عنیزہ سید
جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم

عنیزہ سید

جو رکے تو کوہِ گراں تھے

فضا میں دھول اڑ رہی تھی آسمان نیالا سا ہو رہا تھا۔ میدان آہستہ آہستہ خالی ہو رہا تھا۔ لوگ باگ ہنستے اور باتیں کرتے اپنے گھروں کی طرف چل دیے تھے۔ وہ ان سب کے لیے ایک تفریح سے پُر شام ثابت ہوئی تھی۔ چند نوجوان میدان کے اختتام پر لگے بجلی کے کھمبے کے نیچے کھڑے گپ شپ میں مشغول تھے اور کھینچ کھینچ کر دوپٹے سروں پر لاتی چھوٹے بہن بھائیوں کو ہانکتی لڑکیوں کو کن اکھیوں سے دیکھ رہے تھے۔ لڑکیوں کو دیکھنے کے بعد وہ آپس میں کسی جملے کا تبادلہ کرتے اور پھر ہاتھ پر ہاتھ مار کر بلند آواز میں قہقہے لگاتے۔ ان کا یہ انداز دیکھ کر کچھ لڑکیوں میں شوخی آجاتی اور کچھ گھبرا کر تیز تیز قدموں سے چلنے کی کوشش کرتیں۔

اپنے سامان کو سمیٹتے اور باندھتے ہوئے بندر کے تماشے والے نے دلچسپی سے یہ منظر دیکھا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ سامان باندھ کر اس نے اپنا جھولا کاندھے پر ڈالا۔ ڈگڈگی ہاتھ میں پکڑی اس کا بندر اور بندریا کا جوڑا اس کے دوسرے ہاتھ میں پکڑے بانس سے لٹک گیا اور اس نے بانس بھی دونوں شانوں پر رکھ لیا۔ اس کا سامان کاروبار سمٹ گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے دیکھے منظر کی مسکراہٹ ابھی بھی اس کے لبوں پر تھی۔ وہ مڑ کر اپنے راستے پر چلنے لگا مگر پھر ٹھٹک گیا۔ میدان کے آغاز میں بکھرے کوڑا کرکٹ کے پاس ایک لڑکی اکیلی کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں مکئی کا بھٹا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے شام کی خوشگوار ہوا میں اڑتے اپنے بالوں کو قابو کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔

بال سمیٹتی، بھٹا کھاتی وہ لڑکی اب تماشے والے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ تماشے والے نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر سر جھکا کر اپنے راستے پر چل دیا۔

"ٹھہرو۔ پلیز رکو۔" کچھ دیر بعد اسے اپنے عقب سے آواز آئی۔ اس نے رک کر گردن موڑ کر دیکھا۔ ہنستا کھاتی لڑکی تیز قدموں سے چلتی اس کے پیچھے آرہی تھی۔

"بات تو سنو۔" تیز قدموں سے چلنے کی وجہ سے اس کا سانس پھول رہا تھا۔ تماشے والا رک کر اس کی بات کا ختم ہوا۔

"یہ تم کیسے کرلیتے ہو؟" وہ کہہ رہی تھی۔

"کیا کیسے کرلیتے ہو؟" تماشے والے نے کہا۔

"یہ ہی بندر کا تماشا۔" اس نے اس کے کندھے پر رکھے بانس پر چڑھ کر بیٹھے بندر اور بندریا کی طرف اشارہ کیا۔

"ہمارا کام ہے یہ جی کیسے کرلیتے ہو کا کیا مطلب؟" بندر والے نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے کہ یہ تمہارا کام ہے، مگر تم نے یہ کیسے سیکھا؟ بندر اور بندریا کو سدھایا ہوگا اور یہ جو ریچھ ہے، اسے بھی۔" اس نے بندر والے کے پیچھے پیچھے چلتے ریچھ کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں جی!" بندر والا اس کی بات سمجھ نہیں پارہا تھا۔ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔

"تو پھر مجھے بھی سکھا دو۔" وہ اچانک بڑی عاجزی سے بولی۔ بندر والے کو شاید اس درخواست کی توقع نہ تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے چپ رہ گیا۔

"مجھے بہت شوق ہے لوک ہنر سیکھنے کا۔" وہ کہہ رہی تھی۔ "میں بڑے پیمانے پر ایک فوک فیسٹیول منعقد کرنا چاہتی ہوں 'فوک فیسٹیول۔۔۔ یو نو واٹ از اے فوک فیسٹیول؟" جوش میں وہ یہ بھول گئی تھی کہ بندر والا انگریزی نہیں جانتا ہوگا۔ اس کے سوال پر وہ نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگا۔

"ہے ماہی!" وہ کچھ اور کہنا چاہ رہی تھی، جب دور سے آتی کسی آواز نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرلی۔ وہ دونوں لڑکے تھے جنھوں نے گھٹنوں سے نیچے آتے نیکر پہن رکھے تھے اور آدھے بازو کی قمیص، پاؤں میں ہوائی چپل پہنے وہ تیزی سے ان کی طرف آرہے تھے۔

"سو سلی یو آر ماہی! وی ور سو وریڈ اباؤٹ یو۔ ہو آسکڈ یو ٹو کم آؤٹ آف دیٹ پلیس ود آؤٹ انفارمنگ اس؟"

(تم بے حد بے وقوف ہو ماہی! ہم سب تمہارے لیے اتنے پریشان تھے، تم سے کس نے کہا کہ ہم سب کو بتائے اس جگہ سے باہر نکل آؤ۔)

اس لڑکی نے بھی انگریزی میں ہی کوئی جواب دیا تھا۔ اپنی بات کے دوران وہ بار بار بندر والے کی طرف اشارہ بھی کررہی تھی۔ وہ تینوں آپس میں کسی بحث میں الجھتے دکھائی دیتے تھے۔ بندر والے کے بندر بھوکے تھے، اس کا ریچھ چھلانگیں لگا رہا تھا۔ وہ بھی اب واپس جانا چاہتا تھا، سو بندر والے نے انہیں بحث میں مشغول وہیں چھوڑا اور اپنی منزل کی طرح چل پڑا۔ ان تینوں کی بحث جب ختم ہوئی تو اس لڑکی نے مڑکر دیکھا، تماشے والا جاچکا تھا۔

"دیکھا تم نے؟" اس نے منہ بنا کر پاؤں زور سے زمین پر مارا۔ "وہ چلا گیا، اتنی مشکل سے ہاتھ آیا تھا۔" اس کے چہرے پر ناراضی تھی اور رنج بھی۔

"تم کیسے کیسے لوگوں کے بس ہوجانے پر دکھی ہوتی ہو ماہی!" لڑکا جس کا نام سلمان تھا، منہ بنا کر بولا وہ اس کا سگا بھائی تھا۔ "کبھی کبھی مجھے یقین نہیں آتا۔"

"نہ آئے، مجھے تم کو یقین دلانا بھی نہیں۔" لڑکی نے منہ بنا کر کہا۔ "مگر مجھے اس تماشے والے کو لوکیٹ کرنا ہے، مجھے اس سے کام سیکھنا ہے، میں اس کو پرو موٹ کروں گی۔ سی ول بی مائی فائنڈنگ۔" (وہ میری دریافت ہوگا) وہ

سامنے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی اور اس کا دماغ مستقبل کے نظارے دیکھ رہا تھا۔

"وش فل تھنکنگ۔" (خوش امیدی) دوسرے لڑکے جمال نے قہقہہ لگا کر کہا۔ وہ ان دونوں کا فرسٹ کزن تھا۔ "یہ تماشوں والے سیلانی ہوتے ہیں، یہ تمہیں اب کہاں ملے گا، بھول جاؤ۔"

"کتنے سیلانی ہوتے ہیں۔" وہ اڑ جانے والے انداز میں بولی۔ "یہیں کہیں گھومے گا، آس پاس کے گاؤں میں، اس کو اپنی روزی کمانی ہے، وہ کراچی، کوئٹہ جاکر تو تماشے دکھانے سے رہا۔ یہیں گھوم کر تماشے دکھائے گا اور روزی کمائے گا۔ میں اس کو لوکیٹ کرلوں گی۔ سردار چاچا ول ہیلپ می۔" (سردار چاچا میری مدد کریں گے۔)

"یو آر کریزی (تم پاگل ہو)۔" جمال نے سر جھٹک کر کہا۔ "ہم تو کل واپس جارہے ہیں، یہاں مزید رکنا مشکل ہی ہے۔"

"تم جاؤ، میں تو رکوں گی۔" وہ اسی ضدی انداز میں بولی۔

"اور ماما تمہارا حشر کردیں گی۔" پہلا لڑکا جو اس کا سگا بھائی تھا، بولا "ابھی تک تو ان کو خبر بھی نہیں کہ ہم یوں سردار چاچا کے ہاں رہ رہے ہیں، منسٹر وے کو واپس آرہی ہیں، اس سے پہلے ہمیں یہاں سے بھاگ لینا ہے میڈم! ورنہ شامت آجائے گی۔"

"سنڈے میں ابھی تین دن باقی ہیں۔ ان تین دنوں میں اس نے ویسے ہی مل جانا ہے۔" لڑکی کے لہجے میں لاپروائی تھی۔

"چلو اب چل پڑو یہاں سے۔" جمال نے کہا۔

"ہاں چلو!" سلمان نے تائید کی اور پھر وہ تینوں آہستہ قدموں سے چلتے اس سمت چل دیے، جہاں وہ گھر تھا جس میں وہ مہمان تھے۔ گہری ہوتی شام کے ملگجے اندھیرے میں اِدھر اُدھر جلتی روشنیوں میں ان کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ وہ تینوں ایک بار پھر کسی بحث میں الجھ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

اس کے قدم تھکنے لگے تھے۔ وہ سارا دن پیدل چلتا رہا تھا۔ اس نے سر جھکا کر ایک نظر اپنے پیروں پر ڈالی۔ اس

کے جوتے اور پیر دھول میں اٹے ہوئے تھے۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ اسے وہ چہرے یاد آنے لگے، جو یقیناً" اس کے منتظر تھے۔ ان کا تصور آتے ہی اس کے قدم تیز ہونے لگے اور اس کے بعد جلد ہی وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ کھلے میدان میں قطار در قطار جھونپڑیاں تھیں۔ رنگ برنگے اور مختلف نمونوں والے کپڑوں کو بانس کی کھپچیوں پر چڑھا کر بانس کا سہارا دے کر بنائی گئی جھونپڑیاں جن کے باہر تیل اور مٹی کے چولہے رکھے عورتیں ہانڈیاں چڑھائے بیٹھی تھیں۔ ننگ دھڑنگ اور کچھ صرف نیکریں پہنے بچے ہاتھوں میں سلور کی پلیٹیں اور کٹورے لیے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ دن ڈھل چکا تھا، رات آرہی تھی۔ سو وہ سب بھوکے تھے اور ان کو کھانا چاہیے تھا۔ ان جھونپڑیوں کے مالک مرد دن بھر کی محنت مزدوری، جس میں گداگری سرفہرست تھی کرنے کے بعد اب جھونپڑیوں کے باہر بچھی چارپائیوں پر بیٹھے اور لیٹے گپ شپ میں مصروف تھے۔

اس کے شانوں پر رکھے بانس سے لٹکے بندریہ منظر دیکھ کر چھلانگ لگا کر اترے اور بھاگ کر اپنی اپنی پسندیدہ جگہوں تک پہنچ گئے۔ ریچھ نے اس کے ہاتھ سے لپٹی زنجیر چھڑانے کی کوشش میں کودنا شروع کر دیا۔ جونہی اس نے زنجیر چھوڑی، وہ ایک عورت کی طرف بھاگا، جو پرات گود میں دھرے چاول چننے میں مصروف تھی۔

"آؤ جی آؤ۔ بسم اللہ!" حقے کے کش لگاتا ایک تنومند مرد چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"جی آیاں نوں سرکاراں!" مٹی کے کٹورے میں پانی پیتا ایک اور مرد ہاتھ ہلا کر بولا۔ جھٹپٹے میں بھی اس کے ہاتھوں کی چار انگلیوں میں پہنی موٹے نگوں والی انگوٹھیاں نظر آرہی تھیں۔

وہ ان سب کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور زمین پر بیٹھ کر گھٹنے اس چادر پر ٹیک دیے جس پر بساط بچھائے چند لڑکے پانسا کھیل رہے تھے۔ اس نے اپنے کرتے کی جیب چادر پر الٹ دی۔ دس، پانچ کے چند نوٹوں کے علاوہ ریزگاری کا ایک چھوٹا سا ڈھیر چادر پر نظر آنے لگا۔

"واہ سرکار واہ!" حقے کے کش لگانے والا ریزگاری پر نظریں جمائے متاثر ہوتی آواز میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں نئی سی چمک آگئی تھی۔

"بلے بلے۔" ایک ادھیڑ عمر شخص قریب آکر کھڑا ہوا اور بندر والے کے شانے دباتے ہوئے بولا۔ "بڑیاں کمائیاں سرکار! اگے وادا ای وادا پیسے گا (بہت کمائی سرکار! آگے اضافہ ہی اضافہ ہو گا۔)"

"آپا نسیمہ کدھر ہیں؟" بندر والا جو خود بھی اپنی کارکردگی پر خوش ہو رہا تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں ایدھر میں صدقے۔" اسے قریب سے آواز آئی۔

"لے آیا ہے تیرے لیے۔" اس نے اپنے جھبلے کی طرف اشارہ کیا۔ "کدھر ہے تیرا آٹے والا برتن۔"

"ایدھر آجا۔" چالیس بیالیس سالہ کالی بھجنگ عورت کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ دانت نکوستی ایک جھونپڑی کی سمت چلی۔ بندر والے نے اس کی تقلید کی اور جھونپڑی کے پاس جا کر عورت کے اپنے سامنے رکھے ٹین میں جھبلا خالی کرنے لگا۔ نسیمہ کے لیے کئی دن کے آٹے کا بندوبست ہو گیا تھا۔ پھر اس نے واپس اس جگہ جا کر جہاں وہ اپنی جیب خالی کر آیا تھا۔ نیچے جھک کر مٹھی بھر ریزگاری اٹھائی اور بولا۔

"یہ میرے ننھے دوستوں کے لیے۔" اس کے اردگرد چھوٹے چھوٹے بچے آجمع ہوئے جنہوں نے ادھورے اور پھٹے پرانے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس نے ایک ایک، دو دو روپے کے کچھ سکے ان میں بانٹ دیے۔ وہ شور مچاتے اِدھر اُدھر چھٹ گئے۔

"او چاچا! تمہاری بڑی مہربانی۔" پھر اس نے مسکراتے ہوئے حقہ پیتے شخص سے ہاتھ ملایا۔ "اپنا سامان وصول کرو اور مجھے اجازت دو۔"

ہزاری برس جئیں۔" حقہ پینے والے نے حقے کی نے پیچھے ہٹا کر دبا دی اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"پھر ملاقات ہو گی جلد ہی۔" وہ چند قدم پیچھے ہٹا اور ان سب پر نظر ڈالی۔ "اگلی باری تم سے ظفری!" اس نے گھنی داڑھی میں انگلیاں چلاتے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"خیر نال سائیں سرکار خیر نال۔" اس شخص نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اس نے ان سب کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔

"کوئی روٹی، مائی سرکار؟" جھونپڑی کے باہر رکھے چولہے کی جلتی آگ پر توا رکھتے ہوئے ایک بوڑھی عورت کو خیال آیا۔

"نہیں اماں! بہت دیر ہو گئی۔" وہ اس کی طرف معذرت خواہانہ انداز میں دیکھ کر بولا اور پیچھے کو مڑ گیا۔ ظفری اور ایک دوسرا لڑکا اٹھ کر اس کے ساتھ چلنے لگے۔

"جھلی۔۔۔ اس نوں اے روٹی لنگدی اے بھلا۔" (اس سے یہ روٹی کھائی جائی بھلا) ایک بوڑھے شخص نے کھانے کی پیشکش کرنے والی مائی کو گھر کا۔

"پوچھنا تاں ہے ی۔" (پوچھنا تو تھا نا)

مائی متاثر ہوئے بغیر بولی اور گھر جاتے مہمان کو دیکھنے لگی۔ وہ تینوں چلتے چلتے اس جگہ پہنچ چکے تھے، جہاں چمکتی سیاہ گاڑی کھڑی تھی۔ وہ ان دونوں سے ہاتھ ملا کر گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی، مڑی اور قریب سے گزرتی سڑک پر رواں ہو گئی۔ دن مکمل طور پر ڈھل چکا تھا اور رات کی تاریکی ہر چیز پر اپنا قبضہ جما چلی تھی۔

اس رات غسل کرنے اور تازہ گرم کھانا کھانے کے بعد اپنے نرم گداز بستر پر لیٹ کر اپنی دن بھر کی مصروفیت کو یاد کرتے ہوئے اسے اچانک وہ لڑکی یاد آگئی، جو اسے بہت عاجزی سے کہہ رہی تھی۔

"تو پھر مجھے بھی سکھا دو۔" مٹی کا بھٹا کھاتی، بکھرے بال سمیٹتی وہ لڑکی باقی تماشائیوں سے بالکل مختلف تھی اور اس کی فرمائش بھی بالکل انوکھی تھی۔ پھر اسے وہ نوجوان لڑکے بھی یاد آئے، جو اس لڑکی کو آوازیں دیتے اس سے انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے۔ شاید وہ تینوں سوچ بھی نہ سکتے ہوں کہ اپنی دھن میں وہ جو باتیں کر رہے تھے، ان کے تئیں وہ ان پڑھ گنوار تماشے والا دھیان سے سن رہا تھا۔ نہ صرف سن رہا تھا بلکہ اس کا ایک ایک لفظ سمجھ بھی رہا تھا۔ وہ اس واقعے کو یاد کر رہا تھا اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی، پھر اس کی نیند سے بوجھل آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ گہری نیند میں چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

"نہ پتر نہ، اگر ماہ نور نہیں جانا چاہتی ابھی تو میں تمہیں اسے نہیں لے جانے دوں گا دھکے سے۔" سردار خان نے ماہ نور کی بسورتی شکل دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر چاچا جی! ہمیں بہت دن ہو چکے ہیں یہاں آئے ہوئے۔ ہماری پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے۔" سلمان نے جواب دیا۔

"ان دونوں کی پڑھائی کا حرج ہو رہا ہو گا۔" ماہ نور نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے دانت پیسے۔ "میرا تو نہیں ہو رہا۔ ویسے بھی مجھے یہاں رہ کر کام کرنا ہے تھوڑا سا اپنی پڑھائی ہی کے سلسلے میں۔" اس نے وجہ سوچ لی۔

"او میرے خدایا!" جمال نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے توبہ کی۔ وہ اس کے اس سفید جھوٹ پر محظوظ ہو رہا تھا۔

"تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟" ماہ نور نے اسے گھورا۔ "بڑے دانت نکال رہے ہو، وہ جو میں نے بتایا تھا

تمہیں شام کو۔" اس نے دیکھا' جمال اس کے گھورنے کے باوجود ہنس رہا تھا۔ "وہی جو فوک فیسٹول کا بتایا تھا میں نے تمہیں' اس کے لیے کام یہاں نہیں کرنا مجھے تو اور کہاں کرنا ہے؟"

"فوک فیسٹول کی بچی!" سلمان نے غصے سے کہا۔ "وہ جو ماما تمہارا حشر کریں گی نا آکر' تمہارا سب فوک فیسٹول نکل جائے گا۔ خوابوں میں رہنے والی شہزادی! پہلے اپنا ماسٹرز تو مکمل کرلو' پھر خواب دیکھنا فوک فیسٹول کے۔"

"چلو' چلو۔" وہ مزید منہ بنا کر بولی۔ "کچھ نہیں کہیں گی ماما مجھے۔ سردار چاچا خود بات کرلیں گے ان سے۔"

"ہاں ہاں' بے شک بات کرلوں گا میں اس سے۔ بھرجائی ہماری بے شک غصے کی تیز ہے' مگر دل کی بری نہیں۔" سردار چاچا نے اسے شہ دیتے ہوئے کہا۔

"بس پھر تم دونوں جاؤ' اپنا بوریا بستر سمیٹو میں نہیں جارہی۔" وہ خوش ہو کر بولی۔

"مان جاؤ ماہی!" سلمان نے اسے وارننگ دینے کے انداز میں کہا۔ "ماما کو جانتی ہو تم۔"

"چلو! جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔" وہ ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر بولی۔

"تم برا پھنسو گی ماہی!" سلمان نے اسے یاد دلایا۔

"کوئی بات نہیں' میں پھنسوں گی نا' تم تو نہیں اور پھوپھو' ڈیڈی بھی تو ہیں نا۔" وہ ہنوز بے نیاز تھی۔

آپ بتائیں سردار چاچا۔ اب کب آئے گا بندر کے تماشے والا ادھر؟" پھر اس نے منہ دوسری طرف کرکے سردار چاچا کو مخاطب کیا۔

"وہ روز ایک ہی گاؤں میں نہیں جاتے پتر جی! ابھی ادھر تو اگلے دن کہیں اور' اس سے اگلے دن کہیں اور' راستے میں رک رک کر جگہ جگہ دکھاتے ہیں تماشا!" سردار خان نے ہنس کر کہا۔ "تو فکر نہ کر' میں کرلوں گا پتا' کدھر کو جاتا ہے اس نے اب۔"

"روز دیہاڑی کون سا لگاتے ہیں یہ لوگ۔" چچی صابرہ نے کہا۔ "ایک دن کماتے ہیں' دس دن آرام کرتے ہیں۔"

"ایک دن کی کمائی دس دنوں کے لیے کافی ہوتی ہے کیا؟" ماہ نور حیران ہوئی۔

"کرنا کیا ہوتا ہے انہوں نے۔" چچی صابرہ نے جواب دیا۔ "ایک دن کی کمائی سے' آٹا' چاول لے جاتے ہیں۔ بیویوں پر احسان کرتے ہیں۔ ایک دن کماتے ہیں' دس دن نشہ کرکے پڑے رہتے ہیں۔ بیوی' بچوں کی ہڈیاں توڑتے ہیں۔ جوئے کھیلتے ہیں اور دس دن بعد پھر نکل پڑتے ہیں۔ بیچ کے نو دن ان کی بیویاں جگہ جگہ مانگ تانگ کر لے آتی ہیں' جو کم پڑ جائے تو۔"

"دس دس دن کے بعد؟" ماہ نور کو کچھ مایوسی ہوئی۔

"سوچ لو' دس دن انتظار کرنا پڑے گا۔" سلمان نے اسے ڈرایا۔

"او تو فکر نہ کر بٹیا رانی! میں پتا کروالوں گا اس کے ٹھکانے کا۔" سردار چاچا نے اپنائیت سے کہا۔

"چلیں ٹھیک ہے۔" ماہ نور خوش ہوئی۔

اسے یہ سوچ کر ہی مزا آرہا تھا کہ وہ بندر کے تماشے والے سے کرتب سیکھ سکے گی۔ ڈگڈگی کی آواز پر جس طرح وہ بندر کو نچاتا اور اس کے ساتھ ڈائیلاگز کے سنگ پرفارمنس لیتا تھا' وہ بھی کرپائے گی۔ آنے والے دنوں کے اس خاکے کا تصور کرکے ہی وہ خوش ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم آج کل کہاں غائب ہو جاتے ہو؟" بلال نے سعد سے پوچھا تھا۔

"کہیں نہیں' میں یہیں ہوتا ہوں۔" سعد ان کے لہجے پر کچھ دیر کے لیے گڑبڑا گیا۔

"تم مجھے بتا رہے ہو؟" بلال نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "باپ ہوں میں تمہارا اور مجھے تمہارے بارے میں ہر خبر ہوتی ہے۔" سعد جو آرام کرسی پر بیٹھا جھول رہا تھا' ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ اس کے بارے میں کیا خبر رکھتے ہیں۔ وہ اس کی اس حرکت پر بے ساختہ ہنس دیے۔

"اس کا مطلب ہے کہ تمہاری روٹین میں کچھ گڑبڑ ہے' نا؟" وہ بولے۔

"کوئی گڑبڑ نہیں ہے' بس میرا آج کل آفس میں کچھ زیادہ دل نہیں لگتا اور میں ابراہیم کی طرف چلا جاتا ہوں آفس سے جلدی اٹھ کر۔" ان کی اس بات سے وہ جان گیا تھا کہ وہ صرف اس کے آفس سے غائب ہونے والی خبر سے واقف ہیں' اس لیے فوراً بات بنالی۔

"ابراہیم کی طرف۔" انہوں نے اسے گھورا۔ "سخت ناپسند کرتا ہوں میں اسے' اس کی نامعقول حرکتوں کی وجہ سے۔"

"نامعقول حرکت؟" اس نے حیران ہونے کا مظاہرہ کیا۔

"تو اور کیا۔" وہ اسی انداز میں بولے۔ "جو لڑکا' باپ کا اچھا خاصا بزنس جوائن کرنے کے بجائے جم کھول لے' وہ نامعقول حرکتیں ہی کرتا ہے۔"

"وہ انڈیپنڈنٹ کام کرنا چاہتا تھا ڈیڈی! اور یہ کوئی برا آئیڈیا نہیں۔" سعد نے ابراہیم کی طرف داری کی۔

"ہوں!" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ "تو آپ کس انڈیپنڈنٹ کام کو کرنے کے لیے صلاح مشورے کرنے جا رہے ہیں آج کل اس کے پاس' کوئی ہارٹ کھولنا ہے یا بیوٹی سیلون؟" سعد کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔

"آپ فکر نہ کریں' مجھے جب کوئی ایسا کام کرنا ہوگا' آپ سے ہی مشورہ کرکے کروں گا' ادھر ادھر سے نہیں۔"

"ہوں۔" انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ "ایک کہاوت سناؤں؟"

"کہاوت۔" سعد نے دہرایا۔ "ٹیل یا فیری ٹیل؟"

"نہ ٹیل نہ فیری ٹیل۔۔۔ ایک کہاوت ہے۔"

"چلیں' جو بھی ہے سنائیے۔" اس نے دلچسپی لی۔

"ایک میراثن پر کسی بادشاہ کا دل آگیا۔۔۔"

"یہ بادشاہ بھی خوب مخلوق ہوا کرتے تھے' میراثنوں تک کے لیے دل پھینک' بلکہ اچھال دیا کرتے تھے۔" اس نے لقمہ دیا۔

"بادشاہ آدمی تھے' کچھ بھی کرسکتے تھے۔" وہ مسکرائے۔

"ہاں یہ تو ہے۔" اس نے سر ہلایا۔ "اچھا چلیں! آگے سنائیں۔ کیا ہوا؟"

"کہا نا بادشاہ آدمی تھا' دل پھینکا تو دل کے شوق کو پورا کرنے کے لیے میراثن سے بیاہ کرلیا۔"

"اچھا ہے' جس سے دل کیا' بیاہ کرلیا۔" اس نے ہنس کر کہا۔ "کبھی اتنی آزادی عام انسان کو مل جائے تو ہر گھر میں حرم کھل جائے۔"

"تم خاموشی سے سنو گے یا میں سنانا بند کردوں کہانی؟" وہ ناراض ہوگئے۔

"اوہ میں معذرت خواہ ہوں!" اس نے فوراً ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔

"بس پھر بیاہ کے بعد وہ میراثن کو محل میں لے آیا۔" انہوں نے سنانا شروع کیا۔

"محل ایک طلسماتی دنیا تھی میراثن کے لیے' شاندار خواب گاہیں' بے مثال غلام گردشیں' لاجواب باغات'

پھل، پھول، چرند پرند، جلترنگ بجاتے جھرنے، آبشاریں، بیش قیمت پوشاکیں، ہیرے جواہرات۔ کیا تھا جو میراثن کی رسائی میں نہ تھا۔"

"آج کل بھی ان لوگوں کی رسائی میں سب کچھ ہوتا ہے۔" بے اختیار الفاظ اس کے منہ سے نکلے مگر ان کے گھورنے پر وہ فوراً" خاموش ہو گیا۔

"مگر میراثن بجائے خوش رہنے کے اداس اور دکھی رہنے لگی۔" انہوں نے کہا۔

"بڑی تھینک لیس (ناشکری) میراثن تھی بھئی۔" ایک اور لقمہ اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"بادشاہ اس کی دل جوئی کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ ہر اس چیز کا اہتمام کرتا جس سے اس کا دل خوش ہو سکتا تھا، مگر میراثن بیچاری بجائے خوش ہونے کے اداس اور غم زدہ رہ کر بیمار پڑ گئی۔ اس کا حسن ماند پڑ گیا اور جس زندہ دلی پر بادشاہ مرمٹا تھا، خواب ہونے لگی۔"

"او سو سیڈ!" سعد کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"بادشاہ کو میراثن سے دلی لگاؤ تھا۔" بلال اس بار بھی اس کے جملے سے صرف نظر کر کے آگے چلے۔ "اس نے ملک کے کونے کونے سے حکیم، طبیب، سادھو بلا لیے تاکہ میراثن کا بہترین علاج ہو سکے، مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی کے مصداق، وہ بیچاری تو بالکل خاموش اور لاغر ہو گئی۔"

"پلیز اس کو مارے گا مت، مجھے ٹریجک اینڈ والی کہانیاں بالکل نہیں پسند۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"خاموشی سے سنو بے صبرے!" انہوں نے ڈانٹا۔ وہ خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔

"جب کوئی علاج کارگر نہ ہوا تو بادشاہ نے منادی کرا دی کہ جو شخص میراثن ملکہ کا علاج کرے اور اسے تندرست کر دے گا، اسے ایک لاکھ اشرفیاں انعام میں دی جائیں گی۔"

"پورے ملک میں منادی نجانے کیسے ہوا کرتی تھی ایک ساتھ۔" سعد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "بہت ٹیکنیکل قسم کا سسٹم ہو گا منادی کا یقیناً"۔"

"خاموشی سے سنو گدھے!" بلال نے ڈانٹا "یہ ریسرچ بعد میں کر لینا۔"

"اوہ اوکے!" وہ پھر سے سعادت مند بن گیا۔

"کئی لوگ آئے، کوشش کی، مگر بے سود، میراثن ملکہ کی حالت دن بدن بگڑتی ہی چلی گئی، پھر ایک روز ایک دیہاتی ادھر کو آنکلا، منادی کی خبر سنی اور شاہی محل کا قصد کیا۔ بادشاہ کے دربار میں پہنچایا گیا تو دیکھا بادشاہ سمیت سب درباری اداس، پریشان بیٹھے ہیں۔ اس نے بتایا کہ وہ بھی ملکہ کے علاج کی خاطر آیا ہے۔ بادشاہ مایوسی کی انتہا کو پہنچ چکا تھا، بولا "اتنے بڑے بڑے طبیب، حکیم، سادھو، نجانے کون کون آیا اور کچھ نہ کر سکا، یہ سادہ لوح دیہاتی کیا کرے گا۔" وزیروں، مشیروں نے مشورہ دیا کہ سن تو لیا جائے کیا تدبیر بتاتا ہے، سو اس کی بات سن گئی اور اس کے کہنے پر راتوں رات ایک ماڈل گاؤں تعمیر کروایا گیا، جس میں مٹی کے لیپے پوتے گھر، تنگ گلیاں، نیچے چوبارے ساتھ بنائے گئے، ایک مختصر میدان جس میں دیہاتی میلے کا سامان کیا گیا۔ ڈھول، تاشے والے، چھابڑیوں والے، کھیل تماشوں والے بلائے گئے اور یہ سب کرنے کے بعد بیمار ملکہ کو تخت پر لٹا کر اس گاؤں میں لایا گیا۔ ملکہ جو لاغر تھی اور آنکھیں بند کیے لیٹی تھی، کانوں میں جب بھانڈوں کی جگتوں، ڈھول تاشوں کی دھما دھم اور میراثیوں کے گانوں کی آوازیں پڑیں تو پٹ سے آنکھیں کھول دیں، جو ایک ناچنے والی کے گھنگھرو بجے اور کسی خواجہ سرا نے تان اڑائی تو یکدم اٹھ کر بیٹھ گئی، جو سامنے کا منظر دیکھا تو جھٹ تخت سے اتر مجمع میں جا شامل ہوئی۔ اپنے ہم نسب میراثیوں کے ساتھ تالی بجا بجا جھوم جھوم جھومر ڈالنے لگی۔ کچے گھروندوں اور بیچ چبوتروں پر رقص کرتی گھومنے چڑھنے لگی۔ اس کے چہرے پر لالی آئی اور آنکھوں میں مسرت۔ بیماری یوں ہوا ہوئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔

یہ منظر دیکھ بادشاہ ہکا بکا رہ گیا، جو غور کیا اور دیہاتی سے دریافت کیا تو سمجھ آیا کہ انسانی جبلت اپنے اصل کو فراموش نہیں کر پاتی۔ تاج تخت، آسائشوں کے درمیان بھی بے چین رہتی ہے، سو انسان جتنا پس منظر سے دور ہوتا ہے، اتنا ہی بے چین رہتا ہے۔"

انہوں نے بات ختم کر کے سعد کی جانب یوں دیکھا، جیسے پوچھ رہے ہوں کہ کیا سمجھے اس ساری کہانی سے۔

"ہوں!" سعد سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ "اچھا!" اس نے ان کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا "اچھی کہانی ہے، بامعنی اور سوچنے پر مجبور کرنے والی۔"

جانتے ہو یہ قصہ میں نے تمہیں کیوں سنایا ہے؟"

"کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو پھر ذرا غور کرو، دوست بناتے ہوئے اس کے پس منظر کا خیال رکھنا چاہیے یا نہیں؟"

"آپ رکھتے ہیں؟" اس نے میز پر رکھے گلاس کو گھماتے ہوئے نظریں اٹھا کر ان سے سوال کیا۔

"یقیناً"۔" وہ مسکرائے۔ "کوشش ضرور کرتا ہوں، بھی آغاز میں دھوکا کھا جاؤں تو بعد میں ایسے لوگوں میں سے میراثن پکڑ لینے کی صلاحیت ضرور رکھتا ہوں۔"

"گریٹ!" سعد نے بلند آواز میں کہا۔ "مگر اتفاق سے یا شاید بدقسمتی سے میں انسانوں کی ایک مختلف کیٹگری سے تعلق رکھتا ہوں۔"

"میں جانتا ہوں۔" انہوں نے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا ہوا تھا، اسی لیے ان کی آواز دبی دبی تھی۔ "اسی لیے تمہیں یہ کہاوت سنائی ہے۔"

"تھینک یو۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اگرچہ اس کے سننے کے بعد بھی افاقہ ہونے کا امکان کم ہے۔" وہ مسکرایا۔

"سعد!" وہ دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ اسے عقب سے ان کی آواز آئی۔

"جی!" وہ رکا۔

"یہ مت سمجھنا کہ میں تمہاری ماں کو ڈی گریڈ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔" انہوں نے یوں کہا جیسے کسی انجانی ان دیکھی پر معذرت کر رہے ہوں۔

"آپ فکر مت کریں" اس نے مڑے بغیر کہا۔ "میں نے ایسا نہیں سمجھا۔ آپ ابراہیم کے بیک گراؤنڈ کی بات کر رہے تھے۔" اس نے دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھا۔

"آفٹر آل، اور تم پنجاب قسم کے کسی پہلوان کی فیملی سے تعلق رکھتا ہے۔ تن سازی اکھاڑے میں نہ سہی، جم میں سہی۔" اس نے مڑ کر ان کی جانب دیکھا، ہولے سے مسکرایا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

فضا میں حد سے زیادہ سکوت تھا۔ وہ گرمیوں کی ایک طویل تھکا دینے والی دوپہر تھی۔ باہر صحن میں دن روشن تھا، بے حد روشن مگر اندر اس چھوٹی سی کوٹھڑی میں نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ہلکی سی خنکی بھی تھی۔ چاچی صابرہ نے کوٹھڑی کا کچا فرش دھلوایا تھا اور اس کا پنکھا فل اسپیڈ پر کھلا چھوڑ دیا تھا۔ جب ہی یہ کوٹھڑی نیم تاریکی اور خنکی کی وجہ سے مدہوشی سی طاری کیے دے رہی تھی۔ اس نے بان کی کھری چارپائی پر لیٹے لیٹے نیچے ٹھنڈے فرش پر بغیر کسی بستر کے بے خبر سوئی چاچی صابرہ کو دیکھا اور مزید بور ہو گئی۔

"وقت ہے کہ گزر کے ہی نہیں دے رہا۔" اس نے سوچا اور پھر سامنے کی دیوار کے روشن دان میں جڑے

رنگ برنگے شیشوں کے ڈیزائنوں پر غور کرنے لگی۔ ہاتھ میں پکڑے کاغذوں کو رول کرکے آنکھ سے لگا کر دیکھنے پر ان شیشوں کا منظر اسے کسی کیلیڈو سکوپ جیسا لگا اور اس کی بوریت میں قدرے کمی آنے لگی۔

پندرہ منٹ بعد وہ اس دلچسپی سے بھی بور ہو چکی تھی۔ موبائل کی اسکرین آن کرکے وقت دیکھنے پر علم ہوا کہ ابھی سردار چاچا کے دیے ٹائم میں ایک گھنٹہ سترہ منٹ باقی تھے۔

وہ بیٹھک اور دالان سے گزرتے باہر برآمدے میں آگئی، جس کی جالی دار دیوار پر موٹی موٹی چقیں تنی تھیں۔ ان کا نیلا استر کہیں کہیں سے پھٹا ہوا تھا۔ وہ پھٹی ہوئی جگہوں کے گول سوراخوں سے تپتے سورج کی روشنی چھن چھن کر اندر آرہی تھی۔

چاچی صابرہ کی خاص ملازمائیں ریحانہ اور بختو برآمدے میں بچھی چارپائیوں پر گھوڑے بیچ کر سوئی ہوئی تھیں۔

وہ برآمدے کی جالی کا دروازہ آہستگی سے کھول کر باہر آگئی۔ دھوپ سے بھرے صحن کو عبور کرکے وہ باورچی خانے میں اندر داخل ہو گئی، یہاں بھی نیم تاریکی چھائی تھی۔ اس نے ٹوکری میں سے دو آلو لیے اور اپنے لیے چپس بنانے لگی۔

چپس کاٹ کر تیل سے بھری کڑاہی میں ڈالے ہی تھے کہ اسے باورچی خانے کی گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے باہر سے دو بچوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ اس نے وہ کھڑکی کھول دی۔ باہر بنے اونچے تھڑے پر وہ دونوں صرف جانگیہ پہنے بیٹھے تھے اور ان کے ہاتھوں میں برف کی رنگ برنگی سکرین کھلی قلفیاں تھیں جنہیں وہ گفتگو کے دوران مزے سے چوس رہے تھے۔ اسے ان بے پروا، مگن، کھلنڈرے، انہماک سے قلفیاں چوستے بچوں پر لحہ بھر کے لیے رشک آیا۔ "کیسی بے فکر زندگی ہے۔" اس نے سوچا اور چپس تلتے ہوئے ان کی گفتگو کی طرف توجہ مبذول کر دی۔

"آج باندر والے نے فیر آنا اے، جمعرات دی جمعراتی آوندا اے نا۔" ایک بچے کی بات پر اس کے کان مزید متوجہ ہوئے۔

"اوہدی باندری بیمار اے۔ اوسدی لت نئیں سئی ٹردی۔" (اس کی بندریا بیمار ہے، اس کی ٹانگ ٹھیک سے نہیں چلتی۔) دوسرے بچے نے قلفی کے پگھلے پانی کو اپنے ہاتھ پر سے چوستے ہوئے ماہرانہ رائے دی۔

"لولی باندری لیاوندا اے تے فیر وی پنج پنج روپے لے لیندا اے۔" (لنگڑی بندریا لاتا ہے پھر بھی پانچ پانچ روپے لے کر تماشا دکھاتا ہے۔) دوسرے نے تبصرہ کیا۔

"لے فیر منڈے جاندے پئے گراؤنڈ نے، چل ایس وی چلیے۔" (لو پھر لڑکے اس گراؤنڈ کی طرف جارہے ہیں، چلو ہم بھی چلیں۔)

پہلے لڑکے نے قلفی کا تنکا اچھی طرح چوسنے اور پھر اسے اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد کہ اس پر دودھ کا قطرہ باقی تو نہیں رہ گیا، اسے نالی میں پھینکتے ہوئے کہا اور اٹھ کر دوڑ پڑا۔ دوسرا بھی اپنا تنکا چباتا اس کے پیچھے بھاگا۔

ماہ نور کے چپس تیار ہو چکے تھے۔ اس نے انہیں پلیٹ میں نکالا ہی تھا کہ ہانپتی کانپتی چاچی صابرہ باورچی خانے کا دروازہ تیزی سے کھول کر اندر داخل ہوئیں۔

"ہائیوں جو گیے! تجھے کس نے پھاڑا! تھا گرمی میں ادھر آنے کا، نی ریحانہ! نی بختے!" وہ باہر کی طرف منہ کرکے بلند آواز میں بولیں۔ "نی تسی ستیاں مریاں ہی رہیو، مہمان وچاری آپی گرمی وچ کڑھدی آلو تل دی رہی۔ تہانوں پتا دی نئیں، چوہدری صاحب نوں خبر ہو گئی تے لگ سمجھ جائے گی تہانوں۔" (تم سوتی ہی رہ گئیں اور مہمان بی بی کو گرمی میں خود آلو تلنے پڑے، چوہدری صاحب کو خبر ہو گئی تو تم کو سمجھ لگ جائے گی۔)

"چاچی جی! کوئی مسئلہ نہیں، آپ لوگ سو رہے تھے اور مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ کچھ نہیں سوجھا تو یہاں آگئی

چپس بنانے۔ پلیز کسی کو مت ڈانٹیں۔ مجھے ضرورت ہوتی تو میں خود ان کو جگا لیتی۔" ماہ نور اس واویلے پر بالکل ہی سٹپٹا گئی۔

"ماں صدقے! تجھے کہاں عادت ہے اتنی گرمی میں ایسے تپتے ہوئے باورچی خانے میں کام کرنے کی، اپنا چہرہ دیکھو! کمہلا گیا ہے بالکل، چلو شاباش نکلو ادھر سے۔ ادھر فارم ہاؤس کا آرام چھوڑ کر تو کاہے کو ادھر آگئی گھر؛ یہاں ویسا آرام کہاں۔" چاچی صابرہ کے لہجے سے ممتا ٹپک رہی تھی۔ وہ زبردستی اسے وہاں سے نکال کر دالان میں لے آئیں اور بختو کو ٹھنڈا ٹھار شربت بنانے کو دوڑا دیا۔

"چاچی! پانچ بجنے والے ہیں۔ سردار چاچا نے کہا تھا کہ پانچ بجے آتا ہے تماشے والا۔" اس نے انہیں یاد دلایا۔

"ہاں تو۔" چاچی کو کوئی جلدی نہیں تھی۔ "آپے بھجوا دیں گے کھاری کو تجھے لینے کے لیے، جب آئے گا وہ باندر والا۔"

"مگر گلی کے بچے تو چلے بھی گئے۔" وہ یوں بولی جیسے ان ہی بچوں کی طرح بھاگ جانے کو بے چین ہو۔

"اوہ تو بچے ہیں، ان کا تو کام ہی سارا دن ادھر ادھر ٹوڑ بھرنا ہے۔ تو شربت پی سکون سے۔ دیکھ! آلو کھا کے اوپر سے فوراً ہی نہ ٹھنڈا شربت پی لینا، گلا گھٹ کرے گا۔"

لیکن ماہ نور کا سارا دھیان کھاری کی آواز کی طرف تھا۔ کب وہ ادھر آتا ہے اور اس کو بلا کر اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔

اسی بے دھیانی میں وہ شربت کے دو گلاس اور چپس کی پلیٹ ختم کر چکی تھی، جب باہر سے کھاری کی پھٹی ہوئی آواز آئی۔

"بی بی جی! شہر والی بی بی کو بھیجو، باندر والا آگیا اے۔"

وہ تیزی سے اٹھی اور چاچی کی "ہے ہے" کی پروا کیے بغیر باہر نکل گئی۔ اس کا شوق اور دلچسپی دیکھ کر کھاری دانت نکوستا اس کے آگے چلا۔ یہ وہی میدان تھا، وہی مجمع اور وہی تماشا۔ ڈگڈگی بجاتا تماشے والا بندر کو ہدایات دے رہا تھا۔

"اس کے سسرال والوں نے اسے متوقع پروٹوکول نہیں دیا، اسے ناراض ہو جانا چاہیے۔" بندر بہت مہارت اور خوبی سے ناراضی کا تاثر دیتا ایک چوکی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گیا۔ "اب بندریا منانے جائے گی۔ بندر اس کو ڈنڈے مارے گا، بندر تو صاحب سرکار ہے۔"

وہ سارا تماشا جو اس نے پچھلی مرتبہ اتنی محویت اور شوق سے دیکھا تھا، بالکل اسی طرح اس کی نظروں کے سامنے دہرایا جا رہا تھا۔ بچے، بڑے اسی طرح تالیاں بجا بجا کر داد دے رہے تھے۔ لوگوں کے قدموں کی دھمک سے زمین کی گرد اڑ اڑ کر فضا میں بکھر رہی تھی۔ دسیوں بار دیکھے گئے تماشے کو ایک دفعہ پھر دیکھتے ہوئے بھی سب چہروں سے شوق، تجسس اور خوشی ہویدا تھی، مگر ماہ نور کا جسے اس تماشے کا اتنے دن سے شدت سے انتظار تھا، دل نجانے کیوں مایوس اور ناخوش تھا۔ وہ مجمعے سے پیچھے ہٹتے ہٹتے میدان کے پیچھے تعمیر شدہ دیوار کے ساتھ جا کر لگ گئی۔

"بلاواں باندر والے نوں بی بی جی! چوہدری صاحب آکھیا، بی بی نے باندر والے نوں ملنا اے۔" کھاری دانت نکوستا اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"نہیں۔" ماہ نور نے بدقت سر ہلایا۔ "مجھے نہیں ملنا اس سے۔"

"اوہنے ٹر جانا اے، مل لو۔" کھاری حیران ہوتا بولا۔ "چوہدری صاحب نے بندہ گھل کے یا اینوں ایدھر"

نئیں تے ایہہ نے تے ٹر جانا سی بابے منگورے میلے تے۔" (چوہدری صاحب نے بندہ بھیج کر اسے ادھر بلایا ہے، ورنہ اس نے تو اب بابا منگو کے میلے پر چلے جانا تھا) کھاری نے جتایا۔

"نہیں نا کھاری! انہیں ملنا۔" ماہ نور نے سختی سے کہا۔

"بوری دانیاں دی تے پنج سو روپیہ گھل کے منگایا اے چوہدری صاحب نے۔" (گندم کی بوری اور پانچ سو روپیہ دے کر چوہدری صاحب نے اسے ادھر بلایا ہے) کھاری نے مزید انکشاف کیا۔

"اوپائی" پھرو، تماشا ختم کر کے پیسے چھنتے تماشے والے سے مخاطب ہوا۔

"اویں ٹھنڈے ٹھنڈے نہ ٹر جائیں' بی بی ہوراں دی گل سن کر جاناای۔" (ایسے ہی مت چلے جانا' بی بی جی کی بات سن کر جانا ہے)

کھاری نے تحکمانہ انداز میں اسے جتایا۔ وہ نوٹ اور سکے اٹھاتا ہوا گردن اٹھا کر ادھر دیکھنے لگا اور اثبات میں سر ہلا کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوا۔

"تم وہ تو نہیں' جو پچھلی بار یہاں آیا تھا۔" جب وہ اپنا سامان پیک کر کے ادھر آیا تو ماہ نور نے بے اختیار سوال کیا۔

"اوہو! ای اے بی بی جی! ایس دی باندری لولی اے' تے باندر دی اک اکھ ڈھنگی اے۔" (وہی ہے بی بی جی' اس کی بندریا کی ٹانگ چھوٹی ہے اور بندر کی بھی ایک آنکھ ٹیڑھی ہے) کھاری نے ایک دفعہ پھر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ "پکی نشانی اے باندر تے باندری دی۔" (پکی نشانی ہے بندر اور بندریا کی۔)

"تم چپ کرو کھاری!" ماہ نور نے اسے ڈپٹا اور بندر والے سے مخاطب ہوئی۔ "ہاں! تم بتاؤ' تم وہ نہیں ہو نا جو پچھلی مرتبہ آیا تھا؟"

جواب میں اس نے اپنی بڑھی ہوئی شیو سہلائی' کان میں انگلی ڈال کر کھجانے لگا۔

"کدوں؟" (کب) پھر اس نے پوچھا۔

"اس سے پچھلی مرتبہ جب تماشا یہاں اس گاؤں میں ہوا تھا۔" ماہ نور نے اپنے جملے کے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"اسی ای آوندے آں' ساڈا ای پھیرا ہوندا اے بی بی صیب!" اس نے نشے بھری آواز میں جواب دیا۔

"پچھلی مرتبہ' یاد کرو پچھلی مرتبہ۔" ماہ نور نے لفظ چبا چبا کر ادا کیے۔

"اوبی بی صیب! ایس علاقے وچ ہور کوئی باندر رکھدا ای نئیں۔ مندا پیندا اے۔ ایدھر کسے ہور نئیں آنا سی۔" وہ تھوڑا ہوش میں آتا بولا۔ (او بی بی صیب! اس علاقے میں کوئی بندر رکھتا ہی نہیں' نقصان ہو جاتا ہے۔ یہاں کسی نے نہیں آنا)

"ہیل دو یو۔" ماہ نور نے غصے سے کہا۔ "جاؤ دفع ہو جاؤ' مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے نہ ہی کوئی کام ہے۔"

"او چل پائی چل" (او چلو بھائی چلو) کھاری کو اچانک یاد آیا وہ محویت سے ساری گفتگو سنتا چونک کر بولا۔ شکل گم کرائی "اویں ساڈا ٹیم برباد کیتا تے راہ جاندے دی بوری دانیاں دی تے روپیہ پنج سو کپ لیا۔" (شکل گم کروائی' خوا مخواہ ہمارا ٹائم برباد کیا اور مفت کی گندم کی بوری اور پانچ سو روپیہ بھی لے اڑا۔)

"چلو فیر بی بی جی چلیے۔" اس نے مشن میں ناکام سپاہی کی طرح ہارے ہوئے لہجے میں ماہ نور کو مخاطب کیا۔ ماہ نور سر ہلا کر اس کے پیچھے چل دی۔

"ایہہ نشے دے مارے لوک ہوندے نیں' جنہوں سوجھدی اے جنور پھڑ کر ٹر پیندا اے۔ انہاں نوں آپ وی نئیں پتا ہوندا' پہلاں کون گیا سی تے فیر کون گیا۔" (یہ نشے کے مارے لوگ ہوتے ہیں' جسے خیال آتا ہے

جانور لے کر چل پڑتا ہے۔ انہیں خود بھی نہیں پتا ہوتا پہلے کون گیا تھا اور پھر کون گیا تھا)

مختلف گلیوں میں ماہ نور کی رہنمائی کرتے ہوئے کھاری اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔

"او توں شکلاں دے وی اکو جئے ہوندے نیں۔ ورے دے ورے تے نہاؤندے نیں۔ جنوراں نال جنور ای بن جاندے نیں۔ انہاں دیاں شکلاں نئیں پچھانیاں جاؤندیاں۔" (اوپر سے شکلوں کے بھی ایک جیسے ہوتے ہیں' سال سال بعد تو نہاتے ہیں۔ جانوروں کے ساتھ جانور ہی بن جاتے ہیں۔ ان کی شکلیں نہیں پہچانی جاتیں۔)

وہ بولے جا رہا تھا اور ماہ نور صرف سن رہی تھی۔ اس کا ذہن اسی بات میں الجھا ہوا تھا کہ پچھلی مرتبہ والا تماشے والا کیوں نہیں آیا اور اگر نہیں بھی آیا تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ اسے تو کرتب دیکھنا تھا' کسی سے بھی سہی۔ وہ کیوں اس تماشے والے کو دیکھ کر اتنے غصے میں آ گئی تھی۔ اس نے اس سے تماشے کے بارے میں کیوں پوچھا نہیں پوچھا۔

"اودھر ہوروی وڈے کرتب باز آوندے نیں بی بی جی بابے منگو دے میلے تے۔"

گھر کے دروازے پر پہنچ کر کھاری نے سرگوشی کے سے انداز میں اسے بتایا۔ "تسی چوہدری صاحب تے آکھو' گڈی دیہن اودھر چلاں گے' قسمے' دل خوش ہو جاوے گا تہاڈا۔"

(بابے منگو کے میلے پر اور تماشوں والے بھی آتے ہیں۔ آپ چوہدری صاحب سے کہیں ہمیں گاڑی دے دیں' میلہ دیکھنے چلیں گے' قسم سے آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔)

وہ کوئی جواب دیے بغیر گھر میں داخل ہو گئی۔ چاچی صابرہ صحن میں چارپائی ڈالے پیڈسٹل فین چلائے شان سے بیٹھی تھیں۔ دائیں بائیں تین چار ملازمائیں بیٹھی انہیں گاؤں بھر کی چیدہ چیدہ خبریں سنا رہی تھیں۔

ماہ نور تیزی سے اندر داخل ہوئی اور سلام کر کے اندر جانے لگی۔

"دیکھ آئی تماشا دھی رانی؟" چاچی صابرہ نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔

"جی۔" وہ کہہ کر تیزی سے اندر چلی گئی۔

"لے۔ تماشا دیکھ کے تو اس کا مزاج ہی خراب ہو گیا۔" چاچی نے حیرت سے کہا۔

"وکھرا کر کے دکھانا تھا بی بی جی!" ایک ملازمہ نے کہا۔ "اب ایہنی بھیڑ میں کے دیکھنا تھا اس وچاری نے۔"

"کہا تھا چوہدری صاحب نے کہ وکھرا بلا لیتے ہیں فارم ہاؤس پر باندر والے کو' پر یہ کہتی تھی کہ نہیں اس طرح مزا نہیں آئے گا۔" چاچی صابرہ نے منہ بنا کر جواب دیا۔

ماہ نور تھوڑی دیر بعد اپنا بیگ اٹھائے باہر نکلی۔ "چاچی جی! کھاری سے کہیں مجھے فارم ہاؤس چھوڑ آئے۔"

"لے دس' ایہنی افراتفری میں چھوڑ آئے فارم ہاؤس؟" چاچی نے حیران ہو کر کہا۔ "اور کھاری تو دفعہ بھی ہو گیا ہو گا' کبھی کا نہ ہووے ہلوا (چھلاوہ) ہے' اس کا کوئی پتا چلتا ہے؟"

"چوہدری صاحب کو فون کرو نا بی بی جی۔۔۔ ڈرائیور' گڈی بھیج دیں تو بی بی چلی جائے۔" ایک مصاحب بولی۔

"نا' پھر اتنی جلدی کیا ہے۔" چاچی صابرہ کو یقیناً اس عجلت پر اعتراض تھا۔ "آج رات اور ادھر گزار لے۔ میں نے تیرے واسطے گڑ والے چاول پکوائے ہیں گری بادام میوہ ڈال کر' آلو گوشت کے ساتھ تندوری روٹیاں لگوائی ہیں۔"

"نہیں چاچی' پلیز آپ کھاری کو بلوا دیں' میں نے فارم ہاؤس جانا ہے۔"

اس نے قطعیت سے کہا اور یہ تو چاچی صابرہ اتنے سے دنوں میں سمجھ ہی چکی تھیں کہ اس لڑکی کے دماغ میں ایک بار جو بات آ جائے وہ اس پر عمل کر کے ہی چھوڑتی تھی۔ سو انہوں نے مزید بحث کرنے کے بجائے بلتو کو بھگایا۔

اور کھاری کے آتے ہی ماہ نور انہیں سلام کر کے فوراً" نکل گئی تھی۔ انہیں افسوس ہوا کہ وہ خصوصی کھانا جو انہوں نے اس کے لیے پکوایا تھا اس کی بے قدری ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"میں تمہیں کبھی ڈھنگ سے سمجھ نہیں پاؤں گا' یہ طے ہے۔" ابراہیم نے ایک خراب ٹریڈ مل کی خرابی ڈھونڈنے کی خاطر باریک بینی سے جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"کوشش بھی مت کرنا' خواہ مخواہ الجھ جاؤ گے۔" سعد نے مسکرا کر جواب دیا اور کرسی پر ٹانگیں پھیلا کر نیم دراز ہو گیا۔

"الٹی سیدھی حرکتیں تم کرتے ہو اور تمہارے بادا جان الزام مجھ پر دھرتے ہوئے مجھے اپنے ناپسندیدہ ترین افراد کی کیٹیگری کی جو انہوں نے ڈگریاں بنائی ہوئی ہیں اس میں نیچے سے نیچے ترین کی ڈگری میں شفٹ کرتے جاتے ہیں۔" ابراہیم نے پلاسٹک چڑھے تار کو دانت میں پھنسا کر اس کا پلاسٹک ادھیڑتے ہوئے کہا۔

"آئی ایم رئیلی سوری۔" سعد نے آنکھیں موندے جواب دیا۔ "مگر تمہیں پتا ہے نا کہ دوست ہی دوست کے کام آتے ہیں۔"

"یار! یہ کس قسم کی کوآپریشن ہے' جو تم مجھ سے چاہتے ہو۔" ابراہیم جھنجلا کر بولا۔ "اب اپنی نئی فرمائش پر غور کرو' یہ کوئی حرکت کرنے والی' جو تم کرنا چاہتے ہو۔"

"حرکت تو ہے۔" سعد نے اسے چڑایا۔ "بغیر حرکت کیے تو یہ کام ہوتا نہیں' پھر کرنے والی کا کیا سوال ہے۔ تمہارا اعتراض ریجیکٹ ہوا۔"

"ایسا کرو' تم کسی صوفی میوزک بینڈ کو جوائن کر لو۔ تمہارے بادا جو تمہیں مراثیوں اور میراثنوں کی کہانیاں سناتے ہیں' اس میں پتا نہیں کون سی لاشعوری جبلت کار فرما ہے۔" ابراہیم ٹریڈ مل کے نقص سے مایوس ہو کر اس کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"شک نہ کر یار! میرے ابا جان ایک اعلا نسل خاندان کے وارث ہیں۔ ازلوں سے جس کا تعلق تجارت و کاروبار سے ہے۔ یہ جو بارٹر سسٹم تھا نا اولین تجارت کا سسٹم اس کے بانی بھی ہمارے آباء ہی تھے۔" ابراہیم کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

"پھر یہ تمہاری والدہ صاحبہ کے خاندان کا قصور ہو گا۔" اس نے بمشکل اپنی ہنسی قابو کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں شاید اسی وجہ سے تو مجھے وہ طویل کہاوت سننی پڑی' جو میں نے تمہیں سنائی۔ تمہیں پتا تو ہے ہی کہ مدر ڈیئر ماضی کی ایک مشہور مغنیہ رہ چکی ہیں۔" سعد نے کہا۔

"ویسے تمہارے بادا کو زیب نہیں دیتا کہ تمہیں والدہ صاحبہ کی وجہ سے میراثنوں والی کہانیاں سنائیں۔ اگر وہ میراثن تھیں' مطلب۔ اگر انہیں فن موسیقی سے شغف تھا تو ان کا انتخاب بطور شریک حیات کے تمہارے والد صاحب نے کیوں کیا اور اگر کر ہی لیا تھا تو اس انتخاب کے نتیجے میں تمہارے ظہور کے قصور وار پھر بھی تم ٹھہرائے نہیں جا سکتے۔" ابراہیم نے جیسے فیصلہ صادر کرتے ہوئے کہا۔

"وہ اس اتفاق کو قصور وار نہیں ٹھہراتے بھائی! جو ان کے اور اماں جان کے ملاپ کا باعث بنا۔" سعد نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ ان جینز' جرثوموں کو قصور وار ٹھہراتے ہیں' جو والدہ صاحبہ کی طرف سے مجھ تک بدرجہ اتم منتقل ہوئیں' اسی لیے مجھے میراثن کا قصہ سنایا گیا۔"

"تو اس میں بھی تو تمہارا کوئی قصور نہیں یار!" ابراہیم نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "کیوں تمہارے والد صاحب کے اپنے جرثومے اتنے اسٹرونگ نہیں تھے کہ تم تک منتقل ہو کر تمہیں لومڑی کی طرح عیار' خرگوش کی طرح چست اور الو کی طرح ذہین "فطین بندر صفت تاجر بنا دیتے جس کو ٹوپیاں بیچنے کا گر آتا ہو۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" سعد نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھ میں دونوں کے جرثومے بڑے توازن کے ساتھ منتقل ہوئے' میں جس حد تک میراثی ہوں اسی حد تک ذہنی طور پر خاصا پکا بزنس مین بھی ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"میری ڈگریز دیکھو' شروع سے اکنامکس' ٹریڈ اینڈ بزنس اور فنانس اینڈ مارکیٹنگ جیسے مضامین میں میرا دل زیادہ لگتا اور دماغ زیادہ چلتا رہا ہے۔"

"پھر تمہارے باوا جان کو اعتراض کس بات پر ہے؟" ابراہیم نے تعجب سے پوچھا۔

"بس وہ چاہتے ہیں کہ میرا سارا کا سارا دھیان' جمع جوڑ کی طرف لگ جائے اور یہ میں نہیں کر سکتا۔" سعد نے اپنی پینٹ پر سے نادیدہ مٹی جھاڑتے ہوئے کہا۔ "میں جتنا ٹائم ان کے لیے منافع بخش اور کامیاب بزنس معاہدوں پر لگاتا ہوں' اتنا ہی وقت اپنے دوسرے مشاغل میں مصروف رہنا پسند کرتا ہوں' بغیر کسی دخل اندازی یا بحث مباحثے کے اور یہ ہی ایک بات ہے' جو ان کی سمجھ میں نہیں آرہی یا پھر وہ اسے تسلیم کرنے سے انکاری ہیں۔"

"خیر' جو بھی ہے۔ مجھے تم دونوں باپ بیٹوں کی فلاسفی بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔" ابراہیم نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "یار! تم لوگوں کے پاس اتنا بے شمار پیسہ ہے۔ آرام سے پرتعیش زندگی گزارو۔ وہ ہیں کہ اور' اور بنانے کے چکر میں دن رات کا آرام حرام کیے دے رہے ہیں اور تم ہو کہ اپنے سرپھرے مشاغل میں اپنا آرام و سکون برباد کیے دیتے ہو۔ ایک بات تو بتاؤ۔" ابراہیم نے سعد کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں پوچھو۔" سعد نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔

"یہ جو تم لوگوں کے بینک اکاؤنٹس اثاثے پیسوں سے بھرے پڑے ہیں' ان کا کرتے کیا ہو؟"

سعد نے بھرپور قہقہہ لگایا اور پھر مسکراتے ہوئے ابراہیم کی طرف دیکھنے لگا۔ "ان کو ہم دونوں ہاتھ سے استعمال کرتے ہیں' وہ اپنے ذہنی سکون کے لیے اور میں اپنے ذہنی سکون پر۔ یہ اور بات ہے کہ ہم دونوں کے ذہنی سکون کے پیمانے الگ الگ ہیں۔"

"اوہ یار! مگر تم اپنے ذہنی سکون کے پیمانے بھرنے کے چکروں میں مجھے بھی گھسیٹ لیتے ہو اور بعد میں تمہارے والد صاحب میری کلاس لیتے ہیں کہ ان کے فرزند ارجمند کو بگاڑنے میں سارا کا سارا ہاتھ میرا ہے۔" ابراہیم نے جھنجلا کر کہا۔

"بات یہ ہے جگر!" سعد نے مسکرا کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ سب ایسے ہی چلتے رہنا ہے۔ تُو میرا عزیز ترین دوست ہے' کبھی مہینوں میں ایک آدھ بار اگر وہ تیری کلاس لے ہی لیتے ہیں تو بس اچھے بچوں کی طرح سن لیا کر' تیرا کیا جاتا ہے یار!"

اس نے ہاتھ بڑھا کر ابراہیم کو بھی اٹھایا اور گیٹ کی طرف چل دیا۔

☆ ☆ ☆

وہ پندرہ بیس منٹ میں ہی گھر سے سردار چاچا کے فارم ہاؤس تک پہنچ گئی تھی اور یہاں پہنچنے کے بعد گھنٹہ بھر سے کافی سے زیادہ بور ہو چکی تھی۔ سردار چاچا کسی کام سے گاؤں سے باہر گئے ہوئے تھے اور اس وقت یہاں صرف ملازمین کی حکومت تھی۔ کمھاری اسے فارم ہاؤس تک پہنچانے کے راستے میں ڈراتا رہا کہ وہ فارم ہاؤس میں تنہا رہے گی اور وہاں پر کبھی کبھی انسان دوست بھوت بھی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ وہ اندر سے ڈری ہوئی تھی اور اس کا

دل اب واپس اپنے گھر لوٹ جانے کو بے چین تھا۔ لیکن جب تک سردار چاچا نہیں آجاتے' وہ یہاں سے جا بھی نہیں سکتی تھی۔

بہت دیر تک وہ طویل برآمدے میں بچھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھی سامنے کا منظر دیکھتی رہی۔ تاحد نظر سبزہ ہی سبزہ تھا۔ اونچے پیڑ اور سرسبز درخت' رنگ' برنگ پھول جن میں سے بہت سوں کے ناموں سے بھی وہ واقف نہیں تھی۔ یہ عمارت شہد رنگ کے پتھروں سے بنی تھی۔ محرابی چھتوں' پتھر کے فرش اور لکڑی کے ستونوں پر کھڑا وہ برآمدہ اسے بے حد پسند تھا' مگر اس وقت شاید اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا' پھر ادھر ادھر پھرتی جنت بی بی اس کو تنہا بیٹھے دیکھ کر ادھر آگئی۔ وہ اپنے ہاتھوں کو سہلا رہی تھی جن پر غالباً" کوئی تیل لگا ہوا تھا۔

"کیا ہوا جنت بی بی؟" ماہ نور نے دھیان بٹانے کو پوچھا۔

"کچھ نہیں ہوا جی۔" جنت نے ہاتھوں سے دھیان ہٹا کر کہا۔ "سبزیاں اور پھول توڑنے والے ہاتھ ہیں جی! زیادہ تکلیف ہو تو تیل مل لیتے ہیں۔"

ماہ نور نے آگے بڑھ کر جنت کے ہاتھ پکڑ لیے۔ جنت بھونچکا رہ گئی۔

"یہ محنت کش کے ہاتھ ہیں جنت بی بی!" ماہ نور نے بے اختیار کہا۔

"یہ ہاتھ کھردرے اور بھدے ہیں جی۔" جنت نے جیسے جھینپ کر اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

"نہیں یہ بہت خوب صورت ہاتھ ہیں۔" ماہ نور نے کہا۔ "کوئی دوسرے ہاتھ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

جنت کے لیے یہ ایک نئی صورت حال تھی۔ وہ مالکوں کا غصہ' ڈانٹ اور ناراضی سہنے کی عادی تھی۔ اتنی نرمی اور اتنی اپنائیت اس کے لیے ایک بالکل نئی بات تھی۔

"ہاتھ تو آپ لوگوں کے خوب صورت ہوتے ہیں جی' مالکوں کے۔" جنت کے منہ سے الفاظ اٹک اٹک کے نکلے۔ گیٹ پر گاڑی کا ہارن بجا' جنت یکدم اپنے ہاتھ چھڑا کر عالم گھبراہٹ میں اپنی چپل ڈھونڈنے لگی۔

"کہاں چلیں؟" ماہ نور نے اس کی گھبراہٹ کو حیرت سے دیکھا۔

"چودھری صیب آگئے جی' ابھی چلوں۔" وہ چپل پاؤں میں اڑسا کر چادر کی بکل مارتی پچھلی طرف غائب ہو گئی۔

ماہ نور نے گیٹ کی طرف دیکھا۔ تین چار گاڑیاں ڈرائیو وے پر کھڑی تھیں اور سردار چاچا سمیت کئی لوگ ادھر ادھر کھڑے نظر آرہے تھے۔ وہ اٹھ کر اندر طویل ہال نما کمرے میں آگئی۔

اسی رات اس نے سردار چاچا کو بتایا کہ اسے بابے منگو کا میلہ دیکھنا ہے۔ اس کی یہ نئی فرمائش سردار چاچا کے لیے حسب معمول باعث حیرت بنی تھی' مگر وہ مسکرا دیے۔

"بابے منگو کا میلہ تو تین دن تک جاری رہتا ہے بیٹا جی!" انہوں نے کہا۔

"چلیں آپ ایک ہی دن کے لیے جانے کی اجازت دے دیں۔" وہ بچوں کی طرح ضد کر کے بولی۔

"ویسے تجھے بتایا کس نے ہے بابے منگو کے میلے کے بارے میں؟" سردار چاچا نے اچانک پوچھا۔

وہ بے اختیار کمھاری کا نام لینے لگی تھی' مگر پھر اس نے فوراً" الفاظ زبان تلے دبا لیے' کمھاری ہی تو اس میلے کی سیر کے دوران اس کا راہبر بننے والا تھا اور اس کا نام لے دینے سے کیا معلوم اس کی شامت آجائے۔

"تماشا دیکھنے والی بیبیوں نے بتایا آج۔" اس نے فوراً" بات گھڑی۔ "وہ کہہ رہی تھیں کہ بندر کے تماشے والے وہاں بھی آتے ہیں۔"

"ہوں۔" چاچا سردار نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "اچھا چلو انتظام کر دیتے ہیں تمہارے وہاں جانے کا۔"

"تھینک یو سو مچ چاچا جی!" وہ خوشی کے عالم میں بولی۔

"مینشن ناٹ۔" چاچا سردار مسکرائے۔

"کبھی کبھار ہی لگتا ہے کہ آپ پڑھے لکھے بھی ہیں۔" ماہ نور نے شرارت سے کہا۔

"جیسے کبھی کبھار لگتا ہے کہ تم پڑھی لکھی نہیں ہو۔" انہوں نے برجستہ جواب دیا۔

"مثلاً "کب؟" یہ اس کے لیے نئی بات تھی۔

"مثلاً" جب تم بندر کے تماشے والے کے لیے سرگرداں دکھائی دیتی ہو۔" وہ مسکرائے۔ "مجھے گاؤں کی ایک عام سی میلے کپڑوں، میلے بالوں والی ان پڑھ لڑکی کا خیال آجاتا ہے۔ جس کی ماں، باپ سے فرمائشیں بس ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

ماہ نور جھینپ گئی۔ "میں معذرت خواہ ہوں اگر آپ کو میری فرمائش اچھی نہیں لگی۔"

"ارے "ایسی کوئی بات نہیں ہے پتر جی!" سردار چاچا مسکرائے۔ "بلکہ مجھے اچھا لگتا ہے مجھ ماں، باپ سے چھوٹی چھوٹی سیدھی سادی فرمائشیں کرتی بیٹیاں اچھی لگتی ہیں۔"

ماہ نور مسکرادی۔

"اللہ نے مجھے اولاد نہیں دی، میں اس کی رضا میں راضی ہوں، لیکن میرے دل میں بیٹے سے زیادہ بیٹی کی تمنا رہی ہے۔ اسی لیے جب تم کسی چیز کی فرمائش کرتی ہو تو دل چاہتا ہے ایک دم پوری کردوں۔" سردار چاچا کہہ رہے تھے۔

"اور وہ کھاری کم بخت کہہ رہا تھا۔ کیا پتا چوہدری صاحب اس فرمائش پر غصے میں آجائیں۔" ماہ نور نے دل میں سوچا۔

"چلو پھر میں بندوبست کرتا ہوں تمہارے جانے کا، تم اپنی تیاری کرو۔" سردار چاچا نے کہا۔

"میری تیاری؟" وہ چونک کر بولی۔ "میری کیا تیاری ہونا ہے چاچا جی!"

"ارے بھئی تم لوگ آج کل اپنے لوازمات لیے بغیر نہیں نکلتے نا کہیں، وہ تمہارے کیمرہ، وہ آئی پوڈ، وہ آئی فون۔" سردار چاچا ہنس رہے تھے۔

ماہ نور بھی بے اختیار ہنس دی۔

"فکر نہ کریں، میرے پاس ایسے کوئی لوازم نہیں، ایک سیدھا سادہ موبائل فون ہے، اسی کو سب مقاصد کے لیے استعمال کرلیتی ہوں، ویسے بھی اس قسم قسم کی نیکنالوجیز سے میری جان جاتی ہے۔" اس نے کہا اور اٹھ کر باہر کو چل دی۔

"کھاری کو میرے ساتھ کردیجیے گا چاچا جی راہ نمائی کے لیے۔" جاتے جاتے اسے یاد آیا۔

"ٹھیک ہے۔" چاچا جی ہنس دیے۔ "وہ تو بہت خوش ہوگا۔ اسے ایسے شغل میلے بہت پسند ہیں۔" ماہ نور مسکرا کر باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼
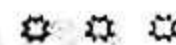
"میرے ایک ہاتھ میں تمہارے لیے پھول ہوں گے اور دوسرے ہاتھ میں کنگ سائز گفٹ باکس، پھر میں تمہارے گھر کا دروازہ کس طرح کھٹکھٹاؤں گا؟"

سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتے ہوئے اسے کچھ عرصہ پہلے کہی اپنی بات یاد آئی اور وہ مسکرادیا۔ اس کے سامنے فلیٹ نمبر 209 کا دروازہ تھا۔ اس نے پھولوں کا گلدستہ دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا اور دروازے پر لگا کنڈا کھٹکھٹایا۔ اندر جامد خاموشی تھی۔ اس نے ایک نظر کال بیل کے ٹوٹے بٹن پر ڈالی، جسے چھونے پر ایک بار اسے زبردست کرنٹ لگا تھا۔ وہ اسے دوبارہ آزمانے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔

"کون؟" خاموشی ٹوٹی۔

"میں!" اس نے مختصر جواب دیا اور دروازہ وا ہوگیا۔

"میں کا لفظ مکمل جاسم ثابت ہوا آج۔" اس نے اندر داخل ہوکر ہاتھ میں پکڑی دونوں چیزیں میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "شکر ہے آپ نے میری آواز پہچان لی۔"

"یہاں آتے ہی کتنے لوگ ہیں۔" وہ زنجیر میں لٹکتی عینک ناک پر دھرتے ہوئے بولیں۔ "جو مجھے پہچان اور شناخت میں دقت ہو۔"

"ہاں یہ بھی ہے۔" سعد کو سمی آنٹی کی خشمگیں نگاہوں اور کھردرے لہجے سے ہمیشہ ہی سے ڈر لگتا تھا، اس لیے وہ ان سے مختصر ترین بات کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

"کیا ہوا وہ کارپینٹر؟" سمی آنٹی نے ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنے سلائی کے سامان کے ڈبے میں ہاتھ مارتے پوچھا۔ "کھڑکی کا آخری قبضہ ہی اب نکارہ گیا ہے، آج گری کہ کل گری، سمجھو۔"

"اوہ، وہ ابھی تک نہیں پہنچا؟" سعد کو افسوس ہوا۔ "میں ابھی پتا کرتا ہوں۔" اس نے اپنا سیل فون جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔ کارپینٹر کا نمبر ڈھونڈتے ہوئے اس نے ایک نظر سمی آنٹی پر ڈالی۔

"وہ سورہی ہے، یا جاگی ہوئی ہے؟" اس نے مختصر ترین الفاظ استعمال کیے۔

"جاگی ہوئی ہے، مگر سونے کی ایکٹنگ کررہی ہے۔" وہ سوئی دھاگوں اور موتیوں میں الجھی ہوئی بولیں۔

سعد نے گہرا سانس لیا اور پھر کارپینٹر سے بات کرنے لگا۔ اسے کھڑکی کی صورت حال سے مکمل آگاہ کرکے جلد آنے کا کہا اور پھر مزید کوئی بات کیے بغیر سامنے والے کمرے کی طرف بڑھا۔

"تم اسے سمجھاتے کیوں نہیں کہ دنیا کی حقیقتیں آنکھیں بند کرکے بستر پر پڑے رہنے سے بدل نہیں جایا کرتیں۔" سمی آنٹی کی آواز نے اس کے قدم روک دیے۔

"تمہاری بات تو سمجھتی ہے نا وہ۔" وہ کہہ رہی تھیں۔ اس نے مڑ کر ایک نظر ان کی طرف دیکھا، پھر اس کی نظر میز پر رکھے پھولوں اور گفٹ پیکس پر پڑی۔ وہ سمی آنٹی سے بچنے کے چکر میں یہ دونوں چیزیں یہاں ہی بھول چلا تھا۔ اس نے تیزی سے مڑ کر دونوں چیزیں اٹھائیں اور اتنی ہی سرعت سے کمرے میں داخل ہوگیا۔

توقع کے عین مطابق وہ بیڈ پر آنکھیں موندے لیٹی تھی۔ اس کے بیڈ کی پشت پر موجود کھڑکی کے شیشوں سے باہر دور تک پھیلا سبزہ نظر آرہا تھا۔ سرو قامت درخت اور ان کے ہوا کے ساتھ لرزتے پتے بھی۔ اس نے باہر کے منظر سے نظریں ہٹا کر بیڈ پر پڑے وجود کی طرف دیکھا۔ بیڈ پر حسب معمول سفید چادر بچھی تھی اور اس کے نچلے دھڑ پر بھی سفید چادر پڑی تھی۔ اس کے سیاہی مائل براؤن بال کھلے تھے اور اس کے چہرے اور تکیے پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا کمزور چہرہ زردی مائل تھا اور اس کے جبڑوں اور رخساروں کی ہڈیاں پچھلی دفعہ کی نسبت زیادہ ابھری ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔ اس کی صحت پہلے سے زیادہ گرچکی تھی۔ سعد نے ایک نظر میں اندازہ لگایا۔

"میں اس ادھورے وجود کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتی، مجھے موت کے ابدی اندھیروں سے محبت ہونے لگی ہے۔" سعد کو اس کی کہی بات یاد آگئی۔

وہ اس کو بغور دیکھ ہی رہا تھا، جب اس نے اچانک بند آنکھیں کھول کر سعد کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ لحہ بھر کو ظاہر ہوئی۔

"مجھے پتا چل جاتا ہے جب تم آتے ہو۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"ہاں!" وہ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ تمہیں پتا چل جاتا ہے، مگر میں حیران ہوں کہ کیسے پتا چل جاتا ہے۔"

"بتادوں کیسے؟" وہ ایک بار پھر ذرا سا مسکرائی۔

"ہاں پلیز ضرور بتاؤ۔" وہ نرمی سے بولا۔

"تمہاری بو..." اس نے کہنیوں کے سہارے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ سعد نے سرعت سے اٹھ کر اس کے پیچھے تکیے سیدھے کیے تاکہ وہ ٹیک لگا سکے۔

"تھینک یو۔" وہ اٹھ کر بیٹھنے میں ہی ہانپ سی گئی تھی۔

"ہوں۔" سعد نے واپس اپنی جگہ پر بیٹھ کر اس کی طرف دیکھا۔

"اب بتاؤ میرے آنے کا تمہیں کیسے پتا چل جاتا ہے؟"

"تمہاری موجودگی بہت اسٹرونگ ہے۔ محسوس ہو جاتی ہے' چاہے آنکھیں کھلی ہوں یا نہیں۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"اچھا!" سعد نے حیرت کا اظہار کیا۔ "وہ کیسے؟"

"پتا نہیں۔" اس نے سر تکیے سے ٹکاتے ہوئے کہا۔ "بس تم ایسے ہی لوگوں میں شامل ہو جن کی موجودگی خود بخود محسوس ہو جاتی ہے۔"

"اچھا!" سعد نے یوں سر جھٹکا جیسے کچھ سمجھ نہ پایا ہو۔ "مجھے فلسفیانہ باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔"

"یہ فلسفیانہ نہیں بہت سادہ اور آسان سی بات ہے۔" وہ مسکرائی۔

"خیر۔" سعد اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے میز پر رکھے پھول اٹھائے۔

"تمہیں ٹیولپس پسند ہیں نا۔" اس نے سامنے دیکھا۔

"ہاں خاص طور سے پنک اور بلو۔"

"اور ہیزل نٹ چاکلیٹس بھی۔" سعد نے ربن سے بندھا ڈبا اٹھایا۔

"بالکل۔"

"میں جب اس طرف آرہا تھا تو راستے میں ایک فلورل شاپ سے مجھے یہ ٹیولپس مل گئے' اتفاق سے پنک اور بلو دونوں۔" سعد نے ڈبے کا ربن کھولا۔

"اور اتفاق ہی سے تمہیں یہ ہیزل نٹ چاکلیٹ مل گئے' چاکلیٹس کے بیسٹ برانڈ میں۔" اس نے ڈبے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ڈبا کھولتے سعد کے ہاتھ لمحہ بھر کے لیے رکے' اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا' اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

"ہاں اتفاق سے۔" اس نے نظریں جھکا کر ڈبے کا ڈھکن کھولا' اور اس میں ترتیب سے رکھے چاکلیٹس پر نظر ڈالی۔

"کیسے ہیں؟" اس نے آگے بڑھ کر ڈبا اس کی گود میں رکھ دیا۔

"وہ سب بہت اچھا ہوتا ہے' اور مجھے خوشی دیتا ہے جو تم میرے لیے لاتے ہو اور میرے لیے کرتے ہو۔" اس نے ترتیب سے رکھے خوشنما ریپرز میں لپٹے چاکلیٹس کی قطار پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ تم کرتے ہی اس لیے ہو کہ میں خوش ہو جاؤں۔"

سعد خاموش رہا۔

"مگر تم ایسا کیوں کرتے ہو' اس سوال کا جواب نہ مجھے تم سے اب تک مل سکا ہے نہ میں خود جان پائی ہوں۔"

"کوئی ضرورت بھی نہیں ہے جاننے کی۔" سعد نے پھول اس کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھے شیشے کے گلاس میں رکھتے ہوئے کہا۔ "ہر بات کی وجہ جاننا ضروری نہیں ہوتا' اگر کسی بات سے خوشی ملتی ہے تو کھل کر خوش ہونا

چاہیے۔ کیوں کیا کیسے جیسے سوالوں میں پڑ کر اپنی خوشیاں برباد نہیں کرنی چاہئیں۔"

وہ کچھ دیر ہاتھ گود میں رکھے سوچتی رہی۔ "لیکن مجھے یہ بھی تو لگتا ہے کہ تم ایسا مجھ پر ترس کھا کر کرتے ہو جیسے تمہیں مجھ پر رحم آرہا ہو۔" اس نے کہا۔

"کیوں؟" سعد نے اس کی گود میں رکھے چاکلیٹس میں سے ایک اٹھا کر اس کا ریپر کھولتے ہوئے کہا۔ "ایسی کون سی بات ہے، جس کی وجہ سے مجھے تم پر ترس آئے گا اور کون سا ایسا ظلم ہے جو تم پر ہوتے ہوئے دیکھ کر مجھے رحم آئے گا؟"

"یہ میری معذوری' یہ میری بے بسی' یہ میری لاچاری اور بے چارگی۔" اس نے اپنی ٹانگوں پر سے سفید چادر اتارتے ہوئے کہا۔

"خیر! یہ تو خوامخواہ کی بے چارگی اور خود ترسی ہے، جو تم اپنے اوپر طاری کیے ہوئے ہو۔" سعد نے چاکلیٹ منہ میں ڈال کر ریپر ڈسٹ بن کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔ وہ اسی طرح نیم دراز سعد کی طرف دیکھتی رہی۔

"بات یہ ہے سارہ خان!" کچھ دیر بعد سعد نے چادر واپس اس کی ٹانگوں پر ڈالتے ہوئے کہا۔ "حادثے بہت سوں کے ساتھ ہوتے ہیں، ہم میں سے ہر ایک کو کسی بھی وقت' کسی بھی کوئی بھی انہونی ہو جانے کے لیے تیار رہنا چاہیے' کیونکہ ہم انسان اسی دنیا کے باسی ہیں اور حادثے' سانحے' واقعے انسانوں کے ساتھ ہی ہوتے ہیں۔" وہ یک ٹک اس کی طرف دیکھتے سن رہی تھی۔

"مگر ایک انسان دوسرے سے مختلف اور بہتر تب ثابت ہوتا ہے' جب وہ خود پر گزرنے والے حادثوں اور سانحوں سے خود کو برتر ثابت کر دے۔ تم نے وہ مشہور بات تو سنی ہوگی جسے "Why me" کا عنوان دیا گیا ہے۔" سعد نے دیکھا وہ نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

"ایک شخص نے دنیا میں بھرپور زندگی گزاری۔ عیش' عیاشی' آسائشات سے لطف اندوز ہوا۔ جس میدان کو اپنے لیے چنا اس میں ٹاپ پر چلا گیا' لیکن پھر اس کو ایک ناقابل علاج بیماری نے آن گھیرا۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ تم نے کبھی خدا سے یہ سوال کیا کہ اس نے تمہیں ہی کیوں اس بیماری میں مبتلا کر دیا تو جانتی ہو اس نے کیا جواب دیا؟"

سعد نے سارہ کی طرف دیکھا' جو ایک بار پھر نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

"اس نے جواب دیا کہ جب میں دنیا کی آسائشات سے لطف اٹھا رہا تھا' جب میں زندگی کا ہر لمحہ عیش میں گزار رہا تھا' جب میں اپنے میدان میں کامیابیوں کے نقطہ عروج پر پہنچ گیا' اس وقت تو میں نے کبھی خدا سے نہیں پوچھا کہ اس دنیا میں موجود اتنے سارے لوگوں میں سے اس نے مجھے ہی کیوں اتنی کامیابیاں دیں' پھر اب میں یہ سوال اس سے کیسے کروں؟"

سعد نے بات ختم کرتے ہوئے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا' وہ ذرا بھی متاثر نظر نہیں آرہی تھی۔

"اور دوسری طرف وہ لوگ بھی ہیں کہ جب وہ کسی حادثے سے دوچار ہوتے ہیں تو ڈٹ کر اس کا مقابلہ کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ "They are above it" سعد نے ایک اور پوائنٹ اسے سنایا۔

"یہ بڑی بڑی باتیں مجھے متاثر نہیں کرتیں۔" سعد کی طویل بات کے جواب میں سارہ نے کہا۔ "یا پھر شاید میری سمجھ میں نہیں آتیں۔" اس نے اپنی گود میں دھرے اپنے ہاتھوں کے ناخنوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جو شخص "Why me" کا جواب دے رہا تھا' اس کی زندگی آسائشوں میں گزری' من مرضی کی زندگی' کامیابیوں کے نقطہ عروج پر پہنچ جانے کی کہانی بھی اسی کی ہے۔ مگر وہ لڑکی جس نے آنکھ کھولتے ہی سرکس کے

جوکر' ہاتھی' شیر' گھوڑے' مداری اور تاروں پر چلتے لڑکے لڑکیاں اپنے اردگرد دیکھیں۔ جس کو ہوش سنبھالتے ہی نئے نئے کرتب سوچنے اور سیکھنے پر لگا دیا گیا ہو' ایسے کرتب جو وہ سروں کو زیادہ سے زیادہ تفریح دے سکیں' وہ خود بھی ایسی کسی حرکت سے لطف اندوز ہوتی ہے یا نہیں' یہ کسی کا دردسر نہ ہو۔ جو لوہے کے کانٹوں پر لیٹتی' جادو کے زور پر خالی بکس میں اچانک بند پڑی ملتی' جو تنی ہوئی رسیوں پر چلتی' جو شیروں کے درمیان جیتی جاگتی کھڑی رہتی اور پھر موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلاتی' کبھی ہاتھ چھوڑ کر کبھی بازو پھیلا کر' تو اسے کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا ملتا۔ جس کی خواہشات کا پیدا ہونے سے پہلے ہی گلا گھونٹ دیا گیا ہو' وہ جب کسی حادثے کا شکار ہو کر ٹانگیں' بازو تڑوا کر بستر پر معذوری لیے پڑ جائے تو کیا اس کا دل یہ سوال نہیں کرے گا کہ "Why me"

اس نے سر اٹھا کر سعد کی طرف دیکھا۔

"اور رہی I am above it والی بات تو یہی لڑکی جب حادثے کا شکار ہو جائے اور اس کی روزی روٹی کا آسرا' اس کے بازو اس کی ٹانگیں کرچی کرچی ہو جائیں' اس کے کھانے اور پہننے کا آسرا ختم ہو جائے' اسے اس چھوٹی سی دنیا سے بھی نکال باہر کیا جائے' جہاں اس نے ایک عمر گزاری ہو۔ محض اس لیے کہ اب وہ ایک عضو معطل بن کر رہ گئی ہے تو وہ کس چیز کے بل بوتے پر مقابلہ کرے گی' ایسا مقابلہ جس کے جیت جانے پر وہ فخر سے سر اٹھا کر کہہ سکے۔

"میں اس سب سے ماورا ہوں۔"

"ہوں۔" سعد غور سے اس کی بات سننے کے بعد بولا۔ "ایک بات بتاؤں؟" پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔

"خود ترسی ایک چیز ہے، جس میں اگر کوئی ایک دفعہ مبتلا ہو جائے تو اس کا نکلنا بہت مشکل ہے۔" وہ اپنی بات کا جواب سنے بغیر کمرے سے باہر نکلنے لگا۔

"یہ خود ترسی نہیں ہے' حقیقت ہے۔" اسے اپنے عقب سے آواز آئی۔ "اور وہ خدا ترسی ہے' جو تمہیں یہاں لے آتی ہے' جو تم سے ہمیں ہیلپ آؤٹ کرواتی ہے' جو تم سے میرے لیے ایسی باتیں کرواتی ہے جن کو سن کر میں' جو تمہارے بقول خود ترسی میں مبتلا ہوں' اس سے باہر نکل آؤں اور جیسا تم چاہتے ہو' ویسے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جی سکوں۔ مگر سچ یہ ہے سعد! کہ تم اور تمہارے جیسے لوگ ایسی باتیں اس لیے کر سکتے ہیں کہ تم ان حالات سے نہیں گزرے جن سے میں گزری ہوں۔"

سعد نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا' اس کی بڑی بڑی خوابناک آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

"کہہ دینا آسان ہوتا ہے سعد! کرنا بہت مشکل۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"پھر بھی میری رائے وہی ہے' جو میں نے اب سے کچھ دیر پہلے دی۔" سعد نے اس بار یہ بات قدرے سخت لہجے میں کی۔

"اور یہ بات یاد رکھو کہ مجھے تمہارا یہ کہنا کہ میں تم پر ترس کھاتے ہوئے یہاں آتا ہوں اور تم سے ہمدردی جتاتا ہوں۔ مجھے بہت برا لگتا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "کسی کے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہوتا سارہ خان! ہمدردی اور خدا ترسی تو ایک بڑی رقم کے چیک کے ذریعے جنگل بیجاتے میں بھی کی جا سکتی ہے۔"

"تو تم یہ سب کیوں کرتے ہو' اس سوال کا بھی تو کوئی جواب ہوگا؟" اس نے عجیب سی کیفیت میں یہ لفظ بولے تھے۔

"ہاں اس کا جواب ہے بالکل ہے۔" سعد نے دو قدم پیچھے جاتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے بہت عزیز ہو۔"

وہ سارہ کا ردعمل دیکھے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عنیزہ سید

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی۔ وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے' تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں سعد کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

۲
دوسری قسط

"وفا بہت کمزور ہو رہی ہے" دوسرے کمرے میں آکر اس نے سیمی آنٹی سے کہا۔ "اس کی ڈائٹ بہتر کرنے کی کوشش کریں۔" اس نے اپنے بٹوے سے کچھ پیسے نکال کر ان کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔

"سب موجود ہے۔ دودھ' پھل' گوشت' مکھن' پنیر سب۔ وہ سب جس سے صحت بہتر ہوتی ہے۔" انہوں نے میز پر دھرے نوٹوں سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔ "مگر کھانا زبردستی تو کسی کے اندر نہیں ٹھونسا جاسکتا۔"

"ہوں!" سعد نے سر ہلایا۔ "اس سلسلے میں بھی کوئی ترکیب سوچتے ہیں۔"

"اچھا۔" پھر اس نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ "اب میں چلوں' کوئی مسئلہ ہو یا کوئی ضرورت' مجھے فون کرلیجیے گا۔"

"گڈ بائے' ٹیک کیئر۔" سیمی آنٹی بڑبڑائیں۔

"سنا ہے' انسانوں کے روپ میں فرشتوں کے وجود والی بات غلط ہے۔" سعد کے جانے کے بعد سیمی آنٹی نے میز پر دھرے نوٹ سمیٹتے ہوئے کہا۔ "فرشتوں اور انسانوں کی بناوٹ میں بہت فرق ہوتا ہے۔" پھر انہیں یاد آیا۔ "پھر یہ خاص انسان ہوں گے' عام انسانوں سے ذرا مختلف' ذرا اونچے۔"

وہ یہ سوچتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھیں۔

"ذرا نہیں بہت مختلف' بہت اونچے۔" پیسے الماری کی دراز میں رکھ کر دراز کے تالے کی چابی گھماتے ہوئے انہوں نے اپنے دل میں حتمی اور آخری رائے دی۔

☼ ☼ ☼
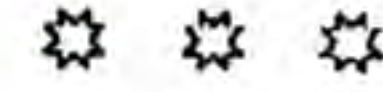
"میں تے راتیں ستا ای نئیں جناب! بابے منگووے میلے دل جان واسن کے" (میں تو رات کو سویا ہی نہیں جناب! جب پتا چلا کہ بابے منگو کے میلے پر جانا ہے)

ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا کھاری اپنی انوکھی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"چل خیر! آرام نال بیٹھ' چھالاں کانوں مار دا پیاں ایں"۔ (چلو پھر آرام سے بیٹھو' چھلانگیں کیوں مار رہے ہو۔) ڈرائیور نے جھڑکا۔

ماہ نور پچھلی سیٹ پر بیٹھی اونچے' نیچے راستوں' دھول سے اٹی فضا' گرد آلود سبزے اور موسم کی تمازت سے پریشان لوگوں کے چہرے دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل میں رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ وہ اس میلے پر کیوں جارہی تھی۔ اسے اس میں کیا دلچسپی تھی' مگر وہ اپنے ذہن و دل کو کوئی جواب دیے بغیر جیسے کوئی نئی دنیا دریافت کرنے کی امید میں یہ سفر کررہی تھی۔

"جلیبیاں بڑے ودھیا ہوندے نیں میں سنیا بابے منگورے میلے تے۔"

(جلیبیاں بہت عمدہ ہوتی ہیں بابے منگو کے میلے پر میں نے سنا ہے)

اس کے کان میں کھاری کا نیا ارشاد پڑا۔ ماہ نور کو کھاری کا پر شوق چہرہ بہت دلچسپ لگا۔ کھاری نے اسے بتایا تھا کہ وہ سحری کے وقت کا جاگا ہوا تھا' اس نے اپنی بہترین شلوار قمیص نہا دھو کر پہنی تھی' یہ اور بات کہ اس کی یہ شلوار قمیص تھی ایسی جیسے اپنے چھوٹے بھائی کی پہن آیا ہو۔ اس نے سبز رنگ کی ہوائی چپل پہن رکھی تھی اور سر پر کروشیے سے بنی سفید ٹوپی تھی۔ اس کے لباس سے اٹھتی سستے عطر کی مہک نے گاڑی کے ایرکنڈیشنڈ ماحول کو خاصا ناقابل برداشت بنا رکھا تھا' مگر ماہ نور کو اس کی معصومیت اچھی لگ رہی تھی۔ یہ یتیم یسیر لڑکا بچپن سے ہی سردار چاچا کے ہاں پلا بڑھا تھا اور فارم ہاؤس کی ڈیری پر کام کرتا تھا۔ اس کے لیے یہ اتنی بڑی تفریح کا موقع تھا کہ ماہ نور کو اس کی کوئی بھی بات بری نہیں لگ رہی تھی۔

"لوجی میلہ شروع ہوگیا جے۔" پھر اسے کھاری کی آواز آئی' جس میں خوشی کی واضح لہر دوڑ رہی تھی۔

ماہ نور نے شیشے سے باہر دیکھا۔ یہ کسی گاؤں کی طرف جانے کا داخلی راستہ تھا اور باہر دیکھنے پر ایسا لگ رہا تھا جیسے ساری خلقت اسی گاؤں کی طرف امڈ آئی ہو۔ نئے کپڑے اور رنگ برنگے کپڑوں سے ڈھکے سروں والے مرد' چادروں' برقعوں میں ملفوف خواتین' رنگ برنگے کپڑوں اور چمکتے زیورات سے مزین بچیاں' تیزی سے بھاگ کر گاؤں کی طرف جاتے بچے' یوں جیسے سب کسی جشن میں شریک ہونے والوں کا مجمع تھا۔ کسی کے ہاتھ میں تھیلے تھے' کسی کے ہاتھ میں ٹوکری اور کوئی یوں ہی پھول اور مزار پر چڑھانے کی چادریں لیے گاؤں کی سمت رواں تھا۔ داخلی راستے سے گزرنے کے بعد وہ ایک کھلے میدان کے سامنے آگئے' یہاں اکا دکا گاڑیاں' سائیکلیں اور موٹر سائیکلیں کھڑی تھیں' ڈرائیور نے ایک طرف گاڑی کھڑی کی اور کھاری نے نیچے اتر کر ماہ نور کے لیے دروازہ کھولا۔

"تنبو قناتاں وی لگیاں نیں' اید ھا مطلب ایس واری بوارا تماشے ہورے نیں۔"

(شامیانے بھی لگے ہوئے ہیں' اس کا مطلب ہے کہ کئی قسم کے تماشے ہو رہے ہیں۔)

کھاری نے اس کے گاڑی سے باہر آتے ہی اسے اہم اطلاع دی۔ باہر شدت کی گرمی تھی۔

"آؤ جی! آؤ ادھر آؤ' ادھر ایہہ سارے ہوندے نئیں' باندراں والے تے کتیاں دی دوڑ والے تے جھولیاں والے۔" (ادھر آئیں جی! ادھر وہ سارے ہوتے ہیں' بندروں' کتوں کی دوڑ والے اور جھولے والے۔) کھاری اسے گائیڈ کرتا ایک ایسی جانب لے گیا جہاں لوگوں کا اژدحام تھا' گرمی اور حبس تھا۔

وہ بمشکل دیکھ پائی۔ وہاں بندر کے تماشے والا بھی تھا' مٹی کے رنگ برنگ برتن بیچنے والا بھی' نت نئے پکوانوں کے اسٹال لگائے دکان دار بھی اور مختلف دیسی ہینڈی کرافٹس بیچتے مرد و زن بھی۔ ہجوم اتنا تھا کہ بار بار دھکے لگ رہے تھے' مگر بمشکل نظر آنے والے ان ہنرمندوں کے چہروں کو ماہ نور ایک ہی نظر ڈالنے پر دیکھ چکی تھی۔

"ناحق آئی۔" اس کا دل بار بار کہہ رہا تھا۔ اسے گائیڈ کرتا کھاری کسی تماشے میں اتنا محو ہو چکا تھا کہ اسے شاید بھول ہی گیا تھا' وہ کس کے ساتھ اور کیوں یہاں آیا تھا۔

"اوکھے پینڈے لمیاں نیں راہواں عشق دیاں۔" وہ اس ہجوم سے باہر نکل کر نسبتاً" کسی خالی اور سایہ دار جگہ کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھ ہی رہی تھی' جب اس کے کانوں میں یہ آواز پڑی۔ اس نے گھوم کر دیکھا' لوگوں کا ایک جم غفیر تھا جو اس جگہ جمع تھا' جہاں سے یہ آواز آرہی تھی۔

پھلاں ورگی جندڑی عشق رُلا چھڈ دا
سربازار جا لے عشق نچا چھڈ دا

آواز میں ایک عجیب سا سرور تھا۔ ماہ نور بے اختیار ادھر بڑھتی گئی۔ اس کی نظر ایک طرف پڑے بانسوں کے ڈھیر پر پڑی۔ وہ اس ڈھیر پر چڑھ کر کھڑی ہوگئی۔ اب حلقہ باندھے ہجوم کے درمیان کا منظر کچھ صاف نظر آرہا تھا۔

وہ ایک عام سا نوجوان تھا' جس نے کالے رنگ کا کرتا اور سبز شلوار پہن رکھی تھی۔ سر پر کالی پگڑی جس کے اندر سے نکلتے اس کے بال شانوں تک آرہے تھے۔ اس نے کانوں میں بالے پہن رکھے تھے اور اکتارہ پکڑے اس کے ہاتھوں کی انگلیوں میں موٹے نگینوں کی انگوٹھیاں موجود تھیں۔ اس نے پاؤں میں ہوائی چپل پہن رکھی تھی اور وہ لوگوں کی فرمائش پر بار بار یہی کافی سنا رہا تھا۔ ماہ نور کو خود بھی پتا نہیں چلا کہ وہ کتنی دیر تک وہاں کھڑی اسے سنتی رہی۔

ککھ نہ چھڈے دیکھ وفاواں عشق دیاں
اوکھے پینڈے لمیاں نیں راہواں عشق دیاں

کھاری اس روز اپنے کھیل تماشوں سے فارغ ہونے کے بعد کتنی دیر ماہ نور کو ڈھونڈتا رہا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ماہ نور کا پتا نہ چلا تو اس کی نوکری خطرے میں پڑ جانی تھی اور چوہدری صاحب کی جوتیاں الگ اس کا مقدر بن سکتی تھیں۔

دوپہر ڈھلے ماہ نور اسے بانسوں کے ڈھیر پر بیٹھی ملی۔ سورج کی تمازت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور پسینے کے قطرے اس کے چہرے پر چمک رہے تھے۔ کھاری تیزی سے ماہ نور کی طرف بڑھا۔

"او بی بی جی! تسی ادھر بیٹھے او میں ساری دنیا وچ لبھدا پھریا۔"

(او بی بی جی! آپ یہاں بیٹھی ہیں میں پوری دنیا میں ڈھونڈتا رہا۔)

اس نے بے اختیار اپنی جھلاہٹ کا اظہار کیا۔

ماہ نور نے ایک نظر کھاری کے گرد آلود کپڑوں اور چپلوں پر ڈالی۔

"اوہ! بے چارے کی تیاری سب خاک ہوئی۔" اسے دل میں افسوس ہوا۔

"او آئی ایم سوری کھاری!" ماہ نور نے کہا۔ "مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ تم کو بتاؤں میں ادھر ہوں۔" اس کا لہجہ واقعی معذرت خواہانہ تھا۔ "مگر تم کہاں غائب ہو گئے تھے ہجوم میں؟" پھر اسے اچانک یاد آیا کہ خود اس کے ادھر چلے آنے سے پہلے کھاری غائب ہوا تھا۔

"میں تہاڈے واسطے ٹھنڈی بوتل لیاؤندا آں۔ تسی کدھرے چھاں وچ بیٹھو۔"

(میں آپ کے لیے ٹھنڈی بوتل لاتا ہوں۔ آپ کہیں سائے میں بیٹھیں۔) کھاری نے اس کی بات ان سنی کردی۔ اسے ماہ نور کی حالت دیکھ کر فکر ہو رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ بی بی موسم کی ایسی سختی سہنے کی عادی نہیں تھی۔

"ٹھہرو! رکو کھاری۔" ماہ نور اسے روکنا چاہتی تھی۔ اس کے پاس ٹھنڈے پانی کا فلاسک تھا اسے بوتل نہیں پینی تھی مگر کھاری سیکنڈوں میں چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا تھا۔

مائے نی میں کینوں آکھاں
درد وچھوڑے دا حال نی

اس کا دھیان اپنے سامنے موجود ہجوم کے درمیان سے آتی آواز کی طرف چلا گیا۔ اس آواز میں ضرور کچھ ایسا جادو تھا جس نے اسے اب تک اپنے سحر میں جکڑ رکھا تھا۔ وہ اس آواز کو پہلی بار سننے کے بعد سے لے کر اب تک وہیں بیٹھی صرف اسی کو سن رہی تھی۔ وہ کون تھا جو بغیر توقف کے گا رہا تھا اور اس کی آواز کا سحر ارد گرد لوگوں پر چھا رہا تھا۔ ماہ نور کو بڑے بڑے کنسرٹس میں آنے والے مشہور و معروف گلوکار یاد آرہے تھے جو اسٹیج پر آکر پس منظر موسیقی اور آواز پر صرف ہونٹ ہلاتے تھے اور لاکھوں روپے لے کر رخصت ہوتے تھے۔ یہ کون تھا جو دس، بیس روپے کے عوض آواز کا جادو جگائے چلا جا رہا تھا۔ بانسوں کے ڈھیر پر چڑھ کر بدقت اندر جھانکنے پر اسے یہ بھی نظر آیا تھا کہ اس کے ساتھ دو خواتین اور ایک مرد بھی تھا جو اپنے حلیے سے خانہ بدوش لگ رہے تھے۔ وہ اس کی آواز سننے والوں سے دس، دس، بیس، بیس روپے وصول کر رہے تھے اور اتنے ہوشیار تھے کہ شاید ہی کوئی سننے والا بغیر پیسے دیے سن پایا ہو۔

"سائیں ہے، درویش ہے۔" کچھ لوگ گانے والے کا تعارف اپنے طور پر دے رہے تھے۔

"ریڈیو ملتان سے سنتا ہوں اس کی کافی۔" کوئی کہہ رہا تھا۔

"نہ جی نہ۔۔۔ یہ تو بس میلوں، ٹھیلوں پر نظر آتا ہے۔ سائیں سرکار کا ماننے والا ہے۔" کسی نے رائے دی تھی۔

"اس کے گلے میں سُر ہے، اس کی انگلی تارا ایسے بجا رہی ہے جیسے سالوں کی مشق کر رکھی ہو۔" ماہ نور نے خود اپنی رائے بھی قائم کی۔

"لو بی بی جی! تسی ہلے ایدھر ای بیٹھے او۔" (لو بی بی جی! آپ ابھی ادھر ہی بیٹھی ہیں۔) کھاری نے آکر اسے اس کی سوچ سے جگایا۔ ماہ نور نے دیکھا، کھاری کے ہاتھ میں کولڈ ڈرنک ـــــ تھی، جو یقیناً "خاصی ٹھنڈی تھی۔ بوتل کے باہر پانی کے قطرے چمک رہے تھے۔

"لو بی بی! بوتل پیو تے کدھرے چھاں وچ ہو جاؤ۔" (لیں بی بی! بوتل پئیں اور کہیں چھاؤں میں آجائیں) کھاری نے بوتل اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"شکریہ کھاری!" ماہ نور نے بوتل سے گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "مگر یہاں سے دور نہیں جانا ناں۔"

کھاری نے حیرت سے اس جگہ کو بغور دیکھا، جہاں ماہ نور بیٹھی تھی اور پھر ارد گرد دیکھا۔ اسے وہاں کوئی قابل توجہ چیز نظر نہیں آئی۔ پھر اس نے اس ہجوم کی طرف دیکھا جس کے اندر اس وقت خاموشی تھی۔

"ایتھے باندر والا اے اندر؟" (ادھر بندر کے تماشے والا ہے۔) کھاری نے سوالیہ نظروں سے ماہ نور کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"سائیں ہے ادھر، اس سے مل کر جائیں گے، جب یہ فارغ ہو گا۔" ماہ نور نے مسکرا کر کھاری کی غلط فہمی دور کی۔

کھاری کی سمجھ میں یہ جواب قطعی نہیں آیا تھا کہ یہ بی بی بندر والے سے سائیں سے ملاقات تک کیسے آن پہنچی تھی۔ اس نے سمجھ میں کچھ نہ آنے کے سے انداز میں شانے اچکائے۔

"میں تہاڈے واسطے نان تے پکوڑے لیاواں۔ بڑے مشہور ہیں ایس میلے دے۔" (میں آپ کے لیے نان اور پکوڑے لاؤں۔ یہاں کے نان پکوڑے بہت مشہور ہیں۔) اس نے ماہ نور سے پوچھا۔ ماہ نور نے نفی میں سر ہلا کر منع کر دیا۔

"تم خود کھا آؤ جاکر۔" ماہ نور نے کھاری کے چہرے پر مایوسی اترتے دیکھ کر کہا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور دائیں سمت مڑ گیا۔ یہ اجازت اس کا پیٹ بھرنے والی تھی جو صبح سے دہائی دے رہا تھا۔

دھوپ کی تمازت آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہوئی اور شام کے سائے اترنے لگے۔ میلے کی چہل پہل میں قدرے کمی آنے لگی۔ ماہ نور کے سامنے موجود بھیڑ بھی رفتہ رفتہ کم ہو رہی تھی۔ اب صرف اتنی تعداد میں لوگ گھیرا باندھے کھڑے تھے جن کے درمیان سے باآسانی اندر کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔

اوکھے پینڈے لمیاں نیں راہواں عشق دیاں
ککھ نہ چھڈے دیکھ وفاواں عشق دیاں

اندر موجود سائیں آنکھیں بند کیے گاتا نظر آرہا تھا۔ اس کے ساتھ موجود خواتین اور مرد ـــ تقریباً "آخری ہجوم سے پیسے وصول کر رہے تھے۔ ان کی پیسوں والی گٹھڑیاں بھر چکی تھیں۔

"یہ کمائی کے لحاظ سے بہت اچھا دن ثابت ہوا ہوگا۔" ماہ نور نے سوچا اور پھر سامنے کھڑے کھاری کی طرف دیکھا جو اب تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

"میں اندر جاکر سائیں نال ملاقات دا انتظام کروا آں۔" (میں اندر جاکر سائیں سے ملاقات کا انتظام کرتا ہوں۔) کھاری لوگوں کے گھیرے کے اندر داخل ہو گیا۔ اب وہ سائیں کے ساتھ موجود مرد سے مذاکرات کرتا نظر آرہا تھا۔

سائیں بھی کافی ختم کر کے اس گفتگو کو سننے میں مشغول ہوا۔ کچھ دیر بعد ماہ نور نے سائیں کا سر اثبات میں ہلتا ہوا دیکھا۔ وہ کھاری سے یقیناً "یہ کہہ رہا تھا کہ وہ اس کی بی بی سے مل لے گا۔

اس وقت شام بھی ڈھل چکی تھی جب ارد گرد روشن ہوتی بتیوں کی روشنی میں ماہ نور نے خود کو سائیں کے سامنے کھڑا پایا۔

"آپ کی آواز میں لوچ ہے' سحر ہے' جادو ہے۔" وہ سائیں سے کہہ رہی تھی۔ "یہ تو بڑے فنکاروں والی خصوصیات ہیں۔ آپ کا نام کیا ہے؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

"سرکار کے سائیں بہتیرے اور سب ایک جیسے سائیں۔" اس کی بات سن کر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "نام میں کیا رکھا ہے؟"

"آپ کی آواز میں اتنے سحر کی وجہ؟" ماہ نور نے اپنی بات پر اصرار کرنے کے بجائے دوسرا سوال کیا۔ اب کے سائیں کی نظریں جیسے زمین پر ہی جم گئیں۔ خاصے توقف کے بعد سائیں نے نظریں اٹھائیں اور بولا۔

"عشق۔"

اس کی نظریں ماہ نور کے چہرے پر جمی تھیں۔ ڈھلتی شام کے سایوں اور ارد گرد جلتی روشنیوں کے درمیان سائیں نے ماہ نور کو اور ماہ نور نے لمبی زلفوں اور گھنی داڑھی میں چھپے سائیں کو جیسے پہچان لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یہ انیس سو بہتر کی بات ہے یا پھر شاید انیس سو تہتر کی۔" خدیجہ نے اپنے سامنے بیٹھی فاطمہ کو مخاطب کیا جس کے ہاتھ میں پکڑی کروشیے کی سلائیاں آپس میں تیزی سے چڑچڑ کر رہی تھیں۔

"خاصی پرانی بات ہے پھر تو۔" فاطمہ نے عینک کے شیشوں کے اوپر سے خدیجہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے یاد نہیں ہو گا پھر۔"

"ہاں! تم تو جیسے منی کاکی ہو۔" خدیجہ چمک کر بولیں۔ "انیس سو بہتر تہتر کچھ اتنے بھی دور کے سال نہیں ہیں بی بی! یاد کرو' وہ زمانہ جب احمد رشدی کے گانے سنا کرتے تھے اور وحید مراد کی ادائیں دیکھا کرتے تھے۔" اس نے یاد دلاتے ہوئے کہا۔ "کچھ یاد آیا؟"

"ہاں خیر! احمد رشدی اور وحید مراد کو کون بھول سکتا ہے۔" فاطمہ نے کروشیے کے پھندے ڈالتے ہوئے سکون سے جواب دیا۔

"اور شنہوری کی نیلو فر علیم اور شکیل بھی یاد ہو گا؟ کیا شاندار جوڑی تھی۔" خدیجہ نے مزید یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی! اس زمانے میں کیا یہ فنکار' فنکارائیں ہی تھیں جو صرف ان ہی کی یاد دلا رہی ہو۔" اب کے فاطمہ کچھ جھنجلا گئیں۔

"وہ تو میں تمہاری یادداشت جو کھو گئی ہے اسے واپس لانا چاہ رہی تھی۔ اس لیے آغاز فنکاروں اور فنکاراؤں سے کیا۔" خدیجہ نے فاطمہ کو تنگ کرتے ہوئے کہا اور زور سے ہنس دیں۔

"اصل میں تو تم کو یاد دلانا تھا انیس سو اکہتر یا بہتر کا آغا جان کا وہ دورہ پاکستان' جب ہم ان کی اور ان کی بیٹیوں کی ادائیں دیکھ دیکھ کر یوں متاثر ہوتے تھے جیسے کوئی خلائی مخلوق آگئی ہو ہمارے گھر میں۔" پھر خدیجہ نے سنجیدہ ہوتے ہوئے اصل بات کی۔

"اوہ ہاں!" فاطمہ نے ہاں کو ذرا کھینچتے ہوئے کہا۔ "اس وقت میں پانچ اور تم آٹھ سال کی تھیں۔"

"توبہ ہے فاطمہ! اب آپس میں تو جھوٹ نہ بولو۔" خدیجہ نے منہ بنایا۔ "اس وقت تم دس اور میں پندرہ سال کی تھی۔ پتا نہیں! تم کو چھوٹا بننے کا شوق کیوں چراتا ہے۔" خدیجہ جھنجلا کر بولیں۔

"ارے بی بی!" فاطمہ نے اون اور سلائیاں ایک طرف رکھ کر آنکھوں سے عینک اتارتے ہوئے کہا۔ "دماغ کے ضعف اور یادداشت کی کمزوری کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ ورنہ اتنے برسوں میں گزرے حادثوں، سر میں اترتی چاندی اور دل کا اجاڑپن خود سے ہی عمر ظاہر کردیتا ہے۔۔۔ ہماری تمہاری، بلکہ اپنی اصل عمر سے کچھ زیادہ ہی کی دکھتی ہوں گی ہم دونوں۔"

"ایک راز کی بات یہ ہے کہ اگر تم اب بھی بال رنگ لو، فیشن کے مطابق کپڑے پہننے لگو اور خود پر سے اداسی اور چڑچڑاہٹ کا لبادہ اتار پھینکو تو تم اپنی عمر سے کم از کم دس سال کم کی لگنے لگو۔" خدیجہ نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔ فاطمہ مسکرادیں۔

"اور تم مجھ سے بھی کوئی دو، تین سال کم کی لگو۔" انہوں نے کہا۔

"آغا جان کے اسی دورے کے دوران تو ہمارے گھر میں اکیس انچ اسکرین اور لمبی پتلی ٹانگوں والوں وہ بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی آیا تھا جس پر ہم شہزوری اور بعد میں کرن کہانی دیکھا کرتے تھے۔" فاطمہ نے پھر یاد کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں! ہاں وہی زمانہ۔" خدیجہ خوش ہو کر بولیں۔ "تمہیں یاد ہے آغا جان کی شہناز کو دیکھ کر ہم کیسا امپریس ہوتے تھے؟"

"تو اور کیا!" فاطمہ کو بھی یاد آیا۔ "یہ لمبے بال کالے سیاہ، ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں۔"

"اور اس کی آواز۔" خدیجہ نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ "یاد ہے ہم اس سے فرمائشیں کرکے نعتیں بھی سنتے تھے اور غزلیں بھی؟"

"سلیم چاچا نے لے جا کر ریڈیو پر اس کا آڈیشن بھی دلوایا تھا۔" فاطمہ کو یاد آیا۔

"اور وہیں سے اس بے چاری کی زندگی کی کہانی پلٹ گئی۔" خدیجہ کے چہرے پر تاسف چھا گیا۔

"او ہو۔" فاطمہ کا لہجہ بھی غمزدہ سا ہو گیا۔

"نہ وہ آڈیشن دیا جاتا، نہ شہناز سلیکٹ ہوتی۔ نہ یہیں رہ جانے کی ضد کرتی، نہ ہی اس کی زندگی برباد ہوتی۔" خدیجہ جیسے خلاؤں میں ماضی دیکھ رہی تھیں۔

"انیس سو اکہتر، بہتر سے لے کر انیس سو بانوے، کتنے سال بنے؟" فاطمہ نے انگلیوں کی پوروں پر گنتے ہوئے کہا۔

"محض اکیس، بائیس سال پر محیط کہانی کا مرکزی کردار تھی شہناز۔" گنتی کرلینے کے بعد فاطمہ نے کہا۔

"خاک سے خاک ہوئی بے چاری۔" خدیجہ مایوس انداز میں بولیں۔ اور اس کی اپنی سگی بہن رئیسہ اور اس کی اولاد آغا جان کی سب جمع جائیداد کی مالک بن کر عیاشی کررہی ہے۔"

"کچھ سراغ نہ لگا شہناز کا، کہاں غائب ہوئی؟" فاطمہ نے بھیگی آنکھیں دوپٹے کے پلو سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"اے ہے! سراغ کیا لگنا تھا۔" خدیجہ تیز آواز میں بولیں۔ "سنا نہیں تھا، چھری پھیر کر گلا کاٹ دیا تھا اس کے ظالم شوہر نے۔"

"تو! یہ سنا ہی تھا نا، آنکھوں سے دیکھا تو نہیں تھا نا۔" فاطمہ حقیقت پسند تھیں۔

"ایسے ہی خبریں نہیں اڑا کرتیں۔" خدیجہ نے دلیل دی۔ "اور آغا جان کا یاد ہے؟ کیسا کلیجہ پتھر ہوا تھا۔ کہتے تھے، ہرگز پتا نہیں کروں گا اس کا کہ زندہ ہے یا مرگئی، کیونکہ میرے لیے تو وہ برسوں پہلے ہی مرگئی تھی۔"

"کچھ سمجھ میں نہیں آیا آج تک کہ ہوا کیا تھا اس کے دماغ کو، جو ماں باپ، بہن چھوڑ کر، زندگی کا عیش آرام چھوڑ کر خاندان کے نام پر بٹا لگانے چل پڑی تھی موسیقی کی دنیا میں نام پیدا کرنے۔" فاطمہ کا دل سخت رنجیدہ ہو گیا تھا۔

"اور کسی کو تو شاید یاد بھی نہ ہو، خاندان بھر میں سے ہم دونوں ہی رہ گئی ہیں، بیتی کہانیاں اور المناک افسانے یاد کرنے کو۔" خدیجہ نے آنسوؤں کے درمیان مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کیونکہ ہم دونوں کو ہی نہ کوئی کام ہے نہ کاج، نہ فکر نہ فاقہ، نہ اولاد، نہ شوہر، نہ کوئی آگا، نہ پیچھا۔" فاطمہ بھی آنسوؤں کے درمیان مسکرادیں۔

"چلو! گردمیں اٹی کہانیوں قصوں کی گرد جھاڑنے کا کام تو رہتا ہی ہے نا ہمیں۔" خدیجہ نے ہنس کر کہا۔ "سو کرتے رہیں گے۔" وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے بولیں۔

"ایک تو یہ جاڑوں کی آمد، جس کا انتظار بھی رہتا ہے، مگر عمر کے تقاضے یہ ہیں کہ سردی سے بچا جائے۔" انہوں نے کہا۔

"سوپ پیو گی، بنالوں؟" انہوں نے فاطمہ سے پوچھا۔

"ہاں!"

فاطمہ نے کہا۔ خدیجہ مسکرا کر کچن کی طرف چل دیں اور فاطمہ میز پر بکھری چیزیں سمیٹنے لگیں۔ دھوپ ڈھل کر بیرونی دیواروں تک پہنچ چکی تھی۔ لان میں ڈھلتی دھوپ اور اترتی شام کے سائے باہم رقصاں تھے۔ اس فضا اور اس منظر کو دیکھ کر انہیں نجانے کیا کیا کچھ یاد آگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بندر کے تماشے دکھانے والا اور ریچھ نچانے والا شخص لوک گلوکار کیسے ہوسکتا ہے؟" اس روز میلے سے واپس آتے ہوئے ماہ نور کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا۔

"مگر یہ بھی تو حتمی بات نہیں کہ یہ وہ ہی شخص تھا۔" پھر اس نے دوسری بات سوچی۔

"آواز میں سحر کی وجہ؟" پھر اس کے کانوں میں اپنی ہی آواز کی بازگشت سنائی دی۔

"عشق۔"

ایک مختصر جواب اس کے ذہن پر دستک دینے لگا۔ کتنا مختصر جواب تھا یہ، مگر اس کے کتنے معنی تھے۔ اس جواب کو کتنے معنوں میں سمجھا جاسکتا تھا۔ یہ مبہم جواب تھا یا بامعنی، مختصر تھا یا جامع۔ ماہ نور سارا راستہ اسی قسم کی باتیں سوچتی آئی تھی۔ وہ کوئی خاص امید لے کر "بابے منگو" کے میلے پر نہیں گئی تھی، مگر وہاں سے واپسی پر اس کا دل خوش تھا اور ہلکا بھی۔ اسے لگا وہ اس میلے سے بہت کچھ لے کر واپس لوٹی تھی۔ اگرچہ چاچا سردار اور چاچی صابرہ کو افسوس ہوا تھا کہ وہ میلے سے کوئی ایسی سوغات خرید کر نہیں لائی تھی جو اپنے گھر والوں کو دکھا سکے۔

"سوغات چھڈ، بی بی نے ادھوں کچھ کھادا پیتا وی نئیں۔ بھکھی پیاسی واپس آگئی۔" (سوغات چھوڑ، بی بی نے وہاں سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں، بھوکی پیاسی واپس آگئی) کھاری نے چاچی صابرہ کو خصوصی اطلاع دی تھی۔

"وے مرنیا! توں کا دے واسطے نال گیا سیں؟" (کم بخت تم کس لیے ساتھ گئے تھے) چاچی صابرہ نے جواب میں کھاری کو ڈانٹا تھا۔

"میں تے جلیب وکھائے، نان پکوڑیاں دا پچھیا، ٹھنڈی بوتل لیا کے دیتی۔ پوچھو بی بی نوں۔" (میں نے جلیبیاں دکھائیں، نان پکوڑوں کا پوچھا، ٹھنڈی بوتل لا کر دی۔ پوچھ لیں بی بی سے۔) کھاری نے اپنی صفائی دیتے

ہوئے بتایا تھا۔

"ارے! اس کو مت ڈانٹیں چاچی ! " ماہ نور نے کھاری کی طرف نرمی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ہی تو مجھے وہاں لے جانے کا وسیلہ بنا۔"

"میں تے شرطیہ کہندا ساں کہ اوتھے تہانوں بڑا مزا آئے گا۔" (میں نے تو شرط لگا کر کہا تھا کہ آپ کو وہاں بہت مزا آئے گا) کھاری اپنی تعریف اور ماہ نور کے لہجے کی نرمی پر خوش ہو کر بولا۔

میلے سے واپسی کے دو دن بعد ماہ نور، سردار چاچا اور صابرہ چاچی سے رخصت ہو کر اپنے گھر چلی گئی۔ اس کے جانے کے دو ہفتے بعد کھاری کو اپنے گھر کی چھت کی صفائی کے لیے مٹی کی گھائی کرتی ماسی شریفاں کی مدد کرتے اچانک نہ جانے کیا یاد آیا کہ وہ ماسی شریفاں کو بتانے لگا۔

"او جیہڑی بی بی سی ناں شہر والی، چوہدری صاحب دی بھتیجی، او بڑی اللہ لوک بی بی سی، اوس میلے والے دن اوس نے نہ کج کھاد انہ پیتا، بس! مٹی دی ڈھیری تے بیہہ کے سائیں دے گیت سندی رہی۔" (وہ جو شہر والی بی بی تھی ناں، چوہدری صاحب کی بھتیجی، وہ بڑی اللہ لوک بی بی تھی۔ اس میلے والے دن اس نے نہ کچھ کھایا نہ پیا، بس مٹی کے ڈھیر میں بیٹھی سائیں کے گیت سنتی رہی۔"

"تے ایہہ" (اور یہ) پھر کھاری نے اپنی شلوار میں سلی جیب سے پانچ پانچ سو کے چار سبز نوٹ نکال کر چاچی شریفاں کو دکھائے۔ "جاندی واری مینوں دے گئی، ایہہ روپے، ئی کھاری! اپنے واسطے کوئی لیٹر اسوالئیں اے جتی دی لے لئیں۔" (جاتے ہوئے مجھے یہ پیسے بھی دے گئی کہ کھاری! اپنے لیے کپڑے سلوانا اور جوتی بھی لے لینا)

"دے جھلیا (او بے وقوف)" ماسی شریفاں نے کھاری کے اس ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے دھکا دیا جس میں اس نے پیسے پکڑے ہوئے تھے۔ "سانبھ کے رکھ، نمیش نہ کر۔ پئے کوئی کھونداای سائیں لوکا" (سنبھال کر رکھ نمائش نہ کر ان کی)۔ (ابھی کوئی چھین لے گا بھولے انسان)

کھاری نے گھبرا کر نوٹ واپس شلوار کی جیب میں رکھ لیے۔

"او کون سی؟" (وہ کون تھا) کچھ دیر تک خاموشی سے کام کرنے کے بعد ماسی شریفاں نے کھاری سے پوچھا۔

"او سائیں۔" (وہ سائیں) کھاری کے سوالیہ نظروں سے دیکھنے پر اس نے اپنا سوال مکمل کیا تھا۔

"رب جانے!" کھاری نے شانے اچکا کر کہا۔ "پر جدبی بی نے پچھیا کہ ایہنی سوہنی آواز ایہنی مٹھری آواز کدوں پائی، تے سائیں بولیا عشق۔" (بی بی نے پوچھا کہ اتنی اچھی اور میٹھی آواز کیسے پائی؟ تو سائیں بولا عشق۔)

"چل! چھتی کم مکا، چل۔" (چل جلدی کام ختم کر) ماسی شریفاں اس بات کو سن کر لمحہ بھر کو ٹھٹکی پھر بولی۔

لیکن کھاری کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس لفظ کو سننے کے بعد پہلے بی بی اور پھر ماسی شریفاں ٹھٹھکی کیوں تھیں۔ وہ کئی دن اس بات پر غور کرتا رہا۔

☼ ☼ ☼

"آج میں تمہیں اپنا فیورٹ سونگ سناؤں گا۔" سعد نے سارہ سے کہا۔ "مگر ایک شرط ہے پہلے تم اپنے لنچ میں موجود ہر چیز ختم کرو گی۔"

"پھر ایک شرط میری بھی ہے۔" سارہ نے جواب میں کہا۔

"ہاں بولو۔" سعد نے اپنا لیپ ٹاپ آن کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"تم وہ سونگ خود بھی مجھے گنگنا کر سناؤ گے۔" سارہ نے خود کو تھوڑا پیچھے کھسکاتے ہوئے تکیوں کا سہارا لے کر کہا۔

"کون میں؟" وہ اس کی طرف دیکھ کر بے اختیار ہنس دیا۔

"تم ہنستے ہوئے بہت اچھے لگتے ہو، پہلے کبھی تمہیں کسی نے بتایا؟" سارہ نے بے اختیار کہا۔

"نہیں!" اس نے سر ہلا کر کہا۔ "اتنی فرصت اور دھیان سے کبھی کسی نے مجھے ہنستے دیکھا ہو تو کہے نا۔" وہ مسکرایا۔

"خیر!" سارہ نے تکیے سے سر ٹیکتے ہوئے کہا۔ "بات ٹالنے کی کوشش نہ کرنا۔ تم یہ گانا مجھے گنگنا کر بھی سناؤ گے۔"

"ارے بابا! کیوں اس گھر سے نکلنے کا سامان کرنا چاہ رہی ہو۔" وہ سر جھٹک کر بولا۔ "تمہارے سب ہمسائے دستک دینے لگیں گے تھوڑی دیر بعد اور کہیں گے کہ گھر خالی کردو۔" سارہ خاموش رہی۔

"اتنی بھونڈی ہے میری آواز۔" اپنی بات کے جواب میں سارہ کی خاموشی پر سعد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"میں نے تو کبھی باتھ روم میں بھی گنگنانے کی جرات نہیں کی، کہیں چیزیں کیبنٹ سے نیچے نہ گرنے لگیں ڈر کے مارے۔" وہ مزید بولا۔

"تم مجھے گنگنا کر سنانے کے وعدے پر ہی مجھ سے لنچ ختم کرا سکتے ہو۔" وہ اپنی بات پر اڑتے ہوئے بولی۔

"اوکے بیوٹی فل! جیسے تم بولو۔" وہ فوراً مان گیا۔ اسے سارہ کو ہر حال میں لنچ کرانا تھا۔ ڈاکٹرز اس کے لو بلڈ پریشر اور گرتے ہوئے وزن کی وجہ سے پریشان تھے۔

"میں جانتی ہوں سعد! کہ میں خوب صورت تو چھوڑ قبول صورت بھی نہیں ہوں۔" لنچ کرتے کرتے سارہ نے کہا۔

"او ریئلی!" اس کے لیے پلیٹ میں مزید کیچ اپ ڈالتے ہوئے سعد نے ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں!" سارہ نے یوں کہا جیسے اسے اپنی بات پر پورا یقین ہو۔ "پھر تم مجھے کبھی بیوٹی فل، کبھی گورجیس، کبھی پریٹی گرل (پیاری لڑکی) کہہ کر کیوں بلاتے ہو۔" سارہ نے بیک کیے ہوئے آلو کا قتلہ منہ میں ڈالتے ہوئے بات مکمل کی۔

"ہوں۔" سعد اپنا ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر کچھ سوچنے لگا کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے سارہ کی طرف دیکھا۔ "اس لیے اچھی لڑکی کہ مجھے اپنے الفاظ پر کوئی شک نہیں۔ میں پورے یقین کے ساتھ تمہیں یہ سب کہتا ہوں۔"

"تم صرف میرا اعتماد بحال کرنا چاہتے ہو۔" سارہ نے پلیٹ سے گرلڈ چکن کا آخری ٹکڑا اٹھاتے ہوئے کہا۔ "مگر یقین جانو! کہ ایسے خوش کن اسٹیٹمنٹس کے بغیر بھی تم میرا اعتماد بحال کر سکتے ہو۔"

سعد نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو۔ "وہ کیسے۔"

"زندگی پر، خود اپنے آپ پر اور لوگوں پر میرا اعتماد بحال کرنے کو یہ حقیقت کیا کم ہے کہ تم جیسا انسان میرا اتنا خیال رکھ رہا ہے۔" سارہ نے گلاس اٹھا کر پانی کا ایک گھونٹ لینے کے بعد کہا۔

"میں بچپن سے لوگوں کے درمیان رہی ہوں۔" کچھ توقف کے بعد وہ بولی۔ "مختلف قسم کے انسان جن میں سے اکثر مطلبی، بدذات، خود غرض اور کمینے تھے، وہ جنہیں مجھ میں صرف اتنی دلچسپی تھی کہ میری ذات، میرے کرتب، میرے کھیل تماشے ان کی جیبیں گرم کروانے میں کتنے کام آ سکتے تھے، کتنے ہی ایسے تھے جو تماشائی تھے، میرے کرتب پسند آنے پر تالیاں بجاتے سیٹیاں بجاتے اور سکے اچھالتے لوگ۔" وہ تواتر اور تسلسل کے ساتھ

بہت دنوں کے بعد بول رہی تھی۔ سعد کو خوشی ہوئی۔

"کئی مہربان بھی تھے' ہمدردی کرنے والے' نرمی سے بات کرنے والے' میری غلطیاں معاف کردینے والے۔" پھر اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "مگر یہ وہ لوگ تھے جو اس وقت میرے ساتھ تھے' جب زندگی متحرک تھی' جب زندگی میں رنگ تھے اور گرم جوشی بھی۔" وہ سانس لینے کو رکی۔ اس نے لحہ بھر کو سعد کی طرف دیکھا۔

سعد محویت سے اس کی بات سن رہا تھا۔

"لیکن تم۔" پھر وہ بولی۔ "تم نے اس وقت مجھے اسپاٹ کیا' جب زندگی رک گئی تھی۔ جب کوئی رنگ بچا تھا' نہ گرم جوشی' کوئی آس تھی نہ امید' ہر طرف اندھیرا تھا اور ناامیدی' اپنی غرض کے لوگوں کے لیے میں ناکارہ ہوچکی تھی' تماشائیوں کی تالیاں' سیٹیاں اور سکے میرے لیے بند ہوچکے تھے' مہربان اور ہمدرد لوگوں کا ذخیرہ بھی ختم ہوچکا تھا۔ جب تم نے مجھے اسپاٹ کیا اور مجھے زندگی کی طرف واپس لانے کی ترکیب کرنے لگے۔"

"اگر یہی کافی ہوتا تو تم زندگی کی طرف لوٹ آئی ہوتیں اب تک۔" سعد نے ٹرے اٹھا کر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم کو ابھی تک یقین نہیں آیا کہ زندگی ہے اور زندگی بہت خوب صورت ہے۔ تمہیں یہ بات بھی ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی کہ زندگی صرف ایک بار ہی ملتی ہے۔"

"جب میں ایکروبیٹ روپ (بازی گروں کی رسی) پر چلتے ہوئے گری تھی' اس وقت مجھے لگا تھا کہ میری ساری ہڈیاں ٹوٹ کر چکنا چور ہوچکی ہیں اور میں گوشت کا ایک چرامرا سالوتھڑا بن چکی ہوں۔ وہ لوتھڑا بھی قریب الختم نظر آرہا تھا' جب میں نے اپنے جسم کے ہر حصے سے بہتے ہوئے خون کو ادھر ادھر بکھرے دیکھا۔ صرف میرا ذہن زندہ تھا جو محسوس کراتا تھا اور میری آنکھیں زندہ تھیں جو دیکھ رہی تھیں۔"

"پھر بھی تمہیں زندگی اور زندگی دینے والے پر اعتبار نہیں آیا؟" سعد نے بے ساختہ سوال کیا۔ "وہ جسم جس کی ہڈیوں کا سارا ڈھانچہ ٹوٹا پھوٹا محسوس ہورہا تھا اور جو صرف ایک لوتھڑے میں بدل کر رہ گیا تھا' اس کے دوبارہ جسم بننے کے عمل کے دوران بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آیا کہ زندگی دینے والا کیسے ہڈیوں میں دوبارہ جان ڈال دینے پر قادر ہے؟ بہتا خون رکا اور دوبارہ سے اسی جسم کی شریانوں میں دوڑنے لگا تو بھی تمہیں یقین نہیں آیا کہ زندگی دینے والا جب تک نہ چاہے زندگی جا نہیں سکتی' موت آنہیں سکتی؟"

"ادھوری زندگی' مفلوج جسم' ناکارہ وجود' محتاجی' ترس' ترحم۔" سارہ نے بلند آواز میں کہا۔ "دینے والے کی شان کے صدقے۔"

"غلط۔" سعد نے تیزی سے کہا۔ "دینے والے نے دوبارہ دیا' یہ تمہارے سوچنے کا انداز ہے' جو دیے ہوئے کو ادھورا' مفلوج' ناکارہ' محتاج اور ترس کا مارا ہوا سمجھتا ہے۔ پھر بھی تم کہتی ہو کہ تمہارا اعتماد بحال ہوسکتا ہے؟"

"اگر تم سمجھتے ہو کہ نہیں ہوسکتا تو کوشش کیوں کرتے ہو؟" سارہ کا لہجہ ترش ہوگیا۔

"اس لیے کہ مجھے زندگی دینے والے پر بھی یقین ہے اور اس کی دی ہوئی زندگی پر بھی۔" سعد نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "اور میں اس وقت تک کوشش کرتا رہوں گا جب تک کامیاب نہ ہوجاؤں۔"

"لیکن کیوں؟ میں ہی کیوں؟" سارہ نے بہت بار پوچھا ہوا سوال دوبارہ پوچھا۔ "اس دنیا میں' اسی ملک میں' اسی شہر میں کئی اور بے بس' معذور' مدد اور توجہ کے مستحق لوگ موجود ہیں' پھر میں کیوں؟"

"اس لیے کور جیس! کہ مجھے وہی کام کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ کو مجھ سے کروانا ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر میں چاہوں تو ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔" سعد نے اٹھ کر لیپ ٹاپ پر کوئی کام کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے Bruno Mars بہت پسند ہے۔ اس کے گانوں کے الفاظ بہت خوب صورت ہوتے ہیں۔

معصوم' چھوٹے چھوٹے' بے ریا' مگر بہت یادر قل کرتے الفاظ۔" سعد نے مگن سے انداز میں کہا۔ اس نے اپنی پلے لسٹ سے ایک گانا نکال کر آن کرتے ہوئے کہا۔

"تم بھی سنو!" اس نے لیپ ٹاپ سارہ کی گود میں رکھ دیا۔

If you ever find yourself stuck in the middle of he sea
I will sail the world to find you
If you ever find yourself lost in the dark and you can't see
I will be the light to guide you
Find out what we are made of what we are called to help
our friends in need
you can count on me like
one two three
I'll be there.

(اگر کبھی تم خود کو سمندر میں پھنسے ہوئے پاؤ۔
میں پوری دنیا کے سفر کرتے ہوئے تم تک پہنچوں گا۔
اگر تم کبھی اندھیرے میں یوں گم ہوجاؤ کہ تمہیں کچھ دکھائی نہ دے۔
میں ایک راہ نما روشنی بن کر تمہارے پاس آوں گا۔
ذرا سوچو! ہمارا مقصد کیا ہے' جب ہمیں ہمارے دوست پکارتے ہیں۔
تم صرف گنتی گنو گے۔
ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین
تم مجھے اپنے پاس پاؤ گے۔)

اپنی دوست کو یقین دلا رہا تھا اور سارہ جیسے ان لفظوں کے سحر میں جکڑی گئی تھی۔ سعد Bruno Mars
زیرلب مسکراتا اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا وہ جو پیغام سارہ کو دینا چاہ رہا تھا وہ اس تک پہنچ رہا تھا۔ وہ سارہ کو گانے میں مگن بیٹھے چھوڑ کر آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے کھڑکی کے قریب آیا۔ شہر کے بلند و بالا پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کی تہ گہری ہو رہی تھی۔ نیچے سڑک پر چلتے لوگ گرم کپڑوں میں ملبوس تھے۔ سرما اپنی تمام خوب صورتیوں کے ساتھ آرہا تھا۔ وہ موسم جو اسے ہمیشہ سے بے حد پسند رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

سردار چچا کے ہاں سے واپسی کے بعد ماہ نور کو سنجیدگی سے اپنی پڑھائی میں مگن ہو جانا تھا اور وہ بظاہر ہو بھی چکی تھی۔ شاید وہ گھر والوں کو اس لیے پہلے سے زیادہ سنجیدہ نظر آتی تھی کہ یہ اس کا فائنل سمسٹر تھا۔ لیکن یہ صرف ماہ نور جانتی تھی کہ سردار چاچا کے پاس قیام کے دوران اس کا ذہن و دل کہیں اٹک گیا تھا۔ ایک عجیب سی الجھن تھی جو جاتی نہیں تھی۔

"کیا مصیبت ہے بھئی! میں بھول کیوں نہیں جاتی؟" کئی بار کتابیں سامنے رکھے ان کے صفحات پر نظر ڈالتے ہوئے اس کا ذہن جب سوچ میں بھٹکنے لگتا تو وہ تنگ آکر سوچتی۔

"اب ایسا بھی کیا کہ بندروں کے تماشے دکھانے والے اور میلوں ٹھیلوں میں اکتارے بجاتے گیت سناتے لوگ یوں ذہن سے چپک جائیں کہ انسان ہر کام سے ہی جائے۔" اس نے کئی بار خود کو جھڑکا تھا۔ مگر عجیب بات تھی کہ جب وہ سنجیدگی سے پڑھنے بیٹھتی گاؤں میں بندر کا تماشا دکھاتا اور میلے میں کافی سناتا سائیں، دونوں ہی اس کے پردہ ذہن پر ابھر آتے اور وہ لاشعوری طور پر سوچنے لگتی کہ ایک کی دوسرے سے کیا مشابہت تھی۔

"دونوں کا ہنر مختلف، حلیے مختلف، مقام مختلف، پھر میں کیوں مماثلت تلاش کرنے میں الجھی ہوئی ہوں۔" پھر وہ خود کو ڈانٹ دیتی۔

"صوفی ازم، آج کل فیشن میں ہے ماہی! اور تم اس فیشن کی تقلید کرنے لگی ہو۔" اس کا بھائی اسے مذاق سے کہتا۔

"وہ کیسے؟" وہ چونک کر کہتی۔

"تمہارے کمرے سے آج کل Enrique یا Akon وغیرہ وغیرہ کے بجائے سائیں ظہور اور عارف لوہار کی آوازیں سنائی دیتی ہیں مس ٹرینڈ فالوور!" وہ کہتا تو ماہ نور کو خواہ مخواہ لگتا جیسے اس کے دل کا چور پکڑا گیا ہو۔ وہ اس بات پر بھائی سے بحث نہیں کرتی۔ اسے لگتا وہ اس کا مذاق بنا کر رکھ دے گا اور اسے جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔

☼ ☼ ☼

"شہر کی آبادی ہماری آنکھوں کے آگے بڑھی اور بڑھتے بڑھتے آبادی کا ازدحام ہر طرف پھیل گیا۔" خدیجہ چولہے پر رکھے برتن میں ابلتے پانی میں ادھر ادھر پھدکتی چائے کی پتی کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔

"دیکھتے ہی دیکھتے بے شمار ٹاؤنز بنے اور یہاں وہاں تاحد نگاہ گھر ہی گھر، عمارتیں ہی عمارتیں نظر آنے لگیں۔" وہ کپ پر رکھی چھلنی میں چائے انڈیلتے ہوئے سوچتی رہیں کہ پہلے کون سا ٹاؤن بنا اور بعد میں کون سا معرض وجود میں آیا۔ اسی دم انہیں کچن سے ملحق چھوٹے برآمدے کی گرل کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

"ارے! یہ کون داخل ہوا؟" وہ لرز گئیں۔ گلے میں پڑی زنجیر سے جڑا چشمہ آنکھوں سے لگا کر وہ کچن کی کھڑکی سے باہر جھانک ہی رہی تھیں جب انہیں اپنے کان کے پیچھے "ہاؤ" کی آواز آئی۔ وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔

"اوہو! یہ تم ہو۔" پھر انہوں نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

"میرے علاوہ یوں دبے پاؤں صرف بلی ہی آسکتی ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔

"جاؤ! ہم تم سے نہیں بات کر رہے۔" خدیجہ نے مصنوعی غصہ دکھاتے ہوئے کہا۔

"ارے! کیوں؟" وہ اپنی بڑی بڑی کالی آنکھیں مزید کھولتے ہوئے بولی۔

"ارے بابا! ان کو تو مت پھیلاؤ۔ خواہ مخواہ ڈر لگنے لگتا ہے۔" خدیجہ ہنسیں۔

"اچھا! یہ تو بتایئے ناراض کیوں ہیں؟" وہ بے تکلفی سے کچن اسٹول پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"کہاں غائب تھیں اتنے دنوں سے؟" خدیجہ نے پین میں ایک کپ چائے کے لیے پانی ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"میں سردار چاچا کے پاس گئی ہوئی تھی۔ بتایا تو تھا آپ کو جانے سے پہلے۔" اٹھ کر فریج کھولتے ہوئے ماہ نور نے کہا۔

"ارے ہاں!" خدیجہ کو یاد آیا۔ "وہ تمہاری اماں بتا رہی تھیں کہ وہاں اپنے چچا کے فارم پر تم کوئی فوک ایونٹس پر ریسرچ کر رہی ہو؟"

"فوک ایونٹس۔" فریج سے پیسٹریز کی پلیٹ نکال کر شلف پر رکھتے ہوئے ماہ نور نے زیر لب دہرایا۔

"ریسرچ" اس نے سوچا اور بے اختیار ہنس دی۔ "ماما کو بھی باتوں میں اٹریکشن پیدا کرنے کے کیا کیا ڈھنگ آتے ہیں۔" اس نے سوچا۔

"بس اسی ریسرچ میں لگی رہی اتنے دن۔" اس نے چاکلیٹ فج پیسٹری نکال کر ایک علیحدہ پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "ویسے اب تو واپس آئے کافی دن ہو گئے مجھے۔"

"اچھا! مجھے خبر نہیں ہوئی۔" خدیجہ نے چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ فاطمہ خالہ کہاں ہیں؟" ماہ نور نے ادھر ادھر دیکھا۔ "وہ چائے نہیں پئیں گی۔"

"نہیں! تم جانتی تو ہو اسے یہ مکس چائے پسند نہیں۔" خدیجہ، ماہ نور کے سامنے ہی کچن ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ "وہ کہتی ہے۔ تم لوگ چائے کا سانس گھونٹ دیتے ہو اسے ابال کر۔"

"فاطمہ خالہ! بہت سوفسٹی کیٹڈ ہیں، بہت ارسٹو کریٹک۔" ماہ نور نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"ہاں!" خدیجہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "فاطمہ نے وقت کے ساتھ خود کو بدلنے سے مکمل انکار کر دیا۔

اچھا! تم بتاؤ کیسی رہی تمہاری ریسرچ۔" خدیجہ نے بات بدلی۔

"ہوں!" ماہ نور نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اچھی رہی۔ ویسے سچ تو یہ ہے کہ ریسرچ وغیرہ میں نے کیا کرنی تھی بس مجھے لوک تماشے اور لوک میلے دیکھنے کا شوق تھا۔"

"ارے! اس کے لیے کسی گاؤں جانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو اب ہر بڑے شہر میں بھی تھوک کے حساب سے لگتے ہیں۔" خدیجہ نے برتن سنک میں رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں خدیجہ خالہ! یہاں شہروں میں وہ ماحول پیدا نہیں ہوتا جو گاؤں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔"

"مثلاً؟" خدیجہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"گاؤں کے بچوں کی ایکسائٹمنٹ کا تو کوئی جواب نہیں۔" ماہ نور یاد کر کے مسکرائی۔

"اتنا اشتیاق، اتنی خوشی ہوتی ہے ان کے چہروں پر کہ بیان نہیں کی جاسکتی اور وہاں کے مرد و خواتین ... وہ بھی اسی تجسس اور شوق سے یہ تماشے دیکھتے ہیں جیسے انہوں نے پہلی بار دیکھا ہوگا۔"

"اچھا تو یہ بڑھتے ہوئے کمیونیکیشن میڈیا اور سب ہتھیاروں سے لیس میڈیا نے ان لوگوں سے اوقات کچھ اثر نہیں کیا؟" خدیجہ خالہ مسکرائیں۔

"پتا نہیں!" ماہ نور نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "ویسے مجھے نہیں محسوس ہوا۔"

"ایک بات بتائیں خالہ!" پھر کچھ سوچنے کے بعد اس نے خدیجہ کو مخاطب کیا۔

"ہاں پوچھو۔" خدیجہ نے کچن کا دروازہ کھول کر لاؤنج میں جھانکتے ہوئے کہا۔ فاطمہ لاؤنج میں نہیں تھیں۔

"ایک بندہ ایک وقت میں کتنے فنون کا ماہر ہو سکتا ہے؟" ماہ نور کو خود بھی پتا نہیں تھا کہ وہ یہ سوال کیوں کر رہی تھی۔

"پتا نہیں!" خدیجہ نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد کہا۔ "مگر میں نے سنا ہے کہ جو زیادہ فنون کے جیکس ہوتے ہیں وہ کسی بھی فن کے ماسٹر نہیں ہوتے۔"

ماہ نور نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ "واہ خدیجہ خالہ! آپ سے ہی اس وٹ (مزاح) کی توقع کی جاسکتی تھی۔"

"کیوں؟ تم نے کیوں پوچھا؟" خدیجہ نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے سوال کیا۔

"بس یوں ہی۔" ماہ نور نے اس سوال کا جواب ٹال دیا۔

"اچھا! اب میں چلوں۔" پھر وہ اچانک جانے کو تیار ہو گئی۔

"ارے! فاطمہ سے نہیں ملو گی؟" خدیجہ نے اسے روکنا چاہا۔

"وہ آرام کر رہی ہیں میں پھر کسی وقت آجاؤں گی۔" وہ تیزی سے کچن کے پچھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔

"کیسی اچھی زندگی سے بھرپور اور محبت کرنے والی لڑکی ہے۔" خدیجہ نے کھڑکی کے پار اسے شاگرد پیشہ کے کوارٹرز کے قریب سے گزر کے پچھواڑے کے گیٹ کے قریب جاتے دیکھ کر سوچا۔ "آج کل کی بچیاں کہاں اپنی عمر سے بڑے لوگوں کے ساتھ وقت گزارتی ہیں اور یہ کہتی ہے کہ اس کا دل جتنا ہم دونوں کے ساتھ لگتا ہے اتنا کسی کے ساتھ نہیں لگتا۔"

"یہ کتنے مزے کا گھر ہے۔" دوسری طرف ماہ نور برآمدہ عبور کر کے شاگرد پیشہ کے کوارٹرز کے قریب سے گزرتی ہوئی سوچ رہی تھی۔ "اب کہاں ایسے طرز تعمیر پر بنے گھر دیکھنے کو ملتے ہیں۔"

اس نے سبزی کی کیاریوں کو دلچسپی سے دیکھا۔ مٹر، پالک، گاجر اور مولی کے ننھے ننھے پتے زمین سے سر اٹھا رہے تھے اور سرونٹ کوارٹرز کو "شاگرد پیشہ کے کوارٹر" کہنے والے لوگ بھی اب تو کہیں کہیں ہوں گے۔

اس نے سر اٹھا کر سامنے بنے کوارٹرز کو دیکھا۔ "اسی لیے تو مجھے یہاں آنے میں مزا آتا ہے۔"

ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان کر لینے کے بعد کہ کوئی اسے دیکھ نہیں رہا، اس نے امرود کے پیڑ پر لگے امرودوں میں سے ایک کچا پکا بڑا سا امرود توڑا اور اپنی قمیص کے دامن سے رگڑ کر صاف کرنے کے بعد مزے سے اسے کھاتے ہوئے پچھلے گیٹ سے باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

"اُفوہ! ایک تو یہ وقت۔" نادیہ نے تیزی سے موزے پاؤں پر چڑھاتے ہوئے بھنا کر سوچا۔ اسے روزانہ صبح نکلتے ہوئے دیر ہو جاتی تھی اور تیاری کے دوران اس کی نظریں گھڑی پر ہی رہتی تھیں۔ موزے پہننے کے بعد اس نے اپنے لانگ شوز کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

"ابھی کل شام ہی تو آکر اتارے تھے۔" اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ جوتے کہاں اتارے تھے۔

"ایک تو سردی کی شدت دماغ اور یادداشت کو بالکل ہی منجمد کیے دیتی ہے۔"

پھر اسے بیڈ کے نیچے گھسے جوتے نظر آئے۔ اس نے جوتے نکال کر انہیں سیدھا کیا اور جلدی جلدی پہننے لگی۔ اپنا بیگ، فون اور کمرے کے دروازے کی چابیاں اٹھاتے اٹھاتے میز پر رکھے ٹیبل فریم میں جڑی ایک تصویر دیکھ کر وہ پل بھر کو مسکرا دی۔

"تم نے تو مجھے بالکل ہی بھلا دیا۔" اس نے تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ "چلو آج تو ویک اینڈ نائٹ ہے۔ آج تمہیں ایک لمبی سی میل بھیجتی ہوں اور پھر دیکھتی ہوں کہ تم جواب دیتے ہو یا نہیں۔"

اس نے تصویر کی طرف پیار بھری مسکراہٹ اچھالی اور تیزی سے چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☼ ☼
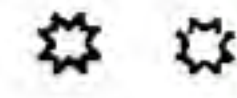
ہاتھ میں تھامی چھوٹی سی گڑگڑی کا کش لگانے کے بعد اختر نے کہا۔

"گل صرف اتنی سی ہے باؤ صیب! کہ صرف فقیر ہی جانتا ہے۔ فقیر کا دیس کون سا ہے۔ فقیر کا بھیس کیا ہے' اس کا پتا کسی کو نہیں چلتا۔ وہ کبھی بھی کدھر بھی موجود ہو سکتا ہے۔"

"اچھا! تو پھر اس کا مطلب ہے کہ جوگی کا 'فقیر کا کوئی دیس نہیں ہوتا۔ اس کی ذات اور صفات کیا ہوتی ہیں جن سے کوئی کوتاہ نظر اندازہ ہی لگانے کی کوشش کرے کہ وہ کون ہے۔" اختر کے مخاطب نے سوال کیا۔

"دیا باؤ جی! اٹھنشہ ہو گیا یہی سمجھاتے' فقیر کی کوئی ذات نہیں ہوتی' کوئی ایسی صفات نہیں ہوتیں کہ پہچانا جائے۔ مولے کو دیکھا ہے کبھی؟" اختر نے اپنی سرخ سرخ نظریں اپنے مخاطب کے چہرے پر گاڑتے ہوئے سوال کیا۔

"لڑا دے مولے کو شہباز سے" والا؟" اس کے مخاطب نے اپنے ساتھی کو کہنی مار کر اپنے جواب کی تائید چاہی۔

"کونجیں کس طرح سفر کرتی ہیں' دیکھا ہے کبھی؟" اختر نے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر پوچھا۔ اس کے مخاطب نے اپنی لاعلمی پر شرمندہ ہوتے ہوئے سر کھجایا۔

"کائنات کے نظام میں باؤ جی!" اس کی لاعلمی پر اختر نے مسکرا کر کہا۔ ان گنت مخلوق موجود ہے' جو اپنے اپنے طریقے سے زندگی گزارتی ہے۔ انسان' حیوان سے مختلف' حیوانوں کے اپنے اپنے درجے' کچھ درندے' کچھ بے ضرر' کچھ دوپائے' کچھ چارپائے' کچھ جنگلوں کے باسی' کچھ شہریوں کے پالے ہوئے' پرند آسمان پر اڑتے' پانی کی مخلوق پانی اندر تیرتی' کبھی پانی کے نیچے سانس لیتے پیڑوں کی' درختوں کی' جھاڑیوں اور بیلوں کے الگ الگ ضابطہ حیات" اختر دم لینے کو رکا۔

"جس کی باریکیوں پر نظر ہوئی۔" دم لینے کے بعد اس نے ایک بار پھر گڑگڑی کا کش لگاتے ہوئے کہا۔ "وہ کائنات کا راز پا گیا اور جو کائنات کے راز پا گیا' وہ آپ سے آپ فقیری لائن میں چلا گیا۔" اختر نے جھونپڑی کے باہر جلتے الاؤ کے دھویں سے آنکھوں میں اترتے پانی کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"اور..." پھر اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ "یاد رکھنا! کائنات کے راز سمجھ جانے والا دیسوں' بھیسوں' ذاتوں' صفاتوں کی حد سے بالا ہو جاتا ہے۔"

"Thank you for your interpretatoin sir!"

اختر کے مخاطب نے جواب تک پنجوں کے بل فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا' اٹھتے ہوئے کہا۔

"فقیر کو القاب یا خطاب سے بھی کوئی سروکار نہیں ہوتا۔" اختر نے تیزی سے جواب دیا۔ "ماسٹر' سر' سردار' آقا' بادشاہ سلامت' ہز ہائی نس' میڈم' میم' مس' محترمہ' ہر ہائی نس' یہ بڑے لوگوں کی تسلیاں ہوتی ہیں۔ فقیر اس حد سے بھی آگے جا چکا ہوتا ہے۔"

"اوہ! آئی ایم سوری۔" اختر کا مخاطب اختر کے جھک کر بولنے پر خجالت سے بولا۔

"لیکن یاد رکھو' فقیر کہیں بھی کدھر بھی موجود ہو سکتا ہے' سرکی کے جھونپڑے میں یا مٹی کی کٹیا میں ہی نہیں'

بڑے بڑے دفتروں میں سوٹ بوٹ پہن کر رنگ برنگی ٹائیاں لگا کر فائلوں میں سر کھپاتے بھی اہلِ ہو سکتے ہیں۔ یہ صرف مولا ہی جانتا ہے کہ اس نے کس کو کون سے کام لگا کر یہ لائن چلانی ہے۔"

"اوکے! تھینک یو۔" اختر کے مخاطب کو جیسے اب ادھر سے نکلنے کی جلدی تھی۔

"اچھا جاؤ' خیر' رب راکھا۔" اختر نے ہاتھ ہلا کر کہا اور آنکھیں بند کر کے گڑگڑی سے کش لگانے لگا۔

"کدھر سرکار؟" جھونپڑی سے باہر جلتے الاؤ پر دیگچہ رکھ کر چائے بناتے شخص نے ان دونوں کو میدان کے دوسری طرف کھڑی گاڑی کی طرف بڑھتے دیکھ کر آواز لگائی۔

"کاڑھے دا پیالہ پی کر جائیو سرکار!" اس نے ان دونوں کے رکنے پر دیگچے میں ابلتے ملغوبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھائی! بہت شکریہ' پھر کبھی سہی۔" ان میں سے ایک نے جواب دیا۔

"خالص دودھ تے دوھیری پتی' چٹی چینی نہیں' گڑ دا شیرہ' ایس تو ودھیا کاڑھا تہانوں کیدھرے نئیں لبھنا باؤ جی!" (خالص دودھ' زیادہ پتی اور سفید چینی کی جگہ گڑ کے شیرے سے بنی اس چائے سے بہتر چائے تمہیں کہاں مل سکتی ہے باؤ جی!) اس شخص نے انہیں لالچ دیا۔

"لو! پیالہ پیالہ پی لوو' سارا تھکیواں لیہ جائے گا۔" (لو! ایک ایک پیالہ پی لو' ساری تھکن اتر جائے گی۔) پھر اس نے تیزی سے دو بڑے بڑے مٹی کے پیالے اس ملغوبے سے بھرتے ہوئے کہا۔

اس کے دونوں مخاطبین نے بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پیالے اس سے لے لیے۔ ایک ہی گھونٹ میں ان دونوں کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ انہوں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے پیالے نیچے رکھے اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

"فقیر دے لنگر نوں کوئی فرق نئیں پیندا بدبختو!" (فقیر کے لنگر کو کوئی فرق نہیں پڑتا بدبختو!) اس شخص نے دونوں کے زمین پر رکھے پیالوں کو واپس دیگچے میں الٹتے ہوئے کہا۔ "فقیر دے لنگر توں رجن والی مخلوق دا گھاٹا کائی نا۔" (فقیر کے لنگر سے سیر ہونے والی مخلوق کی کوئی کمی نہیں۔) وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔

"وہ بددعائیں دے رہا ہے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"فکر نہ کرو! فقیر کی بددعائیں بھی دعائیں بن کر لگتی ہیں۔" دوسرے نے قہقہہ لگا کر جواب دیا۔ ان کی گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور پل بھر میں پکی سڑک پر چڑھ کر نظر سے اوجھل ہو گئی۔

"بھرے پیالے نوں اونج ای چھڈ کے جان والے کدے فیض نئیں پاندے۔" (بھرے پیالے کو یوں ہی چھوڑ کر جانے والے کبھی فیض نہیں پا سکتے۔) الاؤ پر بیٹھا شخص ابھی بھی اس سمت دیکھتے ہوئے چیخ رہا تھا جہاں ان کی گاڑی گئی تھی۔

"عقل دے انے' بدقسمت' بے فیض' نامراد!" وہ نہ جانے کس سے مخاطب تھا۔

☼ ☼ ☼

"اواخر خزاں کی شامیں مجھے ان دنوں کی یاد دلاتی ہیں' جب میں بورڈنگ میں رہتی تھی۔" نادیہ کی انگلیاں کی بورڈ پر تھرک رہی تھیں۔ "سرما کی چھٹیوں کے لیے گھر جانا ہوتا تھا اور صبح سے ہی انتظار ہوتا تھا۔ گھر سے کس وقت کوئی لینے آئے گا۔ اپنا اپنا سامان باندھے سب لڑکیاں طویل راہداریوں میں' باہر کھلے میدان میں رکھے بنچوں پر یا کلاس رومز کے باہر بنے برآمدوں میں انتظار سے بوجھل آنکھیں گیٹ پر جمائے بیٹھی رہتی تھیں۔ صبح' دوپہر میں ڈھلتی اور پھر سورج کی روشنی غروب ہونے لگتی' اس وقت کہیں جا کر شرافت بلیو کرولا چلاتا گیٹ سے

اندر داخل ہوتا۔ اس وقت تک انتظار کرتے کرتے چھٹیوں کی ساری خوشی ہوا ہو رہی ہوتی تھی۔ پیچھے رہ جانے والی اکا دکا لڑکیوں اور سسٹرز کو خدا حافظ کہہ کر بیگ گھسیٹتی جب میں گاڑی کی طرف جا رہی ہوتی تھی تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہوتا تھا جیسے میں گھر جا نہیں رہی' وہاں سے واپس آ رہی ہوں۔"

وہ لمحہ بھر کو کچھ یاد کر کے مسکرائی اور پھر دوبارہ ٹائپنگ میں مصروف ہو گئی۔

"مگر پھر جب اپنے شہر کے مضافاتی منظر نظر آنے لگتے اور شرافت مجھے بتاتا کہ اب تک تم بھی گھر پہنچ چکے ہو گے تو ساری خوشی' سارا جوش واپس آ جاتا اور میں آنے والے دنوں میں کیے جانے والے مزوں کے تصور میں کھو جاتی ــــ چاکلیٹ اور خستہ مونگ پھلیوں' رس بھرے میٹھے سنگتروں اور آپا کے ہاتھ کے کھانوں کا ذائقہ زبان پر محسوس ہونے لگتا۔ تمہارے ساتھ درختوں پر چڑھنے' سائیکلنگ کرنے' درختوں میں چھپتی نکلتی گلہریوں کا خاموش بیٹھ کر نظارہ کرنے اور پھر انہیں قابو کرنے کا ایڈونچر یاد آنے لگتا۔

اوہ! کتنے یادگار' کتنے حسین تھے وہ دن جب "کس کا رویہ کیسا ہے" جیسا احساس ذہن میں کبھی نہیں ابھرتا تھا۔ "ہم کون ہیں اور کیا ہیں" جیسے سوال دل میں کبھی نہیں اٹھتے تھے۔ سگے' سوتیلے کی تفریق کا علم نہیں تھا۔ زندگی صرف ایک مزا تھی اور دنیا ایک ونڈر لینڈ ــــ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ بچپن سے لڑکپن میں داخل ہونا جنت سے بے دخل کر کے حضرت آدم کی طرح زمین پر آ بسنے کا سا تجربہ تھا۔ کاش! زندگی بچپن ہی میں رہتی یا کاش! لڑکپن اور پھر نوجوانی آنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی۔"

نادیہ کی انگلیاں یہ جملے ٹائپ کرنے کے بعد رک گئیں۔

"اوہ!" پھر اس نے لکھنا شروع کیا۔ "میں بھی کیا افسردہ کر دینے والی یادوں کا ذکر لے بیٹھی۔ تم بتاؤ! پاکستان میں موسم کیسا ہے۔ یہاں تو بھئی منجمد کر دینے والی ٹھنڈ ہے۔ تم آج کل کیا کر رہے ہو؟ یقیناً "مزے میں ہو گے۔ بابا سے تعلقات کیسے چل رہے ہیں؟ تم نے اپنی اونگی بونگی حرکتیں بند کی یا نہیں؟ یار اب بڑے ہو جاؤ۔ بہت ہو گئیں اوٹ پٹانگ حرکتیں۔ اب سنجیدگی سے زندگی گزارنا شروع کر دو۔ میری مانو! کوئی اچھی سی لڑکی ڈھونڈ کر اس سے شادی کر لو۔ زندگی میں ٹھہراؤ بھی آ جائے گا اور نظم و ضبط بھی ــــ مجھے پتا ہے یہ بات پڑھ کر تم ہنسو گے' مگر یقین جانو! یہ ایک مخلصانہ مشورہ ہے اور اچھی زندگی گزارنے کے لیے ایک نادر نسخہ بھی۔" وہ لکھتے لکھتے مسکرائی اور پھر دوبارہ لکھنے لگی۔

"دیکھو! اب میں تم کو اتنی طویل اور تفصیلی میل بھجوا رہی ہوں' تم پر لازم ہے کہ اس کا جواب بھی اتنا ہی طویل اور تفصیل سے بھیجو۔ کسی دن فون کر کے یہ تو بتا تاکہ کیا کسی ایک وقت پر ہم ویک اینڈ پر ہی سہی' اکٹھے آن لائن ہو کر بات کر سکتے ہیں؟ مجھے پتا ہے کہ تمہارے پاس اس کا وقت شاید ہی نکلے' پھر بھی ہو سکے تو ضرور بتانا۔ تم اتنے بے ایمان اور کنجوس ہو کہ کبھی ایک کال کرنے کی زحمت تک نہیں کرتے۔ تم اتنے امیر کبیر شخص ہو اور میں ٹھہری ایک غریب طالبہ جو وظیفے پر تعلیم حاصل کر رہی ہے اور اس غریب الوطنی میں مشکل سے گزارہ کر رہی ہے' ورنہ میں تمہیں اکثر و بیشتر کال کر لیا کرتی۔" وہ مسکرائی۔

"چلو! دیکھتے ہیں تم کب اس میل کو پڑھتے ہو' کب جواب دیتے ہو' چھ ماہ تو لگ ہی جائیں گے۔" نادیہ ایک بار پھر مسکرائی۔

"اپنا بہت خیال رکھنا ــــ ایک بات کہنی تو بھول ہی گئی' ایک بہت ضروری بات ــــ اور وہ یہ کہ میرے پیارے بھائی! مجھے تم سے شدید محبت ہے۔"

تمہاری بہن نادیہ ــــ"

لکھنے کے بعد نادیہ نے صفحے کو اوپر نیچے کرتے ہوئے ایک دفعہ پھر پڑھا اور send کا بٹن دبا دیا۔

☼ ☼ ☼

ماہ نور نے آسمان پر اڑتے پرندوں کو کاہلی سے دیکھا۔ کئی دن کے بعد سورج نے اپنی شکل دکھائی تھی اور اپنی حرارت سے ٹھٹھرے جسموں کو گرمائش پہنچائی تھی۔ ماہ نور بھی کیفے سے چائے کا کپ اور کلب سینڈوچ لے کر گراؤنڈ میں بیٹھ گئی تھی' جہاں اس کے گروپ کی باقی لڑکیاں پہلے سے بیٹھی تھیں۔ اس نے بے فکری سے بیٹھی گپیں لگاتی لڑکیوں کو دیکھا جو ادھر ادھر ٹولیوں کی شکل میں بیٹھی تھیں۔ ان میں سے اکثر اپنی کلاسز بنک کر کے دھوپ کا لطف اٹھانے آئی تھیں اور کچھ کا وہ پیریڈ فری تھا۔

"زندگی کتنی حسین ہے۔" اس نے چائے کا آخری گھونٹ بھرنے کے بعد کاغذی گلاس کو زمین پر رکھتے ہوئے جیسے فیصلہ صادر کیا۔

"یہ تم اس وقت اس لیے کہہ رہی ہو بیٹا کہ تمہاری پریزنٹیشن اچھی رہی اور تمہارا یہ پیریڈ فری ہے۔ دھوپ کئی دن بعد نکلی ہے اور تم کو اس سنہری دھوپ سے لطف اندوز ہونے کا پورا موقع مل رہا ہے۔" شاہ بانو جو اس کی سب سے قریبی دوست تھی' نے نوٹس بناتے بناتے ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی۔

"کیا کسی اور وقت میں میں یہ بات نہیں کہوں گی؟" اس نے حیرت سے شاہ بانو سے پوچھا۔

"ہمارے سارے تجربے ہمارے موڈز کے تابع ہوتے ہیں۔" شاہ بانو نے کاغذ اور قلم گھاس پر رکھ دیے۔

"ہو سکتا ہے۔" ماہ نور نے شانے اچکائے۔ "مگر آج تو مجھے سب کچھ اچھا لگ رہا ہے۔"

"آج میں کیا خاص بات ہے؟" شاہ بانو مسکرائی۔

"شاید میرا موڈ اچھا ہے آج۔" ماہ نور نے چمکتے سورج کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے رنگ برنگ دائرے چمکنے لگے۔

"سورج کی روشنی میں چیزیں کیسے ریفلیکٹ کرتی ہیں۔" اس نے سوچا۔

"تم فوک میوزک کی جو سی ڈیز اکٹھی کر رہی تھیں' ان کی تعداد کہاں تک پہنچی؟" شاہ بانو نے اس کا پسندیدہ سوال کیا۔

"ان گنت۔" ماہ نور ہنسی۔ "میرے کمرے میں کبھی آکر دیکھو! تمہیں فوک سونگز کی سی ڈیز ہر طرف بکھری ہوئی ملیں گی اور میری USB کبھی گھر لے جا کر چیک کرو' تمہیں اندازہ ہو جائے گا کیسا خزانہ بھرا ہے اس میں۔"

"نہیں بھئی۔" شاہ بانو نے کہا۔ "مجھے اس فارم آف میوزک میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں۔" جواب میں ماہ نور نے برا سا منہ بنایا اور ادھر ادھر پھرتی لڑکیوں کو دیکھنے لگی۔

"لیکن ایک اچھی آفر ہے میرے پاس۔" کچھ دیر بعد شاہ بانو نے خاموشی توڑی۔

"وہ کیا؟" ماہ نور نے اپنی توجہ شاہ بانو کی طرف مبذول کی۔

"سید پور گاؤں میں فوک میلہ ہو رہا ہے اور عبید بھائی اس کے آرگنائزر میں سے ایک ہیں۔ جانا چاہو تو انویٹیشن کارڈز منگواؤں؟" شاہ بانو نے اپنے تئیں بہت اہم خبر اس کو دی۔

"فوک میلہ۔" ماہ نور نے زیر لب کہا اور پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔ "بابے منگو دا میلہ۔" اسے اچانک کھاری اور اس کے بتائے میلے کے مناظر یاد آنے لگے۔

"تمہیں پتا ہے شاہ بانو! کچھ لوک فنکار ایسے بھی ہیں جنہیں کبھی کوئی بڑا چانس نہیں ملتا۔" ماہ نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ "ایسا چانس جس سے ان کا ٹیلنٹ ابھر کر سامنے آئے' ان کو شناخت ملے' ان کا فن سراہا جا سکے۔ وہ ساری زندگی یوں ہی میلوں' ٹھیلوں میں گا بجا کر گزار دیتے ہیں' اپنا فن چند سکوں کے عوض بیچتے پھرتے ہیں۔ اور وہ

میلے ٹھیلے یوں بڑے لوگوں کے آرگنائز کیے ہوئے نہیں ہوتے۔" یوں ہی چھوٹی چھوٹی بستیوں میں کبھی کسی پیر فقیر کے عرس پر، کبھی گندم کی کٹائی کے موقع پر اور کبھی بہار کی آمد پر ہونے والے چھوٹے چھوٹے گمنام پیمانوں کے میلے ٹھیلے ہوتے ہیں وہ۔"

"مجھے کچھ زیادہ تو نہیں پتا۔" شاہ بانو نے اپنی بکھری کتابیں سمیٹتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ جو لوگ فنکار ٹی وی اسکرین پر متعارف کرائے جاتے ہیں ان کے بارے میں اکثر یہی دعوا کیا جاتا ہے کہ وہ اسی طرح کے میلوں ٹھیلوں پر "ہنٹ" کیے گئے ہیں۔"

"ہاں! یہ بھی ہے۔" ماہ نور کو ایک خیال نے چونکایا۔ کیا خبر وہ الا سائیں بھی اچانک کسی دن ٹی وی اسکرین پر نمودار ہو جائے۔

"چلو بھئی! مسز ادریس کا پیریڈ شروع ہونے کو ہے۔ ایک منٹ کی بھی تاخیر ہو گئی تو کلاس میں داخل نہیں ہونے دیں گی۔" شاہ بانو نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ماہ نور نے بھی کھڑے ہو کر کپڑوں سے چپک جانے والی گھاس کے تنکے جھاڑے اور سینڈوچ کا ریپر اور ڈسپوزایبل گلاس سنبل کے درخت کے نیچے رکھے بڑے ڈسٹ بن میں ڈالنے کے بعد وہ شاہ بانو کی طرف مڑی۔

"سید پور کے میلے کے کارڈز کب منگواؤ گی پھر؟" اس نے شاہ بانو سے پوچھا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس دن صبح اس کی آنکھ تقریباً آٹھ بجے ہی کھل گئی۔ مگر طبیعت میں کسل مندی اتنی تھی کہ وہ آنکھیں موندے دیر تک بستر میں ہی لیٹا رہا۔ دس بجے زمان نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"صاحب ناشتے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" زمان نے اسے اطلاع دی تھی۔

"ایسی اطلاع اسے کافی عرصہ بعد ملتی تھی۔ سال میں دس، بارہ صبحیں ہی ایسی ہوتی تھیں جب وہ اور ڈیڈی اکٹھے ناشتا کرتے تھے۔

"باپ رے۔" وہ یہ پیغام سنتے ہی سیکنڈوں میں بستر سے اٹھا تھا۔ جب تک وہ نہا کر اور کپڑے بدل کر نیچے پہنچا، ڈیڈی کا انتظار جاری تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ انتظار کی کوفت برداشت نہ کر سکنے کے باعث ناشتا کر کے آفس جا چکے ہوں گے۔ سعد کو نیچے آتا دیکھ کر انہوں نے فضل سے ناشتا لانے کا کہا تھا۔

"خیریت؟" سعد نے کچھ دیر ان کے کوئی بات کرنے کا انتظار کرنے کے بعد پوچھا۔

"کیوں؟" انہوں نے کانٹا توسٹ کے ٹکڑے میں کھبوتے ہوئے پوچھا۔

"توپوں کے دہانے خاموش ہیں اس لیے..." سعد نے نیچی آواز میں کہا اور سر جھکا کر چائے کا سپ لینے لگا۔

"تمہاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔" انہوں نے اس کی بات نظرانداز کی۔ "کیا رات بھر جاگتے رہے ہو؟"

"تقریباً۔" سعد نے اپنے سامنے کی دیوار پر سجی پینٹنگ پر نظریں جمائیں۔ کسی مغل بادشاہ کے مطبخ کی منظر کشی کی گئی تھی۔

"استغفار... ایک وقت کے کھانے کے لیے اتنا اہتمام۔" وہ دل میں سوچ رہا تھا۔

"کسی نئے کام پر ہاتھ ڈالنے کا سوچتے رہے ہو رات بھر کیا؟" انہوں نے یقیناً "ہوا میں تیر چلانے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں! ایک دلربا حسینہ کے تصور میں کھویا ہوا تھا۔" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"اوہ!" وہ بے اختیار بولے۔ "پھر تو ٹھیک ہے۔" سعد ان کی حرکات و سکنات پر غور کر رہا تھا۔ انہوں نے اس کی آخری بات سننے کے بعد میز پر رکھا اخبار اٹھا کر نظروں کے سامنے کر لیا تھا۔ سعد کو لگا اب اسے ناشتا کرنے میں مزا آ رہا تھا۔

"اس روز تم اکارڈ کہاں لے کر گئے تھے؟" سعد کو معلوم تھا اب وہ کوئی ایسی بات ہی نکالیں گے جس پر اس کی باز پرس کر سکیں۔

"اس گرد اور کیچڑ نے خود ہی بتا دیا ہوگا۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

"چیزوں کو استعمال کرنے کا بھی کوئی میرٹ ہوتا ہے صاحبزادے!" وہ سنجیدہ سا چہرہ بنا کر بولے۔

"یہاں میرٹ کو کوئی سمجھتا کیا ہے۔" سعد ہنس کر بولا۔ "یہ آپ ہی کے الفاظ ہیں ویسے۔"

"تم بھول رہے ہو میں تمہارا ابھی باپ ہوں۔" انہوں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"میں جینیٹکس پر ہی ریسرچ کر رہا ہوں آج کل۔" اس نے فوراً "جواب دیا۔

"آج کے زمانے میں زندہ ہوتا ناں ڈارون تو اپنی ہی تھیوری کو ریجیکٹ کر دیتا۔"

"ہاں! وہ ایک نئی تھیوری پر سب کے ووٹ لینے کی کوشش کرتا۔ تغیر زمانہ کے ساتھ انسانی نسلوں میں عوارض دماغی بڑھتے جاتے ہیں۔ عقل نیچے آتے آتے گھٹنوں میں پھنس کر رہ جاتی ہے اور اگر انسان اس کو زیادہ استعمال کرے تو ٹخنوں تک بھی چلی جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ کا نظریہ پیش کرتا۔" سعد نے کہا تو وہ ایک بار پھر سر جھٹک کر اخبار بینی میں معروف ہو گئے۔ سعد نے اطمینان سے ناشتا ختم کیا اور ادب سے پوچھا۔

"مجھے اجازت ہے اب۔"

"آج شام کو تم پشاور جا رہے ہو۔ جلیل وہیں ہوگا۔ البرٹ سے ملنا ہے تمہیں۔" انہوں نے اسے ناشتے پر مدعو کرنے کا عقدہ حل کرتے ہوئے کہا۔ "سات بجے کی فلائٹ ہے غالباً"... چیک کر لینا۔"

"جلدی بتا رہے ہیں۔ چھ، ساڑھے چھ بجے کا انتظار کر لیتے تو بہتر نہ ہوتا؟" سعد ان کی اطلاع پر بھنا کر سوچ رہا تھا کہ وہ اس کے سارے وار ایک ہی جملے میں چکا گئے تھے۔

"غلطی ہو گئی۔" وہ مزے سے کہہ کر اخبار کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"ویسے۔" سعد نے اٹھ کر اپنی کرسی آگے کھسکاتے ہوئے کہا۔ "جس حسینہ دلبر کا ذکر آپ کو دل ہی دل میں کھٹک رہا ہے اور جس کی وجہ سے میں رات بھر جاگتا رہا، آپ کے اطمینان کے لیے عرض ہے کہ اس کا نام نادیہ بلال ہے۔" ڈیڈی کے چہرے کے تاثرات سیکنڈز میں بدلتے دیکھ کر سعد کو یہ سوچ کر کچھ دیر پہلے کی کوفت بھولنے لگی کہ اس نے اپنے پوائنٹس مہارت سے اسکور کر لیے تھے۔

(باقی آئندہ شمارے میں ان شاء اللہ)

عنیزہ سیّد

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

تیسری قسط

آپا رابعہ نے آلو منگوانے کے لیے گلی میں جھانک کر کسی بچے کو تلاش کرنا چاہا گلی سنسان پڑی تھی۔ انہیں سخت مایوسی ہوئی۔

"مجال ہے جو مدرسے کے کسی بچے کو پانچ' دس منٹ کے لیے گھر بھجوا کر پوچھ ہی لیا کریں کہ کوئی چیز تو نہیں منگوانی۔" وہ دل ہی دل میں مولوی سراج سرفراز کو کوستی ہوئی ڈیوڑھی میں آکر کھڑی ہو گئیں۔ دھوپ ڈھل رہی تھی اور صحن میں گڑے مٹی کے چولہے پر چھاؤں آرہی تھی۔

" جو پاتھیوں (اپلوں) کے لیے کہا تو بولے "کسی کا احسان نہیں لینا۔" بالن (آگ جلانے کا سامان) اکٹھا لے نہیں سکتے "اللہ جانے! ان کی تنخواہ اور نذر نیازیں کہاں جاتی ہیں' مجھے تو ساری عمر پتا نہیں چلا۔"

وہ خود کلامی میں مشغول تھیں' جب دروازے کی کنڈی کھڑکی۔ انہوں نے سر پر اچھی طرح چادر اوڑھ کر دروازہ ذرا سا کھول کر باہر جھانکا۔

"امرود گھلے نیں چوہدری صیب نے۔ نالے گندلاں دا ساگ وی ایہہ تازہ تازہ" (امرود بھیجے ہیں چوہدری صاحب نے' ساتھ میں سرسوں کا ساگ بھی ہے تازہ تازہ) دروازے پر آئے کھاری نے دانت نکوستے ہوئے انہیں بتایا۔

"لا مجھے دے یہ چیزیں اور بھاگ کر مجھے آلو لا کر دے۔" آپا رابعہ نے جلدی سے تھیلا کھاری کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

"میں تو ٹرک کے ساتھ شہر چلا تھا' چوہدری صاحب نے مجھے کھڑا نہیں ہونے دیا' بولے کھاری بیٹا دوڑ کے جاؤ مولوی صاحب کے گھر سوغاتیں پہنچا کر آؤ۔" کھاری نے ان سے پیسے پکڑتے پکڑتے بھی دل میں جمع کی ہوئی باتیں گوش گزار کردیں۔

"بھاگ کے جا اللہ دتا دکان بند کر کے مسجد چلا جاتا ہے۔" آپا رابعہ نے کھاری کو دوڑا دیا اور خود ڈیوڑھی میں رک کر ہی اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگیں۔ دو' تین منٹ کے اندر ہی کھاری آلو کا تھیلا پکڑے واپس آگیا۔ تھیلے اور پیسوں کا حساب دینے کے بعد کھاری واپس جاتے جاتے مڑا۔

"اج بھین جی (ویسے بہن جی) (آپا رابعہ جگت بہن جی تھیں بہت کم لوگ انہیں آپا رابعہ کہہ کر بلاتے تھے) ایہہ جیھڑے شاہر ہوتے ہیں نا! ایہہ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔"

"چل چل' بڑا آیا افلاطون۔" آپا رابعہ نے مذاق سے کہا "تجھے کس نے بتایا؟"

"مینوں عقلاں والیاں ساریاں گلاں شہر والی بی بی نور نے سکھائی ہیں۔"

"اک تو تیری یہ شہر والی بی بی اللہ جانے کیا شے تھی۔" آپا رابعہ نے چڑ کر کہا۔

"او بڑی عقلاں والی بی بی اے۔" کھاری نے سامنے دیکھتے ہوئے عجیب جذب کے عالم میں جواب دیا۔

"نہ پر کس طرح؟" آپا رابعہ نے ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر سوالیہ انداز میں سہلاتے ہوئے پوچھا۔

"بھین جی! کبھی ہم نے' آپ نے سوچا کہ یہ بندر کا تماشا کس طرح ہوتا ہے؟ کبھی ہمیں خیال آیا کہ یہ جو جوگی لوگ میلوں میں گاتے پھرتے ہیں' ان سے پوچھیں کہ بھئی! آپ کی آواز میں اتنا اثر کیسے آیا؟" کھاری' آپا رابعہ سے سوال کر رہا تھا۔ آپا رابعہ کھاری کی سنجیدگی پر حیرت زدہ تھیں۔

"تمہاری بی بی نے یہ کس سے پوچھا کھاری!" انہوں نے سوال کیا۔

"ہے سی اک جوگی' سائیں تھا شاید۔" کھاری نے بے نیازی سے کہا۔

"سائیں نے کوئی جواب دیا؟" آپا رابعہ کو خواہ مخواہ اس بات میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

"اہو!" کھاری نے مفکرانہ انداز میں سر ہلایا۔ "سائیں ہوری آکھن لگے عشق صدقاں سوز پیدا ہو گیا۔"

(سائیں جی کہنے لگے عشق کی وجہ سے سوز پیدا ہو گیا)

"اوہو بھین جی ایہہ کیا کیا آپ نے' شہر والا ٹرک نہ نکل گیا ہو آپ مولوی صاحب کے لیے کھانا بنائیں' میں چلا۔" کھاری بگٹٹ بھاگا۔

آپا رابعہ کچھ دیر ڈیوڑھی میں کھڑی کھاری کی باتوں پر غور کرتی رہیں اور پھر آہستہ قدموں سے چلتی صحن میں آگئیں' دھوپ مکمل طور پر ڈھل چکی تھی' فضا میں آہستہ آہستہ خنکی بڑھ رہی تھی' شام کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ انہوں نے صحن میں بچھی چارپائی پر بکھری کتابوں پر نظر ڈالی' طبیعات' کیمیا' حیاتیات.....

"آپا رابعہ کی اکلوتی بیٹی سعدیہ کلثوم نویں جماعت کی طالبہ تھی۔ آپا رابعہ اور مولوی سراج سرفراز اس بات پر نازاں تھے کہ ان کی بیٹی میٹرک سائنس کے مضامین کے ساتھ کرنے جا رہی تھی۔ گورنمنٹ اسکولوں میں پڑھنے والی اکثر بچیاں سائنس پڑھنے سے بھاگتی تھیں۔

سعدیہ کلثوم کا سائنس پڑھنا آپا اور مولوی صاحب کے طغرے میں لگا پہلا پر تھا جو ان کی اولاد نے ان کی نذر کیا تھا۔ آپا رابعہ نے سعدیہ کی کتابیں سمیٹ کر چارپائی اٹھا کر دیوار کے ساتھ کھڑی کی۔ کتابیں رکھنے کے لیے جب وہ کمرے میں آئیں سعدیہ کلثوم کمبل اوڑھے میٹھی نیند سو رہی تھی۔

"بے فکری کے زمانے کی نیند بھی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔" آپا رابعہ نے مٹی کے چولہے میں ادھ گیلی لکڑیاں اور اپلے سلگاتے ہوئے سوچا۔ پھونکنی سے پھونکیں مارتے ہوئے جو پانی ان کی آنکھوں میں اترا تھا' وہ دھوئیں کے باعث تھا یا کسی سوچ کی وجہ سے.....وہ خود بھی قیاس نہ کر سکی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو' کیسی ہو؟" نادیہ نے بہت دنوں بعد اسے آن لائن دیکھا تھا' اس کا دل ایک دم خوش ہو گیا۔

"ارے واہ' یہ تم ہو!" نادیہ کی انگلیاں کی بورڈ پر متحرک ہوئیں۔ "مجھے یقین نہیں آرہا۔"

"تمہاری ہمیشہ سے یہ ہی عادت رہی ہے' تمہیں نظر کے سامنے موجود چیزوں پر بھی یقین نہیں آتا۔" نادیہ کے سامنے اسکرین پر الفاظ ابھرے۔

"کوئی بے یقینی سی بے یقینی ہے۔" نادیہ نے لکھا۔ "اور سناؤ ہینڈسم! کیسے ہو؟"

"میں تو بڑا بیوٹی فل ہوں۔" اس نے وہ جملہ لکھا' جو ہمیشہ حال پوچھنے پر اس کی طرف سے سننے کو ملتا تھا۔

"اب تک تو تمہیں کسی بیوٹی کانٹیسٹ میں شرکت کرلینی چاہیے تھی۔" نادیہ نے لکھا۔

"اوہو! نہیں نا___ میں اپنی بیوٹی کی تشہیر کا قائل نہیں۔" جواب آیا۔ "تم بتاؤ' کیسی ہو ایلس! اور کیسا ہے تمہارا ونڈر لینڈ؟"

"ارے تمہیں پتا نہیں چلا؟ میں تو کب کی ونڈر لینڈ سے نکالی جا چکی ہوں۔" نادیہ نے کہا۔ "میرے پاس تو اب صرف ایک لیڈی برڈ اور ایک جھینگے کے ٹوٹے ہوئے پر باقی رہ گئے ہیں۔"

"تم غلط کہہ رہی ہو۔" جواب آیا۔ "انسان کبھی بھی اپنے ونڈر لینڈ سے باہر نہیں نکل پاتا۔ یہ ہی تو اس کی اکلوتی عیاشی رہ جاتی ہے۔ تم کسی وقت غور کرنا' تمہارا ونڈر لینڈ بھی تمہارے ارد گرد ہی موجود ہوگا۔"

"اچھا نا۔ یہ بتاؤ' کیسے ہو اور آج کل کیا ہو رہا ہے۔" نادیہ نے بات بدلی۔

"آج کل والد محترم کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ چکی پیس رہا ہوں' مشق ستم کے نتیجے میں۔"

"اُفوہ! تم کبھی سنجیدہ نہیں ہوتے۔" نادیہ نے جملے کے آخر میں غصے والی شکل بنائی۔

"یار! میرا خیال تھا تم بین السطور پڑھنے کی ماہر ہو' میری بات سمجھ جاؤ گی۔ غصہ کیوں ہوتی ہو۔ بات یہ ہے کہ میں آج کل رائل البرٹ ہال میں پیانو بجا کر دکھانے کی مشق کر رہا ہوں۔" جواب کے آخر میں شرارت بھری شکل بنی ہوئی تھی۔

"جاؤ میں تم سے نہیں بولتی۔" نادیہ بالکل ناراض ہو گئی۔

"ارے نہیں نہیں' ناراض مت ہو میری گڑیا!" پیار بھرا جواب آیا۔ "ڈیڈی کے کام سے پشاور آیا ہوں۔ ایک ہمارے مہربان ہیں مسٹر البرٹ جان' وہ آج کل مجھے سبق پڑھا رہے ہیں کہ ملک کا کون سا بارڈر کون سی بر آمد اور کیسی درآمد کے لیے موزوں ہے۔ میں سبق پڑھ کر کئی بار سنا بھی چکا مگر چھٹی نہیں مل رہی جیسا کہ روایت ہے۔"

"ہاہا' اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا۔" نادیہ کو شرافت کی سکھائی یہ بات یاد آ گئی۔ "ویسے تمہارا فرض بنتا ہے کہ تم ڈیڈی کے اشاروں پر چلو' کیوں کہ تم اس لحاظ سے خوش قسمت ہو کہ اپنی اولاد میں سے صرف تم ہی کو انہوں نے اپنے دست شفقت کا مستحق جانا۔"

"ہاں بھئی یہ تو ہے۔" "فوراً" ہی اعتراف سامنے آیا۔

"اچھا اب تم بتاؤ' کیسی ہو؟" اس کے بعد ایک سوال سامنے آیا۔

"میں ٹھیک ہوں' زندگی ویسی ہی ہے جیسی میں نے تمہیں پچھلی میل میں بتائی تھی۔ مجھے سردی سے وحشت ہوتی تھی۔ اللہ نے مجھے برف پوش علاقوں میں رکھا ہمیشہ۔ یہاں بھی آج کل برف کے نظارے کرتی زندگی گزار رہی ہوں۔ یوتھ ہاسٹل کی زندگی بہت اکتا دینے والی ہے۔ میں انتظار کر رہی ہوں کب میرے کورسز مکمل ہوں اور کب میں اپنی اگلی منزل کی طرف سفر اختیار کروں۔"

"اگلی منزل کیا ہے تمہاری؟" سوال سامنے آیا۔

"تمہارا وہ گھر' جس میں' میں تمہاری بیوی کی نند بن کر خوب حکم چلا سکوں۔ اس کی جان آفت میں لے آؤں جس کے نتیجے میں وہ آئے دن ناراض ہو کر بچوں سمیت میکے چلی جایا کرے۔" نادیہ نے جواب کے اختتام میں قہقہے لگاتا چہرہ بنایا۔

"فکر نہ کرو' میں ایسی لڑکی سے شادی کروں گا جو بچے لے کر نہیں' چھوڑ کر جایا کرے گی پھوپھی جان!" اس جواب کے آخر میں شرارت بھرا چہرہ منہ چڑا رہا تھا۔

"ایسی صورت میں بچے تم سنبھالو گے ابا جان!" نادیہ نے بھی چڑانے کی کوشش کی مگر اس کی اس بات کا جواب نہیں آیا۔ وہ آف لائن ہو چکا تھا۔ نادیہ کچھ دیر اس گفتگو سے محظوظ ہوتی یونہی بیٹھی سامنے رکھی اسکرین کو گھورتی رہی اور پھر اٹھ کر اپنے لیے کافی بنانے چل دی۔

اس روز وہ دن کے اختتام تک ایک عجیب سی خوشی کے احساس میں سرشار رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کسی کو فنکاری اور فنکار کا اصل روپ دیکھنا ہے تو پردے کے پیچھے جھانکے۔ پردے پر تو سب تصنع ہے۔ پردے کے پیچھے ہانپتے ہوئے' اکتائے ہوئے چہروں پر پسینے کے قطرے سجائے' اپنی باری کے منتظر فنکار ادھر ادھر بیٹھے' کہیں لیٹے ہوئے' کبھی پردے کے جوڑ سے آنکھیں ٹکائے نظر آئیں گے' پھر پتا چلے گا کہ اصل چہرہ کیا ہوتا ہے۔"

وہ سامنے دیوار پر لگے کلاک کی سیکنڈ والی سوئی کے ساتھ ساتھ آنکھیں گھما رہی تھی اور آوازیں بازگشت کی

صورت اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

"رسی پر چلنے کا کرتب' چھ انچی بار پر پاؤں کی انگلیوں کے بل کھڑے ہونا اور گھوم کر ہوا میں قلابازیاں کھاتے ہوئے واپس اسی پوزیشن میں پنجوں کے بل بار پر آ کر ٹک جانا۔۔۔ تماشائی مبہوت ہو جاتے ہیں۔ ان کی آنکھیں فنکار کی جنبش کے ساتھ ساتھ حرکت کرتی ہیں۔ ان کا اوپر کا سانس اوپر' نیچے کا نیچے رہ جاتا ہے۔۔۔ دم بخود اور جب تماشا ختم ہوتا ہے تو وہ خوشی کے عالم میں تالیاں پیٹتے ہیں' سیٹیاں بجاتے ہیں' نعرے لگاتے ہیں۔ کبھی کسی تماشائی نے اس فنکار کے دل پر گزرنے والی کیفیت کو سوچا ہے' جو تماشا دکھانے کے بعد ابھی ابھی رنگ سے باہر نکلا ہے۔ ایک جنبش غلط' انگلی کا فرق' آنکھ کا ذرا سا چوک جانا' ذہن کا لمحہ بھر کو بھٹک جانا۔۔۔ اسے کیسے حادثے سے دوچار کرا سکتا ہے' وہ تماشا نہیں دکھاتا' موت کے منہ میں خود کو ڈال دیتا ہے' کبھی کسی نے اس بات پر غور کیا؟"

گھڑی کی سوئی تین منٹ اور آگے کھسک گئی۔

"تماشائیوں کے لیے فنکار ربر کا گڈا ہے' جس کو چابی دے دو تو وہ ایک میکنزم کے تحت وہ سب کرتا ہے' جو ان کو چند لمحوں کی تفریح مہیا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ ایک کے بعد دوسرے' تیسرے' پھر چھٹے اور پھر دسویں تماشے میں وہی فنکار نئی موت کے منہ میں خود کو ڈالنے کے لیے پردے کے آگے ظاہر اور غائب ہوتا رہتا ہے اور اس کے دماغ میں جو کیڑا چھپ کر بیٹھا ہوتا ہے' وہ ایک ہی نعرہ لگاتا ہے' ہلاشیری دیتا ہے اور بار بار رنگ میں داخل کرواتا ہے۔

Earn some more money to night

"آج کی رات پہلے سے کچھ زیادہ پیسے کمالو۔"

یہ نعرہ فنکار میں ہر بار موت سے بچ آنے کے بعد نئی روح پھونکتا ہے اور وہ خم ٹھونک کر دوبارہ ایک نئے روپ میں رنگ میں داخل ہو جاتا ہے۔ کبھی تاروں پر چلتا ہے' کبھی شیروں اور کتوں کے ساتھ مت نئے تماشے کرتا ہے۔ کبھی ہاتھیوں پر سوار ہو کر ہواؤں میں اچھلتا ہے' کبھی کیلوں اور سوئیوں کے بستر پر لیٹتا ہے اور کبھی صندوق یا الماری میں بند ہوتا ہے۔۔۔ یہی فنکار منہ سے آگ کے گولے نکالنے کا کرتب بھی کرتا ہے اور موت کے کنویں میں گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں بھی چلاتا ہے۔"

Just to earn some more money

کلاک کی سوئیاں پانچ منٹ اور آگے کھسکیں اور گھنٹہ مکمل ہونے پر سیدھی ٹک گئیں' کلاک کے اوپری حصے میں بنے ریک کا دروازہ کھلا اور نیلے رنگ کا پرندہ پھدک کر باہر نکلا' وہ لفظوں میں اعلان کر رہا تھا وقت کیا ہوا ہے۔

"وقت!" سارہ خان نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "جو کبھی تو گزرنے میں ہی نہیں آتا اور کبھی یوں گزرتا ہے کہ پتا تک نہیں چلتا۔۔۔ اور اس کے گزر جانے کے بعد انسان اس کے چھوڑے ہوئے خس و خاشاک چنتا رہ جاتا ہے۔"

نیلا پرندہ اپنا فرض پورا کر کے واپس اپنے ڈبے میں بند ہو چکا تھا۔ گھڑی کی سیکنڈ والی سوئی اپنی دھن میں ہلکی سی ٹک ٹک کے ساتھ چلتی جا رہی تھی۔ گھڑی کی یہ سوئی ان تھک چلتی تھی۔ اور کمرے میں اپنی صوت کی صورت زندگی کی ایک علامت تھی۔

"تم بہت عجیب ہو۔" اس آخری سوچ پر سارہ کو سعد کی کہی بات یاد آئی۔ "کیوں یوں بے بسی سے پڑی سوچوں میں گم رہتی ہو یا کمرے کے کونے کھدروں میں موجود چیزوں کے تجزیے کرتی رہتی ہو۔ تمہارے پاس ٹی وی ہے' آئی پوڈ ہے' کمپیوٹر ہے' وائی فائی ڈیوائس موجود ہے' کیوں تم ان میں مصروف نہیں ہو جاتیں۔ ان چیزوں کے ذریعے تم دنیا میں دریافت کر سکتی ہو' چیزوں کی کھوج لگا سکتی ہو۔ سارہ خان! دنیا بہت دلچسپ ہے۔ کیوں وقت ضائع

کررہی ہو کیوں زندگی کی ناقدری کررہی ہو۔"

سارہ نے ایک بار پھر بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کمرے کی بائیں دیوار میں جڑی کھڑکی کے پٹ کھلے تھے اور وہ بیڈ پر لیٹے لیٹے اس کھڑکی کے پار نظر آنے والے پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں کو ہی دیکھ پاتی تھی۔ سارہ نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ بیڈ پر بچھی چادر کو اپنی گرفت میں جکڑ رہے ہیں۔ چادر کے بارڈرز اکٹھے ہو کر دائیں بائیں ہاتھوں کی گرفت میں آ گئے تھے اسی گرفت کو سہارا بنا کر اس نے اٹھنے کے لیے زور لگایا۔

دوبار ناکام رہنے کے بعد وہ خود کو اٹھا کر بٹھانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا' اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے کسی بلند پہاڑ کی چوٹی سر کرلی ہو۔ بیڈ سے تین انچ کے فاصلے پر کرسی رکھی تھی۔ اس نے جسم پر پڑی چادر سمیت اپنی ٹانگیں بیڈ سے بائیں طرف لٹکانے کی کوشش کی۔ بیڈ پر بچھی چادر اس کوشش میں اس کے جسم کے نیچے اکٹھی ہو گئی تھی۔ جس وقت وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوئی کلاک کی سوئیوں نے اگلا نصف گھنٹہ بھی مکمل کرلیا تھا۔ نیلا پرندہ پھدک کر باہر آیا اور وقت کا اعلان کرنے لگا۔

سارہ نے سر اٹھا کر نیلے پرندے کو دیکھا اور بے اختیار مسکرا دی۔ وہ کچھ حاصل کرلینے کی مسرت کے عالم میں تھی۔ اگلے نصف گھنٹے کے اندر وہ کرسی کھینچ کر اپنے قریب کرلینے اور اس پر بیٹھ جانے کی منزل پا چکی تھی۔ سارہ کو محسوس ہوا اس بار نیلا پرندہ خود بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔

"مبارک ہو' وقت کے ساتھ ساتھ تم بھی آگے بڑھ رہی ہو۔" سارہ نے محسوس کیا۔ اس کے اندر کہیں سے جوش اٹھ رہا ہو۔

اسے اپنا چہرہ بھی تمتماتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے بے اختیار اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا' اسے لگا اس کے چہرے پر نمی تھی۔ اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کھڑکی کی طرف دیکھا اور زور لگا کر کرسی کو آگے گھسیٹا' اس کے کمزور جسم میں اتنا زور لگانے کی ہمت نہیں تھی' اس کے منہ سے بے اختیار یسی آنٹی کے لیے مدد کی پکار نکلنے ہی والی تھی مگر اس نے اس پکار کو کنٹرول کرتے ہوئے اپنے گلے میں ہی دبا دیا۔

وہ ایک بلکہ ایک سے زیادہ دفعہ کوشش کرنا چاہتی تھی۔ اگلی بار جب نیلا پرندہ گھنٹے کا اعلان کرنے باہر نکلا۔ سارہ خان نے اپنی کوشش میں ناکامی کا اعتراف کرتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ نیلا پرندہ شاید اس اعتراف پر دکھی ہو گیا۔ سارہ کو لگا جیسے وہ سر جھکا کر مایوس انداز میں واپس اپنے ڈبے میں بند ہو گیا تھا۔ اس نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا' اس کی نظر میز پر رکھے سیل فون پر پڑی' جسے استعمال کرنے کی ضرورت اسے شاذ ہی پڑتی تھی۔ سیل فون پر نظر پڑتے ہی نجانے کیوں اور کیسے اس کے کانوں میں کئی بار سنی ہوئی آواز میں ابھرتے الفاظ گونجنے لگے۔

if you ever find yourself stuck in the middle of the sea.....

سارہ نے موسیقی کی لہروں پر ابھرتے ان الفاظ کو محسوس کیا اور پھر اس کے دل نے گنا۔۔۔ ایک' دو' تین' تین بار گھنٹی بجنے کے بعد دوسری طرف سے اس کی پکار وصول کرلی گئی۔

"سنو! تم جہاں بھی ہو فوراً" چلے آؤ' میں چاہتی ہوں تم دیکھو' میں اس وقت کہاں موجود ہوں اور میرا دل کہاں پہنچنا چاہتا ہے۔"

سارہ کے کانوں نے خود اس کے اپنے منہ سے نکلنے والے لفظوں کو سنا اور اپنی حس سماعت پر یقیناً" حیران ہوئے جبکہ اس کا دل گنتی گن رہا تھا' ایک' دو' تین۔۔۔ اس کے دل کو پتا تھا کہ اس سے آگے کے ہندسے گننے کی اسے ضرورت نہیں پڑے گی۔

☆ ☆ ☆

"وہ جو تم نے تین چار پینٹنگز بنا رکھی ہیں' چار کول میں ان کو کسی نمائش میں کیوں نہیں رکھتیں۔"

شاہ بانو نے اسے ایں روز یاد دلایا تھا' جب وہ اس خیال سے جھوم رہی تھی کہ وہ سید پور گاؤں کے لوک میلے میں شرکت کرنے جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں شاہ بانو کا دیا کارڈ تھا' جس پر نقرئی حروف میں میلے کا پروگرام درج تھا۔

"ارے یار!" ماہ نور نے ایسے سر جھٹکا جیسے شاہ بانو نے کوئی انوکھی بات کہہ دی ہو۔

"کیوں بھئی۔ کیا ہوا؟" شاہ بانو نے حیران ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"میں کون سی کوئی جانی پہچانی مصورہ ہوں۔" ماہ نور نے بے چارگی کا مظاہرہ کیا۔ "تین چار پینٹنگز کی سولو ایگزیبشن ہو نہیں سکتی اور گروپ ایگزیبشن میں ایک گمنام مصورہ کی کاوشیں کون رکھے گا؟"

"یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں۔ عبید بھائی نومیڈ آرٹ گیلری کی سید پور برانچ میں بھی اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ وہ بتا رہے تھے کہ سید پور میلے کے دنوں میں نو آموز مصوروں کی پینٹنگز کی نمائش بھی کی جائے گی' اس طرح کے گروپ ایونٹ میں عبید بھائی تمہیں اسپانسر کر سکتے ہیں۔"

ماہ نور نے بے یقینی سے شاہ بانو کی طرف دیکھا۔ شاہ بانو نے سر ہلا کر اسے اپنی بات کا یقین دلانے کی کوشش کی۔

"مگر وہ تو یونہی سی ہیں۔ ایک آدھے چہرے کی لڑکی' ایک درخت کے تنے پر شاخوں کے بجائے انسانی چہرہ' ایک sillhoule (روشنی کے عکس میں ہاتھوں سے بنائی شبیہہ) اور ایک بند دروازہ۔ ان پینٹنگز میں کچھ بھی تو خاص بات نہیں ہے۔ تمہارے عبید بھائی انہیں دیکھ کر کبھی اسپانسر نہیں کریں گے۔" ماہ نور نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں کریں گے؟" شاہ بانو نے سوال کیا۔ "بھئی ایسی نمائشوں کا تو مقصد ہی نئے ٹیلنٹ کو سامنے لانا ہے۔"

ماہ نور خاموش رہی۔

"بس طے ہو گیا۔" شاہ بانو نے جیسے فیصلہ دیتے ہوئے کہا۔ "ہمارے ساتھ تمہاری پینٹنگز بھی اسلام آباد جائیں گی۔"

ماہ نور کا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا' لیکن اس نے خوشی کا یہ درجہ شاہ بانو پر ظاہر نہیں ہونے دیا اور بے نیازی سے ہاتھ میں پکڑا کارڈ پڑھنے میں مشغول ہو گئی۔ اس کی عمر ایسی تھی کہ اسے کارڈ پر لفظوں کے بجائے اپنا مستقبل نظر آنے لگا تھا۔ وہ خود کو مستقبل کی ایک نامور مصورہ کے روپ میں دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

خدیجہ نے چیزوں سے لدی ٹرالی آگے کھسکائی اور کاؤنٹر پر بل بنوانے لگیں۔ سلور گرے بالوں کا جوڑا باندھے' سادے شلوار سوٹ پر پرنٹڈ دوپٹا اوڑھے' پاؤں میں اعلا برانڈ کی چپل پہنے اپنی سرخ و سفید رنگت کے ساتھ وہ اپنی عمر کے مطابق انتہائی گریس فل خاتون نظر آ رہی تھیں۔ کاؤنٹر پر بیٹھے اس بڑے اسٹور کے وردی پوش لڑکے نے کمپیوٹرائزڈ بل ان کے ہاتھ میں تھمایا۔ خدیجہ نے گلے میں پڑی سنہری زنجیر کے ساتھ لٹکتا سنہری فریم کا نازک سا چشمہ آنکھوں سے لگایا اور بل کی تفصیلات پڑھنے لگیں۔ بل کے مندرجات پڑھتے ہوئے وہ کئی چیزوں کی قیمتوں پر اٹکیں اور کاؤنٹر والے لڑکے سے تصدیق کی کہ واقعی اس چیز کی قیمت وہی تھی' جو بل پر لکھی تھی۔

"میم! یہ انسانی کام ہے ہی نہیں' مشین سے نکلا ہوا بل ہے۔ غلطی کی گنجائش ہی نہیں ہے۔" لڑکے نے انتہائی مؤدب انداز میں پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"اسی طرح کی لش پش کے ذریعے ہی تو تم لوگ ہمارے منہ بند کر دیتے ہو۔" خدیجہ نے ہنس کر کہا۔ "ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ ہر چیز کی قیمت پر بحث ہوتی تھی اور کچھ پیسے تو ہر صورت کم کرا ہی لیے جاتے تھے' اب تم لوگ قیمتوں کے اسٹیکرز اس لیے چیزوں پر چپکا دیتے ہو کہ کوئی بولے نہ بات کرے۔"

"ارے نہیں نہیں میم!" لڑکے نے فوراً" ان کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔

"یہ اسٹیکرز اس لیے لگائے جاتے ہیں کہ ایک ہی چیز کے مختلف برانڈز کی قیمتیں چیک کرنے کے بعد کسٹمر اپنی رینج کے حساب سے چیز خرید سکے۔"

"واہ کیا منطق ڈھونڈی ہے۔" خدیجہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میرے جیسے کسٹمرز جو ہمیشہ سے ایک ہی کمپنی کی چیز خریدنے کے عادی ہوں' ان کے تو کسی کام کی نہیں یہ کسٹمر ہیلپ۔"

"اوہو میم! اب تو برانڈ رینج اتنی وسیع ہو چکی ہے کہ کسٹمر کو چوز (انتخاب) کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔" لڑکے نے مسکرا کر کہا۔

"ارے چھوڑو میاں! برانڈز وغیرہ کو۔ ہم تو سیدھے سادے لوگ ہیں' عمروں سے برتی چیزوں کے معیاری ہونے کا بھروسا کیے ہوئے۔" خدیجہ نے کاؤنٹر پر رکھے شاپرز اٹھاتے ہوئے کہا۔

"آپ ہمیشہ بات ایسے کرتی ہیں جیسے سدا کی گھریلو عورت ہوں۔ جسے مرچ مسالے سے آگے کچھ پتا نہ ہو۔ میم! آپ شہر کے اتنے بڑے اور اتنے پرانے کالج کے ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کی ہیڈ تھیں جب آپ نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لی۔" اسٹور کا مالک جو خدیجہ کی لین کا پرانا رہائشی تھا' نجانے کب سے خدیجہ اور کاؤنٹر پر بیٹھے لڑکے کی نوک جھونک سن رہا تھا' آگے بڑھ کر اس گفتگو میں کود پڑا۔

خدیجہ قہقہہ لگا کر ہنس دیں۔ "عورت کچھ بھی بن جائے شہاب صاحب! مرچ مسالے سے اسے سدا ہی پیار رہتا ہے۔"

"نہیں نہیں۔" شہاب صاحب نے سر ہلا کر کہا۔ "ہم نے ایسی خواتین بھی دیکھی ہیں جو خاصی مردانہ زندگی گزارتی ہیں۔ نسائی سوچ سے جن کا دور دور تک بھی واسطہ نظر نہیں آتا۔"

"وہ نجانے کون ہوں گی۔" خدیجہ شاپر اٹھائے بیرونی دروازے کی طرف چل دیں۔

"ہم تو ایسے نہ ہو سکے عمر بھر۔" اسٹور سے باہر نکل کر انہوں نے سامان پارکنگ میں کھڑی گاڑی میں رکھا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئیں۔

"گاڑیوں کا تو مانو دریا چل رہا ہے سڑکوں پر رنگ برنگ۔" سروس روڈ سے مین لین میں گاڑی موڑتے ہوئے وہ سوچ رہی تھیں۔ یہ شہر کی ایک معروف' بڑی اور مصروف شاہراہ تھی' جس کے دونوں جانب اونچی اونچی عمارتیں استادہ تھیں۔ ان عمارتوں کی پیشانیوں پر خوشنما بورڈز ٹنگے تھے۔ جدید شاپنگ مالز' فارمیسیز' بک اسٹورز' آرٹ گیلریز' شو اسٹورز' ڈرگ ہاؤسز' کافی شاپس' کیفے' ریسٹورنٹس۔ ان کے راستے میں ہر طرح کی عمارتیں تھیں۔ سڑک پر ٹریفک انتہائی منظم طریقے سے رواں دواں تھا۔

دو رویہ کشادہ سڑک کے درمیان پھولوں کے تختے تاحد نظر اپنی خوشنما بہار دکھلا رہے تھے۔ فٹ پاتھ اور سروس روڈز پر اکثر پیدل چلنے والے ادھر ادھر دھیان کیے بغیر تیزی سے چل رہے تھے۔ ہر ایک جیسے جلدی میں تھا۔ ان میں زیادہ تعداد طالب علموں کی تھی۔ خدیجہ یہ منظر دیکھ کر مسکرا دیں۔

"اسی سڑک کے مختلف سالوں میں کتنے مختلف منظر دیکھ رکھے ہیں ان آنکھوں نے۔ بچپن سے لے کر اب تک کتنے دور گزرے' کیسے حالات بدلے' کتنے منظر بدلے' کتنے لوگ زندگی میں آئے اور چلے گئے۔ نہیں بدلی تو

یہ سڑک نہیں بدلی' اسی طرح سکون سے اپنا سینہ کشادہ کیے کب سے لیٹی ہے۔ فرق آیا تو صرف اتنا کہ پہلے اس کو مال روڈ کہا جاتا تھا' اب کچھ لوگ اسے شاہراہ قائداعظم بھی کہہ لیتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

ابراہیم کے لیے کبھی بھی سعد کے مزاج کو سمجھنا آسان کام ثابت نہیں ہوا تھا۔ سعد اس کا ملے گروپ کلاس سے لے کر ایم بی اے تک کا کلاس فیلو رہا تھا۔ وہ بچپن سے ہم پیالہ و ہم نوالہ قسم کے دوست تھے مگر اس پورے عرصے میں بہت زیادہ ذہنی ہم آہنگی کے باوجود ابراہیم کے ساتھ کئی بار ایسا ہوا کہ سعد کے منٹوں میں بدلتے مزاج نے اسے چونکا دیا۔

ایسا بھی کئی بار ہوا کہ سعد کے بدلتے مزاج کی وجہ سے ابراہیم بدمزا ہو گیا مگر اس کے دل میں سعد کے لیے اتنا پیار اور اس کے ساتھ تعلق کی انتہا کا احساس اتنا زیادہ تھا کہ وہ سعد کو کبھی یہ احساس نہ دلا سکا تھا کہ کبھی کبھار وہ اس کے رویے کی وجہ سے خفگی بھی محسوس کرتا تھا اور ایسا ہی ان دنوں بھی ہو رہا تھا' جب سعد اسے اپنے ساتھ ایسی جگہوں پر لے جاتا تھا' جہاں جا کر ابراہیم کا دل متلانے لگتا تھا اور دماغ بھنا تا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا آخر تم کس چیز کی تلاش میں ہو۔" ایک روز ابراہیم نے یہ سوال سعد سے کر ہی دیا تھا۔

جواب میں سعد نے اپنی مخصوص مسکراہٹ پھینک کر شاید اسے ٹالنے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں! آج تمہیں بتانا ہی ہوگا۔" ابراہیم نے ضدی انداز میں کہا۔

"کیوں تمہاری روح اتنی بے قرار ہے کہ کسی طرح قرار ہی نہیں پاتی۔"

یہ الفاظ ابراہیم نے بے دھیانی میں کہے تھے مگر کرسی پر جھولتا سعد ایک دم چونک کر سیدھا ہو گیا تھا۔

"تم سے کس نے کہا میری روح بے قرار ہے؟" سعد نے اس سے سوال کیا تھا۔

"کہنا کس نے ہے۔" ابراہیم نے جمائی روکتے ہوئے کہا۔ "جو تم کرتے پھرتے ہو' اس کا میرے علاوہ کوئی عینی گواہ ہے ہی نہیں' اس لیے مجھے خود سے یہ خیال آیا ہے۔"

"یہ بتاؤ۔" سعد نے ابراہیم کی آنکھوں میں براہ راست دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تمہیں کیا لگتا ہے' میں جنونی ہوں؟"

"خیر! ایسی بات تو میرے ذہن میں کبھی نہیں آئی تمہارے لیے۔" ابراہیم کو دوپہر کے کھانے کے بعد نیند سی آنے لگی تھی۔

"پھر تم نے یہ بات کیوں کی؟" سعد کے سوالات شروع ہو گئے تھے اور ابراہیم جانتا تھا کہ جب تک وہ اس کے سوالوں کا تسلی بخش جواب نہیں دے گا' وہ اس کی جان نہیں چھوڑے گا۔

"یار! بات یہ ہے۔" ابراہیم نے ذہن پر چھاتی نیند کو جھٹک کر سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اگر تمہارے ذہن میں مذہب کے بارے میں سوال کلبلاتے ہیں تو کسی اسکالر کے پاس جاؤ' کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے تو کسی سائیکاٹرسٹ سے مشورہ کرو۔۔۔ کوئی فزیکل بیماری ہے تو ڈاکٹرز بہت۔۔۔ تم کن چکروں میں پڑے ہو یار! جوگی' سادھو' درویش' پیر اور ان کے مرید۔۔۔ یہ تمہارے مسئلوں کا تمہارے سوالوں کا کیا جواب دیں گے۔ کوئی تمہاری پشت پر ہاتھ پھیر کر "سب اچھا ہوگا" کی نوید دیتا ہے' کوئی چٹکی بھر نمک چٹا دیتا ہے' جاؤ بچہ! راستی ملے گی' کوئی ہینڈ پمپ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس کو چلا کر جتنا پانی پی سکتے ہو پی لو' روح سکون پا جائے گی۔۔۔ میں سمجھنے سے قاصر ہوں تم

یوں خوار کیوں ہو رہے ہو۔۔۔ اسی سے میں نے اندازہ لگایا کہ تم اندر سے بے قرار ہو۔"

"اوہ!" سعد نے سر جھٹک کر جھکایا اور پھر سر اٹھا کر ابراہیم کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" ابراہیم نے سوال کیا۔

"یار! تو میرا اتنا بڑا رازدان ہے اور مجھے اتنا جانتا ہے کہ شاید ہی میری کوئی بات تجھ سے چھپی رہ گئی ہو تو میں پریشان ہو گیا تھا کہ تو کہہ رہا ہے تو یقیناً "میرے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔"

"تو کیا تیرے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے؟" ابراہیم نے ہونقوں کی طرح سوال کیا۔

"میرا یہ مسئلہ کیا کم ہے کہ تو میرا اتنا جگری دوست ہے' مجھے تجھ سے زیادہ کوئی جانتا نہیں' پھر بھی میرے بارے میں اتنے غلط اندازے لگاتا ہے۔ میرے ڈیڈی ٹھیک کہتے ہیں۔ ابراہیم کباب کھانے والے پہلوانوں کی اولاد ہے' اسی لیے اس کے دماغ پر بھی کبابوں کی چربی چڑھ چکی ہے۔" سعد نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"بکواس نہ کر۔" ابراہیم نے برا مناتے ہوئے کہا۔ "وہ تو مجھے جم کھولنے کی وجہ سے کہتے ہیں ابا۔"

"میرے پاس تیرے لیے بڑے انقلابی آئیڈیاز ہیں۔" سعد نے اس کا بگڑا موڈ ٹھیک کرنے کی خاطر کہا۔

"کیا آئیڈیاز ہیں؟" ابراہیم بھی پچھلی بات بھلا کر متوجہ ہوا۔

"تو ایسا کر' ایک ماڈرن اکھاڑہ بنا۔ ایک ایسا ایریا جس میں دیسی کشتیوں کو ایک نئے رنگ سے پروموٹ کیا جائے' پہلوانوں کی نیلامی ہو' جو سب سے اچھے پہلوان پر زیادہ بولی لگائے' وہی اس پہلوان کو اپنا کہنے کا حق دار ہو' پھر اس ایونٹ کی اتنی تشہیر کی جائے کہ بڑے بڑے ملینیئرز کی آدھی سے زیادہ بلیک منی اس میں انوالو ہو جائے۔۔۔ پہلوانوں کے وہ جو ہوتے ہیں' کیا کہتے ہیں ان کو۔۔۔" سعد نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔

"ہاں جانگیے بلکہ کچھے' وہ بڑے ڈیزائنرز سے ڈیزائن کروائے جائیں اور جو پہلوان جس اسٹیک ہولڈر کا پٹھا ہو اسی کا پسندیدہ کچھا پہنے۔۔۔ کیسا!" سعد نے پرجوش انداز میں ابراہیم کی طرف دیکھا۔ ابراہیم بہت بیٹھا اس کی بات اتنی توجہ سے سن رہا تھا کہ شاید اس ساری تفصیلات کو اپنی آنکھوں کے سامنے حقیقت کا منظر بنے فلم کی طرح چلتا دیکھ رہا تھا۔

"ہوں!" ابراہیم نے چونک کر سعد کی طرف دیکھا۔ "جانے دے یار!" وہ جیسے ہوش میں آ کر اس آئیڈیا کو ناممکن قرار دیتے ہوئے صوفے پر دراز ہو گیا۔ "تو جو مرضی کرے' رہے گا بزنس مین کی اولاد۔ ہر جگہ' ہر کام میں' ہر آئیڈیا میں پیسہ انوالو کرنے والا بزنس مین۔۔۔ دو جمع دو چار بتانے والا۔۔۔ بارٹر سسٹم شروع کرنے والوں کا سپوت۔"

"اچھا!" سعد نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "ڈیڈی کو ضرور بتانا یہ بات۔۔۔ یار! کبھی کبھار ان کا دل مجھ سے راضی ہونا چاہیے۔"

"تو اس معاملے میں ان کی کاپی ہے پہلے ہی۔" ابراہیم نے نیند سے بند ہوتی آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔ "لائیک فادر لائیک سن۔"

سعد کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ اس کے سیل فون پر میسج کی ٹون بج اٹھی۔ ابراہیم نے ایک بار پھر موندی آنکھیں کھولیں اور اسے لگا کہ سعد آنے والا پیغام پڑھ کر بہت خوش اور پرجوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے سیل فون جیب میں ڈالتے ہوئے اٹھ کر ابراہیم کی طرف دیکھا۔

"اچھا جگر! تو سو' تجھے مرغ کڑاہیوں کا خمار چڑھا ہوا ہے' میں چلتا ہوں۔"

"کدھر؟" ابراہیم نے نیند سے بوجھل آواز میں پوچھا۔

"ادھر ہی کہیں۔" سعد ہاتھ ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔

ابراہیم واپس نیند میں جانے لگا اور آنکھوں کے ساتھ ساتھ بند ہوتے دماغ کو ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھنے کے لیے کھولتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ سعد اس کے پوچھے سوال کا جواب نہ دینے کے لیے بات کو کتنی خوبصورتی سے گھما پھرا کر بدل گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے ابراہیم کو اپنی حماقت پر غصہ آیا۔ دوسرے لمحے گہری نیند اس پر مکمل غلبہ پا چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

دروازہ کھلنے پر سارہ نے پہلے کلاک کی طرف دیکھا' وقت چالیس منٹ آگے کھسک چکا تھا' پھر اس نے ڈبڈبائی نظروں سے گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ سعد دروازے کے ساتھ لگا اپنے سامنے کا منظر دیکھ رہا تھا۔

"میں خود... میں نے خود۔" سارہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہنا چاہا۔ اس کی آواز گلے میں ہی گھٹ رہی تھی۔ سعد سرہلاتے ہوئے اس کے قریب آیا۔ "میں نے ادھر..." سارہ نے بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔ "اِدھر سے اُدھر..." پھر اس نے کرسی کے بازو پر ہاتھ رکھا... "میں خود اپنے آپ کو یہاں لائی۔"

اس نے فاتحانہ نظروں سے سعد کی طرف دیکھا' اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"اور میں ادھر جانا چاہتی تھی مگر نہیں..." اس نے نفی میں سرہلایا اور آنسو پینے کی کوشش کرنے لگی۔

"اس سے آگے جانے کے لیے تم نے مجھے پکار لیا۔" سعد نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اور تمہاری پکار پر میں یوں چلا آیا۔" اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا اور کرسی کی پشت تھام لی۔ "کہو تو کرسی سمیت اٹھا کر تمہیں کھڑکی کے قریب بٹھادوں یا کرسی کو آگے دھکیلوں؟"

"بس ذرا سا زور لگانا پڑے گا۔" سارہ نے اپنا بھیگا چہرہ اٹھا کر سعد کو دیکھا اور مسکرا دی۔

"کرسی کے بازو مضبوطی سے تھام لو۔" سعد نے کرسی کی پشت پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر اسے آگے دھکیلا اور یونہی نرمی سے کرسی دھکیلتا کھڑکی کے پاس لے آیا۔ کھڑکی کے پار برف پوش پہاڑ تھے جن پر سہ پہر کی ہلکی دھوپ پڑ رہی تھی۔ چناروں کے اونچے اونچے درخت تھے۔ نیچے جھانکنے پر سارہ کو سڑک نظر آئی' جس پر گاڑیاں اور لوگ رواں دواں تھے۔ آسمان سے پڑتی ہلکی پھوار سے سڑک بھیگ رہی تھی۔ لوگ چھتریاں بلند کیے سڑک کے اطراف بنی دکانوں میں گھستے نکلتے نظر آرہے تھے۔ چند ان ہی دکانوں کے چھجوں تلے کھڑے بارش رُکنے کے منتظر نظر آتے تھے۔

"یہ مجھو لوگ نہیں... زندگی رواں دواں ہے۔" سعد نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی۔ "زندگی... جو جب تک ہے' رُکتی نہیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"میں اُدھر سے اِدھر آنے کے لیے سیمی آنٹی سے بھی کہہ سکتی تھی۔" سارہ نے سر اٹھا کر کہا۔ "لیکن میں چاہتی تھی کہ میری اس کوشش کو سب سے پہلے صرف تم دیکھو۔" اس کے لہجے میں بچوں کی سی خوشی تھی۔

"آئی ایم آنرڈ۔" سعد نے اپنی شرٹ کے کالر کھڑے کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"کیا خیال ہے اس کوشش کو دیکھتے ہوئے ایک عدد وہیل چیئر نہ لے آئیں؟" اس شام رخصت ہوتے ہوئے سعد نے اچانک سارہ سے پوچھا۔ وہ ایک دم خاموش ہوگئی۔

"چلو ہم نہیں چاہتیں تو نہ سہی۔" سعد نے فوراً "یہ تجویز خود ہی مسترد کردی۔

"ایسی چیزوں کو دیکھ کر معذوری کا خیال بڑھنے لگتا ہے۔" سارہ نے نیچی آواز میں کہا۔

"اِٹس اوکے۔" سعد نے شانے اچکائے اور جانے کے لیے دروازہ کھولا۔

"آئی ایم سوری سعد!" سارہ نے پیچھے سے کہا۔

"نیور مائنڈ۔" وہ ادھ کھلے دروازے پر ہاتھ رکھ کر مسکرا کر بولا۔ "اللہ حافظ!"

سارہ نے اس کے پیچھے بند ہوتے دروازے کو دیکھا اور پھر اپنے آپ پر نظر ڈالی۔

سعد کے اصرار پر سیمی آنٹی نے اس کے کپڑے بدلوائے تھے اور بال برش کرکے سمیٹے تھے۔ اس کے بیڈ پر نئی چادر بچھی تھی اور سرہانوں کے غلاف بھی نئے تھے۔ اس نے بہت دنوں بعد سکون سے تکیے پر سر رکھا تھا۔ اس رات اسے لگا' زندگی باہیں کھولے اسے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ زندگی مسکرا بھی رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ع کو حلق سے نکالو یار محمد! یہ اردو کا عین نہیں عربی کا عین ہے۔"

مولوی سراج سرفراز نے زور زور سے ہل ہل کر قرآن پاک کا سبق یاد کرتے بچوں میں سے ایک کو چھڑی کی نوک چھبو کر ٹوکتے ہوئے کہا' تب ہی ان کی نظر کمرے میں لگی دیوار گیر گھڑی پر پڑی' بچوں کا پڑھنے کا وقت ختم ہونے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ اس روز مولوی صاحب کو اپنا جسم گرم اور دکھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ انہوں نے موٹی چادر اپنے ارد گرد لپٹی اور ہاتھوں کو سردی کی شدت سے بچانے کے لیے ہاتھ بھی چادر کے اندر کرلیے۔

صبح فجر کی اذان دینے سے پہلے جب وہ مسجد میں آکر صحن میں لگی ٹونٹیوں میں سے ایک کو کھول کر برف جیسے ٹھنڈے پانی کی دھار کے نیچے وضو کر رہے تھے تو بری طرح کپکپا رہے تھے۔ پانی جیسے ان کے ہاتھوں' پاؤں اور چہرے کو کاٹ رہا تھا' مگر وہ دل ہی دل میں خود سے گفتگو کرکے اپنا ایمان مضبوط کر رہے تھے۔

"مومن کا ایمان سردی' گرمی کی فکر میں نہیں پڑتا' نہ اسے دھوپ کی تپش کا احساس ہوتا ہے' نہ کہرے کی سردی کا۔ وہ اپنا عمل اپنے اللہ کی قربت اور ایمان پر استادگی کے لیے جاری رکھتا ہے۔ کیا ہم ان زمانوں کی آزمائشوں کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ جب اہل ایمان کو ننگے پنڈے تپتی ریت پر لٹا کر ان کے اوپر پتھر رکھ دیے جاتے تھے؟ جب ان کو مختصر جگہ پر محصور کرکے پتے کھا کر گزارہ کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا' وہ اہل ایمان... جو اللہ کی راہ میں اور پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایما پر اپنے گھربار چھوڑ کر انجانے علاقوں کی طرف ہجرت کرگئے... ان سے ہم خاک پاؤں کا کیا مقابلہ...؟"

مولوی سراج سرفراز ٹھٹھرتے ہوئے وضو کرتے جارہے تھے اور اپنے ایمان پر استقامت کی خاطر دل میں سوچتے جارہے تھے۔ اذان دینے تک کوئی شخص بھی مسجد میں نہیں پہنچا تھا۔

"الصلوٰۃ خیر من النوم" (نماز نیند سے بہتر ہے)

مولوی صاحب نے دو مرتبہ دہرایا' مگر نیند کے ماتوں کو ان کے یہ الفاظ مدہوشی کی نیند سے نہ جگا سکے۔ اذان سے فارغ ہو کر مولوی صاحب نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ صفیں خالی تھیں اور ٹونٹیوں سے پانی گرنے کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔

"استغفراللہ' استغفراللہ" مولوی صاحب دل ہی دل میں ورد کرتے صفوں کی طرف چلے۔ اپنے پیچھے خالی صفوں کی امامت کرنے کی نیت سے وہ اپنی جگہ پر کھڑے ہی ہوئے تھے کہ انہیں اپنے پیچھے اکا دکا لوگوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے مولوی صاحب نے نیت کی دعا پڑھنے کے بعد اپنے ہاتھ کانوں تک بلند کیے۔

"اللہ اکبر۔" اپنے پیچھے انہیں چند آوازیں تقلید کرتی سنائی دیں۔ پھر مولوی صاحب پوری یکسوئی سے نماز میں مصروف ہوگئے۔ فرض ادا کرنے کے بعد انہوں نے دائیں بائیں سلام پھیرا اور دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے۔ دعا کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

بعد وہ اپنے عقب میں بیٹھے لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے۔
"آپ حضرات ذرا جلدی آنے کی کوشش کیا کریں۔ نماز میں تاخیر بھی عمل کی سیڑھی پر دھبہ ڈال دیتی ہے۔" مولوی صاحب نے اپنی خضاب لگی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ان کے دو' چار مقتدیوں میں سے ہر ایک کے پاس اس تاخیر کی اپنی اپنی وجوہات تھیں۔ مولوی صاحب داڑھی پر ہاتھ پھیرتے' وجوہات سنتے ہوں ہوں کرتے جواب دے رہے تھے اور ان کا جسم کپکپا رہا تھا۔

نمازیوں کے رخصت ہونے کے بعد مختصر سوئیٹر پہنے' گرم چادریں اوڑھے' ٹھٹھرتے کانپتے بچے اور بچیاں ناظرہ قرآن کا درس لینے آنا شروع ہوئے۔ بچوں کو سبق دیتے ہوئے مولوی صاحب کا جسم گرم ہونے لگا اور انہیں لگا' جسم بری طرح ٹوٹ رہا ہو۔ بچوں کے رخصت ہونے تک مولوی صاحب کے بخار کا گراف خاصا اونچا ہو چکا تھا۔ وہ خود کو بمشکل اٹھا کر کھانستے ہوئے اپنے گھر کی طرف چلے۔ جہاں ان کی اہلیہ جگت بھین جی رابعہ کلثوم' ان کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔

"آج تو بخار نے پوری طرح لیا۔" گھر پہنچ کر ڈیوڑھی میں بندھی بکریوں کو چارا کھلاتی رابعہ کلثوم سے انہوں نے کہا اور بدقت چلتے کمرے تک پہنچے۔ جہاں ان کا بستر اور گرم رضائی ان کی منتظر تھی۔
رابعہ کلثوم' ان کے پیچھے ہی گئیں۔ انہوں نے فکر مندی سے مولوی صاحب کے ماتھے پر ہاتھ رکھا' جو بری طرح تپ رہا تھا۔

"اتنے دنوں سے کہہ رہی تھی بڑا ڈاکٹر صاحب کو جا کر دکھائیں اور ڈاکٹری دوائیں کھائیں۔ آپ حکیم جی کے پیچھے لگے معجون اور جوشاندے کی پڑیوں پر گزارا کرنے پر بضد تھے۔ اب جو بخار لمبا ہو گیا تو نہ جانے کتنے دن ٹھپ رہے گا کاروبار زندگی!" رابعہ کلثوم ناراض لہجے میں بولیں۔
"مجھے جوشاندے کا پیالہ دے دو گرم گرم اور سعالین کی دو ٹکیاں بھی۔" مولوی صاحب نے رضائی اپنے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔

"دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے۔ آپ کی ضد نہیں جائے گی۔" رابعہ کلثوم بڑبڑاتے ہوئے صحن میں نکل گئیں۔ مگر لکڑیوں کی آگ جلا کر جوشاندے کی دیگچی اس پر رکھتے ہوئے رابعہ کلثوم سوچ رہی تھیں۔ "مولوی صاحب بھی کیا کریں۔ ڈاکٹری علاج کے لیے اتنے پیسے چاہئیں۔ حکیم صاحب دس' بیس روپوں میں دو دن کی دوا دے دیتے ہیں ہوالشافی کہہ کر۔ ہاتھ سے منہ تک نوالہ لے کر جانے کی مشکل میں گرفتار بندہ حکیم صاحب کو ترجیح نہ دے تو کیا کرے۔"

جوشاندے میں ابال آنے پر رابعہ کلثوم نے چولہے سے لکڑی کھینچ دی اور پیالے میں جوشاندہ چھاننے لگیں۔

❋ ❋ ❋

"پڑھائی اور پڑھائی سے متعلقہ ریسرچ اپنی جگہ مگر مجھے یوں شہر' شہر گاؤں گاؤں ریسرچ کے نام پر تمہارا خوار ہونا بالکل بھی پسند نہیں ہے۔"
فائزہ نے معمول سے سخت لہجے میں ماہ نور سے کہا' جو اسلام آباد جانے کے لیے اتنی پرجوش نظر آ رہی تھی کہ ممی کی متوقع نہ کو ہاں میں بدلوا کر اٹھنے کا تہیہ کر کے ان کے پاس آئی تھی۔
"ممی! پروگریس کرنے کے چانسز تو ایسے ہی بڑھتے ہیں۔" ماہ نور نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"اچھا تو جن لوگوں کے پاس یوں لور لور پھرنے کا وقت نہیں ہوتا' وہ پروگریس نہیں کرتے کیا؟" فائزہ نے خشمگیں نظروں سے اسے دیکھا۔

"میرا کام ہی ایسا ہے۔" ماہ نور نے ایک اور وجہ گھڑی۔ "ذاتی مشاہدہ اس کی بنیادی شرط ہے۔"

"تمہارے پاس انٹرنیٹ کے ذریعے ہر چیز تک رسائی کی سہولت موجود ہے۔" فائزہ نے اس کی دلیل رد کردی۔

"ممی! انٹرنیٹ، چیزوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ ان کی ہسٹری بتا دیتا ہے۔ ان پر ہوتی ریسرچ دکھا دیتا ہے۔ مگر انٹرنیٹ ان کو لائیو نہیں دکھاتا۔ ہمیں کسی جگہ کے متعلق سیکھنے کے لیے وہاں موجود ہونا چاہیے۔" ماہ نور ہار نہ ماننے کی قسم کھا کر آئی تھی۔

"اور سب سے بڑی بات!" ماہ نور نے فورا" ہی ایک اور مضبوط وجہ گھڑی۔ "وہاں جانے سے میری چار گمنام چارکول پینٹنگز کو تشہیر ملنے والی ہے۔ ممی ایکسپوزر ہوگا تو کام آگے بڑھے گا نا۔ اس سے زیادہ سنہری موقع مجھے کب مل سکتا ہے؟"

"ہاں یہ پوائنٹ تو ہے۔" بابا جو کب سے بظاہر نیوز ویک کے مطالعہ میں مشغول نظر آرہے تھے، نے اس گفتگو میں شمولیت اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"جو ہنر اور قابلیت اس کے پاس ہے اس کو منوانے، اس پر کام کرنے کے مواقع حاصل کرنے اور خود کو سامنے لانے کے لیے اسے اِدھر اُدھر نکلنا تو پڑے گا ہی۔"

"تو اور کیا؟" ماہ نور نے زور و شور سے سرہلاتے ہوئے بابا کی بات کی تائید کی۔

"آپ کو پتا بھی ہے کہ صابرہ بھابھی اس کی گاؤں کی مصروفیت کے بارے میں کیا بتا رہی تھیں؟" فائزہ نے خفگی سے کہا۔

"ارے اس بات کو تو میں نے بہت انجوائے کیا تھا۔" بابا ہنسے۔ "میں جب چھوٹا تھا مجھے بھی میلے ٹھیلے، تماشوں والے، چمٹا بجا کر گانے سنانے والے بڑے پسند تھے۔ میں ابا جی سے پیسے لیتا تھا۔ تختی یا کسی کتاب کے لیے اور اماں سے بہانہ بنا کر گاؤں میں ہونے والے میلوں میں پھرتا رہتا تھا۔"

"ہونہہ!" فائزہ نے نخوت سے سر جھٹکا۔ "آپ بھی اندر سے پینڈو ہی رہے عمر بھر اور اب یہ بچے بھی۔"

"ارے فائزہ بی بی! ہمارا یہ سب نخرہ شخرہ تو سب آپ کی بدولت ہے، ورنہ ہم نے تو ایک عمر درختوں سے کووں کے انڈے چراتے گزار دی۔" بابا نے ممی کے اپنی زندگی میں کردار کو سراہتے ہوئے کہا۔

"چلو۔۔۔ ٹھیک ہے بھئی ماہ نور۔۔۔ تم تیاری پکڑو اسلام آباد کی۔" بابا نے ممی کے ذرا سے اچھے موڈ کو دیکھ کر جھٹ پٹ فیصلہ داغا۔

"تم فرقان کو فون کر دینا۔ ماہ نور اسی کے پاس ٹھہرے گی نا!" پھر وہ فائزہ سے مخاطب ہوئے۔ یوں جیسے بحث ختم ہو چکی ہو۔

"مگر میں تو شاہ بانو کے ساتھ جا رہی ہوں۔" ماہ نور منمنائی۔

"شاہ بانو کے ساتھ ٹھہرنے کی اجازت تمہیں ہرگز نہیں ملے گی۔" ممی نے فورا" منع کرتے ہوئے یہ عندیہ بھی دے دیا کہ وہ اس کے اسلام آباد جانے پر راضی ہو گئی تھیں۔

"مگر فرقان ماموں کا گھر اور شاہ بانو کے بھائی کے گھر میں فاصلہ بہت زیادہ ہے، میں کیسے مینیج کروں گی۔"

"وہ جو تمہاری دوست ہے۔" ممی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "جو تمہیں اتنے جوش و خروش سے ساتھ لے جانے پر مصر ہے۔ وہ خود ہی کوئی بندوبست کرلے گی اس کا بھی۔"

ممی نے ٹیبل پر بکھرے اپنے کاغذات سمیٹے اور اسٹڈی روم کی طرف چل دیں۔

"غنیمت جانو!" ممی کے جانے کے بعد بابا نے نیوز ویک ہاتھ سے رکھتے ہوئے ماہ نور کی طرف مسکرا کر دیکھا کہ اجازت مل گئی۔"

"بابا! آپ بھی کھل کر ممی سے ہمارے لیے بات نہیں کرتے۔" ماہ نور نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"بھئی، میں رشتوں میں اور گھر میں طاقت کے توازن کا بڑا سخت حامی ہوں۔" بابا نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "تم لوگوں کی تربیت، پڑھائی، دوسری ضروریات، ہر چیز میں تمہاری ماں کا کردار مجھ سے زیادہ اہم رہا ہے اور یہ فطری بات ہے۔ یہ پاور میں ہے اس کا حصہ مجھ سے زیادہ ہونا چاہیے۔"

"لیکن بالآخر بات تو آپ اپنی ہی منواتے ہیں۔" ماہ نور باپ کی بات کو سمجھتے ہوئے مسکرائی۔

"اس کو ڈپلومیسی کہتے ہیں۔" ان کے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ ابھری۔

"پتا ہے کیا بابا!" ماہ نور نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "میں آپ سے اور سردار چاچا سے بہت متاثر ہوں اور میں اکثر آپ دونوں کی شخصیات کا تقابلی جائزہ بھی لیتی رہتی ہوں۔"

"اچھا۔۔۔ اچھا۔" بابا نے چونکتے ہوئے کہا۔ "پھر کوئی نتیجہ بھی اخذ ہوتا ہے یا نہیں۔"

"ایک نتیجہ تو بالکل اخذ ہوتا ہے۔" ماہ نور نے جواب دے کر اپنے ہونٹ بھینچے۔

"کیا؟" بابا نے دلچسپی سے پوچھا۔

"کہ آپ دونوں کی زندگیوں کی جہتیں کوئی بھی ہوں لائف اسٹائل کتنا بھی مختلف ہو، آپ دونوں کی شخصیتوں کی کچھ خصوصیات بالکل ایک جیسی ہیں۔"

"اور اس کی وجہ "بے جی" ہیں۔ بے جی کے بتائے ڈو اور ڈونٹ۔ کیا کرنا چاہیے، کیا نہیں کرنا چاہیے۔ ان کی شخصیت کی انکساری، عاجزی اور نرمی، آپ دونوں کی شخصیات میں گندھ چکی ہے، آپ دونوں ان عناصر کو اپنے خمیر سے نکالنا چاہیں بھی تو نہیں نکال سکتے۔"

"خیر اٹس بٹ نیچرل، یہ تو فطری سی بات ہے۔" بابا اس کی بات سے کچھ خاص متاثر نہیں ہوئے۔ "ماں کی شخصیت کے اثر کی تو میں نے تمہارے سلسلے میں بھی کچھ دیر پہلے مثال دی ہے۔"

"لیکن عظمیٰ پھوپھو تو ایسی نہیں ہیں۔" ماہ نور نے ان کی بات مسترد کرتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ وہ میاں جی کی جلادی شخصیت کا اثر پکڑ گئیں۔" ماہ نور شرارت سے مسکرائی۔ "وہ خاتون ہیں اور آپ نے دیکھ ہی رکھا ہے کہ ان کا خالد انکل اور اپنے بچوں پر کیا مضبوط ہولڈ ہے۔"

"ہاں بھئی یہ تو ہے۔" بابا نے اتفاق کیا۔

"ان کو بے جی کی انکساری، عاجزی اور نرمی چھو کر بھی نہیں گزری۔" ماہ نور نے فاتحانہ نظروں سے بات کو دیکھا۔

"اگر تم کو کل سہ پہر نکلنا ہے تو پھر چلو اٹھو، تمہارے بازار والے کام کر آئیں۔" ممی نے اسٹڈی روم سے نکل کر کہا۔ "تم نے کٹنگ کرانی ہو گی اور جوتے بھی لینے ہیں، ایک دو نئے پل اوور ز اور اسکارف بھی لے لینا، چلو اٹھو جلدی کرو۔" ممی چٹکی بجا کر ماہ نور کو اٹھنے کا اشارہ دیتے ہوئے اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئیں۔

"دیکھا تم نے!" بابا نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ "یہ ہوتی ہے مدر ہڈ (مامتا) کہاں اجازت دینے میں تامل تھا کہاں تمہاری تیاری کی فکر ہے۔۔۔"

"لکی آئی ایم۔" ماہ نور ہنستے ہوئے اٹھی اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

☼ ☼ ☼

"خیریت آج اتنی صبح تمہارا ظہور کیسے ہو گیا؟ سورج نے اپنا رخ بدلا یا تم نے اپنے کمرے کی سیٹنگ بدل لی؟" بلال نے ناشتے کی میز پر پہلے سے موجود سعد کو دیکھ کر کہا۔

"سورج تو خیر ابھی نکلا ہی نہیں اور کمرے کی ترتیب بھی ویسی ہی ہے۔" سعد کے چہرے پر چھائی سنجیدگی ایک لمحے کے لیے بلال کو چونکا گئی۔

"کچھ ایسا ہے کہ میری دسترس میں موجود وقت بتانے کا ہر ذریعہ ایک ہی وقت پر رک سا گیا ہے۔" سعد کی اگلی بات نے ان کی حیرت دور کر دی۔

"اوہ! گویا وقت منجمد ہو گیا تمہارے ہاں!" انہوں نے بے فکری سے سر ہلایا اور کرسی پر بیٹھ کر ٹوسٹ اٹھایا۔

"یوں ہی سمجھ لیں۔" سعد نے مارجرین کا ٹن ان کی طرف بڑھایا۔

"وقت کیا کہہ رہا ہے تمہیں... کب پگھلے گا؟"

"اس کی کچھ شرائط ہیں۔" سعد ہنوز سنجیدہ تھا۔

"میں ہمہ تن گوش ہوں۔" بلال نے دوسرا ٹوسٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اس کا کہنا ہے کہ تبدیلی ضروری ہے' روٹین سے آف ہونا درکار ہے' مداخلت کی گنجائش نہیں' آزادی کی یقین دہانی کرائی جائے۔ اکاؤنٹس' اکانومی' نفع' نقصان پر چیک نہیں ہوگا۔" سعد نے اپنے کپ میں گرم قہوہ انڈیلتے ہوئے کہا۔

"ہوں!" بلال نے غور کرتے ہوئے کہا۔ "اور اگر یہ سب افورڈ ایبل نہ ہو تو؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے بلال کی طرف دیکھا۔

"تو پھر وقت منجمد ہی رہے گا۔ وہ کسی اور کام کے لیے بھی نہیں پگھلے گا۔"

"وقت بہت بڑا بلیک میلر نہیں لگتا؟" بلال نے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اسے ہونا پڑتا ہے۔" سعد نے ترچھی نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "ورنہ انسان جس بے دردی اور سفاکی سے اسے گزارتا چلا جاتا ہے' وقت مزاحمت نہ کرے تو انسان اسے اپنے پیروں تلے روند کر رکھ دے۔"

"ہوں!" بلال نے سر ہلایا۔ "اسی لیے شاید... یہ کہا جاتا ہے کہ وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔"

"بالکل!" سعد نے اسی سنجیدگی سے سر ہلایا۔ "وقت کروٹ بدلتا ہے تو انسان ہڑبڑاتا ہے' ورنہ تو وقت کو سیدھا لٹا کر انسان اس پر سے یوں گزرے اور پہنچ جائے نو ٹائم زون میں۔" سعد نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

"کتنا آف مانگ رہا ہے یہ وقت۔" بلال نے گھڑی پر نظر ڈال کر بات کو ختم کرنے کی کوشش کی' ان کا ایک ایک منٹ قیمتی تھا۔

"ایک مہینہ کم از کم!" سعد نے یوں شانے اچکا کر کہا جیسے یہ بہت معمولی سی بات ہو۔

"گزشتہ رپورٹس بہت اچھی ہیں وقت کے مصرف کی' اس لیے اعتراض بنتا نہیں۔" بلال نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اپنی دسترس میں موجود وقت بتانے کے ہر ذریعے سے کہہ دینا گرانٹڈ۔"

بلال نے اپنا بریف کیس اٹھایا "ویسے یہ بڑی بلیک میلنگ ہے۔" انہوں نے جاتے جاتے مڑ کر کہا۔

"خود ہی تو اپرچونیٹی کوسٹ اور اکانومک چوائس کا فرق پڑھاتے رہے ہمیشہ... اب میری ترجیح اپرچونیٹی کوسٹ بن جائے تو کیا کیا جائے۔"

سعد نے جواب دیا اور اپنا پسندیدہ گانا گنگناتا ہوا اٹھا۔ کمرے سے نکلتے نکلتے اس نے ٹیبل پر رکھی ٹوکری سے ایک تازہ سرخ سیب اٹھایا اور اسے ہوا میں اچھالتا ہوا باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"اس رکی کو تو سدا سے منفرد نظر آنے کا شوق ہے۔ سوراخ والے فوم بال پر سرخ ہی نہیں' کیسری رنگ بھی

پینٹ کرتا ہے اور ہونٹوں کی سپیدی پر نیلی لائنیں لگا کر' وگ کے لیے ہرے اور نیلے رنگوں کے ساتھ فاختائی رنگ کی آمیزش بھی کر لیتا ہے۔ کبھی کبھی تو اس کی وگ قوس قزح کے رنگوں میں رنگی نظر آتی ہے۔ سب منفرد نظر آنے کے شوق کا نتیجہ ہے اور کچھ نہیں۔"

"پری! تمہیں ہر ایک کی ہر بات بری لگتی ہے' کبھی کسی کے کسی کام کی تعریف بھی کر دیا کرو... رکی سرکس کا جوکر اس لیے نہیں بنا تھا کہ اسے کمانے کے لیے کام چاہیے تھا۔ رکی کو تو بس کچھ ایسا کرنا تھا جس سے وہ لوگوں کو ہنسا سکے' ان کے چہروں پر مسکراہٹ لا سکے۔ تم نے دیکھا نہیں' رکی اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے تماشائیوں کے چہروں کو صرف دیکھتا ہی نہیں' ان پر غور بھی کرتا ہے۔ وہ اس مسکراہٹ کی' چہرے کی اس خوشی کی تلاش میں ہے' جو اسے اطمینان دلا دے کہ وہ روح کو خوش کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔"

"سرکس چینیوں کے ہاں مقبول ہے' یہ رکی کم بخت جاپانی ہے۔ اسے سرکس میں کیا دلچسپی۔"

"پریا اور میری پیاری پری! رکی غریب ماں باپ سے بچھڑا بچہ ہے۔ اسے اپنے چینی' جاپانی' پاکستانی ہونے سے کچھ غرض نہیں۔ وہ تو ہم اس کی چپٹی ناک اور چیاں چیاں آنکھوں کو دیکھ کر اسے کبھی چینی کبھی جاپانی سمجھتے رہتے ہیں۔"

"نہیں جی۔ جاپانیوں کی ناک گول اور ذرا سی اٹھی ہوتی ہے۔ چینی چپٹے ہوتے ہیں۔ صاف جاپانی لگتا ہے۔ چینی فرض کرنا حماقت ہے۔"

"چلو پھر جاپانی ہی سہی... اسے اس بات کے نمبر تو دے دو کہ وہ اپنا کام ڈوب کر کرتا ہے۔"

"ہونہہ! یہ کون سا مشکل کام ہے' مجھے دو اس کا کام۔ چٹکیوں میں کر کے دکھا دوں۔ لاؤ اس کے اسٹارز اینڈ اسٹرائپس والے بڑے بڑے بوٹ مجھے دو' میں انہیں پہن کر اس کی یونی سائیکل گھنٹہ بھر مسلسل چلا کر نہ دکھاؤں تو میرا نام بدل دینا۔"

"اور نہ دکھا سکو تو پھر تمہارا نام کیا رکھا جائے بدل کے... "پری سے چڑیل یا پھر "چھل پیری؟"

"اور وہ جو اتنی مہارت سے پلیٹیں ہوا میں اچھال اچھال کر پکڑتا ہے یوں جیسے پہیہ گھما رہا ہو پلیٹوں کا۔ مجھے صرف دو دن دو... میں پلیٹیں' ڈونگے' ڈشیں اور چمچے سب اسی طرح اچھال اچھال کر پکڑ لوں۔ اس کے بدلے اس سے بولو' مجھے دس منٹ صرف دس منٹ تاروں پر چل کر دکھائے' راڈز پر لہرا کر واپس آئے؟"

"پری او پری! رکی نے کبھی یہ دعوا ہی نہیں کیا کہ وہ یہ کرتب کر سکتا ہے۔ رکی تو صرف مسخرہ بننے کے لیے آیا تھا' تو بس وہ صرف مسخرہ ہے۔ یہاں تو سب ہی اپنا اپنا کام کرتے ہیں' کوئی دوسرے کا کرتب کیسے کرے بھلا۔"

"تو پھر میرے کرتب کیوں بدل دیتے ہو... کبھی تاروں پر چلاتے ہو' کبھی سوئیوں کے بستر پر لٹا دیتے ہو اور جب ملکہ بیمار پڑ گئی تھی تو سانپوں والا کرتب بھی میرے متھے لگا دیا۔ ٹھیک ہے' جب سب اپنا اپنا کام کر رہے ہیں تو خبردار! جو مجھے موٹر سائیکل چلانے کو کہا کسی نے گول چکر میں۔"

"اوہو پریا...! بھولی پری' غصیل پری' ضدی پری تو تو سرکس کی رانی ہے' ملکہ ہے اس سلطنت کی۔ تو تو جم پل ہے سرکس کی۔ تیرا کسی سے کیا مقابلہ۔ تو تو وہ بھی کر سکتی ہے' جو پہلے کبھی کیا نہ ہو تو نے بھی۔"

"کیا باقی ہے جو نہ کیا ہو۔"

"اے پریا رانی... تو کبھی رسالے دیکھ روس کے' چین کے سرکسوں کے۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں تیری۔"

"لاؤ مجھے دکھاؤ' میں صرف تصویریں دیکھ کر نہ کر کے دکھاؤں تو نام بدل دینا۔"

"رسالے تو ایک ہی بندے کے پاس ہیں۔"

"کس کے پاس؟"

"رکی... تمہارے جاپانی مسخرے کے پاس۔"

"رکی، رکی، رکی... ابھی جا کر پوچھتی ہوں اس سے۔ رکی، رکی... کہاں ہو تم؟"

"رکی، رکی...!" اس کی چیخیں بلند ہونے لگیں۔ "رکی دیکھو! میں کب سے تمہیں آوازیں دے رہی ہوں۔ تمہارا چہرہ نظروں سے اوجھل کیوں ہے، تمہاری ایک پلی ایک سبز ٹانگ والی پتلون، تمہارا دھاری دار کوٹ، کوٹ کے نیچے نکلتا پاجامہ، تمہاری لمبی نقلی ناک، تمہاری رنگ برنگی وگ، تمہارے سفیدی سے پھیلے ہوئے ہونٹ، تمہاری رنگ برنگ پینٹ کی ہوئی آنکھیں، سب مجھے نظر آ رہی ہیں۔ مگر تم کہاں ہو... تم تو کہیں بھی نہیں ہو... تمہاری آواز بھی مجھے سنائی دے رہی ہے۔ تم مجھے پکار رہے ہو...."

"سارہ... سارہ...! خیال سے۔ تمہاری ایڑی گھوم گئی ہے تمہارے ٹو زغلط جگہ ٹک گئے ہیں۔ سارہ... سارہ خیال سے... ارے کوئی ہے... کوئی مدد کرنے والا... شی از فالنگ... وہ گر رہی ہے... وہ گر رہی ہے...."

"رکی! رکی...! تمہاری آواز مجھ تک پہنچ رہی ہے مگر تم مجھے نظر نہیں آ رہے۔"

"رکی، رکی!" اس کی چیخیں کمرے کی حدود سے باہر نکلنے لگیں۔ دو منٹ کے بعد سیمی آنٹی کمرے کی لائٹ جلا کر اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ کمرے کی تاریکی دور ہوتی محسوس کر کے اس نے اپنی مضبوطی سے بند کی آنکھیں کھولیں۔ اس کے سامنے وہی کمرا تھا، وہی درو دیوار جن میں وہ دن کے چوبیس گھنٹے رہتی تھی اور وہی سیمی آنٹی جو اپنی نیند کے متاثر ہونے پر سامنے کھڑی اسے گھور رہی تھیں۔

"رکی، رکی... کہاں ہو تم؟" ایک سسکی کے ساتھ جملہ اس کے منہ سے نکلا اور ماضی سے اس کا ناتا ٹوٹ گیا، وہ حال میں موجود تھی۔

"سلیپنگ پلز لینا بھول گئیں تم شاید۔" سیمی آنٹی نے خشک لہجے میں کہا۔

اس نے جواب میں سیمی آنٹی پر ایک اجنبی نگاہ ڈالی اور آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

"رکی کو اب کیا یاد کرتی ہو؟" سیمی آنٹی نے اسی کھردرے لہجے میں اسے یاد کرانے کی کوشش کی۔ "بھولے سے پلٹ کر کسی کتے، بلی تک نے تو نہیں دیکھا .... رکی تو سیلانی بندہ ہے۔ بلیو ہیون سرکس کے ساتھ ساتھ شہر شہر، قصبہ قصبہ پھرتا، موجیں اڑاتا، ہنستا ہنساتا، ہزاروں لوگوں سے ملتا، ہزاروں چہرے دیکھتا۔ اسے یاد رہا ہوگا کہ...."

"بس کریں۔" سارہ نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر ناراض نظروں سے سیمی آنٹی کی طرف دیکھا۔

"چلو میں بس کر دیتی ہوں۔" انہوں نے بازو دائیں بائیں لٹکا کر شانے اچکائے۔ "اگر تمہاری تسلی اس سے ہوتی ہے تو۔"

"لائٹ بند کر دیں، مجھے نیند آ رہی ہے۔" سارہ نے بازو دوبارہ آنکھوں پر رکھ لیا۔

"ایک شرط پر۔" وہ بازو سینے پر باندھتے ہوئے ڈیل کرنے لگیں۔ "تو رکی شوا گین۔"

"آپ جائیں پلیز...." سارہ نے ان کی بات نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ کلک کی آواز کے ساتھ لائٹ بند ہوئی اور کمرے میں دوبارہ تاریکی پھیل گئی۔

"زندگی، دن کو رات اور رات کو دن میں بدل بدل کر نہیں گزارنی۔ زندگی کا دن ایسے گزارو کہ رات خواہش کرے میں اس کامیاب انسان کے لیے بازو وا کروں اور اسے اپنی آغوش میں لے لوں، میں اسے اپنے پروں میں سمیٹ کر تھپکوں اور یہ تھکا ہارا انسان مزے سے سو کر اپنی تھکن دور کرے اور دن بے چین ہو کہ کب رات کی تاریکی چھٹے اور یہ کامیاب انسان میری روشنی میں اپنے کام میں مصروف ہو جائے۔" سارہ کے کانوں میں اٹکتی اردو

میں بولے گئے یہ لفظ گونجے۔

"تم تو ایسے ہی ہو گے رکی...! رات تمہیں خوش آمدید کہتی ہو گی اور دن تمہاری طرف لپکتا ہو گا۔" اس نے سوچا اور زور سے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ مزید سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم اسلام آباد جا رہی ہو تو فلزا ظہور سے ضرور ملنا، بہت کمال کی آرٹسٹ ہے۔" فاطمہ نے مگ میں کافی پھینٹتے ہوئے ماہ نور سے کہا، جو فاطمہ اور خدیجہ سے ملنے ان کے گھر آئی تھی۔

"فاطمہ آنٹی! مجھے ڈرائنگز اور پینٹنگز میں کچھ خاص دلچسپی نہیں ہے، وہ تو صوفی خالہ نے مجھے کینیڈا سے چار کولز کا ایک سیٹ بھیجا تھا جس کے ذریعے میں نے کینوس پر طبع آزمائی کر ڈالی۔" ماہ نور نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ بڑے بڑے مصور وغیرہ۔"

"فلزا ظہور کوئی بڑی آرٹسٹ تھوڑی رہی ہے۔" فاطمہ آنٹی نے لکڑی کے نقشین جھولے پر جھولتے ہوئے کہا۔ "بے چاری کوئلے کا ٹکڑا لے کر صحن کے پکے فرش پر تصویریں بناتی رہتی تھی ساری دوپہر، ہم اس سے کوئلہ لینے کے لیے بڑی منتیں کرتے تھے اس کی۔"

"آپ کوئلے سے کیا کرتی تھیں؟" ماہ نور نے دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

"ہمیں کیری کاڑ یعنی شٹاپو کا نقشہ بنانا ہوتا تھا، کبھی ہم اسکول سے چاک چرا لاتے تھے، چاک ختم ہو جاتے تو سلیٹ کی سلیٹیوں سے کام چلاتے۔ وہ بھی نہ مل رہی ہوتیں تو فلزا کی منتیں کرنی پڑتیں جس کے پاس کوئلہ ہر وقت موجود رہتا تھا۔"

"وہ کوئلہ کہاں سے لیتی تھیں؟" ماہ نور نے تجسس سے کہا۔

"ہم جس پرانے محلے میں رہتے تھے وہاں ایک بڑا سا آرا تھا۔" فاطمہ نے اٹھ کر کافی میں ابلتا پانی ڈالتے ہوئے کہا۔

"آرا؟" ماہ نور نے سوالیہ نظروں سے فاطمہ کو دیکھا۔

فاطمہ ہنس دیں۔ "بھئی تم لوگوں کی ووکیبلری بہت کم ہے۔ آرا مطلب وہ جگہ جہاں سے آگ جلانے کے لیے لکڑیاں ملتی تھیں۔"

"آپ لوگ لکڑیوں کی آگ جلاتے تھے؟" ماہ نور کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"اور کیا!" فاطمہ نے ماہ نور کو کافی کا کپ پکڑایا اور بھنے ہوئے نمکین کاجو کی پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

"نا نہیں!" ماہ نور نے ہاتھ کے اشارے سے کاجو کی پلیٹ لینے سے انکار کر دیا۔ "کولیسٹرول کا خزانہ ہے یہ، میں نہیں کھاتی۔"

"تم سے زیادہ ویٹ کانشسس لڑکی میں نے دوسری نہیں دیکھی۔" فاطمہ قہقہہ لگا کر ہنس دیں۔

"آپ کو کیا پتا میرا وزن مہینوں یا دنوں کے حساب سے نہیں گھنٹوں کے حساب سے بڑھتا ہے اگر میں خیال نہ کروں تو۔" ماہ نور نے منہ بنا کر کہا۔

"لڑکی! واک کی عادت ڈالو سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔" خدیجہ نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"آپ کا بڑا اسٹیمنا ہے خدیجہ آنٹی!" ماہ نور مسکرائی۔ "کل صبح میں نے آپ کو دیکھا۔ آپ کا بھاری اپر، اونی مفلر، ٹوپی، دستانے، فروالے بوٹ، کیا گولہ مولہ بنی آپ واک پر جا رہی تھیں۔"

"میرے تو بھئی ٹانگوں میں خون رکنے لگتا ہے اگر میں واک نہ کروں تو۔" خدیجہ نے پھینٹی ہوئی کافی ایک مگ

میں لے کر گرم پانی انڈیلتے ہوئے کہا۔

"اور واپسی پر چھینکیں ایسی کہ چھینکوں کا طوفان اٹھا ہو جیسے۔" فاطمہ نے اضافہ کیا۔

"خیر چھینکوں کا تو علاج ہے مگر ٹانگوں میں خون رکنے کا نہیں ہے۔" خدیجہ نے بے نیازی سے کہا۔

"اچھا فاطمہ آنٹی! آپ بتایئے۔ وہ آرے والا کوئلے کا قصہ تو درمیان میں ہی رہ گیا۔"

"ہاں!" فاطمہ نے خالی مگ میز پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"تو بی بی! یہ جو سوئی کا مقام ہے نا جہاں پر گیس دریافت ہوئی تھی، اس کا نام ہم نے بھی اسی وقت سنا تھا، جب وہاں سے گیس دریافت ہوئی تھی۔ اس سے پہلے ہر طبقے کے لوگ لکڑی کوئلے یا پھر تیل کے چولہوں پر ہی گزارہ کرتے تھے۔"

"وہ آرا!" ماہ نور نے یاد دلایا۔

"ہاں ہاں تو اسی آرے پر ہر سائز کی لکڑی جلانے کو مل جاتی تھی، ایک طرف اس بندے نے کوئلے کا ڈھیر رکھا ہوتا تھا، تول تول کر کوئلے دیتا تھا، ہمارے گھروں میں کوئلہ نہیں جلایا جاتا تھا کیونکہ اس سے جو گیس پیدا ہوتی تھی، وہ صحت کے لیے مضر سمجھی جاتی تھی۔"

"پھر فلزا ظہور کے پاس کوئلہ کہاں سے آتا تھا؟" ماہ نور کی سوئی اسی ایک نقطے پر اٹک گئی تھی۔

"یہ ہی تو۔۔۔" فاطمہ ہنس کر بولیں۔ "اس نے آرے والے سے بنا کر رکھی ہوئی تھی۔ ان کے گھر کا جو ملازم لکڑیاں لینے جاتا، یہ اس کے ساتھ چل دیتی اور ملازم لکڑیاں تلواتا، یہ کوئلے کے ڈھیرے کے گرد بکھرے کوئلے کے چھوٹے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر لفافے میں بھر لیتی۔"

"ہوں۔" ماہ نور مسکرائی۔

"اور پھر گرمیوں کی دوپہروں میں وہ کوئلے کے ٹکڑے، جو شاہکار بنانے کے لیے معاون ثابت ہوتے، یہ ہم ہی جانتے ہیں۔" خدیجہ نے ہنس کر کہا۔

"کوئلے کی وجہ سے اس کی انگلیاں خراب ہوتیں، ناخن میلے ہو جاتے، کپڑوں پر، چہرے پر دھبے لگے ہوتے مگر اس کو پروا نہیں تھی۔ جو اس سے کہتے کہ بھئی کاربن پنسل استعمال کر لیا کرو یا کاغذ پر رنگین پنسلوں سے شکلیں بناؤ تو وہ صاف کہتی، مجھے ان کالی لکیروں سے محبت ہے، میں تو بھئی کوئلے کا استعمال ہی جاری رکھوں گی۔" فاطمہ کو جیسے پرانے دن یاد کرنے میں مزا آرہا تھا۔

"ہم سب آگے پیچھے کی عمروں کی لڑکیوں نے میٹرک سائنس کے ساتھ کیا۔ فلزا ظہور نے آرٹس پڑھا، ہم ایف ایس سی کرنے چلیں۔ وہ فائن آرٹس پڑھنے لگی اور جب ہم سب ایف ایس سی میں ناکام ہو کر سر جھکائے آرٹس کے مضامین میں بی۔ اے اور پھر ایم۔ اے کر کے فارغ ہوئیں، فلزا ظہور نے کوئلے سے چارکول تک کا سفر کامیابی سے طے کر لیا تھا۔"

"لیکن میں نے کبھی ان کا نام نہیں سنا کہیں۔" ماہ نور نے تذبذب کا اظہار کیا۔

"کہاں سنتیں؟" فاطمہ ہنسیں۔ "جبکہ وہ تو کہیں اپنے کام کو ہائی لائٹ ہی نہیں کرتی۔ تم اسے پرانے محلوں کی گلیوں میں، پرانی تاریخی عمارتوں کے کونے کھدروں میں کینوس گود میں رکھے کام کرتے پاؤ تو پاؤ، کہیں نامور جگہ پر تو کوئی اس کو جانتا بھی نہیں۔"

"دکھی ہے۔" خدیجہ نے اٹھ کر مگ سمیٹتے ہوئے کہا۔ "یا تو بندہ کام کرے ہی نہیں، کرے تو تعریف، تنقید دونوں کے لیے پیش تو کرے۔ میں بالکل بھی اس کے آئیڈیے سے متفق نہیں ہوں۔"

"یہ جو ہوتے ہیں نا کلچرل شوز!" فاطمہ نے خدیجہ کے کمرے سے جانے کے بعد ماہ نور کی طرف دیکھتے ہوئے

سرگوشی کی۔

"ان میں بھی جاتی ہے، اپنے فن کا مظاہرہ کرتی ہے وہاں، لیکن پیمانہ چھوٹا ہوتا ہے۔"

"ہائے۔" ماہ نور کو یہ بات سن کر مزا آیا۔ "مجھے ایسے ڈاؤن ٹو ارتھ لوگ بہت اچھے لگتے ہیں۔ جن کو بس کام کی لگن ہوتی ہے شہرت کی نہیں۔"

"کام سے تو سمجھو اس کو عشق ہے۔" فاطمہ نے ماہ نور کا ہاتھ دبا کر گویا اسے یقین دلایا۔

"عشق۔" ماہ نور نے یہ لفظ دہرایا اور اسے اچانک کچھ یاد آگیا۔

"فاطمہ آنٹی! عشق کتنی قسم کا ہوتا ہے۔" اس نے بغیر سوچے فاطمہ سے سوال کیا۔

"ان گنت قسمیں ہیں عشق کی۔" فاطمہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کیا یہ اچھی چیز ہوتی ہے۔" ماہ نور نے معصومیت سے پوچھا۔

"اچھی مگر خطرناک چیز ہے۔" فاطمہ نے اپنے لہجے میں ڈرامائی تاثر پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں خطرناک کیوں؟" ماہ نور نے حیرت سے پوچھا۔

"کیونکہ عشق انسان کو بے خوف کر دیتا ہے، نتائج و عواقب سے بے پروا بندہ۔ آگا دیکھتا ہے نہ پیچھا۔ بس اندھا دھند زندگی گزارتا چلا جاتا ہے۔" فاطمہ نے آہستہ آہستہ سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا عشق بندے کی آواز میں سوز بھی پیدا کر سکتا ہے؟" ماہ نور کے ذہن میں کوئی بازگشت ہوئی تھی۔

"آواز میں سوز، اور دل میں گداز۔۔۔ اگر عشق سچا ہو تو سو فی صد پیدا ہو جاتا ہے۔"

"اس عشق کی نوعیت کیا ہوتی ہے، جو یہ دونوں خصوصیات پیدا کر دیتا ہے۔"

"کوئی بھی۔۔۔ حقیقی، مجازی۔"

ماہ نور نے گہرا سانس لیا اور سامنے دیکھنے لگی۔ اس کے سامنے گزرے وقت کا ایک منظر رقصاں تھا اور اس کے ذہن میں ان گنت سوال تھے۔ فاطمہ ان سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی تھیں، اس کے ذہن میں اٹھتے سوالوں کے جواب کس کے پاس تھے، وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی۔

☼ ☼ ☼

فرقان ماموں کے ہاں ہر طرح کی سہولت ہونے کے باوجود اسے وہ آرام محسوس نہیں ہو رہا تھا، جو گاؤں میں سردار چاچا کے فارم اور ان کے گھر میں محسوس ہوا تھا۔ فرقان ماموں ایک سرکاری محکمے میں گریڈ بائیس کے ملازم تھے اور ان کے گھر کا ماحول ویسا ہی تھا جیسا گریڈ بائیس کے ملازموں کے گھروں کا ہو سکتا تھا۔ فرقان ماموں کے دونوں بچے امریکہ میں سیٹ تھے۔ سیما آنٹی پاکستان اور امریکہ ایک کیے رکھتی تھیں۔ گھر میں ملازمین کی فوج تھی، جو مفت میں موج کرتی پھرتی تھی۔

شاہ بانو اسے لینے کے لیے فرقان ماموں کے ہاں آئی تو گھر کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر ہنس دی۔

"واہ ماہ نور! تمہارے تو پیر زمین پر نہیں ٹکتے ہوں گے۔" اس نے کہا۔

جواب میں ماہ نور نے برا سا منہ بنایا۔ "سونے کے محل میں بند شہزادی والا حال ہے۔"

"اوف۔۔۔ تم نے خود کو شہزادی فرض کر لیا۔" شاہ بانو ہنسی۔ پھر وہ جھرجھری لے کر بولی۔ "توبہ توبہ بھئی تم اس نمائش کی مصنوعی دنیا میں اتنے دن کیسے گزارو گی؟"

"یہ ہی تو میری سمجھ میں نہیں آرہا۔" ماہ نور روہانسی ہو کر بولی۔ "اس سے تو اچھا تھا میں یہاں آتی ہی نہیں۔"

"تمہاری اپنے ماموں سے ذرا بھی انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہے نا!" شاہ بانو نے پوچھا۔

"بالکل بھی نہیں۔" ماہ نور نے گردن ہلا کر کہا۔ "یہ تو ممی کی ضد ہے جو مجھے یہاں لے آئی ہے' ورنہ ماموں سے خود ان کی بھی عمر بھر نہیں بنی' وہ بھی ماموں کو مصنوعی شخص کہا کرتی ہیں۔"

"چلو خیر ابھی تو چلو' باہر نکلتے ہیں۔" شاہ بانو نے اسے مایوسی سے نکالنا چاہا۔ "شاید تمہاری طبیعت بہل جائے۔" شاہ بانو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہم جا کہاں رہے ہیں؟" گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے ماہ نور نے شاہ بانو سے پوچھا' جو بڑی مہارت سے اپنے بھائی کی آلٹو ڈرائیو کر رہی تھی۔

"ہم نومیڈ آرٹ گیلری کی اسلام آباد والی برانچ کی طرف جا رہے ہیں۔" شاہ بانو نے گیئر بدلتے ہوئے جواب دیا۔ "جمید بھائی تمہارا نام رجسٹر کرا چکے ہیں نمائش کے لیے لیکن پھر بھی ہم ایک دفعہ کنفرم کر لیتے ہیں۔ ساتھ ایک نظر بھی ڈال لیتے ہیں گیلری پر۔"

ماہ نور کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے مصورہ بننے کا خواب کبھی نہیں دیکھا تھا' ہاں اس کی ڈرائنگ شروع ہی سے بہت اچھی تھی' اتنی اچھی کہ میٹرک اور پھر ایف ایس سی کے دنوں میں اس کی تقریباً سب سہیلیاں اپنی پریکٹیکل نوٹ بکس پر اس سے ڈایا گرامز بنوایا کرتی تھیں اور اس کے لیے وہ اس کی خوشامد بھی کر لیتی تھیں۔ لیکن اس نے کبھی سنجیدگی سے اپنی اچھی ڈرائنگ کو کسی تصویر کشی کے لیے استعمال کرنے کا نہیں سوچا تھا۔ ایف ایس سی کے امتحان کے بعد جن دنوں وہ فارغ تھی' اس کی خالہ نے اسے ڈرائنگ میں استعمال ہونے والی چیزیں بھیجی تھیں جن میں کچھ پسٹلز' واٹر کلر پنسلز' اور چارکول ڈرائنگ شیٹس شامل تھیں۔ انہی دنوں اس نے چارکول پر جو طبع آزمائی شروع کی تو اسے لگا کہ وہ اچھی تصویر کشی کر سکتی تھی۔ جوش میں آ کر اس نے تین ڈرائنگز بڑے کینوس پر بنا ڈالیں۔ شاہ بانو اور اس کی سہیلیاں اس کام سے کافی متاثر ہوئی تھیں لیکن میڈیکل کالج میں داخلہ نہ مل سکنے کی مایوسی کے دنوں میں اس کا تازہ تازہ جوش ایک دم ٹھنڈا ہو گیا۔ چارکول ڈرائنگز کے کینوس اسٹور میں منتقل ہو گئے اور اس نے ممی کی ناراضی کے باوجود میڈیا اسٹڈیز میں داخلہ لے لیا۔ یہاں بھی بابا ہی اس کے حق میں نامحسوس طریقے سے آگے آئے تھے اور انہوں نے خود جا کر اس کا داخلہ شہر کے ایک نامور کالج میں کروا دیا تھا۔ اس داخلے کے بعد پڑھائی شروع کرنے سے لے کر کچھ دن پہلے تک بھی اسے وہ ڈرائنگز یاد نہیں آئی تھیں اور شاید کبھی نہ آتیں' اگر شاہ بانو اسے ان کی یاد نہ دلاتی۔ اب کچھ دنوں سے وہ یہ سوچ سوچ کر محظوظ ہو رہی تھی کہ کیا خبر وہ تین ڈرائنگز اسے ایک اچھی مصورہ میں بدل دیں۔

"یہ رہا سیونتھ ایونیو اور آیا ہی — چاہتی ہے نومیڈ آوٹ گیلری اسلام آباد رہنے کے لیے بری جگہ نہیں ہے۔ کیا خیال ہے۔" کوئی موڑ مڑتے ہوئے شاہ بانو نے اسے مخاطب کیا۔

"ہوں۔" ماہ نور مسحور کن خیالوں میں کھوئی اچانک چونکی تھی۔ "کیا کہا؟" اس نے شاہ بانو کی طرف دیکھا۔

"کہاں کھوئی ہوئی ہو محترمہ!" شاہ بانو نے خفگی سے کہا۔ "اتنے خوب صورت راستے میں آئے یقیناً" نہیں دیکھے ہوں گے۔"

"دیکھے ہیں۔ بہت منظم طریقے سے بنا ہوا شہر ہے۔" اس نے اپنی خفت مٹانے کے لیے تبصرہ کیا۔

"ویسے۔" اس نے گردن موڑ کر شاہ بانو کی طرف دیکھا۔ "شہر خود بخود بنتے اور بگڑتے ہیں یا بنا کر بسائے جاتے ہیں؟"

"پتا نہیں۔" شاہ بانو نے ایک عمارت کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ "مجھے اتنی خبر ہے کہ شہر مجھے بسے بسائے ملے' میں ان کے ناموں سے واقف ہوں اور ان میں سے کئی خود اپنی نظروں سے دیکھ چکی ہوں۔ مجھے سب شہر تقریباً" ایک ہی جیسے لگتے ہیں۔"

وہ مسکرائی اور گاڑی پارک کر کے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ ماہ نور نے اپنی نظروں کے سامنے موجود عمارت پر نظر ڈالی' جس پہ "نومیڈ آرٹ گیلری" کا بورڈ آویزاں تھا۔

☼ ☼ ☼

سعدیہ کلثوم کی زندگی محدود اور اس کی دنیا خاصی مختصر تھی۔ وہ اپنے ماں' باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ سعدیہ کلثوم کو اپنی آنکھ کھولنے کے حالات تو قطعی یاد نہیں تھے۔ مگر جب اس نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنے اردگرد دنیا مختصر ہی نظر آئی۔ اس کے ابا اس زمانے میں بھی ایک چھوٹے سے قصبے کے ایک چھوٹے اور تنگ و تاریک محلے کی مختصر سی مسجد میں مولوی صاحب تھے اور وہ لوگ اسی مسجد کی چھت پر بنے دو مختصر سے کمروں میں رہائش پذیر تھے۔ ابا کا زیادہ وقت نیچے مسجد میں گزرتا اور اماں اس مختصر سی چھت پر دو ننھے منے کمروں کی صفائی ستھرائی' کھانا بنانے' کپڑے دھونے اور انہیں استری کر کے سنبھالنے کے کاموں میں دن سے رات تک مصروف رہتی تھیں۔ اس چھت سے ملحق کئی چھوٹی بڑی چھتیں تھیں' جن کے نیچے چھتوں کے سائز کے حساب سے ہی اونچی نیچی دیواروں پر کھڑے گھر موجود تھے۔ ان گھروں کے نقشے اور رہن سہن کیسا تھا۔

سعدیہ کو شاید اتنی خبر نہ تھی۔ اس کی دوستیاں اور تعلقات چھت سے چھت تک ہی محدود رہتے تھے۔ وہ اماں کو اپنے کاموں میں مصروف چھوڑ کر چھتوں کی درمیانی نیچی دیواریں ٹاپتی ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری چھت پر پہنچ جاتی۔ جہاں اکثر اسے اپنی ہی ہم عمر یا خود سے کچھ بڑی کچھ چھوٹی ہم جولیوں کی محبت میسر آتی تھی۔ وہ صبح سے شام تک ان ہم جولیوں کے ساتھ چھتیں ٹاپتی' دوڑتی' بھاگتی' شٹاپو' چھپن چھپائی' بندر کلہ اور گیٹیاں کھیلنے میں مشغول رہتی۔ اکثر اس کے جسم پر رنگ برنگ کپڑے ہوتے۔ شلوار پھول دار تو قمیص کسی ایسے رنگ کی جس رنگ کا کوئی پھول شلوار کے پرنٹ میں موجود نہ ہوتا۔ کبھی بدرنگی شلوار کے ساتھ کوئی پھول دار قمیص جس کے چاک کی سیونیں اکثر اونچی نیچی چھتیں ٹاپنے کے چکر میں ادھڑی رہتیں۔

محلے کی ایک خالہ نے کپڑے سینے کی سوئی کے ذریعے اس کے کانوں میں سوراخ کر کے کالے دھاگے پرو کر گرہ لگا دی تھی۔ اس کے کان کے یہ سوراخ کبھی ٹھیک نہیں ہوئے تھے۔ اکثر پکتے رہتے اور ان میں سے پیپ دار مواد نکل نکل کر سوراخوں پر جمع رہتا۔ جسے چھیلنے میں اسے بڑا مزا آتا۔ اماں اسے اس بات پر بری طرح جھڑکتیں' کیونکہ مواد چھیلے جانے پر زخموں سے خون بہنے لگتا۔ مگر سعدیہ کو زخم چھیلنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ اس کا ہاتھ خود بخود کانوں کی طرف جاتا اور پل بھر میں اس لیس دار مواد کو جو کبھی تو تازہ اور گیلا ہی ہوتا' پل بھر میں ادھیڑ دیتا۔ کانوں کے یہ زخم کافی عرصہ اس کے ساتھ رہے تھے اور کب ٹھیک ہوئے تھے' یہ سعدیہ کو یاد نہیں تھا۔

اس زمانے کی یادوں میں کچی امبیوں کو چوستے رہنا' کھٹی نارنگیوں کی پھانکیں نمک لگا کر کھاتے ہوئے گندے سندے ہاتھوں سے گیند ہوا میں اچھال اچھال کر گیٹیاں کھیلنا بھی شامل تھا۔ اس کے یہ حالات دیکھ کر اماں اسے سخت لفظوں میں ڈانٹتی' جھڑکتی اور کئی مرتبہ سخت ہاتھوں سے پٹائی بھی کر دیتی تھیں' پھر انہوں نے پریشان ہو کر اس کو دو محلے چھوڑ ایک اسکول میں داخل کرا دیا۔ سعدیہ' کلثوم کو زندگی کا پہلا جھٹکا اس گورنمنٹ پرائمری اسکول میں جا کر لگا۔ اس سے پہلے جب وہ صبح صبح اٹھ کر نیند میں ڈوبی چہرے پر پانی کے چھپکے مار مار کر وضو کرتی تو اس کے لاشعور میں کہیں یہ اطمینان موجود ہوتا کہ وہ اپنے ابا کے پاس سیپارہ پڑھنے جا رہی ہے۔ جہاں اس کے ابا مولوی صاحب اور پڑھنے کے لیے آئے دیگر بچے شاگرد اور بے چاری مخلوق تھے۔ مولوی صاحب کی بیٹی ہونے کی حیثیت سے اسے ان سب میں ایک ممتاز حیثیت حاصل تھی۔

وہ اپنا سبق جلدی یاد کر لینے اور سنا دینے کے بعد بطور مانیٹر ان سب کے سروں پر سوار ہو سکتی تھی۔ وہ سر کنڈے

کی پتلی سی چھڑی پکڑے باری باری سب کے سر پر سوار ہوتی، ان کے سبق سنتی، غلطیوں پر زبانی سرزنش کے ساتھ بلا تکلف ان پر چھڑیاں برسائی، یوں وہ سب بچے سعدیہ کلثوم سے مرعوب رہتے، مگر گورنمنٹ پرائمری اسکول میں وہ ایک عام سی طالبہ تھی۔ کوئی اس کو مولوی صاحب کی بیٹی ہونے کی حیثیت سے اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا۔ بلکہ وہ بچیاں جن پر صبح مسجد میں وہ چھڑیاں برسا رہی ہوتی، یہاں اسکول میں جتھا بنا کر اس کے خلاف صف آرا ہو گئیں۔ انہیں سعدیہ سے اپنے بدلے لینے کا نادر موقع ملا تھا۔

اس صورت حال پر سعدیہ کو پہلے پہل تو اسکول سے ہی نفرت ہونے لگی کیونکہ اسکول سے اس کا تعارف اچھا ثابت نہیں ہوا تھا مگر اسکول سے نجات کسی طور ممکن نہ ہوئی۔ اسکول نہ جانے کا ہر بہانہ اماں کے مصمم ارادے کے سامنے پورس کا ہاتھی ثابت ہوا۔ اس پر سعدیہ نے کھیل کود اور لور لور چھتیں ناپنے کے شوق کی تہ میں چھپے اپنے ذہن پر زور سے دستک دینے کا آغاز کیا۔ اس کی اس دستک کا جواب بہت عجیب تھا۔

"اتنا پڑھو، اتنی جان کھپاؤ کتابوں میں کہ سب سے ممتاز نظر آؤ، سب مسئلے حل ہو جائیں گے۔" دماغ کے جاگے سوتوں نے اسے مشورہ دیا تھا! اس روز سے ہی سعدیہ کلثوم کتابی کیڑا بن گئی۔ مولوی صاحب نے اسے قلم گھڑنا اور خوشخط لکھنا خوب سکھا دیا تھا۔ وہ پیار اور لگن سے بڑے شوق کے ساتھ تختی پر گاچنی (ملتانی مٹی) کا پوچا لگاتی، اسے ہوا میں لہرا لہرا کر سکھاتی اور پنسل سے لائنیں لگا کر خوشخط پورنے ڈالتی۔ اس کے اسکول کی استانیاں کچھ ہی ماہ میں اس سے متاثر ہو گئیں اور سعدیہ کلثوم مسجد کے علاوہ اسکول میں بھی اپنی ہم عمر لڑکیوں پر حاوی ہو گئی۔

دماغ کے اس مشورے کا فائدہ یہ بھی ہوا کہ اماں جنہیں اس کو پڑھانے لکھانے کا بہت شوق تھا، اس سے خوش رہنے لگیں۔ آہستہ آہستہ اسے اسکول سے محبت ہونے لگی۔ اسکول جس کے اندر استانیوں کی تعریفیں، کتابوں میں درج کہانیاں، آخری گھنٹے میں ہل ہل کر بلند آواز میں پہاڑے یاد کرنے کا سرور، آدھی چھٹی کے وقت استانیوں کے لیے اسکول کے باہر کھڑی ریڑھیوں سے چنا چاٹ، گول گپے، شکر قندی، سموسے خرید کر لانے کی معتبری شامل تھی۔ کبھی کبھار کوئی استانی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک پلیٹ چنا چاٹ، ایک آدھ سموسہ اسے بھی پکڑا دیتی اور وہ بڑے شوق سے یہ چیزیں کھاتی، جن پر اکثر مکھیاں بھنبھنا رہی ہوتیں۔

یہ سوغاتیں اسے اپنے گھر کے کھانے سے بہت زیادہ مرغوب تھیں، جو اکثر تو آس پڑوس کے گھروں سے چھوٹی کٹوریوں میں آئے ذرا ذرا سے سالن کی شکل میں مولوی صاحب کی نذر کیا جاتا یا اماں کے بنائے زیرے میں پکی آلو کی قتلیوں یا ذرا سی دال میں زیادہ پانی ڈال کر پکائے گئے کھانے پر مشتمل ہوتا۔ گھر سے اسکول میں خرچ کرنے کو تو پیسے ملتے نہیں تھے۔ اس لیے استانیوں کی یہ کرم فرمائی سعدیہ کلثوم کو بہت بھاتی تھی۔ وہ اسی طرح اپنا پیٹ بھر لیتی اور اسکول سے واپس آکر اپنے مرغوب کاموں میں مشغول ہو جاتی۔

سعدیہ کلثوم کو زندگی کا دوسرا جھٹکا اس وقت لگا، جب مولوی صاحب کو اپنی تبدیلی کا خط ملا۔ وہ قصبے کی اس چھوٹی سی مسجد سے گاؤں کی مسجد میں تبدیل کر دیے گئے تھے۔ مولوی صاحب اور اماں خوش، جبکہ سعدیہ کا دل اس قصبے اس مانوس محلے اور اس پیارے اسکول کی پیاری استانیوں سے بچھڑ جانے پر بہت غمگین تھا۔ اسے اس گاؤں، مسجد اور گھر سے بغیر دیکھے ہی چڑ ہو گئی تھی۔ جہاں انہیں جانا، کام کرنا اور رہنا تھا۔

☆ ☆ ☆

نومیڈ آرٹ گیلری، ماہ نور کے لیے اچھا تجربہ ثابت ہوئی تھی۔ اس آرٹ گیلری کے ماحول میں جا کر اچانک اسے احساس ہوا تھا، جیسے ایسے ہی ماحول سے، ایسی ہی کسی جگہ سے متعلق تھی اور اب تک وہ بے جگہ زندگی گزارتی آئی تھی۔ اس نے نو آموز مصوروں کی فہرست میں اپنا نام رجسٹرڈ دیکھا اور اس کا دل کسی انجانے وقت کی

آمد کو محسوس کر کے خوش ہونے لگا تھا۔ نومیڈ آرٹ گیلری سے واپسی پر شاہ بانو اور اس نے شہر میں ادھر ادھر گھومنے میں دن گزارا۔ اس پر سے فرقان ماموں کے گھر رہائش کی بے زاری چھٹنے لگی۔

"چلو بھئی اللہ حافظ۔ کل صبح میں جلدی تمہیں لینے آجاؤں گی، سید پور کے لیے۔"

اس شام شاہ بانو نے فرقان ماموں کے گھر کے گیٹ پر اسے ڈراپ کرتے ہوئے کہا تھا اور اس دن کی مصروفیات کی خوش گواری کا یہ اثر تھا کہ اس روز رات تک اسے فرقان ماموں کے ہاں بھی بوریت محسوس نہیں ہوئی۔

☆ ☆ ☆

"سید پور کلچرل شو" کا وہ پہلا دن تھا۔ ماہ نور کو اس منظم گاؤں کا سارا نقشہ بہت ہی متاثر کن لگ رہا تھا۔ اس روز ہنڈی کرافٹس کی نمائش ہو رہی تھی۔ دستکاری اور ہنر مند شاید اتنے پڑھے لکھے نہیں تھے مگر ان کو دیکھنے کے لیے آنے والے لوگ طبقہ اول اور پڑھے لکھے دانشوروں پر مشتمل تھے۔ ماہ نور بھی شاہ بانو کے ہمراہ مختلف ہنر مندوں کو دیکھتی اور ان کے ہنر کے کرشموں کو سراہتی ادھر ادھر پھر رہی تھی۔

"ارے واہ۔ وہ دیکھو! کمہار اپنے چاک پر برتن گھڑ رہے ہیں۔" اچانک شاہ بانو نے ایک نسبتاً "اونچی جگہ کی طرف اشارہ کیا۔

"آؤ دیکھتے ہیں۔" شاہ بانو آگے بڑھ گئی اور ماہ نور اس کا ساتھ دینے کو اس کے پیچھے چل دی۔

"یہ رہا مٹی کا پیالہ۔" ایک کمہار جس کے گرد باقیوں کی نسبت ہجوم زیادہ تھا، کے ساتھ کھڑے اس کے بالکڑے (چھوٹے لڑکے) نے کہا۔ کمہار سفید تہ بند باندھے، سر پر سفید کپڑے کی پگڑی رکھے سر جھکائے اپنے کام میں مشغول تھا۔ اس کے چاک کے پہیے پر رکھا اس کا پاؤں پہیے کو مہارت سے گھما رہا تھا۔

"یہ گلک ہے" بالکڑے نے مٹی کے ایک تازہ تازہ تیار کیے ہوئے گیلے برتن کی طرف اشارہ کیا۔

"اور یہ جگ ہے۔" اس نے ایک لمبے خدوخال کے برتن کی طرف اشارہ کیا۔

"اللہ! اس ان پڑھ، جاہل کمہار کے ہاتھ کتنے خوب صورت ہیں۔"

شاہ بانو کی آواز ماہ نور کے کانوں سے ٹکرائی اور وہ جو غیر دلچسپی سے اس منظر کو دیکھ رہی تھی، چونک کر کمہار کے ہاتھ دیکھنے لگی۔ ہاتھ واقعی چونکا دینے والے تھے۔ لاشعوری طور پر اس کی نظریں ہاتھوں سے ہوتی کمہار کے چہرے پر جا پڑیں اور اسے لگا، اس کا دماغ جیسے گھوم گیا ہو۔ وہ نظر کا دھوکا تھا یا حقیقت۔۔۔ کچھ لمحوں کے لیے اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ سامنے کا منظر، لوگ، آوازیں سب اس کے ذہن میں گڈمڈ ہونے لگے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عنیزہ سید

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی تو اسے لگا جیسے وہ فنکار ہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی اور وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کردیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کررہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور نے "سید پور کلچرل شو" میں شرکت کے لیے اپنی دوست شاہ بانو کے ساتھ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ شاہ بانو نے اپنے بھائی کی معرفت سید پور میں ماہ نور کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا۔ فاطمہ اور خدیجہ نے ماہ نور کو اسلام آباد میں فلزا ظہور سے ملنے کی تاکید کی۔ فلزا ظہور ان کے بچپن کی ساتھی ہے۔ بچپن میں کوئلے سے فرش اور دیواروں پر تصویریں بنانے والی فلزا ظہور اب ایک بڑی آرٹسٹ ہے مگر اسے شہرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔

مولوی سراج اور آپا رابعہ قصبے میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی سعدیہ کلثوم نویں جماعت کی طالبہ بے حد ذہین ہے۔ مولوی سراج اور آپا رابعہ کو اس بات پر فخر ہے کہ ان کی بیٹی سائنس پڑھ رہی ہے۔

ایک رات سارہ نے رکی کو خواب میں دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ سرکس میں کام کرتا تھا۔ رکی اپنے فن کا ماہر جوکر تھا۔

ماہ نور اور شاہ بانو "سید پور کلچرل شو" میں گئیں تو وہاں انہیں ایک کمہار نظر آیا۔ وہ گیلی مٹی کو بہت مہارت سے دیدہ زیب برتنوں کی شکل میں ڈھال رہا تھا۔ ماہ نور کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہ چونک گئی۔ اسے اس پر اسی شخص کا گمان ہوا' جو اسے ہر میلے میں مختلف روپ میں نظر آتا رہا تھا۔

۴

چوتھی قسط

سید پور میلے میں پہلا دن تھا۔ ماہ نور کا ذہن چکرا رہا تھا۔ چاک پر مٹی کے برتن گھڑتے کمہار پر نظر پڑتے ہی اس کے ذہن نے شدید جھٹکا کھایا تھا۔ ماہ نور کمہار کے سامنے کھڑی ایک ٹک اسے دیکھتی چلی جارہی تھی۔

"چلیں۔ اب کچھ کھالیتے ہیں۔" شاہ بانو نے کچھ دیر بعد اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

"ہوں!" ماہ نور چونکی تھی مگر وہاں سے ہلی نہیں تھی۔

"اس برتن کو کیا کہتے ہیں۔" کمہار کے گرد ہجوم ذرا کم ہونے پر اس نے دانستہ آگے بڑھ کر ایک برتن کو چھوتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

"ہاتھ نہ لگانا بی بی!" کمہار کے بالکڑے نے تیزی سے کہا۔ "گیلا ہے۔"

بالکڑے کی بلند آواز پر کمہار نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر ماہ نور کی طرف دیکھا۔ ماہ نور کا خیال تھا کہ اس کی طرح کمہار بھی اس کو دیکھ کر ضرور چونکے گا' مگر اس نے ایک نظر ماہ نور پر ڈالنے کے بعد نظریں جھکا کر اپنا کام دوبارہ شروع کردیا۔ ماہ نور کا ذہن ایک نئی الجھن میں گرفتار ہوگیا۔

"اب چل بھی دو۔" شاہ بانو نے ماہ نور کا بازو کھینچا۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ شاہ بانو کے ساتھ چل رہی مگر نجانے کیوں شاہ بانو کے بھائی تک پہنچتے پہنچتے اس نے کئی بار مڑ کر گیلی مٹی سے برتن گھڑتے اس کمہار کو دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

"چوہدری صیب نے آکھیا اے گول گول تے ایکو جئے گونگلو وکھرے کرلوو۔" (چوہدری صاحب نے کہا ہے کہ گول اور ایک جیسے شلجم الگ کرلو) کھاری نے سبزی دھوتی جنت بی بی کو مخاطب کیا۔

جنت نے ہاتھ روک کر سوالیہ نظروں سے کھاری کی طرف دیکھا۔

"گونگلوواں ری کوئی شپیسل' ہانڈی چاڑھنی اے اج رات دی عوت لئی۔" (شلجموں کا کوئی خاص کھانا بنانا ہے آج رات کو دعوت کے لیے) کھاری نے جنت کو اطلاع دی۔

"تے گاجراں تے ادھیاں کس وی لشہاں نے پانذیر تے چاچے جمالے نیں۔ ادھیوں تھوڑیاں ای پیچھے رہ گئیاں نیں۔" (چاچے جمالے اور بھائی نذیر نے آدھی سے زیادہ گاجریں کدو کش کر بھی لی ہیں)۔ وہ منہ میں آتا پانی نگلتا بولا۔

"وے بدنیتا۔" جنت نے ہاتھ نل سے نکلتے پانی کے نیچے کرکے ان کی مٹی چھڑاتے ہوئے کہا۔ "تیرا دھیان ہر ویلے کھان پین ول ای کیوں رہندا اے۔" (تیرا دھیان ہر وقت کھانے پینے کی طرف ہی کیوں رہتا ہے)

"دھیان ای رہندا اے نا' کیہڑا میں کھاپی لیندا آں۔" (دھیان ہی رہتا ہے نا' کون سا میں کھاپی بھی لیتا ہوں) کھاری نے نیچی آواز میں کہا۔

"ناویرا نا۔" جنت نے کھاری کو شرمندہ ہوتے دیکھ کر کہا۔ "بندے دی نظر رجی ہونی چاہی دی اے۔" (انسان کی نظر سیر ہونی چاہیے)

"میری نظر رجی ای اے جناب۔" (میری نظر سیر ہی ہے جناب) کھاری تیزی سے بولا۔ "میں نے کدی اکھ چک کے کسی شے ول دیکھیا وی نئیں۔" (میں تو نظر اٹھا کر کسی چیز کی طرف دیکھتا بھی نہیں ہوں)

"ہے شاباش اے۔" جنت نے چادر کے پلو سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے کھاری کو شاباش دی۔ "چلو یہ مٹر کا ٹوکرا اٹھاؤ اور بوریوں میں بھر دو۔"

کھاری نے مٹر سے بھرا ٹوکرا اٹھا کر سر پر رکھا۔ دوسرے ٹوکرے میں سے دھلی دھلائی گاجر نکالی اور اسے کھاتے ہوئے فارم ہاؤس کی طرف چل دیا۔

میں ایتھاں تے ڈھول ملتان اے

وہ بلند آواز میں گا رہا تھا۔

"او نئیں او نئیں۔" پھر اس نے لمحہ بھر کر رک کے خود کو یاد دلایا۔ "اے نئیں گانا۔" اس نے خود کو یاد دلایا اور دوبارہ سے چلنے لگا۔

اوکھے پینڈے لمیاں نے راہواں عشق دیاں
لکھ نہ چھڈے دیکھ وفاواں عشق دیاں
(عشق کے راستے دشوار اور مشکل ہیں عشق بندے کے پلے کچھ نہیں چھوڑتا)

گلاب کے پودوں کی کٹائی کرتے افضل اور سعید نے کھاری کی بات سنی اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیے۔

"شیدائی ہے بے چارہ۔" افضل نے کہا۔

"جیسا بھی ہے فارم کی رونق اسی کے دم سے ہے۔" سعید نے ہاتھ روک کر دم لیتے ہوئے کہا۔

"چوہدری صاحب نے بڑی شفقت رکھی ہوئی ہے اس پر۔" افضل نے مشاقی سے قینچی چلاتے ہوئے کہا۔

"بڑی نیکی ہے۔ بے چارے کا نہ کوئی آگا ہے نہ پیچھا۔ یہ فارم ہی اس کا گھر اور فارم پر کام کرنے والے ہی اس کے گھر والے ہیں۔" سعید نے خیال ظاہر کیا۔

"او فارم چھوڑو پورا پنڈ ہی اس کا دوست ہے۔" افضل ہنسا۔

"اللہ خوش رکھے اس کو۔" سعید نے قینچی بند کرتے ہوئے کہا۔

پھلاں ورگی جندڑی عشق رلا چھڈ دا
سر بازار جالے عشق نچا چھڈ دا

(پھولوں جیسی زندگی کو عشق خوار کر دیتا ہے عشق کے لیے سر بازار ناچنا پڑے تو بھی ناچتا ہے)

افضل اور سعید کی گفتگو سے لاعلم کھاری راستہ بھر تانیں اڑاتا چلا جا رہا تھا۔

✲ ✲ ✲

"تم اتنی اپ سیٹ کیوں نظر آ رہی ہو ماہ نو!" شاہ بانو نے سید پور سے واپسی پر پریشان ہوتے ہوئے اسے پوچھا۔

"کیوں ماہ نور۔ کوئی ہٹو (ناگوار) چیز دیکھ لی کیا؟" شاہ بانو کے بھائی عبید نے بھی اس کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں ایسا تو کچھ نہیں ہے۔" وہ جو مسلسل گاڑی کے شیشے سے باہر گزرتے مناظر پر غیر حاضر دماغی کے ساتھ نظریں ٹکائے بیٹھی تھی ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ شاہ بانو اور عبید کن انکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے کسی الجھن کا شکار ہوں۔

ماہ نور نے ہاتھ پھیر کر اپنے بال سیدھے کیے چہرے پر ہاتھ پھیرے اور پھر شاہ بانو کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

"ارے کیا ہو گیا ہے۔" اس نے کہا۔ "شاید میں تھوڑا تھک گئی ہوں۔" اس نے اپنے تئیں دلیل دینے کی کوشش کی۔

"ہمم۔" شاہ بانو نے بے یقین نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے شانے اچکائے۔

"شاید ماہ نور کو آج وہاں کچھ اپنی مرضی کے مطابق نہیں نظر آیا۔ کل اسے مزا آئے گا کل دن میں ایگزیبیشن اور رات میں میوزیکل نائٹ ہوگی۔" عبید نے موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

"مجھے آج بھی بہت مزا آیا۔" ماہ نور نے اپنی آواز میں وہ کھنکناہٹ پیدا کرنے کی شعوری کوشش کی جو اس کے لہجے کا حصہ تھی۔ "یہ بہت بڑا چیلنج ہے۔ میں نے اس سے پہلے انسانی کاوش کے ہاتھوں اس طرح آباد ہوا شہر نہیں دیکھا تھا۔ اٹس وانڈر فل! بہت منظم بہت خوبصورت۔"

"مگر سید پور کے مقامی لوگ اس انسانی کاوش سے خوش نہیں ہیں ان کی آزادی متاثر ہوئی ہے۔" عبید نے کہا۔

"ہاں یہ ان کا پوائنٹ بڑا ویلڈ (صحیح) ہے۔" شاہ بانو کہہ رہی تھی۔

وہ دونوں بہن بھائی اسی موضوع پر بات کرنے لگے۔ ماہ نور کے ذہن پر وہ منظر پھر ابھرنے لگے۔ وہ ان مناظر کے درمیان تعلق جوڑ رہی تھی۔ منطق کی رو سے ان مناظر کا آپس میں کوئی تعلق نہیں بنتا تھا۔ نہ ان مناظر کے پس منظر ایک سے ہے نہ جائے وقوع ایک سی تھیں۔ پھر اس کا ذہن بار بار کیوں اٹکتا تھا۔ وہ خود سے سوال کرتی اپنے آپ سے الجھتی گھر تک پہنچی تھی۔ اس رات وہ ایک لمحہ کے لیے بھی سو نہ سکی تھی۔ اسے بچپن سے ہی پہیلیوں جگسا پزلز اور بھول بھلیوں جیسے کھیلوں سے چڑ سی تھی۔ اخبار میں بچوں کے مضمون اور بچوں کے رسائل میں بھی اس قسم کے صفحات سے اسے چڑ محسوس ہوتی تھی جن میں راستہ ڈھونڈنے اور خزانے تک پہنچنے کی سرخیاں لگی ہوتی تھیں۔ اسے مسٹری موویز اور ایڈونچر فلمیں بھی کچھ زیادہ پسند نہیں تھیں۔ ایسی چیزوں کے بجائے اسے نقطے ملا کر اشکال بنانے والے کھیل زیادہ پسند تھے اور کامیڈی موویز اور رومانٹک فلمیں دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ بھول بھلیوں کے کھیل اور سسپنس کہانیوں میں اس نے کبھی دماغ نہ کھپایا تھا مگر اب اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا سامنا ایک راستہ ڈھونڈ کر خزانے تک پہنچنے والے کھیل یا جگسا پزل کے ٹکڑے ملا کر تصویر بنانے والے چیلنج سے ہو گیا تھا اور وہ چاہنے کے باوجود اپنے ذہن کو اس صورت حال میں الجھنے سے بچا نہیں پا رہی تھی۔

✲ ✲ ✲

"یہ عارف خان ہے یہ ہی تمہارا باپ ہے یہ ہی تمہاری ماں۔"

جب اس نے ہوش سنبھالنے کے بعد لفظوں کو سمجھنا سیکھا تو اسے بتایا گیا۔ وہ شخص جس کی شکل سے وہ مانوس تھی جس کے چہرے پر اس کے لیے نرمی اور محبت تھی اسے بتایا گیا تھا کہ وہ اس کا باپ تھا۔ اسے اس بات کو مان لینے میں کوئی تامل نہ ہوا۔ لفظ باپ کا جو مطلب وہ سمجھتی تھی عارف خان اس پر پورا اترتا تھا۔

"تم پری ہو پری.... جس کے ہاتھ میں جادو کی چھڑی ہوتی ہے۔ جادو کی چھڑی جس کے ایک سرے پر ستارہ بنا ہوتا ہے۔" عارف خان نے اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے اسے بتایا تھا۔

"فیریز وینڈ (پری کی چھڑی۔)" مسز پیٹر نے بہت دن بعد جب اسے اس کتاب میں سے پری کی چھڑی کی تصویر دکھائی جس میں پیاری پیاری چیزوں کی رنگین تصاویر تھیں تو وہ کتنی ہی دیر پلکیں جھپکائے بغیر پری کی چھڑی کی تصویر دیکھتی رہی تھی۔ وہ چھڑی سنہری رنگ کی تھی جس کے ایک سرے پر سنہری ستارہ بنا ہوا تھا اور جس میں سے سنہری روشنیوں کے جھماکوں کے عکس ادھر ادھر جاتے دکھائی دے رہے تھے۔

"تو کیا میں ایسی چھڑی والی پری ہوں؟" کافی دیر بعد اس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے خود سے سوال کیا تھا اور مسز پیٹر سے پریوں کے بارے میں پوچھنے لگی۔ پریاں جن کی چھڑیاں گھمانے سے ناممکن ممکن ہو جاتا ہے۔

اس نے عارف خان سے خود کے لیے چھڑی والی پری کا خطاب سنا تھا اور مسز پیٹر سے پریوں کے کرشموں کے ناقابل یقین اور ناقابل فراموش واقعات سنے تھے اور کبھی کبھی سوچنے پر اسے ایسا لگتا جیسے عمر بھر جو وہ کرتی رہی وہ خود کو اور اپنے ___ دیکھنے والوں کو یہ باور کرانے کے لیے کرتی رہی کہ وہ واقعی ایک ایسی پری ہے جو ناممکن کو ممکن کر دکھاتی ہے۔

"ہم اسکول کی کتابیں بھی پڑھیں گے اور اپنے کام کو بھی سیکھیں گے۔" وہ تھوڑی اور بڑی ہوئی تو عارف بابا نے اسے بتایا۔

"ہم کون سے اسکول جائیں گے؟" اس نے معصومیت سے پوچھا تھا۔

"ہم سیلانی لوگ ہیں پری!" عارف خان بابا نے اس کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔ "ہم ایک جگہ تھوڑی رکتے

ہیں ہم تو شہر در شہر، بستی در بستی گھومتے ہیں، اس لیے ہم کسی اسکول میں بھی نہیں جائیں گے۔"

"تو پھر ہم اسکول کی کتابیں کیسے پڑھیں گے؟" وہ حیران ہوئی تھی۔

"میں پڑھوں گا اور تم کو بھی پڑھاؤں گا۔" عارف بابا نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے یقین دلانے کے سے انداز میں کہا۔

"اور مسز پیٹر بھی تو ہیں۔" پھر عارف بابا نے اسے یاد دلایا تھا۔

"مگر وہ تو کھانا بناتی رہتی ہیں اور جانوروں کو نہلاتی ہیں، ان کو برش بھی کرتی ہیں۔" اسے مسز پیٹر والا آئیڈیا سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"ارے بابا! وہ بہت پڑھی لکھی عورت ہے۔" عارف بابا نے اسے تسلی دی۔ "وہ جو بڑا سا ٹرنک اس کے پاس ہے نا، اس میں ڈھیر سی کتابیں ہیں، وہ کتابیں وہ تم کو پڑھائے گی۔"

پری، عارف خان بابا کی یہ باتیں سن کر آنے والے دنوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا دیکھنے لگی تھی، جن میں مسز پیٹر کے ٹرنک میں دھری تصویروں والی ساری کتابیں اس نے ایک ایک کر کے پڑھ ڈالی تھیں اور عارف خان بابا سے وہ سب بھی سیکھ لیا تھا، جو اس کو ہر حال میں سیکھنا ہی تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ پہلی بار بس پر بیٹھی تھی۔ اس سے پہلے اس نے اپنے گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر کئی بار پچھلی سڑک سے گزرتی اکا دکا لاریوں کو دیکھا تھا۔ اسے یہ لاریاں کچھ اتنی اچھی نہیں لگتی تھیں کیونکہ وہ دھواں بہت زیادہ چھوڑتی تھیں اور ان میں اکثر ان کی گنجائش زیادہ مسافر لدے ہوتے تھے۔ اکثر مسافر چھتوں پر بھی بیٹھے ہوتے تھے۔ اسے لگتا کہ مسافروں کی زیادتی کی وجہ سے یہ ایک طرف کو جھکی جاتی ہیں اور شاید ایک طرف جھکتے جھکتے کبھی یہ الٹ جائیں اور سارے مسافر گر جائیں۔ وہ خود کبھی لاری پر نہیں بیٹھی تھی۔ اس نے بہت عرصے تک اس بات پر کبھی غور ہی نہیں کیا تھا کہ وہ خود، اس کی اماں اور ابا کبھی کہیں نہیں جاتے۔ اس نے کبھی اپنے ماں، باپ سے یہ سوال ہی نہیں کیا تھا کہ کیا ان کے کوئی رشتے دار عزیز، دوست ایسے نہیں ہیں، جن سے ملنے جانے کے لیے انہیں لاری یا رکشا پر بیٹھنا پڑے۔ اس نے کبھی اس بات پر بھی غور نہیں کیا تھا کہ ان کے گھر کبھی کوئی خالہ، ماموں، نانا، نانی، چچا، تایا، پھوپھی یا دادی، دادا قسم کے رشتے دار کیوں نہیں آتے۔ وہ اپنے اس پہلے سفر سے قبل اپنی ہی ایک الگ دنیا میں مست تھی۔ اسی لیے شاید اس پہلے سفر کے تصور، اپنی رہائش گاہ بدل جانے کے خیال اور عزیز ترین سہیلیوں کے چھوٹ جانے کے احساس تلے وہ سفر سے کئی دن پہلے ہی تھکی ہوئی اور نڈھال تھی۔

گھر کا مختصر سامان ایک تانگے میں پورا آگیا تھا۔ دوسرے تانگے میں وہ اماں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ابا سامان والے تانگے پر کوچوان کے ساتھ بیٹھے تھے۔ محلے کی تمام خواتین، بچے اور بچیاں، اماں اور اسے رخصت کرنے کے لیے مسجد کی دہلیز سے بڑی سڑک تک قطاروں میں موجود تھے۔

خواتین اماں کے گلے لگ کے آنسو بھی بہا رہی تھیں۔ سب کا خیال تھا کہ وہ اماں کے پڑھائے سبق اور نصیحتیں کبھی بھلا نہ پائیں گی۔ کسی کو اماں کی سلائی کا انداز یاد آرہا تھا، کسی کو ان کے ہاتھ کے ڈالے اچار، چٹنیوں اور مربوں کا ذائقہ یاد آرہا تھا، کسی کو ان کے وہ مشورے یاد آرہے تھے، جو ہر مشکل وقت میں ان کے کام آئے۔

اماں کی گوناگوں صلاحیتوں اور خوبیوں کا ذکر بھی اسی روز پہلی بار سعدیہ کلثوم کے کانوں میں پڑا تھا۔

محلے کے مرد مولوی سراج سرفراز کو رخصت کرنے کے لیے موجود تھے۔ ان کی روانگی سے ایک روز قبل مولوی

صاحب کے لیے الوداعی محفل کرائی گئی تھی جس میں انہیں ایک عدد نیا سفید جوڑا، سرخ چار خانہ رومال اور سفید ٹوپی کا تحفہ پیش کیا گیا تھا۔ انہیں تلے کا بڑا ہار پہنایا گیا اور ان کے اس مسجد میں گزرے وقت میں ان کی کارکردگی پر خراج تحسین بھی پیش کیا گیا تھا۔ اس پذیرائی پر مولوی سراج سرفراز کی آنکھیں احساس تشکر سے بھر آئی تھیں۔ ان کی مسکین اور عاجز سی شخصیت کے لیے یہ اعزاز خلاف توقع تھا۔ وہ اہل محلہ کے مشکور ہوتے ہوئے گلوگیر ہو گئے تھے۔

وقت رخصت بھی مولوی سراج سرفراز شانے پر رکھے زرد چار خانہ رومال سے بار بار اپنی نم آنکھوں کو پونچھ رہے تھے۔ وہ ایک انجان منزل کے مسافر بننے والے تھے، جہاں خدا جانے ان کے لیے کتنی مشکلات تھیں اور کتنی آسانیاں۔

تانگا ایک جھٹکے سے عازم لاری اڈہ ہوا اور سعدیہ کلثوم نے بڑی سڑک سے آگے کے منظر پہلی بار اور شاید آخری بار ہی دیکھنے شروع کیے۔ وہ گھوڑے کی ٹاپوں پر کان دھرے، راستے میں آنے والی دکانوں، گھروں اور دفتروں کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھی۔

"کاش! پہلے پتا ہوتا کہ بڑی سڑک سے آگے یہ سب کچھ ہے تو کیوں نہ میں کھیلتی کھیلتی سب کو لے کر ادھر ہی آنکلتی۔"

اس نے تانگے کی سواری کے دوران بارہا سوچا تھا۔ جس طرح کے جھٹکے کے ساتھ گھوڑا دوڑنا شروع ہوا تھا، ویسا ہی جھٹکا کھا کر ایک جگہ جا کر رک گیا اور اس نے سعدیہ کو اس کے خیالوں کی دنیا سے نکال باہر پھینکا۔ سعدیہ نے چونک کر دیکھا۔ اس کا کندھا اماں کے آہنی شکنجے جیسے ہاتھ کی گرفت میں تھا۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ سعدیہ بے دھیانی میں جھٹکا کھا کر کہیں نیچے ہی نہ لڑھک جائے۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" اس نے اماں سے پوچھا اور سیاہ برقعے کے دوہرے نقاب تلے چھپے ان کے چہرے کے تاثرات جاننے کی کوشش کرنے لگی۔

"آہستہ بول۔ آواز کا بھی پردہ ہوتا ہے۔" اماں نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

سعدیہ نے کچھ دیر اماں کے کہے الفاظ پر غور کرنے کے بعد سمجھ نہ آنے پر اپنا دھیان دوسری طرف کر لیا۔ سامان والا تانگہ ان سے پہلے یہاں پہنچ چکا تھا اور ابا اس سے نیچے اتر کر سامان اتروا رہے تھے۔ سعدیہ نے دیکھا ایک روغن اڑے سنگ میل پر "لاری اڈا" کے مٹے مٹے الفاظ نظر آرہے تھے۔

"او تو یہ لاری اڈہ ہے۔" اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوچا۔

لاری اڈے کے قریب ہی نہر کا پل تھا۔ سعدیہ نے پانی سے لبالب بھری وہ چوڑی اور لمبی نہر بھی اس روز پہلی بار دیکھی تھی۔ نہر کے کنارے بہت سے لوگ موجود تھے۔ وہ جون کا ایک چلچلاتا دن تھا۔ جب سورج صبح نو بجے ہی سوا نیزے پر محسوس ہو رہا تھا۔ بہت سے لڑکے، جانگیہ پہنے نہر میں چھلانگیں لگانے اور باہر نکلنے میں مشغول تھے۔ نہر کے کنارے سبز تربوزوں کا ڈھیر لگا تھا۔ بہت سے تربوز کنارے کے ساتھ ساتھ بہنے والے پانی کے اندر بھی رکھے ہوئے تھے۔

"کیا یہ تربوز نہر میں بہائے جاتے ہیں؟" سعدیہ کے ذہن میں ایک اور ایسا سوال آیا جو اسے کسی سے نہیں پوچھنا تھا۔

پھر دھواں چھوڑتی، شور مچاتی، کھڑکھڑاتی، نیلے، سرخ اور سبز رنگوں سے مزین ایک ویسی ہی لاری اڈے پر آکر رک گئی، جیسی سعدیہ اپنے گھر کی چھت سے دیکھا کرتی تھی۔ بس میں بیٹھے کچھ مسافر اتر رہے تھے۔ سعدیہ کے ابا

اور ایک آدمی نے مل کر تیزی سے سعدیہ کے گھر کا سامان لاری کی چھت پر منتقل کیا۔ ابا جی نے اماں اور سعدیہ کو لاری میں سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ لاری کا پائدان اونچا تھا اور سعدیہ اس پر چڑھنے سے قاصر۔ ابا جی نے آگے بڑھ کر خود اسے اٹھا کر لاری کے اندر رکھ دیا۔

لاری کے اندر قدم رکھنے تک سعدیہ گن چکی تھی کہ لاری کے بیرونی حصے پر روغن سے سبز رنگ کے بیس مور بنے ہوئے تھے اور اس کے پچھلے شیشے پر دو بڑے بڑے پرندے اڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ پچھلے شیشے پر "حافظ خدا تمہارا" کے الفاظ بھی درج تھے۔

سعدیہ اور اس کی اماں کو دو ایسی سیٹوں پر بٹھایا گیا جہاں سے ڈرائیور' ڈرائیور کے سامنے کا شیشہ اور اس بڑے شیشے سے پار کے منظر بھی دکھائی دے رہے تھے۔ سعدیہ کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی اور اس کھڑکی کا شیشہ بند تھا۔ وہ پسینہ میں نہائی ہوئی تھی اور اسے سخت پیاس لگ رہی تھی۔

اس نے اگلی سیٹ کے مسافر کی تقلید کرتے ہوئے بند شیشے کو پیچھے کھسکایا اور گرم ہوا کے جھونکے سے فیض یاب ہوئی۔ کھڑکی کے شیشے سے مریل مریل آموں کی ریڑھیوں والے' پکوڑوں کے ٹھیلوں والے اور بڑے بڑے کولر اور گلاس تھامے "ٹھنڈا شربت" کا نعرہ لگاتے ہوئے لوگ صاف نظر آ رہے تھے۔

ٹھنڈے شربت کے کولر کو دیکھ کر سعدیہ نے اپنے پیاس سے سوکھتے لبوں پر زبان پھیری اور اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ انہیں متوجہ نہ پا کر اس نے دوبارہ کھڑکی سے پار دیکھنا شروع کر دیا۔

اسی وقت لاری ایک جھٹکے سے چلنا شروع ہوئی۔ سعدیہ نے گھبرا کر لاری کے سارے مسافروں پر نظر ڈالی' اس کے ابا جی کہاں تھے۔ وہ سوار بھی ہوئے تھے کہ نہیں۔ پچھلی سیٹوں میں سے ایک پر بیٹھے ابا جی نظر آئے تو اس کی جان میں جان آئی۔ اب لاری نہر کے ساتھ ساتھ بھاگتی چلی جا رہی تھی اور اس کے پیچھے سے اگلتے دھوئیں کے بادل دائیں بائیں بکھرتے بھی نظر آ رہے تھے۔ سعدیہ' اماں اور ابا انجان منزل کے مسافر تھے اور تینوں کی نظریں راستے پر تھیں۔ کون جانے کب اچانک منزل آجائے اور ان کا سفر ختم ہو جائے۔

☼ ☼ ☼

اگلا دن تصویری نمائش کا دن تھا۔ ماہ نور نے اس خاص دن کے لیے خصوصی کپڑے بہت شوق سے بنوائے تھے۔ ایک مصورہ کی حیثیت سے یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ بہت اچھی طرح اس سے گزرنا چاہتی تھی لیکن کل کی الجھن اس کے ذہن سے نکلی نہیں تھی۔ وہ بے دلی سے تیار ہوتی رہی۔ تیار ہونے کے بعد اس نے خود کو آئینے میں دیکھا رسٹ کلر کی لمبی قمیص اور رسٹ اور سیاہ اسکارف کا گہرا رنگ اس کے چہرے کی اتری رنگت کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے۔ اس نے شاہ بانو کے سوالوں سے بچنے کے لیے ہونٹوں پر قمیص سے ہم رنگ لپ اسٹک سجائی اور کانوں میں سیاہ آویزے بھی پہن لیے۔ لیکن ابھی بھی اسے لگ رہا تھا کہ شاہ بانو سوال کیے جائے گی اور وہ اس کے کسی سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دے پائے گی۔

نومیڈ آرٹ گیلری سید پور میں اس روز گمنام مصورین کا راج تھا۔ وہ سب اپنی پہلی نمائش کے لیے پرجوش نظر آ رہے تھے۔ ماہ نور کے چار کول امیجز (تصویریں) ایک کونے میں رکھی تھیں۔ نمائش دیکھنے والوں میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ' پیشہ ور فوٹو گرافرز' پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے لوگ موجود تھے۔ ماہ نور خاصی پراعتماد شخصیت کی مالک تھی مگر اس روز اسے ایسا لگ رہا تھا وہ یہاں جس حیثیت میں متعارف ہو رہی ہے وہ اس کی نہیں ہے' جیسے وہ یونہی کہیں آ گئی ہو۔ نقاد اور تبصرہ نگار اس سے اس کی پینٹنگ کے بارے میں سوال

پوچھ رہے تھے اور وہ حیرت انگیز طور پر اپنی توقع کے بالکل برعکس جواب بھی دے رہی تھی مگر اسے اپنا ذہن اس جگہ حاضر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

"ایسا لگ رہا ہے جیسے میں کسی سحر میں جکڑی ہوئی ہوں۔ مگر وہ کون ہے۔ جس نے مجھے اس سحر میں مبتلا کر رکھا ہے' وہ کیا ہے؟" وہ وقفے وقفے سے سوچ رہی تھی۔

"کیا آپ یہ اسکیچ بیچیں گی؟" وہ اسی غیر حاضر ذہن کے ساتھ کھڑی تھی جب کسی نے اسے مخاطب کیا۔ ماہ نور نے سر کو ہلکا سا جھٹک کر مخاطب کرنے والے کی طرف دیکھا۔ صبح سے اب تک وہ اپنے ہر مخاطب کے سوال کا جواب حاضر جوابی سے دیتی رہی تھی۔ لیکن اس وقت اسے لگا کہ اس کا ذہن سپاٹ ہو گیا ہے' اس پر جواب کے لیے کوئی لفظ درج ہی نہیں ہو رہا تھا۔

"یہ Silhouette (ہلکے رنگ کے پیش منظر میں گہرے رنگ کی تصویر) امیزنگ ہیں۔" اس کا مخاطب کہہ رہا تھا۔

"میں کسی آرگنائزر سے کہہ کر وقتی طور پر اس پر فروخت شدہ کا ٹیگ لگوا سکتا ہوں' قیمت ہم بعد میں طے کر لیں گے۔" ماہ نور اس کی بات سن رہی تھی مگر اس کا ماؤف ہوتا ذہن اس کے الفاظ کے مفہوم سے قاصر تھا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹی اور وہاں رکھے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اس کو یوں بیٹھتے دیکھ کر شاہ بانو جو دور کھڑی کسی سے باتوں میں مصروف تھی' اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ادھر کو لپکی۔

"کیا ہوا۔ تم ٹھیک ہو نا؟" اس نے ماہ نور کے قریب آ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ماہ نور نے سر اٹھا کر شاہ بانو کی طرف دیکھا اور اسے تسلی دینے کے لیے سر ہلایا۔ شاہ بانو نے گردن موڑ کر اس شخص کی طرف دیکھا' جو ماہ نور کے سامنے کھڑا تھا۔

"میں ان سے اس اسکیچ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔" شاہ بانو کو اپنی طرف دیکھتے دیکھ کر اس نے وضاحت کی۔

"جی کیا پوچھنا تھا آپ کو؟" شاہ بانو نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"یہی کہ اگر یہ اسے بیچنا چاہیں تو میں انہیں اس کی منہ مانگی قیمت دے سکتا ہوں۔"

شاہ بانو نے بے یقینی سے اس لڑکے کی طرف دیکھا۔ "اس کا دماغ چل گیا ہے شاید۔ ایک نو آموز آرٹسٹ کے ناپختہ سے کام کی منہ مانگی قیمت!" اس نے سوچا۔

"آپ بعد میں سوچ کر بتا دیجیے گا۔" وہ لڑکا ماہ نور سے مخاطب ہوا۔ "ابھی صرف اتنی اجازت دے دیجیے کہ میں اس پر سولڈ کا ٹیگ لگوا دوں۔"

شاہ بانو نے ماہ نور کا رد عمل جاننے کے لیے اس کی طرف دیکھا۔ ماہ نور نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"او تھینکس۔" لڑکا خوش ہو کر بولا۔ وہ اتنا خوش نظر آ رہا تھا جیسے اسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ وہ تیز قدموں سے چلتا ہال کے دوسرے سرے پر چلا گیا تھا۔ اسے کسی آرگنائزر سے ملنا تھا شاید۔

"تم بہت خوش قسمت ہو ماہی!" شاہ بانو متاثر ہوتے ہوئے بولی۔

"پہلی ایگزیبشن کے پہلے دن منہ مانگی قیمت پر سیل ہو گیا تمہارا کام۔"

ماہ نور خاموش بیٹھی سامنے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں اسی جگہ ٹکی تھیں' جہاں وہ لڑکا کھڑا کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس کے ذہن کے پردے پر کئی منظر ابھر اور غائب ہو رہے تھے۔

"ماہی!" شاہ بانو نے اس کے شانے کو جھنجوڑا۔ "لگتا ہے تم حیرت اور خوشی کے مارے بے ہوش ہونے والی ہو۔" اس نے کہا اور بیگ سے اپنا سیل فون نکالا۔ "ٹھہرو! میں عبید بھائی کو یہ بریکنگ نیوز دے دوں۔"

شاہ بانو کے بھائی عبید کو بھی یہ خبر اپنی کامیابی محسوس ہو رہی تھی۔

"دیکھو۔ یہ ماہ نور منع کررہی تھی کہ اسے اپنا کام ایگزیبیشن میں نہیں رکھنا۔" وہ باربار کہہ رہے تھے۔

"اسے کہتے ہیں اچانک کامیابی ملنا۔" شاہ بانو بھی بہت خوش تھی۔

"لیکن مجھے تو یہ اسکیچز نہیں بیچنے تھے۔" دوپہر کے کھانے کے بعد ماہ نور کا ذہن تھوڑا ٹھکانے پر آیا تو اس نے کہا۔

"لو بھلا۔" شاہ بانو کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ "کیوں نہیں بیچنے تھے۔" اس نے سوال کیا۔ "اور اگر نہیں بیچنے تھے تو اس وقت سر کیوں ہلا دیا تھا جب وہ لڑکا تم سے کہہ رہا تھا اس پر سولڈ کا ٹیگ لگا دو۔"

"پتا نہیں۔" ماہ نور نے کوک کا آخری گھونٹ حلق میں انڈیلا اور گلاس پر چمکتے پانی کے قطروں کو انگلی سے مٹانے لگی۔

"یہ تو بہت عجیب اور غلط بات ہے۔" شاہ بانو خفگی سے بولی۔

"بے اصولی کی بات ہے بلکہ۔" عبید بھی جھلا کر بولا۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ اسے میں یہ اسکیچ دوں گی نہیں۔" ماہ نور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے یہ کہا کہ میں اسے بیچوں گی نہیں۔"

شاہ بانو نے اس کی بات سن کر ہونٹ بھینچ لیے۔

"یعنی تم اسے یہ اسکیچ تحفتاً" پیش کروگی؟" شاہ بانو نے ماہ نور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جسے تم جانتی ہو نہیں اور جو کہیں دور دراز سے بھی تمہارے مامے' چاچے کا پتر نہیں۔"

"کیا ہے بھئی۔" ماہ نور نے اکتا کر جواب دیا۔ "نہیں بیچنے مجھے' مجھ سے غلطی ہوگئی جو بغیر سوچے سمجھے سر ہلا دیا۔ اب اس غلطی کو کسی طریقے سے نبھانا تو ہے۔ آپ..." اس نے عبید کی طرف دیکھا۔

"عبید بھائی پلیز' اس سے کوئی قیمت ومیت نہیں لیجیے گا۔ بس اس کو دے دیجیے گا۔"

"تم ہوش میں تو ہو؟" شاہ بانو نے زور سے اس کے بازو کو جھٹکا دیا۔ "منہ مانگی قیمت دے رہا ہے وہ پاگل!" اس نے ماہ نور کو یاد دلانا چاہا۔

"وہ بے وقوف ہے۔" ماہ نور ہلکا سا مسکرا کر بولی۔ "ایسے ناپختہ کام کی منہ مانگی قیمت دینے کا کہہ گیا ہے۔ شاید اس کے پاس بہت فالتو پیسہ ہے۔"

"اگر وہ بے وقوف اور فضول خرچ ہے تو پھر میں بھی اتنی مین (لالچی) نہیں ہوں کہ بے سبب پیسے لے لوں اس سے۔ مجھے اپنے کام کی ورتھ (قیمت) کا خوب اندازہ ہے۔"

"تمہارا دماغ چل گیا ہے ماہی!" شاہ بانو خفا ہوگئی۔ "پیسے مل رہے ہیں تمہیں' تم ان پیسوں سے اتنے مزے کر سکتی ہو کہ حد نہیں۔"

"میں ابھی بھی مزے کررہی ہوں۔" ماہ نور نے بے نیازی سے کہا۔

"اتنے کہ حد نہیں۔" اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ اوپن ایر ریسٹوران ملکی' غیر ملکی لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ غیر ملکی لوگوں کے لیے یہ ریسٹوران پاکستانی دیہی ثقافت کا آئینہ دار تھا اور وہ یہاں آکر خوش نظر آرہے تھے۔

"ایک بار پھر سوچ لو میری بہن!" تھوڑی دیر کے بعد شاہ بانو اپنی خفگی جھٹک کر پیار سے بولی۔

"اس میں سوچنے کی تو بات ہے ہی نہیں۔ میں نے کبھی کوئی چیز فروخت کرنے کا سوچا ہی نہیں۔ یہ میرے بچپن کا کام ہے' جسے میں نے یوں ہی موقع ملنے پر نمائش کے لیے رکھ دیا۔ سوچا تھا ایک دن کے لیے ذرا سا اہم بن جانا کیسا لگتا ہے' یہ جان لوں گی۔ میں یہاں خریدنے بیچنے کے لیے نہیں آئی تھی۔" ماہ نور نے حتمی لہجے میں جواب

دیا۔

"بچپن کا نہیں لڑکپن کا۔" شاہ بانو نے ناراضی کے باوجود تصحیح کی۔

"جو بھی ہے۔" ماہ نور نے شانے اچکائے۔ "عبید بھائی! آپ کے پاس اگر اب آئے اسکیچ لینے تو اسے بس دے دیجیے گا۔" اس نے ایک بار پھر عبید سے اپنی بات دہرائی۔ وہ دونوں بہن بھائی یقیناً" اس کی عقل کا ماتم کررہے تھے۔ جب ہی دونوں بالکل خاموش ہوگئے۔

وہ سہ پہر اور شام انہوں نے سید پور گاؤں کے مقامی لوگوں سے ملنے میں گزار دی۔ تھوڑی دیر کی خفگی کے بعد شاہ بانو کا موڈ خود ہی ٹھیک ہو گیا تھا اور وہ بھی ان لوگوں سے محو گفتگو تھی۔

"ان لوگوں کے مسائل سننے والے کان لگتا ہے' بالکل بند ہیں۔" واپس میلے والی جگہ کی طرف آتے ہوئے ماہ نور نے کہا۔

"ہاں۔ وہ کان تو اسی پلینڈ ولیج (ایک منصوبے کے تحت بسائے گئے گاؤں) کی پروموشن کی تعریف سننے میں مشغول ہیں۔ یہاں آئے دن ڈھول بجتے اور تماشے ہوتے ہیں۔ غیر ملکی سیاحوں کو ثقافت کے نام پر تفریح مہیا کرکے پیسہ کمایا جارہا ہے۔ ان لوگوں کی آواز سننے والے لوگ کہاں۔" شاہ بانو نے کہا۔

"ویسے ماہی!" پھر شاہ بانو رک کر بولی۔ ماہ نور نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"کتنا ہینڈسم تھا وہ لڑکا جو منہ مانگی قیمت دے رہا تھا اسکیچ کی۔" شاہ بانو کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ماہ نور کی نظروں کے سامنے کا منظر یہ بات سن کر ایک بار پھر گڈمڈ ہونے لگا تھا۔ اس کے ذہن نے پھر ایک جھٹکا کھایا تھا۔

"کہیں تم پر لٹو تو نہیں ہو گیا؟" شاہ بانو نے شرارت سے ایک آنکھ بند کرکے اس کی طرف دیکھا۔ "کتنی فلمی صورت حال ہے۔ ایک ناپختہ اسکیچ کی منہ مانگی قیمت... ڈیشنگ لڑکا... واہ کیا بات ہے۔"

ماہ نور تیز قدموں سے چلتی شاہ بانو سے آگے چلی گئی۔

"اچھا سوری!" شاہ بانو کو لگا وہ اس مذاق پر ناراض ہو گئی تھی۔ "میں صرف مذاق کررہی تھی بھئی۔"

ماہ نور نے شاہ بانو کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ "کوئی بات نہیں۔"

"کیا بات ہے ماہی... تم کیوں اتنی اپ سیٹ ہو جاتی ہو اچانک۔" شاہ بانو نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں ہے۔" ماہ نور نے سر جھٹکا۔ "چلو' عبید بھائی بلا رہے ہیں۔" اس نے شاہ بانو کے ہاتھ میں پکڑے سیل فون پر کال آتی دیکھ کر کہا۔ وہ دونوں گیلری کی طرف چل دیں۔

"اپنی سیٹس پر قبضہ کرلو۔" عبید نے انہیں دیکھ کر دو کارڈ پکڑائے "میوزیکل نائٹ شروع ہو رہی ہے۔"

☼ ☼ ☼

انہیں ہر کام وقت پر کرنے کی عادت تھی۔ یہ کوشش بھی ان کے مزاج کا حصہ تھی کہ وہ جو بھی کام کریں وہ مکمل ہو' اس میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اپنی اس عادت کو وہ اکثر اپنے ساتھ کام کرنے والوں پر بھی لاگو کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اس حد تک اس کوشش میں کامیاب رہے تھے کہ ان کے ہر پروجیکٹ کا عملہ مستعد اور چوکنا رہتا تھا۔ عملے کا جو رکن ایسا کرنے میں ناکام رہتا تھا' ان کے پاس اس کی مدت ملازمت اکثر بہت مختصر ہوتی تھی۔ گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چلنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اسی لیے ان کے ہر پروجیکٹ کا عملہ "پرفیکٹ پروفیشنلز" پر مشتمل ہوتا تھا۔ ان کے قریبی دوست اور شناسا لوگ ان کے بارے میں اکثر ایک ہی رائے دیتے تھے۔ وہ انہیں پرفیکٹ بزنس مین کا خطاب دیتے تھے۔ وہ کسی کا نقصان کرتے تھے' نہ کسی کو اپنا نقصان کرنے دیتے تھے۔ ان کی شخصیت کی ایک اور خوبی خود اپنا احتساب کرتے رہنا تھا۔ وہ اپنی خامیوں' غلطیوں اور نفع نقصان

کا بھرپور تجزیہ کرتے اور انہیں نہ دوہرانے کے طریقے سوچنے پر کافی غور و فکر کیا کرتے تھے۔
یہ ان کی پیشہ ورانہ زندگی کی خوبیاں تھیں۔ اپنی ذاتی زندگی میں وہ یہ سب اصول و ضوابط لاگو کرنے میں کامیاب رہے تھے یا نہیں' یہ سوچنے کی کبھی بلال سلطان نے دانستہ کوشش نہیں کی تھی۔

✲ ✲ ✲

سنڈریلا' گولڈی لاک' ریڈ رائیڈنگ ہڈ' ہنسل اور گریٹل کی کہانیوں سے مطالعہ کا آغاز کرنے والی پری نے خود اپنے آپ کو ایسی ہر فیری ٹیل (پریوں کی کہانی) میں موجود پایا تھا۔ پریوں کی کہانی کی پری مہربان' خوب صورت' خوش اخلاق' ہر ایک کی مدد کرنے ۔ اور معجزے دکھانے والا کردار تھی۔ پری نے کہانیوں کی پریوں سے بہت کچھ سیکھا۔ مسز پیٹر نے اسے ہندسوں سے بھی متعارف کروایا اور یہ بھی بڑی مزے کی بات تھی کہ مسز پیٹر کے پاس ایسی کتابیں بھی تھیں' جن میں ہندسے انسانی اور جانوروں کی شکلوں میں اپنا آپ متعارف کرواتے تھے۔
ہندسے جو کبھی کہتے ہمیں جمع کرو' کبھی کہتے ہیں' تفریق یا تقسیم کرو۔ کبھی ایک چھوٹا ہندسہ اپنے سے اوپر والے ہندسوں کی طرف اشارہ کرکے کہہ رہا ہوتا ہے' ان کو مجھ سے ضرب دے کر دیکھو یہ کتنے زیادہ ہو جاتے ہیں۔ ان ہی ہندسوں نے کبھی انفرادی طور اور کبھی اکٹھے ہو کر اسے بتایا کہ وزن' رفتار' وقت اور رقبے کے بارے میں ان کے ذریعے کیسے جانا سکتا تھا۔ مسز پیٹر نے ہی اسے زبان سے روشناس کرایا۔ پریوں کی کہانیاں پڑھنے کے بعد اسے انگریزی اور اردو زبان کی ایسی کتابیں پڑھنے کو دیں' جن سے اس کو زبان کے لہجے اور صرف و نحو کا پتا چلا۔ عارف بابا نے اسے مسز پیٹر کے ٹرنک کا خزانہ چاٹ لینے پر لگا دیا' مگر عارف بابا کام کے معاملے میں ست نہیں تھے۔
پری کی دوپہریں مسز پیٹر کے خزانے چاٹنے میں گزرتیں' صبحیں اور شامیں سخت مشقت میں۔ وہ بلیو ہیون سرکس کی بچی تھی' جہاں باہر سے آکر لوگ کرتب دیکھتے تھے اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ اپنے سیکھے ہوئے کرتبوں کا مظاہرہ کرتے تھے' پھر وہ تو پیدا ہی سرکس کی سرگرمیوں کے درمیان ہوئی تھی۔ اسے کرتب سکھانا اور سرکس کا حصہ بنانا لازمی تھا۔ پری کی تربیت چھوٹی چھوٹی گیندیں ہوا میں اچھال کر دوبارہ دبوچنے سے شروع ہوئی تھی۔ وہ ہوا میں گیند اچھالتی مگر دوبارہ پکڑنے سے پہلے ہی گیند ادھر ادھر بکھر جاتی وہ کئی بار گیندوں کو قابو کرنے کی کوشش میں گری' کبھی منہ کے بل' کبھی بازو کے بل اور کبھی چت' کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بھاگتے بھاگتے اس کا سر کسی ستون یا سامنے آنے والے بندے سے ٹکرا جاتا۔ وہ گر کر منہ بسورتی۔ عارف بابا کی آواز اسے دائیں' بائیں' سامنے یا عقب سے سنائی دیتی۔
"یہ تو میجک ہے پری میجک۔ جس کو آجائے' وہ کبھی بھی کسی بھی چیز کو کچھ بھی بنا لیتا ہے۔ انڈے سے طوطا نکال لیتا ہے۔ رومال سے خرگوش اور پیٹ سے کبوتر۔ تم نے تو خود دیکھا ہے عابد انکل اور صائمہ آنٹی کے شوز میں کیا کیا نہیں ہوتا۔"
منہ بسورتی پری کے کان میں پڑنے والی یہ آواز بھی جادوئی اثر رکھتی تھی۔ اپنے چوٹ کھائے اعضا کی تکلیف بھول کر پری اپنی تمام گیندیں اکٹھا کرکے دوبارہ ہوا میں اچھالنے میں مشغول ہو جاتی۔
جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی گیند اچھالنے کا کرتب اس کے سامنے بچہ بنتا گیا۔ بچہ پیچھے رہ گیا اور وہ بڑی سے بڑی ہوتی چلی گئی۔ صرف سات سال کی عمر میں وہ ہاتھی' شیر اور کتے قابو کرکے انہیں اپنی چھڑی کے اشارے پر چلانے' نوکیلی سوئیوں کے بستر پر ہنستے کھیلتے لیٹنے' آگ لگے رنگ میں سے مسکراتے ہوئے گزر جانے اور الماری میں بند ہو کر صندوق سے نکلنے کے کرتب پر مہارت حاصل کر چکی تھی۔
بلیو ہیون سرکس جس شہر میں بھی جاتا' اس کے اشتہاروں اور بینروں پر پری کا ذکر خصوصی طور پر درج ہوتا۔

پری کی تصویریں بھی اشتہاروں پر موجود ہوتیں۔ ہاتھی اور شیروں پر تفاخر کے ساتھ بیٹھی بچی' جو اپنے کرتبوں کے ذریعے تماشائیوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی تھی۔ لوگ مارے تجسس اور شوق کے خاص طور سے اس چھوٹی بچی کے کرتب دیکھنے آتے تھے۔ جو ببر شیر کے جوڑوں کے ساتھ کھلے میدان میں تماشا کرتی تھی اور ہاتھیوں کی پشت پر کھڑے ہو کر ہوا میں لہراتی' قلابازیاں کھاتی' دوبارہ چلتے ہوئے ہاتھی کی پشت پر آن کھڑی ہوتی تھی۔ سرکس کے منتظمین پری کے کرتب عموماً" آخر میں رکھتے تھے تاکہ تماشائیوں کے شوق اور تجسس کو خوب ہوا دے لینے کے بعد اسے سامنے لایا جائے۔
پری کی رِنگ میں آمد تالیوں اور سیٹیوں کے شور میں ہوتی اور جب وہ رِنگ سے نکلتی' اپنے پیچھے تالیوں' نعروں اور سیٹیوں کی گونج چھوڑ کر آتی۔
"پری کی چھڑی لمحہ بھر میں ناممکن کو ممکن کر دکھاتی ہے۔"
عارف بابا کو اپنی ٹریننگ پر فخر محسوس ہوتا تو وہ سینہ پھلا کر اعلان کرتے اور بہت دفعہ ایسا ہوا کہ عارف بابا کی یہ بات سنتے ہوئے کچھ دیر سانس لینے کو ستاتی ہوئی پری ٹریننگ ایریا میں اپنے سامنے موجود جانوروں اور انسانوں کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگتی۔
"تماشا دیکھنے والے لوگوں کو یہ کبھی نہیں پتا چلے گا کہ ان ہاتھیوں' گھوڑوں' شیروں' کتوں اور انسانوں نے اپنے کرتبوں پر مہارت حاصل کرنے کے لیے کتنی مار کھائی' کتنی بار چمڑیاں ادھڑوائیں۔ ان میں کتنوں کے کاسٹیومز کے پیچھے چھپے جسموں پر مار کے کتنے زخم اور کتنے نشان ہیں۔ تماشا دیکھنے والوں کو کبھی پتا نہیں چلتا اور کبھی پتا چلے گا بھی نہیں کہ ان کے سامنے آکر بلی بنے شیر کتنے دن بھوکے رکھے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ اپنا کرتب سیکھنے کی ہار مان لیں۔ ان بڑے بڑے ہاتھیوں کی موٹی سخت کھالیں کہاں کہاں سے ادھڑی ہوئی ہیں اور ان کتوں کے دانت کیسے کمزور کر دیے گئے ہیں۔"
"شش" پھر وہ خود کو یاد دلاتی۔ "تماشا دیکھنے والوں کو کبھی پتا چلنا بھی نہیں چاہیے۔ کیونکہ اگر انہیں پتا چل گیا تو انہیں تماشا بھول جائے گا۔ صرف ظلم یاد رہ جائے گا اور دنیا بھر کے سرکس بند ہو جائیں گے۔"
وہ جیسے خود اپنے کان میں سرگوشی کرتی اور ایسا سوچتے ہوئے خود اس کے اپنے جسم پر نجانے کہاں کہاں تازہ اور مندمل ہو چکے زخموں کا درد اٹھنے لگتا تھا۔ اس کے پیروں کے تلووں میں جلن شروع ہو جاتی۔ ٹریننگ کے دوران پاؤں ایک بار غلط پڑ جانے پر نجانے کتنے بید ان کی نذر کیے جاتے تھے۔
اذیت کا ایک ابال اس کے اندر اٹھتا' جس کو وہ صرف ایک چیز کے تصور سے اندر ہی بٹھا دیتی۔ اور وہ چیز مسز پیٹر کا خزانے سے بھرا ٹرنک تھا۔

✲ ✲ ✲

وہ میوزیکل نائٹ بھی شاید ٹیلنٹ ہنٹ اسکیم (کسی میدان سے متعلق خوبی اور مہارت رکھنے والے لوگوں کی تلاش کا منصوبہ) کے تحت منعقد کی گئی تھی۔ ایک سے ایک ایسا گروپ اسٹیج پر وارد ہو رہا تھا' جس کا پہلے کبھی کسی نے نام سنا تھا نہ گانا سنا تھا۔ ان گروپس کے ساتھ مختلف صوبوں کے روایتی لباسوں میں ملبوس ان کے ساتھی عجیب و غریب رقص بھی کر رہے تھے۔
"ڈانس کم یہ ایکسرسائز زیادہ ہے۔" ایک گروپ کی پرفارمنس دیکھتے ہوئے شاہ بانو نے ماہ نور کے کان میں سرگوشی کی۔
"سب سے ڈبا آئٹم ہے یہ اس میلے کا۔" ماہ نور نے کہا۔ "بہت فضول اور بکواس۔ وقت ضائع کر رہے ہیں ہم

لوگ بس۔"

"اب کیا کریں، پھنس گئے ہیں۔" شاہ بانو نے بے بسی سے کہا۔ ماہ نور نے شاہ بانو کی طرف دیکھ کر ایک لمبا سانس لیا اور پھر اسٹیج کی طرف متوجہ ہوئی جس کے چاروں کونوں سے روشنیاں اٹھ رہی تھیں۔ ایک نیا گروپ سندھ کا کوئی علاقائی گیت سنا رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا یہ گیت انگریزی لہجے میں گا کر اس کی سخت توہین کی جا رہی ہو مگر تماشائیوں میں موجود نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بازو اٹھا اٹھا کر موسیقی کی تال پر رقص کر رہے تھے۔

"ہمارا اخلاقی کلچر تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔" ماہ نور کو خدیجہ آنٹی کی بات یاد آئی اور خدیجہ کی یاد کے ساتھ ہی اسے فاطمہ اور فلزا ظہور بھی یاد آگئیں۔

"کل اس میلے سے فارغ ہو کر شاہ بانو سے کہوں گی کہ فلزا ظہور کا پتا لگاتے ہیں۔" اس نے دل میں سوچا اور کوئلے کے ٹکڑے سے چارکول تک کا سفر کرنے والی فلزا ظہور کے بارے میں سوچنے لگی۔

وہ ان ہی خیالوں میں گم تھی، جب اسے اچانک محسوس ہوا کہ جیسے اس کے اردگرد شور اور کچھ دیر پہلے مچا ہوا ہلڑ تھم سا گیا ہو۔ اس نے چونک کر اپنے اردگرد بیٹھے لوگوں کی طرف دیکھا جن کی متجسس نظریں سامنے اسٹیج پر جمی ہوئی تھیں۔ ان ہی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے اس کی نظریں بھی اسٹیج پر جا رکیں۔ اسٹیج پر اپنے اپنے ساز سجائے دو لڑکے کھڑے تھے اور ان سے آگے مائیک کے ساتھ جو لڑکا کھڑا تھا۔ اس نے سیاہ شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کے گلے میں تہہ کی ہوئی سفید چادر لٹک رہی تھی اور سر پر کس صوبے کی علاقائی ٹوپی تھی۔ اس کا اندازہ ماہ نور کو نہیں ہو سکا۔ اس لڑکے کے چہرے پر سیاہ چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی سجی تھی۔

"میری آپ لوگوں سے صرف اور صرف ایک ریکویسٹ ہے۔ ہماری پرفارمنس کے دوران خاموش رہنے کی کوشش کیجئے گا۔ پلیز نو شور، نو تالیاں، اینڈ نو سلز (سیٹیاں)"

"ایگریڈ؟" (منظور ہے؟) مائیک والا لڑکا ہجوم سے اپنی درخواست کرنے کے بعد سوال کر رہا تھا۔

مجمع میں موجود اکثر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں یس یس اور اچھل اچھل کر رضامندی ظاہر کر رہے تھے۔

"سو پلیز! کیپ سائلنٹ ناؤ۔" (برائے مہربانی اب خاموش ہو جائیے)

ان لوگوں سے منظوری لینے کے بعد وہ ہی لڑکا بولا۔ مجمع پر وقتی طور پر خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر میں ان گلوکاروں کے آلات موسیقی بجنے شروع ہوئے۔ یہ کسی علاقائی گیت کی دھن تھی اور کانوں کو مانوس بھی لگ رہی تھی۔

عشق تے آتش دونوں برابر
ادھے عشق دا تاو کھیرا
آتش سدا سارے ہے پکھے نیان
ادھے عشق سڑے دل جھیڑا
آتش پانی نال بجھیندی
ادھے عشق دا دارو کیہڑا
غلام فریدا اوتھے جا نہ رکھی
جتھے عشق لائے گا ڈیرا
(عشق اور آگ دونوں برابر ہیں
لیکن عشق کی تپش الگ ہی ہوتی ہے
آگ انسانوں کو بھوکا پیاسا جلاتی ہے
لیکن عشق میں دل جو جلتا ہے

آگ پانی سے بجھ جاتی ہے
لیکن عشق کا کیا علاج ہے
غلام فرید!! وہاں مت ٹھہرنا
جہاں عشق نے ڈیرا لگا رکھا ہو)

گانے والا ایک جذب کے عالم میں گا رہا تھا اور مجمع پر سکوت طاری تھا۔ ماہ نور کے ابرو اس آواز کی کشش سے اوپر چڑھے یا کسی اور بات سے.... مگر وہ آنکھیں سکیڑے غور سے اس گلوکار کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

یار ڈاڈھی عشق آتش لائی ہے

اس نے تان اٹھائی اور مجمع جیسے ہوش میں آگیا۔ تالیاں، سیٹیاں اور واہ واہ کی آوازیں ہر طرف گونجنے لگیں۔

"سائلنس پلیز۔" اسٹیج سے گائیکی روک کر درخواست کی گئی۔ آوازیں مدہم پڑنے لگیں۔

یار ڈاڈھی عشق آتش لائی اے
وے یار سانوں لگ گئی بے اختیاری
سینے دے وچ نہ سمائی ہے
یار ڈاڈھی....

اسٹیج سے پھر آواز ابھری۔

گانے والا ایک جذب کے عالم میں گا رہا تھا۔ شور مچاتا، سیٹیاں بجاتا، تالیاں پیٹتا مجمع سکوت کے عالم میں تھا۔

ہو یار سانوں لگ گئی بے اختیاری

الفاظ دہرائے جا رہے تھے اور ماہ نور کے کان جیسے سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اس نے اپنی سیٹ کی پشت چھوڑی اور سیٹ کے کنارے پر آگے ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں ایک بار پھر پہچاننے کی مشق میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ اس کے کان مانوس آواز کا تعاقب کر رہے تھے۔

ہل ہلاں کے عشق جو آیا
اوکھے پینڈے لمیاں نے راہواں عشق دیاں....
گھٹی گھٹی شام آئی ہے
ککھ نہ چھڈے دیکھ وفاواں عشق دیاں....

"سن سن سن۔" ماہ نور کے کان بجنے لگے اور اس کی سماعتوں میں آوازیں گڈمڈ ہونے لگیں۔

بابے منگو کے میلے میں اکتارہ بجاتا سائیں، سید پور کلچر فیسٹیول میں بہترین ساؤنڈ سسٹم اور جدید ترین آلات موسیقی کے ساتھ مائیک پر گاتا یہ نوجوان....

"یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔" اس نے زور سے سر کو جھٹکا اور گڈمڈ ہوتی آوازوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہا۔

"اف! اس کی آواز سنی ہے۔" شاہ بانو نے سحر زدہ انداز میں ماہ نور کا شانہ دبایا۔

"مجھے یقین ہے کہ یہ کوک اسٹوڈیو کے اگلے سیزن میں نظر آنے والا ہے۔"

شاہ بانو اس کے سنسناتے کان میں کہہ رہی تھی۔

پھلاں ورگی جندڑی عشق رلا چھڈ دا
سر بازار جالے عشق نچا چھڈ دا

ماہ نور کو لگا، جیسے وہ ذہنی طور پر ماؤف ہو رہی تھی۔ وہ سحر زدہ انداز میں اٹھ کر آہستہ قدموں سے چلتی اگلی نشستوں کی طرف چل دی۔

"ماہ نور کہاں جارہی ہو؟" شاہ بانو اس کی پیچھے لپکی۔
"یہ شخص۔۔۔ یہ شخص۔" ماہ نور نے شاہ بانو کی طرف دیکھا۔ شاہ بانو کو ایسا لگا جیسے اس کے سامنے ماہ نور نہیں کوئی زومبی کھڑی ہو۔
"کون شخص؟" شاہ بانو نے پریشان ہو کر اس جانب دیکھا جہاں ماہ نور دیکھ رہی تھی۔
"پلیز بیٹھ جائیں۔" مجمع میں سے کسی نے ان دونوں سے درخواست کی تھی۔
"اچھا ادھر آؤ۔" شاہ بانو نے ماہ نور کا ہاتھ پکڑ کر اسے نشستوں کے ساتھ خالی جگہ کی طرف لے جانا چاہا مگر ماہ نور ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ وہ وحشت زدہ نظروں سے اسٹیج کے بیچ میں کھڑے شخص کو دیکھے جارہی تھی۔
"اُفوہ!" شاہ بانو جھنجلائی اور ماہ نور کا بازو پکڑ کر اسے تقریباً" گھسیٹتی ہوئی خالی جگہ کی طرف لے گئی۔
"کیا ہو گیا ہے ماہ نو!" شاہ بانو نے ماہ نور کو زور سے جھنجھوڑا۔

پھلاں ورگی جندڑی
یار ڈاڈھی عشق آتش
ککھ نہ چھڈے
سینے دے وچ نہ سمائی
اوکھے پینڈے لمیاں نے راہواں۔۔۔

ماہ نور کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا' وہ چکرا کر گر جائے گی۔ الفاظ اس کی سماعتوں پر بازگشت کی طرح بکھر رہے تھے۔
"ماہ نور۔۔۔ ماہ نور!" پھر اسے شاہ بانو کی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔
"شاہ بانو! یہ شخص پتا نہیں کون ہے' یہ ہر جگہ موجود ہوتا ہے' ہر جگہ۔" وہ بڑبڑائی۔
"مجھے لگتا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔" شاہ بانو نے گھبرا کر کہا۔ "چلو گھر چلتے ہیں۔" وہ ماہ نور کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔
اس نے پلٹ کر مجمع میں بیٹھے عبید کو تلاش کرنا چاہا۔ عبید اسے نظر نہیں آیا۔ شاہ بانو نے اپنا فون نکال کر عبید کا نمبر ملایا۔ وہ بے چینی سے فون اٹینڈ کیے جانے کی منتظر تھی۔
"سچ سچ بتاؤ تم کون ہو۔" شاہ بانو کی گرفت ماہ نور کے ہاتھ پر ڈھیلی ہوئی اور وہ ہاتھ چھڑا کر کسی سمت لپکی۔ شاہ بانو فون بند کر کے اس کے پیچھے بھاگی۔
اسٹیج پر کچھ لمحے پہلے اپنے فن کا مظاہرہ کرتا شخص اپنے ساتھیوں سمیت نیچے آکر تماشائیوں میں شامل ہو رہا تھا۔ تماشائی اس کی آواز پر سحر زدہ تھے اور اس کے خاموش ہونے پر جیسے طلسم ٹوٹنے کے بعد ہوش میں آئے تھے۔
"ونس مور' ونس مور۔" تماشائی اس سے مطالبہ کر رہے تھے اور ماہ نور نے تماشائیوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے اس تک رسائی حاصل کر لی تھی۔
"تم چھلاوے ہو' ساحر ہو یا تم بہروپیے ہو۔" ماہ نور نے اس لڑکے کا بازو پکڑ لیا' جس نے سیاہ رنگ کی شلوار قمیص اور پگڑی پہن رکھی تھی۔
لڑکے نے ٹھٹک کر شور مچاتے حاضرین کے درمیان اس لڑکی کو دیکھا' جس کی گرفت میں اس کا بازو یوں جکڑا تھا جیسے کسی طور نہیں چھوڑے گی۔
"اسٹاپ اٹ ماہ نور! کیا بے وقوفی ہے۔" شاہ بانو نے بھی کسی نہ کسی طرح لوگوں کے درمیان راستہ بنا لیا تھا اور ماہ نور تک جا پہنچی تھی۔

"تمہیں نہیں پتا یہ شخص ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ تم نہیں جانتیں۔" شاہ بانو نے ماہ نور کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو وہ شور مچانے لگی۔ شاہ بانو نے خجل ہو کر دلچسپی سے اس منظر کو دیکھتے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا' کیمروں کے فلیش جگہ جگہ جل بجھ رہے تھے۔
"آئی ایم رئیلی سوری۔" شاہ بانو نے اس لڑکے سے کہا۔ اس کی نظروں میں شرمندگی تھی۔
"اٹس اوکے۔" لڑکے نے نرمی سے ماہ نور کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اپنا بازو چھڑایا۔
"کاہے کو جذباتی ہو رہی ہو مس!" مجمع میں سے کسی نے جملہ کسا۔ شاہ بانو کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
"نو ہوٹنگ پلیز۔" وہ لڑکا اس طرف کو رخ کر کے بولا' جہاں سے جملہ آیا تھا اور ان لڑکیوں کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہوا ہاتھ ہلانے لگا جو اپنے ہاتھوں' بازوؤں' مفلروں اور دوپٹوں پر اس کے آٹو گراف مانگ رہی تھیں۔
"جسٹ ویٹ فور مائی نیکسٹ سونگ۔" (میرے اگلے گانے کا انتظار کرو) مائیک پر اس کی آواز ابھر رہی تھی۔ وہ ہاتھ ہلاتا ہوا حاضرین کے درمیان پھر رہا تھا۔
"آئی ایک گوئنگ ٹو سنگ رائی حانہ۔"
(میں رائی حانہ کا گانا گانے والا ہوں) وہ بلند آواز میں نوجوان لڑکے لڑکیوں سے مخاطب ہوتا ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔
"فوک کلچر شو میں رائی حانہ' کس کس نے سننا ہے یہ گانا؟" وہ پوچھ رہا تھا۔
شاہ بانو نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ وہ اب قدرے ہوش میں نظر آرہی تھی۔
"چلو یہاں سے۔" شاہ بانو نے ڈپٹ کر کہا۔ ماہ نور بغیر بحث کیے کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے چل دی۔
"پاکستان کے ثقافتی شو میں بدیسی گانا کون سننا چاہتا ہے۔" وہ ہی لڑکا اسٹیج کے بیچ میں کھڑا مجمع سے پوچھ رہا تھا۔
حاضرین ہاتھ اٹھا اٹھا کر ووٹ دے رہے تھے۔
"مجھے امید ہے کہ آرگنائزر بُرا نہیں مانیں گے۔" وہ کہہ رہا تھا اور پھر اسٹیج سے میوزک شروع ہوا۔

روشنی میں چمکتے زرد ہیرے
اور ہم ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہیں
تمہارا سایہ میرے سائے کے پاس سے گزرتا ہے
کیا ہو جو یہ جاندار ہو جاتے ہیں
میں ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں
اور میں اپنے محسوسات کا انکار نہیں کر سکتا
لیکن مجھے اسے جانے دینا ہے۔
ہمیں محبت ایک ایسی جگہ ملی جہاں پر ملنے کی امید نہ تھی۔

کچھ دیر پہلے سرائیکی لہجے میں کافی سنانے والا نوجوان انگریزی کا ایک مشہور گانا گا رہا تھا اور حاضرین پر دیوانوں کی سی کیفیت طاری تھی۔
"یہ تو ورسٹائل ہے۔" شاہ بانو نے سوچا۔
"یہ وہی ہے۔" ماہ نور گاڑی میں بیٹھ کر بڑبڑائی۔ جگہ جگہ نصب اسپیکرز پر آواز ابھر رہی تھی۔
لیکن بابے منگو کے میلے کا سائیں رائی حانہ کو کیسے گا سکتا ہے۔ بندر کے تماشے دکھانے والی سید پور کلچر فیسٹیول میں کیسے پہنچ سکتا ہے۔ منطق اور بصارت کی کشمکش بری طرح شروع ہو چکی تھی۔
ماہ نور اپنے ذہن اور اپنے دل میں یہ جنگ لڑ رہی تھی۔ نہ منطق بصارت کو شکست دے پا رہی تھی نہ بصارت منطق کو۔ گھر پہنچنے تک ان دونوں کی کشمکش میں ماہ نور تھک چکی تھی۔ اسکا سر سیٹ کی پشت پر ٹکا ہوا تھا

"نہیں یہ وہ نہیں ہے۔" پھر وہ خود سے مخاطب ہو کر نفی میں سر ہلانے لگی۔
شاہ بانو بے یقین نظروں سے ماہ نور کی یہ ساری حرکات دیکھ رہی تھی۔
"ایک سائیں راگی حانہ کو کیسے گا سکتا ہے۔" ماہ نور نے شاہ بانو کی طرف دیکھا۔ "ہے نا؟"
"یہ جو سنگر تھا عبید بھائی! یہ وہی لڑکا تھا نا جو چارکول اسکیچ خریدنے کی بات کر رہا تھا؟" ماہ نور سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے عبید سے مخاطب ہوئی۔
"نہیں' بالکل بھی نہیں۔" عبید نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔
"اوہ خدایا...... آپ لوگ کیوں نہیں پہچانتے۔ یہ وہی تھا بالکل وہی۔" وہ زور دے کر بولی۔
"تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے ماہ نور! یہ وہ لڑکا نہیں تھا۔" عبید بھائی نرمی سے بولے۔
"میں سچ کہہ رہی ہوں شاہ بانو!" وہ یقین دلانے والے انداز میں شاہ بانو سے مخاطب ہوئی۔
"اور وہ جو پہلے اس نے سنایا تھا' وہ سائیں جیسا تھا' وہ سائیں بھی یہی تھا۔" وہ کہہ رہی تھی۔
"اچھا۔ چلو گھر چل کر پہلے آرام کرو۔ پھر بات کریں گے۔ شاید تم تھک گئی ہو۔" شاہ بانو نے نرمی سے اس کا ہاتھ دبایا۔
گاڑی سید پور سے باہر نکل آئی تھی۔ سید پور کے در و دیوار سے گانے والے کی آواز ٹکرا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ماہ نور کے ماموں کے گھر گاڑی رکنے پر شاہ بانو نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی بھی سحر زدہ نظر آرہی تھی۔ وہ ماہ نور کے ساتھ گھر کے اندر گئی اور اسے اس کمرے تک لے گئی۔
"ماہ نور! تم چینج کر لو۔" شاہ بانو نے اس کا بیگ ٹیبل پر رکھ کر کہا۔ وہ بغیر کسی بحث کے واش روم میں چلی گئی۔
دس منٹ بعد جب وہ واپس آئی تو اس نے شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں بوجھل نظر آرہی تھیں اور چہرہ ستا ہوا تھا۔
"چلو اب تم لیٹ جاؤ۔" شاہ بانو نے کہا اور اس کے لیٹ جانے کے بعد وہ کچھ دیر اس کے قریب بیٹھ کر اس کا ہاتھ سہلاتی رہی' پھر آہستگی سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل آئی۔
"ماہ نور کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں' ہو سکتا ہے وہ کل دیر تک سوئے۔"
اس نے لاؤنج میں بیٹھی ماہ نور کی ممانی سے کہا۔ انہوں نے سر ہلا دیا۔ شاہ بانو' ماہ نور کی طرف سے خاصی پریشان تھی۔ اس نے راستہ بھر عبید سے کوئی بات نہیں کی۔ اس کی اچھی خاصی سمجھ دار دوست کو شاید کوئی جن چمٹ گیا تھا۔ رہ رہ کر اس کے ذہن میں ایک ہی خیال سر اٹھا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

لاری ایک جھٹکے کے ساتھ کسی جگہ رکی تھی۔ لاری کا کنڈیکٹر اس جگہ کا نام لے رہا تھا۔ مسلسل کھڑکی سے باہر گزرتے منظروں پر نظر جمائے سعدیہ کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اماں نے اسے چونکا دیا۔
"چلو اٹھو۔ ہماری منزل آگئی۔" اماں نے نیچی آواز میں کہا۔
"اتنی جلدی سفر ختم ہو گیا۔" سعدیہ نے حیرت سے پوچھا۔
"یہ جلدی ہے؟" اماں نے اسے گھورا۔ "ڈھائی گھنٹے ہو گئے بس میں بیٹھے بیٹھے۔"
سارا سفر نہر کے ساتھ ساتھ ہی گزرا تھا۔ راستے میں کچھ دیر کے لیے نہر غائب ہوئی لیکن ایک جگہ موڑ کاٹ کر

جب لاری نئی سڑک پر چڑھی تو نہر دوبارہ نظر آنے لگی۔ نہر میں پانی بہت زیادہ نہیں تھا اور یہاں اس میں تربوزوں کی جگہ بھینسیں نہا رہی تھیں۔

"ہائے! ان کو کتنا مزا آرہا ہوگا۔" سعدیہ کو بھینسوں پر رشک آیا۔ خود اس کے اپنے کپڑے پسینے کی وجہ سے جسم کے ساتھ چپک رہے تھے اور پیاس کے مارے برا حال تھا۔

"یہ سولنگ اندر کو جاتا ہے گاؤں کی طرف۔" اس نے سنا ایک شخص ابا جی کو بتا رہا تھا۔ ابا جی ایک طرف کھڑے چند مریل گھوڑوں والے تانگوں کے سوئے سوئے سے کوچوانوں میں سے ایک سے محو گفتگو تھے۔

اب ابا جی ایک مریل گھوڑے والے تانگے پر سامان سوار کروا رہے تھے۔ جس جگہ وہ لوگ کھڑے تھے۔ اس سے چند گز کے فاصلے پر نہر کے کنارے ایک ہینڈ پمپ لگا تھا۔ سعدیہ نے بغیر کچھ بولے اماں سے ہاتھ چھڑایا اور ہینڈ پمپ کی طرف لپکی۔ پانی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ سعدیہ نے نلکا چھوڑ کر پمپ سے اگلتے پانی کے آگے ہاتھوں کی اوک بنالی۔ تھوڑا پانی اس کی پیاس بجھانے کے لیے ناکافی تھا۔ اس نے ایک بار پھر نلکا زور و شور سے چلایا اور پھر اگلتے پانی کے آگے ہاتھ باندھ لیے۔ اس کے کپڑے بھی اس کوشش میں بھیگ رہے تھے اور اسے یہ گیلے ہوتے کپڑے اچھے لگ رہے تھے۔

"سعدیہ!" اماں کی ڈپٹتی آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اماں اس کے سر پر کھڑی تھیں۔

"بڑا ٹھنڈا پانی ہے اماں! آپ بھی پی لو' منہ دھولو۔" سعدیہ نے منہ پر کچھ دیر پہلے مارے پانی کے چھپاکے کے آنکھوں پر رہ جانے والے قطروں کے پیچھے سے اماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" اماں کے سخت لہجے نے اسے ڈرایا۔ "چلو۔ ابا جی ناراض ہو رہے ہیں۔" اماں نے سختی سے اس کا بازو پکڑا اور دوبارہ اسی جگہ لے آئیں جہاں وہ پہلے کھڑی تھی۔

"لو پانی پینے پر بھی ڈانٹ۔" سعدیہ نے سوچا۔ "راستے بھر لاری میں ٹھنڈے شربت اور ٹھنڈے پانی والے چڑھ کر بیچنے آتے رہے' کسی نے ایک گلاس نہیں لے کر دیا۔ اب یہ تو مفت کا پانی تھا' اس پر بھی ناراضی؟"

اس کے دل کی یہ خفگی اور بھی بڑھ گئی جب اماں نے اسے اندر جاتے ایک رستے کی طرف دھکیلا۔ سامان والا تانگہ آگے آگے چل رہا تھا۔ اور ابا جی اس کے پیچھے پیدل چل رہے تھے۔ اماں اس کا بازو پکڑے ابا جی کے پیچھے چلنے لگیں۔ گویا ان کو اگلا راستہ پیدل چل کر طے کرنا تھا۔

"ہم تانگے پر کیوں نہیں بیٹھے؟" اس نے منہ اٹھا کر اماں سے سوال کیا۔

"دیکھتی نہیں کیسا مریل تانگہ ہے' سامان ہی لے جائے بڑی بات ہے۔" اماں نے نقاب کے پیچھے سے جواب دیا۔

"اونہہ!" وہ خفگی سے بولی۔ "دوسرے تانگے کا کرایہ بچایا ہوگا ابا جی نے۔"

اس نے سوچا اور اپنا غصہ نکالنے کے لیے راستے میں آئے ایک پتھر کو جوتے کی نوک سے ٹھوکر ماری۔ پتھر اڑ کر ذرا آگے جا کر گر گیا' پتھر کے قریب پہنچ کر سعدیہ نے اس کو دوسری ٹھوکر ماری۔ پتھر کچھ اور آگے جا گرا۔ اب وہ اس نئے مشغلے میں مشغول ہو گئی۔ وہ پتھر سعدیہ کی ٹھوکر سے اڑتا گرتا اس کے ساتھ اس جگہ تک پہنچ گیا' جو سعدیہ اور اس کے گھرانے کا نیا ٹھکانہ تھا۔

✵ ✵ ✵

"ایک بات غور سے سن لو اور گرہ سے باندھ لو' ایسی کوئی تصویر پرنٹ میڈیا میں نہیں جائے گی اور ایسا کوئی شاٹ الیکٹرانک میڈیا پر نہیں چلے گا' انڈر اسٹینڈ!"

"رائٹ۔"

"آئی ہوپ کہ مجھے یہ بات دوبارہ کرنے کے لیے تمہیں کال نہیں کرنا پڑے گی۔"

"لیکن سر! وہ جو لوگوں کے پرسنل ویڈیوز ہیں۔ وہ جو سوشل ویب سائٹس اور یوٹیوب وغیرہ۔"

"ثاقب! یہ جو تم مِن مِن کر رہے ہو' اس کا حل تم اچھی طرح جانتے ہو۔ تمہیں اندازہ ہے کہ اس کا کیا کرنا ہے۔"

"یس سر!"

"تو پھر پہلی بات ہی آخری بات بھی ہے۔ میں کہیں بھی اس کے بارے میں کچھ دیکھنا یا سننا نہیں چاہتا۔"

"جی سر!"

"اوکے۔"

✵ ✵ ✵

وہ کتنے گھنٹے سوئی تھی اسے اندازہ نہیں ہوا۔ جب اس کی آنکھ کھلی اس کے کمرے کی کھڑکیوں پر دبیز پردے ہونے کی وجہ سے کمرے میں نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ کمرے میں موجود ہر چیز کے خدوخال مدھم سے نظر آرہے تھے۔ اس نے ایک بار آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر اسے لگا اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔ ذہن شاید سوچنے اور محسوس کرنے کا بوجھ نہیں اٹھا پا رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرکے سوچا وہ یوں کیوں لیٹی ہوئی ہے۔

کچھ سمجھ میں نہ آنے پر اس نے سوچنے کی مشقت چھوڑی اور پہلو بدل کر بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اپنا موبائل فون اٹھانے کے لیے ہاتھ مارا۔ موبائل فون وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ چونک کر اٹھی۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا کہ سیل فون اس کے ساتھ کہیں رکھا نہ ہو۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اسے سامنے میز پر رکھا اپنا شولڈر بیگ نظر آیا۔ اس نے تیزی سے اٹھ کر اپنا بیگ اٹھایا اور واپس بیڈ پر بیٹھ کر اس میں اپنا فون تلاش کرنے لگی۔

فون نکال کر اس نے اس کی اسکرین روشن کی۔ تاریخ اور وقت دونوں نے ہی اس کو حیران کردیا۔

مسڈ کالز کی لمبی فہرست تھی۔ اس میں ایک نامعلوم نمبر بھی تھا۔ بابا' ممی' سلمان اور شاہ بانو کے میسجز کے علاوہ نو میڈ آرٹ گیلری میسج تھا۔ جس میں گیلری انتظامیہ سے بہترین تعاون پر اس کا شکریہ ادا کیا گیا تھا اور اس کے اسکیچز کی تعریف کے علاوہ یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ اپنے فروخت شدہ اسکیچ کی قیمت طے کرنے کے لیے گیلری کے اسلام آباد آفس میں تشریف لائے۔

اس نے سر جھٹکا اور ممی کو کال کی۔ وہ حسب توقع پریشان تھیں۔

"اسی لیے میں تمہیں وہاں بھیجنے پر متامل تھی۔" وہ کہہ رہی تھیں۔ "اپنے گھر کے علاوہ تمہیں کہیں رہنے کی عادت جو نہیں ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے ممی! سردار چاچا کے پاس بھی تو رہی تھی۔" اس نے کہا۔ "میں شاید کل زیادہ تھک گئی تھی۔"

"اس وقت رات کے بارہ بج رہے ہیں۔ نسرین یا فرقان نے کل سے تمہاری خبر نہیں لی۔ دیکھا بھی نہیں کہ تم آخر جاگ کیوں نہیں رہی ہو۔" ممی نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔

"آپ کو پتا ہے ممی! وہ دونوں بہت مصروف ہوتے ہیں۔" اس نے اپنی اکڑی ہوئی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ایسی بھی کیا مصروفیت کہ گھر میں آئے چند دن کی مہمان کی خبر ہی نہ لی جائے۔" ممی کو غصہ آگیا۔
"تم صبح ہی سامان اٹھاؤ اور شاہ بانو کے پاس چلی جاؤ۔" تھوڑی دیر بعد ان کی آواز آئی۔
"ارے واہ!" ماہ نور ایک دم خوش ہوگئی۔ "واقعی ممی!"
"ہاں واقعی۔" وہ نرمی سے بولیں۔
"اور اگر شاہ بانو ابھی کچھ دن اور رکنے کا کہے تو۔" وہ منمنائی۔
"تو تم بھی رک جانا۔" وہ فراخدلی سے بولیں۔ "اب گھر سے نکلی ہی گئی ہو تو ذرا گھوم پھر لو۔" ماہ نور کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔
"اور فرقان اور نسرین سے تو مجھے سخت شکوہ ہوگیا ہے۔" وہ ناراض لہجے میں بولیں۔ "دل میں شکوہ ہو تو پھر اس شخص سے دور ہی رہنا چاہیے۔ ورنہ گناہ گاری ہو جاتی ہے۔"
ماہ نور ماں کی یہ بات سن کر بے اختیار مسکرا دی۔ بظاہر اتنی سخت مزاج خاتون کے اندر اللہ سے ہر دم ڈرنے والا دل موجود تھا۔ ماہ نور کو اس کا بہت اچھی طرح اندازہ تھا۔
"ممی! آئی لو یو۔" ماہ نور نے بے ساختہ کہا۔
"چلو اب تم اٹھو' خود ہی کچن میں جاکر کچھ کھالو' مجھے یقین ہے نسرین کا فریج کھانے کی اشیا سے بھرا ہوگا' چاہے انہیں کھانے والا کوئی نہ ہو۔" وہ ہنس کر بولیں۔
"ممی! یہ بھی غیبت ہوتی ہے۔" ماہ نور نے انہیں یاد دلایا۔
"اوہ ہاں' آئی ایم سوری۔" انہوں نے کہا۔
"چلو پھر اٹھ کر کچھ کھا پی لو' صبح مامی کو بتا دینا کہ تم نے فریج سے کیا کیا لیا تھا۔" وہ ہنسیں۔ ماہ نور نے مسکراتے ہوئے انہیں خدا حافظ کہا اور فون بند کر دیا۔ ممی سے بات کر کے اس کا ذہن بہت ہلکا ہو گیا تھا۔
"اور یہ "سولڈ اسکیچ" (فروخت شدہ تصویر) پھر اس نے دوبارہ آرٹ گیلری سے آیا پیغام پڑھا۔ "اچھا دیکھتے ہیں کیا کرنا ہے۔" اس نے خود کو تسلی دی اور اٹھ کر واش روم کی طرف چل دی۔

☆ ☆ ☆

شاہ بانو اس کا فون سن کر خوش بھی تھی اور تھوڑا پریشان بھی۔ ماہ نور کو جس کیفیت میں دو دن پہلے وہ اس کے ماموں کے گھر چھوڑ کر آئی تھی' اس کے لیے وہ کیفیت پریشان کن تھی۔ اب ماہ نور اسے خبر دے رہی تھی کہ اس کی ممی چاہ رہی تھیں کہ وہ شاہ بانو کے ساتھ رہے۔
"تم ٹھیک تو ہونا!" شاہ بانو نے ماہ نور سے بار بار پوچھا تھا۔
"ہاں۔ ایک دم ٹھیک۔" وہ بشاش لہجے میں ہنس رہی تھی۔
"ماہ نور کو تو شاید جناتی دورے پڑنے لگے ہیں۔" ماہ نور کو اس کے ماموں کے ہاں سے لینے کے لیے آتے ہوئے شاہ بانو مسلسل یہ ہی سوچ رہی تھی۔
"لیکن یہ جن اسے چمٹا کہاں اور کیوں؟" پھر اس نے سوچا تھا۔ "جن ہی تو تھا جو پاگلوں کی طرح فوک میوزک کے ریکارڈز جمع کروا رہا تھا اس سے۔" شاہ بانو کو اپنی ہی سوچ پر بے اختیار ہنسی آگئی۔
"اور اس لڑکے کو محترمہ سائیں سمجھ رہی تھیں جو رائے حانہ کا نمبر گا رہا تھا اور کیا خوب گا رہا تھا۔ کاش اس روز ماہ نور یوں ری ایکٹ نہ کرتی تو اس لڑکے کے گائے ہوئے گانے تو سننے کو مل جاتے۔ اللہ جانے اور کتنی دیر اسٹیج پر رہا ہوگا وہ تو بھئی منٹوں میں کراوڈ کے لیے heart throb (دل کی دھڑکن) بن گیا تھا۔
"نام پتا نہیں کیا تھا اس کا؟" ماہ نور کے ماموں کے گھر کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے شاہ بانو نے سوچا۔ "چلو سید پور فیسٹیول کی ویڈیوز اپ لوڈ ہو ہی جائیں گی' سب پتا چل جائے گا۔" اس نے خود کو تسلی دی اور ماہ نور کے ماموں کے گھر میں داخل ہوگئی۔

☆ ☆ ☆

بارہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے پری بلیو ہیون سرکس کے ساتھ میلوں کا سفر طے کر چکی تھی۔ اور اب تاروں اور رسیوں پر کرتب دکھانے کے علاوہ اسٹیل بار پر کرتب دکھانے میں اس سے زیادہ ماہر کوئی دوسرا شخص سرکس میں نہیں تھا۔
"پری تو بلیو ہیون کا ایسا اثاثہ ہے' جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔" عارف خان بابا سینہ تان کر کہتے۔
"پری انگریزی بولتی ہے اور پری رنگ میں پری کی چھڑی جیسے کرشمے دکھاتی ہے۔" مسز پیٹرا اپنا کریڈٹ لینا کبھی نہیں بھولتی تھیں۔
سرکس رنگ میں شام کے وقت پری سے زیادہ پرجوش' ماہر اور میلہ لوٹ لینے والا کوئی دوسرا فنکار نظر نہیں آتا تھا۔ مگر دن کے وقت سرکس کی خاموش چھولداریوں میں سے کسی ایک میں ایک بالکل مختلف پری ہوتی تھی۔
سرکس میں آئے روز نئے نئے لوگ شامل ہوتے تھے' کچھ عرصہ گزار کر چھوڑ جانے والے بھی کئی ہوتے تھے۔
"مجھے مسخرہ بننے کا شوق ہے۔ میں گھر والوں سے چھپ کر آیا ہوں۔" کوئی درخواست کر رہا ہوتا۔
"مجھے ہاتھی اور گھوڑوں کے ساتھ کرتب کرنے ہیں جناب! میں نے ٹی وی پر یہ کرتب دیکھے ہیں۔ مجھے اپنے پاس جگہ دے دیں۔" کوئی اور کہتا سنائی دیتا۔

لوہے کی تاروں پر چل کر کرتب دکھانے کا دعوے دار ہوتا اور کسی کا خیال ہوتا کہ اس سے بہتر موت کے کنویں میں موٹر سائیکل کوئی نہیں چلا سکتا۔

آنے والوں میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہی شامل ہوتے تھے۔ پری ایسے منظر بچپن سے ہی دیکھتی چلی آرہی تھی۔ اکثریہ لڑکے اور لڑکیاں عمر میں اس سے بڑی ہوتی تھیں۔ پہلے پہل اس نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا مگر جوں جوں وہ بڑی ہورہی تھی' اس کا شعور بھی بیدار ہورہا تھا۔ اور کئی قسم کے سوال اس کے ذہن میں اٹھنے شروع ہوچکے تھے۔

"لوگ جو ادھر ادھر سے آئے ہوئے ہیں' ان کے تو اپنے گھر بھی ہیں' ماں باپ بھی ہیں۔" وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو دیکھ کر سوچتی۔ "میں کون ہوں؟ میں کہاں سے آئی ہوں میرے ماں' باپ کون ہیں؟" اس کا ذہن ان سوالوں کی زد میں رہنے لگا تھا۔

"ارے تو تو سرکس کی جم پل ہے پری!" عارف بابا نے ایک بار اس کے سوال کے جواب میں کہا تھا "تو سرکس کی بیٹی ہے۔ سرکس ہی تیرا گھر ہے اور یہاں ہم سب جو کرتب سکھانے والے ہیں تیرے ماں' باپ ہیں۔ تو دیکھتی نہیں' سب تجھ سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ سب کے لیے تو کتنی اہم ہے۔" وہ اس کا دل راضی کرنے کی کوشش میں کہتے۔

مگر پری کا دل ان جوابوں سے کبھی راضی نہ ہوسکا تھا۔ وہ دس سال کی عمر میں ہی یہ بات بہت اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ وہ یہاں موجود کسی بھی شخص کی بیٹی نہیں تھی۔ یہاں کوئی عورت اس کی ماں تھی نہ کوئی مرد اس کا باپ تھا۔ چند ماہ اور آگے کھسکنے پر اس نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ اس حقیقت پر کڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس نے اپنا ننھا سا دل کتابوں اور تربیت کے علاوہ ادھر ادھر کے کاموں میں لگانا شروع کیا۔ سرکس کی بیٹی ہونے کا اعزاز حاصل ہونے کے باعث وہ بلا روک ٹوک سرکس سے متعلق ہر شخص سے بات کرسکتی تھی اور اس کے کام کے متعلق پوچھ بھی سکتی تھی۔

وہ چھولداریاں نصب کرنے' سامان سجانے' سرکس رنگ تیار کرنے' لوگوں کا کھانا بنانے' جانوروں کا راتب تیار کرنے والوں سے لے کر نئے پرانے تمام فنکاروں پر ان سے چھوٹی ہونے کے باوجود رعب جما کر بات کرسکتی تھی۔ اور کچھ عرصہ اس نے ایسا کیا بھی۔ یہ سب لوگ اس سے ڈرتے بھی تھے۔ اس کی ایک شکایت پر وہ اپنے کام سے برطرف کیے جاسکتے تھے۔ مگر وہ تھوڑے ہی عرصے میں اس مشغلے سے بھی اکتا گئی۔

جانوروں کی تربیت دینے والے ایریا میں کم ہی کوئی دوسرا شخص جاسکتا تھا سوائے ان کو تربیت دینے والوں کے۔ پری کو وہاں جانے سے بھی کوئی نہیں روکتا تھا۔ مگر یہاں کے مناظر ہولا دینے والے تھے۔ پری نے اپنی آنکھوں سے خوفناک جانوروں کو ہفتوں کی تربیت میں انسانی اشارے کے سامنے بھیگی بلی بنتے دیکھا جن کے تصور سے ہی عام انسان کو خوف آجائے۔

کچھ ہفتوں میں اس کی برداشت جواب دے گئی اور اس کے بعد اس نے فرصت کے دنوں میں ادھر ادھر پھرنے کے بجائے اپنی چھولداری میں چارپائی پر لیٹے لیٹے دن گزارنے شروع کردیے۔ ان ہی دنوں میں اس نے سرکس سے باہر کی دنیا کے بارے میں سوچا۔ اس کے تصور میں وہ زندگی آتی ہی نہیں تھی جو سرکس کے باہر ہوسکتی تھی۔ جب بھی وہ ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر کرتے' وہ راستوں میں نظر آنے والے مناظر کو دیکھتی اور اسے لگتا سب سے اچھی زندگی سرکس کے اندر ہے۔

وہ اس سے آگے کا شاید سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔ پھر اس نے فن کے مظاہروں کے دوران پہنے جانے والے

اپنے مختلف قسموں کے ملبوسات پر غور کرنا شروع کردیا۔ اس کے اس غور نے اس کے ملبوسات کو تنوع اور جدت عطا کرنا شروع کردی۔

"واہ بھئی' اپنی پری کے تو کاسٹیوم ہی الگ ہوتے ہیں۔" عارف خان بابا کی کلغی میں ایک اور پر لگا۔

اس نے محسوس کیا کہ اس سے عمر میں بڑی لڑکیاں جو سرکس میں کام کرتی تھیں' اس کو ملنے والی اہمیت سے جلتی تھیں۔ وہ اندر سے اپنی زندگی سے کتنی ہی غیر مطمئن سہی اس احساس نے کہ باقی لوگ اس سے حسد کرتے ہیں ____ اسے اپنے کام میں مزید محنت' جدت اور تنوع پیدا کرنے کا جنونی بنا دیا۔ بلیو ہیون سرکس میں سارہ خان عرف پری کو سرکس کی ملکہ بن جانے میں اس کے بعد زیادہ عرصہ نہیں لگا۔

☼ ☼ ☼

شاہ بانو نے ماہ نور کو غور سے دیکھ کر اپنی تسلی کرنے کی کوشش کی کہ وہ بالکل نارمل تھی یا نہیں۔

"تم مجھے اتنے غور سے کیوں دیکھ رہی ہو؟" ماہ نور نے مسکرا کر پوچھا۔

"ویسے ہی۔" شاہ بانو نے اس پر سے دھیان ہٹالیا۔

"تم مجھے اتنے عرصے سے جانتی ہو شاہ بانو! کیا میں پہلے کبھی تمہیں یوں ایب نارمل لگی۔" اپنا سامان شاہ بانو کی گاڑی میں رکھنے کے بعد فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر ماہ نور نے شاہ بانو سے کہا۔

"مجھے تم اب بھی ایب نارمل نہیں لگ رہی ہو۔" شاہ بانو نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"میں ابھی کی نہیں میوزیکل نائٹ والے روز کی بات کررہی ہوں۔" ماہ نور نے سامنے سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں اس روز۔" شاہ بانو کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔

"میں تمہاری جگہ ہوتی تو کسی کو اس طرح ری ایکٹ کرتے دیکھ کر یونہی پریشان ہوتی جیسے تم ہوئیں۔" ماہ نور نے اعتراف کیا۔

"وہ ری ایکشن نہیں تھا۔" شاہ بانو نے گئیر بدلتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "وہ جو کچھ تھا' اس وقت تماشا بن رہا تھا۔" اس نے بدستور سنجیدگی سے اپنی بات مکمل کی۔

ماہ نور نے چونک کر شاہ بانو کی طرف دیکھا۔ "کیا مطلب؟"

"تم کیا سمجھتی ہو ماہ نور۔" شاہ بانو نے اس کی طرف دیکھا۔ "ہزار ڈیڑھ کے مجمع میں تم ایک لڑکے کا بازو پکڑ کر چیخو چلاؤ گی تو کیا اس کو کوئی عقیدت کا اظہار قرار دیا جائے گا۔ وہ سادہ ترین لفظوں میں تماشا تھا۔ جس کو دیکھ کو لوگ محظوظ ہورہے تھے' جملہ بازی کررہے تھے اور بہت سے اس لمحہ کی تصویریں بھی لے رہے تھے شاید کسی نے اس کی ویڈیو بھی بنالی ہو۔" شاہ بانو کے لہجے میں خفگی تھی اور غصہ بھی۔

ماہ نور کو لگا اس کے جسم کا سارا خون چہرے کی چھوٹی چھوٹی رگوں میں جمع ہوگیا ہے۔ جو کسی بھی لمحہ پھٹ کر باہر بھی آسکتا تھا۔

"مجھے نہیں پتا میں نے۔ مجھ سے یہ کیوں ہوگیا۔" اس نے کچھ دیر کے بعد بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

شاہ بانو نے پورا دھیان گاڑی ڈرائیو کرنے کی طرف مبذول کرلیا تھا۔

"آئی سوئیر۔ شاہ بانو!" ماہ نور نے بے بسی سے کہا۔

"میں تو سمجھتی ہوں ماہ نور۔" شاہ بانو نے بدستور سامنے نظریں جمائے ہوئے جواب دیا۔ "مگر لوگ نہیں

بھتے۔

ماہ نور اپنے آنسوؤں کو قابو نہیں کر پا رہی تھی۔

"شاید میں الوژنز (واہموں) کا شکار ہو گئی ہوں۔" اس نے روتے ہوئے اعتراف کیا۔ "مگر یقین کرو۔ مجھے کئی بار مختلف جگہوں پر ایک ہی شبیہہ کے لوگ نظر آئے ہیں۔"

شاہ بانو نے ہمدردی سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہر بار ان کے کام مختلف ہوتے ہیں' ہر بار جگہ مختلف ہوتی ہے' ان کی موجودگی کے پس منظر مختلف ہوتے ہیں' مگر ہر بار کبھی چہرے' کبھی آنکھیں' کبھی ہاتھ اور کبھی آواز اتنی مماثل ہوتی ہے کہ میرا ذہن ماؤف ہونے لگتا ہے۔ پھر میں کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہتی۔"

"ایسا کب سے ہو رہا ہے؟" شاہ بانو نے پوچھا۔

"کافی عرصہ ہو گیا' جب میں گاؤں گئی تھی اس وقت سے۔" ماہ نور نے سر جھکا کر گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کے ناخنوں پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

"میں کوئی سائیکالوجسٹ یا سائیکاٹرسٹ تو نہیں ہوں۔" شاہ بانو نے اس کی طرف نرمی سے دیکھا۔ "لیکن جو تمہاری کیفیت ہے اسے شاید یہی لوگ سمجھ سکتے ہیں۔"

ماہ نور' شاہ بانو کی بات کے جواب میں کچھ نہیں بولی۔

"چلو خیر' اب ہم ساتھ رہیں گے۔ کچھ دن گھومیں پھریں گے۔ تمہارا ذہن بھی ٹھیک ہو جائے گا۔" شاہ بانو نے عبید کے گھر کے سامنے گاڑی کھڑی کرتے ہوئے کہا اور گاڑی کا ہارن بجانے لگی۔

"میں اس کو اپنی بات سمجھا سکتی ہوں۔ نہ یہ سمجھ سکتی ہے۔ پھر بات کرنے کا فائدہ کیا۔" ماہ نور نے عبید کے گھر کے پورچ میں گاڑی سے اترتے ہوئے سوچا۔

☼ ☼ ☼

"تمہارا اسکیچ پچاس ہزار روپے میں بکا ہے ماہ نور۔" اس رات کھانے کی میز پر عبید بھائی نے اچانک اسے بتایا۔ پلیٹ میں چمچہ چلاتا اس کا ہاتھ ایک دم رک گیا۔

"مگر میں نے تو نہیں بیچنا تھا عبید بھائی۔" اس نے بے ساختہ کہا۔

"ہاں بھئی... میں نے بھی اس لڑکے کو تمہارا پیغام دے دیا تھا۔ مگر وہ مفت میں لینے پر تیار نہیں تھا۔ پھر شیراز جو میرا کولیگ ہے' اس نے فیصلہ کیا کہ ہم ایک مناسب سی رقم اس سے لے کر تمہاری طرف سے کسی رفاہی ادارے کو دے دیتے ہیں... کیا خیال ہے؟" عبید بھائی نے سب کچھ کر لینے کے بعد اسے یوں بتایا تھا جیسے انہیں یقین ہو' اس پر وہ برا نہیں مانے گی۔

"ہاں' یہ ٹھیک ہے۔" وہ ایک دم خوش ہو کر بولی۔

"شاہ بانو! سید پور میلے کی ویڈیو میری USB میں موجود ہے' تم کاپی کر لینا۔" عبید بھائی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"حیرت ہے... میں اس روز سے تمام سوشل ویب سائٹس' یوٹیوب وغیرہ سب چیک کر چکی ہوں۔ کہیں مجھے اس سے متعلق کچھ نہیں ملا۔" شاہ بانو کو اچانک یاد آیا۔

"سب رائٹس محفوظ ہیں۔ سختی سے آرڈر ہو چکا ہے اس لیے' کہیں یہ نہیں چلائی جائے گی۔" عبید بھائی نے اطلاع دی۔

"سواسٹرینج۔" شاہ بانو حیران ہوئی۔

"دیٹس اٹھارٹیز' بھئی اتھارٹیز۔" عبید بھائی کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

"اور ہاں!" دو منٹ کے بعد ہی عبید کمرے میں واپس آ گئے۔ "ماہ نور! میں نے اسکیچ خریدنے والے لڑکے کو غور سے دیکھا تھا' وہ کسی طرح بھی اس سنگر کی طرح نہیں لگ رہا تھا۔"

اس کا اتا پتا' نام نشان پوچھا؟" شاہ بانو نے پانی پیتے ہوئے ماہ نور کی طرف دیکھا جس کا چہرہ ایک دفعہ پھر سے سرخ ہو گیا تھا۔

"اس کا کارڈ میرے پاس پڑا ہے' دیکھ لینا۔" عبید نے کہا اور اٹھ کر کمرے سے چلے گئے۔

"شکر کرو۔ کہیں کوئی تصویر' کوئی ویڈیو نہیں آئی۔" شاہ بانو نے ماہ نور کو تسلی دینی چاہی۔ مگر ماہ نور کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

"پھر' مجھے کیوں ایسا لگتا ہے' مجھے ہی کیوں۔" وہ سوچے چلی جا رہی تھی۔ اس اسرار کا جواب اس کو شاید کوئی نہیں دے سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس رات' رات بھر جاگنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اب وہ اس معاملے پر کبھی سوچے گی بھی نہیں۔ یوں جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

لیکن صبح جب اس نے وقت دیکھنے کے لیے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اپنا سیل فون آن کیا' فون میں ایک نامعلوم نمبر سے اس کے لیے پیغام موجود تھا۔ اس نے پیغام کھولا۔

"ماہ نور! میں سخت معذرت خواہ ہوں' میری وجہ سے تمہیں اتنی کوفت اٹھانا پڑی۔"

پیغام پڑھتے ہوئے ماہ نور کا ذہن ایک بار پھر ماؤف ہونے لگا تھا۔

اس نے اپنے ذہن کو ایک بار پھر شفاف ہونے سے روکا۔ وہ ذہن پر لکھی تحریروں کو قائم رکھنا چاہتی تھی۔ ایک لمبے عرصہ سے وہ جس واہمے کا شکار ہو رہی تھی' اس کا اسرار اسے خود ہی کھولنا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر نظریں دوبارہ آنے والے اس پیغام پر جمائیں۔

یہ پیغام جس کسی نے بھی بھیجا تھا اسے بلا سوچے سمجھے اس سے رابطہ کرنا تھا۔ شاید کوئی گرہ کھلے۔ اس نے اس نمبر پر کال ملائی۔ دو' تین بار بیل ہونے کے بعد اس کی کال وصول کر لی گئی۔

"السلام علیکم ماہ نور! مجھے یقین تھا۔ تم کال کرو گی۔" دوسری طرف سے بولے گئے الفاظ نے ماہ نور کو حیرت کا ایک نیا جھٹکا لگایا تھا۔ وہ کون تھا جو اس سے اتنی بے تکلفی سے مخاطب تھا۔

"تم کون ہو؟" اس نے بے اختیار پوچھا۔

"میں کبھی کسی کے سامنے لاجواب نہیں ہوا سوائے اس کے جو مجھ سے پوچھے' تم کون ہو۔" جواب میں کہا گیا۔

"کک... کیا مطلب' کک کون ہو تم؟" ماہ نور کا اعتماد ایک دم متزلزل ہو گیا۔ الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے منہ سے نکلنے لگے تھے۔

"ریلیکس ماہ نور۔" دوسری جانب سے اسی سکون اور اعتماد کے ساتھ کہا گیا' جس کے ساتھ پہلے دو جملے کہے گئے

تھے۔
"پلیز۔ مجھے بتاؤ، تم کون ہو۔" ماہ نور کے لہجے میں اضطراب تھا۔
"میں نے ابھی خلیل جبران کو کوڈ کیا ہے اس سوال کے جواب میں۔"
"پہیلیاں مت بجھواؤ، مجھے بتاؤ پلیز۔"
"ضرور بتاؤں گا' میری وجہ سے تم اتنا پریشان ہوئی ہو کہ میں دل میں سخت شرمندہ ہو رہا ہوں۔"
"کب بتاؤ گے' اب بتا بھی چکو۔" ماہ نور نے اپنی ہتھیلی میں آئے پسینے کو خشک کرنے کے لیے فون دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا۔
میں اس بات کی تفصیل سے وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔' اس نے انگریزی میں کہا تھا۔
"اور یہ تفصیل فون پر سنائی نہیں جا سکتی۔"
"نہیں۔ تم ابھی بتاؤ تم کون ہو۔" ماہ نور نے اب کے سخت لہجے میں کہا۔
"میں نے کہا نا ماہ نور۔ میں اس کے آغاز سے وضاحت کرنا چاہتا ہوں "بندر کے تماشے والے سے لے کر میوزیکل نائٹ کے سنگر تک" ایک ایک بات کی وضاحت۔"
ماہ نور کو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔
"تت۔ تمہیں کیسے معلوم۔" الفاظ بے ربط انداز میں اس کے منہ سے پھسلے۔
"مجھے ہی تو معلوم ہے۔" دوسری جانب سے نرم لہجے میں کہا گیا۔
"میں تم سے کہیں ملنا چاہتا ہوں ماہ نور!"
"کب' کہاں؟" ماہ نور نے بغیر سوچے سمجھے کہا۔
"جہاں تمہارے لیے ممکن ہو اور اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو۔" وہ کہہ رہا تھا۔
"ہاں ضرور۔" ماہ نور نے ایک بار پھر بغیر سوچے سمجھے کہا۔ "میں ضرور تم سے ملوں گی۔ بتاؤ کب اور کہاں؟"
"اوکے میں تمہیں کچھ دیر بعد بتاتا ہوں۔"
دوسری جانب سے ایک لمبا سانس لینے کے بعد کہا گیا۔ فون بند ہو گیا۔ سیل فون ہاتھ میں پکڑے ماہ نور حیرت زدہ بیٹھی تھی۔ کیا اس کو فون پر ہونے والی گفتگو کا یقین کرنا چاہیے تھا۔ کیا اسے اس سے ملنے پر رضامند ہو جانا چاہیے تھا؟
اس کے اردگرد سوالوں کا ہجوم تھا اور اسے ان میں سے کسی کا جواب بھی نہیں دینا تھا۔ اسے صرف اور صرف اپنے ذہن پر چھائے واہموں کے غبار کو دھونا تھا' اسی لیے اس نے نتائج عواقب پر غور کیے بغیر اس کی کال کا انتظار کرنا تھا جس میں وہ بتانے والا تھا کہ وہ اس سے کب اور کہاں ملے۔ اس کال کو سننے کے بعد اسے ہر صورت اس شخص سے ملنا تھا۔ بندر کے تماشے والے سے کلچرل فیسٹیول کے سنگر تک کی کہانی سننے کے لیے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی۔ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور نے "سید پور کلچرل شو" میں شرکت کے لیے اپنی دوست شاہ بانو کے ساتھ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ شاہ بانو نے اپنے بھائی کی معرفت سید پور میں ماہ نور کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا۔ فاطمہ اور خدیجہ نے ماہ نور کو اسلام آباد میں فلزا ظہور سے ملنے کی تاکید کی۔ فلزا ظہور ان کے بچپن کی ساتھی ہے۔ بچپن میں کوئلے سے فرش اور دیواروں پر تصویریں بنانے والی فلزا ظہور اب ایک بڑی آرٹسٹ ہے مگر اسے شہرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔

مگر ماہ نور کو کمہار کی آنکھوں میں شناسائی کی کوئی رمق نظر نہ آئی تو وہ الجھن کا شکار ہو گئی۔

سارہ خان عرف پری نے جب سے ہوش سنبھالا' خود کو سرکس کی دنیا ہی میں پایا تھا۔ وہ سرکس کے استاد عارف خان کو باپ سمجھتی تھی۔ عارف خان نے پری کی تربیت کی تھی۔ انہوں نے اسے سرکس کے تمام کرتب سکھائے تھے۔ جبکہ پیٹر نے اسے کتابی علم دیا تھا۔ پری چھوٹی عمر ہی سے اپنے فن میں ماہر ہو گئی۔ مگر تھوڑے بڑے ہونے پر وہ سرکس کی دنیا سے اکتاہٹ محسوس کرنے لگی۔

تصویری نمائش میں ایک نوجوان نے ماہ نور سے اس کی تصویر پر منہ مانگی قیمت پر خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا تو ماہ نور سحر زدہ سی اسے دیکھنے لگی۔ اسے اس نوجوان میں وہی چہرہ نظر آیا جو وہ ہر جگہ دیکھتی رہتی تھی۔

مولوی سراج کا تبادلہ دوسرے قصبے میں ہو گیا۔ چنانچہ وہ' آپا رابعہ اور ان کی بیٹی سعدیہ کلثوم دوسرے قصبے میں چلے گئے۔

ماہ نور میوزیکل نائٹ میں گئی تو اسے وہاں بھی گلوکار کی شکل میں وہی چہرہ نظر آیا۔ وہ دیوانہ وار اس کے قریب پہنچ گئی اور اس کا بازو پکڑ کر زور زور سے چلانے لگی کہ "تم چھلاوے ہو' ساحر یا بہروپیے؟" شاہ بانو اسے واپس لے آئی۔ مگر ماہ نور شدید الجھن میں مبتلا ہو گئی۔

ماہ نور کو ایک اجنبی نمبر سے پیغام موصول ہوا جس میں اس سے معذرت کی گئی تھی۔ ماہ نور نے اس نمبر پر فون کیا۔ ریسیور کرنے والا وہی نوجوان تھا جو ماہ نور کو ہر جگہ ٹکراتا رہا تھا۔ اس نے ماہ نور سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ماہ نور نے آمادگی ظاہر کر دی۔

۵
پانچویں قسط

پارٹ بیلنا کیا ہوتا ہے۔ ماہ نور کو اس کاوش کے دوران پتا چلا تھا جو اس نے اس شام اس ریسٹوران جانے کے لیے کی تھی جس میں اسے بلایا گیا تھا۔

شاہ بانو کو یہ بتاتے ہوئے اسے خود پر شرم آ رہی تھی کہ اسے فرقان ماموں کے ہاں ایک فنکشن اٹینڈ کرنا ہے کیونکہ یہ سراسر جھوٹ تھا اور اس سے پہلے اس نے کبھی اپنی کسی دوست سے غلط بیانی نہیں کی تھی۔ فرقان ماموں کو فون کر کے گاڑی اور ڈرائیور منگوانا بھی اسے اتنا ہی مشکل لگ رہا تھا وہ ان کے گھر سے انہیں تقریباً" ناراض کر کے نکلی تھی اب ان ہی سے گاڑی اور ڈرائیور مانگنا اسے عجیب سا لگ رہا تھا مگر وہ اس شہر میں اجنبی تھی اسے یہاں کے راستوں سے واقفیت نہیں تھی' شاہ بانو کے ساتھ جانا ناممکن تھا سو اسے یہ شرمندگی اور مشکل دونوں ہی جھیلنا پڑی تھیں اور اسی لیے اسے اندازہ ہوا تھا کہ حقیقت میں پاپڑ کیسے بیلے جاتے ہیں۔

✲ ✲ ✲

"پہلے چھ ماہ گزرنے کے بعد مجھے اچانک ایک دن ایسا لگا جیسے میں برف کی کسی قبر سے باہر نکل آئی ہوں۔" نادیہ نے ٹائپ کیا۔

"تمہیں کس نے کہا تھا کہ تم پڑھنے کے لیے ہیلسنکی کا انتخاب کرو۔" سعد نے جواب میں لکھا۔

"یہ میری چوائس نہیں تھی۔" نادیہ نے لکھا "ممی نے مجھے سپورٹ نہیں کیا۔"

"تمہاری ممی تمہیں یہاں سے جب لے کر گئی تھیں اس وقت ایسا لگتا تھا کہ جیسے دنیا صرف انہی کے قدموں میں ہے۔" یہ الفاظ لکھتے ہوئے سعد کے دل میں تلخی تھی۔ "مجھے ان کے کہے الفاظ ابھی تک یاد ہیں۔"

"عجیب سی بات ہے' تم ڈیڈی سے اتنے اختلافات کے باوجود ان سے نفرت کا اظہار کرنے والے کے سخت خلاف ہو جاتے ہو۔" نادیہ کا جواب چبھتا ہوا تھا۔

"ہاں' یہ سچ ہے۔" سعد نے اعتراف کیا۔ "اختلاف اور نفرت کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے' اس کو عبور کرنے کے لیے وجوہات کا سہارا چاہیے جو میرے پاس نہیں ہے۔" سعد نے لکھا۔

"تم وہ سہارا ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کرتے ورنہ اب تک عبور کر چکے ہوتے۔" نادیہ نے جواب دیا۔

"تم موسم کی بات کر رہی تھیں؟" سعد نے بات بدلی۔

"ہاں۔۔۔ موسم چھ ماہ کے بعد بدلا ہے اور اب ہر طرف سبزہ نظر آنے لگا ہے اس سے پہلے تو صرف اندھیرا تھا اور رات تھی۔"

"چلو۔۔۔ اب انجوائے کرو۔" سعد نے کہا۔

"جب میں یہاں شروع میں آئی تھی اس وقت ہر چیز منجمد تھی۔ اپنی آمد کے اگلے روز جب میں کالج جانے کے لیے باہر نکلی تو میرے سائیکل سے لٹکا اسپائیڈر (مکڑی) اور اس کا جالا بھی منجمد ہو چکا تھا۔" نادیہ نے لکھا۔

"تم نے اس کو محفوظ کر لینا تھا' اس نے کون سا پگھل کر پھر سے مکڑی اور اس کا جالا بن جانا تھا۔" سعد اپنی لکھی بات پر خود ہی مسکرا دیا۔

"تم سناؤ۔ کیا مصروفیت ہے آج کل' ڈیڈی کے کون سے کنسرن کی دیکھ بھال کر رہے ہو ان دنوں؟" اب کے بات نادیہ نے بدلی۔

"آج کل راوی چین لکھ رہا ہے' گرمیوں کی آمد آمد پر جھینگر کھا پی اور گا بجا رہا ہے' یہ تو سردیاں آنے پر اسے پتا چلے گا کہ سردیوں میں کیسے کھایا پیا اور گایا بجایا جاتا ہے۔" سعد نے مبہم سی بات لکھی۔

"سردیوں میں چیونٹا کہیں جھینگر کو یہ کہہ کر نہ بھگا دے کہ جاؤ سردیوں میں بھی گاؤ بجاؤ' ناچو نچاؤ۔" نادیہ

مسکرائی۔

"نہیں چیونٹا یہ کہہ نہیں سکتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس جھینگر کو سردیوں میں بھی یہ سب کچھ کر کے زندہ رہنا آتا ہے۔" سعد نے جواب دیا۔

"اگلی بار اسکائپ پر آنا۔" نادیہ نے کہا۔

"ہاں ضرور، مجھے میسیج کر دینا، میں بھی تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم اپنی تصویریں بھی بھجواؤ۔" سعد نے لکھا۔

"چلو۔ دیکھتے ہیں۔" نادیہ نے آف لائن ہونے سے پہلے کہا۔ اس کی کلاس شروع ہونے والی تھی۔

"کیا ہم جیسے اپنی ماؤں اور باپوں سے بچھڑے بچے ایک نیچرل لائف گزار سکتے ہیں۔" نادیہ نے اپنی کلاس کی طرف جاتے ہوئے سوچا۔

"ہماری مائیں اور باپ جنہیں عرصے تک خبر نہیں ہوتی کہ ہم کس حال میں جی رہے ہیں۔"

اس نے چلتے چلتے رک کر دو پودوں کے پتوں میں سبز رنگ کے دو مختلف شیڈز پر کچھ دیر غور کیا۔ ہیلسنکی میں بہار آگئی تھی اور خون منجمد کرنے والی سردی کی حکومت کچھ عرصہ کے لیے ختم ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں معذرت خواہ ہوں ماہ نور! میں تھوڑا لیٹ ہو گیا۔"

آدھا گھنٹہ اس ریستوران میں بے کار بیٹھے انتظار کرنے کے بعد ماہ نور کے کان میں یہ جملہ پڑا۔ اس نے نظریں اٹھا کر اپنے مخاطب کو دیکھا۔ بلیک جینز اور سفید ٹینس شرٹ میں ملبوس یہ وہ لڑکا تھا جو تصویری نمائش کے دن اس کے چارکول اسکیچ کی منہ مانگی قیمت دے رہا تھا۔

"نہ تو یہ بندر والا ہے نہ ہی سائیں۔" اس کے دل نے فوراً فیصلہ دیا اور ایک بار پھر سامنے بیٹھے اس لڑکے کو دیکھا۔

"میں سعد سلطان ہوں ماہ نور!" اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"میری زندگی میں اتفاقات بہت کم ہوتے ہیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "ایسے اتفاقات جو کوئی تیسرا سنے تو سنتے ہی مسترد کر دے کیونکہ ایسے ماورائی اتفاقات حقیقی زندگی میں نہیں ہوتے۔"

ماہ نور ساکت بیٹھی اس کی بات سن رہی تھی۔

"مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ایسا ہو گیا ہے۔" پھر اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میرے ساتھ بھی اور تمہارے ساتھ بھی۔"

ماہ نور نے اپنی پلکیں تیزی سے جھپکیں۔

"اس لیے میں نے سوچا کہ ہم دونوں ہی اس ماورائی اتفاق کو ڈسکس کر لیں بجائے دوسروں کے سامنے شور مچانے اور اپنی ہنسی اڑوانے کے۔"

"میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آ رہی۔" ماہ نور نے سر ہلایا۔ "تم نے فون پر کہا تھا۔ بندر کے تماشے والے سے لے کر کنسرٹ سنگر تک سب کہانی سناؤ گے کیونکہ تم ہی تو جانتے ہو۔ مگر تم تو مزید پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔"

"نہیں۔ میں پہیلیاں نہیں بجھوا رہا۔" وہ ہلکا سا مسکرایا اور ویٹر کی جانب متوجہ ہوا جو اس سے آرڈر لینے آیا تھا۔

"کیا لو گی تم؟"۔ اس نے ماہ نور سے اتنے بے تکلفانہ انداز میں پوچھا جیسے کوئی پرانا دوست ہو۔

ماہ نور کے ذہن میں کئی قسم کے سوال آ جا رہے تھے اس نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"ہاں تو کہاں سے شروع کروں؟" اس نے خود ہی آرڈر دیا اور ماہ نور کی طرف متوجہ ہوا۔

"بندر کا تماشا۔" الفاظ ماہ نور کی زبان سے پھسلے۔

"ہاں!" وہ بتانا شروع ہوا "وہ ایک اوپن ایر ریستوران تھا۔ ان کے ارد گرد کئی لوگ وہاں آئے اور آ کر چلے گئے۔ شام ملگجے اندھیرے میں تبدیل ہوئی اور ملگجے اندھیرے پر رات کی تاریکی کے سائے نے ڈیرے ڈال دیے۔ جا بجا برقی قمقمے روشن ہوئے اور فضا میں خنکی بڑھتی چلی گئی مگر ماہ نور، بندر کے تماشے والے شخص، منگو کے میلے کے سائیں سعید پور فیسٹیول کے کمہار اور میوزیکل نائٹ کے سنگر کے قصے میں اتنی مگن ہوئی کہ اسے بدلتی ساعتوں کے ساتھ ارد گرد ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں کچھ بھی محسوس نہیں ہوا۔

"اوہ!" سعد سلطان خاموش ہوا تو وہ جیسے حال کی دنیا میں واپس آئی اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرے اور ارد گرد دیکھا۔

"کیا وقت ہو گیا؟" اس نے اپنے موبائل فون پر وقت دیکھا، رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے اسے یہاں آئے ساڑھے چار گھنٹے ہو چکے تھے اس کا فون سائیلنٹ پر تھا اور اسے ممی کے علاوہ شاہ بانو کی بھی تین چار کالز آ چکی تھیں۔

"بہت دیر ہو گئی۔" ماہ نور نے بے اختیار کہا۔

"کچھ خاص دیر نہیں ہوئی۔" وہ بولا اور پھر اس نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"ایک چھلاوے ایک بہروپیے ایک ساحر کی کہانی سننے کے بعد تم میرے لیے دل میں کیا محسوس کر رہی ہو؟"

"مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا۔" ماہ نور نے ایک بار پھر اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا دبانے کے بعد کہا۔

"مگر تم تو عینی گواہ ہو اس سب کی!"

"ہاں۔ یہ ہی تو بات ہے۔" ماہ نور نے سر ہلایا۔ "میں اس کو جھٹلا بھی نہیں سکتی۔"

"ایک بات پوچھوں ماہ نور!" اس نے ماہ نور کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ماہ نور نے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ سب جان جانے کے بعد تم میرے لیے دل میں کیا محسوس کر رہی ہو؟" اس کے لہجے میں ایک ہلکا سا اضطراب محسوس کیا جا سکتا تھا۔

"حیرت، غصہ، ناراضی، نفرت۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا محسوس کر رہی ہوں۔" ماہ نور نے سر ہلایا۔ "مگر یقینی طور پر یہ نفرت نہیں ہے۔"

"اوہ!" وہ پیچھے ہوتے ہوئے کرسی کی پشت سے کمر ٹکا کر سیدھا ہوا "اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ماہ نور کی یہ بات سن کر بہت پرسکون ہو گیا ہو۔

"میں خود بھی اس اتفاق پر کنفیوز ہوں کہ تم ہی، ہر بار، ہر جگہ تم ہی کیوں موجود ہوتی ہو۔" اس نے کہا۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔" ماہ نور نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں ایک نارمل سی زندگی گزارتی عام سی لڑکی ہوں ایک ماورائی اتفاق کا حصہ میں کیسے بن گئی یہ میری سمجھ سے بھی باہر ہے۔"

"تمہاری اسکیچنگ بہت اچھی ہے۔" سعد نے کہا۔ "تم اس کو اپنا پروفیشن بنا سکتی ہو۔"

"کامپلیمنٹ (تعریف) کا شکریہ۔" ماہ نور نے اپنے بیگ کے اسٹریپ سیدھے کرتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔"

"ایک بات اور پوچھوں ماہ نور؟" اس نے ماہ نور کے اٹھنے کے ارادے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوں!" ماہ نور نے اس کی طرف دیکھا۔
"تم نے بندر کا تماشا ہی سیکھنا تھا نا۔" اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ "جس بندر والے کو تمہارے چچا نے گندم کی بوری اور پانچ سو روپے دے کر خاص طور سے بلایا تھا اس سے کیوں نہیں سیکھا۔" ماہ نور کو اس سوال نے خاصا گڑبڑا دیا تھا۔
"پھر بابے منگو کے میلے پر تم کسی بندر کے تماشے والے کی تلاش میں گئی تھیں یا ویسے ہی میلہ دیکھنے کا شوق تھا؟"
ماہ نور نے جواب دینے کے بجائے اپنے سیل فون کے بٹن دبانے شروع کر دیے۔
"تمہیں بابے منگو کے میلے میں کوئی بندر کے تماشے والا قابل اعتنا نہیں لگا مگر ایک سائیں کی آواز نے تمہیں اٹریکٹ کر لیا اتنا کہ تم اس سائیں سے بات کرنے کے لیے سارا دن اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرتی رہیں۔"
ماہ نور نے ٹیبل پر رکھے گلاس میں سے کچھ دیر پہلے چھوڑا ڈرنک کا آخری گھونٹ غیر ارادی طور پر پیا۔
"سید پور میلے میں نہ بندر کے تماشے والا تھا نہ ہی کوئی سائیں' ایک عام سا کمہار جو برتن گھڑنے کے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ تمہیں بری طرح چونکا گیا جبکہ اس وقت اس کے اردگرد بہت سے لوگ موجود تھے' کسی نے نہیں سوچا کہ اس دھوتی کرتا پہنے کمہار کے اندر کوئی اور شخص چھپا ہے۔"
ماہ نور نے اپنے بیگ میں کوئی ایسی چیز تلاش کرنا چاہی' جو شاید اس میں موجود ہی نہیں تھی۔
"اور پھر ایک عام سا لڑکا تم سے تمہارے اسکیچ کی قیمت پوچھتا ہے' ایک ایسا اسکیچ جسے تم نے بیچنا ہی نہیں اور تم اسے فروخت کرنے کی ہامی بھر لیتی ہو۔"
ماہ نور کا ہاتھ لگنے سے ٹیبل پر رکھا گلاس گر گیا۔
"فائنلی تم ایک نو آموز سنگر جو ایک آوٹ آف کنٹرول کراؤڈ میں کچھ گا کر سنانے کی کوشش میں مصروف ہے کو دیکھ کر بے اختیار اس کی طرف لپکتی ہو اور بھرے مجمع میں اس کا بازو پکڑ کر چلاتی ہو اس سے پوچھتی ہو' وہ کون ہے۔"
ماہ نور نے اپنا دھیان دوسری طرف کر لیا اور اپنے بالوں کی اڑتی لٹ کو کان کے پیچھے اڑسنے کی کوشش کرنے لگی۔
"ایسی بے اختیاری... کیوں لگی ماہ نور' خود سے پوچھا ہے کبھی؟" وہ اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
"اس سوال کے جواب کی تلاش ہی تو مجھے یہاں تک لے آئی ہے آج۔" ماہ نور نے دھیان اس کی طرف واپس پھیر کر کہا۔
"کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی شخص کو ایک سے دوسری دفعہ دیکھیں اس کے ایک ہی حلیے میں تو پہچان نہیں پاتے۔" اس نے کہا۔
"پھر تم کو اتنے مختلف حلیوں اور مقامات والے لوگوں نے کیوں بار بار چونکایا؟"
"مجھے نہیں پتا۔" ماہ نور نے الجھ کر کہا۔
"پتا کرو ماہ نور۔" وہ مسکرایا۔ "یہ بڑا اہم سوال ہے۔"
"میں اب چلوں گی بہت دیر ہو گئی۔" ماہ نور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔
"میرا خیال ہے' ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں۔" وہ اس کے ساتھ چلتے چلتے بولا۔ "کتنے دن مزید ٹھہرو گی تم اسلام آباد میں؟"

"مجھے پہیلیوں کی طرح گنجلک' جلیبی کی طرح بل دار' چھلاووں کی طرح حاضر غائب اور بہروپیوں کی طرح نت نئے سوانگ بھرنے والے لوگوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" ماہ نور نے پارکنگ لاٹ کے قریب پہنچ کر اس کے سوال کا جواب دیا۔
"اوہ رئیلی!" وہ مسکرایا۔ "اور پھر بھی تم اپنے ذہن میں اٹھتے سوالوں کے جواب لینے آج یہاں آ گئیں۔" ماہ نور نے خفگی سے سر جھٹکا۔
"میں نے بڑے اچھے الفاظ میں معذرت تو کر لی' اب ایک ایسی بلا ارادہ غلطی پر معاف کرنے کا اختیار تو صرف تمہارے پاس ہے۔" وہ بولا۔
"لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے میں اس سلسلے میں شیور ہوں کہ تم ایک اچھی دوست بن سکتی ہو۔ میں تمہیں فوک سونگز کے ناقابل یقین کلیکشن سے متعارف کروا سکتا ہوں۔ بندر کا تماشا کرنے کے لیے بنیادی ٹپس دے سکتا ہوں۔ اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن میں مجھے یقین ہے' تمہیں دلچسپی محسوس ہو گی۔ لیکن پھر بھی چوائس تو بہرحال تمہاری ہے۔" وہ اپنی گاڑی کی طرف مڑنے سے پہلے بولا۔
ماہ نور برقی روشنیوں کے سائے میں اسے خود سے تیسرے نمبر کے فاصلے پر کھڑی گاڑی میں بیٹھتے دیکھتی رہی۔ اس کے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی گاڑی میں لگے طاقت ور اسپیکرز بج اٹھے۔
" We found love in a hopeless plece "
دوسرے لمحے ہی شاید آواز کو مدھم کر دیا گیا تھا اس کی گاڑی بیک ہوئی اور دائیں طرف مڑ کر سیدھے راستے پر رواں ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"تم اگر کھاؤ پیو گی نہیں تو یونہی اس بیڈ پر پڑے پڑے تمہاری زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔" سیمی آنٹی نے سیب کا چھلکا اتارتے ہوئے کہا۔
"پھر کیا ہے جب نارمل زندگی قسمت ہی میں نہیں رہی تو یوں ہی پڑے پڑے گزر جائے کیا حرج ہے۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔
"یوں جو ہو گی' وہ زندگی نہیں ذلالت ہو گی۔" سیمی آنٹی نے اشتعال میں آتے ہوئے چھری فروٹ باسکٹ میں پٹخ دی۔
"تمہیں Bed ridden (بستر پر پڑے) مریضوں کے انجام کا اندازہ ہے۔" انہوں نے زنجیر کے ساتھ لٹکتی گلے میں پڑی عینک آنکھوں پر لگاتے ہوئے کہا۔
"تمہیں خبر ہے کہ "Bed sores" (بستر پر لیٹے رہنے سے پڑنے والے چھالے اور زخم) کیا ہوتے ہیں۔" سیمی آنٹی کو اپنے الفاظ کی سفاکی کی کبھی پروا نہیں ہوتی تھی۔
"تم نے کبھی ان بے بس' معذور اور بدقسمت لوگوں کی بابت سنا ہے جو Bed sores کا شکار ہو جاتے ہیں اور پھر ان کے ان زخموں میں کیڑے پڑ جاتے ہیں ان کے قریب بدبو اور وحشت کے مارے کوئی پھٹکتا تک نہیں۔"
سارہ نے اپنی آنکھیں مضبوطی سے بند کر لیں۔
"جن کے اپنے سگے رشتے ہوتے ہیں ماں' باپ' بہن بھائی' بیٹا بیٹی' شوہر... وہ بھی اس انجام سے دوچار ہوتے ہیں کیونکہ رشتے بھی اس صورت حال کے آگے ہار مان جاتے ہیں اور تم تو..." پہلی بار سیمی آنٹی کوئی بے رحمانہ جملہ بولتے بولتے رک گئیں۔

"مجھ پر کب تک انحصار کیا جا سکتا ہے۔" کچھ دیر بعد وہ قدرے پست آواز میں گویا ہوئیں۔
"ہائپر ٹینشن، شوگر اور جوڑوں کے درد میں مبتلا ایک چھپن سالہ عورت تم کو کب تک یوں سنبھال پائے گی۔"
انہوں نے نپانی پانی ہوتی آنکھوں سے سارہ کی طرف دیکھا جس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔
"غنیمت سمجھو جو اس لڑکے کے روپ میں خداوند نے ایک فرشتہ تمہارے لیے بھیج دیا۔" انہوں نے اسے یاد دلایا۔
"میری سمجھ میں اگرچہ یہ نہیں آتا کہ اس کو تمہارے ساتھ اتنی ہمدردی کیوں ہے۔" انہوں نے ایک بار پھر سارہ کی طرف دیکھا۔ "لیکن اگر ہے اور وہ اس فلیٹ کے علاوہ تمہارے کھانے پینے، دوا دارو کا خیال کرتا ہے تو تمہیں بھی سوچنا چاہیے "آخر کب تک کرتا رہے گا؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
"تمہیں زندگی نے موقع دیا ہے کہ اس میں پھر سے متحرک ہو جاؤ، خود کو اس قابل بنا لو کہ زندگی کا حق ادا کر سکو، پھر کیوں اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھاتیں۔" سیمی آنٹی کا پتھر مارنے کا سا انداز بے بسی میں ڈھلنے لگا۔
"کیوں خود کو اس قابل نہیں بنا لیتیں کہ دوسروں کے سہارے اٹھنے بیٹھنے کی محتاجی سے نکل کر اپنے سے بھی بری حالت میں مبتلا کسی انسان کو ایک helping shoulder (سہارا) پیش کر سکو۔
کب تک جو ہو گیا اس کا غم مناتی رہو گی۔" سیمی آنٹی نے سوال کیا۔
"ویسے بھی تو عمر تاروں، بار زاور رنگ میں کرتب دکھاتے نہیں گزرنا تھی ریٹائرمنٹ کا ایک وقت تو بہر حال آنا ہی تھا۔ سمجھو آچکا۔ اب ریٹائرڈ لائف کا کوئی مصرف سوچو، پریاں بھی بوڑھی ہو جاتی ہیں لیکن ان کا فیری ونڈ (پری کی چھڑی) کبھی بوڑھا نہیں ہوتا وہ اپنی سنہری جھلملاہٹیں ہر دم ہر سو بکھیرتا رہتا ہے۔"
"تھو پر یا رانی۔" سیمی آنٹی کا لہجہ پتھر سے نرم اور نرم سے نرم ترین ہوا جا رہا تھا۔ "فرشتوں کا قیام ہمیشہ کے لیے نہیں رہتا خداوند انسانوں کو وقتی سہارا دینے کے لیے فرشتے بھیجتا ہے پھر ان کو ان کے اگلے کام پر لگا دیتا ہے۔"
سارہ نے سیمی آنٹی کی بات مکمل ہونے کے بعد سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔
"آپ کے خداوند کو یاد ہونا چاہیے کہ جو زندگی اس نے مجھے عطا کی وہ میرے ساتھ کبھی بھی فیئر نہیں رہی، زندگی نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ میں دراصل ہوں کون، میں بلیو ہیون سرکس میں کیسے آئی، مجھے پیدا کرنے کے ذمہ دار وہ دو لوگ کون تھے جن کو کبھی یاد نہیں آیا کہ میری پیدائش ان کے جسمانی ملاپ کا نتیجہ تھی اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔" سارہ کا لہجہ اور چہرہ دونوں ہی بے تاثر تھے۔
"آپ کے خداوند کو یہ بھی یاد ہونا چاہیے کہ جب بلیو ہیون سرکس میں پائے جانے کی پاداش میں مجھے نٹ بن جانا پڑا اور نٹ بننے کے دوران جسمانی اور روحانی مشقتیں جھیلنا پڑیں اس وقت میں نے کتنی بار اور کیسے کیسے اسے یاد کیا کن کن التجاؤں کے ساتھ اسے پکارا۔ مگر جواب میں اس کی طرف جامد خاموشی طاری رہی اور میری زندگی اسی رنگ میں ڈھلتی گئی جو وہ تقدیر کر چکا تھا۔ اس کو یہ بھی یاد ہونا چاہیے کہ برسوں رنگ میں کرتب دکھاتے کن کن تماشائیوں کے چہروں پر پھیلی آسودگی اور مسرّت کو دیکھ کر میں نے اسے پکار کر التجا کی کہ ایسا ہی کچھ مجھے بھی عطا کر دے مگر اس نے میری کسی ایسی التجا کا جواب نہیں دیا۔
اسے وہ وقت بھی یاد ہونا چاہیے کہ اس آخری کرتب کے دوران جب میں نے ہوا میں تین قلابازیاں کھانے کے بعد خود کو سیدھا کر کے واپس بار پر ٹک جانا چاہا تو اس کرتب کو دیکھ کر گلابی ربنوں سے پونیاں باندھے اس بچی کو کھلکھلا کر ہنستے ہوئے اپنے باپ کے سینے سے لگتے ہوئے دیکھ کر میں نے ایسے ہی ایک سینے کی جو چاہ کی تھی اسے کرنے کے دوران جب میرا دھیان بھٹکا اور مجھے محسوس ہوا کہ میرے پاؤں کی انگلیاں تھرک گئی ہیں اور وہ بار پر

جالر نہیں ... جو میرے اور اس حادثے کے درمیان تھا میں نے اسے پکار کر کیا اپنی گزشتہ تمام خواہشات پر معافی اور ان سے دست برداری نہیں مانگی تھی۔ میں نے اس سے زندگی بھر کے دوران ایک صرف ایک معجزے کی بھیک مانگی تھی۔"
اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگ گئی تھی اس کا حلق گھٹنے لگا تھا اور زبان ساتھ چھوڑ رہی تھی اس نے آنسوؤں کے گولے کو بمشکل حلق سے گزارا اور بھیگے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔
"نہیں۔" اس نے کہا۔ "آپ کے خداوند کی دی ہوئی زندگی میرے ساتھ کبھی فیئر نہیں رہی۔ اس وقت بھی نہیں جب معجزے کی دعا مسترد ہونے پر بار سے گرتے ہوئے میں نے اس زندگی ہی سے دست برداری کی دعا کی تھی، جب میں نے اسے پکار کر کہا مجھے نہ جیتے نہ مرتے میں سے نہ کرنا۔ مجھے ابدی نیند سلا دینا۔ اس وقت بھی تقدیر کے قلم نے میری عرضی پر ریجیکٹڈ کے الفاظ لکھ کر اس پر سیاہ روشنائی کی لکیر کھینچ دی۔
پھر اب!" اس نے ڈبڈبائی نظروں سے سیمی آنٹی کی طرف دیکھا۔
"اب کس بھروسے پر اس "زندگی" کے بھرّے میں آؤں میں کسی التباس کا شکار ہو کر اس "زندگی" کی طرف چل دوں جس نے سدا میری طرف اپنا منفی پہلو موڑے رکھا۔ جس کو آپ کے خداوند نے ہدایت کر رکھی ہے کہ یہ اس روپ میں میرے سامنے آئے جو میرا "من چاہا" نہیں ہے۔
مت سنائیں مجھے حرکت اور عمل کی داستانیں۔" اس نے سر جھٹکا "انجام کی کوئی بھی لرزہ خیزی مجھ پر آغاز کی سفاکی سے بڑھ کر دہشت کی کیفیت طاری نہیں کر سکتی۔"
"پڑا رہنے دیں مجھے یوں ہی، ہونے دیں زخم اور بننے دیں میرے جسم کو جیتے جی خوراک حشرات الارض کی۔" اس نے سخت اور بلند آواز میں کہا۔
سیمی آنٹی بے یقینی سے اس کے الفاظ سن رہی تھیں۔ وہ اس کی زندگی کے سارے سفر سے واقف تھیں۔ ایک پُراعتماد، بے خوف، ہنستے کھلکھلاتے خطرات سے بھرپور کرتب دکھاتی اس لڑکی کے دل میں شروع ہی سے اتنی تلخی اور اتنی مایوسی تھی، انہیں اس کا اندازہ اس روز پہلی بار ہوا تھا مگر وہ اس کے ان الفاظ سے ہار مان کر اسے زندگی کی طرف لوٹ آنے کی ہلاشیری دینے سے باز آنے والی نہیں تھیں۔
"سعد کے بارے میں سوچا تم نے کبھی؟" انہوں نے سارہ کی تمام تلخیاں سننے کے بعد تحمل سے پوچھا۔
"کیا سعد وہ معجزہ نہیں ہے جس کی تم نے دعا کی تھی۔ کیا وہ ان تمام التجاؤں، پکاروں اور دعاؤں کا جواب نہیں ہے جو عمر بھر تم نے خداوند سے کیں۔
کیوں اس خداوند نے تمہارے چکنا چور، شکستہ اور نیم جان وجود کو اٹھا کر اس کی مسیحائی کی طرف لے جانے کو اس لڑکے کو وہاں بھیجا؟" سیمی آنٹی نے اس سے سوال کیا۔
"کیا دلچسپی تھی اس لڑکے کی ایک بے کار اور قریب المرگ وجود میں؟
کیوں اس کے دل میں مدد کا "مسیحائی کا جذبہ اس نے اتارا جو تمہارے بقول تمام عمر تمہاری پکاریں مسترد کرتا رہا۔
اس کو تمہاری زندگی ختم کرنا ہوتی تو اسی وقت کر دیتا جب تم بار کے بجائے زمین پر جا گری تھیں۔ تم کو زندگی کی کچھ اور اذیت دینا مقصود تھا تو ان ابتدائی دنوں جب تم زخم زخم اپنی چھولداری میں بغیر کسی علاج کے پڑی تھیں اور تمہارے قریب مکھیوں کے علاوہ کوئی دوسرا جاندار آنے کو تیار نہیں تھا، کے بعد ہی ختم کر دیتا۔ کیوں اس کو تمہاری موت کے بجائے زندگی مقصود تھی جو اس نے اس لڑکے کو تمہاری تلاش میں لگا دیا جو گھڑی بھر کو سرکس کے دوران تمہیں گرتا دیکھ کر چلا گیا تھا۔

یہ کوئی آسان کام نہیں تھا جس کا ذمہ اس نے لے لیا۔" سیمی آنٹی نے اسے باور کرانا چاہا۔ "زخموں سے چور جسم کے زخم کتنے عرصے میں بھرے، جگہ جگہ سے ادھڑی کھال کی گرافٹنگ کیسے ہوئی ٹوٹی رگوں میں خون دوبارہ کیسے جاری ہوا۔۔۔ یہ دنوں اور ہفتوں کا نہیں مہینوں کا عمل تھا اور وہ کیسا پر عزم تھا یہ میں جانتی ہوں۔ اس کو یہ عزم، یہ حوصلہ کس نے عطا کیا اس کے دل کو اتنی نرمی اور مزاج کو اتنی عاجزی کس نے بخشی۔ کبھی سوچا تم نے؟ مگر وہ تو صرف وسیلہ تھا۔" دم لینے کو رکنے کے بعد وہ دوبارہ کہنا شروع ہوئیں "اصل مرضی اس خداوند کی ہی چلنی تھی۔ جس نے تمہارے قریب الخاتمہ جسم و روح کو دوبارہ زندگی بخشنے کے لیے سعد کو وسیلہ بنا کر بھیجا۔" سیمی آنٹی نے سرسری نظر سارہ پر ڈالی جو رونا دھونا بھول کر مبہوت ہوئی ان کی بات سن رہی تھی۔

"گلے گزاریاں ہم انسان بہت کرتے ہیں، شکر گزاری کی طرف آنے کا نام نہیں لیتے۔" انہوں نے عینک اتار کر رومال سے اس کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارے اندر شیطان بیٹھا ہے جو شکر گزاری کے جذبے پر جھپٹا مارتا ہے، اسے آگے جانے سے روکتا ہے دل میں گلے شکوے شکایتوں کا غلبہ رکھتا ہے۔ خداوند کی مرضی تو صرف یہ ہے کہ اس شیطان کو پچھاڑ کر بے دخل کیا جائے۔ نہ ہم اس کی مرضی پوری کرتے ہیں نہ ہماری عرضیوں پر قبولیت کی مہریں لگتی ہیں پھر ہم چلاتے ہیں فلاں وقت پکارا، فلاں چیز کی بھیک مانگی فلاں وقت التجا کی۔ خداوند کی طرف سے جامد خاموشی پائی۔"

"مجھے بھوک لگی ہے۔" مبہوت سارہ نے سیمی آنٹی کی گفتگو کا طلسم ٹوٹنے پر نیچی آواز میں کہا۔

"سیب کھاؤ۔" انہوں نے پلیٹ اس کے سامنے رکھی۔

"میں نے گھوٹی دال کے ساتھ روٹی کھانی ہے ٹماٹر کی قاشیں سجا کر۔" اسے سرکس کے دنوں کا وہ کھانا یاد آیا جو سیمی آنٹی کے مشاق ہاتھ بڑے پیمانے پر بنایا کرتے تھے۔

"پیاز اور ہری مرچوں کا کچومر بھی بناتے ہیں۔" سیمی آنٹی اس کھانے کے تذکرے پر ایک دم خوش ہو گئیں اور تیزی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔

Its 11:30 am (صبح کے ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں۔) کلک کی آواز کے ساتھ سامنے کی دیوار پر لگے کلاک کا نیلا پرندہ باہر نکل کر اعلان کر رہا تھا۔

"آج ایک بار پھر تم وقت کا اعلان کرتے رہو۔ دیکھتے ہیں اس بیڈ سے اس چیئر تک پہنچنے میں مجھے آج کتنا وقت لگتا ہے۔" سارہ نے نیلے پرندے کی طرف دیکھ کر کہا۔ نیلا پرندہ جیسے ہولے سے سرہلا کر واپس اپنے باکس میں بند ہو گیا۔

"آج اس کھڑکی تک پہنچنے کے بعد میں گنتی گنوں گی۔"

سارہ نے سیمی آنٹی سے سنی باتوں کو یاد کرنے کے بعد ایک نئے حوصلے کو اپنے اندر مجتمع کرنے کی سعی کرتے ہوئے سوچا۔

"پھر اس کے بعد اس سے اگلے قدم کے لیے مجھے تمہاری ضرورت پڑے گی اور میں ایک دو تین کا ورد کروں گی اگر جو تم پہنچو۔" اس نے تصور میں بیٹھے شخص کو مخاطب کر کے سوچا۔

☼ ☼ ☼

میدانی علاقوں میں گرما کا آغاز ہو چکا تھا۔ صبح در شام میں خوشگوار مگر دوپہریں گرم رہنے لگی تھیں۔ اسکول سے واپسی پر گھر پہنچتے پہنچتے دو ڈھائی بج جاتے تھے قصبے کے اسکول سے بچیوں کو گاؤں پہنچانے والا تانگہ سڑک پر ہی اس گاؤں کی بچیوں کو اتار دیا کرتا تھا اس کے بعد اسے اگلے گاؤں کی بچیوں کو پہنچانا ہوتا تھا سرکاری اسکول کی مخصوص

وردی نیلی قمیص، سفید شلوار اور سفید بڑے سے ڈوپٹے میں ملبوس، کتابوں کا وزنی بستہ اٹھائے سعدیہ گاؤں کے آغاز میں موجود کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر جما جما کر قدم رکھتے ہولے ہولے چل رہی تھی۔ دوپہر میں سورج کی حدت بڑھ جانے کی وجہ سے اسے پسینہ آرہا تھا اس کی کوشش تھی کہ وہ ان پگڈنڈیوں پر چلے جن کے ساتھ سایہ دار درخت تھے۔ مگر اس روز پھر بھی اسے سڑک سے گھر تک کا فاصلہ معمول سے زیادہ لگ رہا تھا۔ چلتے چلتے سر اٹھا کر اس نے سامنے دیکھا۔

چوہدری سردار کا فارم ہاؤس اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ سامنے کھڑا تھا۔ روزانہ اسکول آتے جاتے وہ اس فارم ہاؤس کو غور سے دیکھتی تھی۔ وہ اتنے وسیع رقبے پر پھیلا ہوا تھا کہ سعدیہ کبھی تعین نہ کر سکی تھی کہ وہ کہاں سے شروع ہوتا تھا اور کہاں ختم ہوتا تھا اس کے گرد کھڑی دیواریں اتنی اونچی تھیں کہ ان سے اوپر جاتے نظر تھک جائے۔ اس کا آہنی گیٹ سیاہ رنگ کا تھا اور کبھی کبھار ہی کھلا نظر آتا تھا جب بھی یہ گیٹ کھلا نظر آتا تھا سعدیہ اور اس کے ساتھ کی لڑکیاں کتنی کتنی دیر اندر جھانک کر اندازہ لگانے کی کوشش کرتیں کہ اندر کیا ہوتا تھا۔ وسیع و عریض باغوں، پھولوں، پودوں اور درختوں سے پار اندر کی عمارت شاید ہی کبھی نظر آئی ہو کندھوں پر بندوقیں لٹکائے مختلف مرد البتہ اکثر نظر آتے تھے۔

"یہاں ڈاکو اور چور سارا دن چھپے رہتے ہیں۔ رات کو باہر نکل کر ڈاکے ڈالتے ہیں۔ لوگوں کو گولیاں مار کر قتل کرنے والے بھی یہاں ہی رہتے ہیں۔" سعدیہ کی سہیلی روبینہ ان کے سامنے انکشاف کرتی۔

"تمہیں کیسے پتا؟" باقی لڑکیاں سوال کرتیں۔

"میرا چاچا بھی پہلے ادھر ہی کام کرتا تھا۔ اس نے ایک دفعہ ایک ٹوٹی کرسی اٹھالی، گھر لے جانے کے لیے اس کے گھٹنے میں گولی ماروی تھی کسی نے اندر، ساری عمر کے لیے لنگڑا ہو گیا۔ بے چارہ وہ بتاتا ہے سب کچھ۔" روبینہ نے بتایا اور سب کے دل پر ہیبت طاری ہو گئی۔

"مگر چوہدری صاحب تو بڑے اچھے آدمی ہیں۔" سعدیہ حیران ہو کر بولی۔

"ہم جب یہاں آئے تھے تو ہمیں مسجد سے الگ گھر انہوں نے ہی دیا تھا۔ ہمارے گھر فارم سے سبزیاں اور پھل بھی بھیجتے ہیں۔ ابا جی کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ گندم اور چاول کی بوریاں بھی ہمارے گھر ادھر سے ہی آتی ہیں۔"

"تمہارے ابا جی پیپی ہوں گے۔" ایک لڑکی نے بتایا۔

"کوئی نہیں، ابا جی کو تو مسجد سے تنخواہ ملتی ہے۔" سعدیہ نے اس لڑکی کو جھٹلایا۔

"چوہدری بڑا چالاک ہے۔" روبینہ قہقہہ لگا کر ہنستی۔ مولوی صاحب کو نذرانے دے کر اپنا کالا دھن چٹا کرتا ہے۔ مولوی جی تو اس کے حق میں دعائیں ہی کریں گے نا سوغاتیں لے کر۔"

سب لڑکیاں اس بات پر ہنستیں اور سعدیہ کو بہت برا لگتا۔ اسے ایسا لگتا جیسے سب ابا جی پر رشوت لینے کا الزام لگا رہی ہوں، جو کہ سراسر بہتان تھا۔ ابا جی تو گھر میں بھی اور مسجد میں بھی صاف صاف لفظوں میں بتاتے تھے کہ رشوت لینے والا اور رشوت دینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ اب چوہدری صاحب بھلے جہنمی ہوں، ابا جی جیسا تہجد گزار، قرآن کا حافظ شخص تو اپنے عمل جہنم کی آگ میں نہیں جھونک سکتا۔

اس روز بھی سعدیہ فارم ہاؤس کو دیکھ کر یہی باتیں یاد کرتی چلتی جا رہی تھی۔ آج اس کے ساتھ جانے والی چاروں لڑکیوں نے نائیوں کی بیٹی کی شادی کی وجہ سے چھٹی کی تھی اور صرف وہی اکیلی اسکول گئی تھی۔ اکیلے ہونے کی وجہ سے راستہ اور بھی لمبا لگ رہا تھا۔ فارم ہاؤس کے قریب پہنچ کر اس نے دیکھا۔ فارم ہاؤس کی مشرقی دیوار سے باہر نکلا لمبا سا نل پانی اگل رہا تھا اور ماسی رشیدہ اس ہودی کے قریب بیٹھی منہ ہاتھ دھو رہی تھی جہاں یہ پانی

آکر گر رہا تھا۔

"السلام علیکم ماسی!" سعدیہ نے رک کر تعظیماً سلام کیا۔

"وعلیکم السلام!" ماسی نے سر اٹھا کر سعدیہ کی طرف دیکھا۔

"سکولوں پڑھ آئی (اسکول سے پڑھ آئی۔)" سعدیہ نے سر ہلایا۔

"گرمی بڑی اے' آمیری دھی دو چھپا کے پانی کے منہ پر لگالے اور دو گھونٹ پانی پی لے' بڑا ٹھنڈا میٹھا پانی ہے۔" ماسی نے دعوت دی۔

"او ماسی او ماسی... ایہہ پانی تے کھارا اے۔" نہ جانے کہاں سے کھاری نمودار ہوا اور ماسی کو پانی پینے سے روکنے لگا۔

"تیرا بیڑا اتر جائے (تیرا بھلا ہو) مجھے کیا پتا یہ پانی کھارا ہے' کھاری کی طرح۔" ماسی نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"آپ لوگ بھی تو جہاں پانی دیکھو' بیٹھ جاتے ہو۔" کھاری نے کہا۔

"شکر ہے میں پی نئیں لیا' نہ ایس نمانی نے بتیا۔" ماسی نے دوپٹے سے چہرہ خشک کرتے ہوئے کہا۔

سعدیہ نے کھاری کی طرف دیکھا۔ جو دانت نکوس رہا تھا۔

"یہ کتنا خوش قسمت ہے' ہر وقت فارم ہاؤس میں رہتا ہے۔" سعدیہ نے سوچا۔ چوہدری صاحب ان کے گھر جو بھی چیز بھیجتے کھاری ہی لے کر آتا تھا اور اس کی سعدیہ کی اماں سے اچھی خاصی بے تکلفی تھی۔ اماں ہمیشہ یتیم یسیر بچہ کہہ کر کھاری کی خوب خاطر تواضع کرتی تھیں۔

"جو یہ پانی پی لیتی اور اسے کچھ ہو جاتا تو مولوی صاحب کتنا ناراض ہوتے۔" ماسی نے سر جھٹک کر کہا۔ کھاری نے سعدیہ کی طرف دیکھا۔

"ماسی! سعدیہ' مولوی صاحب اور بھین جی سے کتنی چھوٹی ہے نا۔" کھاری کی اس بات کی کیا تک تھی۔ سعدیہ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر کھاری کا کیا تھا اس کی تو سنا تھا اکثر ہی باتیں بے تکی ہوتی تھیں۔

ماسی نے ٹھوڑی پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "بچے' ماں' باپ سے چھوٹے ہی ہوتے ہیں۔"

"نا ماسی نا!" کھاری نے سر ہلایا۔ "سعدیہ بہت ای چھوٹی ہے۔ مولوی صاحب کی عمر دیکھو' بھین جی ان سے کتنی چھوٹی لگتی ہیں اور سعدیہ ان دونوں سے کتنی چھوٹی ہے۔ مجھے لگتا ہے مولوی صاحب اور بھین جی کی شادی بڑی لیٹ ہوئی تھی۔ سعدیہ دونوں کی پچھلی عمر کی اولاد ہے۔"

"او چل شدائیا" ماسی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تیری بات کا نہ کوئی سر ہوتا ہے نہ پیر' نتیوں گھر چھوڑ آؤں' تیری ماں سے بھی مل لوں گی۔" ماسی نے سعدیہ سے کہا جو کھاری کی بات پر غور کر رہی تھی۔

"مانو نہ مانو میں صحیح کہہ رہا ہوں۔" کھاری نے سعدیہ کی طرف دیکھ کر دانت نکالتے ہوئے کہا۔

سعدیہ نے عجیب نظروں سے کھاری کی طرف دیکھا اور ماسی کے ساتھ چل دی۔ سب کی نظر میں احمق کھاری نے سعدیہ کا دھیان اس روز ایک ایسی بات کی طرف لگا دیا تھا جس پر اس نے پہلے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

"ایک چارکول آرٹسٹ ہیں فلزا ظہور' اسلام آباد ہی میں رہتی ہیں۔" مجھے ان کا اتا پتا کچھ معلوم نہیں مگر مجھے ان سے ملنا بھی ہے کیا کروں۔

ماہ نور کا یہ پیغام سعد کے سیل فون پر اس وقت ریسیو ہوا جب وہ ابراہیم کے جم میں ٹریڈ مل پر بھاگ رہا تھا۔ اس کی جیب میں رکھا فون وائبریٹ ہوا۔ وہ رک کر محض ایک میسج پڑھنے کے لیے اپنے پسینے میں شرابور جسم کو وقفہ

نہیں دینا چاہتا تھا۔ لیکن نجانے کیوں اسے محسوس ہوا کہ اسے رک کر یہ میسج پڑھ لینا چاہیے۔ اس نے مشین آف کی اور ٹریڈ مل سے اتر آیا۔ تولیے سے پسینہ خشک کرتے ہوئے چیئر پر بیٹھنے سے پہلے وہ یہ پیغام پڑھ چکا تھا۔ یہ پیغام اس کے لیے ایک سرپرائز تھا۔ اگرچہ اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ اس روز کی ملاقات کے بعد ماہ نور ضرور اس سے رابطہ کرے گی مگر وہ بہت پُریقین بھی نہیں تھا۔

"تمہاری خاطر میں ان خاتون کا پتا جلد ہی لگالوں گا۔" اس نے تیزی سے جواب ٹائپ کیا اور بھیج دیا۔

"تو نے ٹریڈ مل کی جان جلدی نہیں چھوڑ دی آج۔" اسی دم ابراہیم اس کے قریب آیا "کہیں تیری کوئی کیلوری جلنے سے رہ نہ گئی ہو۔"

"جو رہ گئی ہوگی وہ تو لے لینا ادھار۔" وہ مسکرایا۔

"میرے پاس پہلے ہی وافر ذخیرہ ہے کیلوریز کا' تیری کبھی کم پڑ جائیں تو مانگ لینا۔ ادھار نہیں پکی دے دوں گا بخوشی۔" ابراہیم نے اپنے کسرتی مضبوط جسم پر شرٹ کھینچ کر نیچے کرتے ہوئے کہا۔

"او نا بابا!" سعد نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے "تیری مرغ کڑاہیوں' چپلی کبابوں' ہریسوں' نہاریوں اور افغانی پلاؤوں کی پلی کیلوریز لینے کا رسک کون لے' جو دس گھنٹے بھی ان مشینوں پر گزار کر جان نہ چھوڑیں۔" اس نے جم کے ہال میں موجود ایکسرسائز مشینوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھ کتنا اسٹاؤٹ (مضبوط) ہے میرا جسم۔" ابراہیم نے بازو دبا کر اپنے ڈولے دکھاتے ہوئے کہا۔ "تیری طرح دبلا پتلا نہیں ہوں' نرا قد اور ہڈیاں۔"

"تجھے مبارک تیرا مضبوط جسم' میں ایسے ہی بھلا۔" سعد نے جھک کر اپنے سینکوز کے تسمے باندھتے ہوئے کہا۔

"آج کیا پروگرام ہے۔" ابراہیم نے پوچھا۔ "چلتا ہے بنی گالا اجمل کی طرف' وہ آج نمک اور کالی مرچ والی لیمب کڑاہی بنا رہا ہے مکھن میں' پُرزور دعوت دی ہے اس نے ہمیں۔"

"او جگر' کبھی ان مسئلوں سے آگے بھی سوچا کر' زندگی صرف کھانا پینا اور کسرتیں کرنا ہی نہیں۔" سعد نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

"تو تمہارے ساتھ اوٹ پٹانگ جگہوں پر اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے کون جاتا ہے اگر میں صرف کھانے پینے اور کسرتیں کرنے ہی میں لگا رہتا ہوں تو۔" ابراہیم نے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"وہاں بھی تو کاڑھے کے پیالے پیتا اور دیسی گھی کے جلیب کھاتا پھرتا ہے۔" سعد نے مسکرا کر کہا اور ایک بار پھر اپنے سیل فون کے ان باکس کو چیک کرنے لگا۔

"لے پھر میں چلتا ہوں' تو ڈنر نکلوا اپنے آنریبل ممبرز کے۔" سعد نے ہاتھ ابراہیم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جا کدھر رہا ہے" ابراہیم نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

"کسی کی تلاش میں جا رہا ہوں۔" سعد نے زیر لب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"کسی ملا' حکیم کہ طبیب کی یا پھر سائیں کی؟" ابراہیم نے ابرو اچکاتے ہوئے سوال کیا۔

"اس بار کسی سائیکاٹرسٹ کی" سعد نے سر ہلایا "جو نبض پر ہاتھ رکھے بغیر مرض کے بارے میں بغیر کچھ پوچھے جان لیتا ہے۔"

"تیری باتیں۔ باتیں نہیں گتھیاں ہیں۔" ابراہیم نے سر جھٹک کر کہا۔

"اور تو ان گتھیوں کو سلجھانے سے بہتر یہ سمجھتا ہے کہ گشتا بے کھا کر سو جایا جائے۔" سعد نے ایک بار پھر

اس پر چوٹ کی۔

"دیکھ لے تو زیادتی کر رہا ہے۔" ابراہیم نے یاد دلایا۔

"معاف کر دے بھائی۔" سعد نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا اور ابراہیم کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا کر باہر کو چل دیا۔

"فلزا ظہور۔" گاڑی میں بیٹھ کر اس نے ایک بار پھر میسج پڑھ کر نام کنفرم کیا۔ دوسرے لمحے وہ کسی کو کال کر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اسے خود بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ فلزا ظہور کو ڈھونڈنے کے لیے اس نے سعد سلطان کو میسج کیوں کیا تھا۔ سعد سلطان سے اس روز کی ملاقات کے بعد گھر آکر اس نے فیصلہ کیا تھا کہ تجسس ختم ہوا' اتفاقات کے سلسلے کا راز کھلا اور دل پر چھایا غبار چھٹ گیا' مزید کسی التباس کا امکان نہیں' ذہن میں اٹھتے سوالوں کے جواب مل گئے منطق اور بصارت دونوں کی جنگ بھی ختم ہو گئی' اب وہ ایک پرسکون اور نارمل زندگی گزارنے لگے گی۔ مگر ہونے یہ لگا تھا کہ اس دن کے بعد سوتے جاگتے' کھاتے پیتے' کسی دوسرے شخص سے گفتگو کرتے' گھومتے پھرتے غرض ہر وقت' ہر جگہ سعد سلطان کا تصور اس کے لاشعور میں رہتا تھا' اس نے اپنے ذہن کو کئی بار جھٹکا' اس خیال سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی' مگر ناکام رہی' اور جب شاہ بانو نے اس امکان کو مسترد کر دیا کہ بغیر کسی پتے کے وہ فلزا ظہور کو تلاش کر سکتی ہیں اسی روز اس نے بغیر کچھ اور سوچے فلزا ظہور سے متعلق سعد کو میسج کر دیا تھا۔

"در حقیقت تم کسی بہانے اس سے رابطے کی خواہش مند تھیں" اس رات اسی بات پر غور کرتے کرتے اس کے لاشعور نے اس کے شعور کو دو ٹوک بتایا۔

"یہ بھی غلط نہیں کہ وہ لڑکا متاثر کن شخصیت کا مالک ہے اور اس کی سنائی کہانی اس سے بھی زیادہ متاثر کن ہے۔" اس کا ذہن یہ پیغام وصول کر رہا تھا اور اس کا دل اس پیغام کو جھٹلا نہیں پا رہا تھا۔

"یہ بھی درست ہے کہ پہلے ان بہروپیوں کا سحر تھا' اب سعد سلطان کا سحر ہے' جو تم پر طاری ہے۔"

"یہ بھی سچ ہے کہ دنیا میں چند ہی ایسے لوگ ہوتے ہیں' جو ملتے ہیں تو انسان کے ذہن پر اپنا ایسا مضبوط تاثر چھوڑ جاتے ہیں کہ اس تاثر سے چھٹکارا ناممکن ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر کسی کو ایسے لوگ ملیں' مگر جن کو ملتے ہیں ان کے لیے ایسے لوگوں کے تصور سے چھٹکارا مشکل ہوتا ہے اور تم ان ہی لوگوں میں شامل ہو چکی ہو جن سے ایسے لوگ ملتے ہیں۔"

"یہ احساس کیا ہے۔" اس نے اپنے لاشعور کی حقیقت بیانی سے ہار مانتے ہوئے کروٹ بدل کر سوچا۔ "مجھے وہ اچھا لگا یا کچھ اور؟" اس نے خود سے سوال کیا۔ "اس نے کہا تھا ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں' کیا میں اس کی اچھی دوست بننا چاہتی ہوں؟" دوسرا سوال ذہن میں آیا۔

"سو رنگ بدلنے والا سو سوانگ بھرنے والا' ایک شخص دوستی کے لیے قابل بھروسا ہو سکتا ہے۔" تیسرا سوال ذہن میں نازل ہوا۔

"اگر نہیں ہو سکتا تو میں پچھلے دو گھنٹوں سے مسلسل اسی کے بارے میں کیوں سوچے چلی جا رہی ہوں۔ کیا میں عام لڑکیوں کی طرح ایک اجنبی لڑکے کے لیے اپنے سیدھے سادے راستے سے اتر رہی ہوں؟" چوتھا سوال آیا۔

"نہیں۔" پھر اس کا دل اس کی مدد کو آیا۔ "اس کی دوستی کی آفر پر تمہارا دل یوں ہی لبیک کہنے کو نہیں کہہ رہا۔ تم جانتی ہو کہ اس سے دوستی میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

"یہ تو ہے۔" اب کے اس نے ذہن اور دل کو اپنے قابو میں کر کے سوچا۔ "میوزیکل نائٹ والی میری بے ساختہ حرکت کو ایکسپلائٹ بھی کیا جا سکتا تھا' اسے منظر عام سے ہٹوایا گیا۔ یہ کس نے کیا' یقیناً سعد سلطان نے۔ اور جو شخص انسان کی عزت کا ساتھی ہو وہ ہی بہترین دوست ہوتا ہے۔" اس نے آخری بات سوچی۔

"بس تو پھر طے ہے' سعد کو فلزا ظہور کے بارے میں میسج کر کے میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔"

"اور یہ بھی طے ہے کہ فلزا ظہور سے ملنا بہت اہم بات نہیں تھی' مگر وہ میسج میں نے صرف اس کا رد عمل دیکھنے کے لیے کیا تھا۔" اس نے سوچا اور مسکرا کر اپنے سیل فون کے ان باکس میں وہ جواب پڑھنے لگی۔

"تمہاری خاطر ان خاتون کا پتا میں جلد ہی لگا لوں گا۔" وہ یہ پیغام دن میں کئی بار پڑھ چکی تھی اور اب دوبارہ سے پڑھنے کا سلسلہ شروع تھا۔

"تمہاری خاطر۔" اس پیغام کے سب سے اہم الفاظ یہ تھے۔ اور یہ ہی وہ الفاظ تھے جنہیں دیکھنے کے لیے وہ یہ پیغام بار بار پڑھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ شاہ بانو کے ساتھ عبید بھائی کی دی سید پور میلے کی ویڈیو دیکھ رہی تھی' میوزیکل نائٹ میں سعد سلطان کے گائے ہوئے گانے شاہ بانو نے بار بار ری پلے کر کے سنے تھے۔ رائی حانہ کے بعد وہ دوبارہ فوک پر آگیا تھا۔

گھوم چرخڑا گھوم۔۔۔ تیری کتن والی جیوے
کتن والی جیوے۔۔۔ لڑیاں وٹن والی جیوے
(اے چرخے خوب گھوم۔۔۔ تجھ پر سوت کاتنے والی جیے)
(سوت کاتنے والی اور سوت کی بیلیں بنانے والی جیے)

ان لوگوں کے چلے آنے کے بعد اس نے یہ مشہور کافی سنا کر مجمع میں اکثر لوگوں کو حال کھیلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"تم نے سنا۔" شاہ بانو نے پانچویں بار یہ کافی سننے کے بعد ویڈیو بند کی اور اس کی طرف دیکھا۔ "یہ لڑکا پیدائشی گلوکار ہے۔"

"اور تمہاری وجہ سے اس روز ہم نہ اس کا رائی حانہ سونگ سن سکے نہ یہ کافی" ماہ نور نے سر جھکا لیا۔

"اب تم اس کے کلوز اپس دیکھو اور سوچو کہیں سے بھی یہ لڑکا لگ رہا ہے جو تمہارا اسکیچ خریدنے آیا تھا۔" شاہ بانو نے پوچھا۔

ماہ نور نے سر جھکائے جھکائے نفی میں سر ہلا دیا۔

شاہ بانو کے چہرے پر لحہ بھر کے لیے خفگی کا شدید تاثر ابھرا مگر پھر اس نے اسے کنٹرول کر لیا۔

"چلو خیر۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "جو بھی ہوا تمہارا الوژن تو دور ہوا۔" ماہ نور کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ اسی وقت اس کے سیل فون پر میسج کی ٹون بجی۔

"فلزا ظہور بنی گالہ میں رہتی ہیں' ایڈریس اور فون نمبر بھیج رہا ہوں۔" ماہ نور نے یہ میسج پڑھا اور محفوظ کر لیا۔

☆ ☆ ☆

"کھاری ٹھیک ہی کہہ رہا تھا' باجی کتنے بوڑھے سے ہیں اور اماں ان کی نسبت اتنی بوڑھی نہیں ہیں' پھر بھی میں اتنی چھوٹی کیوں ہوں۔" سعدیہ کا دھیان اس دن اپنے سبق سے زیادہ کھاری کی بات کی طرف آرہا تھا۔

"اماں بھی خوب ہیں نہ بالوں میں مہندی لگاتی ہیں نہ ناخنوں پر۔" اسے اماں کی ملنے والی دو تین خواتین ایسی یاد

آئیں جو سفید بالوں میں مہندی لگا کر اس کی سفیدی چھپا لیتی تھیں اور ناخنوں پر بھی مہندی لگاتی تھیں۔

"پر اماں کتنی پیاری ہیں۔" اس نے چولہے میں اپلے رکھ کر آگ جلاتی اماں کو دیکھا۔

"پتا نہیں اماں کی اباجی سے شادی کیسے ہو گئی' اباجی بے چارے تو اللہ معافی اگر چہرے پر داڑھی نہ ہو تو بھلے جن لگیں۔" اسے اپنی سوچ پر خود ہی ہنسی آگئی۔

"میں کس کی طرح ہوں بھلا۔" پھر اس نے ایک چھوٹا آئینہ لے کر اپنا چہرہ اس میں دیکھا۔ اسے زیادہ سمجھ نہیں آئی کہ اس کے نین نقش کس سے ملتے تھے۔

"کبھی میرے پاس بھی دو سے زیادہ سوٹ ہوں نا گھر میں پہننے کے لیے۔" نو عمر دل میں پہلی تمنا اٹھی۔

"جو دو سوٹ ہوتے ہیں وہ بھی بس ایسے ہوتے ہیں کہ دو' تین بار دھونے کے بعد جن کے رنگ بھی نکل جاتے ہیں اور وہ بری طرح گھسے ہوئے لگنے لگتے ہیں۔" پہلی ہوک نے دل میں قدم رکھا۔

"اماں سے کہوں۔" اس نے پھونکنی سے چولہے کی آگ میں پھونکیں مارتی ماں کو دیکھا کہ نئے کپڑے لے دیں تو وہ بے چاری کہاں سے لے دیں گی' میرے یونیفارم کی شلواریں وہ آٹے کی تھیلیوں کا کپڑا جوڑ کر سیتی ہیں' گھر کے کپڑے کیسے نئے لے دیں۔" اسے ماں کے ہاتھ کی تنگی یاد آئی۔

"شمائلہ اور بسمہ کے چاچا اور خالہ جب آئے تھے تو ان کے لیے نئے کپڑے اور جوتے بھی لائے تھے۔" بھٹکتی سوچ نے ایک موڑ کی طرف رخ کیا۔

"میرے تو نہ کوئی چاچا ہیں نہ خالہ ہیں۔" پہلی بار یہ سوچ بھی ذہن میں ابھری۔

"اماں سے بھلا کبھی پوچھوں تو سہی کہ نانا' نانی' دادا دادی کون تھے۔" ایک بار پھر اماں کی طرف دیکھ کر سوچا۔

"توبہ اماں کبھی نہ بتائیں۔" اسے جھرجھری آگئی۔

"کیا ہوا جو ڈانٹ لیں گی تھوڑا بہت۔" پھر اس نے دل میں فیصلہ کیا۔

"میں نے بھی ضرور پوچھ لینا ہے کسی دن۔" اس روز کھاری کی مذاق میں کہی بات نے سعدیہ کی سوچ کو پہلی بار ایک نیا رخ عطا کیا اور اسی رخ پر سوچتے سوچتے بائیالوجی کا ٹیسٹ بھی پہلی بار یاد نہ ہو سکا تھا۔

✲ ✲ ✲

شاہ بانو اور عبید بھائی کی فیملی ایبٹ آباد جانے کا پروگرام بنا رہی تھی۔

"بہت مزا آئے گا' ایبٹ آباد سے آگے کے علاقے بھی دیکھیں گے۔" شاہ بانو نے ماہ نور سے کہا۔

"میرا خیال ہے اتنے دن میں فرقان ماموں کے پاس واپس چلی جاؤں۔" ماہ نور کو نجانے کیوں ایبٹ آباد جانے میں تامل تھا۔"

"یہ کیا بات ہوئی' تم ادھر آئی ہو اپنی ممی کی اجازت سے۔" شاہ بانو نے کہا۔

"لیکن فرقان ماموں بھی ناراض ہوئے ہیں نا۔" ماہ نور کے پاس بہانہ اچھا تھا۔

"ہم اتنے دن اکٹھے رہ لیے' اب جانے سے پہلے تم ایبٹ آباد رہ آؤ' میں فرقان ماموں کی ناراضی دور کر لیتی ہوں پھر واپس لاہور چلے جائیں گے۔"

"تم کیسے رہو گی اس سونے کے محل میں۔" شاہ بانو نے اسے ڈرایا۔

"کوئی بات نہیں' رہ لوں گی۔" ماہ نور نے کہا۔

"تمہارے ساتھ میں نے خوب انجوائے کرنا تھا۔ ابھی تو تم اس سحر زدہ کیفیت سے نکلی ہو مشکل سے' اب ہی تو مزا آنا تھا۔" شاہ بانو مایوسی سے بولی۔

"میں شاید ایک سحر سے نکل کر دوسرے سحر میں گرفتار ہو گئی ہوں شاہ بانو۔" ماہ نور نے یہ بات صرف سوچی تھی کہی نہیں تھی۔

✲ ✲ ✲

"کل رات فارم تے بہت بڑی دعوت تھی۔" کھاری آپا رابعہ کو جلانے کے لیے لکڑیاں پہنچانے آیا تھا اور اس کی زبان قصے سنانے لگی تھی۔

"کوئی نئی بات بتاؤ' فارم پر دعوتیں تو ہوتی رہتی ہیں۔" آپا رابعہ نے لکڑیاں ڈیوڑھی سے چھت کی طرف جاتی سیڑھیوں کے نیچے سنبھالتے ہوئے کہا۔ کئی دن تک ان کے ایندھن کا بندوبست ہو گیا تھا۔

"منوں کے حساب سے بالن آیا تھا۔ ڈیڑھ سو کے قریب دیگیں پکی تھیں' پھر بھی بالن بچ گیا۔" کھاری ہاتھ کی انگلیوں کے جوڑ چٹخاتے ہوئے بولا۔

"چوہدری صاحب نے کہا مولوی صاحب کو دے آؤ۔"

"تم نے کتنی دیگیں کھائیں؟" سعدیہ نے جو کمرے میں بیٹھی کھاری کی لن ترانیاں سن رہی تھی اندر بیٹھے بیٹھے سوال کیا۔

کھاری آپا رابعہ کی طرف دیکھ کر ہنسا۔

"تسیں دسو بھین جی ——— کیا کبھی کوئی ایک بندہ اکیلا پوری دیگ کھا سکتا ہے۔"

"تم قصے تو یوں ہی سناتے ہو۔" سعدیہ نے کہا۔

"میں قصے نہیں سناتا ہوں۔" کھاری نے ترکی بہ ترکی جواب دیا' "خبریں سناتا ہوں۔"

"اچھا چل' میں تجھے گلاب کا شربت پلاؤں۔" آپا رابعہ نے لکڑیاں ٹھکانے لگانے کے بعد کھاری سے کہا۔

"مولوی صاحب سے کہیں مجھے بھی قرآن پاک پڑھا دیں۔" ڈیوڑھی میں بچھی چارپائی پر بیٹھ کر شربت پیتے ہوئے کھاری نے کہا۔

"ارے تم نے ابھی تک قرآن پاک نہیں پڑھا۔" آپا رابعہ کو دھچکا لگا۔

"نہیں..." کھاری نے شرمسار ہوتے ہوئے سر جھکا لیا۔

"جب سے پیدا ہوا یہی حالات ہیں۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے ادھر فارم پر کام کرتے کرتے وقت گزر رہا ہے۔"

"چوہدری صاحب نے تمہیں پالنے کی ذمہ داری لے لی' دین' دنیا کی عقل سکھانے کا بندوبست نہیں کیا۔" دکھ سے آپا رابعہ کی آواز کانپنے لگی۔

"لو جی اماں اب اس کے غم میں گھلیں گی۔" اندر بیٹھی سعدیہ نے منہ بنا کر سوچا۔

"اب اگر میں مسجد میں آکر سبق لینے کی بات کروں تو لڑکے مذاق اڑاتے ہیں۔" کھاری کے لہجے میں بھی دکھ تھا۔

"کھاری بیٹا! یہ بتاؤ... تمہیں دل سے قرآن پڑھنے کا شوق ہے؟" آپا رابعہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بڑا شوق اے بھین جی!" اس نے سر اٹھا کر آپا رابعہ کی طرف دیکھا۔ "میں نہیں جانتا کس نماز میں کتنی سنتیں اور کتنے فرض پڑھتے ہیں۔ نفلوں میں کیا پڑھا جاتا ہے۔ مجھے نہ آیت الکرسی آتی ہے' نہ کلمے اور درود پاک پورا آتا ہے۔ لیکن پھر بھی میں پانچ وقت وضو کرتا ہوں اور نماز کی نیت بھی کرتا ہوں۔ جب سمجھ نہ آئے کہ کیا پڑھنا ہے تو بسم اللہ کا ورد کرتا رہتا ہوں۔"

"شرع میں کیسی شرم میرے بچے۔" آپا رابعہ کھاری کی بات سن کر آبدیدہ ہوگئیں۔ اندر کمرے میں بیٹھی سعدیہ کے دل پر بھی کھاری کی یہ بات اثر کر گئی۔ "نماز، کلمہ سیکھنے کے لیے تم نے پہلے کسی سے کیوں نہیں کہا۔ اتنے سال ہوگئے مولوی سرفراز کو یہاں آئے اور ان سے پہلے بھی مسجد میں مولوی صاحب موجود تھے۔ تم نے کیوں نہیں ان سے کہا کہ مجھے یہ سب سیکھنا ہے۔"

"مولوی صاحب سے پہلے والے مولوی صاب نے ہی تو مجھے ڈرایا مجھے پاگل اور ہلکے دماغ والا کہتے تھے۔ غلطی نہیں ہوتی تھی' وہ ڈنڈا پکڑ لیتے تھے' میں نے سوچا اللہ بھی شاید صرف بڑے لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔" کھاری نے سر جھکا کر بتایا۔

"اوہو..." آپا رابعہ نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "اللہ تو غریب کی کٹیا کا سب سے بڑا اور اکثر اکلوتا آسرا ہے بیٹا۔"

"پھر میں اللہ کا پیچھا کرنا چھوڑ گیا۔ مگر اب مجھے وضو کرتے' نماز کے لیے قطاریں بناتے' اذان کی آواز سن کر سب کام چھوڑ کر مسجد کی طرف آنے والے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں۔ جب کوئی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر میں شروع سے نماز پڑھ کر دعا مانگ رہا ہوتا تو شاید آج تک مجھے میرے ماں' باپ نہ سہی اللہ ہی مل جاتا۔"

آپا رابعہ نے اس سیدھے سادے نوعمر لڑکے کو دیکھا۔ جس کا جسم محنت کا عادی اور ہاتھ محنت کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ جس نے اپنے گھر اور اپنے ماں' باپ کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ جو کسی نگران اور رہنما کے بغیر زندگی گزارتا چلا جارہا تھا۔ مگر اس کے معصوم دل میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ہوک ڈال دی تھی۔ یہ جذبہ کسی کے سکھانے پڑھانے پر نہیں' خود سے اس کے دل پر اترا تھا۔

"تو کسی کی پروا نہ کر بچے۔" انہوں نے ایک بار پھر کھاری کے سر کو سہلایا۔

"میں خود تجھے سب سکھاؤں گی' تو مسجد میں جا کر نماز پڑھے گا بس چند دن کی بات ہے۔ نماز سیکھنے میں زیادہ دن نہیں لگتے۔ ہاں ناظرے میں دن لگیں گے۔ لیکن جو لڑکا اتنے سارے کام جانتا ہو' ٹریکٹر ٹھیک کر لیتا ہو' ٹیوب ویل کے مسئلے حل کر لیتا ہو' شہر تک ٹرک لے جانے کے قابل ہو' صرف کم عمری کی وجہ سے نہ لے کر جا سکتا ہو' اس کے لیے یہ کام مشکل نہیں' بالکل بھی نہیں۔ نہ تم شیدائی ہو' نہ کم عقل ہو۔ اللہ نے بندے کو سب کچھ عطا کیا ہوتا ہے' جب ہی تو باقی کام ٹھیک کر لیتا ہے' پھر اللہ کے کاموں میں کیا مشکل ہے۔"

کھاری نے مسکرا کر تشکر بھری نظروں سے آپا رابعہ کی طرف دیکھا اور اندر بیٹھی سعدیہ کے دل پر بھی یہ ساری گفتگو اثر کر گئی تھی۔

"مجھے سب کچھ میسر ہے اور میرے دل میں یہ لگن نہیں' اوپر سے میں شاکی بھی ہوں۔" وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں اس شہر میں اجنبی ہوں' مجھے راستوں سے واقفیت نہیں' اس لیے فلزا ظہور قریب رہتی ہوں یا دور میرے لیے ایک ہی بات ہے۔" سعد نے ماہ نور کا میسج پڑھا اور مسکرا دیا۔

"تم کہو اور مجھ پر بھروسا کرو تو میں لے جاتا ہوں تمہیں فلزا ظہور کے پاس۔" اس نے جواب لکھ کر بھیجا۔ اس کا جواب آنے میں تاخیر ہوئی تو اس نے ماہ نور کے نمبر کو کال کے لیے پش کیا۔

"تم نے میرے میسج کا جواب نہیں دیا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا تمہیں کال کرلوں۔" ماہ نور کی آواز سنائی

دینے پر اس نے کہا۔

"اچھا۔" دوسری جانب سے مختصر جواب آیا۔

"میری آفر بری تو نہیں لگی؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس بار آواز قدرے اونچی تھی۔

"ماہ نور... میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تم اتنے بڑے کالج میں میڈیا سائنسز کی اسٹوڈنٹس ہوتے' ایک اچھی پڑھی لکھی فیملی سے تعلق رکھنے کے باوجود اتنی انڈر کانفیڈنٹ (اعتماد کی کمی کا شکار) کیوں ہو؟" سعد کے سوال نے ماہ نور کو کنفیوز کر دیا تھا۔ وہ اعتماد کی کمی کا شکار ہرگز نہیں تھی۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ سعد کے سامنے وہ اس کمی کا شکار ہو جایا کرتی تھی۔

"اچھا اپنا ایڈریس بتاؤ اور یہ بھی بتاؤ کہ تم کب فارغ ہو' میں تمہیں فلزا ظہور کے گھر لے جانے کے لیے آؤں گا۔" وہ کہہ رہا تھا۔

ماہ نور کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا جواب دے' وہ نہ انکار کرنا چاہتی تھی' نہ فوری ہامی بھرنا چاہتی تھی۔

"دیکھو ماہ نور! میں کوئی برا بندہ نہیں ہوں۔ میری نیت بھی بڑی صاف ہے۔ میں لڑکیوں کو ورغلانے اور شکار کرنے کی ہسٹری بھی نہیں رکھتا۔ تم مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو۔" سعد نے نرمی سے کہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ دوسری طرف گومگو والی کیفیت تھی۔

"میں تمہیں فون کر کے بتاؤں گی کہ تم کب مجھے لینے آؤ۔" قدرے پراعتماد لہجے میں جواب آیا۔

"گڈ!" وہ مسکرایا۔ "میں انتظار کروں گا۔" اس نے فون بند کرنے سے پہلے کہا۔

☼ ☼ ☼

اس فائیو اسٹار ہوٹل کی پول سائیڈ پر ڈیک چیئر پر بیٹھے انہیں دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ انہوں نے کافی دیر سوئمنگ کی تھی اور سوئمنگ کے دوران وہ سوچتے رہے تھے کہ ان کا جسم اور ذہن ابھی بھی مضبوط اور قائم تھا۔ انہوں نے اپنے بازوؤں کو پوری طاقت سے پانی میں چلایا تھا اور سوئمنگ کے مختلف طریقوں پر زور آزمائی کی تھی۔ نہ ان کا جسم تھکا تھا' نہ ذہن' بلکہ وہ خود کو پہلے سے کہیں زیادہ تازہ دم محسوس کر رہے تھے۔ وہ سوئمنگ پول سے نکل کر ڈیک چیئر پر بیٹھے تھے۔ باوردی اور مستعد ویٹر نے ان کے آرڈر پر فریش جوس کا گلاس ان کے سامنے ٹیبل پر رکھا اس روز اس پول میں سوئمنگ کرنے والوں میں ان کا قریبی شناسا کوئی نہیں تھا۔ چند ایسے لوگ موجود تھے جن سے ان کا تعلق ہیلو ہائے تک محدود تھا باقی اجنبی تھے۔ جب ہی انہیں دو گھنٹے وہاں بغیر کسی کی مداخلت کے بیٹھنے اور لیٹنے کا موقع مل گیا تھا۔

ان کے ذہن میں کئی قسم کے خیالات آ جا رہے تھے۔ ان کے بزنس کنسرنز' میٹنگز' وزٹس' ان کا موجودہ اکانومی اسٹیٹس' وہ اپنے ذہن میں اپنی حکمت عملیاں طے کر رہے تھے۔ انہیں ایسی پلاننگز کرنے میں بہت مزا آتا تھا۔ پلاننگ کرنے میں مشاق ان کا ذہن بہت کم وقت میں دو جمع دو کر کے آنے والے دنوں کا پورا پروگرام مرتب کر کے ان کے ذہن کے خانے میں اسٹور کر دیتا تھا اور ان کے ذہن کی یہ پروگرامڈ فائلز کبھی نہ تو غلط ثابت ہوتی تھیں' نہ ہی کرپٹ ہوتی تھیں۔ نہ ان میں کوئی وائرس گھستا تھا' نہ ہی کوئی وائرس ان پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔ ان کے پروگرامڈ ذہن میں آٹو کلین کا سسٹم بھی فٹ تھا۔ جو خود بخود ناکارہ اور استعمال شدہ فائلز ضائع کر کے اسٹوریج کی استعداد بڑھاتا رہتا تھا۔ آنے والے کئی دنوں کا لائحہ عمل طے کرتا ان کا ذہن نہ جانے کیسے سعد کے بارے میں سوچنے پر لگ گیا۔

گزشتہ کئی دنوں سے اس سے ان کا رابطہ منقطع تھا اور یہ ان کے اور سعد کے درمیان طے ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی انہیں لگتا کہ ان کا اور سعد کا تعلق بھی بزنس کی کسی شق میں ڈھلتا جا رہا تھا۔ دونوں میں سے جس کو جب موقع ملتا ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانے یا پھر ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے میں صرف کر دیتا۔

انہیں سعد کی کاروباری سوجھ بوجھ اور ذہانت پر کوئی شک نہیں تھا۔ وہ ان کا سب سے بڑا بزنس ایڈ تھا۔ ایک ایسا ایڈ جس پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے وہ اسے کوئی بھی پروجیکٹ آنکھ بند کر کے سونپ سکتے تھے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ سعد کی زندگی کا ایک پہلو ایسا بھی تھا جس تک نہ ان کی کوئی رسائی تھی' نہ ہی کنٹرول۔ وہ ان کے لیے بہت بڑے بڑے فائدے حاصل کرنے کے بعد اچانک کہیں غائب ہو جاتا تھا۔ غائب ہونے سے پہلے وہ ان سے غائب ہونے کی اجازت ضرور طلب کرتا تھا اور ایسا وہ صرف اس وقت کرتا تھا جب ان کے پاس یہ اجازت دے دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا تھا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ اس غائب ہونے کے عرصے کے دوران وہ اس کی سرگرمیوں سے بے خبر رہتے تھے۔ باخبر رہنے کے لیے ان کے پاس کئی ذرائع تھے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ اس کی سرگرمیوں پر دل میں ابال اٹھنے کے باوجود وہ اسے ان سے منع نہیں کر سکتے تھے۔

وہ ان کا سب سے بڑا بزنس ایڈ تھا اور اس ایڈ کو ہاتھ سے جانے دینے کی غلطی ان کی سب سے بڑی حماقت ہوتی۔ یہ حقیقت اپنی جگہ تھی۔ لیکن اس سے بڑھ کر شاید وہ اپنے دل میں انڈر ٹون کی طرح بجتی ایک آواز پر کان دھرے اس کی دھڑ لے کو محسوس کرتے اور اس سے مسحور بھی ہوتے تھے کہ دنیا بھر میں سعد ان کا سب سے پیارا رشتہ تھا۔ جسے دیکھ کر ان کا دل جیتا تھا اور جس کی کمپنی میں ان کا دل کھلا رہتا تھا۔ دل کے اس احساس کا اظہار یا اعتراف انہوں نے کسی اور کے سامنے تو کیا' کبھی خود اپنے سامنے بھی نہیں کیا تھا۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ سعد کا تصور اکثر ان کی شدید ترین تھکاوٹ کے احساس کو بھی زائل کر دیتا تھا۔

اس شام بھی بلال سلطان نے خاصی دیر اس خوش گوار تصور کی روشنی میں گزار دی تھی اور ان کا دل بہت ہلکا ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آپا رابعہ نے کھاری کو کلمہ' نماز اور چند دعائیں سکھانا شروع کی تھیں۔ قاعدے کی الف' ب سے نابلد حرف حرف پر اٹکتا تھا۔ پھر اپنے آپ شرمندہ ہو کر آگے پڑھنا بند کر دیتا۔ آپا رابعہ کے دلاسے اور تسلیاں اسے ہمت باندھے رکھنے کی طرف لے آتیں۔

"ایک تو یہ بولتا بہت ہے۔" اس روز بھی کھاری کو ایک ہی لفظ کے ہجے کر کے پڑھنے میں بار بار اٹکتے دیکھ کر چارپائی پر کتابیں پھیلا کر بیٹھے پڑھتے ہوئے سعدیہ نے کہا۔

"ایک لفظ یاد نہیں ہوتا۔ اسے دس خبریں سنانی یاد آجاتی ہیں۔" اس نے کھاری کو گھورا۔

"تم اپنا پڑھو' کھاری کو اپنا پڑھنے دو۔" آپا رابعہ نے سعدیہ کو ڈانٹا۔

"میں سعدیہ صاحبہ' بڑا صحیح پڑھ لیندا ہوں' بس ایک واری زبان تے چڑھ جائے بات۔" کھاری نے پڑھی لکھی سعدیہ سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کرنی شروع کر دی تھی۔

"میوں تھوڑی پڑھا جاتا ہے۔ ایک لفظ پڑھا۔ ساتھ ہی ماسی جنت کے قصے شروع' دوسرا لفظ پڑھا فارم کے مہمان یاد آ گئے۔ تیسرا لفظ پڑھا کوئی میلہ' کوئی شہر والی بی بی یاد آ گئی۔" سعدیہ نے منہ بنا کر سر جھٹکا۔

"بابے منگو واحد میلہ آئے گا پورا سال ہو جائے گا۔ مہ نور بی بی نوں ایتھے آئے۔" کھاری نے اس کی بات کا برا ماننے کے بجائے کچھ یاد آنے پر کہا۔

"دیکھ لیا۔" سعدیہ نے اماں کی طرف جتانے والے انداز میں دیکھا۔ "اس نے خاک پڑھنا ہے۔"

"تمہارے ہی جیسے لوگ ہوں گے وہ جو اس سے پہلے اس بے چارے کی حوصلہ شکنی کرتے ہوں گے۔" اماں نے سکون بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "بچے کو پڑھانا اور بچے کا پڑھنا آسان کام ہے۔ یہ بچپن سے بہت آگے آ چکا ہے۔ کچھ پڑھنا سیکھنے سے پہلے اس نے محنت مزدوری کرنی سیکھ لی ہے۔ اب اسے پڑھنا سیکھنے میں وقت تو لگے گا۔"

"تم ہو کب سے اس فارم پر کھاری؟" سعدیہ نے اماں کی بات کا کوئی خاص اثر نہ لیتے ہوئے کھاری سے پوچھا۔

"پتا نئیں جی جب سے ہوش سنبھالا ہے خود کو ادھر ہی دیکھا ہے۔" کھاری نے جواب دیا اور آپا رابعہ کی طرف دیکھا۔

"پہلے یہ فارم نہیں ہوتا تھا۔ ایک بڑا سا ڈیرہ ہوتا تھا۔" اس نے انہیں بتایا۔

"پچاس بھینسیں' چند گھوڑے' ربیع خریف کی فصلیں۔۔۔ بس یہی کچھ ہوتا تھا۔"

"اچھا پھر کب بنا یہ فارم ہاؤس؟" آپا رابعہ نے پوچھا۔

"جب میں اتنا سا تھا۔" کھاری نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔

"جب تم فارم ہاؤس میں آئے تو کیسا لگا۔" آپا رابعہ محض کھاری کا دل لگانے کو پوچھ رہی تھیں۔

"بڑا اچھا لگیا۔ کشادہ فارم ہاؤس' ڈیری فارم' پھل' پھول' سبزیاں' گھوڑے اور نہ جانے کیا کچھ۔" کھاری نے بتایا۔

"پر اک گل بری ہوئی۔" پھر اس نے منہ بنا کر سر ہلایا۔

"وہ کیا؟" اماں کے بجائے سعدیہ نے تجسس سے پوچھا۔ "پمپ ایکشن تے بڑی بڑی بندوقوں والے لوگ بھی آ گئے۔ آتے جاتے پوچھ پڑتال ہونے لگی۔"

"پابندیاں لگ گئیں یعنی؟" سعدیہ نے تیزی سے کہا۔

"ایک بات بتاؤ کھاری' فارم ہاؤس اندر سے کیسا ہے۔" اسے خیال آیا کہ فارم ہاؤس کے اندر کا احوال کھاری سے بہتر کون بتا سکتا تھا۔

"یہ تو اندر سے جب دیکھو گی تب ہی پتا چلے گا۔" کھاری نے سر ہلا کر جواب دیا۔ اسے پہلی بار سعدیہ کو للچانے کا موقع ملا تھا۔

"وہ کیسے دیکھا جا سکتا ہے؟" اماں کسی کام سے اٹھ کر اندر گئیں تو سعدیہ نے حسرت سے کہا۔ کھاری نے ایک نظر سعدیہ پر ڈالی اور ایک لمحہ اس کی حسرت پر غور کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ خود اپنے ذہن میں کچھ سوچ کر سر ہلا رہا تھا۔

"چلو بیٹا! بہت باتیں ہو گئیں' اب سبق شروع کرو۔" اسی دم اماں ادھر آ گئیں۔

"چلو سناؤ ذرا پھر سے سورہ فاتحہ۔" وہ کہہ رہی تھیں۔

"الحمدللہ۔" کھاری اٹک اٹک کر پڑھنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"انسان کو اپنی زندگی کے معاملات کے بارے میں بہت شیور ہونا چاہیے۔" وہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "گومگو کی کیفیت' ہمیشہ مسائل کھڑے کرتی ہے۔" اس نے کہا۔ "یا تو کوئی چیز غلط ہے یا درست' درمیانی کیفیت کوئی نہیں ہوتی' اس میں پڑ کر انسان ہمیشہ کنفیوز رہتا ہے۔"

"کیا تم ابھی بھی کنفیوز ہو۔" سعد نے لمحہ بھر کے لیے گردن موڑ کر اپنے بائیں جانب بیٹھی ماہ نور کو دیکھا۔

"نہیں۔" ماہ نور نے پریقین لہجے میں جواب دیا۔

"لیکن میں اس سے پہلے کبھی یوں کسی بالکل ناواقف انسان کے ساتھ باہر نہیں گئی۔ اس لیے سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ میں نے ٹھیک کیا یا غلط۔"

"تم جو پڑھتی ہو اس کے لیے ایک اسٹوڈنٹ کو بہت خواری اٹھانا پڑتی ہے۔ تمہارے جیسی اسٹوڈنٹ کو تو بہت پراعتماد اور پُریقین ہونا چاہیے کہ وہ ٹھیک کر رہی ہے یا غلط۔" اس نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

"دراصل تم ڈبل مائنڈ اس لیے ہو رہی ہو کہ تمہارا دل کہتا ہے میں قابل بھروسہ انسان ہوں، جبکہ تمہارا دماغ کہتا ہے ہر کسی پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" اس نے ماہ نور کی طرف دیکھ کر کہا۔

"شاید۔" ماہ نور نے اسے جھٹلایا نہیں۔

"تمہیں اپنے ذہن کو اس کنفیوژن سے نکال کر آنا چاہیے تھا۔" اس کے لہجے میں تردد اتر آیا۔

"میں اپنی زندگی کے اکثر معاملات میں بہت شیور ہوتا ہوں۔ میں جن چند معاملات میں کنفیوز ہوتا ہوں ان کی طرف قدم ہی نہیں بڑھاتا اور اپنے دوستوں سے بھی اسی رویے کی توقع کرتا ہوں۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "ہم اپنے نظریات اور مزاج کی روشنی میں دوست بنانے لگیں تو پھر شاید ہمارا کبھی کوئی دوست نہ بن سکے۔" ماہ نور نے اس ملاقات کی پہلی مکمل بات کی۔

"درست!" اس نے موڑ کاٹتے ہوئے اس کی بات کی تائید کی۔ "ہمارے مزاج، ہمارے ماحول اور تربیت کے ہاتھوں پروان چڑھتے اور بنتے ہیں اور دنیا کے ہر بندے کا ماحول اور تربیت دوسرے سے جدا ہوتی ہے۔" ماہ نور نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میرا تعلق ایک پڑھی لکھی لبرل فیملی سے ضرور ہے، مگر میری تربیت میں یہ بات شامل ہے کہ دوست کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کرو، کیونکہ رشتہ داری کے معاملے میں انسان مجبور ہوتا ہے۔ دوستی کے معاملے میں ہرگز نہیں۔"

"بالکل۔۔۔" اس نے سرہلایا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو کہ میرے دل کو تمہارے ساتھ آنے میں تامل نہیں تھا۔ مگر میرا دماغ گھٹی میں بیٹھی نصیحت کے تابع ہے۔ وہ بار بار مجھے تنبیہہ کر رہا تھا کہ دوستی ایک دن کی ملاقات کا نتیجہ نہیں ہونا چاہیے۔ جانچ اور پرکھ کے لیے زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔" وہ کہہ رہی تھی اور وہ پورے دھیان کے ساتھ سن رہا تھا۔

"میرے کنفیوژن کی وجہ بھی یہی تھی۔۔۔ لیکن میرے مزاج کا ایک فیکٹر میرا امپلسو (Impulsive) ہونا بھی ہے۔ اگر آج میں یہاں تمہارے ساتھ بیٹھی ہوں تو اس میں سارا عمل دخل impulse کا ہے۔ میں بغیر نتائج کی پروا کیے دل کے کہے پر لبیک کہہ دیتی ہوں اکثر۔" اس نے اعتراف کیا۔

"کبھی ایسا کرنے کا نتیجہ غلط نکلا۔" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ ابھی تک تو کبھی نہیں۔" وہ بے ساختہ بولی۔

"آئندہ بھی نہیں ہوگا۔" وہ پراعتماد انداز میں بولا۔ "تم نے بندر کے تماشے والے سے دوبارہ ملاقات کی خواہش بھی اسی طرح کی تھی۔"

"ہاں!" ماہ نور پہلی بار مسکرائی۔

"تم مسکراتی رہا کرو۔۔۔ یوں زیادہ اچھی لگتی ہو۔" اس نے کہا اور اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبالیا۔

"ورنہ میں کیسی لگتی ہوں۔" ماہ نور بغیر سوچے سمجھے بولی۔

"بھئی مجھ سے تمہاری ملاقات تو ہوتی ہی اس انداز میں رہی کہ تم ایک کنفیوز، حواس باختہ، پریشان حال لڑکی

کے روپ میں میرے سامنے آتی رہیں۔ اسی لیے تو آج مجھے تمہاری مسکراہٹ نے تبدیلی کا احساس دیا۔ جو مجھے اچھا لگا اور میں نے کہہ بھی دیا۔ میں جو محسوس کرتا ہوں اکثر کہہ بھی دیتا ہوں۔ میری یہ عادت نوٹ کرلو، کبھی جو تمہیں بری لگے۔" اس نے تفصیلی جواب دیا۔

"میں اس سے پہلے تمہارے جیسے بندے سے کبھی نہیں ملی۔" ماہ نور نے یہ بات بھی بے ساختہ کہی۔

"اور میں بھی اس سے پہلے تمہارے جیسی لڑکی سے کبھی نہیں ملا۔" وہ بھی بے ساختہ بولا۔ "تم بہت سمپل ہو اور انوسینٹ بھی، تمہارے جیسی بے نیازی بھی میں نے کسی دوسری لڑکی میں نہیں دیکھی۔"

"کیا مطلب۔" ماہ نور نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ ایک لڑکی جس کا ایک خام سا اسکیچ پچاس ہزار روپے میں بک رہا ہو، وہ یہ کہے کہ مجھے بیچنا نہیں، مفت لے لو تو یہ بے نیازی نہیں تو اور کیا ہے۔"

"ارے ہاں یاد آیا۔" ماہ نور نے سیٹ کی پشت چھوڑ کر آگے ہوتے ہوئے اسے دیکھا۔ "تم نے وہ احمقانہ اسکیچ اتنا مہنگا کیوں خریدا۔ کیا تمہارے پاس بہت پیسہ ہے۔"

"میرے پاس پیسہ نہ بھی ہوتا تو وہ میں اتنے میں ہی خریدتا، چاہے مجھے کسی سے قرض لینا پڑتا۔" اس کے جواب نے ماہ نور کو ششدر کردیا۔

"کبھی چیزیں اتنی valueable (قیمتی) ہوتی ہیں کہ آپ ان کی قیمت کا اندازہ نہیں لگاپاتے۔ بلکہ ان کی قیمت ادا ہی نہیں کرسکتے۔ تمہارا وہ اسکیچ بھی ایسا ہی تھا۔" وہ کہہ رہا تھا اور ماہ نور کو حیرت کے جھٹکے لگ رہے تھے۔

"لیکن کیوں۔" اس نے پوچھا۔ "وہ تو محض ایک۔۔۔" وہ اس کو بتانا چاہ رہی تھی کہ وہ اسکیچ محض خام لکیریں تھیں جو اس نے یوں ہی مشق کے دوران کھینچی تھیں۔ لیکن اس نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اس لیے کہ وہ اسکیچ اس لڑکی نے بنایا تھا جو نادانستگی میں سہی بار بار مجھ سے ایسے حالات میں ٹکراتی رہی جن میں میرا سگا باپ بھی شاید مجھے نہ پہچان پاتا۔ اس لڑکی نے نہ صرف مجھے پہچانا، بلکہ میری کھوج میں لگ گئی۔ اس کا تجسس میرے بارے میں بڑھتا ہی گیا۔ کیا میں اتنا احمق تھا کہ یہ اشارہ نہ سمجھ سکوں کہ وہ کوئی عام نہیں بہت خاص لڑکی ہے۔" ماہ نور باقاعدہ منہ کھولے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی بات سن رہی تھی۔

"اب اس بہت خاص لڑکی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے کچھ بہت ہی خاص تو کرنا ہی تھا۔" وہ اس کے اس انداز کو دیکھ کر مسکرایا۔

"جب ہی میں نے وہ اسکیچ اتنے پیسوں میں خریدا۔"

"پھر تو تینوں لے لینے چاہیے تھے۔" ماہ نور نے اس کی بات کو بمشکل ہضم کرنے کے بعد دوبارہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔

"ہاہا!" وہ زور سے ہنسا۔ "دل تو میرا یہی چاہ رہا تھا، مگر اس کا کیا جائے کہ ایسا کرنے پر ہلچل مچ جانے کا خدشہ تھا۔ خصوصاً" تمہاری دوست تو شاید بے ہوش ہی ہوجاتی۔"

"ہاں یہ بھی تھا۔" ماہ نور نے کہا۔

"پھر کیا کیا تم نے ان پچاس ہزار کا، دوست کو تو نہیں دے دیے آدھے۔" وہ مسکرایا۔

"نہیں، وہ کسی ویلفیئر آرگنائزیشن کو دے دیے۔ میں ان کی حق دار ہی نہیں تھی۔" ماہ نور نے کہا۔

"تم کو اندازہ نہیں، تم کیا ڈیزرو کرتی ہو۔" وہ زیرلب بولا۔ ماہ نور نے اس بات پر چونک کر اس کی طرف دیکھا، مگر خاموش رہی۔

"ویسے ہم ان خاتون فلزا ظہور کے ہاں کس سلسلے میں جارہے ہیں؟" وہ اس کی خاموشی توڑنے کے لیے بولا۔

"خدیجہ اور فاطمہ' بلکہ فاطمہ خالہ کے کہنے پر۔" ماہ نور نے جواب دیا۔
"اور ان دونوں خالاؤں کا کیا تعارف ہے۔" وہ شرارت سے بولا۔
"میری خالائیں ہیں بس۔" ماہ نور نے لاپروائی سے کہا اور باہر دیکھنے لگی۔ "کب آئے گا آخر فلز اظہور کا گھر' اتنا بھی ضروری نہیں تھا ان سے ملنا' میں بھی پاگل ہوں۔" وہ جیسے خود کلامی میں مصروف تھی۔ اس کی بات پر سعد کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
"اتنا بھی ضروری نہیں تھا' پھر بھی تم نے اس کا پتا لگانے پر مجھے لگا دیا اور اب ان تک پہنچنے کے لیے میرا ہی انتخاب کیا۔" اس نے دل میں سوچا اور ہاتھ بڑھا کر میوزک سسٹم آن کر دیا۔

عشق تے آتش دونوں برابر

اس بار یہ کافی علی ظفر گا رہا تھا۔ اس نے کن اکھیوں سے دیکھا۔ ماہ نور اپنی طرف والے شیشے سے پار دیکھ رہی تھی۔

✲ ✲ ✲

آسمان پر پھیلے سفید بادلوں پر تیزی سے سیاہی چھا رہی تھی۔ اس نے پر مسرت انداز میں بادلوں کے ان ٹکڑوں کو آسمان پر تیرتے دیکھا تھا۔ بادل کے ان ٹکڑوں کی بھی کئی شکلیں تھیں۔ کوئی ٹکڑا فادر کرسمس کی طرح لمبی داڑھی لگائے ادھر سے ادھر پھر رہا تھا' کوئی کسی جھک سفید بالوں والی بڑھیا کی طرح سر جھکائے چرخہ کاتتا نظر آ رہا تھا۔ کچھ ٹکڑے ننھے شرارتی بچوں کی طرح ادھر سے ادھر مسکراتے ہوئے اٹھکھیلیاں کرتے پھر رہے تھے۔ اس نے کتنی ہی دیر بادل کے ان ٹکڑوں کی مختلف شکلوں کو دیکھتے گزاری تھی۔ اسے پتا تھا کہ بادل کے ٹکڑوں کو یہ شکلیں صرف اس کا ذہن عطا کر رہا تھا۔ کسی دوسرے انسان کو شاید وہ کسی اور شکل میں نظر آئیں۔ مگر اسے ان سفید روئی کے گالوں جیسے بادلوں کی حرکات اتنا لطف دے رہی تھیں کہ اس کا ذہن بس انہی میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے مشرق سے کالے رنگ کی ایک گھٹا سی اٹھی اور سفید بادلوں کے ٹکڑوں پر چھا گئی۔ نیلے آسمان پر بھی سیاہی جھلکنے لگی۔ بادل گھبرا کر اپنی رو میں چلنے کے بجائے شاید اس تاریکی کی وجہ سے ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ جب ہی اس بلندی سے گھڑگھڑاہٹ کی آواز آنے لگی تھی۔ اس گھڑگھڑاہٹ سے ذرا دیر پہلے سیاہ پڑتے آسمان پر بجلی نے ایک کوندا سا مارا تھا۔
"روشنی کی رفتار' آواز کی رفتار سے زیادہ ہوتی ہے۔"
اسے مسز پیٹر کے خزانے سے پڑھی کتاب کا ایک جملہ یاد آ گیا۔ وہ کتاب سائنسی حقائق سے متعلق تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اس سائنسی حقیقت کا مشاہدہ کیا تھا۔ روشنی کا ایک اور کوندا آسمان پر لپکا اور تڑاخ کی آواز کے ساتھ بادل ایک بار پھر گرجا' ساتھ ہی اس نیم تاریک آسمان سے پانی کے قطرے زمین پر برسنے لگے۔ اس نے بچے کی سی مسرت کے ساتھ کھلی کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر پانی کی ان بوندوں کو پکڑنے کی کوشش کی' مگر وہ اس کی رسائی سے باہر تھے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر کرسی کے بازوؤں پر ہاتھ رکھ کر ہاتھوں پر دباؤ ڈالتے ہوئے کرسی کو مزید آگے کھینچا۔ اب وہ کھڑکی کی دہلیز کے بالکل ساتھ لگی ہوئی تھی۔ ایک بار پھر اس کا بازو باہر کی طرف بڑھا اور ہاتھ پھیل کر بارش کے قطرے' جو اب نیم پھوار میں تبدیل ہو چکے تھے۔ قابو کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا ہاتھ ہلکا سا نم ہوا' لیکن وہ کوئی قطرہ پکڑ نہیں سکی' اس نے مایوسی سے کھڑکی کے اوپر تنے سیمنٹ کے وکٹورین اسٹائل شیڈ کو دیکھا جو کھڑکی کو موسمی اثرات سے بچا رہا تھا۔ بازو بدستور باہر رکھے اور ہاتھ پھیلائے اس نے اونچے اونچے درختوں کے سیاہ پڑتے تنوں پر غور کیا اور پھر نظر کے سامنے تنی ایک کھمبے سے دوسرے کھمبے تک پھیلی بجلی کی تاروں کو دیکھا۔ اس کے سامنے ایک چھوٹا سا پرندہ ان تاروں پر بیٹھا پانی کی پھوار میں بھیگ رہا تھا۔

"اگر ان بھیگی تاروں میں کرنٹ دوڑ جائے تو اس پرندے کا کیا بنے گا۔" اس نے سوچا۔
"پرندوں کو کرنٹ نہیں لگتا پریا۔" کسی نے اس کے کان میں کہا۔ اس نے سر اٹھا کر دائیں جانب دیکھا۔ سرخ بالوں کی وگ لگائے' زرد ٹینس بال ناک پر اٹکائے' ہونٹوں پر شرفا "غربا" سفید پینٹ پھیلائے' گالوں پر لالی کی ٹکیاں سجائے' سر پر زرد دائروں والی ہری ٹوپی پہنے ایک چہرہ مسکرا رہا تھا۔
"جیسے ایک منحوس سات گھنٹے مسلسل بھی یونی سائیکل چلائے وہ تھک کر نہیں گرتا۔" اس نے اس کا منہ چڑایا۔
"ہر منحو نہیں' صرف رکو (Rikko) کہو' صرف رکو دس گھنٹے مسلسل سائیکل چلائے تو بھی تھک کر نہیں گرتا۔" اس چہرے نے سفید دستانوں میں چھپے ہاتھ کی انگلی اٹھا کر مسکراتے ہوئے کہا۔
"رکو۔" اس نے پھوار سے نم ہوتا ہاتھ کھینچ کر دائیں جانب بڑھایا۔ "تم کہاں چلے گئے تھے۔ مجھے دیکھو میں کیسے اپاہج ہو گئی' تم نے پلٹ کر مجھے پوچھا بھی نہیں' تم کو پریا رانی اتنی جلدی بھول گئی۔ اب کہیں مت جانا۔" اس نے بڑھا ہوا ہاتھ مزید آگے کیا۔ مگر اس کے ہاتھ رکو کی آستین آئی نہ ہاتھ۔ اس کا ہاتھ خلا ہی میں ادھر ادھر ہلتا رہ گیا۔
"آہ... مجھے کیوں اس کا وہم ستاتا ہے۔ مجھے کیوں وہ اس طرح نظر آتا ہے۔ جبکہ وہ ہوتا ہی نہیں۔" اس نے بے بسی سے کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر سوچا۔
"وہ جو نئے نئے منظروں میں پھرتا ہو گا' نت نئی منزلوں کو پاتا ہو گا' نت نئے لوگوں کو اپنے فن اور کرتبوں سے ہنسانے میں مصروف رہتا ہو گا۔ اسے پریا رانی تو کبھی بھول کر بھی نہ یاد آتی ہو گی۔" اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ مگر اس نے سر جھٹک کر خود کو اس دکھ بھرے احساس سے نکال لیا اور ایک بار پھر کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھنے لگی۔
ٹکڑیوں میں بٹے بادل آپس میں مدغم ہو چکے تھے اور مل کر چھما چھم برسنے لگے تھے۔ مشرق سے چلتی ہوا پانی کی پھوار کو کھڑکی سے اندر لاتی اور یہ پھوار اس کو بھگو جاتی۔ اس کے بال بھیگ گئے تھے۔ کپڑے نم ہو رہے تھے۔ اسے ایک عجیب سے لطف کا احساس ہو رہا تھا۔ سامنے کے منظر میں موجود فلک بوس پہاڑ نیم تاریک آسمان کے سائے میں نظر کی حد سے غائب ہو چکے تھے۔ بجلی کے کھمبوں سے منسلک تاروں کے جال کی جھلک بھی مدھم پڑنے لگی تھی۔ تاحد نظر صرف آسمان سے برستا پانی یا کبھی کبھار کڑا کے مارتی روشنی تھی۔ سماعتوں میں بھی صرف برستی بارش کی آواز تھی یا پھر گرجتے بادلوں کی گڑگڑاہٹ' سارہ نے سالوں بعد برستی بارش کا فرصت سے نظارہ کیا تھا اور اس سے بے حد لطف اندوز ہوئی تھی۔ اس سے پہلے سالوں تک وہ بارش کے آثار دیکھ کر سرکس فیملی کے ساتھ بیٹھ کر اجتماعی دعا میں شامل رہی تھی کہ۔
"خدا کرے بارش نہ برسے' کم از کم اتنے دن جب تک سرکس کا ڈیرا ہے۔"
بارش کا مطلب' کئی دنوں تک آمدنی بند ہو جانا تھا۔ بارش دیکھ کر سرکس کے انسان ہی نہیں حیوان بھی دم ہلاتے' بے چین پھرتے تھے۔ ہر کسی کے ذہن و دل پر الارم کی طرح ایک خیال یلغار کرتا تھا۔
"Going to loose some money every rainy night"
(برستی بارش میں ہر رات' ہم پیسے کا نقصان اٹھانے والے ہیں۔)
پریشان حال چہرے' نظریں آسمان سے لگائے ادھر ادھر پھرتے تھے۔ سارہ کی زندگی بھی بارش کے غم میں مبتلا گزر گئی تھی۔ اسی لیے تو اسے بارش سے حظ اٹھانے کا نہ کبھی موقع ملا تھا' نہ ہی خیال آیا تھا۔ "کیا ہو جو اسی طرح کی برستی بارش میں سامنے کے پہاڑوں پر موجود گھروں میں سے کسی گھر میں بیٹھ کر چائے پی جائے۔" اس کو ایک انوکھا خیال آیا۔

"مگر پہاڑ تو بلند ہیں۔ ان تک رسائی کیسے ممکن ہے۔" دوسرا خیال آیا۔
"میرا ناتواں جسم اور میری اپاہج ٹانگیں وہاں تک کیسے پہنچ پائیں گی۔"

And if you ever forget
how much you mean to me
Everday i will
Remind you

(اور اگر تم کبھی بھولنے لگو کہ تم مجھے کتنی عزیز ہو تو میں روزانہ تمہیں یاد دلاتا رہوں گا۔)
پھر اسے وہ الفاظ یاد آئے جو اس نے بارہا سنے تھے اور اس کے چہرے پر آپوں آپ مسکراہٹ دوڑنے لگی۔

You can count on me
Like one, two three
I will be there

اس نے تصور میں ابھرے الفاظ پر سر دھنا اور پھر اپنی گود میں چھپا سیل فون نکال کر احتیاط سے حرف دبا دبا کر لکھنے لگی۔
"سنو مجھے بھی اس پہاڑ پر چڑھنا ہے، اس کی اونچائیوں کو ناپنا ہے، جو اس وقت میری نگاہ کے سامنے موسلا دھار بارش میں بھیگ رہا ہے۔"
لکھنے کے بعد اس نے جملے جانچے، کہیں کسی حرف یا لفظ کی غلطی تو نہیں ہوئی۔ مطمئن ہونے کے بعد اس نے send کا بٹن دبا دیا۔ وہ میسج اس کے سیل فون کی کانٹیکٹ لسٹ میں محفوظ دو نمبروں میں سے ایک پر چلا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہاں ایک وقت تھا جب مجھے کوئلے کے ٹکڑوں سے پیار تھا۔"
ان کے سامنے بیٹھی خاتون کہہ رہی تھیں۔ انہوں نے کیسری اور سفید رنگ کے امتزاج کا جمپر پہن رکھا تھا۔ ان کے شانے سے ذرا نیچے جاتے گھنگھریالے بالوں کے سیاہ رنگ میں کئی جگہ پر سفیدی کی لہریں جھلک رہی تھیں۔ ان کے چہرے کا رنگ جو شاید کبھی گندمی ہوتا ہو، اب ہلکا سیاہ پڑ رہا تھا۔ ان کے چہرے کے خطوط پر عجیب سی سرد مہری اور سختی چھائی ہوئی تھی۔ یہ خاتون فلزا ظہور تھیں جن کی تلاش ماہ نور کو یہاں لے آئی تھی۔
"مگر میرے ذہن میں تو ان کا اور ہی سا تصور تھا۔" ماہ نور نے ان سے اپنا تعارف خدیجہ اور فاطمہ کے حوالے سے کرواتے ہوئے سوچا۔ "آرٹسٹوں کی سی آرٹسٹک خاتون، نرم لہجہ، خوش گوار چہرہ۔ یہ تو بے چاری لگتا ہے حس لطیف کہیں ان کو چھو کر بھی نہیں گزری۔"
خود کو خوش آمدید کہے جانے کے بعد اس چھوٹے سے گھر کے سٹنگ روم میں بٹھائے جاتے ہوئے اسے خیال آیا تھا۔
"مجھے حیرت ہے، فاطمہ کو میں ابھی بھی یاد ہوں۔" یہ بات انہوں نے سعد سے مخاطب ہو کر کہی تھی۔ سعد نے جواب کے لیے ماہ نور کی طرف دیکھا۔
"جی ہاں، آپ انہیں یاد ہیں، جب ہی تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ سے ملنے کی کوشش کروں۔" ماہ نور نے جواب دیا۔
"مگر میرے ذہن کے بہت سے خانے یادوں سے خالی ہو چکے ہیں۔" انہوں نے سر ہلایا۔ "اگر تم یہاں آج نہ

آئیں تو شاید [illegible]
سے اڑایا کرتی تھی۔"
"لیکن جو یادیں یاد آیا دلا دی جاتی ہیں ان کی بہت قدر ہے میرے دل میں۔" دوسرے ہی لمحے انہوں نے کہا۔
"آپ ابھی بھی چارکول میں کام کرتی ہیں۔" ماہ نور نے اس چھوٹے سے سٹنگ روم کی دیواروں پر لگے چارکول میں بنے ماسٹر پیسز کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"کیا صفائی ہے ہاتھ کی اور کیا مشاقی ہے۔" اس نے سوچا۔
"ہاں... لیکن بہت کم۔" انہوں نے کہا۔ "اب میرا رجحان زیادہ تر کیلی گرافی کی طرف ہے۔ میں نے کیلی گرافی میں بہت سے کورسز کیے ہیں اور اب میں ایک اکیڈمی میں کیلی گرافی سکھاتی بھی ہوں۔"
"وہیں سے آپ کا نام پتا مجھے ملا۔" سعد نے کہا۔
"اچھا!" انہوں نے سعد کی طرف دیکھا۔ "جبکہ میں نے کبھی اکیڈمی کے بروشرز اور نیوز لیٹرز میں اپنا نام نہیں آنے دیا۔ میں وہاں ایسے ہی کام کرتی ہوں جیسے میں وہاں نہیں ہوں۔"
یہ ایک مبہم سی بات تھی۔ ماہ نور نے سعد کی طرف دیکھا۔ اس نے یوں سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہو عجیب سا سہی مگر ان کا مزاج تو شاید ایسا ہی ہے۔
"آپ ایسا کیوں کرتی ہیں۔" ماہ نور نے سوال کیا۔
"بس مجھے اچھا نہیں لگتا۔" مختصر جواب آیا۔
"آپ اپنی پہچان نہیں چاہتیں؟" سعد نے سوال کیا۔ "کسی بھی ویب سائٹ پر آپ کا نام مجھے بطور آرٹسٹ نہیں ملا... جبکہ آپ کا کام میں دیکھ رہا ہوں کہ انتہائی noteable ہے۔"
"نہیں مجھے نہ پہچان کی تمنا ہے، نہ شہرت کی خواہش، میں اپنا کام صرف اپنے اطمینان کے لیے کرتی ہوں۔" انہوں نے روکھائی سے جواب دیا۔
"تمہارے آنے سے میری یادوں کا ایک خانہ کھلا۔ میں اس کے لیے تمہاری مشکور ہوں۔" پھر انہوں نے قدرے نرم لہجے میں ماہ نور کو مخاطب کیا۔ ماہ نور کے تنے اعصاب ذرا ریلیکس ہوئے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے انہیں ان کا یہاں آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ کچھ دیر اپنی یاد کے اس خانے سے، جو ماہ نور نے کھولا تھا، کچھ باتیں نکال کر سناتی رہیں۔
"آپ کے بچے، آپ کی فیملی۔" ماہ نور نے —— جھجکتے جھجکتے پوچھا۔
"میرا تعلق بھی خدیجہ اور فاطمہ کے قبیلے سے ہے۔ میں تنہا ہوں۔" انہوں نے غیر واضح جواب دیا۔
"اوہ!" ماہ نور نے کہا اور ایک مرتبہ پھر سعد کی طرف دیکھا۔
"تم کیا کرتے ہو؟" پھر انہوں نے براہ راست سعد سے پوچھا۔
"میں ایک گڈ فار نتھنگ قسم کا انسان ہوں، کچھ خاص نہیں کرتا۔" اس کے جواب نے ماہ نور کو بھی حیران کیا۔
"اور تمہاری فیملی کہاں رہتی ہے۔" یہ سوال انہوں نے ماہ نور سے بھی نہیں کیا تھا۔
"میری فیملی خاصی موبائل ہے، ایک جگہ ٹک کر نہیں رہتی۔" دوسرا حیران کر دینے والا جواب آیا۔
"ہوں۔" انہوں نے بدستور سعد کی طرف دیکھتے ہوئے گہرا سانس لیا۔
"تمہارے ابا، اماں کیا کرتے ہیں۔" ایک اور سوال آیا۔
"آج تک مجھے خود بھی پتا نہیں چلا۔" سعد نے سکون سے جواب دیا۔ "کیوں کیا کوئی کالا دھندا کرتے ہیں جو چھپا کر مصروف رہتے ہیں اس میں۔" انہوں نے خشمگیں نظروں سے سعد کو دیکھا۔ ماہ نور نے سوالات کے اس

اچانک سیشن پر جز بز ہوتے ہوئے پہلو بدلا۔

"کالے سفید کا بھی اندازہ نہیں۔" سعد نے بھی اسی سکون سے جواب دیا۔

"ہمارے ہاں ایک دوسرے کے معمول کے بارے میں سوال کرنے کا رواج نہیں۔"

"ہوں!" انہوں نے سر ہلایا اور ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"یہ لڑکا تمہارا بھائی ہے یا کزن؟"

"ہم لوگ ساتھ پڑھتے ہیں' اکٹھے کمپینز (Compaigns) بناتے ہیں۔" اس بار بھی سعد کی طرف سے جواب آیا۔

"او!" نہیں جیسے مایوسی ہوئی۔

"میرا خیال ہے اب ہم چلتے ہیں۔" ماہ نور کو اب اس ماحول اور فلزا ظہور سے الجھن ہونے لگی تھی۔

"ٹھہرو' میں ابھی آتی ہوں۔" وہ اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آئیں ان کے ہاتھ میں ایک بڑی چارکول شیٹ پر بنا اسکیچ تھا۔

"یہ تمہارے لیے ہے۔" انہوں نے شیٹ میز پر رکھ کر ہاتھ میں پکڑے چارکول کے ٹکڑے سے دستخط کرتے ہوئے کہا۔

"او یہ زبردست ہے۔" ماہ نور بے اختیار دو قدم آگے بڑھی۔

"اس کو فریم کروا لینا۔" انہوں نے سائن کرنے کے بعد شیٹ رول کر کے ماہ نور کی طرف بڑھائی۔

"بہت شکریہ۔ یہ ایک ونڈر فل گفٹ ہے۔" ماہ نور یہاں آنے کے بعد پہلی بار خوش نظر آئی۔

"اور تم برخوردار!" انہوں نے ناک کی پھننگ پر ٹکائی عینک اتارتے ہوئے سعد کو مخاطب کیا۔ "اپنا فون نمبر دے جاؤ' کبھی ادھر چکر لگے تو پھر آنا۔"

"جی!" وہ "تعظیما" سر جھکا کر بولا اور اپنی جیب سے بال پوائنٹ نکال کر ان کی دی چٹ پر اپنا نمبر لکھ کر ان کی طرف بڑھایا۔

"چلو ٹھیک ہے بچو' خوش رہو' آباد رہو۔" پھر انہوں نے ماہ نور کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "بادل جھکا ہوا ہے' کہیں بارش نہ آجائے' اب تمہیں جانا چاہیے۔ فاطمہ اور خدیجہ کو میرا اسلام کہنا۔ ان کا نمبر بھی دے جاؤ مجھے۔ میرا لاہور چکر لگا تو ان سے ملنے آؤں گی۔"

ماہ نور نے سعد والی چٹ پر خدیجہ خالہ کا نمبر لکھا اور تیزی سے چلتی باہر نکل آئی۔ باہر واقعی بادل جھکے ہوئے تھے اور ہلکی سی پھوار بھی پڑ رہی تھی۔

"واہ کیا زبردست موسم ہے۔" سعد اس کے پیچھے آیا اور موسم دیکھ کر بولا۔ ماہ نور اس کی طرف دیکھ کر ہلکا سا مسکرائی۔

"یہ تم کس قسم کی خاتون سے ملنے آگئی تھیں۔" گاڑی میں بیٹھ کر اسٹارٹ کر کے روڈ پر گاڑی لاتے ہوئے اس نے کہا۔

"مجھے خود اندازہ نہیں تھا۔" ماہ نور نے منہ بنا کر کہا۔

"تم نے چارلس ڈکنز کو پڑھا ہے۔" اس نے اسٹیئرنگ وہیل گھماتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔" ماہ نور نے سر ہلایا۔ "تھوڑا بہت۔"

"اس کا ایک کردار ہے مس ہیولیشیم۔" وہ کچھ سوچ کر مسکرایا۔

"ان فلزا ظہور کو دیکھ کر مجھے وہ کردار یاد آگیا۔"

"ایک کہانی... strgoika monor پڑھی تھی میں نے' جس میں چند بچے ایک پراسرار گھر میں گھس جاتے ہیں اور گھر کا مالک انہیں caldron میں ابلتا عجیب ذائقے والا مشروب پلا دیتا ہے۔ اوہ..." اس نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔ "مجھے لگا میں stragoika monor میں جا گھسا ہوں اور وہ محلول آیا کہ آیا۔"

"تمہیں تو بہت اہمیت دے رہی تھیں' بڑے پرسنل سوال کر رہی تھیں۔" ماہ نور نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"ہاہا..." وہ زور سے ہنسا۔ "اب یہ مت کہنا کہ وہ مجھ پر فریفتہ ہو گئیں۔ میری اماں اگر ہوتیں تو ان سے کم عمر ہی ہوتیں۔"

"تمہاری مدر۔" ماہ نور کو یہ بات سن کر جھٹکا سا لگا۔

"پتا نہیں... میں نے انہیں نہیں دیکھا۔" وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے بولا۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"وہ بارش تیز ہو گئی۔" ماہ نور نے بات بدلنے کو کہا۔

"ہاں... دیکھو کتنا حسین نظارہ..." اس کے سیل فون پر بجنے والی مسیج ٹون نے اس کو بات مکمل کرنے سے روک دیا۔

"ایک جگہ میں تمہارے کہنے پر گیا اور مس ہیولیشیم' سے ملاقات کر آیا۔" مسیج پڑھنے کے بعد اس نے کہا۔ "ایک جگہ میرے کہنے پر چلو گی تم۔" اس نے سوال کیا۔

"کہاں؟" ماہ نور نے چونک کر کہا۔

"اگر تم مجھ پر اعتماد کر سکو تو۔" اس نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"جانا کہاں ہے؟" ماہ نور نے دوبارہ پوچھا۔

"ہے ایک جگہ' تمہیں کسی سے ملاتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"اچھا!" ماہ نور نے تھوڑی دیر سوچا۔ "چلو۔" تھوڑی دیر بعد وہ بولی۔

"تھینک یو۔" وہ مسکرایا اور گاڑی نئے راستے پر ڈال دی۔

you can count on me
Like one two three
I will be there

"تمہیں بس ایک' دو' تین تک گنتی گننے کی ضرورت ہے' اس کے بعد میں تمہارے پاس موجود ہوں گا۔"

اس نے ایک کے بعد دو کہا اور پھر تین' بارش زوروں پر تھی اور ایسے میں کسی کا کہیں دور سے اٹھ کر ادھر کو آجانا ناممکن سی بات لگ رہی تھی۔ مگر وہ کھڑکی کے قریب بیٹھی ہوا کے جھونکے کے سنگ آتی پانی کی پھوار میں بھیگتی تین سے آگے گنتی گننے سے انکاری تھی۔ اس کا خوش فہم' پر مسرت دل' موسم کے خراب تیور دیکھ لینے کے باوجود منتظر تھا۔

"ایک' دو' تین' ایک' دو' تین۔" وہ گن رہی تھی۔ جب ہی اسے کال بیل کے بجنے کی آواز آئی۔ اس کا دل جھوم اٹھا۔ وہ سچ کہتا تھا۔ وہ اس کے لیے گنتی گن سکتی تھی۔ جس پر وہ حاضر ہو جاتا۔ چند لمحوں بعد اسے اپنے عقب میں دروازے پر ہلکی دستک کے بعد دروازہ کھل جانے کی آواز آئی۔ بھیگے بالوں' بھیگے چہرے اور مسکراتے ہونٹوں کے ساتھ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ اس نے ایک' دو' تین بار پلکیں جھپکائیں اور پھر آنکھیں پوری کھول کر دیکھا۔ لمحہ بھر میں اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔ اسے نہ جانے کیوں اپنے سامنے کا منظر اجنبی سا لگا تھا۔ وہ منظر غیر متوقع تھا یا ناقابل یقین... یہ اسے فوری طور پر سمجھ نہیں آئی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عنیزہ سید

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا، لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے، کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے، کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ، ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں، جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کردیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور نے "سید پور کلچرل شو" میں شرکت کے لیے اپنی دوست شاہ بانو کے ساتھ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ شاہ بانو نے اپنے بھائی کی معرفت سید پور میں ماہ نور کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا۔ فاطمہ اور خدیجہ نے ماہ نور کو اسلام آباد میں فلزا ظہور سے ملنے کی تاکید کی۔ فلزا ظہور ان کے بچپن کی ساتھی ہے۔ بچپن میں کوئلے سے فرش اور دیواروں پر تصویریں بنانے والی فلزا ظہور اب ایک بڑی آرٹسٹ ہے مگر اسے شہرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔

مگر ماہ نور کو کمہار کی آنکھوں میں شناسائی کی کوئی رمق نظر نہ آئی تو وہ الجھن کا شکار ہو گئی۔

سارہ خان عرف پری نے جب سے ہوش سنبھالا' خود کو سرکس کی دنیا ہی میں پایا تھا۔ وہ سرکس کے استاد عارف خان کو اپنا باپ سمجھتی تھی۔ عارف خان نے پری کی تربیت کی تھی۔ انہوں نے اسے سرکس کے تمام کرتب سکھائے تھے۔ جبکہ مسز پیٹر نے اسے کتابی علم دیا تھا۔ پری چھوٹی عمر ہی سے اپنے فن میں ماہر ہو گئی۔ مگر تھوڑے بڑے ہونے پر وہ سرکس کی دنیا میں اکتاہٹ محسوس کرنے لگی۔

تصویری نمائش میں ایک نوجوان نے ماہ نور سے اس کی تصویر پر منہ مانگی قیمت پر خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا تو ماہ نور سحر زدہ سی اسے دیکھنے لگی۔ اسے اس نوجوان میں وہی چہرہ نظر آیا جو وہ ہر جگہ دیکھتی رہتی تھی۔

مولوی سراج کا تبادلہ دوسرے قصبے میں ہو گیا۔ چنانچہ وہ' آپا رابعہ اور ان کی بیٹی سعدیہ کلثوم دوسرے قصبے میں چلے گئے۔

یہ فون سعد کا تھا۔ اس نے بتایا کہ مختلف روپ میں وہی تھا۔ اس نے ماہ نور کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جو اس نے قبول کرلیا۔

فارم ہاؤس پر کام کرنے والے کھاری کو آپا رابعہ نے نماز سکھائی۔

ماہ نور' سعد کے ساتھ فلزا ظہور سے ملنے گئی۔ وہ واپس آرہے تھے کہ سعد کو سارا کا میسج ملا۔ وہ ماہ نور کو ساتھ لیے سارا کے پاس چلا آیا۔

قسط ۲

"تمہیں یوں' یہاں بیٹھے دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے' تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔" سعد نے آگے بڑھ کر سارہ سے کہا تھا۔

سارہ کی نظریں سعد کے ساتھ آنے والے اجنبی چہرے پر اٹک گئی تھیں۔

"یہ ماہ نور ہے۔" سعد نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے کہا۔

"اور ماہ نور! یہ سارہ خان ہے۔" اسے سعد کی آواز آئی۔

"سارہ ایک ونڈر فل ایکروبیٹ اور ٹیلنٹڈ آرٹسٹ رہ چکی ہے۔ اگر کبھی اسے عالمی سطح پر اپنا ہنر اور جوہر دکھانے کا موقع ملتا تو ضرور ملک کے لیے عزت و وقار کے کئی تمغے جیت کر لاتی۔" وہ کہہ رہا تھا۔ وہ یہ الفاظ سارہ کے لیے کہہ رہا تھا مگر سارہ کی تمام حسیں جیسے ایک ہی چہرے میں اٹک گئی تھیں۔ وہ کچھ دیر پہلے بارش کے قطروں سے کھیلنے اور پہاڑوں کی بلندیاں ناپنے کی خواہش یکسر فراموش کر بیٹھی تھی۔

"مجھے تم سے مل کر بہت مسرت' اور فخر کا احساس ہو رہا ہے سارہ!"

اس اجنبی لڑکی نے مسکراتے ہوئے سارہ کا ہاتھ تھاما۔ سارہ کی نظریں اس کے چہرے سے نیچے اتریں اور اس کے بازو' ہاتھوں کو دیکھتی ہوئی اس کی ٹانگوں اور پھر پاؤں تک دیکھتی نیچے اترتی گئیں۔ گزشتہ ایک عرصے سے اس نے اسپتالوں' ڈاکٹروں' نرسوں' سیمی آنٹی اور سعد کے علاوہ کوئی چہرہ نہیں دیکھا تھا اور جو دیکھے تھے ان پر کبھی دھیان نہیں دیا تھا۔ اپنے ساتھ ہونے والے حادثے کے بعد اس کمرے سے باہر کی دنیا کے لیے اس کی آنکھیں جیسے خالی ہو گئی تھیں۔ نہ تو کسی نئے چہرے کو دیکھ کر ان میں کوئی تاثر ابھرتا تھا' نہ ہی وہ چونکتی تھیں اور نہ ہی زیادہ دیر کسی چہرے پر ٹھہرتی تھیں اور اب تو کتنے ہی عرصے سے سیمی آنٹی اور سعد سلطان کے علاوہ اس نے کوئی چہرہ دیکھا ہی نہیں تھا۔

سیمی آنٹی کے چہرے کو اس نے ہوش سنبھالنے کے ساتھ ہی دیکھنا شروع کردیا تھا اس لیے وہ اتنا مانوس چہرہ تھا کہ اسے اس کو زیادہ دیر تک دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ سعد کا چہرہ بھی وہ سرسری ہی دیکھا کرتی تھی۔ اسے سعد کے چہرے کو دیکھنے سے زیادہ اس کی آواز سننے میں دلچسپی تھی۔ اس کے کہے الفاظ اس کے ذہن کی پژمردگی مٹاتے محسوس ہوتے تھے اور اس کے کانوں میں زندگی کا احساس انڈیلتے تھے۔ سعد اسے زندگی سے محبت کرنے کا سبق پڑھاتا تھا۔ حوصلے ہمت اور ولولے کی داستانیں سناتا تھا۔ وہ اس کی باتوں سے کس حد تک متفق ہوتی تھی اور کتنا اپنے دل میں ان پر عمل کرنے کی امنگ محسوس کرتی تھی' اس سے قطع نظر اسے سر جھکا کر یا ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سعد کی آواز میں کہے لفظ سننے میں مزا آتا تھا اور اس کا دل چاہتا تھا سعد اس سے باتیں کرتا رہے۔

اس نے ایک بار پھر نظریں اٹھا کر سعد کے ساتھ آنے والی لڑکی کی طرف دیکھا۔ سعد نے اسے اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں کبھی کچھ بتایا تھا نہ اس نے کبھی پوچھا تھا لیکن اس لڑکی کو دیکھ کر پہلی بار اس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ سعد کی بھی ایک ذاتی زندگی ہوگی' اس سے متعلق لوگ اس کی زندگی میں نجانے اس کے لیے کتنے اہم ہوں گے۔

"مجھے پہلے کبھی یہ خیال کیوں نہیں آیا؟" اس لڑکی کو دیکھتے ہوئے بار بار اس کے ذہن میں یہ سوچ ابھر رہی تھی۔ "کیا میرے لیے صرف سعد کی موجودگی ہی کافی ہوتی ہے؟" اس نے خود سے بھی یہ سوال کتنی ہی مرتبہ کیا تھا۔

"مجھے ابھی یہاں آتے ہوئے راستے میں تمہارے بارے میں پتا چلا۔" وہ لڑکی اس سے کہہ رہی تھی۔ "تم بہت باہمت لڑکی ہو' مجھے تم پر رشک آرہا ہے۔"

یکبارگی سارہ کا دل چاہا' اس لڑکی کا ہاتھ جس میں اس نے سارہ کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا' بری طرح جھٹک دے اور کہے "مجھے تمہارے ان الفاظ سے کوئی فرق نہیں پڑتا' ہمت اور بیماری کیا ہوتی ہے' یہ میں نہیں جانتی۔ ایک بے کار

وجود کے ساتھ زندگی صرف اس لیے گزارے جانا کہ اس سے فرار ناممکن ہے' ایک قابل رشک بات ہے تو کیوں پھر ہر کوئی اس مشقت میں نہیں پڑجاتا۔"

لیکن اس نے اس لڑکی سے ایسی کوئی بات نہیں کی اور سعد کی طرف دیکھ کر زبردستی مسکرائی۔

"میرے میسج نے شاید تمہیں ڈسٹرب کردیا میں معذرت خواہ ہوں۔" اس نے کہا۔

"تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو۔" وہ حیران ہو کر بولا۔ "تم جانتی ہو کہ تمہارا میسج میرے لیے کتنا اہم ہوتا ہے۔ تو میں یہاں قریب ہی تھا اگر کہیں دور بھی ہوتا تو میسج ملنے پر جلد از جلد پہنچنے کی کوشش کرتا۔"

"ہی از کریزی۔" (یہ تو پاگل ہے) سارہ نے سعد کی بات سن کر ماہ نور کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں مجھے اندازہ ہو رہا ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"پکوڑے اور پاپڑ کون کھائے گا؟" اسی دم یسی آنٹی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں بڑے سائز کی ایک ٹرے تھی۔

"ارے واہ یسی آنٹی! آپ تو اپنے اندر خاصا بڑا انسانی دل رکھتی ہیں۔" سعد نے ہنس کر کہا۔

"تمہیں کوئی غلط فہمی تھی کیا؟" یسی آنٹی ٹرے سارہ کے بیڈ پر رکھ کر میز پر سے چیزیں سمیٹ کر اسے خالی کرنے لگیں۔

"نہیں تو۔ میں مذاق کر رہا تھا۔" سعد نے شرارت بھری نظروں سے باری باری سارہ اور ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"سارہ! تم نے کھڑکی کھول رکھی تھی دیکھو! سارا رگ اور سیٹی پر رکھی کتابیں بھیگ گئیں۔ یسی آنٹی ٹرے میز پر رکھ کر کھڑکی کی طرف بڑھیں۔ قریب تھا کہ وہ کھڑکی کے پٹ بند کردیتیں' سعد نے آگے بڑھ کر انہیں منع کردیا۔ یسی آنٹی وہاں سے ہٹ کر ماہ نور کے پاس جا بیٹھیں۔ سعد' سارہ کی کرسی کی پشت پر دونوں ہاتھ جما کر کھڑا سامنے دیکھ رہا تھا۔

"بولو۔ کون سے پہاڑ پر چڑھنا ہے تمہیں؟" اس نے ذرا جھک کر سارہ کے کان میں سرگوشی کی' جو کھڑکی کے پار دیکھ رہی تھی۔

"وہ جو نیلا سا لگ رہا ہے۔ یا وہ والا جس کے پاؤں میں کھڑا چھوٹا سا پہاڑ گیان میں مصروف بدھا لگ رہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میری ہر خواہش وش فل تھنکنگ کا نتیجہ ہوتی ہے۔" سارہ کا لہجہ سپاٹ ہوگیا۔ "کبھی کبھار مجھ پر بچپنا اتنی شدت سے طاری ہو جاتا ہے کہ مجھے بات کرتے ہوئے یاد ہی نہیں رہتا کہ میں جو خواہش کر رہی ہوں وہ پوری ہونا ناممکن ہے۔"

اس کی نظروں کے سامنے بجلی کے تاروں پر بیٹھا بھیگتا پرندہ اپنی جگہ سے اڑا اور بجلی کے پول پر جا کر بیٹھ گیا۔

"پرندوں کے پنجوں کے نیچے ایسے قدرتی پیڈز لگے ہوتے ہیں جو انہیں برقی جھٹکے سے بچالیتے ہیں۔" اسے ایک اور سائنسی حقیقت یاد آئی۔

"میں تمہیں کئی بار بتا چکا ہوں کہ دنیا میں کوئی بھی بات ناممکن صرف اس وقت تک ہوتی ہے' جب تک ہم سوچتے ہیں کہ وہ ناممکن ہے۔" سعد نے دھیمی آواز میں کہا۔

"اور پھر تم بھی میری بچکانہ حرکتیں دیکھ کر مجھے بچوں ہی کی طرح ٹریٹ کرتے ہو۔ طفل تسلیاں دیتے ہو۔ بچوں کی طرح بہلاتے ہو۔" سارہ کا لہجہ بھیگنے لگا۔ "ایک ناکارہ وجود پہاڑ پر چڑھنے کی خواہش کرے اسے ناممکن اور ممکن کے فلسفے سنائے جانے کا یہی مطلب ہے کہ تم بچوں جیسی باتیں کیے جاؤ' ہم بچوں کی طرح تمہیں بہلاتے جائیں گے۔"

"تمہیں یقین نہیں آیا نا میری بات کا۔" وہ مسکرایا۔ "چلو پھر لکھ کر رکھ لو۔ تمہیں اس پہاڑ کی چوٹی تک نہ پہنچایا تو میرا نام بدل کر کاٹھ کا الو رکھ دینا۔" وہ چیلنج کرنے کے سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

سارہ نے گردن پیچھے تک لے جا کر اس کی طرف دیکھا' وہ اسے یقین دلانے کے سے انداز میں سرہلا رہا تھا۔

"اس نے کہا تھا' ایک روز میں بیڈ سے اٹھ کر اس کھڑکی تک خود پہنچوں گی۔" اسے یاد آیا۔ "مگر وہ پہاڑ۔ اس کی اونچائیاں۔"

اس نے سامنے دیکھا۔ اس کے دل میں ایک امید نے کروٹ لی مگر دوسرے ہی لمحے اس امید پر عقب میں بیٹھی اجنبی لڑکی کا خیال حاوی ہوگیا جو یسی آنٹی کے پکوڑوں اور پاپڑوں کی تعریفیں کر رہی تھی اور یوں محو گفتگو تھی جیسے ہمیشہ سے یہاں آتی رہی ہو۔ اس روز پہلی بار سارہ خان کے دل میں کسی دوسرے انسان کا خیال نیزے کی طرح گڑ کر رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیسا لگا تمہیں یہاں آکر؟" واپسی پر سعد نے ماہ نور سے پوچھا۔

"میں مبہوت ہوں ابھی تک۔" ماہ نور نے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے ایسا منظر زندگی میں پہلی بار حقیقت میں دیکھا ہے' فلموں میں شاید کبھی دیکھا ہو یا کتابوں میں پڑھا ہو لیکن۔۔۔" اس نے سر جھٹکا۔ "یہ سچ مچ ناقابل یقین منظر تھا لیکن اس منظر نے دو بہت اہم کام کیے۔" اس نے گردن موڑ کر سعد کی طرف دیکھا۔

"وہ کیا؟" سعد نے گیئر بدلتے ہوئے کہا۔

"ایک تو ایک انسانی المیے کا حقیقی آنکھ سے براہ راست مشاہدہ' دوسرا۔" اس نے ذرا توقف کیا۔

"دوسرا کیا؟" سعد نے اس کی طرف دیکھا۔

"تم سے ایک نیا تعارف۔" ماہ نور نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں آج اس وقت سے یہ سوچ رہی تھی کہ میرا دل ایک بالکل اجنبی شخص کے ساتھ کہیں جانے پر کیسے آمادہ ہوا' جب میں تمہارے ساتھ باہر نکلی ہوں۔ سارہ کے گھر سے واپسی کے لیے اٹھتے ہوئے مجھے میرے اس سوال کا جواب مل گیا۔"

"مجھے تم سے حسد محسوس ہو رہا ہے۔" اس نے سعد کی طرف دیکھا۔

"گو ابھی تک میں ٹھیک سے اندازہ نہیں کرپائی کہ تمہاری شخصیت کے کل کتنے رخ ہیں۔ کتنے میرے سامنے آچکے ہیں اور کتنے آنے باقی ہیں' مگر جتنے میں دیکھ اور جان پائی ہوں' مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ تم قابل رشک انسان ہو۔"

اس نے آہستہ آہستہ بولتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔ اس کی بات ختم ہونے کے بعد کچھ دیر تک گاڑی میں خاموشی چھائی رہی۔

"میرا ایک مشورہ مانو گی؟" سعد کی آواز خاموش فضا میں ابھری۔

"ہوں۔"

"اتنی جلدی نتائج اخذ کرنے سے گریز کیا کرو۔ ایک دو یا پھر تین ملاقاتوں میں ہی ہم کسی کے بارے میں حتمی رائے دینے کے قابل نہیں ہو جاتے' ایسا کرنے سے اکثر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کی شخصیت کا کوئی نیا روپ سامنے آنے پر بری طرح مایوس بھی ہو جائیں اور اپنی رائے پر شرمندہ بھی۔"

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں انسٹنکٹ (وجدان) کے زیر اثر سوچتی اور فیصلے کرتی ہوں اور مجھے اپنے

انسٹنکٹس پر خاصا بھروسا ہے۔" ماہ نور نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں ہو سکتا ہے۔" وہ ایک دم زور سے ہنس کر بولا۔ "شاید اس لیے کہ تمہاری نیت میں کوئی فتور نہیں ہے۔"

"نیک نیتی بھی شاید اسی وقت تک ساتھ رہتی ہے جب تک زندگی میں بالکل عام سی توقعات اور خواہشات ہوں۔ جب سوچ توقع اور خواہش کا دائرہ وسیع ہونے لگتا ہے' ان کے حصول کے لیے بدنیتی دل میں ابھرنے لگتی ہے اس وقت انسٹنکٹس بھی نیگیٹو ہونے لگتے ہیں۔" ماہ نور نے سادگی سے کہا۔ "زندگی سے میری توقعات اور خواہشات ابھی محدود ہیں اس لیے میری نیت میں فتور نہیں ہے۔"

"تم تو خاصی سیانی باتیں کرلیتی ہو۔" سعد نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

"تمہارا کیا خیال تھا؟" ماہ نور نے پوچھا۔

"میرے خیال کی نہ پوچھو۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "تمہارے نام کے ساتھ میرے ذہن میں بندر کا تماشا دیکھنے کی ضد کرنے والی' میلے میں سائیں سے سوال کرنے والی اور فوک فیسٹیول پر دیوانوں کی طرح بھرے مجمع میں سوال کرتی لڑکی کا خیال آتا ہے۔"

"گویا ایک insane لڑکی کا تصور۔" ماہ نور مایوس ہو کر بولی۔

"نہیں خیر ایسا بھی نہیں ہے۔" سعد نے سر ہلایا۔ "تمہارے نام کے ساتھ جتنے بھی خیال میرے ذہن میں آتے ہیں' مجھے سارے ہی اچھے لگتے ہیں۔ جب ہی تو میں نے تم سے کہا تھا کہ ہماری دوستی ہو سکتی ہے۔"

"ہوں!" ماہ نور ذرا مطمئن ہوئی۔

"سارہ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے' کیسی لگی وہ تمہیں؟"

پھر سعد نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"وہ مجھے ویسی ہی لگی جیسا ری ہیبلیٹیشن کے پیریڈ کے دوران ایک انسان ہو سکتا ہے۔ وہ زندگی سے بھی خوف زدہ ہے اور زندگی کو کھو دینے سے بھی۔" ماہ نور نے سارہ سے متعلق اپنا اندازہ بتایا۔

"اب تو اس میں بہت تبدیلی آگئی ہے۔ شروع میں وہ بالکل مایوس' وحشت زدہ اور بے اعتباری کی حدوں کو چھوتی ہوئی انسان نظر آتی تھی۔ وہ زندگی سے خوف زدہ تھی' محتاجی اور لاچاری کی زندگی کا چند روزہ تجربہ اس کی رگ رگ میں جذب ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی زندگی کے وہ تاریک ترین دن اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں اور اب اس کو دیکھتا ہوں تو وہ پہلے سے بہت بہتر نظر آتی ہے۔ میرے لیکچرز اس کے دل میں زندگی کی امنگ ابھارتے ہیں' مگر پھر منفی سوچیں اس امنگ پر حاوی ہو جاتی ہیں' وہ پھر مایوس اور پریشان ہو جاتی ہے۔"

"یہ نیچرل سی بات ہے' اس پر ایسی کیفیات کا اترنا لازم ہے۔" ماہ نور نے کہا۔

"اگر تمہارے پاس وقت ہو اور تمہارا دل مانے تو کبھی اس کے پاس دوبارہ ضرور جانا۔" سعد نے کہا۔

"ضرور جاؤں گی' لیکن مجھے لگتا ہے اسے میں اچھی نہیں لگی۔"

"ہو سکتا ہے۔" سعد نے ماہ نور کی بات رد نہیں کی۔ "لیکن پھر بھی کوشش ضرور کرنا۔"

"اسے میرا اس کے گھر جانا ہی شاید اچھا نہیں لگا۔" ماہ نور نے کہا۔

"بعض لوگوں کو پہلی بار نظر آنے والے چہرے' جگہیں اور چیزیں بھلی نہیں لگتیں' لیکن کچھ عرصے بعد وہ ان کے عادی ہو جاتے ہیں اور نامانوس نہیں لگتے۔" سعد نے کہا۔

"میں سرکس دیکھنے کے شوق میں ایک ہی بار سرکس گیا تھا۔ اسی روز سارہ خان بار پر جمپ کرتے ہوئے بلندی سے نیچے گری تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس کی ہڈیاں ٹوٹتے اور خون بکھرتے دیکھا تھا۔ سرکس کا شوقین مجمع ساکت تھا' خواتین اور بچے چیخیں مار مار کر رو رہے تھے' سرکس انتظامیہ نے پنڈال کی بتیاں بجھادیں اور سیکنڈوں

میں اس ٹوٹے پھوٹے وجود کو اٹھا کر لے گئے۔ بتیاں دوبارہ روشن ہوئیں اور رنگ میں ایک مسخرہ آکر اپنے کرتب دکھانے لگا۔ سرکس کی دنیا جیسے روبوٹس کی دنیا تھی۔ بغیر جذبات و احساسات کے روبوٹس۔ ان کی نظروں کے سامنے ان کی ایک ساتھی پل کے پل میں زندہ لاش میں تبدیل ہو گئی اور ان مسخروں' کرتب بازوں' جادوگروں اور نٹوں کو اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کی پڑی تھی۔ یہ منظر میرے اور میرے جیسے کئی لوگوں کے لیے ناقابل قبول تھا۔ میں اسی پل وہاں سے اٹھ آیا اور اس کے بعد میری کئی راتیں بنا سوئے گزر گئیں۔ میرا دل بے چین تھا اور ذہن بے سکون۔ پھر میں نے اس لڑکی کی خیریت دریافت کرنے کی ٹھانی' جو مجھ ایسے تماشائیوں کو محظوظ کرتے کرتے اس حادثے کا شکار ہو گئی۔ سرکس کا نواے میرے شہر میں اپنی مدت پوری کرکے روانہ ہو چکا تھا۔ میں اس کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں پہنچا' جہاں اس کا اگلا پڑاؤ تھا۔ زخمی سارہ خان تک میری رسائی پندرہ دن کے بعد ممکن ہوئی۔ رشوت' تعلقات' اختیارات۔ مجھے جو بھی اس سلسلے میں استعمال کرنا پڑا' میں نے کیا اور جو میں نے دیکھا' وہ اتنی کڑوی حقیقت تھی کہ میرے لیے اسے برداشت کرنا ناممکن ہو گیا۔ ابتدائی مختصر علاج کے بعد سارہ خان۔ جس نے غالباً" برسوں سرکس کے لیے آمدنی کا بڑا حصہ کمایا' ٹوٹی پھوٹی ہڈیوں اور زخم زخم جسم کے ساتھ سرکس والوں کی چھولداریوں میں سے ایک میں پڑی یوں موت کی منتظر تھی کہ اس کے زخموں سے مواد رس رہا تھا اور جسم پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں۔"

"اوہ!" ماہ نور نے دکھ اور خوف کی شدت سے آنکھیں میچ لیں۔

"میں کس طرح اسے اس بے بسی کے عالم سے نکال کر لایا' یہ ایک الگ داستان ہے۔ میرے پاس پیسہ تھا اور اختیارات بھی۔ مجھے اسے وہاں سے نکالنے میں زیادہ وقت نہیں ہوئی۔ یہاں اس کا علاج کئی مہینوں تک چلتا رہا۔ اس کا جسم شکست و ریخت کا شکار تھا' اسے دوبارہ تعمیر کیا گیا' جگہ جگہ سے پھٹی جلد کی گرافٹنگ کی گئی۔ اس کی شریانوں کو مرمت کیا گیا۔ یہ سارا عمل میرے لیے بھی ایک انوکھا تجربہ تھا' میں ایک بالکل عام سا انسان تھا' مگر ان دنوں مجھے لگتا تھا یہ میری ڈیوٹی ہے کہ میں اس کا علاج کراؤں۔ مہینوں کے علاج کے بعد اس کے وجود کی وہ شکل بنی جو آج تم نے دیکھی۔ پھر اسے اس فلیٹ میں شفٹ کیا گیا۔ سیمی آنٹی نے اس سارے عمل میں میرا بہت ساتھ دیا۔ وہ سارہ کے ساتھ اس کے بچپن سے رہی تھیں لیکن ہوش کی دنیا میں واپس آتے ہی سارہ نے میری اور سیمی آنٹی کی موجودگی پر ردعمل اور ناگواری کا اظہار کیا۔ ہم اس کے لیے ناقابل قبول تھے۔ نجانے ایسا کیوں تھا' ہمیں سامنے پاتے ہی وہ چیخنا چلانا شروع کر دیتی تھی' لیکن نہ میں نے ہمت ہاری نہ سیمی آنٹی نے۔ اور دیکھ لو! آج ہم دونوں ہی اس کی زندگی میں موجود دو اہم اشخاص ہیں۔"

سعد نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"بہت صبر اور ہمت چاہیے۔" ماہ نور نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

"سارہ کا آج میری اور سیمی آنٹی کی اچیومنٹ ہے۔" سعد نے کہا۔ "اور اچیومنٹس ایسے ہی ممکن نہیں ہو جایا کرتیں' ان کے لیے صبر اور ہمت درکار ہوتی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" ماہ نور نے مختصر جواب دیا۔

"ہم تمہارے ماموں کے گھر پہنچ چکے ہیں۔" سعد نے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ "مجھ پر اعتماد کرنے کا بہت شکریہ ماہ نور!" اس نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"خود کو مجھ سے متعارف کروانے کا بہت شکریہ سعد!" ماہ نور نے اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

"میں اتنا بڑا بہروپیا ہوں۔" وہ ہنسا۔ "سوچ لو۔ کہیں میں کوئی کرمنل نہ نکل آؤں۔"

"اوہ! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔" ماہ نور نے مصنوعی حیرت کا مظاہرہ کیا۔ "اب میں اچھی طرح سوچنے کے

بعد ہی تم سے رابطہ کروں گی۔" ماہ نور نے دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکلنے سے پہلے جواب دیا۔
سعد زیر لب مسکرایا اور ماہ نور کو آہستہ قدموں سے چلتے گھر کے گیٹ کی طرف جاتا دیکھتا رہا۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر ماہ نور نے مڑ کر ہاتھ ہلایا اور گھر کے اندر داخل ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

انہوں نے اپنے سامنے میز پر رکھے اعلا برانڈز پرنٹڈ شاپنگ بیگز پر نظر ڈالی، جس میں ڈیزائنر کپڑے اور جوتے بھرے تھے۔ شاپنگ میں عرصہ کے بعد انہوں نے اتنا وقت لگایا تھا۔ ایک ایک چیز کی کوالٹی اور ڈیزائن کا ہر زاویے سے جائزہ لینے کے بعد خریدتے وقت قیمت کی قطعی پروا نہیں کی تھی۔ ان شاپنگ بیگز پر نظر ڈالتے ہوئے وہ اس کے تصور میں کھو گئے تھے جس کے لیے انہوں نے گزشتہ دن کا ایک قیمتی حصہ فیشن ہاؤسز کے ان لیڈنگ اسٹورز میں گزار دیا تھا۔
"کیا وہ یہ سب چیزیں کبھی پہنے گا؟" انہوں نے خود سے سوال کیا۔ "کیا اسے یہ سب پسند آئیں گی؟" دوسرا سوال ذہن میں آیا۔ پھر ان کے ذہن کے پردہ پر ایک پرانا منظر ابھرا۔ بارش کے بعد، پانی میں بھیگے جاگنگ ٹریک کا منظر۔ وہ اس وقت آٹھ یا نو سال کا تھا اور ان کے ساتھ جاگنگ پر جایا کرتا تھا۔ اس روز جاگنگ ٹریک پر بھاگتے بھاگتے وہ بارش کے پانی میں کیچڑ بنے کچے حصے پر اتر گیا تھا۔ چھپ چھپ چھپ۔ اس کے قیمتی جاگرز کیچڑ میں چھینٹے اڑانے لگے، جو اڑ کر اس کے مہنگے ترین جاگنگ سوٹ پر پڑ رہے تھے۔
"ڈونٹ بی ان سین۔ (پاگل پن کی حرکتیں مت کرو۔)"
انہوں نے بلند آواز میں کہا تھا مگر وہ کیچڑ میں چھینٹے اڑاتا، کیچڑ میں لت پت ہوتا آگے بھاگتا ہی گیا تھا اور اس جگہ جہاں جاگنگ ٹریک ختم ہوتا تھا، پہنچ کر انہوں نے دیکھا، وہ سرتاپا کیچڑ میں لت پت تھا جیسے اس میں قلابازیاں لگا کر آیا ہو۔
"یہ تم نے کیا کیا؟" انہوں نے اپنے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے اپنے کپڑوں اور جوتوں کا حشر کر دیا۔ شہر کی بہترین لانڈری بھی شاید ان کو صاف نہ کر سکے، اتنے برے داغ پڑ گئے ہیں ان پر۔" انہوں نے افسوس سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور نوٹ کیا کہ اس نے ان کی ڈانٹ کی کوئی خاص پروا نہیں کی۔
"تم ان کیچڑ بھرے کپڑوں کو برداشت کیسے کر رہے ہو؟"
"ایسے۔" اس نے گھاس پر لوٹ لگائی، جہاں کیچڑ جمع تھی۔
"تم کبھی نہیں سدھر سکتے، تمہیں کیچڑ سے اور گند سے پیار ہے غالباً" اور یہ محبت تمہیں وراثت میں ملی ہے تمہاری مینٹل جینز کا حصہ ہے۔" وہ بے قابو ہو کر چلائے تھے۔ جواب میں وہ شرارت بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھ کر مسکراتا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے انہیں یوں تنگ کرنے میں اسے مزا آ رہا ہو۔
"اور ایسا تو ہمیشہ ہی محسوس ہوتا رہا۔" انہوں نے حال میں واپس آتے ہوئے سوچا۔ "تم نے ہر وہ کام کیا، جو میرے مزاج کے خلاف ہو۔ صرف اور صرف مجھے چڑانے کے لیے اور ہمیشہ کرتے رہے۔" انہوں نے تصور میں بسی ایک صورت کو مخاطب کیا اور مسکرا دیے۔
"اور اب یہ۔" انہوں نے دوبارہ ان شاپنگ بیگز پر نظر ڈالی جن پر اعلا اور مشہور برانڈز کے نام پرنٹ تھے۔ "نجانے ان کے ساتھ تم کیا سلوک کرو۔ انہیں استعمال کرو بھی یا نہیں۔ مگر سچ ہے آج تمہارے لیے یہ شاپنگ کرتے ہوئے مجھے بہت مزا آیا۔ آگے تمہاری مرضی تم ان مہنگی ترین چیزوں کو کیچڑ میں رول دو یا تن پر زیب

کر لو۔" وہ مسکرائے اور ان کے دل میں عجیب سا سکون اتر آیا۔
اسی دم ہیلسنکی کے رہائشی علاقے کمپی میں گھر گھر اخبار تقسیم کرتی نادیہ بلال کا یہ سوچ کر دل بیٹھنے لگا تھا کہ اس روز وہ اپنی پہلی کلاس سے لیٹ ہو رہی تھی، سائیکل کے پیڈل پوری طاقت اور تیز رفتاری سے گھمانے کے باوجود وقت بھاگ رہا تھا اور ابھی چند اخبار تقسیم کرنے باقی تھے۔
خوشنما اسٹینڈ کے ساتھ پرندوں کے لیے دانہ ڈالنے کے دو ڈبے ترازو کے پاٹوں کی طرح لٹکے ہوئے تھے۔ اسٹینڈ کے عین اوپر ایک چھوٹا سا لکڑی کا گھر بنا تھا، جس کے کھلے دروازے سے کسی پرندے کے لیے وہاں لا کر رکھے گھاس پھونس اور تنکوں کے سرے باہر لٹک رہے تھے۔ فاطمہ نے ہاتھ میں پکڑے کٹورے میں سے باجرے کے دانے دونوں ڈبوں میں منتقل کیے اور رووڈ ہاؤس کا کھلا دروازہ بند کرنے کی سعی کرنے لگیں۔
"اس کی کنڈی خراب ہے جی!" لان کے ساتھ بنی روش پر جھاڑو لگاتی سوسن نے ہاتھ روک کر انہیں مطلع کیا۔ "رشید کو بتانا تھا، وہ ٹھیک کر لیتا۔" وہ اسٹینڈ کے پاس رکھے لکڑی کے سبز بنچ پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔
"رشید اپنا کام کون سا پورا کرتا ہے جی، بس کھرپی ہاتھ میں لیے کیاریوں کے پاس بیٹھا اونگھتا رہتا ہے۔" سوسن جھاڑو ہاتھ میں پکڑے پکڑے ان کے قریب آ گئی۔ "اس کے تو پانی دینے کے دونوں فوارے خراب ہیں۔ ایک کا پیندا ٹپکتا ہے اور دوسرے کا فوارہ آگے سے اتر گیا ہے۔ اس نے وہ بھی ٹھیک نہیں کرایا، لکڑی کے کام پر تو ہاتھ کانوں کو لگائے گا۔" اس نے جھاڑو کا پچھلا حصہ مالٹے کے پیڑ کے تنے پر مار کر تنکے برابر کرتے ہوئے کہا۔
"تمہیں بھی دوسروں کے کام میں نقص نکالنے کے سوا کوئی کام نہیں۔" خدیجہ نے کہا۔ "یہ جو کیاریوں کے ساتھ ساتھ خشک پتے بکھرے ہیں ان کو کس نے صاف کرنا ہے۔"
"یہ مالی کا کام ہے جی، جمعدارنی کا نہیں۔" سوسن نے بے نیازی سے کہا اور ان کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ "ساتھ والی بی بی ہے نا، اس کی نظر بڑی کڑی ہے، وہ ہر ایک سے اس کے حصے کا کام لیتی ہے۔ مالی سے مالی کا، جمعدار سے جمعدار کا، خانساماں سے خانساماں کا اور ڈرائیور سے ڈرائیور کا۔۔۔ آپ سارے کام اکیلے رشید سے لینے کی کوشش کرتی ہیں، جب ہی ایک بھی پورا نہیں ہوتا۔"
"ہمارا کام ہوتا ہی کتنا ہے۔" فاطمہ نے سوسن کی بات پر دل میں اٹھتے غصے کے طوفان کو بمشکل روکتے ہوئے کہا۔ "خانساماں کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں، ہم کھانا خود بناتے ہیں، رشید برتن دھو دیتا ہے ڈرائیونگ بھی خدیجہ خود کرتی ہیں، کبھی کبھار وہ نہ جا سکیں تو رشید کو گاڑی ڈرائیو کرنی پڑتی ہے۔ پھر مالی گیری کون سا مشکل کام ہے۔"
"جس کا کام اسی کو ساجھے فاطمہ بی بی! مالی، مالی ہوتا ہے اس کا ہاتھ لگے تو ہی پودوں، پیڑوں اور گھاس میں جان پڑتی ہے۔ میں، آپ تو صرف کھرپی لے کر ذرا سی صفائی ہی کر سکتے ہیں۔" سوسن نے انہیں جتایا اور بنچ پر رکھا کٹورا اٹھا کر اندر کو چل دی۔
"افوہ سوسن۔! کتنی بار کہا ہے، کھانے پینے کے برتنوں کو جھاڑو والے ہاتھ مت لگایا کرو۔" وہ جھنجلا کر بولیں۔
"دھل ہی جاتے ہیں بی بی!" سوسن بے نیازی سے بولی۔ "آپ ہی اتنا پرہیز کرتی ہیں ورنہ سرخ ٹائلوں والی کوٹھی والوں کے تو برتن بھی میں ہی دھوتی ہوں۔" وہ لچکتی مٹکتی پھر چل دی۔
"زمانے نے کیسے کروٹ بدلی ہے۔" سوسن کو اندر جاتے دیکھتے ہوئے فاطمہ نے سوچا۔ "ہم جیسے لوگ تو اب شاید ہی کوئی رہ گئے ہوں۔ سوسن سے برتن صاف کروائے جاتے ہیں۔" انہوں نے تاسف سے سر ہلایا۔ انہیں برسوں پرانا ایک منظر یاد آ گیا، جب وہ اور خدیجہ چھوٹی بچیاں تھیں اور ان کے والدین کا گھر محلہ کا سب سے بڑا اور اونچا گھر سمجھا جاتا تھا۔ انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ مہترانی سارے گھر کا کام کر لینے کے بعد فارغ ہوتی تو باورچی

خانے میں کام کرنے والی خالہ زینب مہترانی کے لیے رکھی پیتل کی چھوٹی گڑوی میں ٹھنڈا یخ پانی بھر کر لاتی اور اونچائی سے پانی کی دھار نیچے گراتی۔ مہترانی نیچے بیٹھ کر ہاتھوں کی اوک میں پانی روک کر گھونٹ گھونٹ پیے جاتی۔ اسے استعمال کے برتنوں، حماموں کی ٹونٹیوں کو ہاتھ لگانے کی ہرگز اجازت نہ ہوتی تھی۔ کلمہ گو مسلمان کا غیر مسلموں سے یہ پرہیز صرف کلمہ کی بنیاد پر ہوتا تھا، رنگ، نسل یا امیری غریبی کی بنیاد پر نہیں، مگر اب زمانے نے پوری کروٹ بدل لی تھی۔ معاشرے کا مہذب، بااخلاق، عقل و شعور اور روایات کا علمبردار طبقہ پس منظر میں چلا گیا تھا۔ اب معاشرے میں طبقاتی تقسیم صرف روپے پیسے کی بنیاد پر ہو رہی تھی۔ ایسے لوگ اور ایسے خاندان نمایاں اور نامور تھے جن کی تاریخ گزشتہ چند سالوں میں ہی شروع ہوئی تھی۔ اسی لیے تو زندگی گزارنے کے اصول بھی بدل گئے تھے۔

"نجانے کتنی سوسن، کس کس گھر کے برتن دھو رہی ہوں گی۔" انہوں نے سوچا۔ "اور ہم جیسے جوان چیزوں سے پرہیز کرتے ہیں، عجوبے کہلائے جا رہے ہیں۔" وہ بار بار تاسف کے مارے سر جھٹک رہی تھیں۔

"کیسی ہیں فاطمہ آپا؟" سنتھے کی باڑھ اور سرکنڈوں کی جافری سے پار کھڑی فائزہ نے گھر کے ڈرائیو وے پر چلتے چلتے رک کر لان میں بنچ پر بیٹھی فاطمہ کو دیکھا اور رک کر پوچھا۔

"ہاں! فاطمہ اپنے خیالات سے باہر نکلیں اور سر ہلایا۔ "اچھی ہوں تم کیسی ہو؟"

"میں بھی ٹھیک ہوں۔ خدیجہ آپا کیسی ہیں؟" فائزہ چلتے چلتے باڑھ کے بالکل قریب آگئیں۔

"وہ بھی اچھی ہیں۔ ماہ نور کب واپس آ رہی ہے۔" انہوں نے سر اٹھا کر پوچھا۔ "بہت دن نہیں ہو گئے اسے گئے ہوئے۔"

"ہاں کافی دن ہو گئے، لیکن ابھی مزید رکنے کا کہہ رہی ہے۔ ان لوگوں کی سپرنگ بریک ختم ہونے میں ابھی کچھ دن باقی ہیں، کہہ رہی تھی وہ وہیں گزارے گی۔ میں نے سوچا چلو کوئی بات نہیں اتنے ٹف شیڈول میں کبھی ہی تو ان کو اتنا لمبا بریک ملتا ہے، ٹھیک ہے گزار لے۔ وہاں خوب انجوائے کر رہی ہے۔" فائزہ نے کہا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" فاطمہ نے سر ہلایا۔ "کبھی کہیں گئی نہیں نا اس لیے عجیب سا لگ رہا ہے، اس سے اتنے دن ملاقات نہ ہونا۔" وہ مسکرائیں۔

"مجھے بھی لگ رہا ہے۔" فائزہ نے کہا۔ "ہمارے گھر میں تو شور شرابا اور رونق اسی کے دم سے ہے، یہ مجھے اس کے جانے پر معلوم ہوا۔"

"اور ہمارے گھر کی بھی واحد باقاعدہ وزیٹر وہی ہے، اس کے جانے پر ہمیں یہ معلوم ہوا۔" فاطمہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا بھئی ظہر کا وقت ہوا چاہتا ہے، پھر ملیں گے کسی وقت۔" انہوں نے فائزہ کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔

"ہاں جی ضرور۔" وہ مسکرائیں اور اندر چل دیں۔

"سچ کہتی ہے سوسن بھی۔ یہ رشید کم بخت بھی دن بدن نکما ہی ہوا جا رہا ہے۔" آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے فاطمہ نے لان کی گھاس پر جا بجا بکھرے پتوں کو دیکھتے ہوئے سوچا "کہتی ہوں خدیجہ سے کسی باقاعدہ مالی کا انتظام کرے، یہ تو بنی بنائی رونق اجاڑ دے گا۔" ان ہی سوچوں میں گم وہ رہائشی عمارت میں داخل ہو گئیں۔ ٹی وی لاؤنج سے خدیجہ اور سوسن کی گفتگو کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"تو اب یہ یہاں بیٹھی گپیں لگا رہی ہے، کام کب ختم کرے گی آخر۔" انہیں طیش آیا، مگر وہ کچھ کہے بغیر اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

☼ ☼ ☼

"تو بیٹا کھاری! نماز تو تمہیں پوری یاد ہو گئی۔" آپا رابعہ نے اس شام کھاری سے نماز سننے کے بعد خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"بس اب تم بلا جھجک مسجد میں نماز پڑھنے جایا کرو۔" انہوں نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

"بس جی تھوڑی پریسنک (پریکٹس) ہور کرنی ہے۔" کھاری آپا رابعہ کی صحبت میں باقاعدگی سے رہتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی اردو بولنے لگا تھا۔

"میں بھل جاتا ہوں کہ سجدے دو کرنے ہیں، میں فرضوں کی اور سنتوں کی گنتی بھی بھل جاتا ہوں۔ ابھی مجھے کلّے (اکیلے) نماز پڑھ کر پریسنک کر لینے دیں فیر مسیت (مسجد) میں پڑھوں گا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" آپا رابعہ نے اس کی منطق کو سمجھتے ہوئے کہا۔

"ہالے بھی (ابھی بھی) لوگ کدوں (کب) جان چھوڑتے نیں۔ میں نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہوں تو بابا نور مجھ سے پوچھتا ہے ہاں تو دس فرضوں میں کیا پڑھا۔ الحمد شریف سنا، قل شریف سنا۔۔۔ میرا امتحان لیتے ہیں جناب!"

"تو کوئی بات نہیں، تمہیں کون سا نہیں آتا یہ سب بغیر ہچکچاہٹ کے سنا دیا کرو۔" آپا رابعہ نے کہا۔

"آتا ہے۔" کھاری نے سر جھٹکا۔ "جب وہ پوچھتے ہیں تو میرا دل چھپ (ڈر) جاتا ہے، مجھے لگتا ہے مجھے کچھ نہیں آتا۔"

"تم اپنا ایمان پختہ رکھو کھاری بیٹا!" آپا رابعہ نے چھاج میں چاول پھٹکتے ہوئے کہا۔ "جن کا ایمان مضبوط ہو، وہ نہیں ڈرتے۔"

"ایمان بھی وقت کے ساتھ ڈاڈھا (مضبوط) ہوتا ہے بھین جی!" کھاری نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ "جس کے ماں باپ ہوں نہ کوئی آگا پیچھا، جس کی ساری عمر بڑوں کی جوتیاں سیدھی کرتے گزر گئی ہو اس کا ایمان آنے والے وقت کے بارے میں ڈانواں ڈول رہتا ہے۔ وہ خوف زدہ بندہ ہوتا ہے اس کو عادت پڑ جاتی ہے جی حضوری کرنے کی۔ اس کو یاد نئیں رہتا کہ وہ بُرے بندے کی جی حضوری کر رہا ہے یا اچھے کی، کافر کی کرتا ہے یا مسلمان کی۔۔۔ اس کی عقل بیج یا گلے کی عقل سے آگے نہیں جاتی۔ گلے میں بڑا سا راٹل (گھنٹی) ڈالے وہ بس سر ہلاتا رہتا ہے کسی جانور کی طرح۔"

"جب کوئی رہنما کسی کی رہنمائی پر مقرر ہوتا ہے نا کھاری! تو سب سے پہلے اسے ہجوم کی جوتیاں سیدھی کرنے پر لگاتا ہے۔" آپا رابعہ نے اسے بتایا۔

"اس عمل سے اس بندے کی "میں" مر جاتی ہے، جب بندے کی "میں" مر جاتی ہے، اسی وقت وہ اللہ کے رنگ میں رنگنے کے قابل ہوتا ہے۔ تم تو خوش نصیب ہو کہ تمہیں جی حضوری کی عادت پڑ چکی ہے، تمہارے اندر "میں" ابھرنے سے پہلے ختم ہو چکی ہے۔ اب تمہیں اللہ کا بندہ بننے میں کوئی امر مانع نہیں بس اپنا ڈر، خوف ختم کردو اور چل پڑو اللہ کے راستے پر۔"

"قسم سے بھین جی؟" کھاری کے لیے آپا رابعہ کی یہ بات کسی خوش خبری سے کم نہ تھی۔

"بالکل۔" آپا رابعہ نے پُریقین انداز میں کہا۔

"تو پھر اب میں نہیں ڈرتا۔" وہ سینہ ذرا سا باہر نکال کر بولا۔

"شاباش!" آپا رابعہ نے اسے تھپکی دی۔

"وہ جو سانپ قبضہ کر کے بیٹھا ہے سوئے کے منہ پر، اسے مار کر دکھاؤ تو پتا چلے تم کتنے بہادر ہو۔" سعدیہ جو کب

سے آپا رابعہ اور کھاری کی گفتگو سن رہی تھی اچانک بولی۔

"وہ سانپ۔" کھاری نے سعدیہ کی طرف دیکھا۔ "اس کو دیکھ لیتا' میں ہی ماروں گا۔ پر بھین جی!" پھر اس نے آپا رابعہ سے کہا۔ "لوگ کہتے ہیں وہ سو سال کا سانپ ہے' صبح کو بندہ بن جاتا ہے رات کو سنپ کیونکہ وہ صبح ویلے نظر نہیں آتا۔"

"کہانیاں بنائی ہوئی ہیں لوگوں نے۔" آپا رابعہ نے خفگی سے سرہلایا۔

"چلو۔ تم صبح کے وقت اسے بندے کے روپ میں ہی پکڑ لینا۔" سعدیہ نے چڑایا۔

"اگر میں نے بندہ بنا ہوا سانپ پکڑ لیا نا۔" تو پھر بھین جی! اس سانپ نما بندے کے ساتھ سعدیہ کا ویاہ کردیں گے۔" اس نے سعدیہ کو چھیڑا۔

بے اختیار آپا رابعہ کو ہنسی آگئی۔ "اور چڑاؤ اس کو۔" انہوں نے سعدیہ سے کہا جو کھاری کی اس بات پر تاؤ میں آکر منہ بنا رہی تھی۔

"بھین جی! سپ کا خرچا بھی کوئی نئیں ہوتا' دودھ پیتا ہے بس۔" کھاری نے اسے مزید چڑایا۔

"بکواس نہ کرو۔" سعدیہ نے غصے سے کہا اور کمرے کی طرف چل دی۔ کھاری آپا رابعہ کی طرف دیکھ کر ہنس دیا۔ "مینوں بڑی گلاں (باتیں) کرتی ہے' آج دیکھا کتنا غصہ آیا۔"

"ہاں۔ تم نے اس کا منہ بند کردیا۔" آپا رابعہ مسکرائیں۔

"چلو فیر۔ میں چلتا ہوں۔ آج مولوی صیب واپس آئیں تو ان سے پوچھنا کھاری نے کتنی نمازیں پڑھیں آج مسجد میں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"ضرور۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔" آپا رابعہ نے دعا دی۔

☼ ☼ ☼

"ایک مکمل اور صحت مند وجود کے مقابلے میں ایک شکستہ اور اپاہج وجود کی کیا حیثیت ہوسکتی ہے۔" سارہ خان کے ذہن کی سوئی ایک ہی نقطے پر اٹک گئی تھی۔

"وہ کون تھی۔ سعد سے اس کا کیا تعلق تھا۔ اس روز سعد اسے سارہ سے ملوانے کیوں لایا تھا؟" اس نے ان میں سے کوئی سوال سعد سے نہیں کیا تھا' مگر اس کا اپنا ذہن قیاس لگانے میں ہمہ وقت مصروف تھا۔

"اس کمرے میں مجھ سے ملنے کے لیے نکالے گئے چند گھنٹوں کے علاوہ اس کمرے سے باہر کی دنیا میں اس کی ایک الگ زندگی ہوگی۔ ماں' باپ' بہن بھائی' عزیز' دوست۔ جن کے درمیان وہ دن رات رہتا ہوگا۔"

اس نے وہ بات جو پہلے کبھی نہیں سوچی تھی' اس دن کے بعد اس نے بار بار سوچی تھی۔

"پھر میرا اس کا کیا تعلق ہے؟" اس نے اپنے شکستہ وجود پر ایک نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔ "ترس' ہمدردی' رحم اور مدد کا تعلق۔" اس کے ذہن میں ایک تلخ سوچ ابھری۔

"ورنہ اس جیسے انسان کو کیا پڑی کہ وہ سرکس کی ایک نٹ کے لیے اتنا وقت نکالے اور اس پر اتنا پیسہ صرف کرے۔" اس کی آنکھیں اپنی بے بسی پر بھیگنے لگیں۔ "سرکس کی کرتب باز لڑکی کی مہذب دنیا میں کیا حیثیت ہے۔ سرکس میں کام کرنے والی لڑکیوں کے بارے میں لوگوں کی سوچ کیا ہوتی ہے' میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ پھر سعد سلطان کے دل میں سوائے ہمدردی اور رحم کے میرے لیے کیا جذبہ ہوگا۔" وہ ہمیشہ کی طرح خود ترسی کا شکار ہونے لگی۔

"لوگ پیسے کے بل پر چھوٹے بڑے کہلائے جاتے ہیں' یہ بھی اس ملک اور اس معاشرے میں ہی میں نے

دیکھا ہے کہیں اور ایسا نہیں دیکھا۔" رنگے بالوں کی بڑی سی وگ والا سر ہل رہا تھا جب اس نے یہ بات کہی تھی۔

"لیکن تم کبھی غور کرنا' خوشی کو' میلے کو' جشن کو دل سے وہی لوگ مناتے ہیں' جن کے پاس پیسہ نہیں ہے۔ ان کے لیے گھڑی دو گھڑی کی خوشی' میلہ اور جشن ہی تفکرات سے نجات کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں' سو وہ جی بھر کر خوش ہوتے ہیں لیکن جن کے پاس پیسے ہیں وہ خوشی' میلے اور جشن کے لمحوں میں بھی فکروں اور اندیشوں میں گھرے رہتے ہیں۔ کسی انہونی کے خوف میں مبتلا' جمع تفریق کے غم میں الجھے' نہ وہ کبھی جی بھر کر خوش ہوتے ہیں نہ پیٹ بھر کر کھا سکتے ہیں۔"

سفید پینٹ میں رنگے ہونٹ کہہ رہے تھے۔

"تم تو یہاں کے باسی بھی نہیں ہو رکو! پھر تمہیں یہ سب کیسے پتا ہے۔" سارہ کی سوچ اجنبی چہرے والی ماہ نور اور سعد کی ذاتی زندگی سے ہوتی ماضی کی طرف مڑ گئی۔

"میں کہاں کا باسی ہوں پریارانی۔! یہ تو مجھے خود بھی معلوم نہیں۔" سفید پینٹ زدہ ہونٹ مسکرائے۔ "میری قومیت کے خانے میں پاکستانی درج ہے کیوں کہ میرا باپ پاکستانی ہے' مگر پاکستان کے لوگ مجھے پاکستانی نہیں مانتے کیوں کہ میرے نین نقش پاکستانیوں والے نہیں ہیں۔" رنگ برنگے نقش و نگار والے چہرے پر تاسف کی جھلک نمایاں ہوئی۔

"تم تو جاپانی ہو۔۔۔ اپنی ناک دیکھو گول اور اوپر کو اٹھی ہوئی۔ ذرا سی ناک اور اپنی آنکھیں دیکھو چھوٹی چھوٹی اندر کو دھنسی ہوئی۔"

"ہاں!" اس چہرے پر مسکراہٹ دوڑی اور وہ سرہلانے لگا۔ "میری ماں جاپانی تھی۔"

"تھی کیا مطلب' اب کہاں ہے وہ؟"

"پتا نہیں۔ ہوگی کہیں۔" لاپروائی سے کہا گیا۔

"تم اپنی ماں کے ساتھ کیوں نہیں ہو رکی؟"

"میں رکی نہیں رکو ہوں پریارانی! جاپان میں رکی نام نہیں ہوتا' رکو ہوتا ہے۔"

"کیا فرق پڑجاتا ہے' واوری کے فرق سے۔"

"ہاں فرق تو کوئی نہیں پڑتا واوری کے فرق سے' فرق تو اس سے بھی نہیں پڑتا کہ انسان جاپانی ہے یا پاکستانی۔"

"تو بتاؤ نا تم اپنی ماں کے ساتھ کیوں نہیں ہو؟"

"میری ماں بڑی سرپھری اور ضدی تھی۔ میں اور میرے بہن بھائی کل ملا کر چار تھے۔ میرا باپ صبح سویرے کام پر چلا جاتا اور ہم چار بچے جب آپس میں لڑتے اور اودھم مچاتے تو میری ماں ہمیں گھر میں بند کرکے خود کسی ہوٹل میں کمرا بک کرا کے سارا دن وہاں سوئی رہتی۔ وہ وہاں اپنی نیند پوری کرتی اور ہم چاروں بھوکے پیاسے سارا دن ایک دوسرے سے لڑ لڑ کر گزار دیتے۔"

"ہا۔ یہ کیسی ماں تھی؟"

"بس وہ ایسی ہی ماں تھی۔"

"پھر اس نے میرے باپ پر کیس کردیا جھوٹ کا اور اپنا پیسہ ہضم کرجانے کا۔"

"تمہارے باپ نے اس کا پیسہ کھالیا تھا کیا؟"

"پتا نہیں۔ مگر اس نے واویلا کرکے پولیس بلالی اور میرے باپ کو جیل ہوگئی۔"

"ہائے' بیڑا غرق ہوجائے تمہاری ماں کا۔"

"اس کا تو شاید بیڑا غرق نہیں ہوا' ہمارا ہوگیا۔" سفید دستانوں میں مقید ہاتھوں کی انگلیاں رنگ برنگی لمبی ٹوپی پر

پھرتی تھیں اور سفید ہونٹ متحرک تھے۔

"پھر تمہاری ماں تمہیں پالنے لگی؟"

"نہیں وہ تو اپنا سامان باندھ کہیں غائب ہو گئی' ہمیں ہمارے باپ کی بہن کا خاوند پاکستان لے آیا۔"

"چلو۔" قصے سننے کی شوقین پری کو اس نئے موڑ پر مایوسی ہوئی "پھر خیر سے تمہاری پھوپھی نے تمہیں پالا ہوگا۔"

"نہیں۔" رنگ برنگی وگ ہلی۔ "ہمیں ہماری دادی کے پاس چھوڑ دیا گیا جو ایک پس ماندہ سے گاؤں میں رہتی تھی۔"

"اوئے ہوئے۔ پھر۔"

"پھر ہم جاپانی شکل و صورت والے بچوں نے گلیوں میں پھرنا' گالیاں دینا' بدلحاظی کرنا سیکھنا شروع کر دیا۔"

"تو تمہاری پھوپھی کہاں گئی کم بخت!" اس نے غصے سے کہا۔ "جاپانی بچے' پنجابی گالیاں۔" وہ مسکرائی۔

"وہ اپنے بچوں کے ساتھ شہر میں رہتی تھی' میرے سب سے چھوٹے بھائی کو اپنے ساتھ لے گئی کیونکہ وہ اتنا چھوٹا تھا کہ اس کی تربیت کرنا آسان تھا۔"

"اور تم اور باقی دو؟"

"ہمیں قصبے کے اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ نہ ہمیں اردو ڈھنگ سے آتی تھی' نہ انگریزی۔ البتہ پنجابی میں گالیاں دینی خوب آگئی تھیں۔"

"ہی ہی۔ تو تم نے اسکول کے باقی بچوں کو گالیاں سکھادی ہوں گی۔"

"اسکول کے باقی بچے ہمارا مذاق اڑاتے تھے اور ٹیچرز نے چند مہینوں بعد ہی ہمیں ناممکن بچوں کی فہرست میں شامل کر دیا۔"

"چلو جی۔۔۔ پھر کیا ہوا؟"

"پھر دادی گھر میں ہماری کھال ادھیڑتی اور اسکول میں ہم مرغے بنے رہتے یا کلاس سے باہر نکال دیے جاتے۔"

"تم اور تمہارے دو اور بھائی؟"

"میں اور میری بہنیں۔۔۔ ایک مجھ سے بڑی ایک چھوٹی۔۔۔ جب ہم اچھی طرح بگڑ چکے اور ہماری درستی کا کوئی امکان باقی نہ رہا تو سننے میں آیا کہ ہمارا باپ جو اب جیل سے واپس آچکا ہے' پاکستان آرہا ہے اور وہ خود ہی دیکھ لے گا ہم کیسے نہیں سدھرتے۔۔۔"

"ہاہا۔۔۔ پھر تم اس کے آنے پر سدھر گئے کیا؟"

"وہ آیا اور دادی نے اس کی شادی اپنی بھانجی سے کر دی' جو کسر رہ گئی تھی پوری ہو گئی۔ گھر میں سوتیلی ماں آگئی۔"

"ہا۔۔۔ کیا کیا نہ ہوا تمہارے ساتھ۔۔۔"

"جوں جوں آگے سنو گی' پچھلا سنا کم لگتا جائے گا۔

جب تک باپ پاکستان رہا' کبھی دادی اور کبھی سوتیلی ماں شکایتیں لگا لگا کر ہمیں چار چوٹ کی مار پڑواتی رہیں۔ باپ ہماری جاپانی ماں کی زیادتی کا بدلہ بھی شاید ہمیں ہی مار کر لیتا تھا۔ پھر وہ واپس چلا گیا' جانے سے پہلے بڑی بہن کو جو خیر سے خوب ہی زبان دراز اور منہ پھٹ تھی بورڈنگ میں داخل کروا گیا۔ چھوٹی کو دوسری پھوپھی لے گئی اور میں رہ گیا دادی کے پاس۔ اس بار باپ تھائی لینڈ گیا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے مجھے کہا۔ اگر وہ وہاں سیٹ ہو گیا تو مجھے اپنے پاس بلالے گا۔ لہٰذا میں اچھا بچہ بن جاؤں۔"

"بڑا احسان کرتا تھا نا جیسے اس نے۔" وہ منہ بنا کر بولی تھی۔ "یہ بتاؤ رونا نہیں آتا تھا جب تمہیں مار پڑتی تھی؟"

"آنکھوں سے رونا تو معمولی سی بات ہے پریا رانی! دل خون کے آنسو جو روتا ہے اس کا تجربہ ہی کچھ اور ہے۔ آپ کا کچھ قصور ہو اور مار پڑے تو شاید اتنی تکلیف نہیں ہوتی' بے قصوری کی مار دل و جگر پر پڑتی ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ تم اچھے بچے بنے؟" بات خاصا دکھی موڑ لے گئی تھی لہٰذا موضوع بدلا گیا۔

"اچھا بچہ بننے سے پہلے میں نے ساتھ والے گاؤں میں لگا سرکس دیکھ لیا۔ سرکس میں کرتب دکھاتے مسخرے نے میرا دل موہ لیا۔ اس سے پہلے بچپن میں اپنی کتاب میں جے سے جوکر کی تصویر بھی مجھے بہت بھاتی تھی۔ جب مسخرے کو کرتب دکھاتے دیکھا اور لوگوں کو اس کے کرتبوں پر ہنستے پایا تو خیال آیا کہ اس سے بہتر کرتب میں خود دکھا سکتا ہوں۔ بچپن سے دادی کی مار' ہم عمروں کے طعنوں' بہن بھائیوں کی مار کٹائیوں سے بچنے اور خود کو بچانے کے لیے الٹی سیدھی حرکتیں کرنے کی عادت تھی اور یہ بھی یاد تھا کہ میری حرکتوں پر غصہ کھانے والے کو اکثر ہنسی آجاتی تھی۔ سو ذہن میں خیال آیا کہ خود تو اس وقت تک کی زندگی میں رویا بہت' رلانے والے بھی بہت تھے۔ ہنسانے والا کوئی نہ تھا' ہنسی کے معنی اور اہمیت کا اندازہ بھی خوب تھا' سو کیوں نہ لوگوں کو ہنسانے کا کام کیا جائے' روتوں کو ہنسایا جائے' فکر مند چہروں پر مسکراہٹ بکھیری جائے۔ بس یہ فیصلہ کیا اور گھر سے بھاگ کر یہاں آگیا۔"

"ہائے۔۔۔ تو تمہارے گھر والے پریشان نہیں ہوئے تمہارے بھاگنے پر۔"

"پریشان کون ہوتا' دادی جس کا میں نے بقول اس کے 'ناک میں دم کر رکھا تھا یا پھر سوتیلی ماں' جو مجھے موت کی بددعا دیا کرتی تھی۔"

"اوفوہ! پھر بھی تمہیں ڈر نہیں لگا گھر سے بھاگتے ہوئے۔"

"میرے جیسے بچے بہت بچپن میں ہی بڑے ہو چکے ہوتے ہیں پریا رانی! ہمارے دلوں سے خوف' ڈر بھاگ چکا ہوتا ہے۔"

"مگر تمہیں یہاں کیا ملا آکر۔ تمہارا باپ اچھا بھلا تمہیں تھائی لینڈ لے جاتا۔"

"کسی نے نہیں لے جانا تھا پریا رانی! وہ صرف طفل تسلیاں تھیں۔ دادی کے گھر میں میرا کوئی مستقبل نہیں تھا' سوائے سوتیلے بہن بھائیوں کی چاکری کے۔ میں نے سوچا کہ میری زندگی میرے تو شاید کسی کام نہ آسکے' دوسروں کے کام تو آنی چاہیے اسی لیے میں یہاں چلا آیا۔"

"تم کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا ہوگا کہ تم اندر سے اتنے دکھی ہو۔"

"میں دکھی نہیں ہوں پری! بڑا مطمئن اور شاد ہوں۔ میں اپنی زندگی اور صلاحیتیں دوسروں کے چہروں پر دو گھڑی مسکراہٹ کے پھول بکھیرنے میں استعمال کرتا ہوں۔ میں روتوں کو ہنسا سکتا ہوں' مجھ پر نظر پڑتے ہی بسورتا بچہ بھی مسکرانے لگتا ہے۔ بدلے میں میں لوگوں کی محبتیں وصولتا ہوں' پیار پاتا ہوں' کیا یہ میرے لیے خوشی کی انتہا نہیں۔"

"میری سمجھ میں تمہاری باتیں نہیں آتیں بھئی۔۔۔"

"اس لیے پری بی بی! کہ تم نے کچھ پانے کے بعد کچھ کھویا نہیں۔ جو تمہارے پاس نہیں ہے وہ ہمیشہ سے نہیں ہے جو ہے ہمیشہ سے ہے۔ محرومی دو طرح کی ہوتی ہے' کسی چیز کا کبھی نہ ہونا اور کسی چیز کا مل کر کھو جانا زیادہ تلخ تجربہ ہوتا ہے اور جو اس تجربے سے گزرتا ہے وہ ایسی ہی باتیں کرتا ہے جو پریا رانی! تمہاری سمجھ میں شاید کبھی نہ آئیں۔"

سفیدے میں لتھڑے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ ناک کی پھننگ پر جمائی سرخ ٹینس بال سانس کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ہولے ہولے لرز رہی تھی۔

"رکی۔۔۔ رکی۔ ابھی تم آؤتو دیکھو میں پاکر کھونے کے تجربے سے گزرنے کے بعد کیسی کیسی حقیقتیں بغیر کسی کے بتائے سمجھ جاتی ہوں۔" اس نے اپنی ہتھیلیوں سے بھیگی آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

"میں تو اب تجربے میں تم سے بھی بڑی ہو گئی ہوں۔ پہلے میرے پاس ہمیشہ سے نہ ہونے کی محرومی تھی۔ اب پاکر کھونے کی محرومی بھی ہے' میں تو تمہارے بتائے فلسفہ حیات میں ماسٹرز ڈگری پاگئی ہوں رکو! ابھی آکر تو دیکھو!" اس نے آنکھیں میچ کر چہرے پر تکیہ رکھ لیا۔

☼ ☼ ☼

"میں اتنا بڑا بہروپیا ہوں۔ سوچ لو' کہیں میں کوئی کرمنل نہ نکل آؤں۔" ماہ نور کو سعد کے کہے یہ الفاظ دن میں کئی بار یاد آتے تھے۔

"زندگی اتنی غیر متوقع اور حیران کن ہے کہ کسی بھی امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا۔" اس نے بارہا سوچا تھا۔

"لیکن جو شخص ایک زخمی اور بے بس لڑکی کو اس جانفشانی سے زندگی کی طرف لانے کی سرتوڑ کوشش کر رہا ہو' کیا وہ کرمنل ہو سکتا ہے۔"

"اس کے پیچھے بھی نہ جانے کیا کہانی ہو۔" تشکیک کا تقاضہ تھا کہ ہر پہلو سے سامنے پر غور کیا جائے۔

"سلطانہ ڈاکو کی کہانی بھی تو سن رکھی ہے ہم نے۔" اس نے سوچا اور پھر خود اپنی ہی سوچ پر اسے ہنسی آگئی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جتنا اور جیسا بھی غور فرمالوں۔ تم کسی طرح بھی کرمنل نہیں ہو سکتے۔ ہاں تمہاری شخصیت میں عجیب سا اسرار ضرور ہے۔ اور مجھے دیکھو! جسے ہمیشہ سے جگسا پزلز اور "راستہ ڈھونڈیے" جیسے گیمز سے سخت چڑ تھی میرا دل خود بخود آمادہ ہو رہا ہے کہ میں تمہارے اسرار کو جانوں اسے ایک ایک کرکے کئی منظر یاد آنے لگے۔

"مگر یہ حقیقت بھی تو نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ مجھے ہی تم کیوں بار بار مختلف جگہوں پر نظر آئے۔"

اسے سعد کی کہی بات یاد آگئی۔

"تم کو بندر کا تماشا ہی سیکھنا تھا نا' پھر تم نے اس شخص سے کیوں نہیں سیکھا جس کو تمہارے چچا نے گندم کی بوری اور پانچ سو روپے دے کر بلایا تھا؟"

"سچ ہے میں نے اسی سے کیوں نہیں سیکھ لیا' کیوں کوئی اور بندر کے تماشے والا میرے معیار پر پورا نہیں اترا۔ پھر یہ تو طے ہے کہ کوئی خاص ہی بات تھی جس نے مجھے بار بار وہاں موجود رکھا جہاں تم تھے۔ اب اس بات کی کھوج لگانا باقی ہے کہ وہ خاص بات کیا تھی؟" اس نے سوچا اور مسکرا دی۔

"بہر حال تم سے ملاقات۔۔۔ ایک اچھا تجربہ ہے اور میں اس تجربے کو بار بار دوہرانا چاہتی ہوں۔" اس نے طے کیا اور اپنے سیل فون میں سعد کا نمبر فرینڈز لسٹ میں محفوظ کر لیا۔

☼ ☼ ☼

"اسکول والے میری پیدائش کی پرچی مانگ رہے ہیں ابا جی! انم کا داخلہ بھجوانا ہے انہیں۔" سعدیہ نے کھانا کھانے میں مصروف مولوی سراج سرفراز کو مخاطب کیا۔

"پیدائش کی پرچی؟" شوربے میں روٹی کا لقمہ ڈبوتا ان کا ہاتھ رکا اور انہوں نے اپنی زوجہ رابعہ کی طرف دیکھا۔ جو خود بھی اس سوال پر چونکی بیٹھی تھیں۔

"پیدائش کی پرچی کیا کرنی ہے اسکول والوں نے؟" مولوی سراج نے وہ سوال کیا' جس کا جواب انہیں خود بھی معلوم تھا۔

"بورڈ والے مانگتے ہیں۔ مس نسیمہ کہہ رہی تھیں کہ کمپیوٹر سے نکلی پرچی چاہیے۔ ہو سکتا ہے بورڈ والے ب فارم بھی مانگ لیں' پھر وہ بھی بنوانا پڑے گا۔" سعدیہ نے جواب دیا۔

"لاحول ولا۔" مولوی سراج نے کھانا وہیں چھوڑ دیا۔ "ہم کا امتحان نہ ہو گیا۔ ایم اے کی ڈگری ہو گئی۔ اب جس کے پاس پیدائش کی پرچی نہ ہو' وہ کیا امتحان ہی نہ دے۔"

"کئی بچیوں کے پاس نہیں ہو گی۔" آپا رابعہ نے اپنی خوش فہمی کو الفاظ دیے۔

"کتنی لڑکیاں تولے بھی آئی ہیں' جن کے پاس نہیں ہیں ان کے اماں ابا نے درخواستیں دی ہوئی ہیں کمیٹی کے دفتر میں۔" سعدیہ نے اپنی معلومات حاضر کیں۔

"ہوں۔" مولوی صاحب اپنی داڑھی میں ہاتھ پھیرتے سوچ میں گم ہو گئے۔

"آپ نے کھانا کیوں چھوڑ دیا۔ کھانا تو ختم کریں۔" آپا رابعہ نے ان کی توجہ کھانے کی طرف دلائی۔

"اب یہ جو نیا مسئلہ آپڑا ہے اس کا کیا کریں۔" مولوی صاحب کو بے چینی لگ گئی تھی۔

"ہو جائے گا کوئی حل' میں خود اسکول جا کر پتا کرتی ہوں کل۔" آپا رابعہ وقت کو ٹالنے کی غرض سے بولیں۔

"اندراج بھی کرایا تھا کہ نہیں۔ یاد نہیں۔" مولوی صاحب جیسے خود سے مخاطب ہوئے۔ "کرایا تھا تو پرچی تو لینی چاہیے تھی' لی تھی تو محفوظ ہونی چاہیے تھی۔"

"کرایا ہوتا تو پرچی ملتی' پرچی ہوتی تو محفوظ ہوتی۔"

آپا رابعہ دل ہی دل میں مولوی صاحب کی خود کلامی کا جواب دے رہی تھیں اور سعدیہ زندگی میں پہلی بار باپ کی گفتگو اور ماں کے چہرے کے تاثرات غور سے سن اور جانچ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کچے دودھ کو منہ مارا ہے کسی نے۔" جنت بی بی نے دودھ سے بھری بالٹیاں سامنے رکھے باری باری کھاری' سلیم اور شوکت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"دونوں بالٹیوں میں جھگ (جھاگ) کوئی نہیں ہے۔" اس نے ماہرانہ انداز میں بالٹیوں کی طرف دیکھا۔

"کیوں کاکا! یہ کس کا کام ہے۔" اس نے جانچتی نظروں سے ان تینوں کو دیکھا جو سر جھکائے کھڑے تھے۔

"میں نے جب دودھ دوہا' ماسٹر کمال میرے سر پر کھڑا تھا۔ میں فارغ ہوا تو وہ کیری ڈبے میں رکھ کر ادھر کو آگیا۔" شوکت نے اپنی صفائی پیش کی۔

"مجھے آج پھونک کر بخار چڑھا ہے' مجھے تو ماسٹر کمال نے ہاتھ نہیں لگانے دیا کسی گائے کے تھنوں کو۔" سلیم کا بیان مضبوط تھا' اسے واقعی تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔

"تے توں کاکا؟" ماسی جنت نے کڑے تیوروں سے کھاری کی طرف دیکھا۔

"مجھے ایسی بری عادت نہیں ہے۔" کھاری نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"سالوں سے یہ کام کر رہا ہوں ۔۔۔ میرا دین ایمان اس بے ایمانی سے خراب ہوتا ہے۔"

"دکھاوے کی نمازیں' دکھاوے کے سجدے اور مسلسل ٹکریں ایک برابر ہیں۔" جنت نے طنزاً کہا۔

"دیکھ ماسی!" کھاری نے انگلی کے اشارے سے جنت کو تنبیہہ کی۔ "نمازوں کا طعنہ نہیں دینا۔"

"یہ تو چل کے بڑے چوہدری صیب کو بتا۔" جنت چمک کر بولی۔

"ان کو میں خود بتادوں گا۔"

"کیوں بھئی! یہاں کیوں اور کس بات پر بحثا بحثی ہو رہی ہے۔" ادھر سے گزرتے ماسٹر کمال نے سب کے

سنجیدہ چہرے دیکھے تو قریب آگئے۔

"دو بالٹیاں دے دودھ تے جھگ کوئی نئیں سرکار!" جنت نے مودب انداز میں کہا۔ "میں ان بے ایمانوں سے یہ ہی پوچھ رہی ہوں۔"

"او ہو۔" ماسٹر کمال ہنسے۔ "ان دونوں بالٹیوں سے اوپر کا دودھ لے کر چودھرائن کو بھجوا دیا تھا — انہوں نے دودھ کی جھاگ بھیجنے کو کہا تھا کل رات۔"

"دیکھ لیا؟" کھاری تڑپ کو بولا۔ "بغیر نتارے (تفتیش) الزام لگانے والے' لوگوں کی نمازوں کا مذاق اڑانے والو! دیکھ لیا۔ اللہ کس طرح پل کے پل میں اپنے معصوم بندوں کو بچاتا ہے۔" اس نے جنت کی طرف دیکھا جو شرمندگی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔

"ان سب کا بس نہیں چلتا ماسٹر جی! کھاری کو ڈیرے سے باہر پھنکوا دیں۔ میرے شٹے لُس (اسٹیٹس) توں جلدے نیں سب۔"

"او میرے شہزادے!" ماسٹر کمال نے اس کا شانہ تھپکا۔ "کس کی مجال ہے تجھے باہر پھنکوا دے' تو چوہدری صاحب کا بڑا لاڈلا ہے۔"

"بس ماسٹر جی! ہور نئیں برداشت ہوتا" کھاری نے سر جھکایا۔ "تم میری ڈیوٹی ڈیرے سے اٹھا کر کہیں ہور لگا دو' اندر لگا دو مہمان خانے میں۔"

"او بھلیا لوکا! تیری کوئی چاکری تو نہیں نا' تو تو ان سب کی نگرانی کرنے والا بندہ ہے۔ تیری نظر چوکتی ہے نہ' تجھے کوئی دھوکا دے سکتا ہے' اس لیے تیری ڈیوٹی ادھر لگی ہے۔" ماسٹر کمال نے اس کا حوصلہ بڑھانے کی خاطر کہا۔

"او نئیں نئیں۔" کھاری نے نہ ماننے والے انداز میں سر ہلایا۔ "بس تسی مجھے مہمان خانے کی طرف بھیج دو' مجھے ٹرے لگا کر کھانا پیش کرنا آتا ہے۔ مہمان خانے کی صفائی اور سارا بندوبست بھی آتا ہے۔"

"تو اس فارم ہاوس کی اچی بچی (ہربات) جانتا ہے کھاری پتر! تجھے تو آنکھ بند کر کے کہیں بھی بھیج دوں' پر یہ جو دس بھینسیں تیرے ہاتھ پر پڑی ہیں' ان کا کیا کروں اور ادھر جو سبزی کے ٹرک لوڈ کرانے کا بندوبست ہے' وہ کون کرے گا۔" ماسٹر کمال نے اب کے اصل بات کی۔

"نہ ماسٹر جی! آپ میری بات نہ سنو گے تے میں چوہدری صیب نوں آپ کہہ لوں گا۔ میں ادھر ڈیوٹی نئیں دینی۔" کھاری نے کندھے پر رکھا رومال ہاتھ میں پکڑ کر اپنے جوتے کی گرد جھاڑتے ہوئے کہا اور ادھر سے چل دیا۔

"اور جو اس نے شکایت لگا دی نا چوہدری صاحب سے تو بس پھر سمجھو سب کی شامت آگئی۔" ماسٹر کمال نے کھاری کے جانے کے بعد سب کو مخاطب کیا۔

"یہ سارا تمہارا کیا دھرا ہے جنت بی بی!" انہوں نے جنت کی طرف دیکھا۔

"سرکار! میں تے گھرا لے رہی ساں۔" (میں چور کی نشان دہی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔) جنت بی بی نے لرزتی آواز میں کہا۔

"اور کھرا تجھے اسی کا نظر آیا جو اسی فارم ہاوس کی بھول بھلیوں میں پل کر جوان ہوا ہے۔" ماسٹر کمال نے جنت کو گھرکا۔

"غلطی ہو گئی جی!" جنت نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"شکر کر شیدائی ہے' عقل کا ہولا ہے' کوئی بات چوہدری صاحب تک پہنچاتا نہیں' ورنہ جو کچھ سب کو لگی علتیں وہ جانتا ہے' یہاں کوئی دو دن سے زیادہ رہ نہ پائے تم لوگوں میں سے' مت چھیڑا کرو اسے۔"

ماسٹر کمال نے اپنی گھنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ سب کے سر جھک گئے۔

☼ ☼ ☼

"اوئے! تو کن ہواؤں میں اڑ رہا ہے آج کل۔" اس روز ابراہیم نے صبح صبح ہی سعد کو جا پکڑا۔

"ہواؤں میں کدھر یار! میں تو ٹریک پر ٹانگیں بھگاتا ابھی ادھر پہنچا ہوں۔" سعد نے تولیے سے پسینہ خشک کرتے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے کھلاتا ہے۔" ابراہیم نے اسے گھورا۔ "سچ بتا! کدھر غائب تھا اتنے دن سے۔"

"تو میرا سب سے بڑا جاسوس ہے۔" سعد نے لان میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "جو جو رپورٹ تیرے اس چھوٹے سے گول مٹول پیٹ میں موجود ہے' سب نکال دے۔"

"کون ہے وہ لڑکی؟" ابراہیم اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہاہاہا۔" سعد زور سے ہنس دیا۔ "ابراہیم یار! تو پیٹ کا بڑا ہلکا ہے۔ فوراً" اگل دیا۔ تھوڑا ایٹی ٹیوڈ ہونا چاہیے بندے میں یار!"

"تجھے پتا ہے میں اسٹریٹ فارورڈ بندہ ہوں۔" ابراہیم نے ٹانگیں آگے پھیلا کر کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ "مجھے ہیریاں' پھیریاں نہیں آتیں۔"

"تیری سب سے بڑی کوالٹی یہ ہی تو ہے یار!" سعد مسکرایا۔ "اسی لیے تو اچھے کھانے کھاتا ہے اور چین کی نیند سوتا ہے۔"

"مجھے ٹال مت' جلدی بتا۔" ابراہیم نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ "کون ہے وہ۔"

"تجھے کیا لگتا ہے' کون ہو سکتی ہے۔" سعد نے الٹا سوال کیا۔

"میں تیرے بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں دے سکتا۔ تیرے اور چھور کا کچھ پتا نہیں چلتا۔" ابراہیم نے منہ پھلایا۔

"ویسے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' یہ وہی لڑکی ہے جو میوزیکل نائٹ والے دن آپے سے باہر ہو گئی تھی۔" ابراہیم نے سوچتے ہوئے کہا۔

"تیری آبزرویشن بڑی اسٹرونگ ہے' مگر الفاظ غلط استعمال کر جاتا ہے۔" سعد نے پانی کی بوتل منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔ "آپے سے باہر غصے میں ہوا جاتا ہے میرے بھائی!"

"اچھا۔ چھا۔" ابراہیم نے سر ہلایا۔ "تو اس روز کیا وہ تیری محبت میں پُرجوش ہو رہی تھی۔"

"کم آن ابراہیم!" سعد کو پانی پیتے پیتے ہنسی آگئی اور اچھو لگ گیا۔

"پھر تو سیدھی طرح بتا کون ہے وہ؟" ابراہیم نے کہا۔

"ہے یار! ایک لڑکی اچھی دوست بن گئی اتفاق سے وہی ہے' جس کا چارکول اسکیچ خریدا تھا۔"

"اوہ ہاں۔" ابراہیم کو یاد آیا۔

"مگر تو نے کہاں دیکھ لیا اس کو؟" سعد نے سوال کیا۔

"جس روز آپ اس کے ساتھ مری روڈ پر چہل قدمی کر رہے تھے۔" ابراہیم نے کہا۔

"کیا؟" سعد حیرت سے چیخا۔ "مری روڈ پر چہل قدمی... تو اپنے حواسوں میں تو ہے۔"

"چہل قدمی کا مطلب چالیس قدم ہوتا ہے' جو پیدل کی جائے یا گاڑی پر ایک ہی بات ہے۔ تم یہاں سے چالیس کلومیٹر دور جا رہے تھے اس کے ساتھ۔"

"سچ بتا!" سعد نے اٹھ کر ابراہیم کی گردن دبوچتے ہوئے کہا۔ "تجھے میری جاسوسی پر کس نے لگایا' قبلہ والد صاحب نے نا!"

"او نہیں جگر!" ابراہیم نے اپنی گردن اس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ "اتفاق سے میں اس روز مری سے واپس آرہا تھا۔"

"یہ سارے جو اتفاقات ہوتے ہیں نا' میں ان کی حقیقت خوب جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کی ایسی تیسی کیسے کی جاتی ہے۔" سعد نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"دیکھ ابراہیم! تو باز آجا۔" سعد نے انگلی کے اشارے سے اسے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

"جو بھی ہے یار! لڑکی بہت ڈیسنٹ اور سمجھ دار لگتی ہے' تیری دوست کیسے بن گئی؟" ابراہیم نے شرارت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"دیکھ ابراہیم! میری پہلی اور آخری وارننگ ہے تیرے لیے۔" سعد کی سوئی کہیں اور ہی اٹکی ہوئی تھی۔

"تو نے کچھ نہیں دیکھا' تجھے کچھ پتا نہیں۔"

"اچھا بابا اچھا!" ابراہیم نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہر بات بتانے کی نہیں ہوتی' ہر بات کو ہائی لائٹ نہیں کیا کرتے۔" سعد نے سمجھانے کے سے نرمی سے کہا۔

"تجھے پتا ہے اتنا تو میں بھی بے وقوف نہیں ہوں۔" ابراہیم نے خفگی سے کہا۔

"ہاں میں جانتا ہوں۔" سعد مسکرایا۔

"اچھا۔۔۔ اب ناشتا تو کرادے' تجھے پکڑنے کے چکر میں سیدھا ادھر ہی آگیا۔" سعد مسکراتا ہوا افضل بخش کو آواز دینے لگا۔

☆ ☆ ☆

انہوں نے چھت پر لیپائی کی گئی مٹی میں پڑتی دراڑوں کو غور سے دیکھا' جو جابجا بکھری نظر آرہی تھیں۔ جو اس سال ساون پچھلی بار کی طرح بھرپور ہوا تو چھت کا ٹپکنا لازمی تھا۔ کس سے مٹی منگوائی جائے اور کون گھائی کرکے دے گا۔ یہ ایک فوری مسئلہ تھا جو سر پر کھڑا نظر آرہا تھا۔ مگر انہیں محسوس ہوا کہ اس سوچ پر لاشعور میں موجود کوئی اور بات حاوی تھی۔ اسی دم مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے جمعہ کے خطبہ کی آواز ابھرنے لگی۔ شاید بجلی آنے پر آواز دور' دور تک سنائی دینے لگی تھی۔

"ایک بار ایک شخص' ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا۔" مولوی سراج سرفراز پنجابی میں خطبہ دے رہے تھے۔

"بزرگ بھی کون' ایک ولی اللہ' یعنی اللہ کا خاص بندہ۔ اس شخص نے عرض کی مجھے رات بھر نیند نہیں آتی' دن بھر کا تھکا ہارا میرا جسم رات بھر کے آرام کے بعد بھی تھکا ہارا ہی رہتا ہے' بزرگ نے فرمایا۔ اے بندے تو صرف نام کا مسلمان ہے۔ تیرا ایمان کمزور اور نیت میں بدی ہے۔ تو آنے والے کل کے دن کی روزی کے غم میں مبتلا انسان ہے۔ اپنی نیت سیدھی کرلے۔ اپنا ایمان مضبوط کر' کل کی فکر نہ کر' تیری نیند اچھی ہوجائے گی۔ تیری رات سکون سے گزرے گی۔"

آپا رابعہ کو ان کا خطبہ دینے کا یہ انداز کبھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ آواز میں کبھی شدت اور گھن گرج پیدا ہوجاتی اور کبھی وہ بہت نیچی ہوجاتی۔ کبھی اچانک بات کو لہک لہک کر گنگنا کر سنایا جاتا اور کبھی آواز سہم سی جاتی۔ خطبے میں سنائے جانے والی اکثر مثالوں کی صحت ضعیف اور بیان پر عبور کی کمی ہوتی۔ مگر گاؤں کے ان پڑھ' محنت مزدوری

کرنے والے لوگ بڑی توجہ اور دھیان سے مولوی صاحب کا خطبہ سنتے۔

مولوی صاحب۔ ایک بے ضرر انسان تھے، جنہوں نے عمر کا بیشتر حصہ اپنے ہی جیسے ایک کم علم مولوی صاحب سے خطابت اور امامت سیکھتے گزار دیا تھا۔ نہ ان کو مطالعہ سے شغف تھا، نہ اپنی معلومات میں اضافہ کرنے سے، وہ سیدھی سیدھی اذان دینے، امامت کرنے، ناظرہ پڑھانے اور خطبہ دینے والے مولوی صاحب تھے۔ اسی کام میں ان کی روزی روٹی کا وسیلہ تھا۔ اسی کام میں چند لوگوں سے عزت پاتے تھے اور یہی کام کرکے چین کی نیند سوتے تھے۔ مذہبی بحث مباحثہ سے انہیں کبھی کوئی سروکار نہیں ہوا تھا، جو کبھی ان کا کوئی مخاطب کسی مسئلے پر بحث کرنے بھی لگتا تو وہ جو صرف اللہ جانتا ہے، اس پر ہم بات نہیں کرسکتے۔" کہہ کر گفتگو کا اختتام کردیتے تھے۔ وہ اس لگی بندھی زندگی کے عادی ہوچکے تھے۔ اس سے آگے کی نہ کبھی انہوں نے سوچی تھی، نہ اس سے زیادہ کی خواہش کی تھی۔

بزرگ اور اس آدمی کا قصہ جس کو رات بھر نیند نہیں آتی تھی ان کے خطبے کا مستقل حصہ تھا۔" ان کی نظر چھت کی خشک پڑتی مٹی میں نمودار ہوتی دراڑوں میں سے ایک کے اندر گھستی چیونٹیوں کی ایک قطار پر پڑی۔ قطار میں موجود کسی چیونٹی کو نہ اپنے سے اگلی چیونٹی سے آگے جانے کی دھن تھی، نہ ہی راستہ بدلنے کی، سب اسی قطار میں مخصوص رفتار کے ساتھ چل رہی تھیں۔

"یہ اپنے حصے کا رزق حاصل کرکے رہتی ہیں، جہاں سے بھی ملنا ہو وہاں پہنچ جاتی ہیں۔"

انہیں برسوں پہلے کسی کی کہی بات یاد آگئی۔ "یہ حشرات الارض۔۔۔ ان کی کیا مجال تھی جو جیتے جاگتے انسان کے جسم پر چڑھ جاتیں۔ ان کو تو انسان کی موت کے بعد اذن ملتا ہے انسان کی مٹی کو مٹی کے ساتھ مٹی کرڈالنے کا، مگر یہ انسان کی بداعمالیاں ہیں اس کے شیطانی فعل ہیں، جو حشرات الارض کی دسترس میں جیتے جی آگیا۔ ہم نے کبھی انہیں چارپائی کے پائے پر چڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ اب یہ بستروں پر دوڑتے پھرتے ہیں۔ توبہ کر انسان توبہ کر، خود کو اتنا نہ گرا کہ جیتے جی حشرات الارض کی خوراک بن جا۔" انہیں کبھی کی سنی ایک اور بات یاد آئی۔

"میرا باپ کلمہ گو، میری ماں کلمہ گو مسلمان۔۔۔ مجھے کیوں کہا جارہا ہے کہ میں مسلمان ہوجاؤں۔" ایک احتجاج بھری آواز انہیں یاد آئی۔

"تیرا باپ اور تیری ماں کتنے وقت کے نمازی تھے۔ سال بھر میں کتنا قرآن تلاوت کرتے تھے؟ مال پر زکوٰۃ اور جسم کی زکوٰۃ کا کتنا اہتمام کرتے تھے۔ حلال اور حرام کی کتنی اور کیسی تمیز تھی تیرے ماں، باپ کو۔ اگر تجھے ان سب سوالوں کا جواب نہیں آتا تو میری مان، مسلمان ہوجا۔" ایک بارعب مگر پرسکون آواز ان کے کان میں گونجی اور انہوں نے مضطرب ہوکر پہلو بدلا۔

"پڑھ۔ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔

اقرار کر اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

یہ محض لفظوں کا اقرار نہیں ہے۔ یہ حیات انسانی کا چارٹر آف ایکشن ہے۔ سو دل سے اقرار کر اور دماغ سے اس پر غور کر۔"

انہوں نے اپنی چادر سے چہرے پر آتا پسینہ پونچھا۔ ان کا حلق خشک ہورہا تھا۔ انہیں اس میں کانٹے چبھتے محسوس ہورہے تھے۔

"حق ہے حق ہے حق ہے" آپ نے جو بھی کہا سب حق ہے۔" ایک اور آواز سنائی دی۔

"آب زم زم میں بھگو کر سکھائی تسبیحاں اور عجوہ کھجور کے ٹکڑے کس کو چاہیے یہ سوغاتیں۔۔۔ جو توفیق رکھتا ہے ہدیہ دے جائے، جو نہیں رکھتا تبرک کے طور پر لے جائے۔" کسی نے ان کے کان کے قریب ہی صدا

لگائی۔

وہ انتہائی اضطراب کے عالم میں کھڑی ہوگئیں۔ چھت کی منڈیر سے نیچے صحن میں جھاڑو لگاتی سعدیہ پر نظر پڑتے ہی جیسے ان کو وہ سوال یاد آگیا، جو ان کے لاشعور میں چھپا ہر سوچ پر حاوی۔ یادوں کی لگام تھامے انہیں پیچھے کو دوڑا رہا تھا۔

"اماں! ہمارے رشتہ دار کہاں ہیں، اباجی کے بہن بھائی، آپ کے بہن بھائی، میرے دادا، دادی، میرے نانا، نانی سب کہاں ہیں ہم سے ملتے کیوں نہیں، ہمارے پاس آتے کیوں نہیں۔"

پندرہ سالوں میں پہلی بار سعدیہ کے پوچھے اس سوال نے ان کے لاشعور پر ایسا قبضہ کیا تھا کہ سوچ اور خیال کی سب لہریں اسی کی دھار پر بہنے لگی تھیں۔ اپنی سوچوں سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آئیں۔ ڈیوڑھی کی نیم تاریکی میں بیرونی دروازے پر پڑی ہلکی دستک کے بعد اس کے خود بخود وا ہوجانے کے ساتھ روشنی کی لکیر اندر آئی۔ چھت کی تیز دھوپ میں چندھیائی آنکھوں کو پھر بھی کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

"السلام علیکم بھین جی!" ان ـــــ کو کھاری کی مانوس آواز سنائی دی۔

"لڈو بانٹیں آج جی۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "آج آپ دا شاگرد پورا جمعہ پڑھ کے آیا اے میت (مسجد) میں۔"

وہ خوشی سے اچھلا پڑ رہا تھا۔ وہ نیلے رنگ کی دھلی دھلائی شلوار قمیص اور سر پر رکھی کروشیے کی سفید ٹوپی پہنے ان کے سامنے کھڑا تھا۔

"آج مجھ کو کجھ وی نئیں بھولا۔۔۔ او بھین جی۔۔۔ اے سب تہاڈا کمال ہے۔" اس کی باچھیں کھلی جارہی تھیں۔ وہ سب کچھ بھلا کر آگے بڑھیں اور انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"جیتا رہ میرے بچے!" ان کی آنکھیں اشکبار ہونے لگیں۔ "میں نے کہا تھا نا کہ کچھ مشکل نہیں، تو سب کرسکتا ہے۔"

انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ ان کے قریب آگیا۔ اس کے کپڑوں سے کسی سستے عطر کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس نے بالوں میں بھی غالباً کوئی خوشبودار تیل لگا رکھا تھا۔ جمعہ کی نماز کے لیے اس کا اس قدر اہتمام انہیں ایک بار پھر اشکبار کرگیا۔

"تو بڑا خوش قسمت ہے کھاری! تجھے اللہ تعالیٰ نے اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے سے بچالیا، اللہ تعالیٰ نے تجھے اپنے راستے کی طرف بلالیا ہے۔ عمل کے راستے پر، سیدھے راستے پر۔" فرط جذبات میں وہ نہ جانے کیا کیا کہے جارہی تھیں۔

"بڑے راستے اور راستوں کی نہ جانے کتنی سمتیں کھوٹی ہوتی ہیں۔ انسان بھٹکتا پھرتا ہے۔ پھر بھی کتنوں کی قسمت میں یہ راستہ نہیں ہوتا۔ کھاری میرے بچے! ابھی مجھ سے پوچھ، یہ راستہ کتنی کٹھنائیوں کے بعد ملتا ہے۔" ان کا دل ساتھ ساتھ ان کے لفظ بول رہا تھا۔

"بس کہانیاں سنائے جانا تم۔" ان کے عقب سے نکل کر سعدیہ سامنے آئی، جو کچھ دیر سے وہیں کھڑی یہ جذباتی منظر دیکھ رہی تھی۔ "لڈو اماں کیوں بانٹیں ہم بانٹو کنجوس کہیں کے۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"بھین جی ہی بانٹیں گی، یہ بڑی ہیں میں چھوٹا، او میری ماں برابر میں اوناں کا بیٹا۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"بیٹا!" تیا رابعہ نے اس لفظ پر چونک کر کھاری کی طرف دیکھا۔

"ہاں یہ میرے بیٹوں کی طرح ہی تو ہے۔ میں بانٹوں گی لڈو اپنے ہاتھوں سے بنا کر۔" انہوں نے کہا اور سعدیہ نے انہیں چونک کر دیکھا۔ اس کی اماں کے لہجے میں جو تھا، وہ اس نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"توبہ! اس کمرے کے ماحول میں کتنا ڈپریشن ہے۔ یہ بے چاری یہاں پڑے پڑے کوئی اچھی سوچ سوچے بھی تو کیسے۔" ماہ نور نے کمرے کی چاروں دیواروں پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔

"یہ کیوں آگئی دوبارہ یہاں' اس کو یہاں سے کیا لینا ہے۔ یقیناً" میری بے بسی کا نظارہ کرنے میں اسے مزا آرہا ہے' جب ہی تو مسلسل مجھے ہی دیکھے جارہی ہے۔" سارہ نے ناراض نظروں سے اپنے سامنے بیٹھی ماہ نور کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

"شکر ہے ہفتے میں دوسری بار کسی تیسرے ذی روح کی شکل دیکھنے کو مل رہی ہے۔ انسان کب تک کتابوں میں' اخباروں اور رسالوں میں دل لگائے اور بائبل کا مطالعہ کرتا رہے۔ اب تو بائبل بھی پوری کی پوری زبانی یاد ہوگئی۔" سیمی آنٹی خوشی کے عالم میں چائے بناتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔

ان تینوں کی سوچ کے رخ مختلف تھے۔ مگر تینوں ایک دوسرے کے متعلق ہی سوچ رہی تھیں لیکن تینوں ایک دوسرے کی سوچ سے بے خبر تھیں۔

"تمہیں یہاں کا راستہ ڈھونڈنے میں کوئی دشواری تو نہیں ہوئی؟" سیمی آنٹی نے گرم چائے کا کپ ماہ نور کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں یہ راستہ بالکل سیدھا ہے۔ کوئی موڑ نہیں' کوئی چوک نہیں' جہاں کنفیوژن ہو کہ کس سمت مڑنا ہے۔" ماہ نور نے چینی کی سفید پیالی میں بنی ننھی سی گڑیا کو دیکھتے ہوئے کہا' جس کے چاروں طرف ننھے ننھے گلابی پھولوں کا حلقہ تھا۔

"ایسا ٹی سیٹ میں نے پہلے کہاں دیکھا ہے۔" وہ یاد کرنے کی کوشش کررہی تھی' مگر اسے یاد نہیں آرہا تھا۔

"لیکن یہ سادہ سی چائے کتنے سلیقے سے پیش کی گئی ہے۔" لکڑی کی منقش کشتی میں چینی کی چھوٹی سی چائے دانی ٹی کوزی سے ڈھکی تھی۔ چھوٹی سی شیشے کی ڈش میں گھر کے بیک کیے ہوئے بسکٹس رکھے تھے۔ وہ ایک دم متاثر ہوگئی۔ سیمی آنٹی شدید قسم کی سلیقہ مند خاتون تھیں۔

"میری لاہور واپسی میں چند ہی دن باقی ہیں' میں نے سوچا ایک بار پھر آپ لوگوں سے ملاقات کرلوں۔" ماہ نور نے مسکرا کر کہا اور سارہ کی طرف دیکھنے لگی جو بے زار اور ناراض نظر آرہی تھی۔

"تم جنکس پڑھتی ہو سارہ؟" سیمی آنٹی کسی کام سے کمرے سے باہر گئیں تو اس نے سارہ کو مخاطب کیا۔

"نہیں۔" سارہ نے سخت لہجے میں مختصر جواب دیا۔

"مسووریز تو دیکھتی ہوگی؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے شوق نہیں۔" اسی لہجے میں جواب آیا۔

"میوزک سنتی ہو؟" اس نے اس سخت لہجے کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"میں ایسا کچھ نہیں کرتی جو نارمل انسان کرتے ہیں۔" سارہ نے درشت لہجے میں کہا۔

"نارمل انسان!" ماہ نور نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ "وہ کون ہوتے ہیں۔"

"تم اچھی طرح جانتی ہو' نارمل انسان کیسے ہوتے ہیں۔" سارہ اپنے لہجے کی روکھائی کو قابو نہیں کرپارہی تھی۔

"مثلاً" ماہ نور اٹھ کر سارہ کے قریب آئی۔ سارہ کے چہرے پر ناگواری کا تاثر ابھر آیا۔

"مثلاً" تم اور تمہارے جیسے لاکھوں چلتے پھرتے لوگ۔" سارہ کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

"چلتے پھرتے لوگ نارمل ہوتے ہیں۔ یہ تم سے کس نے کہا سارہ؟" ماہ نور نے ایک بار پھر سارہ کے لہجے کی تلخی کو نظرانداز کیا۔ "نارملٹی کا تعلق جسمانی سے زیادہ ذہنی صحت سے ہوتا ہے میرے خیال میں۔"

"تم ایسا کہہ سکتی ہو۔" سارہ نے نتھنے پھلا کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیونکہ جسمانی صحت سے مالا مال ہو۔

تمہیں اس کیفیت کا اندازہ نہیں جو جسمانی عارضوں میں مبتلا لوگوں کی ہوتی ہے۔"

"ایسے لوگوں کو جسمانی طور پر صحت مند لوگوں پر رشک آتا ہے یا ان سے حسد محسوس ہوتا ہے؟" ماہ نور نے سوال کیا۔

فوری طور پر سارہ کے ذہن میں اس سول کا جواب نہیں آیا۔ کیونکہ چلتے پھرتے نارمل لوگوں کے متعلق اس نے ماہ نور سے ملاقات سے پہلے اس انداز میں سوچا ہی نہیں تھا۔

"تمہیں شاید انسانی المیوں کی ان گنت قسموں کا پتا نہیں ہے سارہ!" ماہ نور نے نرمی سے سارہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"تم تو بہت خوش قسمت ہو کہ تمہارا خیال رکھنے کے لیے سعد اور سیمی آنٹی موجود ہیں۔ تم نے شاید ری ہیبلیٹیشن سینٹرز میں پڑے بے بس اور بے سہارا لوگوں کو کبھی نہیں دیکھا' جن کو لک آفٹر کرنے کے لیے غصہ کھاتی نرسوں اور بدمزاج وارڈ بوائز کے علاوہ کوئی اور موجود نہیں ہوتا۔"

ماہ نور نے دیکھا' سارہ کے چہرے کے تاثرات تیزی سے بدلے تھے۔ "یا پھر ان لوگوں کو بھی کبھی نہیں دیکھا۔ جو اس سے بھی بڑھ کر جسمانی عوارض اور معذوری میں مبتلا ہیں اور جن کے پاس علاج کے لیے پیسے ہیں نہ کسی خیراتی ادارے تک دسترس۔ وہ سسکتے ہیں' بلکتے ہیں' جینا چاہتے ہیں' مگر لحہ لحہ موت کی طرف بڑھ رہے ہوتے ہیں۔ موت جو سب کو آتی ہے' مگر ان پر کیسے آتی ہے' یہ صرف وہی جانتے ہیں جو اس کو اپنی طرف آتے ہوئے اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔"

سارہ نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ ماہ نور سے چھڑایا اور اپنا دھیان دوسری طرف کرلیا۔

"یہ فلیٹ چھوٹا سہی' مگر کتنا آرام دہ ہے۔" ماہ نور نے ایک بار پھر اس کا دھیان اپنی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی۔

"سیمی آنٹی بظاہر سخت سہی' مگر اندر سے کتنی محبت کرنے والی اور نرم دل ہیں۔" اس نے کہا۔

"اور سعد۔۔۔" ماہ نور نے کہتے کہتے رک کر سارہ کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ سعد کے نام پر سارہ کی تمام تر توجہ اس کی طرف ہوگئی تھی۔

"سعد چاہے دوسروں کے لیے کیسا بھی سہی' مگر تمہارے لیے وہ کتنا عظیم انسان ہے۔"

"سعد نے تمہیں اس لیے یہاں بھیجا ہے کہ مجھے شکر گزاری پر راضی کرنے کی کوشش کرو اور مجھے یقین دلادو کہ میں بہت سوں سے اچھی ہوں اور مجھے اچھے بچوں کی طرح زندگی گزارنے کی تیاری کرنی چاہیے۔" ماہ نور کے سوال کا جواب ذہن میں نہ آنے پر سارہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مجھے سعد نے تو یہاں نہیں بھیجا۔" ماہ نور نے نرمی سے کہا۔ "اسے تو علم ہی نہیں کہ میں اس وقت یہاں تمہارے پاس موجود ہوں۔"

"جتنی تم سعد سے قریب ہو' جتنی تم لوگوں کی ایک دوسرے سے دوستی ہے اور انڈراسٹینڈنگ بھی۔ میں مان ہی نہیں سکتی کہ سعد کو علم نہ ہو کہ تم یہاں موجود ہو اس وقت۔" سارہ کے لہجے میں عجیب سی پھنکار شامل ہوگئی۔

"اوہ!" ماہ نور نے بے اختیار کہا اور پھر چند لمحوں کے لیے کمرے میں خاموشی چھاگئی۔ یہ چند لمحے ماہ نور نے سارہ کے لہجے میں چھپے جذبات پر غور کرنے میں لگائے تھے۔ "تو یہ معاملہ ہے۔" ان چند لمحوں کے اختتام پر ماہ نور کی سمجھ میں آیا۔ سارہ کے لہجے کی چبھن' طنز' غصے اور پھنکار میں کون سا جذبہ جھلکتا تھا' رشک کا یا حسد کا' وہ اگرچہ فوری طور پر فیصلہ نہ کرپائی تھی۔ مگر جو بھی جذبہ تھا' اس کی وجہ سمجھ چکی تھی۔

"میری اور سعد کی دوستی۔ میری اور اس کی انڈراسٹینڈنگ۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے سارہ! سعد سے

میری ملاقات صرف چند دن پہلے ہوئی ہے۔ میں اس کے بارے میں بہت کم جانتی ہوں۔"

ماہ نور کی بات کے ردِ عمل میں بستر پر نیم دراز سارہ نے سر اٹھا کر ماہ نور کی طرف دیکھا اور اسے محسوس ہوا کہ ماہ نور کے لہجے میں اور چہرے پر سچائی کی جھلک تھی۔ اس کے حلق میں اگے کانٹے جیسے اچانک سے ایک ایک کر کے غائب ہونے لگے۔

"ہم ایک فنکشن میں اتفاقاً" ملے' باتوں باتوں میں سعد نے تمہارا ذکر کیا۔ مجھے تم سے ملنے کا اشتیاق ہوا اور میں نے اس سے کہا کہ مجھے تم سے ملوائے۔ میں اس جگہ کے راستوں سے ناواقف ہوں۔ اسی لیے اس روز سعد کے ساتھ آئی تھی۔ اب راستے کا علم ہو گیا' اسی لیے اکیلی آگئی۔" ماہ نور کہہ رہی تھی اور سارہ کے حلق سے لے کر سینے تک کی جلن پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے سے پڑ رہے تھے۔

"چند دن بعد میں لاہور واپس چلی جاؤں گی' اسی لیے سوچا تم سے ایک بار پھر مل لوں کیونکہ تم مجھے بہت اچھی لگی ہو' لیکن لگتا ہے تمہیں میرا آنا پسند نہیں آیا۔" ماہ نور نے کہا۔

"نہیں' بالکل بھی نہیں۔" سارہ نے شیریں لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اچانک بدل گئے تھے۔ اس کے لہجے میں حلاوت اتر آئی تھی۔

ماہ نور کے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا' اسے سارہ کے لہجے کی تلخی کی اصل وجہ سمجھ میں آچکی تھی۔

"تم بھی بہت اچھی ہو۔" آپ کے سارہ نے ماہ نور کا ہاتھ تھاما۔

"اور تم بہت اچھی باتیں کرتی ہو' تم ٹھیک کہتی ہو مجھے اندازہ نہیں کہ چلتے پھرتے نارمل انسانوں کو کیسے کیسے ذہنی عوارض لاحق ہو سکتے ہیں۔" سارہ کا ماہ نور کے ساتھ رویہ لمحوں میں بدلا تھا۔

"جب میں بالکل ٹھیک تھی اور سرکس میں کام کرتی تھی تو مجھے یاد ہے میں نے چند ایسے لوگ دیکھے جو جسمانی طور پر بالکل فٹ تھے مگر ان کے ذہن نارمل نہیں تھے۔" وہ انتہائی دوستانہ انداز میں ماہ نور کو بتانے لگی۔

"وہ کیا کرتے تھے۔" ماہ نور نے پوچھا۔

"وہ سرکس کے ٹرینر تھے اور معمولی سی غلطی پر کھال اُدھیڑ دیا کرتے تھے۔" سارہ سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔ "جانوروں کی بھی اور انسانوں کی بھی۔"

"او میرے خدا!" ماہ نور نے بے اختیار کہا۔

"کتوں کو یہ سکھانا کہ وہ آگ کے شعلے نچاتے رنگ کے اندر سے گزر جائیں' ہاتھیوں کو چھوٹی چھوٹی چوکیوں پر پاؤں رکھ کر کرتب سکھانے کی تربیت دینا اور شیروں کو اس حکم کے تابع کر لینا کہ وہ انسانی اشاروں پر ناچنے لگیں۔ یہ دنوں میں نہیں ہو جاتا۔" اس کے لیے مہینے چاہیے ہوتے ہیں اور ان مہینوں کے دوران ان کتوں' ہاتھیوں اور شیروں پر کیا گزرتی ہے ہم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔"

"اور جانوروں کو سدھانے والے انسان؟" اس نے مارے خوف کے آنکھیں بند کر لیں۔

"وہ انسان نہیں ہوتے ماہ نور..... کبھی چاہو بھی تو ان کے بارے میں جاننے کی کوشش مت کرنا۔"

ماہ نور ساکت کھڑی سارہ کی باتیں سن رہی تھی۔ دونوں کے درمیان کھڑا بے نام فاصلہ لمحوں میں طے ہوا تھا اور اب وہ پری کے سارہ خان بننے کی داستان سن رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"پتا نہیں کیوں' مجھے یقین نہیں آرہا کہ یہ تم ہو۔" سعد نے یہ جملہ اس گفتگو کے دوران تین مرتبہ دہرایا تھا' جو اس کے اور نادیہ کے درمیان اسکائپ پر ہو رہی تھی۔

"کیوں۔ کیا میں بہت بدل گئی ہوں۔" نادیہ نے تیسری بار اس کے ایسا کہنے پر کہا۔ سعد نے اپنی نظروں کے سامنے موجود اسکرین پر نظر ڈالی۔ اس کی سرخ و سفید رنگت زرد پڑ چکی تھی۔ اس کا صحت مند چہرہ کمزور ہو گیا تھا۔ اتنا کمزور کہ اس کے گالوں کی ہڈیاں نمایاں نظر آرہی تھیں۔ جبڑے کی ہڈیاں کھچی ہوئی لگ رہی تھیں اور چہرہ لمبوترا ہو رہا تھا ———— نادیہ نے اپنے سیاہ بالوں کو باندھ رکھا تھا۔ سعد کو ایسا بھی لگ رہا تھا جیسے اس کی سبز آنکھیں بجھی ہوئی تھیں۔

"ہاں تم بالکل بدل گئی ہو' اتنی کہ مجھے تمہیں پہچاننے میں تامل ہو رہا ہے۔" سعد نے کہا۔ جواب میں نادیہ نے اپنی آنکھیں جھپکیں اور مسکرا دی۔

"جبکہ تم ویسے کے ویسے ہی ہو۔ اتنے کہ میں تمہیں ہزاروں کے مجمع میں بھی پہچان سکتی ہوں۔"

"لیکن مجھے تمہارا اتنا بدل جانا ہضم نہیں ہو پا رہا نادیہ!" سعد کو لگا وہ زبردستی مسکرا رہی تھی۔

"تمہارے چہرے پر مسلسل مشقت کے آثار ہیں اور تم اپنے اندر موجود کسی دکھ کو چھپا نہیں پا رہی ہو۔"

"اوہ!" نادیہ نے جھرجھری لے کر کہا۔ "تم ابھی بھی ویسے ہی اسٹریٹ فارورڈ ہو' ویسے ہی آؤٹ اسپوکن جو دل میں آئے کہہ دینے والے۔"

"ہاں تم جانتی ہو۔ میں ایسا ہی ہوں۔" سعد نے سر ہلایا۔

"یہ بتاؤ تمہاری ممی کہاں ہیں۔" پھر اس نے پوچھا۔

"وہ وہیں ہیں شکاگو میں اپنے ہزبینڈ اور بچوں کے ساتھ۔" وہ ایک دفعہ پھر زبردستی مسکرائی تھی۔

"تو تم ان کے ساتھ کیوں نہیں ہو؟" سعد نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "وہ تمہیں اپنی بیٹی کہہ کے لے کر گئی تھیں اور شاید تمہیں یاد ہو کہ اس کے علاوہ انہوں نے ڈیڈی سے تمہارے بارے میں کیا کہا تھا۔"

نادیہ نے جیسے خلاؤں میں کچھ دیکھا۔ "بہت اچھی طرح یاد ہے۔ جب ہی تو مجھے لگتا ہے کہ جیسے میری کوئی شناخت نہیں ہے' جب ہی تو لگتا ہے کہ جیسے جب تک میری زندگی ہے میں خود ہی اپنے لیے سب کچھ رہوں گی۔"

"تم نے یہ سب کیوں قبول کیا؟" وہ غصے میں اس سے سوال کر رہا تھا۔ "تم نے ڈیڈی سے رابطہ کیوں نہیں کیا۔" "اب جبکہ تم بڑی ہو چکی ہو اور باشعور ہو۔"

"ابھی کچھ دیر پہلے تو تم نے یاد دلایا کہ ممی نے ڈیڈی سے میرے بارے میں کہا تھا۔" نادیہ نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا اور سر جھکا لیا۔ "اس کے بعد ڈیڈی کے میرے بارے میں کیا جذبات ہوں گے' کیا مجھے اندازہ نہیں۔ میں کس برتے پر ان سے رابطہ کرتی۔" کچھ دیر بعد وہ سر اٹھا کر بولی۔

"لیکن میں تمہیں ایسی صورت حال میں پھنسے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔" سعد نے کہا۔ "اس سے پہلے میں بالکل بھی اندازہ نہیں کر پایا تھا کہ تم ان حالات میں رہ رہی ہو۔ آخر تم نے پڑھنے کے لیے فن لینڈ کا ہی انتخاب کیا۔ وہاں زندگی بہت ٹف ہے اور بیرون ملک سے آئے ہوئے اسٹوڈنٹس کے لیے تو بے حد زیادہ ٹف' میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"تم جذباتی ہو رہے ہو اور مجھے علم ہے جذباتی ہو کر تم اکثر کچھ زیادہ ہی غصہ کھا جاتے ہو۔" وہ نرمی سے مسکرائی۔

"لیکن کیوں' آخر کیوں تم نے؟" سعد نے اس کی کہی بات نظر انداز کر دی۔

"کیونکہ مجھے اس کے علاوہ کچھ نہیں سوجھا۔ ممی کا ہزبینڈ مجھ پر بری نظر رکھ رہا تھا اور میرے کریڈٹ میں بہت کم پیسے تھے۔ مجھے وہاں سے نکلنے کا جو بھی راستہ سوجھا میں نے اندھوں کی طرح اس کو اپنا لیا۔ جب عمر اور تجربہ دونوں ہی کم ہوں تو انسان ایسے ہی احمقانہ فیصلے کرتا ہے۔ اور اب تو ایڈجسٹ کر چکی ہوں' مجھے یہ مشکل نہیں لگتا'

جب ہی تو تمہارے سامنے موجود ہوں۔"

سعد نے سر پیچھے کر کے چھت کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس نے نہیں کہا۔

"اور دیکھ لو، اتنے سالوں کے بعد انٹرنیٹ پر دماغ کھپا کھپا کر میں نے ہی تمہیں ڈھونڈا اور تم سے رابطہ ہونے سے پہلے نہ جانے کتنے سعد سلطانوں سے مجھے ٹکرانا پڑا۔ تم کو تو شاید میں یاد بھی نہیں تھی۔" پھر نادیہ نے شرارت بھرے انداز میں کہا۔

"تمہیں تو میں یاد تھا نا؟" سعد نے اپنے رنج کو مسکراہٹ میں دبا کر کہا۔

"ہاں، تم مجھے کبھی نہیں بھولے۔" نادیہ نے کہا اور آنکھیں میچ لیں۔ "اس لیے ہینڈسم! کہ اس پوری دنیا میں تم سے زیادہ عزیز مجھے کوئی نہیں ہے۔ میں دن کے کسی ایسے لمحے کو شاید نہ یاد کرپاؤں، جب تمہارا خیال میرے لاشعور میں موجود نہ ہو، میں ہر رات سونے سے پہلے تمہارے ساتھ گزرے وقت کو یاد کر کے سوتی ہوں اور ہر صبح کا آغاز تمہاری یاد سے کرتی ہوں۔" وہ کہے جا رہی تھی اور سعد ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

"اس لیے میرے پیارے بھائی! کہ مجھے تم سے شدید محبت ہے۔" سعد اسے دیکھ رہا تھا۔ جب اچانک وہ اسکرین سے غائب ہو گئی۔ اس کے غائب ہو جانے پر اس نے تیزی سے اپنا آئی فون اٹھایا، مگر پھر مایوس ہو کر اسے ایک سائیڈ پر رکھ دیا۔

"اس لیے کہ مجھے تم سے شدید محبت ہے میرے پیارے بھائی!"

"میں نے ہی تمہیں ڈھونڈا۔۔۔ تمہیں تو میں شاید یاد بھی نہیں تھی۔"

اسے نادیہ کے کہے الفاظ یاد آئے، پھر اس نے گردن موڑ کر اپنے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھے فوٹو فریم کی طرف دیکھا۔ جس میں ایک سرخ و سفید رنگت سیاہ بالوں اور سبز آنکھوں والی بچی سرخ پھول دار فراک اور سرخ چمکتے شوز پہنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

بازاروں میں بلا کی بھیڑ تھی۔ بقر عید کے سلسلے میں لوگوں کی کثیر تعداد شاپنگ کے لیے بازاروں میں موجود تھی اور اسی بھیڑ سے فائدہ اٹھانے کے لیے گداگروں کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد ادھر ادھر پھر رہی تھی۔ چند ایک گداگر ایسے بھی تھے جنہوں نے بازاروں میں مخصوص اور اہم جگہوں پر پکے ڈیرے لگا رکھے تھے۔ محتاجی، معذوری اور فاترالعقلی کا مظاہرہ کرتے یہ گداگر اپنے پیشے کے ماہر تھے۔ دن بھر میں اچھا خاصا کما لیتے اور مہینے بھر کے بعد ان میں سے اکثر اپنی پوٹلیاں سنبھالے بینکوں کے دروازوں سے اندر داخل ہوتے دکھائی دیتے تھے۔

جیناں بھی انہی گداگروں کے قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے اضافی کمالات میں لکڑی کی ایک چھوٹی سی ہتھ گاڑی میں پڑا چند ماہ کا ایک بچہ تھا۔ بچے کے جسم پر ناکافی کپڑے تھے اور اس کے منہ سے ٹپکتی رال پر مکھیاں بیٹھتی تھیں۔ یہ بچہ جیناں کی بے بسی کی علامت بنا ہتھ گاڑی میں سارا سارا دن پڑا رہتا تھا۔ ناکافی دودھ اور دن بھر کی مشقت کے باعث اس کا جسم ناتواں ہو چکا تھا اور اس کے سینے اور پسلیوں کی ہڈیاں صاف نظر آتی تھیں۔

اس روز بھی گداگر قبیلے کے تمام پیشہ ور اپنے اپنے مخصوص انداز میں اپنے دھندے میں مگن تھے۔ جب اچانک نگرانی پر مامور ان کے گروکی صدا دیتی آواز ادھر ادھر گونجی۔ "پولس۔۔۔ پولس" یہ صدا تھی کہ ادھر ادھر ہو جانے کا سگنل۔۔۔ سب گداگر اپنی چھابڑیاں، پیالے اور پوشاکیں سنبھالتے ادھر ادھر موجود تنگ گلیوں میں غائب ہونے لگے۔ ہفتوں نظر اور کان بند کر کے ادھر ادھر پھرتی ان گداگروں کو نظر انداز کرتی پولیس، کسی نئے افسر کے حکم پر اچانک حرکت میں آگئی تھی۔

جیناں تک یہ سگنل ذرا دیر سے پہنچا۔ وہ ایک سیکنڈ کے اندر اپنی لکڑی کی ٹانگ اتار اصل ٹانگوں پر بھاگتے انداز میں ہتھ گاڑی چلاتی کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ نزدیکی تاریوں والی گلی میں بھی مارکیٹ بن چکی تھی اور رہلا کارش تھا۔ اس کی ہتھ گاڑی جگہ جگہ بھیڑ میں پھنستی اور نکلتی رہی تھی۔ ادھر ادھر خوف زدہ نظریں دوڑاتے وہ بالآخر ایک پتلی گلی ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئی۔ یہ گلی اس وقت سنسان تھی۔ اس میں موجود نئی دکانوں کے شٹر گرے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ دکانیں ابھی کرائے پر نہیں چڑھی تھیں۔ زور، زور سے ہانپتی جیناں کی سانس سے سانس اس گلی میں آکر ملی تھی۔

اس نے اپنے چہرے پر آیا پسینہ پونچھا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کسی محفوظ جگہ کو تاڑنے لگی۔ اسی لمحہ اسے اپنے عقب سے بھاری قدموں کی آواز آتی سنائی دی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ قدموں کی آواز آہستہ آہستہ اس کے عین کان کے قریب آگئی تھی۔ اس نے گردن گھما کر خوف زدہ نظروں سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کے سر پر بڑی بڑی مونچھوں کو تاؤ دیتا پولیس والا سفید کلف لگے شلوار قمیص میں ملبوس ایک شخص کے ساتھ کھڑا تھا۔

"بڑی پھرتیلی ہے تو الو کی پٹھی!" پولیس والے نے ہاتھ میں پکڑی چھڑی جیناں کے حلق پر رکھتے ہوئے کہا اور زور سے چھڑی پر دباؤ ڈالا۔

"او کدھر سے اٹھایا ہے یہ بچہ؟" پھر اس نے چھڑی اس کے شانے پر مار کر پوچھا۔

"آرام سے جوان! آرام سے۔" سفید شلوار قمیص والا بولا۔ "اسے تھانے لے چل اور وہاں پوچھ آرام سے۔" اس نے کہا۔

"چل پکڑ اس حرام کے جنے کو۔۔۔ اور ناک کی سیدھ چلی چل۔" پولیس والے نے ایک بار پھر جیناں کے شانے پر چھڑی برساتے ہوئے کہا۔

مردہ قدموں سے ہتھ گاڑی چلاتی جیناں پولیس والے کے پیچھے چلی۔ سفید شلوار قمیص والا اس کے پیچھے تھا۔

"خبیث کی اولاد، کتے کا بچہ۔" جیناں دل ہی دل میں گالیاں دے رہی تھی۔ "سارا دن دھندے کا بیڑا الگ اور ان کم بختوں سے ہڈیوں کی تڑوائی الگ ہو گی۔۔۔ نہ جانے کس نحس کا منہ دیکھا تھا صبح سویرے۔" انہی سوچوں میں گم چلتی وہ تھانے تک پہنچ چکی تھی۔

اس شام جیناں اپنی ہڈیاں سہلاتی تھانے سے خالی ہتھ گاڑی چلاتی باہر نکلی تھی۔ وہ بچہ جو اسے کمالے نے بس اسٹاپ سے اٹھا کر دیا تھا۔ اسے سفید شلوار قمیص والا ساتھ لے گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں آج کل کیلنڈر پر نظر نہیں ڈالتا۔" سعد نے ماہ نور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا کیوں؟" ماہ نور نے اپنے بازو میں پڑا سفید چوڑا سا کڑا گھماتے ہوئے پوچھا۔ اس روز سعد نے اسے ایک ایسی آرٹ اکیڈمی دکھائی تھی جو ایسے بچوں کو تعلیم دے رہی تھی جن کے پاس وسائل تھے نہ رسائی، صرف پیدائشی ہنر تھا۔

"کیونکہ دن گزرتے جا رہے ہیں، بلکہ ہاتھوں سے پھسلتے جا رہے ہیں۔" اس نے کہا۔

"کیا مطلب میں سمجھی نہیں۔" ماہ نور نے تعجب سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" سعد نے سر جھٹکا اور مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیسی لگی تمہیں یہ اکیڈمی۔"

ماہ نور کا ذہن اس کی مبہم سی بات میں الجھا ہوا تھا لیکن جب اس نے محسوس کیا کہ سعد اس موضوع پر مزید

بات نہیں کر رہا تو اس نے بھی اس بات پر سوچنا موخر کر دیا۔
"بہت اچھی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔
"ویسے تمہیں ایسی جگہوں کا علم کیسے ہے؟" پھر ماہ نور نے سعد کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے ایسی گمنام سی جگہوں کا۔"
"نامور جگہوں اور نامور لوگوں کے بارے میں تو سب ہی جانتے ہوتے ہیں گمنام جگہوں اور لوگوں کے بارے میں جاننا پسندیدہ مشغلہ ہے۔"
"اچھا مشغلہ ہے۔" ماہ نور نے کہا۔ "ویسے تمہارے مشاغل کچھ عجیب و غریب سے نہیں ہیں۔"
سعد ہنس دیا۔ "سوچ لو! میرے مشاغل کو عجیب و غریب قرار دینے سے پہلے اچھی طرح سوچ لو۔"
"اور تمہاری باتیں بھی مبہم سی ہوتی ہیں۔" ماہ نور نے منہ بنا کر کہا۔ "دراصل مجھے پزلز بھول بھلیاں پہیلیوں اور اسرار میں کچھ دلچسپی نہیں۔"
"او! میں معذرت خواہ ہوں پھر تو۔" سعد نے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔
"اختر سے ملنا پسند کرو گی۔" پھر اسٹیرنگ گھماتے ہوئے اس نے اچانک پوچھا۔
"اب یہ اختر کون ہے۔" ماہ نور نے بھویں اچکا کر ایسے سوال کیا۔ جیسے پوچھ رہی ہو تمہارے شعبدوں کے سلسلے کی کوئی انتہا بھی ہے۔
"ہے ایک اللہ کا بندہ۔" وہ مسکرایا۔ اس کی باتیں دلچسپ ہوتی ہیں اور قابل غور بھی۔
"لیکن اس سے ملاقات کی ایک شرط ہے۔ جو ذرا کڑی ہے۔"
"وہ کیا ہے۔"
"کاڑھے کا پیالہ پینا پڑتا ہے اختر سے ملنے کے لیے۔"
ماہ نور نے جھرجھری سی لی۔ "یہ کاڑھا کیا ہوتا ہے۔"
"پی کر دیکھنا پتا چل جائے گا۔" سعد نے گاڑی کا رخ مخالف سمت موڑتے ہوئے کہا۔

☼ ☼ ☼

"بندہ جب سر جھکا لیتا ہے' جب سجدہ ریز ہو جاتا ہے تو اپنی "میں" کی نفی کا اعتراف کر لیتا ہے۔" ان کے سامنے بیٹھے شخص نے کہا۔ اس شخص کے چہرے کا رنگ گندمی تھا' چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ آنکھوں میں سرخی تھی مگر اس کے بات کرنے کا انداز بے حد مہذب تھا۔
"پھر یہ نفی بھی کئی قسم کی ہوتی ہے۔ کبھی وقتی' کبھی مستقل' کبھی آدھی' کبھی پوری۔" وہ کہہ رہا تھا۔
"آپ باؤ صیب بڑے برے پھنسے ہوئے ہو۔" اس نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں سعد کے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔
"کبھی ادھر کھنچتے ہو کبھی ادھر' سمجھ آپ کو بھی نہیں آتی کہ کدھر کا رخ کرو' آپ کی پوری نفی "آدھی ہو جاتی ہے اور مستقبل کا عہد وقتی بن کر رہ جاتا ہے۔"
سعد نے اثبات میں سر ہلایا۔
"کوشش تو کرتا ہوں کہ سمجھ پاؤں۔" اس نے آہستہ آواز میں کہا۔
"کوشش بھی نہیں ہو گی اب باؤ صیب آپ سے۔" اس شخص نے ہولے سے مسکرا کر کہا۔ "یا تو زن پالو یا پھر من پالو۔" اس نے ایک سرسری نگاہ ماہ نور پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔" سعد نے اب کے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"ہمیں بتاتے ہو صیب۔" وہ شخص مسکرایا۔ "ہم اللہ سائیں کے عاجز اور گناہ گار بندے سہی پر ہمیں اس نے اپنی زمین کے سینے پر خوب پھرایا' پہاڑوں پر ٹھکانے بنائے' کبھی دریاؤں میں بسیرا کیا' اس کے میدانوں میں میل ہا میل پیدل چلے' سمندروں کے سینے چیرے اور اس کے بندوں کو پڑھنے کی کوشش کی' تب پتا چلا کہ نظام کائنات اور کاروبار حیات میں ہر جگہ اس کی کار فرمائی ہے۔ زندگی کا کوئی انتظام ایسا نہیں' جس میں اس نے اپنا آپ عیاں نہ کر رکھا ہو' نظر ہر کسی کو عطا نہیں ہوتی۔ نظر کا عطا ہو جانا اس کی سب سے بڑی نعمت ہے۔" اس نے اپنی چھوٹی سی گڑگڑی سے کش لگاتے ہوئے کہا۔
"آپ کو عطا ہو گئی نظر۔" سعد نے پوچھا۔
"ہوتی۔" اس نے سر ہلایا۔ "پر کوتاہ ہے' مکمل نہیں' جب ہی تو کبھی کبھی چوک جاتی ہے۔"
"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ آپ کو غلطی لگ رہی ہے۔" سعد نے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی۔
"ہو سکتا ہے۔" اس شخص نے جس کا نام اختر تھا' بے نیازی سے کہا۔ "پر فقیر کا دل جس بات پر فیصلہ صادر کر دے' وہ ہوتی ہے۔ اس میں زیر زبر کا فرق نہیں ہوتا۔"
"مے بی۔" سعد نے شانے اچکائے۔ وہ شخص ہولے سے ہنسا۔ "زن اور من دونوں ساتھ ساتھ پنپ نہیں پاتے باؤ صیب!"
"آپ مجردی کا سبق پڑھا رہے ہو سائیں جی۔"
"نہیں۔" اس نے سر ہلایا۔
"مجردی ہمارا شیوہ نہیں' پر ایک کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ یہ فیصلہ تو کبھی جا کر آپ کو کرنا پڑے گا۔"
"دیکھیں گے۔" سعد کہہ رہا تھا اور ماہ نور اپنی آنکھیں پوری کھولے اپنے سامنے کا منظر دیکھ رہی تھی اور ہونقوں کی طرح وہاں ہونے والی گفتگو سن رہی تھی۔ وہ شخص جس کا نام اختر تھا ہاتھ میں چھوٹی سی گڑگڑی پکڑے عجیب سی گفتگو کر رہا تھا۔ ماہ نور کو اس شخص اور سعد سلطان کے درمیان کوئی تعلق جوڑنے میں دقت ہو رہی تھی۔
"بی بی صیب! آپ کا من بڑا صاف ہے اسی لیے بڑا شانت بھی ہے۔" اچانک وہ شخص ماہ نور سے مخاطب ہوا۔
"آپ کے دل میں نہ حسد ہے نہ رشک ہے' آپ کی زندگی میں کوئی بغض نہیں ہے اسی لیے آپ کی زندگی بڑی پرسکون ہے۔" وہ کہے جا رہا تھا۔
"مگر...." اس نے گڑگڑی کا کش لیا۔ "آگے آپ کے لیے دشواریاں ہیں اور کٹھنائیاں بھی۔"
ماہ نور ایک دم چونکی ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔
"آپ چاہیں گی بھی تو اس سے فرار ممکن نہیں۔" اس نے کہا۔ ماہ نور بے اختیار اس سے کچھ پوچھنے لگی مگر اسے اپنے ہاتھ پر ہلکا سا دباؤ محسوس ہوا وہ سعد تھا جو اسے منع کر رہا تھا۔
"آپ کی ذات بہت سے غیر متوقع کام کرنے والی ہے' خود کو ذہنی طور پر تیار کر لو۔" اس شخص نے کہا۔
"اب ہمیں اجازت دیں سائیں جی!" سعد ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
"ہاں جائیں آپ باؤ صیب!" وہ شخص مسکرایا۔ "پر یاد رکھو حقیقت سے فرار' ہونی کو انہونی نہیں بنا سکتا۔"
"اللہ حافظ سائیں جی!" سعد کٹیا سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔
"آپ کو اللہ سلامتی دے باؤ صیب! اللہ حامی و مددگار ہو فکر مت کرنا' آپ کے من تک راستہ آپ کو ضرور ملے گا۔"
"ہوں۔" سعد نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

"خبطی ہے۔ سرپھرا اور من موجی۔" باہر نکل کے سعد نے ماہ نور کو تسلی دینے کے سے انداز میں کہا۔ جس کے چہرے پر حیرت کا تاثر تھا۔

"میں معذرت خواہ ہوں۔ میں نے غلط کیا جو تمہیں یہاں لے آیا۔"

"نہیں۔ تم نے بہت اچھا کیا۔" ماہ نور نے پُریقین لہجے میں کہا۔

"یہ شخص خبطی ہے نہ سرپھرا اور تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو' مجھے یوں تسلّیاں مت دو۔" ماہ نور کی بات پر سعد چونک گیا۔ اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"ارے یہاں ایک بالکا تھا سائیں کا۔ وہ کدھر گیا؟" اس نے بات بدلی۔ "نہ اس کا الاؤ ہے نہ کاڑھا۔"

پھر اس نے جھونپڑی کے عقب میں اسے جا پکڑا۔

"کیا بات سائیں جی! الاؤ کیوں بجھا دیا۔" سعد نے اس لڑکے کے شانے پر ہاتھ رکھا جو بازو ٹانگوں کے گرد باندھے گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھا تھا۔

اج سک متراں دی ودھیری اے
اج جندڑی اداس گھنیری اے

اس لڑکے نے سعد کے سوال کے جواب میں کہا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"او ہو سائیں جی! کی ہویا؟" سعد گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھا۔

"کچھ نئیں ہویا۔ جا نس جا (جاؤ بھاگ جاؤ)" اس لڑکے نے سعد کو جھڑکا۔

"کوئی سوغات دے دیو۔" سعد شاید اس کو بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ لڑکا چپ چاپ اٹھا اور کچھ فاصلے پر رکھی چنگیر میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔ اس چنگیر پر دسترخوان رکھا تھا۔

"لے جا فقیر دی سوغات لے جا' فقیر دا ڈیرہ دو دن دا' فقیر کدھرے ہور توں کدھرے ہور۔" اس نے چنگیر سے ایک روٹی نکال کر سعد کو پکڑائی۔

"تھینک یو سائیں جی!" سعد نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اسے سلیوٹ کیا۔

"تیرے متھے تے نیلی لڑانے' تے تیرے بھاگ بڑے اچے نیں۔" (تمہارے ماتھے پر نیلی رگ نمایاں ہے اور تمہارے نصیب بہت اچھے ہیں۔)

"چلو ماہ نور!" سعد نے فوراً قدم آگے بڑھا دیے۔

"نس جا نس جا فقیر دی گل نہ سن نس جا کم بخت!" وہ بالکا پیچھے سے بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔

"یہ سب کیا ہے سعد! اور یہ سب کیوں ہے۔" گاڑی میں بیٹھ کر دم لینے کے بعد ماہ نور نے کہا۔

وہ سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے بیٹھا تھا۔

"تم یہ سب کیوں کرتے ہو۔" ماہ نور نے بے اختیار سوال کیا۔

"ایک ازلی و ابدی تنہائی سے نجات کے لیے ماہ نور!" وہ سیدھا ہو کر بولا۔

"کیوں ہے یہ تنہائی' کیسی ہے یہ تنہائی؟" وہ الجھ کر بولی۔

"بتاتا ہوں۔" اس نے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

عنیزہ سیّد

جنوں کی کوہ گراں سے ستم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا، لیکن اس کے کزنزا سے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے، کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے، کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ، ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں، جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور نے "سید پور کلچرل شو" میں شرکت کے لیے اپنی دوست شاہ بانو کے ساتھ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ شاہ

بانو نے اپنے بھائی کی معرفت سید پور میں ماہ نور کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام بھی کیا ہے۔ فاطمہ اور خدیجہ نے ماہ نور کو اسلام آباد میں فلزا ظہور سے ملنے کی تاکید کی۔ فلزا ظہور ان کے بچپن کی ساتھی ہے۔ بچپن میں کوئلے سے فرش اور دیواروں پر تصویریں بنانے والی فلزا ظہور اب ایک بڑی آرٹسٹ ہے مگر اسے شہرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔

مولوی سراج اور آپا رابعہ قصبے میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی سعدیہ کلثوم نویں جماعت کی طالبہ بے حد ذہین ہے۔ مولوی سراج اور آپا رابعہ کو اس بات پر فخر ہے کہ ان کی بیٹی سائنس پڑھ رہی ہے۔

ایک رات سارہ نے رکی کو خواب میں دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ سرکس میں کام کرتا تھا۔ رکی اپنے فن کا ماہر جوکر تھا۔

ماہ نور اور شاہ بانو "سید پور کلچرل شو" میں گئیں تو وہاں انہیں ایک کمہار نظر آیا۔ وہ گیلی مٹی کو بہت مہارت سے دیدہ زیب برتنوں کی شکل میں ڈھال رہا تھا۔ ماہ نور کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہ چونک گئی۔ اسے اس پر اسی شخص کا گمان ہوا جو اسے ہر میلے میں مختلف روپ میں نظر آ رہا تھا۔

سارہ' ماہ نور سے مل کر خوش نہیں ہوئی۔ اس کا رویہ بہت روکھا اور خشک تھا۔

واپسی پر گاڑی میں ماہ نور نے سعد سے اعتراف کیا کہ وہ اب تک جتنا سعد کو جان پائی ہے' سعد اس کی نظر میں ایک قابل رشک انسان ہے' سعد نے اسے سارہ کے متعلق بتایا وہ سرکس دیکھنے گیا تھا۔ سارہ خان بلندی سے نیچے گری تھی۔ اس نے اس کی ہڈیاں ٹوٹتے اور خون بکھرتے دیکھا تھا' وہ وہاں سے واپس آ گیا لیکن سارہ خان کے لیے بے چین رہا۔ وہ دوبارہ اسے ڈھونڈتے ہوئے اس سے ملنے پہنچا تو وہ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور زخم زخم جسم کے ساتھ ایک چھولداری میں پڑی موت کی منتظر تھی۔ اس کے زخموں پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں۔ سعد اس کو وہاں سے لایا اور اس کا علاج کرایا اور پھر اسے فلیٹ میں منتقل کیا۔

کھاری نے آپا رابعہ سے نماز یاد کر لی تھی اور بہت خوش تھا۔ سارہ خان نے پہلی بار سوچا سعد سے اس کا تعلق صرف ترس اور ہمدردی کا ہے اسے اپنا ماضی یاد آ رہا تھا۔ جہاں جاپانی نقش و نگار والا رکی تھا۔ جس کی جاپانی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اس کا باپ اس کے بہن بھائیوں کے ساتھ پھوپھی کے حوالے کر گیا تھا۔ باپ نے دوسری شادی کر لی تو سوتیلی ماں کے مظالم سے تنگ آ کر وہ گھر سے بھاگ گیا اور قسمت اسے سرکس میں لے آئی۔

آپا رابعہ نے مولوی سراج کو بتایا کہ اسکول والوں نے سعدیہ کی پیدائش کی پرچی مانگی ہے تو وہ پریشان ہو گئے۔

ماہ نور' سارہ سے ملنے آئی اور اس نے سارہ کو بتایا کہ اس کی سعد سے صرف چند دن پہلے ملاقات ہوئی ہے۔ یہ سن کر سارہ کا رویہ اس کے ساتھ بدل گیا۔

سعد نے اپنی بہن نادیہ سے اسکائپ پر بات کی۔ وہ فن لینڈ میں بہت مشقت بھری زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کی ماں کا شوہر اس پر بری نظر رکھ رہا تھا۔ اس لیے وہ فن لینڈ آ گئی۔

جیناں بھکارن نے ایک بچہ اغوا کیا لیکن پولیس نے اس سے بچہ برآمد کر لیا۔

ماہ نور کی سعد سے ملاقات ہوئی تو وہ اسے اختر کے پاس لے گیا۔ اختر نے ماہ نور کو دیکھ کر سعد سے کہا "یا تو زن یا من پالو" ایک کی قربانی دینی پڑے گی۔

اس نے ماہ نور سے کہا بی بی آپ کا دل بہت صاف ہے اور زندگی بہت پرسکون ہے لیکن آگے آپ کے لیے بہت مشکلیں ہیں۔

قسط نمبر 7

"مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش ہے جہاں میرا دل لگ جائے۔" سعد کہہ رہا تھا چاہے کچھ دیر کے لیے سہی مگر کہیں لگے تو۔" اس نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"ہوں!" ماہ نور نے ایسے سر ہلایا جیسے بغیر کسی تفصیل کے سعد کی بات پوری طرح سمجھ گئی ہو۔

"تو کیا تمہیں ابھی تک ایسی کوئی جگہ نہیں ملی؟" اس نے پوچھا۔

"شاید نہیں۔" سعد نے گاڑی کے وائپرز بند کرتے ہوئے کہا۔

"شاید؟" ماہ نور نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں!" سعد نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کے سر ہلایا۔ "میں مختلف جگہوں پر اسی لیے جاتا ہوں کہ شاید کہیں میرا دل لگ جائے' مگر کسی جگہ پر اگر میرا دل لگتا بھی ہے تو کچھ دن بعد اوبھ جاتا ہے۔"

"ہوں!" ماہ نور نے گہرا سانس لیا اور سعد کی طرف دیکھا۔ "ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

"شاید اس لیے کہ میں ایک کامپلیکس کا شکار ہوں۔" سعد نے دامن کوہ پر گاڑی پارکنگ میں لے جاتے ہوئے کہا۔

"ایک ایک کپ کافی پی لیں' اگر تمہیں برا نہ لگے تو؟" اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"ہاں پی لینی چاہیے۔" ماہ نور نے اس بار بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کہا۔

باہر فضا بے حد خوشگوار تھی اور آتی بہار کی مسرت سے سرشار پیڑ' پودوں اور درختوں کے سبز رنگوں کے شیڈز کی تعداد ان گنت تھی۔ سعد اسے اسی اوپن ایر ریستوران میں لے آیا جہاں ان دونوں نے پہلی تفصیلی ملاقات کی تھی۔

"اچھا یہ تو بتاؤ' وہ کامپلیکس کیا ہے جس کے تم شکار ہو۔" ماہ نور نے کرسی پر بیٹھنے کے بعد پوچھا۔ انہوں نے ایک ایسی ٹیبل کا انتخاب کیا تھا جو نسبتاً "کونے میں تھی۔ چیئر پر بیٹھنے کے بعد ماہ نور نے پوچھا۔

"وہ یہ ہے کہ میری جینز میں چند ایسی خصلتیں موجود ہیں جو میرے موجودہ اسٹیٹس اور ماحول سے میل نہیں کھاتیں۔" سعد نے ہاتھ میں پکڑے کی رنگ میں موجود ایک چابی کی نوک سے ٹیبل پر بچھے کپڑے کی سلوٹیں نکالتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہاری جینز میں موجود خصلتیں تمہارے پیرنٹس کی طرف سے تمہیں ٹرانسفر ہوئی ہیں۔" ماہ نور نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "پھر وہ تمہارے ماحول اور اسٹیٹس سے میل کیسے نہیں کھاتیں۔"

"ہاں ایسا ہی ہے۔" سعد نے سر ہلایا۔ "مگر میرا ماحول اور میرا اسٹیٹس میرے ڈیڈی کا مرہون منت ہے اور جینز میں موجود یہ چند خصلتیں غالباً" میری ماں سے مجھے ٹرانسفر ہوئی ہیں۔"

"اور تمہاری ماں....؟" ماہ نور نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میری ماں۔" اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھے۔ "میں نے اپنے ہوش میں انہیں ایک بار بھی نہیں دیکھا۔"

"اوہ...." ماہ نور کے ہونٹ سکڑے "کیا ان کی ڈیتھ ہو چکی ہے؟"

"پتا نہیں۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "مجھے ان کے بارے میں کچھ علم نہیں۔"

"یہ کچھ عجیب سی بات نہیں ہے۔" ماہ نور چونک کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ بہت ہی عجیب۔" وہ تلخی سے مسکرایا۔ "میں شاید بہت چھوٹا تھا جب میری ماں کا وجود میری زندگی سے خارج ہو گیا۔" اس نے کہا۔ "جب میں چہرے اور آوازیں پہچاننے کے قابل ہوا' میں نے اپنے گھر میں ایک خاتون کو موجود پایا جس کا رنگ' زبان اور نسل میرے اردگرد موجود لوگوں سے بالکل مختلف تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ اس گھر میں جس میں' میں موجود تھا' وہ ماں تھی ممی.... وہ بہت ینگ تھی' شاید خوب صورت' اسمارٹ اور

طرح دار بھی تھی۔ گھر بھر پر اس کا پورا ہولڈ تھا' ڈیڈی بھی اس کے بے دام کے غلام تھے۔

یہ بے دام کے غلام والی بات اب میرے ذہن میں آتی ہے جو کبھی میں ان دنوں کو یاد کروں تو۔ اس وقت تو ان الفاظ کے نہ ہجے آتے تھے' نہ معنی" وہ مسکرایا۔ "پھر ہمارے گھر میں ایک گڑیا سی بچی آگئی' مجھے بتایا گیا کہ وہ میری بہن ہے۔"

ماہ نور نے اس بات کو سنتے ہوئے سعد کے چہرے کے تاثرات جانچنے کی کوشش کی' وہ آنکھیں سکیڑے سامنے موجود مارگلہ کی پہاڑیوں پر شاید اپنے ماضی کی فلم چلتے دیکھ رہا تھا۔

"میں نے چیزوں کو' رشتوں کو اور جذبوں کو اسی طرح قبول کیا جیسے وہ میرے سامنے بیان کیے جاتے رہے۔ لیکن میں ڈیڈی سے بہت زیادہ اٹیچڈ تھا۔ شاید اس لیے کہ میری رگوں میں ان کا خون دوڑتا تھا' وہ خاتون جو گھر میں ممی کا رول پلے کر رہی تھی۔ اسے اس بات سے سخت چڑ تھی کہ ڈیڈی اور میں ایک دوسرے کا سایہ کیوں بنے رہتے ہیں اور کیونکہ ڈیڈی اس کے بے دام کے غلام تھے۔ اس نے ان سے کہہ کر مجھے صرف چھ سال کی عمر میں بورڈنگ بھجوا دیا۔"

ماہ نور نے دیکھا اس کی سامنے کے منظر پر جمی آنکھوں میں ہلکی سی نمی جھلملا رہی تھی۔

"میں اس باربی ڈول جیسی گڑیا بچی سے بھی بہت زیادہ اٹیچڈ تھا۔ مجھے اس سے بھی الگ کر دیا گیا۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"بورڈنگ کے وہ ابتدائی دن بہت سرد اور ظالم تھے' مگر میں ایک بات سمجھ گیا تھا کہ مجھے وہ دن اسی طرح گزارنے تھے جیسے وہ ایک کے بعد ایک میرے سامنے آتے جا رہے تھے۔ ان سے فرار ممکن نہیں تھا' کیونکہ بورڈنگ کے لیے روانہ ہونے سے پہلے جب میں چاروں ہاتھ پاؤں چلاتا مچل رہا تھا کہ مجھے بورڈنگ نہیں جانا تو ڈیڈی نے میرے کان میں ایک بات کہی۔"

اس نے ذرا توقف کیا۔ ماہ نور نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"انہوں نے کہا کہ ماں یعنی ایک مدر لی فگر' کی جو بات نہیں مانتا وہ کبھی زندگی میں کچھ نہیں حاصل کر سکتا۔"

"عووو!" ماہ نور کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"میں زندگی میں بہت کچھ حاصل کرنے کی خاطر ڈیڈی کی یہ بات مان کر بورڈنگ چلا گیا۔"

"اس لیے کہ تم اپنے ڈیڈی سے اتنے اٹیچڈ تھے کہ ان کی کہی ہر بات تمہارے لیے قول زریں کی حیثیت رکھتی تھی۔" ماہ نور کی زبان بے اختیار پھسلی تھی۔

"طنز کرنے کی نہیں ہو رہی۔" سعد نے تنبیہہ کی اور مسکرا دیا۔ "بات یہ ہے کہ ایک چھ سال کے بچے کو دل کی تسلی کے لیے ہی سہی' ایک جذباتی سہارا درکار ہوتا ہے اور میرے لیے وہ جذباتی سہارا ڈیڈی ہی تھے۔ لہٰذا ان کی کہی ہر بات کو قول زریں سمجھنا ہی میرا آخری چارا تھا۔"

"اچھا... پھر آگے چلو۔" ماہ نور نے کافی کے کپ پر ہاتھ کی انگلیاں جما کر اس کی حدت کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"اس سے آگے کیا ہو سکتا تھا۔" سعد نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "اس سے آگے ہی تو یہ ہوا کہ بہت سارے لوگوں میں بھی میرا دل لگنا ممکن نہیں رہا۔ میں نے بورڈنگ میں پہلے دو سال روتے دھوتے گزارے' تیسرے سال میں مدر لی فگر' جس کی بات نہ ماننے پر میں زندگی میں سب کچھ ہار سکتا تھا۔ ڈیڈی کو چھوڑ کر اپنے

ڈیپ چلی گئی۔"

"کیوں؟" ماہ نور نے بے ساختہ پوچھا۔

"اسے پتا چلا تھا' وہ ڈیڈی جیسے شخص کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔"

"اوہ میرے اللہ!" ماہ نور نے کپ میز پر رکھ دیا۔ "اور وہ جو چھوٹی سی گڑیا تھی۔ اس کا کیا ہوا؟"

"وہ بے چاری بھی میری طرح ماں کی شکل و صورت سے ناآشنا اس گھر میں ایک فلپائنی آیا کی آغوش میں پلنے لگی۔"

"کیوں بھئی؟" ماہ نور کے لہجے میں احتجاج تھا۔ "اس کی ماں اسے اپنے ساتھ لے کر کیوں نہیں گئی؟"

"اس لیے کہ اسے ڈیڈی سے متعلق ہر چیز سے نفرت ہو گئی تھی۔" سعد عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

"تمہارے ڈیڈی۔" ماہ نور نے ناک سکیڑی۔ "معاف کرنا کچھ عجیب سی شخصیت لگتے ہیں' جن کا دو میں سے ایک بھی بیوی کے ساتھ گزارا نہیں ہوا۔"

"شاید ایسا ہی ہے۔" سعد نے سر ہلایا۔

"پھر کیا ہوا؟" ماہ نور کے لہجے میں تجسس کی آمیزش جھلکنے لگی۔

"پھر وہ گڑیا بھی جب تھوڑی بڑی ہوئی اسے کانونٹ بھیج دیا گیا۔ وہ بھی بورڈنگ کی نذر ہو گئی۔" سعد کے چہرے پر ایک بار پھر تلخی ابھری۔ "میری طرح وہ بھی ایسی طویل چھٹیوں کے انتظار میں دن گزارنے لگی' جب گھر کے مزے جی بھر کے لوٹے جا سکتے تھے' جب ہم دونوں اکٹھے ہوتے تھے اور ہماری دلچسپیاں ایک سی ہوتی تھیں۔"

"اوہ گڈ!" ماہ نور مسکرائی۔ "شکر ہے اس کہانی میں کوئی لائٹ موڈ بھی آیا۔"

"فکر نہیں کرو' لائٹ موڈ ابھی ہوا ہی چاہتا ہے۔" سعد نے فوراً" تردید کی۔

"وہ کیسے؟" ماہ نور کو مایوسی ہوئی۔

"وہ ایسے کہ جب وہ گڑیا تیرہ سال کی ہوئی' مدر لی فگر اچانک آن وارد ہوئی اور اس نے دعوا کیا کہ وہ اپنی بیٹی کو لے کر ہی جائے گی۔"

"کیوں اس کو اچانک بیٹی کی یاد کیوں آگئی؟"

"پتا نہیں... مگر اس کا ارادہ پکا تھا اور وہ اس بے چاری کو زبردستی اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب بھی ہو گئی۔"

"تمہارے عجیب و غریب والد نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی۔"

"کی تھی' مگر اس خاتون نے ایک ایسی بات کر دی کہ والد صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔"

"ہیں۔" ماہ نور نے کہا۔ "وہ کیا بات تھی؟"

"اس نے کہا کہ وہ بچی ڈیڈی کی تھی ہی نہیں۔ وہ ان خاتون کے کسی اور صاحب سے تعلق کا نتیجہ تھی۔"

"اوہ مائی گاڈ!" ماہ نور کو جیسے بری طرح شاک لگا۔ "کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟" وہ آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

"ہاں ایسا بھی ہو سکتا ہے' بلکہ اس سے زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔" سعد اس کی حیرت پر مسکرایا۔

"استغفار!" ماہ نور نے بمشکل تھوک نگلا۔ "اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے۔"

"کیا اس کی یہ بات سچ تھی؟" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ماہ نور نے پوچھا۔ اسے یہ بات ہضم نہیں ہو پا رہی تھی۔

"ڈیڈی کو کچھ لوگوں نے ڈی این اے ٹیسٹ کا مشورہ دیا' مگر وہ نہیں مانے' وہ اتنے طیش میں تھے یا انہیں اتنا طیش دلا دیا گیا تھا کہ وہ چاہتے تھے فی الفور یہ بچی ان کی زندگی سے دور چلی جائے۔"

"سوسیڈ!" ماہ نور نے تاسف سے سرہلایا۔ اس سارے میں اس بے چاری کا کیا قصور تھا۔ جس کی آئیڈینٹیٹی (شناخت) ہی مشکوک بنادی گئی۔

"ان خاتون نے جھوٹ بولا تھا' وہ بچی ڈیڈی ہی کی بیٹی تھی' یہ ڈیڈی نے کچھ عرصے بعد ہی محسوس کرلیا تھا۔"

"وہ کیسے؟"

"کیونکہ کچھ عرصہ کے بعد ہی ڈیڈی کو اپنی اولاد کی جینٹک (وراثت میں ملنے والی) خوبیوں اور خامیوں کا انالسس (تجزیہ) کرنے کا مراق ہوگیا اور ان پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ وہ بچی کچھ ایسی جینٹک خوبیاں رکھتی تھی جو ان سے stem out (نکلی) تھیں۔"

"پھر انہوں نے یہ محسوس کرلینے کے بعد بچی کو دوبارہ اپنی تحویل میں لینے کی کوشش نہیں کی؟"

"نہیں۔" سعد تلخی سے مسکرایا۔ "وہ اپنی زندگی کے اس چیپٹر سے بالکل بے زار ہوچکے تھے۔ انہوں نے بچی کو اس کے حال پر چھوڑدیا۔"

"اوہ!" ماہ نور کو ایک مرتبہ پھر مایوسی ہوئی۔ "پھر اب وہ بچی کہاں ہے' کس حال میں ہے' اس کی identity (شناخت) کیا ہے' کچھ جانتے ہو اس کے بارے میں؟"

"ہاں۔ جانتا ہوں۔" سعد نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کیا۔؟"

"ڈیڈی نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔ اس کی Identity پر' کیونکہ وہ نادیہ بلال کی آئی ڈی کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے' اس کے پاسپورٹ پر' اس کے تمام ڈاکومنٹس پر ولایت کے خانے میں ڈیڈی کا نام درج ہے۔ شاید ڈیڈی اسے اتنی ہی قبولیت دے سکتے تھے۔"

"اب کہاں ہے وہ؟"

"وہ کوئی بہت اچھی زندگی نہیں گزار رہی' اس کی ماں نے اسے اپنے نئے شوہر' نئے بچوں' نئے گھر اور نئی زندگی سے کک آؤٹ کردیا ہے۔ وہ سیلف سپورٹ اور چند وظائف کے ساتھ ایک بہت چھوٹے سے ملک میں انتہائی تکلیف دہ موسم کا مقابلہ کرتی تعلیم حاصل کررہی ہے۔ اسے بغیر کسی سہارے' رشتے اور تعلق کے احساس کے بغیر اپنی زندگی گزارنی پڑرہی ہے۔" سعد نے سر جھکا کر کہا۔

"کبھی کبھی انسان کو ایسی زندگی بھی گزارنا پڑتی ہے' جو اگر اس کو چوائس کا حق دیا جائے تو وہ کبھی انتخاب نہ کرے۔" سعد نے افسردگی سے کہا۔

"کیسی عجیب سی زندگی' الجھنیں ہی الجھنیں۔" ماہ نور بے مزا ہوگئی۔

"مگر یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ تمہارا دل کیوں نہیں لگتا؟" پھر اسے اصل بات یاد آئی۔

"یہ الجھنیں دیکھ کر بھی پوچھ رہی ہو۔" سعد ہنسا۔ "ڈیڈی کو جب سے یہ مراق ہوا ہے کہ اپنی اولاد کی جینٹک خوبیاں اور خامیاں پرکھیں انہیں اندازہ ہوتا رہا ہے کہ مجھ میں اپنی والدہ کی جینز کا اثر بدرجہ اتم پایا جاتا ہے کیونکہ میری والدہ جنہیں میں نے دیکھا بھی نہیں کسی گانے بجانے والی فیملی سے تعلق رکھتی تھیں۔

کبھی ان کو یاد آتا ہے کہ میرے مادرانہ آباؤاجداد جو تھے۔ ان میں سے ایک نسل گاتی بجاتی تھی' ایک کمہار تھی' ایک ترکھان تھی' کچھ خانہ بدوش تھے اور اکثر پیر فقیر اور یہ ساری جو صلاحیتیں ہیں مجھے منتقل ہوگئی ہیں۔"

"تمہارے ڈیڈی ہیں کیا چیز؟" ماہ نور کو سخت چڑ محسوس ہوئی۔ "اگر وہ اتنا ظالمانہ تجزیہ کرتے ہیں تمہاری والدہ کی فیملی کا تو کبھی ان سے پوچھو' انہوں نے تمہاری والدہ سے شادی ہی کیوں کی تھی؟"

"ہم براہ راست سوالوں' جوابوں میں نہیں پڑتے۔" سعد نے مسکرا کر کہا۔ "ہم ایک دوسرے کے بارے میں قیافے اور اندازے لگا کر آگے بڑھتے ہیں' ایک دوسرے کی باڈی لینگویج کو جج کرتے ہیں اور بالواسطہ الفاظ کے داؤ پیچ آزما کر ایک دوسرے کو چت کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔"

"یہ کیوں؟"

"یہ عجیب سا رشتہ خود بخود ہم دونوں کے درمیان بن گیا ہے۔ ڈیڈی مجھ سے اس بات پر نظر چراتے ہیں کہ کہیں میں اپنی ماں کے بارے میں وہ سوال نہ کرڈالوں جو تم نے کیا' اور میں اس بات سے کہ کہیں ایسے کسی سوال کے جواب میں مجھے کسی ناقابل برداشت حقیقت کا سامنا نہ کرنا پڑجائے۔

لیکن ان ساری حقیقتوں اور واقعات نے میرے مزاج کو بنایا کم بگاڑا زیادہ ہے۔ میں جہاں ہوتا ہوں خود کو وہاں اجنبی محسوس کرتا ہوں' مجھے وہاں سے تعلق محسوس نہیں ہوتا' میں بہت سی جگہوں پر وہاں کے ماحول میں ڈھلنے کی کوشش محض اس لیے کرتا ہوں کہ شاید کوئی جگہ مجھے خود میں سمالے' میں کہیں خود کو جذب ہوتا محسوس کرلوں' مگر ایسا نہیں ہوتا' ابھی تک ایسا نہیں ہوا۔ میں سرگرداں ہوں' تلاش میں ہوں۔ شاید۔ کبھی کہیں ایسا ہوجائے۔"

ماہ نور نے نظریں اٹھا کر اس ـــــ کو غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا۔

"مگر اس تلاش میں یہ ضرور ہوا کہ مجھے مختلف لوگوں کو جاننے اور سمجھنے کا موقع مل گیا۔" وہ ایک لمبا سانس لینے کے بعد گویا ہوا' "اور یہ مشغلہ مجھے اتنا اچھا لگا کہ مجھے اس کا چسکہ پڑگیا اور میں اب دانستہ زندگی کی روٹین سے چند دنوں کا آف لے کر اپنا شوق پورا کرتا رہتا ہوں۔" وہ مسکرایا۔

ماہ نور کے ذہن میں موجود کئی گتھیاں جیسے ایک دم سلجھ گئیں۔

"ابھی بھی میں نے آف لیا ہوا ہے۔" اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ "جب ہی تو کہہ رہا تھا کہ دن تیزی سے گزرتے جارہے ہیں۔"

"آف ختم ہوگیا تو کیا کروگے؟" ماہ نور نے کہا۔

"ڈیڈی کی بزنس اسٹیٹ کے معاملات میں غرق ہوجاؤں گا اور کیا۔" وہ ہنسا۔

"تمہارے ڈیڈی۔" ماہ نور نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔ "جن سے تمہارا تعلق عجیب سا ہے۔ جن کے بارے میں تم قیافے اور اندازے لگا کر آگے بڑھتے ہو' جن کی باڈی لینگویج کو جج کرتے ہو اور جنہیں الفاظ کے داؤ پیچ کے ذریعے چت کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہو۔ ان کی بزنس اسٹیٹ کے معاملات میں غرق ہوجاؤ گے؟" اس نے سوال کیا۔

"ہاں!" وہ ٹیبل سے کی رنگ اور سن گلاسز اٹھاتے ہوئے بولا۔ "اس لیے کہ مجھے ان سے شدید محبت ہے۔"

فضا میں ایک دم سناٹا سا چھا گیا۔ ڈھلتی سہ پہر سورج کی عدم موجودگی کے باعث اچانک خنکی کی چادر تن گئی۔ ماہ نور نے پیڑوں کے پتوں کو ہولے ہولے چلتی خوش گوار ہوا کے سنگ آہستگی سے ہلتے دیکھا اور پھر سعد کو مخاطب کیا جو اٹھ کر چند قدم آگے جاچکا تھا۔

"سنو!" اس نے پکارا اور سعد کے چلتے قدم رک گئے۔

"ہوں۔" اس نے گردن موڑ کر پوچھا۔

"کیا یہ سب تم نے پہلے کبھی کسی کے ساتھ شیئر کیا ہے؟"

وہ کچھ دیر یوں ہی گردن موڑے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک لفظ میں جواب دیا "نہیں۔" اور سن گلاسز آنکھوں پر لگا کر دوبارہ آگے چلنے لگا۔

ماہ نور نے ایک لمحے کے لیے رک کر اس کے جواب پر غور کیا اور پھر سر جھکا کر اس کے پیچھے چلنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"آج مولوی صاحب کی بیوی آئی تھی ہماری طرف۔"

صابرہ نے چوہدری سردار کو مطلع کیا۔ چوہدری سردار کبھی کبھار ہی گھر کی طرف آتے تھے۔ ان کا زیادہ تر قیام فارم ہاؤس میں رہتا تھا اور صابرہ کا دل فارم ہاؤس میں کبھی نہیں لگتا تھا۔ انہیں گاؤں کے اندر بنا اپنا گھر جس میں وہ ہمیشہ سے رہتی آئی تھیں بہت اچھا لگتا تھا۔ یہاں گاؤں کی اکثر عورتیں ان کے پاس بلا روک ٹوک جب دل چاہے آسکتی تھیں، جبکہ فارم ہاؤس گاؤں سے نسبتاً" باہر تھا جہاں جانے کے لیے خصوصی تردد کرنا پڑتا تھا اور اندر داخل ہونے کے لیے کئی طرح کی چیکنگ کے مرحلے سے بھی گزرنا پڑتا تھا۔ صابرہ کو ان دیہاتی خواتین کی سنگت کی عادت سی ہوگئی تھی، اسی لیے فارم ہاؤس میں ان کا دل گھبراتا تھا اور وہ ادھر ہی خوش رہتی تھیں۔

"مولوی صاحب کی بیوی تو کبھی ادھر کو نہیں آئی شاید۔" چوہدری سردار نے دانتوں میں خلال کرتے ہوئے یاد کیا۔

"ہاں سنا تھا بڑی دماغ والی ہے، کبھی کم ہی کسی کے گھر جاتی ہے، نہ میلاد پڑھتی ہے، نہ کبھی کسی کی محفل میں شریک ہوتی ہے۔" صابرہ کے چہرے پر ایک تمسخرانہ سی مسکراہٹ ابھری۔

"تو اب کیسے آگئی ہمارے گھر؟" چوہدری صاحب نے کبھی صابرہ سے ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ مولوی سراج پر کیسا ہاتھ رکھتے تھے۔

"کہہ رہی تھی کہ بیٹی نے نویں کا امتحان دینا ہے اور اسکول والے پیدائش کی پرچی مانگ رہے ہیں داخلہ بھجوانے کے لیے۔" صابرہ نے کہا۔

"تو؟" چوہدری صاحب کا دانت خلال کرتا ہاتھ لحہ بھر کو رکا اور انہوں نے صابرہ کی طرف دیکھا۔

"تو یہ کہ اس کے پاس بچی کی پیدائش کی پرچی نہیں ہے۔ پتا نہیں پیدائش درج نہیں کرائی کہ پرچی گم ہوگئی۔" صابرہ نے سرہلایا۔ "جو بھی ہوا بس پرچی نہیں ہے ان کے پاس اور اس کے بغیر داخلہ نہیں جانا بچی کا۔"

"اوہو تو جہاں بچی کی پیدائش ہوئی تھی، وہاں جاکر یونین کونسل میں درخواست دیں۔" چوہدری صاحب نے سیدھا حل بتایا۔

"وہ تو کہہ رہی تھی، چوہدری صاحب سے کہیں پرچی بنوادیں۔"

صابرہ کو چوہدری صاحب کا مشورہ ذرا نہ بھایا۔ مولوی صاحب کی مزاج دار بیوی کا کام کرکے اس پر احسان چڑھانے کا خوب موقع ہاتھ آیا تھا۔

"لو چوہدری صاحب کیسے بنوادیں بھئی پرچی؟" چوہدری سردار کو الجھن سی ہوئی۔ "مجھے کیا پتا لڑکی کی پیدائش کہاں اور کب ہوئی تھی۔"

"وہ آپ ان سے پوچھ لیں، مولوی صاحب سے۔" صابرہ نے بے نیازی سے کہا۔ "کہہ رہی تھی، نہیں تو لڑکی کا سال ضائع ہوجائے گا۔"

"اوہو بھئی۔ لوگوں کو بھی کیسے کیسے کام پڑجاتے ہیں۔" چوہدری صاحب جھنجلا کر بولے۔ "اب یہ کہہ کر کہ لڑکی کا سال ضائع ہوجاتا ہے میرے سر پر سوار کرادی بات۔" چوہدری صاحب نے جیب سے سیل فون نکالتے ہوئے کہا۔

"او ماسٹر جی۔ ذرا کھاری کو بھیجو مولوی سراج کی طرف، بولو لڑکی کے سارے کوائف کاغذ پر لکھ کر بھیجیں۔ ان کی سنو، داخلے کا وقت سر پر آیا کھڑا ہے۔ ان کو اب یاد آیا۔ پیدائش کی پرچی بنوانی ہے ابھی۔" چوہدری صاحب

ماسٹر کمال کو ہدایات دیتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"اور ان کو یہ بھی کہہ دو لیٹ فیس کے ساتھ بھی داخلہ بھیجنا پڑا تو بھیجیں گے ضرور۔ بچی کا سال نہیں مرنے دیں گے۔"

"تو میں نے سوچا تھا پرچی بنوا کر میرے ہاتھ میں دیں گے اور میں اس نخرے والی بی بی کو بلا کر چار احسان چڑھا کر اس کے حوالے کروں گی۔" انہوں نے کھاری کو آگے لگادیا۔" صابرہ نے یہ گفتگو سن کر سوچا اور ناک چڑھائی۔

"ایک تو یہ کم بخت کھاری ہمارے سر پر چڑھا بیٹھا ہے، جو گھر کا کام ہے کھاری ہی کرے، کوئی اور نہیں کرسکتا۔" انہوں نے سر جھٹکا۔ "پر ہے نگوڑا بڑا شریف اور تابع دار۔" میرے کام تو بھاگ بھاگ کر کرتا ہے، ایک بار پیغام بھیجوں، دوڑ کر میری طرف آتا ہے، دوسرے ہی لمحے انہوں نے محبت سے سوچا "جیتا رہے ہمارے تو ڈیرے کی رونق ہے بھلا مانس۔" انہوں نے سوچا اور چوہدری صاحب سے مخاطب ہوئیں۔

"میں سوچ رہی ہوں۔ لاہور رہ آؤں دو دن۔ فائزہ کا فون آیا تھا، کہہ رہی تھی دو، تین نئی دکانیں بنی ہیں بڑی بڑی، آکر دیکھ لیں۔"

"دکانیں مالز بیگم صاحبہ، شاپنگ مالز۔" چوہدری سردار نے۔

"او آہو۔" وہ جھنجلائیں۔ "وہی ہوں گے، اس بار کھاری کو میں نے ساتھ لے کر جانا ہے، اسے بڑی پہچان ہوگئی ہے لاہور کے راستوں کی۔"

"نہیں بھئی۔ کھاری نہیں جاسکتا۔ اس کے بغیر یہاں کام نہیں چلتا۔" چوہدری صاحب نے نفی میں سرہلایا۔

"اس دفعہ میں نے بھی کھاری کو ہی لے کر جانا ہے۔ آپ دوسرے بندوں پر کام ڈالیں گے تو انہیں کام چلانے کی عادت پڑے گی نا۔" صابرہ نے بھی جیسے ٹھان لی کہ اپنی مرضی چلائیں گی۔

"چلو جب خیر سے جانے کی تیاری کروگی تو دیکھیں گے۔" چوہدری صاحب نے بحث ختم کی اور اٹھ کر صحن میں چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

"میری زندگی میں تو کوئی اتار چڑھاؤ کبھی آیا ہی نہیں، میں جیسی زندگی بچپن سے گزارتی آئی ہوں، زندگی ابھی بھی ویسی ہی ہے، سادہ اور سیدھی۔ میرے گھر کا ماحول بھی ویسا ہی ہے جیسا بچپن میں، میں نے پایا۔ لگی بندھی روٹین، ممی اور بابا دونوں جاب کرتے تھے، مگر دونوں ہی میرے اور سلمان کے معاملے میں بے حد کیئرنگ رہے، ہمیں کیا کرنا چاہیے، ہمیں کیا کرنا منع ہے، اس کا سبق بچپن سے ہی گھول کر پلا دیا گیا۔ گھر کا ہر فرد دن بھر جہاں بھی رہا، مغرب کی اذان کے بعد اسے گھر سے باہر رہنے کے لیے خصوصی اجازت لینا پڑتی تھی اور اب بھی لینی پڑتی ہے۔ میں اور سلمان جو نیا دوست بنائیں، اس کی تفصیل سے ممی کو آگاہ کرنا انتہائی ضروری ہے۔ لنچ ہر فرد الگ الگ ٹائم پر لے سکتا ہے۔ مگر ڈنر پر سب کا موجود ہونا ضروری ہے، وہی پرانا مقولہ کہ جو فیملی اکٹھے کھانا کھاتی ہے۔ ہمیشہ اکٹھی رہتی ہے، پر سختی سے یقین کیا اور کروایا جاتا ہے۔

تم خود سوچو، اتنی کیلکولیٹڈ زندگی میں جہاں اتفاقات اور حادثات کا دور، دور تک کوئی چانس نہ ہو، مجھے اگر ایک ہی شخص مختلف حلیوں اور مختلف Traits کے ساتھ مختلف جگہوں پر نظر آئے گا تو میرے حواس خمسہ کا جواب دے جانا لازمی ہوگا یا نہیں؟" سعد کو ماہ نور سے سنی باتیں یاد آرہی تھیں، اس نے انتہائی سادگی سے اپنا تعارف کرایا تھا۔

"مجھے اپنے سردار چاچا سے بہت محبت ہے اور چاچی صابرہ سے بھی ہمان دونوں کا کوئی بچہ نہیں۔ اس لیے وہ مجھے

اور سلمان کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ مجھے کچھ زیادہ' کیونکہ مجھے سلمان کی نسبت گاؤں کا ماحول زیادہ پسند ہے۔ سردار چاچا نے میری خاطر ہی اس بندر والے کو ایکسٹرا پیسے اور گندم کی بوری دے کر گاؤں بلوایا تھا۔ کھاری بے چارہ تو مان ہی گیا تھا کہ وہ بندر والا پہلے والا بندر والا ہی تھا' کیونکہ اس کی باندری لولی تھی اور باندر بھینگا۔" یہ بات سناتے ہوئے اس کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا تھا۔

"تمہیں کھاری سے ملنے کا اتفاق ہو تو پتا چلے کہ وہ کتنا معصوم اور بے ریا ہے' جب ہی تو فٹافٹ مان گیا کہ بندر والا وہی تھا۔ کھاری نے ہی میلے والے سائیں سے بات کرنے کا بندوبست کیا تھا۔ بڑا ہی دلچسپ لڑکا ہے کھاری۔" وہ کہہ رہی تھی اور سعد محویت سے اسے دیکھتا رہا تھا۔

"شاید تمہیں علم نہیں کہ تم بھی کتنی معصوم اور بے ریا ہو۔" اس نے کروٹ بدل کر سوچا۔ "اختر تو تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا تا' لیکن دیکھا اس نے تمہارے بارے میں کتنا صحیح تجزیہ پیش کیا' مگر خدا نہ کرے جو اختر کی پیشن گوئیاں بھی تمہارے لیے درست ثابت ہوں۔" دوسرے ہی لمحے اس نے گھبرا کر سوچا۔

اختر کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا' ایک بات سے دوسری پر' ایک موضوع سے دوسرے پر مینڈکوں کی طرح چھلانگیں لگاتا رہتا ہے۔ میں نے برا کیا جو تمہیں اس کے پاس لے گیا۔ اللہ نہ کرے کہ تم جو اتنی سیدھی سادی زندگی گزار رہی ہو' تمہیں کبھی کہیں کسی مشکل سے دوچار ہونا پڑے۔ مجھے تو تمہاری صاف' پُرسکون اور ٹھہری ہوئی سیدھی سادی زندگی پر رشک آرہا ہے۔ اللہ نہ کرے جو تمہاری ایسی زندگی کو کسی کی نظر لگے۔"

وہ سوچ رہا تھا اور اس کے تصور میں ماہ نور کے مختلف روپ آرہے تھے۔

گاؤں کے کھلے میدان میں بے ترتیب بالوں اور سادہ سے حلیے میں بھٹہ کھاتی لڑکی جس نے اس سے بندر کا تماشا دکھانے کی درخواست کی تھی اور جو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اپنے بھائی اور کزن کے ساتھ انگریزی زبان میں جو گفتگو وہ کر رہی تھی' اس کا ایک ایک لفظ اس کے سامنے کھڑے بدحلیہ' میلے سے گندے سندے کپڑے پہنے بندر والے کی سمجھ میں آرہا تھا۔

منگو کے میلے میں اس لڑکی نے ہلکے فالسئی اور سفید رنگ کے امتزاج سے بنے پرنٹ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ ہلکے فالسئی رنگ کے لان کے بڑے دوپٹے کے چاروں طرف سفید لیس لگی تھی اور اس دوپٹے سے اس نے اپنا سر اچھی طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ہلکے نیلے رنگ کا فلاسک تھا اور دوسرے ہاتھ میں دھوپ کا چشمہ' وہ لڑکی جو اس کی آواز کی مٹھاس کا راز جاننا چاہ رہی تھی۔ اس کا حلیہ اسے اب تک نہیں بھولا تھا۔

سید پور میلے میں کمہار کے چاک پر نظر رکھے اس کے ہاتھوں کو دیکھ کر چونکنے والی لڑکی نے تنگ موری کی نیلی جینز پر کھدر کا ہلکا نیلا کرتا پہنا ہوا تھا' جس کے گلے پر ہلکے نیلے رنگ ہی میں کڑھائی ہوئی تھی اور اس نے گہرے اور ہلکے نیلے رنگ کے امتزاج کا اسکارف بھی گلے کے گرد لپیٹا ہوا تھا' اس کے ایک بازو پر گہرا نیلا سویٹر لٹک رہا تھا۔ کمہار نے ایک ہی نظر میں اس کے کینوس کے نیلے رنگ کے جوتوں سے اس کے گندمی بھورے بالوں تک اسے دیکھا بھی تھا اور پہچانا بھی تھا۔ وہ کمہار کو دیکھ کر بوکھلائی تھی اور گھبرا بھی گئی تھی۔ اس کی نظروں میں ایک بے نام سا خوف تھا' وہ اسے بھوت سمجھی تھی یا کوئی بلا جو یوں اس سے ٹکراتی تھی۔ سعد کو لگا وہ عمر بھر ماہ نور کے ان تاثرات کو بھلا نہیں پائے گا جو سید پور کے میلے میں کمہار کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ظاہر ہوئے تھے۔

اور وہ دن جب اس نو آموز آرٹسٹ کی پہلی تصویری نمائش منعقد ہوئی تھی سیاہ ٹراؤزر اور میرون شرٹ' سیاہ آویزے اور سیاہ میرون اسکارف میں پہلی بار سعد نے اسے ڈھنگ اور سلیقے سے تیار ہوئے دیکھا تھا' اس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک سجی تھی اور بالوں میں سلیقے سے برش کیا گیا تھا۔ اس کے چہرے پر وہ فطری اضطراب تھا جو ایک نو آموز آرٹسٹ کے چہرے پر اپنے کام کی پہلی نمائش کے موقع پر ہو سکتا تھا۔ وہ ان اتفاقات کو جھٹلا نہیں سکتا

تھا جو اس لڑکی کا بار بار سامنا کروا رہے تھے۔ اس نے ایک مختصر چکر لگا کر اس کے چار کول اسکیچز کا جائزہ لیا' نو آموزی اور ناپختگی اس کے کام میں صاف اپنی جھلک دکھا رہی تھی' لیکن وہ خود کو اس کا ایک اسکیچ خریدنے کی بات کرنے سے روک نہیں پایا تھا اسے صرف یہ جاننے کی دھن سوار ہو چکی تھی کہ ایک نارمل انسان کے حلیے میں وہ اس کو پہچان سکتی تھی یا نہیں یا پھر شاید وہ اس کے چہرے پر اُتری حیرت اور اس کی آنکھوں کی بے یقینی کا ایک بار پھر نظارہ کرنا چاہتا تھا اور وہی ہوا جس کی وہ توقع کر رہا تھا۔

اس کو اس نارمل حلیے میں دیکھ کر بھی وہ پہچان گئی تھی' نا صرف پہچان گئی' بلکہ چکرا کر رہ گئی تھی۔ سعد کو لگا اس آمنے سامنے میں وہ ماہ نور کو پچھلی تمام ملاقاتوں سے زیادہ سمجھ پایا تھا اور اس تعارف میں اسے سب سے زیادہ مزا بھی آیا تھا۔

اس کے بعد وہ اس سے کبھی مل بھی پائے گا یا نہیں۔

اسے اس بات کا خیال بھی آیا تھا۔ کیونکہ ایک ہی طرح کے اتفاقات کا سلسلہ بہت دراز نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اسی شام میوزک فیسٹول کے ہزاروں کے مجمع میں وہ بھی موجود ہوگی اور ایک بار پھر اس کو پہچان لے گی۔ اس کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اسی بلیک ٹراؤزر' میرون شرٹ' بلیک اور میرون اسکارف اور میرون اور بلیک پل اوور میں ملبوس وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے پوچھ رہی تھی وہ کون تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر وحشت تھی' آنکھوں میں ہرنی کی سی حیرت اور خوف تھا۔ وہ تماشائی تھی۔ بے خبر تھی کہ اس کی یہ بے خودی اسے تماشا بھی بنا سکتی تھی۔

سعد کو اس کا یہ روپ' اس کے تمام گزشتہ رویوں سے اچھا لگا تھا۔ ایک لمحہ کو اس کا دل چاہا تھا کہ وقت وہیں رک جائے۔ اردگرد سے اٹھتی آوازیں اور چمکتی روشنیاں بند ہو جائیں' وہاں پر صرف وہ اور چیختی چلاتی' سوال کرتی وہ وحشت زدہ لڑکی موجود ہو' مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ اسے اس سے اپنا بازو چھڑانا پڑا تھا۔ مجمع کا دھیان کسی دوسری طرف مبذول کروانا پڑا تھا۔ فوک فیسٹول میں بدلیسی گوتا گا کر اس نے سب کی توجہ سے وہ منظر ہٹانے کی کوشش کی اور کامیاب رہا تھا۔

"واہ لڑکی! تم بھی خوب ہو' تمہاری حیرت نے مجھ سے کیا' کیا حرکتیں سرزد کروائیں۔" وہ کروٹ بدل کر سیدھا ہوا اور مسکرا دیا۔

"یہ سب سن کر مجھے جو بھی محسوس ہو رہا ہے' وہ نفرت تو ہرگز نہیں ہے۔" پھر اس کی سماعت سے ماہ نور کی آواز ٹکرائی۔

"تمہارے اس جملے نے ہمیں اچھے دوست بنا دیا۔" اس نے دل ہی دل میں ماہ نور کو مخاطب کیا۔ "دیکھا کیسے مجھے تمہارا ہر رنگ' ہر روپ یاد ہے۔"

اور تمہارے یہاں سے چلے جانے کے بعد میں تمہیں بہت مس کروں گا۔ یہ تو ڈن ہے۔" اس نے سوچا۔

"چلو خیر۔ یہ تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ زندگی ملنے اور بچھڑنے کا ہی تو نام ہے۔ تم یہاں رہو یا کسی دوسرے شہر میں میرے کانٹیکٹس کے بہترین دوستوں کی لسٹ میں تمہارا نام تو شامل ہی رہے گا۔" اس نے دائیں طرف کروٹ بدلی اور پھر آنکھیں بند کر کے سو گیا۔

☼ ☼ ☼

"چلو جی مولوی جی! چوہدری صاحب کا سدا (پیغام) آیا ہے جی!" کھاری نے مسجد کے صحن میں بچھی چٹائیوں پر بیٹھے اشخاص سے مخاطب مولوی سراج سرفراز کی گفتگو میں رخنہ ڈالتے ہوئے کہا۔ مولوی سراج سرفراز کے بڑے

سے جسم میں موجود ننھا سا دل حلق میں آگیا۔

"ہیں جی چوہدری صاحب نے؟" انہوں نے اس کھاری کو عزت دینے کی کوشش کرتے ہوئے سوال کیا جو اس وقت مسجد کا عام نمازی نہیں چوہدری صاحب کا پیغامبر بن کر آیا تھا۔

"ہاں جی' چوہدری صاحب نے بلایا ہے جی۔" کھاری نہ جانے کیوں اس صورت حال پر خوش نظر آرہا تھا۔ یوں جیسے مولوی صاحب کو چوہدری صاحب کا مہمان بننے کا شرف اس کی وجہ سے ملنے والا تھا۔

"پر کھاری بیٹا! جھٹ گزرتا ہے کہ اذان کا وقت ہونے والا ہے۔" مولوی صاحب نے حلق میں اٹکا تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ نہ جانے کیوں انہیں اس بلاوے میں اپنا تبادلہ نظر آنے لگا تھا۔

"او نئیں جی۔" کھاری نے ہاتھ کے اشارے سے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "چوہدری صاب نے ٹیم (ٹائم) دیکھ کے ہی گھلیا (بھیجا) ہے مجھے' بولے کھاری پتر عصر توں پہلے پہلے مولوی صاب نوں بلا لیا' بڑا ضروری کام ہے۔"

"اچھا جی!" مولوی صاحب نے اپنی سرمہ لگی آنکھیں اپنے مخاطبین سے چراتے ہوئے صورت حال پر غور کیا اور انہیں محسوس ہوا کہ کھاری کی بات مانے بغیر چارہ نہیں۔

"او مولوی جی! جلدی کرو' چوہدری صاب نے فیر لاہور کے لیے نکل جانا ہے۔ ادھر لاہور کے بڑے افسر کے پتر ہوراں کا ولیمہ ہے چوہدری صاب نے وہ اٹینیٹ (اٹینڈ) کرنا ہے۔" کھاری نے جلدی کا شور مچا کر مولوی سراج سرفراز کو مزید بوکھلا دیا۔ وہ اپنا صافہ سنبھالتے اٹھے اور سر پر بندھے کپڑے کو کھول کر دوبارہ باندھنے لگے۔

"موٹر سیکل تے آیا آں آپ کو لینے' چوہدری صاب نے کہا تھا کھاری پتر اینج واپس آئیں جس طرح الاہما (شکایت) آتا ہے۔"

مولوی صاحب نے اپنا سرخ رنگ کا گھسا ہوا کھسا پاؤں میں پھنسایا اور چلو جی جناب کرتے مسجد کے صحن سے باہر نکل گئے۔

کھاری کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھے بیٹھے مولوی صاحب کو جتنی سورتیں اور دعائیں یاد تھیں سب پڑھ ڈالیں۔

"یا مولا! بڑی مشکل سے ایک مستقل اور مکمل ٹھکانا رہنے کو میسر ہوا ہے۔ لوگ باگ عزت کرتے ہیں' پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا ہے۔ زندگی گزارنے کی چھوٹی موٹی سب ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔ بی بی اور بچی کے سر پر عزت کی چھت تنی ہے۔ میرے پیارے مولا اس ٹھکانے سے بے ٹھکانا نہ کرنا' ان بوڑھی ہڈیوں میں اب کسی اور منزل کے راستوں کی خاک چھاننے کا حوصلہ نہیں ہے۔" وہ راستہ بھر دعائیں کرتے آئے تھے۔

کھاری کا موٹر سائیکل فارم ہاؤس کے داخلی راستے پر گیٹ سے اندر کہیں آگے جا کر رکا تھا۔ مولوی صاحب نے فارم ہاؤس کے گیٹ سے آگے کا کوئی منظر ان پانچ' چھ سالوں میں نہیں دیکھا تھا۔ چوہدری صاحب سے بھی اب تک اکا دکا ملاقاتیں گاؤں کے کسی رہائشی کے ایسے جنازے پر ہو جایا کرتی تھیں جس میں چوہدری صاحب خود شریک ہوتے تھے۔ ہاں مولوی صاحب کے گھر گندم اور دھان کی فصلیں باقاعدگی سے چوہدری صاحب کی طرف سے پہنچ جایا کرتی تھیں۔ گاہے بگاہے' پھل اور سبزی کی سوغاتیں' ایندھن اور گڑ' شکر کے تحفے بھی موصول ہوتے رہتے تھے۔ مولوی صاحب دل ہی دل میں چوہدری صاحب کے مشکور اور ہر نماز کے بعد ان کے اقبال کی بلندی کی دعائیں بھی کرتے رہتے تھے۔ مگر یوں چوہدری صاحب کی طرف سے براہ راست بلاوے کا مقصد مولوی صاحب کے خیال میں تبادلے کے سوا کچھ اور نہیں آرہا تھا۔

کھاری ان کی رہنمائی کرتا' انہیں عمارت کے عقبی حصے میں لے گیا۔ جس کی وسعت دیکھ کر مولوی سراج سرفراز کی سرمہ لگی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ عمارت کا گیٹ دیکھ کر انہیں کبھی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ اس کا

[illegible] تک پھیلا ہوگا۔ عقبی حصے میں تاحدِ نظر رنگ برنگ موسمی پھولوں کی بہار تھی۔ وہ گنتی اور رنگوں میں اتنے تھے کہ ایک نظر تو کیا کئی بار دیکھنے پر بھی مولوی سراج ان کا شمار نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس کی کوشش ہی نہیں کی۔ چوہدری سردار خان اپنے ملازمین سے مصروف گفتگو تھے' جن میں سے کئی پھولوں کو لمبی لمبی شاخوں سمیت کاٹنے اور کئی ان شاخوں کو سلیقے سے سمیٹنے اور باندھنے میں مصروف تھے۔

"سارے پھول شہر جاتے ہیں بکنے کے لیے۔" کھاری نے مولوی صاحب کی حیرت کا احاطہ کرتے ہوئے ان کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے انہیں مطلع کیا۔ مولوی صاحب کو اپنے حال اور مستقبل کی فکر پڑی تھی۔ ان کی بلا سے پھول کہاں جاتے تھے اور کیوں جاتے تھے۔ وہ وہیں کھڑے منتظر نظروں سے چوہدری صاحب کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ ملازمین سے گفتگو کرتے ہوئے چوہدری صاحب کی نظر مولوی سراج پر پڑی اور وہ اپنی گفتگو وہیں منقطع کر کے ان کی طرف بڑھے۔

"شاباش ہے بھئی کھاری پتر' نہ مولوی صاحب کو کہیں بٹھایا' نہ مجھے بتایا کہ انہیں لے آئے ہو۔" انہوں نے مولوی صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے کھاری کو سرزنش کی۔

"تشریف رکھو جی مولوی جی!" کھاری نے چوہدری صاحب کی اجازت پاتے ہی مولوی صاحب کو وہیں رکھے موڑھوں میں سے ایک موڑھا پیش کیا۔ چوہدری صاحب بھی وہیں تشریف فرما ہوئے۔

"حکم سرکار!" مولوی صاحب نے دھک دھک کرتے دل کو قابو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"بات کوئی خاص نہیں۔" چوہدری صاحب نے مسکرا کر کہا اور دوبارہ کھاری سے مخاطب ہوئے۔ "او پتر! کوئی لسی' کوئی چائے' کوئی پانی۔۔۔ مہمان کی خاطر تواضع کرنا سیکھو۔"

"او جی بھاڑ میں گئی خاطر تواضع۔ آپ حکم کریں۔ میری جان نہ لے لیجیے گا۔" مولوی سراج کا دل چاہا' وہ یہ بات بلند آواز میں کہہ دیں' مگر صرف سوچ کر ہی رہ گئے۔

"مولوی جی! بی بی صاحب کا پیغام ملا تھا' بچی کے پیدائشی سرٹیفکیٹ کے بارے میں۔" چوہدری صاحب نے بلی کو تھیلے سے نکالتے ہوئے کہا۔

"میں نے کھاری کو بھیجا تھا کہ بچی کے کوائف کاغذ پر لکھوا لائے' لیکن وہ معلومات ادھوری تھیں اور شاید بی بی صاحب کو ٹھیک سے یاد بھی نہیں۔ اس طرح سرٹیفکیٹ نہیں بنتے۔ میں نے سوچا آپ سے خود پوچھ لوں' داخلے جانے میں وقت کم رہ گیا ہے' بچی کا سال نہ ضائع ہو جائے۔"

"اوہ۔" مولوی صاحب کو محسوس ہوا نہ جانے ان کا کب سے رکا سانس سینے سے خارج ہوا ہو۔ انہوں نے اپنی سوکھی زبان کو کھاری کے پیش کیے شربت سے تر کرتے ہوئے کہا۔

"وہ جی شاید ساہیوال کی پیدائش ہے۔" ان کے ذہن میں ایک شہر کا نام آیا۔

"شاید ساہیوال۔" چودھری صاحب کے لہجے میں تحیر تھا۔ "مولوی جی! کمال ہے آپ کو بچی کی پیدائش کا ضلع بھی ٹھیک سے یاد نہیں' میرا خیال ہے تیرہ' چودہ سال پہلے ہی کی تو بات ہوگی۔"

"مولوی جی' سعدیہ تو کنے ای وڈے نیں (مولوی صاحب سعدیہ سے کتنے ہی بڑے ہیں) شاید اس لیے یاد نہیں۔" قریب کھڑے کھاری نے مولوی صاحب کی مدد کرنے کی عجیب و غریب کوشش کی۔

"او جا اوئے جھلیا' تجھے کیا پتا میں کیا پوچھ رہا ہوں۔" چودھری صاحب نے اسے ڈانٹا۔

"وہ جی ساہیوال ہی کی پیدائش ہے جی۔" مولوی صاحب نے حتمی فیصلہ کرتے ہوئے بتایا۔

"اچھا!" چودھری صاحب نے چند لمحے کے لیے اس بات پر غور کیا "پر مولوی جی آپ ساہیوال سے ادھر کیسے پہنچے؟"

"بس جی روزی روٹی جہاں لکھی ہو' بندہ وہیں پہنچ جاتا ہے۔" مولوی صاحب کو پہلی بار کوئی عقل کا بہانہ سوجھا تھا۔

"تو یونین کونسل میں اندراج نہیں کروایا تھا' مطلب کیٹی گھر میں؟" چودھری صاحب نے غور سے مولوی صاحب کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"او جی..... اس کے بعد میرا خیال ہے دو ہفتے بعد ہی' ہمیں وہ جگہ چھوڑنی پڑی تو اندراج کا خیال نہیں آیا شاید۔" مولوی سراج نے دل میں اللہ تعالیٰ سے کئی سو بار توبہ استغفار کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا!" چودھری صاحب کو کچھ مایوسی ہوئی "یوں تو مولوی جی! کام ٹیڑھا اور مشکل ہو جائے گا۔"

"چودھری صاحب! کاکی سعدیہ بڑی لائق بچی ہے۔ جدھوں دیکھو پڑھتی نظر آتی ہے' دن سے رات تک پڑھتی ہے۔ گھٹ تو گھٹ چوبیس میں سے اٹھارہ گھنٹے تو پڑھتی ہو گی جی' اس کا سال مر گیا تو رو رو پاگل ہو جائے گی۔" ایسے میں کھاری نے گفتگو میں کودنا فرض سمجھا۔ "اس دا داخلہ بھجوا دیو کسی طرح' وچاری کا سال بچ جائے' وہ کہتی ہے۔ اس نے ڈاکٹر بننا ہے۔" کھاری سفارش پر سفارش کرنے لگا تھا۔

"ٹھیک ہے کرتے ہیں کچھ۔" چودھری صاحب نے کچھ سوچنے کے بعد سر ہلایا۔

"آپ کے بس میں تو بڑا کچھ ہے چودھری جی!" مولوی سراج کے سر سے تبادلے کے خوف کا بھوت اترا تو ان کے لہجے میں سعدیہ والے کام کے لیے خوشامد اتر آئی' لگے ہاتھوں یہ کام ہو ہی جائے تو کیا بات ہے' انہوں نے سوچا اور مشکور نظروں سے کھاری کی طرف دیکھنے لگے جو ان کی سفارش کر رہا تھا۔

"مولوی جی ہے تو یہ غلط اور آؤٹ آف دی وے کام۔" چودھری صاحب نے ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے کہا "مگر مجھے بچی کی تعلیم کے لیے لگن اور شوق کا خیال آ رہا ہے۔" انہوں نے صاف گوئی سے کہا۔ "کام ہو جائے گا لیکن ایک بات یاد رکھیے گا بندے کو اپنے ہر معاملے میں سیدھا اور سچا ہونا چاہیے۔ کبھی کے چھوٹے چھوٹے ہیر پھیر کسی وقت کے عذاب بھی بن جاتے ہیں۔"

مولوی صاحب نے مجرموں کی طرح سر جھکایا "بس جی۔ غلطی ہو گئی جو اندراج نہیں کروایا۔"

"میں یہ نہیں کہہ رہا۔" چودھری صاحب نے کہا۔ "میں جو کہہ رہا ہوں۔ آپ سمجھ رہے ہیں۔"

"اوئے منڈیو۔" پھر انہوں نے کام میں مشغول لڑکوں کو پکارا "مولوی صاحب کے لیے سبزی اور پھل کی ٹوکری تیار کرو' کھاری پتر!" انہوں نے کھاری کی طرف دیکھا "مولوی صاحب کو جلدی پہنچا دے مسجد' انہوں نے عصر کی نماز پڑھانی ہے جا کر۔"

"جی سرکار۔" کھاری نے سر ہلایا۔

"اچھا پھر مولوی صاحب!" چودھری صاحب نے اٹھتے ہوئے مولوی صاحب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "میری کوئی بات بری لگی ہو تو درگزر فرمائیے گا' آپ اللہ کے خادم ہیں' اللہ کی مخلوق کو پانچ مرتبہ اس کی خدمت میں حاضر ہونے کی پکار ڈالتے ہیں۔ آپ کے درجے کو ہم حقیر لوگ نہیں پہنچ سکتے' آپ کا کیا کہا اس خدمت کے عوض ہی معاف ہو جاتا ہے' ہماری پکڑ معمولی سی بات پر بھی ہو سکتی ہے' ہمارے لیے دعا کر دیا کریں بس۔"

چودھری صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے مولوی سراج کے چہرے پر عجیب سی ندامت تھی اور ان سے چاہنے کے باوجود کوئی بات نہ ہو پا رہی تھی' وہ بار بار اپنا چارخانہ والا رومال اپنے چہرے اور آنکھوں پر پھیر رہے تھے جو گھڑی گھڑی نم ہو جاتی تھیں۔ مولوی صاحب اپنے اضطراب کے سبب غور نہیں کر پائے کہ ان کی ایک ایک جنبش کو کوئی بہت غور سے دیکھ رہا تھا اور شاید اس کی وجہ کا اندازہ لگانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

مولوی صاحب کو واپس مسجد تک چھوڑنے کے راستے میں کھاری مکمل طور پر خاموش رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

لمبی بریک کے بعد کالج دوبارہ کھلنے میں چند ہی دن باقی رہ گئے تھے اور اب اسے واپس لاہور جانا تھا۔

"ارے میں اتنے دن یہاں کیسے رہ لی۔" ماما کے یاد دلانے پر کہ اگلے پیر سے کالج دوبارہ شروع ہو رہا ہے اسے یاد آیا کہ گنتی کر کے دیکھے' وہ کتنے دن سے گھر سے دور تھی۔

"شاہ بانو کو واپس لاہور گئے بھی ہفتہ ہو گیا اور وہ بیچاری پوچھ پوچھ کر ہلکان ہو رہی ہے کہ آخر میں یہاں کیوں رکی ہوئی ہوں' اب میں اس کو کیا بتاؤں کہ کیوں رکی ہوئی ہوں جبکہ مجھے خود بھی پتا نہیں۔" اس نے فرقان ماموں کے گھر کے لاؤنج کے انٹیریر پر اتنے دنوں میں پہلی بار غور کرتے ہوئے سوچا۔

"کس کے لیے بھلا؟" اس نے سوچنے کی کوشش کی "اسلام آباد بہت خوب صورت اور ویل پلینڈ ہے اس لیے؟" اس نے پہلی وجہ پر غور کیا۔

ہرگز نہیں۔" پھر خود ہی اس وجہ کو مسترد کر دیا۔

"فرقان ماموں اور مامی کی مہمان داری زبردست تھی۔" دوسری وجہ ذہن میں آئی۔

"ہاں تھوڑی بہت یہ وجہ ہو سکتی ہے۔" اس نے اتفاق کیا۔

"میں یہاں ریلیکس محسوس کر رہی تھی خود کو۔" تیسری وجہ ذہن میں آئی۔

"وہ تو میں گھر میں بھی ہوتی ہوں۔"

"اچھا ہاں' سیارہ خان سے ملاقات جو کرنی تھی۔" اس نے خود کو ایک بڑی وجہ بتائی۔

"وہ تو ہو گئی تھی دو مرتبہ' پھر اس کے بعد کیوں رکی ہوئی ہوں میں۔" دل نے سوال کیا

"فلز اظہور سے ملاقات کرنا تھی۔" ایک اور بات ذہن میں آئی۔

"نہیں۔" اس تصور سے اسے جھرجھری سی آ گئی۔

"شاپنگ' سیر' ہوٹلنگ..... آخر کیا؟" وہ وجوہات گنتی اور انہیں مسترد کرتی رہی۔

"میں..... میں ہوں واحد اور بڑی وجہ۔" اس کے ذہن پر چسپاں ایک شبیہہ ہر وجہ کے عقب سے جھانک جھانک کر اسے اپنی طرف اشارہ کر کر کے بتا رہی تھی مگر وہ اسے نظر انداز کر کے اگلی وجہ پر غور کرنا شروع کر دیتی۔

"پتا نہیں کیا وجہ ہے۔ جو بھی ہے' اب میں کسی کو یہ بھی نہیں بتا سکتی کہ میرا تو ابھی بھی واپس جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ مگر کیا کروں' جانا تو ہے۔" اس نے منہ بنایا اور اپنا سیل فون اٹھایا۔

"میں اس جمعہ کو واپس جا رہی ہوں۔" اس نے ایک ٹیکسٹ ٹائپ کیا اور میسج بھیج دیا۔

اسکرین پر بنے لفافے کے نشان سے لفافہ اڑ اڑ کر پیغام پہنچنے کی نشاندہی کرتا ہوا غائب ہو گیا' اس کا پیغام موصول کرنے والے تک پہنچ چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

ریڈیو پاکستان اپنی کوئی سالگرہ وغیرہ منا رہا ہے غالباً۔" خدیجہ نے نفاست سے سبزیاں کی کاٹتے ہوئے فاطمہ کو مطلع کیا۔

"اس!" فاطمہ نے ٹی وی اسکرین سے نظر ہٹائی "یہ ریڈیو کی خبر تمہیں کیسے ہو گئی؟"

"تم نے اخبار میں کبھی شوبز نیوز کے علاوہ کچھ اور پڑھا ہو تو تمہیں بھی خبر ہو جائے۔" خدیجہ نے فاطمہ کے چونکنے کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا اخبار میں آئی تھی یہ خبر۔" فاطمہ نے دوبارہ ٹی وی اسکرین کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ویسے تمہیں کوئی خاص دلچسپی محسوس ہوئی کیا اس خبر میں؟" تھوڑی دیر بعد فاطمہ کو خدیجہ سے پوچھنے کا خیال آیا۔

"ہاں!" خدیجہ نے کٹی ہوئی سبزیوں کو پیالے میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں نے سوچا۔ کوشش کروں گی کہ ان پروگرامز کو فالو کروں شاید کہیں بے چاری شہناز کا تذکرہ بھی آجائے۔"

"لو۔" فاطمہ کو گویا خدیجہ کے جواب سے مایوسی ہوئی۔ "شہناز کون سا شہناز بیگم تھی جو اس کا تذکرہ آئے' اکا دکا غزلوں اور گیتوں کے سوا اس نے گایا ہی کیا تھا۔"

"ہاں یہ تو ہے مگر ان دنوں اس کی وہ اکا دکا غزلیں اور گیت صبح اور شام سنوائے ضرور جاتے تھے' ان کے لیے فرمائشی خطوط بھی آتے تھے۔"

"پھر اس کے بعد نہ شہناز رہی نہ شہناز کے گیت" فاطمہ نے ٹی وی بند کرتے ہوئے کہا "ویسے عجیب بات ہے' ریڈیو کے ریکارڈز میں تو وہ گیت ہوں گے ہی۔ شہناز نہ بھی رہے ریکارڈز تو رہے ہوں گے نا محفوظ۔"

"سنا تھا نا کہ اس نے جس چنگیز کی اولاد سے شادی کر لی تھی اس نے جینا حرام کر دیا تھا اس کا۔ ریکارڈ بھی جلا دیے ہوں گے جیسے تاتاریوں نے بغداد کے کتب خانے جلا دیے تھے۔" خدیجہ نے کہا اور خود ہی ہنس دیں۔

"اس روز جو رئیسہ کا فون آیا تھا' تم نے محسوس نہیں کیا۔ شہناز کا ذکر جب میں نے کیا مجال ہے' جو ایک لفظ بھی بولی ہو۔" فاطمہ کو یاد آیا۔

"وہ کیوں بولے گی۔" خدیجہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اسے باپ کی پوری جائیداد ہتھیانے کا موقع مل گیا' اس کے لیے تو شہناز کا منظر سے غائب ہونا نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا۔" وہ آئے روز پورا یورپ ایک کیے دیتی ہے' کہیں کوئی ولا خریدا جاتا ہے' کہیں کیا اس کو کہتے ہیں۔" انہوں نے پیشانی پر ہاتھ پھیرا "ہاں شاطو۔"

"بابا خدیجہ! تم جیلس ہو رہی ہو۔" فاطمہ نے قہقہہ لگایا۔

"میں کیوں جیلس ہوں گی بھئی۔ ہماری تو گزر گئی' اب ولا میں رہنے والے' شاطوؤں اور پیلسوں میں رہنے والے ہوں یا ہماری طرح ان پرانی کوٹھیوں میں رہنے والے' سب ٹھاٹھ یہاں ہی چھوڑ کر بنجاروں کی طرح لاد چلنے کو ہیں۔"

"ویسے یہ بھی بے حسی کی انتہا ہی ہے کہ جو بے چاری شہناز کی خاندان بھر میں سے کسی نے پلٹ کر خبر تک نہیں لی۔ سب ہی مزے لے لے کر اس کے غائب ہو جانے' چنگیز کی اولاد سے شادی کر لینے اور پھر مارے جانے کی خبریں چسکے لے لے کر ڈسکس کرتے رہے' نہ کسی نے افسوس کا اظہار کیا ڈھنگ سے اور نہ ہی زحمت کی کہ کہیں سے پتا کریں کہ اسے زمین کھا گئی کہ آسمان نگل گیا۔" فاطمہ نے کہا۔

"لو شائستہ بھابھی کے ابا جو منسٹری آف انفارمیشن میں اس وقت کوئی اونچے افسر تھے انہوں نے جب کہا کہ میں کوشش کرتا ہوں اس کا پتا لگانے کی تو آغا جی نے کہا۔ خبردار جس نے شہناز کا پتا لگانے کی کوشش کی' میرا اس سے کوئی تعلق نہیں رہے گا' یہ بھاشن سن کر سب کے سب دبک گئے۔" خدیجہ اٹھ کر باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے بولیں۔

"بھائی زین کا بیٹا رافع ایک بار بتا رہا تھا کہ اس کے ایک دوست کے ہاں ایک تقریب میں جو دو تین مغنیائیں مدعو تھیں۔ ان میں سے ایک پر شہناز کا گمان ہوتا تھا' اس نے پوچھا۔ "آپ کا نام شہناز ہے کیا؟" تو وہ محترمہ غصے سے بولیں۔ "فری ہونے کے لیے نام ہی پوچھا جاتا ہے سب سے پہلے۔" وہ بے چارہ تو مارے شرمندگی کے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ آپا جی آپ مجھے اپنی رشتے کی ایک پھوپھی جیسی لگی ہو۔" فاطمہ نے خدیجہ کے پیچھے باورچی خانے میں آتے ہوئے کہا۔

"ویسے ریڈیو کے نام سے تمہیں اور بہت کچھ یاد نہیں آیا؟" خدیجہ نے فرائی پین میں تیل ڈال کر چولہے پر رکھتے ہوئے مڑ کر فاطمہ کو دیکھا۔

"بہت کچھ۔" فاطمہ نے واٹر ڈسپنسر سے کپ میں گرم پانی نکالتے ہوئے کہا۔ "اردو سروس اور اس کے براڈ کاسٹرز کی جادو اثر آوازیں۔"

"ایس ایم شفیق جس کی آواز پر مرا کرتے تھے ہم۔" خدیجہ نے کٹی سبزیاں گرم تیل میں ڈال کر الٹتے پلٹتے ہوئے کہا۔

"آپ کی فرمائش اور پھر رات کو تعمیل ارشاد۔" فاطمہ نے لقمہ دیا۔

"فوجی بھائیوں کا پروگرام اور ریڈیو جموں کی ہکلی خبریں۔" خدیجہ بے اختیار مسکرائیں۔

"ریڈیو' پھر پی ٹی وی' چوائس محدود تھی اور چارم زیادہ' اب چینلز زیادہ ہو گئے اور چارم ختم۔"

"ویسے بھی اب نہ وہ آوازیں رہی ہیں نا وہ لوگ۔" خدیجہ ناسٹلجک ہو رہی تھیں۔

"خیر' ایسا بھی قحط نہیں پڑ گیا۔" فاطمہ نے گرم پانی میں چاکلیٹ پاؤڈر ملاتے ہوئے اختلاف کیا۔ "پچھلے دنوں خبروں میں کسی فیسٹول میں شریک سنگرز کے کلپس دکھائے جا رہے تھے' ایک دو کی آوازیں تو مجھے بہت ہی میلوڈیس لگیں۔"

"اصل میں آج کل میوزیکل انسٹرومنٹس اتنے بے ہودہ ہوتے ہیں کہ ان کی گونج میں کسی کی آواز کی کوالٹی کا تو اندازہ ہی نہیں ہو پاتا۔" خدیجہ نے کہا اور سبزیوں میں ابلے چاول ملانے لگیں۔

"ماہ نور واپس آئے تو اس سے بہت سی خبریں سننے کو مل جائیں گی' باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔" فاطمہ کو یک دم خیال آیا۔

"ماہ نور تو ڈیرہ ہی جما کر بیٹھ گئی اسلام آباد میں۔" خدیجہ کو بھی یاد آیا۔ "اس نے تو کوئی فون بھی نہیں کیا کبھی۔"

"آج کل بچے اپنی ایکٹویٹیز میں مگن ہو کر سب کچھ بھول جاتے ہیں۔" فاطمہ نے کہا' انہیں اچانک ماہ نور شدت سے یاد آنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اولی بی جی سارے بنیرے' ساریاں دیواراں بھر گئیاں گملیاں (گملے) نال ہون کوئی جگہ باقی نہیں رہی۔" کھاری نے ہانپتے ہوئے صابرہ سے کہا۔

"تو جو بچ گئے ہیں وہ کیا میرے سر پر رکھے گا۔" صابرہ نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"تے ہن میں کدھر رکھاں جی باقی گملے۔" کھاری روہانسا ہو رہا تھا۔

"باورچی خانے کی چھت پر رکھ دے آگے کر کے' کھڑکیوں کے شیڈز پر رکھ دے باقی۔" صابرہ کو یہ ہی جگہ خالی نظر آئی تھی۔

"اللہ کرے زور دی ہنیری (آندھی) آئے تے ٹھا ٹھا کر کے گر جائیں گملے باورچی خانے دی چھت سے۔" کھاری صبح سے اپنے تئیں اس بے کار کام میں لگا ہوا تھا اور سخت جھنجلایا ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ چوہدرانی فارم ہاؤس کی رونق کی ضد میں یہ گملے یہاں رکھوا رہی تھیں اور یہاں ان بے زبان پودوں کا خیال کسی نے نہیں رکھنا تھا۔

"اور یہ جو ہے رضیہ چڑیل' اس کا سر تو ضرور پھٹے' جب گملا اس کے سر پر گرے۔" اس نے رضیہ کو دل ہی دل میں کوسا جو صابرہ کی ملازمہ خاص تھی اور مسلسل کھاری کے سر پر افسری کھڑی ہدایات دے رہی تھی۔

"بی بی جی۔ وکھے۔ پتہ نہیں جھاڑے جی کہاری نے۔" رضیہ نے گویا اس کے دل کا کوسنا بھانپ لیا۔ فوراً" ہی شکایتی صدا لگائی۔ کھاری نے جواباً" دانستہ ایک گملا چھت کے بالکل ہی کنارے پر اٹکا دیا۔

"بی چھلانگ مارے گی تو اس چڑیل کا سر تو ضرور پھٹے گا۔"

"چلو' اب پانی کی پھوار بھی مار دے سارے گملوں کو" صابرہ نے صحن میں نکل کر رنگارنگ پھولوں سے سجے گملوں کی بہار دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"او بی بی جی! آج کل نہیں پھوار مارنے ان کو' کل ماشق نے ان کی گوڈی پانی سب کر دیا تھا' ہن کافی دن ضرورت کوئی نہیں۔" کھاری نے اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"اچھا پھر ایسا کر' وہ جو بڑے بڑے بنتے ہیں آرڈر پر ان کا ناپ لے جا اور جا کر دین محمد کو پکڑا آ۔" کھاری صابرہ کے ہاتھ بہت دن بعد آیا تھا' وہ اس سے وہ تمام کام لے لینا چاہتی تھیں جو ذہن میں آ رہے تھے۔

"او نا جی نا!" کھاری نے کان میں انگلی سے خارش کرتے ہوئے سر ہلایا "اج نہیں ہونا ہور کوئی کام۔"

"کیوں آج کیا ہے؟" صابرہ نے اسے گھورا۔

"چوہدری صاحب نے کہا تھا' گملے گھر پہنچا کر ریڑھی واپس بھیج دینا اور خود دوڑ کر مولی (مولوی) صاحب کے گھر ان کی بچی کی پیدائش کی پرچی پکڑا آنا۔ میں نے ادھر جانا ہے اب۔"

"بن گئی پیدائش کی پرچی؟" صابرہ نے تجسس سے کہا۔

"آہو جی۔ بن گئی' کتاب فارم بنوا دیا چوہدری صاحب نے۔" کھاری نے فخر سے کہا۔ "چوہدری صاحب کی کیا باتاں ہیں' اوناں کو ایکو (ایک) فکر تھی سعدیہ کا سال نہ مارا جائے۔" وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔

"کدھر ہے پرچی۔ دکھا ذرا۔" صابرہ نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے ناک چڑھا کر کہا۔

"یہ لیں جی۔ یہ ہے۔" کھاری نے جیب سے موٹی کاغذ میں تہہ کر کے محفوظ کی گئی پرچی نکالی۔

"ہوں۔" صابرہ نے چھیننے کے سے انداز میں اس سے کاغذ لے لیا۔ "کوئی ضرورت نہیں خود جا کر انہیں پرچی پکڑانے کی' ان کو ضرورت ہے۔ خود آ کر لے جائیں۔"

کھاری کچھ دیر اس اچانک کارروائی پر ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔

"پر جی چوہدری صاحب نے آکھا تھا۔" اس نے حلق تر کرتے ہوئے کہنے کی کوشش کی۔

"اور جی۔ میں نے ویسے بھی ادھر جانا ہے۔ سبق لین واسطے۔" اس نے اٹک اٹک کر کہا۔

"تو جاؤ سبق لینے۔" صابرہ نے ناک چڑھا کر کہا۔ "پر پرچی وہ خود آ کر لے جائے گی مولوانی۔ پرچی بنوانے کا کہنے بھی تو ادھر آئی تھی۔ اب اس کی ٹانگیں تو نہیں ٹوٹ جائیں گی آتے ہوئے۔"

"پر بی بی جی! ایمین جی تو کٹ ودھ (کم کم) ہی کہیں آتے جاتے ہیں۔" کھاری نے ہاری ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں تو آئے نا۔ اپنا کام ہے۔ اس کا' ہم اس کو کھا تو نہیں جائیں گے۔" صابرہ نے تنک کر کہا۔ "کٹ ودھ آتے جاتے ہیں۔" انہوں نے بڑبڑاتے ہوئے کھاری کے الفاظ دہرائے۔

کھاری نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد سر جھٹکا اور تیز قدموں سے چلتا گھر سے باہر نکل گیا۔

"اس کو برا لگا۔" رضیہ جو یہ ساری گفتگو سن رہی تھی' صابرہ کو طیش دلانے کے لیے بولی۔

"اس کے لیے تو جو چوہدری صاحب نے کہہ دیا' وہی بات آخری ہو گئی' اس لیے برا لگا۔ اس نے چوہدری صاحب کو واپس جا کر اپنی کارکردگی کی رپورٹ جو دینی تھی۔" صابرہ اصل بات سے ناواقف اپنی عقل کے مطابق جو سمجھیں کہتی رہیں۔

☼ ☼ ☼

"یہ ابراہیم ہے۔" سعد نے ماہ نور کو بتایا۔ ماہ نور نے اپنے سامنے کھڑے شخص کو دیکھا جو چہرے سے خاصا خوش مزاج اور اپنے سراپے سے خاصا خوش خوراک نظر آ رہا تھا۔

"ابراہیم میرا بچپن کا دوست ہے۔ ہم ہمیشہ ساتھ رہے ہیں اور ایک دوسرے کو اتنی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک کی کوئی بات دوسرے سے پوشیدہ نہیں ہے۔"

"اوہ..... دلچسپ۔" ماہ نور نے کہا۔

"یہ ریسٹورنٹ ابراہیم کا ہے۔" سعد نے ریسٹورنٹ کے انٹیریر پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "اور اس کا افتتاح چند دن پہلے ہی ہوا ہے۔"

"یہ بھی بتاؤ کہ اس کا افتتاح کس نے کیا؟" ابراہیم نے کہا۔

"وہ تم بتا دینا۔" سعد نے اس کی بات ہوا میں اڑاتے ہوئے کہا۔

"ابراہیم کے دو ہی شوق ہیں' کسرت اور کھانا پینا۔" سعد نے زبان دانتوں تلے دبا کر شرارتی نظروں سے ابراہیم کی طرف دیکھا۔ "اسی لیے اس کی روزی روٹی ایک عدد جم اور اب اس ایک عدد ریسٹورنٹ پر چل رہی ہے۔"

ابراہیم نے اسے گھور کر دیکھا۔

"آج ہم دونوں یہاں ابراہیم کی طرف سے انوائیٹڈ ہیں۔" سعد نے شرارت سے ابراہیم کی طرف دیکھا۔

"دراصل سعد کو نا۔" جواباً" ابراہیم نے دوسری ٹیبل سے ایک کرسی گھسیٹی اور ان کے سامنے بیٹھ گیا "مفتے اڑانے کا شوق ہے۔" اس نے کن اکھیوں سے سعد کو دیکھا جو ہونٹوں پر ہاتھ رکھے اس کے جوابی حملے کا منتظر تھا۔

"جم کی ممبر شپ لیتا ہے نہ فیس بھرتا ہے۔" ابراہیم نے انگلی پر گنتے ہوئے کہا "مگر جم روزانہ آتا ہے اور اب میں مسکین یہ ریسٹوران کھول تو بیٹھا ہوں اب یہ آئے روز اپنے کسی مہمان کو لے آیا کرے گا اور کہے گا ہم ابراہیم کی طرف سے خاص طور پر انوائیٹڈ ہیں۔" جواب میں سعد قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

"کیوں کیا ہوا؟" ابراہیم کو لگا اس نے کوئی انتہائی مضحکہ خیزبات کر دی ہو۔

"شکر ہے' تو نے اپنے کسی مہمان کی بات کی ہے' اپنی کسی مہمان نہیں کہا ورنہ ماہ نور سمجھتی' میں گرل فرینڈز بھی تیرے کھاتے سے بھگتاتا ہوں۔"

"خیر' میں اتنا کمینہ بھی نہیں ہوں۔" ابراہیم نے کہا "میں الفاظ کی ہیرا پھیریاں کوئی نہیں کرتا۔ تجھے بھی پتا ہے۔"

"ہاں تو جی۔" پھر ابراہیم ماہ نور کی طرف متوجہ ہوا۔

"وہ جو اپنے مہمان بھگتانے ہیں نا اس ریسٹورنٹ کے سر پر وہ تو بعد کی بات ہے' ہاں آج کی حد تک یہ سچا ہے۔ آج واقعی میں نے ہی آپ دونوں کو انوائیٹ کیا ہے۔"

"اچھا؟" ماہ نور جوان دونوں کی نوک جھونک کچھ سمجھتے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سن رہی تھی بولی "لیکن وہ کیوں؟"

"دراصل اس کو تمہارے بارے میں بہت تجسس تھا۔" سعد نے کہا۔ "یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ لڑکی کون ہے۔ جس کے ساتھ میں بقول اس کے مری روڈ پر چہل قدمی کر رہا تھا۔"

"مگر ایسا تو کچھ نہیں ہوا تھا۔" ماہ نور نے حیرانی سے کہا۔

"اس کی تشریح بھی یہ ہی کرے گا۔" سعد نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔

"چہل قدمی' مطلب چالیس قدم دور ..... مری روڈ اس دن جہاں میں تھا وہاں سے چالیس قدم ہی دور تھی۔" ابراہیم نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"اچھا!" ماہ نور کے پلے اب بھی کچھ نہیں پڑا مگر وہ اخلاقاً" مسکرا دی۔

"اچھا۔۔۔اب" سعد نے میز پر انگلیاں بجاتے ہوئے ابراہیم کی طرف دیکھا "تجھے کوئی کام ہے تو کر لے پھر۔"
"ہاں۔ میں جا ہی رہا ہوں۔" ابراہیم نے غصیلی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
"میں نے آپ کے لیے اسپیشلی کوزین آرڈر کیا ہے۔" پھر وہ مخزیہ انداز میں ماہ نور کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "آپ جاتے ہوئے ہماری کمنٹس بک پر اپنے کمنٹس ضرور دیجئے گا پلیز۔"
"بہت شکریہ۔" ماہ نور نے کہا۔ "لیکن آپ جا کہاں رہے ہیں' ہمارے ساتھ کھانا کھائیے نا۔"
"ضرور میں آپ کو جوائن کرتا جی۔" ابراہیم نے کن اکھیوں سے ایک مرتبہ پھر گھورا "لیکن مجھے ایک ضروری کام ہے' ابھی نیا نیا کام شروع کیا ہے نا' سو بکھیڑے ہیں۔" وہ مسکرایا اور خدا حافظ کہتا وہاں سے چلا گیا۔
"مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ تم نے اسے بھگایا ہے۔" ماہ نور نے ابراہیم کے جانے کے بعد سعد سے کہا۔
"وہ پہلوانوں کی اولاد ہے جناب' یونہی بھاگنے والوں میں سے نہیں ہے وہ بھی کسی کے کہنے پر۔" سعد نے اسے تسلی دی۔
"اچھا!" ماہ نور نے یوں کہا جیسے اس سعد کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔
"دراصل تمہارے اس میسج کے بعد کہ تم فرائی ڈے کو واپس جا رہی ہو میں چاہ رہا تھا کہ تم سے الوداعی ملاقات کر لی جائے۔ یہ ابراہیم کا ہی آئیڈیا تھا کہ تمہیں اس کا ریسٹورنٹ دکھایا جائے' وہ اس کے بارے میں اوور ایکسائیٹڈ ہے۔" سعد نے ماہ نور کا تامل دیکھ کر وضاحت کی۔
"اور اس کا نام اس نے کس کے مشورے پر انتخاب کیا؟" ماہ نور نے مسکراتے ہوئے کھڑکی کے شیشے سے پار روڈ پر کھڑے رستوران کے ایک بورڈ کو دیکھا جس پر ریستوران کا نام چیٹر باکس لکھا تھا۔
"ہاں۔ یہ میں نے اسے تجویز کیا تھا کیونکہ وہ خود بھی چلتا پھرتا چیٹر باکس ہے۔" سعد نے ہنس کر کہا۔
"ایک بات پوچھوں سعد؟" ماہ نور نے سعد کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ اس روز اس نے بلیک ڈریس پینٹ پر سکائی بلو ڈریس شرٹ پہن رکھی تھی اور اس فارمل لباس میں وہ اپنے عام سے حلیے سے بھی زیادہ جاذب نظر لگ رہا تھا۔
"ضرور پوچھو۔" سعد نے کہا۔
"تمہاری شخصیت پہیلیوں جیسی کیوں ہے؟" ماہ نور نے بالآخر وہ سوال کر ہی ڈالا جو اس کے دل میں بار بار اٹھا تھا۔ "اگرچہ تم نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے بارے میں بہت کچھ بتا دیا۔ اتنے مختصر سے دنوں میں بند روالے سائیں' کمہار اور لوک سنگر کی وہ گتھیاں جو شاید عرصے تک میرے حواسوں پر چھائی رہتیں' کسی حد تک کھل گئیں' تمہاری ذاتی زندگی کے بارے میں میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی' وہ بھی خاصا جان گئی' پھر بھی۔" ماہ نور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا وہ اپنے مخصوص انداز میں ہونٹوں پر ہاتھ رکھے پورے دھیان سے اس کی بات سن رہا تھا۔
"پھر بھی مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ تمہاری شخصیت پہیلیوں جیسی ہے۔ ایک کے اندر ایک اور پہیلی' اس کے اندر تیسری پہیلی پھر چوتھی۔"
اپنی بات مکمل کرنے کے بعد ماہ نور لمحہ بھر کے لیے چپ ہوئی پھر سعد کا رد عمل بھانپنے کے لیے اس کی طرف دیکھا۔ سعد کی خاموشی پر اسے لگا جیسے اس کے سوال نے اسے ناراض کر دیا تھا۔ لیکن کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ مسکرایا تھا۔
"شاید میں خود کو یا اپنی فیلنگز کو بیان کرنے کا فن نہیں جانتا۔" اس نے کہا "یا یوں سمجھ لو کہ مجھے ابھی تک کوئی دوسرا شخص ایسا ملا ہی نہیں جسے میں تفصیل سے بتا سکوں کہ میں کیا سوچتا' کیا چاہتا ہوں۔ اس لیے میری شخصیت کسی پر کھلتی نہیں۔"
"نہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے۔" ماہ نور نے سر ہلایا "اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنی تمام عاجزی' انسانی ہمدردی'

ڈاؤن ٹو ارتھ شخصیت کے ساتھ ساتھ تم میں ایک خاص طرح کا ایٹی ٹیوڈ (رویہ) ہے' تم خود کو ڈیپ ڈاؤن دوسروں سے بلند سمجھتے ہو' اسی لیے کسی کو اپنے بالکل اصل رنگ کے قریب پھٹکنے کی اجازت نہیں دینا چاہتے' یہ ہی چیز تمہاری شخصیت کو پہیلی بنا دیتی ہے۔"
"ہوں۔" سعد کو شاید ماہ نور سے اس قدر بے لاگ تبصرے کی امید نہیں تھی۔
"شاید تمہارا تجزیہ درست ہو' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "شاید ایسا ہی ہو۔" وہ ایک دم الجھا ہوا سا لگنے لگا تھا۔ "لیکن کیونکہ میں اس کی ایک وجہ جانتا ہوں اس لیے تمہارے تجزیے سے اتفاق نہیں کروں گا۔"
"ہاں اس کا تو خیر تمہیں حق ہے۔" ماہ نور نے بے نیازی سے کہا اور گفتگو کا موضوع بدل دیا۔
"تم نے سارہ کے بارے میں کیا سوچ رکھا ہے' کیا سارہ ہمیشہ اسی طرح ہمت ہارے بیڈ پر پڑی رہے گی۔" ماہ نور نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
"کم از کم اس وقت تک جب تک وہ خود پر یقین کرنا نہ سیکھ لے گی۔" سعد نے مختصر جواب دیا۔
"اور تمہارا کیا خیال ہے' اس میں کتنا وقت لگے گا؟" ماہ نور نے اس کی طرف دیکھا۔
"ایک عمر بھی لگ جائے تو پروا نہیں۔" اس نے سوپ میں پسی ہوئی کالی مرچ چھڑکتے ہوئے جواب دیا۔ ماہ نور کو لگا جیسے اس کا دل ایک دھڑکن دھڑکنا بھول گیا ہو۔
"ہوں۔" دوسرے لمحے اس نے خود پر قابو پا لیا۔ "وہ خود پر یقین کرنا سیکھ بھی لے تو کیا کبھی دوبارہ سرکس رنگ میں داخل ہو پائے گی؟" ماہ نور کو نجانے کیوں لگا کہ اس کے لہجے میں طنز کی ہلکی سی چبھن تھی۔
"دنیا میں بہت سی ایسی باتیں ممکن ہو جاتی ہیں جن کو اکثر لوگ ناممکنات میں شمار کر کے داخل دفتر کر چکے ہوتے ہیں" سعد نے ماہ نور کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔
"اور رہی سرکس رنگ کی بات۔۔۔ تو ضروری نہیں کہ وہ سرکس رنگ میں دوبارہ داخل ہو' اس کے پاس کرنے کو اور بہت کچھ ہو گا' تم جانتی ہو دنیا کا' زندگی کا کینوس کتنا وسیع ہے اور اس پر استعمال کرنے کے رنگوں کی رینج کتنی زیادہ ہے۔" اس نے کستوری کباب کی پلیٹ ماہ نور کے سامنے رکھی۔
"اسے ٹیسٹ کرو' ابراہیم نے خاص طور سے کہلوایا ہے کہ اسے ضرور چکھا جائے۔"
"اور تمہارا اگلا روپ کیا ہو گا؟" ایک بار پھر ماہ نور کو لگا اس کے لہجے میں تلخی سی گھل گئی تھی۔
"کوئی پتا نہیں۔" اس سوال پر وہ مسکرا دیا۔ "من کی موج جدھر کو لے گئی۔"
"من سے یاد آیا۔" ماہ نور نے ڈرنک کا گھونٹ بھرا۔ "اختر کیا کہہ رہا تھا تمہیں یا من پالو یا زن پالو۔" مجھے اس کی صرف یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔"
"اختر کی باتیں اختر ہی سمجھ سکتا ہے' کبھی وہ مولوں اور شہبازوں کے سبق پڑھانے لگتا ہے' کبھی پانی کے اندر سانس لیتی مخلوق کی طرف توجہ دلاتا ہے' کبھی کہتا ہے باؤ صاب فقیری لائن پر لگ جاؤ۔ فقیر بن کے تمہیں سوٹ بوٹ پہن کر۔" سعد نے اختر کے لہجے میں کہا۔ "اور کبھی زن اور من کے قصے سنانے لگتا ہے۔"
"پھر تم اس کے پاس کیوں جاتے ہو؟" ماہ نور نے ابرو ذرا سا چڑھا کر سعد کی طرف دیکھا۔ "اگر اس کی باتیں بے تکی اور بے معنی ہوتی ہیں تو۔"
"میں تو بہت سی جگہوں پر بغیر کسی وجہ کے جاتا ہوں۔" سعد نے مبہم سا جواب دیا "ایسی ہی جگہوں میں اختر کا ڈیرا بھی شامل ہے۔"
ماہ نور نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر خاموش ہو گئی۔
"مجھے لگتا ہے' میرے ایک سوال نے آج تمہیں میرے سامنے بھی انٹروورٹ ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ میں

اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔" کھانے کے بعد ریستوراں سے باہر نکلتے ہوئے ماہ نور نے ریستوران کی لابی میں سعد سے دو قدم آگے چلتے ہوئے رک کر سعد کی طرف مڑ کر کہا۔

سعد نے کنسیلڈ لائٹس کی روشنی میں ماہ نور کو دیکھا۔ اس روز وہ شیفون کی سیاہ لمبی قمیص اور سیاہ ڈوپٹے میں ملبوس تھی۔ اپنی عادت سے ہٹ کر اس نے ہلکا میک اپ بھی کر رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کاجل لگا تھا اور کانوں میں سیاہ آویزے تھے۔ اس نے پاؤں میں اونچی ہیل کے سینڈلز پہن رکھے تھے۔ اس کے چہرے پر معصومیت تھی اپنے سوال کا جواب پانے کی بے صبری بھی۔ سعد نے اس کے تراشیدہ سلکی بالوں کی چمک کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔

"آئی ایم سوری اگر تمہیں ایسا لگا ہے۔" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ گلا کھنکھار کر بولا "لیکن میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں آئی' میں نے تم سے کہا تھا کہ اگر میں کسی بات کے بارے میں شیور نہیں ہوتا' میں اس کی طرف جاتا ہی نہیں۔ اگر میں تمہیں ایک اچھی دوست ماننے کے بارے میں پُر یقین نہ ہوتا تو کبھی اپنے پرسنلز تم سے شیئر نہ کرتا۔ ایسے پرسنلز جو تم سے پہلے میں نے کسی سے شیئر نہیں کیے۔ میں نے تمہیں اس روز یہ بات بتائی بھی تھی۔"

"اچھا!" ماہ نور کو لگا وہ قدرے مطمئن ہوئی تھی۔

"ہاں!" سعد نے سر ہلایا۔ "اب چلیں۔" اس نے کہا اور ماہ نور مسکرا کر آگے چل دی۔

"ایک بات میں بھی کہوں۔" گاڑی میں بیٹھنے کے بعد سعد نے کہا۔

"ہاں۔" ماہ نور نے اس کی طرف دیکھا۔

"آج تم بہت مختلف لگ رہی ہو۔" وہ ہونٹ دانتوں تلے دبا کر مسکرایا۔ "جتنی بار تم میں نے تم کو دیکھا ہے ان سے بہت مختلف بہت اچھی' خاصی sane (معقول) لگ رہی ہو آج تو۔"

"مذاق کر رہے ہو۔" ماہ نور جھینپ کر بولی۔

"ہرگز نہیں۔" اس نے سر ہلایا۔ "تم واقعی بہت اچھی لگ رہی ہو۔"

"جھوٹ!" ماہ نور نے بے ساختہ کہا۔

"میرے دل میں جو بات ہوتی ہے' میں کہہ دیتا ہوں' میں نے تم سے کہا تھا۔ میری یہ عادت نوٹ کر کے رکھ لو۔" سعد نے اسے یاد دلایا۔

"سلمان ہے نا۔ اس نے مجھے یقین دلا رکھا ہے کہ میں جو مرضی پہن لوں جو مرضی کر لوں' کبھی ایوریج سے زیادہ اچھی نہیں لگ سکتی۔" ماہ نور نے منہ بنا کر کہا۔

"اچھا۔" سعد ہنسا۔ "وہ ایسا کیوں کہتا ہے؟"

"اس لیے کہ میں ہوں ہی ایسی۔" وہ اسی طرح منہ بنا کر بولی "اب تو میں ہر کسی سے یہ ہی سوال کرتی ہوں کہ ایک ایک ٹپ بتاتے جاؤ میں خود کو کیسے امپروو کروں کہ اچھی لگنے لگ جاؤں۔ میں خود میں کیا تبدیلی لاؤں کہ پیاری لگنے لگ جاؤں۔" سعد نے ماہ نور کے دل کے زخم کرید ڈالے تھے۔ اب وہ بغیر سوچے سمجھے بول رہی تھی۔

سعد اس کی بات پر محظوظ ہوتے ہوئے زیر لب مسکرا رہا تھا۔

کون مان سکتا تھا کہ بچوں کی طرح گلہ کرتی یہ لڑکی کچھ دیر پہلے اس سے اتنے کٹھلے اور بڑے بڑے سوال کر رہی تھی۔

"تم نے سائیں کی کافی بھی سن لی اور فوک فیسٹول کے سنگر کے گانے بھی' آج میں تمہیں اپنی پسند کا ایک سونگ سنواؤں۔" ماہ نور کے خاموش ہو جانے کے کچھ دیر بعد گاڑی میں سعد کی آواز ابھری۔

"ہوں۔" ماہ نور نے سر ہلایا۔

سعد نے گاڑی کا میوزک سسٹم آن کیا اور کچھ سونگز آگے پیچھے کرنے کے بعد ایک جگہ رک گیا۔ گاڑی میں برونو مارس کی آواز گونجنے لگی۔

O'her eyes her eyes
Make the stars look like
they are not shining
her hair her hair
falls perfectly with out
her trying
she is so beautiful
and I tell her everyday

(اس کی آنکھیں ستاروں کی چمک کو ماند کر دیتی ہیں۔
اس کے بال بلا تردد عمدگی سے اس کے شانوں پر بکھرتے ہیں۔
میں اسے ہر روز بتاتا ہوں کہ وہ کتنی خوبصورت ہے۔)

وہ ساکت' خاموش بیٹھی سن رہی تھی۔

yeah I know I know
when I compliment her
she won't believe me
and its so sad to think
she don't see what I see
but every time she asks me
do I look ok
I say when I see your face
there is nothing that I would change
Cause you are amazing
Just the way you are

ہاں میں بخوبی جانتا ہوں
کہ جب میں اس کی تعریف کرتا ہوں
تو اسے یقین نہیں آتا
اور یہ خیال کیسا المناک ہے
کہ وہ خود کو ویسے نہیں دیکھتی جیسے اسے میری نظریں دیکھتی ہیں
لیکن ہر بار جب وہ مجھ سے پوچھتی ہے
کہ کیا میں اچھی لگ رہی ہوں
تو میں اسے بتاتا ہوں کہ جب میں تمہارا چہرہ دیکھتا ہوں تو مجھے کچھ ایسا نظر نہیں آتا جسے تبدیل ہونا چاہیے

کیونکہ جیسی تم ہو وہی حیران کن ہے۔

And when you smile
the whole warld stops
and stares far a while
cause girl you are amazing
just the way you are

اور جب تم مسکراتی ہو۔
تو تمام دنیا رک کر لمحہ بھر کے لیے تمہیں دیکھتی ہے۔ کیونکہ جیسی تم ہو وہ حیران کن ہے۔

ماہ نور دم سادھے گانے کا ایک ایک لفظ سن رہی تھی۔ گانا ختم ہوا اور میوزک سسٹم بند ہو گیا۔ گاڑی میں اتنی خاموشی تھی کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنائی دے سکتی تھی۔ قریب سے گزرتی گاڑیاں' ان کی روشنیاں' جگہ جگہ نصب برقی قمقمے' فٹ پاتھ پر چلتے راہ گیر' ماہ نور کو لگ رہا تھا۔ ہر چیز ساکت تھی اور وہ غیر محسوس طریقے سے آگے' آگے بڑھ رہی تھی۔

پھر گاڑی ہلکے سے دھچکے کے ساتھ رکی۔ "تمہارے ماموں کا گھر آگیا ہے ماہ نور۔" اس کے کانوں کو محسوس ہوا سعد کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

"مجھ پر اعتبار کرنے' میرے ساتھ باہر جانے' میری سننے اور اپنی کہنے کا بہت شکریہ ماہ نور' تمہارے ساتھ گزرا یہ مختصر وقت بہت خوب صورت تھا اور یادگار بھی۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"میری وجہ سے جتنا تم الجھن کا شکار رہیں' جتنا بے خود ہوئیں' لوگوں کی نظروں میں آئیں' اس کے لیے ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں۔"

"کیا یہ صرف اتنا اور یہاں تک ہی تھا۔" الفاظ بے اختیار ماہ نور کے منہ سے پھسلے۔

"پتا نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "اتفاقات کے بارے میں پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔"

"میں واپس جا کر بھی تمہارے ساتھ رابطے میں رہ سکتی ہوں کیا۔" ماہ نور نے سوال کیا۔

"میرے لیے یہ اعزاز کی بات ہوگی۔" وہ اپنے مخصوص شولرس انداز میں بولا۔

"اور کیا تم مجھے یہ سونگ گفٹ کر سکتے ہو۔" ماہ نور نے ایک ایسا سوال کیا جو اسے خود بھی احمقانہ لگ رہا تھا۔

جواب میں سعد نے اسے چونک کر دیکھا "یہ سونگ۔" اس نے دہرایا۔ "مگر یہ تو ہر جگہ تمہیں مل سکتا ہے۔" اس نے کہا۔

"ہاں۔" ماہ نور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سرہلایا۔ "لیکن کیا تم یہ گانا مجھے گفٹ کر سکتے ہو؟" اس نے وہی احمقانہ سوال دوبارہ دہرایا۔

"اوکے۔" کچھ دیر سوچنے کے بعد سعد نے سرہلایا "میں اس کا لنک تمہیں بھیج دوں گا' کیا تم اس کو ہی گفٹ سمجھ سکتی ہو؟"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" وہ بے اختیار خوش ہو کر بولی اور ہنس دی۔ سعد نے دیکھا' ہنستے ہوئے اس کے کانوں کے سیاہ آویزے ہولے ہولے ہلنے لگے تھے اس کے دانت سفید اور چمک دار تھے۔ وہ اس کی بچوں جیسی فرمائش اور بہلاوے جیسے جواب پر یوں خوش ہونے پر مسکرا دیا۔

"تم جانتی ہو ماہ نور کہ تم کتنی خوش قسمت ہو؟" اس نے کہا۔ "تم اپنی تمام کیفیات کا اظہار بلا جھجک کر سکتی ہو اور کر دیتی ہو۔ میرے نزدیک ایسے لوگ بہت خوش قسمت ہوتے ہیں۔"

"تھینک یو فار دی کمپلیمنٹ۔" وہ سر کو دائیں جانب ذرا سا جھکا کر بولی "اس گانے کے الفاظ بہت خوب صورت ہیں۔"

"ہاں!" سعد نے کہا "ان الفاظ کی خوب صورتی کی وجہ سے ہی یہ مجھے بہت پسند ہے۔ برونو مارس میرے پسندیدہ ترین سنگرز میں سے ایک ہے۔"

"ہوں!" ماہ نور نے کچھ دیر تک اس کی بات پر غور کیا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر اترنے لگی "تم مجھے اس گانے کا لنک ہی گفٹ کرو گے یا الفاظ بھی۔" اترنے سے پہلے مڑ کر اس نے سعد کی طرف دیکھا اور ایک اور احمقانہ سوال اس کے منہ سے نکلا۔

"لنک۔" سعد نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا "اور اس کے الفاظ کے لیے میری پسندیدگی جو ہم اکثر اچھے دوستوں کے ساتھ شیئر کرتے ہیں۔"

ماہ نور کے لیے اس کا جواب غیر متوقع تھا اسے اندازا نہیں ہوا مگر اسے لگا اس پر سرتاپا خاموشی سی چھا گئی تھی۔ وہ گاڑی کے ڈیش بورڈ پر جلتی بجھتی روشنیوں کو دیکھ رہی تھی۔

"میں تمہیں اس سونگ کا لنک ضرور بھیجوں گا۔" وہ ہولے سے مسکرایا۔ ماہ نور ایک لمحہ کو رکی اور پھر گاڑی سے باہر نکل کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

"گڈ بائے ماہ نور۔" سعد نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کر کے کہا۔

ماہ نور نے ہولے سے سرہلایا۔ گاڑی کے پہیے گاڑی کے دوبارہ اسٹارٹ ہونے پر ہلکے ہلکے چرچرائے اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔ ماہ نور وہیں کھڑی گاڑی کو اس لین کے آخر تک جاتے دیکھتی رہی یہاں تک کے وہ لین کا موڑ مڑ کر نظروں سے غائب ہو گئی۔

"میں نے تمہیں گڈ بائے نہیں کہا اس لیے کہ میں تمہیں گڈ بائے کہنا نہیں چاہتی۔"

ماہ نور نے وہیں کھڑے کھڑے سوچا اور پھر مڑ کر گھر کے اندر داخل ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"بیک ٹو ورک۔" وہ سعد کے آفس کے وسط میں پانچ منٹ سے کھڑے اسے فائلز پر سر جھکائے دیکھ رہے تھے۔ اس کا کوٹ اس کی آفس چیئر کی پشت پر رکھا تھا اور شرٹ کے کفس کے بٹن کھلے تھے' ٹائی کی گرہ ڈھیلی ہو چکی تھی۔ یہ صورت حال اس بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ سعد اپنے کام میں پوری توجہ سے مگن تھا۔

"بیک ٹو ورک" پانچ منٹ بعد انہوں نے اپنی سوچ کو الفاظ دیتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ سعد نے چونک کر سر اٹھایا اور مسکرا دیا۔

"آپ جانتے ہیں میں اپنے الفاظ سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتا۔" اس نے کہا۔

"ہوں۔" انہوں نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

"امید ہے کہ تمہارا وقت اب راضی خوشی پھر سے رواں ہو گیا ہوگا۔" انہوں نے کہا۔

"اچھا خاصا۔" مختصر جواب آیا۔

"ویسے ان وقت صاحب کے موڈ کیسے رہے اس آف میں۔" وہ چند قدم چل کر آگے آئے۔

"خاصے اچھے۔" پہلے مختصر جواب کا ہیر پھیر کیا گیا۔

"کوئی ہلا گلا' کوئی شور شرابا' کوئی کھانا دانا' کوئی پینا پلانا' کوئی گرل فرینڈز' کوئی عاشقی معشوقی' کچھ نئی تازی۔" انہوں نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

سعد نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور ان کے بین السطور مدعا پر غور کیا۔
"تقریباً "سب کچھ ہی ہوا۔" اس نے قلم پر ڈھکن لگاتے ہوئے کہا۔ "ہاں یہ پینے پلانے پر آکر بات رہ گئی۔"
"وہ کیوں بھئی۔ آج کل تو سب وافر میسر ہے' پانی کی طرح بہتی ملتی ہے۔" انہوں نے دانستہ چوٹ کی۔
"آہ!" سعد نے ریوالونگ چیئر کو کمر کے دباؤ سے پیچھے کرکے سر اس کی پشت سے ٹکاتے ہوئے دکھ کا اظہار کیا۔
"یہ تو ہے سب میسر ہے۔" اس نے اسی طرح سر ٹکائے ٹکائے ان کی طرف دیکھا "مگر آپ جانیں' میری میٹرنل جینز کتنی اسٹرونگ ہیں اب ان کا رجحان تو ظاہر ہے ٹھرے اور دیسی طریقے سے کشید کیے گئے محلول کی طرف ہی ہوگا نا اور سین یہ چل رہا ہے کہ یہ دونوں ملاوٹ شدہ ہی دستیاب ہیں اور اکثر تو اموات بھی واقع ہو جاتی ہیں ان کے استعمال سے لہٰذا محتاط رہنا بہتر سمجھا۔"
"وائز گائے (wise guy) (عقلمند لڑکا) انہوں نے کہا اور اس کی ٹیبل کے قریب آکر فائلز چیک کرنے لگے۔
"فرینکفرٹ کے بارے میں بتا دیا تمہیں معظم نے؟" فائلز کے صفحے پلٹتے پلٹتے انہوں نے پوچھا۔
"جی ہاں' یہ مژدہ جانفزا صبح آتے ہی گوش گزار ہو چکا ہے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے بال پوائنٹ کا ڈھکن کھولتے اور بند کرتے ہوئے جواب دیا۔
"زمان نے کچھ پیکز رکھے تھے تمہارے بیڈ روم میں' ملاحظہ کیا؟" انہوں نے اسی طرح جھکے جھکے ایک اور سوال کیا۔
"معذرت خواہ ہوں' نہیں دیکھ سکا۔"
"جینز کا ایک سرا اگر ٹھرے اور رم کی طرف کھینچے تو دوسرے کو اصولاً "ان پیکز کی طرف کھینچنا چاہیے تھا۔" انہیں نجانے کیوں اس کے اس متوقع جواب سے تکلیف سی ہوئی۔
"بدقسمتی سے ایک سرا اتنا اسٹرونگ ہے کہ اس نے ایکویٹر کا سارا بیلنس بیڑا غرق کر رکھا ہے۔ اس کا جھکاؤ مسلسل ایک ہی پول کی طرف ہے' دوسرے کی مقناطیسی کشش میں کہیں کوئی گڑبڑ لگتی ہے۔"
"ہوں۔" انہوں نے رد عمل کے طور پر فائلز کو زور سے بند کیا۔ سعد نے عادتاً "ہونٹ دانتوں تلے دبائے۔
"ویسے آپ لندن تک ہی محدود رہے گریٹ برٹن کے دوسرے حصوں کا بھی وزٹ کر لیتے تو اچھا رہتا۔" اس نے ایک اور معنی خیز بات کی۔
"مثلاً"۔" انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔
"سمپل۔۔۔" اس نے دونوں کہنیاں کرسی کے بازو پر رکھ کر ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے شانے اچکائے۔ "صرف انگلینڈ کیوں' اسکاٹ لینڈ' آئرلینڈ اور ایک ذرا فن لینڈ تک بھی ہو آتے۔"
"کوئی خاص وجہ؟" انہوں نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔
"کچھ خاص نہیں۔ بس امکان تھا کہ جینز کے کچھ ڈانڈے وہاں کے کسی باشندے سے بھی جا ملتے۔" اس نے کہا۔
"خیر ویسا ہرگز نہیں ہے جیسا تم سمجھتے ہو یا جیسا اپ ڈیٹ کیے جاتے ہو۔" انہوں نے بد مزہ ہوتے ہوئے کہا۔
"میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی میں تو صرف سیر سپاٹے کی بات کر رہا ہوں۔"
"وہ ایک بزنس ٹرپ تھا' سیر سپاٹا نہیں۔" انہوں نے خشک لہجے میں کہا۔ "کیونکہ میں اپنے وقت کو یہ اجازت کبھی نہیں دیتا کہ وہ مجھے بلیک میل کرے۔"
"آپ کی عمر تک پہنچ کر میں بھی یہ دعوا کرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ کیونکہ وقت نے کسی زمانے میں آپ کو جو

جی بھر کر بلیک میل کیا' اس کا ایک ثبوت آپ کے سامنے موجود ہے اور دوسرے کے لیے ہی میں آپ کو بزنس ٹرپ کا دائرہ فن لینڈ تک بڑھانے کا مشورہ دے رہا تھا۔"
"واضح رہے کہ میں نے اولاد پالنے کا فیصلہ بہت پہلے کر لیا تھا' علتیں پالنے کا پلان میرے چارٹر میں کہیں اور کبھی شامل نہیں رہا۔" سعد نے دیکھا' انہیں طیش آنے لگا تھا۔
"پیٹر یو آر۔" اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا "آج آپ نے آخر کار اولاد اور علت کا فرق تو واضح کر دیا بالآخر۔"
"مگر چونکہ تمہارے ہاں بیلنس سارا گڑبڑ ہے لہٰذا امکان غالب ہے کہ تم عمر بھر اولاد کے بجائے علتیں ہی پالتے رہو گے۔" انہوں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔
"مجھے مبارک ہو' آپ کی پیشین گوئی خاص خوش کن ہے۔" سعد نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔
"خیر فرینکفرٹ کو پلان کر لو۔ زیادہ دن نہیں ہیں درمیان میں۔" وہ واپس بزنس پر آتے ہوئے بولے۔
"شیور!" وہ بھی اپنے ایگزیکٹو روفائل میں واپس آگیا۔
"ناممکن ہی لگتا ہے کہ اتنے لمبے وقفے کے بعد یہ ملے اور چونچ لڑانے سے باز رہے۔" سعد کے آفس سے باہر نکلنے کے بعد انہوں نے سوچا۔
"چل پھر اے زندگی تیری یہ مرضی ہے تو یونہی سہی۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑے سیل فون پر کوئی نمبر ملاتے ہوئے فیصلہ کیا۔
"ہاں نادر!" اب وہ فون پر کسی سے بات کرتے ہوئے اپنے آفس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ "میں نے نوٹ کیا ہے سعد کی گاڑی کا ماڈل پرانا ہو چکا ہے' مجھے سب میکس کے نئے ماڈلز اور پرائس فارورڈ کرو ذرا جلدی۔"

☼ ☼ ☼

"مجھے سعد سلطان کہتے ہیں۔"
"آئی ایم سوری یا دو فور ایس ذرا لیٹ ہو گیا۔"
"کیا آپ یہ اسکیچ بیچنا چاہیں گی؟"
"میں اس کی منہ مانگی قیمت دینے کے لیے تیار ہوں۔"
"تم نے چارلس ڈکنز کو پڑھا ہے کبھی؟"
"ایک جگہ میں تمہارے کہنے پر گیا اور مس ہیوشم سے مل آیا' کیا ایک جگہ تم میرے کہنے پر چلو گی۔"
"یہ سارہ خان ہے' سارہ ایک ونڈر فل ایکروبیٹ اور ٹیلنٹڈ آرٹسٹ رہ چکی ہے۔"
"میں نے اپنی آنکھوں سے اس کی ہڈیاں ٹوٹتے اور خون بکھرتے دیکھا تھا۔"
"اتنی جلدی نتائج اخذ کرنے سے گریز کیا کرو۔"
"انسان کو اپنی زندگی کے معاملات میں بہت شیور ہونا چاہیے۔"
"کبھی چیزیں اتنی ویلیو ایبل ہوتی ہیں کہ آپ ان کی قیمت کا اندازہ ہی نہیں لگا پاتے۔"
"نامور جگہوں اور نامور لوگوں کے بارے میں تو سب ہی جانتے ہوں گے گمنام جگہوں اور لوگوں کے بارے میں جاننا میرا پسندیدہ مشغلہ ہے۔"
"اختر سے ملنا پسند کرو گی؟"
"میں معذرت خواہ ہوں' میں نے غلط کیا جو تمہیں یہاں لے آیا۔"

"مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش ہے جہاں میرا دل لگ جائے۔"
"ابراہیم میرا بچپن کا دوست ہے 'یہ ریسٹورنٹ ابراہیم کا ہے۔"
"شاید میں خود کو یا اپنی فیلنگز کو بیان کرنے کا فن نہیں جانتا۔"
"سارہ کو خود پر یقین کرنے میں ایک عمر بھی لگ جائے تو پروا نہیں۔"
"پتا نہیں اتفاقات کے بارے میں پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔"
"تم جانتی ہو ماہ نور! تم کتنی خوش قسمت ہو۔"

Her eyes' her eyes
Make the stars look like
They are not shining

یار دا اوڈھی عشق آتش لائی ہے۔

We found love in a hopeless place

گھوم چرخڑا گھوم تیری کتن والی جیوے

when i see your face
there is nothing I would like to change

اوکھے پینڈے لمیاں نے راہواں عشق دیاں
ککھ نہ چھڈے دیکھ وفاواں عشق دیاں

And when you smile
the whole world stops

"آپ کی آواز میں اتنے سحر کی وجہ۔"
"عشق۔"
آوازوں کا 'الفاظ کا' ایک ہجوم تھا جو بازگشت کی صورت ماہ نور کے اردگرد پھیل رہا تھا۔
"آپ کی آواز میں اتنے سحر کی وجہ۔"
"عشق۔"
یہ الفاظ دوبارہ اس کی سماعت سے ٹکرائے اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسلام آباد جانے سے پہلے وہ ایک اسرار کے الجھاؤ میں مبتلا تھی 'اسلام آباد سے واپسی پر وہ ایک نئی کیفیت سے دوچار تھی۔ اس کے اردگرد ان مختصر دنوں کی ان گنت یادوں کا ہجوم تھا 'الفاظ اور جملوں کا ذخیرہ تھا۔ تعارف اور شناسائی سے لے کر بے تکلفی تک کا مختصر مرحلہ تھا۔ اسلام آباد سے واپسی پر وہ خوش تھی 'شانت تھی یا پھر کسی نئی الجھن کا شکار ہو کر ایک نئے مخمصے میں پھنس کر نا خوشی کی کیفیت سے دوچار تھی۔

اس کی خود بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر وہ ان یادوں 'ان باتوں اور کیفیتوں سے فرار حاصل کرنے کی خواہش مند بھی ہرگز نہیں تھی۔ اس کے گھر والے 'کالج میں اس کی سہیلیاں 'اس کے ساتھ پروجیکٹس پر کام کرنے والے اور اس کے ٹیچرز سب ہی ماہ نور کی شخصیت میں واضح تبدیلی محسوس کر رہے تھے۔ مگر شاہ بانو کے سوا کسی نے اسے جتایا نہیں تھا۔ اس کے پاس شاہ بانو کے کسی سوال کا بھی جواب نہیں تھا اور وہ کسی کو جواب دیے بنا بس اس کیفیت میں مگن ہی رہتا جانا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

V

"تم اس بار چودہ دن 'سترہ گھنٹے اور پینتالیس منٹ کے بعد ادھر آئے ہو۔" سارہ نے اپنے سامنے بیٹھے سعد سے کہا۔
"سیکنڈز کا شمار کرنا بھول گئیں تم؟" سعد نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔
"ہرگز نہیں۔" سارہ نے سر ہلایا "تیرہ سیکنڈز اوپر ہوئے ہیں۔"
"اچھا!" وہ مسکرایا اور نرمی سے سارہ کی طرف دیکھنے لگا۔ "اور تمہیں پتا ہے کہ ان چودہ دن 'سترہ گھنٹے ' پینتالیس منٹ اور تیرہ سیکنڈز کے اندر تم میں کیا تبدیلی آئی ہے۔"
"کیا؟" سارہ نے تجسس سے اس کی طرف دیکھا۔
"تم پہلے سے زیادہ بیوٹی فل اور گورجیس ہو گئی ہو۔" اس نے جواب دیا اور اپنے ساتھ لائے پھولوں میں سے پنک ٹیولپ کی ایک لمبی شاخ نکال کر سارہ کی طرف بڑھا دی۔
"تمہاری مسمرائزنگ بیوٹی (مسحور کن خوب صورتی) کے نام۔" اس نے کہا۔
"تم باتیں بنانے کے ماہر ہو۔" سارہ وہ شاخ پکڑتے ہوئے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ پر قابو پانے میں ناکام رہی۔
"اور تمہارے reflexes (اعصاب) پہلے سے زیادہ شارپ اور ایکٹو نظر آرہے ہیں۔" سعد نے اس کی کہی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔
"وہ کیسے؟" سارہ نے حیرت سے پوچھا۔
"تمہارا بیٹھنے کا انداز 'بات کرنے کا طریقہ 'ہاتھ بڑھا کر پھول پکڑنے کا عمل سب میری بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔" وہ پر اعتماد لہجے میں بولا۔
"اور اسی خوشی میں سیمی آنٹی کیوں نہ ایک پارٹی تھرو کی جائے 'یہ بات اس نے کمرے میں داخل ہوتی سیمی آنٹی کو مخاطب کرتے ہوئے کہی تھی۔
"ہاں۔ میں نے بھی محسوس کیا ہے 'اس کے پٹھوں کی جنبش اور ہاتھوں کی گرفت پہلے سے بہتر ہوئی ہے 'سیمی آنٹی نے کہا "لیکن یہ بات کہی اس لیے نہیں کہ سارہ کبھی نہیں مانے گی۔"
"رکیں 'میں ابھی ایک اچھا سا ڈنر ڈلیور کرواتا ہوں 'آپ کے پاس کینڈلز تو ہوں گی۔" سعد نے سیل فون نکالتے ہوئے سیمی آنٹی سے پوچھا۔
"ہاں ہاں۔ بالکل ہیں۔" سیمی آنٹی لگی بندھی روٹین میں ذرا سی تبدیلی کے تصور ہی سے خوش ہو گئیں۔
"لیکن ایک شرط ہے۔" ڈنر آرڈر کرنے کے بعد وہ ہاتھ بلند کر کے بولا۔
"وہ کیا؟" سارہ اور سیمی آنٹی کے منہ سے بیک وقت نکلا۔
"ڈنر ہم بالکونی میں بیٹھ کر کریں گے 'آج موسم بے حد خوشگوار ہے 'سیمی آنٹی! چلیں ٹیبل اور چیئرز باہر رکھتے ہیں 'لائٹس آف کر کے کینڈلز جلاتے ہیں اور لائٹ سا میوزک بھی ہو گا ساتھ میں۔" اس نے سیکنڈوں میں پروگرام ترتیب دیا۔
"مگر۔" سارہ کا جواب اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ اس نے اسے جملہ مکمل نہیں کرنے دیا۔
"اگر مگر والی تو کوئی بات ہی نہیں 'آج تمہیں اس کمرے سے باہر نکالنے کا افتتاح ہو گا جناب!" وہ سیمی آنٹی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ سارہ کو کمرے سے باہر چیزیں گھسیٹنے 'اٹھانے 'رکھنے 'کھٹر پٹر کی آوازیں آتی سنائی دے رہی تھیں اور وہ اپنی جگہ پر سر جھکائے بیٹھی سوچ رہی تھی کہ یہ صورت حال اس کے لیے کیسی تھی۔ اس نے گود میں رکھی ٹیولپ کی شاخ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ سعد کے لہجے اور آواز میں موجود زندگی اور زندہ دلی کے احساس کو یاد

کیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اگر تھوڑا سا مزید اس پروگرام کی مخالفت کرے گی تو وہ بحث کیے بغیر اسے منسوخ بھی کر دے گا، مگر وہ پہلا دن تھا جب اس نے سعد کی مان لینے کا سوچ لیا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر گزشتہ کچھ دنوں میں سنی باتوں کا خاصا اثر باقی تھا۔

دھیرے دھیرے رات میں ڈھلتی وہ شام یادگار ترین شاموں میں سے ایک قرار دی جا سکتی تھی۔ چھوٹی سی بالکنی میں بچھی سفید بید کی ہلکی پھلکی کرسیاں اور چھوٹی سی گول اونچی گلاس ٹاپ والی میز پر سلیقے سے سجی نازک سی کراکری، چمکتے چمچ، کانٹے اور چھریاں، لمبی گردنوں والے وائن گلاس اور سفید نیپکنز، ٹیبل کے وسط میں رکھا آٹھ موم بتیوں والا شمع دان، جس میں سیدھی، لمبی آٹھ، سفید موم بتیاں جل رہی تھیں۔ کسی فائیو اسٹار ہوٹل سے آیا پرلطف کھانا اور قریبی تپائی پر رکھے لیپ ٹاپ سے اٹھتی نرم موسیقی کی لہریں۔ سعد جب سارہ کو اس کی کرسی سمیت اٹھائے باہر بالکنی میں لایا تو سارہ کو محسوس ہوا جیسے وہ اچانک سے کسی دوسری دنیا میں داخل ہو گئی ہو، اس کے سامنے یہ سارا منظر تھا جو اسے پریوں کی دنیا کی کہانیوں کا تصویری خاکہ محسوس ہو رہا تھا۔ سعد نے اسے بید کی کرسی پر بیٹھنے میں مدد دی، اس کے سامنے تاحد نظر اونچے پہاڑ اور سربلند چوٹیاں تھیں، جن میں بنے چھوٹے چھوٹے رہائشی مکانوں میں برقی قمقمے یوں جگمگاتے تھے جیسے کسی نے تاروں بھری چادر جا بجا جھاڑ دی ہو۔ "سارہ کے لیے یہ ایک نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ وہ سحر زدہ تھی اور بار بار آنکھیں جھپکا کر اس منظر پر یقین کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"یہ زندگی کا ایک رنگ ہے سارہ خان!" کھانے کے دوران سعد نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"اور تمہارے چہرے کا جتنا بھی حصہ ان موی شمعوں کی روشنی میری نظروں کے سامنے واضح کر رہی ہے، اس پر مجھے مسرت اور شوق کا عکس نظر آ رہا ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "اور سوچ لو کہ زندگی کے ہزاروں رنگوں میں سے ابھی تو یہ صرف ایک ہی رنگ ہے۔"

سارہ نے نظریں اٹھا کر آسمان پر چھائی تاریکی کے نیچے اونچے پہاڑوں پر اُگے چنار کے درختوں کے ہیولے دیکھے اور ہولے سے سرسراتی ہوا کے ساتھ بکھرتے اپنے بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑسا۔

"وہ لڑکی اب کہاں ہے؟" اس نے سعد کی بات کے جواب میں سوال کیا۔

"وہ۔" اس نے پائن ایپل کا ٹکڑا کانٹے میں پھنساتے ہوئے بے دھیانی سے کہا۔ "وہ تو شاید واپس چلی گئی اپنے گھر۔"

"شاید۔" سارہ نے دل میں دہرایا "یعنی اس کی اہمیت بس اتنی ہی تھی کہ وہ چلی گئی یا نہیں اسے معلوم ہی نہیں۔" اس نے آنکھیں ایک بار بند کر کے کھولیں، پریوں کی کہانیوں کے تصویری خاکوں سا یہ منظر اب پہلے سے بھی زیادہ پیارا لگ رہا تھا۔

چہرہ ہے یا چاندنی رات
زلف گھنیری شام ہے کیا
ساگر جیسی آنکھوں والی
یہ تو بتا تیرا نام ہے کیا

لیپ ٹاپ سے ہوا کی لہروں پر بکھرتی موسیقی کے ساتھ یہ الفاظ بھی فضا میں بکھر رہے تھے۔

"پریا... پریا رانی" سارہ نے سعد کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کیا تم مجھے اس نام سے مخاطب کر سکتے ہو؟"

جواب میں سعد نے مسکرا کر سر ہلایا "نائس نیم، کیوں نہیں۔"

وہ کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

"بڑی مشکل سے بنی ہے یہ پرچی۔ چوہدری صاحب کو بڑے بڑے افسروں کے ترلے کرنے پڑے تب جا کر یہ پرچی ہاتھ آئی ہے۔" صابرہ نے اپنے سامنے اونچی پیڑھی پر بیٹھی آپا رابعہ سے کہا۔

"کوئی آسان کام تو نہیں ہوتا نا' نئے سرے سے ریکارٹ (ریکارڈ) بنوانا' علامتیں لکھوانی' عارضی اور مستقل پتے بتانے۔" وہ ان نادیدہ مشکلات کا بیان خود سے ہی کر رہی تھیں جو سعدیہ کے فارم ب بنوانے میں چوہدری صاحب کو پیش آئی تھیں۔

"بڑی مہربانی ہے جی چوہدری صاحب کی۔" آپا رابعہ نے نظریں نیچے کیے نرمی سے جواب دیا۔

"چوہدری صاحب تو اپنی مہربانیوں میں کمی نہیں کرتے مگر لوگ بڑے بے دیتے (کم ظرف) ہوتے ہیں' کئی لوگوں کی تو آکڑ (اکڑ) ہی نہیں ختم ہوتی۔" صابرہ نے ناک چڑھاتے ہوئے آپا رابعہ کو جتایا۔

"جی!" بدستور نظریں نیچی رکھتے ہوئے انہوں نے مختصر جواب دیا۔

"سیدھی سی بات ہے نا۔" اب صابرہ صاف لفظوں میں اپنا مدعا بیان کرنے پر اتریں۔ "ہم آپ لوگوں کے کام آتے ہیں' آپ لوگوں کو چاہیے آپ ہماری بھی سنیں۔"

"جی جی۔ ضرور۔" آپا رابعہ نے ادب سے کہا۔ "آپ بتائیں جی!"

"تین باری پیغام بھیجا تھا آپ کو کہ میلاد شریف میں' محفل میں' ختم قرآن پاک میں ہمارے ساتھ شریک ہوں پر ان چھ سالوں میں آپ نے ایک بار بھی گوارا نہ کیا کہ ہم ماڑے ساڑوں (بے چارے) لوگوں کے ساتھ مل بیٹھیں۔" صابرہ نے کب کا غصہ نکالنے کے لیے اس موقع کو غنیمت جانا تھا۔

"ایسی بات نہیں جی۔" آپا رابعہ نے نرمی سے کہا۔ "میں گھر سے باہر کم ہی نکلتی ہوں اور محافل میں بھی شرکت نہیں کرتی۔"

"تو نائیوں کی نوں کے چالیے (چہلم) پر آپ روٹی ورتانے (کھانا بانٹنے) گئی تھیں کیا؟" صابرہ نے طعنہ دینے کے انداز میں کہا۔ "وہاں تو سنا ہے' آپ نے درس بھی دیا تھا اور دعا بھی کروائی تھی۔"

"جی!" آپا رابعہ کو دو سال پہلے کا وہ واقعہ یاد آ گیا "ایک تو وہ ہمارے بالکل ساتھ والے گھر میں رہتی تھی' ہمسائیگی کا حق تھا' دوسرا غریب لوگ ہیں' درس سبق پڑھنے والی بی بی کپڑوں کے جوڑے اور ہدیے کے بغیر آنے پر راضی نہیں تھی سو اللہ کے نیک بندوں کی جو چار اچھی باتیں مجھے یاد تھیں۔ میں نے دہرا دیں' کوئی خاص نیت

سے میں وہاں نہیں گئی تھی۔" انہوں نے وضاحت کی۔
"پر آپ کے درس سبق کی سارے پنڈ میں دھوم مچی تھی۔" صابرہ نے کلس کر کہا۔ "بس آج مجھ سے وعدہ کر کے یہاں سے اٹھیں کہ آتے درس سبق پر آپ مجھے واری (باری) دیں گی اس بار ضرور۔"
"وہ۔" آپا رابعہ نے کچھ کہنا چاہا تب ہی میں ان کی نظر ہاتھ میں پکڑے موی کاغذ میں ملفوف فارم پر پڑی۔
"ٹھیک ہے۔ جی ضرور۔" انہوں نے احساس ممنونیت سے بوجھل ہوتے ہوئے لہجے میں کہا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔
"اب چلتی ہوں۔" انہوں نے اپنے سیدھے ٹوپی برقعے کا نقاب چہرے پر ڈالنے سے پہلے کہا۔ "آپ کا بہت شکریہ۔ چوہدری صاحب سے بھی شکریہ کہہ دیجیے گا۔" چہرہ پر جالی دار نقاب کھینچ کر وہ اپنے ساتھ آئی اپنی ہمسائی سمیت صابرہ کے گھر کا صحن عبور کر گئیں۔
"اب آیا ہے نا اونٹ پہاڑ کے نیچے" ان کے جانے کے بعد صابرہ نے ملازمہ خاص رضیہ سے کہا اور زور سے ہنس دیں۔

☼ ☼ ☼

"او خیر سعدیہ! باؤ آج پھر اکیلی آ رہی ہو واپس۔" کھاری فارم ہاؤس سے باہر نکلا تو سعدیہ کو بڑا سا بستہ اٹھائے اکیلے پگڈنڈیوں پر قدم جما جما کر چلتے آتے دیکھ کر رک گیا۔ طویل راستہ پیدل چل کر یہاں تک آتے وہ پسینے سے شرابور ہو رہی تھی۔
"مس نے سائنس گروپ کی لڑکیوں کو پریکٹیکل کے لیے روکا ہوا تھا۔ آج میں سونگ پار والے گاؤں کی لڑکیوں کے تانگے پر آئی ہوں اس نے مجھے پٹے (آغاز) پر ہی تار دیا۔" سعدیہ نے ہانپتے ہوئے کہا۔
"ہائے کھاری! بڑی پیاس لگی ہے اور میری ٹانگیں جواب دے گئی ہیں چل چل کے۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔
"اوئے ہوئے ہوئے۔" کھاری نے سرہلا کر افسوس کا اظہار کیا اور پھر ادھر ادھر دیکھا۔ "آؤ تساں کو پانی پلاتا ہوں۔" اس نے فارم ہاؤس کا چھوٹا گیٹ کھولا "فارم ہاؤس بھی دیکھ لینا آج اندر سے۔" کھاری نے مسرت بھرے انداز میں کہا۔
"فارم ہاؤس۔" سعدیہ نے حیرت سے پوچھا۔
"آہو فارم ہاؤس..... دیکھنا نہیں؟" کھاری نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا "آج بڑا سکون اے چوہدری صاحب شہر گئے ہوئے نیں تے سارے کمی کاری عید کی وجہ سے اپنے اپنے گھر گئے ہوئے ہیں اندر کوئی خاص بندہ نہیں جو ہیں وہ سوتے پڑے ہیں' آجاؤ آجاؤ۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔
"ہیں۔" سعدیہ نے بے یقینی سے کھاری کی طرف دیکھا "لیکن اماں انتظار کر رہی ہوں گی' دیر ہو جائے گی۔" دوسرے ہی لمحے اس کی خوشی ہوا ہو گئی۔
"نہیں ہوتی دیر جی۔" کھاری نے سر جھٹکا "اے بس آگے آگے سے دیکھ لو کوئی بندہ نہیں خاص اندر۔"
سعدیہ نے لمحہ بھر کو سوچنے کی کوشش کی مگر پھر فارم ہاؤس کو اندر سے دیکھنے کا ہمیشہ کا شوق اور تجسس اور اسے پورا کرنے کے اس نادر موقع کا خیال اس کے ناپختہ ذہن پر حاوی ہو گیا۔ اور وہ اپنی تھکی ٹانگوں کو دو قدم مزید گھسیٹتی چھوٹے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عنیزہ سیّد

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور نے "سید پور کلچرل شو" میں شرکت کے لیے اپنی دوست شاہ بانو کے ساتھ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ شاہ

بانو نے اپنے بھائی کی معرفت سید پور میں ماہ نور کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا۔ فاطمہ اور خدیجہ نے ماہ نور کو اسلام آباد میں قلزا ظہور سے ملنے کی تاکید کی۔ قلزا ظہور ان کے بچپن کی ساتھی ہے۔ بچپن میں کوئلے سے فرش اور دیواروں پر تصویریں بنانے والی قلزا ظہور اب ایک بڑی آرٹسٹ ہے مگر اسے شہرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔

مولوی سراج اور آپا رابعہ قصبے میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی سعدیہ کلثوم نویں جماعت کی طالبہ بے حد ذہین ہے۔ مولوی سراج اور آپا رابعہ کو اس بات پر فخر ہے کہ ان کی بیٹی سائنس پڑھ رہی ہے۔

ایک رات سارہ نے رکی کو خواب میں دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ سرکس میں کام کرتا تھا۔ رکی اپنے فن کا ماہر جوکر تھا۔

ماہ نور اور شاہ بانو "سید پور کلچرل شو" میں گئیں تو وہاں انہیں ایک کمہار نظر آیا۔ وہ گیلی مٹی کو بہت مہارت سے دیدہ زیب برتنوں کی شکل میں ڈھال رہا تھا۔ ماہ نور کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہ چونک گئی۔ اسے اس پر اسی شخص کا گمان ہوا' جو اسے ہر میلے میں مختلف روپ میں نظر آتا رہا تھا۔

سارہ' ماہ نور سے مل کر خوش نہیں ہوئی۔ اس کا رویہ بہت روکھا اور خشک تھا۔

واپسی پر گاڑی میں ماہ نور نے سعد سے اعتراف کیا کہ وہ اب تک جتنا سعد کو جان پائی ہے' سعد اس کی نظر میں ایک قابل رشک انسان ہے' سعد نے اسے سارہ کے متعلق بتایا وہ سرکس دیکھنے گیا تھا۔ سارہ خان بلندی سے نیچے گری تھی۔ اس نے اس کی ہڈیاں ٹوٹتے اور خون بکھرتے دیکھا تھا' وہ وہاں سے واپس آگیا لیکن سارہ خان کے لیے بے چین رہا۔ وہ دوبارہ اسے ڈھونڈتے ہوئے اس سے ملنے پہنچا تو وہ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور زخم زخم جسم کے ساتھ ایک چھولداری میں پڑی موت کی منتظر تھی۔ اس کے زخموں پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں۔ سعد اس کو وہاں سے لایا اور اس کا علاج کرایا اور پھر اسے فلیٹ میں منتقل کیا۔

کھاری نے آپا رابعہ سے نماز یاد کرلی تھی اور بہت خوش تھا۔ سارہ خان نے پہلی بار سوچا سعد سے اس کا تعلق صرف ترس اور ہمدردی کا ہے اسے اپنا ماضی یاد آرہا تھا۔ جہاں جاپانی نقش و نگار والا رکی تھا۔ جس کی جاپانی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اس کا باپ اس کے بہن بھائیوں کے ساتھ پھوپھی کے حوالے کرگیا تھا۔ باپ نے دوسری شادی کرلی تو سوتیلی ماں کے مظالم سے تنگ آکر وہ گھر سے بھاگ گیا اور قسمت اسے سرکس میں لے آئی۔

آپا رابعہ نے مولوی سراج کو بتایا کہ اسکول والوں نے سعدیہ کی پیدائش کی پرچی مانگی ہے تو وہ پریشان ہوگئے۔

ماہ نور' سارہ سے ملنے آئی اور اس نے سارہ کو بتایا کہ اس کی سعد سے صرف چند دن پہلے ملاقات ہوئی ہے۔ یہ سن کر سارہ کا رویہ اس کے ساتھ بدل گیا۔

سعد نے اپنی بہن نادیہ سے اسکائپ پر بات کی۔ وہ فن لینڈ میں بہت مشقت بھری زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کی ماں کا شوہر اس پر بری نظر رکھ رہا تھا۔ اس لیے وہ فن لینڈ آگئی۔

جیناں بھکارن نے ایک بچہ اغوا کیا لیکن پولیس نے اس سے بچہ برآمد کرلیا۔

ماہ نور کی سعد سے ملاقات ہوئی تو وہ اسے اختر کے پاس لے گیا۔ اختر نے ماہ نور کو دیکھ کر سعد سے کہا "یا تو زن یا من پالو" ایک کی قربانی دینی پڑے گی۔

اس نے ماہ نور سے کہا بی بی آپ کا دل بہت صاف ہے اور زندگی بہت پرسکون ہے لیکن آگے آپ کے لیے بہت مشکلیں ہیں۔

۸

آٹھویں قسط

فارم ہاؤس کیا ہوتا ہے؟ کیسا ہوتا ہے... یہ تو سعدیہ نے پہلے کبھی سوچا نہ تھا مگر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جانے والا محاورہ اس نے بہت بار پڑھ رکھا تھا اور اس روز فارم ہاؤس دیکھنے کے شوق میں کھاری کے ساتھ اندر داخل ہو جانے کے بعد اسے اچھی طرح سمجھ میں آگیا تھا کہ آنکھیں کیسے پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔

اس نے فارم ہاؤس کی رہائشی عمارت کا ایک ایک کمرا دیکھا اور ہر کمرے کی سجاوٹ نے اس کی آنکھیں پھاڑ دیں۔ ہر کمرے کے فرش پر مختلف رنگوں کی ٹائلیں جڑی تھیں۔ اس نے کھاری سے نظر بچا کر پاؤں کا جوتا اتار کر کئی بار کمروں کے فرش پر ٹائلوں کی ہموار سطح اور ٹھنڈک کو محسوس کیا۔

ان گنت کمرے' ان گنت طرز کی سجاوٹیں' کھاری کا تبصرہ اسے بتا رہا تھا کہ کون سا کمرا کس قسم کے مہمان کا مہمان خانہ تھا۔ کس کمرے میں کون کھانا کھاتا تھا۔ کس کمرے میں کون بیٹھ کر گپ شپ لگاتا تھا۔

"ایہہ دیکھ سعدیہ باؤ! پولیو (پولو) گراؤنڈ۔" ایک کمرے کی لمبی لمبی کھڑکیوں سے پردے ہٹا کر کھاری نے اسے کمرے سے باہر کا منظر دکھایا۔ کہیں سے اونچی کہیں سے نیچی سطح پر ایسے ہرے رنگ کی گھاس بچھی تھی جو سعدیہ نے کبھی کبھار اس کیلنڈر کی تصویروں میں دیکھی تھی جو اس کے اسکول کی بڑی مس کے کمرے میں ٹنگا رہتا تھا۔ اس گراؤنڈ میں مختلف جگہ پر بنے سوراخ بھی نظر آرہے تھے۔

"یہ سوراخ خرگوشوں کے بل نہیں' ان کے اندر گیندیں پھینکتے ہیں۔" کھاری نے اسے بتایا۔

"کیسے پاگل لوگ ہوں گے وہ جو گیندیں' سوراخوں میں ڈالنے کو کھیل کہتے ہوں گے؟" سعدیہ نے اس گراؤنڈ سے متعلق کھاری کی تفصیل سن کر سوچا۔

"یہ پردے دبئی سے بن کر آئے ہیں اور فرنیچر لاہور سے۔" کھاری نے بتایا۔ "ساری لائٹیں پتا نہیں کون کون سے ملک سے آئی ہیں اور جتنا شیشہ لگا ہے' وہ بھی باہر سے آیا ہے۔ ماربل بھی باہر کے ملکوں سے اور یہ جو ڈیکریشن (ڈیکوریشن پیسز) ہیں سارا کچھ باہر سے آیا ہے۔"

سعدیہ نے اس طلسماتی محل کی ایک ایک چیز کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا اور پھر نظریں تھک جانے پر انہیں جھکا لیا۔ اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ اتنی بڑی عمارت... اتنے سارے کمرے... اتنا بے شمار سامان اور برتنے والے لوگ ندارد۔ عمارت پر ایسا ہُو کا عالم طاری تھا کہ اسے کھاری کی آواز گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔

"بس کھاری! اب میں نے گھر جانا ہے۔" یکدم سعدیہ کا دل گھبرانے لگا اور اس نے چاہا کہ بس وہاں سے بھاگ جائے۔

"چلئے آں سعدیہ باؤ! ابھی سمنگ پول (سوئمنگ پول) دیکھ لو' کچن دیکھ لو' پھل' پھل تے سبزیاں تے دیکھ لو۔ ابھی تو بڑا کچھ رہتا اے۔" کھاری کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیسے چشم زدن میں سعدیہ کی نظروں کے سامنے عمارت کا سارا نقشہ گھما دے۔

وہ ایک انجان سی معتبری کی خوشی سے سرشار تھا۔

"اس محل میں کوئی انسان رہتا بھی ہے کھاری! یا یہ یونہی سجا سجایا گم سُم کھڑا رہتا ہے۔" سعدیہ نے کہا۔

"بڑیاں رونقاں ہوتی ہیں سعدیہ باؤ!" کھاری نے کہا۔ "بندے ہی بندے' پروہنے (مہمان) ہی پروہنے' پر آج کل بتایا تھا نا عید کی وجہ سے لوگ اپنے گھرو گھری (اپنے اپنے گھر) گئے ہیں۔ چوہدری صاب بھی ادھر نئیں۔" کھاری نے ہنستے ہوئے کان میں انگلی پھیری۔ "اسی لیے تو میں نے سوچا کہ سعدیہ باؤ سکون سے دیکھ لے فارم ہاؤس۔"

"بس کھاری!" سعدیہ کی نظریں کھاری کی بات سننے کے دوران اس نشست گاہ' جس میں وہ دونوں کھڑے تھے' کسی دیوار پر ٹنگے ہرنوں کے سروں پر پڑ گئی اور اسے لگا' وہ اپنی سرمئی سرمئی آنکھوں سے بس اسے ہی گھورے جا رہے تھے۔

"بس اب میں نے جانا ہے۔" وہ تیز قدموں سے چلتی اس نشست گاہ سے باہر نکل آئی۔

اب وہ ایک طویل راہداری میں کھڑی تھی' جس میں کئی کمروں کے دروازے کھل رہے تھے اور جس کے دونوں سروں سے سیڑھیاں بالائی منزل کو جارہی تھیں۔ سیڑھیوں کے ساتھ منقش آبنوسی ریلنگ اوپر جارہی تھی۔

"اس لکڑی کا رنگ سیاہ کیوں پڑگیا ہے کھاری؟" سعدیہ نے راہداری کے بائیں سرے پر پہنچ کر ریلنگ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ لکڑی ہوتی ہی ایسی رنگ دی ہے سعدیہ باؤ! اور بڑی مہنگی ہوندی ہے۔" کھاری نے سعدیہ کے چہرے پر پھیلے حیرت اور مرعوبیت کے آثار کو ترحم بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بیچاری نے گاؤں کے جوہڑوں اور اپلوں سے بجی دیواروں سے آگے کچھ دیکھا ہوتا تو اتنی حیرانی نہ ہوتی۔" وہ دل میں سوچ رہا تھا۔

سعدیہ نے راہداری کے اختتام پر باہر کی طرف کھلنے والے دروازے سے اندر آتی ہوا کو محسوس کیا اور سورج کی روشنی کی لکیر کو دیکھا۔ وہ سورج جو باہر تمتما رہا تھا اور وہ ہوا جو چہرے اور جسم کو جھلسائے دے رہی تھی' یہاں کیوں خنک لگ رہی تھی۔" اس نے اپنے دل میں سوال کیا۔

"سعدیہ باؤ! وڈے لوکاں دے وڈے کم۔" کھاری نے جیسے سعدیہ کے دل میں اٹھا سوال پڑھ لیا تھا۔

"اس عمارت کو اس طریقے نال بنایا گیا ہے کہ چاروں طرفوں ہوا آئے تے ٹھنڈی آئے۔"

سعدیہ رشک' خوف اور حسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اپنے سامنے کا منظر دیکھنے لگی۔ قسم ہا قسم کے پیڑ پودے' تاحد نظر سبزہ اور سبزے کے پار فارم ہاؤس کی طرف آتا سرخ منقش اینٹوں سے بنا راستہ' راستے کے دونوں طرف لکڑی کی باڑھ اور راستے کے عقب میں سیاہ آہنی گیٹ' اس کے دل پر ہیبت طاری ہونے لگی۔

"بس کھاری! اب گھر جانا ہے۔ اماں کا دل گھبرا رہا ہوگا۔" سعدیہ نے تیز قدموں سے باہر جانے والے راستے پر چلتے ہوئے کہا۔

"سعدیہ باؤ پیاس نئیں لگی؟" کھاری کو یاد آیا۔

"نہیں اب نہیں ہے پیاس۔" سعدیہ اب جلد از جلد ادھر سے نکل جانا چاہتی تھی۔

"تو ادھر کہاں جارہی ہو سعدیہ باؤ؟" کھاری اس کی برق رفتاری پر ہنسا۔

"باہر جانے کا راستہ اے تے نئیں۔"

"ہیں؟" سعدیہ کے چلتے قدم رک گئے۔ "تو پھر؟"

"فارم ہاؤس وچ لکن میٹی کھیلو تے بندہ کبھی نہ ملے۔" کھاری ہنس رہا تھا۔

"ادھر کو آؤ۔" اس نے دائیں طرف اشارہ کیا۔ سعدیہ کھاری کے اشارے پر بتائے ہوئے راستے پر چل دی۔ اس کا دل کسی انجانے خوف سے دھک دھک کرنے لگا۔ "یہ فارم ہاؤس ہے کہ بھول بھلیاں' قید خانہ ہے کہ طلسم خانہ۔" وہ باہر جانے والے راستے کو تاڑتی سوچ رہی تھی۔

"لو جی! یہ ہے گیٹ وڈا!" ایک طویل راستہ طے کرکے کھاری نے ایک گیٹ کے قریب پہنچ کر کہا۔

سعدیہ نے کھاری کی طرف دیکھا۔ "جب آئے تھے تو اتنا تو نہیں چلنا پڑا تھا۔"

"او سعدیہ باؤ! اندر آتے ہی تو کمروں میں چلے گئے تھے' پھر واپس تسی دوسری طرف نکل گئے' اینج تے ہونا تھا۔" کھاری نے دانت نکوستے ہوئے کہا۔

سعدیہ کو اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

"کھاری گیٹ کھولو جلدی۔" اس نے بغیر دیکھے قدرے بلند آواز میں کہا۔

"لے لو جی!" کھاری نے آگے بڑھ کر گیٹ کا چھوٹا پٹ کھولا اور سعدیہ نے بھاگتے قدموں سے گیٹ کے باہر قدم رکھا۔

ایک باتصویر کہانی کے کسی منظر سے باہر دنیا وہی تھی' جسے وہ اس آہنی گیٹ کے اندر داخل ہونے سے پہلے چھوڑ کر گئی تھی۔ وہی ٹکڑیوں میں بٹے کھیت' اکا دکا درخت' دھول اڑاتے کچے راستے' اونچی نیچی پگڈنڈیاں' آگ برساتا آنکھوں کو چندھیاتا سورج' وہ کسی عجائب خانے سے نکل کر واپس اپنی دنیا میں آگئی تھی۔

یہاں سے اندر داخل ہونے کے بعد گھڑی کی سوئیاں شاید تھم گئی تھیں اور اس کے باہر نکلتے ہی رکا ہوا وقت جیسے دوبارہ چلنا شروع ہوگیا تھا۔ سعدیہ نے کچھ دیر وہیں کھڑے کھڑے اپنی دنیا میں دوبارہ واپس آجانے پر شکر ادا کیا اور پھر لحہ بھر کو مڑ کر دیکھا۔ کھاری گیٹ سے باہر کھڑا شاید اس کے گھر کی طرف جانے کا منتظر تھا۔

"جادوئی قالین پر بٹھا کر پرستان کی سیر کرانے والا رحم دل جن۔" سعدیہ کو بہت پہلے پڑھی بچوں کی ایک کتاب کا کردار یاد آیا اور اس نے اپنے گھر کی طرف جاتے راستے پر چلنا شروع کردیا۔

"سائنس ہوتی ہی مشکل ہے' اسی لیے تو ہر کوئی نہیں پڑھتا' صبح کی گھر سے نکلی بچی شام پڑے گھر واپس آئی ہے۔ آج استانی نے امتحان میں آنے والے سارے سائنسی تجربے اکٹھے ہی کروائے ہیں..... اور دیکھیں! سارے دن کی بھوکی پیاسی اتنا لمبا راستہ چل کے اکیلی گھر پہنچی ہے تو بھوک کے بخار چڑھ گیا ہے۔"

اس رات سعدیہ کے سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتے ہوئے آپا رابعہ نے مولوی صاحب کو مطلع کیا۔

"ہوں!" مولوی صاحب تیزی سے ستائیس دانوں کی تسبیح کے موتی گراتے اپنے تئیں سعدیہ پر دم کرنے کی کوئی دعا پڑھ رہے تھے۔ بخار سے بے ہوش پڑی سعدیہ کے لیے فکر مند آپا رابعہ بے خبر تھیں کہ سعدیہ کا بخار سائنس کے تجربوں کا نتیجہ تھا یا آرٹ کے کرشموں کا۔

☼ ☼ ☼

"شکر ہے تم کو دیکھنا نصیب ہوا۔ تم تو لگتا ہے جیسے عید کا چاند ہو گئیں۔" خدیجہ نے باڑھ کے پار کھڑی ماہ نور کو دیکھ کر کہا' جو صبح صبح غالباً" کالج جانے کے لیے نکلنے والی تھی۔

"ارے خدیجہ خالہ! السلام علیکم۔" ماہ نور جو اپنے دھیان میں کھڑی موبائل فون پر کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش میں مگن تھی' چونک کر بولی۔

"وعلیکم السلام۔ کب آئیں تم واپس؟" خدیجہ نے ربڑ کے پائپ سے پودوں کی کیاریوں میں پانی کی دھار باندھتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے واپس آئے تو ڈیڑھ ہفتہ ہوگیا۔" ماہ نور شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔ "آتے ہی کالج شروع ہوگیا اور حسب معمول دن رات کی کچھ خبر نہیں۔"

"یہ ہی تو..." خدیجہ نے پائپ ایک بڑے درخت کے قدموں میں رکھتے ہوئے کہا۔ "میں فاطمہ سے کہہ رہی تھی' ماہ نور اپنی ایکٹوٹیز میں گم ہوکر فون تک کرنا بھول گئی۔"

"ارے نہیں خالہ!" ماہ نور مزید شرمندہ ہوئی۔ "آج سے ویک اینڈ شروع ہوجائے گا۔ میں آج شام کو آپ کی طرف آؤں گی۔ میرے پاس آپ کو سنانے کے لیے بہت کچھ ہے۔ میں فون پر آپ کو ادھوری ادھوری سی باتیں سنا کر ان کا مزا خراب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اب سارے قصے اکٹھے سناؤں گی بمعہ ایک سرپرائزنگ نیوز کے۔" وہ شرمندگی مٹانے کو تیزی سے بولی۔

"اوہ ڈیٹس گریٹ!" خدیجہ خوش ہوتے ہوئے ہنسیں۔ "آج تمہارے لیے پزا بیک کرتی ہوں اور چاکلیٹ فج پیسٹری بھی منگواتی ہوں کچھ اور کھانا ہو تو بتادو۔"

"نہیں نہیں۔۔۔ بہت ہے۔" ماہ نور نے ہاتھ ہلایا اور پھر کلائی پر باندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ "اوہ خدیجہ خالہ! آئی ایم سوری مجھے دیر ہورہی ہے آج سلمان پہلے نکل گیا۔ مجھے لوکل ٹرانسپورٹ پکڑنی ہے۔"

"او ہو!" خدیجہ نے کہا۔ "چلو پھر نکلو بھئی جلدی کرو۔" ماہ نور ہاتھ ہلا کر تیزی سے گیٹ سے باہر چلی گئی۔ خدیجہ نے اسے جاتے دیکھا اور مسکرادیں۔

"آج کا اسٹوڈنٹ ہر وقت جلدی میں رہتا ہے۔ روڈز پر' کالجز میں' یونیورسٹیوں میں جدھر دیکھو' جلدی جلدی بول رہا ہے' تیز تیز چل رہا ہے۔ سارے جہان کے تفکرات اپنے چہرے پر سجائے جیسے ہر وقت حالت جنگ میں ہو۔ وقت کے پیچھے بھاگتا' تا نگیں تھکاتا' نہ ڈھنگ سے کھانا' نہ پوری نیند سونا۔ یہ اسٹوڈنٹ بے چارہ زندگی کی کتنی لطافتوں سے محروم رہتا ہے۔" انہوں نے سوچا اور پھر ان کی نظروں کے سامنے اپنے دور طالب علمی کے منظر بکھر گئے۔ وہ ہمیشہ کی طرح ماضی کے تصور میں گم ہوگئیں۔

☼ ☼ ☼

سعد کے سیل فون پر ایک نامعلوم نمبر سے کسی تصویری نمائش کا دعوت نامہ موصول ہوا تھا۔ اس نے دو' تین بار پیغام پڑھا لیکن اسے بالکل بھی یاد نہیں آیا کہ اس نمبر سے اسے پہلے کبھی ایسا پیغام وصول ہوا تھا یا نہیں۔

"دعوت نامے کا بے حد شکریہ! مجھے افسوس ہے کہ میں تصویری نمائش کے دنوں میں ملک سے باہر گیا ہوں گا۔ ویسے آپ کا اسم شریف دریافت کرسکتا ہوں؟" اس نے بلا ارادہ ہی اس پیغام کا جواب ٹائپ کیا اور بھیج دیا۔

اسی شام اسے اسی نمبر سے کال موصول ہوئی۔ دوسری طرف کسی خاتون کی آواز تھی۔

"میں نے سوچا تمہیں پینٹنگز میں دلچسپی ہے اور میرے حلقہ احباب میں جو گنے چنے لوگ موجود ہیں' ان کا ذوق اتنا اچھا نہیں۔" کسی سلام دعا کے بغیر اس خاتون نے کہنا شروع کیا۔

"ہر بار میں واحد مصورہ ہوتی ہوں جس کے ذاتی مدعوئین کی فہرست میں کوئی نام نہیں ہوتا۔" اس سے پہلے کہ سعد کوئی سوال پوچھتا' وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"اس لیے اس بار میں نے سوچا' یہ ریت روایت توڑ ہی دی جائے۔" سعد نے تحمل سے خاتون کی بات مکمل ہونے تک انتظار کیا۔

"آپ کا اسم شریف؟" وہ یہ سوال پوچھنے تک اپنے ذہن میں اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ دوسری طرف کون خاتون تھی۔

"تم بھول گئے؟ صرف ڈیڑھ ہفتہ قبل ہی تو تم سے ملاقات ہوئی تھی۔ تم ایک معصوم سی لڑکی کے ساتھ میرے گھر آئے تھے۔" دوسری طرف سے بے تکلفی کا ایک بار پھر مظاہرہ ہوا۔

"اوہ..... مس ہیولیشم!" سعد کو یاد آیا لیکن ذہن پر زور دینے کے باوجود اسے ان خاتون کا اصل نام یاد نہ آسکا۔

"یاد آیا؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"جی بالکل یاد آگیا۔" سعد نے احترام سے جواب دیا۔ "میں معذرت خواہ ہوں آپ کے پیغام سے اندازہ نہ لگا سکا۔"

"ہوں!" دوسری جانب جیسے اس کی کہی بات پر غور کیا گیا۔ "تو پھر سچ بتاؤ۔ واقعی بیرون ملک جارہے ہو یا صرف بہانا کررہے ہو؟"

"مجھے افسوس ہے میں واقعی یہاں نہیں ہوں گا۔" سعد نے کہا۔ "آپ نے مجھے یاد رکھا اور اس قابل سمجھا کہ آپ مجھے مدعو کریں۔ میرے لیے یہ بہت اہم بات ہے۔"

"اچھا تو پھر ایسا کرو۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "جانے سے قبل ویسے ہی کسی وقت ملنے آجاؤ۔"

یہ بے تکلفی سعد کے لیے قطعی غیر متوقع تھی۔ اس نے گلاس سے پانی کا گھونٹ بھر کر اس گھونٹ کے ساتھ اس بے تکلفی کے مظاہرے کو حلق سے اتارا۔

"ضرور حاضر ہوتا۔" اگلے لمحے وہ بولا۔ "لیکن کل شام ہی میری فلائٹ ہے' میں واپس آکر کوشش کروں گا کہ آپ کے پاس آؤں۔"

"کوشش ہی نہیں کرنی آنا بھی ہے۔" دوسری طرف سے ایک بار پھر دماغ گھمادینے والی بے تکلفی کا مظاہرہ ہوا۔

"ویسے جا کہاں رہے ہو؟" اس سوال پر سعد نے جواب دینے سے پہلے لحظہ بھر کو سوچا۔ "اصل جگہ بتاؤں یا کوئی اور؟" اس نے خود سے پوچھا' نجانے کیوں اسے اندیشہ ہورہا تھا کہ وہ جس جگہ کا بھی نام لے گا' خاتون اس پر طویل گفتگو کرنا شروع ہوجائیں گی۔

"فرینکفرٹ۔" پھر اس نے مختصر جواب دیا۔

"اچھا!" خلاف توقع دوسری جانب سے بھی مختصر جواب ہی آیا۔ "واپسی کب ہے؟"

"ڈیڑھ سے دو ہفتے تو یقینی لگیں گے' شاید اس سے زیادہ دن بھی رکنا پڑے۔"

"کس سلسلے میں جارہے ہو؟" ایک اور سوال آیا۔

"یونہی!" اب کے وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ "سیلانی آدمی ہوں' گھومنے پھرنے کا شوق پال رکھا ہے۔"

"اچھی بات ہے۔" مس ہیولیشم بولیں۔ "یہ شوق لگتا ہے موروثی ہے۔"

"اوہ۔۔۔ آپ کو کیسے علم ہوا۔" سعد نے کہا۔

"اس روز تمہاری گفتگو سے اندازہ ہوا ہے۔ تم اپنے والدین اور باقی گھر والوں کے بارے میں جو بتارہے تھے اس سے لگا کہ سرپھروں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔"

"واہ۔۔۔ آپ تو بہت سمجھ دار نکلیں۔" سعد نے بے اختیار کہا۔ "ہم جو کبھی کسی کو پکڑائی نہیں دیتے۔ آپ نے ہمارے پر بھی گن لیے۔"

"آداب عرض ہے۔" دوسری جانب سے شگفتہ لہجے میں کہا گیا۔

"چلیں پھر طے ہے' واپس آکر آپ سے ملاقات ضرور کروں گا۔" سعد نے جھٹ فیصلہ کیا۔

"میں انتظار کروں گی۔" مس ہیولیشم خوش ہوتی محسوس ہوئیں۔ "اگر تمہارا یہی نمبر رومنگ پر ہو تو بتانا اور اگر نہیں تو وہاں کے نمبر سے پیغام بھیجنا کہ خیریت سے پہنچ گئے ہو۔"

"جی ضرور۔" سعد نے کہا۔

"او کے ٹیک کیئر۔" دوسری طرف سے ان الفاظ کے بعد فون بند کردیا گیا۔

"اوہ یار۔۔۔ کیا نام تھا بھلا ان خاتون کا؟" فون بند کرنے کے بعد سعد نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"فائزہ' فضا' فوزیہ' فارحہ۔۔۔" اس نے کچھ دیر ذہن پر زور ڈالا مگر اسے یاد نہیں آیا۔

"چلو' جو بھی ہے میرے لیے تو یہ مس ہیولیشم ہی ٹھیک ہے۔" پھر اس نے سوچنے کا سلسلہ ختم کردیا۔

"مگر سوال تو یہ ہے کہ ان کو میری یاد کیسے آگئی اور یہ اتنی بے تکلف کیوں ہورہی تھیں؟" اب وہ دوسری بات

سوچ رہا تھا۔

"اس روز تو اتنی مردم بیزار اور اکھڑ مزاج لگ رہی تھیں جیسے دنیا بھر کا بائیکاٹ کیے بیٹھی ہوں۔"

"خیر!" کچھ سمجھ نہ آنے پر اس نے شانے اچکائے۔ "وہ اس دنیا میں بہت سی عجیب و غریب باتیں ہوتی رہتی ہیں ایک یہ بھی سہی۔"

اگلے لمحے وہ اپنی وارڈ روب کے سامنے کھڑا سفر کے لیے سامان نکال رہا تھا۔ وارڈ روب کے نچلے خانے میں بڑے بڑے برانڈڈ اسٹورز کے بیگز رکھے تھے۔ اس نے سب بیگز کے درمیان دو انگلیاں ڈال کر انہیں تھوڑا تھوڑا کھول کر سرسری نظر ان کے اندر موجود چیزوں پر ڈالی۔

"اپنی تمام تر عاجزی، انسانی ہمدردی، ڈاؤن ٹو ارتھ شخصیت کے ساتھ ساتھ تم میں ایک خاص طرح کا ایٹی ٹیوڈ ہے۔ تم سیلف سینٹرڈ ہو۔ یا تو تمہارے اندر کسی قسم کا خوف ہے یا پھر تم خود کو ڈیپ ڈاؤن (دوسروں سے بلند) سمجھتے ہو۔"

کچھ دن پہلے سنی یہ بات اچانک اسے یاد آئی۔ یہ اس کا کٹیلا تجزیہ تھا۔ اس کی شخصیت پر کڑا تبصرہ تھا۔

"اچھا ہوا، جاتے جاتے تم نے میرے متعلق اپنی رائے کا اتنا برملا اظہار کر دیا۔" اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ "نہ کرتیں تو شاید تمہیں ہمیشہ افسوس رہتا۔"

"فضل! میں نے سامان نکال کر بیڈ پر رکھ دیا ہے، آکر پیکنگ کر دو۔"

کچھ دیر بعد وہ انٹر کام پر کسی سے مخاطب تھا۔ وارڈ روب کے نچلے خانے میں رکھے شاپنگ بیگز ویسے ہی دھرے تھے۔ اس نے ان میں سے کچھ بھی اپنے استعمال کے لیے نہیں نکالا تھا۔

☼ ☼ ☼

"فننش (فن لینڈ کی قومی زبان) دنیا کی مشکل ترین زبانوں میں سے ایک ہے۔"

بھارت سے آئے چندر شیکھر نے میکڈونلڈز ریپ پیک کھولا اور مربھکوں کی طرح پیاز اور چکن کے ریشوں سے بنا اسنیک کھاتے ہوئے کہا۔ اس روز اس نے بہت کام کیا تھا اور وہ بری طرح تھکا ہوا تھا اور بھوک بھی ستا رہی تھی۔

"کتنی سیکھ لی تم نے؟" نادیہ نے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر لگے ٹماٹو کیچپ کو زبان سے چاٹتے ہوئے پوچھا۔

"بہت کم۔" چندر شیکھر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں تو تمہاری رفتار پر حیران ہوں۔ تم نے بہت جلد زبان سیکھ لی۔"

"میں نے ان انیس برسوں میں اتنے گھاٹوں کا پانی پیا ہے کہ کوئی نیا گھاٹ مجھے زیادہ دیر مشکل میں نہیں رکھ پاتا۔" نادیہ مسکرائی۔

"یار! تمہاری اردو بھی حیران کن ہے۔" چندر شیکھر نے بے اختیار داد دی۔ "شکر ہے کہ تم ادھر ہو۔ زبان کے بل کھل جاتے ہیں تم سے بات کر کے۔"

"مگر تمہاری سمجھ میں تو نہیں آتی ہو گی اردو۔" نادیہ نے کہا۔ "ہندی اور اردو دو مختلف زبانیں ہیں۔۔۔"

"ہاں لیکن، بھارت میں اب شدھ ہندی کہاں بولی جاتی ہے۔ تم نے کبھی ہندی فلمیں دیکھی ہیں؟" شیکھر نے کوک کا ٹن کھولتے ہوئے کہا۔

"شاید کبھی نہیں۔" نادیہ نے آنکھیں میچ کر یاد کرنے کے بعد کہا۔ "میرے ڈیڈی کے گھر میں ایک خانساماں تھا۔ وہ دیکھا کرتا تھا ہندی فلمیں اور کئی اداکاروں کے نام بھی لیتا تھا، جو مجھے بالکل یاد نہیں۔ اس نے کچن میں اپنے

ساتھ جیوک باکس بھی رکھا ہوتا تھا۔ اس کے پاس بہت سے ہندی گانوں کا ذخیرہ موجود تھا۔"

"ہوں!" شیکھر مسکرایا۔ "یار! انسان بھی کیا ہوتے ہیں۔ رنگوں، نسلوں، قوموں ملکوں، شہروں میں بٹے انسان، سرحد کے اس پار انسان کوئی اور ہے سرحد کے اس پار کوئی اور۔۔۔"

"ہاں!" نادیہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس تقسیم میں ہی تو انسان کی شناخت کا سامان ہے۔ یہ تقسیم نہ ہوتی تو پھر تو ساری دنیا کے تمام باشندے ایک ہوتے۔"

"اچھا ہوتا نا!" شیکھر نے اسنیک کا ریپر موڑ کر ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ سب کائنات کو تخلیق کرنے والے کے فیصلے ہیں۔ ہم اسے اچھا برا کیسے قرار دے سکتے ہیں بھئی۔" نادیہ نے لنچ کرنے کے بعد ہاتھ اپنی جینز پر رگڑتے ہوئے کہا اور اپنا بیگ شانے پر ڈال کر باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف مڑی۔

"نادیہ! کیا تم مسلمان ہو؟" پیچھے سے شیکھر نے سوال کیا۔ اس کے چلتے قدم کچھ دیر کے لیے رکے۔ اس نے پیچھے مڑ کر شیکھر کو دیکھا۔ وہ کوک کا ٹن ختم کرنے کے بعد برانڈی کا ٹن کھول رہا تھا۔

"پتا نہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"چلو اچھا ہے جو پتا نہیں۔" شیکھر نے دو انگلیاں اٹھا کر ہلاتے ہوئے کہا۔ "انجوائے یور لائف۔"

"پتا تو واقعی نہیں ہے۔" نادیہ نے ریستوران سے باہر نکل کر سڑک پر چلتی ٹریفک کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ "مگر پتا لگانا ہے۔" اس نے اسٹینڈ پر کھڑی اپنی سائیکل نکالتے ہوئے خود سے کہا۔

"کیسے؟" اس کے دماغ نے سوال کیا۔

"پتا نہیں۔" دل نے جواب دیا اور وہ سائیکل پر سوار ہو کر اس کے پیڈل تیزی سے چلاتی اپنی منزل کی طرف رواں ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"اوہ!" فاطمہ نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ فلزا کبھی اتنی اکھڑ اور بد مزاج بھی ہو جائے گی۔"

"ان کی بد مزاجی تو ان کے چہرے اور چہرے کے تاثرات پر بھی خاصا اثر انداز ہو رہی ہے۔" ماہ نور نے صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"توبہ استغفار!" اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "ان کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے زمانے بھر کی تلخیاں انہوں نے ہی سہی ہوں۔"

"میں کسی وقت تمہیں اپنے اسکول اور کالج کے دنوں کے البمز دکھاؤں گی۔" فاطمہ نے کہا۔ "فلزا کی کئی تصویریں ہیں اس میں۔ اچھی خاصی خوش شکل چٹی گوری ہوا کرتی تھی۔ خوش مزاج بھی تھی ہاں ذرا خاموش طبع تھی زیادہ باتیں نہیں کرتی تھیں۔"

"وہ تو جناب آپ دونوں کو بھول بھال چکی تھیں۔" ماہ نور نے فاطمہ کو جتایا۔

"میرے یاد دلانے پر انہیں یاد آیا اور جس لڑکے کے ساتھ میں ان کو ڈھونڈتی ان کے گھر پہنچی تھی نا!" اس نے پزا کا ایک بڑا ٹکڑا کاٹ کر اپنی پلیٹ میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔ "اس نے فلزا ظہور کو مس ہیولیشم کا ٹائٹل دے دیا فوراً۔"

"ارے اتنی سڑیل ہو گئی وہ؟" خدیجہ ٹرے میں چائے کے کپ رکھے کمرے میں داخل ہوئیں۔ "اور وہ لڑکا

بھی بڑا باذوق ہوگا جسے مس ہیولیشم یاد آگئی فلزا کو دیکھ کر۔"

"اسے مس ہیولیشم کے علاوہ کسی Manor کے متعلق پڑھی کہانی بھی یاد آگئی تھی فلزا ظہور کو دیکھ کر' جہاں بچوں کو عجیب و غریب مشروب پینے کو ملتا تھا۔"

"stragoika Manor" خدیجہ یاد کرکے مسکرائیں۔ "بڑا اچھا مطالعہ ہوگا بھئی اس لڑکے کا' کون تھا وہ؟" انہوں نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"وہ۔" ماہ نور اس سوال پر لمحہ بھر کو رکی "ہاں وہ لڑکا سید پور میں ملا تھا ایگزیبیشن کے دوران۔ اس سے میں نے فلزا ظہور کا پوچھا تو کہنے لگا - میں پتا کرکے بتاؤں گا۔ شہور و شہور وہ کوئی نہیں ہیں گمنام ہی ہیں بے چاری مگر اس لڑکے نے جیسے تیسے ان کا پتا لگا ہی لیا۔"

"اف بے چاری!" وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی۔

خدیجہ نے عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"شروع ہی سے ذرا تنہائی پسند تھی اور میں نے اکثر دیکھا ہے اوائل عمری کی تنہائی پسندی' اس ادھیڑ عمری میں ایسے ہی انجام سے دوچار ہوتی ہے۔"

"ویسے مجھے تو دو عدد چار کول اسکیچز دیے انہوں نے تحفے میں۔" ماہ نور کو یاد آیا۔

"چلو' یہ تو اچھی بات ہے۔ کچھ تو مروت دکھائی اس نے۔" فاطمہ کو حقیقت میں فلزا کا احوال سن کر دلی دکھ ہو رہا تھا۔

"اور میں ایک ایسی لڑکی سے بھی ملی جو کئی سال سرکس میں گزارنے کے بعد ایک کرتب کے مظاہرے کے دوران گر جانے سے معذوری کا شکار ہوگئی!" ماہ نور نے کہا۔

"اوہ بے چاری!" خدیجہ نے کہا۔ "کون ہے وہ اور اب کیا کرتی ہے؟"

"اس کا نام سارہ خان ہے اور اب وہ کچھ نہیں کرتی۔ بس بستر پر پڑی رہتی ہے۔"

"سرکس والے اس کا اتنا خیال رکھتے ہیں۔" خدیجہ کو حیرت ہوئی۔ "میں نے تو سنا تھا بڑے بے مروت ہوتے ہیں وہ لوگ۔"

"پتا نہیں وہ بے مروت ہوتے ہیں یا نہیں مگر اس لڑکی کا اتنا خیال کوئی اور رکھ رہا ہے۔" ماہ نور نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ویسے خالہ! آپ کا کیا خیال ہے' انسانیت کے کتنے درجے ہیں۔ کسی میں یہ بالکل نہیں ہوتی' کسی میں تھوڑی سی ہوتی ہے' کسی میں کچھ زیادہ' کسی میں بہت زیادہ۔ کیا ایسا ہی ہوتا ہے؟" اس نے سرہلا کر تائید چاہی۔

"یہ تو توفیق پر منحصر ہے۔" خدیجہ نے ماہ نور کی پلیٹ میں پیسٹری رکھتے ہوئے کہا۔

"لو اسے چکھو! ایک نئی بیکری آزمائی ہے آج' دیکھو کیسی ہے۔"

"اور اگر کوئی کسی معذور کی خدمت یہ سوچ کر کرے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کام اس کے فرائض میں شامل کر دیا ہے تو کیا یہ بھی توفیق کی وجہ سے ہے۔" ماہ نور پیسٹری کو نظر انداز کیے اپنے سوال میں الجھی تھی۔

"یہ تو خیر بڑی ہی مختلف سوچ ہے۔" فاطمہ نے ماہ نور کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور کیا انسان اتنا مستقل مزاج ہو سکتا ہے کہ ایک کام کا کوئی مثبت نتیجہ نہ نکلتے دیکھ کر بھی اس کو کرنے پر لگا رہے۔" "اسے پروا ہی نہ ہو کہ اس کام میں کوئی بہتری پیدا ہوتی ہے یا نہیں۔" ماہ نور سوال کیے جا رہی تھی۔

"یہ بھی توفیق سے ریلیٹڈ ہے۔" فاطمہ ماہ نور کو بدستور غور سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

"لو! میری ایک کولیگ کی کال آگئی' میں ذرا بات کرلوں اس سے۔" اسی دم خدیجہ نے سیل فون پر بجتی بیل کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"ضرور۔" ماہ نور نے سرہلایا۔

"کیا بات ہے ماہ نور۔ کوئی الجھن ہے کیا؟" خدیجہ کے کمرے سے جانے کے بعد فاطمہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ماہ نور کے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"جی فاطمہ خالہ! الجھن تو ہے۔" ماہ نور نے سچائی سے اعتراف کیا۔

"مجھے بتاؤ۔ کیا الجھن ہے؟" انہوں نے دوستانہ انداز میں کہا۔

ماہ نور نے کچھ دیر فاطمہ کی طرف دیکھنے کے بعد یوں سرہلایا جیسے کہہ رہی ہو۔ "ہاں' میں آپ پر اعتماد کر سکتی ہوں۔"

خدیجہ ایک طویل کال سننے کے بعد جب تک کمرے میں واپس آئیں' ماہ نور اپنے دل کی ساری کیفیات اور دماغ کی کئی الجھنیں فاطمہ کے گوش گزار کر چکی تھی۔ خدیجہ کے آنے کے بعد وہ دونوں خدیجہ کی دوست کی سنائی خبریں سننے کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"ماہ نور!" اس رات جب چار گھنٹے خدیجہ اور فاطمہ کے ساتھ گزارنے کے بعد ماہ نور اپنے گھر جانے کے لیے باہر نکلی تو فاطمہ اس کے پیچھے گیٹ تک آئیں۔

"جی!" اس نے رک کر فاطمہ کی طرف دیکھا۔

"کبھی اس لڑکے سعد سے ہمیں بھی ملوانا۔" فاطمہ نے کہا۔

ماہ نور نے گیٹ پر لگی لائٹس کی روشنی میں فاطمہ کی طرف دیکھا' ان کے چہرے پر خلوص تھا اور اس کے لیے محبت بھی۔

"ضرور فاطمہ خالہ!" اس نے سرہلا کر کہا۔ "اگر کبھی وہ دوبارہ ملا تو۔"

"کیوں بھئی۔ اب تو تم دونوں کے درمیان اچھی خاصی بے تکلفی ہو چکی ہے نا!" فاطمہ حیران ہوتے ہوئے بولیں۔

"پتا نہیں۔" ماہ نور کے چہرے پر دکھ کا ایک سایہ سا لہرایا۔ "اس کا جو نمبر میرے پاس ہے' وہ تو بند ملتا ہے اور اسے بھیجے ہوئے پیغامات ڈیلیور نہیں ہوتے۔"

"اوہ!" فاطمہ کو لگا ماہ نور کے دماغ کی اصل الجھن اب ان کے سامنے آئی تھی۔

"کوئی اور اتا پتا اس کا؟" انہوں نے یونہی سوال کیا۔

"نہیں۔" ماہ نور نے سرہلایا۔ "اور ویسے بھی شاید وہ مجھ سے رابطہ رکھنے میں اتنا انٹرسٹڈ نہیں تھا' جب ہی تو ایک عارضی نمبر مجھے دیا۔"

فاطمہ' ماہ نور کے چہرے پر دکھ اور دل شکنی کے واضح تاثرات دیکھ رہی تھیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیسے تسلی دیں۔

"چلو دیکھتے ہیں' دنیا گول ہے۔ کبھی کہیں دوبارہ ملاقات ہو بھی سکتی ہے۔" بے تاثر سے تسلی بھرے الفاظ ان کے منہ سے نکلے۔

جواب میں ماہ نور یوں مسکرائی جیسے کسی بچے کی بات پر مسکرایا جاتا ہے۔

☼ ☼ ☼

رات کی تاریکی میں فضا پر سکوت کا عالم طاری تھا۔ کبھی کبھار کہیں سے جھینگر کے بولنے کی آواز ابھرتی یا پھر

کہیں دور سے گیدڑوں کی آوازیں آتیں اور پھر ہو کا عالم طاری ہو جاتا۔ سعدیہ پچھلے کئی گھنٹوں سے سونے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی مگر نیند اس کی آنکھوں کا راستہ جیسے بھول گئی تھی۔ اس کے اور نیند کے راستے میں وہ منظر حائل ہو گئے تھے، جو کھاری کی دعوت پر فارم ہاؤس کی سیر کے دوران نظر آئے تھے۔

ایک محدود دنیا کی باسی کم عمر لڑکی کے لیے وہ مناظر بہت بڑے تھے۔ سعدیہ کے گھر میں ٹی وی کبھی نہیں آیا تھا۔ ریڈیو کی کبھی شکل بھی اس نے اپنے گھر میں نہیں دیکھی تھی۔ ہاں اسکول میں لڑکیوں کو ٹی وی اور فلموں کی باتیں کرتے ضرور سنا تھا۔

"توبہ توبہ! ابا جی کہتے ہیں ایسی باتیں سننے اور دیکھنے والا بہت بڑا گناہ گار ہوتا ہے۔"

وہ اپنی سہیلیوں کو بھی ڈراتی اور خود بھی ڈر ڈر جاتی۔ اسی لیے اس کو بہت سی باتوں کا علم نہیں تھا، چیزوں سے آگاہی نہیں تھی۔ فارم ہاؤس کے بارے میں اس کا تصور بہت مختلف تھا۔ اس کے خیال میں وہاں پراسرار دنیا بستی تھی۔ ڈاکوؤں کے گروہ اور لٹیروں کے سردار وہاں ٹھہرتے تھے، جن کے اعزاز میں آئے روز کھاری کے مطابق دعوتیں ہوتی تھیں۔ اس کا خیال تھا فارم ہاؤس میں جا بجا گڑے بڑے بڑے چولہوں پر دیگیں چڑھی رہتی ہوں گی اور سارے ڈاکو، چور، لٹیرے ادھر ادھر بستر ڈالے دن میں پڑے سوتے ہوں گے اور رات کو اپنے دھندے پر رخصت ہو جایا کرتے ہوں گے۔ فارم ہاؤس کے خیال سے اس کے ذہن میں اسلحہ اور گولیوں سے بھرے ٹرک بھی آتے تھے، جنہیں لوڈ کرنے کی باتیں کھاری کیا کرتا تھا۔

اس تصوراتی دنیا کو فارم ہاؤس کے حقیقی مناظر نے خاک میں ملا دیا۔ فارم میں اتنی اور ایسی چیزیں تھیں جن کے نام بھی سعدیہ کو نہیں آتے تھے۔ وہ ان چیزوں کو کن ناموں سے یاد کرے، اسے یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر اس کے تصور میں ان چیزوں کی شکلیں بار بار ابھرتی تھیں۔

اسے وہ کمرے یاد آتے، جہاں بقول کھاری مہمان ٹھہرتے اور سوتے تھے۔ بڑے بڑے بیڈ جن میں رکھے تھے اور جن بیڈز پر نرم گداز بستر بچھے تھے۔ ان بیڈز پر لیٹنے، بیٹھنے اور سونے کا تصور کتنا خوش کن تھا اور وہ پردے اور صوفے، وہ فرش اور وہ چھتیں، وہ لائٹیں اور پنکھے جو باہر کے ملک سے آئے تھے اور وہ پھل، پھول پودے اور گھاس۔۔۔

سعدیہ کروٹیں بدل رہی تھی اور ہر بار کروٹ بدلنے پر اس کے ذہن کے آئینے پر ایک نیا عکس ابھرتا تھا۔

"آخر انسان ایسا کیا کرے، جو اتنا سب کچھ اس کے پاس آجائے۔" اس نے کئی بار سوچا تھا۔

"ہمارے پاس تو تین سے زیادہ بستر نہیں ہیں۔ سردی ہو تو صرف دو رضائیاں، اماں اور مجھے اکٹھے سونا پڑتا ہے۔ گرمی ہو تو تین کھیس جن میں سے دو بالکل ہی گھس چکے ہیں، گزارے لائق برتن، ایک چولہا جس پر باری باری چیزیں پکائی جاتی ہیں۔ کبھی جو ابا جی کو جوشاندہ بنوانا پڑ جائے تو ہانڈی اتار کر جوشاندے کی پتیلی رکھنی پڑتی ہے، اتنے میں ہانڈی پکنے میں دیر ہو جاتی ہے ہانڈی پکا کر توا رکھو پھر انتظار کرتے رہو کب روٹیاں بنیں اور ہم کھائیں۔"

سعدیہ ان چیزوں پر کڑھ رہی تھی، جن کے ہونے نہ ہونے سے پہلے کبھی اسے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

"انسان کے پاس برتنے کو اتنی وافر چیزیں ہوں تو ہی تو وہ ان میں انتخاب کرنے کے قابل ہوتا ہے نا۔ جب ہوں ہی نا تو پھر انتخاب کس میں سے کرے۔" اس کے دل میں ایک انجانی سی ٹیس اٹھی۔

"جب میں ڈاکٹر بن جاؤں گی تو اتنا سامان ضرور بناؤں گی کہ جب دل چاہے ایک جیسی دو چیزوں میں سے ایک یا دوسرے کا انتخاب کر سکوں۔" اس نے بار بار خود کو ان الفاظ سے تسلی دی۔

"اور ابا جی اور اماں کو دیکھو بھلا، اتنے بڑے ہو گئے ہیں، آج تک انہیں خیال نہیں آیا کہ بندے کے پاس زیادہ چیزیں ہونی چاہئیں۔" اس نے کڑھ کر سوچا۔

اماں تو جو تھوڑا سا ہے، اس میں سے بھی بس چلے تو کچھ اٹھا کر کسی ایسے کو دے دیں جو ان سے مانگ لے اور ابا جی۔۔۔ انہیں تو بس کھانے کو دو وقت روٹی مل جائے، پہننے کو دھلے کپڑے مل جائیں، بس ان کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔" اس نے ایک بار پھر کروٹ بدل کر سوچا۔

"دونوں ایک بار فارم ہاؤس کا چکر لگا لیں تو انہیں پتا چل جائے کہ کیسی مسکین زندگی گزار رہے ہیں ہم۔"

"مگر انہیں اب کیا سمجھ آنی ہے۔" اس نے سوچا "آخر دنیا میں کچھ تو دیکھا ہی ہو گا نا۔ پہلے خیال نہیں آیا اب کیا آئے گا۔" وہ اپنے ماں باپ کے انداز فکر سے بالکل ہی مایوس تھی۔

"کسی کے گھر میں دو سے زیادہ تولیے نہیں ہوتے اور ادھر دیکھو، لمبے لمبے تولیوں جیسے لبادے لٹک رہے تھے الماریوں میں۔ کھاری کہہ رہا تھا یہ نہانے کے بعد کپڑے پہننے سے پہلے پہنتے ہیں تاکہ جسم خشک ہو جائے اچھی طرح۔"

اگلی کروٹ پر ایک اور بات یاد آئی اور غسل خانوں کے آگے الگ چپلیں جو غسل خانوں سے باہر نہیں پہنی ہوتیں۔ "بس ادھر ہی اتار دو تاکہ کمرے کا فرش گیلا نہ ہو۔"

اس سے اگلی کروٹ پر ایک اور۔۔۔ اسی طرح کروٹیں بدلتے منظر یاد کرتے رات گزر گئی۔

"بس ایک دفعہ میں ڈاکٹر بن جاؤں۔" طویل رات کے بعد فجر کی آواز سننے سے پہلے سعدیہ نے آخری بات سوچی تھی۔

✡ ✡ ✡

"میں نے اب ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ نہیں آنا سبق لینے۔" کھاری نے آپا رابعہ کو مطلع کیا۔

"کیوں بھئی! اب تو تمہاری قرات روانی پکڑنے لگی ہے۔" آپا رابعہ نے حیرت سے کہا۔

"میں چوہدرانی ہوراں کے ساتھ لاہور جا رہا ہوں۔" کھاری کے چہرے پر خوشی کا تاثر تھا "ماہ نور بی بی کے گھر جانا ہے ہم نے۔"

"لیکن اتنے وقفے کے بعد تم پھر اٹکنے لگو گے۔" آپا رابعہ کو کھاری کی خوشی نظر نہیں آئی۔ انہیں اس کے تسلسل ٹوٹنے کا افسوس ہو رہا تھا۔

"میں ادھر لے جاؤں گا اپنا سیپارہ ساتھ۔ نماز کے بعد سبق پکا کر لیا کروں گا۔" کھاری نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"مگر چوہدرانی تمہیں کیوں ساتھ لے جا رہی ہے؟"

"او بھین جی، چوہدرانی ہوراں کو پتا ہے شہر کی چیزوں اور باتوں کی انہیں پہچان کوئی نہیں اور جوان کے ساتھ رضیہ جا رہی ہے نا۔ اسے تو سواد کا بولنا بھی نہیں آتا۔ انہیں بڑا پتا ہے کہ کھاری ہشیار بندہ ہے، ہر دوسرے دن ٹرکاں نال شہر جاتا ہے۔ کھاری چپ کر کے انہیں ساری بات سمجھا دے گا اور ان کا مخول نہیں بننے دے گا۔ ایس لئی انہوں نے چوہدری صاب سے کہہ کر میرے لیے چھٹی لی ہے۔" کھاری نے انتہائی سمجھ دار بنتے ہوئے آپا رابعہ کو چوہدرانی کا موقف سمجھایا۔

"تمہاری چوہدرانی کے بھی کیا کہنے ہیں۔" آپا رابعہ نے کھاری کی بات سن کر سر ہلایا "اس کے لیے لگتا ہے چھوٹی چھوٹی باتیں بڑے بڑے مسئلوں سے زیادہ اہم ہیں۔"

"آہو جی!" کھاری نے دانت نکوستے ہوئے کہا "بڑے بڑے مسئلے اوناں کو پیش آئیں تو ان کے بارے میں سوچیں نا! پر دل کی بھی بڑی صاف ہے چوہدرانی۔ ایمان سے بھین جی! بڑا پاک پیارا دل ہے ان کا۔"

”ہوں!“ آپا رابعہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”کھاری!“ پھر انہوں نے کھاری کی طرف دیکھ کر سوالیہ انداز میں کہا۔ ”سعدیہ کا ب فارم چوہدری صاحب نے تمہیں دیا تھا یا چوہدرانی کو؟“

کھاری کے دانت ایک لمحے کے لیے بند ہوگئے۔ دوسرے لمحے وہ مسکراتا ہوا سنبھل کر بولا۔

”دیا تو مجھے ہی تھا۔ میں نے چوہدرانی جی کو دے دیا تھا کہ آپ تک پہنچا دیں۔“

”اور تمہیں پتا ہے کہ تمہاری چوہدرانی نے فارم ب بنوانے کے بدلے مجھ سے کیا فرمائش کی ہے؟“ آپا رابعہ نے کھاری کو جتایا۔

”آہو جی!“ کھاری ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ ”مجھے شاہدہ نے بتایا تھا کہ انہوں نے آپ سے درس دینے کی فرمائش کیتی ہے۔“ کھاری کا سر قدرے جھک گیا۔ پھر وہ سر اٹھا کر بولا۔

”پر تسی دل برا نہ کرو۔ میں آپ تہاڈے ساتھ جاؤں گا جب محفل ہوگی چوہدرانی جی کے گھر۔“

کھاری کے پاس آپا رابعہ کو تسلی دینے کے لیے ایک یہ ہی جملہ تھا لیکن اب وہ آپا رابعہ کے چہرے پر دکھ کا واضح تاثر دیکھ رہا تھا۔

”بھین جی!“ کھاری نے ایک دفعہ پھر سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ”میں اتنا بھی بھلا (بے وقوف) نئیں جنا نظر آتا ہوں۔ یہ جو لوگ ہیں نا!“ اس نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سمجھتے ہیں کھاری کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی پر میں کسی نوں دسدا نہیں کہ کتنے سال ہوگئے دنیا داری کردیاں ہن بھی کھاری کو کوئی بات سمجھ نہ آئے تو درفٹے منہ کھاری دا!“ آپا رابعہ نے چونک کر کھاری کی طرف دیکھا۔

”آہو!“ کھاری نے سر ہلا کر انہیں یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ”میں سب کے جھوٹ‘ چوریاں‘ چکاریاں‘ بد نیتیاں جانتا ہوں پر ادھر۔“ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا ”بڑی جگہ ہے۔ جی! بڑا وڈا ہے یہ۔ ہر بات اندر ہی اندر ڈال لیتا ہے۔“ اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ ”کسی سے کہتا نہیں۔“ آپا رابعہ بے یقینی سے کھاری کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”ایک بات سمجھ لو بھین جی!“ پھر اس نے کسی بزرگ کی طرح آپا رابعہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”درانتی کے ایک طرف کنڈے ہوتے ہیں‘ یہ جھوٹی دنیا ہے ناں اس دے دونوں طرف کنڈے نیں۔“ اس نے دو انگلیاں اٹھا کر اشارہ کیا۔

”یہ ادھر سے بھی کاٹتی ہے ادھر سے بھی کاٹتی ہے۔“

آپا رابعہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے کھاری کے اس نئے روپ کو ششدر بیٹھی دیکھ رہی تھیں۔

”بس ایک چپ۔“ کھاری نے ایک بار پھر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ ”لکھاں دکھاں توں بچاتی ہے۔“

”تمہیں اتنا کچھ پتا ہے کھاری! تو یوں احمق کیوں بنے پھرتے ہو۔“ بے اختیار آپا رابعہ کے منہ سے سوال نکلا۔

”سوکھا رہتا ہے بندہ بھلا بنا رہے تے۔“ وہ ہنسا۔ ”اگلا بندہ سمجھتا ہے اسے کون سی سمجھ آتی ہے۔“

پھر اس نے سر اٹھا کر آپا رابعہ کی طرف دیکھا۔ ”اور ویسے بھی سمجھ کر کرنا بھی کیا ہے۔ اتنے وڈے وڈے لوگ جن کی عقلیں بھی وڈی ہوتی ہیں۔ قبرے اونہوں نے بھی پڑ جانا قبرے ہم بھلوں نے بھی پڑ جانا۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔

”تم چوہدری صاحب کے پاس کب آئے تھے کھاری؟“ اس روز پہلی بار آپا رابعہ کو کھاری سے یہ سوال کرنا یاد آیا۔

”میں کاکا ہی تھا جب‘ ماسی جنت بتاتی ہے چوہدری صاحب مجھے لے کر آئے تھے۔ ماسی جنت کہتی ہے میں بڑا ماڑا (کمزور) تھا۔ میریاں ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں۔ سارا دن روتا تھا پھر ماسی جنت نے اور ایک اور ہوندی تھی ماسی فاطمہ اللہ بخشے‘ انہاں نے مجھے پال ہی لیا۔“

”کبھی چوہدری صاحب سے اپنا آگا پیچھا پوچھا تم نے؟“

”توبہ کرو جی!“ کھاری نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ”ماسی جنت کہتی ہے کھاری اتنا بڑا نہیں کہ چوہدری صاب نے تجھ بھورا (چھوٹے) سارے لڑکے کو پال کر اتنا وڈا کیا۔ اب ان کو پوچھے گا کہ میرا آگا پیچھا کیا ہے تو ان کا دل ٹٹ (ٹوٹ) جائے گا۔“

”لیکن پھر بھی۔“ آپا رابعہ کو نجانے کیوں ماسی جنت کی یہ منطق نہیں بھائی۔

”کبھی موڈ میں ہوں ناں چوہدری صاب!“ کھاری مسکرایا۔ ”تو کہتے ہیں جے کھاری! مجھے تیرے ماں پیو کا پتا ہوندا ناں تو تجھے ان کے سامنے کھڑا کر کے کہتا لو بھائی لو تمہارا بچہ میں نے پال دیا۔ اب اس کی کمائیاں کھاؤ۔“

اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی اتر آئی۔ اس نے مسکرا کر سر جھٹکا۔

”تمہارا دل نہیں چاہتا ماں باپ سے ملنے‘ انہیں دیکھنے کو؟“ آپا رابعہ کو معلوم تھا‘ وہ یہ سوال کر کے کھاری کا دل دکھا رہی ہیں مگر پھر بھی وہ یہ سوال کر رہی تھیں۔

”او جان دیو بھین جی!“ کھاری نے سر ہلایا۔ ”پتا چلنا ہی نہیں تو دل نے کیا کر لینا ہے۔“

”ویسے بھی چوہدری صاحب نے کبھی کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ اب تو مجھے کبھی خیال بھی نہیں آیا۔“

آپا رابعہ غور سے کھاری کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”اور اب تو مجھے آپ مل گئے ہو‘ ماں ورگی (ماں جیسی) چوہدری صاحب پیو بجا (باپ کی طرح) میرا تے قبلہ کعبہ دونوں ہی موجود ہوگئے۔“ وہ آپا رابعہ کے یوں دیکھنے پر جھینپ کے بولا۔

”پر مولوی صاحب بڑے سخت دل ہیں۔ انہیں ہاتیں ماتیں (آسانی سے) کسی پر پیار نہیں آتا۔“ اب وہ اپنے مخصوص انداز میں بول رہا تھا۔

”اک دن مولوی صاحب اتنے کنڑفیوز (کنفیوز) ہوگئے جدوں چوہدری صاب نے ان سے سعدیہ کی پیدائش کے ضلع کے بارے میں پوچھا۔“ وہ بلند آواز میں ہنسا۔

”وچارے بھل ہی گئے کہ کون سا ضلع تھا۔“

آپا رابعہ یہ بات سن کر بری طرح گھبرائی تھیں یا کھاری کو ایسا لگا تھا۔ یہ بات کھاری کو اس وقت سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

”اچھا اب تو لکڑیوں کو دھوپ لگ گئی اچھی‘ تم کلہاڑی پکڑو اور چھوٹے ٹکڑوں میں توڑ دو مجھے یہ لکڑیاں۔“ انہوں نے فوراً بات بدلتے ہوئے کہا تھا۔

”ابھی لیں۔“ کھاری نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہی کام تو کرنے آیا تھا میں۔“

☼ ☼ ☼

”اصل ڈیمانڈ تو اس سُر کی ہے جو تیرے میرے گلے میں ہے۔ یہ سرخی‘ یہ غازہ‘ یہ کاجل‘ یہ ہار یہ سنگھار تو اپنے دل کی تسلیاں ہیں۔ انسان کے پاس ہنر نہ ہو تو سجاوٹیں کتنی دیر چلتی ہیں۔“

”وہ دیکھا تھا شاہدرے کی فیکٹری والا۔ لگتا تھا منہ سے نہیں آنکھوں سے کھالے گا۔“

”اس بیچارے کو سُر اور سُریلی کا پتا ونا کوئی نہیں نا۔ اس کے پاس پیسہ ہے بس اور اسے کسی نے بتا دیا ہے کہ پیسے والا‘ پیسے والا نہیں سمجھا جاتا جب تک ایسی محفلوں میں شریک نہ ہو۔“

"تو یہ کون سی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جانے والی بات ہے۔ سچ! ہے اب اسے اس کام پر لگا دیا گیا ہے۔ اس کا بال بچہ الگ پریشان ہوں گے، پیسہ الگ لٹے گا، وقت خوب برباد ہو گا پھر اس کے ذخیرہ کیے پیسوں کے ڈھیر کم ہوتے جائیں گے۔ اس کے بجن دوست خوش ہوں گے۔ بغلیں بجاتے پھریں گے کہ دیکھو کیسا مال دار بنا پھرتا تھا، اس کا کاروبار سب سے تیز تھا اب قرضے لینے کے لیے ساہو کاروں کے پاس چکر لگاتے نہیں تھکتا۔"

"چچ چچ۔۔۔ بڑا افسوس ہو رہا ہے شاہد رے کی فیکٹری والے کے مستقبل کا حال سن کر۔"

"لیکن شٹرنگ والا سیٹھ بڑا سمجھ دار ہے۔ وہ پیسہ سنبھال کر رکھنے اور داد دینے کے الگ ہی فن میں کمال کا استاد ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے اور وہ جو ہے اسلام آباد والا خر دماغ۔ ایک بات میری مان لے! وہ تیرے سُر کے پیچھے نہیں حسن کے پیچھے رات کی فلائٹ پکڑتا ہے اور صبح سویرے واپس لوٹ کر اپنے دفتر میں جا بیٹھتا ہے۔"

"وہ ابھی مال بنانے کی دوڑ میں نیا نیا شریک ہوا ہے اس کے پاس تو وقت بھی کم ہوتا ہے۔"

"بس تو پھر میری بات پکی سچی ہے۔ وہ سُر کے پیچھے نہیں آتا، وہ حسن کا دلدادہ ہے۔"

"چلو مان لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کتنی دیر اس کی باقاعدہ آمد جاری رہتی ہے۔"

"ویسے ایک بات یہ بھی ہے کہ ان آنے والوں کی آمد اتنی غیر معمولی اس لیے بھی ہے کہ تمہارے ہاں روایتی گائیکاؤں والا ماحول نہیں۔ تم پر ریڈیو کی تربیت کا اثر ہے، خاندان کی تام جھام کا بھی اثر ہے۔ تم باقیوں سے بہت مختلف ہو۔"

"چلو ہٹو! تمہاری عادتیں نہ بدلیں، میراثیوں کی سی خوشامد اور چاپلوسیاں۔"

"ہی ہی ہی۔۔۔ ہماری تو کمائی کا راز ہی ان چاپلوسیوں اور میٹھی چاپی میں چھپا ہوا ہے۔ ہم یوں ہی تو دربار سے سرکار تک نہیں پہنچ جاتے۔"

"دربار کو بھی تم جیسوں کی ضرورت ہوتی ہے اور سرکار کو بھی۔ تم لوگوں کے بنا نہ ان کا دن نکلتا ہے نہ ان کا۔۔۔"

"بس تو پھر ہمیں اپنی عادتیں پوری کرنے دیا کرو، کیونکہ ان کے بغیر ہم ادھورے ہیں۔"

"ایک شرط پر۔۔۔"

"ہاں بولو۔۔۔"

"میرے خاندان کی تام جھام کا ذکر نہ کیا کرو۔ جو خاندان ایک خواہش کی تکمیل کرنے پر دانہ پانی بند کر دے اس کی کیا بڑائی اور کیسی شان۔ بڑے خاندانوں کے تو دل بھی بڑے ہوتے ہیں۔"

"تم اعلا حسب نسب کی اہمیت سے اس لیے واقف نہیں کہ تمہیں یہ بن مانگے مل گیا تھا، ہم تو بچپن سے ہوش سنبھالتے ہی لوگوں کی جوتیاں سیدھی کرتے 'صاحب سرکار' کی پکار ڈالنے لگتے ہیں، اونچے محلوں میں جا جا کر تالیاں پیٹتے اور لڈیاں ڈالتے ہیں اور سر اٹھا اٹھا کر ان محلوں کی بلندیاں اور شان و شوکت دیکھتے رہتے ہیں۔"

"خوش قسمت ہو تم لوگ کہ لوگوں کی جوتیاں سیدھی کرتے ہو، جب ہی تو دوسروں کو اہم اور خاص سمجھتے ہو۔ خود کو کم تر جانتے ہو، اسی لیے تو برتر کے آگے سر جھکانے میں عیب نہیں سمجھتے۔ یہ جو برتری کا احساس ہے، یہ تو جناب جی اپنے کاٹے کا پانی بھی نہیں مانگنے دیتا۔ دانتوں تلے انگلی دبائے مجھے کیا دیکھے چلی جا رہی ہو۔ یہ جو میں کہہ رہی ہوں، اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ رہی ہوں۔"

"تم لوگوں کو کھانے کو تازی روٹی اور سونے کو نرم گدیلا نہ بھی ملے تو جو میسر ہوتا ہے وہ کھا بھی لیتے ہو اور جہاں پڑتے ہو سو بھی رہتے ہو۔ کبھی تم نے مٹروالی شہزادی کی کہانی سنی ہے۔"

"مٹروالی شہزادی؟"

"ہاں وہ شہزادی، جس کی میزبان نے اسے سونے کو اچھا بستر دیا مگر اسے پوری رات نیند نہیں آئی۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ اس لیے کہ اسے بستر میں کچھ چبھتا محسوس ہوتا تھا۔ صبح اٹھ کر دیکھا تو بستر کی کئی تہوں کے نیچے پلنگ پر ایک مٹر کا دانہ پڑا تھا اور وہی اسے چبھتا محسوس ہو رہا تھا۔"

"مٹر کا محض ایک دانہ؟"

آنکھیں اتنی مت پھاڑو کہ سِنی پڑ جائیں۔ یہ کہانی ان لوگوں کی داستان ہے، جو عیش و آرام کے عادی ہوتے ہیں اور انہیں نسبتاً "کم آرام دہ زندگی میں داخل کر دیا جائے تو انہیں ذرا سی بے آرامی بھی چبھتی ہے مٹر کے دانے کی طرح۔"

"ہوں۔۔۔ جیسے تمہیں۔۔۔ تم بھی تو مٹروالی شہزادی ہو۔"

"ہنس لو ہنس لو۔ کوئی بات نہیں۔"

"نہیں نہیں۔۔۔ میں نہیں ہنس رہی۔ لو میں خاموش ہو رہی ہوں چپ بالکل چپ۔"

"اچھا ایسا کرو اب آہستہ آہستہ اپنا حلیہ بدلنا شروع کرو۔ ناک کی نتھنی اتارو۔ چھینٹ کے پرنٹ جیسا لباس پہننا چھوڑ دو، انگلیوں کے چھلے بھی اتار دو اب۔"

ان چھلوں کی مدد ہی سے تو گڑوی بجاتی ہوں اتنی اچھی۔ یہ نہ ہوں تو گڑوی کیا خاک بجے گی۔"

"اچھا چلو چھلے رہنے دو، آواز تمہاری اچھی ہے مگر اپنے لہجے کے گاؤدی پن اور گیت کے دوران "جیوندے رہو" کا نعرہ لگانا بھی چھوڑ دو بس۔"

"ہاں وہ تو میں کر رہی ہوں۔ تم سے یہ ہی سیکھنے کو تو تمہارے پاس پڑ رہی ہوں۔ تمہاری جوتیاں سیدھی کرتی اور تمہارا دم بھرتی ہوں۔ کوئی مجھے بھی فنکار سمجھ لے کبھی۔"

"خیر تمہارا میرے پاس آنا تو میرے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔ تم آگئی ہو تو خیال آتا ہے میں اکیلی نہیں، ورنہ اس چھوٹے سے مکان کا صحن جب رات کو محفل کے شیدائیوں سے بھر جاتا تھا۔ اس وقت بھی دل اس غم سے لرزتا تھا کہ میں اکیلی ہوں۔ اب مجھے چھوڑ کر تو نہ جاؤ گی۔"

"نہیں یہ تو کبھی سوچنا بھی نہ۔ اب تو دم دم کا ساتھ ہے، عمر بھر نبھاؤں گی۔"

"دیکھ لو، سوچ لو۔"

"سوچ لیا اور دیکھ بھی لیا۔" ہی ہی ہی۔

☼ ☼ ☼

"میں ملک سے باہر ہوں اور مجھے یہ فکر ہے کہ کہیں میری عدم موجودگی میں تمہیں میری ضرورت نہ پڑ جائے۔ تم گنتی گنوا دو میں آنہ پاؤں سو میرا یہ نمبر بھی محفوظ کر لو۔ خدانخواستہ کبھی کوئی پریشانی اور مسئلہ ہو تو مجھے فوراً "بتاؤ" میں یہاں بیٹھے بیٹھے بھی تمہارا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

سارہ نے اپنے سیل فون پر آیا یہ پیغام کوئی بیس مرتبہ پڑھا تھا۔

"تم نے بتایا کیوں نہیں کہ تم کہیں دور جا رہے ہو؟"

اس رات سونے سے پہلے اس نے بیس مرتبہ پڑھے پیغام کے جواب میں سوال لکھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ جس ملک میں وہ گیا تھا، اس کے دن اور رات میں اس کے اپنے دن اور رات سے کتنا فرق تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی

تھی کہ اس کے فون سے بھیجا ہوا یہ پیغام خاصا مہنگا پڑے گا۔ اس کے کریڈٹ میں موجود کتنے ہی پیسے کم ہو جائیں گے۔ اسے معلوم تھا تو صرف یہ کہ اس پیغام کے جواب کے انتظار کے لیے اسے گنتی گننا تھی۔ ایک، دو، تین..... اس نے تقریباً" پون گھنٹے تک تین سے آگے گنتی نہیں گنی۔ گنتی گنتے اور جواب کا انتظار کرتے جب اس کی آنکھیں تھک کر بند ہونے لگیں۔ سیل فون کی اسکرین کی روشنی نے اسے چونکا دیا۔

"میں بہت لاپروا اور غیر ذمہ دار ہوں۔ مجھے تمہیں اطلاع کر کے آنا چاہیے تھا، مگر میں نے جتایا نا کہ میں خاصا غیر ذمہ دار ہوں۔ یہاں آنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ تم منتظر ہوگی اور ہو سکتا ہے کہ اچانک تمہیں میری ضرورت پڑے اور تم گنتی گنو اور مایوسی کا شکار ہو جاؤ۔ میں تم سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں ہر وقت کسی بھی جگہ تمہارے لیے حاضر ہوں۔"

سارہ نے اپنے پیغام کا جواب پڑھا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی گنتی نے اسے مایوس نہیں کیا تھا۔ سارہ خان کی وہ رات بہت اچھی گزری تھی۔ اسے گہری اور پرسکون نیند آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

کئی دن کی مسلسل کوشش کے بعد جب کہ اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ نمبر جو اس کے سیل فون کے اہم ترین دوستوں کی فہرست میں محفوظ تھا، سے کبھی جواب آئے گا۔ نہ اس کا بھیجا پیغام یہ نمبر وصول کرے گا... ماہ نور نے اس رات ایک بار پھر اس نمبر پر کال کرنے کی کوشش کی تھی۔ جواب میں اسے کئی بار کی طرح آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے جیسے الفاظ ایک بار پھر سننے کو ملے تھے۔

"سوچ لو ہو سکتا ہے میں کوئی کریمنل نکل آوں۔" اسے اچانک یہ الفاظ یاد آئے۔

"پتا نہیں، اتفاقات کے بارے میں پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔"

"میں تمہیں اس سونگ کا لنک بھیج دوں گا۔"

"گڈ بائے ماہ نور!"

"گڈ بائے، گڈ بائے، گڈ بائے۔" یہ دو الفاظ بازگشت کی طرح اس کے اردگرد بکھرنے لگے۔

"میں نے تم پر اتنا اعتبار کیا کہ تمہارے علاوہ تم سے تمہارے بارے میں کوئی سوال ہی نہیں کیا۔

میں نے تم سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تم اور تمہارے ڈیڈی کیا کام کرتے ہو اور کہاں رہتے ہو۔

میں نے تم سے یہ سوال بھی نہیں کیا کہ اگر تمہاری بہن تمہارے باپ کی شناخت کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے تو وہ نادیہ بلال کیوں ہے اور تم سعد سلطان کیوں ہو۔

میں نے تمہارے ہر روپ میں تمہیں پہچان لیا مگر میں تمہارے اصلی روپ کو نہیں پہچان پائی۔ تم اصل میں کیا ہو، میں ایک بار بھی اندازہ نہیں لگا پائی۔ تم نے میرے سامنے دوستی کا ہاتھ کیوں بڑھایا، مجھے سمجھ میں نہیں آیا اور میں غیر محسوس طریقے سے تم سے اتنی مانوس ہو گئی کہ مجھے لگا کہ تم تو ہر جگہ ہر وقت میری دسترس میں ہو۔"

ماہ نور نے اپنے بیڈ پر کمر کے بل لیٹے لیٹے سوچا اور اپنی بھیگتی آنکھوں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرنے لگی۔ اس کی نظروں کے سامنے اس کے فون میں محفوظ کئی پیغام گھوم رہے تھے۔

چار کول اسکیچ کے بارے میں آنے والے پیغام پر اس کے ردِعمل کا فوری جواب، فلز اظہور کی تلاش میں کیے جانے والے پیغام کا فوری جواب، اس کی واپسی کے بارے میں پیغام کا فوری ردِعمل اور ابراہیم کے ریسٹورنٹ میں مدعو کیے جانا..."

کیا تمہارے پہلے سارے روپ، تمہارے بہروپ تھے یا پھر تمہارا اصل روپ تمہارا بہروپ تھا۔

اس نے ایک بار پھر اپنی بھیگی آنکھیں پونچھیں اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔
جو بھی تھا اور جیسے بھی تھا میری ذات کو تم کیوں اپنے مشاغل کے دائرے میں گھسیٹ لے گئے اور میں سدا کی احمق تمہارے لفظ لفظ پر یقین کرتی رہی۔ میں نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ تم جو اتنے بڑے بہروپئے ہو تمہاری کون سی بات قابل اعتبار ہو سکتی ہے۔"
اس نے اپنے سامنے دیوار پر لگے دیوار گیر آئینے میں لیمپ کی روشنی میں ابھرتا اپنا عکس دیکھا۔
"آج تم بہت مختلف لگ رہی ہو' خاصی Sane (معقول) لگ رہی ہو آج تو۔"
"میرے دل میں جو بات ہوتی ہے' وہ کہہ دیتا ہوں۔"
ماہ نور نے ایک بار پھر اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے اپنے بکھرے بال سمیٹ کر جوڑے کی شکل میں لپیٹے۔ ایک بار پھر اس کی نظر آئینے میں نظر آتے اپنے عکس پر پڑی۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کے دائیں بائیں گر گئے اور اس کے بال ایک بار پھر بکھر گئے۔
"اس کے بال بلا تردد عمدگی سے اس کے شانوں پر بکھرتے ہیں۔"
الفاظ اس کے کانوں سے ٹکرائے۔
"یہ خیال کتنا المناک ہے کہ وہ خود کو اس نظر سے نہیں دیکھتی جس سے میں اسے دیکھتا ہوں۔"
"تمہارا جو روپ ہے' وہ مبہوت کن ہے۔"
ماہ نور کو محسوس ہوا۔ اب وہ مسلسل بے آواز رو رہی تھی۔ وہ رات ماہ نور کے لیے بہت طویل اور غم انگیز تھی۔ رات بھر ایک لمحے کے لیے بھی اسے نیند نہیں آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

نادیہ نے اپنے ای میل باکس کو یہ دیکھنے کی غرض سے کھولا تھا کہ شاید اس میں اس درخواست کا جواب موصول ہوا ہو' جو اس نے ایک کمپنی کو آئندہ چھ ماہ کے تعلیمی وظیفے کے لیے بھجوائی تھی مگر یہ دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی کہ اس درخواست کا جواب موجود نہیں تھا۔ مایوسی کے عالم میں لاگ آؤٹ کرنے سے پہلے اس نے سرسری نظر باقی میلز پر ڈالی جو مختلف تجارتی کمپنیوں کے پیغامات سے بھری پڑی تھی۔ کہاں اور کب سیل لگ رہی تھی۔ سیل میں کیا کیا دستیاب تھا۔ کس سوشل ویب سائٹ پر کون اس کا دوست بننے کا خواہش مند تھا۔ چیزوں کی آن لائن خرید و فروخت کے اعلانات' اس نے ایک ساتھ کئی پیغامات کو ختم کرنے کی غرض سے ان پر نشان لگانے شروع کیے۔ نشان لگاتے لگاتے ایک پیغام پر آکر اس کی انگلی رک گئی۔ اس نے پہلے اس پیغام کو غور سے نہیں پڑھا تھا۔ اس نے انگلی سے کلک کرکے اس پیغام کو کھولا۔
پیغام کی تفصیلات میں لندن کی کسی ٹریول ایجنسی کی طرف سے اس کے پاسپورٹ اور ویزہ کی نقول مانگی گئی تھیں اور اسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ بذریعہ ای میل جلد یہ نقول بھیج دے تاکہ آئندہ پندرہ دن کے اندر اس کے سفری انتظامات مکمل کیے جاسکیں۔
نادیہ کے لیے یہ پیغام غیر متوقع اور حیران کن تھا۔ اس نے کہیں بھی لندن تک کے سفر کے لیے درخواست نہیں بھیج رکھی تھی۔ دو تین بار اس پیغام کو پڑھنے کے بعد اس نے اس کے جواب میں پاسپورٹ اور ویزہ کی نقول مانگنے کی وجہ دریافت کی اور پیغامات ختم کرنے کا ارادہ ملتوی کرکے سائن آؤٹ کرلیا۔
اب اس کا ذہن اس پیغام میں الجھ گیا تھا۔ یہ کسی اشتہاری مہم کا حصہ نہیں لگ رہا تھا' نہ ہی نادیہ نے کسی انعامی مقابلے میں کوئی تفریحی ٹرپ جیت رکھا تھا۔ موسم گرما کے آغاز پر اس طرح کے ٹرپ کا تصور اگرچہ بہت خوش کن تھا مگر اس کی سمجھ میں بہت سوچنے کے بعد بھی یہ نہیں آیا تھا کہ وہ پیغام اسے کیوں موصول ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

کھاری نے ماہ نور کے گھر میں پہلی دفعہ قدم رکھتے ہی بھانپ لیا تھا کہ ماہ نور کے گھر کے رہن سہن اور چوہدری صاحب کے گھر کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ بچپن سے چوہدری صاحب کے ان بھائی کو کبھی کبھار اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گاؤں آتے دیکھ رہا تھا' جو لاہور شہر میں رہتے تھے اور بہت پڑھے لکھے تھے۔
کھاری کو ہمیشہ یہ بات اچھی لگتی تھی کہ چوہدری صاحب کے یہ بھائی اور ان کی بیوی فارم ہاؤس کے ملازمین سے بھی بہت ادب اور پیار کے ساتھ بات کرتے تھے' البتہ ان کا انداز لیے دیے رہنے والا ہوتا تھا۔ چوہدری صاحب کے بھتیجے اور بھتیجی کو بھی وہ بچپن سے دیکھ رہا تھا مگر ماہ نور بی بی کے گزشتہ برس کے قدرے طویل قیام کے دوران جو وہ ان کے اخلاق اور مروت کا دلدادہ ہوا تھا۔ اس کا تو کوئی بدل ہی نہیں تھا۔
چوہدرانی کے ساتھ لاہور آنے میں اور سب خوش کن باتوں پر یہ تصور بھاری تھا کہ وہ ماہ نور بی بی سے ملاقات کر سکے گا مگر ماہ نور کے گھر میں ایک دن کے قیام کے اندر ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ چھٹیوں کی بے فکری میں وقت گزارتی ماہ نور بی بی اور شہر میں اپنی مصروفیات میں گم مشین بنی ماہ نور بی بی میں خاصا فرق ہے۔
جس دن کھاری چوہدرانی کے ساتھ لاہور پہنچا' اس روز تو اس کی ماہ نور سے ملاقات ہی نہیں ہو پائی تھی۔ اگلے روز صبح جب وہ چوکیدار کے ساتھ گیٹ پر اسٹول رکھ کر بیٹھا تھا' اسے ماہ نور گھر کے گیراج میں کھڑی نظر آئی۔
"اسلام علیکم!" کھاری بھاگ کر گیراج کی طرف آیا اور دانت نکالتے ہوئے بولا۔
"وعلیکم السلام۔" ماہ نور نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ اس کی نظریں اپنے ہاتھ میں پکڑے فون کی اسکرین پر جمی تھیں اور دھیان تیزی سے فون کے نمبر دبانے کی طرف تھا' پھر وہ فون کان کے ساتھ لگا کر کسی سے بات کرنے میں مصروف ہو گئی۔ اس کا چہرہ بھی دوسری طرف تھا۔ کھاری کو یوں اپنا نظر انداز کیا جانا تھوڑا مایوس کر گیا لیکن پھر بھی وہ وہیں کھڑا رہا۔ کچھ دیر فون پر گفتگو کے بعد فون بند کرتے ہوئے ماہ نور نے ادھر ادھر دیکھا اور اس کی کھاری پر نظر پڑ گئی۔
"ارے کھاری! یہ تم ہو۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "کتنے بڑے ہو گئے ہو۔"
کھاری کی چند پل پہلے کی مایوسی ایک دم ہوا ہو گئی۔ وہ مسکرایا اور اس نے اپنی ایڑیوں کو ذرا سا اٹھا کر مزید لمبا نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے ماہ نور کی طرف دیکھا۔
"واٹ اے سرپرائز۔" وہ انگریزی زبان میں کچھ بولی۔ جس کا مطلب کھاری نے یہ لیا کہ وہ کہہ رہی تھی تم کتنے لمبے ہو گئے ہو۔
"میں تے جی' کل وی انتظار کر دا رہا کہ آپ سے ملاقات ہو جائے پر آپ نظر ہی نہیں آئے۔" کھاری نے اپنی غیر معمولی خوشی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔
"اوہ..... آئی ایم سوری۔" ماہ نور نے افسوس کا اظہار کیا۔ "کل میں ایک کمپین میں بہت مصروف تھی گھر واپس آتے آتے بہت دیر ہو گئی۔"
کھاری نے کچھ نہ بھی سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔
"تم ٹھیک رہ رہے ہو نا یہاں' ناشتا کرلیا تم نے؟" ماہ نور نے قدرے عجلت میں پوچھا۔ کھاری کے ایک بار پھر سر ہلانے پر ماہ نور نے چوکیدار کو آواز دی۔ "عظمت گل! کھاری کا بہت خیال رکھنا ہے بھئی۔" چوکیدار سر ہلاتے ہوئے گیٹ کھولنے لگا۔

کھاری نے دیکھا گھر کا اندرونی دروازہ کھلا اور ماہ نور کا بھائی سلمان ہاتھ میں فائلیں، فون، اپنا بٹوہ اور ٹائی پکڑے تیزی سے باہر نکلا۔

"جلدی، جلدی، جلدی ماہ نور! دیر ہو گئی۔"

وہ تیزی سے کہتا گیراج میں کھڑی ایک چھوٹی گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"اچھا کھاری! پھر کسی وقت تم سے بات ہو گی۔ ابھی تو میں جا رہی ہوں۔"

ماہ نور نے ملکے سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کھاری سے کہا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ کھاری سر اور ہاتھ ہلاتا گاڑی کے راستے سے ہٹ گیا۔ پل کے پل میں گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور گیٹ سے باہر نکل گئی۔

گاڑی کے جانے کے بعد کھاری کو یاد آیا۔ اس نے سوچا تھا ماہ نور کو اس کے گزشتہ قیام کے بارے میں یاد دلائے گا۔ اس وقت ماہ نور کی وجہ سے اسے اپنے روزمرہ کے کاموں سے کتنی بار چھٹی ملی تھی۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ ماہ نور کو یہ بھی بتائے گا کہ اس بار بابے منگو کے میلے میں بندر والے نے بندر اور ریچھ کے ساتھ ساتھ بھالو اور چیتے کے کرتب بھی دکھائے تھے مگر اس روز تو کیا کھاری کے قیام کے اگلے کئی دن تک ماہ نور سے اس کا سامنا نہیں ہو سکا تھا اور اسے اپنے یہاں قیام سے شدید بوریت محسوس ہونے لگی تھی۔ ماہ نور کے گھر کا رقبہ اگرچہ کم نہیں تھا مگر کھاری کو یہاں عجیب سی گھٹن محسوس ہوتی تھی۔

چھوٹا سا لان، چھوٹا سا ڈرائیو وے، جس پر چند قدم چلنے کے بعد ہی گیٹ آجاتا تھا اور گیٹ سے باہر نئی ہی دنیا سامنے موجود ہوتی تھی۔ جہاں کم ہی کوئی دوسرے کو جانتا تھا۔ جہاں انسان مشینوں کی طرح وقت پر چلتے اور رکتے تھے۔ کوئی کسی سے مانوس اور آشنا نظر نہیں آتا تھا۔ کھاری کو چوہدرانی کے ساتھ شہر کی مارکیٹوں اور شاپنگ سینٹرز میں بھی گھومنا پڑتا تھا، جہاں بجلی سے چلنے والی سیڑھیاں تھیں جن پر قدم رکھنے سے پہلے چوہدرانی ایک دو بار چیخ مارتی اور پھر کھاری کا ہاتھ پکڑ کر ان پر قدم رکھتی۔ ہر بار انہیں ایسا لگتا وہ گر جائیں گی لیکن اوپر اور پھر اس سے اوپر کی منزلوں کا سامان دیکھنے کے لیے انہیں ان سیڑھیوں پر کھڑے ہونا پڑتا۔

"ساری دکانوں میں ایک جیسا ہی سامان رکھا ہوتا ہے بی بی جی! تسی ایویں ای خوار ہو رہے ہو۔" کھاری چوہدرانی کے ذوق و شوق کو دیکھ کر کہتا۔

"دکاناں نہیں شدائیا! یہ مال ہیں مال۔" چوہدرانی اپنی معلومات جھاڑتے ہوئے کھاری کا مذاق اڑاتی۔

"لو مال تو ان دکانوں کے اندر رکھیا ہے، یہ دکانیں تو مال نہیں نا۔"

کھاری سمجھتا چوہدرانی کے فہم میں کہیں کوئی خرابی ہو گئی تھی۔ وہ ہنس کر رضیہ سے کہتا، جو آنکھیں منہ پھاڑے نئے نئے منظر دیکھتی ہونقوں کی طرح سر ہلاتی رہتی۔

"اک گل تہاڈی جان بی بی جی! اتنا سامان کیا کرنا ہے۔" پھر وہ چوہدرانی کی خریدی چیزوں کے شاپنگ بیگز پکڑتے ہوئے کہتا۔

"میں نے کون سا روز روز لاہور آنا ہے۔ ایک ہی بار لے جاؤں چیزیں پھر پتا نہیں کب آنا ہو۔" چوہدرانی برا مانے بغیر جواب دیتی۔

"فیزہ بی بی (فائزہ بی بی) کو دیکھا ہے، روز نیا جوڑا پہنتی ہیں۔ نئے نئے ٹاپس، نئے نئے جوتے، نئی نئی انگوٹھیاں، وہ بھی تو ڈھیر ساری چیزیں خریدتی ہوں گی نا اسی لیے تو روز نویں نکور بن جاتی ہیں۔"

رضیہ کھاری کو گھورتی اور کھاری کے ذہن میں فائزہ بی بی آجاتیں۔ "ان کا اپنی چوہدرانی جی سے کیا مقابلہ، انہوں نے تو نوکری پر جانا ہوتا ہے جھلیے!"

وہ رضیہ سے کہنا چاہتا تھا مگر اسے اس کے منہ لگنے سے چڑ تھی۔ سو ہر روز وہ چوہدرانی کے ساتھ گھومنے پھرنے کی مہم میں شریک ہوتا۔ ہر روز وہ مخصوص باتیں کرتے اور تھک کر گھر واپس آجاتے۔

"امیر ہونا بھی کتنا مشکل کام ہے۔" ہر رات کھاری سونے سے پہلے سوچتا۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو یہ میں ہوں۔ میں چاہ رہا ہوں کہ میں فرینکفرٹ سے پاکستان جانے سے پہلے تم سے ملوں۔ تم نے اپنے پاسپورٹ اور ویزا کی کاپی میل نہیں کی۔ کیا تم اپنے مصروف وقت سے دو دن نکال کر لندن آسکتی ہو۔

خیر خواہ سعد سلطان۔"

نادیہ نے اس میل کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھا اور خوشی سے جھومتے دل پر قابو پاتے ہوئے یہ سوچنے کی کوشش کی کہ کیا اسے اس پر اعتبار کر لینا چاہیے۔

"کتنی پاگل ہو تم!" پھر اس نے خود کو ڈانٹا۔ "اس دنیا میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو تم سے اتنے کنسرنڈ ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو تمہارے لیے ایک ٹرپ ارینج کریں گے۔ پھر اس میل پر کیسا شک اور اس کے بھیجنے والے کی آئی ڈی پر کیسی بے اعتباری۔"

اس نے اپنی میل باکس کے صفحے کو اوپر نیچے کیا۔ اسی ٹریولنگ ایجنسی سے اسے اس کے سوال کے جواب میں ایک یاددہانی کی میل آئی ہوئی تھی۔ وہ ایک بار پھر اس سے اس کی تفصیلات پوچھ رہی تھی۔ اس بار نادیہ نے اپنے کاغذات اسکین کر کے ان کی نقول بھجوانے میں آدھا گھنٹہ بھی نہیں لگایا۔

☼ ☼ ☼

"ہمیں پتا بھی نہیں چلا اور سعدیہ ایک دم بڑی بھی ہو گئی۔" آپا رابعہ نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ مولوی صاحب کے پاس ان کی بات کا کوئی معقول جواب نہیں ہو گا کہا۔

"ہوں!" مولوی صاحب کے پاس معقول تو کیا، کوئی جواب ہی نہیں تھا۔

"وہ سوال کرنے لگی ہے۔" آپا رابعہ نے بتانا چاہا کہ انہیں کیسے پتا چلا تھا کہ سعدیہ بڑی ہو گئی تھی۔

"ایسے سوال جن کا یا تو جواب دیا جائے یا بچے کو جھڑک دیا جائے، مگر جھڑک دینے سے اس کے ذہن میں اور سوال پیدا ہوں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیا کہوں۔"

"تمہارا اٹھنا بیٹھنا پڑھے لکھے لوگوں میں رہا ہے۔ میں تو ایک عام سا کم علم انسان ہوں، میرا دماغ بڑی بات سوچتا ہے نہ سمجھتا ہے، لہٰذا میرے خیال سے تو تم ہی سعدیہ کو بہتر سمجھا سکتی ہو کہ سوال کرنا اچھی عادت نہیں۔"

مولوی سراج نے ایک بار پھر معاملے کی گٹھڑی ان کی طرف اچھال دی تھی۔

"اگر میری سمجھ میں آگیا ہوتا تو میں اسے سمجھا چکی ہوتی۔ مجھے کیا ضرورت تھی آپ کے ننھے سے دماغ پر بوجھ ڈالنے کی۔"

آپا رابعہ نے جل کر کہنا چاہا مگر الفاظ زبان پر ہی روک لیے۔ شوہر کے سامنے زبان چلانے پر انہیں آگ کی وہ لپٹیں نظر آنے لگتیں جو ان عورتوں کی منتظر ہوں گی، جو شوہروں کو ان کا مقام دیتی ہیں نہ ان کا احترام کرتی ہیں۔

"وہ اپنے دادا، دادی، نانا، نانی اور پھپھی چاچوں کے بارے میں پوچھتی ہے۔ اسے حیرت ہوتی ہے کہ کوئی خالہ، کوئی ماموں کبھی اس کے گھر کیوں نہیں آتا۔" انہوں نے اپنے دل کی جلن پر قابو پاتے ہوئے ایک بار پھر مولوی سراج سے مشورہ لینے کی کوشش کی۔

"اسے بتانا تھا نا سب مر مرا گئے۔" مولوی صاحب نے سکون سے جواب دیا۔

"اور اپنے ہر خطبے میں آپ سچ بولنے اور جھوٹ سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔" انہوں نے مولوی صاحب کو

یاد دلایا۔

"دروغ مصلحت آمیز کی بات کر رہا ہوں میں۔" مولوی صاحب نے اپنی بات کی وجہ ظاہر کی۔

"دروغ' دروغ' دروغ۔" آپا رابعہ نے تین بار دہرایا "ہماری تو زندگیاں ہی دروغ مصلحت آمیز کا چلتا پھرتا نمونہ بن کر رہ گئی ہیں۔"

"بصورت دیگر جو ہو گا اس کا سامنا کرنے کی ہمت ہے تو بتا دو سعدیہ کو۔"

مولوی سراج ٹھنڈے ٹھنڈے جواب دے رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ درانتی جس کے دونوں طرف کاٹ دار کانٹے تھے' کی درمیانی جگہ جہاں وہ دونوں قدم جما جما کر چلتے تھے بہت کم چوڑی ہے بلکہ اتنی تنگ تھی کہ ایک غلط قدم ان کے پاؤں کاٹنے کے لیے کافی ہو گا۔

"جیتے رہیں آپ مولوی صاحب! آپ کو رب نے بھاگ لگائے ہوئے ہیں۔ نہ کوئی فکر نہ فاقہ۔ ایک سے دن ایک سی راتیں اور آپ مست ہوئے پڑے ہیں۔ کاش! ایسی بے نیازی' ایسی فاقہ مستی سب کو عطا ہو جائے۔" آپا رابعہ دل ہی دل میں کلستی سوچتی رہیں۔

"ٹھیک ہے۔ میں ایسا کرتی ہوں سعدیہ کو سختی سے ڈانٹ دیتی ہوں کہ پڑھائی میں دل لگائے۔ بورڈ کے امتحان کا سال ہے' ادھر ادھر کی سوچنے کے بجائے اچھے نمبر لینے پر توجہ دے' جو عمر بھر کام آنے ہیں۔"

کتنی دیر سوچنے اور کلسنے کے بعد انہوں نے بھی معاملے کی گٹھڑی کچھ دیر کے لیے سر سے اتار کر طاق پر رکھ دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے سوچا اور اگلے روز جب ناشتا کرتے ہوئے سعدیہ نے ان سے اسی قسم کا سوال کیا تو انہوں نے اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اسے سختی سے سوال کرنے سے منع کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ سعدیہ ابھی اتنی بھی بڑی نہیں ہوئی تھی کہ اس ڈانٹ کے جواب میں ڈرنے کے بجائے مزید سوال سوچنے لگے گی۔

وہ بے خبر تھیں کہ سعدیہ نے معنی کے ایک جہان کی سیر کرنا شروع کر رکھی تھی۔ زندگی کی حقیقتیں اس کی عمر کی ان بچیوں' جن کو بہت کچھ بغیر مانگے ہی میسر تھا' کی نسبت سعدیہ پر جلدی جلدی حملہ آور ہو رہی تھیں کہ ان کی کھوج لگائی جائے۔ ان کے بارے میں جانا جائے۔ آپا رابعہ کی ہڑبڑاہٹ اور مولوی صاحب کی مصلحت آمیز خاموشی بلکہ فرار سعدیہ کے ذہن میں نت نئے سوال اٹھا رہی تھی۔ آپا رابعہ کی ڈانٹ پر اسے یقین ہونے لگا تھا کہ اس کے ماں باپ کی دال میں کچھ کالا تھا' جب ہی پکنے کے بعد بھی الگ نظر آتا تھا۔

☼ ☼ ☼

ماہ نور نے شیشے کی دیوار سے پرے ہونے والی بوندا باندی کو غیر دلچسپی سے دیکھا۔ یہ بوندا باندی سڑک پر گزرتی گاڑیوں کی ونڈ اسکرین کو دھندلانے کے لیے کافی تھی۔ سب گاڑیوں کی ونڈ اسکرین پر وائپرز چل رہے تھے۔ اس منظر میں جو اس کے سامنے تھا اس کے لیے دلچسپی کی کوئی بات نہیں تھی یا وہ ذہنی طور پر پریشان تھی' جو اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اپنی تائی صابرہ کے پُر زور اصرار پر ان کو کمپنی دینے کی خاطر اس ریسٹورنٹ میں چائے پینے آئی تھی۔

اس ہائی ٹی کی میزبان تائی صابرہ تھیں اور وہ اس کے سامنے بیٹھی ہائی ٹی میں موجود تمام لوازمات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مسلسل باتوں میں مصروف تھیں۔ ماہ نور ان کی ہر بات کا ہوں ہاں میں جواب دے رہی تھی۔ اسی دوران تائی صابرہ کو اپنے سیل فون کی بیل بجتی سنائی دی اور وہ اپنے کنگ سائز شولڈر بیگ میں سے اپنا فون تلاش کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

ماہ نور نے ایک بار پھر شیشے کی دیوار سے پار کے منظر پر نظریں جمالیں۔ کھاری ریسٹورنٹ سے باہر گرین بیلٹس

میں لگے جھولوں پر بیٹھے بچوں کے ساتھ ہنستا کھیلتا نظر آ رہا تھا۔ اس روز بھی اس نے موتیا رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور بالوں میں تیل لگا کر سیدھی مانگ نکالی ہوئی تھی۔ اس کے پاؤں میں کالے رنگ کے چپل تھے اور وہ بچوں کے ساتھ ادھر ادھر بھاگتا پھر رہا تھا۔

"کتنا خوش قسمت ہے کھاری۔ ہر طرح کی صورت حال میں خود کو ایڈجسٹ کر لیتا ہے اور کتنا پُر اعتماد بھی ہے۔ کوئی اور اس کی جگہ ہوتا تو شہر اور شہر والوں کی دہشت کے مارے اپنی جگہ سے ہلتا بھی نہیں۔"

اسے کھاری پر رشک آیا۔ اسی دم ریسٹورنٹ کے داخلی دروازے پر کھڑا کسی کارٹون کریکٹر کا روپ دھارے لڑکا کھاری سے جا ملا اور اب کھاری اس خرگوش بنے لڑکے کے ساتھ ٹانگیں اور بازو ہلا ہلا کر وہاں موجود بچوں کو محظوظ کرنے لگے تھے۔ ماہ نور نے ہنستے' مسکراتے' تالیاں بجاتے' بچوں کو بھی رشک سے دیکھا۔

"کیسی بے فکری ہے۔ کتنے مزے ہیں ان بچوں کے۔" اس نے سوچا۔

"مگر میں اتنی زود رنج کیوں ہو رہی ہوں۔" پھر اسے خود پر غصہ آنے لگا۔

"میں کیوں دوسروں پر رشک کیے جا رہی ہوں۔ میری زندگی میں کس چیز کی کمی ہے۔" وہ خود سے سوال کرنے لگی۔

"لے ماہ نور! تو نے تو کچھ کھایا ہی نہیں دھی رانی!" اس سے پیشتر کہ وہ مزید خود سے ناراض ہوتی' تائی صابرہ نے اسے اس کی سوچوں سے باہر نکال لیا۔

"اتنا کچھ ویسے ہی پڑا ہے۔" وہ مایوسی سے سرہلاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ "اب بل تو انہوں نے اب جتنا ڈا لے لینا ہے نا' چاہے ہم سب کچھ ہاتھ لگائے بغیر ہی چھوڑ جائیں۔"

"آپ فکر نہیں کریں' میں ان سے کہہ کر پیک کروا لیتی ہوں۔ کھاری اور رضیہ کھا لیں گے۔"

ماہ نور نے انہیں تسلی دینے کی خاطر کہا اور ایک نظر باہر ڈالی۔ لمبے لمبے کانوں والے خرگوش بنے لڑکے اور کھاری میں گاڑھی چھنتی نظر آ رہی تھی۔ کھاری کے ہاتھ میں جوس کا ٹن تھا اور وہ اس لڑکے سے یوں باتیں کر رہا تھا جیسے برسوں کی واقفیت ہو۔ ماہ نور نے ویٹر سے کہہ کر بچ جانے والے تمام لوازمات پیک کروائے اور بل ادا کرنے کے بعد تائی صابرہ کے ساتھ ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئی۔

"اوئے ہوئے! باہر تو ابھی بھی سورج گرم ہے۔" باہر قدم رکھتے ہی تائی صابرہ نے دہائی دی۔ ان دونوں کو باہر نکلتا دیکھ کر ڈرائیور پارکنگ سے گاڑی نکال کر آگے لے آیا۔ کھاری بھی انہیں دیکھ کر اپنا کھیل تماشا چھوڑ کر گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ خرگوش بنا لڑکا بھی اپنے لمبے لمبے کان ہلاتا' اچھلتا کودتا کھاری کے ساتھ باتیں کرتا ادھر کو آ رہا تھا۔

"چلیے جی!" کھاری گاڑی کے قریب آ کر بولا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور چہرے پر مسرت جھلک رہی تھی۔

ڈرائیور نے گاڑی کے دروازے ماہ نور اور تائی صابرہ کے لیے کھولے۔ ماہ نور کے گاڑی میں بیٹھ جانے کے بعد خرگوش نے اس کی سائیڈ کا دروازہ بند کر کے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے اسے خدا حافظ کہا۔ ماہ نور کو یکدم خیال آیا۔ اس نے بٹن پر انگلی رکھ کر شیشہ نیچے کیا اور اپنے پرس سے پچاس روپے نکال کر خرگوش کو پکڑا دیے۔ جواب میں ایک بار پھر اس نے جھک کر ماہ نور کا شکریہ ادا کیا۔ ماہ نور کی کھڑکی کا شیشہ آہستہ آہستہ بند ہو گیا اور گاڑی آگے چل دی۔

"توبہ توبہ! بندہ کیا کچھ نہیں کرتا روزی کمانے کے لیے۔" تائی صابرہ نے کہا۔ "اسے دیکھو! بے چارہ جانور ہی بن گیا روٹی کی خاطر۔ سارا دن اچھل کود کا بجا کر اس کی بھلا کتنی کوئی مزدوری بن جاتی ہو گی ماہ نور!" انہوں نے ماہ نور سے پوچھا۔

"پتا نہیں تائی جی!" ماہ نور کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ دن میں کتنا کما سکتا تھا۔ "گزارہ ہو ہی جاتا ہو گا تب ہی تو یہ کام کرتا ہے نا۔"

"او جی واہ واہ کمائیاں ہوتی ہیں اس کو، مجھے خود بتایا ہے اس نے۔" کھاری نے خود کو اس گفتگو میں گھساتے ہوئے کہا۔ "میرے سامنے جی کئی لوگوں نے پنجا پنجا سو سو کے نوٹ پھڑائے ہیں اسے۔"

"اچھا! پھر تو اچھا لے جاتا ہے یہ۔" تائی صابرہ نے اچنبھے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"بی بی جی! یہ جو لڑکا ہے نا، یہ ادھر کا ہے بھی نہیں۔ یہ باہر سے منگوایا ہوا ہے ہوٹل والوں نے 'جپان (جاپان) سے بلا کر نوکری دی ہے اس کو پر اردو ساری جانتا ہے۔" کھاری بتا رہا تھا، اسی دم گاڑی سگنل پر رک گئی۔

"اردو ہی نہیں پنجابی بھی آتی ہے اس نوں۔" کھاری کہہ رہا تھا۔

"جاؤ کھاری! تم بھی لمبی لمبی چھوڑتے ہو، تمہیں کیا پتا اس کاسٹیوم کے نیچے چھپا لڑکا پاکستانی ہے، ایرانی ہے کہ جاپانی۔" ماہ نور نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"او جی ماہ نور بی بی! مجھے خود اس نے اپنا منہ اتار کر شکل دکھائی ہے اپنی، پورا جپانی تھا۔ چھوٹی چھوٹی اکھیوں والا، پھینی ناک والا۔" کھاری نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ہمارے فارم ہاؤس پر جپانی آتے نہیں بی بی جی!" پھر اس نے اپنی بات کے حق میں ووٹ لینے کی خاطر چہرہ پیچھے کی طرف موڑ کر تائی صابرہ سے پوچھا۔ "میں ان کی اکھیاں منہ سب پہچانتا ہوں جی۔"

"ان کے لیے تو چودھری صاحب سوشی منگاتے ہیں شہر سے۔" اس نے ماہ نور کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو مجھے کون سی بات کا علم نہیں۔

"اچھا بھئی ہو گا۔" ماہ نور نے ہار مانتے ہوئے کہا۔ "تمہارا تو اچھا دوست بن گیا کوئی اتا پتا بھی لیا اس سے کہ دوستی شروع کر کے یہیں ختم کر آئے ہو۔" وہ مسکرائی۔

"اے دیکھو جی!" کھاری نے جیب میں رکھا ہوٹل کا کارڈ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔ "اس تے اس کا نام پتا فون نمبر سب لکھوا لیا ہے۔ چوہدری صاب سے اجازت لے کر اسے فارم ہاؤس بلاؤں گا۔ میں نے اسے بابے منگو دے میلے دے بارے میں بتایا۔ وہ کہہ رہا تھا اسے وہ کرتب بھی آتا ہے وہ جو کنیاں گینداں اکو واری اوپر اچھالتے ہیں فیر واری واری پھڑ لیتے ہیں، پر گرنے نہیں دیتے ایک بھی، پہلے سرکس میں کام کرتا تھا یہ۔"

اب کھاری ڈرائیور سے مخاطب تھا۔

"پا جی! آپ نے کبھی سرکس دیکھا ہے؟ بابے علم دین دے میلے پر لگتا تھا۔ پہلے تو ہم دیکھنے جاتے تھے۔ لڑکے لڑکیوں والے کپڑے پہن کر سانپوں والا ناچ دکھاتے تھے۔"

کھاری اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا اور ماہ نور کو سرکس کے نام پر سارہ خان، اس کی معذوری اور سعد کی سارہ کے لیے شدت پسندی بری طرح یاد آنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ چھ سال کے بعد لندن آئی تھی۔ اس شہر میں کبھی اس کے نانا رہا کرتے تھے۔ ممی اسے جب پاکستان سے واپس لے کر آئی تھیں پہلے لندن ہی میں رکی تھیں۔ اس وقت وہ اپنے نانا سے پہلی بار ملی تھی۔ نیلی آنکھوں اور گرے بالوں والے نانا خاصے ضعیف تھے اور بیمار بھی۔ اسے یاد تھا ممی اور نانا کی بحث دن رات چلتی تھی، ممی چلا چلا کر نانا کو کچھ سمجھانے کی کوشش کرتی تھیں اور نانا بری طرح کھانستے ہوئے ممی سے جو بھی کہتے تھے۔ اس میں سے ایک ہی بات اس سمجھ میں بھی آتی تھی اور یاد بھی رہ گئی تھی۔ وہ ممی سے کہتے تھے کہ ان کی ضد، خود غرضی اور ہٹ دھرمی ان کی بیٹی کی زندگی برباد کر دے گی۔

"میں تمہیں اور تمہارے مزاج کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں ڈورا!" نانا اپنی کھانسی پر قابو پاتے ہوئے کہتے۔

"تم جس مقصد کے لیے لڑکی کو اس سے چھین لائی ہو، اس میں اس کی صرف تباہی چھپی ہوئی ہے تباہی۔"

"تم نے کب مجھے غلط نہیں کہا۔" ممی چمک کر بولیں۔ "میں تمہارے پاس نصیحتیں سننے یا پیشن گوئیاں کرانے نہیں آئی میں تم سے صرف تمہاری اس جائیداد میں سے اپنا حصہ لینے آئی ہوں جس میں جولیا کے ساتھ میں بھی حصہ دار ہوں۔"

"چلاؤ مت۔" نانا اپنے سینے پر ہاتھ ملتے ہوئے کہتے۔ "میری جائیداد میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ تم نے ہمیشہ مجھ سے بغاوت کی۔ کبھی کسی ایشین سے شادی کی اور کبھی کسی امریکن سے دوستی گانٹھی۔ نہ تم ان کی سگی بنیں نہ میری۔ تمہارے جیسی اولاد کا باپ ہونا کسی سزا سے کم نہیں اور تمہاری جیسی اولاد کا کبھی کوئی حصہ نہیں ہوا کرتا ماں باپ کی جائیداد میں۔"

"میں دیکھتی ہوں تم کیسے نہیں دیتے۔" ممی فرش پر پاؤں مار کر کہتیں اور پھر سارا سارا دن کے لیے کہیں غائب ہو جاتیں۔

وہ ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے نانا کے اس چھوٹے سے گھر کے دو کمروں میں گھومتی رہتی جن میں سے ایک میں نانا ایک بڑی سی آرام کرسی پر بیٹھے جھولتے رہتے اور دوسرے میں اس کی اداس آنکھوں والی آنٹی جولیا جو سننے اور بولنے کی قوت سے محروم تھی بیٹھی آرپ کی تاروں پر انگلیاں پھیرتی رہتی۔ جس پس منظر سے اسے اٹھا کر یہاں لا بٹھایا گیا تھا، اس کے اثرات کے زیر اثر نادیہ کو لندن کا یہ روپ قطعی پسند نہیں آیا تھا۔

"لنڈن گندا ہے، سب سے اچھی جگہ اسلام آباد ہے اور مری ہلز۔" وہ اپنی خالہ سے کہتی جو اس کی بات سن سکتی تھی نہ اس کا جواب دے سکتی تھی۔

پھر ممی اسے لے کر امریکہ چلی گئیں۔ بیمار اور بوڑھے نانا اور گونگی بہری خالہ پیچھے رہ گئیں۔ ممی نے نانا کے خلاف قانونی جنگ جیت کر ان کی جائیداد میں سے اپنا حصہ ہتھیا لیا تھا۔ پاکستان سے واپس امریکہ تک کے سفر میں دو فتوحات کے طغرے ان کے شانے پر سجے تھے۔ وہ نادیہ کو اس کے ڈیڈی سے چھین لائی تھیں اور انہوں نے اپنے باپ سے اپنا حصہ وصول کر لیا تھا۔ نادیہ کے معصوم ذہن میں ممی کی فتوحات کے تذکرے تو نہیں بیٹھ پائے تھے، اسے بس یہ ہی احساس رہتا تھا کہ جو کچھ بھی تھا اس کا کوئی بڑا نقصان ہو چکا تھا۔ اس کے بعد آنے والے سالوں نے نادیہ کے اس خیال کو عملی شکل دیتے ہوئے زندگی سے اس کا جو تعارف کروایا تھا، اس کے مطابق نادیہ کا بڑا ہی نہیں بہت بڑا نقصان ہو چکا تھا۔ چودہ سال کی عمر کو پہنچنے پر ممی اسے بتانے لگیں کہ اپنے ہم عمر امیر لڑکوں کو پھنسانے کے ایک سو ایک بہترین طریقے کیا تھے۔

"ایک اچھا بوائے فرینڈ تمہارے لیے کم از کم ایک اچھے لباس، اچھے سینڈلز اور ایک وقت کے بہترین کھانے کا بندوبست تو کر ہی سکتا ہے۔"

ممی نے اسے لالچ دیتے ہوئے کہا تھا اور اگر تم پندرہ ایسے بوائے فرینڈز بنا لیتی ہو تو دو دن ہر دوست کے ساتھ کے مطابق ایک مہینے کا بندوبست ہو سکتا ہے۔"

ممی یہ سب بتاتے ہوئے ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتیں اور نادیہ بے یقینی سے انہیں دیکھتی رہتی، جو اسے لڑکوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے لباس پہننے کے سو طریقے مزید بتاتیں۔

"یہ تمہاری زندگی ہے نادیہ! جسے تم نے خود جینا ہے۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم اپنے لیے کیا بہترین فیصلہ کرتی ہو۔"

"مجھے ابھی پڑھنا ہے ممی!" وہ بے یقینی سے ممی کی بات سنتی اور جھنجلا کر کہتی۔

"پڑھنا ہے۔" ممی دانت پیستیں۔ "تمہارے خراجات تمہارا باپ پورے کرے گا؟"

"وہ ضرور کرتا اگر آپ مجھے اس سے چھین کر یہاں نہ لے آتیں۔" نادیہ کے دل میں گزرے دنوں کی یاد کی کسک اٹھتی۔

"تمہیں کیا پتا تمہارا باپ کون ہے۔" وہ اسے اسی بات پر بلیک میل کرنے کی کوشش کرتیں جس سے انہوں نے ڈیڈی کو بلیک میل کیا تھا۔

"میں نہیں جانتی۔" نادیہ کا لہجہ گستاخ ہو جاتا۔ "مگر جو آپ کا طرز زندگی ہے اس سے لگتا ہے شاید آپ خود بھی نہیں جانتیں۔"

"بکواس بند کرو۔" ممی ڈپٹنے کی کوشش کرتیں۔

"اب آپ کو یہ باتیں بکواس ہی لگیں گی۔ حقیقت میں آپ نے میری زندگی کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا۔ اچھی بھلی میں ڈیڈی کے ساتھ سکون کی زندگی گزار رہی تھی' آپ نجانے کون سے عزائم پورے کرنے کے لیے ایک پورا ڈرامہ رچا کر مجھے یہاں لے آئیں اور اب میری زندگی تباہ کرنے کے لیے اپنے بے ہودہ مشورے دیتی رہتی ہیں۔ آپ مجھے معاف کیوں نہیں کر دیتیں۔" وہ ہاتھ جوڑ کر ممی کی آنکھوں کے سامنے کرتی۔

"تو جاؤ...." وہ بھڑک کر کہتیں۔ "جاؤ واپس اپنے ڈیڈی کے پاس چلی جاؤ۔"

"ہونہہ!" نادیہ تمسخر اڑانے والے انداز میں سر جھٹکتی۔ "آپ نے مجھے ان کے پاس واپس جانے کے قابل چھوڑا ہوتا تو ضرور چلی جاتی۔"

"تم اچھی طرح جان لو نادیہ!" ممی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہتیں۔ "میں تمہاری کوئی مالی مدد نہیں کروں گی' تمہیں اپنی روزی روٹی کے اخراجات خود ہی پورے کرنے ہوں گے۔"

"فکر مت کریں۔ میں آپ سے کچھ لینا بھی نہیں چاہوں گی۔" وہ غصے سے کہتی۔

"یہ میرا سر درد ہے کہ میں اپنے اخراجات کیسے پورے کروں گی؟"

اس کے اور ممی کے درمیان ایسی بحثیں کئی بار چلیں۔ وہ ممی کے بنائے ہوئے اصولوں پر چلنے پر خود کو آمادہ کر سکی نہ ممی اس کی مالی امداد پر راضی ہوئیں۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں مادر پدر آزادی پیدائشی حق قرار دی جاتی تھی' خود کو لاشعور میں بیٹھے ان تعصبات کے زیر اثر ہر ممکنہ حد تک بچا کر رکھنے کا فیصلہ اس کا اپنا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کسی دین کے اصولوں کی تقلید کر رہی تھی نہ روایات و اخلاقیات کے درس کی' لیکن پھر بھی اسے بہت بچپن میں سنی کئی باتیں رہ رہ کر یاد آتیں۔

ایک ایسے معاشرے کی روایات یاد آتیں جس سے اس کا تعلق کئی سال پہلے ٹوٹ چکا تھا اور وہ خود کو کسی کام سے یہ کہہ کر روک لیتی "نہیں نادیہ! تم ابھی پندرہ سال سے کم عمر ہو۔"

حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اس دلیل میں کوئی منطق نہیں تھی مگر اسے اپنے لیے وجوہات درکار تھیں۔ وہ چھوٹی موٹی نوکریاں کرنے کے خواب بنتی اور اپنے پاس پیسہ جمع کرنے کا شوق پالتے بڑی ہو گئی تھی۔

اب وہ مادر پدر آزاد معاشرہ اسے پوری طاقت کے ساتھ خود میں جذب ہو جانے کی دعوت دینے لگا تھا اور اسی معاشرے کا ایک فرد جان خود اس گھر میں رہتا تھا جس کی مالکن ممی تھیں۔ جان سے ممی نے شادی کی تھی یا ویسے ہی اس کے ساتھ رہ رہی تھیں یہ نادیہ کو کبھی پتا نہیں چل سکا تھا مگر جولیا' کوبی اور ماریہ بہرحال ممی اور جان کی اولادیں تھیں کیونکہ ان تینوں کے چہروں میں ممی اور جان دونوں کی مشابہت تھی۔

جولیا' کوبی اور ماریہ کو گھر میں جائز بچوں کا درجہ بھی شاید اسی لیے حاصل تھا' مگر نادیہ کی اس گھر میں کیا حیثیت تھی۔ یہ نادیہ کو کسی سے کوئی سوال کیے بغیر ہی علم تھا۔ ابھی وہ گھر سے باہر کی دنیا کے رویوں پر رد عمل ظاہر کرنے کی منصوبہ بندی کر رہی تھی کہ گھر کے اندر سے اس پر سیندھ لگنا شروع ہو گئی۔ جان نے تین بار اس سے دست درازی کی جو کوششیں کی تھیں' اس نے لفظ بہ لفظ ممی کے گوش گزار کر دی تھیں۔

"جب تک تم خود اپنے لیے نہیں کماؤ گی' اس وقت تک تمہارے ساتھ اندر' باہر یہ ہی ہوتا رہے گا"

ممی کے نزدیک اقتصادیات اور معاشیات کے سبق ازبر کر لینا سب سے اہم بات تھی۔ ان سب حالات اور رویوں کا ہی رد عمل تھا کہ نادیہ نے اس گھر اور ایک نام نہاد رشتے سے جان چھڑا لینے کا سوچا تھا۔ وہ انٹرنیٹ پر پڑھائی کے لیے کسی سستے مقام کی تلاش میں رہتی اور اسے اس چھوٹے سے ملک فن لینڈ میں پڑھائی اور رہائش کا خرچہ اپنی حیثیت اور مختلف جگہوں سے ملنے والے وظائف کے عین مطابق لگا۔ ایک جہنم سے نکل کر وہ زندگی کے دوسرے بھیانک چہرے سے نمٹنے کے لیے ہیلسنکی پہنچی' جہاں طویل اندھیرے اور برف کی قبر جیسے ماحول نے اس کا استقبال کیا تھا۔

گزشتہ کئی سالوں سے جو کٹھن زندگی وہ گزار رہی تھی' اس نے اسے حالات سے مقابلہ کرنے اور انہیں جیسے وہ تھے' کی حیثیت میں قبول کر لینے کا ہنر سکھا دیا تھا۔ ہیلسنکی میں زندگی سخت تھی' لیکن وہ ان بہت سی ذہنی اذیتوں سے دور چلی آئی تھی جن کا سامنا اسے آئے روز کرنا پڑتا تھا۔ ہیلسنکی میں آمد کے بعد جب وہ موسم اور حالات کی عادی ہوئی تو اس نے یکسوئی سے انٹرنیٹ کے ذریعے دنیا کی کھوج لگانا شروع کی۔ اس کی شدت سے یہ خواہش تھی کہ وہ اپنے بچپن میں جن لوگوں سے مانوس تھی' ان میں سے کوئی اسے کہیں مل جائے' پھر اس ایک کے ذریعے وہ باقیوں تک پہنچ سکتی تھی۔ اس کی لگن تھی یا اس کی نیک نیتی کہ اپنے اس کھوج کے نتیجے میں سب سے پہلے وہ سعد سلطان تک پہنچ گئی' جس تک پہنچنے کی آرزو نجانے کب سے اس کے دل میں تھی۔ اسے کئی دن تک یقین نہیں آیا تھا کہ وہ سعد تک پہنچ گئی اور سعد نے بھی اسے پہچان لیا تھا۔

"یہ تو معجزہ ہو جانے والی بات ہے۔"

وہ کئی بار خود سے کہتی۔ سعد سے ہونے والی کبھی کبھار کی گفتگو اس کے لیے زندگی کا سب سے پرکشش کام بن چکا تھا۔ کوئی تھا جسے کسی بھی تعلق' کسی بھی رشتے کی بنا پر وہ اپنا کہہ سکتی تھی۔ اس کے لیے اس سے بہترین احساس کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا اور وہ اسی میں بہت خوش تھی لیکن سعد کی وہ میل جس میں اسے لندن آ کر ملاقات کی دعوت دی گئی تھی' اس کے نزدیک اس صدی کا سب سے ناقابل یقین واقعہ تھا۔

وہ کئی دن تک اس دعوت نامے پر یقین کرنے اور بے یقین ہو جانے کی کیفیت میں ڈولتی رہی تھی لیکن جب اسے جہاز کے ریٹرن ٹکٹ' ہوٹل بکنگ کی کنفرمیشن اور اس کے سفر کے دیگر انتظامات کے متعلق میلز وصول ہوئیں تو اسے یقین آ گیا کہ انسان کی زندگی میں ایک سے زیادہ بار بھی معجزے ہو سکتے تھے۔ اسی دعوت نامے اور انہی سہولتوں کے نتیجے میں اس روز وہ لندن میں تھی۔

ایک فور اسٹار ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں بیٹھی وہ اس شخص کا انتظار کر رہی تھی جو رشتے میں اس کا سوتیلا بھائی تھا۔

☆ ☆ ☆

"ٹریڈ فیئر کے اختتام پر تمہیں واپس اسلام آباد آنا تھا' تم نے اپنا روٹ کیوں تبدیل کر لیا۔" اپنے کلائنٹس اور سعد کے ساتھ ایک ویڈیو کانفرنس کے بعد سب شرکاء کے اٹھ جانے پر بلال نے سعد سے کہا۔

"میرے سپرد کیا گیا ہر کام حیران کن انداز میں اچھے اور ٹھیک طریقے سے پایہ تکمیل تک پہنچ گیا اور آپ جانتے

ہیں کہ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔" سعد نے ان کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو؟" وہ قطعی متاثر ہونے کے موڈ میں نہیں تھے۔

"تو یہ کہ مجھے دو دن کا بریک چاہیے۔" اس نے بے نیازی سے کہا۔ "ہو سکتا ہے اس بریک کے دوران میں آپ کے کاروبار کے لیے مزید کارنامے سرانجام دے لوں۔"

"تمہارا اشارہ برائن اینڈ کمپنی کی طرف ہے۔" انہوں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں وہ بھی ہے' ایک دو مرغے اور بھی ہیں میری نظر میں' میں نے سوچا لگے ہاتھوں انہیں بھی پھنسا لوں۔"

"ہوں!" وہ سوچ میں پڑ گئے۔

"ڈیڈی! آپ کے پاس میری بات ماننے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ ہے ہی نہیں' آپ برائن اینڈ کمپنی کی اہمیت سے خوب واقف ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"چلو ٹھیک ہے' تم کوشش کرکے دیکھ لو۔" کاروباری مصلحت سعد کو زچ کرنے کی آرزو کے آڑے آگئی۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں ڈیڈی!" وہ ہاتھ میں پکڑا قلم دانتوں سے بجاتے ہوئے بولا۔ "وقت آپ کو بلیک میل نہیں کر سکتا' مگر دو جمع دو چار کرنے کی آرزو آپ کو خوب بلیک میل کر سکتی ہے۔"

"تم جانتے ہو کہ بہت گہرائی میں جا کر مجھے صرف اور صرف ایک چیز بلیک میل کر سکتی ہے تم ہر معلول میں اس بلیک میلنگ علت کو ڈھونڈ سکتے ہو اگر دماغ ساتھ دے تو۔" وہ چڑ کر بولے۔

"اور آپ کہتے ہیں علتیں پالنے کا کوئی پلان آپ کے چارٹ میں شامل نہیں ہے۔" وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر بولا۔

"تمہارے پاس اتنا فالتو وقت ہے کہ تم بات سے بات نکالتے جاؤ اور میرے پاس بھی اتنا وقت ہوتا ہے کہ تمہاری ہر بات کا معقول دلائل کے ساتھ جواب دوں' مگر اس وقت تم یاد کرو' تمہیں اس وفد کے ساتھ ڈنر کرنا ہے صاحبزادے! اگرچہ میں تمہارا اسیکرٹری نہیں ہوں جو تمہیں تمہاری اپائنٹمنٹس یاد کرواتا رہے' مگر کیونکہ یہ دن میرے لیے بہت اہم ہے اس لیے تمہیں یاد دلا رہا ہوں۔" وہ خالص کاروباری لہجے میں بولے۔

"اوہ! رائٹ باس۔۔۔ میں مشکور ہوں آپ نے مجھے اس ٹرپ کے کسی چوک سے بروقت بچا لیا۔"

وہ سر جھکاتے ہوئے بولا اور اگلے ہی لمحے وہ اسکرین سے غائب تھا۔ البتہ بلال اپنی جگہ بیٹھے کتنی ہی دیر اس کی گفتگو پر غور کرتے رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

اس نے فون پر نادیہ کو اپنی آمد سے مطلع کیا تھا۔ نادیہ کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور نادیہ کی اجازت ملنے پر دروازہ ہلکی سی کلک کے ساتھ کھل گیا۔

نادیہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ دراز قد تھا' اس کا جسم کسرتی اور اسمارٹ تھا' اس کے بال سیاہ تھے اور آنکھیں بھی' اس نے گرے پینٹ پر نیلا پل اوور پہن رکھا تھا۔ وہ ہو بہو ویسا تھا جیسا اس نے اپنے بچپن میں ڈیڈی کو دیکھا تھا۔ اس کے سامنے آنے پر نادیہ کو محسوس ہوا وہ اس شخصیت کے سامنے کھڑی تھی جس کے سینے سے لگنے کی خواہش نجانے کب سے اس کے دل میں تڑپ رہی تھی لیکن اگلے لمحے اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔ یہ وہ شخص نہیں اس کا بیٹا تھا اور اسے اپنے جذبات پر پورا قابو رکھنا چاہیے۔

"تم بڑی ہو گئیں اور تمہارے چہرے سے ایسا لگ رہا ہے جیسے تم خاصی ذمہ دار ہو چکی ہو۔" وہ اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے مسکرا کر بولا تھا۔

"اور تم صرف بڑے ہوئے ہو۔ تمہارا چہرہ بتا رہا ہے تم ابھی بھی ویسے ہی لاپروا اور غیر ذمہ دار ہو۔" نادیہ نے مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا' اس کے دل میں سعد کے لیے ڈھیروں پیار امڈ رہا تھا۔

"اچھا تو تم بھی چہرے پڑھنے کا فن جانتی ہو۔" وہ ہنسا اور بے تکلفی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"آؤ ہم دونوں مل کر صرف تمہاری باتیں کرتے ہیں۔" اس نے نادیہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔

نادیہ نے اس کے بہت اچھی طرح پالش کیے ہوئے جوتوں کی چمک پر غور کیا اور پھر اس کی نظریں اس کی پینٹ کی کریز سے اوپر اٹھتی اس کے چہرے تک چلی گئیں۔

اس کی ہر چیز کتنی پرفیکٹ ہے۔" اس نے سوچا اور جسے ایک صحت مند بھرپور زندگی اپنی تمام آسائشوں کے ساتھ میسر ہو تو اس کے ہر انداز میں پرفیکشن خود بخود ہی آجاتی ہے۔" پھر اس نے خود کو بتایا۔

اس کے وجود سے کسی قیمتی پرفیوم کی خوشبو آرہی تھی اور اس کی کلائی پر ایک بڑی مہنگی گھڑی سجی تھی۔ آئی فون کے نیو ورژن کا سیٹ اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا تھا۔

تم میں کیا کم تھا نادیہ بلال جو سعد سلطان میں زیادہ تھا۔ جو تم اس باپ کی بیٹی ہوتے ہوئے اس کی بیٹی قرار نہ پا سکیں۔" سعد کے ساتھ ڈھیر ساری باتیں کرتے ہوئے اس نے بارہا سوچا۔

وہ دن اور اس سے اگلا دن' اس کی ٹھہری ہوئی مخصوص روٹین والی زندگی میں آنے والے گنے چنے غیر معمولی دنوں میں سے ایک تھا۔ وہ عرصہ پہلے بھول چکی تھی کہ آسائشیں اور سر اٹھا کر دیکھی جانے والی چیزیں جب میسر ہوں تو کیسا لگتا ہے۔ لندن تک کا ہوائی سفر ایک طویل عرصے کے بعد آسائش کا مزا چکھنے کا پہلا قدم تھا۔

اس کے بعد اس ہوٹل میں قیام سے لے کر سعد کے ساتھ لندن کے معروف تفریحی مقامات پر گھومتے پھرتے پکاڈلی سرکس کے رنگ و روشنی سے بھرپور نظارے' ویسٹ اینڈ میں سینٹ مارٹنز تھیٹر میں برس ہا برس سے دکھایا جانے والا ماؤس ٹریپ' ہیرڈز اور سلفریجز سے شاپنگ' بہترین فوڈ اسپائس کے کھانے۔۔۔ نادیہ کو کسی اور ہی دنیا میں لے گئے۔

"دور سے سنہری نظر آنے والی چیزیں اتنی آسانی سے آپ کی دسترس میں بھی آسکتی ہیں۔" وہ ایک بے یقینی کی کیفیت میں سب کچھ دیکھتی اور محسوس کرتی رہی لیکن اس کا دل جانتا تھا کہ ایک مشقت بھری زندگی سے کچھ وقت کے لیے دور اس ٹرپ میں ہر چیز اور ہر بات سے زیادہ اہم سعد کے ساتھ گزارے لمحے تھے۔ اس کی محبت کا وہ اظہار تھا' جو وہ الفاظ سے نہیں اپنے عمل سے کر رہا تھا۔

نادیہ کی چھوٹی چھوٹی خواہشات اور خوشیوں کو وہ خود سے سمجھ رہا تھا اور خود بخود وہ سب کر رہا تھا' جو نادیہ کے دل میں تھا۔ اس نے نادیہ کو ضرورت کے کئی کپڑے' جوتے' سویٹر' جیکٹس' ٹائٹس اور مفلر خرید کر دیے۔ گرم بستر اور اوڑھنے کی گرم چیزوں کی خریداری کی۔ کھانے کی ٹن بند اشیا کے ڈھیر اور چھوٹی موٹی جیولری۔ اس کی نظر زیادہ تر ان چیزوں پر تھی جو نادیہ کے کام آسکتی تھیں اور اس کی زندگی میں آسانیاں لا سکتی تھیں۔

"تمہارے اکاؤنٹ میں' میں نے کچھ رقم ٹرانسفر کروائی ہے۔" دوسری رات ڈنر کے دوران اس نے نادیہ کو بتایا۔ "اور میں آنے والے وقت میں بھی وقتاً" فوقتاً" کچھ رقم تمہیں بھجواتا رہوں گا' اس وقت جو ٹریولرز چیک تمہارے پاس ہیں وہ اتنے ہیں کہ واپس جا کر بھی تمہیں ان سے کافی رقم مل سکتی ہے۔"

"مگر۔" نادیہ نے کچھ کہنا چاہا۔

"مجھے اپنی بات مکمل کر لینے دو۔" سعد نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کیا "جب تک تمہاری پڑھائی ختم نہیں ہو جاتی تمہاری ذمہ داری میری ہے۔ ہاں جب تم پڑھ لکھ کر اپنا کیریئر بنا لوگی پھر تم مجھے سپورٹ کیا کرنا۔" وہ مسکرایا۔

"لیکن تم اتنا سب کیسے مینیج کرو گے اور کیوں کرو گے؟" نادیہ نے بے چینی سے کہا۔

"یہ میں اسی رقم سے مینیج کروں گا جو میرے ساتھ ساتھ تمہارا بھی باپ کماتا ہے اور اتنا کماتا ہے کہ بعض اوقات اسے خود بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی کمائی کا مصرف کیا ہو سکتا ہے' سو کپڑے ادھیڑ ادھیڑ کر تننے کے بجائے بہتر ہے کہ رقم کا کچھ حصہ جائز جگہ اور جائز کام پر استعمال ہو۔" اس نے کہا۔

"ویسے بھی یہ رقم میرے ذاتی اکاؤنٹس سے تمہارے اکاؤنٹ میں منتقل ہوا کرے گی' انہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔ اور جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ میں ایسا کیوں کروں گا۔" اس نے کانٹا پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "تو اس کا جواب یہ ہے کہ میرے دل پر یہ بوجھ ہے کہ میں اکیلا تمہارا حق بھی کھا رہا ہوں۔ مجھے اپنے لیے میسر ہر چیز کو اپنے لیے جائز کرنے کی خواہش ہے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ پہلے اپنے ساتھ جائز حق داروں کو ان کا حق پہنچاؤں۔"

وہ سر جھٹک کر ہنسا۔ "سمجھو اس میں میرا اپنا بھی لالچ ہے۔"

"مگر میں ڈیڈی کو جانتی ہوں۔ وہ ضرورت پڑنے پر تمہیں اپنے پاس سے ایک پیسہ بھی نہیں دیں گے۔" نادیہ نے کہا۔

"نہ دیں۔" وہ بے نیازی سے بولا۔ "مجھے اپنے لیے چاہیے بھی کتنا۔ میری ضرورتیں اور دلچسپیاں بہت محدود ہیں۔ ان کے لیے مجھے بہت زیادہ رقم کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ویسے بھی ہر بزنس ڈیل میں ہمیں ڈیڈی کا پچاس فیصد کا شراکت دار ہوں۔ اس لیے مجھے کوئی کمی نہیں ہوتی۔ تم فکر مت کرو۔

اور بس باقی فکریں بھی بھول جاؤ۔" اس نے پیار سے نادیہ کے گال کو چھوتے ہوئے کہا "تم اب ایک صحت مند' نارمل زندگی گزارو۔ ڈٹ کر پڑھو' بے فکری سے رہو اور خوش باش نظر آیا کرو جو کہ تم ہنستے ہوئے بھی محسوس نہیں ہوتیں۔"

"حالات کی ایب نارملیٹیز انسان کو نارمل رہنے نہیں دیتیں۔" نادیہ نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

"میں جانتا ہوں اور سمجھتا بھی ہوں۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"نہیں' سنی سنائی باتوں کو جاننا اور سمجھنا اور بات ہے۔" نادیہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "حقیقت میں ان حالات سے گزرنا اور بات ہے۔"

"تمہیں پتا ہے کہ حالات کی ایب نارملیٹیز کا ایک شکار میں بھی ہوں۔" سعد نے نادیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ نادیہ نے استعجاب سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ یوں سر ہلا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو میری بات کا یقین کرلو۔

"میں بھی نارمل نہیں ہوں۔" پھر اس نے اٹھنے سے پہلے نادیہ کو بتایا۔ نادیہ نے دکھی ہوتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور بے اختیار اس کے سینے سے لگ گئی۔

"آئی لو یو سعد!" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"آئی لو یو ٹو مائی ڈیئر سسٹر!" اس نے نادیہ کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔

"زندگی کی سب سے بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ تم میرے بھائی ہو۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"اور زندگی کی سب سے زیادہ قابل فخر بات یہ ہے کہ تم میری بہن ہو۔" جواب میں سعد نے کہا تھا۔ "مشکل اور ناموافق ترین حالات میں سربلند رکھ کر جینے والی میری پیاری بہن! مجھے تم پر فخر ہے۔" اس نے نادیہ کو خود سے علیحدہ کرکے اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھے اور اس کا سر سہلایا تھا۔

"چلو اب تمہاری فلائٹ میں تھوڑا وقت باقی ہے۔" پھر اس نے نادیہ کو دونوں شانوں پر ہاتھوں سے دباؤ ڈال کر اسے ہمت باندھنے کا اذن دیتے ہوئے کہا۔

"اگلی بار جب ہم یہاں ملیں گے تو میرا وعدہ ہے میں تمہیں فینٹم آف اوپیرا بھی ضرور دکھاؤں گا۔ اس بار وقت کم تھا۔" اس نے اسے بچوں کی طرح بہلایا تھا۔ جواب میں نادیہ ایک زبردستی کی مسکراہٹ کے ساتھ مسکرائی تھی۔

"ایک بار پھر جدائی۔" اس رات واپس ہیلسنکی جاتے ہوئے نادیہ نے سوچا "اور اس بار نجانے کتنے ماہ و سال کے لیے۔"

✡ ✡ ✡

ماہ نور نے ایک سوشل ویب سائٹ پر اپنا اکاؤنٹ کھول رکھا تھا۔ سید پور میلے کے میوزک فیسٹول کے گانے سنتے ہوئے وہ اپنے لیے آنے والے نوٹیفکیشنز دیکھ رہی تھی۔ اسی دم اسے اس ویب سائٹ پر بنے مختلف کمپنیوں کے صفحات کے اشتہار نظر آئے۔ انہی اشتہارات میں ایک صفحہ اسلام آباد میں واقع "چیرپاکس ریسٹورنٹ" کا بھی تھا۔ ماہ نور نے وہ صفحہ کھول کر اس کی تفصیلات دیکھیں اور اسے اپنے پسندیدہ صفحات میں شامل کرلیا۔ اس صفحے پر ریسٹورنٹ کی تمام معلومات دی گئی تھیں اور اس سے رابطہ کرنے کے لیے فون نمبر بھی موجود تھے۔

ایک دم ماہ نور کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ اس نے سرعت سے قریب رکھا سیل فون اٹھایا اور اس صفحے پر دیے گئے ریسٹورنٹ کے نمبروں میں ایک نمبر ملانے لگی۔ تین' چار بار بیل جانے کے بعد دوسری طرف سے کال وصول کرلی گئی۔ ماہ نور نے ریسٹورنٹ کا نمبر ہونے کی تصدیق کرلینے کے بعد ریسٹورنٹ کے مالک ابراہیم سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

"آپ دوسرے نمبر پر کوشش کریں۔" جواب میں اسے یہ الفاظ سننے کو ملے۔ اس نے فون بند کرکے دوسرا نمبر ملایا۔ اس بار چوتھی بیل پر فون اٹینڈ کرلیا گیا۔

"مجھے چیرپاکس کے مالک ابراہیم صاحب سے بات کرنی ہے؟" ماہ نور نے تیزی سے کہا۔

"جی فرمائیے! میں بات کررہا ہوں۔" دوسری جانب سے کہا گیا۔ ماہ نور کو چند لمحوں تک اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"ابراہیم صاحب! آپ کے دوست سعد سلطان کہاں ہیں؟" مزید کوئی بات کیے بغیر اس نے وہ سوال کیا' جسے کرنے کے لیے وہ یہ کال کررہی تھی۔

"آپ کون؟" دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

"میں ماہ نور ہوں۔ آپ نے سعد کے ساتھ مجھے اپنے ریسٹورنٹ میں انوائٹ کیا تھا۔" اپنی آواز کی لڑکھڑاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے ابراہیم کو یاد دلایا۔

"اوہ.... اچھا۔" دوسری جانب سے پہچان لیے جانے پر اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ اس بہروپیے کی چالاکیوں سے پردہ اٹھتا تھا۔ "سعد تو ملک میں نہیں ہے' وہ ایک ٹریڈ فیئر کے سلسلے میں فرینکفرٹ گیا ہوا ہے۔ آپ کو اس نے....."

ابراہیم کی بات درمیان ہی میں کٹ گئی اور فون سے ٹوں ٹوں کی آواز آنا شروع ہوگئی مگر ماہ نور اس آواز کو نہیں سن رہی تھی۔ اس کا ذہن اور کان ایک ہی جملے پر اٹک گئے تھے۔ "سعد تو ملک میں نہیں ہے' وہ ایک ٹریڈ فیئر کے سلسلے میں فرینکفرٹ گیا ہوا ہے۔"

وہ یک ٹک سامنے کی دیوار کو دیکھے چلی جارہی تھی۔

☼ ☼ ☼

”عبدالرحیم ڈھاکہ گیا ہوا تھا' جب صاحب پچھلی بار یہاں آئے۔“ طفیل نے سعد کو بتایا۔

”اسی لیے وہ گھر کے بجائے ہوٹل میں ٹھہرے۔ یہاں انہیں عبدالرحیم کے بنائے ہوئے سی فوڈ کی کھینچ ہی تو لے آتی ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

طفیل اس گھر کا ہاؤس کیپر تھا جو ڈیڈی نے لندن میں خرید رکھا تھا۔ دو سال پہلے ان کو کاروبار کے سلسلے میں اکثر یہاں آنا پڑتا تھا' اسی لیے انہوں نے یہ گھر خریدا تھا۔ طفیل پاکستانی تھا جو کئی سال پہلے لندن آبسا تھا۔ طفیل کی شکل میں ڈیڈی کو بہترین ہاؤس کیپر مل گیا تھا۔

طفیل اور اس کی بیوی شاہدہ گھر کی دیکھ بھال کرتے تھے اور عبدالرحیم نے گھر کا بہت خوبی سے خیال رکھا ہوا تھا۔ اب ڈیڈی اور وہ خود کافی عرصے بعد ادھر آتے تھے اس لیے گھر کے دو تین کمرے بند ہی رہتے تھے۔

”ابھی کل ہی میں نے صاحب کے کمرے کی صفائی کروائی۔“

طفیل سعد سے کہہ رہا تھا جو لندن میں دو روز قیام کی آخری رات گزارنے یہاں آیا تھا۔

”ان کی کچھ فائلز یہاں رکھی ہیں' اب آپ آئے ہو تو ایک نظر دیکھ لو..... اگر اب وہ اتنی اہم نہیں رہیں تو ان کو ضائع کردیا جائے۔“ طفیل کی بیوی شاہدہ نے سعد سے کہا۔

سعد اپنے گھر میں کبھی ڈیڈی کے کمرے میں نہیں گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ شاہدہ کی بات مان کر ان کے کمرے میں جاکر وہ فائلز دیکھے یا وہیں منگوا کر انہیں دیکھ لے۔

”اور سال پیچھے جو پھوٹو (فوٹو) صاحب نے ریجنٹ اسٹریٹ سے بنوایا تھا' وہ ام (ہم) نے بڑا کروا کر کے صاب کے کمرے میں لگوایا ہے وہ بھی دیکھ لیں۔“ عبدالرحیم نے مسکراتے ہوئے کہا تو اسے ناچار ڈیڈی کے کمرے میں آنا پڑا۔ کمرے کا فرنیچر سادہ مگر قیمتی تھا۔ بائیں دیوار پر وہ تصویر فریم میں سجی تھی جو عبدالرحیم اس دکھانا چاہ رہا تھا۔

اس نے سرسری نظر تصویر پر ڈالی اور طفیل کی بتائی فائلز دیکھنے لگا۔

”طفیل بھائی! یہ سب ہی تقریباً ”غیر اہم ہیں' ان کو بے شک ضائع کروا دیجیے۔“ وہ وہیں کھڑا کھڑا ایک کے بعد ایک فائل دیکھتے ہوئے بولا۔

”کوئی بھی نہیں چاہیے۔“ اس نے سر اٹھا کر طفیل کی طرف دیکھا اور فائلز ٹیبل پر رکھ دیں۔

اسی دوران اس کی نظر انہی فائلز کے نیچے رکھے ایک فولڈر پر پڑی۔ یہ فولڈر باقی فائلز سے شکل میں مختلف تھا۔ اس نے بے دھیانی سے فولڈر کا کور کھولا اور بری طرح چونک گیا۔ فولڈر کے اندر موجود ایک چھوٹے فولڈر پر سنہری حروف میں الفاظ درج تھے۔

My Portfolio

From

Filza Zahoor

(میرا فنکارانہ کام..... فلزا ظہور)

سعد نے وہ فولڈر اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بدر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور نے "سید پور کلچرل شو" میں شرکت کے لیے اپنی دوست شاہ بانو کے ساتھ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ شاہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

بانو نے اپنے بھائی کی معرفت سید پور میں ماہ نور کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا۔ فاطمہ اور خدیجہ نے ماہ نور کو اسلام آباد میں فلزا ظہور سے ملنے کی تاکید کی۔ فلزا ظہور ان کے بچپن کی ساتھی ہے۔ بچپن میں کوئلے سے فرش اور دیواروں پر تصویریں بنانے والی فلزا ظہور اب ایک بڑی آرٹسٹ ہے مگر اسے شہرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔

مولوی سراج اور آپا رابعہ قصبے میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی سعدیہ کلثوم نویں جماعت کی طالبہ بے حد ذہین ہے۔ مولوی سراج اور آپا رابعہ کو اس بات پر فخر ہے کہ ان کی بیٹی سائنس پڑھ رہی ہے۔

ایک رات سارہ نے رکی کو خواب میں دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ سرکس میں کام کرتا تھا۔ رکی اپنے فن کا ماہر جوکر تھا۔ ماہ نور اور شاہ بانو "سید پور کلچرل شو" میں گئیں تو وہاں انہیں ایک کمہار نظر آیا۔ وہ گیلی مٹی کو بہت مہارت سے دیدہ زیب برتنوں کی شکل میں ڈھال رہا تھا۔ ماہ نور کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہ چونک گئی۔ اسے اس پر اسی شخص کا گمان ہوا' جو اسے ہر میلے میں مختلف روپ میں نظر آتا رہا تھا۔

سارہ' ماہ نور سے مل کر خوش نہیں ہوئی۔ اس کا رویہ بہت روکھا اور خشک تھا۔

واپسی پر گاڑی میں ماہ نور نے سعد سے اعتراف کیا کہ وہ اب تک جتنا سعد کو جان پائی ہے' سعد اس کی نظر میں ایک قابل رشک انسان ہے' سعد نے اسے سارہ کے متعلق بتایا وہ سرکس دیکھنے گیا تھا۔ سارہ خان بلندی سے نیچے گری تھی۔ اس نے اس کی ہڈیاں ٹوٹتے اور خون بکھرتے دیکھا تھا' وہ وہاں سے واپس آگیا لیکن سارہ خان کے لیے بے چین رہا۔ وہ دوبارہ اسے ڈھونڈتے ہوئے اس سے ملنے پہنچا تو وہ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور زخم زخم جسم کے ساتھ ایک چھولداری میں پڑی موت کی منتظر تھی۔ اس کے زخموں پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں۔ سعد اس کو وہاں سے لایا اور اس کا علاج کرایا اور پھر اسے فلیٹ میں منتقل کیا۔

کھاری نے آپا رابعہ سے نماز یاد کرلی تھی اور بہت خوش تھا۔ سارہ خان نے پہلی بار سوچا سعد سے اس کا تعلق صرف ترس اور ہمدردی کا ہے اسے اپنا ماضی یاد آرہا تھا۔ جہاں جاپانی نقش و نگار والا رکی تھا۔ جس کی جاپانی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اس کا باپ اس کے بہن بھائیوں کے ساتھ پھوپھی کے حوالے کر گیا تھا۔ باپ نے دوسری شادی کرلی تو سوتیلی ماں کے مظالم سے تنگ آکر وہ گھر سے بھاگ گیا اور قسمت اسے سرکس میں لے آئی۔

آپا رابعہ نے مولوی سراج کو بتایا کہ اسکول والوں نے سعدیہ کی پیدائش کی پرچی مانگی ہے تو وہ پریشان ہوگئے۔

ماہ نور' سارہ سے ملنے آئی اور اس نے سارہ کو بتایا کہ اس کی سعد سے صرف چند دن پہلے ملاقات ہوئی ہے۔ یہ سن کر سارہ کا رویہ اس کے ساتھ بدل گیا۔

سعد نے اپنی بہن نادیہ سے اسکائپ پر بات کی۔ وہ فن لینڈ میں بہت مشقت بھری زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کی ماں کا شوہر اس پر بری نظر رکھ رہا تھا۔ اس لیے وہ فن لینڈ آگئی۔

جیناں بھکارن نے ایک بچہ اغوا کیا لیکن پولیس نے اس سے بچہ برآمد کرلیا۔

ماہ نور کی سعد سے ملاقات ہوئی تو وہ اسے اختر کے پاس لے گیا۔ اختر نے ماہ نور کو دیکھ کر سعد سے کہا "یا تو زن یا من پالو" ایک کی قربانی دینی پڑے گی۔

اس نے ماہ نور سے کہا بی بی آپ کا دل بہت صاف ہے اور زندگی بہت پرسکون ہے لیکن آگے آپ کے لیے بہت مشکلیں ہیں۔

فلزا ظہور' سعد کو فون پر کسی تصویری نمائش کی دعوت دیتی ہیں۔ سعد اپنے فرینکفرٹ کے دورے کی وجہ سے معذرت کر لیتا ہے۔ ماہ نور' فاطمہ اور خدیجہ کو فلزا ظہور سے ملاقات کے بارے میں بتاتی ہے۔ فاطمہ ماہ نور سے سعد سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کرتی ہے۔ وہ بے دلی سے ہامی بھرتی ہے کیونکہ سید پور سے آنے کے بعد سے سعد کا فون مسلسل بند مل رہا تھا جبکہ سارہ خان کو اس نے اپنے جرمنی جانے کی اطلاع دے دی تھی۔

نویں قسط

"تمہیں نہیں لگتا کہ پچھلے کچھ سالوں کے دوران تم خاصی ڈل زندگی گزار رہے ہو' کیا تمہیں بوریت محسوس نہیں ہوتی؟" کسی دوست کی کہی یہ بات بلال سلطان کو اس رات سونے سے پہلے یاد آئی تھی۔ وہ سارا دن بہت مصروف گزرا تھا۔ اس صبح ہی کو وہ دو بزنس میٹنگز کے لیے کراچی پہنچے تھے۔ بزنس میٹنگز گویا زندگی کے معمولات کا حصہ بن گئی تھیں اور اب تو کسی بھی ایسی میٹنگ میں شریک ہونے سے پہلے ہی انہیں اس کے منٹس (چھوٹے مگر اہم نکات) کا علم ہوتا تھا۔ جن وفود اور افراد سے ان کی ملاقات ہونے والی ہوتی تھی۔ ان کے بارے میں ان کا سیکریٹری انہیں کوئی بریفنگ نہ بھی دیتا تو بھی انہیں معلوم ہوتا تھا کہ متوقع ملاقاتیوں کے مزاج' تیکنیکی خوبیاں اور خامیاں کیا ہوسکتی تھیں۔ ایسی میٹنگز میں اب ان کا کوئی ایک لمحہ بھی ضائع ہونے نہ پاتا تھا۔

انہوں نے دن بھر کی مصروفیت کو یاد کیا اور اپنے دوست کی بات یاد آجانے پر خود اپنے آپ سے ایک سوال کیا۔

"کیا تمہیں اپنی زندگی ڈل لگتی ہے بلال سلطان! اور تمہیں بوریت محسوس ہوتی ہے؟"

"میں نے کبھی خود کو اتنا فارغ رہنے ہی نہیں دیا کہ بور' بورنگ اور بوریت جیسے احساسات سے میرا سامنا ہو پائے۔" انہوں نے خود کو ایک ایسا جواب دیا' جس کے بارے میں انہیں کوئی مغالطہ نہیں تھا۔

"لیکن کیا یہ ایک فطری زندگی ہے' کیا اس میں بہت کچھ ایسا نہیں ہے' جو غیر فطری سا لگتا ہے؟" ایک اور سوال ذہن میں آیا۔

"ہوں۔" انہوں نے اپنے ذہن کو اپنے دل میں اس سوال پر داد دی۔

"میری زندگی میں یقیناً "ایک شدید قسم کی کمی ہے۔" وہ زیر لب مسکرائے۔ "میری جیبیں' میرے اکاؤنٹس اور میرا دماغ' اپنی ضروریات پوری کرنے کی خاطر خالی کردینے والی ایک گھر والی کی کمی۔"

"ہاہاہا۔" اپنے اس خیال پر انہوں نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

"بیش قیمت ملبوسات' ہیرے جواہرات' سونا اور پلاٹینم' برانڈڈ جوتے' پرفیومز اور بیگز' قیمتی میک اپ' ہوم ڈیکور کو سیزن کے سیزن بدلنے والی' بیوٹی سیلونز اور جمز میں جاکر اپنے فگر اور شکل کو نئے نئے روپ دے کر خود اپنے دل کی تسلی کرنے والی ایک خاتون جو مجھے اپنی انگلی کے اشارے پر چلانے کی صلاحیت رکھتی ہو۔"

انہیں اپنے بہت سے دوستوں کی گھر والیاں یاد آگئیں' جو اپنے تئیں' اپنے شوہروں کی زندگیوں میں بہت اہم حیثیت رکھتی تھیں اور جن کے شوہر انہیں اپنی زندگیوں کے بہت سے شعبوں میں مسز کے طور پر متعارف کروانے اور استعمال کرنے کے باوجود اپنی تنہائیوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے خود اپنے بنائے چور دروازوں سے کسی اور چاردیواری میں داخل ہوکر ڈل اور بور زندگی کی خلش مٹانے کا سامان کیا کرتے تھے۔

وہ خود بہت سی ایسی محفلوں میں شریک ہوتے رہتے تھے' جہاں ان کے حلقہ احباب کے لوگ بغلوں میں ایسے چہرے دبائے موجود ہوتے' جو ان کے گھروں میں موجود بیگم صاحباؤں سے مختلف ہوتے۔ کبھی وہ چہرے گرل فرینڈز کے' کبھی ون نائٹ اسٹینڈرڈ (ایک رات کی ساتھی) کبھی فل ٹائم مسٹریسز (ہمہ وقت داشتاؤں) اور کبھی پرسنل سیکریٹریز کے ہوتے تھے۔ وہ انسانوں کی ان دوغلی زندگیوں کو دیکھنے اور ایک نظر میں یہ جانچ لینے کے بھی عادی ہوچکے تھے کہ ان کے کسی دوست کے بازو کے گھیرے میں موجود حسینہ کا اس کی زندگی میں کیا اسٹیٹس (مقام) ہوسکتا تھا اور اس حسینہ کا متوقع ساتھ کتنے لمحوں' گھنٹوں' دنوں' مہینوں یا سالوں پر مشتمل ہونے کی توقع کی جاسکتی تھی۔

"کیا میں بہت شاطر ہوں جو جان جاتا ہوں؟" انہوں نے خود سے ایک اور سوال کیا۔

"ہوسکتا ہے۔" ان کے دل نے جواب دیا۔ "کیونکہ ایسے مناظر اب تک تو ازبر ہوچکے ہیں۔"

"مگر وہ گھر سے رخصتی کے وقت محبت سے کوٹ پہنانے والی' ناشتے کھانے کا خیال رکھنے والی' شوگر' بلڈ پریشر چیک رکھنے والی' گھر کے ملازموں پر نظر رکھنے والی' گھر میں موجود سامان کا حساب رکھنے والی' کہاں کچھ کم ہوا' کیا ٹوٹا'

کیا غائب ہوا‘ کیا مرمت طلب ہے اور کس کو بدل لینا چاہیے‘ لانڈری میں کتنے کپڑے گئے تھے‘ کتنے واپس آئے‘ کچن بجٹ میں کیا اتار چڑھاؤ آرہا ہے‘ صاحب کس ملک جارہے ہیں‘ اس ملک کے موسم کے حساب سے ان کا سفری بیگ کیسے تیار کرنا ہے‘ بیڈ روم کا ڈیکور کیسا ہونا چاہیے‘ ایسا جہاں داخل ہوکر صاحب باہر کے مسائل بھول جائیں اور ان کے دل میں ایک سکون سا اتر جائے۔ وہ عورت کہاں ہے۔"

انہوں نے اس فائیو اسٹار ہوٹل میں اپنے لیے مخصوص کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے سوچا۔ باہر اندھیرے میں روشنیوں کی جگمگاہٹ تھی اور سڑکوں پر زندگی رواں دواں تھی۔

"اسے ہم اپنے سے نیچے والے درجے میں چھوڑ آئے شاید۔" ان کے دل نے جواب دیا۔

"مڈل کلاس میں؟" ذہن نے سوال کیا۔

"شاید وہ عورت اب مڈل کلاس میں بھی نہ موجود ہو۔" دل نے جواب دیا۔ "مڈل کلاس کی عورت اب اور‘ اور‘ اور زیادہ پڑھنے لکھنے میں مشغول ہے۔ بڑی بڑی یونیورسٹیوں سے اونچی اونچی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے جیسی ڈگری کے حامل مڈل کلاس مرد سے شادی کرلیتی ہے اور پھر اس کے شانہ بشانہ چلتے ہوئے گھر‘ شوہر اور بچے کی خاطر کمائیاں کرنے نکل جاتی ہے۔ اسے اپنی ڈگریز کو استعمال میں لانا ہے۔ اتنی محنت سے حاصل کی گئی ڈگریاں‘ اتنا پیسہ لگا کر حاصل کی گئی ڈگریاں‘ بیس لاکھ‘ تیس‘ چالیس لاکھ لگا کر حاصل کی گئی ڈگری کو کیش بھی تو کرانا ہے۔ لاکھوں کے بدلے کروڑوں بھی تو کمانے ہیں اور پھر زندگی میں تعیشات کا داخلہ بھی فری ہوگیا ہے۔ بڑے بڑے ٹاؤنز اور ہاؤسنگ اسکیمز میں ملنے والے پلاٹ اور بنگلے اپنی چھب دکھلاتے ہیں۔ ڈاؤن پے منٹ کے بعد قسطیں بھی ادا کرنی ہے۔ گھر میں ڈیزائنر فرنیچر ڈالنا ہے‘ کچن اپیرینس کی رینج اتنی وسیع ہے اس کا کھاتہ بھی پورا کرنا ہے۔ بیڈ شیٹس‘ بیڈ کورز‘ میٹس اور رنرز‘ دیواروں کے پینٹ اور فرش کے ٹائلز سے میچ کرنی ہیں اور ڈیکوریشن پیسز ان کے بغیر تو گھر کی سجاوٹ ہی ناممکن ہے۔"

اپنی اور شوہر کی تنخواہ کے زعم میں قسطوں پر ملنے والی تیرہ سو سی سی گاڑی بھی بک کروانی ہے۔ قسطیں‘ قسطیں‘ قسطیں‘ کیلکولیٹر پر مہینے بھر کے اخراجات کا حساب کرتے انگلیاں تھکاتی عورت‘ جسے کیریر ویمن ہونے کی وجہ سے اپنے لباس اور جوتوں‘ بیگز‘ دھوپ کے چشموں اور میک اپ کی مد میں بھی خرچ کرنا ہے اور بچوں کو بھی انٹر نیشنل چین اسکولز میں پڑھانا ہے۔ مہینے کی فیس کے علاوہ جہاں سے کلرڈے‘ گیٹ ٹوگیدرز‘ ون ڈش اور اسٹڈی ٹرپس کی مد میں بھی اخراجات کے لیے چٹھیاں آتی ہی رہتی ہیں۔

اور اس سب کا نتیجہ تھکی تھکائی مڈل کلاس عورت ہائی کلاس اور اپنے درمیان کا خلا عبور کرنے کے لیے ہائی جمپس لگا لگا کر اپنا ہاتھ ہائی کلاس کے بیریر پر جمانے کی کوششیں کرنے کے بعد جب تھکی ہاری گھر پہنچتی ہے تو کہاں کا کچن اور کیسے گرما گرم تازہ کھانے‘ فریزر میں رکھے منجمد کھانوں کے ڈبے نکال کر مائیکرو ویو اوون میں رکھ کر گرم کرتی ہے۔ اگر ماسی میسر ہے تو چپاتیاں ڈلوائیں‘ ورنہ کبھی مارے باندھے خود چپاتیاں ڈالیں۔ کبھی شوہر سے کہہ کر روٹیاں یا نان منگوا کر کھانا‘ ڈائننگ ٹیبل پر پہنچتی‘ بچوں کی ہوم ورک ڈائری دیکھ کر الرٹ ہوتی‘ ان کو ہوم ورک کراتے کبھی اونگھتی‘ کبھی آنے والی کل کی تیاری کے لیے چونکتی بے چاری عورت۔

اسے کہاں یاد رہتا ہے کہ صبح خود اپنی اور بچوں کی تیاری میں شوہر کو کوٹ بھی پہنانا ہے‘ اس کے جوتے بھی پالش کرنے ہیں‘ اس کو محبت بھری مسکراہٹ کے ساتھ رخصت کرتے ہوئے "آج جلدی گھر آئیے گا۔" جیسا جملہ بھی بولنا ہے۔ اس کے حواسوں سے "بریڈ ہے یا نہیں‘ جیم تو ختم نہیں ہوگیا‘ فریج میں کتنے انڈے باقی ہیں اور پیاز لال تھی‘ دودھ والے کا بل‘ کسی بچے کی نوٹ بک‘ موبائل فون کا کریڈٹ" جیسے مسائل ہٹیں تو بے چارے شوہر کا خیال بھی ذہن میں در آئے۔

"اوہ!" بلال سلطان نے جھرجھری سی لی اور کمرے میں ٹہلتے ہوئے سامنے کی دیوار پر سجی پینٹنگ کے قریب رک کر اسے غور سے دیکھنے لگے۔

"طبقہ سوم کی عورت۔" پینٹنگ میں خوب صورت رنگوں کے امتزاج سے ایک علامتی ہیولہ سا بنا تھا۔ اسے سمجھنے کے لیے ذہن پر زور دینے کے تردد سے بچتے ہوئے انہوں نے اپنی سوچ کا دائرہ ایک اور سمت مرکوز کردیا۔

جو اگر گھر پہ ہے تو کسی دکان دار‘ کلرک‘ چپڑاسی‘ دیہاڑی دار مزدور‘ مستری‘ مکینک‘ ترکھان یا دودھ دہی والے کی بیوی ہونے کے باوجود چھوٹی چھوٹی بچتوں اور بڑے بڑے سلیقوں سے گھر کا نظام توازن میں رکھ سکتی ہے‘ مگر آج کے دور میں وہ بھی کیا کرے۔ اس کی زندگی میں موبائل فون اور ٹی وی داخل ہوگئے ہیں۔ شوہر کو کام پر اور بچوں کو اسکول بھیج کر اسے باری باری سب رشتہ داروں کی خیر خیریت موبائل فون کے ذریعہ دریافت کرنی ہے۔ کس کے گھر میں کس بات پر جھگڑا ہوا‘ کس گھر کے مرد نے باہر سے روپے بھیجے‘ کس کی کمیٹی نکلی‘ کون بیمار ہوا‘ کون شادی پر گیا‘ کس نے کیا پکایا۔

مہنگائی کا رونا تو بہت ضروری ہے‘ پھر بھی اس نے ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپے میں ملنے والے کئی ڈیکوریشن پیسز خرید لیے ہیں۔ منے کے ابا سے نظر بچا کر لان یا کاٹن کا نیا جوڑا بھی خرید لیا ہے۔ لیسوں اور فیتوں کی دکان پر دو گھنٹے لگا کر پانچ سو روپے میٹر میں بکنے والی لیس ڈھائی سو میں خریدنے کا کارنامہ بھی سرانجام دے لیا ہے۔ آمدنی کم ہے تو کیا ہوا۔ بچے بہترین انگریزی اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ آخر عمر بھر کی کمائی بچے ہی تو ہوں گے۔ ان ہی کے لیے تو منے کے ابا دن بھر کھپائی کرتے ہیں۔ دو ڈھائی گھنٹے خیر خیریت دریافت کرنے میں گزارنے کے بعد اسے گھر سمیٹنے اور بکھرے برتن دھونے کا خیال آتا ہے۔ اگر وہ ساس سسر‘ دیور‘ نندوں کے ساتھ رہتی ہے تو پھر تو بڑبڑاہٹ اس کا حق ہے۔ ایک اس کی جان ہے اور ہزاروں جھنجھٹ ہیں۔

رات بھی وہ دو ڈرامے مس کرگئی تھی۔ اب دوبارہ ٹیلی کاسٹ ہوں گے۔ اس سے پہلے اسے باقی کام نپٹانے ہیں۔ مارننگ شوز تو چھوڑے جا ہی نہیں سکتے۔ وہاں آنے والی لڑکیوں کے لباس دیکھ کر ہی تو اپنے کپڑے ڈیزائن کرنے ہیں۔ مارے باندھے‘ الٹے سیدھے کام ختم کیے۔ دو تین ڈرامے دیکھنے کے بعد اب اسے ٹوکری اٹھا کر سودا سلف لانا ہے۔ برقعے میں خود کو پھنسا کر وہ ٹوکری لیے مارکیٹ کا رخ کرتی ہے۔ موبائل فون۔ ہاں! اس کے بغیر وہ کیسے باہر جاسکتی ہے۔ گھر میں پیچھے سے کسی کو اس سے کام پڑ گیا تو۔ وہ فون کان سے لگائے خراماں خراماں خریداری کرنے جاتی ہے۔ مول تول بھاؤ تاؤ‘ کتنا ہی وقت تو یوں ضائع ہوتا ہے۔

گھر واپسی تک دوپہر چڑھ گئی۔ کھانا بناتے تک بچے اسکول سے واپس آئے‘ انہیں کھانا کھلا کر ٹیوشن والی ٹیچر کے گھر چھوڑنا ہے اور ان کے یونیفارم دھونے ہیں‘ انگریزی اسکول والے یونیفارم میلا ہونے پر بچوں کو جرمانہ کردیتے ہیں۔ اس کے بچے انگریزی قاعدے پڑھ رہے ہیں۔ مولوی صاحب کا کیا ہے۔ ڈنڈے برسا کر کبھی نہ کبھی تو قرآن پاک پڑھا ہی دیں گے وہاں فیل پاس کا مسئلہ نہیں‘ مگر انگریزی اسکول والے وہ تو کم نمبروں والے بچوں کو اچھا ہی نہیں سمجھتے جب ہی تو منے کے اسکول کی ٹیچر کہتی ہے ٹیوشن بھی مجھ ہی سے پڑھائیں‘ ورنہ بچہ پاس نہیں ہوگا۔ مجبوراً "اسکول کی فیس کے ساتھ ساتھ ٹیوشن کے پیسے بھی ادا کرنے پڑتے ہیں۔

اوپر سے گھر کا کرایہ‘ بجلی‘ پانی‘ گیس کے بل۔۔۔ لگتا ہے دوسرے دن مہینہ ختم ہوجاتا ہے۔ منے کے ابا کو ڈبل کام کرنا چاہیے‘ سرکاری ملازم ہے تو خوب رشوت لے‘ اللہ کو بھی پتا ہے کتنی مہنگائی ہے تنخواہوں میں کہاں گزارا ہوتا ہے۔ دکان دار ہے تو ناپ تول کے فرق سے کما کر لائے۔ گھر کی عورت کو گھر چلانا ہے‘ جو کوئی مذاق نہیں۔ ایک وہی تو ہے جو اتنے جنجالوں سے اتنے کم پیسوں میں نپٹتی ہے۔ منے کے ابا‘ اس کی سلیقہ شعاری سے مرعوب‘ باسی روٹی ٹھنڈے سالن کے ساتھ کھا کر شکر کرتے ہوئے کام پر روانہ‘ کہاں کا استری شدہ لباس اور کیسے

محبت بھرے الوداعی الفاظ۔ غنیمت ہے کہ زندگی کا نظام چل رہا ہے۔

"کیا میں اتنا قنوطی ہو چکا ہوں کہ مجھے وہ آئیڈیل عورت کسی بھی طبقے میں نظر نہیں آرہی؟" انہوں نے کمرے میں کچھ دیر ٹہلنے کے بعد صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ تو وہ نقشے ہیں جو میں نے تینوں درجوں میں موجود ایک ایوریج عورت کو دیکھ کر باندھے ہیں' ایکسپشنز (exceptions) بھی تو ہوتی ہیں۔"

"ہاں! ہوتی ہیں۔" پھر ان کے ذہن میں بہت سی منفی شبیہوں نے ڈیرا جمایا۔ "چور دروازے صرف مرد ہی تو نہیں کھولتے۔ ان تینوں درجوں میں موجود عورتیں بھی تو کھولتی ہیں۔ مزید' مزید' مزید کی خواہش کے چنگل میں گرفتار عورتیں۔" ان کی نظروں کے سامنے کئی مناظر اور کئی چہرے گھوم گئے۔ "نہیں! مجھے ان کے بارے میں نہیں سوچنا۔" انہوں نے اپنے ذہن سے ان شبیہوں کو جھٹکا۔

"بس! ٹھیک ہے۔" انہوں نے کپڑے بدلنے کے ارادے سے اٹھتے ہوئے دل میں کہا۔ "میرے لیے میری دن بھر کی مصروفیات' ہوانا سگار' ہیلتھ کانشس ڈائٹ' فرصت کے لمحوں کی سوئمنگ' صبح کی سیر اور جاگنگ' ہوائی سفر اور ان سفروں کے دوران ملنے والے نئے نئے لوگ' سال بھر میں ایک آدھ بار اپنے دوستوں کے ساتھ شکار پر جانا اور بزنس ٹرپس کے دوران ملنے والا وی آئی پی اسٹیٹس ہی کافی ہے۔ میرے گھر کو دیکھنے والے ہاؤس کیپرز' مینجرز اور ان کا عملہ مخلص' مستعد اور ایمان دار ہے۔ کیونکہ میں شاید ان کی خود سے وفاداری کا معاوضہ ادا کرنے کے لیے ہی تو کمائے پر کمائے چلا جا رہا ہوں۔" وہ ہلکا سا مسکرائے اور شاور لینے کے لیے باتھ روم کی طرف چل دیے۔

"میں تو خیر اس روٹین کا عادی ہو چکا اور اس میں سیٹ اور مطمئن بھی ہوں' مگر سعد۔۔۔" سونے کے لیے لیٹنے کے بعد انہیں یاد آیا۔ "سعد کی تو زندگی پڑی ہے۔ کبھی میں نے غور ہی نہیں کیا کہ اسے اپنی زندگی کے لیے کسی ساتھی کی ضرورت ہے اور وہ اس کا انتخاب کب کرے گا؟" انہوں نے سوچا۔

"یہ جو گوناگوں مصروفیات کا احوال اس کے بارے میں مجھے سننے کو ملتا ہے' اس میں کئی قسم کی لڑکیوں کا تذکرہ بھی تو موجود ہوتا ہے۔" پھر انہیں یاد آیا۔ "جیوفری بتا رہا تھا' پیر اور منگل کے دو دن اس نے لندن میں کسی لڑکی ہی کے ساتھ گزارے ہیں۔ بظاہر ایسا دکھتا تو نہیں' مگر جیوفری کو دھوکا نہیں ہو سکتا۔"

وہ زیر لب مسکرائے۔

"واہ میاں۔۔۔ تمہیں پکڑنے کی طاقت بھی رکھتا ہوں' مگر پکڑنے کو جی نہیں چاہتا' سو کیے جاؤ عیاشیاں۔"

انہوں نے تصور میں سعد کا چہرہ لاتے ہوئے سوچا اور آنکھیں موند لیں۔ ان کو دن بھر کی تھکان کے بعد کسی مسکن دوائی کے بغیر اچھی نیند آجاتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"وہ تو ملک میں نہیں ہے' فرینکفرٹ گیا ہوا ہے۔"

یہ ایک ایسا جملہ تھا جو ماہ نور کے دماغ میں بیٹھ گیا تھا اور دن بھر کی مصروفیات کے دوران بھی ٹھک ٹھک اس کے ذہن میں بجتا رہتا تھا۔ کئی بار وہ اس جملے کو بے معنی' غیر اہم جان کر "ہیل ود" کہتے ہوئے ذہن سے جھٹک کر خود کو کسی اور کام میں مصروف کر لیتی۔ مگر اس کے ہاتھ اس کام میں مصروف ہوتے اور ذہن جیسے دوبارہ اس جملے کی گونج کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ اس نے اپنا موبائل فون بیگ سے نکالا۔ وہ کالج لائبریری کی سیڑھیوں پر اکیلی بیٹھی تھی۔ اس کے ان باکس میں کئی پرانے پیغامات محفوظ تھے۔ اس نے چند پیغامات کھول کر پڑھے۔

"ماہ نور! میرے سر میں شدید درد ہے۔ میں آخری کلاس لینے سے پہلے ہی گھر جا رہی ہوں۔۔۔ شاہ بانو" اس نے پہلا میسج پڑھا۔

"میں ایک گھنٹے بعد ملتان کے لیے نکل رہا ہوں۔۔۔ اجلال۔" دوسرا پیغام اس لڑکے کا تھا جس کے ساتھ وہ کئی کیمپنز بنا چکی تھی۔

"ماہ نور! میں آج تمہیں لینے نہیں آسکوں گا۔ باس نے بلا لیا ہے' معذرت خواہ ہوں۔" سلمان کا پیغام۔

"ہیلو ماہی! شائستہ ہیر۔ مجھے آج تمہارے گھر آنا تھا' مگر نمرہ نے ڈنر پر بلا لیا۔ بہت معذرت خواہ ہوں۔" اس کی قریبی دوست شائستہ کا پیغام۔

"ماہ نور۔۔۔ میں ایک ہفتے کے لیے ملائشیا جا رہا ہوں' کچھ چاہیے ہو تو بتانا۔" عظمیٰ پھوپھو کے بیٹے وقار کا پیغام۔

"ماہی! آج سنڈیکیٹ کی میٹنگ ہے۔ تم وقت پر گھر واپس پہنچ جاؤ تو کھانا کھا لینا۔ میں تمہارے لیے سموکی چکن کے ٹکڑے' گرلڈ آلوؤں کے قتلوں کے ساتھ بنا کر آئی تھی۔" ممی کا پیغام۔

اس نے یہ پانچ پیغام دو' تین بار پڑھے۔ بھیجنے والوں کے نام اس کے موبائل فون کے تعلقات کی لسٹ میں اہم ترین ناموں میں شامل تھے۔ اہم ترین اور قریب ترین دوست جو اگر کسی وجہ سے رابطہ نہ کر سکیں' کہیں جانے آنے کی اطلاع دینا چاہتے ہوں' مقررہ وقت پر آنہ سکیں تو اس جدید ترین ذریعہ مواصلات کے ذریعہ اپنا مدعا اسے ضرور پہنچاتے تھے۔ پھر ان ہی اہم ترین رابطہ نمبرز میں سے اس نمبر سے' جو نہ جانے کیوں وہ دن میں کئی مرتبہ کال کرنے کے لیے ملاتی تھی۔ اسے یہ پیغام کیوں نہیں آیا تھا کہ اس نمبر کا مالک کسی کام سے ملک سے باہر جا رہا تھا۔ یقیناً" وہ اس کے لیے اتنی غیر اہم تھی کہ اس نے اخلاقاً" اور مروتاً" اسے ایک بار پیغام یا کال کے ذریعے اتنا بھی نہیں پوچھا تھا کہ کیا وہ خیریت سے واپس گھر پہنچ چکی تھی۔ چلو! یہ نہ سہی' وہ اسے یہ تو بتا سکتا تھا کہ وہ کہیں جا رہا تھا' لہٰذا وہ اس سے رابطہ کرنے کی زحمت نہ کرے۔

"میں تمہیں اس سونگ کا لنک ضرور بھیجوں گا۔" اسے ایک بات شاید پچاسویں مرتبہ یاد آئی۔

"کہاں بھیجو گے؟" ماہ نور کے دل میں ایک بے نام سی اذیت نے سر اٹھایا۔ "تمہارا نمبر بند ہے اور کوئی میلنگ ایڈریس نہ تم نے مجھے دیا' نہ میں نے تمہیں' پھر یہ لنک کہاں ملے گا مجھے؟"

آسمان پر کہیں کہیں بادل ٹکڑیوں کی شکل میں بکھرے تھے اور ہلکی خوش گوار ہوا چل رہی تھی۔ ماہ نور نے ہوا سے اڑتے اپنے بالوں کو کان کے پیچھے اڑسا۔

"میرا دل کیسے مانے کہ تم نے مجھ سے غلط بیانیاں کیں' تم نے اپنے متعلق مجھے جو بتایا' وہ جھوٹ تھا۔ میرا دل یہ بات قبول کرنے کو تیار ہی نہیں ہوتا' کیونکہ مجھے تمہارے چہرے پر' نہ آنکھوں میں' نہ لہجے میں کبھی کوئی ریا محسوس ہوئی' نہ مکر نظر آیا۔ پھر وہ کیا تھا جو تمہارا رویہ تھا۔"

اس نے الجھتے ہوئے سوچا۔ سامنے کالج کے گراؤنڈ میں فری پیریڈ اور کلاس بنک کر کے باہر آنے والی لڑکیاں ادھر ادھر بکھری خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔

"کیا وہ محض اس کوفت کا تدارک تھا جو تمہیں مختلف بہروپ بدلے مختلف جگہوں پر نظر آنے پر مجھے ہوئی۔۔۔؟ اور اگر وہ اتنا وقتی اور غیر اہم ساتھ تھا تو میرے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ میں تمہیں بھول کیوں نہیں جاتی' میں اپنے ذہن سے تمہیں جھٹک کیوں نہیں پاتی؟"

اسے کچھ فاصلے پر بیٹھی لڑکیوں کے ایک گروپ کے کسی بات پر زور سے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے اس گروپ کی لڑکیوں کو دیکھا۔ وہ موبائل کے کسی جدید سیٹ پر تصویریں دیکھنے میں مگن تھیں اور زور و شور سے تبصرے کرتے ہوئے وقفے وقفے سے قہقہے بکھیر رہی تھیں۔

"کچھ عرصہ پہلے میں بھی ایسی ہی بے فکری، اتنی ہی مگن اور شاید اس سے بھی اونچی آواز میں ہنسنے والی لڑکیوں میں شامل تھی۔" اس کے دل میں درد کا ایک ہلکا سا احساس اٹھا۔ "مگر اب ایسا کیا ہے کہ میں الجھ کر رہ گئی ہوں، ایسا کیا ہے کہ میرا کسی کام میں دل نہیں لگتا؟"

اس نے آنکھوں میں پھیلتی نمی کو ٹشو پیپر سے دبا کر صاف کیا اور ہاتھ میں پکڑے موبائل فون پر کال ملانے لگی۔

"ہیلو شاہ بانو! تم کدھر ہو؟" وہ کہہ رہی تھی۔ "میں یہاں لائبریری کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوں۔ تم بھی یہیں آجاؤ۔ آج باہر لنچ کرتے ہیں۔ آج بہت دن کے بعد کہیں بیٹھ کر ڈھیر ساری باتیں کرتے ہیں۔"

"لیکن میں اس وقت تک تم سے نہیں پوچھوں گی، جب تک تم خود نہیں بتاؤ گی کہ تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔"

دوسری طرف سے فون بند کرنے کے بعد شاہ بانو نے سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

پٹواری غلام حسین کا جنازہ پڑھانے کے لیے مولوی سراج سرفراز کو گاؤں کی بڑی جنازہ گاہ میں ماسٹر کمال نے پہنچایا تھا۔ چوہدری سردار، پٹواری غلام حسین کا جنازہ پڑھنے کے لیے تشریف لا رہے تھے۔ تیار جنازہ چوہدری صاحب کے انتظار میں رکھا تھا۔

"پچھلے ہفتے گاما ماچھی مرا تھا، چوہدری صاحب گاؤں ہی میں تھے، پر نہیں آئے جنازے میں۔" مولوی سرفراز کے کان میں ادھر ادھر کھڑے بیٹھے لوگوں میں سے کسی کی آواز پڑی۔

"آج تو صبح ہی اعلان ہو گیا کہ چوہدری صاحب جنازے کے لیے آرہے ہیں۔ پٹواری صاحب کا جنازہ ہے نا! آج تو چوہدری صاحب کو آنا ہی تھا۔" کسی اور نے کہا۔

"بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ پٹواری صاحب، چوہدری صاحب کے کام کے بندے تھے۔ گاما ماچھی کیا دیتا تھا انہیں۔" تیسری آواز آئی۔

"لاحول ولا ....." مولوی سرفراز تسبیح کے دانے گراتے ہوئے سوچ رہے تھے۔ "میت سامنے رکھی ہے اور لوگ غیبتوں میں مشغول ہیں۔ اللہ شان و جل کے غضب سے خوف نہیں آتا انہیں۔"

وہ آنکھیں بند کیے بظاہر تسبیح میں مشغول تھے، لیکن دراصل لوگوں کی نفسیات کا مقدور بھر تجزیہ کرنے میں مصروف تھے۔

"اور غیبت بھی کس کی؟ چوہدری سردار صاحب کی جن کے سائے تلے یہ گاؤں کے لوگ موجیں مارتے ہیں۔ اس قدر نیک دل، نیک نیت، نیک فطرت انسان میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا۔ اب بھلا چوہدری سرکار کو کیا فرق پڑتا ہے کہ مولوی سراج سرفراز کے گھر کا چولہا جلتا ہے یا نہیں۔ مولوی کے گھر میں ایندھن ہے یا ختم ہو گیا۔ اناج مولوی کا خاندان کم کھاتا ہے یا زیادہ، مگر نہیں، وہ پورا خیال رکھتے ہیں یہ پوچھے بغیر کہ اگلا ذخیرہ ختم ہوا کہ موجود ہے.... اور بھیج دیتے ہیں۔ سبحان اللہ! بھئی عمر بھر کوئی اور ایسا دل والا شخص نہ ملا جو مولوی کا یوں تر رکھنے کی فکر کرتا رہے۔ استغفر اللہ.... انسان گمان میں نہ پڑے، گمان انسان کی اپنی نیکیوں کو بھی کھا جاتا ہے اور دوسروں کو بھی مخمصے میں ڈال دیتا ہے۔ استغفار، استغفار۔"

اب مولوی صاحب کی زبان استغفار پڑھ رہی تھی اور انگلیاں سرعت سے تسبیح کے دانے گرا رہی تھیں۔

جنازے سے فارغ ہونے اور میت کو دفن کرنے کے بعد چوہدری صاحب کافی دیر تک مرحوم کے بیٹوں، بھائیوں اور دامادوں کے پاس بیٹھے رہے اور مولوی سراج، سرفراز کو انہوں نے خصوصی طور پر اپنے ساتھ بٹھائے رکھا۔

پٹواری صاحب مرحوم کے سمدھی نے کھانا کھلوایا۔ کھانا کھلتے ہی مولوی سرفراز کی قوت شامہ جاگ اٹھی۔

"لگتا ہے سپر کے چاول پکوائے ہیں پٹواری کے سمدھی نے۔"

ان کے ذہن میں فوراً" خیال آیا اور جب اچار کے مسالے والی گرم بریانی کی ٹرے مولوی صاحب کے سامنے رکھی گئی تو ان کی عقابی نظروں نے چاولوں کے ڈھیر میں چھپی چھوٹے گوشت کی بوٹیوں کی تعداد کو سیکنڈوں میں گن لیا۔

"سچ ہے، بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔" پلیٹ میں بریانی کا پہاڑ بناتے ہاتھ سے کھاتے ہوئے مولوی سراج سوچ رہے تھے۔ "مرنے پر بھی چھوٹا گوشت، اس کا مطلب ہے اب سوئم تک اچھا ہی کھانے کو ملے گا اور دسویں، چالیسویں کی تو کیا ہی بات ہو گی، سبحان اللہ کیا شان ہے تیری میرے مولا! ہم جیسوں کو اچھا کھلانے کے لیے بھی تو کیا کیا انتظام کر دیتا ہے۔"

پیٹ بھر کے کھا لینے کے بعد مولوی سرفراز کے کان اس آواز کے منتظر تھے جس کو "مولوی صاحب کی روٹی باندھ دو بھئی! انہیں گھر پہنچانا ہے۔" کے الفاظ ادا کرنے تھے۔

"اچھا پھر مولوی صاحب! میں چلتا ہوں۔" اسی دم چوہدری سردار نے مولوی صاحب کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور مولوی صاحب چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

"پرسوں ملاقات ہو گی، قل کے ختم پر۔" وہ کہہ رہے تھے۔ "کوئی نیک بات سنائیے گا دعا میں۔ کوئی اونچا مسئلہ بیان کیجیے گا۔ روشنی کا کوئی چراغ ہمارے ہاتھ میں بھی تھمائیے گا۔ ہم تو اندھیرے راستے پر اندھوں کی طرح چلے جا رہے ہیں۔ کوئی اچھی بات سنا کر ہمارے راستے، ہماری منزلیں بھی آسان کرنے کی کوشش کیجیے گا۔"

"جی سرکار، بالکل سرکار۔" مولوی! صاحب دونوں ہاتھوں سے سر پر بندھا صافہ درست کرتے عاجزی سے بولے۔

"لو! اب چوہدری صاحب کی خاطر محنت کر کے آنا پڑے گا ختم کے لیے۔ رابعہ بی بی سے مدد لینی پڑے گی اور اس کی جلی بھنی نظروں کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔" ان کے دل میں خیال آرہا تھا۔

"کوئی چیز، کوئی سوغات چاہیے ہو مولوی جی! تو بتائیے۔" چوہدری صاحب اٹھتے ہوئے بولے۔ "کوئی بالن، کوئی اناج، کوئی پھل سبزی۔" انہوں نے مولوی صاحب کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "اصل میں کھاری لاہور گیا ہوا ہے بی بی کے ساتھ۔ وہ ہوتا ہے تو میں بے فکر ہوتا ہوں۔ اس کا آپ کے پاس آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اسے خبر ہوتی ہے کہ کب کیا پہنچانا ہے۔ یہ باقی لڑکے تو لاپروا اور من موجی ہیں۔ اگر کوئی غفلت کر جائیں تو در گزر کر دیجیے گا۔"

"نہیں، نہیں سرکار!" مولوی صاحب نے ایک بار پھر صافہ سنبھالتے ہوئے کہا۔ "سب موجود ہے، اللہ شان و جل کے فضل اور آپ کی عنایت سے، سب موجود ہے۔"

"اچھا! یہ تو اچھی بات ہے۔" چوہدری صاحب نے کہا۔ "پھر بھی کوئی ضرورت ہو تو تکلف والی کوئی بات نہیں، اب یہ سارا پنڈ ہی آپ کا ہے۔ پچھلا پنڈ آپ کا چاہے ساہیوال کا ہو یا چیچہ وطنی کا، اب تو آپ ہمارے ہیں، ہے نا جی۔" انہوں نے رک کر مولوی صاحب کی طرف دیکھا۔ مولوی صاحب کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔

"ہاں جی، ہاں جی!" انہوں نے اپنی سرمہ بھری آنکھیں چراتے ہوئے جواب دیا۔ چوہدری صاحب زیر لب مسکرائے اور پٹواری کے بیٹوں کے ساتھ باہر کی طرف چل دیے۔

"بات ہی پکڑلی چوہدری صاحب نے۔" مولوی صاحب نے صافے کے کنارے سے پسینہ پونچھتے ہوئے سوچا اور دزدیدہ نظروں سے اس کونے کی طرف دیکھنے لگے 'جہاں سلیم نائی دیگ سے چاول نکال کر ایک بڑے شاپر میں ڈال رہا تھا۔

"شاباش او منڈیو! مولی جی (مولوی صاحب) کی روٹی باندھ دو۔ مجھے انہیں گھر پہنچا کر ٹیوب ویل پر جانا ہے۔" ان کے کان میں ماسٹر کمال کی آواز آئی اور ان کا دل کھل اٹھا۔

☆ ☆ ☆

"میں آج کل ڈائٹنگ پر ہوں اور تم مجھے زبردستی پزا کھلا رہی ہو۔" شاہ بانو نے پزا ٹاپنگ سے ہرے زیتون کے ٹکڑے اٹھا کر کھاتے ہوئے کہا اور جواب نہ ملنے پر ماہ نور کی طرف دیکھا جو بے دھیانی سے سامنے دیکھ رہی تھی۔

"ہے ماہ نور" شاہ بانو نے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں پھیلا کر ماہ نور کی نظروں کے سامنے ہلائیں۔ "کہاں گم ہو؟"

"ہوں..." ماہ نور نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کہیں نہیں... ادھر ہی ہوں۔" اس نے اپنا دھیان پلیٹ میں رکھے پزا کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

"ادھر تو نہیں ہو۔" شاہ بانو نے کہا۔ "اور یہ تو اب تمہاری عادت سی بن گئی ہے۔ جدھر تم ہوتی ہو' وہاں دراصل ہوتی نہیں ہو۔"

"کیا مطلب؟" ماہ نور نے شاہ بانو کی طرف دیکھا۔

"مطلب تم غیر حاضر دماغی کا شکار ہوتی جا رہی ہو' اب اس کی وجہ کیا ہے' یہ تو میں نہیں جانتی 'مگر کوئی تو وجہ ہے۔"

"یہ محض تمہارا وہم ہے۔" ماہ نور نے سر جھٹک کر کہا۔

"وہم نہیں' مجھے یقین ہے۔" شاہ بانو کے لہجے میں تیقن تھا۔ ماہ نور نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"جب ہم اسلام آباد میں تھے 'اس وقت کی بات تم کر سکتی ہو۔ اب تو ایسا نہیں ہے۔" ماہ نور نے سر جھکا کر کہا۔

"جبکہ مجھے لگتا ہے' اب تمہاری ذہنی کیفیت اس وقت سے زیادہ الجھی ہوئی ہے۔" شاہ بانو نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر کہا۔

"تمہارا وہم ہے... اور کچھ نہیں۔" ماہ نور نے شاہ بانو کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ لاشعوری طور پر اس کی انگلی ہاتھ میں پکڑے موبائل فون پر ایک ایسا نمبر بار بار ملا رہی تھی۔ جس سے اسے جواب موصول ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔

"جسٹ انجوائے دس پزا۔" (بس اس پزا سے لطف اٹھاؤ) اگلے لمحے فون میز پر رکھ کے اس نے موضوع بدلنے کی شعوری کوشش کی۔

"ماہ نور! میں نے اسلام آباد سے آنے کے بعد رائی حانہ کا وہ گانا اتنی بار سنا ہے کہ مجھے ایک ایک لفظ یاد ہو گیا اس کا۔"

شاہ بانو' ماہ نور کے نارمل انداز کو دیکھ کر ہنستے ہوئے بولی۔ اسی وقت ماہ نور کا ہاتھ لگنے سے کافی کا کپ میز پر الٹ گیا۔

"اوہ! آئی ایم سوری۔" ماہ نور نے بے ساختہ کہا۔

"اوہ! تمہارا ہاتھ تو نہیں جلا؟" شاہ بانو نے ٹشو پیپرز میز پر پھیلتی کافی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" ماہ نور نے سر ہلایا۔

"ہاں' تو میں بتا رہی تھی کہ رائی حانہ کا گانا..." میز کی سطح صاف کرنے کے بعد شاہ بانو نے کہا۔

"اس کو چھوڑو... تم یہ بتاؤ! تم نے برونو مارس کو سنا ہے کبھی؟" ماہ نور نے اپنے موبائل پر میوزک فائلز نکال کر شاہ بانو کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "اس کو سنو! یہ برونو مارس ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ غور سے سنو۔"

"یہ تو میں کئی بار سن چکی ہوں۔" شاہ بانو نے موبائل اسکرین کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "خاصا رومانٹک گانا ہے۔"

"خاصا نہیں 'انتہائی رومانٹک۔" ماہ نور نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے شاہ بانو کی طرف دیکھا۔ "سحر زدہ کر دینے کی حد تک رومانٹک۔"

"بہت ہی لکی ہے بھئی! برونو مارس کی محبوبہ' جسے وہ یقین دلا رہا ہے کہ اس سے زیادہ خوب صورت لڑکی کوئی نہیں ہے۔" شاہ بانو نے کہا۔

"اگر کوئی لڑکا کسی لڑکی کو برونو مارس کا یہ گانا خصوصی طور پر سنائے تو اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟" ماہ نور نے پوچھا۔

"ہائے!" شاہ بانو نے مسکراتے ہوئے سر کرسی کی پشت سے ٹکایا۔ "اس کا صرف ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ وہ لڑکی بہت' بہت خوش قسمت ہے۔" اس نے بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔

"ہوں!" ماہ نور کے چہرے اور آنکھوں پر لمحہ بھر کے لیے چمک آئی' لیکن اگلے لمحے وہ بجھ گئی۔ "ایسا ہونا مشکل ہے نا؟"

"کیوں مشکل کیوں ہے؟" شاہ بانو نے کہا۔ "اگر کوئی اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے اس گانے کا سہارا لینا چاہتا ہے تو اس میں کیا مشکل ہے؟"

"اور اگر کوئی یوں ہی کسی کو یہ گانا یہ کہہ کر سنوا دے کہ یہ اس کا پسندیدہ ترین گانا ہے تو..."

"مطلب' کوئی لڑکا اگر ایسا کرے تو؟" شاہ بانو نے سوال کیا۔

ماہ نور نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو پھر تو ظاہر ہے' وہ اپنا پسندیدہ گانا ہی سنوا رہا ہے۔" شاہ بانو نے کہا۔ "یا پھر لڑکی کو پٹانے کے لیے بہانہ بنا رہا ہے۔" شاہ بانو ہنسنے لگی۔

"ایسا کیوں کرے گا؟" ماہ نور نے بھولپن سے سوال کیا۔

"تم خود سوچو' ایک لڑکا کسی لڑکی کو یہ کہہ کر یہ گانا سنوائے کہ یہ میرا پسندیدہ ترین گانا ہے تو لڑکیاں تو ہوتی ہی بے وقوف ہیں۔ اس لڑکی کے دل میں ضرور یہ خیال آئے گا کہ شاید یہ الفاظ اسی کے لیے کہے گئے ہیں اور وہ پھنس جائے گی ان لفظوں میں۔"

ماہ نور نے بمشکل شاہ بانو کی اس بات کو حلق سے اتارا۔

"اچھا! پھر یہ بتاؤ کہ آمنہ اپنے لان پرنٹس کب لا رہی ہے مارکیٹ میں؟ پہلے ایگزیبیشن ہو گی یا یوں ہی ڈائریکٹ مارکیٹ میں لائے گی۔" اس نے تیزی سے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

گھر واپس آنے تک ماہ نور کا جذباتی دل کافی حد تک ٹھکانے پر آ چکا تھا۔ گھر واپس آ کر اس نے بیگ سے موبائل فون نکال کر اپنے سامنے کی دیوار کی طرف اچھال دیا۔ فون دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گرا۔ اس کا کور دو حصوں میں تقسیم ہوا اور بیٹری دور جا پڑی' ماہ نور نے فون کی طرف دیکھے بغیر اپنے جوتے اور موزے اتار کر کمرے کے دوسرے کونے کی طرف اچھال دیے اور بیڈ پر لیٹ کر آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

☆ ☆ ☆

"آپ نے دیکھا' ہر طرف خزاں چھا گئی ہے۔" سارہ نے ناشتا کرتے ہوئے سیمی آنٹی سے کہا۔ چائے کی پیالیوں میں دودھ انڈیلتے ہوئے سیمی آنٹی نے ہاتھ روک کر سارہ کی طرف دیکھا۔

"پچھلے دو سال سے ہم یہاں رہ رہے ہیں اور دو سالوں میں دو دفعہ یہ وقت آیا ہے۔ تم نے اب نوٹس کیا۔" انہوں نے پوچھا۔

"اچھا!" سارہ نے پورج کھاتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔ "پتا نہیں' شاید پہلے بھی ایسا موسم آیا ہو' مجھے تو ابھی پتا چلا۔"

"ہوں!" سیمی آنٹی نے کہا۔ "اور دوبارہ سے پیالیوں میں دودھ انڈیلنے لگیں۔"

"اچھی بات ہے' جو تمہیں ابھی بھی پتا چل گیا۔۔۔ اور یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے کہ تمہیں پتا چل رہا ہے۔"

"آپ کا کچھ پتا نہیں چلتا۔" سارہ نے دلیے کا پیالہ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اگر میں ٹھیک نہیں ہوں تو آپ ناخوش رہتی ہیں' ذرا بہتر ہو جاؤں تو بھی ناخوش۔ اگر کسی چیز کے ہونے یا نہ ہونے سے مجھے کوئی فرق نہ پڑے تب بھی آپ ناخوش اور اگر پڑنے لگے تو بھی ناخوش۔ یہ بتائیں اب آپ کو میری ذمہ داری کھلنے لگی ہے یا کیا؟"

سیمی آنٹی' سارہ کے اس سوال پر کچھ دیر اسے خاموشی سے دیکھتی رہیں' پھر انہوں نے نظریں کھڑکی سے باہر پھیلے ہوئے منظر پر ٹکالیں۔

"کیوں۔۔۔ اب خاموش کیوں ہو گئیں؟" سارہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جواب کیوں نہیں دے رہیں؟"

"تمہیں لگتا ہے' میں تمہاری ذمہ داری سے تنگ آگئی ہوں؟" انہوں نے نظریں واپس سارہ کی طرف ٹکا کر پوچھا۔ "اگر تمہیں ایسا لگتا ہے تو ٹھیک ہے' تمہارے لیے کسی اور کا بندوبست کر دیتے ہیں اور میں یہاں سے رخصت ہو جاتی ہوں۔" سارہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

"سیمی آنٹی کی جگہ کوئی اور۔۔۔" اس نے تصور کرنے کی کوشش کی اور اس کے دل نے اس کے سر کو نفی میں ہلنے پر مجبور کر دیا۔

"تم جانتی ہو' مجھے زندگی میں کیا چاہیے؟" سیمی آنٹی نے پوچھا۔ "اس عمر میں جواب میری ہے۔" انہوں نے خود اپنی طرف اشارہ کیا۔ "ان حالات میں جو میرے ہیں۔" سارہ نے ان کے لہجے کی سختی کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔

"میرا اس ملک میں کون ہے؟" سیمی آنٹی نے بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔ "اس ملک میں میرا کیا ہے؟" انہوں نے سارہ کی طرف دیکھا۔

"ایک ایسی عورت جس نے اپنا بچپن اور لڑکپن ایک سرد ملک کے سرد جذبات والے لوگوں کے ساتھ ایک یتیم خانے میں گزارا' بڑی ہوئی تو وہ یتیم خانے سے بھاگی۔ تعلیم اور ہنر کی کمی کی وجہ سے سڑکوں سے کوڑا چننے کے کام پر مامور ہو گئی۔ قصبہ قصبہ پھرتی' سرکس پارٹی کا حصہ بن کر بینڈ بجانا سیکھنے لگی اور پھر ایک اجنبی ملک کے اجنبی شخص کے اظہار محبت سے متاثر ہو کر اسے اپنا سب کچھ جانتے ہوئے اس سے بیاہ رچا بیٹھی۔ ایک گھر' ایک خاندان سے متعلق ہو جانے کا نرم گرم تصور لیے سرد فضا چھوڑ کر اجنبی ملک کی گرم ہوائیں کھانے یہاں آگئی۔" انہوں نے ہوا میں کہیں اشارہ کیا۔

"یہاں۔۔۔ جہاں ایسی بہوئیں قبول کی جاتی ہیں نہ سینے سے لگائی جاتی ہیں۔ سو وہ عورت بھی دھتکاری گئی اور کئی سال کی خدمت چاکری کے بعد گھر سے نکالی بھی گئی۔ وہ ایک۔۔۔" انہوں نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "سنگ دل بھی جیتنے میں ناکام رہی۔"

سارہ نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا۔

"نہ پاسپورٹ اس کے پاس' نہ کوئی ویزا اس کے پاس۔ بے شناخت' بے نام عورت۔۔۔ کیا کرتی' کہاں جاتی؟" انہوں نے جیسے سارہ سے سوال کیا۔

"بھلا ہو خان محمد کا جس نے اسے اپنے سرکس میں ملازمت دے دی۔ بینڈ بجانا تو وہ بھول چکی تھی۔ ہاں! جانوروں کا راتب تیار کرنا اور انسانوں کے لیے کھانے پکانا اسے آگیا تھا' سو رزق کا وسیلہ بھی بنا اور سر چھپانے کا ذریعہ بھی۔ اس کے بعد۔۔۔"

"اس کے بعد کیا ہوا' کیا کیا ہوتا رہا؟" سارہ نے ہاتھ اٹھا کر سیمی آنٹی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "مجھے سب معلوم ہے۔"

"پھر بھی۔" سیمی آنٹی نے اچنبھے سے اس کی طرف دیکھا۔ "پھر بھی کہتی ہو' میں تمہاری ذمہ داری سے تنگ آگئی ہوں؟"

"نہیں! میں نہیں کہتی۔" سارہ نے اپنے بکھرے بال سمیٹ کر جوڑا بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اس کوشش میں اس کے بازوؤں کے پٹھے تھوڑی ہی دیر میں تھک گئے اور اپنی کوشش میں ناکام ہوتے ہوئے اس نے بالوں کو ایسے ہی چھوڑ دیا۔ سیمی آنٹی اس کی اس کوشش کو بغور دیکھ رہی تھیں۔

"لیکن تمہارے سامنے ابھی لمبی زندگی پڑی ہے۔" انہوں نے کچھ اور کہنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے بات بدلی۔ "سوچو! اگر تمہارے لیے یہ سب انتظام کرنے والا تنگ پڑ گیا تو کیا کرو گی؟"

سارہ نے جھنجلا کر یوں سر جھٹکا جیسے کہہ رہی ہو "چلو! پھر وہی بات لے کر بیٹھ گئیں۔" مگر سیمی آنٹی کو اس کی جھنجلاہٹ کی کوئی پروا نہیں تھی۔

"تم جانتی ہو' اس فلیٹ کا کرایہ کتنا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔ "بجلی اور گیس کے بل' کچن کے اخراجات' لانڈری اور مینٹیننس کے اخراجات' تمہاری دواؤں اور خوراک کا خرچہ۔۔۔" انہوں نے سارہ کو کچھ باور کرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اور وہ جو ابھی تک یہ سب انتظام کر رہا ہے' وہ تنگ پڑ گیا تو کیا ہوگا' کبھی سوچا ہے تم نے؟"

"آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔" سارہ نے تنگ آتے ہوئے سیمی آنٹی کی طرف دیکھا۔ "میری حالت نہیں دیکھتیں؟" اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ "میں کسی کام کے قابل رہ گئی ہوں؟" اس نے سیمی سے سوال کیا۔

"آپ کا کیا خیال ہے' میں دوبارہ سرکس کے تاروں' رسیوں اور بازو پر کرتب دکھا سکتی ہوں؟ شیروں اور کتوں کے ہمراہ آگ کے کھیل کھیل سکتی ہوں؟ کیا میں دوبارہ اس پنڈال میں اس طرح داخل ہو سکتی ہوں' جہاں اتنے برس میں نے موت اور زندگی کے درمیان بقا کی جنگ لڑتے گزار دیے؟"

سیمی آنٹی کچھ دیر سارہ کے بگڑے تیور دیکھتی رہیں اور پھر تحمل بھرے لہجے میں بولیں۔

"جو سرکس میں کام نہیں کرتے' وہ روزگار کمانے سے عاری ہوتے ہیں کیا؟"

"کماتے ہوں گے۔" سارہ نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ "مگر مجھے تو جو کام آتا ہے' میں اسی سے کما سکتی ہوں اور وہ کام کرنے کے قابل میں اب نہیں رہی۔"

"میں نے زندگی میں ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں' جو کئی اعضاء سے معذور ہونے کے باوجود بھی اپنی روزی خود کمانے کی سعی کرتے ہیں اور کما بھی لیتے ہیں۔ ٹانگوں سے معذور' ہاتھوں سے معذور' آنکھوں اور زبان سے معذور' کانوں سے معذور' کئی ایسے بھی جو معذور جسم کو فرش پر گھسیٹ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے ہیں' مگر اپنا رزق خود کما رہے ہیں۔" سیمی آنٹی سارہ کی کسی بھی دلیل سے متاثر نہ ہوئیں۔

"بھیک، خیرات مانگنے والوں کا ذکر کررہی ہیں؟" سارہ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "وہ معذور جواپنے ادھورے اعضاء پر پٹیاں باندھے راستوں، بازاروں اور سڑکوں کے کناروں پر پڑے اپنی بے بسی کو مظلومیت کا نشان بنائے دوسروں کے ہاتھوں اور جیبوں سے اپنے لیے سکے اور روپے نکلوا رہے ہوتے ہیں۔"

"تو یہ کیا ہے؟" سیمی آنٹی نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔ "کیا یہ خیرات نہیں، جو تم انجوائے کررہی ہو؟" سارہ نے چونک کر سیمی آنٹی کی طرف یوں دیکھا، جیسے اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا ہو۔

"تمہیں اندازہ ہے کہ یہ کیا ہے۔ جو سعد سلطان تمہاری مد میں خرچ کررہا ہے؟" سیمی آنٹی نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ نچاتے ہوئے سوال کیا۔ "یہ خیرات ہے، زکوۃ ہے کہ صدقہ ہے؟"

سارہ کا دل ایک دم اپنے معمول سے تیز رفتار میں دھڑکنے لگا۔

"مگر یہ چیریٹی ہے تو بھی صدقہ، خیرات ہے سارہ خان!" سیمی آنٹی نے اپنے الفاظ کی برہنگی اور کاٹ کی پروانہ کرتے ہوئے کہا۔ "کھلے عام نہ سہی۔ ڈھکے چھپے ہی سہی، یوں دو کہ دینے والے ہاتھ کو ہی خبر ہو، دوسرا ہاتھ بے خبر رہے۔ یہ وہ بھی ہو، تو بھی، ہے تو صدقہ اور خیرات ہی نا۔" انہوں نے سارہ کو خوش فہمیوں کے جہان سے ایک وار میں باہر نکالتے ہوئے کہا۔

"سوچو سارہ خان!" انہوں نے سارہ کا ہاتھ ہلایا۔ "کب تک صدقے اور خیرات پر زندگی گزارو گی؟ تمہارے اعضا تمہاری کیا گواہی دیں گے، جب وہ مالک کے حضور حاضر ہوں گے۔"

سارہ پھٹی آنکھوں سے سیمی آنٹی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"سعد سلطان تمہارا کچھ نہیں لگتا، اس نے کوئی چیریٹی ہوم بھی نہیں کھول رکھا۔" سیمی آنٹی نے اس کے کسی بھی ردعمل کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "وہ تمہاری معذوری کا احساس کرکے تمہاری مدد کرتا ہے، مگر اپنی بے شمار دولت میں سے تمہاری مدد کی مد میں جانے والے پیسوں کو وہ کس کھاتے میں شمار کرتا ہے۔ کبھی تم نے اس سے پوچھا؟" وہ دم لینے کو رکیں۔

"کبھی یہ سوچا کہ وہ اس مد سے ہاتھ کھینچ لے تو کسی بھی مشقت کا عادی نہ رہ جانے والا تمہارا جسم تمہارا کتنا اور کیسے ساتھ دے گا؟

سوچو! اگر سعد کو کبھی کچھ ہوگیا تو تمہارا پرسان حال کون ہوگا؟"

"چپ کر جائیں سیمی آنٹی!" سارہ نے برداشت جواب دے جانے پر چلا کر کہا۔ "مجھے کوسیں، مجھے ڈانٹیں، مستقبل کے ڈراؤنے روپ دکھائیں، لیکن سعد کے لیے ایسی بات مت کریں۔ محض مجھے ڈرانے کے لیے آپ اس کے لیے ایسے الفاظ کیوں بول رہی ہیں؟"

"میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ اس دنیا میں انسانوں کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اگلے پل کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ اس لیے اپنے لیے خود سوچو، خود کوشش کرو۔" سیمی آنٹی نے اٹھ کر ناشتے کے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔

"اور اگر وہ ساری باتیں، جو آپ مجھے فرض کرا رہی ہیں تو آپ کا کیا ہوگا؟ آپ نے سوچا کبھی؟" سارہ نے الٹا وار کرتے ہوئے کہا۔ "اور یہ جو آپ سعد کی وجہ سے یہاں اتنی مزے کی زندگی گزار رہی ہیں، اگر وہ ڈراؤنا مستقبل آگیا جو آپ مجھے دکھا رہی ہیں تو آپ کیا کریں گی، کہاں جائیں گی، کیا یہ سب آپ کو خیرات میں نہیں مل رہا؟"

"ہونہہ!" سیمی نے ہاتھ روک کر سارہ کی طرف دیکھا اور سر جھٹکا۔ "میں ایک پل بھی ادھر نہ رہتی، اگر خیرات ہوتا یہ سب کچھ۔"

"کیوں، آپ کے لیے کیوں نہیں؟" سارہ نے سر اٹھا کر کہا۔

"میں یہاں تمہاری خدمت پر مامور ہوں، جس کا معاوضہ یہ چھت اور تین وقت کی روٹی ہے۔ میں کروشیا بنتی ہوں اور قصبے میں ہینڈی کرافٹس شاپ والے کے پاس رکھواتی ہوں۔ مجھے اپنے کام کے اچھے دام مل جاتے ہیں، جن سے میں اپنی باقی ضرورتیں پوری کرلیتی ہوں۔ دو، تین سوٹ، دو سویٹرز، دو جوڑی جوتے اور کچھ دوائیں ۔۔۔ میری ضرورتیں بس اتنی ہی ہیں، جن کے لیے میں اپنے ہاتھوں سے محنت کرتی ہوں۔" سیمی آنٹی نے اپنے ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔

سارہ نے سیمی آنٹی کے ہوا میں بلند ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ مضبوط ساخت کے حامل ان ہاتھوں کی جلد سخت تھی۔ انگلیوں کی گرہوں پر سیاہ نشان تھے۔ ہاتھوں کی جلد کی رنگت پیلاہٹ کا شکار ہورہی تھی۔ وہ ہاتھ مجموعی طور پر محنتی ہاتھ ہونے کا تاثر دے رہے تھے۔ ان ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے سارہ کو گزرے وقت کے کچھ مناظر یاد آنے لگے۔ پیاز کا ڈھیر چھیلتے اور کاٹتے یہ ہاتھ، سرعت سے سبزی کے ڈھیر چھیلتے اور کاٹتے ہاتھ، دیگ نما دیگچیوں میں مسالا بھونتے ہاتھ، جستی ٹب میں گوشت کے ڈھیر دھو کر رکھتے یہ ہاتھ، جستی بالٹیوں اور ٹبوں میں توڑی دانہ ملاتے ہاتھ، گوشت ابال کر اس کو لکڑی کے لمبے ہینڈل والی ڈوئیوں سے بھرتہ بنا کر جانوروں کا راتب تیار کرتے ہاتھ، محنت شاقہ کے عادی ہاتھ۔ اس کی نظریں ہاتھوں سے ہٹ کر سیمی آنٹی کے چہرے پر منتقل ہوگئیں۔ وقت کی گردشوں کے باقی رہ جانے والے آثار کی جھلک دکھاتا چہرہ، چہرے کی رنگت جو اس نے کبھی سفید اور گلابی دیکھی تھی، زرد اور گندمی ہورہی تھی، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے اور گالوں پر بھورے رنگ کے مدھم نشان، ماتھے پر بڑھتی عمر کی لکیریں، بالوں میں سفیدی اتر چلی تھی۔ چہرے سے پھسل کر اس کی نگاہیں سیمی آنٹی کی گردن پر آکر ٹک گئیں۔ گردن کی جلد ڈھلکنے لگی تھی اور چہرہ جھکانے پر اکٹھی ہوجاتی تھی۔ گلے میں سلور کی ایک لمبی زنجیر تھی جو ان کے چشمے کو اپنی گرفت میں لیے اسے سینے تک لٹکائے رکھتی تھی۔

سارہ نے سیمی آنٹی کو اس وقت بھی دیکھا تھا، جب ان کی عمر چونتیس، پینتیس برس کے قریب تھی اور اب جب ادھیڑ عمری میں تھیں، وقت کتنا آگے سرک چکا تھا اور وقت نے ان کے چہرے کے نقوش اور ان کے جسمانی دم خم پر کیسا اثر چھوڑا تھا۔

"یہ وقت جو تم پر ہے، یہ بھی گزر جانا ہے سارہ خان! اور ایک وقت وہ آنے والا ہے، جب تم سیمی آنٹی کی اب والی عمر کو پہنچ جاؤ گی۔" اس کے ذہن میں ایک دم خیال آیا۔ "اس وقت تمہارے چہرے کے نقوش بھی اسی طرح بدل چکے ہوں گے اور تمہارا جسم ۔۔۔" اس نے خود پر نظر ڈالی "جو ابھی کمزوری اور معذوری کا شکار ہے۔ اس کی کیا شکل ہوگی؟" اس نے تصور کرنے کی کوشش کی اور اس کا دل خوف سے لرز اٹھا۔

"میرے لیے ایک وہیل چیئر منگوالیں سیمی آنٹی!" اس نے خود کو کہتے سنا۔

☆ ☆ ☆
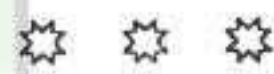
"یہ جو سلمان صاحب ہے اس کی تو زندگی بڑی عذاب ہے بھئی! وچارہ ہر وقت کسی نہ کسی جلدی میں رہتا ہے۔" چوکیدار کے پاس اسٹول رکھ کر بیٹھے کھاری کے ذہن میں خیال آیا۔ "لگتا ہے ہر ویلے (وقت) اسے کسی نے پا جھڑ (بھاگ دوڑ) ہی ڈالی ہوتی ہے۔ گاڑی چلاتا ہے تو لگتا ہے سڑک پر سامنے دیکھ بھی رہا ہے، نہیں بھی دیکھ رہا۔"

اس نے گھاس کے چھوٹے سے قطعے پر مشین پھیرتے مالی کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ نرم ہری گھاس کے کٹنے پر ایک مخصوص سی باس ساری فضا میں پھیلی تھی۔

"اس وچارے کا ذہن ہر ویلے کسی اور طرف کی سوچ رہا ہوتا ہے۔ کیڈی (کتنی) وخت (مشکل) میں ہے اس

کی جان۔" اس نے سر جھکا اور مالی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ کٹی ہوئی گھاس مشین کے آگے لگے ڈبے سے نکال کر ایک سائیڈ پر الٹا رہا تھا۔ ہری ہری نم گھاس کی ڈھیری سے بھی باس اٹھ رہی تھی۔

"ابھی یہ گھاس جان میں ہے۔ اس واسطے رنگ بھی دے رہی ہے اور باس بھی۔ رات تک باسی ہو جائے گی، کل سویرے تک رنگ بدلے گی، سوکھنے لگے گی اور پھر سڑ کر سواہ تنکا ہو جائے گی۔" وہ سوچنے لگا۔ "بندہ وچارہ بھی اسی طرح ہوتا ہے۔ بنیادوں اکھڑا بندہ اور ایس (اس) گھاس میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔" اس کے ذہن میں عجیب وغریب سوچیں خود بخود آئے چلی جا رہی تھیں۔ "مولی صاب وچاروں کی طرح" اسے ایک نیا خیال سوجھا۔

"مولی صاب بھی تو لگتا ہے بنیادوں اکھڑ گئے ہیں۔ اسی واسطے نہ توان کا رنگ ہے۔ نہ ہی ان میں کوئی باس ہے۔ جیسے میں خود۔" اس کی نظریں گھاس کے اس قطعے پر رکیں جس کی گھاس تازہ تازہ تراشی گئی تھی۔

"میں خود بھی تو بنیادوں اکھڑا بندہ ہوں۔ مولی جی کو تو خود ے (شاید) خبر ہو کہ ان کی بنیاد کدھر ہے، مجھ کو تو یہ بھی نہیں پتا۔" مالی اب جھاڑو سے گھاس میں رہ جانے والے کٹے پھونس اور تنکے اکٹھے کر رہا تھا۔

"ویکھا! (دیکھا) یوں ہونجے (اکٹھے کر کے پھینکے) جاتے ہیں بنیادوں اکھڑے لوگ۔" اس کو خیال آیا۔ "یا فیر ساری زندگی ہوا دے نال کبھی ایدھر، کبھی اودھر (ادھر ادھر) اڈدے (اڑتے) پھرتے ہیں۔ مولی جی کی طرح اور کدی کوئی اللہ دا پیارا بندہ چھتر (چھاؤں) ڈال دیندا ہے ان پہ۔۔۔ جیسے میں۔۔۔ پر ہوندا تو بنیادوں اکھڑا ہی نا۔"

"اور اس نوں ویکھو۔" اس نے گھاس کے صاف ستھرے قطعے کو دیکھا۔ "اینج لگدا جیسے شہر دا کوئی باؤ حمام سے نویں نویں شیو کرا کے آیا ہو۔"

شاید اس نے لاشعوری طور پر خود کو خوش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی وقت ایک خاتون نے گھر کے باہر سے گیٹ کے اندر سر گھسا کر جھانکا۔ سگریٹ کے کش لگاتا چوکیدار ایک دم کھڑا ہو گیا۔

"ماہ نور گھر پر ہے؟" سفید بالوں اور گوری رنگت والی اس خاتون نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"نہیں بیگم صاحب! ماہ نور بی بی آج شیخوپورہ گئی ہیں اپنے کام سے۔" چوکیدار نے مودب انداز میں کہا۔

"اور فائزہ؟" خاتون نے کہا۔

"وہ ابھی کالج سے واپس نہیں آئیں۔"

"اچھا!" خاتون نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔

"آپ آؤ بیگم صاحب! گاؤں والے مہمان ادھر ہی ہیں۔" چوکیدار نے گیٹ کھولتے ہوئے کہا۔ کھاری نے دلچسپی سے خاتون کی طرف دیکھا۔ سفید شلوار پر سرمئی پھولوں والی سفید قمیص پہنے، دوپٹا گلے میں ڈالے، سفید سفید پیروں میں دو پٹی کی چپل پہنے، سفید و گلابی نرم ہاتھوں والی وہ خاتون کھاری کو ایک دم سے بہت بھا گئیں۔

"نہیں بھئی! میں چلتی ہوں۔ ماہ نور آئے تو اس سے کہنا! خدیجہ خالہ پیار دے رہی تھیں۔" انہوں نے کہا اور واپس مڑ کر خود سے کچھ فاصلے پر کھڑی اپنی جیسی خود سے عمر میں تھوڑی کم دوسری خاتون سے کچھ کہنے لگیں۔

"واہ بھئی! شہر کی تو مائیاں بھی انگریزی بولتی ہیں۔" کھاری نے سوچا اور اس خاتون سے مرعوب ہوا۔

"آج شام کی ڈیوٹی پوری کر کے چلیں گے لبرٹی۔ انڈا برگر کھائیں گے۔" چوکیدار نے کھاری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کھا لیا انڈا برگر میں نے۔۔۔ یار! تسی لوگ کیسے کھانے کھاتے ہو؟" کھاری نے جواب دیا۔ "روٹیوں پر سبزیاں تے پنیر سجا کر دکان والے، ہوٹل والے شہر کے لوگوں کے سامنے رکھیں تو دو، دو ہزار کی وہ روٹیاں راضی خوشی لیتے ہیں اور انگریزی بولتے ایک ایک برکی (لقمے) گاجروں، کھیروں، ٹماٹروں کے سلاد میں مسالے ملا کر بیچنے والوں سے پنج پنج سو روپے کے ڈبے خریدتے ہو اور کہتے ہو سلاد کھا کے پیٹ بھر گیا۔ بلے بھئی بلے! تہاڈیاں

خوراکاں مجھے اور کوئی چیز نہ کھلانے لے کر جانا، میرا تو منہ دا ذائقہ بھی خراب ہو گیا، جب سے ادھر آیا ہوں۔"

چوکیدار نے زور سے قہقہہ لگایا اور تمسخر اڑانے والے انداز میں بولا۔

"پڑھے کہتے ہیں اس کو کھاری صاحب اور شہر میں جو سلاد والے ہوٹل ہوتے ہیں وہ پتا نہیں کتنی مہنگی چیزیں ڈالتے ہیں سلاد میں، جب جا کر اتنا مہنگا بکتا ہے۔"

"مجھے کیا بتا رہے ہو، پڑاتے سلاد۔" کھاری نے ہاتھ ہلایا۔ "ہمارے چوہدری صاحب کے مہمانوں کے لیے ایسی ساری چیزیں شہر سے جاتی ہیں۔ ادھر خانسامے بشیر کو بھی آتا ہے سارا کچھ بنانا۔ ادھر کیا کچن ہے جو کچن ہمارے فارم ہاؤس کا ہے۔ میں ہر شے کا نام جانتا ہوں، پر ذائقہ نہیں چکھا کبھی۔ ایس واسطے کہ ادھر چکھوں تو چوری ہوتی ہے۔ پر ادھر تو چوہدرائن نے دھکے نال ساریاں ایسیاں چیزاں کھلائی، جو بچ جاتا ہے پلیٹ کے لے آتی ہیں، کھاری کھالے گا، رضیہ کھالے گی، نا بھائی!" اس نے ہاتھ ہلایا۔ "بڑی ہو گئی ہمارے ساتھ اب تو ہم گھر میں جو ہانڈی پکتی ہے، وہ ہی کھائیں گے۔"

"زیتون کے تیل میں پکواتی ہیں بیگم صاحب!" چوکیدار نے اسے ڈرایا۔

"کھاری نے منہ بناتے ہوئے چوکیدار کو دیکھا۔" کوئی بات نہیں۔"

"چھان میں آٹا ملا کر روٹی پکواتی ہیں۔ چھان زیادہ آٹا کم ہوتا ہے۔"

"اوئے ہوئے! ان کو تو پھر شوکر (شوگر) ہو گی۔" کھاری نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

"وہ مجھے نہیں پتا۔" چوکیدار نے کہا۔ "پر اپنا مجھے پتا ہے، میں ادھر کی روٹی، سالن نہیں کھا سکتا۔"

"تہانوں بھنڈیاں، کریلے، پالک، کدو، ٹینڈے اچھے لگتے ہیں، دیسی گھیو (دیسی گھی) میں پکے ہوئے؟" کھاری نے پوچھا۔ چوکیدار نے اثبات میں سر ہلایا۔

"بس پھر تو میرے پاس فارم ہاؤس ضرور آنا، میں تہانوں سب کچھ کھلاؤں گا۔" کھاری نے ان مانوس ذائقوں کو تصور میں زبان پر محسوس کر کے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ چوکیدار کھاری کے بھولپن اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہو جانے کی عادت پر اکثر ہنسا کرتا تھا۔

"چل پھر تجھے جھولوں پر لے کر جاتا ہوں جلو پارک کے۔" اس نے ہنستے ہوئے کھاری کو چھیڑا۔

"نہ بابا!" کھاری نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "دیکھ لے سارے جھولے، سارے پارک، سارے ہوٹل، ساری دکانیں، اب تو بھائی، ہم نے واپس جانا ہے، دل اوودھر (اداس) گیا ہے۔ اب واپس چلئے۔"

"ابھی تو نہیں جانا بڑی بی بی نے۔" چوکیدار نے اسے ڈرایا۔ "ابھی تو چوہدری صاحب کے ماموں کے بیٹے کی بیٹی کی شادی اٹینڈ کرنی ہے انہوں نے، پھر جائیں گی واپس۔"

"میں تے فیر چلے جانا۔" کھاری نے سر جھٹک کر کہا۔ "میرے سبق بھی پیچھے پے گئے ہیں۔ اب میں نے اور نہیں رہنا۔ ڈرائیور پرسوں آیا تھا نا۔ کہہ رہا تھا تین بھینسیں بیمار ہو گئی ہیں۔ پٹھوں (چارے) کو منہ نہیں لگاتیں میرے بغیر۔ میں، ہن چوہدری صاب کو کہہ دینا مجھے لے جائیں ساتھ جب وہ آئیں گے ادھر۔"

چوکیدار کھاری کی ناراضی اور گھبراہٹ دیکھ کر پھر سے ہنسنے لگا۔

☆ ☆ ☆

اس نے صاف نیلے آسمان پر اڑتے پرندوں کی طرف دیکھا۔ شام ہونے پر پرندے اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے۔ پرندوں کی اس اڑان میں بھی ایک خاص ترتیب تھی۔ ایک پرندہ سب سے آگے، پھر تین تین کی دو قطاریں اور آخر میں پھر ایک پرندہ۔ اسے یہ ترتیب دلچسپ محسوس ہوئی۔

”اللہ میاں نے پرندوں کو بھی یہ سمجھ دی ہوئی ہے کہ شام ہوجائے تو گھروں کو واپس جانا ہے۔“ اس نے سوچا۔
”دن بھر یہ کہاں رہتے ہیں اور اگر یہ اپنے بچوں کے لیے خوراک اکٹھی کرکے لوٹتے ہیں تو وہ خوراک کہاں چھپاتے ہیں۔ واپسی پر ان کے پر کھلے ہوتے ہیں اور دوسری تو کوئی جگہ نظر نہیں آتی جہاں خوراک رکھی جاسکے۔“
اس نے ایک ایسی بات سوچی جس کا جواب اس کے ذہن نے اسے نہیں دیا۔ ”پتا نہیں۔“ اس نے خود کو بتایا اور چھت کی منڈیر سے ذرا سر نکال کر نیچے دیکھا۔ دور دور تک کھیتوں میں تیار گندم کی سنہری بالیاں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ غروب ہوتے سورج کی آخری کمزور شعاعیں ان تک پہنچ کر انہیں نمایاں کررہی تھیں اور واقعی یوں لگ رہا تھا جیسے ہر سو سونا بکھرا ہوا ہے۔“
اس نے کھیتوں میں کام کرنے والے کسانوں کو دیکھا، جو تیار فصلوں کو دیکھ دیکھ کر یقیناً ”خوش تھے۔ پچھلے کئی مہینوں کی محنت رنگ لائے کھڑی تھی، لیکن ابھی اس فصل کو روپوں میں بدلنے تک کئی مرحلے باقی تھے۔ فصل کی کٹائی گندم کی صفائی، باردانے کا حصول اور پھر منڈی تک اس کی ترسیل، آڑھتیوں سے سر کھپائی، پھر کہیں جاکر جنس کو نقد میں بدلنا تھا اور اس نقد کو آرزوؤں اور ضرورتوں کی خریداری میں صرف ہونا تھا۔
”ہر بندہ اپنا اپنا کام کرتا ہی بجتا ہے۔“ اس نے نیچے کھڑے کسی شخص کا دھیان خود پر پڑتے محسوس کرکے سر نیچے کرلیا۔
”اب جو کام اباجی کرتے ہیں، وہ بھی کوئی اور نہیں کرسکتا۔“ اسے نہ جانے کیوں اپنے باپ کا خیال آیا۔ جسے ہمیشہ اس نے تازہ وضو کرتے، پاک صاف لباس پہن کر مسجد کی خدمت میں معروف دیکھا تھا۔ وہ مسجد کی صفائی بھی خود کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ صفیں سیدھی کرکے بچھاتے تھے، لوگوں کو نماز کی طرف بلانے کے لیے پانچ وقت اذان دیتے تھے۔ اور پھر اپنے پیچھے کھڑے نمازیوں کی تعداد کی پروا کیے بغیر امامت پر کھڑے ہوجاتے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد صبح، شام لوگوں کے بچوں کو قرآن پاک پڑھنا سکھاتے۔ برسوں سے ایک سا معمول، ایک سے دن رات۔
اباجی بیمار پڑتے تو بھی اپنا فرض پورا کرتے، چاہے اسے پورا کرنے کے بعد اگلی اذان تک چارپائی پر پڑے بے چینی سے کروٹیں بدلتے وقت گزارنا پڑتا، لیکن اگلی نماز کے وقت پھر سے کھڑے ہوجاتے۔ اباجی کو اس معمول کے علاوہ اس نے کبھی کسی دوسرے کام میں مشغول نہیں دیکھا تھا۔
”کیا یہ کام ہے؟“ اس نے سوچا۔ ”کیا یہ ذریعہ روزگار ہے؟“ ایک اور سوال۔ ”اس میں ہاتھوں کی محنت تو شامل نہیں اور شاید جسم کی مشقت بھی نہیں ہے، پھر یہ کیسا کام ہے، جس کی تنخواہ بھی ملتی ہے اور جب سے اس گاؤں میں آئے تھے اس کے عوض کئی دوسری سہولتیں بھی ملی تھیں۔“
سعدیہ کلثوم کا ذہن اب کچھ ایسی باتیں سوچنے لگا تھا جن سے اسے خود بھی پتا چلتا تھا کہ وہ اب ایک لاپروا، بے نیاز اور کھلنڈری بچی نہیں رہی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنے ذہن میں آئے یہ سوال کسی سے پوچھ نہیں سکتی تھی۔ گھر میں اسے سوالوں کے جواب لینے کے لیے اماں میسر تھیں اور گھر سے باہر مس۔ مگر اس نے محسوس کیا تھا کہ اماں اس کے سوالوں سے تنگ بھی ہوتی تھیں اور جھڑکیاں بھی دیتی تھیں۔ ان کے خیال میں سعدیہ کو اپنی پڑھائی کے سوا کسی بات سے غرض نہیں ہونی چاہیے تھی اور مس سے وہ سلیبس میں شامل کتابوں کے متعلق سوال تو کرسکتی تھی، مگر یہ سوال کرنے میں جھجک آڑے آجاتی۔ اسے مس سے ڈر لگتا تھا اور اپنی ہم جماعت لڑکیوں سے اپنی ہنسی اڑانے کا بھی خیال رہتا تھا۔
رہے اباجی تو ایک تو وہ کم گو تھے، دوسرا گھر میں اباجی اور گھر سے باہر مولوی صاحب تھے۔ دونوں درجے بہت بلند تھے۔ سر اٹھا کر انہیں دیکھنے اور سوال کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ اوپر سے وہ ذرا، ذرا سی بات پر سخت پکڑ

ہوجانے کی سناؤنیاں گھر کے اندر بھی دیتے تھے اور مسجد کے لاؤڈ اسپیکر پر خطبے کے دوران ہوا کی لہروں کے دوش پر بکھرتی ان کی آواز بھی یہ ہی کام کررہی ہوتی تھی۔ ایک انجان طاقت کی پکڑ کا خوف سعدیہ کے لاشعور میں سختی سے جاگزیں ہوچکا تھا۔ جب ہی تو وہ اپنی حدود سے باہر نکلنے کا تصور نہیں کرسکتی تھی اور ذہن میں اٹھتے سوالوں کو وہ حدود سے نکل جانے کے خیال سے ذہن ودل میں ہی چھپائے رکھتی تھی، مگر نہ جانے کیوں ایسا کرنے سے اس کے ذہن ودل ہر روز ایک نئے بوجھل پن کا شکار ہوتے چلے جارہے تھے۔ اپنی محدود زندگی سے پار کی چیزیں اسے متاثر کرتیں۔ دعوت نظارہ دیتیں اور ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کو سماعت بے چین محسوس ہوتیں مگر اس کا سر نفی میں ہل جاتا اور زبان ”ہائے گناہ ہوگا“ کا راگ الاپتی رہتی۔
”مگر یہ گناہ اور ثواب کا چکر کیا ہے۔“ وہ یہ سوال بھی پوچھنا چاہتی تھی۔ ”انسان کی حدود کیا ہیں، گناہ کہاں سے شروع ہوتا ہے اور ثواب کا منبع کیا ہے۔“ مگر اسے ان سوالوں کا جواب نہ اس کا اپنا ذہن دے پاتا تھا، نہ اس کی کتابیں اور تیسرا کوئی ذریعہ نہ تھا۔
”ہم نے کل اجے دیوگن کی فلم دیکھی۔ ہائے کیا غضب کی اداکاری کرتا ہے۔“
”اجے دیوگن تو کچھ بھی نہیں، شاہ رخ کے آگے کوئی اور ہیرو مجھے نہیں اچھا لگتا۔“
”عامر خان سے شاہ رخ کا کیا مقابلہ۔ اس کی فلموں کا تو میری امی بھی انتظار کرتی ہیں۔ ہمارا کیبل والا بھی بڑا اچھا ہے، امی اسے فون کرکے کہیں کہ عامر خان کی فلم لگادو تو اسی دن لگادیتا ہے۔“
”انڈیا کے اداکاروں سے اچھا تو ہمایوں سعید ہے، ہائے کتنا اسمارٹ اور ہینڈسم ہے۔ میرا جو کزن ہے نا مجتبیٰ اس کی شکل ہمایوں سعید سے ملتی ہے۔“
”ہمارے ہمسایوں کا بیٹا شان سے ملا تھا، اس کے ساتھ تصویر کھنچوا کر آیا تھا۔“
”ہمسایوں کا بیٹا، وہی والا نا، جس کی بہن تمہاری سہیلی ہے اور تمہیں رقعے بھی لکھتی ہے۔“
”چلو بکواس نہ کرو۔ وہ کیوں مجھے رقعے لکھے گی؟“
”چلو وہ نہ سہی، اس کا بھائی لکھتا ہوگا۔“
قہقہے، مسکراہٹیں، ہاتھ پر ہاتھ مارنے کی آوازیں۔
سارا دن وہ اسکول میں اسی قسم کی باتیں اور سرگوشیاں اپنے اردگرد سنتی۔ جن لوگوں کا اس گفتگو میں ذکر ہوتا تھا وہ ان کے چہروں سے واقف نہیں تھی مگر ان کے ناموں سے اس کے کان اس لیے مانوس ہوچکے تھے، کیونکہ وہ کثرت سے اس کے اردگرد لیے جاتے تھے۔ اسکول سے چھٹی کے بعد تانگے میں بیٹھ کر تانگے کی باقی لڑکیوں کے انتظار کے دوران اس کی آنکھیں کئی نظارے کرتیں۔ گول گپوں، چاٹ، قلفی، چورن، مکئی کے دانوں، نان، ٹکی، آلو کے چپس والوں کی ریڑھیوں کے قریب کھڑے لڑکوں اور اسکول سے نکلنے والی لڑکیوں کے درمیان نظروں، مسکراہٹوں اور سرگوشیوں کے تبادلے۔ ایک مٹھی سے دوسری مٹھی میں منتقل ہونے والے رقعوں کے تبادلے۔ موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر گھر جاتی لڑکیوں کے بارے میں دوسری لڑکیوں کے قیافے۔
”یہ اس کا بھائی تو نہیں، کزن ہے۔“
”یہ اس کا کچھ نہیں لگتا، بے شرم اس کے ساتھ کہیں گھومنے گئی ہے۔“
”اس کے ماما، پاپا کو پتا نہیں چلتا۔“
”گھر میں کہتی ہے پریکٹیکل ہورہے ہیں، مس دیر سے چھٹی دیتی ہیں۔“
”وہ جو ویڈیو والے کی دکان کے آگے کھڑی ہے، اس کا ویڈیو والے لڑکے سے چکر ہے۔“
”اس کے گھر میں کمپیوٹر بھی ہے اور اس کے پاس موبائل فون بھی ہے۔“

"یہ ساری بہنیں ہی ایسی ہیں، اس کی بہن رکشے والے کے ساتھ بھاگ گئی تھی دو سال پہلے۔"

اس کے اردگرد گفتگو جاری رہتی اور سعدیہ دنیا کے رنگ ڈھنگ سے واقفیت حاصل کرتی جاتی۔ اس کے سامنے دو راہیں ہوتیں یا تو اس گفتگو سے متعلق اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کا حصہ بن جائے یا اپنے گناہ، ثواب کے سبق دل میں دہراتی رہے۔ مگر وہ ان دونوں راستوں کے درمیان کھڑی خود کو تنہا پاتی۔ اس کے قدم دونوں طرف باری باری اٹھتے اور پھر انکار میں ہلتے سر کے اشارے پر واپس اپنی جگہ پر آجاتے۔

چوہدری سردار نے جو فارم ب سعدیہ کو اپنے اثر و رسوخ سے بنوا کر دیا تھا، اس میں اس کے نویں جماعت کی طالبہ ہونے کے حساب سے اندازاً" اس کی عمر چودہ سال لکھوائی تھی۔ چوہدری صاحب نہیں جانتے تھے کہ آپا رابعہ نے سعدیہ کو ساڑھے آٹھ سال کی عمر میں پہلی بار اسکول میں داخل کروایا تھا اور قصبے سے گاؤں تبادلے اور یہاں آکر دوبارہ اسکول میں داخلے کے دوران اس کا ایک سال مارا بھی گیا تھا۔

سعدیہ کی سوچیں اس کی اصلی عمر کے مطابق پروان چڑھ رہی تھیں۔ اس کے مخمصے اور الجھنیں عمر کا تقاضا تھیں، مگر آپا رابعہ بھی اسے نویں جماعت کی چودہ سالہ بچی ہی سمجھ کر اس سے ویسا ہی برتاؤ رکھتی تھیں جیسا ان کے خیال میں اس عمر کی بچیوں سے رکھنا چاہیے تھا۔

"میرے ساتھ کی لڑکیوں نے چاہے کچھ بھی دیکھ رکھا ہو، فارم ہاؤس تو صرف میں نے ہی دیکھا ہے نا!" اپنے ذہن میں اٹھتے سوالوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے سعدیہ کو تصور کی ایک ہی پناہ گاہ میسر تھی، سو وہ اس میں پناہ لے لیتی اور اس فارم ہاؤس کا کمرہ کمرہ دوبارہ سے گھومتی۔

"ہائے ہائے۔ شام پڑ گئی اور فزکس کا سبق ابھی یاد کرنا ہے۔"

اس شام بھی وہ پڑھتے پڑھتے پہلے اپنے سوالوں میں کھوئی اور پھر ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے فارم ہاؤس کی یادوں میں۔ جب فضا میں ابھرتی مغرب کی نماز کے لیے ابا جی کی اذان کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اس نے چونک کر اپنے اردگرد بکھری کتابیں سمیٹنا شروع کر دیں۔

✲ ✲ ✲

"میں کئی دن سے تم سے کہہ رہی ہوں نور کی شادی میں پہننے کے لیے اپنے ڈریس فائنل کرلو، جو کوئی کمی بیشی ہے اس کو چیک کرو، جیولری دیکھو اپنی۔ میچنگ شوز ہیں یا نہیں، وہ بھی دیکھ لو۔" فائزہ نے بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھی ماہ نور سے کہا۔

"آخر یہ فیملی کا ایک بڑا ایونٹ ہے اور شہر کی کریم اس میں شرکت کرے گی۔ ماہ نور! ابھی تو اپنی لاپروائیوں اور بچکانہ پن سے نکل کر ذمہ دارانہ رویہ اختیار کرلیا کرو۔" اپنی بات کے جواب میں ماہ نور کی خاموشی فائزہ کو تاؤ دلا گئی۔

"آپ کو پتا بھی ہے کہ میں کتنی مصروف ہوں آج کل! مجھے چار کمپنی تیار کرنی ہیں اور ان کے لیے روزانہ اتنی خواری ہو رہی ہے کہ مجھے دن کا پتا ہے، نہ رات کا ہوش ہے۔" ماہ نور نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم شادی کا کوئی فنکشن مس نہیں کر سکتیں۔" فائزہ نے تنبیہہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "نور تمہاری اچھی فرینڈ ہے۔ افتخار بھائی اور سائرہ بھابھی تم سے اتنا پیار کرتے ہیں، اس لیے اس سلسلے میں کوئی بہانا نہیں چلے گا۔"

"وہ تو میں کرلوں گی۔" ماہ نور نے الجھتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ اتنی اچھی ڈیزائنر ہیں پلیز ممی! یہ کپڑے، جوتے میچنگ وہچنگ آپ دیکھ لیں، میرے پاس واقعی ٹائم نہیں ہے۔"

"شکل دیکھی ہے اپنی۔" فائزہ کی نظریں اس کے چہرے پر ٹک گئیں۔ "کتنے دن ہوگئے تمہیں آئی بروز شیپ کرائے، کب سے کلینزنگ نہیں کی تم نے، مینی اور پیڈی کیورنگ کے لیے کب گئی تھیں آخری بار، اپنے بال دیکھو، کیسے رف ہو رہے ہیں ماہ نور! کیا تمہارے ساتھ کی لڑکیاں پڑھائی نہیں کر رہیں، انہیں کمپنیز اور اسائنمنٹس کے لیے خوار نہیں ہونا پڑتا۔ میں نے کسی اور کو اتنا حلیے سے بے حلیہ ہوتے نہیں دیکھا جیسے تم ہو رہی ہو۔" فائزہ کو اب پر غصہ آنے لگا تھا۔

"سب ہی آج کل ایسے ہو رہے ہیں ممی! آپ کو کیا پتا کتنا کام ہے۔" ماہ نور نے بکھرے بال لپیٹ کر ان میں کیچر اٹکاتے ہوئے کہا اور اپنے ہاتھوں کو نظروں کے سامنے پھیلا کر دیکھنے لگی۔ ناخنوں کے گرد کیوٹیکلز جمع ہو رہے تھے اور ناخن بھی تراشنے والے ہو رہے تھے۔ اس نے کن انکھیوں سے فائزہ کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ سمیٹ کر گود میں رکھ لیے۔

"کوئی اور اس طرح نہیں ہو رہا۔" فائزہ نے سخت لہجے میں کہا۔ "اس روز شاہ بانو آئی تھی نا تمہیں لینے کے لیے، وہ تو پوری طرح ٹپ ٹاپ میں تھی۔ مصباح بھی ملی تھی مجھے لبرٹی میں۔ ایک دم فریش تھی۔ صوفیہ سے کل میری بات ہوئی، بتا رہی تھی ماریہ سیلون گئی ہوئی تھی۔" انہوں نے ماہ نور کی چند قریبی دوستوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "ایک تم پر ہی اسائنمنٹس اور کام کی کوئی قیامت آگئی ہے، جو چمگادڑوں جیسی شکل بنائے پھرتی ہو۔ صبح صابرہ بھابھی بھی کہہ رہی تھیں کہ ماہ نور کا خیال رکھا کرو، وہ نہ ڈھنگ سے کھاتی ہے، نہ پوری نیند سوتی ہے۔"

"انہیں کیا پتا، سوتی ہوں یا نہیں۔" ماہ نور نے جھنجلا کر کہا۔

"یہ ساتھ والے کمرے میں رہ رہی ہیں وہ۔" فائزہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "ساری رات تمہارے کمرے کی لائٹ جلتی رہتی ہے اور جب تمہیں وہ دیکھنے آئیں تو کانوں میں یہ لعنت ٹھونسے تم جاگتی ملتی ہو یا نہیں۔" فائزہ نے ماہ نور کے قریب دھرے ہیڈ فونز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یا تمہارا ٹیپ روشن ہوتا ہے یا لیپ ٹاپ کی اسکرین۔ وہ کہہ رہی تھیں کان، آنکھیں سب رہ جاتی ہیں اس لڑکی کی۔"

ماہ نور نے جھنجلا کر سر جھٹکا اور اپنا دھیان دوسری طرف کرلیا۔

"بس آپ سے میں نے کہا نا، میں نور کی شادی ضرور اٹینڈ کروں گی، صرف کپڑے وغیرہ آپ دیکھ لیں۔" کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر فائزہ کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس ویک اینڈ پر تم ماہین کی طرف چلو گی میرے ساتھ۔" فائزہ نے خشمگیں نظروں سے اسے دیکھا۔

"جی ضرور چلوں گی۔" ماہ نور نے کپڑوں، جوتوں کے جنجال سے بچ جانے کا اشارہ پا کر شکر ادا کرتے ہوئے فوراً رضامندی ظاہر کی۔

فائزہ کچھ دیر کمرے میں کھڑی اس کی طرف دیکھتی رہیں اور پھر باہر چلی گئیں۔ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ کبھی کبھار وہ ایسا سخت رویہ رکھا کرتی تھیں جو ان کے خیال میں ضروری تھا۔

"شکر ہے۔" فائزہ کے چلے جانے کے بعد ماہ نور نے دل میں کہا اور ہاتھ میں پکڑے ٹیپ کی اسکرین روشن کی، سید پور میوزک فیسٹول میں سعد سلطان رائی حانہ کا گانا گا رہا تھا۔

" We found love in a hopeless place "

اس نے گانے کے الفاظ سنے اور لاشعوری طور پر اپنے فون کی اسکرین پر انگلی پھیرتے ہوئے سعد کا نمبر نہ جانے کتنویں بار ملایا، اس کا دل مایوس تھا اور کان اس آواز کے منتظر تھے۔

"ہم معذرت خواہ ہیں، آپ کا ملایا ہوا نمبر فی الحال بند ہے۔ برائے مہربانی کچھ دیر بعد دوبارہ کوشش کیجیے۔"

اس نے گزشتہ کئی دنوں میں یہ آواز دن میں اور رات بھر کے دوران نہ جانے کتنی بار سنی تھی۔ مگر اس وقت

اس کے کانوں کو اچانک اس آواز کے بجائے کچھ اور سننے کو مل رہا تھا۔ اس کے ملائے ہوئے نمبر پر بیل جا رہی تھیں۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور پورے جسم کا خون جیسے ہڑبڑا کر اتنا تیز اوپر سے نیچے پمپ ہوا کہ اس کے دوڑنے کا احساس اس کے دماغ نے شدت سے محسوس کیا۔ ایک' دو' تین' چوتھی بیل پر دوسری جانب سے فون ریسیو کر لیا گیا۔

"السلام علیکم ماہ نور! کیا حال ہے؟" وہ مانوس آواز' وہ نرم لہجہ' ماہ نور کو اپنے اردگرد جیسے ستارے اترتے اور پھیلتے محسوس ہونے لگے۔ اسے اپنی سماعت اور حسیات پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"میں نے انتہائی مایوسی کی کیفیت میں تمہارا نمبر ملایا تھا۔"

اس کی زبان یہ بات کہتے کہتے کیسے رکی' یہ اسے خود بھی سمجھ نہیں آیا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں' تم کیسے ہو؟" اس نے خود کو ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھتے ہوئے سنا۔

"میں ایک دم فٹ ہوں۔" دوسری جانب سے جواب آیا۔

"تمہارا نمبر آف مل رہا تھا؟" ماہ نور نے کہا۔

"اوہ ہاں!" دوسری جانب سے ہنس کر کہا گیا۔ "میں پاکستان میں نہیں تھا۔ کیوں کیا تم نے کال کیا تھا؟"

ماہ نور نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ "ہاں ایک آدھ بار کال کی تھی' سوچا تمہیں یاد دلا دوں' تم نے ایک وعدہ کیا تھا۔"

"وعدہ!" دوسری جانب سے کچھ سوچتے ہوئے کہا گیا۔

"تم نے مجھے سونگ کا لنک بھیجنا تھا۔" ماہ نور کا دل چاہ رہا تھا اپنا سر پیٹ لے' مگر اس نے پھر ایک ایسی بات کر دی تھی جس پر بعد میں اسے خود پر شدید غصہ آیا تھا۔ دوسری جانب سے اتنی بے نیازی کا مظاہرہ ہو رہا تھا اور وہ پچھلے کتنے عرصے سے پاگلوں کی سی زندگی گزار رہی تھی۔

"تمہیں ملا نہیں؟" سعد کی آواز آئی۔ "آئی مین لنک تو بہت آسانی سے مل جاتا ہے۔"

"ڈھونڈنے سے سب کچھ مل جاتا ہے' مگر تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم مجھے وہ لنک بھیجو گے۔" ماہ نور کا دل چاہا سعد کا سر پھاڑ دے۔ "وعدہ تو وعدہ ہوتا ہے۔"

"اوہ! میں سخت معذرت خواہ ہوں۔ ابھی بھیجتا ہوں۔"

ماہ نور کا دل چاہا منع کر دے' مگر اس کی زبان نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔

"تم یہ بتاؤ کیسی ہو' آج کل کیا ہو رہا ہے؟" دوسری جانب سے بے تکلفی سے پوچھا گیا۔

"میں آج کل اتنی مصروف ہوں کہ سر کھجانے کی فرصت نہیں۔" ماہ نور نے پہلی بار رکھائی کا مظاہرہ کیا۔

"ارے پھر تو تمہارے سر کی جوئیں بھی مزے میں ہوں گی۔" سعد نے برجستگی کا مظاہرہ کیا۔

"سارہ خان کا کیا حال ہے۔" ماہ نور نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ اسے محسوس ہوا' اس کے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی۔

"ابھی میں اس کے پاس جا نہیں سکا' نہ ہی فون کر سکا ہوں' ٹھیک ہی ہو گی۔" ماہ نور کے دل میں خوشی کی ایک جوت نے ہلکی سی روشنی دی۔

"ماہ نور! میں چاہتا تھا کہ میں تمہیں بتا کر جاؤں کہ میں کہیں جا رہا ہوں' لیکن نہ جانے مجھے یہ خیال کیوں آیا کہ یہاں سے جانے کے بعد تم مجھے بھول نہ گئی ہو' میں نے سوچا' مجھ سے متعلق یہ بات تمہارے لیے کتنی عام سی ہو گی۔" ماہ نور کے دل میں جلنے والی جوت کی پہلی لو کو کچھ اور منور کیا۔

"میں کہیں جا رہا ہوں یا کہیں سے آرہا ہوں' تمہاری زندگی میں اس بات کی کیا اہمیت ہو گی' میں نے اس لیے

تمہیں نہیں بتایا۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"لیکن اب میں سوچ رہا ہوں میں نے غلط کیا۔" "تم نے مجھے کال کیا' تم لنک ملنے کے انتظار میں تھیں۔ شاید میں تمہیں جتا نہ سکوں' یہ دو خبریں میرے لیے کتنی اہم ہیں۔"

ماہ نور نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔

"میرا نمبر بند ملنے پر تمہیں مایوسی ہوئی ہو گی اور تم نے سوچا ہو گا کہ اسلام آباد میں جو وقت ہم نے گزارا' وہ بھی میرا ایک اور بہروپ تھا۔"

ماہ نور نے سر جھکا لیا۔

"مجھے ان باتوں کا ابھی شدت سے احساس ہو رہا ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"مگر میں نے تمہیں بتایا تھا نا شاید مجھے اپنے احساسات کو بیان کرنا نہیں آتا' میں نے تمہیں مایوس کیا نا؟"

"نن..... نہیں۔" ماہ نور نے کہا۔ "ایسی بات نہیں ہے۔"

"میں اس ٹرپ کے بارے میں کلفت کا شکار تھا' جو چیزیں مجھ پر ٹھونس دی جائیں' اکثر میں ان پر رد عمل ظاہر نہیں کر رہا ہوتا' مگر میرا رد عمل کہیں نہ کہیں' کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہو رہا ہوتا ہے۔ جب ہی میں نے کسی کو نہیں بتایا اور خاموشی سے چلا گیا۔"

"ابراہیم کو تو پتا تھا۔" ماہ نور کے منہ سے ایک اور ایسی بات نکلی جو وہ بالکل بھی کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"ابراہیم!" وہ چونکا۔ "ابراہیم تمہیں ملا تھا؟"

"نہیں۔" اب ماہ نور کو اس سوال کا جواب دینا ہی تھا۔ "میں نے اس کو کال کر کے تمہارا پوچھا تھا؟"

"ارے تمہارے پاس ابراہیم کا نمبر موجود تھا؟" وہ حیران ہوا۔

"نہیں۔" ماہ نور نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "میں نے اس کے ریستوران کے پیج سے اس کا نمبر لیا تھا۔"

"تمہیں اس سے کچھ کام تھا؟"

"مجھے اس سے کیا کام ہوتا تھا۔ میں نے اس سے تمہارا ہی پوچھا تھا' کیونکہ تمہاری کال نہیں مل رہی تھی۔"

"اوہ!" سعد کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا' وہ مسکرا رہا تھا۔

"میں نے تمہیں الجھن میں ڈال دیا' میں واقعی معذرت خواہ ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔" ماہ نور نے نیچی آواز میں کہا۔

"ایک بات کہوں ماہ نور؟" وہ کچھ توقف سے اس نے پوچھا۔

"ہاں کہو۔"

"میں نے بہت بار تمہیں مس کیا۔" ماہ نور کا دل اچھل کر حلق میں آگیا اور روشنی کی پہلی جوت نے اڑ کر گل ہو چکی قندیلوں کو یکے بعد دیگرے ایک پل میں روشن کر دیا۔

"بہت سی جگہوں اور بہت سے موقعوں پر۔"

"کچھ چیزیں اور جگہیں دیکھ کر کچھ لوگوں سے ملتے ہوئے جو خیال ہمارے ذہن میں آتے ہیں' وہ ہم ہر کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتے۔ ایسے ہی کچھ موقعوں پر مجھے تم یاد آئیں اور میں نے سوچا' جو خیال میرے ذہن میں آرہا ہے' وہ تم ہوتیں تو ضرور سمجھ جاتیں۔"

ماہ نور کچھ کہنا چاہ رہی تھی' مگر اس سے بولا نہیں گیا۔

"کیا ہوا' سو تو نہیں گئیں؟" دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

"ہیلو! کیا تم دوسری جانب موجود ہو؟" ماہ نور کی مسلسل خاموشی پر اس نے دوبارہ پوچھا۔

"ہوں!" ماہ نور چونکی۔ "میں ہوں، تم بولو پلیز۔"

"او اچھا۔" وہ ہنسا۔ "میں نے سوچا شاید میری باتیں اتنی غیر دلچسپ ہیں کہ تم سو گئیں۔"

"نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ میں انجوائے کر رہی ہوں۔" ماہ نور نے سچائی کا مظاہرہ کیا۔

"تم بہت اچھی ہو۔ بے ریا اور بے ساختہ۔" وہ بولا۔ "لڑکیوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

ماہ نور کا دل بلیوں کی طرح چھلانگیں مارنے لگا تھا۔

"ایک آدھ ہفتے میں میرا لاہور آنے کا پروگرام ہے۔ تم سے ملاقات ہو سکے گی؟" ایک اور خبر ماہ نور کو بیڈ سے اٹھ کر رقص کرانے کے لیے کافی تھی۔

"ارے ہاں پلیز، ضرور ملنا۔" دنوں کے بعد ماہ نور اپنی جون میں واپس آئی تھی۔ "میں تمہیں اپنے گھر والوں سے ملاؤں گی اور خدیجہ خالہ سے بھی اور فاطمہ خالہ سے بھی۔" وہ پر مسرت انداز میں بولتی چلی جا رہی تھی۔ "اور اگر تم ایک ہفتے کے اندر آسکتے ہو تو کھاری سے بھی، پتا ہے کھاری آج کل ادھر آیا ہوا ہے ہمارے گھر، کھاری!" اس نے سعد کے پوچھے بغیر ہی اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

"وہی کھاری جو تمہیں بلا کر لایا تھا کہ مجھے بندر کا تماشا دکھاؤ، جس کے خیال میں تمہارے بندر کی ایک آنکھ چھوٹی تھی اور بندریا لنگڑی تھی۔" وہ جوش میں آکر نہ جانے کیا کیا بولے چلی جا رہی تھی۔

"ہاں ہاں ضرور۔" سعد اس کی باتوں پر مسکرا رہا تھا۔ "تم مجھے اپنی آئی ڈی بھیجو، میں تمہیں لنک بھجواتا ہوں اور کچھ اور چیزیں بھی۔"

"رہنے دو۔" ماہ نور نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "وہ وعدہ ہی کیا جو یاد دلانا پڑے۔"

"میں نے کہا نا میں معذرت خواہ ہوں، پلیز یہ غلطی درگزر کر دو، میں تمہیں ایک کے بجائے اچھے گانوں کے دس لنکس بھجواتا ہوں جرمانے کے طور پر۔"

ماہ نور دل سے مسکرائی۔ "میں ابھی بھیجتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"جلدی پلیز، بھول نہ جانا۔"

"ہاں ہاں ابھی۔"

"اوکے، پھر اللہ حافظ، اپنا خیال رکھنا۔"

"ٹھیک ہے۔" ماہ نور نے جواب دیا اور دوسری طرف سے فون بند ہو گیا۔ ماہ نور فون ہاتھ میں لیے ہونٹ دانتوں تلے دبائے اپنی جگہ پر بیٹھی تھی، اس کے کمرے میں نیم اندھیرا چھا رہا تھا مگر اسے لگ رہا تھا ہر طرف روشنی ہی روشنی تھی۔ کمرے میں موجود قالین، فرنیچر، پردے، اپنی کتابیں اور ضرورت کی دوسری چیزیں جنہیں دیکھ کر کچھ دیر پہلے اسے الجھن ہو رہی تھی، ایک دم بہت اچھی لگنے لگی تھیں۔ ہر چیز روشن اور واضح تھی۔ اس نے بازو شانوں سے پیچھے لے جاتے ہوئے انگڑائی لی۔

"چلو، ممی سے نور کی شادی کے ڈریسز ڈسکس کر لوں، کتنے کم دن رہ گئے ہیں۔" اسے خیال آیا۔ "سلمان سے کہتی ہوں آج ڈنر باہر کرائے کھاری کو بھی لے کر چلتے ہیں۔" کھاری بے چارہ کتنے دنوں سے آیا ہوا ہے۔ اس سے آرام سے بیٹھ کر باتیں بھی نہیں کیں۔" اسے افسوس ہونے لگا۔ "تائی صابرہ کو بھی محسوس ہو رہا ہو گا، میں کتنی بری میزبان ہوں جبکہ وہ میرا اتنا خیال رکھتی ہیں۔" اس نے اپنے اردگرد بکھری چیزیں سمیٹتے ہوئے سوچا۔

"ہائے میرے اللہ" اٹھ کر چیزیں میز پر رکھتے ہوئے اس کی نظر اپنے کپڑوں پر پڑی۔ "میری جینز کتنی میلی ہو رہی ہے، کتنے دنوں سے یہ ہی جو چڑھائے پھر رہی ہوں۔"

اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے اوپر نصب لائٹ جلاتے ہوئے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ "صحیح کہہ رہی تھیں ممی، چمگادڑوں جیسی شکل ہو رہی ہے میری۔" اس نے اپنے گال پر انگلی رکھتے ہوئے سوچا اور بالوں میں انگلیاں پھیر کر انہیں سیدھا کرنے لگی۔

"ماسی سے کہتی ہوں ذرا میری بیڈ شیٹ تو بدل دے اور کمرے کی صفائی کر دے۔" پاؤں میں چپل پہن کر وہ باہر جانے لگی تو جاتے جاتے اس کی نظر بیڈ پر رکھے فون پر پڑی۔

"اوہ! آئی ڈی تو بھیجی ہی نہیں۔" اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور فون اٹھا کر اس کی اسکرین روشن کی، اس کے نام ایک پیغام آیا ہوا تھا۔

"تم سے بات کر کے میں بہت اچھا محسوس کر رہا ہوں، شکریہ ماہ نور۔"

وہ مزید کھل اٹھی اور اس کی انگلیاں تیزی سے اسکرین پر حرکت کرنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

ہیلسنکی میں موسم گرما رخصت ہو رہا تھا اور فضا پر خنکی کی چادر چھانے لگی تھی، پھر وہی منجمد کر دینے والا موسم، پھر چہار سو برف کی چادر اور اندھیرے کا راج۔ نادیہ نے ہاتھ اپنی جیکٹ کی جیبوں میں ڈالے اور اس رہائشی عمارت کی طرف چلنے لگی جس میں وہ رہتی تھی۔ شام کے سائے آسمان پر چھا رہے تھے اور دور و نزدیک عمارتوں میں روشنیاں جلائی جا رہی تھیں۔ وہ سر کو ذرا سا اوپر اٹھائے دھیان سامنے رکھے فٹ پاتھ پر اکیلی چل رہی تھی۔ دن کا یہ وہ حصہ تھا جس میں کچھ عرصہ پہلے تک وہ بھی اپنے اردگرد بھاگتے دوڑتے طالب علموں میں شامل رہتی تھی۔ وہ طالب علم جن کی شامیں کسی نہ کسی ذریعہ سے پیسے کمانے کی تگ و دو میں گزرتی تھیں۔

نادیہ کو وہ مشقت بھری شامیں کبھی نہیں بھول سکتی تھیں۔ پڑھائی کے بوجھ، لائبریریوں کے چکر، کمپیوٹر اسکرین سے نظریں چپکائے اپنا کام کر کے سر درد لیے اٹھنا اور پھر افراتفری میں کچھ کھانے کو میسر آجانے پر پیٹ میں اتار کر اگلے کام کی فکر، کوئی اخبار تقسیم کر رہا ہے، کوئی ڈاک کی تقسیم میں مصروف ہے، کوئی یونیورسٹی میں ریسرچ کا کام کر رہا ہے، کتنی بھاگ دوڑ ہے، کتنا کام، کتنی مشقت، گرما میں کئی لوگ اپنی نوکریوں سے چھٹی لے کر موسم کا مزہ لینے کے لیے گھومنے پھرنے چلے جاتے تھے، ایسے لوگوں کی عارضی طور پر خالی سیٹوں پر بھی یہ ہی طالب علم جو جاب ہنٹرز تھے، براجمان ہو جاتے تھے، گرما کمائی کے لیے بہترین سیزن ثابت ہوتا اور سرما کے آغاز پر پھر وہی خواری، پھر وہی کام، پڑھائی اور موسم کی شدت کا مقابلہ، وہ جنہیں فینش یا نارویجین زبان سے شناسائی نہیں ہوتی تھی ان کی مشکلات سوا ہوتی تھیں۔

"اف!" نادیہ نے چلتے چلتے جھرجھری لی اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے ایک نادیدہ طاقت کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے ایک لمبا عرصہ اسی طرح کی مشقت میں گزارا تھا، لیکن اب وہ روزگار کی مشقت سے آزاد تھی۔ جیکٹ کی جیب میں گھسے اس کے ہاتھ نے دائیں جیب میں رکھے کریڈٹ کارڈ کو چھو کر محسوس کیا۔ اب اس کے پاس اتنا پیسہ تھا کہ وہ ایک اچھی رہائش افورڈ کر سکتی تھی اور بغیر کام کے اور وظیفوں کی درخواستیں بھر کے بھجوانے کے اپنی پڑھائی آسانی سے چلا سکتی تھی۔

اس نے کچھ ہفتے قبل لندن میں دو دن اپنے بھائی کے ساتھ گزارے تھے اور وہاں سے واپسی کے بعد اس کے بینک کریڈٹ میں خاطر خواہ اضافہ ہو چکا تھا، آنے والے شدید موسم کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کے پاس مکمل سامان موجود تھا، اسے سڑکوں پر سائیکل کے پیڈلز گھماتے ادھر سے ادھر پڑھائی اور کام کے درمیان گھن چکر بننا نہیں پڑ رہا تھا۔ یہ جادو تھا، معجزہ تھا یا خواب، جو بھی تھا اس روز سے ایک سال قبل وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ زندگی میں کبھی کوئی آسانی بھی آسکتی تھی۔

"زندگی کی سب سے زیادہ قابل فخر بات یہ ہے کہ تم میری بہن ہو' مشکل اور ناموافق ترین حالات میں سربلند رکھ کر جینے والی میری پیاری بہن' مجھے تم پر فخر ہے۔"

اس نے ان الفاظ کو یاد کیا اور بے اختیار مسکرا دی۔ لندن سے واپسی پر اس کے ہاتھوں کی بند مٹھیوں میں خوبصورت لمحوں کی تتلیاں موجود تھیں' رنگ برنگ پروں والی خوشنما تتلیاں۔ اس نے چلتے چلتے بے اختیار جیکٹ کی جیب سے اپنے ہاتھ باہر نکالے اور اپنے بند ہاتھ کھول کر اپنی نظروں کے سامنے کیے۔ لمحوں کی تتلیاں سرک کر اڑ چکی تھیں مگر اپنے پیچھے یادوں کے اتنے خوشنما رنگ چھوڑ گئی تھیں کہ جن کے سہارے آنے والا بہت سا وقت آسانی سے کٹ سکتا تھا۔

"آئی لو یو سعد۔ زندگی کی سب سے بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ تم میرے بھائی ہو۔"

اس کی اپنی آواز نے اس کے کان کو یہ بات سنائی۔ وہ چلتے چلتے رک کر مسکرائی' اس کا رہائشی کمرہ اس کے سامنے موجود تھا اس نے ایک لمحے کے لیے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا' روشنیوں سے جھلملاتی' بلند و پست عمارتیں فضا میں پھیلتی دھند کے پیچھے چھپنے لگی تھیں۔ اس نے گردن سیدھی کرتے ہوئے اپنے سامنے موجود عمارت کو دیکھا اور سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ چابی گھمانے پر کلک کی آواز کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ کمرے میں داخل ہو گئی۔

یہ کمرہ کشادہ تھا۔ اس میں اور اس سے ملحقہ کچن اور لانڈری میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اس کے جسم کو کمرے میں داخل ہو کر سکون کا احساس ہوا اور وہ جیکٹ اتار کر صوفے پر پھینکنے کے بعد کچن کی طرف چل دی۔ کمرے میں موجود ڈریسر پر اس کے بھائی کی تازہ تصویر فریم میں جڑی رکھی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں پتا ہے کھاری! تم بہت قسمت والے ہو۔" ماہ نور نے مینگو ملیش میں اسٹرا گھماتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی مینوں پتہ اے۔" کھاری ماہ نور کے سامنے بیٹھا انار کا جوس پی رہا تھا۔ اس نے جوس کے گلاس میں رکھا اسٹرا نکال کر پلیٹ میں رکھ دیا تھا اور گلاس سے براہ راست ہلکے ہلکے گھونٹ لیتا جوس پی رہا تھا۔

"کیسے اور کیا پتا ہے؟" ماہ نور محظوظ ہوئی۔

"لو جی اج تو مہ نور بی بی موج میں آئی ہوئی ہے۔" کھاری نے ماہ نور کو کوئی جواب دینے سے پہلے دل میں سوچا۔

"اینے (اتنے) دن میں رہ چلا ادھر اس کو ویل (فرصت) نہ ملی اور اب جو میں چوہدری صیب کو پیغام بھیج بیٹھا ہوں کہ خدا بخش سے کہیں مجھے واپس لے جائے تو اس کو اتنی ذیل (فرصت) مل گئی ہے کہ یہ میرے ساتھ باتیں بھی کرنے لگی ہے اور اب مجھے لے کر گھمانے پھرانے آ گئی' بھئی بڑی سائیں لوک بی بی ہے مہ نور بی بی بھی۔ من موجی تے، درویش۔"

"بتاؤ نا' کیسے پتا ہے کہ تم خوش قسمت ہو۔" ماہ نور نے اپنا سوال دہرایا۔

"جس بندے نوں عقل نہ ہو نا مہ نور بی بی! وہ ایک طرح کا خوش قسمت ہی ہوتا ہے نا۔" کھاری نے جواب دیا۔

"وہ کیسے؟" ماہ نور نے پوچھا۔

"وہ ایسے" کھاری نے جوس کا گلاس میز پر رکھا اور دانش مندانہ انداز میں بولا "جو بندہ عقلوں پیدل ہو اور علموں بھی پیدل ہو' وہ نہ کسی کی بات بوتی (زیادہ) سمجھ سکتا ہے نہ کر سکتا ہے' نکی (چھوٹی) سی بات کرتا ہے اور مطلب موافق بات سمجھ لیتا ہے بس اللہ اللہ خیر صلا ہے' اس کے مغز پہ نہ زیادہ بھار (بوجھ) پڑتا ہے نہ کوئی ڈالنے کی

کوشش کرتا ہے' پھر خوش قسمت ہی ہویا نا وہ۔"

"ہاں۔" یہ تو بڑی پتے کی بات بتائی تم نے۔" اس نے کھاری کی بات سمجھتے ہوئے ہولے ہولے سرہلایا۔

"لیکن میں کسی اور وجہ سے تمہیں خوش قسمت کہہ رہی تھی۔"

"وہ کیا۔" کھاری نے آنکھیں جھپکتے ہوئے پوچھا۔

"میں تمہیں اس لیے خوش قسمت کہہ رہی تھی کہ یہاں بھی اور تب گاؤں میں بھی میں نے دیکھا تھا کہ سب تم سے بہت پیار کرتے ہیں' کوئی تم سے خار نہیں کھاتا' کسی کو تم برے نہیں لگتے' تم سب کے لیے بس کھاری ہو' نہ غصے سے تمہارا نام کوئی برے طریقے سے لیتا ہے نہ پیار سے تمہارا نام بگاڑا جاتا ہے۔ جدھر جاتے ہو مسکراہٹیں بکھیر دیتے ہو' منٹوں پلوں میں دوست بنا لیتے ہو' یہ بہت بڑی خوش قسمتی ہے کھاری۔" ماہ نور نے صاف دلی سے کہا۔

"اوئے ہوئے۔" کھاری نے گھٹنے پر ہاتھ مار کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "تسی بڑے بھولے ہو مہ نور بی بی۔"

ماہ نور نے پر تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

"ادھر پنڈ میں نا اپنے فارم ہاؤس میں۔" کھاری نے ہوا میں کسی سمت ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ..." اس نے آنکھیں سکیڑ کر یاد کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں تین" سچے (بلکہ) تین لوگ میرے نال بڑی خار کھاتے ہیں' کبھی چپ نہیں رہتے' جو کوئی کام غلط ہو جائے فٹ میرا نام لگا دیتے ہیں۔"

"اوہ!" ماہ نور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

"تے ادھر مسجد میں جو لڑکے ہیں نا!" اب کھاری نے ہاتھ سے اپنے عقب میں کسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ لڑکے میرا بڑا مخول اڑاتے تھے نام ڈالتے تھے' مجھے سیپارے کا سبق نہیں لینے دیتے تھے' میں تو جی بس دل پکا کر بیٹھا تھا۔" اس نے سرہلایا۔

"کس بات کا دل پکا کر بیٹھے تھے۔" ماہ نور نے کہا۔

"میں نے کہا لے وئی افتخار احمد تو کبھی کلام پاک نئیں پڑھ سکتا' تو نے کلام دے علم توں بے علم ہی رہ جانا۔"

"افتخار احمد کون ہے جسے تم نے یہ سب کہا۔" ماہ نور نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"میں جی اور کون۔" کھاری نے سینہ پھلا کر اس پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔ اچھا۔" ماہ نور کو بے اختیار ہنسی آ گئی "تم افتخار احمد ہو۔" اس نے اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کھاری کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

"تے ہور کیا۔" کھاری ہنوز سینہ پھلائے بولا "چوہدری صاحب نے بقلم خود میرا نام افتخار احمد رکھا تھا۔"

"اچھا اچھا!" ماہ نور بمشکل اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولی۔ "گڈ بھئی اچھا نام ہے۔ بہت اچھا نام ہے۔" اس نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی!" کھاری کے چہرے پر فخریہ مسکراہٹ اتر آئی "یہ تو میرا پیار دا نام اے کھاری' افتخار احمد عرف کھاری۔"

"اچھا بھئی!" ماہ نور نے سرہلایا "مجھے واقعی نہیں پتا تھا کہ تمہارا اصل نام افتخار ہے۔"

"کسی کو بھی نہیں پتا جی!" کھاری نے ہاتھ ہلا کر کہا "مجھے پتا ہے یا پھر چوہدری صاحب کو' بی بی ہوراں کو بھی شاید نہیں پتا۔"

"اچھا پھر کیا ہوا جو لڑکے تمہیں سبق نہیں لینے دیتے تھے' وہ جو بات سنا رہے تھے' وہ سناؤ۔" ماہ نور نے کھاری کی پچھلی بات کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھا۔ "تو بس پھر جی میں نے میت والے پڑے راستے تے جانا ہی چھوڑ دیا' پھر مجھے بھین جی مل گئیں 'اللہ کے کرم سے۔" اس کے لہجے میں عقیدت اتر آئی۔

"بہن جی کون؟" ماہ نور نے سلش کا آخری گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

"بھین جی پنڈ کی مسجد والے مولی صیب کی بی بی ہیں جی۔" کھاری نے بتایا "سعدیہ کلثوم نہیں۔" اس نے سرہلا کر ماہ نور سے یوں پوچھا جیسے وہ جانتی ہو۔

"کون سعدیہ کلثوم؟"

"اوہ آہو۔" وہ گردن کو ناخنوں سے کھجاتے ہوئے بولا۔ "جدھوں تسی آئے تھے' میں بھین جی کے گھر نہیں جاتا تھا ابھی' ہمارے پنڈ آئے تو انہیں کتنے ہی سال ہو گئے پر نہ پہلے کبھی چوہدری صاب نے بھیجا تھا نہ میں گیا۔ پھر جب میری ڈیوٹی ڈیری پر لگی تو میں جانے لگا مولی جی کے گھر اور بھین جی نال ملاقات ہو گئی۔ بھین جی نے میرا حوصلہ بڑھایا بس پھر انہوں نے مجھ کو بسم اللہ کرائی۔ اور اب میں خیر نال پندرھویں سیپارے چڑھ (پہنچ) گیا ہوں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" ماہ نور نے بے ساختہ کہا۔

"تو پھر سوچ لو مہ نور بی بی! ایسی گل نہیں کہ کھاری توں کوئی خار نہیں کھاتا' میرے کتنے سال ضائع ہو گئے لڑکوں کے مخول کے ہاتھوں۔ اب تو میں وڈا ہو گیا ہوں' ماسی جنت کہتی ہے مجھے اکیسواں سال لگ گیا ہے' اب میں نئیں ڈرتا مخول سے' غصے سے لڑائی سے' یہ جو میرے نام لگاتے ہیں نا' ان سے بھی نہیں ڈرتا' جھوٹے نام لگانا بڑا گناہ ہے مہ نور بی بی۔ ہے نا۔"

"ہاں بالکل!" ماہ نور مسکرائی "تم بہت پیور (خالص) ہو کھاری! اندر باہر سے ایک جیسے' تم میں کوئی بل ہے نہ فریب"

"آپ بھی بڑے پیو ہو جی۔" کھاری نے تیزی سے کہا۔

"پیو نہیں۔" ماہ نور ایک بار پھر بے ساختہ ہنسی "پیور یعنی خالص۔"

"اچھا!" کھاری نے سرہلاتے ہوئے زیر لب دہرایا "پیور۔"

"اچھا کھاری یہ بتاؤ۔" ماہ نور کو یاد آیا۔

"ہاں جی بولو۔" کھاری نے کہا۔

"تمہیں وہ بندر والا یاد ہے نا' جو پہلی بار تماشا دکھانے آیا تھا' جسے میں نے کہا تھا کہ مجھے تماشا کرنا سکھا دے۔"

"وہ۔" کھاری نے خلا میں دیکھتے ہوئے یاد کیا۔ "پہلے دن میں تھوڑا سا تماشا دیکھ کر چلا گیا تھا جنوروں کو پٹھے ڈالنے۔"

"اوہ اچھا۔" ماہ نور کو مایوسی ہوئی۔

"تو پھر منگو کے میلے والا سائیں تو یاد ہی ہو گا۔"

"او وہ کس طرح بھول سکتا ہے جی!" کھاری نے کہا "بڑا سوز تھا جی اس کی آواز میں۔"

"اوکھے پینڈے لمیاں نی راہواں عشق دیاں۔" کھاری نے ایک ہاتھ کان پر رکھ کر دوسرا بازو سیدھا کرتے ہوئے گنگنانے کی کوشش کی۔

"اوہ کھاری! یہ مارکیٹ ہے۔" ماہ نور نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اسے ڈپٹا۔

"اوہ آہو جی!" وہ سیدھا ہوتے ہوئے بولا "سائیں جی بڑے یاد آتے ہیں مجھ کو مہ نور بی بی! اللہ کرکے زندگی میں ایک بار پھر ان سے دوبارہ کچھ سننے کو مل جائے نا۔۔۔ واہ واہ۔" اس نے سر دھنا۔ کھاری کی اس بات سے ماہ نور کے دل کو ایک انجانی سی خوشی محسوس ہوئی تھی۔

"پھر تو نہیں دکھے کہیں سائیں جی؟" ماہ نور نے پوچھا۔

"نہیں جی۔" کھاری نے سرہلایا "ایس دفعہ نہ منگو دے میلے گئے نہ کوئی رونقاں ویکھیں۔" پر اگلی دفعہ ضرور جانا ہے۔ وہ جو چینی خرگوش تھا نا ادھر ہوٹل میں۔ اس سے میں نے وعدہ کیا ہے میلہ دکھانے کا۔"

"چینی تھا وہ کہ جاپانی تھا۔" ماہ نور نے اٹھتے ہوئے سوال کیا۔

"پتا نہیں جی۔ یاد نہیں رہا' چینی تھا کہ جپانی ... ان دیاں شکلاں ایک جیسی ہوتی ہیں نا نہ پتا چلتا ہے جپانی ہیں نہ پتا چلتا ہے چینی ہیں۔" کھاری نے ماہ نور کے شاپنگ بیگز اٹھا کر اس کے پیچھے چلتے ہوئے کہا پھر اسے ایک اور بات یاد آئی۔

"چائنا دیاں چیزاں ویسے ہوتی تو بے اعتباری ہیں' ہیں نا بی بی جی!"

"ہاں سنا ہے۔" ماہ نور نے کہا۔

"ماسٹر کمال نے مجھے موبیل (موبائل) دے دیا' مطلب میرے سے پیسے لے لیے موبیل (موبائل) کے بدلے' وہ چینا (چائنا) دا موبیل (موبائل) تھا دو دن چلا پھر بند' میں شہر گیا لے کے تو دکان والا بولا یہ نہیں صحیح ہوتا' یہ چائنا کا ہے' اس کی کوئی گرنٹی نہیں ہوندی۔" میں نے کہا "لے بھئی پیسے گئے۔"

کھاری مسلسل بولتا ہوا ماہ نور کے پیچھے چل رہا تھا۔ ماہ نور کا دل ہلکا تھا اور خوش بھی' کھاری خوش تھا کہ لاہور آنا اکارت نہیں گیا۔ اسے ماہ نور بی بی کے ساتھ باتیں کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

اور اس رات سرونٹ کوارٹر میں اپنی چارپائی پر لیٹے ہوئے کھاری نے سوچا تھا۔

"کتنی اچھی ہے مہ نور بی بی! کون نوکروں کو ساتھ بٹھا کر جوس پلاتا ہے۔ انہوں نے مجھے جوس بھی پلایا اور میرے ساتھ باتیں بھی کیں۔ میں بھی پاگل' ہوں ایسے ہی دل برا کر بیٹھا کہ مہ نور بی بی کو میں یاد ہی نہیں۔ وہ بے چاری پتا نہیں کتنی مصروف تھی اپنے کام میں۔ اب وقت ملا ہے تو کتنے پیار سے ملی ہے۔"

"پر کتنی چیزیں خریدیں اس نے۔" اسے یاد آیا "کپڑے' جوتے' تو میک اپ کا سامان' بندے' ہار۔" اس کی نظروں کے سامنے ان بڑی بڑی دکانوں کی روشنیوں کی چکا چوند گھوم گئی جہاں سے ماہ نور نے شاپنگ کی تھی۔

"سنا ہے بڑا وڈا ویاہ ہونا ہے چوہدری صاحب کے خاندان میں' جب ہی تو سارے چیزیں کپڑے بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ حالانکہ سب کے پاس پہلے ہی کتنے کپڑے ہیں۔ کتنی چیزیں ہیں۔ میں نے تو کبھی کسی ویاہ میں نیا جوڑا نہیں بنایا' وہ جو سلیم کی شادی پر بوسکی کا کرتا اور چٹی (سفید) شلوار سلا کر دی تھی چوہدری صاحب نے پچھلے سے پچھلے سال' وہی پہن لیتا ہوں ویاہ شادیوں' عید شبرات پر۔ کوئی مسئلہ نہیں لگتا۔ کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں۔ یہ تو بس پیسوں کا کھیل ہے۔" وہ اسی قسم کی باتیں سوچتا گہری نیند سو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"شکر اللہ کا بھین جی! جس نے اپنا گھر وکھا دیا' بلا وا دے کے بلا لیا ورنہ ہم گناہ گار کس قابل تھے جی!" آمنہ بی بی نے آپا رابعہ کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"لیکن بھین جی! حج جوانی کا ہی اچھا ہوتا ہے' ہماری عمر کے لوگ ذرا مشکل میں پڑ جاتے ہیں' خاص کر کے آخری چھ دن' آخری چھ دن مشقت کے ہوتے ہیں۔"

"مشقت کے کیسے؟" آپا رابعہ سامنے خلا میں کہیں دیکھتے ہوئے بولیں۔

"بڑا چلنا پڑتا ہے بھین جی' ٹانگیں اور جوڑ جواب دینے لگتے ہیں۔" آمنہ نے کہا "کاکا فرید مجھے کہنے لگا۔ بے بے پہیوں والی کرسی لے لیتے ہیں کرائے پر' پر میں نے کہا۔" آمنہ نے دونوں کانوں کو باری باری ہاتھ لگائے

"نہیں کاکا فرید' میں گناہ گار بڑے ترلوں' واسطوں کے بعد اللہ کے در پر پہنچی ہوں' مجھے اس در پر پہنچنے کے سارے فرض پورے کرنے دے' میں ہر جگہ خود اپنے پاؤں پر اپنی ٹانگوں سے چل کر گئی' شکر ہے اس مولا کا جس نے ہمت اور توفیق دی ورنہ میں کملی کس قابل تھی۔" آمنہ دونوں ہاتھوں پر اپنی چادر اٹھائے شکر ادا کر رہی تھی۔

"یہ لیں جی۔ میں آپ کے لیے خاص تبرک لائی ہوں۔" اس نے شاپر کھول کر تسبیح اور جائے نماز نکالی۔

"یہ جو کھجوریں ہیں' خاص ہیں جی' پنڈ کے لوگوں اور اپنی برادری میں ہم نے دوسری کھجوریں بانٹی ہیں پر آپ کے لیے خاص ہیں۔ چار ہی ہیں گنتی میں' بھورا بھورا سارے جی روز کھا لیا کرنا۔" آمنہ کے لہجے میں عاجزی تھی

"یہ چادر' یہ ٹوپی' یہ عطر مولوی جی کے لیے اور یہ بندے اور ہار کاکی سعدیہ کے لیے۔"

آمنہ اپنی دھن میں بولے چلی جا رہی تھی۔ لیکن آپا رابعہ شاید آمنہ کی بات سن نہیں پا رہی تھیں' ان کا دھیان کسی اور طرف لگ گیا تھا' ان کی نظروں کے سامنے چند پرانے منظر گھوم رہے تھے۔

"عجوہ کھجوریں۔" کسی نے پلیٹ بھر کھجوریں ان کی نظروں کے سامنے کی تھیں۔ "شکل' جنس' افادیت اور اہمیت میں سب سے اوپر' ذائقہ سب سے الگ۔ جا نمازیں۔ کسی کو توفیق ہے تو ہدیہ دے جائے نہیں تو ویسے ہی لے جائے۔"

سفید چادر کے ہالے میں نظر آتا وہ چاند چہرہ' تسبیح پھیرتی وہ موی انگلیاں' مصلے پر بیٹھ کر بلک بلک کر گناہوں کی بخشش طلب کرتی' فریاد کرتی' بلک بلک کر روتی وہ شخصیت۔

"آخرت میں سرخروئی کی تمنا بھی ہے اور کشش دنیا کی کھینچ بھی۔ میرے مولا تو اپنا رزق حلال مجھ پر وا کر دے اور میرے گناہ معاف فرما' رزق کی طلب میں مجھے پھر سے آزمائش میں پڑنے سے بچا لے۔ ارے یہ عجوہ کھجوریں' جنس میں' شکل میں' اہمیت و افادیت میں سب پر بھاری۔ کسی کو توفیق ہے تو ہدیہ دے جائے نہیں تو ویسے ہی لے جائے۔"

"یہ ماڑے غریبوں کا تحفہ ہے' بھین جی قبول کر لیں!" آمنہ بی بی نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ جھرجھری لیتی حال میں واپس آ گئیں۔

"میری قسمت کیسی اچھی ہے آمنہ بہن! کہ تم نے مجھے اس قابل سمجھا اور میرے لیے یہ تحفہ خاص لے کر آئیں۔" انہوں نے روتے ہوئے آمنہ بی بی کو گلے سے لگا لیا۔ "آؤ۔ میں تمہارے ہاتھ چوم لوں' تمہاری آنکھوں کو بوسہ دوں' جو ان سب جگہوں کو چھو کر ان کا نظارہ کر کے آئی ہیں۔" انہوں نے آمنہ بی بی کے ہاتھوں کو عقیدت سے بوسہ دیتے ہوئے کہا "دربار مصطفیٰ کی ہوائیں تمہیں چھو کر گزریں' خانہ خدا کو تمہاری نگاہوں نے اپنے سامنے پایا۔ میرا سلام کہا تھا نا۔ بتاؤ یاد سے کہا تھا نا' میری عرضی پیش کی تھی کہ نہیں؟" وہ کانپتی آواز میں بول رہی تھیں۔

"سب یاد تھا بھین جی اور سب عرض کر دیا تھا۔ عرض کیا تھا کہ مولا پاک آپ کی ایک عاجز بندی رابعہ زوجہ سراج سرفراز ملک پاکستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں بیٹھی اپنے جملہ گناہوں کی معافی کی خواست گار اور آپ کے اپنے در پر بلاوے کی منتظر ہے۔ اسے ایک بار پھر موقع عطا فرمائیے' ایک بار پھر بلا لیجیے۔"

آمنہ بی بی بلا کم و کاست ان کی عرضداشت دہرا رہی تھی اور آپا رابعہ ہاتھ سامنے پھیلائے ہل ہل کر آمین کہے جا رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

وہ گھر بہت بڑا تھا۔ اتنا بڑا کہ گھر کے مکین شاید ایک سال کے دوران خود بھی اس کے تمام حصوں کو دیکھ نہیں

پاتے تھے۔ اس گھر میں معاشرے کے طبقہ اول کی ضرورت کی ہر سہولت میسر تھی۔ سوئمنگ پول' بلیرڈ روم' چھوٹا ٹینس کورٹ' باسکٹ بال کورٹ اور بیڈمنٹن کورٹ اس بات کا مظہر تھے کہ گھر کے مکینوں کو جسمانی فٹنس میں خاصی دلچسپی تھی۔ گھر میں کئی بیڈ رومز تھے' ہر بیڈ روم کی اندرونی سجاوٹ کسی ماہر انٹیریئر ڈیزائنر اور پیسے کے بے دریغ استعمال کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ ڈرائنگ روم' مہمان خانہ' ڈائننگ روم' کچن' راہداریاں' سیڑھیاں' لانڈری' کچن سے ملحق پینٹری' لان' پودے' گھاس' سب کے سب کسی باذوق مکین کے ذہنی میلان کی خبر دیتے تھے۔ مگر اس گھر کے ساتھ ایک بد قسمتی ہمیشہ سے رہی تھی۔

کئی کنال پر پھیلے اس گھر کے اصل مالک اور مکین تعداد میں صرف دو تھے اور وہ دو بھی ایسے مکین تھے جن کے لیے یہ گھر اکثر صرف رات گزارنے کا ٹھکانا ثابت ہوتا تھا یا پھر کسی ذاتی دلچسپی کے مہمان کے لیے لنچ یا ڈنر کا طعام خانہ' باقی اوقات میں گھر کے مختلف حصوں میں ملازمین کی فوج ظفر موج پریڈ کرتی پھرتی تھی۔ گھر کی دیکھ بھال پر مامور عملے کے افسر خاص رازی اور ضوفی تھے' جن کے اصل اور مکمل نام افراز اور ضوفشاں تھے۔ دونوں میاں بیوی خاصے ہنس مکھ' پڑھے لکھے اور سمجھ دار انسان تھے۔ دونوں کے اندر اچھے منتظمین ہونے کی تمام خوبیاں موجود تھیں' اسی لیے پچھلے کئی سالوں سے اس گھر کے دیکھ بھال کی تمام ذمہ داریاں بہ حسن و خوبی پوری کر رہے تھے۔

سعد نے اس روز رازی اور ضوفی کے ساتھ دو گھنٹے تک میٹنگ بھگتائی تھی۔ اس میٹنگ میں گھر کا سالانہ بجٹ' گھر کی انٹیریئر ڈیکوریشن کی سیزنل تبدیلی پر اٹھنے والے اخراجات' مہمان داری اور کچن بجٹ' ملازمین کی تنخواہیں زیر بحث رہیں' کب کون سا ملازم ملازمت پر رکھا گیا اور کس کو کب کس وجہ سے ملازمت سے فارغ کیا گیا۔ سعد کو شاید اس میٹنگ کے کسی بھی نقطے میں دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ پورے تحمل کے ساتھ وہاں نہ صرف بیٹھا رہا بلکہ بظاہر تمام باتیں سنتا بھی رہا اور اپنی ڈائری پر دکھاوے کے نوٹس بھی لیتا رہا۔

وہ سر جھکائے گود میں رکھی ڈائری پر کچھ لکھ رہا تھا جب اسے احساس ہوا رازی اور ضوفی کی آوازیں اس کے کان میں پڑنا بند ہو گئی تھیں۔ اس نے نظریں اٹھا کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں منتظر نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے مؤدب بیٹھے تھے۔

"تو اس کا مطلب ہے' میٹنگ ختم ہوئی۔" سعد نے دل میں سوچا اور خوش ہو گیا۔

"او کے مسٹر اینڈ مسز رازی۔ یہ ایک بھرپور اور معلومات افزا بریفنگ تھی۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہم خوش ہیں مسٹر سعد! کہ پہلی بار اس سال آپ نے بریفنگ لی۔" ضوفی نے لائٹ لپ گلوس سے چمکتے ہونٹ مسکرانے کے لیے پھیلاتے ہوئے کہا۔

"اور آپ نے کسی معاملے پر جرح کی نہ بحث۔" رازی نے بھی باچھیں کھلاتے ہوئے کہا۔ "مسٹر بلال کے سامنے بریفنگ دینے کے لیے آنے سے پہلے ہماری ٹانگیں کانپ رہی ہوتی تھیں۔"

"آج بھی کانپ رہی تھیں۔" ضوفی نے اضافہ کیا "مگر یہ ان تمام سالوں میں ہونے والی سب سے خوشگوار اور آسان بریفنگ ثابت ہوئی۔"

"آپ فکر نہیں کریں۔" سعد نے مسکراتے ہوئے کہا "میں نے بہت سے پوائنٹس نوٹ کر لیے ہیں' ہم اگلے ہفتے پھر ملیں گے کیونکہ یہ میرے لیے اس قسم کی پہلی بریفنگ تھی' سو مجھے ان پوائنٹس کو ڈسکس کرنے کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہم اگلے ہفتے آج ہی کے دن اسی وقت دوبارہ مل سکیں گے۔"

سعد نے ان کی سماعتوں پر بجلی گرا کر ان کی خوش فہمی کا خاتمہ کرتے ہوئے کہا۔

"well this boss is even more tricky"

(خوب تو یہ باس زیادہ چالاک ہے)"

رازی نے نظروں ہی نظروں میں شوخی سے کہا اور سعد نے حسب عادت اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا' وہ ان دونوں پر اپنی مسکراہٹ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس بریفنگ میں صوفی اور رازی کے کامیاب ہو جانے کا مطلب ایک مکمل سال کا مزید معاہدہ ہو سکتا تھا' مگر ان دونوں کو اس کی کامیابی یا ناکامی کے بارے میں جاننے کے لیے مزید ایک ہفتہ انتظار کرنا تھا۔

"رائٹ سر۔" رازی نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ چہرے پر پھیلاتے ہوئے کہا۔

ان دونوں کے کمرے سے جانے کے بعد سعد نے وہاں تنہا بیٹھے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اس نے ان دونوں کی شاید ہی کوئی بات دھیان سے سنی تھی اور اس کا ان کی کسی بھی بات پر اعتراض کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا' مگر بریفنگ کے آخر میں ان دونوں نے اسے جیسے چیلنج کر دیا تھا' وہ دونوں اسے اتنا آسان سمجھ رہے تھے' صرف اسی احساس نے اسے ان کے نئے کانٹریکٹ کو اگلے ہفتے پر ملتوی کرا دیا تھا۔

"باس ہونا اور کوئی اختیار اپنے پاس ہونا بھی کتنی عجیب سی کیفیت ہے۔" وہ وہاں بیٹھا سوچ رہا تھا "باس کے چہرے پر پھیلے ہر نئے احساس کے ساتھ ساتھ ماتحتوں کی سانسیں چڑھتی اور ڈوبتی ہیں۔ جی سر' لیس سر' رائٹ سر' بجا فرمایا جیسے الفاظ منہ سے بے اختیار اور تواتر کے ساتھ نکلتے ہیں کیونکہ کامیاب ملازمت کا راز "باس ہمیشہ درست ہوتا ہے" جیسے مقولے میں مضمر ہوتا ہے" وہ سوچ رہا تھا۔

"اور باس کو دیکھو۔" اس نے ریوالونگ چیئر گھماتے ہوئے سوچا "کیسا الو کا پٹھا ہے' سب جانتے ہوئے بھی اس چاپلوسی پر خوش ہوتا ہے' اپنے باس ہونے پر اتراتا ہے اور ماتحت کو زچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔

کیا نظام ہے یار۔ صدیوں میں بھی نہیں بدل سکتا۔" کھڑکی کے قریب جا کر بلائنڈز کھینچتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔ کھڑکی کے شیشے کے پار لان میں نصب لائٹس جلائی جا چکی تھیں۔ لان کے دائیں جانب نصب کسی یونانی دیوی سے مشابہ مجسمہ پانی اگل رہا تھا اور پانی کی دھار چاروں کنول کے پھول جیسے کٹورے میں گر رہی تھی۔ اس نے کھڑکی کا شیشہ ہٹا کر پانی کے گرنے کی آواز سنی اور باؤنڈری وال کے اندر لان کی باؤنڈری بناتے سر اٹھا کر کھڑے سیدھے اونچے درختوں کی قطار کو دیکھا۔

دشت تنہائی میں اے جان جہاں لرزاں ہے
تیری آواز کے سائے
تیرے ہونٹوں کے سراب

اس کے فون پر کسی خاص کالر کے لیے مخصوص ٹون بجنے لگی۔ اس نے تیزی سے میز کی طرف واپس آتے ہوئے موبائل فون اٹھا لیا۔ مخصوص رنگ ٹون کے ساتھ فون پر کال کرنے والے کی تصویر بھی نمایاں ہو رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے فون آن کیا اور اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

"سعد ہیر! کیا حال ہے؟"

☼ ☼ ☼

"سارہ کے سر میں خشکی سی ہو رہی ہے' کیوں نہ اس بار اینٹی ڈینڈرف شیمپو لے جایا جائے۔" سیمی آنٹی نے اس علاقے میں موجود اس چھوٹے سے اسٹور کے ریکس پر رکھے مختلف شیمپوؤں کی بوتلوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ وہ شیمپو کی بوتل اٹھا کر اس کی خوبیاں پڑھنے میں مشغول تھیں جب اسٹور کے شیشے کے دروازے سے باہر سعد کی گاڑی پر نظر پڑی۔

"اوہ۔ اس بار یہ بہت دن کے بعد آیا۔" انہوں نے سوچا اور شیمپو واپس ریک پر رکھ کر تیزی سے اسٹور کے دروازے کی طرف لپکیں۔ اس سڑک پر گاڑیوں کی آمدورفت کم تھی' البتہ پیدل آنے جانے والوں کی تعداد کافی تھی۔ انہوں نے سعد کی گاڑی کے سامنے آتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ وہ اس کو وہیں روک لینا چاہتی تھیں۔ سعد نے انہیں دیکھ کر گاڑی کی رفتار کم کر دی اور ان کے قریب آکر گاڑی روک دی۔ گاڑی کی کھڑکی کا شیشہ نیچے ہوا اور سیمی آنٹی نے جھک کر گاڑی کے اندر جھانکا۔

"السلام علیکم سیمی آنٹی!" سعد انہیں دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

"تم یہیں رکو' میں ابھی آتی ہوں۔" سیمی آنٹی نے کہا۔

وہ تیزی سے واپس اسٹور کی طرف مڑیں اور جو چیزیں منتخب کر کے انہوں نے ہینڈ باسکٹ میں رکھی تھیں ان کا بل ادا کر کے شاپر اٹھائے چند منٹ میں باہر آ گئیں۔ سعد نے ان کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا اور وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئیں۔

"خیریت! آپ آج یہاں کیسے' کیا انجم نہیں آیا تھا۔" سعد نے کہا۔

"وہ آیا تھا' گھر میں کچھ چیزیں مرمت طلب تھیں' میں نے اسے وہ سامان لانے بھیج دیا اور خود ادھر آ گئی۔"

"اور سارہ؟" سعد نے ان کا متوقع سوال پوچھا۔ "آپ اس کو اکیلی چھوڑ آئی ہیں۔"

"نہیں' میں انجم کی بہن فاریہ کو اس کے پاس بٹھا کر آئی ہوں۔"

"لیکن وہ سارہ کو کیسے سنبھال سکے گی؟" سعد کے لہجے میں تشویش تھی۔ "میرا مطلب ہے' اسے تو معلوم نہیں کہ سارہ کو کیسے سنبھالنا ہے۔"

"وہ سنبھال لے گی۔" سیمی آنٹی کے لہجے میں اطمینان تھا۔ سعد نے کچھ کہنا چاہا مگر پھر خاموش ہو گیا۔

"سعد! میری تم سے ایک درخواست ہے۔" سیمی آنٹی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جی پلیز۔ کہیں۔"

"تم سارہ کو بچوں کی طرح ٹریٹ کرنا چھوڑ دو۔" سیمی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" سعد نے ان کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ کہ اگر تم چاہتے ہو' سارہ ایک ایکٹو زندگی کی جانب لوٹنے کی کوشش کرے تو تمہیں اس کے ساتھ اپنا رویہ بدلنے کی ضرورت ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" سعد نے ایک بار پھر ان کی طرف دیکھا۔

"کیا ہم تھوڑی دیر یہاں کہیں رک کر بات کر سکتے ہیں۔" سیمی آنٹی نے کہا۔ "میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں' لیکن وہاں گھر میں یہ ناممکن ہو گا کیونکہ اس چھوٹے سے گھر میں جہاں سوئی گرنے کی آواز بھی دوسرے کمرے میں باآسانی سنی جا سکتی ہے وہاں ایسی بات کرنا ناممکن ہے۔"

"ضرور۔" سعد نے ایک چھوٹی سی کافی شاپ کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

"میں معذرت خواہ ہوں سیمی آنٹی! میں واقعی آپ کی بات سمجھ نہیں پایا۔" سعد نے تقریباً" خالی کافی شاپ کی ایک ٹیبل کا انتخاب کرنے کے بعد سیمی آنٹی کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جانتی سعد! کہ تم سارہ کا اتنا خیال کیوں رکھتے ہو' یقیناً" تمہارے اندر ایک محبت بھرا پر خلوص دل ہے' تمہیں انسانیت سے پیار ہے۔" سیمی آنٹی نے کرسی پر بیٹھنے کے بعد کہا۔

سعد نے گہرا سانس لیتے ہوئے اپنے اردگرد دیکھا' اسے سیمی آنٹی کے اتنی لمبی تمہید باندھنے سے چڑ ہو رہی تھی۔

"لیکن سارہ کی صحت کے متعلق مجھے بھی اتنا ہی کنسرن ہے جتنا تمہیں۔" یمی آنٹی نے اس کی کوفت بھانپتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں۔" سعد نے کہا۔

"لیکن یقین جانو کہ اگر تم سارہ کو یونہی بچوں کی طرح ٹریٹ کرتے رہو گے' اس کے رونے دھونے اور شوروغل مچانے پر اسے بہلاوے دیتے رہو گے تو وہ ہمیشہ تم میں سہارا اور پناہ پا جانے کی وجہ سے خود اپنے لیے کوئی کوشش نہیں کرپائے گی۔"

"لیکن میں تو ہمیشہ اس کا حوصلہ بڑھاتا ہوں اس کی ذرا سی کوشش پر اسے بک اپ کرکے اس کو مزید ہمت باندھنے کا پیغام دینے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔" سعد نے کہا۔

"میں جانتی ہوں۔" یمی آنٹی نے کہا "مگر جب وہ ذرا سی کوشش کرتے ہوئے گرنے کے ڈر سے چیخنے لگتی ہے تو تم فوراً" اس کی انگلی پکڑ لیتے ہو۔" یمی آنٹی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تو آپ کیا چاہتی ہیں' اسے گرنے دوں۔" سعد نے عجیب سی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"ہاں!" "میں یہی چاہتی ہوں' اسے گرنے کے خوف میں مبتلا رہتے ہوئے کوشش کرنے دو' اسے اس خوش فہمی سے نکال دو کہ جیسے ہی وہ گرنے لگی' ایک شانہ فوراً" اس کو سہارا دینے کے لیے جھک جائے گا۔" سعد بے یقینی سے یمی آنٹی کو دیکھ رہا تھا۔

"ہاں!" یمی آنٹی نے یقین سے کہا۔ "میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ جب تک وہ خوف اور خوش فہمی کے اس حصار سے باہر نہیں نکلے گی۔ مکمل اور دل سے کوشش نہیں کرپائے گی' یقین جانو' یہ اس کی صحت یابی کے لیے بہت ضروری ہے۔"

"ہوں۔۔۔" "تو آپ کیا سمجھتی ہیں سارہ کے ساتھ میرا رویہ کیسا ہونا چاہیے۔" سعد نے ان کی بات پر غور کرکے سمجھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ میں تمہیں بتاتی ہوں۔" یمی آنٹی نے کہا اور نیچی آواز میں کہنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

وہ سعد کی گاڑی کا ہارن تھا جسے سارہ کے کانوں نے سنا۔

"فاریہ! دروازہ کھول کر دیکھو' سعد آیا ہے۔" اس نے اپنے کمرے سے آواز لگائی۔ کچن میں برتن دھوتی فاریہ نے بھاگ کر دروازہ کھول دیا۔ چند منٹوں بعد کچھ گفٹ پیکس اٹھائے سعد گھر میں داخل ہوا۔

"اوہ میرے خدا۔۔۔ میں۔ میری نظریں مجھے دھوکا تو نہیں دے رہیں' اس نے وہیل چیئر چلا کر اپنے کمرے سے اس کمرے میں آتی سارہ کو دیکھ کر کہا۔ جواب میں سارہ نے سر کو ذرا سا بلند کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر یوں ہلایا جیسے کہنا چاہتی ہو دیکھ لو میں نے یہ مرحلہ سر کرلیا۔

"میں بہت خوش ہوں۔" سعد نے اس کے سامنے آکر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "تم نے دیکھا یہاں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا' صرف سوچ بدل لینے کی دیر ہوتی ہے۔"

سارہ نے ہونٹ بھینچ کر مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ اسے ڈر تھا اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگیں گے۔

"میں تمہاری کال کو دیکھتے ہی چلا آیا۔" وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"تم ناراض تو نہیں کہ میں اتنے دن رابطہ نہیں کرپایا۔" اس نے سارہ کی طرف دیکھا "بالکل ٹھیک فگر بتاؤ میں کتنے دن' کتنے گھنٹے' کتنے منٹ اور کتنے سیکنڈز کے بعد آیا ہوں' یقیناً" تم نے حساب رکھا ہوگا۔"

"نہیں۔" سارہ نے سر ہلایا۔

"واقعی!" سعد ٹانگ سے ٹانگ اتارتے ہوئے سیدھا ہوا۔ "کیا یہ حقیقت ہے؟"

"ہاں یہ سچ ہے۔" سارہ نے کہا "اس بار میں نے وقت کی گنتی نہیں کی کیونکہ۔۔۔" اس نے سعد کی طرف دیکھا۔

"کیونکہ اب مجھے علم ہے کہ تم ہر وقت' کہیں بھی میرے لیے موجود ہو۔"

"اوہ" سعد نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی "ہاں۔ یہ تو تم نے صحیح کہا اور تمہیں اس کا یقین بھی ہونا چاہیے۔"

"ہاں۔ مجھے اس کا یقین ہے۔" سارہ نے کہا۔

"تم میرے لیے کیا لائے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ اس کی نظریں خوشنما کاغذوں میں پیک ان تحفوں پر جمی تھیں جو سعد اپنے ساتھ لایا تھا۔

"ہاں!" سعد نے وہ پیکٹ اٹھا کر سارہ کی گود میں رکھے۔ "کھول کر دیکھو گی یا میں مدد کروں۔"

"مجھے کوشش کرنے دو۔" سارہ نے گفٹس پر لپٹے فیتے کو ہاتھ سے اکھاڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ دو چار مرتبہ کی کوشش میں بار بار اس کی انگلیاں پھسلیں اور وہ اس فیتے کو اکھاڑنے میں ناکام رہی۔

"فاریہ بچے! قینچی لاؤ بھاگ کر شاباش۔" سعد نے دلچسپی سے یہ منظر دیکھتی قریب کھڑی فاریہ سے کہا۔ فاریہ قینچی لے کر آئی اور اس نے سارہ کی مدد کرتے ہوئے وہ فیتہ کاٹ دیا۔

"اوہ یہ چاکلیٹس۔" خوبصورت پیکنگ میں بند چاکلیٹ دیکھ کر سارہ نے مسرت سے بلند آواز میں کہا۔ دوسرے پیکٹ کا فیتہ کھلا۔ یہ ایک خوبصورت کارڈیگن اپنے اندر بند کیے ہوئے تھا۔ تیسرے پیکٹ میں ایک چھوٹی میک اپ کٹ موجود تھی' ہر چیز کو دیکھتے ہوئے سارہ کے چہرے کی مسرت اور شوق بڑھتا جارہا تھا۔ آخری پیکٹ کے متعلق اس کے دل میں کئی خیالات آرہے تھے' مگر اس کے کھلنے پر اسے اپنی تمام توقعات برعکس جو چیز دیکھنے کو ملی تھی' اسے دیکھ کر اس نے حیرت سے سعد کی طرف دیکھا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ" اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"ہاں یہ۔" سعد مسکرایا "اب تک جو بھی کچھ میں تمہارے لیے لایا' ان میں سے سب سے زیادہ دلچسپ گفٹ"

"یہ ڈو (لچکیلا ربڑ نما آٹا) ہے اور یہ کچھ ڈرائنگ بکس اور کلر پنسلز' پیسٹلز (Pastals) وغیرہ۔" سعد نے رسان سے کہا۔

"ان کو میں کیا کروں گی۔" سارہ نے حیرت سے پوچھا۔

"میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے اندر کتنی آرٹسٹک صلاحیتیں ہیں' مطلب کتنی تخلیقی صلاحیتیں تمہیں اللہ کی طرف سے ملی ہیں۔" وہ اٹھ کر اس کے قریب آیا' اور پیکٹ میں موجود ڈبوں سے ڈو نکال کر سارہ کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

"شیپ اٹ اپ ناؤ (اس سے کچھ بناؤ)" اس نے کہا۔ سارہ نے بے یقینی سے سر اٹھا کر سعد کی طرف دیکھا۔ سعد نے یوں سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہو جو میں نے کہا۔ تم نے وہی سنا۔ مرے مرے ہاتھوں سے سارا اس ڈو کو دبانے اور پھیلانے میں مصروف ہوئی۔

"ان فگرز میں جو ان ڈرائنگ بکس میں موجود ہیں۔ کلرز کیا کرو' لیکن احتیاط کرنا کلرز لائن سے باہر نہیں جانے چاہئیں اور کلرنگ بھی ہموار ہونی چاہیے' چلو دیکھتے ہیں تم میری آئندہ آمد تک کتنی بکس مکمل کرتی ہو۔"

اس رات اپنے بستر میں بیٹھ کر سارہ کو خیال آیا۔
"سعد نے آج پیکٹ کھولنے میں میری ذرا سی بھی مدد نہیں کی، اگر فاریہ کی کوشش کے دوران میرا ہاتھ قینچی سے کٹ جاتا۔" اس نے فاریہ سے ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ وہ احتیاط سے فیتہ کاٹے۔"
اس کی چھٹی حس نے اچانک اسے شدت سے اس چیز کا احساس دلایا تھا جس کی طرف اب تک اس کا دھیان نہیں گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تمہارے لیے محبت کے ساتھ۔"
ماہ نور نے اپنے ان باکس میں آئی اس میل کا عنوان پڑھا جن کے بھیجنے والے نے پہلی بار اسے میل بھیجی تھی اور مسکرادی۔ اس میل کی تمام اٹیچ منٹس سعد کی تصویریں تھیں جو اس کے حالیہ بیرونی سفر میں کھینچی گئی تھیں۔
اس نے ایک ایک تصویر دس دس بار دیکھی اس کا دل ہر تصویر کو دیکھتے ہوئے بلیوں اچھل رہا تھا۔
"صرف میرے لیے یہ تصویریں اس نے بھجوائیں اور میں ناحق اس سے اتنے دن بدگمان رہی۔" وہ سوچ رہی تھی "اب اتنی پرسنل تصویریں کوئی ہر کسی کو تو نہیں بھیجتا نا۔"
اپنے اہم ہونے کے احساس نے اس کے اندر ایک عجیب سی برقی طاقت بھردی تھی۔ وہ سعد کے بھیجے ہوئے لنکس پر کلک کرکے وہ گانے سننے لگی جو سعد کے بقول اسے بے حد پسند تھے۔ ان ہی گانوں میں سے ایک گانا انتخاب کرکے اسے سنتے ہوئے وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ کل شام ہی وہ ممی کے ساتھ ماہین کے پاس ہو کر آئی تھی۔ اس کی بھویں ٹھیک شیپ میں تھیں اور ماہین کے ہاتھوں نے اس کے چہرے کی جلد کو صاف کردیا تھا اور اب اس میں چمک بھی آگئی تھی۔ اس نے اپنے بالوں کو ایک جدید اور نئے اسٹائل میں کٹوایا تھا، جس سے اس کے چہرے کی بناوٹ بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔
"زندگی کتنی حسین اور مزے کی ہے۔"
اس نے نئی خریدی جیولری میں سے ایک آویزہ کان میں پہن کر دیکھا۔ اسی وقت ایک گانا ختم ہونے پر وہ اس سے اگلا گانا چیک کرنے کے لیے دوبارہ اپنے لیپ ٹاپ کے قریب آئی۔ اس کی میل کا صفحہ اس کے سامنے کھلا تھا۔ ایک بار پھر سعد کی تصویریں دیکھ کر سائن آوٹ کرنے سے پہلے یونہی اس کی نظریں میل کے شروع میں اپنے ایڈریس پر پڑی اور اس کی نظریں جیسے وہیں جم سی گئیں اس یاد آوری پر جی بھر کے خوش ہوتے ہوئے وہ یہ دیکھنا بھول گئی تھی کہ
"صرف تمہارے لیے محبت کے ساتھ" نامی میل اس کے علاوہ فلزا ظہور کے ایڈریس پر بھی بھیجی گئی تھی۔
(باقی آئندہ ان شاءاللہ)

مبارک باد

سلویٰ علی بٹ کے قدموں تلے جنت تعمیر ہوئی ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت سے نوازا ہے۔ اپنے گلشن کی اس ننھی کلی کا نام انہوں نے سلویٰ نور رکھا ہے۔
ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے دلی مبارک باد اور دعائیں۔ اللہ تعالیٰ سلویٰ نور کو دو جہاں کی کامیابیاں عطا فرمائے آمین۔

عنیزہ سید

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور نے "سید پور کلچرل شو" میں شرکت کے لیے اپنی دوست شاہ بانو کے ساتھ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ شاہ

بانو نے اپنے بھائی کی معرفت سید پور میں ماہ نور کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا۔ فاطمہ اور خدیجہ نے ماہ نور کو اسلام آباد میں قلزا ظہور سے ملنے کی تاکید کی۔ قلزا ظہور ان کے بچپن کی ساتھی ہے۔ بچپن میں کوئلے سے فرش اور دیواروں پر تصویریں بنانے والی قلزا ظہور اب ایک بڑی آرٹسٹ ہے مگر اسے شہرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔

مولوی سراج اور آپا رابعہ قصبے میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی سعدیہ کلثوم نویں جماعت کی طالبہ بے حد ذہین ہے۔ مولوی سراج اور آپا رابعہ کو اس بات پر فخر ہے کہ ان کی بیٹی سائنس پڑھ رہی ہے۔

ایک رات سارہ نے رکی کو خواب میں دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ سرکس میں کام کرتا تھا۔ رکی اپنے فن کا ماہر جوکر تھا۔ ماہ نور اور شاہ بانو "سید پور کلچرل شو" میں گئیں تو وہاں انہیں ایک کمہار نظر آیا۔ وہ گیلی مٹی کو بہت مہارت سے دیدہ زیب برتنوں کی شکل میں ڈھال رہا تھا۔ ماہ نور کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہ چونک گئی۔ اسے اس پر اسی شخص کا گمان ہوا، جو اسے ہر میلے میں مختلف روپ میں نظر آ رہا تھا۔

سارہ، ماہ نور سے مل کر خوش نہیں ہوئی۔ اس کا رویہ بہت روکھا اور خشک تھا۔

واپسی پر گاڑی میں ماہ نور نے سعد سے اعتراف کیا کہ وہ اب تک جتنا سعد کو جان پائی ہے، سعد اس کی نظر میں ایک قابل رشک انسان ہے، سعد نے اسے سارہ کے متعلق بتایا وہ سرکس دیکھنے گیا تھا۔ سارہ خان بلندی سے نیچے گری تھی۔ اس نے اس کی ہڈیاں ٹوٹتے اور خون بکھرتے دیکھا تھا، وہ وہاں سے واپس آگیا لیکن سارہ خان کے لیے بے چین رہا۔ وہ دوبارہ اسے ڈھونڈتے ہوئے اس سے ملنے پہنچا تو وہ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور زخم زخم جسم کے ساتھ ایک چھولداری میں پڑی موت کی منتظر تھی۔ اس کے زخموں پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں۔ سعد اس کو وہاں سے لایا اور اس کا علاج کرایا اور پھر اسے فلیٹ میں منتقل کیا۔

کھاری نے آپا رابعہ سے نماز یاد کرلی تھی اور بہت خوش تھا۔ سارہ خان نے پہلی بار سوچا سعد سے اس کا تعلق صرف ترس اور ہمدردی کا ہے اسے اپنا ماضی یاد آ رہا تھا۔ جہاں جاپانی نقش و نگار والا رکی تھا۔ جس کی جاپانی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اس کا باپ اس کے بہن بھائیوں کے ساتھ پھوپھی کے حوالے کر گیا تھا۔ باپ نے دوسری شادی کرلی تو سوتیلی ماں کے مظالم سے تنگ آکر وہ گھر سے بھاگ گیا اور قسمت اسے سرکس میں لے آئی۔

آپا رابعہ نے مولوی سراج کو بتایا کہ اسکول والوں نے سعدیہ کی پیدائش کی پرچی مانگی ہے تو وہ پریشان ہو گئے۔

ماہ نور، سارہ سے ملنے آئی اور اس نے سارہ کو بتایا کہ اس کی سعد سے صرف چند دن پہلے ملاقات ہوئی ہے۔ یہ سن کر سارہ کا رویہ اس کے ساتھ بدل گیا۔

سعد نے اپنی بہن نادیہ سے اسکائپ پر بات کی۔ وہ فن لینڈ میں بہت مشقت بھری زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کی ماں کا شوہر اس پر بری نظر رکھ رہا تھا۔ اس لیے وہ فن لینڈ آگئی۔

جیناں بھکارن نے ایک بچہ اغوا کیا لیکن پولیس نے اس سے بچہ برآمد کرلیا۔

ماہ نور کی سعد سے ملاقات ہوئی تو وہ اسے اختر کے پاس لے گیا۔ اختر نے ماہ نور کو دیکھ کر سعد سے کہا "یا تو زن یا من بانو" ایک کی قربانی دینی پڑے گی۔

اس نے ماہ نور سے کہا بی بی آپ کا دل بہت صاف ہے اور زندگی بہت پرسکون ہے لیکن آگے آپ کے لیے بہت مشکلیں ہیں۔

قلزا ظہور، سعد کو فون پر کسی تصویری نمائش کی دعوت دیتی ہیں۔ سعد اپنے فرینکفرٹ کے دورے کی وجہ سے معذرت کر لیتا ہے۔ ماہ نور، فاطمہ اور خدیجہ کو قلزا ظہور سے ملاقات کے بارے میں بتاتی ہے۔ فاطمہ ماہ نور سے سعد سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کرتی ہے۔ وہ بے دلی سے ہامی بھرتی ہے کیونکہ سید پور سے آنے کے بعد سے سعد کا فون مسلسل بند مل رہا تھا جبکہ سارہ خان کو اس نے اپنے جرمنی جانے کی اطلاع دے دی تھی۔

دسویں قسط

وہ رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب اس کے سیل فون کی بیل بجی تھی۔ اس نے فون کی اسکرین روشن کرنے سے پہلے کال کرنے والے کو دل ہی دل میں خوب کوسا تھا اور ساتھ ساتھ خود کو بھی کہیں سونے سے پہلے فون کو سائلنٹ پر لگانا بھول گیا تھا۔ سیدھے لیٹتے ہوئے اس نے آنے والی بیل کو نظر انداز کیا۔ کال ایک دفعہ بند ہوئی اور ایک وقفے کے بعد فون دوبارہ بجنے لگا۔ اس نے ایک بار پھر فون کرنے والے کو کوسا اور کروٹ لے کر فون اٹھایا۔ رات کے ڈھائی بج رہے تھے لیکن فون کرنے والے کا نام پڑھ کر اس کی جھنجلاہٹ ہوا ہو گئی اور وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

"مجھے اس بات کی کوفت کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی کہ تم نے وہ تصویریں میرے علاوہ جس کو بھجوائیں اس کا نام قلزا ظہور ہے۔"

فون کان سے لگانے پر اسے ایک کڑوی، تلخ اور غصے سے پیچ و تاب کھاتی آواز سننے کو ملی۔

"میں نے سوچا اکیلی میں ہی کیوں جاگوں تم کیوں نہ جاگو۔ اس وجہ سے۔" اس نے اس بات کے جواب میں منہ سے نکلنے والی ہنسی کو بمشکل دبایا۔

"وہ تو مس ہیولیشم تھی" اسے دیکھ کر تمہیں Strgoika Manor کا شوب یاد آگیا تھا۔ اچانک وہ تمہارے اتنے قریب کیوں ہو گئی کہ ایک میل جس کا عنوان "جسٹ فار یو" ہے تم نے اسے بھی بھجوادی۔" وہ کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح دھاڑ رہی تھی رات کی خاموشی میں فون پر بھی اس کی سانسوں کے زیر و بم کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

"کیا ہو گیا بھئی! میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔" سعد نے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اکھڑی نیند سے بوجھل ہوتی آواز میں کہا۔

"اپنی وہ میل چیک کرو، جو تم نے مجھے بھیجی ہے۔" وہ ایک بار پھر دھاڑی۔

"اس کے ایڈریسز کون کون ہیں، ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو۔"

"اوہو! لگتا ہے کوئی ٹیکنیکل بلنڈر ہو گیا ہے۔" اس کو سیکنڈز میں شرارت سوجھی۔ "دراصل میں نے اپنی حالیہ گرل فرینڈ کا نام قلزا ظہور رکھا ہوا ہے اور اس کو بھی بول دیا تھا کہ اپنی آئی ڈی اسی نام سے بنائے۔"

"حالیہ گرل فرینڈ۔" دھاڑتی آواز قدرے پست ہوئی "تم گرل فرینڈز بھی بناتے ہو؟" رقابت کا دھارا کسی اور سمت کو بہنے لگا تھا۔

"اور نہیں تو کیا۔" اب وہ مکمل طور پر جاگ چکا تھا اور اس گفتگو کا مزا لینے لگا تھا۔ "آج کے زمانے میں وہ کون سا لڑکا ہو گا جس کی گرل فرینڈز نہ ہوں۔"

"میرے بھائی سلمان کی تو کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔" وہ تیزی سے بولی۔ "وہ آج کے زمانے ہی کا لڑکا ہے اور عظمیٰ پھپھو کے تینوں بیٹوں کی بھی کوئی گرل فرینڈز نہیں ہیں۔ ساریہ کا بھائی علی۔ اتنا ہینڈسم اتنا ڈشنگ لڑکا ہے مگر انتہائی شریف ہے اس کی بھی کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔"

"اچھا تو تم مجھے بدمعاش قرار دے رہی ہو۔" وہ ہونٹ دانتوں تلے دبا کر مسکرایا۔ "ٹھیک ہے۔"

"میں صرف گرل فرینڈز کی بات کر رہی ہوں۔" جواب میں اس نے جتایا۔

"ہوتی ہیں یار! سب لڑکوں کی گرل فرینڈز ہوتی ہیں، کچھ چھپے رستم ہوتے ہیں اور کچھ میری طرح دل کے صاف اسٹریٹ فارورڈ جیسے ہیں ویسا ہی خود کو ظاہر کرنے والے۔"

"نہیں خیر exceptions بھی ہوتی ہیں۔" آواز پست ہوتے ہوتے بالکل ہی مدھم ہو گئی۔

"اچھا یہ بتاؤ تم خود کو کس کیٹیگری میں رکھتی ہو؟" سعد نے اسے مزید ستانے کا ارادہ کیا۔ "تم میری بوائے

فرینڈ تو ہو نہیں' کیونکہ تم ایک لڑکی ہو پھر تم میری کیسی فرینڈ ہو؟"

"خیر! میں تمہاری گرل فرینڈ تو ہرگز نہیں ہوں۔" وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا' بات تیر کی طرح جا کر ماہ نور کے دل و دماغ دونوں کو ہی لگی تھی۔

"تمہارا کیا خیال ہے' گرل فرینڈ کیا ہوتی ہے؟" اس نے دائیں طرف کروٹ بدل کر فون کان اور تکیے کے درمیان دباتے ہوئے کہا۔

"گرل فرینڈ۔" وہ سوچنے لگی اور پھر جواب سوجھنے پر بولی "گرل فرینڈ تو وہ ہوتی ہے جو بوائے فرینڈ کے ساتھ ڈیٹ پر جاتی ہے۔"

سعد اس بار اپنے قہقہے پر قابو نہیں پاسکا۔

"کیا ہوا؟" وہ تشویش سے بولی۔

"یہ بات ہے۔" اس نے اپنی ہنسی کو کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔ "تو پھر جب تم یہاں تھیں اور ہم دونوں ادھر گھومنے اور کھانے پینے کے لیے نکلتے تھے اور اس کے لیے پہلے طے کرتے تھے کہ کہاں جانا ہے' وہ ڈیٹ نہیں تھی کیا؟"

ماہ نور کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ اس کو کس قسم کی لڑکی سمجھ رہا تھا۔

"میرا خیال نہیں تھا کہ تم اس کو اس طرح یعنی اس نظر سے دیکھتے ہو گے۔" اس نے دکھ سے کانپتی آواز میں کہا۔

"میں سچ مچ اس کو اس نظر سے نہیں دیکھتا۔" اس کی آواز میں دکھ کی آمیزش محسوس کرکے اس نے جلدی سے کہا۔ "میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ لفظوں اور رشتوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا غلط ہے۔"

"جو بھی ہے۔" ماہ نور اس وقت گہری باتیں سمجھنے کی کوشش کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ "میرا خیال ہے مجھے پوچھنا ہی نہیں چاہیے تھا کہ تم نے وہ تصویریں کسی اور کو بھی کیوں بھیجیں' میں تمہاری نیند خراب کرنے پر معذرت خواہ ہوں۔"

"ماہ نور!" دوسری جانب سے اس کا نام اس طرح لیا گیا' جیسے کسی ایسے انسان کو مخاطب کیا جائے جس پر بہت مان ہو۔ "خبردار جو تم ناراض ہوئیں اور خبردار جو تم نے اپنا دل برا کیا۔ اس سے زیادہ خبردار جو تم نے فون بند کیا۔" ایک مان بھری دھمکی آئی۔

"یار! تم سے زیادہ سمپل لڑکی میں نے کوئی نہیں دیکھی ابھی تک۔ اگرچہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا ہوں۔" وہ کہہ رہا تھا اور ماہ نور اس کی ہر بات سنتے ہوئے بار بار یوں سر جھٹک رہی تھی جیسے اس کی کسی بات کا بھی یقین نہ کر رہی ہو۔

"پاگل! گرل فرینڈ تو ایک لفظ ہے جو عام طور پر دوست لڑکی کے لیے بولا جاتا ہے' ہم نے اپنے ذہنوں میں بس اس کا یہ ہی خاکہ بنالیا ہے کہ گرل فرینڈ وہی ہوتی ہے' جو ڈیٹ پر جاتی ہے اور پیرنٹس کو دھوکا دیتی ہے۔ ہے نا؟" اس نے رک کر پوچھا۔

"مجھے نہیں پتا۔" سوں سوں کی آواز کے ساتھ جواب آیا۔

"تمہیں یہ تو پتا ہے نا کہ تم میری اس قسم کی فرینڈ نہیں ہو' نہ ہی تم ڈیٹ پر گئی تھیں کبھی میرے ساتھ۔"

"مجھے نہیں پتا۔" پھر وہی جواب تھا۔

"کم آن ماہ نور! میں صرف تمہیں تنگ کر رہا تھا۔" ایک ذرا سے مذاق پر لینے کے دینے پڑ جانے پر بالآخر سعد نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"تم پلیز روؤ نہیں' تم سے اچھی' مخلص اور کیئرنگ دوست بائے گاڈ! کوئی دوسری نہیں ہے۔ میں تمہیں کیسی دوست سمجھتا ہوں' تمہیں اسی دن اندازہ ہو جانا چاہیے تھا۔ جس دن تم نے سوال کیا تھا کہ کیا وہ سب کچھ میں نے کسی اور کو بھی بتایا ہے' بھئی اور میرا جواب تھا۔ نہیں۔ تمہیں اپنے معاملے میں شیور ہونا چاہیے۔ جو تمہارا دل کہتا ہے نا کسی بھی بات پر' وہی سچ ہوتا ہے' وہی حقیقت ہوتی ہے۔"

"میرا دل کچھ نہیں کہتا' وہ تو بالکل بے وقوف ہے' ڈمب ہے۔" ایک اور ناراضی بھرا جواب آیا۔

"نہیں' تمہارا دل تو دنیا کے خوب صورت ترین دلوں میں سے ایک ہے کیونکہ وہ صاف' سچا اور کھرا ہے۔"

"جھوٹ نہ بولو۔" ماہ نور کے ہاتھ چہرے پر پھیلے آنسو صاف کرنے لگے۔

"میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گا؟" وہ نرمی سے بولا۔ "جھوٹ تو وہاں بولا جاتا ہے جہاں کوئی لالچ ہوتا ہے۔ کوئی نفع نقصان کا چکر ہوتا ہے' جہاں مصلحت ہوتی ہے اور جہاں دھوکا دینا مقصود ہوتا ہے۔ میرا تم سے اس طرح کا کوئی واسطہ نہیں' میرے لیے تم ایک بہت قیمتی دوست ہو جسے میں کسی بھی صورت کھونا نہیں چاہتا۔"

"سچی!" ماہ نور نے رونا دھونا بھول کر سوال کیا۔

"ہاں سچی مچی۔" وہ مسکرایا۔

"پھر تم نے فرینکفرٹ جانے سے پہلے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا۔" ماہ نور ابھی تک اس بات کو نہیں بھولی نہیں تھی۔

"غلطی ہو گئی۔" وہ فوراً بولا۔ کان پکڑ کر معافی مانگتا ہوں اور جب تک تم معاف نہیں کرو گی۔ "کان نہیں چھوڑوں گا۔"

"پہلے وعدہ کرو جہاں جاؤ گے مجھے ضرور بتا کر جاؤ گے۔" ماہ نور نے موقع غنیمت جانتے ہوئے مزید زحمت سے بچنے کا وعدہ لینے کی کوشش کی۔

"وعدہ کرتا ہوں۔ جہاں جاؤں گا' تمہیں ضرور بتا کر جاؤں گا۔"

"اور آئندہ تمہاری طرف سے آنے والی میل جو تم مجھے کرو گے' میرے علاوہ کوئی ایڈریس نہیں ہو گا۔"

"وعدہ کرتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "اف ماہ نور! میرے کان لمبے ہو جائیں گے۔ کب سے پکڑے ہوئے ہیں' اب معاف بھی کر دو۔"

"ہا۔۔۔ تم نے ابھی تک پکڑے ہوئے ہیں؟" ماہ نور نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے پوچھا۔

"تو اور کیا لال ٹماٹر ہو گئے میرے کان۔"

"چھوڑ دو چھوڑ دو پلیز۔" وہ بے قراری سے بولی۔

"اف شکر ہے۔" وہ شکر کا سانس لیتا ہوا بولا۔ "کان لمبے ہو جاتے تو لوگ تمہیں کہتے کس خرگوش کو دوست بنایا ہوا ہے۔"

"خرگوش۔" وہ ہنس دی۔ "پتا ہے جو کھاری ہے نا۔ اس نے ایک چینی یا شاید جاپانی خرگوش سے دوستی کرلی ہے۔"

"خرگوشوں کی بھی کوئی نیشنلیٹی ہوتی ہے۔" اس نے حیرت سے پوچھا "گھوڑوں' ہاتھیوں' شیروں کی سنی تھی۔"

"اوہو بھئی! یہ اصلی والا خرگوش تھوڑی ہے' یہ تو خرگوش کے کاسٹیوم والا چینی یا جاپانی لڑکا ہے' جو پنجابی بھی بولتا ہے۔"

"کمال کا بندہ ہو گا بھئی وہ ملٹی نیشنل انسان۔" وہ ہنسا۔

"کھاری بتا رہا تھا یہ خرگوش پہلے کسی سرکس وغیرہ میں کام کرتا تھا۔ اس بات سے مجھے سارہ یاد آگئی۔" ماہ نور حسب عادت رو میں آکر بولتی جارہی تھی "سارہ سے یاد آیا وہ کیسی ہے اب؟"
"سارہ بہتر ہے اور اس کے مزید بہتر ہونے کے چانسز بھی ہیں ہم اس کے لیے دعا کرنا پلیز۔"
"ہوں!" ماہ نور نے مختصر جواب دیا۔ "تم اس سے ملنے گئے تھے؟"
"ہاں! گیا تھا۔ میں اس کے لیے کچھ گفٹس لایا تھا وہ اسے دینے تھے اور اس کو دیکھنا بھی تھا۔ اس لیے گیا تھا۔"

سعد کی اس بات نے ماہ نور کے بلبوں اچھلتے دل کو زیر کرلیا تھا۔
"اچھی بات ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "اوہو کتنا ٹائم ہوگیا تمہیں سونا بھی تو ہوگا۔" پھر وہ بولی۔
"میری چھوڑو، مجھے تو تم جگا ہی چکی ہو اپنی بتاؤ تم نے سونا ہے یا نہیں؟"
"ہاں سونا تو ہے۔" وہ اسی نیچی آواز میں بولی "کل میری ایک کزن کی مایوں کا فنکشن ہے۔ بہت بڑا فنکشن ہوگا۔ ہم سب بہت ایکسائیٹڈ ہیں۔"
"تم سب؟"
"ہاں۔ میرا مطلب ہے میں اور میری باقی کزنز۔"
"گڈ! پھر انجوائے کرو۔" وہ ہنسا۔
"ٹھیک ہے اب تم سو جاؤ۔"
"ہاں پلیز! اب تم بھی سو جاؤ۔" وہ بولا اور کال منقطع ہوگئی۔
"میں جاگ گیا ہوں ماہ نور! اور اب باتھ لینے جارہا ہوں۔"
"میں نے باتھ لے لیا ہے اور اب میں تیار ہو کر ناشتا کرنے جارہا ہوں۔"
"ناشتے کے بعد اب میرا آفس جانے کا ارادہ ہے۔"
"میں ابھی ایک میٹنگ میں جارہا ہوں۔"
"میٹنگ سے فارغ ہو کر اب میں واپس اپنے آفس جارہا ہوں۔"
"آج میں آفس سے جلدی اٹھ جاؤں گا کیونکہ آج مجھے ابراہیم کے ساتھ لنچ پر جانا ہے۔"
"لنچ لے لیا اب میں فاران آفس جارہا ہوں۔ ایک کام ہے وہاں۔"
اگلے روز ماہ نور کو صبح سے شام تک سعد کی طرف سے اسی قسم کے میسجز موصول ہوتے رہے۔
"یہ کیا ہے بھئی؟" شام تک ان میسجز پر حیران ہوتے رہنے کے بعد بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا۔
"ابھی گزشتہ رات ہی کو تو تم نے وعدہ لیا تھا کہ جہاں جاؤں گا، تمہیں بتا کر جاؤں گا۔" جواب میں اس نے لکھا تھا۔
"اف!" ماہ نور نے کہا۔ "میرا مطلب یہ تھوڑی تھا۔"
"تمہارا جو بھی مطلب تھا، مجھے تو وعدہ نبھانا ہے لہٰذا ایسے میسجز کے لیے تیار رہو۔"
"نہیں۔ میں نے صرف یہ کہا تھا اگر ملک سے باہر جانے کا ارادہ ہو تو مجھے ضرور بتادیا کرو۔" ماہ نور کو اگرچہ سعد کے اس قسم کے پیغامات پر دلی مسرت محسوس ہورہی تھی مگر وہ ان سے ایک ہی دن میں دستبردار ہوگئی تھی۔
"سوچ لو پھر اسی بات پر خفا نہ ہو جانا۔"
"نہیں، ٹھیک ہے۔ تھینک یو فار یور کنسرن اینی ویز۔" ماہ نور نے کھلکھلاتے ہوئے کہا۔

☆ ☆ ☆

"اب یہ پوچھنے میں بھی کوئی حرج ہے کہ اماں! یہ بتادیں میرے کوئی ماموں، خالہ، پھوپھو، چچا ہیں یا نہیں۔ نہیں ہیں تو صاف کہہ دیں۔ یوں جھڑکیاں دے کر ٹالنا کیا بات ہوئی۔"
سعدیہ کی بات نے چولہے میں لکڑیاں رکھتی آپا رابعہ کو جیسے زوردار برقی جھٹکا لگایا تھا۔ انہوں نے چونک کر سعدیہ کی طرف دیکھا۔ اسکول کی نیلی قمیص، سفید شلوار اور بڑے سے سفید دوپٹے والی وردی میں ملبوس سعدیہ کو شاید ان دو تین سالوں میں پہلی بار غور سے دیکھا تھا۔ سعدیہ نے قد نکال لیا تھا۔ اس کا جسم بھر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بچپنے کے نشان معدوم ہوچکے تھے۔ اب ان کے سامنے اپنے آپ سے لاپروا، کھلنڈری، بات بے بات ڈر جانے والی سعدیہ کی جگہ ایک ذمہ دار، سمجھ دار اور پہلے کی نسبت پُراعتماد لڑکی بیٹھی تھی، جو لڑکپن سے جوانی کا سفر طے کرنے میں مصروف تھی۔
"تم نے اس طرح بات کرنی کس سے سیکھی؟" آپا رابعہ نے اس واضح طور پر محسوس ہوتی تبدیلی سے آنکھوں میں پیدا ہونے والی چبھن کا احساس کم کرنے کے لیے پوچھا۔
"بات کرنا کون سیکھتا ہے، بات کرنی خود بخود آجاتی ہے۔" وہ اسی لہجے میں بولی جس نے انہیں چونکایا تھا۔
"ماں سے بات کرنے کی تمیز کس نے بھلادی تمہیں؟" انہوں نے سلور کا فرائی پین اٹھا کر اس کے گھٹنوں پر مارنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ سعدیہ نے اپنے گھٹنے پیچھے کرکے خود کو اس وار سے بچالیا۔
"جہاں کسی انسان کے پاس کسی بات کا جواب نہیں ہوتا نا، وہیں وہ دوسرے پر حملہ آور ہوتا ہے اماں؟" سعدیہ نے آپا رابعہ کو سب کچھ بھول کر اپنا منہ تکنے پر لگادیا۔
"آپ نے کوئی بہانہ ہی بنانا ہے نا، غلط بیانی ہی کرنی ہے نا تو کہہ دیں کہ سارے رشتہ دار مرکھپ گئے کیونکہ جس گاؤں میں وہ رہتے تھے۔ وہاں طاعون کی بیماری پھیل گئی تھی اور اس گاؤں میں چوہوں کو پیچھے لگا کر دریا کے حوالے کرنے کے لیے کوئی باجے والا شہزادہ نہیں آیا تھا۔" سعدیہ کی آواز بلند ہوگئی۔
"یہ کیا کہ جب کوئی سوال پوچھو، جواب میں ڈنڈے، برتن، جوتے کھاؤ۔ کب تک کھاؤ بھئی۔" وہ سر اٹھا کر بول رہی تھی "اور کیوں کھاؤ۔ کوئی ناجائز بات کی ہو تو بندہ کھا بھی لے۔ میرے تو سیدھے اور جائز سوال ہوتے ہیں، پھر بھی پتا نہیں آپ کو کیوں غصہ چڑھتا ہے خیر۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی اور اپنا ململ کا سلیقے سے اوڑھا دوپٹا عادتاً ایک دفعہ اتار کر دوبارہ سر پر رکھ کر کندھوں پر پھیلاتے ہوئے مضبوطی سے بکل باندھ لی۔
"تانگہ آنے والا ہے، میں اب جاتی ہوں، خدا حافظ۔" وہ اپنے سفید فلیٹ بوٹوں سے صحن کے کچے، گیلے فرش پر نشان چھوڑتی ڈیوڑھی کے پردے کے پیچھے غائب ہوگئی۔
ہاتھ میں گندھے آٹے کا پیڑا پکڑے آپا رابعہ وہیں بیٹھی رہ گئیں۔ مولوی سراج سرفراز نے مسجد سے واپسی پر گھر کے داخلی دروازے کا ایک پٹ کھلا پایا۔
"دروازے کو کنڈی تو دھیان سے لگالیا کرو رابعہ بی بی!" وہ دروازے کو اندر سے کنڈی لگا کر ڈیوڑھی کا پردہ ہٹاتے ہوئے صحن میں آکر بولے۔ ایک غیر متوقع منظر ان کا منتظر تھا۔ چولہے میں آگ جل رہی تھی اور اس پر دھرے توے میں سے نہ صرف دھواں اٹھ رہا تھا بلکہ اس کے جلنے کی بو پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ سلور اور پیتل کے گلاس، ہلمٹوں، کٹوریوں اور ڈول پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں، سلور کا فرائی پین الٹا پڑا تھا، خشکے کی پرات قریب دھرے آپا رابعہ ہاتھ میں گندھے آٹے کا پیڑا پکڑے گم صم بیٹھی تھی۔
اس صورت حال نے کم فہم مولوی سراج سرفراز کی چھٹی تو نہیں، کوئی دوسری یا تیسری حس ضرور جگادی تھی، جو انہیں کہہ رہی تھی کہ کچھ گڑبڑ ضرور تھی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر توا چولہے سے اتار کر نیچے رکھا۔
"خیر ہے بھئی! کیا ہوا؟" انہوں نے نائلون کے ڈبے میں رکھے گندھے آٹے کو مکھیوں سے بچانے کے لیے

اس پر ڈھکن رکھا اور خود آپا رابعہ کے سامنے رکھی پیڑھی پر مریدوں کی طرح بیٹھ گئے۔

"رابعہ بی بی! خیر ہے کیا بات ہوئی؟" اپنے سوال کے جواب میں جامد خاموشی پر انہوں نے آپا رابعہ کا کند
جنجھوڑتے ہوئے ایک مرتبہ پھر سوال کیا۔

"ہوں۔" آپا رابعہ جیسے بے ہوشی کے عالم سے ہوش میں آئیں۔

"خیر ہے نا۔ کیا ہوا؟" مولوی صاحب نے رنگ برنگ موٹے نگ جڑی چاندی کی انگوٹھیوں والا ہاتھ ہلا کر پوچھا۔

"خیر کدھر ہے۔" آپا رابعہ نے دیوانوں کی طرح ہاتھ میں پکڑا پیڑا خشکے کی پرات میں پٹختے ہوئے کہا اور سر سے اترا دوپٹا سر پر جمایا۔

"ہوا کیا ہے؟" مولوی صاحب کا چوہے جیسا دل انجانے خدشات کے تصور سے لرزنے لگا۔ "رزق' رو
مسجد کی چاکری" ان کا دل ان تینوں چیزوں کے جانے کے خوف سے ہی لرزتا تھا۔

"سعدیہ بچی نہیں رہی مولوی سراج! سعدیہ جوان ہو گئی ہے۔" آپا رابعہ نے وحشت زدہ نظروں سے مولوی صاحب کی طرف دیکھا۔

"وہ سر اٹھا کر بولنے لگی ہے اور اسے اپنے سوالوں کے جوابوں کے متعلق اندازہ بھی ہونے لگا ہے۔"

"آرام سے رابعہ بی بی! آرام سے۔" مولوی صاحب نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ رابعہ بی بی کی یہ حالت نوکری' روزی' روٹی کے جانے کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی۔

"کب تک آرام سے بات کروں مولوی سرفراز؟" آپا رابعہ کو مولوی صاحب کے اطمینان بھرے لہجے پر طیش آگیا۔

"سعدیہ نے جوان تو ہونا ہی تھا نا رابعہ بی بی! اب تک وہ چھوٹی بچی ہی رہتی۔ یہ دس پاس کر لے گی تو اس کا نکا
پڑھا کر رخصت کردیں گے۔ وقتی سر اٹھانے پر سر قلم کرنے کے بھی طریقے بتاتی ہیں کتابیں۔"

"میں نے اسے ڈاکٹر بنانے کے خواب دیکھ رکھے ہیں مولوی سرفراز! سفید کوٹ والی ڈاکٹر' دل کی دھڑکن چیک
کرنے والا آلہ گلے میں ڈال کر رکھنے والی ڈاکٹر۔" آپا رابعہ وحشت زدہ لہجے میں چلائیں "پر وہ ابھی سے نشتر کا
چیرپھاڑ کرنے کی خواہش کرنے لگی ہے۔"

"میں بڑی بڑی باتیں نہیں جانتا رابعہ بی بی!" مولوی صاحب نے پیڑھی پر بیٹھے بیٹھے اپنے ہاتھ اپنے گھٹنوں
نکاتے ہوئے کہا۔ "مگر اتنا تو مجھے بھی پتا ہے کہ ڈاکٹر چیرپھاڑ کر زخموں اور بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ وہ جب تک
جان نہ لیں' بندے کے اندر مرض کیا ہے' مریض کی صرف نبض دیکھ کر دوائی نہیں دیتے' صرف تھرمامیٹر کے
پارے کا نشان دیکھ کر آگے نہیں بڑھتے۔ وہ ٹیسٹ کرواتے ہیں' ایکسرے کرواتے ہیں۔ ان کی رپورٹیں دیکھ کر
فیصلہ کرتے ہیں۔"

"آپ کو یہ پتا ہے تو اتنا بھی پتا ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کس کس مرض کو اندر چھپائے بیٹھے ہیں۔" آپا رابعہ نے
ترچھی نظروں سے مولوی صاحب کو دیکھا۔

"ہمیں ہمارے مولا نے سر چھپانے کو اچھا ٹھکانہ دے دیا۔ کھانے پینے کے مسئلے سے آزاد کردیا۔ اب ہم
امراض کے کھرنڈ کیوں کھرچیں؟" مولوی صاحب نے دہی کے ڈبے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"ہم کیوں کھرچنے لگے۔" آپا رابعہ تیزی سے بولیں "سعدیہ کلثوم کھرچنا چاہتی ہے۔ اسے شک ہو گیا ہے کہ
ہم اس سے کچھ چھپاتے ہیں۔ اسے شک ہو گیا ہے کہ ہمارے ساتھ اور ہمارے پیچھے کوئی گڑبڑ ہے۔"

"کاکی ہے ابھی سعدیہ۔" مولوی صاحب کے معدے نے بھوک اور بوجھل باتوں کے زیر اثر دہائی دینی شرو

کردی تھی "تو ایسے سوال کرنے لگی ہے۔ ذرا اور بڑی ہو گی تو سوچ لو اپنے طور پر کیا کیا نہ جاننے کی کوشش کرے گی۔" مولوی صاحب نے آپا رابعہ کی سوچ کو مزید انجانے خدشات سے لرزایا۔

"وہ۔" پھر مولوی صاحب صافے کے نیچے چھپے بالوں کو کھجاتے ہوئے بولے "ایک روٹی ڈال دو۔ اب تو دن چڑھنے کو آیا۔"

"ان کی ساری فکریں بھوک اور کھانے سے شروع ہو کر بھوک اور کھانے پر ہی ختم ہوتی ہیں۔ انہیں کیا خبر میرا دل کیسے کیسے واہموں سے لرزتا ہے۔"

آپا رابعہ نے دل میں کلستے ہوئے خشکے میں پڑا پیڑا اٹھایا اور روٹی بنانے لگیں۔

"گھی ذرا زیادہ لگالو۔ دہی پر شکر ڈال کر زیادہ گھی والی روٹی کے ساتھ کھانے کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔" مولوی صاحب نے سرمہ لگی آنکھوں سے دیسی گھی والے ڈبے کے اندر جھانکتے ہوئے فرمائش کی۔

"کھائے جائیں گھی میں تر بتر پراٹھے مولوی جی۔ بھلے جسم کے ساتھ ساتھ عقل پر بھی چربی چڑھتی چلی جائے اور وقت کے ساتھ اتنی چڑھ جائے کہ انسان اور جانور کا فرق بھی سمجھ سے باہر ہونے لگے۔"

دل ہی دل میں کلستی آپا رابعہ نے سوچا' لیکن زبان سے ایک لفظ نہیں کہا۔ شوہر کی نافرمانی کرنے والی عورتوں کی بابت وہ اتنی حکایتیں سن چکی تھیں کہ انہیں لگتا' ادھر ان کے منہ سے کوئی غلط لفظ ادا ہوا' ادھر وہ آگ کے شعلوں کے مزید قریب ہوئیں۔

☼ ☼ ☼

اس نے پندرہویں دفعہ لچک دار آٹے نما ربڑ سے گھوڑا بنانے کی کوشش کی اور پھر اس کی شکل بگاڑ دی۔ گھوڑا اس سے بن نہیں پایا۔ اب وہ مختلف رنگوں کے ڈو کے ڈبے کھول رہی تھی۔ ان ڈبوں کو کھولنے کے بعد اپنے ہاتھوں اور بازوؤں کو تیزی سے حرکت دینے کی کوشش کرتے ہوئے انہیں مختلف شکلوں میں ڈھالنے لگی۔

یمی آنٹی نے کچن میں کھانا بناتے ہوئے دوبارہ کچن اور کمرے کی درمیانی کھڑکی سے جھانک کر اسے دیکھا۔ وہ میز پر جھکی اس لچک دار ربڑ سے کھیل رہی تھی۔ تیسری بار انہوں نے چشمہ آنکھوں پر لگا کر دیکھنے کی کوشش کی کہ وہ کیا بنا رہی تھی۔ پیلے رنگ سے اس نے ایک لمبی سی رسی بنانے کی کوشش کی تھی۔ نارنجی رنگ ایک سر' ایک دھڑ' دو بازوؤں اور دو ٹانگوں میں ڈھالا پڑا تھا۔ یہ تمام اعضاء الگ الگ رکھے ہوئے تھے اور اب وہ بھورے رنگ سے نبرد آزما تھی۔

اس کا انہماک اور مسلسل اس کام میں جتے رہنا یمی کو اچھا لگ رہا تھا۔ وہ رونے' کڑھنے' مایوس رہنے اور حسرت بھری سانسیں لینے کے دور سے ایک قدم آگے بڑھنے کی کوشش میں مصروف تھی اور اس کا یہ قدم منفی لکیر کے بجائے مثبت لکیر کو چھو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے امید ہے' نمائش اچھی رہی ہو گی۔" سعد نے کافی سے لبریز پیالی کی اوپری سطح پر تیرتی جھاگ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوں!" کافی کا ایک سپ لینے پر جواب کا انتظار کیے بغیر اس کے منہ سے نکلا۔ "آپ کافی اچھی بناتی ہیں۔"

"یقیناً!" جواب میں وہ اپنے بے تاثر چہرے کو ذرا سا ہلا کر بولی۔ "میں ہر وہ کام اچھا کرتی ہوں جس میں تخلیق کا عنصر موجود ہو۔"

"یقین کیجیے یہ بھی ایک آرٹ ہے۔" سعد نے بے ساختہ کہا۔ "اور بہت دلچسپ آرٹ ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔" اس نے سعد کو غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ اور پھر اپنا دھیان اپنی پیالی کی طرف کر لیا۔

"لوگ مٹھاس سے رغبت رکھتے ہیں عموماً"۔" وہ مسکرایا۔ "تلخی میں دلچسپی رکھنے والے لوگ یقیناً" بہت مختلف اور بہت خاص ہوتے ہوں گے۔"

"یقیناً" "تم بہت اچھے انگریزی اسکولز میں پڑھے ہو گے۔ کالج یونیورسٹی میں بھی ضرور ٹاپ کیا ہو گا' پھر تمہاری اردو اتنی اچھی اور خالص کیسے ہے؟ تمہارا لب و لہجہ بھی بہت درست ہے' جبکہ تمہاری عمر کے لڑکے خصوصاً" جو تمہاری کلاس سے ہی تعلق رکھتے ہیں' ان کو تو اس زبان سے اب خار آنا شروع ہو چکی ہے۔" اس نے موضوع کو بالکل ہی بدلتے ہوئے کہا۔

"میں "جیسا دیس' ویسا بھیس" کا قائل ہوں۔ اس لیے۔" سعد نے برجستہ جواب دیا۔ "مجھے پتا تھا آپ عصر حاضر کے علامتی مصوروں کے بجائے ایک ایسی مصورہ ہیں' جس کا رشتہ اپنی زمین' ثقافت اور زبان سے بہت گہرا اور مضبوط ہے' لہٰذا آپ کے سامنے بیٹھ کر گفتگو کرتے ہوئے مجھے بہت محتاط رہنا چاہیے۔"

"تم بہت بڑے فنکار ہو" وہ خلاف توقع مسکرائی۔ "بلکہ بہت بڑے ڈراما باز ہو۔۔۔ کیوں' ایسا ہی ہے کیا؟" اس نے سوالیہ نظروں سے سعد کی طرف دیکھا۔

"بجا فرمایا آپ نے۔" سعد نے ادب سے جواب دیا۔ "بندہ ناچیز تو نکی کا بادشاہ ہو گا عنقریب۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر تعظیماً" سر کو ہلکا سا جھکاتے ہوئے کہا۔ "میرے مستقبل کے منصوبوں میں یہ منصوبہ سرفہرست ہے۔"

"فضل اور میمونہ کو جانتے ہو تم؟" جواب میں اسے ایسا سوال سننے کو ملا جس کی اسے قطعی توقع نہیں تھی۔

"وہ کون؟" اس نے ذہن میں اٹھتے چار قسم کے جوابوں میں سے ایک جواب کا انتخاب کرتے ہوئے کہا۔

"تھی ایک جوڑی۔" وہ کچھ یاد کرتے ہوئے بولی۔ "جس کسی گھر میں ان دونوں نے بطور آیا و کل وقتی ملازم نوکری کی' اس گھر کے بچوں کو خالص اردو اور درست لب و لہجہ سکھا کر ہی نکلے۔ میں نے سوچا شاید تمہارے بچپن میں وہ تمہارے گھر میں بھی کوئی تین چار سال لگا گئے ہوں' جب ہی تم اتنی خالص زبان بول رہے ہو۔"

"اچھا!" سعد نے کافی کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اب کہاں رہتے ہیں یہ دونوں؟"

"ہیں ایک قریبی گاؤں میں۔۔۔ اب تو صرف زبان ہی باقی رہ گئی ان کے پاس۔ باقی تو سب پر جھاڑو پھر گیا۔۔۔ تم کافی اور لو گے' بناؤں؟"

وہ اس سے پوچھ رہی تھی اور سعد کا ذہن اس کی بات میں اٹک کر رہ گیا تھا۔

"سعد۔۔۔ تم اور کافی لو گے؟" اس نے کافی کی پیالی سے چمچ ٹکرا کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

"جی۔۔۔ ضرور لوں گا۔" وہ چونکتے ہوئے بولا۔ "آپ کو اس گاؤں کا نام معلوم ہے کیا' جہاں وہ دونوں رہتے ہیں؟"

"تم کہاں اٹک گئے بھئی؟" وہ پیالی میں کافی پھینٹتے ہوئے بولی۔ "عرصہ ہوا مجھے ان کی کچھ خبر نہیں ملی۔ یہ تو آخری خبر تھی جو میں نے تمہیں سنائی۔"

"پلیز فلزا میم! مجھے اس گاؤں کا نام یاد کر کے بتائیے گا۔ مجھے ایسے لوگوں سے ملنے کا بہت شوق ہے۔" وہ لجاجت سے بولا۔

"اچھا! ٹھیک ہے۔ میں اپنی ڈائریاں دیکھوں گی کسی وقت۔ شاید کسی یادداشت کے خانے میں ان کا ذکر بھی موجود ہو۔" وہ سرہلا کر بولی۔

"بہت شکریہ میم!" وہ مسکرایا۔
"وہ لڑکی آج کل کہاں ہے جو تمہارے ساتھ آئی تھی یہاں؟" اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔
"وہ جو آپ کے پاس آپ کی کسی دوست کا پیغام لائی تھی؟" سعد نے جوابی حملہ کیا۔
"ہاں! وہی۔" اس نے اپنا گھنگھریالے بالوں والا سر ہلایا۔ "گرل فرینڈ تھی تمہاری کیا؟"
"اوہ!" سعد نے پیالی میز پر رکھ کر ہنستے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "کبھی وہ نظر آئے یا ملے آپ سے تو اس سے پوچھ مت لیجیے گا کہ وہ میری گرل فرینڈ ہے یا نہیں۔۔۔ وہ بہت بُرا مانتی ہے اس لفظ پر۔"
"ہوں!" جواب میں گھنگھریالے بال پھر ہلے۔ "پھر کون تھی کزن یا محبوبہ؟"
"خدا کا خوف کریں قلزا میم!" سعد نے خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "آپ اس سے مجھے مار پڑوائیں گی۔"

"پھر کون تھی وہ؟" اس نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔ "تم نے جو غیر متوقع میل مجھے بھیجی تھی جن میں تمہاری وہ تصویریں تھیں، یہ بتانے کے لیے کہ آج کل کے لڑکے کیا کچھ بنواتے ہیں، وہی میل تم نے اسے بھی کی تھی۔"
سعد نے قلزا ظہور کی اس بات پر نظریں قالین کے ڈیزائن پر ٹکاتے ہوئے کچھ دیر غور کیا۔ اسے آج کل کے لڑکوں کی سوچ پر کیے جانے والے تبصرے پر اچانک آجانے والی ہنسی کو قابو کرنا تھا اور اس اتفاق کو بھی ہضم کرنا تھا کہ ایک میل کو دو مختلف وصول کرنے والوں کا ردعمل کیسا تیکھا اور چبھتا ہوا تھا۔
"ہوں!" کچھ دیر بعد اس نے نظریں اٹھائیں اور قلزا ظہور کی طرف دیکھا۔
"میں نے آپ کو وہ تصویریں اس لیے نہیں بھجوائی تھیں کہ آپ کو بتاؤں، میں کیا کچھ ہوں، بلکہ یہ بتانے کے لیے بھجوائیں کہ میں کیا کچھ نہیں ہوں۔"
"جو کچھ تم نہیں ہو، وہ تم سے پہلی ملاقات میں ہی میں اندازہ کر چکی تھی۔" قلزا نے خشک لہجے میں جواب دیا۔
"پھر یوں سمجھ لیں کہ اس لیے بھجوائیں کہ آپ کو بتا سکوں میں آپ سے رابطے میں رہنا چاہتا ہوں۔"
"اچھا چلو! یوں ہی سہی۔۔۔ اور اس لڑکی کو؟" وہ ابرو چڑھا کر بولی۔
"اسے اس لیے کہ دراصل اسی کو بجھوائی تھیں۔" سعد کے چہرے پر ایک نرم سی مسکراہٹ پھیلی۔
"ہوں!" قلزا نے اس کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ کو دیکھا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔
"اچھی لگی تھی وہ مجھے۔" اس کا لہجہ بھی نرم ہو گیا۔ "اور میری جن دوستوں کے حوالے سے یہاں آئی تھی، وہ بھی شاندار پس منظر سے تعلق رکھتی ہیں۔"
"کیا یہ ممکن ہے کہ میں آپ کا اسٹوڈیو دیکھ سکوں؟" سعد نے اچانک موضوع بدلا۔
"وہاں کیا ہے۔" قلزا نے اپنے پھول دار جمپر کو ہاتھ سے سیدھا کرتے ہوئے کہا۔
"کچھ رنگ جو خشک ہو چکے، کچھ ادھورے کینوس، کچھ اُجڑے برش۔"
"جو بھی ہے مجھے بہت شوق ہے، مصوروں کے اسٹوڈیوز دیکھنے کا۔ کوئی دوسرا بڑا مصور تو شاید مجھے قریب بھی پھٹکنے نہ دے، لیکن آپ نے اتفاق سے مجھ جاہل پر نظر کرم فرما ہی دی ہے تو کوئی حرج تو نہ ہو گا، جو ایک نظر دیکھ لوں۔"

"ہوں!" قلزا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "چلو ٹھیک ہے۔ آؤ! اسٹوڈیو دیکھتے ہیں۔" وہ خلاف توقع جلد مان گئی۔
"ادھر سے آجاؤ۔" وہ چھوٹے سے لونگ روم سے ملحقہ اوپن کچن سے گزر کر اس کا دروازہ ایک مختصر سی راہداری میں کھولتے ہوئے بولی۔ یہ مختصر راہداری ایک طرف سے بند تھی اور اس کے دوسرے سرے پر سے

سیڑھیاں اوپر کو جا رہی تھیں۔ سیڑھیوں کے نیچے کشادہ جگہ نہ ہونے کے سبب سیڑھیاں ہر تیسری سیڑھی پر جا کر دوسری طرف کو گھوم جاتی تھیں۔
"ذرا دھیان سے قدم رکھنا۔ سیڑھیاں کم چوڑی ہیں۔" قلزا نے بجلی کا ایک بٹن دبا کر ان سیڑھیوں کی چھت پر موجود واحد انرجی سیور روشن کرتے ہوئے کہا۔ کم طاقت کا یہ انرجی سیور مدھم سی روشنی پھیلانے کے سوا کچھ نہ کر سکا تھا۔ سیڑھیوں کے آخری چکر پر لکڑی کا کمزور سا، ہلکا سبز رنگ اڑا دروازہ جڑا تھا، جس کی سنہری ناب بھی پرانی ہونے کے سبب اپنی آب کھو چکی تھی۔ قلزا نے ناب گھما کر دروازہ کھولا۔ دروازے کے دوسری طرف موجود کمرے سے نجانے کب سے بند ہوا کو باہر نکلنے کا موقع ملا تھا۔ سعد نے بے اختیار اپنے چہرے پر ہاتھ رکھا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔
"تھوڑی دیر ادھر ہی رکو۔" قلزا نے سعد سے اگلی سیڑھی پر کھڑے کھڑے کہا اور پھر آگے بڑھ کر کمرے کی ٹیوب لائٹ روشن کی۔ سعد نے تھوڑا آگے جھانک کر اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ یہ کمرہ بہت عرصے بعد کھلا تھا۔ اس کے فرش کی گرد باہر ہی سے نظر آ رہی تھی۔
"آجاؤ!" قلزا نے اپنے اول جلول سے ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ گھساتے ہوئے کہا۔
سعد اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہاں مختلف سائز کے ایزل اور ان پر رکھے کینوس دکھائی دے رہے تھے۔ دیواروں پر کچھ ادھورے چارکول اسکیچز ٹنگے تھے اور ان پر مکڑی نے خوب صورتی اور مہارت سے اپنے تار پھیلا رکھے تھے۔
"کافی گھٹن ہے یہاں۔" سعد نے دو قدم آگے بڑھ کر اس مختصر سے کمرے میں موجود واحد کھڑکی پر ہاتھ رکھے جس کے پٹ باہر کو کھلتے تھے۔
"ہاہا۔۔۔ نہیں کھلے گی۔" مختصر کمرے میں قلزا کی ہنسی کی آوازیں گونجی کہ ایک لمحے کے لیے سعد کا دل بھی لرز گیا۔ اس نے کھڑکی کی چٹخنی اتار کر اس کے پٹ باہر کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی۔ کھڑکی واقعی نہیں کھل رہی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر اس کے اوپری حصے میں جڑے گرد آلود شیشوں کو دیکھا اسے سبز پتوں کی موہوم سی شبیہہ نظر آئی۔ اس نے کھڑکی کے پٹ پوری طاقت سے باہر کی طرف دھکیلے۔ دونوں پٹوں کی درمیانی جگہ سے اسے کسی پیچ دار بیل کی موٹی شاخیں کھڑکی سے لپٹی محسوس ہوئیں۔ اس نے دونوں پٹوں کی درمیانی جگہ سے آنکھیں جوڑ کر باہر جھانکنے کی کوشش کی پیچ در پیچ بیل کی پتلی اور موٹی شاخوں نے کھڑکی پر قبضہ کر رکھا تھا۔
"ہاہا۔" عقب میں ایک بار پھر قلزا ظہور کے قہقہے کی آواز ابھری۔ گرد، جالے، ادھورے کینوس، رنگوں کے زنگ آلود ڈبے، کھڑکی سے لپٹی بیل اور یہ قہقہہ۔۔۔ سعد کو یوں لگا جیسے وہ پیچھے مڑ کر دیکھے گا تو اسے قلزا ظہور کے بجائے لمبے دانت منہ سے باہر نکالے، خون آلود ہونٹوں والی، خون آشام چڑیل کھڑی ملے گی۔
"واہ! کیا فیری ٹیل سچویشن ہے۔" اس نے کھڑکی کی طرف رخ کیے سوچا۔ پھر آرتھر کانن ڈائل کی کسی کہانی کے منظر کا اسے خیال آیا۔
"ویسے اگاتھا کرسٹی کے کسی کردار کی طرح جو یہاں ابھی میرا قتل ہو جاتا ہے تو اخبار اور ٹی وی کیسے اسکوپس تیار کریں گے۔"
اس نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنے سیل فون پر بغیر دیکھے ایک پیغام ٹائپ کیا اور ایک نمبر پر بھیج دیا۔ میسج ڈیلیور ہو جانے کی ٹون سن لینے کے بعد وہ مسکراتے ہوئے پیچھے کی طرف مڑا۔ اس کی تمام توقعات غلط ثابت ہوئیں۔ اس کے سامنے قلزا ظہور اپنے جمپر اور اول جلول ٹراؤزر میں ملبوس سینے پر ہاتھ باندھے دروازے سے ٹکی کھڑی تھی۔

"دیکھا میرا اسٹوڈیو۔ کیسا لگا؟" وہ مسکرائی۔

"ویسا ہی جیسا بڑے مصوروں کا ہونا چاہیے۔" سعد نے اب وہاں موجود کینوس ایک ایک کر کے دیکھنے شروع کیے۔

"کافی تیز رنگ استعمال کرتی ہیں آپ؟" اس نے تبصرہ کیا۔

"کرتی تھی۔" جواب آیا۔

"تھی کیا مطلب؟" سعد نے اس کی طرف دیکھا۔

"میں نے اب پینٹنگز اور چارکول اسکیچ بنانے چھوڑ دیے ہیں۔ یہ میرے آخری 'آخری اور ادھورے کینوس ہیں۔ یہ وہیں رک گئے' جہاں میں نے انہیں چھوڑا تھا۔"

"مگر کیوں چھوڑا۔ یہ کمال کا کام ہے۔" سعد نے ایک کینوس پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے ہاتھ پھیرنے سے کینوس پر پڑی گرد اس کی انگلیوں پر چپک گئی۔ اس کینوس کے نیچے اس ادھوری پینٹنگ کا عنوان لکھا تھا۔ سعد نے تیزی سے ان لکھے ہوئے الفاظ پر سے گرد صاف کی۔

I want to be a bride when I grow up

(میں بڑی ہو کر دلہن بننا چاہتی ہوں۔)

اس نے یہ عنوان پڑھا اور پینٹنگ پر غور کیا' یہ سلک پر واٹر کلر میں پینٹ کیا گیا ایک ادھورا منظر تھا۔ ایک بچی کے دھڑ پر ایک دلہن کا سر جس پر تیز رنگوں کی آمیزش سے ادھورا سا دوپٹا اوڑھایا گیا تھا۔ وہ دلہن جس سمت دیکھ رہی تھی وہ حصہ بالکل ادھورا تھا۔ اسے مایوسی ہوئی۔ اس نے ادھورے حصے میں کچھ تلاش کرنے کے لیے اس پر ہاتھ پھیرا۔

"یہ سلک خاصا پرانا ہو چکا ہے۔ اتنی زور سے اسے ہاتھ سے صاف کرو گے تو پھٹ جائے گا۔"

اسے فلزا کی آواز سنائی دی۔ اپنی کوشش ترک کرتے ہوئے وہ دوسرے کینوس کی طرف متوجہ ہوا اور بری طرح چونک گیا۔ اس پینٹنگ میں ایک لڑکی کے بچہ پیدا کرنے کا ادھورا منظر تھا۔ اس تصویر پر سرخ رنگ کا راج تھا۔ اس نے درد زدہ لڑکی کے چہرے کے تاثرات پر نظر ڈالی جو گرد کی تہہ کے نیچے بھی اتنے واضح نظر آ رہے تھے کہ وہ مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔

"Midnight in heaven"۔

(جنت میں آدھی رات۔) اس پینٹنگ کا عنوان بھی انتہائی چونکا دینے والا تھا۔ اس نے مڑ کر فلزا کو دیکھا۔

"یہ اب تک کی آخری پینٹنگ ہے۔" وہ جیسے نیند میں بول رہی تھی۔

"اس کے بعد میں نے کچھ شروع کیا' نہ اس کو مکمل کیا۔" اس کی آواز جیسے نامحسوس ہوا میں سرسرا رہی تھی۔ سعد نے کچھ دیر اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے فلزا کو دیکھا اور پھر ہاتھ آگے کرتے ہوئے بولا۔

"چلیں۔"

"ہاں! چلو۔" فلزا نے سرہلاتے ہوئے اسے دیکھا۔ سعد کے چہرے پر تناؤ تھا۔ اس کے ہونٹوں پر خاموشی سی تن گئی تھی۔ شاید اس کے جبڑے ایک دوسرے کے ساتھ جڑ گئے تھے کیونکہ اس کے جبڑے کی ہڈیاں صاف' کھنچی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے بھی وہ خاموش رہا تھا۔

لونگ روم میں واپس پہنچ کر اس نے میز پر رکھے ٹشو پیپر باکس سے ٹشو پیپر نکالا اور اپنے ہاتھ صاف کرنے لگا۔

"کچن کے سنک پر سینیٹائزر (sanitlizer) رکھا ہے' ہاتھ دھو لو۔" فلزا نے اوپن کچن کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بغیر کچھ کہے سنک کی طرف چل دیا۔

ہاتھ دھونے کے بعد وہ فلزا کی طرف مڑا۔

"کچھ چیزوں کا نہ دیکھنا' ان کو دیکھنے سے بہتر ہوتا ہے نا؟" فلزا نے کہا۔

"میں اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا۔" اس نے بھاری آواز میں جواب دیا "چیزیں اور حقیقتیں کیسی ہی ظالمانہ کیوں نہ ہوں' انہیں دیکھنے کی ہمت ہونی چاہیے۔" پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"میں اب چلتا ہوں۔"

"عشائیے کا وقت ہو رہا ہے۔ کھانا کھا کر جانا۔" اس نے جیسے سعد کا موڈ خوش گوار کرنے کے لیے گاڑھی اردو کا استعمال کیا۔

"پھر کبھی سہی۔" اس نے کہا۔

"میں اب منی ایچرز اور کیلی گرافی پر کام کرتی ہوں۔ وہ الگ کمرہ ہے' جہاں بیٹھ کر میں خطاطی کرتی ہوں۔ وہ نہیں دیکھو گے؟"

"میں آپ کے پاس اکثر آیا کروں گا۔۔۔ لہٰذا اسے پھر کسی دن دیکھ لوں گا۔"

"میں زیتون اور مشروم کا سلاد بہت اچھا بناتی ہوں۔ اگر تم مجھے صرف پندرہ سے بیس منٹ دو تو۔" فلزا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے آپ کو بتایا نا۔۔۔ میں آپ کے پاس اب اکثر آیا کروں گا۔" اس نے نرمی سے فلزا کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کے پاس عشائیہ' ظہرانہ اور فجرانہ سب کروں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"تم یقیناً بہت مختلف ہو۔" فلزا نے کہا۔

"نہیں! میں بالکل ویسا ہی ہوں۔ صرف میں کہنے والی بات دل میں رکھنے کے بجائے کہہ دیتا ہوں۔"

سعد نے جواب دیا اور لونگ روم کے میز سے اپنی گاڑی کی چابیاں اٹھا کر باہر نکل آیا۔ چھوٹے سے پورٹیکو میں فلزا کی وٹز (Vitz) کھڑی تھی۔ وہ گاڑی کو کراس کر کے گیٹ کے قریب پہنچا اور لاشعوری طور پر سر اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس گھر کی مشرقی دیوار پر نیچے سے لے کر اوپر تک بیل پھیلی تھی۔ رنگ رنگ کر اوپر چڑھتی بیل پیچ و خم کا شاہکار تھی اور یہی بیل اوپر جا کر لکڑی کی اس رنگ اڑی کھڑکی پر بھی چڑھی تھی' جس کے پیچھے فلزا ظہور کا ادھورا جہاں ویران پڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آپ بن سرکس میں کام نہیں کرتے ہو؟" کھاری نے لاہور میں اپنے واحد دوست سے پوچھا۔ یہ دوست بھی چوہدرانی کے اس دورہ لاہور کے دوران ہی ملا تھا' جس میں چوہدرانی کے ساتھ کھاری اپنی ڈیوٹی لگ جانے پر کبھی خوش ہوتا اور کبھی اس سے اوبھ جاتا۔

"نہیں یار! اب سرکس میں کام کرنے کو دل نہیں چاہتا۔" اس کے دوست نے جواب دیا تھا۔

"اچھا جی! پر میں نے سنا تھا (کافی) پیسے لبھ (مل) جاتے ہیں سرکس میں۔" کھاری نے چوکیدار کا فون ایک کان سے اتار کر دوسرے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"پیسے ہی کمانے ہیں نا کھاری صاحب! تو سرکس میں نہ سہی' کسی اور جگہ لوگوں کو ہنسا کر کما لیں۔ کیا فرق پڑتا ہے۔"

"آہو! یہ تو سولہ آنے سچی بات آکھی تساں نے اپنا۔۔۔" کھاری نے نام یاد کرنے کی کوشش کی۔ "کیا نام بتایا تھا

تساں اپنا؟"

"محمد رضوان الحق۔"

"ہیں جی!" کھاری اتنے زیادہ اسلامی نام کی بالکل بھی توقع نہیں کر رہا تھا۔

"ادھر ہمارے فارم ہاؤس پر جو آتے ہیں نا جاپانی اور چینی' ان کے نام تو اوکھے اوکھے (مشکل) ہوتے ہیں۔ پنگ کرکے' کبھی چنگ کرکے' کبھی ژاؤ ژاؤ۔ نام لو تو ہنس ہنس کے پیٹ دوہرا ہو جائے بندے کا۔" کھاری زور سے ہنسا۔

"میں مسلمان ہوں کھاری بھائی! الحمدللہ۔"

"او ہو وئی (بھئی) واہ جی واہ۔" کھاری بچوں کی طرح خوش ہوا۔ "تساں نے نماز تے قرآن سیکھ لیا ہوا ہے؟"

"ہاں! وہ بھی آتا ہے الحمدللہ۔"

"واہ بھئی بھائی محمد رضوان الحق! تسی ادھر ہمارے فارم ہاؤس پر ضرور آنا۔ میں آپ کو اپنی بھین جی سے ملاؤں گا۔ وہ بڑے خوش ہون (ہوں) گی تساں نال مل کے۔"

"ضرور کھاری بھائی! میں تب آؤں گا جب میلہ ہو گا۔ مجھے میلوں کے ہنگھوڑوں والے جھولے بہت پسند ہیں۔"

"اوئے ہوئے ہوئے۔" کھاری نے خوشی سے اچھلتے ہوئے اپنی ران پر ہاتھ مارا۔

"ایک واری جب میں نکا کاکا تھا نا! مائی جنتے کے ساتھ ہنگھوڑوں والے جھولے پر بیٹھ گیا تھا۔ لو جناب! ہمارا والا ہنگھوڑا ہی الٹ گیا۔ دب کے سٹ (بری طرح چوٹ) لگی میرے متھے پر گڑومو (سوجن) پڑ گیا تھا۔ گڑومو سمجھتے ہو تسی؟" کھاری کو اچانک مخاطب کی مختلف قومیت یاد آ گئی۔

"مجھے سب سمجھ ہے کھاری بھائی! آپ بولیں۔"

"تساں مینوں بھائی بول دتا ہن میں تساں کو بھائی بن کے دکھاؤں گا جی۔" کھاری نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے اردو بولنے کی کوشش کم کرتے ہوئے کہا۔

جواب میں محمد رضوان الحق کی ہنسی کی آواز آئی۔

"تسی کتنا میٹھا بولدے او جی۔" کھاری نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"شکریہ کھاری بھائی! اور آپ بھی بہت میٹھی باتیں کرتے ہو۔"

"چلو فیر پکا ہو گیا ناں' تسی میلے پر آ رہے ہو۔"

"ضرور ان شاء اللہ لیکن واپس جانے سے پہلے آپ نے میرے پاس چکر لگانا ہے ضرور ہم اکٹھے کھانا کھائیں گے۔"

"او ایہہ ہر جی۔" کھاری نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "بڑی مشکل ہے۔ میں جن کے پاس کاما (ملازم) ہوں انہاں دی فیملی وچ بڑی وڈی شادی ہو رہی ہے اور مجھے وہاں تہاڈے پاس لے کے جانے والا کوئی نئیں۔"

"چلو کوئی بات نہیں' آپ مجھے پتا بتاؤ کھاری بھائی! میں خود آپ کو لے جاؤں گا۔"

"اچھا جی!" کھاری سوچ میں پڑ گیا' "اچھا فیر اے لو بھائی چوکیدار نال گل کرو وہ اڈریس سمجھاتا ہے آپ نوں۔"

گل خان نے کھاری کے دوست کو اڈریس سمجھایا اور فون بند کرکے کھاری کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔

"کی ہویا جی؟" کھاری نے چوکیدار کے دانت نکوسنے پر پوچھا۔

"یہاں بھی دوستیاں بنالیں تم نے کھاری! تم بادشاہ آدمی ہو بھئی۔"

"بندہ ہی بندے دا دارو (ساتھی) ہوتا ہے بھائی جی!" کھاری نے جواب دیا۔ "اس غریب کا بھی آگا پیچھا کوئی

نئیں' تے میرا بھی کوئی نئیں۔"

"تمہیں تو چوہدری صاحب نے شہزادوں کی طرح رکھا ہوا ہے۔ تمہارا آگا بھی وہ' تمہارا پیچھا بھی وہ۔" چوکیدار نے اسے یاد دلایا۔

"اے تے ہے۔" کھاری نے سر ہلایا۔ "پر بھائی گل خان جی' دنیا تو سگے ماں پیو کا پوچھتی ہے نا' جب پار (پچھلے سال) نویں ووٹ بنے تھے نا' اس وقت چوہدری صاب نے میرا ووٹ بھی بنوایا تھا' پھر شناختی کارڈ بھی۔ اب دسو کہ وہ جو والد صاحب کا نام لکھواتے ہیں نا۔ جدھر وہاں چوہدری صاحب کیا لکھاتے؟"

"پھر انہوں نے کیا کیا؟" گل خان سگریٹ کا کش لگانا بھول کر پوچھنے لگا۔

"بس کوئی دال دلیہ کر لیا چوہدری صاحب نے۔" کھاری نے دائیں ٹانگ بائیں گھٹنے پر رکھ کر شان سے بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے چوہدری صاحب مشکل سے مشکل کام بھی کر سکتے تھے۔

"بلے بھی بلے۔ جب ہی چھوٹی پارٹیاں روتی ہیں کہ بڑی پارٹیاں جعلی شناختی کارڈوں پر ووٹ بنواتی ہیں۔" گل خان نے اپنی شہری معلومات جھاڑی۔

"جعلی کیوں بھئی؟" کھاری نے برا مانتے ہوئے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "میں ہوں نہیں بھلا' ہوں نا تو پھر شناختی کارڈ کیوں جعلی ہو گیا۔"

"یہ بھی ہے۔" چوکیدار نے سر ہلایا۔ اسی وقت گھر کی اندرونی عمارت کا دروازہ کھول کر ماہ نور باہر نکلی۔

"کھاری! تم ادھر بیٹھے ہو' میں نے رضیہ کو کوارٹرز کی طرف بھیج دیا' تمہیں بلانے کے لیے۔" ماہ نور نے دائیں ہاتھ سے اپنے شانوں سے ذرا نیچے تک آتے بال سیٹ کرتے ہوئے کہا۔

"جی بی بی!" کھاری مؤدب انداز میں کھڑا ہو گیا۔

"آؤ ذرا' فاطمہ خالہ کی طرف چلتے ہیں' میں نے ان سے کہا تھا تم سے ملواؤں گی۔" ماہ نور آگے چلتے ہوئے بولی۔ کھاری نے سوالیہ نظروں سے گل خان کی طرف دیکھا' اس نے ساتھ والے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شانے اچکا دیے۔

☼ ☼ ☼

"اتنی مزے کی اور انوسینٹ باتیں کرتا ہے کھاری کہ کیا بتاؤں میں آپ کو۔" ماہ نور نے فاطمہ خالہ کے ٹی وی لاؤنج کے صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

سفید شلوار قمیض میں ملبوس' سر پر کروشیے کی سفید ٹوپی رکھے اور پیروں میں نیلی ہوائی چپل پہنے کھاری ایک طرف ہونقوں کی طرح کھڑا تھا۔

"آؤ کھاری بیٹا! بیٹھ جاؤ نا' کھڑے کیوں ہو؟" گوری چٹی مائی نے کہا۔ جو اس دن ماہ نور بی بی کا پوچھ رہی تھی اور انگریزی بھی بول رہی تھی۔

کھاری بھونچکا رہ گیا۔ وہ ایسے لاؤنجز اور ڈرائنگ رومز میں مہمانوں کو مختلف چیزیں پیش کرنے' ان کی خدمت خاطر کرنے کا عادی تھا۔ خود مہمان بن کر ایسی جگہ پر بیٹھنا اسے کہاں آتا تھا۔ اس نے کچھ دیر سوچا اور چپل اتار کر نیچے بچھے قالین پر بیٹھ گیا۔

"ارے بیٹا! ادھر کیوں بیٹھے ہو۔ اوپر بیٹھو چلو شاباش۔" خدیجہ نے اسے چمکارتے ہوئے کہا۔

"نہیں جی ادھر ہی ٹھیک ہے۔" کھاری کے لیے یہ بہت نیا اور انوکھا تھا۔

"مجھے تو یوں بالکل بھی اچھا نہیں لگے گا۔ پلیز بیٹا! ادھر اوپر اس اسٹول پر ہی بیٹھ جاؤ۔" خدیجہ نے ایک سنگل

صوفے کے آگے رکھے اسٹول کی طرف اشارہ کیا۔ اتنے اصرار پر کھاری کو اوپر بیٹھنا ہی پڑا۔

"ہاں اب بتاؤ کیا کرتے ہو کیا شوق ہیں تمہارے؟" فاطمہ نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"شوق؟" کھاری نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"کھاری کو بابے منگو کے میلے پر جانے اور سائیں کی کافی سننے کا شوق ہے صرف۔" ماہ نور نے فاطمہ کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

"وہ تو کھاری بھی سائیں کا فین ہے۔" فاطمہ نے ماہ نور کا اشارہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"وئے ہوئے کج نہ پوچھو خالہ جی! سائیں جی کی آواز میں کیا بات ہے جی۔"

کھاری اتنا آرام دہ ماحول پا کر تھوڑا سا کھلا۔ "سائیں ہوراں کو ماہ نور بی بی نے پچھیا تہاڈی آواز میں اتنے درد وا راز کی ہے' تے پتا ہے جی کی بولے۔ او آکھیا۔ ایس دا راز عشق ہے۔ ہے نا مہ نور بی بی! یہی دسیا تھا نا! کھاری نے ماہ نور سے تائید چاہی۔

"اچھا عشق میں مبتلا تھے سائیں جی!" فاطمہ نے ماہ نور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب پتا نہیں یہ عشق مجازی تھا یا حقیقی۔ کیا خیال ہے ماہ نور!" فاطمہ دانستہ ماہ نور کو بولنے پر اکسانے کے لیے بولیں۔

"ہمیں کیا پتا۔" ماہ نور نے ان کے سوال سے نظریں چرائیں۔ "اچھا کھاری! وہ تو سناؤ۔ بندر والے کا قصہ جس کی بندریا لنگڑی اور بندر بھینگا تھا۔" ماہ نور نے بات بدلی۔

اور کھاری کو تو ایسی باتیں سنانے کا موقع درکار تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اس نے ایسے ایسے قصے سنائے کہ مدتوں سے کھل کر نہ ہنسنے والی خدیجہ اور فاطمہ کی آنکھوں میں ہنس ہنس کر پانی بھر آیا۔

"اف توبہ کھاری بیٹا! تم تو دوائے لا مرض ہو۔" خدیجہ نے چشمہ اتار کر اپنی آنکھیں ٹشو پیپر سے خشک کرتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب خدیجہ خالہ؟" ماہ نور نے ان کی بات نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ کچھ مرض لا دوا ہوتے ہیں یعنی جن کی کوئی دوا نہیں ہوتی اسی طرح کھاری ایک ایسی دوا کی طرح ہے جو کوئی مرض نہ ہوتے ہوئے بھی مریض بنے لوگوں کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔" خدیجہ نے وضاحت کی۔

"توبہ! ہنس ہنس کر پیٹ میں بل پڑ گئے۔"

"اسی لیے تو اسے آپ سے ملوانے لائی ہوں' آپ نے دیکھا کچھ لوگ کتنے پیور اور نیک فطرت ہوتے ہیں۔ کھاری کو کسی سے کچھ لینا دینا نہیں' لیکن اگر یہ کسی کی زندگی میں شامل ہو جائے تو کیسا ان ڈس پینسیبل (ناگزیر) ہو جاتا ہے۔ جیسے سردار چاچا اور صابرہ چچی کی زندگی میں یہ ایسے داخل ہے کہ وہ اس کا دم بھرتے ہیں۔ دونوں کو اتنا مان ہے اس پر کہ کیا بتاؤں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" خدیجہ نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "ایسے لوگ بہت نایاب ہوتے ہیں اور اس کو دیکھو کیسا خود رو پودا ہے' جدھر کوئی جگہ ملی ادھر ہی کو بڑھ گیا۔ ناتراشیدہ ہیرا ہے یہ۔"

"اب تو کھاری قرآن پاک پڑھنا بھی سیکھ رہا ہے۔" ماہ نور نے بتایا۔ "کیوں کھاری! کتنے سیپارے پڑھ لیے؟" ماہ نور نے کہا۔

"میں ایہہ ہی بات کرنے لگا تھا۔" کھاری نے خدیجہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مہ نور بی بی! جو سچ پوچھو تو انہاں خالہ جی کا ماندرا (چہرہ) ساڈھے بھین جی نال بوت ملدا اے۔ بالکل اوہی نین نقش۔"

خدیجہ نرمی سے مسکرائیں۔ "اگر تمہاری بھین جی میری عمر کی ہیں کھاری بیٹا تو ایسا ممکن ہے کیونکہ اس عمر میں آکر اکثر لوگ ایک جیسے ایکسپریشن چہروں پر سجا لیتے ہیں۔"

"ایکسپریس وا تو مجھے نہیں پتا جی۔" کھاری نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "پر ماندرا ویسا ہی ہے۔ بھین جی سے میں سیپارے کا سبق لیتا ہوں جی۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے کھاری بیٹا! تمہاری بھین جی بہت لکی ہیں۔" فاطمہ نے ہونٹوں پر آئی مسکراہٹ کو دباتے ہوئے کہا۔

"ماہ نور! میں نے تمہارے لیے گول گپے بنائے ہیں کھاؤ گی؟" خدیجہ کو اچانک یاد آیا۔

"گول گپے۔ آپ نے بنائے؟" ماہ نور نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ہاں بالکل۔" خدیجہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

"گول گپے بنانا تو بڑا مشکل کام نہیں فاطمہ خالہ۔ یہ خدیجہ خالہ نے کیسے بنا لیے۔" خدیجہ نے کچن کی طرف چلے جانے کے بعد ماہ نور نے فاطمہ سے پوچھا۔

"ٹی وی کے کوکنگ شوز سلامت رہیں۔" فاطمہ نے صوفے کے بازو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "سارا دن بیٹھی دیکھتی رہتی ہیں۔"

"گول گپے تو جی چاچے خدا بخش دے کھانے والے ہوتے ہیں جی۔" کھاری کو اس گفتگو میں بھی کود نا یاد آیا۔ "تاڑی بالکل نہیں ڈالتا جی پانی وچ بڑی صفائی ہوندی ہے اس کے برتنوں میں۔ مہ نور بی بی! آپ خالہ جی کو بھی لے کر آنا کبھی فارم ہاؤس چاچے خدا بخش کو ریڑھی سمیت لے آوں گا۔"

"ضرور کھاری بیٹا! ہم تمہارے فارم ہاؤس پر ضرور آئیں گے ان شاء اللہ۔" فاطمہ نے اس کی پر خلوص دعوت کا مسکرا کر جواب دیا۔

"محمد رضوان الحق نے بھی وعدہ کیا ہے۔ او وی آئے گا فارم ہاؤس۔" کھاری مسکرا کر بولا۔

"محمد رضوان الحق؟" ماہ نور نے حیرت سے کھاری کو دیکھا۔ "وہ کون ہے؟"

"او ہو وہ ای جیالی کہ پتا نہیں چینی خرگوش۔" کھاری نے سر کے اشارے سے اسے یاد کروایا۔

"اچھا۔" ماہ نور کو ہنسی آگئی۔ "اس کا اتنا مشکل اور بھاری بھرکم نام ہے کیا؟"

"چینی خرگوش کا نام ہے یہ؟" فاطمہ حیرت سے بولیں "ناقابل یقین۔"

ماہ نور خدیجہ اور فاطمہ کو محمد رضوان الحق کی تفصیل سنانے لگی۔ اس دوران کھاری نے کھانے کی چیزوں سے بھری اس پلیٹ کی طرف توجہ رکھی جو خدیجہ نے اسے پکڑائی تھی۔

✡ ✡ ✡

"گاڑی لے تو لی ہے پر ہے چھوٹی۔"

"تم کبھی شکر نہ کرنا کسی بات پر۔"

"ہم نے ہمیشہ اونچے محلوں اور بڑی گاڑیوں کی دعائیں دے کر ویلیں وصول کی ہیں۔ ہم بھاگ لگے رہیں کی دعا جو دیتے ہیں اس کا مطلب ہوتا ہے کہ قسمت اونچی چمکے شان دار ہو اسی لیے تو چھوٹی چیزوں پر حیرت ہوتی ہے دعا دینے کے لیے اتنا گلا پھاڑا اور چیز ملنے پر آئی تو اتنی چھوٹی۔"

"کبھی گاڑی میں بیٹھنے کا تصور بھی کیا تھا تم نے؟"

"جھوٹ کیوں بولوں کبھی نہیں کیا تھا۔ ہم تو چوراہوں اور ٹریفک کے سرخ سگنل پر رکنے والی گاڑیوں کے شیشے بجا کر لوگوں کو شیشہ نیچے کرنے پر مجبور کرنے والے لوگ ہیں۔ ان کو دعائیں دیتے اور ان کے ڈیش بورڈوں میں رکھے سکوں میں سے اپنا حصہ وصول کرتے ہوئے یہ بھی نہیں دیکھتے کہ گاڑی اندر سے ہے کیسی۔ اب سکہ سکہ جوڑ کر جمع کر بھی لیں تو گاڑی خریدنے جو گے پیسے تو دو زندگیاں مل جائیں پھر بھی اکٹھے نہیں کر سکتے۔"

"تو پھر شکر کیوں نہیں کرتیں کہ چھوٹی ہی سہی گاڑی آئی تو سہی۔"

"یہ جو میں چھوٹی بڑی کر رہی ہوں اپنے لیے تھوڑی کر رہی ہوں۔ یہ تو میں تمہارے لیے کر رہی ہوں کیونکہ چھوٹی گاڑی تمہاری شخصیت سے چھوٹی لگتی ہے میں جانتی ہوں تمہارا خاندان بڑا اس کا نام بڑا اس کے بھاگ بڑے پھر تم کیسے چھوٹی گاڑی میں بیٹھو گی۔"

"میرے خاندان کے بھاگ بڑے نہیں بہت چھوٹے ہیں۔ تم کیا سمجھو اس بات کو۔ جو خاندان بیٹیوں کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر انہیں معاف کرنے کے بجائے انہیں دھکا دے دیں ان کے بھاگ بہت چھوٹے ہوتے ہیں بڑے نہیں ہوتے اور دیکھا! تم پھر میرے خاندان کا ذکر لے کر بیٹھ گئیں کتنی بار تم سے کہا ہے میرے خاندان کا نام نہ لیا کرو میرے سامنے۔"

"او ہو ہو! غلطی ہو گئی سرکار! کانوں کو ہاتھ لگا کر معافی مانگتی ہوں جناب۔"

"اسلام آباد والے کا بزنس ابھی ڈھنگ سے جما نہیں پھر بھی اس نے یہ چلتی چلاتی گاڑی لے کر تحفے میں دے دی۔ سوچو گاڑی چھوٹی سہی پر دینے والے کا دل کتنا بڑا ہے۔"

"یہ تو ہے وہ جو موٹو سیٹھ ہے پیکجز والا۔ اس کے پاس انت کا پیسہ ہے مگر جتنے اور پیسے کے برعکس دل اتنا سا ہے چڑی جتنا۔ جتنی دیر یہاں رہتا ہے بیوی کے خوف سے لرزتا رہتا ہے۔ نہ غزل کا لطف اٹھا پاتا ہے نہ گیت کا اور اٹھتے وقت یوں ساڑی کی طرح گنے چنے پیسے دے کر چلتا بنتا ہے۔"

"دل اور پیسہ دنیا اور لوگ زندگی کے اس سیاہ دور میں داخل ہونے کے بعد ہی تو دیکھے ہیں میں نے۔"

"تم نے اب دیکھے ہوں گے میں تو آنکھ کھلنے کے ساتھ ہی دیکھ رہی ہوں۔ میرا ابا اپنے گاؤں کا واحد میراثی تھا۔ جدھر کہیں شادی بیاہ ہوتا اپنی ٹیم اور اپنے بچوں کی فوج لے کر چل پڑتا۔ جگتیں کستا ویلیں وصولتا بھاگ لگے رہیں کے نعرے مارتا میراثی۔ ہم بہن بھائیوں کی فوج بارات آنے پر باراتیوں کی طرف سے کئی کئی سوٹ (پیسے پھینکنا) لوٹتے ابے کی جگتیں سنتے اور ہاتھ میں پکڑے ڈول گلافے اور ڈبے اٹھائے روٹی کھلنے کا انتظار کرتے۔ جوں جوں ہم بڑے ہوتے گئے ہمیں جگتیں کرنے دعائیں اور ویلیں لوٹنے کے فن کے قواعد ازبر ہوتے گئے۔ سو بچپن میں ہی دل بھی دیکھ لیے پیسہ بھی دنیا بھی اور لوگ بھی۔"

"اچھا چلو فلسفے نہ جھاڑو۔ کوئی مہمان آتا ہے غزل یا گیت سننے تو تمہاری شکل پر زمانے بھر کی مسکینی چھا جاتی ہے۔ تمہاری نظریں بھاگ لگے رہیں کی دہائی دیتی محسوس ہوتی ہیں اور تمہاری ہر ہر حرکت میں ایسا ندیدہ پن ٹپکنے لگتا ہے کہ آنے والا تمہیں علیحدہ سے کوئی چھوٹا موٹا نوٹ پکڑانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

"کیا کریں عادت سے مجبور ہیں۔"

"تمہیں عزت کی زندگی عزت کی روٹی راس نہیں آئی کیا۔ مجھے تو اس بات کا افسوس ہے کہ میرا ساتھ بھی تمہاری کچھ تربیت نہیں کر پا رہا ہے۔"

"ہا ہائے اب ایسے تو نہ کہو میں کتنی بدل گئی ہوں۔ دیکھا نہیں فیشن کے کپڑے پہنتی ہوں۔ بال بھی تیل سے چپڑنا چھوڑ دیا پلیٹ گلاس میز پر رکھ کر تمہارے ساتھ کھانا کھانا سیکھ گئی ہوں۔ میرے ہاتھ میں پکڑے چمچے نے چاول سنبھالنے بھی شروع کر دیے ہیں۔ آئے گئے کو ادب آداب سے سلام کرتی ہوں۔ موسم کے مطابق چائے شربت پیش کرتی ہوں۔ نہ بھاگ لگنے کی بات کرتی ہوں نہ سستے خیراں کا نعرہ مارتی ہوں۔"

"اور وہ کھانے سے پہلے کٹوردان میں سالن ڈال کر نعمت خانے میں کون چھپاتا ہے 'تاکہ جب میں سو جاؤں تو باورچی خانے میں بیٹھ کر باسی روٹی کے ساتھ لگا۔ لگا کر بھکر بھکر کھائی جائے آئے گئے کو موسم کا مشروب پیش کرنے سے پہلے جھوٹا کرنا کون لازمی سمجھتا ہے بھلا اور رہا نعرے لگانے کے شوق تو وہ تم نالیاں صاف کرنے والا جمعدار اور سبزی بیچنے والے تک کو سنا کر پورا کرلیتی ہو' کانوں میں ایک وقت میں چار' پانچ بالیاں پہننی تم نے نہیں چھوڑیں اور پراندے کے گھنگھرو ابھی تک چھنکاتی پھرتی ہو۔"

"تو جی! اتنا کچھ چھوڑ دیا' پھر بھی باتیں۔"

"اچھا' اچھا۔ اب بجائے شرمندہ ہونے کے ناراض ہونے لگیں۔ چلو جاؤ دیکھو! دروازے پر دستک ہو رہی ہے' روٹی لینے آیا ہو گا مولوانوں کا شاگرد۔"

"آئے ہائے! ایک تو میں اس مرنگھے سے بہت تنگ ہوں۔ ٹیچ (عین) اپنے وقت پر آ کر دستک دیتا ہے' ایک سیکنڈ نہ آگے' نہ پیچھے۔ دروازہ کھولو تو نظریں نیچے' ہاں کٹورا آگے ہوتا ہے۔"

"چلو جا کر دروازہ کھولو۔ بے چارہ انتظار کر رہا ہو گا اور ہاں دیکھو! میں نے ٹینڈے گوشت کے سالن میں ٹینڈوں کے چھ ٹکڑے اور گوشت کی تین بوٹیاں اس کے لیے رکھی ہیں' خبردار! جو تم نے منہ مارا اس کے حصے پر میں نے چیک کر لیتا ہے۔"

"دل تو کرتا ہے بتوئیں (بینگن) اور آلو کا سالن دوں اس مردوئے کو' دیکھتی ہوں اگر گرمی کے مارے بساند اٹھانا نہیں شروع کیا تو وہی دوں گی۔ کم بخت کا دل چاہتا ہے گوشت کے ناغے والے دن بھی اس کو بکرے کی پیٹھ اور ران کا گوشت شوربے میں تیرتا ملے۔"

"اللہ جانے تمہیں اس معصوم سے کیا بیر ہے۔ خبردار! جو تم نے اسے کل والا سالن دیا۔ کیا پتا اسی کی دعاؤں سے اللہ ہمیں بھی رزق دے رہا ہو۔"

"اسی کی دعائیں تو ہمیں لگنی ہیں' پتا نہیں کہاں سے بھاگ کر ادھر کو آیا۔ وہ تو مولوانے ہیں' ذرا نیک دل جو اپنے پاس رکھ لیا تو اس کی شکل پر بھی تھوڑی رونق آگئی' ورنہ جب آیا تھا کیسے فاقے نظر آتے تھے اس کی شکل پر۔"

"تم جاتی ہو یا میں خود اٹھوں' بے چارہ پانچویں بار دستک دے رہا ہے' مایوس ہو کر لوٹ جائے گا۔ کچھ سوچو' وہ کلام پاک حفظ کر رہا ہے' اس کے اندر پاک کلام محفوظ ہو رہا ہے۔ تم اس کے بارے میں یوں بات کرتی ہو جیسے نہ جانے کتنا حقیر ہو۔"

"توبہ توبہ اللہ معاف کرے۔ کلام پاک تو سب کلاموں کا بادشاہ ہے۔ میں اندھی گونگی بہری ہو جاؤں جو اس کی شان میں کوئی گستاخی کروں۔ میں تو اس کی بات کر رہی تھی جو باہر کھڑا ہے' عمر دیکھو اس کی چالیس سال کی عمر میں حفظ کرنے کا شوق آیا ہے اسے۔"

"رکو اب۔ میں خود جاتی ہوں' تم تو اس کی عمر اور حالات کا تجزیہ ہی کرتی رہو گی۔"

"نہیں تھمو میں یہ گئی۔"

☼ ☼ ☼

"اگر آج رات تک میں تمہارے پاس نہ پہنچ پاؤں تو سمجھنا میں قتل ہو چکا ہوں۔"

ابراہیم نے اپنے فون پر آنے والا یہ پیغام پڑھا اور ان تینوں کا انتظار کرنے میں مصروف ہو گیا جنہیں اس نے سعد کی خبر لانے بھیجا تھا۔ کیونکہ اس پیغام کے آنے کے بعد سعد کا فون آف ہو چکا تھا۔

"اچھا تو تم پینا کولاڈا نوش جاں کر کے میرے مرنے کا غم غلط کر رہے ہو۔" دس منٹ بعد اسے اپنے قریب سعد کی آواز سنائی دی۔

"تم کدھر تھے یار! اور کون تمہیں قتل کرنا چاہتا تھا؟" ابراہیم اسے سامنے دیکھ کر جیسے شادیٔ مرگ کی کیفیت میں مبتلا ہوا۔

"تمہیں کیا فرق پڑتا ہے' تمہارے لیے تو مرنا بھی کھانے کے ساتھ اور جینا بھی کھانے کے ساتھ۔"

"نہیں یار! مذاق نہیں' میں واقعی بہت پریشان تھا۔"

"ابے گدھے! اگر تو پریشان تھا تو تجھے چیز باکس کے بجائے پولیس اسٹیشن میں بیٹھے ہونا چاہیے تھا۔"

"میں نے سکندر' کاشف اور طاہر کو تیرے پیچھے بھیجا ہے۔ ابھی دو منٹ پہلے سکندر نے مجھے بتایا کہ تمہاری گاڑی بنی گالہ کی طرف مڑتے دیکھی تھی کسی نے۔ آج تین بجے کے قریب۔"

"اوئے!" سعد نے آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ "وہ کسی کون تھا جس نے میری گاڑی وہاں دیکھی۔"

"یہ میں کیوں بتاؤں۔" ابراہیم نے دونوں بازو اپنی باہر نکلتی توند پر باندھتے ہوئے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

"تمہارے تو اچھے بھی بتائیں گے۔" سعد نے دانت پیسے۔

"تم یہ بتاؤ نا' تم قتل کیوں نہیں ہوئے ابھی تک با ئے دے وے۔" ابراہیم نے اسے تنگ کرنے کی خاطر کہا۔

"کیونکہ مجھے اپنے حصے کا قتل کرنا تھا ابھی۔" سعد نے ابراہیم کی گردن دبوچتے ہوئے کہا۔

"بتا اب' فافٹ بتا کون تھا وہ۔" اس نے ابراہیم کی گردن اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑتے ہوئے کہا۔

"دوست کے ہاتھوں مرنا میرے لیے اعزاز کی بات ہو گی' دبا دے میرا گلا۔ میں تیرے دل کی کوئی حسرت باقی نہیں رہنے دینا چاہتا۔" ابراہیم نے زبان باہر نکال کر دائیں طرف لٹکاتے ہوئے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

"ایک نمبر کا فراڈ ہے تو۔" سعد نے اس کی گردن چھوڑ دی۔

"تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔" گردن چھوٹ جانے پر ابراہیم نے مشروب کا گھونٹ لے کر سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "اگر تمہارا میسج پڑھ کر میں بدحواس ہو جاتا اور انکل کو وہ میسج پڑھا دیتا تو تم جانتے ہو کیا ہوتا۔ یار! مذاق کرتے ہوئے ذرا ہاتھ ہلکا رکھا کرو۔"

"پھر تم نے کیا کیا۔" "نہیں بتا تو نہیں دیا۔" سعد کو خطرے کی گھنٹی بجتی محسوس ہوئی۔

"نہیں یار! میں پاگل تھوڑی ہوں۔" ابراہیم نے ہاتھ ہلایا۔ "میں نے اپنے طور پر ان تین جاسوسوں کو بھیجا تھا جنہوں نے اتنی دیر میں مجھے صرف ایک اطلاع دی' وہ بھی چار گھنٹے پرانی۔"

"احمقوں کا ابا جان سمجھتا ہے تو مجھے۔" سعد نے ہونٹ دانتوں کے نیچے دباتے ہوئے کہا۔ "مجھے اپنے قتل کا خدشہ ہوا اور میں ایس او ایس کال دوں گا تجھے۔" اس نے ابراہیم کی طرف اشارہ کیا۔

"تو جو اول تو کبھی جاگتا نہیں اور جاگا ہوا بھی ہو تو پیغام سمجھ کر جب تک کسی کو بتاتا' مجھے قتل ہوئے اڑتالیس گھنٹے گزر چکے ہوتے۔"

"میں نے پندرہ منٹ کے اندر تین بندے بھیجے تھے تیری طرف۔"

"اور ان تین بندوں نے دو گھنٹوں میں تجھے صرف ایک اطلاع دی اور وہ بھی بے تکی۔"

"مگر اس شرارت کی تک کیا تھی۔" ابراہیم نے اس کی طرف دیکھا۔

شرارت نہیں تھی' مجھے واقعی خطرہ تھا کہ شاید ایک خون آشام چڑیل مجھے مار دینے کے در پے ہو گئی تھی۔"

"مجھے پہلے ہی پتا تھا' یہ کسی فی میل کا کام ہی ہو سکتا ہے اور بتا سہیلیاں۔" ابراہیم نے کہا۔

"تو جل اور روتا رہ بیٹھ کر۔ چیز باکس کے کاؤنٹر میں سر دیے۔" سعد نے ہاتھ سر کے پیچھے باندھتے ہوئے

قہقہہ لگایا۔

"میں نہیں جلتا۔" ابراہیم نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "یہاں سارا دن جتنی لڑکیاں آتی ہیں نا' تو نے خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوں گی۔"

"مجھے خواب میں لڑکیاں نہیں حوریں نظر آتی ہیں محترم! میں پاکیزہ سوچ رکھتا ہوں' تیری طرح بگڑے اور فاسد خیالات نہیں ہیں میرے۔" سعد نے کہا اور ابراہیم کے منہ بنا کر سر جھٹکنے پر قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

"ون اپ۔" اس نے ہاتھ کے انگوٹھے سے اشارہ کرتے ہوئے ابراہیم کو مزید چڑایا۔ جواب میں ابراہیم نے ویٹر کو بلا کر اپنے لیے ایک اور ڈرنک منگوایا اور ڈرنک آنے پر سعد کو نظر انداز کرتے ہوئے گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔

☼ ☼ ☼

"بالکا تو کئی مہینے ہو گئے بھاگ گیا' اسے غم تھا کہ فقیر کے ڈیرے کی چاکری کرنے کے باوجود اسے کوئی اشارہ نہیں ملتا' جھلا تھا' عجلت پسند تھا' انتظار کی مشقت نہیں سہہ سکا' صبر کا پیالہ نہیں پی سکا' فقیر کے ڈیرے کی چار دیواری کے ساتھ تو ہمہ وقت صبر کی چادر چمٹی رہتی ہے' توکل کا سایہ ادھر سے ادھر منڈلاتا پھرتا ہے' بے نیازی بکل اوڑھے ذکر میں مگن رہتی ہے' بالکا سمجھا چار دن کا ڑھا تیار کرنے اور خلقت کو پیالے بھر بھر پلانے سے ہی اشارہ دیا جائے گا۔ بالکے کی نظر صرف اپنی غرض پر تھی' سو خطرہ تھا کہ اشارہ ملنے پر بھی سمجھ نہ پاتا' سو اس کا دل ادھر سے اٹھا دیا گیا' اب وہ اپنی غرض لیے کسی اور کٹیا پر' کسی اور ڈیرے پر' کسی اور جھونپڑی پر' کسی اور کے مسکن پر دستک دیتا پھرے گا' عجلت پسندوں اور بے صبروں کا علاج اسی طرح کیا جاتا ہے۔ انہیں انتظار کی مشقت میں ڈال دیا جاتا ہے۔"

ٹانگوں کے گرد بازو لپیٹے' سامنے دیکھتے اختر نے کہا۔

اج سک متراں دی ودھیری اے
اج جندڑی اداس گھنیری اے

اسے وہ شام یاد آ گئی جب اس نے اختر کی کٹیا کے باہر بالکے کو آخری بار دیکھا تھا۔ اسے بالکے کی اداسی اور اس کی آواز کا سوز یاد آ گیا۔ تو وہ اس لیے اداس تھا اور یہاں موجود نہ ہونے کی باتیں کر رہا تھا۔ اس نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے سوچا۔

"تو اب اس کے جانے کے بعد۔" اس نے اس تنگ سی کٹیا میں جلتے واحد چراغ کی لو کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب کیسے چلتا ہے سب' میرا مطلب ہے۔"

"اللہ مالک ہے باؤ صاب!" اختر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ایک بالکا گیا' کوئی دوسرا آ گیا' یہ بالکے بھی سبب کی طرح ہوتے ہیں' جو اللہ بندے کو اس کے کاموں کے سلسلے میں لگاتا ہے۔"

"اور جن کو سبب نہیں لگتے' وہ کس کیٹگری کے لوگ ہوتے ہیں؟"

"یہ ناممکن ہے باؤ صاب! کہ کسی بندے کو عمر بھر کوئی سبب نہ لگے' فرق صرف سبب کو سمجھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے سے پڑتا ہے۔"

"میں نے تو اکثر لوگوں کو شکوہ کرتے ہی سنا ہے کہ انہیں اچھا سبب نہیں لگا' اس لیے وہ زندگی میں اچھی چیزوں سے محروم رہے۔"

"گلوں' شکوؤں کا سلسلہ بھی اس دنیا کا کھیل ہے باؤ جی۔" اختر نے گڑگڑی کا کش لگاتے ہوئے کہا۔ "آپ سے پہلے یہیں اسی جگہ پر ایک سرکاری صاحب بیٹھے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے سائیں جی! بددیانتی بہت بڑھ گئی ہے' ہر

شخص بے ایمانی پر تلا ہوا ہے' انہیں گلہ تھا کہ ان کا گوالا پانی کی طرح پتلا دودھ دیتا ہے۔ میں نے سنا اور خاموش رہا' جبکہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کہوں' صاحب اپنے گوالے سے پوچھو' اس کو کس سے گلہ ہے' یقیناً" اسے بھی بہت سے لوگوں سے گلے ہوں گے' سبزی والے سے گلہ ہو گا کہ سبزی پر پانی چھڑک چھڑک کر اس کا وزن بڑھاتا ہے اور تول میں کمی بیشی کرتا ہے' سبزی والے کو فروٹ والے سے گلہ ہو گا چند دانے اچھے فروٹ میں گلا سڑا فروٹ ملا کر دیتا ہے' فروٹ والے کو منڈی کے آڑھتی سے گلہ ہو گا۔ وہ بلٹی چھڑانے میں ٹائم لگاتا ہے۔ اتنے میں کبھی آدھی' کبھی پوری پیٹی فروٹ گل سڑ جاتا ہے' آڑھتی کو بلٹی کرنے والے سپلائر سے گلہ ہو گا' سپلائر کو محکمے والوں سے گلہ ہو گا' سرکار کے دفتر سے اجازت نامے دیر سے ملتے ہیں' سرکار کے دفتر میں گوالے کے گلے جاری ہیں۔ آپ نے دیکھا باؤ جی! سرا کہاں سے شروع ہوا اور واپس کہاں آ کر جڑا۔"

اختر نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

"اسی طرح سبب لگنے کے سلسلے ہیں' مگر انسان گلہ گزاریوں میں اتنا مشغول ہے کہ سبب اس کے سامنے آتے ہیں' گزر جاتے ہیں' اس کی عقل پر' اس کی نظر پر پردہ ہی پڑا رہتا ہے۔"

"ہوں۔ سائیں جی عقل اور نظر کے پردے ہٹانے کا کوئی ٹوٹکا تو بتائیں۔"

"آپ باؤ صاب! رہنے دو' ان سلسلوں میں مت پڑو' آپ کو تو سبب کی پہلے ہی کمی نہیں' مگر آپ جو دوسروں کو سبب لگانے کے چکر میں پڑ چکے ہو تو صاف بات بتاؤں' آپ نے خوامخواہ خود کو مشکل میں ڈال لیا ہے۔ اب جو آپ رکے اور رک کر ستانے کی کوشش کی تو وقت آپ پر آزمائش کے پہاڑ کھڑے کر دے گا۔ آپ آزمائش کے ان پہاڑوں کو سر کر سکتے ہو' پر آپ اپنے من کے ہاتھوں مجبور ہو کر زن کے چکر میں جو پڑ گئے ہو' وہ بھی آپ کے لیے آزمائش ہے۔"

"نہیں' ایسا نہیں ہے۔"

"فقیر کی کوتاہ نظر جو دیکھ رہی ہے' وہ آپ شاید ابھی دیکھ نہ پائیں۔"

"کوئی اچھی خبر بھی ہے میرے لیے۔"

"ستے ہی خیراں ہیں۔ (سب خیریت ہے) اگر آزمائش کے چھوٹے چھوٹے پتھروں کو پھلانگتے آگے گزر گئے تو آپ کو من بھی ملے گا' زن بھی اور وہ بھی جس کی تلاش میں آپ کی روح' جان اور جسم سرگرداں ہے' لیکن جو کہیں راستے میں رک گئے تو آزمائش کے بکھرے پتھر سرک سرک کر ایک دوسرے کے قریب آ جائیں گے اور کوہ گراں ثابت ہوں گے آپ کے لیے۔ پھر کڑا وقت آ سکتا ہے۔ میری مانیں' اب بھی اس چکر سے نکل آئیں' ہنے یا بنے (اس پار یا اس پار) کی کیفیت بہت مشکل ہوتی ہے۔"

"آپ میرے حق میں دعا کیا کرو سائیں جی! میں نے کتنے ہی آستانوں' کتنے ہی ڈیروں اور کتنی ہی خانقاہوں میں جھانکا ہے' مگر میرے من کو جو آسودگی آپ کے پاس آ کر ملتی ہے کہیں اور نہیں ملی۔"

"اس کی وجہ یہ ہے باؤ صاب! کہ میں بھی آپ ہی کی طرح کا عام انسان ہوں' میں نے بھی دنیا ترک نہیں کر رکھی' روح کی آنکھ سے زیادہ تجربہ کاری اور ہشیاری کی آنکھ سے چیزوں کو دیکھتا ہوں' مجھے اس کٹیا سے کاروبار نہیں چمکانا' میں اپنے رزق کے لیے غلے میں جمع ہونے والے چندے اور ہدیے پر بھروسا نہیں کرتا' میں کون ہوں' کوئی نہیں جانتا' فقیر کا یہ ڈیرا جتنے دن اجڑا رہتا ہے اتنے دن فقیر کہاں رہتا ہے' کوئی نہیں جانتا' فقیر دفتر میں سوٹ پہن کر بیٹھا ہے یا کسی مسجد میں نمازیوں کے جوتوں پر نمبروں والے ٹوکن سجانے میں لگا ہوا ہے۔ وہ کسی اسمگلر کی' کسی ملک دشمن کی جاسوسی پر لگا ہوا ہے یا کسی حکیم کے مطب پر بیٹھا خاک کی پڑیا میں شفا لپیٹ لپیٹ کر مریضوں کو استعمال کی ہدایات کے ساتھ دے رہا ہے' کوئی نہیں جانتا' مگر فقیر خوب جانتا ہے' رزق وہی خالص ہے' جو ہاتوں

سے نہیں، ہاتھوں سے کمایا جاتا ہے۔"

"آپ یہ بھی دعا کریں سائیں جی! کہ ہم سب کو ایسا سوچنے کی توفیق مل جائے۔"

"دعا ہی تو کرتے ہیں، دعا کرنے کے لیے ہی بیٹھتے ہیں، باؤ صاب! آپ راستے میں رکنے کی غلطی کبھی نہ کرنا، جو جان جوکھوں میں ڈال ہی لی تو دریغ نہ کرنا۔"

"ہوں۔۔۔ سائیں جی! اس روز اس لڑکی کو کن مشکلات کی بات سنا رہے تھے آپ۔"

"ہاں!" اختر نے گڑگڑی منہ سے ہٹا کر سر ہلایا۔ "پتا ہے اس پر مشکل کس کی وجہ سے آئی ہے؟ سر مت جھکاؤ باؤ صاب! من اور زن میں توازن پیدا کرلو، تاکہ وہ اس مشکل سے بچ جائے۔"

"میرا دل ڈر گیا ہے اس روز سے" آپ ایسی باتیں مت کرو۔"

"ڈرنا نہیں، نانا، ڈرنا نہیں۔" اختر نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کا من صاف ہے باؤ صاب! بس سمت کے تعین میں بھٹک رہے ہو جس دن اس کا تعین ہو گیا اس دن سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کمال کی بات نہیں ہے، کبھی ڈراتے ہیں، کبھی تسلی دیتے ہیں، میں مانتا ہوں، سب ٹھیک ہی کہا ہو گا، مگر وہ جو من پالیتے ہیں، وہ تو عبادت گزار ہوتے ہیں۔ تسبیح کے دانے گرانے والے، طویل سجدوں میں راتیں گزارنے والے، میں تو بڑا گناہ گار ہوں۔"

"واہ باؤ جی! بڑے بھولے ہو۔" اختر ہولے سے ہنسا۔ "عبادت، سجدوں اور۔۔۔ تسبیحوں ہی کا نام نہیں ہے، سجدے اور قیام، رکوع اور تسبیح بندگی کی علامت ہے، مگر عبادت کے تو کئی رنگ اور بھی ہیں، وہ جو اس کی مخلوق کے لیے آسانیاں تلاشتا ہے، وہ جو اس کے بندوں کے لیے دل میں بغض اور حسد نہیں رکھتا، وہ جو اس کے بندوں کا برا نہیں چاہتا، وہ بھی عابد ہے اس کی عبادت کا بھی ایک درجہ ہے۔"

"کیوں گھبرا گئے باؤ جی۔" اختر ہنس کر بولا۔ "فقیر کو اتنی پرسنل باتیں کیسے پتا چل گئیں۔ ایک دن آئے گا جب آپ کو بھی پتا چل جایا کریں گی۔"

"اچھا۔ میں اب چلتا ہوں۔" وہ جیسے مزید برداشت سے قاصر ہوا۔

"ہاں۔ ایک دل ایسا ہے جس کو کبھی توڑنا نہ، نہ اس پر شک کرنا، کیونکہ آپ کے معاملے میں وہ بڑا بے لوث ہے، بڑا کھرا ہے، جو یہ غلطی کر گئے تو سمجھو، ساری عبادت مٹی ہو گئی۔" اختر نے اس کے اٹھتے اٹھتے ایک اور وارننگ دیتے ہوئے کہا۔

وہ سرکی کی جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ باہر تازہ ہوا تھی اور سانس لینا آسان تھا۔ اس نے ہوا کے سنگ آتے دھوئیں کے بادل سے چہرا بچانے کی کوشش کرتے ہوئے بھی لاشعوری طور پر اس سمت دیکھا جہاں سے وہ دھواں پھیل رہا تھا۔ ایک نوجوان جو شکل سے تعلیم یافتہ لگ رہا تھا، ہلکی مونچھیں اور چھوٹی چھوٹی داڑھی چہرے پر سجائے، سر پر پلاسٹک کی سبز ٹوپی رکھے الاؤ پر دیگچی چڑھائے بیٹھا اس میں ڈوئی چلا رہا تھا۔ اس لڑکے کے چہرے پر نرمی تھی اور ہلکا سا تبسم۔

"السلام علیکم۔" اس نے آگے بڑھ کر اس نوجوان کو مخاطب کیا۔

"وعلیکم السلام!" اس نے جھکی نظروں کے ساتھ ادب سے جواب دیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"عبدالودود۔"

"کب سے ادھر ہو؟"

"کل ہی آیا ہوں۔"

"وہ پھر تو انجان ہو گے بالکل۔"

"فی الحال تو۔"

"کاڑھا بنا رہے ہو۔"

"نہیں آلو کی قتلیاں پکا رہا ہوں۔"

" oh i can feel the difference " (میں فرق محسوس کر سکتا ہوں۔)

" Every new face is different from the old one "

(ہر نیا چہرہ پرانے سے فرق ہی ہوتا ہے۔)

لڑکے کے جواب نے اسے حیران کیا۔

"پڑھے لکھے ہو۔"

"نہیں۔۔۔ لیکن پڑھنے لکھنے کے لیے آیا ہوں طفل مکتب ہوں۔"

"اللہ کرے ٹکے رہو، پہلے والے بالکے کی طرح بھاگ نہ جانا۔"

"قسمت پر منحصر ہے، دانے پانی کی بات ہے۔"

"ہوں!" اس نے ہاتھ بڑھا کر عبدالودود سے مصافحہ کیا اور اپنی گاڑی کی طرف چل دیا۔ نہ جانے کیوں اسے اپنا آپ عبدالودود کے سامنے بہت چھوٹا لگا تھا۔

"ایک دل ایسا ہے جس کو کبھی نہ توڑنا، نہ اس پر شک کرنا۔" واپسی کے سفر کے دوران اس نے بار بار یہ بات دل میں دہرائی۔

"وہ دل کس کا تھا۔ جو اس کے معاملے میں بڑا کھرا اور بے لوث تھا۔" وہ فوری طور پر اندازہ لگا سکا نہ فیصلہ کر سکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"منصور نی اور رازی کو ایکسٹینشن نہیں ملنے والی کیا؟" بلال نے سعد کو اپنے آفس میں بلا کر کچھ اہم معاملات ڈسکس کرنے کے بعد پوچھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے۔" اس نے بلال سلطان کی طرف دیکھا۔

"میرا اس بارے میں کوئی خیال نہیں ہے، یہ مکمل طور پر تم پر منحصر ہے، تم جو چاہو فیصلہ کرو۔"

"اچھا!" وہ ہنسا۔ "کیا میں فیصلے کرنے کے لیے اتنا آزاد ہوں۔"

"تمہیں کوئی شک ہے کیا؟"

"شک کا پتا نہیں میں تو کنفرم کرنا چاہ رہا تھا۔" اس نے انٹر کام کا ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔

"مس لینا! میں اور ڈیڈی اکٹھے لنچ کریں گے۔ اس کے لیے آپ شیڈول میں جو تبدیلی لاسکتی ہیں، لے آیئے۔" اس نے بلال کی سیکریٹری سے کہا تھا۔

"ہوں۔" بلال کے لیے یہ غیر متوقع بات تھی۔ انہیں لنچ کے دوران ایک اہم بزنس ڈیل ڈسکس کرنی تھی، ان کے دماغ نے نفع نقصان کے تمام پہلو منٹوں میں کیلکولیٹ کیے اور جھٹ سے جواب مرتب کیا۔

"کہاں لنچ کر رہے ہیں ہم۔ ابراہیم کے ڈھابے پر؟" انہوں نے اپنا فون آف کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، وہ آپ کے معیار پر پورا نہیں اترے گا۔" سعد نے سر ہلایا۔ "ہم گھر پر لنچ کر رہے ہیں اور اس لنچ کا

اسٹینڈرڈ اور کوالٹی ہی ضوفی اور رازی کے مستقبل کا تعین بھی کرنے والی ہے۔"

"وہ کیسے؟" انہوں نے بغیر سوچے پوچھا۔

"کیا ان کی کارکردگی کا پیمانہ جانچنے کا اس سے بہتر کوئی اور ذریعہ ہوگا کہ وہ دو افراد جن کے لیے ان کے درجن بھر عملہ موجود ہے اور جو کبھی اکٹھے کسی ایک بھی کھانے پر موجود نہیں ہوتے، وہ اچانک اکٹھے لنچ کرنے کے پاس پہنچ جائیں تو ان کا ردِعمل کیا ہوگا۔"

"وائز گائے (عقل مند لڑکا)" بلال نے بے اختیار کہا۔

"جبکہ آپ کا خیال ہے کہ صرف آپ ہی وائز (عقل مند) ہیں اور باقی لوگ otherwise (یوں ہی) ہیں۔" وہ مسکرایا۔

"ثابت ہوا تم اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہو۔" بلال کے ذہن سے سعد کی بات شاید نکلی نہیں تھی۔

"ہاں، جب میں ان جاسوسوں کے اپنا پیچھا کرنے کا عادی ہوجاؤں گا جو میری ہر ہر حرکت نوٹ کرنے پر مامور ہیں تب ثابت ہوجائے گا۔"

"اس بات میں یہ اضافہ بھی کرلینا تھا کہ جن کو میں اکثر چکمہ دینے میں کامیاب ہوجاتا ہوں۔" بلال نے ہنستے ہوئے کہا۔

"وہ میرا Trait (طریقہ) ہے۔ اس کو سراہا جانا چاہیے۔"

"دیکھتے ہیں۔" بلال دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

سعد زیرِلب مسکرایا اور ان کے پیچھے چل دیا۔

☼ ☼ ☼

"یہ میں نے کلر کی ہیں، یہ سب۔" سارہ نے سر اٹھا کر ذرا سا اونچا کیا۔

"مگر آئی ایم سوری۔ اس میں بہتری کی گنجائش کافی زیادہ ہے۔" سعد نے ان فگرز پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا جن میں سارہ نے رنگ بھرے تھے۔ سارہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ سعد اس کی کارکردگی پر توصیفی کلمات کہنے کے بجائے اس پر تنقید کر رہا تھا۔ اس نے بے یقینی سے سعد کی طرف دیکھا۔

"امپرومنٹ کی گنجائش تو ہمیشہ ہوتی ہے نا۔" وہ شاید اس کی نظروں میں چھپی حیرت اور بے یقینی کو سمجھ رہا تھا۔

"ہاں، مگر تم شاید بھول رہے ہو کہ یہ ان ہاتھوں نے کیا ہے۔" سارہ نے اپنے ہاتھ اس کی نظروں کے سامنے پھیلائے۔ "ویک مسلز اور ٹوٹ کے جڑی رگوں کے ساتھ جن میں کم رفتار سے دوڑتا خون، انہیں سست اور کمزور بناتا ہے۔"

سعد نے اپنے سامنے پھیلے ان ہاتھوں کو دیکھا، جن کی ہتھیلی کی کھال چرمرائی ہوئی تھی۔ اس پر جھریاں سی پڑی تھیں اور جن کی کھال زردی مائل تھی، ان میں سرخی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس نے بے اختیار سارہ کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

"یہ ہاتھ بہت پیارے اور بہت ہمت والے ہیں سارہ!" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "ان ہاتھوں نے پہلے بھی بہت ہمت والے کام کیے تھے اور آئندہ بھی ان شاءاللہ ایسے ہی کام انجام دیں گے۔"

"نہیں۔" سارہ نے اس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ "یہ اب کوئی بھی کام بہتر طریقے سے نہیں کرسکیں... مگر..."

"تم جانتی ہو۔ مجھ پر ایسی نکمی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور اب میں ان کا جواب بھی نہیں دینا چاہتا۔" سعد کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ "میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم ان ڈرائنگ بکس میں زیادہ سے زیادہ کلر کرو اور اس کلرنگ میں پرفیکشن کے لیے کوشش کرو، جس دن کسی فگر میں تمہاری کلرنگ اتنی پرفیکٹ ہوگئی کہ اس پر حقیقی رنگوں کا گمان ہونے لگے۔ اس دن میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں گا۔"

"کس کے بارے میں؟" سارہ نے پرتجسس لہجے میں کہا۔

"تمہارے بارے میں اور۔۔۔"

"اور۔۔۔" سارہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"اور اپنے بارے میں۔"

سارہ کے اردگرد کوئی پھول کھلا تھا یا روشنی کی کوئی کرن چمکی تھی۔ اسے لگا اس کے اردگرد سب کچھ روشن اور رنگارنگ ہوگیا تھا۔

"بس اب تم دیکھنا، میری کلرنگ کتنی بہتر ہوتی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"اور یہ کیا بنا ہے خیر سے؟" سعد نے لچکیلے ربڑ سے بنے فگرز کی طرف دھیان کیا۔

"یہ چھ انچ کی بار ہے۔" سارہ نے مسکرا کر کہا اور یہ سر، دھڑ، بازو، ٹانگیں میری ہیں، ان کو جوڑنا باقی ہے۔ یہ فگر اس چھ انچ بار پر موو کرے گا۔"

"انٹرسٹنگ۔" سعد مسکرایا۔ "مجھے بھی تو بتاؤ بھئی، یہ فن کیسے سیکھا تم نے۔" سارہ سے پہلی ملاقات سے لے کر اب تک یہ پہلا موقع تھا جب سعد نے اس سے سرکس سے متعلق کوئی بات پوچھی تھی۔

سارہ نے مجسم کے وہ مختلف حصے جوڑے اور ان کو انگلیوں کی حرکت سے ہوا میں لہرایا۔ ربڑ کا لچکیلا فگر ہوا میں قلابازی کھانے کے بعد میز پر گرا اور مختلف حصوں میں بٹ گیا۔

"اوہ!" سارہ نے افسردہ نظروں سے ان ٹکڑوں کی طرف دیکھا اور پھر سعد سے مخاطب ہوئی۔ "جب میں پہلی بار رنگ میں یہ کرتب کرنے کے لیے داخل ہوئی تھی، اس وقت میری عمر صرف نو سال تھی، میں اس وقت اس سے بہتر ایکروبیٹ تھی۔"

"نو سال۔۔۔" سعد نے چونکتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔۔۔" سارہ نے سامنے کی دیوار پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "میں نے نیلے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا جس پر سنہری بوٹے چمکتے تھے۔ میرے بالوں کو کس کر یوں باندھ دیا گیا تھا کہ وہ میری کسی جنبش کے دوران میری آنکھوں کے سامنے لہرا کر اسے غلط نہ کرادیں۔"

"تم بہت ایکسائٹڈ ہو رہی ہوگی، ہے نا۔" سعد نے کہا۔

"پتا نہیں وہ کیا تھا۔" سارہ نے یاد کیا۔ "جوش، خوشی، خوف، کچھ کر دکھانے کا شوق یا پھر مجبوری جو بھی تھا رنگ میں داخل ہو کر کچھ بھی کر دکھانے سے پہلے۔۔۔ میرے پاؤں جیسے زمین پر ہی نہیں پڑ رہے تھے۔ میں جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ میں نے اپنے ٹرینرز کی تقلید میں سینٹرل لائٹ کے نیچے کھڑے ہو کر مجمع کی طرف ہوائی بوسے اچھالے۔"

"نو سال کی بچی اور ہوائی بوسے۔"

"ہاں!" سارہ نے سرہلا کر کہا۔ "یہ بھی ہماری ٹریننگ کا حصہ تھا، مجمع کو ایکسائٹ کرنے کے لیے۔"

"وائے۔ سلام ایسے ٹرینرز کو۔" سعد نے بے ساختہ کہا۔

"پھر میں نے بار پر ہاتھ ڈالے اور اس پر جھول کر اس پر تیر کی طرح سیدھی ہو کر کھڑی ہوگئی۔ اس پہلے ایکشن پر

مجھے داد اور تحسین' تالیوں اور سیٹیوں کا دس منٹ تک رسپانس ملتا رہا۔ بس پھر وہاں سے جو سفر شروع ہوا اس وقت تک نہیں رکا جب تک اس بار نے میرے پاؤں کے انگوٹھے کا بار اٹھانے سے انکار نہیں کیا۔" سارہ نے دیوار سے نظریں ہٹا کر سعد کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پانی تیر رہا تھا۔

"بار نے کہا۔ سارہ خان! میرا تمہارا بس اتنا ہی ساتھ تھا' اب تم یہاں سے رخصت ہو جاؤ' تمہیں کسی اور کا حصہ بننا ہے۔" سعد نے کہا۔

"کیا واقعی اس نے یہ کہا تھا؟" سارہ نے سعد کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ہاں' اس نے یہی کہا تھا۔ شاید تم اس کی یہ آخری سرگوشی سن نہیں پائیں۔" سعد مسکرایا۔

سارہ خان کے ارد گرد پھیلی روشنی کی لو کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"مہندی کے فنکشن میں مجھ سے زیادہ بونگی کوئی دوسری لڑکی نہیں لگ رہی ہوگی۔" ماہ نور نے آئینے میں خود کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایک تو ماما کو منفرد بننے کا اتنا شوق ہے کہ وہ چاہتی ہیں' ان سمیت ان کے گھر کا ہر فرد اوروں سے ہر جگہ منفرد نظر آئے۔ مجھے نہ سہی' انہیں تو اچھی طرح پتا تھا کہ آج کل مہندیوں پر کیا پہنا جا رہا ہے' لے کر مجھے وہی اولڈ اسٹائل مغلیہ لک دینے کے چکر میں ہنسی کا گول گپا بنا کر رکھ دیا' سب کے سامنے۔" اس نے اضطراری کیفیت میں لپ شائنر کا ایک اور کوٹ ہونٹوں پر لگا لیا۔

"اف ماہ نور!" اس کی کزن ثمو نے لپ شائنر اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

"یار تم اوور ڈو کر رہی ہو خود کو' اور کل کے فنکشن کے بارے میں بھی خوامخواہ کامپلیکس کا شکار ہو رہی ہو۔"

you were looking so beautiful baby

اس کی دوسری کزن رانیہ نے اس سے مسکرا کر بھینچتے ہوئے کہا۔

"مجھے سب پتا ہے۔" اس نے منہ بنایا۔ "کوئی بھی میری طرف مسکرائے بغیر نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں اتنی کانشس ہو رہی تھی' ڈھنگ سے تو ڈھنگ سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔"

"اسی لیے مسز صدیقی میری ممی سے پوچھ رہی تھیں کہ ماہ نور کا کہیں رشتہ تو طے نہیں کیا نا ابھی فائزہ نے۔" رانیہ نے کہا۔ "یہ شاید انہوں نے اس لیے پوچھا کہ اگر رشتہ طے ہو چکا ہو تو تمہارے ساتھ ساتھ تمہارے سسرال پر بھی ہنس لیں۔" رانیہ نے ثمو کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس دیں۔

"اڑالو' اڑالو میرا مذاق۔" ماہ نور نے ان دونوں سے اپنی چیزیں چھینتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر خود کو آئینے میں دیکھنے لگی۔ شیفون کے ڈیپ ریڈ گھیر دار فراک کے گلے اور بازوؤں پر بلیک ویلوٹ لگا کر ڈیپ ریڈ نگینوں سے تھیں کام ممی نے کسی ماہر کاریگر سے بنوایا تھا۔ بلیک نگینوں سے آویزاں جیولری بھی ممی کا انتخاب تھی۔ اس کے بالوں کو ماہین نے اس روز ایک نیا اسٹائل دیا تھا جس سے اسے خود اپنا آپ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ڈیپ ریڈ لپ اسٹک بچی تھی اور چہرے پر ہلکا میک اپ تھا۔

"کیا میں نے واقعی خود کو اوور ڈو کر لیا ہے۔" آئینے سے نظر ہٹا کر اس نے رانیہ سے پوچھا۔

"ارے نہیں یار! میں نے ایسا صرف اس لیے کہا کہ تم اوور کانفیڈنٹ نہ ہو جاؤ۔" وہ ہنسی۔

"نہیں نا' سچ سچ بتاؤ۔" وہ کنفیوز ہو گئی تھی۔

"تم ایک دم پرنسس لگ رہی ہو۔" ثمو نے کہا۔

"جلدی کرو لڑکیو! ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔" فائزہ نے ماہ نور کے کمرے میں جھانک کر کہا۔

شادی کا وہ فنکشن حسب توقع شان دار تھا۔ جس میں ملک کی ہائی کلاس شرکت کر رہی تھی۔ چچی صابرہ نے خاص طور سے اس دن یہ بات نوٹ کی تھی کہ ماہ نور جواب کی بار انہیں اکتائی ہوئی اور ہر چیز سے بے زار نظر آتی تھی۔ اس فنکشن کے دوران خاصی چہک رہی تھی۔

"کتنی پیاری بچی ہے فائزہ کی' کاش اللہ نے ہمیں ایک ہی بیٹا دے دیا ہوتا۔" ان کے دل میں نہ جانے کیوں ہوک سی اٹھی۔

فنکشن کے اختتام پر اس فائیو اسٹار ہوٹل کی لابی میں بابا کے کسی دیرینہ دوست کی فیملی سے باتیں کرتے ہوئے ماہ نور کو ان ہائی ہیلز میں اپنے پاؤں اچانک حد سے زیادہ دکھتے ہوئے محسوس ہوئے۔ جن پر وہ پچھلے تین چار گھنٹوں سے ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔

"چلیں نا اب بابا! میں بہت تھک گئی ہوں۔" اس نے تیسری بار بابا سے کہا۔

"بس دو منٹ بیٹا!" انہوں نے نرمی سے کہا اور اس نے روہانسی ہو کر ممی کی طرف دیکھا جو خود بھی کسی آنٹی سے محو گفتگو تھیں اور یہ سلمان کا بچہ نہ جانے کدھر ہے' اب اس کا انتظار بھی کرنا پڑے گا۔

سلمان کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑاتے اس نے دانت پیسے اور اسی طرح ادھر ادھر گھومتی اس کی نظریں اوپر سے آتی کیپسول لفٹ کے رکنے پر اس سے باہر نکلنے والے لوگوں کے گروپ پر ٹک گئیں۔ اس وقت بلاشبہ وہ کسی نئے بہروپ میں نہیں اپنے اصلی روپ میں کھڑا کسی سے رخصت ہوتے ہوئے ہاتھ ملا رہا تھا۔ اس کے ساتھ دو' تین اور لوگ بھی تھے جو رخصت ہو رہے تھے۔

"سعد!" بے اختیار ماہ نور کے منہ سے نکلا اور وہ چند قدم آگے بڑھی۔ "کیسا اتفاق تھا کہ وہ ایک ہی چھت کے نیچے کھڑے تھے۔ اسی دم سعد کی نظر ماہ نور اور اس کے اپنی طرف بڑھتے قدموں پر پڑی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ماہ نور کو وہیں رک جانے کا اشارہ کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے فون پر تیزی سے اس کے لیے میسج ٹائپ کیا تھا۔

"میں ابھی تمہارے شہر میں ہی ہوں' لیکن ابھی نہیں ہم پھر ملیں گے۔"

ماہ نور اس کا اشارہ دیکھ نہیں پائی یا پھر شاید اس کی سمجھ میں نہیں آیا' وہ اس کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی' جب اس کے ہاتھ میں پکڑے فون پر میسج کی ٹون بجی تھی۔ اس نے رک کر میسج پڑھا اور بے یقینی سے سعد کی طرف دیکھا۔ وہ اس انداز میں سر ہلا رہا تھا جیسے اسے یقین دلا رہا ہو۔

"ہاں یہ میں نے ہی بھیجا ہے۔"

ماہ نور یوں منع کیے جانے پر ششدر کھڑی تھی۔ مگر اس میسج نے سعد کی طرف اس کی پیش قدمی روک دی تھی۔

(باقی آئندہ ان شاء اللہ)

عنیزہ سیّد

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی۔ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور نے "سید پور کلچرل شو" میں شرکت کے لیے اپنی دوست شاہ بانو کے ساتھ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ شاہ

بانو نے اپنے بھائی کی معرفت سید پور میں ماہ نور کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا۔ فاطمہ اور خدیجہ نور کو اسلام آباد میں فلزا ظہور سے ملنے کی تاکید کی۔ فلزا ظہور ان کے بچپن کی ساتھی ہے۔ بچپن میں کوئلے سے فرش دیواروں پر تصویریں بنانے والی فلزا ظہور اب ایک بڑی آرٹسٹ ہے مگر اسے شہرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔

مولوی سراج اور آپا رابعہ قصبے میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی سعدیہ کلثوم نویں جماعت کی طالبہ بے حد ذہین مولوی سراج اور آپا رابعہ کو اس بات پر فخر ہے کہ ان کی بیٹی سائنس پڑھ رہی ہے۔

ایک رات سارہ نے رکی کو خواب میں دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ سرکس میں کام کرتا تھا۔ رکی اپنے فن کا ماہر جوکر تھا۔

ماہ نور اور شاہ بانو "سید پور کلچرل شو" میں گئیں تو وہاں انہیں ایک کمہار نظر آیا۔ وہ گیلی مٹی کو بہت مہارت سے زیب برتنوں کی شکل میں ڈھال رہا تھا۔ ماہ نور کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہ چونک گئی۔ اسے اس پر اسی شخص کا گمان جو اسے ہر میلے میں مختلف روپ میں نظر آتا رہا تھا۔

سارہ' ماہ نور سے مل کر خوش نہیں ہوئی۔ اس کا رویہ بہت روکھا اور خشک تھا۔

واپسی پر گاڑی میں ماہ نور نے سعد سے اعتراف کیا کہ وہ اب تک جتنا سعد کو جان پائی ہے' سعد اس کی نظر میں ایک قابل رشک انسان ہے' سعد نے اسے سارہ کے متعلق بتایا وہ سرکس دیکھنے گیا تھا۔ سارہ خان بلندی سے نیچے گری تھی۔ اس نے اس کی ہڈیاں ٹوٹتے اور خون بکھرتے دیکھا تھا' وہ وہاں سے واپس آگیا لیکن سارہ خان کے لیے بے چین رہا۔ وہ دوبارہ اسے ڈھونڈتے ہوئے اس سے ملنے پہنچا تو وہ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور زخم زخم جسم کے ساتھ ایک چھولداری میں پڑی موت کی منتظر تھی۔ اس کے زخموں پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں۔ سعد اس کو وہاں سے لایا اور اس کا علاج کرایا اور پھر اسے فلیٹ میں منتقل کیا۔

کمہاری نے آپا رابعہ سے نماز یاد کرلی تھی اور بہت خوش تھا۔ سارہ خان نے پہلی بار سوچا سعد سے اس کا تعلق صرف ترس اور ہمدردی کا ہے اسے اپنا ماضی یاد آرہا تھا۔ جہاں جاپانی نقش ونگار والا رکی تھا۔ جس کی جاپانی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اس کا باپ اس کے بہن بھائیوں کے ساتھ پھوپھی کے حوالے کرگیا تھا۔ باپ نے دوسری شادی کرلی تو سوتیلی ماں کے مظالم سے تنگ آکر وہ گھر سے بھاگ گیا اور قسمت اسے سرکس میں لے آئی۔

آپا رابعہ نے مولوی سراج کو بتایا کہ اسکول والوں نے سعدیہ کی پیدائش کی پرچی مانگی ہے تو وہ پریشان ہوگئے۔

ماہ نور' سارہ سے ملنے آئی اور اس نے سارہ کو بتایا کہ اس کی سعد سے صرف چند دن پہلے ملاقات ہوئی ہے۔ یہ سن کر سارہ کا رویہ اس کے ساتھ بدل گیا۔

سعد نے اپنی بہن نادیہ سے اسکائپ پر بات کی۔ وہ فن لینڈ میں بہت مشقت بھری زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کی ماں کا شوہر اس پر بری نظر رکھ رہا تھا۔ اس لیے وہ فن لینڈ آگئی۔

جیناں بھکارن نے ایک بچہ اغوا کیا لیکن پولیس نے اس سے بچہ برآمد کرلیا۔

ماہ نور کی سعد سے ملاقات ہوئی تو وہ اسے اختر کے پاس لے گیا۔ اختر نے ماہ نور کو دیکھ کر سعد سے کہا "یا تو زن یا من پالو" ایک کی قربانی دینی پڑے گی۔

اس نے ماہ نور سے کہا بی بی آپ کا دل بہت صاف ہے اور زندگی بہت پرسکون ہے لیکن آگے آپ کے لیے بہت مشکلیں ہیں۔

فلزا ظہور' سعد کو فون پر کسی تصویری نمائش کی دعوت دیتی ہیں۔ سعد اپنے فرینکفرٹ کے دورے کی وجہ سے معذرت کرلیتا ہے۔ ماہ نور' فاطمہ اور خدیجہ کو فلزا ظہور سے ملاقات کے بارے میں بتاتی ہے۔ فاطمہ ماہ نور سے سعد سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کرتی ہے۔ وہ بے دلی سے ہامی بھرتی ہے کیونکہ سید پور سے آنے کے بعد سے سعد کا فون مسلسل بند مل رہا تھا جبکہ سارہ خان کو اس نے اپنے جرمنی جانے کی اطلاع دے دی تھی۔

ماہ نور نے سعد کو فون کر کے شکوہ کیا کہ اس نے اسے جرمنی جانے کی اطلاع کیوں نہیں دی تھی۔ ماہ نور نے سعد سے وعدہ لیا کہ آئندہ وہ اسے بتا کر ہی کہیں جائے گا۔ اگلے دن سعد نے اسے کئی میسجز بھیجے۔ جن میں وہ اطلاع دیتا رہا کہ اب وہ کیا کررہا ہے۔ ماہ نور کو یہ سب اچھا تو لگا مگر اس نے سعد کو منع کردیا اور کہا کہ وہ اسے بس ملک سے باہر جاتے ہوئے اطلاع دیا کرے۔

سعدیہ نے آپا رابعہ سے تنگ کر اپنے رشتے داروں کی بابت پوچھا تو وہ تشویش میں مبتلا ہوگئیں۔ انہوں نے مولوی سرفراز سے اپنی تشویش کا اظہار کیا کہ سعدیہ کو شک ہوگیا ہے کہ ہم اس سے کچھ چھپاتے ہیں۔ تاہم مولوی سرفراز نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔

سعد نے فلزا ظہور سے ملاقات کی اور اس کا اسٹوڈیو بھی دیکھا۔ اس نے وہاں کچھ ادھوری پینٹنگز بھی دیکھیں۔ جو اسے بے حد متاثر کن لگیں۔

سارہ نے لچکیلے ربڑ سے کچھ جانور بنائے۔ سعد نے دیکھ کر کہا کہ اگر تم نے اس سے بھی اچھے بنائے تو میں تمہیں اپنے اور تمہارے بارے میں ایک اہم بات بتاؤں گا۔ سارہ نے اس سے وعدہ کرلیا کہ وہ اب اور محنت کرے گی۔

ماہ نور اپنے رشتے داروں کی شادی میں گئی تو وہاں ہال کے باہر اسے سعد کچھ لوگوں کے ساتھ نظر آیا۔ ماہ نور اسے اپنے شہر میں دیکھ کر حیران ہوگئی۔ وہ اس سے ملنے کے ارادے سے اس کی طرف بڑھی۔ مگر سعد نے ایس ایم ایس کے ذریعے اسے روک دیا۔ ماہ نور ششدر رہ گئی۔

—||—

گیارہویں قسط

"کیا مجھے اماں سے اس طرح بات کرنی چاہیے تھی جیسے آج صبح میں نے کی۔" اس روز اسکول میں پڑھائی کے ہر گھنٹے کے دوران سعدیہ کا ذہن اسی بات میں اٹکا رہا۔

"لیکن میں نے کچھ غلط بھی تو نہیں کہا نا۔" اس کے ذہن میں ساتھ ساتھ یہ خیال بھی آتا رہا۔ "کیا کوئی گھرانہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ جس کا کوئی آگا پیچھا ہی نہ ہو اور وہ زندگی کو ایک مشقت بھرے کام کی طرح یوں گزار رہا ہو کہ رات آئی تو کچھ ستالیا۔ صبح ہوئی تو پھر کام سے لگ گئے۔ کچھ تو ہوتا ہے نا زندگی میں' عزیز' رشتہ دار نہ سہی' کوئی جاننے والا' کوئی ملنے والا' کوئی تو ہوتا ہے نا' چلو نہیں ہے کوئی تب بھی کوئی وجہ' کوئی دلیل تو ہوتی ہے نہ ہونے کی' یہ کیا کہ جب پوچھا' بھئی کوئی کیوں نہیں ہے تو جواب میں ڈنڈا اٹھالیا کہ ان باتوں میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں' انہیں کیا پتا کہ کلاس میں جب لڑکیاں کسی خالہ' پھوپھی کا پوچھتی ہیں اور میرے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا تو مجھے کیسا محسوس ہوتا ہے۔ انہیں تو شاید یہ بھی نہیں پتا چلتا کہ گاؤں میں بھی کبھی کبھی لوگ دبی زبان میں یہ بات کر جاتے ہیں کہ مولوی صاحب اور بہن جی کا پیچھے سے کوئی ملنے والا کبھی نہیں آتا' نہ ہی یہ لوگ کبھی کہیں جاتے ہیں' ان لوگوں کو بھی کیا جواب دیا جائے۔

وہ سوچتی رہی' خود سے ہی سوال اور خود ہی جواب دیتی رہی۔ اسے بہت سوچنے پر بھی اپنے ماں' باپ کا کوئی سراغ ہاتھ نہیں لگتا تھا۔ ابا جی مسجد میں وقت گزار دیتے اور اماں سارا دن گھر کے کونے کھدرے میں جھانکتی کوئی نہ کوئی کام اپنے لیے تلاش کرتی رہتیں' اس نے اماں اور ابا جی کی آپس کی گفتگو میں سے بھی کسی بات کا سراغ لگانے کی بہتیری کوشش کر دیکھی تھی' مگر ان کی گفتگو اتنی رسمی' اتنی نپی تلی ہوتی تھی کہ کسی گزری بات کا شائبہ

تک نہیں ہوپاتا تھا۔

کبھی کبھی تو اسے لگتا کہ اماں اور اباجی صرف اس کے ماں باپ تھے آپس میں میاں بیوی تھے ہی نہیں' اگرچہ میاں بیوی کے رشتے کو بہت زیادہ حد تک سمجھ نہیں پاتی تھی کیونکہ بیالوجی کی جو کتاب وہ پڑھ رہی تھی اس میں مرد اور عورت کے تعلق کو کسی جانور یا پودے کی حیات کے ذریعے بیان کیا گیا تھا' مگر اتنا اندازہ اسے ضرور تھا کہ میاں بیوی کے تعلق میں اتنا پردہ اور ایک دوسرے کی اتنی حیا نہیں ہوتی جتنی اس کے ماں باپ کے درمیان حائل تھی۔

کبھی جو وہ سردی کی دھوپ میں بیٹھ کر پڑھنے کے لیے اتوار کی چھٹی والے دن چھت پر بیٹھ جاتی تو اسے اردگرد کے گھروں سے رشتوں' میں جذبات محبت' لڑائی' ناراضی اور کھلکھلاہٹ کی اٹھتی مہک اپنی حسیات تک پہنچتی محسوس ہوتی' وہ اس وقت اپنے محسوسات خود اپنے سامنے ہی وضاحت کرنے سے قاصر رہتی۔ کسی گھر میں میاں بیوی کی تو تکار' کسی گھر میں باپ بیٹے کی گفتگو' کسی گھر کے کھلے دروازے سے آنے والے مہمان کی آمد پر قہقہے' کسی میں موت پر تعزیت' آوازیں بغیر کسی کوشش کے اس کے کانوں پہنچتیں اور وہ ان ہی آوازوں کے ذریعے رشتوں کی اہمیت کو سمجھتے اس عمر تک آپہنچی تھی کہ دل ودماغ میں اٹھتے والے سوال زبان کے ذریعے آواز پانے لگے تھے۔

"اماں نے تو کبھی نہیں بتایا' میں خود ہی کوشش کر کے پتا کرتی ہوں اور لازمی پتا کرتی ہوں۔"

اس نے اس سارا دن کی ذہنی کشمکش کے بعد فائنل فیصلہ کرتے ہوئے سوچا اور صبح کی نسبت ہلکے ذہن کے ساتھ اسکول کے گراؤنڈ میں موجود ان لڑکیوں کے گروپ میں جا بیٹھی۔ اس کی طرح جن کا تانگہ بھی ابھی انہیں لینے نہیں آیا تھا۔ وہ لڑکیاں اپنے درمیان ایک ہفتہ وار رسالہ پھیلائے بیٹھی تھیں' اس رسالے میں رنگ برنگ تصویریں تھیں اور فیشن کے مطابق ملبوسات بھی۔

"اس رسالے میں سب کچھ ہوتا ہے' دین اسلام کی باتیں بھی' کہانیاں بھی' کھانے پکانے کی ترکیبیں بھی' ملک کے حالات کی خبریں بھی' نت نئی ایجادات کے بارے میں معلومات بھی۔" اس کی اپنی ہم جماعت فردوس جو یہ رسالہ لے کر آئی تھی نے اسے بتایا۔

"اگر تم برا نہ مانو فردوس! تو آج میں یہ رسالہ گھر لے جاؤں۔"

سعدیہ نے تانگے میں بیٹھنے سے پہلے اچانک فردوس سے کہا۔ سعدیہ کا یہ سوال فردوس کے لیے اگرچہ انوکھا تھا مگر اسے سعدیہ کو وہ رسالہ دینے میں کوئی تامل نہ ہوا جو دو ہفتے پرانا تھا اور جسے وہ الف تا یے پڑھ چکی تھی۔ اس نے وہ رسالہ سعدیہ کو دے دیا۔ اس روز سعدیہ اپنے بستے میں ایک نیا جہان لے کر گھر پہنچی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں روزگار کے جھنجھٹ سے یوں آزاد دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے۔ کیا تم جانتی ہو؟" شیکھر نے بہت دن بعد نادیہ کے نظر آنے پر اس سے کہا۔

"شکریہ۔" نادیہ ہولے سے مسکرائی۔ "مگر تمہیں یاد رہے کہ کسی کو ادھار دینے کے لیے میرے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" شیکھر کھلکھلا کر ہنس دیا۔ "اور تمہیں بھی یاد رہے کہ میں ان دوستوں میں سے نہیں ہوں جو ادھار مانگنے کی خاطر ایسی باتیں کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" نادیہ نے کہا۔ "میں تمہارا نام ایسے دوستوں کی فہرست میں آج ہی شامل کرلوں گی۔ جو ادھار مانگنے کی خاطر ایسی باتیں نہیں کرتے۔"

"لیکن میں ایسا دوست ضرور ہوں جو یہ پوچھنا چاہے گا کہ نادیہ! کیا تمہاری کوئی لاٹری نکل آئی ہے' کوئی جیک پاٹ ہاتھ لگا ہے یا کوئی دولت مند رشتہ دار مر گیا ہے۔" شیکھر نے کہا اور قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

"اور میں ایسی دوست ہوں جو کم از کم تم جیسے دوست کو یہ ضرور بتائے گی کہ ان میں سے کوئی بھی بات نہیں ہوئی۔" نادیہ مسکرائی اور اس نے ہاتھ میں پکڑے ڈرنک کی بوتل منہ سے لگالی۔

"وہ تو پھر کیا ہوا جو تم ایک دم روزگار ڈھونڈنے کی مشقت سے آزاد ہو گئیں' یقیناً" تم یہ نہیں بتاؤ گی۔" شیکھر نے ترچھی نظروں سے نادیہ کو دیکھا۔

"ہرگز نہیں بتاؤں گی' کیونکہ یہ میرا راز ہے' اور اسے میں کسی پر افشا نہیں کر سکتی۔" نادیہ نے جواب دیا اور ہنس دی۔

"جیسے تمہاری مرضی۔" شیکھر نے شانے اچکاتے ہوئے کہا اور پاپ کارن کے پیکٹ سے دانے نکال کر کھانے لگا۔

"کسی شام آنا' میں تمہیں کافی پلاؤں گی اور سینڈوچ بھی کھلاؤں گی' دو ایسی چیزیں جو مجھے بنانی آتی ہیں۔" نادیہ نے اٹھتے ہوئے شیکھر سے کہا۔

"میں سینڈوچ سے زیادہ بھاجی پوری میں دلچسپی رکھتا ہوں' اگر وہ کسی کو بنانی آتی ہوں تو" شیکھر مست ہو رہا تھا۔

"انڈین مسالے۔" نادیہ نے کہا "کسی قیمت پر نہیں۔ زبان کاٹ دیتے ہیں۔"

"اور مغربی کھانے۔" شیکھر نے مندھتی آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔ "ایک دم بکواس' زبان چاٹ جاتے ہیں۔"

"تو مجھے کیوں کہہ رہے ہو۔" نادیہ نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں مغربی نہیں ہوں۔"

"تو پھر تم کون ہو؟" شیکھر اب مکمل طور پر ٹن ہو چکا تھا' اس کی آواز لڑکھڑانے لگی تھی۔

"میں پاکستانی ہوں شیکھر!" نادیہ نے شیکھر کی ناک کو انگلی سے چھوتے ہوئے شرارتاً کہا۔ "جی جان سے تمہاری دشمن۔"

"اور تمہیں یہ بھی نہیں پتا کہ تم پاکستانی مسلمان ہو یا پاکستانی لادین" شیکھر نے اپنی مست آنکھیں کھولیں اور قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

نادیہ شیکھر کے اس جملے پر ٹھٹکی اور پھر خاموش ہو گئی۔ اس نے ایک نظر شیکھر پر ڈالی جو آنکھیں موندے کوئی پوربی گیت گنگنا رہا تھا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے اس ریستوران کے دروازے تک پہنچی لیکن وہاں سے واپس مڑ کر وہ دوبارہ شیکھر کے قریب آگئی۔

"ہے شیکھر!" اس نے ایک بار پھر شیکھر کی ناک کو چھو کر اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا۔ "معاف کرنا میں نے تمہیں تنگ کیا۔" اس نے اپنے بالوں کو جھٹک کر چہرے پر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "میں صرف یہ بتانا چاہتی تھی کہ اپنی ڈائری میں آج یاد سے لکھ لینا' نادیہ بلال پاکستانی مسلمان ہے۔"

شیکھر نے بمشکل آنکھیں کھول کر اس کی بات سنی' اسے سمجھا اور قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ "لگتا ہے' آج تم نے

بھی خوب پی لی ہے نادیہ!" وہ بولا اور ہنستے ہنستے آنکھیں موند لیں۔

"ٹھیک ہی تو ہنسا تھا شیکھر۔" یونیورسٹی روڈ پر سائیکل چلاتے ہوئے نادیہ نے شیکھر کے ردعمل پر اچھی طرح کھول لینے کے بعد سوچا۔ "میرے حلیے گفتگو اور طرز زندگی کو دیکھ کر کوئی کیسے مان سکتا ہے کہ میں پاکستانی مسلمان ہوں۔ یقیناً" اس بات کو سال کا سب سے بڑا لطیفہ قرار دیتے ہوئے اتنی ہی زور سے ہنسنا چاہیے۔ جتنی اونچی آواز میں شیکھر ہنسا تھا۔"

اسے خود پر غصہ آ رہا تھا یا کسی اور پر، یہ شاید اس وقت اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا مگر وہ اپنا سارا غصہ سائیکل کے پیڈلز پر اتار رہی تھی جنہیں وہ اتنی تیزی سے گھما رہی تھی کہ وہ چرخ چوں کی آوازیں دینے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

"کیا حال ہے ماہ نور؟"

"آئی ایم سوری میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

"اچھا، چلو۔" "کوئی بات نہیں میں نے شاید غلط نمبر پر کال کر دی۔ کیا خیال ہے بند کر دوں فون پھر؟"

"میں کسی ایسے شخص سے بات کیوں کروں جو اپنی مرضی سے بات کرتا اور پہچانتا ہے۔ مرضی نہ ہو تو بالکل اجنبی بن جاتا ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ تم سخت ناراض ہو اور تمہیں ہونا بھی چاہیے۔"

"نہیں۔ تم کچھ نہیں جانتے اور ہر بار مجھے اسی طرح ہرٹ کرتے ہو۔ آئی ایم سوری۔ میں بار بار ہرٹ ہو[نا] نہیں چاہتی۔"

"پلیز! ایسی بات مت کرو، کل رات ایسا نہیں تھا کہ میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔ ایسا بھی ہرگز نہیں تھا کہ میں تم سے بات کرنا اور تم سے ملنا نہیں چاہتا تھا، یقین کرو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔"

"پھر تم نے ایسا کیوں کیا، مجھے منع کیوں کیا۔ مجھے میسج کر کے کیوں روکا۔"

"سمجھو اس میں کچھ مصلحت تھی۔ اس وقت ہم ایک بزنس میٹنگ سے اٹھ کر آئے تھے اور اس وقت میرے ساتھ ایسے ہی لوگ تھے جن کے ساتھ ہمارے صرف بزنس ریلیشنز ہیں۔"

"تو کیا ہوا۔ مجھے تو صرف تم سے ہیلو ہائے کرنا تھی، میرے ساتھ میرے بابا اور ممی تھیں، سلمان بھی تھا، میں تمہیں ان سے ملواتی اور بس۔"

"میرے ساتھ بھی میرے ڈیڈی تھے ماہ نور، اور لوگوں کے علاوہ۔"

"میں سمجھ گئی تھی، میں نے انہیں دیکھا تھا اور دیکھتے ہی پہچان گئی کہ وہ ہی تمہارے ڈیڈی تھے، تم دونوں ایک دوسرے سے انتہا سے زیادہ مشابہت رکھتے ہو۔ تمہارے درمیان صرف عمروں کا فرق ہے۔ لیکن کیا فرق پڑتا تھا۔ کہ وہ تمہارے ساتھ تھے، میں ان سے بھی مل لیتی۔"

"نہیں ماہ نور! تم نہیں سمجھو گی۔ ڈیڈی کا مزاج عام انسانوں سے بہت مختلف ہے، وہ تعلقات اور رشتوں کو بھی بزنس میٹرز کی طرح ہینڈل کرنے کے عادی ہیں، نفع نقصان کی کیلکولیشن کی طرح ان کو بھی کیلکولیٹ کرتے ہیں، میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہارے جیسی مخلص اور اچھی دوست کے ساتھ میری دوستی کا تعلق ان کی نظروں کے سامنے آئے۔ میرے معاملے میں وہ بے حد حساس بھی ہیں، انہیں ہر اس انسان کی چوکسی کرنے کا خبط بھی ہے جس سے میرا تعلق ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے میں اپنے معاملات ان سے بہت خفیہ رکھتا ہوں۔"

"یہ کیا بات ہوئی، وہ تمہارے فادر ہیں، تمہیں ان کے ساتھ فرینک ہونا چاہیے۔"

"میں ان کے ساتھ ہر معاملے میں فرینک ہوں مگر میں ان کے مزاج کی وجہ سے اپنے پیارے تعلقات کو جھلاہٹ میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔"

وہ چپ سی ہو گئی۔

"تم خاموش کیوں ہو گئیں، میں جانتا ہوں تم الجھن میں پڑ گئیں۔"

"نہیں ایسی بات نہیں ہے، لیکن میں سوچ رہی ہوں کہ تمہیں یہ بات، مجھے پہلے بتا دینی چاہیے تھی۔ جیسے تم نے اور بہت سی باتیں مجھے بتائیں، اگر مجھے پتا ہوتا تو شاید میں اس طرح تمہیں مخاطب نہ کرتی، میں تو سمجھی تم لاہور [آ]ئے ہوئے ہو جیسا کہ تم نے بتایا تھا کہ تم آنے والے ہو اور اتفاق سے نظر بھی آ گئے ہو تو اپنی فیملی سے تمہیں [ملوا]تی۔"

"میں نے تمہیں میسج میں بتایا تو تھا کہ میں ابھی ادھر ہی ہوں اور ان شاء اللہ تم سے اور تمہاری فیملی سے [ض]رور ملوں گا۔"

"ہاں ضرور۔"

"کل کی میٹنگ میری آخری مصروفیت تھی، اس کے بعد میں نے اس سیزن کا آف لے لیا ہے اور اب میں کچھ [و]قت کے لیے اس ہنگامہ خیز، تیز رفتار زندگی سے بالکل فارغ ہوں، اپنی مرضی اور اپنے مزاج کے مطابق وقت گزارنے کے لیے۔"

"تمہارے ڈیڈی اب تمہاری چوکسی نہیں کریں گے؟"

"کریں گے۔ کوشش تو ضرور کریں گے لیکن مجھے بھی ان کو جل دینے کے بہت سے طریقے آتے ہیں۔"

"ویسے تم کل رات بہت تیار شیار تھیں، خیر تو تھی۔"

"میں نے تمہیں بتایا تو تھا، میری کزن کی شادی تھی۔ کل رات بارات کا فنکشن تھا اور تم بھی تو ڈنر سوٹ میں ہرگز بندر کے تماشے والے نہیں لگ رہے تھے۔"

"ہاہا" آئی سی۔ مگر تم بہت مختلف لگ رہی تھیں، پہلے میں سمجھا۔ وہ تم نہیں تم نما کوئی لڑکی تھیں اور میری نظریں دھوکا کھا رہی تھیں۔"

"کیا واقعی میں نے اوور ڈو کر لیا تھا۔"

"اوور ڈو کیا مطلب۔"

"مطلب میری ایک کزن کہہ رہی تھی میں نے خود کو ضرورت سے زیادہ ڈیکوریٹ کر لیا تھا، اس کا مطلب میں بہت بری لگ رہی تھی، مجھے پہلے ہی شک تھا، رانیہ کی بچی جھوٹ بول رہی تھی مجھے تسلی دینے کے لیے، وہ تو مذاق کر رہی تھی۔"

"ویسے تو میرے پلے تمہاری کوئی بات نہیں پڑ رہی، لیکن تم کل رات مجھے ہر بار سے زیادہ مختلف لگ رہی تھیں شاید مجھے اپنی بات کی وضاحت کرنی نہیں آ رہی۔"

"صاف کہو نا کہ میں چڑیل لگ رہی تھی، ایک تو میری ممی انہیں مجھے ڈارک اور برائٹ کلرز پہنانے کا خبط ہے چاہے وہ مجھ پر کتنے ہی برے کیوں نہ لگ رہے ہوں۔"

"ارے! تم تو رونے لگیں۔ یہ کیا بات ہوئی۔"

”مجھے یہ سوچ کررونا آرہا ہے کہ کل رات میں کس کانفیڈنس کے ساتھ سارے فنکشن کے دوران ادھر ادھر اڑی پھررہی تھی جبکہ لوگ میری چڑیلوں جیسی شکل پرہنس رہے ہوں گے۔“

”افوہ بھئی۔ تم تو بہت ہی کانشس ہوگئیں‘ میری بھی سمجھ میں وہ الفاظ نہیں آرہے جو میں کہنا چاہتا ہوں۔“

”نہ بھی کہو تو بھی مجھے پتا ہے۔“

”اچھا چھوڑو اس بات کو‘ یہ بتاؤ کہ آج کل کیا ہو رہا ہے۔“

”شادی کے ہنگاموں میں کتنے ہی دن ضائع ہوگئے اور اب تو اسٹڈیز کا بہت ہی زیادہ پریشر ہوگا۔“

”مطلب تم سے ملاقات مشکل ہے۔“

”نہیں۔ ایسا بھی ہرگز نہیں ہے تم میرے گھر آونا کسی دن‘ بلکہ ایک دو دن میں ہی آجاؤ کیونکہ میرے چچا کی فیملی نے دو‘ تین دن میں واپس چلے جانا ہے اور ان کے ساتھ کھاری بھی چلا جائے گا‘ پتا ہے کھاری اس سائیں کو بہت یاد کرتا ہے جو اسے بابے منگو کے میلے پر ملا تھا۔“

”ہاہاہا۔“

”بات سنو تم نے آف لے لیا ہے‘ کہیں کوئی نیا بہروپ بدلنے کا ارادہ تو نہیں۔“

”ہاہاہا۔ اچھا ایسا ہے کہ ایک دوست کی کال آرہی ہے ذرا اس کی بات سن لوں‘ تمہیں پھر کسی وقت کال کرتی ہوں۔“

”ہاں ضرور۔ اپنا خیال رکھنا۔“

ماہ نور نے مسکراتے ہوئے فون بند کردیا اور مسکرا دی۔ وہ سعد کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میسج کی ٹون نے اسے سوچ سے چونکا دیا۔ اس نے میسج پڑھا۔

”یاد آگیا میں تمہارے کل والے روپ کے بارے میں دراصل کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ میں کہنا چاہ رہا تھا۔“

Girl you are amazing
just the way you are
(تم جیسی بھی ہو مبہوت کردیتی ہو)

☼ ☼ ☼

”آپ کے والدین ہوری کہاں رہتے ہیں جناب۔“

کھاری نے مرغ کڑاہی اور کٹاکٹ پلیٹ میں اکٹھے ڈال کر ان کو ملاتے ہوئے محمد رضوان الحق سے پوچھا۔ وہ محمد رضوان الحق کی دعوت پر دیسی کھانوں کے اس ہوٹل کی ایک میز پر بیٹھا خود کو انتہائی اہم شخصیت ... تھا۔

”یہ تو مجھے بھی نہیں پتا بھائی افتخار!“ رضوان الحق نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں میز پر رکھے شیشے کے پھول دان پر جماتے ہوئے کہا۔ شیشے کے اس پھول دان میں پتلی سی شاخ پر سجا گلاب کا مصنوعی پھول بے بسی سے ایک طرف گردن نیہوڑائے جھول رہا تھا۔

”میں نے مدت ہوئی انہیں کھو دیا۔“ اس نے کھانے میں مگن کھاری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کھاری کا لقمہ بناتا ہاتھ ایک دم رک گیا۔ اس نے سر اٹھا کر رضوان الحق کی طرف دیکھا اور پھر سر ہلا کر توجہ دوبارہ لقمے پر مبذول کرلی۔

”بڑے خوش قسمت ہو جی پھرتے تسی۔ تساں نے ان کو کھو دیا۔ ایہہ کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے اوناں کو کبھی پایا بھی تھا‘ ہے نا؟“ اس نے تائید طلب نظروں سے رضوان کو دیکھا۔ ”مطلب تساں نے اپنے والدین دیکھے ہیں؟“ رضوان نے سر ہلایا۔

”ہاں دیکھے ہیں‘ افتخار بھائی!“ اس نے کہا۔ ”جب میں چھوٹا تھا تو ماں اور باپ دونوں کے ساتھ ہی رہا کرتا تھا۔“

”تو پھر آپ تو خوش قسمت ہوئے نا جی!“ کھاری نے روٹی کے آخری نوالے سے پلیٹ صاف کرنے کے بعد نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”شاید“ رضوان شاید کھاری کی بات سمجھ نہیں پایا تھا اس لیے اس نے گومگو میں جواب دیا۔

”میں ہوں نا۔“ کھاری نے ٹشو پیپر سے صاف کرنے کے بعد ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اپنے ماں پیو دیکھے بھی نہیں۔“ ”میں اوناں کی شکلاں سے بھی واقف نہیں۔ مجھے ان کا نام پتا‘ آگا پیچھا بھی نہیں پتا‘ ماسی جنت کہتی ہے۔ کھاری باؤ بوتی پر چولیں (زیادہ کھوج) نہ کیا کر‘ بوتے سوال نہ پوچھا کر‘ اگلے کہیں گے جا اوئے افتخار احمد! پتا نہیں تو حلال کا بھی ہے کہ نہیں۔“

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ رضوان الحق نے دیکھا ہنستے ہوئے کھاری کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

”ایس لیے میں تو سوچتا بھی نہیں‘ میں تو کچھ پچھدا بھی نہیں۔“ کھاری نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ٹشو پیپر سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا اور سر اٹھا کر رضوان کی طرف دیکھا۔

”بوتا ہنسیے (زیادہ ہنسو) تو آنکھوں میں اتھرو (آنسو) آجاتے ہیں۔“ اس نے مسکرا کر آنکھوں پر ایک دفعہ پھر ٹشو پیپر رکھ لیا۔

”پتا نہیں افتخار بھائی!“ رضوان الحق نے جھرجھری لینے کے بعد سر ہلایا ”کون زیادہ خوش قسمت ہے۔۔۔ لیکن ایک بات ہے‘ میں نے تو خود اپنے ماں باپ کو چھوڑا‘ میں بہت سال پہلے گھر سے بھاگ گیا تھا۔“

”اچھا جی!“ کھاری نے حیرت کا شکار ہوتے ہوئے کہا۔

”فرق دیکھو افتخار بھائی! تم نے ماں باپ نہیں پائے پھر بھی اللہ نے تمہیں ایک محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دیا۔ میں نے ماں باپ پائے لیکن ٹھکانے کو لات مار دی۔ تمہیں یہ فکر نہیں ستاتی کہ سارا دن کام کرنے کے بعد رات کہاں گزارنی ہے۔ مجھے یہ فکر سارا دن ڈھنگ سے کام نہیں کرنے دیتی کہ دن تو گزر گیا‘ رات کا کیا ہوگا۔“

کھاری آنکھیں کھولے دم بخود بیٹھا رضوان کی بات سن رہا تھا۔

"تم نے آنکھ کھولی' ہوش سنبھالا تو اپنے نہ سہی 'اپنوں جیسے کچھ رشتے اپنے اردگرد پائے' میں نے آنکھ کھولی اردگرد اپنوں کو پایا ' مگر جب اپنوں سے بچھڑ گیا تو پھر کوئی اپنا نہ بن سکا۔ میں اس اتنی بڑی دنیا میں 'اللہ کے اتنے زیادہ بندوں کے درمیان بالکل اکیلا ہوں افتخار بھائی!"

اب کے جھرجھری لینے کی باری کھاری کی تھی۔

"اوئے ہوئے ہوئے!" کھاری نے آنکھیں جھپکا کر سرہلاتے ہوئے کہا۔ "بھلا دسو' دنیا وچ جس کو پھولو (کھوج لگاؤ) وہی دکھی ہے۔"

"نہیں افتخار بھائی یہ دنیا کا جو میلہ ہے نا' اس میں سب بندوں کو خوش ہونے کا موقع بھی ملتا ہے' دکھ کی کہانی سنا کر ہم بندے ناشکری بھی کرتے ہیں اور دکھ کی کہانی سنا سنا کر خوش بھی ہوتے ہیں۔" رضوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کئی لوگ ہیں جی دنیا میں۔" کھاری نے رضوان کی بات سمجھے بغیر اسے مسترد کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے بڑے ایسے دیکھے ہیں جو کبھی دکھی نہیں ہوندے' سدا خوش رہندے ہیں۔" یہ اپنی جو مہ نور بی بی ہے نا" پھر اس نے بازو میز پر رکھ کر آگے جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

"وہی جو آج تم نے دیکھی جب تم مجھے لینے نہیں آئے تھے۔" اس نے رضوان کو یاد کرایا۔

"ہاں!" رضوان نے سرہلاتے ہوئے کہا۔ اسے وہ لڑکی یاد آگئی جو کھلکھلا کر ہنستے ہوئے افتخار سے اس کے بارے میں پوچھ رہی تھی اور جس نے دوستانہ انداز میں اسے ہیلو بھی کہا تھا اور جس کی عمر' مسکراہٹ' زندہ دلی اور چہرے پر چھائے خوشگوار تاثرات کو دیکھ کر رضوان کو نجانے کیوں ایک پرانا چہرہ' ایک گزرا وقت' ایک پرانا تعلق یاد آگیا تھا۔

"اس کو کوئی دکھ نہیں ہے۔" کھاری نے جیسے رضوان کو ایک راز کی بات جتائی "اس کو اکیلی کو نہیں' اس کے خاندان میں کسی کو کوئی دکھ نہیں' سارے بڑے خوش ہیں اللہ کے فضل سے۔"

"چلو افتخار بھائی! اچھی بات ہے۔" رضوان نے وہ کہنے کا ارادہ منسوخ کرتے ہوئے کہا جو وہ افتخار کی اس بات کے جواب میں کہنا چاہتا تھا۔

"دعا کرو جو خوش ہیں ہمیشہ خوش رہیں' ان کو کبھی کوئی دکھ نہ پہنچے۔" اس نے کھاری کی طرف دیکھا جو اس کی بات کی تائید میں سرہلا رہا تھا۔

"چلو پھر تو طے ہے نا کہ تسی ہمارے پاس آرہے ہو میلے تے؟" کھاری نے مسکراتے ہوئے موضوع گفتگو بدلا۔ اسے رضوان الحق کی اس مہمان نوازی کا بدلہ چکانے کی فکر ہو رہی تھی جس کی وجہ سے اس نے کئی دنوں بعد اتنا مزے دار دیسی کھانا کھایا تھا۔

"ہاں' وہ تو میں ضرور آؤں گا ان شاء اللہ۔" رضوان نے کہا۔

"چلو فیر' میں تو واپس جا کر بس آپ کے آنے کی اڈیک (انتظار) میں ہی رہوں گا۔" کھاری خوش ہوتے ہوئے بولا۔ بیرے نے اس کے سامنے فیرنی کی ٹھوٹھیاں لا کر رکھی تھیں۔

"واہ وئی واہ۔" وہ دانت نکالتے ہوئے بولا۔ "میں سمجھا لاہور شہر میں بس فاس فوڈ (فاسٹ فوڈ) اور انگریزی' چینی' جاپانی کھانے ہی ملتے ہیں۔" اس نے رضوان سے کہا جو مسکرا رہا تھا۔

"چینی' جاپانی سے یاد آیا' آپ کے ابا جی چینی جاپانی تھے کہ اماں ہوری؟" اس نے سوال کرنے کے بعد ایک نظر رضوان پر یہ دیکھنے کے لیے ڈالی کہ وہ اس انتہائی ذاتی سوال پر ناراض تو نہیں ہوا۔

اس نے دیکھا رضوان کا چہرہ ہی نہیں چھوٹی چھوٹی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔

"آپ کا کیا خیال ہے' کون ہو گا ان دونوں میں سے؟" اس نے کہا۔

"کئی لوگوں کی تو اماں جی ہی باہر کی ہوتی ہیں' ابے ادھر کے ہی ہوتے ہیں۔" کھاری نے اپنی معلومات کھنگال کر جواب دیا۔ "ہمارے پنڈ میں گجروں کا بیٹا گیا تھا جرمنی اس نے ادھر میم سے شادی کر لی تھی' ایک دفعہ میم لے کر آیا تھا۔ ہماری جو چوہدرانی ہیں نا ان کو میم کا بڑا چاء (شوق) چڑھا' اونہاں نے میم کی دعوت بھی کی تھی فارم ہاؤس پر چوہدری صاحب بولے لو دسو گجروں کا پتر اب اتنا اپارٹمنٹ (امپورٹنٹ) ہو گیا ہے۔"

وہ ٹانگ پر ہاتھ مارتے ہوئے زور سے ہنسا۔ رضوان دلچسپی سے اس کی بات سنتے ہوئے مسکرایا۔

"پر اس کے بعد وہ مڑ کے نہیں آیا۔" کھاری نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اتنے اتنے اس کے ایانے (بچے) ہیں۔" اس نے ہاتھ کی بلندی سے اندازہ کراتے ہوئے کہا۔ "چٹے دودھ' نرے انگریز۔ اونہاں کی تصویریں گجروں کے گھر بیٹھک کی دیوار پر فریم میں لگی ہیں۔" رضوان نے مسکراتے ہوئے سرہلایا۔

"پر جناب! تسی کیوں واپس آگئے باہر سے' ادھر ای جی کے پاس ہی رہنا تھا' ابے ہوروں کی کمائیاں کھاتے آرام سے۔" "اوئے ہوئے آپ ادھر سے بھاگ کے تو نئیں آئے ہو گے ہوائی جہاز میں اڈھ (اڑ) کے آئے ہو گے۔ آئندہ یہ نہ کہا کرو کہ میں گھر سے بھاگا تھا' کہا کرو میں گھروں اڈیا (اڑا) تھا۔"

"واہ افتخار بھائی! آپ باتیں بہت مزے کی کرتے ہو۔" رضوان نے بے اختیار ہنستے ہوئے کہا۔

"خیر جو بھی ہوا ہو گا۔ آپ کی مرضی تھی نہیں رہے ماں پیو کے پاس۔" کھاری نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ "پر آپ کو پتا اڈریس (ایڈریس) تو یاد ہو گا نا؟" اس نے سوالیہ انداز میں رضوان کو دیکھا "تے پھر کدھی واپس چلے جاؤ ماں پیو معاف کر دیتے ہیں' کوئی بات نہیں ہوتی۔"

"ٹھیک کہتے ہو افتخار بھائی!" رضوان نے اٹھتے ہوئے متانت سے جواب دیا۔ "مگر بہت سے کام ہم چاہتے ہوئے بھی نہیں کر پاتے۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔" کھاری نے کھڑے ہو کر رضوان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "پر آگے سے ایک بات یاد رکھنا۔"

"وہ کیا؟" رضوان نے کھاری سے کسی نصیحت کی توقع کی۔

"مجھے بھائی کہا ہے تو مجھے کھاری کہہ کر بلایا کرو۔ اور یہ آپ جناب بھی نہیں کرنی۔ تسی بھانویں کتنے ورے (سال) ہی مجھ سے وڈے (بڑے) ہو' میں نے بھی آپ جناب نہیں کرنی آئندہ توں۔"

"اوکے' اوکے کھاری بھائی ڈن!" رضوان نے مسکرا کر کہا۔

"ڈن نہیں' ڈزن' ڈزن۔" کھاری نے فرضی پستول تانتے ہوئے منہ سے آواز نکالی۔ دونوں زور سے ہنس دیے۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں ایک بات بتاؤں۔" ماہ نور نے محویت سے سعد کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ضرور۔"

"تم ڈنر سوٹ میں واقعی بہت اچھے لگ رہے تھے۔"

"تھینک یو۔" وہ مسکرایا۔

"اس روز میں سمجھی کہ جیسے تم نے مجھے خود کو مخاطب کرنے سے روکا ہے تو کیا پتا یہ بھی تمہارا کوئی بہروپ ہو۔" وہ زور سے ہنسا۔ "روپ میں بہروپ نہیں ہوتا لڑکی' بہروپ دیکھنا تھا تو کل تم لنڈا بازار آتیں۔"

"ہیں واقعی؟" ماہ نور کا بازو اور ہاتھ پر ٹکا چہرہ اپنے اس اسٹینڈ پر ہل گیا۔
"ہاں!" وہ مسکرایا۔
"تم نے وہ جرائیموں سے بھرپور پرانے کسی کے اترے کپڑے بیچے؟" ماہ نور کی آنکھیں کی پوری کھل گئیں۔
"ہاں بالکل۔" سعد نے اپنے ہاتھ آگے بڑھا کر ماہ نور کے سامنے پھیلائے۔ "مگر دیکھو مجھے کچھ نہیں ہوا اب تک۔"
"شاید میں تمہیں کبھی سمجھ نہ پاؤں۔" ماہ نور نے سرہلایا۔ "تم یہ سب کیوں کرتے ہو۔"
"کیا کرو گی سمجھ کر؟" اس نے کہا۔ "ایسے ہی ٹھیک ہے۔"
"گویا تم آج کل آف ہو پھر سے۔"
"ہاں سیزنل آف۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔
"وہ جو اس روز تمہارے رائٹ ہینڈ پر کھڑے تھے، وہ جو بالکل تمہارے جیسے تھے عمروں کے فرق کے سوا، وہ تمہارے ڈیڈی تھے نا؟"
"ہاں کیسے لگے تمہیں؟"
"ایک دم زبردست!" ماہ نور نے بچوں کی طرح پرجوش انداز میں کہا۔ "اتنے ہینڈسم اور گریس فل۔"
"میں نے بتایا تھا تمہیں کہ وہ ایسے ہی ہیں۔"
"لیکن کیا تم دونوں سی آئی ڈی کے ایجنٹ ہو یا پھر خفیہ والے تمہارے پیچھے لگے ہیں جو تم ان کے سامنے مجھ سے ملنا نہیں چاہ رہے تھے۔" ماہ نور کو ایک بار پھر اس دن والی مایوسی یاد آگئی۔
"ایسا کچھ نہیں ہے۔" سعد نے شکردان سے چینی اپنی چائے کے کپ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں دراصل ان کا اکلوتا اور قیمتی بیٹا ہوں، شاید ان کا دنیا میں واحد رشتہ، اسی لیے وہ میرے معاملے میں اتنے حساس ہیں کہ ہر وقت میری نگرانی پر تلے رہتے ہیں۔ انہیں مجھ سے متعلق کسی نئے شخص کا پتا چل جائے تو اس کے بارے میں بھی چوکنے ہو جاتے ہیں کہ کہیں وہ نیا شخص مجھے کوئی نقصان تو نہیں پہنچانے والا۔ بس اسی لیے میں ان سے اپنے کچھ ایسے تعلق چھپا کر رکھتا ہوں مبادا میرا اتنا پیارا تعلق ان کی چھان بین کا شکار نہ ہونے لگے۔"
"توبہ ہے، کتنی ان نیچرل زندگی ہے بھئی؟" ماہ نور نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔
"بس ایسی ہی ہے کیا کیا جائے۔" سعد نے سر ترچھا کرتے ہوئے ماہ نور کو دیکھا۔ "لگتا ہے تم جلد تنگ آجاؤ گی مجھ سے اور میری دوستی سے۔"
"نہیں، ہرگز نہیں۔" ماہ نور نے سختی سے سرہلایا۔ "میں تمہارے بارے میں اتنا تو بہرحال جانتی ہوں کہ تم کیسے ہو۔"
"واقعی!" سعد نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ "جب ہی میرے بارے میں فوراً بدگمانی کا شکار ہو جاتی ہو۔"
"وہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔" ماہ نور نے بے نیازی سے کہا۔ "ویسے لنڈے کے کپڑے اور تم۔" اس نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو وحشت ہو رہی ہے یہ سوچ کر۔"
"کل اگر تم مجھے وہاں دیکھ لیتیں تو کون ہو تم... تم کون ہو کی پکار ڈالتی آگے بڑھتیں اور کیا پتا کپڑوں کی اس لاٹ پر جا گرتیں۔" سعد نے اسے چڑایا۔
"توبہ اللہ نہ کرے۔" ماہ نور کو تصور کر کے خوف آگیا۔
"اچھا یہ بتاؤ کہ تم میرے گھر کب آرہے ہو؟" پھر اس نے موضوع بدلا۔
"جب تم بلاؤ گی۔"

"میں تو آج بھی چاہ رہی تھی کہ تم مجھے یہاں بلانے کے بجائے میرے گھر آتے۔"
"میں نے سوچا، پہلے تمہارا موڈ تو چیک کر لوں پھر تمہارے گھر پہنچوں، کہیں اب کے تم پہچاننے سے انکار کر دو۔"

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔" ماہ نور نے فوراً جواب دیا۔
"اچھا یہ بتاؤ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں تمہاری وہ جو خالہ ہیں جن کا ذکر تم نے کئی بار کیا، ان سے مل سکوں۔"
"خدیجہ اور فاطمہ خالہ!" ماہ نور نے پرجوش ہوتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہاں کیوں نہیں، اتنی سویٹ خواتین ہیں وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ فاطمہ خالہ تو کئی بار مجھ سے کہہ چکی ہیں کہ سعد سے ہمیں ضرور ملواتا۔"
"اچھا؟" سعد کو حیرت ہوئی "وہ مجھے کیسے جانتی ہیں بھلا؟" اچانک ماہ نور کو احساس ہوا، وہ کچھ زیادہ بول گئی تھی۔
"وہ۔" اس نے جواز سوچتے ہوئے ادھر ادھر آنکھیں گھمائیں۔
"ہاں وہ۔" اس نے بات بنانے کی کوشش کی۔ "فاطمہ خالہ کو کھاری ا۔نے بتایا تھا کہ میلے والے سائیں کی آواز بہت اچھی تھی۔"
"اچھا!" سعد مسکرایا۔ "مگر وہ تو میلے والا سائیں تھا، تمہاری خالہ کو سعد کا کیسے پتا چلا؟"
"ہاں وہ تا۔" ماہ نور کو فوراً احساس ہوا کہ اس نے غلط جواز پیش کر دیا تھا۔ "وہ شاید فلزا ظہور کے گھر جانے کے حوالے سے ذکر ہوا تھا کہ تمہارے ساتھ میں وہاں گئی تھی۔"
"اچھا!" وہ ہنسا۔ "چلو مان لیتے ہیں۔ یہ بات مانی جا سکتی ہے۔"
"ہوں!" ماہ نور نے لمبا سانس لیتے ہوئے پہلو بدلا۔
"ویسے لاہور کی فضا اور یہاں کا ماحول اسلام آباد سے بالکل مختلف ہے۔" سعد نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ایک ریستوران کے اوپن ایریا میں بیٹھے تھے۔
"یہاں بے تکلفی اور بے ساختگی سی ہے جبکہ اسلام آباد میں ہر وقت بیوروکریٹک فضا چھائی رہتی ہے، بے تکلفی اور بے ساختگی نام کو بھی دیکھنے کو نہیں ملتی۔"
"اسی لیے تو جو مزا یہاں ہے، وہاں کہاں۔" ماہ نور مسکرائی۔
"وہ جگہ جہاں سارہ خان رہتی ہے، وہ بھی ہے تو چھوٹی سی مگر وہاں سادگی کی فضا ہے، تصنع اور بناوٹ سے پاک وہ جگہ بھی مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔" سعد کو یاد آیا اور اس نے دانستہ اپنی بات مکمل کر کے ماہ نور کے چہرے کے تاثرات جانچنے کی کوشش کی۔
"تم نے وہ پھول دیکھے؟" جواب میں ماہ نور نے سر کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے جھٹکا اور بالکل ہی مختلف بات کی۔
سعد نے پھولوں کے ان تختوں کی طرف دیکھا جن کی طرف ماہ نور نے اشارہ کیا تھا۔ سفید پھولوں کا ایک تختہ سبز پتوں اور شاخوں پر کھڑا تھا، یہ پھول بہار کی مخصوص مہک سارے میں پھیلا رہے تھے۔
لاہور میں بہار آچکی تھی۔

☆ ☆ ☆

آپا رابعہ نے بستر جھاڑ کر دوبارہ بچھاتے ہوئے کن اکھیوں سے کرسی پر کتاب لے کر بیٹھی سعدیہ کو دیکھا۔ اس نے پھول دار کاٹن کا دھلا دھلایا اور احتیاط سے استری شدہ سوٹ پہن رکھا تھا، اس کے سیاہ گھنے اور سیدھے بال

سلیقے سے کنگھی کرکے چٹیا کی شکل میں گندھے تھے' اس نے پاؤں میں سستی سی چپل پہن رکھی تھی' اس کے پاؤں صاف ستھرے اور پاؤں کے ناخن طریقے سے ترشے ہوئے تھے۔

"یہ اسکول سے واپس آکر کتنے سلیقے سے کپڑے پہننے لگی ہے اور اسکول سے واپسی پر بھی کتنا ٹائم بالوں میں کنگھی کرنے پر لگا دیتی ہے' کیا یہ وہی سعدیہ ہے' جو ایک رنگ کے کپڑے پہنتی تھی یا تین رنگوں کے اسے کوئی پروا نہیں ہوتی تھی' کیا یہ وہی سعدیہ ہے' جو کئی کئی دن بالوں میں کنگھی نہیں کرتی تھی' بس اوپر اوپر سے کنگھی پھیر نیچے الجھے ہوئے بالوں کے ساتھ اسکول چلی جاتی تھی اور سارا سارا دن یونہی گزار دیتی تھی' پورے ہفتے کے بعد اتوار کی چھٹی کے دن' جب وہ ان کے ہاتھ لگتی تھی تو وہ اس کے بالوں میں تیل لگا کر کنگھی پھیر پھیر کر اس کے بالوں کو سلجھاتی تھیں۔

"کیا یہ وہی سعدیہ ہے؟" آپا رابعہ نے بے یقینی سے ایک بار پھر سعدیہ کو دیکھا جس کے چہرے پر سنجیدگی تھی اور عمر کے ساتھ بڑھتے شعور کی جھلک بھی۔

"وقت کہاں سے اور کب گزر گیا۔" انہوں نے گم صم ہوتے ہوئے سوچا۔

"سعدیہ کے چہرے پر نظر آتا اعتماد علم کا تحفہ ہے یا عقل کا؟" وہ سوچتی رہ گئیں۔

"کتنے پرچے باقی رہ گئے تمہارے؟" اپنی سوچوں کی روانی سے گھبرا کر انہوں نے سوال کیا' ان کا لہجہ درشت تھا یا تلخ' انہیں خود اندازہ نہیں ہو پایا۔

"دو۔" سعدیہ نے کتاب سے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا۔

"نویں کے بعد گھر بیٹھ کر پڑھنا پڑے گا۔" وہ ہاتھ میں پکڑی بستر کی چادر رکھ کر سعدیہ کے قریب چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"کیوں؟" سعدیہ نے کتاب سے نظریں ہٹا کر ان کی طرف دیکھا' اس کے ماتھے پر تین چار بل بھی پڑ گئے تھے۔

"دسویں میں اسکول کے اخراجات بھی بڑھ جائیں گے اور تانگے کا کرایہ بھی' تمہارا ابا جی کی محدود سی آمدنی میں یہ اخراجات پورے کرنے مشکل ہو جائیں گے اس لیے۔" انہوں نے سعدیہ کے ماتھے پر پڑے بلوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ہے اماں؟" اب کے سعدیہ باقاعدہ حرکت میں آگئی۔ "کیا مطلب اخراجات پورے نہیں ہوں گے۔" اس نے پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو ڈاکٹر بننا ہے آپ نے؟ ڈاکٹر بننے پر کتنا پیسہ لگتا ہے پتا ہے آپ کو...؟" اس نے ان کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"بس ایک ہی سال میں خبر ہو گئی ہمیں کہ ہم کتنے پانی میں ہیں۔" آپا رابعہ نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "گھر بٹھا کر میٹرک کروا لیں بڑی بات ہے' ڈاکٹر بننے کے لیے جتنا سر اٹھانا پڑتا ہے' اتنا اٹھائیں گے تو ہماری گردنیں ٹوٹ جائیں گی۔"

"مگر آپ نے یہ خواب دیکھا تھا' آپ کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔"

سعدیہ کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ آپا رابعہ سے سوال و جواب کے بدلے اسے اس کی زندگی کے واحد خواب اور اکلوتی آرزو سے دست برداری کی سزا ملنے والی تھی۔

"ایک ہی سال کے اخراجات نے بتا دیا کہ خواب بھی اپنی اوقات کے مطابق ہی دیکھنے چاہئیں اور خواہشیں بھی بساط تک محدود رکھنی چاہئیں۔"

آپا رابعہ نے اپنا بازو سعدیہ کے ہاتھ سے چھڑاتے ہوئے کہا اور اٹھ کر بستر پر چھوڑی چادر سیدھی کرکے

بچھانے میں مصروف ہو گئیں۔ اس دوران تین' چار بار انہوں نے سعدیہ کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا۔ اس کا دھیان کتاب سے بالکل ہٹ چکا تھا۔ ان کے الفاظ کی برہنگی نے اس کے تن سے سفید اوور آل اور گلے میں پڑا اسٹیتھسکوپ آن واحد میں چھین لیا تھا۔ وہ مضطرب اور پریشان نظر آرہی تھی۔

"کہیں یہ کل کا پرچہ بھی خراب نہ کر بیٹھے۔ شاید مجھے اس کے پرچے ختم ہو جانے کا انتظار کر لینا چاہیے تھا۔" انہوں نے سوچا۔ لیکن وہ کیا کرتیں سعدیہ کے بڑے ہو جانے کے متعلق اچانک آنے والے خیال نے انہیں اس بری طرح ہڑبڑایا تھا کہ وہ سعدیہ کی سرکشی پکڑتی سوچ اور گستاخی کی حدود میں داخل ہوتی زبان کو فی الفور گرفت کے جال میں دبوچ لینا چاہتی تھیں۔

ان سے انتظار ہو سکا تھا نہ صبر' انہوں نے جوابی حملہ کرنے میں دیر لگانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ کمرے میں بکھری چیزیں سمیٹنے اور اس کا حلیہ درست کرنے کے بعد جب وہ کمرے سے باہر نکل رہی تھیں' ان کے دل کو یقین ہو چکا تھا کہ سعدیہ آئندہ ان کے سامنے سوال کرنے اور طعنہ زنی سے پرہیز کرے گی مگر کمرے کے بند ہوتے کواڑ کے پیچھے بیٹھی سعدیہ کے ذہن میں کیسے کیسے خیالات امڈ رہے تھے' آپا رابعہ کو ان کا گمان بھی ہوتا تو شاید ان کی منصوبہ بندی کچھ اور ہوتی۔

☼ ☼ ☼

"تم سے مل کر خوشی ہوئی۔" فائزہ نے اپنے سامنے بیٹھے سعد سے رسمی سا جملہ بولتے ہوئے کہا۔ "مجھے ان بچوں سے مل کر خوشی ہوتی ہے' جو اچھے طریقے سے اپنے کیریر میں سیٹل ہو چکے ہوتے ہیں' کیونکہ ایسا ہو جانے کے بعد ان کے پیرنٹس کو سکھ کا سانس لینے کا موقع ملتا ہے۔"

"کیا یہ ہمیشہ اتنے ہی کیلکولیٹڈ الفاظ بولتی ہوں گی۔" سعد نے اپنی پلیٹ میں رکھے چیز بالز میں سے ایک میں کانٹا کھبوتے ہوئے سوچا۔

اسے ایسے لوگوں سے مل کر کبھی بھی بہت زیادہ خوشی نہیں ہوتی تھی' جو الفاظ اور لمحوں کی جمع تفریق کرنے کے بعد ایک خاص تناسب کے ساتھ بولنے کے عادی ہوتے تھے۔ اس نے فوراً" فائزہ کو اپنے ایسے ملاقاتیوں کی فہرست میں داخل کر لیا۔

"میرا بیٹا سلمان لاپروا ہے اور غیر مستقل مزاج۔ ایم بی اے کر لینے کے بعد سے اب تک دو سالوں میں وہ چھ جابز بدل چکا ہے صرف اور صرف اپنے غیر پیشہ ورانہ رویے کی وجہ سے۔" ان کے لہجے میں سختی ابھر آئی۔ "اور یہ ماہ نور ہے۔" انہوں نے تنقید کا رخ ماہ نور کی طرف موڑا۔ "میں نے اپنی زندگی میں اتنی لاپروا اور غیر ذمہ دار لڑکی کوئی دوسری نہیں دیکھی۔"

سعد نے نظر اٹھا کر ماہ نور کی طرف دیکھا جو اپنی ماں کی ان باتوں سے بے نیاز ناخنوں پر تازہ تازہ لگائی نیل پالش کو پھونکیں مار مار کر سکھانے کی کوشش میں مصروف تھی۔

"اسے ابھی تک یہ ہی معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ جو کچھ پڑھ رہی ہے کس لیے پڑھ رہی ہے' اسے پڑھ لینے کے بعد اس نے کرنا کیا ہے۔ ہر دوسرے دن مستقبل سے متعلق اس کے منصوبے بدل جاتے ہیں' کبھی یہ آرٹ کی دنیا میں انقلاب لانے کا منصوبہ بنا رہی ہوتی ہے' کبھی این جی او بنانے اور چلانے کا عزم ہو رہا ہوتا ہے' کبھی اپنے چچا کے ساتھ ایگری کلچر کی فیلڈ میں انقلاب برپا کرنے کے پلان بن رہے ہوتے ہیں تو کبھی کسی خالہ کے پاس ملک سے باہر جا کر کوئی ریسرچ کرنے کا پروگرام بن رہا ہوتا ہے۔ حالانکہ ان سب منصوبوں کا اس مضمون سے کوئی تعلق نہیں جو یہ اصل میں پڑھ رہی ہے۔" انہوں نے ایک سخت نگاہ نور پر ڈالی۔ "اس کے ساتھ کی لڑکیاں میں نے

دیکھا ہے' اپنی مصروف روٹین کے باوجود مختلف نجی کمپنیوں کے لیے فری لانسنگ کر رہی ہیں' کیوں بھلا؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے سعد کو دیکھا۔

"اس لیے کہ وہ اپنی پروفیشنل لائن اور فیوچر کیریر کے بارے میں سیریس ہیں۔" انہوں نے خود ہی جواب دیتے ہوئے کہا۔ "جبکہ اس کے بارے میں تو سوچ سوچ کر میری عقل جواب دے گئی ہے۔" جس لڑکی کو اتنے سالوں میں یہ پتا نہیں چلا ہو کہ اسے کس موقع پر کون سا ڈریس پہننا چاہیے' اس سے فیوچر پلاننگ میں سنجیدگی کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔ ہمارے جیسے پیرنٹس کی فکریں کون سمجھ سکتا ہے۔ جو اولاد کی بہتری کے لیے بھاگے پھرتے ہیں اور اولاد ہے کہ اپنا کوئی سرا تک نہیں پکڑاتی۔"

انہوں نے افسردگی کے ساتھ سعد کو دیکھا اور اپنا چشمہ اتار کر صاف کرتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں "اچھا بھئی سعد سلطان! ایک بار پھر کہوں گی تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ پلیز تکلف مت کرنا' کمفرٹیبل ہو کر چائے انجوائے کرو' مجھے ایک ضروری کام سے نہ جانا ہوتا تو مزید تمہارے ساتھ بیٹھتی۔"

وہ آہستگی سے سعد کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے نپے تلے الفاظ بولنے کے بعد کمرے سے چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد سعد اور ماہ نور نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ماہ نور بے اختیار ہنس دی۔

"تم نے دیکھا' میری ممی کتنی ٹائم کانشس ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی "کتنے وقت میں انہیں کتنی باتیں کرنی ہیں' انہوں نے پہلے سے سوچا ہوتا ہے۔"

"ہاں' میں بھی یہ ہی سوچ رہا تھا۔" سعد نے سرہلایا۔ "مگر انہیں تم سے اتنی شکایتیں کیوں ہیں بھئی؟" اس نے شرارت بھرے انداز میں ماہ نور کو دیکھا۔

"دراصل' ممی پکی perfectionist (کاملیت پسند) ہیں' وہ اپنے مقرر کردہ معیار سے نیچے ہمارے لیے کچھ سوچ ہی نہیں سکتیں اور ہم سے' بلکہ ہم سے ہی کیا ہر ایک سے' مطلب بابا سے لے کر گھر کے ایک عام ملازم تک سے یہ توقع کرتی ہیں کہ وہ اس perfection کے معیار کو چھوئے جو انہوں نے اپنے ذہن میں سوچی ہوئی ہے۔ کسی کام میں' کسی بات میں کوئی بھی کجی یا کمی انہیں ٹینشن میں ڈال دیتی ہے۔"

"یہ کافی مشکل صورت حال نہیں۔" سعد نے چائے کی پیالی کے سنہری کنارے پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

"مشکل!" ماہ نور نے بے بسی سے کہا۔ "بہت ہی مشکل صورت حال ہے۔" "ایک دفعہ ایسی ہی ٹینشن کا شکار ہو کر ممی اسپتال بھی پہنچ چکی ہیں۔" اس نے بتایا۔

"تو پھر تم لوگ یقیناً انہیں غیر معمولی سے زیادہ ٹینشن دیتے ہو گے۔" سعد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"نہیں' ایسا نہیں ہے۔" ماہ نور نے اٹھ کر کمرے کی کھڑکی پر تنے دبیز پردوں کی ڈوری کھینچ کر ہٹاتے ہوئے کہا۔ "ہم انہیں خوش' مطمئن اور پرسکون رکھنے کی حتی الوسع کوشش کرتے ہیں مگر سوچو' ہم انسان ہیں' مشینی کل پرزے تو نہیں جو ہر وقت یک ساں چلتے رہیں۔"

"یہ بھی ہے۔" سعد کے لیے یہ ایک نئی اور انجانی صورت حال تھی۔

"میں ڈیڈی کو اور ڈیڈی مجھے کتنا تنگ کرتے ہیں لیکن شکر ہم میں سے کوئی ہاسپٹل نہیں پہنچتا۔" اس نے سوچا اور اپنی سوچ پر خود ہی مسکرا دیا۔

"لو کھاری اور سردار چاچا بھی آ گئے۔" ماہ نور کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ لوگ تائی صابرہ کو فائنل شاپنگ کرانے گئے ہوئے تھے' کل یہ لوگ واپس جا رہے ہیں' تم ملو گے نا ان سے بھی؟" اس نے سعد کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا۔

"ضرور۔" وہ چائے کا کپ میز پر رکھ کر بولا۔ "میں یہاں تم سے اور تم سے متعلق لوگوں سے ہی تو ملنے آیا ہوں

اس کی بات کے جواب میں ماہ نور کے چہرے پر جو مسکراہٹ ابھری تھی وہ بہت دل فریب تھی۔ سعد اس مسکراہٹ کو دیکھ کر مسکرا دیا۔

☼ ☼ ☼

"تم نے یہ تین اسکیچ بکس جو کلر کی ہیں' ان میں تمہارا ہاتھ مشاقی سے رواں ہوا لگتا ہے۔" یمی آنٹی نے عینک کے اوپر سے ہاتھ میں پکڑی کلرنگ بک کے صفحے پلٹتے ہوئے ماہرانہ رائے کا اظہار کیا۔

"امپروومنٹ ہے نا؟" سارہ نے بچوں کے سے شوق کے ساتھ سوال کیا۔

"یقیناً ہے۔" یمی آنٹی نے کلرنگ بک میز پر رکھتے ہوئے چشمہ ناک کی پھننگ سے اوپر کی طرف کھسکایا۔

"دیکھا!" سارہ گھٹنوں کے درمیان ہاتھ دباتے ہوئے مسکرائی۔ "اس سے ثابت ہوا کہ میں اتنی بھی بے کار نہیں ہوئی۔"

"یہ تمہارا اپنا خیال تھا کہ تم بالکل بے کار ہو چکی ہو' کسی دوسرے نے تمہیں ہرگز یہ نہیں کہا تھا۔" یمی آنٹی نے اسے یاد دلایا۔

"اب یہ تو ہو گیا۔" سارہ نے ایسے ظاہر کیا جیسے اس نے یمی آنٹی کی بات سنی ہی نہیں اور کلرنگ بکس اٹھا کر ایک طرف رکھ دیں "اور اس ڈو کو تو میں اتنی شکلوں میں ڈھال چکی کہ اب کوئی اور شکل یاد نہیں آ رہی کہ کیا بناؤں؟"

"ہاں۔۔۔ وہ جو ایفل ٹاور تم نے بنایا تھا۔" یمی آنٹی نے اس کی حوصلہ افزائی کی خاطر کہا اور ایسے سرہلایا جیسے وہ سارہ کے کام سے شدید متاثر ہوں۔ "وہ تو بھئی کمال تھا۔ میں نے سنبھال کر رکھا ہے' اسے اسی بیس پر جس پر تم نے بنا کر رکھا تھا۔"

"ارے اس پر کیا آپ مجھے کوئی ایوارڈ دیں گی؟" سارہ کو یمی آنٹی کی تعریف پر خوشی ہوئی۔

"نہیں۔" یمی آنٹی نے سرہلایا۔ "جب سعد آئے گا تو میں اسے دکھاؤں گی' وہ بہت خوش ہو گا۔ اور یہ کلرنگ بکس بھی دکھائیں گے اسے۔"

"چھوڑیں۔" سارہ نے ہاتھ بڑھا کر کلرنگ بکس یمی آنٹی سے لے لیں "رہنے دیں۔"

"ہیں!" یمی آنٹی سارہ کے اس رد عمل پر ہکا بکا رہ گئیں "لیکن کیوں بھئی؟" انہوں نے سوالیہ انداز میں سارہ کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال نہیں کہ سعد کو میرے ان کاموں میں دلچسپی ہو گی۔" سارہ نے کسی روٹھے ہوئے بچے کی سی آواز میں کہا "آپ نے دیکھا نہیں تھا' پچھلی بار بھی اس نے کوئی خاص رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ زبردستی تعریف کرائی تھی بلکہ زبردستی ہر چیز دکھانی پڑی تھی۔"

"اوہ!" یمی آنٹی کو دل میں ایک ہلکا سا اطمینان اترتا محسوس ہوا۔ گویا سعد کو اس سمت کا اندازہ ہو چکا تھا جس پر سارہ کے سلسلے میں اسے چلنا تھا۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" انہوں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ "تمہارا کوئی بھی کام ایسا نہیں ہو سکتا جسے سعد دیکھنا اور تعریف کرنا نہ چاہے۔"

"ایسا ہوا ہے۔" سارہ نے سنجیدگی سے کہا "ہوا ہے ایسا۔" اس نے اپنی بات دہراتے ہوئے یمی آنٹی کو یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو' مان لو میں سچ کہہ رہی ہوں۔

"ہو سکتا ہے۔" سیمی آنٹی نے مزید بحث نہیں کی۔

"لیکن کیا پتا اس کا دل چاہتا ہو کہ اب تم اس کام میں آگے مزید بہتری لاؤ۔" انہوں نے ایک مرتبہ پھر کلرنگ بک کھولتے ہوئے کہا "اور دیکھ لو ہر صفحے کے بعد تمہاری کلرنگ میں فرق آیا ہے اور آخری صفحے تک پہنچ کر یہ خاصی میچور ہو چکی ہے۔" انہوں نے سارہ کی طرف دیکھا "اس کا مطلب ہے تم نے اس کی بات کو چیلنج سمجھ کر اس کو قبول کیا ہے۔"

"ہوں۔" سارہ کے دل سے ایک انجانا سا بوجھ سیمی آنٹی کی یہ بات سن کر کسی قدر کم ہوا "آپ کو یاد ہے نا پہلے بھی جب کبھی مجھے کوئی چیلنج کرتا تھا کہ نہیں سارہ خان تم یہ کام نہیں کر سکتیں تو پھر وہ کام کر کے دکھانا میرے لیے جینے مرنے کا مسئلہ بن جایا کرتا تھا۔"

"ہاں!" سیمی آنٹی نے سارہ کے ساتھ ماضی کی گلیوں میں اترتے ہوئے کہا۔ "ماسٹر سنی نے جب تمہیں کہا تھا کہ تم آگ لگی جیکٹ کے ساتھ ٹائر میں سے خود کو نہیں گزار سکتیں۔"

"اور جب خان بابا نے کہا تھا شیری اچانک سرکس چھوڑ کر چلی گئی' کون ہے جو موت کے کنویں میں شیری کی طرح موٹر سائیکل یا گاڑی چلا کر دکھائے۔" سارہ نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی نظر کے سامنے سر اٹھا کر کھڑے سرمئی پہاڑوں پر جیسے ماضی کی فلم کا فیتہ چل رہا تھا اور گزرے وقت کے نقوش ابھر اور مٹ رہے تھے۔

"اور وہ یاد ہے' آپ کو۔" اس نے کچھ یاد آنے پر بلند آواز میں کہا۔ "جب رکو نے مجھے چیلنج کیا کہ اس کی سائیکل چلاتے ہوئے کیلا کھا کر دکھاؤں؟"

"ہاں بالکل یاد ہے' جس کی پریکٹس کرتے ہوئے تم سائیکل سمیت بیس مرتبہ تو گری ہی ہوگی اور کتنے ہی کیلے تمہارے نیچے آکر چپٹے ہوئے تھے۔"

"لیکن دسویں روز جب میں رکو کے لباس میں ملبوس ہو کر سر پر جوکرز ہیٹ سجائے ناک پر سرخ ٹینس بال جمائے' چہرے پر ہو بہو اس کے جیسا پینٹ سجائے رنگ میں اتری تھی تو نہ تو میرے پاؤں کی رفتار میں کوئی فرق آیا تھا نہ ہی کیلے کھانے کی رفتار میں ایسی رکاوٹ آئی تھی کہ کسی کو شک ہو سکے یہ رکو نہیں کوئی اور ہے۔ پورا مجمع رکو' رکو کا شور مچا رہا تھا اور میں نے سائیکل چلاتے ہوئے نجانے کتنے ہی ایسے لوگوں سے جا جا کر ہاتھ ملائے تھے جو اس شہر کے چند روزہ سرکس ہی میں رکو سے اتنے مانوس ہو چکے تھے کہ اس کے پرستار بن گئے تھے۔"

"رکو تو جدھر جاتا تھا پرستاروں کا ایک ہجوم اس کے پیچھے رکو رکو کے نعرے لگاتا اس کی حرکات و سکنات کا نظارہ کرتا تھا۔" سیمی آنٹی نے بھی کھوئے کھوئے انداز میں یاد کیا۔

"جوکرز تو سرکس کا حصہ ہوتے ہیں' مگر رکو جیسا مسخرہ کسی' کسی سرکس میں ہی ہوتا ہوگا' وہ معمول سے ہٹ کر حرکتیں کرتا تھا ٹوٹلی Unusual بالکل معمول سے ہٹ کر' ہے نا۔" انہوں نے سارہ کی طرف دیکھا۔

"ہاں!" سارہ نے کچھ دیر تک پہاڑ پر نظریں جمائے رکھنے کے بعد لمبا سانس لیتے ہوئے سیمی آنٹی کی طرف دیکھا۔ "رکو خوش قسمت ہے سیمی آنٹی! ابھی تک بلیو ہیون سرکس سے جڑا ہوگا۔ ایک کے بعد ایک شہر گھومتا وہ تو اب تک پورا پاکستان دیکھ چکا ہوگا۔" اس کے لہجے میں ایک نامحسوس سا دکھ اور اداسی ابھرنے لگی تھی۔

"شہر در شہر پھرتا بلیو ہیون سرکس اگر کبھی پہاڑوں کے دامن میں سمٹے اس چھوٹے سے علاقے میں بھی آگئے تو تو کیا ہوگا سارہ؟" سیمی آنٹی اپنی عمر اور تجربے کی حقیقت کو فراموش کرتے ہوئے بولیں۔

"ہوتا تو کوئی سوال ہی نہیں سیمی آنٹی۔" سارہ کے لہجے میں اداسی آگئی "بلیو ہیون سرکس کی انتظامیہ کم آبادی والے علاقوں کا رخ نہیں کرتی۔ آپ بھول گئیں کیا؟"

"ارے ہاں!" سیمی آنٹی نے چشمہ اتار کر اپنی نم آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

"ایک بات پوچھوں سارہ؟" چشمہ دوبارہ آنکھوں پر لگاتے ہوئے انہوں نے سارہ کی طرف دیکھا۔

"تم کو رکو سے شدید محبت تھی نا!" انہوں نے سارہ کی آنکھوں میں جھانکا۔ "اور اس کو تم سے شدید محبت تھی؟"

انہوں نے سر ہلاتے ہوئے جیسے خود ہی اپنی بات کی تائید کی۔

"صرف خان کے ڈر سے تم لوگ اس محبت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔"

"آپ کو یہ خیال کیسے آیا؟" سارہ نے سرد لہجے میں سوال کیا۔

"مجھے اس وقت بھی یہ خیال آتا تھا جب ہم دونوں بلیو ہیون کا حصہ تھے اور مجھے وہ راتیں بھی یاد ہیں جب تم نیند میں یا پھر مسکن دواؤں کے زیر اثر سوتے ہوئے رکو کو پکارتی تھیں اور اسے پکارتے ہوئے زار زار رویا کرتی تھیں۔" سیمی آنٹی کے لہجے میں اپنی بات پر اعتماد شامل تھا "سرکس سے متعلق تم نے کبھی کسی اور کو تو نیند میں بلایا نہ جاگتے میں یاد کیا' خان سے زیادہ تم کس کے قریب رہیں اور تتلی سے زیادہ تمہاری کس سے دوستی تھی' ماسٹر مجو جو تمہیں ٹریننگ دیتا تھا اور مس نینا جو تمہارے بال سنوارتی اور میک اپ کرتی تھی۔ تم نے وہاں سے آکر بھولے سے کسی کو یاد نہیں کیا۔ صرف رکو ہی کیوں؟ بھلا رکو ہی کیوں؟" سیمی آنٹی نے بات کے آخر میں دو دفعہ اپنا سوال دہرایا اور سامنے دیکھنے لگیں۔

"جو محبت ہوتی ہے سیمی آنٹی!" کچھ توقف کے بعد سیمی کے کانوں کو ہوا کے ساتھ سرسراتی سارہ کی آواز سنائی دی۔

"اس کی ٹانگیں اور بازو کسی حادثے کے نتیجے میں ٹوٹ نہیں جاتے' محبت کی رگوں میں دوڑتا جذبات کا خون' انسان کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بعد نکلنے والے خون کی طرح بہہ کر نچڑ نہیں جایا کرتا۔ محبت گونگی نہیں ہوتی' وہ کچھ کہے بغیر بھی اپنے ہونے کا احساس دلا دیتی ہے' محبت بہری بھی نہیں ہوتی کہ محبوب کی پکار' اس کی فریاد' اس کی آنکھوں میں اتری اذیت کی زبان نہ سن سکے۔" سیمی آنٹی نے چونک کر سارہ کی طرف دیکھا۔

"ہاں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔" سارہ نے سر ہلایا۔ "محبت میں اتنی گرم جوشی' اتنی بے ساختگی' اتنا احساس' اتنا خیال ہوتا ہے کہ اس کا زبان سے لفظوں میں اظہار نہ بھی کیا جائے تو بھی وہ دل کو اپنے احاطے میں لیے رکھتی ہے' محبت کی بتی محبوب کے دماغ میں ہر وقت جلتی رہتی ہے کیونکہ اس کی روشنی اتنی تیز ہوتی ہے کہ سورج اس کے سامنے چراغ بن جاتا ہے۔ محبت کی ایک پکار محبت کرنے والے کے لیے کافی ہوتی ہے' جس کا پیچھا کرتے وہ فوراً محبوب تک پہنچ جاتا ہے جیسے۔ جیسے" سارہ جوش جذبات میں بولتے بولتے اچانک رک گئی۔

"جیسے!" سیمی آنٹی نے سامنے سے پڑتی سورج کی شعاعوں کو اپنی آنکھوں تک آنے سے روکنے کے لیے ہاتھ کا چھجا بنا کر ماتھے پر رکھتے ہوئے اس کے تلے سے سارہ کو دیکھا۔

"جیسے سعد کی محبت۔ جو میری ہر پکار سن لیتی ہے' جو میری ہر رمز کو جان لیتی ہے' جو میرا ہر اشارہ سمجھ لیتی ہے۔"

سارہ کے الفاظ تھے یا طاقتور کرنٹ جو سیمی آنٹی کی سماعتوں سے ٹکرایا تھا۔ انہوں نے بے یقینی سے سارہ کی طرف دیکھا۔

☼ ☼ ☼

"واہ بھئی برخوردار! تمہیں تو ہمارے علاقے کی گلی گلی اور محلے محلے کا پتا ہے۔" ماہ نور کے چچا سردار کو سعد سلطان سے مل کر حقیقی خوشی ہوئی تھی۔ پہلی نظر میں اسے دیکھنے اور ماہ نور کے اس سے تعارف کروانے پر وہ اسے ان پڑھے لکھے امیر کبیر گھرانوں کا ویسا ہی لڑکا سمجھے تھے جو اکثر لوگوں سے میل ملاقاتوں کے دوران نظر آتے رہتے تھے' لیکن اس لڑکے سے گفتگو کرنے کے بعد انہیں محسوس ہوا تھا کہ وہ ان عام لڑکوں سے ذرا مختلف تھا۔ اس

سے اپنے گاؤں اور اردگرد کے علاقوں کا تذکرہ سن کر وہ چونکے تھے اور یہ جان کر اور بھی حیران ہوئے تھے کہ اس کا اپنا ان علاقوں سے کوئی تعلق نہیں تھا' وہ ویسے ہی ان سے واقف تھا۔

"میں نے عموماً" دیکھا ہے کہ آج کل کے لڑکوں کو دیہاتوں اور ان کے کلچر میں ایسی کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی۔" انہوں نے خیال ظاہر کیا۔

"لیکن مجھے ایسے علاقوں کے گلی' محلوں' چوپالوں اور دکانوں میں بہت کچھ ایسا ملتا ہے جن سے میری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔" اس لڑکے نے کہا۔

"مجھے جب کبھی بھی ایسی جگہوں پر جانے کا موقع ملا میں بہت کچھ سیکھ کر وہاں سے آیا۔"

"ہاں ایک ٹولہ آج کل کے نوجوانوں کا ایسا بھی ہے جو ثقافت' ثقافتی حسن' ہنرمندیوں' دستکاریوں کا چرچا کرنے اور ان کے ذریعے خود اپنی پروموشن کرنے کا شوق رکھتے ہیں۔" چوہدری صاحب کو یاد آیا۔ "تم ایسے کسی ٹولے کے ممبر تو نہیں ہو؟" انہوں نے شک کی نظر سعد پر ڈالی۔

"میں ایک فرد واحد ہوں انکل! میرا کسی ٹولے یا گروپ سے کوئی تعلق نہیں' میرے کسی جاننے والے کو ان چیزوں میں کوئی دلچسپی نہیں' اس لیے میں اکیلا ہی ان جگہوں میں گھومتا پھرتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"یہ اپنی ماہ نور کو بھی بڑا شوق ہے ایسی باتوں کا۔" تائی صابرہ جو اب تک خاموش بیٹھی یہ گفتگو سن رہی تھیں زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکیں۔ "وہ پچھلے سال کافی دن ہمارے پاس رہی تھی' اسے گاؤں بڑا پسند آیا تھا' پر گاؤں سے زیادہ تو اس کو باندر والے کا تماشا دیکھنے کا شوق تھا' روز بچے دوڑائی تھی۔ جاؤ جا کر دیکھ کر آؤ' باندر والا آیا کہ نہیں' وہ کم بخت بھی ایک دفعہ آکر کہیں غروند ہی گیا (غائب ہی ہو گیا)۔ پھر چوہدری صاحب نے پیسے دانے دے کر خاص طور پر بلایا باندر والے کو' پھر بھلا کیا ہوا تھا۔" انہوں نے سوالیہ نظروں سے چوہدری صاحب کی طرف دیکھا اور ادھر سے جواب نہ پا کر سعد کی طرف دیکھنے لگیں۔

"پتا نہیں وہ باندر والا کوئی اور تھا یا اس کی باندر' باندری کوئی اور تھی۔ ماہ نور کا تو موڈ ہی نہیں ٹھیک ہوا بڑے دن' فیرابے منگو کا میلہ بھی اسے پسند نہ آیا' غصے کے مارے اسی دن سامان باندھ کر واپس اپنے گھر۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا' تائی صابرہ کی بات سنتے ہوئے سعد کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ گہری ہوتی گئی' اس نے ماہ نور کو دیکھا جو خجل ہوتے ہوئے تائی صابرہ کو گھور رہی تھی۔

"واہ بھئی ماہ نور! ثابت ہوا کہ تم کوئی بات دل میں رکھنا چاہو بھی تو نہیں رکھ سکتیں۔" اس روز ماہ نور کے گھر کافی وقت گزارنے کے بعد جب وہ واپس جانے کے لیے نکلا' اس نے گھر کے گیٹ کے قریب کھڑے ہو کر ماہ نور سے کہا۔

"ہاں شاید۔" ماہ نور نے سادگی سے اعتراف کیا۔ "میں بوکھلاہٹ اور دباؤ میں کئی ایسی حرکتیں کر جاتی ہوں جو نہیں کرنی چاہئیں۔"

"شاید اسی لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ تم بہت پیور ہو' تم میں بالکل فریب نہیں ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ آج ہم اچھے دوست ہیں۔" اس نے کہا۔

"دوست!" ماہ نور کا ذہن اس ایک لفظ پر اٹک گیا۔ "کیا یہ تعلق صرف دوستی کا ہے؟" اس نے سوچا' وہ شاید اس سوچ کو الفاظ میں ڈھال کر سعد کے گوش گزار بھی کر دیتی جو یقیناً" بعد میں اس کو اپنی عجلت پسندی اور حماقت محسوس ہوتی لیکن اس سے پہلے کہ وہ یہ کام کرتی' چوکیدار کے کمرے سے کھاری نے اچانک باہر نکل کر اسے اس حماقت سے بچا لیا۔

"ارے کھاری!" وہ بے اختیار مسکرا دی۔ "مجھے تو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ تمہیں کھاری سے بھی ملوانا تھا۔" اس

نے سعد سے کہا۔

"کھاری! ان سے ملو' یہ سعد سلطان ہیں۔" اس نے کھاری کی طرف دیکھا۔ کھاری نے سعد کی طرف دیکھا اور ہاتھ ماتھے تک لے جاتے ہوئے اسے سلام کیا۔

"اچھا تو تم کھاری ہو۔" سعد نے مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ کھاری نے ایک نظر سعد کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر ڈالی اور دوسری ماہ نور پر' اس کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔ ماہ نور نے سر کو ہلکا سا ہلایا۔ کھاری نے سعد کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔

"کیوں بھئی کھاری! باندر لولا لنگڑا' تھا یا باندری اور ان دونوں میں سے کانا کون تھا بھلا؟" سعد نے گرم جوشی سے اس کے ہاتھ کو پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

کھاری نے ایک بار پھر چونک کر ماہ نور کو دیکھا۔ وہ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔

"سعد نے بھی بندر' بندریا کے اس جوڑے کو دیکھا ہوا ہے کھاری!" ماہ نور نے اس کی گھبراہٹ دور کرنے کی کوشش کی۔

کھاری نے ایک نظر سعد پر ڈالی اور نظریں جھکا کر بولا۔ "صحیح طرح یاد نئیں باؤ جی!"

"چلو کوئی بات نہیں' یہ بتاؤ کیسے ہو۔" سعد کے انداز میں بے تکلفی تھی۔

"ٹھیک ٹھاک۔" کھاری نے اپنے جوتے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

"سعد بابے منگو کے میلے والے سائیں سے بھی مل چکا ہے کھاری۔" ماہ نور نے کھاری کو مزید بوکھلانے کے لیے شرارتاً" کہا۔

کھاری نے ایک دفعہ پھر نظر اٹھا کر سعد کو دیکھا۔ "سمجھ آگئی مہ نور بی بی!" اس نے نیچی آواز میں جواب دیا۔ کھاری کی یہ بات ماہ نور نے بے دھیانی سے سنی اور سعد نے سننے کے بعد کھاری کو غور سے دیکھا۔

"ٹھیک ہے ماہ نور! پھر ملیں گے' اب میں چلتا ہوں۔" اگلے لمحے وہ ماہ نور سے مخاطب ہوا۔

"اچھا بھئی کھاری!" اس نے کھاری کا بازو تھپتھپایا۔ "تم سے مل کر اچھا لگا۔ تمہارے علاقے میں پھر آنا ہوا تو تم سے ملاقات ہوگی۔"

"ارے ہاں کھاری۔" ماہ نور مسکراتے ہوئے بولی۔ "سردار چاچا نے سعد کو فارم ہاؤس پر انوائٹ کیا ہے۔ سعد کو گاؤں کے لوگوں پر کچھ ریسرچ کرنی ہے نا تو سردار چاچا نے کہا ہے' وہ فارم ہاؤس کا مہمان بن کر جب تک چاہے ان کے پاس رہے۔ اب جب سعد وہاں جائے گا تو پتا چلے گا تم کتنے اچھے میزبان ہو۔" وہ خوش ہو کر بتا رہی تھی۔

ماہ نور کی توقع کے خلاف کھاری نے اپنی جون میں آکر بے تحاشا بولنے کے بجائے سر ہلا کر سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے جی!"

ماہ نور نے ایک مسکراتی نظر کھاری پر ڈالی اور پھر سعد کو دیکھ کر شانے اچکا دیے۔

"Perhaps he is a bit down today" (شاید آج اس کا موڈ اچھا نہیں ہے) اس نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔" سعد نے سر ہلایا اور ہاتھ ہلا کر گیٹ سے باہر کھڑی اپنی گاڑی کی طرف مڑ گیا۔

"کیا بات ہے کھاری! ٹھیک تو ہو تم۔" سعد کے جانے کے بعد ماہ نور نے کھاری کی طرف دیکھا۔

"تساں ان باؤ صاب سے کہنا تھا مہ نور بی بی! ان سے پچھنا (پوچھنا) تھا انہاں کو سائیں جی کا گیت آوندا کہ نئیں (ان کو سائیں جی کا گیت آتا ہے کہ نہیں)۔" کھاری نے اچانک کہا۔

"پتا نہیں۔" ماہ نور کھاری کی اس بات پر بوکھلا کر بولی۔

"پچھنا (پوچھنا) تھا ناں جی' آوندا (آتا) ہوگا ضرور۔" کھاری نے کہا اور اپنے کندھے پر رکھی چادر جھاڑ کر اسے

اپنے اردگرد لپیٹتا سرونٹ کوارٹرز کی طرف چل دیا۔

☼ ☼ ☼

سعدیہ پر چھائی گہری خاموشی اور اپنی بات کے جواب میں کسی خاص ردعمل کے نہ آنے پر آپا رابعہ کو دل ہی دل میں تشویش تھی۔ سعدیہ نے اپنے باقی دو پرچے سکون سے دیے تھے اور پرچوں کے بعد دوبارہ اسکول جانے سے پہلے ایک ہفتے کی چھٹیاں دی گئی تھیں۔ پرچوں سے فارغ ہونے کے بعد سعدیہ نے گھر کے کل دو کمروں جن میں سے ایک میں وہ لوگ سوتے بیٹھتے تھے اور دوسرے میں ضرورت کا سامان رکھا تھا کی تفصیلی صفائی کی تھی۔ جھاڑ پونچھ فالتو چیزوں کو نکال باہر کرنے اور فرشوں کی دھلائی کا کام دو دن میں مکمل ہوا تھا۔ اس کے بعد اس نے چھوٹے سے چھپر کے نیچے اینٹوں کی دیواروں سے بنے اس ننھے سے باورچی خانے کی راہ لی تھی جو بارش اور تیز دھوپ کی تپش کے دنوں میں کھانا پکانے کے کام آتا تھا ورنہ تو سارا سال صحن میں گڑے مٹی کے چولہے پر ہی کھانا بنایا جاتا تھا۔

"جو ٹوٹا پھوٹا سامان اور کاٹھ کباڑ میں نے سیڑھیوں کے نیچے جمع کیا ہے اسے بڑی سڑک والے کباڑ خانے میں بیچ کر پیسے مجھے لادو۔" آپا رابعہ نے سنا سعدیہ مسجد میں حفظ کے لیے آنے والے حفیظ سے کہہ رہی تھی۔

"بوتلیں الگ کرکے رکھنی تھیں نا سعدیہ باجی!" حفیظ جواب میں سیڑھیوں کے نیچے جھکا سامان کا جائزہ لیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"بس جو ہے لے جاؤ اور جتنے پیسے ملیں۔ ایمان داری سے لاکر دینا کھا مت لینا۔" سعدیہ اسے تاکید کررہی تھی۔

"اور ہاں نائلون کے برتن بیچنے والا آئے تو مجھے بتانا۔" کاٹھ کباڑ لے کر جاتے ہوئے حفیظ کو اس نے پیچھے سے پکار کر کہا تھا۔

"بدھ کے بدھ وار آتا ہے وہ۔" حفیظ نے گردن موڑ کر جواب دیا تھا۔

"پھر بھاگ کے جاؤ اور یہ چیزیں بیچ کر آؤ آج بدھ ہے۔" سعدیہ نے تیزی سے کہا اور صحن کی طرف مڑی۔

"کیا کرنے ہیں پیسے اور کیوں بلا رہی ہو پھیری والے کو؟" اس کے سامنے آپا رابعہ کھڑی تھیں۔

"جو مسالے چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں پڑے ادھر ادھر رلتے رہتے ہیں انہیں محفوظ کرکے رکھنے کے لیے دو تین ڈبے خریدنے ہیں اور بس۔" سعدیہ نے نرمی سے جواب دیا تھا۔ "ان چیزوں سے دو تین ڈبے خریدنے کے پیسے ہی مل جائیں بڑی بات ہے۔" وہ ننھے سے باورچی خانے میں گھس کر بولی۔

"ابھی تک ایسے چل ہی رہا ہے نا!" آپا رابعہ اس کے پیچھے آئیں۔

"ہر بات پر اعتراض نہ کیا کریں اماں!" سعدیہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ "میرے دل میں مزید سوال اٹھنے لگیں گے۔ یہ۔" اس نے نمک مرچ اور ہلدی کی چھوٹی چھوٹی تھیلیوں کی طرف اشارہ کیا۔ "انہیں یوں رکھے دیکھ کر خیال آتا ہے یقیناً" ہمارا تعلق خانہ بدوشوں کے خاندان سے ہے جو مستقل ٹھکانے بنا کر رہتے ہیں نہ مستقل گھرداری کا سامان اپنے پاس رکھتے ہیں بدسلیقگی اور پھوہڑپن کا پورا اشتہار ہے یہ باورچی خانہ۔"

آپا رابعہ کو لگا جیسے کسی نے ان کے چہرے پر سامنے سے گھونسا مارا ہو۔

"توکل اور غناء سادگی اور فقر کی دولت جس کے ہاتھ آجائے وہ دنیا کی پریشانیوں اور غموں سے بے نیاز ہوجاتا ہے اسے شکر کی اور صبر کی دولت عطا ہوجاتی ہے۔ وہ سامان دنیا کے جھنجھٹوں سے آزاد رہتا ہے اسے سامان آخرت کی فکر آگھیرتی ہے اور وہ اس کے اسباب ڈھونڈنے لگتا ہے۔" انہیں کسی کی آواز سنائی دی۔

"توکل اور غناء سادگی اور فقر۔" انہوں نے دل میں دہرایا۔

"بدسلیقگی اور پھوہڑپن" انہوں نے الفاظ کا تجزیہ کیا۔

"دنیا اور آخرت۔" وہ پانے نہ پانے فکر اور بے فکری ہونے اور نہ ہونے کی کشمکش میں پڑنے لگیں۔

"آپ کے پاس میرے کسی سوال کا جواب نہیں ہے اماں!" سعدیہ نے ان کے چہرے پر چھائے اضطراب کو دیکھا اور طنزیہ انداز میں بولی۔ "بہتر ہے کہ مجھے وہ کرنے دیں جو میں چاہتی ہوں ورنہ میرے سوالوں اور ان کے اب میں آپ کی خاموشی یا پھر ہار جیت کا سلسلہ دراز ہوجائے گا۔"

آپا رابعہ سعدیہ کی بات کے جواب میں خاموش رہیں اور اسی خاموشی کے ساتھ باورچی خانے سے نکل کر صحن میں آگئیں۔ صحن میں دھوپ نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ انہوں نے مٹی سے لپے پتے صاف ستھرے صحن کو دیکھا اور بے بسی سے دائیں بائیں سر گھمایا۔ کیا اس خالی صحن میں کہیں کوئی ایسی قینچی دستیاب تھی جس کے ذریعے وہ سعدیہ کے نئے نئے نکلتے پر قینچ کرسکتیں۔ اسی دم ان کے دروازے پر دستک ہوئی اور اس دستک نے جیسے اپنا ہاتھ بڑھا کر وہ قینچی ان کے ہاتھ میں پکڑا دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"غضب خدا کا سنا ہے مسجد کے ساتھ والی پرچون کی دکان میں جوا کھیلا جاتا ہے۔"

"کون سی دکان؟"

"ارے وہی تنگ تاریک پرچون کی دکان جس میں دن کے وقت بھی کالی رات جیسا اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ سودا لینے جاؤ تو دکان والا لالٹین ہاتھ میں پکڑ کر ڈبوں میں جھانک جھانک کر سودا نکالتا ہے اور تولنے کے وقت لالٹین گاہک کے ہاتھ میں تھما دیتا ہے لو جی ذرا اونچی کرکے پکڑنا میں ذرا سودا تول لوں۔"

"تو ایسی اندھیری دکان میں جوا کھیلنے والوں کی آنکھیں نہیں جاتیں یا وہ پہلے ہی آنکھوں سے پٹ ہیں۔"

"جواری تو بصارت کی دولت سے مالا مال بھی اندھوں موافق ہوتا ہے۔"

"واہ بھئی۔ تمہیں پتے کی یہ بات کس نے بتائی؟"

"تم ہمیشہ ایسی باتوں پر مجھے شرمندہ کرتی ہو۔ کیا دین اسلام کی باتیں ضرور میں کسی سے سیکھنے ہی جاؤں تو مجھے پتا چلے گا پیدائشی مسلمان ہوں میں گاؤں کے مراثیوں کے سرپنچ گامے میراثی نے اذان دی تھی میرے کان میں۔"

"واہ واہ یقیناً" خاصا سریلا ہوگا گاما میراثی!"

"میراثی سارے سریلے ہوتے ہیں وہ تو بھانڈ ہوتے ہیں جو بیٹھے گلوں اور بے سری آواز میں گاتے ہیں۔"

"اچھا جی مجھے تو علم نہیں تھا کہ بھانڈ اور میراثی دو الگ الگ Species (اقسام) ہیں۔"

"توبہ توبہ بھانڈ تو مسخرا ہوتا ہے نقلچی جھوٹی تعریفیں کرنے والا بھانڈ ڈوبتا ہے لوگ کہتے ہیں گاتا ہے۔"

"کانوں کو ہاتھ ایسے لگا رہی ہو جیسے کوئی گناہ کی بات کہہ دی میں نے۔" "کانوں کو ہاتھ نہ لگاؤں تو اور کیا کروں میراثی کی شان میں گستاخی کردی تم نے۔"

"ہیں واقعی؟"

"ہاں تو اور کیا میراثی کی تو شان یہ ہے کہ بڑے بڑے عزت دار اس کے پاس اپنے شجرے رکھواتے ہیں۔"

"جب ہی تو وہ میراثی جب کسی کی عزت اتارنے پر آتا ہے تو اس کے آباؤ اجداد کی شان میں ایسے ایسے قصیدے پڑھتا ہے کہ سننے والے کو جگہ نہیں ملتی سر چھپانے کو۔۔۔"

"بس تو پھر سمجھ لو میراثی کی شان کیا ہے' اس کی زبان کھل جانے کے ڈر سے بڑے بڑے اس کے سامنے اپنی دستار جھکا دیتے ہیں۔"

"اچھا تو پھر اگر بھانڈ ہی لوگوں کی جھوٹی تعریفیں کرتا ہے تو تم میراثن ہو کر کیوں ایسا کرتی ہو۔"

"میں نے کب کسی کی جھوٹی تعریف کی؟"

"روز کرتی ہو' اس روز اسلام آباد والے کو کیا کہہ رہی تھیں۔"

"کیا کہہ رہی تھی؟"

"کہ نیلی جرسی اور کالی پتلون میں وہ وحید مراد لگ رہا تھا۔"

"کیا نہیں لگ رہا تھا' گلے میں سرخ ڈبی دار مفلر ڈالے سالگرہ والا وحید مراد لگ رہا تھا کہ نہیں لگ رہا تھا؟"

"توبہ' مبالغہ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔"

"اور اس سیٹھ حسین ہوٹل والے کو کہتی ہو' صدقے جاؤں آپ کی قسمت کے' واری جاؤں آپ کے بھاگوں کے' جو رفیق آتا ہے چوہدری کے ساتھ تو دونوں کو شانوں والی جوڑی اور موتیوں والی سرکار کے لقب کون دیتا ہے؟"

"آئے ہائے پھر یہ تو کہنا ہی پڑتا ہے' ایسی تعریفوں سے ذرا خمیر لگ جاتا ہے ان لوگوں کو' جیب ہلکی کرتے ہوئے بھار نہیں محسوس کرتے۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ اگر واقعی بھانڈ اور میراثی الگ الگ species ہیں تو پھر تم دونوں کی مکسڈ بریڈ سے تعلق رکھتی ہو۔"

"اچھا چلو جو بھی ہوں' انسان تو سمجھتی ہو نا مجھے۔"

"ہاہاہا' مکسڈ بریڈ' سمجھ میں آئی نہیں بات' انسان ہونے کا پوچھنے لگیں۔"

"ایک تو جب تم پڑھے لکھوں والی باتوں پر اتر آتی ہو تو میرا دل چاہتا ہے میں اپنے کانوں کے بٹن بند کر دوں۔"

"اور تمہارے ساتھ رہ رہ کر مجھے بھی کبھی ایسے لگتا ہے' مجھ میں بھی لوگوں کی جھوٹی تعریفیں کرنے کے جراثیم منتقل ہوتے جا رہے ہیں۔"

"چلو اچھی بات ہے' کامیاب انسان میں ان جراثیم کا ہونا بہت ضروری ہے۔ ویسے ایک بات ہے۔"

"کیا۔"

"اسلام آباد والے کے ذکر پر تمہارے چہرے پر پھلجھڑیاں چھوٹنے لگتی ہیں۔ ہیں نا؟"

"چلو چلو بکواس نہ کرو' اس میں کون سی ایسی خاص بات ہے۔ جو میرا چہرہ اس کے نام پر گلنار ہو گا۔"

"وہ عاشق خاص ہے تمہارا' چاکلیٹی ہیرو' وحید مراد' وہی تو ہے۔ جو دل سے تمہاری قدر کرتا ہے اور تمہارے چھوٹے چھوٹے معاملات کے متعلق بھی فکر مند رہتا ہے۔"

"پتا نہیں۔"

"تمہیں نہیں پتا میری مٹر والی شہزادی تو کسے پتا ہے کہ جب مٹر کی چبھن محسوس ہونے پر نیند نہیں آتی تو خوابوں کی پنکھیاں کون جھلاتا ہے تمہیں۔"

"اچھا چلو زیادہ باتیں نہ بناؤ' اندھیری پرچون کی دکان میں جوئے کا قصہ سناؤ۔"

"قیامت آنے والی ہے' مجھے لگتا ہے' اوپر مسجد کے سنہری مینار سر اٹھائے کھڑے ہیں' سبز گنبد دور سے اپنی چھب دکھلاتا ہے' جس کے اسپیکر سے پانچ بار اللہ کے پیاروں کو نماز کے لیے جمع ہو جانے کا بلاوا ملتا ہے اور نیچے اندھیری دکان میں خدا کی مار پڑے' پھٹکارے جواری جوا کھیلتے ہیں۔ سنا ہے سینکڑوں کا نہیں ہزاروں کا جوا کھیلا جاتا

ہے روز وہاں۔ اور ان جواریوں کو پولیس سے کون بچاتا ہے بھلا۔"

"کون؟"

"طیفا لاٹر اور کون۔"

"وہ جو بانو کے گھر مہینے کا راشن بھجتا ہے؟"

"ہاں وہی ہے جو پرچون کی دکان پر چھاپہ پڑنے دیتا ہے نہ تالاب والی گلی میں شراب کی بھٹی بند ہونے دیتا ہے۔"

"وہی ہے نا جو ہمارے گھر سے ہر رات کو اٹھتی ساز و آواز کی صدا پر ناک بھوں چڑھانے والے محلے داروں کو چوں بھی نہیں کرنے دیتا؟"

"ہاں وہی۔"

"اب آواز کیوں پست ہو گئی تمہاری؟ یاد آیا کہ نہیں ہمارے رزق روٹی کے وسیلے کو سایہ دینے والا بھی طیفا لاٹر ہی ہے۔"

"نہیں بھولی نہیں کبھی' مگر اس گھر میں' میں ہم' طیفا لاٹر کیا سارا محلہ جانتا ہے' قمار باز اور زانی شرابی نہیں اچھی آواز کے شوقین آتے ہیں' یہاں لچوں لفنگوں کی نہیں' غزل اور گیت کے شائقوں کی محفل جمتی ہے' شعر سنائے جاتے ہیں اور ادب و تاریخ پر بحث ہوتی ہے۔ یہ کسی رنڈی کا ڈیرا نہیں' سروں کی ملکہ کا ٹھکانہ ہے' اسی لیے طیفا لاٹر اس طرف کسی کو آنکھ اٹھانے نہیں دیتا۔"

"دل کو بہلانے کے لیے ہر کوئی اپنے لیے دلیلیں ڈھونڈ لیتا ہے میری عزیز از جان سہیلی!" یہ طوائف کا ڈیرا ہے یا سُر کی محفل کا ٹھکانہ' دونوں برابر ہیں۔"

"گناہ تو ہونے ہیں' ہوتے ہی رہنے ہیں' ابلیس نے یونہی تو اللہ سے مہلت نہیں مانگی تھی پر مسجد کے نیچے جوا' یہ تو بہت بری بات ہے نا۔"

"مسجد کے زیر سایہ خرابات کا منظر ہے۔"

"کس کا منظر ہے؟"

"رہنے دو' تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔"

"چلو نہ بتاؤ۔ میں اسلام آباد والے سے پوچھ لوں گی کہ مسجد کے زیر سایہ کون سا منظر ہوتا ہے۔"

"وہ بے چارہ دو جمع دو چار کرنے والا' تمہیں ان شاعرانہ تعلیوں کا مطلب کیا سمجھا پائے گا۔"

"کیوں نہیں سمجھا پائے گا' وہی تو ہے۔ جو تم سے میر' درد' ناسخ اور آتش کی غزلوں کی فرمائشیں کرتا ہے۔ باقی لکیر کے فقیروں کی طوطی تو غالب سے شروع ہو کر غالب پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ غالب نہ ہوا غالبا" ہو گیا' جو سب سے اچھی شاعری کرتا تھا۔"

"واہ دیکھ لو' تمہیں پڑھوں لکھوں کی محفل میں بیٹھ کر کیسی ٹھکانے کی گفتگو کرنی آ گئی۔"

"پھر بھی میراثن ہونے کا طعنہ دینے سے باز نہیں آئیں۔"

"میراثن کی تو شان ہی اور ہے' بڑے بڑوں کے شجروں کی امین میراثن۔"

"ہاہاہا۔"

☼ ☼ ☼

"آپ کی دوست فلزا ظہور سے ملاقات کے بعد آپ سے ملنے کا بہت شوق تھا مجھے' کیونکہ ماہ نور نے بتایا تھا۔ وہ

فلزا ظہور کو آپ کے توسط سے جانتی ہے۔"

"یہ سمجھا ہو گا کہ آپ بھی فلزا ظہور کی طرح انتہائی مردم بے زار اور کھڑوس خواتین ہوں گی۔" ماہ نور نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "دیکھا تم نے فاطمہ اور خدیجہ خالہ کتنی سویٹ ہیں۔"

"ہاں 'یہ تو ہے۔" وہ مسکرایا۔

"وہ بے چاری بھی ایسی تو نہیں ہوا کرتی تھی جیسی تم لوگ بتا رہے ہو۔" خدیجہ نے افسوس سے سرہلاتے ہوئے کہا۔ "نجانے اتنے سالوں میں اس پر کیا گزری بے چاری جو وہ ایسی ہو گئی۔"

"وہ کیا اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھیں؟" سعد نے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے' کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ ماں باپ کی اکلوتی اولاد' ان کے بعد کسی بھائی بہن کے نہ ہونے کی وجہ سے خاندانی تعلقات کی عدم موجودگی میں تنہائی کا شکار ہو جاتی ہے۔"

"ارے اس کا تو خاصا بھرا پرا خاندان تھا۔ اس کا باپ جی سی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر تھا' دادا اچھی سن میں پڑھاتا تھا' ایک چچا کیمبرج سے گریجویشن کر کے آیا تھا اور اس کا نانا پاکستانی سفارت کار تھا' اس کے خاندان کی اگلی نسلیں تو یہاں وہاں ہر جگہ کے۔۔۔ اہم عہدوں پر کام کر رہی ہوں گی' وہ تنہا کیسے ہو سکتی ہے۔" فاطمہ نے کہا۔

"لیکن شاید تمہیں یاد نہیں فاطمہ! فلزا کے اکلوتے بھائی اکبر نے خودکشی کر لی تھی زمانہ طالب علمی میں ہی۔"

"وہ اسٹوڈنٹ لیڈر تھا' اس پر نجانے کہاں کہاں سے دباؤ پڑا' کس کس بات کے لیے' اس کی خودکشی کا ایک پس منظر تھا۔ فلزا کی تنہائی کا کوئی پس منظر نہیں بنتا۔"

"ہر خاتون آپ کی طرح نہیں ہوتی فاطمہ' خدیجہ خالہ! اکثر خواتین شادی نہ ہونے کو ایک مس ہیپ (سانحہ) سمجھنے لگتی ہیں اور پھر باقی عمر اسی محرومی کے شیڈوز (سایوں) تلے گزار دیتی ہیں' کڑھتی' جلتی' بھنتی۔" ماہ نور نے خیال ظاہر کیا اور جھرجھری لی۔ "اف جیسے وہ فلزا ظہور تھیں' میرے اللہ مجھے ایسے لگ رہا تھا' میں منکر نکیر کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی جب میں ان کے سامنے کھڑی تھی۔"

"اگر ماہ نور کی یہ منطق مان لی جائے تو کیا یہ حقیقت ہے کہ فلزا ظہور نے شادی نہیں کی تھی؟" یہ سوال پوچھتے ہوئے نجانے کیوں سعد کو اپنا دل معمول سے زیادہ تیز رفتار سے دھڑکتا محسوس ہو رہا تھا۔

"آخری خبریں جو اس کے بارے میں ہم تک پہنچی تھیں ان کے مطابق تو نہیں کی تھی۔" خدیجہ نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

"یہ کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے۔" سعد کے لہجے میں عجیب سا اضطرار تھا۔

"غالباً"!" خدیجہ نے گردن پیچھے کر کے نگاہیں چھت سے لگاتے ہوئے کہا۔ "آج سے بیس اکیس سال پہلے کی۔"

"اوہ۔" سعد نے جیسے خود سے کوئی بات کی۔ "ہو سکتا ہے کوئی خفیہ شادی کر رکھی ہو۔"

"خفیہ کیوں کرنی تھی اس نے' اس کا خاندان پڑھا لکھا اور روشن خیال تھا' اس نے کس سے اپنی شادی چھپانی تھی۔" خدیجہ نے سعد کے خیال کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔

"سن اٹھاسی میں وہ لندن چلی گئی تھی اور یہ ہی اس کے بارے میں آخری اطلاع ملی تھی۔" فاطمہ نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ "کئی سال بعد میں نے ایک میگزین میں فن مصوری کے بارے میں ایک مضمون میں اس کا سرسری تذکرہ پڑھا جس میں اس کا تعلق اسلام آباد سے ظاہر کیا گیا تھا جب ہی تو ماہ نور سے میں نے کہا کہ پتا کرنا بھلا وہ اسلام آباد میں ہی رہتی ہے کہ واپس چلی گئی۔"

"ہوں۔" سعد فلزا ظہور سے متعلق خدیجہ اور فاطمہ کی ایک ایک بات غور سے سن رہا تھا۔ "وہ قلندرانہ

مزاج رکھتی ہیں غالباً۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ان کا کام بہت اعلا ہے مگر انہیں شہرت میں کوئی دلچسپی نہیں' اسی لیے جب ماہ نور کے کہنے پر میں نے ان کا پتا لگانے کی کوشش کی تو یہ جان کر حیرت ہوئی' آرٹ کے بڑے بڑے قدردانوں کو بھی ان کے بارے میں علم نہیں تھا' یاد ہے نا ماہ نور۔"

اس نے تائید حاصل کرنے کے لیے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ ماہ نور کے چہرے پر بے زاری اور ناگواری کا تاثر تھا۔

"اوہ یہ تو اس موضوع سے چڑنے لگی۔" اسے خیال گزرا۔

"یہ ڈونٹس آپ نے خود بیک کیے ہیں کیا؟" ماہ نور کی خاطر فوراً موضوع بدلتے ہوئے اس نے خدیجہ سے پوچھا۔

"ہاں!" وہ مسکرائیں۔ "کیسے لگے تمہیں؟"

"بہت اچھے ہیں۔" وہ خدیجہ کے سٹنگ روم میں چہار طرف نظر ڈالنے لگا۔

"مجھے فلزا کے بارے میں جان کر دکھ ہو رہا ہے!" فاطمہ جو کچھ دیر کے لیے اٹھ کر کمرے سے باہر گئی تھیں واپس آتے ہوئے بولیں۔ "وقت کیسے کیسے نقوش چھوڑ جاتا ہے انسانوں کے چہروں اور حالات پر۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا ایک پرانا البم کھولتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے کالج کے دنوں کا یہ البم ڈھونڈ کر صرف تم بچوں کو یہ دکھانے کے لیے لائی ہوں کہ اس وقت کی فلزا کو دیکھو اور جانو کہ وقت کتنا بڑا فیکٹر ہے۔"

سعد اور ماہ نور اپنی نشستوں پر آگے کھسکتے ہوئے اس میز پر جھک گئے جس پر فاطمہ نے البم رکھا تھا۔ البم کے شروع کے صفحات پر ٹرانسپیرنٹ کاغذ کے نیچے خدیجہ اور فاطمہ کی جوانی کی تصویریں چپکی تھیں۔

"اف خدیجہ! فاطمہ خالہ! آپ لوگ تو بیوٹی کوئنز تھیں۔" ماہ نور نے مسرت چھلکاتے لہجے میں تبصرہ کیا۔ "اف فاطمہ خالہ! آپ میک اپ میں کتنی اسٹائلو لگ رہی ہیں۔" اس نے ایک تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "ارے یہ اس زمانے کے ہائی فیشنز' خدیجہ خالہ آپ بھی جینز شرٹس پہنا کرتی تھیں کیا؟"

وہ ایک ایک تصویر پر تبصرہ کر رہی تھی۔

"یہ آپ کے بھائی ہیں نا' بالکل آپ سے شکل مل رہی ہے' یہ آپ کی امی یہ ابو' دیکھیں میں نے سب کو پہچان لیا۔"

سعد کو ماہ نور کی تبصرے اور سوال کرتی آواز اچھی لگ رہی تھی مگر اسے فلزا ظہور کی جوانی کی تصویر دیکھنے کی جلدی تھی۔ ماہ نور کے ایک ایک تصویر کو دیکھ کر ایکسائیٹڈ ہونے اور رک رک کر تبصرے کرنے پر اسے کوفت بھی محسوس ہو رہی تھی۔

"یہ دیکھو' یہاں پہچانو فلزا کو؟" وہ صفحہ آگیا جس پر خدیجہ اور فاطمہ کی کالج یونیفارم میں مختلف تصویریں چپکی تھیں۔ سہیلیوں کے ساتھ' اکیلے اور ایک دو تصویریں کلاس میٹس اور ٹیچرز کے ساتھ گروپ کی شکل میں بھی تھیں۔ ماہ نور اور سعد کی تجسس بھری نظریں ایک ایک تصویر پر تیزی سے پھسلنے لگیں۔

"یہ۔" ماہ نور نے ایک تصویر پر انگلی رکھی' فاطمہ نے انکار میں سر ہلایا۔

ماہ نور نے ایک دو مزید تصویروں کی طرف اشارہ کیا مگر فاطمہ نفی میں سر ہلاتی رہیں۔

"یہ ہیں فلزا ظہور۔" سعد نے ایک تصویر پر انگلی رکھی جس میں فاطمہ اور خدیجہ دو لڑکیوں کے گلوں میں بانہیں ڈالے کھڑی مسکرا رہی تھیں۔

"ایگزیکٹلی (بالکل)۔" فاطمہ نے بے ساختہ کہا اور سعد کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔ سعد نے مسکراتے ہوئے ماہ نور کو دیکھا' وہ اسے جتانا چاہ رہا تھا کہ اس نے فلزا کو پہچان لیا تھا مگر ماہ نور کو برا سا منہ بناتے دیکھ کر اس نے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ کو سمیٹ لیا۔

"یہ بڑی یادگار تصویر ہے!" فاطمہ اس تصویر کو دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ "اس میں' میں' خدیجہ' فلزا اور شہناز ہیں' ہم لوگ پنجاب یونیورسٹی کا بین الکلیاتی تقریری مقابلہ اٹینڈ کرنے گئے تھے' شہناز کنیرڈ میں پڑھتی تھی اور ہم ایل سی میں۔"

"شہناز کون فاطمہ خالہ؟" ماہ نور نے میز سے چائے کے برتن سمیٹ کر ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ہماری کزن تھی شہناز۔" فاطمہ سے البم لے کر وہ تصویر دیکھتے ہوئے خدیجہ نے کہا۔ "بہت ذہین اور محنتی لڑکی تھی' اللہ نے اسے حسن کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سی خوبیوں سے نواز رکھا تھا۔"

"اب کہاں رہتی ہیں وہ؟" ماہ نور ٹرے اٹھا کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"اب شاید وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔" خدیجہ کے لہجے میں تاسف اتر آیا۔

"شاید۔" ماہ نور اور سعد بیک وقت بولے۔

"ہاں!" خدیجہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے البم بند کیا۔ "سنا تھا شہناز کے شوہر نے اسے قتل کر دیا تھا۔"

"اوہ۔" "اب کے بھی ماہ نور اور سعد کی آواز کمرے میں ایک ہی وقت میں گونجی۔

"آپ نے سنا تھا۔" ماہ نور ٹرے واپس ٹیبل پر رکھ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ "مطلب آپ کو خود کو نہیں پتا۔"

"شہناز کی آواز بڑی اچھی تھی۔" خدیجہ نے بتانا شروع کیا۔ "وہ جسے کہتے ہیں نا کوالٹی وائس ——— وہ اسکول کے زمانے میں گلوکاری اور نعت خوانی کے مقابلوں میں حصہ لیا کرتی تھی' پھر وہ اپنے والدین کے ساتھ انگلینڈ چلی گئی' اس کے والد ہمارے ماموں تھے۔ ایک بار چھٹیوں میں وہ لوگ پاکستان آئے ہمارے ایک کزن کی شادی تھی وہاں شہناز نے یونہی رشتہ داروں کی محفل میں دو' تین اس وقت کے مشہور نغمے سنائے۔ معلوم نہیں تھا کہ رشتہ داروں کی اس محفل میں بیٹھا ہماری رشتے کی ایک خالہ کا دیور ریڈیو پر کام کرتا تھا۔ اس نے جو شہناز کی آواز سنی تو بس نجانے کہاں اور کب اس کی جان کو ہی چمٹ گیا۔ ہم میں سے کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوئی اور وہ شہناز کو سبز باغ دکھا کر ریڈیو اسٹیشن لے گیا آڈیشن کے لیے۔ شہناز بی بی نے آڈیشن دیا اور پاس ہو گئی اور اپنے ابا سے ضد کرنے لگی کہ اسے یہیں پاکستان میں رہ کر پڑھنا ہے۔ ابا بھی غالباً" بچی کو لندن کے نامعقول ماحول سے چڑ ہو گئی تھی' سو یہاں داخلہ کروا کر اسے ہمارے دوسرے ماموں کے پاس چھوڑ گئے۔ شہناز اور وہ ریڈیو پروڈیوسر صاحب شہناز کا کیسٹ مارکیٹ میں لانے کی تیاریوں میں جٹ گئے۔ اعتبار اور اعتماد کا زمانہ تھا' چھوٹے ماموں کی فیملی نے توجہ ہی نہیں کی کہ لڑکی کالج جاتی بھی تھی یا نہیں' دیر سے گھر لوٹتی تھی تو ایسا کیوں تھا' سب اپنی زندگیوں میں مگن تھے' مگر سب کی زندگیوں میں بے چینی کا پٹاخہ تو اس وقت پھوٹا جب شہناز کے گیت ریڈیو پر چلے پھر اس کا کیسٹ مارکیٹ میں آیا اور پھر جناب عالی شہناز بی بی ریڈیو سے اٹھ کر ایک دن ٹی وی سکرین پر جلوہ گر ہو گئیں۔ یہ خبر بل کی بل میں ادھر سے اٹھی اور لندن پہنچ گئی۔ بس جناب پھر کیا تھا شہناز کے والد صوم وصلوٰۃ کے پابند' شرع کے عاشق۔ غصے میں آگ بگولہ۔ آکر چھوٹے ماموں اور شہناز کے سر پر وہ برسے وہ برسے کہ الاماں۔ ادھر شہناز پر شہرت اور کامیابی کے بھوت نے اپنے پنجے گاڑ دیے تھے۔ اس نے باپ کی اس ڈیمانڈ پر کہ ان لغویات سے فوراً" چھٹکارا حاصل کرلے' صاف انکار کر دیا۔ خوب مار ماری' بحثا بحثی ہوئی مگر نہ شہناز اپنے موقف سے ہٹی نہ والد صاحب میں لچک آئی۔" خدیجہ سانس لینے کو رکیں۔

"ہمارے خاندان کے لیے یہ ناقابل قبول صورت حال تھی۔" خدیجہ کے رکنے پر فاطمہ نے قصے کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "زمانہ بدل رہا تھا' مگر ہمارے یہاں مخصوص آزادی کی حد کی ایک واضح لکیر جو نجانے کب کھینچ دی گئی تھی اسے مٹانے کا کوئی تصور تک کرنے کو تیار نہیں تھا۔" فاطمہ نے بات سناتے سناتے سعد پر نظر

ڈالی۔ انہیں اس کے چہرے پر تجسس اور محویت نظر آئی۔

"لڑکا قصے اور داستانیں سننے کا شوقین لگتا ہے۔" انہوں نے دل میں سوچا۔

"پھر کیا ہوا؟" کمرے میں ماہ نور کی آواز گونجی۔

"پھر ایسا ہوا کہ شہناز کے والد نے اس سے لاتعلقی کا اعلان کرتے ہوئے اسے اپنی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے عاق کردینے کی دھمکی دے دی۔"

"او یہ تو ایکسٹریم ری ایکشن ہو گیا نا۔" ماہ نور نے بے ساختہ کہا۔

"ایکشن بھی تو ایکسٹریم تھا نا۔" سعد نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور خدیجہ کی طرف دیکھا' وہ آگے کیا سنانے والی تھیں۔

"شہناز پر ان دھمکیوں اور اعلانوں کا مطلق اثر نہیں ہوا' اس کی جوانی اور بغاوت اپنے جوبن پر تھی۔ خاندان کے بزرگوں' نوجوانوں' بچوں تک نے اسے ہر ممکن سمجھانے کی کوشش کی مگر اسے شاید سمجھنا ہی نہیں تھا۔ اس نے ماموں یعنی اپنے والد سے کہا کہ وہ اس سے کیا لاتعلقی اختیار کریں گے' وہ خود ہی ایسے والدین کی اولاد کہلانا نہیں چاہتی جو اولاد کو اپنی مرضی سے جینے کی آزادی دینے کو تیار نہیں۔ ماموں نے شہناز سے لاتعلقی اختیار کرتے ہوئے اسے عاق کردیا اور خود واپس چلے گئے۔ جاتے جاتے سارے خاندان کو یہ دھمکی بھی دے گئے کہ جس کسی نے شہناز سے کوئی تعلق رکھا' اس سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ اس دھمکی کو خاندان بھر نے اس طرح لیا کہ جیسے شہناز سے تعلق رکھنے والا ملعون قرار دے دیا جائے گا۔" خدیجہ نے کہا۔

"بپھری ہوئی شہناز نے چھوٹے ماموں کے گھر سے سامان اٹھایا اور اللہ جانے کہاں گئی کہ اس کے بعد کبھی کہیں نظر نہیں آئی۔ ایک بار ایک موسیقی کی محفل میں ایک عزیز کو ملی اور اسے پہچاننے سے انکار کردیا۔ پھر بہت عرصے بعد کہیں سے اڑتی اڑاتی خبر آئی کہ شہناز نے کسی امیر شخص سے شادی کرلی تھی جس نے کسی وجہ سے اس کا گلا کاٹ کر اسے قتل کردیا۔"

"ہائے!" ماہ نور نے خوف سے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ سعد نے ایک نظر ماہ نور پر ڈالی اور پھر خدیجہ کی طرف دیکھا۔

"اور شہناز کے والد' ان کا گھرانہ؟" اس نے سوال کیا۔

"ماموں بے چارے تو اس صدمے سے جو واپس جا کر بیمار پڑے تو شاید ایک سال بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ مضبوط اعصاب کے آدمی تھے مگر یہ انہونی اور پھر جذباتی فیصلے کے نتائج یعنی شہناز سے دوری کو سہہ نہیں پائے۔ پہلے فالج گرا اور زبان مفلوج ہوئی پھر دل فیل ہو گیا۔ ان کی دوسری بیٹی رئیسہ ان کی وصیت کے مطابق سب جائیداد اور ساز و سامان کی مالک بن گئی' بیوی کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا' اللہ اللہ خیر صلا۔" خدیجہ نے قصہ لپیٹتے ہوئے کہا۔

"یہ خبر تو آپ نے صرف سنی ہی تھی نا کہ شہناز کا قتل ہو گیا' کنفرم تو نہیں ہوئی یہ خبر۔" سعد نے کہا۔ خدیجہ نے جواب دینے سے پہلے ایک نظر سعد پر ڈالی' اضطراب اور تجسس کی کیفیت میں وہ اپنی نشست پر آگے کھسکتا ہوا عین اس کے کنارے پر بیٹھا تھا۔

"شہناز کے قصے کا آخری حصہ یعنی اس کا قتل لاکھ سنسنی خیز سہی مگر یہ لڑکا کچھ زیادہ ہی مضطرب نہیں ہو رہا۔" انہوں نے سوچا۔

"اس کے بعد چونکہ اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں آئی اور ہمارے جیسے خاندانوں کا اکثر یہ المیہ ہوتا ہے کہ خاندانی شرافت و نجابت بچانے کی خاطر اس قسم کے قصوں سے پہلو تہی کرلی جاتی ہے' لہٰذا پھر نہ کوئی اس پر بولا ہی کسی نے بات کی۔" انہوں نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

"ہم دونوں بہنوں کو البتہ شہناز اکثر یاد آجاتی ہے۔" فاطمہ نے کہا۔ "وہ ہماری ہم عمر تھی' کزن ہونے کے علاوہ قریبی دوست بھی تھی' اس لیے ہماری بہت سی یادیں اس سے وابستہ ہیں لیکن خاندان کے اکثر بزرگوں کی وفات کے بعد چونکہ اب ہم لوگ بزرگوں کی فہرست میں شامل ہو گئے ہیں تو وہی خاندانی شرافت و نجابت امانت بن کر ہمارے ہاتھوں میں آچکی ہے' کس سے پوچھیں شہناز کا قتل کیسے ہوا' ہوا بھی کہ نہیں ہوا؟"

فاطمہ کی بات سن کر سعد نے سر جھکا لیا۔ "جی یہ بھی ٹھیک ہے۔" کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر فاطمہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اُفوہ سعد! کیا تم یہاں فلزا ظہور اور اس کی قسم کے دوسرے لوگوں کو ڈسکس کرنے آئے ہو۔" ماہ نور نے جھنجلاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"سعد کو لگتا ہے' ماضی کے قصوں میں خاصی دلچسپی ہے۔" خدیجہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولیں۔

"بے شک۔" سعد نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا اور ماہ نور کی طرف دیکھا۔ "مس ہیولیشم قسم کی اولڈ لیڈیز کے قصوں میں خصوصاً"!"

"گویا اپنی ہم عمر لڑکیوں میں تمہاری دلچسپی بالکل صفر ہے۔" فاطمہ نے دانستہ کہا اور شرارت بھرے انداز میں ہنس دیں۔

"ہوں!" سعد نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ نمبر دو ترجیح کہی جاسکتی ہے۔" اس کے چہرے پر بھی شرارت کا رنگ تھا۔

"ماہ نور کے ساتھ بھی ایسا ہی ہے۔" فاطمہ مسکرائیں۔ "اسے میلوں میں کافی گاتے سائیں' بندر کے تماشے دکھاتے مداری' مٹی کے برتن بناتے کمہار قسم کے لوگ خوب اٹریکٹ کرتے ہیں۔"

"مطلب artisans" (ہنرمند)۔" خدیجہ نے اضافہ کیا۔

"گویا سوانگ بھرنے والے لوگ ماہ نور کو اٹریکٹ کرتے ہیں!" سعد ہنستے ہوئے ماہ نور کو دیکھنے لگا۔

"میرا خیال ہے' اب مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔" ماہ نور نے ناراض انداز میں ٹرے اٹھائی اور کچن کی طرف چل دی۔

"بہت اچھی' بے ریا اور نیک دل لڑکی ہے۔" ماہ نور کے جانے کے بعد فاطمہ نے سعد سے کہا۔ سعد نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ کا کیا خیال ہے' آپ کی کزن شہناز جیسی سنگر اور ایک میلوں میں گانے والی میراثن میں کوئی مماثلت ہو سکتی ہے' کیا وہ ایک ہی کیٹگری میں شامل ہو سکتی ہیں۔" اس نے جلدی سے فاطمہ سے سوال کیا۔

"میرا خیال ہے' بالکل نہیں۔" فاطمہ نے کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد کہا۔ "شہناز کی کوئی آڈیو کیسٹ یا ریڈیو پاکستان کی میوزک لائبریری میں محفوظ ریکارڈز شاید کہیں مل سکیں' تم کو موقع ملے تو کہیں سے ڈھونڈ کر سننا' تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ شہناز کی شخصیت میں اس کا خاندانی وقار اور رکھ رکھاؤ کیسے بولتا ہے' میراثن کا جو اسٹیٹس ہے' شہناز اس سے بہت بلند' بہت مختلف تھی۔"

"ہمارے معاشرے میں البتہ یہ رواج عام ہے۔" خدیجہ نے ان دونوں کی بات سنتے ہوئے کہا۔

"فلم میں کام کرنے والی لڑکی لاکھ چلا چلا کر کہے' اس کا تعلق ایک معزز گھرانے سے ہے' ہم لوگ یہ ثابت کرنے پر تل جاتے ہیں کہ ضرور اس کا تعلق ریڈ لائٹ ایریا سے ہی ہے' اسی طرح جو گلوکار وغیرہ ہیں' ان کے فیملی بیک گراؤنڈز کو نظر انداز کرکے عامیانہ سے انداز میں کہہ دیا جاتا ہے' میراثی ہیں یہ گویتے سارے' سب کا پس

منظر یہ ہی ہے۔"

فاطمہ نے دیکھا' خدیجہ کی یہ بات سن کر لمحہ بھر کے لیے سعد کے چہرے پر کرب کی لہر دوڑی تھی۔ جسے دیکھ کر فاطمہ نے دل میں خود سے کوئی بات کہی اور سر ہلا دیا۔

"اگر فلز اظہور نامہ ختم ہو گیا ہو تو کوئی اور بات کر لی جائے۔" اسی دم ماہ نور نے کمرے میں آکر گفتگو کا موضوع بدل ڈالا۔

☆ ☆ ☆

"میں تو بڑا اداس ہو گیا تھا بھین جی' پر ڈیوٹی تو پھر ڈیوٹی ہوتی ہے نا۔" کھاری نے آپا رابعہ کے قریب تخت پوش پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔ "بھگتانی پڑتی ہے۔"

"بہت دنوں بعد شکل دیکھی ہے تمہاری' ایسا لگتا ہے دل میں ٹھنڈ سی پڑ گئی۔" آپا رابعہ نے محبت بھرے انداز میں کھاری کو دیکھا۔

"او جی لکھ دنیا کے لہور' لہور ہے' میں تو بس اکو (ایک) ہی بات کہتا ہوں جو مزا چھجو دے چوبارے' او نہ بلخ نہ بخارے۔" کھاری کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ اسے گاؤں واپس آکر مانوسیت اور اپنائیت کا جو احساس ہو رہا تھا اس کا اندازہ وہی کر سکتا تھا۔

"میں بڑی کوشش کیتی (کی) جی مگر میرے سبق پیچھے پڑ گئے۔" اس نے آپا رابعہ کو بتایا۔

"ادھر لہور میں کسی کو اتنا ٹائم ہی نہیں کہ دو گھڑی تھم کے کھاری وچارے (بے چارے) کو تھوڑا سبق سیپارے کا ہی دے دے۔" اس کے لہجے میں گلہ تھا۔

"سبق صرف استاد ہی دے سکتا ہے کھاری۔ وہ بھی اپنا!" آپا رابعہ نے محبت بھرے انداز میں کھاری کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔

"پروڈے بزرگ تو کہتے ہیں علم دینا اور لینا پڑھن والے (طالب علم) تے پڑھان والے (معلم) کا کام ہے بلکہ فرض ہے۔"

"پڑھانے والا ہر کوئی نہیں نا ہوتا کھاری۔" آپا رابعہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"چلو خیر معاملہ یہ ہے کہ پچھلا سبق بھی ایک واری فیر پکا کرانا ہے اور نواں (نیا) تو دینا ہی ہے۔" کھاری نے اصل معاملہ ان کے گوش گزار کیا۔

"یعنی سب بھول گئے۔" آپا رابعہ کو افسوس ہوا۔

"بھل نہیں گیا۔" کھاری نے ان کو تسلی دی۔ "پکا کرنا ہے۔"

"کان آگے سے پکڑو یا پیچھے سے ایک ہی بات ہے!" آپا رابعہ کو اس کی چالاکی پر ہنسی آگئی۔ "یہ کیا ہے۔" انہوں نے صحن میں رکھے تھیلوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو کھاری لے کر آیا تھا۔

"سبزی بھیجی ہے چوہدری صاحب نے' سنگھاڑے بھی ہیں' شکر قندیاں بھی' کچھ فروٹ بھی ہے۔ ایک تھیلے میں آٹا ہے اور ایک میں چینی۔"

"شکر ہے چوہدری صاحب' ایس آئے۔ مانو رونق لوٹ آئی ہمارے گھر میں۔ اونچی شانیں سلامت رہیں چوہدری صاحب کی۔" آپا رابعہ نے وافر مقدار میں چیزیں دیکھتے ہوئے کہا اور کھاری کی طرف متوجہ ہوئیں جو لاہور میں قیام کے دوران گزرے واقعات انہیں سنا رہا تھا۔

"السلام علیکم سعدیہ باؤ۔ کیا حال چال ہے۔" اسی دوران سعدیہ سیڑھیاں اتر کر چھت سے نیچے آئی تو کھاری

نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اسے سلام کیا۔ سعدیہ نے کھاری کو جواب دینے کے بجائے راستے میں رکھی لکڑی کی نیچی چوکی کو پاؤں سے ٹھڈا مارا اور ان دونوں کے قریب سے گزرتی کمرے میں چلی گئی۔

"اوئے ہوئے ہوئے۔۔۔" کھاری نے سعدیہ کو اندر جاتے دیکھ کر آپا رابعہ سے کہا۔

"سعدیہ باؤ نے تو لگتا ہے نری مرچوں کا سالن کھالیا ہے' بھلیکے سے' (غلطی سے) وہ ہنسا۔ آپا رابعہ نے خفگی سے سر جھٹکا۔

"پرچے ختم ہوگئے؟" کھاری نے سوالیہ نظروں سے آپا رابعہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔۔۔!" آپا رابعہ نے خفگی سے جواب دیا۔

"تے پھر کیا مسئلہ ہوگیا سعدیہ کو' نفسے' کھلیے' خوش رہے' اگوں دسویں پڑھنی ہے۔" کھاری نے اپنی عقل اور سوچ کے مطابق خیال ظاہر کیا۔ "پر وہ تو لگتا ہے اگ (آگ) کا گولہ بن گئی ہے۔"

"کوئی دسویں نہیں پڑھنی اس نے' یہ گھر بیٹھے اب۔" آپا رابعہ نے سخت لہجے میں کہا۔

"ہیں جی!" کھاری کو ایک دم کرنٹ سا لگا۔ "کیوں نہیں پڑھنی جی؟"

"بس۔" آپا رابعہ نے سر جھٹکا۔ "ہم میں اب اتنا دم نہیں اتنا خرچا کرنے کا۔"

"پر سعدیہ نے تو ڈاکٹر بننا ہے جی!" کھاری اٹکتے ہوئے بولا۔

"ڈاکٹر بننا ہے۔" آپا رابعہ نے تلخ لہجے میں اس کی بات دہرائی۔ "زکوۃ خیراتوں پر بھی کبھی کوئی ڈاکٹر بن سکا ہے۔ ہمارے پاس کون سے خزانے ہیں جن کے منہ کھول کر اسے ڈاکٹر بنائیں گے۔"

بات کچھ کچھ کھاری کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ وہ مزید کوئی سوال پوچھے بغیر آپا رابعہ سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد فارم ہاؤس لوٹ آیا۔

"لو جی۔ میں ان کے گھر سوغاتیں دینے گیا۔ یہ ادھر حاضری لگانے آگئے۔" چوہدری صاحب کے آنے کا سن کر واپسی پر مولوی سراج کو فارم ہاؤس کے ملاقاتیوں والے کمرے سے نکلتے دیکھ کر اس نے سوچا۔ "جو سچ پوچھو تو مولی صاحب بھی تا بڑے ہی چول ہیں۔" اس نے سر جھٹکا۔ "ذرا صبر تو کرو بھائی! چوہدری صاحب کو خود فکر ہے' وہ پہنچا دیں گے چیزیں آپ کے گھر' پر صبر کدھر سے آئے' بڑا مسئلہ ہے بھئی۔" وہ دل میں سوچتا اور سر جھٹکتا رہا۔

اس رات چوہدری صاحب کے بلاوے پر بھی اسے فوراً "مولوی سراج سرفراز" کا ہی خیال آیا تھا۔ "لو جی چوہدری صاب سوچدے ہوں گے کہ میں آگا پیچھا کر گیا ہوں' سوغاتیں نہیں پہنچائیں میں نے مولی صاب کے گھر۔" وہ دل ہی دل میں سوچتا اور مولوی سراج کو کوستا چوہدری صاحب کے پاس آیا تھا۔

"بیٹھو کھاری!" چوہدری صاحب جو ماسٹر کمال سے میٹنگ کر رہے تھے انہوں نے ماسٹر کمال کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ماسٹر کمال کے جانے کے بعد چوہدری صاحب نے کھاری سے کمرے کے دروازے کو اندر سے لاک کرنے کا حکم دیا۔

"کھاری بیٹا جی۔۔۔ میں نے تجھے کبھی غیر سمجھا؟" لاک کر کے واپس آنے کے بعد جب وہ چوہدری صاحب کے سامنے بیٹھا تو انہوں نے سوال کیا۔

"نہیں جی۔۔۔!" کھاری نے سر ہلایا۔

"کوئی مسئلہ' کوئی شکایت کبھی تجھے مجھ سے ہوئی ہو۔" دوسرا سوال آیا۔

"نہیں جی!"

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

عنیزہ سید

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور نے "سید پور کلچرل شو" میں شرکت کے لیے اپنی دوست شاہ بانو کے ساتھ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ شاہ

بانو نے اپنے بھائی کی معرفت سید پور میں ماہ نور کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا۔ فاطمہ اور خدیجہ نے ماہ نور کو اسلام آباد میں قلزا ظہور سے ملنے کی تاکید کی۔ قلزا ظہور ان کے بچپن کی ساتھی ہے۔ بچپن میں کوئلے سے فرش اور دیواروں پر تصویریں بنانے والی قلزا ظہور اب ایک بڑی آرٹسٹ ہے مگر اسے شہرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔

مولوی سراج اور آپا رابعہ قصبے میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی سعدیہ کلثوم نویں جماعت کی طالبہ بے حد ذہین ہے۔ مولوی سراج اور آپا رابعہ کو اس بات پر فخر ہے کہ ان کی بیٹی سائنس پڑھ رہی ہے۔

ایک رات سارہ نے رکی کو خواب میں دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ سرکس میں کام کرتا تھا۔ رکی اپنے فن کا ماہر جوکر تھا۔

ماہ نور اور شاہ بانو "سید پور کلچرل شو" میں گئیں تو وہاں انہیں ایک کمہار نظر آیا۔ وہ گیلی مٹی کو بہت مہارت سے دیدہ زیب برتنوں کی شکل میں ڈھال رہا تھا۔ ماہ نور کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہ چونک گئی۔ اسے اس پر اسی شخص کا گمان ہوا جو اسے ہر میلے میں مختلف روپ میں نظر آ رہا تھا۔

سارہ ماہ نور سے مل کر خوش نہیں ہوئی۔ اس کا رویہ بہت روکھا اور خشک تھا۔

واپسی پر گاڑی میں ماہ نور نے سعد سے اعتراف کیا کہ وہ اب تک جتنا سعد کو جان پائی ہے سعد اس کی نظر میں ایک قابل رشک انسان ہے۔ سعد نے اسے سارہ کے متعلق بتایا وہ سرکس دیکھنے گیا تھا۔ سارہ خان بلندی سے نیچے گری تھی۔ اس نے اس کی ہڈیاں ٹوٹتے اور خون بکھرتے دیکھا تھا۔ وہ وہاں سے واپس آگیا لیکن سارہ خان کے لیے بے چین رہا۔ وہ دوبارہ اسے ڈھونڈتے ہوئے اس سے ملنے پہنچا تو وہ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور زخم زخم جسم کے ساتھ ایک چھولداری میں پڑی موت کی منتظر تھی۔ اس کے زخموں پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں۔ سعد اس کو وہاں سے لایا اور اس کا علاج کرایا اور پھر اسے فلیٹ میں منتقل کیا۔

کھاری نے آپا رابعہ سے نماز یاد کرلی تھی اور بہت خوش تھا۔ سارہ خان نے پہلی بار سوچا سعد سے اس کا تعلق صرف ترس اور ہمدردی کا ہے اسے اپنا ماضی یاد آرہا تھا۔ جہاں جاپانی نقش و نگار والا رکی تھا۔ جس کی جاپانی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اس کا باپ اس کے بہن بھائیوں کے ساتھ پھوپھی کے حوالے کر گیا تھا۔ باپ نے دوسری شادی کرلی تو سوتیلی ماں کے مظالم سے تنگ آکر وہ گھر سے بھاگ گیا اور قسمت اسے سرکس میں لے آئی۔

آپا رابعہ نے مولوی سراج کو بتایا کہ اسکول والوں نے سعدیہ کی پیدائش کی پرچی مانگی ہے تو وہ پریشان ہوگئے۔

ماہ نور سارہ سے ملنے آئی اور اس نے سارہ کو بتایا کہ اس کی سعد سے صرف چند دن پہلے ملاقات ہوئی ہے۔ یہ سن کر سارہ کا رویہ اس کے ساتھ بدل گیا۔

سعد نے اپنی بہن نادیہ سے اسکائپ پر بات کی۔ وہ فن لینڈ میں بہت مشقت بھری زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کی ماں کا شوہر اس پر بری نظر رکھ رہا تھا۔ اس لیے وہ فن لینڈ آگئی۔

جیناں بھکارن نے ایک بچہ اغوا کیا لیکن پولیس نے اس سے بچہ برآمد کرلیا۔

ماہ نور کی سعد سے ملاقات ہوئی تو وہ اسے اختر کے پاس لے گیا۔ اختر نے ماہ نور کو دیکھ کر سعد سے کہا "یا تو زن یا من پالو" ایک کی قربانی دینی پڑے گی۔

اس نے ماہ نور سے کہا بی بی آپ کا دل بہت صاف ہے اور زندگی بہت پرسکون ہے لیکن آگے آپ کے لیے بہت مشکلیں ہیں۔

قلزا ظہور سعد کو فون پر کسی تصویری نمائش کی دعوت دیتی ہیں۔ سعد اپنے فرینکفرٹ کے دورے کی وجہ سے معذرت کر لیتا ہے۔ ماہ نور فاطمہ اور خدیجہ کو قلزا ظہور سے ملاقات کے بارے میں بتاتی ہے۔ فاطمہ ماہ نور سے سعد سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کرتی ہے۔ وہ بے دلی سے ہامی بھرتی ہے کیونکہ سید پور سے آنے کے بعد سے سعد کا فون مسلسل بند مل رہا تھا جبکہ سارہ خان کو اس نے اپنے جرمنی جانے کی اطلاع دے دی تھی۔

ماہ نور نے سعد کو فون کرکے شکوہ کیا کہ اس نے اسے جرمنی جانے کی اطلاع کیوں نہیں دی تھی۔ ماہ نور نے سعد سے وعدہ لیا کہ آئندہ وہ اسے بتا کر ہی کہیں جائے گا۔ اگلے دن سعد نے اسے کئی میسجز بھیجے۔ جن میں وہ اطلاع دیتا رہا کہ اب وہ کیا کررہا ہے۔ ماہ نور کو یہ اچھا لگا مگر اس نے سعد کو منع کردیا اور کہا کہ وہ اسے بس ملک سے باہر جاتے ہوئے ہی اطلاع دیا کرے۔

سعدیہ نے آپا رابعہ سے ننھیال کے رشتے داروں کی بابت پوچھا تو وہ تشویش میں مبتلا ہوگئیں۔ انہوں نے مولوی سرفراز سے اپنی تشویش کا اظہار کیا کہ سعدیہ کو شک ہوگیا ہے کہ ہم اس سے کچھ چھپاتے ہیں۔ تاہم مولوی سرفراز نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔

سعد نے قلزا ظہور سے ملاقات کی اور اس کا اسٹوڈیو بھی دیکھا۔ اس نے وہاں کچھ ادھوری پینٹنگز بھی دیکھیں۔ جو اسے بے حد متاثر کن لگیں۔

سارہ نے چمکیلے ربڑ سے کچھ جانور بنائے۔ سعد نے دیکھ کر کہا کہ اگر تم نے اس سے بھی اچھے بنائے تو میں تمہیں اپنے اور تمہارے بارے میں ایک اہم بات بتاؤں گا۔ سارہ نے اس سے وعدہ کرلیا کہ وہ اب اور محنت کرے گی۔

ماہ نور اپنے رشتے داروں کی شادی میں گئی تو وہاں ہال کے باہر سے سعد کچھ لوگوں کے ساتھ نظر آیا۔ ماہ نور اسے اپنے شہر میں دیکھ کر حیران ہوگئی۔ وہ اس سے ملنے کے ارادے سے اس کی طرف بڑھی۔ مگر سعد نے ایس ایم ایس کے ذریعے اسے روک دیا۔ ماہ نور ششدر ہوگئی۔

آپا رابعہ سعدیہ سے صاف لفظوں میں کہہ دیتی ہیں کہ وہ اسے آگے نہیں پڑھا سکتیں۔ سعدیہ کے مزاج میں مستقل برہمی آجاتی ہے۔

ماہ نور سعد کو اپنے گھر لے جاتی ہے۔ نازنین کا سرد اور دوٹوک انداز سعد کو کچھ اچھا نہیں لگتا مگر کھاری اور ماہ نور کے تایا تائی سے مل کر اسے بہت خوشی ہوتی ہے۔ کھاری اور رضوان الحق کی بہت اچھی دوستی ہو جاتی ہے۔ سارہ کے ہاتھوں میں مشاقی آتی جارہی ہے۔ سمی آنٹی اسے سراہتی ہیں اور باتوں باتوں میں اسے کریدتی ہیں کہ وہ رکو کو پسند کرتی تھی۔ سارہ انہیں مبہم سا جواب دیتی ہے۔ جس میں یہ بات نہایت واضح ہوتی ہے کہ سعد اس سے سچی محبت کرتا ہے۔

سعد ماہ نور کے ساتھ خدیجہ اور فاطمہ خالہ سے ملنے جاتا ہے۔ ادھر شہناز کا ذکر نکل آتا ہے۔ سعد اس گفتگو میں دلچسپی لیتا ہے جسے فاطمہ محسوس کرلیتی ہیں۔ پرانا البم دیکھتے ہوئے سعد قلزا ظہور کی تصویر فوراً پہچان لیتا ہے۔

بارہویں قسط

"کیا تو سمجھتا ہے کہ میں تیرے لیے جو بھی سوچوں گا بھلا ہی سوچوں گا۔" تیسرا سوال۔

"ہاں جی بالکل۔" سبز کھاری نے زور زور سے پرجوش انداز میں سر ہلایا۔

"تو بس پھر بیٹا سمجھ لے جو فیصلہ میں نے آج تیرے لیے کیا ہے اس میں بھی تیرا بھلا ہی بھلا ہے۔ تیری زندگی سنور جائے گی۔" چوہدری صاحب نے پراعتماد انداز میں کہا۔

"میں جی۔" کھاری نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ "کیسا فیصلہ جی؟" اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

"کہیں میری ڈیوٹی پھر سے ڈنگروں (جانوروں) والی حویلی میں تو نہیں لگ گئی۔" اسے خیال آیا۔

"مولوی سراج کی دھی رانی جو ہے نا۔" چوہدری صاحب نے کہا۔

"ہاں جی سعدیہ۔" کھاری نے تیزی سے کہا۔

"اس سے تیرا نکاح طے کردیا ہے میں نے آج سے ٹھیک دس دن بعد یہ جمعہ چھوڑ کر اگلے جمعے۔" چوہدری صاحب نے دھماکا کیا کھاری کے ہوش و حواس اڑ گئے۔

☆ ☆ ☆

"سر نہ اٹھانا' دم نہ مارنا کھاری! تو چوہدری صاحب کا قرض دار ہے ان کے احسانوں کے نیچے دبا ہوا ہے مجال نہ کر سر اٹھانے کی' دم مارنے کی۔"

اس نے اپنے کمرے میں بچھی کھری چارپائی پر لیٹے لیٹے اور کروٹیں بدلتے بدلتے پچاسویں مرتبہ ماسی جنت کی یہ بات یاد کی' اور خود کو اس بات کے سائے تلے لانے کی کوشش کی۔

"مولوی سراج کی دھی رانی جو ہے.....

اس سے تیرا نکاح طے کر دیا ہے میں نے' آج سے ٹھیک دس دن بعد' یہ جمعہ چھوڑ کر اگلے جمعے۔" گلے ہی لمحے اسے اپنی سماعت کے اور گرد بڑی طاقت کا بم پھٹتا محسوس ہوا۔

"سعدیہ کلثوم!" اس نے دل میں دہرایا اور اسے لگا جیسے چارپائی کے بان میں کانٹے اگ آئے تھے اور وہ کانٹے اس کے کپڑوں سے پار جسم میں کھبے جا رہے تھے۔ وہ تڑپ کر اٹھا اور فرش پر بیٹھ گیا۔

"اندر کی بات کھاری پتر اندر ہی رہ جانی چاہیے' جس جس راز پر مولا نے پردہ ڈالا ہے' بندے کو اس کا پردہ اتارنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔" اسے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہتے چوہدری صاحب کا چہرہ یاد آ گیا۔

"تیرا دوڑ دوڑ کر مولوی سراج کے گھر جانا' سوہنی اور چنگی سوغاتیں چن چن کر ان کے لیے تھیلوں میں بھرنا' بھی بہت تھوڑے لوگوں کی نظروں میں آیا ہے' اور مولوی سراج کی دھی رانی کو خالم خالی فارم ہاؤس میں لانا اور اسے یہاں دوپہر سے شام تک رکھنا تو اللہ کے سوا صرف ایک انسانی آنکھ نے دیکھا ہے پتر او ئے۔"

"سن سن سن۔" کھاری کے جسم پر لفظوں کی سنگ باری شروع ہوئی تھی۔ الفاظ کے ذریعے سنگسار کیے جانے کی تاریخ کبھی کسی تاریخ دان نے رقم نہیں کی' کی ہوتی تو شاید چوہدری سردار جیسے پڑھے لکھے شخص کو اس کا سلیقہ ضرور ہوتا۔

فرش پر بیٹھے بیٹھے اس نے جیسے اپنی طرف آتے پتھروں سے خود کو بچانے کی خاطر بازو اپنے آگے پھیلائے مگر پھر بھی اپنا بچاؤ نہیں کر پا رہا تھا۔

"خالم خالی فارم ہاؤس میں دوپہر سے شام۔" پتھر جیسے اس کے جسم کے ہر حصے پر پڑ رہے تھے۔

"میں اس نوں فارم ہاؤس دکھایا تھا جی۔ اس نوں بوت شوق تھا دیکھنے کا۔" اس کے پاس ڈھال کے لیے الفاظ کم تھے' بے ربط تھے اور شاید کھوکھلے بھی' کبھی چور نے بھی مانا ہے کہ اس نے چوری کی تھی' وہ تو یہ ہی کہے گا کہ میں تو بڑا معصوم ہوں۔

"چلو مگر بات تو سچی ہے نا' تم مولوی کی دھی رانی کو ادھر لائے تھے۔" اس کو ڈھال کے لیے استعمال کیے یہ الفاظ مہنگے پڑے تھے' اس کا اقرار' اقرار جرم ثابت ہوا تھا۔

"لیکن اللہ نے پردہ ڈالنے اور پہلے سے پڑے پردے کو قائم رکھنے کا حکم دیا ہے۔" چوہدری صاحب نے کتنے اطمینان سے اس کی بے ضرر حرکت کو گناہ کے معنی پہنا دیے تھے۔ اس بات کا مولوی کو علم نہیں' وہ تو میرے پاس آیا تھا اپنی غریبی کا رونا رونے' ساس کی اتنی پسلی نہیں کہ لڑکی کو خود کہیں دو بول پڑھا کر رخصت کر دے' مگر چاہتا یہ ہے کہ اس فرض سے جتنی جلدی ہو سکے سبکدوش ہو جائے' اب میرے پاس بندے تو بہت تھے جو یہ کام بسم اللہ کر کے کر لیتے مگر میرا دھیان تیری طرف کیوں گیا بھلا؟" انہوں نے اس کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا تھا جو نہتا تیروں کے سامنے کھڑا تھا۔

"تو مولوی کے گھر اڑ کر جاتا ہے' مولوی کی گھر والی نے تجھے بیٹا بنایا ہوا ہے' مولوی کی دھی کو تو فارم ہاؤس کی سیر

بھی کراتا ہے۔ اوئے کھاری باؤ' ہم بھی تو پتروں کی رمزیں جانتے ہیں' تو میرا اپنا پتر نہ سہی' تجھے میں نے بیٹوں کی طرح پالا ہوا ہے۔ تیری ایک ایک جنبش پر میری نظر ہے۔ جس دن محمد مالک نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے اپنی ننگی آنکھ سے تجھے مولوی کی دھی کے ساتھ خالی فارم ہاؤس میں دیکھا تھا' میں اسی روز جان گیا تھا کہ اپنا کھاری جوان ہو گیا ہے۔"

اب کے آنے والے پتھر بڑے اور وزنی تھے' کھاری کے جسم کے ساتھ روح تک کو کچلنے لگے تھے۔

"آپ حکم کریں چوہدری صاحب! میں تو ڑی کا گنڈا اپنے اوپر سے گزار لوں۔" اس نے چوہدری صاحب کے قدموں میں بیٹھ کر اپنے جڑے ہاتھ ان کے سنہری تلے والے کھسے پر رکھتے ہوئے کہا تھا "آپ اپنے ہاتھوں مینوں سولی چاڑھ دیو (سولی پر چڑھا دیں)' میں سی کراں تے کافر (میں اف بھی کروں تو کافر کہلاؤں)' پر میرے متھے ایسی بات نہ لگائیں۔ چوہدری جی' نہ لگائیں۔" دہرا ہوتا ہوا رو رہا تھا وہ۔

"وے کیا ہو گیا ہے پتر جی!" انہوں نے نرم ہاتھوں سے اسے اٹھاتے ہوئے کہا "یہ ہی تو میں کہہ رہا ہوں' جب رب پردے رکھنے والا ہے تو ہم انسان کون ہوتے ہیں پردے اٹھانے والے۔ جب ہی تو میں نے مولوی پر احسان بھی رکھ دیا تو تیرے من کی مراد بھی پوری کر دی۔ نکاح پڑھا کر لے آ اسے پکا ہی فارم ہاؤس' جتنی مرضی آئے سیریں کرا لے اسے فارم ہاؤس کی اس کے بعد' تجھے آپ پتا چل جائے گا کہ چور بن کر پھل چکھنے میں مزا ہے یا سادھ بن کر پھل کی حفاظت کرنے میں۔"

"نہ کریں جی' نہ کریں۔" اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے' وہ بولنا چاہتا تھا مگر اس کے معصوم الفاظ پر ایسا وار کیا گیا تھا کہ زبان گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔

"چل شاباش اٹھ!" چوہدری صاحب نے اٹھ کر اسے اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر اپنے سامنے کھڑا کیا تھا "میرا شیر بن شیر' میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر' جوانی کس پر نہیں آتی' پیر کس کا نہیں ڈولتا' نظر رکھنے والے ماں پیو کا یہ ہی تو فائدہ ہوتا ہے۔ جوانی کی ایک لچک اور پیر کی ایک ہی لغزش پر معاملہ اوپر سے پکڑ لیتے ہیں۔ چل شاباش۔ رونا دھونا بند کر اور دل میں پھوٹتے لڈووں کی خوشی منا چل کے۔"

چوہدری صاحب نے سنگ ساری کے بعد اس کا لاشہ ریشم کے کفن میں لپیٹنا چاہا تھا مگر اس کے جسم پر پڑی ضربیں اس کی روح تک کو چور چور کر رہی تھیں۔ وہ چوہدری صاحب کے کمرے سے اپنے کوارٹر تک کیسے پہنچا تھا' وہ نہیں جانتا تھا۔ ہاں اتنا اسے معلوم تھا کہ وہاں سے آنے کے بعد وہ اپنے ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک کی عمر میں پہلی بار پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا۔ وہ اتنا رویا تھا' اتنا کہ اس کو لگ رہا تھا اس کے تازہ دکھ کے ساتھ اس کے دل اور روح میں اتنی عمر تک کے بڑے سارے پھپھولے پھٹ کر اس کی آنکھوں کے راستے بہنے لگے تھے۔

"میرا ربا! میں نے کبھی گلا نہیں کیا' میرے منہ توں کبھی شکایت دا لفظ نئیں نکلا' پھر تو نے میرے ساتھ یہ کیا کیا ہے؟" وہ اپنی عقل کے مطابق سوچ رہا تھا۔ جب ماسی جنت اس کو ڈھونڈتی ادھر آئی تھی۔

ماسی جنت نے اسے اپنے ہاتھوں سے پالا تھا۔ کھاری کی جو حالت اس روز اس نے دیکھی تھی' اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آئی تھی۔

"بتا تو سہی۔ ہوا کیا ہے۔" ماسی جنت نے اپنے مشقت سے فولاد ہوتے ہاتھوں کی انگلیاں اس کے بازو میں کھبوتے ہوئے جھنجوڑ کر پوچھا تھا۔

"بندے کا کوئی ایک سنگی' کوئی ایک بیلی (ساتھی) ایسا ہوتا ہے کھاری' جس سے دل کا حال کہہ کر وہ ہلکا ہو جائے' بول میرا پتر! کیا ہوا؟ میں تیری ماں جیسی ماسی ہوں کہ نہیں۔"

ماسی جنت برسوں کی مشقت کی دھول کے پیچھے زندگی کی نرمیوں اور خوشگواریوں کو بھول بھال چکی تھی' لیکن پھر

بھی اس نے حتی المقدور کوشش کی تھی کہ وہ کھاری کو اپنائیت کا احساس دلا سکے۔ کھاری کو بھی اس وقت کسی کی ضرورت تھی، کسی سننے والے کان اور سمجھنے والے دل کی ضرورت۔ اس نے پھٹنے کے سے انداز میں سب کچھ ماسی جنت کے گوش گزار کر دیا۔ پوری بات کا ایک چسکے دار پہلو بھی تھا، جو ماسی جنت سے لے کر اس گاؤں کی تقریباً" ہر عورت کے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتا تھا اور اسی پر ماسی جنت کا پہلا رد عمل آیا۔

"ہائے وے وہ جھلیا۔ تو اسے میرے سامنے لے کر آتا فارم ہاؤس میں۔ مجھے بتاتا لے ماسی! مجھے مولوی کی لڑکی پسند آگئی ہے تو میں اس کی خاطر خدمت الگ کرتی اور چوہدری صاحب کو خود بتاتی کہ مولوی کے پاس رشتہ لے کر جائیں۔"

کھاری کو ماسی جنت کے یہ جملے خود پر اچھالے گئے پتھروں میں مزید اضافہ محسوس ہوئے تھے۔

"ماسی جو تو سمجھ رہی ہے، وہ گل (بات) ہے ہی نہیں، تو کہہ سکتی ہے تو اب جا کر چوہدری صاحب کو کہہ دے کھاری نوں معاف کر دیو، کھاری اتنے جوگا (اس قابل) نہیں، ایہہ کھاری کی اوقات تو بڑی اچی (اونچی) گل (بات) ہے۔"

"ہائے وے جھلیا!" ماسی نے اپنی ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر حیرت سے کہا "من کی پسند خود چل کر تیرے پاس آئی ہے تو کہتا ہے اسے موڑ دے، تیرے سے زیادہ جھلا تے شیدائی دوسرا کون ہو گا؟"

"او نہیں ہے من دی پسند کوئی شوئی۔" کھاری الجھ کر بلند آواز میں بولا "تو چوہدری صاحب کو نہیں ناں بتائے گی تے لے فیر (پھر) میں آپ ہی جاتا ہوں، خود گل کرتا ہوں، کدی حکم نہیں ٹالا پر یہ حکم نہیں سولی دا فرمان ہے۔ ایک من گھڑی بات کا الزام ہے، او میں تو بھین جی کا شاگرد تھا، سبق لیتا تھا ان سے، بندے نوں انسان بننے کے واسطے اونھاں دے گھر جاتا تھا، جو چیزیں ان کے گھر پہنچاتا تھا۔ ان دی چھانٹی اس لیے کرتا تھا کہ استاد کو ماٹھی سوغات نہیں دینی چاہیے۔ سعدیہ کو فارم ہاؤس ایس لیے لایا تھا کہ اس وچاری نے دنیا دیکھی نہیں تھی، فارم ہاؤس اس کے واسطے امریکہ تھا امریکہ، میں نے سوچا، میرا کیا جاتا ہے۔ جو یہ وچاری ذرا باہر دیاں شیواں (باہر کے ملک سے آئی چیزیں) دیکھ لے گی۔ چاچے مالک کی نظر پڑ گئی تھی تو اسی دن مینوں تو گردن سے پکڑتا، پوچھتا یہ کیوں یہاں آئی ہے؟ لے کر چوہدری صاحب کو بتایا کہ......" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"آخ تھو!" اس نے چہرہ ایک طرف جھکا کر منہ سے آواز نکالی "میرا وجود کیچڑ و کیچڑ کر دیا چاچے مالک نے، میں سر اٹھا کر چلتا تھا اس نے میری نظروں میں مینوں آپ نوں منہ کے بل گرا دیا۔"

"او نہ کاکا! چوہدری صاحب کو انکار نہ کرنا وہ مولوی سے زبان کر چکے ہیں، سر نہ اٹھانا سر نہ اٹھانا، تو چوہدری صاحب کا قرض دار ہے، تو ان کے احسانوں کے نیچے دبا ہوا ہے، مجال نہ کر سر اٹھانے کی، دم مارنے کی۔" ماسی جنت نے اسے اس کی حیثیت یاد دلا دی تھی۔ اس کا بال بال چوہدری صاحب کے احسانوں کے نیچے دبا ہوا تھا۔ وہ خود اپنے وجود کے لیے چوہدری صاحب کا دم دم محتاج تھا۔

"پر وہ حکم کرتے، اپنے مان سے کہتے۔ لے کھاری! میں نے مولوی صاحب نوں زبان دے دی۔ جو گل انہوں نے کی ہے ماسی او میرے توں (مجھ سے) بھاری ہے۔"

"چھوڑ پرے یہ باتیں۔ شادی کی تیاریاں کر لے، میں تو خود ڈھولکی بجاؤں گی۔ کھاری ساڈا گھوڑی چڑھیا ہمارے فارم ہاؤس کا راجہ گھوڑی چڑھیا۔" ماسی جنت نے اپنے ادھ کھائے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

"توں میری بات نہیں سمجھے گی ماسی!" وہ دکھ سے بلبلا کر بولا "کوئی بھی نہیں سمجھے گا۔" اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"او چھڈ سوچ سمجھ کی باتیں۔" ماسی نے ہاتھ جھٹک کر کہا "ہم نے لوگوں کو یہ بتانا ہے کہ کھاری کا بیاہ مولوی کی

بٹی سے ہو رہا ہے۔ تو مولوی کی بیوی کو استاد کہتا ہے تو شکر کر استاد کی دھی سے بیاہ ہو رہا ہے۔ نہیں تو چوہدرائن نے تجھے اس رضیہ چڑیل کے گلے مڑھ (باندھ) دینا تھا۔" ماسی جنت نے اٹھتے ہوئے کہا اور شادی بیاہ کا کوئی ٹپہ گنگناتی کمرے سے باہر چلی گئی۔

مگر ماسی سے دل کی بات، بلکہ دل کی جلن کا بوجھ بانٹ کر بھی اس کا دل ہلکا نہیں ہوا تھا۔ چوہدری صاحب کے الفاظ کونوں کی طرح اس کے وجود پر پڑے تھے۔ وہ اگلی صبح تک زخم زخم ہو چکا تھا۔ پو پھٹنے سے پہلے نیم تاریکی میں جب کالا اور سفید تاگا نظر آنے لگا۔ مولوی سراج سرفراز کی آواز مسجد کے لاؤڈ اسپیکر پر ابھری۔ "اللہ اکبر، اللہ اکبر" کھاری ٹھنڈے فرش پر دھرا اپنا اکڑا ہوا وجود حرکت میں لایا اور کھڑے ہو کر کمرے میں موجود واحد کھڑکی کا پٹ کھول کر باہر جھانکا، باہر نیم تاریکی تھی اور خنک ہوا۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتا کمرے سے باہر نکلا۔ خنک ہوا اس کے جسم سے ٹکرائی اسے اپنے انگارہ بنتے وجود کو راحت پہنچتی محسوس ہوئی۔

"حی علی الفلاح حی علی الفلاح"

مولوی سراج سرفراز نیند کی بے خبری میں پڑے ہوؤں کو بھلائی کی طرف آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ کھاری نے اپنی جلتی آنکھوں کو زور سے بند کیا اور پھر انہیں کھول کر دوبارہ سامنے کے منظر پر نکا دیں۔ وہ اس نیم تاریکی میں نجانے کیا دیکھنا چاہ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"پھر کیا کہا چوہدری صاحب نے؟" آپا رابعہ کے چہرے پر ایک عجیب سی بے چینی اور اپنے سوال کا جواب جان لینے کی عجلت تھی۔

"انہوں نے کہا، مولوی صاحب! یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔" مولوی سراج سرفراز نے چائے کے پیالے پر آئی باریک سی جھلی کو انگلی سے ہلایا، جھلی ان کی انگلی کے ساتھ چمٹ گئی تھی۔ انہوں نے انگلی اوپر اٹھا کر جھلی کو زبان سے چاٹا اور آپا رابعہ کی طرف دیکھا جنہوں نے اپنے سوال کے جواب کے تجسس میں ان کی اس حرکت پر جزبز ہوتے ہوئے چہرہ دوسری طرف نہیں موڑا تھا۔

"فکر کی بات نہیں تو اور کیا ہے؟" آپا رابعہ نے بے چینی سے کہا۔

"او بی بی! دم تو لے لو۔" مولوی صاحب نے چائے کا گھونٹ سڑکنے کے بعد کہا "چوہدری صاحب کے پاس ہر مسئلے کا حل موجود ہوتا ہے، بادشاہ آدمی ہیں وہ۔ اس سے بڑا ایثار کیا ہو سکتا ہے کہ مجھے کہنے لگے مولوی جی، آپ کی بچی ہمارے لیے قابل احترام ہے، وہ ہماری اپنی بچی ہے، ہم کسی ایرے غیرے، نتھو خیرے کو کیوں ڈھونڈیں بچی کو اس کے ساتھ رخصت کرنے کے لیے۔ بچی کی زندگی ڈبونی ہے کیا!" مولوی صاحب کے چہرے پر چوہدری صاحب کے لیے عقیدت بھری مسکراہٹ ابھری۔

"اوہو! پھر آخر جواب کیا دیا چوہدری صاحب نے؟" آپا رابعہ مولوی صاحب کے اس انداز گفتگو سے سخت چڑا کرتی تھیں۔

"دم لو رابعہ بی بی! دم لو" آپا بیگم کے ساتھ اتنے سال گزارنے کے باوجود آپ کو تحمل سے گفتگو کرنے کا سلیقہ نہیں آیا۔" مولوی سراج نے پیالا ہلا کر چائے مزید ٹھنڈی کرتے ہوئے کہا "آپا۔ کیا سلیقہ تھا گفتگو کا ان کو۔ بات کرتی تھیں، مانو منہ سے پھول جھڑتے تھے۔"

آپا رابعہ نے جھلا کر چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اب یہ مولوی صاحب کے لیے آپا رابعہ کی شدید ناراضی کی علامت تھی۔

"ہاں تو چوہدری صاحب فرمانے لگے۔ مولوی جی! آپ اس پنڈ کے بچوں' بڑوں کو بھلائی کی طرف بلاتے ہو' اللہ کا کلام پڑھاتے ہو' نیکی کا درس دیتے ہو' بزرگوں کے قصے سناتے ہو' آپ بھی ہمارے لیے محترم ہو۔"

"ٹیک اور تفصیل!" آپا رابعہ نے دل میں امڈتے غصے کو بند منہ کے اندر دانت پیس کر باہر آنے سے روکا۔

"بولے آپ کی بچی کی خاطر ادھر ادھر کیوں دیکھیں۔ میرا کھاری حاضر ہے۔" بالآخر مولوی سراج سرفراز نے چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے اس اطلاع کو اگلا جس کو سننے کے لیے آپا رابعہ کے منتظر کان بے چین تھے۔

"کھا' کھا۔۔۔ ری!" الفاظ رک رک کر ان کے حلق سے نکلے۔ انہیں اپنے جسم میں دوڑتے خون میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی۔ عمر بھر میں واحد خواہش جو پوری ہوئی تھی۔

"کون کہے کہ کاش اس لمحے کچھ اور مانگ لیتی' جبکہ میں نے تو مانگنا ہی یہی تھا۔" انہوں نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے سوچا۔

"میں نے کہا چوہدری صاحب! کھاری آپ کا خاص بندہ ہے' بیٹوں کی طرح پالا ہے آپ نے اسے ہم ٹھہرے اجنبی' ہمارا آگا پیچھا دیکھے بغیر آپ نے یہ کیسے کہہ دیا۔ مولوی صاحب نے رسان سے کہا۔" یہ میں نے اس لیے کہا کہ بعد میں کوئی سعدیہ کو طعنہ نہ دے کہ جی نجانے ذات کے کون ہوتے ہیں یہ لوگ۔"

"ماشاء اللہ کیا ایمان دار روح پائی ہے آپ نے مولوی سراج سرفراز۔" آپا رابعہ نے اندر سے اٹھتے غصے کے ابال کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "وہ کوئی اعتراض کیے بغیر رشتہ ڈال رہے ہیں اور آپ اپنے عذر خود ہی پیش کر رہے ہیں۔"

"سبحان اللہ! کیا بڑے دل کے مالک ہیں چوہدری صاحب' بولے مولوی جی بیٹیاں سانجھی ہوتی ہیں سب کی۔ میں آپ کی بچی کی شرافت نجابت اس کے ماں باپ کے کردار سے پہچانتا ہوں۔ اتنے سال ہو چکے آپ لوگوں کو ہمارے درمیان رہتے ہوئے' کوئی قابل اعتراض بات سنی نہ دیکھی۔ بس آپ نکاح کی تیاری کریں۔"

"میں!" آپا رابعہ کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ "نکاح کے لیے بھی تیار ہو گئے۔"

"ارے رابعہ بی بی! اب تک تو وہ نکاح کی تیاری میں بھی مصروف ہو چکے ہوں گے" مولوی صاحب نے چائے کا خالی پیالہ لے کر اٹھتے ہوئے کہا۔

"شادی مرگ۔" رابعہ آپا نے برسوں پہلے یہ لفظ اور اس کے معنی کسی سے سنے تھے' مگر دراصل یہ کیفیت ہوتی کیسی ہے' یہ اس روز انہیں پتا چلا تھا۔ اگلے لمحے ان کی نظر اس جگہ کی بدحالی پر پڑی جس میں وہ بیٹھی تھیں۔

کوٹھڑی نما تنگ کمرہ' جس میں تین چارپائیاں بمشکل بچھی تھیں' ایک جستی ٹرنک اور چمڑے کا ایک سوٹ کیس' فرش پر بچھا گھسا ہوا بدنما نمدہ جس میں سال بہ سال نئے سوراخ نمودار ہونے پر اس کے صاف اور مکمل حصے کو اوپر کی سطح پر رکھنے کے چکر میں وہ تہہ ہوتا ہوتا ایک فرشی گدی کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ مولوی سراج اسی پر بیٹھ کر کھانا کھاتے اور تسبیح پڑھتے تھے۔ دیوار پر لگی پرچھتیوں پر برتنوں کے نام پر چند پلیٹیں' اکادکا گلاس اور تام چینی کے دو ڈونگے سجے تھے' باقی حصے پر سبز کاٹن کے جزدان میں رکھا قرآن پاک اور دعاؤں کی چند کتابیں رکھی تھیں۔ پرچھتی کے بریکٹ پر لگی کیلوں میں سے ایک پر ان گنت چھوٹی بڑی تسبیحیں۔ لٹک رہی تھیں' یہ تسبیحیں' مولوی صاحب کو عمرہ اور حج سے واپس آنے والے اسی گاؤں کے باسی تحفے میں دے جاتے تھے۔ دوسری کیل کے ساتھ ازار بند ڈالنے کی سلائی اور چھوٹی سی قینچی لٹکی تھی۔

"فقر اور صبر' توکل اور غنا' سادگی اور درویشی' وہ ماضی میں پڑھے اسباق کی سچی تصویر تھیں' مگر وہ کس قدر خالی ہاتھ تھیں۔ ان کے پاس سعدیہ کو جہیز کے نام پر دینے کو ایک تنکا تک نہ تھا۔

"جب ہی تو۔" انہوں نے اپنے سر میں اٹھتی ٹیس کو جھٹکنے کی خاطر سوچا۔ "جب ہی تو اس کے لیے ایک ایسے

دولہا کا انتخاب میرے دل میں ٹھنڈ ڈال رہا ہے' جس کا بظاہر کوئی آگا ہے نہ پیچھا' مگر اس کی مست زندگی ہے' سعدیہ کو نہ کھانے کی کمی ہوگی نہ پہننے کو کپڑے لتے کی فکر' چوہدری صاحب اپنی ذمہ داری پر لے کر جا رہے ہیں۔ اپنی ذمہ داری نبھانا بھی جانتے ہیں۔ سواہ میں صدقے جاؤں اس وقت کے' جب مجھے یہ خیال آیا اور میں نے مولوی صاحب کے کان میں یہ خیال پھونک کر انہیں فارم ہاؤس بھیجا۔ کون کہتا ہے چھٹی حس کوئی چیز نہیں ہوتی یا چھٹی حس کام نہیں کرتی' صدقے جاؤں اس خیال کے جو کہتا تھا۔ چوہدری' ضرور کھاری کا رشتہ ڈالے گا۔ اسے پتا ہے بے نام نشان کو کھاری کو اس سے اچھا موقع اور کیا مل سکتا ہے۔

وہ جھومے جا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"میں کسی قابل نئیں چوہدری صاحب! میں نکما' ناکارہ بے حیثیت بندہ ہے' میرے عقل جنوراں (جانوروں) کو پٹھے (چارہ) ڈالنے' پھل فروٹ' پھل بوٹے دی چنائی توں آگے کچھ نئیں جاندی۔ یہ بات میرے وجود اور میری عقل توں بھاری اے۔"

اس نے اپنے وجود اور روح کے زخموں پر برداشت کی مرہم پٹی کرنے کے بعد چوہدری صاحب کی خدمت میں حاضری دیتے ہوئے کہا۔

"مولوی صاحب کی فیملی پڑھی لکھی عقلاں والی سوچ کی مالک ہے۔ میں اوہناں دا حصہ بننے کے قابل نئیں"

"تم اور میں یہ فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں کہ ہم یا کوئی اور کس قابل ہے' کس قابل نہیں ہے" چوہدری صاحب جو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے تھے کہ دو دن میں کھاری ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا' "کھاری پتر یہ جو آگ بجھ جانے پر راکھ باقی رہ جاتی ہے نا چولہے میں' کبھی کبھار اس کو کریدیں تو اس میں سے ہیرے بھی مل جاتے ہیں" وہ اس کی زرد رنگت اور سیاہ حلقے زدہ اندر کو دھنسی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"نہیں چوہدری جی! میں تے راکھ نئیں' ہیرے تو بڑی اچی (اونچی) چیز ہوتے ہیں" وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"تمہیں مسئلہ کیا ہے اس ساری بات میں؟" چوہدری صاحب نرمی سے بولے "دینے والے خوشی سے دے رہے ہیں' انہیں تو جیسے ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ لگ گئی ہے۔ تم نے اپنا حلیہ کاہے کو خراب کر لیا ہے اس بات کا بوجھ خود پر لاد کر۔"

"وہی بوجھ ہے چوہدری صاحب! جو میں نے آپ کو بتائی تھی۔" ماسی جنت جو کھاری کو ان کے پاس لے کر آئی تھی بول پڑی "اس نمانے کو یہ دکھ کھائے جا رہا ہے کہ بھائی مالک نے اس پر ازلام (الزام) لگایا ہے' بہتان باندھا ہے' یہ کہتا ہے اس دن مولوی کی بیٹی اکیلی اسکول سے آ رہی تھی۔ اسے پیاس لگی تھی' گرمی جو بڑی تھی۔ یہ باہر والے پھاٹک کے پاس کھڑا تھا' استانی جی کی بیٹی کر کے پانی پلانے اندر لے آیا' بچوں' کاکیوں کو جو شوق آ جاتا ہے اتنی بڑی عمارت دیکھ کر کہ بھلا اس کے اندر دیکھیں کیا ہے' اس کاکی نے بھی کہہ دیا کہ میں اندر سے فارم ہاؤس دیکھنا ہے۔ یہ جھلا معتبر بن کر اسے دکھانے لگ پڑا' عید کے صدقے کوئی ادھر ہے نہیں تھا اس لیے اس نے سوچا اسے کس نے دیکھنا ہے' کسی نے دیکھا بھی نہیں سوائے بھائی مالک کے اور جا کر آپ سے جڑ دیا۔ سیانے کہتے ہیں پہلے بات کو اندر تک پھرولو پھر فیصلہ کرو بات ہے کیا۔ یہ آنکھوں دیکھی جا کر آپ کو سنا دیتے ہیں۔ اس مسکین کو نکاح کا مسئلہ نہیں۔ اس ازلام (الزام) کا غم ہے جو دو دن کے اندر مٹی ہی ہو گیا ہے" ماسی جنت نے کھاری کی وکیل صفائی ہونے کا حق ادا کرتے ہوئے کہا۔

"ادھر آ میرے پاس۔" چوہدری صاحب جنت کی بات سننے کے بعد بے اختیار کھڑے ہو کر بولے۔ کھاری نے

خوف زدہ اور شرمسار نظروں سے چوہدری صاحب کو دیکھا۔وہ زیرلب مسکرا رہے تھے۔

"اِدھر آ۔" انہوں نے اپنے بازو پھیلائے اور اپنی بات دہرائی' کھاری جھجکتے ہوئے آگے بڑھا' چوہدری صاحب نے اپنے وا کیے بازوؤں میں اس کا وجود بھرتے ہوئے اسے سینے سے لگالیا۔

"میرا ایمان تھا کھاری! تو کسی نیک مگر مجبور ماں کی اولاد ہے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے تو کسی کی' کسی بے بس کی حلال اولاد ہے' تیرے اندر شریفوں کا خون دوڑ رہا ہے۔ جب ہی تو تیری نظر میں لالچ ہے نا ہوس' تجھے خبر ہی نہیں کب تیرا بچپن گزرا لڑکپن آیا اور پھر تو جوانی کے دور میں داخل ہوا۔" وہ اس کو پوری طاقت سے سینے سے لگائے کہہ رہے تھے۔ "تو بڑا بھاگوں والا لڑکا ہے میرے بچے! تو کسی قسم کی فکر نہ کر' میں تیری معصومیت کی گواہی دیتا ہوں' مالک جیسے لوگ کیا جانیں بے خبری' معصومیت اور باخبری' اور ہوس کے درمیان احساس کی کتنی بڑی خلیج حائل ہے' ان لوگوں نے کبھی خلیجیں دیکھی ہوں' ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک کا فاصلہ ماپا ہو تو پتا چلے نا۔"

وہ جذباتی انداز میں نجانے کیا کہے جارہے تھے۔ کھاری ان کی بات کا شاید کوئی حصہ بھی سمجھ نہیں پایا تھا مگر چوہدری صاحب کے سینے سے لگنے کے بعد دو دن سے کانٹوں پر گھسٹتا' کسی انجانی آگ میں جھلستا' الفاظ کی سنگ باری سے زخم زخم اس کا وجود جیسے یکدم پرسکون ہوگیا تھا۔ زندگی بھر اس کے دل و دماغ اور جسم کو اتنی راحت محسوس نہیں ہوئی تھی جتنی اس وقت چوہدری صاحب کے سینے سے لگ کر محسوس ہو رہی تھی۔

وہ رو رہا تھا نہ ہنس رہا تھا' وہ صرف اس آسودگی کو محسوس کر رہا تھا جو چوہدری صاحب کی بانہوں کے حلقے میں اس کے احساس میں اتری تھی۔ اس کی تھکن' جلن' کڑھن سب یکسر غائب ہوگئی تھیں۔ اس کا وجود پھولوں کی طرح ہلکا ہوگیا تھا۔

"چل شاباش! بھول جا ساری فکریں' نکال دے دل سے سارے غم اور خوش ہوجا۔ میں تیرا اپنا باپ نہ سہی مگر باپ جیسا تو ہوں' اور باپ کبھی غلط نہیں سوچتے اپنے بچوں کے لیے۔" چوہدری صاحب نے اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا تھا۔

"اوئے کدھر مرگئے ہو سارے۔" پھر انہوں نے اپنی مخصوص بلند آواز میں باہر کسی طرف چہرہ کرتے ہوئے آواز لگائی "اوئے اپنے دولہے راجہ محمد افتخار کے نکاح کی تیاریاں شروع کرو بھئی"۔

انہوں نے جیسے سب میں منادی کرنے کی کوشش کی کہ فارم ہاؤس میں برپا ہونے والی اگلی تقریب کی نوعیت کیا ہوگی۔

"جنت بی بی! سب چیزوں کی لسٹ بنالے' چودھرائن کے پاس پھیرا ڈال' اسے بھی بتادے۔ کھاری شہزادے کا نکاح ہورہا ہے' کپڑا لتا' جوتی' ہار سنگھار سب تیاریاں کرلے' دن ہی کتنے ہیں درمیان میں۔"

پل کے پل میں جیسے ہر ایک کی دوڑیں لگنا شروع ہوگئی تھیں۔ ماسٹر کمال' کھانے بید کی ٹوکریوں اور مٹھائی کا حساب کتاب لگانے میں مصروف ہوا۔ گاؤں کا بڑا نائی موٹر سائیکل بھیج کر بلوایا گیا' جنت کے ذریعے خبر چوہدرانی تک پہنچی جس نے یہ خبر سنتے ہی عادتاً" دوپٹہ منہ میں دے کر بے لفظوں سرگوشی کی۔

"مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔ یہ کھاری دوڑ دوڑ کر مولوائن کے گھر کیا کرنے جاتا ہے۔"

"شی!" جنت نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے چودھرائن کو خاموش رہنے کا مشورہ دیا۔

"چودھری صاحب سے کوئی ایسی بات کرے گا تو بڑا غصہ کریں گے۔ رشتہ انہوں نے اپنی مرضی سے طے کیا ہے' کھاری غریب کو تو پتا بھی نہیں تھا۔"

"ہائے ہائے پھر چوہدری صاحب کو آفت کیا آگئی تھی دست دوستی رشتہ کرنے کی۔ کھاری غریب کی ابھی عمر ہی

کیا ہے' ابھی کل کی تو پیدائش ہے تمانا۔"

چودھرائن' چودھری صاحب کے غصے سے اچھی طرح واقف تھیں' جنت کی تنبیہہ پر فوراً" دوسری طرف ہوتے ہوئے بولیں۔

"کھاری ہمارا اپنا بچہ' ہمارے ہاتھوں پلا بڑھا' اس مولوی کے تو خاندان کا ہی کوئی اتا پتا نہیں۔ پتا نہیں کدھر سے پھرتے پھراتے ادھر آگئے' ٹھوری واسوں کا مولوی لگتا ہے شکل سے نہ کوئی آگا نہ پیچھا' بچی کی پیدائش کی پرچی تک تو ہے نہیں تھی ان کے پاس' پھر بھی مولوائن کا نخرا ساتویں آسمان پر چڑھا ہوا ہے۔ تو دیکھ لینا۔ جنت! رشتہ تو وہ جو چودھری صاحب نے کردیا ہے' اب کھاری کے نکاح سے پہلے میں نے بھی محفل نہ کرائی تو میرا نام بھی صابرہ نہیں اور اس محفل میں مولوائن کو خود آکر درس دینا ہی پڑے گا۔ پہلے بھی ہم کم نہیں تھے' اب تو ہم لڑکے والے ہیں لڑکے والے۔" وہ اکڑتے ہوئے سر اٹھا کر بولی۔

"ہا ہائے نی رضیہ! تجھے کا ہے کو سانپ سونگھ گیا ہے" پھر اس نے اپنے قریب بیٹھی اپنی مصاحبہ خاص کو ڈانٹتے ہوئے کہا" چل اٹھ' بڑی کوٹھڑی کا تالا کھول' اس میں جو ٹرنک رکھے ہیں۔ انہیں دھوپ میں لاکر رکھ۔ میں کوئی کپڑا لتا دیکھوں۔ میں بھی کہوں اس بار میں لاہور جاکر بے وجہ ہی چیزیں کیوں خریدتی چلی جارہی ہوں۔ اب سمجھ میں آیا کہ کھاری کا نکاح جو ہونا تھا۔ اس کے لیے خرید رہی تھی۔" وہ مسکرا کر جنت سے بولیں۔

"نی چل بی اٹھ!" انہوں نے رضیہ کو ٹس سے مس نہ ہوتے دیکھ کر ڈانٹا۔ "تجھے کا ہے کو مرگی پڑ گئی ہے' ایسے ہے جیسے اب گری کہ تب گری۔"

رضیہ نے دوسری ڈانٹ پر اپنا بھاری ہوتا وجود بمشکل چوکی سے اٹھایا۔ اس خبر نے اس کے اندر آگ لگادی تھی۔ کھاری کم بخت جس نے اس سے کبھی اظہار الفت کیا تھا نا کوئی وعدہ وعید' یکدم ہرجائی سیاں نظر آنے لگا تھا۔ رضیہ کے من کی خواہش دل ہی میں رہ گئی اور مولوی کی بیٹی جھپٹا مار کر کھاری کو لے اڑی۔

وہ جھلستی' کلستی بل کھاتی بڑی کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر اندر گھسی اور کم از کم دو گھنٹے کھاری کے ہرجائی پن پر آنسو بہاتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"میں آٹھ پہر کا مسافر ہوں' مجھے ایسا لگتا ہے میں دن بھر ادھر ادھر بھٹکتا ہوں' مگر میں مسافر نہیں لگتا۔ لوگ سمجھتے ہیں میں اپنے کاموں میں مصروف ہوں' میں ایک کامیاب بزنس مین کا کامیاب بزنس مین بیٹا ہوں' ہم بزنس پلان کرتے ہیں اور پرافٹ کماتے ہیں' دنیا کی ہر سہولت کریڈٹ کارڈز کی شکل میں ہماری جیب میں ہمارے ساتھ پھرتی ہے۔ میں سوشل تقریبات میں بھی کاروباری فائدے پر نظر رکھتا ہوں' سماجی تعلقات کا بیشتر حصہ بھی کیا فائدہ اور کتنا فائدہ کی بنیاد پر کھڑا رہتا ہے۔ میری دوستیاں' میری دلچسپیاں' میرے خوشی و غم کے پیمانے' زندگی کا حظ اٹھانے کے طریقے لامحدود ہیں لیکن وہ سب جو میرے اردگرد ہوتے ہیں' ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں جانتا کہ میں دن کے سب پہروں کا مسافر ہوں۔

میں ایک محدود سی جگہ پر بھی دربدر بھٹکتا ہوں' میری آنکھیں اپنے سامنے پھیلے مناظر اور چہروں پر سفر کرتی ہیں اور میری حسیات ہر قسم کی صورت حال میں پنجوں کے بل بیٹھی ہوتی ہیں۔ میرا جسم' میری نظریں' میری تمام حسیں اس پوری کی پوری دنیا میں صرف ایک چہرے کی متلاشی ہیں' ایک وجود کی کسی سمت سے آمد کی منتظر ہیں۔ ایک نام ایک پہچان کی کھوج میں ہیں۔ میرا جسم' میری آنکھیں اور میری تمام حسیات حالت سفر میں ہیں۔ کئی برسوں سے انہیں نہ کہیں قیام میسر ہوا نہ کوئی ایسا پڑاؤ آیا ہے جہاں بیٹھ کر چند لمحوں کو ستالیں۔ میرے کان کسی آواز کے

منتظر ہیں، کوئی ایسی آواز جو کہے۔
"لو یہ ہے نا وہ جس کی تمہیں تلاش تھی، جس کا تمہیں انتظار تھا، جس کے لیے سفر کرتے بھٹکتے پھر رہے ہو۔ لو دیکھ لو، یہ ہی ہے وہ، اپنی آنکھوں سے دیکھ لو، یہ تمہارے سامنے ہے۔"

اس نے سوچتے سوچتے پہلو بدل کر دوسری سمت دیکھا۔ فون کی اسکرین نے روشن ہو کر کمرے میں روشنی کا ایک چھوٹا سا ہالا منور کیا، وہ کچھ دیر روشنی کے اس حلقے کو دیکھتا رہا اور پھر ہاتھ بڑھا کر فون میز پر سے اٹھا لیا۔ فون کرنے والے کا نام پڑھ کر وہ ہلکا سا مسکرایا۔

اور جو اسکرین روشن نہ ہوتی تو سائلنٹ موڈ پر ہونے کی وجہ سے میں کبھی جان نہ پاتا کہ اس نے فون کیا تھا اور نتیجہ میں اس کی جو سننی پڑتیں، وہ بہت سے دن فون کو سائلنٹ پر رکھنے سے روکے رکھتیں۔ اس نے فون آن کر کے کان سے لگایا۔

"ہیلو۔ توبہ کہاں تھے، اب تو فون بس بند ہی ہونے والا تھا۔" دوسری جانب سے آواز سنائی دی۔
"یہیں تھا، بس سستی چھائی ہوئی تھی، کون فون اٹھا کر سنتا۔" اس نے کہا۔
"تو پھر اب کیوں اٹینڈ کر لیا، رہنے دیتے۔" خوشگوار لہجہ اچانک ناراض ہو گیا۔
"پھر یہ سوچ کر اٹینڈ کر لیا کہ اس وقت کوئی خاص بندہ ہی کال کر سکتا ہے، باقی لوگ تو فون کرتے وقت دوسروں کے سونے، جاگنے کے وقت کا بہت خاص خیال رکھتے ہیں۔"
"چلو شکر ہے۔ تم نے مجھے خاص بندوں کی لسٹ میں تو شمار کیا۔" وہ خوش ہوتے ہوئے اس کی بات کے دوسرے حصے پر غور کرنا بھول گئی تھی۔
"ہاں تو سناؤ، کیسے مزاج ہیں اسپیشل لیڈی!" وہ مذاق سے بولا۔
"میں لیڈی نہیں ہوں، سنا تم نے۔" وہ منہ پھلا کر بولی۔
"تم جینٹس میں بھی شمار نہیں ہو سکتیں، سنا تم نے۔" وہ مسکرا کر بولا۔
"میں لیڈی کہلانے کی عمر سے بہت چھوٹی ہوں ابھی۔"
"اچھا پھر باقی خواتین کے لیے تو لیڈیز فرسٹ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، تمہارے لیے کیا استعمال ہو گا۔ گرلز فرسٹ" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "نہیں بھئی اس کے لیے تو نئی ڈکشنری ایجاد کرنی پڑے گی۔"
"اچھا چلو خیر چھوڑو۔" دوسری طرف سے محاذ بند کر دیا گیا۔ "ایک مزے کی خبر سنو"
"ہاں پلیز سناؤ۔"
"تمہیں پتا ہے، کھاری کی شادی ہو رہی ہے۔"
"ہائیں، کس کی شادی ہو رہی ہے؟"
"کھاری کی، افتخار احمد عرف کھاری کی"
"وہی لڑکا جو اس روز تمہارے گھر ملا تھا، جو گاؤں سے آیا تھا اور جس کی بند روالے کے جوڑے کے بارے میں کچھ ریزرویشنز تھیں؟"
"ہاں ہاں وہی۔"
"لیکن یار! وہ تو اس روز بالکل نارمل لگ رہا تھا۔"
"کیا مطلب ہے تمہارا، جو لوگ شادی کرنے جا رہے ہوتے ہیں، وہ ایب نارمل ہوتے ہیں؟"
"نہیں میرا مطلب ہے کہ وہ تو بہت کم عمر سا لڑکا نہیں۔"
"وہ تو پتا نہیں کم عمر ہے کہ نہیں، تم ایک اور بات سنو گے تو حیران رہ جاؤ گے کہ جس لڑکی سے کھاری کی شادی

ہو رہی ہے۔
She is just a Student
of ninth class
(وہ صرف نویں جماعت کی طالبہ ہے۔)
"مجھے یقین نہیں آ رہا، کیا تمہارے چچا کے ہاں پرانا جاگیرداری نظام رائج ہے، جہاں کم عمر بچے، بچیوں کی شادیاں کر دی جاتی تھیں۔"
"ہرگز نہیں، دراصل یہ بات کچھ اور ہے۔ لڑکی گاؤں کے مولوی صاحب کی بیٹی ہے۔ اور کھاری مولوی صاحب کی بیگم سے قرآن پاک پڑھنے جاتا تھا۔"
"اوہ!" اس نے اوہ کو طول دیتے ہوئے کہا، "گویا کچھ اور چکر ہے۔"
"ارے توبہ وہ نہیں، ایک تو تم لوگوں کی سوئی ایک ہی نقطے پر اٹک جاتی ہے۔ میرا مطلب ہے، کھاری کا مولوی کے گھر آنا جانا تھا۔ مولوی صاحب کی بیٹی کسی اسکول میں زیر تعلیم ہے اور میٹرک کا امتحان دے رہی ہے۔ اچانک ہی مولوی صاحب کو نجانے کیا خیال آیا کہ سردار چچا سے درخواست کرنے لگے کہ ان کی بیٹی کی کسی مناسب جگہ شادی کروا دیں۔ چچا ٹھہرے، ہمدرد اور محبت کرنے والے آدمی، کھٹ سے کھاری کا رشتہ پیش کر دیا۔ اس کے پیچھے ان کی کیا لاجک ہے، یہ تو وہی جانتے ہوں گے، بہرحال یوں ہوا کہ کھٹ رشتہ پٹ نکاح ہو رہا ہے۔ تائی صابرہ نے مجھے کال کر کے ساری کتھا سنائی ہے اور دعوت دی ہے کہ کم از کم میں یہ تاریخی شادی ضرور اٹینڈ کروں۔ میں نے پوچھا اگر میں اپنے ساتھ اپنے کچھ اور مہمان بھی لانا چاہوں تو کوئی مسئلہ تو نہیں ہو گا۔ کہنے لگیں مسئلہ کیوں ہو گا۔ تم کچھ چھوڑ سینکڑوں مہمان لے آؤ، لہٰذا میں نے تمہارا ابھی بتا دیا ہے سردار چاچا کو، کھاری کا نکاح بھی اٹینڈ کر لو گے اور گاؤں اور سردار چاچا کا فارم ہاؤس بھی دیکھ لو گے، ہمارے گھر میں تو کوئی انٹرسٹڈ نہیں ہے جانے میں۔ سب بورنگ ہیں۔ خدیجہ، فاطمہ خالہ کو بھی کہا ہے میں نے، دیکھو ان کا کیا موڈ بنتا ہے، کھاری ان سے بھی ملا تھا نا ابھی جب آیا تھا۔ خیر باقیوں کی چھوڑو، تم بتاؤ چل رہے ہو نا؟" وہ خاموشی سے سن رہا تھا۔
"کہاں گم ہو گئے ہو۔ بتاؤ نا۔"
"پوچھا کیا تم نے؟"
"یہ پوچھا ہے کہ چل رہے ہو کھاری کے نکاح پر کہ نہیں، اتنی سادہ سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔"
"اف بھئی کبھی کبھی تم نان اسٹاپ بولتی ہو، نہ کوئی کوما، نہ فل اسٹاپ" اس نے طویل سانس لینے کے بعد کہا۔
"میری سمجھ میں تو آ نے دو معاملہ کیا ہے۔"
"تم بھی کبھی بری طرح شرمندہ کر دیتے ہو۔" وہ جھینپ کر بولی۔
"یہ تو میں نے تمہیں بہت پہلے بتا دیا تھا کہ میں ایسا ہی ہوں، پھر بھی میں معذرت خواہ ہوں۔" اسے احساس ہوا کہ واقعی اس کا دل دکھ گیا ہے۔
"کوئی بات نہیں۔" وہ نیچی آواز میں بولی "تو پھر بتاؤ نا، چلو گے نا کھاری کے نکاح پر۔" اگلے لمحے اس کے لہجے کا جوش واپس آ گیا۔
"میں کیا کروں گا وہاں جا کر، میں عبداللہ تو ہوں نہیں جو بےگانی شادی میں دیوانہ ہو جاتا ہے۔"
"اچھا!" اس کے لہجے میں مایوسی در آئی۔ "میں نے تو سردار چچا سے بات بھی کر لی تھی، چلو اب منع کر دوں گی۔ ہمارا انتظار نہ کریں۔"
"ہمارا۔" وہ فوراً بولا "تم تو جاؤ نا، تم اتنی ایکسائیٹڈ ہو رہی ہو۔"

"نہیں۔ میں نے بھی کیا کرنا جاکر' ویسے بھی فائنل سمسٹر سر پر ہے۔"

"اوہ!" وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگیا۔ "اچھا یہ بتاؤ ہے کب یہ شادی؟"

"سات آٹھ دن کے بعد۔"

"چلو پھر پلان کرتے ہیں جانے کا' میں سمجھا کل پرسوں ہی ہو رہی ہے' اتنی جلدی جانا میرے لیے ممکن نہیں تھا نا!"

"ہیں واقعی!" اس کے لہجے میں بشاشت دوبارہ جھلکنے لگی "واقعی تم پلان کرو گے وہاں جانے کے لیے۔"

"ہاں ضرور۔ ہوگا تو دلچسپ ایونٹ۔"

"ہائے! مجھے یقین نہیں آرہا۔" اس کا لہجہ خوشی سے لرزنے لگا "میں نے فارم ہاؤس میں اور گاؤں میں بہت سی ایسی باتیں نوٹ کی تھیں جو کسی کے ساتھ ڈسکس کرنے کو دل چاہتا تھا مگر میرے ارد گرد کوئی ایسا ہے ہی نہیں جو ان پوائنٹس کو سمجھے' جن سے وہ شیئر کیے جاسکیں' اگر تم وہاں چلو گے تو یقیناً" تم سے ڈسکس کیے جاسکیں گے۔"

"کیوں نہیں ہم ضرور ہر پوائنٹ ڈسکس کریں گے۔"

"لیکن تم آج کل مصروف کہاں ہو؟ تم تو کہتے تھے کہ تم نے اپنے ڈیڈی سے بیزنل آف لیا ہوا ہے۔"

"میں یہاں ہی ہوں تمہارے شہر میں' کل رات ایک میوزیکل کنسرٹ تھا' میں نے ایک گروپ کے لیے گٹار بجایا۔"

"ارے تمہیں گٹار بجانا بھی آتا ہے؟"

"جب میں اسٹوڈنٹ تھا اس وقت سیکھا تھا' اس کے بعد وقت ہی نہیں ملا پریکٹس کرنے کا۔ پچھلے دو دن سے اس کی پریکٹس کر رہا تھا' اور رات کچھ لوگوں کے سامنے بجانے کا مظاہرہ کیا مگر میری یہ کوشش فارغ ہی تھی' مزا نہیں آیا۔"

"تم مجھے بھی بتاتے۔ میں بھی آتی وہاں تمہاری پرفارمنس دیکھنے۔"

"ہاں۔ مجھے یہ خیال آیا تھا لیکن پھر میں نے تمہیں اس کا نہیں بتایا' اس لیے کہ میں ٹیسٹ کرنا چاہتا تھا' پہلے جو تم ہر اس جگہ آن موجود ہوتی تھیں جہاں میں کوئی سوانگ بھرے کسی کام میں مصروف ہوتا تھا' وہ اتفاقات محض مجھے اور تمہیں ایک دوسرے سے ملانے کے لیے تھے یا دل سے دل کو راہ ہونے والا معاملہ ہے' میرا یہ ٹیسٹ ٹوٹلی فیل ہوگیا۔" وہ ہنسا۔

"تمہارا مطلب ہے۔ دل سے دل کو راہ ہونے والا معاملہ نہیں ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ نہیں۔۔۔" وہ مسکرایا "وہ اتفاقات محض ہمیں ایک دوسرے سے ملانے کے لیے تھے۔"

"ان اتفاقات کی پھر ضرورت ہی کیا تھی۔" اس کا دل بجھ سا گیا۔

"ان کی ضرورت اس لیے تھی کہ شاید میری لگن سچی ہے' شاید اللہ مجھے کوئی درست راستہ دکھانا چاہتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ہوں! اس نے ہوں کو کھینچتے ہوئے کہا "مطلب تو خیر ابھی مجھے خود نہیں پتا جب پتا چلے گا' تمہیں ضرور بتاؤں گا۔"

"اچھا! تو پھر کھاری کی شادی پر جانا ڈن ہے نا۔" اس نے خوامخواہ الجھنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے واپس اسی موضوع پر جاتے ہوئے کہا۔

"بالکل ڈن ہے۔"

"ہائے! میں ابھی سے ایکسائیٹڈ ہو رہی ہوں' کتنا مزا آئے گا۔"

"سوچ لو' اچھی طرح جانچ لو' معاملہ کیا ہے' یہ نہ ہو کہ کم عمر لڑکے لڑکی کا نکاح کرانے کی اطلاع پر پولیس وہاں چھاپہ مار رہی ہو اور نکاح اٹینڈ کرنے کے چکر میں سب باراتی بھی گرفتار ہو جائیں۔" اس نے شرارتاً کہا۔

"میرے سردار چچا بہت سمجھ دار بندے ہیں۔ وہ کوئی فضول اور بچکانہ فیصلے نہیں کرتے جناب۔" اس نے جتایا۔

"پھر ٹھیک ہے۔" وہ مسکرایا۔

"اچھا۔ اب ماما آرہی ہیں' میں فون بند کر رہی ہوں' وہ ساری رات میرے کمرے کی لائٹ آن رہنے پر سخت ناراض رہتی ہیں مجھ سے۔"

"فوراً" لائٹ آف کرو' اور سو جاؤ اب۔"

"ہاں یہ ہی کرنے لگی ہوں۔"

"او کے دین ٹیک کیئر۔"

"ٹیک کیئر۔ ہاں ایک بات اور۔۔۔"

"بولو۔"

"تم نے صرف میری خوشی کے لیے کھاری کے نکاح پر جانے کی ہامی بھری ہے نا' تھینک یو سعد۔"

"تمہارا مایوس ہوتا لہجہ مجھے کبھی اچھا نہیں لگتا' تم ہنستی مسکراتی مجھے بہت اچھی لگتی ہو ماہ نور! ہنستی رہا کرو' خوش رہا کرو۔" وہ نرمی سے بولا۔

"تھینک یو اگین" اس نے نیند سے بوجھل آواز میں کہا۔

"ٹیک کیئر' اللہ حافظ!" اس نے فون بند کرنے سے پہلے کہا' اور فون بند کر کے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔

"پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے جب بھی میں بری طرح ڈپریسڈ ہوتا ہوں' کسی نہ کسی طرح تمہاری آمد ہو جاتی ہے' اور میرا ڈپریشن ختم ہو جاتا ہے۔ ابھی اگر تمہاری کال نہ آتی تو میں آٹھ پہروں کے مسافر کی مسافرت پر غور کرتا کرتا نجانے کہاں تک پہنچ جاتا۔ تم نے مجھے ایک بار پھر ڈپریشن میں جانے سے بچا لیا۔۔۔ تمہارا کردار میری زندگی میں آپ ہی آپ اہم ہوتا جارہا ہے ماہ نور! میں اس صورت حال پر خوش بھی ہوں مگر اس اختر سرکار کی باتیں میرے ذہن سے محو نہیں ہو پاتیں' اسی لیے تمہارے بارے میں سوچ کر ڈر بھی جاتا ہوں' خیر تمہارے لیے نجانے کیوں میرے دل سے دعا نکلتی ہے' تم اتنی معصوم ہو اور نیک نیت ہو کہ میرا دل تمہارے لیے دعا گو رہتا ہے تم ہمیشہ یونہی مسکراتی رہو' خوش رہو۔"

وہ اس کے بارے میں سوچتا سوچتا نجانے کس وقت سو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس پر اس مختصر سے مکان کو گھر بنانے کی دھن سوار تھی۔ ایک ۔۔۔ باون صفحوں کے میگزین نے اس کی زندگی کے کئی رخ بدل کر رکھ دیے تھے زندگی کتنی اہم ہے' اسے گزارنے کا کوئی خاص ڈھنگ' ایک خاص سلیقہ ہونا چاہیے۔ مکان' مکینوں کو سر پر چھت کا احساس دلاتے ہیں لیکن گھر کا درجہ مکان سے بہت اونچا ہے' گھر مکینوں کو ایک دوسرے سے جڑے ہونے کا احساس دیتے ہیں' گھروں کے مکینوں کے دکھ سکھ' ہنسی' خوشی' غم' آنسو سانجھے ہوتے ہیں' گھروں میں صرف رہا نہیں جاتا' گھروں میں زندگی گزاری جاتی ہے اور زندگی گزارنے کے لوازم بہتیرے ہیں۔ اب یہ تو انسان کی استطاعت پر منحصر ہے کہ کتنے لوازم وہ اپنے لیے مہیا کرسکتا ہے۔

وہ بھی مکان کو گھر میں تبدیل کرنے کے لوازم جمع کرنے کے چکروں میں مصروف تھی۔ گندم کے دانے 'چاول اور مکئی جن بوریوں یا تھیلیوں میں ان کے مکان میں آتے تھے 'اپنے اختتام تک ان ہی میں پڑے رہتے تھے۔ اس نے اردگرد کے گھروں میں جھانک کر دیکھا' لوگ اناج رکھنے کے لیے بھڑولے بنواتے تھے' بھڑولے اس کی استطاعت سے بہت آگے کی چیز تھے' سو اس نے اباجی کے شاگردوں کے ذریعے کباڑے سے گھی کے پرانے کنستر منگوا کر انہیں دھومانجھ کر یہ اناج ان میں منتقل کردیا' مسالے کی تھیلیاں جو مختصر سے باورچی خانے کی دیواروں میں ٹھکی کیلوں پر لٹکی رہتی تھیں' سستے پلاسٹک کے رنگ برنگ ڈبوں میں بھر کر ایک نیچی تپائی پر سجادیے' لہسن' پیاز اور سبزی رکھنے کی ٹوکریاں بھی اس نے پھیری والے سے اپنے نویں جماعت کے استعمال شدہ رجسٹر اور کاپیاں دے کر خریدی تھیں۔

"دیکھ لینا۔ میں اسی طرح اس مکان کی حالت بدل کر رہوں گی۔"

وہ دل ہی دل میں عہد کرتی پھرتی تھی۔ یہ بات اماں کے سامنے کہنے کا حوصلہ ابھی اس میں نہیں آیا تھا۔ اسے معلوم تھا جواب میں وہ دنیا کے سامان کی فکر کرنے پر نجانے کیا کیا باتیں سنائیں لہٰذا وہ اپنے خاموش منصوبوں پر خاموشی سے عمل کرنے کے پروگرام ترتیب دیتی رہتی۔ اماں اسے دسویں کے لیے اسکول نہ بھیجنے کا اعلان کرچکی تھیں' وہ اماں کے اس اعلان پر "مصلحتاً" خاموش تھی۔ اسے یقین تھا کہ نویں کا امتحان جس اچھے طریقے سے وہ دے چکی تھی۔ اس کا رزلٹ اسکول سے اسے وظیفہ بھی دلوانے والا تھا اور اپنے لیے ایک دلیل بھی کہ کیوں اس کا دسویں ریگولر طالبہ کی حیثیت سے کرنا ضروری تھا۔

اس کا ذہن ان دنوں اتنے منصوبے بنانے میں مصروف تھا کہ اسے اماں' ابا کے درمیان ہونے والی کھسر پھسر کے غیر معمولی پن کا احساس ہی نہیں ہوا' اور شاید مزید کچھ دن یہ احساس نہ ہوتا اگر اس شام جب وہ چھت سے دھلے کپڑے اتار کر سیڑھیاں اترتے ہوئے کھاری کو اماں کے پاس بیٹھے نہ دیکھ لیتی۔ کھاری کا اماں کے پاس سیپارے کا سبق لینے آنا بھی معمول کی بات تھی۔ اگر وہ کھاری کو روتے ہوئے اماں کے سامنے ہاتھ جوڑتے نہ دیکھ لیتی۔ اس منظر پر وہ بری طرح ٹھٹک گئی۔

"اس بے چارے نے ایسا کیا' کیا ہے۔ جو معافیاں مانگ رہا ہے۔"

اس نے آواز پیدا کیے بغیر سیڑھیاں اترنے کا فیصلہ کیا اور یہ اندازہ لگانے کے لیے کہ ان دونوں کے درمیان کیا گفتگو چل رہی تھی۔ عین ان سیڑھیوں پر آکر بیٹھ گئی جن کے نیچے بچھی چارپائی پر وہ دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"بھین جی! یہ میرے جڑے ہتھ دیکھ لو' میں سچ کہہ رہا ہوں' میں اس قابل نہیں ہوں۔" کھاری کے الفاظ نے اس کو تجسس میں ڈال دیا۔

وہ کس قابل نہیں تھا جو یوں منتیں کر رہا تھا۔ وہ ایک سیڑھی مزید نیچے آگئی۔

"تمہیں کیا پتا کھاری! تم کس قابل ہو' کس قابل نہیں ہو' یہ فیصلہ تم نے نہیں اللہ نے کرنا ہے۔"

"مینوں آپ نوں پتا ہے۔ (مجھے خود کو پتا ہے۔)" وہ کہہ رہا تھا۔ "میں ان پڑھ' جاہل' نہ میرا کوئی آگا نہ پیچھا' گھاس بوٹ نکالنے والا' جانوراں کو پٹھے ڈالنے والا' جانوراں کے ساتھ جانوراں والی زندگی گزارنے والا' تسی لوگ اس دے نال کیسا ظلم کرنا چاہتے ہو۔" (آپ لوگ اس کے ساتھ کیسا ظلم کرنا چاہتے ہو۔)

"ہائیں! یہ کس کے ساتھ ظلم ہونے کی بات کر رہا ہے؟" سعدیہ ایک سیڑھی مزید نیچے کھسکی۔

"کھاری! تمہیں میری بات کا بھروسا ہے کہ نہیں' تمہیں چوہدری صاحب کی بات پر اعتبار ہے کہ نہیں۔" ماں کا لہجہ سخت ہوا۔

"چوہدری صاحب کی چھوڑیں وہ کچھ ہور سمجھ رہے ہیں' میں نے اپنی صفائی دی۔ تو ہے' مگر کوئی پتا نہیں ہوئی ہے کہ نہیں۔"

"تم نے مجھے بھی وہ بات سنائی۔" اماں نے کہا۔ "پریشان تو مجھے ہونا چاہیے تھا' غصہ تو مجھے آنا چاہیے تھا۔ سعدیہ کی اس حرکت پر مجھے اسے جوتے مارنے چاہیے تھے۔ لیکن دیکھ لو مجھے غصہ نہیں آیا' نہ میں ناراض ہوں۔"

اماں کہہ رہی تھیں اور سعدیہ کے اس وقت سمجھ میں آرہا تھا کہ کان کھڑے ہونے کا محاورہ جو اس نے اردو کی کتاب میں پڑھا' اس کا مطلب اس نے کیا سمجھا تھا اور شاید بورڈ کے امتحان میں وہ اس محاورے پر جملہ غلط لکھ آئی تھی۔

"کیونکہ مجھے پتا ہے' میرا یقین ہے کہ تم دونوں اس معاملے میں معصوم ہو' تمہیں اپنی بچکانہ خوشی میں یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ کوئی دوسرا تم دونوں کو وہاں اکیلے دیکھ لے گا تو کیا سوچے گا۔"

سعدیہ ایک سیڑھی مزید نیچے کھسکی۔

"اور بھین جی! تسی سعدیہ سے بھی پوچھا ہے کہ نہیں؟" اب کھاری کی بھیگی آواز اس کے کانوں سے زیادہ واضح ہو کر ٹکرا رہی تھی۔

"پوچھ لیں گے سعدیہ سے بھی۔" اماں کے لہجے میں ناگواری تھی۔ "وہ لڑکی ہے' اتنا تو اسے پتا ہی ہے کہ آج نہیں تو کل اس کے ہاتھ ہمیں پیلے کرنے ہی ہیں۔ پڑھا ہم اسے سکتے نہیں تو گھر میں یوں ہی بٹھا چھوڑنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ اگر چوہدری صاحب اسے عزت آبرو کے ساتھ تمہارے ہمراہ رخصت کرا کرلے جائیں گے تو ہمارے لیے اور خود اس کے نصیب کے لیے اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔"

"دھن' دھنا' دھن' دھن۔"

"منجنیق کے گولوں کے بارے میں تاریخ کی کتاب پڑھتے ہوئے جماعت کی ایک لڑکی نے منہ سے گولوں کے برسنے کی جو آواز نکال کر سنائی تھی اور جس پر باقی لڑکیاں کتنی ہی دیر ہنستی رہی تھیں۔ وہی آواز سعدیہ کو اپنے آس پاس کہیں اٹھتی محسوس ہوئی تھی۔ اس کے بعد کھاری اور اماں کے درمیان تقریباً" پون گھنٹہ بحث چلتی رہی تھی۔ سعدیہ نے اس بحث کا ایک ایک لفظ سنا تھا۔

کھاری اپنی کم حیثیتی اور سعدیہ کی حیثیت کا تعین کرتے ہوئے آنسو بہا رہا تھا۔ اماں اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اسے باور کرا رہی تھیں کہ ان کا فیصلہ اٹل تھا اور ان کے نزدیک ذات' برادری' پیشے' قبیلے اور معاشرتی حیثیت کی نہیں' نیک نیت انسان کی اہمیت سب سے زیادہ تھی۔

کھاری کے خیال میں وہ کوئی بھی بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں تھا۔ اسے گناہ گار نہ کیا جائے۔ سعدیہ نے اس گفتگو کا ایک ایک لفظ سنا' اس ساری گفتگو کا مرکزی موضوع خود اس کی اپنی ذات تھی اور اس کو کانوں کان خبر نہ تھی کہ اس کے لیے کیا فیصلے کیے جارہے تھے۔ اس ساری گفتگو کو سن کر اسے سمجھنے اور ہضم کرنے میں اسے کچھ وقت لگا اور اپنے ردعمل کا تعین کرنے میں تھوڑا وقت مزید ضائع ہوا۔ لیکن جب وہ دل و دماغ میں چھڑی جنگ پر قابو پاتی آہستہ قدموں سے باقی کی چار سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تو اس کے چہرے پر سکون تھا' وہ اس طرح نارمل تھی جیسے اس نے کوئی غیر معمولی بات سنی ہی نہ ہو۔

"مجھے یہاں سے لے چلو کھاری!" اس نے بچوں کی طرح روتے بلکتے کھاری کے عین سامنے جا کر کھڑے ہو کر کہا۔

کھاری اور آپا رابعہ دونوں ہی اس غیر معمولی لہجے اور پر اعتماد انداز پر اپنی بحث اور رونا دھونا بھول کر منہ کھولے

اسے دیکھ رہے تھے۔

"تمہارے پاس ٹھکانا ہے' تمہارا آگا پیچھا کوئی نہیں' تو سب کو اور تمہیں اس کا پتا تو ہے نا۔" اس نے کہا۔

"یہاں تو جھوٹ کا راج ہے' جھوٹے بھرم اور جھوٹی کہانیاں!" اس نے آپا رابعہ پر ایک نظر ڈالی۔ "یہاں تو کوئی اپنے متعلق ذرا سا بھی پر یقین نہیں' یہاں تو سوال کوئی اور کیا جاتا ہے' جواب کچھ اور ہی ملتا ہے۔ مجھے اس منافقت بھرے مکان سے وہاں لے چلو' جہاں تم رہتے ہو۔"

اس کے لہجے میں اپنے ماں' باپ کے لیے نفرت تھی یا حقارت۔ آپا رابعہ سوچتی رہ گئیں۔

"میں!" کھاری کے کھلے منہ سے بمشکل ایک لفظ نکلا۔ "پر سعدیہ باؤ" اس نے ادھر ادھر ہاتھ مار کر اپنی چادر پکڑنے کی کوشش کی جو اس کی گریہ زاری کے دوران چارپائی پر کہیں گر گئی تھی۔ "تساں سمجھ نئیں آپ کیا کہہ رہے ہو۔"

"مجھے نہیں پتا' میں کیا کہہ رہی ہوں کھاری! مگر اللہ کا واسطہ' مجھے یہاں سے لے چلو۔" سعدیہ نے ایک دم گھٹنوں کے بل کھاری کے سامنے بیٹھتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا۔ "جہاں تم رہتے ہو' ہم وہاں ایک چھوٹا سا ٹھکانا بنالیں گے' جو مکان نہیں ہوگا' گھر ہوگا۔"

"پر سعدیہ باؤ! آپ پڑھے لکھے بندے ہو' ڈاکٹر بننا اے تساں' میں تے صاف ان پڑھ' نہ عقل' نہ تمیز' میں ایس قابل ہی نئیں' تے سر کس طرح اٹھا سکتا ہوں۔"

"تمہیں نہیں پتا کھاری! تم کتنے قسمت والے ہو' اپنی مرضی کی زندگی گزارتے ہو' تمہارے سر پر ایک عزت والے بندے کا ہاتھ ہے' جو تمہیں پیار کرتا ہے' اپنا کہتا ہے' باپ نہیں' پر باپ بن کر دکھاتا ہے۔ یہاں تو نام کا باپ ہے' پر پتا ہی نہیں لگتا' ہے کہ نہیں ہے۔" وہ حقارت بھرے انداز میں بولی۔

"تمہاری ماں نہیں تو اب تک تم برداشت کر چکے ہو' مان چکے ہو کہ تمہاری ماں نہیں ہے' یہاں تو ماں ہے' مگر وہ ماں کے نام پر صرف جبر ہے' حاکم ہے' جس کی حاکمیت میں چھوٹے بندے کی تو مجال ہی نہیں چوں بھی کر جائے۔" وہ ایک بار پھر آپا رابعہ کی طرف دیکھ کر بولی۔

"اوپر سے دنیا ایسے ماں' باپ کو اللہ والے لوگ مانتی ہے' جو سارے لوگوں کو یہ بتاتے رہتے ہیں کہ زندگی یوں نہیں یوں گزارنی چاہیے۔ اللہ کا واسطہ ہے کھاری! جو یہ موقع بنا ہے' مجھے یہاں سے نکالنے کا تو ضائع نہ کرو' مجھے یہاں سے نکال کرلے چلو۔" ایک بار پھر اس کے ہاتھ کھاری کے سامنے جڑ گئے۔

"نئیں سعدیہ باؤ' ابھی تساں ڈاکٹر بننا ہے۔ اونچا بندہ بننا ہے' ان کاموں میں پڑ کر بندہ کج نئیں کر سکتا۔" کھاری نے چادر کو اپنے اردگرد لپیٹ کر گویا اس چادر کی پناہ میں جاتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو تم مجھ سے شادی نہیں کرو گے تو تمہارا کیا خیال ہے' یہ دونوں مجھے ڈاکٹر بنائیں گے؟" سعدیہ نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے سوالیہ انداز میں کہا۔

"یہ جس آئی پر آئے ہوئے ہیں نا۔" اس نے مزید ایک گستاخانہ نظر آپا رابعہ پر ڈالی۔ "یہ مجھے کسی سے بھی' جو ان کے ہاتھ لگا' چاہے وہ کوئی لولا' لنگڑا' اندھا' فقیر ہی کیوں نہ ہو' بیاہ دیں گے۔ پھر میں ساری عمر بھی ٹکریں مارتی رہوں گی' جس طرح اب مار رہی ہوں تو مجھے باہر نکلنے کا راستہ کہیں نہیں ملے گا۔"

اس کی آنکھوں میں کھاری کی طرف دیکھتے ہوئے منت' سماجت اور لجاجت اتر آئی۔ کھاری ان نظروں سے بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا' اسے کیا جواب دے۔

میں تو دل سے چاہتا تھا سعدیہ باؤ' تسی ڈاکٹر بنو' یہ آپ کے ماں باپ ہیں' آپ کو پتا نہیں کاہے دا غصہ ہے' ماں پیو سے دل برا نئیں کرتے' کوئی وقتی ناراضی' رنجش' جھگڑا ہو گیا ہے تو غصہ تھوک دو' بھین جی نے خود تساں کو ڈاکٹر

بنانا چاہیے نیں۔" اس نے ایک بودا سا جواب دینے کی کوشش کی۔

"تم چاہتے ہو نا' میں ڈاکٹر بن جاؤں۔" سعدیہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"آہو جی! میں تو دل سے چاہتا ہوں۔" کھاری نے بوکھلائے ہوئے انداز میں سرہلایا۔

"تو پھر تم ہی ہو جو مجھے ڈاکٹر بنا سکتے ہو۔" سعدیہ نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔

"میں۔۔۔!" کھاری کے لیے دنیا میں اس سے زیادہ ناقابل یقین بات کوئی دوسری ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

"ہاں۔۔۔ تم۔۔۔ کھاری! تم مجھ سے شادی کرلو' خدا کے واسطے تم مجھ سے شادی کرلو۔" وہ اس کی بات کا مکمل جواب دینے کے بجائے ایک بار پھر منتوں' ترلوں پر اتر آئی۔ کھاری نے ایک بار پھر گھبرا کر آپا رابعہ کی طرف دیکھا' جو یہ ساری گفتگو بت بنی سن رہی تھیں۔

"تم نے دیکھا' میں جو کہہ رہی تھی' وہ غلط تھا یا درست۔" کھاری کو اپنی طرف دیکھتے پا کر انہوں نے ہوش میں آتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کیا پتا کہ تم کس قابل ہو' کس قابل نہیں ہو' یہ راز صرف اللہ ہی جانتا ہے۔" کھاری نے ان کی بات سن کر لاشعوری طور پر سرہلایا۔

"سن رہے ہو نا اس کی باتیں۔" آپا رابعہ نے دکھ اور ناراضی کے ساتھ سعدیہ کو دیکھا۔

"دیکھ رہے ہو نا اس کے تیور۔" اب کے ان کا چہرہ کھاری کی طرف تھا' جو اس ساری صورت حال پر اس طرح سٹ پٹایا ہوا نظر آرہا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا تھا۔

"اب اس رویے اور ان تیوروں کے ساتھ اسے اور کہاں دھکا دوں۔" آپا رابعہ نے ہاتھ ملتے ہوئے بین کرنے کے سے انداز میں کہا۔ "اور کون ہے' جو ہمارے عذاب سمیٹے گا' کون ہے' جو اس لڑکی کو خوش ہو کر اپنی زندگی میں جی آیاں نوں (خوش آمدید) کہے گا' یہ تو تم ہو کھاری بھاگ لگیں تمہیں اور چوہدری صاحب ہیں' اونچا رہے ان کا شملہ سدا' جو ہم سفید پوشوں کی سفید پوشی کے اندر نظر آتے' جھول اور سوراخ دیکھ کر بھی چشم پوشی کر سکتے ہو اور مجھے بتاؤ۔ کس در پر جاؤں اسے لے کر۔" اب وہ دائیں بائیں ملتے ہوئے رونے لگی تھیں۔

"بھین جی!" کھاری نے بے اختیار ان کے کندھے پر رکھنے کو ہاتھ بڑھایا اور پھر نہ جانے کس خیال کے تحت اپنا ہاتھ واپس کھینچ کر اسے دیکھنے لگا۔

"ٹھیک تیری منتیں کر رہی ہے یہ کھاری بیٹا۔ لے جا اسے' یہاں سے نکال کرلے جا' منافق باپ اور مشکوک ماں کے چنگل سے آزاد کرالے اس کو۔"

انہوں نے بھی جذباتی انداز میں کھاری کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ کھاری نے کانپتی نظروں سے روتی بلکتی آپا رابعہ کو دیکھا اور پھر ان ہی کپکپاتی نظروں کو اٹھا کر سامنے کھڑی سعدیہ تک لے گیا' وہ بھی اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مرنے جینے کے درمیانی عرصے کی سی کیفیت تھی۔ کھاری نے ایک بار اپنی آنکھوں کو زور سے بند کیا' جن کے سامنے منظر بار بار دھندلے ہوئے تھے۔ بند کر کے آنکھیں دوبارہ کھول کر اسے کچھ صاف نظر آنے لگا تھا۔ اس نے باری باری رابعہ آپا اور سعدیہ کی طرف دیکھا اور سر جھکا دیا۔

☼ ☼ ☼

"جائیے' میں تم سے بات نہیں کر رہی۔"

پستی رنگ کی شرٹ اور بلیک ٹائٹس میں اپنے کندھوں تک آتے کالے سیاہ بال کھولے وہ صوفے پر بیٹھی اس سے مخاطب تھی۔ سعد کو یہ منظر خوش گوار اور دلچسپ لگا' اس نے اس کے سیاہ جوتوں پر نظر ڈالی اور اس کے پیچھے

کھڑکی پر تنے فان کلر کے بھاری پردے کو دیکھا۔ نادیہ اور نادیہ سے متعلق ہر چیز آسودگی کا تاثر دے رہی تھی۔ اس نے نوٹ کیا۔ نادیہ کے چہرے کا تناؤ اب نظر نہیں آ رہا تھا۔ غالباً" اس نے کسی ہلکے شیڈ کی لپ اسٹک یا گلوس بھی لگا رکھا تھا۔

"ہاں۔ تمہارے لہجے میں اتنی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ کھنک ہونی چاہیے۔ مجھے کافی دنوں سے یہ منظر دیکھنے کی چاہ تھی۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"جاؤ باتیں مت بناؤ، تمہیں اندازہ ہے کہ تم نے کتنے دنوں کے بعد مجھے کال کیا ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"میں پچھلے دنوں اتنا مصروف رہا کہ اسکائپ پر آنے کا موقع ہی نہیں ملا، عام کال تو اب تم ریسیو ہی نہیں کرتی ہو۔" اس نے شرارتاً کہا۔

"ہاں میں ہیلسنکی کی میئر جو ہو گئی ہوں۔" وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔

"کوئی ناممکن بات نہیں، تم فیمنزم پر چم اٹھا کر کھڑی ہو جاؤ، شاید کوئی دن آئے جو اتنے لوگ تمہارے ساتھ کھڑے ہو چکے ہوں کہ تم وہاں پر کسی چھوٹے موٹے عہدے پر تو فائز ہو سکو۔"

"ہے مائنڈ یو مسٹر سعد! میں یہاں اسٹوڈنٹ ویزا پر موجود ہوں، میرے پاس اس ملک کی قومیت ہے نہ پاسپورٹ۔"

"پچھلے کچھ سالوں میں جتنی قومیتیں اور پاسپورٹ تمہارے بدلے ہیں شاید ہی کسی کے بدلے ہوں۔"

"ہاں!" اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ "جب ہی تو میں کسی بھی چیز کے بارے میں پر یقین نہیں ہوں۔" اس کا لہجہ ذرا سا بدل گیا تھا۔

"کیا مطلب، پر یقین نہیں ہو؟" وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

"سعد! تم ہی بتاؤ۔ میرا وطن کون سا ہے۔ میری زبان، میری قومیت کیا ہے، میں کون ہوں، میں مسلم ہوں، عیسائی ہوں یا یہودی ہوں۔ میری پہچان کیا ہے، کچھ تمہیں پتا ہے کیا؟" اس نے اچانک سوال کیا۔

سعد کے لیے یہ سوال غیر متوقع تھا، اس کو اس سوال کا جواب سوچنے کے لیے تھوڑا وقت درکار تھا، وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

"نہیں پتا نا۔" وہ طنزاً مسکرائی "مجھے بھی نہیں پتا۔ مجھے واقعی نہیں پتا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔ سعد نے کچھ دیر اس کے وحشت بھرے انداز کو دیکھا اور پھر ہلکا سا مسکرایا۔

"تم وہی ہو نادیہ، جو تم چاہتی ہو کہ تمہیں ہونا چاہیے۔" اس نے نرمی سے کہا۔ جواب میں نادیہ نے اسے چونک کر دیکھا تھا۔

"ہاں۔" اس نے سر ہلایا۔ "بعض اوقات ہمیں پوری آزادی مل جاتی ہے، اپنی راہیں متعین کرنے کی، اپنے بارے میں کھل کر فیصلہ کرنے کی، ہمیں کیا ہونا چاہیے، کیسا ہونا چاہیے، ہمیں کیا کرنا چاہیے، ہمیں کیا نہیں کرنا چاہیے۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"میں سمجھتا ہوں اور مانتا بھی ہوں کہ یہ پچویشن بہت کنفیوزنگ ہوتی ہے، جس میں آزادی تو پوری مل جائے مگر گائیڈ لائن کوئی نہ ملے، آپ ہی آپ چلتے جاؤ، آپ ہی آپ راہیں متعین ہوتی جائیں، لیکن جس کو احساس ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی کوئی تو شناخت قائم کرنی چاہیے، وہ بہت لکی ہوتا ہے۔ ایک تو وہ خود کے لیے خود فیصلہ کر سکتا ہے، کوئی سوشل مورلٹی اینڈ ویلیوز، کوئی خاندانی سسٹم اور کوئی مذہبی حدود و قیود اس پر پریشر نہیں ڈال رہی ہوتیں۔ کسی آزاد پنچھی کی طرح اپنی پرواز کے روٹس خود متعین کرنا بڑی عیاشی ہوتی ہے جناب اور دوسری طرف یہ بھی ہوتا ہے کہ غلط سوچ، غلط قدم، غلط انتخاب، اگر ثابت ہو جائے تو خود اپنے آپ کو مورد الزام ٹھہرانے کے سوا

کوئی اور چارہ نہیں ہوتا لہٰذا نادیہ بلال! تم بھی وہی ہو جو تم چاہتی ہو کہ تمہیں ہونا چاہیے۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔" وہ اٹھ کر ذرا فاصلے پر رکھے روم فریج کی طرف گئی اور اس میں سے رس بھری کے جوس کا ٹن نکال کر صوفے کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ "لیکن میں تو اپنے بارے میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پائی کہ مجھے کیا ہونا چاہیے جبکہ۔" اس نے منہ بناتے ہوئے ہاتھ فضا میں بلند کیا۔ "شیکھر کے سامنے میں دعوا کر چکی ہوں کہ میں مسلمان ہوں۔ اور وہ بھی پاکستانی مسلمان۔"

"اس دعوا کے جواب میں شیکھر نے کیا کہا۔"

"اس نے یوں دیکھا جیسے اسے نہ یقین آیا ہو اور میرا مذاق اڑا رہا ہو۔"

"اس کا مطلب ہے نادیہ! تمہارا دعوا اس سے مختلف ہے جو در اصل تم ہو۔"

"پھر میں ایسا کیا کروں جو ویسی نظر آؤں جیسا میں نے دعوا کیا۔"

"پہلے تم یہ فیصلہ تو کر لو، تم کیا ہونا چاہتی ہو اور ہاں نظر آنے اور ہونے میں بھی فرق ہوتا ہے، یاد رہے۔" "اور جب فیصلہ کر لو تو یہ بھی یاد رکھنا کہ کسی بھی چیز کے بارے میں انفارمیشن تمہاری رسائی سے باہر نہیں ہے، لیکن سب سے پہلے خود سے پوچھ تو لو...."

"ٹھیک ہے۔" نادیہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے خود کو سیدھا کیا۔ "ہو سکتا ہے جب ہم اگلی بار بات کریں تو میں فیصلہ کر چکی ہوں۔"

"ہاں اچھی بات ہے، کنفیوژن میں رہنے سے بہتر ہے انسان یکسوئی حاصل کر لے۔"

سعد نے کال ختم کرنے سے پہلے کہا اور اس کال میں آخری نظر نادیہ پر ڈالی۔ اس کی ٹی شرٹ پر لکھے الفاظ ایک نظر میں ہی پڑھے جا سکتے تھے۔

Religion should be used to
bring people to gether not
bLOW them up

اس نے نادیہ کی ٹی شرٹ کے الفاظ پڑھے اور زیر لب مسکرا دیا۔

☆ ☆ ☆

"سر! کیا آپ آج رات ڈنر بھی گھر ہی پر کریں گے۔" یہ رازی تھا جو انٹرکام پر ان سے پوچھ رہا تھا۔

"رازی غریب میرے سارا دن گھر پر رہنے سے پریشان ہو گیا شاید۔" انہوں نے رازی کی بات سن کر دل میں سوچا۔

"یقیناً" ان کا جواب مختصر تھا۔

"او شیور سر۔" رازی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ اس روز وہ اور اس کا ماتحت عملہ ایک امتحان سے گزر رہا تھا۔ رات کو ایک امتحان اور سہی۔

"سر! صوفی اپنے ہاتھ سے بلیک پیپر پرانز تیار کر رہی ہے، اور فش ان وائٹ ساس بھی آپ کو یقیناً پسند آئے گی، اس کے علاوہ اگر آپ کچھ لینا چاہیں تو بتائیں۔"

اس نے اپنے چہرے پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا، حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس کا باس اس کو دیکھ نہیں رہا تھا۔

"سوری رازی! آج میرا اسی فوڈ کھانے کا کوئی موڈ نہیں ہے' یہ مینیو پھر کبھی سہی۔" انہوں نے ریوالونگ چیئر کو گھماتے ہوئے اپنے پیچھے دیوار میں جڑی کھڑکی سے پار دیکھا۔ تاحد نظر سر اٹھائے اونچے سرسبز درخت ان کے سامنے کھڑے تھے۔

"پھر سر؟" رازی کے چہرے کی مسکراہٹ لمحہ بھر کو غائب ہوئی' لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اسے دوبارہ اسی جگہ سجا لیا جہاں وہ پہلے موجود تھی۔

"ٹنڈوں کا دلمہ بنانا آتا ہے ضوفی کو؟" انہوں نے ہنوز سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹٹ۔ ٹنڈوں کا کیا سر؟" رازی کی آواز اس فرمائش پر بری طرح لڑکھڑا گئی۔

"اور خرفے کا ساگ۔"

"سس۔۔۔ سر! ایک منٹ سر! میں نوٹ کرلوں ذرا۔" رازی نے کانپتے ہاتھوں سے کاغذ پنسل پکڑے۔

"اور مکھڈی حلوہ۔" وہ شاید رازی کی کوئی بات سنے بغیر اپنی دھن میں بولے چلے جارہے تھے۔

"ٹٹ ٹنڈوں کا کیا تھا سر اور ساگ کون سا؟" رازی کچھ الفاظ سمجھ نہیں پایا تھا۔ "اور رح حلوہ۔ سر کس چیز کا حلوہ؟" وہ پیشانی پر ہاتھ ملتے ہوئے لڑکھڑاتی زبان سے پوچھ ہی رہا تھا کہ انٹرکام دوسری طرف سے بند کردیا گیا۔

"او مائی گاڈ!" اس نے تیزی سے ایک بار پھر اپنی پیشانی مسلی اور ڈرتے ڈرتے دوبارہ ٹاپ فلور پر موجود آفس ایکسٹینشن کا نمبر ملایا۔ ایک' دو' تین بار بیل بجی' لیکن فون اٹینڈ نہیں کیا گیا۔

"آج کا ڈنر' ڈنر نہیں کیریر کا سب سے بڑا امتحان ہے ضوفی!" کچھ دیر بعد اس نے پینٹری میں راشن کے جار چیک کرتی ضوفی کو سناؤنی سنائی۔

"آج کا ڈنر ہی نہیں' آج کا لمحہ لمحہ ایک امتحان ہے ڈارلنگ!" ضوفی نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ "سر پوچھ رہے ہیں کہ گھر میں آٹا کس فلور مل سے آتا ہے اور چاول کی کوالٹی کیا ہے۔ وہ کوکنگ آئل کے بارے میں بھی پوچھ رہے ہیں اور مسالا جات کی کوالٹی جانچنے کے لیے ان کے نمونے بھی منگوائے ہیں۔"

"او خدایا خیر!" رازی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مگر ہمیں نئی ایکسٹینشن دیتے ہوئے کہا گیا تھا کہ اب ہمارے امیجیٹ باس سعد سلطان ہوں گے۔"

"فیصلہ ریورس ہوچکا ہے رازی! اپنی فائل سے گروسری بلز نکالو پچھلے تین ماہ کے' سر پوچھ رہے ہیں کہ سرونٹس کو سہولتوں کی مد میں کس طرح کیٹگرائز کیا گیا ہے۔" ضوفی نے سب جار چیک کرنے کے بعد ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"دعا کرو باس کے سر پر چڑھے اس جنون کی مدت صرف ایک ہی دن ہو۔" رازی نے اپنے آفس کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "اور ہاں تم کچن ٹیبل پر رکھا وہ پیپر پڑھ لو جو آج کے ڈنر کا مینیو ہے۔ میری دعا ہے وہ سب تمہیں یا دونوں ککس میں سے کسی ایک کو بنانا آتا ہو۔"

رازی آفس اور ضوفی کچن کی طرف مڑ گئی۔ "ٹنڈوں کا تسمہ' گھرنے کا ساگ اور رتھیلے کا حلوہ۔" ضوفی نے رازی کے ہاتھ کا لکھا مینیو پڑھا۔ شام تک سب جاننے والوں کے ککس اسے جواب دے چکے تھے۔ کوئی بھی اس مینیو کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ضوفی تیز دماغ اور باہمت لڑکی تھی۔ رات بلال سلطان کی ڈنر ٹیبل پر جو ڈنر سرو کیا گیا تھا اس کی تعریف کرتے ہوئے بلال نے ضوفی کی اگلی تنخواہ میں اضافے کا اعلان کیا تھا۔

"مگر یہ کارنامہ تم نے کیسے سرانجام دے لیا ڈارلنگ؟" رات سونے کے لیے اپنے بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے رازی نے ضوفی سے سوال کیا۔

"برین۔" ضوفی نے اپنے سر کی طرف مسکراتے ہوئے اشارہ کیا۔ "ایسے کارنامہ سرانجام دینے کے لیے برین چاہیے' تھنکنگ برین۔" وہ مسکرائی۔ "جو اتفاق سے تمہارے پاس نہیں ہے۔"

"پھر بھی۔" رازی نے راستے میں رک کر اس سے جواب پر اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"باس صرف ناسٹیلجک ہو رہا تھا سویٹ ہارٹ' اسے ٹنڈوں اور ساگ کی شکل دیکھے عرصہ ہوچکا اور حلوہ بھی شاید کبھی نہیں کھایا اس نے' اسی لیے اس نے ان چیزوں کا نام لیا' تمہیں ان ڈشز کی ورائٹی سمجھنے میں غلطی ہوئی جو کہ ظاہر ہے باس سے دوبارہ نہیں پوچھی جاسکتی تھی اور اس کے سلسلے میں مجھے کہیں سے مدد بھی نہیں مل رہی تھی' سو میں نے سوچا ناسٹیلجک کے باس کے لیے ڈشز میں رکھے ٹنڈوں' ساگ اور حلوہ کی جھلک ہی کافی ہوگی اور تم نے دیکھا۔ وہ کافی تھی۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"مانتے ہو نا برین؟" اس نے ایک بار پھر اپنے سر کی طرف اشارہ کیا۔

"مانتا ہوں' بالکل مانتا ہوں۔" رازی نے اسے خود سے قریب کرتے ہوئے کہا۔ "یو آر اے جینئس۔" وہ مسکرایا۔

"اور ہاں اس مینیو کے ذریعے مجھے ایک کلیو (Clue) اور ملا۔" ضوفی بھی مسکرائی۔

"وہ کیا؟"

"باس نے یہاں سے وہاں تک کوئی لمبی فلائٹ لی ہے اتنے سالوں میں۔" ضوفی نے نیچے سے اوپر تک اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ڈونٹ ٹیل می۔"

"یقین کرلو۔" ضوفی مسکرائی۔ "جو لوگ یہ لمبی فلائٹ بھرتے ہیں' انہی پر بڑھتی عمر کے دوران ایسے دورے پڑتے ہیں' ٹنڈوں کا تسمہ' گھرنے کا ساگ اور رتھیلے کا حلوہ۔۔۔ آٹے کی کوالٹی' چاول کی جنس' آئل کا حساب اور سرونٹس کی کیٹگریز' مان لو رازی۔۔۔

its another story of rags to ritches

رازی نے اس کی بات پر غور کیا۔ "ہوگی یار!" پھر اس نے لاپروائی سے کہا۔ "لیکن اب تو وہ ملینئر ہے اور یہی اصل میں میٹر کرتا ہے کہ وہ اب کیا ہے۔"

"ہاں مگر ٹنڈوں کا تسمہ اور گھرنے کا ساگ۔" ضوفی بال جھٹکتے ہوئے ہنسی۔

"کم آن یار! چلو سوتے ہیں بہت تھک گئے ہیں آج ٹنڈوں اور ساگوں کے چکر میں' وہ پہلے جو تھا اسے کسی نے نہیں دیکھنا' اس ملک کے سارے بڑے لوگوں کی ایسی ہی کہانیاں ہیں۔"

رازی نے ضوفی کی کمر میں بازو ڈال کر آگے چلتے ہوئے کہا۔

☼ ☼ ☼

خدیجہ نے کھلے گیٹ سے گاڑی باہر نکالی اور گیٹ وے کی صفائی کرتی ملازمہ کو گیٹ بند کرنے کا کہہ کر خود سیدھی سڑک پر رواں دواں ہوگئیں۔ ملازمہ نے گیٹ بند کیا اور گیٹ وے پر ربڑ پائپ سے پانی کی بوچھاڑ کردی۔ اسی دم باہر سے گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی۔

"لو ابھی بند کیا تھا' ابھی پھر کوئی آگیا۔" وہ پائپ پھینکتے ہوئے بڑبڑائی اور آگے بڑھ کر گیٹ کھول دیا۔ باہر کالے رنگ کی ایک بڑی گاڑی کھڑی تھی۔

"ہاں جی۔" اس نے گاڑی کے قریب جا کر آنے والے سے پوچھا۔

"آپ پلیز گیٹ پورا کھول دیں۔ مجھے گاڑی اندر لے کر جانی ہے۔" آنے والا ایک کم عمر لڑکا تھا جسے اس سے پہلے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"پر اندر تو میں پورچ دھو رہی ہوں' جی ساری جگہ پانیوں پانی ہوئی ہے۔" وہ بولی۔

"آپ پلیز بعد میں دھو لیجیے گا' مجھے گاڑی اندر لے جانے دیں۔" آنے والے نے کہا۔ ملازمہ نے اس پر احسان کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا مانجھا جھٹک کر چھینٹے اڑاتے ہوئے گیٹ کھولا۔ وہ گاڑی اندر لے آیا۔

"کون ہے بھئی؟" بیرونی دروازہ کھول کر فاطمہ باہر آئیں۔

"السلام علیکم! میں ہوں۔" اس نے گاڑی سے باہر نکل کر کہا۔

"ارے وعلیکم السلام۔ آؤ بھئی آؤ۔" فاطمہ اس کو دیکھ کر مسکرائیں اور اسے لیے اندر لاؤنج میں آگئیں۔

"ہے تو عجیب سی بات' مگر کیا آپ کو اندازہ ہے کہ ساتھ والے گھر سے آپ کے گھر میں کھڑی گاڑی نظر آسکتی ہے یا نہیں۔" اس نے صوفے پر بیٹھ کر پہلی بات کی۔

"ہوں!" فاطمہ نے چشمہ درست کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ "اول تو دن کے اس وقت میں ساتھ والے گھر میں کوئی ہوتا ہی نہیں' ہو بھی تو جھانک کر دیکھنے سے ہی پتا چل سکتا ہے کہ یہاں یہ گاڑی کھڑی ہے البتہ۔"

ان کے اطمینان دلاتے جملے سے مطمئن ہو کر ٹیک لگا کر بیٹھتا بیٹھتا وہ اس البتہ پر پھر سے چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔

"البتہ کیا؟"

"البتہ یہ کہ تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔"

"اوف۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھا گیا۔ "یہ تو ہے' مگر میرا خیال ہے تاڑنے والے چار بجے سے پہلے تو گھر نہیں آتے۔"

"ہاں شاید۔" فاطمہ مسکرائیں۔ "تو پھر اتنے ڈرے ہوئے کیوں ہو؟"

"ڈرا ہوا نہیں' گھبرایا ہوا ضرور ہوں۔ وہ سوال بہت کرتی ہے اور ناراض بھی بہت جلدی ہو جاتی ہے۔"

"پھر اس کو بتا کر ساتھ لے کر کیوں نہیں آئے۔" انہوں نے پوچھا۔

"اس کی بھی ایک وجہ ہے' وہ میں ابھی آپ کو بتاتا ہوں۔" اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ دوسری خالہ کدھر ہیں' نظر نہیں آرہیں۔"

"خدیجہ کچھ ضروری کام نمٹانے گئی ہے' ابھی کچھ دیر پہلے ہی نکلی ہے' اسے علم ہوتا کہ تم آرہے ہو تو کل چلی جاتی' آج نہ جاتی۔"

"چلیں خیر' آپ تو ہیں نا۔" اس نے کہا۔ "آپ کو برا تو نہیں لگا' میرا یوں بے تکلفی سے بلا اطلاع چلے آنا۔"

"ہرگز نہیں۔ بلکہ بہت اچھا لگا' مجھے تکلفات سے ویسے بھی سخت چڑ ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔" وہ مسکرایا۔ "ماہ نور کی ممی کو شاید اچھا نہ لگتا اس طرح میرا بغیر اطلاع کے آنا' اس لیے پوچھا۔"

"ماہ نور کی ممی گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چلتی ہیں' اسی لیے ان کو وقت سے ادھر ادھر ہونا اچھا نہیں لگتا' ہم ٹھہرے بے کار سے ریٹائرڈ لوگ' ہمیں فرق نہیں پڑتا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

"یہ بتاؤ' چائے پیو گے یا کافی؟"

"کچھ بھی نہیں' آپ بس بیٹھ جائیں پلیز' مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" اس نے انہیں منع کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا پھر یہ کھاؤ۔" وہ ڈائننگ ٹیبل سے ڈرائی فروٹ کی ڈش اٹھا لائیں۔

"ٹھیک ہے' یہ چلے گا' لیکن اب آپ بیٹھ جائیں پلیز۔"

"ہاں پوچھو کیا پوچھنا ہے۔" وہ پستے کے خول اتارتے ہوئے بولیں۔

وہ دو یا ڈھائی گھنٹے تک ان کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا اور انہیں وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔

"بس اب میں چلتا ہوں۔" ڈھائی گھنٹے بعد وہ جانے کے لیے کھڑا ہوا۔

"بس چل بھی دیے۔" انہوں نے وہ دو چار پستے جو شروع میں اٹھائے تھے اور جنہیں وہ چھیلنے کے بعد کھانا بھول گئی تھیں' واپس پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"بہت دیر سے بیٹھا ہوں' اب چلنا چاہیے۔ وہ دوسری خالہ ابھی بھی نہیں آئیں۔"

"ہاں۔ اس کے کام زیادہ تھے۔ بینک کے چکر' پنشن ٹرانسفر کرانا' یوٹیلیٹی بلز کی پے منٹ اور ڈاکٹر سے بھی اپائنٹمنٹ ہے۔ اس لیے وہ بھی تین' چار بجے تک ہی پہنچے گی۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولیں۔

"فاطمہ خالہ! میں آپ سے کلیوز (clues) لینے آیا تھا۔ میرے سوالوں کے جواب میں آپ بھی الجھ گئیں' آئی ایم سوری۔" اس نے کہا۔

"نہیں بیٹا! تمہاری باتوں نے میرے ذہن کے چند بند گوشے بھی کھول دیے ہیں' مجھے ابھی کچھ وقت دو سوچنے کے لیے۔ ہو سکتا ہے کچھ کلیوز مل جائیں اور راستے ادھر کو چل پڑیں' جو تمہاری منزل ہے۔"

فاطمہ نے خلوص سے کہا۔ جواب میں اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"فاطمہ خالہ! ماہ نور کی دوستی مجھے بے حد عزیز ہے۔ ماہ نور میری زندگی میں میری دوست بن کر یوں نہیں آئی جیسے میرے باقی دوست ہیں۔ ماہ نور کا میری زندگی میں آنا غیر معمولی بات ہے' اسی لیے وہ میرے لیے بہت اسپیشل ہے' وہ ابھی معصوم ذہن کی مالک لڑکی ہے' بڑی بڑی اور الجھی ہوئی باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آتیں' وہ الجھ جاتی ہے' پریشان ہو جاتی ہے اور آخر میں ناراض ہو جاتی ہے' اگرچہ اس کے ناراض ہونے پر اسے منانے میں مجھے بہت مزا آتا ہے' لیکن میں اسے الجھانا نہیں چاہتا' اسی لیے دن کے اس حصے میں آپ کے پاس آیا ہوں' مجھے امید ہے کہ آپ اسے نہیں بتائیں گی۔"

"تم فکر مت کرو۔" وہ مسکرائیں۔ "ویسے الجھنے اور ناراض ہونے سے زیادہ اسے یہ بات بری لگتی ہے کہ اس کے بجائے کسی اور موضوع پر بات کی جائے۔"

"خصوصاً' اگر میں کروں تو۔" وہ مسکرایا۔

"میں تمہارے مزاج کو سمجھ گئی ہوں سعد بیٹا! تمہارے ذہن کی الجھنوں کو بھی سمجھنے لگی ہوں۔ اس روز میں حیران تھی کہ اس لڑکے کو اتنا تجسس کیوں ہے' آج سمجھ میں آیا کہ تم فرمائش کر کے ماہ نور کے ذریعے ہم دونوں سے کیوں ملے۔ مجھے یقین ہے' ایک روز تم ضرور کھوج لگا لو گے اور اس کو ڈھونڈ نکالو گے' مگر میری تم سے ایک ریکویسٹ ہے بیٹا!"

"جی پلیز کہیے۔" اس نے کہا۔

"ماہ نور بہت حساس اور معصوم لڑکی ہے۔ اس کی نیت بہت اچھی ہے' جو نیک نیت لوگ ہوتے ہیں' صرف وہی اس دنیا میں پرخلوص بھی ہوتے ہیں۔ بیٹا! کوشش کرنا ماہ نور کبھی تمہارے ہاتھوں ہرٹ نہ ہو' کیونکہ تم سے دوستی کے معاملے میں وہ زیادہ ہی حساس ہے۔"

"میں جانتا ہوں خدیجہ خالہ!" اس نے سر اٹھا کر ماہ نور کے گھر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور میں سمجھتا بھی ہوں۔ میری یہی کوشش رہے گی کہ وہ کبھی میری وجہ سے ہرٹ نہ ہو۔" اس نے ان کی طرف دیکھا۔

جواب میں وہ محبت سے مسکرادیں۔

☆ ☆ ☆

"تین دن رہ گئے ہیں باقی نکاح میں۔ بس کردے اب یہ رونا دھونا کوئی روٹی ٹکر کھالے۔ اپنی کوئی شکل صورت ٹھیک کر پتر جی!"

ماسٹر کمال نے کھاری کو چوہدری صاحب کے سامنے لا کھڑا کرتے ہوئے چوہدری صاحب کی نظر میں اپنے نمبر بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو بھلا ہے ماسٹر کمال! پتا نہیں کون سی بات دل سے لگالی ہے اس نے۔" چوہدری صاحب نے اٹھ کر اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "بیٹھو ادھر میرے پاس میں تمہیں بتاتا ہوں اب میں نے کیا سوچا ہے۔" انہوں نے اسے اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے کہا۔ "ماسٹر کمال دودھ پتی تو بنوا کر بھجوا ادھر میں ذرا دو باتیں تو کرلوں اس سے۔" انہوں نے ماسٹر کمال کو وہاں سے کھسکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو بیٹا جی! اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ چپ کرکے نکاح نہیں کرنا ذرا ہلا گلا کریں گے تیری کون سی بار بار شادی ہونی ہے۔ میں نے لاہور سے کیٹرنگ اور ایونٹ مینجمنٹ والوں کی پوری ٹیم بلوائی ہے تیری شادی کو پورا گاؤں یاد رکھے گا کئی سال۔ لوگوں کو پتا چلے گا چوہدری سردار نے بچہ گود لیا تھا تو اس کے سارے شگن بھی پورے کیے تمہارے جوڑے میں نے اس درزی سے سلوائے ہیں جس سے میں اپنے کپڑے سلواتا ہوں تمہاری دلہن کے لیے بری چوہدرائن خود تیار کروا رہی ہے میں نے چیدہ چیدہ بڑے بڑے لوگ بلائے ہیں شادی میں شرکت کے لیے اور تمہیں پتا ہے ماہ نور بھی آرہی ہے تمہاری شادی میں شرکت کے لیے۔"

وہ شاید کھاری کو خوش کرنے کی کوشش کررہے تھے اور انہوں نے دیکھا تھا کہ سب باتوں میں سے صرف ایک ماہ نور کی آمد کی خبر پر اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

"ہاں۔ ماہ نور نے خود کہا کہ وہ آنا چاہتی ہے۔" انہوں نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "چاہتا تو میں یہ ہی تھا کہ وہ سارے جی (گھر والے) آئیں مگر باقی سب تو تم نے دیکھا ہی ہے کہ کتنے مصروف رہتے ہیں۔ ماہ نور اور اس کے شاید کوئی دوست سہیلیاں آئیں ان کو گاؤں فارم ہاؤس اور گاؤں دکھاؤں گا کہ بچو دیکھو ہمارے گاؤں میں بھی شہروں جیسی شادیاں ہوتی ہیں۔ ایونٹ مینجمنٹ والوں نے ادھر جنگل میں منگل بنا دینا ہے دیکھنا۔ موسیقی کا پروگرام بھی رکھنا ہے آخر میں جب مولوی صاحب اور ان کی گھر والی واپس گھر چلے جائیں گے نا اس کے بعد۔" وہ شرارت سے ہنسے۔

"چوہدری جی! میں تساں نال اک بہت ضروری بات کرنی ہے۔" اچانک کھاری کی خاموشی ٹوٹی۔

"ہاں ہاں بیٹا جی! ضرور کرو ایک نہیں دس کرو۔" وہ شاید اس کی دلجوئی کرنے کی تمام کوشش کررہے تھے۔

"میں تماڈیاں (آپ کی) ساری باتاں مانوں گا پر تساں میری اک من لو۔"

"ہاں ہاں بیٹا تو کہہ تو سہی۔" وہ اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے بولے۔

"اک صرف نکاح نہ کرو ویاہ (رخصتی) کرکے لے آو۔" اس نے کہا۔ "دوسرا میرے نال وعدہ کرو۔ آپ سعدیہ نوں ڈاکٹری پڑھاؤ گے جتنے وی پیسے لگ جائیں جتنا مرضی خرچا آجائے۔"

اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا جیسے وہ یہ بات منوا کر چھوڑے گا۔

"ہاں پتر جی! ضرور ضرور۔" وہ گڑبڑاتے ہوئے بولے۔ "مگر وہ شادی کے بعد پڑھ لے گی؟" انہوں نے سوال کیا۔

"ہاں جی۔ ضرور پڑھ لے گی' میں اس نوں ضرور ڈاکٹر بناؤں گا۔" وہ عزم کے ساتھ بولا۔ "آپ اپنی ذمہ داری تے اس نوں لے کر آرہے ہونا' آپ اسے وعدہ ضرور کرو۔"

"وعدہ بھئی وعدہ۔ پکا وعدہ۔" چوہدری صاحب دو منٹوں میں ہی قائل ہوگئے۔ "مگر اس کو ڈاکٹر بنا کر خود کیا اس کی ڈرائیوری کروگے۔"

"میرا کیا ہے' میں کج بھی کرلوں گا' اصل مسئلہ تے اس غریب کا ہے۔" اس نے کہا۔

"چلو پکا وعدہ ہوا' اگر وہ پڑھنے پر رضامند ہوئی تو ضرور پڑھاؤں گا۔" چوہدری صاحب نے کہا۔ "مگر کھاری باؤ! یہ رخصتی والی بات تو ہم نے مولوی صاحب سے کی ہی نہیں۔"

"اب کرلیونا' میں صرف نکاح نئیں کرانا' رخصتی بھی کرانی اے۔" کھاری اتنے دن جلتے' کلستے رہنے کے بعد گویا تپا ہوا فولاد بن کر باہر نکلا تھا۔

"چلو پوچھ کر دیکھ لیتے ہیں' لیکن اگر وہ نہ مانے تو۔"

"نہ مانے تو نکاح توں وی مکر جائیو (نہ مانے تو نکاح پر بھی نہ مانیے گا۔)" وہ سخت لہجے میں بولا۔

"اچھا!" چوہدری صاحب ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "اور کوئی حکم۔"

"اور بی بی جی نوں کہہ دیو' میلاد' محفل بعد میں کرالیں۔ او ناں نوں بھی فارم ہاوس بلا لونا اتنے دن۔" اب کے کھاری کا لہجہ قدرے نرم تھا۔

"ہاں یہ تو ضرور ہوسکتا ہے اور آسانی سے ہوسکتا ہے۔" چوہدری صاحب فوراً بولے۔ "اور کچھ۔"

"نہیں بس۔ اینھا ای (اتنا ہی)" اس نے سرہلایا۔

"ہن میں جاؤں (اب میں جاؤں)" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"ہاں' ہاں جاؤ اب۔" وہ سرہلاتے ہوئے بولے۔

"اور ہاں' اگر اپنے کسی خاص یار بیلی کو بلانا ہو تو بتا دینا۔"

"اپنا یار بیلی!" کھاری نے واپس اپنے کمرے میں آتے ہوئے غور کیا اور ایک نام' ایک چہرہ اس کے ذہن کی اسکرین پر روشن ہوگیا۔

"نہ تو ابھی بابے منگو کا میلہ ہے نہ کوئی اور میلہ' کیا کہہ کر بلاؤں او تھوں' سعدیہ باؤ تونے کس وخت میں ڈال دتا مجھے۔"

اس نے سوچا اور اپنا موبائل فون نکال کر اس پر ایک نمبر ملانے لگا۔ یہ موبائل فون اسے ماسٹر کمال نے ادھار دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اتنا میں نے شاہ بانو کو کہا تھا میرے ساتھ چلے' اچھی بھلی تیار بھی ہوگئی تھی' عین وقت پر بولی نہیں جی میرے تو اپنے کزن کی شادی آگئی ہے۔" ماہ نور نے کہا۔

وہ اور سلمان' سعد کے ساتھ فارم ہاوس جارہے تھے۔ ماہ نور کی منت سماجت کے بعد سلمان بمشکل ایک رات کے لیے وہاں جانے پر مانا تھا۔ اسے اگلی صبح واپس آجانا تھا۔

"سے پتا ہے نا' تم کتنا اسے تنگ کرتی ہو' جب اس کے ساتھ کہیں باہر جاتی ہو۔" سلمان نے اسے چھیڑا۔ "شاہ بانو بتا رہی تھی' یہ دونوں اسلام آباد میں کسی میوزیکل کنسرٹ میں گئیں یہ وہاں کسی سنگر کو دیکھ کر بے قابو ہو کر اس کی طرف بھاگی' تم کون ہو' تم کون ہو کرتی۔" سلمان نے سعد کو بتایا۔ ڈرائیو کرتے ہوئے سعد کے چہرے پر

گہری مسکراہٹ چھا گئی۔

"اچھا پھر؟" اس نے دانستہ کہا۔

"پھر کیا۔ بے چاری شاہ بانو کے لیے اتنی ایمبریسنگ سچویشن تھی یہ۔ اس کے بعد وہ بے چاری اس کے ساتھ کہیں جانے سے گھبرائی ہی ہے۔"

سعد نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر ماہ نور کی طرف دیکھا' جو سلمان کی بات پر جو اس کے خیال میں بے موقع بات تھی جھلا کر سر جھٹک رہی تھی۔

"دشت تنہائی میں اے جان جہاں لرزاں ہے۔" سعد کے فون پر کسی مخصوص کالر کی کالر ٹیون بجنے لگی۔ اس نے فون اٹھا کر دیکھا اور کال ڈراپ کردی۔ ماہ نور نے سعد کی طرف دیکھا' کیونکہ اگلے ہی لمحے فون اسی ٹیون کے ساتھ دوبارہ بجنے لگا۔ تین' چار بار ایسا ہونے کے بعد سعد نے فون سوئچ آف کردیا۔

"اٹینڈ کرلیتے آپ' ہوسکتا ہے' کوئی ضروری بات کرنی ہو کسی کو۔" سلمان نے کہا۔

"میں ڈرائیو کرتے ہوئے کالز اٹینڈ نہیں کیا کرتا عموماً۔" سعد نے کہا اور کن اکھیوں سے ماہ نور کو دیکھا جو خود بھی کن اکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔

"قلزا!" ماہ نور نے اس کو خود کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ کر کہا اور اسے نہ جانے کیوں لگا کہ یہ نام سن کر سعد ہلکا سا گڑبڑا گیا تھا۔

"ظہور۔" اس نے سعد کی گڑبڑاہٹ دیکھنے کے بعد لفظ مکمل کیا۔ "میرا مطلب ہے قلزا ظہور کی چار کول اسکیچنگ تقریباً" ایسے ہی مناظر پر مشتمل تھی' ہے نا۔" اس نے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ کھیت' عمارتیں' پیدل چلنے والے' ٹریکٹر' ٹرالر' درخت' سڑکوں کے کنارے کچے راستے' کھیتوں کے درمیان پگڈنڈیاں' سعد نے باہر کے مناظر پر نظر ڈالی اور سرہلا کر سامنے دیکھنے لگا۔

☼ ☼ ☼

اس نے وہیل چیئر کے پہیوں کو ہاتھ سے گھمایا' اس سے وہیل چیئر آگے پیچھے ہوئی۔ اب اسے اپنے اعضا کو حرکت دینے میں مزا آنے لگا تھا۔ بالکنی سے نیچے جھانک کر اس نے سڑک پر موجود لوگوں کو دیکھا۔ یہ ایک چھوٹا سا قصباتی بازار تھا۔ جس میں اچھے جنرل اسٹورز بھی تھے اور پان سگریٹ کے کھوکھے بھی' سبزی اور گوشت دکانیں بھی تھیں اور دودھ' دہی والا بھی سامنے ہی بیٹھا نظر آرہا تھا۔ اس نے سبزی والے کو دیکھا' کچھ تازہ' کچھ باسی سبزی سامنے رکھے وہ اپنے قریب رکھی پانی کی بوتل جس کے ڈھکن میں اس نے سوراخ کر رکھے تھے اٹھا کر سبزی پر پانی کا چھڑکاؤ کرنے لگا تھا' اسے شام تک اس سبزی کو قابل خرید شکل عطا کیے رکھنی تھی۔

"مزے کی بات یہ ہے کہ دکان چاہے سبزی کی ہے یا دودھ' دہی کی' نائی کی ہے یا موچی کی' حلوائی کی ہے یا بیکری کی' پانچ روپے میں گھنٹہ بھر بات اور شام سات بجے سے صبح چھ بجے تک مفت کال قسم کے اشتہار سب نے اپنی دکانوں پر چسپاں کر رکھے ہیں' کیا یہ سب ہی کریڈٹ بیچتے ہیں موبائل فونز کا؟"

اس نے فیمی آنٹی سے کہا جو چائے کے دو کپ ٹرے میں لیے اس کے قریب رکھی کرسی پر آکر بیٹھ گئی تھیں۔

"ہاں' کیونکہ ہم لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ اب ایک دوسرے سے بات کرنا رہ گیا ہے' ہر شخص چاہے' اس کی جیب میں پندرہ روپے ہی کیوں نہ ہوں' پانچ اپنے پاس رکھ کر دس کا کریڈٹ ضرور خریدے گا' کیونکہ یہ لوڈ اسے ایزی لوڈ دستیاب ہوجاتا ہے اور ہم سب اس ایزی کا لوڈ اٹھانے کو خوشی خوشی تیار رہیں۔"

فیمی آنٹی نے چائے میز پر رکھنے کے بعد اپنی سلائی کڑھائی کی ٹوکری سے کروشیے کی سلائی اور اون کا گولہ باہر

نکالتے ہوئے کہا۔
"آپ نے مجھے بھی ایک سلائی لا کر دینی تھی۔" سارہ نے انہیں یاد دلایا۔
"ہاں۔" انہوں نے اس کے کمزور ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ "نیچے بازار میں جانے کی فرصت ہی نہیں ملی' جس دن گئی ضرور لا دوں گی۔"
"مجھے اب سمجھ میں آنے لگا ہے کہ سعد نے مجھے گلوز اور ڈوکیوں لا کر دیے تھے۔" اس نے اون کا ایک گولہ نکال کر اسے ایک ہاتھ سے پھینک کر دوسرے ہاتھ سے کیچ کرنا شروع کیا۔
"کیوں بھلا۔"
"اس پریکٹس سے میری کلائیوں' انگلیوں اور پیچھے بازوؤں کے پٹھے مضبوط ہونا شروع ہو گئے ہیں۔" اس نے کہا۔ "سعد کے ذہن میں نہ جانے کیسے ایسے خیال آجاتے ہیں۔" اس نے سامنے پہاڑوں کے اردگرد اڑتے پرندوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"ہوں!" سیمی آنٹی نے اس کی بات پر غور کرنے کے بعد اس کی طرف دیکھا۔ "سارہ! تمہیں وہ اسٹوری یاد ہے آسکر وائلڈ کی دی ہیپی پرنس۔"
"ارے ہاں!" اس نے مسز پیٹر کی کتابوں کے ذخیرے میں پہنچنے کے بعد یاد کیا۔
"مجھے یاد ہے۔ پرنس کا وہ مجسمہ جس کے تمام قیمتی اسٹونز وہ پرندہ اتار کر ضرورت مندوں کو جا کر دے آتا ہے۔"
"اور پرنس کی آنکھ سے جو آنسو ٹپکتا ہے' وہ بھی یاد ہے۔" سیمی آنٹی نے کہا۔
"ہاں بالکل یاد ہے۔"
"اس آنسو کو کبھی بھولنا بھی نہیں' یہ جو پرنس ہوتے ہیں نا' ان کی آنکھوں سے یوں ہی آنسو نہیں ٹپکا کرتے۔"
"اچھا نہیں بھولوں گی۔" اس نے لاپروائی سے ان کی بات سننے کے بعد کہا اور سرمئی پہاڑوں کو دیکھنے لگی۔
"آپ ابھی اندر کس سے بات کر رہی تھیں؟" انجم آیا تھا کیا سودا دینے۔" اسے یاد آیا۔
"نہیں... میں فون پر بات کر رہی تھی۔" سیمی آنٹی نے اون کے گولے سے دھاگا کھولتے ہوئے کہا۔
"کس کا فون تھا؟"
"سعد کا فون تھا' خیریت پوچھ رہا تھا اور بتا رہا تھا' وہ مزید کچھ دن چکر نہیں لگا پائے گا۔"
"کیوں؟" اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔
"وہ اس لڑکی کے چچا کے ہاں کوئی شادی کی تقریب اٹینڈ کرنے گیا ہوا ہے۔ جو اس کے ساتھ ایک مرتبہ یہاں آئی تھی۔ کیا نام تھا بھلا اس کا؟"
سیمی آنٹی نے اس کی طرف دیکھا۔ اون کا گولہ اس کے ہاتھ سے گر کر لڑھکتا ہوا کچن کے دروازے کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا ایک سرا البتہ ابھی بھی سارہ کے ہاتھ میں تھا۔
"ماہ نور!" پھر انہیں خود ہی یاد آگیا۔ "وہ ماہ نور کے چچا کے ہاں کوئی فنکشن اٹینڈ کرنے گیا ہوا ہے۔"
"وہ لڑکی... وہ تو واپس چلی گئی۔" اسے کوئی بات یاد آ رہی تھی' جسے یاد کرتے ہوئے وہ دم بخود بیٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہاں کیا حال ہے بھئی افتخار احمد! میں اتنے دن سے تمہیں فون کر رہا تھا' تم نے کال اٹینڈ ہی نہیں کی میری۔"
"میں ذرا نا۔" اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا بہانہ لگائے۔ "ہاں میرا نا جی ٹھیک نہیں سی پچھلے دنوں۔ آپ سناؤ ٹھیک ہو نا جی۔"

"ہاں بھئی' فٹ ہوں بالکل۔"
"بھائی رضوان الحق صاحب! ایک عرض کرنی تھی۔"
"آپ حکم کرو افتخار بھائی؟"
"کھاری جی کھاری' افتخار نہیں کھاری کہنا ہے آپ نے مجھے۔"
"او سوری بھائی کھاری جی! حکم کرو۔"
"آپ نے پرسوں ایدھر پہنچنا ہے جی پنڈ ہمارے۔"
"پرسوں۔" وہ حیران ہوا۔ "پرسوں کیوں کھاری بھائی؟ میلے کی تاریخ تو ابھی دور ہے۔"
"میلہ نہیں جی ایدھر فاتحہ ہو رہی ہے جی!"
"ہیں!" وہ گھبرا کر بولا۔ "خیر تو ہے نا بھائی افتخار؟"
"پتا نہیں جی خیر ہے کہ نہیں۔ اب تساں کو کیسے بتاؤں بھائی رضوان الحق! آپ دے اس نکے بھرا (چھوٹے بھائی) دی شادی ہو رہی ہے' تسی آنا ہے ضرور' تسی ہی تو ایک یار بیلی ہو اپنے۔" اس نے فراٹے سے بولتے ہوئے کہا۔
"واہ' واہ' واہ... مبارک ہو بھائی کھاری! کیا بات ہے آپ کی۔" وہ بے اختیار خوش ہوا۔
"بس پھر تساں آنا ہے۔"
"ضرور بھائی! ضرور' سمجھو پہنچا کہ پہنچا۔ آپ بھائی ہو میرے' آپ بلاؤ اپنی شادی میں اور میں نہ آؤں' یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ خوش دلی سے بولا۔

☼ ☼ ☼

"کیسا لگا پھر بیٹا جی ہمارا فارم ہاؤس؟"
شام کو چوہدری صاحب نے سعد سے ملاقات کے دوران پوچھا' سارا دن وہ کھاری کی شادی کے انتظامات اور مولوی سراج سرفراز سے معاملات طے کرنے میں مصروف رہے تھے۔
نکاح کے بجائے شادی کی بات سن کر مولوی سراج پہلے پس و پیش کر رہا تھا۔ مگر پھر اس کی گھر والی نے بخوشی اس بات کی منظوری دے کر ان کی جان مولوی صاحب سے چھڑائی تھی اور اب شادی کی خبر سن کر تو پورا گاؤں ہی اس

تقریب میں شامل ہوگیا تھا۔ لوگ ان کے پاس آکر اپنی اپنی خدمات پیش کر رہے تھے۔ کچھ حاسد انہیں مشورہ دے رہے تھے کہ ڈیرے کے ایک ملازم کی شادی پر وہ کیوں اتنا دھوم دھڑکا کر رہے تھے۔ سادگی سے نکاح کر کے لڑکی گھر لے آئیں۔ کچھ لوگ مولوی سراج کی قسمت پر رشک کرنے والے بھی تھے۔ ان ہی چکروں میں وہ صبح کے یہاں پہنچے ہوئے اپنے بھائی کے دونوں بچوں اور ان کے مہمان سعد سے ملاقات نہیں کرپائے تھے۔

"سب کچھ ہی تقریباً "پرفیکٹ" ہے۔" سعد نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔ "میں تو یہاں پہنچنے کے فوراً" بعد سو گیا اور یقین جانیے مجھے مدتوں کے بعد اتنی مزے کی نیند آئی بہت پرسکون اور مزے کا ماحول ہے یہاں۔"

"چلو بیٹا! یہ تو اچھی بات ہے کہ تمہیں یہاں آکر اچھا لگا۔" چوہدری صاحب خوش تھے۔

"ماہ نور بیٹا جی! آج نکاح کی تقریب عشاء کے بعد ادھر ہماری طرف ہی ہوگی' مولوی صاحب اور ان کا بال بچہ ادھر ہی پہنچ جائے گا' تمہاری تائی ادھر پہنچی کہ نہیں ابھی۔"

"سب ادھر ہی ہیں سردار چاچا! اتنی رونق ہے اندر والے حصے میں کہ وہاں سے آنے کو میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ آپ سے ملنے ادھر آگئی بس۔"

"ہاہا۔ انجوائے کرو' ہم دیہاتیوں کے فنکشن بس ایسے ہی ہوتے ہیں۔" وہ ہنسے۔

"سردار چاچا! باہر صحن میں بڑی بڑی کڑاہیوں میں وہ اورنج کلر کی ڈھیر ساری مٹھائی کیوں بن رہی ہے۔" سلمان جو ابھی باہر سے اندر آیا تھا' حیران ہوتا پوچھ رہا تھا۔

"یہ گاؤں کی ایسی تقریبات کی خاص روایت ہے' ہر آنے والے کی شکرپاروں اور جلیبیوں سے تواضع کی جاتی ہے' تم نے چکھی؟" انہوں نے پوچھا۔ سلمان نے سر ہلاتے ہوئے اشارہ دیا کہ نہ اس نے چکھی ہے' نہ چکھنے کا ارادہ ہے۔

"ارے یہ تو بڑا دلچسپ منظر ہوگا۔" سعد نے کہا۔ "کیا میں دیکھ سکتا ہوں۔"

"ہاں' ہاں کیوں نہیں' اس طرف چند ملازم ہی ہیں یا باہر سے آنے والے ادھر سے گزر کر اندر والے حصے میں جاتے ہیں۔" چوہدری صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "چلو میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔"

وہ چوہدری صاحب کے ساتھ پچھلی طرف آگیا۔ یہ ایک ایسی کھلی جگہ تھی جہاں بڑے بڑے چولہے زمین میں گڑے تھے۔ ان ہی چولہوں پر بڑی کڑاہیاں رکھ کر وہ مٹھائی تیار کی جارہی تھی جو گرم گرم ہی ہلٹوں میں رکھ کر مہمانوں کو پیش کرنے کے لیے بھجوادی جاتی تھی۔

سعد کو یہ منظر دلچسپ لگ رہا تھا۔ وہاں موجود لوگوں کی گفتگو' شادی بیاہ کی ایک مخصوص چہل پہل' جہاں ہر شخص مستعد اور عجلت میں لگ رہا تھا۔ وہ چوہدری صاحب کے قریب موڑھے پر بیٹھا کتنی دیر سے ان لوگوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ پچھلے گیٹ سے لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔

"چوہدری صاحب' مولوی صاحب کی فیملی آگئی ہے۔" کسی نے چوہدری صاحب کو اطلاع دیتے ہوئے کہا۔

"اوہ۔ انہیں عزت سے' طریقے سے ادھر لے جاؤ' جہاں ان کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔" چوہدری صاحب اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔ فالتو مردوں کو وہاں سے نکالنے کے بعد مولوی صاحب کی بیوی اور بیٹی کو اندر لایا گیا تھا۔ سرتاپا بڑی چادروں میں لپٹی وہ دو خواتین اندر داخل ہوئی تھیں۔ بچی کو ایک ملازمہ اپنے ساتھ اندر لے جارہی تھی۔ سعد اس طرف نظر ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا نظریں جھکا کر کھڑا تھا۔ مگر اندر آتی تپا را ... نظر اندر داخل ہوتے ہی اس پر پڑی تھی۔ اس کے بعد شاید وہ قدم اٹھانا بھول گئی تھیں۔

(باقی آئندہ ان شاء اللہ)

عنیزہ سید

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور نے "سید پور کلچرل شو" میں شرکت کے لیے اپنی دوست شاہ بانو کے ساتھ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ شاہ

بانو نے اپنے بھائی کی معرفت سید پور میں ماہ نور کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا۔ فاطمہ اور خدیجہ نے ماہ نور کو اسلام آباد میں فلزا ظہور سے ملنے کی تاکید کی۔ فلزا ظہور ان کے بچپن کی ساتھی ہے۔ بچپن میں کوئلے سے فرش اور دیواروں پر تصویریں بنانے والی فلزا ظہور اب ایک بڑی آرٹسٹ ہے مگر اسے شہرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔

مولوی سراج اور آپا رابعہ قصبے میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی سعدیہ کلثوم نویں جماعت کی طالبہ بے حد ذہین ہے۔ مولوی سراج اور آپا رابعہ کو اس بات پر فخر ہے کہ ان کی بیٹی سائنس پڑھ رہی ہے۔

ایک رات سارہ نے رکی کو خواب میں دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ سرکس میں کام کرتا تھا۔ رکی اپنے فن کا ماہر جوکر تھا۔

ماہ نور اور شاہ بانو "سید پور کلچرل شو" میں گئیں تو وہاں انہیں ایک کمہار نظر آیا۔ وہ گیلی مٹی کو بہت مہارت سے دیدہ زیب برتنوں کی شکل میں ڈھال رہا تھا۔ ماہ نور کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہ چونک گئی۔ اسے اس پر اسی شخص کا گمان ہوا، جو اسے ہر میلے میں مختلف روپ میں نظر آتا رہا تھا۔

سارہ، ماہ نور سے مل کر خوش نہیں ہوئی۔ اس کا رویہ بہت روکھا اور خشک تھا۔

واپسی پر گاڑی میں ماہ نور نے سعد سے اعتراف کیا کہ وہ اب تک جتنا سعد کو جان پائی ہے، سعد اس کی نظر میں ایک قابل رشک انسان ہے، سعد نے اسے سارہ کے متعلق بتایا وہ سرکس دیکھنے گیا تھا۔ سارہ خان بلندی سے نیچے گری تھی۔ اس نے اس کی ہڈیاں ٹوٹتے اور خون بکھرتے دیکھا تھا، وہ وہاں سے واپس آ گیا لیکن سارہ خان کے لیے بے چین رہا۔ وہ دوبارہ اسے ڈھونڈتے ہوئے اس سے ملنے پہنچا تو وہ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور زخم زخم جسم کے ساتھ ایک چھولداری میں پڑی موت کی منتظر تھی۔ اس کے زخموں پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں۔ سعد اس کو وہاں سے لایا اور اس کا علاج کرایا اور پھر اسے فلیٹ میں منتقل کیا۔

کھاری نے آپا رابعہ سے نماز یاد کرلی تھی اور بہت خوش تھا۔ سارہ خان نے پہلی بار سوچا سعد سے اس کا تعلق صرف ترس اور ہمدردی کا ہے اسے اپنا ماضی یاد آرہا تھا۔ جہاں جاپانی نقش و نگار والا رکی تھا۔ جس کی جاپانی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اس کا باپ اس کے بہن بھائیوں کے ساتھ پھوپھی کے حوالے کر گیا تھا۔ باپ نے دوسری شادی کرلی تو سوتیلی ماں کے مظالم سے تنگ آکر وہ گھر سے بھاگ گیا اور قسمت اسے سرکس میں لے آئی۔

آپا رابعہ نے مولوی سراج کو بتایا کہ اسکول والوں نے سعدیہ کی پیدائش کی پرچی مانگی ہے تو وہ پریشان ہو گئے۔

ماہ نور، سارہ سے ملنے آئی اور اس نے سارہ کو بتایا کہ اس کی سعد سے صرف چند دن پہلے ملاقات ہوئی ہے۔ یہ سن کر سارہ کا رویہ اس کے ساتھ بدل گیا۔

سعد نے اپنی بہن نادیہ سے اسکائپ پر بات کی۔ وہ فن لینڈ میں بہت مشقت بھری زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کی ماں کا شوہر اس پر بری نظر رکھ رہا تھا۔ اس لیے وہ فن لینڈ آگئی۔

جیناں بھکارن نے ایک بچہ اغوا کیا لیکن پولیس نے اس سے بچہ برآمد کرلیا۔

ماہ نور کی سعد سے ملاقات ہوئی تو وہ اسے اختر کے پاس لے گیا۔ اختر نے ماہ نور کو دیکھ کر سعد سے کہا "یا تو زن یا من پالو" ایک کی قربانی دینی پڑے گی۔

اس نے ماہ نور سے کہا بی بی آپ کا دل بہت صاف ہے اور زندگی بہت پرسکون ہے لیکن آگے آپ کے لیے بہت مشکلیں ہیں۔

فلزا ظہور، سعد کو فون پر کسی تصویری نمائش کی دعوت دیتی ہیں۔ سعد اپنے فرینکفرٹ کے دورے کی وجہ سے معذرت کر لیتا ہے۔ ماہ نور، فاطمہ اور خدیجہ کو فلزا ظہور سے ملاقات کے بارے میں بتاتی ہے۔ فاطمہ ماہ نور سے سعد سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کرتی ہے۔ وہ بے دلی سے ہامی بھرتی ہے کیونکہ سید پور سے آنے کے بعد سے سعد کا فون مسلسل بند مل رہا تھا جبکہ سارہ خان کو اس نے اپنے جرمنی جانے کی اطلاع دے دی تھی۔

ماہ نور نے سعد کو فون کر کے شکوہ کیا کہ اس نے اسے جرمنی جانے کی اطلاع کیوں نہیں دی تھی۔ ماہ نور نے سعد سے وعدہ لیا کہ آئندہ وہ اسے بتا کر ہی کہیں جائے گا۔ اگلے دن سعد نے اسے کئی میسجز بھیجے۔ جن میں وہ اطلاع دیتا رہا کہ اب وہ کیا کر رہا ہے۔ ماہ نور کو یہ سب اچھا تو لگا، مگر اس نے سعد کو منع کر دیا اور کہا کہ وہ اسے بس ملک سے باہر جاتے ہوئے ہی اطلاع دیا کرے۔

سعدیہ نے آپا رابعہ سے تنگ کر اپنے رشتے داروں کی بابت پوچھا تو وہ تشویش میں مبتلا ہو گئیں۔ انہوں نے مولوی سرفراز سے اپنی تشویش کا اظہار کیا کہ سعدیہ کو شک ہو گیا ہے کہ ہم اس سے کچھ چھپاتے ہیں۔ تاہم مولوی سرفراز نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔

سعد نے فلزا ظہور سے ملاقات کی اور اس کا اسٹوڈیو بھی دیکھا۔ اس نے وہاں کچھ ادھوری پینٹنگز بھی دیکھیں، جو اسے بے حد متاثر کن لگیں۔

سارہ نے لچکیلے ربڑ سے کچھ جانور بنائے۔ سعد نے دیکھ کر کہا کہ اگر تم نے اس سے بھی اچھے بنائے تو میں تمہیں اپنے اور تمہارے بارے میں ایک اہم بات بتاؤں گا۔ سارہ نے اس سے وعدہ کرلیا کہ وہ اب اور محنت کرے گی۔

ماہ نور اپنے رشتے داروں کی شادی میں گئی تو وہاں ہال کے باہر اسے سعد کچھ لوگوں کے ساتھ نظر آیا۔ ماہ نور اسے اپنے شہر میں دیکھ کر حیران ہو گئی۔ وہ اس سے ملنے کے ارادے سے اس کی طرف بڑھی۔ مگر سعد نے ایس ایم ایس کے ذریعے اسے روک دیا۔ ماہ نور ششدر رہ گئی۔

آپا رابعہ، سعدیہ سے صاف لفظوں میں کہہ دیتی ہیں کہ وہ اسے آگے نہیں پڑھا سکتیں۔ سعدیہ کے مزاج میں مستقل برہمی آجاتی ہے۔

ماہ نور، سعد کو اپنے گھر لے جاتی ہے۔ فائزہ کا سرد اور دو ٹوک انداز سعد کو کچھ اچھا نہیں لگتا، مگر کھاری اور ماہ نور کے تایا، تائی سے مل کر اسے بہت خوشی ہوتی ہے۔ کھاری اور رضوان الحق کی بہت اچھی دوستی ہو جاتی ہے۔ سارہ کے ہاتھوں میں مشاقی آتی جارہی ہے۔ یمی آنٹی اسے سراہتی ہیں اور باتوں باتوں میں اسے کریدتی ہیں کہ وہ رکی کو پسند کرتی تھی۔ سارہ انہیں مبہم سا جواب دیتی ہے۔ جس میں یہ بات نہایت واضح ہوتی ہے کہ سعد اس سے سچی محبت کرتا ہے۔

سعد، ماہ نور کے ساتھ خدیجہ اور فاطمہ خالہ سے ملنے جاتا ہے۔ ادھر شہناز کا ذکر نکل آتا ہے۔ سعد اس گفتگو میں دلچسپی لیتا ہے جسے فاطمہ محسوس کرلیتی ہیں۔ پرانا البم دیکھتے ہوئے سعد، فلزا ظہور کی تصویر "فوراً" پہچان لیتا ہے۔

چوہدری صاحب نے کھاری کا سعدیہ کلثوم سے رشتہ طے کر دیا۔ آپا رابعہ اور مولوی صاحب بہت خوش ہوتے ہیں۔ سعدیہ اس گھر سے جان چھوٹنے پر مطمئن ہوتی ہے، جبکہ کھاری حیران اور پریشان ہے۔ وہ بہت انکار کرتا ہے، مگر کوئی اس کی بات نہیں سمجھ پاتا۔ کھاری، رضوان کو اور ماہ نور، سعد کو کھاری کی شادی کی دعوت دیتی ہے۔ سعد، ماہ نور کے علم میں لائے بغیر فاطمہ سے ملنے جاتا ہے اور چند باتیں پوچھتا ہے۔ آپا رابعہ فارم ہاؤس میں داخل ہوتی ہیں۔ سعد پر نظر پڑتے ہی وہ چونک جاتی ہیں۔

تیرہویں قسط

آپا رابعہ نے چہرے پر آتے پسینے کو دوپٹے سے پونچھا۔ موسم معتدل تھا مگر نجانے کیوں انہیں بار بار چہرے پر پسینہ آرہا تھا۔ ان کا دل بھی معمول سے زیادہ تیز رفتاری سے دھڑک رہا تھا۔ انہوں نے دل کی تیز دھڑکن سے گھبرا کر سر اٹھا کر اپنے اردگرد دیکھا۔ وہ ایک بالکل نامانوس جگہ پر بیٹھی تھیں۔

چودہ ضرب بارہ کے اس کمرے کے فرش پر سفید ٹائل جڑے تھے اور شیشم کی لکڑی سے بنا ایک ڈبل بیڈ بچھا تھا۔ اسی لکڑی کا سنگھار میز اور دو سیٹوں والا صوفہ رکھا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر ہاتھ سے بنی تصویریں اور

دستکاری کے نمونے وال ہینگنگ کی شکل میں سجے تھے۔ کھڑکیوں پر ہلکے نیلے رنگ میں بھاری پردے لٹک رہے تھے۔ کمرے کا مجموعی تاثر اچھا تھا اور آرام دہ بھی۔ مگر آپا رابعہ کو نئے ماحول کی نامانوسیت کے علاوہ کوئی اور احساس بھی بے چین کر رہا تھا۔

کچھ دیر پہلے دیکھا ایک منظر بار بار ان کی نظروں کے سامنے آتا اور گزر جاتا تھا۔ وہ گومگو کی کیفیت میں تھیں۔ کیا واقعی انہوں نے کچھ دیکھا تھا یا وہ محض نظر کا دھوکا تھا۔ وہ یہاں سعدیہ کا نکاح کرانے کے لیے آئی تھیں مگر انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دل کی ایک الجھن سے نجات حاصل کرنے کے دوران کسی نئی الجھن کا شکار ہو گئی تھیں اور یہ نئی الجھن کسی شکاری کے مضبوط پھندوں والے جال کی طرح تھی جس نے بے خبری میں ہی ان کے دل کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ وہ اس رہائشی کمرے تک آتے آتے یہ تو بھول گئی تھیں کہ وہ یہاں دراصل کس کام سے آئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

فارم ہاؤس کے جس حصے میں وہ کمرا تھا، جہاں آپا رابعہ بیٹھی بے خبری میں خود پر آپڑنے والے جال کی گرہیں ہاتھوں سے کھولنے کی کوششیں میں مصروف تھیں اس کمرے کے عین مخالف پر بنے کمروں میں چودھرائن صابرہ اپنا ڈیرا جمائے بیٹھی تھیں۔

صابرہ کو رونقیں، محفلیں گانا بجانا اور زرق برق لباسوں میں خاصی دلچسپی تھی۔ کھاری کی شادی کی شکل میں انہیں ایک نیا مشغلہ ہاتھ لگا تھا۔ کھاری اگرچہ زیادہ تر فارم ہاؤس میں رہتا تھا مگر صابرہ اپنے اکثر کام اسی سے کرواتی تھیں اور اس سے خاصی مانوس بھی تھیں۔ پچھلے ایک ڈیڑھ سال سے وہ سوچ رہی تھیں کہ جب بھی کھاری کی شادی کے متعلق سوچ بچار چلے گی وہ اپنی مصاحبہ خاص رضیہ کا نام پیش کریں گی۔ رضیہ بارہ سال کی عمر سے ان کی خدمت کر رہی تھی۔ وہ ان کے میکے سے ان کی خدمت کے لیے بھجوائی گئی تھی اور انہیں اس کے سہارے کی خاصی عادت ہو چکی تھی۔

فارم ہاؤس اور گھر کے ملازموں کی شادی بیاہ ہوتے ہی رہتے تھے۔ چوہدری صاحب ایسے موقعوں پر اپنے ان ملازموں کی جن کی شادی ہونے والی ہوتی تھی مقدور بھر مدد کرتے تھے ملازم اپنے آبائی علاقوں میں جاتے بیاہ کرا کر کبھی اپنی بیبیاں ساتھ لے آتے، کبھی پیچھے ہی چھوڑ آتے۔ ملازم لڑکیوں کو باقاعدہ جہیز دیا جاتا اور ان کی فارم ہاؤس ڈیرے یا گھر سے رخصتی ہو جاتی۔ مگر کھاری ایسا لڑکا تھا جس کی حیثیت باقی لوگوں سے مختلف تھی۔ چوہدری صاحب نے نہ تو اسے باقاعدہ متبنیٰ بنایا تھا نہ ہی اسے ملازموں والا درجہ دے رکھا تھا۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ کھاری چوہدری صاحب کو بے حد عزیز ہے۔

اپنی کوئی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے صابرہ کو بھی نجانے کیوں کھاری ایسے عزیز تھا جیسے کوئی بہت اپنا بے سہارا بچہ عزیز ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے تئیں کھاری اور رضیہ کی شادی کا پکا منصوبہ بنائے بیٹھی تھیں۔ چوہدری صاحب کے اس فیصلے نے کچھ دن انہیں دل ہی دل میں ناراض بھی کیے رکھا تھا۔ مولوی صاحب کی بیوی سے انہیں ایک بلاوجہ کی پرخاش بھی تھی، جو کھاری کے سعدیہ سے نکاح کا سوچ کر ان کا حلق مزید کڑوا کرتی رہی تھی۔ لیکن وہ زیادہ دیر تک کوئی بات دل سے لگائے رکھنے کی عادی نہیں تھیں۔ جلد ہی بری کی تیاری، ہلے گلے، ناچ گانے اور رونقوں کے تصور نے ان کے دل سے ناگواری کا یہ احساس ختم کر دیا تھا۔

جب ہی اس وقت وہ پوری تیاریوں اور رونقوں کے درمیان کرن لگے دوپٹے اور گوٹے کے پھولوں سے سجے

سوٹ میں ملبوس، اپنا قیمتی زیور پہنے ہنس ہنس کر گاؤں کی رہائشی خواتین سے مبارک بادیں وصول کر رہی تھیں اور گانے بجانے پر مامور لڑکیوں کو مزید رونق لگانے کی ہدایات دے رہی تھیں۔

"یہ کیا بات ہوئی تائی جی! یہ گھنگھروں والا پراندہ میرے بالوں میں ٹک ہی نہیں رہا۔" تقریب کی مہمان خاص ان کے دیور کی بیٹی جو انہیں دل سے بہت پیاری تھی، اس نے منہ بناتے ہوئے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہائے میں صدقے جاؤں کیوں نہیں ٹک رہا؟" وہ ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر بولیں۔

"بی شمسہ! بھاگ کے جا کنگھا لے کر آ۔ میں خود ماہ نور کے بالوں میں پراندہ ڈالتی ہوں۔ تم ساری تو نکمی ہو بالکل۔" انہوں نے ماہ نور کو اپنے آگے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کسی کو آواز لگائی۔

"پراندہ بھاری ہے جی، ماہ نور باجی کے بال ہلکے بھی ہیں اور چھوٹے بھی، اسی لیے نکل جاتا ہے۔" کسی لڑکی نے قریب سے کہا۔

"تو کیا ہوا، میرے سنگھار میز پر کالی سوئیوں کا پتا رکھا ہے، جا فٹافٹ وہ لے آ۔ مجھے پتا ہے پراندہ کیسے لگاتے ہیں ہلکے اور چھوٹے بالوں میں۔"

انہوں نے یہ بات کہنے والی کو گھُرکا اور کچھ دیر بعد انہوں نے سلیقے سے ماہ نور کے بالوں میں یوں پراندہ ڈالا کہ نہ تو بال اپنی جگہ سے باہر نکل رہے تھے نہ پراندہ نیچے لٹک رہا تھا۔

"ماشاء اللہ!" پراندہ ڈالنے کے بعد ماہ نور کو اپنے سامنے کھڑا کر کے دیکھتے ہوئے انہوں نے خوش ہو کر کہا۔ ہلکے نیلے اور ہلکے شفق رنگ کے امتزاج سے بنے شفون کے سوٹ میں، جس کی قمیص اور دوپٹے پر سلور مقیش لگی تھی، وہ نظر لگ جانے کی حد تک انہیں پیاری لگی۔

"کاش! ایک ہی سہی مگر ماہ نور سے بڑا میرا کوئی بیٹا ہوتا۔" ان کے دل میں پرانی ہُوک نے سر اٹھایا۔

"خیر! اللہ نصیب اچھے کرے اس کے، اتنی پیاری، معصوم اور اچھے گنوں والی بچی جس کا بھی نصیب ہو گی وہ خوش قسمت ہو گا بہت۔" اگلے لمحے انہوں نے دل سے ہُوک کو جھٹکتے ہوئے سوچا اور دوبارہ لڑکیوں کے گانے بجانے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"چٹا ککڑ بنیرے تے
کاسنی دوپٹے والیے۔۔۔ منڈا عاشق تیرے تے۔"

ڈھولک کی تھاپ پر دیہاتی لڑکیاں صدیوں پرانے ٹپے گا رہی تھیں۔ "یہ تو سچ ہے مولوی کی بیٹی پر کھاری عاشق ہی تو تھا جب ہی کتنی چالاکی سے مولوی اور اس کی بیوی نے چوہدری صاحب کو پھنسا لیا۔" صابرہ نے یہ ٹپہ سنتے ہوئے دل میں سوچا۔

☼ ☼ ☼

اس کمرے سے باہر شور تھا، ہنگامہ اور گہما گہمی کا احساس۔ فارم ہاؤس کے رقبے میں سب سے بڑے خالی قطعے پر بڑی کینوپی لگا دی گئی تھی۔ یہ کینوپی اندر سے سفید اور جھالردار تھی۔

"سفید کینوپی کے اندر روشنیاں زیادہ خوبصورتی سے منعکس ہوتی ہیں۔"

یہ چوہدری صاحب کا آئیڈیا تھا۔ گدی والی چیری کرسیوں پر سرخ اور کاسنی غلاف چڑھائے گئے تھے۔ کھاری کے نکاح کے لیے اسٹیج بھی بنوایا گیا تھا۔

نکاح کا دن مہندی کا دن بھی تھا۔ اسٹیج پر زرد رنگ کی بہار تھی۔ گیندے کے پھول اور پیلے رنگ میں قالین اور

صوفے جن کے پیچھے زرد اور پیلے پھولوں کی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ مٹی کی منقش گھنٹیاں بھی اسٹیج کے آگے لٹک رہی تھیں۔ ہر طرف پھولوں کی بہار تھی اور گاؤں کے سیدھے سادے دیہاتی مہمان کھاری اور مولوی صاحب دونوں کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔

"کھاری بھی لاوارث اور مولوی صاحب کا تو کوئی آگا پیچھا ہے ہی نہیں، مگر دیکھ لو! اللہ نے چوہدری صاحب کے دل میں نیکی ڈال کر کیسے رنگ لگائے ہیں دونوں کو۔" لوگ آپس میں بات کر رہے تھے۔

کھاری کی شادی کے لیے گاؤں کے ہر فرد کو مدعو کیا گیا تھا۔ اور سب کے لیے فارم ہاؤس کا مرکزی دروازہ کھول دیا گیا تھا۔

اس سارے شور ہنگامے، سرگوشیوں، غیبتوں سے الگ تھلگ وہ اپنے اس چھوٹے سے کمرے میں خاموش بیٹھا تھا۔ وہ تنہا تھا اور اس کے کمرے میں اندھیرا بھی تھا۔ وہ افتخار احمد عرف کھاری تھا جس کی وجہ سے فارم ہاؤس میں اتنی بڑی تقریب منعقد کی گئی تھی۔ معاملہ صرف مولوی سراج کی بیٹی کا ہوتا تو بہت کچھ دے دلا کر فرض سے سبک دوش ہونا کافی سمجھ لیا گیا ہوتا، مگر مولوی سراج کی بیٹی کی شادی کھاری سے طے کر کے چوہدری سردار بھی شاید شغل میں آگئے تھے، انہیں اس شادی کو یادگار بنانے کے لیے ہر دوسرے منٹ میں کوئی نئی بات سوجھ جاتی تھی۔

مگر جس کے لیے وہ یہ سب کر رہے تھے، وہ تنہا بیٹھا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کیا سوچے اور کتنا سوچے کہ بنا خواہش بنا انتظار اس کی شادی ہونے لگی ہے۔۔۔ یا اس حقیقت پر جھوم جھوم جائے کہ ایک لاوارث لڑکا ہوتے ہوئے بھی اس کے نصیب میں اس دھوم کی شادی لکھی گئی تھی کہ جس کا تصور اچھے خاصے کھاتے پیتے معزز گھرانوں کے لڑکے بھی نہیں کر سکتے تھے۔۔۔ یا اس بات پر لڈی ڈالے کہ وہ بھین جی جو اسے علم کے نور کا مینارہ اور بہت اعلا ہستی نظر آتی تھیں، وہ ان کا داماد بننے جا رہا تھا۔۔۔ اس کے پاس خوشی کے عالم میں ناچ اٹھنے کے لیے بہت سی وجوہات تھیں مگر اس کے برعکس اس کی سوچ کا دائرہ ایسی حقیقتوں کے گرد گھوم رہا تھا جو اس کا دل دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈبو دینے کے لیے کافی تھیں۔ اسے ہمیشہ زندگی کے ہر ہر موڑ پر یہ خیال آتا رہا تھا کہ وہ ایک بے شناخت انسان تھا۔ اپنے ماں باپ اور ایک خاندان سے محرومی ایک الگ المیہ تھا مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ یا اس کے ارد گرد کوئی جانتا تک نہیں کہ وہ دراصل کون تھا، کس کی اولاد تھا، جن کی وہ اولاد تھا انہوں نے اسے کب اور کہاں ایسا گم کر دیا تھا کہ وہ بے نشان منزل کا راہی بن کر رہ گیا۔ اور اب زندگی کے اس انتہائی اہم مگر غیر متوقع موڑ پر اس کے اندر یہ خیال زیادہ شدت سے سر اٹھا رہا تھا۔

کیا اس کے اپنے ماں باپ اس کے لیے ایسے ہی اچانک فیصلے کرتے جیسے چوہدری صاحب نے کیا تھا؟ وہ ہوتے تو کیا ایسے ہی اہتمام کرتے؟ وہ ہوتے تو کیا خود کے ان پڑھ ہونے اور بھین جی کی بیٹی کے پڑھے لکھے ہونے پر شرمساری سے یوں اس کی نظریں جھکی ہوتیں؟ سعدیہ علم والوں کی بیٹی تھی، جس کا باپ لوگوں کے بچوں کو اللہ کا کلام پاک پڑھاتا تھا۔ پانچ وقت کی اذان کے ذریعے لوگوں کو اللہ کے سامنے جھکنے کے لیے بلاتا تھا اور سعدیہ بھین جی کی بیٹی تھی جنہوں نے کھاری کو اس کی اس جھجک سے باہر نکالا تھا کہ مذہب کی تعلیم بچپن سے زندگی کا حصہ نہیں بنی تو کبھی نہیں بن سکتی۔ انہوں نے اسے اللہ کا کلام پڑھنا اور اس کے سامنے جھکنے کا سلیقہ سکھایا تھا، پھر وہ ان پڑھ، بے سلیقہ، عقل سے پیدل شخص اتنی بڑی ہستیوں کی بیٹی کے قابل کیسے ہو سکتا ہے۔

"مجھے یہاں سے لے جاؤ کھاری! خدا کا واسطہ ہے۔ مجھے یہاں سے لے چلو۔"

اسے سعدیہ کی وہ ڈرامائی اور غیر متوقع گفتگو یاد آنے لگی جو اس روز اس نے بھین جی تک سے جھجکے بغیر اس کے سامنے کی تھی۔

"میرے اللہ! میں کس چکر میں پھنس گیا ہوں، میں آزاد مست من موجی بندہ، کیسی ہتھکڑی بغیر کسی جرم کے مجھے لگائی جا رہی ہے، نہ سمجھ ہے نہ عقل کہ دماغ لڑاؤں اور گتھیاں سلجھالوں۔"

بار بار انہی حقیقتوں میں الجھنے کے بعد دل کا بڑھتا بوجھ آنسوؤں کی شکل میں بہہ نکلا۔

"نہ کوئی بیلی ہے نہ کوئی ساتھی، جس کے سامنے دل کی بھڑاس نکالوں۔"

وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ تاریک اور خاموش کمرے کے سکوت کو چند لمحوں بعد اس کی ہچکی لمحہ بھر کو توڑتی اور پھر سے خاموشی چھا جاتی۔

✡ ✡ ✡

ایک بالکل ہی نئی صورت حال نے جیسے اس کے دل و دماغ روح اور جسم میں بجلی کی طرح کی توانائی بھر دی تھی۔ بچپن سے لے کر لڑکپن تک کی زندگی اس نے اماں اور ابا جی کے پروں تلے دبے رہ کر گزاری تھی۔ وہ زندگی سیدھی سادی اور پرسکون تھی۔ نہ ذہن میں کوئی سوال اٹھتا تھا نہ زندگی کے کسی پہلو کے بارے میں دل میں کوئی شک محسوس ہوتا تھا۔ مسئلہ تب ہوا جب آنکھیں کھول کر ارد گرد دیکھنے کی عمر آئی۔ اس عمر میں آکر اسے اندازہ ہوا کہ بظاہر سیدھی سادی اور دور شانہ زندگی کے تانوں بانوں میں تو بہت جھول تھے۔ سفید پوشی، مصلحت اور توکل کی چادر میں ایسے سوراخ بھی تھے جو عام آنکھ سے دکھائی نہیں دے سکتے تھے۔

اس غیر اہم بے ضرر سوالوں کے جواب میں اسے جھڑکیاں ملی تھیں۔ لیکن اب اصل مسئلہ سوالوں کے جواب نہ ملنے کا ہی نہیں رہا تھا اب اصل بات یہ تھی کہ آنکھیں کھول کر چیزوں کا مشاہدہ کرنے کی حس بیدار ہو چکی تھی، بصارت کا تحفہ اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اسے اب اندازہ ہوا تھا کہ بغاوت بھی کسی چیز کا نام ہے اور بغاوت کا چھرا اپنے مقربین کے سینے میں گھونپ دینا کوئی بڑا جرم نہیں تھا، ہاں اس کے بدلے من چاہی زندگی بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ابھی وہ اپنے دل و دماغ پر صبر اور تحمل کے چھینٹے اڑاتی اس ادھیڑ بن ہی میں مصروف تھی کہ اماں کے رد عمل کے خلاف کس قسم کی بغاوت نتیجہ خیز رہے گی کہ اس کی سماعتوں نے ایک ایسا مژدہ سن لیا جو خاصا جاں فزا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ اس کا ایک بار یہ کہنا۔ "مجھے یہاں سے لے جاؤ۔"

کھاری کا منہ عمر بھر کے لیے کھول دینے کو کافی تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اتنی بے ساختہ درخواست کے جواب میں کھاری کا سر انکار میں نہیں ہل سکتا تھا۔ اپنے تئیں سعدیہ کلثوم نے ایک ایسا میدان مار لیا تھا جس میں طبل جنگ ابھی بجا ہی نہیں تھا اور یہ میدان مار لینے کے بعد وہ شادی مرگ کی کیفیت میں مبتلا تھی۔ وہ اس کیفیت میں اس لیے مبتلا تھی کہ وہ لفظ "شادی" کے مفہوم کے بارے میں بالکل بے خبر تھی۔ باون صفحات کا پرچہ دلہنوں کی تصویریں، نت نئے ملبوسات اور میک اپ کی اشیا کے بارے میں معلومات تو دیتا تھا مگر شادی کے لڈوؤں کی خصوصیات اس نے سعدیہ کلثوم کے گوش گزار نہیں کی تھیں۔

اس وقت سعدیہ فارم ہاؤس کے ایک کمرے میں سہیلیوں کے درمیان سبز اور پیلے جوڑے میں ملبوس آنے والے لمحات کے خوش کن تصورات میں گم تھی۔ وہ اتنی خوش تھی کہ اس کو اپنے خوابوں کی دنیا کے تصور کے کسی گوشے میں کھاری کے ساتھ جیسے چبھتے تصور کی چبھن بھی ناگوار نہیں لگ رہی تھی۔ وہ اماں جیسے عفریت سے آزاد ہونے جا رہی تھی اور ابا جی کے منافقانہ طرز عمل سے بھی اسے نجات ملنے والی تھی۔ اس سوچ ہی نے اس کے دل و دماغ، روح اور جسم میں بجلی کی سی توانائی بھر دی تھی۔

✵ ✵ ✵

اس جگہ کے باسیوں کے لیے وہ شاید ایک عجوبہ ثابت ہو رہا تھا۔ شام کے دھندلکے میں جب وہ اپنا چھوٹا سا ہینڈ کیری بیگ اٹھائے بس سے گاؤں کے اسٹاپ پر اترا' اسے اس گاؤں کی طرف جاتے راستے پر دو مرد کھڑے نظر آئے۔

"السلام علیکم۔۔۔ مجھے محمد افتخار احمد کے پاس جانا ہے۔" اس نے ان دونوں سے باری باری ہاتھ ملانے کے بعد کہا تھا۔ جواب میں ان دونوں نے حیرت سے سرتاپا اس کا جائزہ لینے کے بعد ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور زور سے ہنس دیے۔

"اے اردو بولدا اے۔ (یہ اردو بولتا ہے)۔" ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔

"اے افتخار احمد کون اے؟" دوسرے نے ہنسی دباتے ہوئے کہا۔

"وہی جس کی شادی ہو رہی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے یاد دلایا۔

"شادی کس کی ہو رہی ہے؟" ان دونوں میں سے ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

"وہ فارم ہاؤس میں رہتا ہے۔" وہ مزید مسکراتے ہوئے بولا۔

"اچھا!" ایک شخص نے اچھا کو لمبا کھینچتے ہوئے کہا "کھاری دی بات کر رہے ہو۔"

"جی جی۔ بالکل۔" وہ شانے اچکا کر مسکرایا۔ اب وہ دونوں دلچسپی سے اس کی طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ چڑیا گھر سے بھاگا ہوا کوئی جانور ہو۔

"میں اس کا دوست ہوں' محمد رضوان الحق۔" وہ عادتاً مزید مسکرایا' اسے خبر نہیں تھی کہ مسکراتے ہوئے اس کی آنکھیں مزید چھوٹی لگنے لگتی تھیں' بالکل چھوٹے بچے جیسی۔

"کھاری کے غیر ملکی دوست۔" اس نے سنا' ان میں سے ایک نے دوسرے کے کان میں سرگوشی کی۔

"جی میں کھاری کا پاکستانی دوست ہوں۔" جواب میں اس نے ان کی آسانی کے لیے پنجابی میں کہا۔

"ارے یہ تو پنجابی بھی جانتا ہے۔" ان دونوں نے بے ساختہ کہا۔

"پتا نہیں کون ہے' کوئی جاسوس نہ ہو۔" ایک بولا۔

"میں کھاری کا دوست ہوں بھئی! آپ صرف مجھے فارم ہاؤس کا راستہ بتا دیں۔" ان دونوں کی بحث نے اسے جھنجلا دیا۔ اگرچہ وہ جانتا تھا کہ ان کا ردعمل فطری تھا۔ ان سادہ لوح دیہاتیوں نے چہرے مہرے سے اس غیر ملکی نظر آنے والے بندے کو اردو یا پنجابی بولتے کہاں سنا ہو گا۔

"چلو جی! ہمارے ساتھ چلو۔" ان میں سے ایک نے اس کی مدد کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر ہنسی دبانے کی سرخی چھائی ہوئی تھی۔ اس رات دوستوں میں بیٹھ کر ایک دلچسپ واقعے کو حاشیہ لگا کر سنانے کا خوب موقع ان کے ہاتھ آیا تھا۔

✵ ✵ ✵

"میں تمہاری سب بات سمجھ رہا ہوں یار!" اس نے آنسو بہاتے کھاری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ فارم ہاؤس کے مین گیٹ سے اندر داخل ہونے کے بعد کھاری تک پہنچتے پہنچتے اسے کتنی ہی بار خود سے متعلق پوچھے جانے والے سوالوں کے جواب دینا پڑے تھے۔ جب اسے کھاری کے کمرے کے دروازے کے باہر تک پہنچایا گیا۔ وہ اپنے یہاں آنے پر پچھتاوا محسوس کرنے لگا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا' وہ دنیا کا کوئی بڑا عجوبہ تھا جو غلطی سے اس

بستی میں لا پھینکا گیا تھا۔ وہ اپنی کوفت کو دل میں ہی دباتا دروازہ کھول کر کھاری کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس کی توقع کے برعکس اس کمرے میں روشنی کے بجائے تاریکی تھی اور کھاری کے چہرے پر مسرت کے بجائے غم نے سایہ کر رکھا تھا۔

"یہ کیا یار!" کھاری اسے دیکھ کر بے اختیار اٹھ کر اس کے گلے لگ کر رونے لگا تھا۔

"کیوں رو رہے ہو؟" جواب میں کھاری کی داستان غم سن کر اگرچہ اس کا دل بھی اس درد کو محسوس کر رہا تھا جو کھاری کے دل میں نشتر کی صورت اٹھ رہا تھا۔ مگر وہ افتخار احمد عرف کھاری کو صرف دوست ہی نہیں' بھائی کہہ چکا تھا۔ سو اس نے نرمی سے اسے سمجھانا شروع کیا۔

"ارے کھاری! ہم تمہاری شادی کے لیے خاص طور سے آئے ہیں اور تم ہم سے ملے بھی نہیں۔"

ابھی وہ کھاری کو پوری طرح تسلی دے بھی نہیں پایا تھا کہ خواتین کا ایک ریلا کمرے میں گھسا' جس کے آگے وہی لڑکی تھی جسے اس نے اس گھر کے گیٹ پر دیکھا تھا جہاں سے وہ کھاری کو لینے گیا تھا۔

"لے جھلیا! شادی بیاہ پر لڑکیاں روتی ہیں' وہ تیری ہونے والی بیوی۔۔۔ اس کے تو دانت اندر نہیں جا رہے اور تو لڑکیوں کی طرح ادھر بیٹھا رو رہا ہے۔" ایک بڑی عمر کی خاتون نے کھاری کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔

"چل اٹھ شاباش!" اس کا بازو پکڑ کر اٹھاتے ہوئے اس عورت کی نظر رضوان الحق پر پڑ گئی۔

"ہائے یہ کون ہے؟" اس نے بھی اسے دیکھ کر ویسا ہی ردعمل ظاہر کیا جیسے اس سے پہلے بیس لوگ دے چکے تھے۔

"ارے جیمنیز خرگوش۔۔۔ تم یہاں پہنچ گئے؟" اس لڑکی نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

جواب میں وہ ادب سے سر جھکاتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا۔

"گڈ بھئی۔ تم تو پھر کھاری کے اسپیشل مہمان ہوئے۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"ماسی جنت! یہ لڑکا چینی' جاپانی ہے نہیں' صرف لگتا ہی ہے۔" اس نے اس خاتون سے کہا جو ابھی تک تشویش کے ساتھ رضوان الحق کو دیکھ رہی تھی۔

"چلو بھئی کھاری اٹھو' اپنے نکاح کا جوڑا پہنو۔ بس اب تو تمہاری آزادی کے کچھ منٹ ہی باقی ہیں۔" وہ سر کے بالوں کو جھٹکا دے کر چہرے سے ہٹاتی کھاری سے مخاطب ہوئی۔ رضوان الحق اسے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

"پیاری لڑکی! نجانے تمہیں دیکھ کر مجھے کوئی اور بھی زیادہ شدت سے کیوں یاد آنے لگتا ہے۔" وہ دل میں سوچ رہا تھا۔ ہنستا مسکراتا زندگی سے بھرپور وہ چہرہ جو اب وقت کی دھول کے پیچھے نظر سے غائب ہو چکا۔ وہ اداسی سے مسکرایا اور اٹھ کر کھاری کی تیاری میں اس کی مدد کرنے میں مصروف ہو گیا۔

✵ ✵ ✵

سارے میں چھوٹی بڑی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ پنڈال خالی تھا۔ اس میں بچی کرسیاں بھی بے ترتیب ہو چکی تھیں' جس کا جدھر کو دل چاہا کرسی کا رخ ادھر کو موڑے بیٹھا کھاری کے نکاح کی تقریب میں شامل ہونے کے بعد اپنے گھر واپس جا چکا تھا۔ ماہ نور نے پنڈال کے درمیان گڑے ایک بانس سے ٹیک لگاتے ہوئے اپنے سیل فون کی اسکرین روشن کی۔ کچھ دیر پہلے ختم ہونے والی تقریب کے منظر اس کی نظروں کے سامنے اسکرین پر دوڑنے بھاگنے لگے۔ کھاری کو پیلے رنگ کا کرتا اور سفید شلوار پہنائی گئی تھی۔ سرخ اور زرد پھولوں کے ہار گلے میں ڈالے وہ جھینپا' گھبرایا' شرمایا لڑکا کتنا معصوم لگ رہا تھا۔ وہ مسکرائی۔ "اف توبہ کھاری کے سسر یعنی مولوی صاحب کا ڈیل ڈول اور رنگت و شکل کتنی خوفناک ہے' لگتا ہے کسی افریقی مسلمان ملک کے مولوی تھے پہلے۔"

اس نے دل میں سوچا اور اسکرین پر انگلی پھیر کر اگلے منظر کی طرف چلی۔ کھاری کا نکاح مولوی صاحب خود پڑھا رہے تھے۔

"واہ بھئی سلمان نے تو نکاح نامے پر کھاری کے دستخط تک فوکس کرلیے۔" اسے ہنسی آئی "افتخار احمد بقلم خود۔" کھاری کے دستخط دیکھ کر وہ پہلے سے زیادہ زور سے ہنسی۔ ٹیڑھے میڑھے حروف "افتخار احمد بقلم خود" کی شکل میں نکاح نامے پر اپنی شان دکھا رہے تھے۔

اگلا منظر لڑکی کے نکاح کا تھا۔ سرخ گوٹے کے پھولوں سے سجی بڑی سی پیلی چادر میں لڑکی کی شکل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ مولوی صاحب مسکین سی آواز میں لڑکی سے اقرار لے رہے تھے۔

"قبول ہے' قبول ہے' قبول ہے۔" کی واضح آواز البتہ بڑی چادر کے اندر سے سنائی دی تھی۔

"واہ بھئی لڑکی تو بہت خوش لگتی ہے۔"

ماہ نور نے اندازہ لگایا۔ اس کے بعد اس کے منظر میں گاؤں کی خواتین کے ڈھولک بجانے اور لڈیاں ڈالنے کے لمحات قید تھے "گانے' ڈھول' شور شرابا اف! ہر کوئی ایسے خوش ہے جیسے اسی کی شادی ہو رہی ہو۔ وہ پُرشوق' پُرجوش اور ہنستے مسکراتے چہرے دیکھ کر سوچ رہی تھی۔

"ارے ہاں' یہ لڑکی کی اماں کتنی مختلف لگ رہی ہیں البتہ باقی سب سے۔"

ایک منظر کو دیکھتے دیکھتے اس نے رک کر سوچا۔ تائی صابرہ کڑوا سا منہ بنائے لڑکی کی اماں سے گلے مل رہی تھیں۔ لڑکی کی اماں تائی صابرہ کے چہرے پر ناگواری کا تاثر دیکھ چکی تھیں "اسی لیے گلے ملنے کے فوراً" بعد ذرا ہٹ کر ایک نیچے پیڑھے پر خاموشی سے بیٹھ گئی تھیں اور باقی کی تقریب میں وہ اسی جگہ اسی طرح بیٹھی نظر آ رہی تھیں۔

"صرف مجھے ایسا لگ رہا ہے یا واقعی ان خاتون کے چہرے پر ٹینشن نظر آ رہی ہے' بلکہ شاید کوئی الجھن' کوئی گہری سوچ' کوئی بڑا پریشان کن خیال۔

ہاں بھئی بیٹی کو رخصت جو کرنے والی ہیں تو یہاں کی ماؤں کو ٹینشن تو ہوگی۔" پھر اس نے سوچا۔

"ہماری ماڈرن ماؤں کی طرح تھوڑی ہیں' نہ فکر نہ فاقہ' ایک دم ٹینشن فری' ہر کام اتنے پُریقین طریقے سے کرتی ہیں کہ فیل یا فلاپ ہونے کا کوئی خطرہ ہی نہیں۔ اگر بیٹی کو شوہر نہ بھی پسند آئے' ہم آہنگی کی صورت پیدا نہ بھی ہو تو کیا ہوا شادی ختم کردیں گے' ٹینشن لینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

اس نے اپنے اردگرد موجود لوگوں کو یاد کیا اور خود اپنے خیال پر ہی ہنس دی۔ پھر اس نے اسکرین کو دیکھا جس پر سلمان اور سعد گاؤں کے لوگوں کے درمیان موجود تھے۔ سلمان ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا اور جن لوگوں کے درمیان بیٹھا تھا ان سے فاصلہ رکھنے کی ایک نامحسوس کوشش بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ سلمان کی اس کوشش کو صرف ماہ نور ہی محسوس کرسکتی تھی کیونکہ وہ اس کا اپنا بھائی تھا اور اس کے مزاج سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔

اس نے اس منظر کو واپس اسکرین پر لا کر سعد کو دیکھا وہ ہر چیز سے بے نیاز اپنے اردگرد بیٹھے لوگوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مگن تھا۔ کہیں کہیں کان میں پڑتی اس کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ان سے ان ہی کی زبان میں بات کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا سعد کی سنائی باتوں کو سن کر وہ لوگ وقفے وقفے سے ہنس بھی رہے تھے' وہ ان میں ان ہی جیسا بن کے بیٹھا تھا۔

"بہروپیا کہیں کا۔" اس نے مسکراتے ہوئے فون سے دھیان ہٹایا اور سر اٹھا کر پنڈال کے اندر لگے برقی قمقموں کو دیکھنے لگی۔ اسے اچانک خیال آیا کہ اس روز وہ بہت خوش تھی' اتنی خوش کہ اسے ہر چیز بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے اسی سرخوشی کے عالم میں یاد کرنا چاہا کہ اس روز وہ اتنی خوش کیوں تھی۔

"اس لیے کہ تمہارے اندر سے یہ خیال جا نہیں رہا کہ یہ وہ دن ہے جب سعد اور تم ایک ہی جگہ ایک ہی چھت

کے نیچے پچھلے کئی گھنٹوں سے موجود ہو۔" اس کے دل نے چپکے سے اسے بتایا۔

"کیا بات ہے' اس وقت یہاں اکیلی لڑکی کیا کر رہی ہو؟" چہرہ دوسری طرف پھیرنے پر اسے وہ نظر آیا' جس کے نظر آنے پر اس کے محسوسات نے دل کی بات پر یقین کرلیا۔

"بس یونہی۔"

"یہاں خنکی ہے اور تم نے نہ تو سوئیٹر پہنا ہوا ہے نہ ہی کوئی شال اوڑھی ہوئی ہے۔" سعد نے نرمی سے کہا۔

"یہ اتنا سا احساس بھی کتنا کافی ہے کہ اسے میرا خیال ہے۔" دل سے ایک ہلکی سی آواز اٹھی۔

"یونہی میں باہر آگئی اچانک مجھے یہ لائٹس اچھی لگ رہی تھیں۔" وہ پہلی بار سعد سلطان سے بات کرتے ہوئے اٹک رہی تھی۔

"ہاں ہاں یہ لائٹس اچھی ہیں۔" وہ بھی روشنیوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "ماہ نور! تمہارے چچا سے میں آج بہت متاثر ہوا ہوں۔" پھر اس نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"کیوں بھلا؟" ماہ نور نے کہا۔

"کھاری کے سلسلے میں انہوں نے واقعی گریٹ نیس کا مظاہرہ کیا۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "میں نے آج ہی یہاں لوگوں سے سنا کہ کھاری ان کو کہیں لاوارث حالت میں پڑا ملا تھا' چھوٹا سا بچہ جس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ کس کی اولاد تھا۔"

"ہاں شاید ایسا ہی ہوا تھا۔" ماہ نور نے ایک بار پھر اٹکتے ہوئے جواب دیا۔

"پتا نہیں انہوں نے پتا لگانے کی کوشش کی یا نہیں کہ کھاری ہے کون' اس کا آگا پیچھا کیا ہے۔"

"پتا نہیں۔" ماہ نور نے سر جھٹکا۔ "اتنی تفصیل تو میں نے کبھی نہیں پوچھی۔"

"ہوں!" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا "میں ضرور پوچھوں گا کسی وقت تمہارے چچا سے۔"

"توبہ ہے سعد!" وہ ایک دم اپنے مخصوص انداز میں بولی "تمہیں کتنی دلچسپی ہوتی ہے ایسے قصوں میں۔ ایسے قصوں کی تو بال کی کھال اتارتے ہو تم۔"

"کیسے قصوں کی؟" وہ مسکرا کر بولا۔

"ایسے ہی اوٹ پٹانگ قصوں کی' کھاری کا آگا' پیچھا' فلزا ظہور کے ویرا باؤٹس' خدیجہ خالہ کی مرڈرڈ کزن کی کہانی۔ تمہیں کیسی کیسی باتوں میں دلچسپی ہوتی ہے' ایسی باتیں جن کی طرف کسی اور کا دھیان بھی نہ جائے۔"

"ہاں! یہ تو ہے مجھے قصے سننے میں بہت دلچسپی ہے' میں واقعی انجوائے کرتا ہوں قصے سنتے ہوئے۔" وہ ہنسا۔

"تمہیں دنیا کے ہر کام' ہر چیز میں دلچسپی ہے سوائے ــــ" وہ جھنجلا کر کہتے کہتے بے اختیار رک گئی' بلکہ اس نے خود کو جملہ مکمل کرنے سے روک لیا۔

"سوائے کیا؟" وہ چونک کر بولا۔

"سوائے" وہ بوکھلا کر نظریں ادھر ادھر گھماتی کوئی جواب سوچنے لگی۔

"ہاں بتاؤ۔ سوائے کیا؟" وہ اس کی بوکھلاہٹ دیکھ کر محظوظ ہونے لگا۔

"اچھا چلو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ۔" کوئی جواب نہ سوجھنے پر اسے ایک اور احمقانہ خیال آیا۔

"ہاں پوچھو۔" وہ ماہ نور کے عقب میں رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"یہ بتاؤ کہ لو ایٹ فرسٹ سائٹ (پہلی نظر کی محبت) کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" ایک اور اوٹ پٹانگ سوال ماہ نور کے منہ سے نکلا۔

"لو ایٹ فرسٹ سائٹ۔" وہ چونک کر بولا اور پھر اس کے چہرے پر اس کی مخصوص شرارت بھری مسکراہٹ

ابھری "یہ سوال تم نے کیوں پوچھا؟" وہ مسکرایا۔

ماہ نور اس سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنی بے ساختہ اور عجلت پسند عادت پر خود کو کوسنے میں مصروف رہی۔

"کیا بات ہے ماہ نور! تمہیں ہوا تو نہیں کسی سے لوایٹ فرسٹ سائٹ؟" وہ حسب عادت شرارت کے موڈ میں آچکا تھا۔

"اور تو کوئی خاص بندہ یاد نہیں آرہا مجھے اس ساری تقریب میں جس پر گمان ہو، ہاں! نکاح خواں مولوی صاحب خاصے ہینڈسم تھے۔" وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔

"توبہ استغفار کرو۔ وہ کھاری کے سر تھے۔" وہ تیزی سے بولی۔

"کھاری کے سر تھے تو کیا ہوا' دل تو کسی پر بھی آسکتا ہے۔"

"سعد پلیز۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"اچھا اچھا پلیز اب رونے نہ لگ جانا' میں مذاق کر رہا تھا۔" وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ "ان محترم بزرگ کی شان میں بھی گستاخی کر دی میں نے مذاق ہی مذاق میں۔"

"میں سنجیدگی سے پوچھ رہی ہوں سعد!" ماہ نور نے منہ سے نکلی بات پر ڈٹے رہنے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

"او رئیلی!" وہ حسب عادت مسکرایا۔ ماہ نور نے اثبات میں سرہلا دیا۔

"بات یہ ہے ماہ نور!" کچھ دیر اس گومگو میں رہنے کے بعد کہ اس کی بات کا کیا جواب دے' اس نے ماہ نور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہ میں اپنی زندگی کی چند الجھنوں کو سلجھانے میں اتنا مشغول ہوں کہ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کوئی دوسری فیلنگ میرے اندر آتی بھی ہے یا نہیں۔"

"او۔" ماہ نور کا دل دور کہیں بہت ہی دور گہرائیوں میں اوٹ لے گیا۔

"مگر تم تو بہت فارغ لگتے ہو۔" اس کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی تلخی آگئی۔

"فارغ؟" وہ ہنسا۔ "ہاں شاید لگتا ہوں۔"

"بہروپ بدل بدل کر مختلف جگہوں پر جانے' معذوروں' ناداروں اور مسکینوں کی دلجوئی کرنے اور اس سا میں کے پاس بیٹھ کر باتیں سننے کے سوا تمہیں کیا کام ہے' تمہیں بظاہر دیکھ کر تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ تمہاری زندگی میں بھی کوئی الجھن ہے۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔" اس کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر ابھرا۔ "شاید تم بالکل ٹھیک کہتی ہو اور تمہارا یہ سچ ہی میرا سب سے بڑا المیہ ہے۔"

"المیہ۔" ماہ نور کا غصہ کرتا دل اچانک پلٹنے لگا۔ "کیسا المیہ؟"

"میں نے تمہیں اس المیے کی ایک جھلک اس دن سنائی تو تھی جب تم نے پوچھا تھا کہ کیا میں نے وہ باتیں کسی اور سے بھی کبھی شیئر کی ہیں؟"

"ہاں!" ماہ نور کو یاد آیا۔ "مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم سیدھی طرح اپنے ڈیڈی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے کہ تمہاری مدر کون تھیں اور ان کے ساتھ کیا ہوا؟"

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ اس بات کا کیا جواب دیتے ہیں۔ ان کے جواب کے تین نکات یہ ہیں۔ تمہاری ماں مر چکی۔ وہ گانے بجانے کی دنیا سے تعلق رکھتی تھی اور یہ کہ بہتر یہ ہے کہ میں اپنی ماں کے بارے میں ان سے کچھ نہ پوچھوں کیونکہ وہ مجھے میرے سوال کا جواب اس لیے نہیں دیں گے کہ جواب پاکر مجھے بہت مایوسی ہوگی۔"

"تو تم کہو نا کہ تمہیں اپنی مایوسی کی کوئی پروا نہیں' وہ جواب دے دیں۔" ماہ نور نے مشورہ دیا۔

"تم انہیں نہیں جانتیں ماہ نور! جہاں جا کر وہ اپنی ذات کے دروازے بند کر لیتے ہیں' اول تو کوئی وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتا' پہنچ بھی جائے تو بند دروازے پر دستک دیتا ہی رہ جائے' دروازہ کبھی نہیں کھلے گا۔"

"آخر ایسی کیا بات ہو سکتی ہے تمہاری مدر کے سلسلے میں جو وہ یوں دروازہ بند کر لیتے ہیں۔" ماہ نور نے سعد کی بات پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"یہی تو میرا مسئلہ ہے۔ جتنا وہ اس بات پر خاموشی اختیار کرتے ہیں' اتنا ہی میرا تجسس اس سلسلے میں بڑھتا جاتا ہے۔ میرے ذہن میں جگسا پزل کی طرح یہ سوال گتھی بن کر بیٹھ گیا ہے پہلے میں بہت بے صبر تھا' مجھے جلدی پڑی رہتی تھی کہ کہیں سے مجھے اس بات کا کوئی کلیو مل جائے مگر آہستہ آہستہ میں نے یہ تسلیم کر لیا کہ بے صبری اور عجلت گتھیاں سلجھاتی نہیں' انہیں مزید بڑھاتی ہے۔ پھر میں نے صبر اور تحمل کا ہاتھ پکڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اسی لیے شاید تم نے دیکھا ہو گا میں نئی سچویشنز کو آسانی سے ایڈاپٹ کر لیتا ہوں۔ لیکن میرے دل کے اندر تجسس کی ہلچل ہر وقت مچی رہتی ہے۔ جسے تم بہروپ بدل کر مختلف جگہوں پر جانا سمجھتی ہو' یہ میرا مشغلہ نہیں' اسی ہلچل کا حصہ ہے۔ میں نے سوچا: اس پہیلی کا جواب یوں ہی مجھے کسی ایسی جگہ پر اچانک مل جائے۔ ہو سکتا ہے یہ بھی میری احمقانہ سوچ ہی ہو' مگر دل کے بہلانے کو برا خیال ہرگز نہیں ہے۔" بات ختم کرتے ہوئے ماہ نور کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"کتنی عجیب سی بات ہے نا!" ماہ نور نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کتنے ہی لوگ تمہیں اور تمہارے لائف اسٹائل کو دیکھ کر رشک کرتے ہوں گے' کون جان سکتا ہے کہ تم دراصل کتنے مضطرب ہو۔"

"میں کسی کو جاننے دینا بھی نہیں چاہتا۔" اس نے سرہلایا۔ "میں بہت کم خود کو کسی کے سامنے ایکسپوز کرتا ہوں۔" اس نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ "مگر تم تو تم ہو۔ مجھے پتا ہے کہ تم سے دل کی بات کہنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ تم نے اس پر گوسپ کرنا ہے نہ اسے آگے اڑانا ہے' ہاں میرے دل کا بوجھ قدرے ہلکا ہو جاتا ہے......"

"آئی ایم آنرڈ۔" ماہ نور نے سعد کی یہ بات سن کر آنکھیں زور سے بند کرنے کے بعد کھولتے ہوئے کہا۔

"تمہیں نہیں لگتا ہے کہ ہم میں سے اکثر جو دنیا کے سامنے ہوتے ہیں دراصل وہ نہیں ہوتے۔" سعد نے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"یہ بھی ایک ٹریجڈی ہے' اللہ نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا اور انسان نے خود پر ملمع چڑھا لیا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"رات کافی زیادہ ہو گئی ہے اب تم ریسٹ کرو۔" اس نے کہا اور اندر کی طرف چل دیا۔

"سعد! وہ کس کی کال تھی جسے تم بار بار ریجیکٹ کر رہے تھے؟" عقب سے ایک اور جذباتی اور ان سوچا سوال آیا۔

"یہ میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔" اس نے بغیر مڑے جواب دیا۔ "کیونکہ یہاں آکر تم بہت خوش ہو مگر میرا جواب تمہارے سارے موڈ کا ستیاناس کر دے گا۔"

"سارہ کا؟" ماہ نور کی زبان پر نام آتے آتے رہ گیا بلکہ اس نے زبان کو دانتوں تلے دبا کر اسے روک لیا۔

"اور ہاں" پھر اس نے گردن موڑ کر ماہ نور کی طرف دیکھا۔ "لوایٹ فرسٹ سائٹ والے سوال پر غور کرنے کا جب بھی وقت ملا' غور کر کے اس کا جواب ضرور دوں گا' ابھی میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے۔"

"شاید میں تمہیں کبھی نہ سمجھ پاؤں۔" ماہ نور نے ایک بار پھر خود کو ستون سے ٹکاتے ہوئے سوچا۔ وہ مرد انہ حصے

کی طرف کھلنے والا دروازہ کھول کر اس کے اندر غائب ہو چکا تھا۔

"لیکن شاید میں تمہارے لیے اپنے دل میں اٹھنے والے جذبے کو بھی کبھی نہ دبا سکوں۔" اس نے بے چینی سے سر ہلا کر اوپر دیکھا۔

"سنا ہے محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے' اس پر کسی کو اختیار نہیں۔ پہلے سنا تھا اب سمجھا ہے اور اب لگتا ہے کہ جو سنا تھا' وہ سچ تھا۔ اس پر کسی کو اختیار نہیں۔ یہ ہونے پر آتی ہے تو ماہ نور کو سعد کے سحر میں جکڑ دیتی ہے اور سعد کو سارہ خان کا اسیر بنا دیتی ہے۔ لاکھ تم جھٹلاؤ۔ کیا مجھے نظر نہیں آتا اور میری سمجھ میں نہیں آتا؟" اس کی دونوں آنکھوں میں شفاف پانی کا ایک ایک قطرہ اٹدا اور پلکوں پر آکر رک گیا۔

"خوش قسمت ہو تم سارہ خان! سب کچھ گنوا کر کائنات کو پالیا۔" اس نے چہرے کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ پانی کے دونوں قطرے پلکوں سے نیچے چہرے پر لڑھک گئے۔

"لیکن ایک حقیقت کو قبول کرنے سے دوسری جھٹلائی نہیں جا سکتی۔" آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے اندر آتے آتے اس نے خود کے سامنے اعتراف کرتے ہوئے سوچا۔

"ایک حقیقت یہ ہے کہ تم سارہ خان کو بی لونگ کرتے ہو اور دوسری حقیقت یہ ہے کہ میرا اپنے دل پر اختیار نہیں رہا کیونکہ محبت کی نہیں جاتی' ہو جاتی ہے۔"

☼ ☼ ☼

"دیکھا آپ نے رابعہ بی بی! اللہ جل شانہ کا حسن انتظام۔"

اس رات مولوی سراج سرفراز نے آپا رابعہ سے کہا۔

"وہ پتھر کے کیڑے کو رزق پہنچاتا ہے کیونکہ اس کا ذمہ اس نے خود لیا ہے۔ آپ نے دیکھا۔ وہ مشکل اور پریشانی جو سعدیہ کے بچپن سے لے کر اب تک ہمارے ساتھ تھی۔ کیسے بیٹھے بٹھائے آسان اور حل ہو گئی۔ واہ واہ سبحان اللہ!" انہوں نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

"زندگی میں میں نے چوہدری سردار جیسا دل والا نہیں دیکھا۔ آپ نے دیکھا۔ آج نکاح کی رات تھی صرف اور نکاح کے موقع پر سب اخراجات لڑکی کے والدین کو برداشت کرنے پڑتے ہیں مگر واہ واہ!" انہوں نے ایک بار پھر سر دھنا۔

"چوہدری صاحب نے صرف اس تقریب پر ہی کتنا دل کھول کر خرچ کر دیا۔ لڑکے کے ہی نہیں' لڑکی کے وارث بھی بن گئے۔ دم پخت مرغ کے ڈھیر لگے ہوئے تھے دیگوں میں اور پالک گوشت میں چھوٹے بکرے کا گوشت ڈلوایا خاص طور سے منگوا کر تاکہ نرم رہے اور کھانے والے کے دانتوں میں ریشہ بھی نہ پھنسے اور یہ نہیں کیا کہ آرڈر پر اکٹھے نان منگوالیں' ادھر کے تندوروں سے تازہ نان نکل کر آرہے تھے۔ کیا خوشبو تھی کیا ذائقہ تھا ان نانوں کا۔"

"واہ مولوی صاحب! آپ کا تو پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں آنے والا حساب ہے۔" آپا رابعہ نے اپنے ذہن پر چھائے تناؤ کو جھٹک کر سوچا۔ "ذرا سی بھی غیرت نہیں دکھائی گئی آپ سے۔ چوہدری صاحب کے کہنے پر اپنا بوریا بستر سمیٹ ادھر آبراجمان ہوئے' کیا جاتا جو کہتے غریب ہوں' استطاعت کم رکھتا ہوں لیکن پھر بھی روکھی سوکھی پر ہی سہی لڑکی کو میرے ہی گھر سے آکر رخصت کروا کر لے جائیں۔ مگر آپ تو چوہدری صاحب کی تجویز پر بغلیں بجانے لگے کہ شربت کے پیالے تک کے خرچے سے جان چھوٹی۔" انہوں نے کڑھتے اور سوچتے ہوئے سر جھٹکا۔

"سنا ہے چوہدری صاحب نے سعدیہ کے لیے اچھی خاصی بری بنائی ہے اور بھئی ہم سے تو ایک تار تک کی

فرمائش نہیں کی۔ الٹا کہنے لگے مولوی صاحب! آپ نے کوئی تردد نہیں کرنا۔ بیٹی ہماری ہوئی۔ ہم جانیں ہمارا کام جانے۔ آپ بس مسجد کی خدمت دل لگا کر کرتے رہیں۔"

کھانے سے ہٹ کر مولوی سراج کو دوسرا خیال آیا۔

"تار ہو تا تو دیتے نا' مولوی سراج آپ کا تو پوٹا تر رہے بس اس کے سوا نہ کوئی فکر ہے نہ فاقہ......"

"اب میں سوتا ہوں بھئی! سویرے سویرے مسجد جانا ہے' یہاں سے دور پڑتی ہے' اپنے گھر کی تو اور بات ہے۔" مولوی صاحب نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

"چوہدری صاحب نے کہاں کہاں سے مہمان بلوا رکھے ہیں بھلا؟"

آپا رابعہ نے مولوی سراج کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھنا چاہا مگر مولوی صاحب کروٹ بدلتے ہی خراٹے بھرنے لگے تھے۔ انہیں ادھر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ مایوس ہوتے ہوئے انہوں نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

"یا اللہ کس سے پوچھوں۔ کس سے بات کروں؟" انہوں نے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوچا۔ ان کے خاموش سوال کے جواب میں خاموشی کی چادر میں ابھرنے والی جھینگر کی آواز کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

"فضل دین ولد الحاج رحمت الٰہی
ڈاک خانہ خاص ڈھوک کھوکر نزد چکدی وکیلاں
تحصیل گوجر خان' ضلع راولپنڈی"

سعد نے اپنے فون پر موصول ہونے والا پیغام پڑھا اور پیغام بھیجنے والے کے نمبر کو کال کرنے کے لیے بٹن دبایا۔

"السلام علیکم!" دوسری طرف سے کال موصول کیے جانے پر اس نے کہا۔

"بہت شکریہ کہ آپ کو میری یہ درخواست یاد رہی۔" اس نے کہا۔

"مجھے ایسی باتیں اکثر یاد رہتی ہیں کہ کس نے مجھ سے کچھ مانگا ہے اور مجھے اسے وہ چیز دینی ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "کیونکہ میری دنیا اور اس میں موجود لوگ بہت محدود ہیں۔ البتہ تمہاری دنیا لگتا ہے بہت وسیع ہے جب ہی تم اس کے باسیوں کو بھول جاتے اور خلط ملط کر دیتے ہو۔"

"ایسی بات نہیں ہے' میں ہاتھی کا سا حافظہ رکھتا ہوں۔" وہ مسکرایا۔ "آپ میری دنیا میں پچاس اور باشندے شامل کر کے دیکھ لیں' میں پھر بھی سب کو الف تا ے الگ الگ شناخت کر کے دوں گا۔"

"امتحان دینے کی بات مت کیا کرو' انسان امتحان دینے کی بات یوں کرتا ہے جیسے بچپنے کا کوئی کھیل کھیلنا ہو مگر دینا پڑ جائے تو عذاب میں پڑ جاتا ہے۔"

"میں امتحان دینے کی بات تو کر ہی نہیں رہا میم!" وہ مسکرایا۔ "میں امتحان کی حقیقت سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ میں تو صرف حافظہ آزمانے کی بات کر رہا ہوں۔"

"اچھا چلو۔ کبھی آزمائیں گے' لیکن سوچ لو۔ آزمانے کا وقت آئے تو زندگی بھر دیکھے چہرے نہ پہچان سکو۔"

"اگر ایسا ہوا تو میں بہت ایمانداری سے ہاتھ اوپر اٹھا کر آپ سے کہوں گا۔ میں ہار گیا' کوئی ہینکی پھینکی ہرگز نہیں کروں گا۔ آپ اطمینان رکھیے۔"

"یہ بتاؤ غائب کہاں ہو؟" دوسری طرف سے اس بات کا جواب آنے کے بجائے سوال آیا۔

"میرا ایک المیہ یہ رہا ہے کہ میں ایک منظر میں حاضر ہوتا ہوں تو دوسرے منظر میں موجود لوگ میری ڈھنڈیا مچا دیتے ہیں۔ افسوس میں بیک وقت سب منظروں میں موجود نہیں رہ سکتا۔"

"اس کا ایک حل یہ ہے کہ تم ون ایکٹ پلے میں اپنا کوئی کردار ڈھونڈا کرو' نہ زیادہ ڈائیلاگز یاد کرنا پڑیں گے' نہ بار بار ایگزیٹس دینے پڑیں گے' نہ ہی زیادہ انٹریز دینی پڑیں گی۔"

"مسئلہ یہ ہے کہ زندگی ون ایکٹ پلے نہیں ہے' اس کو گزارنے کے لیے میرے جیسی مشکل سے ہی گزرنا پڑتا ہے۔"

"تم میری بات کو گول کر رہے ہو' میرے سوال کا جواب دو' غائب کہاں ہو؟"

"میرے چاروں طرف سبزہ ہے اور رنگا رنگ پھول' خوش رنگ پرندے ہیں اور قسم ہا قسم کے پھل و سبزیاں' گاڑھا اور خالص دودھ دیتی بھینسیں ہیں اور گائیں بھی' اعلا نسل تیز طرار گھوڑے ہیں اور چوگان کھیلنے کے میدان' خدمت گزاری کے لیے چوبیس گھنٹے مستعد خدام۔" وہ ترنگ میں آکر بولا۔

"رکو رکو۔ کہیں تم شداد کی جنت میں تو نہیں پہنچ گئے کسی ٹائم مشین میں بیٹھ کر؟"

"آگے تو سن لیں۔ میں ایک ایسی عمارت میں قیام پذیر ہوں جو رومن' یونانی' گوتھک' وکٹورین' ایلزبتھن اور مغل طرزہائے تعمیر کا ایک دلفریب ملغوبہ ہے۔"

"رکو! عمارتیں ملغوبہ نہیں ہوا کرتیں' طرزہائے تعمیر کا شاہکار ہوتی ہیں۔"

آپ جو بھی کہہ لیں' کیونکہ میں نے اردو لغت رٹی ہوئی نہیں' لہٰذا جو لفظ ذہن میں آرہا ہے' بول رہا ہوں۔"

"یہ جگہ اسی دنیا میں موجود ہے نا؟"

"آپ کا کیا خیال ہے میں عالم بالا سے مخاطب ہوں آپ سے؟"

"نہیں' لیکن تمہاری حاشیہ آرائی نے ڈرا دیا۔"

"ہاہا فلزا میم! آپ بھی ڈرتی ہیں کسی بات سے کیا؟"

"کیوں میں کیوں نہیں ڈر سکتی؟"

"میں نے سوچا شاید آپ صرف ڈرانے کا کام کرتی ہیں۔"

"تم ڈرتے ہو مجھ سے؟"

"ایسا ویسا۔ آپ کے سامنے تو بغیر قصور کان پکڑ کر بیٹھے رہنے کو دل چاہتا ہے۔"

"تو پھر بتاؤ۔ کہاں ہو' سیدھی طرح بتاؤ۔"

"میں خود آگاہی کے سفر کے ایک پڑاؤ پر پہنچا ہوا ہوں' شاید جو میں مجھے کوئی اپنا سرا مل جائے۔"

"خود آگاہی یا خود شناسی؟"

"شاید دونوں ہی۔"

"اچھا۔ پھر تو میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں میاں سعد بلال!" دوسری طرف سے ہلکی سی ہنسی کی آواز آئی۔

"چلو پھر جب پڑاؤ سے دل اٹھے اور واپسی کا سفر کرنے لگو تو مطلع کرنا۔ خدا حافظ۔"

"ایک منٹ میم ایک منٹ۔"

"ہاں بولو۔!"

"میں نے آپ کو اپنا نام سعد سلطان بتایا تھا' آپ نے مجھے سعد بلال کیوں کہا؟" دوسری طرف چند لمحوں کی خاموشی چھائی رہی۔

"اچھا سعد سلطان بتایا تھا' پھر مجھ سے غلطی ہو گئی ہوگی' شاید میرے کسی اسٹوڈنٹ کا نام سعد بلال رہا ہو۔" پھر اٹکا اٹکا سا جواب آیا۔

"دراصل تمہاری طرح میں نے ہاتھی کا سا حافظہ نہیں پایا نا! اس لیے۔"

"ہوں' چلیں خیر آئندہ تو یاد رہے گا نا۔"

"کوشش کروں گی تمہیں اسی نام سے یاد رکھوں۔ اچھا بھئی خدا حافظ' میرے سونے کا وقت ہو رہا ہے۔"

"ایک بار پھر ایڈریس بھیجنے کا بہت شکریہ۔"

"ہاں اسے بھی اپنے سفر کا ایک پڑاؤ شمار کر لینا' شاید جو کوئی سرا ہاتھ آجائے۔"

"ضرور۔"

دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ کمرا جو دیوار میں جڑی ایک الماری' بان کی ایک چارپائی' اس چارپائی پر بچھے سردی گرمی کے موسم کے حساب سے بستر' لکڑی کی سیٹ والی ایک سخت کرسی اور دیوار پر تنکوں میں جڑے ایک آئینے کے علاوہ اپنے اندر کوئی سامان نہیں رکھتا تھا اس روز وہی کمرا تازہ پالش شدہ پرانے ڈبل بیڈ' ڈبل منک کمبل' دو سیٹوں والے چھوٹے صوفے اور ایک عدد سنگھار میز سے سجا تھا۔ بیڈ کے چاروں طرف تازہ پھولوں کی لڑیاں لٹک رہی تھیں اور کمرے کے ماحول میں مہندی' خوشبو اور پھولوں کی باس رچی تھی۔

کھاری نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا۔ یہ اس کا کمرا نہیں تھا۔ یہ وہ ماحول نہیں تھا جس سے وہ مانوس تھا۔ وہ سادہ مزاج' سادہ لوح انسان تھا۔ ایک عرصہ فارم ہاؤس میں گزارنے کے باوجود اسے وہاں کی قیمتی چیزوں میں کبھی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

اس نے ہوش سنبھالتے ہی وہاں کے سجے سجائے' قیمتی سامان سے لیس کمرے دیکھے تھے جو کبھی کبھار تو یوں خالی رہتے تھے کہ کوئی دیکھنے والی دوسری آنکھ موجود نہ ہوتی۔ وہ چاہتا تو قیمتی اور پرتعیش سامان سے مزین ان کمروں میں لوٹیں لگاتا پھرتا' کچن میں موجود نفیس اور قیمتی کراکری اپنے استعمال میں لے آتا' فارم ہاؤس کی پینٹری میں موجود اشیائے خورد و نوش کو خرد برد کر لیتا' مگر اس کی طبیعت پیدائشی طور پر سیر تھی یا اسے آسائشوں میں دلچسپی ہی نہیں تھی' جو اس نے کبھی نظر تک اٹھا کر ان چیزوں کو نہیں دیکھا تھا۔

کھاری سب چیزوں سے بے نیاز دن سے رات کرتا رہتا' وہ اپنی ایسی ہی زندگی میں خوش تھا اور مطمئن بھی۔ مگر اب جوان سوچی' ان چاہی صورت حال اس پر آن پڑی تھی' اس نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

"شادی" اس نے پھولوں کی لڑیوں سے سجے بیڈ اور بیڈ پر دھرے سرخ ملبوس میں سجے وجود کو دیکھا۔ جس کا ابھی دور دور تک اس نے تصور کیا تھا نہ اس کے بارے میں کبھی کسی دوسرے نے اس سے ذکر کیا تھا۔ وہ تو ابھی تک خود کو تایا رابعہ کا چھوٹا سا طالب علم ہی سمجھ رہا تھا۔ کہ اس پر وہ رشتہ مسلط کر دیا گیا تھا جس کی الف' ب' پ تک کا اسے پتا نہ اندازہ' سعدیہ کلثوم جو ہمیشہ اسے چڑایا کرتی تھی۔ جس کو اس نے کہا تھا گاؤں کے راستے پر موجود سانپ جب سو سال کے بعد انسان بن جائے گا تو اس کی شادی سعدیہ کلثوم سے کرادی جائے گی۔ وہ اسی سعدیہ کلثوم کا مجازی خدا بن چکا تھا۔ اسے سعدیہ کلثوم کو بطور اپنی بیوی کے مخاطب کرنا تھا۔

اسے کیا کہنا تھا' وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ اس کی زبان شاید لکنت کھا گئی تھی' اسے اپنے حلق میں ایک پھندا سا اٹکا محسوس ہو رہا تھا۔ چوہدری صاحب کے اس اعلان کے بعد سے اب کہ سعدیہ سے اس کا نکاح کیا جائے گا' ایک ہی مثبت بات اس کے ذہن میں آئی تھی اور وہ یہ تھی کہ وہ چوہدری صاحب کی منت سماجت کر کے سعدیہ کو ڈاکٹر بنانے کا خرچا اٹھانے پر منا لے گا' اور اس کے دل کو اس پورے قصے کو دہراتے

ہوئے صرف اسی بات کا اطمینان تھا اور خوشی بھی۔

"سعدیہ باؤ!" پھر اپنی جگہ سے ایک انچ بھی آگے بڑھے بغیر اس نے بمشکل خود کو بولنے پر مجبور کرتے ہوئے کہا۔ "میں ان پڑھ تے جاہل بندہ ہوں۔ مینوں پتا ہے کہ آپ دے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے' مینوں معاف کر دینا میں ایسی زیادتی کا حقدار نہیں بننا چاہتا تھا۔"

"کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہے میرے ساتھ کھاری!" جواب میں دلہن نے گھونگٹ کا تکلف ہٹاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ پورے ہار سنگھار کے ساتھ گہنے اور اچھے لتے کپڑے پہنے یہ وہ سعدیہ تو کہیں سے بھی نہیں لگ رہی تھی جسے کھاری اب تک دیکھتا آیا تھا۔ وہ دم بخود اسے دیکھتا چلا گیا۔

"میری شادی کسی کے ساتھ تو کرنی ہی تھی نا آپا رابعہ اور مولوی صاحب نے۔" وہ دانت پیستے ہوئے بولی "میں خوش ہوں کہ کسی بے ایمان' خود غرض' منافق اور ریاکار بندے کے بجائے میری شادی تم سے ہو گئی۔ میں تمہارے ساتھ بہت خوش رہوں گی کھاری!"

"او نئیں جی۔" کھاری نے اس کے چہرے سے بمشکل نظریں ہٹاتے ہوئے کہا۔ ملکیت اور دسترس کے احساس سے اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے تھے مگر وہ اس احساس سے نظریں چرانا چاہ رہا تھا۔

"مجھ مسکین نے عاجز بندے دے ساتھ آپ نے کی خوش رہنا ہے' تسی بس پڑھائی کری جاؤ اب میں نے چوہدری صاحب نوں منالیا ہے' وہ آپ نوں ڈاکٹری تک پڑھائیں گے۔"

"اور تم کیا کرو گے؟" سعدیہ اس خبر پر آتا غصہ دباتے ہوئے بولی۔

"میں جی۔" اس نے سر جھکا کر نظریں ادھر ادھر گھماتے ہوئے کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اپنا کیا بندوبست کرے۔ اس نے پھر ایک خیال آتے ہی تیزی سے بولا۔

"میں آپ کا چوکیدارہ کروں گا' آپ نوں ہر اچھی بری توں بچاؤں گا' آپ دی حفاظت کروں گا' پہرا دوں گا پورا پورا۔"

"نہیں بننا مجھے ڈاکٹر اور نہیں کرنی مجھے پڑھائی۔" وہ فلمی انداز میں بیڈ سے اتر کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"ہم ایک چھوٹا سا گھر بنائیں گے۔ اس گھر کو سامان سے سجائیں گے۔ جس میں میں' تم اور ہمارے بچے ہنسی خوشی رہیں گے۔" وہ کھاری کے قریب آکر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"بچے!" کھاری نے بوکھلا کر اسے دیکھا۔ سعدیہ کے چلنے اور سرہلانے سے اس کے زیور ایک ہلکی سی آواز پیدا کر رہے تھے۔ اس کے وجود سے پرفیوم کی خوشبو آرہی تھی۔ اس کے سرخ جوڑے پر سجے تلے اور زردوزی کے تار کمرے میں روشن ٹیوب لائٹ کی روشنی سے منعکس ہوتے آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے۔

سعدیہ معنی اور سرخوشی کے ایک جہان کی صورت کھاری کے سامنے کھڑی تھی۔ شاید اس جہان کو سمجھنے کے لیے کھاری کو کسی لغت کے صفحات الٹنے اور پلٹنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے ذہن و دل پر کئی دن سے چھایا غبار جیسے چھٹتا چھٹتا کمرے میں آتی جاتی نامحسوس ہوا کے ساتھ مدغم ہو کر غائب ہو رہا تھا۔ اسے یکدم احساس ہونے لگا تھا کہ وہ مدرسے اور مکتب میں پڑھتا ایک کم عمر بچہ نہیں رہا تھا۔ وہ بڑا ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اس اجنبی جگہ پر کسی سے واقف نہیں تھیں۔ فارم ہاؤس کی وہ ملازمائیں جو ان کے کمرے میں آتیں اور ان سے کسی ضرورت کا پوچھتی' ان کے لیے بالکل اجنبی تھیں۔ سعدیہ کی رخصتی سے لے کر اس رات گئے تک وہ اس کمرے میں تنہا بیٹھی رہی تھیں۔

مولوی سراج کی ان دنوں پانچوں انگلیاں گھی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ چوہدری صاحب اور ان کے ملازم انہیں غیر معمولی عزت اور احترام دے رہے تھے۔ وہ تو شاید اپنے حواسوں میں بھی نہیں رہے تھے۔ سعدیہ کو اس کمرے سے رخصت کرنے کے لیے دو گھڑی اندر آئے اور دو انگلیاں اس کے سر پر رکھ کر بغیر کچھ بولے ایک طرف ہٹ گئے تھے۔ اس کے بعد سے اب تک آپا رابعہ نے ان کی شکل نہیں دیکھی تھی۔

وہ اس کمرے میں تنہا بیٹھی تھیں اور انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کا دماغ بالکل خالی تھا۔ ان سے نہ کچھ سوچا جا رہا تھا' نہ ان کی سمجھ ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ حالات نے ایک دم پلٹا کھایا تھا۔ انہیں لگ رہا تھا' سعدیہ نے دنوں دن عمر کی کئی منزلیں طے کرتے ہوئے انہیں ہڑبڑا کر مستی کی نیند سے جگایا تھا۔ عمر بھر سعدیہ کو ڈاکٹر بنانے کے خواب دیکھنے والی آپا رابعہ نے اسے دلہن بنا کر کسی کے بھی ساتھ رخصت کر دینے کے خیال تک کا سفر صرف چند ہی دن میں مکمل کر لیا تھا۔

گویہ سفر پوری دنیا کا چکر لگاتے ہوئے در پیش آتے سفر کے برابر تھا۔

انہیں خیال آیا تھا "سات دن میں دنیا کا سفر" انہیں عرصہ پہلے دیکھی ایک کتاب کا سرورق یاد آگیا۔

"جو بھی ہوا' اس کے لیے اسباب اللہ نے خود پیدا کیے۔ بندے نے خود بھی بھلا کبھی اپنی تقدیر کی تدبیر کی ہے۔" سعدیہ والے قصے پر وہ مولوی سراج کے فرمان زرین پر یقین کرتے ہوئے خاک ڈالنے کا ارادہ کر چکی تھیں۔ مگر اس رات ان کے ذہن کو خالی اور جامد کر دینے والی سوچ کچھ اور تھی۔

"کس سے پوچھوں وہ کون ہے' کہاں سے آیا ہے' چوہدری صاحب اور فارم ہاؤس سے اس کا کیا تعلق ہے؟" وہ لاتعداد مرتبہ خود سے یہ سوال کر چکی تھیں۔ مگر اس سوال کا جواب انہیں کون دیتا۔

"میرے خدایا! میں کیسے ذہن سے اس خیال کو جھٹک دوں۔" کئی گھنٹے یونہی بے خیالی میں بیٹھے سامنے موجود دیوار کو گھورتے رہنے کے بعد سر جھٹک کر اپنا چہرہ دوسری طرف کرتے ہوئے انہوں نے سوچا۔

"ہو بہو وہی شکل' وہی چہرہ مہرہ' ویسا ہی قد کاٹھ' ویسی ہی آن بان۔ فرق تو صرف عمر کا ہے اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کیا یہ اتفاق ہے محض؟ کیا دنیا میں ایک سے دو چہرے واقعی ہوتے ہیں یا یہ جھناتی عمل کا کرشمہ ہے؟ ہائے میرے اللہ!"

پھر انہوں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھتے ہوئے سوچا۔ "کس سے پوچھوں' کس کے ذریعے اس تک پہنچوں کہ اس سے پوچھ لوں۔"

"پتا نہیں' وہ یہیں ہے یا کہیں چلا گیا۔" ایک نیا خیال ان کے دل کو بے چین کرنے لگا۔ "کیا خبر وہ یہاں صرف ایک رات کا مہمان ہو۔"

"مہمان ہے یا تھا۔ کس کا مہمان تھا۔ کیا چوہدری صاحب کا کوئی رشتہ دار ہے وہ یا چوہدرانی کا عزیز؟"

"نہیں۔" پھر انہوں نے پر یقین انداز میں سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے سوچا۔

"ان دونوں سے اس کا کوئی خون کا رشتہ ہو ہی نہیں سکتا۔" ان کے خیال میں یقین تھا۔

"اس کی عمر بھی ایسی نہیں کہ اسے چوہدری صاحب کا دوست سمجھا جائے۔ لیکن کسی دوست کا بیٹا تو ہو سکتا ہے۔" ذہن سے ایک خیال سوجھا۔

"نہ نہ۔ اللہ نہ کرے! وہ چوہدری صاحب کے کسی دوست کا بیٹا ہو۔" پھر نجانے کیوں ان کے دل نے سختی سے پکار ڈالی۔

"جو بھی ہے' جہاں سے بھی آیا ہے' اس کی بابت کس سے پوچھوں' کس کے پاس جاؤں اور کہوں کہ مجھے دو گھڑی کے لیے اس کے پاس لے جائے۔" ان گنت خیال' لاتعداد سوچیں ان کے ذہن کو جکڑے جارہی تھیں۔ وہ ایک الجھن سے نکل کر نئی الجھن میں پڑ گئی تھیں۔

"تم بڑی بے صبری ہو۔ کوشش کرو! صبر اور حوصلے کی عادت طبیعت میں پیدا ہو جائے۔ تم دیکھنا! صبر اور حوصلے کے جواب میں کیا کیا معجزے رونما ہوتے ہیں۔ جس چیز کے لیے بے صبری اور بے قراری محسوس ہو رہی ہوتی ہے وہ آپ سے آپ اپنے قدموں پر چلتی تم تک پہنچ جائے گی۔" پھر انہیں ایک پرانی بات یاد آئی۔

"اور جو تم میری جگہ ہوتیں تو کیا اس چہرے کے یوں نظر آجانے پر صبر کرتیں اور حوصلے سے کام لیتیں؟ بے صبری اور بے قراری سے بچ پاتیں؟" انہوں نے تصور میں آتی کسی شبیہہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"نجانے اب یہ کھاری اور سعدیہ کیا بتاتے ہیں۔ شمال اور جنوب کے تانے بانے ملانے کی کوشش تو کی ہے۔ دیکھو! رسی گندھتی ہے یا تانا بانا ٹوٹتا ہے" انہوں نے خود کو مخمصے کی حالت سے نکالنے کی خاطر دھیان کسی دوسری سوچ کی طرف لگایا۔

"کھاری!" ان کے ذہن میں جیسے جھماکا ہوا۔ "تو! میں خوامخواہ بے چین ہوئی۔ کھاری سے خبر لگواتی ہوں اس کی۔" ان کے دل کو کچھ چین نصیب ہونے لگا۔

☼ ☼ ☼
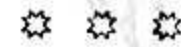
"لے اتنے دن تو تو نے آنسو بہا بہا کر دماغ کا پانی ختم کر دیا۔ اور آج تیرے دانت اندر ہی نہیں جا رہے۔" ماسی جنت نے کھاری کے سر پر چپت رسید کرتے ہوئے کہا۔

"بس دیکھ لے ماسی!" اس نے پیتل کے منقش گلاس سے لسی کا آخری گھونٹ پی کر حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔ "تو صرف ناں (نام) کی جنت ہے نا! مجھے تو من لے کہ ویسے ہی جنت لبھ (مل) گئی ہے۔"

"ہائے ہائے۔" ماسی نے مصنوعی حیرت سے کھاری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو تو کہتا تھا الزام لگایا ہے بھائی مالک نے۔ اب کیسی دندیاں نکل رہی ہیں۔"

"الزام ہی تھا جو الزام تھا۔" کھاری نے کندھے پر رکھے نئے رومال سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "چاچے مالک نے مینوں بے عزت کرنے دی کوشش کی تھی پر۔" اس نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا "میرے مولا نے میری عزت رکھ لئی۔ ہن سمجھ آندی ہے کہ اللہ دے سارے ہی کم (کام) نرالے نیں"۔

"جب ہی تو تم اتنے خوش نظر آرہے ہو۔ سویرے سویرے بن پھب (سج سنور) کر ادھر آئے ہو۔ بڑیاں شیواں شوواں (شیو) کی ہوئی ہیں۔ صاف ستھرے لیڑے (کپڑے) بھی پہنے ہوئے ہیں۔ لگدا شادی راس آگئی کھاری کو۔" قریب سے ایک بوڑھی عورت بولی۔

"سولہ آنے سچی گل ہے ماسی!" کھاری پرجوش انداز میں اس بوڑھی عورت کے شانے دباتے ہوئے بولا۔

"دیکھ تو بہن جنت! اپنا کھاری ایک دم دم جوان جوان سا لگنے لگا ہے۔" ماسٹر کمال نے مذاقاً کہا۔

"میں نوں جوان کہو گے ماسٹر جی تے ایس کا مطلب یہ ہوگا تسی بڈھے ہو گئے ہو۔" کھاری نے دانت نکالے۔

"دیکھو! اس کی آج دندیاں کتنی نکل رہی ہیں۔" ماسی جنت ناراضی سے بولی "اتنے دن مجھے بھی اپنے ساتھ رلا رلا مارا۔"

"بس ماسی! بندے نوں آنے والے ویلے (وقت) دا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ ایویں خامخا پہلے ہی رونے کرلانے لگ جاندا ہے" کھاری نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"چل بڑی بات ہے کھاری پتر! تجھے شادی راس آگئی ہے' ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے" ماسٹر کمال نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"لے! یہ لسی کا جگ اور گلاس ٹرے میں رکھ اور اپنی ووہٹی کے لیے لے جا۔ نمانی خالی پیٹ بیٹھی ہوگی اندر۔" ماسی جنت نے کھاری سے کہا۔

"وہ لسی نئیں پیندی ہے۔ وہ چاء پیندی ہے۔" کھاری نے کہا۔ کچن میں موجود سب لوگ ہنس دیے۔

"واہ بھائی واہ! ایک ہی رات میں تجھے یہ بھی پتا چل گیا؟" ماسی جنت نے ناک پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"لے! میں پہلے نئیں تھا جاندا مولی صاحب کے گھر۔ مینوں اودھوں (اس وقت) کا ہی پتا ہے۔" کھاری نے اپنی صفائی پیش کی۔

"آہا!" ماسی جنت نے دونوں لفظوں کو کھینچتے ہوئے منہ سے آواز نکالی۔ "پہلے دی گل اے۔" وہ ہنس کر بولی "وے جھلیا تے تو کیوں پھر اسے یہاں لا کر پانی پلا پلا کر ہی پھراتا رہا۔ چائے پلانی تھی نا۔" اس نے کھاری کے بازو پر تھپڑ مارا۔

"آہو!" کھاری کو وہ دن یاد آیا' جب فارم ہاؤس سے باہر نکلتے ہوئے پانی کے نل پر سعدیہ نے پانی پیا تھا اور دوسری بار بھی وہ پیاس کی وجہ سے ہی ادھر آئی تھی۔

"ماسی! تجھے پرانی گلاں بڑیاں یاد ہیں۔" وہ کھسیا کر بولا۔

"او کھاری! اوئے کھاری!" باہر سے کسی نے پکارا "تیرا جاپانی یار تجھے ڈھونڈھتا پھر رہا ہے۔ اسے بھی پوچھ لے۔"

"اوئے آہو!" کھاری نے سر پر چپت مارتے ہوئے کہا "تو میں اسے بھل ہی گیا تھا۔" وہ اپنے نئے کپڑے عادتاً جھاڑتا ہوا باہر کو چل دیا۔

"ماسی جنت! کھیر کے لیے جو دودھ الگ ہوا تھا' وہ دے دو۔" باہر سے کسی نے آکر ماسی جنت سے کہا اور پھر سب اپنے اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

"آج میں کھاری کی دلہن کا میک اپ خود کروں گی۔" ماہ نور نے اپنے ذہن پر پڑے ایک انجانے سے بوجھ کو جھٹکنے کی خاطر اعلان کیا۔

"کل تو کسی نے اسے ایسا کارٹون بنا رکھا تھا کہ بے چاری کے اصل نقش و نگار چھپ ہی گئے تھے۔"

"تو اور کیا۔ ہمیں تو پتا ہی نہ چلا' ووہٹی سوہنی ہے کہ کوجھی (بدصورت)۔" تائی صابرہ نے منہ پر کپڑا رکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں خیر! پیاری تو ہے وہ۔" ماہ نور نے بے اختیار کہا۔ "اس کی اماں تو بہت ڈیسنٹ اور پیاری سی خاتون ہیں۔ ان ہی جیسی لگتی ہے۔"

"ہاں! جب ہی تو اماں کا دماغ ساتویں آسمان پر چڑھا ہوا ہے۔ تمہارے چاچے نے مجھے محفل کرا کر اس سے درس دلوانے سے منع ہی کر دیا' ورنہ میں دیکھتی کیسے اس دفعہ انکار کرتی ہے۔" تائی صابرہ کی آپا رابعہ سے بے وجہ کی خلش اچھلی۔

"یقیناً" بہت اچھا سبق دیتی ہوں گی۔ بہت سلجھی ہوئی گفتگو کرتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ بالکل آؤٹ آف پلیس (بے جگہ) اور مس فٹ ہیں اس ماحول میں جس سے ان کا تعلق ہے۔" ماہ نور نے بالوں میں برش پھیرتے

ہوئے آئینے میں خود کو دیکھا اور تائی صابرہ سے مخاطب ہوئی۔

"کیا ہیں؟" تائی صابرہ کے کچھ پلے نہ پڑا۔

"کچھ نہیں۔" ماہ نور نے ہیئر بینڈ کو دانت سے کھولتے ہوئے سرہلایا۔

"لیں! میں چلی کھاری کی دلہن سجانے۔" بال سیٹ کرنے کے بعد ایک بار پھر خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے ماہ نور نے تائی صابرہ کی طرف دیکھا۔ "چلو رضیہ! میری یہ ساری ایسسریز اٹھاؤ اور میرے ساتھ چلو۔ مجھے یاد نہیں رہتا کھاری کا کمرا کس طرف ہے۔" اس نے منہ سوجا کر ایک طرف کھڑی رضیہ سے کہا۔

"جو نوکری کی مجبوری نہ ہوتی تو میں کبھی نہ جاتی ماہ نور باجی! آپ کے ساتھ اس چڑیل اس ڈائن کے کمرے میں۔" رضیہ ماہ نور کی راہنمائی کرتے ہوئے کلستے دل کے ساتھ سوچ رہی تھی "ڈائن۔ جھپٹا مار کر کھاری کو لے اڑی کم بخت۔"

وہ جی بھر کر سعدیہ کو کوس رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اچھا! تو تم پہلے سرکس میں کام کرتے تھے؟" سعد نے اپنے سے اگلی نشست پر بیٹھے رضوان الحق کو مخاطب کیا۔

"جی!" اس نے سرہلایا۔

"کیا کرتے تھے سرکس میں؟"

"جوکری کرتا تھا اور جگلری بھی۔" اس نے نیچی آواز میں کہا۔

"واہ بڑے ٹریٹس ہیں یہ تو" سعد مسکرایا۔ "مجھے سکھاؤ گے۔"

"آپ کو..." اس نے سعد کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، مجھے علم ہے آپ مذاق کر رہے ہیں۔

"ہاں! بالکل... مجھے۔" سعد نے سرہلا کر یقین دلاتے ہوئے کہا۔

"میں آوٹ آف پریکٹس ہو چکا ہوں۔" اس کا لہجہ ایک دم اداس ہو گیا۔ "عرصہ ہوا میں نے دونوں کو چھوڑ دیا۔"

"اوہ!" سعد نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا "کیوں بھئی! اتنے مزے کے کام تم نے کیوں چھوڑے؟"

"بس! دل نہیں لگتا تھا اس کام میں۔ اس لیے چھوڑ دیا۔"

"کتنے سال سرکس میں رہے؟"

"کتنے ہی سال، گنتی یاد نہیں۔" رضوان الحق سامنے دیکھتا ہوا بولا۔

"اتنے سال ایک کام کرنے کے بعد اس سے دل اچاٹ ہو گیا؟" سعد ہنسا اور ہاتھ رضوان الحق کی طرف بڑھایا۔ "تم تو میرے ہی بھائی نکلے یار... ہاتھ ملاؤ... میں بھی بہت غیر مستقل مزاج ہوں۔"

"نہیں... میں غیر مستقل مزاج نہیں ہوں۔" رضوان نے سعد کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھامتے ہوئے ہلایا "میرا معاملہ کچھ اور تھا۔ اس لیے میں نے سرکس چھوڑا۔"

"اچھ... چھا!" سعد نے اس کے لہجے پر غور کرتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

"خیر! جب کبھی دوبارہ پریکٹس کرنے لگو تو بتانا۔ میں بھی سیکھوں گا۔"

"ٹھیک..."

"ویسے تو شاید سارہ کو بھی آتے ہوں یہ دونوں کام۔" سعد نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

"سارہ بھی پہلے سرکس میں کام کرتی تھی۔ اسے جانتے ہو؟" سعد نے سارہ کی یاد آنے پر یونہی رضوان الحق سے پوچھا۔

"نہیں! اس نام کی کسی لڑکی کو تو میں نہیں جانتا۔" اس نے سرہلایا۔

"اچھا... میں نے سوچا شاید تم بھی وہیں کہیں جوکری اور جگلری کرتے تھے۔" اس نے لاپروائی سے کہا اور دور سے آتے کھاری کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"آؤ بھئی کھاری! بہت مبارک ہو دولہے میاں۔" کھاری کے قریب آنے پر سعد نے گرمجوشی سے اس سے ملتے ہوئے کہا۔ دانت نکالتا کھاری سعد کو دیکھ کر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"اتنی سی عمر میں میدان مار لیا تم نے۔ ہمیں دیکھو! ابھی تک اکیلے پھر رہے ہیں۔" سعد نے اسے سنجیدہ ہوتے دیکھ کر دوستانہ ماحول بنانے کی کوشش کی۔

کھاری نے ہلکا سا مسکرا کر سر جھکا لیا اور رضوان کی طرف دیکھنے لگا۔

"سعد صاحب بہت اچھے بندے ہیں۔ ان کے پاس بیٹھ کر ذرا بھی نہیں لگتا کہ ان کے اور ہمارے اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔" رضوان نے مسکرا کر کھاری سے کہا۔ کھاری نے اس بات پر سر اٹھا کر سعد کی طرف دیکھا جو وہ مسکرا رہا تھا۔

"اتنا ہنگامہ، اتنا ہجوم تھا تمہاری شادی پر کہ میں تمہیں کچھ دے بھی نہیں سکا۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کھاری سے کہا۔ "نہ کوئی تحفہ لایا، نہ سلامی دی۔" جیب سے والٹ نکالتے ہوئے وہ بولا۔ پھر والٹ سے پانچ ہزار کا نوٹ نکال کر کھاری کی طرف بڑھایا۔ "یہ تمہارے اور تمہاری دلہن دونوں کے لیے ہیں۔"

"نئیں جی!" کھاری نے سعد کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے روکتے ہوئے کہا۔ "آپ ادھر آئے ہو ایہہ ای بڑا تحفہ ہے۔"

"تکلف مت کرو یار! یہ ایک بڑے بھائی کی طرف سے تحفہ ہے۔" سعد نے کھاری کے تکلفانہ انداز پر مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ نے تحفہ ہی دینا اے نا؟" کھاری نے سعد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا ہاتھ ابھی بھی سعد کے ہاتھ پر تھا۔ سعد نے اثبات میں سرہلایا۔

"تے آپ سانوں دونوں کو..." کھاری نے اپنی اور رضوان الحق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ گیت سنا دیو۔"

"کون سا گیت؟" سعد نے چونک کر کھاری کی طرف دیکھا۔

"اوہی..." کھاری نے اسے نظروں میں جتاتے ہوئے کہا اور بائیں کان پر بایاں ہاتھ رکھ کر دایاں بازو سعد کی طرف لہرایا۔ "اوکھے پینڈے لمیاں نے راہواں عشق دیاں۔"

رضوان الحق دلچسپی سے کھاری کی اس ادا کو دیکھ رہا تھا اور سعد دم بخود کھاری کی آواز سن رہا تھا جس نے ایک لائن سنانے کے بعد اس کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو اب آگے آپ سناؤ۔

"لیکن مجھے تو گانا نہیں آتا یار!" سعد نے کچھ دیر بعد نارمل ہوتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے کھاری کی مخفی ذہانت کو سراہ رہا ہو۔

"اچھا جی! نئیں آوندا؟" کھاری نے جواب میں یوں دیکھا جیسے جتا رہا ہو مجھے بچہ سمجھ رہے ہو۔

"نا۔" سعد نے منہ سے کھٹاک کی آواز نکالتے ہوئے کہا۔

"ماہ نور باجی نوں پتا ہے کہ آپ نوں گانا نئیں آندا؟" (ماہ نور باجی کو علم ہے کہ آپ کو گانا نہیں آتا؟) کھاری

نے کہا اور زیرِ لب مسکرا دیا۔

"میں نے اس سے تو کبھی پوچھا نہیں۔" سعد شرارت سے مسکرایا۔ اسے اپنے اور کھاری کے درمیان مزاح کا ایک عجیب سا تعلق بنتا محسوس ہو رہا تھا۔

"چلو! ماہ نور باجی نوں نئیں بتاتے' آپ گانا سناؤ۔ میں آپ دے نال گاتا ہوں۔" کھاری نے جیسے اس سے "کچھ دو' کچھ لو" والی سودے بازی کرتے ہوئے کہا۔

"ہاہا!" سعد کا جاندار قہقہہ فضا میں ابھرا۔ "چلو! تم شروع کرو۔ میں کوشش کرتا ہوں۔"

"ہن ای لیو (ابھی لیں)" کھاری سیدھا ہوتا ہوا بولا۔

"پھلاں وانگوں جندڑی عشق رلا دیندا!" اس نے تان اڑائی۔

"اوکھے پینڈے لمیاں نی راہواں عشق دیاں۔
درد جگر تخت سجاواں عشق دیاں۔۔۔۔۔"

کچھ دیر بعد سعد کی آواز فضا میں گونج رہی تھی اور کھاری اور رضوان الحق مبہوت ہو کر سعد کو سن رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

ولیمہ کی دلہن سعدیہ کا بناؤ سنگھار مکمل ہو چکا تھا۔ ماہ نور نے اس کے میک اپ کو فائنل ٹچز دیے اور اس سے ذرا فاصلے پر ہٹ کر کھڑی ہو کر اس کا جائزہ لینے لگی۔ اگر کوئی کمی رہ گئی ہو تو اسے پورا کر لیا جائے۔

"زبردست بھئی! تم تو بہت اٹریکٹو ہو' بڑا فوٹو جینک چہرہ ہے تمہارا۔" اپنے فون پر سعدیہ کی تصویریں لیتے ہوئے اس نے کہا۔

سعدیہ' ماہ نور سے میک اپ کروانے کے دوران کسی اور ہی دنیا میں پہنچ چکی تھی۔ میگزین میں چھپی ماڈرن لڑکیوں جیسی لڑکی اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے اس کو سنوار رہی تھی۔ سعدیہ کا اپنا پس منظر بھک سے اڑ کر کہیں دور جا پڑا تھا۔ وہ کون تھی' اس کے ماں' باپ کون تھے' اب تک کی عمر اس نے کہاں اور کیسے گزاری تھی' سب ایک دم ماضی بن چکا تھا۔ جسے بھلا کر وہ اپنے پیش منظر میں موجود تھی۔ جہاں جدت تھی' خوب صورتی تھی' آسائش تھی۔

جدت' خوب صورتی' آرائش آسائش یہ الفاظ بھی میگزین ہی میں اس نے پڑھے تھے۔ وہ سب جو پڑھا تھا' وہ اسے ہاتھ لگا کر چھو سکتی تھی اور اس انقلاب کا سرچشمہ اس کا سرتاج افتخار احمد عرف کھاری تھا۔۔۔ کھاری جسے کچھ عرصہ پہلے اس نے ایک ان پڑھ' سودائی سے انسان کا درجہ دیتے ہوئے اس پر صرف اسی بات کا رشک کیا تھا کہ وہ فارم ہاؤس میں رہتا تھا۔

ایک لمحاتی جرات نے سعدیہ کو فرش سے عرش پر پہنچا دیا تھا۔ اس نے طنز کرتی اور جتاتی ہوئی نظروں سے آپا رابعہ کو دیکھا' جو گزرے کل سے آج تک کے عرصے میں پہلی بار اس سے ملنے آئی تھیں۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئیں۔

"یہ راتوں رات بوڑھی کیوں لگنے لگی ہیں؟" فاتحانہ نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے سعدیہ نے ذرا کی ذرا سوچا۔ "یوں لگتا ہے جیسے ان کے جسم کا سارا خون کسی نے نچوڑ لیا ہو۔"

اس کا دل لحہ بھر کو کانپا اور ایک احساسِ جرم سا اس کے محسوسات میں ابھرا لیکن اگلے ہی لمحے وہ اپنی نئی دنیا میں مگن ہو گئی' جہاں خوشیاں اور رونقیں تھیں۔

"آنٹی! سنا ہے آپ کو دین پر خاصی دسترس حاصل ہے۔" ماہ نور نے دھلے اور گیلے ہاتھ ٹشو پیپر سے خشک کیے

اور آپا رابعہ کے قریب بیٹھ گئی۔

اس کے اس بے تکلفانہ انداز پر آپا رابعہ ذرا محجوب سی ہو کر قدرے سمٹ گئیں۔

"نہیں بیٹا۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" انہوں نے نیچی آواز میں کہا۔

"تائی صابرہ اور کھاری دونوں ہی بتاتے ہیں کہ دین کے بارے میں آپ کو خاصا علم ہے اور آپ درس بھی دیتی ہیں۔"

"کھاری بے چارہ تو ابھی تک ایک دو سپارے ہی ٹھیک طرح سے پڑھ پایا ہے اور اسی کو بہت سمجھتا ہے' اس لیے کہہ رہا ہو گا۔ کسی نے اس بے چارے کی دینی تعلیم کی طرف دھیان نہیں دیا۔ اسی لیے وہ اس عمر میں اتنا بھی پڑھ لینے کو علم جانتا ہے۔ ورنہ بہت چھوٹی عمر میں بچے ناظرہ قرآن مکمل کر چکے ہوتے ہیں۔ اتنا ہی میں بھی اپنے بچپن میں کر چکی ہوں۔" انہوں نے انکساری سے جواب دیا۔

"اچھا؟" ماہ نور مسکرائی۔ "اور تائی صابرہ کو بھی غلط فہمی ہی ہوئی ہو گی۔ وہ تو محفل میلاد کروانا چاہ رہی تھیں آپ کی صدارت میں۔ آپ سے درس دلوانا چاہ رہی تھیں۔"

"یہ ان کا بڑا پن ہے۔" آپا رابعہ اسی انداز میں بولیں۔ "مولوی صاحب کی بی بی سمجھ کر سوچتی ہیں کہ شاید میں بھی کوئی باعلم عورت ہوں۔ جبکہ میرے تو سارے ہی سبق ادھورے ہیں۔۔۔ ناپختہ اور کچے۔"

"ہوں!" ماہ نور نے غور سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔ اسے آپا رابعہ کی شخصیت میں کوئی اسرار والی بات نظر آ رہی تھی۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیا نام دے۔

☼ ☼ ☼

"شکر ہے! یہ شادی ختم ہوئی۔ ایک دن کا کہہ کر لے آئی تھیں۔ تین دن گزر گئے اور میں تو اب تک بری طرح فیڈ اپ ہو چکا ہوں اس ہنگامے سے۔ جس میں ہر قسم کا بندہ بس ہلڑ مچانے پر لگا ہوا ہے۔"

سلمان نے اکتائے ہوئے انداز میں ماہ نور سے کہا۔ وہ جو ناخنوں پر کیوٹکس ریمور میں بھیگا روئی کا پھاہا رکھ کر ان پر چڑھے رنگ چھڑانے میں مصروف تھی۔

"ہوا تو مزا آیا۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔ "تم تو سخت بورنگ ہو بھئی۔"

"میں ایسے مزے سے اس مزے کے بغیر ہی بھلا ہوں" سلمان نے چڑے ہوئے انداز میں کہا "اچھا بھلا میں اگلے روز واپس جا رہا تھا۔ ممی کا حکم آ گیا ماہی کے بغیر نہ آنا۔ اسے ساتھ لے کر ہی آنا۔ کیا تھا جو تم بعد میں آ جاتیں۔"

"ہاں! میں بعد میں بھی جا سکتی تھی۔۔۔۔ سعد کے ساتھ چلی جاتی واپس۔ تم خوامخواہ رکے۔" ماہ نور نے اسے چڑایا۔

"سعد کے ساتھ؟" سلمان نے اسے دیکھا۔ "وہ تو فی الحال واپس نہیں جا رہا۔" اس نے انکشاف کیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" ماہ نور چونکی "وہ کیوں نہیں جا رہا واپس؟"

"اس کی اور چچا سردار کی خوب بن گئی ہے۔ چچا رات ولیمہ کے بعد اس سے کہہ رہے تھے' وہ رک جائے۔ وہ خود بھی کچھ دن کے لیے فارغ ہیں۔ مزے سے شطرنج کھیلیں گے۔ گھوڑے دوڑائیں گے اور فارمنگ کرائیں گے' چچا کے پاس جو گراموفون ریکارڈز ہیں' ان کا کلیکشن بھی دکھانا ہے انہیں سعد کو۔۔۔ اور نجانے کیا کیا ترغیبیں دے رہے تھے۔ وہ بھی شاید بڑا فارغ آدمی ہے۔ خوشی سے مان گیا۔ لہٰذا وہ فی الحال واپس نہیں جا رہا۔"

"اچھا!" ماہ نور نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا ذہن تیزی سے کچھ سوچ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بھئی! یہ سلمان تو بڑی جلدی مچا رہا ہے جانے کی۔ میرا خیال تھا' آج کی رات تم دونوں مزید ٹھہر جاتے۔" دوپہر کے وقت جب وہ فارم ہاؤس کے پچھلے حصے میں بنی سنگ مرمر کی چھوٹی سی بارہ دری میں رکھے سفید سنگی تخت پر نیم دراز درختوں پر جھولتے پرندوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھنے میں مشغول تھی' سردار چچا نے ادھر آتے ہوئے اس کا دھیان توڑا۔ وہ ان کو دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اس کی آفس سے آج تیسری چھٹی تھی چاچا! اسے تو واپس جانا ہی ہے۔ آپ کو پتا ہے نا' وہ پہلے ہی کہاں ٹک کر کوئی نوکری کرتا ہے۔" اس نے کہا۔

"ہاں! یہ بھی ہے۔ ادھر تمہاری ممی کو کہیں پریشانی کے مارے کچھ ہو نہ جائے۔" وہ شرارتاً ہنسے۔

"آپ کو پتا ہی ہے۔" وہ مسکرائی۔

"اور تمہارا کیا دل چاہ رہا ہے' رہنا ہے یا جانا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"مجھے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نہ بھی جاؤں تو کوئی بات نہیں۔" اس نے لاپروا بنتے ہوئے کہا۔

"اچھا واقعی!" وہ حیران ہوئے۔ "تمہارا فائنل سمسٹر ہے۔"

"جی ہاں' میرا تو بس پیپر ہی سبمٹ ہونا باقی ہے۔ جب چاہے کرا دوں۔" اس نے انہیں اطمینان دلایا جبکہ دل میں وہ ممی کے ہاتھوں اپنی درگت پر کانپ رہی تھی۔

"تو پھر سلمان کیوں تمہیں بھی واپس ساتھ لے جانے کی ضد کر رہا ہے' میں ابھی اس کو منع کرتا ہوں۔"

"ہاں! تو اور کیا۔" وہ بسوری۔ "اب اتنی رونق میں سے کس کا واپس جانے کو جی چاہتا ہے۔"

"تم فکر نہیں کرو۔ میں ابھی اسے اکیلے واپس بھجواتا ہوں۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ ان کے جانے کے بعد وہ گہری سوچ میں پڑ گئی۔

"سعد واپس نہیں جا رہا۔ وہ یہاں شطرنج' رائیڈنگ' سوئمنگ' میوزک' گالف اور چچا سردار کی کمپنی کے درمیان مزے سے رہے گا۔ یہ تصور ہی اتنا مزے کا ہے کہ میرا واپس جانے پر کیسے دل چاہ سکتا ہے۔ پڑھائی۔" اس نے سفید سنگی فوارے کے پیروں میں مسلسل گرتے پانی سے جم جانے والی کائی پر نظر جمائی۔ "پڑھائی تو عمر بھر کی ہے۔ پاس بھی ہمیشہ وقت پر ہوتی رہی ہوں۔ کچھ دن پڑھائی نہ بھی کروں گی تو کیا ہو جائے گا۔ جو فیل ہو جاتے ہیں' جن کے سمسٹر زلیٹ ہو جاتے ہیں' وہ بھی تو انسان ہی ہوتے ہیں۔ میں بھی تو انسان ہی ہوں نا۔"

اس نے ذہن کا بوجھ ہواؤں میں اڑاتے ہوئے کہا اور دوبارہ نیم دراز ہو کر درختوں کے سرسراتے پتوں کے درمیان سے گزرتی سورج کی روشنی پر نظر جمالی۔ دھوپ اور چھاؤں کا یہ نرم گرم امتزاج اس کے اعصاب پر غنودگی سوار کیے دے رہا تھا۔ دل' دماغ پر حاوی ہو رہا تھا یا عشق نے عقل کو پچھاڑا تھا۔ اس کا نیم غنودگی میں جاتا ذہن سمجھ نہیں پایا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مذہب۔" شیکھر نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا اور پھر سگریٹ کا گل ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے نادیہ کی طرف دیکھا۔ "ایک بالکل علیحدہ بحث ہے۔"

وہ نادیہ کی دعوت پر سینڈوچ کھانے اور کافی پینے کے لیے اس کے کمرے میں موجود تھا۔

"یہ ایک تعصب کی شکل میں انسان کے لاشعور میں بستا ہے اور اپنی جھلک انسان کی روز مرہ گفتگو میں کبھی کبھار گرما گرم بحث کے دوران یوں دکھاتا ہے کہ اسے دیکھ کر وہ بندہ بھی حیران رہ جاتا ہے' جس کے لاشعور میں وہ چھپا ہوتا ہے۔"

نادیہ نے غور سے اس کی بات سنتے ہوئے یوں سر ہلایا۔ جیسے وہ شیکھر کی بات سمجھ رہی ہو۔

"مگر مذہب انسان کا انتہائی ذاتی معاملہ ہے۔ یہ فیصلہ خود کرنا چاہیے کہ اسے مذہب کے معاملے میں کیا فیصلہ کرنا ہے۔ کسی ایک مذہب کی تقلید کرنے والوں کے گھرانے میں پیدا ہو جانا' کسی مخصوص مذہب کے پیروکاروں کے معاشرے کا فرد ہونا یا کسی قسم کے حالات کے جبر کے تحت کسی مذہب کا پیروکار بن جانا اور اس کے مروجات و ممنوعات کو اپنا لینا بالکل غلط ہے۔" شیکھر اپنی دھن میں بولتا چلا جا رہا تھا۔ "تعقل ایک ایسی چیز ہے۔ جس پر پرکھی چیزیں کبھی غلط ثابت نہیں ہوتیں۔"

"مگر تعقل کی پرکھ ضروری ہے تو لاشعور میں بسے تعصب کا کیا جائے۔" نادیہ نے شیکھر کا مگ کالی گاڑھی کافی سے بھرتے ہوئے کہا۔

"میں نے اپنی اب تک کی زندگی دو مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان گزاری ہے۔" اس نے کہا "لیکن ان دونوں گھروں میں مذہب کے متعلق شدت سے کوئی رویہ میں نے نہیں دیکھا۔ نہ میرا باپ شدید قسم کا مسلم تھا' نہ ہی میری ماں شدت سے عیسائی تھی۔ لیکن عجیب سی بات ہے کہ جب میں خود اپنا تجزیہ مذہب کے حوالے سے کرتی ہوں میرا دل اپنے باپ کے آبائی مذہب کی طرف کھنچتا ہے' حالانکہ میں اس مذہب کے بارے میں شاید کچھ بھی نہیں جانتی۔" اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا

"اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہارے لاشعور میں تمہارا باپ ایک فینٹسی کی صورت بستا ہے۔ شاید تم اپنے باپ سے ماں کی نسبت زیادہ محبت کرتی ہو۔" شیکھر نے کافی کا گھونٹ بھرنے کے بعد ایک عریاں تجزیہ منہ سے اگلا۔

"ایسا نہیں ہے۔" اس نے سر ہلایا۔ "میں اپنے باپ سے زیادہ ماں کے پاس رہی ہوں۔ پھر بھی مجھے وہ ماحول اور اس ماحول میں رچے عقائد اور نظریات بار بار یاد آتے ہیں۔ مجھے ان میں ایک عجیب سی وضع داری اور رکھ رکھاؤ محسوس ہوتا ہے۔ اور نجانے' مجھے کیوں ایسا لگتا ہے' اس کی وجہ ان سب کا اس مذہب کا پیروکار ہونا ہے۔"

"فینٹسیز۔" شیکھر نے اس کی طرف دیکھا۔ "جو ہم سے دور ہو جاتا ہے اور پہنچ میں نہیں رہتا' اس کے متعلق ہم اور طرح سے سوچنے لگتے ہیں۔ تمہارا بھی یہ ہی حال ہے۔ ایک بات یاد رکھنا' مذہب کے متعلق تحقیق کرنے اس وقت بیٹھنا' جب تم دل میں پکا فیصلہ کر لو کہ تمہارا دل اور دماغ کسی مذہب کی طرف جھکتا ہے۔ ورنہ تمہاری تحقیق تمہارے لیے عذاب بھی بن سکتی ہے اور اگر ایسا فیصلہ نہ کر پاؤ تو میری مانو! کسی بری صورت حال سے لادین رہنا زیادہ اچھی صورت حال ہے۔"

"تم بھی تو ایک مذہب کے پیروکار ہو نا؟" نادیہ نے کہا۔

"نہیں! یہ برائے نام نسبت ہے۔ جغرافیائی اور خاندانی نسبت۔ ورنہ میں دنیا کے کسی بھی مذہب کا پیروکار نہیں ہوں۔ اور میں اس کیفیت میں بہت پرسکون اور خوش ہوں۔ انسانیت اور انسانیت کی آزادی دنیا کا حقیق ترین مذہب ہے۔ بس اس سے جڑے رہو۔"

"لیکن میں اس سے اتفاق نہیں کرتی۔ میرا خیال ہے کہ کسی مذہب سے منسلک ہونا انسان کی انفرادی شناخت کے لیے بہت ضروری ہے۔" نادیہ نے کہا۔

"تو پھر سبز پاسپورٹ' سبز عمامے اور سبز پرچم۔ تینوں کو حاصل کرنے کی خاطر بھاگو۔ اور جب انہیں حاصل کر لو تو پھر مجھے ضرور بتانا کہ کون سی صورت حال زیادہ بہتر ہے۔ اب والی یا تب والی۔" شیکھر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"ضرور۔" نادیہ نے کہا۔ اس کی نظروں کے سامنے سبز رنگ ناچ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم واپس نہیں گئیں؟" کھاری کے ولیمہ سے تیسرے دن ماہ نور سے سعد کی ملاقات فارم ہاؤس کے اصطبل کے قریب ہوئی۔ ماہ نور نے دیکھا' بھورے رنگ کے شلوار قمیص میں اس کا قد زیادہ دراز لگ رہا تھا۔ اس نے پاؤں میں براؤن پشاوری چپل پہن رکھی تھی ۔ اس حلیے میں اس نے سعد کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اسے یہ تبدیلی بہت اچھی لگی۔

"ہاں! میں نہیں گئی۔" اس نے سعد کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "تائی صابرہ نے روک لیا' سو میں رک گئی۔"

"تمہاری پڑھائی کا حرج نہیں ہوگا اس طرح؟" اس نے چلتے چلتے رک کر پوچھا۔

"نہیں۔" ماہ نور کو اس سوال سے چڑ سی محسوس ہوئی۔

"اچھا!" وہ دوبارہ چلنے لگا۔ "سنا ہے تمہاری ممی سخت ناراض ہو رہی تھیں تمہارے واپس نہ جانے پر۔"

"ممی کو تو ناراض ہونے کا بہانا چاہیے۔" اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"یار! تمہیں اپنی ممی کو ناراض نہیں کرنا چاہیے۔" سعد نے کہا۔

"وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ ان کا غصہ وقتی ہوتا ہے۔" ماہ نور نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔ "تم بتاؤ تم کیسے رک گئے؟"

"میں۔" اس نے چلتے چلتے سامنے دیکھا اور ہنس دیا۔ "عجیب سی بات ہے۔ میں یہاں آنے سے جتنا ہچکچا رہا تھا۔ اتنا ہی یہاں آنے کے بعد مجھے یہ جگہ اچھی لگنے لگی ہے' میں یہاں گھر کا سا آرام محسوس کر رہا ہوں کیونکہ۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"کیونکہ کیا؟" ماہ نور نے رک کر پوچھا۔

"کیونکہ یہاں ملنے اور مشاہدہ کے قابل بہت لوگ ہیں۔ ڈائیورسٹی (Diversity) ہے لوگوں میں۔۔۔ مختلف النوع لوگ۔ جتنے لوگ اتنے ہی قصے اور تمہیں تو پتا ہی ہے کہ مجھے قصے سننے میں کتنی دلچسپی ہے۔"

"اچھا! تم قصے سننے کے لیے رکے ہو۔" ماہ نور نے کہا۔

"اور بھی بہت کچھ ہے۔ تمہارے چچا دلچسپ انسان ہیں۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کرنے کا مزا آتا ہے۔ انہوں نے مجھے شکار' گھڑ سواری اور شطرنج کے علاوہ اپنے پاس موجود ریکارڈز کا ذخیرہ دکھانے کا لالچ دے کر روک لیا۔ میں نے بھی سوچا کہ زندگی میں کوئی وقت ایسا بھی ہونا چاہیے۔ جس میں انسان ویسا رہے' جیسا وہ رہنا چاہتا ہے۔ کوئی مصلحت' کوئی مجبوری اسے خود پر کوئی ملمع چڑھانے پر مجبور نہ کر سکے۔"

"تمہیں یہاں ایسا محسوس ہو رہا ہے؟" ماہ نور نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ یہاں منافقت کم اور اوریجنیلیٹی ———— زیادہ ہے۔۔۔ اس لیے"

"اچھا!" ماہ نور نے نیچی آواز میں کہا "اچھی بات ہے۔"

"لیکن یہاں مردانہ اور زنانہ حصے کا بڑا مسئلہ ہے۔ تم یہاں ہو اور ہم شاید دو دن کے بعد مل رہے ہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ شاید شادی کے لیے گھر والوں کے یہاں شفٹ ہونے کی وجہ سے ہے۔ پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔" ماہ نور نے ادھر ادھر دیکھا۔

"اس کا مطلب ہے میں یہ توقع کر سکتا ہوں کہ یہاں قیام کے دوران ہم روزانہ مل سکتے ہیں؟" سعد نے ایک درخت کی نیچی شاخ پر جھولتے پتے کو چلتے چلتے انگلی سے محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں! یقیناً۔" ماہ نور کا دل ہلکا سا لرزا۔

"تم میرے ساتھ خانہ بدوشوں کی بستی چلوگی؟"

"خانہ بدوشوں کی بستی۔" وہ چلتے چلتے رکی۔ "وہ کہاں ہے؟"

"یہیں کہیں قریب ہی ہے۔ وہی جگہ جہاں سے میں بندر اور بندریا کا جوڑا لایا تھا۔ جہاں سے مجھے وہ ریچھ ملا تھا۔"

"اوہ!" اس نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔ "لیکن اگر وہ خانہ بدوش تھے تو اب تک یعنی سال بھر میں کہیں اور جا چکے ہوں گے۔"

"ہو سکتا ہے۔" اس نے سر ہلایا۔ "لیکن معلوم کر لینے میں کیا حرج ہے۔"

"یہ بھی ہے۔" ماہ نور نے سر ہلایا۔ "ویسے سنا ہے' یہ لوگ صفائی پسند بالکل بھی نہیں ہوتے۔ گندے' میلے کچیلے۔" اس نے سعد کی طرف دیکھا "تمہیں ان کے پاس اٹھتے بیٹھتے وحشت نہیں ہوتی تھی؟"

"انسان اپنی جبلت پر پیدا ہوتا اور پلتا بڑھتا ہے۔" سعد نے رک کر ماہ نور کو دیکھا۔ "وہ جس ماحول میں آنکھ کھولتا اور سانس لیتا ہے' وہ ماحول عمر بھر اس کے لاشعور میں بیٹھا اس کے ساتھ رہتا ہے۔ خانہ بدوش کا بچہ لکھ پڑھ بھی بن جائے' اس نے جس ماحول میں آنکھ کھولی' اس کی خصوصیات اس کے ساتھ رہتی ہیں۔ اس میں ان لوگوں کا کوئی قصور نہیں۔ ان کی دنیا وہ ہی ہے۔ اور وہ اسی میں مگن ہیں۔ وہ اس کے عادی ہیں جیسے ہم اپنی جبلت اور تربیت کے مطابق ایک مخصوص طرز زندگی کے عادی ہیں۔ میں چیزوں کو اسی نظر سے دیکھتا ہوں۔ ان لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے مجھے یہ خیال آنا نہیں چاہیے۔ کیونکہ وہ تو ایسے ہی ہیں۔ یہ تو میں ہوں جو ان کے پاس جانے اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا ارادہ کرتا ہوں۔ سوچنا تو مجھے چاہیے۔ میں اپنے لیے ان کو اپنی طرز زندگی بدلنے پر تو مجبور نہیں کر سکتا تھا۔"

"ہوں!" ماہ نور نے سر ہلایا۔ "پھر بھی ہمت ہے تمہاری۔"

"فکر نہیں کرو۔ میں تمہاری ہمت بھی بڑھانے والا ہوں۔ تم میرے ساتھ وہاں چل رہی ہو۔"

ماہ نور نے جواب دینے کے بجائے سامنے کھڑی عمارت کو دیکھا۔

"میرے ساتھ رہنے کے لیے ایسے ایڈونچرز کا تو عادی ہونا پڑے گا۔" اس نے کہا تو ماہ نور نے اپنی سماعت پر شک کرتے ہوئے اس کی طرف یوں دیکھا۔ جیسے پوچھ رہی ہو' کیا کہا۔

"میرا مطلب ہے' میرے قریبی دوست جانتے ہیں کہ میں ایسے ایڈونچر کرتا ہی رہتا ہوں۔" وہ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

"تمہارے قریبی دوست؟" ماہ نور نے مزید وضاحت چاہی۔

"ایک ہی ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ ماہ نور ابھی تک وضاحت طلب انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔

"ابراہیم۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "بہت سویٹ بندہ ہے۔" وہ یوں مسکرایا۔ جیسے اسے ابراہیم کا تصور کر کے اس پہ پیار آ رہا ہو "بکتا ہے' جھکتا ہے۔ لڑتا ہے مگر ہر ایسی جگہ میرے کہنے پر میرے ساتھ چل پڑتا ہے۔"

"ابراہیم جانتا ہے کہ تم یہ سب کچھ کرتے پھرتے ہو؟" ماہ نور نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ "میلے ٹھیلے' خانہ بدوش' کمہار۔۔۔ الابلا۔"

"سب نہیں' مگر اتنا' جتنا میں اسے بتانا چاہتا ہوں۔" وہ مسکرا کر بولا اور آگے چلنے لگا۔ ماہ نور نے اس سے چند قدم پیچھے کھڑے رہتے ہوئے اسے خود سے آگے چلتے ہوئے دیکھا اور پھر تیزی سے چلتے ہوئے اس کے قریب آ کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

"تم نے کھاری کو دیکھا' وہ کتنا خوش ہے اور اس کی بیوی بھی کتنی خوش ہے' مگر عمر میں ابھی چھوٹے ہیں دونوں' ہے نا؟" اس نے سر اٹھا کر سعد کی طرف دیکھا۔

"ہاں! کھاری خوش ہے۔" وہ بولا۔ "وہ صرف خوش ہی نہیں 'خوش قسمت بھی ہے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات پر خوش اور مطمئن ہو جانا خوش قسمتی کی نشانی ہے۔" اس نے کہا۔

"خوش ہونا خوش قسمتی ہے کیا؟" ماہ نور نے پوچھا۔

"بالکل!" اس نے سر ہلایا۔ "تم اندازہ ہی نہیں کر سکتیں کہ کسی بات پر دل سے خوش ہونا کتنی بڑی خوش قسمتی ہے۔"

"تم ہوتے ہو کبھی دل سے خوش؟" ایک سیدھا سوال آیا۔

"بہت دفعہ۔" اس نے کہا۔

"اچھا!" ماہ نور کے لہجے میں طنز کی آمیزش ہوئی۔ "لگتا تو نہیں۔"

"شاید مجھے اظہار کرنا نہیں آتا۔ لیکن میں تو بہت معمولی معمولی باتوں پر خوش ہو جاتا ہوں۔۔۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً۔" اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ یاد کر رہا تھا۔ "مثلاً" پھر اس نے گردن موڑ کر ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"میری خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ جب ایک بوڑھی خانہ بدوش عورت نے مجھے اپنے ٹرنک میں رکھی چیزوں کے نیچے سے ایک نئی چادر نکال کر تحفے میں دی۔ وہ ایک سستی سی پرنٹڈ چادر تھی۔ جس کو خانہ بدوش لڑکے کبھی سر پر باندھے پھرتے ہیں اور کبھی شانوں پر اوڑھ لیتے ہیں۔ وہ سستی اور عام سی چادر تھی۔ مگر اس بوڑھی عورت کے تمام اسباب میں سب سے زیادہ قیمتی چیز تھی۔ غالباً" "اس روز میں اتنا خوش تھا کہ مارے خوشی کے میرے آنسو نہیں رک رہے تھے۔" وہ یاد کرتے ہوئے مسکرایا۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

"اور۔۔۔" ماہ نور نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

"اور ایک بار جب میں نے ایک پھرتے پھراتے فقیر سے تان اڑانا سیکھی۔ وہ کافی گانا سیکھنا میری خواہش تھی۔ مگر ایک ہفتے کے اندر اندر وہ مجھے سکھانے میں اتنا اتاولا ہو گیا کہ جب میری آواز اسے سوز اور جنون کی تڑپ میں ڈوبی بقول اس کے 'محسوس ہونے لگی تو اس نے خوشی کے مارے اپنا اکتارہ مجھے دے دیا۔ وہ اکتارہ اس کا واحد شوق اور قیمتی ترین اثاثہ تھا۔ میرے ہزار منع کرنے کے باوجود اس نے وہ اکتارہ مجھ سے واپس نہیں لیا۔" وہ بتا رہا تھا۔

ماہ نور کو ایک دم اپنی زندگی کی خوشیوں کے محور اور خوش ہونے کی تمام وجوہات اس کی باتوں کے سامنے ہیچ لگنے لگیں۔

"اور۔۔۔" اسے اپنی آواز خلا سے آتی محسوس ہوئی۔

"اور۔۔۔" وہ مزید کوئی ایسی بات سنانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "اور اس وقت بھی میری خوشی اپنے عروج پر تھی۔ جب سید پور کے میلے کی میوزیکل نائٹ میں تم دیوانہ وار میری طرف لپکی تھیں۔"

"واقعی!" ماہ نور کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

"ہاں!" اس نے سر ہلایا۔ وہ خوشی یہ احساس پانے کی تھی کہ میرے۔ سروپ پہچانتی جو لڑکی مجھ سے "تم کون ہو" کا سوال کرتی میری طرف آئی یقیناً "بہت خاص تھی اور میری زندگی میں اس کا رول یقیناً "بہت اہم ہو گا۔"

"اوہ!" ماہ نور کے دل نے شاید اس سے اچھا لمحہ خود پر اس سے پہلے گزرتا محسوس نہیں کیا تھا اس کا سر اس لمحے کی خوب صورتی کو محسوس کرتے ہوئے تشکر کے عالم میں جھکنے لگا۔

"خوش گوار لمحے' ہمارے آگے پیچھے' دائیں بائیں ساتھ ساتھ' چلتے ہیں بات صرف ان کو محسوس کرنے کی ہوتی ہے۔ ہم اکثر ان کو اگنور کر دیتے ہیں ماہ نور!" وہ کہہ رہا تھا۔

"اور۔۔۔" اس نے خوشی سے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

"اور۔۔۔" وہ ہنسا اور سر ہلا کر بولا۔ "اور مت پوچھو۔۔۔ آج کے لیے۔۔۔ بلکہ تمہارے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ اور سنانے بیٹھا تو شاید میری خوشی تمہیں اپنی خوشی نہ لگے۔"

ہواؤں میں اڑتا دل چشم زدن میں اپنی اوقات میں واپس آگیا۔

"ہاں! شاید اتنا ہی کافی ہے۔" اس نے سر ہلا کر کہا اور آگے چل دی۔ وہ اس سے چند قدم پیچھے کھڑا اسے دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

سعدیہ کی باتوں نے کھاری کو زندگی کا پہلا حوصلہ' تسلی اور دلاسا دلایا تھا۔ وہ سعدیہ کے تصور سے خائف تھا۔ وہ خود کو سعدیہ کے قابل نہیں سمجھتا تھا' مگر سعدیہ نے اسے باور کرایا تھا کہ اس کے لیے وہ اس کا شہزادہ سلیم تھا۔ کھاری شادی کے چند دن بعد ہواؤں میں اڑتا ہلکا پھلکا اور آزاد پرندہ بن چکا تھا' جو آسمان پر جس سمت چاہتا' پرواز کر سکتا تھا۔ سعدیہ کی صورت میں اسے زندگی میں پہلا سچا اور حقیقی رشتہ عطا ہوا تھا۔

اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ کسی سے متعلق ہونا کتنی بڑی نعمت تھی۔ وہ کم عمر لڑکی اسے بہت سی ایسی باتیں سکھا رہی تھی جن کے بارے میں پہلے اسے کچھ علم نہیں تھا۔ پڑھی لکھی سعدیہ کے ان پڑھ شوہر نے زندگی کی کتاب کی الف' ب پڑھنا شروع کر دی تھی۔۔۔ اور اس کتاب کے پہلے صفحے پر یہ عبارت جلی حروف میں لکھی تھی کہ۔

"سعدیہ سے اس کا رشتہ ایسا تھا جس کی وضاحت کرنے کے لیے اسے کوئی تمہید باندھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ دراصل وہ لاوارث تھا اور سعدیہ نے اس سے خدا ترسی میں یہ رشتہ باندھ لیا۔"

پہلے صفحے کی یہ عبارت اتنی دل خوش کن تھی کہ کھاری پر اگلے صفحے پڑھنے کی بے چینی نے سواری کر لی اور وہ اپنے گرد و پیش سے لاتعلق نظر آنے لگا تھا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں)

عنیزہ سیّد

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور نے "سید پور کلچرل شو" میں شرکت کے لیے اپنی دوست شاہ بانو کے ساتھ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ شاہ

بانو نے اپنے بھائی کی معرفت سید پور میں ماہ نور کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا۔ فاطمہ اور خدیجہ نے ماہ نور کو اسلام آباد میں قلزا ظہور سے ملنے کی تاکید کی۔ قلزا ظہور ان کے بچپن کی ساتھی ہے۔ بچپن میں کوئلے سے فرش اور دیواروں پر تصویریں بنانے والی قلزا ظہور اب ایک بڑی آرٹسٹ ہے مگر اسے شہرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔

مولوی سراج اور آپا رابعہ قصبے میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی سعدیہ کلثوم نویں جماعت کی طالبہ بے حد ذہین ہے۔ مولوی سراج اور آپا رابعہ کو اس بات پر فخر ہے کہ ان کی بیٹی سائنس پڑھ رہی ہے۔

ایک رات سارہ نے رکی کو خواب میں دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ سرکس میں کام کرتا تھا۔ رکی اپنے فن کا ماہر جوکر تھا۔

ماہ نور اور شاہ بانو "سید پور کلچل شو" میں گئیں تو وہاں انہیں ایک کمہار نظر آیا۔ وہ گیلی مٹی کو بہت مہارت سے دیدہ زیب برتنوں کی شکل میں ڈھال رہا تھا۔ ماہ نور کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہ چونک گئی۔ اسے اس پر اسی شخص کا گمان ہوا جو اسے ہر میلے میں مختلف روپ میں نظر آتا رہا تھا۔

سارہ، ماہ نور سے مل کر خوش نہیں ہوئی۔ اس کا رویہ بہت روکھا اور خشک تھا۔

واپسی پر گاڑی میں ماہ نور نے سعد سے اعتراف کیا کہ وہ اب تک جتنا سعد کو جان پائی ہے، سعد اس کی نظر میں ایک قابل رشک انسان ہے۔ سعد نے اسے سارہ کے متعلق بتایا وہ سرکس دیکھنے گیا تھا۔ سارہ خان بلندی سے نیچے گری تھی۔ اس نے اس کی ہڈیاں ٹوٹتے اور خون بکھرتے دیکھا تھا، وہ وہاں سے واپس آ گیا لیکن سارہ خان کے لیے بے چین رہا۔ وہ دوبارہ اسے ڈھونڈتے ہوئے اس سے ملنے پہنچا تو وہ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور زخم زخم جسم کے ساتھ ایک چھولداری میں پڑی موت کی منتظر تھی۔ اس کے زخموں پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں۔ سعد اس کو وہاں سے لایا اور اس کا علاج کرایا اور پھر اسے فلیٹ میں منتقل کیا۔

کھاری نے آپا رابعہ سے نماز یاد کرلی تھی اور بہت خوش تھا۔ سارہ خان نے پہلی بار سوچا سعد سے اس کا تعلق صرف ترس اور ہمدردی کا ہے اسے اپنا ماضی یاد آرہا تھا۔ جہاں جاپانی نقش و نگار والا رکی تھا۔ جس کی جاپانی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اس کا باپ اس کے بہن بھائیوں کے ساتھ پھوپھی کے حوالے کر گیا تھا۔ باپ نے دوسری شادی کرلی تو سوتیلی ماں کے مظالم سے تنگ آکر وہ گھر سے بھاگ گیا اور قسمت اسے سرکس میں لے آئی۔

آپا رابعہ نے مولوی سراج کو بتایا کہ اسکول والوں نے سعدیہ کی پیدائش کی پرچی مانگی ہے تو وہ پریشان ہو گئے۔

ماہ نور، سارہ سے ملنے آئی اور اس نے سارہ کو بتایا کہ اس کی سعد سے صرف چند دن پہلے ملاقات ہوئی ہے۔ یہ سن کر سارہ کا رویہ اس کے ساتھ بدل گیا۔

سعد نے اپنی بہن نادیہ سے اسکائپ پر بات کی۔ وہ فن لینڈ میں بہت مشقت بھری زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کی ماں کا شوہر اس پر بری نظر رکھ رہا تھا۔ اس لیے وہ فن لینڈ آ گئی۔

جیناں بھکارن نے ایک بچہ اغوا کیا لیکن پولیس نے اس سے بچہ برآمد کرلیا۔

ماہ نور کی سعد سے ملاقات ہوئی تو وہ اسے اختر کے پاس لے گیا۔ اختر نے ماہ نور کو دیکھ کر سعد سے کہا "یا تو زن یا من پالو" ایک کی قربانی دینی پڑے گی۔

اس نے ماہ نور سے کہا بی بی آپ کا دل بہت صاف ہے اور زندگی بہت پرسکون ہے لیکن آگے آپ کے لیے بہت مشکلیں ہیں۔

قلزا ظہور، سعد کو فون پر کسی تصویری نمائش کی دعوت دیتی ہیں۔ سعد اپنے فرینکفرٹ کے دورے کی وجہ سے معذرت کر لیتا ہے۔ ماہ نور، فاطمہ اور خدیجہ کو قلزا ظہور سے ملاقات کے بارے میں بتاتی ہے۔ فاطمہ ماہ نور سے سعد سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کرتی ہے۔ وہ بے دلی سے ہامی بھرتی ہے کیونکہ سید پور سے آنے کے بعد سے سعد کا فون مسلسل بند مل رہا تھا جبکہ سارہ خان کو اس نے اپنے جرمنی جانے کی اطلاع دے دی تھی۔

ماہ نور نے سعد کو فون کر کے شکوہ کیا کہ اس نے اسے جرمنی جانے کی اطلاع کیوں نہیں دی تھی۔ ماہ نور نے سعد سے وعدہ لیا کہ آئندہ وہ اسے بتا کر ہی کہیں جائے گا۔ اگلے دن سعد نے اسے کئی میسجز بھیجے۔ جن میں وہ اطلاع دیتا رہا کہ اب وہ کیا کر رہا ہے۔ ماہ نور کو یہ سب اچھا تو لگا، مگر اس نے سعد کو منع کر دیا اور کہا کہ وہ اسے بس ملک سے باہر جاتے ہوئے ہی اطلاع دیا کرے۔

سعدیہ نے آپا رابعہ سے تنگ کر اپنے رشتے داروں کی بابت پوچھا تو وہ تشویش میں مبتلا ہو گئیں۔ انہوں نے مولوی سرفراز سے اپنی تشویش کا اظہار کیا کہ سعدیہ کو شک ہو گیا ہے کہ ہم اس سے کچھ چھپاتے ہیں۔ تاہم مولوی سرفراز نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔

سعد نے قلزا ظہور سے ملاقات کی اور اس کا اسٹوڈیو بھی دیکھا۔ اس نے وہاں کچھ ادھوری پینٹنگز بھی دیکھیں، جو اسے بے حد متاثر کن لگیں۔

سارہ نے لچکیلے ربڑ سے کچھ جانور بنائے۔ سعد نے دیکھ کر کہا کہ اگر تم نے اس سے بھی اچھے بنائے تو میں تمہیں اپنے اور تمہارے بارے میں ایک اہم بات بتاؤں گا۔ سارہ نے اس سے وعدہ کرلیا کہ وہ اب اور محنت کرے گی۔

ماہ نور اپنے رشتے داروں کی شادی میں گئی تو وہاں ہال کے باہر اسے سعد کچھ لوگوں کے ساتھ نظر آیا۔ ماہ نور اسے اپنے شہر میں دیکھ کر حیران ہو گئی۔ وہ اس سے ملنے کے ارادے سے اس کی طرف بڑھی۔ مگر سعد نے ایس ایم ایس کے ذریعے اسے روک دیا۔ ماہ نور ششدر ہو گئی۔

آپا رابعہ، سعدیہ سے صاف لفظوں میں کہہ دیتی ہیں کہ وہ اسے آگے نہیں پڑھا سکتیں۔ سعدیہ کے مزاج میں مستقل برہمی آجاتی ہے۔

ماہ نور، سعد کو اپنے گھر لے جاتی ہے۔ فائزہ کا سرد اور دوٹوک انداز سعد کو کچھ اچھا نہیں لگتا، مگر کھاری اور ماہ نور کے تایا، تائی سے مل کر اسے بہت خوشی ہوتی ہے۔ کھاری اور رضوان الحق کی بہت اچھی دوستی ہو جاتی ہے۔ سارہ کے ہاتھوں میں مشاقی آتی جا رہی ہے۔ سی آنٹی اسے سراہتی ہیں اور باتوں باتوں میں اسے کرید تی ہیں کہ وہ رکو کو پسند کرتی تھی۔ سارہ انہیں مبہم سا جواب دیتی ہے۔ جس میں یہ بات نہایت واضح ہوتی ہے کہ سعد اس سے سچی محبت کرتا ہے۔

سعد، ماہ نور کے ساتھ خدیجہ اور فاطمہ خالہ سے ملنے جاتا ہے۔ ادھر شہناز کا ذکر نکل آتا ہے۔ سعد اس گفتگو میں دلچسپی لیتا ہے جسے فاطمہ محسوس کرلیتی ہیں۔ پرانا البم دیکھتے ہوئے سعد "قلزا ظہور کی تصویر فوراً" پہچان لیتا ہے۔

چوہدری صاحب نے کھاری کا سعدیہ کلثوم سے رشتہ طے کر دیا۔ آپا رابعہ اور مولوی صاحب بہت خوش ہوتے ہیں۔ سعدیہ اس گھر سے جان چھوٹنے پر مطمئن ہوتی ہے، جبکہ کھاری حیران اور پریشان ہے۔ وہ بہت انکار کرتا ہے، مگر کوئی اس کی بات نہیں سمجھ پاتا۔ کھاری، رضوان کو اور ماہ نور، سعد کو کھاری کی شادی کی دعوت دیتی ہے۔ سعد، ماہ نور کے علم میں لائے بغیر فاطمہ سے ملنے جاتا ہے اور چند باتیں پوچھتا ہے۔ آپا رابعہ فارم ہاؤس میں داخل ہوتی ہیں۔ سعد پر نظر پڑتے ہی وہ چونک جاتی ہیں۔

۱۴
چودھویں قسط

وہ غور کرتا بھی تو سمجھ نہیں سکتا تھا کہ کھاری کی ساس اس سے کیوں ملنا چاہتی تھیں، لیکن اس نے یہ بات سوچی ہی نہیں، البتہ وہ اس بات پر اپنے دل میں حیران ضرور ہو رہا تھا کہ وہ ان خاتون کے چہرے سے اپنی نظریں کیوں ہٹا نہیں پا رہا تھا۔ کیسا عام سا چہرہ تھا، بالکل ویسا ہی جیسا عام سی گھریلو خواتین کا ہوتا تھا، پھر کیا تھا جو اسے اپنا دھیان کسی دوسری طرف کر لینے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔

"نام کیا ہے تمہارا میرے بیٹے؟" کچھ دیر بعد اسے ان کی آواز سنائی دی۔

"سعد!" اس نے چونک کر اپنا سر جھٹکتے ہوئے کہا، مگر وہ اپنی اس کیفیت سے باہر نہیں نکل پایا تھا جو کھاری کی ساس کو دیکھنے پر اس پر طاری ہوئی تھی۔

"میرا نام سعد سلطان ہے۔" اس نے دونوں بازو کمر کے پیچھے باندھتے ہوئے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ شاید پورے جسم کو سہارا دے کر کھڑے رکھنا چاہ رہا تھا۔

"سعد سلطان!" خاتون نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر دہراتے ہوئے سامنے دیکھا۔ نجانے کیوں سعد کو لگا کہ وہ اس کا نام سن کر مایوس ہوئی تھیں۔

"میں کتنے دن سے تمہیں یہاں دیکھ رہی تھی۔" وہ دو قدم آگے بڑھ کر اس کے اور اپنے درمیان کا فاصلہ کم کرتے ہوئے بولیں۔

"جی!" سعد نے سر کو تعظیماً" ذرا سا جھکا کر کہا۔

"پتا نہیں کیوں تمہیں دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ تم کسی بہت نیک ماں کی اولاد ہو۔" یہ ان کا جملہ انتہائی غیر متوقع تھا، کسی کو محض دیکھنے سے یہ خیال کیسے آسکتا ہے کہ وہ نیک ماں کی اولاد ہے۔ سعد نے سوچا اور لاشعوری طور پر دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

"بہت پڑھی لکھی، سمجھ دار، نیک طبیعت، نیک دل خاتون ہوں گی تمہاری والدہ۔ ہیں نا؟" انہوں نے عجیب سے انداز میں کہتے ہوئے یوں سر ہلا دیا جیسے جواب میں صرف وہ سننے کی خواہش مند ہوں جو ان کا سننے کو دل چاہ رہا تھا۔

"جی!" سعد نے ایک لمحے کے لیے ادھر ادھر دیکھا، کیا اس کے ذہن میں اس سوال کا کوئی مناسب جواب تھا؟

"وہ ویسی ہی ہیں جیسی ستر فیصد مائیں ہوتی ہیں۔" اس کی زبان سے پھسلا وہ سامنے دیکھ رہا تھا جہاں ایک عورت اپلے تھاپنے سے فارغ ہو کر نل کے شفاف اور تیز دھار پانی سے ہاتھ منہ دھو رہی تھی۔ اس وقت وہ خود بھی جان نہیں پا رہا تھا کہ وہ ان کے سوال کا یہ جواب کیوں دے رہا تھا۔ اس کے جواب کے رد عمل میں کھاری کی ساس کے چہرے کے تمام نقوش ذرا دیر کے لیے کھنچ سے گئے یوں کہ وہ خفیف جھریاں جو ویسے بالکل بھی نمایاں نہیں تھیں نظر آنے لگیں۔

"اچھا!" اس بار بولنے کے قابل ہونے میں انہوں نے کچھ وقت لگایا تھا "کہاں رہتی ہیں وہ؟" اب ان کی آواز یوں لگ رہی تھی جیسے کسی اندھے کنویں سے نکل رہی ہو۔

"وہ۔" اس سوال کا جواب دینے کے لیے بھی سعد کو کچھ دیر سوچنا تھا۔ "دراصل ہم لوگ مستقل ایک جگہ پر نہیں رہ پائے۔" اب کے اس نے صاف ان کو ٹالنے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا "والد صاحب کے کام کے سلسلے میں ——— کبھی ایک شہر کبھی دوسرے شہر اور اکثر ملک سے باہر بھی اب آپ کو کس جگہ کا بتاؤں"۔

"اچھا اچھا!" ان کے چہرے کے نقوش اپنی جگہوں پر واپس آ گئے "جیتے رہو۔" "اللہ بھاگ لگائے رکھے تمہیں بھی اور تمہاری ماں کو بھی، اللہ اونچی حویلیاں، اونچے دروازے عطا کرے، اللہ اتنا دے کہ سمیٹتے تھکو۔ خوش رہو، سدا سلامت رہو۔"

انہوں نے اپنا بازو قدرے بلند کر کے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا اور پھر اسی ہاتھ کو ہلاتے ہوئے وہ اس ملازمہ کے ساتھ باہر نکلنے کے اس راستے پر مڑ گئیں جس پر چل کے یہاں تک پہنچی تھیں۔

سعد انہیں دور تک جاتے دیکھتا رہا۔ یکایک اسے ایسا لگا جیسے فضا میں چہار سو سناٹا چھا گیا ہو، یوں کہ سوئی گرنے

کی آواز بھی سنائی دے سکتی تھی۔ اس کے ارد گرد مختلف جگہوں پر ٹولیوں کی صورت بیٹھی اپلے تھاپتی عورتیں جیسے منظر سے ایک دم غائب ہو گئی تھیں، ان کی آوازیں، قہقہے، اپلے تھاپنے اور دیوار پر لگانے کی چٹاخ پٹاخ سب بند ہو گیا تھا اور فضا میں ایک ہی آواز ابھرتی سنائی دے رہی تھی۔

"تم کسی بہت نیک ماں کی اولاد ہو۔" ایک غیر متوقع اور غیر معمولی سوال۔

"نیک والدین کے بجائے صرف نیک ماں کا لفظ کیوں بولا گیا؟"

اس کے دماغ نے سوال کیا۔ یہ سوال ذہن میں آتے ہی اس نے فوری رد عمل کے طور پر اس راستے کی طرف دیکھا جس پر چل کر وہ خاتون واپس جا رہی تھیں۔ اس کا جسم ایک لمحے کے لیے حرکت میں آیا جیسے اسی راستے پر خاتون کے پیچھے جانا چاہ رہا ہو لیکن پھر وہ وہیں رک گیا۔

"کیا یہ ضروری ہے کہ ہر کسی کو بتایا جائے کہ جی میری والدہ کا تو میرے بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا اور تب سے اب تک میں بن ماں کے ہی زندگی گزار رہا ہوں۔" دل نے سمجھایا تھا۔

کھاری کی ساس سے تو شاید یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی، ان سے کون سا مستقل تعلق رہنے والا تھا جو بعد میں اپنی غلط بیانی پر پکڑے جانے کا امکان ہو۔ ان کا سوال بھی تو سنو "نیک ماں کی اولاد" انہوں نے یہ سوال کیا کیوں بھلا۔ شاید یہ دیہاتی عورتیں جو ہوتی ہیں، وہ اسی طرح سوچتی ہوں، انسان اچھا لگا تو قیافہ لگا لیا کہ نیک ماں کی اولاد ہو گا، نیک دودھ پیا ہو گا وغیرہ وغیرہ..... سو سعد صاحب! اس ایک معمولی سے واقعے پر غیر معمولی سوچ بچار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، آپ کو فضول سی عادت ہے اپنا دماغ تھکانے کی"۔

اپنے کمرے میں واپس آ کر بیڈ پر لیٹنے کے بعد کھاری کی ساس کی غیر متوقع آمد اور بغیر کسی تمہید کے غیر متوقع سوال پر غور کرتے ہوئے اس نے تجزیہ کیا اور اس واقعے کی طرف سے دھیان ہٹانے کی کوشش کی۔

"نیک ماں، نیک دودھ" وہ اس روز سہ پہر تک کمبل میں منہ چھپا کے سونے کی کوشش کرتا رہا مگر سو نہیں پایا۔ چار الفاظ پر مشتمل بغیر سوالیہ نشان کے یہ سوال اس کے دماغ پر مسلسل گرز بجاتا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آنکھوں کی سوئیاں نکلیں تو وہ چہرہ نظر آگیا جو اتنا مانوس ہے کہ بے اختیار دل چاہتا ہے، نظریں اس کی بلائیں لے لیں مگر اس کے ساتھ تو کوئی بلائیں موجود محسوس نہیں ہوتیں، پھر نظریں واری صدقے ہونے سے آگے کوئی دوسرا کام کر ہی نہیں سکتیں، مگر وہ ہونٹ اور وہ زبان کہتی ہے کہ میں وہ نہیں ہوں جو سمجھ کر تمہارے دل کو بے چینی لگی تھی، وہ رویہ کہتا رہا کہ فاصلہ رکھو، فاصلہ رکھو، اپنی اوقات پہچانو۔"

تارا بعد نے دائیں ہاتھ سے اپنی پیشانی مسلی۔

"مگر میں کیسے مان لوں کہ دنیا میں واقعی ایک طرح کے دو چہرے ہوتے ہیں، اور اگر ہوتے ہی ہیں تو میں وہ خوش قسمت ہوں کہ مجھے دونوں ہی چہرے زندگی میں دیکھنا نصیب ہو گئے۔"

"یا اللہ!" انہوں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا "یہ کیسی بے بسی ہے اور، یہ کیسی بے اختیاری ہے۔ نہ آگے جانے کا کوئی راستہ ہے نہ پیچھے ہٹنے کو دل چاہتا ہے، اس اضطراب کا اس بے چینی کا کیا کروں جو کسی کل سکون نہیں آنے دے رہی۔" انہوں نے دوپٹے سے چہرہ پونچھتے ہوئے سر کو دبایا۔

"وہ ویسی ہی ہیں جیسی ستر فیصد مائیں ہوتی ہیں۔" ایک جملہ بازگشت کی صورت ان کے گرد پھیلتا تھا سمٹتا تھا اور پھر پھیل جاتا تھا۔

"صبر اور توکل' غنا اور فقر۔" انہیں بار بار کی دہرائی بات یاد آئی۔ "یہ انجام اور ایسا انجام!" انہوں نے اپنے اردگرد دیکھا' ویرانی اور فاقہ مستی درودیوار سے لپٹی بے بسی سے مسکرا رہی تھی۔ "عمر بھر صرف محرومی' صرف تلخی' صرف احساس زیاں" ان کے دل میں ایک تلخ احساس جاگا۔

"شاید سعدیہ ٹھیک سوچتی ہے' عمر بھر چور اور سادھ کا کھیل کھیلتے رہنے سے بہتر ہوتا ہے کہ انسان نظراندازی کی ضمانت کروا کر اس قید تنہائی سے جان چھڑا لے جیسے سعدیہ نے چھڑالی۔ لیکن کون جانے۔۔۔"

"مسائل کے عقوبت خانے میں ایک بار نام کسی کھاتے میں چڑھ جائے تو مستقبل میں کسی موڑ پر پچھلے کھاتے دوبارہ نہ کھل جائیں گے اس کی ضمانت ہے کسی کے پاس۔"

ان کا منتشر ذہن ایک کے بعد ایک سوچ سوچے چلا جا رہا تھا۔ سعدیہ کی شادی کے بعد اس روز وہ کئی دن بعد اپنے گھر واپس آئی تھیں۔ کئی دن تک گھر بند رہنے کی وجہ سے انہیں اندر باہر ہر جگہ ایک عجیب سی وحشت پھیلی نظر آ رہی تھی' صحن کی کچی زمین میں دراڑیں پڑ رہی تھیں' یہ ہی حال چھت کا بھی ہوگا انہیں خیال آ رہا تھا لپائی کون کرے گا؟! انہوں نے سوچا۔

صحن میں گڑا مٹی کا چولہا ٹھنڈا پڑا تھا' جانے سے پہلے آخری دن کے بنائے کھانے کے بعد ایندھن کی بچ جانے والی راکھ چولہے کی کوکھ میں دبی پڑی تھی۔ انہوں نے چولہے کے قریب رکھے راکھ دان کو دیکھا "چولہے سے کرید کرید کر راکھ کون نکالے گا"

سوچتے سوچتے ان کی نظر اس چھوٹے اور عارضی باورچی خانے پر پڑی جسے سعدیہ نے زندگی میں اپنی اولین عملی کاوش سے منظم کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتی اس باورچی خانے میں داخل ہوئیں' دیوار سے ذرا آگے کو بڑھی مٹی کی شیلف پر قطار در قطار سستے نائیلون کے ڈبے رکھے تھے' نمک' مرچ' ہلدی' پسا دھنیا' گرم مسالہ' انہوں نے ہاتھ لگانے پر پچک جانے والے نائیلون کے ڈبوں کو احتیاط سے کھول کھول کر ان کے اندر جھانکا۔ سب مسالے سیلن زدہ ہوئے پڑے تھے۔

گھر سے غیر حاضری کے دوران ایک دن بارش بھی آئی تھی اور اس عارضی باورچی خانے کی چھت ٹپکتی تھی' بارش کا پانی ان ڈبوں پر پڑا ہوگا' مسالے غارت ہوئے۔ ان کی آنکھوں میں نجانے کیوں آنسو بھر آئے۔

"یہ سامان زندگی' انسان ذرا سی لاپروائی برتے تو غارت ہو جاتا ہے۔" اس سامان زندگی کا تعاقب کرتا انسان اپنی دونوں ٹانگوں کی طاقت کیسے صرف کرتا ہے' اور یہ طاقت صرف کرتے وقت نہیں جانتا ہوتا کہ جب جان نکلنے پر آتی ہے تو سب سے پہلے ان ہی ٹانگوں سے ہی نکلتی ہے۔" انہوں نے سوچا اور وحشت زدہ ہو کر باورچی خانے سے باہر نکل آئیں۔

"دراڑیں پڑتا فرش' ٹھنڈا چولہا' گرد آلود کمرا اور سامان' سیلن زدہ مسالے" انہوں نے وحشت زدہ آنکھیں چاروں طرف گھمائیں۔ "کیا مزید جینے کا' مزید زندگی کا کوئی جواز ہے میرے پاس اب"۔ ایک نیا سوال ذہن سے ٹکرایا۔

"ایک قرض تھا جو ادا ہو گیا' اب کس کے لیے جینا' کس کے لیے جینے کا سامان کرنا؟"

"اب زم زم میں بھگوئی تسبیح اور عجوہ کھجوریں۔" اسی دم ان کی سماعت سے ایک آواز ٹکرائی "اس مولا کے گھر سے لائی ہوں بی بی جی! جس کے در پر اپنی عاقبت سنوارنے کی خاطر گئی تھی۔"

"عاقبت!" ان کے جسم نے یکایک جھرجھری لی "جینے کا جواز پوچھتی ہو رابعہ بی بی! ذرا یہ تو بتاؤ آگے اپنے ساتھ کیا لے جانے کی سعی کی"۔ ایک سوال ذہن نے کیا۔

"عمر کا آدھا حصہ کھیل تماشے میں گزار دیا' اور باقی کا چھپن چھپائی کھیلتے۔۔۔ ایک ناکردہ جرم کی سزا سے بچنے کی خاطر چوروں کی طرح کبھی یہاں چھپ کبھی وہاں چھپ۔۔۔ تمہارے ہاتھ پر لہو تھا نہ خنجر۔ پھر کس ڈر سے دستانے کہنیوں تک چڑھا لیے۔ نہ صرف چڑھا لیے بلکہ ان کو چڑھائے رکھنے کی خاطر جھوٹ' غلط بیانیوں' دردر کی ٹھوکروں میں بھی پڑی رہیں۔۔۔ اور اب پوچھتی ہو' جینے کا جواز کیا ہے۔۔۔ یہ تو بتاؤ مرنے کا سامان کتنا اور کیسا کیا؟"

ان کا پورا جسم خوف کے مارے پتے کی طرح لرزنے لگا۔

"فقر' توکل اور بے نیازی کا جو راگ ایک عرصے سے تم الاپ رہی اپنے تئیں درویش صفتی اختیار کر رہی تھیں' خود سے ایک بار تو پوچھو کیا اس میں اس شاطرانہ چال کی گنجائش تھی جس کے ذریعے تم نے سعدیہ کا عذاب معصوم کھاری کے سر پر ڈال دیا۔ اور اپنی جان چھڑالی۔۔۔ واہ بھولی معصوم' خدا شناس' درویش بی بی ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو تمہارے پس منظر کے یکسوئے جگہ جگہ ادھڑے لپٹے گریبان کی کھونچیں پکڑے نظر آ رہے ہیں' لاکھ گریبان کو ظاہری چادر سے ڈھانپو' اس کے نیچے کا منظر تو وہی رہے گا۔ کیا اس منظر کو بدلنے کی کوشش نہیں کر سکتی تھیں تم؟"

وہ لرزتی ٹانگوں پر کھڑے رہنے سے قاصر تھیں' صحن کے کونے میں رکھی لکڑی کی چوکی پر بیٹھ گئیں۔

"بزدل تھیں' بزدل ہی رہیں' حقیقت سے نظریں چرائے' بس زندگی گزارے جانے کو ترجیح دیتی رہیں' زندگی کی نظروں میں نظریں ڈال لینے کی جرات کرتیں تو درویشی کی اس چادر کی کھونچیں بھی بھری جاتیں اور سعدیہ بھی یوں راہ سے بے راہ نہ ہوتی۔"

"یا اللہ!" سوچوں کی یلغار سے گھبرا کر انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا "تو جانتا ہے' تو تو جانتا ہے نا' صرف تو ہی تو جانتا ہے"۔ آنسو ان کی آنکھوں سے بھل بھل نکلے تھے "ایک میری اکیلی جان اور سوچیں ہیں کہ ان گنت ہیں' یادیں ہیں تو بے شمار ہیں' پچھتاوے ہیں تو بے حساب ہیں۔"

ہلکے نیلے آسمان پر کہیں کہیں اڑتی مہین سی بدلیاں ان کی طرف دیکھ کر جیسے طنزا" مسکرائی تھیں۔

"جب سر پر پڑتی ہے تو یوں ہی اوپر والے کی طرف رجوع کرنے کا خیال آتا ہے۔" ایک شوخ بدلی نے جیسے اٹھلا کر ان کو مخاطب کیا تھا اور ہوا کے سنگ آگے سرکتی کسی اور مقام پر جا بجی تھی۔

"دیکھا' ذرا سی پریشانی ذہن سے ٹکرائی نہیں اور تم ہو میں آپے سے باہر۔" ایک مانوس آواز جسے وہ برسوں قبل کھو چکی تھیں ان کے کان میں سرگوشی کرنے لگی۔

"کتنی بار کہا ہے کہ صبر کرنا سیکھو' صبر دنوں کا نہیں سالوں کا چکر ہے بی بی! اور کبھی کبھی تو صدیوں پر محیط ہو جاتا ہے' دس نسلیں صبر کرتی ہیں تب جا کر ایک نسل کو اس کا میٹھا پھل ملتا ہے' مگر تم ان باتوں کو کیا جانو۔ دنیا کی تاریخ سے واقفیت حاصل ہوتی تو جانتیں نا" اس مانوس آواز کی سرگوشی نے ایک بار پھر انہیں حقیقت کی دنیا میں لا پھینکا۔

"وہ کیسی ہی ہیں جیسی ستر فیصد مائیں ہوتی ہیں۔"

وہ ناقابل یقین' تلخ جملہ ایک بار پھر کان سے ٹکرایا۔ وہ گھبرا کر اٹھیں اور کمرے کے اندر داخل ہو گئیں۔ اب وہ کمرے کے کونے میں رکھے جستی ٹرنک کا تالا بے صبری سے کھول رہی تھیں اس ٹرنک کے تالے کی چابی ان کے بالوں میں پڑے پراندے سے بندھی تھی۔ ٹرنک کا تالا کھلنے پر انہوں نے لرزتے ہاتھوں سے اس کا ڈھکن اٹھایا اور قرینے سے اوپر نیچے رکھے کپڑوں کی تہہ سے ایک خاکی لفافہ نکال کر ٹرنک کا ڈھکن بند کر دیا۔ اس لفافے میں ماضی کی چند تصویریں تھیں۔ پہلی بلیک اینڈ وائٹ تصویر میں وہ چہرہ نمایاں تھا جس کو وہ لاکھوں کے ہجوم میں بھی

پہچان سکتی تھیں۔ پھر ان کو غلط گمان کیسے ہو سکتا ہے۔ ان کے دل پر ایک بار پھر سے وہی بے چینی سوار ہونے لگی۔ کیسا فاصلہ رکھنے کا سا انداز تھا' لیے دیے' اپنے خول میں سمٹا ہوا۔ انہیں یاد آیا۔

"نہیں۔" انہوں نے جیسے خود کو سمجھایا۔ "ایک کوشش اور کرنی ہوگی' ایک بار پھر سے سوال کرنا ہوگا۔۔۔ وہ دل جو برسوں سے کھنڈر کی صورت سینے میں رکھا ہے' ایسے ہی تو نہیں جاگا' بلاوجہ تو نہیں کھنچا۔ یونہی تو گواہی نہیں دے رہا۔"

وہ خود کو سمجھاتے ہوئے سہلا رہی تھیں۔

اگلے ہی لمحے وہ سعدیہ سے ملاقات کے لیے اس کے پاس جانے کا پروگرام اپنے دل میں طے کر رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"ضروری تو نہیں کہ ہر کسی کے سامنے اپنے ذاتی معاملات کھول کھول کر رکھ دیے جائیں' میں کیوں کھاری کی ساس کو بتاتا کہ مجھے اپنی ماں کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے اور یہ کہ نیک صفتی تو دور کی بات ان کی تو شہرت اور ذکر ہی بڑا مشکوک ہے۔" وہ کئی پہر روٹھے بچوں کی طرح کمبل میں منہ دیے سوچتا رہا تھا۔

"نگران خاتون نے واحد یہ ہی سوال کیوں کیا' وہ کہاں بیٹھ کر مجھے آبزرو کرتی رہی تھیں' جو انہیں خیال آیا کہ میری ماں بہت نیک خاتون ہوگی۔ میرا خیال ہے' مجھے یہاں سے اب بھاگ لینا چاہیے۔ بہت رہ لیا۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"میں اس معاملے کے پیچھے اتنی بری طرح لگا ہوا ہوں شاید اسی لیے ایسی کوئی بھی بات مجھے باقی باتوں سے زیادہ ہانٹ کرتی ہے۔"

سر جھکا کر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنا تجزیہ کرتے ہوئے سوچا پھر سیل فون پر بجتی گھنٹی نے اس کے دھیان کو توڑ دیا۔

"السلام علیکم" اس نے فون آن کرکے کان سے لگایا۔

"وعلیکم السلام۔" دوسری جانب سے آواز آئی۔ "کیا میں تمہیں یاد دلاؤں کہ چھٹی کے دن ختم ہونے میں صرف دو دن باقی ہیں۔"

"آپ یاد نہ دلاتے تو بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

"اس بار لگتا ہے بن میں جا بسیرا کیا ہے۔"

"اوہ۔۔۔ آپ کے جاسوس تو خاصے کائیاں نکلے خوب پتا چلا لیا۔"

"میری چھٹی حس میری سب سے بڑی جاسوس ہے اگر مانو تو۔۔۔"

"نہ ماننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' میں نے اس چھٹی حس کے ہاتھوں بڑے بڑے ٹھگ پکڑے جاتے دیکھے ہیں۔"

"فکر نہیں کرو' اس بار میرا ٹھگوں کے بادشاہ کو پکڑنے کا ارادہ ہے۔"

"واہ واہ۔۔۔ لیکن میں کیوں فکر کرنے لگا' فکر آپ کو ہونا چاہیے یا اس کو جو ٹھگوں کا بادشاہ ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو' بس ذرا فیصلہ ہو لینے دو کہ ٹھگوں کا بادشاہ ہے کون؟"

"جب فیصلہ ہو جائے تو مجھے ضرور مطلع کر دیجیے گا' میں دیکھنا چاہوں گا کہ ٹھگوں کا بادشاہ بنارس سے تعلق رکھتا ہے یا بنگلور سے۔"

"ضرور۔۔۔ ٹھگ پکڑنا میرا کام اس کی بائیولوجیکل ہسٹری جاننا تمہارا کام۔"

"ہاں اس کام میں مجھے یقیناً مہارت ہوتی جا رہی ہے' ہو سکتا ہے آئندہ آنے والے وقت میں' میں بغیر پڑھے

ماہرِ ٹھگولوجی اور ماہرِ آرکیالوجی کا درجہ پا جاؤں۔"

"ہو سکتا ہے اگرچہ مجھے اس بیان پر تھوڑا شک ہے' البتہ یہ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آنے والے وقت میں تم بھی گنتی کے اندازے کے بغیر کسی شام چوراسی گھرانے کے فرد بغیر تصدیقی سند کے قرار دیے جا سکتے ہو' کیونکہ تمہاری لائن آف انٹرسٹ کے فل مارکس ادھر ہی کو جاتے دکھائی دے رہے ہیں۔"

"ہاہاہا۔۔۔ گنتی کا اندازہ میں بتا دیتا ہوں۔۔۔ یہ گھرانہ شام چار سو بیس گھرانے کے نام سے مشہور ہوگا' اپنی ڈائری پر نوٹ کر کے رکھ لیجیے۔"

"بالکل ٹھیک اندازہ لگایا تم نے پتا تو مجھے بھی تھا' ہاں منہ سے یہ عدد نکالتے لاج آتی تھی۔"

"آپ کو بھی لاج آتی ہے۔۔۔ معلومات میں اس اضافے کا شکریہ۔"

"باتوں میں اڑانے کی نہیں ہو رہی۔۔۔ یہ بتاؤ بن میں بیٹھے ہو یا صحرا میں' منگلز کا مسئلہ آ رہا ہے۔"

"یہ پتا چلانا آپ کا کام ہے میرا نہیں' کہاں ہیں آپ کے سارے تین نمبری جاسوس جو مفت کی روٹیاں توڑتے ہیں اور آپ کو غلط اطلاعات دیتے ہیں۔"

"رعایت لے جاتے ہو بچو' جاسوسی تین نمبری نہیں ہیں۔"

"اوہ۔۔۔ تو پھر پال کیوں رکھے ہیں' رعایت ہی کی بات ہے تو چلنے دیں یہ رعایتی کھاتہ' محض تین دنوں کی تو بات ہوتی ہے' آپ نے تیس لاکھ کا خرچا بلاوجہ باندھ رکھا ہے۔"

"وہ اس لیے کہ روکڑا بہت ہے اللہ کے فضل سے' ڈالرز' پاؤنڈز' یوروز' درہم' دینار' ریال اور بیچارا روپیہ الحمدللہ سب میں کھیلتے ہیں' جب سمجھ میں نہیں آتا کہ مزید کہاں خرچ کریں تو مفت خورے پال لینے کا سودا سر میں سما جاتا ہے۔"

"ارے آپ بنگالی ٹکے کو بھول گئے ہیں' جو کبھی ٹکے کے بھاؤ بکتا تھا۔ آج ٹکے کے مضبوط کرنسی ہونے کے سبب بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ میں آپ کو تب امیر مانوں گا جو آپ ٹکوں میں بھی کھیلنا شروع کر دیں۔"

"تمہاری خواہش سر آنکھوں پر۔۔۔ بس اب کے تم واپس آتے ہو تو اس آئیڈیا پر بھی کام شروع کر دیتے ہیں۔"

"مجھے پتا تھا آپ یہ ہی کہیں گے' آپ کا پسندیدہ ترین موضوع جو ٹھہرا۔ چلیں دیکھتے دو جمع چار ٹکے کرنے کی کوشش میں رات تک کتنے ٹکے جمع ہوتے ہیں' ان کی گنتی کے بعد ہم ان لوگوں سے رجوع کریں گے جن کو ٹکے کے لوگ کہا جاتا ہے۔"

"تمہیں رجوع کرنے کی کیا ضرورت ہے' تمہارا اٹھنا بیٹھنا تو ویسے بھی اکثر ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔"

"آپ سے تعارف نہیں ہے نا میرے ایسے کسی مصاحب کا' آپ سے ملوانے میں آسانی رہے گی ٹکوں کے متلاشی لوگوں کو۔"

"ہوں۔۔۔ خیر فی الحال تو ایک بار پھر سے یاد کر لو' دو حد سے زیادہ تین دن باقی رہ گئے ہیں۔"

"حد سے زیادہ تین نہیں حد کے اندر ہی تین دن' یہ اکتیس دنوں کا مہینہ ہے' کیلنڈر پر نشان لگا لیں۔"

"چلو میں انتظار کروں گا۔"

"ایک منٹ رکیے۔۔۔"

"ہاں بولو۔"

"یہ بتائیے کہ کسی دیہات کی چھوٹی سی مسجد سے وابستہ کسی مولوی صاحب کے ذکر سے ذہن کے گوشے میں کوئی خیال آتا ہے آپ کو؟"

"خیال نہیں ہے۔۔۔ خیالات ایک نہیں کئی۔"

"واہ۔۔۔ ونڈر فل۔۔۔ پوچھ سکتا ہوں کیا؟"

"میرا مشورہ ہے کہ اگر کوئی ایسا شخص تمہارے اردگرد پایا جا رہا ہے تو اس سے دور رہو۔"

"میں آپ کے خیالات جاننا چاہ رہا تھا۔"

"خیالات کے نچوڑ کی روشنی میں ہی یہ رائے دے رہا ہوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے لیکن یہ بھی بتایئے کہ صرف کسی ایسے شخص ہی سے دور رہا جائے یا اس کی بی بی سے بھی۔"

"بی بیاں تو مار افسا (افسوں گر) ہوتی ہیں ان سے اور بھی دور رہنا چاہیے مگر تمہارا کیا علاج کہ بی بیوں میں بیٹھ کر خود کو ڈان ژوان سمجھنے لگتے ہو۔"

"ہاہا۔۔۔ کیا کیا جائے' بیٹا بھی تو آپ کا ہی ہوں۔"

"تمہاری کیا کہتے ہو۔۔۔ جوانی میں لوگ وحید مراد سے تشبیہ دیتے تھے ہمیں۔"

"جوانی ہی کیا' ابھی بھی آپ چاکلیٹی امیج رکھتے ہیں۔"

"چلو پھر اپنا خیال رکھو میں تمہارا منتظر ہوں' اس بار ٹکا ٹکا کھیلیں گے۔"

"ارے وہ مولوی صاحب کی بی بی اور مولوی صاحب تو بیچ میں ہی رہ گئے۔"

"ٹوں ٹوں" لائن منقطع ہو چکی تھی۔

اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے فون بند کر دیا۔ کچھ دیر سامنے دیکھتے ہوئے سوچنے کے بعد اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا' صبح سے اب تک یونہی سستی میں پڑا تھا' شیو بھی نہیں کی اور کپڑے بھی نہیں بدلے۔

خالی کمرے میں ادھر ادھر دیکھنے کے بعد آہستہ قدموں سے چلتا وہ کھڑکی کے قریب گیا' کھڑکی کھول کر باہر جھانکتے ہوئے اسے ماہ نور کا خیال آیا۔ نجانے اس وقت وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔ اس کا کمرا بالائی منزل پر تھا۔ کمرے کی مشرقی کھڑکی سے گالف کورس اور سوئمنگ پول صاف نظر آ رہے تھے۔ بیرونی دیوار کے ساتھ سرو کے درخت قطار میں سر اٹھائے کھڑے تھے' باسکٹ بال کورٹ کے ساتھ کنکریٹ کی دیوار کے پار جامن اور آم کے پیڑوں کے جھنڈ تھے' سہ پہر کے وقت شاید ادھر کوئی خاص گہما گہمی نہ ہونے کے باعث درختوں کے جھنڈ پر ہو کا عالم طاری تھا۔ فضا کے سکوت کو کبھی کبھی ابھرنے والی کوئل کی آواز توڑتی تھی اور پھر وہی خاموشی چھا جاتی تھی۔

اس نے دلچسپی سے آموں کے بور سے لدی شاخوں کو دیکھا جن کی مخصوص مہک ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔

کیسی سست مگر کتنی دلچسپ ہے یہاں کی زندگی۔

اس نے سوچا اور کھڑکی کے قریب سے ہٹ کر نہانے کے لیے باتھ روم میں گھس گیا۔

☼ ☼ ☼

"ایک' دو' تین' اس نے دائیں پاؤں کے پنجے کو فرش پر ٹکتے ہوئے گنا' ایک' دو' تین' وہ اس پنجے کے بل پر ذرا آگے چلی' تین' چار' پانچ' بائیں پاؤں کو حرکت دینے کے لیے گنتی گنتے ہوئے اس کے دل نے مسرت سے اچھلنا کودنا شروع کیا ہی تھا کہ اس کا نصف قدم ڈگمگایا اور اس کا کمزور وجود ہوا میں لہرا کر فرش پر جا پڑا۔

"اوہ۔" اس نے کچھ دیر بعد سر اٹھایا وہ پیٹ کے بل گری تھی' اس کی ہتھیلیاں اس کے وزن کے نیچے اس طرح دب گئی تھیں کہ اس نے گرتے ہوئے وجود کو ان پر تھام لیا تھا۔ سر اٹھانے کے بعد اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو اپنے وجود کے نیچے سے نکال کر نظروں کے سامنے کیا' اس پر ہلکا سا نشان پڑ گیا تھا اور وہ سرخ بھی ہو رہی تھی۔

"اور جو چند لمحے پہلے یمی آنٹی نے یہ میز اپنی جگہ سے نہ اٹھائی ہوتی تو میرا سر ضرور ہی اس سے جا ٹکراتا۔" کچھ دیر بعد اس نے اس میز کی ٹانگوں پر ہاتھ ڈال کر اپنے گرے ہوئے وجود کو فرش سے اٹھاتے ہوئے سوچا۔ اس کے چہرے پر اتنی سی مشقت کے نتیجے ہی میں پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔ ایک' دو' تین' اس نے اپنے گرنے کی چوٹ سے دکھتے وجود کو کرسی پر گراتے ہوئے ایک بار پھر گنا۔

"You Can Count on me
Like One Two three
Ill be There"

اس کے دماغ میں ایک مختلف زبان میں سنائی گنتی گونجنے لگی۔ تم کو صرف ایک' دو' تین تک گنتی گننے کی ضرورت ہے' اس کے بعد میں تمہارے پاس ہوں گا اس نے انگریزی زبان میں گائے ان لفظوں کو اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے یاد کیا۔

"میں نے تو تین سے آگے گنتی ہی بھلا دی' مگر جتنی بار یہ تین عدد گن لوں' تم آ کر ہی نہیں دیتے۔" وہ جس سوچ سے فرار حاصل کرنا چاہ رہی تھی' وہ زبردستی اس کے ذہن میں در آئی تھی۔

"نجانے تم کہاں ہو۔۔۔ جبکہ تم نے کہا تھا کہ تم میرے لیے ہر وقت' ہر جگہ موجود ہوتے ہو۔۔۔ دیکھو اب کتنے دن ہو گئے مجھے اس چھوٹے سے فلیٹ میں' کبھی پنجوں کے بل' کبھی پاؤں پاؤں چلنے کی کوشش کرتے ہوئے' میں تو اس فلیٹ کے کونے کونے تک یونہی گرتے' اٹھتے' پھر سے کوشش کرتے پہنچی ہوں مگر تم کہیں نہیں ہو' نہ خود کہیں نظر آتے ہو نہ گنتی گننے پر سامنے آتے ہو۔" اس نے اپنی اکڑی ہوئی ہتھیلیاں کھولتے اور بند کرتے ہوئے سوچا۔

"ہاں تم اس لڑکی کے ساتھ اس کے گاؤں جو گئے ہو جس کے ساتھ تمہاری ذہنی ہم آہنگی ہے' جو تمہارے ساتھ چل پھر سکتی ہے' تمہاری باتوں پر کھل کر مسکرا سکتی ہے' ہنس سکتی ہے' جو زندگی سے بھرپور ہے' اس لیے کہ اس کے اندر کوئی غم نہیں ہے' اس کے ساتھ کوئی حادثہ نہیں ہے۔ زندگی۔ زندگی کی طرف ہی کھنچتی ہے' زندگی' موت کے سائے سے گھبراتی اور دور بھاگتی ہے' اسے خاموشی اور جمود سے بیزاری ہوتی ہے' اسی لیے' اسی لیے۔۔۔" مایوس سوچوں نے یکدم اس پر یلغار کی تھی۔

"ہاں ہاں' سب ٹھیک ہے' سارہ بھی ٹھیک ہے۔"

"اب تو وہ وہیل چیئر سے اٹھ کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش بھی کرنے لگی ہے۔ لیکن تم جانتے ہو کب سے تو وہ چلنے کے تصور سے بھی ڈر رہی تھی' اس لیے عادت نہ رہ جانے کے سبب لڑکھڑا جاتی ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو تم یونہی اٹھتے' لڑکھڑاتے' گرتے' سنبھلتے۔ ایک دن ضرور آئے گا۔"

"موسم ہاں بھئی موسم یہاں کا بہت سہانا ہو رہا ہے' ہر سو خودرو بوٹیوں پر رنگ برنگ ننھے ننھے پھولوں کے ڈھیر لگے ہیں' پیڑ پورے سب ہرے بھرے ہیں' پہاڑوں کی برف اسی طرح انہیں سفید پوش کیے ہوئے ہے مگر پہاڑوں کا پیش منظر بدل گیا ہے کیونکہ دھوپ کا رخ بدل رہا ہے۔"

"تم بتاؤ' تم کیسے ہو کہاں ہو' اتنے دن سے غائب کیوں ہو۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ رکو میں سارہ کو فون دیتی ہوں۔"

کچن سے آتی یمی آنٹی کی آواز کو اس نے پورے دھیان سے سنا تھا' ان کی گفتگو کا ایک ایک لفظ اس کے کان میں پڑا تھا' وہ جانتی تھی بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ یمی آنٹی کا مخاطب کون تھا۔

"شاید تم ٹھیک کہتے تھے۔" اس نے کچن سے باہر نکل کر اپنی جانب آتی یمی آنٹی کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ یمی

آنٹی نے مسکراتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا فون اس کی طرف بڑھایا۔
سارہ نے یمی آنٹی سے فون لیتے ہوئے دانستہ سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا تھا "سعد ہے۔" یمی آنٹی نے مسکرا کر کہا۔
"ہیلو!" فون کان سے لگا کر وہ سنجیدہ سے لہجے میں بولی۔
"او ہیلو' کیا حال اینڈ چال ہے گور جیس؟" دوسری جانب وہ جان دار آواز تھی۔ جس نے ایک پل میں گرنے کے بعد محسوس ہونے والے درد کو رفع کر دیا تھا۔
"میں گورجیس نہیں ہوں۔" اس نے آہستہ آواز میں کہا۔
"نہیں ہو تو کیا ہوا' مجھے تو لگتی ہو نا۔"
"میں ایک بالکل معمولی' بے کار اور ادھوری لڑکی ہوں۔"
"مجھے ڈارک موڈز بالکل بھی پسند نہیں ہیں۔" دوسری طرف لہجہ سخت ہوا۔
"جب ہی تو تم ایسی جگہوں پر جانے سے گریز کرنے لگے ہو جہاں کے موڈز اور شیڈز ڈارک ہوتے ہیں۔"
"میری پاس اتنی قسموں کے رنگ اور شیڈز ہیں کہ میں ڈارک رنگوں اور موڈز کو اپنے رنگوں میں اپنی مرضی کے مطابق رنگ سکوں۔"
"ضرور ہوں گے' لیکن ان کا استعمال تم صرف وہیں کرتے ہو جہاں تمہارا دل چاہتا ہے۔"
"آئی ایم سوری میڈم ۔۔۔ لیکن مجھے یہ گفتگو ہرگز اچھی نہیں لگ رہی۔"
"مجھے بھی افسوس ہے' مگر کیا کروں' میرا انداز گفتگو ایسا ہی ہے۔" وہ متاثر ہوئے بغیر بولی۔
"اچھا!" اس نے ٹھہر کر غور کیا "نخرے دکھانے کا ارادہ ہے؟" اس کے لہجے میں سوال تھا۔
"نخرے تو وہ دکھاتے ہیں جو نخرے دکھانے کے قابل ہوتے ہیں۔"
"ہوں!" وہ ایک بار پھر کچھ کہتے کہتے رکا "سچ سچ بتانا کہ میری کال آنے سے ذرا دیر پہلے کیا تم میرے بارے میں سوچ کر اداس نہیں ہو رہی تھیں۔"
اس سوال کا جواب اثبات میں تھا' سارہ کو فوری طور پر کوئی دوسرا جواب بن نہیں پڑا۔
"دیکھا۔" وہ زور سے ہنسا "میں نے تم سے کہا تھا نا کہ صرف تین تک گنتی گننا' میں کسی جن کی طرح حاضر ہو جاؤں گا۔"
"یہ گنتی تو میں پچھلے کئی دن سے گن رہی ہوں ۔۔۔ تم اتنے دن بعد حاضر ہوتے ہو۔"
"تم نے یقین کے ساتھ نہیں گنی ہو گی' دل سے۔"
"پتا نہیں۔" وہ روٹھے ہوئے لہجے میں بولی۔
"ہاں میں جانتا ہوں کہ میں بہت دنوں سے تمہارے پاس نہیں آسکا' دراصل میں یہاں بغیر ارادے کے آیا تھا مگر ارادتاً" رک گیا۔"
"میں جانتی ہوں۔" سارہ نے اسی روٹھے لہجے میں کہا۔
"اچھا!" وہ ہنسا "تم تو پھر ماہر علم نجوم ہونے لگی ہو۔"
"میں نے کبھی ستاروں کو نہیں دیکھا' مجھے علم نہیں وہ کس کی چال پہ چلتے ہیں۔"
"دیکھا کرو ۔۔۔ تمہیں اندازہ ہو گا کہ وہ جن کے پاس خود اپنی روشنی نہیں ہوتی وہ کسی دوسرے سے روشنی مستعار لے کر کیسی ٹھنڈی اور خوبصورت روشنی دیتے ہیں۔"
"ہاں ستارے ہی ہوتے ہیں جو ٹوٹتے ہیں اور گرتے بھی ہیں۔" سارہ کا لہجہ تلخ ہونے لگا۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔" وہ جیسے چونک کر بولا "چلو' میں جلد تمہارے پاس آتا ہوں اور تمہیں اس ستارے کا قصہ سناتا ہوں جو ستاروں کے جھرمٹ میں سب سے روشن اور بڑا ہوتا ہے اور جو نہ کبھی ٹوٹتا ہے نہ گرتا ہے۔"
"تو تم آؤ گے؟" سارہ کے لہجے میں بے یقینی تھی۔
"تو اور کیا۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ مجھ سے تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔"
"تم کب آؤ گے؟" سارہ نے شاید اس کی یہ بات سنی ہی نہیں تھی۔
"بہت جلد' اسی ہفتے میں کسی دن۔"
"پتا ہے کیا میں نے کروشیے کی سلائی کی نوک سے دھاگے میں پھندے ڈالنے بھی سیکھ لیے ہیں" سارہ کے لہجے میں یکایک مسرت کی پہلی جھلک ابھری۔
"اوہ گڈ۔ دیٹس ونڈر فل۔"
"اور اب میں بیٹر سے انڈا بھی پھینٹ سکتی ہوں۔"
"اس سے آگے اس انڈے کا آملیٹ بنانا بھی شروع کر دو۔"
"اور جو میں چلتی ہوں نا' جتنا بھی چلتی ہوں' اسی طرح چلتی ہوں جیسے تنی تاروں پر چلتے ہیں۔"
"کمال کا ہنر ہے یہ تو میں بھی سیکھوں گا۔"
"ہاں ہاں۔ میں تمہیں ضرور سکھاؤں گی۔"
"یار! مجھے جگلنگ سکھانا' مجھے ہوا میں کئی ایک گیند ایک ساتھ اچھال کر انہیں مہارت سے ایک ایک کر کے دبوچنے کا فن سیکھنے کا جنون ہے۔"
"ارے وہ تو کوئی مشکل نہیں' میں یوں سکھا دوں گی ایک دو دن میں۔"
"تمہیں آتا ہے ابھی بھی یہ فن' اتنے عرصے سے اس کی پریکٹس کیے بغیر۔"
"پریکٹس تو نہیں کی کب سے' مگر مجھے یقین ہے ذرا میرے ہاتھ ساتھ دینے لگیں تو میں کر لوں گی مینیج"
"اچھا' اچھا' یہ جو رضوان الحق تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ کیونکہ اسے جگلنگ اور جوکری چھوڑے عرصہ ہو گیا' اس لیے اسے پریکٹس رہی ہے' نہ ہی اسے ایسا لگتا ہے کہ وہ دوبارہ اسے ٹھیک طرح سے کر سکے گا۔"
"کوئی اناڑی جوکر اور جگلر ہو گا' جو ہاتھ ہی اٹھا بیٹھا' ہمارے بلیو ہیون میں تو ایک سے ایک ماہر تھا اپنے اپنے کام کا۔"
"جیسے سارہ خان ماہر تھی ماہر ٹریپز آرٹسٹ' ماہر ایکروبیٹ۔"
"ماہر ہوتی تو یوں گرتی ۔۔۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔
"گرتے تو شہسوار ہی ہیں۔ ہمیشہ یاد رکھنا۔"
"بہت دفعہ سن چکی ہوں کہ شہسوار ہی گرتے ہیں۔"
"صرف سنا ہی نہ کرو' کان بھی دھرا کرو بیوٹی فل!"
"دیکھا پھر تم مجھے لفظوں میں پھنسانے لگے۔" وہ خوش ہوتے دل پر قابو پاتے بولی۔
"تم مت پھنسو' کچھ باتیں صرف سنا کرو۔" وہ ہنسا۔
"میں جانتی ہوں کہ میں بیوٹی فل نہیں ہوں۔" وہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔
"بیوٹی فل لفظ کی مختلف کیٹگریز ہیں میرے نزدیک' میری کیٹگری کے مطابق تمہارے لیے یہ لفظ بہت مناسب ہے۔"
"تم واقعی اسی ہفتے آرہے ہو نا۔" وہ سب کچھ بھلا کر خوش ہوتے ہوئے بولی۔

"ہاں واقعی ان شاءاللہ۔"

"چلو پھر میں انتظار کرتی ہوں۔" اس نے کہا اور سامنے دیکھا' تاحدِ نظر اگا سبزہ اچانک ہی اچھا اور تازگی بخش نظر آنے لگا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے' اپنا خیال رکھنا۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

"شاید تمہارے لیے سب لوگ ایک سے ہی ہیں۔" اس نے فون میز پر رکھتے ہوئے سوچا' میں ہوں یا وہ لڑکی ماہ نور یا کوئی اور... بات اتنی ہے کہ تم خود بہت اچھے ہو۔" اس نے مسکراتے ہوئے بلند پہاڑوں پر نظر ڈالی اور کرسی کے بازوؤں پر ہاتھوں سے زور ڈال کر ایک بار پھر کھڑی ہو کر ریہ پائی کے لیے تیار ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیسے خانہ بدوش ہیں' اگر یہ وہی لوگ ہیں جو پچھلے سال بھی تمہیں یہیں ملے تھے تو یہ خانہ بدوش تو نہ ہوئے نا۔" ماہ نور نے آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگاتے ہوئے کہا۔

"خانہ بدوشوں میں بھی موبلٹی کم ہو گئی ہے شاید۔" سعد نے مسکرا کر کہا اور کھلے میدان میں گڑے ان گندے' میلے' ٹوٹے' پھٹے خیموں کی طرف چل دیا' جو یہاں کے مکینوں کے مکان تھے۔ ماہ نور نے لحہ بھر کے لیے جھجک کر اس بستی کی طرف دیکھا جس کے مکینوں کے ننگ دھڑنگ بچے مکھیوں کی یلغار کے درمیان کھیل رہے تھے۔ سعد نے چلتے چلتے پیچھے مڑ کر دیکھا' ماہ نور کو اپنی جگہ ساکت کھڑے دیکھ کر وہ مڑ کر واپس آیا۔

"کیا ہوا رک کیوں گئیں؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ماہ نور نے ایک نظر سعد کو دیکھا' بلیک جینز' میرون پولو شرٹ اور بلیک سن گلاسز میں بلاشبہ وہ خاصا ہینڈسم لگ رہا تھا' پھر اس نے ایک نظر ان جھونپڑیوں پر ڈالی۔ "اس کا دل کیسے چاہتا ہے ان لوگوں سے ملنے' ان میں بیٹھنے کو۔" وہ سوچ رہی تھی۔

"چلو گی یا یہیں رکے رہنا ہے؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ ماہ نور نے چونک کر اسے دیکھا' پھر گلے کو ہلکا سا کھنکھارنے کے بعد آگے چل دی' سعد نے مسکرا کر اسے دیکھا اور تیز قدموں سے چلتا جھونپڑیوں کے قریب پہنچ گیا۔ ماہ نور اس کے پیچھے تھی' سائبانوں کے سائے میں زمین پر کپڑا بچھا کر لوڈو کی گوٹیوں کی طرح کی گوٹیاں پھیلائے تین چار مرد کوئی کھیل کھیلنے میں مگن تھے۔

"یہ پانسا کھیل رہے ہیں' پانسا سمجھتی ہو؟" سعد نے رک کر ماہ نور کے کان میں سرگوشی کی۔ ماہ نور نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"السلام علیکم!" ماہ نور کی طرف مسکرا کر دیکھنے کے بعد اس نے ان آدمیوں کو مخاطب کیا۔ وہ سب کھیل چھوڑ کر ان دونوں کو دیکھنے لگے۔

"اتنی جلدی بھول گئے بھائی نیامت! جو یوں منہ اٹھا کر دیکھ رہے ہو۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"اوئے بسم اللہ' اوئے بسم اللہ' خیر ہوئے تمہاری' جی آیاں نوں باؤ جی' جی آیاں نوں۔" ان میں سے ایک مرد جس نے شانوں تک بال بڑھا رکھے تھے اور آنکھوں میں سلائیاں بھر بھر کے سرمہ ڈال رکھا تھا' اٹھتے ہوئے بولا۔

"چلو شکر ہے' کسی نے تو پہچانا۔" سعد اس سے گلے ملتے ہوئے بولا۔ میلے' بدبودار کپڑے اور تیل سے چپڑے بال' جو شاید کئی دنوں سے دھلے نہ تھے اور چپکے ہوئے لگ رہے تھے' ماہ نور نے سعد سے گلے ملنے والے شخص کو دیکھ کر جھرجھری سی لی۔

"او پہچانا کیوں نئیں باؤ جی! تسی تو اپنے بھائی ہو جی۔" اس شخص نے سعد کی کمر پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"ست خیراں۔ نیامت کا تپاک دیکھتے ہوئے قریب بیٹھا سب سفید بالوں والا ایک بوڑھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "باپیور (باباجی) میں نے باندر نچانا اے۔"

"میں وی تماشا دکھانا اے" بوڑھا شخص بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سیدھی کھڑی کر کے اسے ہلاتے ہوئے بولا' غالباً" اسے سعد کی گزشتہ خواہشات یاد آ رہی تھیں۔ چند ہی لمحوں کے بعد سعد ان لوگوں میں گھل مل کر زمین پر بچھے کپڑے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ ماہ نور ذرا فاصلے پر کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ ان لوگوں میں آ کر جیسے سعد کو بھول ہی گیا تھا کہ وہ ماہ نور کو بھی ساتھ لے کر آیا تھا۔

"وہائی... باؤ صاحب آیا ہے' کوئی شربت' کوئی پانی!" وہ شخص جسے سعد نے نیامت کہہ کر بلایا تھا۔ اٹھ کر ایک قریبی جھونپڑی کے اندر جھانک کر بولا' اندر سے نجانے کیا جواب ملا تھا۔

"باؤ باندر والا۔" جس کے جواب میں نیامت نے غالباً" وضاحت کی تھی۔

"بسم اللہ' بسم اللہ۔" جواب میں ایک بوڑھی عورت جھونپڑی کے اندر سے نکلی جس نے سرخ چھینٹ کے کپڑے پہن رکھے تھے' اس نے انگلیوں میں مختلف طرح کے چھلے پہن رکھے تھے اور ہاتھوں میں رنگ برنگ چوڑیاں' اس کی ناک میں چھوٹی سی نتھنی بھی موجود تھی۔ سیاہ رنگت والی اس عورت نے باہر آ کر چٹ پٹ سعد کی بلائیں لینا شروع کیں۔

"ویرے (بھائی) پار (پچھلے سال) جدھوں توں گیا میں رج کے روٹی نا ئیں کھاری" (جب سے تم یہاں سے گئے ہو میں نے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا) وہ عورت سعد کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہی تھی۔

"میں باؤ کو بتا رہا تھا کہ اس بار نادرے (نادر) کے پاس ودھیا (عمدہ) جوڑی ہے بندر اور بندریا کی۔" نیامت بلند آواز میں بولا۔

جواب میں سعد مسکرایا۔ نہیں بھائی نیامت! میں اس دفعہ بندر کا تماشا دکھانے نہیں آپ لوگوں سے ملنے آیا ہوں صرف" ماہ نور کو محسوس ہوا اس کی اس بات سے اس کے اردگرد موجود لوگوں میں قدرے مایوسی سی پھیل گئی تھی۔

"میرا خالی کنستر وجدا اے (میرا خالی کنستر بجتا ہے) اس نوں آٹا لوری دا اے آٹا چاہیے۔" ایک درمیانی عمر کی عورت' جس کا حلیہ کم و بیش بوڑھی عورت جیسا تھا نجانے کہاں سے نکل کر سعد کی سمت بڑھی تھی۔

"او جا اوئے تسی زنانیاں بس آٹے چول توں اگے نہ جائیو" (او جاؤ۔ تم عورتیں بس آٹے چاول سے آگے مت سوچنا) سعد کے قریب بیٹھے ایک ادھیڑ عمر شخص نے حقارت سے اس عورت کی طرف دیکھا اور حقے سے کش لگانے لگا۔

"اے اے ہی کون اے!" اس عورت نے ادھیڑ عمر آدمی کی بات پر سر جھٹک کر ـــــ کچھ فاصلے پر کھڑی ماہ نور کو دیکھا۔ سعد نے گردن موڑ کر ماہ نور کی طرف دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔

"کھڑی رہو گی۔" وہ اس کے قریب آ کر بولا۔ "بیٹھ جاؤ نا!"

"کہاں بیٹھوں!" ماہ نور قدرے ناگواری سے بولی۔

"یہ ایک چارپائی تو بالکل تمہارے قریب رکھی ہے۔" سعد نے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔

"اس پر۔" ماہ نور نے بے یقینی سے سعد کی طرف دیکھا اور پھر چارپائی پر نظر ڈالی' میل سے جس کے نائیلون کا رنگ چھپ چکا تھا اور جس پر مکھیاں ایک دبیز چادر کی صورت بھنک رہی تھیں۔

"باؤ صیب! اے تیری عورت اے نا؟" وہ عورت' جس نے ماہ نور کی موجودگی کو نوٹ کیا تھا آگے بڑھ کر ان کے قریب آتے ہوئے بولی۔ ماہ نور کا منہ اس جملے پر کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

"منہ بند کرلو‘ مکھیاں نہ اندر چلی جائیں۔" سعد یقیناً "اس عورت کی بات پر محظوظ ہو رہا تھا جب ہی ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"نئیں سکینہ! یہ میری عورت ہے نہ میں اس کا مرد ہوں‘ ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں بس۔" اس نے عورت کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے کہا تھا‘ ماہ نور کو لگا محض الفاظ سے ملنے والا لمحاتی خوش کن احساس سعد کی وضاحت کے اندر دم گھٹنے سے فوراً ہی مر گیا تھا۔

"وڈے لوکاں وچ کڑیاں منڈے آپس وچ دوست ہوندے نیں‘ ٹھیک آکھدے او (بڑے لوگوں میں لڑکیاں اور لڑکے آپس میں دوست ہوتے ہیں‘ ٹھیک کہہ رہے ہو) عورت نے دانش مندانہ انداز میں سر ہلایا جیسے سعد کی وضاحت سمجھ گئی ہو۔

"آؤ بی بی! بیٹھو‘ کوئی شربت پانی پیو‘ اساں غریباں دے ڈیرے تے بیٹھے والے پانی نوں ہی شربت آکھدے‘ جا او کاکا‘ ہٹی توں برف پھڑ لیا (آؤ بی بی بیٹھو‘ شربت پیو‘ ہم غریبوں کے ڈیرے پر تو شکر والے پانی ہی کو شربت کہتے ہیں‘ جاؤ بچے جا کر دکان سے برف لے آؤ۔" عورت نے ماہ نور کے سامنے ایک نسبتاً "صاف نیچا مونڈھا رکھتے ہوئے ایک بچے کو برف لینے دوڑایا۔

"اور سکینہ! تم؟" سعد نے دوبارہ زمین پر بچھے کپڑے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "غلام حسین کمائی کر کے لاتا ہے یا ابھی بھی نشہ کر کے پڑا رہتا ہے۔" جواب میں سکینہ اسے کوئی لمبی کتھا سنانے لگی۔ ماہ نور مونڈھے کے کنارے پر ٹکی سعد کی گفتگو ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ حیرت سے دیکھ رہی تھی سعد کے قریب ادھورے‘ پورے کپڑوں میں ملبوس بچے آتے اسے ہاتھ لگاتے اور کھلکھلا کر واپس بھاگ جاتے‘ ان میں سے کچھ بچے بالکل ننگ دھڑنگ بھی تھے‘ سعد ان بچوں کی حرکتوں اور شرارتوں کا ذرا بھی برا مانے بغیر انہیں اپنے قریب بلا بھی رہا تھا اور ان کے ساتھ ہنسی مذاق بھی کر رہا تھا۔ سکینہ کا پیش کردہ میٹھا شربت جو وہ سلور کے گلاس میں لائی تھی اس نے غٹاغٹ پی لیا تھا‘ جبکہ ماہ نور نے ویسا ہی گلاس جو اسے پیش کیا گیا تھا اپنے پاؤں کے قریب زمین پر رکھ دیا تھا‘ چند ہی لمحوں میں اس گلاس میں مکھیاں گرنے کے بعد اس کی سطح پر تیرنے لگی تھیں۔

"بی بی نے شربت نئیں پیتا (بی بی نے شربت نہیں پیا)" باتیں کرتے کرتے سکینہ کی نظر ماہ نور کے پاؤں کے قریب رکھے گلاس پر پڑی‘ ماہ نور نے دیکھا‘ سعد کے چہرے پر ناگواری کا ایک موہوم سا سایہ لہرایا اور غائب ہو گیا۔

"لے کاکا۔ تو پی لے۔" سکینہ نے گلاس ماہ نور کے قدموں سے اٹھایا اور قریب سے گزرتے ایک بچے کا بازو پکڑ کر روکتے ہوئے کہا اور گلاس کی سطح سے چھنگلی کی مدد سے تیرتی مکھیاں نکال کر باہر پھینکنے لگی۔ ماہ نور کو ابکائی آ گئی۔

"یہ مت پلاؤ بچے کو‘ انفیکشن ہو جائے گا اسے۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے سکینہ کو منع کرتے ہوئے کہا مگر اس کے منع کرتے کرتے ہی سکینہ مکھیوں سے خلاصی حاصل کر کے گلاس بچے کو پکڑا چکی تھی‘ ماہ نور کے نہیں نہیں کرنے کے دوران بچہ گلاس منہ سے لگا کر اسے پی بھی چکا تھا۔ ماہ نور نے مایوسی حیرت اور پریشانی کے عالم میں سعد کی طرف دیکھا۔

"اس کو انفیکشن ہو جائے گا‘ تم دیکھ لینا۔" اس نے جیسے سعد کو خطرے سے آگاہ کیا۔

"فکر مت کرو‘ یہ لکڑ ہضم پتھر ہضم قسم کے بچے ہیں‘ انہیں کچھ نہیں ہوتا۔" وہ بے نیازی سے بولا۔ اسی دم کندھے پر جھولا لٹکائے‘ بندر اور بندریا کی ڈوری انگلی میں پھنسائے‘ ایک ریچھ کے پیچھے چلتا ایک شخص اس سمت آیا۔

"او خیر ہو باؤ جی کی۔" اس نے سعد کو دیکھ کر خوشی سے نعرہ لگایا۔ اور اپنا سامان ایک طرف رکھ کر گرمجوشی سے

سعد کے گلے ملنے لگا۔ ماہ نور‘ اس شخص کے دھول سے اٹے کپڑے اور جوتے دیکھ رہی تھی‘ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی‘ اس نے اپنے مٹیالے تیل سے چپڑے بالوں پر جو تقریباً" اس کے شانوں تک آئے ہوئے تھے سفید کپڑا باندھا ہوا تھا۔ اس کی انگلیوں میں موٹے موٹے نگوں والی انگوٹھیاں تھیں اور دائیں بازو میں کالے رنگ کا دھاگا رسٹ بینڈ کی شکل میں بندھا تھا۔

"ذرا بھی اس کو اپنے کپڑے خراب ہونے کی پروا نہیں‘ کیسے اس کے گلے مل رہا ہے۔" ماہ نور نے بے ساختہ دوپٹے کا کونا ناک پر رکھتے ہوئے سوچا۔ سعد اب اس نو وارد سے خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ اب دوپہر ڈھل رہی تھی اور جھونپڑی کے باہر رکھے اینٹوں کے عارضی چولہوں میں آگ جلائی جا رہی تھی۔ ماہ نور نے صفائی کا ذرا سا بھی خیال رکھے بغیر ترکاری بناتی‘ چاول بینتی‘ مسالا بھونتی خانہ بدوش عورتوں کو غور سے دیکھا اور ان کے معیار زندگی کا اندازہ لگاتے اوبدا کر دوسری سمت دیکھنے لگی جہاں طویل‘ صاف سڑک تھی اور اس پر رواں دواں ٹریفک۔

"تم اب یہاں سے واپس چلنا پسند کرو گے یا ان لوگوں کے ساتھ رات کا کھانا تناول فرمانے کا بھی ارادہ ہے؟" سڑک سے نظریں ہٹا کر اس نے سعد کو انگریزی زبان میں مخاطب کیا۔

"اگر مجھے تمہارے چہرے پر اتنی بیزاری اور ناگواری صاف نظر نہ آ رہی ہوتی تو یقیناً" میں ایسا ہی کرتا۔" اس نے ایک چھوٹی بچی کی مٹھی سے کچے چاول نکال کر پھانکتے ہوئے بے نیازی سے جواب دیا۔ ماہ نور نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"اوکے‘ اوکے۔" اسے سعد کی آواز سنائی دی۔ "چلو واپس چلتے ہیں۔" ماہ نور نے دیکھا وہ اٹھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ پھر وہ گاڑی تک جا کر اس میں سے ایک چھوٹا سا بیگ نکال لایا۔ اس بیگ میں کافی سارے سکے تھے جو اس نے مٹھیاں بھر بھر کے ادھر ادھر دوڑتے بھاگتے بچوں میں بانٹنا شروع کیے‘ اب بچے شہد کی مکھیوں کی طرح اس کے ارد گرد جمع تھے۔

عورتیں اپنا اپنا کام چھوڑ کر اس چھوٹے سے ہجوم کی طرح متوجہ ہو گئیں۔ مرد اس منظر کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ بچوں سے نمٹنے کے بعد اس نے چند عورتوں کو کچھ رقوم تھمائیں اور چھوٹا سا خالی بیگ بندر والے کو تھما دیا‘ سب سے ہاتھ ملا کر رخصت ہونے میں اس نے مزید پندرہ بیس منٹ لگا دیے‘ ماہ نور آہستہ قدموں سے چلتی گاڑی تک آئی اور اس سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو کر سعد کے ان لوگوں سے رخصت ہونے کا منظر دیکھنے لگی۔

"میرا خیال ہے میں نے تمہیں اپنے ساتھ لا کر غلط کیا۔" گاڑی میں بیٹھ کر اسے سڑک پر لانے کے بعد وہ نیچی آواز میں ماہ نور سے مخاطب ہوا۔ "تم بہت بور ہوئیں یہاں آ کر۔"

"بور ہونے کا تو مجھے پتا نہیں‘ ہاں حیران ضرور ہوئی۔" ماہ نور نے سامنے سڑک کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں اس سارے میں حیران ہونے والی کون سی بات تھی؟" اس نے کہا‘ ماہ نور نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا‘ پہلی بار اس نے سعد کے لہجے میں برہمی جھلکتی محسوس کی تھی۔

"حیران ہونے کی بات ہی تو تھی۔" اسے خود بھی سمجھ نہیں آیا کہ اس کا اپنا لہجہ کیوں درشت ہو گیا تھا۔ "تم ان میلے کچیلے‘ ان پڑھ اور جاہل لوگوں میں کیسے گھل مل کر بیٹھے تھے‘ تمہیں نہ تو وہاں کی گندگی بری لگ رہی تھی نہ وہاں موجود جراثیموں کے انبار سے بچنے کا خیال آ رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ تم تھے‘ تمہارا دل کیسے چاہ رہا تھا اتنی گندگی میں یوں بے تکلفی سے بیٹھنے کو‘ انسان کا کوئی اپنا معیار بھی ہوتا ہے‘ کوئی اصول اور ضابطہ بھی ہوتا ہے زندگی گزارنے کا۔"

وہ بغیر رکے بولے چلی جا رہی تھی۔ "انسانی ہمدردی اچھی چیز ہے‘ مگر اس کو جتانے کے لیے کچھ اور طریقے بھی

استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ ضروری تو نہیں کہ ان لوگوں میں بیٹھ کران جیسے ہی ہو کر ہمدردی جتائی جائے۔" بولتے بولتے وہ سانس لینے کو رکی' اس نے دیکھا' سعد کے چہرے پر عجیب سا تناؤ تھا' اس کے جبڑے بھینچے ہوئے تھے اور آپس میں یوں جڑے ہوئے تھے کہ اس کے چہرے کی جلد بھی کھنچی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر وہ ایک دم خاموش ہوگئی' وہ سامنے دیکھتے ہوئے گاڑی چلا رہا تھا۔ کچھ دیر ماہ نور کے مزید بولنے کا انتظار کرنے کے بعد اس کی خاموشی محسوس کرکے اس نے ایک نظر ماہ نور پر ڈالی۔

"بس یا کچھ اور بھی!" ماہ نور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گہرا سانس لیا اور گردن سیدھی کرکے سامنے دیکھنے لگی۔

"میں معذرت خواہ ہوں میں نے واقعی تمہارے ساتھ برا کیا جو تمہیں وہاں لے گیا' کسی اچھے اینٹی جرمز ہیکو یڈ (جراثیم کش محلول) کو اپنے غسل کے پانی میں ملا کر اچھی طرح نہالینا واپس جاکر اور یہ جو کپڑے تم نے پہن رکھے ہیں ان کو آگ لگادینا تاکہ جراثیم مزید پھیلنے کا خدشہ نہ رہے۔"

اس کے لہجے میں طنز کی واضح آمیزش تھی' ماہ نور نے ہلکے سے سر جھٹکا اور جواب دینے کے بجائے خاموش رہی۔

"یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میرے کپڑوں' ہاتھوں اور چہرے سے چمٹے جراثیم کہیں اس ایئر کنڈیشنڈ بند گاڑی میں اڑ اڑ کر تمہیں نہ چمٹ جائیں لیکن میں معذرت خواہ ہوں' فی الحال میں اس کا کوئی بندوبست نہیں کرسکتا۔ مجبوراً تمہیں میرے ساتھ ہی واپس جانا ہوگا۔" وہ مزید بولا۔

"ہاں' جہاں تک میرے ان لوگوں میں یوں گھل مل کر بیٹھنے کا سوال ہے تو بتاتا چلوں کہ یہ میں ہوں جسے ان لوگوں کے پاس جانے اور ان سے ملنے کا شوق ہے' قصور تو میرا ہے ان کا نہیں کیونکہ ان کا تو طرز زندگی ہی یہی ہے' مجھے علم ہے کہ وہاں گندگی ہے' جراثیم ہیں سوچنا تو مجھے چاہیے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مجھے وہ لوگ اچھے لگتے ہیں' ان کی زندگیوں کا مشاہدہ کرنے کے لیے مجھے براہ راست ان میں اٹھنا بیٹھنا پڑے گا' یہاں کوئی سائبر سرچ یا ضخیم کتاب میری وہ مدد نہیں کرسکتی جو میرا اپنا مشاہدہ کرسکتا ہے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ مجھے ان لوگوں میں جاکر اجنبیت محسوس نہیں ہوتی' کیونکہ ان لوگوں کی خواہشات کے دائرے بہت محدود اور معصوم ہیں' خصوصاً ان کی عورتوں اور بچوں کے۔ مجھے ان سے مل کر اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی خواہشات کو محدود کیسے رکھا جاسکتا ہے' اپنے قد سے اونچی چھلانگیں مارنے سے کیسے بچا جاسکتا ہے۔ ان کے اور اپنے اخلاقیات کے فرق کو جانچ کر مجھے صحیح اور غلط کا مزید اندازہ ہوجاتا ہے' تو پھر لالچ تو سارا میرا ہے' خواہش تو میری ہے ان سے ملنے کی۔ برا اور غلط بھی پھر میں ہی ہوا نا۔ معیار تو میرا کم ہوا نا۔ ان کو کیوں حقارت سے دیکھ رہی تھیں' مجھے حقارت سے دیکھنا چاہیے تھا تمہیں۔" وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ ماہ نور نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

"اور یہ تو بتاؤ تمہیں ان سے گھن کیوں آرہی تھی؟" اس نے درشتی سے سوال کیا۔ "ان کے میلے کپڑے' گرد آلود جوتے' تیل سے چپڑے بالوں کو دیکھ کر تمہیں ابکائی کیوں آرہی تھی؟" جبکہ یہ وہی حلیہ تھا جس میں پہلی بار تم نے مجھے دیکھا تھا' بندر کے تماشے والا' میلے کا سائیں' سید پور کا کمہار۔ کیا عطر میں بسا ہوا اور جیکوزی ہاتھ لیے ہوئے تھا۔" اس کا لہجہ تیز ہوا۔ "ان سب نے تمہیں اتنا کیوں اٹریکٹ کیا کہ تم نے ہر جگہ ان کا پیچھا کیا اور اپنے Self Esteem کی پروا کیے بغیر کون ہو' کون ہو تم کا نعرہ لگاتے کیوں بھاگتی پھری تھیں؟"

ماہ نور کا دماغ گھوم رہا تھا۔ نرمی سے بات کرنے والا' شرارت سے چھیڑنے اور تنگ کرنے والا' سنجیدگی سے سمجھانے والا' اداسی سے اپنا ذاتی دکھ سنانے والا' باتوں باتوں میں معنی خیز جملے کہنے والا سعد' اس وقت اس کے ساتھ کیسا تلخ اور بدلحاظ ہو رہا تھا۔ اس کا ذہن اس کے اس روپ کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر غور کیا اور

پھر اسے لگا کہ اس تلخ اندازی میں سعد نے گویا اس کا اپنا آپ اس کے اپنے سامنے ظاہر کردیا تھا۔

"بڑی بڑی باتیں کرنا' اونچے آدرشوں کو گفتگو کا حصہ بنانا' سلمز اور لو لانیئنگ ایریا کو موضوع بنا کر فلمیں ڈرامے بنانا اور کتابیں' مضمون لکھنا بہت آسان ہے' کچھ وقت ان حالات میں گزار کر ان کے مسائل کا اندازہ لگانا' ان کے کلچر اور طرز زندگی کے رنگ سمجھنا دوسری بات۔" اب سعد نے قدرے دھیمے لہجے میں کہا' شاید اسے اپنے لہجے کی تلخی اور آواز کی تیزی کا احساس ہوگیا تھا۔

"میرا طریقہ یہ نہیں ہے' میں نے ہمیشہ خود کو ایسے لوگوں سے متعلق کرکے ان کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ شاید میں لاشعوری طور پر ان لوگوں میں اپنی جڑیں تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف ہوں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اپنی جڑیں مجھے ملیں یا نہ ملیں' ان لوگوں اور ایسے لوگوں سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد اللہ کے خالق تقدیر ہونے پر میرا ایمان زیادہ پختہ ہوگیا ہے۔" اس نے کہا اور ذرا دیر کے لیے خاموش ہوگیا۔

"کبھی وقت ملے تو سوچنا کہ کیا ہوتا جو تم کسی ایسی بستی میں پیدا ہوئی ہوتیں' تمہارے والدین ان ہی میں سے ہوتے اور ایسا ہی تمہارا لائف اسٹائل ہوتا۔ پھر تم کیا کرتیں' تمہیں تو کبھی پتا بھی نہیں چلتا کہ وہ زندگی کیا اور کیسی ہوتی ہے جو تم اب گزار رہی ہو۔" ماہ نور کو لگا اس کے چہرے پر کسی نے زناٹے کا طمانچہ مارا ہو۔

"ہم جو بھی ہیں جیسے بھی ہیں اس میں میرا اور تمہارا کوئی کمال نہیں یہ سب اللہ کے فیصلے ہوتے ہیں' وہ انسانوں کو رنگ' نسل' قبیلے' خطے' ملک' خاندان' مرتبے' مقام عطا کرنے والا ہے۔ یہ بھی سوچنا کہ ہم کتنا شکر ادا کرتے ہیں اپنی زندگی میں جو کچھ ہمیں عطا کیا گیا ہے۔" سعد کا لہجہ نصیحت آمیز ہونے لگا تھا۔

"شاید میں غلط سوچتی ہوں' شاید میری عقل اور میرا شعور بہت محدود ہے۔" کافی دیر بعد ماہ نور کی آواز گاڑی میں ابھری۔ "شاید میری نظر کوتاہ ہے' جب ہی میں حقیقت کو تہہ تک جاننے سے محروم رہتی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں ناراض کردیا۔" اس نے گردن موڑ کر سعد کی طرف دیکھا اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔

"نہیں' میں ناراض نہیں ہوں۔" اس نے اسٹیئرنگ وہیل پر رکھے ہاتھوں کی انگلیاں اٹھاتے ہوئے اسے تسلی دی۔

"But Let me say you have disappointed me a little."

(لیکن تم نے مجھے تھوڑا سا مایوس کردیا)۔

ماہ نور استعجاب بھری نظروں سے کچھ دیر اسے دیکھتی رہی' وہ اتنا ہی صاف گو تھا کہ اسے اپنی بات صاف صاف کہہ دینے میں کوئی باک نہ ہوتا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ سیدھا کیا اور سڑک کو دیکھنے لگی۔ باقی کا راستہ خاموشی میں ہی کٹ گیا۔ فارم ہاؤس پہنچ کر سعد نے گاڑی کے ڈیش بورڈ سے اپنا سیل فون اور والٹ اٹھایا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل کر کھڑا ہوگیا۔ ماہ نور اسی طرح اپنی سیٹ پر جامد بیٹھی تھی۔

"آج سردار انکل نے خصوصی ڈنر کا انتظام کیا ہوا ہے۔" ماہ نور کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے کے بعد اس نے ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی پر بازو ٹکا کر اندر جھانکا "لیکن وہاں شاید صرف جینٹس مدعو ہیں۔"

ماہ نور اس کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنے بازو میں پڑے واحد کڑے سے کھیلتی رہی۔

"ٹھیک ہے پھر کل ملیں گے۔" وہ ماہ نور کی خاموشی سے شاید اندازہ لگا چکا تھا کہ فی الحال وہ کچھ نہیں بولے گی۔ ماہ نور نے چند لمحوں بعد اسے اندرونی عمارت کی طرف جاتے ہوئے دیکھا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

☆ ☆ ☆

کمہاری زندگی کے خوبصورت رنگوں سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد انہیں برتنے کا سلیقہ سیکھ رہا تھا' کس

خانے میں کون سا رنگ، کس رنگ کا جوڑ کون سے رنگ کے ساتھ بنتا ہے۔ اسے یہ فن سیکھنے میں مزا آرہا تھا۔ اسے اپنے کمرے میں بجتی چوڑیوں کی آواز، ہنسی اور سرگوشی کی جھنکار اور خوشبو کا چھڑکاؤ سب اچھے لگتے تھے۔ سعدیہ، جسے خود زندگی برتنے کا سلیقہ نہیں تھا، راتوں رات کھاری کی استاد بن گئی تھی۔ اسکول میں گزرے آخری ایک سال کے تجربے سعدیہ کے ساتھ ساتھ کھاری کے بھی رہنما بن رہے تھے۔ وہ کھاری کو اسکول کی ان لڑکیوں کے قصے سناتی جن کے اپنے کسی کزن، کسی محلے دار، کسی رشتہ دار سے معاشقے چل رہے تھے، کھاری کی آنکھیں ایسے قصے سن کر پھیلتی جاتیں۔

"سعدیہ باؤ، ایہہ تے گناہ ہوتا ہے۔" وہ بے ساختہ کہتا۔

"لوگوں کو کوئی نہیں لگتا گناہ شناہ!" وہ ایسے کہتی جیسے کوئی بہت بڑی عمر کی سیانی خاتون تبصرہ کر رہی ہو۔

"مجھے پورا فارم ہاؤس تو دکھاؤ، ایک ایک کمرا، ایک ایک حصہ۔" وہ اٹھلا کر فرمائش کرتی۔ اور وہ یوں سرہلاتا جیسے کہہ رہا ہو سب دکھاؤں گا مگر کچھ دن بعد۔

"یہ کتنی بھولی اور معصوم ہے، اس کو یہ نہیں سمجھ لگ رہی میں فارم ہاؤس کا مالک نہیں ہوں میں تو ادھر چاکری کرتا ہوں۔" وہ دل میں سوچتا "سارا قصور ہی چوہدری صیب کا ہے، انہوں نے بڑھ چڑھ کر شادی میں خرچہ کرنا شادی کے دھوم دھڑکے کو دیکھ کر اس بے چاری کا دماغ آسمان پر چڑھنا ہی ہے خیر میں اس کو ہولے ہولے سمجھا دوں گا کہ ہم نے ادھر چاکری کرنی ہے مالکی نئیں۔ پر ابھی نہیں سمجھاؤں گا ابھی بتایا تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔" اس کے دل میں سعدیہ کے لیے محبت امڈتی۔

"یار ایہہ محبت بھی کیا شے ہے!" کبھی وہ ڈیری فارم پر کھڑا اپنی پسندیدہ ولایتی بھوری بھینس کو مخاطب کر کے کہتا "کیسے تیرے ساتھ محبت کے درجے سے اٹھ کر سعدیہ سے محبت کے درجے تک چھلانگ لگا دی افتخار احمد نے ہوتی تو یہ اچھی چیز ہے لیکن ہوتی بہت سخت ہے۔" وہ بھوری بھینس کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچتا۔

"پہلے میں ادھر آتا تھا تو سارا دن کام میں لگا رہتا تھا۔ کبھی کہیں اور جانے کا خیال نہیں آتا تھا لیکن اب ادھر آتا ہوں تو دل چاہتا ہے کہ جلدی سے کام ختم کروں اور واپس سعدیہ کے پاس اڑ کر چلا جاؤں" وہ سوچتا اور پھر اپنی ہی سوچ پر سر جھٹک کر ہنس دیتا۔

زندگی کی جہت بدل گئی تھی۔ جانوروں کا چارہ کترتے ہوئے، ان کو چارہ ڈالتے ہوئے، دودھ دوہتے ہوئے، سبزیوں اور پھلوں کی چنائی کراتے ہوئے انہیں ٹرکوں پر لوڈ کرواتے ہوئے اس کا دماغ اور دھیان سعدیہ کی طرف ہی رہتا۔

"وہ کیا کر رہی ہوگی، نجانے اس نے کچھ کھایا کہ نہیں، کہیں وہ اداس نہ ہو رہی ہو، کہیں میری عدم موجودگی میں اسے کوئی کچھ کہہ نہ دے، میں نے ہر حال میں سعدیہ کو دودھ، مکھن اور گھی کھانے پینے کی عادت ڈالنی ہے، یہ کیا بات ہوئی کہ چیزوں کی اتنی فراوانی ہو اور سعدیہ انہیں استعمال نہ کرے، چوہدری صاحب نے تو کبھی پلٹ کے پوچھا بھی نہیں کہ کہاں اور کتنا لگا، جب یہ سارے ملازم عیش کر سکتے ہیں ان چیزوں پر تو سعدیہ کیوں نہیں۔"

وہ دن بھر الٹی سیدھی باتیں سوچتا، بے دلی سے اپنا کام نمٹاتے میں مصروف رہتا اور جیسے ہی ذرا فرصت ملتی شہر بھجوائے جانے والے پھولوں کے ڈھیر میں سے ایک خوشنما، خوشبودار پھول ٹہنی سمیت چنتا اور خلقت سے چھپاتا، چوروں کی طرح دبے پاؤں چلتا اپنے کمرے کی طرف کھسک آتا۔ سعدیہ کے لیے ہر روز نئے رنگ نئی شکل اور نئی طرح کی خوشبو والا پھول لے جانا اس کی عادت بنتی جا رہی تھی۔ ایک جیتے جاگتے انسان کے ساتھ سچے اور مضبوط تعلق کے احساس نے کھاری کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔

ان ہی مشغلوں میں مشغول قریب تھا کہ کھاری اپنی زندگی میں موجود ہر دوسرے شخص سے لاتعلق اور بے نیاز ہو جاتا کہ اسے آپا رابعہ کی طرف سے بلاوا آگیا۔ اس بلاوے نے کئی دن پیچھے کھاری کو سعدیہ کی علاوہ کسی اور کی یاد دلائی تھی، اپنی فطری سادہ لوحی اور مروت کے زیر اثر وہ دل میں شرمندہ ہو گیا۔ کیا کہتی ہوں گی بھین جی! کھاری کا ظرف کتنا چھوٹا نکلا، مولوی صاحب اور بھین جی کی اتنے دنوں سے خبر تک نہیں لی۔

لیکن عجیب بات ہے کہ میں نے کبھی سعدیہ کی زبان سے اس کے ماں باپ کا نام تک نہیں سنا، مجھے شک ہے کہ اس کے اندر کوئی بڑی گہری بات ہے، چلو جو بھی بات ہے، سعدیہ جانے اور اس کے والدین جانیں، بھین جی میری استاد ہیں۔ میں نے ان کی بات سن آؤں نالے (ساتھ) ان کو سلام کر آؤں۔

اس نے فیصلہ کیا اور دودھ والی گاڑی کو رخصت کرتے ہی سیدھا آپا رابعہ کی طرف چلا آیا۔

"میں آپ کو کس طرح بھول سکتا ہوں بھین جی!" آپا رابعہ کے گلہ پر شرمندہ ہوتے ہوئے اس نے سر جھکا کر کہا "آپ تو میری استاد ہو، سیدھی راہ پر ڈالنے والی ہو مجھے، میرا اور آپ کا تعلق یہاں پتر والا ہے، یہ جو نیا رشتہ بن گیا ہے یہ بعد کی بات ہے، ماں پتر کا استاد شاگرد کا رشتہ پرانا ہے اور اس نئے رشتے سے کہیں اوپر ہے۔"

اس نے شرمندگی کے گہرے احساس سے مغلوب ہوتے ہوئے کہا۔

آپا رابعہ کے گھر آکر بہت دنوں بعد اسے لگ رہا تھا کہ وہ پہلے جیسا کھاری بن گیا تھا، ذہن و دل، جو ہر وقت سعدیہ کے خیال میں غرق رہتے تھے، اس خیال سے وقتی طور پر آزاد ہو گئے تھے۔

"اصولاً تو مجھے تمہیں اور سعدیہ کو ادھر رہنے کے لیے بلانا چاہیے تھا۔" آپا رابعہ نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا لیکن تم دیکھ رہے ہو گھر کی کیا حالت ہو رہی ہے، مجھ میں اب اتنا دم نہیں رہا کہ پلک جھپک سب کچھ ٹھیک کر دوں، آہستہ آہستہ لگی ہوئی ہوں گھر کو ٹھیک کرنے میں، جب سب چیزیں درست اور اپنے ٹھکانے پر آجائیں گی تو تم دونوں کو بلاؤں گی اور یہاں رکھوں گی چند دن، ابھی تم جانو، کہاں یہ ہمارا گھر اور کہاں تم لوگوں کی رہائش، تم دونوں یہاں آکر تنگی محسوس کرو گے۔" آپا رابعہ نے سادگی سے کہا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو بھین جی، ہم کون سے لاٹ صاحب کی اولاد ہیں جو یہاں تنگ ہوں گے، ایک حساب سے تو یہ ہی اپنا گھر ہے جو مولوی سیب کے کام کے بدلے ملا ہے، باقی ہم جہاں رہتے ہیں وہ تو مالکوں کی مرضی کا ٹھکانہ ہے، جب تک ان کو راضی رکھا وہاں رہے جاؤ جب وہ ناراض ہو گئے تو چلو جی اپنا بستر بوریا باندھ لو۔" کھاری نے اداس ہوتی آپا رابعہ کو اپنے تئیں خوش کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں کہیں کے کبھی بھی، تم فکر مت کرو۔" آپا رابعہ نے اسے تسلی دی "یہ بتاؤ تم خوش ہو؟" انہوں نے غور سے کھاری کی طرف دیکھا، خوشی جس کے چہرے سے عیاں تھی۔

"بھین جی! اجی گل تو یہ ہے کہ میں تو خوش ہونا ابھی سیکھا ہوں، پہلے مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ خوش ہونا کیسا ہوتا ہے میں تو بہت کم عقلا اور بے وقوف تھا۔"

"زندگی کا محور بہت محدود ہے نا تمہارا، اس لیے اتنی جلدی خوش ہو گئے ہو۔" آپا رابعہ نے کہا "میری دعا ہے کہ تمہاری یہ خوشی ہمیشہ قائم رہے۔"

"میں نئیں جانتا بھین جی کہ کل کیا ہونا ہے، میں نے کہانا۔ میری عقل کم ہے اور میری نظر زیادہ دور تک نہیں جاتی۔" کھاری نے سادگی سے اعتراف کیا۔

"میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتی ہوں کھاری! تم نے زندگی میں حقیقی خوشی کبھی دیکھی نہیں اس لیے اس خوشی کے چوہے دان کے قابو آگئے ہو، چوہے دان کی گھٹن محسوس ہونے اور بڑھنے لگی تو پھر تمہارے جیسا بندہ کیا کرے گا، مجھے یہ سوچ سوچ کر ہول اٹھتے ہیں۔" آپا رابعہ نے یہ بات سوچی مگر کہی نہیں۔

"سعدیہ کیسی ہے؟" ان کی زبان پر یہ سوال کئی بار آیا، مگر انہوں نے اسے لفظوں میں نہیں پوچھا۔ عجیب سی

بات تھی‘ وہ اور کھاری ادھر ادھر کی باتوں میں شعوری کوشش کرتے ہوئے سعدیہ کا ذکر نہیں آنے دے رہے تھے۔

”سعدیہ نے بھین جی سے جو باغیانہ گفتگو کی‘ ان کے لیے جیسا اس کا حقارت آمیز لہجہ ہوتا ہے‘ میرا نہیں خیال مجھے آج سعدیہ کے بارے میں کوئی بات کرنی چاہیے۔“ کھاری نے اپنے تئیں سوچا تھا۔

”میں نے اس سے سعدیہ کے متعلق پوچھا تو نجانے کیوں مجھے لگتا ہے میرا بھرا دل بہہ نکلے گا اور میرے منہ سے ایسی باتیں ادا ہو جائیں گی جو اس کی چند روز پہلے شروع ہوئی خوشیوں میں زہر گھول دیں گی۔ مجھے سعدیہ کے موضوع پر بات ہی نہیں کرنی چاہیے۔“

آپا رابعہ نے فیصلہ کر رکھا تھا۔ اس لیے کھاری اور آپا رابعہ کی اس دن کی گفتگو کے دوران سعدیہ کا ذکر نہیں آیا۔ آپا رابعہ اس کو سپارہ باقاعدگی سے پڑھنے کی تلقین کرتی رہیں اور اپنے کام میں دل لگانے کی نصیحت بھی۔ کھاری نے آپا رابعہ کی نصیحتوں پر ہوں ہاں کرتے ہوئے ایک دوبار انہیں غور سے دیکھا۔ وہ صاف پریشان اور وحشت زدہ نظر آ رہی تھیں۔

”ٹھیک ہے اب تم جاؤ‘ تمہارے کام رکے ہوئے ہوں گے۔“ تقریباً ”ایک گھنٹے کے بعد آپا رابعہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”بھین جی!“ کھاری نے آپا رابعہ کا ہاتھ اپنے سر سے اتار کر اپنے ہاتھ میں پکڑ کر دبایا جو بات ہے وہ آپ کہہ کیوں نہیں دیتیں‘ آپ کے دل پر جو بوجھ ہے تم سے دل میں کیوں رکھے بیٹھی ہیں“ آپا رابعہ نے رد عمل میں اپنا ہاتھ تیزی سے کھاری کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔

”بیٹا بنایا ہے تو بیٹا سمجھیں بھی۔“ کھاری نے ان کا ہاتھ دوبارہ پکڑتے ہوئے کہا۔ آپا رابعہ نے نظریں اٹھا کر اسے یوں دیکھا جیسے پوچھ رہی ہوں کہ کیا میں تمہاری بات کا یقین کر لوں۔

”آپ آزما کے تو دیکھو ایک بار!“ کھاری نے ان کو یقین دلانے کے انداز میں کہا۔

آپا رابعہ نے عادتاً ”دوپٹے کا پلو اپنے چہرے پر پھیرا اور سر پر اوڑھا دوپٹا ایک بار اتار کر دوبارہ سر پر اوڑھا۔

”بات بتائیں بھین جی؟“ کھاری نے انہیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”کھاری تمہاری شادی پر باہر سے جو مہمان آئے تھے‘ وہ کون تھے؟“ آپا رابعہ کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ بات شروع کہاں سے کریں۔

”وہ جو جاپان سے آئے تھے؟“ کھاری کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

”جاپان سے آئے تھے!“ آپا رابعہ نے حیرت سے کہا۔

”کون سے مہمان بھین جی؟“ کھاری نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”جو میرا یار دوست آیا تھا‘ جاپانی خرگوش وہ؟“

”نہیں۔ جو چوہدری صاحب کا مہمان تھا‘ وہ جو بعد میں بھی ادھر ہی تھا۔“

”چوہدری صیب کا مہمان۔“ کھاری نے سر کھجاتے ہوئے یاد کرنے کی کوشش کی۔

”مہ نور باجی دا بھائی؟“ کچھ یاد آنے پر اس نے آپا رابعہ کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ ماہ نور کا بھائی تھا؟“ آپا رابعہ کو جیسے شاک لگا تھا۔

”باؤ سلمان!“ کھاری نے سوچتے اور غور کرتے ہوئے پوچھا۔

”کوئی اور بھی مہمان تھا‘ ان لوگوں کے علاوہ؟“

”ہوں۔“ کھاری کو فوری طور پر یاد نہیں آ رہا تھا۔ ”او ہوئے“ پھر اس نے سر پر چپت لگاتے ہوئے ہنس کر کہا

”سعد صیب‘ باؤ سعد۔۔۔ ان کی بات کر رہی ہیں نا آپ؟“ اس نے آپا رابعہ کی طرف دیکھا۔

”وہ کون ہے سعد؟“ آپا رابعہ نے پوچھا۔

”او مہ نور باجی کے فرینڈ ہیں۔“

”ماہ نور کا فرینڈ!“ آپا رابعہ کو دوسرا شاک لگا۔

”او ہوئے بھین جی! بڑے لوگوں میں لڑکیاں اور لڑکے آپس میں دوست ہوتے ہیں۔“ کھاری آپا رابعہ کے چونکنے پر ہنس کر بولا۔

”اچھا!“ آپا رابعہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ”کچھ پتا ہے‘ یہ لڑکا کون ہے‘ اس کا آگا پیچھا کیا ہے؟“

”بڑے کوئی امیر لوگ ہیں جناب!“ کھاری نے سنجیدہ سا چہرہ بنا کر کہا‘ اس کے چہرے پر جیسے سعد کی امارت کی ہیبت طاری تھی ”پر بندہ بڑا عاجز ا ہے اس کے ساتھ بیٹھے بندے کو احساس ہی نئیں ہوتا کہ یہ کوئی بڑا بندہ ہے۔“ کھاری نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے یوں سرگوشی کی جیسے کسی کے سن لینے کا ڈر ہو۔ ”اس کی آواز بھی کمال ہے‘ اتنا پیارا اور دل سے گاتا ہے کہ کیا بتاؤں۔“

”کھاری!“ کھاری کی یہ بات سن کر آپا رابعہ کا جسم جیسے جھٹکوں کی زد میں آ گیا تھا۔ ”اس کا پتا لگاؤ‘ وہ کون ہے۔ اس کا باپ کون ہے وہ کہاں سے آیا ہے۔“ وہ شدت جذبات سے رونے لگی تھیں ”تمہیں اللہ کا واسطہ ہے۔“ انہوں نے کھاری کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا ”مجھے اس کے آگے پیچھے کی کوئی خبر لا دو“

”او بس بھین جی بس!“ کھاری نے تیزی سے آپا رابعہ کے جڑے ہوئے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا ”تسی حکم کرو میں سب پتا کر دیتا ہوں مگر یہ تو بتائیں بات کیا ہے؟“

آپا رابعہ نے متورم آنکھوں سے کھاری کو دیکھا‘ روتے ہوئے ان کا دوپٹا سر سے اتر گیا تھا‘ ان کے کھچڑی بال بکھر گئے تھے‘ صاف لگ رہا تھا‘ انہوں نے کئی دن سے بالوں میں کنگھی نہیں کی تھی۔

”میرے دل پر بڑا بوجھ ہے کھاری! برسوں کا جمع کیا ہوا بھاری بوجھ۔“ انہوں نے بدقت الفاظ ادا کیے تھے۔

”اتار دیو بوجھ۔ مجھے دے دیں اپنے بوجھ بیٹا بنا ہوں تو بن کر دکھاؤں گا۔“

”کیا تمہارے سینے میں اتنی وسعت ہے کہ میرے دل کا بوجھ اس میں یوں سما سکے کہ کسی دوسرے کان کو خبر نہ ہو‘ کیا تمہارے شانوں میں اتنی ہمت ہے کہ اس بوجھ کو ساتھ لیے پھرو اور کسی دوسرے کو پتا نہ چلے۔“ آپا رابعہ نے سرگوشی میں پوچھا تھا۔

”الحمد اللہ!“ کھاری نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے سر جھکا کر کہا تھا۔

آپا رابعہ نے ایک بار کھاری کو بے یقینی سے دیکھا‘ وہ ابھی تک سینے پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ آپا رابعہ نے اس سے آگے مزید سوچے اور دیکھے بغیر بولنا شروع کیا‘ ان کا سامع افتخار احمد عرف کھاری مبہوت بیٹھا ان کی داستان طلسم ہوش ربا سن رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

فاطمہ نے ٹاٹ کی بوری کا سلا ہوا منہ قینچی سے کاٹ کر کھولا‘ اور بوری کے اندر جھانک کر دیکھا۔ بوری ان گنت پرانے جرائد سے بھری پڑی تھی۔ انہوں نے سب سے اوپر رکھا رسالہ نکالا۔ یہ ایک رسالہ نہیں تھا بلکہ ایک کور کے اندر کسی پرانے سن کے بارہ مہینوں کے بارہ شمارے سلے ہوئے تھے۔ فاطمہ نے اوپر کا کور کھول کر پہلا پرچہ دیکھنا شروع کیا‘ پرانے ہو جانے کی وجہ سے پرچے کے صفحات زرد پڑ چکے تھے اور ان میں بوسیدگی بھی آ چکی تھی۔ دو تین صفحات پلٹنے کے بعد فاطمہ کے نتھنوں سے بوسیدگی کی بو ٹکرانے کے باعث چھینکوں کا ایک لمبا سلسلہ

شروع ہو گیا‘ لیکن وہ ان پرانے شماروں میں یوں کھو گئی تھیں کہ انہیں الرجی چھینکوں اور ناک منہ سرخ ہونے کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ شام ڈھلے جب وہ ایک طویل مطالعہ کے بعد اپنے کمرے سے نکلیں‘ تو ڈائننگ ٹیبل کی سطح پر کپڑا پھیر کر اس پر گرا پانی خشک کرتی خدیجہ نے دیکھا۔ فاطمہ کی ناک اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور ان پر سوجن بھی نمایاں تھی۔

”نہیں! تمہیں کیا ہوا بیٹھے بٹھائے؟“ انہوں نے رومال ناک پر رکھ کر مسلسل چھینکیں مارتی فاطمہ سے کہا۔

”کچھ نہیں‘ شاید فضا میں پولن بڑھ رہا ہے۔“ انہوں نے رومال سے ناک رگڑتے ہوئے کہا۔

”پولن بڑھ رہا ہے۔“ خدیجہ نے ڈائننگ روم کی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پولن کا موسم تو گزر چکا۔“ انہوں نے حیرت سے فاطمہ کی طرف دیکھا۔

”اچھا!“ وہ ناک پر رومال رکھ کر چھینکنے کے بعد بولیں ”مجھے شاید اب اثر کر رہا ہے جاتا پولن۔“

”کوئی اینٹی الرجی کھالو فورا“۔ ”تمہارا خاصا برا حال ہے‘ خدیجہ نے کہا اور واش بیسن پر ہاتھ دھونے لگیں۔

”ہاں‘ لے لیتی ہوں فاطمہ نے ہولے سے سرہلایا ”اینٹی الرجی لینے سے وقت سے پہلے نیند آنے لگے گی۔ اور مجھے تو ابھی سعد کو ضروری کال کرنی ہے۔ تین چار بار اسے کال کر چکی ہوں‘ اس نے اٹینڈ نہیں کی۔“ وہ سوچ رہی تھیں۔

”تمہارا فون بج رہا ہے شاید۔“ خدیجہ کی آواز نے انہیں ان کی سوچ سے چونکایا ”کمرے میں ہی رکھ آئی ہو فون۔“

”وہ ہاں!“ انہوں نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔ ان کا سیل فون ان کی بیڈ سائیڈ پر رکھا تھا اور اس کی اسکرین پر جلتی بجھتی روشنی میں ”سعد کالنگ“ کے الفاظ نمایاں ہو رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

”تمہارے یہاں قیام کے دوران میں نے تمہاری کمپنی کو بہت انجوائے کیا‘ تمہارے ساتھ گفتگو کا مزا ہی کچھ اور ہے۔“ چوہدری سردار نے مسکراتے ہوئے سعد کی طرف دیکھا جو کمرے کے کونے میں رکھے صوفے پر ڈھیلے ڈھالے انداز میں نیم دراز تھا۔

”مجھے بھی بہت مزا آیا۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑے سوفٹ ڈرنک کے ٹن کو ہلاتے ہوئے کہا ”جن جن چیزوں کا میں نے پہلے کبھی سرسری مشاہدہ کیا تھا‘ انہیں تفصیل سے دیکھنے کا موقع مجھے یہاں قیام کے دوران ملا — یہ ایک دلچسپ تجربہ تھا۔“

”کھاری کی شادی ایک زبردست موقع ثابت ہوئی تم سے تفصیلی ملاقات کا۔“ چوہدری صاحب نے۔

”کھاری کی شادی!“ سعد نے ایک بار پھر ٹن کو ہلایا‘ زیادہ دیر فریزر میں رکھے رہنے سے اس کا محلول ہلکی برف کی شکل اختیار کر چکا تھا اور اب وہ اسے ہلا ہلا کر دوبارہ مائع شکل میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ویسے انکل! ایک بات تو بتائیں‘ کھاری آپ کو ملا کہاں سے تھا۔ آپ کو اس کا آگا پیچھا کچھ معلوم نہیں ہے کیا؟“

اس نے چوہدری صاحب کی طرف دیکھا۔ ”اس کے آگے پیچھے اور آپ کو ملنے کے متعلق بہت سی Myths میں یہاں کے مختلف لوگوں سے سن چکا ہوں‘ لیکن آپ سے یقیناً میں بالکل اصل بات کی توقع کرتا ہوں۔“

چوہدری صاحب سعد کی اس بات پر ہولے سے مسکرائے۔

”اس بیچارے کا آگا پیچھا معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی آپ نے کبھی؟“ سعد نے کہا۔

”کوشش تو میں جب کرتا جب مجھے خود معلوم نہ ہوتا۔“ کمرے کی خاموشی میں چوہدری صاحب کا غیر متوقع جواب ابھرا۔

”کیا مطلب؟“ سعد کا مشروب کا ٹن ہلاتا ہاتھ رکا‘ اس نے مارے تجسس کے ٹن میز پر رکھا اور اپنی نشست سے ذرا آگے کو کھسکا۔

”آپ کو معلوم تھا؟“ وہ حیرت سے بولا ”اور آپ نے اسے اس کے ماں باپ تک پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔“

”اس کی ماں اسے ایک بس اسٹیشن کے ٹکٹ گھر کے قریب رکھ کر خود غائب ہو گئی تھی۔“ چوہدری صاحب کی آواز آئی۔

”اوہ۔ تو آپ کو پھر اس کا آگا پیچھا کیسے پتا چلا‘ اگر ماں غائب ہو گئی تھی۔“ وہ قصے سننے کا شوقین دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔

”میں نے اسے بچے کو وہاں رکھتے دیکھا تھا‘ اس لیے۔“ چوہدری صاحب کی آنکھیں سکڑ کر خلا میں کسی نکتے پر جمی ہوئی تھیں جیسے کوئی پرانا منظر ان کی نظروں کے سامنے چل رہا ہو۔

”پھر؟“ سعد حسب عادت مزید متجسس ہوا۔ ”آپ نے اس عورت کا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی۔“

”میں پیچھا کرتا یا صورت حال سمجھنے کی کوشش کرتا‘ جیسے ہی مجھے صورت حال سمجھ میں آئی۔ اور میں روتے ہوئے بچے کی طرف بڑھا‘ وہ وہاں موجود سب لوگوں کو جل دے کر غائب ہو چکی تھی۔“

”وہ مایوس ہوا“ پھر آپ کو اس کے آگے پیچھے کے بارے میں تو کچھ علم نہ ہوا نا۔ ایک اجنبی نامعلوم عورت بچہ لاوارث چھوڑ کر غائب ہو گئی۔ آپ اس کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتے ناکہ وہ کون تھی اور کھاری کا بیک گراؤنڈ کیا ہے۔“

”وہ نامعلوم عورت نہیں بلکہ ایک نامور عورت تھی‘ اس لیے میں وثوق سے کھاری کے پس منظر کو جاننے کا دعوا کر سکتا ہوں۔“ چوہدری صاحب نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

”نامور عورت؟“ قصے سننے کے شائق کے لیے یہ ایک انتہائی دلچسپ موڑ تھا۔ ”کون تھی وہ نامور عورت؟“ اس نے سوال کیا۔

چوہدری صاحب اٹھ کر کمرے کی مغربی دیوار کے دریچے کے قریب جا کھڑے ہوئے اس دیوار پر نامور مصوروں کی پینٹنگز کی نقول سجی تھیں۔ کچھ دیر دریچے سے باہر جھانکنے کے بعد چوہدری صاحب سعد کی طرف مڑے اور ایک قصہ سنانا شروع ہوئے‘ قصے سننے کے شائق کے اردگرد جیسے سب کچھ جامد اور بے آواز ہو چکا تھا‘ جو سنائی دے رہا تھا اور دکھائی دے رہا تھا‘ وہ ایک بڑا اور تلخ سچ تھا۔ اس کی سماعت اور بصارت دونوں ہی جواب دینے لگی تھیں۔

کتاب ہجراں ندارم جاں
نہ لیسو کیسے لگائے چھتیاں

چوہدری صاحب نے بات ختم کرنے کے بعد اپنے سامع کی حالت سے بے خبری میں کمرے کے مشرقی کونے کا رخ کیا اور لکڑی کے دیوار گیر شیلف میں سجے گراموفون کا بٹن دبا دیا۔ ایاز قوال کی آواز میں امیر خسرو قوالی کی ترنم چہار سو پھیل رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

شبان ہجراں دراز چوں زلف

وروز وصلت چو عمر کو تاہ

ماہ نور بالائی منزل سے آنے والی آواز پر کان لگائے کہ گانے والے کی آواز اور موسیقی کی لے لاجواب تھی۔ وہ مسحور سے انداز میں آگے بڑھی اور کھڑکی کے قریب کھڑی ہو گئی۔ کھڑکی کے قریب کھڑے ہونے پر آواز زیادہ صاف سنائی دینے لگی تھی۔ اس نے مسکرا کر بالائی منزل کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ یہ آواز اس حصے میں سنائی دے رہی تھی جہاں سعد کا قیام تھا۔

"کتنا باذوق اور مہذب شخص ہے یہ اور میرے دل کے کتنے قریب ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے سوچا "کل سے یہ مجھ سے ناراض ہے اور میرا دل چاہتا ہے جاؤں اور اسے مناؤں مگر جھجک میرے قدم روک دیتی ہے چلو ابھی جاتی ہوں اور مناتی ہوں۔"

اس نے پیروں میں چپل پہنی اور صوفے کی پشت پر رکھا دوپٹا اٹھا کر اوڑھا۔ کمرے سے باہر نکل کر طویل راہداری عبور کرنے کے بعد جب وہ بالائی منزل کی طرف جاتے زینے کے قریب پہنچی تو اس نے دیکھا۔ سفید ٹراؤزر اور نیلی پولو شرٹ میں ملبوس سعد تیزی سے عمارت کے عین سامنے کھڑی اپنی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اپنا سامان پھینکنے کے انداز میں رکھ رہا تھا۔

"یہ! یہ سامان کیوں رکھ رہا ہے؟" وہ آگے بڑھی' سعد نے پاؤں میں وہی چپل پہن رکھی تھی جو وہ گھر میں پہنتا تھا۔ ماہ نور نے منتظر نظروں سے دیکھا۔ وہ اندر آئے گا اور اسے راستے میں کھڑا دیکھ کر رکے گا' لیکن اس کی منتظر نظریں منتظر ہی رہیں۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے سعد گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر کے تیزی سے اسے موڑ کر باہر جانے والے راستے پر لے گیا تھا۔

ماہ نور پریشانی اور عجلت میں بھاگ کر باہر نکلی تھی' پل کے پل میں سعد کی گاڑی طویل روش پر نظروں سے دور ہوتی غائب ہو گئی تھی۔ ماہ نور نے پریشان اور حیران نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے ایسا کوئی نظر نہیں آیا جو اسے بتا سکتا کہ سعد اتنی عجلت میں اس وقت کیوں اور کہاں گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر ساکت کھڑی ابھی بھی حیرت سے اس راستے کو دیکھ رہی تھی۔ جس پر سے سعد گاڑی نکال کر گیا تھا۔ بالائی منزل پر گراموفون ابھی بھی ریکارڈ بجا رہا تھا۔

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں

تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

فضا میں یکایک گرد آلود ہوا چلنے لگی تھی' یہاں وہاں کاغذ' سوکھے پتے اور بکھری چیزیں اڑنے لگی تھیں۔ گرد آلود ہوا' رفتہ رفتہ تیز ہو رہی تھی اور در و دیوار سے سر پٹخنے لگی تھی۔ بالائی منزل سے آتی آواز بھی جیسے اچانک گریہ کرنے لگی تھی۔

جو چشم سوزن چو ذرہ حیراں

ہمیشہ گریاں بہ عشق آں مہ

ماہ نور حیرت زدہ نظروں سے گرد آلود آسمان اور بگولے اٹھاتی آندھی کو چلتے دیکھ رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عنیزہ سید

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "مشہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

پندرھویں قسط

ایک' دو' تین' چار' پانچ۔ پانچ کے بعد رک کر وہ دوبارہ سے گنتی شروع کردیتی تھی۔ اس لیے اسے اندازہ نہیں ہو پارہا تھا کہ اس نے کتنی بار سعد کے نمبر پر کال کی تھی اور کتنی بار جواب میں اسے "آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے۔ برائے مہربانی کچھ دیر بعد کال کیجیے" کا پیغام موصول ہوا تھا۔

اس کا دل نجانے کیوں کچھ انہونی ہوجانے کے خدشے کے خوف سے لرز رہا تھا۔ باہر گرد آلود آندھی اپنے پورے زور پر چلتے ہوئے چیزوں کو ادھر سے ادھر اڑائے پھر رہی تھی۔ ماہ نور نے کبھی آندھی میں اٹھتے' بنتے' مٹتے بگولوں کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا' مگر سعد کی گاڑی کے پیچھے بے ارادہ بھاگتے ہوئے آنکھوں میں پڑتی دھول اور ریت کی چبھن کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ جس وقت گیٹ کی طرف جارہی تھی۔ اس نے فارم ہاؤس کے کھلے حصے میں آندھی میں اٹھتے بگولے دیکھے تھے۔

اس نے پل بھر کو آنکھوں میں ذرہ برابر کنکروں کی طرح چبھتی ریت کو آنکھوں سے مل کر باہر نکالنے کی خاطر انہیں باری باری شہادت کی انگلی سے رگڑا تھا' اس اثناء میں سعد کی گاڑی تیزی سے گیٹ سے باہر نکل گئی تھی۔ آنکھوں میں چبھن مسلے جانے سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اس نے وحشت زدہ انداز میں پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تیز آندھی کے ناچتے بگولے جیسے "ہوہوہاہا" کرتے اس کو ڈرانے کی کوشش کرنے لگے تھے۔

"باجی اندر چلو۔ اندر۔" گیٹ پر کھڑے دو تین لوگوں میں سے ایک نے بازو زور سے ہلاتے ہوئے اسے اشارہ کیا اور بلند آواز میں اسے اندر جانے کی ہدایت دینے لگا۔

"اندر کہاں جاؤں؟" اس نے غائب دماغی کی کیفیت میں خود سے سوال کیا تھا۔ تیز اور گرد آلود ہوا اس کے منہ پر طمانچے رسید کررہی تھی۔ اس کے پاؤں گرد آلود ہوا کی زد میں آکر مٹی مٹی ہورہے تھے۔

"اندر تو سخت اندھیرا ہے۔ ایسا اندھیرا جس میں ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دے۔" وہ بڑبڑائی۔

"آئے ہائے ماہ نور بی بی! آپ نے خود کو مٹی مٹی کرلیا ہے۔"

اندرونی عمارت کا دروازہ کھول کر ایک عورت سرپٹ دوڑتی اس کی طرف آئی۔ ماہ نور کو وہ عورت آندھی کے بگولے سے نکلی کوئی چڑیل لگ رہی تھی۔ تیز گردباد میں اس کے بال اڑ کر بکھر رہے تھے۔ جس کی آنکھیں باہر کو ابلی ہوئی تھیں اور زبان باہر کو نکلی لپلپا رہی تھی۔

وہ خوف زدہ ہو کر دو قدم پیچھے کو ہٹی۔ مگر اس چڑیل نما عورت نے اسے آن دبوچا۔ اور اسے اپنے ساتھ لگائے اندر کی طرف گھسیٹنے لگی۔ ماہ نور کا دل خود کو اس کی گرفت سے چھڑا کر فارم ہاؤس سے باہر جانے کو چاہ رہا تھا۔ فارم ہاؤس میں قیام کا کوئی جواز باقی نہیں رہا تھا۔ جو جواز تھا' وہ تو گاڑی کو اڑن قالین بنائے چشم زدن میں آنکھ سے اوجھل ہوگیا تھا۔ بے یقینی' صدمے اور ناقابل تردید حقیقت نے اس پر سکتہ طاری کردیا۔ وہ اس عورت کے ساتھ گھسٹ رہی تھی۔ اندرونی عمارت کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کردی گئی تھیں۔ آندھی کے تھپیڑوں پہ کھڑکیاں اور دروازے لرزتے اور پھر ساکت ہوجاتے۔

اس عورت نے ماہ نور کے نیم بے ہوش وجود کو لٹایا۔ فارم ہاؤس کی دیگر خواتین ملازمین اس کے ارد گرد جمع ہوگئیں اور اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے لگیں۔ اس کے جوتے اتار کر پاؤں کے تلوے سہلانے لگی تو کوئی دائیں بائیں شکست خوردہ سپاہی کی طرح لٹکے بازو' اوپر رکھ کے ان کو دبانے لگی' اس کے منہ میں خوشبو میں بسا شربت ٹپکایا جارہا تھا' اس کی حسیات ایک ایک جنبش کو محسوس کررہی تھیں۔ اس کی بند آنکھوں پر مندھی اس کی پلکیں ہلکے ہلکے ارتعاش میں تھیں۔

"وا وروالا پھر گیا اے مہ نور باجی تے۔" (آندھی کا بگولا ماہ نور باجی کے اوپر پھر گیا ہے) ان خواتین میں سے کوئی کہہ رہی تھیں۔

"آندھیوں میں جنات چھپ کر اڑتے ہیں۔ جیسے ہی کسی اکیلے بندے کو دیکھتے ہیں اس پر عاشق ہوجاتے ہیں۔"

"چلو! یہاں سے بھاگو سب۔ کیا گھیرا ڈال کر بیٹھ گئی ہو بی بی کے ارد گرد؟ کچھ نہیں ہوا ماہ نور بی بی کو۔ بس طوفان بڑا تیز تھا۔ جس میں یہ باہر نکل گئی' منہ اور آنکھوں میں مٹی اور ریت پڑنے سے یہ حال ہوا ہے۔" ماسی جنت نے ماہ نور کا ہاتھ پکڑ کر اسے سیدھا کرکے بٹھاتے ہوئے کہا۔

"جاؤ پروین! باورچی خانے والے بڑے فریزر سے جوس کے ٹن نکال کر لاؤ۔ اور خبردار! جو کسی نے ادھر ادھر رولا ڈالا کہ ماہ نور باجی بے ہوش ہوگئی۔ چوہدری صاحب اور چوہدرانی کے کان میں پڑ گئی تو تم سب کی خیر نہیں۔" اس نے سب کو خبردار بھی کردیا۔

"اٹھو ماہ نور بی بی! اٹھ کر نہاؤ دھوؤ اور کپڑے بدلو۔ مٹی گھٹا اتر جائے گا تو آپ کو ہوش آئے گا۔" سب عورتوں کے وہاں سے چلے جانے کے بعد جنت نے ماہ نور کو ہوشیار کرنے کی سعی کرتے ہوئے کہا۔

ماہ نور نے آنکھیں کھولیں اور خالی خالی نظروں سے اپنے ارد گرد دیکھنے لگی۔ سامان سے بھرا فارم ہاؤس اس کے سجے بنے' در و دیوار ایک دم خالی اور ڈھنڈار نظر آنے لگے تھے۔ سائیں سائیں کرتے' خاموش اور ویران۔

"یہ فون باہر پھینک آئی تھیں ماہ نور باجی۔" اس ابدی سناٹے میں اٹھتی پہلے آدم کی آواز پر اس نے چونک کر آواز کی سمت کی طرف دیکھا۔ اور جھپٹ کر ماسی جنت کے پکڑنے سے پہلے ہی سیل فون اس شخص سے لے لیا۔

کچھ دیر پہلے اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ جنت سے براہ راست بے آباد' بے آب و گیاہ' چٹیل اور خاردار زمین پر پھینک دی گئی تھی۔ لیکن اس سیل فون کے ہاتھ میں آتے ہی جیسے اس کو رہا کردیا گیا۔ زمین سے اپنا تعلق یاد آگیا اور پہلی چیز جو اس کے ذہن کی سلیٹ پر ابھری' وہ سعد کا سیل نمبر تھا۔ اس سیل نمبر کا ایک ایک عدد اسے درست ترتیب کے ساتھ یاد تھا۔ اس کانٹیکٹس میں سے نمبر ملانے کے بجائے اپنے حافظے میں محفوظ اعداد کو دبایا اور بے تابی سے کان سے لگالیا۔

ایک بار' دو بار' تین بار' چار بار' پانچ بار۔ پانچ کے بعد رک کر وہ دوبارہ سے گنتی شروع کررہی تھی۔ یوں اس نے کتنی بار جنونیوں کی طرح وہ نمبر ملایا تھا۔ ماسی جنت منہ پر ڈوپٹا رکھے حیرت سے اس کی مجنونانہ کاوشوں کو ایک ٹک تکے جارہی تھیں۔

سیکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں
تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

طوفان کے باعث متاثر ہوئی برقی رو بحال ہونے پر بالائی منزل کے گراموفون پر ایاز قوال پھر سے دہائی دینے لگا تھا۔ اس نے وحشت زدہ نظروں سے چھت کی طرف دیکھا اور بھاگتے قدموں سے اس ہال نما کمرے کے آخری کونے سے اوپر جاتی سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل پر چلی آئی۔ یہ بالائی منزل کا مردانہ مہمان خانہ تھا۔ سامنے ایک گیسٹ بیڈ کا دروازہ کھلا دیکھ کر وہ تیزی سے اس کے اندر چلی آئی۔ کمرے کے بیڈ پر بچھی چادر پر شکنیں یوں پڑی تھیں جیسے کوئی ابھی ابھی اٹھ کر وہاں سے گیا ہو۔ کمرے کی کھڑکی پر لٹکتے پردے سائیڈوں پر لپٹے ہوئے تھے۔ کمرے سے ملحقہ ڈریسنگ اور باتھ روم کے دروازے پر رکھے باتھ روم سلیپرز کے روئیں یوں مسلے ہوئے اور بے ترتیب تھے جیسے ہلکے نم ہوں۔

ماہ نور نے بے اختیار ڈریسنگ روم کا بند دروازہ ہینڈل گھما کر پیچھے کو دھکیلا۔ مردانہ پرفیوم' شیونگ کریم' آفٹر شیو لوشن' باتھ سوپ اور شیمپو کی باتھ روم میں بند خوشبو دروازہ کھلنے پر آئی۔

ڈریسنگ روم کی دیوار پر لکڑی کے منقش فریم میں جڑے شیشے کی شیلف پر پرفیوم کی دو شیشیاں اور ایک مردانہ

رول آن رکھا تھا۔ شیشے کے قریب رکھی کرسی پر ہلکا نم باتھ روب رکھا تھا۔ ماہ نور نے بے اختیار آگے بڑھ کر باتھ روب کو ہاتھ کی مٹھی میں پکڑ کر نرمی سے مسلا۔ ایک مانوس سا احساس اس کے اندر جاگا۔ جس سے گھبرا کر وہ تیزی سے پلٹ کر کمرے کی طرف آئی۔ وہ خالی تھا اور اپنے مکین کے وہاں موجود نہ ہونے کا پیغام دے رہا تھا۔

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں
تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

ایاز قوال کے الفاظ ایک بار پھر اس کے کان سے ٹکرائے۔ وہ تیزی سے خود کو اس بیڈ روم سے نکال کر اس کے ساتھ والے سٹنگ روم میں لے آئی۔ گراموفون ریکارڈ کی سوئی آہستہ آہستہ اپنی سطح سے جڑے کالے ریکارڈ پر گھوم رہی تھی۔ سٹنگ روم کے بڑے صوفے پر کسی کے بیٹھنے سے پڑا دباؤ ابھی بھی موجود تھا۔ سامنے رکھی میز پر سوفٹ ڈرنک کا ٹن الٹا پڑا تھا اور اس میں بھورا مائع سیاہ سیال میز کی سطح پر ایک لکیر کی شکل میں بہہ رہا تھا۔

جو چشم سوزن چو ذرہ حیران
ہمیشہ گریاں بہ عشق آمد
(کسی حیران ہو مر نعش شمع کی مانند
میں آتش عشق میں گریہ کرتی بھٹکتی پھر رہی ہوں)

گراموفون سے قوال کی آواز ابھر رہی تھی اور ماہ نور کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آنسو کیوں بھل بھل اس کی آنکھوں سے بہتے چلے جا رہے ہیں۔

☼ ☼ ☼

تیز جھکڑ کی شکل میں چلتی گرد آلود ہوا سامنے کا سارا منظر نظروں کے سامنے ہلا رہی تھی۔ یہ طوفان اچانک آیا تھا اور ایسا تھا کہ اس کی مضبوط انجن اور باڈی والی بیش قیمت گاڑی بھی سڑک پر ڈولتی ہوئی چل رہی تھی۔ ہوا گرد کے طوفان کو ونڈ اسکرین کے سامنے اڑا کر بکھیرتی اور حد نظر کو صفر تک پہنچا دیتی۔ دو مرتبہ اس کی گاڑی سامنے سے آتی گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔

اس نے گاڑی کو سڑک کے انتہائی بائیں کنارے پر لا کر اس کی رفتار کم کر دی۔

طوفان کی شدت سے درخت جڑوں سے اکھڑ گئے تھے۔ اونچے نیچے درختوں کی شاخیں اور پتے بکھر رہے تھے۔ مگر اس کی توجہ اس طوفان کے بگولوں پر نہیں تھی۔

اس کا ذہن اس سے بھی بڑے طوفان کی زد میں تھا۔ اس کے دماغ میں اس سے بھی زیادہ تیز رفتار جھکڑ چل رہے تھے۔ اسے کہاں پہنچنے کی جلدی تھی۔ اسے کس کیفیت نے پل بھر میں چوہدری سردار کے فارم ہاؤس سے اٹھا کر مسافر بنا دیا تھا۔

دل و دماغ میں اٹھتے طوفان کے سامنے اپنے اکھڑتے پاؤں سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ خالی خالی نظریں طوفان میں مٹی مٹی ہوتی سڑک پر جمائے گاڑی کا کنٹرول سنبھالے بس آگے "آگے اور آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ کس منزل کی طرف جانے والے فاصلے کم کرنے کی کوشش میں تھا' یہ وہ نہیں جانتا تھا۔ اور اس لاعلمی میں وہ سیدھے راستے سے بھٹک کر کسی بالکل انجان راستے پر جا پہنچا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ارے! ہماری بیٹی یہاں کیا کر رہی ہے؟" کتنی ہی دیر گم صم کھڑے بظاہر بے وجہ آنسو بہاتے رہنے کی کیفیت سے اسے سردار چاچا کی آواز نے چونکا کر باہر نکالا تھا.. اس غائب دماغی کی کیفیت میں بھی اسے نجانے یہ خیال کیسے

آگیا تھا کہ سردار چاچا کی طرف مڑنے سے پہلے اپنے آنسو پونچھ لے۔

"ارے! کیا ہوا ماہ نور؟" وہ بھول گئی تھی کہ اس کا وحشت زدہ حلیہ' سرخ ناک اور آنکھیں سردار چاچا کو چونکانے کے لیے کافی ہوں گی۔ سردار چاچا فطری رد عمل کے تحت آگے بڑھے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اونچا کر کے غور سے دیکھنے لگے۔

"کسی نے کچھ کہہ دیا کیا؟" ماہ نور نے نفی میں سر ہلایا اور یوں سر ہلاتے ہوئے بھی نجانے کیوں اس کی آنکھوں سے آنسو دوبارہ بہہ نکلے۔

"ارے' ارے' ارے گڑیا!" سردار چاچا بالکل بوکھلا گئے۔ "ادھر بیٹھو۔" انہوں نے اسے بازو سے پکڑ کر صوفے پر بٹھا دیا۔ "کیا ہوا ہے؟ جلدی بتاؤ!" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولے۔

"کچھ نہیں۔" وہ سر جھکا کر گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔"

"ضرور کوئی بات ہوئی ہے" سردار چاچا اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ "میں پوچھتا ہوں ان سب سے۔ اور یہ سعد کہاں ہے؟ محمد بخش کے آنے پر مجھے نیچے جانا پڑا۔ وہ یہیں تھا۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوا چاچا جی!" اس سے پہلے کہ سردار چاچا اس کی اس حالت کے بارے میں باز پرس کرنے کو کسی کو بلاتے اور سعد کا پتا کروانے لگتے اس نے اس کا بازو پکڑ کر بمشکل الفاظ حلق سے نکالے۔

"پھر؟" وہ سرعت سے اس کی طرف مڑے "پھر کیا ہوا ہے تمہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"اس قوال کی آواز اور اس کے الفاظ کو سن کر میرا دل بھر آیا تھا۔" اس نے گراموفون کی طرف اشارہ کیا' جو دیر تک بج بج کر اب خاموش ہو چکا تھا۔

"اوہ! یہ بات ہے۔" سردار چاچا مسکرا اٹھے۔ "جھلی ہو تم بھی۔" ان کے لہجے کی تشویش یکایک دور ہو گئی۔ "ہاں مجھے بھی بہت پسند ہے یہ قوالی۔" وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولے۔ "مگر بھئی! ایسا بھی کیا متاثر ہونا کہ انسان رو رو کر آنکھیں سجا لے۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔"

"ہاں!" وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔ "کبھی کبھی کوئی چیز ایسی دل کو لگتی ہے کہ انسان کو خود پر اختیار نہیں رہتا۔"

سردار چاچا نے ماہ نور کی اس بات پر پہلو بدل کر اس کی طرف غور سے دیکھا۔

"ہاں! شاید کوئی وقت ہی ایسا ہوتا ہے۔" پھر انہوں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اب سعد کہاں گیا؟"

"میرا خیال ہے چاچا جی! سعد واپس چلا گیا ہے۔" اس نے ٹھہرتے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کی تمام تر حیرتیں اور وحشتیں جیسے سکون کی طرف مائل ہو گئی تھیں۔ اس کے سر کا بھاری پن بھی جیسے یکایک ہوا ہو گیا تھا۔

"واپس چلا گیا؟" چوہدری سردار کے لہجے میں حیرت اتری۔ "یوں اچانک بغیر بتائے کیسے واپس جا سکتا ہے وہ؟"

"پتا نہیں' میرا اندازہ ہے کہ وہ واپس چلا گیا ہے۔ میں نے اسے اپنا سامان گاڑی میں رکھ کر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔" وہ پر سکون آواز میں بولی۔ "اس نے تمہیں بھی نہیں بتایا کہ کہاں اور کیوں جا رہا ہے؟" سردار چاچا کا تعجب بجا تھا۔

"نہیں۔" اس نے سر ہلایا۔

"کمال ہے" سردار چاچا نے جیب سے اپنا سیل فون نکالتے ہوئے کہا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے تو یہاں بیٹھا مجھ سے کھاری کی کہانی سن رہا تھا۔" وہ سیل فون پر سعد کا نمبر دباتے ہوئے بولے۔

"کھاری کی کہانی۔" ماہ نور نے چونک کر سردار چاچا کی طرف دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ سردار چاچا کو اپنی کال پر کوئی جواب نہیں ملنے والا تھا۔ اسے اس بات میں دلچسپی تھی کہ سردار چاچا نے سعد کو کھاری کی کیا کہانی سنائی

تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے چلتے وقت گاڑی کا فیول گیج نہیں دیکھا تھا۔ طوفان کی زد میں جڑ سے اکھڑے درخت سڑک پر جابجا گرے پڑے تھے۔ ان درختوں سے بچتے بچاتے ایک بڑے درخت کے قریب پہنچ کر جو عین سڑک کے بیچوں بیچ لمبا لیٹا ہوا تھا' اسے مجبوراً "بریک لگانا پڑی" اور اس بریک کے ساتھ ہی گاڑی بند ہو گئی تھی۔

وہ درخت سے بچ کر گاڑی کچے راستے پر لے جانا چاہ رہا تھا۔ مگر گاڑی اس درخت کے ساتھ جڑی ایسی رکی تھی کہ کسی طرح بھی دوبارہ اسٹارٹ ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اب بھی بغیر فیول گیج کو دیکھے' وہ گاڑی کو بار بار لمبی ریس دے کر اسٹارٹ کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ مگر گاڑی مشینی اڑیل گھوڑا بن چکی تھی۔ وہ سر جھکائے گاڑی کو ریس دینے میں مشغول تھا۔ جب اسے ڈرائیور سیٹ کے دروازے کے شیشے پر دستک سنائی دی اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک کالی بھجنگ' سیدھی لمبی' دیہاتی عورت شیشے سے اندر جھانکتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

سعد گاڑی اسٹارٹ نہ ہونے پر جھنجلایا ہوا تھا۔ اس پر اس عورت کی مسکراہٹ نے اسے بے وجہ طیش دلا دیا۔

"ہاں جی! کیا بات ہے؟" اس نے شیشہ نیچے کر کے کھولتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"مجھے یہ بتانا تھا کہ خوشی محمد بندوں کو بلانے گیا ہے۔ وہ ابھی آتے ہیں۔ اس کو اٹھا کر دور پھینکتے ہیں۔" اس نے سڑک کے درمیان گرے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں کیا کروں؟" اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا لہجہ کافی درشت تھا۔ لیکن شاید اس وقت اسے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔

"پھر۔" وہ مسکرائی۔ سعد نے دیکھا۔ اس کے دانتوں کی ساخت اونچی تھی۔ اسی لیے ذرا سا مسکرانے پر بھی دانت نمایاں نظر آنے لگتے تھے۔

"گڈی سے باہر اتر آؤ۔ گڈی ابھی اگے نئیں جانی۔"

"فکر مت کرو۔ میں گاڑی نکال لوں گا۔" سعد نے شیشہ اوپر کرتے ہوئے کہا اور دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی۔ شیشے پر دوبارہ دستک ہوئی اس نے جھنجلا کر شیشہ ایک بار پھر نیچے کیا۔

"اب کیا مسئلہ ہے تمہیں؟" وہ کاٹ کھانے کے سے انداز میں بولا۔

"گڈی کی سوئی تو دیکھ۔ تیل ختم ہو چکا اے۔" اب کی بار سفید دانت کچھ زیادہ ہی باہر نکل آئے۔ پہلی بار سعد نے فیول گیج پر نظر ڈالی اور اسے اپنی حماقت اور غائب دماغی پر بری طرح طیش آیا۔

"باہر نکل آؤ۔" اس عورت نے جیسے سعد کے غصے سے سرخ پڑتے چہرے پر تمسخرانہ نظر ڈالی۔

"ادھر ساڈی کلی (جھونپڑی) ہے۔ خوشی محمد آجائے تو تیل کا بندوبست کر دے گا۔" اس نے سڑک کے کنارے میل ہا میل تک پھیلے کھیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سعد نے ایک نظر گاڑی کے اندرونی حصے پر ڈالی اور سامنے دور تک پھیلی سڑک کو دیکھا۔

"اس سڑک پر آج کسی اور کو نہیں آنا' سوچ کیا رہا ہے میرا ویر! شاباش باہر آجا۔ میں تجھے میٹھی لسی بنا کر پلاتی ہوں۔" اس نے اصرار کیا۔

"بیڈ لک۔" اس نے ہاتھ مار کر چابی اگنیشن سے نکالی اور بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھول کر

باہر آگیا۔

"آجا! آجا شاباش۔" سعد کے باہر آنے پر اس عورت نے ایک بار پھر پورے دانتوں کی نمائش کی اور سڑک کے درمیان چلتی کچے راستے پر اتر گئی۔ سعد نے تذبذب سے دائیں بائیں دیکھا اور گاڑی لاک کر کے اس عورت کے پیچھے چل دیا۔

☼ ☼ ☼

"چاچا جی! آپ نے سعد کو کھاری کے بارے میں کیا بتایا تھا؟" ماہ نور نے یہ بات سردار چاچا سے اتنی تیزی سے پوچھی تھی کہ اس تیزی میں پوشیدہ بے قراری واضح طور پر محسوس کی جا سکتی تھی۔

"کچھ خاص نہیں۔" چوہدری سردار نے ذرا سے توقف کے بعد ٹھہرے ہوئے اور پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "سعد مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں نے کھاری کی شادی ایسے کیوں کی جیسے متوسط طبقے کا کوئی باپ اپنے سگے بیٹے کی کرتا ہے۔"

"پھر؟" ماہ نور کے لہجے میں مزید بے چینی اتری۔

"پھر کیا؟" وہ ہلکا سا مسکرائے۔ "تم تو جانتی ہو کہ کھاری مجھے ہمیشہ سے کتنا عزیز ہے۔"

"ہاں!" ماہ نور نے بغیر سمجھے سر ہلایا۔

"سعد نہیں جانتا تھا۔ حیران ہوا اور بولا کہ کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ کسی بے نشاں بچے کو اتنی محبت سے کوئی پالے جبکہ میں نے اسے باقاعدہ گود تو لیا نہیں تھا۔ حادثاتی طور پر یہ بے چارہ ادھر آگیا۔"

"پھر؟" ماہ نور کے لہجے میں مزید بے چینی اتری۔

"پھر۔" چوہدری سردار نے اس حد تک واضح بے قراری اور بے چینی پر لحہ بھر کو غور کیا اور پرسکون انداز میں مسکرائے۔ "پھر بس' اتنی ہی بات ہوئی تھی کہ مجھے محمد بخش ملاقاتی کی آمد کی اطلاع ملی اور میں اٹھ کر نیچے چلا گیا۔ مگر یہ لڑکا گیا کہاں؟" انہیں پھر سعد کے غائب ہونے والی بات یاد آگئی اور وہ اپنا سیل فون ہاتھ میں پکڑے اٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔

"بس اتنی بات۔" ماہ نور نے اپنی جھکی ہوئی نظروں کو تیزی سے دائیں بائیں گھماتے ہوئے سوچا۔ "بس اتنی سی بات میں وہ کون سی بات ہے' جو سعد اتنا اچانک اٹھ کر کہیں چلا گیا؟"

"ہو سکتا ہے' وہ یہیں کہیں گیا ہو' قریب کسی جگہ۔"

اگلے لمحے سردار چاچا اندر آکر بولے۔ "کہہ رہا تھا کہ ہیڈ کے آس پاس کے علاقے میں فوٹو گرافی کے لیے جائے گا۔ وہاں مرغابیاں بھی ہوتی ہیں اور گندم کی سنہری بالیں بھی۔ اسے وہ منظر اچھے لگے تھے۔"

ماہ نور نے سردار چاچا کو دیکھا اور سر جھٹک کر سوچا۔

"میری چھٹی حس کبھی بھی اتنی تیز نہیں رہی' کسی کے بھی معاملے میں۔ مگر نجانے کیوں وہ سعد کے معاملے میں جاگنے اور ہوشیار کرنے لگی ہے۔ یہ کہنا اور ایسا سوچنا خام خیالی ہے کہ وہ یہیں کہیں گیا ہو گا اور واپس آجائے گا۔ وہ جس انداز سے گیا ہے' وہ انداز بتا رہا تھا کہ وہ ابھی یہاں واپس نہیں آئے گا۔" اس نے دل میں کہا۔

"میں پتا کرتا ہوں رب نواز اور ظہور سے۔ یقیناً" انہیں پتا ہو گا کہ سعد کہاں گیا ہے۔" چوہدری سردار نے کہا اور پھر ہاتھ میں پکڑے سیل فون کی طرف دیکھا "ایک تو فون بھی بند ہے اس کا۔" وہ ایک مرتبہ پھر کمرے سے باہر چلے گئے۔

ماہ نور نے کسی شکست خوردہ سپاہی کی طرح تھکی اور ہاری ہوئی نظروں سے ایک مرتبہ پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ

ایک ایک چیز پر نظر ڈالتے ہوئے کمرے کی مغربی دیوار پر سجی پینٹنگز تک پہنچی۔

"سردار چاچا کی فن اور فنکار سے یہ محبت ہی تو ہے۔ جس نے سعد کو اتنے دن سے یہاں روک رکھا تھا۔ اچانک پھر ایسا کیا ہوا کہ وہ سرپٹ بھاگ کھڑا ہوا۔" وہ آہستہ قدموں سے چلتی مغربی دیوار پر سجی پینٹنگز کے قریب آئی۔

"ایبسٹریکٹ آرٹ۔" اس نے پہلی اور دوسری پینٹنگ کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ یہ کسی مشہور مصور کی پینٹنگز کی نقول تھیں۔ "اوہ! یہ تو بہت صاف مگر ادھوری پینٹنگ ہے۔" چوتھی پینٹنگ کے قریب پہنچ کر اسے خیال آیا۔ "کس مصور نے ادھوری پینٹنگ بیچی اور سردار چاچا نے کیسے خریدلی؟" اس نے بھورے فریم میں جڑی پینٹنگ کو غور سے دیکھا۔

ڈوبتے چاند کی مدھم روشنی' نیچے بہت نیچے ننگے فرش پر مٹھیاں بھینچے' روتے' چلاتے شیر خوار بچے پر پڑ رہی تھی۔ بچے کی کھلی آنکھیں مدھم روشنی پر ٹکی تھیں۔ مادر زاد برہنہ بچے کی ٹانگیں سکڑ کر گھٹنوں سے جڑی تھیں اور گھٹنے پیٹ سے لگے تھے۔ بچے کے ارد گرد وسیع میدان کا خاکہ ادھورا تھا۔ اس میں کہیں کہیں نوکیلی خار دار جھاڑیاں ایسے نظر آرہی تھیں۔ جیسے کوئی انہیں بناتے ادھورا چھوڑ گیا ہو۔

"کیسی عجیب سی تصویر اور کیسا دل خراش منظر ہے۔" ماہ نور لاشعوری طور پر ایک قدم پیچھے ہٹی۔ تصویر میں ادھوری نوکیلی جھاڑیوں کے اندر سے ابھرتے مصور کے دستخط بھی نظر آرہے تھے۔ وہ دستخط بھی کسی خریدی تصویر ہی کی طرح سمجھ میں نہ آنے والی ساخت کے حامل تھے۔

بہت غور سے پڑھنے پر بھی ماہ نور ابتدائی تین حروف سے آگے لکھے حروف پڑھنے میں ناکام رہی۔

اس ناکامی پر الجھ کر اس نے پینٹنگز کے قریب دیوار میں جڑی کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ نجانے کتنے سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتا طوفان تھم چکا تھا اور اب فضا میں اس طوفان کے اپنے پیچھے چھوڑے مٹیالے رنگوں مٹیالے بادلوں اور سکوت کے سوا اس کا کوئی نشان باقی نہ تھا' ہاں! زمین اس کے چھوڑے تمام نشانوں کی ایک صاف تصویر نظر آرہی تھی۔ طوفان کے تھپیڑوں سے بے حال سر نہوڑائے پودے اور پیڑ اپنے قد سے اکھڑے درخت مٹی مٹی ہوتی گھاس گرد آلود درودیوار' ادھر سے ادھر تک بکھرے کاغذ' پتے اور چھوٹی شاخیں۔

"سعد چلا گیا۔" اس منظر کو دیکھتے ہوئے اچانک اس کے دل نے جیسے بلبلا کر کروٹ لی اور اسے یاد آیا کہ ایک طوفان تو اس کے دل و دماغ پر بھی گزر چکا ہے اور اس طوفان کی چھوڑی گرد کے پیچھے کا منظر اتنا غیر نمایاں ہے کہ اسے نجانے کب تک پتا نہ چل سکے گا کہ طوفان کے اٹھنے کی وجہ کیا تھی۔

اس نے اس احساس کی شدت سے گھبرا کر کھڑکی بند کی اور کمرے کے دوسرے کونے میں رکھی میز پر دھرے گراموفون کی طرف دیکھا اور اسی بے دھیانی میں اس نے اس کی سوئی کو سیٹ کیا اور اس کا بٹن دبادیا۔

یکایک از دل دو چشم جادو
بصد فریبم ببرد تسکین
(اپنی چشم فسوں گر کے طلسم ہزار اثر سے
اس نے یکایک میرے دل و دماغ کا سارا قرار چھین لیا)

ایاز قوال ایک مرتبہ پھر خسرو کے دل کا حال بیان کرنے لگا تھا۔

ماہ نور کو کمرے میں موجود ہر چیز میں سے صرف ایک ہی شبیہہ کا عکس دکھائی دینے لگا۔

کسے پڑی ہے جو جا سنائے
پیارے پی کو ہماری بتیاں

اب کے ماہ نور کو ایسا لگا۔ جیسے قوال نے اچانک اس کے اپنے دل کی حالت کی ترجمانی شروع کردی ہو۔

اس نے اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں ہونٹ دانتوں تلے دبائے اور پیچھے مڑ گئی۔ اب ایک بار پھر اس کے سامنے مغربی دیوار اور اس پر سجی پینٹنگز تھیں۔ ایک کے بعد دوسری پھر تیسری پینٹنگ سے ہوتی اس کی نظریں چوتھی تصویر پر جا کر رک گئیں۔ نوک دار ادھوری شاخوں والے میدان کے ادھورے خاکے میں وہ بلبلاتا مکمل بچہ۔ اس کے ذہن نے ایک بار پھر لاشعوری طور پر مصور کے دستخط میں سے سمجھ آنے والے پہلے تین حروف دہرائے اور جیسے اچانک اس کے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا ہوا اور اسے ایک ایسے معمے کا چھوٹا سا سرا ہاتھ آگیا۔ جس کے بارے میں کچھ دیر پہلے تک وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ اسے کبھی سمجھ میں نہیں آسکتا۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں لگ رہے ہو؟" سعدیہ نے ہاتھ میں پکڑے موبائل فون سے کھیلتے ہوئے کھاری کو دیکھا۔ یہ کھاری کا موبائل فون تھا۔ ایک سادہ سا فون سیٹ جس میں جڑا کیمرا' تصویریں کھینچ سکتا تھا۔ سعدیہ کے لیے یہ موبائل فون خود سے قدرے بلند طبقے تک پہنچنے اور اس سے متعلق ہوجانے کا زینہ اول تھا۔ اس موبائل فون کے روابط کے خانے میں سوائے اس کے ابا جی کے نمبر کے سب نمبرز اس کے لیے اجنبی تھے۔ مگر پھر بھی یہ موبائل فون سعدیہ کے لیے ہفت اقلیم کا ایک ایسا خزانہ تھا' جو اسے بیگم صاحباؤں کی صف میں کھڑا محسوس کرواتا تھا۔

کھاری کی بیوی بننے کے بعد جو من چاہی آزادی اسے ملی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ اس موبائل فون پر ہیڈ فون لگا کر اپنی مرضی کے گانے بھی سن سکتی تھی۔ فارم ہاؤس کے ملازمین کی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ گھل مل کر اس نے تفریح کے ایسے بہت سے راز جان لیے تھے' جو وہ اس ایک موبائل فون کے ذریعے حاصل کر سکتی تھی۔ ایف ایم ریڈیو تو گویا اس کی جان بن چکا تھا۔ کرنے کو کوئی خاص کام نہ ہونے کی وجہ سے وہ دن بھر اسی تفریح میں مگن رہتی تھی اور کھاری اس کو یوں مگن اور خوش دیکھ کر خوش ہوتا رہتا تھا۔ سعدیہ' کھاری کو ناز و ادا دکھاتی اور اس سے اپنے نخرے اٹھواتی۔ باقی دنیا سے بالکل بے نیاز دن گزار رہی تھی۔ مگر وہ ایک مختلف دن تھا۔

اس دن کھاری بہانے بہانے سے کام چھوڑ کر اس کے پاس آیا تھا۔ نہ ہی کام سے فارغ ہو کر اس کے پاس آتے ہوئے وہ کسی شاخ پر سجا خوب صورت پھول اس کے لیے لایا تھا۔ اس غیر معمولی صورت حال پر اپنی دنیا میں مگن سعدیہ بھی چونک گئی۔ اس نے کانوں سے ایئر فون نکال کر کھاری کی طرف دیکھا۔ کھاری اسے گھبرایا ہوا نظر آیا۔

"کیا بات ہے تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں لگ رہے ہو؟" سعدیہ نے جانچتی نظروں سے کھاری کو دیکھا۔

"ہوں۔" کھاری نے جیسے کسی گہری سوچ سے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" سعدیہ بیڈ سے ٹانگیں نیچے لٹکاتے ہوئے بولی۔

"ہاں!" کھاری نے سر ہلایا۔ "ہنیری (آندھی) بڑی تیز تھی۔"

"ہاں!" سعدیہ نے سر ہلایا۔ "میں نے دروازے اور کھڑکیوں کی چٹخنیاں چڑھادی تھیں۔ مگر آندھی اتنی تیز تھی کہ لگتا تھا' چٹخنیاں ٹوٹ جائیں گی اور دروازے کھڑکیاں سب کھل جائیں گے۔" اس نے بتایا۔

"اور تم؟" اس نے تیوریاں چڑھا کر کھاری کو دیکھا۔ "تم کہاں غائب تھے؟ تمہیں میرا خیال تک نہیں آیا۔ اتنا

تیز طوفان آیا۔ میں اکیلی یہاں بیٹھی ڈرتی رہی۔"
وہ ناز سے بولی۔
"طوفان!" کھاری نے عجیب سی نظروں سے سعدیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آہو طوفان آیا تھا۔ بڑی تیز ہنیری چلی۔ میرا تے سمجھو دل تے دماغ' سارا ہی کج کچھ اس طوفان وچ خوار ہوگیا۔ ہر سال اس طرح کا طوفان واڈیوں (کٹائی کے موسم) میں آتا ہے۔ پر اس سال جو طوفان آیا ہے نا۔ یہ طوفان وا ورولے (بگولے) کی طرح میری ہستی پر چل گیا ہے۔ سب کج اڑا کے اپنے نال لے گیا ہے۔"
سعدیہ نے ہاتھ میں پکڑا موبائل فون بیڈ پر رکھا اور اٹھ کر کھاری کے نزدیک آگئی۔ طوفان تھمنے کے بعد موسم بہتر ہوگیا تھا اور پنکھے کی ہوا خوشگوار لگ رہی تھی لیکن کھاری کے قریب آنے پر اسے کھاری کے چہرے پر چمکتا پسینہ واضح نظر آرہا تھا۔ کھاری کی نظروں میں عجیب سا تاثر تھا۔
"کیا مطلب ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آئی تمہاری بات۔" اس نے کھاری کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔
"او چھڈو سعدیہ باؤ!" کھاری نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ سعدیہ کی گرفت سے نکال لیا۔ "کرنا کیا ہے سمجھ کے۔ بندہ اول تے سمجھ نہیں سکدا۔" اس نے اپنی کنپٹی پر دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی رکھ کر بایاں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔
"او راگر سمجھ بھی جائے تو کر کچھ نہیں سکتا۔" دونوں بازو جھٹکتے ہوئے اس نے سرہلایا۔ "بندہ بے چارہ تو بڑا ہی بے وسا (بے بس) ہے۔"
"پتا نہیں کیسی باتیں کررہے ہو تم۔" سعدیہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سرہلایا۔
"ٹھیک ہے۔ سعدیہ باؤ! چنگا ہے۔ سمجھ نہیں آئی تو بڑا چنگا ہے۔ اگر سمجھ آگئی تو چین تے قرار چلا جاتا ہے ہمیشہ واسطے۔"
"اچھا چھوڑو یہ بتاؤ میرے لیے کھانے کو کچھ لائے ہو؟" سعدیہ نے ہلکی سی کوشش کے بعد کھاری کی بات سمجھنے میں ناکام رہنے کے بعد اٹھلاتے ہوئے ایک مرتبہ پھر اس کا بازو پکڑا۔
"نہیں!" کھاری نے نفی میں سرہلاتے ہوئے کہا۔
"اوہ!" سعدیہ نے مایوس ہو کر منہ بنایا۔
"سعدیہ باؤ! کچن میں جا کر اب ماسی جنتے کا ہتھ بٹا لیا کرو۔" کھاری کے لب و لہجے نے اچانک ایک نیا پینترا کھایا۔ "اب ہمیں اپنی روٹی پانی کی فکر آپ کرنی چاہیے۔"
سعدیہ نے دو قدم پیچھے ہٹ کر کھاری کے اس نئے انداز پر غور کیا۔ "لیکن ابھی ہماری شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔" اس نے بے اختیار کہا۔
"غریب لوکاں کی شادیاں بس اتنے دن ہی نئی رہتی ہیں سعدیہ باؤ!" کھاری کے لہجے میں طنز کی چبھن اتر آئی۔ "ادھر اپنے کام اپنے ہاتھ سے ہی کرنے پڑیں گے۔"
سعدیہ کو اچانک یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے پہاڑی کی اونچائی سے دھکا دے دیا ہو۔ اس نے سہارا لینے کی خاطر اور خود کو گرنے سے بچانے کے لیے ایک بار پھر کھاری کے شانے سے سر ٹکانے کی کوشش کی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"کام تو انسان عمر بھر کرتا ہے کھاری!"
"ہاں جی۔ تے ٹھیک ہے نا۔" کھاری نے دائیں طرف ہٹتے ہوئے کہا اور اپنی قمیص کے کف الٹ کر آستین کہنیوں تک اٹھانے میں مصروف ہوا۔ "جو یہ دن ہیں۔ یہ بھی اسی عمر میں جمع ہونے ہیں نا۔" اس نے بے نیازی

سے کہا۔
"میں منہ ہاتھ دھولوں' تسی جا کر ماسی جنتے سے کھانا پکڑ لاؤ۔"
سعدیہ نے آنکھیں سکیڑ کر سوالیہ انداز میں کھاری کی طرف دیکھا۔ اسے گمان ہو رہا تھا شاید اس کے کانوں نے کچھ غلط سنا تھا۔ لیکن کھاری کہہ کر کمرے سے متصل چھوٹے سے باتھ روم میں گھس گیا تھا۔
"ماسی جنتے سے کھانا لینے جاتی ہے میری جوتی۔" سعدیہ نے تازہ تازہ وصول کیے گئے گھمنڈ میں آکر دایاں پاؤں زور سے زمین پر پٹخا۔ "خود ہی لائے گا جا کر کھانا۔" اس نے غصے سے سر جھٹکا اور دوبارہ بیڈ پر نیم دراز ہو کر ایئر فون کانوں میں ٹھونس لیے۔ اب وہ ایف ایم ریڈیو پر ابرار الحق کی آواز میں ایک شوخ سا نغمہ سن رہی تھی۔
"آپ کھانا نہیں لائے ہو سعدیہ باؤ؟" کھاری ہاتھ' منہ دھونے کے بعد باتھ روم سے باہر نکلا اور سعدیہ کو اس انداز میں موبائل فون میں مگن دیکھ کر ٹھٹک کر بولا۔
سعدیہ نے اس کی بات سنے بغیر ہی بے نیازی سے سرہلایا۔
کھاری نے کچھ بے یقینی سے سعدیہ کو دیکھا۔ پھر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس کا دل سعدیہ کے اس بے نیازانہ انداز پر بوجھل ہو رہا تھا یا کچھ دیر پہلے سنی آپا رابعہ کی باتوں پر اس نے ماسی جنت کے پاس کچن کی طرف جاتے ہوئے سوچا۔ مگر اسے اپنے اس سوال کا صحیح جواب نہ مل پایا تھا۔"

☆ ☆ ☆

"لے اب تو دونوں ویلے مل رہے ہیں۔ تے خوشی محمد کا کوئی اتا پتا نہیں۔" اس عورت نے جو اسے زبردستی اپنے ساتھ کھیتوں کے عین درمیان بنی مٹی کی اس کچی کوٹھڑی میں لے آئی تھی اور جس نے اپنا نام نور فاطمہ بتایا تھا' نے پتھر کی سیاہ سل پر چھوٹے سیاہ پتھر کی مدد سے ہی کچھ پیستے ہوئے کہا۔
"ٹریکٹر بھی اس کا خراب تھا۔" اس نے اپنا روکھا سا بازو ہوا میں اٹھا کر ہاتھ ہلاتے ہوئے سعد کو بتایا جو روٹھے بچوں کی طرح اس چھوٹے پیڑھے پر بیٹھا فرش پر نظریں گاڑے ہوئے تھا' جو اس کی زبردستی کی میزبان نے اسے پیش کیا تھا۔ "مینوں لگدا ہے ٹریکٹر ٹھیک کرانے بیٹھ گیا ہوگا۔" نور فاطمہ نے جیسے سیانوں کی طرح قیافہ لگانے کے بعد سرہلایا۔ "چاہے آج رات واپس ہی نہ آئے۔" وہ اپنے اونچے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولی۔
"تو مجھے کاہے کو یہاں روک کر رکھا ہوا ہے۔" سعد نے جھلا کر کہا۔ "مجھے بتاؤ کہ نزدیک ترین پیٹرول پمپ کتنے فاصلے پر ہے یہاں سے میں جا کر پیٹرول لے آتا ہوں۔"
"پیدل جاتویں گا۔" نور فاطمہ نے اس کے بھنائے ہوئے انداز پر جیسے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔
"اور کیا میرے لیے ہیلی کاپٹر ہائر کیا ہے تم نے جس کو اڑا کر چلا جاؤں۔" سعد کو اس عورت پر سخت جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔
"پیدل جاؤ گے بچو جی' پنڈ بکھراں کے پیٹرول پمپ تک پہنچے دو ڈھائی گھنٹے تک لگ ہی جانے ہیں۔"
"افوہ مائی! تم نے میرا اتنا وقت ضائع کیا!" سعد بھنا کر اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "کب سے تم اپنے بیٹے کی واپسی کی کہانیاں سنا رہی ہو اور مجھے یہ کہہ کر یہاں بٹھایا ہوا ہے کہ وہ واپس آکر مجھے پیٹرول لا دے گا۔"
"ہاں تے میں کوئی جھوٹ بولیا۔" نور فاطمہ انگلی سے چٹنی اٹھا کر چیک کی اور اس کی بارکی سے مطمئن ہو کر کوٹھڑی کے ایک کونے میں کیل پر ٹنگی لالٹین اتار کر اسے جلانے لگی۔
اسے لالٹین جلاتے دیکھ کر سعد کو احساس ہوا کہ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ اس نے طیش میں آکر اس پیڑھے کو پیر سے ٹھوکر مار کر ایک طرف لڑھکا دیا۔ جس پر وہ بیٹھا تھا اور کوٹھڑی سے باہر نکل آیا۔ شام کے سائے گہرے

ہو رہے تھے۔

کوٹھڑی سے باہر کھیت کے راستے تک کی جگہ کو مٹی ہی سے لیپا پوتا کر' صاف اور پکا کیا گیا ہوا تھا۔ اسی لپے پتے فرش کے ایک جانب ہینڈ پمپ اور چارہ کاٹنے کا ٹوکا نصب تھا۔ اس کے ایک طرف کوٹھڑی کی دیوار کے ساتھ پیپل کے ایک عمر رسیدہ گھنے درخت کے نیچے تین بھینسیں اور دو گائیں بندھی تھیں۔

سعد نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس سارے منظر پر نظر ڈالی اور دونوں ہاتھ کمر پر ٹکا کر کھیتوں سے سڑک تک جانے والے راستے کو تکنے لگا۔ اس سڑک پر سیدھے چلتے جائیں' تب دو ڈھائی گھنٹے سفر کے بعد پہلا پیٹرول پمپ آتا ہے۔ وہ نچلا ہونٹ حسب عادت دانتوں تلے دبائے صورت حال پر غور کر رہا تھا۔

"اگر یہ احمق' باتونی عورت مجھے روک کر یہاں بٹھانہ لیتی اور مجھے سیدھے سیدھے پیٹرول پمپ کا راستہ بتا دیتی تو میں اب تک پیٹرول لے کر واپس آچکا ہوتا۔"

"اب تو اندھیرا ہونے لگا ہے۔ اب پیدل جانے کا تو سوال ہی نہیں ہوتا۔" اسے عقب سے نور فاطمہ کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ نور فاطمہ چولہے میں اپلے سجا کر ان کے درمیان ایک لکڑی سیٹ کر رہی تھی۔

"اب تو سویرے ہی تیل مل سکتا ہے۔ اس راستے پر جانور اور چور ڈاکو سارے ہی راہ روکے کھڑے ہیں۔"

"تو مجھے کیوں یہاں بٹھا رکھا تھا اس وقت سے۔" سعد نے اس کے قریب جا کر تقریباً" چلاتے ہوئے کہا۔ جواب میں وہ اپنے پورے اونچے دانت نکال کر ہنس دی۔ چولہے میں موجود اپلے آگ پکڑ رہے تھے اور ان کی روشنی میں نور فاطمہ کے دانت یوں لگ رہے تھے جیسے کسی ڈائن کے دانت اندھیرے میں چمک رہے ہوں۔ سعد کسی انجانے سے احساس کے تحت پیچھے ہٹ گیا۔ نور فاطمہ کوٹھڑی کے اندر گھس گئی۔ جب وہ کوٹھڑی سے باہر نکلی اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں گوندھے ہوا آٹے کی پرات تھی۔

"میں نے تینوں نہیں روکا۔" اس نے چولہے کے پیچھے دیوار کے ساتھ کھڑے توے کو جلتی آگ پر رکھتے ہوئے کہا اور لالٹین چولہے کے ساتھ دیوار پر ذرا اونچائی میں گڑے کیل پر لٹکانے لگی۔

"تم نے نہیں روکا۔" سعد نے دانت پیسے۔ "تو اور کون مجھے گاڑی سے اتار کر یہاں لایا تھا خوشی محمد کی واپسی کا کہہ کر۔"

"نہیں میں نے نہیں روکا۔" وہ چولہے کے پاس تھی۔ وہ پرات میں سے آٹا کھینچ کر اس کا پیڑا بناتے ہوئے سکون بھرے انداز میں بولی۔

"تو میں خود آیا تھا اپنی مرضی سے۔" سعد کو اس کا یہ اطمینان بھرا انداز مزید طیش دلا گیا۔

"جھلیا لوکا' تینوں۔ میں نئیں میرا اللہ یہاں لے آیا ہے۔" نور فاطمہ نے آگ کی تپش سے چہرے پر چھلکتے پسینے کو دوپٹے سے پونچھتے ہوئے کہا۔

"میری کی مجال میں آندھی چلاؤں۔ میرا کی دم میں گاڑی میں تیل ختم کروں۔ میں کون ہوتی ہوں' اونچے لمبے درخت سڑک پر گرا کر لوگوں کے راستے روکنے والی۔" اس نے توے پر دھری روٹی پر دستر خوان رکھ کر اسے توے پر پھراتے ہوئے کہا۔

"میں تو چنگی بھلی بالن کے لیے سوکھی لکڑیاں جمع کر رہی تھی۔ جب میرے دل میں اس نے ڈالا کہ اٹھ نور فاطمہ چل کے اس گڈی والے کو دیکھ جو بار بار گاڑی اشٹارٹ کرتا ہے اور اس کی گاڑی ہی اشٹارٹ نہیں ہو رہی۔ میرے دیر میں نے تو حکم منیا اور گاڑی کول پہنچ گئی۔"

اس کے انداز میں اتنا سکون' اتنا اطمینان تھا۔ سعد کو اس کے سکون اور اطمینان پر ایک لمحے کے لیے رشک سا آگیا۔

"مگر تمہیں اس نے بھیجا تھا تو اس نے یہ بھی کہا ہوگا۔ اس بندے کو سیدھا راستہ دکھاؤ۔ نہ کہ اس کا راستہ کھوٹا کرنے بیٹھ جاؤ۔" اگلے ہی لمحے اس عورت اور اس کی حرکتوں پر انڈتا طیش اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو گیا۔ وہ کولہوں پر ہاتھ ٹکا کر پھنکارا۔

"سیدھا رستہ ہی تے دکھایا ہے۔" اس نے توے سے روٹی اتار کر چنگیر میں رکھی اور چولہے میں جلتی لکڑی باہر کھینچ لی۔

"خاک سیدھا راستہ دکھایا۔" سعد نے جھلا کر پاؤں پٹخا۔ "اب بتاؤ اس وقت میں کہاں جاؤں۔"

"نلکا چلا کر منہ ہتھ دھولے۔" اس نے پکی ہوئی روٹیاں رومال میں لپیٹتے ہوئے کہا۔ "پھر یہاں میرے ساتھ بیٹھ کے روٹی کھا۔ میں تجھے بتاتی ہوں کہ میں نے تجھے سیدھا رستہ کیسے دکھایا ہے۔"

سعد نے غصے بھرے نظروں سے اس کو دیکھا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ "مجھے نہیں کھانا تمہارا کھانا۔"

"لے دس بھلا روٹی نال کاہے کی لڑائی۔" وہ اٹھ کر سعد کے قریب آئی۔

"چل میرا ویر! شاباش غصہ تھوک دے اور روٹی کھالے۔ بھلا دس اس کے ساتھ کوئی لڑائی کر سکتا اے۔ اس پر بندے کا کوئی زور زبردستی نہیں چلتی۔"

سعد نے نظروں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ کتنی لمبی اور سیدھی تھی۔ اسے خیال آیا۔ اس نے اس سے پہلے صنف نازک میں اتنا سیدھا بے پیچ و خم سراپا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے جسم کی ساخت' اس کے ہاتھ اور پاؤں' اس کے چہرے کے خدوخال جس پر ہڈیاں نمایاں تھیں۔ جیسے سخت ہو کر کھنچ سی گئی ہوں۔ لکڑی کی کھپچیوں کی طرح رخساروں کی ہڈیاں جو لالٹین کی نیم روشنی میں واضح ہو رہی تھیں۔ اس کا کل سراپا سخت مشقت کے عادی انسان کی جھلک دکھا رہا تھا۔

"اس کے ساتھ کیسی زورا زوری بھلا۔" سعد کو اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے نرمی سے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی۔ سعد نے گہرا سانس لیتے ہوئے ہینڈ پمپ کی طرف دیکھا۔

"چل میں نلکا چلاتی ہوں۔ تو ہتھ منہ دھولے۔" سعد کے اس انداز کو نیم رضامندی جان کر وہ خوش ہو کر تیزی سے بولی اور ہینڈ پمپ کی طرف چل دی۔

"مدتوں بعد ادھر کوئی مہمان آیا اے۔ ست بسم اللہ! جو وہ کسی مہمان کو ادھر بھیج دے۔" وہ ہینڈ پمپ کو چلاتے ہوئے کہہ رہی تھی اور ہینڈ پمپ کے ٹھنڈے شفاف پانی کے نیچے ہاتھ منہ دھوتے ہوئے سعد کو لگا جیسے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے اس کے جلتے' تپتے دل و دماغ پر پڑ رہے ہوں۔

"جو پہلے ہی سمجھ لیتے کہ میرا راستہ اس غریب نور فاطمہ نے نہیں روکا۔ میرا راستہ اس نے خود روکا ہے تو اتنا غصہ تو نہ کھانا پڑتا۔ دو تین گھنٹوں کے اندر تمہارا رنگ جل کے سیاہ ہو گیا ہے۔"

منہ ہاتھ دھو کر وہ نور فاطمہ کے سامنے پیڑھی پر آ بیٹھا تھا۔

"یہ کیا دے رہی ہو مجھے۔ یہ کیسا کھانا ہے؟" سعد نے دیکھا' وہ سیاہ پتھر کی بھاری سل اندر سے اٹھا کر باہر لے آئی تھی اور اب چنگیر میں رکھی روٹی پر ایک نوالے کی مدد سے اس سل پر پسی چٹنی رکھ کر پھیلا رہی تھی۔

"فکر نہ کر زہر نہیں دینے لگی تینو۔" اس نے ہاتھ روک کر سعد کی طرف دیکھا۔

"لے کھا! اس چٹنی کو روٹی پر اچھی طرح پھیلانے کے بعد اس نے چنگیر سعد کے سامنے رکھی۔

"مگر یہ ہے کیا؟" سعد نے چنگیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میرے کول سبزی تھی' نہ دال' خوشی محمد آتا تو پکانے کے لیے کچھ لا کر دیتا۔ اس میں میں نے پیاز اور ہری مرچوں میں نمک اور کچی کیریاں ڈال کر پیس لیں۔ اب جو ہے وہی کھانا پڑے گا۔" وہ دانت نکال کر بولی۔

سعد نے ایک بار پھر چنگیر کی طرف دیکھا اور سر ہلا کر چنگیر اپنے قریب کرلی۔ اس نے روٹی کو رول کیا اور دانتوں سے پہلا نوالہ توڑا۔ نور فاطمہ اپنے پورے دانت باہر نکالے تجسس اور شوق سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جیسے پہلے لقمہ کھا لینے کے بعد اس کی داد کی منتظر ہو۔

"یہ تو بہت مزے کا ہے۔" سعد نے دوسرا نوالہ توڑتے ہوئے کہا۔ نور فاطمہ کے چہرے پر پھیلی مسرت سوا ہوگئی۔ "اس کی ساریاں نعمتیں ہی سوادوالیاں ہوتی ہیں۔" وہ یوں خوش ہو کر بولی جیسے اسے کوئی بڑا اعزاز مل گیا ہو۔

"تم یہاں اس ویرانے میں اکیلی رہتی ہو۔ تمہیں ڈر نہیں لگتا۔ یہاں دور دور تک کھلے کھیتوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ کوئی گھر ہے نہ کوئی دوسری عمارت۔"

"اس کے ہوتے ہوئے بندہ اکیلا نہیں ہوتا۔" وہ روٹی کے نوالے کے ساتھ چٹنی لگا کر کھاتے ہوئے بے نیازی سے بولی۔

"اگر کوئی آدھی رات کو آکر تمہارا گلا کاٹ جائے تو۔" سعد نے اس کی بے نیازی سے چڑ کر کہا۔

"میرے کولوں کسی نے کیا لینا ہے۔ جے میرا گلا کاٹ جائے گا۔" اس نے بے نیازی کا مزید مظاہرہ کیا۔

"تمہارے پاس یہ جو جانور ہیں۔ یقیناً ان کی قیمت لاکھوں میں ہوگی۔" سعد نے پیپل کے درخت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوئے گی ہمینوں کی خبر کیا قیمت اے جن کے ہیں اوناں نوں پتا ہوگا۔" اس کی بے نیازی عروج پر پہنچ گئی۔

"اچھا تو یہ تمہارے نہیں ہیں۔" سعد نے ایک بار پھر جانوروں کی طرف دیکھا "اور اگر انہیں کوئی کھول کر لے گیا تو تم کیا کرو گی۔ ذمہ داری تو تمہاری ہے نا۔"

"جن کے ہیں وہ اپنے اپنے جانور کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی آوازیں پہچانتے ہیں۔ جو چور جانوروں کو کھول کر انہیں چلائے گا وہ گھنٹی تو گلے سے نہیں اتارے گا۔ گھنٹیاں بجیں گی تو سب کو ہوشیار کردیں گی۔"

"ہوں۔" سعد نے سر ہلایا۔ "پھر تو تمہارے پاس ایسی کوئی قیمتی چیز بچتی نہیں، جو کوئی لے جانے کی کوشش کرے، سو مزے کرو تم۔"

"ہیں کیوں نہیں ہیں قیمتی چیزیں۔" برتن سمیٹتے اس کے ہاتھ رکے۔

"اچھا ہیں؟" سعد مسکرایا۔ "کہاں ہیں۔ دکھاؤ تو ذرا۔"

"یہاں تو نہیں ہیں۔" اس نے دانت نکالتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔

"کہاں ہیں؟" سعد نے کہا۔

"او پیپل کے پیچھے۔" اس نے درخت کی طرف اشارہ کیا۔

"وہاں تو وہی جانور ہیں جو تم کہتی ہو، تمہارے ہیں ہی نہیں۔" سعد نے درخت کی طرف دیکھنے کے بعد نور فاطمہ کی طرف دیکھا۔

"نہیں وے جھلیا! میری قیمتی چیزیں کسی کو نظر تو نہیں آتیں۔" نور فاطمہ نے سر ہلایا اور اپنے ارد گرد بکھری چیزیں سمیٹنے لگی۔ سعد کو لگا نور فاطمہ کے دماغ میں کوئی خلل تھا۔ اس لیے اس نے اس گفتگو کو ادھورا چھوڑ دیا۔

"میں نے تمہارے لیے کوٹھڑی میں چٹائی بچھادی ہے۔ دو گھڑی کے لیے کمر سیدھی کرلو، صبح ویلے تک خوشی محمد آئے گا۔" برتن سمیٹ لینے کے بعد اس نے سعد سے کہا۔ جو اسی پیڑھی پر بیٹھا تاریکی میں کچھ دیکھ رہا تھا۔

"نہیں مجھے نیند نہیں آرہی۔" اس نے نور فاطمہ کی طرف دیکھا۔ جو چولہے کے قریب چٹائی بچھا کر اس پر لیٹ چکی تھی۔

"روٹی تو غصہ ختم کے نیند پر ٹوال دیا ہے کیا؟" وہ دانت نکالتے ہوئے بولی۔ سعد جواب میں خاموش رہا۔

"تو مان کیوں نہیں لیتا۔ اللہ سوہنے نے تینوں روکا ہے۔"

"اس نے کیوں روکا مجھے؟" سعد نے بے خیالی میں سوال کیا۔

"وہ چاہتا ہوگا کہ یہ میرا بندہ آندھی کے بگولے سے بھی تیز گاڑی چلاتا جہاں جارہا ہے وہاں جاکر آندھی کی ہی طرح کوئی اندھا کام نہ کر بیٹھے۔ اسی لیے اس نے تمہاری گاڑی میں پیٹرول ختم کردیا اور سڑک پر درخت گرا کر تجھے روک لیا کہ آج ذرا نور فاطمہ کا مہمان بن اور رک کر سوچ کیا کرنے چلا تھا۔"

سعد نے چونک کر نور فاطمہ کی طرف دیکھا۔ چاند کی روشنی میں اس کے چہرے کا سیاہ رنگ چمک رہا تھا۔ اس کا میلا سا دوپٹا لیٹنے کے باعث ذرا سا پیچھے ہٹ چکا تھا اور اس کے چاندی کی طرح روپہلے بال نظر آرہے تھے۔

"بڑی آس آس لگا رکھی ہے تم نے شام سے۔" اس نے دانستہ بلند آواز میں کہا۔ "ایک بھی نماز پڑھتے تو میں نے تمہیں دیکھا نہیں۔ اس کے جو بندے ہوتے ہیں نا ایمان والے ان کی پہلی پہچان تو نماز ہی ہوتی ہے۔ جس کی وہ پابندی کرتے ہیں۔"

"لے تے میں نے کب کہا۔ میں اس کی بڑی ایمان والی بندی ہوں۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور سر پر دوپٹا سیدھا کرنے لگی۔

"میں نے تو ابھی صرف اتنا ہی راز پایا ہے کہ اس کی مرضی کے بغیر بندہ قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ اگلیاں گلاں تو ابھی میں نے سیکھنی ہیں۔" اس نے سعد کی طرف دیکھا۔

"پچیس سال ہوگئے مجھے چوہدری انعام اللہ کی چاکری کرتے۔ میرا سائیں چھبیس سال پہلے گزر گیا۔ اس کے بعد میں نے دن دیکھا نہ رات، میرے بچے چھوٹے تھے اور اے خوشی محمد تو گود میں ہی تھا۔ میں نے سردی گرمی دیکھی، برسات، پتھر توڑے، مٹی ڈھوئی، بس وقت کے ساتھ بھاگتی رہی، اتنا وقت ہی نہیں، اس ذات کا کوئی راز پاسکتی۔ وہ اور میں تو اتنی دور تھے جیسے زمین سے آسمان۔" سعد خاموشی سے سنتا رہا۔ قصے سننے کے شوقین کو اس عالم کوفت میں بھی سننے کو قصہ مل گیا تھا۔

"جب اس نے دیکھا اے نور فاطمہ تو بس دوڑتی ہی جارہی اے اسے میرا کوئی خیال کبھی نہیں آیا تو اس نے مجھے ایک جھٹکا دیا۔"

"وہ کیا؟" سعد نے بے اختیار پوچھا۔

"میری نکہت پروین کو بس تپ کے دو دن تاپ چڑھا اور وہ مرگئی۔"

"او آئی ایم سوری!" الفاظ سعد کے منہ سے پھسلے۔ "پر میرا دھیان پھر بھی اس کی طرف نہیں گیا۔" نور فاطمہ اپنی دھن میں بول رہی تھی۔

"فیر دو مہینے بعد محمد امین ہاری کا پانی لگانے کھیتوں میں گیا تو چوہدری انعام اللہ کے بندوں نے چوہدری مشتاق پر فیر کھول دتا۔ گولی چوہدری مشتاق کے بندوق تک جانے سے پہلے محمد امین کے سینے وچ اتر گئی۔ بیس برس کا جوان پل بھر میں مٹی ہوگیا۔"

"او مائی گاڈ!" سعد کے منہ سے پھسلا۔

"چوہدری انعام نے چوہدری مشتاق پر قتل کا کیس کردیا۔ دونوں طرف کے بندے جیل میں اور پھر دونوں میں صلح ہوگئی۔ پر محمد امین کی قبر پر کسی کو مٹی ڈالنے کی فرصت بھی نہ ملی۔ میں نے پھر بھی اس کی طرف دھیان نہیں لگایا۔ بس اپنا اور اپنے باقی بچوں ہی کا سوچتی رہی۔ اندھوں کی طرح چوہدری انعام کے ساتھ مل کر تھانے کچہری میں بیان اور گواہیاں دیتی رہی۔ میں نے سوچا چوہدری انعام راضی تے سب راضی۔ محمد امین دے خون کا سودا کرلیا

اور راضی خوشی کہتا۔ بیٹا اس کو تاپ چڑھ گئی۔" نور فاطمہ نے سر ہلایا۔

"محمد امین کے تین مہینے بعد عفت پروین کو سانپ ڈس گیا۔" تین دن اور تین راتیں عفت پروین نے تڑپتے گزاریں۔ چوتھے دن نور فجرو بلے جان دے دی۔ ایک نہیں، دو نہیں، تین ڈھیریاں ایک سال کے اندر اندر اس پیپل کے نیچے بن گیاں۔"

"وہ اس کا چھپا ہوا خزانہ۔" دفعتاً" سعد کو خیال آیا۔ اس نے پیپل کے درخت کی طرف دیکھا جو کسی جٹا دھاری جوگی کی طرح اپنی جٹائیں پھیلائے ساکت کھڑا تھا۔

"اس وقت پہلی بار مجھے اس کا خیال آیا۔ میں راتوں کو روتی اور چلاتی تھی۔ میرا بھرا آنگن اجڑ گیا تھا۔ میرے پلے کچھ نہیں رہا تھا۔ میں کہتی کہ میں کس سے اس بربادی کا سبب پوچھوں۔" اس نے سعد کی طرف دیکھا۔

"اس سے صرف اس سے۔ سارے کام اس کے ہیں۔ وہ ہی دیتا اور وہی واپس لیتا ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر تو بندہ قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور احاطے کے نیچے چار دیواری سے باہر نکل کر پیپل کے درخت کے نیچے جا بیٹھی۔

"کوئی نشان نہیں چھوڑا قبروں کا۔" اس نے درخت کے نیچے بیٹھ کر زمین کی ہموار سطح پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "چوہدری انعام نے ہر طرف ہل پھروا دیا، پر میرے پاس نشانیاں ہیں۔ ادھر ہی سب ڈھیریاں موجود ہیں۔" نور فاطمہ پیپل کے درخت کے نیچے زمین کی ہموار سطح پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ سعد اندھیرے اور چاندنی کے ملے جلے امتزاج میں دم بخود نور فاطمہ کو دیکھ رہا تھا۔

"تم چھوڑ کیوں نہیں دیتیں چوہدری انعام کی چاکری؟" اس نے جیسے ٹرانس کی کیفیت میں نور فاطمہ کو مخاطب کیا تھا۔ "وہ جو اتنا پتھر دل ہے کہ نہ تو تمہارے مرے ہوئے بیٹے کے خون کی پروا کرتا ہے، نہ اسے تم پر اتنا ترس آتا ہے کہ تمہارے بچوں کی قبروں کے نشان چھوڑ دیتا، باقی جگہ پر جو مرضی کرتا رہتا۔"

نور فاطمہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر زمین پر ہاتھ پھیرنے میں مگن تھی۔ فضا پر سکوت طاری تھا۔ دور کہیں جھاڑیوں میں جگنو چمکتے دکھائی دیتے تھے۔ جو ماحول کی تاریکی کو اپنی ننھی ننھی روشنیوں سے پل بھر کو توڑتے اور غائب ہو جاتے۔

"اٹھ جاؤ، وہاں سے نور فاطمہ! وہاں کیڑے مکوڑے ہوں گے۔ رات کے وقت سبزے کے قریب نہیں جاتے۔" سعد نے نور فاطمہ کو وہاں سے اٹھانے کی ایک اور کمزور سی سعی کی۔ نور فاطمہ زمین میں دفن اپنے خزانوں کے دھیان میں مگن تھی۔ دفعتاً" کہیں قریب سے کسی گیدڑ کے رونے کی آواز ابھری۔ فضا پر ایک عجیب سی الم ناک کیفیت طاری ہونے لگی۔

چاند اپنے سفر کی منزلیں طے کرتے کسی بدلی کے پیچھے جا چھپا تھا۔ آسمان پر ستارے معدوم ہو رہے تھے۔ تاریکی میں منظر کی جزئیات دیکھنے کی کوشش کرتی سعد کی آنکھیں تھکنے لگیں۔ اس نے اپنی بوجھل ہوتی آنکھوں کو سختی سے بند کر لیا۔

"کیا کبھی اس راز پر سے پردہ اٹھ سکتا ہے کہ غم کا پیمانہ کیا ہے۔ کیا انسان کبھی یہ ماننے کو تیار ہو گا کہ کسی دوسرے کا دکھ اس کے دکھ سے بڑا ہے؟ نہیں! ابھی بھی نہیں۔" اس نے خود کو بتایا۔ "غم میں گھرے انسان کو اپنا ہی دکھ سب سے بڑا نظر آ رہا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے اس سے زیادہ دکھی تو کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔"

اس کا والٹ اور فون گاڑی ہی میں کہیں رکھا تھا۔ فارم ہاؤس سے چلنے سے پہلے اس نے اپنا فون آف کر کے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پھینک دیا تھا۔ والٹ بھی یوں ہی کہیں باقی سامان کے ساتھ بے دھیانی میں پھینکا تھا۔

"شاید والٹ کہیں گر گیا ہو اور میں ساتھ لایا بھی نہ ہوں۔" اسے خیال آیا "اور فون!" اسے دوسرا خیال آیا "فون ہی

ہے جو کسی کے ساتھ میرے رابطے کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اس تاریکی میں میں اسے کہاں ڈھونڈوں۔"

اسے یاد آیا فون اس نے اس خیال سے بند کر کے پھینکا تھا کہ اسے معلوم تھا ماہ نور اور سردار انکل اسے فارم ہاؤس میں نہ پا کر اس سے رابطہ کرنے کی ضرور کوشش کریں گے اور وہ جس ذہنی انتشار بلکہ وحشت کا شکار ہو کر فارم ہاؤس سے نکلا تھا۔ اس میں وہ کسی بھی صورت ان دونوں کی کالز کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ اسے یاد آیا اسی ذہنی انتشار کا نتیجہ تھا کہ وہ شہر کو جانے والا سیدھا راستہ بھول کر ایک ذیلی سڑک پر چڑھ گیا اور پیچھے کا راستہ بھول گیا تھا۔ سیدھا راستہ ڈھونڈنے کی خاطر جن بھول بھلیوں جیسے راستوں پر چڑھتا، اترتا وہ اس غیر آباد راستے چڑھ آیا، اسی تک آتے آتے گاڑی کا فیول ختم ہو گیا تھا۔

"کیا یہ بے سروسامانی کی کیفیت ہے؟" اسے خیال آیا۔ "گاڑی میں فیول نہیں۔ والٹ کا پتا نہیں کہ ساتھ ہے بھی یا نہیں۔ سب کیش اور پلاسٹک منی اسی والٹ میں ہے۔ فون جس طرح پھینکا تھا، نہ جانے آن بھی ہوتا ہے دوبارہ کہ نہیں اور یہ ایک دم اجنبی علاقہ ہے۔"

اسے ان سب باتوں کا خیال اچانک آیا تھا اور اس وقت آیا تھا جب اس نے نور فاطمہ کو اپنے بچوں کی قبروں کی مٹی پر ہاتھ پھیرتے دیکھا اور گیدڑوں کو بلند آواز میں روتے سنا تھا۔

"میں اس جگہ پر کچھ نہیں ہوں۔ میں کون ہوں۔ میرا پس منظر کیا ہے۔ یہاں کوئی نہیں جانتا اور میرے پاس جو زادِ راہ ہے وہ شاید اس وقت میرے کسی کام نہیں آ سکتا۔ کیا یہ سونے کی اینٹوں کے ڈھیر پر بیٹھے بھوکے شخص والی صورت حال نہیں۔" اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے گہرا سانس لیا۔

"اور میں کیا ارادہ لے کر فارم ہاؤس سے نکلا تھا۔" آسمان پر چھائی تاریکی کو دیکھتے ہوئے اس نے یاد کیا۔ "اگر راہ سے بے راہ نہ ہوتا، فیول ختم ہو جانے کا شکار نہ ہوتا، سڑک پر درخت نہ گرا ہوتا اور گاڑی اس جگہ پر جہاں نور فاطمہ کی کوٹھری ہے، کہیں آگے ایسی جگہ پر جا کر رکتی، جہاں دور، دور تک کوئی بندہ بشر نظر نہ آتا تو میں کیا کرتا اور بالفرض فیول ختم نہ ہوتا اور میں اس منزل تک پہنچ چکا ہوتا، جہاں کا مقصد کر کے فارم ہاؤس سے نکلا تھا تو اب تک کیا کر چکا ہوتا۔" اس نے سوچا اور اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"اس نے کہا ہو گا کہ یہ میرا بندہ بگولے سے بھی تیز آندھی طوفان کی طرح گاڑی چلاتا جہاں جا رہا ہے، کہیں وہاں جا کر آندھی کی طرح ہی کوئی اندھا کام نہ کر بیٹھے۔ اسی لیے اس نے تمہاری گاڑی کا پیٹرول ختم کر دیا اور سڑک پر درخت گرا کر تمہیں روک لیا اور کہا چلو نوجوان! آج ذرا نور فاطمہ کے مہمان بن جاؤ اور ذرا رک کر سوچو کیا کرنے چلے ہو۔" دفعتاً" اسے نور فاطمہ کی کہی بات یاد آئی۔

"نور فاطمہ! وہاں سے اٹھ جاؤ پلیز۔" اس نے اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے نور فاطمہ کو ایک بار پھر آواز دی۔

"ہر کوئی مجھ سے یہی پوچھتا اے، نور فاطمہ! چوہدری انعام کی چاکری چھوڑ کیوں نہیں دیتی؟" جواب میں اسے نور فاطمہ کی بلند آواز سنائی دی۔ یقیناً" اس کا مخاطب سعد تھا۔ کیونکہ آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے چہرے کا رخ کس طرف تھا۔ "کوئی ان سے پوچھے 'اللہ کے بندو! جو قرضہ میں چوہدری انعام سے لے چکی ہوں۔ وہ کیا میرا باپ قبر سے اٹھ کر اتارے گا۔"

وہ گیلے سبزے پر دھیان سے قدم رکھتا نور فاطمہ تک پہنچا۔ اس کے قدموں کی دھمک سے چوکنا ہو کر پیپل کے درخت تلے جانور اپنی اپنی جگہوں پر لمحہ بھر کے لیے ہلے اور ان کے گلوں میں پڑی گھنٹیاں گونجیں۔ لمحہ بھر بعد پھر خاموشی چھا گئی۔

"اٹھو نور فاطمہ! باقی کا نوحہ ادھر بیٹھ کر ہم دونوں مل کر پڑھتے ہیں۔" اس نے احتیاط سے نور فاطمہ کے عقب میں کھڑے ہو کر کہا۔ اسے خوف تھا۔ غلطی سے اس کا قدم نور فاطمہ کے زمین تلے دبے کسی خزانے پر نہ آ جائے۔

"ایک خوشی محمد بچیا اے۔" نور فاطمہ نے کھڑے ہو کر اپنا رخ اس کی طرف پھیرتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز مضبوط تھی اور لہجہ انتہا سے زیادہ سنجیدہ۔ "اس کی ڈھیری یہاں مقدر نہیں۔" اس نے کہا۔ "اس کی عمر لمبی اے 'میری میت کو کندھا دینا اے اس نے۔ اس کی ڈھیری کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں بچی۔"

سعد نے تاریکی میں سر جھٹکا اور واپس اس چھوٹے سے احاطے کی طرف چل دیا۔ اسے نور فاطمہ کے قدموں کی چاپ اپنے پیچھے آتی سنائی دے رہی تھی۔

باقی کی رات اس چھوٹی کوٹھری کے فرش پر بچھی چٹائی پر لیٹ کر علت اور معلول کے فلسفے پر غور کرتے گزر گئی۔

☼ ☼ ☼

کچن میں کھانے کی ٹرے واپس رکھ کر کچن سے باہر نکلتے کھاری کی نظر ماہ نور پر پڑی 'جو اپنا سیل فون ہاتھ میں پکڑے اس پر کوئی نمبر ملاتے ہوئے کچن سے ذرا فاصلے پر اندر جاتے سفید سنگی برآمدے میں ادھر سے ادھر چکر لگا رہی تھی۔ کھاری کو ماہ نور کے انداز میں اضطراب اور بے قراری کا احساس ہوا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا ماہ نور کو اس کیفیت میں چکر لگاتے کتنی ہی دیر تک دیکھتا رہا۔

"کھاری!" پندرہ منٹ تک اسی طرح چکر لگاتے رہنے اور فون پر کوئی نمبر ملاتے رہنے کے بعد ماہ نور کی نظر اچانک کھاری پر پڑی اور وہ بلند آواز میں اس کا نام پکار کر اس کی طرف بڑھی۔

"تم کہاں غائب ہو اتنی دیر سے؟" اس نے تیزی سے کہا۔

"میں تے ادھر ہی تھا مہ نور باجی! میں کدھر جانا سی۔" کھاری نے شانے پر رکھے کپڑے سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"بی بی شادی کے دن سے اب تک تو تم نے شکل تک نہیں دکھائی اور کہہ رہے ہو کہ تم ادھر ہی تھے۔" اس نے یہ بات بھی تیزی سے کہی تھی۔

"اچھا... اس کو چھوڑو۔ مہ نور باجی! یہ بتاؤ کہ باؤ سعد صاحب کہاں ہیں؟" کھاری نے ماہ نور کے شکوے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"سعد؟" ماہ نور کو لگا جیسے صرف اسے ہی نہیں 'ہر کسی کو صرف ایک ہی شخص کی لگن تھی۔

"وہ تو چلا گیا کھاری!" اسے محسوس ہوا جیسے وہ کھاری کو کسی انتہائی الم ناک صورت حال کی خبر دے رہی تھی۔

"ہیں جی!" کھاری نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "کجی دسو۔"

"ہاں کھاری! سعد تو یہاں سے چلا گیا ہے۔" ماہ نور کو اپنی آواز کسی پاتال سے نکلتی محسوس ہوئی۔

"وہ کدھر چلے گئے مہ نور باجی! میں تو بھین جی کو قول دے کر آیا تھا۔" کھاری کے چہرے پر پریشانی کے آثار ابھرے۔

"بھین جی کو کیا دے کر آئے تھے؟" ماہ نور نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

"قول دے کر آیا تھا۔ میں سعد کو بھین جی کے گھر لے کر جاؤں گا؟" کھاری نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"وہ کیوں؟" ماہ نور کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑیں۔

"وہ!" کھاری کو اچانک احساس ہوا کہ وہ ایک ایسی بات کہہ چکا ہے 'جو اسے نہیں کہنی تھی۔

"وہ!" اس نے کوئی بات بنانے کے لیے ادھر ادھر دیکھا۔ "ہاں او! میں بھین جی سے بوت تعریفاں کی تھیں باؤ سعد کی۔"

"اچھا!" ماہ نور کو ایسا لگا جیسے کھاری نے اپنی بھین جی سے سعد کی نہیں اس کی تعریف کی ہو۔

"لیکن وہ گئے کہاں؟" ماہ نور کو مطمئن کرنے کے بعد کھاری نے پوچھا۔

"پتا نہیں 'وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر یہاں سے چلا گیا ہے۔"

"فون کر کے پوچھیں تو سہی..." کھاری نے ماہ نور کے ہاتھ میں پکڑے سیل فون کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کا فون بند ہے کھاری!" ماہ نور کے لہجے میں بے چارگی اور بے بسی اتر آئی۔

"اوئے ہوئے۔ اے کی ہو گیا۔" کھاری پوری صورت حال جان کر ایک بار پھر پریشان ہوا۔

"مہ نور باجی! میرا باؤ سعد صاحب سے ملنا بوت ضروری ہے۔" الفاظ ایک دم اس کے منہ سے پھسلے۔

"اچھا... وہ کیوں۔" ماہ نور نے ایک بار پھر تعجب کا اظہار کیا۔

"بس جی یہ میں صرف ان ہی کو بتا سکتا ہوں۔"

"نہیں میں ایسے تمہیں اس کا نمبر نہیں دوں گی۔" ماہ نور نے سر ہلاتے ہوئے کہا "پہلے تم مجھے بتاؤ تم کو سعد سے کیا بات کرنی ہے۔"

کھاری نے ذرا کی ذرا ماہ نور کی طرف دیکھا اور۔ ایک دفعہ پھر اس سے نظریں چرالیں۔

"میں اب چلتا ہوں مہ نور باجی!" اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا "آپ باؤ سعد کا نمبر دے دیتے تو اچھا تھا۔" اس نے کہا اور بائیں جانب مڑ کر آگے چلا گیا۔

"یہ ہو کیا رہا ہے؟" ماہ نور نے اپنے چکر کھاتے ذہن کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا "تم کیوں ایک ایسا نیوکلیس بن گئے ہو سعد! جس کے گرد سب گھوم رہے ہیں۔"

اس نے تصور میں سعد کو مخاطب کیا اور تھکے ہوئے ذہن کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ اسے اپنا سامان پیک کرنا تھا اور اگلی صبح گھر واپس جانا تھا۔ چچا سردار کا فارم ہاؤس اچانک خالی اور ویران ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ایک نور کی لکیر نمودار ہونے کی دیر ہوتی ہے اور سارے مسئلے نبڑ جاتے ہیں۔"

اس کی گاڑی کے قریب کھڑی نور فاطمہ نے الوداعی جملے کہے تھے۔

"میں نے کہا تھا نا 'خوشی محمد آجاوے گا تو تیل وی آجاوے گا' درخت بھی ہٹ جائے گا 'خوشی محمد تینوں سیدھے راستے پر ڈال دے گا۔" وہ اونچے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولی۔

"اب راضی ہیں کہ ہن بھی تاپ چڑھا اے۔" اس نے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ سعد گاڑی کی سیٹوں اور سامان کے درمیان اپنا والٹ اور فون ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے والٹ ٹریول بیگ کی ایک چھوٹی جیب میں اٹکا ہوا مل گیا تھا مگر فون کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے تیزی سے بیگ کھنگالے 'ڈیش بورڈ 'سیٹیں سب چیک کرلیں۔

"کہاں گیا؟" وہ پیشانی کو ہاتھ سے مسلتے ہوئے بڑبڑایا۔

"کیا ڈھونڈ رہا ہے؟" نور فاطمہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"اس سے پوچھ رہا ہوں 'میرا فون کہاں گیا۔" اس نے نور فاطمہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اچھا!" وہ ہنسی اور اس کے دانت اور بھی زیادہ نمایاں ہوئے "پھر تو مل ہی جائے گا تھوڑا ساہ (دم) لے۔" وہ تیزی سے بولی۔

"واہ بھئی نور فاطمہ! تم اور تمہارے فلسفے 'یہاں دن چڑھتے ہی دل و دماغ میں پھر سے اگ تازہ ہو گئی اور تم ساہ

لینے کی باتیں کرتی ہو۔" اس نے بھنا کر سیٹوں کے نیچے ہاتھ مارا' ایک فٹ میٹ پر اس کا ہاتھ پڑا اور وہاں نیچے اسے کسی چیز کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے فٹ میٹ الٹا' نیچے خاموش فون پڑا تھا۔

"او تھینک گاڈ!" وہ بڑبڑایا۔

"مل گیا اے کہ نہیں۔" نور فاطمہ نے اس کے چہرے پر ظاہر ہوتے اطمینان کو محسوس کر کے سر آگے کر کے گاڑی میں جھانکا۔

"میں نہیں جانتا نور فاطمہ! کہ تمہاری تھیوری کتنے فی صد درست ہے' مگر میں تم سے اس حد تک ضرور متفق ہوں کہ کل میں رکا نہیں تھا' روکا گیا تھا۔ مجھے دم لے کر سوچنے کی مہلت دی گئی کہ میں سوچ لوں' میرے اندر جو جنگ چھڑ چکی ہے۔ اس کے اگلے محاذ تک جانے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ اس جنگ کو چھیڑنے والی فوج کے سپہ سالار نے چہرے پر جو شیلڈ چڑھا رکھی ہے اس کے کتنے پرت ہیں' میں جتنا بے چین ہوں' کیا یہ بے چینی میرا کام آسان کر دے گی کیا میں' جس حقیقت کو جان لینے کے لیے جگہ بے جگہ بے قرار پھرتا ہوں' اس سپہ سالار کے زرہ بکتر کو نوچ اتارنے سے میری بے قراری دور ہو جائے گی' میری بصارت تیز ہو جائے گی اور میں وہ سب کچھ جان جاؤں گا جو جاننا چاہتا ہوں۔" اس نے گاڑی کے ساتھ پشت ٹکا کر نور فاطمہ کو مخاطب کیا۔

"پتا نہیں کیا بول رہا ہے۔ مجھے تیری بولی سمجھ نہیں آرہی۔" نور فاطمہ ایک مرتبہ پھر دانت نکال کر بولی۔

"یوں سمجھو' اسی لیے اس زبان میں بول رہا ہوں کہ تمہاری سمجھ میں نہ آئے' ورنہ میں تمہاری بولی جانتا بھی ہوں' سمجھتا بھی ہوں اور بول بھی لیتا ہوں۔" اس نے سر ہلایا اور ہونٹ سکیڑ کر آواز نکالی "مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا' اس طرح روکے جانے کا' رات تک جس آگ کی تپش مدھم پڑ گئی تھی دن نکلتے ہی اس کا الاؤ پھر سے تیز ہو گیا۔ میرا دل' میرا دماغ' میری روح اور میرا جسم بھڑ بھڑ جل رہے ہیں' جل کر سوختہ ہوئے جا رہے ہیں تو نور فاطمہ! تم صابر عورت ہو' بہت صابر عورت۔ میرے لیے دعا کرنا' مجھے بھی صبر کی دولت عطا ہو جائے۔"

اس نے نور فاطمہ کی طرف دیکھا جو کچھ نہ سمجھتے ہوئے منہ کھولے اسے دیکھے چلے جا رہی تھی۔

"لے خوشی محمد آگیا!" قریب سے ٹریکٹر کے انجن کی آواز آنے پر اس نے پیچھے دیکھا "اب دونوں بھائی تیل بھر لو گاڑی میں اور پھر تو اللہ بیلی ہو جا تیرا راستہ لمبا ہے اور تجھے منزل تک پہنچتے پہنچتے رات آجائے گی۔"

خوشی محمد ٹریکٹر سے چھلانگ لگا کر اترا اور ہاتھ میں پکڑے جیری کین میں ربڑ کا باریک پائپ ٹکا کر گاڑی کے فیول ٹینک میں کین جوڑنے میں مصروف ہوا۔ نور فاطمہ تیز قدموں سے چلتی اپنی کوٹھڑی کی طرف جا رہی تھی۔ سعد نے خوشی محمد کی مدد کرنا چاہی مگر اس نے منع کر دیا۔ اس نے ایک طرف ہٹ کر اپنا فون آن کیا۔ اضطراب' بے قراری اور بے چینی سے بھرپور بے شمار ٹیکسٹ میسجز اس کے سامنے تھے۔

"ہیلو تم کہاں گئے ہو؟"

"سعد! تم ایک دم کہاں چلے گئے ہو؟"

"تمہارا فون کیوں بند ہے؟"

"تم بغیر بتائے کہاں چلے گئے ہو؟"

"جواب کیوں نہیں دے رہے؟"

"سعد! میں اور سردار چچا سخت پریشان ہیں۔"

"پلیز جواب دو۔"

پیغامات کی ایک قطار تھی جو ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ اس نے فون ایک مرتبہ پھر بند کر دیا۔

"آئی ایم سوری ماہ نور! میں تمام تر دعووں کے باوجود کسی کی توقع پر پورا نہ اترنے کا اپنا ہی قائم کیا ہوا ریکارڈ نہیں

توڑ سکا۔" اس نے سوچا اور خوشی محمد کی طرف دیکھا۔

"لو بھائی جی۔ اتنا تیل پڑ گیا ہے کہ آپ پٹرول پمپ تک آسانی سے پہنچ جاؤ گے۔" خوشی محمد نے پائپ فیول ٹینک سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"بہت شکریہ خوشی محمد!" وہ آہستہ قدموں سے چلتا خوشی محمد کے قریب آیا۔ "تم لوگوں نے میری بڑی مدد کی۔"

"شرمندہ نہ کرو صاحب جی!" خوشی محمد مسکرایا "بے بے میری جھلی ہے بالکل میں تو سوچ رہا ہوں پتا نہیں اس نے آپ کی سوا دکی سیوا بھی کی کہ نہیں' بولتی بھی بہت ہے' اس کا نا!" اس نے کنپٹی پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا "میٹر گھوما ہوا ہے' جو جی میں آئے' بس بولتی ہی جاتی ہے۔"

"نہیں خوشی محمد!" سعد نے اس کا شانہ تھپتھپایا "قدر کیا کرو یار تمہاری بے بے علم کا دریا ہے' اس نے معرفت کی باتیں سیکھی نہیں ہیں' اسے سکھائی گئی ہیں۔ جو لوگ صابر ہوتے ہیں' اللہ ان پر اپنی کچھ نعمتیں یوں ہی انعام کیا کرتا ہے۔" وہ بولتے بولتے ہنس دیا' اس کی ہنسی میں طنز تھا اور چبھن بھی۔

"وہ تو میرے جیسے بدقسمت ہوتے ہیں جن کو اللہ راستہ روک کر ایسے دریاؤں سے سیراب ہونے کا موقع دیتا ہے' پر وہ اپنے بھانبڑ اونچے رکھتے ہیں۔ خود کو ان دریاؤں سے بچا کر بھسم ہو جانے کی راہ پر چل دیتے ہیں۔"

"میں پڑھا لکھا نہیں ہوں باؤ صاحب! میری سمجھ میں آپ کی بات نہیں آئی۔" خوشی محمد نے جھینپتے ہوئے کہا۔

"تمہارے سمجھنے کی ہے بھی نہیں یہ بات۔" سعد نے ایک مرتبہ پھر اس کا شانہ تھپتھپایا۔

"بس بے بے کی قدر کرنا سیکھو۔" اس نے کہا۔ "یہ کچھ رقم ہے۔" اس نے والٹ سے نوٹ نکالتے ہوئے کہا "بدقسمتی سے اس وقت میرے پاس اتنا ہی کیش ہے' یہ رکھ لو بے بے کے لیے اس کی پسند کی چیزیں خرید لینا۔"

"او نا باؤ صاحب!" خوشی محمد بوکھلا کر بولا "ہمیں رقمیں نہیں چاہئیں۔"

"یہ رقمیں نہیں ہیں خوشی محمد؟" سعد نے اس کا ہاتھ بند کرتے ہوئے کہا "یہ محبت ہے' تشکر ہے اور خلوص ہے۔" خوشی محمد نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

سعد نے اثبات میں سر ہلا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور گاڑی کے دروازے کی کھلی کھڑکی سے ہاتھ اندر ڈال کر ہارن بجانے لگا۔ ہارن کی آواز سن کر نور فاطمہ کوٹھری سے باہر نکلی اور ہاتھ سے رک جانے کا اشارہ کرتی ادھر کو چلی۔

"میں تیرے واسطے کوئی سوغات لینے گئی تھی۔" اس نے سعد کے قریب پہنچ کر ہانپتے ہوئے کہا۔ اس نے ہاتھ کا پنکھا اس کی طرف بڑھایا' جس کے کناروں پر خوش رنگ کپڑا چڑھا کر اس پر کانچ کے موتی لگائے گئے تھے "یہ میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔" اس نے سعد کی طرف فخر سے دیکھا "اور یہ" اس نے کپڑے کی ایک چھوٹی سی پوٹلی کھول کر اس کے سامنے کی' اس پوٹلی میں دیسی گڑ کی تین بھیلیاں رکھی تھیں پھر اس نے دوپٹے کی تہہ کھول کر کچھ بھٹے نکالے اور ایک چنری نکال کر اس کے سامنے کی۔

"یہ سب ماڑیاں (غریبانہ) سوغاتیں ہیں لیکن تو ان کو جب بھی دیکھے گا' تجھے یاد آئے گا کہ تو نور فاطمہ کی کوٹھری کا پروہنا بنا تھا اور یہ چنری اپنی بیوی کو دینا جا کے۔"

سعد کو محسوس ہوا' اس کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی تھی "کیا اس خلوص کا بدلہ قیمتی سے قیمتی چیز کے ذریعے بھی اتارا جا سکتا تھا۔" اس نے وہ تینوں چیزیں پورے احترام کے ساتھ نور فاطمہ کے ہاتھ سے لے لیں۔

"میرے لیے ایک دعا ضرور کرنا نور فاطمہ! اللہ مجھے تمہاری طرح صبر عطا کر دے۔" اس نے کہا۔

"کج گنوائے گا اے۔ (جب ہاتھ سے کچھ گنواؤ گے) اس وقت پتا لگ جائے گا صبر کی شے ہوتی ہے۔" نور فاطمہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا یہ بات کہتے ہوئے اس کے اونچے دانت ایک بار پھر نظر آئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"یہ جو اپنے گلے میں طوق تم نے اپنے ہاتھوں ڈال لیا ہے نا اس کا بوجھ اٹھاتے کہیں ہلکان نہ ہونے لگو، مجھے اس بات کا ڈر ہے۔"

"عشق اور جنگ میں سب سہنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

"بڑے دانت نکل رہے ہیں ابھی تو بی بی! آگے دیکھیے ہوتا کیا ہے۔"

"یہ دانت بھی ہاتھی کے دانتوں کی طرح نمائشی ہیں 'دکھانے کے ہیں صرف' اصل تو وہ چیز ہے' جو دل میں ہے اور پھوٹی پڑتی ہے۔"

"میری دعا ہے کہ وہ جو پھوٹے پڑ رہے ہیں' بور کے ثابت نہ ہوں آگے چل کے۔"

"چلو ہٹو' منحوس ماری' ناس پیٹی' جب سے یہ کام سرانجام پایا ہے' ایک بھی مبارک بات تمہارے منہ سے نہیں نکلی۔"

"کیا کروں' خدا لگتی کہنے کی عادت ہے' لگی لپٹی نہیں آتی مجھے۔"

"خوب جانتی ہوں۔ تمہیں لگی لپٹی آتی ہے یا نہیں' لوگوں کو جھولیاں اٹھا اٹھا کر آشیر بادیاں اور مبارکبادیاں دینے والی کو آج لگی لپٹی کہنا بھی بھول گئی' قربان جاؤں میں تمہارے رنگ بدلنے کے۔"

"لوگ لوگ ہیں اور تم تم ہو۔ میں کیا کروں' مجھے اس بات کو سوچ کر ہول اٹھتے ہیں کہ یہاں کسی کو علم ہو گیا کہ اسلام آباد والے نے ڈولی اٹھالی ہے تو کیا ہو گا۔"

"ڈولی اٹھالی ہے' ارے کم بخت تم تو ایسے بولیں جیسے کسی نے جنازہ اٹھالیا ہو کسی کا اور تمہاری زبان کے آگے تو خندق ہے اللہ کی بندی جو بات منہ سے نکالنے کی نہیں ہوتی وہ تمہارے گلے سے پھٹے ڈھول کی طرح بجتی نکلتی ہے۔"

"تو میں کیا کروں' وہم ہیں نا' کسی بھی رنگ میں کسی زبان سے نکل ہی آتے ہیں۔ تمہیں کس نے کہا تھا اپنے عاشقوں کی فہرست اتنی بڑھالو کہ قدم قدم پر بارود بھری سرنگیں بچھ جائیں۔"

"چلو ہم تو سوائے ڈرانے کے کوئی کام نہیں کر سکتیں' جبکہ میرا تو دل چاہتا ہے چھت پر چڑھ کر بلند آواز میں گاؤں "جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔"

"اف میری مدھوبالا۔ کہیں ترنگ میں آکر ایسا کر نہ دینا' جانتی ہو نا طیفے لاڑکی چھت تو اس چھت کے ساتھ ہی ملی ہوتی ہے اور کیا ہے کہ اس کے کانوں کے پرت بڑے ہی پتلے ہیں۔"

"چلو بھاگو یہاں سے' باہر دروازے پر مولوانوں کا شاگرد دستک دے رہا ہے۔ اسے کھانا باندھ دو۔ یہاں کھڑی تو محض دل ہی دہلائے چلی جارہی ہو۔"

"جارہی ہوں' جارہی ہوں۔ تم خود کو سچ سننے کے لیے تیار رکھا کرو میری لاڈو! اسلام آباد والے کے چکر میں کافرستان میں آگ لگ گئی تو کیا ہو گا۔ یہ بھی سوچ کر رکھو۔"

☼ ☼ ☼

اس نے اس چھوٹے سے گھر کے گیٹ پر نصب کال بیل کو تیسری مرتبہ دبایا اور جواب کا منتظر ہوا۔ چوتھی بار بیل کرنے سے پہلے وہ سوچ رہا تھا کہ شاید گھر پر کوئی نہیں تھا۔ لیکن چوتھی بار بیل کے جواب میں بیل کے ساتھ نصب انٹرکام پر آواز ابھری۔

"کون؟" اس نے جواب میں آہستہ آواز میں اپنا نام بتایا۔ دس سیکنڈز کے بعد گیٹ کھل گیا۔

"میں معذرت خواہ ہوں' مجھے معلوم ہے کہ یہ وقت کسی کے گھر جانے کے لیے بالکل بھی موزوں نہیں۔" اس نے بغیر تمہید باندھے کہا۔

"کسی کے گھر جانے کے لیے یقیناً" موزوں نہیں' مگر اپنے گھر آنے کا کوئی مخصوص وقت نہیں ہوتا۔" جواب میں اس نے اس چھوٹے سے گھر کی مالکن کو کہتے سنا تھا۔

"اندر آجاؤ بلا جھجک۔" وہ ایک طرف ہوتے ہوئے بولی۔

"بہت شکریہ۔" وہ گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

"کیا سوتے سے اٹھ کر سیدھے چلے آئے ہو' اور تمہارے چہرے پر اتنی وحشت کیوں طاری ہے' ایک عجیب سی خواری ٹپک رہی ہے تمہارے حلیے سے۔" وہ اس سے دو قدم آگے چلتے ہوئے بولی۔

"یوں ہی سمجھ لیں' طویل نیند سے جاگا ہوں اور سیدھا آپ کے پاس آگیا ہوں۔"

"ہوں۔" وہ گھر کے داخلی دروازے میں رکی اور اس کی طرف مڑ کر دیکھنے لگی۔ "لگتا ہے بری طرح ہڑبڑا کر جاگے ہو۔"

"شاید!" وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولا۔

"آرام سے بیٹھو' بے تکلفی سے بغیر جھجکے۔" لاؤنج میں آکر اس نے صوفوں پر رکھے کشن ترتیب سے رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس کی ہدایت کے مطابق ایک لانگ چیئر پر نیم دراز ہو گیا۔

"میں غالباً" بہت تھک گیا ہوں۔" اس نے آنکھیں موندتے ہوئے کہا۔

"ہوں!" اس نے اس کی بڑھی ہوئی شیو' الجھے بالوں اور شکنوں سے بھرپور ٹراؤزر اور شرٹ کو دیکھا' اس نے پیروں میں فلپ فلاپس پہن رکھے تھے' اتنے عوامی حلیے میں وہ کہاں کا سفر کر کے یہاں پہنچا تھا۔ اس کے دل میں یہ سوال کرنے کی خواہش ابھری لیکن اس نے اس سوال کو زبان پر نہ آنے دیا۔

"بھوک بھی لگ رہی ہو گی' کھانا لاؤں۔"

"جی ضرور۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھا "آپ کو زحمت تو نہیں ہو گی؟"

"نہیں ہو گی۔ بے فکر رہو۔" وہ لاؤنج سے منسلک اوپن کچن میں چلی گئی۔

"منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤ تم' یہ ساتھ ہی بیڈ روم ہے اور اس سے اٹیچڈ واش روم۔" سٹوو پر فرائنگ پین رکھتے کھانے کے لیے کچھ بناتے ہوئے وہ بولی۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" وہ اٹھ کر میزبان کے بتائے بیڈ روم میں چلا گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا گیسٹ بیڈ روم تھا غالباً" کیونکہ اس میں موجود فرنیچر کو سفید چادروں سے ڈھکا گیا ہوا تھا۔ وہ واش روم میں گیا۔

"صرف دو راتوں کے اندر اندر کیا سے کیا اور کہاں سے کہاں تک دیکھ آیا میں۔"

منہ پر پانی کے چھپاکے مارتے ہوئے اس نے واش بیسن کے اوپر لگے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ اسے اپنے چہرے پر تھکاوٹ کے ساتھ ساتھ اضمحلال بھی نظر آیا۔ اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور پھر گیلے ہاتھ منتشر بالوں میں پھیر کر انہیں سیدھا کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ اپنی میزبان کے سامنے موجود تھا۔

"آج میں نے اپنے لیے چکن ود چیز بال بنایا تھا' تمہارے لیے جلدی میں یہ سینڈوچ بنائی ہے' تھوڑے مشروم پڑے تھے اور چکن پیسز بھی' میری اپنی ریسپی ہے۔ ٹرائی کرو بہت بری نہیں ہو گی' یہ تھوڑے فرائیڈ رائس بھی ہیں۔ چکھو میں بہت بری کک نہیں ہوں۔"

وہ منہ ہاتھ دھونے اور بالوں کو گیلا کر کے سیدھا کرنے کے بعد اوپن کچن میں رکھی چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل کی

طرف آیا تو وہ اس کے سامنے پھرتی سے پلیٹیں اور کانٹے چمچ رکھتی ہوئی بولی۔

"ہاں ایک پیالہ سویٹ اینڈ سار سوپ کا البتہ میں نے انسٹنٹ سوپ کے پیکٹ سے بنایا ہے' پہلے اسے پیو۔ تمہاری تھکن کم کرنے میں مدد دے گا۔"

چوہدری سردار کے پُر تکلف ڈنر اور نور فاطمہ کی روٹی پر رکھے پیاز کیری اور ہری مرچوں کی چٹنی سے لے کر اس انسٹنٹ سوپ اور سپیگٹھی تک کا سفر کتنا طویل ہے' کیسے کیسے تجربوں سے بھرپور اور کتنی تلخیوں کو ساتھ لیے ہوئے۔ اس نے خاموشی اور دلچسپی کے ساتھ کھانا کھایا۔ اسے شدید بھوک لگ رہی تھی اور کھانا واقعی اچھا بنا تھا' اس نے کھانا بنانے والی کے ہاتھ کے ذائقے کا دل ہی دل میں اعتراف کیا۔ وہ بھی اسے خاموشی اور تفصیل سے کھانا کھاتے ہوئے اتنی ہی خاموشی سے دیکھتی رہی تھی۔

"مجھے لگتا ہے میں نے سب ختم کردیا۔ آپ کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دینا بھی بھول گیا۔ مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی۔" پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے بعد اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں لنچ نہیں لیتی' اس لیے رات کا کھانا جلد کھالیتی ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا اور اٹھ کر برتن سمیٹنے لگی۔

"تم لاؤنج میں بیٹھو' میں تمہارے لیے کافی بناتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"آپ کے پاس کوئی سوفٹ ڈرنک رکھا ہے تو بتائیں' میں نے زیادہ کھالیا ہے۔" وہ بے تکلفی سے بولا۔

"فریج میں دیکھو' کچھ ٹن رکھے ہیں شاید۔" اس نے اتنی ہی بے تکلفی سے جواب دیا۔ اس نے اٹھ کر فریج کھول کر ایک سوفٹ ڈرنک کا کین نکالا اور لاؤنج میں آکر بیٹھ گیا۔

ڈرنک کا کین کھولتے ہوئے اس کی نظروں کے سامنے ایک منظر گھوم گیا۔

"آپ کا سیل فون یہیں کہیں رکھا ہے یا اندر ہے کہیں' اس میں کریڈٹ تو ہوگا۔" اس نے سر اٹھا کر سامنے کچن میں مصروف میزبان کو دیکھا۔

"کیا بات ہے؟" وہ اس کی طرف گھومی "مجھے یقین ہے' کسی رہزن کے ہاتھ نہیں لگے تم؟"

"رہزن؟" اس نے سوفٹ ڈرنک کا کین صوفے کے بازو سے ہولے ہولے ٹکراتے ہوئے دہرایا "رہزنوں کی بھی تو کئی قسمیں ہوتی ہیں نا۔" اس نے ایک نظر اس کے سیل فون پر ڈالی اور پھر سر ہلایا "چلیں رہنے دیں' آپ کا نمبر دیکھ کر کسی کے ٹھٹک جانے کا اندیشہ ہے۔"

"ہوں" وہ اپنا بڑھا ہوا ہاتھ پیچھے کھینچتے ہوئے بولی۔ "رہزنوں کی کون سی قسم سے جا ٹکرائے تم؟"

"رہزن سے واسطہ تو شاید کسی اور کا پڑا میں نے تو صرف اس سے تعارف حاصل کیا ہے ابھی۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"کس کا واسطہ پڑا رہزن سے؟" وہ چھوٹی سی طشتری میں کافی کے کپ رکھے ادھر آئی اور اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"شاید بہت سوں کا' شاید ہر کسی کا' شاید آپ کا بھی۔" اس نے اپنی میزبان کی طرف غور سے دیکھا۔

☼ ☼ ☼

"باس کی اوپر والی منزل ٹیڑھی ہو رہی ہے لیننگ ٹاور کی طرح۔" رازی نے اس رات ضوفی کو بتایا۔

"وہ تو ظاہر ہی ہے۔" ضوفی نے اطمینان سے جواب دیا۔

"باس کی شخصیت کی فاؤنڈیشن میں گڑبڑ ہے اور تم جانتے ہو' فاؤنڈیشن کمزور ہو تو عمارت اتنی ہی کمزور ہوتی ہے جیسا لیننگ ٹاور۔"

"لیننگ ٹاور کے ٹیڑھا ہونے میں بہت سے فیکٹرز انوالوڈ ہیں' باس کے پاس بظاہر ایسا کوئی فیکٹر نہیں ہے۔"

"وہ کائیاں آدمی ہے' اسے پتا ہے کہ کیسے کیا چھپایا جاسکتا ہے فیکٹرز بھی اور ان کے آفٹر میتھس بھی۔ اس جیسوں کے لیے ڈمپ کرنا کوئی مشکل نہیں۔"

"اچھا اب یہ بولو کہ آج ایسا کیا ہوا جو تمہیں یہ خیال آیا۔" ضوفی نے پوچھا۔

"آج اس نے ہر طرف ایک قیامت سی مچائی ہوئی تھی' سعد سلطان کے دیراباؤٹس نہیں مل رہے تھے کہیں' ان کا فون بند تھا اور وہ کہاں تھا۔ کسی کو کچھ خبر نہیں تھی۔"

"وہ کہاں تھا۔۔۔ یہ تو کئی دن سے کسی کو معلوم نہیں تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ دونوں باپ بیٹے نے کوئی ایسا معاہدہ کر رکھا ہے' جس کے تحت سعد سلطان ایک مخصوص وقت کے لیے اپنے دیراباؤٹس بتائے بغیر غائب رہ سکتا ہے۔"

"تو آج قیامت کا صور کیوں بجایا گیا اگر ایگری منٹ ہے تو۔"

"آج اس معاہدے کے تحت سعد سلطان کو آفس میں موجود ہونا چاہیے تھا مگر وہ نہیں آیا۔"

"اوہ!" ضوفی نے ہونٹ سکوڑے "پھر۔۔۔؟"

"پھر بس آخری خبریں آنے تک تلاش جاری تھی' میں تو پینٹری اسٹاک چیک کرنے کے بہانے کھسک آیا' ورنہ ابھی تک اسی سرگرمی میں مبتلا ہوتا۔" ضوفی بے اختیار ہنس دی۔

"لیکن ایک بات ہے' باس واقعی پریشان تھا۔ یوں جیسے اس کا ذہن ماؤف ہوگیا ہو' وہ بہکی بہکی حرکتیں کر رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کرے اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا جو سامنے آرہا تھا اس کے ساتھ کیا کر ڈالے۔"

"ہوں انٹرسٹنگ۔" ضوفی نے شانے اچکائے۔ "سعد سلطان بچہ تو نہیں ہے۔"

"باس کے لیے تو ہے۔" رازی نے سر ہلایا۔

"دیکھتے ہیں' صبح تک کیا ہوتا ہے' اگر وہ واپس نہ آیا تو تم نئی پریڈ کے لیے تیار رہنا۔" ضوفی نے جمائی لیتے ہوئے کہا اور کمفرٹ اپنے اوپر کھینچ لیا۔

"اللہ کرے وہ صبح تک آجائے' ورنہ باس نے تو ملک کے کونے کونے میں موجود کنوؤں میں بانس ڈلوا دینے ہیں۔" رازی کا لہجہ پریشانی لیے ہوئے تھا۔

"پھر تم کوشش کرنا کہ باس سے ڈھونڈ کر لے آنے والے کے لیے بڑا سا انعام اعلان کروادو' کسی کو بانس ڈالنے کا فائدہ بھی ہو۔" ضوفی نے اگلی جمائی روکتے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا اور کروٹ بدل کر آنکھیں موند لیں۔ رازی چت لیٹا نائٹ بلب کی روشنی میں چھت کو گھور رہا تھا۔ اسے آنے والے کل سے خوف آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں میرا پتا کس نے بتایا؟" نادیہ نے اپنے سامنے بیٹھے شخص کے سوال پر اسے مسکرا کر دیکھا۔

"ایک ایسی چیز جس کی موجودگی ماحول کو معطر کر رہی ہو' اس کی سمت کا اس کے پتے کا پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

"یہ ایک ایسا اندازہ ہے جو میرے قد سے بہت بڑا ہے' میں واقعی سنجیدگی سے پوچھ رہا ہوں۔"

"چلیں ہم الفاظ بدل لیتے ہیں۔" نادیہ نے اپنے قریب رکھے کشن کو جو وہ کمر کے پیچھے سے نکال کر سائیڈ پر رکھ چکی تھی گود میں رکھتے ہوئے کہا "ایک ایسی جگہ جہاں ہر طرف تاریکی کا راج ہو' وہاں آنے والی مدھم سی روشنی کی

سمت بھی کسی سے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں رہتی' نہ ہی اس کے لیے کوئی قطب نما درکار ہے۔"

"مجھے کہنا پڑے گا کہ تمہیں الفاظ کا استعمال اچھا کرنا آتا ہے۔" وہ مسکرائے۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے' میں نے تو بہت محدود سی زندگی گزاری ہے اس لیے میرے پاس الفاظ بھی بہت کم ہیں' مگر مجھے بھی کہنا پڑے گا کہ آپ کے سامنے بیٹھ کر نجانے کیوں میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں اچھی اچھی باتیں ہی کرتی چلی جاؤں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا اور کہتے کہتے تھوڑا توقف کیا۔

"اور میں اس چیز کو اس بات کی علامت کے طور پر لے رہی ہوں کہ میں ٹھیک جگہ پہنچی ہوں۔"

"بات دراصل یہ ہے کہ تمہاری عمر میں جذباتی پن اپنے عروج پر ہوتا ہے' اس عمر میں چیزیں عین ویسی ہی دکھائی دیتی ہیں جیسی انسان دیکھنا چاہ رہا ہوتا ہے۔ تم نے بھی ایک بات فرض کرلی ہے کہ آج کل جذبات کی جس یلغار نے تمہارے اندر اودھم مچایا ہوا ہے' اس کی تسکین' اس کی گتھیوں کا سرا' اس کے متعلق راہنمائی تمہیں مجھ سے مل سکتی ہے' اسی وجہ سے بغیر جانچے اور پرکھے میں تمہیں مینارۂ نور یا چاہ عطر نظر آرہا ہوں' ایک مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ اپنے اندر اودھم مچانے والے انقلاب کو پرکھو' سمجھو' اس کا تفصیلی جائزہ لو اور فیصلہ کرو کہ یہ کہیں کوئی وقتی ابال تو نہیں اور اگر جان جاؤ کہ ایسا ہی ہے تو اس پر شرمندہ مت ہونا کیونکہ زندگی کے مختلف ادوار میں وقتی انقلاب' جن کی نوعیت مختلف ہوتی ہے' آتے ہی رہتے ہیں۔"

"میرے اندر کوئی انقلاب نہیں آیا۔" نادیہ نے غیر جذباتی انداز میں کہا۔ "میری زندگی اب تک کچھ زیادہ آسان نہیں گزری' جس جذباتی اودھم کی بات آپ کررہے ہیں ان کا داخلہ اکثر آسودہ زندگیوں میں اور شخصیتوں پر ہوتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی اپنی بقا کی جدوجہد کرتے گزاری ہے' میرے جیسی زندگیوں میں جذباتی ابال کا گزر بہت ہی کم ہوتا ہوگا۔ میں واقعی کسی راستے کی تلاش میں ہوں' میں واقعی کسی منزل کے حصول کو اپنی زندگی کا مقصد بنانا چاہتی ہوں' میں واقعی کسی الوہی ہستی سے ہمیشہ کے لیے منسلک ہوجانا چاہتی ہوں اور اسی لیے آپ کے پاس حاضر ہوئی ہوں لیکن۔" وہ ایک بار پھر رکی اور اپنے مخاطب کی طرف دیکھنے لگی۔

"مجھے لگتا ہے۔" لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے پھر سے کہنا شروع کیا "مجھے لگتا ہے کہ عمر بھر اگرچہ میں نے لاشعوری طور پر "گناہ" سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ کچھ گناہ انسان لاشعوری طور پر کرجاتا ہے' جو شاید اس کی نظر میں غیر اہم' معمولی اور نظر انداز کردیے جانے والے ہوتے ہیں مگر پکڑ ان کی بھی ہوتی ہے' شاید ایسے ہی کسی گناہ کی پاداش کے طور پر آپ مجھے اور میری درخواست کو سنجیدگی سے سننے سے انکار کررہے ہیں۔" اس کی آواز اس کے لہجے کی غیر معمولی سنجیدگی کے باوجود لرز گئی اور شاید بھرا بھی گئی تھی۔

"تمہارا اصل کہاں سے متعلق ہے؟" وہ جیسے ٹھٹک کر بولے تھے۔

"پاکستان سے۔" نادیہ کے لہجے میں تیقن اترا۔

"یہاں کب سے رہ رہی ہو؟" انہوں نے دوسرا سوال کیا۔

"میں یہاں رہتی نہیں آئی ہوں' پڑھائی کے دوران چند مہینوں کا وقفہ کرکے میں صرف آپ سے ملنے اور آپ سے باتیں کرنے یہاں آئی ہوں۔"

"ملا کرو' آتی رہا کرو۔" انہوں نے اٹھ کر نادیہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"کیا واقعی۔ کیا آپ کو یقین ہے۔" نادیہ کی آنکھوں میں مسرت اور بے یقینی تھی۔

"یقین کی کچھ منزلیں ہوتی ہیں' لیکن ان منزلوں کو طے کرنے کے لیے پہلا قدم تو اٹھانا ہی پڑتا ہے' چلو پہلا قدم اٹھاتے ہیں' آگے کی طرف دیکھتے ہیں' دھند کے اس پار تمہارے لیے کیا رکھا ہے۔" وہ مسکرا کر بولے تھے۔

☆ ☆ ☆

"ماہ نور! کیا تمہیں معلوم ہے کہ سعد کہاں ہے' میں نے ایک ضروری کام سے اسے کال کرنے کی کوشش کی لیکن یا تو اس نے نمبر بدل لیا ہے یا پھر نجانے کیا بات ہے کہ اس کے نمبر پر کال نہیں ہورہی' نمبر مسلسل بند جارہا ہے (خدیجہ خالہ)"

ماہ نور نے اپنے سیل فون پر خدیجہ خالہ کا پیغام پڑھا اور بیٹھتا گئی۔ سردار چاچا' کھاری' خدیجہ خالہ' تین مختلف نوعیت کے لوگ گزرے کل سے اب تک سعد کے متعلق اس سے سوال کررہے تھے' جن میں سے دو کو سعد سے ضروری بات کرنی تھی اور ضروری کام بھی تھا۔

"یہ کیا ہورہا ہے۔" اس نے بارہا خود سے سوال کیا اور ایک بار پھر سعد کے نمبر پر کال کی' حسب توقع نمبر بند تھا۔

"کیا یہ ضرور تھا کہ تمہیں ہر تھوڑے عرصہ بعد میرے لیے سراب بن جانا تھا' تم غائب اور میں تمہاری تلاش میں سرگرداں' ایک صحرا ہے' جس میں سراب کبھی آب محسوس ہوتا ہے اور پھر دوبارہ سے سراب میں بدل جاتا ہے اور میں ہوں کہ دل پر قابو کھو کر اس صحرا میں ہاتھ پاؤں مارتی بھٹک رہی ہوں۔" اس نے اپنے آنسو ہاتھ کی پشت سے صاف کیے اور اپنے بیگ میں ساتھ لائے کپڑے ترتیب سے رکھنے لگی۔

اسے وہ دن بری طرح یاد آرہے تھے جب اسلام آباد سے لاہور واپس آنے کے بعد اسے اسی طرح سعد کا نمبر بند ملتا تھا اور وہ اس کو کال کرکے ایک مخصوص جواب سنتے نہیں تھکتی تھی۔ اس نے ایک بار پھر سعد کے نمبر پر کال کی اور مایوس ہوتے ہوئے بے دھیانی میں اپنے روابط میں محفوظ ناموں کی لسٹ دیکھنے لگی۔ چیٹر باکس (Chatterbox) سی ایچ سے شروع ہونے والے ناموں میں چچا سردار کے علاوہ صرف یہ ہی ایک نام محفوظ تھا۔

"چیٹر باکس" اس نے زیر لب یہ نام دہرایا "ابراہیم" اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ اگلے لمحے وہ اس نمبر پر کال کررہی تھی۔

"ہیلو ابراہیم! یہ میں ہوں ماہ نور۔ تمہیں یاد ہوں کیا میں؟" دوسری طرف سے کال وصول کیے جانے کے بعد اس نے بغیر تمہید کے کہنا شروع کیا۔

"اوہ ماہ نور!" دوسری جانب سے بھی بغیر کسی تعجب کے اظہار کے جواب دیا گیا۔ "ماہ نور' کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ سعد کہاں ہے اس وقت۔"

وہ جس سوال کا جواب پانے کے لیے یہ رابطہ کررہی تھی' وہ سوال خود اس کے سامنے لا کھڑا کردیا گیا تھا۔

"کیا تمہیں بھی نہیں معلوم کہ سعد کہاں ہے۔" اس کا آس نراش کی کیفیت میں جھلا دل بہت اندر کہیں ڈوب گیا۔

"نہیں اور میں اس کے بارے میں خاصا پریشان ہوں۔"

"وہ شاید اسلام آباد واپس گیا تھا۔" ماہ نور نے اٹک اٹک کر کہا۔

"اسلام آباد۔" دوسری طرف سے کہا گیا "اسلام آباد بہت بڑا شہر نہیں ہے ماہ نور! ہم اسے ہر طرف' ہر جگہ تلاش کرچکے۔"

"ابراہیم پلیز!" ماہ نور کی آواز شدت غم سے لرزنے لگی "پلیز جیسے ہی اس کا کچھ پتا چلے' مجھے فوراً" بتانا' پلیز میرا نمبر محفوظ کرلو پلیز پلیز۔"

"ضرور ماہ نور!" دوسری طرف سے متاثر ہوتے ہوئے کہا گیا تھا۔ "میں سعد کے لیے تمہارے جذبات کو سمجھ سکتا ہوں۔"

"اوہ!" ماہ نور نے فون بند کرکے آنکھیں میچیں "دنیا میں کوئی دوسرا ذی روح تو ہے۔ جو اس کے لیے میرے جذبات کو سمجھ سکتا ہے۔" اس نے سوچا تھا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

عنیزہ سید

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ' زرواطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

سولہویں قسط

”کتنا روک رہے ہیں سب بی بی! انہیں ’محرم ہو کے رکنے کا نام ہی نہیں لے رہیں۔“ تائی صابرہ نے ماہ نور کی پشت پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”ماہ نور باجی کو اسی طرح واپسی کی جلدی ہے۔“ رضیہ جو کھاری والے غم کی گہرائیوں سے تازہ تازہ باہر نکلی تھی بغیر سوچے سمجھے بولی۔ ”یاد نہیں آپ کو بی بی جی!“ اس نے چودھرائن کو یاد دلایا۔ ”پچھلی دفعہ بھی جب ماہ نور باجی کو اپنی مرضی کا باندر والا نہیں ملا تھا منگو کے میلے پر۔ یہ اسی طرح تیز و تیزی (جلدی جلدی) واپس چلی گئی تھیں۔“

”ہاں! ابھی تو تو ٹھیک ہے۔“ چودھرائن نے دوپٹا سر پر جماتے ہوئے کہا ”ہماری لاڈلی ہے نا بہت من موجی ہے‘ جو دل میں آیا کہہ دیا‘ جب موڈ خراب ہوا تو ضد کر کے اڑ گئی۔“ انہوں نے پیار بھری نظروں سے ماہ نور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ماہ نور باجی کو اپنی مرضی کا باندر والا نہیں ملا تھا منگو کے میلے پر۔“ ماہ نور تائی صابرہ کی بات نہیں سن رہی تھی۔ اس کا دھیان رضیہ کی کہی بات میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ ”بندر والا‘ سائیں‘ کمہار‘ فوک میلہ کا کا ٹیک۔“ اسکیچز کا خریدار‘ ایک ہنستا مسکراتا‘ بولتا‘ کہتا چہرہ اس کی نظروں میں اپنی شبیہ جمائے بیٹھا تھا نہ اس کے ہٹائے ہٹتا تھا‘ نہ دھیان کسی اور چیز یا چہرے کی طرف ہونے دیتا تھا۔ یہ کیفیت کیا تھی‘ اس کی ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ کسی امتحان میں پڑ گئی تھی یا آزمائش سے گزر رہی تھی۔ ایک شخص کے من چاہا بن جانے کا جرم کر بیٹھی تھی‘ جو ان چاہے سراب کی اسیر ہو گئی تھی‘ جدھر دھیان کرتی تھی‘ وہی چہرہ نظر آتا تھا۔ باقی چہرے جیسے اپنی شناخت گنوا بیٹھے تھے۔

”میں تو کہتی ہوں بس دو دن اور رک جا بیٹی! آج پچھلے پہر میں نے درس کی محفل کرانی ہے۔ نعت بھی ہو گی۔ گانا بجانا تو پورا سال کرتے ہیں۔ ایک شام اس کا ذکر سن لیں گے تو باقی کی شامیں اچھی گزر جائیں گی۔“ تائی صابرہ نے ایک بار پھر ماہ نور کو مخاطب کیا۔

”نسرین سنی جندو! مولوی کی بی بی کو پیغام دے دیا ہے کہ نہیں؟“

وہ خیال آنے پر اپنی مصاحباؤں کو پکارنے لگیں۔ ”کیا کہتی تھی‘ آئے گی کہ نہیں۔“ وہ کسی سے پوچھ رہی تھیں۔

”اچھا! آئے گی۔“ کسی کے جواب سے مطمئن ہوتے ہوئے وہ بولی تھیں۔ ”اسے کہنا تھا ٹائم پر پہنچ جائے۔“ ایک ہدایت جاری کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا ”اور اسے بھی پیغام دینا ضرور تو یں وہ ہٹی (نئی دلہن) کو۔ اس کی ابھی تک روٹی بھی نہیں کی ہم نے۔“

”شادی پر چار دن اور چار راتیں دیگیں چڑھتی رہی تھیں۔ پورا پنڈ روٹی کھاتا رہا تو کیا اس نے نہیں کھائی ہو گی روٹی۔“ جواب الگ سے روٹی کرنی ہے آپ نے شہزادی کی۔ رضیہ نے منہ بنا کر کہا۔

”نی تو تو کام دیکھ کر ہی ڈر جاتی ہے۔“ تائی صابرہ نے غصے سے رضیہ کو ڈانٹا۔ ”چل اٹھ جا کر جو چاندنیاں منگوائی ہیں بھلی پور سے باجی مریم کے گھر سے‘ وہ صاف ستھری ہیں نا‘ باجی مریم بھی بڑی اللہ ولی بندی ہے۔ ابھی تو ان چاندنیوں کے پیکٹ بھی نہیں کھلے تھے کہ انہوں نے مجھے بھیج دیں۔ میں نے بھی چوہدری صاحب سے کہہ دیا ہے کہ میں نے چاندنیاں نہیں واپس بھیجنی‘ ڈبل رقم بھیج دیں باجی مریم کو۔ وہ خود ہی نئی خرید لیں گی۔“

تائی صابرہ کی گفتگو کے دوران ان کی ملازماؤں کی آمد و رفت جاری تھی۔ صحن میں بڑی بڑی دیگیں دھوئی جا رہی تھیں۔ برتنوں کے آپس میں ٹکرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک ہنگامہ تھا جو بپا تھا۔ ماہ نور نے اس چہل پہل کے درمیان بیٹھے بیٹھے اپنے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہاں ویرانی تھی اور خاموشی بھی۔

”سب کتنے خوش باش ہیں اور کتنے شاد آباد۔“ اس نے آنکھ میں اتری ہلکی سی نمی کو انگلی سے چھوتے ہوئے سوچا۔

”چل شاباش! میری دھی رانی اپنا سامان ادھر ہی منگوا لے۔ آج میلاد شریف دیکھ کے کل سویرے ٹھنڈے ٹائم نکل جانا۔“ تائی صابرہ نے ایک بار پھر اسے چمکارتے ہوئے کہا۔

”کل صبح تک تو میرے اور اس کے درمیان نہ جانے اور کتنے پل‘ کتنے گھنٹے‘ کتنے دن اور کتنے کوس حائل ہو جائیں گے۔“ اس نے دل میں جواب دیا۔ ابراہیم نے کوئی اطلاع دی۔ نہ ہی اس کا اپنا نمبر آن ہوا۔“ اب کے دل میں ہوک سی اٹھی۔

”نہ آپ آئے نہ بھیجی پتیاں۔“

کانوں سے آواز ٹکرائی۔

”سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں۔“

کسی نے جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”او کھے پینڈے لمیاں نیں راہواں عشق دیاں۔“

کہیں دور کوئی اکتارہ بجاتا گا رہا تھا۔

”یار ڈاھڈی عشق آتش لائی ہے۔“

کسی آواز نے الفاظ بدل کر گانا شروع کیا۔

”ہو یار سانوں لگ گئی بے اختیاری۔

سینے وچ نہ سمائی ہے۔“

بار ہانے ہوئے لفظوں کا مفہوم اچانک سمجھ آنے لگا تھا۔ کیفیت خود پر گزر رہی تھی اور لفظوں میں چھپے پیغام ڈی کوڈ ہونے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

”میں اب چلتا ہوں۔“ خالی کا کپ میز پر رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

”اس وقت کہاں جاؤ گے؟“ جواب میں سوال آیا۔

”گھر جانا ہے کیا؟“ دوسرا سوال وارد ہوا۔

”گھر۔“ وہ مسکرایا۔ ”آپ کو پتا ہے ہمیں اپنی ملکیت میں کچھ گھر ہوتے ہوئے بھی ‘اپنے پاس دو مختلف ملکوں کی دہری شخصیت رکھتے ہوئے بھی‘ اپنے پاس دنیا کے کئی ملکوں میں جاسکنے کا اختیار رکھتے ہوئے بھی‘ اس پوری کائنات میں جلاوطن ہوں۔

”بھٹکتے رہو گے‘ جو یوں ہی خود پر خود ساختہ جلاوطنی طاری رکھتے رہے۔ ایک عمر چلتے رہو گے گھر نہیں آئے گا۔ منزل پر پہنچ کر بھی منزل کو پہچان نہیں پاؤ گے۔ کیونکہ تمہارے پاس نہ تو راستوں کا کوئی نقشہ ہے۔ نہ ہی نشان منزل کی کچھ خبر۔“ اس کی میزبان نے کافی کی خالی پیالی میں نقرئی چمچ چلاتے ہوئے جواب دیا۔

”جانتا ہوں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“ وہ سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا ”مگر بے بس ہوں‘ بے اختیار ہوں۔ کلیو بے شمار ہیں۔ معمے کا صفحہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا ہے۔ اور کاغذ اتنا خستہ ہے کہ ہاتھ لگانے سے مزید پھٹتا ہے۔“

”یہ بات نہیں ہے۔“ میزبان مسکرائی۔ ”حقیقت کا سامنا کرنا چاہتے بھی ہو اور اس کے عریاں ہو کر سامنے آنے پر آنکھیں میچ لیتے ہو۔“

”کیونکہ آنکھیں کھلی رکھ کر دیکھنے سے تاش کا وہ محل جس کے فرش پر میرے قدم جمے ہیں اکھڑ کر ہوا میں بکھر جانے کا خطرہ ہے۔ فاؤنڈیشن مائی ڈیئر میم!“ اس نے میزبان کی طرف دیکھا۔ ”بنیاد اکھڑ جائے تو انسان بے شناخت ہو جاتا ہے۔“

”تو پھر ڈٹے رہو‘ تاش کے محل میں جس کے تم کراؤن پرنس ہو۔ کیوں بلاوجہ اس کھوج میں جاتے ہو کہ جو رائل بلڈ تمہاری رگوں میں دوڑتا ہے اس کا رنگ نیلا ہے یا سرخ۔“

”نیلے‘ سرخ کی پروا نہیں۔ سفید اور سیاہ سے ڈر لگتا ہے۔ جو ان میں سے کوئی رنگ نکل آیا تو مسئلہ بن جائے گا۔“

”مسئلوں سے ڈرتے ہو۔ مسئلہ تو میں بھی ہوں۔ مسئلہ تو تم بھی ہو۔“ وہ گنگناتے ہوئے بولی۔

”یہ ہی تو سارا مسئلہ ہے کہ مسئلہ تو آپ بھی ہیں۔ مسئلہ تو وہ بھی ہیں اور مسئلہ تو میں بھی ہوں۔“ وہ برجستہ بولا۔

اس کی میزبان کے چہرے پر لحہ بھر کو ایک تاریک سایہ لہرایا اور اپنی نامحسوس چھب دکھا کر غائب ہو گیا۔

”اچھا! ایک بات تو بتا میں۔ پھر وہ اچانک بولا۔

”پوچھو! یہ اور بات ہے کہ اب مجھے تمہارا یہ سوال پھونک پھونک کر سننا چاہیے۔“ اس نے صوفے کی پشت سے کمر ٹکاتے ہوئے کہا۔

”مجھے لگتا ہے جلے دودھ کا اور یقین ایک ہی ہے۔ میرے لیے بھی اور آپ کے لیے بھی۔ لہٰذا چھاچھ بھی بغیر تفتیش و تسلی کے نہیں پئی۔ نہ میں نے۔ نہ آپ نے۔“

”وہ دودھ جس میں پانی زیادہ‘ دودھ کم ہو جل بھی جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ ایسے دودھ کا خریدار اس طرح بھی نقصان میں۔ یوں بھی نقصان میں۔“ میزبان کا لہجہ زہر خند ہو گیا۔

”یہ ہی تو آپ کی غلط فہمی ہے اور اس غلط فہمی کا شکار لوگ بڑی بڑی غلطیاں کر جاتے ہیں۔ اپنی زندگی کا سب سے بڑا نقصان بھی کر ڈالتے ہیں۔“

”نقصان تو جو ہونے تھے ہو چکے۔ اب تو یہ بھی یاد نہیں کہ لکیر کیسے پیٹی جاتی ہے۔“ وہ پہلو بدلتے ہوئے بولی۔

”بس تو پھر یوں سمجھیے میم! کہ میں دوبارہ سے آپ کو لکیر پیٹنا سکھانا چاہتا ہوں۔ وہ مسکرا کر بولا۔

”کیا فائدہ۔ سانپ تو کبھی کا نکل چکا۔“

”سنپولیا پیچھے چھوڑ گیا بھولا سانپ۔ سنپولیا نہیں‘ بلکہ سنپولیے۔ آپ انہیں ہی پیٹ کر دل کا کچھ غبار کم کر لیجیے گا۔“

”رہنے دو۔ وہ جو ایک کیفیت ہوتی ہے نا! جس کا نام ہے بے حسی‘ وہ دل و جاں سے میرے ہاں بسیرا کر چکی ہے۔ لہٰذا یہ مارا پیٹی‘ اور اکھیڑ پچھاڑ کی چاہے ان مُردوں کی ہو جو کب کے گڑ چکے‘ ان کا ذکر سن کر بھی کوئی خاص ولولہ دل میں نہیں اٹھتا۔“

”آپ کی یہ بے حسی سانپ کے لیے نعمت ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ اپنا پھن اٹھائے مزید اکڑ کر چلتا ہو گا۔ آپ جیسے لوگ‘ جو نہ سانپ کا پھن کچلنے کے قائل ہیں۔ نہ ہی لکیر پیٹنے کے۔“ اب کے وہ نیچی آواز میں بولا۔

”جانے دو‘ اس طرح کی گفتگو بھی لکیر پیٹنے ہی کی مترادف ہے‘ تمہیں کچھ پوچھنا تھا کیا وہ نہیں پوچھو گے؟“

”ہاں لو۔“ وہ لمبا سانس لینے کے بعد بولا۔ ”کیا آپ مجھے اپنا وہ اسٹوڈیو ایک مرتبہ پھر دیکھنے کی اجازت دے سکتی ہیں‘ جو پہلے میں نے دیکھ رکھا ہے؟“

”کیا کرو گے دوبارہ دیکھ کر؟ وہاں کیا رکھا ہے دیکھنے کو؟“ وہ تھوڑے توقف کے بعد بولی۔

”آپ اس اسٹوڈیو کے بارے میں خاصی بے نیاز ہیں۔ جبکہ میرا یہ معاملہ ہے کہ ایک بار دیکھا ہے۔ دوبارہ

بلکہ بار بار دیکھنے کی ہوس ہے‘ والی صورتحال میں ہوں۔“

”اچھا؟“ رکو میں آتی ہوں۔“ وہ اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔

”یہ اس کی چابی ہے۔“ تھوڑی دیر بعد واپس آ کر اس نے ایک چابی اس کی طرف بڑھائی۔ ”راستے سے تم واقف ہو‘ خود ہی چلے جاؤ اور دیکھتے رہو‘ جب تک دیکھنا چاہتے ہو۔“

”آپ نہیں چلیں گی میرے ساتھ؟“ سعد نے اس کی ہتھیلی پر رکھی چابی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔“ اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے ہتھیلی پر دھری چابی اٹھائی اور پاؤں میں چپل پہن کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں آپ کی اجازت سے جا رہا ہوں وہاں‘ ہے نا؟“

”ہاں بالکل۔“ میزبان نے جواب دیا۔

☼ ☼ ☼

”کمال ضبط کی اس اسٹیج کا نام کیا ہو سکتا ہے جس سے میں اس وقت گزر رہا ہوں۔“ بلال سلطان نے اپنے سامنے رکھی فائلز کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

”جو بھی نام ہے اور جو بھی اسٹیج ہے‘ میرے جیسے شخص کا شاید یہ ہی علاج ہے۔“ انہوں نے سنہری فریم کا قیمتی چشمہ آنکھوں سے اتارنے کے بعد آنکھوں کو دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے مسلا۔

”کیا وہ کوئی خزانہ ہے جس کے چوری ہو جانے یا گم ہو جانے کا خدشہ ہے؟“ انہوں نے اپنے سامنے پھیلی دیوار کی طرف دیکھا۔ ”اس میں کسی غفلت کے سبب کمی آ جانے کا ڈر ہے۔“

”شاید ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔“ انہوں نے خود ہی فیصلہ دیتے ہوئے سوچا۔ ”حقیقت صرف اتنی ہے کہ اس پوری دنیا میں شاید وہی ہے جس سے میں نے صحیح معنوں میں دل لگایا ہے۔“

To the world you are one of many
To me you are all the world

انہوں نے اپنے سامنے رکھی فائلوں میں سے ایک میں جڑے پہلے صفحے پر قلم سے سنہری الفاظ لکھے۔

”اور ٹریجڈی نہیں‘ بلکہ کامیڈی یہ ہے کہ وہ میری اس کیفیت سے بخوبی آگاہ ہے۔ اسی لیے میری ساتھ ایک عرصے سے لکن مٹی‘ چھپن چھپائی‘ ہائیڈ اینڈ سیک یعنی ایک ہی کھیل مختلف زبانوں میں کھیل رہا ہے۔“ انہوں نے اپنے لکھے الفاظ کے نیچے بے دھیانی میں لائنیں کھینچتے ہوئے سوچا۔

”لیکن وہ ایک پیشہ ورانہ ذمہ دار شخص ہے“ اور ”پیشہ ورانہ ذمہ دار شخص جیسے الفاظ کی حقیقی تصویر ہے۔“ پھر انہوں نے مزید الفاظ اس کاغذ پر نوٹ کیے۔ ”اور یہ ہی وہ حقیقت ہے جس نے مجھے کل سے اب تک بے چین کر رکھا ہے۔ اسے پرسوں تک اس شہر میں اور کل صبح اس دفتر میں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اس نے اب تک اپنی پروفیشنل ذمہ داریوں سے جان نہیں چھڑائی۔ کون سا کام کس دن‘ کتنے بج کر کتنے منٹ پر سرانجام دینا ہے‘ وہ اپنے حساب کتاب میں کبھی کمزور نہیں پڑا۔ اس دفتر میں کام کرنے والے کہتے ہیں کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جسے دیکھ کر گھڑی کی سوئیاں درست کی جا سکتی ہیں۔ پھر اب تک وہ کہاں ہے؟“ انہوں نے بے چینی سے دائیں بائیں دیکھا اور اپنا فون اٹھا کر کال ملانے میں مصروف ہوئے۔

”ہاں! کیا پتا چلا؟“ دوسری طرف سے کال وصول کیے جانے پر انہوں نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا۔

”گاڑی بلیو ایریا میں کھڑی ہے ساجد نے بتایا ہے۔“ دوسری طرف سے جواب دیا گیا۔

"ماننیلج کتنی ہے؟"
"چیک نہیں کیا سر!"
"ہوں!" انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے' بس اتنا کافی ہے۔ اب تم لوگ اپنا اپنا کام کرو۔"
انہوں نے فون بند کردیا۔
"اس کا مطلب ہے کہ تم کہیں قریب ہی موجود ہو۔ مگر نظروں سے دور رہو۔"
انہوں نے اپنے سامنے موجود کاغذ پر مزید الفاظ رقم کرتے ہوئے لکھا۔ ان کے سینے میں بے چینی سے دھڑکتے دل کو قدرے سکون حاصل ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

مولوی سراج سرفراز نے تسبیح کے دانے گراتے گراتے ایک نظر اپنے سامنے بیٹھی رابعہ بی بی پر ڈالی' جن کا دھیان کمرے میں موجود کسی چیز کی جانب نہیں تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔
"سعدیہ کی جدائی نے رابعہ بی بی کی صحت پر خاصا اثر کرڈالا۔" مولوی صاحب کے ذہن میں خیال آیا۔ "نہ کوئی رنگ روپ رہا ہے۔ نہ صحت باقی ہے۔ عجیب ہی ہوتی ہیں یہ بیبیاں بھی۔ ایک فرض بحسن و خوبی پورا ہو گیا۔ یوں کہ نہ ہینگ لگی نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آیا۔ پھر بھی پریشان حال بیٹھی ہیں۔ کیسی ناشکری ہے' کتنی بے وجہ کی بے اطمینانی ہے۔ دوسری طرف سعدیہ ہے۔ میں ابھی کل ہی تو اس سے مل کر آیا ہوں۔ اس کے تو پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے۔ ایسی بھولی ہے اپنی خوشیوں میں مگن ہو کر کہ واپس ادھر پل بھر کی ملاقات کو آنے کو جی نہیں چاہا کبھی اس کا۔"
کسی بھی قسم کے تفکر سے آزاد مولوی صاحب نہ جانے کس اسم کا ورد جاری رکھتے ہوئے سوچ رہے تھے۔
"آج تو لگتا ہے۔ گھر میں کچھ پکا بھی نہیں۔۔۔ آج کیا' کئی دن سے کچھ نہیں پکا۔ جس روز سے فارم ہاؤس سے واپسی ہوئی ہے۔ گھی میں ملی شکر یا پھر دہی کے ساتھ ہی روٹی کھانے کو ملتی ہے۔ بہت ہوا تو دہی میں پودینہ پیس کر ڈال لیا۔ سعدیہ نے تو چند ہی دن کھانا بنایا تھا۔ ورنہ رابعہ بی بی ہی کھانا بناتی تھیں۔ سادگی اور غنا کی قائل تو سدا سے تھیں۔ مگر ایسا فقیرانہ انداز پہلے کبھی نہ تھا۔ بھلا ہو قائم دین کا' جو کہتا ہے۔ "مولوی جی! پیشی (اور دیگر ظہر اور عصر) کے درمیانی وقفے میں صرف کھانا کھانے کے لیے گھر جانے کی ضرورت نہیں۔ اتنا لمبا راستہ۔ بھری دھوپ میں چل کر کہاں جائیں گے۔ ہم آپ کو کھانا یہیں مسجد میں پہنچا دیا کریں گے۔" سو شکر کہ دوپہر کی روٹی ڈھنگ سے ملنے لگی ہے دو دن سے۔ آج بھی کیا بھون کر تیار کیا تھا مرغ کا قورمہ۔ قائم دین کی گھر والی نے۔ مرغ کا پٹ (ٹانگ) کیا پر خور تھا' جسے دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ صحت مند جانور ذبح کیا تھا قائم دین نے۔ کیا لال شوربا تھا تری (چکنائی) والا سبحان اللہ! سواد آگیا تھا۔ چلو! کم سے کم دوپہر کی روٹی میں تو شکر گھی اور چٹنی سے نجات ملی۔"
وہ دانے پر دانہ گراتے سوچ رہے تھے اور سوچ کا بہاؤ بے کنار تھا۔ کبھی کسی جانب بہنے لگتا۔ کبھی کسی دوسری جانب۔
"کھاری لوٹ کر آیا۔ نہ کچھ خیر خبر لایا۔" دوسری طرف آپا رابعہ اپنی سوچ میں گم تھیں۔
"اور ایک میں ہوں کہ گرم توے پر بیٹھی مانو بجل کر راکھ ہو رہی ہوں۔ اس گھر اور فارم ہاؤس کا فاصلہ کتنا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ بھاگتے قدموں سے جاؤں اور وہ من موہنا چہرہ دوبارہ دیکھوں۔ جس کے دیکھنے سے دل کو سکون ملتا ہے اور کلیجہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔ بے اختیار دل کرتا ہے کہ اسے سینے سے لگالوں۔ وہ سراپا جو تمکنت اور وقار سے چلتا پھرتا' اٹھتا بیٹھتا ہے' وہ چہرہ چوم لوں' جس پر نرمی چھائی ہے اور جب وہ مسکراتا ہے تو چاروں طرف سکون بکھر

جاتا ہے۔ اس لہجے اور آواز کے قربان جاؤں۔ جو ہوا کے دوش پر ابھرتی ہے تو اس میں نرمی محسوس ہوتی ہے لوچ محسوس ہوتا ہے 'جس میں احترام ہے اور عاجزی بھی۔"

وہ ایک ٹک سامنے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔

"مگر کیسے جاؤں" انہوں نے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا "عمر اور رتبہ آڑے آتا ہے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ اور پھر ادھر سے بے نیازی کا بھی خدشہ ہے۔ منع کردیے جانے کا خوف بھی ہے۔ وہ کہہ دے۔ "میں تو وہ نہیں جس کو تم تلاش کرتی پھرتی ہو۔" تو کیا ہوگا۔ امید یاس میں بدل جائے تو کیسا لگتا ہے 'دل اس احساس کو محسوس کرنے سے خائف ہے۔ مگر اے کاش اے کاش۔"

"یا اللہ!" انہوں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔

"برسوں گزر گئے۔ میری دعاؤں میں کوئی دنیاوی خواہش شدت سے تو کیا 'معمول بن کر بھی نہیں اتری۔ جب بھی اور جتنا بھی مانگا 'اس کا تعلق دنیا سے نہیں۔ آخرت سے رہا۔ مگر آج تیری یہ گناہ گار 'حقیر بندی تجھ سے دنیا کی ایک نعمت کی دعا کررہی ہے اور اتنی شدت سے کررہی ہے کہ ایسی شدت کبھی آخرت سنور جانے کی دعا میں بھی نہ آئی ہوگی۔ میرا دل جانتا ہے کہ شدت کے اس فرق کی وجہ سے آج مجھ پر بھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ظاہر ہوگیا۔ ہوں نا میں کھوٹے دل کی 'بدنیت 'عام سی انسان۔ اتنے برس اپنے تئیں دنیا نہیں 'آخرت مانگتی رہی اور اس نعمت کی جھلک دیکھتے ہی ہاتھ اٹھا کر دنیا دنیا پر اتر آئی۔ نفس خواہش کرنے لگا۔ ہمک ہمک کر دل پکارنا شروع ہوگیا کہ مجھے یہ عطا کردے۔ میری تمنا پوری کردے۔ جانتی ہوں تو نے دنیا کی یہ نعمت 'آزمائش میں شمار کردی ہے 'پھر بھی آزمائش میں پڑنا چاہتی ہوں۔ میرے اللہ! عطا کردے 'عطا کردے 'میری التجا قبول کرلے۔ میری منتظر نظروں کا انتظار ختم کردے۔ میں پل پل گھر کی دہلیز دیکھتی ہوں۔ کب کھاری کی آواز آئے اور وہ قدم اس گھر کی دہلیز پر نظر آئیں۔ میرے اللہ! مجھے انتظار کی اس جان لیوا کیفیت سے نکال لے۔"

"تو اب یہ بیٹھے بیٹھے رونے لگیں۔" مولوی سراج نے رابعہ بی بی پر دس منٹ کے وقفے کے بعد نظر ڈالی۔

"آپا جی کہا کرتی تھیں۔ رابعہ تو پلک تتی ہے 'پلک تتی۔ مجھے تو بڑی دیر تک اس لفظ کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ پھر آپا جی نے ہی بتایا 'یہ جو بات بے بات آبدیدہ ہوجاتی ہیں۔ اسی لیے ان کو پلک تتی کا خطاب دے رکھا ہے۔ عمر جوں جوں بڑھتی جارہی ہے توں توں یہ عادت بھی بڑھتی جارہی ہے۔ بیٹھے بٹھائے نامعلوم اسباب کے نتیجے میں آنسو بہے چلے جاتے ہیں۔"

مولوی سراج نے سوچا اور ماحول پر چھائی طویل یکسانیت سے اکتا کر سفید رومال اٹھایا اور سلیقے سے سر پر باندھنے لگے۔ اس کام سے فارغ ہو کر ایک نظر رابعہ بی بی پر ڈالی۔ وہ اس طرح ایک ٹک خلا میں دیکھتے ہوئے آنسو بہائے چلی جارہی تھیں۔

"افوہ بھئی!" مولوی صاحب نے الجھ کر دائیں بائیں دیکھا اور جھلائے ہوئے انداز میں شانے پر رکھنے والا رومال زور سے جھاڑا۔

"عصر کا وقت ہورہا ہے۔ میں چلتا ہوں۔" انہوں نے کھڑے ہوتے ہوئے اعلان کیا۔ وہ جانتے تھے 'یہ محض ایک رسم تھی 'جو وہ نبھا رہے تھے 'اس اعلان کو جن کانوں تک پہنچنا تھا۔ وہ یکسر بے نیاز تھے۔

"دروازہ بند کرلینا بھئی 'دروازہ کھلا رہے تو میدان میں کھیلتے بچے بے وجہ گھستے نکلتے رہتے ہیں۔" مولوی صاحب نے نکلتے نکلتے ایک اور اعلان کیا اور جواب کا انتظار کیے بغیر آگے چل دیے۔

"اور ہاں!" کچھ یاد آنے پر انہوں نے مڑ کر دیکھا "چوہدری صاحب کے گھر سے محفل کا جو پیغام آیا تھا 'اس

کا کیا جواب دیا؟"

"ہوں؟" یوں براہ راست دیکھے اور مخاطب کیے جانے پر رابعہ بی بی بھی خیالات کی رو سے چونک کر باہر نکلیں۔

"چوہدری صاحب کے گھر کا پیغام؟" مولوی صاحب نے بات دہرائی۔

"کھاری کو بتادیا تھا۔" رابعہ بی بی نے ایسا مختصر جواب دیا۔ جس میں جواب کی صورت نہ تھی۔

"ہوں!" مولوی صاحب کچھ دیر وہیں رک کے آپا رابعہ کو دیکھتے رہے "دروازہ بند کرلینا۔" انہوں نے ایک بار پھر تاکید کی اور باہر کی طرف چل دیے۔

"غریب کے گھر طمانیت اور سکون نام کا خزانہ ہو تو بھی کچھ لوٹے جانے کا خدشہ ہوتا ہے مولوی صاحب! یہاں تو وہ بھی نہیں ہے۔ پھر کیا فرق پڑتا ہے 'دروازہ کھلا رہے یا بند۔"

رابعہ بی بی نے دل میں کہا اور کمرے سے باہر نکل آئیں۔ لکڑی کا دو پٹ کا سادہ دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ یہ دروازہ بے روغن تھا اور زمانے کے ہاتھ لگنے سے میلا ہورہا تھا۔ اس کی کنڈی نیچے کو لٹکی ہوئی تھی۔ ایک کنڈی دروازے کے قدموں سے ذرا اوپر جڑی تھی۔ جس کو اس کی جگہ سے کبھی ہلایا بھی نہیں گیا تھا۔ وہ سانپ کی طرح کنڈلی مارے ایک کیل میں اگلی سالوں سے ساکن پڑی تھی اور گرد آلود ہورہی تھی۔ کب اس دروازے کا کوئی ایک پٹ اس کے لیے کھلے گا 'جس کی یہاں آمد کے انتظار میں میری آنکھیں روزن ہوئی جاتی ہیں۔" انہوں نے ایک بار پھر دروازے اور گھر کی دہلیز پر نظر ڈالی۔ اسی لمحے دروازے کا بایاں پٹ اندر کی طرف دھکیل کر کوئی باہر دروازے تک پہنچنے والے قدمچے پر کھڑا ہوگیا۔

"بھین جی! میں ہوں کھاری۔" باہر سے آواز آئی۔ رابعہ بی بی کے دل نے خوشی 'شوق اور سرمستی کے عالم میں ایک کروٹ سی لی۔

"آجاؤ۔ آجاؤ کھاری!" انہوں نے بلند آواز میں کہا۔ اس دم انہیں آواز کے پردے کا بھی یکسر خیال نہ رہا تھا۔

"السلام علیکم بھین جی!" سفید شلوار قمیص اور سیاہ پشاوری چپل میں پہلے سے بالکل مختلف حلیہ بنائے وہ اندر داخل ہوا۔

"وعلیکم السلام!" کھاری کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بھی ان کی نظریں ابھی دروازے پر ہی ٹکی تھیں۔

"بھین جی!" کھاری نے ان کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا اور شرمندہ سے لہجے میں انہیں مخاطب کیا۔

"او تے ٹر گئے ہیں (وہ تو چلے گئے ہیں)" اس نے نظریں نیچی رکھتے ہوئے کہا۔

"کہاں؟" آپا رابعہ کو اپنے دل میں جھکڑ سے اٹھتے محسوس ہوئے۔

"جدوں میں ادھر سے گیا۔ فارم ہاؤس میں جا کر پتا لگا کہ سعد باؤ تو واپس چلے ہیں۔" کھاری کا لہجہ ایسا تھا۔ جیسے سعد کے واپس چلے جانے میں سارا قصور اسی کا تھا۔

"پر کہاں چلا گیا وہ؟" آپا رابعہ نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

"واپس اپنے گھر ہی گئے ہوں گے۔" کھاری نے خیال ظاہر کیا۔

"اس کا گھر کہاں ہے کھاری؟" آپا رابعہ نے کھاری کو جھنجوڑا۔

"اے تو مینوں پتا نئیں جی۔" کھاری بوکھلا کر بولا۔

"پتا کرونا کھاری! مجھے اس کا نشان پتا لے دو کہیں سے۔ مجھے اس کا فون نمبر ہی پتا کروادو۔" آپا رابعہ کا انداز ایسا تھا۔ جیسے وہ جو مانگ رہی ہیں 'نہ ملا تو ان کی موت واقع ہوجائے گی۔

"آرام نال بھین جی! آرام نال۔" کھاری آپا رابعہ کے اس انداز پر مزید بوکھلا گیا۔

"میں ماہ نور باجی کی منت کروں گا۔ ان کا ترلا کر کے کسی طرح کوئی نام پتا لے آوں گا۔ پر آپ خود کو سنبھالو۔" اس نے آپا رابعہ کے کانپتے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"اب کی بار بھی وہ کھو گیا ناں کھاری تو پھر کبھی نہیں ملے گا۔" آپا رابعہ خلا میں گھورتے ہوئے بڑبڑائیں۔

"جسے ملنا ہوتا ہے بھین جی! اس واری گواچ کے بھی مل جاتا ہے۔ آپ فکر نہ کرو۔ ایک باری پتا چل گیا تو ہم اسے ڈھونڈ کے ہی دم لیں گے۔"

"میں سوچ رہی تھی بس آنکھوں کی سوئیاں باقی ہیں کھاری! مگر یہ میری خام خیالی تھی۔ انتظار کی سوئیاں جا بجا تکی ہیں اور کوئی انہیں نکالنے والا نہیں۔" آپا رابعہ نے بدستور خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

"میں ہوں بھین جی!" کھاری نے فوراً "جواب دیا" "آپ دیکھو گے بھین جی کھاری کا اس دنیا میں اپنا تو کچھ نہیں بننا۔ مگر آپ کا کچھ ضرور سنوار کے جائے گا۔"

"ایسی باتیں نہیں کرتے کھاری!" آپا رابعہ کو جیسے ایک دم ہوش آیا۔ وہ اپنی دھن میں اس لڑکے کو بھی کیسا جذباتی کر رہی تھیں۔

"اللہ تمہیں خوشیوں سے' دنیا کی تمام نعمتوں سے نوازے' تمہارا اقبال بلند کرے۔" انہوں نے مخصوص دعاؤں کی بارش برسائی۔

"رہن دیو بھین جی!" کھاری ہلکا سا مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں مایوسی بھی تھی اور تمسخر بھی۔ "اس دنیا میں بندہ جو اوقات لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اسی اوقات پر تمام عمر گزار دیتا ہے۔"

"ایسا نہیں ہوتا کھاری!" آپا رابعہ دفعتاً "اپنی پریشانی بھول گئی تھیں۔ "وہ لوگ۔ جو دنیا میں ترقی کرتے ہیں' اپنا مقام بناتے ہیں' نامور بن جاتے ہیں ان کے بارے میں نہیں سنا تم نے۔"

"پتا نہیں وہ لوگ کون ہوتے ہیں بھین جی! غریب بندہ تو اپنی شخصیت کے سوراخ ڈھانپتا ہی عمر گزار دیتا ہے جی۔" کھاری نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

آپا رابعہ کی نظریں کھاری کے چہرے پر چھائی مایوسی کو ٹٹولنے لگیں۔ ابھی دو دن پہلے جب وہ آیا تو بہت خوش اور مطمئن لگ رہا تھا۔ دو دن کے اندر کیا ماجرا ہو گیا تھا۔

"اچھا جی! ہن میں چلتا ہوں۔" پھر وہ اچانک اٹھتے ہوئے بولا۔

"ٹھہرو کھاری!" آپا رابعہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکا "کیا بات ہے تم اتنے ناخوش کیوں ہو؟"

"ناخوش کیا ہوندا اے جی؟" کھاری نے آپا رابعہ کی طرف دیکھا۔

"یعنی تم خوش نہیں لگ رہے ہو۔" انہوں نے اس بات کو دوسرے الفاظ میں کہا۔

"خوش؟" کھاری نے سر جھٹک کر کہا۔ "چھڈو بھین جی! خوشی دی بات نہ کرو۔"

"اس کا مطلب ہے تم خوش نہیں ہو۔" رابعہ آپا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"سعدیہ نے کچھ کہہ دیا ہے کیا؟" انہوں نے سر اٹھا کر سوال کیا۔ جواب میں کھاری نے ان کی طرف دیکھ کر ایک بار آنکھیں بند کیں اور دوبارہ کھول کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"سعدیہ والا کام میری اوقات سے بڑا ہے۔"

"کیا مطلب؟" آپا رابعہ نے حیرت سے پوچھا۔ "تم دونوں تو ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش تھے۔"

"میرے جیسے عاجزی پسند بندے کو غلط فہمی بہت جلدی ہو جاتی ہے بھین جی!" کھاری نے چہرہ دوسری طرف

پھیرتے ہوئے کہا۔

"اوہ!" آپا رابعہ نے جیسے کچھ بھانپ لیا۔ "کیا کیا ہے سعدیہ نے؟"

"اس نے کچھ نہیں کیا بھین جی! میرے مقدر کی بات ہے۔" وہ کوئی بھی وضاحت دیے بغیر بولا۔ "میں اب چلتا ہوں۔ ماہ نور باجی وڈی بی بی کے گھر آئی ہوئی ہیں۔ میں جا کر ان کا ترلا کرتا ہوں۔ کیا پتا وہ باؤ سعد کا نمبر یا پتا دے دیں۔" اس نے کہا اور ہاتھ چھڑا کر آپا رابعہ کی طرف دیکھے بغیر چل دیا۔

"ایک کے بعد ایک آزمائش۔ ایک نہیں' کئی کئی آزمائشیں۔" کھاری کو دروازے کی طرف جاتا دیکھ کر آپا رابعہ کو خیال آیا۔ "میں مطمئن تھی' سعدیہ کا بوجھ میرے سر سے اتر کر کسی اور کے سر پر جا پڑا۔ مگر اب یہ بے چارہ معصوم دکھی ہو کر کیا سا گیا ہے۔" انہوں نے پریشان ہوتے ہوئے سوچا۔

"سعدیہ پر جو سرکشی اور بغاوت کی لہر سوار تھی۔ وہ نشیب سمجھ کر کھاری کی جانب تو نہیں بہنے لگی؟" انہوں نے سوچا اور ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کمرے کی طرف مڑ گئیں۔ ان کے دل پر دھری بے چینی سوا ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اس چھوٹے سے پارک میں موجود بچوں کا دل بہلانے کے لیے پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے اچھل کود میں مصروف تھا ـــــ پارک میں بچوں کی تعداد کم تھی۔ ریسٹورنٹ میں لنچ کے لیے آنے والے زیادہ تر لوگ بھی دفتری اوقات کار میں کھانے کے وقفے کے دوران آنے والے باقاعدہ کسٹمر تھے۔ بچوں کے ساتھ تفریح کے لیے نکلنے والے شام ڈھلے گھر سے نکلتے تھے اور شام ڈھلے سے رات گئے تک اس ریسٹورنٹ اور پارک میں بہت رونق رہتی تھی۔

زیادہ تر بچے پارک کے شمالی کونے میں بنے چھوٹے سے سوئمنگ پول کے لیے یہاں آنے کی ضد کرتے تھے۔ پول کے ساتھ ہی ریسٹورنٹ کی انتظامیہ نے چھوٹا سا چڑیا گھر بھی بنا رکھا تھا' جس میں مختلف نسلوں کے خوشنما طوطے' چڑیاں' مور' بندر اور خرگوش وغیرہ بچوں کی دلچسپی کا باعث بنتے تھے۔ پارک میں مختلف طرح کے جھولے بھی لگے تھے۔ بچوں کے والدین بچوں کو پارک میں چھوڑ کر خود بے فکری سے ریسٹورنٹ میں بیٹھ سکتے تھے۔

بچوں کے لیے جھولوں' پول اور چڑیا گھر کے علاوہ جیتا جاگتا بھاگتا دوڑتا وہ خرگوش سب سے بڑی دلچسپی کا باعث تھا' جو ان سے ان ہی کی زبان میں باتیں ـــ کرتا تھا۔ ان کے پسندیدہ میوزک پر ان کے ساتھ ناچتا تھا اور مختلف کرتب بھی دکھاتا تھا۔

اس پارک کا یہ خرگوش یہاں آنے والے بچوں کا پکا دوست تھا۔ اکثر بچے اپنے ماں باپ سے رو رو کر یہ ضد بھی کیا کرتے تھے کہ انہیں خرگوش کو اپنے ساتھ گھر لے جانا تھا۔ لوگ مذاق مذاق میں خود اس سے اور ریسٹورنٹ انتظامیہ سے اس کی قیمت پوچھتے۔ اس کا اپنا جواب ہوتا' وہ بے مول تھا۔ لہٰذا اس کی خواہش کرنا حماقت تھی۔ جبکہ ریسٹورنٹ انتظامیہ کے لیے وہ قیمتی اور انمول تھا' جس کی وجہ سے سال کی تمام شاموں میں ان کا ریسٹورنٹ اور اوپن ایریا بلیو سائیڈ گاہکوں سے بھر جاتی تھی۔ وہ ریسٹورنٹ بچوں والی فیملی کی پہلی ترجیح بن چکا تھا۔

اس شام بھی وہ اپنی مخصوص اچھل کود' ناچ گانے میں مصروف تھا۔ ہلکے گلابی رنگ کی فراک پہنے' بالوں میں گلابی پونیاں لگائے' پاؤں میں گلابی سفید جوگرز پہنے وہ چھوٹی سی گپلو سی بچی اس شام پارک میں آنے والی پہلی بچی تھی۔ وہ جب سے آئی تھی' خرگوش کے ساتھ کھیل کود میں مشغول تھی۔

"You Are My Dear Bugs Bunny (تم میرے پیارے بگز بنی ہو)" اس نے اسے آتے ہی کہا اور اس کی ٹانگوں سے چمٹ گئی۔

"تم گاجریں کھاتے ہو یا نہیں؟" اس کے ماں باپ اسے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش میں ہار کر اندر ریسٹورنٹ میں چلے گئے تو وہ اس سے پوچھنے لگی۔ "تمہارے لمبے لمبے کانوں میں آواز زیادہ آتی ہوگی' ہے نا؟"

"تمہارے دانت جو باہر کو نکلے ہوئے ہیں' ان کی مدد سے کیا تم چھوٹے بچوں کو کھاتے ہو۔۔۔ تمہارا گھر کہاں ہے' کیا تم نے اسی پارک میں کسی جگہ سوراخ کرکے زمین کے نیچے اپنا گھر بنا رکھا ہے۔۔۔؟ تم سوتے کدھر ہو۔ تمہاری تو ٹانگیں اتنی لمبی ہیں کہ کسی بیڈ پر پورے ہی نہ آؤ گے بھی۔" وہ مسلسل سوال کر رہی تھی اور ایک جھولے سے اتر کر دوسرے جھولے پر چڑھ رہی تھی۔ اس نے اس بچی کے تمام سوالوں کے جواب دینے کی کوشش کی تھی۔ اس کے ساتھ کھیلتا بھی رہا تھا۔ مگر جیسے ہی وہ اس کے پاس سے ہٹ کر دوسرے بچوں کی طرف متوجہ ہوتا وہ رونے اور چیخنے لگ جاتی۔

"تم میرے بگز بنی ہو۔۔۔ تم صرف میرے دوست ہو۔" وہ چلا چلا کر کہتی اور بلند آواز میں رونے لگتی۔ مجبوراً اسے واپس اس کے قریب آکر کھڑے ہونا پڑتا۔

"کیا اس لڑکی نے تمہیں خرید لیا ہے؟" باقاعدہ آنے والے بچوں میں سے ایک دو نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ اس نے کسی دوسرے بچے کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ اس گلابی بچی میں کچھ ایسی بات ضرور تھی' جو وہ اس کی ضدوں سے تنگ آنے کے باوجود اس کی ہر ضد پوری کیے جا رہا تھا۔

رات ساڑھے نو اور دس بجے کے درمیان بچی کے ماں باپ جب اسے پارک کے خرگوش سے واپس لینے کے لیے آئے تو انہوں نے دیکھا خرگوش نے بچی کو اٹھا کر اس کا سر اپنے کندھے سے لگا رکھا تھا اور وہ اس کے شانے پر سر رکھے مزے سے سو رہی تھی۔

"کم آن پری! گھر چل کر سوتے ہیں' اٹھ جاؤ شاباش۔" اس کی ماں نے اسے جگاتے ہوئے کہا تھا۔

"پری ڈارلنگ! چلو اب گھر چلتے ہیں جانو۔" باپ نے نرمی اور احتیاط سے اسے پارک کے خرگوش کی گود سے اپنی بانہوں میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔

"پری!" خرگوش زیر لب بڑبڑایا۔

"صاحب! اس کو روزانہ لے کر آنا۔ یہ بہت سویٹ ہے۔" اس نے بے اختیار کہا۔ بچی کے ماں' باپ اپنی بچی کے لیے اس توصیفی جملے پر مسکرا دیے۔

"ضرور۔" باپ نے سر ہلایا اور جیب سے سو سو روپے کے دو نوٹ نکال کر اسے پکڑا دیے۔

"یہ تو پری ہے صاحب! اس سے میں پیسے کیسے لے سکتا ہوں؟" وہ بے اختیار بولا۔ مگر وہ "رکھ لو رکھ لو شاباش!" کہتے وہاں سے چلے گئے تھے۔

"پریوں سے لیتے نہیں' پریوں کو تو دیتے ہیں صاحب۔" ہاتھ میں پکڑے نوٹ کو دیکھتے ہوئے وہ زیر لب بڑبڑایا۔

☼ ☼ ☼
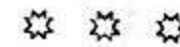
"میں تو نہیں سمجھتا کہ تمہاری زندگی کے حالات غیر فطری ہیں۔" ڈاکٹر رضا حسین نے نادیہ کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "غیر فطری ہوتے تو تم آج اس مقام پر نہ ہوتیں' جہاں کھڑی ہو کر مجھ سے مخاطب ہو۔"

"یہ اس رد عمل کا نتیجہ ہے' جو میں نے غیر فطری حالات پر اپنایا اور اس کی تقلید کی۔ منصوبے بنانا اور منصوبوں پر عمل کرنا تو انسان کے اپنے اختیار میں ہوتا ہی ہے۔"

"چلو! فرض کرتے ہیں کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" ڈاکٹر رضا نے اپنی میز پر رکھی ایک کتاب کا ذرا سا اکھڑا ہوا کونا درست کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن پھر اس سوال کا ممکنہ جواب کیا ہوگا کہ منصوبے بنانا تم نے کہاں سے سیکھا۔ ایک منفی عمل کا رد عمل مثبت ہو تو بھی یہ سوال تو ذہن میں آنا چاہیے تاکہ منفی عمل اور منفی سوچ کے درمیان رہنے والا شخص مثبت ہوا تو کیسے ہوا؟ تمہارے بقول تمہاری والدہ کی شخصیت منفی تھی۔ تمہارے والد کا قول و عمل تمہارے حق میں منفی ثابت ہوا۔ تمہارے بچپن سے لے کر اس وقت تک کے حالات' جب تم نے ان سے فرار حاصل کرنے کی ٹھانی' سب کا سب منفی تھا۔ پھر تم مزید منفی سوچ' سوچنے کے بجائے مثبت کیسے ہو گئیں؟ کچھ تو ایسا ہوگا تمہارے اردگرد جس نے تمہیں یہ مشورہ دیا کہ تمہارے لیے کیا بہتر ہے؟"

"انسان کے پاس اپنا دماغ بھی تو ہوتا ہے نا۔" نادیہ نے اپنے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یقیناً۔۔۔ مگر دماغ تو اپنے اردگرد کہی سنی باتوں سے ہی نقوش لیتا ہے۔" ڈاکٹر رضا نے سر ہلایا۔

"پھر۔۔۔" نادیہ نے اپنی کرسی پر سیدھے ہوتے ہوئے اپنا کوٹ درست کیا۔ "آپ بتائیں کہ حقیقت کیا ہے' آپ وہ بتا دیں جو آپ اس بات میں سے مجھے سمجھانا چاہتے ہیں۔"

ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "میں تمہیں خود کچھ بتانا نہیں چاہتا۔ میں فی الحال صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم اپنے سبق آپ پڑھو۔ زندگی کی کتاب میں کس سوال کا حل' کس صفحہ پر درج ہے۔ میں صرف صفحہ نمبر کی نشان دہی کر سکتا ہوں تمہارے لیے۔ باقی کا کام تمہیں خود ہی کرنا ہوگا۔"

"تو؟" نادیہ نے ابرو چڑھا کر سوالیہ انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

"تو یہ کہ آج واپس جا کر غور کرنا کہ کیا تمہارے اردگرد کچھ ایسا تھا' جس نے تمہیں مثبت اور منفی میں تفریق کرنا سکھائی اور پھر تمہیں اپنا راستہ خود انتخاب کرنے کا شعور دیا؟ اگر اس سوال کا جواب سمجھ میں آجائے تو مجھے ضرور بتانا۔" وہ مسکرا کر بولے۔

"ان چھوٹی چھوٹی گتھیوں کو سلجھاتے تو میرا یہ فارغ وقت یوں ہی گزر جائے گا۔" نادیہ نے شکوہ بھرے انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

"چھوٹے چھوٹے قدم ہی نقطۂ آغاز ثابت ہوتے ہیں۔ ابتدا میں ہی بڑا قدم اٹھانے کی کوشش کروگی تو گر جاؤ گی۔" وہ ایک بار پھر نرمی سے مسکرا کر بولے۔ "یہ مت بھولنا کہ فن لینڈ سے انگلینڈ تک کی ہجرت تم نے یوں ہی نہیں کی۔"

"آپ کی باتیں بظاہر بالکل معمولی محسوس ہوتی ہیں۔ لیکن ہوتی وہ دراصل غیر معمولی ہیں۔۔۔ اور غیر معمولی ہونے کا یہ احساس ہی مجھے باور کراتا ہے کہ میں غلط جگہ پر نہیں آئی۔" نادیہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"خود کو ابھی وقت دو۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا پیپر ویٹ گھماتے ہوئے کہا۔ "فوراً فیصلہ مت کرلو کہ کیا معمولی ہے' کیا غیر معمولی۔۔۔ اور یہ کہ تم درست جگہ پر آئی ہو یا غلط جگہ پر۔"

"چلیں۔۔۔ ٹھیک ہے۔" نادیہ نے سر ہلا کر کہا۔ "جب سمجھ میں آجائے گا' دوبارہ حاضر ہو جاؤں گی۔"

"کسی مذہب کی تقلید کرنا مسئلہ نہیں ہے۔ مسئلہ تب ہوتا ہے' جب انسان کو اپنے لیے خود فیصلہ کرنا پڑے کہ اگر وہ کسی عالمی ضابطہ حیات سے منسلک ہونا چاہتا ہے تو وہ ضابطہ حیات کون سا ہو۔ خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو کسی ایک مذہب کی تقلید کرنے والے گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں۔ اسی کے زیر اثر پیدا شدہ ماحول میں پلتے بڑھتے ہیں۔ آنکھیں بند کرکے اسی ضابطہ حیات کے صحیح اور غلط اور رسومات پر عمل کرتے کرتے اپنی زندگی گزار کر دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ کارزار حیات کا کم از کم ایک پہلو تو ہوتا ہے' جس میں انہیں اپنے لیے فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مسئلہ تو میرے جیسے لوگوں کے لیے جنہیں اپنے لیے ایک ضابطہ حیات انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ اور بدقسمتی سے جو مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان زندگی گزارتے رہے ہوں۔ آنکھ بند کرکے

پر ہی اٹھا لینے کا سا انتخاب تو یہ ہے نہیں۔ اس میں تو منتخب کرنے والے کی آنکھیں اور کان دونوں ہی کھلے ہونے چاہئیں۔ میں لندن میں ہوں۔ جہاں مجھے اذان کی آواز سن کر سر ڈھانپ لینے والے بھی ملتے ہیں۔ مندروں میں بجتی گھنٹیاں سن کر اشلوک پڑھنے والے بھی 'ست سری اکال کرتے کیس اور کرپان کے مقلد بھی' اپنے مردوں کو کھلے میدان میں چیل کووں کا شکار بن جانے کے لیے چھوڑ دینے والے آتش پرست جین بھی' صلیب کا نشان سینوں پر بنا کر خدا کا کرم مانگنے والے عیسائی بھی۔ یہاں کیسری لبادے پہنے سر منڈوائے ممبو جمبو کرتے بودھ بھی اور داؤدی ستارے کو مقدس جاننے والے بھی ہیں اور وہ بھی ہیں جو کسی الہامی یا غیر الہامی مذہب یا نظریے کو سرے سے مانتے ہی نہیں۔ اب جہاں انتخاب کے لیے ترجیحات کا ایسا رنگا رنگ مجموعہ سامنے ہو۔ وہاں انسان کی آنکھیں کھلی نہ ہوں اور کان ٹھیک سے سنتے نہ ہوں تو کیا وہ اپنے لیے کوئی درست فیصلہ کر سکتا ہے؟" اس شام اس نے شیکھر کو ایک لمبی میل میں لکھا تھا۔

"فیصلہ تو تم کر چکی ہو نادیہ بلال! اب تو بس اس پر عمل در آمد کا مرحلہ درپیش ہے۔ لہٰذا مجھے تو ترجیحات کے رنگا رنگ مجموعے کی کہانی نہ سناؤ۔" شیکھر شاید اس وقت آن لائن تھا۔ جب ہی اس کا فوری جواب آگیا تھا۔

"میں فیصلہ کر چکی ہوں۔" شیکھر کا جواب پڑھ کر نادیہ نے خود سے پوچھا تھا۔ "شاید ایسا ہی ہے۔" اسے کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا۔ "جب ہی میں ڈاکٹر رضا حسین کے پاس پہنچی۔ کسی روی شنکر' کسی ولیم اسمتھ' کسی ایز ہرمز ہوائے یا وکرم سنگھ کے پاس نہیں گئی۔" وہ سوچ کر خود ہی مسکرا دی۔

"سچ تو یہ ہے کہ شیکھر ٹھیک کہتا تھا۔ میرے لاشعور میں بیٹھے تعصبات مجھے کسی اور سمت رخ موڑنے دے ہی نہیں سکتے تھے۔"

☼ ☼ ☼

وہ سفید چاندنی پر گھٹنے موڑ کر بیٹھی تھی اور مبہوت ہو کر کھاری کی ساس کی آواز میں نعت سن رہی تھی۔ اس نے چند ہی محافل میلاد و ذکر میں شرکت کی تھی اور وہ محافل بھی بہت فیشن ایبل طبقہ اول کے گھروں پر ہونے والی محافل تھیں۔ جن میں محافل میں ہونے والے درس اور حمد و نعت پر کان دھرے جانے سے زیادہ حاضرین محفل کے لباس و انداز اور نشست و برخاست پر نظر دھری جاتی تھی۔ جوں ہی پروگرام کے تمام جز نمٹتے گویا زبانوں کے قفل کھل جاتے۔ باتیں' قہقہے' دوپٹے سروں سے اتار کر ہیر اسٹائلز کی نمائش' ملبوس و تزئین کو سراہے جانے کا عمل شروع ہو جاتا۔ مگر تائی صابرہ کے گھر میں ہونے والی محفل میلاد و ذکر میں سادگی تھی اور درس سنے جانے کے دوران لرز لرز کر اپنے گناہوں کی معافی کے لیے روتے ہوئے فریاد کرنے والیوں کی کمی نہ تھی۔

تائی صابرہ کے بہت اصرار پر بھی کھاری کی ساس نے درس نہیں دیا تھا۔ وہ ناسازیٔ طبع کا عذر کر کے ایک طرف ہی بیٹھی رہی تھیں۔ لیکن نعت گوئی کی محفل کے دوران تائی صابرہ نے ان کا کوئی عذر نہیں سنا تھا اور اب وہ حاضرین محفل کے درمیان بیٹھی آنکھیں بند کیے نعت گوئی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ نعت خواں کی آواز میں وہ کیا چیز ہوتی ہے' جو لفظ سیدھے دل پر اثر کر جاتے ہیں۔ دل میں سکون اترتا ہے اور اس عظیم ترین ہستی سے محبت میں سرشاری بھی عطا ہو جاتی ہے۔ آنسو آنکھوں سے خود بخود بہہ نکلتے ہیں۔

ماہ نور کو ایسا لگا جیسے ایسی صاف شفاف آواز اس نے شاید ہی کبھی سنی ہو۔ الفاظ کا بہاؤ تھا اور جذبات کا عقیدت کا رچاؤ۔ منہ سے لفظ موتیوں کی طرح جھڑ رہے تھے۔

اس نے نظریں گھماتے ہوئے اپنے اردگرد بیٹھی ان پڑھ' سادہ' دیہاتی عورتوں کو دیکھا۔ ان سب پر بھی جیسے کھاری کی ساس کی آواز کا جادو طاری تھا۔ ان میں سے اکثر آنکھیں بند کیے جھوم رہی تھیں۔ ان میں سے اکثر کو یہ

الفاظ سمجھ میں آرہے تھے یا نہیں۔ لیکن ان کے لیے یہ احساس ہی کافی تھا کہ یہ الفاظ اس ہستی کے لیے کہے جارہے ہیں۔ جس کی ناموس پر وہ خود بھی کٹ مرنے کو تیار ہو سکتی ہیں اور اپنے بھائی ' بیٹے اور شوہر بھی کٹا سکتی تھیں۔

"شاید اس لیے اس کو عالم گیر مذہب کہا جاتا ہے۔" ماہ نور نے سوچا۔ "نہ اس کے لیے نسل کی کوئی اہمیت ہے ' نہ رنگ کی ' نہ جغرافیائی سرحدوں کی۔ بس عقیدہ ہے اور عقیدت ہے۔"

اسے لگا جیسے اس محفل میں بیٹھ کر خود اس پر بھی کئی دنوں سے چھائی بے چینی اور اضطراب کی کیفیت آہستہ آہستہ معدوم ہونے لگی تھی۔ عرق گلاب کا چھڑکاؤ ' اس نے لمبا سانس لیتے ہوئے اس مخصوص خوشبو کو محسوس کیا۔

"یقیناً" خوشبوؤں کے اس استعمال کی کوئی منطقی روایتی اور تاریخی وجہ ہوگی۔ یوں ہی تو ایسے ہر ماحول میں ان کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ ان کا استعمال ماحول میں پاکیزگی کا ایک تاثر ابھارتا ہے اور دلوں اور ذہنوں کو ایک نفسیاتی سکون عطا کرتا ہے۔" اسے خیال آیا۔

"آج کی جدید دنیا اروما تھراپی کے ذریعے جو طریقہ علاج کا شور مچا رہی ہے ' ہو سکتا ہے اس کا اوریجن یہ ہی ہو۔" اسے یاد آیا۔

"میری پیاری بہنو! میں بالکل مختصر بات کرنا چاہوں گی۔" نعت خواں کی آواز بلند ہوئی۔ "اور وہ یہ کہ دنیا کی تمام دولتوں سے اوپر سب سے بڑی دولت وہ ہے ' جو اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو عطا کر رکھی ہے اور جسے ہم باقی دنیاوی دولتوں کے حصول کی خاطر ہاتھوں سے گنوائے چلے جارہے ہیں۔" وہ کہہ رہی تھیں۔

"میری بہنو! وہ دولت ' سکون کی دولت ہے۔ لیکن دنیاوی چیزوں کی کشش کے پیچھے لگ کر ہم زندگی کی یہ سب سے بڑی دولت اپنے ہاتھوں سے ضائع کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے گھر سازو سامان سے بھر جاتے ہیں۔ ہمارے دسترخوان پر قسم ہا قسم کے کھانے چن جاتے ہیں۔ ہمارے بکسے نئے لباسوں سے بھر جاتے ہیں۔ فرشوں پر قالین ' کھڑکیوں پر پردے ' بستروں پر آرام دہ گدے۔ ہم اپنی نظر اور جسم کے لیے خوب صورتی اور آسانیاں خریدنے کے لیے جائز و ناجائز طریقوں سے اپنے بٹوے بھرتے ہیں اور بازاروں میں جا کر دکانوں پر کھڑے کھڑے خرچ کر دیتے ہیں۔ مرد شش ماہی محنت کی کمائی فصل بیچ کر ہماری ہتھیلیوں پر رکھتے ہیں تو ہمارے من چاہے منصوبوں کی خریداری کی حد اس کمائی کی حد سے پہلے ہی بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ مرد مقروض ہو جاتا ہے اور ہمارے دل کی حسرتیں اب بھی پوری نہیں ہوئی ہوتیں۔"

کھاری کی ساس بول رہی تھیں اور حاضرین میں بیٹھی خواتین جن میں سے اکثریت کم پڑھی لکھی ' بلکہ ان پڑھ ' سیدھی سادی دیہاتی عورتیں تھیں۔ آنکھیں بند کیے "بے شک بے شک ' سچ آکھیا جے" قسم کے الفاظ دہرا رہی تھیں۔

"ہم جس ہستی کی یاد میں یہ محفلیں سجاتے ہیں۔ اس ہستی کی تعلیم یہ نہیں تھی۔ میری بہنو! سادگی اور غنا ' فقر اور توکل۔" کھاری کی ساس کی آنکھیں بھیگنے اور آواز بھرانے لگی۔ "چار نکات کا ایجنڈا۔" کانپتی آواز میں وہ بمشکل بولیں۔

" اور ہماری زندگیوں میں اس ہستی کا صرف ذکر باقی رہتا جاتا ہے۔ نکتے تو ایک ایک کرکے ہم نے اپنی خواہشوں کے ریلوں سے مٹا دیے۔ ان کی مدح میں نعت کے لفظ وقتی تحسین ' وقتی عقیدت ابھارتے ہیں ' دل کی تسلی کی جاتی ہے ' ہو جی! ہم نے ذکر کرکے اپنے سیاہ کو سفید کر لیا۔ مگر کیا اس دربار میں ان کھوکھلی باتیں کرنے والوں کی شفاعت کی کوئی گنجائش بنے گی؟ کیا یہ سوال نہیں اٹھے گا کہ ہم نے تو سیدھا سادا سبق پڑھایا تھا۔ تمہیں

وہ بھی یاد نہ رہا۔ ہائے میری بہنو! میرے سوہنے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی امت کی بی بیو! میری تم سے ہاتھ جوڑ کر درخواست ہے۔" انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر خواتین کے سامنے کیے۔

"ان سانپوں اور بچھوؤں کی خریداری میں ' لپلپاتی آگ کو روشنی جان کر اس کے تعاقب میں اپنی اصلی ' سچی دولت نہ گنوا دو۔ اپنے دل کے چین اور سکون کو اپنی مٹھیوں میں اس طرح میٹے رکھو کہ خواہش کے رہزن اور نفس کے ڈاکو ان پر حملہ کرکے انہیں اڑا نہ لے جائیں۔ ان چار نکات کے ایجنڈے کو سمجھو۔ اس کے رنگ اور روشنائی کو پھیکے نہ پڑنے دینا میری بہنو! ایک وقت جلنے والا چولہا بھلا۔ ایک دھویا ایک پہنا لباس بھلا۔ دو کمروں کا سادہ گھر بھلا۔ اپنی ہانڈیوں کو نت نئے پکوانوں سے بھر دینے کے شوق میں ' جسم کو ہر روز نئے لباس سے سجانے کی چاہ میں ' سب سے بڑی دولت ' اپنا بہترین خزانہ لٹانے سے بچو میری پیاری بہنو! میری آپ سب سے بس یہی ایک درخواست ہے اور ہاتھ جوڑ کر درخواست ہے۔"

بات ختم کرتے ہوئے ان کے آنسو تواتر سے بہنے لگے اور ان کے دونوں ہاتھ ایک بار پھر آپس میں جڑ کر ان کے سامنے تھے۔ محفل میں موجود خواتین نے الفاظ کی تاثیر میں کھو کر زارو قطار رونا شروع کر دیا تھا اور چند خواتین عقیدت کے مارے کھاری کی ساس کے ہاتھ چومنے میں مصروف تھیں۔ وہ "ہائے ہائے اور توبہ توبہ" کرتی اپنے ہاتھ چھڑا رہی تھیں۔ مگر خواتین تھیں کہ نہ ہاتھ چھوڑ رہی تھیں ' نہ ان کی ٹانگیں ' جن سے وہ لپٹی جا رہی تھیں۔

"نی پیچھے ہٹو نی ' مولوانی جی کو پنکھے کی ہوا لگنے دو ' کیوں ان کے اوپر چڑھی مری جا رہی ہو؟"

تائی صابرہ نے اٹھ کر شدت گریہ سے سرخ پڑتی ناک کو ہاتھ میں پکڑے رومال سے رگڑتے ہوئے کہا۔ کھاری کی ساس کی درخواست ان پر بھی اثر کر چکی تھی۔ ان کی آواز پر خواتین ذرا ذرا پیچھے کھسکیں ' مگر اس طرح کہ پیچھے کھسکنے پر بھی کھاری کی ساس کے قریب ہی رہ سکیں۔

"نی رضیہ! نی سکینہ! چلو شربت پلاؤ پہلے سب کو اور باہر مردانے میں اطلاع کر دو ' محفل ختم ہو گئی۔ روٹی کھول دیں۔ ادھر کھاری ہو گا باہر حویلی میں۔ اسے پیغام دو بس ' باقی وہ خود ہی دیکھ لے گا۔"

وہ بلند آواز میں نہ جانے کس کس سے مخاطب تھیں۔ اپنا اعلان ختم کرکے واپس اونچے پیڑھے پر بیٹھتے ہوئے کہ گھٹنوں کے درد کے باعث وہ فرش پر نہیں بیٹھ سکتی تھیں۔ ان کی نظر ایک کونے میں سمٹ سمٹا کر بیٹھی کھاری کی نئی نویلی دلہن پر پڑی۔

"ہائے نی دھی رانی!" انہوں نے بے اختیار کہا۔ "تو ادھر ایک طرف الگ تھلگ کیوں بیٹھی ہے؟ چل ادھر آ پنکھے تلے بیٹھ ' آجا شاباش ادھر آ کر اپنی ماں کے پاس بیٹھ۔"

انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ لڑکی کے ساتھ بیٹھی خاتون نے اسے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔

ادھر ادھر بیٹھی خواتین کے درمیان کی تنگ جگہ پر بمشکل پاؤں جماتی پہلے وہ تائی صابرہ کے پاس پہنچی۔ جنہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار دیا اور پھر ذرا تیز قدم رکھتے اپنی والدہ کے پاس پہنچی۔ کھاری کی ساس آنکھیں بند کیے درود پاک کے ورد میں مشغول تھیں۔

"اماں!" کھاری کی دلہن نے ماں کے گھٹنے پر سر رکھا اور رونے لگی۔ کھاری کی ساس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔

"اماں! ساری عمر آپ کہاں تھیں؟" کھاری کی دلہن نے روتے روتے ان کا چہرہ پکڑ کر کہا۔ "مجھ سے بھی پردہ کیے رکھا آپ نے۔ میری نظروں سے بھی پوشیدہ رہیں خلقت کو جو سبق آپ نے آج پڑھایا ' میری الف ب کے ساتھ مجھے کیوں نہیں پڑھایا اماں؟ ساری عمر آپ کہاں رہیں اماں؟"

کھاری کی دلہن کے یہ الفاظ اس محفل میں بیٹھی کسی عورت کی سمجھ میں نہ آئے تھے۔ وہ حیرت سے منہ کھولے، دانتوں میں انگلیاں دبائے، سرگوشیوں میں تبصرے کرتی، اس عمل پر ردعمل ظاہر کر رہی تھیں۔ مگر جو کچھ کھاری کی دلہن کہہ رہی تھی۔ اسے صرف وہ خود یا اس کی اماں ہی سمجھ سکتی تھیں۔ خلقت نہیں جان سکتی تھی کہ الفاظ کے بیان واثر نے ماں اور بیٹی کے درمیان عمر کا فاصلہ کتنا کم کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے گرد آلود تاریک اسٹوڈیو میں بلب کا بٹن دبا کر اسے روشن کیا۔ بلب پر بھی یقیناً "گرد کی" ایک دبیز تہ موجود تھی، جب ہی اس کی روشنی کمرے میں موجود ہر چیز کو پوری طرح روشن کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ اس نے دروازے کے قریب کھڑے ہو کر کم روشنی میں کمرے کا جائزہ لیا۔ اسے اس پینٹنگ کو ڈھونڈنا تھا۔ جس کا عنوان "midnight in heaven" تھا۔ طائرانہ نظر ڈالنے پر اسے وہ پینٹنگ نظر نہیں آئی۔ آگے بڑھ کر اس نے عین اس جگہ پر چیزوں کو الٹنا پلٹنا شروع کیا۔ جہاں وہ پینٹنگ پچھلی بار اسے دکھائی دی تھی "اوہ!" اس کے ہونٹ سکڑے۔ وہ پینٹنگ اپنی جگہ سے غائب تھی۔

"اس کا مطلب خاتون یہاں آتی رہتی ہیں۔" اس کے ذہن میں فوراً "خیال آیا۔

"ہو سکتا ہے یہ محض میرا خیال ہو، دیکھنا چاہیے مزید۔" اس نے کاٹھ کباڑ ہٹا ہٹا کر دیکھنا شروع کیا۔ مختلف چھوٹے چھوٹے اوزاروں، جو غالباً "مجسمہ سازی کے کام آتے ہوں گے۔ پھٹے پرانے کاغذوں اور اخبارات کے انباروں تلے اس کے ہاتھ نے ایک نرم کپڑے کو جا چھوا۔ ایک اونچی میز کے پیچھے چھپے اس کاٹھ کباڑ تک بلب کی روشنی تقریباً "نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس نے اٹکل پچو ہاتھ مار کر اس کپڑے کو دوبارہ چھونا چاہا۔ جس سے لمحہ بھر پہلے اس کا ہاتھ مس ہوا تھا۔

"اف۔۔۔" اگلے لمحے اسے تڑپ کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس کا ہاتھ کسی تیز دھار چیز سے جا ٹکرایا تھا اور اس کے انگوٹھے کے نیچے کلائی اور ہتھیلی کے درمیان ایک لمبا کٹ آچکا تھا۔ پتلا، سرخ خون تیزی سے بہنے لگا۔ اس نے کسی ایسی چیز کی تلاش میں دائیں بائیں دیکھا، جس کو بہنے والے خون کے منبع پر رکھا جا سکے۔ مگر وہاں موجود سب گرد آلود چیزوں میں سے کسی ایک کا بھی استعمال برا ثابت ہو سکتا تھا۔

زخم کی پروا نہ کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر جھک کر وہیں ہاتھ ڈالا جہاں ہاتھ ڈالنے پر زخم آیا تھا۔ کپڑا اس کے ہاتھ میں آیا اور اسے محسوس ہوا کپڑے کے نیچے کوئی ٹھوس چیز موجود تھی۔ کپڑے کو ایک طرف ہٹانے کے بعد اس نے اندازے سے ہی اس ٹھوس چیز کو ہاتھ سے جانچنے کی کوشش کی۔

"شاید یہ کوئی ریلیف ہے۔" ہاتھ کے سگنلز نے اس کے ذہن میں خیال پیدا کیا۔ اس نے مضبوطی سے ہاتھ جمایا۔ وہ ٹھوس شے بازو پر زور ڈالنے سے ہاتھ کے شکنجے میں دبی اوپر اٹھ گئی۔

"ہوں۔" اس نے لمبا سانس لیتے ہوئے اس چیز کو میز کی سطح پر رکھا۔ مدھم بلب اس چیز کو روشن کر رہا تھا۔ یہ ایک سنگی سر تھا۔ سعد نے اس سنگی سر کا ہاتھ سے رخ موڑ کر اس کا چہرہ روشنی کی طرف کیا اور اس پر نظر پڑتے ہی دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

"آہ۔" اس نے نہ جانے کس تکلیف کی شدت کے اثر میں آنکھیں بند کر لیں۔ ہتھیلی سے بہتا خون کلائی پر چلتا بازو تک پہنچ رہا تھا۔ خون کے ٹپکتے قطرے گرد آلود فرش پر بھی گر کر جم رہے تھے۔ یقیناً "یہ خون اس کے شکن آلود ٹراؤزر اور شرٹ پر بھی تجریدی نمونے ظاہر کر رہا تھا۔ مگر اس وقت شاید وہ کسی دوسری چیز کی طرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میز کی سطح پر رکھا سنگی چہرہ اس کے ذہن سے باقی ہر احساس لے اڑا تھا۔ شاید اسے اس سنگی چہرے کے

نقوش، زخم سے زیادہ تکلیف دے رہے تھے۔ اس نے آنکھیں ایک بار کھولنے کے بعد دوبارہ میچیں اور پھر کھول کر اس چہرے کے خطوط دیکھنے لگا۔

"کیا مزید بھی کچھ دیکھنا باقی ہے؟" اس نے خود سے سوال کیا۔

"نہیں۔" پھر اس نے خود ہی نفی میں سر ہلایا۔

"سوئے ہوئے محل کا ہر فرد جاگ چکا ہے، مجھ سمیت۔" اس نے نچلا ہونٹ عادتاً "دانتوں تلے دباتے ہوئے جیسے اس سنگی چہرے کو مخاطب کیا اور پھر ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ "میرا لہو بھی اس چہرے پر نظر آنے لگا ہے۔"

اس کی نظریں اس چہرے کے اس حصے پر رک گئیں، جہاں اس کے ہاتھ کے نشان ابھر آئے تھے۔ چہرے کے خطوط پر پڑی ہلکی گرد پر خون آلود ہاتھ کے نشان۔ وہ ایک بار پھر تکلیف کی شدت سے آنکھیں میچتا پیچھے مڑا۔ شاید اب وہ مزید اس کمرے میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ پیچھے مڑ کر اس نے تیزی سے وہاں سے نکل جانا چاہا۔ نکلتے نکلتے اس کی نظر کھڑکی کے قریب الٹے پڑے ایک کینوس پر پڑی۔

اس نے آنکھیں سکیڑ کر غور سے دیکھنے کی کوشش کی اور پھر آگے بڑھ کر اس الٹے کینوس کو سیدھا کیا۔ وہی پینٹنگ تھی۔ جس کی تلاش میں وہ اس کمرے تک آیا تھا۔

"midnight in heaven" نامی پینٹنگ پر زیادہ بالوں والے برش سے آڑے ترچھے، سیدھے الٹے رنگ پھیر دیے گئے تھے۔ رنگوں کی ان بے ترتیب لکیروں کے نیچے سے کہیں کہیں دردزہ میں مبتلا بچہ جنتی اس عورت کا چہرہ نظر رہا تھا۔ جسے اپنے ذہن میں وہ ایک نام سے محفوظ کر چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کنوؤں میں بانس بھی ڈل گئے اور ویرانوں میں شکاری کتے بھی چھوڑ دیے گئے۔ پھر بھی ولی عہدِ سلطنت کا کچھ پتا نہیں چلا۔" رازی نے صوفے پر گر کر ہانپنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"سو؟" ضوفی نے ہاتھ میں پکڑا میگزین میز پر رکھتے ہوئے اس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔ "اب بادشاہ سلامت کا نیا فرمان کیا ہے، منادی کرائی جائے یا پھر خفیہ والوں سے رابطہ کیا جائے؟"

"منادی کے جو ذرائع ہیں نا ضوفی! وہ بادشاہ سلامت کی کاروباری سلطنت کے لیے انتہائی برے ثابت ہو سکتے ہیں۔ منادی وہ رقم لے کر کریں گے اور چیدہ چیدہ منحوس خبریں کاروباری سلطنت کے بارے میں مفت نشر کریں گے۔"

"یہ تو ہے۔" ضوفی نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا۔ "توڑتی خبریں یعنی بریکنگ نیوز کی مد میں جو کچھ ٹوٹے گا۔ باس اس کا متحمل نہیں ہو سکتا، ہے نا؟" اس نے رازی کی طرف دیکھا۔

"یا اللہ! یہ کیسی نوکری ہے، جہاں کبھی گھر کا ساگ اور ٹنڈوں کا تسمہ بنانا پڑتا ہے اور کبھی ولی عہد سلطنت کی تلاش میں دشت و صحرا میں گھوڑے دوڑانے پڑتے ہیں۔" رازی نے ضوفی کی بات کا جواب دینے کے بجائے دونوں بازو ہوا میں بلند کر کے دہائی دی۔

"ضوفی! چلو بھاگ چلیں۔" پھر وہ پہلو بدل کر ضوفی سے مخاطب ہوا۔ "وہیں واپس دبئی چلیں، چل کر شیخ کے گھوڑوں کی نعلیں جوڑتے ہیں اور کتوں کو شیمپو کرتے ہیں، دوبارہ سے۔"

"فوہ رازی!" ضوفی نے اس کی تجویز کو ذرہ برابر بھی گھاس نہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "اتنا ذرا سا پریشر نہیں برداشت کر سکتے، سارا سال عیش کرنے کے بدلے؟ سال کے آخر میں اگر تمہیں ٹویوٹا کمپنی کے ٹیچر اور مرسڈیز کے

گھوڑے مارگلہ کے دشت اور گلیات کے کوہ ساروں میں دوڑانے پڑ گئے ہیں تو بس تمہارے والی بس ہو گئی اور تم دوبارہ سے اس درجہ "ب" کی نوکری کا سوچنے لگے 'جس کے عوض تمہیں رہنے کو اصطبل کا کمرا اور خرچنے کو چند سو درہم ملتے تھے۔ تف ہے تم پر بھی رازی۔" اس نے سر جھٹکا اور دوبارہ سے میز پر رکھا میگزین اٹھالیا۔

"کاش! تمہیں ان کونوں کھدروں کی سیر کرنا پڑتی 'جہاں باس کے خیال میں اس کے سپوت کے پائے جانے کے امکانات ہو سکتے ہیں تو میں تمہیں پوچھتا' وہ درجہ "ب" کا اصطبل بہتر ہے یا یہ درجہ "الف" کی ایکسی؟" رازی نے ارد گرد نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "اوپر سے وہ تو ندیل وہ ابراہیم جو ہے 'جس کی ذہنی حالت پر مجھے پورا شک ہے۔ وہ صاف لگتا ہے 'ہمیں چکر دے رہا ہے۔ اسے خوب معلوم ہے 'سعد سلطان کہاں چھپا بیٹھا ہے اور وہ ہمیں کبھی گوجر خان کے کسی بابا کے آستانے پر اور کبھی کسی رکی ماسٹر کے پاس لے جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ سعد سلطان ایسی ہی جگہوں پر جایا کرتا ہے۔ مجھے لگتا ہے 'صاف چکمہ دے رہا ہے۔ چاہے سعد سلطان اسی کے گھر کے کسی کونے کھدرے میں بیٹھا ہو۔"

"ایسا لگتا ہے تو اس کا بالکل سادہ علاج ہے۔ کسی وقت بغیر اطلاع کے جا دھمکو اس کے گھر۔ اس سے بولو تمہارے گھر کا نیا انٹیریر چیک کرنا ہے۔ اس لیے گھر تو گھماؤ اپنا۔" ضوفی نے میگزین سے نظریں اٹھا کر مشورہ دیا۔

"چوہے پکڑنے کا پنجرہ نہ ہاتھ میں پکڑلوں ابراہیم کے گھر جانے سے پہلے۔" رازی نے جھلا کر کہا۔ "اور اسے بولوں مجھے گھر کا ہر کونا دکھاؤ۔ میں چوہے پکڑنے کا ماہر ہوں۔ انٹیریر دیکھنے کے ساتھ ساتھ تمہارے گھر سے سب چوہوں کا بھی صفایا کردوں گا۔"

"سب چوہوں کا نہیں 'صرف ایک بے مونچھ چوہے کا' جو پانچ گھر سے نکلے چوہوں کا سردار ہے۔" ضوفی نے نفی البدیہہ جواب دیا۔

"یہ پانچ گھر سے نکلے چوہے؟" رازی نے احمقوں کی طرح ضوفی کی طرف دیکھا۔ "وہ کون ہیں؟"

"تم اور تمہاری کمزور معلومات عامہ۔" ضوفی نے سر جھٹکا۔ "تم نے پانچ چوہے گھر سے نکلے کرنے چلے شکار والی نظم نہیں پڑھ رکھی نا؟"

"نہیں۔" رازی نے سرہلایا۔

"بس پھر تمہیں کیسے سمجھ میں آئے کہ آخر میں جو اکیلا چوہا رہ جاتا ہے 'وہ شادی کر لیتا ہے۔ جس سے بربادی کی داستان مکمل ہو جاتی ہے۔" ضوفی ہنس رہی تھی۔

"اکیلا چوہا شادی کر لیتا ہے؟" رازی نے چونک کر کہا۔

"ہاں!" ضوفی نے سرہلایا۔

"بس پھر اکیلا چوہا یعنی باس شادی کرلے گا آخر میں 'ہے نا؟" رازی کو خیال سوجھا۔

"باس۔" ضوفی زور سے ہنس دی۔ "وہ بے چارہ جو بیوی کے بغیر برسوں سے تنہا زندگی گزارتے گزارتے اس عمر کو آن پہنچا ہے کہ کنپٹیوں اور مونچھوں کے بال سفید ہونے کو آئے ہیں۔ بات کرو کوئی کرنے والی۔"

"تم کیا سمجھتی ہو باس کے یہ چند بال دھوپ میں سفید ہوئے ہیں کیا؟" رازی نے اسے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ "مجرد زندگی گزارنا بڑی ریاضت کا کام ہے ضوفشاں خانم! باس کو باس ہی سمجھو' تارک الدنیا درویش نہیں۔"

"میں تو باس کو جو سمجھنا چاہتی ہوں' سمجھ ہی لوں گی 'لیکن تم اپنی فکر کرو۔" ضوفی نے دیوار پر سجے کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "تم کو یاد دلادوں کہ رات کا نصف ہو چکا' یعنی بارہ بج چکے ہیں اور اگلا دن آگیا۔ اگلا دن تم نئے کنویں' نئے بانس' یوسف ثانی خواہ بازار مصر میں بک رہا ہو' تمہیں کنویں بہرحال کھنگالنے ہی پڑیں گے۔" وہ مسکرائی۔

"وہ میرے خدا!" رازی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔

☆ ☆ ☆

ماہ نور نے اپنی ماں کی ٹانگوں سے لپٹی کھاری کی دلہن کو دلچسپی سے دیکھا۔ وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح رو' رو کر ان سے پوچھ رہی تھی۔

"اماں! آپ کہاں تھیں اب تک؟ اماں! آپ مجھے ملیں کیوں نہیں؟"

محفل میں شریک خواتین کا خیال تھا کہ وہ شادی کے بعد ماں سے دور ہو جانے کی وجہ سے ایسا کر رہی تھی' جبکہ ماہ نور کا اپنا خیال تھا کہ اس کی اس بات کے پیچھے ضرور کوئی اہم راز چھپا تھا۔

"او کھاری' وے کھاری!" رضیہ نے دالان کے دروازے پر کھڑے ہو کر تمسخر اڑانے کے سے انداز میں آواز لگائی۔ "بھاگ کے آ تیری ووہٹی بے ہوش چلی ہے۔" رضیہ کے انداز سے لگ رہا تھا' وہ تماشا بنانے کے موڈ میں تھی۔

"خاموش رہو رضیہ' کیا بے وقوفی ہے۔" ماہ نور نے تیزی سے اٹھ کر اسے ڈانٹا اور دروازے سے باہر کھڑے کھاری کی طرف دیکھا جو پریشانی کے عالم میں کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں ہوا کھاری! اسے' بس اپنی ماں کو دیکھ کر شاید جذباتی ہو گئی۔" ماہ نور نے نرمی سے سمجھایا۔

"ماہ نور باجی! میں اس لیے پریشان تھا کہ اس نوں ڈرامے بڑے اچھے لگدے نیں۔" کھاری نے بے چارگی سے کہا۔ "آٹھ بجے والا ڈرامہ وہ بڑے شوق سے دیکھتی ہے' مرزے رئیس کی گھر والی کے ساتھ بیٹھ کے تو مجھے وہم ہوا کہیں ڈرامے کا کوئی منظر تو نہیں ادھر دکھانے بیٹھ گئی۔" کھاری نے خجل ہوتے ہوئے کہا۔

"بے وقوف ہو تم بھی' وہ کوئی پاگل ہے یا کم عقل ہے۔ اور وہ اتنی چھوٹی بھی نہیں ہے کہ بغیر سوچے ایسے حرکت کرے۔" ماہ نور نے کھاری کو بھی ڈپٹا۔ "جاؤ تم وہ کرو جو تائی جی نے تمہیں کرنے کو کہا ہے۔"

ماہ نور کی بات سن کر کھاری وہاں سے ہٹ گیا۔ ماہ نور رضیہ کو گھورتی ہوئی واپس دالان میں آ گئی۔ کھاری کی ساس اب اپنے گھٹنے پر رکھے سعدیہ کے سر کو سہلا رہی تھیں۔ وہ خواتین کے درمیان جگہ بناتی ان کے قریب بیٹھ گئی۔

"آپ کی بیٹی شاید آپ کے لیے اداس تھی۔" اس نے بھی نرمی سے سعدیہ کے بالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

جواب میں انہوں نے سر کو اثبات میں ہلایا۔

"کھاری بتا رہا تھا' آپ کو سعد سے کوئی کام تھا۔" ماہ نور نے سعدیہ کے شیمپو ہوئے بالوں کو بے دھیانی میں سلجھاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں!" انہوں نے سر ہلایا۔ "میں نے کھاری سے کہا تھا کہ میں اس لڑکے سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے بتا دیں۔ آپ اس سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟" ماہ نور نے کہا۔

"بیٹا! بات بھی تو امانت ہوتی ہے نا۔" انہوں نے نرمی سے جواب دیا۔ "اب مجھے کیا پتا کہ جو بات میں نے اس سے کہنی تھی' وہ تم سے کہنی چاہیے یا نہیں۔"

"کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔" لیکن ماہ نور نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ کوئی اگر سعد کے لیے سنبھالی بات مجھ سے کر دے گا تو سعد کو برا نہیں لگے گا۔"

"تم اس کی۔۔۔" انہوں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں اس کی کوئی نہیں ہوں آنٹی۔" ماہ نور نے بمشکل مسکراتے ہوئے کہا۔ لیکن زبردستی کی یہ مسکراہٹ اس

کی آنکھوں کو بھیگنے سے نہیں بچا پائی تھی۔

"مگر پھر بھی۔" اس نے انگوٹھوں کی پوروں سے اپنی آنکھوں کی نمی کو چنا۔ "وہ مجھ پر ٹرسٹ کرتا ہے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "ٹرسٹ سمجھتی ہیں نا آپ؟" اس نے ان کی طرف دیکھا۔

"ہاں!" وہ آہستہ سے سر ہلا کر بولیں۔ "میں سمجھتی ہوں۔" انہوں نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ "جس بھروسے کی بات تم کر رہی ہو' وہ کسی کسی پر ہی کیا جا سکتا ہے۔"

"اگر آپ کا دل مانے کہ مجھ پر کیا جا سکتا ہے تو ضرور کیجیے گا۔"

ماہ نور نے کہا اور سر جھکا لیا۔ اس کا سعد سے تعلق اتنا بودا اور نا محسوس تھا کہ کوئی اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کہ سعد کے سلسلے میں اس پر اعتبار کیا جا سکتا تھا۔ ایک نیا تکلیف دہ احساس اس کے اندر جاگا اور اسے لگنے لگا جیسے وہ دنیا کی سب سے مظلوم لڑکی تھی۔

"اگر دو گھڑی فرصت کا ٹائم ہو تو میرے غریب خانے پر آنا' میں تمہیں وہ بات سناؤں گی جو مجھے اس بچے سے کرنی تھی۔" کتنی دیر وہاں بیٹھے رہنے' کھانا کھانے اور خواتین سے مختلف موضوعات پر بات کرنے کے بعد واپس گھر جانے سے پہلے کھاری کی ساس نے اس کے قریب آ کر کہا تھا۔

وہ جو محفل کے فوراً بعد واپس چلے جانے کا تہیہ کر بیٹھی تھی۔ سب خواتین کے جانے کے بعد بھی فرش پر بچھی چاندنیوں میں سے ایک پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔

تائی صابرہ نے آخری مہمان خاتون کو رخصت کرنے کے بعد دالان میں آ کر دیکھا۔ ہلکے سرمئی رنگ پر کاسنی پھولوں والے پرنٹ کی قمیص' سرمئی شلوار اور دوپٹے میں ملبوس' کسی طرح کے بھی میک اپ سے بے نیاز سر جھکائے گہری سوچ میں گم ماہ نور پر انہیں بے تحاشا پیار آ گیا۔ سر پر اوڑھا دوپٹا پنکھے کی ہوا سے سرک کر آدھے سر تک ڈھلک گیا تھا اور کیچر میں جکڑے بال تیز رفتار پنکھے کی ہوا سے ۔۔۔ آزاد ہو کر اڑ رہے تھے۔

"چوہدری صاحب کو پیغام بھجواتی ہوں کہ گاڑی تیار کروا کر ادھر ہی بھیج دیں۔" انہوں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تم دھیان سے کھانا کھالو' میں کھانا لگواتی ہوں' ادھر تو ان عورتوں نے خوب گند پھیلایا۔ بے چاری باجی مریم نے نئی نکور چاندنیاں بھیجی تھیں' لے کر بیڑا غرق کر دیا۔ دھوبی کے پاس بھیجنی پڑیں گی۔" انہوں نے ایک ہی سانس میں تین الگ الگ باتیں کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں تائی جی!" ماہ نور نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ "میں کل صبح چلی جاؤں گی' اب تو نکلتے نکلتے دیر ہو جائے گی۔"

"چلو' یہ تو اچھی بات ہے۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولیں۔ "آئے ہائے ماہ نور! تمہاری آنکھوں کے گرد تو سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں' رنگ بھی خراب ہو رہا ہے۔" "تمہاری ماں کیا کہے گی' میری بیٹی کا یہ حال کر کے بھیجا تائی نے۔ ایک تو ادھر گرمی زیادہ ہے۔ اُدھر فارم ہاؤس میں تو چوبیس گھنٹے اے سی چلتے ہیں۔ ادھر میں نے اے سی نہیں لگوائے' بیاری لکڑی کی چھتیں ہیں' مٹی کی چنائی دیواروں میں' کمرے یوں بھی ٹھنڈے رہتے ہیں' میں رات کو صحن میں سوتی ہوں پنکھا لگا کر' مجھے کمروں میں نیند نہیں آتی گرمیوں میں' اس لیے مجھے اے سی کی ضرورت ہے نہ عادت' اس کی ٹھنڈ میں تو میرے ہڈ پیر اکڑنے لگتے ہیں۔"

"مجھے بھی یہاں گرمی نہیں لگتی تائی جی! اور آپ کو وہم ہو رہا ہے کہ میری رنگت خراب ہو رہی ہے۔ میں ویسی ہی ہوں جیسی تب تھی' جب یہاں آئی تھی۔" ماہ نور نے نیچی آواز میں جواب دیا۔

"تائی جی۔" "کھاری ادھر ہی ہے یا چلا گیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"چلا گیا ہے۔ منیر بتا رہا تھا اسے بخار چڑھا ہوا تھا۔ جسم آگ بنا ہوا تھا۔ پھر بھی کیونکہ میں نے بلایا تھا آ گیا۔ منیر

کو لگا اس کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھ کر اسے واپس فارم ہاؤس بھجوا دیا۔"

"تائی جی! سردار چاچا کھاری کو کہاں سے لائے تھے۔ آپ کو انہوں نے کبھی بتایا۔" ماہ نور نے اگلا سوال ان کی طرف دیکھے بغیر پوچھا تھا۔

"کھاری کو۔" زندگی میں شاید پہلی مرتبہ ماہ نور نے تائی صابرہ کو نیچی آواز میں بولتے سنا۔ "کھاری کو وہ بسوں کے اڈے سے اٹھا کر لائے تھے۔"

"یہ تو سب ہی جانتے ہیں مگر کیا سردار چاچا کو کھاری کے آگے پیچھے کا کچھ پتا نہ چلا۔"

"پتا چلا ہوتا تو بے چارہ غریب ادھر تیرے میرے ہاتھوں میں تو نہ پلتا، جو بھی، جیسی بھی اس کی ماں تھی اس کے ہاتھوں میں پلتا۔" تائی صابرہ نے کچھ یاد کرتے ہوئے سر ہلایا۔

"بس اتنی ہی کہانی ہے کھاری کی تائی جی؟" اس نے ٹٹولتی نظروں سے تائی صابرہ کو دیکھا۔

"مجھے تو اتنی ہی پتا ہے، باقی اللہ جی جانیں۔" تائی صابرہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے بولیں۔ "اب پتا نہیں یہ سب کہاں مر گئیں۔ بریانی میں سے بوٹیاں نکال نکال کر کھا رہی ہوں گی کم بختیں۔" وہ بولیں۔ "نی رضیہ، نی رانی" وہ آوازیں دیتی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

"سعد کو اگر کھاری کی کہانی میں کچھ چونکا دینے والی بات محسوس ہوئی تھی تو مجھے کیوں نہیں ہوئی اور اگر وہ اس ادھوری پینٹنگ کو دیکھ کر بھاگا تھا تو وہ پینٹنگ تو وہ اتنے دن سے دیکھ ہی رہا ہو گا۔ پھر اسی دن کیوں بھاگا۔" ماہ نور کا ذہن ایک بار پھر ممکنات پر غور کرنے لگا۔

اور "ابراہیم کے بقول اگر وہ واقعی اسلام آباد نہیں پہنچا تو پھر وہ کہاں گیا۔ اس کا نمبر ابھی تک کیوں بند ہے۔ میرے ساتھ تو چلو، وہ یہ سب کچھ پہلے بھی کر رہا ہے۔ ابراہیم اور اپنے ڈیڈی کے ساتھ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔"

"تم نے مجھے کس مشکل صورت حال میں ڈال دیا سعد! میں کیسی بے فکری کی زندگی گزارتی تھی تم سے پہلے۔" اس نے تصور میں بیٹھی شبیہ کو مخاطب کیا۔ "تم سے پہلے اور تم سے بعد" میری کہانی اگر لکھی جائے تو اس کے صرف دو ہی باب ہوں گے اور دیکھو تو تم سے بعد کیا کیا نہیں ہوا۔"

وہ سوچنے پر آئی تو سوچ کے دھارے کہاں کہاں بہہ نکلے۔ "میرا سمسٹر ضائع ہو گیا۔ ابھی واپس جا کر مجھے ممی اور بابا کا سامنا کرنا ہے۔ میرے پاس نہ کوئی وجہ ہے، نہ دلیل، ممی مجھ سے اتنی ناراض ہیں کہ خود فون کرتی ہیں، نہ میرے فون کرنے پر ڈھنگ سے بات کرتی ہیں۔ بابا ناراض سی ٹون میں کہتے ہیں، تم نے برا کیا ماہ نور جو اپنی ممی کو ناراض کر دیا۔ سلمان کہتا ہے میں ہمیشہ سمسٹر مس کرنے کی خواہش کرتا تھا اور ممی کے خوف سے نہیں کر پاتا تھا۔ تم نے ممی کے خوف کی حد پار کر لی، تمہیں گولڈ میڈل ملنا چاہیے۔ شاہ بانو نے سمسٹر مکمل کر لیا۔ وہ اپنے کزن سے منگنی کروا چکی۔ وہ اپنی نانی کے پاس جرمنی جانے کی تیاریوں میں مگن ہے اور میں کہیں بھی نہیں کھڑی۔ میں تمہارے سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہوں بس، جانتی ہوں تم میری رسائی سے کتنی دور ہو۔ میری پہنچ سے باہر، پھر بھی میں ہوں کہ اس وقت کے انتظار میں سارے نقصان کیے جا رہی ہوں کہ ہاتھ بڑھاؤں اور تمہیں چھو لوں۔ کیا میں نہیں جانتی کہ تم بادل ہو، پانی نہیں جسے ہاتھ بڑھا کر چھونے کی تمنا صرف اونچائی پر جا کر ہی پوری ہوتی ہے اور بلندیوں پر میں نہیں سارہ خان رہتی ہے۔"

اس کی جلتی آنکھیں ایک مرتبہ پھر بھیگنے لگیں۔

"یہ ہے میری کہانی۔" تمہارے بعد، سعد سلطان! میلے کا سائیں کہتا تھا۔ اس کی آواز میں سوز عشق نے پیدا کیا۔ نہ میں نے پوچھا، نہ اس نے بتایا کہ کس کے عشق نے ان پوچھا سوال ان کہے جواب کا منتظر ہی رہے گا۔ سید پور فیسٹول کا سنگر کہتا تھا کہ اسے محبت وہاں ملی جہاں پر ملنے کی امید نہیں تھی۔ وہ جگہ کون سی تھی۔ محبت جو ملی وہ کس کی محبت تھی۔ سوال بے انت ہیں۔ مگر جواب میں جامد خاموشی۔ میں کس سے پوچھوں اور کدھر کا رخ کروں۔ تم نے مجھے کس مشکل اور طویل راستے کا مسافر بنا دیا ہے۔ سعد، نہ راستہ چھوڑنے کو دل مانتا ہے، نہ منزل کا کوئی نشان ہے۔

اس نے سوتے جاگتے ذہن کو ہوشیار کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہتے ہوئے تھک کر اٹھ گئی۔

"رانی! تمہیں مولوی صاحب کے گھر کا راستہ آتا ہے؟" کمرے سے باہر نکل کر اس نے تائی صابرہ کی ایک خاص ملازمہ سے پوچھا۔

"مولوی صاحب، جو کھاری کا سوہرا ہے وہ۔" رانی نے برتن دھونا چھوڑ کر اس کی طرف رخ کیا۔

"ہاں وہی۔"

"آتا ہے راستہ، کیوں؟"

"مجھے ان کے گھر جانا ہے۔"

"اچھا جی!" رانی خوش ہوتے ہوئے بولی اور نل سے نکلتے پانی کی دھار کے نیچے ہاتھ دھونے لگی۔ ہاتھ دھو کر دوپٹے سے خشک کرنے کے بعد اس نے چادر سر پر رکھی اور کھڑی ہو گئی۔

"چلو، پھر چلتے ہیں جی مولوی صاحب کے گھر راستے میں ٹیوب ویل بھی آتا ہے، ٹھنڈے پانی سے کھیلیں گے اور کھیرے ٹماٹر توڑیں گے۔" رانی کو باہر جانے کے تصور ہی سے خوشی ہو رہی تھی۔

"تائی جی کو بتا دیں۔" ماہ نور نے کہا۔

"لیں وہ تو شوگر کا ٹیکہ لگا کے بریانی کھانے کے بعد سو بھی گئیں۔ انہوں نے نہیں جاگنا عصر کے وقت سے پہلے، اتنی دیر میں ہم نے مولوی جی کے گھر سے ہو کے بھی آ جانا ہے۔" رانی نے لاپروائی سے کہا۔

"اچھا ایسا کرو، مولوی صاحب کے گھر والوں کے لیے تھوڑا کھانا اور پھل ساتھ لے لو، ہم کہیں گے ہم کھانا دینے آئے ہیں۔" ماہ نور کو خیال آیا۔

"مولوی جی کی جو بی بی ہے، وہ بڑی ہی نک چڑھی ہے۔" رانی نے برتنوں کے انبار کے درمیان سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "ہماری بی بی جی نے بڑا کہا بی بی کے ساتھ کھانا باندھ دو، پر نا جی، وہ نہیں مانی۔"

"چلو پھر تو اور بھی اچھا ہے، تم فٹافٹ ان کے لیے کھانا باندھ لو ساتھ۔" ماہ نور نے اسے اسی کی زبان میں جواب دیا۔

بیس منٹ بعد ماہ نور دوپٹے میں چہرا چھپائے رانی کے ہمراہ کھیتوں کے درمیان بنی پگڈنڈیوں پر قدم جماتی مولوی کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں، سوئی کیوں نہیں؟" وہ اسٹوڈیو سے نکل کر واپس لاؤنج میں آیا تو میزبان کو ہنوز اسی پوزیشن میں صوفے پر پاؤں چڑھائے بیٹھے دیکھا جیسے چھوڑ کر گیا تھا۔

"ہاں!" وہ جیسے کسی گہری سوچ سے باہر نکلتے ہوئے بولی۔ "آج عرصے کے بعد میں نے دھیان لگا کر گھڑی کی ٹک ٹک سنی ہے ورنہ میں سمجھتی تھی دنیا بے آواز کلاک بنانے لگی ہے۔"

"اوہ! میں معذرت خواہ ہوں۔ آپ میری وجہ سے بے آرام ہو رہی ہیں۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا کینوس ایک میز کی ٹانگ کے ساتھ ٹکا کر فرش پر رکھتے ہوئے کہا اور تیز روشنی میں اپنا ہاتھ نظروں کے سامنے پھیلا کر دیکھنے لگا۔

"تمہارے آنے سے عرصہ بعد احساس ہوا کہ جب کوئی آتا ہے تو کیسا لگتا ہے لہٰذا زحمت، تردد، بے آرامی

جیسی باتیں مت کرنا۔" اسے جواب ملا۔

"ارے تمہارا ہاتھ تو زخمی ہے۔" پھر اس کی نظر اس کے ہاتھ پر پڑ گئی اور وہ صوفے سے اتر کر اس کے قریب آ گئی۔

"اُفوہ! خون تو ابھی بھی بہہ رہا ہے' کتنا خون جم بھی گیا تمہاری کلائی پر۔ زخم گہرا ہے اور تم کتنے سکون سے اسے دیکھ رہے ہو۔" میزبان کے چہرے پر اضطراب جھلکا۔

"میں یہ اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ کلائی کاٹ کر خودکشی کرنے والے کتنی دیر خون بہنے اور اس کے بہنے کے نتیجے میں موت کا انتظار کرتے ہوں گے۔" وہ بدستور اپنے ہاتھ پر نظریں جمائے بولا۔ "اس دوران ان کا کبھی واپس زندگی کی طرف دوڑ آنے کو جی تو چاہتا ہوگا۔ ہے نا؟" اس نے اسے مسکرا کر دیکھا۔

"بے وقوف لڑکے' چلو فورا" زخم کو دھو کر آؤ' میں ڈریسنگ کا سامان لے کر آتی ہوں۔" وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔ وہ اسی طرح مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتا کچن کے سنک کی طرف مڑ گیا۔ "اینٹی جرمز ہینڈ واش!" اس نے سنک پر رکھے ہاتھ دھونے کے محلول کی بوتل پر چپکے معلوماتی کاغذ پر چھپے الفاظ کو پڑھا۔

"نہاتے دا صابن' ہتھ دھونے دا صابن لیتڑے دھونے تے بھانڈے دھونے دا صابن (نہانے' ہاتھ دھونے' کپڑے اور برتن دھونے کا صابن۔)" اسے نور فاطمہ یاد آ گئی جس نے کہا تھا کہ اس کے پاس ہر طرح کی دھلائی کے لیے ایک ہی صابن تھا اور تیز و مخصوص بو والے اس صابن سے ہینڈ پمپ کے پانی کے نیچے ہاتھ منہ دھوتے ہوئے اسے جانے کیا محسوس ہوا تھا' محسوسات اپنی جزئیات کے ساتھ اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔

"ایک سفر اور کتنے پڑاؤ۔" جراثیم کش ہاتھ دھونے کے محلول سے اپنا زخمی ہاتھ دھوتے ہوئے اس نے سوچا اور دھلے ہوئے ہاتھ کی طرف دیکھا' زخم چھ انچ کی لکیر کی مانند کلائی سے انگوٹھے تک پھیلا ہوا تھا۔ شاید کوئی نازک رگ کٹ گئی تھی جب ہی اچھی طرح ٹھنڈے پانی میں دھلنے کے بعد بھی خون بھل بھل بہہ رہا تھا۔

"چلو ادھر آؤ۔ میں تمہاری مرہم پٹی کردوں۔" میزبان فرسٹ ایڈ باکس اٹھائے واپس لاؤنج میں آئی۔

"ویسے تو اس زخم پر ٹانکے لگنے چاہئیں۔" نزدیک کا چشمہ آنکھوں پر جما کر اس نے زخم کا جائزہ لیا۔

"ادھر ایک کلینک ہے جہاں میری دوست بیٹھی ہوگی۔ اس وقت نائٹ ڈیوٹی پر۔" اس کے پاس چلیں تمہارا ہاتھ سلوانے۔ اس نے چشمے کے اوپر سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"ہاتھ ہی سلوائیں گی نا ہونٹ تو نہیں۔" وہ اس کے سامنے سے فرسٹ ایڈ باکس اٹھا کر کھولتے ہوئے بولا۔

"بس اس گاز بینڈیج کو اس محلول میں بھگو کر زخم پر رکھ دیں اور اگر پٹی باندھنی آتی ہے تو کس کر باندھ دیجیے' خون بہنا بند ہو جائے گا۔" اس نے گاز کا پیکٹ نکال کر انہیں پکڑاتے ہوئے کہا۔

"میں چاہ نہیں رہی تھی کہ اس وقت تم اس کمرے میں جاؤ' مگر تمہاری مرضی اور موڈ دیکھ کر خاموش ہو گئی۔" وہ پٹی باندھتے ہوئے بولی۔

"وہاں جو جاتا ہے' زخم ہی کھا کر آتا ہے۔" پٹی کی گرہ باندھتے ہوئے وہ بڑبڑائی۔

"دل پر' روح پر یا جسم پر۔" وہ بلا ارادہ بولا۔

"شاید سب پر۔" اس نے کہا اور دوا اور پٹی کے پیکٹ واپس باکس میں رکھنے لگی۔

"اور یہ کیا ہے؟" اس نے میز کی ٹانگ سے ٹکے کینوس کی طرف دیکھا۔

"یہ پینٹنگ ہے جو مجھے آپ سے خریدنی ہے۔" سعد نے ہاتھ کے درد کی شدت سے آنکھیں بند کرنے کے بعد کھولتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔۔۔ یہ بیچنے کے لیے نہیں ہے۔" وہ سخت لہجے میں بولی۔

"پھر گفٹ کردیں۔" اس نے بے ساختہ کہا۔

"گفٹ!" باکس اٹھا کر دوسرے کمرے کی طرف جاتے جاتے اس نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ "میں گفٹ نہیں دان کر چکی۔" وہ لمحہ بھر کو رکی پھر بولی۔ "اٹ ناٹ فار ڈونیشن۔" وہ تیزی سے دوسرے کمرے میں گھس گئیں۔

"واقعات و حقائق کے ڈانڈے یوں اچانک گمراتی خلیں سے آکر آپ کی نظروں کے سامنے جڑنے لگیں تو نظریں چرانا ممکن ہے کیا؟" سعد نے خود سے سوال کیا۔ "نہیں' یہ ایسے نہیں ویسے ہوا ہوگا' نہیں یہ تو نظر کا دھوکا اور محض اتفاق ہے' یہ سب لغو اور بے معنی باتیں ہیں۔" اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کو دباتے ہوئے سوچا اور تھکے ہوئے جسم کو صوفے پر گرا دیا۔

"یہ پین کلر لو اور ساتھ میں دودھ کا گلاس اور جا کر آرام کرو اب' تم چہرے سے اس وقت بہت تھکے ہوئے اور بے آرام نظر آرہے ہو۔" دودھ کے گلاس کی ٹرے میں دو گولیاں اور ساتھ ہی مفت مشورہ سامنے آیا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے میں آرام کرتا ہوں۔" اس نے چپ چاپ دوا منہ میں رکھی اور نیم گرم دودھ کے گھونٹ حلق سے اتارنے لگا۔

"تمہارے بال الجھے ہوئے ہیں اور گرد آلود بھی۔" ایک ہاتھ اس کے بالوں میں آکر ٹھہرا اور ان کی گرد جھاڑنے لگا۔ "کیوں اور کب سے خود کو خوار کر رہے ہو۔" ایک پرسکون اور لطیف احساس اس کی رگ و پے میں اترا۔ وہ تپتی دھوپ میں چلتا جیسے ایک دم کسی چھتنار درخت کے ٹھنڈے گہرے سائے میں آگیا تھا۔

ساری دنیا میں' میں محض اس احساس کو پانے کی سعی کے جرم ہی میں تو جلاوطن ہوا تھا۔ اس کے دل میں خیال آیا۔ اسی دم وہ ہاتھ اس کے بالوں سے الگ ہو گیا اور وہ واپس دشت نار میں پہنچ گیا۔

"سو جاؤ جاکر۔ نیند تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔" لہجہ اور الفاظ دونوں ہی سپاٹ ہوئے اور روایتی بھی۔

اس نے سر ہلایا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کمرے میں پہنچ گیا' جہاں بیڈ پر سے سفید چادریں اٹھا کر اسے ایک آرام دہ مہمان خانہ بنادیا گیا۔

☼ ☼ ☼

"مولوی کی بیٹی کو دیکھا تھا آپ نے ماہ نور باجی! کتنے بھبھرے کھلا (ڈرامے) رہی تھی آج؟" اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر چلتے چلتے رانی نے اس سے کتنی ہی باتوں کے دوران ایک بات یہ بھی کی تھی۔ "میں نے سنا ہے۔ اس لڑکی نے کھاری سے پسند کی شادی کی ہے۔ اس سے ملنے فارم ہاؤس جایا کرتی تھی۔ بڑی کوئی جگرے والی لڑکی ہے۔ ماہ نور باجی! فارم ہاؤس جانے سے پہلے بڑے بڑے دل والوں کو پسینہ آجاتا ہے۔ جگہ جگہ تو ادھر بندوقوں والے مچھڑ (مونچھوں والے) پھرتے ہیں۔"

"ارے نہیں۔ غلط ہے یہ۔ وہ لڑکی تو شکل سے اتنی انوسینٹ (معصوم) لگتی ہے۔" ماہ نور نے کہا۔ "اور کھاری۔ توبہ کرو لوہ بے چارہ کہاں ایسا لڑکا لگتا ہے' جو کسی لڑکی سے چھپ چھپ کر ملے۔"

"ادھر گاؤں کے لڑکی عزکوں کا آپ کو نہیں پتا جی۔ وہ بڑے چلاک (چالاک) ہوتے ہیں' اب کھاری کی جو وہٹی ہے۔ بندہ اس سے پوچھے! اتنی تم ہاں سے او دھری (اداس) تھیں تو پھر ہاں کے ساتھ کیوں نہیں گئی' کھاری وچارے کو بخار چڑھا ہوا تھا۔ اس کو کہتی ہے۔ "واپس چلو واپس چلو۔" اس کو بھی ساتھ لے کر ہی مل گئی۔" رانی نے ناک چڑھا کر کہا۔ ماہ نور کو اندازہ ہو رہا تھا کہ تائی صابرہ کی مصاحبین کی نظر میں کھاری کی دلہن کا رتبہ کیا تھا۔ اس نے رانی کی اس بات کے جواب میں کوئی بات نہیں کی۔

"جی! آگیا مولوی جی کا گھر۔" ایک کشادہ میدان کے درمیان بنے مختصر سے گھر کے رنگ اڑے دروازے کی دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے رانی نے کہا۔ ماہ نور نے سر گھما کر اس گھر کی طرف دیکھا۔ اسے احساس ہوا کہ جو کچھ مولوی صاحب کی بی بی نے آج محفل میں کہا' یہ گھر ان الفاظ کی عملی تصویر تھا۔

☼ ☼ ☼

"اٹس او کے رازی! تھینک یو سو مچ۔ آج ہم اپنا اپنا معمول کا کام کریں گے۔" باس نے صبح آٹھ بجے رازی کو اطلاع دی تھی۔ صبح صبح باس کا فون آنے پر رازی نے سکون کا سانس لیا تھا۔

"گروسری ایڈ منسٹر کرلیں آج سر؟" اس نے خوشی سے چھلانگیں مارتے دل پر قابو پاتے ہوئے بے تکی سی بات کی۔

"جو دل چاہتا ہے' کرو۔ میں جانتا ہوں' گزشتہ دو دنوں سے میں تمہیں خاصے ٹف ٹاسک دے رہا تھا۔"

"نہیں سر! آپ کی خواہش ہمارے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔" رازی نے مودب لہجے میں کہا۔ دوسری جانب فون بند ہو جانے پر وہ ناچتا ہوا صوفی کی طرف دوڑا۔ اس روز وہ دونوں اپنی مرضی سے ہر وہ کام کرسکتے تھے' جو وہ کرنا چاہتے تھے۔

☼ ☼ ☼

"میں جتنا اس کو جانتا ہوں انکل! اس کے مطابق میرا وجدان کہتا ہے کہ وہ محفوظ ہے اور یہیں کہیں ہے۔" ابراہیم نے بلال سلطان کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں! اس کی گاڑی کا جائزہ لینے کے بعد میرا بھی یہ ہی خیال ہے۔ اسے فوری طور پر کوئی خطرہ لاحق ہے۔ نہ ہی پچھلے دنوں وہ کسی حادثے کا شکار ہوا۔" انہوں نے پرسکون انداز میں کہا۔ "میں معذرت خواہ ہوں' میں نے اپنی گھبراہٹ میں تم سب کو پریشان کیا۔ مگر شاید تم بیٹے کے لیے ایک باپ کے جذبات کو اس وقت زیادہ بہتر سمجھ سکو' جب تم خود باپ بن جاؤ گے۔"

"جی انکل!" ابراہیم نے احتراماً" سر جھکایا۔

"دیکھو! تم اس کی کوئی غیر معمولی ایکٹویٹی' معمول سے ہٹ کر کسی سے تعلق' کسی ایسی جگہ پر اس کا آنا جانا' جہاں کے بارے میں' میں نہ سوچ سکتا ہوں' مجھ سے نہیں چھپاؤ گے۔" انہوں نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے کہ تم میرے جذبات کو سمجھ سکتے ہو۔"

"جی انکل! میں سمجھتا ہوں۔" وہ بولا اور تیزی سے اٹھ گیا۔ "میں اب چلوں۔"

"ہاں! جاؤ۔" انہوں نے سرہلایا۔

ابراہیم کے جانے کے بعد انہوں نے اپنی تھکی ہوئی آنکھیں موندلیں۔

☼ ☼ ☼

"تمہارے ہاتھ کے زخم کی صورت حال کیا ہے اب؟" اگلے روز گیارہ بجے جب وہ اس کمرے سے برآمد ہوا تو میزبان میز پر ناشتے کے برتن لگا رہی تھی۔ "اور ہاں! اب تم کچھ کچھ انسان لگ رہے ہو۔" انہوں نے رک کر جملہ اچھالا۔

"میں نے غسل کیا ہے اور کپڑوں کا واحد جوڑا' جو میں ایک چھوٹے بیگ میں ساتھ لایا تھا' زیب تن کرلیا۔" وہ مسکرایا۔ "میں جانتا ہوں میری شیو بڑھی ہوئی ہے اور چہرے کی وحشت ابھی گئی نہیں۔ لہٰذا میں کچھ کچھ انسان ہی

لگ رہا ہوں۔ پورا انسان نہیں۔"

"میں امپریس نہیں ہوئی۔" اس نے سفید جاذب کپڑے سے کھانے کی میز کے کور پر گرا پانی خشک کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری عمر کے اکثر لڑکے یوں ہی ذرا سی بات پر فرسٹریڈ ہو جاتے ہیں اور شیو بڑھا لینا وغیرہ تو عام سی بات ہے۔"

"ہاہا!" وہ کئی دن بعد بے اختیار ہنس دیا۔ "میری شیو اس لیے بڑھی ہوئی ہے میم! کہ میرے پاس شیونگ کٹ نہیں ہے۔ ورنہ میری فرسٹریشنز شیو پر نہیں نکلا کرتیں۔"

"پھر ٹھیک ہے۔" اس نے جاذب کپڑا سنک میں جھاڑتے ہوئے کہا اور کھانے کی میز کے قریب واپس آئی۔

"آؤ ناشتا کرلو۔" اس نے ایک کرسی باہر نکالتے ہوئے کہا۔

"یہ ایک بھرپور ناشتا تھا اور آپ چائے بہت اچھی بناتی ہیں۔" سعد نے ناشتے کے دوران چھا جانے والی خاموشی چائے کا آخری گھونٹ پینے کے بعد توڑی۔ "اب اگر آپ دوبارہ میری مرہم پٹی کردیں تو میں ممنون ہوں گا۔ اس کے بعد مجھے کسی سے ملنے جانا ہے۔"

"ضرور۔" اس نے نیپکن سے ہاتھ پونچھے اور برتن سمیٹ کر سنک میں رکھنے کے بعد اس کی مرہم پٹی میں مصروف ہوئی۔ "زخم گہرا ہے' تمہیں کسی ڈاکٹر سے مل لینا چاہیے۔" پٹی کرنے کے بعد اس نے سعد کی طرف دیکھا

"فی الوقت تو مجھے ڈاکٹر سے زیادہ ایک عدد spiritual healer کی ضرورت ہے۔ اچھا اب میں وقتی طور پر رخصت ہوتا ہوں۔" پھر اس نے سر اٹھا کر میزبان کی جانب دیکھا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ دن آپ کے ہاں ہی ٹھکانا کرلوں؟"

"پوچھنے کی ضرورت تو نہیں تھی' مگر پوچھ لیا ہے تو میرا جواب ہے کہ شوق سے۔"

"چلیں پھر میں وقتی رخصت لیتا ہوں۔ تھینک یو سو مچ فلزا میم۔"

"گاڑی چاہیے تو کی رنگ' ادھر ہولڈر پر لٹکا ہے۔"

"یہ ایک اضافی عنایت ہوگی۔" وہ مسکرایا اور کی رنگ اتار کر باہر نکل آیا۔

☼ ☼ ☼

"فقیر لباس بدل رہا ہے۔ فقیر کو تھوڑا وقت دو۔" اختر کی جھونپڑی سے باہر وہ ہی لڑکا مٹی کے تیل کے چولہے پر بڑا سا برتن چڑھائے کچھ ابال رہا تھا۔

"تم ابھی تک ادھر ہی ہو بھاگے نہیں؟" وہ گھٹنوں کے بل اس لڑکے کے سامنے بیٹھ گیا۔

"پہلے والا بالکا تو بہت جلدی مایوس ہو گیا تھا۔"

"مجھے روشنی تو نہیں ملی ابھی تک۔ مگر دور کہیں کوئی تارہ ضرور چمکتا دکھائی دیتا ہے۔" لڑکے نے ایک لمبی ڈوئی برتن میں ابلتے پانی میں چلائی اور ڈوئی کی مدد سے ایک ابلتا آلو باہر نکال کر ہاتھ سے اس کی نرمی سختی کا اندازہ لگانے لگا۔

"چاہے وہ تارسائیں کا شعبدہ ہو اور قریب جاؤ تو پتا چلے چائنا کی ایجاد کردہ مصنوعی روشنی کا کوئی اسٹائل ہے؟" اس نے لڑکے کو تنگ کرنے کی غرض سے کہا۔

"جب بندے کا دل ہی چائنا کا کھلونا بن جائے تو تارے کو کچھ کیا کہنا باؤ جی۔" لڑکا فلسفیانہ انداز میں بولا اور سر پر رکھی نائلون کی سبز ٹوپی اتار کر جھاڑنے لگا۔ "سب کچھ مصنوعی ہو گیا ہے باؤ جی! تو امید کے تارے چاہے سستے

کرسٹل سے بنے نکلیں' چاہے پلاسٹک کے' ان کی کشش کم سے کم اس وقت تک تو قائم رہتی ہے نا! جب تک ہاتھ نہیں لگتے۔"

"بس پھر کھائے جاؤ آلو ابال ابال کر۔" وہ اٹھا اور کٹیا کے دروازے کی طرف چل دیا۔

"مجھے پتا تھا' آج کل میں اِدھر کا چکر لگاؤ گے۔" اختر اسے دیکھ کر مسکرایا اور گڑگڑی میں تانبے کا باریک تار پھیرنے لگا۔

"آپ کے کشف کی کرامات ہیں۔" وہ اختر کے سامنے نیچے چٹائی پر بیٹھ گیا۔

"او باؤ جی کیوں فقیر کو گناہ گار کرتے ہو؟" اختر نے گڑگڑی نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

"کشف نیاز کی طرح نہیں بٹتے' جو ہر اس انسان کو ہونے لگیں' جو میری طرح ویرانے میں فقیری کا چولا پہن کر بیٹھ جائے۔"

"اچھا تو پھر آپ کو الہام ہوتا ہے؟ چھٹی حس کا کرشمہ ہے' جو آپ کو قبل از وقت آنے والے واقعات کی خبر دیتی ہے؟"

"میری تو اس جھونپڑی کا تنکا تنکا چھان مارا آپ کے ہم زاد نے۔۔۔ جیسے آپ کوئی ننھا سا مچھر ہو جو ان تنکوں میں چھپا بیٹھا ہے۔" پھر اختر کے لہجے میں شکوہ ابھرا۔

"اوہ!" اس کے ہونٹ نیم دائرے کی شکل میں سمٹے۔ "میری وجہ سے آپ تنگ ہوئے۔"

"بندہ ہی بندے کی وجہ سے پریشان ہوتا ہے باؤ جی!" اختر آنکھیں بند کرکے مسکراتے ہوئے بولا۔

"آپ بتاؤ! کیوں فوجیں پیچھے لگائی ہوئی ہیں؟ کیوں طلسمی چادر اوڑھ رکھی ہے' ماجرا کیا ہے! سنا ہے مواصلاتی رابطے بھی بند ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ آپ کی گاڑی تو مل گئی ہے۔ مگر فون نہیں مل رہا۔"

"واہ سائیں جی! آپ کو تو خوب خبریں ہیں۔" وہ مسکرایا۔ اختر نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور مسکرایا۔

"بات وہی ہے سائیں جی۔" اس نے کہنا شروع کیا اور اپنی بات کرتے ہوئے اس کی نظر اچانک جھونپڑی کی دیوار میں گڑی واحد کھونٹی پر ٹنگے ان کپڑوں پر پڑی جس کے متعلق ہی شاید وہ نیا بابا کا کہہ رہا تھا۔ "فقیر لباس تبدیل کررہا ہے۔"

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عنیزہ سید

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ نور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔ سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو یہ جانی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

سترہویں قسط

”یک طرفہ معلومات پر فیصلہ صادر کرنا بے انصافی نہیں کہلائی جاتی کیا؟“
”یک طرفہ ضرور ہیں لیکن روشن اور واضح ہیں‘ اتنی روشن کہ تصویر کا اگلا رخ جتنا واضح ہے اتنا ہی پچھلا بھی ہے۔“
”مگر سوال کرنا چاہیے‘ سوال تو کٹہرے میں کھڑے نامزد ملزم سے بھی کیے جاتے ہیں‘ جرح کی زد میں تو وہ بھی آتا ہے۔“
”آپ بھی خوب کہتے ہیں سائیں جی!“ ایک طنزیہ مسکراہٹ سعد کے چہرے پر پھیلی۔ ”سوال جس سے کیے جاتے ہوں‘ جرح جس پر کی جاتی ہو‘ وہ شخص اتنا برق رفتار ہو کہ کٹہرے کی نوبت آنے ہی نہ دے‘ اتنا اسمارٹ ہو کہ خود کو ہر مرحلے پر اپنے ہی حصار میں یوں سمیٹ لے کہ دیکھنے والا بنا کسی سوال کے اسے معصوم قرار دے کر ہر الزام سے بری کردے تو پھر کیسی جرح اور کیسے سوال؟“
”یہ آپ نہیں بول رہے‘ آپ کی جوانی‘ اور جوانی کا گرم خون بول رہا ہے باؤجی!“ اختر نے گزگڑی منہ سے ہٹانے کے بعد کہا آپ نہیں آپ کے جذبات بول رہے ہیں جو ”Seeing is Believing“ پر یقین رکھتے ہیں‘ جن کے سامنے تفصیل کی کسوٹی اور استدلال کی پرکھ کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اسی لیے میں کہتا ہوں ذرا سنبھل کر‘ تھوڑا رک کر‘ ذرا سا سوچ کر کوئی قدم اٹھاؤ۔“
اس نے سرخ سرخ آنکھوں سے سعد کو دیکھا جس نے اس کی بات سن کر یوں سر ہلایا تھا جیسے اسے اس کی بات دیوانے کی بڑ لگی ہو۔
”فقیر کے لنگر پر آج کل شربت بھی ملتا ہے‘ ٹھنڈا اور فرحت بخش‘ ایک پیالہ اس کا پیو‘ افاقہ ہوگا۔“ اختر نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کٹیا کے دروازے تک گیا۔
”چھوٹے سرکار! باؤ صاحب کو ایک پیالہ شربت کا تو پلاؤ بیٹا جی۔“ اختر نے اپنے واحد بالکے کو مخاطب کیا۔
”میں کوتاہ نظر ضرور ہوں سائیں جی!“ اختر واپس آکر سعد کے سامنے بیٹھا تو سعد نے سر جھکا کر کہا۔ ”میری عقل کا قد بھی بہت چھوٹا ہے‘ شاید زمین سے پھوٹتی نئی فصل کی طرح محض اپنے اوپر بڑھنے کی ابتدائی منزل پر‘ لیکن نظر اور عقل تو سہی‘ جسم کے باقی اعضا کی طرح دل و دماغ عطا بھی تو ہوتے ہیں نا۔“
”او باؤجی! میں شک نہیں کررہا‘ میں شک نہیں کیا کرتا۔“ اختر نے مسکرا کر کہا۔ ”تو پہلے فقیر کے ڈیرے کا ٹھنڈا شربت پیو پھر آگے بات کرتے ہیں۔“ اختر کا بالکا اس کے لیے شربت کا پیالہ لے آیا تو اختر نے اس کی بات کا جواب درمیان میں روکتے ہوئے اسے ایک بار پھر شربت کا پیالہ پینے کی پیش کش کی۔ سعد نے بالکے کے ہاتھ سے مٹی کا پیالہ لے کر سرخ محلول کی اوپری سطح پر نظریں جمائیں۔
”شک تو آپ کررہے ہو باؤجی؟“ اختر قدرے بلند آواز میں ہنسا۔ ”لال رنگ ہے اور سفید چینی‘ تخم بالنگا ہے اور چار مغز‘ بادام کا عرق ہے اس میں۔ گھبراؤ نہیں پی جاؤ‘ برف کے سلیب لوگ خود چھوڑ جاتے ہیں ان کے بارے میں‘ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ کیسے پانی سے جمائے جاتے ہیں‘ البتہ یقین سے یہ کہہ سکتا ہوں اس میں بوٹی ہے نہ کوئی دو سرا نشہ‘ بلا جھجک پی جاؤ۔“
”اس وقت تو میرے پاس میری شناخت کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے سائیں جی۔“ سعد نے نیچی آواز میں کہا اور اپنے ہونٹ پیالے سے لگا لیے۔ ”شک میں نے اس وقت بھی نہیں کیا تھا جب میرے پاس قیمتی گاڑی بھی تھی‘ میرے والٹ میں رقم بھی تھی‘ میرا بند آئی فون گاڑی کی سیٹوں کے نیچے پڑا تھا‘ میرے کریڈٹ کارڈز‘ میرا شناختی کارڈ سب میرے پاس تھے اور نور فاطمہ نے سل پر پسا ملغوبہ مجھے روٹی پر لگا کر پیش کیا تھا۔ میں نے وہ بھی بغیر شک کے کھالیا تھا کیونکہ مجھے اپنے لیے شاید کوئی وہم ہے نہ دکھ‘ جو میں آپ سے عرض کررہا ہوں وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو متاثر ہوئے جن کی زندگیوں کی شکلیں بگڑ گئیں جن کے دل بنجر ہوئے‘ جو خاردار راستوں کے مسافر بنے۔ میں دیکھ بھی لوں اور آنکھیں بند کرلوں یہ کیسے ممکن ہے۔“
اس نے شربت کے چند گھونٹ پینے کے بعد کہا اور کہنے کے بعد پیالہ دوبارہ ہونٹوں سے لگالیا۔
”او باؤجی! میں غلط نہیں کہتا آپ کو بس اتنا کہتا ہوں کہ اس پر بھی تو غور کرو کہ گاڑی سیدھا راستہ چھوڑ کر نور فاطمہ کی جھونپڑی کو جانے والی سڑک پر کیوں چڑھ جاتی ہے‘ دماغ گاڑی کو پکڑنے جانے والی جگہ پر چھوڑ کر ٹانگوں کو بنی گالہ تک پبلک ٹرانسپورٹ پر سفر کرنے اور پیدل چلنے پر کیوں لگا دیتا ہے‘ دل ہاتھ میں بھرا پستول پکڑ کر کسی کے سر کو نشانہ بنانے کے بجائے فقیر کی کٹیا تک کیوں لے آتا ہے۔“
”یہ سوال دل میں اٹھتا ہے اور دماغ کو کھاتا ہے‘ مگر پھر شعوری اور لاشعوری جبلت دل اور دماغ پر حاوی ہوجاتی ہے۔“ سعد نے پیالے میں موجود باقی محلول ایک سانس میں ختم کرنے کے بعد کہا۔
”آپ تو عالم انسان ہیں اور شاید عامل بھی ہیں۔“ اس نے اختر کی طرف دیکھا۔ ”آپ کا علم اور عمل کیا کہتا ہے‘ اس انسان کے بارے میں جس کی عمر صنف مخالف کے سر کچلنے اور ماؤں سے بچے جدا کرنے میں گزر گئی‘ آپ کے پاس ایسے ثبوت ہوں جو واضح ہیں اور روشن اور جن کے ذریعے آپ ایسے ظالم کو عین اس وقت پکڑ لینے پر قادر ہوں جب وہ اپنے رنگے ہاتھوں سے دستانے اتارے کھلے عام پھر رہا ہو تو آپ کیا کریں گے۔“
”دل اور دماغ کی کہتے ہو باؤجی تو پھر سنو۔“ اختر نے گزگڑی میں موجود بجھتے انگاروں کو پھونک مار کر سرخ رنگ کرنے کی سعی کرتے ہوئے کہا۔
”دل اور دماغ پر آپ کی جو شعوری اور لاشعوری جبلت حاوی ہوئی جاتی ہے کیا اس میں آپ کے خود اپنے اس شخص سے تعلق کا کوئی رنگ شامل نہیں‘ وہ شخص جو آپ کا نشان نہ ملنے پر اپنے بندوں کو شکاری کتوں کی طرح جاسوسی کرنے پر لگا رہا ہے‘ اسے دنیا میں کسی سے نہ سہی‘ آپ سے تو محبت ہے نا‘ اس محبت کا کیا کروگے‘ اسے کیسے جھٹلاؤ گے باؤجی؟“
”محبت خود غرض نہیں ہوتی سائیں اختر!“ سعد نے سختی سے سر ہلایا۔ ”ایک کی محبت انسانوں کے جذبات کا قتل کرنے پر لگا دے تو وہ محبت خود واجب السزا ہے۔“
”محبت کو محبت ہونے کی سزا دوگے؟“ اختر نے پوری آنکھیں کھول کر یوں اس کے چہرے پر گاڑیں جیسے اسے یقین نہ آیا ہو جو سعد کہہ رہا تھا۔
”شاید میں ایسا ہی کرنے والا ہوں“ سعد نے اثبات میں سر ہلایا۔
اختر کے چہرے پر ایسا تاثر آیا جیسے اسے سعد کے ارادے پر دکھ ہوا ہو اور جیسے وہ کوئی ایسے الفاظ یاد کرنے کی کوشش کررہا ہو جن کے ذریعے وہ سعد کو اس کے ارادے سے باز کرسکے۔
”سوچ لو باؤجی! سزا جزا کا اختیار جب انسان اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتا ہے تو نہ اس عمل کو پورا کرسکتا ہے نہ اپنی راہ کا مسافر رہ پاتا ہے۔ اس کی حرکت رک جاتی ہے‘ اس کا سفر بے مراد ہوجاتا ہے اور اپنی انتوں کی صلیب اسے کوہ گراں کی مانند محسوس ہونے لگتی ہے‘ جسے وہ اٹھا پاتا ہے نہ گرا دینے پر قادر ہوتا ہے۔“
”مصلحتیں‘ مصلحتیں‘ مصلحتیں۔“ سعد نے یوں سر جھٹکا جیسے اس پر اختر کی بات کا خاک بھی اثر ہوا تھا۔
”میں اب ان مصلحتوں کا قائل نہیں رہا‘ خود کو سمجھا لینے کے فرسودہ طور طریقے‘ جو ان لوگوں کے ساتھ ہو جن کی اذیت مجھے چین نہیں لینے دے رہی‘ ایسا ہونے ہی میں کوئی مصلحت پوشیدہ ہوگی‘ اس میں کوئی حکمت ہوگی جیسے قناعت پسندانہ سوچیں۔“ اس کے لہجے میں طنز کی آمیزش ہوئی۔ ”آپ بتائیں مجھے کہ کسی ماں سے اپنے معصوم بچے کو خود سے یوں جدا کردینے کا فیصلہ کرواتا کہ عمر بھر دوبارہ دیکھنے کی امید تک نہ ہو‘ اس میں کون سی

مصلحت پوشیدہ ہو سکتی ہے۔" اس نے یوں سر ہلایا جیسے اختر کو چیلنج کر رہا ہو کہ اب بتاؤ اس سوال کا کیا جواب ہے۔

"آپ مصلحتوں کو' قدرت کو' قناعت اور صبر توکل اور امید کو چیلنج کرنے کی اسٹیج پر اتر آئے ہو صاحب!" اختر نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "آپ کو میرے کسی جواب میں کوئی منطق نظر آئے گی نہ ہی میری کسی بات کی کوئی تک سمجھ میں آئے گی۔۔۔ لہٰذا میں ایک طرف ہٹتا ہوں' آپ کے سامنے راستہ کھلا ہے' اپنے اسپیڈو میٹر کی سوئی آپ جس انتہا تک لے جانا چاہتے ہیں' لے جائیے' مصلحت اور منطق تو اس انجام میں بھی ہو گی جس سے آپ دوچار ہونے والے ہیں مگر قبل از وقت آپ کو سمجھانا اور بتانا بے کار ہے' جائیے وہ کیجیے جو آپ کا من چاہتا ہے۔"

اختر کے لہجے میں تاسف تھا۔

"مگر ایک بات یاد رکھیے گا" وہ قدرے توقف کے بعد بولا "وہ بات جو میں نے پہلے بھی ایک بار آپ سے کہی تھی کہ یا من پالو یا پھر زن پالو۔۔۔ اس من کے چکر میں زن کی خواری اور اذیت آپ کی گور گردن پر ہو گی باؤ جی! ایسا نہ ہو کہ اگلی نسل کا کوئی سعد سلطان آپ کو ڈھونڈتا اسی راستے کا مسافر بن جائے جس کے مسافر آج آپ ہیں۔"

یا تو اس مشروب میں واقعی کوئی سرور آمیز شے تھی یا پھر اس کا ذہن ویسے ہی بند ہو رہا تھا۔ سعد نے بوجھل ہوتی آنکھیں اٹھا کر اختر کو دیکھا۔ "جو بھی ہے' آئی ایم سوری سائیں جی! مجھے آپ کی کوئی بھی بات سمجھ میں نہیں آرہی۔"

"اوہو!" اختر نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "آپ کا وقت برباد ہوا' میں بھی جھلا ہوں بالکل۔۔۔ مجھے یاد کیوں نہیں رہا کہ نور فاطمہ کی جھونپڑی میں ایک رات گزار کر بھی جب آپ اپنے موقف پر قائم ہیں تو فقیر کی جھونپڑی کا گھنٹہ دو گھنٹہ اس میں کیا تبدیلی لا سکتا ہے۔"

"شاید آپ ٹھیک سمجھے۔" سعد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ویسے آپ کا یہ لباس دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔" اس نے کیل پر لٹکتے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ "گھبرائیے نہیں اتفاق سے نظر پڑ گئی۔"

اس نے اختر کی تیزی سے کپڑوں کی طرف مڑتی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"یقیناً" اس کٹیا اور اس خلعت فاخرہ!" اس نے اختر کی گدڑی کی طرف اشارہ کیا۔ "کی آڑ میں بڑے بڑوں پر ہاتھ ڈالنے کا موقع مل جاتا ہو گا آپ کو۔ آج تک خفیہ والوں کے بارے میں سنا ہی تھا' آج دیکھ بھی لیا۔" اس نے تیزی سے آخری الفاظ کہے اور اتنی ہی تیزی سے باہر نکل گیا۔

"آپ کا پیالہ خالی ہو گیا۔" باہر بیٹھے لڑکے نے اسے کٹیا سے باہر آتے دیکھ کر سوال کیا۔

"میرا پیالہ شاید کبھی بھرا ہی نہیں تھا۔" سعد نے مبہم جواب دیا۔

"آپ نے بھرا پیالہ خالی کیا ہے بھائی جان!" لڑکے نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ کو نظر نہیں آیا شاید یا پھر آپ کو سمجھ نہیں آئی۔" وہ مؤدب سے انداز میں بولا اور کٹیا کے اندر داخل ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

"کیا آپ کو یقین ہے آنٹی! آپ جو کہہ رہی ہیں۔ وہ سو فیصد سچ ہے۔" ماہ نور نے اپنے کھلے منہ کو بند کیا اور آنکھیں جھپکنے کے بعد آپا رابعہ کی طرف دیکھا اور ان سے سوال کیا۔

"سو فی صد سے بھی آگے اگر کوئی درجہ ہے کسی بات کی سچائی ثابت کرنے کو تو مجھے اس کا بھی یقین ہے۔" آپا رابعہ نے سامنے دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"سعد تو شاید سوچ بھی نہ سکتا ہو کہ جس کو وہ پوری دنیا میں ڈھونڈتا پھرتا ہے' ایک ایسی تلاش جس کی خاطر وہ زندگی کی کسی بھی اور دلچسپی کی طرف متوجہ نہیں ہو پاتا' جس کی کھوج میں اس نے کتنے ہی روپ بدلے اور نامراد رہا' اس کھوج کا سرا آپ کے ہاتھ میں ہے۔" ماہ نور نے آپا رابعہ کے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "آپ کو سامنے دیکھ کر بھی آپ نے سوال کو ٹال کیا وہ۔" اس نے اضطراری انداز میں ان کے دونوں ہاتھ ہلائے۔

"قسمت کو اسے مزید بھٹکانا جو منظور تھا۔" آپا رابعہ نے کہا اور ماہ نور کی طرف دھیان کیا۔ "اسے ڈھونڈو بیٹا' اس کا پتا چلاؤ' اسے یہ ساری بات سناؤ' کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنی سی کر لینے کے بعد بھی ناکام ہو جانے والا انسان مایوسی کے غیظ میں مبتلا ہو جاتا ہے' اور وہ کر ڈالتا ہے' جس پر عمر بھر کے پچھتاوے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔"

"آپ فکر نہیں کریں' نجانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ سعد کی زندگی میں میرا کردار میری نظروں کے سامنے واضح ہو گیا ہے آپ تک لانے میں میرا ہی تو کردار ہو گا۔"

اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ورنہ میں تو سوچ سوچ کر تھکنے لگی تھی کہ اس کی زندگی میں میری آمد کی کیا ضرورت تھی' وہ مجھ سے پہلے اور میرے بعد' میں اس سے پہلے اور میں اس کے بعد۔ کوئی بھی تو فرق نہیں پڑا تھا زندگی میں۔" وہ بے خیالی میں بولے چلی جا رہی تھی۔ "لیکن اب مجھے سمجھ میں آرہا ہے۔ یقیناً سمجھ میں آرہا ہے۔" پھر اس نے خود کو یقین دلایا۔

"شاید ایسا ہی ہو میری بچی!" آپا رابعہ نے ماہ نور کے بال سہلائے۔

"لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی آنٹی!" ماہ نور کو اچانک یاد آیا۔ "سعد تو خیر آپ کو جانتا نہیں تھا۔ اسی لیے پہچان نہیں پایا مگر آپ کی بیٹی سعدیہ۔" اس نے آپا رابعہ کی طرف دیکھا۔ "سعدیہ تو آپ کے ساتھ رہی ہمیشہ سے پھر وہ کیوں کہہ رہی تھی کچھ ایسا جس میں سوال تھے جیسے وہ بھی آپ کو پہچان نہ پائی ہو اب تک۔"

"سعدیہ!" آپا رابعہ نے افسوس کے ساتھ سر ہلایا۔ "اس کا معاملہ الگ ہے بیٹی! اس کو میں نے غربت میں پالا' اسے صبر اور توکل کا سبق پڑھایا' اسے یقین دلا دیا کہ زندگی کی جو نعمتیں اوروں کو میسر ہیں وہ ہمارے لیے نہیں ہیں۔ یہ میری نادانی تھیں' میری سہیلی' میری غم گسار مجھے ہمیشہ سمجھاتی رہی رابعہ تم میں معاملات کو پہنچاننے کی حس یا تو ہے نہیں یا پھر بہت ہی کم ہے' تمہیں کیوں پتا نہیں چلتا کہ لوگوں کے ذہنوں اور سوچوں کے اپنے اپنے لیول ہوتے ہیں۔ وہ ٹھیک کہتی تھی' اپنی سہیلی اپنی غم گسار کے جانے کے بعد مولوی سراج سرفراز کے ساتھ شہر در شہر بدلتے' دنیا سے چھپتے چھپاتے میں نے اپنی سہیلی کی زندگی سے سیکھے سبق کو جو اپنی زندگی پر اپلائی کر لینے کی ٹھانی اور توکل' فقر اور غنا کی چادر اوڑھ لی تو میں یہ تو بھول ہی گئی کہ سعدیہ تو ابھی بچی ہے' اس بے چاری کی زندگی کا یہ المیہ کیا کم ہے کہ وہ مولوی سراج سرفراز جیسے بے حس انسان کے گھر پیدا ہو گئی' جسے کھانے پینے اور اوڑھ لینے کے سوا کوئی غم ہی نہیں۔ اوپر سے اس بے چاری کی چھوٹی چھوٹی خواہشات پر میں نے اپنے اسباق کا پردہ ڈال دیا' وہ کیا سوچتی ہے' وہ کیا محسوس کرتی ہے میں نے اس طرف کبھی دھیان ہی نہ دیا۔ جب تک وہ چھوٹی تھی' میرے ذہن سے سوچتی تھی تب تک تو بات بنی رہی' لیکن جب اس نے خود اپنے ذہن سے سوچنا شروع کیا تو بات بگڑنے لگی' اس پر میں نے جھلا کر ایک حماقت اور کر ڈالی۔"

وہ سانس لینے کو رکیں اور دیکھا کہ ماہ نور دم سادھے ان کی بات سن رہی تھی' وہ یقیناً "انکشافات کا دن تھا۔

"میں نے گھبرا کر اس کی کچھ سننے کے بجائے اس کی انگلی پکڑ کر کہیں آگے ہانک دینے کا فیصلہ کر لیا۔ کھاری معصوم تھا اور بے ضرر بھی' میرا احترام دل و جان سے کرتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ میری بات ٹالنے کی مجال نہ ہو گی اسے' سو میں نے اس سے کہا کہ سعدیہ سے بیاہ کر لے' وہ بے چارہ میری اس گزارش پر حق دق بیٹھا میری طرف

آنکھیں پھاڑے دیکھ ہی رہا تھا کہ میرے اپنے لیے تعجب کا باعث بنی سعدیہ نے بھی اس کے سامنے آکر اس کی منتیں کرنی شروع کردیں کہ وہ اسے بیاہ کرلے جائے۔"

"خود سعدیہ نے؟" ماہ نور کو بات سنتے سنتے جھٹکا لگا۔

"ہاں خود اس نے۔" رابعہ آپا نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "اب سمجھ میں آتا ہے کہ اس محدود سی دنیا میں اسے بھی اپنا نجات دہندہ دوسرا کون نظر آسکتا تھا۔"

"کھاری اور نجات دہندہ۔" ماہ نور نے بے اختیار کہا۔ "سعدیہ پاگل تو نہیں تھی؟"

"اس میں بھی میرا قصور ہے۔ میں نے سعدیہ کی کبھی سنی ہوتی۔ اس سے اپنی کبھی کہی ہوتی تو اس کا ذہن وسیع ہو جاتا۔ وہ سمجھی اور اب تک سمجھ رہی ہے کہ کھاری کے ساتھ سے اسے مجھ سے، مولوی سراج سے اس گھر کی دقیانوسیت اور گھٹے ہوئے فقیرانہ ماحول سے نجات مل گئی۔ وہ خود رو پودا تھی، جدھر کو بڑھنے کا موقع ملا، بڑھ گئی۔"

"آپ ابھی تو بتا رہی تھیں کہ آپ کو تہذیب کی تربیت اپنی سہیلی سے ملی۔ کیا انہوں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ بیٹیوں کی پرورش کیسے کی جاتی ہے؟"

"بیٹیاں!" وہ تمسخرانہ انداز میں ہولے سے ہنسیں "اس کے ہوتے ہوئے تو ہم بیٹے کی دولت دامن میں سمیٹے پھولے نہ سما رہے تھے، بیٹیوں کو تو ہم نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔"

"لیکن خود آپ کی جو تربیت انہوں نے کی، کیا وہ آپ کو یاد نہیں تھی۔" سعدیہ کے سلسلے میں ماہ نور کو سعدیہ سے ہمدردی محسوس ہونے لگی تھی۔

"اس تربیت کی وجہ سے ہی تو اپنی اوقات سے بڑی باتیں سوچنے لگی تھی، نظروں میں سمجھنے سے دل انکار کرنے لگا، اور پھر زندگی طیفے لاڑ جیسے کے ہاتھوں برباد ہو کر شہر در شہر چھپتے چھپاتے گزارنے پر مجبور ہونا پڑا، اسی لیے تو سعدیہ کی تربیت اپنی سہیلی کے ابتدائی درس کے بجائے آخری درس کی روشنی میں کی، توکل، فقر، تمنا اور عاجزی کے اسباق اٹھا کر سعدیہ کو پڑھانے کی کوشش میں کئی سال نکل گئے، یہ تو ذہن میں ہی نہیں رہا کہ تربیت تو بڑے گھر کی پردہ دار بی بی کے درس اسباق سے اٹھا کر رہی ہوں، خون میں جو تاجے میراثی کی جبلت کی آمیزش ہے اسے کیونکر خون سے فلٹر کرپاؤں گی۔ اور دیکھ لو تربیت پر جبلت حاوی ہوگئی آخر میں، توکل، فقر، غنا اور عاجزی کے عفریت سے بھاگ کر اس نے فارم ہاؤس کی دھما چوکڑی میں جا سکھ کا سانس لیا مگر مشکل تو کھاری کے لیے ہوگئی نا!" وہ دکھ کے ساتھ بولیں۔

"کھاری کے لیے کیا مشکل ہوگئی؟" ماہ نور نے کہا۔ "وہ تو قسمت والا ہے جسے آپ جیسی ساس اور آپ کے ہاتھوں پلی بڑھی سعدیہ جیسی بیوی مل گئی، وہ اس قابل کہاں تھا، کم عقل، احمق، معصوم اور ان پڑھ لڑکا۔"

"نہیں ماہ نور بیٹی!" رابعہ آپا نے نفی میں سر ہلایا۔ "تمہاری عمر ابھی کم ہے اور تم لوگوں کی پہچان نہیں رکھتیں، ہم لوگ تو وہ ہیں جن کے پاس بڑے بڑے عزت دار اونچے شملے والے لوگ اپنے خاندانی شجرے رکھواتے تھے، ہمیں بندے کی ہڈی بوٹی سب پتا چل جاتی ہے ایک نظر میں، گلے کے اٹھنے بیٹھنے، نظریں اٹھانے جھکانے سے ہی خون کی نجاست نجابت دونوں ہی کا پتا چل جاتا ہے۔ کھاری کی قسمت کہ وہ ادھر میرے تیرے ہاتھوں پلا، اس کی تو جسم کی ایک ایک جنبش بتاتی ہے کہ وہ کسی اعلا خاندان کی اولاد ہے۔"

"اف!" ماہ نور نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ "میں تو شاید ہی کبھی کسی گورکھ دھندے کو سمجھ پاؤں، مجھے تو ویسے بھی پزلز اور رڈلز (پہیلیوں) میں ذرا سی بھی دلچسپی نہیں۔ لیکن پلیز آپ سعدیہ کو اپنے پاس بلائیے، جو پہلے نہیں بتایا تھا وہ اب بتائیے تاکہ اس کی زندگی کو کوئی واضح شکل مل سکے۔"

"مجھے ایسا لگتا ہے میں سعدیہ سے نظریں نہیں ملا پاؤں گی۔ ساری عمر اس نے میرے چند الفاظ سنے اور کان کھڑے کرلیے کہ یہ ماں اتنی بھی جاہل نہیں تھی، اتنی بھی بے نیاز نہیں تھی۔ تو اگر میں شروع سے ہی اس کے سامنے جہالت اور کم عقلی کا برقعہ اوڑھے ایک بے نیاز ماں نہ بنی رہتی تو آج شاید اس کے حالات بھی مختلف ہوتے۔ میں نے خود ہمیشہ اسے ڈاکٹر بنانے کی بات کی۔ وہ میری بتائی ہوئی لائن پر چلتی گئی۔ محنتی تھی۔ نہ سردی دیکھتی تھی نہ گرمی برسات۔ اسکول جانے کا کبھی ناغہ نہیں کیا اس نے، پھر مجھے کیا سوجھی کہ اس کی آنکھوں میں نئے خوابوں کا ذرا سا رنگ ابھرتے دیکھ کر بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔ میں کیوں بھول گئی کہ بچیاں جب جوان ہونے لگتی ہیں تو نئی چیزیں دیکھ کر نئے نئے خواب بھی دیکھنے لگتی ہیں۔ ماؤں کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ بچیوں کے خوابوں کو سیدھا راستہ دکھائیں تاکہ سیدھے راستے سے دوسری طرف ہٹا دیں۔"

"آپ اسے ڈاکٹر کیسے بناتیں آنٹی! آپ کے وسائل شاید اس کے متحمل نہ ہو پاتے، اس لیے آپ کا وہ فیصلہ ٹھیک ہی تھا۔ کھاری اور سعدیہ ابھی کم عمر ہیں۔ جوں جوں بڑھیں گے سنبھلتے جائیں گے۔" ماہ نور نے آپا رابعہ کو خود ساختہ پچھتاوے سے نکالنے کی کمزور سی سعی کی۔

"جو چوہدری سردار ایک درخواست پر سعدیہ کو کھاری کے ساتھ بیاہ کرلے جاتا ہے۔ وہ ایک درخواست پر اسے ڈاکٹر بنانے کے لیے وسائل بھی مہیا کردیتا۔ شاید بس مجھے ہی عجلت کی بیماری لگ گئی تھی۔" آپا رابعہ کھوئے ہوئے انداز میں بولیں۔

"وہ تو ابھی بھی ہوسکتا ہے آنٹی! میں چچا سردار سے بات کروں گی۔ سعدیہ اگر ڈاکٹر بننا چاہتی ہے تو وہ سب انتظام کردیں گے۔"

"نہ بی بی نہ۔۔۔ اب نہیں۔" آپا رابعہ نے تیزی سے کہا۔ "کھاری بے چارے کا کیا قصور کہ وہ چھوٹی گاڑی کا پہیہ بن کر رہ جائے، اب تو جو ہوگیا سو ہوگیا، بس اللہ کرے دونوں ساتھ خیریت سے نباہ لیں۔"

"ہیلو ماہ نور۔ مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ سعد تو نہیں، اس کی گاڑی البتہ ملی ہے ایک جگہ سے جس کو دیکھ کر سعد کے والد کا خیال ہے، وہ خیریت سے ہے، گاڑی ملنے کے بعد وہ اطمینان سے بیٹھ گئے ہیں، مزید تلاش رکوادی ہے جبکہ میں ابھی تک الجھن میں ہوں کہ وہ کہاں غائب ہے۔ کیا اس نے تم سے کوئی رابطہ کیا؟" اسی دوران ماہ نور کے ہاتھ میں پکڑے فون پر ابراہیم کا پیغام موصول ہوا۔

"سعد تو نہیں اس کی گاڑی۔" ماہ نور نے دو، تین مرتبہ ان الفاظ کو پڑھا اور اسے لگا جیسے ایک بار پھر اس کا دل پسلیوں میں دب گیا ہو۔

"وہ کہاں ہے، وہ کہاں گیا؟" آپا رابعہ سے ہونے والی گفتگو کے دوران جو اضطرار کہیں جا سویا تھا، پھر سے جاگنے لگا تھا۔ اس نے دوبارہ سے سعد کا نمبر ملانے کی سعی شروع کردی۔ کبھی دھیان سے کبھی بے دھیانی میں وہ بار بار نمبر ملاتی اور جواب میں مخصوص پیغام سننے لگی۔

"تمہارا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا میری بچی! اسے مجھ سے ملادو، میرے سینے میں لگی آگ جب بجھے گی تو تمہارے راستے کی سب دھول چھٹ جائے گی اس نیکی کے ثواب میں۔" پھر اس نے دیکھا کھاری کی ساس، آپا رابعہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھی تھیں۔

"اللہ تمہاری شان بڑھائے گا، اونچے شملے والوں کو تمہاری چوکھٹ کا غلام بنادے گا، تمہارے بھاگ جگائے گا من کی مراد پاؤ گی۔"

ماہ نور کا ذہن صاف سلیٹ کی مانند ہو رہا تھا، جس پر کانوں تک پہنچتے یہ نئے الفاظ ثبت ہونے لگے تھے شان، غلام، بھاگ، مراد۔ کیا اگر میں یہ کام کرپاؤں۔ تو واقعی مجھے بدلے میں وہ سب ملے گا جو یہ کہہ رہی ہیں یا یہ محض

روانی میں دی جانے والی رٹی رٹائی دعا تھی۔ اس نے ذہن کی سلیٹ صاف ہونے کے بعد پہلی بات سوچی۔

پھر جیسے اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

"میرے ڈیڈی کا خیال ہے کہ کیونکہ میری والدہ میراثن تھیں لہٰذا مجھ میں بھی میراثیانہ وصف جینز کے ذریعے بدرجہ اتم ٹرانسفر ہوچکے ہیں۔" کبھی کے سنے الفاظ اس کی یادداشت سے ٹکرائے' ذہن کی سلیٹ پھر سے پرانے الفاظ سے بھرنے لگی۔

"آپ کی کہانی پر مجھے یقین آگیا آنٹی! اگرچہ کہیں کہیں آپ نے بات کو توڑا موڑا ہے' لیکن میرا آپ سے وعدہ ہے میں سعد کو آپ تک ضرور لاؤں گی۔ آپ کے سینے میں لگی آگ ضرور بجھے گی' آپ کے سینے میں موجود ممتا کو جو آگ لگی ہوئی ہے نا اس پر صرف تعلق کا پردہ نہ ڈالیں' وہ جانتا ہے اس کے لیے یہ حقیقت شرمندگی کا باعث نہیں ہے۔ وہ تو سب جاننے کے باوجود مسلسل تلاش میں ہے۔ جب ہی تو عزت داروں کی سوسائٹی کے بجائے میلوں' ٹھیلوں' جھگیوں اور سستے بازاروں میں سرگرداں رہتا ہے۔ میں اس کی یہ تلاش بھی ختم کراؤں گی اور آپ کی پیاس بھی بجھاؤں گی۔ چاہے اس کے بدلے میرے بھاگ میری شان اور میری چوکھٹ یونہی رہے جیسے ہے۔" اس نے بے اختیار ہوتے ہوئے کہا اور آپا رابعہ کے نفی میں ہلتے سر کا مفہوم سمجھے بغیر وہاں سے اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"میری آنکھیں کمزور ہوچکی ہیں' اس لیے میں بہت قریب سے بھی دیکھ کر بندہ نہیں پہچان سکتا۔" اس کے سامنے بان کی کھاٹ پر بیٹھے بزرگوار نے آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا سا بنا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ بزرگوار کے ہاتھ بڑھتی عمر کے تقاضوں اور کمزوری کی وجہ سے کانپ رہے تھے۔

"اگر آپ کے کان کمزور نہیں ہوئے تو کیا میں آپ سے چند سوال پوچھ سکتا ہوں" اس نے ان کے مزید قریب آکر بیٹھتے ہوئے منہ تقریباً ان کے کان میں گھساتے ہوئے پوچھا۔

"کان بھی کمزور ہیں' مگر آنکھوں سے کم۔" بزرگ نے اس کے منہ اور کان کے درمیان ہاتھ کا فاصلہ حائل کرتے ہوئے کہا۔ "ذرا یہ تو بتاؤ پہلے کہ تم کون ہو' کہاں سے آئے ہو' یہاں آمد کا مقصد کیا ہے۔"

"یہ تو مجھے آپ بتائیں گے کہ میں کون ہوں۔" اس کے چہرے پر بے بس سی مسکراہٹ ابھری۔ "یہ ہی معلوم کرنا میری یہاں آمد کا مقصد ہے۔"

"سوئی گیس کا پریشر آج پھر کم ہوگیا۔ لاکھ حکومت کہے ہم سپلائی بند نہیں کریں گے' سچ تو یہ ہے دیہاتی علاقوں کے ساتھ سوتیلوں کا سلوک کرتی ہے حکومت چاہے کسی کی بھی ہو۔" بڑے میاں کے جواب دینے سے پہلے ایک بڑی بی جو صحت اور بشاشت میں بڑے میاں سے خاصی بہتر حالت میں تھیں' ہاتھ میں کپڑے کی ایک پوٹلی سی پکڑے ادھر چلی آئیں۔

"ارے یہ برخوردار کون ہے؟" بڑے میاں کے پاس بیٹھی اس اجنبی شخصیت کو دیکھ کر وہ چونکیں اور بڑے میاں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔

"یہ بچہ ہم سے پوچھنے آیا ہے کہ یہ کون ہے۔" بڑے میاں نے اپنے رعشہ زدہ ہاتھ جھلاتے ہوئے کہا۔

"ہائیں۔" بڑی بی نے مارے حیرت کے پوٹلی کھاٹ پر ٹکا دی۔ "ارے میاں! اتنے بڑے یہ جانے بغیر ہی ہوگئے آپ کہ آپ ہیں کون؟"

"جی کچھ ایسا ہی ہے مونا آنٹی میرا مطلب ہے میمونہ بی۔" اس نے سر جھکا کر بالکل ویسے ہی کہا جیسے برسوں پہلے وہ ان ہی خاتون کے سامنے اپنی کی شرارت یا نقصان کردینے والی حرکت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کرتا تھا۔

"ہم تمہیں پہلے بھی بولتے تھے میاں کہ ہم کو آنٹی مت بولو' مت بولو لیکن تم لوگ مانتے کب تھے۔" بڑی بی مزید کوئی سوال کیے بغیر اس کے سامنے دھرے بید کی مخدوش حالت والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولیں اور اپنے کرتے کی جیب سے چشمہ نکال کر آنکھوں پر جمانے کے بعد اس کا بغور جائزہ لینے لگیں۔

"ہوں" کچھ دیر اس کا جائزہ لینے کے بعد انہوں نے چشمہ آنکھوں سے اتارا اور ہونٹ بھینچتے ہوئے سر ہلا کر بولیں۔ "ہو تو سہی کوئی مگر ہماری یادداشت جواب دے گئی ہے اس واسطے ڈھنگ سے یاد نہیں آرہا کہ کون سی والی کوٹھی کے سپوت ہو۔

کیوں فضل صاحب؟" پھر بڑی بی' بڑے میاں سے مخاطب ہوئیں۔ "کچھ یاد آیا کہ یہ صاحبزادے کس گھرانے کے نور چشم ہیں۔"

"کوشش کررہا ہوں' لیکن یاد نہیں آرہا' گنتی بھی تو لمبی ہے برخورداروں کی۔" بڑے میاں نے آنکھوں پر ڈوری کی مدد سے کیے چشمے کو درست کرتے ہوئے کہا۔

"میرا نام سعد سلطان ہے مونا آنٹی! آپ کو سعد اور نادیہ تو یاد ہوں گے' بلال سلطان کا گھر بھی یاد ہوگا جب وہ ویسٹریج میں رہا کرتے تھے۔" اس نے ان دونوں کو مزید ذہنی کشمکش میں ڈالنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"بلال سلطان صاحب' وہ میم صاحب کا صاحب جو تھا۔" بڑی بی کی یادداشت نے فوراً "جمع تفریق کرنے کے بعد نتیجہ ان کے گوش گزار کیا۔

"نادیہ' وہ پیاری معصوم بچی' بے چاری میم صاحب جس کو جل دے کے بھاگ لی تھی۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولیں۔

"جی بالکل وہی۔" اس نے تیزی سے سر ہلایا۔ بڑی بی بزرگوار کے کان میں کچھ بڑبڑائیں' جسے سننے کے بعد بڑے میاں نے تیزی سے سعد کی طرف دیکھا۔

"میرے انگوٹھے کا جوڑ ابھی بھی ٹھیک نہیں ہوا برخوردار! یاد ہے کرکٹ کی لال گیند مار کر جوڑ توڑا تھا آپ نے میرا۔"

"مجھے سب یاد ہے فضل چاچا!" بڑے میاں کی تیز رفتار یادداشت پر حیران ہوتے ہوئے اس نے سر ہلایا اور ان دونوں کو اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے دیکھ کر تیزی سے اٹھ کر ان کے قدموں میں جا بیٹھا۔

"ہم کبھی نادیہ کو اتنی چھوٹی سی عمر میں اکیلے نہ چھوڑتے' مگر صاحب نے ہمیں دن نکلنے سے پہلے نوکری چھوڑ اپنا ٹھکانا کرلینے کا حکم سنا دیا تھا۔" بڑی بی نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"سعد میاں ہاتھ کیسے زخمی کرلیا آپ نے؟" بڑے میاں کی کمزور نظر اچانک اس کے ہاتھ پر پڑ گئی اور انہوں نے بلا ارادہ اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہاتھ کا زخم تو ظاہری ہے فضل چاچا!" اس کی مسکراہٹ میں بھی دکھ تھا اور ایک ایسی بے بسی جس کے اندر غصہ' دباؤ' کشمکش اور رنج چھپا بیٹھا تھا۔ "میں اپنے پوشیدہ زخموں کی گنتی کرنا چاہوں بھی تو نہ کرپاؤں۔"

"اوپر ہوکر بیٹھو سعد میاں!" فضل حسین نے اپنے قریب اس کے لیے جگہ بناتے ہوئے کہا۔ "اور یہ بتاؤ کے برس بعد ہماری یاد آئی۔"

"سالوں کی گنتی بھی ناممکن ہے شاید فضل چاچا اور سچ بتاؤں آپ کی یاد بھی مجھے کسی کے یاد دلانے پر آئی ورنہ خود سے شاید میں کبھی یاد نہ کرتا کہ آپ بھی کوئی تھے۔" اس نے سچائی سے اعتراف کیا۔

"لیکن ہم دونوں شاید کبھی نہیں بھولے۔ وہ سارے بچے جن کو ہم نے بڑھنے میں مدد دی' کل چھ گھر تھے جن میں ہم نے باری باری نوکری کی۔" میمونہ نے چھ انگلیاں اٹھا کر دکھائیں۔ "اور مجھے تو صاحب لوگ رکھتے ہی

اپنے بچوں کے واسطے تھے ان کو کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا سکھاؤ ان کا بولنا بات کرنا سکھاؤ جن صاحب لوگوں کو زبان سے پیار تھا نا جو زبان کی قدر کیا کرتے تھے وہ ہمیں نوکری پر رکھتے تھے۔ بلال صاحب نے بھی مجھے ربانی صاحب کے گھر دیکھا تھا اور ربانی صاحب کے سر ہو گئے کہ جب آپ ولایت چلے جاؤ تو میمونہ بی کو میری طرف رکھوا کر جاؤ گے میں چاہتا ہوں میرے بچے انگریزی اسکولوں میں پڑھتے پڑھتے اردو بولنا لکھنا پڑھنا بھول جانے والے بچوں میں شمار نہ ہوں۔ یوں نوکری مجھے ملی تھی سعد میاں آپ کے گھر فضل صاحب تو اضافی خانساماں بن گئے میرے شوہر ہونے کی مجبوری کو۔"

وہ فضل دین کی طرف دیکھ کر زور سے ہنس دیں جواب میں فضل حسین آدمی پوری بات سن سمجھ کر یوں ہی سرہلاتے ہوئے ہنس دیے۔

"آپ کے گھر سعد میاں! آپ کو یاد ہے موٹا باورچی کام کرتا تھا جس کا نام سعادت تھا جو ہر وقت باورچی خانے میں ٹیپ ریکارڈ وہ موا جس کا نام کیا کرکے تھا بھلا سا۔" وہ یاد کرتے ہوئے بولیں۔

"جیوک باکس۔" سعد نے لقمہ دیا۔

"ہاں وہی" میمونہ بی نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے سرہلایا۔ "ہر وقت لگائے رکھتا تھا اس پر گانے اور چھوٹی جو آپ کی بہن تھی نادیہ اسے کہتا تھا آؤ نادیہ بی بی کتھک ناچ ناچیں برسات کے گیتوں پر یا بریک ڈانس کریں انگریزی گانوں پر وہ جو موا تھا کیا کرکے نام اس کا کالا بھجنگ سیاہ فام گلوکار۔" انہوں نے ایک بار پھر اپنی یادداشت کو کوستے ہوئے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

"ہاں وہ مائیکل جیکسن" میمونہ بی نے سرہلایا۔ "اب یہ سب تو ہوتا تھا باورچی خانے میں جو سعادت کی راجدھانی تھی اور یہ فضل صاحب۔" وہ فضل دین کی طرف دیکھ کر ہنس دیں۔ "یہ باورچی خانے میں دھری پرانی آرام کرسی پر جھولتے رہتے ایک مرتبہ بھی منع نہ کیا اس موٹے باورچی کو جو چھری پھیرے جانے کے لائق تھا کہ معصوم بچی کے اخلاق کیوں خراب کرتے ہو میاں اپنا کام دھیان سے کرو مگر یہ تھے اس کا ماتحت عملہ منع کرتے بھی تو کیوں کرتے۔"

میمونہ بھی یادوں کی گلی میں اتر چکی تھیں اور فضل دین کان لگائے سننے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ کیا کہہ رہی تھیں۔

"چھری پھیرنے والی بات بتا رہی آپ؟" فضل دین نے کان کی لو پر دھرا ہاتھ اٹھاتے ہوئے میمونہ بی بی کی طرف دیکھا۔

"دلیں بھئی سعد میاں! اس بات کو غلطی سے سن لینے پر تو ہم نکالے گئے آپ کے گھر سے یوں کرکے صرف چار پانچ گھنٹے کے نوٹس پر۔" فضل حسین نے چٹکی بجانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے سعد کی طرف دیکھا۔

"کس بات کو سن لینے کی غلطی کی تھی آپ نے فضل چاچا؟" سعد نے منہ ان کے کان کے قریب کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہی چھری پھیرنے والی بات سن لینے پر۔" فضل حسین نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے مسکرا کر — کہا جیسے وہ بات جو انہوں نے غلطی سے سن لی تھی۔ اب زبان زد عام قصہ بن چکی ہو۔

"میم صاحب نے صاحب کو غصے میں کہا کہ ان کو سب معلوم صاحب کسی میڈم صاحب کے ساتھ کیا کر چکے تھے صاف گلے پر چھری پھیری تھی انہوں نے یہ بولی تھیں میم صاحب صاحب سے۔ ہماری قسمت ہم اس وقت صاحب کے شکار پر جانے کا سامان بیگ میں رکھ رہے تھے صاحب نے میم صاحب کو تو کیا جواب دینا تھا۔ ہم پر نظر پڑتے ہی ہم پر ہی پل پڑے ہم سے شکاری بوٹ چھین کر بولے۔ فضل دین! اپنا اور اپنی بی بی کا کوئی دوسرا

بندوبست کرلیجے صبح ہونے تک۔ آپ فی الفور نوکری سے فارغ سمجھیے اپنے آپ کو۔"

فضل دین نے آنکھوں میں آتے پانی کو کرتے کا کونا اٹھا کر خشک کیا اور دوبارہ چشمہ لگانے سے پہلے اپنی پانی پانی ہوتی آنکھوں سے سعد کو دیکھا ہمی کے اس پار ان کو سعد کے چہرے کے نقوش بگڑتے پھیلتے اور بے ہیئت سے نظر آئے چشمہ دوبارہ آنکھوں پر جما کر دیکھنے سے بھی سعد کے چہرے کی صورت حال میں انہیں کوئی خاص فرق نہیں محسوس ہوا تھا۔

"بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی کہ ہمارا قصور کیا تھا۔ کیوں میمونہ بی؟" انہوں نے بات کا سلسلہ دوبارہ سے جوڑتے ہوئے میمونہ بی کی طرف دیکھا جن کے چہرے پر افسردگی چھا چکی تھی جیسے وہ بھی کسی ایسی پرانی یاد کے تصور میں گم تھیں جو تکلیف دہ اور ناگوار تھی۔

"ہمارا تو مغز ہی کم زور تھا لیکن میمونہ بی کو بتایا تو انہیں بھی کچھ سمجھ نہیں آئی کہ وجہ کیا بنی ہماری برخواستگی کی۔ صاحب کے دیے ہوئے وقت کے اندر اندر ہم نے بنا کوئی سوال کیے پھر بھی اپنا بوریا بستر باندھ لیا اور منہ اندھیرے رخصت ہونے کو جب بڑے پھاٹک کے قریب پہنچے تو دیکھا صاحب پریشان حال ادھر سے ادھر چکر لگا رہے ہیں پھاٹک تک جاتی روش ابھی زیر تعمیر تھی بجری کی تازہ بچھی تہہ پر صاحب کے جوتوں کے دباؤ سے کٹاک کٹاک ہوتی اور پھر جب وہ فاصلے پر چلے جاتے تو خاموشی چھا جاتی سردی کی اس منہ اندھیری صبح کے وقت صاحب کو یوں چکر لگاتے دیکھ کر ہم حیران تھے مگر اگلے ٹھکانے کی پریشانی نے یہ سوچنے نہیں دیا کہ صاحب یوں کاہے کو چکر لگاتے پھر رہے ہیں۔ ہم دونوں نے کچھ دیر رک کر یہ منظر دیکھا اور پھر سر جھکا کر پھاٹک کی طرف چل دیے جب ہی ہمیں صاحب کی آواز آئی۔ "فضل میاں اور میمونہ بی! یاد رکھیے گا آپ نے رات کچھ نہیں سنا۔" دونوں نے صاحب کی بات سن کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر میں ہمت کرکے صاحب کی طرف دیکھے بنا بولی۔

"صاحب ہمارے تو کان ہی پٹ چکے ہم نے رات سے پہلے بھی جو کچھ آپ کے گھر میں سنا سمجھیں نہیں سنا۔"

"پھر وہ کچھ نہیں بولے اس پر؟" سعد جواب تک خلاف طبع خاموشی سے ان دونوں کی بات سن رہا تھا۔ پہلی بار سوال کرنے پر مجبور ہوا۔

"نہیں۔ وہ کچھ نہیں بولے اور ہم اپنا سامان اٹھاتے پھاٹک پار کر گئے۔" میمونہ بی بی نے کہا۔

"سعد میاں! ابھی آپ کی شین قاف ہم اپنی مرضی کے مطابق ٹھیک ہی نہیں کر پائے تھے کہ ہمیں وہاں سے آنا پڑ گیا چھوٹی بچی نادیہ کو جس کی ماں میم صاحب جو ہمیں بعد میں پتا چلا کہ اسے چھوڑ کر چلی گئیں ہم بھی بھلا نہ پائے۔ اسے تو ابھی الف آم ب بکری والا قاعدہ ہم نے شروع ہی کرایا تھا کہ اسے چھوڑ آنا پڑا۔"

"ہوں۔ سعد نے لمبا سانس لیتے ہوئے سرہلایا۔" میمونہ بی آپ کو تو پتا ہی ہوگا کہ میں کون ہوں میری ماں کون تھیں؟"

"وہ چھری والی بات اسی لیے تو کہہ رہی تھیں میم صاحب!" میمونہ کے بجائے فضل دین نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن میمونہ بی کے اونہوں کہنے پر فوراً خاموش ہو گئے۔

"آپ کے گھر جب ہم نوکری کرنے گئے تھے سعد میاں! تو آپ کی والدہ اس وقت بھی ہم نے دیکھیں نہ ان کے بارے میں کوئی بات سنی تھی۔ گھر کی کار مختار میم صاحب تھیں اور ظاہر ہے کہ ان کے رکھے سب ملازم انہی کے زمانے کے تھے سو آپ کی والدہ کے بارے میں کسی کو علم نہیں تھا سو ہم بھی کبھی ان کے بارے میں کچھ نہ جان پائے۔" فضل دین کو خاموش کرانے کے بعد میمونہ بولیں۔

"مگروہ چھری پھیرنے والا قصہ تو۔۔۔" فضل دین نے ابھی بھی میمونہ بی کی آدھی بات سن کر آدھی بات نہ سمجھتے ہوئے اپنی بات کہنے کی ایک مرتبہ پھر سعی کی۔

"ارے فضل صاحب! اس بات کا اس سوال سے کیا تعلق؟" میمونہ نے ایک مرتبہ پھر انہیں خاموش کرایا اور مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ سعد کی طرف دیکھا۔

"فضل چاچا شاید ڈیڈی کو قاتل یا قاتل نما ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں' انہیں ایسا کر لینے دیجیے مونا آنٹی!" اس کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ ابھری۔

"ارے سعد میاں۔ کاہے کو آپ ایسا بول رہے ہیں؟" میمونہ بی تیزی سے بولیں۔ "بلال صاحب جیسا وضع دار اور رکھ رکھاؤ والا انسان بھی کبھی کسی کا قتل کر سکتا ہے بھلا۔ یہ فضل صاحب دل سے اپنی برخواستگی نکال نہیں پائے۔"

"یہ ہی تو بات ہے مونا آنٹی!" سعد نے کھاٹ کے نیچے اور اس کے ارد گرد زمین پر بکھرے خشک پتوں اور سوکھے تنکوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "فضل چاچا کو جس بات کو اتفاق سے سن لینے کی پاداش میں کھڑے کھڑے نوکری سے نکال دیا گیا۔ وہ اسے کیسے بھول سکتے ہیں۔ اوپر سے انہیں تنبیہہ بھی کر دی گئی کہ انہوں نے وہ بات نہیں سنی تھی' آپ جانتی ہیں کہ جوں جوں عمر بڑھتی ہے حافظے میں سوئی پڑی پرانی باتیں انگڑائی لے کر جاگنے لگتی ہیں۔"

"وہ بات ٹھیک ہے سعد میاں! مگر آپ کے سوال کا جواب تو وہ نہیں نا جو یہ دے رہے ہیں؟ اور یہ تو بتا ئیں آپ کہ اتنے سالوں بعد آپ کو کیا ضرورت پیش آ گئی کہ یہ سوال لے کر آپ ہم بھولے بسروں سے ملنے یہاں تک آ گئے۔"

"یونہی مونا آنٹی! حقائق کی جو ایک پوٹلی میرے ہاتھ میں ہے اس میں موجود گنجلک گتھیوں کی مانند الجھے پڑے ہیں' میں نے سوچا شاید کسی الجھی ڈور کا کوئی سرا آپ کے ہاتھ میں پکڑا مل جائے سو آپ کی طرف چلا آیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہاں آ کر میں مزید الجھ جاؤں گا' جن ہاتھوں میں انسانی جذبات کے آلات لوکیٹ کرنے میں میں اب تک ناکام رہا تھا یہاں ان میں پکڑی چھری کی خبر مل گئی۔"

"نہیں نہیں سعد میاں! وہ کوئی اور بات ہو گی۔ نہ فضل صاحب کو سمجھ آئی نہ بلال صاحب کو پتا چلا کہ فضل صاحب نے سن بھی لیا تو سمجھ تو نہیں پائے نا۔" میمونہ بی نے سہلاتے ہوئے کہا۔

"چلیں فضل چچا نہ سہی' میں تو کچھ کچھ سمجھ گیا' یہ تو پتا نہ چل سکا کہ میں کون ہوں البتہ اتنا ضرور پتا چل گیا کہ چھری بھی آلات قتل میں شمار ہوتی ہے۔" وہ طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔

"اتنے سے تھے آپ جب ہم آپ جدا ہوئے۔" میمونہ بی نے ہاتھ کے اشارے سے ایک خیالی اونچائی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "کیا ہوا جو تاڑ جیسا قد نکال گئے اب آپ' یہ بھی تو ذہن میں رکھیے کہ ہم قدرت میں تو اتنے ہی سہی عمروں میں اتنے ہی سال آگے نکل چکے ہیں جتنا کہ آپ' زمانہ ہم آپ سے زیادہ دیکھ رکھے ہیں' چھریاں کاٹنے باورچی خانے میں اور دسترخوان پر استعمال ہونے کے اوزار ہیں۔ اوزاروں کو آلات بنانے کی کوشش تو مت کریں سعد میاں! لفظوں کی ذرا سی ہیرا پھیری' سوچ کا ذرا سا آگا پیچھا دوست کو رقیب اور رقیب کو رقیب روسیاہ بنا دیتا ہے یاد رکھیے گا ہماری بات۔"

"ہوں۔" اس نے اپنے خیالات کے گھوڑوں کی لگامیں کھینچتے ہوئے یوں ہی سر ہلا دیا۔ "آپ شاید ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ یہ تو بتائیے کہ آپ لوگ اس جگہ کیسے پہنچے' میرا مطلب ہے آپ دونوں تو اونچے بڑے گھرانوں میں خدمت کاری سرانجام دیتے رہے عمر بھر پھر اب اس عمر میں یہاں کیوں آ بیٹھے۔"

"ہمیں بحریہ میں ملازمت دلوا دی گئی تھی' موٹے باورچی سعادت کی صحبت میں رہتے ہوئے بہت کچھ بنانا سیکھ لیا' بحریہ کے ملازم ہوئے اور افسروں کا کھانا بنانے لگے' میمونہ بی مزے سے ہاؤس وائف بن گئیں' اولاد تو اللہ نے عطا کی ہی نہ تھی تو دوسروں کے بچوں سے ہٹ کر اپنے بچوں کا شین قاف سنوار تیں سو رادی ان کے لیے چین لکھنے لگا' بڑھتی عمر میں بھرتی ہوئے تھے۔ ملازمت کی مدت بھی جلد ختم ہو گئی' جو ملا سمیٹ سماٹ ادھر کو آ گئے اپنے آبائی گاؤں۔ یہ مختصر سا مکان اماں باوا کی نشانی ہے' سو ہم ہیں اور یہ ہے چین کی نیند سوتے ہیں سکھ کی آنکھ کھولتے ہیں۔" فضل دین نے کہا۔

"کیا یہ مشکل کام نہیں' ایک طرز زندگی سے دوسرے طرز زندگی میں آبسنا؟"

"جب بندے کو معلوم ہو کہ آخر میں اس کو اپنے اصل وطن ہی کو لوٹنا ہے تو پھر دیس میں بھی اس کی یاد دل سے نکلتی نہیں ہے جب ہی آبسنے میں مشکل نہیں پڑتی۔" میمونہ بی نے کہا۔

"لیکن آپ لوگ تو وہاں کئی ایسوں کو جانتے تھے جو آپ کے لیے وہاں نہ صرف بہت اچھا ٹھکانا بنا دیتے بلکہ آپ کی ویسے بھی خبر گیری کرتے رہتے۔"

"نہیں ہمیں وہ نہیں چاہیے تھا سعد میاں!" فضل دین نے کہا۔ "کیونکہ" ۔ وہ واپسی کے لیے اٹھتے اٹھتے دوبارہ بیٹھ گیا۔

"کیونکہ ہم نے کچھ نہیں سنا تھا۔" فضل حسین نے مبہم سی بات کی' ایک ایسی بات جو بظاہر بے معنی تھی۔

"مگر آپ جاتے کدھر کو ہو سعد میاں' ہمارے ہاتھ کا چک پی پلاؤ (سفید چنوں کا پلاؤ) نہیں کھائیں گے کیا' آپ کو تو بہت پسند تھا۔" اگلے ہی لمحے فضل دین نے بات بدل دی۔

"نہیں فضل چاچا! میں اب چلوں گا' مجھے بڑا لمبا سفر درپیش ہے مجھے اب چلنا ہی چاہیے۔" اس نے جواب دیا۔

"ایک بار آ گئے ہیں تو آتے ہی رہیے گا سعد میاں! برسوں بعد آنکھوں میں ذرا سی ٹھنڈ اترتی محسوس ہوئی ہے۔" میمونہ بی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چومتے ہوئے کہا۔

"آپ میرے لیے دعا کرتی رہیے گا مونا آنٹی!" اس نے ان کے سامنے احتراماً" جھکتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس کی تو کچھ خبر دیجیے بے بی نادیہ کی' جو میری پھلواری کی سب سے نوخیز کلی تھی۔" میمونہ بی نے اس کا ہاتھ چھوڑے بغیر کہا۔

"نوخیز کلی شاخ سے ٹوٹ کر الگ ہو جائے بلکہ الگ کر دی جائے تو اس کا کیا حال ہوتا ہے۔ آپ خود سمجھ سکتی ہیں۔" اس نے بھی ایک مبہم اور غیر واضح سا جواب دیا۔

"اس سے کبھی ملنا ہو تو اسے بتائیے گا کہ میمونہ بی اب تک ہر رات کو اس کی تصویر دیکھنے کے بعد سوتی ہیں۔" میمونہ بی نے اپنی نم آنکھیں دوپٹے سے پونچھیں۔

"اور اگر سعادت باورچی کہیں ملے تو اسے بتائیے گا کہ فضل دین تمہیں سلیوٹ پیش کرنا چاہتا ہے۔" فضل دین نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں اب چلوں گا۔" اسے یکدم لگا تھا کہ وہ ایک منٹ بھی مزید وہاں ٹھہر نہ پائے گا۔

"فی امان اللہ۔" میمونہ بی نے اٹھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "جیتے رہو سعد میاں' شاد رہو' آباد رہو۔" فضل دین نے اٹھنے کی ناکام سعی کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹھے رہیے فضل چاچا!" اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر انہیں اٹھنے سے منع کرتے ہوئے کہا۔

"ایک آخری سوال فضل چاچا!" یہ بات کہتے ہوئے اس کی آواز خود بخود سرگوشی میں ڈھل گئی اور منہ فضل دین کے کان کے بالکل قریب آ گیا۔

"وہ کیا؟" فضل دین نے اسی سرگوشی کے سے انداز میں یوں پوچھا جیسے چھوٹے سے سعد کے ساتھ کوئی نئی شرارت بھری سازش کی تیاری ہو رہی ہو۔

"آپ کی اور مونا آنٹی کی یہاں موجودگی کا علم یعنی فلزا ظہور کو کیونکر ہے؟" اس نے اسی طرح سرگوشی کی' جواب میں فضل دین کے یکایک سفید پڑتے چہرے کو دیکھ کر وہ بری طرح ٹھٹکا تھا۔

"میمونہ بی! آپ خود دروازے تک رخصت کیجیے گا سعد میاں کو۔" اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے میمونہ بی سے کہی فضل دین کی یہ بات اسے بہت کچھ لمحہ بھر میں سمجھا گئی تھی۔

"ہاں ہاں میں جا رہی ہوں۔" میمونہ بی نے سعد سے بھی پہلے آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یاد رکھیے گا فضل چاچا! میرے سوال کا جواب ادھار رہا۔" اس نے مڑتے ہوئے اس بار با آواز بلند کہا' جواب میں فضل دین نے رخ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔

"فضل صاحب اب سٹھیا گئے ہیں۔ سترے بہترے ہو چکے' ان کو بالکل پتا نہیں چلتا' کیا بات کرنی ہے کیا نہیں' ان کی باتوں پر غور کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سعد میاں! میں بھی ایک کان سے سنتی ہوں اور دوسرے سے نکال دیتی ہوں۔" میمونہ بی نے اس کے ساتھ گھر کے داخلی دروازے کی طرف آتے ہوئے کہا۔

"ساٹھ سال کی عمر میں انسان سٹھیاتا ہے مونا آنٹی!" دروازے کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا اور میمونہ بی سے مخاطب ہوا۔ "ستر یا ستر سال سے کچھ اوپر جا کر سترے بہترے ہو جاتا ہو گا' آپ ایک فیصلہ کریں تاکہ فضل چاچا دراصل اس وقت عمر کے کس پیٹے میں ہیں۔"

"ارے میاں! عمر تو ان کی اسی سے بھی اوپر ہو چکی تو بس کم و بیش وہی حالت ہوئی نا۔ سٹھیائے ہوئے سترے بہترے۔"

"سچ کہہ رہی ہیں۔" وہ مسکرایا "آپ ان کو جو بھی ثابت کرنے کی کوشش کریں' لیکن میری طرف سے تسلی رکھیں' میں ان کی کہی کسی بھی بات کا کسی سے ذکر نہیں کروں گا' کیونکہ میں خود دنیا سے چھپتا چھپاتا آپ تک پہنچا ہوں۔"

"ہوں!" میمونہ بی کے چہرے پر چھائی پریشانی اس سارے عرصے میں پہلی بار قدرے کم ہوئی "اول تو کوئی ادھر کو آتا نہیں' آیا بھی تو ہم بھی کسی سے نہیں کہیں گے۔" وہ گویا اپنے تئیں اس کی شریک راز ہوئیں۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" سعد کو ان کی تسلی پر اطمینان سا محسوس ہوا۔ اس نے احتراماً" سر ہلایا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ میمونہ بی دروازے پر گرے پردے کو ہاتھ سے اٹھائے اسے دور تک جاتے دیکھتی رہیں۔ اور پھر آہستہ قدموں سے چلتی واپس فضل دین تک پہنچ گئیں۔

"یہ کیسے پہنچ گئے بھلا ہم تک؟" انہوں نے فضل دین سے سوال کیا۔

"میمونہ بی! ہم نے ان کو برخواستگی کا تو بتا دیا۔ یہ کیوں نہیں بتایا کہ ہم کو بحریہ میں ملازمت کس نے دلوائی تھی؟" فضل دین نے الٹا میمونہ بی سے سوال کیا۔

"یہ ہی تو ہم بھی سوچ رہے ہیں اور پھر وہ نہیں بتایا تو یہ بھی کیوں نہیں بتایا کہ ابھی تک ڈھوک کھوکھر کے اس مختصر سے مکان کے دو مکینوں کے لیے ہر ماہ راشن کون بھجواتا ہے۔"

"ہاں ہاں!" فضل دین نے اپنے ہلتے ہوئے سر کو قابو کرنے کی کوشش کی۔ "نہیں بتایا مگر یہ بات پکی ہے کہ وہ خود سے سب جانتے ہیں۔"

"ہائیں وہ کیسے؟" میمونہ بی ادھڑے ٹوٹے بید کی کرسی پر ٹکتے ٹکتے پل بھر کو رکیں۔

"تصویروں والی میم صاحب کا پوچھ رہے تھے کہ وہ ہمیں کیسے جانتی ہیں۔"

"ہوئی اللہ سچ کہیں۔" میمونہ بی نے انگشت شہادت اپنی ٹھوڑی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اور نہیں تو کیا۔" فضل دین نے چشمہ آنکھوں سے اتار کر آنکھیں پونچھیں۔ "جو یہ جانتے ہیں کہ تصویروں والی میم صاحب کو ہمارا نام پتا معلوم ہے وہ اور کیا نہ جانتے ہوں گے۔"

"پھر چھری والی بات پر چونکے کیوں؟" میمونہ بی نے سوال کیا۔

"آپ سمجھیں نہیں میمونہ بی! سعد میاں چھری والی بات کی تو ہم سے تصدیق کرنے آئے تھے' باورچی خانے میں استعمال ہونے والے ایک آلے کو آلہ قتل انہوں نے ہی قرار دیا تھا۔" فضل دین مسکرائے۔

"ہائے کیسا خونیں منظر دیکھ کر آئے تھے آپ صاحب کے ساتھ لاہور میں۔" میمونہ بی اپنا سوال بھول گئیں' ان کے پردہ تصور پر ماضی کے ایک منظر کا عکس جھلملانے لگا تھا۔

"آلہ کس کا تھا' قتل کس کا ہوا' کچھ سوجھا ہی نہیں' یاد ہے تو بس وہ کٹی گردن اور چاروں طرف بکھرا خون۔ ہم سے بڑی بھول ہو گئی میمونہ بی! ہم نے بے دھیانی میں سعد میاں سے اسی قصے کا ذکر کر دیا جس کی تصدیق کی خاطر وہ آئے تھے۔"

"یہ ہی تو ہم آپ سے کہتے ہیں فضل صاحب! اب نجانے کیوں باتیں آپ کے منہ سے بلا ارادہ پھسلنے لگی ہیں۔ سننے کو دو کان صرف ہمارے ہی ہیں۔ اس لیے آپ احتیاط نہیں کرتے لیکن آج دیکھا' کیا نتیجہ نکلا اس بے احتیاطی کا کہ سعد میاں کے سامنے وہ بول بیٹھے جو نہیں بولنا تھا' کیونکہ آپ نے تو کچھ سنا تھا نہ دیکھا تھا۔" میمونہ بی نے ناراض لہجے میں کہا اور کھاٹ پر رکھی پوٹلی کھول کر اس کے اندر جھانکنے لگیں۔

"ہم نے تو فوراً" اپنی زبان کو تالا لگا لیا' آپ کہیں اتنے سال سے اپنے اندر وہ واقعہ دفن کیے بیٹھے ہیں کہ نہیں' ہمارے ہاتھوں تو وہ بانسری اب تک نہ نکلی جو بجنے پر پکار ڈالے کہ شہزادے کے گدھے کے کان ہیں۔" فضل دین اپنی صفائی میں بولے۔

"بے چارے سعد میاں بھی ٹھیک پوچھے کہ کوئی تو بتائے وہ کون ہیں۔" میمونہ بی نے فضل دین کی بات ان سنی کرتے ہوئے پوٹلی سے ہاتھ نکال کر کہا۔ "یاد ہے کیسا سختی سے منع تھا گھر میں سعد میاں کی والدہ کا ذکر' شفیق میاں بتا رہے تھے ابھی تک اس معاملے پر چپ چاں کا ماحول ہے ادھر۔"

"نہ میمونہ بی۔" فضل دین نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جو محسن ہے' اس کا احسان یاد رکھیں ہمیشہ نہ ہم نے کچھ نہ دیکھا نہ ہی ہم کچھ جانتے ہیں۔"

"وہی تو ہم کہتے ہیں۔" میمونہ بی نے پوٹلی سے ایک پاسپورٹ سائز تصویر نکالتے ہوئے کہا۔ "اپنی زبان کو پھسلن سے بچائیے فضل صاحب۔"

"کس سے بچائیں بھئی' یہ سعد میاں آپ کا کیا خیال ہے۔ آج گئے پھر دوبارہ کبھی ادھر آئیں گے۔" فضل دین نے میمونہ بی کے ہاتھ سے تصویر لے کر آنکھوں کے قریب کرتے ہوئے کہا۔

"بے بی نادیہ کی یہ تصویر اس وقت کھنچوائی گئی تھی' زیدیز' سے جب ان کا داخلہ کانونٹ میں کرایا تھا میم صاحب نے۔" میمونہ بی نے فضل دین کو یاد دلایا۔

"یاد ہے' سب یاد ہے۔" فضل دین نے سر ہلایا۔ "شاخ سے ٹوٹی نوخیز کلی۔" انہوں نے آہ بھری۔

"شفیق بتا رہا تھا' بے بی نادیہ کدھر ہیں۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔" میمونہ بی نے تصویر واپس اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"میم صاحب بولتی جو تھیں۔ وہ صاحب کی لڑکی نہیں ہیں' ادھر وہ جو کرنل صاحب آتا تھا۔ ہٹلر کی مونچھوں والا' جو رات گئے تک ڈرائنگ روم میں بیٹھا اسکاچ اور وہسکی کی بوتلیں چڑھاتا رہتا تھا' اس کی لڑکی ہوں گی بے بی

نادیہ۔" فضل دین کے لہجے میں غصہ اور سختی اتری۔

"دیکھا پھر پھسلی آپ کی زبان فضل صاحب۔" میمونہ بی نے مصنوعی غصے سے فضل دین کو دیکھا۔

"تصویروں والی میم صاحب شکل کی اچھی تو نہیں تھیں مگر صاحب کو چاہیے تھا' ان کو لے کر گھر بسا لیتے ان سے' ان گوری میم صاحب سے اچھا گھر بسا لیتیں اور بسائے ہی رکھتیں پھر شاید آج سعد میاں چکری ہو کیلاں کا چکر نہ کاٹ رہے ہوتے۔" فضل دین اپنی دھن میں بولے چلے جا رہے تھے۔

"فضل صاحب' فضل صاحب۔" میمونہ بی نے ان کی زبان کی لگامیں کھینچنا چاہیں۔

"مگر ہمیں خوب یاد ہے' کیسا وہ صاحب سے گرج کر بولی تھیں کہ ان کو اب صاحب کی ضرورت نہیں تھی' کیسا تصویروں والے کاغذ اٹھا اٹھا کر صاحب کی طرف پھینکی تھیں' آخر میں موٹی جلد والی فائل بھی صاحب کے دے ماری تھی' خوب یاد ہے ہمیں' صاحب کچھ نہیں بولے تھے سوائے اس کے کہ۔ "تم نے غلط کیا' تمہیں مجھے بتانا چاہیے تھا' میں آوارہ کتوں بلیوں کی خوراک بننے کو چھوڑ دینے سے بہتر تھا۔ مجھے بتا تیں عمل کر گلا گھونٹ دیتے' اور کیا کرتے نفرت' نفرت کی گردان بھی کیسے تھے صاحب!"

"فضل صاحب! آپ بھول رہے ہیں کہ آپ نے کچھ دیکھا نہ کچھ سنا۔" میمونہ بی نے ایک بار پھر دہائی دی۔

"اور پھر صاحب ہمیں بولے فضل میاں! یہ سب کاغذ تصویریں سمیٹ لیجیے' ان کو موٹی جلد والی فائل میں سنبھال دیجیے' نفرت کی نشانیاں سنبھالنے کا بھی انسان میں حوصلہ ہونا چاہیے۔"

"فضل صاحب۔" میمونہ بی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر فضل دین کا بازو زور زور سے جھنجھوڑا۔

"اس کے بعد تو صاحب باہر کے ملک چلے گئے تھے نا میمونہ بی۔ کیا کر کے ولایت شاید' آگے سے ہم بھول سے گئے بات۔" فضل دین نے میمونہ بی کی طرف دیکھا اور اپنا بازو دوسرے ہاتھ سے سہلانے لگے۔

"ہالٹ فضل صاحب ہالٹ۔" میمونہ بی نے کہا۔

"ہاں ہاں۔ ہم تو چپ ہیں۔" فضل دین نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "بالکل چپ۔" فضل دین کا سر رعشے کی وجہ سے ہولے ہولے ہل رہا تھا اور میمونہ بی بے بسی سے سامنے کھڑی انہیں دیکھ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"بندہ ویلے نال روے تو چنگا رہتا ہے سعدیہ باؤ کویلے (وقت کے بعد) رون دا تے کوئی فیدہ (فائدہ) ہوتا ہے نہ بندے کے اتھرو (آنسو) پونچھتا ہے کوئی۔" کھاری نے اپنے بازو سے چمٹ کر روتی سعدیہ کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اماں اتنی اچھی نعتیں پڑھتی ہیں کھاری! اماں اتنی اچھی باتیں سکھاتی ہیں' وہ بول رہی تھیں اور میں نے وہاں بیٹھی عورتوں کو مکر کر کے سیں سچ میں روتے دیکھا میں نے جو آج دیکھیں یہ وہ اماں نہیں تھیں جو میں نے ہمیشہ اپنے گھر میں دیکھیں۔ بات بے بات غصہ کھانے والی' منہ کے آگے' سوچ کے آگے اپنی لاتوں اور گھونسوں کے بند باندھنے والی' مجھے تو اماں ایک نظر غصے سے دیکھ لیتیں تو میرے کئی دن اس ایک نظر کے خوف کی نذر ہو جاتے تھے۔" سعدیہ نے ہچکیوں کے دوران کہا۔

"بھین جی نے بھی چنگا (اچھا) نہیں کیا سعدیہ باؤ!" کھاری نے افسوس سے سر ہلایا۔ "جس ڈر کے ہاتھوں جس خطرے کی وجہ سے آپ کو اتنا دبا کے رکھا وہ تے ہو کے رہیا' آپ نے سر بھی اٹھایا اور اونچی آواز میں بھی بولیں۔ پر چنگا آپ نے وی نئیں کیا سعدیہ باؤ بلکہ آپ نے تو بڑا برا کیا بہت ہی برا کیا۔"

"مجھے اماں نے مجبور کیا ایسا کرنے پر۔" سعدیہ اس کے بازو سے الگ ہو کر بولی۔ "جب میں پانچویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ اس وقت سے مجھے کہہ رہی تھیں میں تمہیں ڈاکٹر بناؤں گی' خوب محنت کرو' میں نے دن دیکھا نہ رات میں کتابیں ہی پڑھتی رہی کتابیں کھول کر بیٹھی رہی میں نے کبھی نہ سوال کیا اماں سے کاہے کو آٹے کے سفید تھیلے کھول کر یونیفارم کی شلواریں سی کر دیتی ہیں مجھے۔ کیوں میری پیلی قمیصوں پر ہر سال ہی پیوند کھونچ بھرنے کی سلائیاں' چکناہٹ کے داغ اور جگہ جگہ سے مسکے ہونے کے نشان نظر آتے ہیں۔ کیوں میں بھی سردی گرمی میں کوئی نیا جوڑا نہیں پہن پائی' کیوں میرے سامنے ہمیشہ پانی میں تیرتے دال کے دانوں یا آلو کی قتلیوں کی رکابیاں ہی آتی ہیں' کیوں ہمارے گھر میں روٹی اتنی ہلکی اور پتلی بنتی ہے کہ دو نوالوں میں ختم ہو جاتی ہے' چاہے پیٹ خالی ہی کیوں نہ رہ جائے۔ بھوک کی شکایت نہیں کی جا سکتی کیونکہ ایک روٹی تو پوری کھالی ہوتی ہے ایک روٹی سے زیادہ کیا کھانا' کیوں بھوک رکھ کر کھانے کا اصول ابا جی پر لاگو نہیں ہوتا جو چپڑی کھاتے ہیں اور جتنی دل چاہے کھاتے ہیں۔"

کھاری نے دیکھا' آنسو بہاتے ہوئے یہ باتیں کرنے کے دوران سعدیہ کی ناک' منہ اور آنکھیں سرخ ہوئی جا رہی تھیں' اس کے بال بکھر گئے تھے اور سر سے اترا دوپٹا کندھوں پر ڈھلکنے لگا تھا۔

"لوگوں کے گھر آتے جاتے مہمان دیکھ کر دل میں جب بھی سوال اٹھا کہ ہمارے گھر کیوں کوئی نہیں آتا' اماں نے کبھی آرام سے نہ بتایا کہ ہمارا آگا پیچھا کوئی کیوں نہیں ہے۔ بس اکھڑ آواز میں چمٹا اٹھا کر گھر ک دیا' پھر بھی میں نے کئی سوال اپنے دل ہی میں رہنے دیے۔ کبھی نہ پوچھے' کبھی آواز نہ نکالی' صرف اس ڈر سے کہ کہیں اماں ناراض ہو کر مجھے ڈاکٹر نہ بنانے کی سزا نہ دے دیں۔" سعدیہ کی ہچکی بندھنے لگی۔

"آپ نئیں جانتیں سعدیہ باؤ!" کھاری نے کہنا چاہا۔ "آپ کو ابھی بھی کچھ نئیں پتا بھین جی دیاں مجبوریاں کا' آپ نوں نئیں پتا بھین جی کون کون سے عذاب سہہ کر ادھر تک پہنچے تھے۔"

"مجھے کبھی بتاتیں تو پتا چلتا۔" سعدیہ نے اپنی ہچکیوں اور سسکیوں پر قابو پاتے ہوئے کھاری کی بات کاٹی۔ "اور سب سے بڑا عذاب تو ابا جی تھے ہمارے لیے۔" اس کے لہجے میں نفرت اور سرکشی اتری' "اللہ کی خدمت کرنے والے ابا جی گھر میں خدا بنے بیٹھے رہے۔ یہ نہیں کرنا' وہ نہیں کرنا' اللہ سے پہلے ابا جی ناراض ہو جائیں گے۔"

اسے نہیں پتا تھا وہ کیا کہے چلے جا رہی تھی۔ "تم نے کبھی ابا جی کو غور سے دیکھا ہے' خوف آتا ہے ان کی شکل دیکھ کر' ابا جی جیسے انسان کے ساتھ زندگی گزارنا ایک بہت بڑا جہاد نہیں تو اور کیا ہے۔ میں نے تو پھر بھی یہ ساری باتیں اماں کے ڈر سے کبھی نہیں کیں۔ اماں کہیں ناراض ہو کر ڈاکٹر بننے سے منع نہ کر دیں۔ پھر بھی کیا ہوا آخر میں؟

وہی ہوا نا' اماں بولیں کوئی ڈاکٹر واکٹر نہیں بننا' ہمارے وسائل ہی اتنے نہیں' سنا تم نے انہوں نے کہا۔ ڈاکٹر بھی نہیں بننا' آگے پڑھنا بھی نہیں بس بیاہ کر دینا ہے تمہارا ابس بیاہ کر دینا ہے۔" وہ بلند آواز میں بولی اور بری طرح رو دی۔

"آپ کی باتیں سن کر مینوں لگدا' چنگا ہی ہویا جو میں بنا ماں باپ دے ادھر رل کھل کر بڑا ہو گیا' جو ماں باپ دے ہونے کی وجہ سے یہ حال ہوتا ہے تو میں تو پھر ایسے ہی ٹھیک ہوں۔" وہ افسردگی سے بولا "مگر تسی ایک بار بھین جی کے پاس آرام سکون نال جا کر بیٹھو' کج ان کی سنو' کچھ اپنی سناؤ' ان کی کہانی سن کر آپ نوں سمجھ آ جائے گی جو انہوں نے کیا او حق تھا او ہی سچ تھا۔" اس نے سعدیہ کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو یہ نہیں پتا مولوی صاحب کا ساتھ ان کے لیے جہاد تھا کہ نعمت آپ کو نہیں پتا بھین جی کن کنڈیاں (کانٹوں) پر چلتی ادھر تک پہنچی ہیں۔ آپ نوں نہیں پتا بھین جی نے آپ نوں دنیا کی اگ (آگ) توں بچانے کے لیے کتنی بڑی قربانی دی ہے۔ بندے کے اندر کے بھید بندہ آپ جانتا ہے یا اس کا خدا جانتا ہے سعدیہ باؤ! دنیا کی

داتری (درانتی) کے دونوں طرف کنڈے ہیں، یہ ادھر سے بھی کاٹتی ہے ادھر سے بھی کاٹتی ہے، بھین جی نے کس طرح داتری (درانتی) کے وچکار قدم چکتے چکاتے آپ نوں یہاں تک پہنچایا۔ یہ وہی جانتے ہیں سعدیہ باؤ، بے وسائی (بے اعتباری) بڑی وڈی دشمن ہے بندے کی، بے وسائی (بے اعتباری) کر کے ہی تو آپ نے پہلے راستہ کھوٹا کیا اب میری مانو، بھین جی کے پاس جا کر اپنا اور ان کا دل پھولو۔" کھاری کے لہجے میں اداسی تھی اور کچھ کھو جانے کا غم بھی۔

"باقی میں نے پہلے دن عرض کیتی تھی آپ نے ڈاکٹر بننا ہے تو میں چوہدری صیب کی منت ترلہ کروں گا، آپ کو ڈاکٹری پڑھنے سے کوئی روک نہیں سکتا، میں آپ نوں ڈاکٹر بناؤں گا سعدیہ باؤ! میں بناؤں گا۔"

سعدیہ اپنا رونا چھوڑ کر کھاری کا یہ جذباتی انداز دیکھ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک سوال نے یکایک سر اٹھایا تھا۔ پڑھے لکھے جاہل اور ان پڑھ عالم میں کیا اور کتنا فرق ہوتا ہے۔

"اور تم... تم کیا کرو گے؟" سوال کچھ اور ہی الفاظ کی شکل میں اس کے منہ سے نکلا تھا۔

"میں۔" وہ بے نیازی سے بولا۔ "میں نے تے یہ بھی پہلے ہی بتا دیا تھا۔" وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں چوکیدارہ کروں گا، کسی نوں آپ تک پہنچنے نہیں دوں گا، چوکیدارہ تگڑا کروں گا ان شاءاللہ!"

"جاہل جو عامل ہو اور عالم جو بے عمل ہو۔ بس اتنا ہی فرق ہے۔" سعدیہ کے ذہن کے کسی گوشے نے ایک عجیب سا جواب دیا۔

☼ ☼ ☼

"میں تمہارے مستقبل سے اتنی مایوس ہو چکی ہوں کہ تمہارے بارے میں کوئی خیال ظاہر کرنا بھی وقت کا ضیاع ہی سمجھتی ہوں۔" فائزہ نے کھردرے مگر واضح الفاظ میں کہا۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں ممی، انہیں میرے بارے میں ایسا ہی سوچنا چاہیے۔" ماہ نور نے فائزہ کی بات کے جواب میں کوئی مزاحمتی جملہ نہ کہنے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا اور ایک سرسری نظر بابا پر ڈالی جو پڑھنے کا چشمہ ہاتھ میں پکڑے ٹھوڑی ہاتھ پر ٹکائے اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس سے نظریں ملنے پر انہوں نے چشمے والا ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے سے نکال کر شانے اچکاتے ہوئے ہاتھ یوں لہرایا جیسے کہہ رہے ہوں۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں کیونکہ تمہاری ماں کی مایوسی بجا ہے۔ اس نے دوبارہ ممی کی طرف دیکھا جن کے چہرے پر بےزاری اور تناؤ تھا۔

"تعلیمی زندگی کا کوئی ایسا سال مجھے یاد کر کے بتاؤ جب تم نے مجھے سولی پر لٹکائے بغیر کلاس پاس کر لی ہو۔" فائزہ نے کہا "کبھی کسی ٹیچر سے مزاج نہیں ملتا تھا اور کبھی عین فائنل ایگزیم کے دنوں میں کتاب یا نوٹ بک گم ہو جاتی تھی اور یہ سال جو تم نے میڈیا سائنسز میں ڈگری لینے کی تگ و دو میں گزارے، ان سالوں نے تو مجھے ناکوں چنے چبوا دیے، نائم نے۔" ان کی آواز بلند ہوئی۔ "اور وہ بھی لوہے کے۔"

وہ فلور کشن پر سر جھکائے بیٹھی تھی، ممی کی آواز اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی مگر اس کی نظریں ماربل فلور پر سجے فلور میٹ پر جمی تھیں جس پر اسے ایک سوال ایک بڑے سوالیہ نشان کے ساتھ لکھا نظر آ رہا تھا "سعد کہاں ہو سکتا تھا؟"

ابراہیم کے خیال میں یہ ملین ڈالر سوال تھا جبکہ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس سوال کا جواب بلند پہاڑوں کی درمیانی وادی میں سر اٹھا کر کھڑے ان فلیٹس کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں موجود تھا جن کی طرف ابراہیم کا دھیان اس لیے نہیں گیا تھا کیونکہ اس کے ہم زاد نما دوست نے اسے ان کے بارے میں قطعی طور پر لاعلم رکھا تھا۔ اس کا ذہن سعد سلطان کے بارے میں ایک نئی کہانی گھڑ رہا تھا۔ سارہ خان کی کوئی ایس او ایس کال

ہی سعد سلطان کو یوں آنا" فانا" فارم ہاؤس سے اٹھا کر لے جا سکتی تھی۔

سارہ خان کے ساتھ تعلق کو ایک عملی رشتے میں ڈھالنے کی خاطر ہی وہ اپنے باپ سے، دوستوں سے اور تقریبا" ساری دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو سکتا تھا کیونکہ شاید یہ وہ فیصلہ تھا جو اس کے کسی بھی قریبی تعلق دار کے لیے ناقابل قبول ہوتا۔

وہ اپنی اختراع کردہ کہانی پر جوں جوں آگے سوچتی توں توں اس کا اس پر یقین بڑھتا جاتا۔ عشق حسد کی اندھی گلی میں جا پھنسا تھا اور وہاں پھنس کر عقل کا داروغہ گنوا بیٹھا تھا۔

"مگر آنٹی رابعہ۔" حسد اور رشک کی کسک کے اندر سے نیکی اور نیک دلی کا ایک فطری جذبہ سر اٹھاتا۔ سعد سلطان اپنی ذاتی زندگی میں خواہ کسی کا بھی شریک سفر بن جائے، آنٹی رابعہ سے اسے ملوانے کا وعدہ میں نے کیا تھا اور میں ان وعدوں کی ناراضی میں جو بھی کیے ہی نہیں گئے، آنٹی رابعہ سے کیا وعدہ کیسے بھلا سکتی ہوں۔" اس کی ذہنی رو ایک خیال سے دوسرے خیال کے درمیان بھٹک رہی تھی۔

"پھر اب تم بتانا پسند فرماؤ گی کہ آئندہ کیا کرنے کا ارادہ ہے، سمسٹر تو ضائع ہو ہی گیا، آگے کیا کیا ضائع کرنے کا ارادہ ہے تمہارا؟" ذہن کی رو سے اچانک فائزہ کی آواز ٹکرائی تو وہ چونک کر حال میں واپس آ گئی۔

"مجھے تو شاید یہ اب کچھ نہیں بتائے گی۔ آپ ہی پوچھ لیجیے کہ اگلے سمسٹر کو جوائن کرنے کے درمیان جو فارغ وقت ہے اس میں یہاں کچھ کرنا پسند فرمائیں گی محترمہ یا چچا کے ساتھ فارم ہاؤس پر مولیوں اور گاجروں کی افزائش پر مزید تحقیق کرنے کا ارادہ ہے ان کا۔" فائزہ اس کی غائب دماغی اور مسلسل خاموشی پر چڑ کر اٹھتے ہوئے بابا سے مخاطب ہوئی تھیں۔

ممی کے جانے کے بعد بابا نے کچھ دیر نظریں ہاتھ میں پکڑی کتاب پر ٹکائے رکھنے کے بعد اس کی طرف دیکھا تھا۔

"میں دل سے معذرت خواہ ہوں بابا" ماہ نور بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر بابا کے قریب آئی۔ "میں نے شاید ہمیشہ آپ کو اور ممی کو لیٹ ڈاؤن کیا ہے، کم از کم آج تو مجھے ایسا ہی لگ رہا ہے۔" اس کی آواز بھیگنے لگی۔

"میں ہمیشہ کی بات تو نہیں کروں گا، لیکن اس مرتبہ تو ایسا ضرور ہوا ہے۔" بابا نے کہا۔

"میں جانتی ہوں اسی لیے ممی کے سامنے بھی کچھ بولی نہیں۔" وہ شرمندگی سے سر جھکا کر بولی۔

"میں شاید تمہاری شخصیت کو کسی اور اینگل سے دیکھ بھی لوں ماہ نور!" بابا نے نیچی آواز میں کہا۔ "لیکن تمہاری ممی ایسا کبھی نہیں کریں گی۔ تمہارے سلسلے میں ان کی تمام کوششیں رزلٹ اورینٹڈ ہیں اور ایسا کرتے ہوئے تم سے بڑی امیدیں لگاتے ہوئے وہ کچھ غلط بھی نہیں کرتیں۔"

"وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں شاید میں نے ہمیشہ ہی انہیں مشکل میں ڈالے رکھا۔" ماہ نور نے اعتراف کرنے کی کوشش کی۔

"سلمان نے بھی ایسا ہی کیا اور اب تک کر رہا ہے۔" بابا نے کہا۔ "لیکن اس میں اور تم میں یہ فرق ہے کہ وہ انہیں چونکا دینے والی کوئی بھی حرکت کرنے سے پہلے انہیں آرام سے بٹھا کر اعتماد میں ضرور لیتا ہے۔"

"میں کیا کروں بابا!" وہ روہانسی ہوئی۔ "میں ہوں ہی گڈ فار نتھنگ انسان۔" آپ لوگ مجھ سے کوئی اچھی امید نہ ہی لگایا کریں۔"

"اب تم خوامخواہ سیلف پٹی (خود رحمی) کا شکار ہو رہی ہو۔" بابا کا لہجہ قدرے سخت ہو گیا۔ "اب تمہارا دل بھائی سردار کے فارم ہاؤس پر زیادہ لگتا ہے تو اس میں تمہارا کیا قصور"۔ اب ان کے لہجے میں ذرا سی شرارت اتری۔ اس نے سر اٹھا کر بابا کی طرف دیکھا جو دوستانہ انداز میں اسے دیکھ رہے تھے۔

"چلو اب تم فٹافٹ بتاؤ کہ آئندہ کرنا کیا ہے تم نے۔ "تمہاری ممی میرے ذمہ یہ سوال لگا گئی ہیں اور یقیناً" جواب کی بھی منتظر ہوں گی۔

"سمسٹر تو ضائع ہو ہی گیا۔" ماہ نور نے فلور میٹ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ اگلا سمسٹر جوائن کرنے میں ابھی وقت ہے میں سوچ رہی ہوں فرقان ماموں کے پاس اسلام آباد جا کر منی ایچر پینٹنگ اور اسکیچنگ کی کلاسز جوائن کرلوں میرا ہاتھ اچھا ہے' چھوٹے موٹے کام تو میں بغیر کسی تربیت کے بھی کرلیتی ہوں' لیکن اگر باقاعدہ تربیت حاصل کرلوں تو بہت اچھا ہو جائے گا' مجھے بہت شوق ہے' یہ دونوں فن سیکھنے کا بابا!" اس نے بچوں کی سی ضد بھری نظروں سے بابا کی طرف دیکھا اس کے دل میں قوی امید تھی کہ بابا اس کی بات مان جائیں گے۔

"اسلام آباد!" بابا نے ٹھٹک کر پوچھا تھا۔ "اسلام آباد کیوں بھئی' ایسی کلاسز تو یہاں بھی لی جاسکتی ہیں۔ کوئی خاص وجہ۔"

"آپ کو دو شعر سناؤں بابا!" جواب میں اس نے ان کی طرف سر اٹھا کر دیکھا تھا۔

"ضرور.... میں ہمہ تن گوش ہوں بھئی۔"

بخی روز وصال دلبر
کہ داد مارا غریب خسرو

سپحتاں کہ ورائے رخن
جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

(ترجمہ)

اس محبوب من سے ملن کے اعزاز میں
اے خسرو' جس کے سحر نے مجھے یہاں تک پہنچایا
میں اپنے دل کو قابو میں رکھوں گی
شاید کبھی جو میں اس کے سحر کا راز جان پاؤں

بہت خوب۔ بابا بے اختیار بولے تھے۔ "کیا سردار چچا سے وہاں بیٹھ کر فارسی زبان سیکھی جا رہی تھی۔"

"شاید یہ آپ کے اسلام آباد جانے والے سوال کا جواب ہے بابا!" اس نے دل ہی دل میں جواب دیا تھا اور سر اٹھا کر بابا کی طرف دیکھا تھا۔

"پھر کیا میں امید رکھوں کہ مجھے میری تمام نالائقیوں کے باوجود اسلام آباد جانے دیا جائے گا۔"

"بھئی' میرا ووٹ تو پکا تمہارے لیے ہے' تمہاری ممی البتہ ضرور بحث کریں گی۔ کیونکہ اعتراض شاید اسلام آباد جانے سے زیادہ فرقان کے گھر رہنے پر ہو۔" بابا نے کہا۔

"وہ میں ان کو خود منالوں گی۔ آپ صرف اسلام آباد جانے والی بات پر راضی کرلیں انہیں۔"

ماہ نور نے خوشامدی لہجے میں کہا اور بابا کی مسکراہٹ پر مطمئن ہو کر دوبارہ سے نظریں فلور میٹ پر بنتے مٹتے ملین ڈالر سوال کی طرف گاڑلیں۔

☼ ☼ ☼

دروازے پر پڑنے والی وہ دستک غیر معمولی تھی یا اس کا دل یوں ہی بری طرح دھڑکا تھا۔ اس نے ہڑبڑا کر دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ سمی آنٹی بھنتی ہنڈیا میں چمچہ چلانا چھوڑ کر چولہے کی آنچ مدھم کریں گی۔ پھر اپنے

ایپرن سے ہاتھ اچھی طرح پونچھنے کے بعد ایپرن کی گرہ کھول کر اسے قرینے سے کرسی کی پشت پر پھیلانے کے بعد آہستہ قدموں سے چلتی دروازے تک پہنچیں گی۔ ان سے جلدی تو میں خود دروازہ کھول لوں گی۔

اس نے سوچا اور میز پر بکھرے رنگ اور برش یوں ہی چھوڑ کر دیوار کا سہارا لیتی دروازے تک پہنچ گئی۔

"کون ہے' پوچھ تو لو۔" اس اثنا میں یسی آنٹی کچن کے دروازے تک پہنچ چکی تھیں۔

"کون ہو سکتا ہے۔ نئے ہمسایوں کی وہی بچی ہو گی جسے ہر دوسرے منٹ کسی چیز کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔" اس نے گردن موڑ کر یسی آنٹی کی طرف دیکھا۔

"اور اس کی ماں تم سے کہتی ہے' تم کیسی مسلمان ہو جو ایک عیسائی عورت کے ہاتھ کا پکا کھانا کھاتی ہو۔" یسی آنٹی کی آواز میں غصہ اترا "اور خود اپنی بیٹی کو روک نہیں سکتی جو مجھ سے میرے بنائے پین کیکس اور سوئس رولز مانگنے آجاتی ہے' بھوک لگنے پر۔ رہنے دو۔ مت کھولنا۔" وہ تیز آواز میں بولیں۔

"اُفوہ! دیکھنے تو دیں' کون ہے۔" اس کا ہاتھ بمشکل دروازے کے اوپری سرے پر لگی کنڈی تک پہنچا۔ دروازے کا نچلا ہینڈل اور لاک کئی روز پہلے ٹوٹ گیا تھا اور اب تک مرمت نہیں کرایا جاسکا تھا۔

"پوچھ تو لو۔" یسی آنٹی نے ایک بار پھر کہا۔ مگر ان کی ہدایت پر عمل کرنے سے پیشتر دروازہ کھل چکا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ سارہ کا منہ بھی۔

"یار! میں کوئی عجوبہ تو نہیں بن چکا۔ اتنے دن میں جسے سامنے پا کر اتنی حیرت کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔" آنے والے نے کچھ دیر اس کے دروازے سے ہٹنے کا انتظار کرنے کے بعد اسے نرمی سے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا اور اندر چلا آیا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے سارہ کے بازو کو اپنے ہاتھ کا سہارا دیا اور اسے لیے آگے بڑھا۔

"کمال ہے یسی آنٹی! کبھی کال بیل خراب ہوتی ہے اور کبھی لاک کا کلچ' کیا اب آپ کو بیرونی حملہ آوروں کی فکر نہیں ستاتی جو خرابیوں کو درست کروانا چھوڑ دیا۔" اس نے اندر آتے ہوئے ـــــ کچن کے دروازے میں ایستادہ بت سی بنی یسی آنٹی کو مخاطب کیا اور پھر سارہ کو کرسی پر بٹھا کر اپنے بازو پھیلاتے ہوئے بولا۔

"آئی ایم سوری ڈارلنگ! آج میرے ایک ہاتھ میں پھول اور دوسرے ہاتھ میں بڑا سا گفٹ باکس نہیں تھا۔ لہٰذا مجھے یہ فکر بالکل نہیں ستائی کہ میں تمہارے دروازے پر دستک کیسے دوں گا۔" اس نے اپنے خالی ہاتھ جھٹکے اور مسکراتے ہوئے سارہ کو دیکھنے لگا۔

"کیوں' کیا ہوا' ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟" سارہ کے چہرے پر مسلسل حیرت دیکھ کر اس نے اس سے سوال کیا اور پھر یسی آنٹی کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیوں یسی آنٹی! کیا میں واقعی عجوبہ لگ رہا ہوں۔"

"نہیں ـــ" بت بنی یسی آنٹی نے حرکت کی اور دو قدم آگے بڑھیں۔ "کیا کوئی بہت لمبا سفر کر کے سیدھے ادھر پہنچے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں تو۔" اس نے سر ہلایا۔ "کیوں؟"

"تمہارے چہرے کی تھکن اور کپڑوں کی سلوٹوں سے ایسا ہی لگ رہا ہے۔" یسی آنٹی نے اس کے لیے کرسی سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ "تم پہلے کبھی اس حلیے میں یہاں آئے نہیں نا؟"

"او ہاں!" وہ جیسے ان دونوں کی حیرت کی وجہ سمجھ گیا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میرا یہ حلیہ آپ کے لیے باعث حیرت ہونا بھی چاہیے۔

کیوں بیوٹی فل! کیا تم بھی اسی لیے حیرت زدہ ہو۔" کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے سارہ سے پوچھا۔

"نہیں۔" سارہ نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"پھر؟" اس نے گاڑی کی چابی میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں اس لیے حیران ہوئی کہ اب تک میں مایوس ہو چکی تھی کہ کبھی تم ادھر آؤ گے۔ تمہیں یوں اچانک دیکھ کر میں بے یقینی سی خوشی میں مبتلا ہو گئی۔ جو شاید تمہیں حیرت لگی۔"

"ہا!" وہ مصنوعی حیرت سے بولا۔ "گویا تم میری فاتحہ پڑھ چکی تھیں۔"

"اللہ نہ کرے۔" سارہ نے بے ساختہ کہا اور یسی آنٹی کی طرف کن انکھیوں سے دیکھنے لگی۔

"چائے ملے گی یسی آنٹی؟" اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے سعد نے یسی آنٹی کی طرف دیکھا۔ "شدت سے چائے پینے کو دل چاہ رہا ہے۔"

"ہاں۔ کیوں نہیں۔" یسی آنٹی نے کہا اور واپس کچن میں گھس گئیں۔ "ہاں' اب بتاؤ۔ تم کیوں میری طرف سے اتنی مایوس ہو گئی تھیں۔" یسی آنٹی کے جانے کے بعد اس نے اپنا رخ سارہ کی طرف کیا۔

"تم نے کہا تھا' میرے لیے تم پوری دنیا میں ہر وقت حاضر ہو۔" سارہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "لیکن میرا تو تم سے کسی بھی طرح کا رابطہ ہی ناممکن ہو گیا۔ تم نے اپنا نمبر تبدیل کر لیا اور مجھے اطلاع بھی نہیں دی۔"

"اچھا!" سعد یوں بولا جیسے سارہ کی کہی یہ بات اس کے لیے بھی اطلاع ہو۔ "تم سے کس نے کہا کہ میں نے اپنا نمبر تبدیل کر لیا۔"

"مجھ سے کہنا کس نے تھا؟" سارہ نے سر جھٹکا۔ "تمہارا پرانا نمبر کئی دن سے بند ہے۔ اس کا مطلب تم نے نمبر تبدیل کر لیا ہے۔"

"کتنے اچھے قیافے لگاتی ہو تم!" وہ ٹانگیں آگے پھیلا کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا اور پھر کچھ سوچ کر ہنس دیا۔ "قیامت کا نام سنا ہے سارہ خان تم نے۔" اس نے سارہ کی طرف دیکھا۔

"قیامت بہت سے لوگوں کے لیے ابھی تک صرف نام ہو گی سعد سلطان! میں نے نہ صرف اس کا نام سنا ہے' بلکہ یہ مجھ پر گزری بھی ہے۔" سارہ نے اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

"ہاں۔ پھر تو تمہیں خوب معلوم ہو گا کہ انسان کی زندگی پر چھوٹی چھوٹی قیامتیں جب گزرتی ہیں تو کیسا محسوس ہوتا ہے۔ اس کا کیا حال ہوتا ہے۔ وہ ویسا نہیں رہتا جیسا کبھی وہ ہوا کرتا ہے۔"

"بالکل معلوم ہے۔" "مگر تمہاری تھیوری کے مطابق تو انسان کو ایسی چھوٹی چھوٹی قیامتوں سے گزرنے کے بعد بھی خوش امید اور زندگی سے بھرپور رہنا چاہیے۔" اس نے سعد کی طرف دیکھا۔

"ہوں!" وہ سارہ کو غور سے دیکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ بے دھیانی میں بولا۔

"ہاں!" پھر سر ہلاتے ہوئے وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "خوش امید اور زندگی سے بھرپور' اپنی اپنی قیامتوں کے گزرنے کے بعد دوبارہ زندگی کی طرف آنے کا اگر موقع ملے تو خوش امیدی اور زندگی سے محبت کا دامن پکڑ لینا چاہیے۔"

"تم یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟" سارہ نے پوچھا۔ "اور تمہارا یہ حال حلیہ' تمہارا تو نہیں لگ رہا' اس کی کیا وجہ ہے' تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"پتا ہے کیا سارہ خان! میں یقیناً" ساری دنیا میں تمہارے لیے کسی بھی وقت' کسی بھی جگہ حاضر ہوں۔" سعد نے سارہ کے سوال کا جواب دینے کے بجائے ایک دوسری بات کی۔ "کیا تم یقین کرو گی۔ پچھلے کئی دنوں سے میں اجنبی انجان لوگوں میں رہتے رہتے پہلی بار جس کسی اپنے سے ملنے آیا ہوں وہ تم ہو۔"

سارہ نے چونک کر اسے دیکھا' اس کے چہرے پر بے یقینی تھی۔

"ہو پچھلے کئی دنوں کی خواری کے دوران جن کی فکر مجھے ستاتی رہی' ان میں سے ایک تم ہو اور تم اس مختصری

لسٹ میں پہلے نمبر پر ہو۔" اس نے سارہ کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ "اسی لیے تو اگلا کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے میں صرف تم سے ملنے آیا ہوں۔ ایک تو اس لیے کہ مجھے تم سے چند ضروری باتیں کرنی تھیں اور دوسرا اس لیے کہ تمہیں سامنے دیکھ کر مجھے زندگی کا احساس ہوتا ہے۔"

"لیکن۔۔۔" سارہ نے کہنا چاہا، مگر سعد نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرا دیا۔

"مجھے کہنے دو سارہ خان۔۔۔! تمہارے بارے میں سب اچھے لفظ کہتے ہوئے جو خوشی میں محسوس کرتا ہوں۔ وہ مجھے کسی اور بات میں نہیں محسوس ہوتی۔"

"لیکن الفاظ سچے بھی تو ہونے چاہئیں۔" سارہ نے بے ساختہ کہا۔

"تمہارا خیال ہے، میرے الفاظ جھوٹے ہوتے ہیں۔" وہ برا مانتے ہوئے بولا۔ اسی دم یسمی آنٹی چائے کا طشت اٹھائے چلی آئیں۔

"تھوڑی دیر ہوگئی چائے بنانے میں۔" انہوں نے طشت میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے ایپل ٹارٹس بیک کرنے کے لیے اوون میں رکھے تھے۔ ان کے بیک ہو جانے کا انتظار کرنے لگی۔ لو یہ کھا کر بتاؤ۔ کیسے بنے ہیں؟" انہوں نے سعد کے سامنے پلیٹ رکھی۔ "اور یہ سینڈوچز بھی کھاؤ، سارہ نے بنائے ہیں۔"

"سارہ نے!" وہ اپنی ناراضی بھول کر سارہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا میں زندہ ہوں۔" اس نے اپنی کلائی پر چٹکی کاٹی۔

"ارے سارہ تو اب چھوٹے چھوٹے کتنے ہی کام کرنے لگی ہے۔" یسمی آنٹی مسکرائیں۔ "تم اس الماری میں بچھی شیٹس دیکھ رہے ہو نا!" انہوں نے دیوار میں جڑی ایک مختصر سی کھلی الماری کی طرف اشارہ کیا۔ جس میں چینی کے کچھ برتن سلیقے سے سجے تھے۔ "یہ الماری سارہ نے سجائی ہے۔ گلیزڈ پیپر کی یہ شیٹس خود کاٹ کر بچھانے کے بعد۔"

"آپ یقیناً "مذاق" کر رہی ہیں۔" سعد نے دانستہ سارہ کو چڑانے کی خاطر کہا۔

"نہیں یہ مذاق نہیں حقیقت ہے۔" یسمی آنٹی نے کہا اور اپنے ایپرن سے ہاتھ پونچھنے کے بعد ایک میز کی دراز سے چند نیپکنز نکال لائیں۔

"یہ دیکھو!" نیپکنز ترتیب سے سعد کے سامنے بچھاتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"یہ سب ایمبرائیڈری سارہ نے کی ہے۔" سعد نے اپنے سامنے بچھے نیپکنز پر نظر دوڑائی۔ ہلکے رنگ کے چیک کپڑے پر دھاگے سے کشیدہ کیے وہ ننھے ننھے وجود یقیناً "سرکس کے کرتب دکھانے میں مصروف تھے۔ اس نے دو، تین نیپکنز اپنے قریب کھسکائے۔ پانچ، چھ گیندیں بیک وقت ہوا میں اچھال کر انہیں مہارت سے دبوچتا فگر، ایک پہیے کی سائیکل چلاتا وجود، لکڑی کی لمبی لمبی ٹانگیں اپنی اصلی ٹانگوں سے باندھ کر گیارہ فٹ کا انسان بنا وجود، سعد نے توصیفی انداز میں سر ہلایا۔

"یہ ونڈر فل ہے۔ ہے نا یسمی آنٹی!" اس نے یسمی آنٹی کی طرف دیکھا۔

"یہی نہیں ہمارے ہاں جو ایک بلی گھومتی بھٹکتی آجاتی ہے، سارہ نے اسے اپنے ساتھ مانوس کر لیا ہے۔ اب وہ یہیں رہتی ہے اور سارہ اسے سرکس کے شیروں والے کرتب سکھاتی رہتی ہے۔ یہ اسٹک دیکھ رہے ہو۔" یسمی آنٹی نے کمرے کے مشرقی کونے میں دیوار کے ساتھ کھڑی چھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ سارہ کو چلنے میں مدد دیتی ہے اور بلی کو سدھانے میں بھی۔"

"گریٹ!" سعد کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"تم چائے انجوائے کرو، میں تمہارے لیے اچھا والا کھانا بناتی ہوں۔ کھانا کھا کر جاؤ گے نا۔" یسمی آنٹی کچن کی طرف مڑتے ہوئے بولیں۔

"جی بالکل، کھاؤں گا!" سعد نے سر ہلایا۔ "آج میں سرکس کی ملکہ سارہ خاتون کے ساتھ دن گزارنے آیا ہوں۔" اس نے مسکرا کر سارہ کی طرف دیکھا۔

"تمہیں پتا ہے۔ آج میں کیا محسوس کر رہا ہوں۔" یسمی آنٹی کے جانے کے بعد اس نے سارہ سے کہا۔

"کیا؟"

"مجھے لگ رہا ہے۔ آج میں نے دنیا فتح کر لی ہے۔" وہ سر کو ذرا سا بلند کرتے ہوئے بولا۔

"تمہیں ایسا محسوس ہونا بھی چاہیے۔" سارہ نے میز پر دھری گاڑی کی چابی کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "ایک ٹوٹے پھوٹے ناکارہ وجود میں زندگی کی رمق ڈالنے، اسے حرکت میں لانے، پاؤں پاؤں چلنا سکھانے اور رفتہ رفتہ اسے کار آمد بنانے کا سہرا تمہارے ہی تو سر ہے۔"

"نہیں سہرا وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ میں نے صرف چاہا تھا کہ ایسا ہو جائے۔ اللہ نے میری دعا سن بھی لی اور گرانٹ بھی کر دی۔" وہ سر جھکاتے ہوئے بولا۔

"مگر bravo پریا رانی! یہ سب تمہارا ہی تو کارنامہ ہے۔" اس نے سر اٹھا کر سرخوشی کے عالم میں کہا۔

"پریا رانی!" سارہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "تم نے مجھے کیا کہا۔ تم نے مجھے کس نام سے پکارا۔" وہ مسرت بھری بے یقینی سے بولی۔

"پریا رانی!" سعد نے دہرایا۔

"کیا واقعی تم نے مجھے اس نام سے پکارا۔" سارہ نے بے اختیار اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں بالکل۔" سعد نے دوسرے ہاتھ سے اپنے بازو پر رکھا اس کا ہاتھ دبایا۔ "اس لیے کہ تم بالکل پریوں جیسی خوب صورت ہو۔ اچھوتی اور نیک دل۔"

"تم بہت اچھے ہو سعد! اتنے اچھے کہ تمہاری اچھائی کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔" سارہ کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔ "آج مجھے لگ رہا ہے کہ میں واقعی زندہ ہوں۔ میں ایک جیتا جاگتا وجود ہوں۔ یہ دیکھو، یہ میرے ہاتھ۔" اس نے ہاتھ پھیلائے۔ یہ میرا چہرہ! ان میں خون دوڑنے لگا ہے۔" اس نے سعد کی طرف دیکھا جو اس کی بات سنتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

"سچ میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں سعد!" سارہ نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"میں جانتا ہوں کہ تم سچ کہہ رہی ہو۔" سعد نے سر ہلایا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "اور یہی تو میں چاہتا تھا کہ تم ایسا محسوس کرنے لگو۔" وہ نرمی سے بولا۔

"تو پھر تم آج میرے لیے چاکلیٹس کیوں نہیں لائے؟" سارہ نے بچوں کی طرح اٹھلا کر پوچھا۔ اس کے روم روم میں خوشی رقص کر رہی تھی۔

"کیونکہ میری جیب میں صرف یہاں تک آنے اور واپس جانے کے فیول کے پیسے تھے۔ اس لیے میں تمہارے لیے نہ چاکلیٹس لا سکا، نہ ہی پھول۔" وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "اور میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔"

"ایسے تو نہ کہو۔" سارہ نے کہا۔ "تمہارے کریڈٹ کارڈز اور اے ٹی ایم، وہ کیا ہوئے؟"

"واہ بھئی تم بڑی باخبر ہو۔" وہ مسکرایا۔

"تو پھر ان کے ذریعے چاکلیٹس کیوں نہیں لیے۔" سارہ نے ناراضی سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس لیے پریا رانی کہ انہیں آپریٹ کرنے سے میں لوکیٹ ہو جاتا۔" اس نے قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے ایک مبہم

سی بات تھی۔ سارہ کو محسوس ہوا اس کے قہقہے میں اداسی سی تھی۔

"مجھے تمہاری بات سمجھ میں نہیں آئی؟" اس نے متوحش نظروں سے سعد کی طرف دیکھا۔ اسے اچانک کسی انہونی کا احساس ہونے لگا تھا۔

"میری بات کو چھوڑو' یہ سنو کہ مجھے تم سے جو ضروری باتیں کرنی ہیں انہیں توجہ اور غور سے سننا ضروری ہے۔" سعد نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر اس کی تہیں کھولتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر بعد وہ ہی کاغذ میز پر پھیلائے ایک کاربن پنسل کی مدد سے اس پر کچھ لکھتا' نشان لگاتا' پہلے سے لکھی کچھ باتوں کے نیچے لکیر کھینچتے ہوئے سارہ کو بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آپ کی سعد سے بات ہوئی فاطمہ خالہ؟ آپ کو اس سے کیا کہنا تھا؟" منتھ کی باڑھ کے اس پار کھڑی ماہ نور نے لان میں مالی کو ہدایات دیتی فاطمہ سے کہا۔

"ارے ماہ نور۔" وہ اسے دیکھ کر باڑھ کے قریب چلی آئیں۔ "کب آئیں تم' بتایا بھی نہیں کہ آگئی ہو اور یہ کیا بھئی' نہ سلام' نہ دعا اور سعد کی بابت پوچھنے لگیں۔"

"او آئی ایم سوری!" اسے اپنی بے خیالی کا احساس ہوا۔ "میں دراصل اس بات پر حیران تھی کہ آپ کو سعد سے کیا کہنا ہو گا اور اس کا نمبر آپ کو کہاں سے ملا۔"

"اچھا' دم تو لو۔" فاطمہ نے پرسکون انداز میں کہا۔ "تم ادھر آجاؤ یا کہو تو باڑھ پھلانگ لوں۔"

"نہیں۔" ماہ نور کو خفت سی محسوس ہوئی۔ "میں آجاتی ہوں۔" وہ باڑھ کے ساتھ چلتی گھر کے عقبی حصے میں پہنچی اور دونوں گھروں کے درمیان لگا لکڑی کا چھوٹا سا گیٹ کھول کر فاطمہ' خدیجہ خالہ کے گھر کے عقبی حصے میں داخل ہو گئی جہاں شاگرد پیشے کے کوارٹر تھے۔

"امرود نہیں توڑو گی کیا۔ خوب پکے ہوئے بھی ہیں اور ادھ پکے' ادھ کچے پستئی رنگ والے بھی۔" باڑھ کے ساتھ کھڑی فاطمہ نے دور سے پکار کر کہا۔

"نہیں۔" وہ تیز قدموں سے چلتی فاطمہ کے قریب پہنچ کر بولی۔

"اچھا' پھر یہ بتاؤ' کیسی ہو اور وہاں گاؤں میں کیا کر رہی تھیں اب تک۔" فاطمہ نے پیار سے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ "اس لڑکے کے چوتھی چالے بھی اب تک تو ختم ہو چکے ہوں گے۔ جس کی شادی اٹینڈ کرنے تم گئی تھیں۔"

"بس وہ۔" ماہ نور کو اس وقت کسی بھی بات کی تفصیل بیان کرنے میں دلچسپی نہیں تھی۔ "سرواز چچا کے اصرار پر رکنا پڑا۔"

"اور تم رک گئیں۔" فاطمہ نے رہائشی حصے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "یہاں تمہاری اماں تمہارا سمسٹر ضائع جانے پر سخت برافروختہ تھیں' جانتی ہو۔"

"جی وہ بس۔" اس نے سر جھکا کر اپنے ہاتھ کے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "پلیز فاطمہ خالہ بتائیے نا' سعد کا نمبر آپ کو کہاں سے ملا۔"

"چھری تلے دم تو لو لڑکی!" وہ لاؤنج میں آتے ہوئے بولیں۔

"نہیں نا' آپ بتائیں پلیز۔" وہ بے چینی سے بولی۔ "اور ہاں یہ خدیجہ خالہ کہاں ہیں؟" اسے یاد آیا۔

"وہ تو کسی کانفرنس میں کاغذ پڑھنے کراچی گئی ہوئی ہیں آج کل!" فاطمہ خالہ نے صوفے پر بیٹھ کر کہا۔

"کاغذ پڑھنے۔" ماہ نور نے اچنبھے سے ان کی طرف دیکھا۔

"ہاں بھئی' وہی کاغذ جسے ریسرچ پیپر کہتے ہیں۔" وہ سادگی سے بولیں۔

"او اچھا!" ماہ نور کو ایک لمحے کے لیے ہنسی آئی۔ مگر اگلے لمحے اس کی بے چینی اس پر حاوی ہو گئی۔

"او ہو بھئی' سعد کا نمبر میرے پاس کہاں سے آتا۔ اگر وہ خود نہ دیتا۔" فاطمہ نے جھنجلا کر کہا۔

"اس نے دیا تھا۔" ماہ نور نے بے یقینی سے کہا۔ "آپ کو نمبر خود؟"

"ہاں تو کیا میں اب اس عمر میں اس سے فلرٹ کرنے کے لیے اس کا نمبر ٹریس کرواؤں گی۔"

"کب دیا اس نے آپ کو اپنا نمبر؟" ماہ نور کو احساس نہیں ہوا۔ وہ جرح کرنے کے سے انداز میں سوال کر رہی تھی۔

جب وہ ایک روز مجھ سے اکیلا یہاں ملنے آیا تھا۔ تب دیا تھا۔" فاطمہ نے بے نیازی سے کہا۔

"وہ آپ سے اکیلا یہاں ملنے آیا تھا۔" ماہ نور کی آنکھیں پھیلیں۔ "اس نے مجھے تو نہیں بتایا کب آیا تھا؟"

"تمہارے گاؤں جانے سے پہلے آیا تھا ایک روز اور تمہیں نہ بتانے پر تم سے ڈر بھی رہا تھا۔ اسے خوف ستا رہا تھا۔ اگر تم جانو گی کہ وہ تمہیں بغیر بتائے خود سے یہاں آگیا تھا تو تم بری طرح ناراض ہو جاؤ گی۔" فاطمہ نے کہا۔

"ہونہہ۔" ماہ نور کی آواز میں شکستگی جھلکنے لگی۔ "اتنی اس کو میری ناراضی کی پروا۔"

"ارے تم ایسا کہہ رہی ہو۔" فاطمہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "جبکہ اس کی باتیں سن کر مجھے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ۔

" How much you mean to him "

(اس کی نظر میں تمہاری کتنی اہمیت ہے)

"کیا بات کرتی ہیں آپ فاطمہ خالہ!" ماہ نور نے فاطمہ کی بات کو یکسر رد کرتے ہوئے کہا۔ "میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میری اہمیت اس کی نظر میں کیا اور کتنی ہے۔"

"نہ مانو۔" فاطمہ نے مسکرا کر کہا۔

"بس آپ یہ بتائیں کہ وہ آپ کے پاس کیوں آیا تھا؟"

"ارے بھئی تمہارے سامنے ہی تو ہم اپنی کزن شہناز کا تذکرہ کر بیٹھے تھے اس سے' اسی کے تذکرے میں اسے عجیب سی دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ اگلے روز اس کے بارے میں مزید تفصیل پوچھنے آیا تھا مجھ سے۔"

"ایک تو یہ سعد بھی! اسے ہر ایسے قصے میں دلچسپی محسوس ہوتی ہے اور یوں تفصیل سے سنتا ہے کہ جیسے اس سے زیادہ اہم بات تو کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔" ماہ نور کو سعد کی فاطمہ کے پاس آمد کا مقصد سن کر مایوسی ہوئی۔

"آپ پھر اس سے فون پر بات کیوں کرنا چاہ رہی تھیں؟" اس نے مایوسی سے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"بات کیا کرنی تھی۔ اس کے اصرار پر مجھے بھی دلچسپی سی محسوس ہونے لگی کہ بھلا کہیں سے پتا تو کراؤں شہناز کا حقیقت میں کیا انجام ہوا۔ وہ واقعی قتل ہو گئی یا ابھی زندہ ہے۔" فاطمہ نے کہا۔

"پھر؟"

"پھر میں نے اپنی ایک دوست سے جو فلمی میگزین پڑھنے کی بہت شوقین تھی۔ پوچھا کہ شہناز کے بارے میں کیا کوئی خبر کبھی شوبزنس کے کسی پرچے میں شائع ہوئی تھی۔ اس نے اٹھا کر مجھے جوٹ کے تین بڑے تھیلے ایسے پرانے پرچوں سے بھرے بھجوا دیے۔ ان پرچوں کو کھول کر پڑھنے کی پاداش میں مجھے پندرہ دن الرجی نے دم نہیں لینے دیا۔"

"اچھا تو پھر وہ خبر۔" ماہ نور نے بے تابی سے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ کوئی خبر ملی آپ کی کزن کے بارے میں۔"

"ہاں ایک پرچے میں ایک مختصر خبر لگی ہوئی تھی کہ سروں کی ملکہ شہناز مجید جوان دونوں گمنامی کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ قاتلانہ حملے میں زندہ بچ جانے اور اسپتال سے چھٹی مل جانے کے بعد حج کے لیے روانہ ہو رہی تھیں۔" فاطمہ نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

"وہ تو اس کا مطلب وہ بچ گئی تھیں۔" ماہ نور نے بے ساختہ کہا۔ "مطلب گلا کٹنے سے ہلاکت کی خبر غلط تھی۔"

"خدا جانے بھئی۔" فاطمہ نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔ "اس خبر سے تو بظاہر یہی لگتا ہے اور یہ ہی بتانے کے لیے میں سعد سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ اس سے بات ہی نہ ہو پائی۔"

"آپ کو خود حیرت نہیں ہوئی فاطمہ خالہ۔ آپ کو خود تجسس نہیں ہوا کہ جانیں اپنی کزن کے بارے میں وہ زندہ ہیں ابھی تک یا نہیں۔" ماہ نور نے کہا۔

"یقیناً" ہوا۔" فاطمہ نے اعتراف کیا۔ "لیکن بھئی تم جانو ہم تو اب کہاں سے معلوم کرتے پھریں کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ میں نے سوچا سعد کو بتاتی ہوں' جوان اور متحرک لڑکا ہے۔ ضرور کچھ پتا چلالے گا۔ مگر اس سے بات ہی نہیں ہوئی' آخر ہے کہاں وہ؟" انہوں نے ماہ نور کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"وہ۔" ماہ نور کی آواز گھٹ گئی۔ "اس کی کچھ خبر نہیں ہے۔ وہ کسی کو بھی کچھ بتائے بغیر کئی دن سے غائب ہے۔"

فاطمہ نے ماہ نور کی آواز اور لہجے پر غور کیا اور اس کی بھیگتی آنکھوں کی طرف دیکھا۔

"کیسا وعدہ خلاف ہے یہ لڑکا بھئی۔ مجھ سے یہاں پختہ وعدہ کرکے گیا تھا کہ تمہیں کبھی کوئی دکھ نہ دے گا۔" انہوں نے با آواز بلند خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"وعدہ کہ مجھے کبھی کوئی دکھ نہ دے گا۔" ماہ نور نے چونک کر فاطمہ کی طرف دیکھا۔

"ہاں بی بی! مجھ سے یہ وعدہ کرتے وقت تو اس کے لہجے میں بڑا خلوص اور سچائی تھی۔" فاطمہ نے رسان سے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"لیکن تم یہ سب مجھے کیوں سمجھا رہے ہو۔" سارہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "میں کیا کروں گی ان اکاؤنٹس' چیک بکس اور پلاسٹک منی کا۔"

"تم استعمال میں لاؤ گی انہیں' اپنے لیے' اپنے مستقبل کے لیے۔" سعد نے کاغذ اس کی طرف کھسکاتے ہوئے ایک بار پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں دبانے لگا۔

"تو تم کس لیے ہو؟" سارہ نے اس کاغذ کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "اب تک بھی تو تم خود ہی یہ سب کرتے آئے ہو' پھر اب مجھے کیوں دکھا رہے ہو۔"

"اس لیے کہ میں تمہیں خود انحصاری کا سبق پڑھانا چاہتا ہوں۔" سعد نے میچی ہوئی آنکھیں کھولیں۔ "ٹھیک ہے کہ میں پوری دنیا میں تمہارے لیے بروقت حاضر ہوں۔ لیکن کبھی کبھی درمیان میں فاصلے اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کی آواز اور دکھ سکھ تو سن سکتے ہیں۔ لیکن فوراً" اڑ کر ایک دوسرے کے پاس پہنچنے سے قاصر ہوتے ہیں اور کبھی کبھی تو نیٹ ورک پرابلمز' آؤٹ آف ریچ لوکیشن ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنے کا بھی موقع نہیں دیتی۔ ایسے ہی وقتوں کے مسائل سے بچانے کے لیے میں چاہتا ہوں جیسا میں نے تمہیں بتایا ہے ویسا کرو۔"

"پتا نہیں کیوں مجھے تمہاری آواز میں کچھ غیر معمولی محسوس ہو رہا ہے۔" سارہ نے کہا۔ "کچھ ہے جسے میں سمجھ نہیں پا رہی' لیکن وہ کچھ اچھا نہیں ہے' وہ خوشگوار بھی نہیں ہے۔"

"زندگی میں کچھ لمحات' کچھ سچویشنز ناخوشگوار بھی ہوتی ہیں پریا رانی! انسان کو ہر طرح کی صورت حال کا سامنا کرنے کی عادت ہونی چاہیے۔" سارہ کو سعد کے لہجے میں عجیب سا تاسف محسوس ہوا۔

"بس مجھ سے وعدہ کرو جیسا میں نے تم سے کہا ہے تم ویسا ہی کرو گی۔ تم نے خود دیکھا۔ کتنے کم وقت میں تم نے کیسا پروگریس کیا۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازہ کھول کر پچھلی بالکنی میں جا کھڑا ہوا۔

"وہ پروگریس تمہارے بغیر ممکن نہیں تھی۔" سارہ نے بلند آواز میں کہا۔

"تم جانتی ہو کہ یہ سفر تم نے میرے بغیر طے کیا۔" اس نے بھی گردن موڑ کر بلند آواز ہی میں جواب دیا۔ "جب تک میں ہاتھ بڑھا کر تمہیں سہارا دیتا رہا۔ تم حوصلہ ہار کر کوشش کرنا چھوڑ دیتی تھیں اور میں تمہاری تکلیف کو محسوس کرتے ہوئے تمہیں دوبارہ سے پیچھا کرنا شروع کر دیتا تھا۔"

سارہ اپنی جگہ سے میز کا سہارا لیتے ہوئے اٹھی اور کرسیوں' وال کیبنٹس' دیواروں کا سہارا لیتی خود بھی پچھلی بالکنی میں آگئی۔

"اور تم بھی جانتے ہو کہ تم موجود تھے یا نہیں۔ مگر تمہارے ہونے کے احساس کے بغیر میں ایک قدم بھی اٹھا نہ پاتی۔" باہر آتے ہی اسے پچھلی رات سے برستی بارش کے اثر سے بوجھل اور نم ہوا کا احساس ہوا اور اس نے بے اختیار اپنے شانوں پر پڑی ہلکی سی سفید شال کو اپنے گرد مضبوطی سے لپیٹ لیا۔

"تم فکر نہیں کرو' میرے ہونے کے احساس سے تم کبھی بھی محروم نہیں ہو گی۔ میں ہوں گا کہیں نہ کہیں' کسی نہ کسی جگہ پر ضرور موجود ہوں گا۔ بس اس سے زیادہ تیزی سے پروگریس کرنا ہو گی اور دیواروں اور چیزوں کا سہارا بھی لینے کی عادت پر قابو پانا ہو گا۔" وہ رسان سے بولا۔

سارہ نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس سمت دیکھا۔ جدھر وہ دیکھ رہا تھا۔ اونچے نیچے پہاڑوں پر اگا سبزہ اور درخت بارش میں بھیگ کر معمول سے زیادہ سرسبز دکھائی دے رہے تھے۔ پہاڑوں کے اوپر جانے کے پتھریلے راستوں پر پھسلن تھی اور پتھروں کے درمیان پانی بھی جمع ہو چکا تھا۔ لیکن مقامی بچے' عورتیں اور بچے پھرتی سے بغیر سنبھلے اور کسی کا سہارا لیے اوپر نیچے آجا رہے تھے۔ سڑک کے اس جانب۔ جس کے پیچھے گہرائی اور ڈھلوان تھی' کنارے پر بیٹھا پٹھان بچہ کوئلوں کی آگ پر ریت سے بھری کڑاہی چڑھائے بھٹے بھون رہا تھا۔ مکئی کے بھونے جانے کی خوشبو سارے میں پھیلی تھی۔ پٹھان بچے نے کمال ہوشیاری سے پہاڑ سے گرنے والے جھرنے کی راہ گزر پر بند سا باندھ کر اس میں ربڑ کا پائپ لگا دیا تھا۔ آتی جاتی گاڑیوں کے سوار نہ صرف اس سے گرم بھٹے خریدتے تھے' بلکہ گاڑیوں کے انجن گرم ہو جانے کی صورت میں اس کے پانی کے ذخیرے میں لگے پائپ سے انجن ٹھنڈا کرنے کے لیے کاربوریٹر میں پانی بھی ڈلواتے تھے۔ جس کے عوض وہ نہ جانے ان سے پیسے وصول کرتا تھا۔

"تم نے دیکھا سارہ خان۔" سعد نے سارہ کی طرف دیکھا۔

"This is what life is" یہ زندگی ہے۔

"اس چھوٹے سے بچے نے اپنی زندگی کا سلیقہ خود سے سیکھ لیا اور اب اس عمر میں ہی وہ نہ جانے کتنے افراد کا کفیل بن چکا ہے۔"

سارہ نے آنکھیں زور سے بند کر لیں۔

"یہ ہی زندگی تمہارے پاس بھی ہے۔ جو حادثہ تھا۔ وہ ہو کر گزر چکا۔ زندگی نے موت کو پچھاڑ دیا اور آگے نکل آئی ہے۔ قدرت نے زندگی کی معذوری کی شدت کم کر کے اس کے ہاتھ میں سہارا لینے کو چھڑی پکڑا دی۔ پھر عجب نہیں وقت آگے بڑھے تو یہ چھڑی بھی چھوٹ جائے۔ زندگی اپنے پاؤں پر دوبارہ سے کھڑی ہو جائے۔ جب سب تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو آنے والے دنوں کے سلسلے میں بے یقینی سی کیوں ہے۔" سعد نے سارہ کے بالوں کو ہاتھ سے نرمی سے چھوتے ہوئے کہا۔

"سعد!" جواب میں سارہ نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ "وہ لڑکی کہاں ہے جس کا نام ماہ نور ہے۔" اس نے دیکھا۔ سعد کے چہرے پر ایک تاریک سایہ لمحہ بھر کے لیے لہرایا اور اگلے ہی لمحے اس نے اپنے چہرے کا رخ دوسری طرف کر لیا تھا۔

"سعد!" سارہ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"پلیز اس وقت۔ مجھ سے اس کا ذکر مت کرو۔ اس وقت میں تعلقات کو پوری سچائی کے ساتھ نبھانے کے موڈ میں ہوں اور ماہ نور' میرے سینے کے اندر بہت گہرائی میں گڑا ایک ایسا تعلق ہے جسے میں نے برتا ہے۔ نبھایا نہیں۔" وہ بھاری آواز میں بولا تھا۔

"سعد! کھانا تیار ہے۔ آجاؤ فٹافٹ' اس سے پہلے کہ ٹھنڈا ہو جائے۔" اندر کمرے سے یسی آنٹی کی آواز آئی۔

"ہاں۔ یہ خوب بروقت بلاوا ہے۔ اب مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" وہ مسکرا کر بولا اور اندر چل دیا۔ سارہ عجیب سے احساس میں گھری اسے اندر جاتے دیکھ رہی تھی۔ زندگی کے کتنے سوالوں کے جواب ادھورے تھے۔ ایسے جواب۔ جن کے کلیوز خود سوالوں سے زیادہ پیچیدہ تھے۔

☆ ☆ ☆

"بھائی رضوان الحق تسی کدھر ہو بھائی۔"

"میں تو ادھر ہی ہوں' جہاں آپ نے مجھے پایا تھا افتخار بھائی۔ آپ البتہ غائب ہو گئے ہو۔"

"آہو جی! میں تو سارا دا سارا ہی گواچ گیا ہوں بھائی رضوان۔"

"ارے افتخار بھائی! آپ تو لگتا ہے رو رہے ہو۔ کیا ہو گیا' خیر تو ہے۔"

"بڑا برا پھنس گیا ہوں جی میں' کیا تسی میرے پاس ایک دن کے لیے آسکتے ہو' ملنے' صرف ایک دن کے لیے۔"

"ہاں' ہاں کیوں نہیں' میں آج رات ہی بس پر بیٹھتا ہوں۔"

"تہاڈی بڑی مہربانی بھائی' آکھیا ہے تو بھائی بن کے دکھانے لگے ہو۔"

"اللہ آپ کا بھلا کرے جی۔"

"اچھا پھر اللہ حافظ میں کل پہنچتا ہوں۔"

"خدا حافظ!"

(باقی ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں)

عنیزہ سید

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردست وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔ سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی' جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

اٹھارہویں قسط

"سیمی آنٹی جو میں نے آپ سے ریکویسٹ کی ہے آپ یقیناً" اسے یاد رکھیں گی۔" وہ ان دونوں سے رخصت ہوتے ہوئے بولا تھا۔

ہاں۔ ایک دم یاد رکھوں گی۔" سیمی آنٹی بشاشت سے بولی تھیں۔

"سعد! اگلی بار تم چاکلیٹس اور پھولوں کے بغیر آئے تو میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔" سارہ نے دل کے سارے خدشے دباتے ہوئے مسکرا کر ایک خوشگوار بات کرنے کی کوشش کی تھی۔

"اگلی بار۔" سعد نے زیر لب دہرایا اور ہولے سے ہنس دیا۔ "تمہیں آج دروازہ کھولتے دیکھ کر مجھے لگا' میں فاتح عالم ہوں۔"

"میں اگلی بار کی بات کر رہی ہوں' یاد رہے' دروازہ نہیں کھلے گا۔" سارہ کے لہجے میں تنبیہہ تھی۔

"کون جانے اگلی بار۔" وہ کچھ کہتے کہتے رکا اور اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے اللہ حافظ کہتا سیڑھیاں اتر گیا۔ سیمی آنٹی اس کے جانے کے بعد تیزی سے کمرے کے اندر داخل ہوئیں۔ انہیں میز پر بکھرے برتن سمیٹنے تھے۔ سارہ بالکنی میں رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے دل میں وہم تھے اور الجھنیں سوال تھے اور اضطراب بھی۔

☼ ☼ ☼

"دیکھا' آخر میں نے تمہیں پکڑ لیا۔ فائنلی تم پکڑے گئے۔" وہ سارہ اور سیمی آنٹی سے رخصت ہو کر سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا تو اسے اپنے سامنے پایا جو چہکتی آواز میں اس سے مخاطب تھا۔

"تم واقعی میرے ہاتھوں قتل ہو جاؤ گے ابراہیم۔" اس نے اپنے زور سے دھڑکتے دل کو قابو کرتے ہوئے جواب دیا۔

سعد کو ڈھونڈ لینا ابراہیم کے لیے ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ لگنے کے مترادف تھا۔

"میں نے سنا تھا تو نے یہاں کسی سے نکاح کیا ہوا ہے اور بمعہ ساس کے یہاں رہتا ہے' کبھی کبھار آکر میں عموماً" ایسی افواہوں پر یقین نہیں کیا کرتا' اسی لیے یہ خبر ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا رکھی تھی' لیکن جب تیری مسلسل گمشدگی میرے لیے ایک چیلنج بن گئی تو میں نے دوسرے کان سے اڑی خبر کو واپس کھینچ لیا اور مفروضات کے ڈانڈے ملاتا یہاں تک پہنچ ہی گیا اور دیکھ لے۔۔۔ کبھی کی سنی افواہ سچ ثابت ہوئی' گمشدہ سعد بڑھیا ساس اور جوان جہان زوجہ کے ساتھ رہتا ہی پایا گیا۔" وہ سعد کے سامنے مزے سے اپنے کارنامے کی تفصیل سنا رہا تھا۔

"لفظ جھانپڑ کا مطلب سمجھتے ہو تم۔" سعد نے اس کی بات سننے کے بعد سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں! سمجھتا ہوں اور رسید کرنا بھی جانتا ہوں۔" ابراہیم نے سر ہلایا۔ "کہو کتنے رسید کروں۔" اس نے سوالیہ انداز میں سعد کی طرف دیکھا۔ "کافی تعداد میں کھانے کے حق دار تو تم ہو۔"

"میں تمہارا لحاظ کر رہا ہوں ابراہیم!" سعد نے کہا۔ "ورنہ تمہارے چار من کے وجود کو نیچے گرا کر ان گنت جھانپڑ رسید کر چکا ہوتا اب تک۔"

"چل پھر چیلنج ہے تو چیلنج ہی سہی' کھلی دعوت دیتا ہوں دنگل کی۔" ابراہیم نے کہا۔ "مت بھولنا کہ میں کن پہلوانوں کی اولاد ہوں۔"

سعد نے ابراہیم کی بات کا جواب دیے بغیر سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور پھر چار سمت پھیلے سبزے پر نظر دوڑائی۔ وہ مری سے آگے گلیات کے راستوں کو جاتی سینہ کشادہ کیے کیٹی سڑک کے کنارے پر بیٹھے تھے۔ فضا میں

نمی تھی اور سبزہ بھی اس نمی سے بوجھل تھا۔ اس نم دار فضا میں سانس لینا مشکل ہو رہا تھا اور اسے ایک نہ ختم ہونے والی تھکاوٹ بھی محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے سر اٹھا کر پہاڑوں کو ایسے دیکھا جن کی چوٹیاں سر کرنے کا خیال کسی کوہ پیما کو کبھی نہ آیا ہو گا کیوں کہ یہ چوٹیاں ان کے پیمانہ کوہ پیمائی سے بہت چھوٹی تھیں۔ لینڈ سلائیڈنگ نے ان پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر کہیں کہیں اپنے سیاہ نشان چھوڑ رکھے تھے۔

"کیا یہ پہاڑ بھی ایسے کوہ گراں ہیں جن کا بوجھ اٹھانے کی طاقت صرف خدا کی اس زمین کو عطا ہوئی ہے۔ ان کو سر کرنے کا خیال کسی انسان کو آتا ہے' نہ ہی وہ ان کی طرف دھیان کرتا ہے۔ انسان کو تو بلندیوں اور صرف بلندیوں سے پیار ہے۔ وہ تو شاید ہی یہ سوچتا ہو کہ یہ نسبتاً" کوتاہ قامت پہاڑ بھی تو زمین کو اس کی جگہ سے ہلنے نہ دینے کے لیے ہی بنائے گئے ہیں لیکن یہ یونہی زمین کے سینے پر کھڑے' اسے اپنی جگہ گڑے رہنے میں مدد دیتے کھڑے رہیں گے' نہ ان کی چوٹیوں تک پہنچنے کا کبھی کسی کو خیال آئے گا نہ ہی ان کی بلندیوں کو کوئی چھو پائے گا۔"

وہ نجانے کس احساس تلے دھیان بٹانے کے لیے الٹی سیدھی باتیں سوچے چلے جا رہا تھا۔

"مانتے ہو پھر کہ میں اس دنیا میں تمہارا واحد' سچا اور مخلص دوست ہوں۔" سبزے کے ایک نرم رسیلے تنکے کو دونوں ہونٹوں کے درمیان دباتے ہوئے ابراہیم نے کہا۔ اب وہ سعد کے سامنے صلح کی سفید جھنڈی لہرانے کے موڈ میں تھا۔

"جو چیزیں غیر حقیقی ہوتی ہیں' نہ ماننے کی کوئی وجہ تو ان کے لیے پیش کی جاتی ہے جبکہ تم ہو اور حقیقت ہو' میں تمہارے دعوے کو کیوں جھٹلاؤں گا۔" سعد نے صلح کی سفید جھنڈی قبول کرتے ہوئے کہا۔

"پھر اس واحد' سچے اور مخلص دوست کو یہ تو بتا ہی دو کہ اس بے سبب خود ساختہ گمشدگی کے پیچھے کیا راز ہے اور یہ جو حلیہ تم نے اس [illegible] تمہارا کون سا روپ ہے؟"

ابراہیم نے سعد کو اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا' حلیے سے یقیناً" اس کا اشارہ بڑھے ہوئے شیو' ملجے مسلے ہوئے کپڑے' چہرے پر تھکاوٹ کے واضح آثار اور ہاتھ پر بندھی اس پٹی کی طرف تھا جو دن بھر کی خواری کے بعد میلی ہو رہی تھی۔

"ابراہیم! تم قسم کھاؤ۔ تم نے ڈیڈی کو کوئی ارجنٹ میسج نہیں کیا میری یہاں موجودگی اور مجھے پا لینے کے حوالے سے۔" سعد نے درخت کے تنے سے ٹیک لگاتے ہوئے بھاری آواز میں کہا۔

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" ابراہیم نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"تم اس کا جواب دو جو سوال میں نے کیا ہے' تمہارے سوال کا جواب میں بعد میں دوں گا۔" سعد نے کہا۔

"اگر میں کہوں کہ کر دیا ہے تو؟" ابراہیم نے اس کی طرف دیکھا۔ جواب میں سعد نے سرعت سے اٹھتے ہوئے اس کے ہاتھ سے فون کو جھپٹ لیا۔ اس کا یہ عمل اتنا فوری تھا کہ ابراہیم کو سنبھلنے اور سمجھنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ بے بسی سے سعد کو اپنے فون کی تمام ہسٹری دیکھتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔

"ہوں۔" اس کے فون کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد سعد نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اگر تم نے یہ کام کر دیا ہوتا تو میں واقعی تمہیں قتل کر دیتا۔"

"مگر مجھے کچھ سمجھ میں تو آئے۔ تم یہ سب کیوں کر رہے ہو۔ کیوں اس شخص کو اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ جس کے لیے ساری دنیا سے زیادہ صرف تم اہم ہو۔" ابراہیم نے بلند آواز میں پوچھا۔ سعد کے حلیے نے اسے

جھنجلا کر رکھ دیا تھا۔

"جو ساری دنیا سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ صرف وہی تو احساس دلا سکتا ہے کہ ساری دنیا میں اور کون کون رہتا ہے اور اس اور کون کون کے ساتھ کیا "کیا ہو چکا ہے۔" سعد نے سہل سا جواب دیا۔

"مجھے تمہاری بات ذرا بھی سمجھ میں نہیں آئی۔" ابراہیم نے سر ہلایا۔ "میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تمہاری گمشدگی نے انکل کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ جب تک تمہاری گاڑی نہیں ملی تھی۔ وہ پریشانی کے عالم میں حواس کھو دینے کے قریب نظر آنے لگے تھے۔ ہاں گاڑی ملنے کے بعد یکایک ان کے رویے میں تبدیلی آگئی اور انہوں نے ہر طرح کی تلاش رکوادی۔ پھر وہ بظاہر نارمل نظر آنے لگے۔ لیکن لاکھ میں احمق سہی میں جانتا ہوں کہ انکل ابھی بھی سخت بے چینی کا شکار ہیں۔ میں ان سے ملنے جاتا ہوں تو ان کی زبان تو نہیں، نظریں مجھ سے سوال کرتی ہیں کہ کچھ پتا چلا۔"

"ان کی نظریں اب سوال کرنے لگی ہیں۔" سعد ہولے سے ہنسا۔ اس کی ہنسی میں عجیب سی تلخی تھی۔ "اگر انہوں نے عمر بھر دوسروں کی نظروں کے سوالوں کے جواب دے دیے ہوتے تو شاید اب ان کی نظریں سوال نہ کر رہی ہوتیں"۔

"کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو یار!" ابراہیم نے الجھتے ہوئے کہا۔ "تم کوئی سیدھا جملہ کوئی قابل فہم بات نہیں بول سکتے کیا؟"

"میں آسان ترین لفظوں میں بھی باتیں کروں نا ابراہیم! تو تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔" سعد نے کہا۔

"چلو نہ بتاؤ کچھ بھی مجھے۔ بس ایسا کرو کہ میرے ساتھ چلو اپنے گھر۔" ابراہیم نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

"گھر... گھر والوں سے بنتے ہیں یار!" سعد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "جبکہ اس گھر سے گھر والوں کو ایک ایک کر کے گھر بدر کر دیا گیا۔ اب وہ گھر گھر نہیں رہا۔" اس نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔ "مقتل گاہوں کو گھر کہتے سنا ہے کیا تم نے کبھی کسی سے؟"

"او بھائی! معاف کر۔" ابراہیم نے گھبرا کر اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "کیوں مجھے ڈرا رہا ہے ایسے خوف ناک لفظ بول کر۔"

"یا تو تجھ پر کسی نے کوئی کالا عمل کروا دیا ہے یا پھر تو ویسے ہی کسی ہانٹڈ جگہ کا چکر لگا آیا ہے۔ جب ہی ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔" کچھ توقف کے بعد ابراہیم نے خیال ظاہر کیا۔

"تم ایسا کرو واپس چلے جاؤ، جا کر اپنا جم اور ریسٹورنٹ چلاؤ۔ دیسی کھانے کھاؤ اور میٹھی لسی پی کر لمبی نیند سو جاؤ۔ مجھے میرے حال میں مست رہنے دو۔" سعد نے اسے مشورہ دیا۔

"تمہارا خیال ہے میں تمہارے اس مشورے پر ہی عمل کروں گا۔" ابراہیم نے سر جھٹکا۔ "میں تو بچو! تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں اور لے کر ہی جاؤں گا۔"

"یہ خیال تو بھول ہی جاؤ۔" سعد نے لاپروائی سے کہا۔ "میں وہاں نہیں جا رہا۔"

"اندھیرا بڑھنے لگا ہے اور یہ سنسان ویران جگہ ہے۔ یہاں سنا ہے گیدڑ، مار خور اور چیتے سب ہی پائے جاتے ہیں ان کی خوراک بننے کا ارادہ ہے تو ٹھیک ہے۔ ہم بیٹھے رہتے ہیں دوست کی خاطر۔ دوست کے ساتھ موت بھی آجائے تو پروا نہیں۔" ابراہیم کو سعد کی بے نیازی پر غصہ آنے لگا۔

"جانوروں کا نوالہ بننے کے لیے یہاں بیٹھے رہنے کا شوق ہے تو بیٹھے رہو۔ تم نہیں جاتے تو میں چلا جاتا ہوں۔" سعد وہاں سے ہٹ کر سڑک کے بالکل کنارے پر کھڑی اس گاڑی کی طرف چلنے لگا، جو اس کی میزبان نے اسے دی تھی۔

اگر تم اس طرح یہاں سے چلے گئے تو تمہاری اس جگہ موجودگی، جہاں تم اپنی ساس اور زوجہ کے ساتھ رہ رہے ہو "اس پجیرو گاڑی اور اس کا نمبر، تمہارا حلیہ اور ذہنی حالت... والد کے گوش گزار نہ کردی تو میرا نام بھی ابراہیم نہیں۔" ابراہیم نے اسے جاتے دیکھ کر کھڑے ہوتے ہوئے پیچھے سے بلند آواز میں پکار کر کہا۔

"اور جو تمہاری ان گیدڑ بھبکیوں میں آجائے، وہ انسان کی اولاد ہی نہیں۔" سعد نے اسی کی طرح بلند آواز میں بغیر مڑے اور بغیر رکے جواب دیا۔

"میں انکل کو میسج کرنے لگا ہوں سعد! اگرچہ وہ اس وقت ملک میں نہیں ہیں لیکن ان کے ایک اشارے پر ان کے کارندے... تم جانتے ہو، وہ لوگ کیا نہیں کر سکتے۔" ابراہیم نے ہار نہ مانتے ہوئے ایک بار پھر دھمکی دینے کی کوشش کی۔

"کیا؟" سعد کے چلتے قدم رکے اور اس نے گھوم کر پیچھے دیکھا۔ "وہ یہاں نہیں ہیں کیا؟"

"بدقسمتی سے۔" ابراہیم اسے رکتے دیکھ کر بڑے پھرتوں پر سے کودتا ہوا لپک کر اس تک پہنچا۔ "وہ اس ٹریڈ میلے میں شرکت کے لیے ایمسٹرڈیم گئے ہوئے ہیں، جہاں شیڈول کے مطابق تمہیں جانا تھا۔"

"تم اپنی گاڑی میں بیٹھ کر آگے چلو۔ میں تمہارے پیچھے آتا ہوں۔ گھر چلتے ہیں۔" سعد نے ابراہیم کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

"آر یو شیور؟" ابراہیم نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک پل میں سعد کو منت بدلتے دیکھ کر یقیناً ششدر تھا۔

"چلو گاڑی اسٹارٹ کرو۔" سعد نے کہا اور خود اس گاڑی کا لاک کھولنے لگا۔ جسے صبح سے اب تک نہ جانے کہاں کہاں بھگائے پھر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہاں... اس بار اس کے رویے اور اس کی باتوں میں کچھ غیر معمولی پن تھا۔" یمی آنٹی نے اپنے ٹخنے پر درد دور کرنے والی دوا کی مالش کرتے ہوئے کہا۔ موسم میں خنکی بڑھ رہی تھی اور یہ خنکی ان کی ہڈیوں کے جوڑوں پر اثر انداز ہو رہی تھی۔

"کچھ..." سارہ نے میز پر رکھے اسکیچنگ پیپر پر رنگ بھرتے ہوئے رک کر کہا اور یمی آنٹی کی طرف دیکھا۔ "کچھ نہیں یمی آنٹی! بہت کچھ غیر معمولی تھا۔"

"ہو سکتا ہے بہت کچھ غیر معمولی ہو۔" یمی نے دوا کی ٹیوب پر ڈھکن لگانے کے بعد ٹخنے پر اونی گارڈ چڑھاتے ہوئے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا "لیکن تمہارا کیا اندازہ ہے "اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔"

"میں کوئی اندازہ نہیں لگا پائی۔" سارہ نے بالکنی میں کھلنے والے دروازے میں جڑے شیشے سے پار دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ اسے نظر کے سامنے پھیلے ہوئے پہاڑوں پر دھند چھاتی محسوس ہو رہی تھی۔ جھٹ پٹے کے وقت کے اس منظر میں اس کے لیے کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ اس کی نظروں کو وہ ہلکی سی دھند بھی بری لگ رہی تھی اور اس میں چھپتے پہاڑ معمول سے زیادہ سیاہی مائل ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

"میرا خیال ہے وہ کسی ذاتی مسئلے میں پھنسا ہوا ہے۔" یمی آنٹی کچن کی طرف جاتے ہوئے بولیں۔

"پتا نہیں۔" سارہ جیسے بے خیالی میں بولی۔ "ہم اس کو آخر جانتے ہی کتنا ہیں جو اس کے ذاتی مسئلے کو سمجھ سکیں۔"

"یہ تو ہے۔" یمی آنٹی نے مڑ کر اسے دیکھا۔ "ہم صرف سعد کو جانتے ہیں۔ اس کا آگا پیچھا، گھر بار، کاروبار...

اس نے بھی ان سب کی تفصیل تو ہمیں بتائی ہی نہیں۔"

سارہ نے اس یاران کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ تیزی سے پھیلتے اندھیرے میں چھپتے سیاہ پڑتے پہاڑوں کو دیکھے چلے جا رہی تھی۔

"بس اتنا معلوم ہے کہ وہ پیسے والا آدمی ہے۔ اس کے پاس پیسہ ہے اور خوب ہے۔" سیمی آنٹی کچن میں جا کر سنک کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے بولیں۔

"بس اتنا معلوم ہے کہ وہ دل والا آدمی ہے۔ اس کے پاس دل ہے اور بہت بڑا دل ہے۔" سارہ نے سیمی آنٹی کی بات کا جواب صرف سوچا۔ زبان سے ادا نہیں کیا۔ اس کے سامنے کے منظر پر مکمل تاریکی چھا چکی تھی اور چپکے سے ہر دل کو بھانے والا پیلا اداس چاند اپنے قمری چکر کے آخری دنوں کی کمزور روشنی لیے عین اس کی نظروں کے سامنے آکر ٹھہر سا گیا تھا۔

"نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ شاید ہی اب کبھی میں تمہیں دیکھ پاؤں۔" سارہ نے اس زرد چاند کو دیکھتے ہوئے سعد کو تصور میں مخاطب کیا۔ "ہمیشہ مجھے امید اور حوصلہ نہ ہارنے کے سبق پڑھانے والے تم کتنے ناامید اور بے حوصلہ لگ رہے تھے اور میں تو تمہاری یہ حالت دیکھ کر اس پر یقین کرنے میں ہی اپنا سارا جتن صرف کرتی رہ گئی۔ تم سے یہ بھی نہ کہہ پائی کہ تم کیوں اتنے ناامید اور بے حوصلہ ہو رہے ہو۔"

اس نے سوچا اور سعد کے تھکے ہوئے مضمحل چہرے کو یاد کرتے ہوئے دکھ سے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

"اس محدود و مختصر سے گھر سے باہر میری زندگی تو صرف تم ہو سعد! تمہاری آمد زندگی کا پیغام اور تمہارا رخصت ہونا تمہاری دوبارہ آمد کی امید ہے۔ پھر مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ زندگی رخصت ہوئی بس سانس باقی ہے۔"

اس نے سر جھکا کر آنکھیں کھولتے ہوئے اپنے سامنے میز پر رکھے سفید اسکیچنگ پیپر کو دیکھا۔ جس پر رنگ بکھرے تھے۔ یہ رنگ اس نے بے دھیانی میں بکھیرے تھے جن سے نہ تو کسی چیز کا عکس ابھرتا نظر آرہا تھا نہ ہی کسی شبیہہ کے خدوخال تھے۔

"تمہارے تصور کے بغیر میرے لیے زندگی اتنی ہی بے معنی ہے جتنے کاغذ پر بکھرے یہ رنگ۔" اس نے اسکیچنگ پیپر کو ہاتھ میں پکڑ کر مٹھی بند کر کے مروڑ دیا۔

"اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب سے تم گئے ہو میرا دل بیٹھا جا رہا ہے اور میں بے معنی سی حرکتیں کرنے میں مصروف ہوں۔ جیسے ایسا کرنے سے تمہارے جانے کا خیال دل سے دور ہو جائے گا۔" اس نے دکھ سے سر ہلاتے ہوئے سوچا۔

"وہ تم سے کیا بات کر رہا تھا۔ تمہیں کیا سمجھا رہا تھا بھلا؟" سیمی آنٹی نے کچن سے نکل کر اس کے سامنے آکر کہا۔

"وہ کچھ ایسے اکاؤنٹس کے بارے میں بتا رہا تھا جن کے اے ٹی ایم اور کریڈٹ کارڈز وہ مجھے کوریئر کے ذریعے بھیجے گا۔ تاکہ میں اکاؤنٹس سے رقم حاصل کر سکوں۔" سارہ نے جواب دیا۔

"اس نے ایسا کیوں کہا؟" سیمی آنٹی نے ٹھٹکتے ہوئے پوچھا۔ "پہلے تو وہ میرے والے اکاؤنٹ ہی میں رقم ٹرانسفر کیا کرتا تھا۔"

"میں نہیں جانتی اس نے ایسا کیوں کیا۔ میں نے اس سے پوچھا تھا۔ مگر اس نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔"

"ہوں۔!" سیمی نے دونوں ہاتھ کولہوں پر ٹکاتے ہوئے معاملے پر غور کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب ہے واقعی کچھ غیر معمولی ہوا ہے یا ہونے والا ہے۔"

"ذرا ٹرائی کر کے دیکھو۔ کیا ابھی بھی اس کا فون بند ہے۔" اچانک سیمی آنٹی کو خیال آیا۔ ان کے خیال دلانے پر

سارہ نے میز پر رکھا فون اٹھا کر سرعت سے سعد کا نمبر ملایا۔ اس کی حیرت کو انتہا پر پہنچانے کے لیے دوسری طرف فون پر بیل جانے کی آواز واضح سنائی دے رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم نے اپنے لیے ایک مشکل فیصلہ کرلیا ہے ماہ نور!" فاطمہ نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

"پوری زندگی اتنی آسانیوں میں بھی تو گزاری ہے فاطمہ خالہ!" ماہ نور کے چہرے پر ایک بے بس سی مسکراہٹ تھی۔

"میں نہیں جانتی تھی کہ تم سعد کے لیے اتنی سنجیدہ ہو' ورنہ میں اس سے یہ بات ضرور کرتی' مجھے اندازہ تو ہو جاتا کہ وہ تمہارے لیے سوچتا ہے؟"

"آپ نے اچھا کیا کہ اس سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ کیونکہ میں خود بھی نہیں جانتی کہ میں اس کے لیے کس وجہ سے سنجیدہ ہوں۔ میں اس کے معاملے میں خود کو اتنا انوالو کیوں پاتی ہوں۔" ماہ نور نے کہا۔

"جہاں تک مجھے علم ہے' جو بے قراری میں تم میں دیکھتی ہوں' اسے محبت کہتے ہیں۔" فاطمہ نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"محبت تو ایک لفظ ہے فاطمہ خالہ! اور یہ تو کسی کو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ ماں' باپ کو اولاد سے' مرد کو عورت سے' انسان کو جانور سے' محبت تو ایک کامن ناؤن (اسم نکرہ) ہے۔ جسے کوئی بھی' کہیں بھی اپنے جذبے کی وضاحت کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔" ماہ نور کی بات فاطمہ کو حیران کرنے کے لیے کافی تھی۔ وہ ماہ نور سے اتنی گہری بات کی کبھی بھی توقع نہیں کر سکتی تھیں۔

"تو پھر یہ محبت سے بھی آگے کا کوئی جذبہ ہوگا۔" انہوں نے بے ساختہ کہا تھا۔ "ایک پراپر ناؤن (اسم خصوصی) مثلاً "عشق وغیرہ۔"

"عشق!" ماہ نور نے اس لفظ کو دل میں دہرایا اور اسے جیسے ایک دھکا سا لگا۔ آواز میں سوز کارانہ... عشق اسے یاد آیا۔ عشق آتش لائی ہے... اوکھے پینڈے لمیاں نیں راہواں عشق دیاں... یہ پراپر ناؤن اس کے اور سعد کے تعلق کے دوران کتنی بار آیا۔ کتنی بار دہرایا گیا تھا۔ شاید یہ اس تعلق کا حاکم لفظ تھا۔ جس کے عنوان کے تحت اس تعلق کے باقی تمام مندرجات رقم ہوئے تھے... وہ سوچ رہی تھی۔

"یہ لفظ اگر مناسب بھی ہو تو کیا فائدہ فاطمہ خالہ! جو جذبہ ہو ہی یکطرفہ اس کا مستقبل کیا ہو سکتا ہے؟"

اس نے پہلی بار کسی کے سامنے سچے دل سے اقرار کرتے ہوئے کہا۔ اسے اپنے دل کی کیفیت کو روشنی دینے کے لیے ایک روزن درکار تھا' جو اسے فاطمہ کی شکل میں اچانک دستیاب ہوا تھا۔

"جب ہی تو کہہ رہی ہوں۔ تم نے اپنے لیے ایک مشکل فیصلہ کرلیا ہے۔" فاطمہ نے ماہ نور کے منہ سے وہ بات سننے کے بعد جو وہ پہلے ہی سمجھ چکی تھیں' کہا۔ "وہ اچانک یوں غائب ہو جاتا ہے کہ اپنا نام و نشاں تک نہیں چھوڑتا۔ وہ تمہارے قریب موجود ہوتے ہوئے بھی کسی ان دیکھی ہستی کی تلاش میں رہتا ہے۔ اس ہستی کو پالینے کے لیے بہروپ بدلتا ہے۔ عجیب و غریب جگہوں پر پایا جاتا ہے۔ کسی بھی انوکھی کہانی کو سن کر اسے گمان ہونے لگتا ہے کہ ضرور اس قصے میں ہی اس ہستی تک پہنچنے کا سراغ مل جائے گا۔ جو اپنے باپ سے بدگمان بھی ہے اور اس سے بہت مانوس بھی ہے اور سب سے بڑھ کر جس نے ایک بار بھی تمہیں کوئی حوصلہ افزا جملہ نہیں کہا۔ اس کے لیے شہر در رہونا۔ مجھے کہہ لینے دو ماہ نور! تم خود کو مشکل میں ڈال رہی ہو۔" فاطمہ کے چہرے پر باوجود کوشش کے پریشانی عیاں ہو رہی تھی۔

"میں وہاں کلاسز لینے جارہی ہوں فاطمہ خالہ! آپ میرے اس ارادے کو سعد سے کیوں جوڑنا چاہ رہی ہیں۔" ماہ نور نے انہیں تسلی دینے کی ایک کمزور سی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تم کلاسز کا صرف بہانہ کررہی ہو ماہ نور!" فاطمہ نے سرہلایا۔ "دراصل تم اسے تلاش کرنا چاہتی ہو اور بتانا چاہتی ہو کہ وہ اپنی تلاش کا سرا کہاں سے پکڑے اور ایسا تم محض اس لیے نہیں کرنا چاہتیں کہ تم کسی انسان کی مدد کرنا چاہتی ہو۔ بلکہ ایسا تم اس لیے کرنے جارہی ہو کہ وہ انسان سعد ہے۔"

فاطمہ ایک دم اس کی کیفیت کا ظالمانہ تجزیہ کرنے پر تل گئیں۔

"فاطمہ خالہ! آپ کا کیا خیال ہے۔ آپ کی کزن جن کو گلے پر چھری پھیر کر قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان کا سعد کی ممی سے کوئی تعلق ہوسکتا ہے؟" ماہ نور نے اچانک موضوع بدلنے کی خاطر سوال کیا۔ وہ ہر صورت فاطمہ کے کڑوے سچ سے فرار حاصل کرنا چاہتی تھی۔

"اللہ جانے۔" فاطمہ نے سرہلایا۔ "سعد ایک بڑے بزنس مین کا بیٹا ہے۔ تمہارے بقول اور شہناز کوئی ایسی نامور گلوکارہ تو تھی نہیں کہ اس کے حلقہ احباب میں ایسی کوئی خاتون پائے جانے کا امکان ہوتا جس سے سعد کے والد تعلق بنانا پسند کرتے۔"

"سعد کے بقول سعد کے والد اس کی ممی کو میراثن کا لقب دیتے ہیں۔" ماہ نور نے کہا۔

"شہناز کا ذوق اتنا گیا گزرا بھی نہیں تھا کہ وہ کسی میراثن کی صحبت میں بیٹھ جاتی۔ وہ بے چارہ بس ماں ڈھونڈنے کے چکر میں میری تیری سب کی سنائی داستانوں میں اپنی ماں تلاش کرنے لگتا ہے۔" فاطمہ نے ماہ نور کی بات کی نفی کرتے ہوئے کہا۔

"چلیں پھر جو بھی ہے ہمیں کیا۔" ماہ نور نے صوفے کے کناروں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "قصہ یہ ہے کہ سعد گیا اس کا کسی سے کوئی رابطہ نہیں۔ اب وہ جانے اور اس کی تلاش جانے۔"

اس نے بے نیازی سے سر جھٹکا۔ فاطمہ اس کی اس کوشش پر نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرادیں۔

☼ ☼ ☼

سیدھے سادے، سادہ لوح کھاری پر بڑا کڑا وقت پڑا تھا۔ اس کی آسان اور بے نیاز سی زندگی طوفان کی زد میں تھی۔ زندگی بے انت سوالوں کے ساتھ اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی اور اسے صاف محسوس ہوتا تھا کہ ان بے انت سوالوں میں سے اسے ایک کا بھی جواب نہیں آتا تھا۔

اس روز وہ سعدیہ کو بھین جی کے گھر چھوڑنے کے بعد واپسی پر کتنی ہی دیر چاچے رفیق کے کھیتوں کے کنارے اکیلا بیٹھا رہا تھا۔ کھیتوں میں دھان کی فصل سر اٹھائے کھڑی تھی۔ دھان کی سرسبز فصل تاحد نظر پھیلی تھی اور اس میں کھڑے پانی پر سورج کی براہ راست پڑتی حدت زمین سے ایک عجیب سی دم گھٹنے والی بھڑاس اٹھارہی تھی۔ سر پر چمکتا سورج پسینہ چوٹی سے ایڑی تک بہا رہا تھا۔ لیکن ایسی فضا میں جہاں کوئی بھی ذی روح اس کی شدت سے بھاگ کھڑا ہو، وہ اس کی سختی کے احساس سے بے نیاز کب سے وہاں بیٹھا تھا۔

"مجھے نہیں پتا کہ میں کون ہوں۔ نہ مجھے پتا میرا آنے والا وقت کیسا ہے۔ اوپر سے سعدیہ اور بھین جی کی باتوں کا بوجھ بھی میرے کندھوں پر آپڑا۔"

وہ کھیتوں میں ٹھہرے پانی پر نظریں جمائے سوچ رہا تھا۔ "مجھے کیا خبر تھی کہ بھین جی اور مولوی جی جیسے سادے سیدھے بندوں کے آگے پیچھے اتنے کنجل (گرہیں) ہوتے ہیں کہ ہاتھ تھک جائیں کنجل نہ کھلیں۔"

اس نے افسوس کے اظہار کے طور پر سر جھٹکا۔

"بے چاری سعدیہ کا بھی کیا قصور ہے۔ اسے ایک ناؤ سے اتار دوسری میں چڑھا۔ بھین جی کے کنفیوژن

کنفیوژن) اس کی ناؤ ہی بدلتے رہے ساری عمر۔ پھر بے چاری کو میرے ساتھ نکاح کی کشتی میں بٹھا دیا۔ بتاؤ بھلا لڑکی کو ڈاکٹر بنانے کے خواب دکھا دکھا کر مجھ جیسے جاہل، بے حقیقت بندے کے پلے باندھ دیا۔ سعدیہ کی بھی ساری غلط فہمی دور ہوگئی ہوگی میرے ساتھ نکاح کرکے۔ اس نے جو کسی تخت پر بیٹھنے کا سوچا ہوگا، چوہدری سردار کی محبت، پیار اپنی جگہ، فارم ہاؤس کے کامے (ملازم) اور راکھے کی بیگم بن کر کون سے تخت پر چڑھ بیٹھنا تھا اس نے۔ سچی بات ہے یہ جو بڑے لوگوں والے کنفیوژن ہوتے ہیں، غریب بندے کو بھاری ہی پڑتے ہیں اور میرے جیسے عقل سے پیدل بندے تو ان میں پھنس کر اپنا آپ ہی بھول جاتے ہیں۔"

اس نے چہرے پر چمکتے پسینے کو شانے پر رکھے رومال سے پونچھتے ہوئے سوچا۔

"دیکھو میں تو سب کو پتا ہے کہ گواچا (گمشدہ) بندہ ہوں۔ ان کو دیکھو سعد باؤ صاحب کو۔ وہ اتنے امیر ہو کر بھی مجھ سے بھی زیادہ گواچے (گمشدہ) ہیں۔ ان کو خبر ہی نہیں کہ ان کی ماں جو انہوں نے کبھی دیکھی ہی نہیں، اس کے ساتھ کیا ہوا۔ بے چاری نے کیسی زندگی گزاری۔ اب پتا نہیں انہوں نے کبھی اپنی ماں کے بارے میں سوچا بھی کہ نہیں۔ لیکن اگر سوچا ہو تو کیا سوچتے ہوں گے۔ شاید سمجھتے ہوں کہ ماں میری کب کی مرگئی۔ عید، شب برات پر اس کے لیے فاتحہ دعا کرتے ہوں گے۔ جو ان کو پتا چلے کہ ماں بے چاری کے ساتھ کیا، کیا گزری تو کبھی سکون کی نیند نہ سوئیں رب سوہنڑے کی قسم۔" اس نے یقین انداز میں سرہلایا۔

"سچی بات تو یہ ہے کہ جب سے بھین جی کی بات سنی ہے اور جب سے سعدیہ کی بات سنی ہے، مجھے بھی دن رات ساری باتوں کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی آتا ہے کہ میری بھی تو کوئی ماں ہوگی۔ میں کوئی آسمان سے نہیں گرا ہوں گا۔ اللہ جانے میری ماں زندہ بھی ہوگی یا نہیں۔ وہ کیسی ہوگی، کہاں رہتی ہوگی۔ میں اس سے کدھر اور کیسے گم ہوگیا ہوں گا۔ جب گم ہوا ہوں گا تو اس نے کدھر کدھر مجھے نہ ڈھونڈا ہوگا۔ میرے اور بھی کوئی بہن بھائی ہوں شاید۔ وہ تو اکٹھے رل مل (مل جل) کر رہتے ہوں گے۔ کوئی ابا بھی ہو شاید کہیں۔" اس کی کھلی آنکھیں ایک خاندان کو تصور میں دیکھنے لگیں۔

"سچی بات ہے۔" کچھ دیر بعد اس نے سر جھٹکا۔ "کنفیوژن ہی کنفیوژن ہے۔ میں تو اپنا آپ سے مذاق ہی بھول گیا۔ ان میں پھنس کر۔ بابے منگو کا میلہ بھی گزر گیا۔ کیا اچھا وقت تھا، پچھلے سال جب مہ نور باجی اور میں بابے منگو کے میلے پر گئے تھے۔ وہاں سائیں بھی ملا تھا۔" اس کے چہرے پر لحہ بھر کو مسکراہٹ بکھری۔

"سائیں اور سعد باؤ صاحب۔ عجیب ہی رولا ہے ہر بات میں۔ آدمی امیر ہو یا غریب، کنفیوژن اب عام سی بات ہوگئی ہے سب کے لیے۔ جیسے اب میں کنفیوژ ہوں۔" اس کا چہرہ پھر سے اداس ہوا۔

"ایک ایسی جگہ پر بندہ کھڑا ہو جہاں سے شمال، جنوب، مشرق اور مغرب چاروں طرف راستے نکلتے ہوں۔ ایسے چوک میں کھڑے ہوئے بندے کو کیسے پتا چلے کہ وہ کدھر جائے۔ کس راستے پر چلے۔" اس نے ایک بار پھر سر جھٹکا۔

"اوئے کون ہے اوئے ادھر کیوں بیٹھا ہے۔ شکر دوپہرے" (بھری دوپہر میں)

قریب سے آتی آواز اس کے کان میں پڑی۔ اس نے چونک کر آتی آواز کی سمت دیکھا۔

"اوئے کھاری اوئے شدائیا!" چاچا رفیق سر پر سفید ململ کا کپڑا باندھتا اس کی طرف چلا آرہا تھا۔

"جھلا ہوگیا ہے جو اس ہسڑ (حبس) میں بیٹھا ہے۔ سر کو چڑھ گیا نا ہسڑ تو مہینہ بھر بستر پر پڑا رہے گا۔" چاچے رفیق نے اس کے قریب آکر اپنی بات مکمل کی۔

"سر کو صرف ہسڑ ہی نہیں چڑھتا چاچا!" کھاری نے پگڈنڈی کے کنارے پر گیلی مٹی میں ہاتھ میں پکڑا تنکا پھیرتے ہوئے کہا۔ "سر کو تو باہر کی شیویں (چیزیں) بھی چڑھ جاتی ہیں۔ پھر بھی تو بندہ شیدائی ہوجاتا ہے نا۔"

"اوئے چل اوئے اٹھ ادھر سے۔" چاچا رفیق نے اس کی بات پر دھیان نہ دیتے ہوئے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ "تو بستر پر پڑ گیا تو چوہدری سردار کی ساری بھینسیں تجھ (دودھ دینا چھوڑ دیں گی) جائیں گی وہ تو تیرے ہاتھ پڑی ہیں نا۔"

"ہاں سب کو اور اور چیزوں کی فکر پڑ جاتی ہے۔ کھاری غریب کی کسی کو کوئی فکر نہیں۔" اس نے اٹھنے کے لیے چاچے رفیق کے بڑھے ہوئے ہاتھ کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

"تیری فکر تیری گھر والی کو ہو گی نا جھلیا۔" چاچا رفیق ہنسا۔ "اب تو تو گھر والی والا ہو گیا ہے۔ اب شیدائیوں کی طرح ادھر ادھر بیٹھنا چھوڑ دے۔"

"بندے کا کوئی گھر ہو تو ہی گھر والی بھی گھر والی بنتی ہے چاچا!" اس نے زبردستی دانت نکوستے ہوئے بظاہر مذاق میں کہا لیکن یہ راز صرف وہ جانتا تھا کہ اس کی بات میں آنے والے وقت کے خوف، اندیشے اور فکریں کیسے لرز رہی تھیں۔

"کھاری وے کھاری!" وہ چاچا رفیق کے ساتھ اس کے ڈیرے کی طرف جا رہا تھا۔ جب پیچھے سے اسے ماسٹر کمال کی آواز سنائی دی۔

"اوئے تو ادھر گھوم پھر رہا ہے۔" اس نے مڑ کر دیکھا ماسٹر کمال موٹر سائیکل پر بیٹھا اس سے مخاطب تھا۔ "ادھر شہر سے تیرے مہمان فارم ہاؤس آ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔"

"میرے مہمان؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"ہاں اور میں تجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پھاوا (خوار) ہو گیا ہوں۔" ماسٹر کمال نے ناراضی سے کہا۔ "اپنا فون بھی تو نے اپنی گھر والی کو پکڑا رکھا ہے۔ اس سے پوچھو تو وہ بھی کہتی ہے پتا نہیں افتخار کدھر ہے۔" ماسٹر کمال نے لفظ افتخار پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"او ہو کون آ گیا؟" کھاری نے چاچا رفیق کی طرف یوں دیکھا جیسے اسے پتا ہو کہ کون آیا تھا۔

"چلو پھر جلدی سے میرے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ پروہنا انتظار کرتا ہو گا۔" ماسٹر کمال نے کہا اور کھاری چاچا رفیق سے ہاتھ ملا کر رخصت ہوتا ماسٹر کمال کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

انہوں نے اپنے سامنے بیٹھی سعدیہ کی طرف دیکھا جو گھٹنے موڑے ٹانگوں کو بازوؤں کے ہالے میں لیے یوں گم صم بیٹھی تھی جیسے شکست کھائی فوج کا کوئی سپاہی شکست کے بعد اپنی ہار کے اسباب پر غور کر رہا ہو۔ "اس کے حوالے مجھ سے شاید سب کچھ غلط ہو گیا۔" انہوں نے افسوس سے سوچا تھا۔ "سہیلیوں، ساتھ والیوں اور اسکول سے گھر تک راستے میں نظر آنے والے لوگوں کو دیکھ کر اگر جو اسے بھی اپنی حالت سنوارنے کا خیال آ گیا تھا۔ ایک چھوٹی سی خواہش نے مجھے اتنا خوف زدہ کر دیا کہ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اس کے سارے خوابوں پر پانی پھیرتے ہوئے اسے ایک بے شناخت، ان پڑھ لڑکے کے پلے باندھ دیا۔"

وہ سعدیہ کے سامنے نظریں جھکانے پر خود کو مجبور محسوس کرنے لگیں۔

"لاکھ نیک دل، معصوم اور شریف ہے کھاری، مگر یہ بھی تو حقیقت ہے کہ اس کا نہ کوئی آگا ہے، نا پیچھا، نہ ہی کوئی ڈھنگ کا کام کرتا ہے۔ نہ سلیقے کی کمائی ہے۔ چوہدری سردار کی مرضی ہو تو اسے چار پیسے پکڑا دیے ورنہ پتر جی سب کچھ تمہارا ہے۔ رج کے عیش کرو، کھاؤ پیو، مزے کرو جیسے جملوں پر ٹرخا دیا۔"

اس روز وہ صرف اور صرف سعدیہ کی ماں بن کر سوچ رہی تھیں۔

"میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اماں اپنے دل میں اتنے بڑے بڑے راز چھپا کر بیٹھی ہیں۔ وہ ایسے وحشت ناک حالات سے گزر کر مجھے گود میں اٹھائے شہر در شہر چھپتی چھپاتی یہاں تک پہنچیں اور تو فیق بھر مجھے پالتی رہیں۔" رابعہ آپا کے سامنے بیٹھی سعدیہ خلا میں گھورتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"میں تو یہاں آنے سے پہلے اس چھوٹے شہر کے پرانے، گندے، چھوٹے سے محلے کی مسجد کے اس چوبارے کو ہی یاد کرتی رہی جس میں ہم رہتے تھے اور جہاں میری دلچسپیوں کا جہان آباد تھا۔ اماں اور ابا جی کو وہاں سے اٹھ کر اس گاؤں تک کیوں آنا پڑا، مجھے کیا خبر تھی کہ اس نقل مکانی کے پیچھے اپنی اور میری جان بچانے کا ارادہ چھپا ہوا تھا۔ مجھے یہاں آنے پر اعتراض، کسی رشتہ دار، عزیز کے نہ ہونے پر اعتراض، اس طرز زندگی پر اعتراض، اس مفلوک الحالی پر اعتراض، زندگی میں شکر کا کلمہ تو شاید ہی میں نے کبھی پڑھا ہو اور میرے ماں باپ۔"

اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے چہرہ دوسری طرف موڑا اور ایک بار پھر خلا میں کچھ دیکھنے لگی۔

"دونوں کتنے بڑے دل والے ہیں۔ ابا جی ایک وقت اچھا کھانا مل جانے پر اگلا پورا ہفتہ اسی کا شکر ادا کرتے رہیں اور اماں، مکے مدینے سے آئی چار کھجوروں کا تحفہ مل جانے پر شکر گزاری کی کیفیت سے سرشار جھوم جھوم جائیں۔ ہائے! میں نے کبھی ان دونوں کی ان عادتوں پر تو غور ہی نہیں کیا۔"

اس کے دل میں دکھن کا احساس جاگا۔

"میں گلے ہی کرتی رہ گئی ساری عمر۔ نہ ہونے کے رونے ہی روتی رہی۔ جو تھا اور مل رہا تھا اس پر کبھی دھیان ہی نہیں کیا لاکھ اماں توجہ دلاتی رہیں۔"

اس نے مضطرب ہوتے ہوئے سر کو نفی میں ہلایا۔ "آج جب اپنی اوقات اور حیثیت کا انکشاف ہوا ہے تو پچھلی پوری زندگی پر شرمندگی محسوس ہونے لگی ہے۔"

"اور اب جو اس کو میں نے آگے پیچھے کی ساری داستان سنا دی ہے تو یہ نہ جانے اپنے بارے میں کیا فیصلہ کرے۔ کھاری کا کیا ہو گا اس سارے میں؟" آپا رابعہ نے اپنے خیالات سے نجات حاصل کرنے کے لیے وہاں سے اٹھتے ہوئے سوچا۔

"اماں کی باتیں سن کر مجھے کیا کیا خیال نہیں آ رہے۔ مگر میرے سر پر اماں اور ابا جی تو ہیں نا میں بے شناخت تو نہیں ہوں۔ کیا ہوا جو میں میراثیوں کے کسی سربج کی نواسی ہوں اور میرے باپ کو اس کی ماں غربت کے ہاتھوں تنگ آ کر یتیم خانے میں چھوڑ گئی تھی۔ میرے بے نشان منزل کے مسافر ماں، باپ کو اللہ نے زمانے کی تمام ٹھوکریں کھلانے اور تجربے کے سارے رنگ دکھانے کے بعد اپنے راستے پر تو چلا دیا نا۔ ابا جی خود سے بتا کر یا کہیں سے پڑھ پڑھ کر لوگوں کو جو دین اسلام کی باتیں سناتے ہیں ان کے پیچھے مقصد تو فلاح ہے اور اصلاح بھی۔ ابا جی جیسے مولوی جو انجام اور آخرت کی خوفناک لفظی تصویریں نہ دکھائیں تو یہ عام دیہاتی لوگ تو بالکل ہی بے راہ رو ہو جائیں۔ ان ہی کا دم ہے جو ان ان پڑھ لوگوں کو اللہ کی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی، رسولوں، پیغمبروں، آسمانی کتابوں، الہاموں اور دوسرے مذاہب کی باتیں سنا کر کم از کم ان کے کانوں کو ان سب سے روشناس تو کراتے ہیں۔ بے رلو اور بدگمان تو نہیں کرتے۔ باقی رہی انسانی فطرت اور جبلت تو اس پر کسی کا اختیار نہیں، غربت کے مارے تنگ آ کر یتیم خانے میں جمع کروانے والی ماں کا بیٹا صدیوں اور نسلوں کی بھوک ہی تو مٹاتا رہے گا۔ جب بھی دستر خوان پر بیٹھے گا۔"

اس نے ابا جی کو جبلت کا مارجن دیتے ہوئے سوچا۔

"اور اماں، ان کی قسمت تو جیسے کھل ہی گئی۔ تاجے میراثی کی بیٹی تمام عمر دھائیاں اور دہائیں نہ دیتی رہتی تو اور کیا کرتی۔ لیکن اپنی سہیلی کے گھر اتفاقاً پہنچ جانے اور اس کی خدمت گزاری میں دن گزار دینے نے اماں کو کیسے

کیسے اسباق پڑھا دیے۔ اماں کی سہیلی بھی کیا نصیب لے کر پیدا ہوئی ہوگی۔ عزت دار گھرانے کی مال ' جائیداد کی وارث ' اتنی پڑھی لکھی لڑکی اور قسمت دیکھو ساری عمر پرانے محلے کے تین کمروں کے مکان میں گزار دی۔ زندگی کی تمام تلخیاں دیکھیں اور سہیں اور ان کو سہتے سہتے توکل ' تمنا ' فقر اور صبر کے درس پڑھ ڈالے۔ نہ صرف خود پڑھے ' بلکہ اماں کو بھی پڑھا دیے۔ اماں کی قسمت ' بے سمت مسافر کو کیسی سمت مل گئی سہیلی کے طفیل ' مگر کھاری ؟"

اس کا دھیان پھر سے کھاری کی طرف چلا گیا۔ "اس بے چارے کو تو یہ بھی پتا نہیں چلا کہ زندگی کا جو سفر وہ طے کر رہا ہے ' وہ سفر ہے ' جس میں جب بھی وہ مڑ کر پیچھے دیکھے گا ' اسے کوئی اپنا نظر نہیں آئے گا۔ " اسے جھرجھری سی آگئی۔

" دیکھو ' اب اس کے اور کھاری کے رشتے کا بنتا کیا ہے۔ " ہینڈ پمپ چلا کر شفاف پانی سے وضو کرتی رابعہ آپا سوچ رہی تھیں۔

" ماں نے جو سبق پڑھا۔ اگر میں آج سے اس کی الف ' ب کی گردان سیکھنا شروع کروں تو کتنا وقت لگے گا پوری تختی سیکھنے میں۔ " مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے مولوی سراج سرفراز کی اذان دیتی آواز سن کر دوپٹا سر پر اوڑھتے ہوئے سعدیہ نے سوچا۔

" تختی پڑھ لوں تو کھاری کی زندگی سنورے ' نہ پڑھوں تو اپنی من مرضی کرتی پھروں ' نہ اس صورت روک ٹوک ' نہ اس صورت۔ " وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ہینڈ پمپ کے قریب رکھی پچی چوکی پر چپل اتار کر بیٹھ گئی۔ پمپ کی ہتھی چلانے پر پمپ کے منہ نے ٹھنڈا میٹھا صاف پانی اگلا۔

" اشہدان لا الہ الا اللہ واشہدان محمد الرسول اللہ۔ "

سعدیہ کلثوم اس ٹھنڈے صاف میٹھے پانی سے وضو کرنے کے بعد زیر لب اقرار کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

" بے ایمانی تمہارے دل کی پکی مکین بن چکی ہے ابراہیم ! اور جھوٹ تیری گھٹی کا حصہ ہے۔ " سعد دانت پیستے ہوئے ابراہیم کی طرف مڑا۔

" وزڈم میرے یار وزڈم ! " ابراہیم نے کنپٹی پر انگلی بجاتے ہوئے جواب دیا۔ " میرا وزڈم وہاں شروع ہوتا ہے جہاں تیرا ختم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ میں مرغن اور چربیلے کھابے کھانے والوں کی اولاد ہوں۔ "

" میں تمہاری وزڈم کا آملیٹ بنا کر نہ کھا گیا تو میرا نام بدل دینا۔ " سعد نے بلند آواز میں کہا اور ڈرائیو وے پیدل ہی تیز قدموں سے چلنے لگا۔ وہ گھر کے مین گیٹ سے باہر جا رہا تھا۔

" تھینک یو ابراہیم ! میرا خیال تھا کہ تم ایک وفادار اور با اعتماد دوست ہو۔ " اس کے تیز قدموں کے راستے میں آنے والے شخص نے ابراہیم کو اتنی ہی بلند آواز میں مخاطب کیا۔ سعد نے بے بسی سے اپنے سامنے اور پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کے سامنے اس کا باپ اور پیچھے جگری دوست تھا۔ وہ زندگی میں پہلی بار بلال سلطان کے ہاتھ چوہے کی طرح پکڑا گیا تھا۔

" کہاں اور کس سے فرار چاہیے تھا برخوردار ! " بلال سلطان نے اسے دونوں شانوں سے تھامتے ہوئے مخاطب کیا۔

" مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ " اس نے ان کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ ایسا جواب جو ان کے سوال سے بالکل بھی میل نہیں کھاتا تھا۔

" ہاں ضرور۔ " انہوں نے سر ہلایا۔ " تمہارا کمرا ' تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ "

" ٹھیک ہے۔ میں ادھر ہی جا رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ مجھے بالکل بھی ڈسٹرب نہیں کیا جائے گا۔ " اس نے رک کر ایک دو لمحے سوچنے کے بعد صلح جو انداز میں کہا۔

" سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ " بلال نے خوش دلی سے کہا۔ کتنے دن کے بعد انہیں محسوس ہوا تھا کہ ان کے بے جان جسم میں خون دوڑ رہا تھا اور سانس کا معمول نارمل ہونے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

" میں آپ سے سخت شرمندہ ہوں میم ! اپنے وعدے کے مطابق نہ خود اب تک آپ کے پاس واپس پہنچا ' نہ ہی آپ کی گاڑی آپ کو واپس پہنچا سکا۔ "

" مجھے گاڑی کی اس وقت تک فکر نہیں ہے جب تک یہ اطمینان ہے کہ تمہارا تعلق گاڑی چوروں کے ٹولے سے نہیں ہے۔ لیکن تمہارے لیے میں یقیناً " فکر مند ہوں۔ تمہارے زخمی ہاتھ کے لیے اس سے بھی زیادہ۔ اور یہ تم واپس اپنے فون نمبر تک کیسے پہنچ گئے۔ "

" میں تو وہیں پہنچ گیا ' جہاں سے چلا تھا فلزا میم ! "

" ثابت ہوا دنیا گول ہے۔ " ہنسی کی آواز۔

" دنیا صرف گول نہیں گھول مٹول ہے۔ میرے گول مٹول ہم زاد نے اس بار میری عقل پر اعتماد کا پردہ ڈال کر مجھے واپس اغوا کر لیا۔ "

" یعنی سر اٹھانے سے پہلے ہی سر کچل دیا گیا۔ "

" ابھی کچلا نہیں گیا۔ جال میں جکڑا گیا ہے۔ کچلنے کا فیصلہ شاید بعد میں کیا جائے۔ "

" ارے کسی دوست چوہے کو ڈھونڈ و سعد بلال ! کیا تم نے ایسے موقع کے لیے کسی چوہے سے دوستی نہیں کر رکھی تھی ' جو اس جال کو کتر سکے۔ "

" جس چوہے کو اس منظر میں کودنا تھا ' اتفاق سے وہ چوہا میں خود ہی ہوں۔ ایک ایسا چوہا جو جال پھینکنے والے پر الٹانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ الحمد اللہ۔ ویسے آپ نے پھر مجھے سعد بلال کہہ دیا۔ یاد رکھیے گا لکیر پیٹنے کی صلاحیت رکھنے سے انکاری بھی ہیں اور بخوبی پیٹ بھی لیتی ہیں۔ "

" یادداشت کا قصور ہے۔ جو کمزور ہوئے جاتی ہے۔ میری حقیر سی میزبانی کے عوض امریکن باداموں کا ایک پیکٹ دلوا دو تو مشکور ہوں گی۔ "

" معاوضہ مانگ رہی ہیں۔ یہ بھی یاد رکھیے گا اور بے فکر رہیے گا۔ میں آپ کو امریکن نہیں ' دیسی باداموں کا تحفہ پہنچاؤں گا۔ وہ زیادہ طاقت کے حامل ہوتے ہیں۔ اگرچہ پستہ قامت اور نا قابل اعتنا ہوتے ہیں دیکھنے میں۔ "

" تم صرف باتیں کر سکتے ہو ' عمل وغیرہ کچھ نہیں۔ "

" عمل ہی تو کرنے جا رہا ہوں۔ ایسا عمل جس کے بعد آپ چھوڑ بڑے بڑے فرعون مجھے اس صدی کا سب سے بڑا عامل بابا ماننے پر مجبور ہو جائیں گے۔ "

" دیکھتے ہیں۔ "

" ہاں انتظار کیجیے اور دیکھیے کی پالیسی اپنا لیجیے آپ۔ "

" ٹھیک ہے۔ "

" ویسے یہ بتائیے گاڑی آپ کے نام رجسٹرڈ ہے کیا ؟ "

" میرا ! میرے علاوہ اور ہے کون ' جس کے نام رجسٹر کراؤں گی۔ "

"آپ کا" آپ کے علاوہ جو ہے 'میرا عمل اسی کو تو آپ کے سامنے لانے والا ہے۔ بس ایک چلّہ کاٹ لینے دیجیے مجھے۔ اس کے بعد اس سنیاسی باوے کا کمال دیکھیے گا۔"

"واہ بھئی بڑے پرعزم لگ رہے ہو آج تو۔"

"انسان جب جال میں پھنس جائے تو عقل کے داؤ پیچ زیادہ لڑائے جاتے ہیں۔ ارتکاز کی بات ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔"

"لیجیے۔ پھر میں رخصت لیتا ہوں۔ آپ کی گاڑی کچھ دیر بعد پہنچ جائے گی۔ آپ تک۔"

"اور تم؟"

"میری چھوڑیے، مجھے جال پر دانت آزمانے ہیں اور چلّہ بھی کاٹنا ہے۔"

"مطلب اگلی بار میری ملاقات ایک جٹادارجوگی سے ہوگی۔"

"آپ کی ملاقات جلد ہی دل کے سکون اور آنکھ کی ٹھنڈک سے ہوگی انتظار کیجیے اور دیکھیے بس۔"

"معما بن رہے ہو تم تو۔"

"معما حل کر رہا ہوں' دعا کیجیے گا میری اس کوشش کے دوران سیاہ بادبانوں والے جہاز ساحل سے نہ آلگیں ورنہ چٹان سے کود کر خودکشی کرنے والے بادشاہوں کی کل تعداد دو ہو جائے گی۔"

"یہ ادب سے لیا یا تاریخ سے؟"

"آدھا' آدھا دونوں سے۔"

"میں شاید تمہیں سمجھ نہیں پائی۔"

"لیکن میں آپ کو خوب سمجھ گیا۔ آپ کو بھی اور آپ کی ٹڈ نائٹ ان ہیون کو بھی۔"

"ڈرا رہے ہو؟"

"نوید دے رہا ہوں۔"

"چلو دیکھتے ہیں۔"

"ہاں دیکھیے۔"

"گڈبائے سعد ب۔ سعد سلطان۔"

"گڈبائے فلزا میم۔"

☼ ☼ ☼
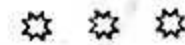
اس کی نظروں کے سامنے پیغام تھے' بلکہ پیغامات ان گنت پیغامات' اور وہ ایک کے بعد ایک پیغام پڑھ رہا تھا۔ وہ پیغام تھے جنہیں وصول کرنے اور پڑھنے سے پہلے ہی وہ جانتا تھا کہ اسے کیسے اور کن الفاظ میں پیغام بھیجے جا رہے ہوں گے۔ اپنا فون بند کرنے کے بعد اس نے سر پیچھے کر کے آنکھیں بند کر لیں۔

"کچھ سچوئیشنز ایسی ہوتی ہیں جن سے نظریں ملانا مشکل ہی نہیں' ناممکن بھی ہوتا ہے۔" اس نے سوچا اور اٹھ کر اپنے وارڈ روب کی طرف چل دیا۔ صبح ہونے سے قبل اسے بہت سے کام نمٹانے تھے۔ اس نے وارڈ روب کے دروازوں اور چند خفیہ خانوں سے کچھ کاغذات نکالے اور انہیں لیے کھڑکی کے قریب رکھی اسٹڈی ٹیبل کی طرف آگیا۔ کھڑکی کے پردے اس کے شیشوں سے ہٹے ہوئے تھے۔ شیشوں کے آر پار سارے میں رات کا اندھیرا تھا اور اندھیرے میں چمکتی کچھ بڑی سولر روشنیاں' اس نے گھر کے وسیع لان میں لگے لیمپ پوسٹس کے اندر سر جھکائے روشنیوں کے ان منبعوں کو دیکھا اور پھر سامنے دیکھنے لگا۔ روشنی کے بعد اندھیرا' رات کی سیاہی۔

وہ اس پوری کائنات میں جلاوطنی کی غالباً" آخری رات تھی۔

☼ ☼ ☼

"تمہارے پروفیشنل رویے سے مجھے یہ توقع نہ تھی۔" بلال سلطان نے ٹوسٹ پر جیم لگاتے ہوئے کہا۔

"آپ کی توقع کا قصور ہی کہہ سکتا ہوں اسے۔" سعد نے اپنی پلیٹ میں دھرے ٹوسٹ کا ٹکڑا ہاتھ سے توڑ کر آملیٹ کا ایک چھوٹا ٹکڑا اس میں سمیٹا۔ وہ دونوں کتنے دن بعد اکٹھے ناشتا کر رہے تھے' اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔

"ہاں شاید میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔" بلال نے سر ہلایا۔

"پاپا! آپ جیسا جوان ہمت بوڑھا میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے۔"

"شہ مات کا غصہ نکال رہے ہو کیا یوں ہنس کر۔"

"غصہ تو نہیں نکال رہا' کامپلیمنٹ (تحسین آمیز الفاظ) دے رہا ہوں۔" اس نے ٹوسٹ کا دوسرا ٹکڑا توڑا۔

"چلو یونہی سہی۔" وہ مسکرا کر بولے۔ "شاید تم بھول گئے' میں تمہارا بھی باپ ہوں۔"

"میں یہ کبھی نہیں بھولا کہ آپ میرے بھی باپ ہیں' بھول صرف یہ سوچنے میں ہوئی کہ آپ صرف میرے ہی باپ ہیں۔" اس نے جملہ مکمل کرنے کے بعد دانستہ ایک نظر ان پر ڈالی۔ وہ ان کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا۔

"میں بھول جانا چاہتا ہوں کہ تم اتنے دن مجھے بتائے بغیر کہیں غائب رہے۔" وہ اس کی بات سمجھ نہیں پائے یا دانستہ گول کر گئے' اسے سمجھ نہیں آیا۔ "لیکن تمہارے انداز مجھے بار بار یاد دلا رہے ہیں کہ تم اتنے دن نجانے کہاں اور کن لوگوں میں رہے۔"

"میرے انداز۔" وہ ہاتھ روک کر بولا۔ اس کا انداز سوالیہ تھا۔

"ہاں!" انہوں نے جس ہاتھ میں چھری پکڑی تھی' اس سے اس کی طرف اشارہ کیا۔

"تم مسلسل ہاتھ سے ٹوسٹ توڑ کر کھا رہے ہو' چھری کانٹے کا استعمال بھول گئے غالباً۔"

"اوہ!" وہ ان کی بات سمجھتے ہوئے سر ہلا کر بولا۔ "چھری کانٹا۔" اس نے ان کے الفاظ دہرائے اور مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔ "دراصل مجھے چھری کے استعمال سے ڈر لگنے لگا ہے۔ خاصا خطرناک اوزار ہے یہ۔ ضرورت پڑنے پر ہتھیار بننے میں دیر نہیں لگاتی یہ چھری' ٹوسٹ' بن' پھل' سبزیاں ہی نہیں کبھی کبھی لوگوں کے گلے کاٹنے کے کام بھی آجاتی ہے۔" اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔

"ارے آپ کا ہاتھ کیوں کانپ گیا۔" اگلے لمحے وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا تھا۔ "لیجیے میں اپنا کامپلیمنٹ واپس لیتا ہوں۔ آپ جواں ہمت تھیں بڑھاپے کی طرف گامزن بوڑھے ہیں۔ ہیں نا" وہ ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "جب ہی چھری کانٹے چلاتے ہاتھ کانپنے لگے ہیں آپ کے۔"

"اوہ بہت لیٹ ہو گئے۔" انہوں نے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ سعد نے دل میں ان کے خود پر قابو پانے کی صلاحیت کی داد دی۔

"میں اب چلتا ہوں۔" وہ تیزی سے اٹھتے ہوئے بولے۔ "میں آج آفس میں منتظر رہوں گا۔ مجھے منتظر رہنا چاہیے نا۔" قریب رکھا فون اور ایک فائل اٹھاتے ہوئے انہوں نے سوال کیا۔

"ظاہر ہے۔" وہ اپنے کپ سے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔ "مجھے یاد ہے آج جعفری اینڈ جعفری والوں سے لنچ پر میٹنگ شیڈولڈ ہے۔"

"زبردست" وہ بے ساختہ بولے "گویا ہم وہیں سے دوبارہ آغاز کر رہے ہیں' جہاں رک گئے تھے۔"

"ہم چلتے چلتے رک گئے اور رک کر ٹھٹک گئے' زمین قدم چھوڑتی ہے یا نہیں' کٹس سی!" وہ مسکرایا۔ "لگتا ہے کسی شاعر کی مصاحبت میں وقت گزار کر آئے ہو۔"

"شاعر نہیں فنکار کہیں۔" وہ مزید مسکرایا۔

"تمہارا نہیں جینز کا قصور ہے۔" وہ جاتے جاتے رکے۔

"جینز پرانڈڈ ہے یالنڈے کی میں نہیں جانتا کیونکہ یہ قصور آپ کا ہے۔" اس نے برجستہ جواب دیا۔

"بلیم گیم۔" انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ "کھیلنا ہے تو چھپ کر مت کھیلو بساط پر آؤ۔"

"بساط بھی آپ کی مہرے بھی آپ کے شاہ بھی آپ شاہ مات بھی آپ کی میں تو تماشائی ہوں' تالیاں پیٹتا ہوں اور سر دھنتا ہوں۔"

"آداب عرض ہے۔" وہ دایاں ہاتھ ماتھے تک لے جاتے ہوئے بولے۔

"اعلا ظرفی ہے بندہ پروری کی" اس نے اپنی پلیٹ کھسکائی۔

"آج ابراہیم کو میں نے ڈنر پر انوائیٹ کیا ہے' ضوفی کو اس کی پسند کے متعلق بتادینا۔ میں اس کا تعاون سیلیبریٹ کرنا چاہتا ہوں اس کے ساتھ۔"

"کرنا چاہیے' وہ ڈیزرو کرتا ہے یہ سیلیبریشن' میں ابھی ضوفی کو بریف کرتا ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "ایک پیالہ ہیملاک (Hemlock) کی قیمت کیا چل رہی ہے آج کل مارکیٹ میں' کچھ آئیڈیا ہے آپ کو" اس نے ان کی طرف دیکھا۔

"ضوفی کو آئیڈیا ہوگا۔ اس سے پوچھ لینا۔ اور اسے بتادینا کہ مشروبات میں بھی شامل ہوگا کیونکہ ڈنر کا مینیو سرو کرنے سے پہلے چکھنے اور انہیں فٹ ٹوایٹ سرٹیفکیٹ دینے کی ذمہ داری بھی اس کی ہے۔" اس کی بات سے حظ اٹھاتے ہوئے بولے۔

"فکر مت کیجے فٹ ٹوایٹ سرٹیفکیٹ میں اس سے چکھنے سے پہلے ہی سائن کروالوں گا۔" وہ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔ بلال نے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور مسکرادیے۔

"آفس آنے سے پہلے سرجن ڈاکٹر عبداللطیف سے ملنا ہوگا تمہیں' میں ان سے اپائنٹمنٹ حاصل کرچکا ہوں' اپنا ہاتھ کا زخم چیک کراؤ فوراً۔"

انہوں نے پیچھے سے بلند آواز میں کہا اور مسکراتے ہوئے باہر کی طرف چل دیے۔ ان کی توقع کے عین مطابق سعد گھر واپس آچکا تھا۔ سرخوشی کے اس عالم میں وہ چند دن تک کوئی اور بات سوچنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ سوائے اس کی واپسی کی خوشی منانے کے۔

☆ ☆ ☆

"صرف ایک شرط پر میں تمہیں جانے کی اجازت دے رہی ہوں یاد رکھنا۔" قائزہ نے ڈائیوو کے ٹرمینل پر اپنی گاڑی پارک کرتے ہوئے گاڑی سے باہر نکلنے سے پہلے ایک بار پھر ماہ نور سے کہا۔

"مجھے آپ کی شرط ازبر ہوچکی ہے ممی! اور یقین رکھیے میں اگلا سمسٹر شروع ہونے سے پہلے لوٹ آؤں گی۔" ماہ نور نے بے چارگی سے کہا۔

"کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہاری دشمن ہوں جو اتنی بے زاری سے جواب دے رہی ہو۔" قائزہ اس کے لہجے پر چونکتے ہوئے بولیں۔

"نہیں ممی پلیز! آپ ایسا مت سمجھیے۔ میں آپ کی تسلی کے لیے کہہ رہی تھی۔" اس نے بیگ پکڑ کر گاڑی سے باہر لاتے ہوئے کہا۔

"اور فرقان ماموں کے ہاں ڈھنگ سے رہنا ہوگا تمہیں۔ تم جانتی ہو نا تمہاری ممانی کی طبیعت کیا ہے؟" قائزہ

نے ڈگی سے اس کا دوسرا بیگ نکال کر اس کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے اس کے پہیوں پر اپنے پیچھے دوڑاتے ہوئے یاد دلایا۔

"سب جانتی ہوں ممی! آپ فکر مت کریں پلیز۔" وہ نیچی آواز میں بولی تھی۔ اس کی بس نکلنے میں پانچ سات منٹ ہی باقی تھے۔ وہ تیز قدموں سے چلتی بس کی طرف جارہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"طیفے لاٹ کو نکاح کا علم ہوچکا ہے اور سنا ہے' وہ سخت غضب ناک ہورہا ہے۔"

"ہوگئے دو اس کی غضب ناکی خلاف توقع تو نہیں۔"

"تمہیں ڈر نہیں لگتا' جبکہ وہ جس سے تم نے نکاح کرلیا کچھ اتنا باہمت نہیں لگتا' ویسے بھی حسن پرست ممن پربت فنکار پرست شخص کو بازو آزمانے سے کیا مطلب۔"

"بڑے بڑے لفظ زیادہ ہی نہیں بولنے لگیں تم؟"

"تمہارے ساتھ کا کمال ہے۔"

"چلو اچھا ہے کچھ تو زبان شستہ ہوئی تمہاری۔"

"تمہیں زبان کی شستگی کی پڑی ہے ادھر طیفا لاٹ دن دیہاڑے محلے بھر کے مکانوں کی چھتوں پر دندناتا پھر رہا ہے۔ رات کے اندھیروں کی تو کیا ہی بات ہے۔"

"فکر مت کرو' کچھ نہیں بگاڑ پائے گا وہ ہمارا۔ یہ جو بڑے بڑے سورما بنتے ہیں نا مچھڑ سنگھ قسم کے' یہ صرف باتوں کے شیر ہوتے ہیں' دل ان کا چوہے کا سا ہوا کرتا ہے۔"

"تم تو شاید عشق کی طاقت کے سر پر شیر ہو لیکن میرا تو سچ پوچھو دن' رات دل ہولتا رہتا ہے' ہمارے پاس تو اپنی حفاظت کو پستول چھوڑ پستول کی گولی بھی نہیں اور شوہر نامدار تمہارا پندرہ پندرہ دن کے وقفے سے ادھر کا چکر لگاتا ہے۔"

"ہو ہو میری چوہیا! جب جگر والوں کی محبت اختیار کی ہے تو حوصلہ بھی بلند کرنا ہوں گے۔ اچھا اب وحشت ناک شکل بنا کر مجھے بھی اپنے ساتھ مت ہولاؤ۔ اتنا ہی تم کو ڈر لگتا ہے نا تو مولوانوں کے ہاں پڑ رہنے والے کو بولو' رات ہماری چھت پر آکر سو جایا کرے' چوکیدار بن کے سو دو سو روپے ماہوار دے دیا کریں گے اسے اس چوکیداری کا۔"

"واہ کیا بندہ ڈھونڈا ہے چوکیداری کرنے کو۔ ذرا جثہ ہی جثہ ہے کم بخت کا' اندر سے خالی ہے منحوس ڈھنڈار۔"

"بری بات اس طرح دوسروں کو منحوس نہیں کہتے کیا پتا کل کو یہی منحوس تم سے مانوس ہوجائے۔"

"خیر کا کلمہ پڑھو کوئی خیر کا کلمہ' منحوس کو مانوس کراتے دس بار سوچنا چاہیے۔"

"تم مجھے منٹ دو منٹ بعد طیفے لاٹ سے ڈراؤ اور میں تمہارے لیے خیر کا کلمہ پڑھوں بہت خوب۔"

"اچھا چلو خیر مذاق برطرف' دیکھو لو دروازے پر دستک ہورہی ہے' یقیناً "بڑی لمبی عمر ہے اس سراج سرفراز کی' اس تک میرا پیغام پہنچادو' بلکہ بہتر ہے میں خود ہی ڈیوڑھی میں جاکر چق کے پیچھے سے اس سے بات کرتی ہوں۔"

"تم نے کون سا میری مان لینی ہے' جو دل میں ٹھان لیتی ہو کر کے رہتی ہو' جبکہ اس موئے نے وقت پڑنے پر ایک ڈنڈا بھی چلالیا تو پھر کہنا۔"

"اچھا اچھا یہ بحث بعد میں کرلینا۔ ابھی تو دروازہ کھولو اور اسے بولو کہ میں آرہی ہوں۔"

☆ ☆ ☆

ماواں دھیاں رل مل بیٹھیاں
تے چرخے دی کوک مک گئی
(ماں بیٹی جب اکٹھی بیٹھتی ہیں تو اپنی باتیں کرنے کو کہتی ہیں کہ کام کاج سب بھول جاتی ہیں)

تایا رابعہ نے اپنے گھٹنے پر سر رکھ کر بیٹھی سعدیہ کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ عصر کی نماز کے بعد سے مغرب کی اذان تک ان دونوں نے دل کی اتنی باتیں ایک دوسرے سے کہہ سن لی تھیں کہ دونوں کو ایک بار بھی کسی دوسرے کام کا دھیان نہیں آیا تھا۔ مولوی سراج سرفراز نے مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر مغرب کی اذان دینا شروع کی تو دونوں ایک دم چونکیں۔

"مغرب کا وقت ہو گیا اور تمہارے اباجی کے لیے ہانڈی نہیں چڑھائی میں نے۔" تایا رابعہ نے کہا۔

"ایک ہی تو شوق ہے اباجی کا اماں! اس کا خیال رکھا کریں۔" سعدیہ نے عرصہ بعد باپ کے لیے کوئی بات دل سے اتنی محبت کے ساتھ کی۔

"تم جانتی ہو کہ ان کے لیے کسی دوسری بات کا تو خیال ہی نہیں آتا مجھے۔"

"کھاری سبزیاں، گھی، دودھ اور مکھن لانا چھوڑ گیا نا اماں؟" سعدیہ نے پوچھا۔

"تمہارے لیے کوئی محفوظ راستہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے کھاری خود کہیں گم ہو گیا ہے شاید۔"

تایا رابعہ نے افسوس کے ساتھ سرہلایا۔

"آپ فکر نہ کریں اماں! میں کھاری کو گم نہیں ہونے دوں گی، بلکہ اس کے ساتھ مل کر اسے ڈھونڈنے کی کوشش کروں گی، اس کے دکھ کی طرف تو میرا ابھی دھیان ہی نہیں گیا تھا، آج اس طرف دھیان گیا ہے تو اپنے تمام خود ساختہ غم ہیچ لگنے لگے ہیں، اتنی شرمندگی محسوس ہو رہی ہے دل میں کہ لگتا ہے اس سے کبھی نظریں نہ ملا پاؤں گی۔ بڑے اور عظیم لوگ جب عاجزی کی گدڑی پہن لیں تو کتنی مشکل ہو جاتی ہے نا انہیں پہچاننے میں اماں!" سعدیہ نے سوالیہ انداز میں تایا رابعہ کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ کھاری کی ذات میں چھپے عظیم انسان کو پہچاننا واقعی بہت مشکل ہے۔ دیر سے سہی تم نے پہچان لیا، سمجھو پہلا سبق ازبر ہو گیا۔" تایا رابعہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

"تم وضو کرلو نماز کا وقت تنگ ہو رہا ہے۔" انہوں نے قمیص کی آستینیں کہنیوں تک موڑتے ہوئے کہا۔

☼ ☼ ☼

اس کے ہاتھ تیزی سے مصروف تھے۔ اسے گھر سے نکلنے سے پہلے اپنے سارے کام مکمل کرنے تھے۔

"ہاں رحیم! جو جو کام میں نے تمہارے سپرد کیے تھے مکمل ہو گئے کیا؟" اس نے فون پر ایک نمبر ملانے کے بعد کال ریسیو کر لیے جانے پر تیزی سے سوال کیا تھا۔

"ایک لفظ۔ سیکرٹ یاد ہے نا؟" دوسری طرف سے اثبات میں جواب ملنے پر اس نے پوچھا۔

"اس لفظ کو دن رات دل میں دہراتے رہنا۔ آج اور آج کے بعد آنے والے دنوں میں بھی۔ ٹھیک ہے۔"

"او کے پھر، ملتے ہیں وہیں، جہاں ملنا طے ہے۔" اس نے فون بند کرنے سے پہلے کہا اور اپنا آفس بیگ اٹھایا۔ اس کے فون کی بیل اس کے کمرے سے نکلنے سے ذرا دیر پہلے ہی بجی تھی۔ اس نے رک کر میز پر سے فون اٹھا کر دیکھا اور کال کرنے والے کا نام پڑھ کر نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبالیا۔

"میں معذرت خواہ ہوں، اب میں تمہاری کوئی کال ریسیو نہیں کر سکتا۔" اس نے زیر لب کہتے ہوئے کال ختم کی۔ بند ہونے پر فون بند کر دیا اور سم نکال کر میز کی دراز میں رکھے براؤن رنگ کے لفافے میں رکھ دی۔ بھورے کاغذ کا یہ لفافہ اپنے اندر کئی اور چیزیں بھی سمائے ہوئے تھا۔ اس کی پھولی ہوئی ظاہری حالت اس میں موجود چیزوں کا اندازہ لگانے کے لیے کافی تھی۔

کمرے سے نکلنے سے پہلے اس نے آگے بڑھ کر کمرے کی کھڑکی کو اپنے ہاتھوں سے بند کیا تھا اور اس کے پردے برابر کر دیے تھے۔

"ہیلو سر! آپ کے بتائے ڈنر مینو کے تمام لوازمات منگوا لیے گئے ہیں، لیکن یہ بھلا کس لیے؟" سیڑھیاں اتر کر نیچے آنے پر اس کا سامنا صوفی سے ہوا جو آخری لفظ ادا کرنے کے بعد سر کھجا رہی تھی۔

"بھئی اس کا انتظام کرنا تو بہت ضروری ہے۔" وہ مسکرا کر بولا تھا۔ "ڈیڈی اور ابراہیم اس کے بہانے پر تو اپنا جشن فتح منا سکیں گے۔"

"لیکن سر" صوفی نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"او کے بھئی بائے، مجھے دیر ہو رہی ہے۔ ڈیڈی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔" وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا اور رہائشی عمارت سے باہر آ گیا۔

"لیکن سر! صاحب نے سختی سے منع کیا تھا۔ آپ کو گاڑی ڈرائیو نہیں کرنے دی جائے" آپ کا ہاتھ زخمی ہے۔ آپ کو ڈاکٹر عبداللطیف کے پاس بھی رکنا ہے راستے میں۔" سجاد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"اوہو بھئی۔ ڈیڈی کی چھوڑو۔" اس نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیگ اس میں رکھتے ہوئے کہا۔ "میں ڈرائیو کر سکتا ہوں اور آفس تک کا فاصلہ ہی کتنا ہے۔" وہ ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آتے ہوئے بولا اور سجاد کی کوئی بھی مزید بات سنے بغیر گاڑی اسٹارٹ کر کے گیٹ تک لے آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آئی ایم سوری ماہ نور! مصروفیت میں تمہیں بتانا بھول گیا، سعد کو نہ صرف میں نے ڈھونڈ لیا ہے، بلکہ اب وہ اپنے گھر میں موجود محفوظ ہے۔ اس کا نمبر آن ہو چکا ہے تم اسے کال کر سکتی ہو۔"

راولپنڈی ٹرمینل پہنچنے سے صرف دس منٹ پہلے ماہ نور کو ابراہیم کا وہ جاں فزا پیغام وصول ہوا تھا۔ اس کا دل ایک انجانی خوشی کے زیر اثر بری طرح دھڑک اٹھا تھا، دھک دھک کرتے دل پر قابو پاتے ہوئے اس نے تیزی سے سعد کا نمبر ملایا تھا۔

"ہم معذرت خواہ ہیں" آپ کا مطلوبہ نمبر فی الوقت بند ہے۔" کئی ہفتوں سے جو آواز اور الفاظ وہ بارہا سن چکی تھی، ایک بار پھر اس کے کانوں سے ٹکرائے تھے، ایک عجیب سی گھبراہٹ کے عالم میں اس نے بار بار وہ نمبر ری ڈائل کیا اور جتنی بار ملایا اتنی ہی بار وہ پیغام اسے دوبارہ سننے کو ملا تھا۔

ماہ نور کی بس آہستہ رفتار سے چلتی اپنی منزل پر پہنچ کر مخصوص مقام پر رک رہی تھی۔ عین اسی وقت اسلام آباد ایئرپورٹ سے دبئی جانے والی ایک پرواز اپنے دیگر مسافروں کے ساتھ ساتھ سعد سلطان کو بھی ایک نئی منزل کی طرف لے اڑی تھی۔

باقی ان شاءاللہ آئندہ ماہ

عنیزہ سیّد

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا 'لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے 'تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے 'کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے 'کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ 'ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی ہم نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

۱۹

انیسویں قسط

شہزاد سلیم' بلال سلطان کا پرسنل سیکریٹری تھا' شہزاد کے اپنے باس سے تعلقات ویسے ہی تھے جیسے کسی باس کے اپنے ماتحت سے ہوتے ہیں۔ وہ بلال سلطان کی شخصیت کو کام کی حد تک خوب سمجھتا تھا۔ اسے بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ کون سی صورت حال باس کے موڈ پر کیسا اثر کرے گی اور صورت حال سے مراد کاروباری صورت حال تھی۔

اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ کس قسم کے کاروباری دوستوں اور پارٹنرز کے ساتھ باس کا رویہ کیسا ہو سکتا ہے۔ بلال سلطان کاروبار کے معاملے میں ٹھنڈے دل و دماغ کا آدمی تھا اور شہزاد کا خیال تھا کہ یہی خوبی اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز تھا۔ بڑے سے بڑے نقصان اور بڑے سے بڑے نفع کی خبر سنتے ہوئے بھی بلال کے ردعمل ایک سے ہوتے تھے۔ نقصان کی خبر سن کر بھی وہ سر ہلاتے ہوئے کہتا۔

"Now we have to see how to reverse it"

(اب ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس صورت حال کو ہم فائدے کی طرف کیسے موڑ سکتے ہیں)

اور بڑے سے بڑے فائدے کی خبر سن کر بھی وہ سر ہلاتے ہوئے کہتا۔

"Now we have to see how to double it"

(اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم اسے دگنا کیسے کر سکتے ہیں)

شہزاد نے کبھی بھی بلال کو کسی بڑے فائدے کے دوران ترنگ میں آکر بڑی بڑی باتیں کرتے اور نقصان کے دوران ڈپریشن کے دورے پڑتے نہیں دیکھا تھا۔ اسے اپنے باس کا یہ انداز بہت پسند تھا اور وہ کوشش کرتا کہ وہ اپنے مزاج کو بھی اسی مزاج میں ڈھال لے اور بلال کی شخصیت کی تقلید کرے۔

اتنے برسوں میں صرف ان دنوں اس نے باس کو آپے میں نہ رہتے ہوئے پایا تھا جب "سعد سلطان" اچانک منظر سے غائب ہوگیا۔ اس صورت حال میں بھی شاید ایک دو دن اس نے انتظار میں گزارے۔ تیسرے دن وہ کسی نامعلوم اغوا کار کی فون کال کا انتظار کرتا رہا جو اس سے تاوان میں بڑی رقم مانگنے والا تھا۔ چوتھے دن تشویش اس کے چہرے سے ظاہر ہونا شروع ہوئی اور پھر ہر گزرتے دن کے ساتھ شہزاد باس کا ایک نیا روپ دیکھتا رہا۔ باس کے "ہوگ" حرکت میں آنا شروع ہوئے اور پھر جیسے کنوؤں میں بانس ڈالنے کا عمل شروع ہوگیا۔ پل پل کی رپورٹیں مختلف کونوں سے آنے لگیں' تمام بزنس میٹنگز کینسل ہوئیں' کاروبار کا پہیہ ایک دم رک سا گیا۔

ان دنوں پہلی بار شہزاد کو محسوس ہوا کہ بلال سلطان ایک میکانگی روبوٹ نہیں' گوشت پوست کا ایک ایسا انسان ہے جس کے سینے میں دل بھی ہے اور وہ دل دنیا میں موجود اتنے سارے لوگوں میں سے صرف ایک شخص کے لیے دھڑکتا ہے۔ شہزاد کو بلال کا یہ روپ دیکھ کر اچنبھا بھی ہوا' خوشی بھی ہوئی اور شاید ہلکی سی مایوسی بھی۔ میکانگی کھلونے سے کون توقع کر سکتا ہے کہ وہ انسانوں جیسے جذبات کا اظہار کرنے لگیں گے' لیکن باس کی یہ صورت حال زیادہ دن نہیں چلی' سعد سلطان کی گاڑی وصول کرنے کے بعد وہ یوں سکون پذیر ہوا جیسے کبھی اس کے لیے پریشان ہوا ہی نہیں تھا۔

"کمال ہے یار! گاڑی ہی ملی ہے' سعد سلطان تو نہیں ملا۔ باس اس پر ہی مطمئن ہوگیا' بھلے سعد سلطان کو کسی نے قتل کرکے پھینک دیا ہو اور گاڑی وہاں کھڑی کرکے چلا گیا ہو۔" شہزاد بھی اس طرح کی چہ میگوئیاں کرنے والوں میں شامل نہیں ہو سکتا تھا' بلال سلطان کا پرسنل سیکریٹری تھا اور مرکزی دفتر میں بیٹھا روبوٹ' انسانی چولا اتار کر تہہ کرنے کے بعد اسے واپس رکھ چکا تھا۔

"اب وہ صرف اور صرف بزنس کرے گا۔" کی سختی اس کے چہرے پر موجود سنجیدگی کے پیچھے چھپی نظر آرہی تھی۔

شہزاد وہ "ہوسپ ٹیبل" چھوڑ کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔

لیکن وہ ایک مختلف دن تھا۔ اس روز باس کی آفس آمد کے بعد خوش گوار حیرتوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ باس نے آفس آتے ہی شہزاد کو اپنے پاس بلا کر اس دفتر میں موجود تمام عملہ کی اگلی تنخواہوں کے ساتھ ایک صحت مند اضافی رقم بونس کے طور پر لگا کر بھجوانے کی ہدایت کی تھی۔ دفتر عرب ریاستوں کے کاروباری اداروں کے ساتھ تعلق کی وجہ سے اتوار کو تعطیل کے لیے بند ہو سکتا تھا نہ ہی یورپی ممالک میں کاروباری تعلق ہونے کی وجہ سے جمعہ کو بند رکھا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس مرکزی دفتر میں مرکزی کام ہوتا تھا' یہاں کا عملہ محدود' لیکن سب کا سب اعلا تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ افراد پر مشتمل تھا جس کے ہر رکن کی تنخواہ لاکھوں میں جاتی تھی۔

بے وقت' غیر متوقع بونس عملے کے ہر رکن کا کتنے کلو خون بڑھانے والا تھا' شہزاد کو بخوبی اندازہ تھا' اسی لیے وہ جلد سے جلد اسٹاف کو یہ خبر سنانے کے لیے بے چین تھا۔ دوپہر بارہ بجے تک وہ مسلسل باس کے ساتھ مصروف رہا اور اس دوران اس نے محسوس کیا کہ باس نے پہلو بدلتے ہوئے دو سے تین بار آفس میں لگے وال کلاک' اپنے فون کی اسکرین آن کرکے اور اپنی کلائی پر بندھی بیش قیمت رسٹ واچ پر نظر دوڑائی تھی۔ یقیناً "وہ وقت کے کسی حصے کے معاملے میں بے چین تھے۔

"شہزاد! کافی منگوالو' کچھ دیر میں ہی سعد یہاں پہنچتا ہے۔" ایک فائل پر سنجیدہ گفتگو کرتے کرتے انہوں نے اچانک رک کر کہا تھا۔

"س۔۔۔ سعد!" شہزاد نے ٹھٹک کر پوچھا تھا۔ "مطلب سعد سلطان؟"

"ہاں!" انہوں نے سر ہلایا اور پھر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیوں کوئی اور سعد بھی ہے کیا ہمارے یہاں کے اسٹاف میں؟"

"ن۔۔۔ نہیں سر!" شہزاد نے اپنی ہکلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "دراصل سعد صاحب کافی دنوں سے آ نہیں رہے تھے نا۔"

"ہاں' نہیں آرہا تھا۔" وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولے پھر ان کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ بکھری۔ "لیکن آج سے اس کی وہ ہی پرانی والی روٹین شروع ہو جائے گی۔" انہوں نے شہزاد کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اوہ اچھا!" شہزاد اپنی بوکھلاہٹ پر قابو ہی نہیں پا رہا تھا۔ "میں ابھی کافی کا کہہ کر آتا ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ انٹرکام پر کافی کا کہنے کے بجائے خود دفتر سے اٹھ کر باہر آنے کا مقصد صرف اور صرف اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پانا تھا۔

شہزاد کی منگوائی کافی آئی' تو مین این کی قیمتی طشتری میں رکھے سفید کافی کپس میں موجود بلیک کافی کی خوشبو اپنی طرف کھینچتی تھی اور اس کی بھاپ اپنے ساتھ اس کی خوشبو بھی سارے میں بکھیرتی تھی' لیکن پھر شہزاد نے دیکھا اس کے اپنے کپ کے علاوہ دوسرے دونوں کپ یونہی بھرے بھرے پڑے ٹھنڈے ہونے لگے' بھاپ معدوم ہوئی اور پھر اٹھنا بند ہوگئی' کپ کی اوپری سطح پر تیرتے کافی آرٹ کے شاہکاروں کی ہیئت بگڑتی اور پھیلتی چلی گئی اور اس سارے عمل کے دوران باس کے چہرے پر موجود تاثرات نے بھی کئی رنگ بدلے۔

سعد سلطان کو دن کے گیارہ بجے تک آفس پہنچنا تھا۔ گیارہ سے بارہ بجے تک باس گاہے بگاہے وقت پر نظر ڈالتا رہا اور اس کے بعد ہی کافی کی رنگت' خوشبو' بھاپ' باس کی کیفیات کی طرح بدلنے لگے تھے۔

ایک کے بعد ایک فون کال' باس کے چہرے کی تشویش اور زاویے بڑھاتی اور بدلتی چلی گئی۔ سعد سلطان کو گھر سے ڈرائیور کے ساتھ نکلنا تھا' وہ ڈرائیور کو گھر پر بیٹھا چھوڑ کر اکیلے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے گھر سے نکلا تھا۔ اس کو آفس کے راستے میں سرجن ڈاکٹر عبداللطیف کے کلینک پر رکنا تھا' جہاں اس کے لیے خصوصی اپائنٹمنٹ لی

گئی تھی' وہ وہاں مقررہ وقت پر نہیں پہنچا تھا۔ اس کی وہ گاڑی جس پر وہ گھر سے نکلا تھا' کمپنی کے ایک نسبتا" چھوٹے ذیلی دفتر کے باہر کھڑی تھی' دفتر کے باہر کھڑے گارڈ نے سعد سلطان کو وہاں گاڑی لاتے نہیں دیکھا تھا۔ گاڑی سے نکلنے کے بعد سعد سلطان ایک بار پھر غائب تھا۔ شام تک ہر ممکنہ جگہ پر تلاش کرلینے کے بعد بھی اس کا کوئی سراغ نہیں مل پایا تھا۔

"بونس کی نیوز تو بریک ہونے سے پہلے ہی واپس لے لی گئی شاید۔"

اس رات بلال سلطان کی ذہنی کیفیت سے بے خبر شہزاد نے سونے سے پہلے آخری بات سوچی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہاں۔ بدقسمتی سے وہ ایک بار پھر غائب ہوگیا۔"

ماہ نور کو یہ بات بتاتے ہوئے ابراہیم کا لہجہ اور انداز ایک ایسے مجرم کا سا تھا جو اعتراف کررہا ہو کہ سارا جرم صرف اسی کا تھا۔

"کمال ہے۔" ماہ نور کے تیور بگڑ گئے۔ "پانچ دس منٹ میں ہی وہ پھر سے غائب ہوگیا جیسے ہی تم نے بتایا کہ وہ مل گیا ہے اور اس کا فون آن ہے' میں نے اسے کال کرنے کے لیے اس کا نمبر ملایا' اس وقت بھی اس کا فون بند جارہا تھا۔ کیا یہ عجیب سی بات نہیں؟ کیا اس کی گم شدگی کے بعد اس کے مل جانے کا وقفہ اس کی دوبارہ گم شدگی سے پہلے صرف تمہارا خواب تو نہیں۔"

"اب تو مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔" ابراہیم نے سر جھکا کر کہا۔ "جیسے وہ خواب ہی تھا' مگر۔" اس نے سر اٹھا کر ماہ نور کی طرف دیکھا۔ "مگر وہ خواب نہیں تھا' یقین جانو' میں نے خود تین گھنٹے تک اس کے ساتھ مغز ماری کی تب جاکر وہ میرے ساتھ اپنے گھر آنے پر رضامند ہوا۔ میں نے اس سے غلط بیانیاں کیں اور یقین دہانیاں بھی اور میں بڑا خوش تھا کہ سعد جیسے چھلاوے کو شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہوگیا' گھر پہنچنے کے بعد وہ مجھ پر گرم ہوا' ناراض ہوگیا' آئندہ کبھی بات نہ کرنے کی دھمکی بھی دی' لیکن میں پھولے نہیں سما رہا تھا۔ میں اسے پکڑنے میں اور انکل کے سامنے لانے میں کامیاب ہوچکا تھا' میں اس کی گم شدگی کے دوران انکل کی حالت دیکھ چکا تھا اور اسے ڈھونڈ لینے کے بعد خود اس کی اپنی حالت بھی میری نظروں کے سامنے تھی۔ وہ صدیوں کا تھکا ہارا' شکست خوردہ اور پریشان حال نظر آرہا تھا۔ اس کا ہاتھ زخمی تھا' لباس شکنوں سے بھرپور جس پر گرد کے آثار بھی تھے۔ اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں جیسے نہ جانے کب سے سویا نہ ہو۔"

ابراہیم نے کچھ یاد کرتے ہوئے سر جھٹکا اور پھر ماہ نور کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں اسی بات میں خوش تھا کہ میں جھوٹ بول کر' غلط بیانی کرکے ہی سہی' باپ بیٹے کو ایک دوسرے سے ملا چکا تھا' وہ مجھے گالیاں دے رہا تھا اور میں ہنس رہا تھا پھر وہ نارمل ہوگیا' انکل سے باتیں بھی کرنے لگا۔ اس کے بعد میں وہاں سے آگیا۔ اگلے روز جب میں نے تمہیں میسج کیا' اس روز اسے آفس جانا تھا' ڈاکٹر کے پاس جانا تھا' مگر وہ دونوں جگہ ہی نہیں پہنچا۔"

ابراہیم نے رک کر لمبا سانس لیا۔

ماہ نور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس سے آگے سننے کی منتظر تھی۔

"وہ شاید چند سیکنڈز میں حساب لگا چکا تھا کہ اسے آئندہ کیا کرنا تھا' انکل اس کی آمد پر خوش تھے' اتنے خوش کہ فوری طور پر اس کی نقل و حرکت کو آبزرو کرنے کی ڈیوٹیاں لگانے کا ان کو خیال بھی نہیں آیا ہوگا' لیکن وہ جانتا تھا اور خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ اگلی صبح تک وہ اپنا پلان مکمل کرچکا تھا۔ اس نے انکل کے ساتھ نارمل انداز میں

باتیں کیا' ان سے گپ شپ لگاتا رہا' ہنسی مذاق کرتا رہا یوں کہ ان کو اس کے انداز میں ذرا سا بھی کچھ انوکھا نہ لگا نہ ہی کوئی کھٹکا محسوس ہوا۔"

"لیکن پھر وہ گیا کہاں؟" ماہ نور کو اس تفصیل سے زیادہ اس سے آگے سننے میں دلچسپی تھی۔ وہ بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

"ابھی تک پتا نہیں چل سکا۔" ابراہیم نے مایوسی بھرے انداز میں کہا۔

"پہلے تمہیں وہ کہاں ملا تھا؟" ماہ نور نے پوچھا۔

"وہ۔" ابراہیم کچھ کہتے کہتے رکا اور ماہ نور پر ایک نظر ڈال کر نظر چراتے ہوئے بولا۔

"ایک ایسی جگہ جہاں کے بارے میں میرا اپنا خیال تھا کہ وہ وہاں ہو ہی نہیں سکتا تھا۔"

"وہ کون سی جگہ ہے؟" ماہ نور نے بے چینی سے پوچھا۔

"وہ ایک معذور لڑکی ہے اور اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر خاتون رہتی ہیں' مری سے ذرا سا آگے۔" ابراہیم یوں بولا جیسے اسے سعد کے اس فعل پر شرمندگی محسوس ہورہی ہو۔

"میں نہیں جانتا کہ اس لڑکی سے سعد کا کیا تعلق ہے۔" "میں بس اتنا جانتا تھا کہ وہ وہاں جایا کرتا تھا' ہر طرف سے مایوس ہوکر محض ایک بار دیکھ لینے کی خاطر وہاں گیا تھا اور۔"

"اور وہ وہیں موجود تھا۔" ماہ نور نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا' ابراہیم کو لگا جیسے ماہ نور ایک دم ٹرانس کی کیفیت میں چلی گئی تھی۔

"تم یوں ہی خوار ہوئے' تمہیں سب سے پہلے اسی جگہ جاکر اس کا پتا کرنا چاہیے تھا۔" وہ یوں بولی جیسے کسی ناموجود شخص سے مخاطب ہو۔

"اور ابھی بھی۔" اس نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔ "ابھی بھی تمہیں وہیں جاکر اس کا پتا کرنا چاہیے۔"

"نہیں۔" ابراہیم نے ماہ نور کی کیفیت دیکھ کر سکتے میں آتے ہوئے کہا۔ "وہ وہاں نہیں ہے' ہی ہیز لیفٹ دی کنٹری' وہ ملک چھوڑ چکا ہے۔"

"پھر وہ بھی ساتھ ہی ہوگی اس کے۔" ماہ نور نے یقین سے کہا۔ "اسی کی خاطر ملک چھوڑا ہوگا اس نے۔"

"نہیں۔" ابراہیم ابھی بھی ماہ نور کے اس بدلے ہوئے انداز پر بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا' اس نے سہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ لڑکی اور خاتون یہیں ہیں اور اس کے بارے میں بے خبر ہیں۔" اس نے ماہ نور کو تسلی دینے کے سے انداز میں کہا۔

جواب میں ماہ نور نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا' آنسو بہنے سے روکنے کی کوشش میں اس کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ اس کے ہونٹ اس کوشش میں کپکپا رہے تھے اور ذہن میں کئی قسم کے خیال اٹھ رہے تھے۔ وہ دونوں اس وقت ابراہیم کے ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے' اوائل سرما کی وہ سہ پہر خاموش اور اداس تھی۔ اس نے شیشے کی دیوار کے پار سڑک پر بھاگتی دوڑتی گاڑیوں کو دیکھا' یہ اس شخص کا شہر تھا جس کے لیے وہ اپنا شہر چھوڑ آئی تھی' مگر سیکڑوں' ہزاروں کے اس ہجوم میں وہ خود کہیں بھی نہیں تھا' اس کی آنکھوں سے چند آنسو لڑھکے اور اس کی گود میں جاگرے۔ وہ اپنے دل میں اسے ہر صورت کہیں ڈھونڈ نکالنے کا عزم کرکے آئی تھی' مگر وہ تو کہیں بھی نہیں تھا' جس کی خاطر اس نے اپنا شہر چھوڑا' وہ ملک ہی چھوڑ گیا تھا۔

"ایک معذور لڑکی ہے اور اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر خاتون رہتی ہیں' مری سے ذرا آگے۔" رہ رہ کر اس کے کانوں میں ابراہیم کا یہ جملہ گونج رہا تھا۔

"اور یہ تو ایک بالکل متوقع سی بات ہے' پھر میں اتنی حیران کیوں ہورہی ہوں۔ اسے وہیں ملنا چاہیے تھا' بالکل

وہیں ملنا چاہیے تھا۔" اس نے سر جھٹکتے ہوئے جیسے خود کو یقین دلایا۔

"کبھی تمہیں یہ خیال بھی آیا ابراہیم کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے' وہ کیوں سب سے بھاگ اور چھپ رہا ہے۔" کچھ دیر بعد ماہ نور نے ابراہیم کی طرف دیکھے بغیر سوال کیا اور اسے محسوس ہوا کہ اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

"جتنا میں اس کو جانتا ہوں' اس کے حساب سے تو یقیناً" اس کے پیچھے کوئی خاص وجہ ہے' لیکن جو بھی وجہ ہے' اس سے اس معذور لڑکی سارہ کا کوئی تعلق نہیں ہے' یقین کرو۔" ابراہیم نے اپنے تئیں ماہ نور کو تسلی دینے کی غرض سے کہا۔

"ہوں!" ماہ نور کے چہرے پر بے بس سی مسکراہٹ ابھری۔ "یہ تم کہہ رہے ہو نا جبکہ میں جانتی ہوں کہ اس لڑکی کا اس کی زندگی میں کیا مقام ہے۔" ابراہیم نے اس کی بات سن کر سر جھکا لیا۔

"جو بھی ہے۔" وہ ٹیبل پر رکھے چھری کانٹوں سے کھیلتے ہوئے بولا۔ "جلد ہی پتا چل جائے گا' وہ کہاں ہے اور ایسا کیوں کر رہا ہے۔ تم جانتی ہو ماہ نور۔" پھر اس نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ "سعد کے فادر انکل بلال ویل کمپوزڈ (well composed) انسان ہیں۔ پچھلی بار سعد کے غائب ہو جانے پر وہ گھبرا گئے تھے' لیکن اس بار اگر وہ گھبرائے ہوئے بھی ہیں تو ظاہر نہیں ہونے دے رہے۔ وہ یقیناً" اس کے اس رویے کی وجہ جانتے ہیں کیونکہ اس بار اس کی تلاش کا ان کا اپنا انداز ہے' وہ مجھے بھی اس میں انوالو نہیں کر رہے' میں جو کوشش کر رہا ہوں' اسے تم اپنی سی کوشش کہہ سکتی ہو۔"

ماہ نور ابراہیم کی بات سن کر جواب دینے کے بجائے خاموشی سے شیشے کے باہر سڑک پر نظر آنے والے لوگوں اور گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ اوائل سرما کے وہ دن چھوٹے ہو چکے تھے' دیکھتے ہی دیکھتے تاریکی پھیلنے لگی تھی اور برقی قمقمے جا بجا روشن ہو رہے تھے۔

"وہ ایسی ہی ایک شام تھی جب تم نے مجھے چیٹو باکس میں ڈنر پر انوائٹ کیا تھا۔" اس نے روشنی کی اس لکیر پر نظریں جماتے ہوئے یاد کیا جو لیمپ پوسٹ سے اتر کر سڑک پر بچھ گئی تھی۔

"اور یہ وہ جگہ ہے جہاں تم نے کہا تھا کہ اگر تم کسی بات کے بارے میں شیور نہیں ہوتے تو اس کی طرف جاتے ہی نہیں اور یہ بھی کہ اگر تم مجھے ایک اچھی دوست مان لینے کے بارے میں پر یقین نہ ہوتے تو کبھی اپنے مسئلے مجھ سے شیئر نہ کرتے۔" نجانے اسے کیوں ایسا لگا جیسے بلیک ڈریس پینٹ اور اسکائی بلو ڈریس شرٹ میں ملبوس سعد وہیں سامنے کھڑا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"التباس۔" اس نے ہونٹ دانتوں تلے دبا کر اپنی سسکی روکی۔ "مجھے التباس کیوں نظر آتے ہیں جبکہ مجھے معلوم بھی ہے کہ تم میری رسائی سے بہت دور ہو۔"

"آج تم بہت مختلف لگ رہی ہو' جتنی بار میں نے تم کو دیکھا ہے ان سے بہت مختلف' بہت اچھی' خاصی sane لگ رہی ہو آج تو۔" اس کے کانوں میں سرگوشی کی طرح آواز گونجی۔

"جھوٹ۔" اس نے پہلے کی طرح سر ہلایا۔

"میرے دل میں جو بات ہوتی ہے میں کہہ دیتا ہوں' میں نے تم سے کہا تھا' میری یہ عادت نوٹ کر کے رکھ لو۔" پھر وہی سرگوشی جیسی آواز۔

"میری نوٹ بک کے تمام صفحے بھر گئے تمہاری عادتیں نوٹ کرتے کرتے' لیکن تم ابھی بھی التباس ہی ہو' یوں کہ ہاتھ بڑھانے پر بھی ہاتھ نہ آؤ۔" وہ پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"اوکے ماہ نور' سی یو سم ادر ٹائم See you some other time" ابراہیم نے پارکنگ میں کھڑی اس کی گاڑی کے قریب پہنچ کر کہا۔

"ہوں!" اس نے بے دھیانی میں سر ہلایا اور گاڑی کا لاک کھولنے لگی۔ لاک اور دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے سے پہلے وہ ایک خیال آنے پر مڑی اور ابراہیم سے مخاطب ہوئی۔

"ابراہیم! کیا کسی وقت میں سعد کے والد سے مل سکتی ہوں؟" اسے محسوس ہوا' اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

"دیکھو۔" ابراہیم نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "میں فوری طور پر یقین سے ہاں نہیں کہہ سکتا' میں کوشش کروں گا کہ ان سے تمہاری ملاقات کرا سکوں۔"

"ہاں پلیز۔ کوشش کرنا اور اگر ایسا ممکن ہوا تو فوراً" مجھے انفارم کرنا' میں فی الحال ادھر ہی ہوں اسلام آباد میں۔" اس نے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد کہا اور ابراہیم کو خدا حافظ کہتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"میں تو کپ آف ہیملاک سے ہی چونک گئی تھی۔" ضوفی نے اپنی جینز سے نادیدہ گرد جھاڑنے کے بعد ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے کہا۔

"کپ آف ہیملاک جانتے ہو کیا مطلب؟" اس نے دانش مندوں کی طرح رازی کی طرف دیکھا جو صوفے پر پھیل کر بیٹھا منہ پر ہاتھ رکھے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"مجھے بھی پتا نہیں تھا۔" رازی کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر ضوفی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اور جب مجھے پتا نہیں تھا تو تمہیں تو خیر کیا علم ہو گا۔" اس کے لہجے میں اپنی معلومات کے بارے میں یقین اور تفاخر آیا۔

"میں نے گوگل پر سرچ کیا تو معلوم ہوا' ایک قسم کا زہر کہلاتا ہے ہیملاک۔" اس نے رازی کی طرف دیکھ کر سرگوشی سی کی۔

"کیا کہا؟" اب کے رازی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "یعنی کہ زہر۔"

"یعنی کہ زہر۔" ضوفی نے رازی کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر اس کی بات کی تائید کی۔

"اور وہ سعد سلطان' زہر کو ڈنر مینو میں شامل کرا رہا تھا۔" رازی کے چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا۔ "اور ڈنر سرو کرنے سے پہلے تم یا میں اسے چکھتے اور کوچ کر جاتے۔ اسے فٹ ٹو ایٹ کا سرٹیفکیٹ دیتے دیتے۔ اوہ خدایا!" وہ جیسے کسی انجانے خطرے کی زد سے باہر نکل آنے پر شکر کرتے ہوئے بولا۔ "شکر ہماری جانیں بچ گئیں۔"

"اور اگر ہم حسب معمول ڈنڈی مارتے ہوئے اسے چکھے بغیر فٹ ٹو ایٹ کا سرٹیفکیٹ دے دیتے تو بلال سلطان اور ابراہیم دونوں کا قتل ہماری گردنوں پر آجاتا۔" اگلے لمحے دوسری سوچ پر خیال آرائی کرتے کرتے اس کی آواز گھٹ سی گئی۔

"احمق ہو تم تو۔" ضوفی نے اسے ڈپٹا۔ "تمہارا کیا خیال ہے کپ آف ہیملاک یوں مارکیٹ میں کھلے عام ملتا ہو گا کہ طلب کرنے پر فوراً" سیلڈ پیکنگ میں دستیاب ہو جائے گا۔"

"تو پھر؟" رازی نے ڈپٹے جانے پر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"یہ صرف ایک metaphorical phrase تھی محترم۔" ضوفی نے ایک بار پھر دانش مندوں والا انداز اپنایا۔ "جس کا مقصد یہ اشارہ دینا تھا کہ سعد سلطان' باس اور ابراہیم کو ختم کرنا چاہتا تھا' اب ختم کرنے سے مطلب ان کی وہ خوشی ختم کرنا تھی جو اس کی گمشدگی کے بعد مل جانے پر پیدا ہوئی تھی یا کچھ اور' اس کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"لیکن کچھ مرنے مارنے کا سلسلہ تو تھا نا یار۔" رازی خوف زدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "بہت ہی پیچیدہ اور پر اسرار

ہوتے جا رہے ہیں۔ اس فیملی کے معاملات بھئی۔"

"فیملی!" ضوفی ہنسی۔ "ایک باپ اور ایک بیٹا۔ اسے فیملی کہتے ہو تم؟"

"باپ بیٹا ہی سہی، پوری ایمپائر بنا رکھی ہے دونوں نے بزنس میں اور یہ گھر۔" رازی نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اسٹیٹ ود ان اسٹیٹ، لیکن حالات دیکھو، بیٹا باپ سے دور بھاگتا ہے اور باپ بھاگے ہوئے بیٹے کو پکڑنے کے لیے اپنے بندوں کو بھگاتا ہے۔ یہ بھی اپنی طرز کی انوکھی میراتھن ہے۔ ان کی میراتھن میں ہم بے چاروں کی مفت میں سانس پھول پڑتی ہے۔ کل سے اب تک مواصلاتی رابطوں پر لگا ہوا ہوں۔ پل کا چین نہیں۔" رازی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"پھر کچھ کامیابی بھی ہوئی کہ نہیں۔" ضوفی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکتے ہوئے پوچھا۔

"بس اتنی ہی کہ وہ اس دن گیارہ بجے کسی ایک فلائٹ سے دبئی اڑ گیا۔ دبئی میں کہاں ہے، فی الحال پتا نہیں۔" رازی نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ اور تیز قدموں سے چلتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

"یقیناً" سعد سلطان... کو دماغی دورے پڑنے لگے ہیں۔ جب ہی گھر سے بھاگتا ہے۔" ضوفی نے رازی کو جاتے ہوئے دیکھ کر سوچا۔ "بڑے لوگوں کے دماغی دورے بھی خوب ہوتے ہیں۔ گھر سے بھاگ کر دوسرے ملکوں میں پہنچا دیتے ہیں۔" وہ مسکرائی۔

"تو بھئی۔ اس دن کا ڈنر جب سے سیوتاژ ہوا ہے۔ ڈنر لنچ کا جھنجٹ ہی ختم ہوا۔ کچن اسٹاف اور باقی عملے کا کیا ہے۔ آلو انڈے، آلو بینگن اور ایک سادہ سا چکن بنوا لو۔ گزارہ ہو جائے گا۔ باس تو گیا اپنی ملٹی وٹامن گولیوں پر واپس۔ کھانا وانا فی الحال موقوف، باس کو چاہیے بیٹے کی واپسی تک "مرن بھرت" کا اعلان کر دے۔ خوب نام کما جائے گا۔" وہ خود کلامی کرتی اٹھی اور کچن کی طرف چل دی۔

☼ ☼ ☼

"میرا دل ایک نکے (چھوٹے) جتنے کٹورے کی طرح ہو گیا ہے۔ بھائی رضوان الحق! بات بات پر بھر آتا ہے۔ کٹورا بھر جاتا ہے تو دو گن (بہنے) لگتا ہے۔ میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اب ہو گیا ہوں۔ میرا کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ چاہتا ہوں سارا دن ہتھ تے ہتھ (ہاتھ پر ہاتھ) رکھ کے بیٹھا رہواں۔ اکھاں سامنے (نظروں کے سامنے) کج (کچھ) بھی نہ ہووے پر میں تکدا رہواں (دیکھتا رہوں۔)"

رضوان الحق منہ پر ہاتھ رکھے خاموش بیٹھا کھاری کی باتیں سن رہا تھا اور اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا، وہ جس کھاری کو جانتا تھا، یہ وہ کھاری نہیں تھا۔ کھاری کی معصوم باتیں جن میں بعض اوقات وہ انجانے میں ہی بہت گہری بات کر جایا کرتا تھا۔ اس کا بات بات پر ہنس دینا۔ اس کی بے نیازی، سب یکدم کہیں غائب ہو چکی تھی۔ یہ کھاری جو اس کے سامنے تھا بہت الجھا ہوا، تھکا ہوا، شکست خوردہ اور غم زدہ تھا۔ یوں جیسے اس کے ساتھ کوئی بڑا حادثہ گزر چکا ہو۔

اپنی شادی سے اگلے دن تو یہ بہت خوش تھا۔ پھر اب اسے کیا ہوا۔" اس نے سوچا۔ اس کی کال میں کوئی ایسی ہی بات محسوس ہوئی تھی۔ جیسے یہ بہت مشکل میں ہے۔ جب ہی تو میں فوراً" اس کی طرف بھاگا آیا۔ مگر جو یہ دیکھ رہا ہوں" اس کا اندازہ تو نہیں تھا مجھے۔

"تمہاری بیوی کہاں ہے افتخار؟" اس نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

"وہ اپنے رستے سیدھے کرنے گئی ہے۔ ساڈے جئے (ہمارے جیسے) لوکاں (لوگوں) کے ساتھ بھی عجیب ہی ہوئی گزرتی ہے بھائی رضوان الحق! پہلے ہمیں انگلی سے پکڑ کر ایک راستے پر چلایا جاتا ہے۔ چلتے جاتے ہیں پہلے جاتے ہیں، کوئی موڑ آتا ہے تو آسے پاسے (ادھر ادھر) دیکھتے ہیں۔ راستے پر چلانے والا کدھر گیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ تو غائب ہے۔ اب کیا کریں۔" اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر سوچنے کی طرف اشارہ کیا۔ "جب کتنا ہی آسے پاسے کوئی نہیں ملتا تو خود ہی موڑ مڑ جاتے ہیں۔ پتا ہوتا نہیں کہ کھبے (بائیں) مڑنا ہے کہ سجے (دائیں) موڑ مڑ کر۔۔۔ جب کتنا ہی آگے پہنچ جاتے ہیں تو رستے پر چلانے والے کہیں سے نکل آتے ہیں اور کہتے ہیں۔ او ہو ہو، یہ کدھر نکل آئے تم۔ یہ تو تمہارا راستہ نہیں تھا۔ چلو واپس، پھر سے شروع کرو۔" کھاری کے چہرے پر دکھ پھیل رہا تھا۔

"تسی دسو۔" بھائی رضوان الحق، پھر سے شروع کرنا آسان کام ہے کیا۔ جو راستے تسی لنگ آئے (جو عبور کر چکے ہو۔) ان پر سے گزر کر واپس شروع ہو جانا سوکھا (آسان) کام ہے کیا؟" اس نے رضوان الحق کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

رضوان الحق نے جھرجھری لیتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"کتنا اوکھا کام ہے جی یہ۔" کھاری نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"سعدیہ آج کل یہ ہی اوکھا کام کر رہی ہے۔ پھر سے اسٹارٹ (اسٹارٹ) اپنے راستے سیدھے کرنے پر لگی ہوئی ہے جی۔"

"چلو، یہ تو اچھی بات ہے۔ اسے رہنمائی ملنے لگی ہے۔ تمہیں خوش ہونا چاہیے۔" اگرچہ رضوان کو کھاری کی اس مہمل سی بات کی پوری طرح سمجھ نہیں آئی تھی۔ پھر بھی وہ اسے تسلی دینے کی خاطر بولا۔

"اس کی اچھی بات میں کھاری تو مفتے میں مارا گیا نا جی!" کھاری نے سر جھکا۔

"نہ میں نہیں رہنا اس دا (اس کا) بندہ (شوہر)" ایک اور مہمل بات۔

"کیوں... خیر تو ہے نا؟" رضوان گھبرا کر بولا۔ "کیا وہ تمہیں چھوڑ گئی ہے؟"

"نہیں۔" کھاری نے سر ہلایا۔ "ابھی تے نہیں چھوڑا پر لگتا ہے چھوڑ جائے گی۔ میں کل بھی اس کے قابل نہیں تھا۔ آج تو ہور بھی ناقابل ہو گیا ہوں گا۔ وہ بھل بھلیکھے (انجانے میں) میرے بنے نال آ لگی تھی۔ اب جب اسے اپنا راستہ سیدھا نظر آیا تو میرا سینہ اور اینٹ گارے کی دیوار ایک برابر ہو جائے گی۔ آپ ہی بتاؤ بھلا اینٹ روڑے کی دیوار کے ساتھ لگ کر کوئی کب تک کھڑا رہ سکتا ہے۔" کھاری نے سوال کیا۔

"جنہیں تحفظ اور سایہ درکار ہوتا ہے۔ ان کو بعض اوقات دیوار بھی کافی ہوتی ہے سہارا لینے کے لیے میرے بھائی۔" رضوان نے کہا۔

"نہیں بھائی رضوان الحق!" کھاری نے سر ہلایا۔ "یہ بس کہنے کی باتیں ہیں۔"

"دیکھو، جب تک تم مجھے تفصیل سے سیدھی اور مکمل بات نہیں بتاؤ گے۔ مجھے شاید سمجھ نہ آئے کہ تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہوا ہے؟" رضوان نے کہا۔

"میری بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ مسئلہ ہوا کیا ہے، پر مسئلہ ہے ضرور۔" کھاری نے فلسفیوں کے سے انداز میں سر ہلا کر کہا۔ "اصل میں بھائی رضوان الحق۔ کنفیوژن بڑا ہے۔" اس نے رضوان کی طرف دیکھا۔ "میں پہلے سمجھتا تھا کلا (اکیلا) میں ہی کنفیوژ ہوں۔ پر اب لگتا ہے، ہر بندہ ہی کنفیوژ ہے۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ "آپ کو سعد باؤ صاب یاد ہے؟" اس نے رضوان سے پوچھا۔

"وہ جو تمہاری شادی پر آئے تھے اور جن کی آواز بہت اچھی تھی۔" رضوان نے کہا۔

"ہاں وہی۔" کھاری نے سر ہلایا۔ "کتنے اچے (بڑے) بندے ہیں وہ۔ پیسہ بھی ہے۔ عزت، نام سب کچھ، مجھے لگتا تھا اچے (اونچے) ہی نہیں سچے (صاف) بندے بھی ہیں وہ۔ نہ غم، نہ کوئی فکر، نہ فاقہ، پرنا۔" اس نے ایک دفعہ پھر سر ہلایا۔ "میں نے کہا نا ہر بندہ ہی کنفیوژ ہے۔ نوربا جی نے بھین جی نوں دسیا کہ سعد صاب کی والدہ کدھرے

گواچ (گم) گئی ہیں۔ وہ ہر طرف اپنی ماں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔" اس نے رک کر اپنی بات پر رضوان کے چہرے کے تاثرات جانچنے کی کوشش کی۔

"پر کنفیوژن اتنا زیادہ ہے کہ شادی کے دنوں میں کتنی بار بھین جی کو انہوں نے دیکھا اور سمجھ نہ سکے کہ کس کے سامنے کھڑا ہوں۔ میں جو جنگلوں بیابانوں میں، میلوں ٹھیلوں میں، بازاروں میں، پہاڑوں میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔ جہاں ملنے کی آس ہوتی ہے وہاں پوچھتا پھرتا ہوں۔ میری منزل تو میرے سامنے کھڑی ہے۔ بس ایک قدم آگے بڑھاؤں تو سراغ تو سامنے ہے۔ پر ستیاناس جائے اس کنفیوژن کا۔ عقل کا پردہ اپنی جگہ سے ادھی انچی (آدھا انچ) بھی نہ ہٹا۔ ادھر بھین جی تڑپتی رہ گئی۔ ادھر سعد باؤ صاحب گڈی کا اسٹیرنگ (اسٹیئرنگ) سنبھال کر یہ جا وہ جا۔"

"کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو بھائی افتخار؟" اب کے رضوان الحق کو لگا جیسے کھاری کے دماغ میں کچھ خرابی ہو گئی تھی جو وہ الٹی سیدھی باتیں کرتا چلا جا رہا تھا۔

"او ٹھہو جی۔ میں آپ کو سناتا ہوں ساری تفصیل۔" کھاری کو خود بھی محسوس ہوا کہ وہ رضوان کو کوئی راز کی بات بتانے کے بجائے کنفیوژ کر رہا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر رضوان کے قریب بیٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ کمرے کے درمیان ۔ اکیلے کھڑے تھے۔ اس کمرے میں آنے سے پہلے وہ دو دن اس شش و پنج میں رہے تھے کہ انہیں ادھر آنا بھی چاہیے یا نہیں۔ شش و پنج کی یہ کیفیت بھی نہ جانے کتنے عرصے کے بعد ان پر وارد ہوئی تھی۔ ورنہ وہ اپنے معاملات میں پر یقین اور اٹل رہتے تھے کہ ایک کے علاوہ کوئی دوسری سوچ ان کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتی تھی۔

"چاہے انسان اعلان کرتا پھرے یا عمر بھر اسے راز رکھے۔ جو بھی چیز اس کی کمزوری بن جائے، مات وہ اسی کے ہاتھوں کھاتا ہے۔" کمرے کے درمیان کھڑے انہوں نے سوچا۔ وہ خالی خالی نظروں سے ہر چیز کو دیکھ رہے تھے۔ جیسے کسی اشارے، کسی سراغ، کسی سبز بتی کو ڈھونڈتے ہوں۔ جس کو پانے پر وہ اپنی تلاش میں آگے بڑھ سکیں۔

سامنے کی دیوار پر ایک پورٹریٹ سائز تصویر موجود تھی۔ لیکن وہ دانستہ اس تصویر سے نظریں چرا رہے تھے۔ وہ اس کی طرف دیکھنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے ہی اس تصویر پر ان کی نظر پڑی۔ ان کا چڑھایا آہنی خول آن کی آن میں ٹوٹ جائے گا۔

"اور یہ بھی کتنی عجیب سی بات ہے کہ جب سے وہ بڑا ہوا ہے، میں پہلی بار اس کے کمرے میں آیا ہوں۔ مجھے علم ہی نہیں کہ اتنے برسوں میں اس کے کمرے کا انٹیریئر کتنی بار بدلا۔ کس نے انتخاب کیا اور جس نے انتخاب کیا اس کا ذوق کیسا ہے۔" انہوں نے سوچا۔

"جو دنیا میں سب سے زیادہ پیارا ہے۔ وہی اتنے فاصلوں پر کھڑا رہا اور میں فاصلے کے اس طرف کھڑا ہی نظروں کی پیاس بجھاتا رہا کہ تعلق جیسا بھی ہے۔ وہ نظروں کے سامنے تو ہے نا۔" انہوں نے کھڑکی پر برابر کیے ہوئے پردے ہٹاتے ہوئے سوچا۔

"کتنی بار اس کھڑکی کے قریب کھڑے ہو کر اس نے باہر دیکھا ہو گا۔" انہیں خیال گزرا۔ شاید اکثر یا شاید کبھی بھی نہیں۔

"لیکن سوچنا تو یہ ہے کہ وہ آخر کیوں بھاگ رہا ہے؟ اور بھاگ کر گیا کہاں ہے؟" وہ واپس کمرے کی طرف مڑے۔ جہاں کھڑکی سے پردہ ہٹنے کے بعد روشنی سی پھیل گئی تھی۔ انہوں نے کمرے کے فرش، فلور میٹس، بیڈ، کرسیوں، اسٹڈی ٹیبل اور دیوار گیر وارڈروب پر نظر دوڑائی۔

"خیر بھاگ تو وہ جتنا بھی لے۔ جائے گا کہاں۔ ایک وقت تو اسے ہاتھ آنا ہی ہے۔" وہ سعد کے غائب ہو جانے پر خود کو خود دلاسا دینے میں مشغول تھے۔ لیکن ان کا دل کسی انہونی کے ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔ ان کی اطلاع کے مطابق وہ دبئی سے اگلی فلائٹ پر اسپین چلا گیا تھا۔ اسپین میں ان کے چند بندے اس کا پیچھا کرنے کے لیے حرکت میں تو آچکے تھے۔ لیکن وہ اس کے پلان پر ششدر تھے۔ اس نے انہیں محسوس بھی نہیں ہونے دیا اور ایک رات میں انہیں چکمہ دے گیا۔

انہیں رہ رہ کر ناشتے کی میز پر ہونے والی آخری گفتگو یاد آرہی تھی۔ وہ معنی خیز باتیں کر رہا تھا اور وہ اسے جان بوجھ کر طرح دیے جا رہے تھے۔ ان دونوں کے درمیان ایسی معنی خیز باتوں اور ایک دوسرے کے خلاف گفتگو کے پوائنٹ اسکور کرنے کا سلسلہ عرصے سے جاری تھا۔ اس روز بھی وہ اسے معمول کا حصہ جان کر محظوظ ہو رہے تھے۔ ان کا خیال تھا، وہ ابراہیم کے ہاتھوں پکڑے جانے پر تپا ہوا تھا۔ اسی لیے ایسی باتیں کر رہا تھا جن سے اس کا غصہ اور رد عمل جھلک رہا تھا۔ وہ نہیں سمجھ پائے تھے کہ وہ ان سے فرار حاصل کرنے کی ٹھان چکا تھا۔ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔ وہ ابھی تک پوری طرح سمجھ نہیں سکے تھے۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ فرار حاصل کرنا چاہ رہا تھا اور حاصل کر چکا تھا۔

"کیسی غیر فطری زندگی گزاری ہم نے۔" وہ شل ہوتے ہوئے ذہن کے ساتھ اسٹڈی ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ قربت میں فاصلے، فاصلوں میں قربت، اوپر اوپر سے ایک دوسرے کو جانا۔ کبھی دل کے اندر جھانکنے کی کوشش نہ اس نے کی، نہ میں نے۔

اور ایسا اس لیے ہوا کہ میں خوف زدہ تھا۔ میرا دل خوف زدہ تھا۔ میرا اندر نظریں چراتا تھا۔ جو کبھی اس خاص سطح سے آگے بڑھ کر اس نے کچھ پوچھ لیا تو کیا میں خود کو جسٹی فائی کر پاؤں گا۔ کیا میں اس کو وہ وضاحت دے پاؤں گا جو میں آج تک خود کو نہیں دے پایا۔ کیا میرے اقرار اور میرے انکار مجھے اس کے سامنے ایک کٹہرے میں نہ لا کھڑا کریں گے۔ جہاں جرح ہو گی اور اپنی صفائی میں کہنے کے دلائل، مگر کیا وہ دلائل قابل قبول ہوں گے۔ کیا وہ اس گہرائی تک جا سکے گا جو حالات کے رخ موڑ سکتی ہے۔"

انہوں نے گردن پیچھے کرتے ہوئے سر کرسی کی پشت سے ٹکایا۔

"شاید نہیں۔" اس شاید نہیں کے خوف نے ہی تو فاصلوں کو قربتوں میں ڈھلنے نہیں دیا۔

انہوں نے سر اٹھا کر یوں جھٹکا جیسے اپنے ہی نظریے سے متفق نہ ہوں۔

"اور اب جو اس کی ناشتے کی ٹیبل والی گفتگو یاد کرتا ہوں تو وہم آتا ہے کہ اس کے فرار کا تعلق ان ہی باتوں سے ہے جو ایک خاص سطح سے پار کی ہیں۔ اگر صرف کسی ایک اشارے کا نتیجہ یہ فرار ہے تو پوری داستان کا رد عمل کیا ہو گا صاحبزادے کی طرف سے۔"

انہوں نے بے دھیانی میں اسٹڈی ٹیبل کی دراز کھینچ کر باہر نکالتے ہوئے سوچا۔ بے دھیانی میں باہر نکلی دراز میں ان کے لیے کیا موجود تھا۔ اسے باہر نکالتے ہوئے وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اشارے تھے۔ سبز بتی تھی۔ وہ اس میں موجود سراغ، اشاروں اور سبز بتی کو دیکھنے میں یوں محو ہوئے کہ انہیں وقت گزرنے کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہوا۔

☼ ☼ ☼

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا، یہ کیا ہو رہا ہے؟" سمی آنٹی نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

"کیوں آئے روز ہمیں تفتیش کے لیے سامنے بٹھالیا جاتا ہے۔ سعد سلطان کہاں چلا گیا ہے۔ جو ہم سے بار بار پوچھا جاتا ہے کہ بتائیں وہ کدھر ہے۔"

سیمی آنٹی کی آواز لرز رہی تھی اور اچھے خاصے خوش گوار موسم میں بھی ان کی پیشانی پر پسینہ چمک رہا تھا۔ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد انہوں نے متوحش نظروں سے سارہ کو دیکھا جو چہرے کو ہاتھ پر ٹکائے خاموش بیٹھی خلا میں کچھ دیکھے چلی جارہی تھی۔

"سارہ!" انہوں نے سارہ کا بازو جھنجھوڑا۔ "کیا تمہیں کوئی فکر نہیں ہے؟ کیا تم ذرا سا بھی پریشان نہیں ہو رہیں؟"

"پریشان ہونے یا پریشانی دکھانے سے کیا فرق پڑے گا سیمی آنٹی۔" سارہ نے چہرہ ہاتھ کے اسٹینڈ سے نکالتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ "ابھی تو صورت حال ہی سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ کیا ہوا ہے' کیا ہونے والا ہے' کیا پتا ہے ہمیں۔"

"یہ ہی تو میں کہہ رہی ہوں۔" سیمی نے جھلا کر کہا۔ "تم نے اس روز اس سے کیوں کرید کر نہیں پوچھا کہ وہ تمہیں بینک اکاؤنٹس' کریڈٹ کارڈ اور اے ٹی ایم کی تفصیل سنا رہا تھا تو کیوں سنا رہا تھا۔ تم نے تو اس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اس روز وہ اتنے رف حلیے میں کیوں تھا۔ میں نے ہاتھ کی چوٹ کا پوچھا تو وہ ہنس کر ٹال گیا۔ اس کے ہر انداز میں اس روز کچھ غیر معمولی تھا۔ لیکن تم نے نوٹ کیا' نہ مجھے کچھ پوچھنے دیا۔"

"آپ کا کیا خیال ہے' وہ مجھے میرے کسی ایسے سوال کا جواب دیتا جو ہم سے باہر اس کی جنرل زندگی سے متعلق ہوتا۔" اس نے سوال کیا۔

"ہمارے لیے' ہمارے سامنے اس کا صرف ایک ہی روپ نمایاں ہے۔" اس نے بلند آواز میں کہا۔ "نیکی کے فرشتے کا روپ۔ اس سے آگے وہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کون ہے۔ میں اور آپ نہیں جانتے۔ پھر اس سے کیا سوال کرتے آخر ہم؟"

"تو پھر اتنا تو سوچو کہ آئندہ کیا ہوگا۔" سیمی آنٹی کے سامنے مستقبل کسی خوفناک بھتنے کی طرح ناچ رہا تھا۔ "ہمارا کیا ہوگا۔ یہ فلیٹ' یہ سامان۔" انہوں نے اپنے اردگرد نظر ڈالی۔ "زندگی گزارنے کے تمام وسائل" ان کے چہرے پر وحشت دوڑنے لگی۔ "سعد تو کہیں چلا گیا۔ وہ تو رابطے میں بھی نہیں ہے۔ سوچو ہم کیا کریں گے؟"

"حیرت ہے سیمی آنٹی! یہ آپ کہہ رہی ہیں۔" سارہ نے ان کی طرف دیکھا۔ "مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ سعد کے یوں چلے جانے پر آپ کی ہوائیاں اڑنے لگیں۔"

سیمی آنٹی اسی طرح وحشت زدہ چہرے کے ساتھ عینک کے شیشوں کے پیچھے سے اپنی گول گول آنکھیں گھماتی اسے دیکھ رہی تھیں۔

"آپ کو وہ دن شاید بھول گیا۔" سارہ کے لہجے میں تلخی اتری۔ "وہ گفتگو بھول گئی۔ مجھے اس گفتگو کا ایک ایک لفظ یاد ہے۔ کیونکہ آپ کی اس گفتگو نے ہی مجھے باغ عدن سے دشت ظلمت میں لا پھینکا تھا۔ یاد کریں ذرا۔" اس کے لہجے کی تلخی بڑھی۔

"آپ نے کہا تھا' سعد تمہاری زندگی میں ہمیشہ نہیں رہے گا اور جب وہ چلا گیا تو سوچو ہم کیا کرو گی؟" سارہ کا لہجہ تلخ سے تلخ تر ہوتا چلا جارہا تھا۔

"مبارک ہو آپ کو۔" پھر اس نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ "آپ کی پیشن گوئی سچ ثابت ہوئی۔ وہ مبارک وقت آن پہنچا جب سعد ہماری زندگیوں میں نہیں ہے۔" اس نے اپنی آنکھوں کے آنسو روکنے کے لیے لمحہ بھر کو سر جھکایا۔

"مگر آپ کو کیا فکر۔" آپ کے تو دونوں ہاتھ سلامت ہیں اور ان دونوں ہاتھوں کو کام کرنے کی عادت بھی ہے۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی اور ناک اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ "آپ جائیے' جا کر کروشیے اور اون سلائی کے شاہکار بنا کر بیچیے' سلائی کڑھائی کر کے گزارہ کیجیے۔ آپ یہ کیوں پوچھ رہی ہیں کہ ہمارا کیا ہو گا۔ اس کے بجائے آپ کو یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ سارہ اب تمہارا کیا ہو گا؟" اس نے جتانے کے سے انداز میں اس جملے کا ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولتے ہوئے کہا۔

"میرے ہاتھ۔" اس نے اپنے کمزور ہاتھ میز پر پھیلائے۔ جن پر نسیں ابھری ہوئی تھیں اور جن کی ہتھیلیوں کا رنگ زرد تھا۔ "اور میری ٹانگیں' اس نے میز کے نیچے سے اپنی ٹانگیں باہر نکال کر پھیلائیں۔ "معذور ہیں' کمزور ہیں' کچھ کرنے کے قابل نہیں' لیکن پھر بھی مجھے سعد کے یوں چلے جانے پر یہ غم نہیں ستا رہا کہ آگے میرا کیا ہو گا۔" اس کی آواز بھرانے لگی۔

"میرا دل یہ سوچ کر کٹا جا رہا ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا جو اس کے اپنے' اس کو ڈھونڈنے یہاں چلے آئے۔ میرا ذہن یہ سوچ سوچ کر ماؤف ہو رہا ہے کہ وہ نہ جانے کہاں اور کس حال میں ہو گا۔ اس روز جب وہ یہاں آیا تھا تو کتنا ٹوٹا ہوا اور دکھی نظر آ رہا تھا۔ اس کی باتیں بے ربط تھیں اور معنی خیز بھی۔ مجھے ان کے معنی سمجھ میں نہیں آئے تھے اور اس روز سے ہی نہ جانے میرا دل کیوں اس خدشے میں تھا کہ اب شاید ہی کبھی میں اسے دیکھ پاؤں۔"

یمی آنٹی' سارہ کی یہ حالت دیکھ کر اپنی پریشانی بھول گئیں۔

"مجھے اس وقت سوائے اس کے غم کے کوئی اور غم یاد نہیں یمی آنٹی!" اب اس کی آواز پست ہونے لگی۔ "وہ جو دنیا کے لیے پیسے والا آدمی ہے' جس کے پاس پیسہ ہے اور بہت ہے۔" اس نے یمی کو طنز سے دیکھا۔ "مگر مجھے اس کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ دل والا آدمی ہے۔ اس کے پاس دل ہے اور بہت بڑا ہے۔ وہ وہ ہے۔ جس کی آمد میرے لیے زندگی کا پیغام اور جس کی رخصت اس کی دوبارہ آمد کی امید دیتی رہی ہے۔ اب جس کے یوں چلے جانے سے مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے زندگی رخصت ہوئی۔ صرف سانسیں باقی ہیں۔"

یمی آنٹی پھٹی پھٹی نظروں سے سارہ کو دیکھ رہی تھیں۔

"باقی رہا زندگی گزارنے کا معاملہ اور آئندہ آنے والے وقت کا انتظام۔" وہ سانس لینے کے وقفے کے بعد بولی۔ "تو میں نے کہا نا' وہ صرف پیسے والا نہیں دل والا آدمی ہے۔ پچھلے ایک عرصے سے وہ مجھے خود اپنے آپ پر انحصار کرنے کے سبق یوں ہی نہیں پڑھا رہا تھا۔" اس نے یمی آنٹی کی طرف دیکھا۔ جس نے اس کے یوں دیکھنے پر شرمساری سے سر جھکا لیا۔

"یہ جو میرے ہاتھ کام کرنے لگے ہیں اور میری ٹانگیں چلنے لگی ہیں۔ ان کو کس نے کام کرنے اور چلنے کا حوصلہ دلایا۔ میں تصویروں میں رنگ بھرنے سے شروع ہو کر سوئی دھاگے کے کام تک کس کے کہنے پر پہنچی۔ اسی دل والے کے کہنے پر جس کے پاس دل ہے اور بہت بڑا دل ہے۔ یوں ہی تو وہ اس روز مجھے بینک اکاؤنٹس' اے ٹی ایم اور کریڈٹ کارڈ کی تفصیل لکھ کر مجھے نہیں دے گیا۔" اس نے سر جھکا۔

"لیکن ان بے حقیقت چیزوں کے سامنے دنیا کی سب سے بڑی حقیقت مجھ سے نظریں ملانے کو میرے سامنے آکھڑی ہوئی ہے۔ وہ نہیں ہے یمی آنٹی۔ وہ کہیں نہیں ہے۔" اس نے اب اپنے آنسوؤں کو روکا نہیں' انہیں بہنے دیا۔

"آپ لے لیں وہ سب' وہ سب تفصیلات آپ لے لیں۔ اکاؤنٹ' کارڈز' پیسہ سب آپ لے لیں۔ یہ جانے بغیر کہ وہ پیسہ اس نے مجھے کس مد میں دیا۔ زکوٰۃ کی مد میں یا خیرات کی مد میں۔ اسے اس وقت تک استعمال کر لیں یمی آنٹی! جب تک وہ ختم نہیں ہو جاتا۔" وہ بلند آواز میں روتے ہوئے بولی۔

"روزگار کا غم میرا روگ نہیں ہے۔ اس کی جدائی کا غم منانے دیں مجھے۔ وہ جو کہیں نہیں ہے۔ وہ جو کہیں گم ہو گیا ہے۔"

یمی آنٹی' سارہ کو روتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ وہ اپنی وقتی پریشانی بھول بیٹھی تھیں۔

"ابھی یہ صرف اس کے نہ ہونے کا غم منا رہی ہے۔ یہ اس بات سے بے خبر ہے کہ سعد کے لواحقین جو اسے ڈھونڈتے ہم تک آپہنچے ہیں' وہ ہمارے اس کے ساتھ تعلق کی نوعیت کے بارے میں کتنے مشکوک ہو رہے ہیں۔"

جہاندیدہ یمی آنٹی کی سوچ سارہ سے بالکل مختلف سمت میں سفر کر رہی تھی۔ انہیں رہ رہ کر سعد کے متعلق سوال کرتا وہ گول مٹول لڑکا یاد آ رہا تھا جو یہ ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا کہ وہ دونوں یقیناً" جانتی تھیں کہ سعد کیوں اور کہاں گیا تھا۔ کیونکہ آخری بار اس نے سعد کو ان ہی کے فلیٹ کے نیچے پکڑا تھا۔

"اور اگر وہ ہمارے پیچھے پڑ گئے تو یہ فلیٹ' یہ اکاؤنٹ اور یہ پلاسٹک منی سب دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ پھر کھلا آسمان ہو گا اور ہم ہوں گے۔ یہ تو سو فیصد درست بات ہے کہ میں اپنے جینے کا سامان کر سکتی ہوں۔ مگر تم۔ تمہارا کیا ہو گا سارہ!" یمی کے دل میں سوال اٹھ رہے تھے۔ "کیا مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ کسی کے سہارے کے بغیر تمہارا بوجھ اٹھا سکوں؟" وہ سوچ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اس نے کمرے میں روشنی کا کوئی ذریعہ آن نہیں کیا تھا۔ وہ دوپہر سے صوفے پر ٹانگیں سمیٹے اپنے سامنے میز پر رکھی ان چیزوں کو دیکھے چلی جا رہی تھی جو اسے کوریر کے ذریعے موصول ہوئی تھیں۔ دوپہر گزری' سہ پہر نے سورج کا رخ بدل دیا۔ پھر شام کے سائے اترنے لگے اور کمرے میں روشنی کم ہونے لگی۔ روشنی کم ہوتے ہوئے تاریکی میں بدلنے لگی۔ لیکن اس کی ساکت نظریں میز پر رکھی ان چیزوں سے نہیں ہٹیں' پھر کمرے کے دروازے کے اوپر لگی اطلاعی گھنٹی بجنے لگی۔ گھنٹی کی اس آواز نے اس کے ذہن کو چونکایا' لیکن یوں ہی بیٹھی رہی۔ گھنٹی مسلسل بج رہی تھی اور اس کی آواز اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسانے لگی تھی۔ مجبوراً" اسے اپنی نظریں اس جگہ سے ہٹانی پڑیں اور اپنی جگہ سے اٹھنا پڑا۔

"اُفوہ! کیا مصیبت ہے۔" وہ بلند آواز میں چلائی اور تیز قدموں سے چلتی باہر نکل گئی۔

"کون ہے؟" بلند اور غصیلی آواز ساکت فضا میں پھیلی۔

"دودھ لے لیں میڈم! اور دودھ کا بل بھی دے دیں۔ آج ڈیو ڈیٹ ہے بل کی۔" باہر سے آواز آئی۔

"اگر تم آج بل نہ لیتے تو کیا قیامت آجاتی؟" اس نے گیٹ کھول کر اسی درشتی سے کہا۔

"ملک شاپ پر پیسے جمع کروانے ہوتے ہیں میڈم! وہ انتظار نہیں کرتے۔" سامنے کھڑے لڑکے نے جواب دیا۔ وہ ان میڈم صاحبہ کے غصے اور درشتی سے واقف تھا۔ لہٰذا اس رویے سے بالکل بھی نہیں گھبرایا۔

"اس وقت میرے پاس گھر میں کیش بالکل نہیں ہے۔ کل لے لینا۔" اس نے دودھ کے پیکٹ پکڑتے ہوئے اسی درشتی سے کہا جو اس کی عمومی شخصیت کا خاصا تھی۔

"میں معذرت خواہ ہوں میڈم! پیسے تو مجھے لے کر ہی جانے ہیں۔" لڑکا تحمل سے بولا۔ اس کے لیے ایسے بلاوے روزمرہ کا معمول تھے۔

وہ کچھ دیر غصے میں پھنکارتی شعلہ بار نظروں سے لڑکے کو گھورتی رہی اور پھر زور سے فرش پر پاؤں مارتے ہوئے اندر مڑ گئی۔ سات منٹ کے بعد گیٹ پر واپس آکر اس نے پیسے بیچ لڑکے کے منہ پر مارتے ہوئے بلند آواز میں

اسے دفع ہوجانے کو کہا تھا۔
"تھینک یو میڈم! ہیو اے نائس ایوننگ!" لڑکے نے اپنی پی کیپ پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیشہ وارانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور واپس مڑ کر اپنی موٹر بائیک اسٹارٹ کرنے میں مصروف ہوگیا۔ ٹھاہ کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ میڈم کے گیٹ بند کرنے کا انداز تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر مسکرایا اور بائیک کی سیٹ پر بیٹھ کر اسے سڑک کی طرف موڑتا اپنی اگلی منزل کی طرف چل پڑا۔
"افوہ دنیا' انسان کو تنہا رہنے اور تنہا ہی زندگی کیوں گزارنے نہیں دیتی۔" اس نے بلند آواز میں خود کلامی کرتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔ جس پر ننھے ننھے ستارے جابجا بکھرے پڑے تھے۔
"اسی لیے تو میں اپنی ذات کے دروازے بند کیے سب سے چھپ چھپا کر بیٹھی تھی کہ نہ کسی کو میرا پتا معلوم ہو نہ کوئی آئے اور دستک دے۔" اس کے چہرے کے نقوش غصے کے مارے بگڑنے لگے تھے۔
"برا ہو اس دوستی کا' جس نے لوگوں کو میرے راستے دکھا دیے۔" اس کا دماغ الٹنے لگا۔
"ہو گیا نا سب پھر سے درہم برہم۔" میز پر رکھی چیزوں پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے دانت پیسے۔
"لگ گئے سراغ۔ اوپن ہوگئے سب کلوزڈ چیپٹرز' جیسے میں نے اپنی پہیلی انعامی معمے میں چھپوائی تھی کہ جو بوجھ لے گا اسے انعام ملے گا۔" اس نے شعلہ بار نظروں سے ان چیزوں کو گھورا۔
"نہیں چاہیے مجھے کوئی کلیو' نہیں چاہئیں مجھے کی ورڈز' نہیں چاہئیں مجھے گمشدہ پتے اور ان پتوں پر موجود حقیقتوں کا سامنا۔" آگے بڑھ کر میز پر رکھی چیزوں کو ہاتھ مار کر ادھر ادھر گراتے ہوئے وہ بلند آواز میں چلائی تھی۔ اس کے ہاتھ مارنے سے کچھ چیزیں قریب ہی اور کچھ دور جا گری تھیں۔ گرنے والی چیزوں میں دیسی باداموں کا ایک پیکٹ بھی تھا جو فرش پر گرنے کی چوٹ کھاتے ہی پھٹ گیا تھا اور اس میں موجود بادام ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔ اس پیکٹ پر چسپاں پرچی پر سیاہ روشنائی میں ایک دلچسپ عبارت درج تھی۔
"آپ کی بے لوث میزبانی کا عوضانہ دیسی بادام' یقین جانیے بادام گو دیسی ہیں' کوتاہ قامت اور ناقابل التفات' لیکن اصلی ہیں۔ اس لیے کہ اپنے ہیں' خالص اپنے۔"
وہ اس عبارت کو پڑھ چکی تھی اور شاید اس کا مفہوم بھی سمجھ چکی تھی۔ لیکن وہ اس سے نظریں نہیں ملانا چاہتی تھی۔ اسی لیے اپنے سفید اور سیاہ امتزاج والے گھنگھریالے بالوں والا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر وہیں صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں نے تمہیں اپنی کہانی سنائی بھائی افتخار! اور تمہاری کہانی تم سے سنی۔ اب بتاؤ' کس کا بوجھ زیادہ ہے' کون زیادہ خوار ہوا؟"
"سبغول تے کج نہ پھول۔" کھاری نے تاسف سے سر ہلایا۔ "جس کو پھولو' وہی دکھی' جس نوں سنو' اوہی سچا بھائی رضوان الحق! میں نے کہا تھا نا بڑا ہی کنفیوژن ہے۔"
"ہر کوئی کسی دوسرے کی تلاش میں لگتا ہے۔ میری اور تمہاری کہانیوں کے سب کردار بھٹکتے پھرتے اور خوار ہوتے پھر رہے ہیں۔" رضوان نے سر اٹھا کر خود پر جھکی درخت کی شاخوں کے چھدرے پتوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ دن بھر کے حبس کے بعد آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے۔ ہلکی ہوا چلنے لگی تھی۔ جس کے ساتھ درخت کے پتے بھی آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔
"سچ آکھیا بھائی رضوان الحق! کس کا سرا کس سے جا کر ملتا ہے' کون جانے۔" کھاری نے ٹھنڈی آہ بھرتے

ہوئے کہا۔ وہ اپنے تئیں اپنی ذات کے دکھ بیان کرنے بیٹھا تھا۔ مگر رضوان کی داستان سن کر اسے لگ رہا تھا۔ وہ اس سے بہتر زندگی گزار رہا تھا۔ کم از کم اس کے سر پر اور کسی کا نہ سہی' چوہدری سردار کا سایہ تو تھا ہی۔
"تم ایک کام کرو بھائی افتخار۔" رضوان نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے کھاری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"چنگے ہی رہتے ہیں یہ جاپانی اور چینی گڈے۔" کھاری کو اس کی چھوٹی آنکھیں اور چھوٹی سی چپٹی ناک دیکھ کر خیال آیا۔ "شکلوں سے بہت معصوم لگتے ہیں۔ بھانویں (چاہے) اندر سے کتنے مکار ہی کیوں نہ ہوں۔" اسے اپنے ہی خیال پر ہنسی آنے لگی۔
"ہاں جی! کیا کام؟" وہ اس بے اختیار ہنسی کو کنٹرول کرتے ہوئے رضوان سے پوچھنے لگا۔ "لگدا اے پتا نہیں کتنے سالوں بعد ہنسا ہوں۔" اسے خیال آرہا تھا۔
"فوراً" سے پہلے اپنی بھین جی اور سعد صاحب کی ملاقات کا انتظام کرو۔ یہ بہت ضروری ہے بھائی! کوئی بچھڑا ہوا تو کسی سے ملے نا' ہماری داستانوں میں۔" رضوان نے سنجیدگی سے کہا۔
"کتنے چھوٹے چھوٹے بال ہیں اس کے۔" کھاری بے دھیانی سے رضوان کی بات سنتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ "مشین ہی پھیروا رکھی ہے بے چارے نے۔ لگتا ہے گھاس اگی ہوئی ہے نکی نکی۔"
"میری بات غور سے سن رہے ہو بھائی افتخار؟" رضوان کو اس کی غائب دماغی کا اندازہ ہو رہا تھا۔
"آہو جی!" کھاری چونکتے ہوئے بولا۔ "آپ کو بتایا تو ہے کہ مہ نور باجی اسی ویلے واپس چلی گئی تھیں' سعد باؤ صاب سے بات کرنے۔"
"تو پھر اب تک ان کی کوئی اطلاع تو نہیں آئی نا۔" رضوان نے کہا۔ "ان سے کسی نے پوچھا کہ سعد صاحب کی کیا خبر ہے؟ بھین جی کے بارے میں سن کر ان کا کیا رد عمل تھا؟"
"نہیں جی۔" کھاری نے کان کھجاتے ہوئے سر جھکا لیا۔ "آپ نوں بتایا تو ہے میں نے سعدیہ والی بات۔ مجھے تو اپنی پڑ گئی تھی جی۔ میں نمانا بڑا برا پھنسا بھائی رضوان! سپنے دیکھنے کی عمر تھی' پر کبھی دیکھے نہیں تھے۔ چوہدری صاحب انگل سے پکڑ کر سپنوں کی دنیا میں لے گئے۔ ابھی پوری طرح دیکھے وی نئیں تھے کہ دھکے نال جگا دیا کسی نے۔" وہ بے چارگی سے بولا۔
"ضروری نہیں کہ بھیانک خوابوں کی تعبیر بھی بھیانک ہی ہو بھائی افتخار! کبھی کبھار خوابوں کی تعبیریں ان سے الٹ بھی ہوتی ہیں۔" رضوان نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تم اپنی بیگم کی واپسی کا انتظار کرو۔ واپس نہ آئے تو ہمت کرو اور جا کر اس سے پوچھو کہ اس کا کیا ارادہ ہے۔ گومگو میں پڑے رہنے سے بہتر ہے' انسان حقیقت سے نظریں چار کرلے۔"
"کوئی آسان کام بتاؤ رضوان بھائی! حقیقت نال نظریں چار کرلو۔ واہ جی واہ!" کھاری نے اس کی بات دہرا کر کہا۔ "پہاڑ تے چڑھ کر دوسرے پاسے اترنا آسان کام ہے۔ حقیقت نال نظراں ملانا بڑا اوکھا کام ہے میرے بھائی۔"
"تو کیا' پھر یوں ہی ادھر ادھر چھپتے پھرو گے' خود سے بھی اور لوگوں سے بھی؟" رضوان نے اب کے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "کیا فائدہ ہوگا اس چھپن چھپائی کا؟ ایک نہ ایک روز تو حقیقت تمہارے سامنے کسی کونے سے نکل کر آ کھڑی ہی ہوگی۔" کھاری خاموشی سے سر جھکائے زمین پر اگے سبزے پر ہاتھ پھیرتا رہا۔
"اتنے بزدل ہو تو اسے کس برتے پر ہلا شیری دے رہے تھے کہ وہ ڈاکٹر بننے کی تیاری کرے۔ تم اس کے چوکیدار بن جاؤ گے۔"
کھاری نے کچھ گیلی' کچھ سوکھی زمین سے چند بوٹیاں نوچ کر اکھاڑیں۔

"خزانے کا چوکیدار بننا آسان کام ہے کیا؟" رضوان نے اس کا بازو ہلا کر کہا۔ "دس دفعہ دل بے ایمان ہو گیا بندے کا۔ دیکھنے والا کوئی نہیں۔ چرانا نہیں تو خزانے کو ہاتھ لگا کر ہی دیکھ لیا جائے کہ یہ ہوتا کیسا ہے۔"

"بس ہتھ لگانے سے پہلے ہی خزانہ 'خزانہ ہوتا ہے بھائی رضوان! ہتھ لگا لو تو خزانے کی ڈھیری بھی مٹی ہو جاتی ہے۔" پیروں کے بل اکڑوں بیٹھے کھاری نے خودرو بوٹیوں کا ایک اور گچھا اکھاڑتے ہوئے کہا۔

"خیر! ایسا بھی نہیں ہے۔" رضوان نے کہا۔ "سونے کے کچھ ڈھیر ہاتھ لگانے سے کندن بھی بن جاتے ہیں۔"

"بڑیاں اچیاں باتیں نہ کرو بھائی صاحب! میری سمجھ وچ کتابوں کی باتیں کہاں آتی ہیں۔"

"سمجھنے کی کوشش نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔ بس بھابھی کی واپسی کا انتظار کرو۔" رضوان نے کہا۔

"ایہہ راستہ دیکھ رہے ہو آپ؟" کھاری نے نظر کے سامنے پھیلے ایک راستے کی طرف اشارہ کیا' جو کھیتوں کے درمیان پگڈنڈیوں کی شکل میں بل کھاتا' سیدھا ہوتا' مڑتا پھیلا تھا۔

"ایہو ای راستہ آگے جا کر مسجد کے پاس سے گزر کر کھبے مڑتا ہے اور پھر مولوی جی کے گھر تک چلا جاتا ہے۔" اس نے راستے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کوئی بڑا لمبا راستہ نہیں ہے جی' پر آج کل لگدا رستہ نہیں اے بندہ چلنے لگے تو ختم ہی نہیں ہو گا۔ ساہ چڑھ جائے رستہ نہ مکے۔"

"یہ راستہ نہیں ہے بھائی افتخار' انتظار کی کیفیت ہے' جو تمہیں تھوڑا سا فاصلہ میلوں پر پھیلا نظر آ رہا ہے۔" رضوان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میں اس کیفیت سے واقف ہوں۔ کیونکہ میں انتظار ہی نہیں کر رہا۔ معجزے کا بھی منتظر ہوں اور میرے سامنے تو نہ کوئی راستہ ہے' نہ منزل۔ بس سراب ہی سراب ہے۔" وہ شاید خود سے مخاطب تھا۔ اسی لیے کھوئے کھوئے انداز میں بول رہا تھا۔

"مگر تم فکر مت کرو۔ تمہارے پاس راستہ بھی ہے۔ منزل بھی۔ بس مقدر کو نظروں کی اوٹ سے نکل کر سامنے آنا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم جیسے نیک نیت لوگوں کے مقدر ایک عرصے کے انتظار کے بعد جب یاوری کرتے ہیں تو اگلے پچھلے کئی ریکارڈ ٹوٹ جاتے ہیں۔" وہ مسکرایا۔

"ٹپ۔" آسمان پر جمع ہوئے گہرے بادلوں سے ٹپکی پہلی بوند کھاری کے چہرے پر گری۔

"اوئے! اندر چلو۔ بادل برسنے لگا ہے۔"

پہلی بوند کے احساس نے کھاری کے اندر ایک عجیب سی سرشاری بھر دی۔ وہ چھوٹے بچوں کی طرح چیخ کر بولا اور رضوان کا ہاتھ پکڑ کر بھاگتا ہوا فارم ہاؤس کی طرف آ گیا۔

"جے تے میرا مقدر اچھا ہوا تو پھر بھائی رضوان الحق! ہم مل کر تمہارا معجزہ بھی ڈھونڈھ نکالیں گے۔ ویسے اس کا نام بڑا عجیب سا ہے بھئی۔" فارم ہاؤس تک پہنچتے پہنچتے وہ دونوں اچھے خاصے بھیگ چکے تھے۔ کھاری نے اپنے کپڑوں کو جھاڑتے ہوئے ہنس کر رضوان کو یقین دلایا۔

"تم سعد صاحب اور بھین جی کی فکر کرو پہلے۔" رضوان نے اپنے سر پر ہاتھ چلاتے ہوئے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے۔" کھاری نے سر ہلایا اور سر جھکا کر مسکرایا۔ "ہو دسو بھلا' پیا رانی بھی کسی لڑکی کا نام ہوتا ہے؟" وہ دل میں محظوظ ہو رہا تھا۔ "جپانی گڈے بھی پیار کے نام جپانی زبان میں ہی نکالتے ہیں۔ نام بھانویں پیدن اختر ہو اس کا' پیار نال بلاؤ پیا رانی۔" اسے بلاوجہ ہنسی آئے چلی جا رہی تھی۔

"چلو! شکر ہے تم مسکرائے تو۔" رضوان نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "میرا خیال ہے موسم بھی موڈ بدل ڈالتا ہے انسان کا۔"

"میرے جیسے بندے کا تو دل کا بوجھ نکل جائے' تے وہ مسکرانے لگتا ہے۔" کھاری مسکرایا۔ "آپ میرے بلانے پر آ گئے' میرے دل کی بن بی میں بھلا چنگا ہو گیا۔"

"بڑے خوش قسمت ہو بھائی! اتنی جلدی بھلے چنگے ہو جاتے ہو۔"

"چلو! آپ کہتے ہو تو ہوں گے خوش قسمت۔" کھاری نے سر ہلایا۔ "آؤ' آپ نوں سٹڈ دکھاؤں۔"

"سٹڈ؟" رضوان نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"سٹڈ نہیں سمجھدے۔" کھاری نے بے یقینی سے کہا اور پھر ہاتھوں میں فرضی باگیں پکڑ کر بازو ہلاتے ہوئے منہ سے آواز نکالی۔ "ٹگالگ ٹگالگ۔ گھوڑے والا فارم۔"

"اوہ! اچھا۔" رضوان نے سمجھ میں آنے پر کہا۔ "تمہارے چوہدری صاحب کو چاہیے' دو تین شیر بھالو چیتے بھی رکھ لیں اور اپنا سرکس کھول لیں۔"

"سرکس ہی تے لگا ہے چار طرف۔" کھاری نے ہنس کر کہا۔ "کوئی دیکھے تے تالیاں بجائے نا۔"

"کبھی کبھی تم سادگی میں بھی بڑی گہری بات کر جاتے ہو بھائی افتخار!" رضوان نے کہا اور کھاری کے پیچھے چل دیا۔

☆ ☆ ☆

"طیفے نے سنا ہے قسم کھالی ہے۔"

"اچھا! کس بات کی بھلا؟"

"میرے منہ میں خاک بڑے' سنا ہے' کہتا ہے 'اس بن بارات کے دولہے کی گردن اتار کر رکھ دوں گا۔"

"ہاہاہا۔ ارے واہ! لیکن گردن اتار کر رکھے گا کہاں؟"

"آپ مذاق سمجھ رہے ہو جی! طیفے نے سنا ہے' کبھی جھوٹی قسم نہیں کھائی۔ جو کہتا ہے پورا کر کے رہتا ہے۔"

"تو گردن میری اترنے جا رہی ہے۔ آنسو تمہارے بہنے لگے۔ ٹانگیں بھی لگتا ہے' کانپ رہی ہیں۔"

"تو ایسی باتیں سن کر میں جھومر گانے لگوں اور لڈی ڈالوں کیا؟ ٹانگیں تو دہشت کے مارے کانپ رہی ہیں۔"

"اچھا تو پھر تمہارے خیال میں کیا ہونا چاہیے؟"

"آپ ادھر زیادہ آنا جانا بند کر دیں جی۔ دشمن کے ارادوں پر آگ برسے' پر آپ کی جان کی سلامتی چاہیے۔"

"ارے بھئی! میں آنا جانا کیسے بند کر دوں۔ یہاں میری بی بی رہتی ہے۔ جو آج کل دوسرے جی سے ہے اور۔"

"اور کیا؟"

"اور یہاں تم رہتی ہو' جو مجھے جھولیاں پھیلا پھیلا کر دعائیں دیتی ہو۔ تم کہتی ہو کہ مجھے بھاگ لگیں تو پھر دیکھ لو کیسے بھاگ لگے مجھے۔ کاروبار ایک دم اوپر جا رہا ہے۔ بس وہ فارغ ہو جائے خیر سے تو یہاں سے کہیں اور شفٹ ہو جائیں گے۔"

"اللہ آپ کے شملے کو اور بھی اونچا کرے' اللہ اونچے دروازوں اور کڑی دیواروں والے محل عطا کرے۔ اللہ نے خیراں رکھے جی' لیکن مجھے بڑی فکر ہے۔ اس کی تو حالت ہی ایسی ہے۔ اس کے سامنے میں یہ باتیں نہیں کر سکتی ہوں لیکن آپ کو سمجھاتی ہوں' اپنی جان کی سلامتی کا لحاظ کریں۔ نہ آیا کریں ادھر زیادہ۔"

"اچھا! اگر اتنا ہی خطرہ ہے اور حفاظت کا تردد ہو نہیں سکتا تو یہ پہلوان سراج سرفراز کیا کر رہا ہے ادھر؟ اس کی جیب میں دو ڈھائی سو روپے کیوں جھونکے جاتے ہیں ہر مہینے؟"

"اگ لگے اس ناس پٹے کو تو جی۔ مشٹنڈا چار چار روٹیاں کھا کر بس ڈکار مارنے اور اپنے بڑے بڑے ہاتھ پاؤں

پھیلا کر لیٹے لیٹے چارپائی توڑنے کو ادھر پڑا رہتا ہے۔"

"استغفر اللہ توبہ کرو۔ نمازی پرہیزگار بندہ ہے۔ اتنے برے برے الفاظ مت بولا کرو اس کے لیے۔"

"بولا نہ کروں تو اور کیا کروں۔ طیفا لاٹر سامنے والے چوبارے پر کھڑا لال لال آنکھیں نکالے گریبان کھولے ادھر جھانکتا رہتا ہے دن بھر اور یہ کم بخت سرنچا کیے وضو کے لیے پانی اور کھانے کے لیے روٹی سالن مانگنے کے سوا کچھ کر نہیں سکتا۔ آپ کی زوجہ محترمہ بھی اپنے نام کی ایک خاتون ہیں۔ دل کی تسلی کو یہ مشٹنڈا ادھر بٹھا چھوڑا ہے۔ اناج کا دشمن۔ ہمیں تو گھر سے پڑ رہا ہے کم بخت۔"

"ہوں۔ سنا ہے، محلے والوں کو بھی اس کے ادھر پڑے رہنے پر اعتراض ہے؟"

"اعتراض نہ ہو تو اور کیا ہو۔ وہ تو کہیں گے ہی اور ٹھیک ہی کہیں گے کہ دو جوان جہان لڑکیوں کے گھر میں یہ باہر کا مشٹنڈا کیا کر رہا ہے۔ نامحرم اگ لگتا۔"

"ہاں! یہ بھی سوچنے کی بات ہے۔"

"آپ سمجھائیے اپنی زوجہ کو۔ اسے تو انگلی سے پکڑ کر نکال باہر کریں اور خود آپ کے سامنے تو۔ یہ لیں میرے ہاتھ جڑے ہوئے ہیں۔۔۔ ادھر آنا کم کردیں۔"

"نہ بھئی! میں ادھر آنا نہیں چھوڑ سکتا۔ ہفتے کے شروع میں جب تک تمہاری دعاؤں کا کوٹہ نہ سمیٹ لوں مجھ سے کاروبار نہیں ہوتا۔"

"میری دعاؤں کا تو بہانہ ہی ہے۔ اصل میں تو سرکار اپنی زوجہ کی من موہنی صورت اور میٹھی آواز سننے تشریف لاتے ہیں۔"

"کیا سولے آنے سیانی بات کی ہے تم نے۔ یاد کرو، جب میں پہلے پہل یہاں آنا شروع ہوا تھا تو مجھ سے دس، بیس روپیہ بخشش لے کر تم کتنی دعائیں دیتی تھیں مجھے۔ اونچی شان، اونچے بھاگوں کی۔ دیکھ لو! تمہاری دعائیں لگ گئیں مجھے۔ جس کی خاطر طیفا لاٹر گردنیں اتارنے کو باؤلا ہوا پھرتا ہے وہ میرے عقد میں آگئی۔"

"ہاں! یہ تو ہے۔ مگر ہے بڑا خونی فیصلہ۔ طیفے جیسے بندے کو کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک چھوڑ۔ دس گردنیں اتار سکتا ہے وہ۔ پہلے بھی کتنی ہی اتار چکا ہے اور پھر بھی کھلا پھرتا ہے۔"

"چلو! تم دعا کرو۔ یہ خیر سے فارغ ہو جائیں۔ پھر نکلتے ہیں یہاں سے۔"

"میں نہ کروں گی دعا تو اور کون کرے گا۔ یہاں سے نکل چلیں گے تو اس مولوانوں کے لمڈے سے تو نجات ملے گی کم از کم۔"

"بھئی! تمہاری کیمسٹری سمجھ میں نہیں آتیں مجھے۔۔۔ تمہیں طیفا لاٹر زیادہ برا لگتا ہے یا یہ سراج سرفراز؟"

"طیفا برا نہیں لگتا۔ اس سے ڈر لگتا ہے مجھے۔ لیکن اس سراج سے تو ایک عجیب سی چڑ ہے مجھے۔ مگر آپ مجھے اس بار طیفوں اور سراجوں کی باتوں میں الجھا کر بچ نہیں سکتے۔ خیر سے لڑکا ہوا تو سچے سونے کے کنگن لوں گی میں۔"

"سچے سونے کے نہیں، سچی چاندی کے۔"

"ارے جائیں صاحب! بڑے کاروباری بنتے ہیں۔ سونے کو چاندی میں بدل دیا۔ جائیں، جائیں ہم کچھ بھی نہیں لیتے۔ میرے لیے چاند جیسا لڑکا ہی بہت ہوگا۔"

"اوہو! تم تو برا مان گئیں۔ اچھا چلو، سونے کے کنگن فائنل ہو گئے اور بتاؤ۔"

"اور کچھ نہیں بتاتا۔۔۔ شش۔۔۔ اب خاموش ہو جائیں۔ آرہی ہے آپ کی زوجہ۔۔۔ جو سن لی تا اس نے طیفے والی بات تو مار جوتوں کے فرش کردے گی مجھے۔"

"تمہاری بولتی بھی اسی کے سامنے بند ہوتی ہے۔"

"بھاگ لگے رہیں اسے۔ سلامتی ہو اس کی۔ اللہ شان اونچی رکھے اس کی۔ اس جیسا کوئی دوسرا نہیں۔"

"ہاہا۔۔۔ بھئی تمہارے اندر کی میراثن نہیں مرتی۔ جتنی مرضی کوشش کر لو تم ریفائن ہونے کی۔ مجھے تو کبھی کبھی ڈر لگتا ہے۔ میرا بچہ تم پالوگی تو یہ جراثیم اس میں بھی ٹرانسفر کردوگی۔"

"دیکھ لینا صاحب جی! وہ ماں باپ سے زیادہ مجھ پر پڑے گا۔ دن رات تو میں ہی ساتھ ہوں آپ کی زوجہ کے۔"

"جب ہی مجھے ڈر ہے کہ ماں کے پیٹ سے نکلتے ہی "بھاگ لگے رہیں" کے نعرے نہ مارنے لگے۔"

"میراثیوں کی سنگت میں بیٹھنے والے میراثی نہ بنیں تو بھی میراثی پن آ ہی جاتا ہے ان میں بچ کر رہیے گا سرکار۔"

"بچ نہیں سکتا نا، تمہارے تیر دعا کا شکار ہو چکا ہوں، جب تک لے نہ لوں چین نہیں آتا۔"

"شش ہشش۔۔۔ چپ۔۔۔ آرہی ہے وہ۔ مار نہ کھا لینا کہیں۔"

☼ ☼ ☼

"مجھے تم سے ایک شکایت ہے ابراہیم!" انہوں نے میز پر رکھا کرسٹل کا پیپر ویٹ اٹھا کر ہاتھ میں گھماتے ہوئے اسے دیکھا۔

"میں اس پر پیشگی معذرت خواہ ہوں انکل!"

"پوچھوگے نہیں کیوں؟" انہوں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

"یقیناً" اس کی کوئی ٹھوس وجہ ہوگی۔" ابراہیم نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ ان کی طرف دیکھنا چاہ بھی نہیں رہا تھا۔ اس روز ان کے سامنے آکر ان پر نظر پڑتے ہی اسے فوری طور پر ایک ہی خیال آیا تھا۔ وہ ان چند دنوں میں ہی اچانک بوڑھے اور کمزور لگنے لگے تھے۔

"شاید انہوں نے بال ڈائی نہیں کیے۔ یا شاید انہوں نے صحت مند خوراک لینا چھوڑ دی۔" اس نے سوچا۔ لیکن نجانے کیوں اس پہلی بار کے بعد وہ ان پر دوبارہ نظر ڈال نہیں پایا۔ اسے لگا وہ جس بلال سلطان کو دیکھنے کا عادی تھا۔ اگر وہ بلال سلطان اسے دکھائی نہیں دے رہے تھے تو وہ اس شخص کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ جو اس کے سامنے بیٹھا تھا۔"

"تم نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ اس کی زندگی میں کوئی ایسی لڑکی ہے، جسے وہ بہت چاہتا ہے۔" وہ پوچھ رہے تھے اور وہ ایک ایسی بات پوچھ رہے تھے، جو ابراہیم کے لیے غیر متوقع تھی۔

"میں آپ کو یہ بات کیسے بتاتا انکل! جبکہ میں خود ایسی کوئی بات نہیں جانتا تھا۔" اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"غلط بیانی مت کرو۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ "کم از کم اب تو مت کرو اور اس لیے مت کرو کہ مجھے تم سے غلط بیانی کی امید نہیں ہے۔"

"میں بہت سوچوں۔۔۔ بہت یاد کروں۔ تب بھی مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس کی زندگی میں ایسی کسی لڑکی کی موجودگی کے بارے میں میں جانتا ہوں۔" ابراہیم کو ان کے لہجے کے تیقن پر حیرت ہو رہی تھی۔

"جہاں سے آخری بار تم اسے لے کر آئے تھے، وہاں اس کے علاوہ کون تھا۔"

"وہ۔۔۔" ابراہیم کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"ہاں! اب بھی کہو۔ تم نہیں جانتے تھے۔"

"اس نے اس وقت ایسی کوئی بات مانی نہیں تھی، اس کا کہنا تھا، وہ ان لوگوں سے یوں ہی واقف تھا۔"

"خیر! میں اس سے زیادہ اس موضوع پر بات نہیں کروں گا۔" انہوں نے گردن موڑ کر کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"انکل! وہ بارسلونا میں ہے۔ اس نے تین دن پہلے وہاں ایک ٹورسٹ کمپنی سے رابطہ کیا ہے۔ شاید وہ کہیں جانا چاہ رہا تھا۔" ابراہیم نے تیزی سے کہا۔

"ہم اس کے پیچھے جاسکتے ہیں۔ آپ اجازت دیں۔ میں جاتا ہوں اس کے پیچھے۔۔۔ ہم ابھی اسی وقت اس کو ٹریس کرسکتے ہیں۔"

ابراہیم کے خاموش ہونے کے بعد کمرے میں سوئی گرنے کی آواز تک سنائی دینے جیسے خاموشی چھائی۔ ابراہیم کے کان ان کے جواب کے منتظر تھے۔ وہ جانتا تھا وہ اسے اپنے ذہن میں ترتیب دیا کوئی ایسا منصوبہ سنانے والے تھے۔ جس کے ذریعے سعد کی پھرتیاں اور فرار ایک بار پھر دھرا کا دھرا رہ جانے والا تھا۔ وہ اس ان سنے منصوبے پر دل ہی دل میں پرجوش بھی ہو رہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بلال سلطان کا ذہن کیسا پختہ منصوبہ بنانے کا اہل تھا۔

"نہیں۔" اپنی توقع کے خلاف لفظ کان میں پڑنے پر اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ اگرچہ وہ ان کی طرف نہ دیکھنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

"نہیں۔" ابراہیم سے نظریں چار ہونے پر انہوں نے وہی لفظ دہرایا۔

"کوئی بھی اس کے پیچھے جائے گا۔ نہ ہی اس سے رابطہ کرے گا۔ نہ ہی اسے ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کرے گا۔"

"ہم۔۔۔ مگر۔" ابراہیم ان کی اس بات پر ششدر رہ گیا۔ الفاظ اس کے منہ سے ٹھیک سے نکل نہیں پا رہے تھے۔

"لوگ چلے جاتے ہیں۔ ان کے چلے جانے سے زندگیاں رک نہیں جاتیں۔ زندگی اسی طرح چلتی رہتی ہے کیونکہ اس کے لیے کسی کا اس میں سے منفی ہوجانا یا کسی کا اس میں جمع ہوجانا معمول کی بات ہے۔"

"ہم۔۔۔ مگر انکل۔۔۔ ہم لوگوں کی بات تو نہیں کررہے۔ ہم سعد کی بات کررہے ہیں۔"

ابراہیم کے منہ سے الفاظ ابھی بھی ٹھیک سے نہیں نکل رہے تھے۔ وہ شاک میں تھا۔

"میں بھی اسی کی بات کررہا ہوں صاحب زادے۔" ان کے لہجے میں وہی تیقن تھا، جو ان کے لہجے کا خاصہ ہوا کرتا تھا۔

"لیکن وہ۔۔۔" ابراہیم سٹپٹا گیا۔ "میرا مطلب ہے کہ آپ اس کے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں۔"

"میں سمجھتا تھا کہ تمام تر نظریاتی اختلافات کے باوجود وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا، لیکن اس نے ایسا کرلیا۔" وہ پیپر ویٹ میز پر رکھ کر اسے غور سے دیکھتے ہوئے اس پر انگلی پھیر رہے تھے۔

"اور یہ اس کا اپنا فیصلہ ہے۔۔۔ اور ظاہر ہے اچھی طرح سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا اس نے یہ فیصلہ۔" ان کے چہرے پر ایک بے بس سی مسکراہٹ ابھری۔ "اسے اس فیصلے پر عمل درآمد کرنے کی آزادی ملنی چاہیے۔" انہوں نے ابراہیم کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔

"مگر وہ غلط کررہا ہے۔" ابراہیم نے تیزی سے کہا۔ "وہ کنویں میں چھلانگ لگانے جائے گا تو کیا آپ اور میں اسے لگانے دیں گے؟"

"اس کا کینوس کنویں سے بڑا ہے مائی ڈیئر سن۔" وہ اسی بے بس مسکراہٹ کے ساتھ مسکرائے۔ "اس کے سامنے سمندر ہے اور وہ خود کو ایک ماہر تیراک سمجھتا ہے۔ اسے اپنے بازو آزمانے دو۔" انہوں نے یوں کہا جیسے

بات ختم کرنا چاہتے ہوں۔

ابراہیم جانتا تھا، اس سے آگے وہ اس موضوع پر ایک بھی بات نہیں کریں گے، سو جواب میں انہیں صرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ چند لمحوں بعد وہ انٹرکام اور فون پر اپنے کاروباری رابطوں کے ساتھ مصروف تھے۔

☼ ☼ ☼

وودن زادے، ایرانی النسل تھا، لیکن اس نے آنکھ امریکا میں کھولی تھی۔ انقلاب ایران کے زمانے میں اس کے دادا، دادی ترک وطن کے بعد پہلے ہالینڈ اور پھر امریکا کی ریاست نیویارک میں جا بسے تھے۔ وودن زادے کے باپ نے اپنی ہی طرح ترک وطن کرکے نیویارک پہنچی ایک ایرانی خاندان کی بیٹی سے شادی کرلی۔ دونوں خاندانوں کے درمیان ایک نکتہ مشترک تھا۔ دونوں ہی خاندان شاہ کے وفادار تھے۔ شاہ کے ساتھ جلاوطنی میں کیا بیتی، پیچھے وطن میں بچ رہے خاندان کے ساتھ کیا گزری، دونوں ہی خاندانوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ان کی نئی دنیا پرکشش تھی اور وہ اس میں رہتے ہوئے آزاد زندگی کے مزے لے رہے تھے۔

وودن زادے پیدائشی امریکی تھا۔ اس کی زبان، رہن سہن، تہذیب، ثقافت سب امریکیوں کی سی تھی، مگر وودن زادے اپنے ماں، باپ سے زیادہ اپنے دادا، دادی اور نانا سے مانوس تھا۔ ویک اینڈز اور لمبی تعطیلات کے دوران وہ اپنے دادا یا نانا کے پاس جاکر رہا کرتا تھا، جو اس وقت اس عمر کو پہنچ چکے تھے۔ جب ترک وطن کرکے آئے لوگوں کو وطن کی یاد ستانے لگتی تھی۔ دادا اور نانا اس کو "ہوم" کی کہانیاں سناتے اور وہ ایک ان دیکھے وطن کی رومان پرور کہانیوں کا اسیر ہوتا رہا۔ اس کے دادا کا انتقال اس وقت ہوا، جب وہ تیئیس برس کا تھا۔ دادا کو وطن کی یاد کے علاوہ ایک اور چیز بہت مرغوب تھی۔ وہ چیز "سکی انگ" (Skieng) کہلاتی تھی۔ دادا کا یہ شوق بھی وودن زادے کو منتقل ہوا۔ جس وقت دادا کا انتقال ہوا، وہ ایک انٹراسٹیٹ سکی ڈائیونگ مقابلے میں شرکت کررہا تھا۔ دادا کی آخری رسومات میں تو وہ شریک نہیں ہوسکا۔ لیکن اس نے وہ مقابلہ جیت کر اس جیت کو دادا کے نام معنون کرتے ہوئے انہیں ایک طرح کا خراج عقیدت پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔

دادا کے جانے کے کچھ عرصہ بعد نانا اور دادی بھی دنیا سے چلی گئیں۔ وودن کے ماں اور باپ میں شادی کے ستائیس برس بعد علیحدگی ہوگئی۔ وودن اس کے دو بھائی اور ایک بہن ہائی اسکولز، کالجز سے نکل کر غم روزگار میں مصروف ہوگئے۔ دادا کا "ہوم" اور "سکی ڈائیونگ کا خبط" ایک خوب صورت خواب بنتے چلے گئے۔

وودن کو ایک مقامی سافٹ ویر کمپنی میں معمولی سی نوکری ملی۔ اپنی محنت پسند مزاج کی وجہ سے اگلے پانچ سالوں میں وہ اسی کمپنی میں ترقی کرتا کرتا ایک اچھے عہدے پر پہنچ گیا۔ زندگی میں ذرا سی سہولت آنے کے بعد اسے دادا کا "ہوم" کم، لیکن "سکی ڈائیونگ" پھر سے یاد آنے لگے۔ کسی زمانے میں وہ ایک پیشہ ور سکی ڈائیور بننا چاہتا تھا۔ مگر مسائل نے اسے ایسا کرنے نہیں دیا تھا۔ جب مالی آسودگی آنے لگی تو اس کا وقت آگے جاچکا تھا۔ وہ مشق نہ ہونے کے باعث مہارت کی حد سے باہر جاچکا تھا اور اب یہ جنون صرف شوق کی حد تک ہی پالا جاسکتا تھا۔ اس شوق کو پورا کرنے کے لیے وہ ہر سال موسم سرما میں کسی ایک ایسے ٹرپ کا اہتمام ضرور کرتا، جس میں مختلف یورپین ملکوں میں اسے سکی ڈائیونگ کے زیادہ سے زیادہ مواقع مل سکتے تھے۔ اس سال وہ اسی سلسلے میں انگلینڈ میں تھا اور اس بار ڈرہم سکی ڈائیونگ ایونٹ اس کے شوق کی منزل تھا۔ ڈرہم میں اس کی ملاقات ایک ایسے نوجوان سے ہوئی، جو دادا کے "ہوم" کے ہمسایہ ملک سے آیا تھا اور پہلی بار کسی سکی ڈائیونگ ایونٹ میں شامل ہو رہا تھا۔

"میں وودن زادے ہوں نیویارک سے۔" موٹیل میں ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھے اس نوجوان سے وودن نے اپنا تعارف کرایا۔

”وودن زادے اور نیویارک۔“ جواب میں اس نوجوان نے ایک چمکتی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔
”دونوں ناموں میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔“
”اس لیے کہ میرے آباؤاجداد کا وطن ایران تھا۔“ وودن زادے اس کی بات پر بلند آواز میں ہنستا ہوا بولا۔
”اوہ! خوشبوؤں اور پھولوں کا ملک ایران۔“ اس کے مخاطب نے بے اختیار کہا تھا۔
”ہو سکتا ہے۔“ وودن نے شانے اچکائے۔ ”میں اس کے بارے میں جو جانتا ہوں، وہ بہت کم ہے۔“
”لیکن میں اس کے بارے میں جو جانتا ہوں، وہ کافی زیادہ ہے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”ایران میرے وطن کا ہمسایہ ہے۔ میں پاکستان سے سعد سلطان ہوں۔“
پاکستان اور سعد سلطان سے وودن کا یہ پہلا تعارف تھا۔

☼ ☼ ☼

”میں ابھی یہاں کے سب ایسے انسٹی ٹیوٹ دیکھ رہی ہوں، جہاں سے مجھے واقعی کچھ سیکھنے کا موقع مل سکتا ہے۔ ابھی میں نے باقاعدہ کوئی انسٹی ٹیوٹ جوائن نہیں کیا ہے ممی۔“ ماہ نور کان سے فون لگائے فائزہ کو بتا رہی تھی۔
”نہیں! مجھے نہیں لگتا، میرا یہاں قیام زیادہ لمبا رہے گا۔ جس پروجیکٹ کی تکمیل کے لیے میں یہاں آئی تھی، وہ پراجیکٹ کسی اور کے پاس چلا گیا ہے۔ میں تو بس اب رہی سہی معلومات ہی حاصل کر رہی ہوں اس کے متعلق۔“ اس نے نیچی آواز میں کہا۔
”میں جانتی ہوں، آپ کو میری بات آپ کی سمجھ میں نہیں آرہی ہوگی۔ دراصل یہ ساری ٹیکنیکل باتیں ہیں۔ آپ کے واقعی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ آپ فکر مت کریں۔ میں سمسٹر شروع ہونے سے پہلے آجاؤں گی۔ ابھی میں یہاں بہت مزے میں ہوں۔ مامی امریکا گئی ہوئی ہیں۔ آپ کو پتا ہی ہے، فرقان ماموں نے مجھے ہر طرح کا کمفرٹ دیا ہوا ہے۔ ایک چھوٹی گاڑی انہوں نے مجھے دے دی ہے۔ تاکہ مجھے آنے جانے میں آسانی رہے۔ کھانا وانا سب ٹائم پر ملتا ہے۔ آپ فکر مت کیا کریں۔“
اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ابراہیم کے دیے ہوئے ٹائم پر اس کے جم میں پہنچ گئی تھی اور یہاں پہنچتے ہی فائزہ کا فون آنے پر اسے ان سے تسلی بھری گفتگو کرنی پڑی تھی۔ سامنے سے آتے ابراہیم کو دیکھ کر اس نے فائزہ کو خدا حافظ کہا اور فون بند کر دیا۔
”ہیلو!“ ابراہیم نے اس کے قریب آکر کہا۔ ”تم وقت کی خاصی پابند لگتی ہو۔“
”ہاں! شاید۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ اور بات ہے کہ وقت پھر بھی میرے ہاتھ نہیں آتا۔ آگے نکل جاتا ہے۔“
”اچھا!“ ابراہیم کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی تھی۔ اس لیے وہ بس مروّت ہی میں ہنسنے لگا تھا۔
”آؤ! کوئی کولڈ ڈرنک، جوس وغیرہ لیتے ہیں۔ پھر چلتے ہیں۔“ وہ مین ہال سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔
”نہیں! کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بس چلتے ہیں۔“ وہ بھاگتی ہوئی ٹریڈ مل پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔
”یہ ٹریڈ مل جو تم دیکھ رہی ہو۔ یہ سعد کے لیے ریزرو تھی۔“ ابراہیم کو یاد آیا۔ ”وہ ہمیشہ اسے ہی استعمال کرتا تھا۔“
”چلیں؟“ ماہ نور نے اس کی بات سن کر دل کی تیز ہوتی دھڑکن کو نظر انداز کر کے کہا۔
”ہاں! چلو، چلتے ہیں۔“ ابراہیم اس سے آگے چلتا ہوا جم سے باہر نکل آیا۔

☼ ☼ ☼

”اللہ اللہ بھائی کے۔ کان کاٹوں نائی کے۔“
”ہاہا۔ بھئی! بچے کو بہلاتے بہلاتے نائی کے کان کیوں کاٹنے لگیں؟“
”نائی کم بخت نے ہی تو سر کے پہلے بال اتارتے اتارتے لگتا ہے، زخم لگا دیا ہمارے شہزادے کو۔ جب ہی روئے چلا جا رہا ہے۔“
”نہیں! جب سے تم نے اسے گود میں لیا ہے۔ تب سے روئے چلا جا رہا ہے۔“
”پھر تو نائی کے نہیں، میراثی کے کان کٹنے چاہئیں۔“
”اڑالو اڑا لو مذاق تم دونوں میراثیوں کا۔ ایک دن دیکھنا! یہ میراثی ہی ہوں گے۔ تمہاری طرف بڑھتے وار اپنے بچے پر لینے والے۔“
”سن لو۔ بہادری اور وفاداری کے دعوے کر رہی ہیں محترمہ۔“
”اس کی باتیں رہنے دیں۔ اسے اپنے علاوہ ساری دنیا کم بخت ہی لگتی ہے۔ ہر وقت مولوانوں کے بے چارے لمحے کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ وہ کم بخت، نائی کم بخت، دکان والے کم بخت، مہترانی کم بخت۔ اللہ جانے کوئی بلند بخت بھی ہے اس کے نزدیک کہ نہیں۔“
”ہے کیوں نہیں بلند بخت۔ ہمارا یہ شہزادہ ہے نا بلند بخت۔ اللہ اس کو بھاگ لگائے۔ اس کی شان اونچی کرے۔“
”جس دن سے یہ پیدا ہوا ہے، اٹھائے اٹھائے پھرتی رہتی ہو۔ اسے گود کی عادت ہو گئی نا تو بستر پر ڈالنا دشوار ہو جائے گا۔“
”اچھا! ابھی تو اسے مجھے دے دو۔ میں دو گھڑی اٹھالوں گود میں۔ پھر میرے جانے کا ٹائم ہو جائے گا۔“
”یہ لیں بھئی، عجیب والد پائے ہیں ہمارے شہزادے نے۔ بے چارہ دنیا میں جس وقت آیا، ابا اس وقت بھی موجود نہیں تھے۔ اس کے کان میں اذان دینے کی سعادت بھی اس حبشی پہلوان سراج سرفراز کو ہی ملنی تھی۔“
”ابا موجود ہوتے۔ ضرور موجود ہوتے۔ تم ہی نے بھگایا تھا اسی شام طفیلے لانگری سناؤنیاں سنا کر۔“
”ہاں تو ٹھیک ہی کیا تھا نا۔ خود اپنی آنکھوں سے اسے ننگا خنجر لیے بڑھکیں مارتے سنا تھا۔“
”آہ نہیں گیا پھر وہ کسی کی گردن کاٹنے۔ تم خوامخواہ ہی میرے معصوم سے شوہر کو یہاں سے بھگانے کے چکر میں رہتی ہو۔“
”احتیاط لازم ہے بیگم صاحب۔“ اور آپ نئے نویلے ابا جان! صرف باتوں پر نہ ٹرخایئے، روکڑا نکالیے روکڑا۔ میں بوندی کے لڈو منگواؤں شیریں محل سے۔ منہ تو میٹھا کرائیے۔ کنگن کی بات بعد میں کروں گی۔“
”ہاں ہاں! جتنے چاہے لڈو کھاؤ۔ یہ لو پیسے۔ اب بتاؤ بھلا لڈو منگوانے کے لیے سراج سرفراز کے سوا کوئی دوسرا ہے تمہارے پاس؟“
”تنا بھی نہیں کرے گا تو صبح سے شام پڑا چارپائی ہی توڑے گا کیا؟ چلیں جی! میں چلی لڈو منگوانے۔ تم دونوں میاں بی بی محبت اخلاص کی باتیں کر لو چند گھڑیاں۔ اور میرا شہزادہ مجھے دے دو۔“ اس نے اسے لینے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عنیزہ سید

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی' ہمن نادیہ سے بات ہوئی' جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

بیسویں قسط

"اللہ اللہ بھائی کے۔۔۔ کان کاٹوں نائی کے۔"

"ہاہا۔۔۔ بھئی! بچے کو بہلاتے بہلاتے نائی کے کان کیوں کاٹنے لگیں؟"

"نائی کم بخت نے ہی تو سر کے بال اتارتے اتارتے لگتا ہے زخم لگا دیا ہے ہمارے شہزادے کو' جب ہی روئے چلا جا رہا ہے۔"

"نہیں۔۔۔ جب سے تم نے اسے گود میں لیا ہے' تب سے روئے چلا جا رہا ہے۔"

"پھر تو نائی کے نہیں' میراثی کے کان کٹنے چاہئیں۔"

"ڈالو۔۔۔ اڑالو مذاق' تم دونوں میراثیوں کا۔ ایک دن دیکھنا! یہ میراثی ہی ہوں گے تمہاری طرف بڑھتے وار اپنے سینے پر لینے والے۔"

"سن لو۔۔۔ بہادری اور وفاداری کے دعوے کر رہی ہیں محترمہ۔"

"اس کی باتیں رہنے دیں۔ اسے اپنے علاوہ ساری دنیا کم بخت ہی لگتی ہے۔ ہر وقت مولوانوں کے بے چارے لمڈے کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ وہ کم بخت' نائی کم بخت' دکان والے کم بخت' مہترانی کم بخت۔۔۔ اللہ جانے کوئی بلند بخت بھی ہے اس کے نزدیک کہ نہیں۔"

"ہے کیوں نہیں بلند بخت۔۔۔ ہمارا یہ شہزادہ ہے نا بلند بخت۔۔۔ اللہ اس کو بھاگ لگائے۔ اس کی شان اونچی کرے۔"

"جس دن سے ہوا ہے' اٹھائے اٹھائے پھرتی رہتی ہو۔ اسے گود کی عادت ہو گئی نا تو بستر پر ڈالنا دشوار ہو جائے گا۔"

"اچھا۔۔۔ ابھی تو اسے مجھے دے دو۔ میں دو گھڑی اٹھالوں گود میں۔ پھر میرے جانے کا ٹائم ہو جائے گا۔"

"یہ لیں بھئی! عجیب والد پائے ہیں ہمارے شہزادے نے۔۔۔ بے چارہ جس وقت دنیا میں آیا' اس وقت بھی موجود نہیں تھے۔ اس کے کان میں اذان دینے کی سعادت بھی اس حبشی پہلوان سراج سرفراز کو ہی ملنی تھی۔"

"ابا موجود ہوتے۔۔۔ ضرور موجود ہوتے' تم ہی نے بھگایا تھا اسی شام طیفے لاٹ کی سناؤنیاں سنا کر۔"

"ہاں تو ٹھیک ہی کیا تھا نا۔ خود اپنی آنکھوں سے اسے ننگا خنجر لیے بڑھکیں مارتے سنا تھا۔"

"انہیں کیا پھر وہ کسی کی گردن کاٹنے۔۔۔ تم خواہ مخواہ ہی میرے معصوم شوہر کو یہاں سے بھگانے کے چکر میں رہتی ہو۔"

"احتیاط لازم ہے بیگم صاحب! اور آپ سنئے تو لیے ابا جان۔۔۔ صرف باتوں پر نہ ٹرخایئے' روکڑا نکالیے روکڑا۔ میں بوندی کے لڈو منگواؤں شیریں محل سے۔ منہ تو میٹھا کرائیے۔ کنگن کی بات بعد میں کروں گی۔"

"ہاں' ہاں جتنے چاہے لڈو کھاؤ' یہ لو پیسے۔ اب بھلا جاؤ گے لڈو منگوانے کے لیے سراج سرفراز کے سوا کوئی دوسرا ہے تمہارے پاس؟"

"تو اتنا بھی نہیں کرے گا؟ صبح سے شام پڑا بس چارپائی ہی توڑے گا کیا؟ چلیں جی ۔۔۔۔۔ میں چلی لڈو منگوانے۔۔۔ تم دونوں میاں' بی بی اخلاص کی باتیں کر لو چند گھڑیاں۔۔۔ اور میرا شہزادہ مجھے دے دو۔" اس نے لینے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔

"ارے یہ کیا ہوا۔۔۔ یہ کیسی آواز ہے؟"

"لگتا ہے' صحن میں کوئی کودا ہے۔"

"ٹھہرو! تم دونوں ادھر ہی بیٹھے رہو۔ میں دیکھتی ہوں۔ کوئی ضرورت نہیں ہلنے کی۔ ارے۔۔۔ ہائے میرے ربا! یہ تو طیفا لاٹ ہے۔ سچ مچ صحن میں کود آیا۔ جلدی کرو۔ میرے بھائی! یہ پچھلی ڈیوڑھی میں ملکی بیکنے کے گھر کا

دروازہ کھلتا ہے۔ کچھ نہ سوچو' کچھ نہ بولو' بس نکل چلو ادھر سے۔"

"اف وہ! جلدی کرو جلدی۔ جوتے ہاتھ میں پکڑ لو' نکلو بس جلدی سے۔"

"شکر ہے مان گیا۔ ضد نہیں کی' نکل گیا' پر۔۔۔ آہ۔۔۔ چھوڑو مجھے۔۔۔ آہ! میری گردن کاٹے کو دبا رہے ہو۔۔۔ ہائے' میری جان نکل گئی۔"

چیخیں۔۔۔ شور۔۔۔ گرنے کی آوازیں۔

☼ ☼ ☼

وہ سڑک سے بنی اس جھونپڑی کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ دوسری مرتبہ یہاں آئی تھی۔ پہلی بار جب وہ آئی تھی تو اس جھونپڑی اور جھونپڑی والے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی بس اپنے ہمراہی کے ساتھ چلی آئی تھی۔ جھونپڑی والے کی باتوں سے اس کا ذہن الجھ گیا تھا۔ مجال ہے جو ایک بات بھی پلے پڑی ہو۔ یہاں سے واپس جانے کے بعد اس نے کبھی ان باتوں کو یاد کیا نہ ان پر غور کیا کیونکہ یہاں سے واپسی کا راستہ دل فریب تھا' خوابوں' خواہشوں' تمنا اور چاہ کا راستہ۔ وہ اس راستے کی دل فریب اور حیران کن منظروں میں کھو کر رہ گئی تھی۔ جب ہی تو اس دوران اسے جھونپڑی یاد آئی نہ جھونپڑی والا' اب راستے کی اندھی گلی میں گم ہوئی تو اس سے باہر نکلنے کی سعی میں اسے ایک خیال اس جھونپڑی اور جھونپڑی والے کا بھی آیا تھا۔

"کیا پتا روٹی کا کوئی ٹکڑا' راستے کی نشان دہی کے لیے اس جھونپڑی کے باہر یا اندر پڑا ملے جس کو حاصل کرنے کے بعد اندھی گلی سے چھٹکارا ممکن ہو جائے۔"

اس نے سوچا تھا۔ جب ہی ابراہیم کے ساتھ یہاں تک پہنچ گئی تھی۔

"وہ لڑکا نظر نہیں آ رہا جو آگ کے الاؤ پر دیگچہ رکھے کاڑھا بنا رہا ہوتا تھا' پیالہ نہ پینے پر گالیاں اور کوسنے سناتا تھا۔"

ابراہیم نے آگ پر الٹا توا رکھے ایک وقت میں کئی روٹیاں بناتے لڑکے سے پوچھا۔ لڑکا شکل سے سنجیدہ اور کم گو نظر آتا تھا۔

"یہ فقیر کا ڈیرہ ہے باؤ صاحب! یہاں بالکے آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہاں آنے والوں کو لنگر سے غرض ہونی چاہیے لنگر پکانے والے سے نہیں۔" اس نے پرات سے پیڑا اٹھاتے ہوئے بردباری سے جواب دیا۔

"اچھا جی!" ابراہیم استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا۔ "یہ کیسا لنگر ہے۔ جس میں کاڑھا پینے کو ملتا ہے اور اب یہ خالی روٹیاں۔"

"کاڑھا اور شربت تبرک ہیں باؤ جی' مذاق مت اڑائیں ان کا جن کو فیض نہیں ملنا ہوتا وہ پا کر بھی محروم رہ جاتے ہیں' کٹورا ہاتھ میں پکڑا ہوتا ہے لیکن لبوں تک نہیں جا پاتا۔ لڑکے نے توے پر پڑی روٹیوں کو ہاتھ میں پکڑے کپڑے سے دباتے ہوئے تیزی سی گھمایا اور دو تین روٹیاں ایک ساتھ اتار کر قریب رکھی بڑی سی چنگیر میں رکھ دیں۔

"ہوں" ابراہیم نے اسی استہزائیہ انداز میں اس لڑکے کو دیکھتے ہوئے سر ہلا دیا۔ "میں نے دو گھونٹ پیے تھے کاڑھے کے اور وہ جو میرے ساتھ تھا' وہ آدھا کٹورا پی گیا تھا' فیض! مجھے ملا نہ اسے' تھوڑا نہ زیادہ۔"

"سچ کہہ رہے ہیں آپ' جب ہی آج پھر یہاں موجود ہیں۔" لڑکے نے رسان سے کہا اور مزید روٹیاں بنانے میں مشغول ہو گیا۔

"میرا خیال ہے ہم جس کام کے لیے آئے ہیں' وہ کرلیں۔" ماہ نور نے ابراہیم کو یاد دلایا۔ ابراہیم اور اس لڑکے

کی گفتگو کے دوران وہ کئی پرانے منظروں کو یاد کرنے میں مصروف تھی۔ اس وقت اور اس وقت کا درمیانی وقت کیا تھا ایک کیفیت "گومگو" امید و بیم "انتظار اور پھر کچھ کھو دینے اور ہمیشہ کے لیے کھو دینے کا احساس۔" اس نے سوچا تھا۔ کبھی کبھی ایک وقت اور دوسرے وقت کے درمیانی عرصہ میں کیسے کیسے شادیانے بجتے اور کیا کیا قیامتیں گزر جاتی ہیں وہ سوچ رہی تھی۔

"اوئے تم کس کے لیے روٹیوں کا یہ ڈھیر پکا رہے ہو؟" ابراہیم نے اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا "اس ویرانے میں کون آئے گا خالی روٹیوں کا لنگر کھانے" آوارہ کتوں، بھیڑیوں اور ہوا میں اڑتی اندھی چمگادڑوں کے سوا کون آتا ہوگا یہاں یہ روٹیاں کھانے۔

"بڑے کوتاہ نظر ہو صاحب آپ!" لڑکا زیر لب مسکرا کر بولا۔ "یہاں تو ایک روٹی کا چوتھائی حصہ لینے کو بھی ترستے ہیں لوگ۔"

ابراہیم نے مسکرا کر ماہ نور کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اس لڑکے کی ہوائی باتیں سنیں تم نے۔

ماہ نور کو اس وقت اس لڑکے کی باتوں میں کوئی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی نہ ہی اس کے دعووں میں، وہ جلد سے جلد سرکی کی جھونپڑی میں بیٹھے اس فقیر سے ملنا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ٹھیک ہے، یہ کوئی بری علامت نہیں ہے، لیکن اس قدم کے اٹھانے کی کوئی منطق مجھے بھی تو سمجھاؤ لڑکی۔" ڈاکٹر رضا حسین نے قرمزی جلد والی کتاب کی جلد پر سنہری الفاظ میں چھپے عنوان پر انگلیاں پھیرتے ہوئے نادیہ سے پوچھا۔

"یہ۔" نادیہ نے اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر اس اسکارف کی طرف اشارہ کیا جس نے اس کے سر کو ڈھک رکھا تھا۔ "منطق تو اس کی کوئی نہیں ہے، صرف میرے ذہن کی سوچی ایک ترکیب ہے۔"

"کیسی ترکیب؟" رضا حسین نے دائیں آنکھ کی ابرو اپنی جگہ سے تھوڑا اوپر چڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہ کسی نئے راستے کی طرف اٹھتا پہلا قدم ہے یا تم سمجھتی ہو کہ ایک عالمگیر مذہب کی سچی پیروکار بننے کے لیے سب سے پہلے اپنا سر اور جسم ڈھانکنا ضروری ہے یقین۔ میرا مطلب ہے کہ خود کو یقین دلانے اور اس یقین کو ایمان میں ڈھالنے کا درجہ ثانوی ہے۔"

"نہیں۔ میں ایسا کچھ نہیں سمجھتی۔" نادیہ نے سر ہلایا۔ "ابھی تک میں جس اسٹیج پر پہنچی ہوں وہ یہ ہے کہ ایک اللہ ہے، ایک ایسی غیر مرئی ہستی جس کے پاس سب طاقت ہے، سب کنٹرول ہے، وہ ایک ایسی طاقت ہے جس کے ہونے سے انکار میرے لیے ممکن نہیں اور یہ کہ۔" اس نے مناسب الفاظ کا انتخاب کرنے کے لیے توقف کیا۔

"اور یہ کہ وہ جو ایک غیر مرئی طاقت ہے اور وہ یقیناً" ہے "اس کا پیغام مجھے اس کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیا۔ اس پوری کائنات میں کیا کچھ موجود ہے، اس کائنات کو وجود میں لانے کا سبب کیا تھا اس کی ضرورت کیوں پیش آئی، اس میں موجود سب چیزوں کا نظام کیسے چلتا ہے اور کون چلاتا ہے اس کا علم بھی مجھے اسی ہستی نے دیا مجھے انسان ہونے کی حیثیت سے اس دنیا میں کیسے کب کہاں کیا کرنا ہے۔ کیا کرنا چاہیے۔ اس کا سبق بھی مجھے اسی ہستی نے پڑھایا جو خود اس کائنات کی تخلیق کا سبب تھی جس کے لیے یہ کائنات وجود میں آئی۔"

"بہت خوب!" ڈاکٹر رضا حسین نے سر ہلایا۔ "گویا تم نے معلول سے علت کو پہچانا۔"

"ہاں شاید ایسا ہی ہے۔"

"شاید!" رضا حسین چونکے "شاید کے لفظ میں تو شک کا عنصر جھلکتا ہے، بے یقینی کا رنگ نمایاں ہونے لگتا ہے۔"

"بے یقینی مجھے ان سب باتوں پر نہیں، اپنے فہم کی پختگی پر ہے۔" نادیہ نے سادگی سے کہا۔ "ہو سکتا ہے میری سمجھ ابھی ناپختہ ہو، ہو سکتا ہے میں ابھی پہچان کی اصل منزل سے بہت دور ہوں، لیکن اتنا یقین ضرور ہے کہ ایک راستہ ضرور میرے قدموں تلے آچکا ہے، اب پہلے کی سی وہ کیفیت نہیں ہے کہ رنگ برنگ راستوں پر اترنے چڑھنے کا عمل جاری ہو، اور ذہن الجھن کا شکار ہو کہ میرا راستہ کون سا ہے۔"

"بہت اچھے۔" رضا حسین کو جیسے اس کے جواب سے خوشی محسوس ہوئی تھی "لیکن یہ اسکارف؟" انہوں نے نادیہ کے سر کی طرف اشارہ کیا "ہم غالباً" اس کی وجہ جان رہے تھے۔"

"ہاں یہ ... یہ میں نے اس لیے پہنا ہے کہ مجھے ایک الگ شناخت کا احساس رہے، میرا خیال ہے کہ ایک راستے کو پکڑ لینے کی بنیادی شرط یقین اور ایمان تو ہے ہی لیکن ایک الگ شناخت ہر دم انسان کو یہ احساس دلاتی رہتی ہے کہ وہ اس ہجوم سے مختلف ہے جو اس کے اردگرد ہے۔"

"لیکن بغیر پوری طرح سمجھے شناخت بنانے کا کیا فائدہ۔" ڈاکٹر رضا حسین نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ آنے والے وقت میں کبھی تمہیں احساس ہو کہ جو تم نے سمجھا اصل میں ویسا نہیں ہے یا پھر یہ کہ یہ وہ راستہ نہیں جس کی تمہیں تلاش تھی، پھر تم کیا کرو گی؟ شناخت بدلنے کے عمل سے گزرو گی، اس کو سر سے اتار پھینکو گی واپسی کا سفر شروع کرو گی اور اسی مقام پر پہنچ جاؤ گی جہاں سے چلی تھیں، ایک نئے سفر کے آغاز کے لیے؟"

"نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔" نادیہ کے لہجے میں یقین جھلک رہا تھا "آپ نے خود ہی تو قیاس کیا کہ میں معلول سے علت تک پہنچی ہوں۔" وہ ہلکا سا مسکرائی "دنیا کے سو عظیم انسانوں کی تاریخ، شخصیت اور زندگی کے حالات و واقعات پڑھنے کے بعد جو شخصیت میرے اپنے خیال میں مجھے عظیم ترین محسوس ہوئی اور جس کے بارے میں پڑھ کر مجھے لگا کہ وہ جو کچھ سکھا رہی ہے اسے جھٹلانا ناممکن ہے، اور اگر وہ شخصیت یہ کہتی ہے کہ ایک خدا ہے تو مجھے بغیر استدلال کے مان لینا چاہیے کہ وہ عظیم انسان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پھر اس کے بعد، میرا خیال نہیں کہ کبھی مجھے واپسی کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔

"مجھے اچھا لگا نادیہ! بہت اچھا لگا۔" ڈاکٹر رضا حسین نے بے ساختہ کہا۔ وہ نادیہ کی یہ بات سن کر اتنا پرجوش اور خوش ہو گئے تھے کہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

"مجھے سب سے اچھی بات یہ لگی کہ تم نے کسی وعظ، کسی نصیحت، کسی سبق کو سن کر اپنی راہ متعین کرنے کے بجائے اپنے فہم اور استدلال کو استعمال کرنے کی کوشش کی اور اپنی شناخت حاصل کی میں ایسا ہی چاہتا تھا۔ اسی لیے درس و تدریس اور وعظ و نصیحت سے کنارہ کرتا رہا۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے اس اجتناب پر کئی بار تمہارا دل میری طرف سے برا ہوا، لیکن یقین جانو میں ایسا ہی چاہتا تھا۔" انہوں نے نادیہ کو یقین دلانے کے انداز میں کہا۔

"میں جانتی ہوں، لیکن جو کتب آپ نے مجھے پڑھنے کے لیے دیں، کیا ان کے انتخاب میں ایک ارادہ، ایک کوشش شامل نہیں تھی۔" اس نے نظریں اٹھا کر ڈاکٹر حسین کی طرف دیکھا۔

"ہاں یقیناً" اور وہ اس لیے تھی کہ مجھے اندازہ تھا کہ لاشعوری طور پر تم اس طرف جھکاؤ رکھتی ہو، میں نے وہ کتب تمہیں اس لیے دیں تاکہ تمہیں کوئی ابہام نہ رہے، شعوری یا لاشعوری رجحان کی وجہ سے تم وقتی طور پر ایک طرف نہ جھک جاؤ، ایسا جھکاؤ جس پر بعد میں تمہیں پچھتاوا ہو۔"

"میرے لیے دعا کیجیے گا ڈاکٹر صاحب!" نادیہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا "کائنات جیسی وسعت رکھنے والے اس موضوع پر کچھ حاصل کر سکوں، کیونکہ ایک قدم آگے بڑھانے پر مجھے روشنی کی تیز کرنیں اپنی جانب آتی

محسوس ہوتی ہیں' ایسی کرنیں جو نئی حقیقتوں کو منور کرتی ہیں اور میں اب تک کی اپنی کوتاہ بینی پر نئے پچھتاووں کا شکار ہو جاتی ہوں۔"

"پچھتاووں کا شکار ہونے کے بجائے منور ہوتی حقیقتوں کا نظارہ کرنے اور انہیں سمجھنے کی کوشش کیا کرو' تمہارے قدم تیزی سے آگے بڑھنے لگیں گے۔" ڈاکٹر رضا نے مسکراتے ہوئے کہا "جتنے برسوں سے میں یہاں رہا ہوں' اتنے برسوں میں میرے پاس آنے والے لوگوں میں تم پانچویں ایسی انسان ہو' جس نے اپنے فہم اور استدلال کے بل پر کسی حقیقت کو پایا ہے۔ میرے نزدیک ایسے لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں۔"

"جب انسان فیصلہ کر کے چلتا ہے کہ اسے زندگی کا کوئی راستہ حاصل کرنا ہے تو اللہ وہ راستہ اسے ضرور عطا کرتا ہے' کیونکہ اسے اپنے بندے کا ارادہ اور لگن اچھی لگتی ہے۔"

"چاہے انسان اپنے لیے کوئی بھی راستہ حاصل کرنا چاہے۔" نادیہ نے رک کر سوال کیا۔

"انسان کی فہم اور استدلال کا کیا ہے' وہ تو کوئی بھی راستہ منتخب کر سکتی ہے' میں انسان کے ارادے اور لگن کی بات کر رہا ہوں' جو اللہ کو پسند آجائے تو کامیابی مقدر بن جاتی ہے۔" ڈاکٹر رضا نے نرمی سے کہا۔

"شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" نادیہ نے کچھ دیر ان کی بات پر غور کرنے کے بعد سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اس شاید سے یقینا" تک پہنچنے کے لیے تمہیں کافی فاصلہ طے کرنا ہو گا۔" ڈاکٹر رضا نے نادیہ کے شاید پر بے اختیار مسکراتے ہوئے کہا "میں تمہارے لیے دعا گو ہوں کہ یہ فاصلہ طے کرتے ہوئے نہ تمہارا سانس پھولے نہ تمہیں تھکن محسوس ہو۔"

نادیہ نے ایک بار پھر سر ہلایا اور ڈاکٹر رضا کو خدا حافظ کہہ کر ان کے کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس عمارت سے جہاں ڈاکٹر رضا کا کلینک تھا۔ باہر دن روشن تھا' دوپہر کی ہلکی دھوپ نے ہر طرف اپنی روشنی بکھیر رکھی تھی۔ لندن کے باسیوں کے لیے وہ ایک خوشگوار دن تھا جب ہی اس کے سامنے پھیلے راستے پر آنے جانے والے اکثر لوگوں کے چہرے پر سکون اور مزاج خوشگوار محسوس ہو رہے تھے۔

"یہاں سے دور ہیلسنکی کے چند روزہ موسم بہار میں اپنی نوکری اور پڑھائی کے اوقات کار میں توازن پیدا کرتا شیکھر اس وقت کیا کر رہا ہو گا۔" اس کے ذہن میں اچانک خیال آیا۔

"یقینا" وہ آنے والے ویک اینڈ کو اپنی مہینے بھر کی ذرا سی بچت کے ذریعے بھرپور طریقے سے منانے کے خوابوں میں گم ہو گا۔ اس کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ بکھری۔

"کسی بھی انسانی فکر سے آزاد وہ زندگی کیسی ہے جو شیکھر گزار رہا ہے' کیا میں کبھی اسے بتا پاؤں گی کہ بے سمت چلنے والے مسافر کی زندگی زیادہ بہتر ہے یا کسی منزل کو ذہن میں رکھ کر ایک متعین راستے پر چلنے والے مسافر کی۔ میں اسے بتا تو پاؤں لیکن سمجھا بھی نہ پاؤں شاید۔"

اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے سوچا اور اپنے شولڈر بیگ کا اسٹریپ ہاتھ میں مضبوطی سے تھام کر آگے بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو' کیا یہ فاطمہ ذوالفقار کا نمبر ہے؟"

"آپ کون؟"

"میں جو بھی ہوں' پلیز آپ صرف اتنا بتا دیں کہ کیا یہ فاطمہ ذوالفقار کا نمبر ہے۔"

"نہیں' میں معذرت خواہ ہوں' یہ فاطمہ کا نمبر نہیں ہے۔"

"اوہ۔ پھر یہ کس کا نمبر ہے اور میری ڈائری میں فاطمہ کے نام سے کیوں لکھا ہے' شاید میں بہت لاپرواہ ہوں یا شاید میں بہت بھلکڑ ہوں۔"

"شاید آپ یہ دونوں ہوں' لاپرواہ بھی اور بھلکڑ بھی۔"

"اگر میں ایسی ہوں تو پرواہ کیوں کر رہی ہوں' بھول کیوں نہیں جاتی۔"

"یہ سوال تو آپ خود اپنے آپ سے کریں محترمہ! مجھے البتہ یہ ضرور بتا دیں کہ آپ فاطمہ سے کس سلسلے میں بات کرنا چاہتی تھیں؟"

"نہیں رہنے دیں' جب یہ اس کا نمبر ہے ہی نہیں تو بتانے کی کیا ضرورت ہے۔" دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ خدیجہ نے چونک کر فون کان سے الگ کر کے نظروں کے سامنے کیا اور پھر آخری کال کا نمبر دوبارہ سے دیکھنے لگیں۔

"نامعلوم نمبر ہے۔" انہوں نے چشمہ آنکھوں سے اتارا "اگر محترمہ دو منٹ صبر کرتیں تو میں ان کو بتاتی کہ یہ فاطمہ کا تو نہیں خدیجہ کا نمبر ہے' خدیجہ جو فاطمہ کی بہن ہے۔ اور شاید میں واپس کال کر کے ان کو خود بھی بتا دیتی لیکن اس وقت تو میرے فون میں پیسے بھی ختم ہو چکے ہیں اور بجلی بھی۔"

انہوں نے سر ہلاتے ہوئے یاد کیا اور فون واپس بیگ میں رکھ دیا۔ وہ اس وقت بجلی کا بل ادا کرنے اور پنشن لینے کے لیے بینک میں بیٹھی تھیں۔ بینک منیجر سے ان کی پرانی علیک سلیک تھی' اس کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہو کر انہیں وقت گزرنے کا اندازہ نہیں ہوا۔ بینک سے نکل کر انہیں گوشت' سبزی اور پھل خریدنے تھے اور اس خریداری میں دکانداروں سے مول تول کرنا ان کی پرانی عادت تھی۔ ان کاموں سے فارغ ہوتے اور راستے بھر کے ٹریفک مسائل سے نبرد آزما ہوتے ہوئے گھر پہنچنے تک ان کے ذہن سے اس نامعلوم نمبر سے آئی کال والی بات بالکل نکل چکی تھی۔ اسی لیے وہ اس کا تذکرہ فاطمہ سے کرنا بھول گئی تھیں۔ خدیجہ ذوالفقار بڑھتی عمر کے ساتھ نسیان کا شکار ہو رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"آپ اب آئی ہیں بی بی صاحب! جبکہ فقیر کو بڑے دن پہلے سے پتا تھا کہ آپ کو آنا ہے۔" اپنے سامنے بیٹھے اختر کے منہ سے یہ بات سن کر ماہ نور نے چونک کر اسے دیکھا۔

"یہ ان لوگوں کے شعبدے ہوتے ہیں' ایسی ہی باتیں کر کے یہ خلقت کو پھنساتے ہیں' ان پر دھیان مت دینا۔" اس کے قریب بیٹھے ابراہیم نے بزبان انگریزی اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"مانا آپ نے فرونیلز سے سینئر کیمبرج کر رکھا ہے باؤ صاحب! مگر ہو سکتا ہے کہ فقیر کو آپ کی دونوں زبانوں سے زیادہ زبانوں پر عبور حاصل ہو۔" اختر ہنس کر بولا۔ "فقیر خلقت کو پھنسانے والا ہوتا تو فقیر کے تذکرے آپ اخباروں میں پڑھتے' فقیر کو ٹیلی ویژن کی اسکرین پر یہی چولا پہنے مفکرانہ گفتگو کرتے دیکھتے' فقیر کے بارے میں سنا کرتے کہ وہ اقتدار کے ایوانوں میں بسنے والوں کا پرسنل پیر ہے' اس کی ایک گالی' ایک ڈنڈے کی قیمت لاکھوں کے نذرانے کے برابر ہے' کیوں بی بی صاحب! کیا خلقت کو پھنسانے والے فقیروں کا کلٹ (Cult) ہی یہ نہیں ہے آج کل۔"

اس نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ ابراہیم اس کی یہ بات سن کر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ ماہ نور نے سرزنش بھری نظروں سے ابراہیم کی طرف دیکھا اور پھر اختر کی طرف متوجہ ہوئی۔

"پچھلی بار جب آپ یہاں آئی تھیں تو یاد ہو گا آپ کو میں نے آپ کو اس آنے والے وقت کے بارے میں

کچھ بتانے کی جسارت کی تھی۔"

ماہ نور نے سر جھکالیا۔ ابراہیم سوالیہ نظروں سے ماہ نور کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اور میری ان باتوں کے مکمل ہونے سے پہلے ہی باؤ صاحب آپ کو لے کر یہاں سے بھاگ لیے تھے۔" اختر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"باتوں سے بھاگ لینے کا کیا فائدہ ہوتا ہے' وقت تو پھر بھی نہیں ٹلتا۔" وہ رکا اور گڑگڑی کی چھوٹی سی نال منہ میں دبا کر کش لینے لگا۔

"میں نے کہا تھا نا' یہاں سے کوئی سراغ نہیں ملے گا۔" ابراہیم نے ایک بار پھر انگریزی زبان میں ماہ نور کو مخاطب کیا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ کا من بڑا صاف ہے' اس لیے بڑا شانت بھی ہے۔"

اختر اس بار ابراہیم کی بات نظر انداز کرتے ہوئے ماہ نور سے مخاطب رہا۔ "آپ کے دل میں نہ حسد تھا نہ رشک تھا' آپ کی زندگی میں کوئی بغض نہیں تھا' اسی لیے آپ کی زندگی بڑی پر سکون تھی۔"

"تھی؟" ماہ نور نے تیزی سے کہا۔

"ہاں تھی۔" اختر نے سر ہلایا۔ "وہ زندگی ماضی کا حصہ نہ بن چکی ہوتی بی بی صاحب تو آپ آج فقیر کی کٹیا کا رخ کاہے کو کرتیں۔"

ماہ نور نے ایک بار پھر سر جھکالیا۔

"اس بات کے صرف چند دن کے اندر آپ کا من بھی اٹکا اور دماغ بھی قابو میں نہ رہا۔" اب وہ ایک کڑوا سچ سنانے لگا تھا۔ "پھر زندگی میں حسد بھی آیا اور رشک بھی دخیل ہو گیا' رشک اور حسد نے بغض کو بھی کہیں نہ کہیں جنم دے دیا' اسی لیے تو اب راستے میں دشواریاں بھی ہیں اور کٹھنائیاں بھی۔"

ماہ نور نے دم سادھ کر اختر کی سرخ سرخ آنکھوں میں جھانکا' اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں' وہ اس کے اندر کی دنیا کو کھینچ کر باہر لے آیا تھا اور اس کی ذہنی کیفیت کو الفاظ میں بیان کر رہا تھا۔

ماہ نور نے اختر کے چہرے سے نظریں ہٹا کر چہرہ دوسری طرف پھیر لیا' اس میں اختر کا سچ سننے کی تاب نہیں تھی یا پھر وہ اپنے محسوسات پر قابو پانا چاہتی تھی۔

"باؤ صاحب ایک بار مجھ سے کہنے لگے سائیں جی! آپ نے اس لڑکی سے وہ باتیں کیوں کی تھیں میرا دل ڈر گیا ہے۔

میں نے کہا پتا ہے نا آپ کو کہ بی بی صاحب پر کڑا وقت کس کی وجہ سے آتا ہے۔ آگے سے کچھ نہ بولے بس سر جھکا کر بیٹھ گئے" وہ رک کر ذرا سا ہنسا۔

"میں نے کہا سر نہ جھکاؤ باؤ صاحب' بس من اور ذہن میں توازن پیدا کر لو تاکہ وہ اس مشکل سے بچ جائیں۔" اس نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں ماہ نور پر گاڑتے ہوئے کہا۔

"او گاڈ!" ابراہیم جھلا کر بولا "نجانے کیا پہیلیاں بجھوائی جا رہی ہیں یہاں۔ اگر تمہیں مزید سننا ہے تو تم بیٹھو ماہ نور! میں ذرا باہر نکل کر سانس لے لوں' یہاں تو دم گھٹتا جاتا ہے۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ضرور صاحب بہادر! آپ باہر جا کر سانس لے لو' باہر آپ کی تواضع کے لیے لنگر بھی تیار ہے۔" اختر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ابراہیم ناگوار سی شکل بنائے باہر چلا گیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا مجھے کیا بات کرنا چاہیے۔" ابراہیم کے جانے کے بعد وہ بے بسی سے بولی۔ "میں

آپ کے پاس اس لیے آئی ہوں کہ شاید آپ سے پتا چلے' وہ کدھر چلا گیا ہے' اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے' آپ نے تو اس سے کہا تھا کہ وہ فکر نہ کرے۔"

"میں آپ کو یہی بتانے لگا تھا بی بی صاحب!" اختر نے گڑگڑی میں بجھتے انگاروں کو پھونک مار کر روشن کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے باؤ صاحب سے کہا تھا' فکر نہ کریں' وہ من بھی پالیں گے اور ذہن بھی پالیں گے' اور انہوں نے پا بھی لیا تھا' لیکن بندے کی صفت ہوتی ہے بے صبری اور عجلت پسندی' یہ بے صبری اور عجلت پسندی بندے کی آنکھوں پر گمان کی پٹی باندھ دیتی ہے۔ گمان کی بھی اور بدگمانی کی بھی' باؤ صاحب ساکن پانی پر تیرتے تیرتے موجوں کے تلاطم سے ہڑبڑا گئے اور پٹی بندھ گئی آنکھوں پر۔ اس پٹی کو تو بس اشارے کی ضرورت ہوتی ہے بی بی صاحب۔"

"کیسی بدگمانی' کس سے بدگمانی؟" ماہ نور نے تیزی سے سوال کیا۔

"ہر کسی سے۔ اس سے بھی جس سے کوئی براہ راست واسطہ بھی نہیں۔" اختر نے آنکھوں میں آتے پانی کو انگلی سے صاف کیا' الاؤ کا دھواں اب جھونپڑی کے اندر گھسنے لگا تھا۔

"اس سے پہلے ہونے والی گفتگو میں ہی فقیر سمجھ چکا تھا باؤ صاحب اس تشکیک کا شکار ہو چکے تھے جس کے بارے میں انہیں وارننگ دی جا چکی تھی کہ اس سے نہ بچ پائے تو قدم رک جائیں گے اور زندگی ایک کوہ گراں بن کر رہ جائے گی' اپنے اپنے کوہ گراں انسان کو خود اٹھانے پڑتے ہیں بی بی صاحب! کسی دوسرے کو کیا پڑی ہے اس کے حصے کا بوجھ اٹھاتا پھرے' یہ تو آپ ہو جن کا من اٹکا اور دماغ بھی قابو میں نہ رہا۔ آپ بھی آزمائش کی زد میں آ گئیں' یہی تو سمجھاتا تھا باؤ صاحب کو' اپنے ساتھ بی بی صاحب کو بھی مشکل میں ڈالو گے۔ گمان سے بچ جاؤ' مگر وہ نہ سمجھے' جب ہی تو آج وہ غائب' آپ حاضر ہو' اپنے اپنے حصے کی کٹھنائیاں کاٹنے کے لیے۔"

"وہ جانے سے پہلے آپ سے ملا تھا؟" ماہ نور نے بے چینی سے کہا۔

"ہاں!" اختر نے سر ہلایا۔ "وہ ایسے ملے کہ دماغ میں بے شمار سوال تھے اور دل میں ان گنت شکوک میں نے بڑی جان ماری۔ سوال نہ پوچھو' شک میں نہ پڑو' باؤ صاحب نے کیا یہ کہ سوال پوچھے نہیں مگر دل دماغ میں سوال اور شکوک کا بنڈل سنبھالے خود منظر سے غائب ہو گئے وہ کہتے تھے۔ میں خود اس محبت کا کیا کروں گا جو خود غرض ہے۔ مگر انہوں نے شک کے بیج کی جو آبیاری شروع کر دی تھی' وہ اس سے خود کو باز رکھنے پر تیار نہیں تھے' پھر میں پیچھے ہٹ گیا۔"

"آپ نے اسے وارن نہیں کیا کہ وہ غلط کر رہا ہے۔"

"یہی تو بتا رہا ہوں بی بی صاحب! کہ وہ کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھے' جو نظر اور عقل کے سامنے شک کا پردہ حائل نہ ہو گیا ہوتا تو مجھ تک آنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی' نور فاطمہ کی جھونپڑی ہی کافی تھی' مگر باؤ صاحب وہاں بھی شک کا شکار ہوتے رہے۔ یہاں آئے تو شربت کے پیالے کو ہونٹوں سے لگا کر دیر تک سوچ میں گم رہے کہ پئیں کہ نہ پئیں' او بی بی صاحب۔" اختر نے کچھ سوچنے کے بعد رک کر ماہ نور کی طرف دیکھا "جب بندے پر یہ اسٹیج آ جائے تو پھر اسے اس کے حال پر چھوڑنا بہتر ہوتا ہے۔ باؤ صاحب کم عقل نہیں نہ ہی ان کی نظر کوتاہ ہے' لیکن جو کچھ بھی ان کے لیے غیر متوقع تھا اس کی گہرائی میں جانے کے بجائے اس سے گھبرا گئے' آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے بجائے نظریں چرا گئے' جس شخص کے لیے میں ان سے شروع سے کہتا چلا آ رہا تھا کہ اس پر شک نہ کیجیے گا۔ اسی کے بارے میں مشکوک ہو گئے۔ بس پھر فقیر کو پیچھے ہٹنا بنا کوئی چارہ نہ تھا۔"

"میں بہت عقل مند نہیں ہوں سائیں صاحب" ماہ نور نے سر جھکاتے ہوئے کہا "میری سمجھ میں آپ کے علم

اور مصروفیت کی باتیں شاید نہ آرہی ہوں' عقل اور نظر کے پردے' انسان کی تجربہ گاہیں' نور فاطمہ کی جھونپڑی' شہرت کے پیالے' ہوسکتا ہے یہ کوئی ایسے کوڈورڈز ہوں جنہیں ڈی کوڈ کرنا میرے لیے ممکن نہ ہو' لیکن میرے پیش نظر سب سے اہم بات صرف ایک ہے' میں ہر حال میں سعد کے لیے سلامتی چاہتی ہوں' میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ مجھے پتا چلے' وہ کسی مشکل میں پھنس گیا ہے' جبکہ آپ کی باتوں کو سن کر جو مطلب میری سمجھ میں آیا ہے' وہ یہی ہے کہ وہ یا تو کسی بہت بڑی مشکل کا شکار ہوچکا ہے یا ہونے والا ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"میں نہیں جانتی' وہ کس سے بدگمان ہوا' میں نہیں جانتی کہ وہ کس سے بھاگ رہا ہے' میں بس اتنا جانتی ہوں کہ وہ کسی بھی جگہ ہے۔ کسی بھی حال میں ہے' میرے دل کی ہر دھڑکن اس کا نام لے کر دھڑکتی ہے اور میں اپنی اس کیفیت کے ہاتھوں مجبور ہوں۔" اس کی آواز بھرانے لگی۔

"فقیر سب جانتا ہے بی بی صاحب! آپ اس کے سامنے اپنا دل کھولو چاہے نہ کھولو' فقیر سب جانتا ہے۔ آپ کی اس کیفیت کی تشریح تو اسی لیے میں نے شروع میں ہی کردی تھی۔" اختر نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

"تو بس پھر' میں آپ کی منت کرتی ہوں۔" ماہ نور نے اختر کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "اپنے علم' اپنی کرامات' اپنی روحانیت کے کرشموں' اپنی معرفت یا جو کچھ بھی آپ کے پاس ہے' اس کے ذریعے کوئی ایسا عمل کردیجیے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے۔ سلامت رہے اور ساتھ سلامتی کے واپس لوٹ آئے۔ اس کے ذہن کی ساری الجھنیں دور ہوجائیں۔"

"بی بی صاحب!" اختر ہنس کر بولا۔ "آپ کو پتا ہے کہ وہ علم' وہ کرامات' وہ کرشمہ اور وہ منتر جو اس کو واپس لاسکتا ہے' وہ میرے پاس نہیں صرف آپ کے پاس ہے۔"

"نہیں سائیں جی! میں جانتی ہوں کہ اس دنیا میں' میری زندگی میں اس کا کوئی کردار ہے نہ ہوگا کیونکہ وہ جس کو اپنے مقدر کا ستارا سمجھتا ہے' وہ اونچائیوں میں چمکتا ہے میری طرح زمین کی گرد کے ذروں میں نہیں رلتا' لیکن میں اپنے دل کا کیا کروں' جو ہر حال میں صرف اس کا نام لیتا اور اس کا نام لے کر جیتا ہے۔" ماہ نور کو لگا اختر جیسے شخص کے سامنے اپنی دل کی کیفیت بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

"آپ کے اس بے غرض جذبے نے ہی تو ڈھال بننا ہے بی بی صاحب" اختر نے کہا۔ "لیکن باؤ صاحب کی تشکیک نے ان کے راستے کے چھوٹے چھوٹے پتھروں کو اکٹھا کرکے جو کوہ گراں ان کے سامنے کھڑا کردیا ہے' اس کے سامنے ان کی پیش قدمی رک جائے گی وہ رک گئے تو انہیں محسوس ہوگا کہ وہ خود بھی ایک کوہ گراں بن چکے ہیں' اس کیفیت سے اس وقت تک چھٹکارا نا ممکن ہے جب تک اپنے ذہن کی گتھیوں کو نہ سلجھائیں گے۔ آپ اپنے بے غرض جذبے کی مالا جپتی رہیے' بہت ممکن ہے آپ کی یہ تسبیح ہی باؤ صاحب کو دوبارہ اپنے راستے پر واپس لے آئے۔"

ماہ نور نے بے یقینی سے اختر کی طرف دیکھا' وہ سرہلاتے ہوئے مسکرا رہا تھا' پھر اس نے آنکھیں بند کرکے گڑگڑی کی نے منہ میں دبالی۔

☆ ☆ ☆

اصطبل کے قریب رکھے سنگی بینچوں میں سے ایک بینچ پر وہ کب سے اکیلا بیٹھا تھا۔ اس کا دوست' اس کا غم گسار محمد رضوان الحق اسی صبح اس سے رخصت ہوکر واپس گیا تھا اور اس کے جانے کے بعد اس پر تنہائی اور اداسی کی' ایک نہ ختم ہونے والی کیفیت طاری تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے پہلے زمین کے ایک وسیع قطعے میں

سفیدے کے اونچے لمبے درخت قطار در قطار سر اٹھائے کھڑے تھے اور ان درختوں سے بغیر ڈنٹھل کے چھوٹے چھوٹے جھنجھیری نما پھول ہوا کے سنگ ہلتے اپنی جگہ چھوڑتے نیچے آن گرتے تھے۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ایسے ان گنت پھول نیچے گرے اور یہاں وہاں اپنی مخصوص خوشبو بکھیرتے بکھر گئے۔

"بندے کا دارو بندہ ہی ہوتا ہے۔" اس نے ایک لمبے وقفے کے بعد پہلو بدلتے ہوئے سوچا' پھل' پھول' جانور' پرندے تو بس دیکھنے کے اور مصروف رہنے کے بہانے ہیں' بندہ' جنوروں سے اور پھل بوٹوں سے گلاں (باتیں) نہیں کرسکدا (سکتا)۔"

سوچتے سوچتے اسے لطیف مالی یاد آگیا' جو پودوں کی کٹائی کرتے ہوئے' بیلوں کو دیواروں پر چڑھانے کے لیے ان کے سروں کو باندھتے ہوئے ان سے باتیں کیا کرتا تھا۔

"اللہ بخشے' چاچا لطیف' بڑیاں باتاں کرتا تھا' کہتا تھا یہ پودے' یہ درخت یہ پتے اور پھول میرے بچے ہیں' میں ان سے اپنے دل کی باتاں کرتا ہوں بڑا قسمت والا تھا۔ ان سے ہی گلاں باتاں کرکے ویلا (فارغ) ہوجاتا تھا' میرے جیسے بندہ تو اپنے ورگا (جیسا) بندہ ہی ڈھونڈتا رہ جاتا ہے' دل کی ہواڑ (دکھ) نکالنے کے لیے۔" اس نے اپنی حالت پر افسوس کرتے ہوئے سرہلایا۔

"پھر یہ بھی بڑی عجیب گل (بات) ہے کہ سارا فارم ہاؤس اللہ خیری صلا آباد ہے' بندوں کی تو کوئی کمی نہیں ہے ادھر' پر وہ ایک بندا نہیں ملتا جس کے آگے میں اپنے دل کی ہواڑ (دکھ) پھول سکوں۔ وہ بھائی رضوان الحق آگیا تھا جو چار دن اور نکال جاتے' میرا دل لگا رہتا' ورنہ بابی کی حیاتی اب میں نے تو بندہ ہی ڈھونڈتے پھرنا ہے دل کی بات کرنے کے لیے۔" اس نے افسردگی سے سوچا۔

"پر تم بھی کیا کرتے' بندے کے ساتھ پیٹ جو لگا ہوا ہے' اس ظالم پیٹ کے پیچھے بندے کو سنگی ساتھی' خوشی غمی سب چھوڑ کر اسے بھرنے کا سامان کرنے' رزق کمانے نکلنا پڑتا ہے' اچھا کیا جو تم میرے روکنے پر نہیں رکے۔ کہیں جو نوکری سے جواب ہوجاتا تو تم کیا کرتے۔" وہ اپنے ذہن کو کسی ایسی سوچ سے بچانے کے لیے جو اسے مزید غم زدہ کرنے کا باعث بن سکتی تھی' اوٹ پٹانگ باتیں سوچتا چلا جارہا تھا۔

اسی دم اسے محسوس ہوا کہ اس کے پیچھے املتاس کے جھنڈ سے جھڑے خشک پتوں پر چلتا کوئی دم بدم اس کے قریب آرہا تھا۔

"چلو جی' آگیا ماسٹر کمال۔" اس نے ان قدموں کی آہٹ سن کر دل میں سوچا "ابھی کہے گا کھاری پتر! چل جاکر ڈیری کی خبر لے' ساری نسلی بھینسیں دودھ دینا چھوڑ گئی ہیں' کریکشن (کلیکشن) والے شکایت کرتے ہیں۔ تو چل تھوڑا پیار پوچا کر' تیرا ہاتھ سیانتی (پہچانتی) ہیں' آپے سیدھی ہوجائیں گی۔" اس نے ایک بار پھر سر جھٹکا "جیسے کھاری نہ ہوا' پیر ہوگیا جس کا ہاتھ پھر گیا تو بھینسیں آپ سے آپ سیدھی ہوجائیں گی۔"

اس کے کان قریب آتے قدموں کی آہٹ پر لگے تھے اور وہ ماسٹر کمال کی بلغمی آواز کا منتظر تھا۔ مگر چند لمحوں بعد اسے احساس ہوا کہ جو کوئی بھی عقب سے قریب آرہا تھا' وہ اس کے بالکل ساتھ اسی بینچ پر آکر بیٹھ گیا تھا۔

"لے اب ماسٹر گلاں کر کرکے مجی مار مارے گا۔ ویلا (فارغ) بیٹھ رہتا ہے کھاری نکما ہوگیا ہے۔" اس کا دل دھڑکنے لگا۔

"کیا بات ہے تم ادھر کیوں بیٹھے ہو' وہ بھی اکیلے۔ میں ہر جگہ تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔" ماسٹر کمال کی بیٹھی ہوئی بلغمی آواز کے بجائے' ایک مانوس نسوانی آواز اس کے کان میں پڑی۔

"سعدیہ باؤ!" اس نے چونک کر دیکھا اور بدک کر قدرے دور ہٹ گیا۔

"اور تم نے یہ اپنا حلیہ کیا بنایا ہوا ہے کھاری! اتنے میلے کپڑے اور یہ ٹوٹی ہوئی چپل' موگ کیا کہیں گے' کھاری

کو اپنے کپڑوں کا بھی ہوش نہیں' چلو اٹھو! اپنے کوارٹر میں چلتے ہیں۔ میں تمہیں کپڑے نکال کر دیتی ہوں تم ادھر کپڑے بدلو' صاف ستھری ٹوپی پہنو۔ ابا جی کہہ رہے تھے کھاری سے کہنا۔ آج جمعہ پڑھنے ضرور آئے۔ پتا ہے آج ابا جی کے جمعہ کے خطبے کے لیے میں نے اور اماں نے خود انہیں تیاری کرائی ہے۔ چلو اب اٹھ جاؤ' دیر نہ ہو جائے پھر ابا جی ناراض ہوتے رہیں گے میں نے تمہیں ان کا پیغام نہیں دیا۔"

وہ جیسے کہیں گئی ہی نہیں تھی۔

وہ ایسے تھی جیسے اس کے اور کھاری کے درمیان کوئی فاصلہ ہی نہیں تھا۔

کھاری نے بے یقینی سے ایک بار سعدیہ کو دیکھا اور ایک بار خود اپنے حلیے پر نظر ڈالی۔

"چلو نا! اب اٹھ جاؤ' جماعت کھڑی ہو جائے گی تو پہنچو گے' ابا جی نے بڑا سخت ناراض ہو جانا ہے۔" سعدیہ نے اس کا بازو پکڑ کر اسے کھینچ کر اٹھانا چاہا۔

"یا قسمت یا نصیب۔" محمد رضوان الحق نے کھاری سے رخصت ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"قسمت بھی کھل گئی بھائی رضوان الحق! نصیب بھی کھل گیا۔" کھاری نے اچھلتے دل کے ساتھ رضوان الحق کو تصور میں مخاطب کیا۔ اس کے ارد گرد چھائی تنہائی' مایوسی' سناٹا اور اداسی یکدم چھٹ گئی تھی۔ اس کا دل خوشی کی ایک انوکھی لہر سے سرشار ہونے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر سرخی پھیلی اور مسکراہٹ بھی۔

"آپ نے سعدیہ باؤ! آنے سے پہلے مینوں بتایا ہی نہیں۔" اس نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ اس کا دل پھر بھی بلیوں اچھل رہا تھا۔

"کیسے بتاتی!" وہ اس سے ایک قدم آگے چلتی ہوئی بولی "نہ تمہارے پاس کوئی فون تھا نہ میرے پاس۔"

"او ہو جی! میں نے تو اپنا فون آپ کوں دے دیا تھا' اس سے کر لیتیں ماسی سکینہ کے فون پر۔" کھاری چلتے چلتے رک گیا۔

"میں نے وہ فون پھینک دیا تھا۔" وہ مڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "اب تم سادہ فون خریدنا جس پر کوئی گانا وانا نہ سنا جا سکے۔"

"اچھا جی!" کھاری بھونچکا گیا "ٹھیک اے جی!" اس نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔ سعدیہ رخ بدل کے ایک مرتبہ پھر اس سے آگے چلنے لگی۔ اس کے پیچھے چلتے ہوئے سفید کاٹن کی سادہ شلوار پر آسمانی پھول دار کاٹن کی قمیص اور سوتی ڈوپٹے میں ملبوس اپنی غیر متوقع طور پر واپس آئی زوجہ کو دیکھ رہا تھا جس کے ظاہر میں اسے شادی کے بعد والا کوئی پرانا رنگ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"اج لگدا ہے کہ یہ بھین جی دی بیٹی ہے۔" اس نے سوچا۔ "بدلی بدلی لگدی ہے پر جتنا بھی بدل جائے — یہ کدھروں (کہیں سے بھی) مولی جی کی بیٹی نہیں لگ سکتی' بے چارے بھین جی دا بڑا حوصلہ ہے کتھے (کہاں) سعدیہ باؤ دے ابا جی' کتھے مولی جی' بڑا جگرا پایا ہے بھین جی نے۔ توبہ توبہ!" وہ اپنی دھن میں سوچتا آگے بڑھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے کہا تھا نا' یہ شخص کچھ نہیں جانتا۔ محض شعبدے باز ہے۔" ماہ نور کے اختری جھونپڑی سے باہر آنے پر ابراہیم نے تیزی سے اس کی طرف آتے ہوئے کہا۔ اس بار بھی وہ انگریزی زبان میں بات کر رہا تھا۔

ماہ نور نے بابے کے الاؤ سے لے کر دور تک جاتی انسانی قطار کو دیکھا جو اپنے سامنے سلور کی پلیٹیں اور کٹورے رکھے انہماک سے کھانا کھانے میں مشغول تھی۔

"آج اس نے بجی کے انداز کا ثابت مرغ بنا رکھا ہے' کٹی سرخ مرچ اور کھٹائی والا اور میں نے اس سے لذیذ لنگر پہلے کبھی کہیں نہیں کھایا۔" ابراہیم نے سوتی رومال سے گیلے ہاتھ خشک کرتے ہوئے اسے بتایا۔ غالباً" وہ لنگر کھانے سے فارغ ہو کر ہاتھ دھونے کے بعد ادھر آیا تھا "یہ ایک نایاب کک ہے میں نے اسے اپنے ریسٹورنٹ کے کچن میں جاب کی آفر بھی کر دی ہے۔ لیکن یہ نہیں مانا' اسے اسلام آباد کی ایلیٹ کلاس کے لیے کھانا بنانے سے زیادہ یہاں اس اجاڑ بیابان میں لنگر پکانے میں دلچسپی ہے۔"

"اور تم نے اس سے کہا تھا کہ کیا یہ آوارہ کتوں' بھیڑیوں اور ہوا میں اڑتی اندھی چمگادڑوں کے لیے لنگر پکا رہا ہے تم اس کا مذاق اڑا رہے تھے ابراہیم کچھ ہی دیر پہلے۔" ماہ نور کا لہجہ درشت ہوا۔ وہ کچھ نہ بولا۔

"اب چلیں ابراہیم' دیر ہو رہی ہے!" ماہ نور نے دھوپ کا چشمہ آنکھوں پر لگایا اور گاڑی کی طرف چلنے لگی۔

"اگر آپ برا نہ مانیں بی بی! تو فقیر کا لنگر چکھ ضرور لیں' یہاں نہیں کھانا چاہتیں تو ساتھ لے جائیے۔" الاؤ پر سے تو ا اتار کر اسے بجھانے میں مشغول بالکا ماہ نور کو یونہی جاتا دیکھ کر اپنا کام چھوڑ کر اس کی طرف لپکا۔ ماہ نور نے رک کر اس کی طرف دیکھا' وہ تیزی سے لپک کر چنگیر پر جھکا' تھوڑی دیر بعد اس نے اخبار کے کاغذ میں لپٹی آدھی روٹی میں ثابت مرغ کا نصف حصہ لپیٹ کر ماہ نور کی طرف بڑھایا۔

"باؤ صاحب شک کا شکار ہوتے رہے' یہاں آئے تو شربت کے پیالے کو دیر تک ہونٹوں سے لگائے سوچتے رہے کہ پییں کہ نہ پییں۔"

ماہ نور کو اختری بات یاد آئی' اس نے ممنون ہونے کے سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے اسے پکڑ لیا۔

☼ ☼ ☼

اے ٹی ایم کارڈ مشین کی درز میں رکھ کر سیمی نے اپنی مطلوبہ رقم کے نمبر دبائے اور ایسا کرتے ہوئے نجانے کیوں اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا' اس — عمل پر مشین نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا "اوہ' وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا" سیمی کا دماغ گھومنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کسی نے یکایک اسے ایک گھر کی چار دیواری اور ایک چھت تلے کے نرم گرم ماحول سے نکال کر کھلے آسمان تلے بیچ سڑک پہ کھڑا کر دیا ہو۔

"رہائش' تحفظ' روٹی' اس کی نظروں کے سامنے تین لفظ گھوم گھوم کے ناچنے لگے۔ ان لفظوں کے اندر سے دن میں بھی تارے نکلتے نظر آ رہے تھے' اس نے گھبرا کر اپنی آنکھوں پر لگا چشمہ اتار کر اس کے شیشے اپنے اسکارف سے صاف کیے اور چشمہ دوبارہ لگا کر اس بے جان مشین کی طرف دیکھا جو اپنے پیٹ میں کڑکڑاتی نقدی لیے ایستادہ تھی۔ اسے مشین کے بٹنوں کے اوپر سرخ رنگ الفاظ چلتے نظر آئے۔

"اپنا پاس ورڈ داخل کریں۔" مشین اس سے مطالبہ کر رہی تھی۔

"اوہ میں گھبراہٹ میں پاس ورڈ ڈالنا بھول گئی شاید۔" سیمی کا اپنے حافظے پر ماتم کرنے کو دل چاہا۔ ایک بار پھر کارڈ درز میں رکھ کر اس نے وہ پاس ورڈ داخل کیا جو سارہ نے اسے ایک چھوٹی پرچی پر لکھ کر دیا تھا' اس سے مطلوبہ رقم داخل کرنے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ مطلوبہ رقم کے بٹن دبانے کے ساتھ ہی مشین نے اپنے پیٹ میں ذخیرہ کڑکڑاتے نوٹوں میں سے سیمی کے مطلوبہ نوٹ اگلے۔ سیمی نے کپکپاتے ہاتھوں سے وہ نوٹ پکڑے۔ اس کا رواں رواں شکر گزاری میں مشغول تھا۔ کارڈ اور مشین سے نکلی رسید نکال کر اس نے رسید آنکھوں سے قریب کرتے ہوئے روشنی کی طرف رخ کیا۔ اس کی نکالی رقم کے منہا ہو جانے کے بعد بھی اکاؤنٹ میں ایک خطیر رقم موجود تھی۔

"ہاں۔ وہ دل والا ہے' اس کے پاس دل ہے اور بہت بڑا دل ہے" سیمی فٹ سے سارہ کی ہم نوا ہو گئی' اس نے

ہاتھ میں پکڑے نوٹ کارڈ اور رسید سمیت اپنے پرس میں منتقل کر لیے۔ اگلے دو ماہ تک وہ دونوں اس رقم سے بہت اچھا وقت بغیر کسی پریشانی کے گزار سکتی تھیں۔ اس نے کسی لینڈ لیڈی کے انداز میں اے ٹی ایم روم کا دروازہ کھولا اور تمکنت کے ساتھ چلتی بینک کی حدود سے باہر سڑک پر آگئی۔ پریشانی کے بھوت اور دن میں ناچتے تارے آنکھوں کے سامنے سے ہٹ چکے تھے۔ یمی گھر کی چار دیواری اور ایک چھت تلے کے نرم گرم ماحول میں واپس آگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں تو سب نوں کہنا آں سعدیہ باؤ میری عقل چھوٹی ہے' اس کو چھوٹی چھوٹی باتاں تے سمجھ آسکتی ہیں لیکن وڈیاں باتاں (بڑی باتیں) ایہہ بے چاری نہیں سمجھ سکتی" جمعے کی نماز سے فارغ ہو کر واپس فارم ہاؤس میں آنے کے بعد کھاری نے سعدیہ کے سامنے بیٹھتے ہوئے سچائی کے ساتھ اعتراف کیا۔

"تمہاری عقل چھوٹی نہیں ہے کھاری! تم جان بوجھ کر ظاہر کرتے ہو کہ تمہاری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" سعدیہ نے نچی آواز میں کہا۔

"نہیں سعدیہ باؤ! مجھے سچی بات ہے وڈیاں وڈیاں باتاں سمجھ نہیں آتیں' پر پھر بھی میں سمجھدا (سمجھتا) ہوں کہ آپ نے واپس آنا تھا تو مجھے سنیہا (پیغام) بھجوانا چاہیے تھا۔ میں آپ نوں خود جا کر لے آتا' اس میں تہاڈی بھی عزت تھی' مولی صاحب کی بھی تے بھین جی کی بھی۔" کھاری نے نرمی سے کہا۔

"اور تمہاری؟" سعدیہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا "کیا اس میں تمہاری عزت بھی تھی؟"

"میری۔" وہ ہولے سے ہنس دیا "میری کاہے دی عزت اور کاہے دی بے عزتی' میرے سارے ٹیم (ٹائم) اکو جئے (ایک جیسے) ہیں۔ میرے جیسوں کو کیا فرق پڑتا ہے عزت بے عزتی سے۔"

"تمہارے بقول تمہاری عقل چھوٹی ہے کھاری! اور میرے بقول میری عمر چھوٹی ہے۔" سعدیہ نے اپنے ہاتھ کے ناخنوں پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا "حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ میں عمر میں چھوٹی ہوں نہ تم عقل میں چھوٹے ہو۔ میں نے نویں جماعت کا امتحان دیا' اس کا مطلب یہ تو نہیں نا کہ ضرور ہی میں نویں جماعت کی عمر کی لڑکی ہوں۔ اماں نے جو حساب کتاب مجھے بتایا ہے۔ اس کے مطابق مجھے اس وقت ایف ایس سی کر چکے ہونا چاہیے تھا یا شاید اگر میں سیدھے سیدھے عمر کے مطابق پڑھ رہی ہوتی اور میرے ماں باپ کے پاس توفیق ہوتی تو میں ڈاکٹری کے پہلے سال میں ہوتی لیکن اماں' ابا جی کی خواریوں اور مجبوریوں کی وجہ سے میں آج لوگوں کے خیال میں دسویں جماعت کی عمر کی لڑکی ہوں۔"

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

"اسی طرح تم ہو۔" اس نے سر اٹھا کر کھاری کی طرف دیکھا "تمہیں بھی اندازہ نہیں کہ تم کتنے عقل مند اور سمجھ دار ہو' تم کتنے ذہین ہو۔ اس لیے کہ تمہیں یہ بات بتانے والا کوئی نہیں۔ جتنے تم ذہین ہو' اگر حالات تمہارے حق میں ہوتے تو آج تم کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی میدان میں بڑا نام کما رہے ہوتے۔ تمہاری ذہانت اس فارم ہاؤس کی چار دیواری کے اندر پل بڑھ کر جوان ہوئی۔ بھینسیں' چارا' دودھ' سبزیاں' پھل' پھول' ٹرک لوڈ کراتے اور ان لوڈ کراتے کراتے وقت گزر گیا' پھر بھی تم نے یہ نکتہ سمجھ لیا کہ خیریت اسی میں ہے کہ جتنی باتیں تمہاری سمجھ میں آتی ہیں' انہیں ظاہر نہ ہونے دیا جائے اور ایک کم عقل' جاہل کا سا انداز بنائے رکھا جائے' یہ بھی تو تمہاری ذہانت کی اعلا مثال ہے نا۔" سعدیہ افسردگی سے مسکرائی اور اس نے تائید طلب نظروں سے کھاری کی طرف دیکھا۔

"او نہیں سعدیہ باؤ!" میں اتنی عقل والا ہوتا تو پکا پکا یہ کیوں سمجھ لیتا کہ آپ اب کبھی ادھر واپس نہیں آؤ گے' میں نے تہاڈے ساتھ نکاح چوہدری صاحب کی زور زبردستی میں آکر کیا تھا۔ اور بھین جی کے جوڑے ہتھ کھولنے کے لیے بھی" اس نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔

"جے یہ دونوں میرے ساتھ انج نہ کرتے تو آپ لکھ ترلے ڈال کر دیکھ لیتیں میں نے کدی نہیں ماننا تھا۔" اس نے سعدیہ کی اس خوش فہمی کو ہوا میں اڑایا جس کے مطابق کھاری سعدیہ کی ڈرامائی اپیلوں کی وجہ سے نکاح سے انکار نہیں کر سکا تھا۔

"میرے تے چوہدری صاحب تے بھین جی کا بڑا احسان ہے سعدیہ باؤ! ایک نے مینوں زندگی دی' الف ب پڑھائی تے دوسرے نے کتاب دا علم دتا۔ میں ان دونوں کی گل نہیں موڑ سکتا تھا۔ پر جب نکاح ہو گیا تے مولی جی کے نکاح دے خطبے دی سمجھ آپ کے جانے کے بعد آئی۔ نکاح دے دو بول دو بندوں کے دل جوڑ دیتے ہیں۔ بھانویں وہ اس سے پہلے ساری عمر کبھی ملے بھی نہ ہوں۔ آپ بھین جی دے پاس چلے گئے' مینوں پتا تھا' بھین جی آپ نوں وہ ساریاں باتاں بتائیں گے جو انہوں نے مجھے بتائی تھیں' مجھے پکا یقین ہو گیا تھا۔ آپ وہ باتاں سننے کے بعد مڑ کر واپس نہیں آؤ گے۔ آپ شناخت کے بغیر نکاح کرانے پر تیار ہو گئے تھے' شناخت آپ کو بھین جی کی باتوں میں مل جانی تھی' شناختی کارڈ تو آپ کا ادھر ہی اڑا پھرتا تھا' آپ کو پتا نہیں تھا۔ میں نے پکا سوچ لیا تھا جب آپ کو پتا چل جائے گا کہ آپ کون ہو تو پھر ہاڑے غریب افتخار احمد ولد نامعلوم کی زوجہ بن کر کس نے حیاتی ضائع کرنی ہے اپنی!" کھاری کی آواز رندھنے لگی۔

"جب یہ سوچ لیا تو پھر نکاح کے خطبے کی سمجھ آئی' نکاح کے دو بولوں نے آپ سے جو میرا تعلق جوڑا تھا' اس سے ہی مجھے پتا چلا تھا کہ کوئی اپنا ہو تو کیسا محسوس ہوتا ہے' آپ کے ساتھ میرا رشتہ بن گیا تھا۔ آپ گانے سننے' فیشن کرنے دے شوقین بن گئے تے میرا بھی دل کہتا میں شوق پورے کرنے دے قابل ہو جاؤں پر ابھی آنکھوں میں سپنے اترنے ہی لگے تھے کہ آپ نے بھین جی دا درس سن لیا۔ آپ بھین جی توں بدظن ہو گئے تھے' فیر میرا دل نہ کہتا کہ میں اپنے سپنے سنبھالتا پھروں' آپ نوں بھین جی کے پاس بھیج دیا' مجھے پکا یقین تھا' آپ نے اس کے بعد مڑ کر واپس نہیں آنا پھر بھی بھیج دیا۔ آپ کے جانے کے بعد سارا فارم ہاؤس ویلا (خالی) ہو گیا' سارے جی (لوگ) ادھر ہی رہتے کام کرتے پھرتے تھے پر مینوں لگتا کوئی نہیں ہے' اک کلی میری جان ہے جو ادھر ویرانے میں رہتی ہے۔ میں ہوکے بھردا (آہیں بھرتا) اپنی قسمت کو روتا' کوئی کام نہ کرتا وقت گزار رہا تھا۔ مجھے اپنے اگلے وقت میں کچھ نظر نہیں آتا تھا' گھپ اندھیرا میری آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا۔ میں ازلی بدنصیب' نہ ماں نہ پیو' نہ کوئی بھین نہ بھائی' نہ کوئی آگا نہ پیچھا' واحد جان اپنی۔ آہا!"

اس نے سر ہلاتے ہوئے ایک سرد آہ بھری۔ اس کی باتیں سنتے ہوئے سعدیہ کا دل بھرنے لگا۔

"اتنے دکھ سے بھرے دل کے دکھ کا مداوا کیونکر ہو پائے گا۔" اس نے گھبرا کر سوچا۔

"جے میں اتنی عقل رکھتا ہوتا سعدیہ باؤ! جتنی وڈی آپ میری بتاتے ہو تو آس تو نہ چھوڑتا' ہوکے تو نہ بھرتا' بھائی رضوان الحق کو ایکسپریس فون کر کے یہاں بلا کر اپنے رونے تو نہ سناتا' وچارہ (بیچارہ) سارے کم کاج چھڈ کر کے میرے پیچھے بھاگا چلا آیا۔" کھاری نے افسردگی سے سر ہلایا۔

"بس ثابت ہو گیا نا کہ میں کم عقلا' تے انا (اندھا) ہوں۔" اس نے سعدیہ کی طرف دیکھا۔

"تمہارے لیے یہ صورت حال ہی ایسی تھی کھاری! کہ تم اس کے علاوہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔" سعدیہ نے اسے تسلی دینے کی ایک کمزور سی کوشش کی "میں دیکھو کتنی بے وقوف ہوں' اماں مجھ سے کہتی رہیں۔ کھاری کو پیغام بھیجو' آکر لے جائے' میں نے فون پیچھے کھیتوں میں پھینک دیا۔ تمہیں پیغام کیسے دیتی مگر نہیں۔" اس نے

نفی میں سرہلایا۔ ”دے دیتی تو تم اس مشقت سے بچ جاتے۔“

”چلو جوئی گل بات ہے۔“ کھاری نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں کچھ دیر چھپا لینے کے بعد ہاتھ چہرے پر پھیرتے ہوئے کہا ”سچی گل تو ابھی بھی یہ ہے سعدیہ باؤ! میں کسی طرح دی (بھی) آپ دے قابل نہیں ہیں۔ میں بے حیثیتا‘ بے شناختا بندہ تے کسی دے بھی قابل نہیں‘ آپ تو سعدیہ باؤ ہو‘ بھین جی دی بیٹی‘ آپ دے تو میں کسی طرح بھی قابل نہیں۔“

”ہاں اب لگ رہا ہے جیسے واقعی تم نے عقل گھاس چرنے کے لیے بھیج دی ہے۔“ سعدیہ مسکرائی‘ کھاری نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”خود کہتے ہو‘ نکاح کے دو بولوں میں واقعی بڑی تاثیر ہوتی ہے اور خود ہی اس کو جھٹلانے پر اتر آتے ہو۔ میاں بیوی کے رشتے میں حیثیت اور شناخت کا کیا دخل ہے پاگل‘ نکاح کے دو بول‘ میاں بیوی کی ازدواجی حیثیت ایک برابر کر دیتے ہیں۔“

سعدیہ‘ تایا رابعہ کی زبان بولنے لگی تھی‘ اتنے دن ان کے ساتھ ماضی کی کتاب کے اوراق الٹتے گزرے تھے‘ زبان پر اثر کیسے نہ ہوتا۔

”اور پھر تم کیسے بے عقل ہو‘ میراثیوں کے سرپنچ کی نواسی کو اپنے سے بڑھ کر حیثیت دار سمجھتے ہو۔“ وہ ہنسی۔

”آپ نوں اندازہ ہے سعدیہ باؤ! بھین جی اور مولی صاحب آپ کی جان سنبھال کے کدھر کدھر کھجل خوار (خوار) ہوتے رہے۔“ کھاری نے کہا۔ ”میرے تو جو اپنے تھے اگر کوئی تھے وہ مجھے بس اسٹاپ پر پھینک گئے چاہے ادھر مینوں بلیاں کھاتیں کہ کتے پھاڑتے‘ ان کی جان تے چھٹ گئی ناں میرے سے‘ بس یہ ہی فرق ہے حیثیت کا سعدیہ باؤ بھین جی اور مولی صاحب آپ کو جان سے لگائے خون دی وگدی نہر پار کر آئے اور مینوں کتے بلیوں دے اگے ڈال دیا گیا۔ باقی کس دی جد (آباؤ اجداد کی ذات صفات) کیا ہے تے نسل کون سی ہے‘ اس نال کوئی فرق نہیں پڑتا‘ فرق بس ایسی حیثیت نال پڑتا ہے کہ بندہ کسی کے واسطے کتنا لازمی (اہم) ہے۔“

”تم نے ماں کی کہانی غور سے سنی ہوتی تو یہ گلہ بھی دل میں نہ پالتے۔“ سعدیہ نے کہا ”کتنے حیثیت والے ہوں گے وہ سعد صاحب! میں نے تو خیر نہ دیکھا ہے نہ جانتی ہوں بس سنا ہی ہے‘ تم نے تو دیکھا بھی ہے‘ سنا ہے سب کچھ کے مالک ہونے کے باوجود کوئی سکون نہیں انہیں‘ دربدر بھٹکتے پھرتے ہیں اسے پانے کے لیے جو ایک چیز انہیں نہیں ملی۔ اللہ سے خیر مانگو کھاری اللہ اپنی جانب سے اور کچھ دے نہ دے دل کا سکون ضرور عطا کرے۔“

”او آہو‘ میں تے بڑا چنگا ہوتا تھا۔“ سعدیہ کے لہجے اور انداز کی سادگی نے کھاری کو پرانی جون میں واپس لا کھڑا کیا ”بڑے سکون دی نیند سوتا تھا‘ بڑے آرام سکون امن امان کے نال دن گزارتا تھا‘ نہ کوئی فکر نہ فاقہ پر یہ جو بیچ میں وڈے وڈے کنڑفیوژن آ گئے تو میں بونتر (بوکھلا) گیا‘ لو دسو بھلا کھاری غریب کی اتنی اوقات ہے کہ کنڑفیوژنا بھی آئیں اور وہ سلامت بھی رہے۔“

”اچھا تو پھر اب بتاؤ‘ اب کیا حال ہے‘ کنفیوژن ختم ہوا کہ ابھی بھی ہے۔“ سعدیہ نے کہا۔

”پہلے آپ بتاؤ‘ آپ سچی مچی واپس آ گئے ہو؟“ کھاری نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”ہاں بالکل۔“

”ہن مڑ کرتے نہ چلے جاؤ گے؟“

”نہیں۔ کبھی بھی نہیں۔“

”کوئی اندیشہ‘ کوئی گل الاہما (شکوہ شکایت) کوئی پچھتاوے تو نہیں؟“

”نہیں‘ کیونکہ نکاح کے دو بولوں میں بڑی طاقت ہے‘ جو میاں بیوی کو ایک جیسی ازدواجی حیثیت میں لا کھڑا

کرتی ہے۔“

”بڑا چنگا کیا سعدیہ باؤ! صاف صاف بتا دیا‘ نہیں تو کنڑفیوژن اور ودودھ (بڑھ) جانا تھا‘ پہلی بار کھاری کے دانت نکلے ”ہن کوئی کنڑفیوژن نہیں‘ قسمے ہن کوئی کنڑفیوژن نہیں۔“

اس نے خوش ہوتے ہوئے سعدیہ کے دونوں ہاتھ گرم جوشی سے پکڑ لیے۔

”اب ہم دونوں مل کر فارم ہاؤس کی چاکری کریں گے‘ مجھے سبزیاں اور پھل توڑنے کا بڑا شوق ہے۔“ سعدیہ نے کہا۔

”او نہ جی نہ‘ میں نے نہیں سبزیاں پھل تڑانے آپ سے۔“ کھاری نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اور بھی مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیا ”ہتھ لہولہو ہو جاندے ہیں کانٹوں نال لگ کے نہ۔“ اس نے سرہلایا ”چاکری میں کراں گا‘ تسی بس پڑھائی کرو‘ جتنا دل کرتا ہے پڑھو۔“ وہ لگاوٹ سے بولا۔

سعدیہ مسکرا دی۔

☆ ☆ ☆

”تم ابھی تک کنوارے کیوں ہو‘ تم نے شادی کیوں نہیں کی؟“ وڈون زادے نے اپنے نئے دوست کے اس سوال پر گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

”اگر یہی سوال میں تم سے کروں تو؟“ اس نے اپنی مسکراہٹ ہونٹوں تلے دباتے ہوئے کہا۔

”پہلے سوال کرنے والے کو جواب پہلے۔“ اس کے دوست نے آنکھیں میچتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں بھی تمہارے سوال کا جواب ضرور دوں گا‘ تم فکر مت کرو‘ لیکن پہلے تم بتاؤ۔“

وہ دونوں برک اے بریک ہالیڈے کاٹیج کے عقبی لان میں بیٹھے تھے۔ سکی ڈائیونگ کے لیے ڈریم میں گزارنے والے وقت کے لیے اس کاٹیج کا انتخاب سعد سلطان نے یہاں آنے سے پہلے کیا تھا اور وڈون زادے سے سٹین ہوپ کے ایک کیفے میں ملاقات کے دوران اس نے اس کا ذکر وڈون زادے سے کیا تھا۔ وڈون زادے کو سعد سلطان کا یہ انتخاب پسند آیا تھا اور اب وہ بھی اس کے ساتھ اس کاٹیج میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ کاٹیج دو سو سال پرانے سٹین ہوپ محل کی شکارگاہ کے لاؤنج میں بنایا گیا تھا۔ وڈون زادے کو اس کاٹیج کے انتخاب میں سعد سلطان کے مزاج کی جھلک نظر آئی تھی۔

”یہ شخص قدامت پسند ہے اور اسے فنون لطیفہ میں دلچسپی ہے۔“ اس نے برک اے بریک ہالیڈے کاٹیج کا نام سننے کے بعد سوچا تھا اور یہاں آ کر اس سنگی کاٹیج کے اندرونی طرز تعمیر‘ اس کی لکڑی کی چھتوں‘ انگل تک آتش دانوں‘ سجاوٹی نوادرات اور قدیم طرز کی کھڑکیوں اور دروازوں کو دیکھ کر اس کے سعد کے مزاج کے بارے میں قیافہ کو مزید تقویت ملی تھی۔ وہ پچھلے دو دن سے اکٹھے یہاں رہ رہے تھے۔ وڈون زادے کو پاکستان کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ سعد نے اسے انٹرنیٹ کے ذریعے نہ صرف پاکستان بلکہ ایران کی بھی سیر کرا دی تھی۔ وڈون زادے کو اپنی زندگی میں ملنے والا یہ پہلا پاکستانی خاصا اچھا لگا تھا۔

”ہاں‘ تمہیں زندگی کے بہت سے موضوعات پر عبور حاصل ہے۔ تم سے ملنے کے بعد مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں اب تک کنویں کے مینڈک کی سی زندگی گزارتا رہا ہوں۔“

”ہمارے ساتھ رہو گے تو یوں ہی عیش کرو گے۔“ جواب میں کسر نفسی سے کام لینے کے بجائے اس نے وڈون زادے کو آنکھ مارتے ہوئے کہا تھا۔

”ویسے مجھے کیوں ایسا لگ رہا ہے کہ سکی انگ کا صرف بہانا ہے‘ دراصل تم صرف اس برک اے بریک کاٹیج

میں رہنے کے لیے ویرڈیل آئے ہو۔" وودن زادے نے وودن اس کے سکی انگ ریزارٹ جانے کے بجائے اس گاؤں میں ادھر ادھر گھومتے پھرتے رہنے پر مذاق سے کہا تھا۔

"پینالٹز کے مشرقی حصے میں واقع "ویرڈیل" میں آکر قیام کرنے کا اصل مقصد اس موسم میں کیا کوئی اور بھی ہو سکتا ہے سوائے ویرڈیل سکی انگ کلب کے سیزن کا مزا لوٹنے کے۔" جواب میں وہ مسکرا کر بولا تھا۔ یہ وودن تو تم نے صرف اپنے ہاتھ اور بازو کھولنے میں گزارنے ہیں۔

"لیکن تم نے میرے سوال کا جواب گول کر دیا' بتاؤ تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟"

"عورت کی وجہ سے۔" وودن زادے نے کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد جواب دیا۔ "امریکن عورت ناقابل اعتبار ہے اور ایرانی عورت۔" اس نے اپنے سامنے کھڑے سعد سلطان کی طرف دیکھا "وہ امریکن عورت کی طرح ہی ناقابل اعتبار ہے۔" اس نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"تم امریکن عورت کو چاہے جو مرضی کہو لیکن ایرانی عورت پر لعنت مت بھیجو کیونکہ وہ تو پھولوں کے دیس کی باسی ہے۔ جس کے وجود سے پھولوں کی خوشبو آتی ہے' پراسرار مشرق کے پراسرار پھولوں کی خوشبو۔" جواب میں وہ یکدم بلند آواز میں بولا تھا۔

"مجھے علم نہیں۔" وودن زادے نے سرہلاتے ہوئے کہا "میں ایرانی عورت سے صرف اپنی ماں' بہنوں' نانی' دادی اور ایک پھوپھی کی حد تک واقف ہوں' یہ چھ عورتیں خالص ایرانی تھیں' ان کی اگلی نسلیں مخلوط ہو چکی ہیں اور یہ چھ کی چھ خالص عورتیں بھی امریکی عورتوں کی طرح ہی تھیں' ناقابل اعتبار' بےوفا' ناقابل بھروسا۔"

"پھر مجھے کہنا چاہیے کہ تمہارا تجربہ اور مشاہدہ بہت محدود ہے' نہ ہونے کے برابر۔" جواب میں وہ شانے اچکا کر بولا۔

"ہاں' وہ تو ہے' تم سے مل کر مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔" وودن زادے نے سچائی کے ساتھ اعتراف کیا۔

"اسی لیے میں تمہیں اجازت نہیں دوں گا کہ تم ایرانی عورتوں پر لعنت بھیجو۔" وہ قطعیت سے بولا۔

"چلو' ٹھیک ہے میں انہیں کچھ نہیں کہتا۔" وودن زادے صلح جو انداز میں بولا۔

"ویسے یہ ہے کہ میں آج کل کے حالات میں ایرانی قوم کے بے لچک رویے پر خوش بھی ہوتا ہوں' چاہے کوئی اسے اس ملک کی ضد کہے' ہٹ دھرمی کہے مگر یہ ایک قوم کی خودداری ہے خواہ وہ ضد ہو یا ہٹ دھرمی۔"

"اسی لیے تو میں تمہیں ان کے بارے میں کچھ کہنے کی اجازت نہیں دوں گا' اس زمانے میں جب دنیا بھر کے ملک علامتی طور پر ہی سہی ایک عالمی طاقت کے سامنے جھک جاتے ہیں' اس ملک کے بے لچک رویے میں اس سے متاثر ہونے کا خاطر خواہ مواد موجود ہے۔" وہ اپنے ڈی ایس ایل آر کیمرے کے لینس کو صاف کرتے ہوئے بولا۔

"چلو خیر' یہ تو ایک ایسا موضوع ہے جس پر میں زیادہ بات نہیں کر سکتا کیونکہ اس پر میرا علم بہت کم ہے' لیکن عورت ہاں عورت۔" اس نے سعد کی طرف دیکھا "عورت امریکی ہو یا ایرانی' فرانسیسی ہو یا جاپانی' بے اعتبار ہوتی ہے ناقابل بھروسا۔"

"دیکھو تم پھر مشرق کی عورت پر الزام لگا رہے ہو۔" سعد نے انگلی اٹھا کر اس کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو بھئی' میرا اپنا تجربہ ہے۔" اس بار وودن زادے نے پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں امریکی شہری ہوں اور عورت کے سارے روپ دیکھ چکا ہوں' اس معاملے میں شاید میرا تجربہ تم سے زیادہ ہے' تم جو ایک جدید پاکستانی دکھتے ہو مگر شراب نہیں پیتے' تو ٹھر ہو۔"

"ایک دو یا دس عورتوں کے تجربے کو تم سب پر لیبل نہیں کر سکتے۔" سعد نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"جو بھی ہے۔" وودن زادے نے پہلو بدلتے ہوئے جواب دیا۔ "اپنے تجربوں کی روشنی میں میں ایسا ہی ہوں اور ایسا ہی رہنا چاہتا ہوں' عورت سے شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے' وہ کون سا گھر بناتی اور بچے سنبھالتی ہے' ہر چھ ماہ کے بعد دسیوں گھر ٹوٹتے اور بکھر جاتے ہیں۔"

اپنی بات کے جواب میں خاموشی پر وودن زادے نے کن انکھیوں سے سعد کی طرف دیکھا' اس کا خیال تھا کہ جواب میں وہ مزید بھڑکے گا لیکن وہ خاموشی سے سر جھکائے کیمرے کا لینس صاف کرنے میں مصروف تھا۔

اب تم بتاؤ' تم نے شادی کیوں نہیں کی؟" وودن زادے نے خاموشی توڑنے کی خاطر کہا۔

"میں نے؟" سعد نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا "میں نے اس لیے شادی نہیں کی۔" سر دوبارہ جھکا کر اپنے کام میں مشغول ہوتے ہوئے اس نے کہا' "کہ میری ابھی شادی والی عمر نہیں ہے' میں ابھی چھوٹا ہوں۔"

ہنسی بے اختیار وودن زادے کے منہ سے پھوٹی تھی' اس کا نیا دوست بھی فنون لطیفہ میں دلچسپی رکھنے کے ساتھ ساتھ فن ظرافت میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کھاری جمعہ پڑھنے آیا تھا' میں نے جمعہ کے بعد دوپہر کے کھانے کے لیے اسے بہت روکا مگر نہیں رکا۔ پتا نہیں اسے کس لیے اتنی جلدی تھی۔" مولوی سراج سرفراز نے آپا رابعہ کو بتایا۔

"اس کا گھر دوبارہ سے بسنے جا رہا تھا۔ خدا جانے وہ جمعہ پڑھنے کیسے آگیا۔" آپا رابعہ سوچ رہی تھیں "شکر ہے جو آ گیا نہ آتا تو مجھے ایک اور غم نے آگھیرنا تھا کہ سعدیہ نے اسے آنے کو کہا نہیں یا وہ نہیں آیا۔"

"بہتر نہ ہوتا اگر کھاری خود آتا اور سعدیہ کو لے جاتا' سعدیہ اکیلی کیوں گئی۔" مولوی صاحب نے آپا رابعہ کی طرف دیکھا۔

"اس کا خیال تھا کہ اسے خود سے چلے جانا چاہیے' کھاری تو گھبراتا شاید کبھی نہ آئے۔"

"کھاری کیوں گھبراتا رہا' اسے کیا مسئلہ تھا؟" مولوی سراج نے پوچھا۔

"خود اعتمادی کی کمی کا شکار ہو گیا تھا بس۔" آپا رابعہ کو مولوی سراج کا یوں سوال کرنا کھل رہا تھا۔

"ٹھیک ہے پھر میں اب عصر پڑھانے جا رہا ہوں۔" مولوی سراج کو شاید آپا رابعہ کا جز بز ہونا سمجھ میں آ گیا تھا وہ سر پر رومال باندھتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"مولوی سراج کو کیا بتاؤں کہ سعدیہ نے عقل کو ہاتھ ڈال لیا' اسے سمجھ آ گئی کہ زندگی حیثیت اور بے حیثیتی کا نام نہیں' زندگی اس چیز کا نام ہے کہ انسان کب کہاں اور کیسے سمجھ داری کا ثبوت دیتا ہے۔ اپنے نفع نقصان کو سمجھ جاتا ہے۔ میں مولوی سراج کو کیا سمجھاؤں کہ ساری عمر پیچھے مجھے بھی اب سمجھ میں آیا ہے کہ سعدیہ عمر میں مجھ سے کہیں چھوٹی مگر عقل میں مجھ سے کہیں آگے ہے۔ جو باتیں وہ چند دنوں میں سمجھ گئی وہ باتیں اگر میں نے اتنے سالوں میں تھوڑی تھوڑی کر کے سمجھائی ہوتیں تو آج وہ عقل' شعور اور فہم میں ہم سے اور بھی کہیں آگے ہوتی۔ بس!" سر کو تاسف سے ہلاتے ہوئے انہوں نے سوچا "آج خود پر نظر ڈالوں تو لگتا ہے سارا قصور ہی میرا ہے۔ میرا تو وہ حال ہے جو سارے سیانے مر جائیں تو کملا بھی سیانا بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ جو چند سال میں نے اس سمجھ دار' باشعور' سلیقے سبھاؤ والی بی بی کے ساتھ گزار لیے تو میں نے سمجھا کہ میں اتنی کملی بھی عقل کل بن گئی ہوں۔ اس کے بعد زندگی کے معاملات کی ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ گویا نظام سقے کی حکومت دائمی ہو گئی۔ مولوی سراج سرفراز بے چارے کی زندگی بھی اپنے انگوٹھے تلے کر لی اور سعدیہ بیچاری کو بھی اپنی فہم کے ہنٹر مار مار کر سدھاتی رہی۔"

"آوہا۔" انہوں نے ایک سرد آہ بھری "اب جو اپنے اصل پر نظر پڑتی ہے تو شرم سے گھٹ گھٹ جاتی ہوں۔ کانے کوے والا حساب لگتا ہے اپنا، جو سب کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔ عمر بھر اپنے تھیلے میں جو بلیاں چھپائے سعدیہ کی نظروں سے بچاتی رہی جب وہ ہی بلیاں اس کے سامنے نکالنی پڑیں تو وہ بولی "کاش اماں! آپ نے مجھے بہت پہلے بتادیا ہوتا۔ میں اپنے خوابوں کی دیوار کے کنگرے اتنے اونچے بناتی نہ ان پر بیل بوٹے کھینچتی۔" سعدیہ کا یہ جملہ تھا کہ ایک طمانچہ۔ سانوزن سے میرے رخسار پر آن پڑا۔ جو اس کی جگہ میں ہوتی اور اس عمر میں ہوتی جس میں وہ ہے تو چیخ چیخ کر بین ڈال ڈال کر بف تھک جاتی لیکن وہ بولی "اماں! پیچھے جاکر ایک دفعہ تو دیکھنا تھا جو آپ دیکھ کر بھاگی تھیں، اس کے بعد کیا ہوا تھا۔" آج کی بچی ہم سے کہیں زیادہ بہادر نکلی، زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والی، جب ہی تو اس نے سوچ لیا کہ کھاری کے ساتھ زندگی گزارنے میں آسانی رہے گی اور چلی گئی۔ وہ بات جو میں عمر بھر سراج سرفراز کے بارے میں نہ سوچ سکی۔ بس ثابت ہوا کہ میں ہی احمق تھی، میرے سارے عمل الٹے اور ناپختہ تھے جب ہی آج بھی دل کو کوئی سکون نہیں ہے، جب ہی آزمائش آتی ہے اور آکر ٹھہری جاتی ہے۔ پہلے لگتا تھا سعدیہ آزمائش ہے، اب لگتا ہے وہ آزمائش بن گیا ہے۔ جو دو گھڑی غائب سے نظروں کے سامنے حاضر ہوا اور پھر نظروں کے سامنے سے غائب ہوگیا، دل کا بچا کھچا قرار لوٹ کر۔ آنکھوں کی رہی سہی نیند چھین کے۔ وہ نجانے اب کس پردے کے پیچھے پھر سے غائب ہوگیا اور میں دریا کے سامنے کھڑی پیاسی کی پیاسی رہ گئی نہ کسی پل چین ہے نہ کسی پل قرار ہے۔" وہ اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگیں۔

"کیا کروں اور کہاں جاکر ڈھونڈوں، ماہ نور نے کہا تھا، وہ مجھے جلد واپس آکر بتائے گی مگر اب تو اس کی بھی کوئی خیر خبر نہیں۔ کھاری ملے تو اس سے کہوں، ماہ نور کا تو پتا لے۔ کہاں رہ گئی۔"

انہوں نے اپنی تھکی ہوئی آنکھوں سے دیوار کے اس کونے کو دیکھا جس پر لگے جالے کی مکڑی اپنے تار تیزی سے بنتی اوپر اوپر اور اوپر چلی جارہی تھی۔

✡ ✡ ✡

"میں کہتی تھی تم سے نہ کو سا کرو سراج سرفراز کو، نہ کہا کرو اسے کم بخت اور منحوس، دیکھ لو اس روز وہ نہ ہوتا تو یہاں چار قتل ضرور ہوئے ہوتے، ایسے چار قتل جن کا نہ کوئی پرچا کٹتا، نہ کوئی مدعی ہوتا نہ گواہ اور قاتل حسب معمول چھریاں لہراتا اسی محلے میں دندناتا پھر رہا ہوتا۔"

"اب چپ کیوں ہو بولتی نہیں، کہیں وہ تمہاری زبان کاٹ دینے میں کامیاب تو نہیں ہوگیا، وہ جو چھریاں لہراتا آیا تھا مگر اسی سانڈ نما سراج سرفراز نے اسے بھگا دیا تھا۔"

"اچھا ہی تھا زبان کاٹ جاتا، کم بخت غلط موقع پر غلط بات کر جاتی ہے۔"

"کاٹ ہی جاتا جو تمہاری زبان اس کی چھریوں سے تیز نہ ہوتی مگر یہ آج موقع اور بات کی غلطی کا احساس کیسے ہونے لگا تمہیں۔۔۔؟"

"بس ہوگیا اور بچ جانو، مجھے تو یہاں رہتے اب ڈر لگتا ہے۔ وہ کہیں گیا نہیں، یہیں ہے اور پھر آئے گا، یہ بے چارہ سراج سرفراز کب تک اسے بھگائے گا، اب کے وہ آیا تو سب سے پہلے اسی کی گردن اتارے گا۔"

"ہاں! اس بے چارے کے لیے تو میں بھی پریشان ہوں، ابھی تو وہ اسے کچھ نہیں کہے گا۔ تازہ تازہ بات ہے، لیکن جیسے ہی ذرا ٹھنڈی پڑی سب سے پہلے اسی کا قصہ ختم کرے گا۔"

"وہ خود چپ ہو کر بیٹھا ہے مگر محلے والوں کی زبانیں اپنی سان پر تیز کر رہا ہے جو اٹھتا ہے، یہ ہی کہتا ہے یہ نامحرم سراج سرفراز ادھر آکر کیوں بیٹھ رہا ہے دو جوان عورتوں کے گھر میں۔"

"ہاں ہر طرف سے گھیرے میں آگئے، اوپر سے ان کو بھی کاروباری مسائل نے یکدم ہی آن گھیرا، ورنہ وہ تو بچے کی پیدائش کے فوراً بعد یہاں سے ہمیں نکال لے جانا چاہتے تھے۔"

"طیفا لالٹرجان کا دشمن، سراج سرفراز نامحرم، منے کے ابا کا کاروبار مندے میں، تمہارا گانا بجانا ختم۔ ہر طرف سے گلی بند۔ جائیں تو جائیں کہاں۔"

"ماں ہوں ممتا منہ پکڑ لیتی ہے لیکن کوئی دوسرا سنے تو کہے یہ بچہ ہی منحوس ثابت ہوا۔"

"ہائے تمہارے منہ میں خاک، بچہ کیوں منحوس ثابت ہونے لگا، ہمارا منا تو مبارک ہے، خوش قسمت ہے، اس کا آنا سعد ثابت ہوگا۔ دیکھ لینا، اس کے ماتھے پر قسمت کی لکیر چمکتی ہے، اس کی آنکھوں کے صدقے جاؤں جن میں سے روشنی کی کرنیں نکلتی ہیں، مولا خوش رکھے اسے، سدا سلامتی دے اس کے شملے اونچے رہیں، خبردار جو اس کو منحوس بولا کوئی۔"

"کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے میں نہیں تم ہی اس کی ماں ہو۔"

"ہاں تو ماننا کون ہے کہ میں اس کی ماں نہیں، تم ماں ہو بھی نہیں سکتیں جو اپنے بچے کو منحوس کہے وہ ماں نہیں ہوتی۔"

"اس کا باپ بھی تمہاری باتوں کا گرویدہ اور یہ بھی گلا پھاڑ پھاڑ کر روتا تمہاری گود میں جاکر چپ ہوجاتا ہے۔ میں تو درمیان میں سے نفی ہوتی چلی جارہی ہوں۔"

"کوئی نفی وفی نہیں ہو رہی، بس حالات اور کام دھندے کی مارے سٹپٹا گئی ہو، سب ٹھیک ہوجائے گا ان شاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہوتے ہوتے ہوگا! اب اس سراج سرفراز کا کیا کریں، جو آج صبح کہہ رہا تھا۔ بی بی جی! محلے میں نکلتا ہوں تو لوگوں کی باتیں کہیں کھڑا نہیں ہونے دیتیں، آپ کو اکیلے چھوڑ دینے کو جی نہیں مانتا مگر یہاں رہ بھی نہیں پاؤں گا، ہوسکے تو مجھے اجازت دیں۔ میں کہیں اور ٹھکانا کرلوں۔"

"ہائے میرے ربا، یہ کم۔ میرا مطلب ہے، یہ اللہ کا بندہ بھی چلا گیا تو کون روکے گا طیفے لالٹر کو۔"

"اب کیوں گھگھی بندھ رہی ہے، اور کہو اسے کم بخت اور منحوس۔"

"نہیں بولتی۔ اب تو کہتے کہتے رک جاتی ہوں۔ سر پیٹ کر اپنی عقل کا ماتم بھی کرلیتی ہوں جو منہ سے غلطی سے اس کے لیے کوئی برا لفظ نکل بھی جائے تو، پر اس کو نہ جانے دینا۔ اللہ کا واسطہ ہے اسے روک لو۔ یہ چلا گیا تو ہم کیا کریں گے۔"

"تم تو کہتی تھیں، بڑا چارپائی توڑتا رہتا ہے اناج کا دشمن۔"

"توبہ میری توبہ، جواب کہوں تو میری زبان واقعی کاٹ دینا مگر اسے تو روکو کس طرح۔"

"ہوں، سوچتی ہوں، لڑاتی ہوں کوئی ترکیب اس کو روکنے کی۔"

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

عنیزہ سیّد

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم

"میرا خیال ہے میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم اب اس کے پیچھے جا رہے ہیں نہ ہی اس کی کوئی بات کر رہے ہیں" ہلال سلطان کا لہجہ اور بات ابراہیم کے لیے حوصلہ افزا ہرگز نہیں تھی۔

"لیکن انکل! میں نے بتایا نا کہ یہ لڑکی تو ویسے ہی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" اس نے منمنا کر ایک کوشش مزید کرنا چاہی۔

"تمہارا کیا خیال ہے، میں بہت فارغ ہوں جو جب کوئی مجھ سے ملنا چاہے میں اسے ملنے کے لیے Available (دستیاب) ہو جاؤں۔" وہ سخت اور خشک لہجے میں بولے۔

"نہیں۔ ہرگز نہیں انکل! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں" ابراہیم نے زبان پھیر کر اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا ہے کہ اسے میں اپنے مان پر لایا تھا۔" اس نے ایک جذباتی وار کھیلنے کی کوشش کی "میں نے ہی اسے یقین دلایا تھا کہ انکل میری بات کو اون کرتے ہیں کیونکہ مجھے وہ اپنے بیٹے جیسا ہی سمجھتے ہیں۔"

"خیر ایسی حماقت تو میرے بیٹے نے بھی کبھی نہیں کی، میرے بی ہاف پر کسی کو امید دلانے کی حماقت۔" وہ بے لچک انداز میں بولے "لیکن تمہیں اس بات کا مارجن دیا جا سکتا ہے کہ تم جن پہلوانوں کی اولاد ہو، وہ دماغ کے بجائے معدے سے سوچنے کی جبلت جینز میں پرو کر تمہیں ورثے میں دے گئے ہیں تمہارا ابھی کوئی قصور نہیں۔"

—۲۱—
اکیسویں قسط

"جی جی۔ یہ آپ نے ٹھیک کہا۔" ابراہیم مارجن ملنے کی خبر سن کر اس بات سے متفق ہونے پر بھی تیار ہو گیا۔ وہ ماہ نور کو بلال سلطان سے ملوانے اچانک لے آیا تھا۔ نہ اس نے ان کو پیشگی اطلاع دی تھی نہ ان سے ملاقات کا وقت اور اجازت مانگی تھی اور اب یہ ہی غلطی اس کے لیے مہنگی ثابت ہو رہی تھی۔ وہ ماہ نور سے شرمندہ ہونا چاہتا تھا نہ ہی یہ چاہتا تھا کہ ماہ نور اور بلال سلطان کی ملاقات ہونے سے رہ جائے۔

"میرے پاس لنچ بریک کے صرف بیس منٹ ہیں اور بیس منٹ کا مطلب ہوتا ہے بیس منٹ۔ یعنی بارہ سو سیکنڈز' میں اپنا لنچ تمہاری حماقت کے سامنے سیکری فائس کر سکتا ہوں کیونکہ تم نے ٹھیک کہا تم مجھے اسی طرح عزیز ہو جیسے کوئی بیٹا اپنے باپ کو ہو سکتا ہے۔" چند ثانیوں کے توقف کے بعد انہوں نے کہا۔

"جی انکل!" ابراہیم کی باچھیں کھل گئیں۔ "جی جی بالکل ٹھیک' میں ابھی اسے بتا کر آتا ہوں۔" وہ تیزی سے اٹھا اور باہر کی طرف چلا۔ شرمندگی سے بچ جانے کی خوشی اور بیس منٹ یعنی بارہ سو سیکنڈز کے اعلان کے دباؤ میں وہ باہر نکلتے نکلتے پہلے ایک چھوٹی تپائی اور پھر صوفے کی ٹانگ سے بری طرح ٹکرایا۔

ماہ نور کو بلال سلطان کے وقت اور اصول کے متعلق بتا کر اسے ان کے پاس بھیجنے کے بعد وہ کتنی ہی دیر اپنی چوٹ کھائی ٹانگ اور بند جوتے کے اندر سے پاؤں نکال کر انگوٹھے کا زخم سہلاتا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میرا نام ماہ نور ہے' اور میں لاہور میں رہتی ہوں۔"

"لاہور میں رہتی ہو تو یہاں اسلام آباد میں کیا کر رہی ہو؟"

"میں یہاں آپ کے بیٹے سعد سلطان سے ملنے آئی تھی۔ پتا چلا کہ وہ تو یہاں نہیں ہے تو سوچا' آپ سے مل لوں۔"

"سعد سے کس سلسلے میں ملنے آئی تھیں؟ اور میں بتا تا چلوں کہ میں سعد سلطان کا باپ ضرور ہوں' لیکن اس کا متبادل ہرگز ثابت نہ ہو سکوں گا۔"

"میں آپ کو اس کا متبادل سمجھ بھی نہیں رہی' میں آپ سے اس لیے ملنے آئی ہوں کہ مجھے آپ سے ملنا تھا' آپ کو بتانا تھا کہ یہاں سے خاصے فاصلے پر لاہور سے آگے ایک گاؤں میں ایک خاتون رہتی ہیں' جو آپ کو خوب اچھی طرح جانتی ہیں' نہ صرف جانتی ہیں بلکہ آپ کے ذکر پر تڑپ تڑپ کر روتی بھی ہیں۔"

"بلیک میلنگ ہتھکنڈے۔" انہوں نے ابرو چڑھا کر ماہ نور کی طرف دیکھا۔ "نہیں چلیں گے' ایک کاروباری انسان ہونے کی حیثیت سے میں ان کا عادی بھی ہوں اور ان سے نمٹنا بھی جانتا ہوں۔"

"نہیں۔ میں آپ کو بلیک میل کرنے نہیں آئی' نہ ہی وہ خاتون کبھی ایسا چاہیں گی جو آپ کو جانتی بھی ہیں اور آپ کا ذکر سن کر تڑپ تڑپ کر روتی بھی ہیں ان کا نام رابعہ ہے' مولوی سراج سرفراز کی زوجہ رابعہ جو گاؤں میں بھین جی کے نام سے بلائی جاتی ہیں۔"

مسلسل حرکت کرتی ریوالونگ چیئر ساکت ہوئی اور اس پر بیٹھے شخص کے چہرے کا رنگ لمحہ بھر کے لیے بدل گیا۔ کمرے میں خاموشی چھا چکی تھی اور وال کلاک کی ٹک ٹک کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بیس' پچیس' تیس' ایک گھنٹہ' دو گھنٹے اور ان کے آگے نجانے کتنے ہی اور منٹ بھی گزر گئے' بلال سلطان اور ماہ نور کی ملاقات ختم ہونے میں نہیں آئی۔ باہر بیٹھا ابراہیم منتظر نظروں سے اس کمرے کے دروازے کے کھلنے کا انتظار کر رہا تھا جس میں وہ دونوں بیٹھے تھے اور اس کا ذہن یہ سوچ سوچ کر گھومنے لگا تھا کہ بلال سلطان کی لنچ بریک ختم کیوں نہیں ہو رہی تھی۔

"لاحول ولا...!" چوہدری سردار کے حلق میں جیسے زہر سا گھل گیا۔ "یہ خاتون آج بھی ویسے ہی بے ہنگم حلیے میں ہیں جیسی کئی سال پہلے ہوا کرتی تھیں۔ زمانہ بدل گیا' زمانے کے سارے رنگ ڈھنگ بدل گئے مگر یہ نہیں بدلیں۔ عمر کا بھی لحاظ نہیں ہے انہیں' بڑے بڑے رنگ برنگ پھول پتوں والا جمپر اور وہی شوخ رنگ قمیص' دوپٹے کے نام پر کپڑے کی دھجی سی سر پر ٹکائے ابھی بھی ویسی ہی کم عمر بننے کی کوشش فرما رہی ہیں جیسی اس وقت تھیں جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ زندگی میں بہت سی خواتین سے ملنے کا اتفاق ہوا کچھ بہت باذوق' کچھ سادہ سی' کچھ بے ذوق بھی' مگر یہ خاتون اپنی طرز کا واحد نمونہ ہیں۔ اتنے سالوں میں فرق صرف اتنا پڑا ہے کہ ان کے بالوں کا جھنڈ سفید ہو گیا۔ باقی تو۔" انہوں نے سوچتے ہوئے تاسف سے سر جھٹکا۔

چوہدری سردار اپنے فارم ہاؤس کے مہمان خانے میں آئی خاتون کو شرف ملاقات دینے ادھر آئے تھے اور اس وقت مہمان خانے سے ملحق طویل راہداری کے درمیان کھڑی شیشے کی دیوار کے پار بیٹھی مہمان کو دیکھ کر ٹھٹکے کھڑے تھے۔

"اور یہ ان کو اتنے برسوں بعد ادھر کا پتا کس نے تھما دیا اور جو یہ آج بھی اتنی ہی مردمار لڑاکا اور غصیلی ہوئیں تو پھر ان کی مہمان داری کون کر پائے گا بھلا۔" انہیں یاد آ رہا تھا کہ کئی برس پہلے ان خاتون کا مزاج کیسا تھا۔

"اب نہ جانے یہ یہاں آئی کس لیے ہیں' کیا پوچھیں گی' کیا کہیں گی' ان کے تو مزاج کے بارے میں کچھ بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا۔" انہیں وہم بھی ستا رہے تھے۔ "چلو بھئی' چوہدری سردار! اس اوکھلی میں سر تو دینا ہی پڑے گا' ان کے آگے تو کوئی بہانہ بھی چلنے والا نہیں۔ ملنے کے ارادے سے آئی ہیں تو ملاقات کیے بنا ٹلیں گی نہیں' بہانہ بنایا تو کیا پتا یہیں قیام پذیر ہو جائیں کہ جب تک ملاقات نہیں کرو گے جانے والی نہیں میں۔" وہ اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے کھنکھار کر اپنی آمد کی اطلاع دیتے مہمان خانے میں داخل ہوئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ذات کے میراثیوں کے ہاتھ شرفا کا شجرہ لگ جائے تو وہ اسے کیسے توڑ اور کس طرح موڑ سکتے ہیں۔ اس کا تذکرہ صرف سنا ہی تھا۔ اب ذاتی تجربہ بھی ہو رہا ہے۔ سنا ہے میراثیوں میں ایک بات پر بہت اکڑ ہوتی ہے کہ گاؤں کے طرم خان چوہدری بھی ان کے پاس اپنے خاندانوں کے شجرے بطور امانت رکھواتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باراتوں بیاہوں میں جب وہ دولہا یا دلہن کے رشتہ داروں پر جگتیں کسنے لگتے ہیں تو ان کے آباؤ اجداد کے بخیے بڑی آسانی سے ادھیڑ لیتے ہیں۔" بلال سلطان نے کہا اور یہ بات کہتے ہوئے ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی' جیسے انہیں کسی بات سے گہرا صدمہ پہنچا ہو۔

"مگر بھین جی تو بہت اللہ والی' ایمان دار اور متاثر کن شخصیت کی مالک ہیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ وہ ایسی بد دیانتی کر سکتی ہیں۔" ماہ نور نے جواب دیا۔

"تمہیں اپنی نظر کا معائنہ کرانا چاہیے لڑکی!" بلال سلطان کا لہجہ مزید سنجیدہ ہوا۔ "ضروری تو نہیں کہ سامنے والا جو بات کہہ رہا ہو' وہ لازمی سچ ہو۔"

"لیکن ان کی باتوں کی سچائی کا ثبوت تو یہ بھی ہے نا کہ آپ ان کی تائید کر رہے ہیں۔" ماہ نور نے سرہلاتے ہوئے کہا۔ اسے بلال سلطان سے زیادہ خود زعم شخص پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ وہ نہ صرف خود زعمی میں مبتلا تھے بلکہ خود پسند بھی تھے' اس نے ان سے گفتگو کے بعد فیصلہ کیا تھا۔

"میں نے واقعات کے ظہور پذیر ہونے کی تائید ضرور کی ہے' لیکن یہ تو نہیں کہا کہ وہ ویسے ہی ظہور پذیر ہوئے جیسے تمہیں بتایا گیا ہے۔"

"خیر میں یہ تو نہیں جانتی کہ حقیقت میں وہ کس طرح ظہور پذیر ہوئے' لیکن مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ سعد کو ان ساری باتوں سے بلاوجہ لاعلم رکھا گیا۔ اس لاعلمی نے اسے کس ذہنی اذیت میں مبتلا رکھا' اس کا اندازہ آپ کو نہیں ہے۔ آپ نہیں جانتے' وہ اپنے اندر کی اذیت کو دبانے کے لیے کیسے قریہ قریہ بستی بستی خوار ہوتا رہا۔ کبھی ایک روپ میں' کبھی دوسرے روپ میں اس امید کے ساتھ کہ شاید کہیں کسی قریے میں' کسی بستی میں' کسی پنڈال میں' کسی روپ میں' کسی بہروپ میں اسے کوئی ایسا سرا ہاتھ لگ جائے' جس کے سہارے ساری گتھی سلجھ جائے۔ آپ کیسے باپ ہیں' جو آپ کو اس کی اس اذیت کا اندازہ ہوا نہ اس کا مداوا کرنے کا خیال آیا۔" وہ جذباتی ہونے لگی۔

بلال سلطان نے چونک کر ماہ نور کی طرف دیکھا۔ اس لڑکی کی آنکھیں اور ناک شدت جذبات سے سرخ ہو رہی تھیں' اس کے چہرے پر گہرا دکھ تھا۔ ان کے دل نے ایک دھڑکن چھوڑ دی تھی۔

"تم ابھی کم عمر ہو۔" انہوں نے پہلے کی نسبت نیچی اور نرم آواز میں کہا "نا تجربہ کار بھی ہو۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ زمانے بھر کے ڈیٹیکٹوز (سراغ رساں) جب ایک انسان کو مجرم ثابت کرنے پر تل جائیں' ان کے دستانہ پوش ہاتھ ایک کے بعد ایک ایسا کلیو اٹھا کر سامنے لاتے جائیں' جن کے مطابق واردات کے سارے ثبوت ایک ہی بندے کی طرف جا رہے ہوں اور حقیقت یہ ہو کہ وہ بندہ' سرے سے مجرم ہی نہ ہو تو اس کے لیے خود کو بے گناہ ثابت کرنا' کتنا مشکل ہوتا ہے' مشکل کیا ناممکن ہوتا ہے۔" ان کے لہجے کی سنجیدگی سے ایک بے بسی کی بے چارگی ٹپکتی محسوس ہو رہی تھی۔ ماہ نور نے نظریں جھکالیں' اسے لگا' اس ایک لمحے میں وہ بلال سلطان کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی۔

"میں نے اس ناممکن کا زہر پیتے عمر گزار دی۔ وہ میرا بیٹا ہے' مگر اس کے اور میرے درمیان ناممکن کا ایک لفظ دومونہی برچھی کی طرح گڑا ہے۔ دائیں حرکت کرو تو برچھی چیرے' بائیں حرکت کرو تو برچھی چیرے' اس لیے میں نے خود کو سیدھا اور ساکت رکھا' اس لیے کہ ذرا سی جنبش سے ناممکن کی یہ برچھی میرے اور اس کے رشتے کو کاٹ سکتی تھی۔"

ماہ نور نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا' انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

"تم جانتی ہو کہ ایک رشتے سے وہ پہلے ہی محروم تھا' میں اسے دوسرے رشتے سے محرومی کے دکھ سے بچانا چاہتا تھا۔ مگر زمانے کے یہ ڈیٹیکٹوز اپنے اپنے کھرے اٹھائے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی روپ میں پھر بھی اس سے ٹکرا گئے۔ یقیناً" ہر کسی نے اپنا کھرا اسے دکھاتے ہوئے کہا ہو گا کہ دیکھ لو کھوجی لکیر تو تمہارے اپنے گھر کی طرف جا رہی ہے' ایسی صورت میں اس نے اور کیا کرنا تھا۔" انہوں نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"اپنے باپ کو ماں کے قاتل کے روپ میں ملنے کے بعد دو طریقے ہو سکتے تھے یا تو وہ طیش کے عالم میں باپ کو قتل کر دیتا یا پھر وہ کرتا جو اس نے ابھی کیا' باپ کی نظروں سے دور چلا جاتا نہ اس کو دیکھتا نہ اپنی شکل دکھاتا۔ اس نے شاید یہ بہتر راستہ اختیار کیا۔" انہوں نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

"مگر تم نے دیکھا۔ بنا کوئی جنبش کیے' سوال جواب کے بغیر' ارادے اور نیت کی کسی لغزش کے بغیر بھی ناممکن کی یہ برچھی اپنا کام دکھا کر رہی' مگر میں خوش ہوں۔" انہوں نے اپنی آنکھوں کے اندرونی کناروں کو دو انگلیوں سے دبایا اور پھر ماہ نور کی طرف دیکھ کر بولے۔

"وہ مجھ سے دور چلا گیا' جتنا میں اس کو جانتا ہوں' وہ خود کو اذیت میں مبتلا کر کے اپنے تئیں مجھ سے انتقام لینے کی کوشش کر رہا ہے' مگر تم جانتی ہو' میرے جیسے انسان کے لیے اس نے بہترین انتقام منتخب کیا ہے' میرے اعصاب' جذبات' ہمت' طاقت' حوصلہ' سب کی آزمائش ہے یہ اور یہ گھڑی مجھ پر آنی بھی چاہیے تھی کیونکہ اتنے برس میں اس سے محفوظ رہا جو ہوا' اس میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی جگہ میری بے احتیاطی' میری کوتاہی' میری بزدلی اور کم ہمتی بھی تو قصوروار تھی پھر ایسا کیوں ہو کہ مرنے والے دنیا سے چلے جائیں' کمزور اور بے بس لوگ ٹھکانے سے بے ٹھکانا ہو کر در در کی ٹھوکریں کھاتے خود کو ایک مشترکہ دشمن کے وار سے بچاتے پھریں اور میں محفوظ رہوں' عیش کرتا رہوں' واقعات کا ایک کردار میں بھی تو تھا' پکڑ کی گھڑی مجھ پر بھی تو آنی تھی اور یاد رکھنا۔"

انہوں نے انگلی اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے کہا "آزمائش کی سب سے سخت گھڑی وہ ہوتی ہے جب آپ ذہنی طور پر خود کو اس سے محفوظ تصور کر رہے ہوں اور وہ اچانک آپ کو آن دبوچے۔ اللہ محفوظ رکھے بڑی سخت آزمائش ہوتی ہے یہ بڑی سخت۔" انہوں نے اپنے کان پکڑے۔

"ہونہہ!" ماہ نور نے سر جھٹک کر استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "تو گویا آپ خود کو آزمائش میں گھرا محسوس کرتے ہیں یہ آفس یہ اسٹیٹس جو آپ کا ہے' یہ شان و شوکت جس کے آپ مالک ہیں۔ آپ کی بزنس ایمپائر ہر بڑے شہر میں آپ کے گھر' آپ کی گاڑیوں کے فلیٹس' آپ کا اپنا چھوٹا طیارہ جس میں آپ سفر کرتے ہیں۔ آپ کے ڈھیروں سب آرڈینیٹس۔ ان سب کے ہوتے ہوئے بھی آپ آزمائش میں ہیں۔"

اس نے ابرو چڑھا کر سوالیہ انداز میں بلال سلطان کی طرف دیکھا اور تلخی سے ہنس دی۔

"جائیں سر! آپ بھی خوب۔ آپ کے گمان بھی خوب۔" اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا' وہ اپنی آنکھوں میں امڈتے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں اپنا ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

پھر خود پر قابو نہ پاتے ہوئے قدرے بلند آواز میں بولی۔

"ارے آزمائش میں تو وہ ہے۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے "جو اتنی عمر ایک ذہنی اذیت کے ساتھ جیتا رہا اور اب کے بعد کی عمر میں شاید جسمانی اذیت بھی سہے گا' آئی ایم سوری مجھے کہنا پڑے گا آپ ایک پتھر دل انسان ہیں' ایک پتھر دل باپ' جسے اپنا کلین امیج ہر رشتے سے زیادہ پیارا ہے' چاہے وہ خونی رشتہ ہو یا صرف انسانی۔"

"اوہ!" بلال سلطان اسے حیرت سے یوں روتے ہوئے دیکھتے رہے پھر گہرا سانس لیتے ہوئے بولے "لڑکی! میں نے کہا نا تم ابھی کم عمر ہو اور نا تجربہ کار بھی' یہ بات ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی کہ آزمائش کی گھڑی نے دراصل کس کو آن دبوچا ہے۔" انہوں نے اپنے ٹیبل پر رکھا ٹشو پیپر باکس ماہ نور کی طرف بڑھایا۔ ماہ نور ٹشو پیپر نکال کر۔ آنسو پونچھنے لگی۔

"اوہ! پھر۔" بلال سلطان کی نظر اپنی کلائی کی گھڑی پر پڑی "میرے پاس تو بہت کیلکولیٹڈ وقت ہوتا ہے لڑکی! تمہاری گفتگو کی وجہ سے میں ایک اہم میٹنگ کینسل کر چکا ہوں' لیکن اب ایک اور میٹنگ کا ٹائم ہونے والا ہے' میرا خیال ہے' اب یہ ملاقات اپنے اختتام کو پہنچ جانی چاہیے۔ میں نے ابراہیم کو بیس منٹ کا کہا تھا۔ بیس منٹ یعنی بارہ سو سیکنڈز مگر ان گنت سیکنڈز گزر چکے۔"

"بالکل ٹھیک؟" ماہ نور نے سرہلاتے ہوئے کہا۔ "میں بھی اب یہاں مزید رکنا نہیں چاہتی۔" وہ جذباتی ہو رہی تھی۔ غصہ میں تھی۔ اس کو دکھ تھا اور غم بھی' اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ جسم لرز رہا تھا اس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنا بیگ اٹھا کر اس کا اسٹریپ کندھے پر ڈالا' آنسوؤں کی وجہ سے اس کی آنکھیں اور ناک سرخ ہو رہی تھی۔ وہ بلال سلطان کو خدا حافظ کہے بغیر تیزی سے مڑی۔

"ایک منٹ!" پیچھے سے بلال سلطان کی آواز آئی۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔

"اگر تم وہ لڑکی ہو جو سعد کی کوئین آف ہارٹ (دل کی شہزادی) ہے تو میرے پاس تمہاری کچھ امانتیں رکھی ہیں۔"

"چھن!" ماہ نو دل میں کچھ اور بھی ٹوٹا اور اس کا زخمی دل رسنے لگا۔ اس نے کچھ دیر بے بسی سے بلال سلطان کو دیکھا۔ اس کی قوت گویائی ساتھ چھوڑ رہی تھی۔

"نہیں۔" بمشکل اس کے منہ سے نکلا۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی "میں وہ لڑکی نہیں ہوں۔ وہ کوئی اور ہے۔" ہزاروں کی تعداد میں ادھر سے اڑتے آتے نیزے اس کے زخمی دل میں آرپار پیوست ہو چکے تھے۔ اسے لگا بلال سلطان دلچسپی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"غور سے دیکھو تو یک طرفہ عشق میں مبتلا لوگوں کا چہرہ اور حالت میرے جیسی ہوتی ہے۔" اس کی نظروں نے بلال کو پیغام دیا۔ "وہ خوش نصیب جس کا تم پوچھ رہے ہو' وہ تو کہیں بلندیوں میں رہتی ہے اور میں تو زمین کی مخلوق ہوں لیکن میں تمہیں کیوں بتاؤں' وہ کون ہے۔ وہ عشق جس میں وصل کی راہ میں حائل شخصیت سے حسد اور اس پر رشک شامل نہیں' وہ عشق ادھورا ہوتا ہے' اس میں نقص ہوتا ہے اور کمی بھی۔"

اس نے دوبارہ دروازے کی طرف رخ موڑا اور اسے کھول کر باہر نکل آئی۔

"او مائی گاڈ ماہ نور! تم کہاں رہ گئی تھیں؟" اس کے انتظار میں بیٹھے ابراہیم نے اس کی شکل نظر آنے پر اٹھ کر تیزی سے اس کی طرف آتے ہوئے کہا اور پھر شاید اس کی سرخ ناک اور آنکھیں دیکھ کر ٹھٹک کر رک گیا۔

"خیر تو ہے نا' انکل نے تمہیں مارا ہے کیا؟" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھ رہا تھا۔

"ہاں۔ خیر ہے۔" ماہ نور نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "لیکن یہ ایک بری ملاقات تھی' حد سے زیادہ بری۔"

☼ ☼ ☼

"تمہارے پاس جو گاگلز ہیں' ان کے فیچرز زبردست ہیں۔ مجھے بھی ان کو خریدنے کا شوق تھا لیکن یہ بہت مہنگے ہیں' میں ان کو خرید نہیں سکتا۔" وددن زادے نے اپنے پاکستانی دوست کے گاگلز باکس کے پیچھے چھپی ان کی خصوصیات پڑھتے ہوئے کہا۔

"اچھا' واقعی!" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"کیوں کیا تمہیں معلوم نہیں؟" وددن کو لگا۔ وہ جان بوجھ کر بے نیازی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تم نے دیکھے بغیر انہیں خرید لیا ہو۔"

"شاید تم یقین نہ کرو لیکن ایسا ہی ہے۔" وہ اسی بے نیازی سے بولا جو وددن زادے کو بناوٹ لگ رہی تھی۔

"یہ جو پاوڈر باول جیکٹ اور روبیکون پینٹس ہیں یہ ڈفی گلوز تورواک سکیز اور سنوبورڈ شوز' یہ سب تم نے دیکھے بغیر خریدے ہیں؟" وددن کو اس کی اس بناوٹ پر بے وجہ طیش آنے لگا۔

"ہاں ایسا ہی ہے۔" وہ اپنی بات پر مصر رہا۔

"تم جانتے ہو' یہ ایک نارمل سکی کٹس کی نسبت کتنے زیادہ مہنگے ہیں' جو صرف ایک پروفیشنل کا انتخاب ہی ہو سکتے ہیں' وہ بھی ایسا پروفیشنل جس کی جیب میں اندھا پیسہ ہو۔" وددن زادے کا موڈ آف ہو گیا۔ اس کی بناوٹ بھری بے نیازی نے اس لڑکے کا تاثر خراب کر دیا تھا۔

"میں ایک پیشہ ور کھلاڑی نہیں ہوں۔" وہ سرہلاتے ہوئے بولا۔ "میں نے یہ سب زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے آرمیڈ کمپنی کو ایک میل لکھی تھی کہ مجھے بہترین سکی کٹس مہیا کردیں' انہوں نے مجھے مختلف کٹس کی فہرست بھیجی' جس میں سے میں نے اس کا انتخاب کر لیا' یقین جانو' میں نے دیکھا نہ جانچا کہ ان سب کی خصوصیات کیا ہیں؟"

"اور تم نے ڈالرز میں قیمت چکائی؟" وددن نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھا۔

"نہیں۔ پاونڈز میں۔"

"جو پاونڈز تم نے ادا کیے' ان کو اپنے ملک کی قابل رحم کرنسی میں تبدیل کر کے دیکھا تھا تم نے؟"

"نہیں۔" اس نے آہستہ سے سرہلایا۔

"مجھے یقین نہیں آیا کہ ایک شخص جو پیشہ ور ڈائیور (Diver) نہیں ہے وہ صرف شوق کی خاطر اتنا پیسہ خرچ کردے' جبکہ اس کا تعلق تیسری دنیا کے ایک غریب ملک سے ہو۔" وددن نے سرہلایا۔

"تیسری دنیا کے غریب ملک کے ارب پتی تم نے دیکھے ہیں کبھی؟" سعد نے اس سے سوال کیا۔

"پہلے نہیں دیکھے تھے' اب دیکھ رہا ہوں۔" وددن نے کہا۔

"اچھی طرح دیکھ لو' وہ ایسے ہی ہوتے ہیں جاہل' شوقین انہیں کسی بھی چیز کا کچھ پتا نہیں ہوتا وہ بس پیسہ لٹانا جانتے ہیں میری طرح۔" اس کے چہرے پر تمسخرانہ مسکراہٹ ابھری جس کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ ایسا کیا کرے جو پیسے سے اس کی جان چھوٹ جائے۔

"پیسے سے جان چھڑانا چاہتے ہو؟" وددن نے چونک کر دیکھا۔

"ہاں۔" اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "لیکن جتنی جان چھڑاتا ہوں یہ اتنا ہی اور بڑھ جاتا ہے' نفع کے کھاتے میں پہلے سے چوگنا پیسہ آجاتا ہے میں نہیں جانتا اس سے کیسے جان چھڑاؤں۔"

وددن زادے اپنی جگہ پر ساکت بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ شخص سنکی تھا یا سرپھرا' وہ سوچ رہا تھا۔ جس پیسے کو کمانے کی خاطر وہ سارا سال مشین بنا رہتا تھا' اسی پیسے کو دونوں ہاتھوں سے لٹانے کی خواہش کر رہا تھا۔

"تم خیراتی ادارے کھول لو' وہاں خرچ کرو۔" وددن نے تجویز دی۔

"تمہارا کیا خیال ہے' میں نے ایسا نہیں کیا ہوگا۔" وہ تیزی سے بولا "اور مجھے لگتا ہے کہ ان ہی کی وجہ سے یہ بڑھ رہا ہے اسی لیے تو میں نے تعیش پر' فضول کاموں پر خرچ کرنا شروع کر دیا ہے تاکہ یہ مجھ سے روٹھ جائے۔"

"تم نادان ہو' احمق' بے وقوف!" وددن بلند آواز میں بولا "تم جانتے ہو کہ یہ کتنی بڑی نعمت ہے۔"

"تم نہیں جانتے کہ یہ کبھی کبھی کتنا بڑا عذاب بن جاتا ہے۔" وہ اسی تیزی سے بولا۔ "یہ ہی پیسہ لوگوں کو ایک دوسرے کے گلے کاٹنے پر لگا دیتا ہے' پستول کے نشانے پر لوٹنے لٹوانے لگتا ہے' یہ ہی پیسہ ہائی فائی نینس بن کر پوری دنیا میں گردش کرتا قوموں کی تقدیریں بدلنے کے کام آتا ہے' غریب قوم کو غریب تر اور امیر کو امیر ترین بنا دیتا ہے۔ یہ ہی پیسہ جوا بنتا ہے اور جرم و گناہ کے نجانے کتنے مرکز چلاتا ہے' یہ ہی پیسہ عزتیں بکواتا اور خریدتا ہے' رشتوں کے احترام گنواتا ہے اور انسانوں کو آدمی بنا دیتا ہے' دلوں کے سکون چھینتا ہے اور راتوں کی نیندیں بھی۔"

"تم نے اتنا کمایا ہی کیوں پھر' اگر اسے سانپ ہی سمجھتا تھا۔" وددن زادے کو اس کی ہر دلیل پر غصہ آرہا تھا۔

"میں نے نہیں کمایا۔" وہ سر جھٹکتے ہوئے بولا "یہ خود سے خود آتا گیا' جیسے پانی کسی ایک راستے کا انتخاب کر کے اسی طرف بہنے لگتا ہے نا' یہ اسی طرح میری طرف بہنے لگا اور بہتا چلا آتا ہے۔ جب تک میں انجان تھا' میں نے اس پانی میں خوب ہاتھ دھوئے لیکن جب سے باخبر ہوا ہوں' اس کے سوتے سکھانے کی کوشش میں مصروف ہوں مگر وہ سوکھنے کا نام نہیں لیتے' ایک سوراخ بند کرتا ہوں' دس اور پھوٹتے ہیں۔ تم نہیں جانتے وددن!" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ نہ ہو تو بھی عذاب' یہ ہو تو بھی عذاب۔"

وددن زادے کے دل میں سعد سلطان کی بناوٹ بھری بے نیازی پر غصے کا جو ابال اٹھ رہا تھا' وہ لمحہ بھر میں بیٹھ گیا۔ یہ لڑکا بناوٹ کا شکار نہیں تھا' اس کا مسئلہ یقیناً "کچھ اور تھا۔ کچھ ایسا جو خاصا پیچیدہ تھا اور جسے سمجھنے کے لیے وددن کو وقت درکار تھا۔

"میں معذرت خواہ ہوں' میں بے وجہ تلخ ہو گیا۔" وددن نے اپنی آواز نیچی رکھتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔" اس نے بھی اپنا موڈ بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "مجھے بھی افسوس ہو رہا ہے کہ تمہاری بات کا جواب دیتے ہوئے میرا لہجہ تیز ہوا۔"

"کیا تم کسی وقت مجھے خود سے ملاقات کا موقع دو گے؟" وودن نے پوچھا۔

"یقیناً۔" وہ دوستانہ انداز میں مسکرایا۔ "بشرطیکہ میں اپنے بارے میں خود جان لوں کہ بات کیا ہے۔"

"میں انتظار کروں گا اور اس وقت تک تمہارے ساتھ رہنا چاہوں گا۔" وودن بھی مسکرایا۔

"اچھا تو ان گلز کی کیا خصوصیات ہیں' مجھے بھی بتاؤ۔" اس نے وودن سے سوال کیا' اس کے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔

"ان میں ایچ ڈی کیمرہ اور میوزک سسٹم موجود ہے' ایک سو ستر ڈگری کا زاویہ بنا سکتا ہے یہ کیمرہ اور اوکلے کمپنی کے دستیاب گاگلز میں سے یہ گاگلز سب سے قیمتی ہیں' اتنے قیمتی کہ ایک عام پیشہ ور سکی ڈائیور' ان کا صرف خواب ہی دیکھ سکتا ہے۔" وودن زادے نے کہا۔

"یہ تم رکھ لو وودن! اور مجھے اپنے والے دے دو۔" اس کے پاکستانی دوست نے انتہائی سادگی سے کہا۔

"کیا؟" وودن اپنی جگہ سے زیادہ نہیں تو ایک فٹ تو ضرور اچھلا ہوگا۔

"ہاں!" وہ نرمی سے بولا "میں تو ایک اناڑی سا بندہ ہوں' مجھے سکی ڈائیونگ کی الف ب بھی ابھی سیکھنی ہے' اس بار یہاں چلا آیا ہوں' اگلی بار شاید مجھے اس کا خیال بھی نہ آئے' یہ سب سامان بے کار جائے گا۔ یہ تم رکھ لو تم تو ایک شوقین سکی ڈائیور ہو' یہ تمہارا شوق ہے' جو کبھی ختم نہ ہوگا' تم ہر سال کہیں نہ کہیں اسے پورا کرنے کے لیے جاتے رہو گے' یہ تمہارے کام آئے گا' اسے تم رکھ لو۔"

وودن زادے بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے سامنے نظر جماتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں گے' پہلے تم کل کی تیاری کرو' تم نے لفٹ کے ٹکٹس سنبھال رکھے ہیں نا!"

"ہاں!" اس کا پاکستانی دوست اس کے یوں موضوع بدل دینے پر مسکرا کر بولا تھا۔

"کل میں پہلی بار سکی ڈائیونگ کے لیے جاؤں گا۔"

"اللہ تمہارا حامی ہو" وودن نے اسے دعا دی اور دونوں ہنسنے لگے۔

"میں نے حل سوچ لیا ہے اس مولوانوں کے لمڈے کے مسئلے کا۔"

"ارے واہ! مولا خوش رکھے' مجھے معلوم تھا جتنی سیانی تم ہو' کوئی نہ کوئی حل ضرور ہی سوچ لو گی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر۔"

"مگر کیا؟ ارے بولو بھی۔ منہ لٹکا کر چپ کیوں ہو گئیں۔"

"مگر۔"

"اب بول بھی دو' اتنی لمبی سوچ میں کیوں پڑ گئیں۔"

"مگر یہ کہ اس حل پر عمل نہیں ہو سکتا تمہاری مرضی کے بغیر۔"

"میری مرضی کے بغیر' ارے بی بی! میری مرضی اتنی اہم کب سے ہو گئی کہ اس کے بغیر کوئی کام رک جائے ہوتے ہوتے۔"

"ہاں' واقعی ویسے تو ایسا کوئی کام نہیں ہے دنیا میں' مگر یہ کام ایسا ہی ہے' جو تمہاری مرضی ہو تو یوں ہو جائے چٹکی بجاتے میں اور جو ہو جائے تو بہت سے مسئلے حل ہو جائیں اور جو تمہاری مرضی شامل نہ ہو تو پھر بہت سے مسئلے نئے سرے سے آکر ناچنے لگیں گے۔"

"خیر ناچنے نچانے کا کام تو آج تک ہم نے کیا ہے نہ کرایا ہے' نہ آئندہ ہونے دیں گے' چاہے وہ اللہ مارا طفیلا لاٹر کتنے ہی الزام کیوں نہ دھرتا پھرے ہم پر۔ تم یہ بتاؤ' ایسا کیا ہے جس میں مجھ کمین ذات کی مرضی درکار ہے۔"

"بتا دوں' لیکن پہلے وعدہ کرو' میراثنوں والی گالیاں نہیں دو گی۔"

"اچھا تو گالیوں والی بات ہے' نہیں بی بی' تمہیں گالیاں دینے کا بوجھ یہ زبان نہیں سہار سکتی۔"

"دے بھی لو گی تو کیا فرق پڑے گا' تمہاری گالیاں بھی پھول بن کر لگیں گی۔"

"ارے مولا بھاگ لگائے رکھے سدا تمہیں اور تمہارے دولہا کو۔ تم اب بتا بھی دو مسئلے کا حل۔ ادھر وہ حبشی سانڈ' ٹین ڈبہ سنبھالے جانے کو تیار کھڑا ہے' آج کی رات تو مشکل ہی ہے نکالے یہاں۔"

"چپ کرو بے ادب! خبردار جو ایسے برے برے ناموں سے پکارا' کیوں بھول جاتی ہو کہ اس کے سینے میں قرآن محفوظ ہے' مجھ سے تم سے کہیں زیادہ با عمل مسلمان ہے وہ۔"

"ہائے! میں بھول گئی تھی۔"

"کوئی فائدہ نہیں اب کلے پیٹنے کا' توبہ کرو توبہ اور منہ سے دوبارہ ایسی بات یوں بھی نہ نکالنا اور دوں بھی نہ نکالنا۔"

"دوں کیا مطلب؟"

"مطلب یہ میری عزیز از جان سہیلی! کہ میں نے سوچا ہے شام سے ادھر ادھر تمہارا نکاح مولوانوں کے اس لمڈے سراج سرفراز سے پڑھوا دیا جائے۔ اس سے میں نے صلاح لے لی ہے۔ وہ تو راضی ہے مگر تم۔ ہائیں ارے تم یہ کھڑے قد سے گر سی کیوں گئیں۔"

"ہائے ہائے' تمہاری زبان ذرا سی بھی نہ لڑکھڑائی یہ بات کرتے ہوئے' شاباش ہے تمہاری عقل کو' سلام تمہاری سوجھ بوجھ کو۔ مولا کرم کرے تمہاری تدبیروں پر۔ اے بی بی' مجھے جیتے جی دھکا کیوں نہیں دے دیتیں ماسی صغراں کے تندور میں۔ وہ بھلی بات ہوگی۔ میں سی کیے بغیر چپ چاپ سہ جاؤں گی گردن دو سارے یہ ظلم' ارے کیسی سہیلی ہو جو ایسی منحوس بات دھڑلے سے کہہ گئیں۔"

"دیکھا۔ لگیں ناں فوراً ہانپنے اور چابک بھی الٹا کوچبان پر چلانے لگیں اگر تو مصلحت کے معنی سمجھتی ہو تو جانو وہ اسی بات میں چھپی ہوئی ہے اور بات یہ بتاؤ کہ انسانوں کو اچھا برا' منحوس مارا کم بخت' شہزادہ اور من کا راجہ بنانے کا اختیار ہمارے تمہارے پاس کہاں سے آگیا۔"

"کیوں کیا ہم انسان نہیں ہیں' ہمارے اچھے برے کا کوئی معیار نہیں' ظالم ہو تم جو خود تو ایک خوبرو شہزادے کی بیوی بن بیٹھیں اور میرے لیے انتخاب کیا وہ حبشی سانڈ میں خوب سمجھتی ہوں ذات اور خاندان کا گھمنڈ آج بھی تمہارے اندر سے نہیں نکلا' مجھے سمجھا ناں وہی ذات کی میراثن اور نیچ خاندان کی اولاد۔"

"استغفار پڑھو' لاحول پڑھو' شیطان تمہارے کندھے پر سوار بیٹھا نظر آرہا ہے۔ ٹھیک ہے۔ تمہیں میری تجویز پسند نہیں آئی نہ سہی مگر ایک بات سوچ کر رکھو۔ میں اور تم نہیں جانتے کہ سراج سرفراز کس خاندان کا چشم و چراغ ہے' لیکن جو آج تک اس نے ہمارے لیے کیا ہے' محلے والوں کی گالیاں سنیں اور اپنا تمسخرا اڑوایا ہے' جیسے اس بونزوہ طفیلے لاٹر کے سامنے سینہ سپر ہوا' بڑے بڑے خاندانی لوگ کسی کے لیے اس طرح ڈھال بننے سے گھبراتے ہیں۔ اب بیٹھی سوچ کیا رہی ہو۔ جاؤ جا کر سراج سرفراز سے کہہ دو' اپنا بوریا بستر باندھے اور چلا جائے جہاں کو قدم اٹھتے ہیں۔"

"جاؤ' اب اٹھتی کیوں نہیں۔"

"اور جو آج ہی اس کے یہاں سے چلے جانے کی خبر لے کر رات کو طیفا لاڑ پھر گھس آیا تو؟"

"تو گھس آنے دو' جو ہوگی دیکھی جائے گی' چھریوں اور خنجروں کے سائے میں بیٹھے ہیں انجام خدا جانے۔"

"نہیں جائے گا سراج سرفراز یہاں سے میں نے کہہ دیا۔"

"کیسے نہیں جائے گا' وہ کہہ چکا ہے ہماری خاطر جان لٹا سکتا ہے' مگر اس کے یہاں رہنے سے محلے بھر میں ہمارے لیے بھی تھو تھو ہے' لوگ پہلے ہی باتیں بنانے میں کم تھے کیا کہ یہاں سے سرشام ساز اور آواز کا شور اٹھنا شروع ہو جاتا ہے' جو ایک ہٹے کٹے جوان مرد نامحرم نے یہاں مستقل ڈیرے ڈال لیے' ابھی تو کئی میرے اور منے کے ابا کے نکاح کو بھی نہیں مانتے' دل چاہتا ہے' اپنے ہی کیے سے سر ٹکرا کر مر جاؤں۔ یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے' شہر میں جہاں کوئی ذی روح آنکھ اٹھا کر میرے خاندان کی طرف دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اسی شہر میں ہر انگلی اپنی طرف اٹھی محسوس ہوتی ہے۔ عزت کی چادر اوڑھ لینے کو نکاح کیا تھا' اس کے بچے کی ماں بھی بن گئی' عزت کی چادر سر پر تننے کے بجائے تار تار ہوئی جاتی ہے۔"

"تو اس میں کس کا قصور ہے' اس کا نا' جو تمہیں عزت کی چادر اوڑھانے کے بجائے پیسہ کمانے کے میدان میں قدم جمانے میں ساری توانائی خرچ کر رہا ہے' کب سے بہلاوے دے رہا ہے کہ بس چند دن اور گزر جائیں' ہم لوگوں کو اس محلے سے شفٹ کراتا ہوں نہ وہ چند گزرتے ہیں نہ ہماری اس محلے سے جان چھوٹتی ہے۔ کیا اس کو نہیں معلوم کہ ہمارے دن' رات کس خوف کے سائے میں گزر رہے ہیں میرا نہیں' تمہارا نہیں تو اپنے بچے کا احساس کر کے ہی اس کی راتوں کی نیندیں حرام ہو جانی چاہئیں۔"

"اس کی نیت پر مجھے کوئی شک نہیں ہے' تمہیں سب پتا ہے۔ وہ کیسے صفر سے سفر شروع کر کے یہاں تک پہنچا ہے کہ ہم کچھ نہیں کرتے اور ہمارے کھانے پینے' پہننے اوڑھنے کا بندوبست کر جاتا ہے' خود بسوں اور ویگنوں میں دھکے کھاتا سفر کرتا ہے مگر ہمیں سواری کے لیے پرانی ہی سہی گاڑی لے کے دے رکھی ہے' اسے معلوم ہے' خوب معلوم ہے طیفا لاڑ کیسے چھریاں لہراتا پھرتا ہے مگر یہاں سے شفٹ کرنے کے لیے اس شہر میں کوئی نیا محلہ نیا مکان ڈھونڈ لینے سے طیفا ہماری جان نہیں چھوڑے گا' وہ اپنی چھریاں لہراتا وہاں بھی پہنچ جائے گا' ہم سے پہلے اس کے گلے پر چھری پھیرے گا' آخر اس کا رقیب روسیاہ وہی تو ہے۔"

"کرلو اس غم کی وکالتیں' تمہارا حق بنتا ہے' ہائے ہمارے مقدر' جان چھڑانا چاہتے ہیں پر چھوٹتی نہیں۔"

"اچھا پھر جاؤ اس بے چارے سراج کی جان کی تو خلاصی کراؤ وہ خواہ مخواہ اس جوکھم میں آن پھنسا ہے۔ نہ اسے ساز و آواز سے کوئی لینا دینا تھا نہ حسن و نزاکت سے' وہ بے چارہ تو دو وقت کی روٹی لینے اور کھانے کی شرم میں جان پھنسا بیٹھا' نمک حلالی بہتری کرلی اس نے۔ اس سے کہہ دو کہ جہاں پناہ ملتی ہے لے جاکر' توبہ ہے کیسی زمین پکڑ کر بیٹھ گئی ہو' جاتی کیوں نہیں۔"

"نہیں جا رہی میں اسے بھیجنے کو یہاں سے۔ کیسے بھیج دوں نام کا یہ آسرا بھی نہ رہا تو کریں گی کیا ہم دو نہتی عورتیں۔"

"ڈرتی ہو؟"

"ہاں ڈرتی ہوں' کیسے نہ ڈروں' چمچماتی چھریاں تمہاری طرف بڑھتے دیکھ چکی ہوں خود اپنی آنکھوں سے' میرا تو کم بخت گلا گھونٹنے کو ہی تھا۔"

"دیا کرو۔ سراج کو تو بھیجو ہی بھیجو' خود بھی خوف اور موت کے ان سایوں سے دور بھاگ جاؤ' تمہارا پرانا پیشہ تمہارے لیے دو وقت کی روٹی کمانے کو کافی ہے' تمہارے وہ چھینٹ کے لباس اور انگلیوں کے چھلے' ناک کا بلاق اور چٹیا کے چھن چھناتے پراندے سنبھالے پڑے ہیں نا' چھتی پر' ان سے دوبارہ دوستی کرلو' پیتل کی گڑوی البتہ میں

تمہیں نئی لے دیتی ہوں' بجاتی پھرنا گاتی پھرنا' روپیہ دو روپیہ' آٹھ آنے چار آنے' شام تک اچھی خاصی دولت جمع ہو جایا کرے گی' رہنے کو سڑک کنارے بنی بستیوں میں جگہ مل ہی جائے گی' تمہارا مستقبل روشن ہے' جاؤ اسے ہاتھ میں لے لو' مجھ کرموں جلی کو اپنی کرنیوں کے بھوتوں کا سامنا کرنے کے لیے ادھر اکیلی پڑی رہنے دو' جو چھری میرے نصیب ہے' میری ہی گردن پر پھرے' تم اور سراج مفت میں کیوں مارے جاؤ۔"

"اف وہ! اب روتی کیوں ہو' جو سب سے آسان حل ہے' وہ بتا تو دیا تمہیں۔"

"تم نے میرے منہ پر جو طمانچہ مارا ہے' اسے کھا کر روؤں بھی نہیں اب' پل بھر میں مجھے اپنی اوقات اور وہ رات یاد آگئی جب اپنی عزت بچانے کو تمہاری چھت پر کودی تھی' بھولے سے' اس وقت میری اوقات کیا تھی بھلا۔ ایک اٹھارہ انیس سال کی جاہل گنوار گڑوی بجانے والی میراثن جو اپنے باپ' ماں اور بھائیوں کے ساتھ محلہ' محلہ شادی بیاہ' کھیل تماشوں' میلوں ٹھیلوں میں گنواروں والے گیت گاتی بجاتی' اونچے شملے والوں کو اور دھندے کے فقیروں کو ایک برابر سمجھتی۔ ہاتھ پھیلا پھیلا کر دعائیں دیتی پھرتی تھی' سب کو شالا سدا جیویں' بھاگ لگے رہیں' مولا خوش رکھے' اونچی پگڑی اور بھی اونچی ہو جائے' اونچے چوباروں کو بھاگ لگے رہیں کے نعرے مارتی' جنج کی روٹی اور ولیمہ کی دعوت کے کھانوں سے اپنے ٹبر کا پیٹ بھرنے کو چاولوں' روٹیوں اور گوشت کی بوٹیوں سے اپنے کٹورے' کنستر بھرتی۔ ایک عیار بدمعاش کے زیادہ پیسے دینے کے لالچ میں آکر ٹبر خان' برادری چھوڑ اس کی انگلی سے لگی اس کے ساتھ آگئی۔ اس کے ہاتھوں اپنی عزت پر ہاتھ پڑنے پر اس کو جل دے کر نکل تو بھاگی مگر جاتی تو جاتی کہاں' شہر بڑا' علاقہ نیا' محلہ اجنبی' چھت کے ساتھ چھت' دیوار کے ساتھ دیوار ملی ہوئی' نہ راستہ سوجھے نہ ہی کوئی جائے اماں' جو چھت پھلانگوں تو پراندے کے گھنگھرو اور کانوں کی ان گنت مرکیاں بج اٹھیں' لوگ باگ شش شش کرتے پیچھے بھاگنے کو تیار' پھولے سانس اور بے ہمت جسم کے ساتھ جو تمہاری چھت پر کودی تو پھر اٹھ نہ سکی۔

ہائے میری بہن کیسے تم نے دھول مٹی میں اٹے میرے وجود کو اٹھا کر اپنے صاف ستھرے پلنگ پر ڈالا تھا۔ کیسا میرا منہ کھول کھول کے چمچوں سے میرے حلق میں پانی ٹپکایا تھا۔ میں تھی یا وہ ادھ مری بلبل جسے ہم دونوں نے ایک بار مرتے سے بچایا تھا۔ تمہارا حسن سلوک' تمہارے موہنی صورت' تمہاری محبت' توجہ' شائستگی' عقل' سلیقے سبھاؤ' تمہاری لوچ دار آواز نے کیسا جکڑا مجھے جو میں تم سے کہہ بیٹھی "بی بی اب میں یہاں سے جانے کی نہیں' مجھے اپنے ساتھ ہی رکھ لو۔" اور تم کیسی محبت کی پتلی تھیں جو مجھے تم نے منع نہیں کیا بلکہ مسکرا کر بولیں "میں تو اصول کے معاملے میں بڑی سخت ہوں اور تم ٹھہریں آزاد فضاؤں میں رہنے والی' میرا تمہارا نباہ کیوں کر ہو گا۔" ہائے میری بی بی' اس دن دل میں فیصلہ کر لیا تھا جیسے تم نے میری جان بچائی' ویسے ہی تم پر جان نہ لٹا دی تو ناچے میراثی کی آل میں سے نہیں۔

"بس کرو بس' دیکھو اب تو ہچکی بندھنے لگی ہے تمہاری۔"

"ہائے نہ بی بی! آج نہ روکو مجھے' مجھے اپنی اوقات بھول چلی تھی اسے یاد کر لینے دو آج یاد کرنے دو وہ دن جو تم نے مجھ گنوارن' جاہل' منہ پھٹ' بے سلیقہ' بدتمیز کو انسان بنانے میں گزارے' میں جو خود کو مسلمان کہتی تھی صرف نام ہی کی تو مسلمان تھی' کلمہ تک تو آتا نہیں تھا مجھے۔ کیسے تم نے مجھے لفظ لفظ سکھا کر آگے بڑھایا' قرآن پڑھایا' نماز سکھائی' ہاتھوں پیروں اور سر سے میل چھڑا کر صاف ستھرا رہنا سکھایا' میں اجڈ' جاہل گنوار جو میرے تیرے کے تھالوں سے جھپٹ کر کھانے کی عادی تھی' چولہا چوکا' باورچی خانہ' کھانا پکانا' جس کے فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہ تھی۔ تم نے مجھے مسالے پیاز کی الف بے سے لے کر کیسے کیسے نوابی کھانے بنانے تک سکھا ڈالے۔ ہائے میں کم ظرف کیوں اپنی اوقات بھول گئی' میرے دماغ میں علم گھس گیا اور میرے معدے کو گھی کی تری کیا لگی

میں بھول گئی کہ میں نے تو خود جانور سے انسان بننے کا سفر تمہارے ساتھ چلتے چلتے تمہاری انگلی پکڑ کر طے کیا تھا۔ میں کیوں فلاں کو برا اور ڈھمکاں کو بھی ذلیل سمجھنے لگی۔ ہائے بی بی! میں کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کرتی ہوں اور تمہارے سامنے بھی ہاتھ جوڑتی ہوں لو مجھے معاف کردو اور میرے حق میں دعا کرو کہ اپنی اوقات بھول جانے کا حقار میرے آگے نہ آجائے۔"

"اچھا اچھا بس کرو اب' دیکھو تمہاری آواز بھی بیٹھنے لگی ہے' مت چلا چلا کر روؤ۔ اب چپ کر جاؤ۔"

"ہائے! میں کیسی بدنصیب ہوں جان لٹانے کا عہد کر کے بھول گئی تھی بی بی! ایسا کرو چھرا پکڑو اور میرے سینے میں اتار دو۔ ایسی احسان فراموشی کی سزا یہ ہی ہونی چاہیے۔ میں سی بھی نہ کروں گی۔"

"بس کرو۔ میں نے کہا نا بس کردو' اوقات یوں یاد آئی تمہیں کہ بین بھی میراثیوں کی طرح شروع کردیے۔ خبردار جواب آواز آئی مجھے تمہاری۔"

"بس بی بی! مجھے معاف کردو' تم دل سے معاف کردو' کہہ دو تم نے مجھے معاف کیا۔ تم معاف کردو گی ہی تو اللہ بھی مجھے معاف کردے گا۔"

"ہاں اللہ تمہیں معاف کرے۔"

"اور جو تمہاری اور میرے لاڈلے منے کی سلامتی اس میں ہے تو بلاؤ نکاح خواں کو اور پڑھاؤ نکاح میرا سراج سرفراز کے ساتھ۔ یہ ہی میری اوقات ہے۔ بی بی! یہ ہی میری اوقات ہے۔"

"نہیں' جو تمہارے دل کو قبول نہیں اسے میں تم پر کیسے مسلط کرسکتی ہوں۔"

"تمہیں منے اور اس کے ابا کی جان کی قسم ہے میری بہن! منع نہ کرنا اب۔ یہ نکاح آج ہی ہونا چاہیے' یہ آج ہی ہوگا' نہیں جانے دوں گی سراج سرفراز کو کہیں۔ زمانہ اسے نامحرم کہتا ہے نا تو آج اندھیرا ہونے سے ادھر ادھر ہی وہ محرم بن جائے گا۔ پھر دیکھتی ہوں کون اس کی داڑھی اور ہمارا چونڈا پکڑ کر ٹھٹھا لگا سکے گا۔ تمہیں اللہ کا واسطہ ہے بی بی لو میں تمہارے پیروں کو ہاتھ لگاتی ہوں۔ نکاح پڑھوا دو مولوی کو بلا کر۔"

"اچھا اچھا۔ اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں' مجھے مزید سوچ لینے دو۔"

"سوچنا وچنا کیا ہے اب بی بی! بس میں جو کہہ رہی ہوں وہ کرو' یہ ہے کدھر سراج سرفراز' ارے میں دیکھتی ہوں' کہیں چپکے سے نکل نہ لے کم بخت۔ ہائے میرا مطلب ہے کرموں والا۔"

"پاگل ہو تم بھی رابعہ بی بی! بالکل پاگل۔ زبان پر قابو پانا سیکھ لو اب تو۔"

☼ ☼ ☼

اس نے تیزی سے نظریں دائیں بائیں گھمائیں۔ اس کا ذہن ایک ہی نقطے پر الجھا ہوا تھا اور تیزی سے نظریں دائیں بائیں گھماتے ہوئے وہ اسی ایک نقطے کے مختلف پہلوؤں پر سوچ رہی تھی۔ بلال سلطان کے ساتھ اس کی ملاقات کوئی مثبت نتیجہ برآمد کرانے میں ناکام رہی تھی۔ اسے اس شخص کا جو سعد سلطان کا باپ تھا ہر انداز مبہم اور غیر واضح لگا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ شخص دنیا بھر میں کسی دوسرے شخص سے نہیں خود اپنے آپ سے خوف زدہ تھا اور اس خوف کو دنیا کی نظروں میں آنے سے بچانے کی خاطر اور خود کو ایک مضبوط انسان ثابت کرنے کے لیے اس نے بے نیازی' خود پسندی' کرختگی اور سرد مہری کا خول پہن رکھا تھا۔ اس خول کے پار کوئی اسے دیکھ سکتا تھا نہ ہی اس خول کے باہر اس سے کوئی لڑ سکتا تھا۔

اس کا خیال تھا آپا رابعہ والی خبر سن کر وہ چونک جائیں گے' گھبراہٹ کا مظاہرہ کریں گے یا اشتیاق ظاہر کریں گے لیکن جس پرسکون انداز میں انہوں نے وہ ساری بات سنی تھی اور پھر مزید جاننے کے لیے سوال کرتے رہے

تھے لیکن نہ تو ان کے چہرے سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سب ان کے لیے نیا تھا نہ ہی یہ کہ وہ سن کر پریشان ہوئے تھے اور کیسے سب سن کر انہوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ آپا رابعہ کی بتائی باتیں حقائق کی مسخ شدہ تصویریں تھیں۔

"ہونہہ!" ماہ نور نے تلخ ہوتے ہوئے سر جھٹکا جیسے میں ان پر تو یقین کرلوں گی۔ اور ان کے دلائل تو دیکھو ذرا' اگر بات کا پتا چل جاتا تو اور لوگوں کی طرح سعد بھی خون کی لکیر کے پیچھے چلتا اپنے ہی گھر تک آپہنچتا۔ اف کیسی الجھی ہوئی اور پیچیدہ باتوں کے درمیان پھنس گئی ہوں میں۔"

اس نے آنکھیں بند کرلیں "نہ اختر سے کوئی سراغ ملا نہ ہی بلال سلطان سے" اس پر مایوسی چھانے لگی اختر نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دینے کی بات کی اور بلال سلطان اس کا پیچھا نہ کرنے کا فیصلہ کرچکے ہیں۔ پتا نہیں کیسے باپ ہیں' جوان کو اپنے بیٹے کی خواری ستاتی ہے نہ ذہنی انتشار کا خیال آتا ہے' ایک میں ہوں کہ۔" وہ آہستہ قدموں سے چلتی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آکھڑی ہوئی اور آئینے میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔

"مجھے شاید پتا بھی نہیں چلا کب دن ہوا' کب رات ہوئی' ہر وقت آکٹوپس کی طرح تمہارا خیال میرے ذہن کو' میرے دل کو اور میری آنکھوں کو جکڑے رہتا ہے نہ اور کچھ سوچا جاتا ہے نہ محسوس کیا جاتا ہے نہ ہی دیکھا جاتا ہے۔" اس نے تصور میں بیٹھی سعد کی شبیہہ کو مخاطب کیا۔ "میں تمہارے پیچھے تمہارے شہر میں آئی اور تم شہر چھوڑ کر چلے گئے۔ اب بتاؤ' اس سے آگے کہاں جاؤں جو تم مل جاؤ۔" اس نے اس شبیہہ سے سوال کیا۔

"شاید اس دل کے پاس' جس میں' میں رہتا ہوں۔" تصور میں بیٹھی شبیہہ نے جیسے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"وہ دل' جس میں تم رہتے ہو۔" اس نے زیر لب دہرایا "وہ دل تو میرا ہے' جس میں تم رہتے ہو۔"

"ارے نہیں۔" وہ شبیہہ مسکرائی۔ "تم نے تو زبردستی مجھے اپنے دل کا مکین بنا رکھا ہے۔ میں اس دل کی بات کررہا ہوں' جس میں میں اپنی مرضی سے رہتا ہوں۔"

"اپنی مرضی سے۔" ایک ازلی اور ابدی منحوس حقیقت نے اس کے ذہن پر دستک دی۔

"اوہ۔" اس شبیہہ کے عقب سے جھانکتی ایک اور شبیہہ کو دیکھ کر بے اختیار اس کے منہ سے الفاظ نکلے "ہاں تمہیں تو میں بھول ہی گئی تھی اختر اور بلال سلطان کے علاوہ تم بھی تو ہو جسے علم ہوسکتا ہے کہ وہ کہاں چلا گیا اور کیوں چلا گیا۔"

"تم مجھے بھول گئی تھیں ماہ نور؟" وہ نئی شبیہہ معنی خیز انداز میں مسکرائی "نہیں تم مجھے بھول نہیں سکتیں۔ ہاں بھلانے کی نظر انداز کرنے کی ذہن سے جھٹک دینے کی کوشش ضرور کرتی ہو لیکن دیکھ لو۔ میں ہوں' میں اپنی جگہ پر موجود ہوں اور رہوں گی' اس سے کتنی قریب اس سے کتنی مانوس۔" وہ ماہ نور کے دل میں بسی شبیہہ کے سر کے ساتھ اپنا سر جوڑتے ہوئے بولی۔

"ہاں!" ماہ نور نے شکست خوردگی کے ساتھ سر نیہوڑاتے ہوئے تسلیم کیا "تم ہو اور واقعی ہو۔ میں ہی احمق ہوں جو تمہاری موجودگی کو جھٹلانے اور نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔"

"ابراہیم! کیا تم مجھے اس لڑکی سے بھی ملوا سکتے ہو جس کا نام سارہ ہے۔" اس شام ماہ نور نے ابراہیم سے فون پر بات کرتے ہوئے کہا تھا۔

"افوہ ماہ نور!" جواب میں ابراہیم جھنجلا کر بولا تھا "یار! یہ تو وہ ہی لوگ ہیں جن کے پاس میں خوار ہوتا رہا اور مجھے کوئی سراغ نہیں ملا۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ اختر اور انکل کے بعد تم سارہ سے مل کر بھی اسی طرح مایوس ہو گی۔"

"جہاں اتنی مایوسیاں مل گئیں وہاں ایک یہ بھی سہی' سارہ سے ملنے کے بعد میرا خیال ہے کہ میں لاہور واپس چلی جاؤں گی۔"

"بس؟ ہمت ہار گئیں؟" ابراہیم نے کہا۔

"ہارنے کے لیے میرے پاس تھا کیا جو ہاروں گی ابراہیم! مجھے تو واپس جا کر اپنا سمسٹر جوائن کرنا ہے۔"

"چلو ایسا ہے کہ اس ویک اینڈ پر میں تمہیں لے جا سکتا ہوں سارہ کے پاس' اس سے پہلے میرے پاس وقت نہیں ہے۔" ابراہیم نے کہا۔

"ٹھیک ہے' ویک اینڈ کون سا دور ہے' دو ہی تو دن ہیں درمیان میں۔" ماہ نور نے فون بند کرنے سے پہلے جواب دیا۔

☆ ☆ ☆

"آپ کو یہاں دیکھ کر مسرت ہو رہی ہے لیکن ایک عجیب سی حیرت کا احساس بھی ہے۔" چوہدری سردار نے اپنے سامنے بیٹھی مہمان سے کہا۔

"جب ہی آپ حیرت سے کھلا منہ بند کرنے میں ناکام ہو رہے ہیں۔" مہمان نے ان پر چوٹ کی۔

"شاید!" چوہدری سردار محظوظ ہوئے تھے۔

"برائے مہربانی آپ منہ بند کرلیں کیونکہ مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے' اسی لیے میں یہاں آئی ہوں۔" مہمان نے سنجیدگی سے کہا۔

"سنجیدہ ہو جانے پر تو اس کے چہرے پر پڑی عمر کی لکیریں واضح ہونے لگتی ہیں' اسے چاہیے یوں سنجیدگی خود پر طاری نہ کیا کرے۔" چوہدری سردار نے دل میں سوچا۔

"جی جی میں ہمہ تن گوش ہوں۔" انہوں نے بھی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ یقیناً" مجھے پہچان تو چکے ہوں گے۔" انہوں نے چوہدری سردار کی طرف دیکھا اور شاید آپ کو یاد آگیا ہو کہ آپ کے پاس میری ایک امانت موجود ہے۔"

"امانت؟" چوہدری صاحب نے کچھ نہ سمجھنے کے سے انداز میں دیکھا۔ "آپ نے میرے پاس کوئی امانت رکھوائی تھی کیا؟"

"میں نے نہیں رکھوائی تھی۔ آپ خود ہی اٹھا لائے تھے۔" وہ ایسے بولیں جیسے انہیں جتا رہی ہوں' دیکھا تم نے کتنا غلط کام کیا تھا۔

"جو میں خود اٹھا لایا تھا' وہ امانت تو نہیں کہلاتی جا سکتی۔"

"چوری تو کہلائی جا سکتی ہے۔" وہ ترچھی نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

"ہاں ضرور' لیکن چوری کا کوئی پرچہ کٹا کیا' کوئی ایف آئی آر' کوئی مدعی' کوئی گواہ؟"

"آپ جانتے ہیں میں کس قسم کی چوری کی بات کر رہی ہوں چوہدری صاحب۔" وہ زچ ہوتے ہوئے بولیں۔

"میرے پاس چوری کا کوئی ثبوت ہے نہ اغوا کا' نہ ہی امانت میں خیانت کا' میرے پاس صرف ایک بات ہے' ایک سوال!" انہوں نے ابرو چڑھاتے ہوئے چوہدری سردار کی طرف دیکھا" ایک ایسی بات' جو صرف آپ سمجھ سکتے ہیں' ایک ایسا سوال' جس کا جواب صرف آپ کے پاس ہے۔"

"آپ جانتی ہیں بیگم صاحبہ! میں ایک سیدھا سادہ دیہاتی سا آدمی ہوں' میری سمجھ ہلکی اور سوچ چھوٹی ہے' آپ بڑے لوگوں کی بڑی بڑی باتیں میری سمجھ میں اسی وقت آ سکتی ہیں جب آپ انہیں میرے قد کے مطابق

سلیس کر کے بیان کریں۔ میری بات آپ سے مختلف ہے' میرا جواب آپ کا من پسند نہ ہوا تو آپ کیا کریں گی؟"

"آپ کچھ بھی نہیں' صرف میرا وقت ضائع کر رہے ہیں۔" خاتون اشتعال میں آتے ہوئے بولیں "آپ کو سب معلوم ہے اور آپ کو سب یاد بھی ہے' لیکن یہ جو آپ سلیس کر کے سنانے کو کہہ رہے ہیں تو لیں۔ میں آپ کا یہ شوق بھی پورا کیے دیتی ہوں۔" انہوں نے پہلو بدلا۔

"آپ کو میرے ساتھ ہونے والی وہ ملاقات تو یاد ہی ہو گی جو اظہر نوریز کے گھر پر ڈنر کے موقع پر ہوئی تھی آج سے تقریباً" پچیس سال پہلے۔"

"اسی ملاقات کی وجہ سے تو آپ مجھے یاد ہیں۔" چوہدری صاحب مسکرائے۔ "یقین کیجئے' اتنے سالوں کے لمبے عرصے نے اپنے بہت ہی کم نشان آپ پر چھوڑے ہیں' بخدا میں نے آپ کو اسی لیے تو ایک نظر میں پہچان لیا۔"

"اظہر نوریز کے گھر پر میری پینٹنگز رکھی تھیں۔ کچھ مکمل' چند ادھوری۔" مہمان نے کمرے کی دیوار پر لگی پینٹنگز کی قطار پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"او ہاں خوب یاد دلایا۔" چوہدری سردار نے یوں تاثر دیا جیسے اچانک کچھ یاد آگیا ہو "آپ کا تعارف یہ ہوا تھا کہ آپ ایک مصورہ تھیں' جو نامور ہونے جا رہی تھیں۔ کیا بھلا سا نام تھا آپ کا۔" انہوں نے مہمان کی طرف دیکھا "معاف کیجئے گا بڑھتی عمر نے حافظے کے چند خانے مکمل طور پر ہی بند کر دیے ہیں۔"

جواب میں مہمان نے چوہدری سردار کو یوں دیکھا جیسے ان کی بات پر انہیں بالکل یقین نہ آیا ہو۔ وہ جز بز ہوتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھیں اور آہستہ قدموں سے چلتی پینٹنگز سے سجی دیوار کے قریب پہنچیں اور پینٹنگز پر نظر ڈالتے ہوئے ایک پینٹنگ کے قریب رک گئیں۔

"سیدھے سادے دیہاتی چوہدری صاحب!" انہوں نے اس پینٹنگ کے سامنے کھڑے ہو کر چوہدری سردار کو مخاطب کیا" اظہر نوریز کے گھر سے آپ نے میری یہ ادھوری پینٹنگ بغیر اجازت کے اٹھائی' یہ تو آپ کو یقیناً" یاد ہو گا۔"

چوہدری صاحب نے جیب سے چشمہ نکال کر پینٹنگ کی طرف سر اٹھا کر دیکھا' اب بھی ان کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

"چلیں' اس بات پر بحث نہیں کرتے کہ بغیر اجازت کیوں اٹھائی۔" انہوں نے پینٹنگ کے سامنے کھڑے کھڑے بازو کمر کے پیچھے لے جا کر قینچی کی شکل میں دیوار سے ٹکائے اور اپنی کمر ان کے ساتھ ٹکاتے ہوئے کہا۔ لیکن یہ سوال ضرور کروں گی کہ صرف یہ پینٹنگ ہی کیوں اٹھائی اور اس وقت سے لے کر اب تک جب بھی آپ نے اس کو دیکھا ہو گا' اس پر موجود میرے دستخط تو آپ کو نظر آئے ہی ہوں گے پھر بھی آپ پوچھتے ہیں کہ میرا نام کیا ہے؟"

"آپ تو خاصی جینئس ہیں بیگم صاحبہ!" چوہدری سردار نے دانت نکوستے ہوئے کہا۔

"ادھوری پینٹنگ کے یہاں تک پہنچ جانے کی سن گن لیتے پچیس سال لگا دیے آپ نے' اتنے عرصے بعد آپ اگر اس کی چوری کا پرچہ کٹوائیں گی بھی تو نہیں کٹ پائے گا۔"

"مذاق اچھا کر لیتے ہیں آپ!" مہمان نے کمر کے پیچھے سے بازو نکال کر سینے پر باندھتے ہوئے کہا اور اپنا سر دیوار کے ساتھ ٹکا لیا" اب بتائیے میرا نام کیا ہے؟"

"واہ!" چوہدری سردار نے کہا۔ "یہ تو وہی لطیفہ ہو گیا کہ بلو کے تین بھائی اور دو بہنیں ہیں جبکہ پپو کی ایک بہن اور ایک بھائی ہے' اب بتائیے میری عمر کیا ہے؟"

"اگر آپ میرا حوصلہ آزما رہے ہیں تو شوق سے آزمائیے' میں بہت ڈھیٹ ہوں' آپ نہیں جانتے۔"

"پتا نہیں" آپ ایک دم ایک کرخت اور سخت گیر استانی کا سا رویہ کیوں اختیار کر رہی ہیں۔ برائے مہربانی تشریف رکھیے اور پہیلیاں بجھوانے کے بجائے سیدھی سیدھی بات کیجئے تاکہ اگر میں آپ کے کام آسکتا ہوں تو بصد شوق آسکوں۔" چوہدری سردار کو اچانک احساس ہوا کہ وہ حق میزبانی میں کوتاہی کرتے ہوئے مہمان کے ساتھ زیادتی کر رہے تھے۔

"میں بہت لمبا سفر کر کے آپ تک پہنچی ہوں چوہدری صاحب! میری بات کو سمجھیں اور میرے سوال کا جواب دے دیں' آپ کے پاس میری ایک امانت ہے' میں اس کی خاطر یہاں آئی ہوں۔" وہ چوہدری صاحب کے تشریف رکھنے کی پیشکش پر غور کیے بغیر بولیں۔

"کیا آپ نے کسی امانت کے سلسلے میں لکھا پڑھی کر رکھی تھی میرے ساتھ۔" چوہدری صاحب نے بھی سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"آپ کو اپنی وہ فون کال بھی یاد ہوگی جس میں آپ نے ــــ" وہ بلند آواز میں بولیں۔

"اور آپ کو بھی یاد ہوگا کہ آپ نے اس فون کال میں میری عرضداشت سننے کے بعد اس پر غور کرنے کے بجائے مجھ سے کہا تھا کہ میں بدحواس ہو کر آپ پر الزام لگا رہا ہوں۔" چوہدری سردار نے مہمان کی بات کو درمیان میں ہی کاٹتے ہوئے کہا۔

"آپ نے یہ بھی کہا کہ میں۔" چوہدری سردار نے انہیں بات کرنے کے لیے منہ کھولتے ہوئے دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا "خدانخواستہ آپ کی ممکنہ ترقی اور شہرت کو دیکھتے ہوئے آپ کو بلیک میل کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ کا نام آسمان مصوری پر چمک نہ سکے۔ میں آپ کو اسکینڈلائز کر کے کسی اور ابھرتے ہوئے مصور کا گارجین بن کر اسے سامنے لانا چاہتا ہوں۔"

"چوہدری صاحب نے دیکھا۔ ان کی بات سن کر دم بھر کو ان کی مہمان پر خاموشی چھا گئی تھی۔

"یاد ہے بیگم صاحب سب یاد ہے۔ حرف حرف یاد ہے۔ بلا کم بلا کاست یاد ہے۔" چوہدری سردار نے سانس لینے کے بعد نیچی آواز میں کہا۔ "وہ دھند بھری صبح بھی بہت اچھی طرح یاد ہے۔ جب بس اسٹاپ پر رک کر چائے کے کھوکھے سے چائے کا ایک کپ پینے کی خاطر گاڑی روکی تھی اور آپ کو اس دھند بھری سرد صبح کی خاموشی اور تنہائی میں وہ کرتے دیکھ لیا جس کا آپ جیسی نامور خاتون سے میں سیدھا سادہ دیہاتی تو کیا آپ جیسا پڑھا لکھا دانشور بھی توقع نہیں کر سکتا تھا۔"

مہمان نے کرب کی شدت کا مقابلہ نہ کرتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔

"بوڑھا ضرور ہو رہا ہوں بیگم صاحب! لیکن جوانی سے لے کر اب تک نہار منہ مغز بادام کھانے کی عادت نہ چھوڑنے کے باعث حافظہ میرا کمزور نہیں ہوا ہے' کسی بات سے نظر چرانا اور انجان بننا چاہوں تو اور بات ہے۔"

"آپ نے دیکھا' آپ کو یقین آیا ہو یا نہ آیا ہو۔" مہمان نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولنے کے بعد کہا۔ اس کی آواز میں لرزش اتر آئی تھی' لیکن آپ نے اس کو وہاں سے اٹھا تو لیا۔ آپ نے اٹھا لیا تا۔" انہوں نے سوالیہ نظروں سے چوہدری سردار کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔ میں اسے وہاں سے اٹھا نہیں پایا۔" چوہدری صاحب نے سہلاتے ہوئے کہا۔ "دیکھنے اور یقین کر لینے کے درمیان وقفہ اتنا لمبا ہو گیا کہ میرے آگے بڑھنے سے پہلے ہی اسے کوئی اور اٹھا کر لے گیا۔"

مہمان خاتون نے بری طرح چونک کر چوہدری صاحب کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بے یقینی تھی اور چہرے کی وحشت بڑھ گئی تھی۔

"جھوٹ بول رہے ہیں آپ' غلط کہہ رہے ہیں' ایک دم جھوٹ۔" وہ بلند آواز میں چلا کر بولیں۔ "آپ نے

خود مجھے اس فون کال میں کہا تھا کہ آپ نے وہ سب دیکھا۔"
"میں کب کہہ رہا ہوں کہ نہیں دیکھا۔" چوہدری سردار نے تحمل سے کہا۔
"میں تو وہ سب دہرا چکا ہوں جو میں نے دیکھا مگر یہ سچ ہے کہ۔۔۔"
"نہیں یہ سچ نہیں ہے' وہ اور بھی بلند آواز میں چلائیں۔ "یہاں آکر آپ مکر کر رہے ہیں' جھوٹ بول رہے ہیں' آپ نے خود مجھے ہی دن پہلے کسی کو بتایا کہ آپ اسے وہاں سے اٹھالائے اور اب تک وہ آپ کے پاس ہے۔"
اب کے چونکنے کی باری چوہدری صاحب کی تھی۔
"میں نے کہا' میں نے کس کو بتایا؟" وہ بھونچکا ہو کر مہمان کو دیکھ رہے تھے' کیا وہ لڑکا آپ کے پاس جا پہنچا۔ کیا وہ آپ کو جانتا تھا؟" الفاظ بے اختیار ان کے منہ سے نکلے۔
"اتفاق سے" اس بار مہمان کی آواز نیچی تھی "اتفاق سے وہ مجھے جانتا تھا۔ اتفاق سے وہ اس کہانی کے چند اور کرداروں کو بھی جانتا تھا۔"
"اس نے مجھے تو نہیں بتایا۔" چوہدری سردار اب تک ششدر تھے۔
"اس نے مجھ سے بھی کچھ نہیں پوچھا' وہ ایک خاموش سامع کی طرح آپ سے سن کر چلا گیا اور ایک خاموش نقیب کی طرح مجھے بتا گیا' بغیر کوئی ریفرنس دیے' بغیر کوئی سوال کیے۔"
"وہ؟" چوہدری صاحب نے بڑبڑا کر پوچھا "وہ کون تھا؟"
"آپ نہیں جانتے کیا!" مہمان نے انہیں غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ بلال سلطان کا بیٹا ہے۔"
چوہدری صاحب کا منہ کھلا اور کھلا ہی رہ گیا۔
"اور یہ کون ہے؟" سوال ایک مرتبہ پھر چوہدری سردار کے منہ سے پھسلا۔
"یہ بھی بلال سلطان کا بیٹا ہے۔" مہمان نے نیچی آواز میں کہا۔
"اور آپ کون ہیں اس سارے میں؟" چوہدری سردار نے شاید ہی کبھی اتنے تواتر کے ساتھ کسی سے سوال کیا ہو۔
"میں اس سارے میں کوئی نہیں ہوں' میں صرف فلزا ظہور ہوں۔" خاتون نے سرد آہ بھرنے کے بعد کہا۔ "ایک گمنام مصورہ' جس کی ناموری کا راستہ دوسروں کے راز رکھنے کی گرد سے اٹ گیا۔"
"بہت خوب' اب بھی آپ میں گناہ کے اعتراف کا حوصلہ نہیں آپایا۔" چوہدری سردار انکشافات کی دہشت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔ "اب بھی جب کہ آپ میرے علاوہ ایک کل کے بچے تک کے سامنے ایکسپوز ہو چکی ہیں۔"
"حوصلہ تو میں تب کروں چوہدری صاحب! جب گناہ میرا ہوتا' گناہ تو بلال سلطان کا تھا' بھگتنا مجھے پڑ گیا۔" مہمان خاتون' جس کا نام فلزا ظہور تھا' تھکے قدموں سے چلتی واپس صوفے کے قریب آئیں اور ہارے ہوئے سپاہی کی طرح چوہدری سردار کے سامنے بیٹھ گئیں۔
"میں آپ سے کسی تفصیل سننے کا مشتاق نہیں ہو رہا ہوں بیگم صاحب!" چوہدری سردار نے فلزا ظہور کی طرف کچھ دیر تک دیکھنے کے بعد اپنا چہرہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے سرد مہری سے کہا۔ "مجھے بہت زیادہ پڑھے لکھے دانشوروں کے سفاک اور پتھر دلوں کی داستانیں سننے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بہتر ہے آپ یہاں سے چلی جائیں' وہ جیسا ہے' جس بھی حال میں ہے' ایک مسرور اور مطمئن زندگی گزار رہا ہے' اگرچہ بے خبر ہے لیکن میں اسے آپ کی اور بلال سلطان کی سفاکی اور بے رحمی کی خبر دے کر اس کے سکون' چین' بے فکری اور خوشی کو آگ نہیں لگا سکتا۔"

"میں ایسے یہاں سے جانے کے لیے نہیں آئی چوہدری صاحب' میں اس وقت تک نہیں جاؤں گی جب تک آپ مجھے اس کی خبر' اس کا پتا نہیں دیتے۔" غرا کر بولیں۔
"نہیں تو کیا کریں گی آپ؟" چوہدری سردار نے چہرہ واپس موڑ کر ان کی طرف دیکھا "آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کچھ نہیں کر سکیں گی' اس جگہ کے سب رہنے والوں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے پہچاننے کی کوشش کرنا چاہتی ہیں تو بسم اللہ۔ سو دفعہ کریں' میں آپ کو اس کے متعلق ہرگز نہیں بتاؤں گا۔ آپ اپنی پہچان آزما لیں' ہو سکتا ہے' آپ کا خون روایتی جوش مارے اور آپ اسے سینکڑوں کے ہجوم میں بھی پہچان جائیں۔"
"میرا خون؟" فلزا ظہور نے سوالیہ نظروں سے چوہدری سردار کی طرف دیکھا "میرا خون کیسے جوش مار سکتا ہے چوہدری صاحب! خون تو اس کا جوش مارے گا جس کا وہ ہے' میں تو میں نے کہا نا' اس ساری کہانی میں کوئی بھی نہیں ہوں۔"
"مت کہیں بیگم صاحبہ! کہ وہ آپ کا بیٹا نہیں ہے جسے آپ ایک گناہ کی پوٹ کی شکل میں آوارہ کتوں اور بلیوں کا نوالہ بننے کے لیے وہاں چھوڑ کر چلتی بنی تھیں۔" چوہدری سردار کا لہجہ ایک مرتبہ پھر درشت ہو گیا۔
"مجھے کہنے دیں چوہدری صاحب! کہ وہ میرا بیٹا نہیں ہے۔ وہ تو بس اس آدھی رات کا ثمر ہے' جو میں نے جنت میں گزارنے کی خواہش کی تھی۔"
فلزا ظہور نے کہا تھا' اس کے لہجے میں شکستگی' درد اور اضطراب کے علاوہ ایک اور چیز بھی نمایاں تھی اور وہ چیز "سچائی" تھی۔

☼ ☼ ☼

ایک نحیف' زردی مائل رنگت والے ہاتھ نے دروازے کو پکڑا' کچھ دیر وہیں ٹکے رہنے کے بعد وہ ہاتھ آگے بڑھا اور کمرے کی مغربی دیوار کے ساتھ رکھے چیسٹ آف ڈرارز پر آکر ٹک گیا' اگلے مرحلے میں اس ہاتھ نے ڈائننگ چیئر کو اپنی گرفت میں لیا اور پھر آگے بڑھ کر کھانے کی میز کے کنارے پر جم گیا۔ ماہ نور کی نظریں مسلسل اس ہاتھ کی حرکات و سکنات پر جمی تھیں۔ اس ہاتھ نے کھانے کی میز کا کنارا پکڑا اور پھر اسی ہاتھ پر دباؤ ڈالتے ہوئے وہ وجود اس کے سامنے آکر کھانے کی کرسی پر بیٹھ گیا جو اس نحیف' زردی مائل رنگت کے حامل ہاتھ کا مالک تھا۔
"معاف کرنا میں بہت تیزی سے چلنے سے قاصر ہوں۔ اس لیے مجھے یہاں آنے میں تھوڑا وقت لگا۔ تمہیں انتظار کی زحمت تو اٹھانی پڑی ہوگی۔"
وہ اس کے سامنے بیٹھنے کے بعد نرمی سے معذرت خواہانہ لہجے میں بات کر رہی تھی۔ ماہ نور نے نظریں اٹھا کر اس چہرے کو دیکھا ہاتھ ہی کے جیسا زردی مائل رنگت کا حامل چہرہ جو صاف ستھرا تھا اور جس پر گہری بھوری آنکھیں ذہانت اور زندگی کی چمک لیے سجی تھیں اس کے بھورے سیدھے بال جو شانوں سے ذرا نیچے تک آتے تھے کھلے تھے اور اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ بالوں کی چند لٹیں چہرے کے دائیں بائیں بھی بکھری تھیں ان بکھرے بالوں کو سر کے اوپر جمے سیاہ ہیئر کیچر نے جکڑ رکھا تھا۔ اس کی ناک تیکھی اور ذرا سی اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ ہونٹ ہلکے گلابی رنگ کے تھے جن میں جھلکتی سفیدی خون کی کمی کا احساس دلاتی تھی۔
"ہمارے شاعر بھی کیا خوب لوگ تھے۔ اچھی خاصی پیاری شکلوں کے حامل لوگوں کو بھی رقیب روسیاہ قرار دے دیتے تھے۔" اس نے دل میں سوچا۔
"اور اس بے چاری کو تو میں نے زبردستی رقیب روسیاہ کا مقام دے رکھا ہے۔ جبکہ محبوب تو جی جان سے صرف

اس کا ہے۔ میرا تو وہ کسی دن کے ہزارویں لمحے میں بھی نہ ہو سکا۔“ اس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔

پھر اپنے ذہن سے سب بے کار خیالات کو جھٹکتے ہوئے بولی ”نہیں تمہاری یہ صورت حال تو بہت پوزیٹو اور پرامسنگ ہے۔ ”تم اپنے قدموں پر چلتی یہاں تک آئی ہو جبکہ آخری بار جب میں تم سے ملی تھی‘ اس وقت تم بستر پر ہمہ وقت لیٹا ایک کمزور سا وجود تھیں بس۔“

”ہاں مجھے اپنے قدموں پر چلنے کا حوصلہ عطا ہوا۔“ اس نے سرہلاتے ہوئے کہا

”عطا!“ اس نے ماہ نور کی طرف دیکھتے ہوئے دہرایا ”کیا تم جانتی ہو کہ عطا ہونا کیا ہوتا ہے؟“

ماہ نور نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور اپنا دھیان بالکنی میں کھلنے والے کھلے دروازے سے پار دور تک نظر آتے پہاڑوں کی طرف مبذول کرلیا۔ پہاڑوں پر سورج کی ہلکی روشنی پھیل رہی تھی اور ان کی برف پوش چوٹیاں اس روشنی میں سر اٹھائے چمک سی رہی تھیں۔

”تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی ہے‘ میرا خیال نہیں تھا کہ کبھی تم دوبارہ یہاں آؤ گی؟“ سارہ نے اپنے سوال کا جواب نہ پانے کے بعد اپنا خیال ظاہر کیا۔

”کیوں؟“ ماہ نور نے پہاڑوں پر سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا ”تم نے ایسا کیوں سوچا۔“

”اس لیے کہ مجھے لگا‘ پہلے بھی تم یہاں آکر خوش نہیں ہوئی تھیں۔“ سارہ نے صاف گوئی سے کہا۔ ”ایسے جیسے تمہیں زبردستی لایا گیا ہو۔“

”کسی کو کہیں زبردستی کیسے لایا جاسکتا ہے؟“ ماہ نور نے کہا۔

”لانے والے پر ڈی پینڈ کرتا ہے‘ جو لا رہا ہو‘ ہوسکتا ہے اس کی حیثیت اتنی ڈومیننٹنگ ہو کہ لایا جانے والا انکار نہ کرسکتا ہو۔“ ماہ نور کے دل نے ایک دھڑکن چھوڑ دی۔

”تو بھئی‘ بچیوں چائے پیو۔“ سیمی آنٹی ٹرے اٹھائے کمرے میں آئیں۔ ”آج روزانہ کی نسبت سورج میں قدرے حدت ہے‘ چاہو تو میں چائے بالکنی میں لگا دوں۔“ انہوں نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔ یہ ٹھیک ہے‘ جسم کو کچھ تو حدت پہنچے گی میں تو ہیٹرز کی آگ سینک سینک کر تنگ آچکی۔“ ماہ نور کے بجائے سارہ نے کہا۔ سیمی آنٹی چائے کی ٹرے بالکنی میں لے گئیں اور وہاں لگی میز اور کرسیوں کی ترتیب درست کرنے لگیں۔

”آؤ ماہ نور! بالکنی میں چلتے ہیں۔“ سارہ نے اپنا نحیف و نزار ہاتھ کرسی کی پشت پر جما کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ماہ نور نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دینا چاہا۔ سارہ ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔ میں خود چل سکتی ہوں۔“ ماہ نور نے بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے سرہلایا۔ یہ وہ لڑکی تھی جس کے زندگی سے مات کھائے ہوئے انداز کے سامنے کوئی دلیل‘ کوئی مثال کام نہیں کرتی تھی۔

”تم نے سارہ کے بارے میں کیا سوچ رکھا ہے‘ کیا سارہ ہمیشہ اسی طرح ہمت ہارے بیڈ پر پڑی رہے گی۔“

”کم از کم اس وقت تک جب تک وہ خود پر یقین کرنا نہ سیکھ لے گی۔“

”اور تمہارا کیا خیال ہے‘ اس میں کتنا وقت لگے گا۔“

”ایک عمر بھی لگ جائے تو پرواہ نہیں۔“

گزرے وقت کے دریچوں سے گزر کر ایک پرانی بات یاد آئی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر سارہ کی طرف دیکھا۔ وہ ایک دو قدم خود سے اٹھانے کے بعد کسی چیز کا سہارا لیتی‘ چلتی بالکنی کی طرف جارہی تھی۔

”ایک عمر بھی لگ جائے تو پرواہ نہیں۔“

ایک عمر بھی۔

ایک عمر

ایک عمر

الفاظ باز گشت کی طرح اس کے اردگرد گونجنے لگے۔

”دنیا میں بہت سی ایسی باتیں ممکن ہو جاتی ہیں جن کو اکثر لوگ ناممکنات میں شمار کرکے داخل دفتر کرچکے ہوتے ہیں۔“ یہ بھی سارہ کے بارے میں اس نے کہا تھا جو یقیناً ”اتنی سچی نیت سے ایک عمر سارہ کے ساتھ گزارنے اور اس کا سہارا بننے کا عہد کرچکا تھا کہ ایک عمر کے بجائے کچھ ہی وقت آگے سرکا تھا اور وہ سارہ جو ہمت ہارے ہمہ وقت بیڈ پر پڑی رہتی تھی‘ اس کی نظروں کے سامنے خود اپنے پاؤں پر چلتی کمرے سے باہر نکلی تھی اور اس وقت میز پر رکھی چائے کی ٹرے میں سے کپ‘ پلیٹیں‘ چمچ‘ چائے کے لوازمات اور چائے دان نکال کر میز پر سجا رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی حرکت نارمل تھی اور ان میں کوئی لڑکھڑاہٹ نہیں تھی۔

”معجزہ!“ اس کے ذہن میں یہ منظر دیکھتے ہوئے خیال آیا ”کیا یہ معجزہ ہے؟ صرف محبت اور نیت میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ ایسے ایسے معجزے رونما کرا سکتی ہے؟“

”ماہ نور! آؤ نا‘ یہاں آجاؤ۔“ سارہ نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ماہ نور اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی طرف چل دی۔

☼ ☼ ☼

”تمہاری وہ دوست کیا کررہی ہے آج کل جو تمہارے ساتھ سید پور کلچر فیسٹول دیکھنے آئی تھی اور یاد ہے کہ اس نے میوزیکل نائٹ پر بھرے کراوڈ میں چلا چلا کر ایک سنگر کو مخاطب کرتے ہوئے نیوز بننے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔“

شاہ بانو کے بھائی عبید نے اس سے پوچھا۔ شاہ بانو ان دنوں ایک مرتبہ پھر اپنے بھائی کے پاس چند دن گزارنے اسلام آباد آئی ہوئی تھی۔

”وہ۔۔۔! وہ تو آج کل کچھ بھی نہیں کررہی‘ اس نے اپنا ایک سمسٹر بھی مس کردیا۔ اس کی ممی اس کی وجہ سے خاصی پریشان رہتی ہیں کیوں؟ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔“

”یونہی مجھے اس فوک میوزیکل نائٹ کی خبر پڑھ کر وہ یاد آگئی۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑے اخبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ویسے مجھے آج تک حیرت ہے کہ اس سنگر کی تمام وڈیوز میں سے وہ حصہ کیسے ایڈٹ ہوا اور کسی بھی سائٹ پر آنے سے رہ گیا جس میں تمہاری دوست اس پر چلا رہی تھی۔ یا تو تمہاری دوست کے کانٹیکٹس بہت اسٹرانگ ہیں یا پھر۔“ عبید کہتے کہتے رک گیا۔

”یا پھر؟“ شاہ بانو نے سوالیہ انداز میں عبید کی طرف دیکھا۔

”یا پھر اس سنگر لڑکے نے خود اپنا اثر و رسوخ استعمال کرکے وہ حصہ کہیں بھی سامنے آنے سے رکوایا۔“

”لیکن وہ ایسا کیوں کرتا؟“ شاہ بانو نے حیرت سے کہا۔ ”ایسے لوگوں کے لیے اس قسم کے واقعات تو شہرت چمکانے کا ذریعہ ہوتے ہیں‘ وہ اس کو اپنی مقبولیت کی علامت بنا کر بھی تو پیش کرسکتا تھا۔“

”یہی بات تو میرے لیے دلچسپی کا باعث بنی ہوئی ہے۔“ عبید مسکرایا۔ ”تم تو نہیں مانو گی لیکن مجھے ایسا لگتا ہے تمہاری دوست یونہی اس کو دیکھ کر نہیں چیخی تھی۔ اس کے چیخنے چلانے اور اس سنگر کے درمیان کوئی تعلق ضرور تھا‘ جب ہی موصوف نے اسے اپنی مقبولیت کی علامت بنانے کے بجائے بالکل غائب ہی کروادیا۔“ وہ دوبارہ اپنی توجہ اخبار کی طرف منتقل کرنے سے پہلے بولا۔

عبید اخبار میں مگن ہو چکا تھا مگر شاہ بانو کا ذہن کئی پرانی باتوں میں الجھ چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"برسوں تک مجھے اپنے کام میں مصروف و مگن رہتے ہوئے اچانک کسی چیز کا ایک مانوس سا احساس ہوتا تھا ایک ایسا احساس جو میرے اردگرد پھیل جاتا تھا اور میرے دل میں ایک عجیب سا سکون اتر جاتا تھا۔ سکون کی اس کیفیت کو میں خود اپنے سامنے بھی بیان نہیں کرپاتی تھی۔ لیکن میں اتنے برس اس مانوس احساس کے ساتھ ہی پلتی بڑھتی رہی۔ اب اتنے برسوں بعد' جب میرے دل و دماغ اور بہت سی بڑی بڑی باتوں کو سمجھ لینے کی صلاحیت حاصل کرچکے ہیں اب جاکر بہت ہی اچانک مجھے پتا چلا کہ وہ مانوس احساس کیا تھا۔

تم سنو گے تو یقیناً "بہت ہنسو گے" اسے میرا وہم قرار دو گے' یہ بھی کہو گے کہ میں ایک وقتی کیفیت کے زیر اثر ہوں' اسی لیے ہر نئی بات کا تعلق اس سے جوڑ رہی ہوں لیکن میں تمہیں بتاؤں چندر شیکھر اورائے کہ میں اس احساس کی حقیقت کے بارے میں اتنی ہی پر یقین ہوں جتنی اپنے اس وقت زندہ ہونے کے بارے میں ہوں۔ وہ مانوس احساس' میری سماعت میں ایک انجانی سی آواز آنے پر امڈتا تھا۔ میں اس آواز کو اور اس میں کہے الفاظ کو شاید کبھی سمجھ پائی نہ ہی میں نے اس کی طرف دھیان دیا لیکن لندن کی سنٹرل مسجد میں جمعہ کی نماز کے لیے جاتے ہوئے پارک روڈ پر ریجنٹس لاج میں داخل ہوتے ہوئے وہ انجانے الفاظ اپنے ساتھ وہی مانوس احساس لیے میرے کان میں پڑے' اس بار میں انہیں آواز کی بلند ترین سطح پر سن سکتی تھی۔ وہ الفاظ عربی زبان میں ادا کیے جا رہے تھے اور وہ اذان کے الفاظ تھے۔"

نادیہ نے چندر شیکھر کو میل لکھتے لکھتے رک کر سامنے دیکھا اور ایک بار پھر اس پرکیف کیفیت کو یاد کیا اور مسکراتے ہوئے میل کا اگلا حصہ لکھنے لگی۔

"اذان کی آواز جس سے تم بھی یقیناً "مانوس ہو گے۔ تمہارا دیس' جو مختلف مذاہب کے پیروکاروں کا دیس ہے وہاں تم نے مندروں اور کلیساؤں میں بجتی گھنٹیوں' بلند آواز میں اشلوک پڑھنے نواکار منتر (جین مذہب) دہرائے جانے کی آوازوں' نیا نفو (بدھ مذہب) کی آوازوں' گرو گرنتھ صاحب پڑھنے اور بھجن گائے جانے کی آوازوں کے درمیان اکثر مسجدوں سے اٹھتی اذان کی بھی سنی ہوگی' لیکن تم جتنا چاہو' اس حقیقت کا اقرار کرنے سے بھاگو' میں جانتی ہوں کہ تمہارا دل یقیناً "مندروں کی گھنٹیوں' اشلوک اور بھجن کی آواز کی طرف کھنچتا ہوگا کیونکہ لاشعوری طور پر تم ان ہی سے زیادہ مانوس ہو۔ اب یہ آوازیں برسوں بعد بھی سنو گے تو تمہارے اندر وہی مانوس احساس جاگے گا جو اس وقت جاگتا تھا جب تم اپنے دیس میں موجود تھے۔"

وہ رکی اور کچھ سوچنے کے بعد کی پیڈ کی کیز دوبارہ سے دبانے لگی۔

"میں جانتی ہوں یہ الفاظ پڑھتے ہوئے تم یقیناً "ہنس رہے ہو گے' لیکن میرا مشورہ ہے' کبھی جو میں نے کہا ہے اسے ضرور آزمانا' میں نے آزمایا نہیں لیکن یہ حقیقت مجھ پر عیاں ہو چکی ہے کہ پوری دنیا میں' میں جس مانوس احساس نے ہمیشہ میرے دل کو ایک سکون آمیز کیفیت عطا کی وہ ان انجان الفاظ کے اندر بند تھا جنہیں میں شاید ابھی بھی پوری طرح سمجھ نہیں سکی ہوں۔ ہاں سمجھنے کے مراحل سے ضرور گزر رہی ہوں اور یقین جانو۔ صرف ایک کوشش کی نیت نے میری زندگی کو آسودہ اور پرسکون کر رکھا ہے' میں لندن جیسے شہر میں رہنے کے لیے سوچتے ہوئے ڈرتی تھی کہ میں اس مہنگے ترین شہر میں رہنے کے اخراجات کیسے پورے کرپاؤں گی۔ مجھے پتا نہیں چلتا کہ کیسے اور کہاں سے مگر ڈاکٹر رضا حسین کے مقالے کمپوز کرنے کا جو معاوضہ مجھے ملتا ہے' وہ اور ہر ماہ میرے اکاؤنٹ میں آنے والی ایک مخصوص رقم کے ساتھ میں اتنے اچھے طریقے سے اپنی زندگی کی گاڑی کھینچ رہی ہوں کہ مجھے

ہیلسنکی کے وہ مشقت سے بھرپور مشکل ترین دن ایک خواب لگنے لگے ہیں۔ میں نے جو سمجھا ہے اور جو پایا ہے' جو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں اور جو پالینا چاہتی ہوں' سب نے مل کر میری زندگی میں سکون اور چین شامل کر دیا ہے۔ میرا بہت دل چاہتا ہے شیکھر آج کل تم مجھے ملو اور دیکھو مجھ میں اور اس نادیہ بلال میں جو ہیلسنکی میں رہتی تھی کیا فرق آیا ہے۔"

اس نے لکھنے کے بعد اس صفحے پر ایک نظر ڈالی اور ایک بٹن دبا کر وہ مکتوب بھیج دیا۔

☼ ☼ ☼

"آپا رابعہ' سعد کو سردار چچا کے فارم ہاؤس پر ملی تھیں۔ وہ اس روز سے اب تک دم بخود ہیں اور پہلے سے کہیں زیادہ مضطرب' وہ سعد میں سعد کو دیکھ رہی تھیں یا سعد میں آپ کو دیکھ رہی تھیں۔ یہ تو آپ ہی جانتے ہوں گے لیکن سعد ان میں کچھ بھی دیکھ نہیں پایا۔ اسی لیے ان سے کنارا کرتے ہوئے ان کے سامنے سے ہٹ گیا۔ سعد تو آپا رابعہ کو نہیں پہچانتا تھا مگر آپا رابعہ' آپ سمجھ سکتے ہیں' ان کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی سعد کو دیکھ کر۔"

ان کے کانوں میں اس لڑکی کی آواز گونج رہی تھی جو ابراہیم کے توسط سے ان سے ملنے آئی تھی۔ جبکہ ان کی نظریں سامنے موجود ہوم تھیٹر ل وی کی بڑی اسکرین پر جمی تھیں' جس پر وہ اپنے بیٹے کی تصویریں دیکھ رہے تھے ایک کے بعد ایک تصویر اس سلائیڈ شو میں محفوظ ترتیب کے ساتھ اسکرین پر آتی اور گزرتی جاتی تھی۔ ان کا جسم آرام کرسی پر جھول رہا تھا اور دماغ میں کئی قسم کی سوچیں گردش کر رہی تھیں۔

"آپا رابعہ اور مولوی سراج سرفراز' ہمارے آبائی گاؤں میں رہتے ہیں۔ مولوی سراج سرفراز گاؤں کی جامع مسجد میں تعینات ہیں اور آپا رابعہ گاؤں والوں کی طرف سے پیش کردہ ایک چھوٹے سے کچے مکان میں رہتی ہیں' ان کی بیٹی سعدیہ گاؤں کے قریبی قصبے کے اسکول سے میٹرک کر رہی تھی کہ اچانک نجانے دونوں کو کیا خیال آیا جو جھٹ پٹ سعدیہ کا بیاہ کھاری سے کر دیا۔ کھاری ایک یتیم' مسکین' ان پڑھ سا لڑکا ہے۔ پھر بھی آپا رابعہ اور مولوی سرفراز نے سعدیہ کا بیاہ کھاری سے کر دیا۔" آرام کرسی تیزی سے آگے پیچھے حرکت کرنے لگی۔

"وہ دونوں بے چارے معذوروں کی طرح ڈری سہمی زندگی گزار رہے ہیں۔ اب تک وہاں انہوں نے کسی کو نہیں بتایا کہ دراصل دونوں کہاں کے رہنے والے ہیں۔ طیفے لاٹ' نامی خونی بلا کا روگ دونوں کو ایسا چمٹا ہے کہ دونوں بس سانس لیتے ہیں تو زندہ ہیں۔"

"طیفا لاٹ۔" ان کے چہرے کا زاویہ بگڑا۔

"طیفا لاٹ۔" چہرے کی رنگت سرخ ہونے لگی۔

"طیفا لاٹ۔" ان کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔

"طیفے لاٹ نامی خونی بلا۔" انہوں نے غصے اور بے بسی سے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیے۔ ان کے جبڑوں کی ہڈیاں آپس میں سختی سے جڑ گئی تھیں اور رخسار کھنچے ہوئے نظر آرہے تھے۔

"مولوی سراج سرفراز کو تو پھر بھی لگتا ہے' جس حال میں ہوں جینا آتا ہے کیونکہ وہ غور و فکر کرنے کی عادت جیسی علت نہیں پالتے لیکن آپا رابعہ' وہ بے چاری نجانے اب تک زندہ کیسے ہیں اور پھر ابھی تک تو جیسے تیسے زندہ تھیں' سو تھیں۔ سعد کو دیکھ لینے کے بعد نجانے کیسے جی رہی ہیں۔ میں تو ان کی خاطر سعد کو ڈھونڈتی یہاں تک آئی تھی' لیکن یہاں آکر سنا ہے کہ یہاں کسی کو بھی سعد کی خبر نہیں' آپ کو بھی نہیں۔"

اس لڑکی کی کچھ اور باتیں یادداشت کے گوشے سے نکل کر ذہن کے پردے سے ٹکرائیں۔ انہوں نے سامنے دیکھا' 100 انچ بڑی اسکرین پر موجود سلائیڈ میں سعد کسی بزنس میٹنگ میں بیٹھا اپنے مخاطب کی بات

سنتے ہوئے مسکرا رہا تھا' پل بھر بعد یہ تصویر غائب ہوئی اور اگلی سلائیڈ اسکرین پر نظر آنے لگی کسی سوئمنگ پول کے کنارے ڈیک چیئر پر نیم دراز وہ ایک آنکھ دبائے تصویر لینے والے کی طرف دیکھتے ہوئے ہنس رہا تھا' اگلی سلائیڈ' ایک فیملی فرینڈ کے ہاں شادی کی تقریب میں سیاہ ڈنر سوٹ پہنے دولہا کے ساتھ کھڑا۔ اگلی سلائیڈ' فرینکفرٹ میں پراڈکٹ کوالٹی انشورنس کانفرنس میں شریک' گلے میں کانفرنس کے شرکاء کا مخصوص کارڈ لٹکائے ایک گروپ فوٹو میں' اگلی سلائیڈ' یونیورسٹی کے زمانے کی تصویر کسی اسپورٹس ایونٹ کے اختتام پر ٹرافی وصول کرتے ہوئے۔ اگلی سلائیڈ' اس سے اگلی' اس سے اگلی۔ انہوں نے آنکھیں بند کرلیں۔

منظر' چہرے' آوازیں' واقعات' شور ان کے اردگرد جیسے ہنگامہ بپا تھا۔

''آپا رابعہ شاید کسی طرح سعد تک پہنچ ہی جاتیں اگر جو وہ چچا سردار کے فارم ہاؤس کے مہمان خانے کی دیوار پر ٹنگی قلزا ظہور نامی ایک مصورہ کی ایک ادھوری پینٹنگ دیکھ کر اچانک وہاں سے غائب نہ ہوجاتا' وہ آخری دن تھا جب فارم ہاؤس میں موجود کسی شخص سمیت میں نے اسے دیکھا تھا۔'' اس لڑکی کی آواز سب آوازوں پر بھاری ہونے لگی۔

''آپا رابعہ' مولوی سراج' سرفراز' قلزا ظہور' پینٹنگ۔۔۔ جگسا پزل کے ٹکڑے' کس کو کہاں جوڑنا ہے' کس کو کس سے ملانا ہے' میرا دماغ تو سوچ سوچ کر ہار مان گیا' مجھے تو زندگی میں کبھی جگسا پزلز میں دلچسپی نہیں رہی۔ میں نجانے کس وجہ سے چند ٹکڑے سامنے رکھے کوئی نامعلوم پزل حل کرنے چل پڑی ہوں۔''

آرام کرسی کے ہلنے کی رفتار پہلے سے کہیں زیادہ تیز ہوگئی تھی۔ اسکرین پر چلتی سلائیڈز اپنا ایک ایک چکر ختم کرکے دوبارہ نئے سرے سے چلنا شروع ہوچکی تھی۔

☆ ☆ ☆

''جنت میں ایک رات گزارنے کا ثمر؟'' چوہدری سردار نے قلزا ظہور کی طرف دیکھا' کچھ ہی وقت گزرا تھا' محض چند گھنٹے جن کے اندر اندر چوہدری سردار کو وہ کم رو' بد مزاج' بددماغ سڑیل عورت۔ جس کا لباس ہمیشہ سے ہی عجیب و غریب رہا تھا۔ دنیا کی مظلوم' دکھی مگر صابر اور خاموش عورتوں میں سے ایک نظر آنے لگی تھی۔ بے کے پن کی سزا کاٹتی ناکردہ کی مجرم' جس کے پاس اپنے حق میں کوئی ثبوت تھا نہ دلیل تھی۔

''وہ خود کدھر ہے؟'' انہوں نے بھاری آواز میں کہا۔ قلزا ظہور نے جواب تک بول بول کے تھک چکی تھی چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

''وہی۔۔۔ بلال سلطان!'' چوہدری صاحب نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

''خود پر بے اعتنائی' سرد مزاجی اور بے نیازی کا زرہ بکتر چڑھائے زندگی سے نبرد آزما ہے۔'' قلزا نے کہا۔ ''وہ منحوس حقیقت ''پیسہ'' ہی تھی نا جس نے اس سے زندگی چھینی' زندگی کی خوشیاں چھینیں' وہ اپنے تئیں اسی پیسے سے انتقام لے رہا ہے۔ اسے کما کما کر' اسے لٹا لٹا کر بے جان' بے مقصد چیزوں پر ضائع کرکے شاید وہ ''پیسے'' کو بتانا چاہتا ہے کہ در حقیقت وہ کتنا بے وقعت ہے' جس کے پاس ہے اس کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں' جس پر وہ مہربان ہے' اسے اس کی کوئی قدر نہیں۔ برسوں کی پہنی سرد مہری اور بے نیازی کی اس زرہ بکتر نے اسے شاید شدید مادیت پرست بنا دیا ہے۔ وہ شہر در شہر پلازے کھڑے کرنے' ٹاؤنز بنانے' آسمان سے باتیں کرتے مالز تعمیر کروانے' اندرون و بیرون ملک اپنے بینک اکاؤنٹس بڑھانے اور بڑھاتے چلے جانے میں مصروف شاید اپنا وہ غم غلط کررہا ہے کہ دولت کا یہ ہما اس کے سر پر اس وقت بیٹھا جب وہ اپنا سب کچھ گنوا چکا تھا۔''

''سعد سلطان اس کا بیٹا ہے' مگر وہ یہ سب سن کر بپھر جاتا' یا اور بکھر جاتا' کیوں' اس کے لیے یہ سب ایک انکشاف

کیوں تھا؟'' چوہدری سردار نے پوچھا۔

''سعد سلطان گھمسان کے اس کارزار حیات سے نمٹنے کے بعد بلال سلطان کے ہاتھ لگا واحد مال غنیمت ہے' اس کی سب سے قیمتی متاع۔ اس کے سامنے ماضی کے یہ بھیانک البم کھولنے کی طاقت یقیناً' اس میں نہ ہوگی' اسی لیے سعد سلطان کے لیے یہ سب نیا تھا۔''

''دیکھ لیجئے بیگم صاحب! پھر انسان کتنا بے بس ہے۔'' چوہدری سردار نے کہا۔ ''جن حقیقتوں کو اپنے ہاتھوں زمین میں دفن کرنا چاہتا ہے۔ وہ دنیا کے کس کس کونے کھدرے سے نکل کر سامنے آتی جاتی ہیں۔''

''سچ ہے۔'' قلزا ظہور نے سرہلاتے ہوئے کہا ''اس بچے کے بارے میں ادھورا پورا ہی سہی سعد سلطان نے آپ سے سن لیا' حالانکہ آپ کو قطعی علم نہ تھا کہ جس کو سنا رہے ہیں' وہ واقعہ کا ایک کونا ہے' میری سہیلی فاطمہ ذوالفقار کے توسط سے آپ کی بھتیجی کے ہمراہ وہ مجھ تک آپہنچا' اور پھر کڑی سے کڑی اس کے لیے آپ سے آپ ہی مل گئی۔ واقعی سچ ہے چوہدری صاحب! جو انسان چھپاتا پھرتا ہے وہ خدا کو منظور نہ ہو تو چھپ نہیں پاتا۔'' قلزا ظہور نے جواب دیا۔

''کوئی شک نہیں' کوئی شک نہیں۔'' چوہدری سردار نے سرہلاتے ہوئے تاکید کی۔

''چوہدری صاحب! اب اگر مہربانی کریں تو اسے بلا دیں' شام بھیگنے لگی مجھے لمبا سفر طے کرکے واپس بھی جانا ہے۔''

چوہدری سردار نے بوکھلا کر ان کی طرف دیکھا اور پھر لجاجت سے بولے۔

''میں تو کہتا ہوں بیگم صاحبہ! اسے اس کے حال میں مست رہنے دیں۔ وہ حساس اور جذباتی طور پر کمزور بچہ ہے۔ مجھے ڈر ہے' اس اتنے بڑے انکشاف کا بوجھ سہ نہیں پائے گا۔ وہ جیسا ہے' جس حال میں ہے بہت خوش ہے۔''

''نہیں چوہدری صاحب!'' قلزا نے سختی سے کہا ''میں نے جب سے سنا ہے کہ وہ زندہ ہے' سلامت ہے' ابھی تک آپ کی حفاظت میں ہے' میں چین سے بیٹھ نہیں پائی ہوں' پلیز آپ اسے بلا دیں' مجھے اسے بتانے دیں' میں برسوں پہلے کیے گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔''

''اچھا!'' چوہدری سردار نے بے بسی سے کہا اور اٹھ کر دروازے کے قریب جاکر آوازدینے لگے ''او دین محمد! اوئے شفیع کاکا! کدھر چلے گئے ہو او سارے؟''

☆ ☆ ☆

''ہاؤس کو تمہاری سکی ڈائیونگ یقیناً'' پسند آئی ہوگی' کیونکہ وہ واقعی شاندار تھی۔'' رات کے کھانے کے دوران ودون زادے نے سعد سے کہا۔

''تم یقیناً' میرا مذاق اڑا رہے ہو۔'' اس نے تلے ہوئے جھینگے کو کانٹے میں پروتے ہوئے کہا ''میں جانتا ہوں کہ پہلی لفٹ کے ڈائیورز میں' میں سب سے زیادہ مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ میرے پیر سکینز پر جمنے سے قاصر ہو رہے تھے اور میری نظر کی انتہائی حد بھی کمزور پڑ رہی تھی۔''

''مت بتاؤ مجھے۔'' ودون زادے ہنس کر بولا۔ ''یہ سب سے کم اونچائی کی سکی ڈائیونگ تھی' جہاں سورج کی روشنی بہت کمزور ہوتی ہے' تمہاری نظر کی حد یہاں کمزور پڑ رہی تھی تو پھر تمہیں اگلی اونچائی پر جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''وہ تو خیر میں ضرور جاؤں گا' مجھے انتہائی اونچائی پر جاکر سکینگ کرنے کا شوق ہی تو یہاں تک کھینچ لایا ہے اس

کو پورا کیے بغیر تو میں یہاں سے جانے والا نہیں۔" سعد نے مسکرا کر کہا۔

"تو پھر میرے عزیز دوست' پروٹین اور چکنائی والی یہ غذائیں کھانا بند کرو' کاربوہائیڈریٹس لو زیادہ سے زیادہ میری طرح' اونچائی پر تمہارے کام آئے گی۔" وودن زادے نے اپنی پلیٹ کی طرف اشارہ کیا' جس میں خمیر سے گندھے آٹے کی روٹی کا ٹکڑا اور سبز پتے کی ابلی سبزی رکھی تھی۔

"مذاق مت کرو۔" سعد زور سے ہنس دیا۔ "میرا فشار خون اکثر کم رہتا ہے' میں تمہاری والی غذا کھا کر بستر پر نہیں لیٹ جانا چاہتا۔"

"اور یہ کہ چند دن یہیں' اس کم اونچائی والے ٹریک پر مشق کرو' اس کے بعد ہم اگلی لفٹ پر جائیں گے' اپنی نظر کی حد کو بھی بہتر بنانے کی مشق کرو۔" وودن نے اگلا مشورہ دیا۔

"چند دن اور۔" وہ حیران ہوتا ہوا بولا۔ "قطعی نہیں" "تم نے موسم کی پیش گوئی نہیں سنی' اگلے دو دن میں اونچائی کی آخری حد پر مزید برف پڑنے والی ہے۔ ہم ان ہی دو دنوں میں سے ایک میں اگلی نہیں بلکہ اس سے اگلی لفٹ پر سوار ہوں گے۔"

"کیا تم جنونی ہو یا یہاں سے کھسکے ہوئے ہو۔" وودن زادے نے کنپٹی پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "برف ایک رات پڑے گی اور اس سے اگلے روز دن میں سورج نکلے گا' زیادہ اونچائی پر برف پر پڑنے والی سورج کی تیز شعاعیں جانتے ہو' کتنی خطرناک ہوتی ہیں۔ ہم کوئی نہیں جا رہے اگلے دو دنوں میں وہاں' فی الحال یہیں مشق ہو گی' بس تم اپنے پانی پینے کی مقدار بڑھاؤ' زیادہ سے زیادہ جوس اور پانی پیو۔"

"آپ فکر مت کریں ابا جان! میں آپ کو ان ہی دو دنوں میں وہاں جا کر دکھانے والا ہوں۔" سعد نے مزاحیہ انداز میں کہا تھا اور وودن زادے اس کی ہٹ دھرمی پر سر جھٹک رہا تھا۔ یقیناً" وہ اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے والا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں کوئی زیادہ قابل اعتبار شخص نہیں ہوں لیکن پھر بھی نجانے کیوں باس مجھے ایک ایسی جگہ کی خبر لانے پر تلا ہوا ہے' جس کے محل وقوع سے میں قطعی واقف نہیں ہوں۔" رازی نے جلدی جلدی چائے کے بڑے بڑے گھونٹ بھرتے ہوئے کہا' وہ انتہائی عجلت میں نظر آ رہا تھا۔

"باس جانتا ہے کہ تم اپنے ذمہ لگائے کام کو بہت اچھی طرح پورا کر سکتے ہو' اور تم یہاں سے۔" ضوفی نے اس کے سر کی طرف اشارہ کیا۔ "جسم کی نسبت زیادہ موٹے ہو' سوال کرنا چاہو بھی تو کر نہیں پاتے اور کسی معاملے کی گہرائی میں بھی تمہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کام کے لیے تم سے بہتر آدمی کوئی دوسرا ہو بھی نہیں سکتا۔ جتنے سالوں سے تم باس کی خدمت کر رہے ہو' اتنا عرصہ تمہاری وفاداری جانچنے کے لیے بھی کافی ہے۔"

"ہاں!" رازی اپنی شخصیت کا ایسا تجزیہ کیے جانے پر بگڑ کر بولا "حالانکہ باس جانتا ہے کہ تم جیسی چالاک لومڑی میری بیوی ہے۔"

"یہ تو تمہارا پلس پوائنٹ ہے جناب! بے وقوف دوست کا عقل مند ساتھی' باس جانتا ہے کہ پازیٹو اور پازیٹو مل کر روشنی نہیں کرتے' پازیٹو کو نیگیٹو کے ساتھ تعلق جوڑ کر روشنی حاصل کرنی پڑتی ہے' تو اگر نیگیٹو' پازیٹو دوست کی بیوی ہو تو زیادہ بہتر ہے' بجائے اس کے کہ وہ اس کی صرف دوست ہو۔"

"میری چالاک لومڑی! میری سوچ کی حد جہاں ختم ہوتی ہے وہاں تمہاری سوچ کی حد شروع ہوتی ہے۔ لو پھر میں چلا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"تمہارا حافظہ ذرا کمزور ہے' میں نے احتیاطاً" ان لوگوں کے ناموں کی لسٹ بنا کر تمہاری جیکٹ کی جیب میں رکھ دی ہے' جن کے بارے میں تمہیں پتا کرنا ہے۔" ضوفی اٹھ کر اس کے ساتھ کمرے سے باہر آتے ہوئے بولی۔

"ہوں" رازی نے توصیفی نظروں سے ضوفی کی طرف دیکھتے ہوئے جیکٹ کی جیب سے لسٹ والا کاغذ نکال کر دیکھا۔ "مولوی سراج سرفراز' رابعہ کلثوم زوجہ مولوی سراج سرفراز' چوہدری سردار خان ... ارے ڈارلنگ یہ تو صرف تین لوگ ہیں' تین نام یاد رکھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"تمہارے لیے یقیناً" مشکل ہے' تم مولوی' سراج سرفراز' رابعہ' کلثوم' زوجہ اور چوہدری سردار خان' چھ لوگوں کا پتا لگانے میں مصروف رہتے اگر میں نمبر شمار کے ساتھ یہ نام نہ لکھتی۔" ضوفی نے مسکرا کر کہا۔

"چلو اب جاؤ' دیر ہو رہی ہے۔"

رازی نے تیزی سے ہاتھ ہلایا اور ڈرائیو وے کی طرف چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں سعد نے یہاں آنے کے لیے کہا ہے نا ماہ نور! ہم لوگوں کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے۔" سارہ نے سینڈوچز میں سے پنیر کے ٹکڑے نکال کر پلیٹ میں ایک طرف جمع کرتے ہوئے کہا۔ پنیر اسے کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا جبکہ یمی آنٹی کو پنیر کھانے کا جنون تھا۔

"سعد نے۔" ماہ نور نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "نہیں۔ مجھے اس نے نہیں بھیجا۔" وہ کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں بولی "اور وہ مجھے کیوں بھیجے گا' تمہارے بارے میں تو وہ خود براہ راست خبر رکھتا ہو گا۔"

"ہم سے تو بہت دن سے اس کا کوئی رابطہ نہیں۔" سارہ کے لہجے میں دکھ اترا "وہ بہت دن پہلے یہاں آیا تھا' شاید دوبارہ کبھی نہ آنے کے لیے۔"

"کیا مطلب؟" ماہ نور کو دھکا سا لگا۔

"مطلب وہ آخری بار ایسے ہی آیا جیسے دوبارہ اسے یہاں آنا ہے نا ہی ہم سے کوئی تعلق رکھنا ہے۔"

ماہ نور کے اردگرد ہر چیز ساکت ہو گئی۔ نیچے سڑک پر چلتے پھرتے لوگوں کی اور رواں دواں گاڑیوں کی فضا میں گونجتی آوازیں خاموش ہو گئیں۔ اس کے اردگرد صرف سناٹا تھا۔

"وہ کہاں گیا ہے سارہ؟" بہت لمبے وقفے کے بعد اس نے خود کو کہتے سنا۔

"معلوم نہیں۔" سارہ نے نیچی آواز میں کہا۔

"تمہیں بھی معلوم نہیں۔" ماہ نور نے بے یقینی سے کہا۔ "تم جو اس کی کوئین آف ہارٹ ہو' اس کی زندگی کا مرکزی نکتہ' جس سے وہ کبھی ایک انچ ادھر ہوا نہ ادھر۔"

سارہ اسے منہ کھولے دیکھ رہی تھی' یہ بات وہ لڑکی کر رہی تھی' جس پر اس نے ہمیشہ رشک کیا تھا۔ جس سے اس نے ہمیشہ حسد بھی محسوس کیا تھا۔ وہ جو بلندیوں پر نظر آتی تھی' سعد سلطان کے کندھے سے کندھا جوڑے شاد اور مسرور۔

اس نے بمشکل اپنا کھلا ہوا منہ بند کیا اور سر جھٹکتے ہوئے دائیں بائیں دیکھنے لگی پھر اس نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔" اس نے اپنی رندھی ہوئی آواز کو حتی الوسع اعتماد کا سہارا دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں وہ لڑکی نہیں ہوں ماہ نور! تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے۔ وہ لڑکی تو اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "وہ لڑکی تو تم ہو تم خود۔"

یہ الفاظ کہتے ہوئے اس کے دل کے آرپار کیسی چھریاں پیوست ہوئی تھیں یہ صرف وہی جانتی تھی اس کی پسلیوں کے درمیان کہیں اس کا زخمی دل پھڑپھڑا کر رہ گیا تھا۔

"میں ان دنوں اتنی سنجیدہ اور پریشان ہوں سارہ! کہ تمہارے مذاق کا ٹھیک سے لطف بھی نہیں اٹھا سکتی میں معذرت خواہ ہوں۔ مجھے واقعی ہنسی نہیں آرہی۔" ماہ نور نے یہ کہتے ہوئے اپنی نظریں سامنے سر اٹھا کر کھڑے پہاڑوں پر جمالیں۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور پہاڑوں کا منظر دھندلانے لگا تھا۔

سارہ نے اس کی طرف دیکھا اور سر جھکالیا۔

"میں اس کے لیے صرف ایک نیکی ہوں ماہ نور! جس سے اس کا انسان دوست، ہمدرد دل فرار حاصل نہیں کرسکتا۔ وہ چاہے بھی تو مجھے نظرانداز نہیں کرسکتا کیونکہ میں اس کے ہاتھوں لگا نیکی کا رحم دلی کا "انسان دوستی کا وہ پودا ہوں، جس کی آبیاری اس نے اپنے ہاتھوں سے کی ہے۔" اس نے سر اٹھا کر ماہ نور کی طرف دیکھا "انسان کی فطرت میں اپنے ہاتھوں سے لگائے پودے کی محبت بیٹھی ہے "ایسے کسی پودے کا کوئی پتا مرجھانے لگے "اس پر کسی موسم کے اثر کے تحت پھل کم آئے' یا وہ ناقص پھل دینے لگے' سب سے زیادہ فکر پودا لگانے والے کو ہوتی ہے۔ وہ اس کی نگہداشت اور پرداخت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا۔" وہ لحہ بھر کو رکی۔

"میں سعد سلطان کے لیے ایسا ہی ایک پودا ہوں ماہ نور! جس کی طرف سے وہ غافل اور لاپرواہ نہیں ہو سکتا۔" اس نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی ہو سکتا ہے اتنے سالوں میں میری حیثیت محض ایک ہمدردی' ایک نیکی سے بڑھ کر ایک اچھے دوست میں تبدیل ہو گئی ہو کیونکہ جو سونگ اس نے مجھے ڈیڈیکیٹ کیا تھا "اب میں اس کے الفاظ غور سے سنتی ہوں تو مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مجھے کیسی دوست سمجھتا ہے۔"

اس نے ماہ نور کے چہرے پر استعجاب کے سائے بڑھتے دیکھ کر کہا۔

"ایک ایسی دوست جس سے اسے اتنی انسیت ہے کہ وہ اس کے لیے "اس کی ایک پکار پر پوری دنیا میں ہر وقت موجود ہے۔ ایک ایسی دوست جسے اسے پکارنے کے لیے صرف نمبر تین تک گنتی گننی پڑے اور وہ حاضر ہو جائے' اور ایسا ہوا بھی۔" اس نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

"میں جب بھی اس کی غیر حاضری کی وجہ سے پریشان ہوئی اور میں نے اس کو یاد کیا تو وہ اسی روز یہاں آن موجود ہوا' ہاتھوں میں پھول لیے' چاکلیٹس کے ڈبوں اور محبت بھری مسکراہٹ کے ساتھ' مجھے زندگی کے ہونے کا یقین دلانے کے لیے' مجھے گرتے ہوئے دیکھ کر اپنے ہاتھ اور اپنے کندھے کا سہارا پیش کرنے کے لیے' مجھے دنیا میں حوصلے اور عزم کی بکھری داستانیں سنانے کے لیے' مجھے یقین دلانے کے لیے کہ ہاں۔ میں کرسکتی ہوں' میں زندہ ہوں اور جب تک زندگی ہے میں آگے بڑھ سکتی ہوں کسی بھی نارمل انسان کی طرح میں بھی زندگی کے رنگوں کے ساتھ کھیل سکتی ہوں کیونکہ میں ابھی مری نہیں' وہ زندہ ہوں' میری زندگی جو ایک معجزہ ہے' یہ معجزہ مجھے اسے ضائع کرنے کے لیے عطا نہیں ہوا۔

آج جب میں اسے تصور میں دیکھتی ہوں تو بھی مجھے چاروں طرف وہ ہاتھ کے اشارے سے اٹھنے کا' زیرلب بولتے ہوئے ہمت کرنے کا' مسکراتے ہوئے میری کوششوں کو سراہنے کا اشارہ دیتا نظر آتا ہے۔ کیونکہ میں اس کی "نیکی کا پودا" ہوں' مجھے زندگی کی طرف لوٹتے ہوئے' زندگی کی سرسبزی سے شاداب ہوتے ہوئے دیکھ کر اس سے زیادہ کون خوش ہو سکتا ہے۔"

اس نے رومال سے آنکھیں خشک کیں اور اپنے سامنے دم بخود بیٹھی ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"میں بھی کبھی کبھی اس خوش فہمی کا شکار ہو جاتی تھی کہ میں اس پوری دنیا میں سعد کے لیے سب سے اہم ہوں' جس کی ایک پکار پر وہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر بھاگا چلا آتا ہے' جس کی خوشی کی خاطر وہ پیسہ پانی کی طرح بہا رہا

ہے' جس کی ایک مسکراہٹ کے لیے وہ گھنٹوں بول سکتا ہے' اور جس کے مسکرا دینے پر وہ جانثار ہوتا نظر آتا ہے۔"

اس نے دیکھا' ماہ نور کے چہرے پر رشک اور حسد کے سائے لرزنے لگے تھے۔ وہ معصوم مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"لیکن۔ میں نے اب جان لیا ہے کہ ایسا محض اس لیے تھا کہ وہ اتنا نیک نیت اور نیک دل ہے کہ اپنی نیکی پر غفلت کا سایہ پڑنا اسے کسی طور منظور نہیں' وہ اتنا محبت کرنے والا دوست ہے کہ دوست کی ذرا ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھنا اس کی عادت ہے۔ اس کی مجھ سے متعلق ہر بات ان ہی دو چیزوں سے ان ہی دو جذبوں سے پھوٹتی تھی' ان ہی دونوں جذبوں کا نتیجہ تھی' جب ہی اس نے ایک دوست کو ڈیڈیکیٹ کیے جانے والا سونگ مجھے ڈیڈیکیٹ کیا۔ مگر تم۔" اس نے ماہ نور کی طرف دیکھا "تم تو اس کے لیے پوری کائنات ہو ماہ نور! اس کی زندگی' جس کے ہونے کا احساس اسے جینے پر مجبور کرتا ہے۔"

"غلط کہہ رہی ہو تم سارہ۔" ماہ نور نے اس کی بات کاٹی "مجھ سے تو اس نے ہمیشہ پہلو تہی کی' مجھے تو ہمیشہ اس نے نظرانداز کیا' بتائے بغیر غائب ہو جاتا تھا۔ میرے جذبے کا اظہار میری باتوں میں ہوا اور وہ اس کا تمسخر اڑاتا رہا جیسے اس کے لیے وہ بہت معمولی سا جذبہ ہو' بے مول' چھوٹا' ناقابل اعتنا۔ اس کے لہجے میں تلخی گھلنے لگی۔

"جب ہی وہ آخری بار مجھ سے ملاقات کے دوران اتنا غم زدہ تھا کہ تمہارے تذکرے پر اس نے جانتی ہو مجھ سے کیا کہا؟" سارہ نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ "اس نے کہا "پلیز اس وقت مجھ سے اس کا ذکر مت کرو "اس وقت میں تعلقات کو پوری سچائی کے ساتھ نبھانے کے موڈ میں ہوں اور ماہ نور میرے سینے کے اندر بہت گہرائی میں گڑا ایک ایسا تعلق ہے جسے میں نے برتا ہے' نبھایا نہیں۔" ان لفظوں پر غور کرو ماہ نور! تم اس کے سینے کے بہت اندر گہرائی میں گڑا تعلق ہو۔ غور کرو ماہ نور! تمہاری کیا سمجھ میں آتا ہے اس بات سے؟"

"گہرائی میں گڑا تعلق۔" ماہ نور نے الفاظ کو دہرایا۔ "یہ تعلق پچھتاوے کی پھانس اور ناپسندیدگی کی انی بھی تو ہو سکتا ہے' جسے اس نے برتنا پسند کیا مگر نبھانا نہیں' جب ہی تو ہر بار بغیر کوئی اتا پتا دیے وہ میری زندگی سے اتنی آسانی سے غائب ہو جاتا رہا کہ اسے اس طرح غائب ہو جانے کا کوئی افسوس ہوا نہ دکھ یوں جیسے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا سو چھڑا لیا۔"

"نہیں ماہ نور! تم غلط فہمی کا شکار ہو رہی ہو۔" سارہ نے نرمی سے کہا "اس کے جانے کے بعد میں نے بہت دن اس کے اور اپنے تعلق کی نوعیت کا اندازہ لگانے میں گزار دیے میں نے اس کی خود سے کی باتیں یاد کیں "اس کی ایک ایک حرکت اور عمل جو میرے لیے تھا۔ اس نے جو گانے مجھے سنوائے ان کے الفاظ پر غور کیا اور میں اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ مجھے سعد سے متعلق اپنے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس کے لیے میں صرف اس کی "انسان دوستی کا لگایا ہوا پودا" ہوں۔ ہاں مجھے خوش ہونا اور فخر کرنا چاہیے کہ میں آدمیوں کی بستی میں موجود ایک ایسے انسان سے کسی بھی حیثیت میں سہی بہت قریب ہوں' جس کے قریب ہونے پر خوشی اور فخر محسوس کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ صرف ایک انسان نہیں بہت عظیم انسان ہے' میری اس مختصر زندگی کا عظیم ترین انسان۔"

اس نے مسکراتے ہوئے ماہ کی طرف دیکھا' اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ "میری بات مانو تو اسی طرح تم بھی اس کے اور اپنے تعلق کی نوعیت جاننے کی کوشش کرو۔ آنکھوں سے غصے اور بدگمانی کی عینک اتار کر اسے یاد کرو۔ اس کی باتیں' اس کا عمل' اس کی فیلنگز جو تمہارے ساتھ وابستہ تھیں' کوئی ایسا سونگ' کوئی ایسی بات جو اس نے خصوصاً" تمہیں سنائی ہو۔ کوئی ایسا لمحہ جب اس نے تم سے خالص اپنے دل کی کوئی بات کہی ہو۔

یاد کرو ماہ نور! یاد کرو۔"

سارہ کہہ رہی تھی اور ماہ نور سامنے پہاڑوں پر نظریں جمائے بیٹھی تھی اب وہ سارہ کی بات نہیں سن رہی تھی اب اسے کچھ اور ہی سنائی دے رہا تھا۔ آوازیں "الفاظ" انداز۔ پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر اسے بہت کچھ نظر آرہا تھا' یکایک اسے بہت کچھ سنائی دے رہا تھا۔

"اتنی جلدی نتائج اخذ کرنے سے گریز کیا کرو۔"

"انسان کو اپنی زندگی کے معاملات میں بہت شیور ہونا چاہیے۔"

کبھی چیزیں اتنی ویلیوایبل ہوتی ہیں کہ آپ ان کی قیمت کا اندازہ ہی نہیں لگا پاتے؟" اسے لفظ لفظ یاد آنے لگا تھا۔ وہ لفظ جو یقیناً "کبھی کسی اور سے نہیں کہے گئے تھے۔

"Her eyes her eyes
make the stars look like
they are not shining
Her hair her hair
falls perfectly without her trying
she's so beautiful
And I tell her everyday

ایک ایک کر کے الفاظ' باتیں' جملے اسے سب یاد آنے لگے تھے۔

"اتفاقات کے بارے میں پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔"

"تم جانتی ہو ماہ نور! تم کتنی خوش قسمت ہو۔"

ماہ نور کا سر نفی میں آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ وہ کس چیز کی نفی کرنا چاہ رہی تھی اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔

IKnow I Know when I Compliment her
She won't beleive me And its so sad
that she dosn'tsee what I see

اس نے بے اختیار اپنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیا۔ اسے لگ رہا تھا اگر وہ ایسا نہ کرتی تو اس کے منہ سے چیخ نکل جاتی' چند لمحوں کے اندر اندر اس نے ایک ایسی حقیقت کو پالیا تھا جس کے متعلق اس کا خیال تھا کہ وہ اسے ہمیشہ کے لیے کھو چکی ہے۔

And when you smile
The whole world stops
and stares for a while
cause girl you are amazing
Just the way you are

سارہ نے اسے وہ نکتہ بتایا تھا' جس کا ایک ایک لفظ اس اتنی بڑی حقیقت کو اس کی نظروں کے سامنے آشکار کر رہا تھا جو اس کی مٹھی میں بند تھی اور وہ اس سے بے خبر تھی۔

"سارہ! میں!" اس نے بمشکل ایک ادھوری بات کی اور تیزی سے بھاگتی ہوئی کمرے کی میز پر رکھی گاڑی کی چابیاں اور اپنا سویٹر اٹھا کر گھر کے بیرونی دروازے تک پہنچ گئی۔

"سارہ! مجھے جلدی ہے' مجھے اچانک ایک بہت اہم کام یاد آگیا ہے۔ مجھے کسی کو کچھ بتانا ہے فوراً" ۔۔۔ ابھی۔" اس نے دروازے سے باہر نکلنے سے پہلے رک کر بلند آواز میں کہا اور گھر سے باہر نکل گئی۔

اس نے اتنی تیز ڈرائیونگ کبھی نہیں کی تھی' وہ راستہ پہاڑوں کو کاٹ کر بنایا گیا تھا جو تنگ بھی تھا اور بل دار بھی۔ برف باری کے سین کو دیکھنے کے شوقین یہاں آنے والوں کی گاڑیوں کی ایک طویل قطار تھی جو بار بار اس کا راستہ روکتی اور اسے رک جانے پر مجبور کر رہی تھی۔

"مجھے سعد سلطان کہتے ہیں۔"

"آئی ایم سوری ماہ نور ہمیں ذرا لیٹ ہو گیا۔"

"کیا آپ یہ اسکیچ بیچنا چاہیں گی؟"

"میں اس کی منہ مانگی قیمت دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش ہے جہاں میرا دل لگ جائے۔"

"یار ڈاڈھی عشق آتش لائی ہے۔"

"آپ کی آواز میں اتنے سحر کی وجہ؟"

"عشق!"

الفاظ "گاڑی چلانے' مجبوراً" روکنے' دوبارہ آگے بڑھنے' پھر رکنے کے دوران بھی اس کے اردگرد پھیل رہے تھے۔ آنسو بھل بھل اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ وہ ایک ہاتھ سے آنسو پونچھتی' دوسرے ہاتھ سے اسٹیرنگ وہیل گھماتی آگے بڑھ رہی تھی۔

اسے بلال سلطان کے پاس پہنچنے کی جلدی تھی' اسے انہیں کچھ بتانا تھا' ایک بہت ضروری بات جسے فوری طور پر انہیں بتانا بہت ضروری تھا۔

Yellow diamonds in the sky
Now we are standing side by sids
As your shadow crosses mire
what it takes to come alive
its the way i am feeling I just can't dry

we found love in a hopeless place
we found love in a hopeless place

الفاظ اس کے ذہن میں گھوم رہے تھے۔ اور اس کا دل اپنی عقل پر ماتم کرنے کو چاہ رہا تھا۔ وہ بادل جسے وہ چھو کر محسوس کرنا چاہتی تھی، جس کی برساتی پھوار میں بھیگنا چاہتی تھی، وہ تو اس کے اپنے آسمان پر سجا اس کی کوتاہ نظری کا شکار ہوتا رہا تھا۔ الفاظ، الفاظ کتنے سچے تھے، اسے محبت وہاں ملی تھی جہاں ملنے کی اسے کبھی بھی امید نہیں ہو سکتی تھی۔

گاڑی بل دار تنگ راستوں سے نکل کر ایک نسبتاً" کشادہ اور سیدھی سڑک پر پہنچ گئی تھی، مگر یہاں ٹریفک جام تھا اور گاڑیوں کی ایک لمبی قطار لگی تھی۔ اس سڑک کے کنارے چھوٹی چھوٹی کئی دکانیں تھیں اور دکانداروں کے علاوہ چند خریداروں کی موجودگی کے باعث قدرے رونق بھی اسے اپنے آگے موجود گاڑیوں کی قطار پر غصہ آنے لگا تھا۔ اسے پہنچنے کی جتنی جلدی تھی، اتنی ہی اس قطار کی وجہ سے تاخیر ہو رہی تھی۔

"آج تم بہت مختلف لگ رہی ہو، جتنی بار میں نے تم کو دیکھا ہے، اس سے بہت مختلف بہت اچھی۔"

"میں تمہیں اس سونگ کا لنک ضرور بھیجوں گا۔"

"شاید میں خود کو یا اپنی فیلنگز کو بیان کرنے کا فن نہیں جانتا۔"

"نہیں تم جانتے تھے بہت اچھی طرح جانتے تھے، ایک میں ہی احمق، انجان اور بے خبر تھی۔" انتظار کی کوفت سے بے زار ہوتے ہوئے اس نے ہارن دبایا۔ "یہ سب کتنا عجیب اور ناممکن سا لگ رہا ہے جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں، مگر یہ سچ ہے کہ ایسا ہی ہے یہ اتنا ہی بڑا سچ ہے جتنا میرا یہاں ہونا، اگرچہ اس سے زیادہ عجیب اور ناممکن بات کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی تھی، جب ہی تو مجھے یقین نہیں آرہا، ایسا کیسے ہو سکتا تھا، کیسے؟"

وہ مسلسل خود سے باتیں کیے جا رہی تھی۔ گاڑیوں کے ہارن کا شور، لوگوں کی آوازیں، اور خود اس کے اپنے خیالات سب گڈمڈ ہوتے جا رہے تھے۔

یہ دنیا اوٹ پٹانگا کتے ہتھ تے کتے ٹانگا
اتھے گکڑی ونڈی بانگا ایدے چکدے پھٹے
یہ دنیا کھیل تماشا یہ تیری میری بھاشا
کنوں سمجھ نچ تن کے شوشا ایدے چکدے پھٹے

اس سارے شور ہنگامے میں کسی دکان پر چلتے ٹیپ ریکارڈر پر لگے گانے کا شور بھی شامل ہو گیا تھا۔ اس نے جھنجلا کر اپنی گاڑی کے ہارن پر مستقل ہاتھ رکھ دیا۔

یہ دنیا مست قلندر تاں اتے بیٹھا بندر
تجھے آپ نوں سکندر ایدے چکدے پھٹے

گانے والا جیسے ماہ نور کے دل کی ساری کیفیت پر پھبتی کس رہا تھا۔ ماہ نور کا ہاتھ ہارن سے اٹھ نہیں رہا تھا۔ اسے جلد سے جلد بلال سلطان کے پاس پہنچنا تھا اور انہیں اس لڑکی کے بارے میں بتا کر جو سعد سلطان کی کوئین آف ہارٹ تھی، اس کی امانتیں وصول کرنا تھیں۔

یہ دنیا واری واری چکدے سارے تار تاری
توں کانوں بنیا بھکاری ایدے چکدے پھٹے

گانے والا اس سڑک کی تمام صورت حال سے بے خبر پوری آواز کے ساتھ چلا رہا تھا۔ (باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عنیزہ سیّد

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم

"میرا خیال ہے میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم اب اس کے پیچھے جا رہے ہیں نہ ہی اس کی کوئی بات کر رہے ہیں" بلال سلطان کا لہجہ اور بات ابراہیم کے لیے حوصلہ افزا ہرگز نہیں تھی۔

"لیکن انکل! میں نے بتایا نا کہ یہ لڑکی تو ویسے ہی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" اس نے منمنا کر ایک کوشش مزید کرنا چاہی۔

"تمہارا کیا خیال ہے، میں بہت فارغ ہوں جو جب کوئی مجھ سے ملنا چاہے میں اسے ملنے کے لیے Available (دستیاب) ہو جاؤں۔" وہ سخت اور خشک لہجے میں بولے۔

"نہیں۔ ہرگز نہیں انکل! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں" ابراہیم نے زبان پھیر کر اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا ہے کہ اسے میں اپنے مان پر لایا تھا۔" اس نے ایک جذباتی وار کھیلنے کی کوشش کی "میں نے ہی اسے یقین دلایا تھا کہ انکل میری بات کو اون کرتے ہیں کیونکہ مجھے وہ اپنے بیٹے جیسا ہی سمجھتے ہیں۔"

"خیر! ایسی حماقت تو میرے بیٹے نے بھی کبھی نہیں کی، میرے بی ہاف پر کسی کو امید دلانے کی حماقت۔" وہ بے لچک انداز میں بولے۔ "لیکن تمہیں اس بات کا مارجن دیا جا سکتا ہے کہ تم جن پہلوانوں کی اولاد ہو، وہ دماغ کے بجائے معدے سے سوچنے کی جبلت جینز میں پرو کر تمہیں ورثے میں دے گئے ہیں تمہارا ابھی کوئی قصور نہیں۔"

—۲۲—

بائیسویں قسط

"تم نے کبھی سوچا ہے کہ تمہاری ماں ہوتی تو کیسی ہوتی اور تمہارا باپ ہوتا تو کیسا ہوتا؟"
کھاری کے سامنے بیٹھی اس عورت نے پوچھا۔ جسے دیکھتے ہی اسے خیال آیا تھا کہ وہ یقیناً "ان کالے لوگوں کے ملک سے آئی ہوگی' جو کبھی کبھار چوہدری سردار کی دعوتوں میں شامل ہوتے تھے اور جن کو دیکھ کر وہ شکر ادا کیا کرتا تھا کہ وہ ان سے تو کم ہی کالا تھا۔

اس نے یہ سوال سن کر چوہدری صاحب کی طرف دیکھا' جو مسکراتے ہوئے اسے آنکھوں آنکھوں میں اشارہ کر رہے تھے کہ اس کی بات کا جواب دے۔ اس نے نفی میں سرہلاتے ہوئے گویا انکار کیا۔ وہ اس عورت کی بات کا کیا جواب دے' جسے وہ جانتا تک نہیں تھا اور جس کے حلیے کو دیکھ کر اسے دل ہی دل میں ہنسی بھی آرہی تھی۔

"آپ نے اس کے منہ میں موجود زبان پر تالا لگا رکھا ہے غالباً۔" وہ عورت' جس نے کھاری کا مکمل جائزہ لینے کی خاطر آنکھوں پر چشمہ لگا رکھا تھا' چشمہ اتارتے ہوئے بولی۔ شاید اس کا جائزہ مکمل ہو چکا تھا۔

"یہ آپ کا رعب حسن ہے بیگم صاحبہ! جس کے آگے بے چارے کی زبان گنگ ہو گئی ہے' ورنہ یہ تو اچھا خاصا باتونی ہے۔" چوہدری صاحب نے ازراہ تفنن کہا۔

"مذاق اچھا کر لیتے ہیں آپ۔" چوہدری صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے سرہلایا۔ "لیکن یہ کیوں نہیں بول رہا؟" اس نے دوبارہ کھاری کی طرف توجہ کی۔

"اوئے کاکا کھاری! بولے گا نہیں تو بیگم صاحبہ نے یہیں بیٹھے رہنا ہے۔" چوہدری صاحب نے کھاری کی طرف دیکھا۔

"میں کیا بولوں جی' میری تے سمجھ میں ہی نئیں آئی جی اتاں دی بات۔"

کھاری نے اپنے دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے ہاتھ بغلوں میں گھسائے اور گردن تھوڑی اور اندر گھسالی۔ ایسے جیسے کسی وار کے خلاف اپنا دفاع کر رہا ہو۔

"میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ کبھی اپنے ماں باپ کے بارے میں تم نے سوچا ہے کہ وہ کیسے ہوں گے؟"

بیگم صاحبہ اب کے قدرے کرخت لہجے میں بولی اور ایسے بولتے ہوئے اس کا انداز ہو بہو استانی حمیدہ جیسا ہو گیا جو لڑکیوں کے پرائمری اسکول میں پڑھاتی تھی اور جس کو بے در و دیوار اسکول کے میدان میں چوکیوں پر بیٹھی بچیوں کو پڑھاتے اس نے کئی بار دیکھا تھا۔

"میری ماں تے باپ کوئی ہے ہی نئیں جی' ان کے بارے وچ کیا سوچنا۔" چوہدری صاحب کے اکسانے والے اشاروں کی شہ پر وہ بہت سوچنے کے بعد بولا۔

"او ہو! اگر وہ ہوتے تو کیسے ہوتے؟ میں نے یہ پوچھا ہے۔"

"اس بے چارے کو ایسی باتوں کے جواب کہاں آتے ہیں بیگم صاحبہ! میں نے آپ کو بتایا تاں کہ یہ ایک بھولا بھالا سیدھا سادہ لڑکا ہے۔" چوہدری صاحب نے تنگ آ کر کہا۔

"یقیناً" یہ ایسا نہیں ہوتا' اگر آپ اسے ایسا نہ بناتے۔" وہ اپنے غم و غصے کو دباتے ہوئے بولی۔ "اگر آپ نے کوئی نیکی کرنے کا ارادہ کر ہی لیا تھا تو پوری نیکی کرتے' اسے ادھورا کیوں رہنے دیا۔"

"غنیمت سمجھیں بیگم صاحبہ! کہ میں نے اسے نہ پورا کیا نہ ادھورا چھوڑا۔" چوہدری صاحب نے جواب دیا۔ "میں چاہتا تو آج یہ آکسفورڈ یا ہارورڈ میں پڑھنے والے نوجوان کی شکل میں بھی آپ کے سامنے موجود ہو سکتا تھا اور اگر ایسا ہوتا تو آج آپ اس سے سوال نہ کر رہی ہوتیں بلکہ اس کے سامنے جواب دہ ہو کر بیٹھی ہوتیں۔ ہماری نیتوں کی اصلیت یا تو ہم جانتے ہیں یا پھر ہمارا خدا جانتا ہے۔" پھر وہ سر جھکا کر بولے۔

"آپ نے اسے ڈس اون کر دیا تو میرے لیے بھی یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا کہ مجھے اسے کن خطوط پر اٹھانا ہے۔ اپنا لے پالک بناتا تو جو میری حیثیت اور پہچان اس دنیا میں ہے' اس کے حساب سے اس نے لے پالک ہی رہنا تھا۔ بے حیثیتی اور بے شناختی پھر بھی اسی کے حصے میں آنی تھی۔ یہ بتا کر اس کی کہانی شروع کرتا کہ تم فلاں ابن فلاں کے بیٹے ہو تو یہ اپنے غم میں گھلتا عمر گزار دیتا۔ میری محدود عقل میں یہ ہی بہترین شکل آئی جو میں اس کو دے سکتا تھا یا جو مجھے اس کو دینی چاہیے تھی' نہ کُل کا حصہ نہ کُل سے جدا۔"

"واہ چوہدری صاحب واہ۔۔۔ دلائل زبردست پیش کرتے ہیں آپ' آپ کو تو وکیل ہونا چاہیے تھا وہ بھی سپریم کورٹ میں۔" چوہدری صاحب نے فلزا ظہور کو تن فن کرتے تو لتے دیکھ کر کھاری کی طرف دیکھا۔

"میں جی چلتا ہوں فیر۔" کھاری نے چوہدری صاحب کے چہرے پر مزاج کا رنگ دیکھ کر اٹھتے ہوئے کہا' اسے یہ محفل فرار کے لیے غنیمت محسوس ہوا تھا۔

"بیٹھو تم!" استانی حمیدہ کی بہن جیسی خاتون ڈپٹ کر بولی۔ "چوہدری صاحب بتائیں اسے۔" اس نے چوہدری صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کھاری کی طرف اشارہ کیا۔ "بتائیں اسے کہ میں کون ہوں۔ بتائیں اسے کہ آپ نے اس کے ساتھ کیا کیا۔ آپ بتائیں گے اسے اس کی اور اپنی زبان میں یا میں بتاؤں۔" وہ چوہدری صاحب پر بھی رعب جمانے والی کوئی انوکھی ہی عورت تھی۔

"میری سمجھ میں ابھی تک یہ نہیں آرہا کہ گناہ کا تھیلا آپ مجھ غریب کے کندھے پر لٹکانے کی کوشش کیوں کر رہی ہیں۔" چوہدری صاحب نے معصوم سی شکل بنا کر کہا۔

"چلیں ٹھیک ہے' میں اسے سناتی ہوں "اس" کی کہانی۔ اس ٹرائیکا میں سے یہ خود ہی پہچان لے گا گناہ کے تھیلے کو لٹکانے کی کھونٹی کس کے کندھے پر سجی ہے۔" فلزا ظہور نے چیلنجنگ انداز میں چوہدری صاحب کو گھورا اور کھاری کی طرف دیکھا۔

"میں جی چلتا ہوں۔۔۔ ڈیرے پر ماسٹر کمال اڈیکتا ہو گا۔" کھاری ایک دفعہ پھر اٹھا۔ وہ اس عورت کی نظروں کا سامنا نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک عجیب سے خوف نے اسے یکدم آن گھیرا تھا۔

"میں نے کہا نا' بیٹھو تم!" وہ کڑک کر بولی۔ "آج میں تمہیں بتانے آئی ہوں کہ تمہارا باپ کون ہے؟"

کھاری کی ٹانگیں کانپ گئیں۔ اس نے ڈرتے ڈرتے چوہدری صاحب کی طرف دیکھا۔

"باپ ہی کیوں' یہ بھی بتایئے کہ اس کی ماں کون ہے۔" چوہدری صاحب نے خاتون کو لقمہ دیا۔

"بے فکر رہیے۔۔۔ یہ بھی بتاؤں گی۔ نانا' نانی' ماموں' خالہ بھی بتاؤں گی' کون تھے۔"

"اور دادا' دادی' چاچا' پھوپھی؟" چوہدری صاحب نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"ن۔۔۔" اس کے چہرے پر استہزائیہ ہنسی پھیلی۔ "وہ تو شاید خود اس کے باپ کو بھی یاد نہ ہوں کہ کون تھے۔"

☼ ☼ ☼

دنیا اوٹ پٹانگا
تحتے ہتھ تے کتے ٹانگا

گاڑیوں کے ہارن کی پوں پوں' پاں پاں

"میری بات مانو تو تم بھی اس کے اور اپنے تعلق کی نوعیت جاننے کی کوشش کرو۔ آنکھوں سے غصے اور بدگمانی کی عینک اتار کر اسے یاد کرو۔ اس کی باتیں' اس کا عمل' اس کی فیلنگز جو تمہارے ساتھ وابستہ تھیں۔"

"اگر تم وہ لڑکی ہو جو سعد کی کوئن آف ہارٹ ہے تو میرے پاس تمہاری کچھ امانتیں رکھی ہیں۔"

"کچھ امانتیں' کچھ امانتیں۔"

یہ دنیا واری
چکدے سارے نار ناری
توں کاہنوں بنیا بھکاری

ماؤف ہوتے ذہن اور شل ہوتے اعصاب کے ساتھ ایک مرتبہ پھر اس نے ہارن پر ہاتھ رکھتے ہوئے سوچا۔

توں کاہنوں بنیا بھکاری
ایدے چکدے پھے

اس نے زیرِ لب دہرایا۔ ”جس کا پتا میں ساری دنیا میں بھکاریوں کی طرح ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ اس کا احساس اس کے محسوسات تو میری ہی مٹھی میں بند تھے۔۔۔ ہائے میں کیوں سمجھ نہ پائی۔“

اس نے ہارن پر سے ہاتھ اٹھا کر بے بسی کے عالم میں اسٹیئرنگ پر مارتے ہوئے سوچا۔

”اور جب کہیں سمجھی اس وقت تک وہ خود نجانے کہاں غائب ہو گیا۔“ اس نے آنکھوں سے بہتے پانی کو الٹے ہاتھ سے صاف کیا۔

”مگر وہ امانتیں۔۔۔ ہاں وہ امانتیں ایک بار جو ہاتھ آجائیں تو شاید کوئی پتا ملے‘ کوئی سراغ‘ کوئی راستہ۔“

اس نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ اس کی گاڑی کے آگے لگی گاڑیوں کی قطار آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگی تھی۔

اس نے تیزی سے اسٹیئرنگ گھمایا۔ اس کی گاڑی بھی آگے کھسکی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ٹریفک کے اس جمود سے باہر نکل کر کھلی سڑک کے جو طرفہ موڑ پر آنکلی تھی۔ ماہ نور نے گاڑی اپنی منزل کی طرف جانے والے راستے پر ڈالی۔ یہاں سڑک کشادہ اور ٹریفک یک طرفہ تھی۔ گاڑی کی رفتار بڑھنے لگی‘ اسے اپنی منزل تک پہنچنے کی جلدی تھی۔

☼ ☼ ☼

کھاری نے سر اٹھا کر باری باری چوہدری صاحب اور فلزا ظہور کو دیکھا۔ اسے اپنے سامنے کا منظر دھندلا نظر آنے لگا تھا۔ چوہدری صاحب اور فلزا ظہور کے چہرے جیسے دھوئیں کے بادل کے پیچھے چھپ رہے تھے۔

”بندے کو جب تک اپنی حقیقت کا پتا نہیں چلتا‘ وہ سوکھا رہتا ہے‘ جب اپنی حقیقت کا پتا چل جائے تو زندگی کے دیہاڑے (دن) بڑے اوکھے ہو جاتے ہیں۔“

یہ بات صرف ایک دن پہلے اس نے سعدیہ کلثوم سے کہی تھی۔ سعدیہ جو آپا رابعہ سے ان کی اور اپنی کہانی سن کر آئی تھی اور جس کے دل کو یہ غم لگ گیا تھا کہ اگر وہ پہلے اپنی حیثیت سے آگاہ ہوتی تو شاید اس کی زندگی کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

”اور جو مجھے پہلے اپنی حقیقت کا پتا ہوتا تو کیا میری زندگی کا نقشہ بھی کچھ اور ہوتا۔“ اس نے اپنی تیز ہوتی سانسوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔

”تمہاری ماں میری دوست تھی اور تمہارا باپ دوست کا شوہر۔“ فلزا ظہور نے ایک بار پھر اپنی بات بلند آواز میں دہرائی۔ ”تمہاری ماں قتل ہوئی اور تمہارا باپ قتل کے الزام میں ملزم بنا۔ جب تک مجھے علم نہیں تھا کہ تمہارا باپ میری دوست کا شوہر تھا‘ میں تمہارے باپ کو دل میں بسائے اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھتی رہی اور وہ جو میرے فن کا پرستار تھا‘ کبھی معلوم نہیں ہو سکا کہ میرے لیے وہ کیا سوچتا تھا۔ میں تو بس ایک بار۔۔۔ صرف ایک بار اس کے یہ پوچھنے پر کہ میرے ساتھ سفر کر کے میری منزل تک چلنے پر تیار ہو۔۔۔ اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی۔ جوانی کی بے فکری‘ زندگی کی اونچ نیچ سے لاعلمی‘ بس رفاقت کی خواہش کی تکمیل‘ سامنے نظر آتے دیکھنے کا جوش‘ مجھے ایک ایسے راستے کی طرف لے گیا جس نے میری زندگی کے اردگرد پچھتاووں کی باڑھ اگا کر رکھ دی۔ عمر بھر نہ تو اس باڑھ سے الجھ کر اس سے باہر نکلنے کا حوصلہ کر پائی‘ نہ ہی اس کے اندر جینے کا حوصلہ خود میں پیدا کر سکی۔“

فلزا ظہور نے پچھتاوے کے کسی نادیدہ احساس کے ساتھ سر جھٹکا۔ اس نے اپنے سامنے بیٹھے کھاری کے کانپتے ہوئے کمزور سے وجود کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم میری جنت میں آدھی رات گزارنے کی خواہش کا ثمر تھے افتخار احمد! جسے میں نے دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی گزارنے کی مجبوری کے دباؤ کے تحت اپنے ہاتھوں سے گنوایا۔ بقائمی ہوش و حواس‘ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے۔ تمہارا باپ‘ بہت بڑا آدمی ہے افتخار احمد! دولت جس کے گھر کی لونڈی ہے اور جو ایسے دس فارم ہاؤس کھڑے کھڑے خریدنے کی استطاعت رکھتا ہے۔ جس میں اب

تک تم ایک ملازم کی طرح عمر گزارتے رہے ہو۔“

”تڑک۔۔۔ تڑک۔۔۔ تڑک۔“ الفاظ تھے یا زہر میں بجھے نیزے اڑتے ہوئے آکر کھاری کے سینے میں پیوست ہو رہے تھے۔

”میں تو گناہ کے بوجھ تلے دبے آج تک سر اٹھا ہی نہیں سکی۔ لیکن یہ چوہدری صاحب۔“ فلزا ظہور نے طنز بھری نظروں سے چوہدری صاحب کی طرف دیکھا۔ ”انہوں نے تمہارے ساتھ کیا نیکی کی‘ جو تمہیں یہاں سے اٹھایا اور اپنی جاگیر پر کمی کمین کی حیثیت سے پال پوس کر یہ بنا دیا۔“ اس نے کھاری کے سراپے کی طرف ہاتھ سے اوپر سے نیچے تک اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”او جی! چوہدری صاحب کو کچھ نہ کہیں۔“ ٹرانس میں بیٹھا کھاری تڑپ کر بولا۔ ”چوہدری صاحب میرے مائی باپ نیں۔“ اس کی آواز کانپنے لگی۔ ”چوہدری صاحب نہ ہوندے تو آپ جناب صاحب نے تو مینوں کتے بلیاں دے کھاون واسطے ادھر پھینک دیا تھا۔ میں آپ دی اولاد نہیں تھا نا۔ آپ کو تو بھل کے بھی یاد نہ آیا ہو گا۔ کھاری بچ گیا کہ مر گیا۔ تن حوصلہ چوہدری صاحب دا تھا جو کیڑے ورگا بچہ اٹھا کر لے آئے تے اپنے ڈیرے والیاں کو کہا کہ اسے اپنے بچے ورگا پالیں گے۔ اج جو میں ہوں۔“ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”چوہدری صاحب دی وجہ سے ہی ہوں‘ زندہ سلامت‘ کتنے ہی کوڑھوں تے کجیوں توں بچا ہوا‘ میں سگرٹ نہیں پیتا۔ میں جوا نہیں کھیلتا ۔۔۔۔۔۔ چوہدری صاحب نے ہی مجھے سکھایا ہے۔ کھاری پتر نک دی سیدھ چلنا ہے۔ بجے کھبے نہیں دیکھنا۔“

اس نے جتانے والی نظروں سے فلزا ظہور اور فخر سے چوہدری صاحب کو دیکھا۔

”میں سبزیاں تے پھل‘ پھول تروڑنا جانتا ہوں۔ ٹرک لوڈ کرا سکتا ہوں‘ میں جنوروں (جانوروں) کا دودھ دھوندا ہوں۔ تے ان کو پٹھے ڈالتا ہوں۔ چوہدری صاحب نے اس بے آسرا بال کو ہنر سکھایا ہے۔ کم دا بندہ بنایا ہے۔ محتاجی توں بچایا ہے۔ چوہدری صاحب نال کسی کا کیا مقابلہ‘ چوہدری صاحب تے مائی باپ نیں میرے۔“ اس نے حقارت سے فلزا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم۔۔۔“ فلزا نے کہنا چاہا۔

”او چھڈو جی۔“ کھاری نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”چوہدری صاحب ورگا حوصلہ کسی ہور کا ہو نہیں سکدا۔ میرا سگا پیو تو وہی تھا نا‘ جس نے آپ جیسی ڈین (ڈائن) کے حوالے کر دیا مجھے اور پھر پلٹ کر پتا بھی نہ لیا۔ اوئے ایسے سگے پیو کو دور سے ہی سلام۔“ اس نے سیلوٹ کرنے کے انداز میں ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

”جاؤ بی بی صاحب! اپنا کم کرو جا کے‘ مینوں کوئی شوق نہیں سگے ماں پیو دے بارے پچھ پرتیت (پوچھ گچھ) کرنے کی۔ میں افتخار احمد عرف کھاری ہی چنگا۔ میرے دم نال فارم ہاؤس دیاں رونقاں قائم ہیں‘ کیوں چوہدری صاحب؟“ اس نے ابرو چڑھاتے ہوئے چوہدری صاحب سے سوال کیا۔

چوہدری سردار کو قطعی توقع نہیں تھی‘ کھاری فلزا کی طنزیہ گفتگو کے جواب میں ایسی بھرپور تقریر جھاڑے گا۔ انہوں نے نم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ کھاری کے چہرے کا رنگ سرخ پڑ رہا تھا۔ نتھنے پھڑپھڑا رہے تھے اور آنکھوں میں ایک عجیب سا جوش نظر آرہا تھا۔

”اوئے شاباش ہے اوئے میرے پترا۔“ انہوں نے اٹھ کر وفورِ محبت سے کھاری کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ ”آج تو نے حق ادا کر دیا میری نیتوں کا‘ میرے خلوص کا‘ میرے احساس کا۔“ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”دیکھا بیگم صاحب آپ نے۔“ احسان مندی اسے کہتے ہیں‘ محبت کا جواب محبت سے دینا اور خلوص کو خلوص سمجھنا اسے کہتے ہیں۔ آپ کی مادی زندگی میں تو شاید ان چیزوں کی گنجائش نہ ہو مگر ہم سیدھے سادے دیہاتی لوگ اپنے بچوں کی تربیت کو اسی خمیر سے اٹھاتے ہیں۔“

”آئی ایم ایمپریسڈ۔ لیکن افتخار احمد! تم اب بھی نہیں سمجھ پائے کہ کس باپ کی اولاد ہو‘ بلیز (ارب پتی) ہے تمہارا باپ اور تم اس فارم ہاؤس کے ایک ان پڑھ‘ معمولی اور ادنیٰ ملازم کی سی زندگی گزار رہے ہو۔“

"ترک" الفاظ ایک مرتبہ پھر نیزے کی انی کی طرح کھاری کے دل سے جا ٹکرائے اور اس کا دل زہر میں بجھے وار کی زد میں آکر کسی سیال کی طرح بہنے لگا۔

"دور مت جاؤ' بہت سارا مت سوچو۔ اگر تم سعد سلطان سے واقف ہو تو جان لو کہ تم اس کے سگے بھائی ہو۔" فلزا ظہور نے چوہدری صاحب کے چہرے پر پھیلے منت بھرے تاثرات کی پروانہ کرتے ہوئے کہا۔

"سعد سلطان۔" اب کے کھاری نے فلزا کی طرف یوں دیکھا 'جیسے اسے سننے اور سمجھنے میں غلطی لگی ہو۔

"سعد۔ وہ لڑکا جو کچھ عرصہ پہلے ادھر فارم ہاؤس میں مہمان ٹھہرا تھا۔" فلزا نے مزید تفصیل سنائی۔

"سعد۔۔۔ سعد سلطان۔" کھاری کی نظروں کے سامنے وہ چہرہ گھوما۔ بندر کا تماشا دکھانے والا' میلے کا سائیں' مہ نور باجی کا فرزند سعد سلطان جو اس کی شادی میں اسے اور رضوان الحق کو گیت سنا تا تھا۔ سعد سلطان جو آپا رابعہ کو مطلوب تھا۔ سعد سلطان' جس کے باپ کی کہانی سے وہ خوب واقف تھا۔

سائیں' سائیں' سائیں۔۔۔ کھاری کے کان بجنے لگنے اور ارد گرد مہیب سناٹا چھانے لگا۔ اس نے بے یقین نظروں سے چوہدری صاحب کی طرف دیکھا۔ چوہدری صاحب نے فلزا ظہور کے بیان کی تصدیق میں سرہلایا۔

کھاری نے گردن موڑ کر فلزا ظہور کی طرف دیکھا' جو بے تاب نظروں سے اس کے ردعمل کی منتظر بیٹھی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کھاری نے لکڑی کے اسٹول پر بیٹھے اپنے لرزتے وجود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور پھر چشم زدن میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بھین جی۔" اس نے زیر لب کہا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے چوہدری صاحب اور فلزا ظہور نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھا۔

☼ ☼ ☼
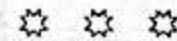
"میں تمہاری کسی بھی بات کی تردید کروں گا نہ تائید' دنیا کے بہت سے رنگ دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہر انسان کو اپنی ترجیحات کے مطابق زندگی گزارنے کا حق ملنا چاہیے اور ایک انسان کو کسی دوسرے انسان کی ترجیحات پر سوال اٹھانے اور بحث کرنے سے باز ہی رہنا چاہیے کیونکہ اس کی آزادی دوسرے انسان کی حدود سے باہر ہی ختم ہو جاتی ہے۔

سو نادیہ بلال! میری پیاری دوست! میں تہہ دل سے تمہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ تمہیں تمہاری منزل مل گئی۔ اس دعا کے ساتھ یہ مبارک باد قبول کرو کہ کاش! یہ منزل ہی تمہاری اصل منزل ثابت ہو' اور تم کچھ عرصے بعد اس کے بارے میں کسی الجھاؤ' کسی تشکیک کا شکار نہ ہو جاؤ۔

میں ایک لاپروا' بے کار' غیر منظم سا انسان ہوں۔ ہو سکتا ہے چیزوں کے بارے میں میرا مشاہدہ بہت سطحی اور اوپری سا ہو' لیکن یقین کرو کہ میں نے تمہاری حالیہ میل کا ایک ایک لفظ دھیان سے پڑھا اور سمجھا ہے۔ مجھے اس کے کسی بھی لفظ پر اعتراض ہے نہ شک۔ ہاں اپنے بارے میں' میں یہ وضاحت ضرور کرنا چاہوں گا کہ اپنے وطن میں رہتے ہوئے جہاں میں تقریباً" سب ہی مذاہب کے معبوز اور جمبوز سے بہت اچھی طرح واقف اور مانوس رہا۔

وہاں مجھے اپنے بارے میں یقین ہے کہ مندروں سے اٹھتی گھنٹی کی آوازوں' اشلوک دہرانے اور بھجن پڑھنے کی موسیقیت بھی کبھی مجھے اپنی طرف نہیں کھینچ سکی تھی' شاید اس لیے کہ میں پیدائشی دہریہ ہوں۔ بچپن ہی سے میرا دل مذہب کے سکھائے صحیح اور غلط اصولوں کی غیر دلچسپ تفصیل سے الجھتا تھا۔ میری ماں مجھے اپنے سامنے بٹھا کر سمجھایا کرتی بھگوان مجھ سے کیا چاہتا تھا' اور میرا کیا کرنا بھگوان کو پسند نہیں تھا۔ گھر کے ایک کونے میں بنائے گئے چھوٹے سے پوجا پاٹ مندر کو جو گھر بھر کے لیے احترام کی جگہ تھی' میں نے ہمیشہ دل کو اکتا دینے والے کونے کی

حیثیت سے دیکھا۔

مندروں میں جا کر گھنٹیاں بجانے' پراتھنا کرنے اور جھوم جھوم کر بھجن پڑھنے سے مجھے ہمیشہ چڑ سی رہی۔ مٹی کی رنگی پتی بے جان مورتیوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھنا اور اپنے من کی آشاؤں کو بیان کرنا' ہمیشہ ہی مجھے ایک انتہائی غیر دلچسپ عمل محسوس ہوا' میری یہ ہی فطرت مجھے مذہب سے دور اور دور' بہت دور لے جاتی گئی' آج جہاں میں ہوں اور جس طرح ایک آزاد فرد کی حیثیت سے زندگی گزار رہا ہوں۔ میرے دل کے اندر ایک عجیب سا سکون موجیں مارتا رہتا ہے کہ میں رسمی' دنیاوی قیود سے آزاد ہوں' میری زندگی میں مذہبی افکار کی کوئی گنجائش نہیں میرے صحیح اور غلط کے پیمانے وہ ہیں جو میں نے اپنے لیے خود وضع کیے ہیں کسی مذہبی طاقت کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں۔ لہٰذا آج بھی نہ تو مندروں سے اٹھتی گھنٹیوں کی آوازیں اور نہ ہی اشلوک و بھجن پڑھے جانے کی صداؤں نے مجھے کبھی مانوسیت کا احساس دیا ہے۔ میرے لیے ان آوازوں اور مسجد' کلیسا' گوردوارے وغیرہ وغیرہ سے سنائی دیتی آوازوں میں کوئی فرق نہیں۔

مجھے ان آوازوں اور مذہبی ثقافتوں سے ایک شدید قسم کی چڑ محسوس ہوتی ہے اور جہاں کبھی یہ آوازیں میرے کان میں پڑنے لگیں میرا دل وہاں سے دور بھاگ جانے کو چاہنے لگتا ہے۔

لیکن اس سب کے باوجود میرا دل تمہارے لیے بہت خوش ہے' تمہارے الفاظ میں موجود جوش اور خوشی کا احساس مجھے خوش کر دیتا ہے۔ کیونکہ ایک دوست کی حیثیت سے تم مجھے بہت عزیز ہو اور میں دوستوں کی خوشی میں خوش ہونے والا انسان ہوں۔"

نادیہ نے چندر شیکھر کی میل تفصیل سے پڑھی اور نظریں لیپ ٹاپ کی اسکرین سے ہٹا کر سامنے جمالیں۔ اس کی نظروں کے سامنے دیوار میں جڑی کھڑکی کے شیشوں پر سے پیچھے ہٹے ہوئے پردے تھے اور شیشوں سے پار باہر فضا میں آسمان سے گرتی برف کے گالے سارے میں اڑتے پھرتے تھے۔ اس کے دل میں ایک عجیب سی اداسی اترنے لگی۔

چندر شیکھر' ایک بے منزل مسافر' ایک بے سمت راہی' اس کا عزیز دوست۔ اسے چندر شیکھر کے لیے اپنے دل میں ایک دکھ محسوس ہو رہا تھا۔

"کاش وہ سمجھ پاتا' کاش وہ اسے سمجھا پاتی۔" اس کے دل میں ہوک سی اٹھنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آئی ایم سوری مس! آپ کی ملاقات بلال صاحب سے نہیں ہو سکتی' آج تو بالکل بھی نہیں۔" بلال سلطان کی پرسنل سیکریٹری نے اپنے خوش رنگ لپ اسٹک سے سجے ہونٹ سکیڑتے ہوئے پیشہ ورانہ انداز میں ماہ نور سے کہا تھا۔

"دیکھیں' میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے' آج ہی کیا ابھی بالکل ابھی' یقین جانیے' یہ ایک کاروباری نوعیت کی ملاقات ہرگز نہیں ہو گی' یہ ذاتی ملاقات ہے اور بہت اہم ہے' پلیز آپ میری بات پر غور کیجیے' پلیز پلیز۔" ماہ نور نے بے قراری سے کہا۔

"باس کے پہلے سے طے شدہ پروگرام میں آج کے دن کسی فالتو ملاقات کے لیے ایک سیکنڈ بھی فارغ نہیں ہے۔ چاہے ملاقاتی کے لیے وہ کتنی ہی اہم ملاقات کیوں نہ ہو۔" سیکریٹری نے اس کی درخواست نظر انداز کرتے ہوئے اپنی نظریں فلیٹ اسکرین مانیٹر پر جمائے ہوئے جواب دیا تھا۔

”ایک سیکنڈ بھی کیسے نہیں۔“ ماہ نور نے کہا ”لنچ بریک تو لیتے ہی ہیں ناوہ۔ اور اس میں وہ فارغ ہی ہوتے ہیں یقیناً“۔

”آج ان کا لنچ بھی ایک فارن ڈیلیگیشن کے ساتھ طے ہے اور ڈنر بھی وہ ملائیشین قونصلیٹ میں کریں گے، آج وہاں کوئی ثقافتی تقریب منعقد ہو رہی ہے۔“ سیکریٹری کا انداز انتہائی بے نیازانہ تھا۔

”افوہ!“ ماہ نور نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ اس وقت اسے اپنا آپ بری طرح بے بس محسوس ہو رہا تھا۔

”دیکھیں! ابھی صرف ایک دن پہلے میری ان سے ملاقات ہوئی تھی، جس میں انہوں نے مجھے پہلے سے دیے ہوئے بارہ سوسیکنڈز سے کہیں زیادہ وقت دیا تھا، آپ کو یاد ہو شاید۔“ اس نے ایک اور حربہ آزماتے ہوئے کہا۔ ”میں ابراہیم کے ساتھ یہاں آئی تھی، ابراہیم جو سعد سلطان کا دوست ہے۔“

”مجھے اچھی طرح یاد ہے مس!“ سیکریٹری نے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے کہا ”لیکن ایک دن پہلے کے شیڈول اور آج کے شیڈول میں بہت فرق ہے۔ ایک دن پہلے انہوں نے خود بارہ سوسیکنڈز آپ کو دیے تھے۔ ان بارہ سوسیکنڈز کو آگے بڑھانا ان کی اپنی مرضی تھی۔ لیکن آج کے شیڈول میں ایک بھی سیکنڈ آپ کے نام نہیں ہے۔“

”آپ ان سے بات تو کر کے دیکھیں، انہیں میرے بارے میں بتائیں تو سہی۔ ہو سکتا ہے وہ آپ سے میرا ذکر سن کر مجھے ملاقات کے لیے بلالیں۔“

”اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں اپنی اس جاب سے فائر کر دی جاؤں تو ٹھیک ہے میں ان کو اطلاع کرنے کی کوشش کر کے دیکھ لیتی ہوں۔“ سیکریٹری نے رکھائی سے کہا۔

”اوہ۔۔۔ نہیں۔“ ماہ نور کو اچانک احساس ہوا کہ وہ اس لڑکی پر ضرورت سے زیادہ دباؤ ڈال رہی تھی۔ اسے شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ وہ استقبالیہ کے پاس رکھے ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے ذہن میں کوئی ایسا راستہ نہیں آرہا تھا، جس کے ذریعے وہ فوری طور پر بلال سلطان تک پہنچ سکے۔ اس نے ایک دوبار ابراہیم کا نمبر ملانے کی کوشش کی لیکن اس کا فون بند جا رہا تھا۔ اس نے بے قرار نظروں سے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ وہ ایک ویل فرنشڈ، ویل ڈیکوریٹڈ ریسپشن روم تھا۔

”کبھی یہاں وہ بھی آتا ہو گا۔ یہیں اس کمرے میں کھڑے ہو کر کسی سے بات کرتا ہو گا۔ مین آفس میں جاتے جاتے لحہ دو لحہ یہاں بھی رکتا ہو گا۔“ اس کی سوچ کی رو بھٹکنے لگی۔ ”وہ۔۔۔ جسے میں نے اس وقت پایا جب وہ یہاں کہیں بھی نہیں ہے۔“ ایک بار پھر وہی ہوک دل میں اٹھنے لگی۔

”مس رائنہ! باس کو انفارم کر دیں، میں واپس پہنچ گیا ہوں، انہوں نے شاید اپنا نمبر سائیلنٹ کیا ہوا ہے۔“ اسی دم ایک دراز قد کسرتی جسم والا شخص کمرے میں داخل ہوا۔

”اوہ مسٹر رازی! باس صبح سے تین بار آپ کے بارے میں پوچھ چکے ہیں۔“ سیکریٹری نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہوئے انٹر کام کا نمبر دبایا۔

”وہ کہہ رہے ہیں کہ ٹھیک پچیس منٹ بعد آپ کو اندر بھجوا دوں۔“ انٹر کام پر بات کرنے کے بعد اس نے آنے والے شخص سے کہا۔

”آہ۔۔۔ ہا!“ وہ ماہ نور کے سامنے والے صوفے پر اپنی ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے آرام دہ پوزیشن میں بیٹھ گیا۔

”لگتا ہے خاصا لمبا سفر کر کے آئے ہیں رازی صاحب۔“ سیکریٹری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کوئی ایسا ویسا لمبا سفر آپ کو باس کا تو پتا ہی ہے نا۔“ اس نے دائیں بائیں دیکھنے کے بعد سرگوشی کے انداز میں کہا سیکریٹری نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا ”مشن امپاسیبل پر بھیجتے ہوئے باس کوئی ساتھی بھی ساتھ نہیں بھیجتا اور کچھ نہیں انسان بات چیت ہی کر لیتا ہے۔ میرا تو منہ بھی خاموش رہ رہ کر تھک چکا ہے۔“

”اوہ یہ تو بہت برا ہوا۔۔۔!“ سیکریٹری مسکرا کر بولی اور پرنٹر سے صفحے نکالنے میں مصروف ہو گئی۔

”نندپور سے آگے بیس کلو میٹر کے فاصلے پر وہ گاؤں تھا جہاں سے میں ہو کر آیا ہوں۔ افوہ!“ اس شخص نے خود کلامی کے سے انداز میں کہتے ہوئے سر ہلایا ”ایک بور تجربہ تھا یہ“ اس نے سیکریٹری سے کہا، جو اپنے کام میں مگن شاید اس کی بات سن بھی نہیں رہی تھی لیکن سامنے صوفے پر بیٹھی ماہ نور کے کان کھڑے ہو چکے تھے۔

”آپ ہگن والا تک ہو کر آئے ہیں یا اس سے بھی آگے کہیں۔“ اس نے ہوا میں تیر چلانے کے سے انداز میں کہا۔

”ب، ہگن والا“ وہ شخص سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑانے کے بعد ماہ نور کی طرف دیکھنے لگا۔ ”کیا میں نے یہ نام لیا، کیا یہ نام میرے منہ سے نکلا ہے؟“ اس نے ماہ نور سے پوچھا۔

”ہرگز نہیں۔“ ماہ نور کو لگا ”تیر نشانے پر جا بیٹھا تھا“ ”یہ تو میرا اپنا قیاس تھا۔“

”کیا آپ نے وہ علاقہ دیکھ رکھا ہے؟“ وہ شخص متجسس ہوا۔

”نہ صرف دیکھ رکھا ہے بلکہ میں وہیں سے تعلق رکھتی ہوں۔“ ماہ نور نے اسے ایک اور دھچکا پہنچاتے ہوئے کہا۔

”کیا واقعی؟“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ماہ نور والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”آپ وہاں کب گئی تھیں آخری مرتبہ؟“ اس نے پوچھا۔

”ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی گئی تھی، سعد سلطان کے ساتھ۔“ ایک اور تیر چلا۔

”سعد سلطان کے ساتھ۔“ وہ شخص اپنی جگہ سے دو انچ آگے کھسکا۔

”جی ہاں، وہاں میرے چچا سردار کے منہ بولے بیٹے کی شادی کی تقریب تھی، سعد سلطان بھی انوائیٹڈ تھا۔“

”اوہ مائی گاڈ! آپ چوہدری سردار کو بھی جانتی ہیں۔“ اب کے وہ شخص واقعی بوکھلا گیا۔

”کیوں نہیں جانوں گی وہ میرے والد کے سگے بھائی ہیں۔“ ماہ نور نے بے نیازی دکھائی۔

”پھر تو آپ رابعہ کلثوم اور مولوی سراج سرفراز کو بھی جانتی ہوں گی۔“ اس شخص نے چاروں طرف دیکھنے کے بعد پوچھا۔

”بالکل جانتی ہوں۔“ ماہ نور نے کہا اور سوالیہ انداز میں اس شخص کی طرف دیکھنے لگی۔

”آپ وہاں کیا کرنے گئے تھے اور آپ ان سب لوگوں کو کیسے جانتے ہیں؟“

”مجھے باس نے وہاں بھیجا تھا، ان سب لوگوں کی خبر لانے۔“ اس شخص نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

”اوہ۔۔۔ تو یہ بات ہے!“ ماہ نور نے بے اختیار کہا۔ ”پھر لے آئے آپ خبر؟“

”وہی تو لے کر آرہا ہوں۔“ اس شخص نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”وہاں یہ سب لوگ موجود ہیں۔“

”پھر؟“ ماہ نور نے ابرو چڑھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”پھر تو پتا نہیں، یہ تو باس کو ہی پتا ہو گا کہ پھر کیا ہو گا۔“ اس شخص نے کہا۔

”اگر آپ مجھے ایک فیور دیں اور مجھے بلال سلطان سے ملوا دیں تو میں آپ کو ہگن والا اور وہاں کے مکینوں کے بارے میں کافی معلومات دے سکتی ہوں۔“ ماہ نور نے ترپ کا پتا پھینکنے کی کوشش کی۔

”آپ باس سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟“ اس نے مشکوک ہوتے ہوئے پوچھا۔

”سعد سلطان کے سلسلے میں ملنا ہے مجھے ان سے۔“ ماہ نور نے کہا۔

”سس، سعد سلطان!“ وہ بلا ارادہ بلند آواز میں بولا اور پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے اپنی آواز نیچی کی ”وہ تو غائب ہے کافی دنوں سے۔“

”میں جانتی ہوں۔“ ماہ نور نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ ”لیکن پھر بھی مجھے اسی کے سلسلے میں ملنا ہے۔“

”ہوں،“ اس نے اپنی ٹانگ پر دائیں ہاتھ کی انگلیاں بجاتے ہوئے سوچا ”ٹھیک ہے“ پھر وہ ماہ نور کی طرف دیکھتے

ہوئے بولا "میں کوشش کرتا ہوں کہ باس سے تمہاری ملاقات ہو جائے، لیکن پہلے تم مجھے وہ معلومات تو دو جو تمہارے پاس ہیں۔"

"ہاں وہ......" ماہ نور سیدھی ہو کر بیٹھی۔ بلال سلطان سے ملاقات کی امید پیدا ہونے نے اس کے اندر نئی توانائی سی بھر دی تھی۔

☆ ☆ ☆
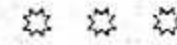
آپا رابعہ نے دو دن سے پانی میں بھگوئی مٹی کو دونوں ہاتھوں سے گوندھا اور پھر اس گندھی ہوئی مٹی کا ایک ٹکڑا لے کر اسے سورج کی روشنی میں دیکھا۔ مٹی میں ہوا کے بلبلے باقی رہ جانے سے ان کا بنایا چولہا خراب ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

"اس کو مزید گوندھنے کی ضرورت ہے۔" انہوں نے مٹی کا وہ ٹکڑا دوبارہ گندھی مٹی میں ملاتے ہوئے سوچا اور ان کے دونوں ہاتھ دوبارہ مٹی گوندھنے میں مصروف ہوئے۔ اسی دم گھر کا بیرونی دروازہ ایک اونچی آواز کے ساتھ کھلا اور اس کے دونوں پٹ اپنی اپنی طرف کی دیوار سے جا لگے۔

"الٰہی خیر!" آپا رابعہ نے گھبرا کر ڈیوڑھی کی طرف دیکھا "یہ کون آ گیا۔" ان کا خیال تھا کہ آنے والا ہمسایوں کا کوئی بچہ ہو گا جس کی پتنگ یا گیند ان کی چھت پر آ گری ہو گی مگر ان کی توقع کے خلاف آنے والا کھاری تھا جو اس سے پہلے جب بھی آیا، بڑے سلیقے اور قرینے سے گھر میں داخل ہوا تھا۔ وہ اپنا کام چھوڑ کر مٹی میں سنے ہاتھ لیے اٹھ کر ڈیوڑھی کی طرف آئیں۔ کھاری ڈیوڑھی کے درمیان میں کھڑا تھا اور اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

"خیر تو ہے؟" آپا رابعہ نے گھبرا کر پوچھا۔ کھاری کے پیچھے گھر کا داخلی دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کیا اور پھر پیچھے مڑ کر کھاری کی طرف دیکھا۔

"خیر کوئی نہیں بھین جی! خیر کوئی نہیں۔" اس نے پھولے سانس کو قابو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سر ہلایا۔

"افوہ، ہوا کیا؟" آپا رابعہ نے مزید گھبراتے ہوئے کہا۔ "سعدیہ تو ٹھیک ہے نا!" ان کے ذہن میں فوری طور پر سعدیہ ہی کا خیال آیا۔

"سعدیہ نوں تے ستے ہی خیراں ہیں بھین جی! مسئلہ تو سارا افتخار احمد عرف کھاری کے ساتھ ہو گیا ہے۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"ہوا کیا ہے، آرام سے بیٹھو اور بتاؤ مجھے، ہوا کیا ہے۔" آپا رابعہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ڈیوڑھی کی سیڑھیوں کے نیچے بچھی چارپائی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"چور پھڑیا گیا (چور پکڑا گیا) بھین جی۔" کھاری نے ان کی طرف دیکھا۔

"کون سا چور، کہاں چوری ہوئی۔" آپا رابعہ نے حیرت سے کہا۔

"دل کا چور۔" کھاری نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "میرا باپ۔"

"اے ہے! کیا اول فول بک رہے ہو، کہیں بخار تو نہیں چڑھ گیا تمہارے دماغ کو؟" آپا رابعہ نے کھاری کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

"او نہیں بھین جی!" اس نے زور سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو کوئی رپٹ کرائی نہ تھانے گیا پر میرا چور آپوں آپ ہی پھڑیا۔"

"کون ہے تمہارا چور، کس کی بات کر رہے ہو؟"

"اس دا نام بلال سلطان ہے بھین جی اور وہ سعد سلطان دا باپ ہے، آپ کو پتا ہے بھین جی! میرا باپ بھی وہی ہے۔ وہی ہے جس نے مینوں چوہے، کتے بلیاں دا کھاجا بننے کے لیے پھکوا دیا تھا۔" کھاری نے آپا رابعہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی کے ڈورے تیر رہے تھے۔

"کیا کہہ رہے ہو تم کھاری؟" آپا رابعہ کو لگا ان کا اپنی سماعت پر سے یقین اٹھنے لگا تھا۔

"میں صحیح کہہ رہا ہوں بھین جی! بے شک چوہدری صاحب سے جا کر پوچھ لیں۔" کھاری نے انہیں یقین دلانے کے انداز میں سر ہلایا۔

"میں نہیں مانتی۔" آپا رابعہ نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔ "بلال سلطان تمہارا باپ کیسے ہو سکتا ہے، وہ اتنا سفاک اور ظالم کیسے ہو سکتا ہے کہ اپنی اولاد کو آوارہ جانوروں کا لقمہ بننے کے لیے یوں چھوڑ جائے۔"

"آپ نوں بھلیکا ہے بھین جی (آپ کو غلط فہمی ہے)۔" کھاری نے ہاتھ ہلایا۔ "اس نے اس پچھل پیری کو کہا تھا کہ مینوں بسوں دے اڈے پر پھینک جائے۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے غالباً "فارم ہاؤس کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"مجھے لگتا ہے کھاری تمہارے دماغ کو بخار چڑھ گیا ہے، تمہیں سرسام ہو گیا ہے شاید۔" آپا رابعہ نے اب کے اسے ڈپٹتے ہوئے کہا۔

"آپ چلو۔" کھاری نے ان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "چلو میرے ساتھ فارم ہاؤس پر، ساری کہانی، ساری حقیقت وہیں کھل جائے گی جا کر، آپ چل کر اس پچھل پیری نوں ملو تے سہی، وہ آپ نوں خود ہی بتائے گی کہ کیا ہوا تھا کیا نہیں ہوا تھا۔" وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں کھینچنے لگا تھا۔

"اچھا دم تو لو۔" آپا رابعہ نے صورت حال کو سمجھنے کے لیے اس کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"نہیں، ہن تسی میرے ساتھ چلو گے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "چھیتی نال برقعہ پہن لو اور میرے ساتھ چلو۔

چل پڑو بھین جی، اللہ دا واسطہ جے چل پڑو۔" آپا رابعہ کو جز بز ہوتے دیکھ کر وہ منتوں پر اتر آیا "او کہندے نیں میں سعد صاب دے ابے کا بیٹا ہوں، تسی میرے نال چلتے نہیں، دسو میں کی کراں۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"اچھا صبر کرو، میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔" آپا رابعہ کو کھاری کی باتوں سے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ

کیا کہہ رہا تھا' اس کی تسلی کی خاطر وہ اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"میرا دل کہتا تھا' تم دلہن بن کر بہت پیاری لگو گی۔"

"تمہارا دل میرے دولہا کے بارے میں کچھ نہیں کہتا تھا کیا؟"

"ہاہا۔۔۔ اس کے بارے میں دل نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔"

"ہاں' جب ہی تو جھونک دیا مجھے' جدھر کو آگ کے شعلے لپکے۔"

"افوہ! اتنا دکھ ہو رہا ہے تمہیں؟"

"تو اور کیا' بس بھیانک شکل اور سرمہ لگی آنکھوں کا تصور کر کے ہی کانپ کانپ جاتی ہوں' سر پر چار خانے کا رومال باندھے اپنی طرف سے سنگھار کر کے آیا تھا نکاح پڑھوانے کم۔۔۔۔"

"ہاں ہاں' کہہ دو کم بخت اس بے چارے کو' رک کیوں گئیں کہتے کہتے۔"

"پرانی عادت کے تحت زبان پھسل جاتی ہے' کیا کروں' بہتیرا خود کو سنبھالتی ہوں مگر سنبھالا نہیں جاتا۔"

"یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ وہ کم بخت نہیں بلند بخت ہے' جس کا نکاح تمہارے ساتھ ہوا۔ تمہارا شوہر بن جانا بلند بختی کی دلیل ہے۔"

"ارے جاؤ' جاؤ۔۔۔ میرا دل نہ بہلاؤ' میں سب جانتی ہوں' کتنا بلند بخت ہوا وہ مجھ سے نکاح کر کے' بات تک کرنی نہیں آتی' ہابڑیوں (ندیدوں) کی طرح کھانا کھاتا ہے' لگتا ہے نسلوں کا بھوکا ٹوٹا ہے' کھائے جاتا ہے کھائے جاتا ہے نہ نیت بھرتی ہے اس کی نہ پیٹ۔"

"بس کرو بس' نیک عورتوں کو زیب نہیں دیتا شوہروں کی برائیاں کرنا' بہت ہو چکی اب اس کی برائی' توبہ کرو اور آئندہ اس کی عزت کرنا سیکھو' ورنہ اللہ ناراض ہو جائے گا تم سے۔"

"بس ایک یہ ہی دھمکی دے کر ڈرایا کرو مجھے' اللہ ناراض ہو جائے گا۔ جانتی ہو نا اس دھمکی کا اثر ہو کر رہے گا مجھ پر۔"

"اچھا اچھا' بس کرو اب اپنے شوہر نامدار کی باتیں اور مجھے اس بوتل سے کانجی کا گلاس بھر دو' جو بہن سکینہ نے بھجوائی ہے' عجیب سی پیاس لگ رہی ہے مجھے۔"

"بہن سکینہ کے گھر سے آئی چیز کھانے سے کتنی بار منع کیا ہے تمہیں' طیفے لاڑکی ایجنٹ ہے وہ' جانتی بھی ہو اچھی طرح۔"

"کیا کیا شک اٹھتے ہیں تمہارے اندر' پھر کسی سے کوئی نہ کوئی تعلق تو ہو گا طیفے لاڑ کا محلے میں' اب کیا ہم ہر کسی سے تعلق توڑ لیں۔ چلو جا کر میرے لیے ایک گلاس بھر لاؤ۔"

"لو یہ لو۔۔۔ آیت الکرسی پڑھ کر پینا بہن!"

"تمہارے وہم' تمہارے شک' ارے دیکھو ذرا اسعد کو اٹھاؤ' یہ لڑکا جب سے گھٹنوں کے بل چلنے لگا ہے' ہر چیز پکڑ کر خود پر کھینچ لیتا ہے' لگتا ہے پھر خود پر کچھ گرا لیا اس نے۔"

"ہاں' میں دیکھ کر آتی ہوں۔"

"ارے ارے ارے میرا منا گر گیا تھا' آؤ میری جان میں تمہیں گود میں اٹھا لوں۔ نہ نہ رونا نہیں چلو تمہاری اماں کے پاس چلتے ہیں۔"

"ارے ارے یہ کیا ہوا' ہیں' ہیں۔ تمہارے ہاتھ سے گلاس کیسے چھوٹ گیا اور تم گر کیسے گئیں! ہائے میرے اللہ' یہ تو اوندھے منہ گری ہوئی ہے۔ ہائے کسے بلاؤں اس کے تو منہ سے خون چھوٹ رہا ہے۔ ہائے کوئی ہے۔ اسے پکڑو کوئی اسے اٹھاؤ۔۔۔ کدھر گئے ہو سراج سرفراز۔۔۔ دیکھو تو میری بہن کو کیا ہو گیا۔ ارے صرف پانچ منٹ

تو لگے تھے مجھے دوسرے کمرے سے جا کر بچہ اٹھانے میں۔ اتنی سی دیر میں یہ کیا ہو گیا میرے اللہ۔"

بچے کے رونے کی آوازیں' کسی کے سراسیمگی میں دوڑنے بھاگنے کی آوازیں۔

"میں نے کہا تھا کہ آج کوئی میٹنگ نہیں ہو گی پھر یہ لڑکی میرے آفس میں کیسے آ گئی؟" بلال سلطان نے چلاتے ہوئے رائنہ کی طرف دیکھا جس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ رازی کے ساتھ وہ لڑکی بھی آفس میں چلی آئی تھی جسے وہ کب سے ٹکا سا جواب دے کر واپس چلے جانے کی تلقین کر رہی تھی۔

"سر! مجھے معلوم نہیں' یہ کیسے اندر چلی آئیں۔" رائنہ بیچاری کے پاس اپنے دفاع کے لیے الفاظ کم پڑنے لگے تھے۔

"تمہیں علم نہیں تھا۔۔۔ اگر تمہیں علم نہیں تھا تو پھر سنجیدگی سے سوچنا پڑے گا۔ تمہاری سیٹ پر کسی ایسے شخص کو بٹھاؤں جو ایسا لاعلم اور بے خبر نہ ہو کہ اس کے سامنے سے گزر کر کوئی بھی ایکس وائی زیڈ میرے آفس میں گھس آئے اور اسے خبر ہی نہ ہو۔" وہ پہلے سے بھی زیادہ اونچی آواز میں چلائے تھے۔

"باس' میری بات۔" رازی نے آگے بڑھ کر کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"شٹ اپ رازی! میں نے تمہیں کچھ کہنے کے لیے کلیو دے دیا کیا کہ تم بولنے لگے۔" وہ الٹا رازی پر بھی برس پڑے۔

"آئی ایم ایکسٹریملی سوری سر! میں تو کب سے اس لڑکی کو بتا رہی تھی کہ آپ کا شیڈول کتنا ٹائٹ ہے' ملاقات کا کوئی چانس نہیں لیکن کچھ لوگ ہوتے ہی بڑے ڈھیٹ ہیں۔" رائنہ نے حقارت سے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

ماہ نور نے غصے سے چکراتے سر کو قابو کرنے کی کوشش میں آنکھیں بند کر لیں۔ اسے لگا اس کا فشار خون بڑھ رہا تھا اور بڑھتے بڑھتے اتنا اونچا ہونے لگا تھا کہ اس کے دماغ کی نسیں پھٹ جانے کے قریب تھیں۔ اتنی بے عزتی اور ایسی حقارت بھری نظریں عمر بھر کبھی کسی کو اس پر ڈالنے کی جرات نہیں ہوئی تھی۔

"آپ ہیں کیا چیز؟" وہ بلال سلطان کے سامنے جا کر چلا کر بولی۔

"خود کو سمجھتے کیا ہیں آپ' فرعون ہیں یا نمرود ہیں آپ۔ سب پر یوں چلا رہے ہیں جیسے ان کی سانسوں کی ڈور بھی آپ کے ہاتھ میں تھمی ہے۔"

بلال سلطان نے دم بخود ہوتے ہوئے اس لڑکی کی طرف دیکھا جو ان کے ذاتی ملازموں کی موجودگی میں ان پر چلا رہی تھی۔

"ہاں میں زبردستی گھسی ہوں آپ کے آفس میں' آپ کا آفس نہ ہوا تو گوارا ہو گیا۔ جس میں کسی کا داخل ہونا ایسے ہی ہے جیسے خود کو گولی کی زد پر رکھ کر گھس رہے ہوں۔۔۔ میں نے سنا ہی تھا' آج دیکھ بھی لیا۔ خود کو اتنا ناقابل رسائی بنا کر بہ زعم خود آپ اپنا دفاع کر رہے ہیں لیکن آپ کے نامہ اعمال سے وہ سیاہ کرتوت دھل تو پھر بھی نہیں جائیں گے جو اس میں انمٹ سیاہی سے لکھے جا چکے۔"

"رازی۔۔۔ کک ہر آؤٹ (اسے باہر نکال دو)" بلال سلطان نے سرخ پڑتی آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"I say kick her out at once"

"آپ مجھے کک آؤٹ نہیں کر سکتے بلال صاحب۔" ماہ نور نے اپنی طرف پیش قدمی کرتے رازی پر ایک سخت نظر ڈالتے ہوئے کہا "آپ چاہیں بھی تو ایسا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ میں وہ لڑکی ہوں جسے آپ کے بیٹے نے اپنے دل کی ملکہ بنایا اور جسے اپنے دل سے نکالنے کا وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

بلال سلطان ایک بار پھر دم بخود ہو چکے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عنیزہ سیّد

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم

"میرا خیال ہے میں تمہیں بتاچکا ہوں کہ ہم اب اس کے پیچھے جارہے ہیں نہ ہی اس کی کوئی بات کررہے ہیں۔" بلال سلطان کا لہجہ اور بات ابراہیم کے لیے حوصلہ افزا ہرگز نہیں تھی۔

"لیکن انکل! میں نے بتایا نا کہ یہ لڑکی تو ویسے ہی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" اس نے منمنا کر ایک کوشش مزید کرنا چاہی۔

"تمہارا کیا خیال ہے، میں بہت فارغ ہوں جو جب کوئی مجھ سے ملنا چاہے میں اسے ملنے کے لیے Available (دستیاب) ہوجاؤں۔" وہ سخت اور خشک لہجے میں بولے۔

"نہیں۔ ہرگز نہیں انکل! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں۔" ابراہیم نے زبان پھیر کر اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا ہے کہ اسے میں اپنے مان پر لایا تھا۔" اس نے ایک جذباتی وار کھیلنے کی کوشش کی "میں نے ہی اسے یقین دلایا تھا کہ انکل میری بات کو اون کرتے ہیں کیونکہ مجھے وہ اپنے بیٹے جیسا ہی سمجھتے ہیں۔"

—۲۳—
تیئسویں قسط

کمرے میں خاموشی چھا چکی تھی۔ اتنی خاموشی کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنی جا سکتی تھی۔ بلال سلطان ان کی ریسپشنسٹ رائنہ ' رازی 'تینوں دم بخود نظر آرہے تھے۔ رائنہ اور رازی اس لیے دم بخود تھے کہ باس کے سامنے انہوں نے کبھی کسی کو یوں بلند آواز میں بڑھ بڑھ کر بولتے نہیں سنا تھا۔

دونوں اپنے باس کے مزاج سے بخوبی واقف تھے اور وہ چھٹانک بھر کی لڑکی جس انداز میں باس کو ڈپٹ رہی تھی۔ وہ ان دونوں کو نیم بے ہوش کر دینے کے لیے کافی تھا۔

"رائنہ! رازی!" پھر اس خاموشی میں باس کی آواز ابھری۔

"Both of you leave the office (تم دونوں دفتر سے باہر جا سکتے ہو)

مقام حیرت تھا' باس اس لڑکی کو گٹ آؤٹ کرنے کا حکم سناتے سناتے رائنہ اور رازی کو آفس سے باہر چلے جانے کا حکم دے رہا تھا۔ دونوں نے ایک نظر ایک دوسرے کو دیکھا اور خاموشی سے واپس جانے کے لیے مڑے۔

"اینڈ مائنڈ یو!" پیچھے سے باس کی آواز آئی۔ "نو گوسپ' نو سائیڈ۔" دوسرا حکم جاری ہوا "رازی! تم گھر جاؤ فوراً" اور صوفی کے ساتھ بیٹھ کر آج کا ڈنر پلان کرو' ایک اسپیشل اور پر لطف ڈنر۔"

"لیکن سر' آج کا ڈنر ملاتشین تو نعیلیٹ۔" رائنہ نے کہنا چاہا۔

"کیا میں نے تمہیں کچھ بولنے کے لیے کہا؟" بلال سلطان نے تحکمانہ انداز میں سوال کیا۔

"سوری سر! آئی ایم سوری!" رائنہ گڑبڑا گئی اور اس گھبراہٹ میں بھی ایک زہر خند نظر ماہ نور پر ڈالتی آفس سے باہر نکل گئی۔

"ڈنر کو ایکس کلیوز (exclusive) اور scramprous ہونا چاہیے رازی؟" باہر نکلتے رازی کے کان تک ایک اور ہدایت آئی۔

"کتنے مہمانوں کے لیے سر؟" رازی نے رک کر پیچھے دیکھے بغیر پوچھا۔

"ایک۔" باس کی آواز آئی "صرف ایک۔"

☼ ☼ ☼

"مجھے تمہاری کہانی سن کر حیرت نہیں ہوئی۔" دودن زادے نے اپنی جیکٹ کی جیبوں سے ہاتھ نکال کر انہیں اپنے منہ کے آگے رکھ کر اپنی گرم سانسوں سے گرما کر آپس میں رگڑا "مجھے یقین تھا کہ تمہارے پیچھے کوئی ایسی کہانی ہے جو غیر معمولی اور انوکھی ہے۔"

"اکیلے میرے پیچھے ہی نہیں ہر انسان کے پیچھے ایک غیر معمولی اور انوکھی کہانی ہوتی ہے۔" سعد نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے اپنی کہانی کو غیر معمولی قرار دیا جانا اسے پسند نہ آیا ہو۔

"تمہارا یہ خیال غلط ہے۔" دودن زادے نے سر ہلایا "بہت کم لوگوں کے پیچھے غیر معمولی اور انوکھی کہانیاں ہوا کرتی ہیں' دنیا بھر میں شاید ایسے صرف پچیس فی صد لوگ ہوتے ہیں۔"

"اور باقی پچھتر فی صد کیسے لوگ ہوتے ہیں؟" سعد نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ سامنے تیز سورج اس کی نظروں کے سامنے چمک رہا تھا اور اس کے چاروں طرف برف کی ایک دبیز تہہ جمی ہوئی تھی۔ وہ اس سکی انگ رنگ کے بلند ترین مقام پر پہنچ چکے تھے اور کچھ دیر ستانے کو کھڑے تھے۔

"وہ میرے جیسے ہوتے ہیں' جن کے پیچھے کوئی لمبی' چوڑی کہانی نہیں ہوتی اور جو آنکھیں بند کیے کنوؤں کے مینڈکوں کی سی زندگیاں گزارے چلے جاتے ہیں اور ایک دن موت کے منہ میں پہنچ جاتے ہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے' دنیا کے پچھتر فی صد لوگ ایرانی النسل امریکی ہوتے ہیں اور دنیا بھر کی خواتین سے مایوس ہو کر سال بھر بعد کہیں نہ کہیں سکی انگ کرنے پہنچ جاتے ہیں۔" سعد نے کہا' اس کے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔

"ابھی کچھ دیر پہلے تم کیسے غمگین ہو رہے تھے اپنے والد کی مہم جوئی سے بھرپور زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے' اپنی

والدہ کے قتل کا ذکر کرتے ہوئے' اس چارکول آرٹسٹ کے دکھ کا اندازہ کرتے ہوئے جسے تمہارے والد نے دھوکا دیا اور جو تمہارے والد کی سفاکی کی وجہ سے اپنا بچہ بس اسٹینڈ پر چھوڑ آئی' تمہیں اس بچے کے بارے میں سوچ کر بھی کتنا دکھ ہو رہا تھا کہ نجانے وہ زندہ بھی ہو گا یا نہیں' تمہیں کتنا دکھ ہو رہا تھا یہ بات بتاتے ہوئے کہ تمہاری زندگی کے کتنے کردار تمہارے باپ کی خود غرضی کی بھینٹ چڑھ گئے اور سب سے بڑھ کر تم اس لڑکی کو یاد کر کے کتنے دکھی ہو رہے تھے جس سے تم محبت کرتے ہو اور جس سے بوجوہ تم اظہار محبت نہ کر سکے۔" دودن زادے نے سعد کی شرارت بھری مسکراہٹ کو دیکھ کر کہا۔

"اور اب تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔ تمہاری اپنے مخاطب کو مات دینے والی رگ پھڑکنے لگی ہے۔ سچ ہے سعد سلطان؟" دودن نے توصیفی نظروں سے سعد کو دیکھا "تم میری زندگی کا سب سے دلچسپ تجربہ ہو۔"

"میں ایک جان دار انسان ہوں دودن زادے! بے جان تجربہ نہیں۔" سعد نے اپنی سکی اسٹکس تھامتے ہوئے کہا۔

"انسان بھی کسی تجربے سے کم نہیں ہوتے۔" دودن زادے نے اپنے الفاظ کا دفاع کیا "میں ہر نئے انسان سے ملاقات کو ایک نیا تجربہ ہی گردانتا ہوں۔"

"چلو' پھر اگلے ہدف تک پہنچنے کے لیے سکی (Ski) کرتے ہیں۔" سعد نے قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

"آگے دھوپ اور بھی تیز ہے' اس کی شعاعوں کا براہ راست سفید برف سے ٹکراؤ بصارت کو دھوکا دے سکتا ہے' میرا خیال ہے۔ آگے جانے کے لیے ہمیں بادلوں سے ڈھکے آسمان والے دن تک کا انتظار کر لینا چاہیے۔" دودن زادے نے نرمی سے کہا۔

"انتظار! دنیا کی سب سے بری کیفیت ہے' میں اب اس سے گزرنے کا قائل نہیں رہا۔" سعد نے اپنے سر پر جمے ہیلمٹ کا زاویہ درست کرتے ہوئے کہا۔

"سعد! میرا مشورہ ہے کہ میری بات مان لو۔" دودن نے قریب سے گزرتے اسکیٹ بورڈ سرفرز کی ایک ٹولی کو دیکھتے ہوئے کہا "تمہیں ابھی اندازہ نہیں کہ یہ شعاعیں نظر کو کیسے دھوکا دیتی ہیں۔"

"تم نے دیکھا نہیں' یہ سب لوگ آگے جا رہے ہیں۔" سعد نے سکی اسٹک سے آگے جانے والوں کی ٹولی کی طرف اشارہ کیا "اور وہ پیشہ ور اسکیٹ بورڈز ہیں۔"

"مگر تم پیشہ ور سکیٹر نہیں ہو سعد۔" دودن زادے نے متانت سے کہا "چلو ابھی نیچے جانے والی لفٹ تیار ہے' واپس چلتے ہیں۔"

سعد' دودن زادے کی بات سنتے ہوئے متذبذب نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کانچ کے دو گھونٹ پینے کی چور ہوئی تھی میری بہن' پل کی پل میں یہ حال ہو گیا جو نظر آرہا ہے۔"

"ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ نہایت اثر انگیز زہر ایسا جو سیکنڈوں میں خون میں شامل ہو کر جسم بھر میں دوڑنے لگے' پلایا گیا ہے۔"

"ہائے سکینہ! تیرا بیڑا تر جائے' میں تو پہلے ہی خوف زدہ تھی' بہتیرا منع کیا تھا نہ پیو وہ اللہ ماری کانجی' سکینہ طیفے لاری اڈے کی ایجنٹ ہے۔ یوں ہی نہیں پکڑا گئی بوتل بھر کانجی' مگر مجھے ہی جھڑکنے لگی۔ ہر کسی پر شک کرتی ہو' لوگ شک نہ کرنے کا صلہ۔ ہائے میرے مولا' سارا جسم آبلوں سے بھر گیا' حلق تک میں آبلے ابھر آئے' آواز نکلتی ہے نہ بات ہوتی ہے' کیسی بے بسی کی تصویر بنی پڑی ہے میری بہن' ہائے وے طیفیا تیرا ککھ نہ رہے کم بختا' ظالما' چھری سے گلا کاٹنے آیا تھا۔ وہ نہیں کٹا تو زہر دے کے مارنے کو آگیا ہائے خانہ خرابا' تجھے اگلی گھڑی سے پہلے موت آجائے۔"

"آواز آہستہ رکھو رابعہ بی بی! یہ ہسپتال ہے۔ تمہارا محلہ نہیں' مریض ڈسٹرب ہوتے ہیں' مت بین کرو اس

طرح۔"

"ارے تم کیسے دولہا ہو اس کے 'جو یوں سکون سے کھڑے اس کا چہرہ ایک ٹک دیکھے چلے جا رہے ہو' ہائے میری بہن کا شہزادیوں جیسا حسین چہرہ' پریوں جیسا معصوم حسن' ہاتھ لگانے سے میلا ہو جانے والا گورا رنگ' ہائے میں مر کیوں نہ گئی اس کا یہ جلا' مٹا' آبلوں سے بھرا چہرہ دیکھنے سے پہلے' ارے دیکھو تو صرف آنکھیں بچی ہیں' باقی چہرے کا کوئی حصہ ایسا نہیں جو بچ گیا ہو اس کم بخت زہر کے اثر سے۔"

"ہاتھ مت لگاؤ رابعہ بی بی! ہاتھ لگانے سے منع کیا ہے ڈاکٹروں نے انفیکشن ہو جائے گا۔"

"میں تم سے پوچھتی ہوں دولہا بھائی! کیسے جگرا لاتے ہو اس کم نصیب کا یہ حال دیکھنے کا' تم تو اس موہنی صورت کے پروانے تھے اور اس کی کھنکتی آواز کے دیوانے' کیسے سکون سے کھڑے ہو یہ سب دیکھنے' ارے جاؤ' جا کر رپٹ کیوں نہیں لکھواتے طیفے لاڑے کے خلاف' اس نے' اس نے یہ ساری خباثت چلائی ہے' رکو ذرا میں اس سکینہ کی تو خبر لوں' دو دو ہاتھ کروں اس سے ارے چاہے میرے خلاف قتل کا مقدمہ درج کروا دیں اس کے گھر والے' اس کی گردن نہ مروڑ ڈالی آج میں نے تو رابعہ کلثوم نام نہیں میرا۔"

"ارے' رکو تو' رابعہ بی بی! کدھر جاتی ہو۔"

"میرا بازو چھوڑ دو دولہا بھائی! تمہاری تو عقل اور غیرت دونوں پر ہی پانی پڑ گیا ہے شاید' مگر مجھے کیسے چین آئے' میں تو اب سکینہ کو ہی نہیں طیفے کو بھی گولی نہ مار کر آئی تو نام میرا رابعہ کلثوم نہیں۔"

"جذباتی باتیں مت کرو رابعہ بی بی! تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے ان دونوں کے خلاف۔ سکینہ کے گھر سے کانجی آئی' ہم دونوں نے لے لی' جانتی بھی نہیں کہ اس کا اس طیفے سے کیسا تعلق ہے' پھر بیگم صاحب نے وہ کانجی پی بھی لی' بوتل میں صرف ایک گلاس کانجی تھی' جس کے چند گھونٹ اس کے اندر گئے' باقی کی گلاس سمیت نیچے گر گئی' اس کو ہوش میں لانے کی خاطر گلاسوں کے گلاس پانی اس پر پھینکنے کی کوشش میں وہ بھی پانی کے ساتھ پانی بن کر اپنے ثبوت مٹاتی بہہ گئی' گلاس ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا' تمہارے واویلا ڈال کر محلہ اکٹھا کرنے کے دوران نجانے کس کا داؤ لگا اور وہ بوتل بھی غائب ہو گئی' جس میں کانجی تمہیں دی گئی تھی۔ بولو اب کس ثبوت لو لے کر رپٹ درج کراؤں میں اور کیا جا کر طیفے اور سکینہ کو گولی ماروں۔"

"نہیں' میں کسی بات کو' کسی دلیل کو نہیں مانوں گی' مجھے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ میرا راستہ مت روکو' میں ان پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دوں گی۔ ہائے میں اپنی بہن کو دیکھتی ہوں تو میرا کلیجہ کٹ کٹ جاتا ہے' میں چین سے کیسے بیٹھ جاؤں' چھوڑو' چھوڑ دو مجھے۔"

"رکو رابعہ بی بی! رک جاؤ' سامنے کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو سراج! روکو اسے' پکڑو پہلے کم مصیبت آئی ہے ہم پر جو یہ کوئی نئی مصیبت لانے چلی ہے۔"

"میرا کون سا بس ہے جی اس پر' اس دن سے رہ رہ کر ایسے ہی دورے پڑتے ہیں اس پر' میں تو بی بی جی کے ساتھ ساتھ اسے بھی سنبھالتا تھک ہی گیا ہوں۔"

"بیٹھ جاؤ رابعہ بی بی! میں کہتا ہوں بیٹھ جاؤ' خبردار جواب تم نے اونچی آواز نکالی یا اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی' جان لو کہ ابھی ہم کسی سے بھی قانونی جنگ لڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں' میری بیوی زخم زخم ہے اور بے ہوش پڑی ہے' میرا معصوم بچہ ماں کی آغوش سے محروم بخار میں پھنک رہا ہے' سرمایہ سب کا سب میں مشترکہ کاروبار میں لگا بیٹھا ہوں' نہ پاؤں تلے زمین ہے نہ سر پر کوئی چھت ہے۔ میں کس آسرے پر ان لوگوں سے ماتھا بھیڑوں' مجھے اپنے مسئلوں سے نمٹ کر سکون کا سانس تو لے لینے دو' مگر مت بھولنا کہ میں اپنے دشمنوں کو معاف کر دینے والوں میں سے نہیں ہوں اور خوب جانتا ہوں کہ کہاں' کب اور کیسے جوابی وار کرنا ہے۔ مگر ابھی نہیں' ابھی میں مجبور ہوں' ابھی میرا وقت نہیں ہے۔"

"اللہ جانے کب آئے گا تمہارا وقت' کہا تھا تم سے اس محلے سے ہماری جان چھڑا دو' تم نے کہا۔ ابھی وقت نہیں' کہا تھا طیفے کا کوئی انتظام کر لو' تم نے کہا۔ ابھی وقت نہیں ہے' کہا تھا اسے ہی یہاں سے لے کر نکل جاؤ

بچے سمیت۔ تم نے کہا ابھی وقت نہیں' ارے چھری پھرے اس کم بخت وقت پر' جس نے لے کر میری بہن کی شکل کو بے شکل کر دیا' نہ وہ مردوں میں ہے نہ زندوں میں' یونہی پڑی کراہتی ہے ہر دم' نہ کروٹ بدل سکتی ہے نہ سیدھی لیٹ سکتی ہے' ہائے میری ماں' میں کیا کروں' میرے تو رو رو کر آنسو بھی خشک ہو گئے اب تو۔"

"سراج! تم اسے لے کر گھر جاؤ' اسے نیند کی دوا دے کر سلا دو' اس کا ذہن تھک چکا ہے' اسے سکون کی ضرورت ہے۔"

"جی سرکار! میں کوشش کرتا ہوں۔"

"اور پلیز میرے بھائی! ذرا سعد کو بھی دیکھ لینا' میں اسے ساتھ کر آیا تھا' اس کے پاس تمہارے مولوی صاحب کی بی بی بیٹھی تھیں' ان کو بھی اب تک تو گھر واپس جانا ہو گا' مہربانی کر دو یار! اسے بھی لے جاؤ رابعہ بی بی کو بھی اور جا کر سعد کو بھی دیکھ لو۔"

"جی صاحب' میں خادم۔"

☼ ☼ ☼

"یہ کھاری تو جذباتی ہے اماں! نجانے کہاں اور کس کی کیا سن کر آپ کو کھینچ لایا ادھر' اور آپ بھی بغیر سوچے سمجھے چل پڑیں' چوہدری صاحب کے پاس تو ہر طرح کے مہمان آتے ہی رہتے ہیں' کھاری کو سیدھا اور انجان سمجھ کر اس سے ہنسی مذاق بھی کر لیتے ہیں' یہ جذبات میں آ کر آپ کو بلانے چلا گیا۔ پہلے پتا تو کر لیں کون مہمان آیا ہوا ہے اور اس نے اس سے کس رنگ میں کوئی بات کی ہے۔"

کھاری کے اصرار پر آپا رابعہ اوائی توائی کرلی فارم ہاؤس پہنچی تھیں اور ذرا سانس لینے کو سعدیہ کے پاس رکی تھیں اور سارے قصے سے بے خبر سعدیہ نے آپا رابعہ کی آمد کی وجہ جان کر اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔

"او سعدیہ باؤ! ایہہ کوئی مخول شغول نئیں" کھاری کا سانس برابر معمول سے تیز چل رہا تھا۔ "مینوں خود اس بچھل پائی نے بتایا ہے' وہ میرے ماں پیو کو جانتی ہے' چوہدری صاحب نے خود تصدیق کیتی ہے کہ وہ جو کہہ رہی ہے' وہ سولہ آنے سچ ہے۔"

"تسی بہن جی!" وہ سعدیہ سے دھیان ہٹا کر آپا رابعہ سے مخاطب ہوا۔

"سعدیہ دی کوئی نہ سنو' بس میرے نال اوپر والے کمرے میں چلو' ادھر ہی مہمان بیٹھی ہے' رنگ اس کا توے ورگا (کی طرح) کالا ہے' بال کھچڑی تے مونڈیاں (شانوں) تک کٹے ہوئے اور اس نے عمر کے حساب سے بڑے شوخے کپڑے پہنے ہوئے ہیں' اس دی سن لو بہن جی! خدا معلوم تسی اس کو جانتے ہی ہو گے جی۔"

"اوپر والے کمرے میں۔" سعدیہ نے کھاری کی بات سن کر کہا "وہاں تو ابھی ابھی کچھ مہمان گئے ہیں' ماسی رشیدہ چائے کا انتظام کر رہی ہے بڑے کچن میں' مجھے بھی بلایا تھا اس نے کہ اس کی مدد کروا دوں' پہلے پتا تو کر لو وہاں اب کون بیٹھا ہے' ایسے ہی اماں کو وہاں لیے جا رہے ہو۔"

"اوئے ہوئے میں نے کہا تھا نا بہن جی جلدی چلیں۔" کھاری نے ماتھے پر ہاتھ مارا "فیر بھی اتنی سی دیر میں ادھر کوئی ہور مہمان آ گئے' ٹھہرو پھر میں دیکھ کر آتا ہوں کدھر سے وہ بچھل پائی آ دھمکی ہوا تنی سی دیر میں۔"

کھاری کا جوش ایک دم چڑھے ابال کی طرح بیٹھ گیا اور وہ مرے مرے قدموں سے کمرے سے باہر چلا گیا۔

"وہ جو بات کہہ رہا ہے سعدیہ! بے پر کی نہیں لگتی' بے چارہ یونہی تو جوش میں نہیں آیا تھا۔" کھاری کے جانے کے بعد آپا رابعہ نے سعدیہ سے کہا۔

"ارے اماں بے پر کی نہیں لگتی مگر ہے بے پر کی ہی۔" سعدیہ نے لاپروائی سے کہا۔ "اب آپ خود سوچیں کھاری اور اس سعد باؤ صاحب کا بھائی' آپ ذرا غور کریں' اس سے زیادہ بے پر کی کیا ہو سکتی ہے۔ ایسے ہی کسی مہمان نے جو سعد صاحب کو بھی جانتی ہو گی۔ مذاق سے اسے کہہ دیا ہو گا کہ تم اس کے بھائی ہو' یہ بے چارہ بات کی گہرائی میں تو جاتا نہیں' یقین کر کے آپ کی طرف بھاگ پڑا۔"

"لیکن وہ کہہ رہا تھا کہ چوہدری صاحب نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔" آپا رابعہ کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔

"افوہ اماں! آپ خود سوچیں' چوہدری صاحب کو بھلا کیا پتا کہ کھاری کے ماں باپ کون ہیں' وہ جانتے ہوتے تو کیا اس کو اسی وقت ان تک پہنچا نہ دیتے جب یہ انہیں ملا تھا۔ آپ چوہدری صاحب کے مزاج سے واقف نہیں۔ جب ان کا موڈ اچھا ہوتا ہے تو مذاق کرلیتے ہیں سب سے اچھا خاصا' اس بے چارے سے بھی کردیا ہوگا مذاق' یہ تو اللہ لوک ہے' مذاق کو سچ سمجھا' ذرا سا غور کرنے کی توفیق ہوتی تو خود ہی سمجھ جاتا کہ کیسی ناممکن بات کررہی ہے وہ مہمان۔"

"اتنا ہی بے چارہ سیدھا ہے تو اسے دنیا داری' سمجھ بوجھ سکھانا اب تمہاری ذمہ داری ہے۔" آپا رابعہ نے سعدیہ کی بے نیازی اور لاپروائی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "تم تو سمجھ دار اور چار لفظ پڑھی ہوئی ہو نا۔"

"ارے اماں! سمجھاتی ہوں' بہت سمجھاتی ہوں کہ اتنے جذباتی نہ ہوجایا کرو جو آنکھیں بند کرکے ہر کسی کی ہر بات پر یقین کرنے بیٹھ جاتے ہو۔" سعدیہ نے داناؤں کی طرح بات کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی دو چار دن پہلے کی بات ہے چوہدری صاحب نے اس سے کہہ دیا کہ اگر "تمہاری بیوی پڑھنا چاہتی ہے تو میں اسے پڑھاؤں گا' سارا خرچا میں پورا کروں گا' اس سے پوچھو اس نے کیا پڑھنا ہے۔" یہ اسی طرح جذباتی ہوکر خوشی کے مارے آندھی کی طرح آیا اور میرا بازو پکڑ کر مجھے چوہدری صاحب کے پاس لے گیا۔ مجھے ان کے سامنے جاتے ہی احساس ہوگیا' وہ مذاق کے موڈ میں تھے' میں نے ان کے پوچھنے پر صاف کہہ دیا کہ جی مجھے ایف اے کے کورس کی کتابیں منگوادیں' میں نے میٹرک کا امتحان پرائیویٹ دینے کے بعد ایف اے کرنا ہے پرائیویٹ۔"

"ارے یہ کیا کیا تم نے؟" آپا رابعہ کو سعدیہ کی بے نیازی پر غصہ آنے لگا۔ "ایسا ہی چوہدری صاحب فیاض ہورہے تھے تو کہنا تھا نا میٹرک سائنس کے ساتھ کرکے ایف ایس سی کروں گی۔ انہوں نے تمہیں ڈاکٹری بھی پڑھادینی ہے۔"

"کوئی نہیں پڑھاتی اماں کوئی نہیں پڑھاتا کسی کو ڈاکٹری۔" سعدیہ حقیقت پسندی کے دائرے میں داخل ہوکر ایک مرتبہ پھر دانشمندوں کے انداز میں بولی "سیڑھی پر چڑھا کر سیڑھی کھینچ لیں تو ان چوہدری لوگوں کا کیا اعتبار۔ اور پھر میں بہت پڑھ کر کروں بھی کیا۔ کھاری کی بیوی اور ڈاکٹری۔ اماں کیوں چاہتی ہیں آپ کہ ایک مرتبہ پھر ایک گاڑی ایسی بنے جس میں دو پہیے سائیکل کے اور دو ٹرک کے لگے ہوں جیسے آپ کی اور ابا جی کی گاڑی تھی نہ چلتی تھی نہ رکتی تھی اور اس کے بار بار اسٹاپ کرنے نے مجھے بھی یہ پتا نہیں چلنے دیا کہ میرے قدم زمین پر ہیں کہ آسمان پر۔ نہیں اماں!" اس نے آپا رابعہ کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے یونہی رہنے دیں' میں کھاری کی نیکی کو نیکی رہنے دینا چاہتی ہوں اس بے چارے کے گلے پڑا عذاب نہیں بننا چاہتی۔"

سعدیہ نے ایک مرتبہ پھر آپا رابعہ کو حیران کردیا تھا' ان کی بیٹی ہوکر بھی اس نے دوسری مرتبہ ان کی نسبت دانش مندی کا ثبوت دیا تھا' سعدیہ اچانک اتنی سمجھ دار کیسے ہوگئی تھی' خود ان کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم جو کوئی بھی ہو' تہذیب اور تمیز سے نا آشنا ہو۔" رازی اور رائنہ کے جانے کے بعد بلال سلطان نے سامنے کھڑی ماہ نور کو مخاطب کیا۔ "یا تو تمہارے والدین نے تمہاری تربیت کی نہیں' اگر کی ہے تو تم نے اثر قبول نہیں کیا۔"

"میرے والدین نے تو خیر میری تربیت کرنے میں ہی اپنی عمریں گزار دیں اور اللہ کا شکر ہے کہ ان کی تربیت نے ہی مجھے انسان بنادیا۔" ماہ نور نے چبا چبا کر لفظ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "آفرین تو اس لڑکے پر ہے جس کا نام سعد سلطان ہے اور جس کے آپ والد بزرگوار ہیں زندہ اور موجود ہونے کے باوجود آپ نے اس کی تربیت میں اپنا ایک لمحہ بھی استعمال نہیں کیا' وہ خودرو پودے کی طرح بڑھا لیکن واہ کیا خوب بڑھا کہ آج جو بھی شخص اس سے واقفیت

رکھتا ہے اس کی تعریف کرتا ہے اور اس کے لیے دعاگو بھی ہے' لیکن آپ" وہ زہرخند لہجے میں بولی "ذرا سوچ کر تو بتایئے گا اس دنیا میں کوئی ہاتھ ایسا بھی ہے جو آپ کے لیے دعا کرنے کو اٹھتا ہو۔"

"اچھی خاصی ماہر ڈرامہ باز ہو تم۔" وہ ماہ نور کی باتوں سے ذرا برابر بھی متاثر نہ ہوتے ہوئے بولے۔ "صرف ایک ڈیڑھ دن پہلے تمہیں پتا نہیں تھا کہ وہ لڑکی کون ہے جو سعد کی کوئین آف ہارٹ ہے اور یہ تمہارے ہی الفاظ تھے کہ تم اس لڑکی کو نہیں جانتیں' آج تم پر اچانک انکشاف ہوگیا کہ تم ہی وہ لڑکی ہو اور تم یہ دعوا کرتی یہاں بدتمیزوں کی طرح بغیر اجازت گھس آئیں۔"

ماہ نور کا چہرا ان کی بات سن کر غصے سے تمتمانے لگا۔

"خوب سمجھتا ہوں میں یہ سب ڈرامہ بازیاں' یہاں آکر یہ سب دولت' جائیداد' روپیہ پیسہ' آسائش' سہولت دیکھی تو میرے بیٹے کی یہاں عدم موجودگی سے تمہیں خیال آیا ہوگا کہ لگے ہاتھوں یہ دعوا کرنے میں کیا حرج ہے کہ تم اس کے خوابوں کی شہزادی ہو' سو چلی آئیں منہ اٹھا کر' میری حماقت جو تم سے اس بات کا تذکرہ کر بیٹھا۔" وہ آگ لگا رہے تھے اور اسے مزید بھڑکانے کے لیے ساتھ ساتھ اس پر تیل بھی چھڑک رہے تھے۔

"آپ کی دولت' جائیداد' روپیہ پیسہ' آسائشیں' سہولتیں مائی فٹ!" ماہ نور پھٹ کر بولی۔ "دور سے سلام ایسی دولت کو جسے لات مار کر آپ کا اپنا سگا بیٹا آپ کو چھوڑ کر چلا گیا۔ جو اسے دل کا سکون نہ دے سکی۔ وہ کسی اور کو کیا اپنی کشش سے کھینچے گی۔"

اب وہ بول نہیں رہی تھی پھنکار رہی تھی۔

"آپ جیسے مادیت پرست' ہر جذبے' ہر احساس کو دولت کے کھنکتے سکوں کی آواز کے ساتھ تولنے والے کیا جانتے ہوں گے کہ کچھ حقیقتوں کا انکشاف واقعی اچانک ہوتا ہے انسان پر' وہ توقع بھی نہیں کررہا ہوتا اور اس کی جھولی نعمتوں سے بھردی جاتی ہے' آپ کو کیا معلوم کہ اللہ کی نعمت صرف روپیہ پیسہ' دھن دولت ہی نہیں۔ اس سے کہیں بڑی نعمت کسی کی محبت پالینے کا احساس ہے۔"

اس نے طنزیہ نظروں سے بلال سلطان کی طرف دیکھا۔

"ہاں' میں نہیں جانتی تھی۔ محض ایک دن پہلے تک نہیں جانتی تھی کہ میں اتنی خوش قسمت ہوسکتی ہوں کہ سعد سلطان جیسا انمول شخص مجھے اپنے دل کی ملکہ بنالے' مگر کچھ انکشافات واقعی اچانک اور غیر محسوس طریقے سے ہوتے ہیں۔ مجھ پر بھی یہ انکشاف اچانک ہی ہوا اور میں اس کی خوشی میں سرشار آپ کی طرف دوڑ پڑی' آپ سے آپ کی دولت' پیسہ' اسٹیٹس مانگنے نہیں' صرف وہ امانتیں لینے کے شوق میں بھاگتی چلی آئی جو آپ کے پاس سعد کی کوئین آف ہارٹ کے لیے رکھی ہیں۔" وہ سانس لینے کو رکی۔

"یقیناً" میرے لیے وہ جو کچھ بھی ہے' دنیا کی ہر بڑی اٹریکشن سے بھی بڑی اٹریکشن ہے لیکن جس رویے کا مظاہرہ آج آپ نے کیا ہے' اسے دیکھ کر مجھے خیال آرہا ہے کہ آپ جیسے شائیلاک سے کچھ مانگنے سے بہتر ہمیشہ کی محرومی ہے' دوسروں کی ایگو اور سیلف ریسپیکٹ کو ہرٹ کرکے شاید آپ کو بھی وہی مسرت حاصل ہوتی ہے جو شائیلاک کو دوسروں کے گوشت کے ٹکڑے اتارنے میں ہوا کرتی تھی' بے چارے آپ۔" ماہ نور نے افسوس سے کہا۔

"اسی مسرت کو پاتے پاتے اپنا بیٹا گنوا بیٹھے' نہیں چاہیے مجھے آپ سے کچھ بھی' میرے لیے یہ احساس ہی کافی ہے کہ میں وہ ہوں جسے وہ چاہتا ہے۔"

اس نے مڑ کر کمرے سے باہر نکلنے کے لیے قدم بڑھائے۔

"تم ٹھہرو' ادھر آکر بیٹھو میرے سامنے۔" بلال سلطان کی آواز آئی۔

ماہ نور نے پیچھے مڑ کر حیرت سے دیکھا۔

"میں صرف تمہیں جج کرنے کے لیے اتنی بے رحمانہ گفتگو کررہا تھا۔" ان کا لہجہ سراسر بدلا ہوا تھا۔

"آپ نے جج کرلیا؟" ماہ نور نے اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے پوچھا۔

"میں ان بے رحمانہ باتوں سے پہلے ہی تمہیں جج کر چکا تھا اور مجھے کوئی شک نہیں تھا تمہارے دعوے پر۔"

"پھر آپ نے مجھے لالچی اور موقع پرست قرار دینے کی کوشش کیوں کی۔" ماہ نور کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑیں۔

"میں صرف تمہارے اعصاب آزما رہا تھا۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا قلم میز پر رکھ کر ریوالونگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگائی "اگر تم تھوڑا سا غور کرتیں اور اپنے اعصاب کو اس تناؤ سے بچاتیں' جس کا اظہار ابھی تم نے کیا ہے تو تمہیں اندازہ ہو جاتا کہ میں نے اپنے دو ماتحتوں کو تو کمرے سے باہر بھیج دیا' تمہیں نہیں بھیجا۔" انہوں نے ماہ نور کو جتانے والی نظروں سے دیکھا۔

"میں نے اپنے ہیڈ ہاؤس کیپر کو آج ایک خصوصی ڈنر کی تیاری کا آرڈر دیا حالانکہ میرا ڈنر کہیں اور شیڈولڈ تھا۔ اس شیڈولڈ ڈنر کو کینسل کرکے گھر پر ایک خصوصی ڈنر جس میں صرف ایک مہمان انوائیٹڈ ہے' صرف ایک مہمان۔" انہوں نے شہادت کی انگلی کھڑی کی۔

"اور وہ مہمان تم ہو گی۔"

"آپ کو کیسے معلوم میں سچ کہہ رہی ہوں۔" ماہ نور کچھ دیر انہیں حیرت سے دیکھتی رہی پھر ان کی بات پر غور کرنے کے بعد بولی۔ "آپ کو کیا پتا میں جھوٹ ہی بول رہی ہوں' ہو سکتا ہے میں واقعی لالچی اور موقع پرست ہوں۔"

"نہیں ہو سکتا۔" بلال سلطان کرسی کی پشت چھوڑ کر سیدھے ہوئے۔ "کیونکہ ایک سچا جذبہ ہی انسان کے منہ سے وہ کچھ کہلواتا ہے' جو تم نے کہا وہی جذبہ اسے اتنی جرات عطا کرتا ہے' جس کا مظاہرہ تم نے کیا' ورنہ میرے سامنے اکثر لوگوں کی ٹانگیں اور آوازیں کپکپا جاتی ہیں۔"

"آپ کے ماتحتوں کی کپکپاتی ہوں گی' میں آپ کی ماتحت نہیں ہوں۔" ماہ نور نے سرہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں۔" وہ اپنی ٹھوڑی پر انگلی رکھتے ہوئے بولے۔ "تم ماتحت نہیں ہو۔ تم میرے بیٹے کی کوئین آف ہارٹ ہو' تم بہت اسپیشل ہو۔"

ماہ نور کو لگا جیسے کمرے کی فضا یکسر بدل گئی ہو۔ ایک سرد اور جامد ماحول میں نرمی اور ایک انجانے تعلق کی گرم جوشی اتر آئی ہو۔ وہ بے اختیار اپنی جگہ سے آگے بڑھ کر بلال سلطان کے ٹیبل کے قریب آئی۔

"بیٹھ جاؤ۔" انہوں نے اسی نرمی سے اپنے سامنے رکھی چیئر کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ سعد سے کتنی محبت کرتے ہیں؟" ماہ نور نے بیٹھے بغیر انہیں ایک ٹک دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں کیلکولیشنز کا ماہر ہوں۔" انہوں نے سرہلایا۔ "لیکن میں یہ کیلکولیٹ نہیں کر پایا کہ میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔"

"آپ جانتے ہیں کہ وہ آپ سے دور جانے کے لیے کہیں چلا گیا ہے' کسی اور سے نہیں۔" ماہ نور نے کہا۔

"بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"آپ نے اسے کیوں جانے دیا' آپ نے وہ سب کچھ کیوں کیا جسے جاننے کے بعد وہ یہاں سے چلا گیا' آپ اس کے پیچھے کیوں نہیں جاتے' وہ جہاں کہیں بھی ہے' آپ اسے ڈھونڈ کر واپس کیوں نہیں لے آتے۔" ماہ نور چاہتے ہوئے بھی ایک بار پھر اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں پا سکی تھی۔

"تم بیٹھو' ہم آرام سے بات کرتے ہیں۔" انہوں نے ایک بار پھر اپنے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"چوہدری صاحب کے پاس کراچی سے اور سنگاپور سے مہمان آگئے ہیں' چوہدری صاحب اب ان کے ساتھ مصروف ہیں' لگتا ہے چمڑے کی فیکٹری کے متعلق بات چل رہی ہے' چوہدری صاحب نے کھانے کا بندوبست کرنے کا کہا ہے اور چائے پانی منگوا کر دروازہ بند کر لیا ہے ہال کمرے کا۔ ادھر ابھی کوئی نہیں جا سکتا۔"

ماسی رشیدہ نے کھاری کو بتایا تھا۔ کھاری آپا رابعہ کو سعدیہ کے پاس بٹھا کر خود افتاں و خیزاں ماسی رشیدہ کے پاس پہنچا تھا۔ اس پر ماسی رشیدہ کا جواب سن کر مایوسی چھا گئی گویا ابھی فوری طور پر چوہدری صاحب نہیں مل سکتے تھے۔

"اور وہ مہمان' جو پہلے آئی تھی' کدھر گئی؟" اس نے بے چینی سے ماسی رشیدہ سے پوچھا۔ جو پیاز کاٹ رہی تھی۔

"وہ واپس چلی گئی ہے شاید بشیرا ڈرائیور گاڑی میں بٹھا کر لے کر گیا ہے اسے۔" ماسی رشیدہ نے پیاز سے آنکھوں میں آئے پانی کو اپنے دوپٹے کے پلو سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"چوہدری صاحب نے کل بھی سویرے سویرے نکل جانا ہے مہمانوں کے ساتھ شکار پر۔ ہیڈ قادر آباد سے فون آیا تھا چوہدری صاحب کو۔" ماسٹر کمال نے بڑے کچن میں داخل ہوتے ہوئے ماسی رشیدہ کی طرف دیکھ کر اعلان کیا۔

"ماسٹر جی! وہ پروہنی کدھر کو گئی ہے۔ جو پہلے ادھر تھی؟" کھاری مایوسی اور بے چینی کی انتہا کو پہنچنے لگا تھا۔

"وہ شہر گئی ہے بشیرے کے ساتھ' پتا نہیں اس سے آگے اس نے کدھر جانا ہے' بشیرے کو ہی بتایا تھا چوہدری صاحب نے۔" ماسٹر کمال نے دودھ کے بڑے بڑے برتن اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

"یا بشیرے کا نمبر تو دو ماسٹر جی!" کھاری نے اپنی جیب سے موبائل فون نکالتے ہوئے کہا۔

"اوئے تجھے اس پروہنی کی فکر کیوں پڑ گئی ہے؟" ماسٹر کمال نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آ ئے ہائے نہ شکل نہ رنگ روپ' وچاری ہر یا سوں (طرف سے) بخشی ہوئی تھی۔" ماسی رشیدہ ہنس کر بولی۔

"انگریزی بڑی بولتی تھی نا' کھاری کو گٹ مٹ کرنے والے مہمان بڑے اچھے لگتے ہیں۔" ماسٹر کمال نے شرارت سے کھاری کی طرف دیکھا۔

"مخول چھوڑو۔" کھاری جھنجلا کر بولا۔ "ماسٹر جی یا بشیرے کا نمبر دے دو بڑی مہربانی تمہاری۔"

"مجھے کون سا زبانی یاد ہے۔" ماسٹر کمال نے کہا۔ "لے ادھر میرے موبائل میں سے دیکھ لے۔" اس نے اپنا فون کھاری کو دیا۔

کھاری نے بشیر کا نمبر اپنے فون میں محفوظ کرنے کے بعد اسے فون کیا۔

"میں مہمان کو ادھر شہر کے ایک وڈے ہوٹل میں اتار کر آیا ہوں' پر اب چوہدری صاحب کا فون آیا ہے کہ ابھی واپس نہیں آنا' ادھر ہی رہنا ہے اکبر صاحب کی طرف۔" بشیرے نے کھاری کے استفسار پر جواب دیا تھا۔

کھاری کی بے چینی اور مایوسی مزید بڑھ گئی تھی۔ مہمان اس کے دل اور دماغ میں غیر متوقع آگ لگا کر بات ادھوری چھوڑ کر جا چکی تھی اور چوہدری صاحب اپنے نئے مہمانوں کے ساتھ مصروف ہو چکے تھے۔ کھاری کے سوال' جذبات اور بے چینی کے سوا نیزے پر آکر کھڑے ہو گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

دودن زادے نے اپنے نرم گرم بستر میں لیٹے لیٹے سر اٹھا کر سعد کی طرف دیکھا' وہ اپنا گٹار صاف کر رہا تھا۔ دودن نے سر واپس تکیے پر رکھ لیا۔ رات کے دس بج رہے تھے اور اس پوری عمارت پر خاموشی چھائی ہوئی تھی اس روز اس سیزن کی اب تک کی سب سے زیادہ برف باری ہوئی تھی اور ویر ڈیل کے تمام مہمان اسیکنر اور اسکیٹ بورڈرز اپنے شوق کو سرشام ہی ادھورا چھوڑ کر واپس اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ چکے تھے۔ اس کاٹیج کے طعام خانے سے جہاں وہ اور سعد ٹھہرے تھے کبھی کبھار برتنوں اور چمچوں کی کھنکھناہٹ کی آواز آتی تھی اور پھر ماحول پر سکوت چھا جاتا تھا۔ دودن نے اپنی گردن کے نیچے ایک چھوٹا گول تکیہ رکھا اور سعد کے بارے میں سوچنے لگا۔

اس کا نیا دوست' وہ پاکستانی لڑکا کتنا بے نیاز' مگن اور پرسکون نظر آتا تھا۔ جبکہ جو حالات اس نے اپنے دودن کو سنائے تھے' دودن کو یقین تھا اگر وہ خود ایسے حالات اور ذہنی کیفیت سے گزر رہا ہوتا تو یقیناً "انتشار' بے سکونی اور اضطراب اس کے چہرے کے تاثرات سے عیاں ہوتا اور اسے دیکھنے والا فوراً" سمجھ جاتا کہ وہ کسی دکھ' پریشانی اور

مایوسی کی کیفیت سے گزر رہا ہے، مگر اس سلسلے میں وودن، سعد کے کمال مہارت کا قائل ہو چکا تھا۔ اسے اپنی ذہنی اور دلی کیفیت کو چھپا کر پرسکون نظر آنے کا فن آتا تھا۔

"میں حیران ہوں تمہارے والد نے اب تک تمہارا پیچھا کیوں نہیں کیا، وہ تم تک پہنچے کیوں نہیں۔" وودن نے یونہی سر تکیے پر رکھے رکھے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں بھی حیران ہوں۔" سعد نے گٹار کے تاروں پر انگلی پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ ایک بے سری آواز اس کے گٹار کے تاروں سے نکلی تھی۔

"تم نے کوشش نہیں کی کہ پتا کرو، انہوں نے تمہارا پیچھا کیوں نہیں کیا۔" وودن لکڑی کے گول ستون پر ٹکی چھت کے شہتیروں کو گنتے ہوئے بولا۔

"نہیں۔" اس نے اٹھ کر گٹار ایک کونے میں رکھتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ میں بھی اس بار انہیں مکمل طور پر حیران کر دینے کے موڈ میں ہوں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، کبھی وہ تم سے پوچھیں گے کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟" وودن نے اس کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے اب تک وہ جان چکے ہوں گے کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ اور اسی لیے انہوں نے میرا پیچھا نہیں کیا جب انسان۔ مکمل طور پر عیاں ہو جائے، خصوصاً "اس شخص کے سامنے جس کے سامنے وہ عمر بھر چھپتا پھرا ہو تو پھر اسے اس شخص کا کبھی سامنا نہ کرنے میں ہی مصلحت نظر آتی ہے۔" وہ واپس اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"تو پھر تمہارا اپنا کیا ارادہ ہے؟ مستقبل کے بارے میں تم نے کیا سوچ رکھا ہے؟" وودن اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "یہاں تو سکی سیزن چند ہفتوں بعد ختم ہو جائے گا۔ پھر تم نے آگے کہاں جانا ہے، کیا کرنا ہے؟"

"میں یہاں بھی بلا ارادہ آیا تھا، آئندہ کے لیے بھی میرا فی الحال کوئی ارادہ نہیں ہے، جدھر کو اللہ لے جائے گا چل دوں گا۔"

"تم نے کبھی سوچا ہے کہ اپنے تئیں تم اپنے والد کو جو سزا دینے پر تلے ہوئے ہو اگر وہ واپس تمہیں سزا دینے پر تل گئے تو کیا ہوگا۔" وودن نے کہا۔

"کیا ہوگا؟" سعد نے اس کی طرف دیکھا۔

"اگر انہوں نے تمہارے اکاؤنٹس منجمد کرا دیے، اگر تمہارے بارے میں کوئی ایسا مقدمہ درج کرا دیا جس میں اپنے ملک کے قانون کو تم فوری طور پر مطلوب ہو گئے تو وہ انٹرپول کے ذریعے۔"

"بابا وودن!" وہ اپنا بستر سیدھا کرتے ہوئے بولا۔ "لگتا ہے تم مہم جوئی کی اور جاسوسی کہانیاں بہت پڑھتے ہو۔ ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "اکاؤنٹس اول تو وہ منجمد کرا نہیں سکتے، کرا دیں گے تو بھی پروا نہیں۔"

"کرا دیں گے تو تم اپنا مکھن اور روٹی کہاں سے کماؤ گے؟"

"میں۔" وہ آنکھیں میچ کر سوچنے لگا۔ "ہاں!" اس نے کچھ سوچنے کے بعد آنکھیں کھولیں۔ "میں پکاڈلی میں سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر گٹار بجایا کروں گا۔ میرے آگے ایک کپڑا بچھا ہوگا، پینیز اور شلنگز بھیک میں کمانے کے لیے۔"

"بابا۔" وودن زادے اس کے جواب سے محظوظ ہوا۔ "تم یقیناً" خوابوں کی دنیا میں رہتے ہو۔"

"اسی میں تو مزا ہے۔" وہ کمفرٹر میں گھستے ہوئے بولا۔

"ویسے!" بعد کمرے میں چھائی خاموشی کو وودن نے کچھ توقف کے بعد توڑا۔ "مجھے امید نہیں تھی کہ تم آج میرے کہنے پر سب سے بلند رنگ میں سکی اٹنگ کرنے سے باز آ جاؤ گے۔"

"مجھے بھی امید نہیں تھی۔" کمفرٹر کے اندر سے سعد کی آواز آئی تھی۔ "لیکن میں باز آ گیا۔ اب اگر مہربانی سے تم لائٹ آف کر دو تو میں تمہارا ممنون ہوں گا۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

اس کی آواز بھاری ہونے لگی۔

وودن کچھ دیر یوں ہی بیٹھا سعد ہی کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر اس نے اٹھ کر روشنی بجھا دی۔

☼ ☼ ☼

"میں نے ایک بار کہیں پڑھا تھا کہ دل کی بات اگر کسی سے کہہ نہ پاؤ تو کہیں لکھ دو، کاغذ اور قلم تمہارے دل کی بات کا بوجھ اتارنے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوں گے۔"

کسی کا یہ قول پرانے وقتوں میں ریکارڈ ہوا۔ اب وقت بدل گیا ہے۔ میرے جیسے انسان کو قلم پکڑ کر کاغذ پر لکھنا بھول سا گیا ہے۔ میری انگلیاں ٹیکسٹ ٹائپنگ کی عادی ہو چکی ہیں۔ اسی لیے میں اپنے دل کی بات اپنے اس ملٹی فنکشن فون پر ٹائپ کر کے ایک فائل میں محفوظ کر رہا ہوں۔

"میں جانتا ہوں کہ میرا یہ فون اور اس میں محفوظ یہ فائل شاید تم تک کبھی نہ پہنچ پائے، نہ تمہیں کبھی خیال آئے گا کہ تم یہاں میرے گھر تک پہنچو، نہ ہی میرے گھر میں کوئی ایسا موجود ہے جو اسے پا کر دیکھنے اور پڑھنے کی زحمت فرمانے کے بعد تمہیں تلاش کرے اور تم تک پہنچ کر اسے تمہارے حوالے کر دے۔ سو یہ تو یہ مضحکہ خیز کام جو میں کر رہا ہوں، مگر کیا کروں میرے دل پر بوجھ بہت ہے اور مجھے اس بوجھ کو ہلکا کرنا ہے۔ مجھے کہیں یہ بات رقم کرنی ہے ماہ نور۔ کہ میں تم سے شدید محبت میں گرفتار ہوں، شدید ترین محبت میں گرفتار۔"

ماہ نور کے ہاتھ کانپنے لگے تھے اور اس سرد موسم میں بھی اس کے چہرے پر پسینہ آنے لگا تھا۔ اس نے گھبرا کر اپنے اردگرد دیکھا۔ اس خالی کمرے میں ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے کی کھڑکیوں پر پردے تنے ہوئے تھے اور کمرے میں ایک عجیب سا سکوت طاری تھا۔

وہ سعد سلطان کا کمرہ تھا۔ جس میں بلال سلطان اسے بٹھا کر گئے تھے۔ خود باہر نکل جانے سے پہلے انہوں نے اسے بھورے رنگ کے سخت کاغذ سے بنا وہ لفافہ دیا جو بھاری تھا اور پھولا ہوا تھا اور جس میں وہ امانتیں محفوظ تھیں جو سعد کی کومین آف ہارٹ کے لیے تھیں۔ اس لفافے میں پہلی چیز جو اسے ہاتھ لگی تھی، وہ یہی فون تھا۔ جس کی بیٹری کی چارجنگ ختم ہو چکی تھی۔ اس نے فون کے ساتھ ہی رکھے اس کے چارجر کو بجلی کے ساکٹ میں لگا کر فون کو چارجنگ پر لگانے کے بعد اس بھورے لفافے کو مزید ٹٹولا تھا۔ اس لفافے میں گڑ کی دو ڈھیلیاں، ایک شفاف کاغذ میں لپٹی رکھی تھیں۔ ہاتھ سے بنا ایک خوب صورت پنکھا جس کے کنارے پر کپڑا لگا کر کانچ کے موتی ٹانکے گئے تھے۔ دو بھٹے جن کے دانے مرجھا رہے تھے اور سیلے ہوئے تھے اور ایک سستی سی چنری، چند مرجھائے ہوئے پتے اور سرسوں کے سوکھے پھول۔

اس نے حیران نظروں کے ساتھ وہ سب چیزیں دیکھیں اور ان پر ہاتھ پھیرا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی گھومتی بھٹکتی نظر کمرے کی جنوبی دیوار پر سجی پینٹنگز پر پڑی۔ وہ ان چیزوں کو وہیں چھوڑ کر اس دیوار کی طرف بڑھی۔ یہ وہی دو چار کول پینٹنگز تھیں جو سید پور کی ایگزیبیشن میں سعد نے اس سے خریدی تھیں۔ ان پینٹنگز کو خوب صورت اور قیمتی فریمز میں جڑوا کر وہاں آویزاں کیا گیا تھا۔ ماہ نور کی آنکھیں ایک انجانے احساس سے بھیگنے لگیں۔

"میں ان کی منہ مانگی قیمت دینے پر تیار ہوں۔" الفاظ بازگشت کی طرح اس کے کانوں سے ٹکرائے۔

"نہیں ماہ نور! میں وہ لڑکی نہیں ہوں جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ وہ لڑکی تم ہو۔" سارہ خان نے کہیں قریب سے کہا تھا۔

"ماہ نور میرے سینے کے اندر بہت ہی گہرا کھا وہ احساس ہے جسے میں نے برتا ہے۔"

"آہ۔" سسکیوں کے درمیان بے اختیار ماہ نور کے منہ سے نکلا۔ "وہ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی کہتا رہا۔ میں سب

کچھ سنتے ہوئے بھی نہ سن سکی۔"

"بدگمانی' شک' حسد اور رشک کی پٹی نے مجھے کچھ دیکھنے دیا' نہ سننے اور سمجھنے دیا۔" اس نے اپنے آنسو ہاتھ کی پشت سے صاف کیے۔

وہ واپس چارجنگ پر لگے فون کے قریب آئی۔ فون تھوڑا چارج ہو چکا تھا اور اس کی اسکرین آن ہونے پر روشن ہو رہی تھی۔ اس نے اس مخصوص فائل کو کھولا۔ جس کا پاس ورڈ کاغذ کے ایک پرزے پر لکھا اسی بھورے لفافے میں بند تھا۔

"نجانے کتنی بار' نجانے کتنے موقعوں پر میرا دل بے اختیار چاہا کہ میں تم سے برملا اظہار کروں۔ میں تم سے صاف صاف کہہ دوں' اپنے دل کا حال تمہیں سنا دوں' لیکن میں اپنے سارے احساسات کو دل میں دبا تا رہا۔" اس نے پڑھنا شروع کیا۔

"کیوں آخر کیوں؟" ماہ نور کے دل سے سوال اٹھا۔

"بندر کا تماشا دکھانے والے اس اجڈ' گنوار' میلے کچیلے' جاہل' خانہ بدوش کو اس پہلی ملاقات میں ہی تم اتنی اچھی لگی تھیں۔ جتنا اچھا لگنے پر انسان پہلی نظر کی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ میں خود اپنے سامنے بارہا اعتراف کر چکا ہوں کہ وہ پہلی نظر کی محبت نہیں' پہلی نظر کا عشق تھا۔ جس میں 'میں مبتلا ہوا تھا۔"

ماہ نور کا دل ایک دھڑکن چھوڑ گیا۔

"تم سے پہلے میں بہت سی لڑکیوں سے واقف بلکہ ان کے قریب بھی رہا تھا۔ لیکن تمہارے اندر سے اٹھتی اور باہر ظاہر ہوتی Purity نے مجھے یکدم حیران بھی کیا اور اپنے طلسم میں جکڑ بھی لیا۔ بھٹا کھاتی۔ اس خالص دیہاتی ماحول میں بے نیازی مگر پورے شوق کے ساتھ بندر کا تماشا اس کے کرتب سیکھنے کی خواہش کا اظہار کرتی' تم کتنی Pure (خالص) لگ رہی تھیں۔ یہ میں جانتا ہوں یا میرا دل اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس رات سب کاموں سے فارغ ہو کر اپنے بیڈ پر سونے کے لیے لیٹتے ہی میرے تصور میں تم آ گئیں اور میں دیر تک تمہارے بارے میں سوچتا رہا۔ بارہا میرا دل چاہا کہ دوبارہ اسی پس منظر میں تم سے ملوں اور تمہارا بے نیاز' مگر پر شوق چہرہ دیکھوں۔

اس رات ہی مجھے لگا کہ اس دنیا میں تم سے دوبارہ ملاقات ممکن نہیں' کیونکہ تم سے وہ ملاقات محض اتفاق تھی اور میرے حالات ایسے نہیں تھے کہ میں رانجھے کی طرح بھینسیں چرانے' میرا مطلب ہے بندر کا تماشا دکھانے کے پیشے کو مستقل اپنا سکوں۔ اسی لیے میں نے کوشش کی کہ تمہارے خیال کو ذہن سے جھٹک کر سو جانا چاہیے۔" ماہ نور نے پہلو بدلا۔

"لیکن اگلے روز جاگنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ میرے لیے ایسا ممکن نہیں تھا۔ میں تمہیں اور اس منظر کو بھول جانا چاہتا تھا' مگر بھلا نہیں پا رہا تھا' شاید میرے احساس میں کوئی کھوٹ نہیں تھی' جب ہی تو مجھے ایک راہ چلتے درویش نے اچانک اکتارہ بجانا سکھا دیا۔

وہ اکتارہ جس کے بارے میں' میں نے تم کو بتایا تھا کہ میری زندگی کے خوب صورت ترین احساسات میں سے ایک احساس تھا' جو اس جوگی فقیر کے اپنی واحد قیمتی چیز مجھے تحفے میں دے دینے پر مجھے محسوس ہوا تھا۔ اکتارے کو میں کیا کرتا۔ میں نے اسے کہاں اور کیسے بجانا تھا۔ یہ مشورہ مجھے نذیرے خانہ بدوش نے دیا۔ اس کے خیال میں بابے منگو کے میلے پر اکتارہ بجانے اور جوگی سے سیکھی چند کافیوں کے بول سنانے پر اس کی بستی کے لوگوں کے لیے بہت سی نیر (پیسے) اکٹھی ہو سکتی تھی۔ میں ان دنوں بھی ڈیڈی سے آف پر تھا۔ اسی لیے اکتارہ اٹھائے' بھیس بدلے بابے منگو کے میلے کی طرف چل دیا۔ اس روز میں نے سارا دن وہ اکتارہ بجایا اور چند کافیاں بار بار سنائیں۔

نذیرے خانہ بدوش اور اس کی فیملی کو اچھی خاصی آمدنی ہوگئی۔

میں وہاں اس بھیس میں اکتارہ اٹھائے کیوں گیا تھا۔ یہ مجھے سارا دن گزر جانے کے بعد شام کے قریب پتا چلا۔ وہاں تم نے مجھے نظر آنا تھا۔ ایک مرتبہ پھر تم نے مجھ سے سوال کرنا تھا۔

"سائیں جی! آپ کی آواز میں اس سوز کی وجہ؟" اور مجھے بالکل بے ساختہ جواب دینا تھا۔ "عشق"

ماہ نور میں نے تو دوسری بار ملنے پر کہہ دیا تھا۔ مگر تم اتنی معصوم اور بے نیاز ہو کہ مجھے یقین ہے، تمہیں کبھی سمجھ میں نہ آیا ہوگا میں کون ہے اور کس سے عشق کی بات کر رہا تھا۔ مگر اس رات میں اتنا خوش اور سرشار تھا کہ میں اس کی انتہا بیان نہیں کر سکتا۔

اس روز میرے دل نے بارہا کہا۔ مجھے تمہارے پیچھے جانے اور تمہارے بارے میں پتا کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وقت ہمیں خود ہی آمنے سامنے لے آئے گا۔ مجھے معلوم نہیں میرا دل ایسا کیوں کہتا تھا۔ مگر میں نے بعد میں جانا کہ وہ سچ کہتا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک کہتا تھا۔ تم مجھے ہر اس جگہ ٹکرائیں جہاں کا میں نے قصد کیا۔ سید پور میں مٹی کے برتن بنا کر نمائش کرنے والے عبدالکریم کمہار سے میری اتفاق سے ہی ملاقات ہوئی اور میری روپ بہروپ والی رگ پھڑکنے لگی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس رگ کے پھڑکنے پر کمہار کا بھیس بدل کر اوٹ پٹانگ اور ٹیڑھے میڑھے برتنوں کو بنانے کی مشق کرنے کے پیچھے کون سی وجہ کار فرما تھی۔ مگر میلے والے دن اس چبوترے پر بیٹھ کر برتن بنانے کے دوران وجہ اچانک ہی میری سمجھ میں آگئی تھی۔

وہ وجہ تم تھیں اور تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ میرے لیے وہ کیسی خوشی کا لمحہ تھا۔

اس روز ہی مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یقیناً "میرا اور تمہارا ایسا تعلق بننے والا تھا جسے میرے، دنیا کے کسی بھی دوسری لڑکی سے تعلق سے الگ اور منفرد ہونا تھا۔ سید پور میں دوسری ملاقات تمہاری چار کوال پینٹنگز کی نمائش میں ہوئی۔ تم اپنی پینٹنگز کو خام ہاتھ کا کام قرار دیتے ہوئے جس طرح مجھے پہچاننے کی کوشش میں کنفیوز ہو رہی تھیں۔ مجھے اس دوران اپنا محظوظ ہونا نہیں بھولتا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں تمہاری چاروں پینٹنگز خرید لوں، لیکن تمہارے کنفیوز ہو جانے پر میں نے یہ خواہش ادھوری چھوڑ دی۔

میں تمہارے کنفیوژن کی وجہ جانتا تھا۔ بندر والے، سائیں اور کمہار میں نظر آتے آتے میں، تمہیں اپنے اصلی روپ میں نظر آگیا۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ روپ کیا تھا اور بہروپ کیا تھا۔ جب ہی تو فوک میوزک ایوننگ میں تم مزید برداشت نہ کرتے ہوئے اس اتنے بڑے ہجوم میں اٹھ کر مجھ تک چلی آئیں۔

وہ کیا لمحہ تھا۔ ماہ نور جب بکھرے بالوں، وحشت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنی دوست کی گرفت سے خود کو چھڑاتے ہوئے تم چلا چلا کر مجھ سے سوال کر رہی تھیں کہ میں کون تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا۔ وہ لمحے وہیں رک جاتے اور میں تمہارا وہ کنفیوژن کی آخری حد تک پہنچا تاثر دیکھتا رہوں۔

تم جانتی ہو! اس سنگر کے لیے جو اس فوک میوزک ایوننگ میں پہلی بار پرفارم کر رہا تھا۔ وہ خبر، وہ تصویریں اور وہ ویڈیوز کتنا بڑا اسکوپ ثابت ہو سکتا تھا۔ ایک امیج بلڈنگ، پروفائل بلڈنگ اسکوپ، لیکن میں ایسا کیسے ہونے دے سکتا تھا۔ کیونکہ بال بکھرائے، وحشت زدہ نظروں سے دیکھتی۔ چیختی چلاتی وہ لڑکی کوئی اور نہیں تم تھیں، تمہیں اپنی تشہیر کا ذریعہ بنانے سے بڑھ کر میری توہین کیا ہو سکتی تھی۔ وہ بھی جبکہ تم میرے ہی چھپن چھپائی گیم کا شکار ہو کر وہ سب کر رہی تھیں۔

میں نے تمہیں تمہاری دوست کے ساتھ گھر بھجوانے کے بعد نجانے کون کون سی ترکیب اور ذریعے استعمال کر کے اس خبر کو پریس میں جانے اور اس ویڈیو کو کہیں بھی اپ لوڈ ہونے سے روکا۔ میں اس سلسلے میں اتنا کریزی ہو چکا تھا کہ کئی قریبی دوست مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ اس واقعے کی کئی اسٹل پکچرز اور ویڈیوز اسی فون

کی ایک فائل میں محفوظ ہیں، جس کا ٹائٹل "ماہ" ہے۔ اسے میں اکثر کھولتا تھا۔ دیکھتا تھا۔ اس واقعے کو یاد کرتا تھا اور میرے چہرے پر ایک نہ ختم ہونے والی مسکراہٹ بکھر جاتی تھی۔

"تھا، تھی۔" ماہ نور نے پڑھتے پڑھتے رک کر سوچا۔ "اس کا مطلب میں اور میرے لیے اس کی محبت بھی ماضی کا صیغہ بن گئی" اس نے فون کی اسکرین پر انگلی چلا کر "ماہ" نامی فائل دیکھی اور کھول لی۔

"سید پور فوک میوزک ایوننگ میں اس کے بے خود ہو کر لوگوں کے ہجوم میں کھڑے سعد سلطان کی طرف بڑھنے سے لے کر اس کے بازو پر رکھے اس کے ہاتھ پر دھرے سعد سلطان کے ہاتھ تک، اور اسی انداز میں کھڑے اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے تک ایک ایک لمحہ کی تصویریں اس فائل میں محفوظ تھیں۔ ویڈیوز جن میں تالیوں کا، سیٹیوں کا اور نعرے لگاتے، شور مچاتے ہوئے ہجوم کا شور تھا اور اس شور کے درمیان اس کا دیوانہ وار سعد کی طرف لپکنا اور اس کے بازو کو جھنجھوڑتے ہوئے اس سے سوال کرنا صاف نظر آرہا تھا۔

"اوہ خدا!" ماہ نور فون کی اسکرین کو سوائپ کرتے ہوئے واپس اس فائل پر آگئی جسے کچھ دیر پہلے وہ پڑھ رہی تھی۔

"اس واقعے کے بعد میں نے تمہارے لیے مزید کنفیوژن کا باعث نہ بننے کا فیصلہ کر لیا، تمہیں یاد ہے وہ فون کالز اور میسجز۔ میں تمہارے سامنے آنا چاہتا تھا، اپنی احمقانہ حرکتوں کا اعتراف کرنا چاہتا تھا، ان میسجز کے جواب اور کال پر بات کے دوران ہی میں اپنے بارے میں تمہاری کیفیت سے آگاہ ہو گیا تھا، قیافے اندازے لگانا تو کوئی مجھ سے سیکھتا۔"

ماہ نور ایک مرتبہ پھر اس لفظ سیکھتا، پر رکی اب اس کے ذہن میں الجھن کی کئی گرہیں پڑتی جارہی تھیں۔

"لیکن اس کے بعد جو ہوا، وہ میرے لیے ناقابل یقین تھا۔" اس نے آگے پڑھنا شروع کیا۔ "اتفاق سے میں نے تمہاری ملاقات سارہ خان اور اختر سائیں سے کروادی، ان دو ملاقاتوں نے میری سوچ کی ساری جہت بدل ڈالی۔ سارہ خان، اور اس کی صحت تندرستی اور اس کی زندگی میرے لیے بہت اہم تھی، مگر تم نے پہلی ہی ملاقات میں اس اہمیت کو ایک مختلف نوعیت عطا کر دی، تمہارے اس جذبۂ رشک و حسد پر میں کچھ دیر کے لیے محظوظ ہوا، اور تمہاری نظر میں اپنی حیثیت پر خوش بھی، لیکن اس سے پہلے کہ میں تم پر اپنے دل کا حال کھولتا، میں خود ہی تمہیں اختر کے پاس لے گیا۔

اختر کی تمہارے بارے میں گفتگو نے مجھے ڈرا دیا، مجھے اس کی باتوں کا حرف حرف بہت اچھی طرح یاد ہے، مجھے یقین تھا کہ اختر کی بات غلط نہیں ہوتی، میری وجہ سے کبھی تم پر پریشانی آئے، میں اس کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بس اس کے بعد میں نے خود کو اور تمہارے لیے اپنی محبت کو جھٹلانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد ہر ملاقات میں، میں نے دانستہ کوشش کی کہ تمہیں یہ تاثر دے سکوں کہ تم میرے لیے ایک نزدیک ترین دوست کی حیثیت رکھتی ہو۔ مجھے اعتراف ہے میں غلط کرتا تھا، مجھے اعتراف ہے تمہارے معاملے میں، میں نے حماقت کی حد تک لاپروائی اور بے نیازی برتی۔ میں اپنے لیے تمہاری تڑپ اور بے قراری دیکھتا اور محسوس کرتا تھا لیکن تم سے دل کی بات نہ کہہ کر خود شاید تم سے زیادہ تڑپتا اور بے قرار رہتا تھا۔

میں نے تم سے کئی بار کہا مجھے اپنی فیلنگز کے اظہار کا طریقہ نہیں آتا۔ میں نے تم سے کہا۔ میں بے نام منزل کا مسافر ہوں جبکہ مجھے خود ایسا لگتا تھا میں ہر اس راستے پر چلنا چاہتا ہوں جو مجھے تم تک لے جائے۔ اسی سلسلے میں تمہاری مایوسی اور بے چارگی دیکھنا میرے لیے ایک عظیم دکھ، ایک المناک ترین منظر تھا، لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے تمہیں خود سے اتنا مایوس کر دینا ہے کہ تم میرا تصور کرنا بھی بھول جاؤ۔

میں جانتا تھا کہ خود میں کتنا الجھا ہوا انسان تھا۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی خود کو محروم ترین شخص سمجھتا تھا،

ڈیڈی کے رویوں اور ان کے گریز نے مجھے اپنی ماں کے سلسلے میں جنونی بنا دیا تھا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میں اپنی ماں کو نہیں ڈھونڈ لینے یا ان کا کوئی نشان پانے کے لیے کیسا بھٹکتا پھرتا تھا۔ میرے سارے روپ، بہروپ، میرا ہر عمل، ہر غیر معمولی اور ناقابل یقین جگہ پر موجود ہونا صرف ماں کا نشان پانے کے لیے تھا۔ ڈیڈی نے اس سلسلے میں اتنی کہر آلود خاموشی اختیار کر رکھی تھی، جس کو توڑنا میرے لیے کبھی ممکن نہیں رہا۔

میرے اردگرد، آگے پیچھے کوئی بھی شخص میری ماں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا، نہ صرف یہ بلکہ ہر شخص ان کے بارے میں کوئی بات بھی کرنے سے گریزاں دکھائی دیتا تھا۔ اس جامد خاموشی نے ہی میرے اندر وہ تڑپ پیدا کردی جسے تم نے بھی دیکھا اور جس سے ابراہیم اور اختر بھی واقف ہیں۔ میرے سب غیر معمولی رویے اور عمل اس تڑپ ہی کا نتیجہ تھے۔

کبھی سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ وہ سب ایب نارمل رویے تھے۔ روپ بدل کر ایسی جگہوں پر چلے جانے سے کیا میری ماں کبھی مجھے مل سکتی تھی یا ان کا کوئی نشان میں پا سکتا تھا۔ مگر تم جانتی ہو ہر انسان کے ری ایکشنز مختلف صورت حالات میں مختلف ہی ہوتے ہیں۔ میرے ری ایکشنز نے میرے دونوں راستے کھوٹے کردیے، نہ میں اپنی ماں کی طرف جا پایا نہ ہی تمہاری طرف، میرے ہی جیسے لوگ ہوتے ہوں گے جو سب کچھ اختیار میں ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ پاتے ہوں گے۔

میرے ساتھ عجیب ہی قصہ ہوا، اپنی ماں کے بارے میں جاننے کا جنون میرے باپ کو میرے سامنے ایکسپوز کرتا گیا اور جوں جوں میں ان کے بارے میں جانتا گیا ویسے ویسے ہی ڈیڈی سے میرا رشتہ کمزور ہوتا چلا گیا، تمہیں یاد ہوگا، میں نے تم سے کہا تھا۔ مزاج کی سب پیچیدگیوں کے باوجود مجھے اپنے ڈیڈی بہت عزیز ہیں۔ مگر جیسے جیسے میں ڈیڈی کے بارے میں جانتا گیا انسان پر، انسانی تعلق اور انسانی رشتوں پر سے میرا اعتبار اٹھتا چلا گیا۔

میں تمہیں تمہارے چچا چوہدری سردار سے سنی وہ بات نہیں بتاؤں گا ماہ نور! جس کو سننے کے بعد مجھے کماری کے غیر اہم وجود کی اہمیت کا علم ہوا، میں تمہیں اپنے اندر اٹھتے اس طوفان کی خبر بھی نہیں سناؤں گا جس نے مجھے چچا سردار کے فارم ہاؤس سے آنا"فانا" نکل جانے پر مجبور کردیا، مگر میں تمہیں نور فاطمہ کے بالٹ کے بارے میں ضرور بتاؤں گا جس کو میں نے سمجھتے ہوئے بھی اگنور کردیا۔

نور فاطمہ، میرے لیے ایک تنبیہہ کی علامت تھی یا کسی نئے سبق اور تجربے کی، میں اس معاملے پر غور کرنا اور سوچنا ہی نہیں چاہتا تھا لیکن تمہارے لیے میرے دل میں یہ خواہش ضرور ہے کہ ایک بار تم کوٹلی فقیر چند کے سولنگ کے ساتھ تاحد نظر نظر آنے والے سبز کھیتوں کے درمیان بنی اسی کچی جھونپڑی میں ضرور جاؤ اور کچھ وقت وہاں گزار کر دیکھو، کیا تمہیں بھی وہاں صبر اور تشکر مٹی کی ان دیواروں سے لپٹے محسوس ہوتے ہیں، کیا تمہیں بھی وہاں رہ کر سکون اور طمانیت کا وہ احساس ملتا ہے جو جسم و جاں، روح و ذہن میں اٹھتے غصے، انتقام اور سب کچھ بھسم کردینے کے ارادے باندھنے والے شعلوں کو یکدم بجھا سا دیتا ہے۔

میرا دل چاہتا ہے ماہ نور! تم ایک بار صرف ایک بار نور فاطمہ سے ضرور ملو، اگرچہ میں جانتا ہوں کہ میل ملاقاتوں کے سلسلے میں تمہارے اپنے اسٹینڈرڈز ہیں اور تم اس سلسلے میں میرے فلسفے سے بالکل بھی متفق نہیں ہو، مجھے خانہ بدوشوں کی بستی میں تمہیں لے جانے والا واقعہ بھولا نہیں ہے، پھر بھی اگر کبھی مزاج گوارا کرے تو تم وہاں ضرور جاؤ۔

ماہ نور! میں تمہیں فضل حسین اور میمونہ آنٹی سے ملاقات میں ملنے والی معلومات اور فلزا ظہور کے سینے میں انی کی طرح گڑے دکھ کا احوال بھی نہیں سناؤں گا کیونکہ ان سب باتوں کا تم سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"فلزا ظہور۔" ماہ نور نے رک کر سوچا "فلزا ظہور کا کسی بھی بات سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔"

"میں تمہیں یہ سب اس لیے بھی نہیں بتاؤں گا۔" اس کی نظریں دوبارہ فون کی اسکرین پر دوڑنے لگیں۔ "کہ تم ان باتوں کو کسی تیسرے فرد کے بے کان بن کے سنو گی اور کسی تیسرے فرد کی سی نظر سے دیکھو گی، تمہارا ان کے سلسلے میں تجزیہ یکسر مختلف ہوگا، اور میں تمہیں کبھی سمجھا نہیں پاؤں گا کہ ان سب باتوں نے جو میں نے سنیں اور ان سب حقیقتوں نے جن کا میں نے نظارا کیا، میرے ذہن و دل پر کیا اثر کیا۔ تم شاید یقین نہ کر پاؤ وہ سب جان کر دنیا کی ہر چیز کی اہمیت میری نظر میں صفر ہو کر رہ گئی ہے۔ مجھے اپنا وجود بھی خلا میں معلق ادھر سے ادھر تیرتا پھرتا محسوس ہوتا ہے، میں کیوں ہوں، مجھے کیا کرنا ہے، مجھے کس راستے پر چلنا ہے، میری سمجھ سے ہر سوچ ختم ہوتی چلی جارہی ہے، اپنی بے وجودی کا احساس بڑھتا چلا جارہا ہے۔ وہ لوگ جو میرے باپ کی خود غرضیوں کی بھینٹ چڑھے ان کا غم دنیا کے ہر احساس پر حاوی ہوتا چلا جارہا ہے۔ کبھی اپنے باپ کو ختم کردینے کو دل چاہتا ہے اور کبھی خود اپنے آپ کو، اور کبھی دل چاہتا ہے ساری دنیا کو تباہ و برباد کردوں۔

جو میری کیفیت ہے ماہ نور! اس میں مبتلا ہونے کے بعد میں نے بارہا شکر ادا کیا۔ میں تم پر تمہارے لیے اپنے جذبات ظاہر نہ کرپایا۔ اگر اظہار کرچکا ہوتا تو اپنی بے وجودی سمیت تمہارے لیے کتنا بڑا عذاب بن جاتا۔ بہت سوچنے کے بعد سمجھ میں آیا ہے کہ میں اپنے تینوں ارادوں میں سے کسی ایک کو بھی عملی جامہ نہیں پہنا سکتا، نہ ہی میں وقت کا پہیہ الٹا چلا کر ساری غلط چیزوں کو درست کرسکتا ہوں، اس لیے میرے لیے بہترین راستہ یہ ہی ہے کہ میں اس پورے منظر سے آؤٹ ہوجاؤں۔ اپنے باپ سے اتنا دور چلا جاؤں کہ جتنی دوری پر جانے کے بعد انہیں ایک بار احساس ہوجائے کہ جن دلوں کو، جن رشتوں کو انہوں نے ایک دوسرے سے دور کیا۔ ان پر عمر بھر کیا گزری ہوگی۔

میں نہیں جانتا میں غلط کررہا ہوں یا صحیح۔ اختر کی باتیں اور نور فاطمہ کی جھونپڑی مجھے غلط قرار دیتی ہیں، مگر میرا تعقل مجھے درست کہتا ہے، ایک عمر میں نے ایک انجانے تعلق کی تلاش میں جگہ بے جگہ بھٹکتے گزاری۔ اب میں رک کر محسوس کرنا چاہتا ہوں کہ زندگی کی گہما گہمی اور اس کے سب کام، انسان کے سب پرانے تعلق جب رک جاتے ہیں تو کیسا لگتا ہے۔

اس وقت رات کے ڈھائی بج رہے ہیں اور صبح مجھے یہاں سے چلے جانا ہے، اس درمیانی وقفے میں مجھے کچھ اور نہیں سوجھ رہا، اس لیے یہ باتیں تمہارے لیے یہاں لکھے چلا جارہا ہوں، میرے یہ لفظ جنہیں شاید ہمیشہ ہی اس فائل میں محفوظ بند پڑے رہنا ہے، نہ کبھی تمہاری اس فائل تک رسائی ہوپائے گی نہ ہی تم یہ سب پڑھ پاؤ گی، لیکن میں نے اپنے دل کے سارے جذبے اور دماغ کی ساری منتشر سوچیں اس کے حوالے کیں اور ان کا مخاطب تمہیں بنایا، اس لیے ماہ نور! کہ میں یہ سب اگر کبھی کسی سے شیئر کرنا چاہتا تو وہ صرف تم ہوتیں۔

تم جو میری کوئین آف ہارٹ ہو تم جو میری واحد محبت ہو۔ تم جو کبھی میری باتوں، میرے اشاروں اور میری نظروں میں چھپے پیغام کو پڑھ سکیں نہ ہی سمجھ پائیں۔

تم جس نے خود ہی سے سارہ خان کو اپنی رقیب روسیاہ سمجھ لیا، اور اس سے رشک اور حسد کے رشتے میں خود کو باندھ بیٹھیں۔ کبھی جو میں تمہارے چہرے پر پھیلے رشک و حسد کے اس احساس کو یاد کرتا ہوں جو سارہ کے ذکر پر اپنا آپ چھپانہ پاتا تھا تو مجھے تم پر پیار آتا ہے اور میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ تم جو صاف چھپتی بھی نہیں تھیں اور سامنے آتی بھی نہ تھیں مگر مجھ سے کیسے بچ پاتیں، لو ایٹ فرسٹ سائیٹ کا سوال پوچھنے والی تم نے کتنی امید کے ساتھ مجھ سے جواب مانگا تھا۔

تمہارے سوال کو ٹالتے ہوئے میرے دل پر بھی قیامت گزری تھی اور اس روز مجھ پر بھی یہ حقیقت واضح ہوگئی تھی کہ محب اپنے محبوب کو کبھی آزمائش میں نہیں ڈالتا، اختر نے کہا تھا۔ تم میری وجہ سے آزمائش میں پڑو گی۔ اس

کی اسی بات کو دل سے لگا کر میں تم کو اور تمہارے جذبے کو نظرانداز کرتا رہا۔ مجھ سے تمہاری بدگمانی میرے سر آنکھوں پر سویٹ ہارٹ مگر تمہاری آزمائش مجھے کسی طور قبول نہیں۔"

ماہ نور کی آنکھوں سے آنسو بھل بھل بہہ رہے تھے فون کی اسکرین اس کی نظروں کے سامنے دھندلی ہو رہی تھی۔

"تمہارے لیے میرے دل میں بہت دعائیں ہیں اور بے شمار خواہشیں ہم تم مسکراتی ہوئی بہت اچھی لگتی ہو خدا کرے تم ہمیشہ مسکراتی رہو۔

تمہارے شانوں پر پڑے بال تمہاری اپنی کسی بھی کوشش کے بغیر اتنے سجے ہوئے اور شان دار لگتے ہیں کہ انہیں کسی بھی ہیئر ڈریسر کی کبھی ضرورت نہیں پڑے گی۔

تمہاری آنکھوں کی چمک ستاروں کی چمک کو ماند کر دیتی ہے خدا کرے تمہاری آنکھوں کی یہ چمک ہمیشہ اسی طرح قائم رہے کیونکہ لڑکی تمہیں خدا نے جیسا بنایا ہے تمہارا ویسا ہونا ہی دیکھنے والے کو مبہوت کر دیتا ہے۔

خدا کرے تم ہمیشہ ایسی ہی رہو جیسی تم ہو کم از کم میرے خوابوں میں میری سوچوں میں میرے تصور میں تم ہمیشہ ایسی ہی رہو گی جیسا خدا نے تمہیں بنایا ہے۔

میں اس فون کے ساتھ نور فاطمہ کے دیے وہ تحفے جو اس نے مجھے میری دلہن کے لیے دیے تھے تمہارے لیے رکھ رہا ہوں کیونکہ اگر جو میں اتنا خوش قسمت ہوتا کہ تمہیں پا سکتا تو میں یہ سب چیزیں تمہیں ہی دیتا۔ اب نجانے کتنے برس یا شاید ہمیشہ یہ یونہی پڑی رہیں گی تم کبھی ان تک پہنچ پاؤ گی نہ انہیں دیکھ پاؤ گی کیونکہ میں اتنا خوش قسمت تو ہوں ہی نہیں کہ میرا اظہار تم تک پہنچ جائے لیکن کاش یہ پہنچ جائے۔

لیکن کبھی سوچتا ہوں کاش یہ کبھی تم تک نہ پہنچے۔ کیونکہ مجھے تم سے صرف محبت ہوتی تو شاید تمہیں میرا اعتراف اور اظہار تکلیف نہ دیتا مگر کیا کیا جائے کہ مجھے تم سے صرف محبت نہیں مجھے تم سے عشق ہے ماہ نور! عشق جو پھولوں جیسی زندگی کو اجاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ تم تک یہ الفاظ اور یہ اظہار پہنچے یا نہ پہنچے میرے دل کا ایک بوجھ تو اس فائل میں منتقل ہو گیا میں نے کسی کو تو شریک راز کر لیا۔"

آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کے پار دھند بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ الفاظ معدوم ہونے لگے تھے۔

✡ ✡ ✡

"آپ اب آئے ہو صاحب! فقیر تو کئی سالوں سے کٹیا جمائے یہاں بیٹھا ہے" فقیر کا ورا ک منتظر تھا اور اس کی حسیات گواہی دے رہی تھیں کہ آپ کبھی تو آؤ گے ہی" اختر نے اپنے سامنے بیٹھے بلال سلطان سے کہا۔

"راستہ کھلے اور قدم مڑیں' آنا تو تب ہی ممکن ہوتا ہے سائیں اختر!" بلال نے نیچی آواز میں کہا اور اختر کی کٹیا کے فرش پر بکھرے تنکوں پر نظر جمالی۔

"یہی تو عرض کر رہا ہوں کہ راستہ بھی کھلنا تھا اور قدم بھی مڑنے ہی تھے بس وقت کا تعین انسان کے بس کی بات نہیں۔" اختر نے گڑ گڑی ہاتھ سے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ جیسوں کو پہچاننے کے لیے جس نظر کی ضرورت ہوتی ہے' وہ مجھیں اب ہی عطا ہوئی۔" بلال نے بدستور گھاس کے تنکوں پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

"کمال کی بات تو یہ ہے کہ آپ سے کہیں پہلے وہ نظر سعد سلطان کو عطا ہو گئی۔" اختر ہلکا سا مسکرایا۔

"اس کو نظر عطا ہو چکی ہوتی تو حقیقت بھی روشن ہو جاتی' اس کی نظر تو چوک چکی جب ہی اس نے سامنے نظر

آتی حقیقت سے منہ موڑلیا۔" بلال کے لہجے میں شکوہ اُترا۔

"آپ سمجھتے ہو' یہ اس کا قصور ہے کہ اس کی نظر چوک گئی' آپ سمجھتے ہو' اس نے سامنے نظر آتی حقیقت سے منہ موڑلیا۔" اختر نے سوال کیا۔

"نہیں۔" بلال نے سرہلایا۔ "میں اپنے قصور کا اعتراف کرتا ہوں' لیکن اس بات سے بھی متفق نہیں ہوں کہ اس کو نظر عطا ہو گئی' وہ عطا ہو چکی ہوتی تو میری قصورواری اس کے راستے کا پتھر بھی نہیں بنتی۔"

"بابا!" اختر بے اختیار ہنس دیا۔ "میں ان سے ہتا رہا باؤ صاحب! یا زن پالو یا من پالو' وہ دونوں کے درمیان پھنس کر رہ گئے اور جب دونوں کی گرفت سے نکلنے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آیا تو دونوں کو ادھورا چھوڑدیا۔"

"وہ ہاں کیا سائیں اختر اور اسے کب واپس آنا ہے؟" بلال کے لہجے میں اضطراب اترا۔

"اس نے سب جانتے ہوئے منہ موڑا ہے صاحب! آپ کے گریز نے اسے حقیقت کا سامنا ہو جانے پر اس کے سچ اور جھوٹ' صحیح اور غلط کی کھوج میں جانے سے پہلے' حقائق وواقعات کا نتارا کرنے سے پہلے ہی منہ موڑنے پر مجبور کردیا' میں نے اس سے کئی بار کہا' اس سے منہ نہ موڑنا جو تم سے سچا پیار کرتا ہے۔ راستہ کھوٹا کر بیٹھو گے' راستے کے ادھر ادھر بکھرے چھوٹے چھوٹے پتھر ایک جگہ جمع ہو کر تمہارے لیے ایک ایسا کوہ گراں بن کر رہ جائیں گے جسے سر کیے بغیر نہ من کو مکمل طور پر پاسکو گے نہ زن کو۔" اختر کے لہجے میں تاسف تھا۔

"لیکن وہ بھی کیا کرتا۔ اس کی عمر ہی ایسی ہے۔ جو بندے کی نظر کو چوک کا شکار کردیتی ہے۔ اسے نور فاطمہ کی جھونپڑی اور اس کی مہمان نوازی پر بھی شک ہونے لگتا ہے اور اختر کے ڈیرے کے لنگر کے شہرت میں بھی ملاوٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔ اوپرے دل سے اگر کوئی کام کر بھی لیا جائے صاحب تو اس کی worth وہ نہیں رہتی' جو پورے دل سے کیے کام کی ہوتی ہے۔ اب اس نے خود کو راستے کی آزمائش میں ڈال لیا ہے' یہ کوہ گراں سر کیے بغیر اس کی واپسی ناممکن ہے۔"

"سب میرا قصور ہے سائیں اختر!" بلال نے سرہلایا' "میں جو خود کو دنیا کا بہترین کیلکولیٹر سمجھتا تھا' شمار ہی نہیں کرپایا کہ حالات کا رخ کدھر کو مڑرہا ہے' اس کے لاابالی پن کو اس کی شخصیت کا حصہ سمجھ کر دانستہ نظرانداز کرتا رہا' کاش کبھی اسے بٹھا کر حالات کی تفصیل سنا دیتا اور واقعات کا بیان بھی' میری ہی وجہ سے وہ اپنا راستہ کھوٹا کر بیٹھا' من بھی اس کی دسترس میں تھا اور زن بھی' میری ہی وجہ سے وہ دونوں سے منہ موڑ گیا' آپ جانتے ہو سائیں جی!" انہوں نے اختر کی طرف دیکھا۔ "میری زندگی کے سارے اکاؤنٹس پچھتاووں کی دولت سے بھرے ہوئے ہیں۔ میں نے زندگی کے ہر اہم محاذ پر مناسب وقت کا انتظار کرنے میں وقت ضائع کرکے مار کھائی ہے۔ میری گنتی اور میرے شمار سب میری عقل کا دھوکا ثابت ہوئے۔" انہوں نے تاسف سے سرہلایا۔

"آپ جیسے انسان پر اللہ کا یہ کرم بھی بڑا خاص ہے صاحب کہ اس نے آپ کو اپنے قصور کا اعتراف کرنے' پچھتاووں کو کیلکولیٹ کرنے اور کسی کے سامنے سرجھکا کر بیان کرنے کا موقع عطا فرمادیا۔ اب جایئے اپنی ساری اغلاط کو درست کرنے میں کچھ وقت صرف کیجیے۔ زندگی کی بساط کے جو مہرے غلط خانوں میں چلے گئے' انہیں واپس ترتیب دینے کی کوشش کیجیے۔ فقیر کو یقین ہے کہ بگاڑ ہے تو سہی مگر اتنا نہیں جتنا آپ سمجھ بیٹھے ہیں' بس ایک دست مسیحا پھیرنے کی دیر ہے' بہت سی اغلاط درست ہو جائیں گی کیونکہ آپ کی نیت میں کھوٹ تھا نہ من میں جھوٹ۔"

بلال نے چونک کر اختر کی طرف دیکھا' وہ گڑگڑی کے کش لگاتا ہوا ان کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا' اس کی

نظریں انہیں یقین دلا رہی تھیں کہ جو کچھ اس نے کہا وہ سچ تھا۔

☼ ☼ ☼

"آج موسم کی صورت حال اس روز سے بھی زیادہ عجیب ہے۔" وو دن نے سر جھٹکتے ہوئے کہا' "برف گرتی ہے' گرنا بند ہوتی ہے اور سورج اپنی روشنی بکھیرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا ہے' بادل اور آسمان سے گرتی برف اپنا زور لگا کر پھر سے میدان میں آتی ہے اور نظر کو دھوکا دینے میں خاصی حد تک کامیاب ہو جاتی ہے۔ میں تو آگے نہیں جاؤں گا۔ یہیں بیٹھ کر لفٹ کا انتظار کروں گا' لفٹ آتی ہے تو واپس چلتے ہیں۔"

"مجھے لگتا ہے' تم مجھے سکی انگ کرنے کے بجائے آتشدان کے پاس بٹھا کر دنیا بھر کی گپ بازی میں مصروف رکھنا چاہتے ہو۔" سعد نے اپنا ہیلمٹ درست کرکے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھو' میں یہاں سکی انگ کرنے آیا ہوں' برائے مہربانی مجھے وہ بھی کرلینے دو۔"

اسے سامنے تاحد نظر سفید برف نظر آرہی تھی اب تک وہ سکی انگ کی شوق میں اتنا طاق تو ہو ہی چکا تھا کہ اس اونچائی کے پورے راستے پر پھسلتا اس کی آخری حد دیکھ کر واپس آسکے۔

"نہیں۔ اس غیر یقینی موسم میں تو ہرگز نہیں' یہ ایک ایسا دن ہے' جس کے بارے میں پیش گوئی بھی نہیں کی جاسکتی کہ کب کیا صورت حال ہو۔" وو دن زادے نے انکار میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

"آتش دان کے پاس بیٹھ کر روٹین سے بھرپور غذا کھاتے کھاتے تم چند دنوں میں بوڑھے ہو چکے ہو وو دن! اس دن تو تم ایسے نہیں تھے جب میں پہلی بار تم سے ملا تھا۔" سعد نے اپنی سکی اسٹکس پر وزن ڈالتے ہوئے کہا۔

"چلو پھر بوڑھے انسان! تم یہیں بیٹھ کر میرا انتظار کرو' میں ابھی آیا۔" اس نے اسکیٹس پر دباؤ ڈال کر آگے پھسلتے ہوئے کہا۔

"سعد! بات سنو۔ صرف میں ہی نہیں تم بھی آگے نہیں جارہے۔" وو دن بلند آواز میں بولا مگر اس کی بلند آواز اس جمار ہوت چھیلی خاموشی سے ٹکرا کر واپس اسی تک آگئی تھی' اس کا مخاطب آگے آگے پھسلتا اس کی نظر سے کہیں فاصلے پر جا رکا تھا۔

"سعد! سورج کی کرن ایک بار پھر نمودار ہونے کی کوشش کررہی ہے' واپس آجاؤ۔ تمہاری نظر ابھی اتنی پختہ نہیں ہوئی کہ برف پر پڑتی سورج کی کرن کے زاویے کو جانچ سکے۔" وو دن بے قراری سے اٹھ کر آگے بڑھا تھا مگر اس کی آواز اس کے دوست کے کان تک پہنچ نہیں پائی تھی۔ سو وہ بے بسی سے وہاں کھڑا اسے آگے جاتا دیکھ رہا تھا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے سورج کی کرن نے ایک بار پھر بادلوں سے مات کھائی اور برف کے گرتے گالوں کے پیچھے چھپ گئی' اس وقت کے کسی ہزارویں حصے میں اس کی سامنے دیکھنے کی کوشش میں سکڑی آنکھوں نے سعد کے وجود کو کئی فٹ اوپر اچھل کر کہیں دور گرتے دیکھا تھا۔ وہ بے قراری سے آگے پھسلتا سعد کے قریب چلا گیا تھا۔ اس کے پاکستانی دوست کا وجود نظر کے دھوکے کا شکار ہو کر برف کے پہاڑ پر ساکت پڑا تھا۔ کائنات میں ہر طرف موت کی سی خاموشی چھا چکی تھی اور برف کے گالے سک سک کرتے تیزی سے سعد کے بے حس و حرکت پڑے وجود کو ڈھانپ رہے تھے۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

عنیزہ سیّد

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم

"میرا خیال ہے میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم اب اس کے پیچھے جا رہے ہیں نہ ہی اس کی کوئی بات کر رہے ہیں" بلال سلطان کا لہجہ اور بات ابراہیم کے لیے حوصلہ افزا ہرگز نہیں تھی۔

"لیکن انکل! میں نے بتایا ناکہ یہ لڑکی تو ویسے ہی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" اس نے منمنا کر ایک کوشش مزید کرنا چاہی۔

"تمہارا کیا خیال ہے، میں بہت فارغ ہوں جو جب کوئی مجھ سے ملنا چاہے میں اسے ملنے کے لیے Available (دستیاب) ہو جاؤں۔" وہ سخت اور خشک لہجے میں بولے۔

"نہیں۔ ہرگز نہیں انکل! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں" ابراہیم نے زبان پھیر کر اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا ہے کہ اسے میں اپنے مان پر لایا تھا۔" اس نے ایک جذباتی وار کھیلنے کی کوشش کی "میں نے ہی اسے یقین دلایا تھا کہ انکل میری بات کو اون کرتے ہیں کیونکہ مجھے وہ اپنے بیٹے جیسا ہی سمجھتے ہیں۔"

—۲۴—
چوبیسویں قسط

صبح سے سرما کی پہلی بارش کی کن من جاری تھی' خدیجہ نے آتش دان میں نصب گیس ہیٹر کی ناب گھما کر اپنی سماعت اس میں سے اٹھنے والی آواز کی طرف لگائی' ہیٹر سے گیس نکلنے کی سرسراتی آواز آرہی تھی۔

"شکر ہے' ابھی گیس بند نہیں ہوئی۔"

انہوں نے ہیٹر کی ناب گھما کر بند کی اور دیا سلائی جلا کر دوبارہ گیس آن کرکے ہیٹر جلا دیا۔ آہستہ آہستہ حدت بند دروازوں والے اس کمرے میں پھیلنے لگی۔ وہ ہیٹر کے قریب سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئیں۔ کھڑکی کا پردہ برابر کرتے ہوئے انہوں نے کھڑکی سے پار باہر کے منظر پر نظر ڈالی تھی۔ گرد و غبار میں اٹے پیڑ پودے دھل اور نکھر گئے تھے۔ پردہ برابر کرکے واپس ہیٹر کے قریب صوفے پر آبیٹھیں۔

"فاطمہ ابھی تک بستر میں دبکی بیٹھی ہے' اسے تو بچپن سے ہی سردی ہم سب سے زیادہ لگا کرتی ہے' بستر میں گھسی کتابیں پڑھ رہی ہوگی' نجانے اپنے کمرے کا ہیٹر بھی جلایا اس نے کہ نہیں' کہاں جلایا ہوگا' سستی کے مارے اٹھ کر چیک کرنے کی بھی کوشش نہیں کی ہوگی کہ گیس آئی یا نہیں۔" خشک میووں سے بھری ٹرے سے پستے اور کاجو نکال کر کھاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھیں۔

سرما کی پہلی بارش۔۔۔ اب اس میں وہ مزا کہاں جو کبھی ہوا کرتا تھا' کئی کئی راتیں اور کئی دن مسلسل قطرہ قطرہ برستی رہتی تھی' چپ چاپ بغیر آواز کے بغیر بادل کی کڑک اور بجلی کی چمک کے۔

خدیجہ تو ستلجیا میں مبتلا ہو گئیں۔

"اب تو یہی ایک دو گھنٹہ برسے گی اور بس ختم۔۔۔ اب تو موسموں کے بدلنے سے یہ احساس شدت پکڑنے لگتا ہے کہ گرمی بڑھے گی تو بجلی کی لوڈشیڈنگ بڑھ جائے گی اور سردی بڑھے گی تو گیس کی لوڈشیڈنگ ہیٹر اور چولہے ٹھنڈے کردے گی' رہنے کو بستیاں بڑھیں' بستیوں میں بسنے والے انسان بڑھے' انسانوں کی سہولت کے لیے نت نئی ایجادات بڑھیں اور پھر انسانوں کی گنتی کے دباؤ کے نیچے سب کچھ کم ہونے لگا' برقی آلات میں زندگی دوڑانے والی بجلی کی پیداوار کم ہو گئی' استعمال کے لیے انسان بڑھنے لگے' سوئی کے مقام سے گیس برآمد ہوئی تو دعوا کیا گیا' یہ ذخائر ہزاروں برس کے لیے کافی ہیں۔ کوئلہ' لکڑی' اُپلے استعمال کرنے والے انسان نے اپنے چولہوں کا ماڈ بدل لیا' گھر گھر سوئی سے چلتی' پائپوں سے گزرتی گیس چولہے روشن کرنے لگی' لیکن پھر نجانے کیا ہوا' وہ گیس استعمال کرنے والے انسان بڑھے یا اس کو فراہم کرنے والے انسانوں کے پیٹ بڑھ گئے جو بھی ہوا سوئی سے چلنے والی گیس کے پائپ تنگ پڑ گئے اور پھر کم پڑنے لگے' نتیجہ انسان پھر انہی کوئلوں' لکڑیوں اور اپلوں کے پاس واپس ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا چلو میرے پیارو چل کر میرا چولہا روشن کردو' ورنہ میں تو خالی پیٹ سونے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

سوچتے سوچتے خدیجہ اپنی ہی سوچی بات پر بے اختیار مسکرادیں۔ پھر بیل بجنے کی آواز پر چونک گئیں۔

"ہائیں! اس بارش میں اس وقت کون آگیا۔" انہوں نے حیران ہوتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں کہا اور کھڑکی کے قریب جا کر پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ بند گیٹ کے نچلے حصے سے باہر کھڑے کسی شخص کے جوتے نظر آرہے تھے۔ گیٹ کے اوپری حصے سے باہر فضا میں اڑتا ہلکا سا دھواں بھی نظر آرہا تھا جیسے کسی ایسی کھڑی گاڑی سے نکل رہا ہو۔ جس کا انجن بند نہ کیا گیا ہو۔ اطلاعی گھنٹی ایک مرتبہ پھر بجی۔

"انٹرکام بھی کئی دن سے بے کار پڑا ہے' ورنہ اندر سے ہی پوچھ لیتی کون آیا ہے' اب اس برستی بارش میں بھیگتے ہوئے گیٹ تک تو جانا ہی پڑے گا۔" انہوں نے چھاتا اتارا اور گیٹ دے پر جاکر اسے کھول کر خود پر تانا۔ کال بیل مسلسل بج رہی تھی۔ "صبر بھئی صبر' آرہی ہوں۔" انہوں نے بلند آواز میں پکار کر کہا اور گیٹ کے قریب پہنچ کر اسی بلند آواز میں پوچھنے لگیں۔ "کون ہے بھئی؟"

"گیٹ تو کھولو کوئی بھیا' یہیں کھڑی کھڑی بہہ جاؤں' ہوں تو مٹی سے ہی بنی ہوئی نا۔" باہر سے ایک نسوانی آواز آئی۔ خدیجہ نے گیٹ کھول دیا۔ لمبے رین کوٹ میں ملفوف' سر پر تنے چھاتے کے اندر سے جھانکتی وہ شکل یقیناً مانوس سی تھی لیکن خدیجہ کو فوری طور پر نہ نام یاد آیا نہ ہی حوالہ۔

"یوں تو میرے پیچھے جاسوس بھیجے تھے تم دونوں نے اور اب میں سامنے کھڑی ہوں تو مجھے پہچان ہی نہیں پا رہیں۔" آنے والی نے کہا اور گردن موڑ کر اپنے عقب میں کھڑی گاڑی کے ڈرائیور سے مخاطب ہوئی۔

"تم اب جاؤ' ایک گھنٹے بعد آجانا۔" گاڑی آگے بڑھ گئی۔ آنے والی نے گردن موڑ کر واپس خدیجہ کی طرف دیکھا۔

"آیا یاد یا نہیں؟ ظلّا ہوں میں ظلّا ظہور۔" آنے والی نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

کھاری اپنی زندگی کے سب سے مشکل موڑ پر آ کھڑا ہوا تھا۔ وہ سعدیہ اور آپا رابعہ کو یقین دلانے میں ناکام ثابت ہو رہا تھا کہ اپنے باپ اور بھائی کے سلسلے میں جو دعوا وہ کر رہا تھا وہ سو فیصد وہی تھا جو اس نے سنا تھا۔ اسے زندگی کے مشکل ترین موڑ پر لا کھڑا کرنے والی وہ عورت جو اسے کسی "بجھل پائی" جیسی بد شکل اور استانی حمیدہ جیسی کرخت لگی تھی۔ اچانک کہیں غائب ہو گئی تھی' ڈرامائی طور پر اس بجھل پائی کی بات کی تائید کرنے والے چوہدری صاحب اپنے کاروباری دوستوں کے ساتھ دریائی مچھلی کے شکار پر نکل چکے تھے۔ اب اپنی بات کا یقین دلانے کے لیے کھاری اپنے گواہ کے طور پر کسے سامنے لاتا۔ مایوس اور بے بس کھاری کے پاس اس وقت خاموش ہو جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ اپنے دل و دماغ کی کیفیت کسی کے سامنے بیان بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جن حقائق سے آگہی' اسے پاؤں سے اکھیڑ ڈالنے کے مترادف تھی' وہ زبردستی اس کے کانوں میں انڈیل دی گئی تھی' وہ نہ خود میں رہ پا رہا تھا نہ خود سے جدا ہو پا رہا تھا۔ اسے اپنی ذات' پہلے سے بھی زیادہ ہلکی' بے وقعت اور ادھوری لگنے لگی تھی' اگر وہ سب سچ تھا جو چوہدری سردار کی مہمان کہہ رہی تھی تو وہ لڑکا جس کا نام سعد سلطان تھا' آسمان پر کیوں نظر آتا تھا اور خود وہ آسمان سے بہت دور بہت ہی نیچے زمین پر کیوں کھڑا تھا۔ حالات کی گرد میں سر تاپا اٹا ہوا چیونٹی کی طرح حقیر' وہ کیوں سعد سلطان کی طرح آسمان پر چاند بن کر نہیں چمک سکا تھا۔ اگر وہ اور سعد سلطان ایک ہی باپ کی اولاد تھے تو باپ نے ایک کو آنکھوں کا نور اور دوسرے کو پاؤں کی دھول کیوں بنایا تھا۔

کھاری سوچنا نہیں چاہتا تھا' مگر سوچیں اس کے دماغ میں اٹھتی تھیں اور اس کے پیٹ میں گرہیں ڈالتی جاتی تھیں اس پر المیہ یہ تھا کہ کوئی دوسرا شخص اس کی بات سننے کے موڈ میں نظر آتا تھا نہ ہی سمجھنے کے' اسے اس وقت دنیا میں اپنے آپ سے زیادہ تنہا کوئی دوسرا شخص نظر نہیں آتا تھا۔ کھاری کو زندگی میں پہلی بار اپنے ہونے پر دکھ محسوس ہونے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

نادیہ نے پاؤں سے جوتے اتارتے ہوئے سامنے دیکھا' کھڑکی کے شیشوں سے پردے ہٹے ہوئے تھے اور باہر آسمان سے گرتی ہلکی برف کے روئی کے سے چھوٹے چھوٹے گالے زمین پر اتر کر تھم جاتے تھے۔ کہر آلود لندن' سرما کی مخصوص برف باری کی زد میں تھا۔ منجمد کر دینے والا درجہ حرارت زندگی کو مفلوج کر دینے کی کوشش میں مصروف تھا' مگر زندگی رواں تھی۔ نادیہ نے چہار طرف پھیلی برف کی سپیدی کو دیکھا اور کچھ یاد کرتے ہوئے مسکرا دی۔

فن لینڈ کے برف کے قبرستان جیسے اندھیرے اور یخ بستہ موسموں کی سختی سے نبرد آزما ہوتے ہوئے زندگی اس پر مہربان ہوئی اور پہلے اس نے ہیلسنکی ہی میں اس کے لیے سکون کے سانس لینے کا کیسا موقع فراہم کیا تھا۔ اسے

ہیلسنکی کے یوتھ ہوسٹل کی سخت زندگی سے — ایک آرام دہ اور فرنشڈ کمرے کی طرف سفر کا منظر یاد آیا اور پھر اس آرام دہ، پرسکون زندگی کی دین کا خیال آیا جس نے اسے ایک دن دیکھی طاقت سے ذہنی، جذباتی، جسمانی اور نظریاتی طور پر منسلک ہونے کی راہ پر ڈال دیا تھا۔

"کیسا انقلابی فرق ہے، میرے کل اور میرے آج میں۔ بے وجودی کے احساس سے لے کر وجود کو پالینے تک کا فرق۔ اور یہ سب کبھی ممکن نہ ہوتا اگر زندگی میں اچانک کہیں سے تم نہ آجاتے۔"

اس نے کھڑکی کے قریب رکھی گول میز پر سجے فوٹو فریم میں جڑی تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ "کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ تم انسان ہو یا انسان کے روپ میں مہمان فرشتے۔" اس نے سوچا اور اس تصویر سے مخاطب ہوئی۔

"کیا تم خود بھی جانتے ہو کہ تمہارا وجود کتنی بڑی خوشی ہے، اتنی بڑی خوشی کہ اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ کتنا عرصہ ہو گیا، تم سے رابطہ نہیں ہوا، مگر وہ دل اور روح کا تعلق ہے، جو ہر دم مجھے تمہارے ہونے کا احساس دلاتا رہتا ہے جو ہمیشہ مجھے یقین دلاتا رہتا ہے کہ تم جہاں بھی ہو مجھ سے دور نہیں ہو، جو ہر دم میرے لبوں کو اور میرے ہاتھوں کو تمہارے لیے دست دعا بنائے رکھتا ہے، تم جہاں بھی ہو، جو بھی کر رہے ہو۔ سلامت رہو، آباد رہو، تم خوشی ہو ہمیشہ خوشی کا احساس بنے رہو۔"

تصویر سے باتیں کرتے اس کی نظر اپنے فون پر پڑی جس کی اسکرین روشن ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے قریب رکھا فون اٹھایا، فون پر ایک انجان نمبر کی طرف سے اس کے لیے پیغام موجود تھا۔

"تم فوراً" ڈارلنگٹن میموریل اسپتال پہنچ جاؤ جو کہ تین ہزار نو برن ایونیو پر واقع ہے۔" پیغام اسے ہدایت کر رہا تھا۔ اس نے حیران ہوتے ہوئے اس نامعلوم نمبر پر کال کی، کچھ دیر تک بیل بجتے رہنے کے بعد نمبر مصروف کر دیا گیا، وہ نمبر کس کا ہو سکتا تھا اور وہ پیغام اسے کیوں بھیجا گیا تھا۔ اسے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ موبائل کی میسج ٹون ایک بار پھر بجی اور اس کی اسکرین روشن ہوئی۔

"سوچنے میں وقت ضائع کیے بغیر فوراً" اس اسپتال پہنچ جاؤ، یہاں تمہارے لیے ایک ایمرجنسی جیسی صورت حال ہے۔"

پیغام کہہ رہا تھا اس نے مزید کچھ سوچے بغیر اپنے فون پر نقشوں کی سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بتائے گئے پتے کی تصویر لی اور اسے محفوظ کرنے کے بعد تیزی سے دوبارہ جوتے پہننے لگی۔

☼ ☼ ☼

"تم نے وہ سب دیکھ لیا جو تمہارے لیے اس لفافے میں محفوظ تھا؟"

بلال سلطان نے ڈنر کے دوران ماہ نور سے پوچھا۔ انہیں اس لڑکی کے مرجھائے ہوئے چہرے اور سوجی ہوئی آنکھوں سے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ کس کیفیت سے گزر رہی ہے۔

"نہیں، میں اسے پوری طرح نہیں دیکھ پائی، شاید مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔" اس نے ڈائننگ ٹیبل پر رکھی کہنی کے سہارے اپنا ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ کر اپنے تئیں اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت کسی سے بات کرنا چاہ رہی تھی نہ کسی کا سامنا کرنے کی ہمت خود میں پا رہی تھی۔

"ہوں!" بلال سلطان اس کا جواب سننے کے بعد چند ثانیے اسے غور سے دیکھتے رہے پھر گہرا سانس لیتے ہوئے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا "مجھے تم سے معذرت کرنا تھی کہ تم سے پہلے میں وہ سب کچھ دیکھ چکا تھا۔" انہوں نے لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر ماہ نور کی طرف دیکھا۔ وہ ہنوز اسی انداز میں بیٹھی تقریباً" خالی پلیٹ

میں کانٹا گھما رہی تھی۔

"اسی لیے میں اس وقت بھی جانتا تھا کہ میرے بیٹے کی کوئین آف ہارٹ تم ہی ہو، جب میں نے پہلی بار تم سے وہ سوال پوچھا تھا۔"

ماہ نور نے چونکتے ہوئے ایک لحظے کے لیے ہاتھ روک کر ان کی طرف دیکھا۔

"تمہارے انکار پر میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کی طرح میں بھی تمہیں نہیں بتاؤں گا کہ وہ لڑکی تم ہو۔" وہ دوبارہ کھانے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے۔ "شاید میں نے یہ اندازہ کرنے کے لیے ہی تم سے پہلی ملاقات میں وہ سوال کیا تھا کہ تم اس کے دل کی کیفیات سے کس حد تک واقف ہو جبکہ میں جانتا تھا، تم ماہ نور تھیں اور تم ہی اس کے لیے اتنی پریشان اور سرگرداں ہو سکتی تھیں جیسی پہلی ملاقات میں تم نظر آئیں۔"

ماہ نور کی آنکھیں بھر آئیں اس نے اپنے چہرے کو چھپانے کے لیے اپنے ہاتھ کو چہرے پر مزید پھیلا لیا۔

"کچھ حقیقتوں کا انکشاف اگر موزوں ماحول اور موزوں وقت پر ہو تو انسان کو اپنی زندگی میں ہر طرف پھول ہی پھول کھلتے نظر آتے ہیں، لیکن وہی خوشگوار حقیقتیں ببول اگا دیتی ہیں جب وہ ایسے وقت اور ایسے ماحول میں منکشف ہوتی ہیں جب دل کی بستی بنجر، ویران اور خشک ہو رہی ہوتی ہے۔ میرا دل تمہاری لاعلمی اور غلط فہمی کو دیکھ کر چاہنے لگا کہ تمہیں محبت بلکہ سعد کے الفاظ کے مطابق عشق کے اس اظہار سے بچالوں جو تمہارے دل میں پھول کھلانے کے بجائے ببول اگا دے۔ تم سے دوسری ملاقات حیرت انگیز تھی۔ تمہارے انداز، اعتماد اور تمہارے لہجے کی Surity نے مجھے حیران کر دیا۔ چھتیس گھنٹے پہلے تم ایک ہاری ہوئی، دل شکستہ لڑکی نظر آرہی تھیں اس انکشاف نے صرف چھتیس گھنٹوں کے اندر تمہیں سراپا بدل کر رکھ دیا۔ یہ انکشاف تم پر اچانک کیسے وارد ہوا میں بے خبر ہوں، مگر میں اس جذبے کی طاقت کا پہلے بھی قائل تھا، تمہاری کیفیت دیکھ کر میرا یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔" وہ کہہ رہے تھے۔

"اور اب!" ماہ نور نے اپنے ہونٹوں سے ہاتھ ذرا سا ہٹاتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ "اب میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے، میں انکشاف کی طاقت کی تصویر نظر آتی ہوں یا نارسائی کے کرب کی۔"

"دونوں کی درمیانی کیفیت کی۔" وہ نرمی سے بولے۔

"آپ۔" ماہ نور نے بے چینی اور وحشت زدہ انداز میں ان کی طرف دیکھا۔ "آپ کے لیے سب کچھ ممکن ہے؟" اس کی آواز بھرا رہی تھی، "یہ پوری دنیا آپ کی رسائی کے لیے محض ایک چھوٹا سا گاؤں ہے پھر آپ کیوں پتا نہیں کرتے، آپ کیوں اس کے پیچھے جا کر اسے ڈھونڈ نہیں لاتے، اپنے لیے نہ سہی، میرے لیے ہی ایسا کر دیں، پلیز۔ میں آپ کی منت کرتی ہوں۔ میرے لیے اسے ڈھونڈ لائیے، میں کمزور ہوں اور میری رسائی بہت محدود ہے۔ پلیز آپ کچھ کیجیے، خدا کے واسطے اسے ٹریس کریجیے۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے اور اس نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بلال نے اس کی آنکھوں سے بہتے ان آنسوؤں کو دیکھا۔ اس کے منتشر بالوں اور گلابی ناک پر نظر ڈالی اور سامنے دیکھنے لگے۔

"سائیں اختر تم نے کہا تھا کہ یہ لڑکی سعد کی وجہ سے آزمائش میں پڑے گی۔" انہوں نے سوچا۔ "اور اس کم عقل سعد کو دیکھو جس آزمائش سے اسے بچانے کے لیے اظہار سے گریز کرتا رہا خود اپنے ہاتھوں اسے اسی آزمائش سے دوچار کر گیا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، کیا وہ میرے کہنے پر واپس آجائے گا؟"

انہوں نے گلاس سے پانی کا گھونٹ پینے کے بعد کہا۔

"نہیں وہ جو سوچ کر گیا ہے، اسے اس سوچ کے تجربے کر لینے دو، اسے معلوم ہو لینے دو کہ اس بھری دنیا میں

انسان تنہا ہوجائے تو دل کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ اسے پتا چل جانے دو کہ اس اتنی بڑی دنیا میں جھوٹا سچا ہی سہی ایک رشتہ بھی کافی ہوتا ہے اسے رشتوں، ناتوں اور تعلق کی قدر ہو لینے دو، ایک "Priviliged" (پر تعیش) زندگی سے نکل کر Unpriviliged زندگی کا تجربہ کر لینے دو، بھرے پیٹ کھانے کا برتن توڑ دینا شاید بہت بڑی فینسی ہوتی ہے بھوک لگنے پر اس برتن کا نہ ملنا ہی اس کی یاد بھی دلاتا ہے اور قدر بھی کراتا ہے۔"

"یہ آپ کی سوچ ہے نا!" ماہ نور نے تڑپ کر کہا۔ "آپ اسے خود سے بغاوت کرنے کا سبق سکھانے پر تل گئے ہیں، جبکہ آپ بھی جانتے ہیں کہ اس نے یہ بغاوت بے سبب نہیں کی، اسے اور آپ کو اطمینان سے بیٹھ کر آپس میں ایک طویل ڈائیلاگ کی سخت ضرورت ہے، ایک ایسا ڈائیلاگ جس میں انا، بدگمانی اور شک انوالو نہ ہو۔ جس میں اتنے قریبی تعلق کے باوجود ایک انجانا سا فاصلہ انوالو نہ ہو، آپ کیوں نہیں سمجھتے کہ ایسا نہ کر کے آپ اس کا اور اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

اس نے بے بسی سے بلال سلطان کی طرف دیکھا وہ اس کی بات غور سے سن ضرور رہے تھے، مگر ان کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔

"وقت!" ان کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری، ایک تمسخر اور طنز بھری مسکراہٹ۔ "میں وقت ہی کی چوٹ تو کھایا ہوا ہوں، وقت کی مار۔" انہوں نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ "جس کے دیے زخموں کا کوئی علاج نہیں، جس کی دی چوٹوں کے درد سے کوئی مسیحا نجات نہیں دلا سکتا۔ کیونکہ وقت زخم دے کر آگے بڑھ چکا ہوتا ہے اور انسان کچھ نہیں کر پاتا۔ وقت کا ذکر مت کرو لڑکی، وقت بڑی ہی ظالم شے ہے۔"

"یعنی آپ سعد کو بھی یہ ہی سبق سکھانا چاہتے ہیں کہ وقت کی مار بڑی ظالم شے ہے۔" ماہ نور ان کی بات بالکل بھی سمجھ نہیں پائی تھی۔

"نہیں۔" انہوں نے سر ہلایا۔ "میں اسے کوئی سبق نہیں سکھانا چاہتا، میں تو عمر بھر اسے ایسے اسباق سے بچانے ہی کی کوشش کرتا رہا۔ یہ اس کی اپنی ضد ہے کہ اسے سبق سیکھنا ہے۔ میں تو اس سلسلے میں بڑا ہی بے بس ہوں، کیوں کہ اپنی زندگی میں میں نے اور کچھ سیکھا ہو یا نہ ہو اتنا ضرور سیکھا ہے کہ جو کچھ لکھا جا چکا ہے اسے پیش آنا ہی آنا ہے، کوئی تدبیر، کوئی کوشش آنے والے اچھے یا برے وقت کو ٹال نہیں سکتی اور اسی چیز کو شاید تقدیر کہا جاتا ہے۔"

ماہ نور نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ وہ بہت گہری بات کر گئے تھے۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر کچھ سوچ کر منہ بند کر لیا۔

"تمہارے لیے بھی میرا مشورہ یہی ہے کہ صبر کرو اور وقت کا انتظار کرو، دیکھو، وہ تمہارے لیے کیا Unfold کرتا ہے۔ میں تمہیں دیکھتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ تم میرے لیے سعد کا دیا وہ سرپرائز ہو جس کی میں بالکل بھی توقع نہیں کر رہا تھا۔"

"وہ کیسے؟" ماہ نور نے بے اختیار پوچھا۔

"سعد ان لوگوں میں سے ہے جو جب کچھ کر لینے کی ٹھان لیتے ہیں تو نتائج و عواقب کی پروا کیے بغیر بس کر گزرتے ہیں، جو کچھ وہ کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں۔ اس میں وہ کسی دوسرے کا مشورہ مانتے ہیں، نہ تجویز، نہ ہی وارننگ، حیرت ہے تم سے اسے عشق ہو گیا اور اختر کی ایک وارننگ نے اسے اس کے اظہار سے روک دیا۔"

ماہ نور نے سر جھکا لیا۔

"وہ بہت سمجھ دار، بہت Composed لڑکا ہے بہت آرگنائزڈ اور ٹھہرا ہوا، لیکن اس کے اندر کی کیفیات اس ٹھہراؤ اور سمجھ داری کے بالکل متضاد ہوتی ہیں۔ اس کے عمل میں بظاہر وہ بے چینی اور بے قراری نظر نہیں

آتی جو اس کی روح کو بے قرار کیے رکھتی ہے۔ اس لیے کہ وہ زندگی کو آرگنائزڈ طریقے سے گزارنا جانتا ہے، جو بات اس کے ذہن میں ایک بار سما جائے۔ اس پر عمل اس نے ہر حال میں کرنا ہوتا ہے۔ یہاں عمل کرنے کے لیے وہ اپنے دماغ میں دو تین طرح کے پلان ترتیب دیتا ہے۔ جہاں پلان اے چلنے کا امکان کم نظر آتا ہے وہاں فوراً" پلان بی اختیار کر لیتا ہے، وہ نہیں تو پھر اس سے اگلا یا پھر اس سے بھی اگلا پلان، اپنی سوچ کو عملی جامہ کسی نہ کسی طریقے سے پہنا کر چھوڑتا ہے، مگر تمہارے سلسلے میں اس نے مجھے حیران کر دیا۔ اس نے تمہارے لیے اپنے جذبے کو محبت کے بجائے عشق کا نام دیا ہے تو میں سمجھ سکتا ہوں وہ عشق، کس درجے کا ہوگا۔ لیکن وہ اس احساس، اس جذبے کے ساتھ تم سے ملتا رہا اور پھر بھی اظہار سے گریز کرتے ہوئے تمہیں خود سے اور خود کو تم سے بچاتا رہا محض اختر کے وارن کرنے پر۔ اس کا مطلب ہے۔" انہوں نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ "وہ دنیا کے ہر تعلق سے زیادہ تم سے تعلق کو ویلیو کرتا ہے، کیونکہ تمہیں آزمائش میں ڈالنا اسے کسی طرح بھی منظور نہیں تھا۔"

"محض اختر کی وارننگ۔" ماہ نور نے کہا۔ "اسے اس کے کہے لفظوں پر پورا یقین تھا اس لیے اس نے۔۔۔"

"ہوں!" بلال سلطان ماہ نور کی بات کاٹتے ہوئے ہلکا سا مسکرائے۔ "تمہیں شاید علم نہیں کہ اختر نے اس سے یہ بھی کہا تھا کہ پوری دنیا میں ایک دل ایسا ہے جو اسے بہت چاہتا ہے، اسے اس دل کی قدر کرنی چاہیے، اس دل کو توڑنے سے بچنا چاہیے، سعد بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ دل کس کا تھا، مگر اس نے اس دل سے ہی بدگمانی سے گریز نہیں کیا، ایک بار اس کے دل نے کہہ دیا کہ وہ شخص جس کا دل توڑنے سے اختر اسے منع کرتا ہے محبت کے نہیں نفرت کیے جانے کے قابل ہے تو دیکھ لو، وہ کسی وارننگ کے، کسی تجویز کے، کسی اشارے کے بھرے میں نہیں آیا اور اس نے وہی کیا جو خود ایک بار سوچ لیا۔ اب بتاؤ، اختر کے کشف و کرامات پر یقین کیا ہوا جبکہ وہ تو آخری ملاقات تک اسے منع کرتا رہا۔"

ماہ نور کے دل نے ایک دھڑکن مس کر دی۔

"میں تمہارے اضطراب کو، بے قراری اور بے چینی کو خوب سمجھتا ہوں۔" بلال نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ "لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ اضطراب، بے قراری اور بے چینی کسی کام نہ آئے گی جب تک تمہارا اور اس کا وقت نہیں آجاتا، اگر وہ تمہاری تقدیر میں لکھا ہے تو اس کے اور تمہاری وقت کو آنے سے کوئی روک نہیں سکتا، لیکن اگر وہ تمہارے تقدیر میں نہیں ہے تو لاکھ ہاتھ پاؤں مار لو تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آنے والا۔" وہ یوں بولے جیسے ماہ نور کی کیفیت سے بالکل بے نیاز ہوں۔

"کوشش۔۔۔" ماہ نور کو ان کی بے نیازی پر طیش آگیا۔ "کوشش کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟"

"ہاں وہ کر لو، ضرور کرو۔" انہوں نے اسی بے نیازی سے کہا۔ "تمہارا دل لگا رہے گا۔"

"بہت شکریہ!" ماہ نور نے نیپکن سے اپنے ہونٹ صاف کیے اور اسے میز پر پٹخ دیا۔ "میں بھی یہیں ہوں اور آپ بھی یہیں ہیں۔ میں آپ کو دکھا کر رہوں گی کہ کوشش پیہم کیا رنگ لایا کرتی ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"شیور!" وہ اس کا چیلنج قبول کرتے ہوئے جیسے محظوظ ہو رہے تھے۔

"میں اب جا رہی ہوں۔" ماہ نور نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔

"وہ سب جو وہ میرے لیے چھوڑ گیا تھا، میں لے جا رہی ہوں کیونکہ وہ میرا ہے۔" اس کے لہجے میں استحقاق کا رنگ نمایاں تھا۔

"ضرور، ضرور۔" انہوں نے جواب دیا۔ "میں تمہیں بھجوانے کا انتظام کرتا ہوں۔"

"شکریہ۔" ماہ نور نے سخت لہجے میں کہا۔ "میرے پاس گاڑی ہے۔"

"اچھا چلو میں تمہیں باہر تک رخصت کرنے چلتا ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

"زحمت مت کیجیے، کیوں کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" ماہ نور نے دانت پیسے۔

"چلو جیسے تمہاری مرضی۔" وہ واپس ڈائننگ چیئر پر بیٹھ گئے۔ ماہ نور انہیں خدا حافظ کہے بغیر دروازے کی طرف چل دی۔

"سنو!" بلال نے پیچھے سے آواز دی۔ ماہ نور نے گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھا۔

"یہ کبھی مت بھولنا کہ تم مجھے بے حد عزیز ہو، اس لیے کہ میرا بیٹا تم سے صرف محبت نہیں کمال درجے کا عشق کرتا ہے۔" انہوں نے مسکرا کر کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں دیکھتی ہوں تو دل پر قابو نہیں رہتا، دل بے اختیار بھر آتا ہے، تم کہتی ہو۔ صبر کرو، کہو کیسے صبر کروں؟"

"صبر کرو کیونکہ اس کے سوا چارہ نہیں۔"

"ہائے اب اسے کیسے بتاؤں کہ جب یہ بولتی ہے تو آواز گلے سے ایسے نکلتی ہے جیسے کسی تنگ سرنگ سے کوئی پھنس پھنس کے نکلے، مجھ میں تو اسے بتانے کا حوصلہ کبھی آئے گا بھی کہ نہیں۔"

"سراج کہاں ہے، اسے کہا تھا، ناشنی صدیقہ سے پیسے پوچھ آئے، دو سال ہو چکے اسے ہم سے قرض لیے ہوئے، کیا اب بھی واپس نہ کرے گی۔"

"مانو آواز تو گھٹ ہی گئی ہے، ہائے کیا میٹھی آواز تھی تمہاری میری بہن! سُر کے ساتھ سفر کرتی تھی تو لگتا تھا مدھر جھرنا بہہ رہا ہو، ہائے ہائے طیفا تیرا بیڑا غرق ہو جائے، کسی کی آئی تجھے آجائے، دشمنی اور ایسی دشمنی پالی تو نے میری اس معصوم بہن سے کہ اس کی شکل صورت اور آواز ہی لے ڈوبا۔ نہ جیتوں میں لگتی ہے نہ مرتوں میں۔ زخم ٹھیک ہو گئے، مگر اپنے پیچھے کیسے بھیانک نشان چھوڑ گئے، خیال بھی نہیں آتا۔ یہ وہی سندر شکل ہے جسے دیکھ کر انسان کی بھوک مٹ جاتی تھی، ہائے اسی شکل کی دیوانگی نے ہی تو طیفا تجھ سے یہ وار کرایا، اس کرموں والی کا کیا قصور تھا جو اس کو اللہ نے وہ حسین شکل اور میٹھی آواز بخش دی تھی، دونوں ہی اس کا تو امتحان بن کے رہ گئیں۔"

"میں سراج کا پوچھ رہی ہوں رابعہ!"

"ہوں، ہاں۔۔۔ کس کا پوچھ رہی ہو۔۔۔؟"

"سراج کا۔۔۔ کس سوچ میں گم ہو تم؟"

"کسی بھی سوچ میں نہیں، ہاں سراج باہر نکلا ہے ذرا۔"

"ناشنی صدیقہ سے پیسے نہیں پوچھے اس نے؟"

"پوچھے تھے، ابھی تو اس نے کوئی حوصلہ افزا جواب نہیں دیا۔"

"سراج سے کہنا پھر جائے اس کے پاس تقاضا کرنے، بینک کی کاپیاں بھی نکال کر دینا مجھے، دیکھوں کتنا روپیہ پڑا ہے بینک میں۔"

"اچانک تمہیں روپے پیسے کی کیوں فکر پڑ گئی، تمہارا علاج کروا تو رہا ہے دولہا بھائی گھر کا سارا خرچا بھی اٹھا لیا اب تو اس نے۔ چاہے چور کو ٹھگ کر چاہے یار کو ٹھگ کر لاتا ہے، لاتا ہے نا، دیتا ہے نا، تم روپے پیسے کی فکر میں کیوں پڑ گئیں۔"

"مجھے علاج کے لیے پیسے چاہئیں نہ گھر کے خرچے کے لیے، مجھے تو اپنی جمع پونجی دیکھنی ہے، اتنی ہے کیا کہ میں قصد کروں؟"

"کہاں کا قصد کرنا ہے تمہیں؟"

"بتاؤں گی، پہلے جمع پونجی کی خبر لوں۔"

"اللہ جانے کیا کیا سوچتی رہتی ہے من میں دن بھر پڑے پڑے۔ بے چاری کی دنیا ہی الٹ گئی یک دم، اپنا یہ حال ہو گیا، دولہا بھائی بچے کو اپنے ساتھ لے گیا، کیا تو اس نے ٹھیک ہی، ماں کی یہ بھیانک شکل دیکھ دیکھ کر بچہ روتا اور ہولتا رہتا۔ ماں سامنے ہو تو اسے کیسے بچے کو گود لینے اور پیار کرنے سے روکا جائے۔ اب طفل تسلیاں تو بہت ہیں۔ دولہا بھائی کہتا ہے، ذرا اس کے پاؤں زمین پکڑ لیں، وہ اس کا بہترین سے بہترین علاج کرائے گا، شکل و صورت تک کو بدلوا دے گا، لیکن کون جانے یہ کب ہو گا اور کیسے ہو گا، ٹھیک کہتے ہیں سیانے۔ مصیبت اکیلی نہیں آتی، اپنے ساتھ چاروں طرف سے منحوس خبریں لے کر چلتی ہے۔ بے چاری نے اس آفت کے ٹوٹ پڑنے پر جو واپس اپنے گھر والوں کی طرف رجوع کرنے کی کوشش کی کہ دکھیا ماں باپ سے معافی مانگ لے تو پتا چلا۔ پیچھے تو جھاڑو ہی پھر چکی ہے۔ اماں، باوا اللہ کو پیارے ہو چکے اور بہن سارا پیسہ، جائیداد سمیٹ کر بیٹھ گئی۔ اس نے باہر کے ملک سے پیغام بھیجا۔ "جب میرے ماں باپ نے اپنی زندگی میں تمہاری شکل تک نہ دیکھنے کا اعلان کیا تھا تو میں بھی ان ہی کی بیٹی ہوں، میں تو تمہاری طرف دیکھ کر تھوکوں گی بھی نہیں۔" یا میرے مولا، کیا کیا تیرے رنگ ہیں۔ انسانوں کی ایک ذرا سی غلطی انہیں کہاں کہاں پہنچا دیتی ہے۔ ہائے میری چاند صورت بہن، جس کی چاند صورت دیکھنے اور گلے کا سُر سننے کہاں کہاں سے لوگ اس گھر کے صحن میں اکٹھے ہوا کرتے تھے، اب نئی شکل اور گھٹی آواز لے کر سارا سارا دن کھٹیا پر پڑی آسمان کو تکا کرتی ہے۔ گلے میں آواز اٹکتی ہے، جو نکلیں تو صرف نوحے نکلیں یا مرثیے۔ یا میرے مولا، میری زندگی بھی اسے لگا دے، جو میرے حصے میں کچھ خوشیاں، کچھ نعمتیں تو نے لکھ رکھی ہیں، وہ بھی اسے عطا کر دے۔ میری جھولی تو ہمیشہ سے خالی تھی، میرے جیسے تو دوسروں کے چہروں کو مسکراہٹیں دے کر خوش ہو جاتے ہیں، مجھے فرق نہ پڑے گا کہ میرے پاس کچھ ہے یا نہیں، مگر اسے بہت پڑتا ہے، بہت فرق پڑتا ہے میرے مولا! تو اس پر رحم کر۔۔۔ ہائے وے طیفا ٹث مرنیا، تیرا بیڑا غرق ہو جائے، کسی کی آئی تجھے آجائے وے ظالما۔"

☼ ☼ ☼

"مجھے ذرا سا بھی گمان نہیں تھا کہ تم مجھے نہیں پہچانو گی خدیجہ!" فلزا ظہور نے خدیجہ کے لاؤنج میں گیس ہیٹر کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا اور اپنے سرد ہاتھ آپس میں رگڑ کر ہیٹر سے اٹھتی حدت کے قریب کر دیے۔

"تم نے شاید کبھی آئینہ نہیں دیکھا۔" خدیجہ سیدھی بات کرنے کی عادی تھیں، انہیں تلخ بات چینی کی پڑیا میں لپیٹ کر کرنا نہیں آتی تھی۔ "آج تم جیسی مجھے نظر آرہی ہو، وہ اس فلزا ظہور کا بگڑا ہوا بھوت تو کہلایا جا سکتا ہے جس کو میں نے عرصہ پہلے دیکھ رکھا ہے، فلزا ظہور نہیں کہلائی جا سکتی۔"

"کیا میں اتنی بدل چکی ہوں، ایسی بدشکل ہو گئی ہوں؟" فلزا نے بے اختیار اپنے ہاتھ چہرے پر رکھتے ہوئے خدیجہ کی طرف دیکھا۔

"میں نہیں جانتی اتنے برس جو درمیان میں گزرے، تم پر کیسے گزرے لیکن اتنا اندازہ ضرور کر سکتی ہوں کہ ان برسوں کی تلخیوں نے تمہارے چہرے کے نقوش پر خاصے خوفناک اثرات چھوڑے ہیں۔" خدیجہ اسی صاف گوئی سے بولیں۔ "تمہارے چہرے کے ہر نقش پر تلخی، اکھڑ پن، بے زاری اور بدمزاجی کا رنگ نمایاں ہے۔"

فلزا کا وجود خدیجہ کی یہ بات سنتے ہوئے جیسے تناؤ کا شکار ہو رہا تھا۔ اس کے کندھے اوپر کو اٹھ گئے اور جسم ایک ہی جگہ ساکت سا ہو گیا۔ اس کی نظریں ایک ٹک کسی سمت دیکھے چلی جا رہی تھیں۔ جیسے خدیجہ کی بات سن کر گزرے ماہ و سال کے نفع نقصان کے اعداد و شمار کا حساب کر رہی ہوں۔

"ہوں!" چند منٹ بعد اس نے خود کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے خدیجہ کو دیکھا۔ "شاید تم ٹھیک کہتی ہو، میں نے

برسوں سے آئینہ نہیں دیکھا‘ اس خوف سے نہیں کہ میری شکل کیسی بگڑ چکی ہے بلکہ اس خوف سے کہ آئینے میں جھانکنے کی صورت میں کہیں مجھے اپنے کیے کی جھلک بھی نہ دکھائی دینے لگے۔ میں نے حقیقتوں کی بدشکلی اور بدہیتی سے فرار حاصل کرنے کے لیے برسوں سے کبھی آئینے میں نہیں جھانکا۔"

"اس سے کیا ہوا ہوگا بھلا؟" خدیجہ نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھا۔ "حقیقتیں تو اسی طرح سر اٹھا کر اپنی جگہ پر قائم دائم رہتی ہیں جیسے اول دن تھیں۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ اتنے برس آئینہ نہ دیکھ کر تم نے خود اپنا ہی نقصان کیا‘ کیونکہ آج تمہیں دیکھ کر مجھے اس کے علاوہ کوئی دوسرا خیال نہیں آرہا کہ تم کوئی نہایت ہی بدمزاج‘ غصیلی اور مردم بے زار خاتون ہو‘ جس سے بات کرنا خود پر قہر برسوانے کے ہی مترادف ہوگا‘ شاید تم بھول گئیں کہ چہرے انسانوں کے اندرونی حالات کے سب سے بڑے غماز ہوتے ہیں۔"

"جب ہی لوگ اکثر چہروں سے ہی دھوکا کھا جاتے ہیں۔" قلزا نے کہا۔

"دھوکا دینے والے چہروں کے مالکوں کو بھی شاید یہ نہیں پتا ہوتا کہ چہروں کے پیچھے چھپے چور دوسرے چوروں کی نسبت جلدی پکڑے جاتے ہیں۔" خدیجہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"خیر اب میرا یہ چہرہ دھوکا دیتا ہے یا سچ کہتا ہے‘ یہ جیسا ہے ویسا ہی ہے۔" قلزا نے بات کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ "اچھا ہی ہوا‘ جو اتنے برس میں نے اسے دیکھا نہیں‘ ورنہ خود سے ہی ڈر جاتی۔"

"لیکن میں تمہیں دیکھ کر ڈری تو نہیں۔" خدیجہ ہلکا سا مسکرائیں۔ "میں تو تمہارے اس چہرے کے اندر اب بھی اس قلزا ظہور کے چہرے کو کھوجنے میں مصروف ہوں‘ جس سے میں واقف تھی۔ اوہ" پھر انہیں خیال آیا۔ "دیکھو تو میں بھی کیسی بری میزبان ثابت ہو رہی ہوں‘ اتنی سردی میں تم یہاں ہم تک آئی ہو اور میں نے چائے کافی سے تمہارے مدارات کرنے کے بجائے تمہیں چہرے کے غم میں مبتلا کرنا شروع کر دیا۔ تم بیٹھ کر آگ تاپو۔ میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔" انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"فاطمہ کہاں ہے‘ میں اس سے ملنے کے لیے بے چین ہوں؟"

"مجھے یاد ہے۔" خدیجہ مسکرائیں۔ "مجھ سے زیادہ تمہاری دوستی فاطمہ سے تھی۔ میں اسے تمہاری آمد کا بتاتی ہوں‘ وہ ایسے موسم میں اب بھی پہلے کی طرح اپنے بستر میں دبکی رہتی ہے۔"

"یہاں آنے سے پہلے میں راستہ بھر یہی سوچتی آئی تھی‘ مجھے بالکل اندازہ تھا کہ فاطمہ بستر میں دبکی ہوگی اور میرے لیے دروازہ تم یا تمہارا کوئی ملازم ہی کھولے گا۔"

قلزا ذرا سا پرسکون ہو کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کر بولی۔

"میں چائے نہیں‘ کافی پیوں گی خدیجہ! تمہارے گھر میں کافی ہے یا نہیں‘ اگر نہیں ہے تو مجھ سے لے لو۔ میرے بیگ میں کافی کا ڈبہ موجود ہے‘ کافی بینز ہیں یہ‘ تمہیں انہیں گرائنڈ کرنا پڑے گا۔" اس نے بے تکلفی سے فرمائش کی۔

"تلخی یا شاید تلخیوں کا ایک اور ثبوت۔" خدیجہ نے زیر لب کہا اور سرہلاتے ہوئے قلزا کی طرف دیکھا۔ "میں کافی ہی بنا لیتی ہوں‘ میرے پاس کافی پاؤڈر موجود ہے۔"

قلزا نے سرہلایا اور خدیجہ کے کمرے سے جانے کے بعد کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے اس کا جائزہ لینے لگی۔

☆ ☆ ☆

"تمہاری ممی نے کال کر کے مجھے اتنا ڈانٹا جتنا دراصل تمہیں ڈانٹنا چاہیے تھا۔" وہ فرقان ماموں تھے جو اس

روز ماہ نور کے گھر واپس آنے پر اسے اپنے منتظر ملے تھے۔

"کیوں کیا ہوا؟" اگرچہ وہ اس روز کسی سے بھی بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی‘ لیکن اسے فرقان ماموں کو جواب دینا ہی تھا۔

"انہوں نے تمہیں آج کتنی بار فون کیا‘ معلوم ہے تمہیں؟" فرقان ماموں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"پتا نہیں۔" اس نے اپنے بیگ میں رکھا فون ٹٹولتے ہوئے جواب دیا۔

"بیس مرتبہ یا شاید اس سے بھی زیادہ۔" وہ جتانے کے سے انداز میں بولے۔

"ہو سکتا ہے۔" بالآخر فون اس کے ہاتھ میں آگیا‘ اس نے اس پر مسڈ کالز چیک کیں۔ "ہاں ان کی کافی مسڈ کالز ہیں۔"

"مجھے پتا نہیں چلا‘ میرا فون سائلنٹ پر تھا۔"

"اسی لیے انہوں نے مجھے کال کر کے بے نقط سنائیں‘ ان کا خیال ہے کہ میں تمہاری طرف توجہ نہیں دے رہا‘ نہ ہی تمہاری ایکٹویٹیز پر نظر رکھ رہا ہوں‘ الٹا میں تمہیں بے جا سہولتیں دے کر پہلے سے زیادہ بگاڑ رہا ہوں۔"

"میں بگڑ چکی ہوں کیا؟" ماہ نور نے رک کر فرقان ماموں کی طرف دیکھا۔ "آپ کا کیا خیال ہے؟"

"خیر میں تو یہ اسٹیٹمنٹ تمہارے بارے میں نہیں دے سکتا‘ کیوں کہ میرے نزدیک تمہاری ایکٹویٹیز خاصی ہومیو پیتھک قسم کی ہیں‘ لیکن تم اپنی ممی کو جانتی ہو نا!" انہوں نے عینک کے شیشوں کے پیچھے سے اسے دیکھا۔ "تمہیں پتا ہے اسے کیسی منظم زندگی پسند ہے‘ میں‘ میری بیوی‘ میرے بچے‘ میرے بچوں کی تربیت اسے سب غلط لگتے ہیں۔ لہٰذا وہ اگر تمہیں بگڑی ہوئی سمجھتی ہے تو اس کے لحاظ سے درست ہی ہوگا۔"

"پھر۔" ماہ نور نے کہا۔ "کیا حکم ہے آپ کے اور میرے لیے؟"

"تم جانتی ہی ہو۔" فرقان ماموں نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ "تمہاری فوراً واپسی کا حکم ہے۔"

ماہ نور نے ان کی بات سن کر آنکھیں بند کرلیں‘ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھول کر فرقان ماموں کی طرف دیکھا۔

"لیکن میں تو ابھی واپس نہیں جا رہی ماموں! کیا آپ مجھے مزید اپنے گھر رہنے دے سکتے ہیں؟"

"ارے شیور!" وہ اس کے سوال پر گڑبڑا سے گئے۔ "تم جب تک چاہو‘ یہاں رہ سکتی ہو۔"

"اگر یہ چاہنا عمر بھر کا ہو تب بھی؟" ماہ نور نے ان سے یہ سوال یوں کیا جیسے یقین دہانی چاہتی ہو۔

"میرا خیال ہے‘ تمہیں پوچھنے کی ضرورت نہیں۔" وہ اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پا کر مسکراتے ہوئے بولے۔ "میں نے صرف تمہیں تمہاری ممی کا پیغام دیا تھا۔"

"میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے ان کا پیغام دے دیا۔" ماہ نور نے سرہلایا۔ "لیکن میں واقعی ابھی نہیں جا رہی ماموں! میں یہاں جو کام کرنے آئی تھی وہ ابھی ادھورا ہے اور میں نہیں جانتی کہ اسے مکمل کرنے میں کتنا وقت لگے۔"

"میں نے کہا نا‘ مجھے بتانے یا پوچھنے کی ضرورت نہیں‘ ہاں اپنی ممی کو بتانا‘ پوچھنا اور سمجھانا تمہارا کام ہے‘ میں یہ ذمہ داری نہیں لے سکتا۔" فرقان ماموں نے کہا۔

ماہ نور نے ماموں کی طرف ممنونیت سے دیکھا اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر کچھ دیر وہ دروازے کے قریب کھڑی کچھ سوچتی رہی۔ اس وقت اسے اپنا ذہن ماؤف ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔

"نہیں ماہ نور یوں نہیں۔" پھر جیسے اس نے خود کو مخاطب کرتے ہوئے سرہلایا۔

"ڈپریشن' انگزائٹی' غم کے دورے' رونے کی شدت' دکھ کا بوجھ اٹھانے کی اذیت نہیں۔۔۔ جس صورت حال میں تم پھنس چکی ہو اس میں یہ سب نہیں چلے گا۔" وہ دو تین قدم چل کر آگے بڑھی اور دیوار پر لگے آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"تم بلال سلطان جیسے بڑے پلاز کو چیلنج کر کے آئی ہو تم نے کوشش پیہم کا دعوا کیا ہے اب اپنے دعوے سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنا تمہاری توہین ہے۔" اس نے آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے اپنے آپ کو خم ٹھونکنے کا حوصلہ دیا۔ "کوشش پیہم کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹیں یہ ہی تو ہیں' ڈپریشن' انگزائٹی' غم کے دورے' رونے کی شدت' دکھ کا بوجھ اٹھانے کی اذیت۔

"نہیں ماہ نور! یہ سب نہیں چلے گا' تمہیں اپنا چیلنج پورا کرنا ہی ہو گا' چاہے کیسی ہی مشکل راستے میں کیوں نہ آئے۔" اس نے بالوں کو جھٹک کر پیچھے کرتے ہوئے اپنی حوصلہ افزائی کی اور ایک بار پھر خود کو آئینے میں دیکھا۔

"تمہارے شانوں پر پڑے بال' تمہاری اپنی کسی بھی کوشش کے بغیر اتنے سجے ہوئے اور شان دار لگتے ہیں کہ انہیں کسی بھی ہیئر ڈریسر کی کبھی ضرورت نہیں پڑے گی۔" اس کی نظر اپنے بالوں پر پڑی۔

"تمہاری آنکھوں کی چمک ستاروں کی چمک ماند کر دیتی ہے۔ خدا کرے تمہاری آنکھوں کی یہ چمک ہمیشہ اسی طرح قائم رہے۔" اس نے اپنی آنکھوں کو دیکھا۔

"تم مسکراتی ہوئی بہت اچھی لگتی ہو' خدا کرے تم ہمیشہ یوں ہی مسکراتی رہو۔" اس کے آپس میں سختی سے جڑے ہونٹ اسے نظر آرہے تھے۔

وہ ایک قدم آگے بڑھ کر آئینے کے بالکل قریب آئی۔ "کیونکہ لڑکی! تمہیں خدا نے جیسا بنایا ہے' تمہارا ویسا ہونا ہی دیکھنے والے کو مبہوت کر دیتا ہے۔"

اس نے آنکھوں میں بے اختیار امڈ آنے والے آنسوؤں کو چھنگلی کی جنبش سے اڑا دیا۔

"ماہ نور! میں تم سے شدید محبت میں گرفتار ہوں' شدید ترین محبت میں گرفتار۔" کسی نے جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"وہ پہلی نظر کی محبت نہیں' پہلی نظر کا عشق تھا۔" کوئی کہہ رہا تھا۔ ماہ نور کا دل معمول سے زیادہ تیز رفتار سے دھڑکنے لگا تھا۔ اسے لگا اس کے جسم کا خون اکٹھا ہو کر اس کے چہرے کی رگوں میں جمع ہو گیا تھا اور آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔

"نہیں ماہ نور!" اس نے ایک بار پھر خود کو تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔ "جذباتی ہونے سے کام نہیں چلے گا' راستہ مشکل اور منزل کہیں دھند کے اس پار ہے' اگر وہ تم سے عشق کرتا ہے تو عشق کے تقاضے پورے کرنے بھی لازم ہیں' وہ اظہار کر گیا' تقاضے پورے کی کٹھن ذمہ داری تمہارے حصے میں آگئی۔ اب جذبات سے نہیں ہوش سے کام لینے سے ہی بلال سلطان کے دیے چیلنج کو سرانجام دینا ممکن ہے۔"

اپنے جذبات کو قابو کرنے میں اسے مزید پندرہ منٹ لگے' اگلے پندرہ منٹ اپنے جسم کے تناؤ اور ایب نارمل ردعمل کو قابو کرنے میں صرف ہوئے۔ ٹھیک تیس منٹ کے اندر اس کے چہرے کی رگوں میں جمع ہوا خون واپس اپنے راستوں پر دوڑنے لگا' جسم میں چلتی چیونٹیاں غائب ہوئیں اور آنکھیں بھی خشک ہو گئیں۔

اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے ایک بار پھر خود کو آئینے میں دیکھا۔ اسے اپنے چہرے اور آنکھوں میں اس چیز کا عکس نظر آیا' جو وہ دیکھنا چاہتی تھی۔ آئینے کے قریب سے ہٹ کر وہ اپنی شل ہوتی ٹانگوں کو آرام دینے کے لیے نیچے فلور کشنز پر بیٹھ گئی۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی میں اس نے اپنے بیگ سے اپنا فون نکالا۔ وہ اپنے بابا کا نمبر ملا رہی تھی۔

"آئی ایم سوری بابا! ایک بار پھر میں آپ کو لیٹ ڈاؤن کر رہی ہوں۔ لیکن اس بار میں سب سچ سنا کر آپ سے ایک اجازت مانگنا چاہتی ہوں۔" کچھ ثانیوں کے بعد کمرے کے خاموش ماحول میں اس کی آواز ابھری تھی۔

"اس کا نام سعد سلطان ہے بابا۔۔۔ آپ اس سے مل چکے ہیں۔ میں اسی کی خاطر اسلام آباد آئی تھی اور اسی کی خاطر یہاں رکنا چاہتی ہوں۔ بابا آئی ایم سوری۔ پہلے میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔ لیکن اب میں آپ سے سچ کہنے جا رہی ہوں۔"

وہ بول رہی تھی اور شاید زندگی میں پہلی مرتبہ بہت سوچ سمجھ کر بول رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تمہاری بدقسمت کزن شہناز۔" خدیجہ اور فاطمہ کے سامنے قلزا ظہور نے گویا سینٹر آف اسٹیج پر بیٹھے ہوئے گریک ٹریجڈی کے ایک کردار کو متعارف کرتے ہوئے کہا۔ "میری بدقسمتی میں اس کے شوہر کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔"

خدیجہ اور فاطمہ نے ایک ٹک قلزا ظہور کو دیکھتے دیکھتے رک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر توجہ قلزا کی طرف مبذول کر لی۔

"لیکن جب میں اس کی محبت میں گرفتار ہوئی' میں نہیں جانتی تھی کہ وہ شہناز کا شوہر تھا اور پہلے سے ایک بچے کا باپ بھی تھا۔"

"بچے۔۔۔" بیک وقت خدیجہ اور فاطمہ نے اپنے اپنے دل میں کہا۔

"وہ سحر انگیز شخصیت کا مالک تھا۔ آرٹ اور لٹریچر کا دلدادہ جب میرا اور اس کا پہلی بار آمنا سامنا ہوا۔ اس وقت وہ اپنے بزنس میں ترقی کی سیڑھیاں' قدم جما۔۔۔ جما کر چڑھ رہا تھا۔ وہ وہاں اسلام آباد میں تنہا رہتا تھا۔ ہماری پہلی ملاقات ایک آرٹ ایگزیبیشن میں ہوئی۔ اس نے پہلی بار میری پینٹنگز دیکھیں اور وہیں مجھ سے ملنے آگیا۔ ہم نے دیر تک آرٹ کی ہسٹری پر گفتگو کی۔ اس کا علم باکمال اور میرا فن بے عیب تھا۔ اس ملاقات میں ایک دوسرے سے رخصت ہونے کے وقت تک ہم ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جان چکے تھے اور مزید ملاقاتوں کے خواہش مند بھی تھے۔ پہلی ملاقات آئندہ ہونے والی کئی ملاقاتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس کی شخصیت میں ایک عجیب سا تحمل' ایک عجیب سا ٹھہراؤ تھا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی' مگر وہ اتنا کمپوزڈ اور آرگنائزڈ تھا کہ اس کے منہ سے کبھی کوئی غیر ضروری بات نہیں نکلی تھی۔ ہم گھنٹوں اپنے اپنے پسندیدہ مصوروں' اسکول آف تھاٹس' پیریڈز آف آرٹ' مصنفین' کتابوں' شاعروں اور شاعری پر بات کرتے اور اس گفتگو کے دوران بھی کبھی اس نے کوئی فالتو بات نہیں کی تھی اور میں شاید اس کی اسی خصوصیت پر مر مٹی تھی۔ جتنا وہ فالتو بات کرنے سے گریز کرتا اتنا ہی میرا دل اس کی طرف مائل ہوتا۔ ان دنوں میں اسلام آباد میں ہی ایک اسٹوڈیو اپارٹمنٹ میں رہ رہی تھی۔ اکثر شام کے وقت وہ میرے ہاں آجاتا۔ میری ادھوری' مکمل پینٹنگز دیکھتا۔ ان پر رائے دیتا اور کبھی کوئی ایسا نکتہ بھی بتا دیتا جس کو سن کر مجھے اپنے کام میں بہتری لانے میں آسانی رہتی۔ اس کی اپنے ہاں آمد میرے اندر ایک نیا جوش اور شوق پیدا کر دیتی۔ شاید اس سے ملاقات کے بعد وجود میں آنے والا میرا سارا آرٹ اس کو خوش کرنے کے لیے ہی تھا۔ وہ میرے کسی فن پارے کو سراہتا تو مجھے ایسا لگتا جیسے میں نے پوری دنیا فتح کر لی ہو۔"

قلزا نے رک کر خدیجہ اور فاطمہ کی طرف دیکھا' جو عمر کے اس حصے میں تھیں جہاں بہت سی باتیں چونکا دینے اور حیرت میں مبتلا کر دینے والی نہیں لگتیں۔ ان دونوں کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے کہہ رہی ہوں' یہ تو ہو گیا۔ بی بی آگے بتاؤ کیا ہوا۔

"وہ میرے کام کو سراہتا' میری مہارت پر حیران رہ جانے کی بات کرتا' لیکن ایک سال' دو مہینے کی ملاقاتوں میں مجھے کبھی یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ خود میرے بارے میں اس کی کیا رائے تھی' نہ اس کی آنکھوں نے کبھی یہ تاثر دیا' نہ ہی الفاظ نے کہ وہ بھی مجھ پر اسی طرح فدا تھا جیسے میں اس پر۔"

"تم نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ اس کا آگا پیچھا کیا تھا۔ اس کے گھر والے' ماں' باپ' بہن' بھائی۔" خدیجہ نے سوال کیا۔ "اگر تمہیں یہ لگا کہ وہ شادی شدہ نہیں ہے تو تم نے شادی کرنے کے بارے میں اس کا خیال نہیں پوچھا کبھی؟"

"میں سچ کہوں۔ وہ ایسا تھا کہ اسے دیکھتے ہوئے اس کے ساتھ وقت گزارتے ہوئے ذہن سے اس کے سوا دوسرا ہر خیال مٹ جاتا تھا۔ میرے ذہن میں صرف اس کا' اس کے میرے ساتھ موجود ہونے کا خیال باقی رہ جاتا تھا یا پھر یہ کہ یہ کتنی دیر کے لیے میرے سامنے' میرے ساتھ موجود ہے۔ چند گھنٹے جن کا ایک ایک لمحہ یوں بھاگا چلا جا رہا ہے۔ میری مٹھی میں بند چند گھنٹوں کی رفاقت کا ذرہ ذرہ ایک کے بعد ایک کر کے گرتا جاتا اور جب اس کی رخصت کا وقت آجاتا تو جیسے کیسی طلسم میں بند میرا سحر ٹوٹنے لگتا۔ خیال اور سوال ذہن میں امڈنے کا وقت آنے لگتا۔ لیکن وہ رخصت ہو چکا ہوتا۔"

"یہ کتنے برس پہلے کا واقعہ ہے؟ کیا اس وقت تمہاری عمر اس طوفانی محبت کی تھی۔" خدیجہ نے حسب عادت لگی لپٹی کے بغیر سوال کیا۔

"شاید نہیں۔" فلزا نے سر ہلایا۔ "لیکن طوفانی محبت ہو جانے کے لیے عمر کی تو کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ وہ تو ہونے پر آئے تو تمہیں بھی اس عمر میں بھی ہو سکتی ہے۔"

"لاحول ولا..." خدیجہ نے بے اختیار کہا اور مزید کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ مگر فاطمہ کی کہنی اپنی پسلی میں چبھتی محسوس کرنے پر خاموش ہو گئیں۔

"وہ بتاتا تھا' وہ سیلف میڈ انسان تھا۔ اس کا باپ کسی گورنمنٹ کالج میں لیکچرار تھا۔ مگر بہت کم عمری میں اس کا انتقال ہو گیا۔ باپ کے مرنے کے بعد ماں کے گھر والوں نے اس کی دوسری شادی کر دی اور وہ اپنے چچاؤں اور دادی کے پاس رہ گیا۔ باپ نے جائیداد' گھر' روپیہ پیسہ جیسی کوئی ایسی چیز ترکے میں نہیں چھوڑی تھی جو اس کے کام آتی۔ چچاؤں' ان کی بیویوں اور دادی کی جھڑکیاں' گھرکیاں سنتے۔ اس نے گریجویشن کر لیا۔ ماں جو دوسری جگہ بیاہی گئی تھی۔ ٹی بی کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔ چچاؤں نے مزید پڑھانے سے انکار کر دیا۔ تو وہ اپنی قسمت خود بنانے نکل کھڑا ہوا۔"

"تو شہناز سے کہاں ٹکرا گیا۔ اس بدقسمت کا کیا ہوا۔ یہ تو بتاؤ' جو اصل بات ہے' وہ بتا نہیں رہیں۔ ادھر ادھر کی سنائے جا رہی ہو۔" خدیجہ نے کہا۔ اس بار فاطمہ کی کہنی بھی انہیں کہنے سے نہیں روک سکی تھی۔

"ابھی شہناز اس قصے میں آئی کہاں ہے۔ جو بتا دوں۔" فلزا نے ناگواری سے سر جھٹکا۔

"تو شروع تو شہناز سے ہی ہوئی تھیں نا کہ وہ بدقسمت تھی۔" خدیجہ کو داستان گوئی کے اس انداز پر غصہ آنے لگا۔

"وہ جملہ میں نے اس شخص کے تعارف کے لیے بولا تھا۔ جو اس کا شوہر تھا۔"

"اور بدقسمتی سے جس سے تمہیں محبت ہو گئی۔" فاطمہ نے اس بار بولنے کا فریضہ خود انجام دے لیا۔ وہ فلزا کی داستان اسی ترتیب سے سننا چاہ رہی تھیں۔ جس ترتیب سے فلزا سنا رہی تھی۔

"ہاں۔" فلزا نے سر ہلایا۔ "جن دنوں میری ملاقات اس سے ہوئی وہ آگے بڑھنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ چھوٹے موٹے کام کر کے اس نے تھوڑا سرمایہ جمع کر رکھا تھا اور پھر وہ سرمایہ کسی کے ساتھ بزنس میں انویسٹ

کردیا تھا۔ ان دنوں وہ اپنی انویسٹمنٹ کے ثمر کا منتظر تھا۔ پنڈی میں ایک عام سے علاقے میں کرائے کے کمرے میں رہتا تھا۔"

"وہ بن سنور کر تمہارے پاس تمہارے فن پر گفتگو کرنے آیا کرتا ہوگا۔" خدیجہ نے کہا۔ "فرا ڈیا کہیں کا یوں ہی کسی طرح شہناز بے چاری کو بھی پھانس لیا ہوگا اس نے۔"

"نہیں وہ بن سنور کر نہیں آتا تھا۔" فلزا نے نفی میں سرہلایا۔ "وہ تھا ہی ایسا کہ جو پہنتا تھا وہ اس پر جچ جاتا تھا۔"

"کیا تمہیں اس سے پہلے کوئی مرد ایسا نہیں ملا تھا جو تمہارے دل کو بھا جاتا۔" فاطمہ نے پہلا سوال کیا۔

"فاطمہ! تم تو مجھے اچھی طرح جانتی ہو۔" فلزا نے فاطمہ کی طرف دیکھا۔ "تمہیں یاد ہے نا کہ میں کیسی ہوا کرتی تھی خود میں گم اپنے مشغلے میں مگن میں نے کسی بھی مرد کے بارے میں کبھی سوچا کہاں تھا اور تم میری کم روئی سے بھی اچھی طرح واقف ہو۔ اگر کوئی میرے دل کو بھا بھی جاتا تو ایسے مرد نے مجھے گھاس ہی کہاں ڈالنی تھی۔"

"تو یہ بے چاری تو خاصی خود آگاہ ہے میں نے ناحق ہی دل توڑنے والی باتیں کیں اس سے۔" خدیجہ نے دل میں سوچا۔

"پھر اس شخص نے تمہیں کیسے گھاس ڈالی۔" وہ پھر بھی اپنی عادت سے مجبور ہو کر پوچھنے لگیں۔

"اس کے ساتھ میری کیمسٹری مل گئی تھی۔ اسے میرے آرٹ نے اپنی طرف متوجہ کیا اور مجھے خود اس نے۔"

"آگے سناؤ۔" فاطمہ نے خدیجہ کا منہ کھلتے دیکھ کر ایک مرتبہ پھر انہیں کہنی مارتے ہوئے کہا۔

"ایک عرصے تک بات صرف ملاقاتوں اور فن و ادب پر باتوں تک محدود رہی۔ اس دوران وہ ترقی کا زینہ ایک ایک اسٹیپ اوپر چڑھتے ہوئے طے کر رہا تھا۔ اس سفر کے دوران ہی میں نے دیکھا۔ اس کے لباس کا رنگ ڈھنگ بدلا پرانی پتلون اور ملگجی قیص اتری اور ان کی جگہ شہر کے بہترین ٹیلرنگ ہاؤس سے سلوائی ہوئی قیص اور پتلونیں لینے لگیں۔ سگریٹ کا برانڈ بدلا کبھی کبھار سگار بھی انگلیوں میں رہنے لگا۔ بالوں کو برش کرنے کا انداز بدلا جوتے کا لیدر مہنگا ہونے لگا۔ وہ ایک جدوجہد کرتے انسان کا کامیابی کی طرف بڑھنے کا سفر تھا۔ میں اس کی کامیابی کے نشان دیکھ کر اور عنوان پڑھ کر خوش ہوتی رہی۔ مجھے اس بات سے سروکار نہیں تھا کہ وہ rags سے Riches کا سفر طے کر رہا تھا۔ مجھے اس سفر کے پڑاؤ اور منزلیں دیکھنے میں لطف آتا تھا۔ وہ کما رہا تھا۔ کتنا اور کیسے؟ یہ میری دلچسپی کا محور نہیں تھا۔ میری نظروں کے سامنے وہ ایک عام سے علاقے کے کرائے کے کمرے سے اٹھ کر پہلے کرائے کے ایک انڈیپینڈنٹ مکان میں منتقل ہوا اور پھر اس مکان سے ویلسٹریج کے ایک بنگلے میں۔ اس ایک بنگلے کے بعد نجانے کتنے اور کہاں کہاں بنگلے پینٹ ہاؤسز اپارٹمنٹس اور محل اس کے مقدر نے اسے عطا کیے۔ میں نہیں جانتی۔ میرا اور اس کا ساتھ ویلسٹریج کے بنگلے تک ہی رہا۔

ان دنوں میں ہی پہلی بار اس نے مجھے میرے مستقبل کے بارے میں سہانے خواب دکھانے شروع کیے۔ وہ میرے لیے ایک ٹیسٹ ٹو آرٹ اسٹوڈیو بنانے کی بات کرنے لگا۔ ملک کے سب بڑے شہروں میں میری سولو ایگزیبیشنز فنانس کرنے کا ذکر کرنے لگا۔ وہ مجھے دنیائے مصوری میں ایک ہونہار اور ابھرتی ہوئی مصنفہ کے طور پر متعارف کروانے کے لیے بالکل تیار تھا۔ اسی مقصد کے لیے اس نے مجھ سے میرا پورٹ فولیو بنوایا۔ اس وقت اس کا بزنس اتنا سیٹل ہو چکا تھا کہ وہ یہاں تک بھی کہنے لگا تھا کہ وہ ملک سے باہر بھی میرا کام انٹروڈیوس کروائے گا۔ میں اس کی برسوں سے جو پوجا اپنے دل میں کر رہی تھی میرے نزدیک اس کے رنگ لانے کے دن آرہے تھے۔ میں نے ان سالوں میں جتنے پورٹریٹس چارکول اسکیچز اور بسٹ اس کے بنائے پوری زندگی میں کسی دوسرے

شخص کے نہیں بنائے۔ بلکہ شاید کسی کے بنائے ہی نہیں۔ بنائے بھی تو اولین کاوشوں کے دوران جن کا کوئی ریکارڈ میرے پاس نہیں۔ وہ اپنے لیے میرے جنون کو جانتا تھا سمجھتا تھا لیکن اس کے متعلق اس نے کبھی مجھ سے بات نہیں کی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان میرا اور اس کا موضوع کبھی آیا ہی نہیں۔"

فلزا سانس لینے کے لیے رکی۔ خدیجہ اور فاطمہ کے ذہن میں بہت سے سوال سر اٹھا رہے تھے۔ لیکن اب وہ پہلے سب سن لینا چاہتی تھیں۔

"پھر ایک رات اچانک اس نے مجھے فون کیا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ کیا اس رات کے وقت میں اس کے ساتھ لاہور تک کا سفر کر سکتی ہوں۔"

خدیجہ کے حلق تک سوال اٹھا۔ جسے انہوں نے بڑی دقت سے واپس دھکیلا۔

"میرے لیے یہ سوال غیر متوقع تھا اور اس سوال کے آگے معمول سے کہیں بڑا سوالیہ نشان بھی موجود تھا۔ وہ مجھ سے ایسا کیوں کہہ رہا تھا۔ وہ مجھے لاہور کیوں لے جانا چاہتا تھا۔ میرے ذہن میں اٹھتے ان سوالوں کا جواب میرے بغیر پوچھے خود اسی نے دے دیا۔ اس نے بتایا کہ لاہور میں ان کے ایک نامور مصور دوست کے گھر ڈنر پر کچھ اور نامور آرٹسٹ بھی اکٹھے ہو رہے تھے۔ وہ میرا کام مجھ سمیت وہاں لے جانا چاہتا تھا۔ "تمہارا کام اس لیے کہ اب اس کی پروموشن کی طاقت مجھ میں ہے۔ طاقت سے میری مراد سرمایہ ہے۔" اس نے کہا تھا "اور تم اس لیے کہ رات کے وقت اس سفر کو تنہا طے کرنے کے بجائے تم جیسی رفیق کے ساتھ کرنا یقیناً" میرے لیے ایک حسین تجربہ ہوگا۔" اس کی اس بات کو سن کر میری روح تک خوشی سے جھوم اٹھی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی نئی نئی خریدی زیرو میٹر گاڑی میں لاہور تک کا سفر میرے لیے جنت تک کے سفر کے برابر تھا۔"

خدیجہ نے بے چینی سے پہلو بدلا مگر خاموش رہیں۔

"آج تک مجھے وہ سفر کسی خواب کی مانند لگتا ہے۔ راستوں پر پھیلی روشنی راستوں پر چھایا اندھیرا کہیں راستوں پر چھائی سنسانی کہیں راستوں پر نظر آتی آبادی نئی گاڑی کی ہموار ایک سی بے آواز رفتار اس زمانے کا سُریلا میوزک اور اس کا ساتھ اس کی آواز اس کی گفتگو مجھے لگا رات کا وہ نصف حصہ میں کسی جنت میں گزار رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا وہ سفر کبھی ختم نہ ہو مگر سفر تھا کہ گام گام طے ہوا چلا جا رہا تھا۔ رات کے اس نصف حصے میں پہلی بار وہ اپنے بارے میں مجھ پر کھلا تھا۔ وہ سب کچھ دسترس میں ہوتے ہوئے بھی تنہا تھا۔ وہ زندگی بھر کے لیے کسی ساتھی کو اپنی زندگی میں خوش آمدید کہنے کے لیے بے چین تھا۔ اس نے کئی بار گلہ کیا کہ وہ وقت جیسی ظالم چیز کے ہاتھوں بلیک میل ہوتا چلا آیا تھا۔ لیکن اس وقت وہ اس پوزیشن میں آچکا تھا کہ وقت کو شکست دے سکے۔ اس کی گفتگو کے مفہوم کو سمجھتی میں جنت میں چہار طرف قلانچیں بھرنے لگی تھی۔ اس نے کہا کہ بس ایک دو دن کی بات ہے۔ متوقع خوشیاں جو اس کے دروازے پر دستک دے رہی ہیں۔ ان کے لیے وہ اپنے دروازے کھول دے گا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میرے جیسی خوب صورت دل رکھنے والی خاتون کے لیے اس کے دل میں بے پناہ قدر ہے اور بے شمار جگہ بھی۔ اس نے کہا اس کی شخصیت میں بے شمار کجیاں تھیں۔ ان کجیوں کے باوجود کیا میں اپنے دل میں اسے جگہ دے پاؤں گی۔ میں خوشی سے اچھلتے دل پر قابو پانے میں اس قدر مشغول تھی کہ اس کی بات کا جواب دینے کے لیے ڈھنگ کے الفاظ بھی مجھے سوجھ نہیں پا رہے تھے۔"

فلزا کی نظریں سامنے ٹکی تھیں۔ جیسے ماضی کے پردے پر کوئی خوش گوار منظر دیکھ رہی ہوں۔

"بہت زیادہ تفصیل میں پڑ گئیں تم فلزا! یہ بتاؤ آگے کیا ہوا؟" خدیجہ اپنی بے چینی کب تک چھپاتیں یقیناً اس عمر میں انہیں فلزا کا اپنے رومانس کا یوں ذکر کرنا انہیں پسند نہیں آرہا تھا۔

"ہاں شاید میں زیادہ تفصیل میں پڑ گئی۔" فلزا نے چونک کر سرہلایا۔ اس کے لہجے میں درد سا اتر آیا۔ "شاید

مجھے خیال نہیں آرہا کہ وہ رات جو میری زندگی کا حاصل تھی اس کے قصے میں کسی دوسرے کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

"اچھا نا۔ تم اسی طرح سناؤ جیسے سنا رہی تھیں تمہاری باتیں میری سمجھ میں آرہی ہیں اور دلچسپ بھی لگ رہی ہیں۔" فاطمہ نے خدیجہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

"اس کے بعد وہ رات ختم ہو گئی۔ اس کا وہ نصف پہر شاید منٹوں میں گزر گیا۔ صبح کی روشنی پھیلی اور ہم لاہور پہنچ گئے۔ لاہور جو میری جائے پیدائش تھا۔ اس کے بعد شاید مجھے کبھی اچھا نہیں لگا۔" قلزا کے چہرے پر تلخی پھیلی۔

"وہ مجھے اس مصور دوست کے گھر لے گیا جس کے ہاں ناشتے پر بہت سے ایسے لوگ مدعو تھے جن کو وہ میرا کام دکھانا چاہتا تھا۔ میری پینٹنگز، اسکیچز اور مجسموں پر اس نے اتنی تفصیل سے گفتگو کی کہ میں خود بھی حیران رہ گئی۔ وہ ان کے تکنیکی پہلوؤں سے اتنا واقف ہوگا۔ میں بھی نہیں جانتی تھی۔ اس کی گفتگو اور میرے کام کو حوصلہ افزا رسپانس ملا۔ اس نے مجھے کئی ایسے لوگوں سے ملوایا جو آئندہ میری رہنمائی کر سکتے تھے اور جن کے اسکول آف تھاٹ پر مجھے غور و خوص کرنے کی ضرورت تھی۔ صبح کا ناشتا تقریباً دوپہر کو ختم ہوا۔ پھر وہ مجھے لے کر ایسی دکانوں پر پھرتا رہا جہاں میرے کام سے متعلق سامان کھلی مارکیٹ کی نسبت خاصا سستا مل جاتا تھا۔ اس نے جو سامان ان دکانوں سے خرید کر مجھے دیا۔ وہ دو سالوں کے کام کے لیے کافی تھا۔ اپنے لیے اس کی یہ توجہ مجھے ہواؤں میں اڑا رہی تھی۔"

"تمہیں ملک کی صف اول کی مصورہ بنا دیکھنا میرا خواب ہے قلزا اور اس خواب کو تعبیر میں ڈھالنے کے لیے مجھے جو بھی کرنا پڑا مجھ سے جو کچھ بھی ہو سکا۔ میں کروں گا۔"

اس شام ایک کافی شاپ پر بیٹھے اس نے مجھ سے کہا تھا۔

"خود کو اس آنسو لیشن سے باہر نکالو، چیزوں کو ایکسپلور (دریافت) کرنا سیکھو۔ تمہیں اللہ نے بڑے ہنر سے نوازا ہے۔ آگے بڑھنے کا حوصلہ کرلو میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

وہ نرم لہجے میں بات کرتا میرا حوصلہ بڑھا رہا تھا اور ہوائیں مجھے اوپر، اوپر بہت اوپر اڑانے لگی تھیں۔ پھر وہ مجھ سے پبلک کال بوتھ سے کسی کو فون کرنے کی اجازت لے کر کافی شاپ سے باہر گیا اور جب وہ واپس آیا تو بہت گھبرایا ہوا تھا۔

"مجھے ابھی، اسی وقت کہیں پہنچنا ہے قلزا۔ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر۔ تمہیں کسی دوست کے ہاں ڈراپ کردوں یا۔۔۔" اس کی آواز کسی انجانے خوف کے تحت کپکپا رہی تھی۔

"میرا تو ایسا کوئی دوست، کوئی رشتہ دار یہاں نہیں رہتا۔" اس کی گھبراہٹ نے مجھے بھی ایک یکدم سب کچھ بھلا دیا تھا۔

"میرے لیے تو ایک ایک لمحہ بہت بھاری ثابت ہونے لگا ہے۔" وہ بے بسی سے بولا۔

وہ اضطراب کی حالت میں تیزی سے مڑ کر دوبارہ باہر کی طرف چل دیا۔ میں بنا سوچے سمجھے اس کے پیچھے چل دی اور گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ وہ انتہائی خطرناک اسپیڈ پر گاڑی چلاتا اندرون شہر پہنچا اور گاڑی ایک کھلے احاطے میں چھوڑ کر اس علاقے کی تنگ و تاریک پر پیچ گلیوں کی طرف بھاگا۔ میں اسی طرح بنا سوچے سمجھے اس کے تیز چلتے قدموں کے پیچھے چلتی جا رہی تھی۔ وہ راستہ طویل اور بھول بھلیوں ایسا تھا۔ چلتے چلتے میرا سانس پھولنے لگا۔ کمزور روشنی کی اسٹریٹ لائٹس جو کہیں کہیں جل رہی تھیں۔ مجھے یہ سمجھانے کے لیے قطعی ناکافی تھیں کہ ہم کس سمت جا رہے تھے۔ یوں ہی چلتے چلتے ہم ایک تنگ و تاریک مکان تک پہنچے جس کی نیم روشن ڈیوڑھی کی دہلیز

پر ٹھوکر کھا کر میں بمشکل گرتے گرتے بچی، چھوٹے سے صحن سے گزر کر وہ ایک کمرے میں گھس گیا۔ میں وہیں صحن میں کھڑی تھی۔ اس کمرے کے اندر سے تکلیف سے کراہتی ایک نسوانی آواز صحن تک سنائی دے رہی تھی۔

"میں آگیا ہوں میری جان! ابھی سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔" میں نے سنا، وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔ میرے کان کھڑے ہوئے اور میں ان الفاظ کے جھٹکے کا شکار ہوتی کمرے کے اندر پہنچ گئی۔ میرے سامنے کھری چارپائی پر پڑا وہ نسوانی وجود، میرے حلق سے چیخیں نکالنے کا باعث ثابت ہوا۔ تم جانتی ہو فاطمہ! وہ وجود کس کا تھا؟" قلزا نے رک کر فاطمہ کی طرف دیکھا۔ فاطمہ کے چہرے پر تجسس اپنی انتہا تک ابھرا۔

"وہ وجود شہناز کا تھا۔" قلزا نے کسی گریک ٹریجڈی کے کردار کو متعارف کروانے کے سے انداز میں کہا۔ "وہ چہرہ مندمل ہو چکے عجیب سے زخموں کے نشانوں سے بھرا ہوا تھا۔ سرخی مائل سفید رنگت سیاہ پڑ چکی تھی۔ ہوش اڑا دینے والی سیاہ چمک دار آنکھیں اندر کو دھنس چکی تھیں۔ مگر میں نے پھر بھی ایک نظر میں اسے پہچان لیا تھا۔

"شہناز تم!" میں بے قراری سے آگے بڑھی۔ میرے ان الفاظ نے اس کو بھی بری طرح چونکا دیا جو میرا محبوب تھا اور دردِ زہ میں مبتلا شہناز کو بھی، شہناز کی نظریں لمحہ بھر کے لیے مجھ پر ٹکیں، پھر درد کی ایک لہر نے اسے دہرا کر دیا۔ وہ ہاتھ پاؤں مار رہی تھی، سر پٹخ رہی تھی اور میرا رفیق خود اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے وہ کرنے میں مصروف تھا جو کسی دایہ کے کرنے کا کام تھا۔

"یہ کون ہے؟" میں نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

"یہ شہناز ہے۔ تم نے پہچان تو لیا۔" وہ اپنے کام میں مصروف بولا۔

"یہ تمہاری کون ہے اور یہ اتنی تنہا کیوں ہے کہ تم اس کے لیے یہ کام کر رہے ہو۔"

"یہ میری بیوی ہے۔ میرا بچہ پیدا کر رہی ہے اور اسے اس علاقے میں ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی میں نے شفٹ کیا ہے۔ ابھی میں یہاں کسی سے بھی واقف نہیں ہوں اور اس کی یہ حالت ہے کہ اسے تنہا چھوڑ کر نہ اس وقت کہیں جا کر میں کسی دایہ، کسی نرس یا ڈاکٹر کو بلا لانے کی پوزیشن میں ہوں، نہ ہی خود مجھے اس کام کا تجربہ ہے۔" اس کا اپنا چہرہ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ "تم میری مدد کر سکتی ہو کیا؟"

اس نے پر امید نظروں سے میری طرف دیکھا تھا۔ مگر میں اس بمباری کی زد میں تھی جو اس کے الفاظ کی شکل میں مجھ پر برسی تھی۔ میں بے یقینی سے آنکھیں پھاڑے اپنے سامنے موجود منظر کو دیکھ رہی تھی۔ بھل بھل بہتا سرخ سرخ خون، نا تجربہ کار ہاتھوں کی لرزش، دل چیر دینے والی درد سے بھری چیخیں، میں اس منظر کی تاب نہ لاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا اور پوری کائنات پر تاریکی چھا چکی تھی۔ پھر ایک دلدوز چیخ کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی بچے کے رونے کی آواز۔۔۔ میں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

"پلیز قلزا پلیز۔۔۔ میری مدد کرو۔"

اپنے عقب میں مجھے اس کی آواز سنائی دی۔ اس کے ہاتھوں میں کپڑے میں لپٹا وہ کمزور ننھا سا وجود تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور بے اختیار ہاتھ بڑھا کر گوشت پوست کا وہ جاندار لوتھڑا پکڑ لیا۔ اسی دم کمرے میں کسی چیز کے گرنے کی زوردار آواز آئی۔ وہ الٹے قدموں کمرے کی طرف بھاگا۔ میں بچہ ہاتھوں میں پکڑے کچھ سمجھ میں نہ آنے والے انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اسی دم، اس گھر کا دروازہ کھلا اور ایک باریش شخص گھر میں داخل ہوا۔

"میں فضل حسین، میرا صاحب کدھر ہے؟" اس شخص نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے گردن موڑ کر کمرے کی طرف دیکھا۔ جہاں سے اب ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے بکرے کی گردن پر چھری پھرنے کے بعد اس کے

زخرے کی خرخراہٹ سنائی دیتی ہے۔ ساتھ ہی دو مردانہ آوازیں گرنے اٹھنے اور چیزیں گرنے کی آوازیں' گرنے والا باریش شخص کمرے کی طرف بھاگا۔

"یہ کیا صاحب؟" مجھے اس شخص کی آواز آئی۔

"وہ ادھر کو۔۔۔" میرے محبوب کی آواز آئی۔ "میرا سب کچھ تباہ ہو گیا۔"

وہ کہہ رہا تھا۔ میں روتے بچے کو ہاتھوں میں اٹھائے کمرے کی طرف بھاگی۔ میری نظروں کے سامنے ایک دل دوز منظر تھا۔ شہناز نیم برہنہ چارپائی پر پڑی تھی اور اس کی گردن کٹی ہوئی تھی۔ اس کا وجود خون میں ڈوب رہا تھا اور میرے محبوب' اس کے شوہر کے ہاتھ میں خون آلود چھری تھی۔ اس کے اپنے کپڑوں پر جابجا خون اور گرد کے داغ تھے۔

میرے حلق سے نکلنے والی چیخیں شاید کبھی تھم نہ پاتیں' جو وہ میرے قریب آکر با آواز بلند مجھے آواز نہ دیتا۔

"خاموش ہو جاؤ قلزا! یہ قیامت کا وقت ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "تمہیں اس محبت کی قسم دے کر کہہ رہا ہوں جو تمہیں مجھ سے ہے' میرے اس بچے کو لے کر یہاں سے فوری طور پر نکل جاؤ۔ اپنے ساتھ اسے بھی کسی محفوظ مقام پر پہنچا دو' تم جہاں بھی ہو گی' میں تمہیں ڈھونڈ لوں گا۔"

"مگر یہ۔۔۔" میں خون میں ڈوبے شہناز کے بے جان وجود کو دیکھے چلی جا رہی تھی۔

"جاؤ قلزا! پلیز۔۔۔ نکل جاؤ۔" اس نے مجھے ہلکا سا دھکا دیا تھا۔ "فضل حسین اس کو باہر کھلے تک پہنچا کر واپس آجاؤ۔"

اس نے باریش شخص سے کہا' اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور تقریباً" گھسیٹتے ہوئے باہر لے گیا۔ اس کے ساتھ یوں ہی گھسٹتی' ٹھوکریں کھاتی' گرتے پڑتے پچتی میں نجانے کیسے کھلی سڑک تک پہنچی تھی۔ بچہ بھوک سے بلبلا کر رو رہا تھا یا اپنے وجود میں آجانے کے غم میں' جو بھی تھا' اس کے رونے کی آوازیں بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ اس باریش شخص نے مجھے قریب آکر رکی ایک بس میں سوار کر دیا۔ میری مڈ نائٹ ان ہیون ختم ہونے والی تھی اور A Dawn in hell کا سفر شروع ہو رہا تھا۔" قلزا کی آواز بھاری ہونے لگی۔

"او میرے خدا!" محویت سے سنتی خدیجہ اور فاطمہ کے منہ سے بیک وقت نکلا۔ گویا جو کچھ شہناز کے بارے میں سنا تھا سچ تھا۔ دونوں کے چہرے سفید پڑ رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ اپنی فرسٹ کزن کی بھیانک موت کا قصہ سن کر دونوں کے چہروں پر ایسا تاثر تھا جیسے برسوں بعد اس کی نعش وصول کر رہی ہوں۔

"اس کے شوہر نے اسے کیوں قتل کر دیا۔ تمہارے لیے نا؟" خدیجہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور آنکھوں سے اتارا چشمہ دوبارہ آنکھوں پر جما کر قلزا کی طرف دیکھنے لگیں۔

"مجھے کچھ علم نہیں۔ کمرے میں اس وقت کیا ہوا' جب میں صحن میں کھڑی تھی' لیکن اس کے ہاتھ میں پکڑی خون آلود چھری' شہناز کی گردن کٹی نعش اور کمرے میں جابجا بہتے خون کا وہ منظر میری نظروں کے سامنے سے بھی گیا نہیں۔ اس پر اس نے مجھے کچھ پوچھنے' کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر بچہ پکڑا کر چلتا کر دیا۔" قلزا کی نظریں ابھی بھی اپنے سامنے خلا میں ماضی کی فلم پر وہ بھیانک منظر دیکھتی دکھائی دے رہی تھیں۔

"اس کے بعد کیا ہوا؟" فاطمہ نے شدت غم سے گلابی پڑتی ناک کو سوں سوں کرتے ہوئے رومال سے پونچھا۔

"اس کے بعد۔۔۔" قلزا نے فاطمہ کی طرف یوں دیکھا۔ جیسے اسے فاطمہ کا سوال سمجھ میں نہ آیا ہو۔ "اس کے بعد میں اس ٹوٹی پھوٹی' کھڑکھڑاتی بس میں بیٹھی کسی انجانی منزل کا سفر طے کرنے لگی۔ نصف رات بیت چکی تھی۔ اس بس میں مسافر کم تھے۔ دو خواتین اور چار یا شاید پانچ مرد' میرے سینے سے لگا وہ گوشت کا لوتھڑا رو رو کر تھک چکا تھا یا مر چکا تھا۔ میں نہیں جانتی تھی' مگر وہ خاموش ہو گیا تھا اور میں اس خوف سے اسے سینے سے الگ نہیں کر رہی

تھی کہ ان چند مسافروں کی نظروں میں مشکوک نہ ہو جاؤں۔ میں نے اپنی چادر سے اسے ڈھانپ لیا اور اپنی خوف زدہ تھکی ہوئی آنکھیں موند لیں۔ جو کچھ دیر پہلے دیکھا تھا' وہ منظر خواب تھا یا حقیقت میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ بس شہر کے مختلف راستوں سے گزر کر شہر سے باہر نکل گئی تھی۔ بس کے کنڈیکٹر نے مجھ سے ٹکٹ کے پیسے مانگے تو مجھے اپنے شانے پر لٹکے بیگ کا خیال آیا۔ میں نے چادر میں لپٹے بچے کو گود میں لٹایا اور بیگ سے پیسے نکال کر کنڈیکٹر کو دیتے ہوئے نیچی آواز میں پوچھا۔

"بس کہاں جا رہی ہے؟"

"بی بی! تم یہ دیکھے بغیر ہی بس میں سوار ہو گئیں کہ بس کہاں جا رہی ہے؟" کنڈیکٹر بلند آواز میں بولا اور زور سے ہنس دیا۔

"فیصل آباد جا رہی ہے۔ بس تم نے کدھر جانا ہے؟" پھر وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

"میں نے بھی وہیں جانا ہے۔" مجھے عجیب سی خجالت نے آن گھیرا۔

اسی دم ان پانچ' سات انسانوں کے درمیان عجیب سی کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ میں جانتی تھی' اب وہ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کسی کی طرف نہ دیکھنے کا فیصلہ کر لیا اور آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی۔ بس تیز رفتاری سے بھاگتی چلی جا رہی تھی' کسی اسٹاپ پر رکتی' نئے مسافر بس میں سوار ہوتے۔ اکا دکا پہلے سے بیٹھا مسافر اتر جاتا' صبح کی سفیدی نمودار ہوئی' میں مجرم سی بنی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ جب میری گود میں لیٹے بچے نے چیخ مار کر ایک بار پھر رونا شروع کیا۔ وہ زندہ تھا اور نیند سے جاگا تھا۔

"بچے کو دودھ پلاؤ بہن!" ایک مسافر عورت مشورہ دے رہی تھی۔

"ہائے یہ ہے کتنے دن کا اور تمہیں کس مصیبت نے آن گھیرا جو تازہ زچگی سے اٹھ کر اسے لے کر بس میں سوار ہو گئیں۔" کسی اور نے کہا۔ پھر مجھے لگا سب طرح طرح کی باتیں بنانے لگے تھے۔ میں بت بنی بیٹھی تھی۔ بچہ ایک پل خاموش ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ بس ایک اسٹاپ پر رک کر دوبارہ چلی' اس میں چند نئے مسافر سوار ہوئے۔

"توبہ۔۔۔ توبہ۔۔۔ توبہ۔" کسی کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ "ریڈیو پر خبر سنی ہے ابھی ابھی' گزشتہ رات اندرون لاہور میں ایک عورت قتل ہو گئی۔ اس کے شوہر نے مبینہ طور پر اس کے گلے پر چھری پھیر کر اسے قتل کر دیا۔ قاتل رنگے ہاتھوں آلہ قتل سمیت پکڑا بھی گیا۔"

میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ قاتل تھا۔ وہی قاتل تھا' جب ہی تو بچہ میرے حوالے کر کے مجھے بھگا دیا۔ بدگمانی کا دھواں میرے دل پر چھانے لگا۔ کیسی چال چلی اس نے' مجھے بچہ پکڑا کر چلتا کیا' تاکہ بچے سمیت میں پکڑی جاؤں اور خود۔۔۔ خود بھی کہاں بچ پایا؟

سوچتے سوچتے مجھے خیال آیا اور ایک مرتبہ پھر وہی بھیانک منظر میری نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ پہلی بار اس شخص کے لیے میرے دل میں نفرت کی ایک لہر اٹھی۔ راسکل' کروک' دھوکے باز' کمینہ' میں نے دانت پیستے ہوئے سوچا' دل چاہا' وہ چیختا چلاتا بچہ چلتی گاڑی سے اچھال کر کہیں باہر پھینک دوں۔

"لیکن میں کیوں قاتلہ بنوں؟" دماغ نے مارے غصے کے کام کرنا شروع کر دیا۔ بس ایک چھوٹے سے قصبے کے اسٹاپ پر رکی اور میں بچے کو اٹھا کر بس سے اتر گئی۔

اپنے پیچھے نجانے میں نے کتنے لوگوں کو اپنے بارے میں چہ میگوئیاں کرتے چھوڑا تھا۔ وہ جگہ اجنبی تھی۔ مجھے اس اسٹاپ کا نام بھی معلوم نہ تھا۔ میں بچے کو اٹھائے بس اسٹاپ پر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ بچے کی چیخیں دم توڑنے لگیں۔ شاید اس کے حلق نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ میرے دل میں یکایک اس سے نجات حاصل کرنے کا

خیال آیا۔ اس کے قاتل باپ کے بارے میں تفتیش کرتے ہوئے جو پولیس مجھ تک آن پہنچی؟ میرا رواں رواں کانپ اٹھا۔ عمر زیادہ نہیں تھی۔ تجربہ کم تھا۔ آنکھوں کے سامنے کئی منظر گھومنے لگے۔ خود کو ہتھکڑی لگے دیکھا' بچے اغوا کرنے والے گروہ کی صف میں کھڑے دیکھا۔ اپنے خاندان' بہن' بھائیوں کے حیرت زدہ چہرے اور ملامت کرتی نظریں دیکھیں۔ جس شخص کے سحر میں گرفتار میں کسی کو بتائے بغیر اس کے ساتھ گھر سے چل دی تھی۔ وہ مجھے کس انجام کو پہنچانے کا باعث بننے جارہا تھا۔

بس سیکنڈوں میں فیصلہ ہو گیا۔ میں نے دائیں بائیں' آگے پیچھے دیکھتے ہوئے ایک مناسب اوٹ تلاش کی اور بچہ وہاں رکھ کر خود تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے میں اس بس اسٹاپ کی حدود سے باہر نکل گئی۔ بس اسٹاپ سے ذرا فاصلے پر ٹیکسی اسٹینڈ تھا۔ وہاں سے میں نے ایک ٹیکسی کرائے پر لی اور اسلام آباد واپس پہنچ گئی۔ سارا راستہ میں خوف سے لرزتی رہی۔ اب پکڑی گئی کہ تب پکڑی گئی۔ لیکن خدا کا شکر اپنے گھر واپس آنے تک اور اس کے بعد بھی کوئی میرے پیچھے نہیں آیا۔"

"تو پھر اس بچے اور اس کے باپ کا کیا ہوا؟ شہناز بے چاری کا کیا بنا؟" خدیجہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"اوہ!" اسی وقت کال بیل کسی اور کسی گاڑی کا ہارن بیک وقت بجنے لگے۔

"مجھے اس وقت ایک جگہ بہت ضروری پہنچنا ہے۔" فلزا یکدم اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں نے ڈرائیور کو ٹھیک ایک گھنٹے میں یہاں پہنچنے کو کہا تھا۔ یقیناً" وہی آیا ہے۔ میں چلتی ہوں۔" وہ فاطمہ کا ہاتھ دبا کر باہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"لیکن تم نے ابھی پورا قصہ تو سنایا ہی نہیں۔" خدیجہ نے کہا۔

"باقی پھر کبھی سناؤں گی اگر ملاقات ہوئی تو۔" وہ ہاتھ ہلاتی تیزی سے باہر نکل گئی۔

"فلزا سنو تو۔ تمہارا فون نمبر' تم ٹھہری کہاں ہو؟" فاطمہ اس کے پیچھے لپکیں' لیکن وہ ان کے کسی سوال کا جواب دیے بغیر تیزی سے گیٹ کھول کر گھر سے باہر جاچکی تھی۔

"بہت عجیب ہے یہ۔" خدیجہ نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔ "ہمارے دلوں میں دکھ کی آگ لگا کر ادھوری بات سنا کر چلتی بنی۔"

"ہوں۔" فاطمہ کی نظریں کسی شے پر ٹکی تھیں' ان کا ذہن تیزی سے کچھ سوچ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میرے دل دا حال کوئی بھی نہیں جاندا' بھائی رضوان الحق! سب سمجھتے نیں کہ میں کملا ہو گیا ہوں۔ ایس لئی آپ نوں فون کر بیٹھا ہوں۔ شاید میری بات آپ دی سمجھ وچ آجائے۔"

"میں تمہاری بات تو سمجھ رہا ہوں بھائی افتخار! مگر میری سمجھ میں اور کئی باتیں نہیں آرہیں۔ تم ان سعد صاحب کے بھائی ہو تو کیا انہیں پتا نہیں تھا ان کا کوئی ایسا بھائی بھی ہے جو گم ہو چکا ہے۔ تمہاری بھین جی جو قصہ تمہیں سعد صاحب کے والد اور والدہ کا سناتی ہیں' اس میں بھی سعد صاحب کے کسی بھائی کا ذکر نہیں' پھر تم ان کے بھائی کیسے ہوئے؟"

"میں نئیں جاندا بھائی رضوان الحق' پر میرا ساہ پھلدا اے (میرا سانس پھول جاتا ہے) میرے قدم بھاری ہو جاندے ہیں ٹردے ٹردے (چلتے چلتے) میں بے دم ہو جاندا ہوں۔ رب دا ناں اے بھائی رضوان الحق! میرے حق اندر دعا کرو' خدا کا واسطہ ہے میرے لیے دعا کرو۔"

کھاری کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ کسی سے بھی کس قسم کی اپیل کرے جو کوئی اس کے لیے آسانی پیدا

کردے۔ تیا رابعہ اپنا وقت ضائع کرنے پر اسے ڈانٹ کر واپس اپنے گھر جا چکی تھیں۔ سعدیہ کبھی اس کی حالت پر اس کا مذاق اڑاتی اور کبھی تشویش ظاہر کرنے لگ جاتی۔ اسے محسوس ہوتا کھاری پر کسی جناتی شے کا سایہ تھا۔ وہ اسے مولوی سراج سرفراز سے دم کروانے بھیج دیتی۔ مولوی سراج سرفراز دم کرنے کے بعد اسے اپنا ذہن دین کی باتوں میں لگانے کی تلقین کرنے لگتے۔ ان کا خیال تھا کھاری گاؤں کے بگڑے ہوئے لڑکوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگ گیا تھا اور اس کے خیالات بے راہ روی کا شکار ہو رہے تھے۔ دن اور رات کھاری کے لیے مشکل ہوتے چلے جا رہے تھے۔ چوہدری سردار شکار سے فارغ ہو کر وہیں سے کراچی جا چکے تھے۔ کراچی سے انہیں تھائی لینڈ چلے جانا تھا اور پندرہ بیس دن سے پہلے ان کی واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اسے زندگی کی نئی حکایت سنانے والی، پچھل پائی بھی اسے اس کے پیروں سے اکھیڑ کر کہیں غائب ہو چکی تھی۔

"خدا کسی نوں میرے ورگا نہ پیدا کرے، نہ پیچھے دا پتا ہے نا آگے دا، تے جے پتا لگنے لگے تو سر نادے توں بغیر چٹھی دے وچ لکھیا ہووے۔"

وہ اکثر سوچنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں نے اس روز جو بات تم سے کہی تھی ماہ نور! مجھے اس کا صرف شک نہیں تھا، مجھے یقین تھا کہ سعد کی زندگی میں مرکزی حیثیت رکھنے والی لڑکی تمہارے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتی۔"

سارہ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔ ماہ نور نے دیکھا۔ سارہ کی مسکراہٹ میں اداسی تھی۔ جسے چھپانے میں وہ ناکام ہو رہی تھی۔

"تم نے میری بات پوری سنی نہیں شاید سارہ!" ماہ نور نے کہا۔ "مجھے اس کی محبت کا اعتراف اس وقت ملا جب اپنی محبت کا احساس دلانے کے لیے وہ خود میرے سامنے موجود نہیں۔ شاید تمہیں اندازہ نہ ہو سکے کہ یہ کیسی بے بسی کی کیفیت ہے۔"

"سعد جیسے شخص کی محبت کے اعتراف کا مل جانا ہی اتنا بڑا احساس ہے ماہ نور! کہ اس کے بعد کسی دوسری سوچ کا ذہن میں آنا ممکن ہی نہیں۔" سارہ نے کہا۔ "وہ سامنے موجود نہیں، مگر وہ ہے، اسی دنیا میں کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ اگر وہ میرے جیسی لڑکی کو جس سے اس کا فقط ہمدردی کا تعلق ہے یہ یقین دلا سکتا ہے۔ وہ میرے لیے ہر وقت کہیں بھی موجود ہے تو تم تو اس کے دل کا سب سے مقدس جذبہ ہو، سو جو وہ جہاں بھی ہے، تمہارے لیے کیا اور کیسا محسوس کرتا ہو گا۔"

"مگر وہ ہے کہاں؟" ماہ نور نے بے بسی سے کہا۔ "وہ جن سے بھاگا ہے، انہیں تو اس کے بھاگنے کی پرواہ بھی نہیں۔ جسے پرواہ ہے، جو اس کے لیے دن کے چوبیس گھنٹے بے قرار ہے۔ اسے ایک بے نشاں راستے کی مسافر بنا گیا۔ بتاؤ میں اسے کہاں تلاش کروں؟"

"انتظار کرو ماہ نور! اسے ایک نہ ایک دن لوٹ کر آنا ہی ہو گا۔" سارہ نے یقین کے ساتھ کہا۔

"انتظار۔۔۔ صبر، تلاش!" ماہ نور روہانسی ہو گئی۔ "جس آزمائش سے مجھے بچانے کے لیے سعد نے کبھی میرے سامنے اعتراف نہیں کیا، اس آزمائش میں خود ہی مجھے ڈال گیا۔"

"انتظار!" سارہ نے دہراتے ہوئے کہا۔ "تلاش۔۔۔ صبر۔۔۔" وہ بڑبڑائی۔ "ہم میں سے ہر کوئی اس آزمائش میں پڑتا ہے۔ اس سے گزرتا ہے۔" اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا اور اکثر کی تو تلاش، انتظار، صبر سب بے سود ہی رہتا ہے، ناکامی کا شکار۔" وہ اٹھی اور مختلف چیزوں کا سہارا لیتے ہوئے چلتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"اب یہ اکیلی بیٹھی رہے گی۔ کڑھتی اور روتی رہے گی۔" یسی آنٹی نے کشیدہ کاری کے فریم سے نظریں ہٹا کر سارہ کو جاتے ہوئے دیکھنے کے بعد ماہ نور سے کہا۔

"کیوں؟" ماہ نور نے بے دھیانی سے سوال کیا۔ اس کی نظریں سامنے موجود بلند پہاڑوں پر جمی تھیں اور ذہن سعد سلطان کے خیالوں میں کھویا تھا۔

"میں اس سے کہتی تھی کہ سعد کے بارے میں زیادہ نہ سوچا کرے۔" یسی آنٹی نے کہا۔ "سعد کو اس سے ہمدردی تو ہو سکتی ہے، خلوص کے ساتھ مدد کرنے کا احساس تو ہو سکتا ہے، مگر جس محبت کا خیال اس کے دل میں ہے، وہ سعد سلطان اس سے نہیں کر سکتا اور اب جبکہ اسے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ جو سوچتی تھی، وہ غلط تھا تو اسے شدت سے احساس ہونے لگتا ہے کہ جس کے جذبات اور محبت کو اس نے نظر انداز کیا۔ اس کے رویے پر اس کا کیا حال ہوتا ہو گا۔"

"ہیں!" ماہ نور اپنے خیالات سے چونک کر باہر نکلی۔ "ایسا کون تھا۔ ایسا بھی کوئی تھا؟" بے ترتیب جملے اس کے منہ سے نکلے تھے۔

"ہاں۔" یسی آنٹی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ رکو تھا، بلیو ہیون سرکس کا ہر دل عزیز مسخرہ، جسے ہم وقت کی دھول کے بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔"

یسی آنٹی کہہ رہی تھیں اور ماہ نور سن رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"مجھے اس لڑکی کے بارے میں بتاؤ ابراہیم! جس کے گھر کے باہر سے آخری مرتبہ تم نے سعد کو پکڑا تھا، وہ لڑکی جو معذور ہے اور بے آسرا بھی۔"

"آئی ایم سوری انکل! میں شاید آپ کو نہ بتا سکوں، وہ سعد کا ایسا معاملہ تھی جس کے بارے میں اس کی سختی سے ہدایت تھی کہ اس کے بارے میں آپ کو علم نہیں ہونا چاہیے۔" ابراہیم نے سر ہلاتے ہوئے بلال سلطان کو جواب دیا تھا۔

"گدھے ہو تم!" وہ ڈپٹ کر بولے تھے۔ "اس کے ایسے سارے معاملات، اس وقت تک میرے علم میں نہیں آنے چاہیے تھے جب تک وہ یہاں تھا اور تم اچھی طرح واقف ہو، اس وقت میں نے اس کے کسی ایسے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی کبھی کوشش بھی نہیں کی تھی، لیکن ابھی وہ یہاں نہیں ہے اور اس کے جانے کے بعد اگر اس کے ایسے تمام معاملات رک گئے تو جانتے ہو کیا اور کس کا نقصان ہو گا۔"

"جج۔۔۔ جی۔۔۔ انکل!" ابراہیم ان کے لہجے کے سامنے گھگھیا کر رہ گیا۔

"اس کے ایسے تمام معاملات کی ایک فہرست بنا کر مجھے دو، جہاں اس کے اکاؤنٹس سے ہر ماہ رقم منتقل ہوا کرتی تھی اور اس لسٹ میں ٹاپ آف دی لسٹ اس معذور لڑکی کا ذکر اور تفصیل ہونی چاہیے۔"

"معاملات رک جائیں تو کیا ہوتا ہے انکل!" ابراہیم نے احمقوں کی طرح سوال کیا۔ "ان لوگوں کا کچھ اور بندوبست ہو جائے گا، اللہ ہے نا!"

"احمق لڑکے! معاملات رک جائیں تو مسائل کے پہاڑ کھڑے ہو جاتے ہیں، کبھی جا کر ان لوگوں کی خبر بھی لی ہے جن کے معاملات اس کے چلے جانے کی وجہ سے رک گئے ہیں۔" وہ پہلے سے بھی زیادہ درشت لہجے میں بولے "اور ہاں یہ ہی تو تمہیں بتا رہا ہوں کہ ان لوگوں کا کچھ اور بندوبست کرتا ہے، واقعی اللہ ہے نا!" آخری جملہ انہوں نے نرم لہجے میں کہا تھا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ انکل!" ابراہیم کو اگرچہ ان کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی، لیکن اس نے ان کی تائید میں سر ہلا دیا تھا۔

"بے چارے انکل!" بعد میں اس نے سوچا تھا۔ "سعد کے یوں چلے جانے نے ان کا دماغ بالکل ہی بے ٹھکانا کرکے رکھ دیا ہے۔"

☆ ☆ ☆

"وہ سارہ کو چاہتا تھا۔ بہت زیادہ چاہتا تھا، اس کی ہر الٹی سیدھی فرمائش پوری کرنا اپنا فرض سمجھ لیتا تھا۔ چھوٹی آنکھوں، گول ناک اور راؤنڈ چہرے والا رکو نجانے کب اور کیسے اچانک کہیں سے آکر بلیو ہیون سرکس کا حصہ بن گیا تھا۔ بے چارہ اپنی ماں سے دور، باپ سے ذہنی فاصلوں پر کھڑا، گھر والوں کی بے نیازیوں کا شکار، گھر سے بھاگ آیا تھا اور بلیو ہیون سرکس کا حصہ بن کر ہم سب میں گھل مل سا گیا تھا۔ وہ ہم سب سے ہنسی مذاق کرتا، سرکس کے تماشائیوں کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھیرتا، کسی مہربان فرشتے کی طرح ہمہ وقت ہر کسی کی مدد کے لیے تیار رہتا مگر سارہ کے لیے اس کے جذبات بالکل مختلف تھے۔ خاص اور جان دار!"

یمی آنٹی بتا رہی تھیں اور ماہ نور خاموشی سے سن رہی تھی۔

"وہ اس کو پریا رانی کہہ کر بلاتا تھا۔ سارہ کو پالنے والا ماسٹر خان اس کو پری یا پریا رانی کہہ کر بلاتا تھا، اس کے علاوہ رکو تھا جو اسے پریا رانی کہا کرتا تھا۔ اس کے ہر عمل سے سارہ کے لیے پیار جھلکتا تھا، مگر سارہ نے کبھی اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا جب یہ چھ انچی بار پر کرتب دکھاتی نیچے گری، وہ رکو ہی تھا جو سرکس کے پردے کے پیچھے بیٹھے سب فنکاروں کو وہیں چھوڑ کر پنڈال میں داخل ہوا اور تماشائیوں کو دھکیلتا، اس جگہ جا پہنچا جہاں سارہ گری تھی۔ سارہ کو اٹھا کر چھولداری میں لانے اور فرسٹ ایڈ دینے کے دوران وہ وہیں موجود رہا، میں بھی وہیں موجود تھی پھر سرکس کے مالک ماسٹر کا فو نے رکو کو اپنے پاس بلوایا۔ اس کے بعد میں نے رکو کو نہیں دیکھا، نہ سرکس رنگ میں، نہ ہی کرتبوں کی پریکٹس کرنے والے میدان میں، نہ ہی سارہ کی چھولداری میں، چند دن کے وقفے کے بعد جب سارہ کے زخم خراب ہونے لگے تو کسی فرشتے کی طرح سعد سلطان آگیا اور سارہ کو وہاں سے اٹھا لایا، میں سارہ کی حالت دیکھ کر اسے اکیلے جاتے نہ دیکھ پائی اور ساتھ ہولی، بلیو ہیون سرکس اور وہ جاپانی گڈار کو پیچھے رہ گئے اور ہم آگے نکل آئے اس کے بعد مجھے علم نہیں بلیو ہیون کا کیا ہوا، رکو کہاں غائب ہوا تھا، وہ واپس بلیو ہیون آیا یا نہیں۔

ہاں، شروع شروع میں بلکہ اس کے بہت بعد تک سارہ کو بلیو ہیون والوں میں اگر کوئی یاد آتا تھا تو وہ رکو ہی تھا۔ اکثر نیند میں یہ چیختے چلاتے ہوئے اسے آوازیں دیتی، اسے پکارتی اٹھ کر بیٹھ جاتی تھی، میں نے اسے سمجھایا رکو کو یاد کرنا چھوڑ دے، وہ اپنی دنیا میں مگن ہوگا، اسے اس کی فکر ہوتی تو اسے ڈھونڈ لیتا، میں ایسا دانستہ کیا کرتی تھی تاکہ یہ اسے بھول جائے کیونکہ اس کو یاد کرنے میں اسے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اب اتنے عرصے کے بعد سعد سلطان کا احساس ہاتھ سے چھٹ جانے پر اسے پھر سے رکو یاد آنے لگا ہے۔ اب اس کا خیال ہے، جو کچھ اس کے ساتھ ہوا، وہ رکو کا دل توڑنے کا نتیجہ ہے۔ اب پچھتاوے اس کو گھیرنے لگے ہیں محبت کے، خیال کے ایک گہرے احساس سے اچانک بے دخل ہو جانے پر اسے محبت اور خیال کا وہ گہرا احساس یاد آنے لگا ہے، جو دلانے والا دلا تا رہ گیا، مگر یہ دامن جھٹک دیتی تھی۔"

یمی آنٹی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ہوتا ہے، کبھی کبھی ایسے بھی ہوتا ہے، چیزوں کے ہاتھ سے نکل جانے پر چیزوں کی قدر آتی ہے۔"

وہ کہہ رہی تھیں، مگر ماہ نور ان کی نہیں سن رہی تھی۔ اس کے ذہن میں چند الفاظ گردش کر رہے تھے۔ چھوٹی

آنکھیں، گول ناک، راؤنڈ چہرہ، سرکس کا مسخرہ، جاپانی گڈا۔ اس کے پردہ ذہن پر ایک چہرہ یاد بن کر ابھرنے لگا تھا۔

"کھاری!" وہ دل میں اس چہرے کے مالک کا نام یاد کرتے ہوئے اٹھی اور کمرے میں رکھے اپنے فون کی طرف لپکی۔

☆ ☆ ☆

ہولی ہرسٹ روڈ ڈارلنگٹن پر واقع ڈارلنگٹن میموریل اسپتال پہنچنے تک نادیہ کو معلوم نہیں تھا کہ وہ وہاں کس کے بلاوے پر اور کس لیے جا رہی تھی، اسپتال کے مرکزی گیٹ پر پہنچ کر اس نے ایک بار پھر پیغام بھیجنے والے کے نمبر پر کال کی۔ دو، تین بار بیل بجنے کے بعد کال وصول کر لی گئی۔

"میں نادیہ بلال۔" نادیہ نے کہا۔ "میں ڈارلنگٹن پہنچ چکی ہوں اور اس وقت میموریل اسپتال کے مرکزی گیٹ پر کھڑی ہوں۔"

"میرا خیال ہے، تم وہیں رہو، میں تمہاری رہنمائی کے لیے وہیں آتا ہوں۔" دوسری جانب سے کہا گیا۔ نادیہ شش و پنج میں وہیں کھڑی تھی کچھ دیر بعد اس کے فون کی گھنٹی بجی، اس نے ہاتھ میں پکڑا فون آن کرنے کے لیے نظروں کے سامنے کیا۔

"رہنے دو۔" سامنے سے آئے ایک اجنبی شخص نے اسے قریب آکر مخاطب کیا۔ "میں صرف تم تک پہنچنے کے لیے کال کر رہا تھا۔" وہ بولا۔ نادیہ نے استفہامیہ نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھا۔

"میں وودن زادے ہوں۔" اس شخص نے کہا۔ "وودن زادے فرام امریکا۔ میرے پاس تمہارے لیے ایک بری خبر ہے اور وہ خبر تمہارے بھائی سعد سلطان کے متعلق ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم حوصلے کے ساتھ یہ خبر سنو گی۔"

وہ کہہ رہا تھا اور زمین نادیہ کو اپنے قدموں تلے سرکتی محسوس ہو رہی تھی۔ (باقی ان شاءاللہ آئندہ شمارے میں)

عنیزہ سیّد

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم

"میرا خیال ہے میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم اب اس کے پیچھے جا رہے ہیں نہ ہی اس کی کوئی بات کر رہے ہیں" بلال سلطان کا لہجہ اور بات ابراہیم کے لیے حوصلہ افزا ہرگز نہیں تھی۔

"لیکن انکل! میں نے بتایا نا کہ یہ لڑکی تو ویسے ہی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" اس نے منمنا کر ایک کوشش مزید کرنا چاہی۔

"تمہارا کیا خیال ہے' میں بہت فارغ ہوں جو جب کوئی مجھ سے ملنا چاہے میں اسے ملنے کے لیے Available (دستیاب) ہو جاؤں۔" وہ سخت اور خشک لہجے میں بولے۔

"نہیں۔ ہرگز نہیں انکل! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں" ابراہیم نے زبان پھیر کر اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا ہے کہ اسے میں اپنے مان پر لایا تھا۔" اس نے ایک جذباتی وار کھیلنے کی کوشش کی "میں نے ہی اسے یقین دلایا تھا کہ انکل میری بات کو اون کرتے ہیں کیونکہ مجھے وہ اپنے بیٹے جیسا ہی سمجھتے ہیں۔"

-۲۵-
پچیسویں قسط

"کتنے ہی مہینے گزر گئے دولہا بھائی کی کوئی خیر ہے نہ خبر۔"

"میں بھی یہی بات سوچ رہا تھا آج ظہر کے لیے وضو کرنے کے دوران۔"

(شکر ہے کبھی تم نے بھی کچھ سوچنے کی زحمت کرلی سراج سرفراز! ورنہ تو ایسا لگتا ہے تمہارا دماغ بے چارہ اپنے ہونے پر ہی اشک بہاتا رہتا ہوگا)

"میری بہن بے چاری غم میں گھل رہی ہے۔ شکل گئی' آواز گئی اور اس کے ساتھ ہی شوہر اور بچہ بھی گئے' اس کی تو سمجھ میں شاید یہ بھی نہ آتا ہو کہ دن کے کس پہر کس کا غم منائے' کس کا نہ منائے۔"

"بھائی صاحب اتنے مادہ پرست' کٹھور اور سخت دل لگتے نہ تھے' مگر جو ہو رہا ہے۔ اسے دیکھ کر خیال آتا ہے کہ شاید وہ ایسے ہی تھے۔"

"آہا۔ جو نظر آتا ہے وہ ہوتا نہیں اکثر۔"

"ہاں یہ بھی ہے۔"

"اب اس کا کیا کیا جائے کہ میری بہن کو ہر دم لگن لگی رہتی ہے حج پر جانے کی' ادھر ادھر سے' تیرے میرے سے جو پیسہ ادھار' نقد' قرض دے رکھتا تھا' واپس مانگنے کو کہتی ہے۔ اس کے اپنے اکاؤنٹ میں جو پیسہ ہے وہ اور یہ سب پیسے جو لوگوں سے واپس مانگتی ہے۔ کیا یہ سب ملا کر حج کے سفر کا ارادہ کر سکتی ہے وہ؟"

"آپا جی کے لیے تو ان کا اپنا پیسہ' جو بینک میں رکھا ہے' وہی بہت ہے حج کے لیے' لیکن وہ تو ہم دونوں کو بھی ساتھ لے جا کر حج کرانا چاہتی ہیں رابعہ بیگم!"

"سوچتی ہوگی سفر کے لیے ہم سفر بھی تو ہونا چاہیے۔ کوئی ساتھ میں' ارے اس بے وفا' کٹھور' ہرجائی کو اسی لیے تو روتی ہے۔ کیسے کیسے وعدے نہ کر رکھے تھے عمر بھر ساتھ نبھانے کے' اس نے یہ شکل سے کیا گئی۔ وہ اس سے گیا' ساتھ میں بچہ بھی اٹھا لے گیا' ظالم' حسن پرست' نگھے اور شکل کا عاشق' کسی کی آئی آئے کم بخت کو۔"

"بھائی صاحب ایسے دکھتے تو نہ تھے۔"

"آپ کی تو جناب سراج سرفراز صاحب عقل ہی پوری پوری ہے' دیکھ رہے ہو کیسا وہ میری بہن کو چونا لگا کر بھاگا' ساتھ میں بچہ بھی لے گیا' پھر بھی جب بات ہوتی ہے یہ ہی کہے جاتے ہو بھائی صاحب ایسے لگتے تو نہ تھے۔"

"نہ رابعہ بیگم! چہرہ بگاڑ کر کسی کی نقلیں اتارنے سے بڑا گناہ ہوتا ہے' جہنم کی آگ آگے بڑھ کر لپکتی ہے ایسے شخص کی طرف مجھ مسکین کی نقلیں اتار کر گناہ گار مت ہوں آپ۔"

(ایک تو تمہارے وعظ سراج سرفراز' برا ہوا جو تم ایک نکاح کے صدقے میرے مجازی خدا بن بیٹھے' نہ ہوتا یہ رشتہ تو میں تمہیں بتاتی' ایسے واعظوں پر کیا حشر کر سکتی ہوں تمہارا)

"ارے اللہ توبہ! زبان ہے چڑے کی پھسل گئی' معاف کردیں سراج سرفراز صاحب! بہتری کوشش کرتی ہوں قابو کرنے کی پھر بھی پھسل جاتی ہے' فکر نہ کریں جلد ہی قابو آجائے گی۔"

"کوئی بات نہیں رابعہ بیگم! آپ کی کسی بات کا ملال دل میں نہیں رکھتا میں' اللہ جل شانہ ہدایت عطا فرمائے آپ کو۔"

(ہونہہ' تمہارے جیسے بے علم مولوی کے ذریعے ہدایت پانے سے میں بے ہدایتی ہی اچھی ہوں)۔

"آپ کی بڑی مہربانی سراج سرفراز صاحب جو ملال دل میں نہیں لاتے۔"

"آپا بیگم کی خاص شفقت ہے' جو میرے لیے آپ جیسی بی بی کا انتخاب کردیا' ورنہ میں مسکین' جس کا نہ کوئی آگا نہ پیچھا' ساری عمر مولوانوں کے در پر پڑا مانگے کی روٹی کھانے والا' مسجد' مکتب سے بساط بھر ہدایت حاصل کرتا پھرتا' کبھی کسی حافظ جی سے' کبھی کسی مولوی صاحب سے' کبھی کسی مولانا سے چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر بھی ڈنڈے کھانے والا' گرتے پڑتے عمر گزارتا آدمی' مجھ ایسے کو آپ جیسی حسین' سگھڑ سلیقہ شعار' عقلمند بی بی کا ساتھ مل جانا ہی معجزہ ہے رابعہ بی بی! مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آتا اس معجزے پر۔"

(لو میں ٹھہری ذات کی میراثن' اور یہ بے چارہ بھلے دھکے کھاتا دین اسلام کا علم حاصل کرنے والا آدمی' میری اوقات دیکھو اور اس بے چارے کی سوچ دیکھو' اس ساتھ کو معجزہ قرار دے رہا ہے۔ واہ بھئی نیلی چھتری والے! تیری شان ہے' جو بندے کو سمجھا دیتا ہے کہ جو تجھے ملا تیری اوقات سے بڑھ کر ہے)

"اچھا یہ سب چھوڑیں' یہ بتائیں کہ جو پیسے اب تک اکٹھے ہوئے ان سے حج کا سفر کیا بھی جا سکتا ہے کہ نہیں۔"

"میں نے پتا کروایا ہے' پانی کے جہاز کے ذریعے جانے پر پیسہ کم خرچ ہوتا ہے' آپا بیگم نے فرمایا تھا درخواستیں جمع کروادو' وہ تو ایک آدھ دن میں جمع ہو جائیں گی' اللہ جل شانہ کی منظوری عطا ہو گئی تو ان شاء اللہ سفر حج اس بار ضرور مقدر بنے گا۔"

(واہ میرے مولا تیری شان' کدھر کی اینٹ اور کہاں کا روڑا جوڑ کر تو کنبے بنا ڈالتا ہے۔ سفر حج پر جو نے بلا لیا تو بھلا اس گروہ میں کون کون شامل ہوگا۔ ایک پیدائشی میراثن' ایک مولوانوں کی ڈیوڑھی میں پلنے والا بے نام و نشان لمڈا' اور ایک وہ بے بس عورت' جس کا خاندان اونچی ناک والا' جو عیش آرام' محبت خلوص کی نرمی اور گرمی' روپیہ پیسہ سب چھوڑ کر مجبور میں آن ٹکی' واہ میرے مولا تیرے سارے ہی رنگ نرالے ہیں۔)

"جو آپ کہیں رابعہ بیگم تو میں بھائی صاحب کی تلاش میں پنڈی اسلام آباد کا قصد نہ کرلوں۔"

"اس محلے سے باہر نکل کر ماڈل ٹاؤن تک راستہ آپ کو آتا نہیں سراج سرفراز صاحب اور آپ چلے ہیں پنڈی اسلام آباد کا سفر کرنے۔ وہ بھی ایک ایسے شخص کی تلاش میں جسے ملنا ہوتا تو گم ہوتا ہی کیوں۔ بیٹھے رہیے یہیں آرام سے۔ آپ انہیں نیک دل سمجھ رہے ہیں تو یہ آپ کی حماقت ہے۔ یہ سب ایک جیسے ہیں اندر سے' بس چہرے الگ الگ سجا رکھتے ہیں خود پر' کوئی بلال سلطان کا چہرہ پہنے مظلوم' بے بس کا عاشق بنا چلا آتا ہے تو کسی نے طیفے لانڑ کا چہرہ پہن رکھا ہے۔ اندر سے سب ایک سے ہیں' محسن کے اور ہوس کے پجاری' محسن اجاڑ کر ہوس پر پانی ڈال دینے تک ہی ان کی رقابت کا رشتہ قائم تھا۔ اب نہ حسن رہا نہ ہوس' دونوں پجاری سب اجاڑ کر اپنی اپنی راہ چل دیے۔ بیڑا غرق ہو جائے دونوں ٹٹ مرنوں کا' دونوں کو کسی اور کی آئی آجائے' ہم تینوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر بھاگ جانے والے کو تو طیفے سے بھی پہلے آجائے کم بخت سسک سسک کر مرے۔"

"نہ رابعہ بیگم! کسی کو بددعائیں دینا سخت گناہ ہے' بددعا ہمیشہ دینے والے کا پیچھا کرتی ہے الٹا توبہ کریں توبہ۔"

(آگ لگے تمہارے بے وقت واعظوں کو سراج سرفراز' دل کر رہا ہے چمٹا اٹھا کر تمہارے منہ پر دے ماروں کم بخت' مگر کیا کروں میری بہن کی نصیحتیں آڑے آجاتی ہیں' شوہر کی نافرمانی اور گستاخی کرنے والی عورت جہنمی ہو گئی۔ ارے منہ بند ہو جاتا ہے اس کی نصیحت یاد کر کے' خود کیسا عمل کرتی ہے اس بات پر' بڑی تکلیفیں سہتی ہم پتی ہے مگر مجال ہے' جو شوہر کے خلاف ایک بات بھی منہ سے نکال لے بیٹے کی موہنی صورت یاد کر کے یقیناً کلیجہ منہ کو آتا ہوگا اس کا' مگر مجال نہیں نکالتی منہ سے' ارے ایسی صابر عورت کا ساتھ نہ ہوتا چوبیس گھنٹوں کا سراج سرفراز تو میں دیکھتی تم کیسے مجھے یہ وعظ سناتے ہر دم' جہنم کی آگ کی سناؤنیاں سنانے والے بھیاڑ۔

☆ ☆ ☆

اس نے اپنے سامنے بیٹھے شخص کی طرف دیکھا جو پچھلے ایک گھنٹے سے مسلسل بولتا چلا جا رہا تھا۔ وہ ویسے ہی بہت باتونی تھا یا اس وقت ایک اضطراب کے عالم میں بے تحاشا بول رہا تھا' اسے اندازہ نہیں ہو سکا تھا کیونکہ اس

وقت خود اسے بھی اپنے اندر سے اٹھنے والے اضطراب کو قابو میں رکھنے کے لیے کسی دھیان بٹانے والے کی اشد ضرورت تھی، خود کو آئینے میں دیکھے بغیر بھی اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ شدت غم کو قابو میں رکھنے کی کوشش میں اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور یقیناً" آنکھوں کی نمی چھپانے کی کوشش کے باوجود نظر آرہی ہوگی۔

"بھلا یہ کیسا اتفاق ہے۔" اس نے ایک بار پھر اپنے سامنے بیٹھے شخص کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ "یہ شخص جو اپنا نام وردن زادے بتاتا ہے' ایرانی النسل امریکی ہے' خود میں بیک وقت دو ملکوں کی قومیت کی حامل لڑکی ہوں اور تیسرا وہ شخص ہے جو میرا بھائی تو ہے مگر اس کی قومیت بالکل ہی مختلف ہے' ہم تین لوگوں کو ایک نقطے پر ایک سانحہ اکٹھا کر رہا ہے۔ یوں کہ میں اس شخص کو اور یہ شخص مجھے بالکل نہیں جانتے' جو ہم دونوں کو جانتا ہے اور جسے ہم دونوں جانتے ہیں۔ اس کے بارے میں کچھ اندازہ نہیں۔ وہ جی رہا ہے یا نہیں' وہ جی سکے گا بھی کہ نہیں۔" اس کا دل بری طرح بھر آیا اور اس بار اس نے اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

سعد سلطان جو اس کا سوتیلا بھائی تھا اور جس کے ساتھ ایک چھت کے نیچے رہنے کی اس نے ہمیشہ تمنا کی تھی مگر قدرت کی ستم ظریفی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے اتنے برس اس سے دور ہی رہنا پڑا تھا' کیا کبھی اس نے سوچا تھا کہ وہی سعد سلطان' جن لوگوں میں رہتا چلا آیا تھا ان سے اپنا تعلق توڑ کر جب اس غیر آلود ملک میں آئے گا تو اپنی شناخت کے خانے میں اس نے صرف نادیہ بلال کا حوالہ دے رکھا ہوگا۔ کسی بھی ہنگامی صورت حال میں اپنے بارے میں اطلاع دینے کے لیے صرف اس کا نمبر ہر جگہ درج کر رکھا ہوگا۔ نادیہ نے روتے روتے سر جھٹکا۔

یہ شخص وردن زادے کہتا ہے کہ وہ اپنے ملک سے' اپنے باپ سے ہر اس شخص' ہر اس چیز سے اپنا تعلق توڑ چکا تھا جو اس کے ماضی کا حصہ رہی تھی' اگر ایسا ہی تھا تو ایسا کیوں تھا۔ اس نے کچھ نہ سمجھ پاتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا' آنسو مسلسل اس کی آنکھوں سے بہتے چلے جارہے تھے۔

"اس نے کیوں اپنے حوالے سے صرف نادیہ کا نام ظاہر کر رکھا تھا۔" مسلسل سوچنے' ذہنی دباؤ' ڈپریشن اور غم کے مارے اس کا ذہن ماؤف ہونے لگا تھا۔

"اس طرح مت رو چھوٹی لڑکی!" وردن زادے اپنی نشست سے اٹھ کر اس کے قریب آکر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "وہ ابھی مرا نہیں۔" اس کی اپنی آواز بوجھل ہونے لگی "اس کی چند سانسیں ابھی بھی اس کے جسم سے جڑی ہوئی ہیں' اور جب تک یہ سانسیں ہیں وہ زندہ ہے۔"

نادیہ اس کی یہ بات سن کر اور بھی زیادہ شدت سے رونے لگی۔

"شاید یہ دعا کا وقت ہے۔" وردن زادے نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا "میں نے سنا ہے کہ دعائیں قبول بھی ہو جایا کرتی ہیں۔ اگرچہ میرا یقین بہت کمزور ہے' لیکن اگر لوگ ایسا کہتے ہیں تو ہو سکتا ہے دعاؤں کو آسمانوں تک پہنچانے والے فرشتے ادھر ہی ہمارے ارد گرد کہیں موجود ہوں۔"

"تم نے تو مجھ سے بھی زیادہ تفصیل سے سنا ہے۔" نادیہ نے اپنی دبی دبی چیخوں نما سسکیوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر نے اس کی کیا حالت بتائی ہے۔" اس نے اپنا بھیگا ہوا چہرہ وردن زادے کی جانب موڑا "چوٹ اس کے سر پر آئی ہے' ضرب اس کے دماغ پر لگی ہے اور وہ کوما کی حالت میں ہے۔"

"ہاں!" وردن زادے نے سر ہلایا "لیکن ڈاکٹرز نے یہ بھی تو نہیں کہا کہ وہ بچ نہیں سکے گا' وہ اپنی کوششوں کے بارے میں پرامید ہیں۔"

"کتنے ڈاکٹرز؟" نادیہ نے یہ سوال چلانے کے سے انداز میں کیا تھا "پورے میڈیکل بورڈ میں سے صرف دو ڈاکٹرز کی یہ رائے ہے کہ اس کی جان بچ سکتی ہے۔ وہ بھی صرف اس صورت میں کہ اگر اسے اس ابتدائی امداد کے بعد جو ڈار لنگٹن میں اسے مل رہی ہے فوراً" کسی بڑے اسپتال میں لے جایا جائے اگرچہ یہ حرکت اس کی جان کے

لیے مزید خطرہ ثابت ہو سکتی ہے۔"

"ہاں تو ہم یہ خطرہ مول لینے ہی والے تو ہیں' اس کو یہاں سے لندن منتقل کرنے کے تمام انتظامات مکمل ہیں۔" وودن زادے نے اسے یقین دلانے کے انداز میں سرہلایا۔

"نہیں۔" نادیہ کی چیخ نکل گئی' اس کے اس چلانے سے اس پارک میں جہاں وہ دونوں بیٹھے تھے' موجود بیشتر لوگوں نے مڑکر اس کی طرف دیکھا تھا۔ "نہیں تم ایسا نہیں کرو گے۔ وہ راستے ہی میں مرجائے گا۔"

"اگر سعد نے مرنا ہی ہے تو کیوں نہ بجائے اس کو یہاں رکھ کر اس کے سامنے بیٹھے ہوئے اس کی سانسوں کی گنتی کرنے کے اس کی زندگی بچانے کا خطرہ مول لیتے ہوئے یہ موت آجائے۔ اس عمل میں کم از کم کوشش کا دخل تو شامل ہو گا نا۔" وودن زادے نے حتمی لہجے میں کہا۔

"نہیں پلیز' یہ مت کرنا۔ جب تک وہ زندہ رہ سکتا ہے' اسے زندہ رہنے دو' اسے جلدی ماردینے کی کوشش مت کرو۔"

"میں نے برا کیا جو تمہیں یہاں بلالیا۔" وودن زادے نے یوں سر جھٹکا جیسے اسے نادیہ کے پاگل پن پر غصہ آرہا ہوں۔ "بہتر ہوتا وہاں پہنچ کر تمہیں اطلاع دیتا۔"

"وہاں پہنچ کر۔" نادیہ کو بھی وودن پر غصہ آیا۔ "وہاں پہنچ کر اس کی لاش وصول کرنے کے لیے اطلاع دیتے کیا تم؟"

"لاش تو یہاں بھی تم ہی وصول کرو گی' اس مصنوعی تنفس کے ساتھ وہ چند گھنٹے اور جیتا نظر آئے گا بس' پھر تو لاش ہی باقی رہ جائے گی جسے تم ہی نے وصول کرنا ہے کیونکہ میں تو صرف اس کا اتفاقی دوست ہوں' جیسا بھی ہے خونی رشتہ تو صرف تم سے ہے نا اس کا۔" وودن زادے تیزی سے بولا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"رکو!" نادیہ نے اس کا بازو پکڑا' وہ متوحش نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ "ایسا مت کرو پلیز۔ ایسا مت کرو۔"

"میں جامد بیٹھ کر انتظار نہیں کر سکتا۔" وودن نے اپنا بازو اس سے چھڑایا۔ "مجھے کوشش کرنی ہے۔"

"ٹھہرو! مجھے ڈیڈی سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے دو۔" نادیہ نے التجائیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"ایسا کر کے اس کی رخصت ہوتی ہوئی روح کو تکلیف دینے کے سوا کچھ نہیں کرو گی۔ اپنے باپ کے بارے میں جو گفتگو اس نے مجھ سے کی' اس میں میں نے کہیں اپنے باپ کے لیے اس کے دل میں کوئی گنجائش نہیں پائی' اپنے باپ کی وجہ سے ہی تو وہ اپنے وجود پر شرمسار رہتا تھا۔" وودن نے سختی سے کہا۔

"مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تم کیا سنا رہے ہو۔" نادیہ نے بے بسی سے سہلاتے ہوئے کہا۔ "ڈیڈی اور سعد ..." اس نے سر اٹھا کر وودن کی طرف دیکھا۔ "میں کیسے مان لوں کہ سعد ڈیڈی سے اتنا بے زار تھا۔"

"بہتر ہے کہ مان لو اور برائے مہربانی باتوں میں الجھا کر میرا وقت ضائع مت کرو' ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔" وودن نے درشتی سے کہا۔ اور وہاں سے چل دیا۔ نادیہ یوں ہی بے بس اور ملتجیانہ نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو کھاری! میں ماہ نور بات کر رہی ہوں۔"

"او ہو مہ نور باجی! تسی کتھے رہ گئے تھے جی؟" کھاری کے کانوں نے جیسے ماہ نور کا نام نہیں' کوئی مژدہ جاں فزا سن لیا تھا۔

"آئی ایم سوری کھاری! میں اپنے مسائل اور معاملات میں پڑ کر تمہیں بالکل ہی بھول گئی تھی۔"

"آپ مجھ کو بھل گئے کوئی بات نہیں بی بی مہ نور باجی تسی' جن بی بی رابعہ تو بی بی جی' آپ کو یاد ہے آپ ان سے وعدہ کر کے گئے تھے کہ باؤ سعد صاحب دا اگا پچھا معلوم کر کے دسو گے۔" کھاری نے بے قراری سے گلہ کیا۔

"وہی اگا پچھا معلوم کرتے کرتے تو میرا اپنا راستہ بدل گیا کھاری اور نئے راستے کے نشیب و فراز سے میں واقف ہی نہیں۔" ماہ نور عجیب سی کیفیت میں بولی تھی۔

"واہ بھئی کیا بات اے سعد باؤ صاحب دی' جس دے نال ان کا نام جڑدا ہے' اس دا ہی رستہ بدل جاندا ہے۔" کھاری کے لہجے میں طنز کی آمیزش ہوئی "وڈے پیو صاحب کے وڈے پتر صاحب جو نیں سعد باؤ صاحب' چھوٹے تے ماڑیاں (کمزور) لوکاں دے رستے ہی بدلنے نیں ناں او نہاں کے اپنے بوہے (اونچے دروازے) سرچکے (اٹھا) کر وکھلدے وکھلدے۔"

"پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو کھاری!" ماہ نور نے تھوڑا الجھتے ہوئے کہا۔ "بات سنو' آج میں تمہیں ایک ضروری کام سے فون کر رہی ہوں۔"

"مینوں آپ دی تہاڈے نال ایک ضروری کم (کام) ہے مہ نور باجی' پر تسی وڈے ہو پہلے تسی حکم کرو۔"

"حکم وکم کیا کھاری! مجھے تو صرف تمہارے اس جاپانی خرگوش دوست کا کانٹیکٹ نمبر چاہیے فوراً۔" ماہ نور نے کھاری کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

"رضوان الحق دا نمبر؟" کھاری نے اس کی بات سن کر حیرت سے پوچھا۔

"ہاں بھئی' اس کا نمبر' چلو جلدی سے دو مجھے اس کا نمبر۔"

"مینوں زبانی تو یاد نہیں مہ نور باجی!" میرے موبیل فون دے وچ اس دا نام ہے' تے نمبر بھی' اس دی نشانی رکھی میں نے اس دے نمبر دے ساتھ خرگوش دی تصویر لائی ہوئی ہے۔"

"تو پھر کیسے دو گے؟" ماہ نور نے بے قراری سے کہا۔

پھر ایک خیال سوجھنے پر اس نے کھاری کو سمجھایا۔ "تم ایسا کرو اپنی بیوی سعدیہ کے پاس لے جاؤ فون' اس سے بولو اس خرگوش کا نمبر مجھے بھیج دے' مجھے یقین ہے اسے طریقہ معلوم ہو گا نمبر بھیجنے کا۔"

"اچھا جی میں ابھی بھیجنا آں۔" کھاری نے سعدیہ کے تعلیم یافتہ ہونے پر رشک کرتے ہوئے جواب دیا۔

"اوکے گڈ!" ماہ نور نے تیزی سے کہا۔ "جلدی کرنا پلیز' مجھے ارجنٹ یہ نمبر چاہیے۔" اس نے فون کان سے ہٹالیا۔

"مہ نور باجی! میں نمبر بھیجنا آں پر میری وی تو سن لو۔" کھاری نے ماہ نور کے فون بند کردینے کا ارادہ بھانپتے ہوئے تیزی سے کہا۔ "میں بڑا پریشان ہوں جی۔" وہ کہتا رہ گیا اور اس کے کان سے لگے فون پر ٹوں ٹوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ جلدی سے اپنا کام بتا کر ماہ نور فون بند کر چکی تھی اور اپنے دل کا حال سنانے کو بے چین کھاری ایک مرتبہ پھر دل کی دل میں ہی لیے رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"فلزا کی طبیعت میں شروع ہی سے عجلت کا جو عمل دخل رہا ہے' وہ ابھی تک موجود ہے' اب یہ ہی دیکھو اس روز چھلاوے کی طرح آئی' ایک اور ادھوری الیہ کہانی بغیر نتیجہ کے سنائے آنا" فانا" غائب۔ اس کے بعد کوئی فون کیا نہ ہی خود آئی۔ طبیعت میں بے چینی پیدا کر گئی بس۔" خدیجہ نے دن میں کئی بار دہرائی بات رات کے وقت ایک مرتبہ پھر کرتے ہوئے فاطمہ کی طرف دیکھا۔

"انگریزی کے پرچے میں ایک حصے کا سوال ہوا کرتا تھا جسے comprihensive کہتے تھے۔" فاطمہ نے کئی بار سنی بات کو ایک مرتبہ پھر سننے کے بعد تحمل سے کہا۔

"ہاں وہی جسے اردو کے پرچے میں تفہیم کا نام دیا جاتا تھا۔" خدیجہ نے بے زاری سے کہا۔

"بالکل وہی۔" فاطمہ مسکرائیں۔ "بس وہی ایک عبارت جو کمپری ہنشن یا تفہیم کی شکل میں ہوتی تھی' اسی طرح کی عبارت فلزا ہمیں سنا گئی ہے۔ اس عبارت کو ذہن میں رکھتے ہوئے ذہن میں اٹھتے سوالوں کے جواب ہمیں خود دینا ہوں گے۔

"نہیں بھئی میں مفروضوں پر مبنی جواب دینے کی قائل نہیں ہوں۔" خدیجہ کو فاطمہ کی بات سے اختلاف محسوس ہوا۔

"چلو پھر ذرا سوچ کر بتاؤ شہناز کو کس نے قتل کیا ہوگا؟" فاطمہ نے خدیجہ کے انداز سے حظ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو کوئی مشکل سوال نہیں۔" خدیجہ نے یوں سر جھٹکا جیسے فاطمہ کی بات کا تمسخر اڑا رہی ہوں۔ "وہی کریمنل جو اس کا شوہر تھا وہی شہناز کا قاتل ہے سو فیصد۔"

"اگر وہ قاتل ہے تو اسے شہناز کو ڈیلیوری میں ہیلپ آؤٹ کرنے کی کوشش کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" فاطمہ نے سوال کیا۔ "دروازہ میں جتلا تھی تو اکیلی پڑی اس کو سہتی مرجاتی' نہ کوئی قتل ہوتا نہ کوئی قاتل بنتا۔"

"مرد کی فطرت میں ایک مخصوص کمینگی ہوتی ہے۔" خدیجہ نے کہا۔ "اس کو معلوم تھا شہناز اس کا بچہ پیدا کرنے والی تھی' اسی لیے تو بچہ ڈیلیور کرانے پہنچ گیا۔"

"اگر بچہ اس شخص کا تھا تو شہناز سے کیا اختلاف تھا اس کا جو اسی کے پیدا کیے بچے کا باپ ہونے کے ساتھ اسی کا قاتل بننے کا اعزاز بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔" وہ فاطمہ نے ترچھی نظروں سے فاطمہ کو دیکھا۔

"اللہ جانے کیا اختلاف ہوگا' یہ جو کریمنلز ہوتے ہیں ان کی دوستیوں اور دشمنیوں کے اسٹینڈرڈ تو بہت ہی عجیب ہوتے ہیں بھئی۔" خدیجہ نے کہا۔

"اس سوال کا جواب فلزا کی عبارت میں موجود ہی نہیں اس لیے کہ فلزا کی عبارت میں کئی تیکنیکی سقم موجود ہیں۔" فاطمہ نے یقین سے کہا۔

"تمہیں بغیر دیکھے شہناز کے شوہر کو قتل سے بری الذمہ ٹھہرانے کی کیوں سوجھ رہی ہے؟" خدیجہ نے استفہامیہ نظروں سے فاطمہ کو دیکھا۔ "جبکہ مجھے تو وہ کوئی بہت بڑا فراڈیا' ٹھگ اور کریمنل قسم کا انسان لگتا ہے۔"

"میں شہناز کو جتنا جانتی ہوں اس کے مطابق شہناز کسی فراڈیے' ٹھگ اور کریمنل سے شادی نہیں کرسکتی تھی۔" فاطمہ نے کہا۔

"شہناز تو بے وقوف تھی' ناتجربہ کار اور جذباتی۔" خدیجہ نے سر ہلا دیا۔ "اتنی ہی عقل مند ہوتی تو باپ اور خاندان کی عزت کو یوں ٹھوکر مار کر چلی جاتی۔"

"اس نے وہ جو قدم اٹھایا تھا بہت سوچ سمجھ کر اٹھایا تھا' اس میں اندھی جذباتیت کا کوئی دخل نہیں تھی' وہ خوب جانتی تھی کہ وہ کیا کرنے جارہی تھی اور اس کا نتیجہ کیا نکلنے والا تھا۔" فاطمہ نے خدیجہ کو یاد دلایا۔

"وہ نتیجے کی پروا نہ کرنے والی لڑکی تھی نا' اسی لیے جب ایک دھوکے باز' فراڈیے کی محبت میں گرفتار ہوئی ہوگی تو نتیجے کی پروا کیے بغیر اس سے شادی بھی کرلی ہوگی۔"

"وہ دھوکے باز' فراڈیا ہوتا تو کیا فلزا' اس اچھی بھلی عمر میں جاکر بھی اس کے عشق میں جتلا ہوتی' فلزا عقل کی ناقص تو کبھی نہیں تھی۔" فاطمہ کی دلیل میں وزن تھا۔

"اچھا تو پھر تمہارے خیال میں قاتل کون تھا۔" خدیجہ' فاطمہ کے دلائل کی تاب نہ لاتے ہوئے بولیں۔

"جو کوئی بھی تھا قاتل' شہناز کے شوہر کے علاوہ تھا۔ اس شخص کو قاتل قرار دینا حماقت ہوگی۔" فاطمہ نے اپنی بات پر قائم رہتے ہوئے کہا۔

"پھر قلزا نے ریڈیو پر خبر کیوں سنی کہ قاتل رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔" خدیجہ نے سوال کیا۔

"اس ملک میں کوئی بھی شخص کچھ کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا جاسکتا ہے۔ کرلسی یہاں کی پولیس کی۔" فاطمہ نے کہا۔

"گویا تم ہر حال میں اس شخص کو معصوم قرار دینا چاہتی ہو۔" خدیجہ نے تیوری چڑھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" فاطمہ نے سرہلایا۔ "میں صرف اتنا کہنا چاہ رہی ہوں کہ کمزور اور بودے مفروضوں اور ناکافی شواہد کی بنا پر کسی کو قاتل قرار دے دینا بھی عقل مندی نہیں۔"

"کمزور اور بودے مفروضے۔" خدیجہ نے حیرت سے دیکھا۔ "تم نے قلزا کی بات دھیان سے نہیں سنی تھی کیا؟ اس کہانی کے مطابق وہاں شہناز کے علاوہ اس کا شوہر اور قلزا ہی موجود تھے' پھر شوہر اور قلزا میں سے کوئی ایک ہی قاتل ہوسکتا ہے نا' جو کنڈیشن شہناز کی وہ بتارہی تھی اس کے مطابق وہ خود تو اٹھ کر اپنے گلے پر چھری پھیرنے سے رہی۔"

"تم بھول گئیں قلزا نے یہ بھی بتایا تھا کہ کمرے سے زور آزمائی اور دھینگا مشتی کی آوازیں بھی آئی تھیں۔"

"ظاہر ہے ایک جیتے جاگتے انسان کا گلا چھری سے کاٹے جانے کی کوشش کی جارہی ہوگی تو وہ مزاحمت تو کرے گا ہی' یقیناً" وہ شہناز کی مزاحمت کی آوازیں تھیں۔" خدیجہ نے کہا۔

"واہ۔ کیسی کامیاب ڈی ٹیکٹوز ہیں ہم' اپنے اپنے صوفوں پر بیٹھے بیٹھے قیافے لڑاتے ہوئے ایک پرانی مرڈر مسٹری حل کرنے کی کوشش کررہی ہیں۔" فاطمہ ہنس کر بولیں۔ "اور دونوں ہی اپنے مفروضوں سے ایک انچ ہٹنے پر تیار نہیں یہ سوچے بغیر کہ قلزا کی سنائی کہانی میں صداقت کتنے فیصد ہے۔"

"خیر یہ تو ہم بہت پہلے بھی سن چکے تھے کہ شہناز کو اس کے شوہر نے گلے پر چھری پھیر کر قتل کردیا تھا۔" خدیجہ نے کہا۔ "قلزا نے تو اس سنی سنائی کو باقاعدہ ایک سین عطا کیا اپنی باتوں میں۔"

"جو بھی ہوا بہت خوفناک ہوا۔" فاطمہ نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ "اور اس پوری کہانی میں شہناز کے ساتھ جو ہوا' اس کا پس منظر تو ہمیں معلوم نہیں لیکن اس نومولود کے ساتھ جو ہوا' وہ اس سے بھی بڑی ٹریجڈی ہے وہ بچہ بچ گیا یا مرگیا۔ بچ گیا تو کدھر گیا' اب تک ہے بھی یا نہیں' کسے معلوم ہے۔"

"ہاں' یہ تو ہے۔" خدیجہ نے سرجھکا کر فاطمہ کی بات پر غور کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے کیسا سفاک شخص تھا وہ' بیوی کو قتل کردیا۔ بچہ قلزا کو پکڑا کر اس بے چاری کو باہر ہانک دیا' یہ سوچے بغیر کہ جو تنہا کہانی اس بے چاری پر پڑی ہے اس میں اس کا ذہن اتنا کام بھی کرسکتا ہے کہ نہیں کہ بچہ سنبھال لے۔"

"قلزا نے بچے کے ساتھ جو کیا وہ بہت لاجیکل ہے' میں تو یہ بھی اس کی بڑی ہمت سمجھتی ہوں' جو اتنا سفر اس بچے کے ساتھ کرلیا۔" فاطمہ نے کہا۔

"بس ثابت ہوا کہ اس دنیا میں انہونیاں بھی ہوتی ہیں اور کچھ لوگ اتنے ہی ظالم اور سفاک بھی ہوتے ہیں' جتنا ہم کہانیوں میں پڑھتے ہیں۔" خدیجہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کہانی ابھی ادھوری ہے خدیجہ! ادھوری کہانیوں کے نتیجے ہم کیسے اخذ کرسکتے ہیں' کہانی مکمل ہونی چاہیے' مسٹری آف مرڈر کو حل کیے بغیر کسی شخص کو قاتل قرار دینا حماقت ہی ہوگی۔" فاطمہ نے ایک مرتبہ پھر اپنا نقطہ نظر دہرایا۔

"اور کہانی مکمل کیسے ہوگی؟" خدیجہ نے مڑ کر فاطمہ کی طرف دیکھا۔

"قلزا ہی کہانی مکمل کرے گی یا پھر وہ شخص جو قاتل قرار دیا جارہا ہے۔"

"وہ شخص کہاں ملے گا؟" خدیجہ نے رک کر کہا۔

"مگر میں اس کو جانتی ہوتی تو اس تک ضرور پہنچی اور ضرور اس سے سوال کرتی۔" فاطمہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "اور اگر مجھے چند کلیوز اور مل جائیں تو شاید میں اس تک پہنچنے ہی والی ہوں۔" فاطمہ خلا میں دیکھتے ہوئے بڑبڑا رہی تھیں۔

"اللہ جانے کیا کہہ رہی ہے۔" خدیجہ نے چند لمحوں کے لیے فاطمہ کی بڑبڑاہٹ پر غور کرنے کی کوشش کی' لیکن پھر کچھ سمجھ میں نہ آنے پر شانے اچکا کر آگے چل دیں۔

✡ ✡ ✡

اسے سینٹرل لندن میں واقع نیشنل اسپتال فار نیورولوجی اینڈ نیورو سرجری میں شفٹ کردیا گیا تھا' جہاں اس کا دماغ ایک ہنگامی سرجری سے گزر چکا تھا۔

"میں اس حالت کو کوما نہیں کہہ سکتا۔ اس کا دماغ بیرونی اشارے وصول کررہا ہے اور جب تک وہ ایسا کرتا ہے' مریض کو کوما کی حالت میں نہیں قرار دیا جاسکتا۔" اس کے لیے بٹھائے گئے خصوصی میڈیکل بورڈ کے سربراہ ڈاکٹر مائیکل نے وودن زادے کو بتایا تھا۔ "تم نے خاصی عقل مندی کا ثبوت دیا جو اسے یہاں لے آئے۔" ڈاکٹر نے سر ہلاتے ہوئے وودن زادے کو داد بھی دی تھی۔ "میں جانتا ہوں ڈارلنگٹن میں اس کی سخت مخالفت کی گئی تھی' مگر خطرہ مول لیے بغیر بڑے کام سرانجام نہیں دیے جاسکتے' ہوسکتا ہے کہ تمہاری اس ہمت کی وجہ سے اس کی جان بچ جائے۔"

"میں اتنا بہادر نہیں ہوں ڈاکٹر!" وودن زادے نے سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے موت سے اور مُردوں سے ڈر بھی بہت لگتا ہے' مجھے حادثوں سے' خون سے' چوٹوں سے بھی بہت ڈر لگتا ہے اور میں کسی بھی ایسے منظر کا سامنا کرنے کے بجائے وہاں سے بھاگ جایا کرتا ہوں' لیکن۔" اس نے یوں سرہلایا جیسے اسے خود بھی اپنے عمل کی وجہ سمجھ نہ آرہی ہو۔ "یہ لڑکا جو میرا پاکستانی دوست ہے' جواں مرگی اس پر جچتی نہیں' یہ زندگی سے اتنا بھرپور شخص ہے کہ اس کی موت کے تصور نے مجھ سے وہ سب کروادیا جس کا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا' تم نے کبھی پاسیت میں لبستی زندگی دیکھی ہے ڈاکٹر۔"

اس نے ڈاکٹر مائیکل کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"یوں ہوتی ہے وہ زندگی جسے ایک دوسرے سے جڑی دو چٹانوں کے درمیان موجود ہلکی سی دراڑ میں سے کہیں ایک سرسبز شاخ باہر جھانکنے لگے اور اس سرسبز شاخ پر ایک ننھا پھول نظر آنے لگے' چٹانوں کے سخت وجود سے پھوٹتی شاخ پر جھولتے ننھے پھول کی سی زندگی سے بھرپور ہے یہ شخص' اس سرسبز شاخ کو اوپر نیچے' دائیں بائیں پھیل کر چٹانوں پر ہر طرف تن جانا ہے' ایک پھول نے کئی اور پھولوں کو کھلنے کا راستہ دکھانا ہے یا کلی کے چٹک کر پھول بن جانے کے عمل کے دوران ہی مرجھا جانا ہے' جانتے ہو ڈاکٹر! اس شخص کو اپنے سامنے برف کے اس پہاڑ سے گرتے دیکھ کر میرے ذہن میں یہی بات آئی تھی جو میں نے تمہیں بتائی۔" اس نے اپنی بھرا جانے والی آواز پر قابو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"میں اس بلندی سے ناواقف نہیں تھا۔" کچھ توقف کے بعد وہ گلا کھنکھارتے ہوئے دوبارہ گویا ہوا۔ "جس سے اچھل کر یہ ڈھلوان پر جاگرا تھا' میں سر کی اس چوٹ کے زاویے سے بھی ناواقف نہیں تھا' جو حادثے کے بعد اس پر پہلی نظر پڑتے ہی مجھے اپنا اندازہ کرا گئی تھی' میں ایک پرانا سکی ڈائیور ہوں' میں نے سکی ڈائیونگ کے دوران

ہونے والے حادثات کی تفصیل پڑھ رکھی ہے، میں جانتا تھا کہ ایسے گرنے کے نتیجے میں آئی چوٹ کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، کوئی بھی دوسرا شخص میرے سامنے یوں گرتا تو میں نیچے کسی کو "میری مدد کرو" کا بلاوا کبھی نہ دیتا، مگر یہ شخص چٹانوں کی دراڑ میں کھلا ننھا پھول ہے، اسے پوری طرح کھلے بغیر مرجھا جانے کے لیے اکیلے نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔"

"ہوں!" ڈاکٹر مائیکل نے وودن زادے کی بات سن کر پرسوچ انداز میں کہا۔ "اس کے چہرے سے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ وودن کے جذبے سے متاثر ہورہا تھا۔

"میری دعا ہے کہ اس کی زندگی بچ جائے۔" پھر اس نے وودن کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "اور ہم اس کے لیے پوری کوشش بھی کررہے ہیں، اس کا ایمبولینس کے ذریعے یہاں تک زندہ پہنچ جانا ایک معجزہ ہے۔ ہمیں اس معجزے کو ہی لے کر آگے چلنا ہے، دیکھو جو ایک معجزہ مزید کو جنم دے جائے۔"

وودن نے ڈاکٹر کی بات سن کر اس پر غور کرتے ہوئے اسے دور جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ذہن میں مختلف قسم کے خیال آرہے تھے۔ وہ مزید کتنے دن یہاں ٹھہر سکتا تھا۔ اسپتال کے اخراجات پورے کرنے کے لیے رقم کہاں سے آنے والی تھی؟ اس چھوٹی لڑکی کو کیسے تسلی دی جاسکتی تھی جو خود پر پڑنے والی اس ناگہانی صورت حال کو دیکھ اور سن کر مسلسل گریہ زاری میں مبتلا تھی۔ ان چوبیس گھنٹوں میں اس نے کچھ کھایا تھا نہ ہی وہ کوئی بات سننے کو تیار تھی۔ وہ اس بار اس ملک میں کیا کرنے آیا تھا اور وہ اس وقت کیا کررہا تھا۔ وہیں کھڑے کھڑے اسے اپنی دادی کی کہی بات برسوں بعد اچانک یاد آنے لگی۔

"ہمیں اپنی قسمت کے بارے میں پہلے سے کبھی اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ ہم سے اگلے لمحے، اگلے روز، اگلے مہینے یا اگلے سال کیا کروانے جارہی ہے۔ جو کچھ ہماری تقدیر میں ہمارے لیے کرنے کو لکھ دیا گیا ہے، وقت خود بخود ہمارے قدم اس کام کی طرف موڑ دیتا ہے۔" دادی جو تقدیر پر دل سے یقین رکھتی تھیں کبھی کبھار ایسی باتیں کیا کرتی تھیں۔

"وہ دادی! آج آپ یہاں موجود ہوتیں تو یقیناً اس واقعہ اور میرے عمل کو اپنے فلسفے کے حق میں دلیل قرار دے رہی ہوتیں۔" اس نے آنکھیں بند کرکے لمحہ بھر کے لیے مرحومہ دادی کو یاد کیا اور آہستہ قدموں سے چلتا اس طرف آگیا۔ جہاں وہ لڑکی بیٹھی اپنی ناک اور آنکھیں ٹشو پیپر سے رگڑتے ہوئے انہیں سرخ کرچکی تھی اور اب اس کے چہرے پر سوجن نمودار ہورہی تھی۔

"دیکھو، میں رونے کے فلسفے کو نہیں مانتا۔" وہ آہستہ سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔ "کیونکہ رونا دھونا کسی کام کو ہونے یا نہ ہونے سے روک نہیں سکتا۔ برائے مہربانی مت روؤ، تم بہت روچکی ہو۔" اس نے نرمی سے کہا۔

اس نے سر اٹھا کر اپنی سرخ ہوتی سوجی ہوئی آنکھوں سے وودن زادے کی طرف دیکھا۔

"تم اس لیے ایسا کہہ رہے ہو کیونکہ تمہیں کھو دینے اور بچھڑ جانے جیسے الفاظ اور احساس سے شناسائی نہیں ہے۔ میں ان دونوں سے واقف ہوں، میں بچھڑی بھی ہوں اور میں نے کھویا بھی ہے، ہر رشتے سے بچھڑی ہوں، ہر رشتے کو کھویا ہے، میرے پاس تو جینے کو صرف اس ایک رشتے کا احساس باقی رہ گیا تھا صرف اس ایک رشتے کا۔" اس نے دہرایا۔

"میں نے کبھی سوچا نہ تھا کہ میں اس کو اس قدر جلد کھو دوں گی، ابھی تو میں محبت کے اس نرم احساس سے پوری طرح دوچار بھی نہیں ہوئی تھی جو میرے اس بھائی نے مجھے دی تھی اور اس نے جانے کی ٹھان لی، مجھے بتاؤ میں کیسے نہ روؤں۔ جب اس کا یہ بے جان سا وجود میری نظروں کے سامنے آتا ہے تو میرا دل پھٹ کر میری پسلیوں سے باہر آنے کو بے چین ہوتا ہے اور میرے پیٹ کی سب آنتیں آپس میں الجھ الجھ پڑتی ہیں۔"

"تمہارا خیال ہے تمہارے اس واویلے اور رونے دھونے سے وہ جاتے جاتے واپس آجائے گا۔" وددن زادے نے جذبات سے عاری لہجے میں سوال کیا۔

نادیہ نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے بال سنہری تھے اور آنکھیں ہلکی سبز۔ اس کے چہرے پر سنہری داڑھی بھی موجود تھی' وہ ایک مکمل امریکی نظر آتا تھا۔ اس کے ایرانی آباؤ اجداد اس کے چہرے مہرے پر کوئی اثر نہ چھوڑ سکے تھے۔

"تم امریکی ہوتے ہی سرد مزاج' بے مہر اور لاپروا ہو۔" نادیہ نے کہا۔ "میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں' میں نے زندگی کے کئی سال تمہارے ہی بھائی بندوں کے درمیان گزارے ہیں۔ زندگی اور موت جو کسی دوسرے کی ہو' اس سے تم لوگوں کو کوئی مطلب نہیں ہوتا' ہاں تمہاری اپنی ہو تو تم ایک کو بچانے اور دوسرے سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہو۔ تمہیں کیا پتا رشتے اور رشتوں کا احساس کیا چیز ہوتا ہے۔"

وددن نے ہونٹ بھینچ کر اس لڑکی کو دیکھا۔ جس کے بال سیاہ اور آنکھیں نیلی تھیں۔ اس نے سر پر اسکارف لپیٹ رکھا تھا اور سیاہ پینٹ پر سرمئی لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی رنگت سرخ و سفید تھی' وہ بھی سوائے بالوں کے کہیں سے مشرقی لڑکی نہیں دکھ رہی تھی۔

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو' لیکن مفروضوں کے ساتھ وقت گزارنے کے بجائے اگر حقیقت کو سمجھ لیا جائے اور اس کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہا جائے تو زندگی مشکل سے بچائی جا سکتی ہے۔" وددن کو خود بھی محسوس ہوا کہ وہ ایک بودی دلیل دے رہا تھا۔

نادیہ نے جواباً "کچھ نہیں کہا' وہ وہاں بیٹھ کر صرف روتی رہی۔ اس کا دل غم سے پھٹنے کو تھا۔ سعد کے ساتھ حادثے اور حادثے کے بعد اس کی حالت نے اس کی دنیا میں اندھیرا کر دیا تھا اور اس اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے اس کے ذہن پر صرف ایک خیال چھایا ہوا تھا کہ بس کچھ ساعتوں کی بات تھی کہ زندگی رخصت ہوا چاہتی تھی' ایک انتہائی غیر متوقع اور الم ناک صورت حال کے رد عمل میں جو اس کی حالت ہو رہی تھی۔ وہ غیر منطقی ہرگز نہیں تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دنیا کے آخری کنارے پر واقع موت کے کسی جزیرے پر وہ تنہا جلاوطن کر دی گئی ہو۔ وددن زادے کی تسلیاں اور دلائل اس کے کسی کام نہیں آ رہے تھے۔ وہ آنے والے ایک ایک لمحے سے خوف زدہ تھی اور اس خوف نے اس کا دل بیٹھا رکھا تھا۔

وددن اس کو ہر طرح سے پرسکون کرنے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد اسپتال کی عمارت سے باہر جا چکا تھا۔ اور وہ وہیں بینچ پر تنہا بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کی نظریں سامنے دیوار پر لگے وال کلاک پر لگی تھیں اور کلاک کی منٹ بتانے والی سوئی کی ہر جنبش پر اس کا کلیجہ منہ کو آتا محسوس ہوتا تھا۔ اسی حالت میں بیٹھے بیٹھے اسے اپنے کوٹ کی جیب میں رکھے فون کے بجنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے جیب سے فون نکال کر نظروں کے سامنے کیا۔ یہ ڈاکٹر رضا حسین کی کال تھی۔ وہ اس سے ملنے کے لیے آنے والے تھے۔

☼ ☼ ☼

"میرا نام عبدالودود ہے سائیں جی۔" اختر کے بالکے نے اس کی جھونپڑی میں بچھی چٹائی پر اختر کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں تم خوش قسمت ہو کہ جس کے بندے ہو اس کے بندے ہونے کا اعتراف تمہارے نام میں ثبوت کے طور پر موجود ہے۔" اختر نے ہلکا سا مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ مجھے جانتے ہو سائیں جی' جانتے ہو نا!" عبدالودود نے سوال کیا۔

"مخلوق خدا کی خدمت کرنے والے کو اپنی شناخت کے بارے میں کوئی شک ہونا تو نہیں چاہیے۔" اختر نے زمین پر دھری گڑگڑی اٹھائی۔

"شاید آپ صحیح کہہ رہے ہو سائیں جی۔" عبدالودود نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے یہاں آئے ایک برس سے اوپر کچھ دن ہو چکے ہیں' اپنے کام میں مصروف رہتا ہوں اور جو میری نظروں کے سامنے سے ہوتے ہوئے گزرتا ہے۔ اس کا مطلب جاننے کی کوشش کرتا ہوں سائیں جی۔"

"بہت اچھا کرتے ہو' مطلب جاننے کی کوشش ہی سے تو راستہ ملتا ہے۔" اختر نے گڑگڑی کا کش لگایا۔

"میں نے اس سے پہلے بھی چند آستانوں میں وقت گزارا ہے' وہاں بھی میں مطلب جاننے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ اور میری اس کوشش نے میرا دل ایسی ہر جگہ سے اٹھا دیا۔" عبدالودود نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔ "پتا نہیں کیوں مجھے ہر ایسی جگہ پر ڈھکوسلہ نظر آیا' فریب نظر اور ٹوٹکی دکھائی دی۔ میں کوئی عالم ہوں نہ عالم کی سی نظر رکھتا ہوں' اگر میری سوچ میرا گمان ہے تو اللہ مجھے معاف کرے جی۔"

"کاروبار دنیا ہی ہے' پیٹ بھرنے کے ذرائع ہیں سب۔" اختر نے عبدالودود کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"لیکن یہاں کی جی۔" عبدالودود نے جھونپڑی کے فرش پر بکھرے تنکوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "یہاں کی پتا نہیں چلتی جی' یہاں کی بات کی سمجھ مجھے ابھی تک نہیں آئی۔"

"ادھر بھی تو یہ ہی کچھ ہے نا ڈھوسلہ' دھوکا ٹوٹکی۔" اختر مسکرایا۔

"نہیں جی!" عبدالودود نے سر ہلایا۔ "ادھر وہ بات نظر نہیں آتی۔"

"پھر کیا نظر آتا ہے۔" اختر نے پوچھا۔

"کچھ ایسا بھی نظر نہیں آتا جی' جس کی وجہ سے میں ادھر ٹھہرا رہوں" عبدالودود نے سر جھکا کر کہا۔

"تم دیکھنا کیا چاہتے تھے' دیکھنا کیا چاہتے ہو؟" اختر نے کہا۔

"میں جی!" عبدالودود نے اختر کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ "میں کسی ایسے کی تلاش میں ہوں۔ جس کے فیض نظر سے میری ماہیت قلب ہو جائے۔"

"اچھا!" اختر نے اس کے جملے پر غور کرتے ہوئے کہا۔ "پھر تو بچہ جی تم بہت مایوس ہوتے ہو گے یہاں اتنا عرصہ گزارنے کے دوران۔"

"پتا نہیں جی۔" عبدالودود نے سر ہلایا۔ "میری سمجھ میں بات نہیں آئی جی' جب یہاں لوگوں کا ہجوم دیکھتا ہوں تو ذہن کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے' آپ کو کسی سے کہتے بھی نہیں سنا' پھر بھی نجانے کدھر کدھر سے لوگ لنگر سے بھری گاڑیاں ادھر لے آتے ہیں اور جنگل میں منگل ہو جاتا ہے' میں نے بڑی بڑی گاڑیوں والے سوٹ بوٹ پہنے آدمیوں کو ادھر آپ کے پاس آتے دیکھا ہے' لیکن جھونپڑی سے نکلتے ہوئے نہ تو کسی کے ہاتھ میں کوئی تعویذ ہوتا ہے' نہ دھاگا' نہ آپ کوئی دم درود کرتے ہیں۔ نہ آپ دوا دیتے ہیں' پھر بھی آنے والا آدمی چہرے سے پریشان نظر آتا ہے اور جانے والا پرسکون۔ جب آپ کو دیکھتا ہوں تو تذبذب میں پڑ جاتا ہوں' نہ کوئی چلہ نہ گیان' سادہ نماز اور تسبیح' ہاں رات بھر لالٹین جلائے آپ کو قرآن پاک کی تلاوت کرتے ضرور سنتا ہوں' تہجد بھی پڑھتے ہوں شاید' مگر یہ سب تو ایک عام مسلمان بھی کرتا ہی ہے' پھر آپ کے پاس لوگ کیوں آتے ہیں' یہاں لنگر کہاں سے آتا ہے' مخلوق کیوں جمع ہو جاتی ہے۔"

عبدالودود کے چہرے سے اس کے دل کی الجھن ہویدا تھی۔ اس نے دیکھا۔ اس کی بت سن کر سائیں اختر مسکرا رہا تھا جبکہ اسے ڈر تھا وہ سائیں اکثر کو ناراض کر چکا تھا۔

"نماز' روزہ' تسبیح' تہجد' قرآن۔" اختر نے بلند مگر نرم آواز میں کہا۔ "تو انسان اپنے لیے کرتا ہے' اس سے اس کا

اللہ راضی ہوتا ہے۔۔۔ نہیں راضی ہوتا۔ راضی ہوتا ہے تو اس پر کیسے کیسے نظر کرم کرتا ہے یہ اس کا اور اس کے اللہ کا معاملہ ہوتا ہے۔ یہ بندے کی خصوصیات قرار نہیں دی جاسکتیں کیونکہ بندہ تو پیدا ہی اس مقصد کے لیے ہوا کہ وہ اپنے رب کو کتنا اور کیسے پہچانتا ہے پہچان جائے تو تسلیم و رضا کا اظہار کیسے کرتا ہے۔"

"پھر یہ بھی تو بات ہے۔" عبدالودود نے بے چینی سے کہا۔ "اگر یہ تسلیم و رضا کا عام اظہار ہے جو سب کرتے ہیں تو پھر وہ خاص بات کیا ہے جو مخلوق خدا کو ادھر آپ کے ڈیرے پر لے آتی ہے اور ان سے یہ کہلواتی ہے کہ آپ کو نظر عطا ہو چکی۔"

"نظر بچہ جی!" اختر نے ہاتھ سے گڑگڑی زمین پر رکھتے ہوئے کہا اور بازو گھٹنوں کے گرد باندھ لیے۔ "نظر کی تعریف کیا ہے' کچھ پتا ہے؟"

"نہیں سائیں جی!" عبدالودود نے سر ہلایا "آج تک نظر کا فلسفہ ہی تو سمجھ نہیں آیا۔"

اختر نے مسکراتے ہوئے سامنے دیکھا۔ پھونس کی جھونپڑی کی دیواروں میں درازیں تھیں جن سے چھن کر اندر آتی سورج کی کرنوں میں گرد کے ذرات چمکتے تھے۔ یوں جیسے سونے کے ذرے چمکتے ہوں۔ اختر آنکھیں سکیڑ کر کچھ دیر ان چمکتے ذرات کو دیکھتا رہا اور پھر عبدالودود کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"انسان کا ایک وصف یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز پر ارتکاز کرلیتا ہے تو اس چیز میں ماسٹر ڈگری حاصل کرلینے کی صلاحیت بھی اسے عطا ہوجاتی ہے' اب وہ اس صلاحیت عطا ہوجانے کے باوجود کوشش ترک کرکے کام ادھورا چھوڑنے کے بعد کسی اور چیز پر ارتکاز کرلیتے ہیں۔ بچہ جی! یہ تو تمہیں علم ہی ہوگا کہ کسی مضمون میں اعلا ترین ڈگری لے لینے والے اور اس میں کوئی دلچسپی نہ رکھنے والے کا علم ایک برابر نہیں ہوسکتا۔ اس فقیر نے۔" اختر نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ علت اور معلول کے سلسلے پر ارتکاز کرنے سے اپنی کوشش کا آغاز کیا۔ ایک لافانی طاقت کے ہونے کا اعتراف اور اس کی قدرت کے نظارے 'علت و معلول کا سلسلہ ہیں۔ فقیر نے سبزہ زاروں تک کا سفر کیا' پہاڑوں کی بلندیوں کو ناپا' میدانوں اور صحراؤں میں گھوما' دریاؤں اور سمندروں کا مشاہدہ کیا۔ ہر طرف اس لافانی طاقت کی قدرت کی کارفرمائی نظر آئی' ہر چیز اپنے خالق کی صناعی کا عکس بن کر نظر آئی۔ ارتکاز کی بات ہے نا بچہ جی۔"

اس نے ایک بار پھر عبدالودود کی طرف دیکھا جو بغور اس کی بات سن رہا تھا۔

"فقیر کا ارتکاز نہیں ٹوٹا' اپنے سبجیکٹ میں ماسٹرز ڈگری کی دھن سوار ہوگئی اور اس ڈگری کو حاصل کرنے تک کے درمیان کے عرصے میں وہ بس اتنا جان پایا کہ "کن" کا فرمان صرف اسی طاقت کی طرف سے ہی جاری ہوسکتا ہے۔ فیکون کا نظارہ اس کی تخلیق کرتی ہے' مگر نہ "کن" کو کبھی غیر منطقی پایا نہ ہی "فیکون" کو۔ گویا علت کے بغیر معلول کا ہونا ممکن نہیں' اسی چیز پر غور کرتے کرتے معلوم ہوا کہ جب علت غیر منطقی نہیں تو معلول بھی ال لوجیکل نہیں ہوسکتا' لافانی طاقت کی قدرت کا ایک مظہر اس کی تخلیق میں سے اعلیٰ ترین یعنی "انسان" فقیر کی ریسرچ کا اگلا موضوع بن گیا' فطرت' قدرت اور انسان پر غور کیا تو ایکشن اور ری ایکشن کی تھیوری سمجھ آنے لگی' کسی ایکشن پر انسان اپنی جبلت کے مطابق کیا رد عمل ظاہر کرے گا' معاملہ فہم پر کھلنے لگا' تجربے کی پٹاری بھی ساتھ ساتھ زرخیز ہورہی تھی' یہیں وہ نظر عطا ہونے لگی جو دیکھتی تھی۔ کسی عمل کا رد عمل کیا اور کب جاکر ہوگا' چہرے اور چیزوں پر ابھرتے تاثر دلوں کے حال سناتے نظر آنے لگے' غور کرنے پر معلوم ہوا نظر کو فیاض کی صفت عطا ہورہی ہے' نبض پر نظر کا ارتکاز ہوجانے سے دل کا حال جان لینا مشکل نہ رہ گیا' سفر طویل مگر ثمر آور ثابت ہونے لگا' عین یونہی جیسے ایک' دو' تین سیکھنے والا بچہ وقت کے ساتھ ساتھ ریاضی کے مضمون پر ارتکاز کرلے اور ارتکاز کے نتیجے میں ماہر ریاضی دان بن جائے' بس یہ ہی۔" اختر نے رک کر عبدالودود کی طرف دیکھا۔

"بس یہ ہی وہ نظر ہے جو برسوں خاک چھانتے رہنے کے بعد سونے کی مہر کی طرح چھلنی کے اوپر رہ گئی۔ گویا ہاتھ آ گئی' ایم فل کے بعد پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کا شوق چرایا تو محسوس ہوا دنیا میں دل لگا کر واردات کا حصول ناممکن ہے' دل کی اپنی جو دنیا ہے اس میں دل لگایا جائے' سو دنیا کی گہما گہمی سے رخصت ہو کر یہاں اس کٹیا میں بسرا کر لیا' حقیقتوں سے فرار حاصل کرنے والے' مسائل سے پریشان حال' شور ہنگامے سے فیڈ اپ ہوئے لوگوں کا گزر جو ادھر سے ہوا تو ضعیف الاعتقادی نے انہیں راستہ دکھادیا۔ حقیقت سے فرار' مسائل سے نجات' کتھارسس کی خواہش و تسلی کے چند بول سننے کی آرزو۔ فقیر کو اللہ کے ان بندوں سے کوئی غرض نہ تھی' کوئی لالچ نہیں تھا' پہلے پہل کٹیا میں آئے مہمان سمجھ کر آؤ جی' بیٹھو جی کہنا شروع کیا' پھر لوگوں کی باتیں سننے اور ان پر غور کرنے کی عادت پڑنے لگی' برسوں کی چھنی خاک میں سے چھلنی کے اوپر رہ جانے والی سونے کی مہر کام آنے لگی' توفیق بہر حال ان کے مسائل کا سمجھ میں آنے لگا' ایک دو کے مسئلے حل ہو گئے' پھر چل سو چل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ فقیر نے تشہیر کی' نہ گھر گھر دستک دے کر کسی کو خود سے متعارف کروایا۔ مخلوق خدا آپ سے آپ ادھر آنے لگی پھر تو گویا ڈیوٹی لگ گئی' ان کی سنی ہے ان کو تسلی دیتی ہے' کائنات کے جن رازوں اور اسرار سے پردہ فقیر کی نظر سے اٹھا' ان کی کچھ خبر انہیں بھی سنائی ہے۔ یوں یہ سلسلہ کسی کے شروع کیے بغیر ہی شروع ہو گیا۔ فقیر نہیں جانتا۔ کس کس کے من میں آتی ہے' اور وہ مخلوق خدا کی بھوک مٹانے کا سامان لیے یہاں چلا آتا ہے' وہ مخلوق جس کو بھوک مٹانی ہوتی ہے وہ کدھر سے یہاں آتی ہے اور بعد میں کہاں غائب ہو جاتی ہے۔ فقیر جانتا ہے کہ سوال کرنا' جاننے کی خواہش کرنا کہ یہ سب سلسلہ کیسے چل رہا ہے حماقت ہے۔ جو چلا رہا ہے' جو سبب بنا رہا ہے اس نے جو کام فقیر کے ذمے لگایا ہے فقیر کو صرف وہ ہی کرنا زیب دیتا ہے۔"

"ہوں!" اختر کے خاموش ہو جانے پر عبدالودود چونکا اور پھر اختر کی طرف دیکھنے لگا۔ "مگر وہ کشف القلوب' وہ آنے والے وقت کے بارے میں پیش گوئیاں؟" اس نے سوال کیا۔

"ساری بات سنا دی پھر بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئی؟" اختر نے گڑگڑی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے ارتکاز کی بات کی ہے بچہ جی" اس نے گڑگڑی کی بجھتی آگ میں پھونک مارتے ہوئے کہا۔ "کشف القلوب اور پیش گوئیاں تو ٹرمنولوجی ہے پیچیدہ امراض کی کیس اسٹڈی کے بعد میڈیکل سائنس سے وابستہ افراد اپنی فائنڈنگ کرتے ہیں کہ نہیں' اپنی رائے دیتے ہیں یا نہیں کہ مرض کہاں کہاں کتنا اثر چھوڑ سکا اور وہ مریض کے ساتھ کیا کرنے والا ہے؟" اس نے عبدالودود کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"جی ہاں!" عبدالودود نے سر ہلایا۔

"بس ایسے ہی ہے' وہ جسم کے عوارض کے ماہر ہوتے ہیں' فقیر کے ارتکاز نے اسے روح اور دل و دماغ کے عوارض پر مہارت عطا کر دی' کسی انسان کو آگ پکڑ لے تو تم بھی پیش گوئی کر لو گے کہ وہ جل جائے گا' کتنا جلے گا' اور جلنے کے بعد ٹھیک ہو سکے گا یا نہیں' یہ ہی فقیر کا تجربہ اور پی ایچ ڈی کی ڈگری ہے۔ لوگ اسے پہنچا ہوا۔۔۔ کشف القلوب۔۔۔ اللہ والا" کچھ بھی نام عطا کر دیں۔ بات صرف اتنی سی ہے جو میں نے سنائی۔ پریشان حال' مسائل کے مارے انسانوں کو اگر میرے چار لفظوں سے تسلی ہو جاتی ہے تو یہ بھی تو اسے ذات کا کرم ہے نا جس نے مجھے ان لوگوں کے لیے یہاں لا بٹھایا ہے۔ میں خود تو آ کر نہیں بیٹھ گیا تھا۔ میں نے کسی عبدالودود کو کسی رحیم بخش کو کسی دوسرے بالکے کو بلا کر یہ نہیں کہا کہ بچہ جی یہاں بیٹھ جاؤ اور مخلوق خدا کے لیے لنگر پکاؤ۔ سارے عبدالودود اور رحیم بخش اسی کے حکم پر یہاں آتے ہیں' کیا پکاتے ہیں' کس کو کھلاتے ہیں۔ فقیر نے تو کبھی اس کا بھی سوال نہیں کیا' فقیر تو صرف فیکون کا نظارہ کر رہا ہے۔" عبدالودود ایک بار پھر اپنی محویت سے باہر نکلا اور جھرجھری لے کر سیدھا ہوا۔

"لوگ خود کو پیر کہتے ہیں آپ فقیر بولتے ہو' کئی کاغذ پر تعویذ اور دھاگے پر دم کر کے تسلی دیتے ہیں' آپ لفظوں کے جادوگر ہو۔ شاید میں کبھی سمجھ نہ پاؤں۔" اس نے سر ہلایا۔

"سمجھ میں نہیں آتا تو اپنا راستہ کھوٹا مت کرو۔" اختر نے کہا۔ "شاید جو تم کرنا چاہتے ہو' جو بننا چاہتے ہو' وہ تمہارا راستہ ہی نہ ہو۔"

"آپ بتائیں کہ یہ میرا راستہ ہے یا نہیں۔" عبدالودود نے سوال کیا۔ "آپ کو تو علم ہو جاتا ہے نا!"

اختر بے اختیار ہنس دیا۔ "دیکھا تم بھی میرے لفظوں کی جادوگری میں پھنس رہے۔ تمہیں بھی وہم ہو گیا کہ مجھے پتا چل جاتا ہے۔"

"پھر بھی۔" عبدالودود نے اصرار کیا۔

"راستہ تو تمہارا ہے ہی جب ہی تو بجائے بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں پڑھنے کے ڈیروں اور کٹیاؤں کے دھکے کھاتے پھر رہے ہو مگر ول پاور کی کمی ہے' گمان اور بدگمانی کے درمیان پھنس جاتے ہو' راستہ دشوار ہے' قدم من من بھر کے ہونے لگتے ہیں' راستہ کھوٹا ہونے لگتا ہے لیکن اگر قوت ارادی ہے اور ہر حال میں سفر کر لینے کا عزم ہے تو ایک نہ ایک روز پا جاؤ گے۔ کیونکہ سو میں سے پانچ ہوتے ہیں جنہیں یہ راستہ پکڑنے کا خیال آتا ہے' اور یہ خیال ڈالتا کون ہے دل میں' وہی پاک ذات جو بندوں کو خود منتخب کرتی ہے۔ دعا کرو یہ انتخاب رحمت بنے تمہارے لیے آزمائش نہ بنے۔"

"اور جو اگر مجھے نظر عطا ہو جائے تو کیا کروں۔"

"پھر نیت صاف رکھنا پڑے گی' نظر عطا ہو جانا اور نظر عطا ہو جانے کا دعوا کرنا دو مختلف وارداتیں ہیں بچہ جی! جہاں صرف دعوا ہوتا ہے وہیں ڈھکوسلے' شعبدہ بازیاں اور ٹونے ٹوٹکے جنم لیتی ہیں۔ میں نے کہا نا راستہ دشوار بہت ہے۔"

"ہوں۔" عبدالودود نے سر ہلا دیا۔ "گویا آپ کے کشف اور آپ کی پیشن گوئیاں نباض کے سے وصف ہیں' آپ کی باتیں فزیکل ہیلنگ کی طرح اسپریچوئل ہیلنگ کا اثر رکھتی ہیں۔ وہ دوا دیتے ہیں آپ دعا دیتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر ہیں' میڈیکل کے مختلف شعبوں کے اسپیشلسٹ ہیں' آپ سائیکاٹرسٹ ہیں۔"

"فقیر سائیکاٹرسٹ نہیں ہے' فقیر تو صرف سائیں ہے بچہ جی فقیر سائیں اختر ہے۔"

"میں اب اٹھتا ہوں جی' مجھے دوپہر کا لنگر پکانا ہے۔" عبدالودود نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آج تم نے "ارتکاز" کے معنی جان لیے بچہ جی' اب خود سے پوچھ لینا کہ کر بھی سکتے ہو یا نہیں۔" اختر مسکرایا اور گڑگڑی کے کش لگانے لگا۔

☆ ☆ ☆

"اتنے برسوں سے وہ اس لڑکی کو لک آفٹر کر رہا تھا' آخر اس میں اس کا کیا انٹرسٹ تھا؟" بلال سلطان نے ابراہیم سے پوچھا' جو بے یقینی سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں سعد سلطان کے اکاؤنٹس کی تفصیل جاننے کی کوشش میں مصروف دیکھ رہا تھا۔

"مجھے معلوم نہیں۔" اس نے تھوک نگلتے ہوئے بے نیاز بننے کی کوشش کی۔ "وہ اسے اچھی لگتی ہو شاید۔"

"خیر اس کی وجہ یہ تو ہرگز نہیں ہے' یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔" بلال سلطان نے ایک فائل کھولتے ہوئے کہا اور ناک پر عینک جمائی۔ "مجھے ایسا نظر آ رہا ہے کہ خاصی تگڑی ہیلپ ہوتی رہی اس کی۔"

"سے بی" ابراہیم نے شانے اچکائے "اس لڑکی کے بارے میں' میں نے بھی اسی روز جانا تھا جس روز میں نے

اسے اس کے گھر میں جاتے دیکھا تھا۔"

"اور جس گھر کی صورت حال اور سعد کا تعلق اس گھر سے دیکھتے ہوئے تم نے اسے اس کی بیوی قرار دے دیا تھا' اور اس کی کیئر ٹیکر کو سعد کی ساس سمجھے تھے۔" بلال نے طنزیہ نظروں سے ابراہیم کی طرف دیکھا۔

"پکچر تو کچھ ایسی ہی تھی' اس کے علاوہ کیا اندازہ لگایا جا سکتا تھا اسے دیکھ کر۔" ابراہیم نے کہا۔

"بدھے ہو تم" بلال سلطان بلند آواز میں بولے۔ "بچپن سے اس کے ساتھ رہے ہو پھر بھی اتنا نہیں جان سکے کہ کس سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔"

"وہ جتنا ان پری ڈیکٹیبل ہے' اس سے کچھ بھی توقع کی جا سکتی ہے۔" ابراہیم کو اب بلال کے مزاج سے ڈر نہیں لگتا تھا' اب وہ کچھ کچھ انہیں سمجھنے لگا تھا۔

"وہ جتنا بھی ان پری ڈیکٹیبل ہو' تمہیں اتنا تو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ ساس اور بیوی کا انتخاب کرتے ہوئے کن کن باتوں کو مد نظر رکھے گا۔" بلال نے سر جھٹکا۔ "مجھے دیکھو" پھر انہوں نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ "ساری عمر ہم ایک دوسرے سے نارتھ اور ساؤتھ پول جتنے فاصلے پر رہے' مگر میں اس کے مزاج سے اتنا واقف ہوں کہ اس کے ماتھے پر پڑا ہوا ایک بھی بل دیکھ کر اس کی وجہ جان سکتا ہوں۔"

"پھر آپ کو اس رات اندازہ کیوں نہیں ہوا کہ وہ یہاں سے چلے جانے کی ٹھان بیٹھا ہے اور اگلی صبح وہ آپ کی ہدایت کے مطابق آپ کے آفس نہیں جائے گا بلکہ پہلے سے کنفرڈ ٹکٹ پر دبئی کی طرف اڑ جائے گا۔" ابراہیم نے اپنے تئیں ان پر زوردار وار کیا تھا۔

"تم کیا سمجھتے ہو' میں اس کی باڈی لینگویج میں غیر معمولی تبدیلی نہیں دیکھ پایا تھا۔" بلال نے اپنی طرف آتے وار کے ہلکے وزن پر طنزا" مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کچھ ایسا کرنے جا رہا تھا جس کی توقع مجھے اس سے نہیں تھی' لیکن وہ اپنے جذبات اور حواس پر کمال قابو رکھتا ہے' وہ مجھے اور میرے اندازوں کو ٹھنڈی مار دے گیا' میں اس کی ٹائمنگ کا اندازہ نہیں کر سکا۔"

"دیکھا۔" ابراہیم ان کے اس اعتراف کو اپنی کامیابی سمجھ کر بغلیں بجانے لگا۔ "وہ آپ کو ہمیشہ ہی جُل دے جاتا رہا ہے' آپ اسے کبھی بھی پکڑ نہیں سکے' مان لیں۔"

"الفاظ کے ہیر پھیر کی ہی بات ہے" بلال نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا "وہ مجھے جُل دے جاتا رہا یا میں دانستہ جُل کھاتا رہا۔ شاید تم نہیں سمجھو گے" انہوں نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔

"اب کرنا کیا ہے آپ نے" ابراہیم نے ان کے سامنے بکھرے کاغذات پر نظر ڈالی "ساری مائیوں' بابوں' لڑکے' لڑکیوں' اداروں' بیماروں کی فہرست تو آپ دیکھ چکے جن کی طرف رقم اس کے مختلف اکاؤنٹس سے جاتی رہی ہے' اب آگے کیا کرنے والے ہیں آپ آخر' ان سب کو کوئی سزا دینے والے ہیں یا یہ فرمان جاری کرنے والے ہیں کہ اب تک جو رقم ان پر خرچ ہوئی' وہ واپس کر دیں۔"

"تمہارے باپ نے نا' تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کی۔" بلال سلطان نے بکھرے کاغذات اکٹھے کرتے ہوئے کہا۔ "اکلوتے بیٹے ہونے کی وجہ سے تم اس کی آنکھ کا تارا بن گئے' ایک ایسا تارا جس کے بارے میں اس نے سوچ لیا کہ وہ صرف فوڈ پائپ سے طاقت لے کر چمک سکتا ہے۔ سو اس نے تمہیں سوائے کھلانے اور کسرتیں کرانے کے دوسری کسی خوبی کی طرف دھیان نہیں دیا' سنا ہے تمہارے کچن میں کوکنگ آئل اور بناسپتی گھی کا داخلہ ممنوع ہے' انہوں نے ایک اچٹتی نظر ابراہیم پر ڈالی۔

"ڈیڈی کے خیال میں دیسی گھی' پیور اور نیچرل ہوتا ہے۔" ابراہیم نے کہا۔

"ہوں۔" بلال نے سر ہلایا۔ "بس اسی نیچرل اور پیور گھی کی چربی چڑھ گئی ہے تمہارے دماغ پر' جسم کو کسرت

کے ہاتھوں حرکت مل جاتی ہے اور وہ استعمال بھی ہو جاتا ہے' لیکن دماغ کی ایکسر سائز جم میں نہیں ہوتی نا' اس کے لیے جو نیڈ مل استعمال ہوتی ہے بدقسمتی سے وہ تمہاری پہنچ سے باہر ہے۔"

ابراہیم نے لمحہ بھر کے لیے بلال کی بات سمجھنے اور اس پر غور کرنے میں صرف کیا' لیکن پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے شانے اچکا دیے۔

"یہ وہ لسٹ ہے' جس میں ان لوگوں کے نام شامل ہیں' جن کو باقاعدگی سے رقم جاتی تھی۔" بلال نے اس کی حالت پر مسکراتے ہوئے ایک لسٹ اس کے سامنے رکھی۔

"جی!" ابراہیم کی نظروں کے سامنے بھتہ وصول کرنے والوں کی فلموں میں دیکھی شکلیں گھوم گئیں۔

"اب ان لوگوں تک رقم میرے ایک اسپیشل اکاؤنٹ سے جایا کرے گی' بلا تعطل اور اس عمل کو تم خود مانیٹر کرو گے۔" بلال نے ابراہیم کی توقعات کے برعکس کہا۔ "مجھے امید ہے تم اپنے دوست کی خاطر اتنی ذمہ داری تو لے ہی سکتے ہو۔" یہ آخری بات انہوں نے نیچی آواز میں کہی تھی۔

ابراہیم نے بے یقینی سے سر ہلاتے ہوئے لسٹ ان کے ہاتھ سے پکڑ لی۔

"ظہیر صاحب سے مل لو اس سلسلے میں۔" انہوں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں تم خاصے مصروف لڑکے ہو' لیکن تمہاری دوستی کے جو جذبات انوالوڈ ہیں اس کے کاموں میں' تم سے زیادہ موزوں کوئی اور نہیں۔"

"ڈونٹ یو وری۔" ابراہیم نے سنجیدگی سے کہا "لیکن ایک بات ضرور بتا دیں' آپ ایموشنل ہو رہے ہیں یا کمزور؟"

"ہاہا" بلال نے ابراہیم کے سوال کے جواب میں قہقہہ لگایا "میں صحیح کہتا ہوں کہ تم احمق ہو' گدھے ہو۔" انہوں نے رک کر گہرا سانس لیا "اتنا بھی نہیں جانتے کہ جو ایموشنل ہوتا ہے وہی کمزور بھی ہوتا ہے۔"

ان کی آواز کپکپانے لگی تھی یا ابراہیم کو ایسا محسوس ہوا تھا' ابراہیم دیر تک سوچتا ہی رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"سعدیہ باؤ! میں مہ نور باجی کے نال وعدہ کر بیٹھا تھا کہ اونہاں نوں بھائی رضوان الحق دا نمبر بھیجوں گا' آپ میری گل منو' اونہاں نوں بھیج دیو" کھاری نے سعدیہ کے قریب بیٹھتے ہوئے منت بھرے لہجے میں کہا۔

"پتا نہیں کیوں کھاری! مجھے ایسا لگتا ہے آج کل تمہارا دماغ صحیح کام نہیں کر رہا۔" سعدیہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ کھاری سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"کبھی تمہیں وہم ہونے لگتا ہے کہ تم ان سعد باؤ صاحب کے بھائی ہو' کبھی تم کہتے ہو ماہ نور باجی محمد رضوان الحق کا نمبر مانگ رہی تھیں۔"

"تے میں دو تاں ہی گلاں غلط تے نئیں کردا۔" کھاری نے کہا "او گل وی صحیح سی تے ایہہ گل وی صحیح اے۔" اس نے ہوا میں انگلی لہراتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اچھی طرح پتا ہے کھاری' اماں سعد باؤ صاحب کی اگلی پچھلی سب سے واقف ہیں۔" سعدیہ نے رسان سے اسے سمجھانا شروع کیا "انہیں پتا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے اکلوتے بیٹے ہیں' ان کی اماں مر چکیں' اب مرنے کے بعد تو وہ بچہ پیدا کرنے سے رہیں' پھر تم کدھر سے ٹپک پڑے۔"

"مینوں رب دی سوں (قسم) میں جھوٹ نہیں بول دا سعدیہ باؤ' مینوں خود چوہدری صاحب تے اوس بھجھل پائی نے دسیا سی۔" کھاری روہانسا ہو گیا۔

"چلو میں نے مان لیا کہ انہوں نے تم سے دل پشوری کر لی' مگر تم خود کو دیکھو' اماں کی سنائی کہانی جانتے ہوئے بھی

بغیر سوچے سمجھے ان کی طرف دوڑ پڑے، تمہیں پتا ہے مجھے کتنی بے عزتی محسوس ہوئی جب تم اماں کے سامنے جھوٹے پڑے۔"

کھاری پر گھڑوں پانی پڑ گیا، سعدیہ کے چہرے پر جو دکھ اسے نظر آرہا تھا اسے لگا سب اس کی ذات کی وجہ سے تھا۔

"میں کسے توں کس طرح یقین دلاواں سعدیہ باؤ!" وہ بے بسی سے بولا "میرے کن وجدے نیں نا میں خواب دیکھا۔" اسے اپنا آپ لاچار لگنے لگا۔ "اس لئی ہی میں بن چپ ہاں۔" اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھی "میں چوہدری صاحب تے اڈیکدا ہوں، آپی جدوں آن گے دودھ پانی وکھرا کریں گے۔"

"بس پتا نہیں کیوں" سعدیہ نے سرہلایا "پتا نہیں کیوں کھاری! میرا دل چاہتا ہے کہ کچھ ایسا ہو جائے جو تم سب لوگوں سے مختلف نظر آؤ ممتاز ہو جاؤ مگر تم اپنے حال میں مست اس سے باہر نکلتے ہو نہ اوپر جانے کی خواہش کرتے ہو۔"

"نا سعدیہ باؤ نا!" کھاری نے اس کی بات سن کر گردن دائیں بائیں گھمائی "میں مرجاؤں پر ممتاز کدی نا بناں، یاد نئیں پچھلے ورہے (پچھلے سال) گجراں دی رانی نوں کنڈھ کے لے گیا سی ممتاز "توبہ میری توبہ" اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا "توبہ توبہ رب نہ کرے میں ممتاز ورگا ہو جاواں سارا پنڈ لعنت لعنت کروائے ہن وی ممتاز نوں۔"

"ہائے کھاری!" سعدیہ نے اپنا سر پکڑا "تم بات کا کیا سے کیا بنادیتے ہو۔"

"مینوں پتا ہے سعدیہ باؤ! میں کم عقلا تے بے وقوف آں۔" کھاری کو سعدیہ کی بے چارگی پر افسوس ہونے لگا "میں آکھیا سی تہانوں میں ایس قابل نئیں پر تسی مانے ہی نئیں۔"

"مت کرو ایسی باتیں" سعدیہ جھنجلا کر بولی۔ "بات تمہاری سمجھ میں آتی نہیں اور تم اپنی نااہلی کے دکھڑے رونے لگ جاتے ہو۔"

"اچھا نہیں کرداباتیں، پرتسی مہ نور باجی نوں......"

"ہائے میرے اللہ کھاری!" سعدیہ نے ایک بار پھر سر پکڑ لیا۔ "بھلا بتاؤ ماہ نور باجی کو تمہارے اس دوست کا نمبر مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم نے خواب دیکھا ہوگا۔"

"نہیں دیکھا خواب" کھاری بے بسی سے بولا "اچھا چلو خواب ہی سہی تسی نمبر گھل دیو مہ نور باجی نوں۔" پھر وہ مصالحت آمیز انداز میں بولا۔

"اچھا رکھ جاؤ یہاں فون، میں بھیج دیتی ہوں ابھی۔" سعدیہ نے کہا، کھاری نے اس کے موڈ کا اندازہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے فون بستر پر رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼

"رب سوہنے کے کرم سے حج بیت اللہ تو ہو گیا، کیسا اس نے پہلی بار میں ہی بلاوا دے دیا نہیں تو لوگ کتنے کتنے سال درخواستیں دیتے رہ جاتے ہیں بلاوا نہیں آتا۔"

"میری تو آنکھیں خشک نہیں ہوتیں رابعہ بی بی، سوچتا ہوں تو خواب سا لگتا ہے میں اور بیت اللہ کو نظروں کے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ میں اور طواف کرتے ہوئے الھم لبیک کی پکار ڈال رہا ہوں میں اور مسجد نبوی میں نوافل ادا کررہا ہوں، اپنا قدبت دیکھتا ہوں تو ایسی عظیم رحمت کے سامنے بڑا ہی چھوٹا لگتا ہے جی، آپا جی کی مہربانیوں کی حد نہیں جو ہم ایسے ادنیٰ لوگوں کو ہمراہ لے گئیں۔"

"کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو سراج سرفراز! میری بہن کی خدمت گزاری نے تمہارا قدر رحمت کے قابل بنادیا۔"

"کیا سوچنے لگیں رابعہ بی بی! آپا جی سے ملاقات تو کروادیں۔"

"ہائے کیا ملاقات کرواؤں' جب سے واپس آئی ہے منہ سر لپیٹے بیٹھی ہے' کہتی ہے جو دولہا بھائی کا دیا جمع کر کے بیٹھی تھی وہ حج کے اخراجات پر لگادیا' اب جو بینکوں میں باقی ہے اس آمدن کا ذریعہ نظروں میں حرام ہوا' نہ اس سے خریدا ہوا رزق گھر میں داخل ہونے دے گی' نہ ہی کوئی اور ضرورت زندگی۔"

"فیصلہ تو معقول ہے آپا جی کا' مگر گزر بسر کیسے ہوگی' مالک مکان تو پچھلے مہینے کا کرایہ ملا کر کل دو مہینوں کا کرایہ طلب کررہا ہے' اوپر سے گھر میں کچھ کھانے کو ہے نہیں۔"

"میں نے اسے یہ ہی بتایا بولی بھوکے مرجائیں گے تو کیا ہوا' اللہ کا گھر دیکھ آئے' اپنے گناہوں کی بخشش کی دعائیں مانگ آئے' آگے ہماری قسمت ہے' لیکن یہاں اب اگر بھوکے مرتے ہیں تو مرجائیں۔ اس مال کا آنا بھی استعمال نہ ہوگا۔"

"یہ تو بڑی مشکل ہوگئی رابعہ بی بی! پیٹ میں جو ہے دوڑنے لگے اب تو۔"

"واہ سراج سرفراز! تمہاری سوچ پیٹ سے شروع ہوکر پیٹ ہی پر ختم ہوجاتی ہے اور کیا فرماتے تھے مکہ دینے کی تو خاک دیکھ کر ہی بھوک مٹ جاتی ہے۔"

"مجھے ایسے طنز سے کیا دیکھ رہی ہیں رابعہ بی بی! بندہ بشر ہوں' جیتے جی بھوک تو لگے گی ہی۔"

"بھوک لگتی ہے تو اسے مٹانے کا سامان کرنے کے لیے ہی اللہ نے ایسا بڑا جثہ عطا کیا ہے' اسے استعمال کرنا بھی کبھی شروع کریں گے یا یوں ہی ایک جگہ سے اٹھا دوسری جگہ رکھتے رہیں گے۔"

"بھائی صاحب کی بھی کوئی خیر خبر نہیں ملی اب تک' اب تو یقین ہونے لگا ہے چھوڑ چھاڑ گئے آپا جی کو' ظلم کیا بڑا ہی ظلم کیا انہوں نے' بچہ بھی لے گئے اور آپا جی کا مڑ کر پتا بھی نہیں کیا' ثابت ہوا صرف شکل کے ہی پرستار تھے۔"

"کیا میری بات گول کردی تم نے سراج سرفراز' کام کرنے کی بات سن کر تو تمہارا دل چاہتا ہے جھوٹ ہی ہو جو سنا ہے' لگے بھائی صاحب کو باتیں سنانے اب کہو گے ارے وہ تو میرا بھائی بیچارہ نہ جانے کدھر راستے میں رہ گیا' ایسا تھا ہی نہیں جیسا ثابت ہورہا ہے۔"

"رابعہ! ایک کام کرو۔"

"ارے تم کیوں کمرے سے باہر آگئیں۔ مجھے آواز دے لی ہوتی۔"

"یوں کمزور ہوجانے کے بعد تو آپا جی کی شکل اور بھی بھیانک لگنے لگی اللہ معاف کرے' شکر ہے مجھے دیکھ کر فوراً" چادر منہ پر کرلی' میری بھی بے دھیانی ہی میں نظر پڑگئی' اب تو یہ محرم نامحرم والے چکر میں بھی پڑگئی ہیں' اللہ جل شانہ جب بھی سیدھی راہ دکھادے۔"

"میری بات غور سے سنو رابعہ اور سراج' جو عجوہ کھجوریں اور آب زم زم کا ذخیرہ ساتھ لائے ہیں' اور وہ تسبیحاں جو آب زم زم میں بھگو کر سکھائی تھیں وہ کدھر ہیں؟"

"سب اندر رکھی ہیں بڑے اٹیچی کیس میں۔"

"لاؤ مجھے دو اور باہر گلی کی طرف والے کمرے کا دروازہ کھول دو' رابعہ تم اور میں وہاں بیٹھ کر وہ کھجوریں اور تسبیحاں فروخت کریں گے۔"

"کیا وہ کھجوریں اور تسبیحاں' انہیں کون خریدے گا؟"

"ہیں بہت اللہ کے پیارے اس جہان میں بجن کی پہنچ ابھی ادھر تک نہیں ہے۔ اللہ کے دیوانوں اور متوالوں کے لیے ان سوغاتوں سے بڑھ کر کیا بڑی سوغات ہوگی۔ چند دنوں کے لیے دو وقت کی روٹی کا تو انتظام ہو ہی جائے گا۔"

"کیا سوچ رہی ہو' جاؤ جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو۔"

"ہاں ہاں۔"

"اللہ کے پیارو' شمع نبوت کے متوالو' یہ عجوہ کھجوریں ہیں اور آب زمزم میں بھگوئی تسبیحاں' دنیا میں ان سے بڑی سوغات کوئی دوسری نہیں۔ لے جاؤ جس جس کو توفیق ہے' دھن دولت' دنیا میں برکت پاؤ گے۔"

"عجوہ کھجوریں اور آب زم زم میں بھگوئی تسبیحاں۔"

چار بکیں' دس بکیں' پندرہ بک گئیں۔

"اللہ تیرا شکر' رزق حلال کا سامان ہوا کچھ تو۔"

☆ ☆ ☆

" ڈاکٹر کہہ رہا ہے' میرا مطلب ہے ڈو' ڈاکٹر مائیکل یعنی وہ کہہ رہا ہے کہ" نادیہ کے جذبات اور حواس بدحالی کی جس اسٹیج سے گزر رہے تھے' اس اسٹیج پر کھڑے وہ کسی ایسی خبر پر جو غیر متوقع تھی اور اچانک بھی اسی طرح ردعمل ظاہر کرسکتی تھی جیسے کررہی تھی' اس کے منہ سے ٹھیک سے بات نکل پارہی تھی نا ہی وہ' بات کہ پارہی تھی جو کرنا چاہتی تھی۔

"ہاں میں بھی تمہیں یہ ہی بتانے آیا تھا۔" وودن زادے نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا' وہ پرسکون نظر آرہا تھا اور ترحم بھری نظروں سے نادیہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے ان چند دنوں میں ہی اس لڑکی کو جس سے وہ بالکل ناواقف تھا نارمل حالت سے ٹوٹتے' بکھرتے اور مرمر کر جیتے دیکھا تھا۔ وہ اس کے ہر ہر عمل' حرکت اور جنبش کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ کسی بھی تعلق اور رشتے کے حوالے سے عورت کا یہ وہ روپ تھا جس سے وودن زادے ناشناس تھا۔ وہ نادیہ بلال سے متاثر ہورہا تھا اور اسے یہ بھی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ اس کے لیے کیا کرسکتا تھا۔

"ڈاکٹر مائیکل نے مجھے بھی یہ ہی بتایا ہے کہ وہ معجزانہ طور پر خطرے سے باہر ہے' وہ دواؤں کو قبول کررہا ہے اور دواؤں نے اپنا اثر دکھانا شروع کردیا ہے۔" وودن نے اسی پرسکون انداز میں کہا جبکہ اس کا دل بھی بالکل اسی کیفیت سے گزر رہا تھا جس کا مظاہرہ نادیہ کررہی تھی۔

"میں کتنی احمق تھی' کتنی بے وقوف جو اس کو یہاں لانے کے تمہارے فیصلے پر چلاتی چلی جارہی تھی۔" نادیہ نے اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ وودن نے دیکھا یک لخت اس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں زندگی کی جوت نظر آنے لگی تھی' اس کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل کر چمکنے لگا تھا۔ وودن نے دھوپ چھاؤں کی سی یہ کیفیتیں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ اسے سعد سلطان کی قسمت پر رشک آنے لگا' وہ رشتوں سے مایوس' رشتوں سے تعلق توڑ کر یہاں آیا تھا' مگر رشتے تو یہاں بھی موجود تھے۔ دوستی کا رشتہ' خون کا رشتہ وہ بے اختیار مسکرانے لگا۔

"میں زندگی کے اور موت کے فلسفوں کے بارے میں زیادہ جانتا ہوں نہ ہی اس پر کوئی عالمانہ بیان دے سکتا ہوں۔" اس نے کہا "لیکن میں اسے سامنے رکھ کر اس کی سانسیں گنتے ہوئے' اس پر ایک ٹک نظریں جمائے اس کی موت کا انتظار کرنے بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا' موت سے ہارنا ہی تھا تو کیوں نہ زندگی کی فتح کی کوشش کرتے ہوئے ہارا جاتا' میں یک طرفہ جنگ لڑنے کا قائل نہیں ہوں مجھے خطرہ مول لینا ہی تھا۔"

"تم اتنے ہی جنگجو ہو تو اسے کیوں منع کرتے رہے' وہ سب سے بلند سطح پر جاکر سکی انگ نہ کرے۔" نادیہ نے روتے روتے ذرا سا مسکرا کر کہا' اس کے دل پر پڑا منوں بوجھ ڈاکٹر مائیکل کی دکھائی امید کی ایک کرن نے پل بھر میں

ہٹا دیا تھا۔ آگے کیا ہونے والا تھا وہ نہیں جانتی تھی ' مگر اس وقت اسے ایسا لگ رہا تھا وہ پوری دنیا کے لوگوں سے زیادہ شاد اور مطمئن تھی۔

"میں بے سبب ' بلاوجہ اور احمقانہ خطرے مول لینے کا بھی قائل نہیں ہوں ' مہم جوئی کے نام پر موت سے ہاتھ ملانے اور اس سے بچ آنے کا دعوا کرنا حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں اور تمہارے بھائی نے یہ حماقت میری نظروں کے سامنے کی۔"

"میں نہیں جانتی ' میری سمجھ میں نہیں آتا اس نے ایسا کیوں کیا ' جو کچھ تم بتاتے ہو جو اس نے تمہیں بتایا میں نہیں جانتی اس کی بھی کیا وجہ تھی ' ڈیڈی اور سعد ایک دوسرے سے جو دونوں پولز جیسے فاصلے پر۔" نادیہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اس سے زیادہ حیرت انگیز بات کوئی دوسری ہو نہیں سکتی ' سعد کے لیے تو ڈیڈی نے ' سعد ہی تو وہ انسان ہے ڈیڈی نے سب کو چھوڑ کر جسے پایا تھا ' سعد اور ڈیڈی کے درمیان اتنے فاصلے کیسے پیدا ہو گئے میں شاید کبھی سمجھ نہ پاؤں۔"

"میں نہیں جانتا کہ تاریخ کیا ہے ' جو اس نے مجھے بتایا وہی میں نے مختصراً" تمہیں بتا دیا۔ وہ کسی بھی صورت پیچھے رابطہ نہیں کرنا چاہتا تھا ' شاید وہ ان چاہی حقیقتوں سے نظریں چراتا ہی یہاں آیا تھا اور انہی حقیقتوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے اس نے وہ احمقانہ خطرہ مول لیا جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔"

"جو بھی ہوا ' جو بھی گزرا!" نادیہ نے سب سن کر سہلاتے ہوئے کہا۔ "میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ جن لمحوں کو گزر جانا تھا وہ گزر چکے ' اب وقت بدل چکا ہے نیا وقت آچکا ہے ' سعد ابھی زندہ ہے ' وہ خطرے سے باہر ہے ' اس کا جسم دواؤں کو قبول کر رہا ہے اور دوائیں اس کے جسم پر اثر بھی کر رہی ہیں۔ میں نے جن معجزوں کے بارے میں پڑھ رکھا ہے ان میں سے ایک معجزہ میری نظروں کے سامنے ہو رہا ہے اور ابھی میں صرف اس معجزے کو دیکھ لینے کی خوشی منانا چاہتی ہوں۔"

وودن زادے نے دلچسپی سے اس خوشی سے پاگل ہوتی لڑکی کی طرف دیکھا۔

"تمہارے پاس اس روز جو شخص آیا تھا ' جس نے تم سے کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کیں اور جس کے چلے جانے کے بعد تم نے سجدوں اور عبادتوں کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں کیا وہ کون تھا اور اس نے تم سے کیا کہا تھا۔" وودن نے پوچھا۔

"وہ ڈاکٹر رضا حسین ہیں۔" نادیہ اپنے فون پر کوئی نمبر ملاتے ملاتے رکی۔ "اور انہوں نے مجھ سے صرف اتنا کہا تھا غم میں گھر کر اس کو کیوں بھول گئیں نادیہ ' جس کو پانے کے لیے تم مجھ تک پہنچی تھیں۔"

"جس کو پانے کے لیے تم اس تک پہنچی تھیں؟" وودن نے نادیہ کے الفاظ دہرائے اور پھر کچھ نہ سمجھنے کے سے انداز میں نادیہ کی طرف دیکھا۔

"تم نہیں سمجھ پاؤ گے۔" نادیہ نے کہا اور فون کان سے لگا لیا۔

"وہ زندہ ہے ' وہ بچ گیا ہے ' آپ نے مجھے بروقت یاد دلا دیا کہ میں غم میں گھر کر اسے بھول رہی ہوں جو زندگی عطا کرتا ہے ' وہی جو مرنے کے بعد بھی مردوں کو اٹھانے کی طاقت رکھتا ہے۔ میں بھول بیٹھی تھی ' مایوس ہو چکی تھی لیکن پھر اسی نے آپ کو مجھ تک بھیجا ' مجھے یاد دلانے کے لیے کہ وہ ہے ' وہ جو عظیم ترین طاقت ہے۔"

نادیہ فون پر کسی سے بات کرتے ہوئے بھی جذباتی ہو رہی تھی ' روتے ہوئے لرزتی کانپتی آواز میں بول رہی تھی اور وودن اس کے الفاظ پر غور کر رہا تھا۔

"وہ ہے ' وہ جو عظیم ترین طاقت ہے۔" وودن نادیہ کے الفاظ پر غور کر رہا تھا۔

(باقی ان شاءاللہ آئندہ شمارے میں)

عنیزہ سید

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم

"میرا خیال ہے میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم اب اس کے پیچھے جا رہے ہیں نہ ہی اس کی کوئی بات کر رہے ہیں۔" بلال سلطان کا لہجہ اور بات ابراہیم کے لیے حوصلہ افزا ہرگز نہیں تھی۔

"لیکن انکل! میں نے بتایا کہ یہ لڑکی تو ویسی ہی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" اس نے منمنا کر ایک کوشش مزید کرنا چاہی۔

"تمہارا کیا خیال ہے' میں بہت فارغ ہوں جو جب کوئی مجھ سے ملنا چاہے میں اس سے ملنے کے لیے Available (دستیاب) ہو جاؤں۔" وہ سخت اور خشک لہجے میں بولے۔

"نہیں ہرگز نہیں انکل! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں۔" ابراہیم نے زبان پھیر کر اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا ہے کہ اسے میں اپنے مان پر لایا تھا۔" اس نے ایک جذباتی وار کھیلنے کی کوشش کی۔ "میں نے ہی اسے یقین دلایا تھا کہ انکل میری بات کو اون کرتے ہیں کیونکہ مجھے وہ اپنے بیٹے جیسا ہی سمجھتے ہیں۔"

۲۶

چھبیسویں قسط

"میں سعدیہ بول رہی ہوں ماہ نور باجی' کھاری کی بیوی سعدیہ۔"

"ہاں ہاں سعدیہ پلیز بولو۔" ماہ نور جلدی میں تھی' گھر میں اس کے بابا آئے ہوئے تھے' وہ خاص طور پر اس سے ملنے کچھ دیر پہلے اسلام آباد پہنچے تھے۔

"کھاری کہتا ہے آپ اس کے جاپانی دوست کا نمبر مانگ رہی ہیں۔" سعدیہ کے لہجے میں ابھی بھی شک کا عنصر جھلک رہا تھا۔

"ہاں ہاں' پلیز سعدیہ! مجھے وہ نمبر دے دو' میں تو کب سے انتظار کر رہی ہوں۔" ماہ نور چلتے چلتے لونگ روم کے دروازے تک پہنچی۔

"میں آپ کو نمبر بتاتی ہوں ماہ نور باجی! مگر مجھے بھی آپ سے ضروری کام ہے۔"

"ہاں پلیز بولو سعدیہ مگر جلدی کرلو میں ذرا جلدی میں ہوں۔" ماہ نور اسی جگہ رکتے ہوئے تیزی سے بولی۔

"ماہ نور باجی! آپ کی بات کھاری سنتا ہے' سمجھتا ہے' اسے آپ سمجھائیں وہ کملا ہو گیا ہے' عجیب عجیب باتیں کرنے لگا ہے۔"

"ہیں اچھا بھلا تو تھا تو وہ اس روز' کیا ہوا اسے؟"

"پتا نہیں جی اسے کیا سودا ہو گیا ہے' کہتا ہے کہ وہ سعد باؤ صاحب کا بھائی ہے۔"

"ہیں!" ماہ نور کو جھٹکا سا لگا۔ "سعد کا بھائی ہے۔"

"ہاں جی' میں اسے روکتی ہوں' منع کرتی ہوں کسی سے یہ بے وقوفوں والی بات نہ کرے' پر وہ کہتا ہے چوہدری صاحب واپس آلیں سب کو پتا چل جائے گا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

"چچا سردار واپس آجائیں۔" ماہ نور کے ذہن میں ایک عجیب سی کشمکش شروع ہو گئی۔

"ہاں جی وہی جی۔" سعدیہ کہہ رہی تھی۔

"چچا سردار' سعد' کھاری۔" ماہ نور کی نظروں کے سامنے کچھ دن پہلے پڑھے کچھ الفاظ گھومنے لگے' جن پر اس نے اپنی دھن میں مبتلا ہوتے ہوئے غور ہی نہیں کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

سیمی نے فرش پر ڈنڈے سے جڑا پوچا (پ) پھیرا اور پھر اسے کچن سے باہر والی بالکنی میں رکھنے گئی' اس بالکنی سے فلیٹس کے نیچے والی سڑک کا وہ حصہ صاف نظر آتا تھا جہاں سے فلیٹس والی عمارت میں آنے جانے والے لوگ دیکھے جا سکتے تھے۔ سیمی نے عادتاً سر جھکا کر نیچے دیکھا فلیٹس کی عمارت کے قریب ایک قیمتی لمبی چمکتی سیاہ گاڑی آکر رکی تھی۔ سیمی تجسس کے مارے وہیں کھڑی نیچے دیکھتی رہی۔

"کس کے ہاں کون آگیا بھائی؟" وہ دل میں سوچ رہی تھی' نجانے کیوں اسے یہ گاڑی دیکھ کر سعد یاد آنے لگا تھا۔ اس کا دل تیز رفتاری سے دھڑکنے لگا "کیا پتا سعد واپس آگیا ہو' ایسا ہوا تو سارہ تو خوشی کے مارے پاگل ہو جائے۔" اس نے سوچا اور ایک بار پھر دیکھا۔ باوردی شوفر پچھلی سیٹ کا بایاں دروازہ کھول رہا تھا۔ گاڑی سے باہر آنے والے شخص کا چہرہ سیمی کو واضح نظر نہیں آیا' مگر اس کا قیمتی سوٹ اور چمکتے جوتے ضرور نظر آرہے تھے۔ وہ شخص سعد نہیں تھا۔ سیمی کو مایوسی ہوئی۔

"ان فلیٹس میں ایسا تو کوئی نہیں رہتا جس کے ہاں اتنی قیمتی گاڑی میں بیٹھ کر کوئی آئے۔" وہ سوچتے سوچتے واپس کچن میں آگئی۔

"آج مونگ کی دال اور املی کا گڑمبا بنالیتی ہوں۔" اس نے ہاتھ دھوتے ہوئے مینیو ترتیب دیا۔

"سارہ تو لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نظریں جمائے ایک ہی گانا سنے جارہی ہے' صبح سے اردگرد کا کچھ ہوش نہیں' ون ٹو تھری۔ ون ٹو تھری کے علاوہ جس میں کوئی اور الفاظ سمجھ نہیں آتے۔"

وہ سوچے چلی جارہی تھیں۔ جب ہی داخلی دروازے پر دستک سنائی دی۔ کال بیل ہمیشہ کی طرح اس روز بھی خراب تھی۔

"دیکھو تو کب سے انجم کو کہہ رہی ہوں۔ مجال ہے جو سن لے' سعد یہاں نہیں ہے اسے بھی پتا چل گیا شاید جب ہی نہیں سنتا' سعد کے ہوتے اس کی مجال نہیں تھی کسی کام پر کان نہ دھرتا۔" سیمی ایپرن سے ہاتھ پونچھتی داخلی دروازے کی طرف آئی۔

"کون ہے بھئی؟" اس نے رسماً پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر دروازہ کھول دیا۔ قیمتی لمبی' چمکتی سیاہ گاڑی میں بیٹھ کر آنے والا انہی کے فلیٹ کے دروازے پر کھڑا تھا۔

If you ever find yourself stuck in
the middle of the sea.
I'll sail the world to find you
If you ever find yourself lost in
the dark and you cant see
I'll be the light the guide you
Find out what were made of when we
are called to help our friends in need
You cant count on like 1'2'3
I'll be there

سارہ کے کمرے سے برونو مارز کے گانے کی آواز آرہی تھی۔ وہ گانا جو سعد سلطان کو بہت پسند تھا۔

"مجھے بہت اچھا لگا جو تم نے مجھ سے صاف بات کر دی۔" زوار نے فلور کشن پر اپنے قدموں میں بیٹھی ماہ نور سے کہا۔

"لیکن یہ ایک بھاری بوجھ ہے جو تم نے میرے حوالے کر دیا۔" انہوں نے بات مکمل کی۔

"میں جانتی ہوں۔" ماہ نور نے گھٹنوں پر رکھا سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ "لیکن آپ کے علاوہ میرے پاس کوئی دوسرا کون تھا ممی؟" وہ دکھ سے مسکرائی "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ممی میری کسی ایسی بات کو سن کر آسانی سے ہضم کر جاتیں' مجھے کھری کھری نہ سناتیں یا کسی بھی طرح مجھے سپورٹ کرتیں؟"

"نہیں۔" زوار نے سر ہلایا "وہ تمہاری ایسی بات کو نہ تو آسانی سے سن کر ہضم کر سکتی ہیں نہ ہی تمہیں سخت سست سنانے سے باز رہ سکتی ہیں نہ ہی وہ کسی بھی طرح تمہیں سپورٹ کر سکتی ہیں۔۔۔ یہ تینوں کام ان کے بس میں نہیں۔"

پتا نہیں انہوں نے ماہ نور کی بات کی تائید کی تھی یا اسے اس کی ماں کے ممکنہ ردعمل سے ڈرایا تھا۔

"پھر آپ بتائیے وہ کون سا دوسرا انسان ہے جسے میں اپنے دل کی بات سناتی۔" ماہ نور کی آواز بھاری ہو گئی۔

"میں نے کہا نا تم نے بہت اچھا کیا جو مجھے سنا دی اپنے دل کی بات۔" زوار نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا "میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ لڑکا یونہی تمہارا انتخاب نہیں بنا ہو گا اس میں کچھ ایسا ضرور ہو گا

جو وہ تمہاری نظروں میں سمایا اور تمہارے دماغ کا فتور بن گیا۔"

"آپ اسے دماغ کا فتور سمجھتے ہیں؟" ماہ نور نے چونکتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" زوار نے سرہلایا۔ "جب کسی کے خیال میں ڈوبتا ہوا انسان اس بات کی پرواہ کرنا بھول جاتا ہے کہ اس کی یہ ڈبکی اس کے ارد گرد رہنے والوں کے لیے کیسا منظر ثابت ہو رہی ہے تو اس خیال کو دماغ کا فتور ہی قرار دیا جاسکتا ہے یا ہو سکتا ہے' میری اردو کمزور ہو اور میں اس کے لیے غلط لفظ استعمال کر رہا ہوں۔"

"آپ کا مطلب ہے میں غلط کر رہی ہوں۔" ماہ نور کا اپنے بابا سے پرامید دل مایوس ہوا۔

"نہیں تمہارے خیال کو میں غلط نہیں کہہ رہا۔ خیال میں کھو کر بے خودی کے اس عالم پر البتہ میری کچھ ریزرویشنز ہیں۔" زوار نے کہا۔

"مثلاً"؟" ماہ نور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"مثلاً" اپنی اسٹڈیز کو اپنے کیریر کو بھول جانا' اپنے گھر والوں کو چھوڑ چھاڑ دوسرے کسی شہر میں آبسنا' اس خیال کو پانے کی خاطر ادھر ادھر بھٹکتے پھرنا۔" زوار نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"کیا آپ بھی سمجھتے ہیں کہ ہر چیز سے زیادہ اہم چیز ڈگری ہے۔" ماہ نور کو علم تھا کہ وہ ایک احمقانہ سوال کر رہی تھی مگر پھر بھی اس نے کیا۔

"میرے خیال میں ہر چیز سے زیادہ اہم چیز سیلف ریسپیکٹ ہے۔" زوار نے اس کی بات کا فوری جواب دیا۔

"گویا مجھے سیلف ریسپیکٹ کی پروا نہیں رہی" ماہ نور کچھ سوچتے ہوئے بڑبڑائی۔

"ہاں مجھے ایسا ہی لگا" زوار نے سچائی سے کہا "لیکن اگر میں باپ بن کر نہ سوچوں تو شاید اس لیے لوگ کہتے ہیں خود کو گنوا کر ہی کسی کو پایا جاتا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" کچھ دیر تک زوار کی باتوں پر غور کرنے کے بعد ماہ نور نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "شاید میں بے اختیاری کی اسٹیج میں داخل ہو چکی ہوں' لیکن بابا! میں سچ میں بے اختیار ہو چکی ہوں۔" اس نے تڑپ کے زوار کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھا۔

"میں سمجھ رہا ہوں۔" زوار نے سرہلایا "اور میرا بس نہیں چل رہا کہ کس طرح کہیں سے اس نالائق لڑکے کو پکڑ کر تمہارے والے سین میں حاضر کروں۔"

"کیا آپ کا دل ایسا کرنے کو چاہ رہا ہے؟" ماہ نور کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر جھلکی' زوار نے دیکھا اس کی آنکھوں میں پہلی بار ایک عجیب سی چمک اتری تھی۔

"ہاں میرا دل ایسا ہی کرنے کو چاہ رہا ہے۔" انہوں نے اپنے گھٹنوں پر رکھے ماہ نور کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے یقین دلایا۔

"آپ میرے ساتھ ہیں نا بابا؟" ماہ نور نے دوسرا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں' فی الوقت تو میں تمہاری بات سمجھ بھی رہا ہوں اور تمہیں سپورٹ بھی کرنا چاہوں گا بشرطیکہ تم ایک حد سے باہر نہ نکل جاؤ۔"

"نہیں میں ہرگز نہیں نکلوں گی۔" ماہ نور نے بچوں کی طرح سرہلایا۔

"مجھے معلوم نہیں تم اس کے سلسلے میں کیا کرنے والی ہو لیکن میرا مشورہ ہے کہ ایک بار بھائی سردار سے بھی یہ راز شیئر کر کے دیکھو۔ پتا نہیں کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ تمہارے لیے ایک اچھی مدد ثابت ہوں گے۔" زوار نے کہا۔

"میں سب کچھ بہتر خطوط پر کر سکتی ہوں اگر آپ میرے ساتھ ہیں' اگر آپ ممی کو کسی طرح مجھے یہاں اپنا قیام بڑھانے پر کنوینس کرلیں گے تو۔"

"ہاں وہ میں کرتا ہوں کسی طرح۔" زوار نے سرہلایا۔

ماہ نور نے ممنون اور مسکراتی نظروں سے باپ کی طرف دیکھا۔ زوار کی نظروں میں اس کے لیے محبت تھی' یقین تھا اور اعتماد و بھروسہ بھی۔

☼ ☼ ☼

"سارہ!" سیمی آنٹی آنے والے شخص کو دروازے پر ہی چھوڑ کر سارہ کے کمرے کی طرف لپکیں۔ سارہ گود میں لیپ ٹاپ رکھے وہ گانا سن رہی تھی اور اسکرین پر نظریں جمائے اس کا ویڈیو بھی دیکھ رہی تھی۔

"سارہ!" سیمی آنٹی نے آگے بڑھ کر لیپ ٹاپ کے کی بورڈ پر جڑا بیک اسپیس کا بٹن دبا دیا۔

"کیا ہوا؟" سارہ نے چونک کر سیمی کی طرف دیکھا۔ سیمی آنٹی کے چہرے پر سراسیمگی تھی اور ان کی ٹانگیں جیسے کسی کے رعب کی وجہ سے کپکپا رہی تھیں۔

"ہوا کیا ہے' آپ بتا کیوں نہیں رہیں آخر؟" سارہ نے جھنجلا کر پوچھا۔

"وہ ادھر۔۔۔" سیمی نے کانپتی آواز میں کہتے ہوئے دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

"اوہ کیا ہے ادھر؟" سارہ نے گود میں رکھا لیپ ٹاپ اٹھا کر میز پر رکھا اور اس کا چارجر اور تاریں اٹھا کر سائیڈ پر لڑھکا دیں۔

"ہے کیا ادھر جن بھوت دیکھ لیے یا کسی کا سایہ؟" وہ بڑبڑاتے ہوئے ساتھ والے کمرے کی طرف چلی۔ دونوں کمروں کے درمیانی دروازے تک آکر وہ رک گئی بلکہ اسے رک جانا پڑا۔ دوسرے کمرے میں موجود وہ شخص اس کے سامنے تھا جو قطعاً" اجنبی ہوتے ہوئے بھی نجانے کیوں اسے۔ بے حد مانوس شکل لگا تھا۔ یوں جیسے اسے کئی بار دیکھ چکی ہو شاید وہ التباس کا شکار ہو رہی تھی' وہ دروازے پر ہاتھ رکھے وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

"کیا بات ہے تم وہیں رک کیوں گئیں؟" اس کے سامنے کھڑے شخص نے کہا۔ جواب میں سارہ سے کچھ کہا نہیں گیا بس وہ وہیں کھڑے ایک ٹک اس شخص کو دیکھتی چلی جا رہی تھی۔

"یہاں آؤ میں تم ہی سے ملنے آیا ہوں۔" آنے والے نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

دروازے کے درمیان کھڑی 'سفید لباس میں ملبوس 'زرد رنگت 'سیاہ آنکھوں والی وہ لڑکی شاید اس شخص کو بھی خاصی مانوس لگی تھی جب ہی دوستانہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے اس لڑکی کے شانے پر بکھرے سیاہ بالوں کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نظر دروازے پر رکھے اس کے ہاتھ پر رک گئی 'ایک نحیف اور زرد ہاتھ 'جس کی رگیں کھنچی ہوئی تھیں۔

"کیا وہیں کھڑی رہوگی؟" اس کے ہاتھ سے زبردستی نظریں ہٹاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"آپ کون ہیں۔" سارہ نے مسلسل اس کی طرف دیکھتے ہوئے بھاری مگر نیچی آواز میں سوال کیا تھا۔

"میں بلال سلطان ہوں۔" اس شخص نے اپنا تعارف کروایا تھا۔ "کیا تمہیں معلوم ہے کہ سعد سلطان کے باپ کا نام بلال سلطان ہے۔"

"نہیں۔" سارہ نے پہلی بار صورت حال کو سمجھتے ہوئے سرہلایا۔ "ہم اس سے متعلق کسی کو نہیں جانتے۔"

"ہم!" وہ شخص مسکرایا "اور کسی کو نہیں جانتے۔" اس نے ابرو چڑھا کر سارہ کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہوں "سوچ لو کیا واقعی تم اس سے متعلق کسی کو نہیں جانتیں۔"

"ماہ نور کو بھی نہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"ماہ نور میری دوست ہے۔" سارہ نے وہیں کھڑے کھڑے ایک ٹانگ سے جسم کا بوجھ دوسری ٹانگ پر منتقل کرتے ہوئے کہا۔

"بالکل 'دوست کا دوست بھی دوست ہی ہوتا ہے۔" وہ مسکرایا "اور میں تو دوست کا باپ ہوں 'یقیناً" میں اس سلوک کا مستحق نہیں ہوں کہ مجھے اتنی دیر تک یہاں کھڑا رکھا جائے۔"

سارہ نے ایک نظر ان پر ڈالی اور دروازے کا سہارا چھوڑ کر پیر گھسیٹتی آگے بڑھی۔

"آپ پلیز تشریف رکھیں۔" اس نے اس لاؤنج کم ڈائننگ روم قسم کے کمرے میں رکھے ٹوسیٹر صوفے کی طرف اشارہ کیا وہ صوفے پر بیٹھ گئے اور کمرے میں موجود چیزوں پر طائرانہ نظر دوڑائی 'سیمی آنٹی بھی سارہ کے کمرے سے نکل کر ادھر آگئیں۔ ان کے چہرے سے ابھی بھی گھبراہٹ عیاں تھی۔

"یہ سعد کے فادر ہیں سیمی آنٹی! آپ کیوں گھبرا گئیں اتنا؟" سارہ نے کہا۔

"سعد کے فادر ہیں 'اسی لیے تو گھبرا گئی شاید۔" سیمی نے دل میں سوچا "یہ یہاں کیسے اور کیوں آگئے 'اب نجانے آگے کیا ہونے والا ہے۔"

"میں نے تمہارے بارے میں صرف سنا تھا 'آج تمہیں دیکھنے اور ملنے بھی چلا آیا۔" بلال نے سارہ کے چہرے پر نظر آتی گھبراہٹ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

سارہ کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور وہ فرش کو تک رہی تھی۔

"مجھ سے ملنے مجھے دیکھنے۔" اس نے سوچا "یقیناً" ماہ نور نے ان سے میرا ذکر کیا ہوگا۔ جو بات سعد نے ان کو نہیں بتائی وہ ماہ نور نے بتادی

ٹیپیکل گرلش مینٹلیٹی (Typical girlish mentality) اسے غصہ آنے لگا۔

اس نے سعد کی محبت کا راز کیا پالیا 'لگتا ہے آپے سے باہر ہی ہو گئی یہ بھی نہیں سوچا کہ سارہ تو اس کے محبوب کا راز ہے 'اسے عیاں نہیں کرنا چاہیے مگر نہیں۔" اس نے سوچتے سوچتے نفی میں سرہلایا۔ "سعد کی زندگی میں میری حقیقت اچھی طرح جان لینے کے بعد بھی وہ جیلسی ہی کا شکار رہی اور یقیناً" ان صاحب سے جاکر جڑ دیا ہوگا۔ اب یہ۔" اس نے کن اکھیوں سے سامنے بیٹھے بلال سلطان کی طرف دیکھا "ہمیں یہاں سے بے دخل ہی

کرنے آئے ہوں گے اور بے دخل کرکے ہی چھوڑیں گے 'کیونکہ وہ خود تو نہ جانے کہاں ہے 'جو اگر میرے لیے اس دنیا میں کہیں موجود ہے تو ایک 'دو 'تین سے آگے گنتی تو نہ گننی پڑتی مجھے۔"

وہ سوچ رہی تھی اور اس کے سامنے بیٹھے بلال سلطان اس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

کمرے میں موجود تیسرا کردار سیمی آنٹی مسلسل اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے دعائیں پڑھنے میں مصروف تھیں انہونی کو ٹالنے کا ان کے پاس یہ واحد ذریعہ تھا۔

"بہت عرصے کے بعد میں نے یہ مخصوص ماحول دیکھا ہے۔" بالآخر کمرے کی خاموشی کو توڑتے ہوئے بلال سلطان نے سیمی ہی کو مخاطب کیا "اور یقین جانو 'مجھے بہت اچھا لگا۔"

سیمی کی نظروں نے اجنبی مہمان کی نظروں کا تعاقب کیا۔ وہ دیوار کے ساتھ رکھے کنسول پر سجی چیزوں کو دیکھ رہے تھے۔

اس کو ڈچ سیٹ بولتے ہیں غالباً۔" انہوں نے اٹھ کر اس کنسول کے قریب جاتے ہوئے کہا اور اس پر رکھے سفید ٹیپسٹری پر سفید ہی کڑھت سے ابھرے پھولوں والے ڈچ سیٹ پر انگلی پھیری "کروشیا سے بنا یہ میز پوش۔" انہوں نے ایک اونچی گول تپائی کو ڈھانپتے میز پوش کی طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ کٹ ورک ہے 'ہے نا۔" وہ پھر ڈائننگ ٹیبل پر رکھی ٹی کوزی کے سیٹ کی طرف بڑھے اور پھر سیمی آنٹی کی طرف مڑ کر بولے۔ "طویل عرصے کے بعد دیکھ رہا ہوں یہ سب۔" انہوں نے کہا "دیکھا تو شاید کئی جگہ پر ہوگا مگر ایک گھریلو عورت کی انگلیوں سے بنے شاہکار عرصے کے بعد دیکھ کر میں بہت امیزڈ (حیران) amazed ہو رہا ہوں اور اس کے لیے میں تم لوگوں کا ممنون ہوں۔"

سیمی اور سارہ نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا وہ مذاق اڑا رہے تھے یا پھر ان کی بات میں سچائی تھی۔

"میں نے ایک چھوٹی اکائی سے کروڑوں تک کا طویل سفر کر رکھا ہے۔ ایک صفر سے چلا اور ہر گام پر صفر بھی بڑھتے گئے اور اس کے ساتھ لگنے والے ہندسے بھی 'مگر میں تم لوگوں کو ایک بات بتاؤں 'انسان لاکھ بھولنا اور بھلانا چاہے 'وہ اپنی اکائی کو نہیں بھلا پاتا یا کم از کم میں نہیں بھلا پایا جب ہی تو اولین اکائی سے منسوب چیزیں دیکھ کر بھی اور اس آگے آنے والی ہر دہائی سے منسوب چیزیں دیکھ کر بھی میں اس کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہوں جسے ناسٹیلجیا کہتے ہیں۔"

انہوں نے باری باری سارہ اور سیمی آنٹی کی طرف دیکھا۔ ان پر مرکوز ان کی نظروں میں ایک ہی پیغام چھپا تھا۔ "اس وقت تم مختار ہو 'تمہارے اختیار میں ہے 'جو چاہے کہو کہتے چلے جاؤ۔" وہ ہلکا سا مسکرائے اور آہستہ قدموں سے چلتے واپس اپنی جگہ پر جاکر بیٹھ گئے۔

"میں معذرت خواہ ہوں 'شاید میں نے تم لوگوں کو پریشان کر دیا۔ جبکہ میں تمہیں پریشان کرنے کی نہیں تمہاری پریشانیاں بٹانے کی نیت سے یہاں آیا تھا۔"

سارہ اور سیمی نے ایک بار پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"سارہ۔۔۔ کیا تم مجھے بتانا پسند کروگی کہ تم کب اور کیسے سعد سے متعارف ہوئیں؟" پھر وہ نرمی سے بولے۔

"آپ کو ماہ نور نے یہ نہیں بتایا؟" سارہ کی آواز گھٹی ہوئی تھی۔

"میں اس سے تمہارے بارے میں کیوں کچھ سنوں گا 'میں تو تم سے تعارف حاصل کرنے خود یہاں تمہارے پاس آیا ہوں 'ماہ نور کا اس بات سے کیا لینا دینا؟"

سارہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"اور یہ بھی یقین کرلو 'میرے یہاں آنے میں میری کوئی بدنیتی یا دل کا کھوٹ شامل نہیں ہے 'میں تم سے صرف

تمہاری باتیں کرنے یہاں آیا ہوں۔"

"آؤ آج ہم مل کر صرف تمہاری باتیں کرتے ہیں۔" سارہ کو سعد کی کہی ایک پرانی بات یاد آئی۔ اس کے دل نے ایک دھڑکن چھوڑدی۔

"میری باتیں۔" اس نے ان کی طرف دیکھا "میری باتیں جتنی زیادہ ہیں۔ اتنی ہی غیر اہم بھی ہیں اور آپ کا وقت میں جانتی ہوں کہ بہت قیمتی ہے۔" اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"میں تمہاری بہت زیادہ باتیں سننے کے لیے ہی وقت نکال کر آیا ہوں۔" انہوں نے سارہ کے جملے سے غیر اہم کا لفظ نکالتے ہوئے کہا اور پھر سیمی کی طرف دیکھا "آپ مسلسل کھڑی کیوں ہیں خاتون! بیٹھ جائیے اور آپ بھی سنائیے یقیناً" اس بچی کی باتوں میں آپ کا کردار بھی خاصا اہم ہوگا۔"

سیمی آنٹی کا ذہن متوقع صورت حالات کے بارے میں مسلسل سوچ سوچ کر ماؤف ہو رہا تھا وہ کسی روبوٹ کی مانند دو قدم چلیں اور ایک کرسی پر ٹک گئیں۔

"ہوں!" بلال سلطان نے سارہ کی طرف دیکھا "اب بولو۔"

☼ ☼ ☼

"یہ آب زم زم میں بھگوئی تسبیحاں، تھیلی بھر عجوہ کھجوریں اور چند جاء نمازیں، کب تک ہماری روزی کا وسیلہ بنے رہیں گے، محلے بھر کے لوگ اب ہماری اس انوکھی دکان داری پر ہمارا مذاق اڑانے لگے ہیں۔ جو چیزیں حاجی اپنی واپسی پر تبرک کے طور پر تحفے میں دیتے ہیں، وہ ہی چیزیں ہم بیچ رہے ہیں۔"

"تحفے اپنوں کو دیے جاتے ہیں اور ہمارا اپنا کون ہے یہاں بھلا۔ اسی لیے تو ہم لوگوں کو بیچ رہے ہیں۔"

"بھولی ہو تم بھی، چند روپوں کے عوض اگر ہم سے یہ کوئی خرید بھی لے جاتا ہے تو ان چند روپوں میں نہ آٹا پورا ہوتا ہے نہ دال۔ اور اب یہ رہ بھی کتنی گئی ہیں چند ایک باقی ہیں۔ ان سے مزید کتنے دن گزریں گے۔"

"واہ رابعہ بی بی! اتنا وقت دیکھ لیا، اتنا وقت گزر گیا، تمہارا ایمان اسی طرح کمزور رہا جیسے پہلے تھا، حج کر آئیں، عمرے بھی کرلیے، اپنی آنکھوں سے وہ سب دیکھ آئیں جن پر نظر پڑتے ہی کافر سے کافر دل بھی مومن ہو جاتے ہیں مگر تم ہو کہ ابھی بھی کل کی فکر میں پڑی ہو، کتنا کہا تھا کہ کلمہ پڑھ لو، ہو جاؤ مسلمان، پر تم نے میری بات پر کان دھر کے نہ دیا۔"

"لو میں پیدائشی مسلمان، میرا ابا مسلمان میری اماں مسلمان، پھر بھی جب تم نے کہا کہ نہیں رابعہ تمہارا دل ابھی بھی کافر ہے تو کیا تمہارے کہنے پر میں نے وضو کر کے کلمہ نہیں پڑھا تھا، تمہارے بقول پکی مچی کی باقاعدہ مسلمان بننے کے لیے۔"

"میں بھی سمجھی تھی کہ تم کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئیں، مگر آج اپنے دل میں جھانکو تو پتا چلے کیسا کافر ہے وہ، آج پیٹ بھرا نہیں کل کی فکر پڑ گئی۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور معبود سے زیادہ عہد کی کسی کو فکر ہو گی رابعہ بیگم! کاش جو تم سمجھ جاؤ۔"

"میری سمجھ میں تو اللہ جانے تمہاری باتیں بالکل نہیں آتیں۔"

"چار لفظوں کے معنی جان جاؤ بس تو سمجھو پوری کتاب پڑھ لی تم نے، وہ چار لفظ سنو۔ توکل، فقر، غنا اور سادگی۔"

"مطلب؟"

"مطلب کہ یہ چار عناصر ہوں تو بنتی ہے زندگی آساں"

"ذرا ان کا مطلب تو سمجھاؤ ایک ایک کر کے۔"

"ایک ایک کر کے کیا بتاؤں اصل میں چاروں ایک ہیں۔"

"سمجھ گئی تم مجھے بتانا چاہ رہی ہو کہ فاقے کاٹنے سے ثواب ملتا ہے۔"

"اللہ کی شان ہے، ہر انسان اپنی بساط کے مطابق ہی سمجھتا ہے۔"

"فاقے کاٹنے کی عادت تو ڈالنے کی کوشش کرتی ہوں مگر پڑتی نہیں کیا کروں۔"

"سراج سرفراز کو جدھر نوکری مل رہی ہے اسے کہو کہ وہ نوکری کر لے۔ تم وہی تو فاقے کاٹنے سے بچ جاؤ۔"

"نوکری معلوم بھی ہے کہ کدھر مل رہی ہے، جامع مسجد کے امام صاحب نے اس سے کہا ہے کہ یزمان منڈی میں ایک چھوٹی سی مسجد میں ضرورت ہے، بچوں کو قرآن پاک بھی پڑھانا ہے اور پانچ وقت نماز کی امامت بھی کرانی ہے۔"

"تو پھر سوچ کیا رہے ہو تم لوگ، سراج سے کہو نوکری سنبھالے۔"

"اللہ جانے یہ یزمان منڈی ہے کدھر اللہ جانے وہاں کے لوگ کیسے ہوں میں تو کبھی نہ جانے دوں۔"

"گھر آئی روزی رزق کو ٹھوکر نہیں مارتے، تم ہی کو تو گلہ تھا سراج سرفراز کوئی کام نہیں کرتا اب کام مل رہا ہے تو تم ہی روک رہی ہو۔"

"اچھا یہ بات ہے تو چلو پھر تینوں چلتے ہیں مسجد کے اندر چھوٹی سی رہائش بھی ہے ادھر رہ لیں گے تینوں۔"

"مجھے ساتھ کدھر گھسیٹتے پھرو گے تم لوگ، میں ادھر ہی اچھی ہوں، اب تو یہ نیا محلہ بھی اپنا اپنا لگنے لگا ہے۔ لوگ عزت احترام دیتے ہیں، حاجن بی بی کہہ کر پکارنے لگے ہیں، ہاں تم دونوں کا وقت ہے، تم دونوں کی زندگی کا آغاز ہے اگر بہتر موقع ملتا ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

"تم جانتی ہو نا میں نے سراج سرفراز سے نکاح تمہاری خاطر کیا تھا، تمہارے کہنے پر ورنہ جو میں اس کے بارے میں خیالات رکھتی تھی وہ اسے ابھی بھی معلوم ہو جائیں تو ایک دم بھاگ جائے یہاں سے، پھر بھی کہتی ہو کہ تمہیں یہاں چھوڑ کر اس کے ساتھ چلی جاؤں۔"

"شوہر کے بارے میں ایسے حقارت آمیز لہجے میں گفتگو تمہیں زیب نہیں دیتی رابعہ۔ نہ کیا کرو ایسی باتیں گناہ ہوتا ہے۔"

"ہاں اور دل کی دل میں رکھ کر ثواب کے چکر میں پڑ جاؤں تمہاری طرح، اس کی خاطر دل کی دل میں رکھے بیٹھی ہو جس بے وفا اور ہرجائی نے مڑ کر دیکھا بھی نہیں، ہو کس حال میں اور کم بخت ہمارا بچہ بھی لے اڑا۔"

"رابعہ میں ان کے بارے میں ایک لفظ بھی گستاخی کا نہیں سن سکتی، وعدہ کرو آج کے بعد اس لہجے میں ان کے بارے میں بات نہیں کرو گی۔"

(کیا مشرقی عورت ہے یہ بھی بھئی اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ یہ ہم سے بھی تعظیم کرائے جاتی ہے۔)

"اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ ٹھیک ہے۔ نہیں کرتی۔"

"اور تم بھی سراج سرفراز کی عزت کرنا سیکھو۔ شوہر کی وفادار اور تابعدار بیوی ہی آخرت میں کسی اچھے کی امیدوار ہو سکتی ہے۔"

"تو تم کسی اچھے کے لیے دولہا بھائی کی وفاداری کر رہی ہو۔"

"میرے نامہ اعمال میں جتنی سیاہ کاریاں ہیں۔ ان کا دھلنا فقط ایک وفاداری سے کہاں ممکن ہے۔ میں تو فقط کوشش ہی کر سکتی ہوں کہ جو چند لکیریں رہ گئی ہیں ان پر ہی میرے حق میں کچھ اچھا لکھا جا سکے۔"

"سیاہ کاریاں؟ ارے کاہے کی سیاہ کاریاں۔۔۔ گھر سے تم خود نہیں بھاگی تھیں۔ تمہارے باپ نے تمہیں بے

دخل کردیا۔ خاندان بھر میں سے کسی کو اشک شوئی کی توفیق نہیں ہوئی۔ اپنی روزی روٹی کے لیے برائی کا دھندہ نہیں کیا تم نے۔ ہاں اس خداداد صلاحیت سے فائدہ اٹھا کر توفیق بھر رزق ضرور کمایا۔ مارے گناہ کے خوف کے ریڈیو چھوڑا' اپنے ریکارڈ جلا دیے۔ ایک بظاہر نیک شریف مرد سے نکاح کیا۔ اس کا بچہ پیدا کیا' پھر بھی تقدیر نے تمہارے ساتھ کیا کیا۔ اگر کچھ غلط ہوا بھی تو اس کی سزا تو تم نے قدم قدم پر بھگت لی۔ پھر کون سی سیاہ کاری باقی رہ گئی تمہارے نامہ اعمال میں آخر۔"

"اپنے بیان کی صحت درست کرلو تو تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا۔ کیسی سیاہ کاریاں۔۔۔ ماں' باپ کی نافرمان۔۔۔ بغاوت کرکے گھر سے نکلی۔۔۔ خاندان شریف اعلا حسب نسب کا حامل' اسے تو مجھ پر تھوکنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ اشک شوئی کرنے کی بات کرتی ہو۔ حکم ہے کہ آواز کا بھی پردہ کرنا چاہیے ایک مسلمان نیک بی بی کو۔۔۔ میں اپنی آواز کی تانیں سُر کی لہروں پر بکھیر کر ہر سو پھیلاتی رہی۔ طیفے لاٹروں جیسی کی سرپرستی میں محافل موسیقی کا اہتمام کرتی رہی اور ان کے عوض ملنے والی رقم سے گھر کا خرچا چلاتی رہی۔ جو نکاح کیا تو بھی چوروں کی طرح۔۔۔ بچہ پیدا کیا تو بھی چوروں کی طرح۔۔۔ نہ میں طیفے لاٹرے سے اپنے لیے پناہ طلب کرتی' نہ وہ یوں جان کا دشمن ہوتا۔ کوئی ایک سیاہ کاری ہو اعمال نامے کی تو کہوں' کچھ سیاہ عملوں کے نشان تو سزا کے طور پر میرے چہرے پر پکے ثبت ہوگئے۔ آواز جس کا غرور تھا اور جس کے غرور پر ماں' باپ کی دل شکنی کرکے بغاوت کرکے گھر سے نکلی وہ آج ایسی ہے کہ کیا پھٹے ڈھول کی ہوگی۔ جو نے خوف کھائے' سزا کا عمل تو دنیا ہی سے شروع ہوگیا۔ آخرت کا سوچوں تو خوف کے مارے کانپ کانپ جاتی ہوں۔ اب بھی ہوش نہ آئے تو مجھ جیسا کوئی بدقسمت بھی ہوگا۔"

"ہائے میرے مولا! مجھے تو خوف کے مارے جھرجھری آگئی۔ اے اللہ کا واسطہ ہے' میرے بیان کی صحت مت درست کرنا۔ آئندہ بھی' مجھے میرا بیان ہی ٹھیک ہے۔"

"تو پھر اتنا ہی کرلو کہ سراج سرفراز کی عزت کرنا سیکھ لو۔ یہ سیکھ لیا تو سمجھو آدھی آخرت تو سنور گئی۔"

"اچھا بھئی۔۔۔ کوشش کرتی ہوں۔"

"صرف کوشش نہیں' عمل۔۔۔ عمل کرنا سیکھو۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہی۔۔۔ وہی عمل۔"

"تمہارے لہجے کی ناگواری ہی مجھے تمہاری نیت کا پیغام دے رہی ہے۔"

"توبہ ہے' تم تو پیچھے ہی پڑ گئیں۔"

"پیچھے پڑوں گی ہی تو تم بھی مانوگی۔"

"اچھا۔۔۔ اس بات کو چھوڑو' یہ بتاؤ کہ تسبیحیں اور کھجوریں ختم ہوگئیں تو آگے روزی کا کیا وسیلہ ہوگا؟"

"اللہ مسبب الاسباب ہے۔ وہ ہی روزی عطا کرنے والا ہے۔ ماسی صغراں ہے نا تندور والی۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔!"

"وہ کل کہہ رہی تھی کہ لوگ بچیوں کو مسجد نہیں بھیجنا چاہتے۔ ناظرہ کے لیے۔۔۔ اگر میں بچیوں کو قرآن پڑھانا شروع کردوں تو۔۔۔ ایک وقت کی روکھی سوکھی کا انتظام بھی ہوجائے گا اور بچیاں بھی قرآن پڑھ لیں گی۔"

"اللہ تیری شان۔۔۔ ہوا کے دوش پر سُر کی تانوں کے ساتھ آواز کی لہریں بکھیرتی گائیک۔۔۔ بچیوں کو ناظرہ قرآن پڑھائے گی اور جو بچیاں معصوم تمہارا چہرہ دیکھ کر خوف کھا گئیں تو۔۔۔ اللہ توبہ اللہ توبہ میں بھی کیسی کیسی باتیں سوچنے لگتی ہوں۔۔۔ استغفار۔۔۔ استغفار۔۔۔"

☼ ☼ ☼

اس کی سماعت سے کہیں قریب سے آتی ہلکی سی آواز ٹکرائی تھی۔ اس کے دماغ نے اس آواز کی لہروں کو وصول کیا تھا۔ اس کا ذہن جیسے ایک طویل نیند سے جاگا تھا۔ لیکن ابھی بھی اس پر غنودگی کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس نے اپنی بند آنکھوں کو کھولنا چاہا' مگر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ اس کے قریب کھڑے لوگوں نے دیکھا۔ اس کی اس کوشش کے نتیجے میں اس کی پلکیں ذرا سا لرز کر پھر ساکت ہوگئی تھیں۔

"ردعمل ظاہر ہو رہا ہے۔" اسے محسوس ہوا اس کے کانوں نے یہ الفاظ سنے تھے۔ وہ ان الفاظ کا مفہوم سمجھ سکتا تھا۔ اس نے سوچنا چاہا وہ الفاظ کس زبان میں بولے گئے تھے۔ مگر اس کا ذہن مزید سوچنے کا بوجھ نہیں اٹھا پایا تھا۔ وہ پھر سے غنودگی میں جانے لگا تھا۔ وہ دوبارہ غنودگی میں نہیں جانا چاہتا تھا۔

"آف!" اس کے بند ہونٹوں سے ایک آواز نکلی تھی۔ اس کے اردگرد کھڑے لوگوں نے چونک کر یہ "آہ" سنی تھی اور ان کے چہروں پر مسرت اور امید کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ یہ زندگی کی نوید کی لہر تھی۔ وہ سب لوگ جو اس کے سر پر کھڑے اس کی سانسوں پر نظر رکھے ہوئے تھے' ان میں سے ہر کسی کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ سکی ڈائیونگ کی تاریخ میں سر کے بل گرنے کے نتیجے میں آنے والی چوٹوں سے زندہ بچ جانے کی مثالیں کتنے فیصد تھیں۔ اس کے لیے بیٹھنے والے طبی بورڈ میں موجود صرف دو ڈاکٹروں کی رائے تھی۔

"ضرب کھوپڑی کے صرف اوپری حصے پر آئی ہے۔ اندرونی حصے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔"

اس کی زندگی کے سلسلے میں سب سے زیادہ پرامید ڈاکٹر مائیکل تھا۔

"بے ہوشی کی کیفیت قے یا ناک کے ذریعے خون نہ بہنے اور چوٹ کے اندر ہی جم جانے کی وجہ سے ہے' اگر سرجری کے ذریعے جمے ہوئے خون کو ہٹایا جاسکا تو زندگی کی امید بہت زیادہ ہے۔ شاید ننانوے اعشاریہ نو فیصد سے بھی کچھ زیادہ ہی۔۔۔" ڈاکٹر پال نے اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا تھا۔

ڈاکٹر اپنی سی کوشش میں مصروف تھے اور ڈاکٹروں کی اس سرگرمی سے ہٹ کر باہر ایک اور ذی روح اس کے ساتھ زندگی اور موت کی سی کیفیت میں گرفتار اپنی سی کوشش میں مصروف تھی۔ اس نے بھی ڈاکٹروں کے ساتھ ساتھ اس کی آتی جاتی سانسوں کو گنا تھا۔ ڈاکٹر دوا اور سرجری میں مصروف تھے۔ وہ دعا اور پکار میں مگن تھی۔ اس نے اپنی اب تک کی زندگی میں اتنی شدت سے اپنے لیے کچھ نہیں مانگا تھا اور جب اپنے لیے مانگنے کو اپنے اللہ کو پکارنے لگی تھی تو شدت کی آخری حد تک پہنچ گئی تھی۔

"تم ایک عہد کرکے گزارش کروگی تو مجھے یقین ہے تمہاری عرضداشت کا جواب جلد اور مثبت آئے گا۔" ڈاکٹر رضا حسین نے اس سے کہا تھا۔

"کیسا عہد؟"

"یہ عہد کہ دعا کا جواب جو بھی آئے' تم اس جواب پر راضی برضا ہوگی' شکوہ' شکایت' گلہ گزاریوں کی اندھی گلی میں پھنسنے سے گریز کروگی۔"

انہوں نے اسے ایک کٹھن کام سونپا تھا۔ انسانی جذبات کی برداشت سے باہر کام۔۔۔ مگر شاید یہ ہی شرط تھی اور وہ اس راستے سے ہٹ کر کوئی اور راستہ اپنانے پر تیار نہیں تھی اور وہ اسی صبح کی شام تھی جب اس نے اپنے دل میں پختہ عہد کیا تھا کہ وہ اس کی رضا میں راضی رہے گی۔ صبح کو کیا گیا عہد شام کو زندگی کی نوید لے کر آیا تھا۔

"آف۔۔۔!" ہر پندرہ' بیس منٹ کے وقفے کے بعد انتہائی نگہداشت کے شعبے میں بستر پر پڑے اس کے بھائی کے منہ سے نکلنے والی یہ آواز اس کے لیے گویا پہروں گفتگو کے برابر ثابت ہو رہی تھی۔ اس نے ڈاکٹروں سے درخواست کرکے دو' تین مرتبہ اپنے کان لگا کر یہ آواز سنی تھی۔ یہ زندگی کی نوید تھی۔

زندگی ابھی باقی تھی۔ زندگی تھی تو سب کچھ تھا۔ وہ کتنے دنوں سے جن کانٹوں کے درمیان کھڑی تھی۔ وہ یکایک جیسے پھولوں میں تبدیل ہوگئے تھے۔ زندگی سے بھرپور رنگا رنگ پھول۔

☆ ☆ ☆

"ہیلو۔ کیا یہ رضوان الحق کا نمبر ہے؟"
"السلام علیکم! جی جی۔ میں رضوان الحق ہی بات کر رہا ہوں۔"
"کیسے ہو تم رضوان الحق؟ میں ماہ نور بات کر رہی ہوں۔ شاید کھاری کے ریفرنس سے میں تمہیں یاد ہوں گی۔"
"میں معذرت خواہ ہوں' یہاں بہت شور ہے جہاں میں کھڑا ہوں' آپ مجھے صبح کے وقت کال کر سکتی ہیں کیا؟ یہاں میں آپ کی بات سن نہیں پا رہا۔"
"مجھے تم سے بہت مختصر سی بات کرنی تھی۔"
"نہیں جی۔ دیکھیں مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔"
"اف۔ آخر تم کھڑے کدھر ہو؟"
"میرے پاس آپ کا نمبر آگیا ہے۔ ایسا کرتا ہوں کہ میں آپ کو خود کال کر لوں گا فارغ ہونے کے بعد۔"
"تم مجھے مس کال دے دینا میں تمہیں خود کال کر لوں گی۔"
"اُفوہ۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔"
اس نے فون بند کر دیا اور ایک نظر کال کرنے والی کے نمبر پر ڈالی۔
"پتا نہیں کون تھی اور مجھے کیسے جانتی تھی اور مجھے کیوں کال کر رہی تھی۔" اس نے سوچا۔ اس کے پاس اس وقت اپنے ان تینوں ہی سوالوں کا جواب نہیں تھا اور مزید غور کرنے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ فون بند کر کے اس نے اپنی قمیص کی جیب میں رکھا اور مڑ کر پیچھے دیکھنے لگا۔
اس کے سامنے روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ قطار در قطار رکھی کرسیوں سے بھرے پنڈال میں تماشائیوں کی رونق بڑھ رہی تھی۔ شام کا شو شروع ہونے والا تھا۔ وہ ہولے سے مسکرایا' مسکراتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر لگی سفیدی پھیلی اور اس کے رخساروں پر گول ٹکیا کی مانند لگی سرخی نمایاں ہونے لگی۔ اس نے دائیں ہاتھ میں پکڑی سبز اونی بالوں والی وگ سر پر جمائی اور اس پر مسخروں والا ہیٹ رکھ دیا۔
جیب سے سفید پنگ پانگ گیند نکال کر اس نے کھلے حصے کو ناک پر جمایا۔ اس کا سبز گول دائروں والا پیلا پائجامہ اور ہری جیکٹ ایک دن پہلے ہی سل کر اس کے ہاتھ آئی تھی۔ جسے اس وقت زیب تن کیے اپنے دیگر لوازمات سے لیس وہ تماشائیوں کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھیرنے کو ایک مرتبہ پھر تیار تھا۔ تیز روشنیوں کے عین نیچے تماشائیوں کی تالیوں اور سیٹیوں پر ہاتھ ہلاتا اپنے کرتب دکھاتا وہ بلیو ہیون سرکس کے تماشائیوں کو کتنے سال بعد نظر آیا تھا۔ ان کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ اس انتظامیہ سے شدید ناراضی کے سبب اس سے منہ موڑ کر جانے والا مقبول عام مسخرو نجانے کہاں کہاں کی خاک چھاننے کے بعد ایک بار پھر ان کے درمیان واپس آ موجود ہوا تھا۔ یقیناً" اس شہر میں قیام کے دوران ہونے والے سرکس کے تمام شوز میں پچھلے کچھ سالوں کی نسبت انہیں زیادہ آمدنی کی امید بندھ چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

ایک بند کمرے میں ایک مرد اور ایک عورت کی گفتگو۔۔۔
کھٹ کھٹاک کی آواز۔
نسوانی آواز۔۔۔ "ارے کون ہے' کون ہے بھئی؟"
جواب میں کمرے کے ماحول پر خاموشی چھائی رہی۔

"کون ہے ایک تو اس بجلی کو بھی آئے روز خراب ہونا ہے۔ لالٹین میں بھی تیل بھرنا بھول گئی رابعہ۔"
قدموں کی آواز۔۔۔
"ک۔۔۔ کون ہے ادھر' رابعہ۔۔۔ ارے رابعہ؟"
"شور مت مچاؤ' یہ میں ہوں۔"
"تت۔۔۔ تم۔۔۔؟"
"ہاں میں۔۔۔"
"تم کہاں سے آئے؟ کدھر سے آئے؟ دروازہ کس نے کھولا؟"
"میں دروازے سے نہیں آیا ہوں' میں اس کھڑکی کے راستے آیا ہوں جو تم نے کھول رکھی ہے۔"
"کیوں اس طرح کیوں آئے۔ تم اتنا عرصہ رہے کہاں' تم مجھے چھوڑ کیوں گئے۔ میرا بچہ کدھر ہے۔ تم اسے ساتھ کیوں نہیں لائے۔ تم مجھے چھوڑ کیوں گئے' تم ہرجائی ہو' بے وفا ہو' دغا باز ہو' کیا ہو تم؟"
"آرام سے۔۔۔ آرام سے بیٹھو ادھر ذرا۔۔۔ میں اس لائٹر کی روشنی میں تمہیں دیکھ تو لوں' سوال بہت ہیں اور ان کے جواب بھی بے شمار۔۔۔ مگر میں جو تمہیں دیکھنے کو ترسا ہوا ہوں۔ مجھے اپنی صورت تو دیکھ لینے دو۔"
"میرا ہاتھ چھوڑ دو' اور میرا مذاق مت اڑاؤ' جو میری صورت کا حال ہے' جیسی میں اب دکھتی ہوں' میں اچھی طرح جانتی ہوں' میری صورت کا یہ حال ہو جانے پر ہی تو تم بھاگ لیے۔ ٹھیک کہتے تھے تم۔ میرا حسن تمہیں مبہوت کر دیا کرتا تھا۔ مبہوت ہونے کا وہ عالم ٹوٹا اور تمہاری دنیا اور سے اور ہی ہو گئی۔"
"اچھا۔۔۔ گویا تم بھی یوں ہی سوچتی ہو' قسم لے لو اگرچہ خود تمہارے منہ سے اور اپنے کانوں سے سن رہا ہوں سنی سنائی نہیں' مگر مجال ہے جو مجھے یقین آیا ہو کہ تم بھی ایسا ہی سوچتی ہو۔"
"رابعہ کہتی ہے کہ۔۔۔"
"رابعہ کی چھوڑو۔۔۔ اسے تو یہ ہی کہنا ہے۔۔۔ وہ ذات کی میراثن ہے۔۔۔ اس نے توصیف پر اترنا ہے تو آسمان کی بلندیوں کو چھونے کی کوشش کرنی ہے اور اگر تبرا بکنا ہے تو زمین کی پستیوں میں اتار دینا ہے۔ تم اس کی نہیں اپنی سناؤ مجھے' تمہارا دل کیا کہتا ہے؟"
"میرا۔۔۔" بھیگتا لہجہ۔۔۔ "میں نے کیا سوچنا ہے۔ مجھے کیا کہنا ہے۔ میں اپنے دل کو دیکھوں تو آج بھی اس حسین وادی میں کھڑا ہے جہاں تم اسے چھوڑ گئے تھے۔ مگر دماغ کی طرف دھیان دوں تو جو گزری' وہ ماہیت دماغ کے لیے اتنا کافی ہے کہ دنیا میں دل لگانے کو جی نہیں چاہتا اور یہ ایسی حقیقت ہے کہ دل کی مجال نہیں جو اس کے سامنے دم مارنے لگے۔"
"خیر۔۔۔ میں نہیں مان سکتا کہ تم نے اپنے دل کی دنیا سے مجھے نکال پھینکا ہے۔ کیونکہ جو مرضی تمہارے یہ حالی موالی کہیں' تم بھی جانتی ہو کہ میرے دل پر تمہارے حسن کی ہیبت کا عالم کبھی ٹوٹا نہ ٹوٹ سکتا ہے۔ تمہارا حسن' تمہاری شکل کے حسن تک ہی محدود تھوڑی ہے' تمہارا حسن تمہاری پوری شخصیت پر چھایا ہوا ہے۔ تمہارے کردار پر تمہارے افکار پر' تمہاری گفتگو پر' تمہاری سوچ پر' شکل کا حسن تو یوں بھی وقت اور عمر کے آگے بڑھنے کے ساتھ ماند پڑتا چلا جاتا ہے۔ جو حسن تمہاری پوری شخصیت پر حاوی ہے' اس کا کوئی ثانی نہیں۔"
"باتیں بنانے میں ماہر تو تم ہمیشہ سے ہو' مگر عمل کے نام پر کیا کیا ہے' جانتے ہو' کتنے عرصے سے مجھے تنہا چھوڑے ہوئے ہو۔"
"ایک۔۔۔ ایک ساعت کہو تو گن کر بتا دوں کتنے عرصے سے۔۔۔؟"
"پھر وہی باتیں بنانے کے فن کا مظاہرہ۔"

”دھیرے سے... آرام سے... بدگمانی کی فضا اس قدر پھیل چکی ہے تو مجھے بھی صفائی کا اتنا ہی وقت تو دے دو۔“

”ہاں بولو!“

”تمہاری ذات کے بارے میں... میں کیا کہوں... نظر شناس بھی ہو تم اور مردم شناس بھی... جب ہی تو عاشقی کے بڑے بڑے جاگیردار، امین، تاجر، بزنس مین، عاشقی کے دعوے داروں کے ہجوم میں سے مجھ ایسے قلاش عاشق کو ترجیح دے بیٹھیں۔ نہ دی ہوئی تو آج کسی بڑے پیٹ والے کی دوسری بیوی بن کر ہی سہی عیش کر رہی ہوتیں۔“

”تم یہ بات پہلے بھی کئی بار کر چکے ہو، کوئی نئی بات کرو۔“

”اسی پرانی بات میں ہی تو مضمر سب نئی باتیں ہیں، قلاش عاشق جب خود کو اپنی حسینہ عالم کے قابل بنانے کی تگ و دو میں ہو تو کئی کٹھن منزلیں راستے میں آتی ہیں اور اس خاکسار کا ٹکراؤ تو پہلے ہی قدم پر عبداللطیف عرف طیفے لاڑے ہو گیا۔ جب ہی تو ہر گام پر باقی سب کٹھنائیوں کے ساتھ ساتھ طیفے صاحب نے ہم راہی کی گویا قسم کھا رکھی ہے۔“

”کیا مطلب...؟“

”مطلب یہ جان من کہ اس پچھلے محلے میں جہاں تم رہتی تھیں تو حکومت ہی ان صاحب کی تھی نا اور ادھر میرا آنا جانا تمہارے حادثے کے بعد اس نے پہلے سے ہی دو بھر کر رکھا تھا۔ آخری بار جب تم سے رخصت ہو کر سعد کو اس کی حفاظت کی خاطر ساتھ لیے جب میں یہاں سے نکلا تو مجھے محسوس ہوا کہ حضرت نامحسوس طریقے سے میرا پیچھا کر رہے تھے۔ اپنی عقل توفیق کے مطابق اس کو جل دیتا میں کسی طرح پنڈی پہنچ گیا۔ پنڈی میں تم جانتی ہو۔ میرے پاس کرائے کا ایک کمرہ تھا، سعد کی خاطر اس کمرے سے اٹھ کر ایک چھوٹے مکان کو کرائے پر لے لیا۔ سعد کی خاطر کام سے چھٹی کرتا رہا، پھر ایک دوست نے جسے کاروبار میں لگانے کو کچھ سرمایہ دے رکھا تھا تو ید سنائی کہ کاروبار چل نکلا ہے۔ سعد کو وہ بہت ہی نیک، سیدھے سادے میاں، بیوی کے پاس چھوڑنے کا انتظام کر کے دوست کے پاس جا رہا تھا کہ تمہارے عاشق بنام عبداللطیف لاڑنے راستہ روک لیا۔“

”ہائے میں مرجاؤں۔“

”مریں تمہارے دشمن، چپ چاپ سنتی جاؤ۔ اپنے ری ایکشنز آخر میں ایک مرتبہ ہی دکھا دینا۔ طیفا لاڑ اپنے مخصوص آلہ قتل یعنی ”چھرے“ کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ قریب تھا کہ سینے میں گھونپ دیتا۔ دور سے قریب آتی پولیس وین کی آواز سن کر مجھے ان زخموں سے ہی تڑپتا چھوڑ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا جو اس کے وار سے مزاحمت کے دوران جسم کے مختلف حصوں پر مجھے آئے۔ گشت پر نکلی پولیس وین میرے لیے لائف سیور ثابت ہوئی، مجھے اٹھا کر پولیس والے اسپتال لے گئے جہاں ڈیڑھ مہینہ میں زیر علاج رہا۔ ایک دو، دوست اس دوران میرے کام آئے اور علاج معالجہ ممکن ہو سکا۔ سعد، محفوظ ہاتھوں میں محفوظ جگہ پر تھا۔ اس کی مجھے فکر نہ تھی۔ مگر تمہاری بہت فکر تھی۔ دو مہینے کے وقفے کے بعد چھپتا چھپاتا لاہور آیا۔ پرانے محلے سے تم اپنے حوالی موالیوں سمیت کہیں اور جا چکی تھیں۔ وہ دن اور آج کا دن، تمہاری تلاش میں مارا مارا پھرتے اور خود کو معاشی طور پر مضبوط کرنے کی کوشش میں وقت گزر گیا۔ چند دن پہلے ہی تمہارے اس ٹھکانے کے بارے میں معلوم ہوا۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ طیفا صاحب بھی تمہارا پتا لگاتے یہاں تک پہنچ چکے ہیں۔“

”ہائے میرے خدا! اب کیا ہو گا۔ ہم تو بہت بچ بچا کر گزر رہے ہیں، کم ہی کسی کے سامنے آتے ہیں۔“

”تم اور وہ رابعہ بیگم تو کم ہی آتی ہوں گی کسی کے سامنے۔ مگر وہ تمہارا جو ٹریڈ مارک ہے سراج سرفراز، وہی کافی ہے دنیا کو بتانے کے لیے کہ تم یہاں رہتی ہو۔“

”ہائے میری قسمت... اب بھی تم کیوں آئے۔ وہ موا تمہاری ہی تو جان کا دشمن ہے۔“

”میں تمہیں باقاعدہ بسانے سے پہلے مرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے چھپتے چھپاتے رات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح تم سے ملنے آیا ہوں۔ نہیں چاہتا کہ اسے خبر ہو، میرا تمہارا پھر سے رابطہ ہونے لگا ہے۔“

”ہائے میں مرجاؤں... اس ظالم نے تمہیں کدھر کدھر سے زخمی کیا۔ مجھے دکھاؤ، مجھے بتاؤ، مگر ٹھہرو پہلے اس رابعہ کو تو خبر کر دوں کہ تم بھگوڑے تھے نا بے وفا، تم صرف حسن پرست تھے، نہ خود غرض۔“

”آں ہاں... رکو ادھر ہی، تم نہیں بتا رہیں اس کو کچھ بھی۔“

”چھوڑو میرا ہاتھ، کیوں نہ بتاؤں اسے طعنے دے دے کر میرا کلیجہ چھلنی کرتی ہے ہر وقت۔“

”اسے مت بتاؤ ابھی، وہ پیٹ کی ہلکی ہے، سراج سے کہنے سے باز نہیں آئے گی اور سراج تو چلتا پھرتا اشتہار ہے، گھر کے اندر کی باتوں کا۔“

”ارے واقعی ایسا ہے کیا... ہائے اللہ بندہ کس پر اعتبار کرے۔“

”بندی صرف اپنے بندے پر اعتبار کرے۔ ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔“

”اللہ کدھر کدھر تمہیں زخم آئے تمہیں۔ اللہ پوچھے اس طیفے لاڑ کو، دیکھو تم نے میری وجہ سے خوامخواہ اس کی دشمنی پال لی، نہ میں ہوتی، نہ تم... میری زندگی میں آتے، نہ طیفے لاڑ سے واسطہ پڑتا۔“

”اگر تم نہ ہوتیں تو میں کیسے ہوتا... تم جانتیں نہیں کہ تم ہو تو میں ہوں، تم سے الگ میں کچھ بھی نہیں۔“

”اب تم ایسے دعوے کرتے ہو تو مجھے لگتا ہے میرا دل رکھنے کو کر رہے ہو، اب تو میری شکل وہ ہے جسے دیکھ کر بچے ماؤں کی گود میں چھپ جائیں۔“

”تمہارا دل رکھنے کی مجھے کیا ضرورت ہے، جب کہ وہ تو پہلے ہی میرے پاس رہتا ہے۔ رہی شکل تو اے پری چہرہ حسین، پہلے بھی کون کافر تمہارے نقش و نگار پر مرا تھا۔ نقش و نگار سے پرے ایک چہرہ تم پہلے بھی رکھتی تھیں اور وہ اب بھی زندہ ہے۔ میں نے تو اس سے پیار کیا ہے اور کرتا رہوں گا۔“

”میرا سعد کہاں ہے، وہ کیسا ہے، کتنا بڑا ہو گیا۔ ہائے میرے دل سے پوچھو، میرے کلیجے کو دیکھو، کیسی آگ لگی ہے اس میں۔“

”تم سمجھتی ہو میں جانتا نہیں۔ ہر دم مجھے یہ ہی احساس گناہ رہتا ہے کہ ماں سے اس کا بچہ چھین لایا ہوں، مگر تم کو یاد ہے یہ تمہاری تجویز تھی۔“

”ہاں... میں اسے یہ بھیانک چہرہ نہیں دکھانا چاہتی۔“

”حالانکہ ماں حسین ہو یا نہیں۔ بچے کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بچے کے لیے ماں کا تصور ہی سب سے حسین ہوتا ہے۔“

”ہو سکتا ہے، لیکن نجانے کیوں مجھے یہ لگتا ہے وہ مجھے یوں قبول نہیں کر پائے گا۔ ابھی کتنا چھوٹا تھا جب تم اسے لے گئے تھے یاد ہے اس وقت بھی مجھے دیکھ کر رونے لگتا تھا اور رابعہ سے چمٹا رہتا تھا۔“

”رابعہ سے چمٹا رہتا تھا۔ جب ہی میراثیوں والی عادات اس میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ پورے ایک سال کے بھی نہیں ہوئے موصوف اور ریڈیو یا کیسٹ پلیئر پر چلتا گانا سن کر ہلنے لگتے ہیں۔ کسی بھی محظوظ کر دینے والی چیز کو دیکھ کر تالیاں بجانے لگتے ہیں اور چاؤں پیاؤں کرتے گویا اس چیز کی اونچی شانیں بیان کرنے لگتے ہیں۔“

”ہائے میں صدقے جاؤں، میرا لال میرے دل کا ٹکڑا! اس کی کوئی فوٹو ہی لے آتے تم۔“

”لایا ہوں... لایا ہوں... یہ دیکھو۔“

"ذرا اپنے لائٹر کی لو اونچی تو کرو" اس لالٹین نے تو جواب دے دیا۔ ہائے میں قربان کتنا پیارا ہے میرا بچہ' ہو بہو تم پر گیا ہے۔"
"ہاں اتفاق ہے۔"
"تم کہتے تھے پیسے جمع کر کے سب سے پہلے میری پلاسٹک سرجری کا بندوبست کرو گے۔"
"اسی میں تو لگا ہوا ہوں میری جان۔۔۔ کچھ وقت اور فقط کچھ وقت اور درکار ہے۔"
"خدا کے لیے جلدی کرو' کب میری شکل اس قابل ہوگی کہ میں اپنے بچے کے سامنے جا کر اسے سینے سے لگا پاؤں گی' تمہیں اندازہ نہیں جب وہ میرا یہ چہرہ دیکھ کر رونے لگتا تھا تو میرا دل کیسے کیسے ٹوٹتا تھا۔"
"میں جانتا ہوں اور میری زندگی کا اب سب سے اہم مقصد بھی یہ ہی ہے۔ کہیں سے کیسے اتنا پیسہ اکٹھا کر لوں کہ تمہارا علاج کرا سکوں۔ اسی لیے تو ہر دوسری طرف سے دھیان ہٹا لیا۔ ورنہ اتنا کم ہمت نہیں ہوں میں کہ اس طیفے سے نمٹ نہ سکوں۔ مگر شاید اس کے پاس کچھ مہلت باقی ہے خدا کی طرف سے۔"
"کب تک ہو جائے گا اتنا پیسہ جمع۔"
"بہت جلد۔۔۔ بہت جلد میرے پاس اتنا پیسہ ہوگا کہ میں تمہیں وہ سب دے سکوں جس کی تم مستحق ہو۔ وہی چہرہ۔ اپنا گھر' آسائشیں' ملبوسات' زیورات۔"
"نہیں۔۔۔ نہیں چاہئیں مجھے آسائشیں' ملبوسات اور زیورات' مجھے چہرہ بھی نہیں چاہیے تھا۔ اگر میں ماں نہ ہوتی' دنیا کی ان سب مادی اشیا سے میرا دل اٹھ چکا۔ میں ان کی حقیقت جان گئی ہوں۔ اب میں فقر' توکل' غنا اور سادگی کے راستے پر گامزن ہوں۔ اب میرے تھوڑے میں بھی میرے لیے بہت کچھ ہے۔ میں نے ایک کھجور اجوہ کھجور اور ایک گھونٹ آب زم زم کے ساتھ پورا پورا دن گزارا ہے اور مجھے کسی دوسری چیز کی طلب محسوس نہیں ہوئی۔ میرا رب' مجھے قناعت کرنا سیکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔"
"ارے تم تو بہت اللہ والی بن گئیں۔"
"تم جانتے ہو کہ وہ رقم جو تم مجھے گاہے گاہے دیتے رہے ہو۔ وہ رقم جو وہ گاڑی بیچ کر حاصل ہوئی جو تم نے مجھے دی تھی۔ اس رقم کو جوڑ کر ہم تینوں حج کر آئے الحمدللہ پچھلے مہینے۔"
"ارے۔۔۔ اتنا بڑا کام! اکیلے کر لیا تم نے۔ مجھ محرم کے بغیر۔"
"گروپ کے ساتھ گئی تھی۔ محرم تو ایسا کوئی نہیں تھا۔ مگر اللہ نیت قبول فرمائے۔"
"چلو۔۔۔ تم سے وعدہ رہا جیسے ہی تمہارا علاج ہو جاتا ہے' تمہیں اور سعد کو لے کر حج پر جاؤں گا۔"
"تم بس میرا علاج کرا دو۔۔۔ پھر میں۔۔۔ سعد اور تم کسی کٹیا میں بھی رہ کر زندگی گزار لیں گے۔"
"چٹنی پیس کر کھایا کریں گے اور سوکھی روٹی پانی میں بھگو کر وقت گزار لیں گے' ہے نا۔"
"ہاں بالکل۔"
"ہاہاہا۔۔۔"
"ہنس کیوں رہے ہو۔"
"اس لیے ہنس رہا ہوں میری جان کہ میرے تمہارے بارے میں کیا خواب ہیں اور تمہارے اکتفا کا عالم کیا ہے۔"
"ہنس لو۔۔۔ ہنس لو۔۔۔ مجھے تو بس اتنا ہی چاہیے۔"
"نہیں میں نہیں ہنستا۔۔۔ میں تو فقط کر کے دکھاؤں گا۔ بس میرا وقت آنے دو۔"
"اللہ جانے تمہارا وقت کب آئے گا۔"

"بہت جلد۔۔۔ بہت جلد۔۔۔ اور یہ تم اس وقت سے سعد کی تصویر ہی کو چومے جا رہی ہو۔۔۔ مجھے صرف باتوں پر ٹرخایا جا رہا ہے۔"
جھنجھی ہوئی ہنسی کی آواز۔
"مجھے۔۔۔ بھی لفٹ کرا دو بیگم صاحبہ۔۔۔ نور کا تڑکا ہوتے ہی مجھے کھڑکی سے باہر کود جانا ہے۔ تمہارے عاشق بنام طیفے لاٹری نظروں سے بچنے کے لیے۔"
"یا اللہ کیا اب یوں چوروں سی ملاقاتیں نصیب میں لکھی ہیں۔"
"مت سوچو کہ کیسی ملاقاتیں۔۔۔ شکر کرو کہ ملاقات ممکن تو ہوئی۔۔۔ میرے تو اکلوتے جوتے گھس چکے ہیں۔۔۔ تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے۔"
"اور وہ رابعہ کہتی تھی ہم بھاگ لیے۔"
"مت ذکر کرو رابعہ کا اس وقت اور مت ذکر کرنا اس سے میرا۔۔۔ ان بھانڈوں' میراثیوں کو ہر بات اونچی تانیں اڑا کر دنیا بھر کو سنانے کے سوا آتا ہی کیا ہے میری شہناز بیگم۔"
"اچھا۔۔۔ نہیں بتاتی۔ میرے بلال سلطان۔"

☼ ☼ ☼

"پتا نہیں کیوں مجھے شبہ ہونے لگا ہے کہ میری سہیلی کا دماغ چوپٹ ہونے لگا ہے۔"
"دماغ چوپٹ ہونے لگا' ارے رابعہ بیگم یہ دماغ کیسے چوپٹ ہوا کرتا ہے۔"
(اللہ میرے۔۔۔ اس سراج سرفراز کا تو اپنا دماغ چوپٹ ہے۔ اسے کیا پتا ہوگا کہ دماغ چوپٹ ہونا کسے کہتے ہیں۔)
"مطلب بے چاری غم سہ سہ کر حواس کھوئے دے رہی ہے۔"
"وہ کیسے؟"
"وہ ایسے کہ مجھے لگا رات بھر کمرہ بند کیے خود سے ہی باتیں کرتی رہتی ہے۔"
"اچھا واقعی۔۔۔"
"ہاں بالکل۔۔۔ آج رات جتنی بار بھی میں غسل خانے جانے کے لیے اٹھی' اس کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے باتوں کی آوازیں سنائی دیں۔۔۔ بے چاری باؤلی ہونے لگی ہے۔ خود اپنے آپ سے باتیں کرتی ہے رات رات بھر۔"
"استغفراللہ۔۔۔ اللہ معاف فرمائے۔۔۔ کیا وقت آ گیا ہے۔ اچھی بھلی' سمجھ دار آپا بیگم کا دماغ چوپٹ ہونے لگا۔"
(اب سمجھ میں آیا تمہیں سراج سرفراز کہ دماغ چوپٹ ہونا کسے کہتے ہیں۔)
"اچھا بھئی میں اب چلتا ہوں۔ پیش امام صاحب نے پیغام بھیج رکھا ہے' ان سے مل لوں۔"
(ہاں جاؤ۔۔۔ ان کی صحبت میں بیٹھ کر چار باتیں تم بھی کہنے سننے کی سیکھ لو شاید۔)

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عنیزہ سید

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم

میرا خیال ہے میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم اب اس کے پیچھے جا رہے ہیں نہ ہی اس کی کوئی بات کر رہے ہیں۔" بلال سلطان کا لہجہ اور بات ابراہیم کے لیے حوصلہ افزا ہرگز نہیں تھی۔

"لیکن انکل! میں نے بتایا کہ یہ لڑکی تو ویسی ہی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" اس نے منمنا کر ایک کوشش مزید کرنا چاہی۔

"تمہارا کیا خیال ہے، میں بہت فارغ ہوں جو جب کوئی مجھ سے ملنا چاہے میں اس ملنے کے لیے Available (دستیاب) ہو جاؤں۔" وہ سخت اور خشک لہجے میں بولے۔

"نہیں ہرگز نہیں انکل! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں۔" ابراہیم نے زبان پھیر کر اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا ہے کہ اسے میں اپنے مان پر لایا تھا۔" اس نے ایک جذباتی وار کھیلنے کی کوشش کی۔ "میں نے ہی اسے یقین دلایا تھا کہ انکل میری بات کو اون کرتے ہیں کیونکہ مجھے وہ اپنے بیٹے جیسا ہی سمجھتے ہیں۔"

—۲۷—
ستائیسویں قسط

"اس نے اچھا کیا، مگر اس نے بہت اچھا نہیں کیا۔"

سارہ نے اپنی سنائی تفصیل کے جواب میں بلال سلطان کی بات سنی اور اس پر غور کیا۔

"مطلب؟" اسے ان کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

www.paksociety.com

"مطلب یہ کہ تمہیں اس ٹوٹی ہوئی حالت سے اٹھا کر لانا اور تمہارا علاج کرانا، تمہیں یہاں اکاموڈیٹ کرنا بہت اچھا قدم تھا، مگر اس اچھے جیسچر کو ایڈونچر کیوں بنا دیا اس نے۔"

"ایڈونچر؟ مطلب؟" سارہ نے اب بھی کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"اس نے یہ سب یوں کیوں کیا جیسے کوئی غلط کام کر رہا ہو۔ جسے دنیا کی نظروں سے چھپانا ضروری ہے، یوں جیسے کسی خفیہ مشن کو سرانجام دے رہا ہو جس سلسلے میں سیکریسی ضروری ہو۔"

"آپ کا خیال ہے، اسے اپنے اس کام کے بارے میں دنیا کو بتانے کے لیے ڈھول بجانے چاہیے تھے۔" سارہ نے کہا۔

"نہیں ڈھول بجانے کی ضرورت نہیں تھی۔ تمہاری ری ہیبلیٹیشن کے لیے اسے چاہیے تھا، تمہیں کراوڈ سے دور نہ رکھتا، تمہیں صحت مند سرگرمیوں میں مصروف کروتا۔"

"کیا اس کے اکثر معاملات اسی طرح سیکریٹ نہیں رہے۔ ماہ نور والے معاملے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ اس نے اس کو بھی خفیہ رکھا۔" سارہ کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اس نے یہ بات کیوں کہی تھی۔

"خیر، ماہ نور کا معاملہ مختلف تھا، ماہ نور اس کے دل کا معاملہ تھی اور دل کے معاملات اکثر دل میں ہی رکھے جاتے ہیں۔"

نجانے کس کس سمت سے کانچ کے ٹکڑے اڑ کر سارہ کے دل میں آپیوست ہوئے تھے۔

"ماہ نور اس کے دل کا معاملہ تھی۔" اس نے عجیب سی ٹیس محسوس کرتے ہوئے سوچا "اور میں۔ میں کیسا معاملہ تھی۔" ذہن میں سوال تھا اور چبھن مزید بڑھ گئی۔

"تم انسانیت کا معاملہ تھیں۔" بلال سلطان نے جیسے اس کے ذہن کا سوال پڑھ لیا تھا۔ "احساس کا معاملہ تھیں۔ تمہارے سلسلے میں اسے اس سے زیادہ حساس ہونا چاہیے تھا۔ جتنا وہ رہا۔"

"اس سے زیادہ حساس۔" سارہ کے چہرے پر تلخی پھیلی۔ "آپ شاید جانتے نہیں کہ اس نے مجھے کس ناز و نعم سے رکھا۔ آپ نے کسی گود کے بچے کو عمر اور وقت کے ساتھ پروگریس کرتے نہیں دیکھا ہوگا۔ آپ نے اپنے بچوں کی پروگریس کے بھی کئی حصے مس کر دیے ہوں گے، سعد نے میری پروگریس کا کوئی حصہ بھی مس نہیں کیا، اس نے گود کے بچے کی طرح مجھے دن بدن آگے بڑھنا سکھایا ہے۔ مایوسی کی گہرائیوں میں جا کر ایک زخمی دل کو اس نے کس طرح امید کی کرن کو فالو کرنا سکھایا، میں جانتی ہوں، زندگی ایک تنگ سرنگ کی مانند تھی، سعد نے میرے پیچھے کھڑے ہو کر اس تنگ سرنگ میں اپنی روشنی میرے آگے بکھیری، اور میں نے اس تنگ سرنگ سے باہر کھلی فضا تک آنے کا سفر اسی روشنی کے سنگ طے کیا ہے۔ میرے یہ الفاظ چند لمحوں کے اندر میرے منہ سے ادا ہوئے، جبکہ حقیقت میں یہ سفر چند لمحوں میں نہیں، کئی سالوں میں طے ہوا۔ یہ میرے ہاتھ دیکھ رہے ہیں آپ!"

اس نے اپنے ہاتھ سامنے پھیلائے۔ جو شدت جذبات سے لرز رہے تھے۔

"یہ بے جان تھے، یوں جیسے چینی کی گڑیا کے ہاتھ ہوں، ہاتھوں کے محض خطوط جن میں خون تھا نہ جان، یہ میری باہیں اور یہ ٹانگیں۔" اس نے اپنے پیر آگے بڑھائے "ان کی ہڈیاں نجانے کہاں کہاں سے ٹوٹی تھیں اور ان کا گوشت کہاں کہاں سے پھٹا، کچلا اور ادھڑا تھا، مجھے کوئی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے شانے پر اٹھاتا تو یہ ٹانگیں کٹی پتنگ کی طرح اس کے دائیں بائیں لٹکتی تھیں۔ یہ میری گردن، اس کے مہرے اس کے پیچھے میری ریڑھ کی ہڈی اس کے مہرے، میرے جسم کا گوشت، رگیں اور پٹھے، کچھ بھی ایسا نہیں تھا جو سلامت تھا بس ایک جان تھی جو باقی تھی، کس میں وہ صبر اور حوصلہ تھا، کس میں ہمت تھی کہ ان سب کی رفوگری کرتا بیٹھ کر۔"

اس نے بلال کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔ "یہ صرف اسی کا حوصلہ تھا۔ یہ صرف وہی کر سکتا تھا، اتنی خاموشی سے، اتنے سکون سے، اتنے صبر سے جیسے دائیں ہاتھ سے دیا جائے اور بائیں ہاتھ کو پتا نہ چلے، وہ اس حکم کی تعمیل کا عملی نمونہ بنا میرے چاک ہوتے جسم کو پھر سے پرانی شکل میں واپس لانے کی کوشش میں سرگرداں رہا۔ یوں کہ آپ تک کو پتا نہ چلا، آپ جو اس کے باپ تھے جان نہ سکے کہ بیٹا کس کام میں دن رات لگا ہوا ہے۔ میری موجودہ صورت حال اس کے ظرف اور حوصلے کی دین ہے سر! اور آپ کہتے ہیں کہ اس نے اس کام کو ایڈونچر بنائے رکھا۔ آپ بتائیں، آپ میں حوصلہ ہے ایسے ایڈونچر کرنے کا، اتنا صبر، اتنی ہمت، اتنا ظرف۔"

وہ چھوٹی سی نحیف نزار لڑکی ان کے سامنے بیٹھی ان سے سوال کر رہی تھی، وہ ان کے بیٹے کی وکیل تھی اور اپنے دلائل دے رہی تھی۔ وہ اس کی نیکی کا نیک فطرتی کا کرشمہ تھی جسے وہ لاابالی، لاپرواہ، خود پسند اور بے نیاز کہتے رہے تھے۔

"دنیا میں لاکھوں کروڑوں انسان بستے ہوں گے صاحب!" اب کے وہ سیاہی مائل گندمی رنگت زرد رو، کھچڑی بالوں والی ادھیڑ عمر عورت بولی۔ "مگر ان کروڑوں انسانوں میں سعد سلطان، صرف ایک ہے۔" اس نے شہادت کی انگلی کھڑی کرتے ہوئے کہا، اس کی انگلی کے ساتھ ساتھ آواز بھی شدت جذبات سے — کانپ رہی تھی۔

"ہمارے لیے کم سے کم ہمارے لیے سعد سلطان صرف ایک ہے اس دنیا بھر میں۔"

بلال نے اس عورت کی طرف غور سے دیکھا، جس کا جسم محنت کا عادی محسوس ہوتا تھا اور بولتے ہوئے جس کے دانت چھوڑتے بھورے پڑتے مسوڑھے صاف نظر آتے تھے۔ "بلیو ہیون سرکس کے کسی کرتا دھرتا کے دل میں رحم نہ آیا کہ برسوں تک سرکس شو کی جان بنی رہنے والی اپنی جان پر کھیل کر گھوڑے، ببر شیروں کے ساتھ خطرناک کرتب دکھانے والی۔ بلیو ہیون سرکس کے لیے لاکھوں کمانے والی، بلیو ہیون سرکس کی شہزادی پریا رانی۔ جب چھ انچی بار پر پیر کے انگوٹھے کی نوک ٹھیک سے نہ جمنے کی وجہ سے سر کے بل پتھریلے فرش پر گری تو اسے اٹھانے کو اسٹریچر ہی منگوا لیتے کوئی فرسٹ ایڈ دینے والا ہی کال کر لیتے ٹوٹے پھوٹے، خون بکھیرتے اس جسم کو کپڑے کی چادر میں ڈال پوٹلی بنائے اٹھا لے گئے اور اگلے لمحے بتیاں روشن کر کے دوبارہ سے شو شروع کرا دیا۔"

سیمی آنٹی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"بے حسی کی ایک انتہا یہ بھی ہوتی ہے صاحب جو میں نے آپ کو سنائی اور اسی انتہا سے دل والے احساس والے، دوسروں کے غم میں رونے والے جنم لیتے ہیں، بے حسی کی اسی انتہا سے سعد سلطان جنم لیتے ہیں صاحب۔ آپ تو جانتے ہی نہیں شاید کہ کس کے باپ ہو، آپ کو تو لگتا ہے معلوم ہی نہیں کہ آپ کے گھر میں سعد نے نہیں سعد کے روپ میں کسی فرشتے نے جنم لیا تھا، مجھے یقین ہے کہ جب وہ فرشتہ دنیا میں آیا ہوگا، احساس محبت اور ہمدردی کی تتلیوں نے اس کی آنکھوں کو چوم کر اس کی آنکھیں کھولی ہوں گی، نیکی، نیک دلی، نیک فطرتی کے جگنوؤں نے اس کے دل کو اپنی روشنی سے منور کیا ہوگا، جب ہی تو اس نے دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور دل سے مصروف عمل ہوا۔" سیمی کی آنکھوں سے آنسو تواتر سے بہے چلے جا رہے تھے۔

بلال سلطان کو یاد کرنے پر بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ زندگی میں کتنے سالوں کے بعد اس روز دم بخود ہوئے تھے، اپنے ذہن میں عادتاً "جمع تفریق" کرتے وہ اس دم بخود رہ جانے والی کیفیت میں بیٹھے سیمی کی بات سن رہے تھے۔

"ہمیں نہیں معلوم ہماری اس محدود دنیا سے باہر سعد سلطان کون ہے۔"

سیمی آنٹی نے اس طرح رونے پر اپنی آنکھوں میں بے اختیار امڈ آئے آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا "ہمیں

صرف اتنا معلوم ہے کہ ہماری اس محدود دنیا کے اندر وہ کسی فرشتے کی مانند ہمارے پاس آتا رہا اور اپنے نوش و بند کو تھما تا ہماری ہر ضرورت پوری کرتا رہا۔ میری بیماری معذوری پر منتج ہوئی اور معذوری محتاجی کے راستے پر چل پڑی' میری محتاجی کو اپنے دو مضبوط ہاتھوں اور محبت بھرے شانے کا سہارا دے کر ایک طویل راستے پر چلتے خود انحصاری کے موڑ پر مجھے موڑنا وہ فرشتہ' میرے لیے کل دنیا ثابت ہوا' اسے نتیجے کے منفی یا مثبت ہونے کی پروا تھی نہ ہی اس بات کی کہ کتنا وقت لگے گا' اس کے اندر صرف ایک لگن تھی' ایک جذبہ تھا۔ ایسی لگن اور ایسا جذبہ جو ناممکن کو مجبور کر ڈالتا ہے کہ وہ ممکن ہو جائے اور آپ دیکھ لیجئے یہ میں ہوں' میرا آج جو آپ کے سامنے ہے۔"

وہ سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی' اس کے شانے اوپر کو اٹھے ہوئے تھے اور جسم بالکل سیدھا تھا۔ وہ بلال سلطان کو دکھانا چاہتی تھی کہ وہ پہلے سے کتنی بہتر تھی۔

"ہوں۔" کچھ لمحوں کے مزید توقف کے بعد انہوں نے پلکیں جھپکیں۔

"کیا تم واپس سرکس رنگ میں جانا چاہو گی؟" انہوں نے ایک بار پھر اس سے سوال ہی کیا تھا۔

"شاید یہ اب ممکن نہیں۔" سارہ نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

"ممکن ناممکن کی تو ابھی بات ہی نہیں ہو رہی' ابھی تو بات چاہنے یا نہ چاہنے کی ہو رہی ہے۔"

"چاہنے یا نہ چاہنے کا تعلق بھی ناممکن اور ممکن سے براہ راست ہوتا ہے۔"

"تم چاہتے یا نہ چاہنے کی بات کرو۔" انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگرچہ میں اب بوڑھا ہو رہا ہوں' مگر سعد سلطان کا بھی باپ ہوں' وہ جذبہ جو ناممکن کو مجبور کر ڈالتا ہے کہ وہ ممکن ہو جائے مجھ میں بھی کچھ ایسا کم نہیں۔"

وہ کہہ رہے تھے اور اب کے سارہ خان عرف پریا رانی دم بخود بیٹھی ان کی بات سن رہی تھی۔

☼ ☼ ☼
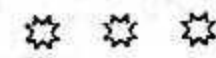
اس روز اس نے آنکھیں کھول کر اپنے اردگرد موجود چہروں کو دیکھا تھا۔ اس کے ذہن نے اسے بتایا تھا کہ وہ سب اجنبی چہرے تھے' نگران کا کام ایک سا تھا' وہ بیمار کو دوا دینے والے طبیب تھے اور ان میں سے چند ان طبیبوں کے مددگار بھی تھے۔ اس نے آنکھیں کھول کر سامنے نظر آنے والے چہروں کے خدوخال کی نامانوسیت پر دکھ محسوس نہیں کیا تھا' وہ بس اتنے میں ہی خوش تھا کہ اسے انسانوں کے چہرے دکھائی دے رہے تھے اور اس کی بصارت کسی نقصان سے محفوظ تھی۔

اس روز صبح کے اس وقت کے بعد جب اس نے وہ اجنبی چہرے دیکھے تھے نجانے کتنے دورانیہ کا وقفہ آیا تھا' جس میں ذہن اور آنکھوں پر حاوی غنودگی کو شکست دینے کے بعد اس نے ایک بار پھر آنکھیں کھولی تھیں۔ اس کے دائیں طرف موجود اس پر جھکے دو چہرے اس کے یوں دیکھنے پر مسکرائے تھے' جواب میں اس کے ہونٹ بھی پھیلے تھے یا نہیں' اسے پتا نہیں چلا تھا اگرچہ اس نے جواباً" مسکرانے کی کوشش کی تھی پھر اس نے اپنی گردن کو بائیں طرف موڑنے کی کوشش کی تھی اپنی نظروں کو موڑ کر زاویہ بنانے کی کوشش کی تھی اور اس کے ذہن نے ایک زوردار جھٹکا کھایا تھا۔ اس کے بائیں طرف موجود دو چہروں میں سے ایک چہرہ نامانوس اور اجنبی ہرگز نہیں تھا۔ اس کی نظریں اس چہرے پر گڑی رہ گئیں' پہلے ان میں حیرت اتری اور پھر اسے ایک ٹک دیکھتے ہوئے شاید کئی سوال اترے' اس کے بعد ایک بار پھر اس کی آنکھیں بوجھل ہوتے ہوئے دھیرے دھیرے بند ہو گئی تھیں۔

"اس نے مجھے دیکھا اس نے مجھے پہچان لیا۔" بائیں طرف کھڑی اس لڑکی نے جس کے چہرے کو وہ ایک ٹک دیکھتا رہا تھا' مسرت سے کھنکتی آواز میں کسی سے کہا تھا۔

"اس کا مطلب ہے اس کے حواس کام کر رہے ہیں۔" ایک دوسری آواز نے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کہاں تو تمہیں سراج سرفراز کی شکل سے بھی چڑ تھی' کہاں اس کے بچے کی ماں بننے کی خوش خبری پر ہواؤں میں اڑی پھر رہی ہو۔"

"اس کے بچے کی ماں بننے کا اضافہ نہ کرو تو بہتر ہے' مجھے ماں بننے کی خبر سن کر خوشی ہو رہی ہے' جس وقت سے خبر آئی ہے اپنا آپ شہزادیوں جیسا لگ رہا ہے۔"

"سراج سرفراز کا اضافہ کیے بغیر خبر ادھوری ہے نا شہزادی صاحبہ اس کا اضافہ کیسے نہ کروں۔"

"اونہوں۔ دو گھڑی پوری طرح خوش تو ہو لینے دو۔"

"ضرور خوش ہو لو' میں نے لال کھوہی سے برفی منگوائی ہے اسپیشل' خان محمد کے ابا سے کہہ کر جی بھر کر میٹھا کھاتے ہوئے خوشی منانا۔"

"ہائے میرے منہ میں تو ابھی سے پانی بھر آیا۔"

"اچھا یہ بتاؤ لڑکی کی خواہش ہے کہ لڑکے کی؟"

"دونوں میں سے کوئی بھی ہو جائے' مجھے تو بس ماں بننے کی خبر کی خوشی ہے عمر گزر گئی دوسروں کی مبارک بادیاں گاتے ہوئے' اللہ اللہ کر کے خود پر یہ وقت آیا ہے کہ میں بچہ جنوں اور کوئی اور مبارک بادیاں گائے۔"

"اچھا اللہ خیر کا وقت لائے' نہ ہوتا سراج سرفراز تو کیسے آتا یہ وقت' یہ بتاؤ۔"

"اے' وہی سراج سرفراز پھر سے بیچ میں' آج بتا ہی دو کہ تمہیں مجھے تنگ کرنے میں کیا مزا ملتا ہے۔"

"تمہیں تنگ نہیں کرتی' یاد دلاتی ہوں کہ سراج سرفراز سے۔ اب تمہاری زندگی جڑی ہے' اس کی وفاداری اور تابع داری ہی میں تمہاری دنیا اور آخرت کا سامان ہے۔ شوہر کی عزت نہ کرنے والی عورتوں سے جہنم بھری ہو گی قیامت والے دن۔"

"توبہ ہے تم نے تو ہولا ہی دیا مجھے۔"

"میں ہولاؤں گی تو تمہاری سمجھ میں آئے گا نا!"

"اچھا۔ ٹھیک ہے' ویسے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے مالک مکان نے کیوں خاموشی اختیار کر رکھی ہے' نہ کرائے کا مطالبہ کرتا ہے' نہ ہی ملنے پر بداخلاقی سے پیش آتا ہے۔ کہیں یہ مکان ہی تو ہمارے نام نہیں لگا رہا پکا۔"

"اتنا وہ فیاض! اسے کرایہ مل جاتا ہو گا تم پہ۔ اسی لیے نہیں بولتا۔"

"فرشتے دے جاتے ہیں کیا کرایہ' ہمارے پاس تو ہانڈی روٹی چلانے کے پیسے نہیں ہوتے۔ ارے یاد آیا تم نے کل کچنار کیا بھاؤ منگوائی تھی۔ نئی سبزی تو بہت مہنگی ہوتی ہے۔ تم نے کیسے منگوالی؟"

"میرا دل چاہ رہا تھا کچنار کھانے کو' اس لیے منگوالی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے' مگر کچنار منگوانے کو پیسے کدھر سے آئے تھے؟"

"اللہ نے بھیجے تھے۔ میں نے خرچ کر لیے۔"

"کمال ہے' اللہ ہم پر کچھ زیادہ ہی مہربان نہیں ہو گیا آج کل' کمائی کے نام پر چند دھیلے اور کرایہ بھی پہنچ جاتا ہے' گھر کی ہانڈی بھی کراری ہونے لگی۔"

"تم بس شکر ادا کیا کرو اپنے رب کا۔"

"ارے ہاں وہ تو ادا کرتی ہی رہتی ہوں۔ یہ بتاؤ آج کیا چڑھانا ہے؟"
"بگھارے بینگن پکاؤ' خوب کھٹا ڈال کر۔"
"ارے واہ زبان ابھی سے مزا لینے لگی' مگر ایک بات تو بتاؤ وہ جے.جی سے تو میں ہوئی ہوں۔ عنوان تمہارے لگ رہے ہیں' نت نئے کھانے کھانے کو دل چاہنے لگا ہے' کھٹائی کھانے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے پیر میرا نہیں تمہارا بھاری ہوا ہے۔"
"مذاق مت کرو' مجھ بے چاری کا پیر کیسے بھاری ہوگا اب' تم تو جانتی ہو۔"
"ارے ہاں ہاں جانتی ہوں' اچھا اب چلتی ہوں سبزی منگوانے۔"
"ہاں جاؤ۔"
"ہائے میرے ربا' ہم لٹ گئے۔"
"کیا ہوا؟"
"گلی سے لڑکا بھاگتا آیا ہے' کہتا ہے سراج سرفراز کو کسی نے چھرا مار دیا' خون میں لت پت پڑا تھا۔ محلے والے اٹھا کر اسپتال لے گئے ہیں۔"
"ہائے یہ کیا ہو گیا' ارے کسی سے پتا تو کرواؤ ہوا کیا۔"
رونے دھونے کی آوازیں۔

☼ ☼ ☼

"تمہارے فون پر ایم ایم ایس ایکٹویٹ ہے یا نہیں۔" ماہ نور نے اس سے پوچھا تھا۔
"ہاں ایکٹویٹ ہے' میرا فون تصویریں وصول کر لیتا ہے۔"
"میں' تمہیں ایک تصویر بھیج رہی ہوں مل جائے تو بتانا۔"
"ہاں ضرور۔"
چند لمحوں بعد ماہ نور کی بھجوائی تصویر محمد رضوان الحق کی نظروں کے سامنے تھی۔
"یہ سارہ خان کی تصویر ہے' سارہ خان جسے پریا رانی بھی کہا جاتا تھا' بلیو ہیون سرکس کی شہزادی پریا رانی۔"
ماہ نور نے تصویر کے ساتھ بھیجے پیغام میں لکھا تھا۔
محمد رضوان الحق ایک ٹک اس لڑکی کی تصویر کو دیکھ رہا تھا' جسے اس نے بلیو ہیون سرکس کے کرتا دھرتاؤں کی برین واشنگ کی دھول میں ایک بار کھو دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کے قریب ہی کہیں سے ٹک ٹک اور گھرر گھرر کی ہلکی آوازیں آتی تھیں' کبھی یہ آوازیں ٹوں ٹوں کی آواز میں بدل جاتی تھیں۔ اس نے آوازوں کے سگنلز کو وصول کیا۔
"یہ کسی قسم کی مشینوں سے آنے والی آوازیں ہیں' یوں جیسے اسپتال میں مریضوں کے جسم کے مختلف اعضاء کی حالت جانچنے والی مشینوں کی آوازیں ہوں۔" اس کے دماغ نے ان آوازوں کو ایک درست اندازے میں تبدیل کیا تھا۔ زندگی کی طرف لوٹنے میں اس کی رفتار خاصی تیز اور حوصلہ افزا تھی۔

☼ ☼ ☼

"کھاری! تم کیوں ایسے چپ چاپ ہو گئے ہو میرے بچے' سعدیہ بتا رہی تھی' تمہارا کھانا پینا بھی بہت کم ہو گیا

ہے' کیا بات ہے میرے بچے؟" آپا رابعہ نے اس روز پیغام بھیج کر کھاری کو گھر بلوایا تھا اور اس کی کمزور پڑتی صحت دیکھ کر خود بھی حیران رہ گئی تھیں۔
"کج نئیں بھین جی' مینوں کی ہونا ہے۔" وہ سر جھکائے بیٹھا تھا' وہ ان سے نظریں ملانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اسے ڈر تھا اس کی نظروں میں بھین جی کے لیے جو شکوے اور گلے تھے وہ نظریں ملانے پر بھین جی پر آشکار ہو جائیں گے جبکہ حد ادب کا تقاضا تھا کہ ایسا نہ ہو پائے۔
"لگتا ہے' تم نے مہمان بی بی اور چوہدری صاحب کی بات دل سے لگالی ہے۔"
"نہیں بھین جی' میں شیدائی بنداہاں' میں دل نال کس راں لگانی ہے وہ بات' شیدائیاں دے وی کدی دل ہوندے نیں۔ اس نے ہنوز سر جھکائے کہا' اس کی نظریں اپنی گھسی ہوئی بے پالش پشاوری چپل کی نوک پر جمی تھیں۔
"ادھر دیکھو کھاری! میری طرف دیکھو۔" اب کے آپا رابعہ نے قدرے رعب دار آواز میں کہا۔
"کیا تم مجھ سے بھی ناراض ہو' ناراض ہونا؟"
کھاری نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا۔
"دیکھو کھاری!" آپا رابعہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "اگر تم اس بات پر ناراض ہو کہ میں نے بھی تمہاری بات کا یقین نہیں کیا تو تم کو شاید اندازہ نہیں میرے پاس تمہاری بات کے یقین نہ کرنے کی وجوہات بھی ہیں۔"
"بھین جی! میں کی آکھیا اے' میں نے کج وی نئیں آکھیا۔" کھاری نے ابھی بھی نظریں اوپر نہیں اٹھائی تھیں۔
"دیکھو کھاری! مجھ سے زیادہ کون سمجھ اور جان سکتا ہے کہ سعد سلطان اکیلا بچہ ہے اپنے والدین کا' اس کا کوئی اور بھائی تھا ہی نہیں۔ اس کی ماں کے ہاں' اس کے بعد کسی اور بچے کے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا' سعد کا باپ اس کی ماں کو چھوڑ کر کب کا بھاگ چکا تھا۔"
"بھین جی!" اب کے کھاری نے پہلی بار سر اٹھایا تھا۔ گلاں کرن لگیں تو گلاں (باتیں) تو مجھے بھی وڈی آتی ہیں۔" اس کے انداز میں طنز کی کاٹ تھی۔
"ہاں' تم بتاؤ۔ کیا بات ہے؟" آپا رابعہ نے تحمل سے کہا۔
"ابھی تو یہ بات کنفرم ہی نہیں ہوئی کہ وہی سعد ہے' جو آپ سمجھی تھیں' کیا ماہ نور باجی نے آپ کو پیغام بھیجا کہ کنفرم ہو گیا یہ وہی سعد ہے۔"
آپا رابعہ کھاری کی دلیل کے صدقے جانے کو بے چین ہوئیں' مگر پھر خود پر قابو پاتے ہوئے اسی تحمل سے بولیں۔
"نظر اور عقل دونوں ہی اکٹھے دھوکا نہیں کھا سکتیں کھاری! اور نظر اور عقل سے اوپر میرا وجدان ہے' جو کہتا ہے یہ وہی سعد ہے' مجھے کسی کنفرمیشن کی ضرورت ہے ہی نہیں۔"
کھاری نے آپا رابعہ کے پُریقین انداز کی طرف دیکھا اور اس کا دل پسلیوں میں کہیں مزید دب گیا۔

☼ ☼ ☼

"میں درد محسوس کر رہا ہوں' کہاں یہ مجھے پتا نہیں۔"
اس کے منہ سے ادا ہوئے الفاظ اس کے قریب کھڑے لوگوں نے سنے بھی تھے اس کے منہ سے ادا ہونے والا

ایک ایک لفظ واضح تھا اور الگ الگ بھی' ان لوگوں نے اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ کو سنا تھا اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے تھے گو ان میں سے کوئی ایک بھی ان الفاظ کا مفہوم نہیں سمجھ پایا تھا کیونکہ ان کے پاکستانی مریض نے یہ الفاظ اپنی زبان میں کہے تھے۔ وہ سمجھ نہیں پائے تھے مگر ان کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ اس کی قوت گویائی بھی برقرار تھی۔

"تم یہاں کیسے آگئیں؟" چوبیس گھنٹوں کے وقفے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا تھا' اور اس بار اس نے یہ الفاظ اپنے سامنے کھڑی اس لڑکی سے کہے تھے جسے ایک بار پہلے دیکھ کر اس کی نظروں میں شناسائی جھلکی تھی۔

"کیسے کیا مطلب؟" وہ لڑکی خود کو مخاطب کیے جانے کی مسرت سے سرشار اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی تھی۔

"یہاں مجھے ہی تو ہونا چاہیے تھا' تمہارے پاس' تمہارے بہت قریب۔"

وہ شاید اس کی بات سن کر مسکرایا تھا اور اس نے آنکھیں موندلی تھیں۔

"اوہ شکر خدایا' میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا' معجزے رونما ہوتے ہیں' وہ یونہی رونما ہوتے ہیں۔" اس کی سماعت نے سنا تھا وہ لڑکی نجانے کس سے مخاطب یہ الفاظ کہہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس کے فون پر سردار چاچا کی کال آئی تھی۔ اس نے بے تابی سے کال وصول کرتے ہوئے فون کان سے لگایا تھا۔

"السلام علیکم چاچا' کیا حال ہے' کدھر تھے آپ اتنے عرصے سے' میں آپ کو کال کرکے تھک چکی' میسج بھی کتنے سارے کیے' کوئی جواب ہی نہیں۔" اس نے تیزی سے کہا تھا۔

"آرام سے' آرام سے پتر جی۔" جواب میں سردار چاچا کی مخصوص کھنکتی ہوئی آواز سننے کو ملی۔ "تمہیں پتا تو ہے میں ملک میں نہیں ہوں' نمبر رومنگ پر نہیں تھا' اسی لیے تمہاری کالز مجھے نہیں ملیں' اب رومنگ پر نمبر کروایا ہے تو تمہارے اتنے سارے میسج مل ہی گئے' جب ہی فون کیا' خیر تو ہے۔"

"نہیں چاچا خیر کدھر ہے؟" اس نے آہستہ آواز میں کہا۔ "چاچا! یہ تو بتائیں کہ آپ نے سعد کو کھاری کے بارے میں کیا بتایا تھا جو وہ ایک دم ہی گاؤں سے کہیں چلا گیا تھا۔" اس کا سانس تیز ہو رہا تھا۔

"ہیلو۔ کیا کہہ رہی ہو؟ ایک تو آواز بھی ٹھیک سے نہیں آرہی۔"

"ہیلو سردار چاچا' میں پوچھ رہی تھی کہ سعد کو کھاری۔" اس نے بلند آواز میں کہا۔

"ٹوں ٹوں۔" دوسری طرف سے فون بند ہوگیا اور اس کا سوال ادھورا ہی رہ گیا تھا۔

"مائی گاڈ۔" اس نے جھنجلا کر کہا اور خود سے سردار چاچا کا نمبر ملانے لگی۔ اب اسے دوسری طرف فون بند ہونے کی اطلاع موصول ہو رہی تھی۔

"کیا مصیبت ہے؟" اس نے جھنجلاہٹ کے مارے فون بند کردیا۔

"کوئی کلیو نہیں مل رہا' کوئی راستہ نہیں سوجھ رہا' سب سوالوں کے جواب میں خاموشی' سب زبانیں خاموش' چہرے گم ہوچکے ہیں!" اسے اپنی بے بسی پر رونا آنے لگا تھا۔

اس نے اپنی آنکھوں میں امڈتے آنسوؤں کو جھٹکا اور یاد کرنے کی کوشش کی کہ وہ "بلال سلطان" کو کیسا چیلنج دے کر آئی تھی۔ بلال سلطان کی یاد آتے ہی اسے سعد کا آئی فون اور اس میں محفوظ فائلز یاد آگئیں۔ جنہیں اس نے ایک بار دیکھا اور پڑھا تھا اور اس کے بعد وہ ایک طوفانی محبت کا احساس ملنے پر جذباتی بھی ہوچکی تھی اور جنونی

بھی' ان فائلز کو اس نے دوبارہ اس لیے نہیں کھولا تھا کہ وہ جانتی تھی دوبارہ ان پر نظر پڑنے سے اس کا ارادہ' اس کا چیلنج بھرا انداز اور اس کی کوشش ٹوٹ کر ریزہ ریزہ بھی ہوسکتی تھی۔ مگر وہ وقت کا کوئی ایسا لمحہ تھا جس میں اسے لگا کہ اسے بغیر کسی احساس و جذبے کے ایک بے تاثر دل کے ساتھ اس فائل کو دوبارہ پڑھنا چاہیے جس میں سعد کے اعترافات موجود تھے۔ اس نے اٹھ کر اپنے وارڈروب کی دراز سے وہ آئی فون نکالا اور سعد کی یادداشتوں کی فائل ڈھونڈ کر کھولی۔

"میں تمہیں تمہارے چاچا چوہدری سردار سے سنی وہ بات نہیں بتاؤں گا ماہ نور! جس کو سننے کے بعد مجھے کھاری کے غیر اہم وجود کی اہمیت کا علم ہوا۔"

فائل کے مندرجات پڑھتے پڑھتے ایک بار پھر وہ ان الفاظ کو پڑھ کر بری طرح چونکی تھی۔

"کھاری کے غیر اہم وجود کی اہمیت کا علم۔" اس نے ایک بار پھر غور کرنے کی کوشش کی۔

"سردار چاچا نے آخر اسے کھاری کے بارے میں کیا بتایا ہوگا؟"

"مہ نور باجی! مینوں آپ وی تہاڈے نال ایک ضروری کم اے (ماہ نور باجی مجھے بھی آپ سے ایک ضروری کام ہے)۔" اسے یاد آیا وہ کیسے منت بھرے انداز میں اس سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس نے سنی ان سنی کردی تھی۔

"اوہ کھاری!" اس نے اپنا فون اٹھا کر اس پر کھاری کا نمبر ملایا۔ چند سیکنڈز کے وقفے کے بعد اس پر بھی آپریٹر کی مخصوص آواز ابھری۔

"ہم معذرت خواہ ہیں آپ کا ملایا ہوا نمبر اس وقت بند ہے۔"

"یا اللہ۔ یہ کیا تماشا ہے؟" اس نے فون بند کرکے ایک بار پھر پھینک دیا۔ "جدھر منہ کرتی ہوں وہیں رابطہ بند ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔" وہ کڑھنے لگی تھی' کچھ دیر۔ یونہی کڑھتے رہنے کے بعد اس نے سعد کے آئی فون کی طرف توجہ کرلی۔

"نور فاطمہ کی جھونپڑی ایک تنبیہہ کی علامت تھی یا کسی نئے سبق اور تجربے کی' میں اس معاملے پر غور کرنا اور سوچنا ہی نہیں چاہتا تھا' لیکن تمہارے لیے میرے دل میں یہ خواہش ضرور ہے کہ کوٹلی فقیر چند کے سولنگ کے ساتھ تاحد نظر' نظر آنے والے سرسبز کھیتوں کے درمیان بنی اس کچی کوٹھری میں ضرور جاؤ۔"

پڑھتے پڑھتے ماہ نور سانس لینے کو رکی۔

"وہ کیوں چاہتا تھا کہ میں وہاں جاؤں' وہ کیوں چاہتا تھا کہ میں سکون اور طمانیت کے اس احساس کو محسوس کروں۔" اس نے ایک بار پھر سوچنا چاہا' "کون ہے نور فاطمہ' اور اس کی جھونپڑی میں ایسا کون سا خزانہ دبا ہے جس نے اس کو اتنا اہم بنا رکھا ہے۔"

"میں تمہیں فضل حسین اور میمونہ آنٹی سے ملاقات میں ملنے والی معلومات اور فلزا ظہور کے سینے میں انی کی طرح گڑے دکھ کا احوال بھی نہیں سناؤں گا۔"

اگلی لائنیں اور بھی الجھا دینے والی تھیں۔ ماہ نور نے ان پر بھی غور کرنے کی کوشش کی۔ اس کا ذہن بند تھا' مگر پھر سوچنے کی مسلسل کوشش کے دوران یکایک جیسے اس کے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا' اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے یہ الجھا دینے والے جملے محض جملے نہیں وہ کلیوز تھے' جن کو حل کرتے کرتے۔ وہ کسی منزل پر پہنچ جائے گی۔ اسے لگا سعد نے جیسے دانستہ یہ جملے اس کے لیے لکھے تھے۔ جو اگر کبھی وہ پڑھ لے تو اس گورکھ دھندے کو حل کرنے کے لیے کہ وہ کیوں یہاں سے بھاگ نکلا' اس کے مددگار ثابت ہوں۔

آئی فون میں محفوظ وہ فائل اس کے لیے ایک نیا عزم ثابت ہونے لگی تھی۔

"کھاری، سردار چچا، نور فاطمہ، فضل حسین اور میمونہ، فلزا ظہور۔" وہ اپنے طور پر جگسا پزل کے ایسے ٹکڑے جوڑنے میں مصروف ہوئی جن کا بظاہر آپس میں کوئی تعلق بنتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

"جگسا پزل سے جتنی مجھے چڑ تھی' اتنا ہی تم مجھے اسے حل کرنے پر لگا گئے ہو۔" کچھ دیر بعد اس نے اپنے دل میں بسی اس شبیہہ کو مخاطب کرتے ہوئے سوچا۔

"کتنے برے ہو نا تم۔" اس نے دل میں موجود شبیہہ سے کہا۔ "میرے سب اپنے مجھ سے چھڑا لیے اور خود بھی میرے نہیں بنے اب تک" اس کا شکوہ بجا تھا' مگر سننے والا وہاں موجود نہیں تھا۔

"بس تو پھر طے ہے کھاری سے بات ہو جاتی ہے تو بہت ٹھیک ہے' اگر بات نہ ہوئی تو پھر دوسرے نمبر پر فلزا ظہور سے ملنا ہے۔ اگرچہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ کہاں سے بیچ میں ٹپک پڑیں' آنٹی تو وہ کھڑوس ہیں' ان سے ملنا آسان کام تھوڑی ہے۔ مگر یہ فضل حسین اور میمونہ آنٹی کون ہیں۔" ان دو ناموں پر آکر وہ ایک بار پھر اٹکی۔

"خیر دیکھتے ہیں۔" کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اس نے سر جھٹکا اور فون اٹھا کر ایک بار پھر کھاری کو کال کرنے لگی۔ اس کا مطلوبہ نمبر ہنوز بند تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم جانتے ہو' تم زندہ ہو اور میرے سامنے موجود ہو۔" وہ لڑکی اس سے مخاطب تھی' جس کا چہرا اتنے سارے اجنبی چہروں میں جانا پہچانا تھا۔

"تمہیں اندازہ نہیں کہ تم کتنے بڑے حادثے سے گزر کر زندہ بچے ہو' تم میرے لیے کسی معجزے کی عملی تفسیر ہو اور مجھے تم سے شدید محبت ہے' مجھے تم سے اس لیے بھی محبت ہے کہ اس اجنبی ملک میں تم نے اپنے پتے کے لیے میرا نام منتخب کیا' میں تم سے اس لیے بھی محبت کرتی ہوں کہ تم جب ہوش خرد کی دنیا سے بے گانہ تھے' وہ میں تھی' صرف میں ہی تھی جو تمہارے لیے دعا کر رہی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارا زندہ بچ جانا میری دعاؤں ہی کے مثبت جواب کا معجزہ ہے' جبکہ میں تو یہ عہد کر چکی تھی' میری دعاؤں کا جواب جو بھی آئے۔ میں شکوہ کروں گی نہ ہی آہ وزاری۔"

وہ ایک ٹک اسے دیکھتے ہوئے دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اسے اس کی ایک ایک بات سمجھ میں آرہی تھی اور شاید اس کی باتیں سنتے ہوئے اس کے چہرے پر مسکراہٹ بھی تھی۔

"ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اب تم کروٹ بدل کر پہلو کے بل بھی لیٹ سکتے ہو اور اپنے منہ سے کھا پی سکتے ہو۔" وہ کہہ رہی تھی۔ "اگر ایسا ہے تو بھلا کھانے کے سے انداز میں اپنے جبڑے ہلا کر دکھاؤ' دکھاؤ تو سہی۔" اس نے منت بھرے انداز میں کہا تھا۔

جواب میں اس نے ذرا سا مسکرا کر اپنے منہ اور جبڑوں کو حرکت دینے کی کوشش کی تھی۔ "آہ" اس کے منہ سے اس کوشش کے نتیجے میں بے اختیار آہ کی آواز نکلی تھی۔ مسلسل حرکت نہ کرنے کے سبب اس کے اعضا سخت پڑنے لگے تھے اور اب انہیں جنبش میں لانے کی کوشش اسے تکلیف دیتی تھی۔

"درد ہو رہا ہے؟ اس کی آہ سن کر وہ بے چینی سے اس پر جھکی تھی۔ "درد ہوتا ہے تو مت کرو کوشش۔ رہنے دو' ڈاکٹر خود ہی اس کا کچھ حل نکال لیں گے۔" وہ نرم ہاتھوں سے اس کے رخساروں کی ہڈیاں اور جبڑے کی بیرونی جلد سہلانے لگی تھی' اس کے ہاتھوں کی نرمی محسوس کر کے اسے ایک عجیب سی راحت محسوس ہونے لگی تھی۔

"تمہارا شیو بڑھ گیا ہے۔" اس نے اس کے رخسار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "کیا تم شیو کروانا چاہو گے۔ کہو تو میں اسپتال کی حجام خدمات کو بلا لوں۔"

اس نے سر کے اشارے سے اثبات میں جواب دیا تھا۔

"تمہاری آنکھوں کی سوجن اور نمی کم ہو رہی ہے۔" اس کے جواب پر خوش ہوتے ہوئے اس نے اس کی آنکھوں کو انگلیوں کی پوروں سے سہلاتے ہوئے کہا تھا۔ "ویسے تم ہو بہت عجیب' تمہارے بارے میں کوئی بھی قیافہ لگانا مشکل کام ہے' اب بتاؤ بھلا اگر تمہیں ڈائیونگ کی الف ب بھی نہیں آتی تو تم سے کس نے کہا تھا دیر ڈیل چل دو' چھٹیاں گزارنے کو لندن میں کیا کم تفریح موجود تھی۔"

"نادیہ!" اس کی سب باتوں کو غور سے سنتے رہنے کے بعد وہ پہلی بار بولا تھا۔ اس کا چہرہ سہلاتی وہ اپنا نام پکارے جانے پر' بری طرح چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

"مجھے بھی تم سے شدید محبت ہے۔" اس نے کمزور آواز میں رک رک کر الفاظ ادا کیے تھے۔ اس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا تھا۔

"اور مجھے بھوک محسوس ہو رہی ہے۔ مجھے کچھ کھانا ہے' مگر کوئی محلول نہیں مجھے کوئی ٹھوس چیز کھانی ہے۔ اگر تم اپنے ہاتھ سے کھلاؤ تو۔" اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔

"ہاں!" ساکت کھڑے اسے دیکھتے دیکھتے وہ چونک کر بولی تھی۔ "ہاں ہاں ضرور۔" وہ خوشی سے پاگل ہوتی ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی۔ وہ کیا چیز تھی جو وہ اپنے ہاتھوں سے اسے کھلانے والی تھی۔ وہ اپنی مدد کے لیے ڈاکٹر کی طرف بھاگی تھی۔

اور کچھ ہی دیر بعد اپنے بھائی کے سینے پر نیپکن پھیلائے وہ اپنے ہاتھوں سے نیم ٹھوس۔ نیم سیال دلیہ کھلا رہی تھی۔ اور رک رک کر چمچ چمچ دلیہ کھاتا ہوا اس کی طرف دیکھتے وہ سوچ رہا تھا۔ اس سے پہلے کی آخری ملاقات میں اس نے کہا تھا۔

"ہو سکتا ہے آنے والے وقت میں تم میرا خیال رکھ رہی ہو اور میں تمہاری مدد کا محتاج ہو جاؤں۔"

☼ ☼ ☼

"فلزا ظہور' ایک گمنام مصورہ اور مجسمہ ساز ہیں چار کول اور وصلی پر گوچے اور پنسل کلران کا خصوصی میڈیم ہے' منی ایچر کی بھی ماہر ہیں اور ایک مقامی آرٹ اکیڈمی میں منی ایچر سکھاتی ہیں۔ آج کل بنی گالہ میں رہائش پذیر ہیں' نہایت ہی کم آمیز اور گوشہ نشین شخصیت ہیں۔ ان سے ان دنوں ملاقات ناممکن ہے کیونکہ اکیڈمی سے چھٹی پر ہیں اور ان کا گھر بند ہے' وہ اس وقت کہاں موجود ہیں' کسی کو معلوم نہیں' ہاں ان کا فون نمبر مندرجہ ذیل ہے۔"

بلال سلطان نے اپنے فون کی اسکرین پر خود کو موصول ہوا یہ طویل پیغام پڑھا اور گہرا سانس لیتے ہوئے بھیجا گیا نمبر محفوظ کر لیا۔

"فلزا ظہور!" اس نام کو دل میں دہراتے ہوئے انہیں بہت سے پرانے منظر یاد آرہے تھے۔

ہیلو! ہاں یہ نمبر تمہیں دے رہا ہوں اس کو ٹریس کرواؤ' نمبر کا مالک یا مالکہ اس وقت کہاں موجود ہے' مجھے پتا کروا کر فوراً" اطلاع کرو۔" اگلے لمحے وہ خود کو فون پر کسی سے کہتے سن رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

اس کے حافظے میں محفوظ رہ جانا بھی حیران کن بات تھی۔ بنی گالہ کی طرف ڈرائیو کرتے ہوئے اسے بہت سی

پرانی باتیں بھی یاد آرہی تھیں اور بہت سی نئی سوچیں بھی ذہن کو الجھائے دے رہی تھیں۔

فلزا کا گھر ایڈریس معلوم ہوتے ہوئے بھی اسے بہت آسانی سے نہیں ملا تھا۔ اور جب بالآخر گھر مل گیا تو اس کے لیے مایوسی کی انتہا بنا وہ گھر اپنے گیٹ پر قفل ڈالے خاموش کھڑا تھا۔ قفل نظر آرہا تھا مگر وہ بار بار کال بیل پر ہاتھ رکھتی اور گیٹ کو جھنجھوڑ کر اس پر دستک دینے کے بے معنی عمل میں تقریباً"پندرہ منٹ مصروف رہی تھی۔

"ہیلو!" پھر اس نے ایک نوعمر لڑکے کو دیکھا جو سائیکل کے پیڈل چلاتا اس کے قریب سے گزر رہا تھا اور اس کے ہیلو کہنے پر رک کر اس دیکھنے لگا تھا۔

"یہیں کہیں رہتے ہو کیا؟" اس نے اس لڑکے سے سوال کیا تھا "نہیں!" اس نے سائیکل سے اتر کر اپنی پی کیپ اتارتے ہوئے جواب دیا۔

"اوہ!" ماہ نور مزید مایوس ہوئی۔

"یہاں پر رہتا نہیں مگر پچھلے ڈیڑھ مہینے سے ساتھ والی کوٹھی میں رنگ و روغن کا کام کررہا ہوں' رات کو بھی ادھر ہی پڑا رہتا ہوں ہم لوگ ٹھیکے پر کام کررہے ہیں۔" لڑکے نے بتایا۔

"اچھا! ماہ نور کو کچھ امید بندھی۔" تو پھر اس گھر میں جو خاتون رہتی ہیں ان کو دیکھا ہے کبھی۔"

"یہ گھر۔" لڑکے نے گھر کے گیٹ پر نظر ڈالی۔ "یہ گھر تو جب سے ہم لوگ ادھر آئے ہیں بند ہی پڑا ہے' کبھی ساتھ والی کوٹھی کی چھت سے اس میں جھانکیں تو ایسا لگتا ہے یہ کوئی بھوت بنگلہ ہے' گھاس بڑھی ہوئی ہے' ہر طرف سوکھے پتے' کاغذ' گرد بکھرے ہوئے ہیں' دیواروں پر گھنی بیلیں ادھر ادھر ہر طرف پھیل گئی ہیں' مجھے تو اس گھر کو دیکھ کر خوف آتا ہے۔ آپ نے خریدنا تو نہیں یہ گھر؟"

لڑکا باتونی تھا' ماہ نور کی طرف سے کوئی جواب نہ آنے کے باوجود سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔

"نہ خریدیے گا جی یہاں پکے بھوت رہتے ہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے' تھینک یو۔" ماہ نور نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

لڑکا دوبارہ سائیکل پر سوار ہوکر پیڈل چلاتا سیٹی پر کسی مشہور گانے کی دھن بجاتا وہاں سے چلا گیا۔ اور فضا میں پھر پہلے کا سا سکوت طاری ہوگیا۔ ماہ نور نے ایک مرتبہ پھر گھوم کر فلزا ظہور کے گھر کے قفل لگے گیٹ کی طرف دیکھا اور فضا میں چھائے سکوت کو محسوس کرنے لگی' جس کو کبھی کبھار درختوں پر بیٹھے پرندوں کی آوازیں توڑتی تھیں اور پھر وہی سکوت چھا جاتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اچھا اب بتا ہی دو کہ ویرڈیل میں سکی انگ کا آئیڈیا کیسے سوجھا تمہیں؟" نادیہ نے چھوٹے ٹکڑوں میں کٹے سیب کا ایک ٹکڑا کانٹے میں پھنسا کر اسے کھلاتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے کبھی کم ہی کوئی کام سوچ سمجھ کر کیا ہے۔" وہ اس ٹکڑے کو بچوں کی طرح اگلے دانتوں سے چباتے ہوئے نیچی آواز میں بولا اس کی آواز میں ابھی نقاہت تھی اور وہ زیادہ دیر بولتے رہنے سے قاصر تھا۔

"پہلے کبھی سکی انگ کی تھی تم نے بھلا؟" نادیہ نے پلیٹ میں رکھے ٹکڑوں کو کانٹے سے بکھیرتے اور پھر سمیٹتے ہوئے پوچھا' سعد کو کوئی چیز کھلانے میں کتنا ہی وقت لگ جاتا تھا' وہ نیم ٹھوس چیز کو بھی نگلنے میں وقت لگاتا تھا۔ جبکہ یہ تو بہت چھوٹا ہی سہی تازہ سیب کا ٹکڑا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اسے اگلا ٹکڑا کھلانے میں وقت لگے گا۔

"بتاؤ تو پہلے کبھی سکی انگ کی تھی تم نے؟" اس نے اپنا سوال دہرایا۔ وہ کچھ دیر منہ میں رکھے سیب کے ٹکڑے کو چباتا رہا اور پھر بدقت اسے نگل کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں نے اس کے بارے میں بہت پڑھا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا میں یہ کرسکتا ہوں۔"

"پاگل ہو تم!" نادیہ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اس کو صرف پڑھ کر تو نہیں کیا جاسکتا۔ اس کو سیکھنا پڑتا ہے' پریکٹس کرنی پڑتی ہے۔"

"تم نہیں جانتیں' پہلے میں جو کام ایک آدھ دن کی پریکٹس کے بعد کرتا تھا وہ ہوجاتا تھا۔" سعد نے سر جھکا کر کہا اور یہ بات مکمل کرنے میں اسے تین منٹ لگے تھے۔

"پہلے میں ہلپسڈ تھا شاید اس لیے۔" پھر اس نے سر اٹھا کر کہا۔ نادیہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اسپتال کے مریضوں والے نیلے لباس میں ملبوس' سفید بیڈ شیٹ پر سفید ہی نرم تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھا اس کا وہ بھائی شاید دنیا کا خوبصورت ترین لڑکا تھا' کم از کم اسے تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔

"اچھا ہوا تم نے شیو کرالیا۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "اور بال بھی ترشوالیے۔ میں شرط لگا کر کہہ سکتی ہوں کہ اگر کبھی کسی فیشن سے متاثر ہوکر تم بال بڑھانا چاہو تو تم ذرا بھی اچھے نہ لگو گے۔" اس کی بات کے جواب میں وہ مسکرادیا۔

"یوں تم بہت اچھے لگ رہے ہو Lean tanned اور Slim وہ مسکرائی۔ "میں سچ بتاؤں مجھے ان تینوں لفظوں کے بارے میں معلوم نہیں۔ انہیں اردو میں کیا کہتے ہیں۔ میں اردو کے صرف سیدھے سیدھے لفظ بول سکتی ہوں۔ اتنے ہی جتنے میمونہ آنٹی نے مجھے سکھائے اور جنہیں میں نے اتنے برسوں میں اجنبی ملکوں کی اجنبی زبانوں کے لفظوں میں کھونے نہیں دیا۔" اپنی بات مکمل کرکے وہ خود ہی قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ اس نے دیکھا۔ سعد پوری دلچسپی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ مسکرا بھی رہا تھا۔

"تم نے مجھے حیران کردیا۔" پھر وہ رک رک کر بولتے ہوئے کہنے لگا۔ "شاید تم میری زندگی کی سب سے بڑی حیرت بن کر میرے سامنے آئی ہو۔ اس نے کہا۔ "تمہارا یہ اسکارف میری بصارت کی حیرت ہے اور جس روانی سے تم قرآنی آیات کا ورد کرتی ہو وہ میری سماعت کی حیرت ہے۔"

نادیہ نے مسکراتے ہوئے اس کی بات سنی اور آنکھیں میچ کر کھولتے ہوئے بولی۔ "یہ سیب تم کو ختم کرنا ہے ڈاکٹر پال کا خیال ہے' تم کاہلی کا شکار ہورہے ہو۔ تم اپنے جبڑوں کو حرکت دینا ہی نہیں چاہتے۔ جب ہی نیم سیال' نیم ٹھوس چیزیں کھانے کو ترجیح دیتے ہو' بس اب باتیں مت بناؤ اور کھانے کی طرف توجہ دو۔"

"کیا اس اسپتال والے مجھے یہاں سے کبھی فارغ بھی کریں گے؟" اس نے نادیہ کی بات پر غور نہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں تمہیں شک ہے کیا؟" نادیہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"شاید!" وہ تھوڑا سا نیچے کھسک کر نیم دراز ہوگیا۔ "نادیہ! مجھے بتاؤ۔ میری حالت کیسی ہے؟ کیا میری کوئی چوٹ ایسی ہے جو مجھے چلنے پھرنے سے یا کسی اور کام سے معذور کردے۔"

"یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟" نادیہ پہلے سے بھی زیادہ چونکی۔ "کیا ڈاکٹر نے تمہیں کچھ کہا ہے۔"

"نہیں۔" وہ تکیے پر سر رکھتے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ دراصل وہی تو ہیں جو مجھے کچھ بتاتے نہیں ہیں۔ ڈاکٹروں کا پراسرار رویہ ہی تو میرے دل میں وہم ڈال رہا ہے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے سعد!" نادیہ نے پلیٹ میز پر رکھ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ "چوٹ صرف تمہارے سر پر آئی تھی۔ سر کی چوٹ کے بارے میں ہی خطرہ تھا کہ وہ تمہارے پورے جسم یا جسم کے کچھ حصوں کو مفلوج کرسکتی تھی۔ لیکن اب ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کیا تمہیں اپنی حسیات اپنے قابو میں محسوس نہیں ہوتیں۔"

"ہوتی ہیں۔" وہ بدستور چھت پر نظریں جمائے بولا۔ "لیکن ابھی میں اٹھ کر بیٹھا نہیں' میں خود اٹھ سکتا

ہوں چل سکتا ہوں اپنے کام کر سکتا ہوں یا نہیں۔ یہ بتاؤ اور پلیز مجھے کسی اندھیرے میں رکھنے کی کوشش مت کرنا؟"

"میں ایسا نہیں کروں گی۔" نادیہ نے اس کے سر کے بال سہلائے۔ "تمہیں تھوڑی فزیو تھراپی کی ضرورت پڑ سکتی ہے بس۔ صرف ایک خطرہ سر کی چوٹ تھا اور تم اس سے نکل چکے ہو۔"

"میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ میں آنے والے وقت کے لیے ذہنی طور پر تیار ہونا چاہتا ہوں۔" وہ ابھی بھی چھت پر نظریں ٹکائے بول رہا تھا۔ "مجھے معلوم ہے جسمانی معذوری انسان کے دل و دماغ پر کیا اثر کرتی ہے' وہ کیسی کیسی باتیں فرض کرنے لگتا ہے۔"

"میری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آرہی۔" نادیہ نے واقعی کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ "تم نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ وہ سب تمہارے ساتھ ہوگا جو تم کہہ رہے ہو۔"

"بس یونہی۔" وہ نروٹھے پن کے ساتھ بولا اور پھر اس نے آنکھیں موند لیں۔

"تم ایسے نہیں سو سکتے' سیب ختم کرنا ہوگا۔" نادیہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"میں تھک گیا ہوں نادیہ! مجھے آنکھیں بند کرکے خاموشی سے لیٹنا ہے۔" سعد کا لہجہ اچانک اجنبی ہونے لگا۔

☼ ☼ ☼

"پلیز سردار چاچا! آپ میری بات سن لیں پہلے' دعا سلام بعد میں ہو جائے گی۔" فلزا ظہور کے بند گھر سے مایوس ہو کر واپسی پر راستے میں ہی اس کے فون پر ایک بار پھر سردار چاچا کی کال آگئی تھی۔ اس نے تیزی سے فون آن کیا اور کان سے لگا کر چھوٹتے ہی بولی۔

"ہاں تو بیٹا جی! بولو میں سن رہا ہوں۔" سردار چاچا کی جان دار آواز سنائی دی۔

"چاچا! آپ نے اس روز سعد کو کھاری کے بارے میں کیا بتایا تھا' جس روز وہ اچانک فارم ہاؤس سے چلا گیا تھا۔" وہ تیزی سے بولی تھی۔

"تمہیں کس نے بتایا کہ میں نے اسے کھاری کے بارے میں کچھ بتایا تھا؟" سردار چاچا جیسے چونک گئے تھے۔

"چاچا! میں اس وقت اسلام آباد میں ہوں اور سعد اسلام آباد ہی میں رہتا ہے۔" ماہ نور نے سگنل پر گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

"اگر تم وہاں سعد سے ملتی ہو اور اس نے تمہیں یہ بتایا ہے کہ میں نے اسے کھاری کے بارے میں کچھ بتایا تھا تو یہ بھی تو بتایا ہوگا کہ میں نے اسے کیا بتایا؟"

"اُفوہ چاچا پلیز!" وہ جھنجلائی۔ "اگر پتا ہوتا تو آپ سے کیوں پوچھتی۔"

"تم ایسا کرو' سعد سے ہی پوچھ لو' وہ بہتر بتا سکتا ہے کہ کھاری کے بارے میں کچھ معلوم ہوتے پر وہاں چانک فارم ہاؤس سے کیوں بھاگ نکلا۔" سردار چاچا نجانے کیوں کچھ بتانے سے ہچکچا رہے تھے۔

"چاچا! سعد اس شہر میں نہیں ہے' وہ فارم ہاؤس سے آنے کے فوراً' بعد ہی یہاں سے کسی کو کچھ بتائے بغیر کہیں چلا گیا تھا' اس کے تو باپ کو بھی خبر نہیں کہ وہ کہاں چلا گیا۔"

"اوہ... اچھا!" چاچا کا ردِعمل فوری تھا۔ "اسے شاید ایسا ہی کرنا چاہیے تھا' شاید وہ پہلے ہی سے بہت کچھ جانتا تھا۔"

"چاچا پلیز! مجھے بھی بتادیں کہ وہ کیا بات تھی' وہ میرے لیے ایک ادھورا پیغام چھوڑ گیا ہے کہ سردار چاچا نے اسے کھاری کے بارے میں کچھ بتایا تھا۔ پلیز چاچا! اس سے پہلے کہ کال کٹ جائے آپ مجھے بتادیں۔" وہ روہانسی

ہونے لگی۔ جواب میں فون پر خاموشی چھا گئی۔

"ہیلو ہیلو چاچا! آپ میری آواز سن رہے ہیں نا۔" اس کے دل میں ڈر پیدا ہونے لگا کہ کال پھر سے کٹ گئی تھی۔

"میں نے اسے جو بتایا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کھاری سعد کا سگا بھائی ہے۔"

سردار چاچا کی آواز ایئرپیس پر یوں ابھری جیسے سات سمندر پار سے آرہی ہو اور اس کے بعد اس کے کان میں لگے ہینڈ فری ریسیور پر ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

"کک۔ کیا؟" ماہ نور کے منہ سے بمشکل الفاظ نکلے۔

"ٹوں ٹوں۔" دوسری طرف رابطہ منقطع ہو چکا تھا اور اس بھری پُری کشادہ سڑک پر جیسے سناٹا چھا گیا تھا۔

"میں نے اسے جو بتایا اس کا مطلب یہ تھا کہ کھاری سعد کا سگا بھائی ہے۔" اسے لگا اس کے چاروں طرف سے ایک ہی آواز لپک کر اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔

"میں تمہیں تمہارے چاچا چوہدری سردار سے سنی' وہ بات نہیں بتاؤں گا ماہ نور! جس کو سننے کے بعد مجھے کھاری کے غیر اہم وجود کی اہمیت کا علم ہوا۔"

"مہ نور باجی مینوں آپ وی تہاڈے نال اک ضروری کم اے۔"

"مہ نور باجی! میری وی تے سن لو۔"

"کھاری کا غیر اہم وجود اور اتنا اہم۔" اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا اور وہ سنی ہوئی باتوں پر یقین کرنے کی کوشش میں ایک ٹک صاف شفاف سڑک پر نظریں جمائے ساکت بیٹھی تھی۔

اسے اس محویت سے اس کی گاڑی کے پیچھے قطار میں لگی گاڑیوں کے بجتے ہارن نے باہر نکالا۔ ٹریفک سگنل کی بتی سبز ہو چکی تھی اور اسے خبر نہیں ہوئی تھی۔ اس نے کلچ پر پاؤں رکھ کر گاڑی کو پہلے گیئر میں ڈالا اور ایکسلیٹر پر پاؤں رکھتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

"کھاری سعد کا سگا بھائی ہے۔" آواز ابھی بھی اس کی سماعت میں گونج رہی تھی۔

"وہ پہلے سے جانتا تھا۔"

"وہ وحشت کے عالم میں فارم ہاؤس سے بھاگ نکلا۔"

"آپا رابعہ کے مطابق سعد اپنے والد کا اکلوتا بیٹا ہے اور آپا رابعہ سعد کی والدہ کی قریبی دوست تھیں۔"

"آپا رابعہ کے مطابق سعد کی امی کا انتقال ہو چکا۔ پھر کھاری کہاں سے آیا' بلال سلطان کی کسی بات سے کیوں اندازہ نہیں ہوتا کہ سعد کے علاوہ بھی وہ کسی کے باپ ہیں جبکہ سعد نے اسے بتایا تھا کہ اس کی کوئی سوتیلی بہن بھی تھی۔"

"یہ کیا اور کیسا گورکھ دھندا ہے۔ کھاری سعد کا سگا بھائی ہے' ناممکن' ضرور سردار چاچا کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی اور اسی غلط فہمی کا انہوں نے سعد کو بھی شکار کر دیا۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے سوچا۔

"بلال سلطان!" پھر اسے یک دم خیال آیا۔ "کیوں نہ ان ہی سے جا کر پوچھ لیا جائے۔"

"اونہوں!" اس نے اپنے ہی خیال کو رد کر دیا۔ "جتنے وہ مغرور' آدم بے زار اور انا پرست انسان ہیں ان کے پاس جا کر کچھ پوچھنا بہت بڑی حماقت ہوگی۔"

"لیکن اس کے علاوہ چارہ ہی کیا ہے۔ اس انکشاف کے جس کے حقیقت ہونے کے چانسز نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بلال سلطان سے بڑا گواہ کون ہوگا؟" کچھ لمحوں کے بعد اس نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"تمگران کا وہ طنز اور چیلنج بھرا انداز۔ اسے بلال سلطان کا چہرہ یاد آیا۔" اس کا سامنا کون کرے گا۔ جس شخص کو

سعد جیسے بیٹے کے غائب ہو جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر اس کا کوئی اور بیٹا! کھاری؟" اسے ایک بار پھر یاد آیا۔ "نہیں کیسی غیر منطقی سی بات ہے کہ کھاری سعد سلطان کا بھائی ہے۔ کہیں کوئی مماثلت ہے ہی نہیں۔"

اس نے ایک مرتبہ پھر سردار چاچا کا نمبر ملایا' نمبر بند جا رہا تھا۔ اس نے کھاری کا نمبر ملایا' اس نمبر پر بیل جا رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد کھاری کی آواز فون پر ابھری۔

"ہیلو!" آواز نیچی اور دبی ہوئی تھی۔

"ہیلو کھاری! یہ میں ہوں ماہ نور! اس نے گاڑی روڈ سائیڈ پر کھڑی کرتے ہوئے کہا۔

"آہو مہ نور باجی میں سیان (پہچان) گیا ہوں۔" وہ اسی نیچی اور دبی ہوئی آواز میں بولا۔

"کھاری! اس روز تم مجھے کوئی ضروری بات بتانا چاہ رہے تھے نا۔ مجھے افسوس ہے اس روز میں مصروف تھی اور جلدی میں تھی۔ تمہاری بات سن نہیں سکی۔ پلیز اب بتاؤ کیا کہنا تھا تمہیں؟"

"کج بھی نہیں کہنا تھا مہ نور باجی!" اس کی آواز میں افسردگی تھی۔ "کھاری تے انا مورا تے شیدائی اے (کھاری تو نابینا' بے سمجھ اور پاگل ہے) کھاری دی باتاں پر غور نہ کریا کرو۔"

"ہائے کھاری!" ماہ نور کے دل کو کھاری کے لہجے کی بے چارگی اور یاسیت محسوس کر کے دکھ ہونے لگا۔ "کیا ہوا؟ تم خیریت سے تو ہو نا؟"

"ہاں جی مہ نور باجی! خیر ہی خیر اے۔" وہ اسی لہجے میں بولا' ڈھور ڈنگر اور میرے جیسے لوگ ایک برابر نہ ان کے دل پہ چوٹ لگدی اے نہ میرے جیسوں کے دل پر۔ بس کہیں ٹانگ بازو ٹوٹ جائے تو درد سے چلاتے پھرتے ہیں۔"

"کھاری!" ماہ نور ٹھٹک سی گئی' کھاری جیسا ہنستا کھیلتا' ہلکی پھلکی گفتگو میں کبھی کبھار گہری بات کر جانے والا' میلوں ٹھیلوں' کھیل تماشوں کا شوقین اور ایسی یاسیت بھری مایوس کن باتیں۔

"مجھے بتاؤ۔ کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟" اسے کھاری کی فکر ہو گئی تھی۔ "کیا سعدیہ سے کوئی جھگڑا ہو گیا یا پھر فارم ہاؤس پر کسی نے تمہیں ستایا ہے۔"

"نہیں مہ نور باجی!" وہ ایک سرد آہ بھرتے ہوئے بولا۔ "جو لوگ مقدراں کے ستائے ہوئے ہوتے ہیں انہیں کوئی اور کیوں ستائے گا۔"

"ایک منٹ کھاری!" ماہ نور نے فون ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرنے کے بعد دوسرے کان سے لگایا۔ "دیکھو' میں تو تمہاری مہ نور باجی ہوں ناں' تمہاری دوست ہوں میں' مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟" اس کے لہجے میں نرمی تھی' محبت تھی اور لگاوٹ بھی۔

"میں تو کب سے کہہ رہا ہوں' مہ نور باجی! اے دنیا ہوتی اے ناں اس دونوں پاسے کانٹے ہوندے ہیں اے ادھر سے بھی کاٹتی ہے' ادھر سے بھی۔"

ماہ نور کے لہجے کی اپنائیت محسوس کر کے وہ ذرا سا کھلا۔ "چوہدری صاحب اور ان کی مہمان بھی کھاری کے ساتھ مذاق کرتے ہیں اور کھاری جسے بتاتا ہے وہ بھی کھاری کا مذاق اڑاتا ہے۔"

"سردار چاچا نے تم سے کون سا مذاق کیا کھاری!" ماہ نور نے اپنے بال کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں مہ نور باجی!" وہ سرد آہ بھر کر بولا۔ "کوئی بات نئیں سارے کھاری نال دل پشوری کرتے ہیں تو بھی خیر ہے انہیں خوش ہو لین دیو کھاری کا کیا جاتا ہے۔"

"اوہ مائی گاڈ کھاری!" ماہ نور نے اسٹیرنگ پر رکھے بازو پر اپنا سر ٹکتے ہوئے کہا۔ "ایسا بلیک موڈ' ایسی حسرت بھری باتیں۔"

"اچھا ماہ نور باجی اجازت دیو! دودھ لوڈ کرانا اے گاڑی پر' شاماں پڑ رہی ہے۔ دیر ہو جائے گی' اچھا جی رب راکھا۔" کھاری کی آواز آئی' اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی کھاری فون بند کر گیا تھا۔

"یا اللہ یہ سب کیا ہے؟" ماہ نور کا ذہن پریشان ہونے لگا تھا۔ اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد رضوان الحق کا نمبر ملایا۔

"ہیلو!" پہلی ہی گھنٹی پر کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

"رضوان! میں ماہ نور بات کر رہی ہوں۔"

"جی میں نے پہچان لیا۔" وہ نرمی سے بولا' شکر کا مقام تھا کہ اس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

"تمہیں وہ تصویر مل گئی تھی نا؟" ماہ نور نے پوچھا۔

"ہاں مل گئی تھی۔" وہ بے تاثر لہجے میں بولا۔

"تم اس کو جانتے ہو نا' اس کو پہچانتے ہو نا؟"

"وقت بہت آگے بڑھ چکا ہے میم! بہت سے چہرے' بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔" یہ ایک غیر واضح جواب تھا۔

"گویا تم نے اسے نہیں پہچانا؟" ماہ نور کو مایوسی ہوئی۔ "میں سمجھی ہم اس کے والے جاپانی مسخرے ہو۔"

"کیا اس نے خود آپ کو بتایا کہ اس کا کوئی جاپانی مسخرہ ہوا کرتا تھا؟" دوسری طرف سے اسی سنجیدہ آواز میں پوچھا گیا تھا۔

"نہیں۔ اس نے نہیں بتایا' کسی اور نے بتایا تھا۔" ماہ نور نے سادگی سے کہا۔

"کیا کوئی اور بھی ہے' جو جانتا ہے۔" ایک مبہم سی بات پوچھی گئی۔

"پتا ہے کیا میں تمہاری بات کا تفصیلی جواب پھر کسی وقت دوں گی۔ ابھی تو مجھے یہ پوچھنا ہے کہ کیا تم جانتے ہو' کھاری کیوں پریشان ہے۔" ماہ نور کو فون کرنے کا مقصد یاد آگیا۔

"کیا کھاری نے آپ کو بتایا کہ وہ پریشان ہے؟"

"نہیں' لیکن اس کی باتوں سے مجھے لگا وہ پریشان ہے۔"

"شاید اس کے ساتھ کسی نے کوئی بُرا مذاق کیا تھا' اس نے اس مذاق کو دل پر لے لیا۔" رضوان نے کہا۔

"اور وہ بُرا مذاق کیا تھا؟" ماہ نور نے بے تابی سے پوچھا۔

"کسی نے اسے کہا کہ وہ ان باؤ صاحب کا سگا بھائی ہے' جو اس کی شادی پر آپ کے مہمان بن کر آئے تھے۔" رضوان الحق کہہ رہا تھا۔

"زن' زن' زن!" ماہ نور کی سماعت پر جیسے پتھر برسنے لگے تھے۔

"جس نے بھی ایسا کیا اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" رضوان کہہ رہا تھا۔ "کھاری معصوم اور بھولا بھالا انسان ہے' وہ اس مذاق کو سچ سمجھا' بے چارہ بے شناخت تھا اسے لگا اسے شناخت ملنے والی ہے' بعد میں اسے سب کہنے لگے کہ یہ مذاق تھا' بہت ڈس ہارٹ ہوا بے چارہ۔"

"کس نے کہا کہ یہ مذاق تھا؟" ماہ نور جیسے خواب میں بولی تھی۔

"کھاری کی مدر ان لاء نے۔ اس کی وائف نے' وہ دونوں شاید باؤ صاحب کے بیک گراؤنڈ سے ویسے بھی واقف تھیں پہلے سے' بے چارہ کھاری' بہت ہرٹ ہوا۔" رضوان بتا رہا تھا۔

"اور یہ مذاق کیا کس نے تھا؟"

"کھاری کے چوہدری صاحب اور ان کے پاس مہمان آئی کسی خاتون نے' وہ کہہ رہا تھا۔"

"سردار چاچا نے!" ماہ نور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ایک ایک لفظ پر غور کر رہی تھی۔ "مہمان خاتون!" یہ سرا ہاتھ

نہیں آیا تھا۔

"میں اب اجازت چاہوں گا۔ میرے شو کا وقت ہو گیا ہے' اگر آپ لاہور میں ہیں اس وقت تو کبھی میرا شو ضرور دیکھنے آیئے گا' میلہ چراغاں پر ہمارا سرکس آج کل ادھر ہی ہے۔"

وہ کہہ رہا تھا لیکن ماہ نور سن نہیں رہی تھی۔ اس کا ذہن صرف اسی ایک انکشاف پر اٹک کر رہ گیا تھا' کھاری سعد سلطان کا بھائی تھا۔

کتنی ہی دیر سوچتے رہنے کے بعد کوئی سرا نہ ملنے پر اس نے سر جھٹکتے ہوئے باہر دیکھا اور چونک گئی۔ نجانے کب سے وہ وہاں گاڑی پارک کیے کھڑی تھی۔ باہر اندھیرا پھیل رہا تھا اور سڑک کے درمیان کسی پرندے کی طرح پر پھیلائے اپنے اسٹینڈز پر کھڑے برقی قمقمے روشن ہو چکے تھے۔

"مجھے بلال سلطان سے ملنا ہی ہو گا۔" اس نے دل میں سوچا۔ "یہ جو گوسپ ہر طرف پھیلا ہوا ہے' اس کی حقیقت کو پانا ہی ہو گا۔ بے چارا کھاری۔" اسے کھاری کا خیال آرہا تھا۔ "سردار چاچا کو اس سے ایسا بھونڈا مذاق نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ ایسا ہرٹ کر دینے والا مذاق کرتے تو نہیں' لیکن کیا پتا موج مستی میں آکر کر دیا ہو' جب ہی تو سعد بھی اپنے باپ سے یوں بدگمان ہو کر یہاں سے چلا گیا۔ اللہ کچھ مذاق کتنے مہنگے ثابت ہوتے ہیں۔"

مختلف سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے وہ مسلسل اسی ایک نقطے پر سوچے چلی جا رہی تھی۔

سعد سلطان' کے گھر جانا یوں کہ سعد سلطان کے وہاں ہونے کا امکان صفر سے بھی کم ہو' کیسا اذیت ناک تجربہ ہو سکتا تھا۔ یہ صرف ماہ نور جان سکتی تھی اور اگر بلال سلطان سے ملاقات ہو پاتی تو اسے ان کے کیسے بھپھتے ہوئے طنز بھرے سوالات کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی مگر تجسس اور الجھن دو ایسی چیزیں تھیں جو کسی بھی دوسری سوچ پر حاوی ہو چکی تھیں۔

بلال سلطان کے گھر کے گیٹ پر موجود مستعد باوردی گارڈز نے شاید اسے اس لیے پہچان لیا تھا کہ چند روز پہلے وہ بلال سلطان کے ساتھ ہی یہاں آئی تھی۔ گھر کے مینجمنٹ اسٹاف کے ہیڈ مسٹر رازی سے اس کے لیے خصوصی اجازت پھر بھی مانگی گئی تھی۔ اور جب اس کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو اس نے دیکھا گیٹ وے پر مسٹر رازی خود اسے خوش آمدید کہنے کے لیے موجود تھے۔

"شکر' عزت رہ گئی۔" اس نے سوچا اور گاڑی سے باہر آگئی۔

"مجھے بلال صاحب سے ملنا ہے' اگرچہ میری ان سے اپائنٹمنٹ پہلے سے طے شدہ نہیں ہے۔" اس نے رازی کو بتایا تھا۔

"اتفاق کی بات ہے باس آج کل باقاعدگی سے ڈنر گھر ہی پر کر رہے ہیں۔" رازی خوش دلی سے مسکراتے ہوئے اسے ہمراہ لیے رہائشی عمارت کی طرف بڑھا۔

"سو۔ ان کی گھر آمد ایک آدھ گھنٹے میں متوقع ہے' امید ہے آپ باس کے ساتھ ڈنر میں شریک ہونا پسند کریں گی۔"

وہ کہہ رہا تھا اور وہ اس کے ساتھ ماربل کی چکنی سیڑھیاں احتیاط سے چڑھتے ہوئے بہت کچھ سوچ رہی تھی۔ رہائشی عمارت کے اندر داخل ہونے کے لیے جیسے ہی وہ لابی میں داخل ہوئی اسے ایسا لگا اوپر جاتی سیڑھیوں کے قریب اسے ایک ایسا چہرہ نظر آیا تھا جسے وہ جانتی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اس مانوس چہرے کو دوبارہ دیکھتی وہ چہرہ نظروں کے سامنے سے ایک دم غائب ہو گیا۔

"یہ۔ یہاں ابھی کوئی کھڑا تھا؟" اس نے بے اختیار رازی کو مخاطب کرتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ "ابھی نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔"

"ہاہاہا!" رازی کا جان دار قہقہہ لابی میں گونجا۔ "کوئی بھوت پریت یہاں موجود نہیں' میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ ہاں ہو سکتا ہے کہ آپ نے میم سیمی کو یہاں کھڑے دیکھا ہو' جب میں آپ کو ریسیو کرنے کے لیے باہر نکل رہا تھا اس وقت وہ یہاں کھڑی وان گو کی story night کے اس ریپلیکا کو بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔" رازی نے لابی کی دیواروں پر سجی مختلف پینٹنگز میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا۔

"میم سیمی!" ماہ نور نے جیسے کچھ نہ سمجھتے ہوئے رازی کی طرف دیکھا۔

"میم سیمی' ایک مہمان ہیں جو آج کل یہاں ٹھہری ہوئی ہیں۔" رازی نے کہا۔ "دراصل وہ مس سارہ خان کی کیئر ٹیکر ہیں۔ مس سارہ خان جو آج کل ہماری وی آئی پی گیسٹ ہیں' کیا آپ انہیں جانتی ہیں مس سارہ خان دی ایکروبیٹ؟"

"سارہ خان۔۔۔ یہاں!" ایک نئے انکشاف نے ماہ نور کا ذہن بالکل ہی ماؤف کر دیا۔

"جی ہاں۔ سارہ خان۔ دراصل وہ کسی حادثے کا شکار ہو کر رنگ میں جانے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ باس نے ان کے لیے دبئی سے خصوصی فزیو تھراپسٹ ہائر کیا ہے اور ان کے لیے یہ پیچھے والے حصے میں اسپیشل پریکٹس روم اور رنگ بھی بنوایا جا رہا ہے' ایک آدھ ہفتے میں وہ شاید چاپکا جا رہی ہیں' ری ہیبلٹیشن اور پریکٹس سیشن کے لیے' بہت اچھی لڑکی ہے سارہ خان۔ مس ماہ نور کیا آپ ان سے ملنا پسند کریں گی۔ چلیں پہلے میں آپ کو پریکٹس روم اور رنگ دکھالاؤں' بہت زبردست انٹیریر ہے' باس نے سب ایکوپمنٹ باہر سے منگوایا ہے' کسی بھی پروفیشنل پریکٹس روم اور رنگ سے زیادہ ایکوپڈ ہے یہ سیٹ اپ۔" رازی لابی سے اندر جانے کے بجائے باہر نکلنے لگا۔

"نہیں پلیز۔" اس کی ضرورت نہیں' پھر کبھی سہی۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "ابھی مجھے دیر ہو رہی ہے' مجھے یاد آیا۔ میں نے کسی کو ٹائم دیا ہوا ہے' میں پھر کسی دن آجاؤں گی بلال صاحب سے ملنے۔"

وہ تیزی سے کھلے دروازے سے باہر نکلی' دروازے کے پٹ پر ہاتھ رکھے کھڑا رازی اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ جس تیزی سے باہر نکلی تھی' اسی تیزی سے چلتی ڈرائیو وے پر کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"مس ماہ نور!" اسے یوں جاتے دیکھ کر رازی بھی تیزی سے اس کے پیچھے لپکا تھا مگر وہ اس کے خود سے قریب پہنچنے سے پہلے ہی گاڑی میں بیٹھ کر اسے بیک کرتی گیٹ تک پہنچ چکی تھی جب تک رازی گیٹ تک پہنچا' وہ گاڑی گیٹ سے باہر نکال لے گئی تھی۔ رازی نے اس کی گاڑی کے ٹائروں سے اٹھتی ہلکی گرد اور انجن کے دھوئیں کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا' اسی دم ایک اور گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی اور اس میں موجود شخص کچھ فاصلے پر جا کر گاڑی روکنے کے بعد گاڑی سے باہر نکلا۔

"ہیلو رازی! ادھر کھڑے ہو' خیریت ہے؟" آنے والے نے پوچھا۔

"مسئلہ ہو گیا مسٹر ابراہیم!" رازی اس شخص کی طرف بڑھا۔

"کیا ہوا؟" ابراہیم رازی سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

"یہ مس ماہ نور تھیں' جو باس سے ملنے آئی تھیں۔" رازی ابراہیم کو بتا رہا تھا "اور ان کے بارے میں باس کی خصوصی ہدایت یہ ہے کہ یہ جب آئیں انہیں وی وی آئی پی پروٹوکول دیا جائے۔ جب ہی تو انہیں ریسیو کرنے میں خود باہر آیا۔ لیکن یہ اندر جاتے جاتے اچانک مڑ کر واپس چلی گئیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیوں۔"

"اچھا!" ابراہیم نے گیٹ کی طرف دیکھا۔ "کیا کہہ کر گئی ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں۔" رازی نے شانے اچکائے۔ "میں انہیں مس سارہ خان کے بارے میں بتا رہا تھا اور ان کے زیر تعمیر رنگ کے بارے میں' اچانک بولیں انہیں کوئی کام یاد آگیا۔ وہ پھر کبھی آئیں گی۔ میرے کچھ سمجھنے سے

پہلے ہی یہ جا وہ جا۔"

"ہوں!" ابراہیم نے رازی کی بات پر غور کرتے ہوئے گہرا سانس لیا۔ "ویری اسٹرینج!"

اس نے رازی کی طرف دیکھا۔ "بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔"

"مجھے بھی۔" رازی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "صوفی سے ڈسکس کروں گا' وہ بہت سمجھ دار ہے۔ ضرور اس سے کوئی کلیو مل جائے گا۔" وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ڈاکٹر کے پاس سے بھی ہو آئی' چیک کر کے اس نے چھوٹی چھوٹی کتنی ہی گولیاں دے دی ہیں' کہتی ہے۔ صبح سویرے ایک گولی کھا لیا کرو سارا دن متلی ہونے کی شکایت نہیں ہوگی مگر گولی کھانے کے بعد نیند آنی شروع ہو جاتی ہے اور جسم کچا کچا سا پھر بھی ہوتا رہتا ہے۔"

"ارے تم کیسی عورت ہو رابعہ! شوہر تمہارا زخم زخم ہوا پڑا ہے۔ تمہیں اپنے جسم کے کچے پکے ہونے اور ڈاکٹر کی گولیوں کی پڑی ہے۔"

"اسی کی خاطر تو رات رات بھر جاگتی ہوں۔ اے بی! میں تو سچ بتاؤں مجھے اس لاہور شہر سے ہی ڈر لگنے لگا اب تو' اتنی لمبی دشمنی بھی کوئی پالتا ہے' کبھی' جس بھی کونے میں چلے جائیں گے اس شہر کے' وہ کم بخت ہمارا پیچھا کرتا پہنچ جائے گا۔ تم جانو' میرا تو دماغ سوچ سوچ کر شل ہوا جاتا ہے کہ سراج سرفراز جیسے بے ضرر انسان کی جان لے لینے میں تو اس نے کوئی کسر چھوڑی نہیں' ہمارا تمہارا کیا ہوگا' کم بخت کو معلوم نہیں کہ جس کی خاطر ادھر ادھر چھرے لہراتا پھرتا ہے وہ تو کب کی صورت گنوائے' نہ طلاقن' نہ رانڈ' نہ ہی سہاگن بنی زندگی کے بس دن گزارے جا رہی ہے' اب اس دشمنی میں وہ کیا نکالے گا اور۔۔۔"

"میں تو تم کو بیچ میں کئی بار کہہ چکی تھی۔ سراج سرفراز کو پکڑو اور یہاں سے چلی جاؤ' بی بی تمہاری فیملی بڑھنے والی ہے۔ آنے والی ننھی جان کا کیا قصور کہ ہماری طرح آج ہے کل نہیں جیسی زندگی گزارے' اوپر سے وہ خونی' قاتل جنونی چھرے لہراتا ہر دم سولی کی طرح سر پر ٹنگا رہتا ہے۔ زخم مندمل ہونے لگے ہیں۔ سراج سرفراز کے' اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے تو اسے بولو' جو نوکری مل رہی ہے کر لے' چند دن پیش امام صاحب کی شاگردی میں گزار لے' دین' حکمت کی باتیں اور خطابت سب سیکھ جائے گا۔ نکل جاؤ یہاں سے تم دونوں اپنی جان بچا کر۔۔۔"

"ہاں! اب تو میں بھی یہ ہی سوچ رہی ہوں' میں تو بہت ڈر گئی ہوں بی بی! جو تھوڑا بہت اسباب ہے' باندھو' یہاں سے چلتے ہیں۔"

"چلتے ہیں نہیں' تم دونوں نکل چلو یہاں سے بس۔"

"تمہیں ادھر ہی چھوڑ کر نکل چلیں' دماغ ٹھکانے پر تو ہے تمہارا؟"

"تم سمجھتی کیوں نہیں' میں ہی تو سارے فساد کی جڑ ہوں' جہاں میں ہوں گی وہاں ہی پر تو وہ قاتل جنونی طیفا لاٹ آ دھمکے گا۔ مجھے لگتا ہے میرے ابا یا اماں کی بددعا بن کر چمٹ گیا ہے میری جان کو' اور مرتے دم تک وہ میری جان نہیں چھوڑنے والا' مجھ تک رسائی نہیں ملتی تو بے چارے سراج سرفراز جیسوں کی شامت بلانے پر تل جاتا ہے' بس تم سراج سرفراز کے زخم چنگے ہونے تک اپنا کوئی بندوبست کر لو میری بہن۔"

"اور تم اکیلی ادھر کیا کرو گی؟"

"جب تک سانس ہیں ادھر پڑی جیسے جاؤں گی' بچوں کو ناظرہ پڑھاتی رہوں گی' تمہیں معلوم تو ہے اس کے عوض محلے کی بیبیاں عزت بھی دیتی ہیں اور دال روٹی کا بندوبست بھی ہو جاتا ہے۔ کیوں یوں حیرت سے کیوں

دیکھے چلی جا رہی ہو مجھے؟"

"دیکھ رہی ہوں، سوچ رہی ہوں، کب کبھی سوچا تھا کہ تم سے زندگی میں کبھی جدا ہونا پڑے گا۔ ایک پل کی جدائی برداشت نہیں مگر کیا کروں یہ پیٹ کی اولاد ہے۔ جس نے دل کے رنگ ڈھنگ ہی بدل دیے ہیں۔ سراج سرفراز شوہر تو کبھی جی کو بھایا نہیں، مگر سراج سرفراز باپ بننے والا ہے۔ دل چاہتا ہے، آنے والی اولاد کے لیے کمائے بھی اور اس کی چھاؤں بھی بنے، مجھے معاف کرنا میری بہن! میرا من اپنے لیے تو خواہش کرنا کبھی کا چھوڑ چکا، میرے سیلانی ماں، باپ، خاندان مجھے ایک نقطے کی طرح یہاں چھوڑ کر خود لکیر بنا، نجانے کتنے کوسوں دور کا سفر کر کے کدھر پہنچ چکا ہوگا۔ بس اب تو سراج سرفراز اور اس کی اولاد ہی میرا خاندان ہے نا۔"

"میں سب جانتی ہوں۔ مجھے ہر بات کا اندازہ ہے۔ جب ہی تو کہہ رہی ہوں بھاگ نکلو یہاں سے۔"

"اور جو وہ آ گیا تم اکیلی کی خبر پا کر تو......"

"اگر تو میری موت اس کے ہاتھوں لکھی ہے تو مجھے اس سے کوئی بچا نہیں سکتا، لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو وہ مجھے دس جنم لے کر بھی مار نہیں سکتا۔"

"بھلا اس سے کوئی پوچھے، تم نے کب اس سے عاشق معشوقی کے وعدے وعید کیے تھے جو بے وفائی کا الزام دھرتا ہے تم پر اور تمہاری اور اس تمہارے کسی لگتے کی جان کا دشمن ہوا پھرتا ہے۔ وہ تو دکھاتا، بھاگ گیا جان بچا کر، جس کی خاطر تم نے اس موئے کی دشمنی مول لے لی، شکل صورت سے گئیں، آواز گنوائی، گھر ٹھکانا گنوایا، چھروں کے سائے میں لرزتی زندگی گزار رہی ہو اور اسے پروا تک نہیں، بچے کی شکل دیکھنے کو ترس رہی ہو اور وہ بے وفا بچہ لیے چھپت ہوا پھرتا ہے۔"

"تم سے کتنی بار کہا ہے، اسے بُرا مت کہا کرو، میرے دل کو تکلیف پہنچا کر تمہیں کیا ملتا ہے۔"

"اللہ جانے تمہارا دل کس چیز سے بنا ہے۔ جو اس پر لٹا تو لٹ ہی گیا۔ اندھا ہو کر، نہ اس کی بے وفائی کھلتی ہے اسے، نہ ہی اس کا یوں چلے جانا برا لگتا ہے تمہیں۔"

"اس کے موضوع کو بس رہنے دو تم اور آج ہی جا کر پیش امام صاحب سے ملو، وہ کیا کہتے ہیں، سراج سرفراز کے لیے۔"

"ہاں جاؤں گی۔ مگر یاد رکھنا، دل پر بڑا بھاری پتھر رکھنا پڑے گا مجھے۔"

"کوئی بات نہیں، کبھی رکھنے پڑ ہی جاتے ہیں دل پر پتھر۔"

"تمہیں کیسے اکیلی چھوڑوں گی؟"

"یہ سوچ کر کہ میں اکیلی نہیں ہوں میرے ساتھ میرا اللہ ہے۔"

"اللہ تو بری گھڑی میں بھی ساتھ ہی ہوتا ہے۔"

"اس کی ذات پر جگتیں کسو گی نا تو سیدھی جہنم میں جاؤ گی۔"

"لکیر سے اُدھر بھی جہنم، لکیر سے اِدھر بھی جہنم، بی بی! تم تو مجھے جہنم سے ہی ڈرا ڈرا کر مار دو گی۔"

"بس ناک کی سیدھ کا سیدھا راستہ ادھر بھی جہنم ادھر بھی جہنم، ایک صراط مستقیم، ایک راہ ہدایت پکڑ لو، ناک کی سیدھ کا سیدھا راستہ تمہاری بیڑی پار لگ جائے گی ان شاء اللہ، یوں منہ بنا کر کیا دیکھ رہی ہو۔"

"صراط مستقیم، پاک سرزمین اور سب شاد باد ہے نا۔"

"پھر جگت سوجھی تمہیں، اللہ جانے تمہارے اندر کی میراثن کب مرے گی۔"

"شاید کبھی نہیں۔"

☼ ☼ ☼

وہ مریضوں کے بستر سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھتا تھا اور پھر واکنگ شوز پہن کر پاؤں پر بیٹھے بیٹھے دباؤ ڈالتا تھا، ہسپتال کی نرس اس کے ہاتھ میں واکنگ اسٹک تھماتی تھی اور وہ اس کا میٹل بینڈ بازو میں کس کر اس پر دباؤ ڈالتا، اس کا سہارا لیتا اٹھ کر کھڑا ہوتا تھا۔ مسلسل لیٹے رہنے سے اس کی ٹانگوں کی ہڈیوں کو جیسے قفل سا لگ گیا تھا اور پیروں پر وزن ڈالنا مشکل لگتا تھا، مگر دو چار دن کی مشق کے بعد ٹانگیں اور پیر کھلنے لگے تھے۔

اس کی ریڑھ کی ہڈی کسی بھی ضرب سے محفوظ رہی تھی۔ کیونکہ گرتے وقت اس کی کمر اس جگہ جا ٹکی تھی جہاں برف قدرے نرم اور بھربھری تھی۔ وہ سر کے بل گر کر اچھلا تھا اور پھر کمر کے بل اس نرم بھربھری برف پر جا کر گرا تھا۔ ڈاکٹر حادثے کے اس زاویے کو بھی معجزہ قرار دیتے تھے۔

"کھوپڑی کا یوں بچ جانا حیرت انگیز ہے۔ کوما کی حالت صرف خون کے بیرونی بہاؤ کے بجائے اندر ہی جم جانے سے ہوئی۔ تمہارا وہ دوست بہت سمجھ دار تھا۔ جس نے تمہیں ایئر ایمبولینس کے ذریعے یہاں لے آنے کا خطرہ مول لیا۔" اس کے ایک ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا۔

"میرا وہ دوست......" کتنے ہی دنوں کے بعد اسے یاد آیا تھا اور اسی شام جب نادیہ اس کے لیے گلاب کا گلدستہ اور چکن سوپ لیے اس کو دیکھنے آئی، اس نے اس سے پہلا سوال یہ ہی کیا تھا۔

"میرا دوست وردن زادے، وہ کہاں گیا؟" نادیہ نے سنا۔ اس کی آواز صاف ہو رہی تھی اور الفاظ کی ادائی کی رفتار بھی نارمل ہو رہی تھی۔

"اسے واپس جانا تھا۔ اس کی چھٹی ختم ہو چکی تھی۔ وہ تمہیں یہاں اسپتال پہنچانے اور تمہاری پہلی سرجری کی کامیابی کے تیسرے دن ہی چلا گیا تھا۔" نادیہ نے شبنمی گلابوں کا گلدستہ شیشے کے شفاف جار میں لگاتے ہوئے کہا۔

"اس کے بعد اس نے رابطہ نہیں کیا؟ اس نے کبھی میرا پوچھا نہیں۔"

"وہ اکثر پوچھتا ہے۔" نادیہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔

"وہ ایک بہت اچھا انسان ہے۔ بہت پیارے دل والا۔" سعد نے کہا اور نادیہ سے ایک پڈنگ مانگی۔

"کیا وہ تم سے بھی اچھا انسان ہے۔ تمہارے دل سے زیادہ پیارا دل ہے اس کا؟" نادیہ نے ایک چھوٹی پلیٹ میں پڈنگ کا ایک چھوٹا سا حصہ رکھ کر اسے پکڑایا۔

"نہیں......" وہ کھاتے کھاتے رک کر بولا۔ "میں اچھا انسان کہاں ہوں، میرا دل بھی اچھا نہیں۔"

"تمہارا دل بہت پیارا ہے۔ یہ اور بات کہ وہ فارغ نہیں ہے۔ وردن کا دل فارغ ہے۔ خالی کمرے کی طرح۔ اگرچہ وہ تمہارے دل کی طرح بہت پیارا نہیں۔" نادیہ نے پھول ترتیب دینے کے بعد سعد کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کیسے اندازا ہوا کہ اس کا دل فارغ ہے۔" وہ پڈنگ کھاتے ہوئے بولا۔

"جو چند دن تمہارے لیے امید اور یاس کے درمیان میں نے اور اس نے اسپتال میں اور اس سے باہر گزارے، ان دنوں میں شاید وہ میرے غم کی شدت اور رونے دھونے کی رفتار کو کم کرنے کے لیے مجھے بہت سی باتیں سناتا رہا۔ وہ بھی مضطرب تھا۔ اس لیے وہ ان دنوں بہت بولا اور جب ہم بہت بول رہے ہوتے ہیں تو ہمیں خود بھی پتا نہیں چلتا کہ سننے والے پر ہم کہاں کہاں سے ظاہر ہو رہے ہیں۔"

"اچھا......" سعد نے گہرا سانس لیا اور پلیٹ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔ "نادیہ کیا وردن نے میرا سامان تمہارے حوالے کر دیا تھا؟"

"ہاں...... سب کا سب۔" نادیہ نے سر ہلایا۔ "تمہارے ٹریولرز چیک، تمہارا علاج کروانے میں معاون ثابت

ہوئے۔"

"میں یہی پوچھنے والا تھا۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا اور نادیہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"نادیہ! جب میں آخری بار تم سے ملا تھا اس وقت حالات اور تھے' بہت مختلف' لیکن اب وہ پہلے سے حالات نہیں ہیں' اگر میں بالکل ٹھیک بھی ہو گیا تو شاید مجھے اپنی گزراوقات کے لیے کام کرنا ہو گا۔"

نادیہ اس کی بات سن کر زور سے ہنس دی۔ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"کیا یہ اس صدی کا سب سے بڑا لطیفہ نہیں؟" نادیہ نے بمشکل اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ "بلال سلطان کا بیٹا' سعد سلطان اپنی گزراوقات کے لیے کام کرے گا۔ ہم چھوٹے موٹے انسانوں والے چھوٹے موٹے کام۔"

"میں سنجیدہ ہوں نادیہ۔"

"میں بھی سنجیدہ ہوں سعد!" وہ اپنی ہنسی پر قابو کر کے بولی۔ "میں نے وو دن سے کہا کہ میں کسی طرح تمہارے حادثے کے بارے میں ڈیڈی کو اطلاع کرتی ہوں۔ اس نے مجھے صاف منع کر دیا۔ وہ کہنے لگا کہ ایسا کر کے میں تمہاری رخصت ہوتی روح کو تکلیف دوں گی۔"

"اس نے ٹھیک کہا۔" سعد نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اگر میں واقعی مرجاتا اور تم ایسا کرتیں تو مجھے یقیناً" بہت تکلیف ہوتی۔"

"لیکن ابھی تو تم زندہ ہو' تندرست ہو رہے ہو' بلکہ تقریباً" تندرست ہو چکے ہو۔" نادیہ نے کہا۔

"اس لیے تو کہا ہے کہ اب کام کروں گا۔"

"اور ڈیڈی سے رابطہ نہیں کرو گے؟" نادیہ نے سوال کیا۔

"نہیں۔۔۔" وہ سختی سے بولا۔

"کیوں؟" نادیہ کے لہجے میں احتجاج تھا۔

"بتاؤں گا میں تمہیں ضرور بتاؤں گا۔" وہ سرہلاتے ہوئے بولا۔

"اور کیا تم ماہ نور سے بھی رابطہ نہیں کرو گے؟" نادیہ کے اس سوال نے اسے صحیح معنوں میں جھٹکا لگایا تھا۔ اس نے چونک کر نادیہ کی طرف دیکھا تھا۔

"تم نے میری کچھ دیر پہلے کہی بات پر غور نہیں کیا شاید میں نے کہا تھا تمہارا دل بہت پیارا ہے۔ اگرچہ وہ فارغ نہیں۔" نادیہ کا انداز جتانے کا سا تھا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں کہ وہ دن زادے واقعی بہت بولتا رہا۔" وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں نے بتایا تھا نا کہ بہت۔۔۔" نادیہ مسکرائی تھی۔

☼ ☼ ☼

"بہت روئی تھی بے چاری رابعہ یہاں سے جاتے ہوئے۔ مجھے اکیلے چھوڑ دینے کا تصور ہی نہیں کر پارہی تھی وہ۔ تڑپ تڑپ کر روتی تھی۔ جاتے جاتے لوٹ آتی تھی۔ دس بار تو دہلیز سے لپٹ لپٹ کر روئی۔"

"اس کا خاندانی پیشہ ہے دوسرے کو یقین دلا دینا کہ اس سے اہم کوئی نہیں۔ چاہے رو کر یقین دلائے' چاہے ہنس کر' چاہے صاحب سلامیاں گا کر' چاہے گالیاں بک کر۔"

"بہت بری بات ہے۔ تم اسے بہت کمتر سمجھتے ہو۔"

"میں اسے کمتر نہیں کہہ رہا اس کے جینیاتی خواص بیان کر رہا ہوں۔ جن سے مل کر اس کی ہیئت ترکیبی وجود میں آئی اور پھر جس پر اس کی پیدائش ہوئی۔"

"وہ بھی تم سے بہت بدگمان گئی ہے یہاں سے' حساب برابر ہوا' اللہ جانے کتنے کوسنے دیتی ہو گی تمہیں دل میں' میرے سامنے تو سنانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔"

"مجھے حسرت ہی رہے گی کہ اس کی زبان میں اپنا شجرہ سنتا۔ یقیناً" مجھے خبیث ابن خبیث قرار دیتی ہو گی وہ دل میں۔"

"تم بڑے مسرور دکھائی دیتے ہو اس کے چلے جانے پر؟"

"ہاں بہت اچھا ہوا جو وہ دونوں چلے گئے' اب میں چوروں کی طرح تمہارے پاس آنے کے بعد کم از کم اس گھر میں تو چوروں کی طرح نہیں رہوں گا نا۔ تمہارے ساتھ کھل کر رومانس تو کر سکوں گا نا۔"

"ارے ہٹو۔۔۔ پہلے ہی تمہارے رومانس نے ایک بار پھر مجھے دوسرے جی سے کر دیا۔ خود کو چوروں کی طرح چھپائے پھرتی رہی رابعہ سے' اللہ اتنی شرم آتی تھی کہ اگر اسے شبہ ہو گیا تو کیا کہوں گی اس سے۔"

"ابھی تو ابتدائی دن ہیں' اسے شبہ کیسے ہوتا۔"

"میں جو اس کے ساتھ بیٹھ کر کھٹی اور چٹ پٹی چیزیں ہڑپ کرنے کو بے چین رہتی تھی' تو وہ کئی بار ہنس کر پوچھتی تھی کہ کہیں اس کی طرح میں بھی تو دو جی سے نہیں ہو گئی اور پھر خود ہی اپنے سوال کے بے تکے پن پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتی تھی۔"

"اسے تو خیر ہنسنے اور بدھائیاں دینے کا بہانہ چاہیے ہوتا ہے۔ اچھا ہوا جو وہ لوگ چلے گئے۔ ایک تو ہر وقت کے جان کے خطرے سے بچ جائیں گے' دوسرا تم سکون سے یہ وقت یہاں گزار سکو گی۔"

"لیکن جوں جوں دن گزریں گے' راز عیاں ہوتا جائے گا محلے والے جواب اکثر۔ آنے جانے لگے ہیں۔ کیا' کیا نہ قیاس کریں گے۔"

"میں کوشش کر رہا ہوں کسی اور جگہ مکان لے لوں' اس سے بہتر نہ سہی' مگر تمہارے لیے کافی ہو گا' نئی جگہ نئے لوگ ہوں گے' وہاں تم یہ عرصہ آرام سے گزار لینا' پھر میں بھی اکثر آتا جاتا رہوں گا' سراج پر جو طبلچے نے حملہ کیا ہے اس کے بعد یہ جگہ بھی محفوظ نہیں رہی۔"

"تم ایسا کیوں نہیں کرتے' مجھے اپنے ساتھ پنڈی ہی لے جاؤ۔ ادھر نت نئے محلوں اور نت نئے مکانوں سے میں گھبرا گئی۔"

"پنڈی میں ایک کمرے میں شفٹ ہو گیا ہوں دوبارہ سے' ایک مکان ہے' جس کا ایک ایک کمرہ نوکری دار لڑکوں نے کرائے پر لے رکھا ہے۔ سعد کو فضل حسین کی بیوی کے حوالے کر رکھا ہے۔ وہ وہاں محفوظ ہے۔ میں پیسہ جمع کرنے میں لگا ہوا ہوں' جو تمہاری دعا اور اللہ کے فضل سے اچھا خاصا آرہا ہے۔ دن میں ایک وقت کا کھانا کھاتا ہوں' تاکہ زیادہ سے زیادہ جمع کر سکوں' تمہارے علاج کے لیے' اپنا مکان بنانے کے لیے ان سب راحتوں کے لیے جو میں نے تمہارے لیے سوچ رکھی ہیں۔"

"آخر کب تک یوں ہی اپنی جان کو ہلکان کرتے رہو گے' خود کو دیکھو' کتنے کمزور ہو چکے ہو' آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے ہیں۔ کپڑے جو پہنتے ہو گھس رہے ہیں' نہ ڈھنگ سے دھلے ہوتے ہیں' نہ ڈھنگ سے استری ہوئے ہوتے ہیں۔ اللہ جانے کیا اور کیسا کھاتے ہو' بچے کو نہ ماں کا ساتھ میسر ہے' نہ باپ کی شفقت' اللہ جانے کن غیروں میں پل رہا ہے وہ۔"

"تم کیا سمجھتی ہو' میں سب کیفیات کو سمجھتا نہیں ہوں بھلا' کیا میرا دل ایک گھر' ایک چھت' بیوی' بچے کا ساتھ' سکون کی زندگی' آرام کی روٹی کے لیے نہیں ترستا' تمہیں کیا سناؤں کہ کیسے کیسے خواب دکھاتی ہیں۔ مجھے میری تشنہ کام آرزوئیں' لیکن پھر خود کو تسلی دیتا ہوں۔ سمجھا لیتا ہوں۔ جہاں اتنا صبر کیا۔ وہاں اب تو بس کچھ ہی دیر

باقی ہے۔ پھر وہ سب کچھ ہمارا ہو گا جو ہم چاہتے ہیں۔ نجانے کیوں مجھے لگتا ہے یہ جو آنے والا بچہ ہے یہ میرے لیے بہت ہی سعد ثابت ہونے والا ہے۔ میں تصور ہی تصور میں اسے اپنی گود میں کھیلتا' اپنے سینے پر چڑھتا محسوس کرتا ہوں۔ سچ کہوں تو یہ فیلنگز سعد کی دفعہ نہیں تھیں' شاید اس لیے کہ اس وقت مزاج زیادہ ہی لاابالی اور غیر ذمہ دارانہ تھا۔"

"ارے واہ۔ میرے سعد سے زیادہ سعد کیا ثابت ہو گا آنے والا' میرے سعد کو تو ماں کی بدقسمتی لڑ گئی' ورنہ جیسا وہ سعد ہے اور کون ہو گا' اتنا خوب صورت کہ جو دیکھے گود میں لے لینے کی خواہش کرنے لگے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ حضرت ہیں بہت خوش شکل ماشاءاللہ' میں تو اسے نظر بھر کر دیکھتا بھی نہیں کہ کہیں میری ہی نظر نہ لگ جائے۔"

"ہائے کیسے خوش قسمت ہو' اسے دیکھ تو لیتے ہو۔ مجھے دیکھو رات دن تڑپتی ہوں اس کے لیے۔"

"کچھ دن اور بس میری جان فقط کچھ ہی دن اور۔۔۔"

"سب سمجھتی ہوں' مگر انسان ہوں' کیا کروں؟"

"اچھا یہ سب چھوڑو' میں بتاؤں آج میں دو دن سے تقریباً" بھوکا ہوں' شاید کل ایک دو ٹوسٹ کھائے تھے۔ چائے کی چھوٹی پیالی کے ساتھ۔ بہت بھوک لگ رہی ہے' کھانا نہیں کھلاؤ گی کیا۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں کیوں نہیں' آج صبح سے منڈیر پر بیٹھا کوا راگ الاپ رہا تھا۔ میرا دل کہتا تھا تم آؤ گے اسی لیے تو تمہاری پسند کا کھانا بنا لیا۔ چاہت اور محبت کے ساتھ۔"

"کیا بنایا؟"

"ٹنڈوں کا دلمہ اور مکھڈی حلوہ۔"

☼ ☼ ☼

اس نے اس وسیع ہال پر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کیا تھا جو نہیں تھا اس ہال میں ہر سائز اور اونچائی کی بارز' فوم کے گدے' رنگز' بالز اور پریکٹس لیڈز' اس ہال کی چھت میں کنسیلڈ روشنیاں جگمگا رہی تھیں اور صفر سے شروع کر کے انتہائی نقطے تک کی مشقوں کی تمام سہولتیں ان روشنیوں میں چمک رہی تھیں۔

ماہر فزیو تھراپسٹس کا ایک گروپ تھا جو دن میں دو بار اسے ضروری ورزشیں کراتا تھا اور ماہر ڈاکٹرز کی ایک ٹیم تھی جو اس کی رگوں' پٹھوں اور ہڈیوں کا علاج کر رہی تھی۔ اس کی خوراک بیلنسڈ ڈائٹ کی اعلا ترین مثال قرار دی جاسکتی تھی۔ پہننے کو اچھے سے اچھا لباس' گھومنے کو بہترین گاڑی' سیرو تفریح کے مواقع۔۔۔ وہ یقیناً" ایک فیری لینڈ میں داخل ہو چکی تھی۔ بلیو ہیون سرکس کی شہزادی پریا رائی نے گویا اپنا تیسرا جنم لیا تھا۔

دنوں میں اس کا رنگ روپ' جسمانی اور ذہنی صحت میں بہتری آنے لگی تھی۔ اسے ورزش کے لیے بہترین جم میسر تھا اور پریکٹس کے لیے بہترین رنگ' ایک مستعد اور ذمہ دار عملہ صرف اس کی خدمت کے لیے متعین کر دیا گیا تھا۔ اس ونڈر فل فیری لینڈ میں داخلے کے بعد وہ اور یسی آنٹی ششدر و دنگ سی ہو چکی تھیں۔

کہاں وہ ہر چیز سے بے دخل ہو جانے کے خدشے سے دوچار تھیں۔ کہاں وہ مری کے مضافات میں چوروں کی طرح ایک چھوٹے سے فلیٹ میں زندگی گزارتے گزارتے جیسے لائم لائٹ میں لا کر کھڑی کر دی گئی تھیں اور یہ سب اسی شخص بلال سلطان کی وجہ سے ممکن ہوا تھا۔ جسے اپنے اس چھوٹے سے فلیٹ میں موجود دیکھ کر اس دن کو اپنے آرام کا آخری دن گردانتے ہوئے اس نے اور یسی آنٹی نے دل کھول کر انہیں دل کی باتیں سنائی تھیں۔

بلال سلطان جو سعد سلطان کا باپ تھا۔ سعد سلطان' جس نے سارہ خان کو تڑپ تڑپ کر مرتے ہوئے بستر مرگ سے اٹھایا تھا اور اس کے دم توڑتے وجود میں بساط بھر جان ڈال دینے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس کی زندگی قدرت کا تحفہ اور سعد سلطان کی نیک فطرتی کا معجزہ تھی۔

سعد نے بچوں کی طرح اس کی حفاظت کی تھی اور جو بن پڑا تھا اس کی صحت کی بحالی کے لیے کرتا رہا تھا۔ بغیر کچھ جتائے' بغیر کسی تشہیر کے' مگر اس کی بساط محدود تھی یا پھر وہ تشہیر ہی کے خوف میں مبتلا تھا جو اس نے سارہ خان کو دنیا سے چھپا رکھا تھا۔ وہ خود اپنی زندگی میں کتنا بے سکون اور مضطرب تھا' اس نے سارہ خان کو بے سکونی اور اضطراب سے بچائے رکھا تھا۔ اسے کس وجہ سے سب کچھ چھوڑ کر جانا پڑا تھا۔ مگر جاتے جاتے بھی وہ سارہ خان کے لیے زندگی کے سب اہتمام کر گیا تھا۔

اور اب یہ بلال سلطان تھے جن کی بساط کا فورم بڑا اور استطاعت زیادہ تھی۔ وہ بیٹے کی پوشیدہ نیکی کو لائم لائٹ میں لے آئے تھے اور ان کی کاوشوں کی دسترس بھی بڑی تھی' جب ہی تو ایک طویل عرصے کی جدوجہد کے بعد پاؤں پاؤں چلنے کے قابل ہوئی۔ سارہ خان دنوں میں پریکٹس بارز پر چڑھنے کے قابل ہونے لگی تھی۔

"یہ میرے ہاتھ۔۔۔" اس نے اپنے ہاتھ اپنی نظروں کے سامنے پھیلاتے ہوئے سوچا۔ "اس کی ہتھیلیاں گلابی ہونے لگی تھیں اور نسوں کی کھنچاوٹ دور ہو رہی تھی اور میری ٹانگیں۔ اس کی ٹانگیں جیسے جان پکڑنے لگی تھیں۔ "کیا کبھی میں نے سوچا تھا کہ میں کبھی اس سٹیج پر پہنچ پاؤں گی۔" اس کا دل تشکر سے بھر گیا۔

"لیکن کیا اس مقام تک پہنچنے کا کوئی امکان ہوتا ہے' جو سعد سلطان میری زندگی میں نہ آتا۔" سعد کی ایک بساط بھر نیکی۔ چلتے چلتے روشنی کا کیسا مینارہ بن گئی' کیسی نیت تھی اس کی اور کیسا ارادہ جس میں برکت ہی برکت پڑتی گئی۔ وہ سعد کی محبت تھی جس نے مجھے بستر سے اٹھایا وہ اس کی لگن تھی جس نے مجھے دوبارہ سے قدموں پر چلایا اور یہ سعد سے اس کے باپ کی محبت ہے' جو مجھے دوبارہ ایک نارمل زندگی کی طرف لوٹا رہی ہے۔

"یا خدایا۔۔۔" پھر اس نے اوپر لکھا۔ "یہ کیسے تیرے سلسلے ہیں۔ ایک بے نام و نشان بچی کو بلیو ہیون سرکس کے پالنے میں ڈال دیا اور پھر ایک قریب المرگ لڑکی پر سعد سلطان کی نظر ڈال دی۔ اس سارے سلسلے میں کس کو کیا عطا ہوا۔ یہ کون کیلکولیٹ کر سکتا ہے' مگر تیری عظمت' تیرے کرم اور تیرے رحم کی انتہا کیا ہے' یہ تو مجھ ایسی کوتاہ نظر پر بھی عیاں ہو گیا۔"

"یہ سب۔۔۔" دوبارہ اس وسیع ہال پر نظر ڈالتے ہوئے اچانک اسے خیال آیا۔ "اگر یہ سب بلال سلطان میرے لیے کر سکتے ہیں تو ماہ نور کا اس گھر میں کیا مقام ہو گا جسے بلال سلطان اپنے بیٹے کے دل کا معاملہ کہتے ہیں۔ مگر ماہ نور ہے کہاں۔ وہ یہاں کیوں نہیں آتی' اس نے تو کبھی مجھ سے بھی رابطہ نہیں کیا۔" وہ سوچ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آپ تو بہت جلد گھبرا گئیں بی بی صاحب' ابھی تو ایک پڑاؤ بھی ٹھیک سے عبور نہیں ہوا۔" اختر نے اپنے سامنے چٹائی پر بیٹھی ماہ نور سے کہا۔

"مجھے لگتا ہے یہ میرے بس کا کام نہیں ہے سائیں جی یا پھر میں ہی کم عقل ہوں' میں ہی ان پلانر (ill-planner) ہوں۔" ماہ نور نے نیچی آواز میں کہا۔

"یہ آپ ہی کے تو بس کا کام ہے بی بی صاحب!" اختر مسکرایا۔ "آپ کو ادراک ہی نہیں کہ آپ کیسی سینٹرل پوزیشن پر کھڑی ہیں۔"

"مجھے طفلانہ تسلیاں مت دیں سائیں جی' میں جان گئی ہوں کہ میں ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہوں۔" ماہ نور کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"آپ کا مسئلہ گمان اور انا ہے بی بی صاحب' اس پر قابو پالیں تو راستہ تو صاف ہی صاف ہے' اگرچہ گمان اس راستے کا جزو لازم ہے' جس پر آپ چل رہی ہیں' مگر انا تو اس راستے کے پاس نہیں پھٹکتی' انا تو اس جذبے کی قاتل ثابت ہوتی ہے جو آپ کے دل میں گھر کیے بیٹھا ہے۔"

"گمان کیا مطلب؟" ماہ نور نے سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"آپ سامنے کا منظر دیکھ کر اپنی من مرضی کے قیافے لگانا چھوڑ دیں بی بی صاحب' منظر کے پار بھی دیکھا کریں' کبھی کبھی پس منظر میں ہی اصل منظر بس رہا ہوتا ہے' پیش منظر نظر کا دھوکا ہوتا ہے۔"

"میری سمجھ میں آپ کی باتیں شاید نہیں آسکتیں۔"

"غور کرنے کی عادت ڈالیں۔ آپ سے میں نے عرض کی تھی' ہے تو مشکل' مگر یہ راستہ صرف آپ کا ہے' آپ کو طے تو کرنا ہی پڑے گا۔"

"میں بہت پریشان ہوں سائیں جی' عجیب و غریب انکشافات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔"

"ان ہی انکشافات سے گھبرا کر تو باؤ صاحب فرار حاصل کر گئے تھے۔ انہیں بھی پیش منظر نے دھوکا دے دیا۔ جب ہی تو گمان کی بھول بھلیوں میں پھنس گئے اور اتنا پھنسے کہ نہ نور فاطمہ کی جھونپڑی میں رات بھر کا قیام کام آیا' نہ ہی شربت کے گھونٹ' آپ سے میری درخواست ہے گمان' سے بچ جائیں' ان کو قابو کرلیں اور پس منظر میں جھانکنے کی عادت ڈال لیں۔ آپ کی نیا پار لگ جائے گی۔ پھر دل بھی آپ کا ہوگا۔ دل والا بھی' بس ایک ذرا فہم پر ہاتھ ڈالنے کی بات ہے۔"

اختر نرم لہجے میں کہہ رہا تھا اور نجانے کیوں ماہ نور کو اپنے اندر ہلچل مچاتی بے چینی سکون پذیر ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

مولوی سراج فراز' بچوں کو ناظرہ کا سبق دینے کے بعد صف پر اکیلے بیٹھے نیاز محمد کے گھر سے آنے والے ناشتے کا انتظار کر رہے تھے۔ چند دن سے ان کے معمول میں کچھ فرق آگیا تھا۔ وہ گھر سے نہار منہ صبح نور کے تڑکے ہی مسجد آجاتے تھے۔ اپنے معمول کے فرائض سے فارغ ہوتے تو نیاز محمد کے گھر سے ان کے لیے ناشتہ آجاتا۔ مولوی صاحب کو اتنی صبح آتے دیکھ کر نیاز محمد نے جس کا گھر مسجد کے ساتھ ہی متصل تھا خود ہی یہ خدمت اپنے سر لے لی تھی اور مولوی صاحب کو تو یہ معمول بہت ہی راس آیا تھا۔

رابعہ بیگم نے کچھ عرصے سے چوہدری سردار صاحب کے ہاں سے آنے والی سوغاتوں کو واپس موڑنا شروع کردیا تھا۔ ان کے خیال میں چوہدری صاحب کے ہاں بیٹی بیاہنے کے بعد اب ان کا ان سوغاتوں پر کوئی حق نہیں بنتا تھا اور اسی کے ساتھ مولوی صاحب کے گھر میں بننے والے ناشتے پر عجیب سی مسکینی چھا گئی تھی۔

معمول کی سوکھی روٹی کے ساتھ کبھی کبھار رات کا بچا ہوا سالن کھانے کو مل جاتا تھا' لیکن اکثر سوکھے اچار کے ساتھ ہی ناشتے پر ٹرخا دیا جاتا۔ وہ دیسی گھی میں تلے پراٹھے' مکھن' دہی اور شکر تو جیسے خواب ہونے لگے تھے۔ ایسے میں قدرت نے خود ہی نیاز محمد والا انتظام کرکے جیسے مولوی صاحب کے دن پھیر دیے تھے۔ نیاز محمد' تلے پراٹھوں کے ساتھ کبھی انڈوں کا آملیٹ' کبھی سوجی کا حلوہ' تو کبھی موٹی بالائی کی تہ والا دہی معہ شکر کے بھجوا دیتا تھا۔ ساتھ میں لسی جس پر تازہ مکھن بھی تیر تا تھا۔

"سبحان اللہ... اس کی قدرت ہے سب' فاقہ کشی سے بال بال بچا لیا اس نے۔" مولوی صاحب آنکھیں بند کیے نیاز محمد کے ناشتے کا تصور کرتے ہوئے جھوم رہے تھے' جب اپنے قریب آہٹ سن کر انہوں نے فوراً

آنکھیں کھول دی تھیں۔ نظریں نیاز محمد کے بیٹے کے ہاتھوں اپنی طرف بڑھاتے ناشتہ دان کی منتظر ہوئیں۔ جس کے نہ آنے پر انہیں نظریں اٹھا کر دیکھنا پڑا تھا۔ ان کی توقع کے بالکل برعکس ان کے سامنے ان کا اکلوتا داماد افتخار احمد عرف کھاری کھڑا ان سے بیٹھنے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼
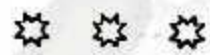
"اس نمبر کی مالک خاتون جن کا نام فلزا ولد محمد ظہور احمد ہے۔ اس وقت لاہور کی ایک آرٹ گیلری میں موجود ہیں۔ وہ گزشتہ کئی دن سے لاہور شہر ہی میں ٹھہری ہوئی ہیں۔ ان کی جائے قیام شہر کا ایک معروف فائیو اسٹار ہوٹل ہے۔ جہاں وہ چوہدری سردار نامی کسی شخص کی مہمان کی حیثیت سے رہ رہی ہیں۔ گزشتہ ماہ وہ ان ہی چوہدری سردار صاحب کے فارم ہاؤس' جو ننکانہ صاحب کے قریب واقع ہے' بھی مہمان کی حیثیت سے ٹھہر چکی ہیں۔"

بلال سلطان نے خود کو ملنے والی معلومات کو دھیان سے سنا اور آنکھیں سیکڑتے ہوئے اس پر غور کرنے لگے۔

"سر!" اسی دوران رازی کمرے میں داخل ہوا۔ رازی چند منٹ پہلے ان سے ملاقات کی اجازت لے چکا تھا۔

"ہاں بولو رازی' کوئی خاص بات؟" انہوں نے رازی کی طرف دیکھا۔

"سر! میں نے سارہ خان اور میم سیمی کے کنفرڈ ٹکٹ ان تک پہنچا دیے ہیں۔ ضوفی ان کے ساتھ سفر کرے گی۔" رازی نے کہا۔

"ہاں... یہ بہت اچھا رہے گا' ضوفی خاصی سمجھ دار لڑکی ہے۔ وہ بہت اچھی طرح سب معاملات ہینڈل کرسکتی ہے۔"

"یس باس..." رازی بیوی کی تعریف سن کر خوش ہوتے ہوئے بولا۔

"اور یہ تمہاری بھی خوش قسمتی ہے۔" بلال نے اس پر چوٹ کرتے ہوئے کہا' جسے رازی نے نظر انداز کردیا۔

"اور سر! ایک اور اہم بات بھی بتانی تھی آپ کو۔"

"ہاں بولو..."

"سر! کل رات مس ماہ نور آپ سے ملنے کے لیے یہاں آئی تھیں۔ ان کی آمد کی اطلاع ملتے ہی میں خود انہیں گیٹ پر ریسیو کرنے گیا۔ باقی لوگوں کو بھی الرٹ کردیا گیا تھا۔ آپ کی ڈنر پر متوقع آمد کے پیش نظر میں اس وقت تک انہیں انٹرٹین کرنے کے لیے نشست گاہ کی طرف لا ہی رہا تھا کہ ان کا ارادہ اچانک بدل گیا اور وہ کسی اور سے ملاقات کا وقت ہو جانے کا بتا کر واپس پلٹ گئیں۔ میں نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی' مگر انہوں نے نہیں سنا۔ میں تو بلکہ انہیں مس سارہ خان کا رنگ اور پریکٹس روم دکھانے کی دعوت بھی دے رہا تھا' مگر میری بات سنتے ہی یکدم ان کا ارادہ بدل گیا۔"

رازی نے اپنی بات سنا کر ڈرتے ڈرتے باس کی طرف دیکھا۔ اسے پوری امید تھی ماہ نور کے یوں چلے جانے پر باس سخت ناراض ہوں گے اور سخت سست سنائیں گے' لیکن اس کی توقع کے برعکس باس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ ایک شرارت بھری مسکراہٹ۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

عنیزہ سید

میرا خیال ہے میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم اب اس کے پیچھے جا رہے ہیں نہ ہی اس کی کوئی بات کر رہے ہیں۔" بلال سلطان کا لہجہ اور بات ابراہیم کے لیے حوصلہ افزا ہرگز نہیں تھی۔

"لیکن انکل! میں نے بتایا کہ یہ لڑکی تو کسی ہی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" اس نے منمنا کر ایک کوشش مزید کرنا چاہی۔

"تمہارا کیا خیال ہے' میں بہت فارغ ہوں جو جب کوئی مجھ سے ملنا چاہے میں اس ملنے کے لیے Available (دستیاب) ہو جاؤں۔" وہ سخت اور خشک لہجے میں بولے۔

"نہیں ہرگز نہیں انکل! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں۔" ابراہیم نے زبان پھیر کر اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا ہے کہ اسے میں اپنے مان پر لایا تھا۔" اس نے ایک جذباتی وار کھیلنے کی کوشش کی۔ "میں نے ہی اسے یقین دلایا تھا کہ انکل میری بات کو اون کرتے ہیں کیونکہ مجھے وہ اپنے بیٹے جیسا ہی سمجھتے ہیں۔"

۲۸

اٹھائیسویں قسط

رازی نے بلال سلطان کو مسکراتے دیکھا اور اس کا رکا ہوا سانس بحال ہوا۔

"آپ مسکرا رہے ہیں سر! جبکہ میں سمجھ رہا تھا کہ مس ماہ نور کے یوں چلے جانے پر آپ ناراض ہو سکتے ہیں۔" اس نے ان کے اچھے موڈ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہوں!" وہ مسکرا کر بولے۔ "بات ہی مسکرانے والی سنائی تم نے۔" انہوں نے رازی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "رازی! کیا تم جانتے ہو کہ عشق اور آتش دونوں برابر کیسے ہو سکتے ہیں۔"
"عشق اور آتش!" رازی نے دہرایا اور اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سامنے دیکھتے ہوئے غور کرنے لگا۔
"اچھا چلو رہنے دو اگر نہیں پتا تو۔" وہ ہنس دیے۔ "دماغ پر زیادہ زور ڈالنے سے نقصان ہوتا ہے۔"
"لیکن ضوفی سر!" رازی نے باچھیں پھیلائیں۔ "وہ ایک wise (ذہین) لیڈی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اسے ضرور پتا ہو گا عشق اور آتش دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں۔"
"واہ۔۔۔!" وہ ایک دفعہ پھر کھل کے ہنس دیے۔ "تم شاید دنیا کے واحد انسان ہو جو اپنی بیوی کی عقل مندی کا اتنا اور زوردار اعتراف کرتے ہو۔"
"آئی ایم آنرڈ سر!" رازی نے ان کی بات پر غور کیے بغیر باس کے ہنس دینے پر نوکری کے تقاضے پورے کرتے ہوئے کہا۔ بلال سلطان کو ایک بار پھر ہنسی آ گئی۔
"تمہیں پنجابی آتی ہے رازی؟" انہوں نے اپنی ہنسی کو بمشکل ضبط ہوئے کہا۔
"آ آ آ۔" رازی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ فوری طور پر کیا جواب دے جس سے نوکری پر کوئی زد نہ آئے۔
"آپ بولیں سر! اگر کوئی بات ہے پنجابی کی میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔"
"اچھا تو پھر سنو' ایک مشہور پنجابی کہاوت ہے کہ "جس تن لاگے اوہی جانے"
"اچھا سر!" رازی نے ایک بار پھر باچھیں پھیلائیں۔ "ویل سیڈ سر!"
"تمہاری سمجھ میں آیا' اس کا مطلب کیا ہے۔"
"نہیں سر! لیکن جو بڑی بات ہوتی ہے' جو اچھی بات ہوتی ہے اکثر وہی کوٹ کی جاتی ہے' آپ نے بھی بڑی اور اچھی بات ہی کوٹ کی ہو گی نا سر!"
"ہوں!" بلال نے سر ہلایا۔ "تمہیں پتا ہے میں نے یہ بڑی اور اچھی بات کیوں کوٹ کی؟"
"نہیں سر!"
"تم سے ماہ نور کا یوں چلے جانا سن کر مجھے یہ بات یاد آ گئی۔" وہ سنجیدہ ہو گئے۔ "جس دل کو لگن لگی ہوتی ہے نا کسی چیز کی' وہی جانتا ہے کہ اس کا حال کیا ہے۔"
"ہوں' مجھے معلوم نہیں کہ مس ماہ نور کے دل کو کیا لگن لگی ہے سر! لیکن وہ اس طرح کیوں چلی گئیں پھر بھی۔"
"تم نہیں سمجھ پاؤ گے۔" بلال نے سر ہلایا۔ "یہ بتاؤ سارہ کہاں ہے؟"
"مس سارہ اندر ہیں' مس انجلین دی ہیئر ڈریسر ان کے بال بنا رہی ہیں غالباً۔"
"اچھا!" بلال سلطان مسکرائے۔ "بہت اچھے اور وہ جو خاتون ہیں سیمی وہ؟"
"وہ بھی مس سارہ کے پاس ہی ہیں۔"
"ضوفی سے بولنا' واپس آ کر اپنے ساتھ سیمی کو بھی ایڈ کر لے مینجمنٹ میں۔ مجھے یقین ہے کہ "سیمی" ایک پرفیکٹ ہاؤس منیجر ثابت ہو سکتی ہیں۔"
"جی سر!" رازی کا دل ڈوبنے لگا۔

"ڈونٹ یو وری رازی۔۔۔! اس سے تمہاری نوکری پر کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔" بلال سلطان اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے۔ "میرے پاس کام کرنے والے لوگ جب بھی کام چھوڑ کر گئے' اپنی مرضی سے گئے۔ میں نے

خود کبھی کسی کو فائر نہیں کیا لہٰذا تمہیں غم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"
"جی سر۔ تھینک یو سر!" رازی کو اطمینان ہوا۔
"سارہ' ضوفی اور سیمی کے جانے کے اگلے روز میرا تین' چار روز کا بیگ تیار ہونا چاہیے۔" انہوں نے جاتے جاتے رک کر کہا۔
"کیا آپ بھی کہیں جا رہے ہیں سر؟"
"ہاں۔۔۔ ارادہ باندھ رہا ہوں۔ دیکھو' جانا ہوتا ہے یا نہیں۔" وہ کمرے سے باہر جاتے ہوئے بولے۔
"Yepice" بلال کے جانے کے بعد رازی نے ایک چھوٹا سا نعرہ مارتے ہوئے خود کو مخاطب کیا۔ "ضوفی بھی جا رہی ہے اور باس بھی اور تم مسٹر رازی! بہت ہی زیادہ مزے کرنے والے ہو۔" اس نے اپنے شانے سے نامحسوس گرد انگلی کی مدد سے جھاڑتے ہوئے کہا۔ "ہیلو اسلام آباد اینڈ الٹس نائٹ سینیریو۔۔۔ میں آ رہا ہوں۔" اس نے قدرے بلند آواز میں کہا اور کسی شوخ سی دھن پر سیٹی بجاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

"مبارک ہو' تمہیں اسپتال سے ڈس چارج کیا جا رہا ہے۔" نادیہ نے اس کے کمرے میں آ کر کہا۔ اس نے اس میگزین پر سے نظر ہٹا کر نادیہ کی طرف دیکھا۔
"ہاں۔ تمہیں ڈس چارج کیا جا رہا ہے۔" نادیہ آگے بڑھی اور اس کے قریب مارننگ گلوری کے تازہ شگفتہ پھول رکھنے لگی۔ اس نے نظر اٹھا کر سعد کی طرف دیکھا' اس کا شیو پھر بڑھ آیا تھا' وہ تکیوں اور کشنز کے سہارے بیڈ پر نیم دراز تھا۔
"تمہاری صحت بہت بہتر ہو رہی ہے' ماشاء اللہ!" نادیہ نے پھول رکھنے کے بعد کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
"تمہارے منہ پر یہ الفاظ کچھ زیادہ ہی چڑھ گئے ہیں۔" سعد نے میگزین ایک طرف رکھنے کے بعد کہا۔ "ماشاء اللہ' سبحان اللہ' الحمد للہ' ان شاء اللہ۔" وہ رک کر ذرا سا مسکرایا۔
"اور مزے کی بات یہ ہے کہ تمہارے اجنبی سے لہجے میں یہ الفاظ بہت اچھے لگتے ہیں۔"
"ہاں!" نادیہ نے بے نیازی سے کہا۔ "یہ الفاظ بولنا بہت ضروری ہیں کیوں کہ ان سے ہمارا ایمان ظاہر ہوتا ہے۔"
"اور تم نے یہ ایمان پکڑا کیسے؟" وہ مسکرا کر بولا۔
"میں شعوری کوشش کر کے اس کے پیچھے گئی۔"
"شعوری کوشش!" وہ چونکا۔ "کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ میں نے دنیا کے سب مذاہب کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ نہیں نکالا کہ یہ ہی اصل دین ہے بلکہ میں نے یہ سوچ لینے کے بعد کہ یہ ہی اصل دین ہے اس کا جائزہ لیا۔ میں نے سوچا اگر یہ میرے تعقل کے سوالات کے جواب نہ دے سکا تو پھر کسی اور طرف رجوع کر لوں گی' لیکن ہوا یوں کہ مجھے میرے سارے سوالوں کے جواب مل گئے بہت تفصیل اور وضاحت کے ساتھ۔"
"تم نے یہ فیصلہ کیوں کر لیا کہ یہ ہی اصل دین ہے۔ تقابلی جائزہ کیوں نہیں لیا سب ادیان کا؟" سعد کے لہجے میں تجسس تھا۔ "تمہاری ممی بھی تو ایک مذہب سے تعلق رکھتی ہیں' اسی مذہب کے پیروکاروں کے درمیان تم نے اب تک کی عمر گزاری پھر تم نے اسی دین کا جائزہ لینے کا کیوں سوچا؟"

"اس لیے کہ... "یہ میرے ڈیڈی کا مذہب تھا۔" اس نے نظریں اٹھا کر سعد کی جانب دیکھا۔
"ڈیڈی کا مذہب!" وہ ہنسا۔ "چاہے ڈیڈی کو دین مذہب جیسی کسی شے سے کوئی سروکار ہی نہ ہو، چاہے ڈیڈی کا اپنا کوئی دین ایمان ہی نہ ہو۔"
"یہ مجھے نہیں پتا۔" نادیہ نے سر ہلایا اور اٹھ کر سعد کی چھوٹی چھوٹی چیزیں سمیٹنے لگی۔
"میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ ڈیڈی سے منسوب چیزیں مجھے ہمیشہ اچھی لگتی رہی ہیں، میں ان سے ایک عجیب سا قلبی تعلق محسوس کرتی رہی ہوں۔ جیسے وہ گھر جو ڈیڈی کا تھا، جیسے وہ زبان جو ڈیڈی بولتے تھے، جیسے وہ شہر جس میں ڈیڈی رہتے تھے، جیسے وہ ملک جو ڈیڈی کا تھا۔" نادیہ کی آواز بھیگنے لگی۔ "ایسے ہی وہ مذہب بھی جس کی ڈیڈی تقلید کرتے تھے۔" اس نے سعد کی اسپورٹس جیکٹ کو تہہ کر کے اپنے سینے سے لگایا اور مڑ کر سعد کی طرف دیکھنے لگی۔
"کتنی معصوم اور سیدھی ہے یہ لڑکی!" سعد نے دل میں سوچا۔ "اور جو کبھی یہ ڈیڈی کا وہ چہرہ دیکھ لے جو میرے سامنے بے نقاب ہو چکا ہے تو اس کی زندگی کی ساری کی ساری فیسی نیشنز کیسے کٹاک کٹاک ٹوٹ جائیں۔"
"تم تیار ہو جاؤ، اسپتال کا عملہ تمہارے چیک اپ کے لیے آ رہا ہے، اس کے بعد ڈسچارج سلپ مل جائے گی۔"
"ایک منٹ!" سعد نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔ "مجھے ذرا سوچ لینے دو کہ ڈسچارج ہونے کے بعد مجھے کہاں جانا ہے۔"
"کیا مطلب، کہاں جانا ہے؟" نادیہ کی آنکھیں پھیلیں۔ "میرے ساتھ جانے کے علاوہ تم اور کہاں جا سکتے ہو۔"
"تمہارے ساتھ؟" سعد نے اس کی طرف دیکھا۔ "تمہارے ساتھ کہاں جاؤں گا میں؟"
"وہیں جہاں میں رہتی ہوں۔" وہ ہنوز اس کی جیکٹ سینے سے لگائے ہوئے تھی۔ "اور یقین جانو، وہ کوئی بری جگہ نہیں ہے۔" وہ اس کے قریب آئی۔ "میں اس کو تمہارے لیے اور بھی آرام دہ بنانے کی کوشش کروں گی۔ بس اب تم انکار مت کرنا... پلیز۔" سعد نے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا، جن میں خواہش تھی، التجا تھی اور حسرت بھی۔
"اچھا!" وہ سر جھکا کر بولا۔ "ہم وہیں چلیں گے۔"
"اوف!" نادیہ نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ "مجھے یقین تھا تم منع نہیں کرو گے۔"
سعد نے ڈبڈبائی ہوئی نظروں سے نادیہ کو خوش ہوتے دیکھا اور اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کی پوریں اپنی آنکھوں پر رکھ لیں۔

☆ ☆ ☆

ادق باتیں مولوی سراج سرفراز کی سمجھ میں کم ہی آتی تھیں، اگر کوئی ان کے سامنے ایسی گفتگو کرتا بھی تھا تو وہ موٹے موٹے لفظ ذہن نشین کر کے بعد میں رابعہ بی بی سے ان کے معنی پوچھ لیتے تھے اور گفتگو کرنے والے کے سامنے سر ہلانے ہی پر اکتفا کرتے تھے، لیکن اس روز مولوی صاحب کی جان خوب چوہے دان میں پھنسی تھی۔ ان کا اکلوتا داماد افتخار احمد عرف کھاری اس سے پہلے کبھی بالمشافہ ان سے گفتگو کرنے نہیں بیٹھا تھا، ان دونوں کے درمیان جیسے چوری کا رشتہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے مختصر گفتگو پر ہی اکتفا کرتے تھے، لیکن اس روز کھاری ان

سے ان کی اپنی تاریخ کی باتیں چھیڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ ایسی تاریخ جسے مولوی صاحب نے بصد وقت بھلایا تھا۔
"بھین جی تے کج نئیں بتاتیں مولی جی، آپ کو بھی تو پتا ہی ہوئے گا نا۔" وہ بہت سے سلے بخیے ادھیڑتا ہوا کہہ رہا تھا۔
"یہ کیا کہانی سنا رہا ہے۔" مولوی صاحب نے گھومتے دماغ کے ساتھ سوچا۔ "یہ سب جو اسے پتا ہے، یہیں کبھی، کہیں بیٹھ کر اسے سنایا گیا ہو گا مگر کب؟ اور مجھے خبر بھی نہیں ہوئی۔" انہوں نے سر اٹھا کر کھاری کی طرف دیکھا۔ "اس شخص کا بیٹا، ادھر اس گاؤں میں پہنچ گیا، رابعہ بیگم نے اسے دیکھ بھی لیا، پہچان بھی لیا اور اس کی کھوج میں اسے لگا بھی دیا اور مجھ سے ذکر تک نہیں کیا۔ وہ شخص جس نے آج تک ہمیں چوہے بلی کے کھیل میں الجھا رکھا ہے، ذرا آہٹ ہوتی ہے اور لگتا ہے کہ بلی آئی کہ آئی۔ اس نے جھپٹا مارا کہ مارا۔"
انہیں ماضی کے جھروکوں سے جھانکتا ایک چہرہ نظر آنے لگا۔
"واہ رابعہ بی بی! عمر بھر تم نے مجھے جس اذیت کے ساتھ برداشت کیا اور خود کو ہمیشہ مجھ سے برتر خیال کیا تمہارے دماغ کا وہ غرور آج بھی نہیں گیا، جب ہی تو مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ کسی معاملے کی خبر مجھ کو بھی کر دیتیں۔" انہیں افسوس ہوا۔
"مولی جی۔" کھاری مضطرب نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ "تہانوں خبر ہوئے گی کہ سعد باؤ صاحب کا کوئی اور بھرا (بھائی) ہے کہ نہیں۔"
"سعد باؤ!" مولوی صاحب نے دل میں دہرایا اور ان کی نظروں کے سامنے من موہنی صورت والا ایک چھوٹا سا بچہ گھوما جو روتا تھا اور وہ اسے اپنے کندھے پر بٹھائے ادھر سے ادھر اس خیال سے چکر لگاتے پھر رہے تھے کہ اس طرح خوش ہو کر وہ رونا بند کر دے گا۔
"سعد باؤ کا قصہ کب دوبارہ کھل گیا۔" مولوی صاحب کو اپنی لاعلمی پر رونا آنے لگا۔
"مولوی جی آپ نے بھی تو اپنی آنکھوں سے سعد باؤ کی والدہ کو ذبح ہوتے دیکھا تھا نا۔" کھاری پوچھ رہا تھا۔ "پھر سعد باؤ کا کوئی اور بھائی تو پیدا نہیں ہو سکتا تھا نا۔"
مولوی صاحب اور گنجلک سوال، وہ اپنی سرمہ لگی آنکھوں سے کھاری کو دیکھتے ہی چلے جا رہے تھے۔
"مولوی صاحب! میں ہر طرف سے ہار کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ مجھے آپ ہی کچھ بتا دیں۔" کھاری تھا کہ فریاد کیے چلا جا رہا تھا۔
"تمہاری بھین جی جن سوالوں کا جواب نہیں دے پائیں برخوردار!" مولوی صاحب نے سر پر لپٹا چار خانہ صافہ کھول کر دوبارہ اسے سر پر باندھتے ہوئے کہا۔ "ان کے جواب میرے پاس ہو سکتے ہیں؟"
"نا کرو ایسا مولی جی!" کھاری تڑپ کر بولا۔ "تہانوں سب پتا اے۔"
"اللہ جل شانہ گواہ ہے۔ برخوردار! اس پوری داستان میں، میں تو ایک پٹے ہوئے مہرے کی طرح کبھی ادھر کبھی ادھر لڑھکتا رہا۔" مولوی صاحب نے سچائی کے ساتھ کہا۔ "سمجھ لڑھکایا جاتا رہا۔ مرحومہ آپا جی کے مجھ غریب پر بڑے احسان ہیں۔ وہ ان دنوں میرے لیے دو وقت کی روٹی کا بندوبست کرتی رہیں، جب میں مسکین، یتیم مولانوں کے گھر کی ڈیوڑھی میں پڑا ان کے گھر کے اوپر کے کاموں کے لیے بھاگتا پھرتا تھا اور ان کے گھر میں میرے لیے صبح شام دو وقت کی روٹی بھی نہیں پک سکتی تھی، کام کے عوضانے میں صرف چار لفظ قرآن پاک کی تفسیر کے سمجھا دیے جاتے اور حفظ قرآن میں معاونت دی جاتی تھی بس۔ ایسے میں اللہ بخشے آپا جی کو انہوں نے خود پیغام بھجوایا کہ دو وقت کی روٹی کنڈی بجا کر ان کے دروازے سے لے جایا کروں بس اسی احسان نے مجھے ان کا غلام بنایا، رابعہ بی بی کا شوہر بنایا اور پھر سعدیہ بیٹی کا باپ بنا دیا اور پھر اسی احسان کا انجام وہ دربدری، وہ چوروں کی طرح رات کے

اندھیروں میں ایک شہر سے دوسرے شہر نقل مکانی مقدر بن گئی۔

میں نہ تب کچھ جانتا سمجھتا تھا جب وہ سب ہو رہا تھا نہ ہی اب تک کچھ جان سکا ہوں 'سمجھ سکا ہوں اسی لیے تو ماضی کے وہ سارے باب میں نے بھلا دیے ہیں۔ اللہ جل شانہ نے برسوں کے دھکوں اور مشقتوں کے بعد یہ سکون کا ٹھکانا نصیب فرما دیا ہے۔ عزت کی زندگی پہلی دفعہ جی رہا ہوں 'زیادہ کٹ چکی 'تھوڑی رہ گئی ہے 'اللہ جل شانہ سے درخواست ہے 'یہ بھی اچھی گزر جائے عزت کے ساتھ۔"

اب کے مولوی صاحب کو ہونقوں کی طرح منہ کھول کے دیکھنے کی باری کھاری کی تھی اور وہ دیکھے چلا جا رہا تھا۔

"میری تم کو بھی یہ ہی نصیحت ہے برخوردار!" مولوی صاحب کھاری کا ہونق پن دیکھ کر ایک دم سمجھ دار ہو گئے۔ "زیادہ تفتیشوں میں مت پڑو 'جو گزر چکا وہ گزر چکا 'جو ہو رہا ہے اسے ہونے دو کیونکہ ہونی کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ چوہدری صاحب تم سے بہت پیار کرتے ہیں 'تمہارے لیے اتنا ہی بہت ہے 'چوہدری صاحب کی محبت کے سبب تمہیں رابعہ بیگم کی بیٹی کا ساتھ مل گیا۔ تمہاری زندگی سنور گئی۔ بس اب ادھر ادھر کے سوال کیے 'مزے سے گزارتے چلے جاؤ اپنی زندگی۔"

"سعدیہ صرف بھین جی دی بیٹی تو نئیں نا 'آپ کی بیٹی وی تو ہے نا۔" کھاری کا دماغ مولوی صاحب کی گفتگو کے ایک نکتے پر اٹک گیا۔

مولوی صاحب کے چہرے پر مبہم سی مسکراہٹ ابھری۔ "میری بھی بیٹی ہے 'لیکن وہ ہمیشہ سے ماں کے زیادہ قریب رہی ہے۔ اس کی تربیت 'تعلیم 'سلیقہ سب ماں کی محنت کا نتیجہ ہے۔"

"خیر۔" کھاری نے سر جھٹکا۔ "تو اس کا مطلب ایہہ وے کہ آپ بھی مجھے کچھ نہیں بتائیں گے۔"

"میرے پاس کچھ بتانے کو ہو تو بتاؤں نا!" مولوی صاحب نے دزدیدہ نظروں سے مسجد کے داخلی دروازے کی طرف دیکھا۔ ابھی تک ان کا ناشتہ نہیں آیا تھا۔ ان کے دل کو بے چینی سی ہونے لگی تھی۔ "جو مجھے پتا ہے نا۔" وہ دوبارہ کھاری کی طرف دیکھ کر بولے۔ "وہ تم نے خود سنا دیا۔ اب میں کیا بتاؤں۔"

"سعد باؤ دا بھرا!" کھاری نے کہا۔

"نہیں۔" مولوی صاحب نے سر ہلایا۔ "وہ ہو نہیں سکتا 'ہوتا تو ہمیں ضرور خبر ہوتی۔" کھاری کی آخری امید پر بھی منوں پانی پڑ گیا۔

"لیکن اگر کوئی ہوتا بھی تو برخوردار! تمہیں اس کی اتنی کھوج کیوں ہے؟" مولوی صاحب نے پوچھا۔

"کج نئیں مولی جی 'بس خوامخواہ۔" کھاری نے سر جھکا کر آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے ان کی نمی خشک کی۔

"چلو بھئی وہ دیکھو۔ ناشتہ آ گیا۔" اتنے میں ایک بچہ سٹیل کا ناشتہ دان اٹھائے مسجد میں داخل ہوا تو مولوی صاحب کے گویا سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا۔

"چھوڑو سارے سوال اور بھول جاؤ ساری فکریں۔" انہوں نے ناشتہ دان کھولتے ہوئے کھاری سے کہا۔ "ناشتہ کرو 'ناشتہ۔۔۔ بھئی برخوردار!" انہوں نے ناشتہ لانے والے کو مخاطب کیا۔ "بھاگ کر گھر سے ایک گلاس اور پکڑ لاؤ۔ امی سے کہنا 'سعدیہ باجی کا میاں افتخار احمد بھی ناشتہ ادھر ہی کرے گا۔" لڑکا سر ہلاتا بھاگ گیا۔

"او نئیں مولی جی!" کھاری اٹھتے ہوئے بولا۔ "مجھے بکھ نہیں ہے۔"

"او ہو برخوردار! بیٹھو تو سہی 'چکھو تو سہی۔" مولوی صاحب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔

☼ ☼ ☼

"میں آپ کا ایک ادنیٰ پرستار 'آپ کے فن کا ایک حقیر سا قدر دان 'ملاقات کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں 'کیا

شرف ملاقات حاصل ہو سکتا ہے؟ وقت؟"

خالص اردو ٹائپنگ میں بھیجا پیغام فلزا نے حیرت سے پڑھا اور سوچ میں پڑ گئی۔ بھیجنے والا کون ہو سکتا تھا۔ پیغام میں انڈر ٹون کی طرح بجتا انداز 'مانوس سا لگ رہا تھا 'لیکن وہ مانوس کون ہو سکتا تھا 'یاد آ کر نہیں دے رہا تھا۔ وہ دو دن ذہن پر زور دینے کی کوشش کرتی رہی 'مگر یاد نہ کر پائی تھی۔

"آپ کی جانب سے جواب نہ موصول ہونے پر تشویش ہے۔ امید ہے کہ آپ کے مزاج بخیر ہوں گے۔" دو دن کے بعد اسی نمبر سے دوسرا پیغام موصول ہوا۔

"کون ہو سکتا ہے 'جس کے پاس میرا نمبر ہو اور وہ ایسے پیغامات بھیجے۔" فلزا نے سوچا۔ "میرا نمبر تو بہت ہی محدود لوگوں کے پاس ہے۔"

"لیکن بات کہنے کا انداز کتنا مانوس ہے 'یوں جیسے کوئی عرصے سے جانتا ہو 'انداز سے بے تکلفی جھلکتی ہے اور اپنائیت بھی۔" پھر ایک نام نے اس کے ذہن میں روشنی کی طرح کوندا مارا۔

"اچھا تو یہ تم ہو۔" وہ بے اختیار مسکرائی۔ "تمہاری سرپرائز دینے کی عادت نہ گئی۔" اس کا ذہن ہلکا پھلکا ہونے لگا۔

"واہ سعد سلطان! اتنے عرصے کے بعد یاد بھی کیا تو کس انداز میں۔" وہ مسکراتے ہوئے سوچنے لگی۔ "ہاں تم سے ملاقات تو بہت ضروری ہے اور کرنی بھی ہے۔"

"ہاں ضرور ملاقات ہو سکتی ہے 'چوہدری سردار کا فارم ہاؤس تمہارے لیے نئی جگہ تو نہیں ہو گی 'اسی ویک اینڈ پر میرا وہاں جانا متوقع ہے 'تم بھی آ جاؤ۔ ملاقات ہو جائے گی۔" اس نے اس نمبر پر جواب بھیجا تھا۔

☼ ☼ ☼

سعد کا آئی فون اب وہ ہر وقت چارجڈ رکھتی تھی 'خود کو درپیش معمے کے حل کے لیے اسے سعد کے دیے ہوئے کلیوز کی کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی تھی 'لیکن اس رات سے اب تک اس کا دل سعد کے آئی فون کی طرف دیکھنے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔

"کیا فائدہ ساری مارا ماری کا 'کیا ضرورت جستجو میں پڑنے کی۔" اسے بے وجہ رونا آ رہا تھا۔

"سعد کے صاف اعترافات کے بعد بھی میرا دل کیوں بے یقین ہو جاتا ہے جب میں سارہ خان کی طرف دیکھتی ہوں 'کیسی مقدر کی سکندر لڑکی ہے وہ 'پہلے سعد سلطان کی ہتھیلی کا پھپھولا بنی رہی اور اب بلال سلطان نے اسے جان کے ساتھ لگا رکھا ہے اور میں۔۔۔" اس کا دل اڑنے لگا۔ "میں کون ہوں اس سارے چکر میں۔۔۔"

"پس منظر میں اصل منظر تلاش کرنے کی کوشش کیجیے بی بی صاحب!" اسے اختر کی کہی بات یاد آئی۔ "انا اور گمان کی پٹی نظروں سے اتار دیجیے۔ آپ کو منظر صاف صاف نظر آنے لگے گا۔"

"مگر منظر ہے کہاں؟" اس نے بے دلی سے ہاتھ میں پکڑا آئی فون ایک طرف ڈال دیا۔

"تم تو بلال سلطان سے ملاقات کرنے اور ان سے کھاری کی حقیقت معلوم کرنے گئی تھیں نا۔ تمہیں اس سے کیا واسطہ کہ بلال سلطان کے گھر میں اب سارہ خان رہتی ہے یا انجلینا جولی 'تم کیوں یہ خبر سنتے ہی وہاں سے واپس بھاگ لیں۔" اچانک دماغ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔

"ایک بار پھر پیش منظر دیکھ کر انا 'گمان اور فریب کا شکار نہیں ہو گئیں کیا تم؟" دماغ روبرو آ کر کھڑا ہو گیا۔

"اگر تم رک کر انتظار کرتیں تو کیا پتا بلال سلطان سے ملاقات میں معاملے کی اصل شکل تمہارے سامنے آ جاتی۔"

"ہونہہ!" دل نے بے زاری ظاہر کی۔ "تمہاری بلا سے بلال سلطان کے گھر سارہ خان رہتی ہے یا کوئی اور تمہارا اس معاملے سے کیا لینا دینا۔ تمہارا تعلق سعد سلطان سے ہے اور تمہیں اسی کی کھوج لگانی ہے' بلال سلطان جیسے روکھے اور بددماغ آدمی سے مل کر فائدہ بھی کیا ہونا تھا' ان کا کیا ہے' چاہے تو سامنے دیکھ کر بھی ملاقات سے انکار کردیتے۔" دل نے اس کے جذبات کا دفاع کیا۔

"لیکن۔" دماغ کچھ کہنا چاہتا تھا' لیکن اسی دم حیرت انگیز طور پر سعد کا آئی فون بجنے لگا۔

دشت تنہائی میں اے جان جہاں لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے' تیرے ہونٹوں کے سراب

اس نے تیزی سے ہاتھ بڑھا کر فون پکڑا' مخصوص کالر ٹیون کے ساتھ فون کی اسکرین پر دی آرٹسٹ کا نام روشن ہو رہا تھا۔ ازلی و ابدی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے فون آن کرکے کان سے لگالیا۔

"جتنے تمہارے چہرے ہیں' شاید اتنے ہی نمبر بھی اپنے نام رجسٹر کروا رکھے ہیں تم نے۔" کال کرنے والی بغیر کسی سلام دعا کے شروع ہوگئی۔ "اتنے دن سے یہ نمبر بند کر رکھا تھا نا تم نے اور اپنی دانست میں غائب بھی تھے' دیکھ لو جس دوسرے نمبر سے تم نے مجھے اپنے تئیں گمنام پیغام بھیجا میں نے نمبر بھی پہچان لیا اور پیغام بھی۔ یہ بتاؤ کدھر چھپے ہوئے ہو۔ یہ بات پوچھنے کے لیے میں نے دانستہ اس مانوس نمبر پر کال کی چیک کرنے کے لیے کہ جو میں سمجھ رہی ہوں' وہ ٹھیک سمجھ رہی ہوں یا نہیں اور دیکھ لو میں ٹھیک سمجھی۔"

ماہ نور نے بے یقینی کے ساتھ بے تکلفی کے اس مظاہرے کو سنا اور فون کان سے ہٹا کر ایک بار پھر اس کی اسکرین کو یوں دیکھا جیسے اس میں کال کرنے والی کی تصویر نظر آرہی ہو۔ پھر اس نے دوبارہ فون کان سے لگالیا۔

"اب خاموش کیوں ہوگئے' لگ گئی نا چپ' ہوگئے نا گنگ؟" وہ آواز کہہ رہی تھی۔ "تم نے ملاقات کا وقت مانگا ہے نا؟" ماہ نور کے کان کھڑے ہوئے۔

"تو ملاقات تو بہت ضروری ہے' ماضی کی آغوش میں سوئے جس قصے کو تم چھیڑ گئے تھے اس کی بازگشت کے پیچھے چلتی میں بھی ادھر ہی پہنچ گئی جہاں سے تم بن کر میرے پاس آئے تھے' میں ممنون ہوں کہ تم نے زندگی بھر اپنی طرح میرے سینے میں گڑے تیر کو یوں ہلایا کہ وہ نکالا ہی چاہتا ہے' ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔ ارے اب بولتے کیوں نہیں میری مردم شناسی پر کہیں بے ہوش تو نہیں ہوگئے۔" ہنسی کی آواز۔ "چلو نہ بولو۔ بس اتنا بتادو ڈن ہے نا وہاں ملاقات جہاں میں نے تمہیں بتایا ہے۔ ہیلو۔۔۔ آرہے ہو نا۔۔۔ ہیلو۔۔۔ ہیلو!"

آواز کہہ رہی تھی اور کہے جا رہی تھی' لیکن ماہ نور کال کاٹ چکی تھی۔

"دی آرٹسٹ۔" اس نے کال لاگ کو چیک کیا۔ اس نمبر اور نام سے آنے والی کالز اور مسیجز کی پوری تاریخ فون میں محفوظ تھی۔ اس نمبر سے دوبارہ دو بار کال آئی' لیکن اس نے وصول نہیں کی۔ وہ اس نمبر کی تاریخ دیکھ رہی تھی۔ فون کالز کی تعداد محدود مگر موجود تھی۔ پیغامات ذومعنی اور ناقابل فہم۔۔۔ یہ کون تھی جو اس قدر آشنا اور بے تکلف تھی۔

سوچ کا ایک در مزید وا ہوگیا۔ "دشت تنہائی میں' یہ وہی کالر ٹیون تھی جس کی کال کھاری کی شادی پر جاتے ہوئے راستے میں سعد نے چار بار کاٹی تھی اور اس کے پوچھنے پر کہا تھا۔

"تم یہاں بہت خوش ہو۔ میں تمہیں بتا کر ناخوش نہیں کرنا چاہتا۔"

"او خدا! یہ کیا گورکھ دھندا ہے اور اس میں کہاں ۔۔۔ میں پھنس گئی۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے سوچا اور دوبارہ فون کی طرف متوجہ ہوئی۔

فضل دین ولد کرم الٰہی

ساکن ڈھوک کھوکھراں نزد چکری وکیلاں
تحصیل گوجر خان، ضلع راولپنڈی

اس نمبر سے آنے والے ایک پیغام میں ایک پتا بھیجا گیا تھا۔

فضل حسین اور میمونہ آنٹی۔" ماہ نور کو اب تک اس معمے کے تمام ٹکڑے ازبر چکے تھے' اس نے چونک کر اس پیغام کو بار بار پڑھا جس کے جواب میں سعد کی طرف سے بھرپور شکریہ ادا کیا گیا تھا۔

"فضل دین ولد کرم الٰہی۔"

اس نے ایک مرتبہ پھر پڑھا اور اپنے فون میں موجود نقشوں والی سہولت میں ڈھوک کھوکھراں نزد چکری وکیلاں کا نقشہ تلاش کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼
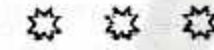
اس کی نظروں کے سامنے روشنیاں تھیں اور رنگ تھے۔ شور تھا' قہقہے' تالیاں' سیٹیاں پر اس کے کان ہر صورت کو سن رہے تھے۔ وہ ان سب سے مانوس تھا۔ شاید وہ ایسی ہی رونقوں میں پلا بڑھا تھا' مگر ایسا کیوں تھا کہ اب یہ رونقیں بھی اسے سیاہ عباؤں میں ملبوس ماتم کرتی مخلوق نظر آنے لگی تھیں' مگر وہ پھر بھی اس سب کا حصہ اور ان کے درمیان موجود تھا۔

پنڈال سے باہر نکل کر اس نے اپنے سر پر رکھی پیلی وگ اتار کر ہاتھ میں پکڑی اور خود چھولداریوں کے قریب گرے درخت کے ایک موٹے تنے پر بیٹھ گیا اس کے سامنے روشنیاں اور رنگ تھے۔ لوگ باگ' زندگی کی مصروفیات' مسائل اور پریشانیوں سے منہ موڑ کر گھڑی دو گھڑی کی اس تفریح کی طرف بھاگے چلے آتے تھے اور وہ سب جو یہاں آنے والوں کے لیے تفریح کا' خوشیوں کا' تالیوں اور سیٹیوں کا اہتمام کرتے تھے۔ خود اپنے مسائل اور پریشانیوں کا کیا علاج کرتے تھے' کون جانتا تھا۔

وہ سامنے دیکھتے ہوئے سوچتا چلا جا رہا تھا تب ہی اسے اپنے شانے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ اس کے پیچھے اسی تنے پر خان چاچا بیٹھا تھا۔

"کیا بات ہے شہزادے! کئی دن سے میں دیکھ رہا ہوں' کچھ اداس اداس ہے تو۔۔۔" خان چاچا نے اس سے پوچھا تھا۔

وہ کچھ دیر تک اسے جواب دینے کے بجائے خاموش بیٹھا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ خان چاچا جس نے بلیو ہیون سرکس کو اپنی زندگی کے بہترین سال دیے تھے۔ برسوں اس نے خان چاچا کو ہاتھ میں پتلی چھڑی پکڑے' باریک چمڑے جڑی لاٹھی پکڑے کرتب بازوں کو مختلف کرتب سکھاتے دیکھا تھا' کرتب سکھانے والا خان چاچا دل' گردے اور جگر کا اتنا سخت تھا کہ بڑوں' بچوں' مردوں' عورتوں' جانوروں کی پنڈلیوں' پیروں اور پشتوں کی کھالیں اڑاتے اسے ذرا سا بھی رحم نہیں آتا تھا۔ اس کا کام کرتب بازوں کو تربیت دینا تھا اور اس معاملے میں وہ کسی کو اس وقت تک بخشنے کا قائل نہیں تھا جب تک سیکھنے والے کی ایک ایک جنبش اس کے قابو میں نہ آجاتی۔

اسی خان چاچا نے بلیو ہیون سرکس کے لیے شیروں کو بلیاں اور ہاتھیوں کو چوہے بنا کر ان سے کام لیا تھا۔ اس کے سدھائے جانور سرکس رنگ میں جا کر یوں اشاروں پر حرکت کرتے تھے جیسے جنگل کی وحشت سے ان کا دور دور تک واسطہ نہ ہو۔ اس کے تربیت یافتہ نٹ' ایکروبیٹس' مسخرے' جادوگر بلیو ہیون سرکس کو دل کھول کر کما کر دیتے رہے تھے۔

مگر اب یہ ہی خان چاچا بوڑھا ہو رہا تھا بلکہ شاید بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس نے خان چاچا کی جھلسی ہوئی سیاہ پڑتی رنگت' سفید بالوں جن کو کن پٹیاں چھوڑ کر اس نے سرخ مہندی میں رنگ رکھا تھا۔ پیلے اور کیڑا کھائے ہوئے دانتوں اور کھنچی ہوئی جلد والے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور گزرتے ہوئے ماہ و سال کے چکر پر مزید ایمان لے آیا۔

"دیکھ کیا رہا ہے' بتانا؟" خان چاچا نے اسے خود کو یوں گھورتے دیکھ کر ہولے سے ہنس کر کہا اور جیب سے سستے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر اس میں سے ایک سگریٹ باہر کھینچ لیا۔

"تم ریٹائر ہوگئے ہو خان چاچا! یا دل چھوڑ دیا ہے' پریکٹس رنگ میں کبھی نظر نہیں آئے۔" اس نے خان چاچا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"لے!" وہ ہنس دیا۔ "سوال تو میں نے تجھ سے کیا تھا تو نے جواب دینے کے بجائے الٹا مجھ ہی سے سوال کر دیا۔"

"بتانا!" اس نے اصرار کیا۔

"دیکھ میرے شہزادے! وقت انسان کی عمر کو آگے دوڑاتا چلا جاتا ہے۔" خان چاچا نے سگریٹ کا دھواں ناک سے چھوڑتے ہوئے کہا۔ "عمر کے گھوڑے کی باگ کسی کے ہاتھ میں نہ کبھی آئی ہے نہ آئے گی' ہر بندہ اس سرپٹ دوڑتے گھوڑے کے ساتھ بس بھاگا چلا جاتا ہے اس کا خیال ہوتا ہے کہ زندگی کا سامان کر رہا ہے' اسی لیے فرصت نہیں ہے' پر پھر ایک دن اس گھوڑے کا دوڑتا قدم پہلی بار ٹھٹکتا ہے' پھر غلط پڑتا ہے' پھر ٹھوکر کھاتا ہے' ٹھوکر کھا کر گرتا ہے' سنبھلتا ہے' اٹھتا ہے پھر سے دوڑنے کی کوشش کرتا ہے' مگر نہ وہ چال رہتی ہے نہ ہی رفتار۔ اس وقت بندے کو پتا چلتا ہے۔ عمر گزر گئی اب بونس کی زندگی شروع ہوگئی۔"

"ہاہا۔ بونس کی زندگی!" وہ ہنسا۔

"ہاں۔ میرے جاپانی شہزادے' بونس کی زندگی۔" خان چاچا نے سر ہلایا۔ "بس جمع خرچ حساب کتاب' یہ ہی رہ جاتا ہے باقی انسان کی زندگی میں' میری بھی عمر گزر چکی ہے۔ اب میں بونس والے سالوں میں داخل ہو چکا ہوں' حساب کتاب' جمع خرچ۔" اس کے اپنے کیڑا کھائے دانت نکالے اور سگریٹ کا کش لگانے لگا۔

"جمع خرچ' حساب کتاب!" وہ بڑبڑایا۔ "خان چاچا اس جمع خرچ حساب' کتاب میں ابھی پریا کے کھاتے کی باری بھی آئی کہ نہیں۔" اس نے خان چاچا کی طرف دیکھا۔ "پریا' میرا مطلب ہے پریا رانی!"

اس کا سوال سن کر خان چاچا کا سگریٹ کا کش لینے کے لیے منہ کی طرف جاتا ہاتھ وہیں رک گیا۔

"اس کا کھاتہ جانے دے یار۔" اس نے ہاتھ جھٹک کر ادھ جلی سگریٹ دور پھینک دی۔

"اس کا کھاتہ کیسے جا سکتا ہے خان چاچا' تم نے اسے اپنے ہاتھوں پالا پوسا' اسے سرکس کی شہزادی بنایا اور پھر اسے بھول گئے' کیسے مانوں تم اسے بھول گئے۔"

"یادداشت ختم ہو جائے تو ذہن سے نام مٹ جاتا ہے' شکل بھول جاتی ہے پر میں کیا کروں میری تو کم بخت یادداشت بھی قائم ہے' ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔" خان چاچا نے سر دونوں ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے کہا۔

"پھر اس کا کھاتہ کیسے جانے دو گے' یہ بتاؤ۔"

"رات کو سونے کے لیے لیٹتا ہوں نا شہزادے! تو فلم چلتی ہے آنکھوں کے سامنے۔" خان چاچا نے سامنے دیکھا۔ "وزیر آباد لگا تھا سرکس جس کے ختم ہونے پر اپنے خیمے اکھاڑتے ہوئے ہماری نظر اس چند مہینوں کی بچی پر پڑی تھی جس کی ماں یا شاید جس کا باپ اسے ننگی زمین پر روتے ہوئے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔"

"ایسا!" اس نے یہ بات پہلی بار سنی تھی۔

"ہاں ایسا ہی۔" خان چاچا کے چہرے پر تلخی پھیلی۔ "شیرو نے بچی اٹھائی' تھانے لے گیا۔ مسجدوں میں اعلان کرائے' رپورٹیں درج کرائیں' سرکس تین دن وزیر آباد میں ہی رکا رہا پر بچی کے ہوتوں سوتوں کا کوئی پتا نہیں چلا۔

اتنے دن ہم نے بچی کو یوں سنبھالا جیسے وہ ہم میں سے ہر کسی کی ہی بچی ہو' وہ تھی بھی اتنی ہی پیاری کہ سب ہی کو اس پر پیار آتا تھا۔"

"پھر۔۔۔؟"

"پھر کیا؟ نہ کوئی دعوے دار آیا نہ ہی پولیس کسی ماں کو' کسی باپ کو ڈھونڈ سکی۔ شیرو کو اتنے دنوں میں نئی سوجھ چکی تھی' اس نے پولیس سے معاملہ کرلیا' بچی سرکس کے قافلے کے ساتھ اگلے پڑاؤ پر روانہ ہوگئی۔"

"بے چاری' بے نام نشان بچی۔"

"ہاں بے نام نشان بچی!" خان چاچا نے سرہلایا۔ "لیکن اس میں ہم میں سے کسی کا کوئی قصور نہ تھا کہ وہ بے نام نشان تھی۔"

"یہ بھی ہے۔"

"اس دنیا میں یہ واقعہ کوئی غیر معمولی نہیں کہ کوئی یوں بے نام و نشان بچہ کہیں پھینک گیا' آئے روز ایسے واقعات ہمیشہ سے ہی رونما ہوتے رہتے ہیں۔" خان چاچا نے کہا۔

"اور پھر اس کے بعد شیرو نے وہ بچی آپ کے حوالے کردی؟" اس نے سوال کیا۔

"اس نے نہیں کی' میں نے خود لے لی' میں نے اس سے کہا۔ بچی کے ہڈپیر سخت ہوجائیں گے تو میرے حوالے کرو گے۔ اسے ٹریننگ دو' پھر کام مشکل ہوجائے گا۔ بہتر ہے ابھی سے مجھے پکڑا دو بچی۔"

"گویا یہ فیصلہ ہوچکا تھا کہ بچی بلیو ہیون سرکس کا سرمایہ بننے والی تھی۔"

"ہاں!" خان چاچا عجیب سے ہنسی ہنسا۔ "شیرو کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اللہ نے اسے چھپر پھاڑ کر عطا کیا تھا ایک بچی جو آنکھ ہی سرکس کی آغوش میں کھولنے والی تھی' اسے سرکس کی شہزادی بننے سے کون روک سکتا تھا۔"

"اور پھر آپ نے اس کی ہڈیوں اور پیروں کو اٹھایا ہی اس ساخت پر کہ وہ لچک کی اعلا مثال بن گئے۔"

"ہاں!" خان چاچا کے چہرے پر دکھ کا تاثر ابھرا۔ "اس بچی کو احساس ہونے دیے بغیر کہ وہ کس مقصد کے لیے پالی پوسی جارہی ہے' میں نے اسے اپنی انگلیوں کے اشاروں پر حرکت کرنا سکھادیا۔"

"اور آپ کو ایک بار بھی خیال نہ آیا کہ اگر وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں ہوتی تو وہ کبھی اپنی بچی کو ایسی اذیت کا شکار نہ بننے دیتے۔"

"اس کے ماں' باپ۔" خان چاچا کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ پھیلی۔ "وہ جو اس کے کبھی تھے ہی نہیں' وہ جو خود ایسے سنگ دل تھے کہ بچی کو عین سامان بردار گھوڑا گاڑی کے پہیے کے قریب یوں رکھ کر بھاگ لیے کہ ادھر کوئی انجانے میں گھوڑے کو چابک مارتا ادھر گھوڑا گاڑی سرکتی اور بچی کے اوپر سے گزر جاتی۔ ایسے ماں باپ کے بارے میں یوں سوچتے ہو؟" خان چاچا نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"اوہ!" اسے جھرجھری آگئی۔

"میں نے تو پھر بھی مقدور بھر کوشش کی اسے پڑھانے لکھانے کی' نینسی پیٹر کے پاس اسے بٹھا آتا تھا جو اسے پڑھاتی تھی' پریوں کی دنیا کی' جادو کی دنیا کی کہانیاں سناتی تھی' میری ان ہی کوششوں کی وجہ سے ہی تو وہ سرکس کی باقی لڑکیوں سے بہت مختلف بہت منفرد تھی۔"

"مگر آپ یہ نہ بھولیں کہ کرتبوں میں مہارت حاصل کرتے ہوئے آپ کے چابک اور چھڑی نے کتنی بار اس کی کھال ادھیڑی تھی۔" اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

"ہاں مجھے یاد ہے' مگر یہ تو اس دنیا کا حصہ ہے۔ ہم اسے کتنا بھی منفرد بنالیتے' بنتا تو پھر بھی اسے سرکس ہی کا حصہ تھا اور وہ تو سرکس کی بچی تھی۔ اس کا مقابلہ کوئی دوسرا کیسے کرسکتا تھا۔ اس کی مہارت ہماری عزت تھی۔ وہ تو

ہماری پریا رانی تھی۔"

"ہاں جب ہی۔۔۔ وہ بار سے گری تو آپ سب اس کے پس منظر سے نکل کر کہیں اور چلے گئے۔ یوں جیسے کبھی اس کی زندگی کا حصہ ہی نہیں تھے۔ شیرو تو خیر ہے ہی پیسہ بنانے والا بندہ۔ اس کے رشتے ناتے' دوستی تعلق سب پیسے سے جڑے ہیں' لیکن آپ۔۔۔ خان چاچا! آپ تو اس کے خان بابا تھے۔ آپ نے تو ذرا سی بچی کو اپنے ہاتھوں پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ آپ نے کیسے اسے گرنے کے بعد سسک سسک کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔"

"ہاں۔۔۔ میں نے اسے مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔" خان چاچا کا لہجہ بے تاثر ہوگیا۔ "میں یہ ہی چاہتا تھا کہ وہ مر جائے۔"

"لیکن کیوں؟"

"وہ جس طرح زخمی ہوئی تھی' بچ بھی جاتی تو چارپائی پر پڑی بے بسی کی تصویر بنے رہنے کے سوا اس کی کوئی زندگی نہیں تھی۔ میرے وسائل کتنے محدود ہیں' تم جانتے ہو' شیرو اور اس کے بندے زخموں سے جراثیم پیدا کرتی اس لڑکی کو زیادہ دن برداشت کرتے نہ ہی اس کی دوا دارو اور خوراک کا انتظام کرتے' وہ سسکتی تھی نا' چند دن بعد اس نے ایڑیاں رگڑنی تھیں اور اس کی وہ اذیت میری برداشت سے باہر ہوجاتی' اسی لیے میں چاہتا تھا' وہ مرجائے جتنی جلد ہوسکتا تھا مرجائے۔"

"خان چاچا! رشتوں کی' تعلق کی محبت کی کوئی ویلیو ہی نہیں۔" الفاظ بہت مشکل سے اس کے منہ سے نکلے۔

"محبت تو تم بھی اس سے کرتے تھے نا۔ تم کیوں بھاگ لیے تھے اسے چھوڑ کر' کیوں نہیں اس کے ساتھ ساتھ رہے۔" خان چاچا کے لہجے میں تلخی ابھری۔

"وہ رات یاد ہے آپ کو جب شیرو۔۔۔ آپ اور دوسرے چند خاص لوگ جن میں آنٹی پیٹر بھی شامل تھیں' اکٹھے بیٹھے تھے۔"

"یاد ہے۔" خان چاچا کا لہجہ ایک بار پھر بے تاثر ہوا۔

"اس رات میں کتنا بولا تھا' چیخا تھا' چلایا تھا' میں نے سب کے سامنے ہاتھ جوڑے' منتیں کی تھیں' عمر بھر بلیو ہیون کے لیے بلا معاوضہ کام کرنے کی بات کی تھی۔ اگر وہ سب پریا رانی کا علاج کروادیتے' لیکن کیا وہاں کوئی ایک کان بھی ایسا موجود تھا جس نے میری سنی' کوئی ایک ایسی زبان تھی جس نے مجھے دھتکارا نہ ہو۔ احمق اور پاگل نہ کہا ہو۔"

"نہیں۔ کوئی ایک بھی نہیں۔" خان چاچا سامنے دیکھ رہا تھا "بلکہ ان میں چند زبانیں ایسی بھی تھیں جو تم دونوں کے تعلقات کو مشکوک قرار دے کر کیچڑ اچھال رہی تھیں۔"

"پھر۔۔۔ پھر بھی آپ کہتے ہیں' میں بھاگ لیا' میں کیوں بھاگ لیا؟" اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں درد اتر آیا۔ "میں اس لیے بھاگ لیا کہ مجھ سے اتنے سفاک رویوں کا سامنا نہیں کیا جاتا تھا۔ مجھ سے پریا رانی کی اذیت برداشت نہیں ہوتی تھی۔ میں بھاگ لیا۔ شاید سرکس سے باہر مجھے کوئی ایسا کام مل جائے کہ میں جس سے کم دنوں میں اتنا کمالوں جس سے اس کی تکلیف میں کچھ کمی آجائے۔ آپ کو کیا پتا خان چاچا! اس کے علاج کے لیے پیسہ کمانے کی خاطر میں نے چاہا' میں چور بن جاؤں' میں ڈاکو بن جاؤں کہ سب سے زیادہ تیزی سے پیسہ اسی کام میں ہاتھ لگتا ہے' لیکن میری بدقسمتی' میں چاہنے کے باوجود وہ بھی نہیں بن سکا۔" اس نے مایوسی سے سر جھکا لیا۔

"مجھ سے بنا ہی نہیں گیا اور جب میں کچھ نہیں کرسکا تو میں نے خود کو تقدیر کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ جدھر تقدیر لے گئی میں چلا گیا۔ میں نے دل سے ساری یادیں' ساری شکلیں نکال پھینکیں' نہ میں کچھ یاد کروں' نہ مجھے اذیت کا احساس ہو' حالانکہ اذیت تو میرے ہر طرف تھی' میرے اندر' میرے باہر' میرے دائیں بائیں' اوپر نیچے'

پریا رانی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر چکی ہوگی' کوشش کے باوجود یہ اذیت ہر دم میرے ساتھ تھی۔"

"یہ اذیت ہر دم میرے بھی ساتھ ہے۔" خان چاچا نے نئی سگریٹ نکالتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ سوچ لیتا کہ پری مرچکی' مجھے سکون دیتا ہے' مرجانا اس اذیت سے بہتر ہے' جو دوسری صورت میں اسے سہنی پڑتی۔"

"وہ مری نہیں خان چاچا!" رگو نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "وہ زندہ ہے' اسی دنیا میں بلکہ اسی ملک میں رہتی ہے۔"

خان چاچا سکتے کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ دیر تک اسے یوں ہی دیکھتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی انگلیوں میں دبی سگریٹ جلتے جلتے اپنے اختتام کو پہنچ گئی اور اس کی حرارت نے اس کی انگلیوں کو مس کرنا شروع کردیا۔

✡ ✡ ✡

میری پیاری سہیلی!

السلام علیکم۔

امید ہے کہ بفضل خدا! بخیریت ہوگی۔ یہ خط میں تمہیں از زبان منڈی لکھوا رہی ہوں۔ جب سے یہاں آئی ہوں' تمہاری کوئی خیریت معلوم نہیں۔ اب ہار کر یہ خط عزیزی سلمیٰ سے لکھوا رہی ہوں' جو ہماری مسجد کے مؤذن صاحب کی بڑی بیٹی ہے۔ مجھے پتا نہیں کہ جو پتا مولوی سراج سرفراز اس خط کے لفافے پر لکھیں گے' وہ درست بھی ہوگا یا نہیں۔ یہ خط تم تک پہنچ بھی پائے گا یا نہیں۔ مگر ایک چھوٹی سی امید پر یہ خط بھجوا رہی ہوں۔

میری پیاری بہن! ہم یہاں پہنچے تو علاقہ بالکل اجنبی لگا۔ زبان بھی ادھر کے لوگوں کی کچھ اور ہی سی ہے۔ اوئی بہن! میرا تو جی الجھتا رہا' کئی دن کہ یہ ہم کدھر آگئے۔ لیکن پھر چند ہی دنوں میں جیسے زندگی بدل گئی۔ یہاں لوگ مولوی سراج سرفراز کی بہت عزت کرنے لگے ہیں۔

مولوی کے گن تو مجھ پر بھی یہاں آنے کے بعد کھلے۔ وہ تو جناب علم و حکمت کی بہت سی باتیں سیکھ چکا۔ جب یہاں کے لوگوں کو سناتا ہے' لوگ جھوم جھوم جاتے ہیں۔ ہمیں مسجد کی چھت پر ایک بڑا کمرہ' غسل خانہ اور لیٹرین دے رکھی ہے انہوں نے' صبح شام کھانا ادھر' ادھر سے ہمارے گھر خود حاضر ہوجاتا ہے۔ طرح طرح کے سالن اور قسم قسم کی روٹی بھی' چاول بھی' ارے میں تو کھانے پکانے سے بھی چھوٹی' مگر پھر بھی کیا ہے کہ دل عجیب طرح اڑا اڑا ہی رہتا ہے۔ پرانی محفلیں یاد آتی ہیں۔ تمہارا ساتھ' تمہاری محبت' تمہاری باتیں۔ ہائے وہ دن کدھر گئے۔ تم نے مجھ گنوارن کو ایسی بنادیا کہ پڑھے لکھے بھی بات کرتے دس دفعہ سوچیں۔ اب میرے روپ میں تمہاری جھلک تو نظر آتی ہے' مگر تم کہیں نہیں ہو۔

اچھا خیر... میں تو اپنی لے کر بیٹھ گئی' تم سناؤ کیسی ہو تم... اکیلی اپنی کٹھیا پر پڑی رہتی ہو یا محلے دارنیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ یقیناً "اس بے وفا" ہرجائی کا کچھ اتا پتا پایا نہ ہوگا اب تک' ہائے کیسا بے رحم' سفاک شخص ہے کہ جاتے جاتے بہانے بنا کر ہمارا بچہ بھی لے گیا۔

جوں جوں میری زچگی کے دن قریب آرہے ہیں توں توں تمہارا دکھ دل میں محسوس ہوتا ہے اور بھی شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ اللہ جانے تمہارے اندر ایسا صبر اور بے حسی کیسے اتر آئی' نہ یاد کرتی ہو' نہ روتی ہو' دل یاد سے غافل ہوگیا۔ آنکھ کے آنسو خشک ہوگئے۔ سچ بتاؤ۔ کیا ابھی بھی ایسا ہی ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو میں کیسے سوچوں کہ مجھ سے دوری تمہیں میری یاد بھی دلاتی ہوگی۔

مولوی سراج سے تمہاری بات کروں تو کہتا ہے آپا جی... بڑے صبر والی بی بی ہیں' ان کا دل اتنا کچھ سہ چکا ہے کہ صبر کا وصف کسی چیز کو کسی نئی بات کو' کسی نئے دکھ اور کسی نئی جدائی کو دل پر حاوی نہیں ہونے دیتا۔ دل کی اس کیفیت کو وہ کوئی بھی نام دیتے رہیں۔ لیکن مجھے اس وقت وہ نام یاد نہیں آرہا۔

مولوی سراج سے یاد آیا کہ یہاں آکر موصوف نے علم کے موتی تو بانٹنے شروع کیے تو کیے ہی ہیں' جناب والا نے حکمت بھی شروع کردی تھی ساتھ کے ساتھ۔ یہ بات پڑھ کر تمہیں ہنسی آئی ہی ہوگی۔ نجانے کہاں سے حکمت کے چند نسخے ان کے ہاتھ لگ گئے۔ اب ان کے دن تو مسجد کی خدمت میں گزرتے ہیں اور رات جڑی بوٹیاں پیسنے ان میں شہد ملا کر گولیاں اور معجونیں بنانے میں گزر جاتی ہے۔

فرماتے ہیں پیٹ بھر کر روٹی کھانے کے لیے بندے کو محنت مزدوری کرنی ہی پڑتی ہے۔ ہائے اللہ ماری... روٹی ہی سر پر سوار رہی ساری عمر۔ یاد ہے مولوانوں کے گھر سے روٹی لینے آنے کے چکر میں ہی تو ہمارے ساتھ دعا سلام بڑھی تھی۔ میں مولوی کو دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ روٹی کا چکر انسان کو کیا سے کیا بنا ڈالتا ہے۔ چلو ایک "ٹکڑا گندم کی روٹی" کے لیے ہی سہی مولوی سراج ٹس سے مس تو ہوئے۔

خود اپنا حال کیا سناؤں' جوں جوں زچگی کے دن قریب آرہے ہیں' دل کی بے قراری بڑھتی جارہی ہے' نہ کچھ کھانے کو دل چاہتا ہے' نہ پیاس لگتی ہے' بس دل ہی گھبراتا رہتا ہے۔ دن رات تمہاری بتائی دعاؤں کا ورد کرنے میں مصروف رہتی ہوں۔ ان ہی دعاؤں کا صدقہ اللہ تعالیٰ مجھے خیریت سے فارغ کرے۔ دعاؤں سے یاد آیا کہ تم تو حج پر جانے سے پہلے مجھے مسلمان ماننے ہی پر تیار نہیں تھیں۔ کیسے کلمہ پڑھا کر مجھے مشرف بہ اسلام کرتی رہی تھیں۔

توبہ... توبہ... مجھ بے چاری کو بالکل ہی لادین سمجھنے بیٹھی تھیں۔

اب میرا خیال ہے کہ بہت سی باتیں ہوگئیں۔ خط کے لفافے پر جو پتا مولوی سراج لکھیں گے' اس پتے پر جواب لکھ کر ضرور بھجوانا۔ اپنی خیریت سے آگاہ کرنا نہ بھولنا۔ لو اب میں رخصت ہوتی ہوں۔

فقط تمہاری بہنوں جیسی سہیلی

رابعہ کلثوم

✡ ✡ ✡

لاہور

بہت ہی پیاری بہن رابعہ کلثوم!

بعد سلام دعا کے عرض ہے کہ تمہاری چٹھی سے تمہاری خیریت معلوم ہوئی۔ دل کو سکون ملا اور خوشی ہوئی کہ تم اس اجنبی جگہ پر مطمئن و مسرور ہو' اللہ تعالیٰ تمہیں اس سے بھی بڑھ کر نوازے۔

تمہاری وفاداری اور محبت کا میرے پاس کوئی جواب نہیں کہ تمہاری وفاداری اور محبت انمول ہیں۔ جن حالات میں تم نے اور سراج سرفراز نے میرا ساتھ دیا۔ ان حالات میں تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ تمہاری محبت اور قربانی میری زندگی کا انمول خزانہ ہیں۔

میں یہاں ٹھیک ہوں' بفضل تعالیٰ کوئی مسئلہ' کوئی پریشانی مجھ کو لاحق نہیں ہے۔ محلے دار میرا بہت خیال رکھتے ہیں اور میرا اللہ میرے ساتھ ہے اور جب اللہ میرے ساتھ ہے تو مجھے کوئی مسئلہ ہو بھی نہیں سکتا۔

تمہارے خط سے جہاں تمہارے اچھے حالات کی خبر ملی' وہاں یہ دکھ بھی دل میں محسوس کیا کہ تم نے ابھی تک سراج سرفراز جیسے بڑے دل کے مالک شخص کی قدر کرنا سیکھی' نہ ہی عزت کرنا۔ میری بات یاد رکھنا' دین و دنیا'

دونوں ہی کی دولت سے مالا مال ہو جاؤ گی' جب خود میں یہ دو وصف پیدا کرلوگی۔ اللہ تعالیٰ تمہاری رہنمائی فرمائے۔ صبر' شکر' فقر' تحمل' تقویٰ' یہ پانچ عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان۔ خالی کلمہ پڑھ لینے سے نہیں۔ حج بیت اللہ کرلینے سے نہیں' ایمان کے عناصر پر دل سے یقین کرلینے سے ہی منزل پاؤ گی۔

اللہ تعالیٰ تمہیں خیریت سے فارغ کرے۔ میرے لیے بھی دعا کرتی رہنا۔ سراج سرفراز کو بہت ادب و احترام سے میرا سلام کہنا۔ ہو سکے تو کہیں تمہارے قریب کسی کے گھر میں اگر ٹیلی فون لگا ہو تو نمبر لے کر اگلی چٹھی میں لکھ بھجوانا۔ اللہ تعالیٰ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

تمہاری مخلص بہن
شہناز سلطان

☼ ☼ ☼

"میں نے سب معلومات حاصل کرلیں۔ تمہارے علاج اور ٹریننگ کے لیے چین سے بہتر آپشن ہی نہیں۔" بلال سلطان نے سارہ سے کہا۔

"جاپان میں ایسی کوئی سہولت دستیاب نہیں؟" سارہ کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اس نے یہ سوال کیوں کیا تھا۔

"میں نے بتایا نا کہ میں نے سب معلومات حاصل کرکے ہی یہ فیصلہ کیا کہ تمہیں چین بھجوایا جائے۔ صوفی اور سیمی تمہارے ساتھ جائیں گی۔" انہوں نے ٹوسٹ پر مارجرین پھیلاتے ہوئے کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ آپ مجھے ایک فیری لینڈ میں لے آئے ہیں۔" سارہ نے ممنون نظروں سے انہیں دیکھا۔

"میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیا کبھی تم نے سعد کا بھی شکریہ ادا کیا تھا؟" انہوں نے سیب کا جوس گلاس میں نکال کر سارہ کے سامنے رکھا۔

"سعد!" سارہ نے ان کی طرف دیکھا۔ "اس سے تو میں ہمیشہ لڑتی رہی۔ اسے تنگ کرتی رہی کہ وہ مجھ پر ترس کھاتا تھا۔"

"کیا واقعی وہ تم پر ترس کھاتا تھا؟"

"مجھے معلوم نہیں۔"

"یقیناً" وہ ایسا نہیں کرتا تھا۔ ترس کھانے اور خلوص میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بہت بڑا فرق۔۔۔ تم دونوں کے درمیان فرق کو سمجھ نہیں پائیں غالباً"۔

"آج آپ نے پہلی بار سعد کو ایڈووکیٹ کیا ہے۔" وہ ذرا سا مسکرا کر بولی۔

"میرا خیال ہے کہ اب کے بعد کی زندگی میں مجھے ہمیشہ اس کو ایڈووکیٹ ہی کرنا ہے۔ کیونکہ جو فوٹ پرنٹس۔۔۔ میں نے اس کے دیکھے ہیں۔ وہ کسی بھی ایسی جگہ نہیں جاتے جہاں جانے پر مجھے امبیرلیس ہونا پڑے۔ میں ان تمام اتفاقات کا بے حد ممنون ہوں' جن سے دوچار ہونے پر میں سعد کا ماسکلڈ چہرہ دیکھ پایا۔"

"گویا اس سے پہلے آپ اس سے بدگمان تھے۔" سارہ نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

"بدگمانی اور غلط فہمی کے اگر ایک ہی سے معنی ہیں تو شاید میں تھا۔"

"ان دونوں الفاظ کے معنی مختلف ہیں۔"

"اگرچہ ان کے اوریجنز ایک سے ہیں۔" وہ مسکرائے۔ "تم جوس کیوں نہیں پی رہیں' تمہیں دو گلاس سیب کا جوس پینا چاہیے۔ سیب اینٹی آکسیڈنٹ ہوتا ہے اور تمہارے لیے اینٹی آکسیڈنٹ غذا بہت اچھی ثابت ہوگی۔"

"میں پی رہی ہوں۔" اس نے فوراً" گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگالیا۔ "ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں پوچھو۔"

"آپ نے کبھی ماہ نور کو یہاں نہیں بلایا؟"

"ماہ نور!" وہ ایک دم ہنس دیے اور پھر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ "تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟"

"آپ شاید جانتے نہیں۔ ماہ نور سعد سے شدید محبت کرتی ہے۔ بلکہ شاید آپ جانتے ہیں' کیونکہ آپ ہی نے کہا تھا کہ ماہ نور' سعد کے دل کا معاملہ ہے۔"

"اگر وہ دونوں ایک دوسرے کے دل کا معاملہ ہیں تو انہیں یہ معاملہ خود حل کرنا چاہیے۔ میں اس معاملے میں کیوں آؤں۔" انہوں نے ایک مبہم سی بات کی۔

"آپ سعد کے معاملات سے Indiffrence (لاتعلقی) کیوں ظاہر رہے ہیں۔" جبکہ آپ خود کہتے ہیں کہ اس کے فوٹ پرنٹس بہت اسٹرونگ ہیں۔" سارہ کے لہجے میں دکھ تھا اور شکوہ بھی۔

"میں Indiffrence شو کررہا ہوں۔" انہوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ تم خود ہی بتاؤ کہ "تم خود کس کا معاملہ تھیں۔ تم سے میں نے لاتعلقی کیوں ظاہر نہیں کی؟"

سارہ کے پاس ان کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"کچھ باتیں ان کہی رہنے دی جائیں تو بہتر ہوتا ہے۔" کچھ دیر بعد وہ نرمی سے بولے۔ "سعد زندگی کے کچھ معاملات کو معمہ بنا کر مجھ سے دور گیا ہے۔ اسے یہ معمہ خود حل کرنا چاہیے۔ میں یہاں بیٹھ کر دوسروں کے سامنے اسے ایڈووکیٹ کرسکتا ہوں' لیکن اگر اس کے سامنے خود کو ایڈووکیٹ کرنے لگوں گا تو اس کا معمہ کبھی حل نہ ہوگا۔"

سارہ نے ان کی بات سنی' اگرچہ ان کی بات پوری طرح اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن اس نے مزید سوال کرنے سے گریز کیا۔

☼ ☼ ☼
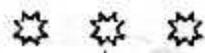
"تمہیں زندگی میں اتنا آگے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہورہی ہے۔" سعد نے نادیہ کے فلیٹ کی بالکونی میں کھڑے' بغیر پیچھے مڑے نادیہ کو مخاطب کرکے کہا۔

"اور مجھے تمہیں یہاں اپنے اس دو کمروں کے فلیٹ میں دیکھ کر بہت خوشی ہورہی ہے۔" نادیہ نے اس کے لیے سوپ بناتے ہوئے ہاتھ روک کر جواب دیا۔ "اگرچہ یہ تمہارے شایان شان ہرگز نہیں ہے۔ اس کے منے سے باتھ روم میں تو تمہارا دم ضرور گھٹتا ہوگا۔"

"تم جانتی نہیں کہ میں اس حادثے سے پہلے سوچتا تھا کہ میں پکاڈلی میں سڑک کے کنارے کپڑا بچھا کر گٹار بجا کر آنے جانے والوں سے نذرانہ وصول کرکے۔۔۔ اپنی روٹی اور مکھن کا انتظام کرنے والا ہوں۔" وہ آہستہ قدموں سے چلتا کمرے میں آیا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں چھڑی تھی۔ جس کا سہارا۔۔۔ لینے کی اس کے ڈاکٹر نے اسے پرزور تلقین کررکھی تھی۔

"بڑے لوگوں کے خوابوں کی دنیا بھی خوب ہوتی ہے۔" نادیہ نے چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل کو کپڑے سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ان بھکاریوں کی زندگیوں کی سختی سے تم واقف نہیں ہو۔ اس حادثے میں تو تم موت سے بچ گئے' لیکن اگر واقعی میں تم اپنے خوابوں کی اس دنیا کے منظر میں چلے جاتے تو شاید ایک آدھ دن سے زیادہ جی نہ

پاتے۔"

"مجھے اپنی قوت ارادی ہی کو تو آزمانا تھا۔" وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"قوت ارادی کو تو تم اب میرے بنائے ہوئے کھانے کھا کر بھی آزما سکتے ہو۔" نادیہ مسکرائی۔ "نہیں کھا کر تم زیادہ سے زیادہ کتنے دن زندہ رہ سکتے ہو۔"

"شاید بہت دن تک۔" وہ مسکرایا۔ "کیونکہ ان کھانوں میں تمہاری محبت بھی شامل ہے اور خلوص بھی۔"

"ہاں' دل رکھنے کو ایسی باتیں کرنی چاہئیں۔" اس نے ڈش واشر میں چند برتن رکھتے ہوئے کہا۔

"میں واقعی سحر زدہ ہوں' تمہیں یہ سب کرتے دیکھ کر۔" سعد نے سچائی کے ساتھ کہا۔ "مجھے یقین نہیں آ تا کہ تم اتنی اونچی اور لمبی جست لگانے میں کامیاب ہو گئیں۔"

"جبکہ اس کا حوصلہ بھی تم ہی نے مجھے دیا تھا۔ یاد کرو' وہ سب جو میرے لیے اپنی گزشتہ ملاقات میں تم نے کہا تھا' وہی تو نقطہ آغاز ثابت ہوا۔"

"میں شکر کرتا ہوں کہ میں تمہارے لیے کچھ کر پایا۔"

"اور میں تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم نے اپنا چیلسی والا گھر چھوڑ کر میرے پاس رہنا پسند کیا۔" نادیہ نے اس کے سامنے پلیٹ اور سوپ کا پیالہ رکھتے ہوئے کہا۔

"وہ میرا گھر نہیں ہے۔ وہ ڈیڈی کا گھر ہے۔" وہ رکھائی سے بولا۔

"جو ڈیڈی کا ہے' وہ تمہارا بھی تو ہے۔" اس نے اس کے سامنے سوپ کا پیالہ رکھا۔

"جو ڈیڈی کا ہے وہ تمہارا بھی تو ہے۔" سعد نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"مگر مجھ سے تو ڈیڈی کبھی کا اظہار لاتعلقی کر چکے۔" اس کے چہرے پر دکھ بھری مسکراہٹ ابھری۔

"وہ تم سے کر چکے تھے۔ اب میں نے ان سے اظہار لاتعلقی کر دیا ہے۔" وہ چبا چبا کر بولا۔

"یہ تم نے بالکل بھی اچھا نہیں کیا۔"

"انہوں نے بھی تمہارے ساتھ بالکل بھی اچھا نہیں کیا تھا۔"

"کیا تم ان سے میرے ساتھ کیے کا انتقام لے رہے ہو۔" وہ چونک کر بولی۔

"کاش میں اتنا اچھا ہوتا۔" اس نے اپنے پیالے میں سوپ ڈالتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں اتنا بے غرض نہیں ہوں' میں ان سے اپنی وجوہات کی بنا پر لاتعلق ہو چکا ہوں۔" نادیہ نے کچھ دیر یک ٹک اس کی طرف دیکھا اور پھر سرہلاتے ہوئے بولی۔

"جو ڈیڈی نے میرے ساتھ کیا' اس کے باوجود میں آج تک ان سے بدگمان نہیں ہوئی۔ جو زمینی حقائق ان کی نظروں کے سامنے لائے گئے' ان کی روشنی میں انہیں وہی کرنا چاہیے تھا جو انہوں نے کیا۔"

"تم بہت اچھی اور نیک دل ہو' بدقسمتی سے میں ایسا نہیں ہوں۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

"نجانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ تم کسی بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو کر ڈیڈی سے بدگمان ہو گئے ہو' اگرچہ مجھے کسی بھی تفصیل کا علم نہیں۔" نادیہ نے کہا۔

"معلوم ہو جانے پر تم بہت دکھی ہو جاؤ گی۔ لہٰذا رہنے دو۔" سوپ میں چمچہ ہلاتے ہوئے کہا۔

"میں خود کو ابھی تک ڈیڈی سے بہت قریب محسوس کرتی ہوں۔ میرا یہ حال اس وقت بھی تھا جب مجھے ان سے جدا کر دیا گیا تھا۔ تمہیں شاید یاد نہ ہو۔ ممی مجھے بازو سے پکڑے گھسیٹتی تھیں اور میں اپنا دوسرا بازو ڈیڈی کی طرف بڑھاتے ہوئے روتی بھی' چیختی تھی' چلاتی تھی۔"

"مجھے وہ منظر کبھی نہیں بھولا۔ تم روتی تھیں' چیختی اور چلاتی تھیں' لیکن ڈیڈی کے دل پر رتی بھر اثر نہیں ہوا

تھا۔"

"ہم چیزوں کا مثبت انداز میں بھی تو جائزہ لے سکتے ہیں۔" نادیہ نے کہا۔ "ڈیڈی کو جو بتایا گیا' وہ بہت خوف ناک تھا۔ وہ کیسے اثر لیتے؟"

"مجھے کہنے دو کہ تمہارا دل بہت بڑا ہے۔" سعد نے سوپ ختم کر کے پاشا کی پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"وہاں سے آنے سے ایک رات پہلے جب مجھے معلوم ہوا کہ مجھے وہاں سے جانا ہو گا' میں ڈیڈی کے کمرے میں اس نیت سے گئی کہ ان سے درخواست کر سکوں' مجھے نہ جانے دیں' مجھے ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ لیں' لیکن وہ وہاں نہیں تھے۔ انہوں نے خود کو لائبریری میں بند کر لیا تھا۔" نادیہ نے یاد کیا۔

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔"

"لیکن تمہیں یہ تو معلوم نہیں کہ میں نے سوچا تھا کہ میں ڈیڈی کے کمرے سے ان کی کوئی ایسی چیز اٹھا لوں' جس سے ان کی خوشبو آتی ہو' میں نے وہاں سے ایک چیز چرا لی تھی۔ میں چھوٹی تھی' مگر میری کوشش لاجواب تھی۔" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"کیا کبھی ڈیڈی نے میرے چلے جانے کے بعد اپنی کسی چیز کے گم ہو جانے کا ذکر نہیں کیا تھا۔" پھر وہ سعد کی طرف دیکھ کر بولی۔

"کسی ایک معمولی سی چیز کے گم ہو جانے سے ان کے خزانے میں کون سی کمی آ گئی ہو گی۔ جو وہ واویلا کرتے۔"

"شاید کوئی کمی نہ آئی ہو۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "مگر جو چیز میں نے اٹھائی' وہ یقیناً" ان کے لیے بہت اہم ہو گی' کیونکہ خاصی پرانی ہو جانے کے باوجود انہوں نے اسے بہت سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔"

"ایسی کون سی چیز تھی؟" وہ پہلی بار چونکا۔

"میرے پاس ابھی بھی موجود ہے۔ میں تمہیں دکھاتی ہوں۔" وہ اپنے اسٹڈی ٹیبل کی طرف بڑھی۔ سعد دلچسپی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ لڑکی اپنا خلوص کس بے حس انسان کے لیے لٹاتی رہی تھی۔

"یہ دیکھو!" چند لمحوں بعد جو چیز نادیہ نے اس کی نظروں کے سامنے کی اس نے ایک بار پھر اسے چونکا دیا تھا۔ وہ ایک بہت پرانا والٹ تھا۔ جس کی اوپری سطح ادھڑ چکی تھی اور جو یقیناً" کسی زمانے میں بہت سستے داموں خرید اگیا ہو گا۔

"میں ہر روز اسے دیکھتی ہوں۔ اگرچہ اس کے اندر کچھ بھی نہیں' سوائے ایک پرانی تصویر کے۔" نادیہ کہہ رہی تھی۔ سعد نے والٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔ والٹ کے سب خانے خالی تھے۔ جبکہ ایک ادھڑی ہوئی جیب کے پلاسٹک کور کے پیچھے سے ایک شکستہ بلیک اینڈ وائٹ تصویر جھانک رہی تھی۔ اس نے تصویر نکال کر نظروں کے سامنے کی اور جیسے اس پر سکتہ سا طاری ہونے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ہم تو ایسے اہم نہیں ہیں کہ کوئی ہمارا انٹرویو کرنے ادھر کو آئے۔" میمونہ' فضل حسین نے ہاتھ سے آنکھوں کے اوپر چھجا بنا کر ماہ نور کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے لیے تو آپ کچھ ایسے ہی اہم ہیں۔" ماہ نور نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ وہ بہت زیادہ خواری کے بعد ان دونوں کے اس ٹھکانے پر پہنچنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ اپنی اس خواری میں اپنی تنہائی اور اس تلاش کے اختتام پر ساری کوشش کی بے مقصدیت ظاہر ہونے کے خوف نے اسے بے کل کیے رکھا تھا۔

جب ہی وہ معمول سے زیادہ مرجھائی ہوئی نظر آرہی تھی۔

"مگر ہم تو تمہیں جانتے ہی نہیں۔" میمونہ بی نے قطعیت سے سرہلاتے ہوئے کہا۔ "نا۔ بالکل بھی نہیں۔"

"میں تو آپ کو جانتی ہوں نا اماں جی۔۔۔ پلیز۔ مجھے گھر کے اندر داخل ہونے دیں۔" ماہ نور نے ایک بار پھر زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

"کیسے اندر آنے دیں ہم تمہیں جانتے تو ہیں گے نہیں۔"

"میں بلال سلطان اور سعد سلطان کے ریفرنس سے آپ کے پاس آئی ہوں اماں جی۔۔۔! ان دونوں کو تو آپ جانتی ہوں گی۔" ماہ نور نے آخری کوشش کی۔ یہ دونوں نام جیسے اس کے لیے کھل جا سم سم کا سا منتر ثابت ہوئے۔ بڑی بی نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا اور خود ایک طرف ہٹ گئیں۔

"جانتی تو میں ابھی بھی نہیں ہوں تمہیں۔" ماہ نور کے اندر داخل ہو جانے پر وہ اس کے پیچھے پیچھے آتے ہوئے بولیں۔ "مگر ہماری چوکھٹ پر کھڑے ہو کر ان دو ناموں کو اتنی بلند آواز میں دوبارہ تمہیں لینا بھی۔"

"کیوں۔۔۔ بہت مشکوک نام ہیں کیا؟" ماہ نور رک کر ان کی طرف پلٹی۔

"یہ تو میں نہیں کہتی ہوں مگر ڈر لگتا ہے۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے آگے لے آئیں' جہاں ایک مخبوط الحواس بڑے میاں ڈوری والا آلہ سماعت کان میں لگائے کان سے ریڈیو جوڑے چارپائی پر بیٹھے تھے۔

"یہ لڑکی کہتی ہے اسے بلال صاحب اور سعد بابا نے بھیجا ہے۔" میمونہ بی نے بڑے میاں کے قریب جا کر ان کے ہاتھ سے ریڈیو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے ان کے کان میں بلند آواز میں کہا۔

"مجھے انہوں نے نہیں بھیجا۔ میں نے یہ نہیں کہا۔" ماہ نور نے پیچھے کھڑے بلند آواز میں کہا۔ "میں ان کے ریفرنس سے آپ سے کچھ پوچھنے آئی ہوں۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ آیئے آیئے۔ بیٹھیے بیٹھیے۔" بڑے میاں نے ماہ نور کی طرف دیکھنے کے بعد چارپائی پر اپنے قریب ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ادھر بیٹھو۔" پھر انہوں نے ماہ نور کو براہ راست مخاطب کیا۔

ماہ نور دو قدم آگے بڑھ کر چارپائی پر ان کے قریب بیٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

سعدیہ نے سامنے بیٹھے کھاری کو دیکھا۔ "چند ہفتوں میں ہی بے چارا شیدائی ہو گیا ہے۔" اس نے تاسف سے سوچا۔ "نہ کپڑوں کا ہوش ہے نہ ہی ڈھنگ کے جوتوں کا' کھانا پینا' بات کرنا سب بھولتا چلا جارہا ہے۔ بڑے ہی ظالم ہیں چوہدری صاحب جو اس کے ساتھ ایسا مذاق کر گئے۔"

کھاری پچھلے دو گھنٹوں سے چپ چاپ اپنی جگہ پر بیٹھا تھا اس کی نظریں خلا میں کسی ایک ہی نکتے پر جمی تھیں۔ سعدیہ نے اسے کئی بار مخاطب کرنا چاہا تھا۔ لیکن وہ جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ تقریباً" سوا دو گھنٹے کے بعد وہ اپنی اس کیفیت سے باہر نکلا تھا۔ اس نے سعدیہ کی طرف دیکھا اور پھر برآمدے کی دیوار پر لگے وال کلاک کی طرف دیکھنے لگا۔ کلاک کی سوئیاں دیکھ کر وہ جیسے ہڑبڑا کر اٹھا۔

"اچھا فیر سعدیہ باؤ۔۔۔ میں چلنا آں۔" اس نے سعدیہ کو مخاطب کیا۔ "میرا ٹیم ہو گیا ہے۔ میرے جانے دا ٹیم ہو گیا ہے۔" وہ برآمدے سے اترتی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

"ابھی سے۔۔۔ ابھی تو دودھ والی گاڑیوں کا وقت نہیں ہوا کھاری!" سعدیہ چونکی۔

"گڈیاں نوں چھوڑ میں اپنے ٹیم کی بات کر رہا ہوں۔"

کھاری سیڑھیاں اتر کر آگے بڑھ گیا۔ چلتے چلتے وہ اپنے اور سعدیہ کے کمرے کی طرف کھلنے والے لوہے کے ذیلی دروازے تک پہنچا اور مڑ کر سعدیہ کو دیکھتے ہوئے خدا حافظ کہنے کے انداز میں ہاتھ ہلا کر باہر نکل گیا۔

سعدیہ عجیب سی الجھن میں گرفتار ہو گئی۔ کھاری دودھ اٹھانے والی گاڑیوں کی آمد کے وقت سے خاصا پہلے چلا گیا تھا۔

عین اسی وقت فارم ہاؤس پر کام میں مصروف چند لوگوں نے ماسٹر کمال کو پاگلوں کی طرح کھاری کے کمرے والے حصے کی طرف دوڑتے دیکھا تھا۔

"اوہو۔۔۔ کیا ہو گیا ماسٹر جی! خیر تو ہے؟" راستے میں جب وہ ماسی رشیدہ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تو وہ گھبرا کر بولی۔

"اوئے خیر کوئی نہیں رشیدہ بی بی! کھاری کو دیکھو' اس کا حال پوچھو جا کر' دو گھنٹے پہلے وہ میدے کی دکان سے گندم میں رکھنے والی گولیاں خرید کر نکلا ہے۔ جبکہ فارم ہاؤس کے سب بھڑولوں کی گندم میں کیڑے مار گولیاں میں نے خود پرسوں ہی رکھوائی ہیں۔ اوئے بیڑا غرق' جا کر دیکھو' وہ شیدائی کس واسطے گولیاں لایا ہے۔"

ماسٹر کمال نے دہائی دینے کے انداز میں پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔

"ہائے نی میری قسمت!" ماسی رشیدہ' ماسٹر کمال سے بھی زیادہ بوکھلا کر بولی۔ اور سر پیٹتے ہوئے کھاری کے کمرے کی طرف لپکی۔

☼ ☼ ☼

فارم ہاؤس کے بڑے گیٹ پر چوہدری سردار کی گاڑی آکر رکی تھی۔ چوہدری صاحب کے ساتھ گاڑی میں شہر سے آنے والی وہ مہمان بھی بیٹھی تھی جو کچھ ہفتے قبل چوہدری صاحب سے ملنے فارم ہاؤس آئی تھی۔

عین اسی وقت اسی گاؤں میں ایک اور قیمتی اور بڑی گاڑی داخل ہوئی تھی۔ گاؤں والوں نے یہ گاڑی اور گاڑی والا پہلے کبھی اس گاؤں میں نہیں دیکھے تھے۔ گاڑی والا دیکھنے میں ہی بہت پیسے اور شان و شوکت والا نظر آتا تھا۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ وہ چوہدری سردار کے فارم ہاؤس کے راستے کے بجائے مولوی سراج سرفراز کی مسجد کا راستہ پوچھ رہا تھا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں)

عنیزہ سیّد

میرا خیال ہے میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم اب اس کے پیچھے جا رہے ہیں نہ ہی اس کی کوئی بات کر رہے ہیں۔" بلال سلطان کا لہجہ اور بات ابراہیم کے لیے حوصلہ افزا ہرگز نہیں تھی۔

"لیکن انکل! میں نے بتایا کہ یہ لڑکی تو کسی ہی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" اس نے منمنا کر ایک کوشش مزید کرنا چاہی۔

"تمہارا کیا خیال ہے' میں بہت فارغ ہوں جو جب کوئی مجھ سے ملنا چاہے میں اس سے ملنے کے لیے Available (دستیاب) ہو جاؤں۔" وہ سخت اور خشک لہجے میں بولے۔

"نہیں ہرگز نہیں انکل! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں۔" ابراہیم نے زبان پھیر کر اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا ہے کہ اسے میں اپنے مان پر لایا تھا۔" اس نے ایک جذباتی وار کھیلنے کی کوشش کی۔ "میں نے ہی اسے یقین دلایا تھا کہ انکل میری بات کو اون کرتے ہیں کیونکہ مجھے وہ اپنے بیٹے جیسا ہی سمجھتے ہیں۔"

۲۹

اُنتیسویں قسط

"ابھی ہم جیسی زندگی گزار رہے ہیں یوں کہ ٹانگیں قبر میں لٹکی ہیں اور سر دنیا میں موجود ہے تو ایسی حالت میں کسی سے جھوٹ کیوں بولیں گے توبہ توبہ!" فضل حسین نے خرخراتی آواز میں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"تو جب آپ جوان تھے اور بھاگ دوڑ کر سکتے تھے۔ جھوٹ بول لیا کرتے تھے۔" ماہ نور نے حیرت سے ان کی

جانب دیکھا۔

"ہاں تو اور کیا!" فضل حسین کے بجائے میمونہ بی نے جواب دیا "وہی جھوٹ جس میں مصلحت شامل ہوتی ہے انہوں نے بھی خوب بولے ہم نے بھی خوب بولے۔"

"ہاں بولے تھے" فضل حسین ماہ نور سے مخاطب ہوئے۔ "بلال صاحب کے واسطے بولے تھے' وہ جو بی بی تھیں تصویروں والی نا۔ انہوں نے صاحب کے منہ پر تصویروں والی کتاب ماری تو انگریز میم صاحب ہم سے پوچھا کیں۔ کئی بار 'کیا معاملہ ہوا تھا دونوں کے درمیان' ہم نے بولا ہم تو نہیں جانتے' صاف مکر گئے۔"

"تصویروں والی میم صاحب؟" ماہ نور نے سوالیہ نظروں سے فضل حسین کی طرف دیکھا۔

"انگریز بیگم صاحب ہم سے یہ بھی پوچھا کیں' صاحب اور ان کی پہلی بیگم کے درمیان کیا معاملہ ہوا تھا بولیں۔ بتاؤ فضل حسین! وہ پہلی بی بی سعد صاحب کو چھوڑ چھاڑ کر کدھر گئیں' ہم نے انہیں کبھی نہیں بتایا کہ ہم نے کیسا ان کو خونم خون دیکھا تھا ہم بولے کچھ پتا نہیں۔"

"خونم خون۔" ماہ نور نے میمونہ بی کی طرف دیکھا۔

"ارے یہ تو سترے بہترے ہوگئے' یادداشت جواب دے گئی۔" میمونہ بی تیزی سے بولیں "جانے کدھر کدھر کی جوڑتے رہتے ہیں۔"

"اتنا تو میں جانتی ہوں آنٹی کہ سعد کی مدر کا مرڈر ہوا تھا' انکل اسی لیے یہ لفظ بول رہے ہیں۔"

"آپ کو کیسے معلوم؟" میمونہ بی کی آنکھیں پھیلیں۔

"مجھے رابعہ آنٹی سب بتا چکیں مگر افسوس سعد میرے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی یہاں سے جا چکا تھا۔" ماہ نور نے تاسف کے ساتھ کہا اور اٹھ کر بڑے میاں کے کان کے قریب گئی۔

"بتائیں تو انکل سعد کی مدر کا مرڈر کس نے کیا تھا' کیا واقعی بلال سلطان قاتل ہیں ان کے؟"

بڑے میاں کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"آپ رابعہ آنٹی کو جانتے ہیں کیا؟" ماہ نور نے بلند آواز میں دوسرا سوال کیا "رابعہ کلثوم جو مولوی سراج سرفراز کی بیوی ہیں۔"

"ارے اسی مولوی صاحب نے تو صاحب کے ہاتھ سے چھری چھین لی تھی اور رو رو کر کہنے لگے تھے۔ نہیں آپ قتل نہیں کرسکتے بھائی صاحب! میں آپ کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے جاتا نہیں دیکھ سکتا۔" فضل حسین جیسے اچانک ماضی کی فلم کی پٹی دیکھنے لگے تھے۔

"ہاں' مجھے معلوم ہے اور بلال سلطان نے چھری ان سے واپس چھین کر انہیں وہاں سے بھاگ جانے کا حکم دیا تھا۔ یہ کہہ کر کہ اگر وہ وہاں سے نہیں گئے تو وہ قتل ان دونوں میاں بیوی پر ڈال دیں گے۔"

"ہاں ہاں... وہ دونوں بے چارے بیگم صاحب کی لاش پر بیٹھ کر بین بھی نہ کرسکے تھے کہ پولیس کی وین آ گئی۔" فضل حسین کسی معمول کی طرح بولے۔

"اور بلال سلطان نے کہا 'لو سراج! قتل تم پر پڑنے والا ہے۔"

"ہاں' دونوں بے چارے ڈر کے مارے کانپتی ٹانگوں سے وہاں سے بھاگ لیے تھے' چند دنوں کی بچی تھی ان بی بی کی گود میں۔"

"مجھے یہ سب پتا ہے' بس یہ بتائیے کہ قتل کس نے کیا تھا۔"

"یہ مجھے بھی نہیں پتا۔" فضل حسین نے سر جھکایا "مجھے صاحب نے فون کرکے کہا۔ وہ اسی محلے کی طرف جا رہے تھے جدھر بیگم صاحب رہتی تھیں۔ بولے تم بھی ادھر پہنچو میں جب پہنچا قتل ہوچکا تھا بیگم صاحب خون میں لت پت' آنکھیں نیم وا کیے پڑی تھیں میں نے دوسری چارپائی پر پڑی چادر اٹھا کر ان پر دی' اللہ معاف کرے نیم برہنہ لاش تھی۔"

"پھر قتل کس نے کیا ہوگا؟" ماہ نور نے کہا۔

"کچھ پتا نہیں صاحب نے تصویروں والی بی بی اور بچے کو بس میں بٹھا آنے کا بولا میں ذرا سوال جواب کرنے بیٹھتا بس نکل جاتی اس لیے ان دونوں کو لے کرکے بس اسٹاپ کی طرف نکل پڑا۔"

"بچہ؟" نور کے دماغ میں کچھ جھلملایا۔ "وہاں بچہ کہاں سے آگیا؟"

"کچھ معلوم نہیں' تصویروں والی بی بی ایک نومولود کو گود میں اٹھائے صحن میں کھڑی تھیں جب میں ادھر پہنچا تھا بچہ رو تا تھا تو بی بی اس کے منہ کے آگے دوپٹہ دے دیتیں اپنا۔"

"یہ تصویروں والی بی بی کون تھی آخر؟" ماہ نور اس مسلسل ذکر پر جھنجلا کر بولی۔

"وہ جو تصویریں بناتی تھیں۔ صورت شکل کی اچھی وچھی نہیں تھیں مگر تصویریں بہت اچھی بناتی تھیں' اسلام آباد میں رہتی ہیں' ہم دونوں کو آٹا' راشن بھیجتی ہیں کبھی کبھی۔" اب کے میمونہ بی بولیں۔

"شکل کی اچھی نہیں' تصویریں بناتی ہیں' اسلام آباد میں رہتی ہیں۔" ماہ نور نے ذہن میں دہرایا اور جیسے اس جگسا پزل کا ایک ٹکڑا اپنی جگہ پرفٹ بیٹھ گیا۔

"کیا وہ بچہ ان تصویروں والی کا تھا؟" اس نے بے اختیار پوچھا۔

"پتا نہیں۔" فضل حسین کا ہلتا ہوا سر اور بھی تیزی سے ہلا۔ "مگر اللہ معاف کرے جس حالت میں ہم نے اللہ جنت نصیب کرے بیگم صاحب کو دیکھا کہ یوں لگتا تھا مانو ابھی کوئی زچہ بچہ جن کر فارغ ہوئی ہوں اور قتل کردی گئی ہوں۔"

"کلک' کلک۔" ماہ نور کے دماغ میں تیزی سے چند اور بتیاں روشن ہوئیں۔

"فلزا ظہور کا دکھ۔" اسے سعد کے نوٹ کے الفاظ یاد آگئے۔

"کھاری سعد کا بھائی ہے۔" سردار چاچا کی گواہی۔

"دی آرٹسٹ!" سعد کے فون میں محفوظ نمبر کے مالک کا نام۔

"دی آرٹسٹ کے الفاظ... بے تکلفی کا عالم۔"

اس نے باری باری میمونہ بی اور فضل حسین کو مشکور نظروں سے دیکھا' پہلی بار اس کی خواری بے مقصد نہیں رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

فاطمہ بیس منٹ تک کسی سے فون پر بات کرنے کے بعد فارغ ہوئی تھیں' فون بند کرکے انہوں نے ایک لمبا سانس لیا تھا اور پھر ان کی نظریں خلا میں کسی ایک نکتے پر جم گئی تھیں۔

پچھلے کچھ عرصے سے جس بات کا انہیں یقین ہو چلا تھا اس روز وہ ایک ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آگئی تھی۔

"یا اللہ' دنیا میں کیا کیا ہوتا رہتا ہے' حیرت انگیز' عجیب اور ناقابل یقین واقعات۔" انہوں نے سوچا۔

"اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ ماہ نور کے ساتھ جو لڑکا ہمارے گھر آیا تھا وہ شہناز کا بیٹا تھا تو کیا تم بری طرح چونک نہیں جاؤ گی۔" اسی روز انہوں نے خدیجہ سے کہا تھا اور چاول کی پلیٹ میں کانٹا اور چمچ چلاتی خدیجہ کے ہاتھ رک

گئے تھے۔

"مگر فلزا تو شہناز کا بیٹا کسی بس اسٹاپ پر رکھ آئی تھی۔" خدیجہ نے کہا۔ "کیا اس بچے نے یوں سروائیو کرلیا؟"

"نہیں' یہ وہ بچہ نہیں ہے غالباً" یہ تو شہناز کے شوہر ہی کے پاس پلا بڑھا ہے' مگر اسے خود علم نہیں کہ اس کی ماں کون تھی' غالباً" شہناز کے شوہر نے اپنے کرتوت چھپانے کی خاطر بچے کو بتایا ہی نہیں کہ اس کی ماں کون تھی۔"

"شہناز کے شوہر کے کرتوت۔" خدیجہ نے حیرت سے فاطمہ کو دیکھا۔

"ارے بھئی وہی جو فلزا نے سنایا تھا' چھرے سے شہناز کی گردن کاٹ دی۔"

"اگر وہ شخص اتنا سمارٹ تھا کہ حقیقت کو اتنے عرصے تک چھپائے رکھنے میں کامیاب رہا تو کیا اس نے اس بچے کو تلاش نہیں کیا ہوگا جسے فلزا بس اسٹاپ پر رکھ آئی تھی۔" خدیجہ نے کہا۔

"اس کا مجھے علم نہیں۔" فاطمہ نے سر ہلایا "فلزا ابھی تو ادھوری کہانی سنا کر فرار ہوگئی۔"

"اس کا تمہیں علم نہیں تو اس کا تمہیں کیسے علم ہوگیا۔" خدیجہ نے سوال کیا۔

"اس کا خود اس لڑکے نے بتایا۔" فاطمہ نے سکون آمیز لہجے میں کہا۔

☼ ☼ ☼

سعدیہ نے ماسی رشیدہ کو چیختے چلاتے اپنی بات سناتے سنا اور وحشت اور سراسیمگی کے عالم میں دائیں بائیں دیکھا۔

"اٹھ نی سعدیہ! خورے وہ شیدائی کیا کر بیٹھا ہے؟" ماسی رشیدہ نے جنونیوں کی طرح اس کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا تھا۔ سعدیہ نے چپل پہنی تھی یا نہیں اس نے سر پر دوپٹہ اوڑھا تھا یا نہیں اسے خود بھی ہوش نہیں رہا تھا اور وہ ماسی رشیدہ کے ساتھ باہر کی طرف بھاگی تھی۔

"وہ ادھر۔۔۔ ادھر دودھ لوڈ کرانے گیا تھا' اس نے حواس باختگی کے عالم میں باہر کھڑے ماسٹر کمال کو بتایا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ٹائم ہوگیا دودھ لوڈ کرانے کا۔"

"اوئے کدھر فیم ہوگیا تھا دودھ لوڈ کرانے کا۔" ماسٹر کمال نے صافہ کندھے سے اتار کر دوبارہ رکھتے ہوئے کہا اور دوسری سمت بھاگنے لگا۔

"اوئے منڈیو' اوئے جوانو' اوئے بھج کے' (بھاگ کے) کھاری کو پکڑو اوئے' اوئے دیکھو اسے لبھو (ڈھونڈو) وہ بھاگتے ہوئے چلا رہا تھا' سعدیہ اور رشیدہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

مولوی سراج کو ظفر لمبڑ نے کسی مہمان کی آمد کی اطلاع دی تھی "بڑا کوئی امیر کبیر' اونچی شان والا بندہ لگتا ہے مولوی جی یہ لمبی گاڑی پر بیٹھ کر آیا ہے۔" ظفر لمبڑ نے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی کی لمبائی کا بیان کیا۔

"کوئی مسافر ہوگا' دو گھڑی مسجد میں آرام کرنا چاہتا ہوگا۔" مولوی صاحب نے بے نیازی سے کہا۔

"لیں مولوی جی!" ظفر لمبڑ ہنسا "اتنے امیر ادمی نے' ہمارے پنڈ کی مسجد میں ہی آکر آرام کرنا ہے نا' اس مسجد کی عمارت سے لمبی تو اس کی گاڑی ہے' اس میں اول نمبر اے سی بھی چلتا ہوگا' آرام کرنا ہوتا تو اسی میں لیٹ کر آرام کرلیتا مسافر۔ اور پھر ادھر بابے شاہ عالم کا دربار بھی تو ہے' چوبیس گھنٹے جس کا لنگر چلتا ہے' آرام کرنا ہوتا تو ادھر کرتا پھر وہ تو ادھر آیا ہے' آپ کا نام لے کر پوچھتا ہے' آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

مولوی صاحب سوچ میں پڑ گئے۔

"میرا تو ایسا کوئی واقف نہیں۔" وہ سوچتے ہوئے بولے۔

"پر وہ تو آپ کا واقف ہے نا۔" ظفر مسکرایا۔ "آپ مل لیں مولوی جی' ہوسکتا ہے مسجد کے لیے چندہ ہی دے جائے' چوبارہ پکا کرا لیجئے گا' صحن میں پنکھے لگوا لیجئے گا' جنریٹر خرید لیجئے گا مسجد کے لیے۔"

"ہاں ہاں۔۔۔ یہ تو خیال نہیں آیا۔ مولوی صاحب کو تسلی محسوس ہونے لگی "بلالو بھئی بلالو اندر۔"

وہ سنبھل کر بیٹھ گئے اور چہرے پر معتبری طاری کرلی۔ آنکھیں بند کرکے تیزی سے تسبیح کے دانے گرانے لگے۔ آنے والے کے انتظار میں چند لمحے گزارنے کے بعد ذرا کی ذرا کو آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔ آنے والا جھک کر اپنے بوٹ اتار رہا تھا مولوی صاحب کی نظریں سیاہ پالش شدہ چمکتے قیمتی بوٹوں پر پڑیں اور انہوں نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔

"السلام علیکم سراج سرفراز' پہچانا!" چند لمحوں بعد انہیں اپنے قریب سے آتی آواز سنائی دی اور انہوں نے آنکھیں کھول کر اوپر دیکھا۔ اپنے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر لحہ بھر میں ان کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگ رہا کہ تم کام کرتی ہو اور میں سارا دن ادھر بیٹھا آرام کرتا ہوں۔" سعد نے نادیہ کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"ابھی تم مکمل صحت یاب نہیں ہوئے' جب ہوجاؤ گے تو تم بھی کام کرنا۔" نادیہ نے اس کے کپڑے لانڈری باسکٹ میں رکھتے ہوئے جواب دیا "میں تمہیں کام کرنے سے بالکل منع نہیں کروں گی کیونکہ اس ملک میں ایک عام آدمی کی حیثیت میں رہنے کے لیے تمہیں کام تو کرنا ہی پڑے گا۔"

"میں وہاں بھی ایک عام آدمی کی حیثیت ہی میں رہتا تھا۔" وہ روکھائی سے بولا۔

"کیا واقعی؟" وہ ہنس دی "کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ حیثیت عام آدمی کی سی تھی۔"

"تم طنز کررہی ہو بلکہ کرتی رہتی ہو۔"

"نہیں' میں طنز نہیں کرتی۔" وہ اس کی شرٹ تہہ کرتے ہوئے اس کے سامنے آبیٹھی۔ "میں صرف تمہیں یاد دلاتی ہوں۔"

"یہ کہ ایک عام آدمی کی حیثیت میں بالکل بے کار انسان ہوں کیونکہ میری عادتیں بگڑی ہوئی ہیں۔" اس نے ناراضی سے کہا۔

"نہیں' یہ کہ ایک خاص آدمی کی حیثیت میں تم بہت کار آمد شخص ہو۔" نادیہ کھلکھلا کر ہنس دی' سعد نے جواب نہیں دیا۔ وہ بات کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ اس روز ڈیڈی کے والٹ کو دیکھ کر تمہیں سانپ کیوں سونگھ گیا تھا' نادیہ نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

"والٹ دیکھ کر نہیں اس میں موجود تصویر دیکھ کر۔" وہ ابھی بھی اس کی طرف دیکھے بغیر بولا تھا۔

"وہ تصویر؟ نادیہ کو یاد آیا کس کی ہے وہ تصویر؟"

"وہ میری ماں کی تصویر ہے۔" اس نے سامنے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہاری ماں!" نادیہ چونکی "لیکن تم نے تو انہیں دیکھ نہیں رکھا؟"

"میں نے انہیں دیکھ نہیں رکھا مگر میں انہیں کھوج چکا ہوں۔"

"ارے یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" وہ دل سے خوش ہوتے ہوئے بولی "کہاں ہیں وہ کدھر رہتی ہیں؟"

”وہ کہیں بھی نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ مر چکی ہیں۔“ وہ بے تاثر لہجے میں بولا تھا۔

نادیہ کو یک دم ایسا لگا کہ اردگرد بالکل سناٹا پھیلنے لگا تھا ہر چیز خاموش اور جامد ہو چکی تھی۔

”اوہ مجھے بہت افسوس ہوا سن کر۔“ اس نے بدقت کہا۔ ”کیا ہوا تھا انہیں‘ بیمار تھیں کیا۔“

”کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ انہیں قتل کیا گیا تھا۔“ سعد کا لہجہ مزید بے تاثر ہوا۔

”قتل۔“ نادیہ نے چیخنے کے سے انداز میں کہا۔ ”کس نے کیا ان کا قتل اور اور کیوں کیا؟“

”تمہارے محبوب اور عزیز از جان ڈیڈی نے“ اب کے سعد نے براہ راست اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔“ نادیہ کا رد عمل فطری تھا۔

”ہونہہ!“ سعد کے چہرے پر تمسخرانہ تاثر ابھرا ”اسی لیے تو تمہیں کہتا ہوں آنکھیں اور دھیان کھلا رکھا کرو۔“

”لیکن ڈیڈی ایسا نہیں کر سکتے‘ وہ ایسا کیوں کریں گے۔“ نادیہ نے بے یقینی سے کہا۔

”تمہیں پتا ہے کہ ایک بار ممی کو میں نے یہ تصویر اور والٹ دکھایا تو تصویر دیکھ کر ممی اس کو پھاڑ کر پھینک ڈالنا چاہتی تھیں‘ ان کا کہنا تھا کہ یہ اس عورت کی تصویر تھی جو بلال سلطان کے دل پر راج کرتی تھی اور جس کی وجہ سے ممی کو ڈیڈی کی زندگی میں وہ حیثیت نہیں ملی جس کی وہ مستحق تھیں‘ میں نے بہت مشکل سے ممی سے یہ تصویر بچائی تھی۔“

سعد نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

”جس عورت کی ایسی حیثیت ڈیڈی کی زندگی میں تھی‘ ڈیڈی اس کو قتل کیسے کر سکتے تھے۔“ نادیہ نے سوال کیا۔

کچھ دیر یونہی بے یقینی سے نادیہ کو دیکھتے رہنے کے بعد سعد نے سر جھٹکا۔

”سب ڈراما ہے۔“ اس نے نادیہ سے کہا۔ ”تم نہیں جانتیں کہ ڈیڈی خود ایک کتنا بڑا ڈراما ہیں۔“ اس نے نادیہ کے چہرے پر پھیلی حیرت دیکھ کر دھیان دوسری طرف پھیر لیا۔ ڈیڈی کو اپنا آئیڈیل ماننے والی نادیہ کے لیے ان کے بارے میں بولے گئے یہ الفاظ یقیناً بہت سخت تھے۔

”میرے پاس بہت سارے شواہد ہیں۔“ اس نے ایک مرتبہ پھر نادیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میری بے گناہ اور معصوم ماں کے قتل سے چل کر پاؤں کے سارے خون آلود نشان ڈیڈی کی طرف جاتے ہیں۔“

”لیکن......“ نادیہ نے کہنا چاہا لیکن سعد نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش کرا دیا۔

”یہ ہی نہیں بیچاری فلزا ظہور کو ایک بچے کا تحفہ دے کر اس سے وہ بچہ حادثاتی طور پر گما دینے والی ذات بھی ڈیڈی ہی کی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”وہ ماں بچے کی جدائی میں سسکتی رہی اور بچہ چودھری سردار کے فارم ہاؤس پر ملازموں کی طرح پلتا رہا اور اس سارے ڈرامے کے مرکزی کردار یعنی ڈیڈی نے کبھی عمر بھر اس بچے کو یاد تک نہیں کیا‘ جو فلزا ظہور سے ہی سہی ان کا اپنا بچہ تو تھا۔“

”فلزا کون؟“ نادیہ نے پوچھا۔

”ہے بے چاری قسمت کی ماری ایک دکھی عورت۔“ سعد نے سر جھٹکا ”میں کبھی اس کی پینٹنگز کا مفہوم نہ سمجھ پاتا اگر ڈیڈی کے چیلسی والے گھر پر فلزا کا پورٹ فولیو نہ دیکھ لیتا۔“

”وہ بچہ تمہارا نصف برادر ہوا نا پھر تو جیسے میں تمہاری نصف بہن ہوں۔“ نادیہ نے کہا۔

”اوہ ہاں!“ نادیہ کی بات سے سعد کو یاد آیا ”ایک اور مثال تم ہو ڈیڈی کے پتھر دل ہونے کی۔ دو عورتوں سے دو بیویوں سے بے وفائی کے بعد ڈیڈی نے تمہاری ماں کے ساتھ قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا‘ تمہیں پیدا کیا اور پھر ایک نیا ڈراما رچا کر تم دونوں کو بھی اپنی زندگی سے فارغ کر دیا۔ تمہارے چلے جانے کے بعد میں نے انہیں کبھی

بھولے سے بھی تمہارا ذکر کرتے نہیں سنا۔“ سعد کو لگا ‘ڈیڈی کے بارے میں ایک تلخ سچ سنا کر ہی وہ نادیہ کو قائل کر سکتا تھا۔

”خیر وہ تو کہانی ہی دوسری ہے۔“ نادیہ کا دل ڈیڈی کی طرف سے بالکل صاف تھا۔ وہ حقائق کی جمع تفریق کرتے رہنے کے بعد ہی اس عمر کو پہنچی تھی۔

”لیکن تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے‘ ڈیڈی کی سنگ دلی اور بے حسی تمہارے اور ان کے درمیان فاصلے کیوں نہ کھڑے کر سکی۔“ نادیہ نے اس سے براہ راست سوال کیا ”جبکہ تم اس عورت کے بیٹے تھے جس کو وہ اپنے ہاتھوں سے قتل کر چکے تھے۔“

”میں!“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ ”میں ان کی مجبوری بن گیا تھا۔ مجھے وہ دنیا کے سامنے اپنا بیٹا ڈکلیئر کر چکے تھے اور پھر رشتوں کے ایک ہجوم کو ٹھکرانے کے بعد کسی ایک سے متعلق رہنا بھی ایک مجبوری تھی‘ سو انہوں نے مجھے اپنا لیا۔ مگر کیا اپنایا؟“ اس نے نادیہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”انہوں نے میری تربیت میں اتنے خلا اور سوال چھوڑ دیے کہ میں نہ وہ رہا جو وہ مجھے بنانا چاہتے تھے نہ وہ بنا جو خود بننا چاہتا تھا۔ میرا وجود مجسم سوال‘ مجسم تلاش بن کر رہ گیا۔ میری ماں سے متعلق ہر سوال سے اجتناب نے ڈیڈی کے سامنے میری نظروں میں ایک سوالیہ نشان کھڑا کر دیا اور ان ہی سوالوں کے جواب ڈھونڈنے نے مجھے روپ بہروپ کے چکر میں ڈال دیا۔ بستی بستی قریہ قریہ کا مسافر بنا دیا میں خود کو سب کچھ اپنے پاس موجود ہوتے ہوئے بھی خالی ہاتھ ہی محسوس کرتا رہا۔“

”اور اسی روپ بہروپ نے ‘بستی بستی قریہ قریہ کے سفر نے تمہیں جو ماہ نور سے ملا دیا اسے تم کیا قرار دو گے خوش قسمتی یا کچھ اور؟“ نادیہ نے اس کی بات سنتے سنتے کہا‘ نادیہ کا سوال سن کر وہ لمحہ بھر کے لیے گم صم ہو گیا۔

”بد قسمتی۔“ پھر اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ اسے بد قسمتی کہنا چاہیے۔“ نادیہ حیرت سے بولی۔

”ہاں!“ وہ اٹھ کر بالکنی کی طرف چلا گیا۔ اس کا چہرہ نادیہ کی نظروں سے چھپ گیا تھا۔ ”انسان کسی کو شدت سے چاہنے لگے اور اسے صرف اس وجہ سے اپنا نہ سکے کہ اس کی ذاتی زندگی میں بہت سے تضادات ہیں تو اسے بد قسمتی کے علاوہ اور کیا قرار دیا جا سکتا ہے“ نادیہ کو محسوس ہوا کہ اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

”اگر ایسا بھی ہے تو ماہ نور سے تمہارے تعلق کو اس سے کیا لینا دینا‘ تمہیں چاہیے آگے بڑھو اور اسے اپنا لو بس۔“ نادیہ اس کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔

”میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔“ وہ بالکنی میں کھڑا سامنے کا منظر دیکھتے ہوئے بولا۔

”وہ ایک اکیلی لڑکی نہیں ہے‘ اس کا ایک خاندانی پس منظر ہے‘ والدین‘ بھائی‘ رشتہ دار‘ برادری اور وہ ایسے لوگ ہیں کہ کسی نئے شخص کو اپنے خاندان میں خوش آمدید کہنے سے پہلے اس کی اچھی طرح جانچ کرتے ہیں اور میرے تضادات کیا ہیں اس کے سگے چچا کو بہت اچھی طرح معلوم ہے۔ ایک قاتل باپ کا بیٹا‘ ایک ایسے باپ کا بیٹا جس کا دوسرا سگا بیٹا اس کے چچا ہی کے فارم ہاؤس پر پلتا رہا...... نہیں۔“ سعد نے سر جھٹکا ”میں اس جانچ کا سامنا نہیں کر سکتا تھا‘ میں اس لڑکی کو جس سے میں نے ٹوٹ کر محبت کی ہے یوں لیٹ ڈاون نہیں کر سکتا تھا۔“

”ایک بات بتاؤ۔“ نادیہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”ہاں پوچھو۔“ اس نے مڑ کر دیکھا۔

”ماہ نور بھی تم سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہے۔“

”اگر ٹوٹ کر محبت کرنے سے آگے بھی کوئی درجہ ہوتا ہے تو وہ اس درجے پر کھڑی ہے۔“

نادیہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"پھر بھی تم اسے بغیر کچھ کہے، بتائے چھوڑ آئے۔"

"ہاں پھر بھی، کیونکہ میں اسے کوئی دکھ نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔"

"اس کے لیے تمہارے یوں چلے جانے سے بڑھ کر بھی کوئی دکھ ہوگا بھلا بتاؤ۔" نادیہ کو غصہ آنے لگا۔

"یوں وہ مجھے ایک غیر مستقل مزاج، لاپروا، جذباتی، احمق شخص سمجھ کر بھول جائے گی۔ مجھ سے وہ پہلے بھی شاکی رہتی تھی، اسے میرے کسی اظہار کا انتظار رہتا تھا جو خوش قسمتی سے میں نے نہیں کیا اس کی مجھ سے توقعات کم تھیں، وقت کے ساتھ ساتھ بالکل ختم ہو جائیں گی۔"

"او میرے خدا!" نادیہ نے آنکھیں بند کرلیں۔ "کیسے کیسے مفروضوں پر زندگی گزار رہے ہو تم۔" اس نے غصے اور ناراضی بھرے لہجے میں کہا۔ "یہ ہو جائے گا، وہ ہو جائے گا۔ مجھے تو رہ رہ کر اس لڑکی کا خیال آرہا ہے، کیا حال ہوگا اس کا۔"

"وہ ٹھیک ہے، نارمل ہے، اپنے چند کورسز مکمل کرنے کے لیے شہر سے باہر گئی ہوئی ہے۔" سعد واپس کمرے کی طرف مڑا۔

"تمہیں کیسے معلوم۔۔۔ کیا تم اس سے رابطے میں ہو؟" نادیہ نے کہا۔

"میں احمق ہوں جو اس سے رابطے میں ہوں گا۔" اس نے سر جھٹکا۔

"پھر؟"

"میری اس کی پڑوسن خالہ سے بات ہوئی، انہوں نے ہی بتایا۔"

"پڑوسن خالہ سے اس کے بارے میں پوچھنے کے لیے فون کیا تھا تم نے۔" نادیہ نے حیرت کا اظہار کیا۔

"نہیں۔" اس نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کھولتے ہوئے کہا۔ "میں نے انہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ میری ماں جو ان کی کزن تھی۔ قتل ہو چکی۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ ان کی کزن تھیں۔"

"تمہارے پاس موجود تصویر دیکھ کر۔" اس نے کہا اور ٹی وی پر چلتا پروگرام دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ درختوں کے ایک کنج میں یوں بیٹھا تھا کہ کسی کو نظر نہ آسکے۔ زندگی کے اہم ترین فیصلے پر عمل کرنے کے لیے اسے ایسے ہی گوشہ تنہائی کی ضرورت تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ننھی سی پڑیا تھی، جس میں بند سوغات کا استعمال اس کا رشتہ دنیا اور دنیا والوں سے منقطع کر دینے والا تھا۔ کچھ دیر ہاتھ میں پکڑی پڑیا کو دیکھتے رہنے کے بعد اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ سہ پہر ڈھل رہی تھی، آسمان پر کہیں کہیں بادلوں کی ٹکڑیاں تیر رہی تھیں ڈھلتی سہ پہر کے اس آسمان کا رنگ ہلکا نیلا تھا۔ اس نے فضا میں اڑتے پرندوں کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے، وہ اسی آسمان کو تکتے، انہی پرندوں کو چہچہاتے سنتے اور اڑتے دیکھتے دیکھتے بڑا ہوا تھا۔ بچپن میں وہ سبزیوں اور پھولوں کی پنیریوں کو چونچیں مار کر برباد کرتے پرندوں کے پیچھے ہاہو کا شور مچاتے بھاگتا، ان کو یہاں سے وہاں اڑاتا پھرتا تھا۔ جال لگا کر دعوتوں کے لیے پکڑے جانے والے بٹیروں اور چڑیوں کو ہاتھ میں پکڑ کر ان کی سہمی ہوئی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے باتیں کرتا تھا "اوئے کیوں آئے او ایدھر، نہ ایدھر آوندے نہ پھڑے جاوندے، ہن دسو میں تہانوں کیویں بچاواں (اوئے کیوں ادھر آئے نہ ادھر آتے نہ ہی پکڑے جاتے، اب بتاؤ۔ میں تمہیں کیسے بچاؤں) وہ ان سے کہتا جاتا اور قریب موجود بٹیرے، چڑے حلال کر کے ان کے پر اتارتے بندوں سے نظر بچا کر ان میں سے چند ایک کھلی فضا میں اڑا دیتا تھا۔ ان چند پرندوں کو یاد کرتے ہوئے جن کو اس نے حلال

ہونے سے بچا لیا تھا اس کی آنکھوں سے جاری آنسوؤں نے قطار باندھ لی۔

"اور یہ درخت۔" پھر روتے روتے اس نے خود پر سایہ کیے درختوں کو دیکھا۔ وہ اس کی نظروں کے سامنے جڑیں پکڑتے رہے اور اس کی نظروں کے سامنے ہی بڑے ہوتے آسمان کو چھوتے محسوس ہونے لگے تھے۔

"پیپل کے اس درخت کے پتوں کو ہاتھوں میں دبا دبا کر ان کی روٹیاں پکاتا تھا بچپن میں اور آم کے اس درخت سے کیری امبیاں چنتے بڑا ہوا، کسی وقت کا کھانا پسند نہیں آتا تھا تو ان امبیوں (کیریوں) میں پودینے کے پتے ملا کر پیسا نمک مرچ ملا کر روٹی کے ساتھ کھا لیتا اسے اپنی زبان پر اس چٹنی کا ذائقہ محسوس ہونے لگا۔ آنسوؤں کی قطار مزید بندھی۔

آسمان پر موجود بادلوں کی ٹکریاں ایک جگہ جمع ہونے لگیں، آسمان کا ہلکا نیلا رنگ ان بادلوں کے پیچھے چھپنے لگا۔

"جب کوئی نیک بندہ مرتا ہے نا تو بارش ہونے لگتی ہے، آسمان بھی اس کے دنیا سے رخصت ہو جانے پر روتا ہے۔" مامی جنت کہا کرتی تھی۔

"جے اج رات نوں مینہ وس جائے تے فیر ایدھا مطلب میں نیک بندہ ساں (جو آج رات بارش برس جائے تو اس کا مطلب میں نیک بندہ تھا) اس نے سوچا "چھڈ و جی" پھر اس نے سر جھٹکا۔ "نیک بندہ ہوندا تے حرام موت مردا۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی ننھی پڑیا کی طرف دیکھا اور رونے لگا۔

یہ وہ موسم تھا جب گندم کی فصل کاٹی جاتی تھی۔ فضا میں اڑتی دھول اسے گندم کی کٹائی کے منظر یاد دلانے لگی۔ (بندے کٹائی کرتے تو وہ دوڑ دوڑ کر کبھی سب کو پانی پلاتا اور کبھی لسی پلاتا۔ گندم کے خوشوں کو ایک جگہ باندھتا اور پھر سب کو زردہ پلاؤ کھلاتا تھا۔ اسے یاد آرہا تھا۔

اسی موسم میں ہر طرف میلے لگتے تو وہ گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ منگو کے میلے پر جاتا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے بابے منگو کے میلے کی رونقیں گھومنے لگیں، جھولے، اسٹال، کھیل تماشے، میلے کو یاد کرتے کرتے اسے ماہ نور اور میلے کے سائیں کی یاد آنے لگی۔

سعد باؤ کے نام سے اس کے دل میں ہوک اٹھنے لگی۔

ہائے ککھ نہ چھڈے دیکھ وفاواں عشق دیاں
اوکھے پینڈے لمیاں نیں راہواں عشق دیاں

اس کے کانوں میں سائیں کی آواز گونجنے لگی۔

"واہ سعد باؤ جی تسی کہندے کھاری من موجی بندہ ہے اور اب آپ ہی کی وجہ سے کھاری موت کے دہانے پر پہنچ گیا۔" اس نے قمیص کے دامن سے اپنے آنسو پونچھے۔

"لیکن سعد باؤ کا اس میں کیا قصور، نہ وہ چڑیل ادھر آتی نہ میرے کان میں نئی بات پڑتی۔ جسے سنتا ہوں وہ ہی ماننے سے انکار کر دیتا ہے میں تو نہ اپنے جوگا رہا نہ بیچاری سعدیہ کے جوگا رہا۔"

"سچی گل ہے کہ بندا بے خبر ہی رہے تو چنگا ہوتا ہے، خبر مل جائے تو اس پر بڑا ہی مشکل ویلا آجاتا ہے۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

سعدیہ کہتی ہے چودھری صاحب آئیں گے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا، لیکن کیا پتا چودھری صاحب آئیں تو کیا نئی بات سنا دیں بہتر ہے بندہ اس سے پہلے ہی دنیا سے چلا جائے۔"

اس نے ہاتھ میں پکڑی پڑیا پر گرفت مضبوط کرلی۔

"میں مخول نئیں بننا چاہتا، میں تماشا نئیں بننا چاہتا ہاتھ جوڑے اور فریاد کی۔ میری کسی نے نہ سنی۔ چلو جی نہ سنیں میں نے کون سا دنیا میں بیٹھے رہنا ہے۔ وہ سب مزے کریں میں تو جا رہا ہوں۔"

اپنے جانے کا سوچ کر اس کا دل لرزنے لگا ہاتھ میں پکڑی پڑیا کھولتے ہاتھ لرزنے لگے۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے پڑیا میں بندھی دو کیڑے مار گولیاں نکالیں۔ یہ دو گولیاں اس کا ناتا دنیا سے ہمیشہ ختم کر دینے والی تھیں۔

"اتنا آسان ہوتا ہے دنیا سے چلے جانا' کیا اتنا آسان ہوتا ہے خود بڑھ کر موت کو گلے لگانا۔" نظر چکرانے لگی۔ زندگی اور زندگی کی ساری لطافتیں اپنے حسین رنگوں کے ساتھ نظروں کے آگے رقص کر رہی تھیں۔

"اوئے کھاری اوئے' اوئے کھاری کدھر چلا گیا تو اوئے؟" درختوں کے جھنڈ سے باہر سے آتی آواز اس کے کان سے ٹکرائی یہ ماسٹر کمال کی آواز تھی۔

"اوئے کھاری نہ اوئے میرا پتر' کوئی پٹھا کام نہ کر بیٹھنا۔"

"کھاری! کدھر ہو تم' اللہ کے واسطے سامنے آؤ۔" سعدیہ پکار رہی تھی۔ قدموں کی آوازیں اور زندہ انسانوں کی پکاریں قریب آتی جا رہی تھیں۔ ہاتھ میں پکڑی گولیاں لرزتے ہاتھ سے منہ کے قریب لے جاتے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

"اوئے کھاری! اوئے رحم کر اپنی جوانی پر' اپنی جوان بیوی پر" وہ کہہ رہا تھا زندگی کی لطافتوں کا رقص تیز ہوئے چلا جا رہا تھا۔ موت کی نیند سلا دینے والی گولیوں والا ہاتھ بری طرح کانپ رہا تھا۔

"اوئے مینوں بچالو ماسٹرجی' میں مرچلا۔" (مجھے بچالیں ماسٹرجی' میں مر چلا۔) ایک چیخ نما آواز اس کے منہ سے نکلی تھی۔

ماسٹر کمال اس آواز پر چونکا اور درختوں کے کنج کے اندر داخل ہو گیا۔ اڑی ہوئی زرد رنگت' فق ہوتے چہرے اور خوف زدہ نظروں کے ساتھ سامنے بیٹھا کھاری تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ماسٹر کی نظریں اس کے پاؤں کے قریب گری پڑیا اور دو گولیوں پر پڑیں اور اس نے سکھ کا سانس لیا۔

"کھاری نوں سنتے ہی خیراں نیں اوئے منڈیو آؤ اس کو یہاں سے اٹھاؤ۔" اس نے پکار کر باہر پھرتے ملازمین سے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼
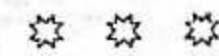
"میری پیاری سہیلی بہیلی۔"

بعد سلام کے عرض ہے کہ یہاں سب خیریت ہے۔ خدا خدا کر کے موسم کی گرمی ختم ہوئی' پرسوں ساون کی پہلی بارش ہوئی اور موسم کھل سا گیا جمعرات کی جھڑی لگی آج تک جاری ہے' سب پیڑ' پودے درخت پتے دھل گئے' ہماری مسجد کی نئی چھت کچی مٹی کی ہے۔ پکی نہیں' ہاں وہ جگہ جگہ سے ٹپکنے لگی۔ کتنے ہی برس ہو گئے کچی چھتوں والے مکانوں کی عادت نہیں رہی' تمہارے سنگ بیتے سال پرانی سب عادتیں بھلا گئے۔ مولوی سراج کا جگر بڑا مضبوط ہے بولا "مٹی اور توڑی محلے والے منگوا دیں گے تم اللہ کا نام لو اور لیپائی شروع کر دو۔"

ہائے میری بہن' اس پتھر دل سے کوئی کیا کہے کہ آخری دنوں سے ہوں ایسی حالت میں گھٹنوں سے پیٹ جوڑ کر کیا بیٹھوں گی اور لپائی کیا کروں گی' مگر اس کو یہ بات کیسے سمجھاؤں وہ تو پانی سے بھرے بھاری ڈول اٹھا کر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے کو بھی معمولی کام سمجھتا ہے' مونگ اور ماش کی پتلی پانی بھری دال کی کٹوری میں روٹی کے نوالے ڈبو ڈبو کر یوں کھاتا ہے جیسے زندگی کا آخری کھانا کھا رہا ہو۔ اسے موسم کی گرمی' سردی خاصے کے معیار اور کام کی سختی کسی بات سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اتنے سال تمہاری ڈیوٹی میں گزار کر بھی اسے نہ سلیقہ چھو کر گزرا نہ ادب آداب سیکھ پایا اور میرا یہ حال کہ ذات کی میراثن' ڈرور تالیاں پیٹ پیٹ کر گانے بجانے والی تمہارے ساتھ رہ کر مغل شہزادیوں کے سے نخرے سیکھ گئی۔ اب زندگی یہاں مشکل لگنے لگی ہے' پھر بھی تمہاری ہدایتوں پر عمل

کرتے ہوئے فقر' غنا' توکل اور صبر پر عمل کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

تم سناؤ کیسی ہو' یہ اچھا کیا کہ سلائی کڑھائی شروع کر دی' تمہارے سلیقے اور ہاتھ کی صفائی سے میں خوب واقف ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے ہاتھ کے بنے صوفوں کے غلاف' سرہانوں کے غلاف اور چادریں خوب بکیں گی۔ چکن کاری تم نے کہاں سے سیکھی یہ ضرور بتانا' مجھے پتا تو نہیں کہ یہ کیسی ہوتی ہے مگر خیال آتا ہے کہ خوب شاندار کام ہو گا یہ بھی۔ دیکھ لو اللہ بھی انسان کے رزق کے لیے کیسے کیسے سبب بناتا ہے۔ میری مانو تو اس شخص دولہا بھائی کو کبھی معاف نہ کرنا' تمہارے ان حالات کا سب کا سب ذمہ دار وہی شخص ہے۔ نہ وہ زندگی میں آتا نہ طیفا تمہارا دشمن بنتا۔

میری مانو پچھلے صحن کا دروازہ کنڈا لگا کر بند رکھا کرو بلکہ اس میں تالا ڈال کر رکھو بڑا سا۔ دل ہر وقت تمہاری طرف اٹکا رہتا ہے۔ مولا تمہیں محفوظ رکھے' تمہاری شان اونچی رکھے' دل اڑتا ہے تمہارا سوچ کر۔ ایک یہ مولوی سراج ہے مجال ہے بلال سلطان کے خلاف کوئی بات سن جائے۔ یہ اس کا بہت بڑا وکیل ہے بھئی۔ اسی لیے تو کہتی ہو کسی اونچ نیچ' سرد گرم سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ہاں! تمہارے کہنے پر ادھر ادھر بہت ڈھونڈنے کے بعد ان ماسٹر صاحب کا پتا چلا ہے' جن کے گھر پر ٹیلی فون لگا ہے۔ ایک گلی چھوڑ ان کا گھر ہے ایک روز میں گئی تھی ان سے نمبر لینے' بیچاروں نے ٹیلی فون بھی سرپوش میں چھپا رکھا تھا۔ دیکھ کر مجھے خوب ہی ہنسی آئی۔ ٹیلی فون کا نمبر لکھ کر بھیج رہی ہوں' ضرور فون کرنا' ماسٹرجی کہہ رہے تھے' چھ منٹ کی کال بک کرائے گا کوئی تو ہم آپ کو اطلاع دے پائیں گے' تو چھ منٹ سے کم کی کال نہ بک کرانا۔

دائی سیماں نے مجھے دو ہفتے بعد کا وقت بتایا ہے' میرا دل ابھی سے گھبرا ہے۔ دعا کرنا میں ساتھ خیریت کے فارغ ہو جاؤں۔ اس حالت میں یہاں صرف میرا اللہ ہے اور میں ہوں ــــ مولوی سراج سرفراز کی بلا سے بچہ پیدا کرتے میری چٹنی بنے یا مربہ۔ وہ تو یہ ہی کہے گا۔ "یہ کون سا غیر معمولی کام ہے رابعہ بیگم! ساری دنیا کی عورتیں بچہ پیدا کرتی ہیں۔" ہونہہ جانے دو' مولوی سراج سرفراز کی بات کو کیا اہمیت دینی۔ اب رخصت ہوتی ہوں چٹھی کا جواب ضرور اور جلد دینا' تمہیں میری قسم۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

فقط تمہاری بہن' رابعہ کلثوم

☼ ☼ ☼
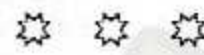
ماسٹر کے گھر پر مولوی سرفراز سراج اور ان کی بی بی کے لیے ٹیلی فون پر ایک پیغام کا مکالمہ ــــ

"بھائی صاحب! میں لاہور سے رابعہ بی بی کی بہن شہناز بات کر رہی ہوں۔ دونوں کو پیغام پہنچا دیجیے کہ فوراً لاہور پہنچ جائیں۔"

"پیغام تو پہنچا دیں گے بہن' لیکن ان کا لاہور پہنچنا مشکل ہے۔ مولوی صاحب کی بی بی کے ہاں چند دن پہلے ہی ولادت ہوئی۔ اللہ نے بچی عطا فرمائی ہے ان کو' زچگی کی حالت میں کیسے سفر کریں گی وہ؟"

"ٹھیک ہے۔ بہن! ابھی لڑکا بھیج کر پیغام پہنچاتا ہوں۔ آپ بے فکر ہو جائیے۔"

☼ ☼ ☼

"گھبرا کیوں گئے سراج سرفراز' لگتا ہے پہچانا نہیں۔ ہاں بھئی بہت سال جو گزر گئے ملاقات ہوئے۔"

آنے والے نے مولوی سراج کے ساتھ گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ مولوی سراج کے حلق سے آنے والے کی بات کے جواب میں الفاظ نہیں نکل پا رہے تھے۔ ان پر ایک عجیب سی رقت طاری ہو رہی تھی۔ ان کی آواز بھرانے لگی تھی اور آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے تھے۔

"بڑی مشکل سے مگر اتفاقاً" تمہارا سراغ لگا میرے ہاتھ سراج! یہ مت سمجھنا کہ میں نے تمہیں تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔" آنے والے نے سراج سرفراز کا ہاتھ پکڑ کر انہیں نیچے صف پر بٹھاتے ہوئے کہا اور خود بھی ان کے قریب آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"لیکن ایک مختصر عرصے کی تلاش کے بعد میں نے تلاش کرنا چھوڑ دیا۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "ایک مختصر عرصے کی تلاش کے بعد گویا میں نے کچھ بھی کرنا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد سب کچھ جیسے آپ ہی آپ ہوتا رہا' میں تو بس نظارہ کر رہا تھا۔"

مولوی سراج نے دائیں بائیں دیکھا اور کچھ کہنا چاہا۔ الفاظ ایک مرتبہ پھر اس کے حلق میں پھنس گئے۔

"مگر اس وقت میں اپنی کرنے تو نہیں آیا تا۔" پھر اس نے نرمی سے مولوی سراج کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

"اس وقت تو میں تمہاری سننے آیا ہوں' کدھر رہے' کہاں گم ہو گئے تھے؟"

"ق ۔۔۔ ق ۔۔۔ قت۔" مولوی سراج کے منہ سے کانپتے لرزتے الفاظ نکلے۔ "قت۔۔۔ قتل کا کیا ہوا۔"

انہوں نے بمشکل الفاظ ادا کیے اور مسجد کے داخلی دروازے کی طرف یوں دیکھا۔ جیسے وہاں کوئی کھڑا ہو۔ مہمان نے بھی ان کی نظروں کی تقلید میں دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے دھیان دوبارہ مولوی صاحب کی طرف کر لیا۔

"وہ۔۔۔ وہ ایک بھولی بسری کہانی بن گیا۔"

"ک ۔۔۔ کس پہ پڑا؟" مولوی صاحب نے اس شخص سے آنکھیں چراتے ہوئے پوچھا۔

"تم پر نہیں پڑا' تم فکر نہ کرو۔" وہ مسکرایا۔ اس کے یہ الفاظ جیسے جادو کا سا اثر کر گئے۔ مولوی سراج سرفراز کے عظیم جثے کے اندر دھڑکتے دل' اس کی رگ رگ' نس نس ۔۔۔ ریشے ریشے کے کونوں' کھدروں میں نجانے کب سے چھپا ہمہ وقت کا ایک خوف رینگ رینگ کر باہر نکلنے لگا۔ انہیں یکایک اپنا وجود' دل' دماغ سوچ سب ہوا سے بھی ہلکی محسوس ہونے لگی۔ انہیں ایسا لگا ان کا جسم جو نجانے کب سے چابکوں کی زد میں تھا۔ یکایک کسی انتہائی آرام دہ' نرم گرم' سایہ دار مقام پر آ ٹھہرا ہو۔

انہوں نے برسوں کے تکلیف دہ اس احساس سے نجات حاصل کرنے پر ایک لمبا گہرا سانس لیا۔ لیکن اس سانس کے ساتھ ہی انہیں اتنے برسوں کی خواری' خوف اور آبلہ پائی یاد آنے لگی اور ایک شدید قسم کا غصہ' ناراضی اور رنج ان کے اعصاب سے آ چمٹا۔

"مجھ پر نہیں پڑا اور ہم اب تک چوروں کی سی زندگی گزارتے آئے۔ کبھی ایک جگہ چھپ کبھی دوسری جگہ چھپ' بستی بستی اپنی شناخت چھپاتے' لوگوں کے سوالوں سے بچتے ۔۔۔ آپ کی دھمکی ہماری زندگیوں کے کتنے سال کھا گئی بھائی صاحب! کچھ معلوم بھی ہے۔" ان کی سرمہ لگی آنکھیں ناراضی اور غصے کے احساس کے تحت جلنے لگیں۔

"وہ دھمکی ۔۔۔" آنے والے نے شدید حیرت کے ساتھ مولوی سراج کو دیکھا۔ "یا میرے خدا۔" اس نے اپنا سر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور چند لمحوں کے بعد مولوی صاحب کی طرف دوبارہ دیکھا۔

"سچ کہتی تھی مرحومہ' سراج سرفراز دماغ سے نہیں گردوں سے سوچتا ہے اور اسے دیکھو رابعہ بی بی کو' کیسی عقل مند اور قیافہ شناس بنتی تھی' باتوں باتوں میں اگلے کی عزت اتار بھی لیتی تھی اور اسے بادشاہ بھی ثابت کر دیتی تھی۔ وہ بھی تم جیسے گھامڑ کے ساتھ رہ رہ کر اتنی ہی گھامڑ ہو گئی۔ بخدا مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

"تو کیا گائی نہیں تھی دھمکی' خدا کی قسم سراج قتل تم پر ڈال دوں گا۔" مولوی صاحب نے ناراضی بھری نظروں سے دیکھا۔ اس وقت ان کو خود اپنا آپ برسوں بعد گلیور محسوس ہو رہا تھا اور اپنے سامنے بیٹھا شخص ایک ننھا سا

ہونا نظر آ رہا تھا۔ جس ایف آئی آر کے خوف نے ان دونوں میاں' بیوی کو اتنے برس ادھر ادھر بھگایا' کہیں مستقل ٹھکانا بنانے نہیں دیا۔ اپنی شناخت چھپانے پر مجبور کیے رکھا۔ سعدیہ کی پیدائش کا اندراج تک کرانے سے روک دیا۔ وہ تو بقول اس شخص کے کبھی کٹی ہی نہیں تھی اور وہ ہر لمحے کسی بھی نئی آہٹ کی آواز سن کر اپنے ہاتھوں میں ہتھ کڑیاں لگتی محسوس کرتے رہے۔ ان کا جسم پولیس کے ٹارچر سیل کے اوزاروں کا تصور کر کے خوف سے کانپ کانپ جاتا رہا۔

"تم اس دھمکی کو سچ سمجھے تھے کیا؟" اس شخص نے جس کا نام بلال سلطان تھا سوال کیا۔

"آپ میری اوقات اور بساط کو کیا سمجھتے ہیں بھائی صاحب! آپ کی دھمکی نے میری زندگی کو روگ لگا دیا۔" سراج سرفراز کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"میں نے ۔۔۔" بلال سلطان نے کچھ کہنا چاہا لیکن اسی دم کوئی تیز قدموں سے بھاگتا مسجد کے صحن میں داخل ہوا۔

"مولوی جی' مولوی جی ۔۔۔" آنے والا ہانپتے ہوئے بولا۔ "بڑا قہر پڑ گیا ہے جی' کھاری نے کیڑے مارنے والی گولیاں کھالی ہیں' جلدی کرو مولوی جی! سعدیہ باجی کا کوئی حال نہیں۔"

مولوی صاحب کے چہرے کی نسوں میں تازہ تازہ اترتا خون ایک مرتبہ پھر نچڑ سا گیا ان کا رنگ زرد اور چہرہ دوبارہ سے فق ہو گیا۔

"مولوی جی! بھین جی کو میں لے آیا ہوں' دیر مت کرو باہر موٹر سائیکل کھڑی ہے' دیر کرنے والی بات کوئی نہیں ہے جی۔" آنے والا کہہ رہا تھا اور مولوی صاحب اپنا صافہ سنبھالتے پل میں کھڑے ہو گئے۔ آنے والے مہمان کی طرف دیکھ کر بولے۔

"تمہارے داماد نے گولیاں کھالی ہیں' آپ نے دیکھا ہم پر ہر دم کیسا کیسا کڑا وقت پڑتا ہے۔"

"میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ' کہاں ہیں تمہاری بیٹی اور داماد" بلال سلطان کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"ادھر ہیں جی فارم ہاؤس پر۔" اطلاع لانے والے نے ہاتھ سے کسی سمت اشارہ کیا۔

"او فارم ہاؤس۔" بلال سلطان نے کہا۔ "ادھر تو مجھے بھی جانا تھا۔" انہوں نے تیزی سے جوتے پہنے اور ایسا کرتے ہوئے ان کی نظر سراج سرفراز کے رنگ اڑے پرانے کھسے پر پڑی' جس میں سراج کے پاؤں بے بسی سے محفوظ تھے۔

"اچھا جی!" اطلاع دینے والے نے کہا "پھر لگے آؤ میرے پیچھے' مولوی جی!" اس نے سراج سرفراز کو مخاطب کیا۔ "آپ باؤ صاحب کے ساتھ آجاؤ گڈی پر' میں بھین جی کو لے کر پہنچتا ہوں۔" وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

مولوی سراج سرفراز نے خفا نظروں سے بلال سلطان کی طرف دیکھا۔

"چلو سراج دیر کرنے والا معاملہ تو نہیں ہے۔" بلال سلطان داخلی دروازے تک پہنچ کر بولے۔

"تمہاری وجہ سے آپ کو تکلیف ہو گی بھائی صاحب!" مولوی صاحب نے اسی خفا لہجے میں کہا۔

"تمہاری بیٹی میری بیٹی اور تمہارا داماد بھی میرے بیٹوں جیسا ہی ہے سراج مجھے کیا تکلیف ہو گی۔" وہ تیزی سے بولے "جلدی کرو اب کہیں لیٹ نہ ہو جاؤ۔" وہ داخلی دروازے سے باہر نکلے۔ اطلاع دینے والا ٹوپی برقعے میں چھپی رابعہ کلثوم کو موٹر سائیکل پر اپنے پیچھے بٹھائے آگے اڑا جا رہا تھا۔ بلال نے اپنی گاڑی کے لاک ریموٹ کنٹرول سے کھولے اور سراج سرفراز کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"مولوی جی کیوں نہیں آئے صابر بیٹا؟" رابعہ کلثوم نے موٹر سائیکل والے سے پوچھا تھا۔

"وہ لگے آ رہے ہیں جی پیچھے گاڑی میں' شہر والے کسی پروہنے کے ساتھ۔" صابر نے جواب دیا۔ رابعہ کلثوم

نے حیران ہوتے ہوئے گردن ذرا سی موڑ کر پیچھے دیکھا۔ پیچھے ایک لمبی سیاہ گاڑی کچے پکے' اونچے نیچے راستوں پر چلتی آرہی تھی۔

"سراج سرفراز کو کسی نے گاڑی میں لفٹ دے ڈالی۔" رابعہ کلثوم کے دل میں سوال اٹھا لیکن اگلے ہی لمحے کھاری کے متعلق دل دوز خبر اس خیال پر حاوی ہوگئی۔

"اللہ جی میرے کھاری کو سلامت رکھنا' اللہ جی میری سعدیہ کا سہاگ سلامت رکھنا۔" وہ مسلسل دعا کیے جارہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"چوہدری جی! چوہدری صاحب" فارم ہاؤس میں چوہدری سردار کی گاڑی داخل ہوتے ہی چاروں طرف سے فارم ہاؤس کے ملازم گاڑی کے اردگرد جمع ہوگئے۔

"کیا ہوگیا کاکا! خیر تو ہے؟" چوہدری سردار نے اپنی سیٹ کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے پوچھا۔

"کھاری نے خودکشی کرلی ہے جی' اس نے گندم والی گولیاں کھالی ہیں۔" دل دہلا دینے والی خبر ہر طرف سے ان کے کان میں پڑی اور پچھلی سیٹ پر بیٹھی فلزا ظہور کا دل بھی چوہدری صاحب کے دل کے ساتھ ساتھ بیٹھ گیا۔

"اوئے کم بختو! یہ کیا سنا رہے ہو" چوہدری صاحب یکایک جذبات میں آتے ہوئے بولے۔ "کدھر ہے کھاری' کیا حالت ہے اس کی' اوئے تم سے ایک اتنے سے لڑکے کی حفاظت نہ ہوئی ذلیلو! کیا کہا کسی نے اسے جو وہ گولیاں کھا بیٹھا الو کے پٹھو!"

وہ گرج رہے تھے اور گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر آکر کھڑے ہوگئے تھے۔ فلزا ظہور نے بھی تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر آگئی۔ باہر کھڑے ننھے سے ہجوم کی موجودگی کے احساس سے خود بخود اس کا ہاتھ اپنے گلے میں جھولتے اسکارف تک گیا اور اس نے اسے سر پر اوڑھ لیا۔

"ادھر جی!" ایک شخص نے ایک سمت اشارہ کیا' وہ شخص زاروقطار رو رہا تھا۔

"ادھر جی ماسٹر کمال نے اسے ڈھونڈا ہے کنج کے اندر جی' وہ ادھر پڑا تھا۔ پتا نہیں مرگیا کہ بچ گیا' ماسٹر جی کسی کو ادھر جانے نہیں دے رہے۔"

چوہدری سردار تیزی سے فارمنگ ایریا میں موجود کنج کی طرف بڑھے۔ فلزا ان کے پیچھے تھی۔

☼ ☼ ☼

"ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خون خلق
لرزے ہے موج مے تیری رفتار دیکھ کر
ثابت ہوا ہے' ثابت ہوا ہے
گویا ثابت ہوگیا ہے گردن بلال سلطان پر خون خلق
نہیں نہیں خون خلق نہیں
خون مدر آف سعد سلطان
گو ان کا نام نامعلوم ہے اب تک

ماہ نور' فضل حسین اور میمونہ بی تک رسائی کے بعد ہاتھ آنے والی معلومات کی خوشی میں مگن تھی اور اس وقت ہاتھ آئی معلومات کے نوٹس بناتے ہوئے اپنے بابا کے منہ سے ہزاروں بار سنا شعر دہرانے چلی جارہی تھی۔ شعر دہراتے دہراتے اس نے اس کا مفہوم تازہ تازہ ہاتھ لگی معلومات سے جوڑ دیا۔

"گردن فلزا ظہور پر خون خلق۔"

اچانک اس نے شعر کا تعلق فلزا ظہور سے جوڑ دیا۔

آخ' اس کو اپنے حلق میں کڑواہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ "مجھے تو پہلی نظر میں وہ خاتون مشکوک سی لگی تھیں' دیکھا اس کا تعلق جڑ گیا نا قتل کی اس پراسرار واردات سے۔" اس نے سوچا۔ "اس کو دیکھو سعد کہاں کہاں پہلی ملاقات میں اسے مس ہولیشیم قرار دے رہا تھا اور کہہ رہا تھا وہ Caldro میں ابلتا محلول پلانے والی مخلوق تھی' کہاں اس کا نمبر خصوصی رنگ ٹون کے ساتھ فون میں محفوظ کررکھا ہے اور اس کے دکھ پر رویا جارہا ہے۔" وہ جھنجلانے لگی تھی۔

"خیر فی الحال تو ثابت ہوگیا ہے گردن نجانے کس کے خون مدر آف سعد۔" پھر اس نے سر جھٹک کر اپنا دھیان دوبارہ شعر کی طرف کرلیا۔ اور اس دوران اپنے لیپ ٹاپ پر نیا ٹیب کھول کر سوشل ویب سائیڈ پر اپنا اکاؤنٹ چیک کرنے لگی۔

"افوہ اتنے سارے نوٹی فیکشنز۔" وہ حیران ہوتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"کب سے میں لاگ ان نہیں ہوئی ادھر۔" یاد کرتے کرتے نوٹی فیکشنز چیک کررہی تھی۔

اس سلمان کو تو صرف نئے نئے پیجز لائیک کرنے کے سوا کوئی کام نہیں' سلمان سے متعلق نوٹی فیکشنز چیک کرتے کرتے وہ مسکرائی۔ سلمان نے اس دوران بیسیوں نئے پیجز پسند کیے ہوئے تھے۔ یونہی بے دھیانی میں اس نے سلمان کے پسند کردہ ایک صفحے کو کلک کردیا۔ یہ سیاحت سے متعلق کوئی غیر ملکی صفحہ تھا۔ جس پر مختلف سیاحتی مقامات کی تصویروں اور ان کے متعلق معلومات کی بھرمار تھی صفحے کو اوپر نیچے کرتے ہوئے دیکھتے دیکھتے اپنے باکس کی طرف جاتے ہوئے اچانک اس کی نظر ایک تصویر پر پڑی۔ یہ تصویر ایک اتنے مانوس شخص کی تھی کہ اسے دیکھتے ہوئے اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ زندگی میں پہلی بار جہاز کا سفر کررہی تھی۔ اور یہ سفر کرنے سے پہلے اسے ٹی وی پر دیکھے ایسے پروگرام یاد آتے رہے تھے جن میں ہوائی حادثوں کی ویڈیوز دکھائی جاتی تھیں۔ اس کا دل ایک انجانے خوف کے تحت بلاوجہ دھڑک رہا تھا۔ جبکہ اس کے ساتھ سفر کرنے والی ضوفشاں اور سیمی آنٹی کے لیے جیسے یہ ایک معمولی بات تھی۔

"کتنی عجیب بات ہے نا سارہ! ہم جہاز میں سفر کررہے ہیں' سفر کرکے ایک سے دوسرے ملک میں چلے جائیں گے اور یہ سفر بھی ہم عام مسافروں والے اکانومی کلاس میں نہیں بزنس کلاس میں کریں گے' چیک پاٹ ہاتھ لگنا اسے ہی کہتے ہیں غالباً" جیک پاٹ "ایئرپورٹ پر چیک ان کرتے ہوئے سیمی آنٹی نے اس کے کان میں کہا تھا۔

"جو ہم اب تک گزارتے آئے وہ ایک خواب تھا یا یہ ایک خواب ہے سیمی آنٹی! میں فیصلہ نہیں کرپارہی ہوں۔" اس نے نیچی آواز میں جواب دیا تھا۔ سیمی آنٹی نے یہ جواب سن کر اسے مسکرا کر دیکھا تھا۔ سیاہ ٹراؤزر پر سفید کرتی پہنے' سیاہ جیکٹ میں ملبوس وہ ایک ہاتھ سے اپنے سامان کی ٹرالی خود گھسیٹنے کی کوشش کررہی تھی۔ اس کے بال جدید انداز میں ترشے ہوئے تھے اور اس کے چہرے کی رنگت صحت مندی کی چمک سے مالا مال تھی۔

"اور جو ہم جاپان جاتے چین کے بجائے تو کیا خبر ہمیں وہاں رکو مل جاتا۔" سیمی آنٹی نے اور سرگوشی کی۔ ایک آسودہ زندگی کا سکون اور اطمینان سیمی کے چہرے سے بھی جھلکتا تھا۔

"آپ نے غلط کہا سیمی آنٹی' رکو جاپانی نہیں پاکستانی تھا۔ اسے ملنا ہوگا تو پاکستان میں ہی ملے گا۔" سارہ نے اپنے فون کے ہینڈز فری کو کان میں ٹھونستے ہوئے کہا۔

"پاکستان کون سا چھوٹا ملک ہے 'یہاں رکو کال جانا کون سا آسان کام ہوگا" یسی نے سرد آہ بھری۔ "مگر یہ دنیا جس طرح کے عجیب اتفاقات سے بھری پڑی ہے اس میں یہ ناممکن بھی نہیں کہ رکو ہم سے آ ٹکرائے" اس نے سوچا اور پھر اپنے اردگرد چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھ کر چہرے پر ہائی سوسائٹی لیڈی کا تاثر سجا کر رعب داب کے ساتھ آگے چلنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"شاید تم اندازہ نہیں کرسکتے کہ تمہیں زندہ اور صحت مند دیکھ کر میں کتنا خوش ہوں۔" وودن زادے نے اسکائپ پر سعد سے بات کرتے ہوئے کہا تھا۔

"تم میری زندگی میں پیش آنے والا پہلا معجزہ ہو" وہ کہہ رہا تھا "تم جانتے ہو تمہارے ڈاکٹرز بالکل مایوس تھے۔"

"ہاں میں جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ میری زندگی تمہاری ضد کا نتیجہ ہے۔" سعد نے جواب دیا تھا۔

"نہیں یہ میری ضد کا نہیں تمہاری بہن کی دعاؤں اور اس کے ایمان کا نتیجہ ہے۔ یہ اللہ کی مرضی کا نتیجہ ہے۔" وودن نے جواب دیا۔

"جہاں تک میں اندازہ کرسکتا ہوں 'تمہاری یہ سوچ ایک بڑے انقلاب کی نشان دہی کررہی ہے۔" سعد چونکا۔

"ہاں شاید۔" وودن نے مسکرا کر سرہلایا "تمہارے ساتھ تمہارے لیے ہسپتالوں میں گزارے وہ چند دن شاید انقلاب ہی کا باعث بنے۔ مجھے تمہاری بہن کی دعاؤں اور اللہ پر ایمان نے ہلا کر رکھ دیا۔"

"اوہ خوب!" سعد کے چہرے پر عجیب سا طنز ابھرا "اچھی بات ہے۔" اگلے لمحے اس نے چہرے کے تاثر کو چھپا لیا تھا۔

"تمہاری بہن کو مغرب میں عمر گزار دینے کے باوجود پراسرار مشرق کے فسوں نے اپنی گرفت میں جکڑ رکھا ہے۔"

"ہاں معصوم ہے اور نادان بھی۔" سعد نے کہا۔

"تمہاری سوچ ہے کہ وہ کتنی سمجھ دار ہے۔" وودن نے اس سے اختلاف کیا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں کہ تم کچھ زیادہ ہی متاثر ہوگئے ہو۔"

"توکیا تم متاثر نہیں ہو۔"

"میری بات اور ہے 'میری وہ بہن ہے اور اس رشتے کے ناتے مجھے اس سے جتنا پیار ہے اس میں اس کی معصومیت اور نادانی میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔" سعد کا لہجہ سپاٹ ہوا۔

"اور مجھے ایسے لگ رہا ہے جیسے نادان وہ نہیں تم ہو 'دوست تم اپنے ساتھ ہونے والے معجزے کو سمجھ نہیں پا رہے۔" وودن کو اس کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔

"میں جس ذہنی درجے پر کھڑا ہوں 'وہاں موت 'زندگی دونوں ہی میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔"

"اس کا مطلب میرا اندازہ درست تھا 'اس روز دیر ڈبل سلی رنگ کے سب سے اونچے مقام پر تم دانستہ سلی انگ کرنے گئے تھے۔ جبکہ موسم اور سورج کا زاویہ اس کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔" وودن نے چونک کر کہا۔

"تمہارا خیال ہے میں جس ذہنی درجے پر کھڑا ہوں 'وہاں انسان آسانی سے خودکشی پر آمادہ ہوجاتا ہے۔"

"یہ مجھے نہیں معلوم" وودن نے سرہلایا "میرا خیال ہے کہ جس ذہنی درجے پر تم کھڑے ہو وہاں انسان مثبت اور منفی کی جمع تفریق اور ضرب تقسیم کرنے کی صلاحیت کھودیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسے سب منفی دکھائی

دیتا ہے۔ اور یہ ذہنی تنزلی کی ایک بری مثال ہے۔"

"تم جانتے ہو کہ میرے دوست احباب اور وہ لوگ جو مجھے جانتے تھے مجھے 'مسٹر پرفیکٹ' کہہ کر پکارتے تھے۔" سعد نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"وہ ان کی خام خیالی تھی شاید۔" وودن ہنس دیا "پرفیکشن انسان کی خوبی نہیں ہے 'پرفیکٹ ہونا انسان کے مقدر میں لکھا ہی نہیں۔"

"ابھی کچھ دیر پہلے تم نادیہ سے مرعوب ہو رہے تھے۔"

"مرعوب نہیں میں اس کی خوبیوں کا قائل ہو رہا تھا۔ ایسے میں بھی میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ ایک پرفیکٹ ہے۔ غالباً" ایسا تو وہ خود بھی اپنے لیے کہلوانا پسند نہیں کرے گی۔"

"الفاظ کا گھماؤ پھراؤ بات کے معنی نہیں بدل سکتا۔" سعد کا لہجہ سپاٹ ہوا۔

پچھلے پندرہ منٹ سے سعد کے پیچھے کھڑی ان دونوں کی گفتگو سنتی نادیہ نے بے چینی سے چھت کی طرف دیکھا۔ سعد کے بعض رویے اس کی سمجھ سے بالاتر ہو جاتے تھے۔ اس نے وودن کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ سعد کی تلخ باتیں سن کر بھی ناراض نہیں لگ رہا تھا۔

"بات کے معنی بدل کون رہا ہے 'بدلنا چاہتا کون ہے دوست" وودن مسکرایا تھا۔ "فی الحال تم ان سب فلسفوں کو چھوڑ کر اپنی نئی زندگی سے لطف اٹھاؤ اور مجھے یہ بتاؤ کہ پکاڈلی میں کپڑا بچھا کر گٹار بجاتے ہوئے پیسہ کمانا کب سے شروع کر رہے ہو۔"

"شاید بہت جلد۔" سعد نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"شاید کا لفظ ساتھ مت لگاؤ 'کہو بہت جلد۔" وودن نے کہا۔ "انسان کے ارادے میں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے۔ تمہیں امارت سے غربت تک 'محل سے فٹ پاتھ کا سفر کرنے کا بہت شوق ہو رہا تھا نا۔ شاید اسی لیے اللہ نے تمہیں موت کے منہ سے بچالیا۔"

"طنز کر رہے ہو۔" سعد نے کہا۔

"حقیقت بیان کر رہا ہوں۔" وودن مسکرایا۔ "برائے مہربانی اپنے روزانہ کے تجربات مجھے میل کرنا نہ بھولنا۔"

"ضرور۔" سعد نے کہا اور اسکائپ کال بند کردی۔

"تم اسے تنگ کر رہے تھے یا وہ کہہ رہے تھے جو کہنا چاہ رہے تھے۔" نادیہ اس کے عقب سے نکل کر سامنے آ گئی۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔" سعد نے ابرو چڑھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے تمہارا مزاج خراب ہو رہا ہے 'تم گستاخ ہو رہے ہو اور تمہاری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آخر تم چاہتے کیا ہو۔" نادیہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ سعد نے جھلا کر چہرہ دوسری جانب پھیر لیا۔

"اب یہاں ماہ نور ہوتی تو یقیناً" "تمہارے مزاج میں بہتری لاسکتی تھی۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔

"بند کرو نادیہ! برائے مہربانی بند کرو اس موضوع کو۔" سعد تلخ ہوتے ہوئے بولا "میں اس موضوع سے جتنا بچنا چاہتا ہوں۔ اتنا ہی تم یہ موضوع چھیڑ کر بیٹھ جاتی ہو۔"

سعد کی تلخ بات سن کر نادیہ کو برا نہیں لگا تھا 'بلکہ وہ چپکے سی مسکرا دی تھی۔

☼ ☼ ☼

کنج سے کھاری کو تین بندے اٹھا کر باہر کھلی فضا میں لائے تھے۔ اسے اس وقت تک وہاں لائی گئی چارپائی پر لٹا

دیا گیا تھا' کھاری پر غشی طاری تھی۔ ماسٹر کمال نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تھا اور اپنے صافے سے اس کو ہوا دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر آیا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ سعدیہ اور ماسی رشیدہ چارپائی کی پائنتی کے قریب بیٹھی کھاری کے تلوے سہلا رہی تھیں۔

"اوجی مینوں بچالو' ہائے ماسٹرجی موت بڑی ڈاھڈی شے جے' میں اجے مرنا نہیں چاہندا' ماسٹرجی مینوں کدھرے لے چلو' مینوں بچالو" کھاری نیم بے ہوشی کے عالم میں سر ادھر ادھر مارتا بول رہا تھا۔

"کچھ نہیں ہوگا میرے بیٹے' میں تجھے مرنے نہیں دوں گا۔" ماسٹر کمال چہرے پر کپڑا پھیرتے ہوئے اسے چمکارتا جا رہا تھا۔

"میں نے گندم والی گولیاں کھالی ہیں ماسٹرجی!" کھاری نے آدھی آنکھیں کھول کر کہا تھا۔ سعدیہ اور ماسی رشیدہ گھبرا کر سر پیٹنے لگی تھیں۔ ماسٹر کمال نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر دونوں کو خاموش کرا دیا اور ہاتھ ہی کے اشارے سے انہیں سمجھانے لگا کہ کھاری پر صرف خوف طاری تھا اس نے گولیاں نہیں کھائی تھیں۔ کسی نے چارج ایبل پیڈسٹل فین لا کر کھاری کے سرہانے رکھا۔ چہرے پر براہ راست ہوا پڑنے سے وہ ذرا پرسکون ہوتا محسوس ہونے لگا تھا۔

"کدھر ہے کھاری' کیا ہوا اس کو' اوئے کم بختو کھاری کو کچھ ہو گیا تو میں نے تم سب کو فائر مار دینے ہیں لائن میں کھڑا کر کے۔" اسی وقت جذبات میں آئے چودھری صاحب گرجتے برستے وہاں پہنچ گئے ان کے پیچھے سراسیمہ فلزا بھی تھی۔

"ستے ہی خیراں نیں چوہدری جی' کھاری کو کچھ نہیں ہوا۔" چودھری سردار کو دیکھ کر ماسٹر کمال ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"اس کی حالت غیر ہو رہی ہے اور تم کہہ رہے ہو اسے کچھ نہیں ہوا۔" چودھری صاحب تیزی سے چارپائی کے قریب پہنچے۔

"کملا ہے چودھری صاحب! شیدائی ہے' بڑا بہادر بن کر گولیاں کھانے چلا تھا" ماسٹر کمال نے پرسکون لہجے میں کہا "ڈر گیا ہے' گولیاں اندر گنج میں نیچے گری پڑی ہیں' یہ ان کی دہشت سے ہی نیم بے ہوش ہو گیا۔" چوہدری سردار ذرا مطمئن ہو کر کھاری پر جھک گئے۔

"سعدیہ باجی کی امی جی آگئیں' بھین جی آگئیں۔" کسی نے آواز لگائی اور اس منظر میں رابعہ کلثوم آن کھڑی ہوئیں۔ اردگرد کھڑے ہجوم کی وجہ سے انہوں نے برقعے کا جالی دار نقاب اوپر نہیں اٹھایا تھا' لیکن چارپائی پر بے سدھ پڑے کھاری کو دیکھ کر ان کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ ماں کو سامنے دیکھ کر سعدیہ لپک کر ان کے سینے سے جا لگی تھی۔ دونوں ماں بیٹیاں بلند آواز میں رو رہی تھیں۔

"مولوی جی بھی پہنچ گئے ہیں جی!" ایک اور آواز آئی اور اسی منظر میں تیز قدموں سے چلتے مولوی سراج سرفراز کے ساتھ بلال سلطان بھی داخل ہو گئے۔ روتی ہوئی آپا رابعہ اور سراسیمہ کھڑی فلزا ظہور کی بیک وقت بلال سلطان پر نظر پڑی تھی۔ ماضی کی کہانی کے سب اہم کردار برسوں بعد ایک منظر میں اکٹھے ہو چکے تھے۔

✡ ✡ ✡

"میرا پہلا پاکستانی دوست' میری زندگی کا پہلا آنکھوں دیکھا معجزہ۔" کے اسٹیٹس کے ساتھ سعد سلطان کی تصویر امریکا کے کسی شخص نے سیاحت نامی اس صفحے پر اپ لوڈ کر رکھی تھی جسے ماہ نور کے بھائی سلمان نے پسند کیا تھا اور جیسے ماہ نور اپنے بھائی کی تقلید میں دیکھنے کے لیے نظروں کے سامنے روشن کر چکی تھی۔

ودون زادے نامی شخص کی اپ لوڈ کی وہ تصویر ماہ نور کے لیے بھی معجزہ ثابت ہوئی تھی۔

"کون کہتا ہے کہ ڈھونڈے سے کچھ نہیں ملتا۔ کون کہتا ہے کہ لگن سچی بھی ہو تو مشن ادھورے رہ جاتے ہیں۔" ماہ نور کا دل بلیوں اچھلنے لگا تھا۔

اس نے اسی دم اس شخص ودون زادے کے پروفائل کو پڑھا اور اس کے نام ایک طویل پیغام لکھنے کے بعد اسے دوستی کی درخواست بھی بھیجی تھی۔

سعد سلطان' ودون زادے کے لیے معجزہ کیسے ثابت ہوا تھا۔

سعد سلطان کہاں اور کس حال میں تھا۔

اسے سعد سلطان تک پہنچنا تھا۔

ودون زادے کے نام پیغام ان تین باتوں کو مرکز میں لیے ہوئے تھا۔

نصف شب کے قریب ودون زادے کی طرف سے اس پیغام کا جواب اور دوستی کی درخواست قبول کرنے کا پیغام آچکا تھا۔

"We found love in a hopeless place"

نصف شب کے قریب ماہ نور کے کمرے میں رائی حانہ کا گیت زور زور سے بجتا سنائی دے رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

اختر نے اپنی کٹیا سے باہر نکل کر باہر کے منظر کا نظارہ کیا۔

"سائیں جی خیر تو ہے نا۔ مجھے آواز دے لی ہوتی" گھاس پھونس کی آگ جلاتا عبدالودود اٹھ کر اختر کے قریب آیا۔

"کوئی کام نہیں تھا برخوردار! اس لیے آواز نہیں دی۔" اختر نے مسکرا کر کہا۔

"کوئی دم جاتا ہے کہ اس ویرانے میں رونق لگنے لگے گی۔" عبدالودود سامنے دیکھتا ہوا بولا۔ "جدید ترین ماڈل کی قیمتی ترین گاڑیوں سے لے کر' موٹر سائیکل' آٹو رکشے' سائیکلیں' سائیں جی بہتر ہو گا ادھر ایک پارکنگ اسٹینڈ بنوالیں' بعض لوگوں کو بڑی دقت ہوتی ہے لوگ کسی اصول کے بغیر پارکنگ کرتے ہیں اور خواتین تو اکثر ہی شکوہ کرتی ہیں۔ ملک صاحب سے بولیں ادھر فائبر گلاس کا سائبان بھی لگوا دیں' ڈیرا ڈیرا لگنے لگے گا۔" اختر نے دلچسپی اور توجہ سے عبدالودود کی بات سنی اور سامنے دیکھنے لگا۔ مارگلہ کی پہاڑیوں پر ڈوبتا سورج۔ بڑھتی شام کے سائے بڑھا رہا تھا۔

کونجاں وانگ مولیاں دیس چھٹرے
سب' شبیہ تے فقیر دا دیس کیا

اگلے لمحے اس خاموشی اور تنہائی کے سکوت میں اختر کی مترنم آواز سنائی دینے لگی تھی۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عنیزہ سیّد

میرا خیال ہے میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم اب اس کے پیچھے جا رہے ہیں نہ ہی اس کی کوئی بات کر رہے ہیں۔" بلال سلطان کا لہجہ اور بات ابراہیم کے لیے حوصلہ افزا ہرگز نہیں تھی۔

"لیکن انکل! میں نے بتایا کہ یہ لڑکی تو ویسی ہی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" اس نے منمنا کر ایک کوشش مزید کرنا چاہی۔

"تمہارا کیا خیال ہے' میں بہت فارغ ہوں جو جب کوئی مجھ سے ملنا چاہے میں اس ملنے کے لیے Available (دستیاب) ہو جاؤں۔" وہ سخت اور خشک لہجے میں بولے۔

"نہیں ہرگز نہیں انکل! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں۔" ابراہیم نے زبان پھیر کر اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا ہے کہ اسے میں اپنے مان پر لایا تھا۔" اس نے ایک جذباتی وار کھیلنے کی کوشش کی۔ "میں نے ہی اسے یقین دلایا تھا کہ انکل میری بات کو اون کرتے ہیں کیونکہ مجھے وہ اپنے بیٹے جیسا ہی سمجھتے ہیں۔"

۳۰

تیسویں قسط

"میں شاید تمہیں جانتا ہوں' اگر پاکستان میں بہت سی لڑکیوں کا نام ماہ نور ہو تو بھی ایک ماہ نور کو میں ضرور جانتا ہوں۔" دودن زادے نے اپنے نام ماہ نور نامی لڑکی کا پیغام پڑھ کر جواب لکھا۔

"تم کیا سمجھتے ہو' اس پاکستانی لڑکے کی تصویر دیکھ کر پاکستان میں موجود تمام ماہ نور نامی لڑکیوں میں سے کسی ایک ماہ نور نامی لڑکی نے ہی تم سے کیوں رابطہ کیا؟" لڑکی کا جواب آیا۔

"میں سعد سلطان کے حوالے سے ایک ماہ نور نامی لڑکی کو جانتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ ہم ایک دوسرے سے
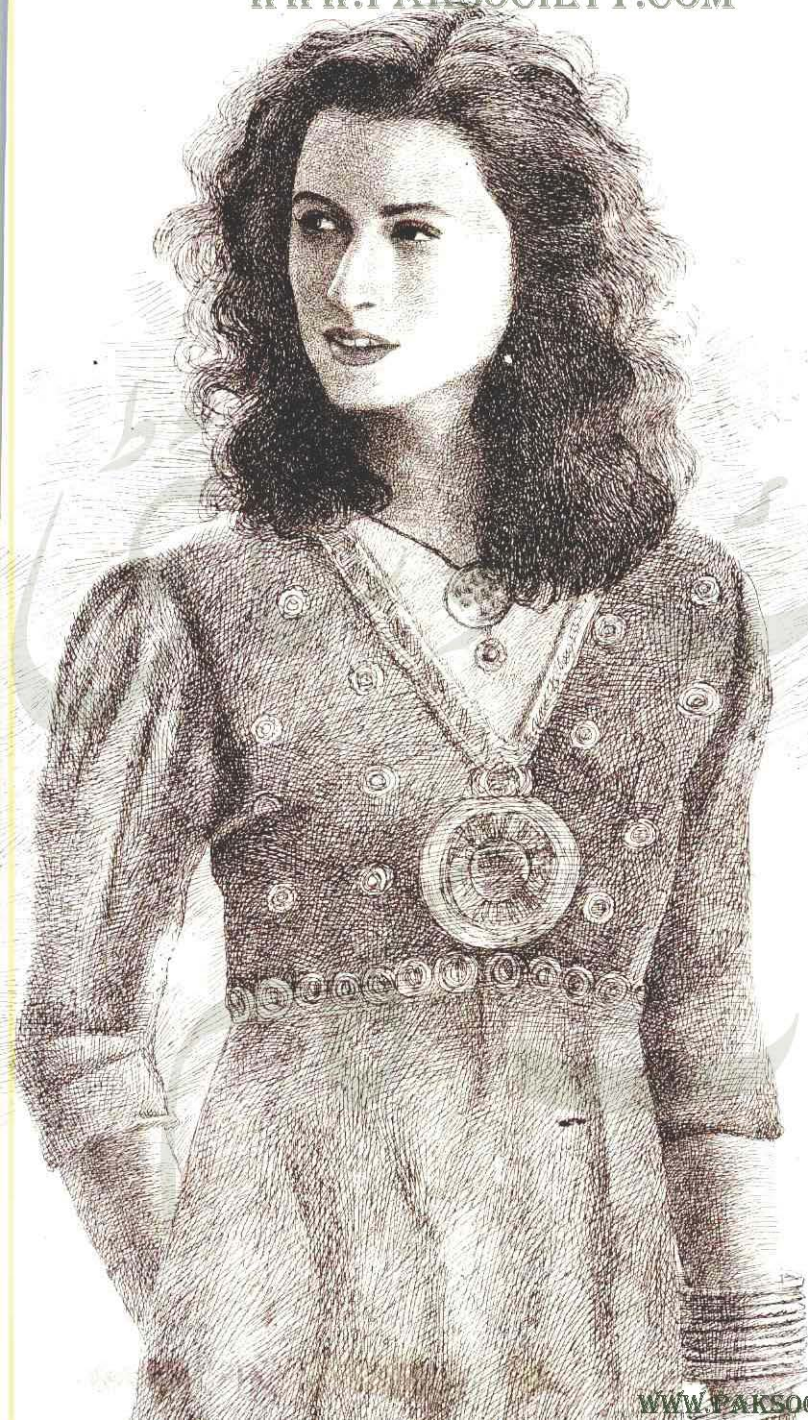
بالکل ناواقف ہونے کے باوجود دوست بن سکتے ہیں۔" وددن نے جواب لکھا اور لڑکی کی دوستی کی درخواست قبول کر لی۔

"تم سعد کو کیسے جانتے ہو۔ کیا تم جانتے ہو کہ وہ ابھی کدھر ہے' کیا کر رہا ہے اور کس حال میں ہے؟" ماہ نور نے وددن زادے سے سوال کیا۔

"میں سعد سلطان کو اتنا جانتا ہوں کہ اس کے سلسلے میں تمہاری بے چینی مجھے ٹھیک سمجھ میں آرہی ہے اور میں اس پر محظوظ بھی ہو رہا ہوں۔" وددن کے جواب نے ماہ نور کو چونکا دیا۔

"رہا یہ سوال کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کس حال میں ہے تو شاید میرا جواب سن کر تمہیں دکھ بھی ہو گا اور تم رونے بھی لگو گی (رونا اس لیے لکھ رہا ہوں کہ مشرقی خصوصاً" ایشیائی لڑکیوں کو سنا ہے رونے کا بہت شوق ہوتا ہے)" بریکٹ میں لکھے اس جملے کو آگے بھجوانے سے پہلے وددن کو اس پر ہنسی آرہی تھی۔

"نہیں مجھے مت بتانا۔ اگر وہ کسی ایسے حال میں ہے جسے جان کر میں رونے لگوں گی۔" ماہ نور نے فورا" جواب دیا۔ "مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں پوچھنا۔" اس کا دل دہل گیا تھا۔

"کیسی عظیم بات کی تم نے؟" وددن ہنسا۔ "لڑکیاں ہر جگہ ہی توہم پرست ہوتی ہیں خصوصاً" اپنی زندگی کے خصوصی مرد کے لیے۔"

"تم سے کس نے کہہ دیا کہ سعد میری زندگی کا خصوصی مرد ہے؟" ماہ نور چڑ گئی۔

"تمہارے اس کے بارے میں کیے گئے سوالات کے انداز نے' تمہاری بے چینی نے۔" وددن نے لکھا۔

"جی نہیں۔" ماہ نور بے نیاز بن گئی۔ "وہ صرف ایک دوست ہے۔"

"اچھا تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں۔" وددن نے لکھا۔ "ویسے اس نے کسی بھی عام دوست یا شناسا کو اپنے بارے میں بتانے سے منع کر رکھا ہے۔ اس لیے میں معذرت خواہ ہوں میں تمہیں اس کے بارے میں نہیں بتا سکتا۔"

"رکو! ایسی بھی بات نہیں۔"

"مجھے نیند آرہی ہے کیونکہ یہاں آدھی رات گزر چکی ہے اور مجھے کام پر بھی جانا ہے صبح اٹھ کر۔" وددن نے لکھا اور سائن آؤٹ کر گیا۔

"افوہ!" ماہ نور کا دماغ گھوم گیا۔

"یہ کیا بات ہوئی!" اس کا دل مایوس ہونے لگا۔ "ہر بات ادھوری رہ جاتی ہے' تلاش کا ہر سرا نامکمل ہاتھ میں آتا ہے۔"

اس نے وددن زادے کے ٹائم لائن کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ پھر اس کے دوستوں کی فہرست دیکھنے لگی اور اس فہرست میں اسے اپنی تلاش میں آگے بڑھنے کا ایک نیا نکتہ ہاتھ لگ گیا۔

☼ ☼ ☼

"نہیں!" بلال سلطان جو اس وسیع کمرے کے وسط میں کھڑے تھے' بولے۔ "ماضی کے چند جھروکے ایسے ہیں

جن کو میں بالکل بھی خوشگوار خیال نہیں کرتا' لہٰذا میں ان پر بات نہیں کروں گا۔"

"کیسے نہیں کرو گے؟" کمرے کے مشرقی کونے سے ایک نسوانی مگر مضبوط آواز ابھری تھی۔ "ماضی کے بدنما' ناخوشگوار' بھدے جھروکوں کے پیچھے ہی تو اصل کہانیاں چھپی ہیں' تم ان پر کیسے بات نہیں کرو گے۔"

"اوہو!" بلال ہنسے۔ "آج کی فلز اظہور اور ماضی کی فلز اظہور میں کچھ زیادہ فرق نہیں آیا ماسوائے بالوں میں

جھلکتی چاندی کے۔ تمہارا لہجہ ابھی بھی ویسا ہی تلخ ہے اور تمہاری پیشانی پر ابھی تک وہی تین بل ہیں' حالانکہ ان میں مزید کا اضافہ ہو جانا چاہیے تھا۔"

"اگر تم سمجھتے ہو کہ ہم سب کی ایک ہی جگہ موجودگی کو تم ہنسی میں اڑا سکتے ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔" فلزا تقریباً" غرائی تھی۔

"اچھا!" بلال نے زبردستی اپنی ہنسی روکی۔ "گویا سب لوگ اپنے دانت تیز اور پنجے جھاڑ کر یہاں پہنچے ہیں۔"

"دیکھیے بلال صاحب! بہتر ہو گا آپ تشریف رکھ کر بات کریں۔" چوہدری سردار نے بلال کے قریب آتے ہوئے کہا۔

"چوہدری صاحب!" بلال مسکرائے۔ "مجھے تو آپ کے فارم ہاؤس کی جادوئی کشش یہاں کھینچ لائی ہے۔ میں نے سوچا خود جا کر دیکھوں' یہ کیسا طلسم ہوش ربا ہے' جس کے اندر داخل ہوتے ہی آئینوں میں اصل چہرے نظر آنے لگتے ہیں۔"

"دیکھیے ایسی کوئی بات نہیں ہے' پلیز! آپ بیٹھ جائیے۔" چوہدری سردار نے ایک اور کوشش کی۔

"بات کچھ خاص ہے ضرور اس فارم ہاؤس میں۔" بلال نے چوہدری صاحب کی درخواست کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہا "دیکھیے تو.... اس ایک جگہ پر سراج سرفراز' رابعہ کلثوم اور فلزا ظہور سب جمع ہیں' کون ہے' جو یہاں نہیں ہے۔ ایک ایک وہی ہے جسے تلاش کرنے میں میرے کتنے ہی ماہ و سال ضائع ہو گئے۔"

"دیکھیے بھائی صاحب!" چوہدری صاحب کا لہجہ مزید شیریں ہوا۔ "آپ کو بیٹھ کر تحمل سے بات کرنی چاہیے۔"

"رہنے دیجئے چوہدری صاحب!" اب کے کمرے میں سنائی دی جانے والی آواز رابعہ کلثوم کی تھی۔ "بلال سلطان صاحب صرف اپنے مطلب کے بندے ہیں' ان سے ان کے مطلب کی بات پوچھ لیجئے' ان کے اردگرد بیٹھے لوگ بھی انسان ہیں' یہ کہاں مانیں گے۔"

"اوہ!" بلال سلطان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی۔ "یہاں تو سب ہی پتنگوں کو پر لگ چکے ہیں۔ افسوس میں اتنا عرصہ ان کی پرواز کے نظاروں سے محروم رہا۔"

"پتنگوں کا لفظ تو تم نے شاید مارے مروت کے استعمال کر لیا۔" فلزا ظہور اپنی جگہ سے اٹھ کر بلال سلطان کے سامنے آکر کھڑی ہوئی۔ "کہنا تو تم چیونٹیاں ہی چاہتے تھے نا!"

بلال سلطان نے تمسخرانہ انداز سے فلزا کی طرف دیکھا اور پھر چوہدری صاحب سے مخاطب ہوئے۔

"ٹھیک ہے چوہدری صاحب! میں یہاں بیٹھ کر سب ہی کی سن لیتا ہوں۔" وہ چوہدری صاحب کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئے۔ "سناؤ بی چیونٹی! کیا سنانا ہے۔" یہ بات انہوں نے کسی کی طرف دیکھے بغیر کہی تھی' لیکن ان کے سامعین جانتے تھے کہ ان کی مخاطب فلزا ہی تھی۔

"جب میں سناؤں گی اور جو میں سناؤں گی' اسے سن کر تو تمہارے ہوش ہی اُڑ جائیں گے بھگوڑے چوہے!" فلزا نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "لیکن پہلے یہ تو بتاؤ تمہارا بڑا لڑکا کہاں ہے' وہ کیوں یہاں نہیں آیا جبکہ وہ مجھے وقت بھی دے چکا تھا اور اس جگہ کا نام بھی۔"

"میرا بڑا لڑکا!" بلال ایک بار پھر ہنس دیے "بڑے" "چھوٹے" کی تفریق میں پڑنے کا تکلف تو تم نے خوامخواہ ہی کیا۔" انہوں نے سر جھٹکا "اور خوب!" انہوں نے فلزا کی طرف دیکھا۔ "گویا وہ تم سے رابطے میں ہے' جبکہ میری نظروں سے تو کب کا اوجھل ہے۔ چوہدری صاحب!" پھر انہوں نے چوہدری سردار کی طرف دیکھا "عجیب

سا ہی اتفاق ہے، میری اولاد کی گمشدگی میں ہمیشہ ان ہی خاتون کا ہاتھ نکل آتا ہے۔"

"یہ کیا چکر ہے بھائی صاحب؟" اس سے پہلے کہ فلزا کوئی تگڑا جواب دیتی، مولوی سراج کی سرسراتی آواز کمرے میں گونجی۔ "بڑا لڑکا، چھوٹا لڑکا، بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"آپ چپکے بیٹھے رہیے مولوی صاحب!" رابعہ کلثوم نے مولوی صاحب کو گھورا۔ "ان صاحب کا کیا بھروسا،" انہوں نے تیز نظروں سے بلال سلطان کو اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا۔ "معاملہ اور چکر کوئی بھی ہو، پرچے ہم پر کٹوا دیں گے۔ یہ تو جب صاحب حیثیت نہیں تھے، اس وقت بھی تگڑے تھے، اب تو خیر سے حیثیت کو بھی بھاگ لگے نظر آتے ہیں، شملے اونچے اور شانیں بلند دکھتی ہیں۔"

"ہوں!" بلال نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "پھر اب کیا کرو گی تم رابعہ بی بی؟"

"بھاگ جانا ہی بہتر ہے۔" رابعہ نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "ایک بار آپ بڑے لوگوں کے کرتوتوں کا ان گناہ گار آنکھوں سے نظارہ کر لینے کا نتیجہ عمر بھر چوروں کی طرح گزارنے کی سزا بھگتنے میں لگ گیا۔ اب تو جو رہ گئی ہے وہ بہت کم ہے اور آپ صاحب لوگوں کے انداز حکمرانی سہنے کی ہمت بھی نہیں رہی۔"

"نہیں رابعہ بی بی! ہم غلط سمجھے تھے۔ بھائی صاحب تو۔" مولوی سراج نے کہنا چاہا لیکن رابعہ کلثوم نے ان کی بات درمیان ہی میں کاٹ دی "ارے چھوٹے مولوی صاحب! آپ تو ہمیشہ ہی ان کے مرید اور وکیل رہے۔ ایسے مرعوب کہ عمر بھر یہ ہی کہتے گزر گئی، جو بھی ہوا اس میں بھائی صاحب کا کوئی قصور نہیں۔ ارے اپنے سامنے سر کٹی لاش پڑے دیکھ کر بھی آپ کو یہ ہی لگتا رہا کہ بھائی صاحب بیچارے گنگا نہائے ہوئے ہیں۔ چھرے پکڑنا اس دنیا میں صرف طیفے لاڑوں کا کام ہے۔ بھائی صاحب کے تو مکھن لگانے کی چھری پکڑتے ہوئے بھی ہاتھ کانپتے ہیں۔ ہیں نا۔"

وہ طنزیہ انداز میں مولوی سراج سرفراز کی طرف دیکھنے لگیں۔ مولوی صاحب رابعہ بی بی کا اتنا سا ہی رعب دیکھ کر سہم گئے اور سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

"ارے واہ سراج سرفراز!" بلال سلطان یکدم اپنی جگہ سے اٹھ کر مولوی صاحب کے قریب پہنچے۔ "معاف کرنا یار! ہمیشہ تمہیں کوتاہ نظر ہی خیال کرتا رہا۔ آج معلوم ہوا اس ہجوم نسواں میں ایک تم ہی تو ہو جو مردم شناس ہو۔"

انہوں نے مولوی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اٹھا کر اپنے برابر کھڑا کیا اور پھر گلے سے لگا لیا۔

"چوہدری صاحب!" پھر وہ چوہدری صاحب سے مخاطب ہوئے "سراج کے داماد کا تو پتہ کروائیے، حواسوں میں آیا وہ لڑکا یا نہیں۔ سراج! تمہیں کیا سوجھی بھئی! کل کے بالشت بھر لڑکے سے بیٹی بیاہ دی۔ کون ہے یہ لڑکا، کہاں رہتا ہے، کیا کرتا ہے، آگا پیچھا دیکھ کر بیاہی لڑکی یا سر سے بوجھ کی طرح پھینک دی۔ دیکھنے میں تو بیچارہ یتیم ہی لگتا ہے۔ کسی مدرسے یا مکتب سے تو نہیں لے آئے تھے ساتھ۔ دیکھو تو مولوی سراج سرفراز کا داماد گولیاں کھا کر خودکشی کرنے چلا تھا۔"

"نہیں بھائی صاحب! کھاری تو بہت ہی بیبا لڑکا تھا۔" مولوی سراج نے بلال کے سوال پر چوہدری سردار کے منہ کے زاویے بگڑتے دیکھ کر کہا۔

"بیبا لڑکا!" بلال ہنسے "کس کا ہے یہ بیبا لڑکا؟"

"تمہارا۔" مولوی سراج کے بجائے اس سوال کے جواب میں فلزا، بلال سلطان کے روبرو آتے ہوئے غرائی تھی۔ "تمہارا لڑکا ہے کھاری، بھگوڑے چوہے!"

☆ ☆ ☆

سعد نے اپنے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا، جس کے چاندی جھلکاتے بال اس کے سر پر الٹا کر کنگھی کیے گئے تھے، اس ہیئر اسٹائل نے اس کی پیشانی کو کشادہ اور نمایاں بنا رکھا تھا اس کے چہرے کے خدوخال چٹپٹے تھے آنکھیں چھوٹی اور زیادہ نمبر کے شیشے جڑی عینک کے پیچھے چھپی تھیں۔ اس کی ٹھوڑی پر سفید اور سنہری بالوں کی چھوٹی سی داڑھی سجی تھی۔ اس نے سرمئی رنگ کا تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا اور وہ کتابوں سے بھری دیوار گیر الماریوں سے سجے اس کمرے میں ایک بڑی سی دفتری میز کے پیچھے گھومنے والی کرسی پر بیٹھا تھا۔

"تمہاری یہ زندگی ایک معجزہ ہی تو ہے۔ اگر تم اس حادثے میں ختم ہو جاتے تو سننے اور دیکھنے والے اس موت کو ایک حادثہ ہی سمجھ کر یاد رکھتے۔ یہ تو تم زندہ بچ گئے تو لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ تم خودکشی کرنے چلے تھے۔ خدا کا شکر ادا کرو اس کو تمہارے لیے حرام موت منظور نہیں تھی۔" اس شخص نے چند لمحے پہلے اس سے کہا تھا۔

"نیت کے بارے میں آپ کا کیا کہنا ہے پھر۔" اس نے اس شخص کا بغور جائزہ لینے کے بعد کہا۔ "کیا میں نیت کے گناہ کا سزاوار نہیں ٹھہروں گا۔ اللہ کو تو حرام موت میرے لیے منظور نہیں تھی، مگر وہ جو خودکشی کی نیت تھی اس کا کیا ہو گا۔"

"یہ ہی تو کہہ رہا ہوں، اللہ نے تمہیں یہ زندگی عطا فرما کر نیت کے گناہ، پر توبہ کا موقع عطا فرمایا ہے۔ اب تو یہ تم پر ہے کہ تم اس موقع کو توبہ کرنے میں گزارتے ہو یا پھر نئی نیتوں کی منصوبہ بندی میں۔"

"آپ کو یہ گمان کیسے ہوا کہ نئی نیتوں کی منصوبہ بندی بھی ہو سکتی ہے۔" سعد نے دفتری میز پر کہنیاں ٹکا کر ذرا سا آگے جھکتے ہوئے کہا۔

"کیونکہ میں نے کئی ایسے لوگوں کی داستانیں پڑھ رکھی ہیں، جو خودکشی کی ایک کوشش ناکام رہ جانے کے بعد نئی کوشش کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں اور ہر نئی کوشش پہلے والی سے زیادہ خوف ناک اور ناقابل یقین ہوتی ہے۔"

"ایسا کون لوگ کرتے ہیں؟" سعد نے سوال کیا۔

"وہ جن کے راستے کھوٹے ہو چکے ہوتے ہیں یا وہ جو اپنے راستے خود گم کر دیتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کی ضد ہوتے ہیں جو طویل اور تاریک راستے کے آخر میں ایک فرضی شمع کی موجودگی کے گمان میں دانستہ مبتلا ہوتے ہیں اور اسی فرضی شمع تک پہنچنے کی آرزو لیے طویل اور تاریک راستہ طے کر لیتے ہیں۔"

"آپ نے منفی لوگوں کے بجائے مثبت لوگوں کی مثال دی ہے کیوں؟" سعد نے سوالیہ انداز میں ابرو چڑھایا۔

"اس لیے کہ میں خود زندگی کو مثبت نظر سے دیکھنے کا قائل ہوں۔" اس کے مخاطب نے اپنا چشمہ اتار کر اس کے شیشے نرم رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کے مطابق میرے جیسے لوگ مثبت انداز فکر والے لوگوں کی ضد ہوتے ہیں۔"

وہ گہرا سانس لیتے ہوئے پیچھے ہٹا اور اپنی کرسی کی پشت سے کمر ٹکا لی۔ جواب میں اس کے مخاطب نے اسے معنی خیز انداز میں دیکھتے اپنے شانے ہلکے سے اچکا دیے۔

"جانے دیں صاحب!" سعد نے اپنی آنکھوں پر دائیں ہاتھ کی انگلیوں کا دباؤ ڈالا۔ پھر اس نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹا کر ان صاحب کی طرف دیکھا جن کا نام ڈاکٹر رضا حسین تھا اور جن سے ملوانے کے لیے نادیہ بطور خاص اس

روزا سے ان کے پاس لے کر آئی تھی۔ ''آپ ملائیشیا یا پھر غالباً'' انڈونیشیا سے تعلق رکھتے ہیں۔''

''میرا تعلق فلپائن سے ہے۔'' ڈاکٹر رضا نے نرمی سے کہا۔

''کچھ ایسا ہی لگ بھی رہا ہے۔'' وہ لاپروائی سے بولا۔ ''نادیہ نے شاید میرے بارے میں آپ کو تفصیل سے نہیں بتایا۔''

''نادیہ نے آپ کے بارے میں صرف اتنا ہی بتایا ہے کہ آپ اس کے نصف برادر ہیں میرے لیے نادیہ کے حوالے سے آپ کا اتنا ہی تعارف کافی ہے۔''

''بہت خوب!'' وہ مسکرایا ''گویا اپنے بارے میں آپ کو مجھے خود ہی بتانا پڑے گا۔''

''میں غور سے سن رہا ہوں۔'' ڈاکٹر رضا نے چشمہ اتار کر میز پر رکھ دیا۔

''کچھ عرصہ پہلے تک میں بھی طویل اور تاریک شاہراہ کے آخر میں جلتی فرضی شمع کے تصور میں غرق ہو کر راستہ عبور کر جانے والوں کی فہرست میں شامل تھا یا شاید یوں سمجھئے کہ میں ایسے لوگوں کی ایک قطار کا رہبر خیال کیا جاتا تھا۔''

''زبردست!'' ڈاکٹر رضا نے کہا۔ ''پھر؟''

''پھر یوں ہوا کہ میرے خود ساختہ مثبت انداز فکر کو حقیقت کے زہر کا پیالا پلا دیا گیا۔''

''ذرا رکیے۔'' ڈاکٹر رضا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔ ''حقیقت کے زہر کا پیالا آپ کو زبردستی پلایا گیا یا آپ نے خود پیا؟''

''نہ تو کسی نے زبردستی پلایا نہ ہی میں نے اپنی مرضی سے پیا بلکہ یوں سمجھئے مجھے پینا پڑا' کیونکہ حقیقتیں ایک کے بعد ایک میرے سامنے آتی چلی گئیں۔''

''اور آپ کے اعصاب بس اتنے ہی مضبوط تھے کہ جب تک حقیقت سے لاعلم تھے اپنی جگہ قائم رہے اور جب حقائق سامنے آگئے تو اعصاب ساتھ چھوڑ گئے اور آپ نے فیصلہ کرلیا کہ زندگی ہی سے منہ موڑ لیا جائے۔'' ڈاکٹر رضا زیر لب مسکرا رہے تھے۔

''آپ مجھے بہت ہی ہلکا سمجھنے لگے غالباً''!'' سعد نے تحمل سے جواب دیا ''میرے اعصاب اتنے مضبوط تو تھے کہ میں حقیقتوں سے روشناس ہونے خود ان کی کھوج میں نکلا تھا۔''

''پھر ان کا سامنا کرنے کا یارا کیوں نہیں رہا؟''

''سامنا بھی کرلیا اور سمجھ بھی گیا۔'' سعد نے سر ہلایا۔ ''لیکن کچھ حقیقتیں انسان کے اپنے وجود پر سوالیہ نشان لگا دیتی ہیں اور جب ایسا ہوتا ہے تو جی نظریں چرانے کو چاہنے لگتا ہے مگر نظر چرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا' ایسے میں جی چاہتا ہے بس زندگی سے ہی منہ موڑ لیا جائے۔''

''ہوں!'' ڈاکٹر رضا اب کے سنجیدہ نظر آئے۔ ''گویا زندگی سے منہ موڑ لینے کا فیصلہ کرلینے کے بعد آپ نے ایک لمبی منصوبہ بندی کی۔ سکی انگ سے ناواقفیت کے باوجود آپ سکی ڈائیونگ کے لیے سازو سامان اٹھائے ویر ڈیل پہنچ گئے اور وہاں آپ نامناسب وقت اور روشنی کا انتخاب کر کے سب سے بلند مقام پر پہنچے۔ موت سے نظریں ملاتے ہوئے ایک لمبی چھلانگ ماری اور اپنے تئیں مر گئے۔ ایک ایسی موت جو بظاہر حادثہ معلوم ہو تاکہ آپ کے لواحقین کو یہ ملال نہ رہے کہ آپ حرام موت مرے۔''

''میرے لواحقین!'' سعد بے اختیار ہنس دیا۔ ''مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں تھی ڈاکٹر صاحب کہ کسی کو میری گمشدگی یا موت کا ملال ہوگا' میرے کھاتے میں لواحقین کی فہرست تو تھی ہی نہیں۔''

''نادیہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

"نادیہ!" سعد نے گہرا سانس لیا "نادیہ کو میرے حادثے کی اطلاع دی جائے گی' یہ میرے وہم میں بھی نہیں تھا۔ میرا امریکی دوست میری توقع سے زیادہ سمجھ دار نکلا۔"

"گویا آپ ایک گمنام سیاح' ایک گمنام سکی ڈائیور کی قبر میں اترنے کا پروگرام بنائے بیٹھے تھے۔"

"یقیناً!" پہلی بار وہ ڈاکٹر رضا کے قیاس سے متفق ہوا۔

"اوہ پھر تو آپ کو اپنا منصوبہ ناکام ہو جانے پر بہت افسوس ہوا ہو گا۔"

"منصوبہ ناکام ہو جانے پر افسوس ضرور ہوتا اگر میں اس حادثے میں زندہ بھی بچ جاتا اور معذور بھی ہو جاتا۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"معذوری سے ڈرتے ہیں؟" ڈاکٹر رضا نے سوال کیا۔

"نہیں۔" اس نے سر ہلایا "معذوروں کے لیے دوسروں کے رویوں سے ڈرتا ہوں' کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر میں معذور ہو جاتا تو اپنے لیے کوئی دوسرا میں خود نہ ہوتا۔"

"میں آپ کی یہ بات سمجھ نہیں پایا۔" ڈاکٹر رضا نے کہا۔

"اچھا ہے نہ ہی سمجھیں۔" وہ بے دلی سے بولا "بات آپ کے سمجھنے کی ہے بھی نہیں۔"

"چلیں ٹھیک ہے نہیں سمجھتے۔" ڈاکٹر رضا نے کہا "یہ بتائیے اب کیا ارادہ ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" اس نے شانے اچکائے۔ "میں فی الحال بے ارادہ ہوں۔"

"آپ نے نادیہ کو دیکھا۔ اس کی زندگی کیسا مثبت موڑ اختیار کر گئی۔"

"ہو سکتا ہے۔" وہ بے نیازی سے بولا "مثبت اور منفی کے ہر انسان کے پاس اپنے پیمانے ہوتے ہیں۔"

"گویا آپ کے پیمانے' عام انسانوں کے پیمانوں سے مختلف ہیں۔ برائی اور اچھائی' سچ اور جھوٹ' مثبت اور منفی کے پیمانے۔"

"آپ گفتگو کو رفتہ رفتہ جس سمت موڑنے کی کوشش کر رہے ہیں میں اسے سمجھ رہا ہوں۔" سعد نے ڈاکٹر رضا کی طرف دیکھا۔ "اس سوال کے بعد آپ ایمان' یقین اور اعتماد کی طرف جائیں گے' پھر میرے کسی دین کی تقلید کرنے یا لادین ہونے پر سوال کریں گے اور پھر اس سے اگلا قدم کوئی نصیحت ہو گی' وعظ ہو گا یا پھر تلقین؟"

ڈاکٹر رضا نے جواب دینے کے بجائے سعد کی طرف دیکھتے دیکھتے آنکھیں جھپکائیں۔

"چھوڑیے ڈاکٹر صاحب!" وہ محظوظ ہوتے ہوئے سر جھٹک کر بولا "نادیہ کو میرے بارے میں شاید کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ میں گمان اور بدگمانی کے درمیان ہچکولے کھا رہا ہوں۔ وہ سمجھتی ہے کہ میں غلط فہمی اور ناسمجھی کا شکار ہو چکا ہوں۔ اسی لیے وہ اپنے تئیں میری عقل اور شعور کے ابہام دور کرنے اور ان کی گرہیں کھولنے کے لیے مجھے آپ کے پاس لے کر آئی ہے۔" اس نے ایک بار پھر سر جھٹکا۔

"مجھے آپ کی قابلیت اور علم پر کوئی شک نہیں۔ آپ کی ذہنی استعداد اور راہنمائی بھی یقیناً" قابل رشک ہوں گی۔ لیکن میری بھولی بہن نہیں جانتی کہ میں حقیقت سے آگاہی کے اس سفر میں کیسے کیسے پڑاؤ عبور کر کے یہاں پہنچا ہوں۔ کوئی سل پر پسی چٹنی' کوئی نور فاطمہ کی جھونپڑی' کوئی شربت کا پیالا' کوئی سائیں اختر کی تنبیہہ میرے بڑھتے قدم نہیں روک سکی۔ اسے کیا معلوم کہ گمان اور یقین کے اس سفر میں کیسی کیسی رکاوٹوں نے میرا راستہ روکا تھا' لیکن حقیقت کی روشنی اتنی طاقت ور تھی کہ میرا راستہ تاریک ہوا نہ طویل' نہ ہی مجھے فیصلے کی سرحد پر پہنچنے میں کوئی مشکل پیش آئی' آپ کو۔" اس نے دائیں بائیں نظر ڈالتے ہوئے کہا "خوامخواہ ہی زحمت دی میری اس محبت بھرے دل والی بہن نے۔"

"آپ نے کبھی پڑھا یا سنا ہے کہ سائنس کے کسی قانون کو قانون بننے سے پہلے کن کن مرحلوں سے گزرنا پڑتا

ہے۔" ڈاکٹر رضا نے اس کی بات کا جواب دینے کے بعد ایک غیر متوقع سوال کیا۔ سعد نے انہیں حیرت سے دیکھا۔

"سب سے پہلے کسی چیز کے بارے میں کسی سائنس دان کے ذہن میں کوئی سوال اٹھتا ہے۔" ڈاکٹر رضا نے انگلی پر گنتے ہوئے کہا۔

"پھر وہ اس سوال پر تحقیق کرتا ہے۔" انہوں نے بائیں ہاتھ کی دوسری انگلی کی پور پر دائیں ہاتھ کی انگلی رکھی۔

"پھر اس کے چند ساتھی اس کے ساتھ اسی تحقیق پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

پھر خیالات کے اس مجموعے پر تجربہ گاہوں میں تجربے کیے جاتے ہیں۔

پھر تجربات کی بنیاد پر اس سوال کے جواب کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اس کی تشریح کی جاتی ہے۔

پھر ایک سے زیادہ سائنس دانوں کا تجزیہ ایک سا نکلنے لگے تو پھر اس کو ایک نظریہ قرار دیا جاتا ہے۔ نظریے پر تحقیقاتی مقالے لکھے جاتے ہیں اور اگر تمام لوگوں کی تحقیق اس سوال کے جواب کی تائید کرتی ہو تو آخر کار اسے سائنس کا ایک قانون بنا دیا جاتا ہے۔"

ڈاکٹر رضا سات انگلیوں کی پوریں گننے کے بعد سانس لینے کو رکے۔

"لیکن آپ کا سلسلہ تو بالکل ہی مختلف ہے' آپ کے ذہن کے سوال نے اپنے ہی اندر سے اٹھنے والے جواب کو قانون قرار دے دیا۔" "مجھے نجانے ایسا کیوں لگ رہا ہے۔"

سعد حسب عادت اپنا نچلا ہونٹ دانت تلے دبائے ڈاکٹر رضا کی بات سن رہا تھا۔

"اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں آپ کو بتاؤں کہ عام انسان کے ذہن میں اٹھنے والے سوال کا جواب کس مرحلے پر جا کر قانون بننا چاہیے۔" ڈاکٹر رضا نے اس سے سوال کیا۔

"جی ضرور بتائیے۔" اس نے خود کو کہتے سنا اور یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں نرمی تھی اور اس کا انداز مہربانہ سا تھا۔

☆ ☆ ☆

کھاری نے جنون کے انداز میں دائیں بائیں سر پٹخا' اسے اپنے ہاتھوں اور پاؤں میں عجیب سی اینٹھن محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے چارپائی سے بمشکل ذرا سا سر اٹھا کر سامنے دیکھنے کی کوشش کی۔ سعدیہ اداس' مغموم' پریشان حال اس کی پائنتی بیٹھی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ کھاری کی ٹانگ پر دھرا تھا' جسے وہ ہولے ہولے دبا رہی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں اپنے دوپٹے کا پلو تھامے وہ آنکھ سے آنسو خشک کرنے میں مصروف تھی۔

"اوئے لیٹا رہ اوئے پتر!" اسے قریب سے ماسٹر کمال کی آواز سنائی دی "ذرا ڈھنگ سے ہوش تو کرلے پہلے۔"

"مم' ماسٹر جی!" ماسٹر کمال پر نظر پڑتے ہی کھاری کے منہ سے چیخ نما آواز نکلی "میں مر چلا جے' میں کنک (گندم) میں رکھنے والی گولیاں کھالی ہیں۔"

ماسٹر کمال ہنس دیا۔ "اوئے! تو تو گولیوں کی دہشت سے ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ کھائی تو نے خاک تھیں؟"

"نہیں ماسٹر جی!" کھاری نے پہلے کی طرح جنون میں دائیں بائیں سر پٹخا "تہانوں نئیں پتا میں نے گولیاں کھالی ہیں اور میرا اخیر وقت آن پہنچا ہے۔ سعدیہ باؤ!" اس نے ایک مرتبہ پھر سر اٹھا کر سعدیہ کی طرف دیکھا "بھین جی اور مولی صیب کو بلا لینا تھا' اپنے ہاتھ سے مینوں رخصت کرتے۔" پھر اس نے ماسٹر جی کو مخاطب کیا۔

"ماسٹر جی! میری قبر بابے منگو کے دربارے کے صحن میں بنانا' وہاں ہر ویلے لوک آوندے رہندے ہیں۔ سارے دن میں ایک یا دو اللہ کے بندے تو میری قبر پر فاتحہ پڑھیں گے ہی نا.... میری قبر پر کتبہ لکھوائیے گا جس پر

لکھا ہوگا یہاں وہ بے چارا دفن ہے۔ جس کا کوئی نام نشان نہیں۔ ایسی قبروں کی لوگ خوب پروا کرتے ہیں۔ سائیں لوگ سمجھ کر ہار اور پھول بھی چڑھاتے ہیں اور دیے بھی جلاتے ہیں۔" وہ بولتے بولتے ہانپنے لگا تھا' اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

"اوئے جا اوئے جھلیا!" ماسٹر کمال نے اسے زور سے ڈپٹا "جو لوگ مرنے والے ہوتے ہیں' جنہوں نے زہریلی گولیاں کھائی ہوتی ہیں' ان کو اتنی کمی چوڑی وصیتیں کرنے کی مہلت ملتی ہے بھلا۔ اب بس کر یہ ڈراما اور اٹھ کر بیٹھ جا۔ تجھے ستے ہی حیران ہیں۔ اٹھ سارے لوگوں میں نہ خود کو تماشا بنانہ ہی سعدیہ بٹی کو۔"

"اوئے تسی مخول نہ سمجھو ماسٹر جی! میں میدے دیندار کی دکان سے گولیاں لے آیا اور میں نے وہ گولیاں کھالی تھیں۔" کھاری بلند آواز میں بولا۔

"بتا اس جھلے کو سعدیہ پتر! بتا اسے۔" ماسٹر کمال نے سعدیہ کو مدد کے لیے پکارا "یہ جھلا تو گولیوں کی شکل دیکھ کر ہی کملا ہو گیا تھا' مرنا اتنا آسان ہوتا تو لوگ روز گولیاں کھا کھا کر مر جایا کرتے۔"

"کھاری!" اب کے سعدیہ کھاری کی پائنتی سے اٹھ کر سرہانے بیٹھ گئی "تمہیں وہم ہے کہ تم نے گولیاں کھالی تھیں' گولیاں تو یہ دیکھو میرے ہاتھ میں ہیں۔" اس نے اپنی بند مٹھی کھولی۔ کھاری نے پھٹی پھٹی نظروں سے سعدیہ کی ہتھیلی پر رکھی گولیوں کی پڑیا دیکھی اور جنونیوں کی طرح ان پر جھپٹا' سعدیہ نے فوری طور پر اپنا ہاتھ بند کر کے پیچھے کر لیا۔

"ایہہ گولیاں مینوں دے دیو سعدیہ باؤ! میں جیونا نئیں چاہندا" وہ چلایا۔

"اگر تم اپنے یہ ڈرامے بند نہیں کرو گے کھاری! تو یہ گولیاں میں کھالوں گی ابھی اور اسی وقت۔" سعدیہ نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا۔ کھاری نے بے یقینی سے سعدیہ کی طرف دیکھا اور ہارے ہوئے انداز میں کہنیوں پر تھوڑا اونچا ہوا۔

"نجانے کس کس نے اس ہنگامے میں تمہارا تماشا دیکھا ہے۔" سعدیہ نے غصے سے کہا۔

"چوہدری صاحب کے ساتھ اتنے معزز مہمان بھی تمہارا واویلا سن کر تمہاری طرف دوڑے چلے آئے۔ کیا سوچتے ہوں گے وہ لوگ ہمارے بارے میں' ہم اتنے بے وقوف اور لاچار ہیں کہ بغیر وجہ کے موت کو گلے لگانے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ چوہدری صاحب کے سامنے میری نظریں شرم کے مارے اٹھ نہیں رہی تھیں۔ کتنی سبکی ہوتی ہو گی ان کی سب کے سامنے۔"

"وہ تو بھلا ہو چوہدری صاحب کا!" ماسی رشیدہ نے کہا۔ "جو سب کو فٹافٹ اکٹھا کر کے مہمان خانے لے گئے' نہیں تو ساروں نے دیکھنا تھا اس جھلے نے ہوش میں آکر جو جو تماشے کیے ہیں۔"

"چیونٹی تو تجھ سے ماری نہیں جاتی۔ دودھ دوہنے جاتا ہے تو بھینسوں کی ٹکریں آرام سے کھالیتا ہے۔ انہیں شکار تک نہیں سکتا' چلا تھا گولیاں کھا کر مرنے۔"

ماسٹر کمال نے کھاری کے بالوں پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اوئے یوں مرنا تو بزدلوں کا کام ہے' تھڑدلوں کا کام ہے۔ تو تو بہادر ہے' بڑے سوہنے دل والا بندہ ہے تو کیوں بے وقتا ہی مرنے چلا تھا۔"

کھاری لمبے لمبے سانس لیتا سب کی سن رہا تھا۔ نظریں گھماتا وہ سب کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ بات اس کی سمجھ میں آنے بھی لگی تھی۔ وہ مرا تھا نہ ہی مرنے والا تھا۔ اس کی زندگی نے نہ صرف اس کی ممکنہ موت سے دست پنجہ کر لیا تھا بلکہ اسے پچھاڑ بھی دیا تھا۔ زندگی ابھی اپنی تمام تر حقیقتوں اور تلخیوں کے ساتھ اس کے سامنے تھی۔ اب کیا اس کو نئے سرے سے زندگی کی ان حقیقتوں سے نظریں چراتا ہوں گی جن کو نہ کوئی تسلیم کرتا

تھا نہ ہی وہ اس کے دل سے نکلتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"تم نے کبھی تفصیل سے سعد سے بات کی۔ اس کے اگلی زندگی کے بارے میں کیا منصوبے ہیں؟" وددن زادے نے نادیہ سے پوچھا تھا۔

"مجھے نہیں لگتا کہ ابھی اس کا ذہن کوئی اگلا منصوبہ بنانے کے قابل ہے۔ اس کی باتوں میں اور اس کی سوچ میں ایک عجیب سا خلا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے وہ کسی گومگو کی کیفیت میں ہو' جیسے اس کے اندر ایک انجانی سی کشمکش چل رہی ہو۔" نادیہ نے کہا۔ "وہ کیا سوچتا ہے۔ وہ کس الجھن میں ہے یہ تو میں نہیں جان پائی' لیکن جو اندازہ مجھے اس کے بارے میں ہو سکا ہے اس کے مطابق وہ ایک پیہم دکھ کی کیفیت میں ہے' جیسے کسی بھی غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرتے ہوئے کبھی ہم اس بے یقینی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ کیا یہ سب ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔ ہم نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ہمارے ساتھ کبھی یوں بھی ہو جائے گا۔"

"کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ اس ساری صورت حال کا ذمہ دار وہ خود ہے۔" وددن زادے نے کہا۔

"کسی حد تک۔" نادیہ نے جواب دیا "لیکن اس کے ساتھ یہ سب ہو جانے میں بڑا قصور ناہموار حالات کا بھی ہے۔ میں بہت حد تک اس کی اس صورت حال میں ڈیڈ کو قصوروار سمجھتی ہوں' یہ اور بات ہے کہ اس کا اعتراف میں نے اس کے سامنے کبھی نہیں کیا۔"

"ہوں!" وددن زادے جیسے کچھ سوچتا ہوا بولا "تمہارا کیا خیال ہے اس کے یوں ہو جانے میں اپنے باپ کی غیر متوقع شخصیت سے اچانک سامنا ہو جانے کے علاوہ کوئی اور دکھ بھی شامل ہے۔"

"یقینی طور پر۔" نادیہ نے سرہلایا۔ "وہ اس غیر متوقع سامنے سے ایسا دل برداشتہ ہوا کہ اس نے ان حقیقتوں سے راہ فرار اختیار کرلی اور ایسا کرتے ہوئے اس نے اپنی محبت کو اپنے دل کے حساس ترین معاملات کو بھی ہاتھ سے گنوا دیا۔ اور میں اس کو اس میں بھی غلط قرار نہیں دوں گی۔ دل برداشتہ ہونے کا عمل بعض اوقات اتنی شدت سے ہم پر حملہ کرتا ہے کہ دل ہر چیز سے اچاٹ ہو جاتا ہے' ہم اپنی موجودہ صورت حال سے فرار حاصل کرنے کی خاطر نہ ہی اپنے نفع کو یاد رکھتے ہیں نہ ہی نقصان کو' ایسا ہی سعد کے ساتھ بھی ہوا۔" نادیہ کے لہجے میں دکھ تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے میں یا تم یا ہماری مشترکہ کوششیں اس کو اس صورت حال سے باہر نکال سکتی ہیں؟"

"پتا نہیں۔" نادیہ نے سرہلایا "میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتی' وہ مسلسل غصے اور غم کی کیفیت میں مبتلا ہے۔ اس کیفیت کے اندر کچھ پچھتاوے بھی شامل ہیں۔"

"پچھتاوے!" وددن چونکا "کیسے پچھتاوے؟"

"سارہ خان کو بیچ منجدھار میں چھوڑ آنے کا پچھتاوا' فلزا ظہور کے حوالے سے ادھوری معلومات کی گرہیں لے کر آنے کا پچھتاوا' اپنے کسی نصف برادر کی موجودہ صورت حال کا پچھتاوا اور سب سے بڑھ کر ماہ نور کو بغیر کچھ بتائے' کہے' سمجھائے یہاں چلے آنے کا پچھتاوا...... اب تم ہی بتاؤ' جن مختلف کیفیتوں میں وہ مبتلا ہے ان سے اسے نکالنا کیا ہمارے لیے' میرے لیے' تمہارے لیے ممکن ہے۔"

"پھر؟" وددن نے سوال کیا۔

"فی الحال تو میں نے اسے ڈاکٹر رضا حسین کے پاس لے جانا شروع کیا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس کے سب مسائل کی بنیادی وجہ یقین کی کمی ہے۔ ایک پُر یقین' انسان کسی بھی صورت حال کا سامنا ہو جانے پر یوں ڈگمگاتا نہیں جیسے وہ ڈگمگا گیا۔"

"کیا ڈاکٹر رضا کے پاس جانے سے اسے کچھ فرق پڑا؟"

"پتا نہیں۔" نادیہ نے شانے اچکائے۔ "ابھی تو وہ ان سے سوال کرتا ہے، بحث کرتا ہے، کبھی کبھی ان سے الجھ بھی جاتا ہے۔ لیکن وہ تجربہ کار انسان ہیں، ماتھے پر بل لائے بغیر اس کی تحلیل نفسی میں مگن رہتے ہیں، مجھے اس کے مسئلے کا یہ ہی ایک مثبت حل نظر آیا تھا۔ دیکھو شاید میں کامیاب ہو جاؤں۔"

"تم نے بہت اچھا کیا۔" وددن نے ستائشی انداز میں کہا "لیکن میرے پاس ایک اور تجویز بھی ہے۔ کہو تو بتاؤں۔"

"ضرور۔" نادیہ نے تجسس سے اس کی طرف دیکھا۔

"تو پھر غور سے سنو!" وددن اسے اپنی تجویز کی تفصیل سنانے لگا۔ وہ غور سے سن رہی تھی اور سنتے ہوئے اس کی آنکھوں کی چمک بھی بڑھ رہی تھی یوں جیسے وددن کی تجویز اسے اچھی لگ رہی ہو۔ ڈیڑھ گھنٹے کی اس اسکائپ گفتگو کے بعد نادیہ سعد کے بارے میں پہلے سے زیادہ مطمئن نظر آنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں مشکور ہوں گی اگر تم مجھے سعد کا پتا دے دو۔" ماہ نور نے وددن زادے کے نام تیسرا پیغام لکھا تھا۔ "میں نے اس کے بارے میں تمہاری بات تفصیل سے پڑھی ہے، مجھے اس میں عجیب سا جھول نظر آتا ہے، سعد کو سکی انگ میں کبھی بھی دلچسپی نہیں رہی۔ وہ کیوں سکی ڈائیور بننے کی کوشش کرے گا۔"

"اگر تم سعد کو جانتی ہو تو تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ وہ کتنا غیر یقینی شخص ہے، اس کے بارے میں کوئی بھی قیافہ لگانا مشکل ہے یا نہیں، بتاؤ!"

اگلی رات اسے وددن کا جواب ملا۔ ساتھ ہی اس کی ڈائیونگ گیئر میں ملبوس سعد کی تصویر بھی۔ ماہ نور نے اس تصویر میں سعد کو عرصے بعد دیکھا تھا۔ وہ مکمل سکی ڈائیور کیمرے کی آنکھ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ ماہ نور نے اس تصویر کو چھوٹا، بڑا کر کے بار بار دیکھا تھا۔ کیا یہ وہی زندگی سے بھرپور مسکراہٹ تھی۔ کیا وہ چہرہ اتنا ہی جان دار تھا جیسا پہلے ہوا کرتا تھا اور اس کے دل نے ہر بار اپنی ایک دھڑکن روک دی تھی۔ اس چہرے پر عجیب سی اجنبیت نظر آ رہی تھی۔ ایک ایسا تاثر جس سے وہ بالکل بھی واقف نہیں تھی۔

"ہاں وہ غیر یقینی ہے۔" کتنے ہی لمحوں کی تاخیر کے بعد اس نے جواب ٹائپ کیا۔

"Totally unpredictable" اس کے لکھے الفاظ تھے۔

"جو شخص بندر کا تماشا دکھانے والے کا روپ دھار سکتا ہے، میلے میں گیت گاتا سائیں بن سکتا ہے، کمہار بن کر مٹی کے برتن بنا سکتا ہے، لوک میلے میں علاقائی گیت سناتا جدید گلوکار بن سکتا ہے۔ اس کے لیے بغیر دلچسپی کے سکی ڈائیور بننا کون سا مشکل ہو گا۔"

"اب تم سمجھی ہو۔" وددن نے مزاحیہ شکل کے ساتھ جواب بھیجا۔

"کیا وہ تمہارے ساتھ ہے، امریکا میں؟" ماہ نور نے پوچھا۔

"نہیں۔" وددن نے سادہ جواب بھیجا۔

"پھر؟"

"کیا تم اسے کھوجنا چاہتی ہو، کیا تم اسے ملنا، اسے پانا چاہتی ہو؟" وددن نے پوچھا۔

"ہاں!" ماہ نور کے جواب کے اندر اس کی خواری کی تھکن اور جذبات کی پوری شدت چھپی ہوئی تھی۔

"کیا تم یہ بات یقین کے ساتھ کہہ رہی ہو؟"

"پورے یقین کے ساتھ۔"

"پھر میرے پیغام کو غور سے پڑھو۔" وددن نے لکھا اور کچھ دیر بعد ایک تفصیلی پیغام ماہ نور کی نظروں کے سامنے تھا۔ جسے پڑھنے کے بعد اس کی آنکھوں کو خود پر یقین نہیں آرہا تھا۔

☆ ☆ ☆
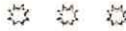
کمرے میں مکمل سناٹا چھا گیا تھا۔ بلال سلطان بے یقینی سے فلزا ظہور کو دیکھ رہے تھے۔ فلزا ظہور دونوں بازو سامنے باندھے پورے اعتماد کے ساتھ بلال سلطان کے سامنے کھڑی تھی۔ رابعہ کلثوم اور مولوی سراج سرفراز دم بخود بیٹھے تھے۔ یوں جیسے پردے پر چلنے والی کسی فلم کے وقفے کے دوران اس کے اگلے تھرل سے بھرپور منظر کے انتظار میں سانس روکے بیٹھے ہوں۔ اس پورے منظر میں صرف چوہدری سردار ایک ایسا کردار تھے، جو پوری طرح پرسکون تھے اور اسی سکون سے بیٹھے اپنی مونچھوں کو تاؤ دینے میں مصروف تھے۔

"اس وقت تو تم مجھے چونکانے کے لیے کوئی بھی بات کر سکتی ہو۔" بلال سلطان نے اس طویل سکتے سے نکلتے ہوئے فلزا ظہور کو مخاطب کیا اور مڑ کر چوہدری سردار کی طرف دیکھنے لگے۔

"چوہدری صاحب! یہ بھی غالباً" آپ کے فارم ہاؤس کا ہی کمال ہے۔ شاید یہاں کسی کو بھی کسی کا بیٹا بنا دینا اور کسی کو کسی کا بھی باپ بنا دینا بھی ایک اعلیٰ قسم کا مذاق سمجھا جاتا ہے۔"

"یہ فارم ہاؤس ہے بلال صاحب! یہاں مذاق کا کیا کام۔" چوہدری صاحب اسی پرسکون انداز میں بولے "یہاں تو کام کا کام ہوتا ہے۔"

بلال نے چوہدری صاحب کے جواب پر توصیفی نظروں سے انہیں دیکھا جیسے انہیں یہ جواب پسند آیا تھا۔

"رہی فلزا صاحبہ کی بات تو معاف کیجئے گا! یہ آپ کے سوال کا جواب تھا۔ مذاق نہیں۔" چوہدری صاحب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ ہی تو مولوی صاحب سے پوچھ رہے تھے کہ کھاری کس کا بیٹا ہے۔"

"ہاں تو؟" بلال نے سر ہلایا "اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ جو بولے اس کو اس بے چارے لڑکے کا باپ بنا دیا جائے۔ میں نے تو یہ سوال صرف اس لیے کیا کہ سراج بے چارہ سادہ لوح آدمی ہے۔ راستہ بھر مجھے بتاتا رہا اس نے کیسے کیسے اپنی بیٹی کو چند جماعتیں پڑھا رکھی ہیں۔ اب اس کا یہ داماد دیکھ کر جو الف' ب بھی پڑھا نہیں لگتا مجھے خیال آیا کہ کہیں داماد کے سلسلے میں اس کو کوئی دھوکا نہ ہو گیا ہو۔"

"دھوکا ہی تو ہو گیا ہے بے چارے کے ساتھ۔" فلزا نے زہر خند لہجے میں کہا۔ "بے چارہ بیٹی کا رشتہ طے کرتے ہوئے سوچ بھی نہیں سکتا ہو گا کہ کسی خونی لٹیرے کے بیٹے کو رشتہ دے رہا ہے۔"

آپا رابعہ نے فلزا کی بات سنی اور زور سے آنکھیں بند کر کے اپنے گھومتے سر کو قابو کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔

"دیکھ لیں چوہدری صاحب! ایک الزام اور لگا۔" بلال نے چوہدری صاحب کی طرف دیکھا۔ "خونی لٹیرا!"

"آپ اگر خود پر چھایا تفنن کا مزاج دور کر لیں تو شاید کوئی بات آپ کی سمجھ میں بھی آسکے اور ہمارے بھی۔" چوہدری صاحب نے اب کے سنجیدگی کے ساتھ کہا "میں تو خود بھی نہیں جانتا کہ فلزا بی بی کا آخر آپ کے ساتھ کیا بیر رہا ہے، جو وہ آپ کو دیکھ دیکھ کر تلملا رہی ہیں۔"

"ان کے ساتھ بیر...." بلال نے طنزیہ نظروں سے فلزا کی طرف دیکھا "ان کی طرف تو ایک لمبا چوڑا حساب نکلتا ہے میرا، لیکن دیکھ لیں۔" انہوں نے اپنے بازو دائیں بائیں پھیلائے "میں پھر بھی پرسکون ہوں، تحمل سے بات کر رہا ہوں۔"

"پہلیں پھریوں سمجھیں۔ آج ہی تو موقع بنا ہے، اسی چھت کے نیچے سارے حساب کتاب پورے کر لیجئے آپ لوگ۔" چوہدری صاحب نے کہا اور پھر مولوی سراج کی طرف دیکھا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا مولوی صاحب! آپ بھی ان سے جڑی کسی داستان کا حصہ رہے ہیں اور اگر رہے ہیں تو دیکھ لیجئے قدرت نے اس درمیانی وقت میں بھی آپ کو ان سے جوڑنے کا کیا انتظام فرمایا۔ کھاری اور سعدیہ کی شادی آپ کے جانے اور بلال صاحب کے انجانے میں ہو گئی مگر کیا رشتہ قائم ہو گیا آپ دونوں کے درمیان 'سبحان اللہ' بھئی سبحان اللہ۔"

"ولیں اب آپ بھی پہیلیاں بجھوانے لگے چوہدری صاحب!" بلال سلطان اب کے چونک گئے "سراج کی بیٹی کی شادی سے میرے انجان پن کا کیا تعلق ہے بھئی۔"

"بہت گہرا تعلق ہے بلال صاحب!" چوہدری صاحب نے نرمی سے کہا۔ "اسی لیے تو کہہ رہا ہوں آرام سے تشریف رکھ کر سنیے 'لگتا ہے آج بہت سی گتھیوں کو سلجھنا ہے۔"

"کسی بھی اور بات سے پہلے میرا حساب بے باق کر دیجئے چوہدری صاحب!" رابعہ کلثوم نے پہلی بار چوہدری صاحب کو براہ راست مخاطب کیا۔ "یہ شخص" انہوں نے بلال سلطان کی طرف اشارہ کیا "میری بہنوں جیسی سہیلی کا قاتل ہے۔ قتل تو خیر اس نے بہت بعد میں کیا 'اس دکھیاری سے اس کا بیٹا چھین کر خود فرار ہو کر اسے جیتے جی تو یہ بہت پہلے مار چکا تھا 'اس مری ہوئی 'آہیں اور سسکیاں بھرتی عورت کو چھرے کی تیز دھار سے قتل کرنے کا کارنامہ سرانجام دینے کے بعد اس نے مجھے اور مولوی سراج کو دھمکیاں دیں کہ یہ قتل کا پرچا ہمارے نام کٹوائے گا 'جبکہ ہمارا قصور صرف اتنا تھا کہ ہم اپنی سہیلی کے ایک ٹیلی فون پر دیے گئے پیغام "فوراً" مجھ تک پہنچو" کے جواب میں دن بھر کی خواری کے بعد عین اس وقت اس کے گھر پہنچے جب یہ شخص اسے قتل کرنے کے بعد اسے اور خود کو بھی خون میں نہلائے 'آلہ قتل یعنی وہ چھرا ہاتھ میں پکڑے کھڑا تھا۔"

"آلہ قتل بلال صاحب کے ہاتھ میں تھا 'خون میں نہائے ہوئے بھی یہ تھے۔ پھر آپ نے ان کی یہ دھمکی کیسے مان لی کہ پرچہ آپ پر کٹوا دیں گے۔" چوہدری صاحب کے لہجے میں رابعہ کلثوم کے لیے بے حد احترام تھا۔

"ہمیں ماننی پڑی چوہدری صاحب! غربت 'پس ماندگی اور کم علمی انسان کی بہت بڑی دشمن ثابت ہوتی ہیں۔" رابعہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ "ہم جب جائے وقوعہ پر پہنچے 'ایک انتہائی غیر متوقع منظر دیکھ کر جذباتی ہو جانا لازمی تھا۔ میں اپنے جذبات پر قابو نہ پاتے ہوئے لاش سے لپٹ لپٹ کر روتی تھی اور دیرینہ تعلق کی بنا پر مولوی سراج 'ان صاحب کے گلے لگ کر آلہ قتل ان سے چھیننے کی کوشش کرنے لگے 'ساتھ ساتھ یہ دہائی دیتے جا رہے تھے۔ نہیں بھائی صاحب! آپ آپا جی کو قتل نہیں کر سکتے 'یہ آپ نے کیا کر ڈالا بھائی صاحب! یہ چھرا آپ کے ہاتھ میں سجتا نہیں۔ لائیں یہ چھرا مجھے دے دیں 'میں زمین کھود کر کہیں اسے دفن کر دوں گا۔ میں قتل کا الزام آپ پر نہیں آنے دوں گا۔"

رابعہ کلثوم نے نمناک نظروں سے سراج سرفراز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جنہوں نے ان کی یہ بات سن کر سر جھکا لیا۔

"بس۔" پھر رابعہ کلثوم نے ایک لمبی سرد آہ بھرنے کے بعد چوہدری صاحب کی طرف دیکھا۔ "اسی کوشش میں میرے اور مولوی سراج کے کپڑوں پر خون کے دھبے بھی لگے اور آلہ قتل بھی اس چھینا جھپٹی میں مولوی صاحب کے ہاتھ آ گیا۔"

"اوہ!" چوہدری صاحب کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"پھر یہ صاحب گرج کر بولے سراج! چھرا مجھے واپس کر دو اور بھاگ جاؤ یہاں سے۔ دیکھو! جو میں کہہ رہا ہوں

وہ نہیں کرو گے تو بس کسی آن بھی پولیس یہاں پہنچنے والی ہے' میں اپنی بیوی کے قتل کا پرچا تم دونوں پر ڈال دوں گا۔"

"اوہو!" چوہدری صاحب گڑبڑا کر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ فلزا ظہور نے ایک طنز بھری نظر بلال سلطان پر ڈالی۔

"چوہدری صاحب! ہماری شامت کہ اسی وقت کہیں سے پولیس کی گاڑی کے سائرن کی آواز سنائی دینے لگی۔" مولوی سرفراز نے اپنی سرمہ لگی آنکھیں سکیڑ کر معصومیت سے چوہدری صاحب کی طرف دیکھا۔

"ساتھ ہی ہماری چند دن کی بچی نے رونا شروع کر دیا۔" رابعہ نے کہا۔ "ان صاحب کی تنبیہہ جاری تھی۔ بھاگ جاؤ' ورنہ قتل تم پر ڈال دوں گا۔ ہم غریب' پس ماندہ' کم علم لوگ تھے۔ قتل خود پر پڑ جانے کے بعد کے منظر دونوں کی نظروں کے سامنے ایک ساتھ گھومنے لگے۔ بچی نے رو کر اپنا آپ یاد دلایا۔ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' چھرا وہیں پھینک' بچی کو کندھے سے لگا' وہاں سے نکلنے کی کی۔"

"ان ہی خون آلود کپڑوں اور ہاتھوں سمیت؟" چوہدری صاحب نے پوچھا۔

"اس وقت یہ تو یاد ہی نہیں رہا کہ ہمارا حلیہ کیا ہو رہا تھا۔ بس نکلنے کی پڑی تھی۔ اوپر سے ان صاحب کی دھمکیاں جاری تھیں۔ ہم یوں بھاگے کہ آج تک پیچھے مڑ کر دیکھنے کا حوصلہ نہ کیا۔" رابعہ کلثوم زار و قطار رونے لگیں۔

"رات کے اندھیرے میں بھاگے تھے' صبح کی روشنی پھیلی تو ایک دوسرے کا حلیہ دیکھا۔ کپڑوں پر جا بجا خون کے دھبے۔ رابعہ بی بی کے پاس کپڑوں کا تھیلا تھا' جو زمان منڈی سے ساتھ لے کر چلے تھے۔ چھپتے چھپاتے لاہور سے کئی میل کے فاصلے پر ایک گاؤں پہنچے جہاں ایک جگہ کھیتوں پر ٹیوب ویل چل رہا تھا۔ میں نے پہرے داری کی اور رابعہ بی بی نے لباس تبدیل کیا' رابعہ بی بی نے پہرے داری کی اور میں نے لباس تبدیل کیا۔ نہا دھو کر ہاتھوں پیروں سے خون کے دھبے چھڑا کر ہم اللہ کے آسرے پر آگے چل دیے۔ اللہ جل شانہ کا کرم ایسا تھا کہ ہمارے اس عمل کے دوران ٹیوب ویل کے آس پاس کوئی پھٹکا بھی نہیں۔ جیسے ہی آگے چلے' اکا دکا لوگ راستے میں نظر آتے رہے۔ ہمارا خوف نظروں کے سامنے آنے والے ہر شخص کو پولیس کی وردی پہناتا رہا اور ہم ایک دوسرے سے بھی بات کیے بغیر بے نام نشان راستوں پر بس چلتے ہی گئے۔ ایک جگہ لاری اڈا نظر آیا۔ وہاں پہنچ کر ساہیوال جانے والی ایک بس پر بغیر سوچے سمجھے سوار ہو گئے۔ غنیمت تھا کہ چند سو روپے ایک پوٹلی میں لے کر زمان منڈی سے چلے تھے۔ وہ محفوظ تھی۔ بس اس کے بعد ساہیوال پہنچے۔ اس کے نواحی دیہات کی مسجدوں میں پڑے رہے' جگہ جگہ نوکریاں کیں' اپنی شناخت چھپانے کے لیے ہلکان ہوتے رہے۔ دن یونہی گزرتے گئے۔ چھوٹی سی بچی اسی خواری میں جوان ہو گئی۔ ماں باپ کو یوں دنیا سے کٹ کر رہتے دیکھ کر سو سوال ذہن میں پالتی رہی۔ رابعہ بی بی حد سے زیادہ محتاط تھیں۔ اس احتیاط نے بچی کے اندر بغاوت پیدا کر دی اور اس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے' چوہدری صاحب! بے نام' بے شناخت کھاری ہمارا داماد ہے۔ اس پر بھی بھائی صاحب کہتے ہیں آگا پیچھا بھی دیکھا لڑکے کا کہ نہیں۔ انہیں کون بتائے کہ خوف کے جس راستے پر انہوں نے ہمیں ڈال دیا تھا' اس پر چلتے تو ہم اپنا آگا پیچھا ہی بھول گئے تھے' کسی اور کا کیا پوچھتے۔"

مولوی سراج کی اس طویل بات کے دوران کمرے میں ایسی خاموشی چھائی تھی کہ سوئی گرنے تک کی آواز بھی سنائی دے سکتی تھی۔

"اسی لیے سعدیہ بیٹی کا ب فارم اور پیدائش کا سرٹیفکیٹ نہیں تھا آپ کے پاس؟" چوہدری صاحب کو یاد آیا۔

"ہمارے اپنے شناختی کارڈ پرانے ہو گئے تو ڈر کے مارے نئے شناختی کارڈ نہیں بنوائے آج تک کہ کسی شناخت کی زد میں نہ آ جائیں۔ سعدیہ بے چاری کا پیدائشی سرٹیفکیٹ اور ب فارم بنانے کا ہوش کس کو تھا۔" رابعہ کلثوم

نے کہا۔

"مولوی سراج سرفراز صاحب!" اسی دم فلزا ظہور اپنی جگہ سے اٹھ کر عین مولوی صاحب کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ "آپ تو مذہب کو' اللہ تعالیٰ کو' اللہ تعالیٰ کے حسن انتظام کو اور مکافات عمل کے پروسیس کو مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔ حسن اتفاق پر غور کیجئے کہ جس افتخار احمد عرف کھاری کو بے شناخت بے نام و نشان آپ گردان رہے ہیں' وہ اسی شخص کا اپنا سگا بیٹا ہے' جس نے آپ کی ساری زندگی ایک پیہم خوف کے سپرد کر ڈالی۔" فلزا نے آگ برساتی نظروں سے بلال سلطان کی طرف دیکھا۔

"اب اتنے سالوں بعد کسی کی اولاد میری ولدیت کے کھاتے میں ڈال دینے سے تم اس حساب کتاب سے نہیں بچ سکتیں فلزا ظہور! جو تمہاری طرف میرا نکلتا ہے۔" بلال سلطان نے پُرسکون انداز میں کہا۔

"میں کسی کی اولاد کو تمہاری ولدیت کے کھاتے میں نہیں ڈال رہی۔" فلزا نے جواب دیا "کھاری تمہارا ہی بیٹا ہے' جسے تم نے اس خونی رات کو میرے حوالے کیا تھا۔"

"تم نے کہا تھا' وہ مر گیا۔" بلال سلطان کے منہ سے الفاظ اب کے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے تھے۔

"میرا گمان تھا۔ وہ مر گیا ہو گا۔" اس بار فلزا کی آواز دھیمی پڑی تھی۔

"جہاں' جس طرح میں نے اسے رکھ دیا تھا اور اپنا آپ اس ذمہ داری سے چھڑوا لیا تھا' اس میں اس کا مر جانا لازمی تھا۔ اس بس اسٹاپ پر صبح کے اس وقت پھرتا کوئی بھی آوارہ کتا' کوئی بھی جنگلی بلی گوشت کے اس ذرا سے لوتھڑے کو چیر پھاڑ کر رکھ سکتی تھی مگر۔" فلزا نے رک کر گہرا سانس لیا "ایسا نہیں ہوا اللہ کو اس کی زندگی منظور تھی۔"

اس پورے وقت میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ بلال سلطان کا چہرہ سفید پڑا اور ان کی آنکھیں پھیلی تھیں۔ اس سے پہلے کی گئی ساری باتیں گویا متوقع تھیں۔ ایک صرف یہ ہی بات ناقابل یقین اور غیر متوقع تھی۔ وہ کافی دیر تک کچھ اور بولنے کے قابل نظر نہیں آ رہے تھے۔

"اسے قدرت کی ستم ظریفی سمجھ لو یا اپنی خوش قسمتی کہ وہ بچہ چوہدری سردار کی گود میں پہنچ گیا' جنہوں نے اتنے برس اسے اپنے پاس رکھا' پالا پوسا اور وہ بچہ آج کا افتخار احمد عرف کھاری بن گیا۔"

اپنی بات کہتے کہتے فلزا کی نظر رابعہ کلثوم پر پڑی جو اپنی داستان غم بھول کر اس نئے انکشاف پر دم بخود بیٹھی تھیں۔ رابعہ سے نظر ہٹا کر فلزا نے بلال سلطان کی طرف دیکھا اور اسے ایسا لگا جیسے بلال کو دل کا دورہ پڑنے والا ہو۔ جیسے ان کا جسم اور زبان مفلوج ہو رہی ہو۔ وہ سوالیہ نظروں سے چوہدری سردار کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن خواہش کے باوجود اپنے سوال کو الفاظ میں ڈھال نہیں پا رہے تھے۔

"یہ درست ہے بلال صاحب!" چوہدری سردار نے آہستہ آہستہ سر ہلاتے ہوئے کہا "ادب اور فن مصوری پرستوں کی جس محفل میں محض ایک روز پہلے آپ نے اور فلزا ظہور نے شرکت کی تھی' اس میں میں بھی موجود تھا۔ یقیناً" آپ دونوں کو وہاں میری موجودگی یاد نہیں ہو گی کیونکہ میں ایک عام آدمی تھا۔ لیکن مجھے آپ تھوڑے بہت مگر فلزا بی بی خصوصاً" یاد تھیں۔ ان کے جو فن پارے وہاں دکھائے گئے تھے۔ ان میں سے ایک دو فن پارے مجھے پسند آئے تھے اور میں انہیں خریدنا چاہتا تھا لیکن اس وقت وہ برائے فروخت نہیں تھے خیر۔" انہوں نے سر جھٹکا۔ "اس سے اگلے روز مجھے فیصل آباد جانا تھا۔ میں اپنے ڈرائیور کے ساتھ نصف شب کو ہی سفر پر روانہ ہو گیا۔ شب دن میں ڈھلنے لگی تھی' جب ایک قصبے کے بس اسٹاپ کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہاں رک کر ٹی اسٹال سے چائے کے دو کپ لے آئے' کیونکہ ہم دونوں کو ہی اونگھ آنے لگی تھی۔ ڈرائیور گاڑی روک کر چائے لینے چلا گیا اور میں گاڑی میں ہی بیٹھا باہر دیکھ رہا تھا' جب اچانک میری نظر گھبرائی'

سہمی، چور نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی فلزا ظہور پر پڑی۔ میں اس ایک نظر میں ہی انہیں پہچان گیا تھا۔ پہچانتا کیسے نہیں، محض ایک روز پہلے ہی تو ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ابھی تک ان کا لباس بھی وہی تھا۔ انہیں وہاں دیکھ کر میں چونک گیا۔ اس قصباتی بس اسٹاپ پر یہ کیا کر رہی تھیں وہ بھی تنہا.... میں نے دیکھا ان کی گود میں کپڑے میں لپٹی کوئی چیز تھی، جسے انہوں نے وہاں کھڑی ایک بس کی اوٹ میں رکھ دیا اور خود تیزی سے چلتی دوسری جانب نکل گئیں۔"

چوہدری صاحب نے رک کر بلال کی طرف دیکھا جنہوں نے شدت کرب سے اپنی آنکھیں میچ رکھی تھیں۔

"عجیب بات یہ تھی کہ جونہی فلزا بی بی وہاں سے نکلیں۔ کپڑے میں لپٹا بچہ چیخ مار کر رو دیا۔ میں نے گھبرا کر گاڑی کے دروازے کو کھولا اور باہر نکل کر اس جگہ پہنچنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ڈرائیور چائے لے کر آگیا۔ میں ذرا کی ذرا اس کی طرف متوجہ ہوا، اس کی بات سننے میں زیادہ سے زیادہ ایک منٹ لگا ہوگا جس کے بعد میں نے دوبارہ بچے کی طرف دیکھا تو وہ وہاں سے غائب تھا۔ میں ششدر رہ گیا۔ ایک منٹ کے اندر بچہ کہاں گیا۔ اگر بس اسٹاپ پر موجود کسی دوسرے شخص کی نظر اس پر پڑی تھی تو پھر تو ہنگامہ مچ جانا چاہیے تھا، لیکن وہاں وہی پہلے سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے تیزی سے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ کچھ ہی فاصلے پر مجھے ایک بھکارن نما عورت جاتی نظر آئی جس نے سینے سے کوئی شے لگا رکھی تھی۔"

چوہدری صاحب نے رک کر ایک بار پھر بلال سلطان کی طرف دیکھا جنہوں نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیے تھے۔ ان کے چہرے پر واقعی اذیت پھیلی تھی۔

"میں نے ڈرائیور سے کہا، سب کچھ وہیں چھوڑ کر بھکارن کا پیچھا کرے۔ ٹی اسٹال والے کے برتن وہیں زمین پر رکھ کر ہم نے گاڑی بھکارن کے پیچھے لگا دی۔ وہ بھاگتے قدموں سے آگے جا رہی تھی۔ دو ایک بار اس نے پیچھے مڑ کر بھی دیکھا، جس سے مجھے اس کا چہرہ نظر آگیا۔ ہم اس کے سر پر پہنچا ہی چاہتے تھے کہ وہ مڑ کر ایک تنگ گلی میں گھس گئی، جہاں گاڑی نہیں جا سکتی تھی۔ ہم دونوں گاڑی وہیں چھوڑ کر اس کے پیچھے گلی میں پیدل ہی داخل ہو گئے لیکن اس گلی سے کئی ذیلی گلیاں نکلتی ادھر ادھر جا رہی تھیں۔ اس کی تلاش میں ایک دو گلیوں میں جھانکنے کے دوران ہی وہ غائب ہو گئی۔ ہم پاگلوں کی طرح سب گلیوں میں دیکھتے پھرے۔ آنے جانے والوں سے پوچھتے رہے مگر اس بھکارن کو نہ ملنا تھا وہ نہ ملی۔"

"وہ لے گئی اس بچے کو؟" رابعہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"جی بہن جی! وہ بھکارن اس بچے کو لے گئی۔" چوہدری صاحب نے سر ہلایا "میں مایوس ہو کر واپس گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ دل چاہا اس قصے پر فاتحہ پڑھ کر آگے بڑھ جاؤں لیکن نجانے میرے اندر کیوں کوئی مجھے اکسا رہا تھا کہ بچے کو ڈھونڈنے کی کوشش کرو۔ میں نہیں جانتا کس طاقت نے مجھ سے گاڑی کا رخ مقامی تھانے کی طرف کروایا۔ جہاں جا کر تھانے دار سے میں نے سارا قصہ کہہ ڈالا۔ میں اللہ کے کرم سے صاحب حیثیت تھا، میرے تعارف اور حیثیت نے تھانے دار کو بھی فوری عمل پر مجبور کر دیا۔ پولیس کے سپاہی ادھر ادھر بھگائے گئے، بھکاریوں کے ٹھکانوں اور بستیوں کو کھنگال دیا گیا۔ وہیں کہیں سے معلوم ہوا کہ جینا نامی ایک بھکارن کہیں سے ایک نوزائیدہ بچہ اٹھا لائی تھی، اس تلاش میں کئی دن نکل گئے۔ تھانیدار خود میرے ساتھ ہر اس جگہ پہنچا جہاں اس بھکارن کی موجودگی متوقع تھی۔ کتنی ہی خواری کے بعد ہم اس تک پہنچ ہی گئے۔ وہ بچے کو ایک ہتھ گاڑی میں ڈالے ہمیں دھوکا دیتی ادھر ادھر بھاگ رہی تھی، جب ہم اس کے سر پر جا پہنچے۔ بچہ اس سے بازیافت کروا کر کچھ لکھا پڑھی کے بعد تھانیدار نے بچہ میرے حوالے کر دیا۔"

چوہدری صاحب بات مکمل کرتے ہوئے رکے۔

"آپ کیوں اس بچے کے پیچھے اتنا خوار ہوئے چوہدری صاحب! آپ نے کیوں اسے حاصل کرکے ہی دم لیا؟"
رابعہ کلثوم نے ایک بار پھر بے اختیار سوال کیا۔
"میں نے بتایا نا کہ محض ایک روز پہلے ہی تو فلزا بی بی سے ملاقات ہوئی تھی۔ میرے ذہن میں بے شمار سوال تھے' الجھنیں تھیں۔ وہ بچہ فلزا بی بی کا تو ہرگز نہیں تھا۔ یہ مجھے یقین تھا کیونکہ ایک روز پہلے ہونے والی ملاقات میں ایسے کوئی آثار مجھے نظر نہیں آئے تھے کہ فلزا بی بی بچہ پیدا کرنے جارہی ہیں۔ پھر وہ بچہ کون تھا اور فلزا بی بی نے اسے یوں کتوں' بلیوں کا شکار ہو جانے کے لیے وہاں کیوں چھوڑا تھا۔ خود چوروں کی طرح کیوں غائب ہو گئی تھیں۔ ان ہی سوالوں اور الجھنوں نے مجھے مجبور کردیا کہ میں وہ بچہ لے آؤں۔ میں نے سوچا' شاید وہ بعد میں پچھتاوے میں مبتلا ہو جائیں۔ میں کسی بھی طرح ان سے رابطہ کرکے بچہ ان تک پہنچادوں گا۔"
"پھر آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا' بچہ آپ کے پاس ہی کیوں رہ گیا۔" رابعہ کا اگلا سوال تھا۔
"ان سے پوچھ لیجئے۔" چوہدری صاحب نے فلزا کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا میں ان سے رابطہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ کیا میں نے ان سے بچے کے بارے میں استفسار کرتے ہوئے یہ نہیں کہا کہ بچہ محفوظ ہے' اسے لے جائیے یا آپ تک پہنچا دیا جائے اور کیا میری ہر کوشش کے جواب میں انہوں نے یہ نہیں فرمایا کہ میں ان پر الزام لگا رہا تھا' بہتان باندھ رہا تھا۔ وہ کسی بچے کو نہیں جانتیں۔ نہ ہی انہوں نے کوئی بچہ اس بس اسٹاپ پر رکھا تھا۔ کیا میری چند کوششوں کے بعد انہوں نے نہ صرف اپنا رابطہ نمبر بلکہ اپنا ٹھکانہ بھی بدل نہیں لیا تھا۔"
رابعہ کلثوم کی سوالیہ نظریں فلزا کی طرف مڑ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"آپ نے ہمیشہ مجھ پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ میں بچوں کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ محتاط ہوں اور ان پر غیر ضروری پابندیاں لگانے کی بھی مرتکب ہوتی ہوں۔" فائزہ نے جھلا کر زوار کی طرف دیکھا جو پچھلے ایک گھنٹے سے فائزہ کے الفاظ کی بمباری کی زد میں تھے۔
"میں آپ کو کتنی بار بتا چکا ہوں کہ میں ایسا ہرگز نہیں سمجھتا۔" زوار نے ایک مرتبہ پھر اپنا کمزور سا دفاع کرنے کی کوشش کی "بلکہ میں تو تہہ دل سے آپ کا مشکور ہوں کہ آپ نے میرے بچوں کی بہت دل لگا کر تربیت کی' ایسی تربیت جس کے زمانہ بھی گن گاتا ہے۔"
"یہ تربیت کی میں نے۔" فائزہ نے کسی سمت اشارہ کیا "لعنت ہے ایسی تربیت پر' جو بچوں کو اپنی من مانی سے نہ روک پائے۔ آپ نے دیکھا نہیں کیا حلیہ ہو رہا ہے لڑکی کا۔ یوں جیسے سالوں سے سوئی نہیں' نہ ڈھنگ سے پہننے اوڑھنے کا ہوش ہے نہ ہی خود پر دھیان دینے کا۔ صرف آپ نے اس کا ساتھ دیا تو میں خاموش ہوگئی کہ اسے اسلام آباد چھوڑ دیا جائے۔ لیکن یہ وہاں سے کچھ سیکھ کر آنے کے بجائے جو سیکھا ہوا تھا لگتا ہے' وہ بھی بھلا آئی ہے۔ پڑھائی کا سلسلہ ٹھپ ہوا' ڈگری کا بیڑا غرق ہو گیا۔ لڑکی کے طور اطوار تباہ ہو گئے۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا کہ یہ وہی ماہ نور ہے۔ جو میری بیٹی تھی۔"
"تھی سے کیا مراد ہے آپ کی۔ یہ ماہ نور ابھی بھی آپ ہی کی بیٹی ہے۔" زوار نے مسکرا کر کہا۔
"نہیں' میں ایسی بے ہنگم' غیر منظم اور لاپروا اولاد کی ماں کہلوانا ہرگز پسند نہیں کروں گی۔" فائزہ کی پیشانی پر بلوں کا اضافہ ہو گیا۔
"یقین کریں کہ وہ ایسی نہیں ہے۔" زوار نے سمجھانا چاہا۔
"وہ ایسی نہیں تھی لیکن پچھلے کافی عرصے سے وہ ایسی ہو چکی ہے۔ میں اس کو ایک ہفتے میں سیدھا کردوں اگر

آپ کی شہ اسے حاصل نہ ہو۔"

"میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گا' کیونکہ شاید میں اسے آپ سے زیادہ سمجھتا ہوں۔" زوار کے لہجے میں استحکام آگیا۔

"تو کیا آپ اس کا نیا مطالبہ بھی مان لیں گے؟" فائزہ نے ابرو چڑھایا... "یاد رکھیے! اگر آپ نے ایسا کیا تو پھر میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔"

"میں اس کے نئے مطالبے کو بالکل سپورٹ کروں گا۔" زوار مسکرائے "اور یقین جانیے ایسا کرلینے کے بعد بھی وہ آپ کی ہی بیٹی رہے گی۔ آپ اس کی ذرا سی تکلیف پر ویسے ہی ردعمل ظاہر کریں گی جیسے ہمیشہ کرتی رہی ہیں۔"

"ہرگز نہیں۔" فائزہ نے سختی سے کہا۔ "ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ دیکھو بھلا لڑکی من مانی پر من مانی کیے چلی جا رہی ہے اور یہ ٹھنڈے ٹھنڈے اسے شہ دیے جا رہے ہیں۔"

"آپ میری گارنٹی پر اسے اجازت دے دیں' یقین جانیے اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔" زوار نے رسان سے کہا۔

"اسے اجازت دے دوں۔" فائزہ نے تیوری چڑھائی "وہ جو فٹ بال نما لڑکا اس کے ساتھ آیا ہے۔ اس کے ساتھ اسے وہاں جانے کی اجازت دے دوں' جہاں جانا چاہتی ہے۔"

"جی بالکل!" زوار نے کہا۔

فائزہ پیٹھ موڑ کر بیٹھ گئیں۔ "آپ جانتی ہیں کہ وہ ایک سمجھ دار لڑکی ہے" زوار نے سمجھانا چاہا۔ "وہ سوچے سمجھے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتی۔"

"میں جانتی ہوں کہ وہ ایک جذباتی لڑکی ہے' پل بھر میں فیصلہ کرلینے والی اور بعد میں وہ ایسے فیصلوں پر کتنا پچھتاتی ہے' یہ وہ کسی پر ظاہر نہیں کرتی۔"

"بچوں کو تجربے کرنے دینے چاہئیں۔ انہی سے گزر کر انہیں سمجھ آتا ہے کہ ان کے لیے کیا درست ہے کیا غلط۔"

"یہ آپ کا نظریہ ہو گا میرا نہیں۔"

"کب تک بچوں کی انگلی پکڑ کر انہیں چلانے کی کوشش کرتی رہیں گی" زوار تھکنے لگے۔

"میں ایسا کبھی نہ کروں اگر یہ بچے اپنے لیے درست فیصلہ کرنے کی استطاعت رکھتے۔"

"اچھا ایسا ہے کہ آپ جو چاہتی ہیں' وہ سلمان پر آزمالیں۔ ماہ نور کے سلسلے میں کچھ دیر مجھے فیصلہ کرلینے دیں۔"

"ٹھیک ہے۔" فائزہ تیزی سے اٹھیں۔ "بعد میں اگر آپ کے فیصلے غلط نکلے تو مجھ سے مت کہئے گا۔"

"اوکے... کوئی آپ سے نہیں کہے گا۔" زوار کو لگا ان کے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔

"تمہاری ماں کو کنونس کرنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔" کچھ دیر بعد وہ ماہ نور سے کہہ رہے تھے' جو ایک شام قبل ہی اسلام آباد سے لاہور پہنچی تھی۔

"آپ تو کنونسڈ ہیں نا بابا؟" ماہ نور نے پوچھا۔

"مجھے یقین نہیں" زوار نے سر ہلایا "لیکن جو تم کرنا چاہ رہی ہو' اگر اس میں بھلائی ہے تو مجھے تم پر بھروسا کرنا چاہیے۔"

"آپ ابراہیم سے ملے؟" ماہ نور نے موضوع بدلا۔ "آپ نے دیکھا وہ کتنا سویٹ لڑکا ہے۔"

"ہاں وہ ایک اچھا اور سمجھ دار لڑکا ہے۔"

"ابراہیم، سعد کے لیے مجھ سے زیادہ پریشان ہے۔" ماہ نور نے کہا۔
"اس ایک لڑکے نے اپنی ناقابل فہم طبیعت کی وجہ سے کتنے لوگوں کو پریشان کر رکھا ہے۔" زوار نے سرہلایا۔
"وہ ایسا ہی ہے۔" ماہ نور نے کہا۔ "شاید آپ اس ٹراما کو سمجھ نہیں پائے، جس سے وہ گزرا ہے۔"
"میں نے تم سے کہا تھا۔ سردار بھائی سے بات کرلو۔"
"میں نے ان سے بات کرلی ہے، وہ کہہ رہے تھے کہ تم جو سمجھ رہی ہو وہ بالکل ٹھیک ہے۔ مگر ایک عجیب بات انہوں نے کی۔" ماہ نور کو یاد آیا۔
"وہ کیا؟"
"وہ کہہ رہے تھے، میں زیادہ لمبی بات نہیں کر سکتا کیونکہ یہاں ماحول بہت گرم ہے۔"
"ماحول گرم ہے یا موسم گرم ہے؟" زوار چونکے۔
"موسم تو خیر اب اتنا گرم نہیں رہا، لیکن پتا نہیں، سردار چچا کی اس بات کا کیا مطلب ہے؟"
"ان کو بہت سے کام رہتے ہیں۔ تھوڑے وقفے کے بعد گاؤں واپس آئے ہیں ناں، لوگوں کے جھگڑے نمٹا نا ہوں گے، تصفیے کرانا ہوں گے، اسی میں مصروف انہوں نے کہہ دیا ہوگا۔" زوار مسکرائے۔
"ہوں!" ماہ نور نے سرہلایا۔ "بابا! آپ، سکندر انکل سے کہہ کر میرا کام جلد کرادیں گے نا!"
"ہاں میں نے اس سے بات کرلی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا جو تھوڑا وقت روٹین میں لگتا ہے، وہ تو لگے گا ہی لیکن کام ترجیحاتی بنیادوں پر ہو جائے گا۔"
"آئی لو یو بابا!" ماہ نور مسکرائی تھی۔

☆ ☆ ☆

"انسان کے ذہن میں کوئی سوال اٹھتا ہے۔" ڈاکٹر رضا کہہ رہے تھے یہ ان کے ساتھ سعد کی اگلی ملاقات تھی۔

"وہ اس سوال کا جواب اپنی عقل کے مطابق دینے کی کوشش کرتا ہے۔۔۔ جب عقل جواب دینے سے قاصر ہو جاتی ہے تو وہ اپنے اردگرد دیکھتا ہے، کیا اس کے گردوپیش میں کوئی چیز اس کے اس سوال کا جواب دے سکتی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ اپنے ہم خیالوں سے ذہن کی الجھن کا ذکر کرتا ہے۔ کئی سر جڑتے ہیں تو سوال کا کوئی نہ کوئی مشترکہ جواب نکل ہی آتا ہے اس جواب پر تحقیق ہو سکتی ہے، اس کے حقائق و جمع تفریق پر غور کیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق تمام شکوک و شبہات پر بحث ہوتی ہے۔ اس بحث مباحثہ میں کہیں نہ کہیں سوال کا وہ جواب موجود ہوتا ہے، جو سوال کرنے کے دل کو لگتا ہے۔
بس یہیں اس کا دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ پھر اس جواب کو حقیقت سمجھ کر قبول کرلیا جاتا ہے۔ اسے ہی قانون کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔"
"اچھا ہے!" سعد نے سرہلایا "آپ کا انداز اچھا ہے، مگر یہ گمان مت کیجئے گا کہ میں کسی سوال کے جواب کو پانے کے لیے ان تمام مرحلوں سے گزرے بغیر ہی کوئی قانون بنا گیا ہوں گا۔"
"پھر بھی آپ کو جواب نہیں ملا؟" ڈاکٹر رضا نے حیرت کا اظہار کیا۔
"جواب ہی نے تو فرار پر مجبور کر دیا۔"
"مجھے نادیہ آپ کے ذہن کی سب الجھنوں سے آگاہ کر چکی ہے۔"
"تو؟" سعد نے ان کی طرف دیکھا "آپ کو کیا لگا، میں غلط یا باقی سب لوگ صحیح؟"

"ہاہا۔۔۔ آپ نے تو دونوں طرف ایک ہی بات کر دی۔" ڈاکٹر رضا ہنسے۔

"کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ گھما پھرا کر آپ بھی مجھے ہی غلط قرار دیں گے۔ جیسے اختر نے کہا جیسے نور فاطمہ نے کہا جیسے ہر وہ شخص کہے گا جو سنے گا۔"

"نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔" ڈاکٹر رضا نے کہا۔ "میرے خیال میں آپ نے وہی کیا جو ایک صحیح الدماغ شخص کو کرنا چاہیے تھا۔"

سعد نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا "کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ وہی کہنا چاہ رہے ہیں جو کہہ رہے ہیں۔"

"ایک سو فی صد!" ڈاکٹر رضا مسکرائے۔

"شکر خدا!" سعد نے چھت کی طرف دیکھا۔ "کوئی تو ہے جس نے میرا نقطہ نظر سمجھا۔" "لیکن ایک اختلاف مجھے بھی ہے آپ سے۔"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ ابتدائی ذہنی جھٹکے کے بعد آپ جیسے تعقل پسند شخص کو سنبھل جانا چاہیے تھا اور اپنے ذہن میں اٹھتے سوال شکوک اور گمان بلا کم و کاست اپنے والد سے جا کہنے چاہیے تھے۔"

"آپ انہیں جانتے نہیں۔" سعد نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ "وہ بند دروازوں کے پیچھے چھپے شخص ہیں۔ ان کے بند دروازوں پر کوئی عمر بھر بھی دستک دیتا رہے دروازے نہیں کھلیں گے۔"

"کسی کو اپنی صفائی کا موقع دیے بغیر اسے مجرم قرار دینا بھی قانون فطرت کے خلاف نہیں ہے کیا۔" ڈاکٹر رضا نے سوال کیا۔

"آپ ایک آئینہ خانے میں کھڑے ہوں اور وہاں موجود ہر آئینہ ہر عنوان کے نیچے ایک ہی چہرہ دکھاتا ہو تو آپ کو کسی بیان یا صفائی کی ضرورت پڑے گی کیا؟" سعد نے الٹا سوال کیا۔

"آئینوں پر اعتبار کرتے ہیں گویا آپ!"

"آئینے بھی جھوٹ بولتے ہیں کیا؟" سعد نے براہ راست ڈاکٹر رضا کی آنکھوں میں جھانکا۔ جس کے رد عمل میں انہوں نے فوراً" اپنا چشمہ آنکھوں پر لگا لیا۔

"آئینے جھوٹ بولتے ہیں یا نہیں یہ الگ بحث ہے، لیکن کبھی کبھی ہمیں آئینے میں وہی عکس نظر آنے لگتا ہے جو ہم دیکھنا چاہ رہے ہوتے ہیں اسے اشتباہ کہتے ہیں، اشتباہ نظر۔"

"میں ایسا کوتاہ نظر نہیں۔" سعد برا مان گیا۔

"ان خاتون کی پینٹنگز کو آپ نے اپنے والد کی فرضی بربریت سے خود ہی جوڑ لیا نہ خاتون سے سوال کیا نہ ہی والد سے کیا یہ آپ نے ٹھیک کیا؟" ڈاکٹر رضا براہ راست سوال پر اتر آئے۔

"کبھی کبھی سوال کیے بغیر ہی جواب مل جاتے ہیں اور وہ جواب اتنے واضح ہوتے ہیں کہ سوالوں کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔"

"واہ! آپ تو بہت ذہین آدمی ہیں۔" ڈاکٹر رضا نے مسکرا کر کہا "اچھا یہ بتائیں کہ اگر آپ چیزوں کے بارے میں اتنے واضح ہیں تو پھر آپ کی پریشانی کی وجہ کیا ہے؟"

"میں پریشان نہیں ہوں۔" سعد نے سر ہلایا۔ "میں مایوس ہوں، زندگی نے بہت بڑا پلٹا کھایا ہے، میری ترجیحات ایک بڑی شکست سے دوچار ہو گئی ہیں اور مجھے اپنے سامنے کا راستہ واضح نظر نہیں آتا، یوں لگتا ہے مجھے زندگی کو دوبارہ سے منظم کرنا ہو گا، لیکن یہ کیسے ہو گا میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

"آپ اپنے مسئلے کا حل چاہتے ہیں کیا؟" ڈاکٹر رضا نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" اس نے شانے اچکائے۔ "شاید میں خود بھی نہیں جانتا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔"

"مطالعہ کی عادت ہے آپ کو؟" ڈاکٹر نے سوال کیا۔

"کبھی تھی اب میں پوری توجہ سے کچھ نہیں پڑھ پاتا۔"

"اگر میں آپ کو کچھ پڑھنے کو دوں تو پڑھیں گے کیا؟"

"میرا معاملہ نادیہ سے مختلف ہے ڈاکٹر صاحب' وہ واہموں کا شکار تھی آپ نے اس کے سامنے کا منظر اس پر واضح کردیا' جبکہ میں سب کچھ جانتا ہوں' سمجھتا ہوں مگر جو کچھ جان اور سمجھ چکا ہوں' اس سے مایوس ہوں۔"

"آپ فکر مت کریں۔ میں آپ کو راستہ دکھانے والا ہوں نہ ہی کچھ واضح کرنے جا رہا ہوں' میں صرف آپ کے وقت کا مثبت استعمال چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے' دیجیے جو آپ دینا چاہتے ہیں' میں ضرور پڑھوں گا۔" اس نے ہاتھ بڑھایا۔

اگلے لمحے اس کے ہاتھ میں قرمزی جلد والی ایک کتاب تھی جس کا عنوان اس کی قرمزی جلد پر سنہرے حروف میں لکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میری مان' جہاں سے پتا چلا ہے' وہاں پہنچ جا اور اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو جا۔"

اس رات سونے کے لیے ایک ہی چھولداری میں اس کی چارپائی کے ساتھ بچھی چارپائی پر لیٹتے ہوئے خان چاچا نے اسے مشورہ دیا تھا۔

"اس کا اب کیا فائدہ۔" اس نے اپنے موبائل پر ایم ایم ایس کے ذریعے بھیجی گئی تصویر دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھو خان چاچا! وہ اپنے قدموں پر کھڑی ہے۔ اگرچہ دیکھنے میں مکمل نارمل نہیں لگتی۔" اس نے موبائل خان چاچا کے سامنے کیا۔

خان چاچا کتنی ہی دیر اس تصویر کو غور سے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے آنسو اس کی آنکھوں کے گوشے بھگوتے ہوئے رخساروں پر لڑھک آئے۔

"یقین نہیں آتا۔ یہ تو معجزہ ہے معجزہ۔"

"آپ کو معلوم ہی نہیں کہ یہ معجزہ کس شخص کے ہاتھوں ممکن ہوا.... مگر مجھے معلوم ہے۔" وہ جیسے خود سے کہہ رہا تھا۔

"بہت اچھا ہوا نا' ایسا ہو گیا' ہے نا خان چاچا؟" اس نے کروٹ بدل کر خان چاچا کی طرف دیکھا۔

"ہاں.... بہت اچھا۔" خان چاچا ابھی بھی تصویر میں گم تھا۔

"لیکن دکھ تو اس بات کا ہے کہ یہ معجزہ جسے ممکن ہونا ہی تھا' ہمارے ہاتھوں کیوں نہیں ممکن ہوا۔ وہ غیر ہاتھوں میں چلی گئی اور ایسا ہماری بے حسی کی وجہ سے ہوا۔ اب ہم میں سے کوئی بھی کس منہ سے اس کا سامنا کرے گا۔" وہ رک رک کر بول رہا تھا۔

"رکو.... میرے شہزادے!" خان چاچا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "تیرا جو منہ تجھے اللہ نے دیا ہے نا' اسی کے ساتھ جا۔ اس کے سامنے چلا جا۔ کچھ نہیں ہوتا میرے یار! وہ سرکس کی بیٹی ہے' سرکس والوں سے منہ موڑ ہی نہیں سکتی۔ تو دیکھ لینا ۔ میری بات سچ ثابت ہوگی۔"

"ہمت نہیں ہوتی خان چاچا!"

"تے ہور کی؟" نور فاطمہ مسکرائی۔ "رات لمی سی تے گلاں مکدیاں نئیں سن 'فجر ویلے تک اودھے اندر دا بھانبھڑ ٹھنڈا ہو گیا سی۔ اوس نے کہا بے بے توں نکا گھیڑ میں وضو کرنا اے توں آپ ہی دس کدھی کوئی کافر ہو تو وضو کردا اے؟" اس نے لڑکی سے سوال کیا۔

"آپ نے ایسا کیا جادو پھونکا کہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا؟" لڑکی نے اب کے سر اٹھا کر پوچھا اور کھسک کے نور فاطمہ کے قریب ہوئی۔

"میں۔" نور فاطمہ ایک دفعہ پھر مسکرائی۔ "میں اودھے نال اودھے دل دیاں گلاں کیتیاں 'اودھیاں سنیاں اودھیاں ہی کیتیاں۔"

"دل کی بات کیا تھی؟" لڑکی کے چہرے پر تجسس ابھرا۔

"اوجدھے نال پیار کردا اے 'اودھیاں گلاں کہن لگا" نور فاطمہ منہ بنا کر بولی "اودا دماغ بڑا اچا اے بے بے! اوتے کدھی وی تیری ایس کلی وچ نہ آئے گی۔"

لڑکی کے چہرے پر تاریک سایہ لہرایا۔

"اوتے تیرے ان بھانڈیاں وچ کبھی وی روٹی نہ کھاوے گی 'کبھی وی ایس چٹائی تے نہ سووین گی۔"

لڑکی نے اپنے ساتھ آئے لڑکے کی طرف دیکھا اور پھر اس سے نظریں چرالیں۔

"تم نے دیکھا۔ تمہارے بارے میں اس کی ریزرویشنز کیسی ہیں۔" لڑکے نے ہنس کر اس سے کہا۔

"غلط سوچتا ہے وہ 'غلط کہتا ہے۔" لڑکی نے جھلا کر کہا۔

"میں اونھوں آکھیا 'نہ وے جھلیا 'جی نوں جی ہوندی اے 'پیار محبت ہور کی ہوندی اے۔" نور فاطمہ ان دونوں کی بات سمجھے بغیر بولی۔ "جے اونھوں تیرے نال سچا پیار اے تے فیر او تیرے نال اک مک ہو جائے گی' جو توں ایں اودی توں ہی ہو جاوے گی۔"

لڑکی نے آنکھیں میچ لیں۔ اس کی پلکیں بند آنکھوں پر لرز رہی تھیں۔

"میری گل سن کے او بولیا 'بے بے دل خوش کیتا ای پھر ہنسنے لگا تے بولن وی لگا 'اوتھے مینوں دسیا کڑی بڑی سوہنی اے تے اودھا دل اوس توں وی بوتا سوہنا اے۔ اودھیاں اکھاں سوہنیاں اودھے وال وی سوہنے' اوجدھوں ہسدی اے تے ساری دنیا ساہ لینا بھل جاندی اے 'بس ساری دنیا اودھے دل ہی تکن لگ جاوندے اے۔"

لڑکی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ جنہیں وہ الٹے ہاتھ سے خشک کرنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

"تاریاں ونگر جگ مگ کردا دل سی اودھا!" نور فاطمہ بولی "اودھے دل وچ پیار ہی پیار سی 'پیار دا پورا سمندر وگدا سی اودھے اندر 'سویر ہوئی تے میں پچھیا 'وے جھلیا ہن تے اونہ کریں گے جو کرن ٹریا سیں آکھن لگا نئیں بے بے ہن کسے نوں کج نہ آکھاں گا بس لانبھ کر جاواں گا۔ میرا دل ہسیا تے میں سوچیا ایویں ای تے میرے رب سوہنے نے مینوں بالن چگدی نوں اودھی گڈی دے پچھے نئیں لایا سی 'میرا رب سوہنے دے ہر کم وچ کوئی نہ کوئی گھوڑی (گہری) بات ضرور ہوندی اے۔"

"لیکن وہ تو اپنی کرنی سے نہیں رکا ماں جی' وہ تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلا گیا' غائب ہو گیا ہم سب کی نظروں کے سامنے سے۔" لڑکے نے کہا۔

"جو کج او کرن چلا سی او تے نئیں نا کیتا اونھے۔" نور فاطمہ نے کہا۔

"کیا کرنے چلا تھا؟"

"اپنے سکے پیو نوں فیر (فائر) مارن چلیا سی او۔" نور فاطمہ نے اس ساکت ماحول میں جیسے کوئی بم پھوڑا تھا۔

"تو میرے کہنے پر ایک دفعہ ہمت کر۔ ایک بار ضرور جا، کرایہ، جیب خرچا، سب میں دوں گا۔" خان چاچا پریا رانی کی تصویر دیکھ کر جیسے جی اٹھا تھا، جوش میں آکر اٹھ کر بیٹھ گیا۔
"آپ کو یقین ہے، وہ منہ نہیں موڑے گی؟" اس نے بے یقینی سے خان چاچا کو دیکھا۔
"مجھے پورا یقین ہے۔" خان چاچا کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔
"ٹھیک ہے، میں ایک بار ان بی بی سے رابطہ کرتا ہوں جنہوں نے اس کی تصویر مجھے بھیجی تھی۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

☆ ☆ ☆

"بڑی سوہنی رات تھی وہ، ہم دونوں ماں بیٹے نے باتیں کرتے ہی گزار دی رات۔"
نور فاطمہ نے اپنے سامنے بیٹھے نوجوان لڑکے اور لڑکی سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔ یہ دونوں مہمان ادھر ادھر سے اس کے بارے میں پوچھتے لمبی خواری کے بعد اس تک پہنچے تھے۔
"وہ آپ تک پہنچا کیسے ماں جی؟" لڑکے نے جس کا قد زیادہ لمبا نہیں تھا اور جسم بھرا بھرا سا تھا، پوچھا۔
"اونہوں ہنیری موڑ کر میرے پاس لے آئی سی۔" نور فاطمہ مسکرائی "نئیں تو اس نے کہاں میرے ول آونا سی، توبہ توبہ!" اس نے انگلیوں سے کچے فرش پر دو لکیریں سی کھینچنے کے بعد کانوں کو ہاتھ لگائے "غصے کا تو بڑا ہی تیز تھا او۔"
"ماں جی! اسے غصہ نہیں آتا میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔" لڑکے نے ایک بار پھر مداخلت کی۔
"نئیں آتا ہووے گا۔" نور فاطمہ نے بے نیازی سے کہا۔ "پر اس دن تے او غصے وچ بھا نبھڑ بنا ہویا سی او سدھی راہ بھول گیا، اس کی گڈی دا تیل ختم ہو گیا، اسے میں بہانے سے ایدھر لے آئی اپنی کلی وچ، خوشی محمد نے اس رات نوں کوئی نئیں سی آنا، میں اونہوں جھوٹ کہا کہ خوشی محمد آجاوے گا تے اونہوں تیل لا دیوے گا، اس نمانے نوں غصہ تے چڑھنا ہی سی۔"
"آپ نے اس سے یہ جھوٹ کیوں بولا ماں جی؟" لڑکی جو اب تک اس کے سامنے کچے فرش پر گھٹنے موڑ کر ان پر سر رکھے بیٹھی خاموشی سے سن رہی تھی بولی۔
"وہ جس طرح گڈی دا ہرن (ہارن) بجا رہا تھا اور تیل والی سوئی وکھدا نئیں سی، اوس توں ہی مینوں پتا چل گیا

سی کہ اے وچارہ بڑے غصے وچ اے۔ تے ایس غصے وچ اپنا ہی نقصان کرن چلا اے۔"

"آپ والی اللہ تھیں کیا جو آپ کو پتا چل گیا تھا؟" لڑکا بولا۔

"توبہ توبہ!" نور فاطمہ نے ایک مرتبہ پھر کانوں کو ہاتھ لگایا "میں تے بڑی گناہ گار آں میری کی مجال میں ولی اللہ بن جاواں میرے اینڈھے چنگے نصیب کتھے۔"

"پھر کیسے پتا چلا آپ کو۔"

"میرے بچے جب ایک ایک کر کے مر گئے تے چوہدریاں تے پرچہ پے گیا اودھوں دا مینوں یاد اے میں وی غصے وچ انا بھا نبھڑا بن گئی تے چوہدری وی عقل نال ناں میں سوچیا ناں چوہدریاں بعد وچ کج ہتھ میرے آیا ناں چوہدریاں دے آنے پائیاں گنیاں تے نقصان اپنا ہی ہویا پیا سی۔ ایس واسطے مینوں اس جوان دا غصہ دیکھ کے پتا چل گیا انا مورا ہو گیا ہے' اینھوں کلی وچ بٹھا کے ٹھنڈا پانی پیا واں تے پریت پیار دیاں دو گلاں وچ اج دی رات اینتھے ہی کھلا رلواں تاکہ کج غصہ لتھ جائے۔"

"پھر اس کا غصہ اتر گیا کیا؟" لڑکی نے سوال کیا۔

☆ ☆ ☆

"میرے پاس ایسا کہنے کی وجوہات ہیں اگرچہ کوئی دوسرا انسان ان سے متفق نہیں ہو گا۔" فلزا نے کہنا شروع کیا۔

"رکیں بی بی! ذرا ٹھہریں۔" رابعہ کلثوم نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ اپنے برقع کی ٹوپی اٹھا کر انہوں نے چہرے پر دوپٹے سے نقاب کر رکھا تھا۔

"مجھے بچے والی اس ساری داستان پر ہی شک ہے' اس شخص کا" انہوں نے بلال سلطان کی طرف اشارہ کیا۔ "میری بہنوں جیسی سہیلی سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا تھا' اس کو پلائے جانے والے زہر نے اس کا چہرہ بگاڑ دیا' اس کے بعد یہ شخص اپنا بچہ لے کر اسے بے چارگی کی حالت میں چھوڑ کر فرار ہو گیا' وہ بے چاری کشیدہ کاریاں کر کے اور بچوں کو ناظرہ قرآن کی تعلیم دے کر گزارہ کر رہی تھی' پھر وہ اس کا بچہ کیسے پیدا کر سکتی تھی۔ یہ کہانی جھوٹ ہے' سراسر بے سروپا۔ میری اس بات کے گواہ مولوی سراج سرفراز ہیں۔"

انہوں نے مولوی صاحب کی طرف دیکھا۔

"جو کچھ یہاں بیان ہو رہا ہے۔ اسے سن کر میرے تو کان خود پر یقین نہیں کر پا رہے۔" مولوی سراج نے کہا۔ "میری تو عقل ویسے بھی کم کام کرتی ہے' اگر وہ سب ہو گیا تھا جو چودھری صاحب اور یہ بیگم صاحبہ سنا رہی ہیں تو پھر تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔"

"اب اس الزام کا جواب صرف آپ دے سکتے ہیں بلال صاحب! بولیے!" چوہدری سردار نے بلال سلطان کی طرف دیکھا اور بری طرح چونک گئے۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

عنیزہ سیّد

میرا خیال ہے میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم اب اس کے پیچھے جا رہے ہیں نہ ہی اس کی کوئی بات کر رہے ہیں۔" بلال سلطان کا لہجہ اور بات ابراہیم کے لیے حوصلہ افزا ہرگز نہیں تھی۔

"لیکن انکل! میں نے بتایا کہ یہ لڑکی تو ویسی ہی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" اس نے منمنا کر ایک کوشش مزید کرنا چاہی۔

"تمہارا کیا خیال ہے، میں بہت فارغ ہوں جو جب کوئی مجھ سے ملنا چاہے میں اس ملنے کے لیے Available (دستیاب) ہو جاؤں۔" وہ سخت اور خشک لہجے میں بولے۔

"نہیں ہرگز نہیں انکل! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں۔" ابراہیم نے زبان پھیر کر اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا ہے کہ اسے، میں اپنے مان پر لایا تھا۔" اس نے ایک جذباتی وار کھیلنے کی کوشش کی۔ "میں نے ہی اسے یقین دلایا تھا کہ انکل میری بات کو اون کرتے ہیں کیونکہ مجھے وہ اپنے بیٹے جیسا ہی سمجھتے ہیں۔"

—۳۱—
اکتیسویں قسط

"لیکن وہ انکل کو کیوں شوٹ کرنا چاہتا تھا، میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔" ابراہیم نے سر ہلا کر کہا۔ "وہ جتنا بھی ناقابلِ فہم ہے، پھر بھی اس سے میں یہ توقع تو کر ہی نہیں سکتا۔"

"تم سمجھنے کی کوشش بھی کرو گے تو شاید تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔"

ماہ نور نے گردن موڑ کر پیچھے کھڑے ابراہیم کو جواب دیا اور پھر دوبارہ سامنے دیکھنے لگی۔ اس کی نظروں کے
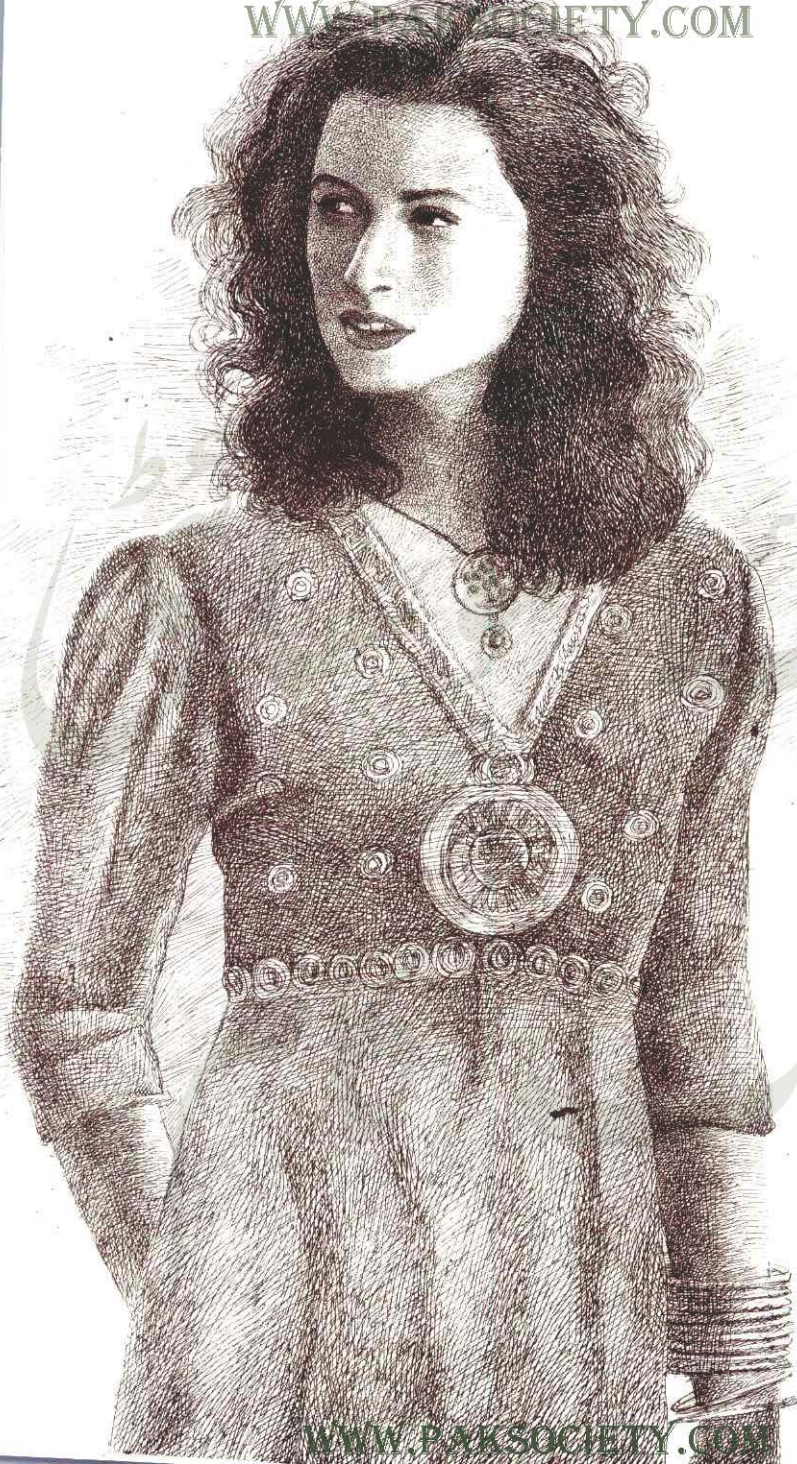
سامنے دور دور تک سرسبز کھیت پھیلے تھے۔ دھان کی فصل ہری تھی اور اس کے پیروں میں کھڑے پانی سے حبس زدہ باس اٹھ رہی تھی۔ زمین پر دن بھر اپنی روشنی اور تمازت پھیلائے رہنے کے بعد سورج آہستہ آہستہ غروب کے سفر پر رواں تھا۔ آسمان پر کہیں کہیں رکی بادلوں کی ٹکریاں ڈوبتے سورج کی روشنی میں شنگرفی ہو رہی تھیں۔ اس سے چند گز کے فاصلے پر کھڑے پرانے اور بوڑھے درخت کی شاخیں اور ان سے نکلتی بھوری ٹہنیاں جٹا دھار جوگی کی طرح جیسے آلتی پالتی مارے بیٹھی نروان کے لیے "آشتی کی خاطر کوئی چلہ کاٹتی معلوم ہوتی تھیں۔

"یہ ہی وہ درخت ہے جس کے نیچے نور فاطمہ کے بچوں کی بے شناخت قبریں ہیں۔ ان پر کسی کا نام ہے نہ کوئی نشان، تین چھوٹے چھوٹے ایسے پتھر جو کسی بھی آنے جانے والے کے قدموں کی زد میں آ کر ادھر ادھر ہو سکتے ہیں۔ کسی اور کو ان قبروں کی نشان دہی کی کیا ضرورت۔ یہ پتھر تو شاید اس پوری دنیا میں صرف اور صرف نور فاطمہ کے دل کی تسلیاں ہیں۔" اس نے لمبا سانس لیتے ہوئے سوچا اور اپنے بازو سامنے باندھ لیے۔

"اسی درخت کے نیچے رکھے ان پتھروں کے گرد وہ پانی کا چھڑکاؤ کرتی ہوگی۔ ان ہی کے قریب ایک ایک گلاب کا پھول رکھ کر وہ اپنے بچوں کی یاد منالیتی ہوگی.... اف کس قدر مشکل ہے اپنے بچوں کے مرقد کے قریب دن رات گزارنا۔" اسے جھرجھری سی آگئی۔ اس نے چھوٹے سے کچے صحن میں ایک طرف بنی کچی کوٹھڑی سے چولہے میں جلانے کے لیے اپلے اور خشک ٹہنیاں نکالتی نور فاطمہ کی طرف دیکھا۔ "کیسے مضبوط دل کی مالک ہے یہ عورت بظاہر پرسکون نظر آتی ہے اپنے دکھوں پر واویلا نہیں کرتی۔ مگر اپنی سادگی اور انجان پن میں کیسی کیسی پتے کی باتیں کر جاتی ہے۔" اس نے دل میں اعتراف کرتے ہوئے سوچا۔

"میں عام اور ان پڑھ لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا ہوں' ان کی سنتا ہوں اور سنتا ہی چلا جاتا ہوں' ان عام لوگوں کی باتوں میں بہت پتے کی باتیں ہوتی ہیں۔ میری خواہش ہے کہ کبھی تم بھی ان سے کراہیت محسوس کرنے کے بجائے ان کے قریب بیٹھ کر ان کی باتیں سنو' تمہیں اس میں فوک وزڈم نظر آئے گی۔"

اس نے سر جھٹکا اور اپنا دھیان بٹانے کے لیے اس بوڑھے درخت کو پھر سے دیکھنے لگی۔

"مجھے ان درختوں کی پہچان نہیں۔ پتا نہیں یہ برگد کا درخت ہے یا پیپل کا لیکن یہ جو بھی درخت ہے' اسی کے نیچے بیٹھ کر تو تم نے نور فاطمہ کا درد سنا ہوگا اور اس کا درد بٹایا ہوگا' تم بھلا کہاں بیٹھے ہوگے۔" وہ کچی چار دیواری کے حصار سے باہر نکل آئی اور تین پتھروں کی نشانیوں کے قریب پاؤں کے بل بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں نمناک ہونے لگیں۔

"کیا کبھی تم جان پاؤ گے کہ آج میں بھی اسی جگہ پر بیٹھی نور فاطمہ کے غم کو اسی طرح محسوس کر رہی ہوں' جیسے اس روز تم نے کیا تھا۔ نور فاطمہ نے تو اپنے بچوں کی یاد میں ان پتھروں کو نشانیاں بنا ڈالا۔ کاش! تم مجھے یہ بھی بتا جاتے کہ دل میں بسی تمہاری محبت کو میں کہاں دفن کروں اور اس کی یاد میں کس چیز کو نشانی بناؤں۔" آنسو اس کی آنکھوں سے لڑھک کر کچی زمین میں جذب ہو گئے۔

"توں ایتھے آکے کیوں بیٹھ گئی ایں!" نور فاطمہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور پنجوں کے بل بیٹھ گئی۔ "ہائے نی جھلیے! رونے کیوں لگ گئی ایں؟" اسے اگلی نظر میں ہی ماہ نور کے آنسو نظر آ چکے تھے۔ "دیکھ میرے دل میں تے نئیں روندی۔" اس نے ماہ نور کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اپنی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

"جنہاں گلاں دا رون ساری عمر دا ہووے' اونہاں تے روز روز کی رونا۔ چل میری دھی! ایتھوں اٹھ' پیر تھک جان گے نی تسی کرسیاں' صوفیاں تے بہن والے لوک.... اٹھ شاباش اندر چل کے بیٹھ۔ میں تینوں اوہ ای پیڑھی کڈھ کے دیندی آں' جدھے تے اونہوں بٹھایا سی' خورے جے تینوں اوس پیڑھی تے بیٹھ کے ہی سکون آجاوے۔"

ماہ نور نے حیرت سے نور فاطمہ کی طرف دیکھا۔ جواب میں وہ مسکرا دی اس ہلکی مسکراہٹ نے بھی اس کے اونچے دانت نمایاں کردیے تھے۔

"جھلا کہندا سی 'او تے تیری ایس گلی وچ کدھی نہ آوے گی' او تے تیرے بھانڈیاں وچ روٹی کدھی نہ کھاوے گی۔ او تے ایس چٹائی تے سویں گی۔۔۔ اج ہوندا کدھرے نمہڑے تے دیکھ لیندا تے فیر کہندا اے بے! توں سچ آکھیا سی۔ جو توں ایں اووی توں ہی ہو جاوے گی۔"

ماہ نور، نور فاطمہ کی یہ بات سن کر بھل بھل رو دی۔

"نہ میری دھی!" نور فاطمہ نے اسے اپنے گلے سے لگالیا اور وہ آرام سے اس کے گلے لگ گئی۔ اُس وقت اسے نور فاطمہ کے جسم سے پسینے کی بو آتی محسوس ہو رہی تھی نہ ہی اس کے کپڑے میلے لگ رہے تھے۔

"نا میری سوہنی دھی! رون تیرے دشمن، توں چپ کر جا، مینوں یقین اے۔ او جتھے وی اے تینوں، تیرے نالوں بوہتا یاد کردا پیا ہووے گا۔ او نہوں ہور ساریاں گلاں توں بوہتی تیری فکر ہووے گی، تے جدھوں وی او واپسی دی راہ پھڑے گا، او دھے پیر تیرے رستے ول ہی ٹرن گے، کسی ہور پاسے نئیں جان گے۔" اس نے ایک مرتبہ پھر ماہ نور کو پچکارا۔

اس نے ماہ نور کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور جھونپڑی کی طرف چل دی۔

"یہاں ایک رات گزارنا ناممکن بات ہے ماہ نور!" ابراہیم نے ماہ نور کو واپس آتے دیکھ کر کہا۔ وہ پریشان چہرہ لیے نور فاطمہ کی جھونپڑی کے آگے کھڑا تھا۔

"یہاں کوئی باتھ روم نہیں ہے اور اردگرد پھیلی فصلوں کی وجہ سے حبس ہے۔ فصلوں میں کھڑے پانی کی وجہ سے مچھروں کی بہتات ہے۔ یہاں بجلی ہے نہ ہی گیس، نہ کوئی سیوریج کا انتظام، میرا خیال ہے واپس چلیں، تم نے سعد کی خواہش کی تکمیل تو کردی۔" وہ انگریزی میں کہہ رہا تھا۔

"توں بھانویں کیہڑی زبان وچ گٹ مٹ کریں مینوں سمجھ لگ گئی اے، توں میری دھی نوں کہندا پیا اے چل ایتھوں ٹرچلیے۔" نور فاطمہ جو کولہوں پر ہاتھ رکھے ابراہیم کی طرف دیکھ رہی تھی بولی۔

ابراہیم نے اکتائی ہوئی رحم مانگتی نظروں سے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"ابراہیم کاروباری آدمی ہے بے جی! اسے اپنے کام کی فکر ہے۔" ماہ نور نے ابراہیم کی طرف داری کی۔ "میرے ساتھ یہاں آنے کے لیے اس نے اپنا خاصا وقت ضائع کیا۔"

"ہوں!" نور فاطمہ نے ہاتھ کولہوں سے نیچے گرائے اور سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "ہلا فیر چل کے دونویں جی روٹی تے کھالوؤ۔"

ماہ نور نے ابراہیم کو کچھ دیر اور رکنے کے لیے کہا اور نور فاطمہ کے ساتھ ہینڈ پمپ کی طرف چل دی۔

"اج میں چوچا پکایا اے تیرے لئی، او شودھا جدھوں آیا او اس دن تے میرے کول کوئی شے ہی نئیں سی پکان لئی۔" نور فاطمہ نے ماہ نور کی پلیٹ میں بھنے مرغ کا سالن ڈالتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی وہی دے دیتیں جو اس کو دیا تھا۔" ماہ نور نے آہستہ آواز میں کہا۔ "اووی گھوٹیا اے، لے اے وی چکھ۔" نور فاطمہ نے پسی چٹنی اس کی پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"مینوں یقین سی او تینوں لے کے میرے ول ضرور آئے گا۔" نور فاطمہ نے ان دونوں کو کھانا کھاتے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تاں ہی تے میں میلے تے جا کے ایہہ برتن بھانڈے لے آئی ساں۔ کدھرے توں ساڈھیاں مٹی دیاں کولیاں توں نفرت کھاویں۔" اس نے پلاسٹک کی اس پلیٹ کی طرف اشارہ کیا، جس میں ماہ نور کھانا کھا رہی

تھی۔

"اس نے مجھے انڈر اسٹیمیٹ کر رکھا تھا!" ماہ نور نے ابراہیم سے کہا۔

"سچ کہو کیا تم یہاں خود کو ثابت کرنے نہیں آئیں۔" ابراہیم جو رغبت سے نور فاطمہ کے ہاتھ کا بنایا ہوا سالن کھا رہا تھا مسکرا کر بولا۔ "تاکہ جب بھی وہ ملے تم اسے بتا سکو کہ تم اس امتحان میں بھی پوری اتریں۔"

"بکواس نہ کرو۔" ماہ نور دل کا چور پکڑے جانے پر خفا ہو گئی۔ "میں تو صرف اس لیے یہاں آئی ہوں کہ دیکھوں آخر نور فاطمہ کی جھونپڑی میں کیا ہے، جو اس نے اتنا زور دے کر اس کا ذکر کیا اور اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ مجھے یہاں آنا چاہیے۔"

"اچھا!" ابراہیم نے یوں کہا جیسے اسے ماہ نور کی توجیہہ پر یقین نہ آیا ہو۔ "پھر یہ ہی بتا دو کہ کیا پتا چلا تمہیں یہاں آکر؟"

"یہ کہ حوصلے، صبر، توکل اور عجلت، بے صبری، لالچ میں کیا فرق ہوتا ہے اور دونوں قسم کی عادتیں انسان کو کس انجام تک پہنچا دیتی ہیں۔" ماہ نور نے اپنی اور ابراہیم کی پلیٹ اٹھاتے ہوئے پُر سکون لہجے میں کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی، کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔" ابراہیم نے احمقوں کی طرح اس کی طرف دیکھا۔

"سمجھنے کی کوشش بھی مت کرنا، کیونکہ تمہاری سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے یہ۔" وہ برتن اٹھائے ہینڈ پمپ کی طرف چلی گئی جہاں نور فاطمہ بیٹھی دیگچیاں مانجھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے پڑھتے پڑھتے سر اٹھا کر دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھا۔ گھڑی شام کے چار بجا رہی تھی۔ نادیہ کی واپسی میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ اس نے کتاب میز پر رکھ دی اور انگڑائی لے کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ دو قدم پر ہی نادیہ کا چھوٹا سا اوپن کچن تھا جس کے چھوٹے سے کاؤنٹر پر انتہائی ضرورت کی چند چیزیں رکھی تھیں۔ نادیہ ان ہی چیزوں کے استعمال کے ساتھ پیٹ بھرنے کے ایسے لوازمات بنا لیتی تھی، جو انتہائی سادہ ہوتے تھے اور وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ خود کو ایسے کھانے کا عادی بنا لے۔ اس وقت اسے شدت سے کافی کے ایک کپ کی طلب محسوس ہو رہی تھی لیکن نادیہ کے کچن میں کافی کا ڈبا موجود نہیں تھا۔ اس نے کچن کی کھڑکی سے باہر دیکھا، تین دن سے جاری بارش اس وقت بھی اسی تواتر سے برس رہی تھی۔

"اگر یہ بارش نہ برس رہی ہوتی تو میں کہیں جا کر کافی تو پی ہی آتا۔" اس نے سوچا۔ اگلے ہی لمحے اسے خیال آیا تھا۔ "لندن جیسے شہر میں بارش کو بہانہ بنا کر کسی کام کے ارادے کو ملتوی کر دینا کتنی عجیب بات لگتی ہے، جبکہ اسی بارش نے یہاں کے معمولات زندگی کو ذرا برابر بھی متاثر نہیں کیا۔

پھر کیا ایسا ہے کہ میں باہر نکلنے اور لوگوں کا سامنا کرنے سے کترانے لگا ہوں۔ خواہ وہ لوگ مکمل اجنبی ہی کیوں نہ ہوں۔" وہ اپنے معاملے کو سوچتے سوچتے سنجیدہ ہو گیا۔

"اور یقیناً" ایسا بھی ہے کہ میں اور میرا مزاج دوسروں کے لیے گستاخانہ اور سخت ہوتا چلا جا رہا ہے۔" سنجیدہ سوچ اسے خود احتسابی کی طرف لے گئی "میں اس زندگی کو ایسے گزار رہا ہوں۔ جیسے دوسروں پر احسان کر رہا ہوں نادیہ جتنا مجھے خوش رکھنے اور حوصلہ دینے کی کوشش کرتی ہے، اتنا ہی اس کے ساتھ میرا رویہ ایسا ہوتا جا رہا ہے، جیسے میں زندہ رہ کر اس پر احسان کر رہا ہوں۔ کتنی احمقانہ بات ہے کہ وہ صرف ایک انسیت اور اپنی ہمدرد فطرت کے تحت ایسا کرتی ہے اور میں اس کے سر پر چڑھا جاتا ہوں۔ آخر میں کر کیا رہا ہوں، چاہ کیا رہا ہوں۔

کیا مجھے اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرلینا چاہیے کہ میں اس چھوٹے سے ایک کمرے کے فلیٹ میں رہنے کا عادی نہیں ہوں۔ ایسی کم وسائل زندگی میری عادت نہیں۔ یہ ملک جہاں پہلے میں کبھی تفریح کی خاطر اور کبھی کاروبار کے سلسلے میں آیا کرتا تھا۔ اب مجھے اجنبی لگتا ہے اور میرا یہاں سے بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے۔ مجھے اپنا نارمل لائف اسٹائل، من مرضی کی زندگی آزادی اور سیلانی پن یاد آتا ہے تو میں ایک اذیت ناک احساس تنہائی کا شکار ہو جاتا ہوں۔ مجھے الجھن اور بیزاری محسوس ہوتی ہے۔ میں لوگوں کے ساتھ گستاخ ہو جاتا ہوں۔ اور بھلا یہاں میرے مخاطب لوگ ہیں ہی کتنے۔" اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔ "نادیہ، ڈاکٹر رضا اور کبھی کبھار وودن زادے ...... کیا میں نے کبھی سوچا تھا کہ دنیا بھر میں ہزاروں کانٹیکٹس رکھنے والا شخص صرف تین رابطوں پر اکتفا کرنے لگے گا۔" اسے خود پر ہنسی آنے لگی۔

"چوروں جیسی یہ زندگی کبھی بھی میری ترجیحات میں نہیں تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا ہو چکا ہے اور اس وقت تک ایسا ہی رہے گا۔ جب تک میں اپنی کوئی نئی شناخت نہیں بنا لیتا۔ پرانی شناخت سے واقف لوگ مجھے اسی پس منظر میں ملیں گے، جس سے ملتے رہے ہیں اور وہ میں کبھی نہیں چاہوں گا۔" فطری، غصہ، انا اور رنج ایک بار پھر اس پر حاوی آنے لگا۔ اس نے خود احتسابی کا سلسلہ ترک کر کے واپس کتاب اٹھالی۔ تب ہی دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے ایک بار پھر اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

آنے والا ایک اجنبی چہرہ تھا جو نادیہ کے بارے میں پوچھ رہا تھا اور اپنا نام چندر شیکھر بتا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

بلال سلطان کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ ان کے ہونٹ خشک اور سفید ہو رہے تھے۔ چوہدری سردار نے ان کے چہرے پر نرمی سے ہاتھ پھیرا اور اپنی انگلیوں سے ان کی پیشانی تھپتھپائی۔

"بلال صاحب! کیا ہوا؟" انہوں نے پوچھا۔

"بھائی صاحب، بھائی جی! طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟" مولوی سراج بے چین ہو کر ان کے قریب آگئے اور اپنا صافہ اتار کر ان کے چہرے پر پھیرنا چاہا لیکن پھر رک کر ایک مرتبہ اپنے صافے کی طرف دیکھا جو پرانا تھا اور سفید ہونے کے باوجود اجلا اجلا نہ لگ رہا تھا۔ انہوں نے صافہ دوبارہ شانے پر رکھ لیا اور بلال کے کندھے دبانے لگے۔

"سراج! مجھے پانی کا ایک گلاس چاہیے۔" چند لمحوں کے بعد بلال کے منہ سے الفاظ نکلے۔ گھبرائے ہوئے مولوی صاحب نے میز پر رکھے جگ سے پانی گلاس میں ڈالا۔ احساس مرعوبیت سے ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پانی کے چند گھونٹ پینے کے بعد بلال کی طبیعت قدرے سنبھلی تھی۔ نظر اٹھا کر انہوں نے سامنے دیکھا۔ فلزا اپنے سینے پر بازو باندھے کھڑی زہر آلود نظروں سے ان کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"اب پتا چلا بلال سلطان ڈراما کیسا ہوتا ہے؟" وہ ان سے نظریں ملنے پر بولی۔ "حقیقت سے نظریں چار ہو جانے پر وہ چار کے بجائے آٹھ کیسے ہو جاتی ہیں۔"

"تم!" بلال سلطان نے کمزور مگر پراعتماد آواز میں کہا۔ "تم میری بہت بڑی مجرم ہو فلزا۔"

فلزا نے رابعہ کلثوم کی طرف دیکھا۔ "چور جب الٹا کوتوال کو ڈانٹتا ہے تو کیسا لگتا ہوگا، خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو بہن!"

"دیکھ رہی ہوں، سن رہی ہوں اور سمجھ بھی رہی ہوں۔" رابعہ کلثوم کا لہجہ بھی فلزا کے لہجے سے مختلف نہیں

تھا۔

"بھائی صاحب! پانی اور پی لیجیے۔" مولوی سراج سرفراز دونوں خواتین کی گفتگو کی طرف سے کان بند کیے بندگی نبھانے پر تلے ہوئے تھے۔

"چوہدری سردار صاحب!" بلال نے مولوی سراج کا بڑھا ہوا ہاتھ ہٹا کر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا اور کمرے کی مشرقی کھڑکی کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ "آپ نے کبھی پرانے بند قلعوں کے اردگرد بنے بلند حصار دیکھے ہیں؟"

"بالکل دیکھے ہیں۔" چوہدری صاحب نے کہا۔

"کبھی ان محصور قلعوں کا حال دیکھا ہے؟" بلال نے دوسرا سوال کیا۔

"جی ہاں' دراڑیں پڑے' شکستہ ہوئے' رنگ اڑے۔" چوہدری صاحب نے کہا۔

"نہیں ایسے نظر نہیں آتے وہ' کیونکہ جو حکومتیں ان کی حفاظت پر مامور ہوتی ہیں' وہ ان کی رینوویٹ (مرمت) کراتی رہتی ہیں۔ دراڑیں بھر دی جاتی ہیں۔ شکستگی کا علاج کروا دیا جاتا ہے۔ اڑے رنگ دوبارہ پھروا لیے جاتے ہیں۔ یوں بظاہر ان قلعوں کی شان و شوکت اور رعب و دبدبہ قائم رہتا ہے۔ دیکھنے والے قلعوں میں گھوم پھر کر دیکھ تو لیتے ہیں لیکن ان کے اردگرد کھڑے' بلند و بالا حصار کسی کو قلعے ایکسپلور کرنے کی ہمت نہیں کرنے دیتے۔ تاریخ دان' محقق' آثار قدیمہ کے ماہرین' سیاح سب اپنی اپنی ڈائریاں لکھتے وقت ان کے متعلق قیافے ہی لگاتے ہیں۔ کسی کو ٹھیک سے یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ ان رینوویٹڈ قلعوں کے اندر دراڑیں کتنی ہیں۔ یہ درحقیقت اندر سے کتنے شکستہ ہیں اور ان پر اب تک کتنی بار رنگ روغن کا کام ہو چکا ہے۔"

"شاید آپ درست کہہ رہے ہیں۔" چوہدری صاحب نے سوچتے ہوئے کہا۔

"شاید نہیں میں واقعی درست کہہ رہا ہوں۔" بلال نے کہا۔ "اور ایسے ہی قلعوں جیسی ایک مثال میں ایک انسان بھی ہوں۔" انہوں نے سب حاضرین پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "بلند و بالا فصیلوں میں چھپا ہوا بظاہر عظیم الشان قلعہ۔" وہ لمحہ بھر کو رکے اور ایک تمسخرانہ ہنسی ہنسنے کے بعد دوبارہ گویا ہوئے۔

"ہر سال چھ مہینے بعد خود کو رینوویٹ کروا لیتا ہوں اپنی شکستگی چھپانے کے لیے۔ دراڑیں بھروانے کے لیے اپنی شخصیت پر رنگ و روغن کروانے کے لیے بہت سارا پیسہ خرچ کر لیتا ہوں۔ پیسہ۔۔۔۔ یو نو چوہدری صاحب! جو انسان کی زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہے' بلکہ شاید سب سے بڑی۔ یہ پیسہ' درحقیقت میرے پاس میرے اپنے اندازے سے بھی کہیں زیادہ ہے' اتنا زیادہ کہ کئی بار تو سمجھ نہیں آتا کہاں خرچ کروں؟"

چوہدری سردار نے بلال کی بات سن کر ایک طویل سانس لیا اور دوبارہ ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"لیکن ایسا ہمیشہ سے نہیں ہے چوہدری صاحب! ایک وقت تھا جب میرے پاس پیسہ نہیں تھا۔ میں پائی پائی کمانے اور دھیلا دھیلا جوڑنے کی جنگ میں مصروف تھا۔ اور یہ سب۔" انہوں نے مولوی سراج' رابعہ کلثوم' اور فلزا ظہور کی طرف اشارہ کیا۔

"میرے اس وقت کے ہم نشین ہیں' یہ گواہ ہیں میرے اس وقت کہ جب میرے لباس پر خفیہ پیوند ہوا کرتے تھے اور ایک وقت کے معمولی کھانے پر پورا دن گزار دیتا تھا۔"

"وہ خفیہ پیوند نہیں تھے۔" رابعہ کلثوم نے بلند آواز میں کہا "میری بدنصیب سہیلی جو بدقسمتی سے ان کی بیوی تھی' ہاتھ سے کپڑے کی رفوگری میں کمال رکھتی تھی۔ ایسی رفوگری کہ محدب عدسے سے بھی دیکھو تو رفو نظر نہ آئے۔"

"شکر ہے رابعہ بی بی! تمہیں اتنا تو یاد ہے کہ وہ میرے کپڑوں میں پیوند نہیں لگاتی تھی' انہیں رفو کیا کرتی تھی۔ ایسی رفوگری کہ محدب عدسے سے بھی نظر نہ آئے۔" بلال سلطان کی آواز میں طنز اترا۔

"ایسی ہی رفوگری چوہدری صاحب! اس نیک عورت نے میری اور اپنی زندگی کی بھی کی تھی' ایسے ایسے رفو کہ قریب رہنے والے سراج اور رابعہ بی بی کو بھی نظر نہ آئے۔" انہوں نے چہرے کا رخ دوبارہ چوہدری سردار کی طرف موڑا۔

"وہ تو ٹھیک ہے بلال صاحب! لیکن رابعہ بہن نے تو کنفیوژن کی انتہا کر دی۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ کے اور مرحومہ کے آپس کے تعلقات ختم ہو چکے تھے۔ پھر کھاری کا چکر کیا ہے۔ یہ بے چارہ کون ہے آخر میرا تو دماغ گھوم رہا ہے۔" چوہدری صاحب نے کہا۔

"ارے چوہدری صاحب آپ کس کی باتوں میں آ رہے ہیں۔" فلزا بلال اور چوہدری صاحب کے درمیان آن کھڑی ہوئی۔ "میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ یہ شخص بلا کا ڈرامہ باز ہے۔ خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے کوئی بھی کہانی گھڑ سکتا ہے۔"

"باقی سب سوالوں کا جواب تو میں بعد میں دوں گا' پہلے تو تم سے حساب کتاب کرلوں۔" بلال نے دانت پیستے ہوئے اچانک فلزا کا بازو پکڑا۔

"تم نے کہا تھا۔ وہ مر گیا۔ بتاؤ' تم نے ایسا کہا تھا یا نہیں؟" انہوں نے فلزا کا بازو زور سے جھنجھوڑا۔ "کیوں کہا تھا۔ کیوں کیا تم نے ایسا میرے ساتھ؟"

"یہ تو میں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ میرے حساب سے اسے زندہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔" فلزا نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔

"چوہدری صاحب! میں نے اپنا نوزائیدہ بچہ اس عورت کے حوالے کیا تھا' وہ اس کے پاس میری امانت تھی۔" بلال نے ایک مرتبہ پھر چوہدری صاحب کی طرف دیکھا "میں ایک بڑے حادثے کے درمیان کھڑا تھا۔ میرا خیال تھا جیسے اس نے شہناز کو پہچان لیا' جیسے اس کے دل میں میرے لیے اچھے جذبات تھے "اس سے بہتر اس بچے کا کوئی دوسرا محافظ نہیں ہو سکتا تھا مگر اس نے...." ان کی آواز بھرائی "اس نے مجھے بتایا اس نے اسے بس سٹاپ پر رکھ دیا تھا اور بچے کو بعد میں آوارہ کتے کھا گئے۔"

"فلزا بی بی! بچہ رکھنے کے کچھ ہی عرصے بعد میں نے آپ سے رابطہ کیا تھا اور آپ سے پوچھا تھا کہ آپ بچے کو کیوں اس طرح بس اسٹاپ پر رکھ آئی تھیں؟" چوہدری صاحب نے فلزا سے پوچھا۔ "تو آپ نے سارے واقعے سے لاعلمی کا اظہار کر دیا تھا۔"

"کاش! اس وقت آپ مجھے یہ بتا دیتے کہ بچے کو آپ وہاں سے زندہ سلامت اٹھا لائے تھے۔" فلزا کی آواز پست ہوئی۔ "آپ اسی بات پر اصرار کرتے رہے کہ آپ نے خود مجھے بچہ وہاں رکھتے دیکھا تھا۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ آپ مجھے ایسی ظالم نہیں سمجھتے تھے کہ ایک نوزائیدہ بچے کو کتے بلیوں کی خوراک بننے کے لیے کہیں بھی رکھ دوں۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ 'یہ پولیس کیس بن سکتا ہے۔'"

"بالکل! میں نے ایسا ہی کہا۔" چوہدری صاحب نے اعتراف کیا۔ "میں چاہ رہا تھا کہ آپ ذرا دباؤ میں آ کر اعتراف کر لیں بچہ آپ نے رکھا تھا تو میں بچے کو آپ کے حوالے کر دوں' لیکن دو دفعہ رابطے کے بعد آپ یوں غائب ہوئیں کہ کوئی پتا نشان نہیں چھوڑا...."

"آپ کے خیال میں مجھے اور کیا کرنا چاہیے تھا؟" فلزا کے لہجے میں بے بسی اتری۔ "بچہ کتے بلیوں کا شکار ہو گیا' پولیس کیس بن سکتا تھا' میری عمر اس وقت کم تھی' میں غیر شادی شدہ تھی' اس خوفناک رات کا تذکرہ کسی

سے کر سکتی تھی نہ ہی کسی سے مدد مانگ سکتی تھی۔ میرے بہن بھائی' میرا خاندان۔ میرا کیریر... سب کے سامنے میرا وجود ایک سوالیہ نشان بن سکتا تھا۔ میں ڈر گئی۔ میں نے قتل ہوتے نہیں دیکھا تھا مگر میں جائے وقوعہ پر موجود تھی۔ میں نے گردن کٹی لاش دیکھی تھی اور خون کی ندی بھی۔ میں نے آلہ قتل قاتل کے ہاتھ میں دیکھا تھا اور میں نے وہ سارا دن قاتل کے ساتھ گزارا تھا۔ کیا کیا خوف' کیسے کیسے اندیشے نہ ہوں گی میرے سامنے۔ ایسے میں آپ ہی بتائیے! غائب ہو جانے سے بہتر راستہ میرے پاس کیا تھا۔ ایک بچے کی لاش سے چلتے پولیس کے قدم بلال سلطان کے ہاتھوں ہونے والے قتل تک پہنچتے اور میں کہاں کہاں نہ پھنستی۔ آپ ہی بتائیے میرے پاس کوئی دوسرا راستہ تھا کیا؟"

"تمہیں پتا ہے تمہارے اس من گھڑت مفروضے نے میرا کیا حال کیا؟" بلال سلطان فلزا کی وضاحت پر ایک مرتبہ پھر دانت پیستے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔

"تم جانتی ہو! میں نے اس بس سٹاپ جس کا تم نے بتایا تھا... اور اس کے ارد گرد کا سارا علاقہ چھان مارنے میں کتنا وقت صرف کیا۔ تمہیں کیا معلوم اس بس اسٹاپ پر کتنے ہی سال گھنٹوں بیٹھ کر میں اپنے اس معصوم بچے کو کتنا رویا ہوں' جس کی دنیا میں آمد کا مجھے کس شدت سے انتظار تھا اور جس کی میں شکل بھی ڈھنگ سے نہ دیکھ سکا تھا۔ کبھی موقع ملے تو جا کر دیکھیے گا چوہدری صاحب! اس پس ماندہ' غیر آباد' غیر معروف علاقے کے اس بس اسٹاپ کو اپنے بچے کی یاد میں میں نے کیا سے کیا بنا دیا۔ مسافر خانہ' ریسٹورنٹ' فلٹرڈ پانی کے الیکٹرک کولر' مسجد قیمتی ترین ٹائلز سے سجے فٹ پاتھ' بس سٹاپ کی انتظامیہ کو ہر ماہ فقیروں اور ناداروں کے لیے نجانے کتنی رقم' ہر ماہ کی اس تاریخ کو جب وہ بچہ پیدا ہوا اسی بس اسٹاپ پر دیگیں پہنچ جاتی ہیں اور کھانا تقسیم ہوتا ہے۔"

انہوں نے شدت غم سے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک مجبور' بے بس' ترسا ہوا باپ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا ہے اپنے بچے کے لیے۔

کمرے میں موجود ہر شخص کے ہونٹ یکدم جیسے سل سے گئے تھے۔

"میرا خیال ہے!" چوہدری صاحب نے گلا کھنکھارنے کے بعد بات شروع کرتے ہوئے اس سناٹے کو توڑا۔ "فلزا بی بی! آپ سے نادانستگی میں خاصی بڑی غلطی ہو گئی۔"

"آپ نہیں جانتے چوہدری صاحب! اسے اس بچے کی پروا کچھ عرصے تک تو رہی ہو گی' اس کے بعد یہ فرعون بن گیا۔ فرعون سمجھتے ہیں آپ؟" فلزا نے بلال کی طرف دیکھا' جو اسے ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جن کا مفہوم وہ سمجھ نہیں پائی۔

"عجیب بات ہے' میرے الفاظ پر کوئی دھیان ہی نہیں دے رہا... آخر وہ بچہ کس کا تھا۔ شہناز کا تو نہیں ہو سکتا کبھی بھی۔" رابعہ کلثوم نے گفتگو میں ایک مرتبہ پھر دخل دیا۔

"ہاں... تمہارے الفاظ یہ ہی ہونے چاہئیں رابعہ بی بی! تمہارے سوال بھی درست ہیں" اب کے بلال نے رابعہ کی طرف دھیان دیا "کیونکہ تم اپنے خاندانی پیشے کے زیر اثر کسی بھی بات کا ڈھول پیٹے بغیر رہ نہیں سکتیں۔ پہلے بھی یہ تمہاری مجبوری تھی اور آج اتنے سال بعد بھی یہ ہی مجبوری ہے تمہاری۔"

"میں!" رابعہ کلثوم نے کچھ کہنا چاہا۔ بلال سلطان نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا۔ "تمہاری اسی عادت کی وجہ سے میں نے شہناز کو منع کیا کہ میں جو اتنی عرصے بعد اس سے دوبارہ ملا تھا تو اس کا تذکرہ تم سے ہرگز نہیں کرے۔ تمہارے ہونٹوں سے نکلی سیدھی طیفے لاٹر کے کوٹھے پر جا چڑھنے کا اندیشہ تھا۔"

"آپ دوبارہ آن ملے شہناز سے؟" رابعہ نے طنزیہ نظروں سے انہیں دیکھا "یہ کب کا واقعہ ہے خیر سے؟"

"یہ ان ہی دنوں کا واقعہ ہے سراج! جب رابعہ بی بی تم سے کہا کرتی تھیں کہ شہناز کو سرسام ہو گیا ہے۔ جب

ہی وہ راتوں کی تنہائی میں کمرے میں اکیلی بیٹھی خود سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ ہنستی ہے اور گنگناتی بھی ہے۔" بلال نے مولوی صاحب کی طرف دیکھا۔ رابعہ کلثوم کا منہ حیرت سے کھلنے لگا۔

"اور یہ ان ہی دنوں کا قصہ ہے جب تم شہناز سے کہا کرتی تھیں کہ پاؤں تو تمہارا بھاری ہوا ہے، کھٹی اور چٹپٹی چیزیں کھانے کو اس کا دل کیوں چاہنے لگا ہے؟" رابعہ کلثوم کا منہ کچھ اور کھل گیا۔

"اور یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب تم اس سے سوال کیا کرتی تھیں کہ مکان کا کرایہ مالک مکان کے پاس کب اور کیسے پہنچا، گھر میں تازہ ترکاری اور گوشت کہاں سے آنے لگا، پھل اور دودھ کی شکل کیسے دکھائی دینے لگی ہے اور بجلی، گیس کے بل کہاں سے دیے جا رہے ہیں؟"

رابعہ کا ذہن جیسے گزری ساری باتوں کے سرے آپس میں جوڑنے میں مصروف تھا۔

"ان ہی دنوں شہناز نے تم دونوں کو بصد اصرار لاہور سے نکل جانے پر مجبور کیا۔ اس کے اس عمل کی وجہ ہم دونوں کا دوبارہ ملن تھا۔ جسے طیفے لاٹر سے چھپانا مقصد تھا۔ میں شہناز سے دوبارہ آملا۔ طیفے کو پتا چل جاتا تو اس کا چھرا اسی وقت ایک یا دو گردنیں تو ضرور کاٹتا، تم دونوں کے ہاں ولادت ہونے والی تھی۔ طیفا تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائے اس ڈر سے تم دونوں کو لاہور سے نکل جانے پر مجبور کیا۔" بلال نے سراج سرفراز سے کہا۔

"مگر بھائی صاحب! آپ کی واپسی ہم سے کیوں چھپائی آپا جی نے؟" سراج سرفراز اٹک گئے۔

"نہ تمہاری زبان چوکوں چوپالوں میں رکتی تھی، نہ ہی تمہاری زوجہ کی، ڈر تھا تم دونوں میں سے کوئی ایک ضرور کسی محلے دار کے سامنے ذکر کردے گا۔"

بلال کی بات سن کر سراج سرفراز نے سر پر بندھا کپڑا اتار کر سر کھجایا اور کپڑا دوبارہ باندھنے لگے۔

"ہائے ہائے!" رابعہ کلثوم نے اپنے پرانے انداز میں ہاتھ ملے "ہمیں بھی نکلوا دیا، خود بھی آنے لگے، بچہ بھی آنے والا ہو گیا تو پھر اس کم نصیب کا گلا کیوں کاٹ دیا آخر میں.... اس لیے کہ وہ اپنی خوب صورتی کھو چکی تھی اس لیے کہ طیفا اس کا عاشق تھا اور تم اس سے حسد کھاتے تھے؟"

"جتنی انسان کی عقل ہو، اس سے بڑھ کر وہ سوچنے لگے تو اصل کائنات کا نظام درہم برہم نہ ہو جائے۔" بلال نے رابعہ کی طرف طنزیہ نظروں سے دیکھا۔

"بھائی صاحب! اگر آپ خود ہی مرحومہ کے قتل کا منظرنامہ، محرکات اور تفصیلات بیان کردیں تو یہاں موجود کوئی بھی شخص اپنی عقل یا بے عقلی کا مزید مظاہرہ نہ کرے۔" چوہدری صاحب نے کہا۔

"وہ صرف میری بیوی ہی نہیں تھی، وہ میری محبوبہ بھی تھی۔ کیوں سراج! تم اس بات کی گواہی تو دو گے نا؟" انہوں نے مولوی سراج سے پوچھا۔

"جی بھائی صاحب!" سراج سرفراز نے فوراً" سر ہلایا۔

"ارے ان کی گواہی، خواجہ کی گواہی کے برابر ہے۔" رابعہ کلثوم نے چڑ کر کہا۔

"بس رابعہ بی بی! اب تم ایک لفظ بھی نہیں بولو گی۔" بلال ڈپٹ کر بولے۔ "کہیں تمہیں اپنے الفاظ پر رونا نہ پڑ جائے۔"

رابعہ کلثوم جواب دینا چاہ رہی تھیں کہ فلزا نے ان کا ہاتھ دبا کر انہیں خاموش کر دیا۔

"آپ کی محبوبہ اور بیوی کے ساتھ ہوا کیا یہ تو بتائیے۔" چوہدری صاحب کا صبر جواب دینے لگا۔

"ریڈیو پاکستان کے ماضی کی ایک ایسی مغنیہ تھی وہ جو اپنی خوب صورت آواز کی وجہ سے شہرت کی سیڑھیاں چڑھنا شروع ہی ہوئی تھی کہ اس کے والد نے اس کے اس شوق پر سخت پابندی لگانے کی کوشش کی اور اس نے

اس کوشش کو قبول نہیں کیا۔ الٹا بغاوت کردی 'وہی ایک روایتی کہانی۔'' بلال رک کر استہزائیہ انداز میں ہنسے۔
''یہ اضافہ بھی ساتھ میں کرلیجئے چوہدری صاحب! کہ اس کا باپ ایک انتہائی معزز' تعلیم یافتہ اور مہذب خاندان کا فرد تھا۔'' فلزا نے درمیان میں ٹکڑا لگایا۔
''میں نے اس حقیقت سے انکار تو نہیں کیا فلزا بی بی!'' بلال نے نیچی آواز میں کہا۔
''لیکن اس کی ایک خواہش کی۔ اس معزز' تعلیم یافتہ اور مہذب خاندان نے اسے بڑی کڑی سزا نہیں دی 'کیا خیال ہے؟'' انہوں نے سوال کیا۔
''وہ ان کے اپنے اصول تھے' جو آڑے آگئے۔'' فلزا جانتی تھی' اس کی دلیل بودی تھی۔
''چلو مان لیتے ہیں۔'' بلال نے خلاف توقع بحث نہیں کی۔ ''بس اس کی بغاوت کے نتیجے میں اسے عاق کردیا گیا۔ پورے خاندان نے اس سے قطع تعلق کرلیا۔ بقول اس کے اگر کبھی کہیں سرراہ خاندان کے کسی فرد سے مڈبھیڑ ہو بھی جاتی تو وہ یوں راستہ بدل لیتا جیسے کسی اچھوت سے سامنا ہو گیا ہو۔''
''سیڈ!'' چوہدری صاحب نے زیرلب کہا۔
''اس زمانے میں ایسی بغاوتوں سے یونہی نمٹے جانے کا رواج تھا شاید' والد بزرگوار سوچتے ہوں گے اس قطع تعلق کے نتیجے میں وہ غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے معافی مانگ کر ان کی قدموں میں جاگرے گی' لیکن وہ بھی ان ہی کی بیٹی تھی۔ اس نے ایسا نہیں کیا۔ یہاں ایک وار اس پر اور بھی کیا گیا' اثر ورسوخ اور تعلقات استعمال کرکے اس کا وہ کیریر جو ابھی آگے بڑھنے کی دوسری تیسری سیڑھی پر ہی کھڑا تھا۔ ختم کرادیا گیا۔ کوئی میوزک ڈائریکٹر' کوئی ریڈیو پروڈیوسر' کوئی میوزک مینٹر اس کی سرپرستی کرنے پر راضی ہوتا تھا نہ ہی اسے کہیں آگے بڑھنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر وہ شخص بھی جو کسی مقابلے میں اس کے گلے کا سر دیکھ کر اسے انگلی سے لگا کر اس میدان میں لے کر آیا تھا اور اس وقت تک اس کا ساتھ بھی دے رہا تھا' رفوچکر ہو گیا اور یہ محترمہ تن تنہا رہ گئیں۔''
''پھر کیا ہوا' اس سے آگے کے معاملات انہوں نے کیسے چلائے؟'' چوہدری صاحب تجسس میں تھے۔
''میں اس اسٹرگل کا چشم دید گواہ تو نہیں ہوں' سنی ہوئی بات یہ ہی ہے کہ ایک ایسے موسیقار وگلوکار جو خود ضعیف ہوچکے تھے۔ انہوں نے اسے سہارا دیا اور کہا تم نجی محفلوں میں فن کا مظاہرہ کیا کرو' تمہاری آواز اچھی ہے اور اچھی آواز کے قدردان بہت لوگ تمہیں سننے ضرور آئیں گے۔ سو اسی مشورے کے نتیجے میں اندرون لاہور کے اس محلے میں وہ گھر لیا گیا' جہاں آپ رابعہ بی بی! ان سے اتفاقاً'' آن ٹکرائیں اور آپ نے ان کی صحبت میں تہذیب کے چند قدم چلنا سیکھ لیے۔'' بلال کے لہجے میں ایک مرتبہ پھر تلخی اور طنز اتر آیا۔
''میری خوش قسمتی تھی وہ اتفاقاً'' ٹکراؤ۔ میری زندگی سنور گئی اور آج تک جو صراط مستقیم میرا راستہ ہے' وہ اسی نیک روح کی صحبت کا نتیجہ ہے۔'' رابعہ نے مضبوط آواز میں جواب دیا۔
''اچھا!'' بلال استہزائیہ انداز میں بولے۔ ''مزید اس چھوٹے سے کرائے کے مکان کے صحن میں محافل موسیقی سجتیں اور فن کے قدردان حاضرین بننے لگے' جہاں ایک بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا اور وہ مسئلہ تھے اہل محلہ۔ چوہدری صاحب! آپ محلے والوں کی طاقت سے تو واقف ہی ہوں گے' ایک بہت بڑا فیکٹر بن جاتی ہے یہ طاقت انسانوں کی زندگیوں میں۔''
''بالکل!'' چوہدری صاحب نے سرہلایا۔
''اس طاقت نے شہناز کے سرپر منڈلانا شروع کردیا۔ اس پر دباؤ ڈالنا شروع کردیا کہ شریفوں کے محلے میں گانا بجانا نہیں چلے گا۔ شریفوں کا محلہ سمجھتے ہیں نا آپ چوہدری صاحب؟'' ایک بار پھر بلال نے چوہدری صاحب سے

"بالکل' بالکل۔" چوہدری صاحب نے سرہلایا۔

"یہ اور بات کہ شریفوں کے اس محلے پر اصل حکومت بدمعاش کررہے ہوں اور بدمعاشوں کی سرپرستی میں سب دھندے خفیہ خفیہ شریفوں کے ہی اسی محلے میں چل رہے ہوں۔" بلال نے کچھ یاد کرتے کرتے سر جھٹکا۔

"بس ایسا ہی کچھ حال شریفوں کے اس محلے کا بھی تھا' جس کی سرپرستی لطیف عرف **طیفا لاٹر** کررہا تھا۔ شہناز کو اہل محلّہ نے دھمکانا شروع کیا اور **طیفا لاٹر**' شہناز اور اہل محلّہ کے درمیان آگیا۔ اس نے اہل محلّہ کی شرافت کو چپ کا روزہ رکھوا دیا اور شہناز کو ہر طرح **فیسی لیٹ** (زیر احسان) کرتے ہوئے اس کے کاروبار زندگی کا سرپرست بن گیا۔"

"اللہ کی مار پڑے موئے پر' آگ لگ جائے اس کے اگلے پچھلوں کو' مرتے پانی نصیب نہ ہو کلموئے کو۔" رابعہ کلثوم یہاں خود پر قابو نہ رکھ سکیں۔

"حیران مت ہوں چوہدری صاحب! رابعہ بی بی اپنی آبائی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ ان کے ابا یا تو دوسرے لوگوں کی پگڑیاں سنبھالنے کا کام کرتے تھے یا پگڑیاں اچھالنے کا۔ وہ ہی کام ان کو بھی آتے ہیں۔ لوگوں کے بھاگ لگے رہنے کی دعا یا ان کے جہنم واصل ہوجانے کی بددعا۔ دونوں طرف انتہا ہے۔" بلال نے کہا۔

رابعہ بی بی نے ایک مرتبہ پھر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا' مگر فلزا کے اشارے پر خاموش رہ گئیں۔

"وہ تو مرحومہ کا سرپرست بن گیا۔ یہ بتائیے آپ کی آمد کس طرح ہوئی ان کی زندگی میں۔" چوہدری صاحب نے سوال کیا۔

"میں ایک مسکین سی زندگی گزار رہا تھا۔ یتیم یسیر دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنے والا بچہ تھا' جو بڑا ہوا تو اپنے پیروں پر خود کھڑے ہونے کی تلقین کرکے گھر سے نکال دیا گیا۔ ایک سے دوسری نوکری کو سوچ کرتا۔ روزگار کے حصول کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا' میں ایک ایسے شخص سے دوستی اختیار کرچکا تھا جس کے پاس تھوڑا بہت ایسا سرمایہ تھا جس سے وہ کاروبار شروع کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے اسے میرے جیسے ذہین اور تیز طرار شخص کی ہی ضرورت تھی۔ ہم دونوں اس متوقع کاروبار کی تفصیلات ڈسکس کرتے رہتے تھے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ شخص اس مغنیہ کی غزل سننے ہر رات اس کے گھر جایا کرتا تھا۔ جس کی ایک غزل میں نے بھی ریڈیو پر سنی تھی اور دوبارہ سننے کی خواہش ہی کرتا رہ گیا تھا۔ میرے شوق اور پسند کو دیکھتے ہوئے میرا دوست ایک رات مجھے بھی وہاں لے گیا۔ ایک بار کا وہ جانا' باربار جانے کا پیش خیمہ بن گیا۔ میں آواز کا مداح تھا۔ زلف کا اسیر ہوا اور شناسائی بڑھانے کا متمنی ہونے لگا۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ دوسری طرف کی نظروں نے بھی مجھے خود میں بسالیا۔ اس طرح دونوں طرف آگ برابر لگ گئی اور اپنی اس لگن میں ڈوبے ہمیں یہ اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کوئی اور بھی ہے' جو میری طرح اس کی زلف کا اسیر ہوچکا تھا اور اسی لیے سرپرستی پر بھی مامور ہوا تھا۔"

"یعنی وہ ہی بدمعاش اعلا **طیفا لاٹر**۔" چوہدری صاحب نے کہا۔

"جی وہی۔" بلال نے سرہلایا۔ "ادھر معاملہ بڑھا اور بڑھ کر زندگی بھر کے ساتھ تک پہنچ گیا۔ ہمارا نکاح ہوگیا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ موصوف لاٹر صاحب اپنے اور مطلوب کے درمیان آنے والی ہر دیوار ڈھادینے کے درپے ہوچکے تھے۔ اس وقت میرے مالی حالت یہ تھے کہ راولپنڈی میں دوست کے ساتھ مل کر کاروبار شروع کرچکا تھا۔ کبھی نفع' کبھی نقصان کا چکر شروع ہوچکا تھا۔ ہفتے کے چھ دن پنڈی میں گزارتا تھا اور جمعرات کی رات لاہور پہنچتا تھا۔ یہ وہی دن تھے' جب لباس کی رفوگری اور دل کی دل بستگی کا آغاز ہوا تھا۔ کسی کے ساتھ میں' کسی کے دل میں بس جانے کا کیا مزا ہوتا ہے' محسوس ہونا شروع ہوا تھا۔ یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ کسی کی آنکھ میں میرے لیے خون

بھی اُتر چکا ہے۔ رابعہ بی بی اور سراج سرفراز اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کے عینی گواہ ہیں۔ بلکہ ان دنوں جب طیفے لاٹر کی موشگافیوں اور ذہنی حالت کی اطلاعات ملنی شروع ہوئیں۔ یہ رابعہ ہی تھی جو مجھے اپنی حفاظت کرنے اور طیفے سے بچ کر رہنے کی تلقین کیا کرتی تھی۔"

بلال نے رابعہ بی بی کی طرف دیکھا، جنھوں نے یہ بات سن کر ناگواری سے سر جھٹک کر چہرہ دوسری جانب پھیر لیا۔

"یعنی وہ آپ کے قتل کے درپے تھا؟" چوہدری صاحب نے کہا۔

"ظاہر سی بات ہے، دشمنی ہمیشہ رقیب روسیاہ سے ہی ہوتی ہے، کسی راہ چلتے سے نہیں ہوتی۔"

"پھر آپ بچ کیسے گئے؟"

"بچ اس لیے گیا کہ اللہ کو میری زندگی منظور تھی، ورنہ اس شخص نے کوشش تو کئی بار کی۔"

"آپ سمجھ چکے تھے کہ آپ کو اس سے جان کا خطرہ تھا۔ آپ نے کہیں شکایت کیوں نہیں کی۔ کہیں کوئی درخواست کیوں نہیں دی؟"

"چوہدری صاحب! میں نے بتایا کہ اس زمانے میں میرا ذریعہ معاش غیر یقینی صورت حال سے دوچار تھا۔ گھر والی اور آنے والے بچے کے احساس نے مجھے لاپروائی چھوڑ کر سنجیدگی سے اپنے قدم جمانے کی کوشش میں تو لگا دیا تھا۔ مگر پھر بھی میں ابھی ایک غریب آدمی تھا۔ ساتھ ہی ساتھ بدقسمتی سے شریف بھی تھا اور طیفا اس زمانے کے جوا مافیا والوں کا بندہ تھا۔ سلطانہ ڈاکو ٹائپ شخص، امیروں کے ساتھ جرم اور غریبوں کا ہمدرد قسم کا انسان، کسی کو قتل کرنا، کسی کو اغوا کرالینا، بھتے لینا اور جگہ جگہ دھندوں کے اڈے چلانا، اس زمانے میں تازہ تازہ وارد ہوئی ہیروئن کی اسمگلنگ اور کاروبار میں ملوث، وہ شخص ویسا ہی تھا جسے عرف عام میں کن ٹٹا کہتے ہیں۔"

"اوہ!" چوہدری صاحب کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"اب میں ایک بے یار و مددگار شخص اس سے متھا لگانے پر قادر نہیں تھا۔ اوپر سے بیوی کی نصیحتیں اور مشورے۔ طیفے سے بچ کر رہو، چاہے اس لیے میرے پاس آنا چھوڑ دو، کیونکہ طیفے نے اپنے جاسوس محلے میں چھوڑ رکھے تھے۔ جیسے ہی میری وہاں آمد کی بھنک اسے پڑتی۔ وہ چھرا لہراتا کہیں نہ کہیں سے آوارد ہوتا اور مجھے اپنی جان بچانے کے لیے چھپنا پڑتا۔"

"محلہ بدل لیتے آپ۔ آسان حل تھا۔"

"وہ بھی کر کے دیکھ لیا۔ محلہ بدلا۔ سراج کو چوکیداری پر بٹھایا۔ کچھ عرصہ سکون کا گزرا، لیکن پھر موصوف نے اس محلے کا بھی سراغ لگا لیا اور اس سراغ لگا لینے کا بڑا سبب سراج جیسی بڑی نشانی کا ساتھ ہوتا تھا۔ مرد آدمی تھا۔ گھر میں چھپا بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ باہر دکانوں پر، تھڑوں پر، مسجد میں بیٹھنے اٹھنے لگا اور ہم پکڑے گئے۔"

"گویا نئے مکان پر بھی چھرا لہرایا گیا۔"

"بالکل لہرایا گیا۔ لیکن وہاں ایسا بھی ہوا کہ میرے بیٹے کی پیدائش کے ساتھ ہی وہ کاروبار جو شروع کیا تھا، اس کے چل پڑنے کی امید پیدا ہوگئی اور میرا زیادہ وقت پنڈی میں گزرنے لگا۔"

"گویا سعد آپ کے لیے سعد ہی ثابت ہوا۔"

"آپ کہہ سکتے ہیں جبکہ میرا اس وقت خیال مختلف تھا۔ سعد ابھی بہت چھوٹا تھا۔ جب مجھ پر بس نہ چلنے پر طیش میں آکر طیفے نے محبوبہ کو ہی نشانہ بنایا اور کسی بہانے اسے زہر آلود کانجی پلوادی۔"

"اوہ... زہر آلود کانجی... وہ اس حملے میں بچ گئیں کیا؟" چوہدری صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں... وہ بچ گئی۔" بلال کے لہجے میں افسردگی اتری۔ "اور اسے بچ ہی جانا تھا، کیونکہ طیفے کا مقصد اسے

جان سے مار دینا تو تھا ہی نہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں شہناز کی صورت اور گلے کے سُر کا اسیر تھا۔ اس نے ان دونوں کو نشانہ بنایا۔ زہر خورانی کے نتیجے میں اس کے گلے کا سُر بھی گیا اور چہرے کی خوب صورتی بھی۔ چہرہ پہلے زخم زخم ہوا اور زخم مندمل ہو جانے پر داغ دار ہو گیا۔

"آہ!" رابعہ کلثوم کے منہ سے آہ نکلی اور ساتھ ہی جیسے انہوں نے وہ چہرہ یاد کرتے ہوئے شدت کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

"او مائی گاڈ!" چوہدری صاحب نے رابعہ کلثوم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ آپ اپنی بیوی اور بچے کو اپنے ساتھ پنڈی کیوں نہیں لے گئے تھے۔"

"میں یہی کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ پنڈی میں اس وقت میں چند لوگوں کے ساتھ ایک گھر شیئر کر رہا تھا۔ فیملی کو ساتھ رکھنے کے لیے کرائے کا مکان الگ سے لینا پڑتا' دیگر ضروریات بھی پوری کرنے کے لیے ماہانہ مسلسل آمدنی درکار تھی جو اس وقت میرے پاس مستقل نہیں آرہی تھی۔ شروع کی آمدنی سے میں نے ایک سیکنڈ بلکہ تھرڈ ہینڈ گاڑی خریدی جو اپنی محبت کے اظہار کے طور پر بیوی کو **تحفتا**" پیش کردی۔ آپ جانتے ہیں محبت کے اولین اظہار..... اس وقت صرف رومانس یاد ہوتا ہے۔ غم روزگار کا ہوش تو بہت بعد میں آتا ہے۔ گاڑی خریدنے کے نتیجے میں 'میں مقروض بھی ہو گیا اور آمدنی کا بیشتر حصہ وہ قرض اتارنے میں صرف ہونے لگا۔ لہٰذا میں فیملی کو ساتھ رکھنے کی خواہش کے باوجود ابھی تک اسے اپنے ساتھ لے جا نہیں سکا۔"

بلال دم لینے کو رکے' رابعہ کلثوم نے ایک بار پھر سر جھٹک کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"یہاں وسائل اور پیسے کی کمی ایک اور ستم ظریفی ساتھ لے آئی چوہدری صاحب' بیوی کا چہرہ اور آواز گئی اور بچے نے بلوغت کا سفر شروع کرنے کے ساتھ ہی ماں کو دیکھ کر ڈرنا شروع کر دیا۔"

"اس قدر خراب حالت ہو چکی تھی کیا چہرے کی؟ آخر ملایا کیا گیا تھا اس کا نجی میں' لیب ٹیسٹ نہیں کروایا آپ نے اس کا؟ سیندور پلا کر آواز بٹھانے کے قصے تو میں نے سن رکھے ہیں' مگر یہ کس قسم کا زہر تھا جو چہرہ بھی بدنما کر گیا۔" چوہدری صاحب نے کہا۔

"اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ زہر کیسا تھا۔ مجھ پر تو وہ وقت ہی بہت کڑا تھا۔ بیوی زخم زخم چہرہ اور گلا لیے سرکاری ہسپتال میں پڑی تھی۔ بچہ روتا چیختا چلاتا تھا اور کاروبار کو چھوڑا نہیں جا سکتا تھا۔ میرا ایک پاؤں لاہور دوسرا پنڈی میں رہنے لگا۔ علاج معالجے کا خرچا الگ سر پر آن پڑا تھا۔ پیسہ' چوہدری صاحب! پیسہ دنیا کی اتنی بڑی حقیقت ہے میں نے ان دنوں اس پیسے کی کمی کے ہاتھوں خود کو کیسا بے بس اور مجبور محسوس کیا' یہ میں ہی جانتا ہوں۔ کہاں سے اتنا ڈھیر پیسہ لاتا جو سارے مسائل جادو کی چھڑی سے ختم کر دیتا۔ سراج! تمہیں یاد تو ہوں گے وہ دن؟" بلال نے سراج سرفراز کی طرف دیکھا۔

"الامان! الامان!" سراج سرفراز نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "آپا جی کے چہرے کے زخموں میں پیپ پڑ گئی۔ اور بدبو ایسی آنے لگی تھی کہ قریب کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ اس وقت تو رابعہ بیگم ہی کا حوصلہ تھا کہ خدمت کی اور جی جان سے کی۔"

رابعہ کلثوم نے آنسوؤں کی بہتی قطار کو پونچھا۔

"بس چوہدری صاحب! ان سب الیموں پر بھاری وہ المیہ تھا جب بچے نے ماں کی شکل دیکھ کر ڈرنا' بدکنا اور رونا شروع کر دیا۔ وہ ممتا کی ماری اسے گود میں لینے کی تمنا کرتی۔ بچہ رابعہ بی بی کی گود سے نکلنے کا نام نہ لیتا۔ ایسا چیختا' چلاتا کہ مجبورا" اسے ماں کے سامنے سے دور لے جانا پڑتا۔"

"چچ..... چچ..... اور وہ کم بخت طیفا لاٹر..... اس کا کیا ہوا؟"

"درمیان میں کچھ عرصہ وہ غائب رہا۔ بہت بعد میں مجھے پتا چلا کہ منشیات کے کسی کیس میں گرفتار ہو گیا تھا۔"
"تو پھر تو چین کے دن ہوں گے آپ کے لیے؟"
"ہوتے ضرور ہوتے' اگر بچہ یوں تنگ نہ کرنے لگ جاتا۔ بچے کی دن بدن بڑھتی چڑچڑاہٹ اور خود سے گریز دیکھ کر ماں نے دل پر پتھر رکھ کر مجھ سے کہا۔ اسے اپنے ساتھ لے جاؤ' میرے قریب تو آتا نہیں' تمہارے ساتھ رہے گا تو کم سے کم باپ سے مانوس تو ہو ہی جائے گا۔ یہ بڑی کڑی فرمائش تھی۔ میں پنڈی میں آزاد وقت گزارتا تھا۔ دن کا نکلا رات کو سونے کے لیے گھر آتا تھا۔ وہاں میرے سر پر کوئی ذمہ داری نہ تھی۔ لیکن اس بے چاری کا دکھ بھی سمجھتا تھا۔ بچہ سامنے رہتا اور اس کے پاس آنے سے انکاری ہوتا تو اس کے دل پر کیا گزرتی تھی' شاید اسی لیے خود سے دور لے جانے کا کہتی تھی۔ اس کے اصرار اور ضد پر میں نے ویسا ہی کرنے کا ارادہ کر لیا' جیسا وہ چاہتی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اس سے وعدہ کرکے اٹھا کہ جلد ہی اتنا پیسہ اکٹھا کرلوں گا کہ اس کے چہرے کی پلاسٹک سرجری کرا کر اس کو دوبارہ وہی شکل لوٹا سکوں جسے دیکھ کر بچہ نہ بدکے گا' نہ روئے گا۔"
"گویا وہ حادثہ ان سے آپ کی محبت پر کوئی اثر نہ ڈال سکا۔ دشمن کا وہ وار بھی رائیگاں گیا۔" چوہدری صاحب ذرا سا مسکرا کر بولے۔
"محبت چہروں اور آوازوں سے تھوڑی کی جاتی ہے چوہدری صاحب۔ محبت تو روح سے کی جاتی ہے۔ دل سے کی جاتی ہے۔ انسان سے کی جاتی ہے۔ اس کی خوبیوں سے کی جاتی ہے۔ محبت انسان کی غیر مرئی خصوصیات سے کی جاتی ہے چوہدری صاحب! محبت ظاہری چیزوں سے نہیں کی جاتی' کیونکہ یہ سدا رہنے والی چیزیں نہیں ہوتیں' یہ تو کبھی بھی کسی بھی وقت ساتھ چھوڑ جاتی ہیں۔"
بلال کہہ رہے تھے اور پہلی مرتبہ فلزا اور رابعہ دم بخود ہو کر ان کو سن رہی تھیں۔
"صرف باتیں....." چند ساعتوں کے بعد رابعہ کلثوم نے بلال کی گفتگو کے سحر سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آتے ہوئے فلزا سے کہا۔ فلزا نے ان کا ہاتھ دبایا۔
"بہت خوب۔" چوہدری صاحب نے بلال سلطان کی بات کو سراہا۔
"میں بچے کو پنڈی لے گیا۔ بچے کو فضل حسین اور میمونہ بی جیسے فرشتہ صفت لوگوں کے پاس چھوڑا جو اتفاق سے میرے پارٹنر کے گھریلو ملازم تھے اور انہیں اس نے اپنے گھر میں ایک کوارٹر دے رکھا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ وہ دونوں میاں' بیوی انتہائی مہذب' شائستہ اور رکھ رکھاؤ والے انسان تھے۔ ان دونوں کے پاس سعد کو چھوڑ کر میں مطمئن ہو گیا۔ لیکن کم بختیاں ابھی باقی تھیں۔ سعد کو لے آنے کے بعد دوبار لاہور جانے سے پہلے ہی نجانے کہاں سے طیفا میرا پیچھا کرتے پنڈی پہنچ گیا۔ انجانے میں اس نے مجھ پر حملہ کیا۔ وہ تو مجھے مار ڈالنے کے لیے آیا تھا۔ لیکن وہی کہ اللہ کو میری زندگی منظور تھی۔ اس نے مجھے بچالیا۔ میں شدید زخمی ہوا اور کتنا ہی عرصہ ہسپتال میں پڑا رہا۔ مائنڈ یو اس زمانے میں موبائل فونز نہیں ہوتے تھے۔ لینڈ لائن فون بھی گھر گھر نہیں ہوا کرتے تھے۔ ڈائریکٹ ڈائلنگ کی سہولت بھی صرف بڑے شہروں کے لیے تھی اور فون کال بہت مہنگی پڑتی تھی۔ بد قسمتی سے میری بیوی کے پاس لینڈ لائن نمبر بھی نہیں تھا اور میں زخمی اس سے رابطہ کرتا تو کرتا بھی کہاں۔"
رابعہ کلثوم نے چونک کر فلزا کی طرف دیکھا۔ جس نے آگے سے یوں شانے اچکائے جیسے ان حالات سے یکسر ناواقف ہو جو بلال بیان کر رہے تھے۔
"یہیں ہمارے رابطے میں تعطل آیا اور اتنا لمبا آیا کہ کچھ لوگوں نے مجھے گالیاں' کوسنے اور بددعائیں دینا شروع کردیں۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے بقول میں بے وفا' ہرجائی حسن و آواز کا پجاری اپنا بچہ لے کر ایک بے بس' بے سہارا' نیک دل عورت کو چھوڑ کر بھاگ لیا تھا۔" بلال نے طنز بھری نظر رابعہ کلثوم پر ڈالی جو یہ بات سن کر لاشعوری

طور پر سمت کر بیٹھ گئیں۔
"لمبا عرصہ میری کوئی اطلاع نہ ملنے، بچے سے دوری، اپنی حالت زار۔۔۔ ان سب چیزوں نے مل کر میری بیوی کے ذہن پر ایسا اثر ڈالا کہ دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا۔ ایسی ماہیت قلب ہوئی کہ دنیاوی چیزوں سے منہ موڑ کر اللہ سے لو لگالی۔ اپنا قیمتی سامان بیچ باچ کر سراج اور رابعہ کے ساتھ پانی کے جہاز پر بیٹھ کر حج بیت اللہ کر آئیں اور واپسی پر ایسی درویشی اختیار کرلی کہ جو سامان حج سے ساتھ لے کر آئی تھیں گھر کی ڈیوڑھی میں بیٹھ کر اسے بیچ کر گزارہ کرنے لگیں۔"
"عجوہ کھجوریں، آب زم زم میں بھگوئی تسبیحاں، جاء نمازیں۔" رابعہ کے کانوں میں ماضی کی آوازیں بازگشت کرنے لگیں۔
"یہاں ایک بات بتانا بھول گیا۔ حج پر جانے سے پہلے سراج اور رابعہ کا نکاح انہوں نے بصد اصرار کرایا، کیونکہ نئے محلے والے سراج کی دونا محرم خواتین کے ساتھ موجودگی پر انگلیاں اٹھانے لگے تھے۔"
"بصد اصرار۔۔۔" چوہدری صاحب نے مولوی سراج اور رابعہ بیگم پر باری باری نظر ڈالی۔ "ہوں۔۔۔ اب سمجھ میں آیا۔" انہوں نے جیسے خود سے کہا۔
"جی بصد اصرار۔" بلال سلطان نے چوہدری صاحب کے دل کی بات پڑھتے ہوئے کہا۔ "اور اس کے بعد کی کہانی مختصراً" یہ ہے کہ جیسے ہی میں ہسپتال سے اٹھا۔ ایک رات کے اندھیرے میں لاہور جا پہنچا۔ گھر کی بیرونی دیوار سے رسی کی سیڑھی اٹکا کر چھت پر چڑھا اور زوجہ کے کمرے کی کھڑکی کے ذریعے اس تک جا پہنچا۔"
"ایسا آپ نے طیفے لاٹر سے بچنے کی خاطر کیا ہوگا؟"
"اس سے بچنے کی خاطر بھی اور ان سے بچنے کی خاطر بھی۔" بلال نے رابعہ اور مولوی صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ "انسان اپنی فطری جبلت کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے چوہدری صاحب! ان دونوں کے منہ سے ضرور میرے دوبارہ اس کی زندگی میں آجانے کی بات نکلتی اور میں پھر سے نظروں میں آجاتا۔ اس بار میں بہت محتاط رہنا چاہتا تھا۔"
"آپ کی زوجہ نے یوں غائب ہو جانے پر آپ کو دھتکارا نہیں۔"
"نہیں اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔" بلال سلطان کچھ یاد کر کے مسکرائے۔ "وہ مجھ سے بدگمان نہیں، ناراض تھی، حالانکہ اسے بدگمان کرنے کی پوری کوشش کی گئی تھی۔" رابعہ نے ایک بار پھر منہ پھیرا۔
"وہ خوف خدا رکھنے والی باوفا عورت تھی چوہدری صاحب! اور اس وقت تو ماہیت قلب ہو جانے کی وجہ سے اور بھی زیادہ خدا خوفی اس کے دل میں اتر چکی تھی۔ گانے بجانے، باپ سے بغاوت اور طیفے جیسے شخص کو روزی روٹی کے ذریعے کا سرپرست بنا لینے پر گھنٹوں پچھتاتی اور دنوں رویا کرتی تھی۔ ساتھ ساتھ اس کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ شوہر پرستی، مسلمان عورت پر لازم ٹھہری ہے۔ لہٰذا شوہر کے خلاف کوئی بات منہ سے نکالنا سخت گناہ کی بات ہے۔ کیوں رابعہ بی بی۔۔۔ اتنا تو یاد ہوگا آپ کو؟؟"
رابعہ نے جواب نہیں دیا۔ ان کا ذہن کسی جمع تقسیم میں الجھ گیا تھا۔
"میں نے یوں ہی چوروں کی طرح آنا جانا شروع کر دیا اور اسے اکسایا کہ رابعہ اور سراج سے کہے کہ اپنا ٹھکانا بدل لیں۔ ان دونوں کے ہاں ولادت متوقع تھی۔ یہ دونوں بے گناہ ہمارے ساتھ طیفے کی نظروں میں آئے ہوئے تھے۔ سراج بے چارہ تو اس کے ہاتھوں پٹ بھی گیا اور چھرے کے وار بھی سہے اس نے۔ اسی لیے اس نے ان دونوں کو یزمان منڈی جانے پر مجبور کیا۔ یہ دونوں چلے گئے، پیچھے وہ اکیلی جس سے جب میں ملنے جاتا اسے کھل کر مجھ پر نثار ہونے کا موقع ملنے لگا۔ رابعہ اور سراج کی رخصتی سے پہلے اس نے مجھے بتایا۔ وہ امید سے تھی۔ یقین جانیے

چوہدری صاحب! اتنی خوشی مجھے سعد کی آمد کی خبر سن کر نہیں ہوئی جتنی اس بچے کی خبر سن کر ہوئی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس وقت میں معاشی طور پر بدحال اور عمر میں بھی کم تھا۔ سعد کے آنے کا سن کر مجھے لگتا تھا' عجیب سی ذمہ داریاں سر پر آن پڑیں گی' مگر اس بچے کی دفعہ میرے قدم جم رہے تھے۔ پیسہ جو ہمیشہ میرا وقت مجھے دینے سے انکار کر دیتا تھا۔ میرے بینک اکاؤنٹ میں آنے لگا تھا۔ میں سوچا کرتا تھا' سعد کا نام تو ہم نے یوں ہی سعد رکھ دیا۔ اصل میں تو یہ بچہ سعد ہوگا۔" بلال نے سر جھٹکا۔

"میری قسمت۔۔۔ وہ بچہ دنیا میں آکر بھی میرا نہ رہا۔" بلال کی آواز بھرا گئی۔

"میں نے پلان بنایا۔ شہناز کے ہاں ولادت ہونے تک میں پنڈی میں گھر لے کر اسے سنوار بنا چکا ہوں گا۔ سعد کو فضل اور میمونہ سمیت وہاں لے آؤں گا اور پھر آنے والے بچے کو بھی ان دونوں کے حوالے کر کے خود شہناز کو لے کر بیرون ملک جاؤں گا۔ اس کا علاج کروانے۔ میرے دن پھر رہے تھے' مگر میں کنجوسی کرتے ہوئے پیسہ جمع کر رہا تھا۔ وہ پیسہ جو مستقبل کے اچھے دنوں کی نوید تھا۔ میں نے دن میں بھی خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے۔ میری زندگی کا وہ وقت سنہری ترین تھا جسے اب بھی میں دوبارہ پانا چاہتا ہوں' مگر اس کی طرف لپکے ہوئے میرے ہاتھ خالی ہی رہ جاتے ہیں۔

فلزا!" انہوں نے فلزا کی طرف دیکھا۔ "ان ہی دنوں میری زندگی میں تمہاری بھی آمد ہوئی تھی۔ تمہیں میرے وہ دن یاد تو ہوں گے۔ ذرا' ذرا سی خوش حالی میرے حلیے سے ٹپکتی ہوگی اور ذرا' ذرا سا ارسٹو کریٹ میں نظر آتا ہوں گا۔" فلزا نے آنکھیں میچ لیں۔ شاید اسے بھی کچھ یاد آگیا تھا۔

"عرصے کے بعد میں خوش رہنے لگا تھا۔ قدم قدم بڑا ہوتا سعد مجھے جی جان سے پیارا لگنے لگا تھا۔ وہ میری بات نہیں سمجھتا تھا' پھر بھی میں اسے آنے والے اچھے دنوں کی باتیں سنانے لگا تھا۔ فلزا جیسے مصوروں' دانشوروں اور ادیبوں کی محفلوں تک میری رسائی ہونے لگی تھی۔ زندگی بوجھ' پریشانی' مسلسل دباؤ سے آزاد ہوتی دکھائی دینے لگی تھی۔ اپنے سامنے وہ زندگی نظر آنے لگی تھی جو میرا خواب تھی۔ ویسی زندگی جیسی میں چاہتا تھا۔۔۔ لیکن۔۔۔" وہ کہتے کہتے رکے۔ "خواب اور آدرش' سپنے اور خواہشات یوں پوری ہو جانا میرا مقسوم ہی نہ تھا۔ خواہشوں اور خوابوں کی سرزمین سے عمر بھر کی جلاوطنی ہی میرا مقدر تھا۔"

انہوں نے رک کر دیکھا سب کے چہرے افسردہ ہونے لگے تھے اور ہونٹ خاموش تھے۔ جیسے کسی المیہ فلم کے کلائمکس تک پہنچتے پہنچتے دیکھنے والوں کے ہو جاتے ہیں۔

"فلزا! بی کو وہ رات یاد ہے اور میں جانتا ہوں کہ کیوں یاد ہے؟" توقف کے بعد بلال سلطان کی آواز دوبارہ گونجی۔

"فلزا اظہور۔۔۔ تم مجھ پر غصہ کرنے اور مجھے واجب القتل قرار دینے میں شاید حق بجانب تھیں۔" انہوں نے فلزا کو براہ راست مخاطب کیا۔ "مگر میرا اللہ گواہ ہے' میں تمہیں کوئی دھوکا نہیں دے رہا تھا۔ میں واقعی صرف تمہارے من کا قدردان تھا۔ تم اتنا ہنر رکھتے ہوئے بھی گمنامی کی زندگی گزار رہی تھیں' میں تازہ تازہ کمائے پیسے اور تعلقات کے سر پر تمہیں لائم لائٹ میں لانا چاہتا تھا' کیونکہ میں جانتا تھا کہ انسان صلاحیت رکھتے ہوئے بھی گمنام رہے تو اس کی زندگی کیسا بڑا المیہ بن جاتی ہے۔ میں اسی مقصد کے لیے تمہیں اس رات لاہور لے کر گیا تھا۔ وہ نصف شب' جو تمہارے لیے مڈنائٹ ان ہیون ہوئی تھی اور میرے لیے نئی صبح کی نوید اور میرے درمیان آخری ساعت تھی۔

شہناز کو مڈوائف نے ان ہی دنوں ولادت کا بتا رکھا تھا اور نجانے کیوں میرا دل کہتا تھا' وہ دن اس نصف شب کی کوکھ سے نکلنے والا دن ہی تھا۔ میں نے اسے لینڈ لائن فون لگوا کر دے دیا تھا۔ لاہور پہنچتے ہی اس سے بات کی' اس

نے بتایا۔ وہ ٹھیک تھی۔ میں نے سوچا۔ تمہیں دوستوں کی محفل میں متعارف کرواکر اور سامان مصوری دلواکر کہیں ٹھہراؤں گا اور خود شہناز کے پاس چلا جاؤں گا۔ لیکن اسی شام اس سے فون پر رابطہ کرنے پر معلوم ہوا اچانک اس کی طبیعت بگڑ گئی تھی اور مجھے فوراً" اس کے پاس جانا تھا۔ محلے میں موجود مڈوائف اسی روز کسی فوتگی پر چلی گئی تھی اور وہ اکیلی تھی۔ اس ایمرجنسی میں تم نے بتایا' تم تو لاہور میں کسی کو جانتی تک نہیں۔ وہ تمہاری غلط بیانی تھی' لیکن تمہیں اس بات کا مارجن دیا جاسکتا ہے کہ تم دل کے ہاتھوں مجبور تھیں کہ تم میرے ساتھ مزید وقت گزارنا چاہتی تھیں۔ تم ناواقف تھیں کہ آنے والے وقت کا کیا پتا' رومانس سے بھرپور ہویا خون آشام نکل آئے۔ اسی لیے بنا سوچے سمجھے میرے ساتھ چل دیں۔

وہ ڈھلتی شام' اترتا اندھیرا یاد ہوگا تمہیں جب میں دیوانہ وار اس محلے کی گلیوں میں بھاگ رہا تھا اور تم میرے پیچھے آرہی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ میں شہناز کو اٹھا کر کسی بہترین ہسپتال میں لے جاؤں گا۔ لیکن جب تک میں اس تک پہنچا مجھے دیر ہوچکی تھی۔

وہ اکیلی ہی تخلیق کا درد سہ سہ کر بے حال ہوچکی تھی اور نئی جان کے وجود میں آنے میں شاید کچھ ہی دیر باقی تھی۔ میں پہلے ہی گلیوں سے بھاگ کر آنے کی بے احتیاطی کرچکا تھا۔ باہر نکل کر کسی محلے دار خاتون کو بلانا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ جب ہی میں نے کوئی تجربہ نہ ہوتے ہوئے بھی وہ کام خود سرانجام دینے کا فیصلہ لمحوں میں کرلیا۔ فلزا جانتی ہے' وہ صورت حال کیا تھی۔ اس کو بھی میں نے اپنی مدد کے لیے کہا۔ اس وقت یہ شہناز کو پہچان چکی تھی' لیکن شناسائی پر رقابت غالب آگئی اور یہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ جیسے تیسے ولادت ہوگئی۔

میں نے بچے کو ہاتھوں میں اٹھایا ہی تھا کہ مجھے اپنی قمیص پیچھے سے کھنچتی محسوس ہوئی۔ میں نے بچہ چارپائی پر رکھا اور مڑکر دیکھا' وہ ازلی وابدی منحوس شخص میرے سامنے تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھرا تھا اس وقت مجھے موت سے شاید کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ میری نظروں کے سامنے میرے خوابوں کی وادی جل کر خاک ہوجانے کا منظر گھومنے لگا۔ میری طرف ایک وار آیا' میں نے ٹرانس کی کیفیت میں ہی اس وار کو روک لیا اور پھر باقاعدہ جیسے ایک کشتی سی شروع ہوگئی۔ موت ایک قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی اور میں زندگی کی لڑائی لڑنے کے لیے ذہنی طور پر لمحوں میں تیار ہوچکا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ میرے ہاتھوں اور بازوؤں میں اس رات اتنی طاقت کیسے آگئی کہ میں نے اس کو بے بس کرکے رکھ دیا۔ وہ پسینہ پسینہ ہوا میرے قدموں میں گرا اور میں نے ایک لمحاتی غلطی کرڈالی' میں اپنی نیم عریاں بیوی پر چادر ڈالنا چاہتا تھا جو اپنے سامنے کا منظر دیکھ کر کراہنا تک بھی بھول چکی تھی۔ میں نے چادر کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی اور اسی ایک لمحے میں وہ اس کے سر پر پہنچ گیا۔ شاید وہ سمجھ چکا تھا کہ اس رات مجھ پر اس کا بس چلنے والا نہیں تھا۔ اس نے زمین پر گرا چھرا اٹھایا اور بھرائی' تھکی ہوئی آواز میں بولا۔

"لے پھر آج سے یہ اگر میری نہیں تو تیری بھی نہیں۔" اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا' اس نے چھرا شہناز کی گردن پر پھیر دیا۔ لہو کا ایک سمندر تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے بہنے لگا تھا۔ نہ کوئی آہ' نہ کراہ' میری زندگی جاگنے سے پہلے سوچکی تھی۔ خون کے سمندر نے میری آنکھوں میں بھی خون اتار دیا تھا۔ میں اس کی طرف پاگلوں کی طرح بڑھا۔ وہ کائیاں آدمی تھا' جانتا تھا اب میں ہر کمی کر گزروں گا۔ اسی کھڑکی کے راستے جس سے وہ اندر آیا تھا۔ سرعت سے باہر کود گیا۔ اس کا چھرا وہیں گر گیا جسے اٹھا کر میں اس کے پیچھے جانا چاہتا تھا کہ بچہ رونے لگا۔ میری توجہ بچے کی طرف منتقل ہوگئی۔

اس وقت نجانے کیا معجزہ تھا کہ میری تمام حسیات سو فیصد کام کرنے لگی تھیں۔ میرے سامنے بیوی کی سرکٹی لاش تھی۔ قاتل فرار ہوچکا تھا۔ نوزائیدہ بچہ تھا اور آگے پیش آنے والے حالات کا خاکہ ناچ رہا تھا۔ اس وقت فوری خیال بچے کو محفوظ ہاتھوں میں پکڑانے کا آیا تھا۔ فضل حسین اپنے کسی کام سے لاہور آیا ہوا تھا۔ اسے میں

پہلے ہی سے اس گھر میں آنے کو کہہ چکا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کیسے پل کی پل میں دنیا بدل جانے والی تھی۔ میں نے بچہ اٹھایا اور فلزا کی محبت کو آزمائش میں ڈالنے کو اسے پکڑا دیا۔ جو منظر اس کے سامنے تھا' اس کا مجھے قاتل سمجھنا فطری عمل تھا۔ فضل حسین کی آمد کے ساتھ ہی میں نے اسے بس میں بیٹھنے کے لیے بھجوادیا اور خود.... اپنی لٹی ہوئی کائنات کی طرف متوجہ ہو گیا۔"

"کمال اعصاب تھے آپ کے' آپ نے خود پر قابو کیسے پائے رکھا۔"

"میں نہیں جانتا' میں آج تک نہیں جان پایا کہ خود کو میں نے کنٹرول میں کیسے رکھا۔ مجھے پیش آنے والے حالات صاف نظر آرہے تھے۔ میرے ہاتھ خون سے رنگے تھے اور میں خود کو بے گناہ ثابت کرنے میں ناکام ہونے والا تھا۔ چھرا میرے ہاتھ میں تھا اور جائے واردات پر صرف میں ہی موجود تھا۔ پوسٹ مارٹم ہوتا تو کیا' کیا ظاہر ہونے والا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا۔ تازہ زچگی سے فارغ ہونے والی عورت قتل ہوئی تھی۔ اس کا بچہ کہاں تھا۔ فلزا بھی اس معاملے میں بے گناہ الجھ جاتی۔ اسی لیے میں نے جذبات کو اعصاب پر حاوی ہونے سے روکا۔

فضل حسین واپس آیا اور پھر سراج اور رابعہ بھی آگئے۔ یہ جانتے ہوں گے کہ میری کیفیت کیا تھی۔ سراج محبت میں وہ سب کہہ رہا تھا جسے رابعہ نے دہرایا۔ مگر میں جانتا تھا' ان دونوں کی جائے واردات پر موجودگی ان کو بھی لمبے مقدموں میں گھسیٹ لے گی۔ جب ہی وہ دھمکیاں دے کر ان کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا' جس پر آج بھی یہ بدگمان ہیں۔ ان کے ساتھ معصوم بچی تھی۔ میرے بچے ماں سے محروم ہو چکے تھے۔ وہ بچی بے گناہ رل جاتی۔ میں جس خیال سے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر وہاں سے بھگا رہا تھا۔ اسی خیال پر یہ مجھ سے نالاں ہیں۔" بلال سلطان نے سراج اور رابعہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ دونوں نے سر جھکا لیے۔

"پھر آگے کیا ہوا' پولیس پہنچی یا نہیں' آپ پکڑے گئے اور اگر پکڑے گئے تو آج تک بچ کیسے رہے؟"

"اس شاطر نے اپنے ہی بندوں کے ذریعے اس مکان میں قتل ہو جانے کی اطلاع کروائی اور پولیس بھجوادی۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا' مجھے آگے کیا کرنا تھا کہ پولیس میرے سر پر تھی۔"

"تو آپ پکڑے گئے؟"

"ظاہر سی بات ہے۔"

"قتل ثابت ہو گیا؟"

"آہ!" بلال سلطان نے اپنے تنے ہوئے اعصاب کو ذرا سا آرام دینے کی کوشش کی اور تھکی ہوئی آنکھوں کو ہاتھ کی انگلیوں سے دبایا۔

"میں نے کہا نا چوہدری صاحب! اللہ کو میری زندگی منظور تھی۔ حالانکہ ہر بار وہ مجھے ہی قتل کرنے آیا۔ ہر بار میں بچ گیا۔ آخری بار بھی میں بچ گیا اور وہ چلی گئی۔ جس کے خوب صورت دل کو میں نے تاعمر پوجنا تھا۔" انہوں نے تاسف سے سر ہلایا۔

"میں سوچتا تھا' رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہوں' عدم ثبوت کا بھی کوئی امکان نہیں' میری موت طیفے کے ہاتھوں نہیں پھانسی کے جھولے پر لکھی ہے۔ لیکن اللہ کو ایک مرتبہ پھر میری زندگی منظور تھی۔ میں چھ مہینے جیل میں رہا۔ پیشیاں اور تاریخیں پڑتی رہیں۔ میرا تو کوئی گواہ تھا' نہ پیروی کرنے والا' میں سوچتا تھا' یہ پیشیاں اور تاریخیں محض زندگی کے باقی سانس تھے جو بہر حال مجھے لینے ہی تھے۔"

"اس دوران سعد کا کیا بنا؟"

"اللہ جزا دے فضل حسین کو' بہت ہی وفادار ثابت ہوا۔ واحد وہ شخص تھا جو کہتا تھا' قتل میں نے نہیں کیا۔ عدالت میں گواہیاں بھی دیتا رہا کہ جائے واردات کا غور سے معائنہ کیا جائے۔ فرش کی گرد پر دو افراد کے قدموں

کے نشان یوں موجود تھے۔ جیسے وہ دونوں کشتی لڑ رہے ہوں۔ کمرے کی دیوار پر جو خون آلود ہاتھوں کے نشان ہیں' ان کا بھی معائنہ کیا جائے' مگر ہم کمزور تھے اور ہماری مخالف پارٹی تگڑی تھی۔ وہ جرم کی دنیا کا بادشاہ تھا اور میں بے گناہی کا فقیر' اس دوران فضل اور میمونہ نے سعد کی دیکھ بھال یوں کی کہ کیا میں خود کرتا۔"

میں کسی بھی پیشی پر پھانسی کے حکم نامے کا منتظر تھا کہ مخالف پارٹی کے گروہ میں پھوٹ پڑ گئی۔ طیفے کے دست راست نے پولیس کے روبروان تمام وارداتوں کا اعتراف کرلیا جو کہ ان لوگوں نے کی تھیں' لیکن ڈال کسی اور پر دی گئیں۔ ان ہی وارداتوں میں سے ایک شہناز کا قتل بھی تھا۔ اس شخص نے بتایا' قتل کے ارادے سے وہ اور طیفا اکٹھے نکلے تھے۔ وہ باہر پہرہ دے رہا تھا' جبکہ طیفا کھڑکی سے اندر کودا' وہ کھڑکی سے ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ آلہ قتل کے متعلق بھی اس نے تفصیل سے بتایا کہ کہاں سے اور کس نے خریدا۔ اب مقدمے کا رخ ہی بدل گیا۔"

"اوہ... کیسا اتفاق ہے۔"

سامعین اب اپنی اپنی نشستوں کے کناروں پر بیٹھے تھے۔ متجسس اور حیران۔

"بس پھر یوں ہوا جیسے دنوں میں رت بدل گئی' طیفا گرفتار ہوا' ثبوت اکٹھے ہوئے اور اگلے دو ماہ کے اندر مجھے بے گناہ قرار دے کر رہا کردیا گیا۔ طیفا اپنے ہی ساتھیوں کی لڑائی کی لپیٹ میں آگیا۔"

"جسے اللہ رکھے۔" چوہدری صاحب نے کہا۔

"جی۔ جسے اللہ رکھے۔" بلال نے کہا۔ ان کے چہرے پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ پھیلی۔ "حالانکہ اس وقت مجھے اپنے جیسے جانے کا کوئی مقصد سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ جس کے لیے تنکا تنکا جوڑ رہا تھا۔ وہ آشیانہ بننے سے پہلے قتل کردی گئی۔ جس بچے کا منتظر تھا' وہ بقول فلزا کے مرچکا تھا۔ ایک سعد تھا جو مجھ سے زیادہ فضل اور میمونہ سے مانوس تھا۔ المیوں کی کوئی ایک قسم نہیں ہوتی چوہدری صاحب! المیے ہزار ہا شکلیں رکھتے ہیں۔ میں اپنے تئیں بہت شاطر ذہن رکھتا ہوں۔ لیکن میری آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ جو ہوا وہ کیوں ہوا۔ رقابت' حسد' غصہ' اختیار' رشک' سب مل کر میری معصوم سی محبت کے پیچھے پڑے اور اسے کھا گئے۔ میں ایک عام سا انسان تھا۔ واقعات کی ترتیب نے میرے اندر عام سے خاص بن کر دکھانے کا ری ایکشن پیدا کردیا۔ مجھے اس پیسے کے حصول کا جنون ہو گیا جو نہیں تھا تو میرا سب کچھ لٹ گیا۔ اب میں اس لیے اسے حاصل کرنا چاہتا تھا کہ اس کے ذریعے اپنے لیٹروں کو لوٹ سکوں۔ اس وقت میری سب سے بڑی خواہش تھی کہ طیفا' قانون سے سزا نہ پانے پائے' میں اسے خود اپنے ہاتھوں سے ختم کرنا چاہتا تھا۔ پولیس' وکیل' جج' عدالت' اس کے لیے مجھے کچھ بھی خریدنا پڑے میں خرید لوں اور اللہ کا کرنا دیکھیے جیسے ہی میں بے گناہ ثابت ہو کر حوالات سے باہر آیا اور میں نے کاروبار دوبارہ جوائن کیا۔ پیسہ ہن کی طرح مجھ پر برسنے لگا۔ وہ مجھ پر یوں مہربان ہوا۔ جس کا مجھے گمان بھی نہ تھا۔ شان دار گھر' گاڑی' نوکر چاکر سب اختیار میں آگئے۔

"پھر تو آپ نے طیفے کو مار ڈالنے کے اختیار بھی ضرور خریدے ہوں گے۔" چوہدری صاحب نے کہا۔

"کسی کی جان لینا انسان کے اختیار میں کہاں ہوتا ہے چوہدری صاحب۔" بلال سلطان نے سر جھکا۔ "ورنہ اپنی اپنی زندگی میں ہم سے تقریباً" ہر شخص کسی ایک کو قتل کرنے کی خواہش ضرور رکھتا ہے۔ پولیس' وکیل' جج' عدالت سب خرید لینے کی سکت آجانے کے باوجود میں طیفے کو اپنے ہاتھوں سے نہ مار سکا۔ وہ اپنے سیل میں ایک روز مردہ پایا گیا' غالباً" اس نے کوئی زہر چاٹ لیا تھا۔"

"ہا..." ایک سی آوازیں ایک مرتبہ پھر کمرے میں ابھریں۔

"وہ سب کچھ انسان کو دے کر صرف ایک اختیار اللہ انسان کو عطا نہیں کرتا۔" بلال نے کہا۔ "وہ عطا کردے تو بندے کی سرکشی کبھی تھامی نہ جائے' یہ جو ہم سمجھتے ہیں کہ بہت کام اپنی خواہش پر کرلیتے ہیں تو اسے بھی اپنا اختیار

سمجھنا بہت بڑی حماقت ہوتی ہے۔ وہ اختیار نہیں ہوتا' اللہ کی مرضی اور اجازت ہوتی ہے۔ جو ہماری خواہش میں شامل ہو کر اسے ہو جانے کا حکم سنا دیتی ہے۔ ورنہ سچ پوچھیں تو بندہ تو بڑا ہی بے بس اور مجبور ہے۔"

"بھائی جی! بھائی صاحب!" بلال کے خاموش ہونے پر بلند آواز میں روتے ہوئے مولوی سراج اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ "جو آپ کے ساتھ ہوا' اس کا ایک شمہ بھی ہمارے ساتھ نہیں ہوا اور ہم اتنے سال آپ پر گلہ شکوہ کرتے رہے۔"

"نہیں سراج!" بلال نے نرمی سے کہا۔ "تم لوگوں کے یہ حالات دیکھ کر جو شرمندگی آج میرے اندر اتری ہے۔ اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ کیونکہ اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگوں' تمہارے پیروں میں پڑ جاؤں' عمر بھر اللہ سے درخواست کروں کہ معاف کر دے تو بھی شاید معافی نہ ملے۔"

بلال سلطان کہہ رہے تھے اور فلزا اور رابعہ ششدر بیٹھی اس شخص کو گریہ کرتے دیکھ رہی تھیں' جو ان کے نزدیک انا پرست' ضدی' خود غرض اور مفاد پرست تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں سمجھتا تھا' میں سعد کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں اور جتنا میں اسے جانتا تھا' اس کے مطابق اسے کسی سے مستقل محبت ہو ہی نہیں سکتی تھی' لیکن تمہارے سلسلے میں شاید وہ بے بس ہو گیا تھا۔" نور فاطمہ سے ملنے کے بعد لاہور واپس آتے ہوئے ابراہیم نے کہا۔

"تمہارا دعوا غلط ثابت ہو گیا' تم سعد کو بالکل بھی نہیں جانتے۔" ماہ نور نے کہا۔

"سچ کہوں تو وہ اتنا غیر متوقع شخص ہے کہ مجھے لگتا تھا ایک روز وہ سارا سے شادی کا اعلان کر دے گا۔ حالانکہ سارا کے سلسلے کو اس نے مجھ سے چھپایا ہوا تھا' لیکن میں اس کی جاسوسی میں لگے رہنے کی عادت میں مبتلا تھا اور یہ عادت مجھے انکل نے ڈالی تھی۔ اسی لیے سارا کے سلسلے کو میں جان چکا تھا اور میں سمجھتا تھا جس طرح وہ اس کا خیال کرتا ہے شادی بھی اسی سے کرے گا۔"

"پہلے میں بھی یہ ہی سمجھتی تھی۔" ماہ نور نے کہا۔

"اس کا مطلب تم بھی کوئی خاص نہیں جانتی تھیں اس کو۔" ابراہیم قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ "اور اس احمق کو دیکھو جو باتیں اسے تم سے کہنی چاہیے تھیں' اس ان پڑھ' جاہل بڑھیا نور فاطمہ کو سناتا رہا رات بھر بیٹھ کر۔"

"پلیز۔۔۔ ابراہیم!" ماہ نور نے سخت لہجے میں کہا۔ "جن باتوں کو تم سمجھ نہیں سکتے ہو' ان پر اتنے سخت تبصرے مت کیا کرو۔"

"جتنا میں سمجھا ہوں۔ اتنا ہی تبصرہ کر رہا ہوں۔" ابراہیم متاثر ہوئے بغیر بولا۔ "کیسی ان رومانٹک بات ہے کہ تم کو اپنے بارے میں اس کے خیالات نور فاطمہ سے سننے کو ملے' وہ بھی پنجابی زبان میں ہاہاہا۔"

"شٹ اپ ابراہیم!" ماہ نور کو غصہ آنے لگا۔

"ویسے نور فاطمہ کک اچھی ہے' اگر تھوڑی سی ریفائنڈ ہو جائے تو میں اسے اپنے کیفے میں ملازم رکھ لوں۔"

"شٹ اپ ابراہیم۔"

"اچھا چلو۔۔۔ اعلا حضرت نور فاطمہ کے بارے میں بات نہیں کرتا۔ مگر ایک بات بتاؤ' سعد بھلا انکل کو مار دینے کا ارادہ کیوں کر چکا تھا۔"

"کیونکہ وہ گمان اور بدگمانی کی سرحد پر پھنس کر رہ گیا تھا۔ جن گتھیوں کے صرف سرے وہ کھول سکا' انہوں نے اسے بے بس کر دیا۔ اور سعد تو سعد تھا' جو حالات میں سن اور دیکھ رہی ہوں' دل تو میرا بھی یہ ہی چاہتا ہے کہ قتل نہ

سہی ان کا سر تو ایک مرتبہ پھاڑ ہی دوں۔"

"ایک تو تم سارے لوگ باتیں بہت مشکل کرتے ہو۔" ابراہیم نے منہ بنا کر کہا۔ "اچھا ایسا ہے کہ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ کر اسلام آباد چلا جاؤں گا۔ تم جس مقصد کے لیے مجھے لائی تھیں' وہ پورا ہو گیا' اعلا حضرت بی بی نور فاطمہ سے ملاقات ہو گئی۔ اب تم اپنی ممی کا دل خوش کرو اور اپنی پڑھائی شروع کر دو۔"

"ہاں ایسا ہی کروں گی۔" اس نے دھیان گاڑی کی کھڑکی سے باہر کے مناظر پر منتقل کر دیا۔

☼ ☼ ☼

"میں یہاں خاص طور سے ایک بدلی ہوئی نادیہ کو دیکھنے آیا تھا۔ لیکن تمہیں اس کے ساتھ فلیٹ شیئر کرتے دیکھ کر مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں جو سمجھ کر آیا تھا' نادیہ میں وہ تبدیلی نہیں آئی' ہاں شاید اس نے لندن کا کلچر ضرور اپنا لیا ہے' حالانکہ وہاں ہیلسنکی میں بھی وہ ان خرافات سے بچتی رہی تھی۔" سعد کے سامنے بیٹھا چندر شیکھر کہہ رہا تھا۔

"تم نادیہ کو کتنا جانتے ہو؟" سعد نے کوئی وضاحت دیے بغیر پوچھا۔

"ہیلسنکی میں ہم نے کئی سال اکٹھے پڑھتے گزارے' ہم دونوں ایک ہی سال میں آگے پیچھے وہاں پہنچے تھے۔ ہیلسنکی ہم دونوں کے لیے شروع میں ایک سا ہی ڈراؤنا خواب ثابت ہوا تھا۔ اجنبی ملک' اجنبی زبان' موسم کی شدت یوں جیسے ہم کسی آئس برگ میں پھنس چکے ہوں۔ پھر ہم نے ایک ساتھ ہی ہر مخالف صورت حال سے نمٹنا سیکھا۔ ایک سی جگہوں پر کام کر کے اخراجات پورے کرتے تھے۔ اکٹھے بیٹھ کر اسائنمنٹس بناتے تھے اور سب سے بڑھ کر....." وہ ہنستے ہوئے رکا۔ "ہم ایک دوسرے سے اردو' ہندی میں بات کر لیتے تھے۔ نادیہ کی اردو تم جانتے ہی ہو گے' کیسی مضحکہ خیز ہے۔"

"ہوں....." سعد نے کہا۔ "اور اس سارے عرصے میں تم نے کیا محسوس کیا' نادیہ کی شخصیت کیسی تھی؟"

"بہت غیر معمولی۔" چندر شیکھر نے اعتراف کیا۔ "وہ دل کی سادہ' بے لوث' مخلص اور سچی لڑکی تھی۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ پاکستان سے بہت کم تعلق ہونے کے باوجود وہ ہمیشہ پاکستان کے حق میں مجھ سے لڑنے کیوں کھڑی ہو جاتی تھی' مگر وہ ایسا کرتی تھی۔ مجموعی طور پر وہ ایک مختلف لڑکی تھی۔"

"تھی سے کیا مراد ہے تمہاری؟"

"میری مراد ہے کہ شاید اب وہ ویسی نہیں رہی۔" چندر شیکھر نے سعد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "نادیہ کے فلیٹ کو کوئی لڑکا چاہے' وہ پاکستانی اور مسلمان ہی کیوں نہ ہو' شیئر کر رہا ہو گا' اس کے بارے میں شاید یہ آخری بات بھی نہ ہوتی' جس کی میں اس سے توقع کرتا۔"

سعد نے چندر شیکھر کی بات سن کر لمبا سانس لیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ "تم نے مجھے دیکھ کر جو اندازہ لگایا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم نادیہ کو بالکل بھی نہیں جانتے یا پھر یہ کہ تمہارے دماغ میں کچھ بھی نہیں ہے سوائے گند کے۔"

"ہو سکتا ہے۔" چندر شیکھر نے شانے اچکائے۔ "تمہارے دونوں دعوے ہی غلط ہوں۔"

"نہیں میرے دونوں ہی دعوے ٹھیک ہیں۔"

"نادیہ سے میری ای میل پر برابر بات ہوتی رہی ہے۔ اس نے کبھی تمہارا ذکر نہیں کیا۔ ہاں' وہ اپنے بارے میں ضرور بتاتی رہی کہ اس نے راستہ پا لیا ہے۔"

سعد غور سے چندر شیکھر کو دیکھ رہا تھا۔

"ہاں۔ اس نے واقعی راستہ پالیا ہے۔" اس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ "اب تم اس سے ملو گے تو شاید ایک مختلف نادیہ کو دیکھو۔"

"مطلب اس نے ایک ساتھی پالیا' مطلب اس نے تمہیں پالیا؟" چندر شیکھر کے لہجے میں تذبذب تھا۔

"مجھے....." سعد ہنسا۔ "مجھے اس نے اب نہیں' بہت پہلے ہی پالیا تھا۔" اس نے چندر شیکھر کے چہرے پر چھائے تذبذب کو بڑھا دیا۔ "اسی لیے تو میں نے دعوا کیا تھا کہ تم اسے یا تو جانتے نہیں یا تمہارے دماغ میں صرف گند بھرا ہوا ہے۔" چندر شیکھر نے بے یقینی سے دیکھا۔

"میں نادیہ کا بڑا بھائی ہوں چندر شیکھر! ضروری نہیں کہ کسی لڑکی کے ساتھ لندن میں فلیٹ شیئر کرنے والا اس کا بوائے فرینڈ ہی ہو۔" سعد نے کہا۔ "اب بولو تم نادیہ کو کتنا جانتے ہو۔"

"اوہ!" چندر شیکھر گڑبڑا گیا۔ "میں واقعی معذرت خواہ ہوں' نادیہ نے کبھی اپنے کسی بھائی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس نے کبھی کسی بھی فیملی ممبر کا ذکر نہیں کیا تھا۔"

"وہ اس میں بھی درست تھی۔" سعد نے کہا۔ "ہم نے اسے تنہا کر رکھا تھا۔ ہم ہمیشہ اس سے لاتعلق ہی رہے۔"

"اوہ.... تو کیا اب تم نے دیکھا' وہ کیسی ہیرے جیسی لڑکی ہے۔" چندر شیکھر کی نظروں میں تجسس اور شوق اتر آیا۔

"ارے اتنی جلدی اپنی پہلی رائے پر پلٹ گئے تم۔" سعد ایک بار پھر ہنسا۔

"ہاں اور میں اپنی وقتی بدگمانی پر سخت شرمندہ ہوں۔ شکر میں یہ بات نادیہ سے نہیں کہہ بیٹھا۔ عمر بھر اس کے سامنے نظریں نہیں اٹھا پاتا۔"

چندر شیکھر واقعی معذرت خواہ نظر آرہا تھا۔ سعد اس کو جواب دینا چاہ رہا تھا' مگر اسی وقت نادیہ کی آمد ہوئی۔ وہ چندر شیکھر کو دیکھ کر بہت خوش تھی۔ اس شام دیر تک چندر شیکھر وہیں رکا رہا۔ وہ اور نادیہ چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل کی کرسیوں پر بیٹھے مسلسل باتیں کرتے رہے تھے۔ جبکہ خود سعد سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے قریب بیٹھا باہر روشنی پھیلاتی مصنوعی روشنیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس دوران اس نے کئی بار کن اکھیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ خوش گپیوں میں مگن نادیہ اور چندر شیکھر کے ہنستے مسکراتے چہرے دیکھے۔

"کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جن کے گمان محض گمان نکلتے ہیں اور وہ کبھی لمحاتی اور پھر وہ اپنی بدگمانیوں پر بڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے معذرت بھی کرلیتے ہیں۔ لیکن کیا ہر کسی کے ساتھ ایسا ہو سکتا ہے' نہیں۔" اس نے سر جھٹک کر دل میں اٹھتے سوال کا نفی میں جواب دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"خان چاچا! میں اسلام آباد شہر میں پہنچ چکا ہوں۔ اسی شہر کے ایک امیر ترین علاقے کے بڑے سے گھر میں پریا رانی رہتی ہے۔ میں اس گھر کے گیٹ کے آگے تین دفعہ جاکر کھڑا رہا ہوں' مگر آگے جاکر کسی سے اس کے بارے میں پوچھنے کی ہمت نہیں کرپاتا' گھر کی دیواریں اور مین گیٹ اونچا اور بہت مضبوط ہے' جبکہ میرا قد پست ہے اور اوقات بہت ہی چھوٹی۔ ڈرتا ہوں پریا رانی سے متعلق جو ایک خواب آنکھوں میں بسا رہ گیا ہے۔ چھن سے ٹوٹ نہ جائے۔ سوچتا ہوں بنا دستک دیے لوٹ جاؤں۔ پریا رانی نہ سہی' میرا خواب تو میرے ساتھ ہی رہ جائے گا ناہمیشہ کے لیے۔" وہ سڑک کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھا فون پر بات کر رہا تھا۔

"جھلے ہوگئے ہو کیا۔ بے وقوف ہو پورے کے پورے' قریب جاکر یوں ہی لوٹ آؤ گے۔ آگے بڑھو جاؤ دستک

"اگر ایسے ہی لوٹ آئے تو عمر بھر پچھتاتے رہو گے۔"
اس نے جواب دیے بغیر فون بند کر کے قمیص کی جیب میں ڈال دیا اور سر اٹھا کر سڑک کے اس پار نظر آتے اس بلند و بالا دیواروں میں گھرے محل نما گھر کی طرف دیکھنے لگا، جس میں پریا رانی رہتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"آج میں بہت خوش ہوں، میں نے جو چاہا پالیا، دیکھنے والوں میں سے کسی نے پہلی بار اس کا اعتراف بھی کر لیا اور اس سے بڑی خوشی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ آپ نے جو پایا ہو وہ آپ میں سے جھلکنے بھی لگے۔"
اس نے لکھتے لکھتے سر اٹھایا اور مسکرا دی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ دوبارہ کی بورڈ پر جھکی۔
"یہ بھی عجیب سا ہی اتفاق ہے نا کہ کچھ عرصہ پہلے میں خود کو دنیا کی محروم ترین انسان سمجھتی تھی اور اب کچھ عرصہ ہی کے بعد مجھے سمجھ میں آنے لگا ہے کہ تہی دامنی کی کتنی اقسام ہوتی ہیں۔ میرے بھائی اور میرے باپ، میری ماں اور میرے سوتیلے بہن بھائیوں کی مثالیں میرے سامنے ہیں۔ کسی کے پاس سب کچھ ہے، مگر پر بھی وہ تہی دامن ہیں۔ یوں جیسے بھرے دستر خوان پر بیٹھا خواہش کے باوجود کچھ کھا نہ پائے۔ کچھ سب پانے کی خواہش میں تھوڑا بھی گنوا بیٹھے اور اب اپنی تہی دامنی سمیت دوبارہ سے کچھ پانے کی جدوجہد کے لیے تیار ہوئے پھر رہے ہیں۔ ان سب میں ایک میں بھی تھی، جس کو سب نے جھٹکا اور جس سے سب نے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔ شاید میری یہ ہی محرومیاں میرے کام آئیں اور میرے رب نے میرا راستہ سیدھا کر کے میرا دامن ستاروں سے بھر دیا۔ اب میرے دامن میں روشنیاں ابھرتی ہیں۔ ایمان اور امید کے جگنو کھلتے ہیں اور میرے آگے کے راستے کو روشن کرتے چلے جاتے ہیں۔ اوہ میرے اللہ..... میں تیری کون کون سی نعمتوں کو جھٹلا سکتی ہوں؟"
اس نے لکھتے لکھتے سر جھٹکا۔
"اب چاہے میری مٹھی میں کوئی رشتہ، کوئی تعلق نہ بھی ہو تو بھی مجھ جیسا امیر کوئی نہ ہو گا۔ میرا دل بغض و عناد، رشک و حسد، شکوہ و شکایت سے پاک ہو چکا ہے اور ایسے دل کبھی مایوس نہیں ہوتے۔"
نادیہ نے ٹائپنگ ختم کی اور اپنے لکھے ہوئے کو دو لوگوں کے نام بھیج دیا۔

☆ ☆ ☆

رابعہ کلثوم نے اپنے سامنے بت بنی بیٹھی سعدیہ کو دیکھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ آنکھوں میں خوف اور ملال تھا۔ بے یقینی اور گھبراہٹ تھی۔
"کیا اس کے پاس کوئی ایسی قیمتی متاع ہے، جو چھن جانے کو ہے، کیا یہ خالی ہاتھ رہ جانے کا خوف ہے یا قبولیت نہ بخشے جانے کا ڈر۔" رابعہ سوچ رہی تھیں۔
"ارے میری بچی کی عمر ابھی کیا ہے۔ جو اس طرح کے وسوسوں نے اسے چانک گھیرے میں لے لیا ہے۔ یہ بولتی کیوں نہیں۔ اس کے ہونٹوں پر چپ کیوں لگ گئی ہے؟" ان کے دل میں خیال آرہا تھا۔ ایک انجانے خوف کے تحت وہ جھٹکے سے اٹھیں اور سعدیہ کو بری طرح جھنجوڑنے لگی تھیں۔

باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ

عنیزہ سید

"روشنی کے اندر اندھیرا چھپا ہوتا ہے"۔ سفید صفحے پر سیاہ روشنائی میں لکھے الفاظ پر اس کی نگاہ دوڑی۔
"خوشی کے اندر دکھ چھپا ہوتا ہے۔" الفاظ جیسے اسے کچھ سمجھا رہے تھے۔
"اور گلاب کے ساتھ کانٹے ضرور ہوتے ہیں۔" بڑی پتے کی بات تھی۔ اس نے ایک دفعہ پھر ان الفاظ پر نظر دوڑائی۔
"ہوں۔" دوبارہ ان الفاظ کو پڑھنے کے بعد اس نے جسم کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور ہاتھ میں پکڑی قرمزی جلد والی کتاب کرسی کے قریب رکھی میز پر دھر دی تھی۔

لفظوں کے اندر چھپی پتے کی بات اس کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔
زندگی کے ہر سکھ کے ساتھ دکھ سائے کی طرح چلتا ہے۔ جہاں اور جب بھی بس چلتا ہے' وہ سکھ کے نرم پروں پر اپنے پنجے گاڑ لیتا ہے۔
یہ ہر ذی روح کے ساتھ جڑا ہوا ہے' لیکن سوچ کا درست زاویہ اس کی شدت کا احساس کم کر سکتا ہے اور اس سے نجات کی راہ بھی دکھا سکتا ہے۔ یہی نچوڑ تھا کتاب میں درج جملوں کا۔
"سوچ کا درست زاویہ۔" اس کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ ابھری' تب ہی دروازے کا تالا باہر سے کھول کر نادیہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔
"تو تم تو ابھی تک یوں ہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو۔" نادیہ نے اپنی پشت دروازے کے ساتھ لگا کر اسے بند کرتے

۳۲

بتیسویں اور آخری قسط

ہوئے کہا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں گھریلو سودا سلف کے بیگ تھے۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ مجھے کیا کرتے نظر آنا چاہیے تھا؟" سعد نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"تم بھول گئے۔" وہ سیدھی کچن کاؤنٹر کی طرف بڑھی۔ تم نے مجھے چیلنج کیا تھا کہ تم آج رات کے کھانے کے لیے پاکستانی انداز میں مرچ مسالے والی مچھلی فرائی کرو گے۔"

"ہاں۔۔۔ میں نے کہا تھا۔ لیکن مجھے تمہارے ان چند ڈبوں میں وہ تمام مسالے نظر نہیں آئے جو اس کو بنانے کے لیے ضروری تھے۔ اس لیے میں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" وہ اپنے ساتھ لائے سامان کو کھول کر مختلف جگہوں پر رکھتے ہوئے بولی۔ "اصل بات یہ ہے کہ تم بہت کاہل اور آرام پسند ہو اور یہ کہ تمہیں ویسی مچھلی فرائی کرنا آتی ہی نہیں۔"

"سوچ ہے تمہاری۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "میں ابراہیم کا بہترین دوست' بلکہ ہم زاد رہ چکا ہوں اور ابراہیم سے بہتر کھانا کوئی نہیں بنا سکتا۔ ہم نے کئی بار مختلف دریاؤں پر کچی مچھلی خرید کر صاف کی اور بنائی۔ ابراہیم اسے مسالے لگا کر تلا کرتا تھا۔ میں بھی ابراہیم سے یہ فن سیکھ چکا ہوں۔"

"ابراہیم۔۔۔" نادیہ نے کچن کاؤنٹر پر رکھے ہاتھ کی انگلیاں کاؤنٹر سلیب پر بجاتے ہوئے یاد کیا۔ "ارے وہ موٹو جس کے گھر سے اس کے لیے بڑا سا ناشتا دان آیا کرتا تھا۔ جب ہم پنڈی والے اسکول میں پڑھتے تھے۔"

"ہاں بالکل وہی۔" بہت دن بعد سعد کے چہرے پر خوش گوار مسکراہٹ پھیلی تھی اور وجہ ابراہیم کا ذکر تھا۔

"ہاں۔۔۔ پھر میں مان سکتی ہوں کہ تمہیں مچھلی فرائی کرنا آتی ہوگی' کیونکہ وہ موٹو تو بچپن میں بھی صرف کھانے کے لیے زندہ رہا کرتا تھا۔ بڑے ہونے تک تو یقیناً" کھانا ہی اس کا اوڑھنا بچھونا بن چکا ہوگا۔" نادیہ نے رات کا کھانا بنانے کے لیے مشروم کے ٹن کا ڈھکن کاٹتے ہوئے کہا۔

ویسے کیا اب بھی وہ اتنا ہی موٹا ہے اور کھانے کا ویسا ہی شوقین۔۔۔ مجھے یاد ہے ایک بار وہ میرا بھنہ چھین کر کھا گیا تھا۔ کیونکہ اسے سخت بھوک لگ رہی تھی اور میں صرف اس ڈر سے اس سے لڑ نہیں سکی کہ وہ مجھ سے دگنا بلکہ تگنا تھا اور اسے خوف ناک شکلیں بنا کر دوسروں کو ڈرانے میں مہارت حاصل تھی۔"

اپنے کام میں مگن' وہ سعد کی طرف دیکھے بغیر بولے چلی جارہی تھی۔ لیکن اپنی طویل بات کے جواب میں خاموشی پا کر اس نے سر اٹھا کر سعد کی طرف دیکھا تھا۔ وہ کسی سوچ میں گم تھا۔ اس کے چہرے پہ لمحہ بھر کو پھیلی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی اور اب اس کی جگہ اداسی نے لے رکھی تھی۔

"تم پھر اداس ہو گئے' ہمیشہ کی طرح۔" الفاظ بے اختیار نادیہ کے منہ سے پھسلے۔

"میں نہیں جانتا تھا کہ ایک طویل عرصے تک مانوس شکلوں کا نظر نہ آنا بھی انسان کے دل پر عجیب عجیب سی کیفیات طاری کر دیتا ہے۔" سعد نے سر جھٹک کر اپنی سوچ سے باہر آتے ہوئے کہا۔

"یقیناً" ایسا ہی ہوتا ہے۔" نادیہ نے سر ہلا کر اس کی بات کی تائید کی۔ لیکن تم کیوں اس خود ساختہ جلاوطنی کی اذیت میں مبتلا ہو۔ جبکہ وقت اور حالات تمہاری اپنی مٹھی میں ہیں۔ تمہاری یہ کیفیت اور ضد کم از کم میری سمجھ میں تو اب تک نہیں آئی۔"

"اس لیے کہ تم سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتیں۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"چلو۔۔۔ میں نے مان لیا۔ ڈیڈی بہت برے شخص اور تمہارے مجرم ہیں۔" نادیہ نے مچھلی کے قتلوں پر مختلف چٹنیاں ڈالتے ہوئے کہا۔ بلکہ "مان لینا غلط لفظ ہوگا' یوں سمجھو میں نے فرض کر لیا جو کچھ تم ڈیڈی کے بارے میں سمجھتے ہو وہ سچ ہے' لیکن دوسرے لوگوں کا اس میں کیا قصور ہے۔ ان کو کیوں پیچھے چھوڑ آئے ہو۔"

"میں اس کی وضاحت بھی کر چکا ہوں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"وہ وضاحت' تو صرف ماہ نور کے سلسلے میں تھی۔" اس نے مچھلی کے قتلوں والی ٹرے اوون میں رکھنے کے بعد پلٹ کر سعد کی طرف دیکھا "اور میں اس سے متفق بھی ہوں۔ تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ لیکن۔۔۔"

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی سعد نے چونک کر اسے یوں دیکھا جیسے اسے نادیہ سے اس بات کی توقع نہ ہو' جیسے وہ کہہ رہا ہو' پاگل ہو گئی ہو جو میری اس منطق سے متفق ہونے کی بات کر رہی ہو۔

''لیکن باقی لوگوں کو کیوں چھوڑ آئے تم؟'' نادیہ نے سعد کی نظروں اور ان میں چھپے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ابراہیم' سارا خان اور سارا خان جیسے وہ اتنے سارے لوگ ، جنہیں صرف تم میں زندگی اور امید کی کرن نظر آتی تھی۔

سعد نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''کبھی سوچا بھی ہے کہ وہ لوگ تمہارے قدموں کی آہٹ سننے کے انتظار میں کان لگائے رکھتے ہوں گے۔ ان کی آنکھیں تمہاری ایک جھلک دیکھنے کو بے چین رہا کرتی ہوں گی۔ تمہاری کوئی خبر سننے کے منتظر وہ لوگ کس تکلیف دہ کیفیت میں مبتلا رہتے ہوں گے۔''

''میں اب ان کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔'' وہ تلخی سے بولا۔ ''کچھ بھی تو نہیں۔ میرے پاس ان کو دینے کے لیے اب بچا ہی کیا ہے۔ خالی جیب اور ویران دل۔۔۔ دونوں ہی ایسی چیزیں جن کی کسی کو ضرورت نہیں ہوتی۔''

''تو پھر ان کو اپنی توجہ۔۔۔ اپنے خیال اور اپنی محبت کا احساس دیا ہی کیوں تھا تم نے؟'' نادیہ کچن کاؤنٹر سے باہر آکر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ ''کیوں یہ ظلم کیا تھا' ان کے ساتھ تم نے۔''

''جب تک میں ان کے لیے کچھ کر سکتا تھا' میں نے کیا' جب اس قابل نہیں رہا تو راستہ بدل لینے کے سوا میرے پاس چارا ہی کیا تھا۔'' وہ کچھ دیر نادیہ کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد اس سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔

''تم سمجھتے ہو تم نے اپنا راستہ بدل لیا؟'' نادیہ نے دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''ہاں۔۔۔'' وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

''غلط سمجھتے ہو تم کہ تم نے راستہ بدل لیا؟'' نادیہ کی آواز معمول سے قدرے بلند ہوئی۔ ''تم راستہ بدلنے کے بجائے تھک کر راستے ہی میں رک کر بیٹھ گئے ہو سعد اور ایسے رک جانا ہی تمہاری زندگی کا سب سے بڑا المیہ بن چکا ہے۔ نہ تم آگے جا رہے ہو' نہ ہی پیچھے پلٹنے کی ہمت کرتے ہو۔ تم خود اپنے آپ کے لیے ایک ایسا کوہ گراں بن چکے ہو جسے ماضی کے ماتم اور مستقبل سے متعلق مایوس باتیں سوچنے کے سوا کوئی کام ہی نہیں رہ گیا اور تم اپنا ہی راستہ کھوٹا کر چکے ہو' آگے کا بھی اور پیچھے کا بھی۔۔۔'' سعد نے چونک کر نادیہ کی طرف دیکھا۔

''میری باتیں تلخ محسوس ہو رہی ہوں گی۔'' نادیہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تلخ سہی' مگر حقیقت پر مبنی ہیں۔'' وہ واپس کچن کاؤنٹر کی طرف چلی گئی اور اوون سے ٹرے نکال کر تیار مچھلی کی خستگی کا جائزہ لینے لگی۔

''کوہ گراں۔۔۔ کوہ گراں۔۔۔'' کرسی پر بیٹھے سعد کی سماعت کے ارد گرد وہ ایک لفظ چھوڑ گئی تھی۔ جس کی بازگشت نے اسے اپنی زد میں لے لیا تھا۔

☼ ☼ ☼ ☼

''میں نے رابعہ بہن اور مولوی صاحب کو ان کی بیٹی کے پاس بھجوا دیا تھا' تاکہ وہ بھی تھوڑا آرام کر سکیں اور آپ بھی آرام کر لیں۔ آپ نے کھانا اچھی طرح کھایا ہے نا۔'' چوہدری سردار نے بلال سلطان کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''چوہدری صاحب! کیا یہ وہی کمرہ ہے۔ جس میں سعد آپ کے پاس قیام کے دوران ٹھہرا تھا؟'' بلال سلطان نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''جی ہاں۔۔۔ یہ وہی کمرہ ہے۔'' چوہدری صاحب کو ان پر ترس سا آنے لگا۔ بلال سلطان کے بال منتشر تھے۔ آنکھیں تھکی ہوئی اور سرخ تھیں اور آواز بوجھل ہو رہی تھی۔

''آپ کو کیسے لگا کہ یہ وہی کمرہ ہے۔ جس میں سعد ٹھہرا تھا۔'' وہ نرم مسکراہٹ کے ساتھ بلال سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''اس کے زیر استعمال بہت سی چیزیں اب بھی یہاں موجود ہیں۔'' بلال نے لمبا سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ ''اور ان سب

تنہا بیٹھ کر ابھی تک اس کی مسکراہٹ محسوس ہوتی ہے۔"

"سب چاہتے ہیں بلال صاحب۔" چوہدری صاحب کو بلال کی بات سن کر خیال آیا۔ "ایک بیٹا ہاتھ سے گنوا بیٹھے تو دوسرا اس سے [illegible] نہیں سمجھ گیا۔

"آپ اگر [illegible] ہو سکے تو میں آپ کو کھاری سے ملواؤں۔ آپ اس سے مل کر خوش ہو جائیں گے، کیسا فرشتہ صفت بیٹا ہے آپ کا۔" انہوں نے اپنے تئیں بلال سلطان کا دکھ بٹانے کی کوشش کی۔

"میں اس سے کیا کہہ کر ملوں گا چوہدری صاحب؟ اسے کیا بتاؤں گا کہ میں کون ہوں۔ اس کی ایک ڈھب پر چلتی زندگی میں انتشار پھیلانے میں رکھا ہی کیا ہے۔" بلال سلطان کی آنکھیں جھک گئیں۔

"انسان اپنی زندگی میں چاہے کتنی ہی اذیتوں کے لیے تیار کیوں نہ بیٹھا ہو چوہدری صاحب کوئی نہ کوئی انہونی ایسی ضرور ہو جاتی ہے جو اس کے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ میرا وہ بیٹا جسے میں برسوں پہلے ہی جی بھر کر رو چکا ہوں۔ میرے سامنے کھاری کے روپ میں آ کھڑا ہو گا۔ ایسی انہونی کی توقع تو مجھ جیسا ہوشیار انسان بھی کبھی نہیں کر سکتا تھا۔"

"شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ زندگی کی بساط کے سارے مہرے اللہ خود چلاتا ہے۔ انسان کا ان پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔" چوہدری صاحب نے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہیں آپ۔" بلال سلطان نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ایک یہی نکتہ تو ساری عمر گزارنے کے بعد سمجھ میں آیا ہے کہ اختیار اللہ اپنے پاس ہی رکھتا ہے۔"

"تو پھر چلیں کھاری سے ملنے۔" چوہدری صاحب نے کہا۔

"میں اس وقت صرف یہ سوچ کر خوف زدہ ہوں چوہدری صاحب! میرے اس بیٹے کا مجھ سے ملنے پر ری ایکشن کیا ہو گا؟ میں اس کے سامنے جانے کی ہمت خود میں پیدا نہیں کر پا رہا۔" بلال سلطان کے انداز میں بے بسی تھی۔

چوہدری صاحب نے بلال سلطان کو [illegible] رہنے کے بعد سر ہلایا۔

"میں سمجھتا ہوں بلال صاحب لیکن اس ایک لمحے کا سامنا تو آپ کو کرنا ہی پڑے گا۔ اس غریب کو تو ہم کچھ عرصہ پہلے یہ اشارہ دے چکے ہیں کہ سعد آپ کا بیٹا ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے وہ اس بات سے زیادہ کہ وہ آپ کا بیٹا ہے۔ اس بات پر [illegible] تھا کہ وہ سعد سلطان کا بھائی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میرے اچانک چھوٹی سفر اور فلزا صاحبہ کے یہاں سے چلے جانے کے سبب [illegible] ہو گیا کہ وہ سعد سلطان کا بھائی ہے تو اسی وجہ سے وہ مایوس ہو کر خود [illegible] ملازمت کرنے چلا گیا۔"

"یہی قسمت ہے [illegible]" بلال نے جواب دیا۔ "اس کی لاعلم مطمئن، مگن، مسرور زندگی میں کیا یہ انکشاف [illegible] اس کے سامنے بیٹھا شخص اس کا باپ ہے۔ وہ باپ جو اتنا ظالم تھا کہ اسے بلیوں، کتوں کی خوراک بننے کے لیے [illegible] چھوڑ گیا۔ ایک بیٹے کو عمر بھر کی اذیت سے بچانے کے لیے لاعلم رکھنے کی سعی کی سزا [illegible] شاید [illegible] اور راست قیس نہ کر پاؤں۔"

"آپ کی نیت میں کھوٹ تھا نہ ہی محبت میں کمی تھی۔" چوہدری صاحب نے ان کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔ "آپ کا مقصد تو [illegible] کے باوجود وہ نتائج نہ آ سکے جو آپ نے سوچ رکھے تھے۔ خود کو اس مجرموں والی کیفیت سے نکالیے بلال صاحب! میری نظر میں تو آپ اس پوری کہانی کے ہیرو ہیں۔ میں تو آپ کی ہمت اور حوصلے کو سلام پیش کرتا ہوں۔"

"ہیرو؟" بلال نے سر اٹھا کر پوچھا۔ "ہیرو تو [illegible] میں یا سعد۔ جس سے وابستگی کا تصور ہر کسی پر خوشی کی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔"

"آپ بلال صاحب آپ۔" چوہدری صاحب نے انہیں یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "آپ اس پوری داستان کے Unsung hero ہیں۔ سعد تو میرے خیال میں بزدل نکلا جو ذرا سی حقیقت کو کل سمجھ کر اس کا سامنا کرنے کے بجائے بھاگ نکلا۔ آپ کی طرح مشکل ترین وقت میں خود کو قائم رکھنا ہی ہیرو ازم کی تشریح ہے۔" انہوں نے بات مکمل کر کے بلال سلطان کی طرف دیکھا جن کے چہرے کے تنے ہوئے نقوش اب قدرے ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

سارا نے اپنے فون کی اسکرین پر نظر آتے شخص کو دیکھا۔ وہ اسے کئی برس بعد دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے بہت اچھی طرح جانتی بھی تھی۔ لیکن نجانے کیوں فون کی اسکرین پر نظر آتا شخص اسے نامانوس سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی ہر دم چمکتی آنکھیں بجھی بجھی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کا مسکراتا چہرہ اداس تھا۔ وہ تھکا ہوا اور مضمحل نظر آ رہا تھا۔ سب سے بڑھ کر اس کے چہرے پر مایوسی اور ناامیدی چھائی ہوئی تھی، معمولی اور گرد آلود لباس میں ملبوس وہ لڑکا نجانے کہاں کہاں کی خاک چھانتا بلال سلطان کے اس محل نما گھر تک آ پہنچا تھا۔

"رکو!" سارا نے کچھ دیر اسکرین کو دیکھتے رہنے کے بعد سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

اگتے سورج کی سرزمین کا وہ باشندہ، نگر نگر گھومتا پریا رانی کو کھوجتا کہاں تک چلا آیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور گول چھوٹی سی ناک والے رکو نے اسکرین کی طرف دیکھا۔ پریا رانی، سارا خان بن چکی تھی۔ اس کا لاغر بیمار جسم توانائی اور شفا حاصل کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی مردنی زندگی کی رونق سے اپنا آپ بدل چکی تھی۔ وہ اس کے سامنے تھی، مگر اس کی دسترس سے اتنی دور کہ وہ ہاتھ بڑھانے پر بھی اس کو چھو نہیں سکتا تھا۔

"تم اب آئے ہو رکو! اتنے عرصے کے بعد۔" سارا خان نے اسی سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔ "اتنا کچھ ہو جانے کے بعد۔ اتنا کچھ بدل جانے کے بعد، جبکہ میں تو تمہیں رات کی تنہائیوں میں، بے بسی کے عالم میں دل سے آوازیں دیتی رہی۔ تم نے میری ایک بھی آواز نہیں سنی۔"

"میری بساط بہت مختصر اور اوقات بہت چھوٹی تھی سارا خان!" رکو نے کہا۔ "اپنی بساط اور اوقات کے مطابق میں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا۔ میں بھی پکارتا رہا۔ میں بھی ہر نظر آنے والے چہرے میں تمہیں تلاشتا رہا۔ مجھ سے چوک صرف اتنی ہوئی کہ میں نے تمہیں ان جگہوں پر ڈھونڈنے کی کوشش کی، جہاں میرے خیال میں تم ہو سکتی تھیں۔ سرکاری، خیراتی، اسپتالوں میں، رفاہی اداروں میں اور دارالامانوں میں، بھول کر بھی مجھے یہ خیال نہیں آیا کہ تم ایسی کسی جگہ کے علاوہ بھی کہیں ہو سکتی ہو۔ ان سے بہتر اور ان سے زیادہ خیال رکھنے والے ہاتھوں نے تمہیں تھام رکھا ہو سکتا تھا۔ یہ ہی میری غلطی تھی سارا!" اس نے مسکرانے کی ایک بے بس سی کوشش کی۔ سرکس کا ایک مسخرہ آخر اس سے زیادہ سوچ بھی کیا سکتا تھا۔

"پھر؟" سارا نے بے تابی سے کہا۔ "پھر تم یہاں تک۔ مجھ تک کیسے آ پہنچے۔"

"ماہ نور بی بی کے بتانے پر۔" رکو کا جواب مختصر تھا۔

"اوہ!" سارا کے دھیان میں ماہ نور اتر آئی تھی۔

"لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ میں تمہیں غلط جگہوں پر ڈھونڈتا رہا تھا اور یہ کہ تم ان سے کہیں بہتر اس جگہ پر موجود ہو تو

میں نے تمہارا پیچھا کرنے کا خیال ترک کردیا تھا اور شاید میں یہاں تک پہنچنے کی جرات بھی نہ کرپاتا۔ اگر جو خان چاچا مجھے حوصلہ نہ دیتا۔ میری ہمت نہ بندھاتا۔"

"خان چاچا!" سارا کے منہ میں جیسے کسی نے کڑواہٹ بھردی۔ اس کا چہرہ تلخ ہوگیا۔ وہ بزدل اور ظالم شخص جو عمر بھر مجھے اپنی بیٹی کہتا رہا اور جب میں اس کے کام کی نہیں رہی تو مجھے یوں لاوارثوں کی طرح پھینک دیا جیسے اس کا میرا کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔"

"تمہارا حق ہے، تم جو چاہے کہتی رہو۔ لیکن خان چاچا کی بساط اور اوقات شاید... مجھ سے بھی چھوٹی تھی۔ اپنا دم خم گنوا تا وہ بوڑھا ہوتا شخص تمہارے زخمی وجود کو کہاں اٹھالے جاتا، جبکہ اس کی عمر بھر کی کمائی بھی شیرو کے پاس بطور گارنٹی رکھی تھی۔" رکو نے نرمی سے کہا۔

"ہونہہ..." سارا نے نخوت سے سر جھٹکا "اسی لیے وہ مجھے بے بس اور بے آسرا کرکے اس کمھیوں بھری چھولداری میں پھینک کر خود باہر بیٹھا میرے مرنے کی دعائیں کرتا رہا۔"

"وہ اس سے زیادہ شاید کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا سارا!" رکو نے خان چاچا کی طرف داری جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم واقف نہیں ہو کہ سرکس سے منسلک ہر شخص کی زندگی سرکس کے مالکوں کے پاس رہن رکھی ہوتی ہے۔ زندگی کو زندگی سے زیادہ کون سی قیمتی شے دے کر چھڑایا جاسکتا ہے، بتاؤ۔" اس نے سوالیہ انداز میں سارا کی طرف دیکھا۔ "زندگی سے زیادہ قیمتی شے شاید موت ہی ہے جو اس رہن شدہ زندگی کو ان ظالموں کے شکنجے سے چھڑا سکتی ہے۔ اسی لیے تو خان چاچا تمہارے مرنے کی دعائیں کرتا تھا۔"

"لیکن میں زندہ ہوں۔ دیکھو اور غور سے دیکھ لو کہ میں ابھی تک زندہ ہوں۔" اس نے اپنا ٹیب میز پر سیدھا رکھ کر اپنے بازو پھیلائے۔ "یہ میرے بازو، یہ میرے ہاتھ، یہ میری ٹانگیں۔ دیکھو ان میں خون اپنی پوری رفتار سے دوڑتا ہے۔ میری ٹوٹی ہوئی رگوں اور پٹھوں کی گرافٹنگ ہوچکی ہے۔ جدید اور مہنگی ترین فزیو تھراپی نے میرے مردہ ہوئے جسم کو زندہ کردیا ہے اور اب میں دوبارہ سے ان بار ز جھولوں اور تو کیلے بستروں پر اپنے کرتب دکھا سکتی ہوں۔" اس نے فخر سے رکو کی طرف دیکھا۔

"لیکن میں وہ سب اب کیوں کروں گی۔" اس کے انداز میں نخوت ابھری۔ "جس شخص نے مجھے اپنی سرپرستی میں لے لیا ہے۔ وہ مجھے اب سرکس کی دنیا میں واپس تھوڑی جانے دے گا۔ وہ تو میرے لیے ایک سے بڑھ کر ایک زندگی کا انتخاب کرے گا۔" وہ گردن کو خم دیتے ہوئے مسکرائی۔ "تم نے اچھا کیا جو یہاں آگئے اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ میں کس حال میں زندگی گزار رہی ہوں۔ جاکر بتادو بلیو ہیون سرکس کے کرتا دھرتاؤں کو، وہ بے شناخت، بے آسرا اور مظلوم لڑکی جس نے تمہارے لیے کروڑوں کمائے اور پھر جسے تم لوگوں نے شدید زخمی حالت میں مرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ آج تک زندہ ہے۔ نہ صرف زندہ ہے بلکہ اب اس پوزیشن میں ہے، کہ ایک چھوڑ دس بلیو ہیون سرکس کھڑے کھڑے نقد خرید سکتی ہے۔"

رکو نے سارا کے لہجے کی حقارت اور تلخی کو سکون سے مسکراتے ہوئے اپنے اندر اتارا اور سرہلاتے ہوئے بولا۔ "تم بے فکر رہو، میں تمہارا یہ پیغام بغیر کسی لفظ کو آگے پیچھے کیے ان تک پہنچادوں گا۔"

"میں ممنون رہوں گی۔" سارا نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

وہ سارا خان جو کبھی پریا رانی تھی رکو اس کی طرف دیکھ کر ایک بار پھر اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ سرہلاتے ہوئے بولا۔ "اچھا... میں چلتا ہوں۔"

"ہاں... ٹھیک ہے، تم جاؤ۔" سارا نے کہا۔

رکو کے سامنے دیوار پر لگی ساٹھ انچ کی اسکرین جو ذرا دیر پہلے روشن تھی۔ تاریک ہوگئی۔ اس نے چونک کر اپنے اردگرد دیکھا۔ وہ ایک وسیع و عریض، شان دار کمرے کے وسط میں کھڑا تھا۔ چند لمحے پہلے اس کمرے میں تاریکی تھی اور سامنے والی اسکرین روشن تھی۔ اب اسکرین تاریک اور کمرہ روشن ہوچکا تھا۔ اس کا دل نیچے کہیں بہت ہی نیچے ڈوبنے لگا۔ بہت گہرائی

میں کہیں بہت دور۔" اس نے اپنے ڈوبتے دل کو سہارا دینے کی کوشش کی اور دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر نکلنے کا دروازہ تلاش کرنے لگا۔ اسی دم ایک دروازے سے وہ شخص داخل ہوا جس نے بتایا تھا کہ وہ اس گھر کی دیکھ بھال کرنے پر مامور عملے کا ہیڈ ہے۔ اس کے پیچھے لوازمات خورد و نوش سے بھری بڑی سی ٹرے اٹھائے ایک باوردی شخص اندر چلا آیا تھا۔

"رضوان الحق صاحب!" رازی نے اس کے قریب آکر کہا۔ "آپ تشریف رکھیے۔" اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے صوفے پر بٹھا دیا اور ملازم کو اشارے سے ٹرے میز پر رکھنے کو کہا۔

"آپ ہمارے مہمان ہیں اور کچھ دن ہمارے ساتھ ہی قیام کریں گے۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"نہیں جی۔۔۔ وہ میں۔۔۔" زکو نے گھبرا کر کہا تھا۔

"نہیں' وغیرہ تو ہو ہی نہیں سکتا' یہ صوفی کا فرمان ہے جو میم سیمی کے کہنے پر جاری ہوا ہے اور ان دونوں خواتین کا فرمان نظر انداز کرنے کی ہمت میں تو ہرگز نہیں کر سکتا۔"

"لیکن۔۔۔" اس نے کہنا چاہا۔

"کہا نا۔۔۔ لیکن ویکن کچھ نہیں۔۔۔ جب تک میم سیمی واپس نہیں آجاتیں آپ یہیں رکیں گے اور ان کی واپسی میں اب وقت ہی کتنا باقی رہ گیا۔ یہی کوئی ہفتہ' دس دن۔" رازی لاپروائی سے بولا تھا۔

"ارے آپ یہ اسنیکس لیں نا۔" اس نے ایک پلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "چائے میں چینی کتنی لیتے ہیں آپ؟" وہ زکو کو بات بھی کرنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔

☼ ☼ ☼
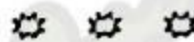
"آپ نے میری شادی ایک لاوارث' بے شناخت' غریب سے لڑکے سے کی تھی اماں! اور میں بھی اس شادی کے لیے اس لیے رضامند ہو گئی تھی کہ اس بے آسرا لڑکے پر میرا رعب رہے گا اور اس کی وجہ سے میں چوہدری سردار کے فارم ہاؤس میں رہنے کے مزے لوٹا کروں گی۔" سعدیہ نے شکستہ اور ہاری ہوئی آواز میں کہا۔ رابعہ کلثوم نے اس کی بات سنتے ہوئے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"لیکن وہ لاوارث' بے شناخت اور غریب لڑکا تو بڑا مقدروں والا نکلا اماں! پل کے پل میں فقیر سے شہزادہ بن گیا۔ لاوارث کے وارث مل گئے۔ اسے ایسی شناخت مل گئی جو عمر بھر سر اٹھا کر چلنے کے لیے کافی ہے۔ اس کے ارد گرد روپے' پیسے' زر و جواہر کے محل کھڑے ہو گئے ہیں۔ وہ بغیر جست لگائے زمین سے آسمان پر جا پہنچا ہے۔ آسمان جہاں سے نیچے نظر ڈالنے پر زمین پر رہنے والے ننھے ننھے بونے نظر آتے ہوں گے۔ بے حیثیت اور حقیر بونے۔"

"لیکن تم یہ سب کیوں کہہ رہی ہو سعدیہ۔۔۔ تم ایسی دکھی اور پریشان حال کیوں نظر آنے لگیں' میری بات سن کر؟" رابعہ کلثوم سمجھ نہیں پائی تھیں' سعدیہ کو ہوا کیا تھا۔

"آپ کی سمجھ میں نہیں آرہا اماں کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔" سعدیہ ان کی ناسمجھی پر تلخ ہوتے ہوئے بولی۔

"تمہارے لیے تو یہ بہت بڑی خوش خبری ہے۔" رابعہ کلثوم ابھی بھی اس کی بات نہیں سمجھی تھیں۔ وہ سعدیہ کی پریشانی کا محرک سمجھنے سے قاصر تھیں۔

"حیرت ہے اماں! آپ اسے خوش خبری سمجھ رہی ہیں۔" سعدیہ نے ماں کی بے نیازی اور ناسمجھی پر حیرت سے کہا۔ "بلال سلطان صاحب' جن کی کہانی آپ نے مجھے سنا رکھی ہے۔" ان کی کہانی میں رابعہ کلثوم یعنی رابعہ میراثن کی کیا حیثیت ہے۔ آپ نہیں جانتیں کیا؟ وہ مولوی سراج سرفراز کو کیا سمجھتے ہوں گے۔ آپ کو معلوم نہیں کیا؟"

رابعہ کلثوم کو یکایک آگاہی کا پہلا چھناکا لگا۔

"رابعہ میراثن جس کا باپ میراثی برادری کا سرپنچ تھا اور مولوی سراج سرفراز بے چارے جن کا اگا پچھا بھی کسی کو معلوم نہیں اور جنہیں آپ خود مولوانوں کا لمڈا کہہ کر پکارا کرتی تھیں۔ ان کی بیٹی سے کیا بلال سلطان صاحب جیسے آدمی اپنے بیٹے کا چاہے وہ گمشدگی کے بعد اچانک مل جانے والا بیٹا ہی کیوں نہ ہو کوئی رشتہ بندھا پسند کریں گے۔ کیا ان کو گوارا ہو گا کہ ان جیسے بڑے آدمی کی بہو اتنی معمولی حیثیت کے ماں باپ کی بیٹی ہو۔ کیا وہ یہ رشتہ قائم رہنے دیں گے؟"

سعدیہ سوال کر رہی تھی اور رابعہ کلثوم کا دل ہر سوال کا جواب نفی میں دے رہا تھا۔

"شاید کبھی بھی نہیں۔" سعدیہ نے ماں کی خاموشی پر خود ہی اپنے سوالوں کا ایک جواب دیا۔ "اس نے امان اللہ جو خبر سنائی، کہ ہمارا کھاری واقعی بلال سلطان صاحب کا بیٹا ہے۔ میرے لیے خوش خبری نہیں ہے۔ یہ خبر تو خبری ہے۔ یہ خبر کھاری کی زندگی سے میرے وجود کو نکال باہر پھینکنے کی سناؤنی ہے۔ یہ خبر ہمیں ہماری وہ حیثیت یاد کرانے کے لیے کافی ہے جسے ہم کھاری سے بہت بہتر بہت بلند سمجھتے تھے اور جس کے بل پر ہم اس پر اپنا رعب جمائے بیٹھے تھے۔"

"بلال سلطان، جس کو جیسا بھی سمجھیں، کھاری تو ان کے جیسا نہیں ہے نا، وہ تو محبت کرنے والا، محبت کو جاننے سمجھنے والا بچہ ہے۔ دھن دولت کی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں، وہ تو درویش صفت انسان ہے۔" رابعہ نے کانپتی آواز میں کہا۔

"واہ اماں واہ!" سعدیہ تلخی سے بولی۔ "کس کے دل کو تسلی دے رہی ہیں۔ میرے یا خود اپنے؟ دھن دولت کی حیثیت اس کی نظروں میں اس وقت تک نہیں تھی جب تک یہ دونوں اس کی دسترس میں نہیں تھیں۔ وہ تب تک ہی درویش صفت تھا، جب تک اسے پتا نہیں تھا کہ امیری میں کیا مزا ہوتا ہے۔ اب تو وہ ہو گا اماں اور اس کے باپ کے محل نما بنگلے، آسائشات، ایسے میں غریب مولوی صاحب اور مسکین بھین جی کی بیٹی تو شاید اسے نظر آئے نہ یاد رہے۔" اپنی بے حیثیتی پر سعدیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

رابعہ کلثوم کا سر سعدیہ کی گفتگو سن کر چکرانے لگا۔ زندگی تھی یا کوئی تماشا۔ کبھی ایک منظر اسٹیج ہوتا تھا۔ کبھی دوسرا اور ہر منظر پہلے سے جدا، درمیان میں کوئی ربط تھا نہ کوئی تال میل۔

"بس اماں! عزت اسی میں ہے کہ چپکے سے اپنا سامان باندھ کر یہاں سے نکل لیں ہم۔" سعدیہ نے سسکی لیتے ہوئے اپنے آنسو پونچھے۔ "اس سے پہلے کہ کھاری، مجھے خود اپنی زندگی سے نکال دے اور اس سے پہلے کہ چوہدری سردار ہمیں فارم ہاؤس سے نکل جانے کا حکم صادر کردیں۔"

"کیوں، ہم کوئی چور ہیں، ہم نے کسی کا قتل کیا ہے یا لوٹا ہے کسی کو؟" رابعہ کلثوم پر حالات و واقعات کا رد عمل ہوا ہو گیا تھا۔ جب ہی وہ چلاتے ہوئے بولی تھیں۔ "ہم اگر غریب مولوی صاحب اور مسکین رابعہ کلثوم ہیں تو ہاں ہیں اور فخر سے کہتے ہیں کہ ہم فلاں فلاں ہیں۔ اپنی محنت کرتے ہیں اور محنت کا کمایا کھاتے ہیں۔ خواہ سوکھی روٹی اور بغیر سالن کے چاہے ہی ہمارا کھانا ہو تب بھی ہمیں اس بات کا ڈر نہیں کہ کوئی انگلی اٹھا کر کہے گا کہ فلاں فلاں کا دیا کھاتے ہو، سر اٹھا کر جیتے ہیں اور سر اٹھا کر ہی جیتے رہیں گے۔ کوئی کون ہوتا ہے ہمیں نکل جانے کا حکم صادر کرنے والا۔"

"بات آپ کی نہیں، بات بلال سلطان صاحب کی ہے اماں!" سعدیہ نے ان کے رد عمل کا کوئی خاص اثر نہ لیتے ہوئے کہا۔

"ارے چھوڑو بھی بلال سلطان کو۔" رابعہ کلثوم نے ہاتھ سے دفع دور کیا۔ "بادشاہ ہو گا تو اپنی نظر میں ہو گا۔ آج اس کے پاس دھن دولت آگئی تو یہ اس کی قسمت ہے۔ گزرے کل کو کیسے بھولے گا، اس میں وہ ہم ایسوں کے ساتھ ہی اٹھتا بیٹھتا تھا اور ہماری ہی گودوں میں اس کا بڑا بیٹا پلا تھا۔"

"آپ کے غصے میں آنے اور غصہ دکھانے سے کیا فرق پڑے گا اماں۔ ہونی ہو چکی اور اگلی ہونی کو ہونے سے روک نہیں سکتا۔" سعدیہ نے کہا۔

"دیکھ لیں گے کیا ہوتا ہے۔ تو غم نہ کر میری بچی۔" رابعہ نے سعدیہ کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "ایسا ہی نزد کا مرد نکلے گا نا کھاری تو ہم خود اس پر تین حرف بھیج کر اس کی زندگی سے نکل جائیں گے۔ وہ ہمیں کیا نکالے گا۔" وہ سعدیہ کے الجھے بال ہاتھ سے سلجھاتے ہوئے بولیں۔ "تم کیوں غم کرو، تمہارے ماں باپ بھی زندہ ہیں۔ جیسی گزارتے آئے ہیں آگے بھی گزار لیں گے۔ نہ ہوا کھاری ہماری زندگی میں تو کیا قیامت آجائے گی۔" وہ خود کو تسلی دے رہی تھیں یا سعدیہ کو۔ انہیں خود بھی معلوم نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

سارا کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ "تم خود اپنے آپ کے لیے ایک ایسا کوہ گراں بن چکے ہو جسے ماضی

کا ماتم اور مستقبل کے بارے میں مایوس کن باتیں سوچنے کے سوا کوئی کام ہی نہیں رہ گیا۔"

"کوہ گراں..." اسے یاد آیا۔ سائیں اختر نے بھی تو ایسی ہی کوئی بات کی تھی۔ سزا و جزا کا اختیار جب انسان اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتا ہے تو اس عمل کو پورا کر سکتا ہے نہ اپنی راہ کا مسافر رہ پاتا ہے۔ سفر بے مراد رہ جاتا ہے اور اپنی اذیتوں کی صلیب اس کے لیے کوہ گراں بن جاتی ہے۔ جسے وہ اٹھا پاتا ہے نہ گرا دینے پر قادر ہوتا ہے۔"

"کوہ گراں!" اس نے اس لفظ کو دہرایا۔ "سفر بے مراد' اذیتوں کی صلیب' راستہ کھوٹا۔" اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی نظروں کے سامنے زرد رنگت' کمزور جسم' خون نچڑی سفید ہتھیلیوں والی سارا خان کا سراپا گھوما۔ خانہ بدوش بچوں کے دوڑتے بھاگتے نیم برہنہ اور بعض اوقات تنگ دھڑنگ وجود گھومے جو مٹھی بھر سکوں کے لیے پنجے اٹھا اٹھا کر سڑک پر دھیمی رفتار میں چلتی اس کی گاڑی کو دیکھنے کا انتظار کیا کرتے تھے۔ وہ بوڑھے اور ناتواں چہرے گھومے جو ہفتے دو ہفتے بعد اس کی آمد کے انتظار میں گھروں کی دہلیزوں پر بیٹھے رہتے' کب وہ لڑکا آئے جوان کے پاس بیٹھ کر ان کے دکھ سکھ سنتا ان کو لطیفے سنا کر ہنساتا۔

"وہ سب کس حال میں ہوں گے۔" اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں۔ "آنکھوں میں انتظار کے چراغ جلائے کیا اب بھی وہ اس کی راہ تکتے' اس کی طرف سے کوئی پیغام موصول ہونے کی امید کرتے ہوں گے یا وہ سب اس سے مایوس ہو کر اسے بھول بھال چکے ہوں گے" اسے خیال آیا۔ "کیا بھول جانا اتنا آسان ہے کہ کوئی کچھ عرصہ نظر نہ آئے تو اسے بھلا دیا جائے۔ کیا ایک انسان کی دوسرے انسانوں کی زندگی میں صرف اتنی اہمیت ہے کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔"

اس کا دل گھبرانے لگا۔

"اگر یہ سب اتنا آسان ہے تو میں کیا کر رہا ہوں۔ میں کیوں ایک جگہ ٹھہرا ہوا ہوں' یوں جیسے زمین نے میرے قدم جکڑ رکھے ہوں۔ کیا واقعی میں تھک کر راستے میں ہی بیٹھ گیا ہوں اور اپنا راستہ کھوٹا کر چکا ہوں۔ کوئی رشتہ' کوئی تعلق' کوئی احساس' کوئی جذبہ۔" اس نے خالی ہتھیلی سے سوال کیا اور اس کی نظریں ہتھیلی پر پھیلی لکیروں میں پھنس کر رہ گئیں۔ "اتنا تہی داماں کہ اتنے مہینے ہو چکے مجھے خود کو ان سب سے دور کیے اور پیچھے سے ایک بھی پکار میرے کانوں کو سنائی نہیں دی۔" اس کا دل خون کے آنسو رونے لگا تھا۔

"پھر وہی خود اذیتی' پھر وہی بیمار سوچ' دماغ نے ڈانٹنا شروع کیا۔

"محبتوں کو ٹھوکر تو تم نے خود ماری۔ نہ اپنا نشان کسی کو بتا کر آئے' نہ ہی پتا اور گلہ کرتے ہو پیچھے سے کسی آواز کے نہ آنے کا۔

ذرا خود کا احتساب کرو تو پتا چلے کہ تمہاری انسان دوستی' نیک فطرتی' محبتیں تقسیم کرنے کا عمل اور دوسروں کے کام آنے کا جذبہ صرف تب تک تھا جب تک تم ذاتی درد سے ناواقف تھے۔ جیسے ہی خود پر آگہی کا در کھلا۔ تم اپنے تئیں خود سب سے بڑے مظلوم بن گئے اور سب چھوڑ چھاڑ دنیا تیاگ کر بیٹھ گئے۔ واہ کتنے خود غرض نکلے تم۔ کبھی سوچا تم نے سارا خان کا کیا حال ہوگا' تنگ گلیوں اور محلوں میں گھروں کی دہلیزوں پر بیٹھے ان ضعیف العمر مرد و خواتین کی نظریں تمہارا انتظار کرتے کرتے کیسے تھکتی ہوں' یتیم خانوں اور دارالامانوں میں رہنے والے ان مخصوص لوگوں کا کون پرسان حال ہوگا جن کی ذمہ داری تم نے اپنے سر لے رکھی تھی۔"

اس نے دماغ کی ڈانٹ سے گھبرا کر ایک بار پھر آنکھیں میچ لیں۔

"تم تو راہ فرار حاصل کرنے کے لیے سب سے چھوٹا راستہ یعنی خودکشی تک کرنے چلے تھے۔ بس اتنی ہی ہمت تھی تمہاری۔ دوسروں کو ہمت' بہادری اور حالات کا سامنا کرنے پر لمبے لمبے لیکچر دینے والے خود پر پڑی اتنی سی ضرب بھی نہ سہ سکے۔" دماغ پوری شدت کے ساتھ اس پر برس رہا تھا۔

"رکھو ابھی رکھو اس کم بخت دل پر ہاتھ اور بتاؤ بھلا کیا اس کی ایک ایک دھڑکن پکار پکار کر ان کا نام نہیں لیتی' جس کو تم صرف اس لیے پیچھے چھوڑ آئے کہ جانچ سکو اس کی محبت میں کتنا دم ہے۔ جو آج بھی تمہارے دل میں بستی ہے۔ اس بے چاری کا کیا قصور تھا؟"

"نہیں ہے وہ بے چاری سنا نہیں تھا فاطمہ خالد کیا کہہ رہی تھیں۔ وہ مزے میں ہے۔ کوئی کورس کرنے شہر سے باہر گئی

ہوئی ہے۔ اتنا ہی تمہارے لیے ہلکان ہو رہی ہوتی تو کیا یوں مگن ہوتی پڑھائی میں۔" اس نے سوچا تھا۔
لیکن دل سے تو ایک ہی آواز ابھر رہی تھی۔ ایک ہی نام سماعت میں گونجنے لگا تھا۔
"ماہ نور۔۔۔ ماہ نور۔۔۔"

☆ ☆ ☆
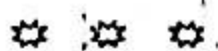
"دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔" سیمی آنٹی نے عینک کے اوپر سے سارا کو گھورتے ہوئے کہا۔ "وہ لڑکا نجانے کہاں کہاں تمہیں تلاش کرتا تم تک پہنچا ہے اور تم نے اسے جھٹک دیا۔ شرم کرو اور یاد کرو ان راتوں کو جب تم ڈپریشن زدہ نیند سے اٹھ کر چلا چلا کر اس کا نام پکارا کرتی تھیں۔ جب بلیو ہیون سرکس والوں میں سے اس کے علاوہ تمہیں کوئی دوسرا یاد بھی نہیں آتا تھا۔"
سارا نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے ان کی بات سنی اور پھر ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔
"اچھا تو آپ چھپ چھپ کر اس سے ہونے والی میری گفتگو سن رہی تھیں۔" اس کا لہجہ کاٹ دار تھا۔
"میں کبھی نہ سن پاتی اگر رازی نہ بتاتا کہ کون لڑکا تم سے ملنے آیا تھا۔" سیمی آنٹی پر سارا کے انداز کا ذرا برابر بھی اثر نہیں ہوا۔
"چلیں۔۔۔ اچھا ہے کہ آپ نے سن لیا۔" سارا نے اپنے دونوں بازو سامنے باندھتے ہوئے کہا۔ "اب شروع ہو جائیں نصیحتیں کرنا۔"
"میں نصیحت نہیں کر رہی، تمہیں کچھ یاد دلا رہی ہوں۔" سیمی نے کہا۔
"کیا یاد۔" سارا نے ان کی طرف دیکھا۔ "اب آگے بولیں۔"
"میں دیکھ رہی ہوں کہ جوں جوں تمہارا جسم صحت اور تازگی پکڑتا جا رہا ہے توں توں تمہارا لہجہ گستاخ ہوتا لگا ہے۔"
"اوہ!" سارا مسکرائی۔ "یہ تو کوئی نئی بات نہیں کی آپ نے، آپ کو تو میں اس وقت بھی گستاخ لگا کرتی تھی جب زندگی کے بارے میں بے زار گفتگو کرتی تھی۔"
"ہاں۔۔۔" سیمی نے بلند آواز میں کہا۔ "تمہاری ہر انتہا آخری ہی ہوتی ہے۔ اس وقت تم اپنی بے بسی اور ناکارہ وجود کا رونا روتے نہیں تھکتی تھیں اور تمہیں زندگی میں کوئی مثبت بات نظر ہی نہیں آتی تھی۔"
"اور آپ کا سارا دن مجھے ان وقتوں سے ڈراتے گزر جاتا تھا جب سعد نے ہماری زندگیوں سے چلے جانا تھا۔ جب سعد کی دی ہوئی زکوۃ اور خیرات کا سلسلہ ختم ہو جانا تھا۔"
سارا کے لہجے میں پوری شدت سے طنز جھلکا۔
"آپ نے دیکھا۔" اس نے بھنویں چڑھاتے ہوئے سیمی کو جتاتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ "سعد چلا گیا۔ ہماری زندگیوں سے نکل گیا، مگر پھر بھی کوئی قیامت نہیں آئی، ہمارے دن پہلے سے بھی بہتر اور بہتر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اب دیکھیں، آج کو دیکھیں کیا ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے۔" اس نے اپنے بازو کھول کر پھیلاتے ہوئے کہا۔ "دنیا بھر کے سارے سرخ قالین ہمارے قدموں تلے بچھے ہیں اور ہم ہر جگہ یوں جاتے ہیں جیسے کوئی بہت اہم شخصیت ہوں۔"
سیمی نے بے یقینی سے سارا کے اس انداز کو دیکھا، ان کا دل ڈوبنے لگا۔
"اور جانتی ہو اس کی وجہ کیا ہے؟" انہوں نے خالی نظروں سے سامنے دیکھتے ہوئے کسی زومبی کی طرح سوال کیا۔
"ہاں جانتی ہوں۔" سارا نے پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ "ہمارے ساتھ یہ سب اس لیے ہو رہا ہے کہ ہم اپنے برے دن گزار چکے ہیں۔ ہم نے اپنے حصے کی مشکلیں، دکھ اور آزمائشیں سہہ لیں۔ اب بدلاؤ کا زمانہ ہے۔ جو ہر انسان پر آتا ہے، دکھ، اذیتیں اور آزمائشیں جنہوں نے کبھی دیکھی بھی نہیں ہوتیں، بدلاؤ کا زمانہ ان پر ان سب کے دروازے وا کر دیتا ہے اور جنہوں نے سہے ہی صرف اذیتیں اور دکھ ہوتے ہیں، ان پر بدلاؤ کا زمانہ زندگی کی نعمتیں برسانے لگتا ہے۔"
"واہ کیا خود ساختہ تجزیہ ہے۔" سیمی نے بے اختیار کہا۔ "اتنی سی عمر میں اتنا کچھ دیکھ لینے کے بعد بھی تمہیں اندازہ نہیں ہوا کہ بدلاؤ کا زمانہ کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا جب تک اوپر بیٹھی سب طاقتوں سے بڑی طاقت نہ چاہے۔ جب

تک وہ سب جو تمہیں مل رہا ہے ' تمہاری قسمت میں نہ لکھا ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور بدلاؤ کے زمانے والا تمہارا فلسفہ درست ہوتا تو کچھ لوگ تمام عمر سونے کے چمچے سے نوالے منہ تک لیتے نہ دکھائی دیتے اور کچھ لوگوں کے مقدر میں تمام عمر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ایک ایک پل گزارنا نہ لکھا ہوتا۔"

"جو جیسی زندگی گزار رہا ہوتا ہے ' ویسے ہی تجزیے زندگی کے بارے میں کیا کرتا ہے۔ میں ایک عام انسان ہوں۔ فرشتوں جیسی گفتگو کی توقع مجھ سے نہ کریں تو بہتر ہے۔" سارا نے بے نیازی سے کہا۔

"تمہارے پاس کیا گارنٹی ہے کہ یہ جو آج تم پر اتنے اچھے دن اترے ہیں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔" یمی نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

"اس کا انحصار میری آج کی پلاننگ پر ہے۔"

"تمہاری وہ پلاننگ کیا ہوئی جو پریا رانی کی حیثیت سے تم نے کی تھی۔ منہ اور سر کے بل گرنا تو یقیناً" تمہاری پلاننگ میں شامل نہیں تھا۔" یمی کے لہجے میں پہلے سے زیادہ چبھن اتری۔

"اس وقت میں کم عمر تھی اور ناتجربہ کار۔" سارا کے انداز میں ہنوز بے نیازی تھی۔ "اب مجھے خوب معلوم ہو چکا ہے کہ وقت اگر میرے ہاتھ میں ایک ستارا پکڑائے تو اس کے ذریعے مجھے چاند تک کیسے پہنچنا ہے۔ بلیو ہیون والوں نے مجھے میرے بچپن سے لے کر اس وقت تک جب میں گری ' خوب ایکسپلائٹ کیا۔ میرے ذریعے کروڑوں کمائے ' مگر میری اہمیت ان کی نظر میں دو کوڑی کی بھی نہیں تھی۔ آپ نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کیسے مجھے بے بس موت مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا اور پھر جب میں وہاں سے اٹھالی گئی اس کے بعد سے اب تک ' جب تک ماہ نور کے ذریعے انہیں یہ خبر نہیں پہنچ گئی کہ میں نہ صرف زندہ ہوں ' بلکہ کروڑوں میں کھیلنے والا ایک شخص میرا سرپرست بن چکا ہے۔ انہیں میری یاد نہیں آئی۔ جیسے ہی میری موجودہ حیثیت کا علم ہوا انہوں نے اپنا جاپانی گڈا بھیج دیا میرے پیچھے۔ اب میں دوبارہ سے پریا رانی بن گئی۔ خان بابا کی پریا رانی ' رکو کی پریا رانی ' بلیو ہیون سرکس کی شہزادی پریا رانی۔" اس نے ایک استہزائیہ قہقہہ لگایا۔ "اسی لیے میں نے واپس بھیج دیا اسے ' تاکہ اس کے ذریعے بلیو ہیون والوں کو پیغام پہنچ جائے کہ زندگی اس وقت تک ختم نہیں ہوتی جب تک اس کا وقت پورا نہ ہو جائے اور وقت کا کیا ہے وہ تو کسی بھی وقت کوئی بھی کروٹ لے سکتا ہے۔"

یمی نے ایک ٹک سارا کو دیکھتے ہوئے اس کی بات سنی تھی۔ ان کے سامنے جو سارا کھڑی تھی ' اس کی جسمانی اور ذہنی بحالی کے سفر کے ایک ایک پل میں وہ اس کے ساتھ رہی تھیں۔ وہ ٹوٹی پھوٹی ' شکستہ حال لڑکی اب ایک نارمل انسان تھی۔ اس نے قیمتی لباس پہن رکھا تھا اور وہ اس اجنبی ملک کے دارالحکومت میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے لگژری کمرے میں ٹھہری ہوئی تھی۔ اس کی فزیوتھراپی اور جسمانی تربیت مکمل ہونے میں چند ہی دن باقی رہ گئے تھے۔ اس کے بعد اسے واپس وطن لوٹ جانا تھا۔ بلال سلطان اس پر اتنے مہربان کیوں تھے؟ وہ اس ایک اہم نقطے پر دھیان دینا بھول رہی تھی۔

وہ اس سعد سلطان کو بھول گئی تھی۔ جس کے صدقے وہ آج یوں خود اعتمادی کے ساتھ اپنے پیروں پر کھڑی دنیا کی نظروں میں نظریں ڈالنے کی ہمت تک آ پہنچی تھی۔ پچھلے کئی دنوں میں اس نے کبھی بھولے سے بھی سعد سلطان کو یاد نہیں کیا تھا۔ وہ سعد سلطان جس کی ایک آمد سے لے کر اگلی آمد تک کے درمیانی عرصے کے ہفتے ' دن ' گھڑیاں ' ساعتیں تک اس نے گن رکھی ہوتی تھیں۔ وہ سعد سلطان جس کا کندھا اس کی ہر لڑکھڑاہٹ پر سہارے کے لیے اس کے سامنے حاضر رہتا تھا۔ وہ جو اس کے ایک ' دو سے لے کر تین تک کی گنتی پر کسی جن کی طرح اس کے سامنے موجود ہوتا تھا۔

وہی سعد سلطان اب کہاں تھا۔ کس حال میں تھا۔ اس سارا خان نے شاید کبھی بھولے سے بھی اسے یاد نہیں کیا تھا۔

"مگر افسوس۔۔۔" یمی نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے ' انسان کی عادتیں بدل سکتی ہیں ' فطرت نہیں بدل سکتی ' شیرو کے سرکس کی کسی گھوڑا گاڑی کے پہیے کے قریب نوزائیدہ بچی پھینک جانے والی ماں یا باپ کا دل بھی تو ایسا ہی پتھر اور بے حس ہو گا نا جیسی بے حسی آج کی سارا خان میں اتر آئی ہے۔ یہ بے حسی ہی تو تھی جو سفاک ماں سے جگر کے ٹکڑے کو یوں لاوارث وہاں رکھوا گئی ' پھر سارا کی جبلت میں محبت اور لگاؤ کیسے اترتا۔ خود غرضی کی پٹی آنکھوں پر باندھے سارا اندھا دھند آگے بڑھنے لگی تھی اور یمی کو اس کے آنے والے دنوں سے نجانے کیوں ایک انجانا سا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

"سارا! جلدی کرو بھئی، مسٹر ڈینگ تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔" صوفی نے کمرے کا دروازہ کھول کر جھانکا۔ سارا تیزی سے ہلکے گلابی رنگ کا لپ گلوس ہونٹوں پہ پھیرتے ہوئے نکلی۔

"آپ جائیں گی سیمی آنٹی؟" اس نے جاتے جاتے رک کر پوچھا۔

"نہیں۔۔۔" سیمی کا دل ایک دم اس بے حسی پر پورے ماحول سے اکتا سا گیا تھا۔

"چلیں پھر بیٹھیں تنہا اور یاد کرتی رہیں اس جاپانی گڈے کو۔" اس نے کہا اور تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔

"خداوند۔ میں نے تیرے بھروسے پر اس لڑکی کو اس کی وقتی نادانی کی سزا سے بچانے کی خاطر اس غریب لڑکے کو وہاں رکوا دیا ہے۔ تو ہی میرے ارادے کی لاج رکھ لے۔ میں نے تیرے ایک محبت بھرا دل رکھنے والے بندے کا دل ٹوٹنے سے بچانے کی خاطر اپنی حیثیت داؤ پر لگا کر اسے وہاں روک لیا ہے اور تجھ سے درخواست کر رہی ہوں، تو اپنے بھروسے پر کوئی قدم اٹھانے والے کو ذلت سے دوچار نہیں کیا کرتا، تو میرے ارادے کی لاج رکھ لے۔"

اس شام دیر تک سیمی آنٹی دعا میں مشغول رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼
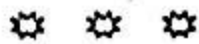
"خود شناسی بہت بڑی نعمت ہے میرے عزیز اور کیا تم جانتے ہو کہ یہ نعمت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔" ڈاکٹر رضا نے سعد کی لوٹائی ہوئی کتاب کی قرمزی جلد پر درج سنہرے حروف پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

"شاید۔۔۔" سعد نے مختصر جواب دیا۔

"مگر اس نعمت سے کہیں بڑی ایک نعمت اور بھی ہے، جو اس سے بھی کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔" ڈاکٹر رضا ہلکا سا مسکرائے۔

"اور وہ نعمت کیا ہے؟" اس نے سر اٹھا کر سوال کیا۔

"بندے کا خود اپنے سامنے یہ اعتراف کہ ہاں اسے خود شناسی حاصل ہو چکی ہے۔"

"اوہ ہاں!" سعد نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا صرف خود اپنے سامنے کہ کسی اور کے سامنے بھی۔۔۔"

"جب بندہ خود اپنے سامنے اعتراف کرنے کی ہمت پکڑ لیتا ہے تو دوسروں کے سامنے اعتراف کرنے میں بھی اسے حرج محسوس نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا آئینہ دل شفاف ہو چکا ہوتا ہے۔ دوسروں سے ہم اپنے بغض، رنج، حسد اور رشک کی وجہ سے ہی تو کتراتے ہیں جب دل کا آئینہ شفاف ہو جائے اور اس میں کوئی بال باقی نہ رہے تو گریز و فرار کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔" ڈاکٹر رضا نے نرمی سے کہا۔ جواب میں وہ ان کی طرف غور سے دیکھتا ہی رہا، بولا کچھ نہیں۔

"پڑھ لی یہ کتاب کہ بغیر پڑھے ہی لوٹا رہے ہو۔" ڈاکٹر رضا نے اس کا یہ انہماک توڑتے ہوئے کتاب اٹھا کر اس کی نظروں کے سامنے کی۔

"پڑھ لی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"پھر۔۔۔" انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"پھر یہ کہ مجھے خوشی ہوئی آپ نے مجھے کتاب کے ذریعے وعظ و نصیحت اور تبلیغ کرنے کی کوشش نہیں کی۔"

"کیا تمہارا خیال تھا کہ میں ایسا کروں گا۔"

"ہاں بالکل۔۔۔" اس نے سچائی سے اعتراف کیا۔ "لیکن میں ممنون ہوں کہ آپ جس نتیجے پر مجھے پہنچانا چاہتے تھے، اس میں آپ کامیاب ہو گئے۔"

"ارے کس نے کہہ دیا کہ میں تمہیں کسی نتیجے پر پہنچانا چاہتا تھا؟" ڈاکٹر رضا چونکے۔

"میرے دل نے کہا۔" وہ سکون سے بولا۔ "اور آپ نے ایسا کر کے ٹھیک ہی کیا، میرے التباس ختم ہو گئے اور مجھے دھند کے اس پار کی چیزیں بھی نظر آنے لگیں۔"

"مثلاً" "کیا نظر آیا؟" وہ محظوظ ہوتے ہوئے بولے۔

"مثلاً" "یہ کہ ذاتی دکھ کو اجتماع پر مسلط کر دینے کی خواہش کرنے والا انسان تنہا رہ جاتا ہے۔"

"اور یہ کہ خوشی' سکون اور آسائش کے لمحوں سے محظوظ ہوتے ہوئے ہم اندازہ نہیں کرپاتے کہ آنے والے لمحے ہمارے لیے کس احساس پر سے نقاب اٹھانے والے ہیں۔"

"خوب۔"

"اور یہ کہ بہادری' یہ نہیں کہ آپ خود پر ہر خوشی حرام کرلیں بہادری' یہ ہے کہ اپنے دکھ کی اذیت کے دنوں میں بھی دوسروں کی خوشی میں یوں شامل رہیں جیسے یہ آپ کی اپنی خوشی ہے۔"

"بہت خوب!"

"اور یہ کہ جب آپ پر اپنا آپ ظاہر ہوجائے تو اعتراف کرلو کہ ہاں مجھ میں یہ خامیاں ہیں اور بہت تھوڑی سی فلاں فلاں خوبیاں۔"

"خودشناسی۔" ڈاکٹر رضا نے برجستہ کہا۔

"جی ہاں۔ خودشناسی۔" اس نے سرجھکا کر اعتراف کیا۔ جی ہاں... خودشناسی ہر آئینے میں انسان کو اپنا چہرہ دکھاتی اور وہ بھی اتنا واضح کہ کچھ پوشیدہ نہیں رہتا۔"

"بس یا کچھ اور بھی؟" ڈاکٹر رضا کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ تھی جیسے وہ بہت مطمئن ہوں۔

"بس اتنا ہی۔"

"گویا تم اس سے آگے کا سفر طے کرنے کو تیار ہو۔"

"اس سے آگے کا سفر۔" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ مسکرائے۔ "صرف نظر کرنے سے لے کر درگزر کرنے تک کا سفر..."

"وہ کٹھن سفر ہے۔ اس کے لیے جو زادِ راہ درکار ہے' شاید وہ میری دسترس میں نہیں۔" سعد نے سادگی سے کہا۔

"حوصلہ' صبر' تحمل' نرمی۔" ڈاکٹر رضا مسکرا کر بولے۔ "زادِ راہ کچھ اتنا ناقابل حصول تو نہیں۔"

"ہوسکتا ہے نہ ہو' مگر حوصلہ' صبر' تحمل اور نرمی حاصل کرنے کے لیے' ردعمل' غصے' نفرت اور انتقام کے پھن پھیلائے ناگوں کا سر کچلنا پڑتا ہے۔ جو شاید میرے جیسے کمزور انسان کے لیے یہ ممکن نہیں۔"

"بدگمانی کی پٹی آنکھ سے اتار کر تھوڑی سی اعلا ظرفی سے کام لو۔ یہ ناگ خود بخود مرجائیں گے۔"

سعد نے ان کی بات سننے کے بعد گہرا سانس لیتے ہوئے سر صوفے کی پشت سے ٹکالیا۔

"اچھا یہ بتاؤ' محبت اور محبوب کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟" ڈاکٹر رضا نے موضوع بدلا۔

"وہی جو نادیہ نے آپ کو بتایا۔" اس نے یوں ہی سر صوفے کی پشت سے ٹکائے جواب دیا۔

"محبت تمہاری اور محبوب بھی تمہاری' نادیہ بے چاری کو کیا خبر کہ تمہارا کیا خیال ہے۔"

"اس نے آپ کو بتا تو دیا ہے کہ میں کمال بے حس انسان ہوں۔ محبت اور محبوب کے موضوع سے بے زاری کا اظہار کرتا ہوں۔"

"پتا نہیں۔" ڈاکٹر رضا نے سر ہلایا۔ "نادیہ نے تو مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ لیکن اگر ایسا ہے تو پھر تو تم پکڑے گئے۔"

"کیا مطلب؟" وہ یک لخت سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"مطلب کہ جس موضوع سے دانستہ بے زاری کا اظہار کیا جائے' اصل میں وہی تو بندے کی جان کا روگ ہوتا ہے..."

ڈاکٹر رضا نے دیکھا' سعد کا چہرا ایک دم سفید پڑنے لگا تھا۔

"دیکھا... میں نے کہا تھا تم پکڑے گئے۔" وہ مسکرائے۔ "خودشناسی کی اسٹیج پر پہنچ چکے ہو' اعتراف والی اسٹیج تک بھی چھلانگ مار ہی لو..."

"ضرور مارلوں' مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں' محبت اور محبوب دور' بہت پیچھے رہ گئے' شاید میں بہت آگے نکل آیا ہوں۔" وہ افسردگی سے بولا۔

"جن کو محبت نصیب ہوجائے' وہ یوں شکست خوردہ تو نظر نہیں آتے۔ محبت کا حصول تو انسان کو فاتح عالم بنادیتا ہے' سر

اٹھا کربات کروسعد! سلطان۔"

"محبت کرنے اور اس کو پانے کے درمیان بہت لمبا فاصلہ ہے۔ ڈاکٹر! مشرق 'مغرب جتنا فاصلہ....."

"اس دور میں تو فاصلے اتنے سمٹ گئے ہیں 'ایک بٹن دباؤ اور مشرق سے مغرب پہنچ جاؤ۔"

"بٹن دبانا ہی تو سب سے مشکل کام ہے۔"

"اچھا!" ڈاکٹر رضا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے۔ "اگر اتنے عذر حائل ہیں تو پھر ٹھیک ہے 'قائم رکھو فاصلے اور مت دباؤ بٹن 'بس اپنی خودشناسی کے بحر بے کنار میں تیرتے پھرو ہر دم۔"

"آپ ناراض ہوگئے شاید...." سعد نے رنجیدگی سے کہا۔

"نہیں 'ناراض تو تم ہو' خود سے 'میں تو تم سے ناراض نہیں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ "مغرب کی نماز کا وقت ہوا چاہتا ہے 'میں چلوں گا اب۔" انہوں نے اپنی سفید ٹوپی سر پر رکھی اور کمرے سے باہر چلے گئے۔

"اور گلاب کے ساتھ کانٹے ضرور ہوتے ہیں۔"

کسی نے جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"ہاں.... مجھے اتنی ہی کڑوی باتیں سن لینے کی عادت ڈال لینی چاہیے شاید۔" اس نے سرہلاتے ہوئے خود سے کہا۔

☼ ☼ ☼
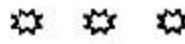
سردیوں کی راتوں میں سب کی باری باری ڈیوٹی لگا کرتی تھی۔ صبح منہ اندھیرے سبزیوں پھلوں اور پھولوں کے ٹرک لوڈ ہو کر اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوتے تھے 'ٹرکوں پر لوڈ ہونے والا سامان تیار کرنے کے لیے راتوں کی ڈیوٹی لگا کرتی تھی۔ اس کی بھی بھی فرض کرکے یہ ڈیوٹی نہیں لگتی تھی مگر اسے ڈیوٹی والوں کے ساتھ رات بھر جاگنا اور ان کی باتیں سننا بہت اچھا لگتا تھا۔

رات بھر سب جائے کے پیالے بھر بھر پیتے 'اپنی گرم چادروں اور کھیسوں کو اپنے اردگرد لپیٹے فرصت کی چند گھڑیاں ملنے پر ایک دوسرے کو اپنے بڑوں سے سنی کہانیاں 'خود اپنی آپ بیتیاں 'ادھر ادھر سے کان میں پڑی خبریں سناتے اور اسے یہ سب سننا بہت لطف دیتا تھا۔ ان میں سے چند حقہ بھی پیتے تھے۔

حقے کے کش لگا کر اس کی نے اگلے کو پکڑانا یہ اشارہ ہوتا تھا کہ پچھلے والے کی کہانی ختم ہوئی 'اب نے جس کے ہاتھ میں ہے وہ کوئی بات سنائے گا۔ ان کہانیوں آپ بیتی اور جگ بیتیوں میں لوگوں کے ماں باپ 'بہن بھائیوں اور ان کے گھروں کا ذکر ہوتا ان سب کی سننے کے بعد رات کے کسی پہر جب وہ اپنے گرم بستر میں لیٹ کر رضائی اپنے گرد لپیٹتا تو دیر تک وہ ان ہی کہانیوں اور داستانوں پر غور کرتا رہتا تھا۔ ماں 'باپ 'بہن بھائی اور ایک گھر مختلف شکلوں اور ہیولوں کی مانند اس کی نظروں کے سامنے آتا اور گزر جاتا۔ ایک رات ان کی شکل کچھ اور ہوتی اگلی رات کچھ اور 'ان بنتی بگڑتی شکلوں کو دیکھتے ہوئے وہ کبھی کسی ایک حتمی شکل سے خود کو مانوس نہیں کرپایا تھا۔

"پتا نہیں میری ماں کے بال لمبے تھے یا چھوٹے۔"

"میرا اگر کوئی بھائی ہے تو مجھ سے بڑا ہوگا کہ چھوٹا۔"

"جو کوئی بہن ہے اور کبھی میں اس سے ملوں تو اسے میلے سے پلاسٹک کی گلابی رنگ والی گڑیا ضرور لے کر دیتا پتا نہیں میری کوئی بہن ہے بھی کہ نہیں اگر ہے تو اس کی شکل میرے جیسی ہے کہ کسی اور کے جیسی۔"

"اللہ جانے اپنے ابے کی جو بھی شکل میری سمجھ میں آتی ہے 'وہ ہر پھر کے چودھری صیب جیسی ہی کیوں ہوتی ہے اور اماں کی ساری شکلیں بنتے بگڑتے آخیر میں چودھرانی صابرہ بی بی جیسی کیوں بن جاتی ہیں وہ مفروضوں کے ساتھ تصوراتی شکلیں گھڑتا 'بگاڑتا بڑا ہوا تھا۔ زندگی نے اپنا رخ بدلا تھا 'اس کے رنگ ڈھنگ بھی بدل گئے تھے لیکن ابھی بھی فرصت اور تنہائی کے چند لمحے میسر آنے پر یہ اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

چودھری سردار اور گھر سے آئی اس بھولی بھری جیسی بی بی نے جو انکشاف چند ہفتے پہلے اس پر کیا تھا 'اس کو مذاق پر محمول کرتے کرتے حالات اسے گندم میں رکھنے والی گولیاں کھانے کی طرف لے گئے تھے۔

موت کے فطری خوف نے اسے ان زہریلی گولیوں سے بچا کر اس روز ایک نئی حقیقت کے سامنے لا بٹھایا تھا۔ اس کے سامنے بادشاہوں کی سی آن بان والا ایک خوش شکل' خوش لباس شخص بیٹھا تھا جو اپنی وضع قطع سے ہی بڑا امیر کبیر دکھائی دیتا تھا' پڑھا لکھا اور آن بان والا۔

اور چودھری صاحب اسے پہیلی بجھوا رہے تھے۔

"بوجھو ذرا کھاری! یہ صاحب کون ہیں؟"

اور اس کے ہار مان لینے پر چودھری صاحب ہی اسے بتا رہے تھے کہ وہ شخص اس کا سگا باپ ہے' اس کا یعنی محمد افتخار احمد کا' جس نے اپنے باپ کے تصوراتی ہیولوں میں بھی کبھی ایسے باپ کو دیکھنے کی جرات نہیں کی تھی وہ باپ اس کے سامنے بیٹھا تھا اور توقع' امید اور خوف نظروں میں سمیٹے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس نے چودھری صاحب کی بات سن کر سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور انکار میں یوں سر ہلایا تھا جیسے اسے ان کی بات سمجھ میں نہ آئی تھی۔

"کھاری میرے پتر' اٹھ کریلال صاحب سے مل' یہ تیرے والد صاحب ہیں' تیرے اپنے سگے والد صاحب۔"

"چودھری صاحب! اب تو ہر طرف اتنا شور مچ چکا ہے کہ بابے دین محمد نے مجھے گولیاں بھی نہیں دینی۔" اس کے دل نے ایک دم دہائی مچادی۔

"تجھے یقین نہیں آرہا نا جھلیا!" چودھری صاحب نے اس کے قریب بیٹھ کر پیار سے اس کی گردن کے گرد اپنا بازو پھیلاتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگالیا اور پھر سرگوشی کے سے انداز میں اسے ایک کہانی سنانے لگے' ایسی کہانی جو سردیوں کی راتوں میں جاگ کر ڈیوٹی دینے والوں کی کہانیوں سے بالکل مختلف تھی۔

☼ ☼ ☼
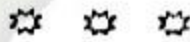
"میں نہیں مانتا کہ انسان کی 'Transformation' اچانک ہوجاتی ہے۔ سب فضول باتیں ہیں۔ انسان کے لاشعور میں کچھ چیزیں تعصب کی طرح موجود ہوتی ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ لاشعور ہی ہماری زندگی کے بہت سے فیصلوں میں کارفرما ہوتا ہے۔" چندر شیکھر نے کافی کا گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد کہا۔

"تمہارا مطلب ہے نادیہ کے لاشعور میں ہی مذہب کے خانے میں اسلام کی تقلید موجود تھی۔" سعد نے دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سو فیصد۔" چندر شیکھر نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔ "اور تم نے دیکھا' لاشعور فیصلہ کرنے میں کیسے کارفرما ہوا؟"

"ہوں۔" سعد نے سر ہلایا اور پھر سوالیہ انداز میں چندر شیکھر کی طرف دیکھنے لگا۔

"اور اگر نادیہ کے ذہن میں کسی ایک راستے کا انتخاب کرنے کا خیال ہی نہ آتا تو اس کا لاشعور کیا کرتا۔"

"نادیہ ان لوگوں میں شامل ہے جن کی روح کسی ایک راستے کو اختیار کرنے سے پہلے بے چین رہتی ہے' اسے اس راستے کا انتخاب کرنا ہی کرنا تھا جلد یا بدیر۔" چندر شیکھر نے اس بار بھی پورے تیقن کے ساتھ جواب دیا۔ "میں تمہیں بتاؤں' جب لندن آنے سے پہلے اس نے مجھ سے ذکر کیا کہ وہ خواب میں ایک سراب دیکھتی ہے' جس کی شکل واضح نہیں مگر وہ ایک ایسی عمارت کی مانند ہے' جس کے گنبد صاف دکھائی دیتے ہیں۔ اسی وقت مجھے یقین ہوچکا تھا کہ نادیہ اس راستے پر چلنے والی تھی۔ مندر کی سیڑھیوں' اشلوک اور بھجن پڑھنے کی آوازوں' گرجاؤں کی گھنٹیوں اور مسجدوں سے آنے والی اذان کی آوازوں میں سے کسی ایک کا اسے انتخاب کرنا ہی کرنا تھا۔ وہ اپنے باپ' باپ کے وطن اور باپ کی زبان سے محبت نہیں عشق کرتی تھی۔ اسے باپ کے ۔۔۔ اونہ بجن کی طرف بڑھنا ہی تھا جب ہی تو یہاں آنے کے بعد جب اس نے اپنی کیفیات مجھے میل کرنا شروع کیں تو مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ اس کی بے چین روح نے اپنا وژن حاصل کرلیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت خوش قسمت ہے۔"

سعد حیرت سے چندر شیکھر کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی بات سن رہا تھا کچھ دیر اس کی گفتگو کے سحر میں ڈوبے رہنے

کے بعد وہ مسکرایا۔ "تمہارا خیال ہے نادیہ کا یہ وژن اس کی خوش قسمتی ہے۔۔۔۔"

"ہاں!" چندر شیکھر نے سر ہلایا۔

"جبکہ تم اور تمہارے ہم وطن، تمہارے ہم مذہب اس وژن کی آفاقیت کے منکر ہیں؟"

"ہاں، یہ صحیح ہے۔" چندر شیکھر نے بلا حیل و حجت اعتراف کیا۔

"کیا تمہارا دل اس کی آفاقیت اور عالمگیری پر یقین کر لینے کو نہیں چاہتا؟"

"دل کے چاہنے پر میں نے کبھی غور نہیں کیا۔" چندر شیکھر نے سڑک پر چلنے والی گاڑیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں اس وقت ایک روڈ سائیڈ کیفے کے باہر رکھی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ "لیکن میری نظر تعصب سے بہرحال بچی ہوئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں دین اسلام نے دنیا کی تاریخ کو تہذیب، اخلاق اور علم کے خزانے عطا کیے ہیں۔۔۔۔"

"نادیہ خوش قسمت ہے کہ اسے وژن مل گیا، تمہاری نظر تعصب سے بچی ہوئی ہے ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے ہو، تم نادیہ کی مخصوص خوبیوں کے معترف ہو، اس کا خیال ہے کہ تم سے بہتر اس کا کوئی دوسرا دوست نہیں۔"

سعد نے بات کرتے کرتے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا جس پر بادل جھکا ہوا تھا۔ گیلا اور سیلا لندن ایک مرتبہ پھر بھیگنے جا رہا تھا۔ "نادیہ ایسی لڑکی اور دنیا کی تاریخ کو تہذیب، اخلاق اور علم کے خزانے عطا کرنے والے دین کی طرف تمہارا دل نہیں کھنچتا کیا؟"

چندر شیکھر جو اس کی بات غور سے سن رہا تھا۔ سعد کی بات کا مفہوم سمجھتے ہوئے گہرا سانس لے کر مسکرا دیا۔ "یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟"

"اس لیے کہ میں نادیہ کا بھائی ہوں اور میرا دل چاہتا ہے کہ میری بہن کٹھنائیوں سے بھری رہ گزر پر چلتے چلتے آسانیوں سے بچی شاہراہ پر جا نکلے۔" سعد نے مبہم سی بات کی۔

"ہوں۔" چندر شیکھر نے سر ہلایا اور ایک بار پھر سڑک پر دوڑنے والی گاڑیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں نے ابھی تمہیں بتایا کہ انسان کے لاشعور میں کچھ چیزیں تعصب کی طرح موجود ہوتی ہیں۔ یوں جیسے گھٹی میں چٹا دی گئی ہوں۔ میرا بھی عجیب ہی معاملہ ہے۔" وہ رک کر ہنسا "میں کسی بھی مذہب کی تقلید نہیں کرتا۔ مجھے لادین کہلانا اچھا لگتا ہے لیکن پھر بھی جہاں کہیں مندر میں بجنے والی گھنٹیوں کی آواز میرے کان میں پڑتی ہے۔ جب بھی کہیں بھجن پڑھتی لڑکیاں اور اشلوک سناتے پنڈت نظر آجاتے ہیں۔ میرا دل بے ساختہ ان سے تعلق محسوس کرنے لگتا ہے حالانکہ یہ وہ آوازیں ہیں جن سے میں نے اپنے بچپن ہی سے بچنے کی کوشش کی۔ مندر جانے کے لیے تیار اپنی ماں سے انگلی چھڑا کر میں گھر کے دروازوں کے پیچھے، سیڑھیوں کے نیچے اور غسل خانوں کے اندر چھپ جایا کرتا تھا کیونکہ مجھے پنڈتوں اور بھگوانوں کی مختلف اشکال کو دیکھ کر کچھ ہونے لگتا تھا۔

میں مذہب سے ہمیشہ سے باغی رہا ہوں، مگر لاشعور میں بیٹھا تعصب جو گھٹی میں مجھے چٹا دیا گیا ہے مجھے خود کو اس سے وابستہ کرنے سے بچنے نہیں دیتا اور شاید زندگی بھر نہ بچنے دے، یہ ہی حقیقت میرے اور نادیہ کے درمیان ایک بہت بڑا خلا ہے، ایک بہت بڑا بعد جس کو پاٹنا مشکل ہے۔ ہندو، مسلم، ہندوستانی، پاکستانی۔" وہ استہزائیہ سی ہنسی ہنسنے لگا۔ "انسانوں کی ٹریجڈیز کی بھی کوئی حد ہے؟" اس نے سوالیہ نظروں سے سعد کی طرف دیکھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" سعد نے اس کی بات سن کر اپنے دل میں اٹھنے والے نئے خیال پر فاتحہ پڑھتے ہوئے کہا "اکثر اچھے دوست اچھے دوست ہی رہتے ہیں، کیونکہ دوستی میں ایسی حدود و قیود کا کوئی تصور مانع نہیں ہوتا۔ ویسے مجھے معلوم نہیں تھا تم لوگوں کے ہاں بھی گھٹی دینے کا رواج ہے۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"میں نادیہ کے لیے ایک بہترین ساتھی مل جانے کی دعا کے ساتھ تم سے رخصت ہوتا ہوں۔" چندر شیکھر نے کھڑے ہو کر سعد سے مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ایک بات کبھی نہ بھولنا، نادیہ جیسی لڑکی بہترین سے ذرا سے بھی کم کی حق دار نہیں ہے۔" اس نے سعد سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

سعد نے چندر شیکھر کو رخصت ہو کر جاتے اور پھر نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھا۔

"ٹھیک کہتے ہو تم۔ انسانوں کی ٹریجڈیز کی کوئی حد نہیں ہے۔" اس نے سوچا اور سر پیچھے کرتے ہوئے نظریں اٹھا کر ایک بار پھر آسمان پر چھائے بادلوں کی طرف دیکھنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"بندہ بھی کتنا ڈرپوک ہوتا ہے' بزدل' چوہے جتنے دل والا" وہ کب سے اکیلی بیٹھی سوچ رہی تھی "کبھی اس بات سے ڈرتا ہے کہ وہ کم شکل ہے' کبھی اس بات سے کہ وہ کم حیثیت ہے' بندے کے اندر کے کوڑھ جن پر اس کا اختیار بھی نہیں ہوتا۔ اسے ہر وقت کسی نہ کسی خوف میں مبتلا کیے رکھتے ہیں' پیٹ بھر کے خوش بھی ہونے نہیں دیتے۔"

اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے اس کمرے کے در و دیوار پر نظر ڈالی جس میں کچھ عرصہ پہلے وہ دلہن بن کر آئی تھی اور جہاں آکر وہ اپنے تئیں بیگم صاحبہ بن گئی تھی۔ میلی صدری والے کم رو مولوی صاحب اور پیوند لگے کپڑے پہننے والی بھین جی کی بیٹی' جس نے اس عمر تک پیٹ بھر کر کھانا کھانے کی خواہش ہی کی تھی۔ اچھا پہننے اوڑھنے 'مٹی گرتے' کچے فرشوں والے ایک کمرے کے گھٹن زدہ مکان سے باہر نکلنے کے خواب ہی دیکھے تھے۔ اس کمرے میں دلہن بن کر اترنے کے بعد خود کو کوہ قاف کی ملکہ سمجھنے میں حق بجانب ہی تو تھی' مگر اس کا کیا کیا جائے کہ خوابوں جیسی زندگی پلک جھپکتے ہی گزر جاتی ہے۔ بے چاری سعدیہ کلثوم کو بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے حسین خوابوں بھری رات بھر کی نیند بس اب ٹوٹنے کو تھی۔

چودھری سردار نے لاوارث' بے نشان کھاری کے لیے مولوی صاحب اور بھین جی کی بیٹی کا انتخاب بھی اسی لیے کیا تھا' کہ بے شناخت کھاری کو کیا فرق پڑتا تھا اس کی زندگی کی ساتھی' کس کی بیٹی تھی اور مولوی سراج اور بھین جی کے لیے اس سے بڑا اعزاز کیا ہو سکتا تھا کہ چودھری سردار نے اپنے لاڈلے کھاری کے لیے ان کی بیٹی کا انتخاب کیا تھا۔

کس کو معلوم تھا رات ختم ہونے اور نیند ٹوٹ جانے پر اسے کیسے بھیانک دن کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ روشن دن کھاری کے لیے روشن زندگی کی نوید لے کر آیا تھا۔ وہ گدا سے شاہ بننے والا تھا مگر غریب سعدیہ کو ناکردہ جرم کی نسل در نسل بھگتنے والی سزا منتقل ہونے کو تھی۔ کوئی پل جاتا تھا کہ کھاری کی زبانی اسے حکم نامہ سنایا جانے کو تھا' اعلا نسب' صاحب حیثیت' بلال سلطان کے بیٹے کی زندگی میں سراج سرفراز اور رابعہ کلثوم کی بیٹی کے لیے کوئی جگہ نہیں بنتی' ذات پات' حسب نسب' ایک بہت بڑی خلیج کی مانند اس کے اور خواب ناک زندگی کے درمیان آکر ٹھہر چکے ہیں۔

اس نے آہ بھرتے ہوئے اپنے حلق سے نکلتی سسکیوں کو روکنے کی خاطر اپنے منہ میں دوپٹا ٹھونس لیا۔ اس کے انگوٹھے تلے رہنے والا کھاری' انگوٹھے کے نیچے سے نکل کر قابل ذکر قد کاٹھ نکالتا سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ سعدیہ کو اس گلیور کے سامنے اپنا آپ ایک ایسے بونے کی طرح لگ رہا تھا جو ناتواں تھا اور جس کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ اس نے اس منظر سے نظریں چرانے کے بعد آنکھیں سختی سے بند کر لیں۔

"بڑی ہی سختی کے دن آن ٹھہرے ہیں سعدیہ!" اس کے کانوں میں کھاری کی بوجھل آواز سنائی دی۔ وہ سعدیہ کے قریب بیٹھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ سعدیہ لاشعوری طور پر سمٹ کر ذرا فاصلے پر کھسک گئی۔

"لو بتاؤ بھلا میں انسان نہ ہوا جانور ہو گیا' کبھی ایک جگہ باندھ دو' کبھی کسی اور جگہ۔ میں نہ تو خود کو اجنبی محسوس کروں نہ ہی شور مچاؤں۔ نا بابا نا۔"

سعدیہ نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول کر دیکھا' وہ دونوں کانوں کی لوؤں کو دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے چھوتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میں غریب بندہ چٹا ان پڑھ اور جاہل اس انگریز نما باپ کو باپ کیسے مان لوں۔ چاہے وہ کتنا ہی بے چارا کیوں نہ ہو۔"

"وہ بے چارا ہے کیا؟" خوف سے بھرے لفظ سعدیہ کے منہ سے پھسلے۔

"آہو!" کھاری نے سر ہلایا۔ "مجھے چودھری صاحب نے ساری بات بتا دی ہے بھین جی کو غلط فہمی ہوئی تھی۔ میری ماں کو' میرا مطلب ہے سعد باؤ کی ماں کو انہوں نے نہیں مارا۔ یاد ہے نا بھین جی نے ساری گل سنائی تھی۔۔۔"

سعدیہ نے ہونقوں کی طرح سر ہلا دیا۔

"وہ سعد باؤ کی ماں ہی نہیں تھی' وہ میری بھی ماں تھی۔" اس کی آواز بھر آنے لگی "کسی ظالم نے چھرا پھیر کر میری ماں کا

گلا کاٹ دیا تھا۔" وہ ماند آواز میں ابھی برسوں پہلے مری ماں کو رونے لگا تھا۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔

"سعدیہ باؤ! بڑے خواب دیکھتا تھا میں۔" پھر اس نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔ "جو کبھی میری ماں مجھے مل گئی تو اس کے قدموں میں بیٹھ جاؤں گا' اس کے پیر پکڑے اس کی شکل تکتے تکتے باقی کی ساری زندگی گزار دوں گا۔۔۔۔

میں غریب کب جانتا تھا کہ ماں تو اسی دن ہی مر گئی تھی' جس دن میں دنیا میں آیا تھا۔" وہ ایک مرتبہ پھر رونے لگا تھا۔

کھاری کو تسلی دیتی سعدیہ خود بھی اس کے ساتھ اس عورت کو رو رہی تھی' جس کی زندگی اور موت' دونوں ہی کئی اور زندگیوں کے لیے المیہ بن چکی تھی۔

"پر بھین جی غلط سمجھیں' ماں کو بلال صاحب نے نہیں مارا تھا۔۔۔۔" روتے روتے ایک بار پھر کھاری نے اس حقیقت کو دہرایا جو کہانی کا مرکزی نکتہ تھی' "وہ تو خود بھی بڑے ہی بے چارے ہیں۔ ایک بیٹا سالوں پہلے ہاتھ سے گنوا بیٹھے' دوسرا اب آکر ہاتھ سے گیا۔ وچارے بلال صیب' نہ دھن نہ دولت' نہ گھر نہ بار۔۔۔۔ جج وی انہیں راس نہ آیا۔ وہ مشین جیسے لگتے ہیں جیسے مشین کا ٹائم لگا دیا جائے تو وہ ٹک ٹک کرتی اپنا کام کرتی رہتی ہے۔"

"چلو شکر کرو کھاری! ماں نہ سہی' تمہیں اپنا باپ تو مل گیا' ابا جی بتا رہے تھے تمہارے اچانک مل جانے پر وہ' جن کو کبھی کسی نے روتے نہیں دیکھا تھا' زار و قطار رو رہے تھے۔" سعدیہ نے اپنے دل پر بھاری پتھر رکھتے ہوئے وہ بات کہی جسے کہتے اس کا کلیجہ پھٹنے کو آرہا تھا۔

"آہو شکر اے۔" اس نے قمیص کی آستین سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "مگر اب کیا فائدہ' اب نہ میں ان کے کسی کام کا ہوں نہ ہی وہ میرے کسی کام کے ہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" سعدیہ نے چونکتے ہوئے کہا "وہ تمہارے باپ ہیں' ان کے پاس بے حد و حساب پیسہ ہے' تمہاری تو لاٹری نکل آئی کھاری! اب تم آئندہ کی زندگی بہت اچھی گزارو گے' فارم ہاؤس اور چودھری صاحب کی چاکری سے آزاد ہو جاؤ گے۔ پینٹ کوٹ' پالش شدہ مہنگے جوتے پہن کر قیمتی ترین گاڑیوں میں گھوما کرو گے۔ تمہارے والد دنیا کی ہر نعمت تمہارے قدموں میں ڈھیر کر سکتے ہیں۔ وہ کسی بہت امیر کبیر' اونچی حیثیت والے باپ کی بیٹی سے تمہاری شادی کروا دیں گے۔ پھر تم بالکل صاحب لگو گے صاحب' جب بھی یہاں گاؤں آؤ گے' لوگ دور سے ہی تمہیں دیکھ کر سلام کیا کریں گے۔"

سعدیہ کو خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب باتیں کرنے سے پہلے اس نے اپنے دل پر جو پتھر رکھا تھا' اس کا وزن کتنا تھا۔

"اوئے اللہ دا واسطہ اے سعدیہ باؤ!" کھاری کو جیسے ڈنک لگا تھا' وہ اچھل کر پیچھے ہوا۔ "کیسی باتیں کرنے لگی ہو۔ اللہ نہ کرے جو میں پینٹ کوٹ پہن کے گڈیاں چلاؤں۔ توبہ توبہ توبہ ہزار واری توبہ۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "سعدیہ میں کیا خرابی ہے' جو میں کسی امیر باپ کی بیٹی سے شادی کرواؤں گا۔ میں تو اللہ کا شکر ہے پہلے ہی شادی شدہ ہوں۔"

"نہیں کھاری۔" سعدیہ نے افسردگی سے کہا "تمہارے والد مجھے کبھی بھی تمہاری بیوی کی حیثیت میں قبول نہیں کریں گے۔ تم نہیں جانتے' وہ میرے ابا جی اور اماں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں' ابا جی بے چاروں کا تو دنیا میں شاید ہے ہی کوئی نہیں۔ اماں میراثیوں کی اولاد ہیں۔ تمہارے والد کی حیثیت بہت اونچی ہے۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتے ہوں گے کہ قسمت ان کے ساتھ ایسا ظالمانہ مذاق کرے گی کہ ان کے کسی بیٹے کا رشتہ ابا جی اور اماں کی بیٹی سے جڑ گیا ہو گا۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو سعدیہ باؤ۔" کھاری رونا دھونا بھول گیا۔ "بلال صاحب نے تو چودھری صاحب کا بڑا شکریہ ادا کیا ہے کہ انہوں نے میری شادی بھین جی اور مولی جی کی بیٹی سے کرا دی۔ وہ کہتے ہیں ایسی تربیت کوئی اور نہیں کر سکتا ہے اپنی بیٹی کی۔"

سعدیہ کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"وہ تو تمہیں ملنے کے لیے ادھر آنے ہی لگے ہیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"اور اگر وہ راضی نہ بھی ہوتے تو سعدیہ کیا تم نے کھاری کو اتنا ہلکا سمجھ لیا تھا کہ امیر کبیر باپ کو دیکھ کر کھاری اپنا راستہ بدل لیتا۔ کھاری قول کا بندا ہے سعدیہ باؤ! اس نے تمہارے ساتھ قول کا رشتہ باندھ رکھا ہے' روپیہ پیسہ اس قول کے سامنے کیا حیثیت رکھتا ہے۔"

کھاری کہہ رہا تھا اور سعدیہ کو ایسا لگ رہا تھا اس کے سینے پر دھرا بھاری پتھر کسی نے اٹھا کر دور پھینک دیا تھا۔ روشن دن کی چمک میں بھی اس کے ارد گرد ستارے اتر رہے تھے' وہ دن میں بھی آنکھیں موند کر اپنے خوابوں کی دنیا میں جا سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

''چندر شیکھر واپس چلا گیا کیا؟'' سعد نے نادیہ سے پوچھا جو چھٹی کے دن ہفتہ واری صفائی میں مصروف تھی۔

''ہاں!'' نادیہ نے مختصر جواب دیا۔

''ہیلسنکی گیا ہے کیا؟''

''نہیں' وہ ہندوستان گیا ہے' کسی ہندوستانی لڑکی سے شادی کرنے کا ارادہ لے کر۔'' نادیہ نے ڈسٹر کو کوڑے دان میں جھاڑتے ہوئے کہا۔

''اچھا!'' سعد نے نادیہ کے چہرے کے تاثرات جانچنے کی کوشش کی لیکن نادیہ کا چہرا بے تاثر تھا۔

''تمہیں کیسا لگ رہا ہے اس کا ارادہ جاننے کے بعد؟''

''مجھے کیسا لگنا چاہیے۔'' نادیہ نے کام میں مصروف ہاتھ روکتے ہوئے پوچھا۔

''کیا تمہیں نہیں لگتا' چندر شیکھر ایسے لوگوں میں سے ہے' جن کے بارے میں دل چاہتا ہے ان کا ہماری زندگیوں میں قیام دائمی ہو جائے؟'' سعد نے سوال کیا۔

نادیہ ڈسٹر ہاتھ میں پکڑے کچھ دیر اس کی طرف دیکھتی رہی اور' پھر اس نے اپنا رخ دوسری طرف موڑ لیا۔

''میں ایسی کوئی بات اس لیے نہیں سوچتی کہ میری زندگی میں لوگوں کا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے' کسی کا قیام بھی دائمی نہیں ہو گا۔''

''کیوں تمہیں کیسے معلوم کہ ایسا ہو گا' ضروری تو نہیں کہ.....''

''ضروری ہے بلکہ یقینی ہے۔'' وہ دوبارہ کام میں مصروف ہو چکی تھی ''ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا چلا آتا ہے اس لیے میں نے خوش فہمیوں میں مبتلا ہونے کی عادت ہی نہیں ڈالی خود کو۔''

''اور پھر بھی تم خوش ہو؟'' سعد نے سوال کیا۔

''ہاں' پھر بھی میں خوش ہوں' خوش رہنے کے لیے میرے پاس اور بہت سی وجوہات جو ہیں۔'' اس نے ڈش واشر کھول کر اس میں برتن رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''مثلاً''.....؟''

''مثلاً''' وہ ڈش واشر بند کر کے اس کی طرف پلٹی۔ ''میری حالیہ زندگی جس میں' میں مصروف اور مگن ہوں.....''

''تم قرآن پاک پر اور اسلام کی تاریخ پر تحقیق کر رہی ہو' تمہاری کوئی خاص سماجی زندگی نہیں ہے' تم مخصوص وقتوں میں مخصوص کاموں میں مصروف رہتی ہو یا پھر فارغ وقت میں مسلسل عبادت کرتی ہو۔ کیا مجھے تمہیں یاد دلانا پڑے گا کہ ہمارے مذہب میں راہباؤں والی زندگی کا کوئی تصور موجود نہیں۔'' سعد نے کہا۔

''پتا نہیں۔'' نادیہ نے سر جھٹکا۔ ''مگر جو بھی ہے' میں اس زندگی میں خوش ہوں۔''

''مگر میں تمہاری اس زندگی سے خوش نہیں ہوں۔'' سعد نے کہا ''اگر تمہاری نظر میں کوئی لڑکا ہے جو تم سے اور تم اس سے شادی کر کے خوش رہو گی تو مجھے بتاؤ' ورنہ میں خود تمہارے لیے کوئی مناسب لڑکا دیکھتا ہوں.....''

''اوہو!'' نادیہ ہنس دی ''تم خود ڈھونڈو گے میرے لیے زندگی کا ساتھی۔''

''ہاں بالکل!'' سعد اس کے انداز پر حیران ہوا۔

''یوں اس ایک کمرے کے فلیٹ میں بیٹھے بیٹھے پوری دنیا سے کٹے ہوئے تم میرے لیے زندگی کا مناسب ساتھی ڈھونڈو گے۔'' وہ مذاق اڑانے لگی۔

''بہتر ہو گا' تم مجھے چیلنج مت کرو' کہیں ایسا نہ ہو اسی ایک ہفتے میں' میں لڑکا لا کر تمہارے سامنے کھڑا کر دوں اور تمہیں اس سے نکاح پڑھوا لینے پر مجبور کرنے لگوں۔'' سعد نے سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کی۔

"چلو یونہی سہی۔" وہ ہنوز مذاق کے موڈ میں تھی۔ "ایک نہیں تم دو ہفتے لے لو، چیلنج ہے تو چیلنج ہے۔۔۔"

"ضرور" وہ مسکرا کر بولا "لیکن پھر تمہیں بلا چون و چرا اس میری بات ماننی پڑے گی۔۔۔"

"فکر مت کرو، مجھے تم پر پورا بھروسا ہے۔" وہ بہت دنوں بعد ہلکے پھلکے موڈ میں آئی تھی اور اسے اس مسلسل مذاق میں مزا آرہا تھا۔

"لیکن اگر ہفتے دو ہفتے میں چیلنج پورا ہوگیا اور تم نے میرا نکاح پڑھوا دیا تو اس کے بعد تم کیا کرو گے، بالکل اکیلے نہیں رہ جاؤ گے۔" رات کا کھانا کھاتے ہوئے اسے اچانک دن میں ہونے والی بات یاد آگئی تھی اس نے اسے دوبارہ چھیڑ دیا۔

"اچھا ہے نا، اکیلا پڑا تمہیں یاد کرتا رہوں گا، تمہیں چھینکیں آآ کر زکام لگ جائے گا۔" وہ مسکرایا۔

"مجھے یاد کرتے رہو گے، کسی اور کو نہیں۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔

"کسی اور کو، کس کو؟" وہ چونکا۔

"تم جانتے ہو، میں ماہ نور کا ذکر کر رہی ہوں، وہی ماہ نور جس کی یاد تمہیں رات بھر سونے نہیں دیتی۔"

"تم سے کس نے کہا؟" وہ یک دم انجان نظر آنے لگا۔

"مجھے کسی کا کہا سننے کی ضرورت کہاں ہے، میں تمہیں خوب جانتی ہوں۔" وہ پورے یقین کے ساتھ بولی تھی۔

"ہاں وہ میرے وجود کا حصہ تھی، ہے اور ہمیشہ رہے گی۔" وہ اچانک بولا تھا، نادیہ کو اس سے ایسے کھلے اعتراف کی توقع نہیں تھی۔

"لیکن اس کی زندگی کا حصہ بننا میری قسمت میں نہیں تھا۔ میری ذاتی زندگی کے عظیم المیے نے اس کے چہرے کو اجنبی چہروں کے ہجوم میں کہیں گم کر دیا ہے۔ اب میں چاہوں بھی تو اسے تلاش نہ کرپاؤں گا۔" وہ کہے چلا جا رہا تھا۔

"جو اتنے عزیز ہوتے ہیں، وہ یوں اتنی آسانی سے گم نہیں ہو جاتے، ہجوم میں لاکھ اجنبی چہرے ہوں، ایک شناسا چہرے کی تو بس ایک جھلک نظر آجانا ہی کافی ہوتی ہے، انسان اس شناسا چہرے تک خود بخود پہنچ جاتا ہے۔" نادیہ کہہ رہی تھی۔

وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا نہ ہی اس نے نادیہ کی بات کا جواب دیا تھا۔

"اپنی انا کو راستے کا پتھر مت بناؤ سعد، پلٹ کر دیکھنے میں، آدھے راستے سے واپس لوٹ جانے میں، خود سے پکار لینے میں، اپنی حماقت کا اعتراف کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ محبت اتنی بے مول چیز نہیں کہ اسے اتنی چھوٹی باتوں کے ہاتھوں پر ہاتھ سے گنوا دیا جائے۔"

"شاید وہ ایک واہمہ تھا محبت نہیں۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ "ایک وقتی جذبہ۔ جب ہی تو اس میں تڑپ پیدا ہوئی نہ پکارنے کا حوصلہ اور تو اور براہ راست اظہار کا موقع بھی نہیں ملا۔ شاید وہ محبت تھی ہی نہیں۔" اس نے نادیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو ذرا کہ وہ محض واہمہ تھا۔" نادیہ نے کہا۔ "آج مجھے تو یہ بتا ہی دو کہ ڈیڈی والے انکشاف نے تمہیں زیادہ مغلوب کیا یا ماہ نور کو کھو دینے کے احساس نے؟"

"دونوں کے درمیان ایک عجیب سا ربط ہے۔ ڈیڈی والا انکشاف غیر متوقع تھا اور میرا اس پر ردعمل اس سے بھی زیادہ غیر متوقع۔ میں نے اپنی زندگی کی ہر قیمتی شے اس آزمائش میں ہار دی۔ مجھے اپنی اس تہی دامنی پر زندگی بھر افسوس رہے گا۔" اس رات شاید وہ اعتراف کے موڈ میں تھا۔

"یہ دنیا بہت چھوٹی ہے۔" نادیہ نے میز پر دھرے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں یقین دلاتی ہوں یہ دنیا انتہائی چھوٹی ہے۔" سعد نے دیکھا ایسا کہتے ہوئے نادیہ کی آنکھوں میں اس کے لیے محبت کی جوت چمک رہی تھی جیسے اس کا بس نہ چل رہا ہو کہ وہ سعد کے حصے کی ساری خوشیاں اس کے قدموں میں ڈھیر کر دے۔

"سب کچھ گنوا کر اس سچی اور بے مثال لڑکی کی محبت باقی رہ جانا بھی غنیمت ہے۔" اس نے سوچا اور مسکرایا۔

☼ ☼ ☼

"پتا نہیں کیوں مجھے پہلے ہی لگتا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ جانے سے انکار کر دے گا۔" فلزا نے آنکھوں سے چشمہ ہٹا کر

اخبار میز پر رکھتے ہوئے بلال سلطان سے کہا۔

"تم نے زندگی میں شاید ہی کبھی کوئی اچھی بات سوچی ہو۔" بلال نے جھنجلا کر جواب دیا۔ "سچ سچ بتاؤ تمہاری زبان پر سیاہی کا کوئی داغ تو نہیں۔"

"ایسا اس لیے ہے کہ میں دل سے نہیں دماغ سے سوچتی ہوں۔" فلزا کا موڈ خراب ہونے لگا۔

"ہاں جب ہی تم اس نوزائیدہ بچے کو بس اسٹاپ پر مرنے کے لیے چھوڑ آئیں' اس لیے کہ تم دل سے نہیں دماغ سے سوچتی ہو۔"

"زندگی بھر کا واحد ایسا کام جس پر میں تم سے بہت شرمندہ ہوں' میری وجہ سے تمہارا بہت بڑا نقصان ہوگیا۔" فلزا کی آواز پست ہوگئی۔

"میں بظاہر کتنا بے حس اور خود غرض لگتا ہوں... لگتا ہوں نا!" بلال سلطان نے سوال کیا۔ فلزا نے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا' وہ اپنے ماضی کی طرح آج بھی ویسے ہی دلکش تھے۔ کنپٹیوں پر موجود سنہرے بالوں اور پیشانی پر ظاہر ہوتی بڑھتی عمر کی چند لکیروں کے سوا ان میں کچھ زیادہ فرق نہیں آیا تھا۔

"شاید دوسروں کو تم لگتے ہو لیکن مجھے نہیں لگتے' اس لیے کہ میں جانتی ہوں تم بے حس ہو نا ہی خود غرض۔" فلزا نے سچائی کے ساتھ جواب دیا۔

"اور وہ دن یاد کرو جب تم نے اپنا پورٹ فولیو میرے منہ پر مارتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ مجھ ایسا خود غرض' بے حس' پتھر دل اور سفاک آدمی تم نے کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔" بلال سلطان ہلکا سا مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ میں عجیب سی اداسی تھی۔

"ہاں!" فلزا کی نظروں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا۔ "اس لیے کہ اس وقت شاید میرا اوژن خاصا امیچیور تھا۔"

"کیا اب تمہارا اوژن میچیور ہوچکا ہے۔" بلال سلطان نے سوال کیا۔

"کل جب کھاری نے پہلے تم سے ملنے' تمہارے گلے لگنے سے انکار کردیا اور "نہیں ہے یہ میرا باپ" کی گردان کرنے لگا تو مجھے ایسا لگا جیسے برسوں پہلے جو چھرا شہناز کے گلے پر چلا تھا اس کی اذیت اس اذیت سے کہیں کم ہوگی جو کل کھاری کے رد عمل پر تمہارے اندر اٹھی ہوگی۔" فلزا نے کہا اور بلال سلطان کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ اس نے غور کیا ایک رات کے اندر اندر ہی ان کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے سے بن گئے تھے۔

"تم اگر سعد کا وہ پیغام پڑھ لو جو اس نے جانے سے پہلے میرے نام لکھا تھا تو شاید تمہیں لگے اس کے رد عمل میں جو اذیت میرے اندر اتری تھی' وہ اس سے کہیں زیادہ تھی جو کھاری کے رد عمل سے ہوئی۔ کھاری تو مجھ سے ناواقف تھا' سعد کو تو میں نے اپنے ہاتھوں سے پالا تھا' وہ تو قدم قدم پر میرے ساتھ رہا تھا۔ چوہدری سردار کی ادھوری انفارمیشن' تمہاری ادھوری پینٹنگز اور ماہ نور کی خالاؤں کی ادھوری گفتگو' سب ادھورے میں سے ایک مکمل نتیجہ اخذ کرنے میں اس نے ذرا دیر نہیں لگائی اور اس مکمل نتیجے کے ذریعے اسے مجھ سے بدظن ہونے میں اس سے بھی کم وقت لگا' میں تو اس بدظنی کا سامنا کرنے کے بعد بھی زندہ رہا۔" وہ تلخی سے مسکرائے۔ "ثابت ہوا کہ میں واقعی خاصا بے حس اور بے نیاز ہوں۔"

"سعد تم سے جتنی شدید محبت کرتا ہے' یہ رد عمل اسی محبت کا مظہر ہے۔ ایک انتہا کا فطری رد عمل دوسری انتہا ہے۔ کیا تمہیں اس انتہا کو دیکھ کر تسلی نہیں ہوئی کہ اس کی تم سے محبت کی شدت کیا ہے؟" فلزا نے کہا۔ "میرے اسٹوڈیو کو دیکھنے کی خواہش میں تمہیں جاننے کی خواہش پنہاں تھی۔ میرے اسٹوڈیو میں موجود وہ لیسٹ جو میں نے کسی زمانے میں تمہارا بنایا تھا دیکھنے کی خواہش میں اس نے اپنا ہاتھ زخمی کرلیا' تمہیں جان لینے کے جنون نے اسے میری مڈنائٹ ان ہیون والی پینٹنگ مجھ سے مانگ لینے پر مجبور کیا۔ کیا اس سارے عمل میں تمہیں اس کی تم سے محبت کی شدت نہیں نظر آتی۔"

"مگر اس کا نتیجہ کیا نکلا' جان لینے کا جنون' نفرت کے خونی سمندر میں جاکر ڈوب مرا۔ ایک انتہا دوسری انتہا کی طرف اتنی تیزی سے مڑی کہ اس نے درمیان میں رک کر مجھے کسی کٹہرے میں کھڑا کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔"

بلال کے چہرے پر کرب تھا۔ فلزا کو سمجھ میں نہیں آیا وہ بلال کی اس بات کا جواب کیا دے۔

"ثابت ہوا کہ مجھ سے زیادہ ناکام کوئی دوسرا شخص دنیا میں نہ ملے شاید۔ میں نے سعد کو جس کرب سے بچانے کے لیے

اسے اس کی ماں کے تذکرے سے دور رکھا اس کرب نے اسے کسی اور ہی رنگ میں آلیا۔ میں نے اپنی اس بیٹی سے جس کی ماں اسے مجھ سے یہ کہہ کر چھین کر لے گئی کہ وہ میری بیٹی ہی نہیں' جدائی اس لیے گوارا کرلی کہ بیٹی ماں کے جھوٹ اور سچ کے درمیان پس کر خود اپنے آپ سے نفرت نہ کرنے لگ جائے۔ میری وہ بیٹی نہ ماں کی رہی نہ میری' اب نجانے کہاں کس حال میں جیتی ہوگی۔"

"اوہ۔" فلزا چونکی۔ "وہ کون تھی؟"

"تھی ایک۔" بلال نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "انسان خطا کا پتلا ہے اس بچی کی ماں نے دعوا کیا کہ وہ میری بچی ہی نہیں تھی' میری مردانگی کے لیے اس سے بڑی چوٹ اور کیا ہو سکتی تھی۔ میں نے اسے بچی لے جانے دی' حالانکہ میں سچ یا جھوٹ جاننے کے لیے بہت سے طریقے اپنا سکتا تھا' مگر میں پہلے ہی ایک بن ماں کا بچہ پال رہا تھا' بن ماں کی ایک اور بچی پالنے کا حوصلہ اس احساس کے ساتھ نہ کرپایا کہ ہوسکتا ہے' اس کی ماں کا دعوا سچا ہو۔ اس دعوے نے دنیا کے ہر رشتے سے میرا اعتبار ختم کردیا تھا۔ میں نے خود پر بے حسی کی چادر اوڑھ لی اور خود کو حیثیت کے قلعے کے حصار میں بند کرلیا۔ آج یاد کرنے بیٹھتا ہوں تو سوچتا ہوں اس بچی کے ساتھ میں نے ایسا کیوں ہونے دیا۔ بھولے سے بھی کوئی واقعہ ایسا یاد نہیں آتا جو اس کی پیدائش سے پہلے اس کی ماں کی کسی بے وفائی کا شک ڈالتا ہو' لیکن میں نے خود کو اولاد کے معاملے میں اتنا بد قسمت تسلیم کرلیا تھا کہ ہر انہونی کو ہوجانے دیا اور وہ بچی خود سے جدا کرڈالی۔"

"اوہ میرے خدا!" فلزا پریشان ہوتے ہوئے بولی۔ "اب کہاں ہے وہ؟"

"پتا نہیں۔" وہ ٹرانس کی کیفیت میں بولے۔ "سعد کا اس کے ساتھ رابطہ رہتا تھا اور وہ مجھے بتانے کی کوشش بھی کیا کرتا تھا' مگر میں یوں سنتا جیسے وہ کسی اجنبی کا ذکر کررہا ہو....."

"کیوں؟"

"اس لیے کہ میرا دل اس کو تسلیم کرنے پر مائل ہی نہیں ہوتا تھا۔ میں اس کی ماں کے دعوے کو بھلا ہی نہ پاتا تھا۔ انسان کی خود ساختہ انا اس سے ایسی حماقتیں نہ کروائے تو کیا وہ ایسا ہی خسارے میں رہے جیسے میں رہا۔"

"اور اب یہ کھاری!" فلزا کو بلال کا دکھ اپنے دل پر چھاتا محسوس ہوا۔ "یہ تمہارے ساتھ جانے سے انکاری ہے۔ کیونکہ تم اسے اجنبی لگتے ہو' وہ اس ماحول' اس فضا سے مانوس ہے' وہ یہاں سے کہیں اور جانا نہیں چاہتا....."

"وہ ایسا نہ کرتا تو مجھے حیرت ہوتی۔" بلال نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "وہ جو کہہ رہا ہے' ٹھیک کہہ رہا ہے' مگر شکر ہے' اس نے وہ نہیں کیا جس کی مجھے توقع تھی۔ کل رات وہ میرے گلے لگا۔ میرے سینے پر سر رکھ کر بیٹھا رہا۔ اس نے میری پیشانی اور میرے ہاتھ چومے۔ میرے گھٹنے دبائے اور مجھے "ابا جی" کہہ کر پکارا' ایسے تو کبھی سعد نے بھی نہیں کیا۔ برسوں بعد مجھے لگا جیسے میرے اندر بھڑکتی آگ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پڑے ہوں۔ میرے بے چین وجود میں سکون کی ٹھنڈک اتر رہی ہو۔"

"مگر تمہیں اسے دیکھ کر افسوس تو ہوتا ہوگا' تم بھول کر بھی کبھی اپنے بیٹے کو ایسا نہ دیکھنا چاہتے جیسا وہ بن چکا ہے۔"

"میں نے کہا نا' ہر چیز کا "اختیار" اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو انسان تو بڑا ہی سرکش اور بے مہار مخلوق ہے۔" بلال نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اور کھاری کی دلہن جو مولوی صاحب اور رابعہ کی بیٹی ہے' تم رابعہ کی فیملی کے متعلق کچھ مشکوک ہونا۔" فلزا ان سے ہر سوال اس روز ہی کرلینے پر تلی ہوئی تھی۔

"وہ بھی میرا واہمہ تھا۔ ذات اور حسب نسب نہ تو انسان نے خود بنائے نہ ہی خود بنانے کا اختیار اس کے پاس ہے۔ لیکن پھر بھی انسان نے انہیں اپنے لیے فخر اور شرم کا ذریعہ بنالیا۔ میرا کیا کمال ہے کہ میرا تعلق ایک اعلا نسب خاندان سے ہے اور رابعہ کا کیا قصور ہے کہ وہ اس خاندان سے ہے' جسے معاشرے نے استہزاء کا نشانہ بنا رکھا ہے۔ افسوس میں رابعہ کے لیے ایسا سوچتا رہا۔ سراج سے وفا کرکے اور شہناز سے وہ سب سیکھ کر جو میں اس سے نہ سیکھ پایا' رابعہ نے ثابت کردیا کہ وہ مجھ سے کہیں بہتر انسان ہے۔ کھاری جیسے معصوم اور بھولے بھالے لڑکے کے لیے رابعہ کی بیٹی سے بہتر انتخاب کیا ہوگا اور اب اس انکشاف کے بعد کہ کھاری شہناز کا بیٹا ہے۔ تم دیکھنا ان تینوں کی کھاری سے محبت کا رنگ کیا ہوتا ہے۔"

''عجائب خانہ۔ یہ دنیا ایک بہت بڑا عجائب خانہ ہے۔'' فلزا نے بلال کی ساری باتیں سن کر کہا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا' نظر آتے کس منظر پر یقین کیا جائے کس پر نہیں۔''

''تم تو ایسا مت کہو' تم تو دل سے نہیں دماغ سے سوچتی ہو تمہارا وژن تو اچھا بھلا میچیور ہو چکا ہے۔'' بلال ہلکا سا مسکرائے اور پھر سنجیدہ ہو گئے۔

''میں معذرت خواہ ہوں فلزا! میں اپنے لیے تمہارے جذبات کا مثبت جواب کبھی نہ دے سکا۔''

''اس میں تمہارا کیا قصور' ضروری تو نہیں جیسے میں تمہارے لیے سوچتی تھی ویسا ہی تم بھی میرے لیے سوچتے۔'' فلزا ہونٹ بھینچ کر مسکرائی۔ ''اور معذرت خواہ تو مجھے ہونا چاہیے میں نے انجانے میں دوبار تمہارے بہت بڑے نقصان کردیے۔ دونوں بار میں ہی تمہارے بیٹے تم سے جدا کردینے کا باعث بن گئی۔''

''تم بدنیت نہیں تھیں اسی لیے دیکھ لو۔ ماہ و سال کیسے مجھے واپس اپنے بیٹے کے پاس لے آئے۔'' بلال نے اس کی شرمندگی کم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''اور سعد؟'' فلزا نے سوال کیا۔

''سعد!'' وہ مسکرائے۔ ''اس کی تم فکر مت کرو' وہ مجھ سے زیادہ اب کسی اور کے دل کا معاملہ بن چکا ہے۔''

☼ ☼ ☼
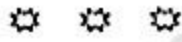
''ماہ نور! شاید تم کبھی بھی بڑی نہیں ہوگی۔''

''اور شاید میرے بوڑھے ہوجانے تک آپ کا میرے بارے میں یہ ہی خیال رہے گا۔ ممی۔''

''ہاں جیسے تمہارے بڑھاپے تک میں دنیا ہی میں بیٹھی ہوں گی۔''

''دیکھ لیجئے گا آپ کو عمر خضر عطا ہونے والی ہے۔''

''بکواس بند کرو اور یہ جو کر کے تم نے گولا بنا کر بیگ میں ٹھونسا ہے اسے نکال کر ٹھیک طریقے سے تہہ لگا کر رکھو۔''

''اُفوہ ممی! طریقے سے کپڑے رکھنے سے وہ بیگ میں کبھی بھی پورے نہیں آئیں گے۔''

''تم رکھ کر دیکھو جتنے رکھنا چاہتی ہو' اس سے دگنے آجائیں گے۔'' فائزہ نے اس کے بیگ سے سارے کپڑے نکال کر بیڈ پر پھینکتے ہوئے کہا۔

''ہائے ممی! سارے کپڑے نکال دیے اتنی مشکل سے سیٹ کیا تھا بیگ۔'' وہ چلائی۔

''سیٹ کیا تھا یا کاٹھ کباڑ کا ڈربا بنایا تھا' رکو میں نے تمہیں رکھ کر بتاتی ہوں بیگ کیسے تیار کیے جاتے ہیں۔'' فائزہ نے کہا۔

''ارے بھئی' یہ کون کدھر جارہا ہے۔'' فاطمہ جو ماہ نور کے ہاں تازہ اترے کینو دینے آئی تھیں' اس چیخ پکار کو سن کر اندر آتے ہوئے بولیں۔

''کون جاسکتا ہے ان محترمہ کے علاوہ۔'' فائزہ نے منہ بنا کر کہا۔ ''جارہی ہے اسلام آباد۔''

''اسلام آباد۔'' فاطمہ مسکرائی۔ ''لڑکی تمہیں اس شہر سے تو زیادہ ہی عشق نہیں ہوگیا۔''

''عشق سے اگلی بھی اگر کوئی منزل ہے تو شاید وہ ہوگئی ہے۔'' وہ بغیر جھجکے بولی اور فاطمہ کی لائی ٹوکری سے کینو نکال کر چھیلنے لگی۔

''آپ کے ہاں کوئی مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں کیا فاطمہ آپا۔'' فائزہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں میری ایک کزن آئی ہوئی ہے پیرس سے' رئیسہ نام ہے اس کا۔ بہت سالوں بعد آئی ہے پاکستان۔ اسے اپنے اس بھانجے سے ملنا ہے جس کی ماں کے حصے کی جائیداد پر عرصہ پہلے اس نے ناجائز قبضہ کرلیا تھا۔ اب اچانک ضمیر جاگا ہے' مجھ سے بات کی' میں نے کہا تو آؤ اور حق دار کو اس کا حق دے دو' آخرت سنوار لو اپنی۔''

''تو اس کے بھانجے سے ملتی رہتی ہیں کیا آپ' کیا بہت بڑی جائیداد ہے کزن کے پاس' جو حصہ دینے کا خیال آگیا۔''

''ایسی ویسی۔ بڑی پیرس میں شاندار مینشن کی مالک ہیں اور ادھر بھانجے صاحب بھی کم مال دار نہیں بس مایا کو مایا ملنے

والی بات ہے۔ کیوں ماہ نور۔" فاطمہ نے معنی خیز نظروں سے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"بابا۔" ماہ نور نے سمجھے بغیر کہا۔ "یہ تو ہندو لڑکیوں کا نام نہیں ہوتا فاطمہ خالہ۔"

"اوہ یہ لڑکی۔" فائزہ نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "آپ نے دیکھا' یہ کبھی سمجھ دار ہوگی نہ بڑی ہوگی۔۔۔" انہوں نے فاطمہ کی طرف دیکھا۔ "اسے محاورے تک نہیں آتے۔"

"یہ بڑی سمجھ دار ہے' تم دیکھتی جاؤ' یہ کیا کرتی ہے۔" فاطمہ نے مسکرا کر کہا۔

"دیکھتے ہیں کیا کرتی ہے' ایک تو اس کے بابا کو اس سے بڑی توقعات ہیں۔ دوسرے آپ کو' دیکھیے پہلے کون لیٹ ڈاؤن ہوتا ہے۔" فائزہ نے کہا اور ماہ نور کا بیگ سیٹ کرنے لگیں۔

☆ ☆ ☆
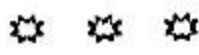
"ہاں بھئی سعد! یہ رئیسہ سے بات کرلو۔ بے چاری برے انجام سے ڈرتی تمہیں ڈھونڈتی پاکستان آپہنچی' اسے کیا معلوم تم وہیں کہیں بیٹھے ہو یورپ میں۔" فاطمہ خالہ نے اس کا وہ نمبر محفوظ کر رکھا تھا جس پر یہاں آنے کے بعد اس نے ایک مرتبہ کال کی تھی۔

"میں ان سے بات کرکے کیا کروں گا فاطمہ خالہ۔"

"ارے بھئی رئیسہ تمہاری خالہ ہے' تمہاری مرحومہ ماں کی سگی بہن' ماں کی بہن سے ماں جیسی خوشبو ہی تو آتی ہے نا۔"

"ماں کی وہ بہن جس نے انہیں اس وقت چھوڑ دیا جب وہ برے حالات میں تھیں۔"

"ہاں۔ بس اسی بات کا تو غم کھائے جاتا ہے اب اس کو' بے چاری شوگر اور آرتھرائٹس کی مریضہ ہے' میں تو اسے دیکھ کر حیران رہ گئی' بہترین لیونگ اور سپر کلاس علاج کے باوجود لگتا ہے جیسے اس کی ہڈیاں بھی گھل رہی ہوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے میں کرلوں گا ان سے بات' آپ نے ہی بتایا ہوگا انہیں میرے بارے میں۔ ہے نا۔"

"ہاں بالکل۔"

"مگر سچ یہ ہے کہ اپنی ماں کے حوالے سے آپ اور خدیجہ خالہ مجھے زیادہ عزیز ہیں۔ شاید آپ دونوں کے علاوہ خاندان بھر میں وہ کسی کو یاد بھی نہ ہوں۔"

"بس بیٹا! چھوٹے چھوٹے گلے' شکوؤں میں نہ پڑو۔ جس وقت انسان جوان اور طاقت ور ہوتا ہے' اسے غلط صحیح کا اندازہ نہیں ہو پاتا' معاف کردینا چاہیے' کیونکہ معاف نہ کرنے سے تمہیں کوئی فائدہ تو ہونے والا نہیں۔" فاطمہ گلوگیر ہوئیں۔

"لو بات کرلو۔"

"ہاں۔۔۔ لیکن فاطمہ خالہ! ایک منٹ۔۔۔ ایک بات بتادیں پہلے۔"

"ہاں پوچھو۔"

"وہ۔۔۔" وہ پوچھتے ہوئے تھوڑا جھجکا۔ "آپ کے ہمسائے میں کیا چل رہا ہے آج کل۔"

"ہمسائے میں۔" فاطمہ کا لہجہ اچانک کھنکھنانے لگا۔ "آج صبح ہی گئی تھی میں ان کی طرف' سامان باندھ رہی تھیں دونوں ماں' بیٹیاں۔ ماہ نور واپس اسلام آباد جارہی ہے اپنا کورس مکمل کرنے۔ بڑے لائٹ موڈ میں تھیں دونوں' نوک جھونک جاری تھی دونوں میں جب میں گئی۔"

فاطمہ خالہ کی آواز سن کر اسے لگا تھا اس کے اور پاکستان میں موجود لوگوں کے درمیان فاصلے یک دم سمٹ گئے ہوں مگر فاطمہ خالہ کی اس بات نے اچانک وہ فاصلے درمیان میں دوبارہ لا کھڑے کیے تھے' اس کا دل بجھنے لگا اور اسی بجھے دل کے ساتھ اس نے ان خاتون سے بات کی جو اس کی ماں کی سگی بہن تھیں' وہ اسے کنٹری سائیڈ میں موجود اس گھر کی بابت بتا رہی تھیں جس کی مالیت نجانے کتنے پاؤنڈز تھی اور وہ اس کی ملکیت اس کے نام منتقل کرنا چاہتی تھیں۔ نیویارک میں ایک ریسٹورنٹ اور پیرس میں ایک مینشن' اس کے علاوہ ایک بڑا بینک بیلنس۔ وہ ان کی باتیں سنتا رہا۔ اسے اس اچانک ہاتھ

لگنے والے جیک پاٹ میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس ساری دولت کی قانونی مالک ہوتے ہوئے بھی اس کی ماں نے اللہ جانے کیسی کسمپرسی کی زندگی گزاری تھی اور یہ ساری دولت دوسروں کے اکاؤنٹس میں پڑی رہی تھی' اپنی ماں کی بہن کے دکھ اور پچھتاوے اب اس کے کس کام کے تھے' جب زندگی کی بساط پر موجود سب سے مہرے اپنی اپنی جگہوں سے ہل چکے تھے۔

☆ ☆ ☆

''تم میرے بیٹے ہو' جو کچھ تمہارے اور میرے ساتھ ہوا۔ کیا ہم اس کو بھلا نہیں سکتے۔'' بلال سلطان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کھاری سے کس سلیس زبان میں بات کریں جو وہ ان کی بات سمجھ سکے۔ جواب میں وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں' کھاری پر یہ سب انکشاف اچانک ہوئے ہیں' یہ آہستہ آہستہ سمجھ جائے گا اور سنبھل بھی جائے گا۔'' کھاری کے بجائے اس چھوٹی سی لڑکی نے جواب دیا تھا جو سراج سرفراز اور رابعہ کی بیٹی اور کھاری کی بیوی تھی۔

''تم اس چھوٹی سی عمر میں بھی بہت سمجھ دار ہو۔'' انہوں نے بے اختیار تعریف کی۔ ''میں نے سنا ہے' تمہیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ میں تمہیں جہاں کہو گی' داخلہ کرواؤں گا۔ تم جتنا دل چاہے پڑھنا.....''

''اچھا!'' وہ مسکرائی۔ ''اور کھاری..... یہ کیا کرے گا جو میں پڑھتی رہوں گی.....''

''یہ.....'' انہوں نے کھاری کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''مجھے صرف ایک سے ڈیڑھ سال کا عرصہ چاہیے۔ وہ تم دے دو' اس کے بعد دیکھنا کھاری کس روپ میں تمہارے سامنے آتا ہے۔''

''او نہیں جی نہیں۔'' خاموش بیٹھے کھاری کو یک دم جیسے کرنٹ لگا۔ ''مینوں معاف کردیو ابا جی۔'' اس نے بلال سلطان کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ ''میں نہیں کوئی روپ بدلنا' میں ایجے وا ایجے ای ٹھیک آں.....''

سعدیہ نے بلال سلطان کی طرف دیکھا وہ کھاری کے رد عمل پر ان کا دکھ سمجھ سکتی تھی۔

''میں بوڑھا ہو رہا ہوں کھاری' اب اس عمر میں اگر تم مجھے مل ہی گئے ہو تو میرے بڑھاپے کا خیال نہیں کرو گے کیا؟ مجھے تمہاری ضرورت ہے' اب میں زندگی کا ایک بھی لمحہ تمہارے بغیر نہیں گزارنا چاہتا۔ میرے ساتھ چلو' میرے کاموں میں میرا ہاتھ تمہیں ہی بٹانا ہے۔ تمہارا بڑا بھائی تو روٹھ کر بیٹھ گیا مجھ سے۔'' بلال سلطان نے آسان ترین الفاظ میں بات کرنے کی کوشش کی۔

''گل اے نہیں۔'' کھاری نے ایک مرتبہ پھر ان کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ ''کہ میں آپ کی خدمت نہیں کرنا چاہتا۔ بات یہ ہے کہ مجھے جو کام آتا ہے' میں وہی کر سکتا ہوں۔ مجھ سے پھل تڑوالو' گاڑیاں لوڈ کروالو۔ مجھے کچھ اور کرنا نہیں آتا۔ میں چٹا ان پڑھ ہوں مجھے 'الف' 'بے' بھی نہیں آتی۔'' بلال نے بے بسی سے کھاری کی طرف دیکھا۔

''تم میرے ساتھ چلو' میں تمہیں اس سے بڑا' اس سے زیادہ خوب صورت اور جدید ترین فارم ہاؤس بنا کے دوں گا' تم وہی کام کرنا جو تمہیں آتا ہے۔''

بلال سلطان کی یہ بات سن کر کھاری نے فوراً سعدیہ کی طرف دیکھا' جس نے سر ہلا کر بلال کے فیصلے کی تائید کی تھی۔

''پرائے پنڈ' یہاں کے لوگ' چوہدری صیب' چوہدرانی صابرہ بی بی' ماسی شیداں' ماسٹر کمال' بابے منگو دا میلہ!'' وہ زیر لب بڑبڑایا۔

''تمہارا جب دل چاہے' آکر سب سے مل جایا کرنا اور رہے میلے ٹھیلے تو ان کی فکر نہ کرو تمہارے بھائی نے گھر میں پورے پاکستان میں ہونے والے میلوں کے سالانہ کیلنڈر اور روڈ میپس جمع کر رکھے ہیں جب بھی جہاں بھی جانا چاہو' تمہیں مشکل نہیں آنے والی۔''

''اور مولی صاحب اور بھین جی!'' کھاری نے سوالیہ نظروں سے سعدیہ کی طرف دیکھا۔

''تمہارا خیال ہے' میں انہیں باقی کی عمر بھی اسی طرح گزارنے دوں گا۔'' بلال سلطان مسکرائے۔ ''ان دونوں سے

میری بات ہو چکی ہے۔ ان دونوں کے تو بہت سے قرض مجھ پر واجب ہیں "ابھی فوری طور پر تو دونوں نے کاروبار کے لیے یہیں رہنا ہے۔ لندن یا ہیوسٹن سے واپسی پر اس کے انتظامات شروع ہو جائیں گے۔"

"اور سعد باؤ اور مہ نور باجی۔"

"ان کا کیا مسئلہ ہے اب؟" بلال سلطان نے پوچھا۔

"ان کا مسئلہ آپ نہیں جانتے۔ ان کا مسئلہ صرف میں جانتا ہوں۔" کھاری نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "میرے سامنے میلے کے سائیں نے مہ نور باجی کو کہا تھا۔ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ مہ نور باجی تو شدید (سودائی) ہو گئی تھیں۔ آپ کو کیا پتا۔"

اس نے بلال سلطان کی طرف دیکھا۔ بلال سلطان جس روز سے فارم ہاؤس میں آئے تھے، پہلی بار دل سے مسکرائے تھے۔ وہ کھاری کے سینے میں چھپے راز سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔

☼ ☼ ☼

"کمو کب تک رکے رہنے کا ارادہ ہے، چلنے کا بھی کوئی منصوبہ ہے یا نہیں ذہن میں۔" وودن زادے شرارت بھرے انداز میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

"میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے "انسان پر ایک در بند ہوتا ہے اللہ اس کے لیے کئی اور در کھول دیتا ہے، سمجھو بس دوبارہ چلنے کا وقت آیا ہی کھڑا ہے۔" سعد نے نرمی سے جواب دیا۔

"تم نے کہیں پڑھا تھا۔" وودن زادے نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ "میں تو بغیر کہیں پڑھے ہی جانتا ہوں کہ ایک غیر مرئی طاقت ایسی ہے، جو قدم قدم پر انسان کی مددگار رہتی ہے۔"

"تم بغیر پڑھے جانتے ہو تو اپنے نظریات کا زاویہ کیوں درست نہیں کر لیتے۔"

"میرے نظریات درست ہو رہے ہیں۔ زاویوں کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ تم کمو کب آ رہے ہو امریکا؟"

"بہت جلد۔"

"امریکا میں رفاہی ادارے پہلے ہی سے ہیں بہت، تم یہاں آ کر لوگوں کے لیے مزید کیا کرو گے؟" وودن ایک مرتبہ پھر شرارت سے مسکرایا۔

"میں وہاں تمہارے لوگوں کے لیے نہیں خود اپنے لیے آ رہا ہوں وودن زادے" ایک جلتا ہوا ریستوران مزید جلائے۔"

"اوہ۔ پھر تو اللہ امریکیوں کے معدوں پر رحم کرے، تمہاری ذہنی رو تو کسی بھی وقت بھٹک جانے کے امکان موجود رہتے ہیں۔ مجھے وہ ریڈ چلی سکی انگ مرگز کبھی نہیں بھولتا۔"

"باقی امریکیوں کو چھوڑو تم اپنے معدے کا بیمہ کروا لو بس۔"

"اللہ نے مجھے ویسے ہی بچا لیا۔ میں امریکا چھوڑ کر ایران جا رہا ہوں عنقریب۔ مجھے لگتا ہے وہاں کی آب و ہوا مجھے راس آئے گی۔"

"اچھا۔" سعد چونکا۔ "لگتا ہے واقعی دنیا بھر میں بدلاؤ کا موسم آ چکا ہے، سب لوگ اپنے اپنے اصل کی طرف لوٹنے کے چکر میں ہیں۔"

"مگر تم تو ایسا نہیں کر رہے نا۔ شاید تم تو اصل کے بجائے اجنبی اور پھر مزید اجنبی سرزمینوں کی طرف بڑھنا چاہتے ہو۔"

"یہ ہی تو بدلاؤ ہے شاید میرے لیے۔" وہ دھیمی آواز میں بولا تھا۔ وودن کے ساتھ اسکائپ پر ہونے والی یہ گفتگو اس کے دل پر مزید بوجھ ڈال گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

سعدیہ کو لگا "اسے اپنا کھلے کا کھلا رہ جانے والا منہ بند کرنے کے لیے اس پر اپنا پورا ہاتھ رکھنا پڑے گا۔ ایک عمر تک گاؤں سے باہر کسی چھوٹے یا بڑے شہر کی شکل تک نہ دیکھ سکنے والی لڑکی ایک ہی دن کے چند گھنٹوں کی مسافت کے بعد ملک کے دارالخلافہ میں پہنچ چکی تھی۔ اس گھر تک پہنچنے سے پہلے ہی شہر کی سڑکیں اور ان کے ارد گرد کھڑی عمارتیں دیکھ دیکھ کر

ہی اس کا منہ آدھے سے زیادہ کھل چکا تھا۔

باقی کی کسر بلال سلطان کے گھر کے نظارے نے پوری کردی تھی۔ اس محل نما گھر میں وہ کھاری کی بیوی اور بلال سلطان کی بہو کی حیثیت سے داخل ہوئی تھی۔ اس نے یہاں آتے ہوئے سنا تھا کہ یہ وہ گھر نہیں تھا جس میں بلال سلطان خود رہتے تھے۔ یہ گھر کھاری اور سعدیہ کے لیے لیا گیا تھا۔ یہاں کھاری کی وہ تربیت ہونا تھی جس کے بعد بلال اسے اپنے حلقہ احباب میں اپنے بیٹے کی حیثیت سے متعارف کروانے والے تھے۔

"کتنا پاگل ہے کھاری!" سعدیہ نے منہ پر واقعی ہاتھ رکھتے ہوئے گھر کے درودیوار کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ "آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا' کس مشکل سے منایا سب نے اسے' آتے ہوئے بھی رو رو کر اپنا برا حال کرلیا' ساتھ میں گاؤں کے گاؤں کو رلا دیا۔ چودھری صاحب' چودھرانی بی بی' فارم ہاؤس کے سارے ملازم' گاؤں کے لوگ' سب ہی تو اسے رخصت کرتے ہوئے رو رہے تھے۔ اللہ توبہ' کتنی محبتیں ڈال رکھی تھیں اس نے سب سے۔" اسے گاؤں سے رخصتی کے منظر یاد آنے لگے۔

"لوگ اوپر سے رو رہے تھے' اندر سے تو جل مر رہے ہوں گے' بے چارہ کھاری اصل میں شہزادہ نکلا' کبھی اس گھر میں آکر دیکھ لیں کہ کھاری کیسی کیسی چیزوں کا مالک بن چکا ہے تو سچ میں ہی ان کو دل کے دورے پڑنے لگ جائیں۔ سچ ہے بھئی اللہ بڑا بے نیاز ہے' چاہے تو بیٹھے بٹھائے چھپر پھاڑ کر دے دے' کھاری کو تو سمجھو بھاگ ہی لگ گئے۔ یہ بڑی سی گاڑی میں بیٹھ کر تو ہم یہاں پہنچے ہیں' جس میں بیٹھ کر نہ تو دھکا لگتا ہے نہ ہی تھکن ہوتی ہے اور وہ بلال صاحب۔" اسے یاد آیا۔ "ان کا بس چلے تو ایک پل کے لیے بھی کھاری کو اپنی نظروں سے جدا نہ کریں۔ اتنا پیار دیا ہے انہوں نے کھاری کو اتنے سے دنوں میں کہ اس جیسا اڑیل گھوڑا بھی ان کے سامنے ہار مان گیا۔"

وہ گھر کے لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی کمرے کی سجاوٹ دیکھتے ہوئے اوٹ پٹانگ باتیں سوچتی چلی جارہی تھی۔

"سعدیہ' آؤ میں تمہیں تمہارا کمرہ دکھاؤں۔" کسی نے اس کے قریب آکر کہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا' پیازی جمپر اور بڑے بڑے شوخ پھولوں والی قمیص پہنے اس کے سامنے قلزا ظہور کھڑی تھی۔

ہائے سنا ہے یہ ہمارے ساتھ رہے گی' کھاری کو یہ ہی سکھائے گی۔ کیسا کرخت چہرہ ہے اس کا میں نے شکر کیا تھا سسر ملا' ساس نہیں' مگر یہ عورت تو لگتا ہے دس ساسوں سے بڑھ کر ثابت ہوگی' کتنی ہی دفعہ تو گاڑی میں بیٹھنے اٹھنے کے طریقے بتا چکی راستے میں۔ سعدیہ سہم سی گئی۔

"ویسے تو یہ سارا گھر ہی تمہارا ہوگا' لیکن ایک کمرہ تو خالصتاً" تمہارا اور کھاری کا ہے۔ چلو دیکھتے ہیں اس کا انٹیریئر کیسا ہے۔" قلزا نرمی سے بول رہی تھی' اور آؤ تمہیں فضل حسین اور میمونہ بی سے بھی ملواؤں' وہ دونوں ابھی آج ہی شفٹ ہوئے ہیں اس گھر میں۔ افتخار کو اردو اور روایتی ادب آداب وہ دونوں ہی سکھائیں گے۔"

"افتخار!" سعدیہ نے چونک کر دیکھا۔

"ہاں افتخار۔" قلزا نے سر ہلایا۔ "اب کھاری کو کھاری کوئی نہیں کہا کرے گا' تم بھی نہیں۔" اس نے جتایا۔ "اسے اس کے اصل نام سے پکارا جائے گا۔"

"اتنی پابندیاں۔" سعدیہ قلزا کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ "یہ ہوگا' وہ نہیں ہوگا۔" اس کا دم الجھنے لگا۔ "چھوڑو" اس کا دل چاہا کہے "ایسے محل سے تو فارم ہاؤس کا وہ ایک کمرہ ہی بہتر تھا۔"

"افتخار کے ساتھ ساتھ تم بھی سب سیکھ جاؤگی۔" قلزا جیسے اس کی الجھن سمجھ گئی تھی۔ "انسان ترقی کا سفر کرنے کا شوقین ہوتا ہے نا۔ اسے ہونا بھی چاہیے۔ مگر اس سفر میں مشکلیں بھی پیش آتی ہیں اور خود پر جبر بھی کرنا پڑتا ہے۔ مجھے یقین ہے کھاری کے اس سفر میں تم ہماری بہترین معاون ثابت ہوگی۔" وہ مسکرا رہی تھی۔

"خیر یہ اتنی بھی بری نہیں جتنی دیکھنے میں لگتی ہے۔" سعدیہ نے ذرا سا مطمئن ہوتے ہوئے سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے تمہیں واپس ایک نارمل لڑکی کے روپ میں دیکھ کر۔"

سارا خان کی چین سے واپسی کے اگلے دن بلال سلطان سے ناشتے کی میز پر ملاقات ہوئی تھی۔

"یہ سب آپ کی وجہ سے ممکن ہوا۔" سارا نے ان کی طرف دیکھا "آپ فرشتوں جیسی صفات کے مالک ہیں۔"

"مجھے گناہ گار مت کرو بھئی۔" وہ معمول سے کہیں زیادہ مطمئن نظر آرہے تھے۔ "فرشتوں جیسی صفات انسان کو مل جاتیں تو دنیا کو دنیا نہیں جنت کہا جانے لگتا۔"

"میں اپنے تجربے کی بات کر رہی ہوں۔" سارا نے توس پر مارملیڈ لگاتے ہوئے جواب دیا۔ "میرے لیے تو یہ دنیا آپ ہی کی وجہ سے جنت جیسی ہو گئی۔"

"میری وجہ سے یا سعد کی وجہ سے؟" انہوں نے دفعتاً کہا۔

"سعد!" وہ چونکی۔

"بھئی، اگر میں سعد کا باپ نہ ہوتا تو مجھے تو شاید کبھی تمہارے بارے میں پتا بھی نہیں چلتا اور اگر مجھے اپنے بیٹے سے اتنی شدید محبت نہ ہوتی کہ اس کے سارے معاملات کو میں اپنے معاملات بنا لیتا تو تم تو اس کے چلے جانے کے یوں ہی چیزوں کا سہارا لیتی قدم قدم چلتی، لڑکھڑاتی زندگی ہی گزارے چلی جاتیں۔ مجھے کیا کسی کو بھی خیال نہ آتا کہ تمہاری مدد کرنی چاہیے۔"

وہ دم بخود بیٹھی ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔" انہوں نے کہا۔ "تمہیں اگر ممنون ہی ہونا ہے تو میری نہیں سعد کی ہو۔ اسی نے تمہیں اسپاٹ کیا تھا۔ کیوں نہیں کیا تھا کیا؟"

سارا نے اسی کیفیت میں ان کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔

"مجھے تمہاری فننس اور ٹریننگ پوزیشن کی رپورٹس میل کر دی گئی تھیں، یہ سپر کلاس رپورٹس ہیں۔ اے ون۔" انہوں نے موضوع بدل دیا۔

سارا نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

"اب ایک دو دن میں تم نے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ واپس سرکس رنگ میں کب داخل ہو گی تم؟" وہ کہہ رہے تھے۔ سارا پر جیسے کڑک کر آسمانی بجلی گری تھی۔

"سرکس رنگ۔" اس نے یوں کہا جیسے اس لفظ سے نابلد ہو۔

"ہاں بھئی سرکس رنگ۔" انہوں نے سر ہلایا "اتنی اچھی فننس اور ٹریننگ کے بعد یوں ہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے رکھ کر بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے کیا۔" وہ ان کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

"اللہ نے جو نعمت تمہیں واپس کی ہے، اسے کام میں نہیں لاؤ گی کیا؟"

"لیکن میں نے تو سرکس رنگ میں واپس داخل ہونے کا کبھی سوچا بھی نہیں۔" وہ بڑبڑائی۔

"تو پھر زندگی کیسے گزارو گی؟ اپنی لیونگ کیسے مینج کرو گی۔" انہوں نے بے تاثر لہجے میں پوچھا۔

"آپ۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"میں.... میرا کام تمہاری زندگی میں یہیں تک تھا بھئی۔ میں ایک پریکٹیکل انسان ہوں۔ بے عملی اور دوسروں پر انحصار کر کے بیٹھے رہنا مجھے ذاتی طور پر سخت ناپسند ہے۔ تمہاری صحت بحال نہ ہو پاتی یا کسی وجہ سے تم اتنی نارمل نہ ہو سکتیں تو میں ضرور عمر بھر تمہیں سپورٹ کرتا۔ لیکن اب تم ماشاء اللہ فٹ ہو، نارمل ہو تم نے زندگی کیسے مینج کرنی ہے مجھے بتاؤ۔ میں اس کے لیے تمہاری مدد کو حاضر رہوں گا۔ لیکن کرنا تو بہرحال تمہیں خود ہی ہے اب!"

وہ نیپکن سے منہ صاف کر کے اٹھ گئے اور اگلے لمحے وہ کمرے سے باہر جا چکے تھے۔ مگر اپنے پیچھے ناشتے کی میز پر بیٹھی سارا خان کے اردگرد وہ بہت سے سوال چھوڑ گئے تھے۔ آسمان پر اڑتے اڑتے اسے انہوں نے یکایک واپس زمین پر آجانے کا اشارہ دے دیا تھا اسے۔ سارا خان کو دوسروں پر انحصار چھوڑ کر خود اپنی طاقت اور ہمت کے بل پر زندگی گزارنا تھی۔ ان کی گفتگو کا لب لباب یہ ہی تو تھا۔

"رکو!" اس نئی صورت حال پر سوچتے سوچتے اچانک ایک نام اس کے ہونٹوں پر آیا۔ اس نے تیزی سے دائیں بائیں

دیکھا۔"

"یمی آنٹی!" اس نے بلند آواز میں کہا تھا اور ناشتہ ادھورا چھوڑ کر یمی آنٹی کو پکارتی ڈائننگ ہال سے باہر نکل آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"کتنی عجیب سی بات ہے جیب میں چند پاؤنڈز ڈال کر تم آکسفورڈ سٹریٹ میں خریداری کرنے چلی آئی ہوں' جب کہ خریدنا تمہیں کچھ بھی نہیں۔" سعد نے اپنے ساتھ چلتی نادیہ سے کہا جو ہلکی بارش سے بچنے کے لیے چھاتا سر پر تانے دائیں بائیں دیکھتی ہر اسٹور میں سجی چیزیں دیکھ رہی تھی۔

"ضروری تو نہیں کہ انسان خریداری نہ کر سکے تو بکنے والی اشیاء بھی نہ دیکھے" نادیہ نے چلتے چلتے رک کر کہا۔ اس کی نظریں سلفریجز سٹور کے چمکتے شیشوں کے پیچھے سجے آؤٹ فٹس پر رک گئی تھیں۔ سعد نے بھی رک کر اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔

عرصے کے بعد جب تم پہلی بار مجھے اسی شہر میں ملے تھے تو تم نے مجھے اسی اسٹور سے کوٹ خرید کر دیا تھا' تمہیں یاد ہے نا؟' نادیہ نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

"کیا تم سمجھتی ہو کہ اب میں تمہیں اس جگہ سے' خریداری نہیں کروا سکتا۔" سعد نے اسی انداز میں جواب دیا جیسے نادیہ بولی تھی "اگر تم ایسا سمجھتی ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔" وہ عین اس کے پیچھے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

نادیہ نے مڑ کر سعد کی طرف دیکھا۔ سیاہ پتلون پر اس نے سرمئی رنگ کا قیمتی رین کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر نرمی تھی اور اس کے بال اس کے مخصوص انداز میں پیشانی پر بکھرے تھے۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے مسکرا دی۔

"تم نے اس جگہ چلتے' آتے جاتے لوگوں کی اکثریت کو نہیں دیکھا۔" اس نے سعد سے سوال کیا' یہ سب صرف نظارہ کرنے ہی تو آئے ہیں۔ خریداری تو بہت کم لوگ کرتے ہیں یہاں سے۔"

"لیکن پھر بھی۔۔۔" سعد نے کہنا چاہا۔

"پھر بھی کچھ نہیں۔" وہ مسکرائی "ہم یہاں صرف لوگوں اور اسٹور میں رکھی چیزوں کو دیکھنے آئے ہیں' ایک چھوٹی سی تفریح۔ اس کے بعد ماربل برو اسٹریٹ کے اچھے سے انڈین ریسٹورنٹ سے کھانا کھائیں گے۔ مجھے یقین ہے' تم یہ ایک کھانا تو مجھے کھلا ہی سکو گے۔"

سعد نے مسکراتے ہوئے اپنی اس گڑیا جیسی بہن کو دیکھا جس کی نظریں اتنی شفاف اور پاک تھیں کہ اسے ان پر رشک آتا تھا۔

"چلو اب آگے چلتے ہیں۔" نادیہ نے اپنا رخ سیدھا کرتے ہوئے آگے قدم بڑھائے۔

نادیہ کا یہ ہلکا پھلکا انداز دیکھ کر وہ بھی اس مشہور زمانہ فیشن اسٹریٹ کے اسٹورز اور یہاں گھومتے پھرتے لوگوں کا نظارہ کرنے پر ذہنی طور پر تیار ہو گیا تھا۔ یہاں نظر آنے والے لوگوں کی اکثریت سیاح تھی۔ وہ مختلف چہروں کو دیکھتے ہوئے ان کی قومیت کا اندازہ کرتے ہوئے رین کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے نادیہ کے پیچھے چل رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ آکسفورڈ سرکس تک پہنچ گئے۔

اور پھر جیسے اس کی نظر دھوکا کھا گئی اور ایک چہرے پر رک گئی تھی اردگرد چلتے لوگ' گاڑیوں اور بسوں کی آوازیں' بچوں کا رونا اور شور سب کچھ جیسے ساکت ہو گیا تھا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اپنی جگہ پر ٹھہر گیا تھا۔ سب کچھ پس منظر میں تھا' صرف وہ ایک چہرہ پیش منظر پر تھا۔

"جب میں تمہارے چہرے کو دیکھتا ہوں۔

اس میں ایک چیز بھی ایسی نہیں جسے تبدیل کیا جا سکے۔"

اس کے اردگرد برونو مارس کی آواز بازگشت کرنے لگی تھی۔ اسی دم اس چہرے نے مسکراتے ہوئے دائیں طرف دیکھا تھا۔ کائنات ایک مرتبہ پھر ساکت ہو گئی تھی۔

• "اور جب تم مسکراتی ہو تو جیسے تمام دنیا نسر جاتی ہے۔"

بوندا باندی گار رہا تھا اور سعد سلطان کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا کسی معمول کی طرح چلتا وہ آگے بڑھ آیا تھا۔ اس سے آگے چلتی نادیہ پیچھے رہ گئی تھی۔ اسی طرح عالم بے خودی میں آگے بڑھتے بڑھتے اسے اچانک ایک خیال آیا۔ اس نے رک کر گردن پیچھے موڑ کر دیکھا۔ نادیہ اس سے فاصلے پر رک گئی تھی۔ چھاتا سر پر تانے وہ جھلملاتی آنکھوں کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔ اس کی نظریں اسے پیغام دے رہی تھیں۔

"لو اجنبی چہروں کے درمیان اپنے شناسا چہرے کو پہچانو اور یہ کام تو ذرا بھی مشکل نہیں ہے لاکھوں کے مجمع میں بھی یہ ایک چہرہ ڈھونڈ لینا ذرا برابر بھی مشکل نہیں ہے نا؟" وہ اشارہ کرنے لگی تھی "جاؤ' آگے بڑھو اور اس کے ساتھ ہم قدم ہو جاؤ' آج تمہارا دن ہے۔"

اس نے جھلملاتی نظروں اور کپکپاتے ہونٹوں کے ساتھ مسکراتی نادیہ کو دیکھا اور گردن سیدھی کرتے ہوئے اس نقطے کی طرف دیکھنے لگا جس نے کائنات کی ہر جنبش روک دی تھی۔ پھر اس کی نظر اس چہرے کے ساتھ نظر آنے والے ایک اور چہرے پر پڑی اور کائنات واپس چیخنے چنگھاڑنے لگی تھی۔ اس کے حلق تک میں کڑواہٹ اتر آئی تھی۔ اس کا دل فوراً" آنکھیں بند کر لینے کو چاہا اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے آنکھیں بند کیں اور اگلے لمحے واپس مڑ گیا۔

نادیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ نادیہ کو وہیں کھڑا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ نادیہ نے اشکبار نظروں سے ماہ نور کے ساتھ کھڑے بلال سلطان کی طرف بے بسی سے دیکھا اور مڑ کر بھاگتے قدموں سے چلتی سعد کے قریب پہنچ گئی۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔

"کیوں چلے آئے' اس کی طرف گئے کیوں نہیں؟" وہ پھولے سانس کے ساتھ اس کے ساتھ تیز قدموں سے چلتی پوچھ رہی تھی "ایک ہی گلہ تھا نا تمہیں محبت سے اگر وہ محبت تھی تو اس میں تڑپ کیوں نہیں تھی۔ اس میں ڈھونڈ نکالنے کا جنون کیوں نہیں تھا۔ دیکھو' وہ اس آزمائش پر پوری اتری۔ کہاں کہاں کیسے کیسے تمہیں تلاش کرتی' تمہاری کھوج لگاتی وہ تم تک پہنچ چکی ہے' اس نے قریہ قریہ پھر کر تمہیں ڈھونڈ نکالا ہے' کیا اب بھی تمہاری تسلی نہیں ہوئی' کیا اب بھی تم اسے واہمہ قرار دو گے۔"

اس سے زیادہ تیز قدموں سے چلتا وہ جواب نہیں دے رہا تھا۔

"بولو' بتاؤ' سعد! تم اتنے پتھر دل کیوں ہو گئے ہو؟" نادیہ نے اس کا بازو پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا تھا۔

"تم!" وہ رک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پھنکارا' "تم جانتی تھیں نا۔ تم دانستہ مجھے یہاں لائی تھیں نا آج؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"ہاں!" نادیہ نے تھکن بھرے لہجے میں جواب دیا تھا۔ "اس کی گرفت سعد کے بازو پر کمزور پڑ گئی تھی جب ہی بازو اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

"تم نے اچھا نہیں کیا۔ تم نے یہاں تک ان کی راہنمائی کی' جبکہ تم جانتی تھیں کہ۔۔۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"ہاں میں جانتی تھی۔" وہ بلند آواز میں چیختے ہوئے بولی تھی "میں سب جانتی تھی' مجھے سب معلوم ہے' وہ سب جو تم نہیں جانتے وہ سب جو تمہیں ابھی جاننا ہے۔"

وہ کہہ رہی تھی۔ آسمان سے گرتی ہلکی پھوار تیز بارش میں بدل گئی تھی اور وہ دونوں وہاں کھڑے بھیگ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼
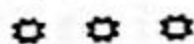
"میں نے تم سے کہا تھا' مجھے اپنے ساتھ وہاں نہ لے جاؤ' وہ بھاگ لے گا۔" بلال سلطان نے برساتی اتار کر نور الدین کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی پتا تھا' وہ بھاگ لے گا۔" ماہ نور مسکرائی "نور الدین انکل! کیا اچھی سی چائے پینے کو مل سکتی ہے؟" اس نے نور الدین سے سوال کیا۔

"ضرور۔ مگر کون سی دارجلنگ والی یا سیلون والی۔" نورالدین نے اپنے چوڑے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"کوئی سی بھی، مگر خوشبودار اور گرم ہونی چاہیے۔"

"ابھی لیجیے۔" وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

"پھر بھی تم مجھے ساتھ لے کر چلی گئیں۔" بلال سلطان نے پوچھا" جبکہ اس کو دیکھنے کی تڑپ لے کر وہاں گئی تھیں۔ دیکھا' مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں کیا اترا تھا۔ وہ خون تھا یا نفرت' میں فرق نہیں جانچ پایا۔"

"آپ کو نہ لے کر جاتی۔" ماہ نور نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا" میرے دل میں موجود تڑپ آپ کی تڑپ سے زیادہ تھی کیا؟"

"شاید نہیں۔" وہ سادگی سے بولے" مگر میرے لیے اس کے دل میں کیا ہے' خوب جانتی ہو تم.... نفرت' انتقام' بدگمانی!"

"اسی پٹی کو تو اتارنا ہے۔" ماہ نور سنجیدگی سے بولی۔ "آپ کا بیٹا بھی خوب ہے۔ ٹاسک پر ٹاسک دیے چلا جا رہا ہے' مجھے لگتا ہے' میں ایک ایسے رئیلٹی شو میں شرکت کر رہی ہوں' جس میں جیت جانے کی صورت میں مجھے انعام میں سعد سلطان ملے گا۔"

"اتنا ہی تو قیمتی ہے میرا بیٹا۔" بلال سلطان نے کہا۔ "ٹاسک تو پورے کرنے پڑیں گے۔"

"آج کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔" ماہ نور نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "جب تک سردار چچا نے مجھے سب تفصیل نہیں سنائی تھی۔ میں بھی آپ کے بارے میں ایسے ہی جذبات رکھتی تھی دل میں اور اب میں آپ سے اتنی ہی شرمندہ ہوں۔ اتنا ہی شرمندہ اس کو بھی ہونا پڑے گا۔ ادھوری معلومات پر راستہ کھوٹا کر لینے والا احمق۔" اس نے سر جھٹکا "کیا انعام ہے' بھئی کیا رئیلٹی شو ہے" وہ مسکرائی۔ "لیکن انکل سعد کے رد عمل سے تو آپ واقف تھے۔ آپ نے نادیہ کا ری ایکشن دیکھا۔ میرا تو دل رک سا گیا اس کے آنسو دیکھ کر۔ سعد کو جانے دیتے۔ نادیہ کو تو گلے لگا لیتے آگے بڑھ کر۔"

"ایک کے بعد ایک۔" بلال سلطان اداسی سے مسکرائے "بچھڑی ہوئی اولاد سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔" "تم جانتی ہو نادیہ کو دیکھ کر کتنے ہی لمحے میرے ہاتھ پاؤں بلکہ پورا جسم سن سا ہو گیا مجھے لگا۔ میں ہلکی سی جنبش بھی کرنے کے قابل نہیں رہا تھا' شاید فالج کا شکار ہو جانے والے لوگوں کی کیفیت ایسی ہی ہوتی ہو گی۔" وہ کہہ رہے تھے" میں اپنی پوری ہمت جمع کر کے جیسے ہی اس کی طرف بڑھنے لگا' وہ مڑ کر سعد کے پیچھے چلی گئی اور اس کے پیچھے سعد تک پہنچنا کم از کم آج کے دن میرے لیے ممکن نہیں تھا۔" وہ ٹوٹے' ہارے ہوئے لہجے میں بول رہے تھے۔ ماہ نور انہیں غور سے دیکھ رہی تھی۔

"چٹان نظر آنے والا یہ شخص اندر سے کیسا کمزور اور بھربھرا ہو چکا ہے' کیا کسی کو معلوم ہو گا۔" وہ سوچ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆
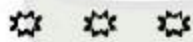
"مجھے افسوس ہے کہ تم میری نیت پر شک کر رہے ہو' میں نے ایسا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔" نادیہ نے بسورتے ہوئے کہا۔

"کب سے رابطے میں ہو تم ان سے؟" سعد نے اس کی بات' کا جواب دینے کے بجائے اپنا سوال کیا۔

"ان سے' کن سے؟" وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "میں صرف ماہ نور سے رابطے میں تھی' وہ بھی وودن زادے کے ذریعے۔"

"وودن!" وہ چونکا "اوہ!" اس کے ہونٹ سکڑے "گویا یہ کوئی لمبا چکر ہے؟"

"ہاں! نادیہ نے اپنے اٹھے شانے گراتے ہوئے اپنے ہاتھ اپنی گود میں رکھے۔ یہ لمبا چکر ہے' مگر میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ یہ دنیا بہت چھوٹی ہے۔ ہم گھوم پھر کر دوبارہ ایک ہی نقطے پر پہنچ جاتے ہیں۔"

"اچھا!" وہ طنزیہ انداز میں ہنسا "جیسے تم اور تمہارے ڈیڈی گھوم پھر کر آج ایک ہی نقطے پر پہنچ گئے۔"

"تم میرا دل چھلنی کرنا چاہتے ہو۔" نادیہ نے سوال کیا "اور اگر تمہیں ایسا کرنے سے کوئی تسلی ہو سکتی ہے تو تم ایسا بھی ضرور کر لو۔ جبکہ تم بھی جانتے ہو کہ اجنبیوں کے اس ہجوم میں ڈیڈی کے لیے شناسا چہرہ صرف تمہارا ہو سکتا تھا۔"

نادیہ کی آواز میں ایسا درد تھا' ایسی شکست تھی کہ سعد کا دل لمحہ بھر کے لیے کانپ اٹھا۔
"اور میرے لیے اس ہجوم میں شناسا چہرہ صرف تمہارا تھا۔" اس نے نادیہ کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں۔"
"ہوں!" نادیہ سر جھٹکتے ہوئے مسکرادی "جیسے میں جانتی نہیں۔" اس نے سعد کی طرف دیکھا۔ "وہ تمہارے پیچھے خوار ہوتے یہاں تک پہنچی ہے سعد تمہاری خاطر وہ بے چاری کہاں کہاں نہیں پہنچی۔ فضل حسین اور مونا آنٹی' فلزا ظہور نور فاطمہ' سائیں اختر کی جھونپڑی' میرا میل باکس اس کی ستائی داستان سے بھرا پڑا ہے' کہو تو دکھا دوں۔"
"فضل حسین اور میمونہ بی' فلزا ظہور' نور فاطمہ' سائیں اختر!" سعد نے چونک کر نادیہ کی طرف دیکھا۔
ان ناموں کی نادیہ کی زبان سے ادائی ہی یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ وہ محبت کیا تھی' وہ جنون کیسا تھا' تڑپ کتنی تھی' بے قراری کا کیا عالم تھا۔ سعد نے بے یقینی کو یقین میں بدلنے کے لیے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ پیچھے سے آنے والی اس پکار کا اس نے جس قدر طویل انتظار کیا تھا' وہی جانتا تھا۔ آج وہ بے حیثیت نہیں رہا تھا۔ صاحب حیثیت ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"جاؤ' میں تم سے نہیں بولوں گی۔" ماہ نور نے اپنی قمیص کو گھٹنوں پر پھیلاتے ہوئے کہا اور چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔
وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ ہلکے زرد رنگ کی اس سادہ سی شلوار قمیص پر زرد اور بھورے رنگوں کے امتزاج والا اسٹول اوڑھے وہ ہمیشہ کی طرح معصوم' بے ریا اور سادہ لگ رہی تھی۔ وہ ایک ٹک اس کے سراپے کو دیکھ رہا تھا اور دیکھے ہی چلا جا رہا تھا۔
"مجھ تک یہاں آ پہنچی ہو اور مجھ سے ہی نہیں بولو گی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بھلا بتاؤ تو' تم مجھ سے کیوں نہیں بولو گی۔"
"اس لیے کہ تم نے کبھی میرے سامنے تو مجھ سے اپنی محبت' کا اقرار نہیں کیا اور خود کو میرے لیے جیک پاٹ بنا کر یہاں آ بیٹھے' ٹاسک پر ٹاسک پورے کرنے کے لیے۔ بس میں تم سے۔ ہرگز نہیں بولوں گی۔" اس نے دوبارہ چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔
"محبت کا اظہار نہیں کیا تو تمہیں کیا الہام ہوا تھا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے وہاں آ بیٹھا جس طرف ماہ نور نے چہرہ پھیرا تھا۔
"مجھے نہیں پتا۔" وہ نروٹھے پن سے بولی۔
"اتنی بار اظہار کیا تھا کہ کوئی کیا کرے گا۔" اس نے اس کا چہرہ پکڑ کر اپنی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔ "یاد کرو' منگو کے میلے میں سائیں نے تم سے کیا کہا تھا۔" ماہ نور کی نظروں کے سامنے وہ پرانا منظر گھوم گیا۔
"یاد کرو۔ سید پور فیسٹول میں تمہاری غلطیوں سے بھرپور پینٹنگز مہنگے داموں کس نے خریدی تھیں۔"
"میں اس کی منہ مانگی قیمت ادا کرنے پر تیار ہوں۔" وہ لڑکا ماہ نور کے سامنے کھڑا کہہ رہا تھا۔
"یاد کرو' میوزیکل ایونٹ میں یارڈ ڈاؤ تھی عشق آتش لائی ہے" کس نے گایا تھا اور یاد کرو' ایک چیختی چلاتی' سوال کرتی دیوانی لڑکی کو' ہائی لائٹ ہونے سے کس نے بچایا تھا؟" وہ یاد کراتا چلا جا رہا تھا۔
"یاد کرو تمہیں Just the way you are والا گانا بطور خاص کس نے سنوایا تھا۔"
ایک اور منظر' ماہ نور کی نظروں کے سامنے گھوما۔
"تمہیں ہر اس جگہ۔ جہاں میں بھی کسی اور کو لے کر نہیں گیا تھا' کون لے کر گیا تھا اور کس لیے لے کر گیا تھا؟"
ماہ نور نے یاد کرتے کرتے خجالت سے تھوک نگلا۔
"اتنی بار اظہار کے باوجود اگر کوئی پاگل محبت کے پیغام کو نہ سمجھے تو میرا کیا قصور۔" وہ ہنسا۔
"محبت تھی کہ کوئی پہیلی۔" اس نے ناراضی سے سر جھٹکا۔
"میری محبت تھی نا۔" وہ مسکرایا۔ "اس کے اظہار کا انداز بھی مختلف ہونا چاہیے تھا۔"
"دو لفظ سیدھے سیدھے بولتے جیسے تمہاری زبان الٹ جاتی تھی۔ اتنا مجھے خوار کیا' اتنا مجھے رلایا' اتنے حسد اور رشک

میں مبتلا کیے رکھا۔" اس نے ایک بار پھر سر جھٹکا۔

"بابا!" وہ کھل کر ہنس دیا۔ "غلطی ہو گئی' میں بھول گیا تھا کہ میری محبوبہ کو پزل اور بھول بھلیوں جیسی چیزوں سے بست چڑ ہے۔"

"جتنی چڑ تھی' اتنا ہی تم نے مجھے گھمایا۔" وہ منہ بسور کر بولی "میری پڑھائی بھی رہ گئی' میری ممی بھی مجھ سے ناراض ہیں۔"

"اوہ.... آئی ایم ایکسٹریملی سوری۔" وہ لجاجت سے بولا "مگر میں بھی کیا کرتا' میں ہوں ہی ایسا مشکل ٹاسک۔"

"تم بست خراب ٹاسک ہو' آتے آتے وہ پیغام محفوظ کر آئے میرے لیے اپنے آئی فون میں۔ کہاں کہاں نہیں جانا پڑا مجھے اختری کٹیا' اف" اسے یاد کر کے جھرجھری سی آگئی "فضل حسین اور میمونہ بی.... ڈھوک کھو کھرہائے اور وہ بے نور فاطمہ یا اللہ سعد! وہ بے چاری کتنی دکھی مگر کیسی حوصلے والی عورت ہے' ہے نا۔"

"محبت کی ماری ہے نا!" سعد نے کہا۔ "محبت ایسا ہی حوصلہ اور ایسا ہی صبر طلب کرتی ہے۔ جیسا نور فاطمہ میں ہے' مگر کتنی عجیب بات ہے کہ میں نے اپنے دل کی وہ باتیں ایسی جگہ محفوظ کیں جہاں کا مجھے پتا تھا' تم کبھی تم پہنچ نہیں پاؤ گی' مگر تم وہاں تک پہنچ گئیں۔ یہ کیسی حیران کن بات ہے۔"

"یہ حیران کن اس لیے نہیں ہے کہ یہ محبت کا اعجاز ہے' وا ہے کا نہیں تم جانتے ہو تمہارا وہ آئی فون مجھے کس نے دیا؟"

سعد نے جواب دیے بغیر پہلو بدلا۔

"تم جانتے ہو' بلال انکل نے' وہ زہرا سی روز پڑھ لیا تھا جو تم نے ان کے بارے میں اگلا تھا' جب تم وہاں سے یہاں چلے آئے تھے۔"

سعد دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"تم جانتے ہو' وہ تم سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ تم جانتے ہو' تم نے انہیں دکھ کی کس انتہا تک پہنچا دیا' ادھرادھر سے ان کے خلاف ادھوری شہادتیں اکٹھے کرتے رہے اور پھر ان پر فرد جرم عائد کیے بنا ان پر کوئی مقدمہ چلائے بغیر انہیں ڈیتھ سیل میں ڈال کر خود یہاں چلے آئے۔ تم جانتے ہو' تم نے کتنی بڑی زیادتی کر ڈالی انجانے میں۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتیں۔" وہ بھاری آواز میں بولا تھا۔

"غلط کہہ رہے ہو' دراصل تم کچھ بھی نہیں جانتے۔" ماہ نور نے سختی سے کہا۔ "اور تم نے مجھے بھی مس گائیڈ کیا۔"

"پلیز ماہ نور! مجھے ان کی سنائی کہانی مت سنانا' اگرچہ میں معاف کر دینے اور نظر انداز کر دینے کا سبق پڑھ چکا ہوں اور میں نے انہیں معاف بھی کر دیا ہے۔" سعد نے کہا۔

"تم انہیں کیا معاف کرو گے۔" ماہ نور کے لہجے میں غصے کی جھلک اتری "جو تم نے ان کے ساتھ کیا' الٹا تمہیں ان سے معافی مانگنی پڑ جائے گی' بچو' میری بات دھیان سے سنو۔" خبردار جو درمیان میں بولے تو۔"

وہ کہہ رہی تھی اور اسے بغیر ایک لفظ بولے دھیان سے سننا پڑ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼
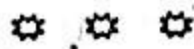
"کیا تم اپنے اس کم ظرف' انا پرست اور خود پسند باپ کو معاف کر سکتی ہو؟" نادیہ کے کمرے کے چھوٹے سے فلیٹ میں بلال سلطان ایک معمولی سی کرسی پر بیٹھے نادیہ سے پوچھ رہے تھے۔

"مجھے پہلے اس بات کا یقین کر لینے دیں کہ آپ مجھ سے ملنے' میرے لیے یہاں تک آئے ہیں۔ آپ میرے سامنے موجود ہیں۔" نادیہ نے کانپتی آواز میں جواب دیا۔

"یہ ایسی کون سی ناقابل یقین بات ہے۔" وہ افسردگی سے بولے "مجھے تو بست پہلے تم تک پہنچنا چاہیے تھا' مجھے تو تمہیں تمہاری ماں کے ساتھ جانے ہی نہیں دینا چاہیے تھا۔ مگر میں انا پرست' خود پسند شخص اپنی ان دونوں خامیوں کے ہاتھوں بست بڑی غلطی کر گیا۔

"اس میں آپ کا کیا قصور تھا۔ جو کچھ آپ کو بتایا گیا۔ اس کو سننے کے بعد آپ کو یہی کرنا چاہیے تھا۔" نادیہ نے سادگی سے کہا۔

"نہیں' میں اپنی ذات کے حصار میں محصور شخص تھا' میں نے رشتوں کی قدر کرنا چھوڑ دی تھی اور دیکھو' رشتوں کے معاملے میں میرے ساتھ کیا' کیا نہیں ہوا۔ کبھی کسی اور کے ساتھ بھی ایسا ہوتے دیکھا ہے؟" انہوں نے نادیہ کی طرف دیکھا۔

"آپ نے جو بھی کیا' مجھے اس کا گلہ نہیں ہے۔" نادیہ نے کہا۔ "لیکن آپ جو بھی ٹیسٹ کرانا چاہیں جیسے بھی جانچنا چاہیں جانچ لیں۔ مجھے یقین ہے' میں آپ ہی کی بیٹی ہوں۔"

"مجھے کسی جانچ کی ضرورت نہیں' تم آج جو ہو' جیسی ہو' یہ ہی اس یقین کے لیے کافی ہے کہ تم میری بیٹی ہو۔" بلال نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر چومتے ہوئے کہا۔

"پھر میں آپ کو آپ کے سامنے ڈیڈی کہہ کر پکار سکتی ہوں نا!" نادیہ نے آنسوؤں میں بھیگی آواز کے ساتھ پوچھا۔

"سو بار' ہزار بار' عمر بھر۔" بلال پاگلوں کی طرح اس کے ہاتھ' سر اور پیشانی چوم رہے تھے۔

قسمت سے لڑنے کے لیے پیسہ جمع کرتا یہ شخص' دولت کے انبار میں چھپ کر بھی اپنی قسمت پر قادر نہ ہو سکا تھا۔ اپنے وقت کا انتظار کرتے کرتے اس کی عمر گزر گئی' اس کا وقت اس وقت تک نہیں آیا جب تک اس کے آجانے کا حکم اس عظیم طاقت نے نہیں دیا جسے ہم اپنا رب مانتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

"یہ ہائیڈ پارک ہے اور میں اس کے اسپیکرز کارنر کی طرف جا رہا ہوں۔" اس کے ساتھ پیدل چلتے شخص نے کہا تھا۔

"شوق سے جائیے اور جی بھر کر گالیاں دیجیے۔"

ضرور..... اگر تم کان لگا کر سننے نظر آؤ تو.....

"مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ گالیوں کے زیر سایہ ہی پل کے جوان ہوئے ہیں ہم۔"

"جب ہی جوان ہوتے ہی خودکشی کرنے چل پڑے تھے۔ گالیاں سنتے سنتے بے مزہ ہونے لگے تھے شاید۔"

"افسوس میری وہ کوشش ناکام ہو گئی' میں بہت سے معاملات میں اناڑی ثابت ہوا ہوں۔"

"مجھ ایسے کہنہ مشق کھلاڑی کے بیٹے ہو کے بھی اناڑی نکلے' افسوس!"

"آپ نے سب سکھا دیا' ایک درخت پر چڑھنا جو نہیں سکھایا۔"

"میں تمہارا باپ ہوں' خالہ نہیں تمہاری۔"

"خالہ تو وہ ہے جو مجھے ریسٹورنٹ اور مینشن وغیرہ وغیرہ کا مالک قرار دے رہی تھی' آپ عمر بھر مجھے جھانسا دیتے رہے' میں خوامخواہ خود کو میراثیوں کا نواسا سمجھتا رہا۔"

میراثن خالہ کی گود میں پل رہے تھے' وہ تو میں بچا لے آیا۔ چند ماہ کی رفاقت نے ماشاء اللہ خوب اثر چھوڑا تھا۔ رہتے ہی اس گود میں تو اللہ جانے کیا حال ہوتا۔"

"یاد رہے' اسی خالہ کی بیٹی آپ کی بہو بن چکی' اللہ آپ کی اگلی نسلوں پر رحم کرے۔"

"فکر مت کرو' وہ سراج سرفراز کی بھی بیٹی ہے۔"

"شکر کریں شکل و صورت میں ماں پر اور مزاج میں باپ پر گئی ہے بھئی آپ کچھ معاملات میں بہت لکی ہیں۔"

"ایسا ویسا..... جیسے کہ میں تم جیسے احمق بیٹے کا باپ ہوں' کیا خوش نصیبی ہے میری۔ ماں کے قتل کا کھرا اٹھاتے اٹھاتے باپ تک پہنچ گئے۔ دنیا پاگل تھی جو اب تک قاتل باپ کو کھلا چھوڑ رکھا تھا۔"

"میں سخت شرمندہ ہوں۔ مجھے فلزا ظہور کی پینٹنگز۔"

"بہت بڑے گدھے ہیں آپ' ثبوت دیکھو..... فلزا ظہور کی پینٹنگز سبحان اللہ۔"

"مذاق برطرف' ذرا رکیے' مجھے آپ کے قدموں میں گر کر معافی مانگنی ہے سیریسلی۔" سعد نے چلتے چلتے رک کر کہا۔

"ڈرامے بازی نہیں چاہیے۔" وہ اپنا سانس بحال کرتے ہوئے بولے۔

"ڈرامے بازی نہیں ہے۔ میں حقیقت میں بہت شرمندہ ہوں۔ چار دن سے حوصلہ جمع کر رہا تھا آپ کا سامنا کرنے کا۔"

"تم نے مجھے بہت بڑے کرب سے دوچار کیا۔" وہ سنجیدہ ہو گئے۔

"میرا سر حاضر ہے' جتنے چاہے جوتے مار لیجئے۔" وہ اپنا سر ان کے سامنے جھکاتے ہوئے بولا۔

"ضرور مارتا... اگر اپنی ساری زیادتیوں کے باوجود تم مجھے اس قدر عزیز نہ ہوتے۔" ان کی آواز بھرا گئی۔

"اپنے گمشدہ بیٹے اور کھوئی ہوئی بیٹی کے ملنے کے صدقے اس حقیر پُر تقصیر کو معاف کر دیجئے۔" وہ بدستور سر جھکائے ہوئے تھا۔

"وہ تمہارا سگا بھائی ہے۔"

"مجھے دکھ ہے' آپ نے کبھی بھولے سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا کہ کوئی ایسا بھی تھا۔"

"وجہ جانتے ہو یا جاننا چاہتے ہو؟"

"نہیں جانتا مگر آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں' میں جان جاؤں گا۔"

"سعد! تمہیں معلوم تھا' تم میری زندگی کی واحد خوشی تھے۔ تم نے خود کو مجھ سے دور کیوں کیا؟" انہوں نے اسے شانوں سے پکڑتے ہوئے کہا۔ "تم نے مجھے تنہا کیوں کر دیا؟" جواب میں وہ خود پر طنز بھرے انداز میں ہنس دیا۔

"اپنے تئیں' آپ کو سزا دینے کے لیے' کیونکہ میرا خیال تھا' اس سے بڑی سزا آپ کے لیے کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔"

"تمہارا خیال درست تھا۔" انہوں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "یار! میں تو پہلے ہی ناکردہ جرائم کی سزائیں بھگت رہا تھا.. تم نے ناحق مجھے مجرم قرار دے دیا۔"

"مجھے معاف کر دیجیے۔ میں کوتاہ نظر ثابت ہوا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے' میرے لیے تمہیں ڈھونڈ نکالنا مشکل تھا کیا؟" کچھ دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد بلال سلطان نے سوال کیا۔

"میں تو حیران تھا۔ آپ کو واقعی میں نہیں ملا' یا آپ جان بوجھ کر انجان بن رہے تھے۔" اس نے جواب دیا۔

"میں نے دانستہ وہ ڈور ماہ نور کے ہاتھ میں پکڑا دی جس کا ایک سرا تمہاری انگلی میں بندھا تھا۔ مجھے بھی دیکھنا تھا۔ وہ تمہیں کتنا چاہتی ہے۔"

"آپ نے دیکھ لیا؟" اس کے لہجے میں فخر اترا۔

"ہاں!" انہوں نے سر ہلایا "وہ تمہیں اتنا ہی چاہتی ہے جتنا تمہاری ماں مجھے چاہتی تھی۔"

"شاید۔" سعد نے سر ہلایا۔

"اللہ تمہاری زندگی ۔ سلیقے لاٹروں سے محفوظ رکھے۔ تم خوش قسمت ہو جو تمہیں اس قدر چاہنے والی لڑکی کا ساتھ مل گیا۔"

"ارے ابھی کہاں' ابھی تو اس کی ممی کے سامنے ایروو ہونا باقی ہے۔"

"میرے بیٹے ہو.... تمہیں کوئی ریجیکٹ نہیں کر سکتا۔" وہ یقین سے بولے۔

"ایسا؟" اس نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" انہوں نے سر ہلایا اور آگے چل دیے۔

"ڈیڈی!" سعد نے پیچھے سے پکارا۔

"ہاں بولو!" بلال سلطان نے مڑ کر دیکھا۔

"کیا آپ نے مجھے معاف کر دیا۔ میں نے آپ کی آزمائشوں میں اضافہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔"

"میں نے تمہیں معاف کیا۔ مجھے فخر ہے میں تمہارا باپ ہوں۔ تم۔" انہوں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا "جس نے مجھے مدت بعد یاد دلا دیا کہ جب ہم اس پوزیشن میں ہوتے ہیں کہ کسی کے کام آسکیں تو ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

"مجھے کہنے دیجیے ڈیڈی! آپ بہت گریٹ ہیں اور مجھے آپ کا بیٹا ہونے پر فخر ہے۔"
سعد نے ڈبڈبائی نظروں سے انہیں دیکھا اور آگے بڑھ کر ان کے سینے سے لگ گیا۔

☆ ☆ ☆

"اچھا تو میں اب سمجھی کہ یہ چکر تھا سارا۔" فائزہ نے اخبار پڑھتے زوار کی طرف دیکھا "اور سب کچھ آپ کی ملی بھگت سے ہو رہا تھا۔ شکل سے کتنے معصوم لگتے ہیں آپ۔"
"تو کیا میں معصوم نہیں ہوں؟" زوار نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔
"آپ جیسے دس معصوم اور پیدا ہو جائیں تو دنیا تو معصومیت کا گہوارہ ہی بن جائے۔" فائزہ نے کہا۔ "لیں بتائیں بھلا لڑکی ناک کے نیچے لڑکے کے لیے خوار ہوتی رہی اور مجھے پتا ہی نہیں۔ میں اس کے سمسٹرز ضائع ہونے کا رونا روتی رہی۔ اس کے کیریئر کے بیڑا غرق ہو جانے پر واویلا مچاتی رہی اور دونوں باپ بیٹی خفیہ منصوبے بنا کر کبھی اسلام آباد چل پڑتے اور کبھی پاسپورٹ ویزا بنوانے کے چکروں میں مگن رہے۔"
"ایک انتہائی اچھا داماد ڈھونڈنے کے لیے انسان کو پاپڑ تو بیلنے ہی پڑتے ہیں۔ کہیے کیا ایک قابل فخر داماد نہیں ڈھونڈ نکالا میں نے آپ کے لیے۔" زوار نے شرارت بھرے انداز میں کہا۔
"داماد۔" فائزہ نے سر جھٹکا "توبہ توبہ کتنے ٹوئسٹس اینڈ ٹرنز ہیں داماد کی فیملی کی داستان میں۔ کبھی ماں کا مرڈر ہوتا ہے اور کہیں بھائی گم ہو جاتا ہے، اسے سردار بھائی اٹھا لے جاتے ہیں اور پھر پتا چلتا ہے کہ داماد صاحب تو خدیجہ، فاطمہ آپا کے قریبی رشتہ دار بھی ہیں۔ پھر کہیں سے ایک بہن بھی منظر پہ آجاتی ہے۔ ہمیشہ سے صابرہ بھابھی کے ساتھ آنے والا گھامڑ سا کھاری اس کا بھائی نکل آتا ہے اور پھر وہ اپنے باپ سے ناراض ہو کر لندن چلا جاتا ہے جہاں میری ہی بیٹی میری ہی لاعلمی میں اس کے پیچھے پہنچ جاتی ہے۔ توبہ توبہ۔ میرا تو سر گھوم جاتا ہے اس داستان پر غور کرتے کرتے ابھی تو درمیان کے اللہ جانے کتنے لنکس مسنگ ہیں۔"
"اسی لیے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اس داستان کے نشیب و فراز پر غور کرنے کے بجائے بیٹی کی شادی کی تیاریوں پر توجہ دیں۔ آپ کہانی کے اینڈ پراڈکٹ کو دیکھیں۔ سعد سلطان جیسا داماد تو چراغ لے کر بھی نہیں ملنے والا تھا آپ کو۔" زوار نے کہا۔
"ارے چھوڑیں۔ بیٹی کا کیریئر گنوا کر ملنے والا داماد کس کام کا بھئی۔ آپ نے بھی اس کے باپ کے سوال پر فوراً "یوں آمنا و صدقنا کہا جیسے ذرا سی دیر ہو جانے پر اس نے ہاتھ سے نکل جانا تھا۔" فائزہ اٹھتے ہوئے بولیں۔
"آپ کی بیٹی آمنا و صدقنا پہلے ہی کہہ چکی تھی۔ میں نے اور بلال صاحب نے تو رسم ہی پوری کی۔" زوار مسکرائے۔
"اسی لیے کہا تھا۔ یہ لڑکی کسی نہ کسی کو ضرور لیٹ ڈاؤن کرے گی۔"
"کسی اور کو نہیں، صرف آپ کو۔ پڑھائی میں نکمی نکلی ہے نا۔" زوار نے شرارتاً "کہا۔
"جانے دیں کیریئر کو۔ آگے دیکھیے کیا گل کھلاتی ہے۔ آپ دھیان سے مہمانوں کی لسٹ بنائیے۔ ماہ نور کی شادی شہر کی اہم ترین شادیوں میں سے ایک ہونی چاہیے اس سیزن میں بس مجھے اتنا ہی چاہیے۔" وہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئیں۔
"ابراہیم ہے نا شادی کی تقریبات دیکھنے کے لیے، مجھے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" زوار نے کہا اور دوبارہ اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

"تم دیکھ رہی ہو سعدیہ! یہ جاپانی خرگوش اس لڑکی کے پیچھے ادھر پہنچا ہے۔ اسی کے پیچھے یہ نمانا دکھی رہتا تھا وچارہ یہی کہتا تھا بھائی افتخار دکھ کی کئی شکلاں ہوتی ہیں۔" کھاری نے بلال سلطان کے گھر پر بنے ٹریننگ روم اور منی سرکس رنگ میں پریکٹس کرتے رضوان الحق کو دیکھ کر سعدیہ کے کان میں سرگوشی کی۔
"ہائے پھر بولا نمانا وچارہ شکلاں۔" سعدیہ نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ "انہوں نے سن لیا نا فلزا آنٹی نے تو لگ پتہ جائے گا

آپ کو۔"

"ہائے میں کیا کروں۔ میرا تو قسمے منہ بھی تھک گیا ہے اردو بول بول کے۔ کدھر چلا جاؤں میں۔" کماری نے بے بسی سے کہا۔

"عادت ڈالیں اردو بولنے کی۔"

"ڈال تو رہا ہوں اور کیا کروں۔ توبہ جب تم مجھے آپ کہہ کر بلاتی ہو' مجھے خواہ مخواہ اپنے آپ پہ پیار آتا ہے۔" وہ چہکنے لگا۔

جواب میں سعدیہ کو بھی بے اختیار ہنسی آگئی۔

☆ ☆ ☆

"چی انگ سرکس' جدید ترین سرکس کمپنی ہے۔ تم نے دیکھا ان لوگوں کا اسٹائل ہمارے دیسی سرکسوں سے مختلف ہے۔ میں چاہتا ہوں تم دونوں اسی طرز پر اپنی ایک سرکس کمپنی بناؤ۔" بلال سلطان نے اپنے سامنے بیٹھے سارا اور رکو سے کہا تھا سارا نے بلال کے ساتھ بیٹھے سعد سلطان کی طرف دیکھا اور لاشعوری طور پر اپنا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔

"سارا... ڈیڈی نے تمہارے لیے بہت اچھا مستقبل پلان کیا ہے' تم دونوں کو فنانس اور سپورٹ کرنا ہماری ذمہ داری ٹھہری ہم پرافٹ اینڈ لاس میں بھی حصہ دار نہیں ہوں گے۔ یہ خالصتاً تم دونوں کی اپنی کمپنی ہوگی۔" سعد اس کی کیفیت کو سمجھ چکا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" سارا نے اپنے دل کی تمام کیفیات چھپا کر سرہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا میں نے تمہیں ہرٹ کیا سارا؟" بلال سلطان اور رکو اٹھ کر باہر چلے گئے تو سعد نے سارا نے سوال کیا۔

"نہیں۔" سارا نے سرہلایا "میں تو تمہاری بہت ممنون ہوں... اپنی اس زندگی کے لیے' زندگی کے ولولے اور جوش کے لیے اگر تم نہ ہوتے تو آج میں یہ نہ ہوتی۔"

"سارا! میں اب بھی تمہارے لیے وہی سعد ہوں اور ہمیشہ ایسے ہی رہوں گا تمہارے لیے۔ ہر وقت دنیا میں کہیں نہ کہیں موجود۔ بس ایک' دو' تین تک گنتی گننے کی دیر ہوگی۔" سعد نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"ہاں۔ میں جانتی ہوں۔" سارا نے بھاری آواز میں کہا "لیکن میں بہت خود غرض نکلی سعد! بلال صاحب کی ذرا سی توجہ نے مجھے اپنی اوقات بھلا دی۔ مجھے اپنا آپ بھلا دیا۔ مجھے تمہارا وجود بھی بھولنے لگا۔ جب ہی تو میں نے کسی سے سوال کیا نہ ہی پریشان ہوئی کہ آخر تم کہاں چلے گئے تھے۔ میں ظرف کی اتنی چھوٹی ثابت ہوئی کہ مجھے یہ سوچ کر ایک کمینی سی خوشی محسوس ہوتی رہی کہ تم کہیں جا چکے ہو' اب میرے کہیں تو ماہ نور کی دسترس میں بھی نہیں۔" اس نے استہزائیہ انداز میں ہنستے ہوئے سر جھٹکا۔

"بتاؤ بھلا... کوئی میرے جیسا کم ظرف بھی ہو سکتا ہے۔ وہ تو مجھے بیبی آنٹی کی دور اندیشی اور معاملہ فہمی بھاگئی ورنہ میں تو اپنے غرور میں رکو کو بھی گنوا بیٹھی تھی' وہ بھی واپس چلا جاتا تو میں اکیلی خود اپنے لیے کیا کر پاتی۔"

"یہ بھی مت سمجھنا سارا کہ... ڈیڈی نے تمہیں تمہاری اوقات یاد دلانے کے لیے سرکس رنگ میں واپسی کا مشورہ دیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں یہاں واپسی پر اس آئیڈیا کا سب سے بڑا مخالف ہوتا۔ لیکن یقین کرو... یہ راستہ تمہاری ذہنی اور جسمانی صحت کو قائم رکھنے کے لیے بہت ضروری ہے۔ خود انحصاری کا احساس دنیا کے بہترین احساسات میں سے ایک ہوتا ہے میری یہ بات کبھی نہ بھولنا۔ رہی بات تمہاری خود غرضی اور کم ظرفی کی تو بھول جاؤ کہ تم نے کبھی ایسا کیا تھا ہم میں سے کوئی بھی مکمل نہیں ہوتا۔ ہم سب کوتاہیوں اور کجیوں کے مارے ہوئے لوگ ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کو معاف کرتے اور ایک دوسرے کی خطاؤں کو بھول جاتے رہنا چاہیے۔ مجھے تم پر آج بھی فخر ہے اور تمہیں یوں دیکھ کر مجھے خود اپنے آپ پر بھی فخر محسوس ہو رہا ہے۔ میری ذات تمہاری زندگی کو بچانے اور اسے دوبارہ کار آمد بنانے کا باعث بنی۔ میرے لیے اللہ کا اس سے بڑا اور احسان کیا ہوگا...."

سعد کہہ رہا تھا اور سارا مبہوت بیٹھی اس کی بات سن رہی تھی۔

☆ ☆ ☆
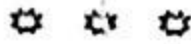
اس رات سعد کی کھاری سے ملاقات ہونے والی تھی۔ بلال سلطان نے دانستہ اس ملاقات میں تاخیر کی تھی۔ وہ کھاری کو تھوڑا اور گروم کرنے کے بعد سعد کے سامنے لانا چاہتے تھے۔

"بڑی شرم آئے گی مجھے سعد باؤ کے سامنے جاتے ہوئے۔" کھاری نے کنفیوز ہوتے ہوئے سعدیہ سے کہا تھا۔

"سعد باؤ نہیں سعد بھائی۔" سعدیہ نے تصحیح کی۔

"اوئے اوہو ای۔" وہ جھنجلا کر بولا "تھوڑا وقت تو لگے گا باؤ کو بھائی بنتے ہوئے۔"

"بننا کیا ہے۔ وہ ہیں ہی تمہارے بھائی۔" سعدیہ نے کہا۔

"اچھا نا.... بس دیکھو وہ کیسے ملتے ہیں مجھ سے؟" کھاری نے کہا۔

اور جس لمحے کے آنے سے پہلے وہ اس سے گھبرا رہا تھا۔ جب وہ لمحہ آیا تو اسے محسوس بھی نہیں ہوا کہ وہ اس شخص سے مل رہا تھا جس کے دل کے راز سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد اس نے امانت کی طرح اسے اپنے اندر چھپا رکھا تھا۔

"آپ میلے والے سائیں تھے نا؟" وہ اپنے اس بڑے بھائی سے گلے ملتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"تم جانتے تھے نا.... مجھے پہلے ہی شک تھا۔" سعد نے اسے اپنے ساتھ لگا کر اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا تھا۔

"سعد باؤ! میں کتنے اور آپ کدھر' میں کہیں سے بھی آپ کا بھائی نہیں لگتا نا۔ مجھے لگتا ہے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔" کھاری نے یہ بات بھی اس کے کان میں کہی تھی۔

"میں بھی یہ ہی سوچ رہا تھا کہ میں کہیں سے بھی تمہارا بھائی نہیں لگتا۔" سعد نے اس کے کان میں کہا۔ "تم اتنے معصوم' بے ریا اور نیک دل' میں اتنا چالاک 'کمرک اور ہوشیار...."

"آپ تو سائیں ہو جی' میلے والے سائیں' یاد ہے نا آپ نے مہ نور باجی سے کیا کہا تھا۔"

"کیا کہا تھا...."

"آپ کے گلے میں سوز کی وجہ عشق ہے' کہا تھا کہ نہیں کہا تھا۔"

"کہا تھا...."

"تو پھر جو عشق کرتے ہیں' وہ چالاک نہیں ہوتے' ہوشیار نہیں ہوتے اور وہ' وہ تیسرا لفظ بھی نہیں ہوتے جو آپ نے بولا' مجھے ابھی وہ نہیں آتا۔" وہ جھجکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"واہ! تم تو بڑے تیز ہو بھئی' سائیں کی باتیں بھی یاد ہیں...."

"مجھے ہی نہیں یاد' مہ نور باجی کو بھی یاد ہیں' آپ نے بھولنا نہیں۔" کھاری کو اس وقت بھی ماہ نور کا خیال تھا۔

"افتخار! اپنے بھائی سے ہی ملتے رہو گے' بہن سے نہیں ملو گے کیا؟" فلزا نے نادیہ کو آگے کیا۔ کھاری سعد سے الگ ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹا۔ نادیہ کو دیکھ کر چونکنے کے بعد اس نے سعدیہ کی طرف دیکھا۔

"بلے بھئی بلے' پوری انگریز اور میری بہن' یہ ہو کیا رہا ہے میرے ساتھ؟" اس کی نظریں سعدیہ سے کہہ رہی تھیں۔ اس کی بہن کو اچھی اردو نہیں آتی تھی اور اسے اچھی انگریزی نہیں آتی تھی' وہ دونوں دوسروں کی مدد سے ہی باتیں کرتے تھے۔

☆ ☆ ☆

سعد اور ماہ نور کی شادی شہر کا بہت بڑا ایونٹ ثابت ہوئی تھی۔ اس شادی میں بلال سلطان نے اپنے چھوٹے بیٹے اور بیٹی کو بھی اپنے احباب میں متعارف کروایا تھا۔ اچانک ایک اور بیٹے اور بیٹی کا یوں سامنے آنا اچنبھے کی بات تھی مگر اس طبقے میں اچنبھے کی باتوں پر فوری اچنبھے کا اظہار نہیں کیا جاتا تھا' ایسی خبروں پر بعد میں تبصرہ کیا جاتا تھا۔ خود بلال سلطان اب زندگی کی اس اسٹیج پر تھے جہاں انسان لوگ کیا کہیں گے جیسے خوف سے باہر نکل جاتے ہیں' اور بلال کو تو شاید زندگی کی کسی اسٹیج پر بھی یہ خوف لاحق نہیں رہا تھا۔ ان کی شخصیت میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ سوال کرنے والے ہونٹ' ان کے سامنے خاموش رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔

شادی میں رابعہ کلثوم اور سراج سرفراز کو دولہا کی خالہ اور خالو کی حیثیت میں متعارف کروایا گیا تھا۔
شادی میں خدیجہ اور فاطمہ بھی دولہا کی خالاؤں کی حیثیت سے شامل تھیں اور فلزا ظہور سے ''ادھوری کہانی سنا کر چھوڑ جانے کا شکوہ کرتی رہی تھیں۔
''کہانی کا انجام تمہارے سامنے ہے' دیکھ لو غور سے۔'' فلزا نے اسٹیج پر بیٹھے دولہا دلہن کی طرف اشارہ کیا تھا۔
شادی میں شریک دلہن کے چچا سردار' دولہا کے بھائی افتخار اور بھابھی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہے تھے۔
اور دلہن کی تائی صابرہ نے قیمتی تھری پیس سوٹ میں ملبوس افتخار احمد عرف کھاری کی طرف حیرت سے دیکھ کر سوچا تھا ''شکر ہے رضیہ! میں کہیں انجانے میں اس بے چارے کی شادی تجھ سے نہیں کروا بیٹھی۔ مولوائن تو سنا ہے اس کے ابے کی رشتہ دار نکلی جو تجھ سے ہو جاتی اس کی شادی تو بلال۔ سلطان کی سوسائٹی کیا کرتی بھلا۔''
شادی میں شریک ایک نئی سرکس کمپنی کی مالکن سارا خان' اور اس کا شوہر رضوان الحق بھی شریک تھے۔ دونوں نے حال ہی میں اسلام آباد میں جدید خطوط پر ایک سرکس کمپنی کا آغاز کیا تھا۔
''صرف دو گانوں کے بولوں کا فرق' دو انسانوں کی حیثیت واضح کرنے کے لیے کافی ثابت ہوا' یاہ نور! تم واقعی سعد سلطان کے دل کا معاملہ تھیں اور میں۔'' سارا خان اسٹیج پر دلہن بنی بیٹھی ماہ نور کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی ''میں اس کی نیک دلی کا معاملہ۔'' اس کے چہرے پر ایک اداس مسکراہٹ پھیلی تھی۔
شادی کی تقریبات ابھی جاری تھیں جب پنڈال میں داخل ہوتے ایک شخص کو دیکھ کر سعد سلطان اپنی دلہن سے معذرت کرتے ہوئے اسٹیج سے اتر کر اس سمت بھاگا تھا جدھر سے وہ شخص داخل ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ مہمانوں سے خوش گپیوں میں مصروف نادیہ کو بلا کر ایک طرف لے گیا تھا۔ اس جگہ وہ مہمان بھی کھڑا تھا جس کی آمد نادیہ کے لیے بھی سرپرائز کا باعث تھی۔
''معذرت خواہ ہوں چیلنج پورا کرنے میں دو ہفتے سے زیادہ دن لگ گئے۔'' سعد نے نادیہ سے کہا ''بس ان موصوف کے ویزے کا کچھ مسئلہ ہو رہا تھا۔'' اس نے مہمان کی طرف دیکھا تھا۔
''تمہیں مجھ پر مکمل بھروسہ ہے نا نادیہ۔'' اس نے نادیہ سے پوچھا تھا۔ نادیہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

"بس پھر یہ محض وودن زادے' تمہاری زندگی کے ساتھی کی حیثیت سے میرا انتخاب ہے' بولو قبول ہے؟" اس نے پوچھا تھا" اور اب تو تمہیں قبول کرنا ہی پڑے گا' یہ تمہارا وعدہ تھا۔"

نادیہ نے حیرت سے سر اٹھا کر وودن زادے کی طرف دیکھا۔۔وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"میری ترجیحات بہت مختلف ہو چکی ہیں سعد' وودن ان کو قبول کر پائے گا کیا؟" اس نے سوال کیا تھا۔

"تمہاری ترجیحات اور وودن کے نظریات دونوں ایک ہی سمت میں رواں ہیں' تم فکر مت کرو بس تم اسی بھروسے پر قائم رہو جو تمہیں مجھ پر ہے۔" وہ مسکرا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتی رابعہ کلثوم دیوانہ وار رو رہی تھیں۔ برسوں پہلے وہ اپنی منہ بولی بہن کی لگن کے صدقے اللہ کے گھر میں حاضری دینے آئی تھیں اور اس کے بعد دوبارہ آنے کی خواہش لیے واپس لوٹ گئیں۔ اپنے حالات اور دل میں جاگزین خوف کے مارے وہ خواب میں بھی یہ تصور نہیں کر سکتی تھیں کہ ان کی یہ خواہش کبھی پوری ہو سکے گی۔

"دنوں کا پھیر' اے میرے رب' یہ سب دنوں کا پھیر ہے۔" وہ روتے ہوئے بڑبڑا رہی تھیں۔ "اور انسان تو بہت ہی کوتاہ نظر' بے صبرا ہے' خود ہی مفروضے باندھتا' آپ ہی مایوس ہو جاتا ہے۔ اے میرے مالک تو مجھے شکران نعمت کی توفیق عطا فرما اور زوال نعمت سے محفوظ رکھ" وہ یہاں آنے کے بعد ہر قیام' رکوع اور سجدے میں یہ ہی دعا مانگتی رہی تھیں۔

"مولا واہموں' بدگمانیوں اور حسرتوں سے بچائے۔"

مولوی سراج سرفراز نے کعبہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا تھا اور اپنے شانے پر رکھے صافے سے اپنی بھیگی آنکھیں خشک کرنے لگے تھے۔

☆ ☆ ☆

"سائیں اختر نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں نے جو جذبہ دل میں پال لیا ہے' وہ مجھے بہت خوار کرے گا۔" ماہ نور نے چڑھائی چڑھتے چڑھتے رک کر سانس بحال کرنے کے دوران کہا۔

"ہاں اختر کو سچ بولنے اور وہ بھی منہ پر سچ بولنے کی عادت ہے۔" سعد مسکرایا۔

"تم اس سے بہت متاثر نظر آتے ہو' جب ہی شادی کے اگلے ہفتے ہی اس سے ملنے یہاں چلے آئے۔" ماہ نور نے چھیڑا۔

"ہاں میں اس کا بہت بڑا فین ہوں۔"

سعد نے محبت بھری نظروں سے ماہ نور کی طرف دیکھا اور آگے چلنے لگا۔

"یہ کیا؟" اختر کے ڈیرے کی جگہ کو اجڑا اور خالی دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

"اختر کی کٹیا کہاں گئی' اختر کہاں گیا؟" اس نے مڑ کر ماہ نور کی طرف دیکھا' جو خود بھی یہ منظر حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

ان دونوں کی آوازیں سن کر کسی درخت کے نیچے بیٹھے دو شخص اٹھ کر ان کی طرف آگئے۔"

"عبدالودود۔" سعد نے ان میں سے ایک کو دیکھ کر کہا۔ "سائیں اختر کی کٹیا اور خود اختر کہاں گئے؟"

"سائیں جی اپنی اگلی منزل پر روانہ ہو گئے صاحب۔" عبدالودود نے کہا۔

انہوں نے فرمایا۔ "سانپ' سپیرے اور فقیر کا کوئی ایک ٹھکانا نہیں ہوتا۔ وہ ایک سے دوسری جگہ کا سفر کرتے ہی رہتے ہیں۔ میں نے سوچا پاؤں پڑ جاؤں گا' منت کر لوں گا سائیں جی یہ ٹھکانا نہ چھوڑیے' مگر اگلی صبح میرے نیند سے جاگنے سے پہلے ہی وہ یہاں سے کوچ کر چکے تھے۔"

"اوہ!" سعد اور ماہ نور نے بیک وقت کہا۔ "کہاں گئے وہ؟"

"پتا نہیں جی، تا حال ان کی کوئی خبر نہیں؟" عبدالودود نے کہا اور واپس جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ سعد اور ماہ نور نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں نے چہرے پر کچھ گم ہو جانے کا احساس تھا۔

جوگی آکھیا خیال نہ پوؤ میرے
سب نے فقیراں دیس گیا

فضا میں آخری آواز کی بازگشت گونجی۔ دونوں آہستہ قدموں سے واپس نیچے اترنے لگے۔

"یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے، جوگی، فقیر اور سائیں لوگوں کا یہ ہی شیوہ ہوتا ہے۔" ماہ نور نے نیچی آواز میں کہا، وہ سعد کے احساسات کو سمجھ رہی تھی۔

"ہاں، وہ کبھی بھی کہیں بھی کسی بھی روپ میں نظر آ سکتے ہیں۔ ان کا کوئی مخصوص حلیہ یا حوالہ نہیں ہوتا۔" سعد نے سر ہلایا۔

"ہاں جیسے منگو کے میلے کا سائیں۔" ماہ نور مسکرا کر بولی۔

"جو بہت unpridictable (غیر متوقع) ہے، کبھی بھی، کسی بھی روپ میں کہیں بھی نظر آ سکتا ہے۔" سعد نے مسکراتے ہوئے اس کی بات سنی اور بلند آواز میں ہنس دیا۔

"یہ دیکھو یہ بورڈ کسی جانب اشارہ دینے کے لیے لگایا گیا ہے۔ مگر یہ کس طرف اشارہ کر رہا ہے یہ اس پر نہیں لکھا۔" نیچے اترتے ہوئے ایک جگہ رک کر ماہ نور نے لوہے کے اسٹینڈ پر رکھے ایک تیر کے نشان جیسے لکڑی کے تختے کی طرف اشارہ کیا جس پر کوئی تحریر درج نہیں تھی۔

"رکو، اس پر میں کچھ لکھتا ہوں۔" سعد نے کہا۔ "تمہارے بیگ میں لکھنے کی کوئی چیز ہے؟"

"نہیں۔" ماہ نور نے کہا "ہاں ایک سرخ رنگ لپ اسٹک موجود ہے بس۔"

"لاؤ وہی دو۔" سعد نے ہاتھ بڑھایا اور لپ اسٹک اس سے لے کر تختے کی طرف بڑھ گیا۔ لکھنے کے بعد اس نے مسکرا کر ماہ نور کی طرف دیکھا، جو تجسس کے مارے تیزی سے آگے بڑھی۔

"Happily ever after"

سعد کے ہینڈ رائٹنگ میں سرخ لپ اسٹک سے بڑے بڑے حروف میں لکھے یہ الفاظ پڑھ کر وہ بے اختیار ہنس دی تھی۔ اس شخص کی محبت کے اظہار کا طریقہ کبھی بھی نارمل نہیں رہا تھا۔

☆

کسی بھی کہانی کے اختتام پر کوئی ایسی جادو کی چھڑی نہیں چلتی جس کے ذریعے سب غلط ٹھیک ہو جائے۔ یہ کہانی کے واقعات کا تسلسل ہی ہوتا ہے جنہیں کہانی کی آخری قسط میں ہی جا کر اپنے انجام تک پہنچنا ہوتا ہے۔ کہانی شروع ہوتی ہے، مختلف موڑ لیتی، خود کو قاری پر کھولتی اپنے کرداروں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات آگے بڑھاتی آہستہ آہستہ اپنے اختتام تک پہنچ جاتی ہے سعد اور ماہ نور کی یہ کہانی بھی ایسی ہی کہانیوں میں سے ایک کہانی ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد سوچ کر بتایئے گا کہ اس کہانی کو اسی طرح آگے بڑھتے بڑھتے یوں ہی ختم ہونا تھا یا نہیں؟ کہانی کی آخری قسط میں اچانک کوئی جادو کی چھڑی ملی یا واقعات کا تسلسل بالآخر اپنے منطقی اختتام کو پہنچا۔ ضرور سوچیے گا اور ضرور بتایئے گا۔

عنیزہ سید